سب رس

اعلیٰحضرت سلطان العلوم [illegible] خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ

دکن نمبر

ادارۂ ادبیات اردو

رجسٹر نمبر (M3950)

نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۳)

مُرقّعِ دکن

یعنی

ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے ماہ نامہ

سب رس

کا سالگرہ نمبر بابتہ جنوری ۱۹۳۹ء

زیر نگرانی

ڈاکٹر سیّد محی الدّین قادری زورؔ

مجلس ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکشؔ

سکینہ بیگم

خواجہ حمید الدین شاہدؔ

معین الدین احمد انصاری

مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر " ادارہ " رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

تعداد صفحات ۲۱۶ تعداد تصاویر ۱۰ قیمت عال

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہ ادارہ ادبیات اردو کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہ ہوں گے

(۳) اُردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کرکے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہ کار مضامین کو اُردو میں منتقل کرکے اُردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہئے

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی پی یا وی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے	چار روپے	دو روپے	چھ آنے
شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ڈاک	چار روپے آٹھ آنے	دو روپے بارہ آنے	سات آنے

بچوں کے سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے	ایک روپیہ	دس آنے	ڈیڑھ آنہ
شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ڈاک	ایک روپیہ آٹھ آنے	بارہ آنے	دو آنے

محرم نمبر ۱۲/ اقبال نمبر عہ ۴/ دکن نمبر عاا/

سب رس کی خریداری اس میں اشتہارات کی طباعت اور ادارہ ادبیات اردو کی رکنیت یا اس کے مطبوعات کی خریداری کے سلسلے میں جو اصحاب صدر دفتر (رفعت منزل خیریت آباد) سے گفتگو یا مراسلت نہیں کرسکتے وہ حسب ذیل اصحاب سے گفتگو یا مراسلت کرسکتے ہیں۔

بلدہ (۱) مسٹر یس اے کریم نمائندہ خصوصی چیلہ پورہ قریب مکان حکیم محمود صمدانی مرحوم (۲) مسٹر یس پی اننتا۔ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ (۳) رحمان کا ٹیج گھانسی بازار۔ **اضلاع** مسٹر محمد فخرالدین ارماں (روضۂ شیخ) گلبرگہ شریف ان کے علاوہ نور احمد صاحب عثمانیہ ادارہ کی طرف سے علمی و ادبی دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے یہاں ادارہ کی کتابیں اور رسالے لے کر آئیں گے۔ توقع ہے کہ علم دوست اصحاب ضرور ان کی مدد کریں گے۔

سب رس مرقع دکن نمبر جنوری ۱۹۳۹ء

فہرست تصاویر

سلاطین آصفی

وزرائے آصفی

امرائے آصفی

دیگر تصاویر

تعداد صفحات ۲۱۶ - تعداد تصاویر ۷۸ - قیمت عـلـلـہ

سب رس مرقع دکن نمبر جنوری ۳۹ء

فہرست مضامین

ہز ہائینس والاشان نواب اعظم جاہ بہادر

ولیعہد سلطنت آصفیہ و شہزادہ برار

اپنے فرزند ارجمند شہزادہ کرنل نواب مکرم جاہ بہادر کے ساتھ

مدحِ خواجہ

معین الدینؒ ہیں قطب الدینؒ سے شاد — تو قطب الدینؒ، فرید الدینؒ سے شاد
فرید الدینؒ، نظام الدینؒ سے خوش — نظام الدینؒ، نصیر الدینؒ سے خوش

نصیر الدینؒ مرے ممدوح سے شاد
مرے ممدوح کا تو نام رکھ یاد

مطیعِ مصطفےٰ سید محمدؐ — مطاعِ باصفا سید محمد
دوئی کیسی؟ یہ ہے فردِ یگانہ — مری نظروں میں ہے قطبِ یگانہ

اُدھر جو ہے وہی ضو پاش اِدھر ہے
نمودِ خواجہ ہر سُو جلوہ گر ہے

سمجھ کا دُور ہو جائے اگر پھیر — تو گلبرگہ کو بھی تو سمجھے اجمیر
غرض، تنویرِ خواجہ دیدنی ہے — جدھر دیکھو اسی کی روشنی ہے

نگاہِ عارف ان جلووں کی جُویا
مری نظریں بھی خوش ان سے ہیں گویا

دکھاتا ہے یہ سلطانِ طریقت — مجازی شان میں شانِ حقیقت
نزول اچھا عروج اچھا ہے اس کا — سلوک اس شان سے کامل ہے کس کا

جو یہ شہباز ہو مائل بہ پرواز
کھلے تشبیہ سے تنزیہ کا راز

عیاں خواجہ کی ہے بندہ نوازی — نہیں کس کو امیدِ سرفرازی
سلیمانِ دکن عثمان علی خاںؒ خلد اللہ — فروغِ مدعائے آصفستاں

مرے خواجہ کے رُخ سے سب کا ہے ضو
دکن افروز ہے خواجہ کا پرتو

علی منظور

---

۱ غریب نواز ۲ بختیار کاکی ۳ گنج شکر ۴ سلطان المشائخ ۵ چراغ دہلی ۶ بندہ نواز۔ غریب نواز اور بندہ نواز تینوں بھی واسطے آیا ہے ۷ خواجہ کے القاب میں ایک لقب شاہباز بلند پرواز بھی

ادار یہ

سب رس کا دوسرا سال جس اہتمام کے ساتھ شروع ہو رہا ہے۔ اس کا عملی ثبوت یہ سالگرہ نمبر ہے جو دکن کے ماضی و حال کے متعلق دلچسپ اور اہم تاریخی معلومات کے لئے وقف کر دیا گیا ہے اور ہزارہا روپیہ کے صرفہ سے تیار ہوا ہے۔ قدیم تاریخی قلمی تصویروں کے فوٹو لینے اور پھر ان کے اسّی بلاکس کی تیاری اور اُن کی چھپائی کے لئے جو وقت اور رقم صرف ہوی ہوگی صرف اسی کا اندازہ کرنے سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ ادارہ نے اس شاندار تاریخی نمبر کی خاطر کتنا اہتمام کیا ہے اور سب رس کی زندگی اور ترقی کے لئے کس حد تک رقم کا صرفہ اور محنت کرنے کے لئے تیار ہے۔

اسی اہتمام اور غیر معمولی کوششوں میں آسانی کار پیدا کرنے کے سلسلہ میں ادارۂ ادبیات اردو نے نئے سال سے سب رس کی ایک مجلس ادارت بھی قائم کر دی ہے۔ جو اپنے ہر ماہ نامہ کو ہر ذوق اور ہر قسم کی دلچسپیوں سے مالا مال کرنے کی طرف خاص طور پر متوجہ رہے گی۔

مجلس ادارت کے قیام کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ سب رس کا علمی و ادبی معیار بڑھتا جائے اور اس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ایسی مفید اور ضروری معلومات بھی درج ہوا کریں جن کا جاننا ہر تعلیم یافتہ کے لئے ضروری ہے۔ اس بارے میں ادارۂ ادبیات اردو کے مختلف شعبے سب رس کا ہاتھ بٹائیں گے۔ مثلاً شعبۂ زبان اردو زبان کے ضروری اور اہم مسائل پیش کرتا رہے گا۔ شعبۂ تنقید کی طرف سے اردو کتابوں پر سنجیدہ اور ذمہ دارانہ تنقیدیں شایع ہوتی رہیں گی۔ اور تمام ہندوستان کی جدید مطبوعات کی اطلاع بھی وقت بوقت دی جائے گی تاکہ معلوم ہوتا رہے کہ اردو میں کون کونسی کتابیں شایع ہو رہی ہیں۔ شعبۂ تاریخ دکن ایسی مفید اور دلچسپ معلومات فراہم کرتا رہے گا جو ملک کی ترقی اور عروج کیلئے اہل ملک کی رہبری کریں گی۔ شعبۂ نسوان ہر ماہ نسوانی فلاح و بہبود سے متعلق مضامین کی فراہمی کے علاوہ اس امر کی کوشش کرتا رہے گا کہ سب رس میں نسوانی دلچسپیوں کے کافی سامان مہیا ہوتے رہیں۔

ساتھ ہی ادارہ کے تمام شعبوں کے ماہوار جلسوں کی روئدادیں بھی سب رس میں شایع ہوں گی تاکہ ہر مضمون سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب مستفید ہو سکیں۔ چنانچہ ان تمام شعبوں کی تفصیل اور ان کے جلسوں کی روئدادوں کے اہم حصے اس مہینے بھی شایع کئے جا رہے ہیں۔

یہ باتیں صرف اس لئے بیان کی گئیں کہ سب رس کے قدردانوں کو اندازہ ہو جائے کہ سب رس کی ترقی اور اس کے مستقبل کو درخشاں بنانے کے لئے ادارہ کیا کام کر رہا ہے۔

دکن نمبر کے بارے میں زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ خود اس کا مطالعہ اس کی سفارش کرے گا۔ اتنا لکھنا ضرور ہے کہ محض اعلیحضرت ظل سبحانی سلطان العلوم آصفجاہ سابع کی علم نوازیوں اور مسیحا نفسیوں کے باعث آج ہم اس قابل ہو سکے کہ دکن کی قدیم تاریخ کو اس طرح باتصویر پیش کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مرقع دکن اعلیحضرت کے نام نامی اور حالاتِ زندگی سے شروع کیا جا رہا ہے۔ اور اس کا سرورق حضرت ظل سبحانی سلطان العلوم ہی کی تصویر سے مزین ہے۔ اس سلسلہ میں نواب سالار جنگ بہادر کی علم دوستی اور فیاضی کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ جس کی وجہ سے یہ مرقع دکن صحیح معنوں میں ایک مرقع بن سکا۔ اس کی اکثر تصویریں نواب صاحب ہی کے خزائنِ فنونِ لطیفہ سے حاصل کی گئی ہیں۔ اور نواب صاحب نے بکمال مہربانی ان کو سب رس میں شایع کرنے کی اجازت عطا فرمائی ہے۔

سب رس کے قلمی معاونین کا شکریہ بھی لازمی ہے کہ انھوں نے قلیل عرصے میں نہایت مستند، دلچسپ اور مکمل مضامین تیار کر دئے۔ خاص کر دکن نمبر کی تیاری کے لئے جو مجلس مشاورت مقرر کی گئی تھی اس کے اراکین (عبد المجید صاحب صدیقی ام اے ال ال بی۔ میر محمود علی صاحب ام اے

سید تاج الدین صاحب ام۔اے۔ سید محمد اکبر وفا قانی صاحب بی۔اے۔ ال ال بی۔ عبدالقادر سروری صاحب ام۔اے۔ ال ال بی اور سید محمد صاحب ام۔اے۔ ہر طرح سے مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے نہ صرف خود کام کیا بلکہ دوسروں سے بھی اچھے اچھے تاریخی مضامین لکھوائے۔ مولوی غلام احمد خاں صاحب صوبہ دار اورنگ آباد کی علمی دلچسپی کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ انھوں نے نہ صرف اورنگ آباد پر مضمون لکھ بھیجا بلکہ وہاں کے مختلف مناظر اور تاریخی مقامات کی تصاویر بھی روانہ کیں۔ جن میں سے بعض اس مرقع میں یا بچوں کے دکن نمبر میں شامل ہیں اور بعض آئندہ نمبروں میں چھپیں گی۔

سب رس کے ناظرین یہ معلوم کر کے خوش ہوں گے کہ حیدرآباد کے مشہور آرٹسٹ مسٹر قیوم نے جس طرح اس شمارہ کے لئے عبدالرزاق لاری کی تصویر بنا دی ہے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ بھی سب رس کو اپنے حسن کارانہ کمالات سے مستفید کرتے رہیں گے

سید محمد اکبر وفا قانی صاحب اور مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب نے بھی سب رس کے ہر شمارہ میں کسی نہ کسی معمولی مضمون کی تیاری اور اشاعت میں مدد دینے کا ذمہ لیا ہے۔ اگرچہ وقت کی تنگی کی وجہ سے لاری کی تصویر رنگوں میں چھاپی نہ جا سکی۔ تاہم یہ تصویر اپنی تاریخی اہمیت اور ایک مشہور مصور کا نتیجہ قلم ہونے کی وجہ سے قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ عبدالرزاق لاری نے تنہا اس وقت مغل فوج کا مقابلہ کیا جب غداروں کے دروازہ کھول دینے کی وجہ سے مغل فوج قلعہ میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ لاری کو عین وقت پر اس کی اطلاع ہوئی اور وہ کھلے ہوئے دروازے کے سامنے مقابلہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ زخموں میں چور ہو گیا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

اس سب رس میں ایک چیز کی کمی محسوس ضرور ہی ہوگی۔ سب مضامین اور نظمیں مردوں ہی کے ہیں۔ صنف نازک کو اس میں سوائے بچوں کے حصہ کے، کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے۔ ایسا عمداً کیا گیا۔ کیونکہ ادارہ کے شعبہ نسواں نے تصفیہ کیا تھا کہ وہ اپنا نمبر علحدہ شائع کرے گا۔ اس لئے جملہ مضامین معتمد شعبہ نسواں اور سب رس کی مجلس ادارت کی رکن محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کے یہاں روانہ کر دئے گئے۔

انھوں نے ان سب مضامین کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کر لیا اور خواتین دکن کے دلچسپ اور مفید مضمونوں اور نظموں کا یہ مجموعہ اب نذر دکن کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ اور غالباً آئندہ جنوری تک قدردانوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔ نذر دکن اپنی قسم کی واحد اور قابل دید کتاب ہوگی۔ اور سب رس کے سالانہ خریداروں کو نصف قیمت پر دی جائے گی کیونکہ وہ دراصل سب رس ہی کا ایک حصہ ہے۔

نذر دکن کے علاوہ شعبہ نسواں کی طرف سے قریب میں اور کتابیں بھی شائع ہوں گی۔ توقع ہے کہ یہ شعبہ ملک کی علم دوست خاتونوں کے تعاون کی وجہ سے خاطر خواہ کامیاب ہوگا۔

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس عاملہ نے حسب ذیل اصحاب کو ان کی علمی و ادبی دلچسپیوں اور ادارہ کے کاموں میں خلوص کے ساتھ ہاتھ بٹانے کے پیش نظر ادارہ کا رفیق منتخب کیا ہے۔

محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ (داعی شعبۂ نسواں)، مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری ام۔اے۔ بی۔ایس۔سی آنرز (داعی شعبۂ زبان) مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ام۔اے۔ ایچ۔سی۔ایس (داعی شعبۂ تراجم) اور نواب کتقباد جنگ بہادر

توقع ہے کہ سب رس کا دوسرا سال نئے انتظامات اور خاص اہتمام کے باعث پہلے سال سے زیادہ کامیاب ثابت ہوگا۔

سید محی الدین قادری زور

اعلیحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخان بہادر آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ

حضرت ظل سبحانی کے حالات زندگی اور عہد میمنت مہد کے متعلق اس وقت تک متعدد کتابیں اور مضامین شایع ہو چکے ہیں ہر سال ملک اور بیرون ملک میں رسائل و اخبارات کے سالنامے اور سالگرہ اقدس کی مبارکباد کے خاص نمبر شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ان سب میں حضرت بندگان عالی کی عظیم الشان شخصیت، آپ کے بے مثال تدبر و سیاست، ذاتی علم و فضل شعر و سخن کی دلچسپیوں اور ذہنی و اخلاقی محامد وغیرہ کے ہر پہلو سے متعلق تفصیلی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں اگر ان سب کو یکجا کر دیا جائے تو اعلیحضرت سلطان العلوم کی قابل تقلید ہستی کے متعلق کئی جلدوں کی سوانح حیات مرتب ہو جائے۔

دودمان آصفی میں اعلیحضرت سلطان العلوم آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہ کی ذات والا صفات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور علم و فضل و شعر و سخن کی سرپرستیوں میں حضرت جہاں پناہی نے خاص توجہ فرمائی ہے یہی وجہ ہے کہ اعلیحضرت خلد اللہ کے تذکرہ کو اس مرقع دکن کے لئے زیب عنوان قرار دے کر تاریخی سلسلہ سے درج کرنے کی جگہ ابتدا میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اعلیحضرت سلطان العلوم خلد اللہ کی حیات کا محض علمی و ادبی پہلو بھی ایسا وسیع ہے کہ اس پر لکھنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر کئی جلدوں کی مبسوط کتاب لکھی جا سکتی ہے اگر موقع ملے تو خود ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے اس موضوع پر نہایت اجمال کے ساتھ پانچ ابواب میں ایک نذر عقیدت پیش کی جائیگی۔ اس سوانح شاہانہ کا پہلا باب حیات سلطانی اور دوسرے چار ابواب ۲۔ اردو شاعری۔ ۳۔ اردو نثر۔ ۴۔ فارسی شاعری اور ۵۔ ہندی شاعری پر مشتمل ہوں گے۔

ادارہ

خسرو دکن مشرق کے سب سے زیادہ ہردلعزیز تاجدار ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ آپ کے لئے بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام تھا اس لئے آپ کو مشرقی اور مغربی علوم میں اعلیٰ مہارت حاصل ہے۔ فارسی اور اردو زبان کے اعلیٰ شاعر ہونے کے علاوہ اپنی خداداد ذہانت و اعلیٰ قابلیت اور علوم و فنون کی سرپرستی کی بناء پر بجا طور پر سلطان العلوم کہلاتے ہیں۔

اپنے والد نواب میر محبوب علیخاں کے انتقال پر آپ ۱۹۱۱ء میں ۲۷ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے جس کو آج تقریباً ۴۰ سال کا عرصہ ہوتا ہے اس عرصہ میں حیدرآباد کی ہمہ جہتی ترقی حیرت انگیز ہے جو کام کہ سلطنت آصفیہ کے قیام کے زمانے سے حالیہ زمانہ تک یعنی دو سو سال کے عرصہ میں نہیں ہوا تھا وہ اس وقت ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور بندگان عالی نے اپنی غیر معمولی روشن خیالی۔ رواداری بے انتہا سادہ زندگی، اعلیٰ اخلاق اور خداداد قابلیت سے حیدرآباد کی قومی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی ہے جس کی وجہ سے سارے ملک میں علم بیداری پیدا ہو گئی ہے اور سلطنت آصفیہ میں ترقی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے۔

رعایا کے نہ صرف جان و مال کی حفاظت اور ملکی ترقی کا خیال آپ کے پیش نظر رہتا ہے بلکہ تعلیمی اور اخلاقی زندگی کی اصلاح اور رعایا کے آرام و آسایش کی فکر ہمیشہ آپ کے دامنگیر رہتی ہے۔ چنانچہ طبقۂ امراء اور بالخصوص نوجوانوں کو ابھی حال میں جو نصائح آپ نے فرمائے ہیں وہ آب زر سے

لکھے جانے کے قابل ہیں۔

اعلیٰحضرت کی تخت نشینی کے وقت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر مدار المہام تھے۔ پھر نواب سالار جنگ بہادر سوم، مدار المہام ہوئے بعد ازاں پانچ سال تک اعلیٰحضرت نے نہایت جانفشانی سے یہ فرائض خود انجام دئے۔ آخر پر ۱۹۱۹ء میں باب حکومت کا قیام عمل میں آیا اس کے بعد سر علی امام سر فرید ملک الملک نواب ولی الدولہ بہادر، اور پھر مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یکے بعد دیگرے صدر اعظم مقرر ہوئے۔

جنگ عظیم کے نازک موقع پر اعلیٰحضرت نے خاندانی روایات کے مطابق اپنی جملہ فوجوں اور تقریباً چار کروڑ روپیوں سے سلطنت برطانیہ کی مدد فرمائی۔ اس امداد کے اعتراف میں حکومت برطانیہ نے "یار وفادار، و ہز اگزالٹیڈ ہائینس" کے خطاب سے مخاطب کیا۔

اعلیٰحضرت کی حب الوطنی اور رعایا پروری ضرب المثل ہے چنانچہ آپ نے بادشاہ ہوتے ہی قدیم محکموں کی از سر نو تنظیم فرمائی اور بہت سے نئے محکمے قائم کئے جیسے محکمہ آثار قدیمہ محکمہ زراعت۔ محکمہ صنعت و حرفت۔ محکمہ آرائش بلدہ و محکمہ امداد باہمی محکمہ بلدیہ و محکمہ لاسلکی وغیرہ۔ کئی ایک بڑے بڑے تالاب بنوائے جیسے عثمان ساگر، حمایت ساگر اور نظام ساگر وغیرہ اسی طرح بے شمار عمارتیں تعمیر کیں۔ جیسے عدالت العالیہ۔ دواخانہ عثمانیہ۔ سٹی کالج معظم جاہی مارکٹ۔ کتب خانہ آصفیہ۔ جامعہ عثمانیہ کی عمارتیں۔ جوبلی ہال وغیرہ۔

غرض خوبصورت عمارتوں کی کثرت، سمنٹ کی سڑکوں کی رونق اور ہر قسم کی جدید ترقیوں کی وجہ سے اس وقت حیدرآباد ہندوستان کا بہترین شہر بن گیا ہے۔ جہاں مشرقی و مغربی دونوں قسم کے تمدنوں کے نمونے موجود ہیں۔ اسی طرح اضلاع اور شہر میں آمد و رفت کی بہت کچھ سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ ریلوں اور سڑکوں کا ایک جال سارے ملک میں بچھا دیا گیا ہے۔ اسی طرح دور عثمانی میں عمارتوں کی تعمیر و رعایا کی خوشحالی اور ترقی کو دیکھ کر عہد شاہجہانی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

اعلیٰحضرت کے پچیس سالہ کامیاب حکومت کا جشن سلور جوبلی، منایا جا کر ابھی پورے ۲ سال کا عرصہ نہیں ہوا ہے کہ جشن سیمیں کے بعد رائٹ آنربل سر اکبر حیدری نواز جنگ بہادر کو صدر اعظم مقرر فرمایا گیا ہے۔ سر اکبر نے صدارت عظمیٰ سے قبل ملک میں اشاعت تعلیم، قیام جامعہ عثمانیہ اور ریاست کے مالیہ کے استحکام اور دیگر اصلاحات کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے دوران کے سلسلہ میں گول میز کانفرنس جا کر آپ نے ریاست کے مفاد کی جس خوبی سے حفاظت کی ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں حکومت برطانیہ اور اعلیٰحضرت کے درمیان یہ معاہدہ ہوا کہ "برار میں انگریزی جھنڈے کے ساتھ حضور نظام کا جھنڈا بھی بلند ہوگا۔ ولیعہد بہادر ہز ہائینس پرنس آف برار کا خطاب اور اعلیٰحضرت ہز اگزالٹیڈ ہائینس نظام آف حیدرآباد و برار کا خطاب اختیار فرمائیں گے۔" اسی طرح علاقہ ریذیڈنسی کی واپسی بھی اعلیٰحضرت کے زمانے کی ایک بڑی یادگار رہے۔

اعلیٰحضرت کی تقلید میں خاندان شاہی کے دیگر اراکین بھی ترقی ملک کے لئے ہمہ تن مصروف ہیں چنانچہ ولیعہد سلطنت ہز ہائینس پرنس آف برار والا شان اعظم جاہ بہادر کی سپہ سالاری میں فوجوں کی بہت کچھ اصلاح اور ترقی عمل میں آئی ہے۔ شہزادہ والا شان نواب معظم جاہ بہادر کی میر مجلسی میں محکمہ آرائش بلدیہ حیدرآباد کے اشتراک عمل سے، غربا کی زندگی کو بہتر بنانے، بہبودی اطفال کے مرکز قائم کرنے، معظم جاہی مارکٹ کو ایک نمونے کی مارکٹ بنانے اور شہر کی عام رونق میں اضافہ کرنے میں سرگرم عمل ہے۔ ترکی شہزادیوں یعنی شہزادی ہز ہائینس درشہوار اور شہزادی نیلوفر کی رہنمائی کی وجہ سے حیدرآباد کے طبقۂ نسوان میں بہت کچھ بیداری، اصلاح

اور ترقی کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے ہیں چنانچہ انجمن خواتین حیدرآباد کی سرگرم کوشش اس کا بدیہی ثبوت ہیں۔ اسی طرح سے اعلیٰحضرت نے اپنے بھائی صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر کو جدید تعلیمی کمیٹی کا صدر اعلیٰ مقرر فرمایا ہے۔ جن کی صدارت میں بہت کچھ مفید کام کیا جا رہا ہے۔ غرض ۸۲ ہزار مربع میل سے زاید رقبہ ملک پر اعلیٰحضرت کے نام کا سکہ جاری ہے۔ اور تقریباً ڈیڑھ کروڑ رعایا قانون آصفی کے تحت عدل و انصاف سے مستفید ہو رہی ہے۔

صرفِ خاص مبارک، پائیگاہوں، جاگیرات اور سمستانوں کے قطع نظر محض علاقہ دیوانی کی آمدنی اس وقت (۹) کروڑ روپے سالانہ سے زاید ہے۔ جس کی وجہ سے خزانہ معمور ہے اور قوم سازی کے بہت سے کام ہو رہے ہیں۔ زراعت پیشہ طبقہ کی مشکلات کو بڑی حد تک دور کیا گیا ہے۔ صنعت و حرفت کی ترقی کی طرف بھی خاص توجہ کی گئی ہے۔ چنانچہ اس وقت بہت سی صنعتیں جاری ہیں اور بعض بڑے بڑے کارخانہ جات کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ اسی طرح تجارت کیا بلحاظ درآمد اور کیا بلحاظ برآمد ترقی پر ہے۔

اعلیٰحضرت بندگان عالی کی سرپرستی اور فیاضی کا یہ عالم ہے کہ ریاست کے باہر بھی جو باشندے یا جو ادارے مستحق ہیں ان کو یہاں سے مالی امداد دی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ حیدرآباد قدیم کی روایات برقرار ہیں اور بعض امور میں حیدرآباد جدید دوسری ریاستوں اور برطانوی ہند سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے جیسا کہ انتظامی اختیارات کی علٰحدگی کا مسئلہ ہے۔ اس پر اکتفا نہیں بلکہ اس وقت دستوری اصلاحات کے نفاذ اور مزید معاشی ترقیات کی تحریکات پر غور کیا جا رہا ہے۔

آخر پر اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ مبارک دورِ عثمانی کا سب سے اہم اور لافانی کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے جہاں سارے علوم و فنون کی تعلیم ملک کی عام فہم اور سرکاری زبان یعنی ہندوستانی (اردو) کے ذریعہ دی جاتی ہے۔

اس بیس سال کے عرصہ میں جامعہ عثمانیہ نے جو ترقی کی ہے اور اس کو اندرون و بیرونِ ملک جو غیر معمولی کامیابی اور عام مقبولیت نصیب ہوئی ہے وہ تاریخ میں اپنی آپ نظیر ہے ؂

زندہ کردی چوں مسیحا علم و فن را در دکن
زندہ باش اے حضرتِ عثمان علی خاں زندہ باش

میر محمود علی

سب رس کے گذشتہ سال کے پرچے

سب رس کے گزشتہ پرچوں کی ابھی سے مانگ بڑھ گئی ہے۔ نومبر اور ڈسمبر کے پرچے اصلی قیمت میں خریدے جائیں گے۔ اگر کسی صاحب کے یہاں اچھی حالت میں ہوں اور وہ ان کو نکالنا چاہتے ہوں تو دفتر کو مطلع فرمائیں۔ دوسرے مہینوں کے پرچوں کو بھی حفاظت سے رکھئے۔ آئندہ طلب کئے جائیں گے۔

مہتمم

تمدنِ ہند میں دکن کا رتبہ

تاریخ ہند کی یہ کھلی حقیقت ہے کہ دکن تہذیب ہند کا تنہا محافظ ہے۔ اس حقیقت کو ہم حال اور مستقبل کے آئینہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ وہ تاریخ ہند جو انگریزی اقتدار کا فدیہ بنی ہوئی ہے ہمارے ماضی کی تقسیم فرقوں کی سرخیوں سے کرتی اور اس تنگ نظری کی وجہ سے تاریخ کا تہذیبی پہلو اجاگر نہیں ہوتا۔ ایک وطن پرست تہذیبی تقسیم کے لحاظ سے ہندوستان کو ان عنوانات کے تحت مطالعہ کر سکتا ہے۔ ویدوں کا دور، مثنویوں کے ذریعے ہندوستان ماسبق کی تہذیب، گوتم بدھ کا ہند، ہند کا نشاۃ ثانیہ اور آخر میں وہ تہذیب جو ویدانت اور توحید کے تخیل سے پیدا ہوئی۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس دوسری تقسیم کے تحت ہندوستانی تہذیب میں دکن کی اہمیت پر روشنی ڈالیں۔

آریائی قوم دنیا کی ان بڑی اقوام میں سے ہے جس نے ایک خاص رنگ اور نہج کی تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ انسان، کائنات اور ان سب کے خالق کے متعلق ان کے نظریوں نے دیومالے پیدا کئے اور یہی دیومالے ایک ایک تمدن کی بنیاد بن گئے۔ مغرب میں یونان اور مشرق میں ہند۔ یہاں پر چونکہ آریائی تمدن سے اصل بحث نہیں ہے اس لئے مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ آریائی تہذیب نے چاروں کی معاشرتی تنظیم کے ذریعے ایک مستقل تمدن پیدا کیا۔ دکن نے اس تمدن کے ابتدائی خط و خال کو خوب جذب کیا۔ افسانوی دور میں رامائن کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شہ کار مثنوی کا ایک نمایاں ہیرو ہنومان ہے۔ دکن کا یہ راجہ رام کو مدد دیتا ہے۔ صداقت کی تلوار ہے اور مظلوم عورت یا آریاورت کی ماں کو دشمنوں سے چھڑا لاتا ہے اور اس کے صلہ میں آریا اس کو دیوتا بنا دیتے ہیں۔ لیکن اس واقعے سے یہ ثابت ہے کہ دکن نے اپنی جگہ میدانوں میں بسنے والے خوددار متمرد اور دوسروں کو ہیچ سمجھنے والے آریاؤں کو اپنی انسانیت سے منوایا اور اپنی تمدن نوازی کو ثابت کیا۔ اس کے بعد دوسری بڑی مثنوی مہابھارت ہے۔ اس میں بھی دکن نمایاں ہے۔ پانڈوؤں کا دیس نکالا ہوتا ہے تو دکن میں پناہ ملتی ہے اور دوارکا کا روحانی اور بانکا راجہ پانچ بھائیوں کو سو کوروں پر فتح مند کرتا ہے۔ یہ افسانے صحیح لیکن ان کا اثر دکن پر دیکھئے کہ یہاں کا ایک ایک مقام انہیں مثنویوں کی وجہ سے مقدس بن گیا۔ مندر جو قدیم تمدنوں کے مرکز ہوتے تھے لاتعداد شکل میں پیدا ہوگئے۔ ہر وہ مقام جہاں رام، سیتا اور لکشمن پہنچے مقدس بن گیا اور وندھیاچل سے لے کر رامیشورم تک قدیم تہذیب کے مختلف اور مستقل ادارے پیدا ہوگئے جنہوں نے آریاؤں کا مذہب، فلسفہ، علم، ادب، شاعری اور جملہ شعبۂ ہائے حسن کاری کو محفوظ اور غیر متبدل بنا دیا۔ اس طرح بیدر، نل اور دمینتی کے لافانی عشق کی وجہ سے اہم بن گیا۔

افسانوں سے نکل کر جب ہم تاریخ پر آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہی سے دکن بیرونی عداوت سے محفوظ رہا اور اکثر اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ دکن نے شمالی ہند کے میدانوں پر بھی اپنا سیاسی اقتدار جما لیا۔

بدھ مذہب وہ پہلی روحانی تحریک ہے جس نے آریاؤں کی طبقہ داری تقسیم اور آریا اور غیر آریا کے عصبی فرق مراتب کو دور کر کے ہندوستان کو ایک قومیت میں لانے کی کوشش کی۔ لیکن دکن باوجود اشوک کی کامیابی کے اس ہمہ گیر تحریک کو تہذیبی حد تک قبول کر سکا اور ماضی کے تمدنی روایات کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود بدھی حسن کاری کے خزانے کے ایلورہ، اجنتا دکن میں ہونے کے وہ بدھ تمدن کے تحت آریائی تہذیب کو معدوم نہ ہونے دیا اور جب کبھی موقع ملا از سر نو دکن نے قدیم ہندو عصبیت اور طبقہ داری تمدن کو تمام ہندوستان پر مسلط کر دیا۔ شنکر اچاری کی تحریک حقیقت میں دکن کے بدھ مت پر روحانی فتح تھی۔ یہ دکن کا نشاۃ ثانیہ ہماری موجودہ بحث کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ ہندوستان کا یہ سطح مرتفع نہ صرف بلند ہے بلکہ تہذیب دکن کا سپہ دار بھی ہے۔

اس کے بعد وہ دور آتا ہے جب کہ ہندوستان قدیم اور ایشیا کا وہ تمدن جو عرب کی سرزمین سے نکل کر پورے تمدن عالم پر محیط ہوگیا۔ ہندوستان میں ضیا پاشیاں شروع کرتا ہے۔ اسلام ایک ایسا ہمہ گیر سیل رواں ہے جو جگہ، مقام اور حالات کے لحاظ سے بظاہر اپنی شکل کو تو بدلتا ہے، لیکن فطرت نہیں بدلتا۔ ہندوستان میں بھی اس نے یہاں کی تہذیب میں آکر ایک نیا روپ اختیار کیا اور ایک مستقل اور ہندوستانی تہذیب کی بنا ڈالی۔ دکن میں سب سے پہلے مسلمان جن کو تہذیبی اعمال کا موقع ملا وہ ترک ہیں۔ جو ہندوستان کی تاریخ میں غلام خاندان کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ تُرکانِ دکن نے اس سرزمین کی تہذیب میں ایک چیز کا اضافہ کیا موسیقی، رنگ کاری، آذری یہاں پہلے ہی سے موجود تھی۔ لیکن پرشکوہ تعمیر کاری کا رواج ترکوں سے شروع ہوا اور دنیا کی سب سے بڑی گنبد' بولی گنبد بیجاپور پر ختم ہوا۔ اس دور میں علاوہ اور چیزوں کے ہندوستانی قومیت کے لئے وہ انمول شئے پیدا ہوئی جس کو قومی زبان کہتے ہیں اور پراکرت' ترکی' فارسی اور عربی عام فہم الفاظ' محاورے اور لسانی اجزا مل کر ہندوستان کی قومی زبان بن گئی ہے جس کو ابتداء میں دکھنی' پھر ریختہ' اور اس کے بعد اردو کا نام نصیب ہوا۔ اور موجودہ دور تعصب میں ہندوستانی ہندی' ہندی ہندوستانی کی الجھن میں پھنس گیا۔

یہ مختصر سا خاکہ اس امر کے لئے کافی ہے کہ ایک سوچنے والا اور تجسس کرنے والا عالم اس کو ابتدائی خط و خال سمجھ کر آگے آئے اور ایک اور مبسوط کارنامہ پیش کرے جس سے دکن اور اہل دکن کو معلوم ہو کہ حقیقت میں ہندوستانی تمدن میں ان کا درجہ اور رتبہ کیا ہے اور ہندوستان کے مستقبل کے سنوارنے میں ان کی کیا ذمہ داری ہے۔

سید محمد اکبر وفاقانی

دکن قدیم اردو شاعروں کی نظر میں

ملا وجہی ملک الشعرائے عہد محمد قلی قطب شاہ مصنف قطب مشتری

(سنہ ۱۰۱۸ھ) و سب رس (سنہ ۱۰۴۵ھ)

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں ۔۔۔ پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
(مقام) (وجود)

دکھن ہے نگینہ، انگوٹھی ہے جگ ۔۔۔ انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہے لگ

دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے ۔۔۔ کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے
(سجی) (اور)

دکھن ملک بھوت خاصہ اہے ۔۔۔ تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے
(بہت، رہی)

طبعی شاعر عہد ابوالحسن قطب شاہ مصنف بہرام و گل اندام

(سنہ ۱۰۸۱ھ)

جو کوئی یاد کرتا نیں اپنا وطن ۔۔۔ او مردہ ہے پیرن ہے اس کا کفن
(نہیں) (پیرہن)

اگر کوئی غربت میں شاہی کرے ۔۔۔ اگر مال ہور ملک لاکھاں دھرے
(اور)

اس کوں دیکھے کھول کر اپ انکھیاں ۔۔۔ دیوے خاک تن کا وطن کا نشاں
(تو بھی) (آنکھیں)

وطن سب کوں دنیا میں پیارا اہے ۔۔۔ سفر ہے سو جوں بادیارا اہے

اجنتا

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں
جہاں گلنار رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھینچا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں
جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں

جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

شراب و شعر کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں
بہارِ زندگی غلطاں ہے سبزے کی اداؤں میں
نوائے سرمدی آتی ہے جھرنوں کی صداؤں میں
بیاں ممکن نہیں وہ لطف آتا ہے دعاؤں میں

یہاں صدیوں سے رائج پرسکوں شیریں مقالی ہے
یہاں کا ذرہ ذرہ مظہرِ شانِ جمالی ہے

در و دیوار پر ہیں نقش حسن و عشق کی گھاتیں
پیامِ زندگی دیتی ہیں شرمیلی ملاقاتیں
جواں برسات کے دن، جان لیوا چاندنی راتیں
فضا میں ہر قدم پر گونجتی ہیں دلنشیں باتیں

یہاں پیری پہ ہو جاتا ہے دھوکہ نوجوانی کا
سبق دیتا ہے ہر چہرہ حیاتِ جاودانی کا

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقشِ لاثانی
تصدق جن کے ہر خط پر نگارخانۂ مانی
مشکل ہے شباب و حسن میں تخئیلِ انسانی
تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی

گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

بہانہ مل گیا دستِ جنوں کو حسن کاری کا — اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصلِ بہاری کا
چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بے قراری کا — سکھایا گُر اسے جذبات کی آئینہ داری کا

دلِ کہسار میں محفوظ اپنی داستاں کر دی
جگر داروں نے بنیادِ جہانِ جاوداں کر دی

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے — ترازو دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی ہے
اداؤں سے عیاں ہے لذّتِ دردِ جگر دی ہے — کھلیں گے راز اس ڈر سے دہن پر مہر کر دی ہے

یہ تصویریں بظاہر گو یونہی خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کے بھید کہتی ہیں

کرشمہ ہے یہ سب اہلِ جنوں کی سعیِ پیہم کا — جنھیں احساس تک باقی نہ تھا کچھ شادی و غم کا
دلوں پر عکس کھنچ آیا تھا جن کے حسنِ عالم کا — قلم کو نقش از بر ہو گیا تھا اسمِ اعظم کا

چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کر دیں

جہاں چھوڑا خوشی سے عشق کے پیغام کی خاطر — خوشامد اہلِ دنیا کی نہیں کی نام کی خاطر
نہ چھانی خاک در در کی کسی انعام کی خاطر — جیے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر

زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے، نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

سکندر علی وجد

دکن کا قدیم جغرافیہ

دکن سنسکرت زبان میں دکشینا کہلاتا ہے یعنی جنوبی علاقہ یعنی وہ علاقہ جو دریائے نربدا کے جنوب میں واقع ہے۔ سنسکرت اور بعض دوسری کتابوں میں اِس علاقہ کا نام دکشینا پتا بھی ہے یعنی جنوبی علاقہ۔ پراکرت زبان میں اس علاقہ کا نام دکھینا بادھا (DAKKINA BADHA) ہے۔ یونانیوں نے اسے دکھینا باڈس (DAKHINABADES) لکھا۔ فاہیان نے اسے اپنے سفرنامہ میں سنسکرت کی تقلید میں صرف TA - THSIN لکھا جو دکشینا کا مترادف ہے۔

قدیم ہندو جغرافیہ نویس نربدا کے جنوبی حصے کو دکن کہتے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے دوران میں دکن کے علاقہ کو صرف کرشنا ہی تک قرار دیا اور حالیہ مورخین بھی دکن سے وہ علاقہ مراد لیتے ہیں جو دریائے نربدا اور کرشنا کے درمیان ہے۔ بعض مورخین دکن کی سرحد کو بالا گھاٹ تک قرار دیتے ہیں اور بعض نے میسور کے شمالی حصہ کو بھی دکن میں شامل کیا ہے۔ جغرافی نقطۂ نظر سے یہہ سرزمین سطح مرتفع دکن کہلاتی ہے کیونکہ یہہ سمندر کی سطح سے تین ہزار سے پانچ ہزار فیٹ تک بلند ہے۔ عام طور پر ریاست حیدرآباد کو دکن کہتے ہیں۔

دکن کی سرزمین پہاڑی ہونے کی وجہہ سے یہہ قیاس کیا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں کوہ آتش فشاں بکثرت تھے۔ انہی پہاڑیوں کے بعض حصے تیز ہواؤں اور بارش کے عمل سے صدیوں بعد زرخیز اور قابل رہائش ہوئے۔ یہہ علاقہ کوہستانی ہونے کی وجہہ سے یہاں کی آب و ہوا خشک ہے۔ اونچے پہاڑیوں کے نہ ہونے سے بارش کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ اس ملک کو نربدا، تاپتی، گوداوری، کرشنا اور ان کے معاون سیراب کرتے ہیں۔ علاقہ دکن پہاڑی ہونے کے باعث بے حد نشیب و فراز ہے جس کی وجہ سے دریا اور ندیاں سرعت سے بہتی ہیں۔ ان کا دارومدار کلیتہً بارش پر ہے ان میں برسات میں بار بار طغیانیاں آتی ہیں اور گرما میں یہہ پایاب ہوجاتی ہیں۔ انہی وجوہات کی بناء پر یہہ ندیاں کشتی رانی کے قابل نہیں۔

دکن کے شمال میں بندھیاچل اور ست پڑا پہاڑ ہیں اور اس کے مشرق و مغرب میں مشرقی و مغربی گھاٹ ہیں اور جنوب میں دریائے کرشنا ہے جو جنوبی ہند کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ شمال میں کوہ بندھیاچل دکن کی اس طرح حفاظت کرتا ہے جس طرح ہمالیہ ہندوستان کی۔ علاوہ ازیں اس پہاڑ کے باعث ہندوستان دو حصوں میں منقسم ہوگیا۔ غرض بندھیاچل دو مختلف تمدنوں دو مختلف آب و ہواؤں، زمینوں اور اقوام کو ایک دوسرے سے علحدہ کرتا ہے۔ شمالی پہاڑوں اور دریاؤں کے دشوار گزار راستوں کے باعث دکن کا تمدن بڑی حد تک محفوظ رہا۔ یہاں کے قدیم باشندے دراوڑی اسی باعث خارجی اثرات سے محفوظ رہے۔ یہہ اقوام تقریباً اب تک اپنے قدیم اعتقادات، رسم و رواج، اور عادات و خصائل پر قائم ہیں اسی طرح کرشنا کے حائل ہونے سے انتہائی جنوبی ہند کے تمدن میں بہت زیادہ قدامت ہے اس لئے کہ شمالی ہند کے بہت کم فاتحین نے اس طرف توجہہ کی۔

آریا وسط ایشیا سے افغانستان آئے اور پنجاب سے ہوتے ہوئے دوآب کے علاقے میں آباد ہوئے۔ دریائے سرسوتی اور تھانیسر کا درمیانی علاقہ ان کا مقدس مقام تھا یہیں ان کے عقائد اور مذہبی تصورات کا آغاز ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ بندھیاچل تک پھیل گئے لیکن دکن کے شمالی پہاڑوں نے ایک عرصہ تک ان کی روک تھام کی جب آریا جنوب میں داخل ہوئے تو پہلے برار کی وادیوں میں سکونت اختیار کی اس کے بعد اور آگے بڑھے۔ رامائن اور مہابھارت میں بھی اس دکھنی سرزمین کا تذکرہ ہے۔ راما سے عقیدت کے باعث شعرائے اِس علاقہ کو جنت نشان بتانے میں کسر اٹھا نہ رکھی۔ آریاؤں کی آمد کے وقت جنوب میں منظم معاشرت اور حکومتیں تھیں۔

دکن کی قدیم ترین وحشی قومیں گونڈ، بھیل، سنتال اور ٹوڈا ہیں۔ جو اب بھی جنگلوں اور پہاڑوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں اب بھی وہی اگلی بربریت ہے جب آریاؤں نے شمالی ہند میں اپنے قدم جمائے تو قدیم باشندوں یعنی دراوڑیوں کو سوائے جنوب کی طرف راہِ فرار اختیار کرنے یا ان کے تابع ہو کر غلام بنے رہنے کے کوئی اور صورت نہ تھی۔ اسی طرح جب دراوڑی جنوبی ہند میں داخل ہوئے تو انھوں نے بھی آریاؤں کی طرح یہاں کے قدیم باشندوں پر جبر و زیادتی کی ہوگی۔ ایک عرصہ بعد آریاؤں نے جنوبی ہند کا رخ کیا جہاں انھیں قدیم حکومتوں سے سابقہ پڑا جن سے انھوں نے ربط و اتحاد قائم کیا۔

دکن کی قدیم تاریخ بالکل تاریک ہے۔ جس طرح ہندوستان قدیم کی کوئی ہم عصر تاریخی تصنیف نہیں اسی طرح قدیم دکن کی بھی لہٰذا دکن کے قدیم خاندانوں کا حال معلوم کرنا بہت مشکل ہے البتہ تاریخ سے متعلق چند پراگندہ اوراق ملتے ہیں جن کا مرتبہ افسانوی ہے، اور کچھ مختصر حالات شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ کتبات سے جو چٹانوں اور تانبے کے پتروں پر کندہ ہیں یہاں کی مذہبی اور معاشرتی تحریکات پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی سلسلہ میں ان تحریکات کی سرپرستی کرنے والے حکمرانوں کے واقعات بھی معلوم ہو جاتے ہیں قدیم سکوں سے حکمرانوں کے نام اور ان کے سنین ظاہر ہوتے ہیں جس مقام سے یہ سکے برآمد ہوتے ہیں ان سے حکمرانوں کے حدودِ سلطنت یا اثرات کا پتہ لگتا ہے۔ پرانوں سے بھی چند بڑے راجاؤں کا حال معلوم ہوتا ہے، سنسکرت ادب کی جن حکمرانوں نے سرپرستی کی ان کے بھی واقعات سنسکرت کی کتابوں میں چیدہ چیدہ ملتے ہیں۔ نیز بعض چینی کتابوں میں صرف مذہبی معاملات کی حد تک ان راجاؤں کے حالات لکھے ہوئے ہیں جنھوں نے جین مت کی حمایت کی لیکن ان میں کوئی ترتیب و تنظیم نہیں، پہلی صدی عیسوی میں بدھ مت جب چین میں مروج ہوا تو بہت سے چینی سیاح بدھ کے مقدس مقامات کی زیارت کرنے کے لئے ہندوستان آئے ان سیاحوں نے جنوب کی بھی سیر کی اور لنکا تک گئے ان کی تحریروں سے بھی دکن کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اشوک کے تیسری صدی ق م کے کتبوں میں دکن کی بعض حکومتوں کا تذکرہ ہے۔ بعض یونانی اور رومی مورخین کے بیانات سے پانچویں یا چھٹی صدی ق م تک کی حکومتوں کے واقعات ظاہر ہوتے ہیں۔ باوجود ان ماخذوں کے دکن کے چند ایسے علاقے رہ جاتے ہیں جن کی قدیم تاریخ کا پتہ لگانے کا کوئی ذریعہ نہیں

دکن میں مختلف اقوام آباد ہیں جن کی مختلف زبانیں ہیں اور انھی زبانوں کے اعتبار سے یہاں کے علاقے موسوم ہیں۔

بیدر سے اوپر شمال مغربی علاقہ میں مرہٹی زبان بولی جاتی ہے۔ یہ علاقہ مہاراشٹر کہلاتا ہے، اس میں برار کا ایک حصہ، تلنگانہ اور کوکن کا علاقہ شامل ہے، تلنگانہ کا علاقہ مہاراشٹر کے مشرق میں ہے اس میں اندھرا اور کلنگ سلطنتیں تھیں یعنی جیسے گوداوری کے

جنوب میں آندھرا سلطنت اور شمال میں کلنگ، مسلمانوں کے دور میں تلنگانہ کا مرکز ورنگل تھا، کنڑی علاقہ بیدر سے ادھونی تک اور مغرب میں دریائے کرشنا کے منبع تک پھیلا ہوا ہے تلنگانے کے نیچے تامل علاقہ ہے جو راس کماری تک ہے۔

ان علاقوں پر مختلف زمانوں میں مختلف حکمرانوں نے حکومت کی، اشوک کے کتبات اور قدیم پرانوں کے دیکھنے سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ جنوب کے قدیم ترین حکمران پانڈیا، چولا اور چیرا ہیں ان کا تمدن ۲۵۰ق م سے بھی پہلے کا ہے، یہاں ۲۵۰ ق م میں بدھ مت کی تعلیم و تلقین کے لئے اشوک نے مبلغین بھیجے جنھوں نے یہاں کے باشندوں کو بدھ مت کے فلسفہ کی تعلیم دی اس زمانہ میں دکن ڈنڈا کرانیا (DANDAKARANYA) یا ڈنڈکا (DANDAKA) یعنی صحرائے ڈنڈک کہلاتا تھا۔

آندھرا سلطنت

رامائن میں لکھا ہے کہ گوداوری اور کرشنا کے درمیان اندھرا خاندان حکومت کرتا تھا جس سے یونانی جغرافیہ نویس بھی واقف تھے، قدیم تاریخی ماخذوں کے دیکھنے سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ اندھراؤں کی حکومت تقریباً ۱۸۰ ق م سے شروع ہوئی۔ انھوں نے دھنیا کٹکا (DHANYAKATAKA) کو اپنا مرکز قرار دیا جو دریائے کرشنا پر تھا۔ ان کی سلطنت شمال میں بندھیاچل سے جنوب میں دریائے کرشنا تک، مشرق میں خلیج بنگال سے مغرب میں بحیرۂ عرب تک پھیلی ہوئی تھی۔ پروفیسر بھنڈارکر کا خیال ہے کہ اندھرا خاندان دکن پر ۷۳ ق م سے ۲۱۸ء تک برسر اقتدار رہا۔ مہاراشٹرا اور تلنگانہ کا تمام علاقہ ان کے تابع تھا۔ وسنٹ اسمتھ کا خیال ہے کہ اندھرا کا پائے تخت سری کاکولم تھا جو دریائے کرشنا پر واقع تھا۔ شائد دھنیا کٹکا کا نام بدل کر سری کاکولم ہوگیا ہو یا بدل گیا ہو۔

اس زمانہ میں گجرات اور بمبئی کے علاقہ میں ستراپوں کی حکومت تھی۔ ستراپ کے معنی صوبہ دار کے ہیں۔ یہہ ایرانی لفظ ہے۔ اندھرا خاندان کے ایک حکمران بل بائے کرنے ۱۲۶ء میں ستراپوں کے علاقہ مہاراشٹر پر قبضہ کیا اسی زمانہ میں مالوہ میں ایک اور ستراپ خاندان حکمران تھا۔ اس خاندان کے ایک راجہ رودرادامن اول نے جس کا پائے تخت اجین تھا اندھرا خاندان کے راجہ سے مہاراشٹر کا علاقہ چھین لیا، جب تلنگانہ کے اندھرا خاندان میں یجن سری یا یجنا سری ۱۷۲ء میں برسر اقتدار ہوا (جس کا عہد حکومت ۲۰۲ء تک ہے) تو اس نے مالوہ کے ستراپوں سے جنگ کی اور ان کی سلطنتوں کے بعض صوبے اپنی سلطنت میں شامل کر لئے۔

دکن میں دو آندھرا سلطنتیں تھیں، ایک مشرق میں جس کا پائے تخت دھنیا کٹکا تھا اور دوسری مغرب میں جس کا مرکز پیتھان (PAiTHAN) تھا جو اب پٹن کہلاتا ہے اور صوبہ اورنگ آباد کے ایک تعلقہ کا مستقر ہے، پٹن دریائے گوداوری کے شمالی کنارے پر ہے۔ یہہ پرتستان (PRATISTHAN) بھی کہلاتا ہے یہہ دکن کا قدیم ترین شہر ہے اشوک نے اپنے مبلغ یہاں بھی بھیجے تھے، بطلیموس (PTOLEMY) کے قول کے مطابق یہہ آندھرا بادشاہ پلومائی (PLUMAYE) دوم کا پائے تخت اور اہم تجارتی مرکز تھا۔ یہہ مشہور آندھرا راجہ سلماہانا (SALMAHANA) کی جائے پیدائش ہے اور اس کا پائے تخت بھی رہا۔ اب بھی یہاں بہت سے منادر اس کی قدیم عظمت کی یادگار ہیں۔ آندھرا خاندان کا کب اور کس طرح خاتمہ ہوا کچھ بھی پتہ نہیں چلتا۔

جب کہ آندھرا سلطنت عروج پر تھی شاند راشٹرا کوٹ سلطنت اس کی باجگزار تھی جس کا علاقہ بندھیاچل کے شمال وجنوب میں تھا' اٹ قوم یا راشٹرا کوٹ سلطنت کے شمال میں گپتا حکومت تھی ان کے علاوہ ایک اور خاندان کدمب پانچویں صدی عیسوی میں مرہٹہ علاقہ میں برسراقتدار تھا جن کا مرکز ہانسی تھا اس سلطنت میں کنڑا اور میسور کا علاقہ شامل تھا۔

اسی پانچویں صدی عیسوی میں پلوا کو عروج حاصل ہوا اور اس نے آندھرا کے مشرقی پائے تخت اور علاقوں پر قبضہ کیا۔ آندھرا دور میں ملک کی تجارتی حالت بہت اچھی تھی۔ یہاں ایشیا' مصر' روم' یونان' چین اور دوسرے مشرقی مقامات سے سفراء آتے تھے شام میں جنگ میں ہندوستانی ہاتھیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ آندھرا سلطنت کے بعض علاقوں میں رومی سکے بھی دستیاب ہوئے ہیں پروفیسر بھنڈارکر کے قول کے مطابق آندھرا کے خاتمہ کے بعد تین سو سال تک دکن کے حکمران خاندانوں کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

چالوکیا

دکن کی سلطنتوں کے حالات وضاحت کے ساتھ چھٹی صدی عیسوی کے وسط سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں خاندان چالوکیا حکمران تھا۔ چالوکیا یا سولنکی کا تعلق چاپ قوم سے ہے جو گرجر کی ایک شاخ ہے' گرجر جو شمال مغربی ہندوستان میں زیادہ آباد ہیں ان کا تعلق ہون سے ہے۔ شمالی ہند کے پرہار اور راجپوت قبائل دراصل ان وحشی اقوام کی تبدیل شدہ شکل ہیں جو پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان میں داخل ہوی تھیں ان میں سے ادنیٰ درجہ کے لوگ گرجر کہلاتے ہیں اور اعلیٰ درجہ کے راجپوت چالوکیا خاندان کا ابتدائی تعلق شمالی ہند کے راجپوتوں سے ہے جو کچھ عرصہ بعد دراوڑیوں میں غلط ملط ہو گئے۔ چالوکیا نقل مقام کر کے راجپوتانہ سے دکن آئے۔ اس خاندان کی بنیاد ایک سردار پلکیسن اول نے ڈالی۔ یعنی ۵۵۰ء میں واتاپی ضلع بیجاپور (موجودہ مقام بادامی) پر قابض ہو کر اس نے ایک چھوٹی سی سلطنت قائم کی اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے پلکیسن نے اشومیدھ کی رسم منائی تھی اس کے دونوں بیٹوں کیرتی وامن اور منگلیس کے عہد میں سلطنت مشرق اور مغرب کی طرف پھیلی۔ کیرتی ورمن اول ۵۶۶ء میں تخت نشین ہوا۔ یہہ زبردست جنگجو تھا۔ ایک کتبہ میں لکھا ہے کہ اس نے جنوب کے تمام قبائل اور اقوام کو تابع کیا۔ مشہور بدھی راہب دھرما گپتا اسی کے عہد میں گزرا ہے جو مذہبی کتابوں کا چینی زبان میں ترجمہ کرتا تھا۔ کیرتی ورمن وشنو کی پوجا کرتا تھا۔ اس نے بادامی میں ایک غاری مندر تعمیر کروایا' منگلیس نے کونکن اور مغربی گھاٹ کا کچھ علاقہ بھی سلطنت میں شامل کیا۔

منگلیس کے بعد کیرتی ورمن کا بیٹا پلکیسن دوم تخت نشین ہوا۔ اس نے ونگی پر قبضہ کیا اور اپنے بھائی وشنو وردھن کو وہاں کا نائب السلطنت بنایا جس کا صدر مقام پشتپور تھا جو اب ضلع گوداوری میں پتھاپورم کہلاتا ہے۔ ۶۱۵ء میں وشنو وردھن خود مختار ہوا اور خاندان چولا' پانڈیا اور کریل سے جنگ کی پلکیسن دوم نے ۶۲۰ء میں ہرش کو پسپا کیا' ۶۲۵ء تا ۶۲۶ء میں اس نے ایک سفارت ایران کے شہنشاہ خسرو دوم کے پاس روانہ کی جس کا طبری نے تذکرہ کیا ہے اجنتہ کے غار نمبر ۱ میں استرکاری کی ایک بڑی تصویر میں ایرانی سفیر ہندی راجہ کے آگے کھڑا ہوا ہے۔ اس تصویر سے ایرانی اور ہندی فنون لطیفہ کے اختلاط کی جھلک ظاہر ہوتی ہے۔

۶۴۱ء میں ہیون سانگ چینی سیاح پلکیسن دوم کے دربار میں حاضر ہوا' اس نے اجنتہ کی تعریف کی ہے۔ اس وقت چالوکیا سلطنت کا

مرکز واتاپی نہ تھا بلکہ ناسک' ہرش کے مقابلہ میں سہولت پیدا کرنے کے لئے پلکیسن نے ناسک کو موقتی پائے تخت قرار دیا تھا۔ اس نے کونکن کے موریا کو شکست دی۔ راشٹرکوٹ کی طاقت توڑ دی اور کدمب کا بھی خاتمہ کیا اور مشرقی شامل سے بڑھ کر پتھاپورم کے قلعہ پر قبضہ کیا' کلنگ کے راجہ کو زیر کیا جس کا پائے تخت پوری تھا جو اب بھی جگناتھ کے مندر کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ اس نے چولا' پانڈیا اور کریل سلطنتوں پر بھی حملہ کیا۔

جنوبی ہند میں پلوا خاندان بہت طاقتور تھا' اگرچہ مسلسل کوشش کرکے چالوکیا راجاؤں نے ان کی قوت توڑ دی تھی پھر بھی ۶۴۲ء میں کانچی کے پلوا خاندان کے راجہ نرسمہا ورمن نے پلکیسن دوم کو شکست فاش دے دی اور بادامی کو اس بری طرح برباد کیا کہ تیرہ سال تک بادامی پر کسی نے حکومت نہ کی۔ جب ۶۵۵ء میں وکرماجیت اول (پلکیسن دوم کا بیٹا دور حکومت ۶۵۵ء تا ۶۸۰ء) تخت نشین ہوا تو اس نے پلوا سے اپنے باپ کا بدلہ لیا اور شہر کانچی پر قبضہ کیا اس نے چولا کو بھی شکست دی۔ وکرماجیت کے پوتے وجیادیتا کے راشٹرکوٹ سے اچھے تعلقات تھے جن کی بنا بر راشٹرکوٹ کے اندرا راجا نے چالوکیا شہزادی سے شادی کی جس کے بطن سے دنتی درگا پیدا ہوا جب کیرتی ورمن دوم برسر اقتدار ہوا تو اس کے دور میں دنتی درگا نے بادامی پر قبضہ کیا جس سے مغربی چالوکیا سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ اسی چالوکیا دور میں شاید پلوا کی مخالفت کے سلسلہ میں راجمندری کی بنیاد پڑی اور یہاں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا گیا کیونکہ جنوب والوں کے لئے کرشنا سے ہوتے ہوئے شمال کی طرف جانے کا راستہ یہیں سے گزرتا ہے۔

مغربی چالوکیا کا پائے تخت بادامی ضلع بیجاپور میں ہے۔ یہاں جینوں کا ۶۵۰ء کا ایک غاری مندر ہے۔ اس کے علاوہ تین غار برہمنی اثر کے ہیں۔ ان میں سے ایک ۵۷۹ء کا ہے یہاں دو قلعے ہیں ایک باون بندی اور دوسرا رن منڈل' چھٹی صدی عیسوی میں پلوا نے اس پر قبضہ کیا تھا۔ اس کے بعد چالوکیا اس پر قابض ہوئے ساتویں صدی عیسوی میں مشہور چینی جاتری ہولنسانگ یہاں آیا تھا اس نے لکھا ہے کہ اس کی راجہ (پلکیسن دوم) سے ملاقات ہوئی چھتری ذات کا ہے یہ راجہ وسیع النظر اور بلند حوصلہ ہے اس کے ماتحت وفاداری کے ساتھ اس کی خدمت بجالاتے ہیں اور راجہ کو ان سے خاص ہمدردی ہے۔

یہاں کی زمین زرخیز ہے۔ غلہ خوب اگتا ہے۔ موسم گرم ہے یہاں کے باشندوں کے خصائل سادہ اور دیانت دارانہ ہیں ان کے قد اونچے ہیں اور طبیعت کے غائٹے ہیں اگر ان کی توہین کی جائے تو بری طرح بگڑتے ہیں اور بدلہ لیتے ہیں۔ جنگ میں ڈٹ کر لڑتے اور غنیم کا خوب تعاقب کرتے ہیں لیکن جب کوئی اپنے آپ کو ان کے حوالہ کر دیتا ہے تو وہ اسے ایذا نہیں پہونچاتے۔ جب کسی جنگ میں سردار ہار جاتا ہے تو اسے مارتے نہیں بلکہ اسے زنانی لباس پہناتے ہیں اور اسی طرح اسے زندگی کاٹنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ملک میں بے شمار پہلوان ہیں جو اکثر کشتی لڑتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ خوب پیتے اور لڑتے ہیں۔ اگر وہ کسی کو سڑک پر مار دیں تو قانوناً انھیں گرفتار نہیں کیا جاتا۔ یہاں ہاتھیوں کو بھی خوب پلایا جاتا ہے۔ اپنے پہلوانوں اور جنگی ہاتھیوں پر راجہ کو فخر ہے۔

واتاپی کے حکمرانوں کے دور میں بدھ مذہب آبادی کے ایک بڑے حصے میں رائج تھا جس کا ہیون سانگ نے ذکر کیا ہے۔ اس وقت یہاں بدھ مت کے بہت سے منادر اور خانقاہیں تھیں' لیکن بدھ مت کو زوال ہو رہا تھا۔ کیونکہ برہمنی مذہب کے اثرات بڑھ رہے تھے

چنانچہ خود راجہ پلکیسن اول نے اشومیدھ کی رسم منائی، برہمنی مت کی ترقی کے ساتھ ان کے منادر بھی چوطرف بننے لگے اور پران کے دیوتاؤں برہما، وشنو اور شیوا وغیرہ کی پوجا ہونے لگی، بادامی غاری مندر میں منگلیس کے عہد میں وشنو کی پوجا ہوتی تھی جو اس کا تعمیر کرایا ہوا تھا ان مختلف مذاہب کا سلطنت میں پایا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ چالوکیا راجہ تمام مذاہب کے ساتھ رواداری برتتے تھے ۔
باوجود اس کے بدھ مت بتدریج برہمنی مذہب اور جین مت کے مقابلہ میں معدوم ہوگیا۔ ہندو خاص طور پر قربانی کی طرف توجہہ کرنے لگے۔
اس زمانہ میں بدھ اور جین مت والوں سے ہندؤں نے غاروں میں مندر تراشنے کا فن سیکھا۔ مرہٹوں کے علاقہ کے جنوبی حصے میں عام طور پر جین مذہب مقبول تھا، آٹھویں صدی عیسوی میں زرتشتی مذہب بھی ہندوستان میں رائج ہوا۔ خراسان کے جلاوطن پارسی ۷۳۵ء میں پہلی دفعہ احاطہ بمبئی کے ضلع تھانہ میں بمقام سنجان آباد ہوئے، پلی کیسن دوم اور وکرماجیتا دوم نے جینوں کی مدد کی اور ان کے منادر تعمیر کروائے، ۶۷۸ء میں یہاں مشہور قواعد کا عالم (PUUYAPADA) تھا، اوپر بیان ہوچکا ہے کہ سلطنت زیادہ وسیع ہو جانے سے انتظامات کی خاطر پلی کیسن دوم نے وینگی پر اپنے بھائی وشنو وردھن کا تقرر کیا جس نے کچھ عرصہ بعد اپنی علیحدہ حکومت قائم کرلی اور اس طرح دو چالوکیا خاندان ہوگئے مغربی چالوکیا کا مرکز بادامی تھا اور مشرقی کا وینگی۔ وینگی گوداوری اور کرشنا کے دہانوں کے قریب ہے ۔ بدھ مت کا زبردست دشمن اور ذی اثر شخص شنکر اچاریہ اور مشہور عالم (AKALANKA) اسی زمانہ کے ہیں آٹھویں صدی میں کلنگ اور مشرقی دکن پر مشرقی چالوکیا اور دکن کے وسطی اور مغربی حصہ پر راشٹرکوٹ حکمران تھے ۔ دسویں صدی کے اختتام پر راشٹرکوٹ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئے جس کے باعث مغربی چالوکیا کا دوسرا دور شروع ہوا جو مغربی چالوکیا خاندان کی رجعت کہلایا جاسکتا ہے۔ تیلا دوم نے ۹۷۳ء میں راشٹرکوٹ کے آخری راجہ کک دوم کو شکست دی اور نئے مغربی چالوکیا خاندان کی بناء ڈالی، اس نے راشٹرکوٹ شہزادی سے شادی کی اس کا عہد حکومت ۹۷۳ء سے ۹۹۶ء تک ہے، اس کے دور میں سلطنت بلاری اور میسور کے بعض بعض حصص تک پھیل گئی تھی ۔

اسی زمانہ میں چولا حکمران راجا راجہ نے وینگی پر قبضہ کیا اور چالوکیا خاندان کے ایک لڑکے کو تخت نشیں کرکے واپس ہوا اس راجہ نے جس کا نام وی مالادیتا ہے راجا راجہ کی لڑکی سے شادی کی اس کی اولاد نے مشرقی چالوکیا اور چولا سلطنت پر حکومت کی بالآخر مشرقی چالوکیا حکومت کا ۱۰۷۰ء میں خاتمہ ہوگیا جس سے مغربی چالوکیا کا اقتدار بہت بڑھ گیا اور وہ تمام دکن پر حاوی ہوگئے۔ ۱۰۴۲ء میں مغربی چالوکیا خاندان میں سومیسورا اول تخت نشین ہوا تھا جس نے کلیانی کو دارالسلطنت قرار دیا جس کے باعث یہ چالوکیان کلیانی کہلاتے ہیں۔ کلیانی ممالک محروسہ سرکارعالی میں ہے۔ اس خاندان نے بھی قدیم چالوکیا کی طرح دو سو برس حکومت کی سومیسورا اول نے چولا کے راجا راجہ کو شکست دی، دھارا (مالوہ کے علاقہ میں ہے) اور جنوبی کانچی پر حملہ کیا اور ان دونوں کو فتح کیا۔

۱۰۷۶ء میں وکرماجیت اول یا بکرمانک تخت نشین ہوا۔ اس نے کانچی فتح کیا اور دوارا سمدرا کے خاندان ہوسل سے سخت جنگ کی دوارا سمدرا کو دوارا وتی پور بھی کہتے تھے مسلمان مورخین نے اسے دوارا سمندر لکھا اس کے کھنڈر ضلع حسن میسور میں موجود ہیں اس نے اپنے نام سے ایک سنہ جاری کیا جو کبھی مقبول نہ ہوا، وکرماجیت نے وشنو کا ایک بڑا مندر تعمیر کروایا اور اس کے آگے ایک تالاب بنوایا اور اس کے قریب ایک شہر آباد کیا جو وکرماپورا کہلاتا تھا، اس کے عہد میں رعایا خوش حال تھی کشمیری پنڈت

(BILHANA) کے قول کے مطابق ملک میں چو طرف امن تھا۔ کہیں چوروں کا خوف نہ تھا جو اچھے انتظام کی دلیل ہے۔ علاوہ اس کے بادشاہ نیک منش، فیاض اور ہمدرد تھا اس نے علم کی خوب سرپرستی کی، یہہ کلیانی کا بڑا راجہ تھا جس کے عہد میں سلطنت انتہائی عروج کو پہونچی، اور بقول بلہانا کلیان ہر اعتبار سے عدیم المثال تھا، یہی مشہور قانون داں وجنانیسور کا وطن ہے جس کی تصنیف متاکشرا ہند و قانون کی سب سے زیادہ مستند کتاب ہے۔ کلیانی احاطہ بمبئی کے ضلع تھانہ میں ہے۔ (PRIPLUS) کے قول کے مطابق کلیانی کی اہمیت دوسری صدی عیسوی سے شروع ہوئی، یہہ شہر تجارت کے اعتبار سے مشہور تھا، بڑے بڑے تجار یہاں آتے تھے شائد یہہ شہر ۱۵۳ء میں آباد ہوا یہاں پیتل اور شیشم کا کام اچھا ہوتا تھا اور کپڑے بھی اچھے بنتے تھے، چودھویں صدی میں مسلمان حکمرانوں نے اس کا نام اسلام آباد رکھا۔

وکرما جیت کے مرنے کے بعد چالوکیان کلیانی کو زوال شروع ہوا، راجہ تیل سوم کے عہد میں سپہ سالار افواج بجّل یا وجّالیا بجّالا نے بغاوت کی اور تمام سلطنت پر قابض ہو گیا ۱۱۶۲ء سے ۱۱۸۳ء تک بجل اور اس کے جانشینوں نے حکومت کی جس کے بعد خاندان چالوکیا کے ایک شہزادہ سیمسور چہارم نے بجل کے جانشینوں سے ملک کا بہت بڑا حصہ حاصل کیا لیکن یادوا خاندانِ دیوگری اور ہوسل خاندان دوارا سمدرا کے عروج کے باعث اس کا اقتدار جاتا رہا یعنی ۱۱۹۰ء میں کلیان سلطنت کا خاتمہ ہوا۔

بجل کے عہد میں ایک مذہبی انقلاب ہوا جس سے شیو کے مذہب نے دوبارہ زندگی پائی اور ایک نیا فرقہ قائم ہوا جس کا نام ویرا سیوس یا لنگایت ہے جو اب تک موجود ہے۔ بجل مذہباً جین تھا، اس کے متعلق یہہ مشہور ہے کہ اس نے فرقہ لنگایت کے دو پرہیزگاروں کو اندھا کیا تھا جس کے بدلہ سرپرست مذہب لنگایت بسوا (BASAVA) کے اشارہ ۱۱۶۷ء میں راجہ کو قتل کیا گیا اس مذہب کے ماننے والے عام طور پر کنڑی علاقوں میں آباد ہیں۔

وکرما جیت کے عہد میں تاجروں نے بدھ مذہب کے لئے خانقاہیں تعمیر کروائیں اور ان کے اخراجات کے لئے رقمیں اور زمینیں فراہم کیں اس زمانہ میں جین مت کو تفوق حاصل نہ تھا، لنگایت فرقہ کے نکلنے کے بعد تو جین مت کا اثر اور بھی زائل ہو گیا، لنگایت مذہب زیادہ تر تجار میں پھیلا جو پہلے جین مت کے طرفدار تھے۔ لنگایت لنگ کو حیات کا مبدا سمجھتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ یہہ ویدوں، تناسخ بچپن کی شادی کے مخالف ہیں۔ یہہ بالکل حقیقت ہے کہ ان کے مذہب کا بانی بسوا برہمن تھا لیکن انھیں برہمنوں سے سخت نفرت ہے اس مذہب کے جاری ہونے سے نہ صرف بدھ مت جنوب سے ناپید ہوا بلکہ جین مت کو بھی زوال شروع ہوا۔

راشٹراکوٹ

۷۵۳ء تا ۹۷۳ء

راشٹراکوٹ یادو نسل کے تھے راجہ (RATTA) کے ایک بیٹے کا نام راشٹراکوٹا تھا جس کے نام سے یہہ خاندان مشہور ہوا۔ آٹھویں صدی کے درمیان میں دنتی دگا نامی ایک سردار نے جو راشٹراکوٹ خاندان سے تعلق رکھتا تھا خاندان چالوکیا کے راجہ کرماجیت دوم کے بیٹے کیرتی ورمن دوم کو شکست دی اور راشٹراکوٹ سلطنت قائم کی۔ جب عوام اس کی طرف سے بدظن ہوئے تو اس کے چچا کرشنا اول نے

اسے تخت سے اتار دیا اور خود راجہ بنا' بعض کتبوں سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ دنتی درگاہ لاولد تھا شائد اس کے مرنے کے بعد کسی اور وارث تخت کو ہٹا کر کرشنا تخت نشین ہوا' دنتی درگا کو تخت سے علحدہ کرنا اس لئے ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت طاقتور حکمران تھا۔

کرشنا اول کے عہد میں ایلورا کا مشہور کیلاس کا مندر تعمیر ہوا۔ یہہ مندر ایک چٹان میں ترا شا گیا ہے جو فن تعمیر کے اعتبار سے غیر معمولی ہے۔ اسی خاندان کے ایک حکمران گوبند سوم نے ۷۹۳ء تا ۸۱۵ء سلطنت کو شمال میں بندھیا چل اور مالوا اور جنوب میں کانچی تک وسعت دی اور اپنے بھائی اندراج کو جنوبی گجرات میں نائب السلطنت مقرر کیا' اس کے بعد امو گھورش تخت نشین ہوا۔ (۸۱۵ء تا ۸۷۷ء) اس نے زیادہ تر ونگی کے مشرقی چالوکیا راجاؤں سے جنگ کی۔ اس نے اپنا دار السلطنت ناسک سے مانیا کھیت بدل دیا اسی شہر کو عرب مورخین نے مانکیر لکھا ہے' اب یہہ مالکھیڈ یا ملکھیڑ کے نام سے ریاست نظام میں ہے' یہہ اس زمانہ کا بہت مشہور اور بارونق شہر تھا' امو گھورش کے جانشین کرشنا دوم نے جینیوں کے ننگے فرقے دگمبر کی بہت سر پرستی کی۔ جن سین' گنبھدرا اور دوسرے علماء کی توجہہ کے باعث اس فرقہ کو بہت تقویت حاصل ہوی جس کی بدولت بدھ مت کے اثرات دکن سے رفتہ رفتہ زائل ہوتے گئے' اور بارھویں صدی تک یہہ مذہب دکن سے معدوم ہوگیا۔

اسی خاندان کا ایک راجہ اندر سوم نے قنوج پر کامیاب حملہ کیا' اور ۹۴۹ء میں چول خاندان کے راجہ دت پر فوج کشی کی اس زمانہ میں ہندوؤں اور بدھ مت والوں میں زبردست رقابت تھی' راشٹر کوٹوں کے ابتدائی دور میں برہمن وید کی تعلیم کے مطابق خوب قربانی کرتے تھے' اس زمانہ میں جین مت کو بھی فروغ حاصل ہوا' راشٹراکوٹوں کی علمی سرپرستی کے باعث ان کے دربار میں شعرا کا اجتماع ہوا

آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں یعنی ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کی فتح سے سندھ پر اسلامی سیاسی اثرات غالب آئے' راشٹراکوٹ خاندان کے ان عرب حملہ آوروں سے دوستانہ تعلقات تھے اور گرجروں سے مخالفت تھی' گرجروں نے عربوں سے اچھے تعلقات نہ رکھے جس کے باعث انھیں نقصان پہونچا' اس سے بچنے کے لئے راشٹراکوٹوں نے ان نو وارد حملہ آوروں سے اتحاد کرلیا تھا' جس کے باعث مسلمان سوداگر اور سیاح مغربی علاقوں میں بہ آسانی تجارت کرتے تھے اور بہت سے مغربی ساحل پر آباد ہوے' ان مسلمان تاجروں اور سیاحوں نے اپنے سیاحت نامے لکھے جن میں یہہ راشٹراکوٹ راجاؤں کو بَل ہَرا لکھتے ہیں جس کے معنی ہندوستان کا سب سے بڑا راجہ ہیں' انھیں بل ہرا اِس لئے لکھتے ہیں کہ یہہ خود کو ولبھ کہتے تھے۔ اور یہہ لفظ رائے کے ساتھ مل کر بلہرا ہوگیا' چالوکیا راجہ بھی ولبھ اپنے نام کے ساتھ لکھتے تھے' شائد انہی سے یہہ طرز راشٹراکوٹوں نے اختیار کی' ولبھ رائے یا بلہا رائے مقامی استعمال سے بلہرائے ہوا اور عربوں نے اسے بلہرا لکھا۔

راشٹراکوٹ راجاؤں کی مسلمان سیاحوں نے بہت تعریف کی' ان کے عہد کا کیلاس کا مندر دنیا کے عجائبات میں ہے۔ ان راجاؤں نے سنسکرت ادب کی سرپرستی کی اور بہت سے مندر شاہی مصارف سے تعمیر کروائے۔

ان تمام سلطنتوں میں چالوکیا سلطنت زیادہ عرصہ تک باقی رہی یہہ ایسے زمانہ میں یعنی ۱۱۹۰ء میں ٹوٹی جب کہ تمام ہندوستان کی سیاسی حالت بدل رہی تھی کیونکہ اِسی سنہ میں مسلمانوں نے شہاب الدین غوری کے تحت ہندوستان پر حملے کئے اور یہاں اپنی

حکومت قائم کی جو صدیوں تک برقرار رہی، جغرافی اعتبار سے چالوکیا جیسی وسیع سلطنت میں مختلف زبانوں کے علاقے تھے جو فطرتاً زبانوں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے علحدہ ہو کر اپنی علحدہ حکومتوں کے علم بردار ہو گئے، مرہٹواڑی کے علاقہ میں یادوا سلطنت قائم ہوئی جس کا پائے تخت دیوگیر موجودہ دولت آباد تھا آندھرا یعنی تلنگانہ میں گکیتیا سلطنت جس کا مرکز ورنگل تھا، تیسرے کنڑی علاقہ میں ہوسلیا خاندان برسر اقتدار تھا جس کا پائے تخت دوارا سمدرا تھا۔

گکیتیا خاندان ۱۱۰۰ء کے بعد نمایاں ہوا اس کے طاقتور راجہ پرتاپا رودرا اور گنپتی تھے، اس خاندان نے مسلمانوں کے حملے تک اچھی طرح حکومت کی، یادوا خاندان کے راجہ خود کو سری کرشنا کی نسل سے سمجھتے تھے۔ یہ لوگ جنوب میں ہوسلیا حکومت سے برسر پیکار تھے اور شمال میں گجرات تک اپنی سلطنت کو وسعت دی، ان کا بڑا حکمران سنگھانا (۱۲۱۰ء تا ۱۲۴۷ء) تھا، اس خاندان نے سنسکرت کی سرپرستی کی علاء الدین خلجی (۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء) نے اپنے آخری دور حکومت میں نہ صرف دکن بلکہ تمام جنوبی ہند کو مستقل طور پر حکومت دہلی کے تابع کیا، لیکن اس کے انتقال کے بعد مرکزی حکومت کی کمزوریوں سے جنوب کے حکمرانوں نے فائدہ اٹھایا، جب محمد تغلق (۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء) برسر اقتدار ہوا تو اس نے ۱۳۲۶ء میں دیوگڑھی کا نام دولت آباد قرار دے کر اسے اپنا پائے تخت بنایا لیکن فوراً ہی بعض اسباب کی بنا پر اپنے ارادہ سے باز آیا مگر جنوب کو اپنے قابو سے نکلنے نہ دیا اور ورنگل پر فوج کشی کر کے اس کا نام سلطان پور رکھا محمد تغلق کے آخری عہد میں گجرات اور دکن کے امرا نے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی، چنانچہ موقع پا کر انھوں نے ۱۳۴۶ء میں حسن گنگو بہمنی کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا جس نے دکن میں ایک طاقتور حکومت قائم کی جو بہمنی سلطنت کہلاتی ہے جس کا دار السلطنت گلبرگہ تھا۔

دکن کی قدیم تاریخ کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شمالی ہند اور دکن اکثر ایک دوسرے کے مرہونِ منت رہے چنانچہ آندھرا سلطنت جو موریا کی ہم عصر تھی، اس کے ایک فرد نے اشوک کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد مگدھ پر حکومت کی اور یہ مگدھ کا آندھرا خاندان کہلاتا ہے حملوں کے سلسلہ میں بھی دکن کے حکمرانوں کو بعض دفعہ تفوق حاصل رہا یعنی پلی کیسن دوم نے ہرش کو شکست دی اور اندر سوم نے قنوج پر کامیاب حملہ کیا، قدیم دکن کی تہذیب و تمدن اور سیاسی حالات کا پتہ لگانا اس لئے مشکل ہے کہ اس خطہ میں سنہ عیسوی سے بھی صدیوں پہلے سے حکومتیں قائم تھیں جن کی کوئی مفصل سند نہیں ملتی نیز یہ سرزمین مختلف اقوام کی آماجگاہ ہے کیونکہ یہ خطہ شمالی و جنوبی ہند کے درمیان واقع ہے۔ علاوہ ازیں اپنی قدرتی خوبیوں کے باعث بھی یہ ہمیشہ سے دلکش اور جاذب نظر رہا۔

سید سراج الدین

نقوشِ اجنٹہ

نگاہِ عشق سے دعوئی ہوئی ہیں تصویریں — چمک رہی ہیں یہاں آرزو کی تقدیریں
پگھل گئے ہیں کہیں صاف ہوگئے ہیں کہیں — وہ سختئ دلِ ناکام پتھروں میں نہیں
یہہ حسن و عشق کی پوجا کے کارنامے ہیں — یہہ رنگ و نور کے دردآشنا فسانے ہیں
دکن کی خاک میں ہے بدھ کی زندگی خاموش — دکن کی خاک میں اندر کے ہے پریم کا جوش
نقوشِ حسن کو خونِ جگر سے دھوتے ہیں — یہہ پتھروں میں نہیں، بزم دل میں سوتے ہیں
ہے دیوتاؤں کی تعبیرِ زندگی میں حُسن — ہے پارساؤں کی تصویرِ زندگی میں حُسن
چمک ہے روح کی، رنگوں کی راجدھانی ہیں — لچک ہے عشق کی، پتھر کی سخت جانی میں
نظر نواز بنا، اور جاں گداز بنا! — زمینِ شوق کا ہر ذرہ عشق باز بنا
زمیں پہ رفعتِ جاں، خود نمائی کرتی ہے — وہ دیکھ بزمِ تصور، خدائی کرتی ہے!

باقی

خواتین دکن نمبر

اِس مرقع دکن کے ساتھ اس کا ایک **ضمیمۂ خواتین** علحدہ کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے جس میں دکن کی بیش انشاء پرداز خاتونوں کے نہایت دلچسپ اور مفید مضمون اور نظمیں شامل ہیں، یہہ اصل میں اسی دکن نمبر کا حصہ ہے جو صنف لطیف کے رشحاتِ قلم پر مشتمل ہے۔ اور ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبۂ نسوان کی طرف سے اس کی سرگرم معتمد محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کے پرخلوص مساعی کی وجہہ سے نہایت خوبی، نفاست اور لطافت کے ساتھ مرتب اور شائع ہو رہا ہے۔ اس کی عام قیمت ۸/ رکھی گئی ہے۔ لیکن صرف سب رس کے خریداروں کو ختم فروری تک نصف قیمت پر محض اس وجہہ سے دیا جائیگا کہ یہہ سب رس ہی کا ایک حصہ ہے۔ اس خواتین دکن نمبر کے بعض مضمون نگاروں کے نام یہہ ہیں:-

رالعبہ بیگم صاحبہ (زنانہ کالج)	فاطمہ بیگم صاحبہ ادا	تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ	قمر النساء بیگم صاحبہ
کبریٰ اقبال عبدالرؤف	زبیدہ ضیاء الدین انصاری	بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیرؔ	رالعبہ بیگم صاحبہ (معلمہ محبوبیہ اسکول)
افسر النساء بیگم صاحبہ	ممتاز جہاں بیگم صاحبہ صوفی	صفیہ صدیق فریدہ بیگم صاحبہ	جہاں بانو بیگم صاحبہ بی، اے
لطیف النساء بیگم صاحبہ بی، اے	ذاکرہ بنت فضل اللہ احمد صاحب	تسنیم ربانی بی، اے	مسز صوفی ام، اے۔

دکن کی اسلامی فتوحات

"دورِ وسطیٰ میں دکن اور شمالی ہند کے تعلقات" ۱۲۹۴ء تا ۱۳۵۱ء

۱۲۰۶ء میں جب دہلی کی اسلامی سلطنت قائم ہوئی تو اس کے حدود زیادہ وسیع نہ تھے۔ بنگال، گجرات، مالوہ، قنوج، اجمیر اور دوآبہ کے کچھ حصے اس میں شامل تھے۔ ۱۲۹۰ء تک اس کو بنگال سے سندھ اور جنوب میں دریائے نربدا تک وسیع کیا گیا۔ جب دہلی کی حکومت خلجی خاندان کے ہاتھ آئی تو جلال الدین خلجی کے پیش نظر کسی قسم کا فتوحاتی یا تعمیری کام باقی نہ رہا۔ علاءالدین خلجی صوبہ دار کڑہ شاہی فوجوں کے ہمراہ مالوہ کے قریب بھیلسہ کی فتح میں مصروف تھا یہاں اس کو دکن کی مہاراشٹرا سلطنت کے حالات معلوم ہوئے جس کا مرکز دیوگری تھا۔ یہ سلطنت کوہ ست پڑا کے جنوب میں واقع تھی۔ چونکہ یہ خطہ تا مختلا واقع ہوا تھا اور اس کے پیش نظر سلطنت دہلی پر قبضہ کرنے کا منصوبہ پہلے ہی سے تھا اس لئے اس نے بغیر سلطان کی اجازت کے آٹھ ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ دیوگری کا رُخ کیا۔

یوں تو جنوبی ہند کے ساحلوں پر مسلمان عرب تاجروں نے آباد ہو کر اسلامی آبادکاری کی بنیاد ڈال دی تھی لیکن فرشتہ اور شہریار کی تحریروں کے بموجب ان تاجروں نے کوئی سیاسی حیثیت حاصل نہ کی۔ بلکہ وہ دوسرے فرقوں کی طرح آباد ہوئے۔ ان عرب تاجروں کے ہمراہ بعض بزرگ، فقیر اور درویش بھی آئے جن میں بابا ظاہر، خواجہ خضر اور شیخ عبداللہ خفیف بھی تھے۔ ان بزرگوں نے سماجی اتحاد میں نمایاں حصہ لیا جس سے مخلوط تہذیب و تمدن کا وجود ہوا۔ انسانی برادری اور وحدت کا پیام سرزمین دکن پر بالکل نئے اصول سے پیش کیا گیا جو آگے چل کر شمالی ہند پر بھی پھیلا اور ہندلسانی تکمیل کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

علاءالدین کے حملے کے وقت دکن میں تین خودمختار سلطنتیں تھیں۔ ۱۱۹۰ء میں جب چالوکیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا تو مہاراشٹرا، تلنگانہ اور کرناٹک کے صوبے خودمختار ہو گئے۔ مہاراشٹرا کا پایۂ تخت دیوگری تھا جہاں یادو خاندان کا راجہ رام دیو حکمراں تھا۔ تلنگانہ کے مرکز ورنگل پر کاکتیا خاندان کی ایک عورت رودرما دیوی اپنے پوتے کی کمسنی کی وجہ سے حکمراں تھی۔ کرناٹک کے مرکز دوارسمدر پر بلال خاندان کا راجہ ویر بلال حکمران تھا۔ یہ سلطنتیں بہت متمول تھیں کیونکہ ان کے حدود میں سونے، چاندی اور جواہرات کی کانیں تھیں اور اس کے علاوہ گھوڑے، ہاتھی کافی تعداد میں موجود تھے۔

علاءالدین خلجی کی روانگی سے قبل بعض صوفی اور فقیر منش بزرگ دکن کی طرف روانہ ہو چکے تھے جن میں سے بعض تو راستہ کی گھاٹیوں پر آباد ہو گئے اور بعض آگے بڑھتے چلے گئے۔ ان لوگوں سے علاءالدین کو راستہ معلوم کرنے میں بڑی مدد ملی۔ دولت کی ہوس اور اپنے منصوبوں کو کامیاب بنانے کی کوشش میں اس نے راستہ کی مشکلات کا مطلق خیال نہ کیا۔ اس کی فوج بالاگھاٹ سے ہوتی ہوئی ایلچپور پہونچی جو مہاراشٹرا سلطنت کی فوجی چھاؤنی تھی یہاں معمولی جھڑپ ہوئی اور ایلچپور پر قبضہ کر لیا گیا جو دکن کا باب الداخلہ ہے۔ یہاں اس نے ٹھہر کر معلومات حاصل کیں۔ اس کے بعد آگے بڑھ کر دیوگری (دولت آباد) کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

راجہ رام دیو قلعہ بند ہو گیا۔ اس زمانہ میں اس کا بیٹا شنکر دیو کسی جاترا میں گیا ہوا تھا۔ راجہ نے اس اچانک حملے سے پریشان ہو کر صلح پیش کیا۔ اس صلح نامہ میں فرشتہ کے بیان کے بموجب علاءالدین کو چھ سو من سونا، سات من موتی، دو من جواہرات اور ہزار من چاندی اور اس کے علاوہ ریشمی تھان، گھوڑے، ہاتھی وغیرہ ہاتھ آئے۔ سالانہ خراج کا وعدہ لے کر یہ واپس ہو رہا تھا کہ شنکر دیو آگیا اور اس نے علاءالدین کی فوج پر حملہ کر دیا۔ لیکن اس پر بھی علاءالدین کو کامیابی ہوئی اور اس نے نئے صلح نامہ کی رُو سے دوگنا تاوان حاصل کیا۔ ایلچپور پر اس نے مستقل قبضہ رکھنا ضروری سمجھا کیونکہ اس کو آئندہ بھی دکن سے تعلقات قائم رکھنے تھے۔ یہ واپس ہو گیا لیکن بعض صوفی اور درویش ایلچپور اور اطراف و اکناف کی

پہاڑیوں پر آباد ہوگئے۔ یہی سب سے پہلی دکن کی اسلامی آبادکاری کی ابتدا ہے۔ علاء الدین کا یہ حملہ محض اتفاقی اور اپنے سیاسی منصوبوں کی تکمیل کے سلسلہ میں دولت کے حصول کی خاطر ہوا۔ دکن پر براہ راست حکومت کرنے کا کوئی خیال علاء الدین کے دماغ میں نہ تھا۔ اس حملے کے بعد دکن کا راستہ شمالی ہند کی طاقتوں کے لئے کھل گیا اور ساتھ ہی ساتھ دکن کے سیاسی حالات پر بھی اس کا اثر پڑا۔

علاء الدین خلجی کو دکن میں وہی درجہ حاصل ہے جو محمود غزنوی کو تاریخ ہند میں۔ جس طرح محمود نے ہندوستان کی دولت سے اپنی سلطنت کو مستحکم اور مالامال کرلیا اسی طرح علاء الدین نے دکن کی دولت سے سلطنت دہلی کو حاصل کیا اور بادشاہ بننے کے بعد اسی دولت سے اپنے مخالفین کے منہ بند کردیئے۔ اور وہ قوت حاصل کی جو آج بیسویں صدی میں آمروں کو حاصل ہے۔

دکن پر دوسرا حملہ سنہ ۱۳۰۶ء میں ہوا کیونکہ دیوگڑی کے راجہ نے خراج ادا کرنا روک دیا تھا۔ علاء الدین اس دوران میں سلطنت کے کاروبار اور فتوحات میں مصروف رہا اور دکن کی طرف سے کسی قدر غافل بھی ہوگیا جس سے فائدہ اٹھاکر رام دیو نے تین سال تک مسلسل خراج ادا نہ کیا۔ سلطنت دہلی کی جانب سے ملک کافور کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی گئی لیکن راجہ نے بغیر مقابلہ کئے اطاعت قبول کرلی اور دہلی جاکر ایک ماہ تک شاہی مہمان رہا۔ دربار سے اس کو رائے رایاں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا اور سرخ چتر لگانے کی اجازت دی گئی۔ گجرات کا ضلع نیسری بھی اس کی عملداری میں دے دیا گیا۔ اس طرح دیوگڑی پر پورا سیاسی اقتدار حاصل ہوگیا۔

سنہ ۱۳۰۹ء میں تلنگانہ کے مرکز ورنگل پر حملہ کیا گیا۔ اس حملہ سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ سلطنت دہلی کے پیش نظر دکن پر حملہ کرنے کا ایک خاکہ موجود تھا۔ ملک کافور کی ماتحتی میں شاہی فوجیں ورنگل کی طرف روانہ ہوئیں۔ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ علاء الدین نے ملک کافور کو یہ حکم دیا تھا کہ ورنگل پر قبضہ کرنے کے بجائے دولت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ شاہی فوجیں ایلچپور، قندہار، دیوگڑی سے ہوتی ہوئی ورنگل پہونچیں۔ راستہ میں دیوگڑی کے راجہ کی جانب سے شاہی فوج کیلئے ضروری انتظامات کردیئے گئے تھے۔ ہنمکنڈہ پر قبضہ کرکے قلعہ کا محاصرہ کرلیا گیا۔ قلعہ بہت مضبوط اور مستحکم تھا۔ تھوڑے دنوں کے اندر ہی راجہ رودر دیو نے صلح کرلی اور سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا اور نذرانہ و تاوان کے سلسلہ میں کثیر مقدار سونا، چاندی اور زر و جواہرات پیش کیا جو ایک ہزار اونٹوں پر لادا گیا۔ ہاتھی اور گھوڑوں کی ایک کثیر تعداد بھی ہاتھ آئی۔ پروفیسر کرشنا سوامی اینگار نے امیر خسرو اور برنی کے بیانات کا حوالہ دیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ورنگل کی پوری دولت ملک کافور کے ہاتھ آگئی تھی۔ اس طرح دکن کی دو متمول سلطنتوں پر سیاسی اقتدار قائم ہوگیا۔ اب صرف جنوب ہند میں دو اور سلطنتیں باقی رہ گئی تھیں۔ ایک دوار سمدرا کی ہوئسلا سلطنت اور دوسری سلطنت پانڈیہ جو مالابار میں واقع تھی۔

ملک کافور نے ورنگل کی فتح کے وقت ہی جنوبی سلطنتوں کے حالات معلوم کرلئے تھے۔ دہلی پہونچنے کے بعد اس نے سلطان سے مالابار پر حملہ کی اجازت لے لی چنانچہ سنہ ۱۳۱۰ء میں ایک بڑی فوج کے ساتھ مالابار کی طرف روانہ ہوا۔ اس حملہ کو امیر خسرو نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے کیونکہ وہ خود اس میں ہمراہ تھے۔ دکن کی پہاڑیوں اور دشوار گذار راستوں کا حال بہت ہی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ راستہ میں رام دیو نے رسد کا انتظام کردیا تھا۔ اور کچھ فوجی ہاتھی بھی پیش کئے۔ نربدا، تاپتی کے علاوہ اس فوج کو تین اور دریا، گوداوری، سینی اور بھیما عبور کرنے پڑے۔ پاندری کے مقام پر ملک کافور ٹھیر گیا تاکہ مالابار سلطنت کے حالات معلوم کرے۔ اس وقت سلطنت کے لئے دو دعویداروں، ویر پانڈیہ اور سندر پانڈیہ کے درمیان جنگ ہو رہی تھی جو حقیقی بھائی تھے۔ دوار سمدر کا راجہ بلال دیو اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاکر اپنی فوج کے ساتھ حملہ کے لئے آگیا لیکن جونہی

اس کو مسلمانوں کے آمد کی اطلاع ہوئی وہ واپس ہوگیا۔ ملک کافور نے اس کا تعاقب کیا اور اُس کو دوارسمدر (دوار وتی پور) میں محصور کر لیا۔ جو سلطنت کرناٹک کا مرکز تھا۔ بلال دیو نے صلح نامہ پیش کیا جس پر ملک کافور نے سالانہ خراج کی پابندی عاید کی اور تا وان جنگ جو ایک کثیر مقدار میں ہاتھ آیا مع ویر بلال سوم کے دہلی روانہ کر دیا تاکہ علاء الدین کے روبرو اپنی اطاعت کا اقرار کرے۔

مالابار سے سندر پانڈیہ نے بھاگ کر دہلی کا رخ کیا اور علاء الدین کے پاس پہونچا اور سلطنت پر ویر پانڈیہ قابض ہوگیا۔ مسلمانوں کی آمد پر راجہ نے پایۂ تخت کو چھوڑ کر ایک جزیرہ میں پناہ لی۔ ملک کافور نے بغیر کسی جھگڑے کے کثیر مال و دولت پر قبضہ کر لیا۔ واصف اور خسرو کے بیان کے بموجب اس نے ۳۲۰ ہاتھی ۲۰ ہزار گھوڑے ۵۰۰،۲ پونڈ سونا اور جواہرات کے کئی صندوق حاصل کئے۔ اس دولت سے اس کے خیالات پلٹ گئے اور ایک خود مختار سلطنت کے قیام کا منصوبہ اس کے دماغ میں آیا لیکن حالات سے مجبور ہو کر اپنے منصوبہ کو کامیاب نہ بنا سکا۔ اس شکست سے اس کی ہمت ٹوٹ گئی اور یہ آگے بڑھتا ہوا۔ رامیشورم تک چلا گیا جہاں اس نے یادگار کے طور پر ایک مسجد بھی تعمیر کروائی۔ یہاں اس نے مسلمانوں کو بھی دیکھا جن کا طرز معاشرت، نسلی امتیاز اور زبان وہاں کے ماحول اور جغرافی حالات کی وجہ سے بہت کچھ بدل گئی تھی۔ ۱۳۱۱ء میں یہ شمالی ہند کی سب سے پہلی اور انتہائی پیش قدمی تھی۔ اورنگ زیب صرف دریائے کاویری تک بڑھ سکا۔ اس طرح تاریخ ہند کا یہ دور، جنوب ہند کی فتح اور سیاسی اقتدار کو حاصل کرنے میں سب سے نمایاں رہا۔

علاء الدین خلجی کے بعد اس کا دوسرا بیٹا مبارک خلجی جب ۱۳۱۶ء میں تخت نشین ہوا تو دیوگڑی میں بغاوت ہوگئی۔ وہاں ہرپال دیو نے شنکر دیو کو ہٹا کر تخت پر قبضہ کر لیا تھا۔ مبارک خلجی نے ہمت سے کام لے کر دیوگڑی پر حملہ کر دیا۔ اس نے پہلے خسرو کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ بھیجا اور اس کے بعد خود گیا۔ ہرپال دیو کو شکست ہوئی اور دیوگڑی پر براہ راست قبضہ کر لیا گیا۔ اس طرح مہاراشٹرا سلطنت براہ راست شمالی ہند کے زیر حکومت آگئی۔ گلبرگہ اور ساگر پر فوجی عہدہ دار مقرر کر دیئے گئے اور دیوگڑی پر ایک ترکی النسل صوبہ دار مقرر کیا گیا جس کا نام یک لاکی تھا۔ ان انتظامات کے بعد مبارک خلجی نے خسرو کو ورنگل کی تسخیر کے لئے روانہ کیا۔ .... ورنگل کے راجہ نے اطاعت قبول کر لی اور کثیر مال و دولت نذرانہ کے طور پر پیش کیا جس کی تفصیل ابن بطوطہ نے لکھی ہے یعنی ایک سو ہاتھی ۱۲ ہزار گھوڑے ۶۰ صندوق جواہرات ۲۵۰ پونڈ سونا۔ ورنگل کی سلطنت کے پانچ اضلاع بھی دیوگڑی میں شامل کر دیئے گئے۔

خسرو اس فتح کے بعد جنوبی ہند کی طرف روانہ ہوگیا۔ ضیاء الدین برنی نے خسرو کی اس جنوبی مہم کو بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ جن جن شہروں سے یہ فوج گزرتی تھی وہاں کے راجہ شہر چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ اس نے ان خالی شہروں سے بہت بڑی دولت حاصل کی۔ دولت کی فراوانی نے اسے باغی بنا دیا اور یہیں سے اس نے سلطنت دہلی پر قدم جمانے کے منصوبے شروع کر دئے۔ دکن کی دولت نے ہر جنرل کو شاہی کے خواب دکھائے اور انھوں نے اسی قوت کے نشے میں سلطنت دہلی پر قبضہ بھی حاصل کیا۔

خلجی دور کے بعد تغلق دور میں غیاث الدین تغلق نے جب شاہی خزانہ خالی پایا تو اپنے بیٹے الغ خان کو ورنگل پر حملے کے لئے روانہ کیا۔ اس لئے یہاں کے راجہ نے دہلی کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھا کر خراج دینا بند کر دیا تھا۔ یہ حملہ ۱۳۲۳ء میں ہوا جب شاہی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا تو فوج میں یہ غلط خبر مشہور ہو گئی کہ غیاث الدین تغلق کا انتقال ہوگیا ہے جس کی وجہ سے محاصرہ پر برا اثر پڑا۔ راجہ کی فوج نے محاصرین کو سخت شکست دی۔ الغ خان نے دیوگڑی میں پناہ لی۔ ضیاء الدین برنی اور ابن بطوطہ کے بیانات میں کچھ اختلاف ہوگیا ہے کیونکہ برنی اس غلطی کا ذمہ دار الغ خان کو

بتاتا ہے اور بطوطہ اس کو مورد الزام نہیں سمجھتا۔ بہر حال واقعات کچھ بھی ہوں غیاث الدین تغلق نے اکثر لوگوں کو جو دہلی بھاگ آئے تھے سخت سزائیں دیں۔ اور ایک دوسری فوج الغ خاں ہی کی سرکردگی میں روانہ کی جس کے بعد قلعہ فتح ہوگیا اور راجہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرکے تلنگانہ کے علاقے کو بھی براہ راست دہلی کے تحت کردیا گیا۔

سلطنت دہلی جو سنہ ۱۲۹۴ء میں صرف دریائے نربدا تک پھیلی ہوئی تھی سنہ ۱۳۳۰ء میں مالابار تک پھیل گئی۔ مسلمانوں کی اتنی وسیع سلطنت اس سے قبل یا اس کے بعد کبھی قائم نہ ہوئی۔ خاندیس کے علاقے میں پٹھانوں کی نوآبادی اسی زمانہ میں قائم ہوئی۔ ان حملوں سے مسلمانوں کے اکثر قبیلے اور خاندان شاہان دہلی سے جاگیریں حاصل کرکے دکن کے مختلف علاقوں میں آباد ہوگئے تھے۔

سلطان محمد تغلق (الغ خاں) کے ابتدائی زمانہ میں اس کے بھانجے بہاء الدین گرشاسپ نے جو گلبرگہ کے قریب ساگر میں متعین تھا بغاوت کردی۔ اس کی سرکوبی کے لئے خواجہ جہاں کی قیادت میں شاہی فوجیں روانہ کی گئیں۔ بہاء الدین نے شاہی فوجوں کی آمد سے مرعوب ہوکر دریائے کرشنا اور تنگبھدرا کی درمیانی سلطنت کمپلی میں پناہ لی۔ یہاں اس کا تعاقب کیا گیا۔ یہاں سے یہ دوار سمدرا چلا گیا اور وہاں بھی اس کا تعاقب کیا گیا۔ اس تعاقب میں ان دونوں سلطنتوں کا خاتمہ کردیا گیا اور ان کو براہ راست دہلی کے تحت کردیا گیا۔ بہاء الدین یہاں گرفتار ہوا اور قتل کردیا گیا لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ روپوش ہوگیا اور پھر اس کا پتہ نہ چلا۔

محمد تغلق کے پیش نظر سب سے زیادہ مشکل مسئلہ مرکزی قوت کا قیام تھا اس لئے کہ مرکز کو موثر بنائے بغیر اتنی وسیع سلطنت پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ اس نے اس مسئلہ کا حل یہ سوچا کہ دہلی کے بجائے دیوگری کو مرکز بنایا جائے تاکہ شمال، جنوب، مشرق اور مغرب چاروں طرف سے اس کا فاصلہ یکساں رہے۔ دہلی میں بیٹھ کر جنوب ہند کے علاقے مالابار وغیرہ پر تسلط قائم رکھنا بہت ہی مشکل تھا اور پھر ایسے زمانہ میں جب کہ ذرایع حمل ونقل میں بڑی دشواریاں تھیں۔ نظری اعتبار سے اس کا یہ حل بہت ہی مناسب اور بہتر تھا لیکن عملی اعتبار سے اس کا یہ منصوبہ بیکار ثابت ہوا۔ اس نے اپنے اقتدار سے دہلی کو اجاڑ کر دولت آباد کو بسالیا لیکن بہت ہی تھوڑے عرصے میں پھر دہلی واپس ہونا پڑا۔ اس رد و بدل سے دولت آباد (دیوگری) میں مسلمانوں کی ایک کافی تعداد آباد ہوگئی اور امرائے صدہ کا ایک بڑا حصہ یہیں مقیم ہوگیا۔ جس کے بعد انھیں امراؤں نے دہلی سے بغاوت کرکے ایک علیحدہ اسلامی سلطنت دکن میں قائم کی جو بعد میں سلطنت بہمنی کے نام سے مشہور ہوئی۔ دکن کی یہ خود مختار سلطنت محمد تغلق کی زندگی ہی میں قائم ہوئی اور بعد میں تاریخ ہند اور تاریخ دکن کی سیاسیات میں ایک بڑے انقلاب کا باعث ثابت ہوئی۔

سید کرار علی

افغانی قندہار نہیں۔ دکن کا قندہار جسے قندہار شریف کہا جاتا ہے۔ کیونکہ محمد تغلق کے ساتھ دکن میں آئے ہوئے اولیاء اللہ کی چودہ سو پالکیوں میں کا ایک کثیر حصہ قندہار شریف ہی کے حصہ میں آیا۔ یہ دکن کا بلگرام ہے، یہاں سے اولیاء، صوفیا، علماء، شعراء، مورخین اور مشاہیر پیدا ہوئے جن کے حالات اور کارنامے "مشاہیر قندہار دکن" میں پڑھئے جس کو اکبر صدیقی صاحب بی اے نے مرتب کرکے باتصویر شائع کیا اور اب ادارۂ ادبیات اردو کو اس کا حق تصنیف دے دیا ہے۔ (مہتمم)

سلطان مجاہد شاہ بہمنی
۷۷۵ھ تا ۷۸۰ھ

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی
۱۲۵ھ تا ۱۳۱ھ

دکن پر بہمنی خاندان کی حکومت

سلطنت بہمنی کی مبارک تاسیس جو ۱۳۴۷ء میں عمل میں آئی وسط چودھویں صدی کا عظیم الشان واقعہ تھا۔ اس سلطنت کی حقیقی عظمت اس کے جلیل القدر سلاطین کی علمی و عملی شخصیت اور ان کے غیر معمولی سیاسی اور تمدنی کارناموں میں مضمر ہے۔ ان علم برداروں نے دکن کو ایک بلند پایہ سیاست اور پاکیزہ تمدن کے زیور سے اس قدر سنوارا کہ دنیا اس کو پہچاننے لگی اور اب بھی اس کی یاد تازہ ہے، دکن کی اصلی عظمت اسی خاندان کی وجہ سے ہے، اس وقت دکن کو جس تمدن پر ناز ہے وہ سب شاہان بہمنیہ کا سرمایہ ہے انہیں سلاطین نے دکن کے طول و عرض میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی اور اس کو پھیلایا۔ بہمنیوں کا کرشمہ تھا کہ انھوں نے بہت جلد دکن کو اپنا گھر بنالیا۔ اس ملک کی جغرافی خصوصیات اپنے میں جذب کرلیں اور اپنی حکومت انہیں خصوصیات کے مطابق بنائی۔ بہمنی سلطنت اس وقت قائم ہوئی تھی جب کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کمزور ہونے کی وجہ سے سیاست منتشر ہو رہی تھی۔ اس کے ذمہ دار کچھ تو اس زمانے کے سیاسی حالات تھے جو خلجی خاندان کے خاتمہ کے بعد ہندوستان میں رونما ہوئے بعض خاندان میں ہندوستان جیسے وسیع ملک کی رہنمائی کی اہلیت نہ تھی مرکز کی کمزوری سے ہر صوبے میں جداگانہ عمل داری قائم ہوگئی دکن کی انفرادیت جس طرح پہلے زمانے میں قائم تھی پھر کھڑی ہوگئی اور امرائے صدہ کی بدولت جو دکن کے تاریخ ساز ہیں سلطنت بہمنی کی داغ بیل پڑگئی

سلطنت بہمنی کا پہلا دور

سلطنت بہمنی کی تقریباً ڈیڑھ سو سال کی تاریخ ہے اس کا ابتدائی زمانہ جب کہ اس سلطنت کے بانی علاء الدین حسن اور اس کے بیٹے محمد شاہ اول نے حکومت کی عہد تاسیس تھا اس دور میں سلطنت کی بنیاد رکھی گئی اور دکن کے طول و عرض اور اس کی قومی اور جغرافی خصوصیات کا صحیح مطالعہ کرکے ایک پایدار خوشگوار نظام حکومت قائم کیا گیا۔ یہ سلاطین بہمنیہ کا سیاسی کرشمہ سمجھنا چاہئے کہ انھوں نے ابتدا ہی سے دکن کو اپنا گھر بنالیا تھا اس جدید ماحول میں اپنے آپ کو اس قدر مانوس کرلیا کہ قدیم اہل دکن ان کو اپنا بادشاہ تسلیم کرنے لگے۔ نظام حکومت اس طرح مرتب کیا گیا جو سب کے لئے خوش گوار تھا، ہندوؤں کو حکومت میں شامل کیا گیا جس کو تاریخ ہند کا پہلا واقعہ سمجھنا چاہئے، مرکزی حکومت کی بنا ڈالی گئی اور سلطنت مقامی حلقوں میں تقسیم کرکے صوبہ داری اور ضلع داری طرفیں قائم کی گئیں، اگرچہ اس انتظام کا سہرا ان بادشاہوں کے سر ہے جو اس سلطنت کے بانی اور معمار تھے لیکن اس میں اسی سلطنت کے پہلے وزیر اعظم سیف الدین غوری کا بھی ہاتھ تھا۔ محمد شاہ کو اس بات کا امتیاز ہے کہ اس نے شاہی آداب کے لئے خاص اہتمام کیا تھا دربار کو مختلف طریقوں سے سجایا گیا، امرا اور رسالے کو کھڑے رہنے کی جگہ مقرر کی گئی اور بادشاہ کے بیٹھنے کے لئے تخت فیروزہ کے نام سے ایک تخت بنایا گیا جس کی بڑی شہرت تھی اور ہندوستان کی تاریخ میں اب تک ایسا تخت نہیں بنا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں اسی تخت کی شہرت سے متاثر تھا اور تخت طاؤس کو بہمنی تخت کا نقش ثانی سمجھنا چاہئے نیز محمد شاہ کے دربار کا تزک و احتشام بھی بہمنیوں کی خاص اختراع ہے۔ اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔

محمد شاہ اول کا انتقال ۱۳۷۵ء میں ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مجاہد شاہ تخت نشین ہوا جو تین سال سے زیادہ بادشاہی کرنے نہ پایا کیونکہ اس کے چچا داؤد نے اس کا خاتمہ کر کے خود تخت پر قبضہ کر لیا مجاہد شاہ کے ہمدردوں نے بہت جلد اس کا بھی خاتمہ کر دیا اور علاء الدین حسن کے ایک پوتے کو جس کا نام محمد شاہ دوم ہے تخت نشین کیا گیا، محمد شاہ دوم کی تخت نشینی سے اس سلطنت کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے اس میں نہ صرف ملک کو خانہ جنگی سے نجات ملی بلکہ تمدنی ترقی کی نئی راہیں کھل گئیں محمد شاہ بہت تعلیم یافتہ اور علم دوست آدمی تھا اس کی وجہ سے دکن میں سب سے پہلے علمی سرگرمیاں شروع ہوگئیں جو اس سے پہلے نہیں ہوئی ہیں اور ظاہر ہے کہ محمد شاہ دوم سے پہلے جو زمانہ گزرا تھا وہ تاسیس اور تشکیل کا زمانہ تھا۔ اس میں علمی ترقی نہیں ہوسکتی تھی۔ جب تک استحکام سلطنت کے ساتھ ملک میں سیاسی اطمینان نہ پیدا ہوجائے اہل علم اطمینان کے ساتھ علمی کام نہیں کرسکتے۔ محمد شاہ دوم کے کامیاب نظم و نسق کی وجہ سے ایک طرف تو امن قائم ہوگیا اور دوسرے طرف اس کی علم دوستی نے ملک میں علمی دلچسپیاں پیدا کردیں لائق علما جمع کئے گئے مدرسے کھول دئے گئے۔ استادوں کے لئے خاطر خواہ تنخواہیں اور طلبہ کے لئے وظائف مقرر ہوگئے ان علما میں سے جو اس زمانے میں دکن آتے تھے فضل اللہ انجو کا نام ہمیشہ یاد رہے گا جو دنیائے اسلام کا بہت بڑا عالم تھا اسی شخصیت کی وجہ سے دکن میں علم کی دیا روشن ہوئی اور اس کی روشنی ایسی پھیلی کہ دکن علم کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

سلطنت بہمنی کا انتہائی عروج

جس طرح محمد شاہ اول کے انتقال کے بعد خانہ جنگی کی بدنما شکل پیدا ہوئی تھی اور چند روز تک تمدنی ترقی مسدود ہوگئی اسی طرح محمد شاہ دوم کے بعد بھی بہت سی سیاسی بدمزگیاں پیدا ہوگئیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز کے لئے سلطنت بہمنی کے وقار کو دھکا لگا محمد شاہ کا انتقال ۱۳۹۷ء میں ہوا۔ اس کے جانشین غیاث الدین اور شمس الدین جو چند مہینوں کے فصل سے اس کے بعد تخت نشین ہوئے اس گراں بار کے متحمل نہیں ہوسکے۔ ایک ترک غلام تغلچین نامی سلطنت پر بری طرح حاوی ہوگیا اور بادشاہ کٹ پتلی ہوگئے اس وقت ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو ملک کی صحیح رہنمائی کرسکیں۔ علاء الدین حسن کے دوسرے پوتے محمود خاں اور احمد خاں جو بہت لائق اور ذی علم تھے بہمنی سلطنت کے وقار کو بچانے کے لئے میدان میں آگئے اور سازش کرکے تغلچین کو ماردیا اور فیروز خاں تاج الدین فیروز شاہ کے لقب سے تخت فیروزہ پر بیٹھ گیا۔ جو اس خاندان بہمنیہ کا سب سے زیادہ جلیل القدر اور مایۂ ناز بادشاہ تھا۔ اس کے عہد حکومت میں دکن کی جس قدر ذہنی اور اخلاقی تربیت ہوئی اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے بہمنیوں کا تمام تر تمدن اسی عہد کی پیداوار ہے۔ فیروز شاہ فضل اللہ انجو کا شاگرد تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے استاد کے تمام سرمایۂ علم سے فائدہ اٹھایا تھا بلکہ اپنی رسا طبیعت اور غیر معمولی ذہن کی وجہ سے ایسی علمی شان پیدا کردی تھی کہ دنیا کے سلاطین میں اس کی مثال نہیں ملتی اس نے تمام ملک میں اشاعت علم کے تمام ذرائع استعمال کئے۔ دور دراز سے علما جمع کئے اور ان کی خاطر خواہ تواضع کی علم کی مجلسیں منعقد کیں اور ان میں وہ خود بھی ایسا حصہ لیتا تھا کہ گویا وہ بادشاہ نہیں ہے اسی پر حصہ نہیں ہے بلکہ فرصت کے اوقات میں وہ بلند پایہ طلبہ کو جمع کرکے ان کو انتہائی مضامین میں درس دیا کرتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ

فیروز شاہ کی ذی علم شخصیت کی وجہہ سے دکن کے در و دیوار علم و فضل سے گونجنے لگے اور گلبرگہ علم کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

علمیت کے ساتھ فیروز شاہ میں سیاسی تدبر بھی کچھ کم نہیں تھا۔ ملک کی کامیاب سیاسی رہنمائی کی اور ہمسایہ سلطنتوں پر اس قدر رعب داب قائم کیا کہ سب سلطنت بہمنی کا لوہا مانتے تھے۔ نیز فیروز شاہ کے پاکیزہ ذوق کی وجہ سے دکن کے تمدن میں بڑی شگفتگی پیدا ہوگئی لباس وضع قطع نئے انداز میں ڈھل گئے لباس کی بعض اختراعیں جو فیروز شاہ نے بنائی تھیں وہ اب تک موجود ہیں اگر فیروز شاہ سے کوئی غلطی ہوی تھی تو وہ صرف یہہ ہی کہ اس نے اپنے بھائی احمد خاں کی جگہ اپنے بیٹے حسن خان کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا۔ احمد خاں عمر رسیدہ اور لایق آدمی تھا۔ اس نے خود فیروز شاہ کی تخت نشینی میں مدد دی تھی۔ اسی بنا پر اس زمانے کے مشہور بزرگ حضرت بندہ نوازؒ نے بھی احمد خاں کے لئے اپنا روحانی فیصلہ صادر کردیا تھا اس کا نتیجہ یہہ ہوا۔ دونوں فریقوں میں ان بن ہوگئی اور احمد خاں کو تلوار کے زور سے تخت حاصل کرنا پڑا

سلطنت بہمنی کا آخری دور

احمد خاں جو اپنی روحانیت کی وجہہ سے احمد شاہ ولی بہمنی کے نام سے موسوم ہے ۱۴۲۲ء میں تخت نشین ہوا اس کی تخت نشینی سے سلطنت کے استحکام و توسیع میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ علم و فن کی سرگرمیاں اسی طرح قائم رہیں جس طرح فیروز شاہ کے عہد میں تھیں۔ لیکن اس کے عہد میں گلبرگہ کی جگہ بیدر کو پائے تخت بنا یا گیا اس انتظام سے یہہ فائدہ ہوا کہ پائے تخت کے لئے بیدر جیسی ایک بلند جگہ مل گئی لیکن گلبرگہ جو ایک زمانے میں علم و فن کا مرکز بن گیا تھا اس کی آب و تاب گھٹ گئی اب دنیا کی توجہہ بیدر کی طرف منعطف ہونے لگی۔ شیخ آذری جو اس زمانے کا مشہور عالم ہے اسی زمانے میں دکن آیا تھا اور دربار کی فیاضیوں سے فائدہ اٹھا کر ملک کی علمی خدمت کرتا تھا۔ اس کو دربار سے یہہ کہا گیا تھا کہ بہمن نامہ کے نام سے سلطنت بہمنی کی تاریخ لکھے۔ چنانچہ اس نے اپنی آخری عمر تک اس کی تکمیل بھی کی تھی لیکن افسوس ہے کہ وہ ناپید ہے ان چند ظاہری چیزوں کے قطع نظر جو بہت کچھ حوصلہ افزا معلوم ہوتی ہیں سلطنت کی تہہ میں بہت سی چیزیں ایسی بھی تھیں جو آگے چل کر اسی سلطنت کے زوال کا باعث ہوگئیں یعنے اسی عہد سے طبقہ داری کشمکش کے بدنما آثار ظاہر ہونے لگے۔ علاء الدین حسن کے عہد سے جو امرائے صدہ اور ان کے خاندان دکن میں آباد ہوگئے تھے وہ اپنے آپ کو دکھنی کہتے تھے اور انھیں اس کا حق بھی تھا کیونکہ دکن کے حقیقی آباد کار اور سلطنت بہمنی کے بانی تھے۔ اور اس پر تقریباً ایک صدی گذر گئی اس کے بعد جو نو وارد ترکستان اور ایران سے یہاں آتے تھے وہ ان میں گھل مل نہیں سکے اور اہل دکن ان کو اپنا دشمن سمجھنے لگے طبقہ داری کشمکش۔ احمد شاہ کے بیٹے علاء الدین ثانی کے عہد میں جو ۱۴۳۴ء میں تخت نشین ہوا بری طرح ظاہر ہوگئی یعنے دونوں فرقوں میں سخت خوں ریزیاں ہونے لگیں ایک ہنگامہ تو اس قدر زبردست ہوا کہ جس میں تمام باہر کے لوگ مار دے گئے۔ اگرچہ علاء الدین ثانی نے اپنے آہنی پنجہ سے اس آگ کو فرو کردیا لیکن اس کے جانشینوں کے عہد میں اس کی چنگاریاں پھر بھڑک اٹھیں اور بالآخر سلطنت بہمنی کو جلا کر خاک کر دیا۔

علاءالدین ثانی کے بعد جس کا انتقال ۱۴۵۸ء میں ہوا تھا اس کا بیٹا ہمایوں اس کا جانشین ہوا لیکن یہ تین سال سے زیادہ حکومت نہیں کرسکا۔ اس کی بے وقت موت سے بہت نقصان ہوا۔ اس کے بیٹے چھوٹے تھے، ایک بیٹا نظام شاہ بہمنی کے نام سے تخت نشین کیا گیا تھا وہ جلد مرگیا اور دوسرا بیٹا محمد شاہ لشکری کے نام تخت پر بٹھایا گیا چونکہ اس کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی اس لئے اس کی ماں نرگس بانو مخدومہ جہاں ملک کی سیاسی رہنمائی کرتی تھی لیکن وزارت کی بڑی خدمت پر محمود گاواں ثانی ایک نووارد برسراقتدار ہوگیا۔

یہ اگرچہ علاءالدین ثانی کے عہد میں باہر سے آیا تھا اور تجارت کرتا تھا لیکن محمد شاہ لشکری کی کمسنی کے زمانے میں اس نے بہت ترقی کرلی۔ اور سلطنت کے تمام سیاہ وسفید اس کے سپرد ہوگئے۔ محمد شاہ کے سن رشد کے پہنچنے کے بعد بھی اس کے اقتدار میں کمی نہیں ہوی محمود گاواں کے اقتدار سے بہت سے فائدے بھی ہوئے چنانچہ ملک میں علمی کام ہوے اور دستور میں اضافے ہوے لیکن اس کی تنگ نظری سے دکھنی فریق بیزار ہوگیا اور اس کو مارنے کے درپے ہوگیا۔ چنانچہ ایک خاص موقع پر جب کہ بادشاہ اور محمود گاواں مشرقی اور شمالی تلنگانے کی مہم میں مصروف تھے ایک سازش ہوگئی۔ بادشاہ کو محمود گاواں کی طرف سے بدظن کیا گیا۔ بادشاہ نے ناعاقبت اندیشی سے اس کو مارنے کا حکم صادر کردیا۔

محمود گاواں کا قتل جو ۱۴۸۱ء میں ہوا دکن کا بڑا واقعہ ہے اسی واقعہ کے بعد سے سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ کیونکہ جو لوگ اس کے قتل کے ذمہ دار تھے ان میں سیاسی رہنمائی کی صلاحیت نہ تھی۔ ملک حسن بحری جو نظام الملک کے خطاب سے سرفراز تھا اس فعل کا ذمہ دار تھا اگر اس میں محمود گاواں کی وزارت کے سنبھالنے کی صلاحیت ہوتی تو سلطنت اپنی جگہ قائم رہتی اور شیرازہ نہیں بکھرتا لیکن افسوس یہ ہے کہ نظام الملک اور اس کا فریق بالکل خود غرض تھا۔ ان کی نااہلیت اور خود غرضی کی وجہ سے ہر قدم پر ملک کو نقصان پہنچنے لگا جو لوگ محمود گاواں کے آزردہ تھے سب حکومت سے متنفر ہوگئے اور ہر جگہ انحراف کرنے لگے محمد شاہ لشکری کی زندگی تک جو ۱۴۸۲ء میں ہوا تھا حالات کسی قدر روبراہ تھے لیکن اس کے انتقال کے بعد جب اس کے کمسن بیٹے محمود شاہ بہمنی کو تخت نشین کیا گیا تو علانیہ خودسری ظاہر ہونے لگی۔ اکثر صوبہ دار باغی ہو گئے چنانچہ ۱۴۹۰ء میں احمد نگر اور بیجاپور اور برار کے صوبہ داروں نے اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا چند سال بعد گولکنڈہ بھی خودمختار ہوگیا۔ ۱۴۹۰ء کو سلطنت بہمنی کی آخری تاریخ سمجھنا چاہئے۔ بیدر میں جو سلطنت کا مرکز ہے قاسم برید ذی اختیار ہوگیا جو در اصل شہر کا کوتوال تھا محمود شاہ اور اس کے تمام جانشین سب اس کے ہاتھ میں کٹ پتلی ہوگئے تھے ۱۵۱۸ء میں محمود شاہ کے مرنے کے بعد اس کے چار بیٹے احمد شاہ، علاءالدین ثالث، ولی اللہ کلیم اللہ یکے بعد دیگرے برائے نام تخت پر بٹھائے گئے تھے لیکن یہ سب بریدیوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی تھے۔ بالآخر کلیم اللہ حق ناشناس بریدیوں کی دست درازیوں سے تنگ آکر ۱۵۲۶ء میں احمد نگر بھاگ گیا اور اس کے ساتھ تخت فیروزہ پر بیٹھنے والے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے۔

عبدالمجید صدیقی

مجاہد شاہ بہمنی

مجاہد شاہ سلطنت بہمنی کا تیسرا تاجدار ہے۔ اس کی جگہ ایسی صف میں ہے جہاں بالعموم کسی کی نظر نہیں پڑتی لیکن اپنے درجہ میں بھی وہ مطالعہ کے قابل ہے۔ اگرچہ اس کی مختصر زندگی کچھ زیادہ جاذب نظر نہیں مگر اس کے بعض پہلو نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ سبق آموز ہیں۔

مجاہد شاہ محمد شاہ کا بیٹا اور علاء الدین حسن گنگو کا پوتا تھا۔ یہ ۱۳۷۵ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۳۷۸ء میں قتل کر دیا گیا۔ اس طرح اس نے صرف تین سال حکومت کی۔ اس کا قاتل خود اس کا چچا داؤد شاہ تھا۔ جب مجاہد شاہ نے وجیانگر پر حملہ کیا اور وہاں کے راجہ کشن رائے کو بری طرح شکست دی تو واپسی میں وہ دریائے کرشن کے کنارے آرام کے لئے ٹھیرا۔ اس کے دشمنوں نے موقع پاکر اسے یہاں قتل کر دیا۔

مجاہد شاہ ایک بیدار مغز حکمران اور ایک نہایت اچھا سپاہی تھا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی سلطنت کے چاروں طرف نظر ڈالی اور ان مقامات کو بغور دیکھا جہاں سے حملے ہوتے تھے۔ اگرچہ سلطنت بہمنی کو خاندیس، مالوہ اور گجرات کی شمالی سلطنتوں سے بھی خطرہ تھا لیکن جنوبی سلطنت وجیانگر ہمیشہ پریشانی کا باعث رہتی تھی۔ علاء الدین اور محمد شاہ کے عہد میں اس سلطنت سے لڑائیاں ہو چکی تھیں اور کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ مجاہد شاہ کی نظر سب سے پہلے اسی ہمسایہ سلطنت پر پڑی۔ اس نے بین سلطنتی سمجھوتہ کرنا چاہا اور وجیانگر کو لکھا کہ آئندہ نزاع کا سدباب اس طرح ہو سکتا ہے کہ تمہارے اور ہمارے درمیان حدود کا تعین ہو جائے۔ چنانچہ مجاہد شاہ نے اپنی طرف سے یہ تجویز کی تھی کہ دریائے تنگبھدرا حد فاصل ہو۔ لیکن کشن رائے اس تجویز پر راضی نہیں ہوا۔ وہ رائچور اور مدگل کا دوآبہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اسی لئے اس نے تنگبھدرا کی بجائے دریائے کرشنا کو حد فاصل بنانا چاہا۔ لیکن مجاہد شاہ اس کو کیسے مان لیتا۔ چنانچہ اپنی تجویز کو منوانے کے لئے اس نے حملہ کر ہی دیا۔

مجاہد شاہ کے غیر معمولی قوائے جسمانی اور اس کے ساتھ اس کی شجاعت اور جوانمردی اس کی زندگی کے روشن پہلو ہیں۔ سلطنت بہمنی کا عام دستور تھا کہ وہ اپنے شاہزادوں کو خاطر خواہ تعلیم و تربیت دیتے اور درس و تدریس کے لئے لائق اساتذہ فراہم کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ تمام سلاطین بہمنی اچھے تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ بعض تو اونچی قابلیت رکھتے تھے۔ نیز ان کو جسمانی اور فوجی تربیت دی جاتی تھی اور وہ اچھے سپاہی ہوتے تھے۔ چنانچہ تمام معرکوں میں سلاطین بہمنی بذات خود حصہ لیتے تھے۔ اسی ماحول میں مجاہد شاہ کی بھی اٹھان ہوئی تھی۔ چونکہ اس کے قویٰ بھی کافی اچھے تھے اس لیے اس پر تعلیم و تربیت کا غیر معمولی اثر ہوا تھا۔ فرشتہ کے قول کے مطابق وہ شمشیر، نیزہ اور خنجر کے سوا بات نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ مجاہد شاہ کے اس شوق شمشیر زنی کے متعلق بہمن نامہ کے اشعار یہ ہیں۔

ز گہوارہ چوں پائے بیروں نہاد — بہ تیر و کمان دست و بازو کشاد
ببستے تنگ گردون کفش پیل زور — کہ نشنید گفتے کسے وقت شور
چناں بر سر کنگرہ می دوید — کہ انگشت حیرت فلک می گزید

مجاہد شاہ سلطنت بہمنی کا بہت بڑا سپہ سالار تھا۔ اس کی سپہ سالاری کے حقیقی جوہر اس وقت نمایاں ہوئے جب کہ سلطنت وجیانگر سے اس کی ان بن ہو گئی تھی۔ وہ ۱۹ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا اور جو وجیانگر کے وقت اس کی عمر مشکل سے ۲۲ سال ہو گی۔ اس نوخیز عمر میں اس کا دلیرانہ معرکہ اس کی زندگی کا اچھوتا واقعہ تھا۔ کشن رائے کے مقابلہ سے پہلے گنگاوتی کے آگے اس نے جو خونخوار شیر کا تنہا شکار کیا تھا وہ دکھنیوں میں عرصہ تک زبان زد خاص و عام رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس انتہائی جرأت کا وجیانگر پر اتنا رعب پڑا تھا کہ کشن رائے اور اس کی فوج سہم کر رہ گئی تھی۔

کشن رائے کے عہد میں سلطنت وجیانگر کی جو عظمت تھی وہ سب کو معلوم ہے۔ اس کی فوجی طاقت بہت زیادہ تھی۔ ایسی طاقتور سلطنت کا مقابلہ کچھ آسان نہیں تھا۔ اس موقع کی نزاکت کے باوجود مجاہد نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ یہ بڑے گھمسان کا معرکہ تھا۔ گو اس حملہ سے کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا تھا لیکن اس میں مجاہد شاہ نے جو کارنامے دکھائے تھے وہ ہمیشہ یاد رہیں گے۔ کوئی معرکہ ایسا نہ تھا جس میں اس نے حصہ نہ لیا ہو۔ وجیانگر کی چڑھائی' شر رنگا حملہ' قلعہ ادھونی کا محاصرہ' اور رامیشورم تک کشن رائے کا تعاقب اس کے مشہور کارنامے ہیں جو بھلائے نہیں جا سکتے۔ ان چڑھائیوں میں ایک امتیازی بات یہ تھی کہ کہیں قتل عام نہیں کیا گیا۔ جو دشمن مقابلہ کرتا تھا اسی کو مارا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ مجاہد شاہ کے باپ محمد شاہ کی وصیت تھی جس کی پابندی کی گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر شجیع سپہ سالار کے اوصاف میں یہ چیز داخل ہے۔

اگر مجاہد شاہ کی زندگی مہلت دیتی تو شاید دنیا کے بڑے بادشاہوں میں اس کا شمار ہوتا۔ دریائے کرشنا کے کنارے جہاں اس کے دشمنوں نے اس کا خاتمہ کرنا چاہا تھا اس وقت بھی اس نے اپنی فطری شجاعت کے جوہر دکھائے۔ یہ کیمپ میں سو رہا تھا کہ دشمنوں نے اس پر وار کیا۔ داؤد خاں نے خنجر بھونکا تو اس کی آنتیں نکل آئیں تھیں۔ لیکن اس کے باوجود اس نے داؤد کو اس کے خنجر کے ساتھ پکڑ کر کھینچا اور قریب تھا کہ داؤد مر جاتا لیکن اس کے ایک ساتھی مسعود خاں نے اس کو مار دیا اور اس طرح دکن کا یہ ہونہار حکمراں موت کے گھاٹ اتار گیا۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی

عبدالحفیظ صدیقی

احمد خاں بہمنی بن سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے دوسرے بیٹے تھے۔ ولادت سنہ ۷۷۵ھ م سنہ ۱۳۷۳ء میں بعہد سلطان محمد شاہ بن سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی ہوئی۔ باپ کے انتقال کے وقت یہ اور ان کے بھائی فیروز شاہ صغیر سن تھے۔ اور ان دونوں کی پرورش و پرداخت ان کے چچیرے بھائی محمد شاہ ثانی نے کی۔ ان دونوں کو تیراندازی۔ چوگان بازی۔ سواری۔ پڑھنا۔ لکھنا غرض کہ ہر شاہی علم و فن کی اچھی تعلیم دی۔ اور شیراز کے مشہور اور متبحر عالم میر فضل اللہ انجو کو ہر دو کی تعلیم و تربیت کے لئے مقرر کیا اور اپنی دونوں بیٹیاں ان دونوں بھائیوں کو بیاہ دیں۔

جب فیروز شاہ بادشاہ ہوا تو احمد خاں کو خانخاناں کا خطاب دیا اور امیر الامرا مقرر کیا۔ وہ نہایت شجاع اور خوبصورت جوان تھے چہرہ روشن اور پیشانی خندہ تھی۔ خلوص ارادت سے حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو دراز سے بیعت کی۔ بصرف زر کثیر حضرت کے لئے ایک خانقاہ تعمیر کرائی اور ہمیشہ حاضر خدمت ہو کر اسرار معرفت کا سبق لیتے اور ہر محفل سماع میں شریک ہو کر نکات تصوف سے محظوظ اور توجہ حضرت سے بہرہ مند ہوتے تھے۔ چنانچہ حضرت نے ان کی نسبت بادشاہی کی پیشین گوئی کی تھی جس کی وجہ سے فیروز شاہ بہت رنجیدہ ہوا اور حضرت کو شہر گلبرگہ سے باہر جا کر رہنے کا حکم دیا۔ اور مصاحبین کے ورغلانے سے احمد خاں سے بھی بدظن ہوا اور اپنے دو غلاموں ہوشیار عین الملک و بیدار نظام الملک کی صلاح سے ان کو اندھا کرانے کا ارادہ کیا۔ جب ان کو اس کی اطلاع ملی تو اپنے فرزند علاء الدین کے ساتھ شہر سے بھاگ نکلے اور حضرت کے ارشاد و فیوض سے مطمئن ہو کر وہاں سے رخصت ہوئے۔

جب ان کے بھاگ جانے کی خبر فیروز شاہ کو ہوئی تو ایک فوج اپنے دو غلام ہوشیار اور بیدار کے ساتھ پکڑ لانے کے لئے روانہ کی۔ انھوں نے بھی اطلاع پا کر مختصر سی فوج تیار کر کے شاہی فوج کا مقابلہ کیا جس میں ان کو کامیابی حاصل ہوئی۔

فیروز شاہ ان کی فتح کی خبر سن کر قلعہ کا دروازہ کھلوا کر اپنے پاس بلوایا۔ وہ فیروز شاہ کے پاس گئے اور اس کے قدموں پر سر رکھ کر

جو حالت بیماری میں فریش تھا زار و قطار رونے لگے۔ فیروز شاہ نے سر اٹھا کر خوشی کے لہجہ میں کہا کہ میں نے تم کو اپنے عین حیات بادشاہ دیکھا۔ تم شایان سلطنت ہو اور استحقاق اس کا تمہیں کو پہونچتا ہے۔ میں شفقت پدری سے حسن خاں کی ولیعہدی کی سعی کرتا رہا۔ جب کارفرمایان قضا و قدر میرے بعد تاج سلطنت تمہارے لئے نامزد کر چکے ہیں تو دوسرے کے لئے کوشش بے فائدہ ہے۔ حسن خاں کو تمہارے سپرد کیا۔ اٹھو آج ہی سے مہمات سلطنت کو انجام دینا شروع کرو۔ غرض شوال پانچویں ۸۲۵ھ کو تاج بادشاہی کا زیب سر کرکے تخت فیروزہ پر جلوہ گر ہوئے اور اپنا نام "احمد شاہ بہمنی" رکھا۔

مہمات سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلے خلف حسن بصری کو وکیل امور سلطنت کرکے ہزار دو صدی کا منصب عطا کیا اور ملک التجار خطاب دیا۔ اور ہوشیار و بیدار غلاموں میں سے ایک کو خطاب امیر الامرائی اور دوسرے کو دولت آباد کی فوج کی سپہ سالاری کے منصب سے سرفراز فرمایا۔ اور فیروز شاہ کے بیٹے حسن خاں کو جو وارث تاج و تخت تھا اور جمیع ارکان دولت جس کے قتل یا قید کرنے کی صلاح دیتے تھے منصب پانصدی عطا کیا اور فیروز آباد جاگیر میں دیا اور وہاں اس کو آزادی سے رہنے اور سیر و شکار کرنے کی اجازت بھی عطا کی۔ یہ شہزادہ جیسی کی زندگی تک وہاں سیر و شکار میں مشغول رہ کر اپنی زندگی خوب مزے سے بسر کرتا رہا۔

راجہ وجیا نگر نے سرکشی شروع کی اور خراج دینے سے انکار کیا۔ علاوہ اس کے گزشتہ جنگ میں مسلمانوں کا بیدردی سے کشت و خون ہوا تھا اس کا بدلہ لینا بھی ضروری تھا۔ اس لئے پچاس ہزار سوار جرار ہمراہ رکاب لے کر وجیا نگر کی طرف روانہ ہوئے۔ راجہ رائے ورنگل کی مدد سے مقابلہ میں آیا۔ دونوں فوجیں دریائے تنگبھدرا کے کنارے ایک دوسرے کے سامنے اتریں لیکن دونوں میں سے کوئی آگے بڑھ کر اول حملہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر بہمنی فوج کا ایک دستہ یکایک ایسی پھرتی سے دریا پار اترا کہ راجہ دیو رائے بھی حیران رہ گیا اور اس کی فوج فوراً منتشر ہو کر بھاگ نکلی۔

ایک دن احمد شاہ چند سواروں کے ساتھ شکار کو نکلے۔ ہندوؤں نے جو موقع کی تاک میں تھے پیچھا کیا اور چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے سلطان کے سب ساتھی کام آئے مگر اس اثناء میں کمک آ پہونچی اور وجیا نگر کی تسخیر کا مصمم ارادہ کیا۔ دیو رائے گھبرایا اور اس نے حیرانی میں کئی سال کے خراج کی بقایا رقم کو ہاتھیوں پر لاد کر فی الفور بارگاہ سلطانی میں داخل کر دیا۔ اور بہت ہی عجز و انکسار سے صلح کی درخواست کی۔ دونوں میں صلح ہو گئی بوقت واپسی تلنگانہ پر چڑھائی کی۔ رائے ورنگل نے با فوج کثیر آپ کا مقابلہ کیا۔ آخر مارا گیا۔ ملک تلنگ کو اپنے تصرف و اقتدار میں لیا اور مظفر و منصور ہو کر واپس ہوئے۔

انہیں ایام میں سلطان بیدر کے ایک میدان سے گزرے جو نہایت پر فضا تھا۔ حکومت کے لئے ایک مرکزی مقام کی ضرورت تھی جہاں سے پورے دکن پر حکومت کی جا سکے۔ بیدر چونکہ دکن کے وسط میں نہایت بلندی پر واقع تھا اس لئے سلطان نے اس کو پسند فرما کر یہیں شہر کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام احمد آباد بیدر رکھا۔ اور رجب ۸۲۶ھ م ۱۴۲۳ء میں گلبرگہ کے بجائے بیدر کو پائے تخت قرار دیا جہاں قلعہ حصار اور محلات شاہی و باغات وغیرہ چار سال کے قلیل عرصہ میں تعمیر کرائے۔

بیدر میں سلطنت کرتے ہوئے چند سال گزرے تھے کہ امساک باراں سے سخت قحط پڑا نہریں اور باؤلیاں خشک ہو گئیں انسان و حیوان مرنے لگے۔ سلطان نے خزانہ کا منہ کھول دیا۔ اور غلہ کے شاہی ذخائر غرباء و مساکین میں لٹا دئے۔ جب ایک سال اس طرح گذرا اور دوسرے سال بھی بارش نہ ہوئی سلطان نے علماء، مشائخ اور زہاد کو ساتھ لے کر نماز استسقا ادا کی لیکن جب یہ بھی بے سود ہوا تو سلطان

بہ نفسِ نفیس صحرا کی طرف تشریف لے گئے اور تنہا بلندی پر چڑھ کر چند دوگانے ادا کئے۔ دعا مقبول ہوئی اور اس قدر مینھ برسنے لگا کہ لوگ خوش ہوگئے اور اُسی دن سے سلطان "احمد شاہ" ولی کے لقب سے مشہور ہوگئے۔

سلطان کو قواعدِ لشکرکشی اور آئینِ فرمانروائی میں کافی مہارت تھی۔ وہ ہر کام میں بھائی کی پیروی کرتے سادات علماء اور مشائخ کی تعظیم و تکریم کرتے۔ فقیروں اور درویشوں سے بہت عقیدت رکھتے۔ صوم و صلوٰۃ کے اتنے پابند کہ کبھی تہجد اور اشراق تک قضا نہیں ہونے دی اور کل مہامِ سلطنت بذاتِ خود انجام دیتے۔ غریب سے غریب رعایا کی فریاد سنتے اور انصاف فرماتے اور گاہے گاہے مثل ہارون رشید خلیفۂ بغداد کے بھیس بدل کر رعایا کے حالات دریافت کرتے۔ کبھی مسجدوں اور مدرسوں میں جاکر وہاں کے حالات دیکھتے اور کبھی دفاتر میں جاکر ملک کے نظم و نسق کو ملاحظہ فرماکر اصلاحیں جاری فرماتے۔ غرض آپ نے اخلاقِ حسنہ سے خاص عام کو مطیع و فرمانبردار بنالیا تھا۔

جن دنوں میں سلطان جنگ میں مصروف تھے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ نے رحلت فرمائی۔ جس کا سلطان کو بہت صدمہ ہوا۔ ایک روز بھرے دربار میں اپنے صاحبزادوں کو طلب کیا اور سب کی طرف مخاطب ہوکر بولے۔ جب مالک اپنے بندہ کو اپنے پاس بلائے تو کیا کرنا چاہیئے۔ مجمع نے جواب دیا کہ اپنے مالک کا حکم بجالانا چاہیئے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ جناب الٰہی مجھے طلب فرماتے ہیں اور حضرت پیرو مرشد بندہ نواز گیسو دراز کی یاد ستارہی ہے۔ اب باغِ عالم کی سیر سے دل کو سیر ہوگیا۔ یہ کہہ کر آپ نے ملک کے مختلف علاقوں پر فرزندوں کو حاکم مقرر فرمایا۔ چنانچہ ولایت رام نگر، مدھول، کلم، برار اور ولایت ماہلور کا شاہزادہ محمود خاں کو حاکم مقرر کیا۔ شاہزادہ داؤد خاں کو رائچور اور تلنگانہ کا اور ولیعہد علاء الدین کو اپنی جگہ بادشاہی دی اور چھوٹے شہزادہ محمد خاں کو بڑے بھائی کا شریک شاہی کیا اور عدم مخالفت کے بارہ میں چاروں سے قسم لی اور ضروری وصیت اور سب کو اتفاق کی ہدایت کرکے دربار برخاست اور پھر یادِ حق میں ایسے مشغول ہوئے کہ عین حالتِ عبادت میں ۲۹ ذیحجہ ۸۳۹ھ کو بوقت شب واصل بحق ہوئے۔ سلطان کا گنبد بیدر سے ایک کوس کے فاصلے پر موضع اشٹور کے میدان میں زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

محمد ظہیر الدین

پرانا پُل

(حیدرآباد)

لرزتی نگاہوں کا فرمان ہے تو
دھڑکتے ہوئے دل کا احسان ہے تو
ثباتِ تمنا کی پہچان ہے تو
رُکا جس سے طوفاں وہ طوفان ہے تُو

(۲)

گلستانِ چیلم کی رنگیں کہانی
قطب شاہ کے دل کی کافر جوانی
غرورِ محبت کی زندہ نشانی
ضیائے چراغِ شبستان ہے تُو

(۳)

پڑی "بھاگ نگری" کی بنیاد تجھ سے
ہوا دشتِ ویران آباد تجھ سے
بنا تجھ سے، ہاں حیدرآباد تجھ سے
مری داستانوں کا عنوان ہے تُو

(۴)

وہ دن جا چکے، وہ زمانہ نہیں ہے
وہ زلفیں نہیں ہیں وہ شانہ نہیں ہے
مگر یہ حقیقت، فسانہ نہیں ہے
کہ سچی محبت کا پیمان ہے تُو

میکشؔ

بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت

سلطنت بہمنیہ کے زوال کے بعد دکن میں جو پانچ اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں ان میں دو بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومتیں سیاسی، درتمدنی حیثیت سے نہ صرف دوسری ریاستوں سے بہت زیادہ ممتاز تھیں نہ صرف حدود اراضی کی وسعت بلکہ فوجی قوت میں یہ دوسری دکنی ریاستوں سے بڑھی ہوئی تھیں بلکہ ہندوستان کی دوسری متعدد حکومتوں سے زیادہ پائدار اور برتر تھیں۔ ان کی عالیشان عمارتیں اور تہذیب و تمدن کے دوسرے آثار آج بھی ان کی عظمت اور اہمیت کو یاد دلاتے ہیں۔ بیجاپور کا بول گنبد، ابراہیم روضہ اور سیکڑوں خوش نما مسجدیں، گولکنڈے کا عظیم الشان قلعہ، بادشاہوں کے گنبد، حیدرآباد کا چارمینار اور مکہ مسجد ان دونوں خاندان کی وہ زبردست یادگاریں ہیں جو آج بھی سیاحوں کو اپنی طرف کشاں کشاں لے آتے ہیں۔ اگرچہ آخری دور میں ان ریاستوں میں بہت سی کمزوریاں پیدا ہوگئی تھیں اور یہ مغلوں کی باج گزار بھی بن گئی تھیں اورنگ زیب عالم گیر نے سلطنت مغلیہ کو کشمیر سے لے کر راس کماری تک وسیع کرنے کے جوش میں ان کا خاتمہ کر کے خود اپنی سلطنت کو ہمیشہ کے لئے کمزور اور زوال پذیر کر دیا۔

سب سے پہلے عادل شاہی ریاست ہی اس کی جوع الارض کا شکار بنی اور یوسف عادل شاہ نے ۸۹۵ھ میں جس ایوانِ حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی وہ دو سو سال قائم رہ کر منہدم ہو گیا۔ یوسف اصل میں ترکی شہزادہ اور سلطان مراد کا دوسرا بیٹا تھا شیر خوارگی کے زمانے میں باپ کے انتقال اور بھائی کی تخت نشینی کے بعد اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس لئے ماں نے بڑی دانش مندی اور چالاکی سے اس کو موت کے منہ سے چھڑا کر خواجہ عمادالدین گرجانی نامی تاجر کے ساتھ راتوں رات قسطنطنیہ سے باہر بھیج دیا سوداگر مذکور یوسف کو لے کر ایران پہنچا اور یہاں شہر ساوہ میں سکونت اختیار کی، یوسف کا ابتدائی زمانہ ایران میں ہی گزرا اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ جب جوان ہوا تو خواجہ عماد کے ساتھ بطریق تجارت و سیاحت ۸۶۴ھ میں ہندوستان میں داخل ہوا۔

ان دنوں ہندوستان میں بہمنیہ سلطنت اپنے پورے عروج پر تھی۔ سلطان محمد بہمنی کا دربار خود اس کی الوالعزمی اور عالی حوصلگی اور اس کے وزیر خواجہ جہاں خواجہ محمود گاواں کے تدبر اور حسن انتظام کی وجہ سے مرجع خلائق بنا ہوا تھا۔ یوسف بھی ہندوستان آیا تو سیدھے خواجہ محمود گاواں کے ہاں باریاب ہوا، خواجہ جہاں نے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا جہاں اس کی قابلیت کے جوہر کی آزمائش کے بعد اس کو شاہی چیلوں یا مقربین خاص کے زمرے میں شریک کر لیا گیا۔ سلطان محمود بہمنی کے دربار میں یوسف نے اپنی علمی اور فوجی قابلیتوں کے متعدد ثبوت دئے اور ہر قسم کے انعامات اور اعزازات سے سرفراز ہوتا گیا۔ یوسف عادل خاں اور ملک الشرق کے خطابات بھی پائے اور کئی سیر حاصل پرگنے بھی جاگیر کے طور پر ملے۔ مختلف موقعوں پر میدان جنگ کی سرکردگی اور فوجوں کی سپہ سالاری کے فرائض انجام دینے کے علاوہ پہلے بیدر کا عامل اور بالآخر سلطنت کے بہت بڑے صوبہ بیجاپور کا طرف دار یعنی گورنر مقرر ہوا۔

سلطان محمود اور اس کے وزیر خواجہ جہاں دونوں کی موت سے سلطنت بہمنیہ روز بروز کمزور ہوتی گئی۔ بریدی امیر نے بادشاہ کو

سلاطین بیجاپور

اپنے ہاتھ میں کٹھ پتلی بناکر خود حکومت شروع کردی اور سلطنت بہمنیہ تباہی کے قریب ہوگئی تو یوسف نے احمد نظام الملک طرف دار احمدنگر کی تحریک سے دوسرے صوبہ داروں کی طرح اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اور ۸۹۵ھ یا ۸۹۶ھ میں عادل خاں کی بجائے عادل شاہ کا لقب اختیار کرکے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کیا۔

یوسف عادل شاہ

خودمختار ہوتے ہی یوسف عادل شاہ اپنی ریاست کے اندرونی و بیرونی استحکام میں ہمہ تن مصروف ہوگیا۔ قاسم برید نے تیم راج مہاراجہ بیجانگر اور بہادر گیلانی کو اس کے خلاف اکسایا۔ اولاً عادل شاہ کے دو تین زرخیز علاقوں پر دشمنوں کا قبضہ ہوگیا لیکن بالآخر اس نے کئی معرکوں میں دشمنوں کا مقابلہ کرکے ان سے نہ صرف اپنے علاقے واپس لے لیے بلکہ ایک مدت کے لئے ان کو خاموش کردیا بیرونی استحکام سے فراغت پاکر جب وہ اندرونی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا تو اس سلسلے میں بھی بڑی مشکلات کا سامنا ہوا وہ نہ صرف شیعہ عقائد کی طرف مائل ہوگیا تھا بلکہ اپنی ریاست پر شیعیت کو سرکاری مذہب کی طرح رائج کرنے پر مصر بھی تھا۔ اس کے تمام امرا اور خاص و عام سب سنّی تھے۔ بادشاہ کے اس ارادے اور راج ہٹ نے بڑی زبردست اندرونی فساد اور ایک بیرونی جنگی طوفان کی صورت اختیار کرلی ۹۰۹ھ میں کہ جو بہمنی بادشاہ محمود شاہ اس کا مشیر اور نائب السلطنت قاسم برید جو عملاً بیدر کا بادشاہ تھا، احمد نظام شاہ والی احمدنگر اور قلی قطب شاہ فرماں روائے گولکنڈہ چاروں متحدہ طور پر بیجاپور پر حملہ آور ہوئے اور یوسف عادل شاہ کو سوائے وہاں سے بھاگ جانے کے اور کوئی چارہ نہ رہا۔ وہ بھاگ کر خاندیس میں عماد الملک کے پاس پناہ گزین ہوا۔ یہاں اس نے اپنے خیالات سے دست برداری کی قسم کھائی اور عماد الملک نے بیچ میں پڑ کر حملہ آوروں سے معذرت کی اور ان کے لشکر واپس کرائے۔ یوسف کی خوش قسمتی تھی کہ ریاست دوبارہ مل گئی اور ایک زبردست فتنہ ختم ہوگیا اگرچہ یوسف نے شیعہ عقائد کی ترویج نہ کرنے کی قسم کھائی تھی لیکن وہ ارادے سے باز نہ آیا اور جب دوبارہ اپنے تخت پر متمکن ہوگیا تو اس نے زیادہ اہتمام اور ہوشیاری کے ساتھ بالآخر شیعیت اختیار کی اور بعد کو اس نے خاندان اور ریاست کا سرکاری مذہب اثنا عشری ہی قرار دیا۔

یوسف نے کم و بیش بائیس سال حکومت کی اور ۷۵ سال کی عمر میں ۹۱۶ھ میں وفات پائی اور حسب وصیت اس کی جاگیر جو بہمنی بادشاہ کی عطا کی ہوئی تھی، قصبہ کوئی (نصرت آباد) میں حضرت شاہ چندہ حسینی کے پائین دفن کیا گیا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے بیٹے اسماعیل کو اپنا جانشین کرکے مسند نشینی کے رسوم ادا کردئے تھے۔ اسماعیل کے علاوہ اس کی اولاد میں تین لڑکیاں، مریم سلطان، خدیجہ سلطان اور بی بی ستی تھیں۔ یہ سب اور اسماعیل اس کی بیوی پونجی خاتون کی اولاد تھیں جو ایک دکنی خاتون تھی۔ مریم سلطان برہان نظام شاہ کو، خدیجہ سلطان علاء الدین عماد الملک اور بی بی ستی احمد شاہ بہمنی سے بیاہی گئیں یوسف ملک گیری اور ملک داری کے علاوہ اعلیٰ علمی لیاقت سے بہرہ ور متصف تھا وہ فارسی کا اچھا شاعر اور خط نستعلیق کا عمدہ خوش نویس تھا۔ فن موسیقی کا بھی شایق اور طنبورا اور عود بجانے میں مہارت رکھتا تھا اس کی علم دوستی کی

وجہ ہے بہت سے لایق اور قابل افراد اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے ۔ اس کو تعمیر عمارات کا کوئی زیادہ موقع نہیں ملا۔ بریں ہم اس کے عہد کی بعض عمارتیں ہیں مگر بہت شکستہ حالت میں ۔ وہ عام طور پر عدل و انصاف میں کافی شہرت رکھتا تھا اور اپنی شجاعت کی طرح سخاوت میں دور دور مشہور تھا ۔

اسماعیل عادل شاہ ۱۵۱۰ء - ۱۵۳۴ء

یوسف عادل شاہ نے اپنی زندگی سے مایوس ہو کر اپنے سامنے ہی اپنے اکلوتے بیٹے اسماعیل کو مسند نشین کر دیا تھا اور انصرام امور سلطنت کے لئے کمال خاں دکھنی کو وزیر اعظم کے علاوہ کمسن بادشاہ کا متولی (ایجنٹ) بھی قرار دے دیا تھا اس وقت اسماعیل کی عمر بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ کمال خاں جو داراب جرد ی کے نام سے بھی موسوم ہے پونجی خاتون کے مشورہ اور ہدایت سے ریاست کے کاروبار تن دہی اور ہوشیاری سے انجام دیتے لگا ہمسایہ ریاستوں کے ساتھ تعلقات میں جو کشیدگی چلی آرہی تھی اس کو اپنے حسن تدبیر سے بہت جلد دور کر دیا اور گوا بندرگاہ کے پرتگالیوں سے جن کی سرکوبی یوسف عادل شاہ نے بھی کی تھی مصلحت وقت کے تحت صلح کر لی اور اطمینان کے ساتھ ریاست کی اندرونی اصلاحات کی طرف متوجہ ہوا لیکن چند سال فراغت اور اطمینان سے حکمرانی کرنے کے بعد اکثر متولیان ریاست کی طرح اس کی نیت بدل گئی اور اس بادشاہ کی کم سنی اور خارجی سیاسی حالات کے مدنظر خود بادشاہ بن بیٹھنے کی ٹھان لی اس کی حرکات سے پونجی خاتون اور دیگر شاہ پرست افراد بے خبر نہیں تھے مگر اس کے غیر معمولی اثر و اقتدار اور جالالیوں کے آگے ان کی ایک نہیں چلتی تھی ۔ بادشاہ محل میں قیدی کی طرح تھا اور کمال خاں کے آدمی اس کی ذرا ذرا سی نقل و حرکت پر نظر رکھتے تھے ۔

باوجود اس سخت انتظام کے پونجی خاتون نے ایک تدبیر ایسی نکالی کہ اس کا کانٹا ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔ پونجی خاتون نے اسماعیل نامی ایک غلام کے ذریعے بڑی ہوشیاری سے کمال خاں کا کام تمام کر دیا اور پھر اس کے بیٹے صفدر خاں کی لشکر کشی پر بڑی مردانہ ہمت سے اس کا مقابلہ کر کے بالآخر اس کو بھی ختم کیا اور اسماعیل کو خود سر متولی کے پنجے سے ہمیشہ کے لئے رہائی دلائی ۔ اسماعیل نے خود مختار ہو کر دکھنیوں اور حبشیوں کو خدمات سے الگ کر کے مغلوں کو ان کی جگہ مامور کیا ۔ خسرو آغا لاری کو جو اس کا طرف دار تھا اور کمال خاں کے مقابلہ پر بڑی ساتھ داری کی تھی اسد خاں لاری کے خطاب سے سرفراز کر کے اپنی علاقے بھی لبطور جاگیر عطا کئے اور مہمات سلطنت میں اس کو مشیر اور وزیر بنایا ۔

اسماعیل کی زندگی کا بڑا حصہ جنگ میں گزرا ۔ اس کے عہد میں متعدد جنگیں ہوئیں ۔ سب سے پہلے قاسم برید سے جنگ چھڑی ۔ قاسم برید نے برہان نظام شاہ، قلی قطب شاہ اور علاء الدین عماد الملک کی مدد سے بیجاپور پر چڑھائی کر دی۔ مگر اسماعیل نے ان چاروں سے مقابلہ کیا اور شکست دی ۔ سب کی فوجیں تتر بتر ہو گئیں سلطان محمود شاہ بہمنی اور اس کا بیٹا احمد شاہ جو برید کی لشکر کے ہمراہ تھے، اسماعیل کے ہاتھ گرفتار ہو گئے ۔ اسماعیل نے ان دونوں کو بہت احترام اور خاطر تواضع سے مہمان رکھا اور پھر اپنی بہن ستی بی بی کی شادی احمد شاہ سے بہت اہتمام کے ساتھ بمقام گلبرگہ انجام دے کر دونوں کو بیدر واپس کیا ۔

اسماعیل کے عہد کی دوسری جنگ راجائے بیجانگر سے ہوئی ۔ بیجانگر کے راجہ نے اپنی سرحد کے استحکام کے لئے رائچور اور مدگل کے قلعے اور ان کے آس پاس کے علاقے کو فتح کرنے کے لئے ایک بڑے جرار لشکر سے ۱۵۲۰ء میں بڑی معرکۃ الآرا جنگ کی ۔ اسماعیل اور اس کے سپہ سالاروں نے بڑی مردانگی سے مقابلہ کیا مگر بدقسمتی سے شکست اٹھائی اس جنگ میں ناکامی سے اسماعیل کی طاقت اور شہرت کو بہت دھکا لگا اور وہ

عرصہ دراز تک بیجانگر والوں سے جنگ آزمانہ ہوا بہت دنوں کے بعد رائچور کو دوبارہ فتح کیا اس زمانے میں اس نے اپنی طاقت بڑھانے کے لئے دوسرے ہمسایہ بادشاہوں سے تعلقات مضبوط کرنے کی کوشش شروع کی۔ ۹۳۰ھ میں اسد خاں کی توجہ سے برہان نظام شاہ اور مریم سلطان ہمشیرہ اسماعیل کی شادی ہوگئی مگر یہ شادی بجائے تعلقات کو بہتر بنانے کے دشمنی و عداوت میں اضافے کا موجب بنی۔ شادی کے وقت طے ہوا تھا کہ قلعہ شولاپور جہیز میں دیا جائے گا مگر بعد کو اسماعیل نے انکار کیا نظام شاہ نے بہ زور شمشیر فتح کرنے کی ٹھان لی اور بہ مرتبہ زبردست معرکہ آرائی ہوئی مگر ہر وقت نظام شاہ کو شکست ہوئی۔ آخر تک یہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن بنے رہے۔

اسد خاں نے اتحاد بڑھنے کے سلسلہ میں اسماعیل کی دوسری بہن خدیجہ سلطان کی شادی علاء الدین عماد الملک بادشاہ برار سے طے کرادی اس کے کچھ دن بعد ہی قاسم برید نے جو اس عرصے میں کسی قدر طاقتور ہوگیا، اسماعیل سے جنگ کی طرح ڈالی اس کو قلی قطب شاہ اور والی بیجانگر کی تائید بھی حاصل تھی، اسماعیل اس کی دراز دستیوں سے تنگ آکر دس ہزار سپاہ کا لشکر لئے ہوئے اس پر حملہ آور ہوا اور بری طرح اس کو شکست دے کر قلعہ بیدر پر قابض ہوگیا۔ قاسم برید قید ہوا اور بہت دنوں کے بعد اسماعیل کی مہربانی سے پھر اپنے علاقے پر حکمران بنا کر۔ وجہ دا اس نے سلوک کے اسماعیل کے ساتھ اس نے دوستی اور وفاداری نہیں کی۔

اسماعیل نے ان جھگڑوں سے فراغت پا کر کچھ دن اصلاح ملک میں صرف کئے تھے کہ موت کا پیغام آپہنچا اور ۱۵۳۴ء (۹۴۱ھ) میں حوالی سگر میں اس کا انتقال ہوگیا اور اپنے باپ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ اسماعیل نے کل (۲۴) سال حکومت کی وہ بڑا بہادر، دیانتدار واقع ہوا تھا۔ اس نے محض اپنی فیاضی سے قاسم برید کو پھر بیدر جیسا زرخیز علاقہ دوبارہ بخش دیا۔ بدقسمتی سے اس کا تمام تر زمانہ جنگ و جدل میں لڑا ملک کی اندرونی اصلاح کی طرف بھی خاطرخواہ توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس کی اولاد میں چار لڑکے ملو خاں، علو خاں، ابراہیم خاں، عبداللہ خاں باقی تھے، عقیدتاً وہ شیعہ تھا اور اس کے عہد میں کمال خاں کے زوال کے بعد سے مغلوں اور ایرانیوں کا عروج رہا۔ اس کو شاعری اور موسیقی سے بھی بہت دلچسپی تھی اور تاریخوں میں اس کے اشعار جستہ جستہ منقول ہیں۔

ابراہیم عادل شاہ اول ۱۵۳۴ء--۱۵۵۷ء

اسماعیل کی وفات پر اس کے حسب وصیت اسد خاں غازی نے اس کے بڑے بیٹے ملو خاں کو تخت نشین کیا اور اس کی نظامی بد اطواری کے مدنظر خود کنارہ کش ہوکر اپنی جاگیر بلگام چلا گیا۔ چھ مہینے کے اندر ملو خاں نے اپنی نالائقی سے ساری رعایا کو اپنے سے متنفر کر دیا آخرکار اس کی دادی بونجی خاتون کے ایما سے وہ تخت سے الگ کیا گیا اور ابراہیم خاں "ابراہیم عادل شاہ" کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

ابراہیم کی تخت نشینی کے ساتھ ہی اسد خاں کو بونجی خاتون کے حکم سے پھر کاروبار سیاست میں حصہ لینا پڑا ابراہیم خود بھی بہت بہادر اور تیز فہم نوجوان تھا۔ وہ اسد خاں کے مشورے سے کاروبار کرنے لگا۔ ابھی ایک سال نہیں گزرا تھا کہ والی بیجانگر سے لڑائی ہوئی مقابلہ بہت سخت تھا مگر اسد خاں کی تجربہ کاری کام آگئی اس نے ادھونی کے مقام پر بیجانگر کے لشکر کو شکست فاش دے کر ابراہیم کا سایہ بڑھا دیا۔ بادشاہ نے خوش ہوکر اسد خاں کے مراتب میں اور بھی اضافہ کیا مگر کچھ دنوں کے بعد سازشیوں نے بادشاہ کو اس سے بدظن کر دیا اور وہ کنارہ کش ہوکر پھر بلگام چلا گیا۔

بادشاہ اور سپہ سالار کی اس نااتفاقی سے فائدہ اٹھا کر برہان نظام شاہ حملہ آور ہوا۔ قلعہ شولاپور جس کے لئے وہ اسماعیل کے زمانے میں

تین مرتبہ ناکام کوشش کر چکا تھا فتح کر لیا اور بیجاپور کی طرف پیش قدمی کرنے لگا۔ اسد خاں کی وفاداری اس کو کسی طرح روا نہیں رکھ سکتی تھی وہ پھر ابراہیم سے آملا اور عماد الملک والی برار کی امداد سے نہ صرف قلعہ شولاپور واپس لے لیا بلکہ برہان نظام شاہ کو بیڑ تک مار بھگایا۔

نوجوان ابراہیم سے شکست کھا کر برہان نے پہلے سے زیادہ تیاریاں کیں اور رام راج والی بیجانگر، جمشید قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ اور علی برید تینوں کو اپنے ساتھ ملا کر پھر ۱۵۴۶ء میں چڑھائی کی۔ اس موقع پر اسد خاں کی حسن تدبیر سے رام راج ان سے الگ کر دیا گیا اور شولاپور کا قلعہ جو اصل میں سارے جھگڑے کا باعث تھا بغیر لڑائی کے نظام شاہ کے حوالے کر دیا گیا اور اسد خاں نے ان دونوں کا تصفیہ کرنے کے بعد جمشید قلی قطب شاہ کا مقابلہ کیا اور اس کو بے طرح شکست دی۔ باوجود اس حکمت عملی اور حسن تدبیر کے لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ برہان نظام شاہ اور والی بیجانگر اور برہان کے جانشین حسین نظام شاہ نے ابراہیم سے کئی مرتبہ لڑائیاں کیں اور بہت کچھ خوں ریزی ہوئی مگر آخر کار ابراہیم ہی کامیاب رہا۔ ان لڑائیوں کے دوران میں اسد خاں سے وقتاً فوقتاً ابراہیم کو بڑی مدد ملتی رہی مگر اس کے مخالف ہمیشہ بادشاہ کو اس کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے بالآخر کچھ تو بیماری کی وجہ سے اور کچھ بادشاہ کی ناراضی دیکھ کر اسد خاں بلگام میں گوشہ نشین ہو گیا۔ اسد خاں کے بعد احمد نگر کا سپہ سالار جو عین الملک کے خطاب سے مفتخر ہو کر ابراہیم کا ملازم ہو گیا تھا اس کے لشکر کی سپہ سالاری کرتا رہا مگر وہ بہت جلد باغی ہو گیا۔

ابراہیم اگرچہ بڑا بہادر سپاہی اور اہل سیف کا بہت قدردان تھا مگر اس کی سختی کی وجہ سے بہت سے لوگ ہمیشہ اس سے ڈرتے رہتے تھے اسی خوف نے دشمنی کی شکل اختیار کی اور سلسلہ یہاں تک بڑھا کہ اس کو معزول کرنے اور اس کے بھائی عبداللہ کو بادشاہ بنانے کی سازش ہونے لگی۔ سازش کا راز فاش ہوتے ہی عبداللہ بھاگ کر گوا میں پرتگالیوں کے ہاں پناہ گزین ہوا۔ اور چند روز کے لئے ان کی حمایت سے اپنی بادشاہی کا اعلان بھی کرا لیا مگر ابراہیم کی زبردست فوجی قوت اور اس کے لشکریوں کی وفاداری سے عبداللہ کو کبھی اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ پرتگالی بھی اس قضیے میں پھنس کر نفع کی بجائے ہمیشہ فوجی نقصان برداشت کرتے رہے۔

ابراہیم اپنے باپ کی طرح علم دوست بھی تھا اور میدان جنگ میں اس کی شجاعت و بہادری ہمیشہ لائق ستائش رہی مگر تند خو اور ہٹیلہ بھی بہت زیادہ تھا۔ اپنی علالت کے زمانے میں جس کا سلسلہ تقریباً دو سال رہا جلد صحت یاب نہ ہونے پر بگڑ کر کئی طبیبوں کو قتل کر ڈالا اور بعض کو ملک بدر کر دیا۔ وہ اپنی اولاد کے ساتھ بھی سختی کرنے سے باز نہیں رہتا تھا۔ اس کا دوسرا فرزند علی بڑے بھائی کے مقابلے میں جو ولی عہد تھا بہت ذہین تھا اس نے کمسن شہزادے کو اپنے ولی عہد کے حق میں مضر سمجھ کر نہایت بے دردی سے کم عمری میں ہی قلعہ مرج میں قید کر دیا تھا۔

ابراہیم نے کم و بیش (۴۲) سال حکومت کر کے ۱۵۵۷ء (۹۶۵ھ) میں وفات پائی اور اپنے باپ دادا کے پہلو میں بمقام نصرت آباد (گوگی) دفن کیا گیا۔ اس کے کل چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ بڑا اسماعیل ولی عہد مگر بہت غبی اور کودن تھا۔ منجھلا علی بہت زیرک تھا اور وہی باپ کے بعد اس کا جانشین ہوا۔ دوسرے دو لڑکوں کے نام طہماسپ اور احمد تھے۔ لڑکیوں میں ایک تانی بی بی علی برید سے بیاہی گئی تھی اور دوسری جس کا نام ہدیہ سلطان بتایا جاتا ہے مرتضیٰ نظام شاہ بحری سے منسوب تھی۔

اگرچہ ابراہیم کا زمانہ زیادہ تر لڑائیوں میں گزرا لیکن اس نے اس پر بھی بہت سے کام اصلاح و ترقی ملک کے لئے کئے۔ ۹۴۳ھ میں ابراہیم پور کے نام سے ایک شہر آباد کیا اور وہاں ایک عالی شان مسجد بنائی ۹۳۵ھ میں سولہ کھمبی محل تعمیر کرایا۔ نیز غالب مسجد جس میں صرف روشنی کے لئے ۳۰۳ طاقچے تھے اور جامع مسجد جو درگاہ حضرت جعفر سقاف سے متصل ہے اسی کی بنائی ہوئی ہیں ان کے علاوہ اس کے عہد میں بیجاپور اور رائچور کے قلعوں کی فصیلوں کی درستی اور استحکام کا کام بھی انجام پایا۔

علی عادل شاہ اوّل ۱۵۵۷ - ۱۵۸۰ء

شہزادہ علی کو قلعہ مرج میں قید کر دیا گیا تھا گو قید میں بھی اس کی تعلیم و تربیت بہت ہی اعلیٰ درجے کی ہوئی تھی اور وہ اپنے سب بھائیوں سے زیادہ لائق تھا۔ باپ کے عقائد کے خلاف وہ شیعہ عقائد کی طرف مائل تھا اور اس کے اتالیق، رفیق اور نگران بھی بہت ہوشیار اور ابراہیم کی موت کے منتظر تھے انھوں نے ابراہیم کے مرنے سے پہلے ہی اس کی بادشاہت کے منصوبے پورے کر لیے۔ ادھر ابراہیم فوت ہوا اور ادھر علی کی بادشاہی کا اعلان دبیل قلعہ مرج سے کر دیا گیا۔ چند ہی روز میں بیجاپور علی نے اپنے دوسرے بھائیوں کو جو باپ کے مرتے ہی قید ہو گئے تھے اندھا اور ناکارہ کر دیا اور بے کھٹکے بادشاہت کرنے لگا۔ اس کو چونکہ شیعہ عقائد میں سخت غلو تھا اس لئے اس نے اہل ایران کی لعنت سے بیجاپور میں جمع لیا اور شیعہ عقاید کی ترویج میں بہت شدت دکھائی لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی فیاضی اور داد و دہش اس قدر زیادہ تھی کہ مذہب کے معاملے میں اس کی سختی بر غالب آگئی اگرچہ سنی مسلمان اس کی حرکات اور خصوصاً صحابہ کی شان میں سخت ناراض تھے لیکن اس کے احسان عام نے "مذہبی جذبات" کو دبا دیا۔

اس کی تخت نشینی پر والی بیجانگر نے مبارک باد دی اور دوستی کی طرح ڈالی مگر اس کے برخلاف حسین نظام شاہ والی احمد نگر نے بدخلقی دکھائی اسی لئے بیجاپور اور بیجانگر کے تعلقات بہت بڑھ گئے دونوں ملکوں کے فرماں رواؤں نے حسین نظام شاہ سے ۹۶۷ھ میں مقابلہ کیا اور اس کو بہت نقصان پہنچایا۔ پھر اسی سال دونوں نے مل کر اس کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ اس دفعہ حسین نظام شاہ نے ابراہیم قطب شاہ کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا مگر علی عادل شاہ نے ابراہیم کو اس سے الگ کر دیا اس دفعہ احمد نگر کی ریاست بری طرح برباد ہو گئی اور تینوں نے مل کر حسین نظام شاہ کو بہت ستایا ان دونوں جنگوں میں والی بیجانگر اور اس کے لشکر نے بیجاپور والوں کی احسان مندی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عام طور پر ... کی ... مسلمانوں کی سخت دل آزاری ہوئی ان کی مسجدیں توڑ دیں ... بدل دیں تب بیجاپور اور گولکنڈہ ... علانیہ ہی کے پردے میں چھین لئے، دولت اور مال غنیمت کی لعنت نے والی بیجانگر کو بے حد خود سر بنا دیا تھا جس کی وجہ سے علی عادل شاہ اور دوسرے فرماں رواؤں کو سخت خطرہ لاحق ہو گیا۔ اس اتفاقی موقع سے فائدہ اٹھا کر بیجانگر نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور ایک ایک کر کے ان اسلامی ریاستوں کو ختم کرنے کی تدبیریں ہونے لگیں۔ اور یہ موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے بیجاپور احمد نگر گولکنڈہ کے بادشاہ بھی اپنی آپس کی عداوتیں بھلا کر متحد ہو گئے اور ۹۷۲ھ میں سب نے مل کر تالی کوٹ کے میدان میں بیجانگر والوں سے فیصلہ کن مقابلہ کیا۔ میدان ... بیجانگر کا شہر تاراج ہو گیا اور اس کی سلطنت کو بھی ایسا دھکا پہنچا کہ وہ پھر پنپ نہ سکی۔

اگرچہ بیجانگر سے جنگ کرنے کیلئے اتحاد بڑے زور شور سے عمل میں آیا تھا اور حسین نظام شاہ کی بیٹی چاند بی بی کی شادی علی عادل شاہ سے اور علی عادل شاہ کی بہن کی شادی حسین نظام شاہ کے بیٹے مرتضیٰ نظام شاہ سے ہوئی تھی مگر باوجود ان سب باتوں کے ان ریاستوں میں پھر لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے اور علی عادل شاہ برابر آخر تک جنگوں میں گھرا رہا۔

علی عادل شاہ لاولد تھا اس لئے اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بھتیجے ابراہیم ابن طہماسپ کو ۹۸۸ھ میں اپنا ولی عہد قرار دے دیا تھا ابھی اس بات کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اگلے ہی سال یعنے ۹۸۸ھ م ۱۵۸۰ء میں علی عادل شاہ ایک خائن غلام کے ہاتھ قتل ہو گیا۔ اس کی مدت حکومت (۲۳) سال اور عمر ۴۴ سال تھی۔ اس کی وفات سے ریاست بیجاپور کو بہت نقصان پہنچا کیونکہ گو اس کا جانشین ابراہیم بعد کو بہت بڑا بادشاہ ثابت ہوا لیکن اس کی کمسنی کے زمانے میں منتظمین نے ریاست کو بہت کمزور کر دیا

علی عادل شاہ کو تعمیرِ عمارت کا بہت شوق تھا۔ اس کے عہد میں جو عمارتیں بنیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے خاص طور پر مشہور یہ ہیں۔ قلعہ شاہ درگ (نلدرگ) فصیل قصبہ شاہ پور، نہر کشور خانی، پریاں محل، آنند محل، گگن محل، باغ دوازدہ امام، باغ فدک، مسجد جامع، چاند باؤلی، قلعہ دھارور، قلعہ بیکا پور وغیرہ۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی ۔ ۱۵۸۰ ۔ ۱۶۲۷ء

جب علی عادل شاہ کے حسب وصیت ابراہیم ابن طہماسپ تخت نشین ہوا تو اس کی عمر صرف نو سال تھی۔ اس کی چچی چاند بی بی کے زیر ہدایت کامل خاں متولی اور مختار ریاست کی حیثیت سے کام کرنے لگا مگر بہت جلد وہ خود سر ہو گیا۔ اس کی جگہ چاند بی بی کے اشارے سے کشور خاں متولی ہوا گروہ بھی چند ہی دنوں میں حد درجے خود سر اور دشمن ملک و مالک ثابت ہوا اس نے تو خود چاند بی بی کو بے حرمتی سے محل سے نکال کر قید کر دیا۔ اس کے مارے جانے پر اخلاص خاں نے متولی کا عہدہ پایا۔ پھر دلاور خاں مختار کل بنا اور اسی کے زمانہ مختاری میں ابراہیم قطب شاہ کی بیٹی اور محمد قلی قطب شاہ کی بہن ملکہ جہاں سے جس کا عرف چاند سلطانہ ہو، ابراہیم عادل شاہ کی شادی ہوی۔

ان متولیوں کے زمانۂ اقتدار میں احمد نگر کے نظام شاہوں نے بیجا پور پر متعدد حملے کئے اور اس کو نقصان پہنچایا اس کے علاوہ متعدد مرتبہ کئی خانہ جنگی اور امرا اور متولیاں ریاست کے جھگڑوں سے بیجا پور کو باوجود خوش حالی کے بہت نقصان پہنچا۔ دلاور خاں کے زمانہ مختاری میں اسماعیل نے جو ابراہیم کا چھوٹا بھائی تھا کمزوری سلطنت کی اور سارے ملک میں ہل چل مچ گئی۔ دلاور خاں کی درپردہ شرارتوں کے باوجود ابراہیم کے اقبال سے اسماعیل کا قلع قمع ہو گیا مگر دلاور خاں بادشاہ کی نظروں میں بے طرح کھٹک گیا اب بادشاہ نے جو سن بلوغ کو پہنچ چکا تھا اور ہر طرح کاروبار ریاست سنبھال سکتا تھا، دلاور خاں کو معزول کرکے ۱۰۰۰ھ عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور بہت کروفر کے ساتھ بیجا پور میں داخل ہوا۔ اس نے چند بیرونی جھگڑوں سے الگ رہ کر اندرون ملک کی اصلاح و تعمیر شروع کی ۱۰۰۸ھ میں ایک نئے شہر نورس پور کو آباد کیا اور رفتہ رفتہ دیگر بہت سی عمارتیں بنائیں، شعرا و علما سے اپنے دربار کو آراستہ کیا، فن موسیقی کے بڑے بڑے ماہرین کو جمع کیا کیونکہ اس کو اس فن سے طبعی لگاؤ اور اس میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس کی کتاب نورس آج تک مشہور ہے۔

اس کے خود مختار ہونے سے کچھ دنوں قبل ہی چاند بی بی اپنے میکے چلی گئی اپنی آبائی ریاست احمد نگر کو جو ابراہیم نظام شاہ کی جوان مرگی کی وجہہ سے بے طرح خود غرض امرا کی تباہ کاریوں کا شکار بنی ہوئی تھی۔ سنبھالنے کی کوشش کی مغلوں نے اس پر پے در پے حملے کرکے اس کے اکثر حصوں کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ شہنشاہ اکبر کی فتوحات کا سلسلہ اور آگے بڑھا۔ اس نے ابراہیم عادل شاہ سے بھی خراج طلب کیا اور ابراہیم نے اس کے مقابلے میں اپنے کو کمزور پاکر خراج منظور کر لیا۔ اس کے بعد مغلوں کا زور اور بھی بڑھ گیا ابراہیم نے اکبر کے پیغام بھیجنے پر اپنی لڑکی سلطان بیگم کی شادی شہزادۂ دانیال سے کردی۔ اکبر کے بعد جہانگیر اور اس کے بیٹے شہزادہ خرم نے دکن کے کئی علاقوں پر جو عادل شاہی نظام شاہی اور قطب شاہی ریاستوں کی ملک تھے اپنا قبضہ جمایا۔ ابراہیم نے بیدر پر حملہ کرکے اس کو فتح کر لیا۔ ادھر ملک عنبر نے بیجا پور پر حملہ کیا اور ابراہیم کے آباد کئے ہوئے نورس پور کو ہمیشہ کے لئے تباہ و تاراج کر دیا اور خود بھی چند ہی روز میں فوت ہو گیا۔ ابراہیم کو اس کا بڑا رنج ہوا مگر ملک عنبر کے مرجانے کی وجہہ سے وہ اس سے بدلہ نہ لے سکا۔

ابراہیم نے پورے (۴۷) سال حکومت کی اور ۱۶۲۷ء (۱۰۳۷ھ) میں انتقال کیا۔ اس نے متولیوں کا دورِ دلالت ختم ہونے کے بعد

۱ سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی
(نورس)
۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ

سلطان محمد عادل شاہ
۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۷ھ

تیس سال تک یہ مدت تک جو خود مختارانہ حکومت کی وہ زمانہ زیادہ تر پُر امن رہا اور اس عرصے میں اس نے ریاست کی اندرونی اصلاح کے بہت سے کام کئے۔ اس کو تعمیر عمارات کا بہت شوق تھا، اس کے عہد میں کثرت سے عمارتیں بنی ہیں مثلاً آثار محل، انند محل، مسجد ملکۂ جہاں، نورس محل یا سنگت محل نورس پور کی عمارات وغیرہ ابراہیم روضہ اس کے عہد میں بہت سی اور بھی تمدنی ترقیاں ہوئیں اور نئی رسوم و تقاریب کا اضافہ ہوا جیسے عید نورس وغیرہ، اس کا مقبرہ جو ابراہیم روضہ کے نام سے مشہور تعمیری نقطۂ نظر سے ایک بہترین یادگار ہے اور اپنی گل کاریوں اور نقش و نگار کے اعتبار سے دکن کا تاج محل سمجھا جاتا ہے۔

اس کے کل چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں جو مختلف محلات کے بطن سے تھے۔ بڑا بیٹا درویش پادشاہ محمد قلی قطب شاہ کی بہن ملکۂ جہاں کے بطن سے تھا مگر ابراہیم اس کی ماں سے ناراض تھا علاوہ ازیں چھوٹا سلطان محمد اس کے مقابلے میں باپ کا منظور اور زیادہ لایق تھا اس لئے اس کو اپنا جانشین کیا۔

محمد عادل شاہ ۱۶۲۷ء - ۱۶۵۶ء

جس وقت سلطان محمد اپنے مرحوم باپ کے حسب وصیت تخت نشین ہوا اس کی عمر پندرہ سال کی تھی مرزا محمد امین لاری، دولت خاں آقا رضا اور دیانت املک امر مختلف عہدوں پر مامور کئے گئے وہی نوجوان بادشاہ کے مشیر اور مددگار تھے اگرچہ بادشاہ کم عمر تھا لیکن اپنی ذہانت طبعی سے فوراً توجہ کی اصلاح میں مصروف ہو گیا۔ چند ہی دن کے بعد نظام شاہی خاندان نے فرمان روائے چڑھائی کی ابھی زیادہ معرکہ آرائی نہیں ہوئی تھی کہ صلح ہو گئی مگر یہ دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ دوبارہ نظام شاہی فوج حملہ آور ہوئی اور بری طرح شکست کھائی۔ اس واقعہ کے بعد نظام شاہی ریاست روز بروز کمزور ہونے لگی امرا اور منصب دار خود غرض و خود سر بنتے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رہی سہی طاقت مغلوں کے پے در پے حملوں نے توڑ دی بہت سے علاقے محمد عادل شاہ کے قبضے میں آ گئے۔

شاہ جہاں نے جب یہ دیکھا کہ محمد عادل شاہ قوی سے قوی تر ہوتا جا رہا ہے تو اس نے نظام شاہی ریاست کے مفتوحہ علاقوں کی واپسی کی چلے سے چھیڑ چھاڑ شروع کی اور نہایت تلطیف دہ خط لکھے محمد عادل شاہ نے ان کا نرالی پر رکھی جواب دیا بعض امرا اور امرائے عادل شاہی کی ریشہ دوانیوں سے شاہ جہاں کو پیش قدمی کے اچھے موقعے مل گئے وہ بلا اجازت دولت آباد تک آ پہنچا۔ محمد عادل شاہ نے بیجاپور میں قلعہ بند ہو کر شہر کے اطراف میلوں تک وسیع میدان و بے آب و گیاہ بنا دیا۔ مغل فوج نے محاصرہ کر لینے کا ارادہ کیا مگر اس کی یہ تدبیر ناکامیاب رہی۔ مغلوں نے بیجاپور کا محاصرہ تو کیا مگر اس میں فتح نہ کر سکے اور مجبوراً صلح پر آمادہ ہو گئے۔ عادل شاہ نے بھی اس شرط پر صلح کر لی کہ رود کرشنا کے اس طرف کا تمام علاقہ شاہ جہاں کے قبضے میں رہے اور اس طرف کا سارا علاقہ بدستور بیجاپور کی ریاست میں شامل رہے نیز تاوان جنگ کے طور پر بیس لاکھ روپے شاہ جہاں کو ادا کئے جائیں۔

مغلوں سے پیچھا چھڑا کر محمد عادل شاہ نے کرناٹک کے سرکش عاملوں سے بھی لڑائیاں لیں اور بہت سے علاقے فتح کر کے اپنی ریاست کو وسیع اور مالا مال کیا اور اپنی ساری توجہ رعایا کی فلاح اور ملک کی اصلاح و ترقی کے کاموں میں صرف کی۔ اس دوران میں برابر شاہ جہاں کی طرف سے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی مگر یہ مقتضائے وقت اس نے جنگ نہیں کی بلکہ نگرانہ حالت تھی بادشاہ کے سب مخفی کام کرتا رہا۔ باوجود اس کے محمد عادل شاہ کے زمانے میں بیجاپور کی ریاست کو کافی وسعت ہوئی اور رعایا کی خوش حالی تو ایسی تھی کہ اگلے کسی بادشاہ کے

دور میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے ۔

محمد عادل شاہ نے فصیلوں اور برجوں کی مرمت کے علاوہ دادمحل، بیگم تالاب وغیرہ کئی عمارات اور متعدد مسجدیں بنائیں جن میں سب سے زیادہ مشہور خود اس کا گنبد ہے محمد عادل شاہ نے ۱۶۵۶ء میں (۳۰) سال سے زیادہ عرصے تک حکومت کرکے وفات پائی اور اپنے گنبد میں جو گول گنبد یا بول گنبد کے نام سے مشہور ہے، دفن ہوا، یہہ گنبد اس قدر بڑا ہے کہ ہندوستان بھر میں کوئی اور گنبد اس کے برابر نہیں ۔ اس کی یہہ خصوصیت مسلمہ اور مشہور ہے کہ ایک سرے میں کھڑے ہوکر خفیف سی خفیف آواز پیدا کی جائے تو دوسرے سرے پر برابر سنائی دیتی ہے اسی وجہہ سے اس کو بول گنبد کہتے ہیں سیکڑوں سیاح اس گنبد کو دیکھنے کے لئے بیجاپور آتے ہیں ۔ اس کے عہد میں علوم و فنون کی بہت ترقی ہوئی اور کئی بڑے بڑے شعراء علما اس کے دربار میں ملازم تھے ۔

علی عادل شاہ ثانی ۱۶۵۶ء ۔ ۱۶۷۲ء

علی عادل شاہ ثانی اپنے نامور باپ کا اکلوتا بیٹا تھا ۔ خوش قسمتی سے محمد عادل شاہ کی حرم خاص حاجی بڑی صاحبہ نے جو محمد قطب شاہ کی بیٹی تھی، خاص اہتمام سے اس کی پرورش اور تربیت کی اور علوم متداولہ اور فنون متعارفہ میں ہر طرح ماہر بنایا ۔ وہ (۱۹) سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور اپنی والدہ کی ہدایت اور خان محمد خاں وزیر ملک اور دیگر معتبر ارکان ریاست کے مشورے سے کاروبار ریاست انجام دینے لگا ۔

شاہ جہاں نے جو اپنی سلطنت کے حدود وسیع سے وسیع تر کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا اس بہانے کہ ریاست بیجاپور سلطنت تیموریہ کی باج گزار ہے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کی اور یہہ اعتراض اٹھایا کہ ہماری منظوری کے بغیر علی عادل شاہ کس طرح تخت نشین ہوسکتا ہے ۔ اس نے یہاں تک لکھ دیا کہ علی عادل شاہ صلبی فرزند نہیں متبنیٰ ہے اور اس لئے وارث تخت و تاج نہیں مگر علی عادل شاہ ثانی نے ان اعتراضات کے ترکی بہ ترکی جواب دئے جب مراسلت کا کوئی اثر نہیں ہوا تو اسی سال اورنگ زیب نے ایک بڑی فوج لے کر حملہ کیا اور بیدر اور کلیانی کے قلعے فتح کرکے اس کے بعد بیجاپور کا بھی محاصرہ کرلیا ۔ ابھی علی عادل شاہ ثانی کو تخت نشین ہوکر ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اس طرح زبردست دشمن سے مقابلہ آن پڑا ۔ بیجاپور کے امرا آپس کی ناراضیوں کی وجہہ سے خاطر خواہ متحد اور وفادار نہیں تھے ۔ محاصرہ روز بروز شدید ہو رہا تھا کہ شاہ جہاں کی علالت کی خبر پاکر خود اورنگ زیب محاصرہ اٹھاکر دہلی کو روانہ ہوا ۔ جس وقت مغلوں کا لشکر سرحد پار کر رہا تھا خان محمد وزیر مملکت سے جو سرحد پر مقابلے کے لئے متعین تھا، ملاقی ہوا، خان محمد نے اورنگ زیب کی عاجزانہ التجا اور اس چالبازانہ وعدے کی بنا پر کہ جب تک وہ وزیر مملکت ہے، بیجاپور کی طرف مغل کبھی پیش قدمی نہیں کریں گے، اورنگ زیب سے مزاحمت نہیں کی خان محمد کی یہہ حرکت جس کی قباحت کا خود اس کو یقین تھا، اس کی موت کا باعث ہوی ۔ اس کے قتل کے بعد ابراہیم خاں وزیر مملکت بنایا گیا ۔ اور سپہ سالاری کی خدمت افضل خاں کے سپرد ہوئی ۔

ابھی اس طرف سے سکون نہیں ہوا تھا کہ سیواجی نے جو محمد عادل شاہ کی علالت کے زمانے میں قلعہ جنیر پر قبضہ کرلیا تھا، مزید پیش قدمی کی اور کوکن اور اس کے پاس کے علاقوں میں لوٹ مار مچادی اور کئی قلعوں پر قبضہ کرلیا اس کی سرکوبی کے لئے افضل خاں کی سرکردگی میں ۱۶۵۹ء میں فوج روانہ کرنی پڑی مگر سیواجی نے افضل خاں کو دھوکا دے کر تنہائی میں قتل کرڈالا اور پھر اس کی فوج کو پیچھے سے حملہ کرکے اچانک

سلطان سکندر عادل شاہ
۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۷

سلطان علی عادل شاہ ثانی
(شاہی)
۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ

زبردست شکست دی ۔ افضل خاں مارا گیا ۔ اس کے بعد سدی جوہر کو جو اپنی باغیانہ سرکشی سے توبہ کرکے حاضر ہو گیا تھا صلابت خاں کا خطاب دے
ایک بڑے لشکر کے ساتھ روانہ کیا گیا مگر یہ سیواجی کی باتوں میں آگیا اور اس کے ساتھ سازش کرکے قلعہ پنالہ جو ایک نہایت مستحکم اور اہم قلعہ تھا
قبضہ کرکے اور علانیہ بغاوت شروع کردی ۔ اب خود بادشاہ خود لشکر لے کر مقابلے کے لئے نکلا اور ایک معرکے میں پنالہ فتح کرلیا ۔ سیواجی اور سدی جوہر
دونوں فرار ہو گئے ۔ چلتے ہوئے بادشاہ نے قلعہ ستو میں بھی جوہر کا مقابلہ کیا اور اس دفعہ بھی شکست دی ۔ جوہر زخمی ہوا مگر وہاں سے کسی طرح
بچ بچا کر قلعہ رنگو میں پناہ گزیں ہوا ۔ بادشاہ نے اس قلعہ کو بھی فتح کرلیا ۔ سدی جوہر بھاگتے اور شکست کھاتے ہوئے آخرکار سخت بیمار
ہو کر مر گیا ۔ بادشاہ تلنگانہ کے سرکش زمینداروں کو جو خراج ادا نہیں کر رہے تھے گوشمالی کرکے مظفر و منصور بیجاپور واپس ہوا اور
سیواجی نے مصلحت وقت دیکھ کر اس شرط پر ۱۰۷۲ھ میں صلح کرلی کہ کوکن اور اس کے قریب کا علاقہ سیواجی کے قبضے میں رہے اور وہ اس
سے آگے نہ بڑھے مگر موقع پاکر سیواجی نے پھر لوٹ مار شروع کردی اور شائستہ خاں مغل سردار سے مقابلہ کرکے اس کو قید کرلیا ۔

اورنگ زیب نے یہ خبر سن کر علی عادل شاہ ثانی سے اس کی سرکوبی میں مدد مانگی ۔ ادھر بیجاپور سے خواصی خاں کی سرکردگی میں
ایک لشکر روانہ کیا گیا جس نے سیواجی کو سخت شکست دی مگر عین وقت پر سیواجی نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اورنگ زیب کے سپہ سالار
جے سنگھ کو اپنا دوست بنالیا اور یہ وعدہ کرلیا کہ جتنے قلعوں کی کنجیاں جے سنگھ کو دے دیں کہ میں آپ کی مدد کرکے
عادل شاہی ریاست کا خاتمہ کر ڈالتا ہوں اور اس طرح یہ سارا ملک اورنگ زیب کی حکومت میں آجائے گا ۔ علی عادل شاہ ثانی کو اس
کی اطلاع ملنے پر جے سنگھ کا مقابلہ کرنا پڑا ۔ دونوں میں مقابلے ہوئے اور ہر دفعہ جے سنگھ نے شکست کھائی آخرکار ۱۰۷۶ھ میں دہلی
کو واپس بھاگا ۔ سیواجی جو اورنگ زیب کے دربار میں پہنچا اور جیسے وہاں سے فرار ہو کر دکن آیا اور وہی لوٹ مار شروع کردی ۔ کئی قلعے جو
مغلوں کے قبضے میں آگئے تھے سیواجی نے چھین لیے اور اپنی جگہ مستحکم ہو کر علی عادل شاہ ثانی کو ستانا شروع کیا ۔ ادھر جے سنگھ وغیرہ کے
ساتھ مسلسل جنگوں کی وجہ سے خزانہ خالی ہو گیا تھا اور سلطنت مغلیہ کا خراج ادا نہ ہونے سے مغلیہ لشکر بار بار چڑھائی کر بیٹھتا تھا
اس لئے علی عادل شاہ ثانی نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ اورنگ زیب اور سیواجی دونوں سے مصالحت کرلی جائے ۔

یہ صلح محض عارضی تھی اورنگ زیب اور سیواجی دونوں ریاست بیجاپور کو اپنے قبضہ و تصرف میں لانے کی آرزو دل میں لئے
ہوئے تھے ابھی اس صلح کو کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ یکایک علی عادل شاہ ثانی بدقسمتی سے فالج میں مبتلا ہو کر معذور و مجبور
ہو گیا ۔ حالات بگڑ رہے تھے ۔ امراء کے آپس میں عداوت پھیلی ہوئی تھی ۔ مصلحت وقت کے تحت اپنے کمسن بیٹے سکندر عادل شاہ
کو تخت نشین کرکے دارالسلطنت کے تمام خواصی خاں کے سپرد کئے اور خود پلنگ پر لیٹے لیٹے صلاح و مشورہ دینا مناسب سمجھا
مغلوں کی روک تھام کے لئے عبدالمحمد شاہ درگ (نل درگ) گلبرگہ اور سکر کے علاقے کا صوبہ دار بنایا اور عبدالکریم اور بہلول خاں
و مرج اور پنالہ کے قلعوں پر متعین کرکے سیواجی کی دراز دستیوں کا بندوبست کیا ۔ اسی حالت میں وہ ۱۰۸۳ھ (م ۱۶۷۲ء)
میں (۳۲) برس کی جوانی میں سولہ سال حکومت کرکے راہی ملک عدم ہوا ۔ اس نے مقابر میں اپنی زندگی میں ہی اپنے لئے ایک بہت ہی
عالیشان مقبرے کی تعمیر شروع کی تھی ابھی اس کی تعمیر مکمل نہیں ہوئی تھی ۔ اسی میں اس کو دفن کیا گیا ہے ۔ اس کی بیوی اور
کئی عزیز اور بھی دفن ہیں اور آج بھی یہ ناتمام مقبرہ اس کے عالی شان تعمیری حوصلوں کی ایک عبرت ناک تصویر پیش کر رہا ہے ۔

علی عادل شاہ ثانی بڑا بہادر اور شجیع تھا۔ اس نے کئی بڑے بڑے معرکے خود فتح کئے۔ اس کو شعر و شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ خود بھی شاعر تھا اس کے عہد میں اُردو زبان کو بہت ترقی ہوئی، وہ اردو شاعروں کا بڑا سرپرست تھا، ملا نصرتی جو علی نامہ اور دیگر مثنویوں کا مصنف ہے اسی کے دربار کا متوسل تھا اس کے عہد کی عمارات میں علاوہ نا تمام مقبرے کے چینی محل اور کئی مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ اس نے دو عظیم الشان محلات، علی محل اور عشق محل کے نام سے بنانے شروع کئے تھے مگر یہہ نا تمام رہ گئے یہہ عادل شاہی خاندان کا آخری با اقتدار بادشاہ تھا اس کے بعد اس کے کمسن بیٹے سکندر کو اورنگ زیب نے قید کر لیا اور بیجاپور کی ریاست کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

سکندر عادل شاہ - ۱۶۷۳ء - ۱۶۸۶ء

علی عادل شاہ ثانی کے انتقال پر خواص خاں نے باضابطہ طور پر پانچ سال کے کمسن شہزادے کو سکندر عادل شاہ کے نام سے تخت پر بٹھایا اور خود بطور متولی کے کاروبار ریاست انجام دینے لگا بادشاہ کی کمسنی امرا کی نا چاقی اور غداری سے فائدہ اٹھا کر ریاست کے دو ان دشمن مغل اور مرہٹے من مانے لوٹ مار اور جنگ و جدل کرنے لگے۔ سیواجی نے غیر معمولی طاقت حاصل کر لی پنالہ فتح کر لیا۔ مغلوں کا لشکر بھی حملہ آور ہوا۔ خواص خاں نے مغلوں سے سازش کر لی اور سکندر کی بہن شہربانو بیگم کی شادی شہزادہ محمد اعظم سے کر دے کر ایک بڑے پیشکش کے ساتھ اورنگ زیب سے صلح کر لی مگر یہہ صلح کبھی پائدار ثابت نہ ہوئی۔

خواص خاں، سدی مسعود خاں، بلول خاں، سید مخدوم، شرزہ خاں اپنی ناعاقبت اندیشی اور نمک حرامی سے کبھی اورنگ زیب سے مل جاتے اور کبھی مرہٹوں سے اسی طرح صلح و جنگ میں اپنی قوتیں صرف کرتے رہے۔ اسی عرصہ میں سیواجی فوت ہو گیا مگر اس کے بیٹے سنبھاجی اور دوسرے مرہٹہ سرداروں نے اپنی وہی روش جاری رکھی، وہ ادھر عادل شاہیوں کو تنگ کرتے وہ ادھر مغلوں کو الگ دق کرتے بالآخر اورنگ زیب نے بیجاپور کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا تہیہ کر کے اولاً ایک فرمان بھیجا جس میں متعدد سخت شرائط درج تھیں۔ سکندر عادل شاہ کے مشیروں نے اس کا جواب اس طرح مرتب کیا جس سے اورنگ زیب کی شرائط کی تکمیل نہیں ہوتی تھی۔ اورنگ زیب نے ایک بڑی فوج کے ساتھ ۱۰۹۷ھ (۱۶۸۶ء) میں بیجاپور پر چڑھائی کی اور شہر فتح کر کے سکندر کو قید کر لیا اور بیجاپور کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بدقسمت سکندر پانچ سال کی عمر میں بادشاہ ہوا، چودہ سال حکومت کی اور چودہ سال اورنگ زیب کی قید میں رہ کر بالآخر ۱۱۱۱ھ میں وفات پائی۔

سید محمد

بیجاپور کے سپہ سالار

افضل خاں

شرزہ خاں

عادل شاہی امراء

افضل خاں

افضل خاں بیجاپور کے مشہور سپہ سالاروں میں تھا۔ اس کا نام عبداللہ خاں تھا۔ سلطان محمد عادل شاہ کے زمانے میں آپ نے مہتم و معرکوں میں حصہ لیا اور ملک کی بڑی شائستہ خدمات انجام دیں جس پر اس کو افضل خاں کا خطاب عطا کیا گیا۔ سلطان محمد عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا نوجوان فرزند علی عادل شاہ ثانی تخت نشین ہوا تو اس کے مراتب و اعزاز میں اور اضافہ کیا گیا اور یہ نواب محمد خاں کے ساتھ ایک بڑے لشکر کا سپہ سالار بنا کر اورنگ زیب کے مقابلے کے لئے بھیجا گیا۔ اورنگ زیب اس عرصے میں بیدر اور کلیانی کے قلعے فتح کر چکا تھا اور بیجاپور کا محاصرہ کر لیا مگر شاہجہاں کی علالت کی خبر پا کر محاصرہ برخاست کر کے دہلی کا رخ لیا۔ جب وہ سرحد سے گزر رہا تھا تو خان محمد نے بطور خود اس کے لشکر کو چلے جانے کا موقع دیا اور اس طرح ایک بے نظیر موقع چھوڑ دیا۔ افضل خاں اس پر بہت ناراض ہوا۔ جب بادشاہ کو اس کی رپورٹ ملی تو خان محمد کو واپس طلب کیا مگر وہ رستے میں ہی اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔

خان محمد کے بعد افضل خاں ہی سب سے بڑا سپہ سالار تھا۔ بادشاہ نے اسے سیواجی کے مقابلے میں روانہ کیا جس نے کوکن کے علاقے میں سخت طوفان مچا رکھا تھا۔ تلجا پور اور پنڈھارپور سے گزر کر افضل خاں پرتاب گڑھ پہنچا۔ سیواجی نے اس کی آمد کی خبر سن کر اپنی فطری [illegible] سے مقابلے کے صلح و اطاعت کی تدبیر سوچی۔ افضل خاں کے سفیر کرشنا جی کے ساتھ اپنے سفیر گوپی ناتھ کو بھیجا کہ قول و قرار لیا کہ افضل خاں سے تنہائی میں مل کر معذرت کرنا اور اطاعت ختم کرنا چاہتا ہے۔ افضل خاں اس کے دھوکے میں آگیا اور جب تنہائی میں یہ دونوں ملے تو سیواجی نے اپنے چھپے ہوئے ہتھیار سے فوراً اس کا کام تمام کر دیا۔ افضل خاں کے قتل ہوتے ہی سیواجی کی فوج کے حوصلے بڑھ گئے اور عادل شاہی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ سیواجی نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ افضل جوش شجاعت میں اس کی چال کو نہ سمجھا اور اپنی جان گنوائی۔ سیواجی کے ایک ساتھی نے اس کا سر کاٹ لیا اور سیواجی کے پاس لے جا کر انعام پایا۔ علی عادل شاہ ثانی کو افضل خاں کی موت سے بڑا نقصان پہنچا اور سیواجی کی طاقت ہمیشہ کے لئے بڑھ گئی کیونکہ اس کے بعد علی عادل شاہ ثانی نے جن لوگوں کو سیواجی کے مقابلے کے لئے بھیجا وہ یا تو ناکام رہے یا سیواجی نے ان کو اپنے مکر و فریب سے ناکام کر دیا۔ بالآخر خود بادشاہ کو اس سے مقابلہ کر کے شکست دینی پڑی مگر یہ شکست بھی سیواجی کو ختم نہ کر سکی۔

شرزہ خاں

شرزہ خاں علی عادل شاہ ثانی کے ان نامور سپہ سالاروں میں تھا جنھوں نے اورنگ زیب اعظم کے بڑے لشکروں [illegible] سرداران مغلیہ سے بڑے معرکۃ الآرا مقابلے کئے اور ہمیشہ مظفر و منصور رہا۔ اس کا نام سید الیاس تھا اس نے [illegible] بیجاپور کے قریب جے سنگھ اور اس کے مددگار سردار سرفراز خاں اور صلابت خاں کو بڑی بڑی شکستیں دیں اور آخر کار مغلوں کو پیچھے ہٹنے اور میدان جنگ چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی موت عجیب و غریب طریقے پر واقع ہوئی۔ مغلوں کو شکست دے کر ابھی یہ واپس نہیں ہوا تھا۔ راستے میں [illegible] مغلوں کے اکے دکے حملے ہو رہے تھے۔ اتفاقاً ایک دن ایک معمولی سپاہی نے اس کے کمسن لڑکے کو زخمی کیا۔ بیٹے [illegible] کو اٹھا لیا اور آناً فاناً دشمن کو مار بھگایا۔ باپ بیٹے واپس ہو رہے تھے کہ یکایک گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ شرزہ خاں زمین پر آ رہا اور گرتے ہی فوت ہو گیا۔ جب لشکر میں اس کی مرگ مفاجات کی خبر پہنچی تو ایک کہرام مچ گیا۔ بادشاہ کو ناقابل بیان رنج ہوا [illegible] دونوں [illegible]

سلامی، وم وسید حبیب کو ان کے باپ کی شایستہ خدمات کے صلہ میں شتہ زدہ خاں خطابوں سے سرفراز کیا اور ملازم رکھ لیا۔

سید محمد

ہاشمی بیجاپوری

ہاشمی، علی عادل شاہ ثانی اور نصرتی کا ہم عصر تھا۔ شاہ ہاشم بیجاپوری کا مرید خاص تھا اسی مناسبت سے ہاشمی تخلص رکھا۔ شاہ ہاشم اور ملا ہاشمی دونوں کی تصویریں اس مضمون کے ساتھ شایع ہو رہی ہیں وہ مادر زاد اندھا تھا لیکن شاعری سے فطری لگاؤ رکھتا تھا۔ دکن میں ریختی زبان کی ایجاد کا سہرا ہاشمی کے سر ہے ایک دیوان ریختی کی غزلیات کا مرتب کیا اور ایک مثنوی یوسف زلیخا احسن القصص کے نام سے ۱۰۹۹ھ میں لکھی۔ ہاشمی کی زندگی کے حالات کسی تذکرے میں نہیں ملتے البتہ اس کے کلام سے اندرونی شہادتیں کچھ ملتی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ برہان پور کا باشندہ تھا بیجاپور کے ایک امیر ذوالفقار خاں کی شہرت سن کر وہاں آیا اور اپنے ممدوح سے قصائد کے بدلے میں گراں بہا انعام حاصل کئے۔ دو تین قصیدے ذوالفقار خاں کی مدح میں ہاشمی کے ملتے ہیں۔ ابھی ہاشمی کے متعلق کافی معلومات فراہم نہ ہو سکے۔ اس کا دیوان ریختی اور مثنوی یوسف زلیخا جو زیر طبع ہیں ان کے مقدمہ کی تکمیل تک ہماری کوشش ہے کہ جس قدر ممکن ہو سکے اس کی زندگی کے متعلق معلومات فراہم کریں۔ علاوہ دیوان اور مثنوی کے ہاشمی بیجاپور کا اعلیٰ پایہ مرثیہ نگار ہے اس کے کئی مرثیے دستیاب ہوئے ہیں جن سے اس کی قادر الکلامی اور وسیع النظری کا ثبوت ملتا ہے۔ یہاں ہم دیوان اور مثنوی سے چند شعر نقل کرتے ہیں:

غزل ریختی

جھانکو نکو سو پچھن تج دل چھوڑ جہنے کا — تجھ خیل میں تمنا چپ سب جگ میں شور ہوئے گا
تجھ کن بھری سندر کی عالم میں ہانٹ ہوی ہے — تھا نیلکی تس اوپر تو شہرت بھی زور ہوئے گا
آنکھیں تو ہور دستیاں دل میں تو بھید کچھ ہے — باتاں جی ہور کچھ ہیں مقصد بھی ہور ہوئے گا
ہے حسن دہن تمہارا رکھنا جتن مہیں دہن — نیں تو یو دہن پرانے کوئی ساہو چور ہوئے گا (دیوان ریختی)

عشق

اگر عشق نیں ہے تو چند رکوں نور — تو کیا واسطے نت یو تپتا ہے سور
اگر عشق نیں ہے تو دریا دبین آب — پلاتا ہے بادل کوں کی بے حساب
اگر عشق نیں ہو تو کی دہر تری — تو ہی رت میں کرنی ہے کہوت ہری
اگر عشق نیں ہے تو کی یو بھنور — پھرے باس لینا ہر اک گل اوپر
اگر عشق نیں ہے تو کی یو فقیر — فقیر ہو کے غربت لئے اپے سیر

مجازی عشق راست ہر طور ہے
حقیقی و لے عشق کچھ ہور ہے (یوسف زلیخا)

میر سعادت علی رضوی

وطاسمی سحانوری

سد هاسم علوی بحاری

نظام شاہی خاندان

احمد نظام الملک ۸۹۵ھ تا ۹۱۴ھ

بہمنی سلطنت کا جب شیرازہ بکھر گیا تو سب سے پہلے احمد نظام الملک نے بغاوت کی۔ احمد نظام الملک دکن کے برہمن نژاد امیر حسن بحری کا لڑکا کہلاتا ہے جس کو بعد کے مورخ ایک عجیب و غریب حکایت کے ذریعہ محمد شاہ بہمنی کا لڑکا تسلیم کرانے کی کوشش کرتے ہیں یہ بہمنی سلطنت کے شمال مغربی حصے کا مالک بنا اور اپنا صدر مقام جنیر قرار دیا لیکن بعد میں ایک شہر آباد کرکے احمد نگر اس کا نام رکھا۔ اور اسی نام سے اس کی سلطنت موسوم ہوتی۔ احمد نظام الملک نے ۸۹۵ھ میں اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کیا اور ۲۲ سال پر شوکت حکومت کرنے کے بعد ۹۱۴ھ میں انتقال کیا۔

برہان نظام شاہ ۹۱۴ھ تا ۹۶۱ھ

باپ کے بعد تخت نشین ہوا۔ اور اپنی سلطنت کی تمدنی ترقی کا باعث بنا اس دور میں نظام شاہی حکومت کی وسعت اور تنظیم کا کام ہوا اور اسی بادشاہ کی وجہ سے بہادر شاہ والی گجرات کا دیا ہوا لقب نظام شاہی اس خانوادہ کا لقب ہوگیا۔

سلطان حسین نظام شاہ شاہ اول ۹۶۱ھ تا ۹۷۲ھ

باپ کے مرنے کے بعد سریر آرائے حکومت ہوا۔ یہ بہت بڑا سپاہی اور مدبر تھا۔ اس کے زمانے میں سلاطین دکن میں اتحاد ہوا اور اسی کی سرگردگی اور کوشش سے تالی کوٹ میں رام راج کو شکست ہوئی اور نہایت شان اور جبروت کی حکومت کے بعد ۹۷۲ھ میں انتقال کیا۔

مرتضیٰ نظام شاہ۔ ۹۷۲ھ تا ۹۹۶ھ

یہ صغیر سنی میں بادشاہ ہوا۔ اور اپنی مدبر ماں خونزہ ہمایوں کے تحت حکومت کرتا رہا اور ۹۷۵ھ میں ماں کو قید کرکے برسر اقتدار آیا۔ یہ بادشاہ چاند بی بی کا بھائی تھا اس کے دور میں سلطنت کے ابتدائی آثار تنزل شروع ہوگئے تھے ۹۹۶ھ میں کثرت عیاشی کی وجہ سے دیوانہ ہوگیا اور اس کے بیٹے میراں حسین نے اس کو حمام میں بند کردیا۔

میراں حسین نظام شاہ۔ ۹۹۶ھ

باپ کو قید کرکے تخت پر بیٹھا اور وزیر مرزا خاں کے ہاتھ مارا گیا۔ اس نے صرف نو مہینے حکومت کی۔

اسماعیل نظام شاہ۔ ۹۹۷ھ تا ۹۹۹ھ

یہ امرائے گردی کے ذریعے تخت پر آیا اور اپنے باپ برہان نظام شاہ کے ہاتھوں تخت سے اتار دیا گیا۔

برہان نظام شاہ ثانی۔ ۹۹۹ھ تا ۱۰۰۳ھ

مغلوں کی طاقت کے ذریعے بیٹے کو معزول کرکے تخت حاصل کیا۔ اور ۱۰۰۳ھ میں عادل شاہیوں سے شکست کھا کر اسی صدمہ میں انتقال کیا۔ اور اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین بڑے بیٹے اسمٰعیل کے بجائے جو مہدوی تھا اپنے چھوٹے بیٹے کو جو اسماعیلیہ مذہب کا پیرو تھا مقرر کیا۔

ابراہیم نظام شاہ - ۱۰۰۳ھ

باپ کے بعد برسرِ حکومت آیا اور ایک ہی سال میں عادل شاہیوں سے لڑتا ہوا ایک سپاہی کے ہاتھ مارا گیا۔

احمد نظام شاہ

یہ شخص ایک دعویدارِ سلطنت تھا اور بعض امراء کی کوشش سے تخت نشین ہوا لیکن بعد میں چاند بی بی کے تدبر سے اس کو تخت سے ہٹایا گیا اور بہادر نظام شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔

بہادر نظام شاہ ۱۰۰۴ھ تا ۱۰۰۹ھ

یہ طوائف الملوکی کا دور تھا۔ وزیر اعظم اخلاص خاں حبشی اور چاند بی بی کے ذریعہ برسرِ اقتدار آیا یہ وہ دور تھا جس میں چاند بی بی نے مغلوں سے غیر معمولی معرکے کئے۔

مرتضیٰ نظام شاہ دوم ۱۰۰۹ھ تا ۱۰۳۵ھ

بہادر نظام شاہ کے بعد طوائف الملوکی پھیلی اور امرا نے مرتضیٰ نظام شاہ کو تخت پر بٹھایا اس دور کو ملک عنبر کا دور کہا جا سکتا ہے مغلوں کی بڑھتی ہوئی قوت ملک عنبر کی زندگی تک نظام شاہی سلطنت پر چھا نہ سکی۔ ملک عنبر کے بعد وہی نظام شاہی حکومت کو بچانے والا تھا

برہان نظام شاہ سوم ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۴۰ھ

برہان نظام شاہ نے باپ کے بعد سلطنت حاصل کی اور ۱۰۴۰ھ میں انتقال کیا یہ دورِ تنزل تھا۔

حسین نظام شاہ سوم

یہ احمد نگر کا آخری تاجدار ہے۔ اس کے زمانے میں مغلوں نے احمد نگر پر قبضہ کیا اور شاہ جہاں نے اس کو گوالیار میں قید کر دیا

مرتضیٰ نظام شاہ سوم ۱۰۴۲ھ تا ۱۰۴۵ھ

یہ بادشاہ نظام شاہی سلطنت کے بعد شاہ جی مرہٹے کے ذریعے تین سال تک شاہ گڑھ پر حکومت کرتا رہا اور تین سال کے بعد اپنے خاندان کا خاتم بنا۔

چاند بی بی

دکن کی نامور سلطانہ چاند بی بی حسین نظام شاہ اور خونزہ ہمایوں بیگم کی بیٹی تھی اور اس طرح باپ کی طرف سے نظام شاہی تدبر اور ماں کی طرف سے ترکی تہور اور بے جگری ورثے میں پائی تھی۔ یہ ملکہ ۹۵۷ھ میں احمد نگر میں پیدا ہوئی آنکھ کھولتے ہی اس نے تلوار کی جھنکار سنی بہمنی سلطنت کے مختلف شہ پارے آپس میں دست و گریباں تھے اور اس نفاق سے فائدہ اٹھا کر رام راج کے تحت وجیانگر کی شہنشاہیت مسلم راج اور مسلم سلطنتوں پر چھائی جا رہی تھی چودہ برس کی عمر میں چاند سلطانہ اس شطرنج کا مہرہ بنی اور علی عادل شاہ والی بیجاپور کے نکاح میں آکر دکنی مسلم اتحاد کا باعث بنی کوئی تعجب نہیں کہ تالی کوٹ کی لڑائی میں یہ شاہی دلہن میدان کارزار میں ہو اور مسلمانوں کے ناموس کا مرکز بنی رہی ہو۔ یہ چاند سلطانہ کا پہلا دور ہے۔

چاند سلطانہ کی زندگی کا دوسرا دور ۹۷۲ھ سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ وہ دلہن بن کر بیجاپور کے بادشاہ کے دل میں حکمران تھی

حسن نظام الملک بحری
بانی سلطنت نظام شاہیہ

چاند سلطانہ
(ملکہ علی عادل شاہ اول)

علی عادل شاہ خود بڑا بادشاہ تھا اس کی زندگی تک چاند بی بی کو صرف نظری تجربہ سیاست کا اور سلطنت کا حاصل ہوتا رہا یہاں تک کہ ۹۸۸ھ میں چاند سلطانہ کا شوہر علی عادل شاہ بیجاپور کا پانچواں زبردست فرماں روا بریدی غلام کے ہاتھوں شہید ہوا اب چاند سلطانہ بیجاپور میں وہی تدبر اور تنظیمی قوت کا اظہار کرنے لگی جو تاریخ انگلستان میں صرف ملکہ ایلزبتھ کو حاصل تھی نیا بادشاہ ابراہیم عادل شاہ نو برس کا تھا اور سلطنت چو طرف سے اندرونی سازش اور بیرونی غنیموں سے گھری ہوئی تھی امرائے سلطنت کی باہمی رقابت اور تنت کے ذریعے اس مدبر خاتون نے ابراہیم عادل شاہ کو نہ صرف بچایا بلکہ اس کو تربیت کے ذریعے بیجاپور کا سب سے بڑا فرماں روا بننے کے قابل رکھا۔ اس طرح ۹۸۷ھ سے ۹۹۲ھ تک چاند بی بی بیجاپور کے لئے فرشتۂ رحمت رہی کوئی مورخ جو چاند بی بی کی حقیقی سوانح عمری لکھنے بیٹھے اس دور کو اس کا دور تدبر قرار دے گا۔

جس طرح چاند بی بی بیجاپور خود کی شادی کی وجہ سے آئی تھی اسی طرح ابراہیم عادل شاہ کی بہن خدیجہ سلطانہ کے ساتھ چاند بی بی کے بھتیجے میراں حسین کو بیاہی گئی تھی پھر احمد نگر واپس ہوئی۔ اس کو پہلے سے بھی زیادہ زبردست سیاسی خدمات انجام دینے پڑے اس زمانہ مسلم اقتدار دکن کا سب سے اہم مرکز تھا مغل اس کو کسی نہ کسی طرح اپنے علاقے میں شامل کرنے کی تاک میں لگے ہوئے تھے اور یہ ہم جانتے تھے کہ [illegible] کی سلطنت ہے مرتضیٰ نظام شاہ کے انتقال کے بعد جو طوائف الملوکی مچی [illegible] کے بعد اسمٰعیل تخت پر بیٹھا جس کو اس کے باپ برہان نظام شاہ دوم نے مغلوں کی مدد سے قتل کر دیا اور اس کے چند سال بعد ابراہیم نظام شاہ اور پھر بہادر نظام شاہ [illegible] یہ دور احمد نگر کے لئے ریشہ دوانی اور موت کا دور تھا اور چاند بی بی کی زندگی کا حقیقی کارنامہ اسی دور سے متعلق ہے جو کام بیجاپور میں اپنے شوہر اور ان کی اولاد کے لئے اس نے کیا وہی کام اپنے خاندان کے لئے اسے کرنا تھا لیکن یہاں بیجاپور کے لحاظ سے اندرونی فتنے زیادہ تھے اور مغلوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے سابقہ تھا۔ اس دور میں چاند بی بی نے بادشاہ گری کی بہادر نظام شاہ کے لئے وہ سب کچھ کیا جو بڑے سے بڑا مدبر اور سپہ سالار کر سکتا تھا۔ اندرونی فتنہ کو رفع کیا اور مغلوں کو تا دم زیست اپنے آبا و اجداد کی سلطنت سے دور رکھا۔ اکبری لشکر نے مراد کی سرکردگی میں ۱۰۰۴ھ میں احمد نگر پر یلغار کی چاند بی بی نے اتنی بہادری سے ان کا مقابلہ کیا کہ مغلوں کو [illegible] پڑی۔ یہی وہ معرکہ تھا جس میں سرنگ کے ذریعے پچاس گز قلعہ کی دیوار اڑا دی گئی تھی۔ اور چاند بی بی نے مغلیہ دل بادل کو تلوار کی نوک سے اس وقت تک روک رکھا تھا جب تک دیوار از سر نو تیار نہ ہو گئی تاریخ حرب میں یہ کارنامہ ہمیشہ سنہری حروف میں رہے گا اس کے بعد مغلوں نے دوسرا حملہ شہزادہ دانیال کی سرکردگی میں کیا۔ اور چار مہینے کے محاصرہ کے بعد چاند بی بی [illegible] کی لاش اور دکن کا ایک میران شہر اس کے ہاتھ آیا ۱۰۰۹ھ میں یہ بہادر سلطانہ ناموس کی حفاظت کے لئے تیزاب کے کنویں میں مستور ہو گئی۔

ملک عنبر

ملک عنبر دکن کا مشہور سپہ سالار، مدبر اور بادشاہ گر حبشی ۹۵۵ھ میں پیدا ہوا۔ [illegible] میں ابتدائی تربیت پائی اور دکن کے بازار میں آکر فروخت ہو گیا۔ احمد نگر میں چنگیز خاں کے غلام کی حیثیت سے تربیت حاصل کی اور آقا نے غلام کو اولاد کی طرح پالا۔ آقا کی وفات کے بعد ۹۸۲ھ میں ملک عنبر گولکنڈہ میں قطب شاہی کا ملازم ہوا پھر بیجاپور چلا گیا۔ ابراہیم عادل شاہ کے ملازمان میں شریک ہو کر ایک ممتاز عہدہ پر فائز اور ملک عنبر کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ اب اس نے عربوں اور حبشیوں کی فوج جمع کرنا شروع کیا اور اس کی شرفا نوازی اور بہادری کی دھوم مچ گئی لیکن بیجاپور کے امراء کے حسد اور حوصلہ شکن فضا سے بیزار ہو کر بیجاپور بھی [illegible]ھ میں چھوڑنا پڑا۔ کچھ مدت ملک عنبر کی عسرت و تنگ دستی میں بسر ہوئی لیکن اس حالت میں بھی فوج فراہم کرتا رہا اور احمد نگر میں ملازمت اختیار کر لی۔ حسین نظام شاہ کی فوج میں اس جوان مرد حبشی کے اضافہ نے مغلوں کے مقابلے میں ایک قوت پیدا کر دی تھی۔

ملک عنبر ایک ایسے دور میں سیف و دماغ کے جوہر دکھانے کے لئے دنیا میں آیا جب کہ دکن تباہ ہو رہا تھا۔ بہمنی شہنشاہیت کے ٹکڑے پارے آپس میں دست و گریباں تھے اور مغلوں کا بڑھتا ہوا اقبال ان پر عقاب کی طرح چھا رہا تھا۔ احمد نگر فتح دکن کی کنجی تھا جس پر مغلوں کی آنکھ لگی ہوئی تھی۔ ملک عنبر کی جوانی بیجاپور و گولکنڈہ اور احمد نگر کے عروج میں شروع ہوئی اور دکن کی سلطنتوں کے زوال کے ساتھ ساتھ ملک عنبر کی حوصلہ مندیوں نے عروج حاصل کیا اور کم از کم اپنی دانشمندی کی وجہ سے تیس سال تک دکن کو اغیار کی غلامی سے بچائے رکھا۔ اس طرح تمام عمر ایک مجاہد کی زندگی بسر کر کے ۱۴ شعبان ۱۰۳۵ھ کو بخار کی وجہ سے اسّی سال کی عمر میں انتقال کیا۔

ملک عنبر میانہ قد، حبشی رنگ اور گٹھیلے جسم کا آدمی تھا۔ مغلوں کا پیاسا اور دکنی دل رکھتا تھا۔ حلیم الطبع، منکسر مزاج، وفا شعار ایسا کہ آخری دم تک باوجود بے تاج کا بادشاہ ہونے کے مرتضیٰ نظام شاہ کو بادشاہ مانتا رہا۔ اس کے زمانے کی معلوم نہیں [illegible] علاوہ شعراء کے ادیب، علماء و فضلاء، اولیاء اور رشیوں کا مامن تھا۔ میدان جنگ میں شمشیر زن اور میدان تدبر کا شاطر۔ ایک طرف اہل سیف اور دوسری طرف مصلح، ریفارمر اور تعمیر کار تھا۔ ملک عنبر کے احسانات میں سے سب سے بڑا احسان وہ ہے جو اس نے مرہٹہ قوم پر کیا۔ آج کل کے مرہٹہ مورخ تعصب کی وجہ سے اس کو تسلیم نہ کریں لیکن خالص عربی طرز جنگ اسی نے مرہٹوں کو ایک طرز نو سے سکھائی۔ مرہٹوں کو بحیثیت قوم سپاہی بنانے کا کام ملک عنبر نے انجام دیا۔ اسی نے صدیوں کے غلام اور بے بس کسانوں کو نہ صرف مرد میدان بنایا بلکہ صاحب تاج اور سلطنت کر دکھایا۔ یہ سچ ہے کہ جب تک مرہٹے ملک عنبر کی سمجھائی ہوئی راہ پر گامزن تھے اقبال ان کے ساتھ تھا جس روز انھوں نے برگیگیری چھوڑ کر میدان سنبھالا تو ان کو پانی پت کی تیسری جنگ کا روز بد دیکھنا پڑا۔

ملک عنبر کا دوسرا کارنامہ مالی انتظام تھا۔ اس مدبر سپاہی نے باوجود تمام عمر میدان جنگ میں بسر کرنے کے اپنی رعایا کی خوشحالی کے لئے بہترین مالی انتظام کیا۔ مالگزاری کی تنظیم، زمینات کا بندوبست اور محاصل کے خوش تناسب نے رعایا کو مطمئن اور فارغ البال کر دیا تھا۔ اس نے انتظام سلطنت کے لئے ملکی زبان کو دفاتر کے لئے رائج کیا۔

بحیثیت تعمیر کار اس کی ہستی لافانی ہے۔ کھڑکی ایک غیر آباد اور پہاڑی قریہ کو اس نے بارونق اور متمدن شہر بنا دیا گو اس شہر کو ایک مرتبہ جہانگیر کی فوجوں نے زمین کے برابر کر دیا تھا تاہم ملک عنبر نے چند دنوں میں اس ویرانہ کو گلزار میں تبدیل کر دیا۔

سید محمد اکبر وفا فانی

گولکنڈے کا نیا قلعہ

(قلعہ گولکنڈہ کے پہلو میں سلطان عبداللہ قطب شاہ نے جو نیا قلعہ بنایا تھا اس کی ایک جھلک)

اب بھی رونق پا رہا ہوں تیرے ویرانے میں میں
سن رہا ہوں کچھ سکوتِ شب کے افسانے میں میں

موجزن ہے تشنگی حوضوں میں پانی کیلئے
ابر جن پر چھا رہا ہے دُر فشانی کیلئے

ہیں نقوشِ جستجو تیرے شکستہ بام و در
جن میں کھو جاتی ہے دل کی دھڑکنیں لے کر نظر

تیرے سائے میں ہے اب تک بھی جھلک تلوار کی
تیرے خود رو دشت میں فرحت سی ہے گلزار کی

تیرا ہر پربت ہے اپنی عظمتوں کا راز داں
تیری خاموشی کے دامن پر ہیں نغموں کے نشاں

نوحہ خواں ہے پُرسکوں تالاب کی سرسبز دوب
شام کو جس کے کنارے مہر ہوتا ہے غروب

جو خموشی میں ہے کیفیت کہاں فریاد میں؟
یہ مسجد ہے خدا کا گھر خدا کی یاد میں

عکسِ ماضی دیکھتا ہوں میں تری تصویر میں
حسن کاری کا تخیل ہے تری تعمیر میں

پیکرِ مردہ میں تیرے زندگی کی آن ہے
اب بھی محلوں کے کھنڈر کی جاودانی شان ہے

تھی تری بیداری تقدیر سونے کیلئے
تو یوں ہی چھوڑا گیا برباد ہونے کیلئے

آج کر دوں گا نمایاں بےحسی کے داغ کو
اپنے دل کے خون سے سینچوں گا تیرے باغ کو

آج میں تعبیر مانگوں گا فسونِ خواب سے
تیرے حوضوں کو بھروں گا آنسوؤں کی آب سے

ڈوب جائیگی اثر میں آج آہِ آتشیں
ثبت کر دوں گا تری مسجد میں میں نقشِ جبیں

تیرے کھنڈروں میں سکونِ زندگانی پاؤں گا
تیری خاموشی میں ماضی کے ترانے گاؤں گا

میکش

گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت

قطب شاہی خاندان کی حکومت سرزمین حیدرآباد پر تقریباً دو سو سال یعنی ۹۰۱ھ سے ۱۰۹۸ھ تک رہی اور اس عرصہ میں ان حکمرانوں نے یہاں تہذیب و تمدن، تموّل و ثروت، علم و فضل اور شعر و سخن کی ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس پر دکن کی تاریخ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ ان بادشاہوں نے شیعہ و سنّی اور مسلمان و ہندو، غرض ہر مذہب و ملّت کے باشندوں میں ایک مشترک کلچر کے پیدا کرنے میں یہاں تک کامیابی حاصل کی تھی کہ دوسروں کے لئے اس ملک کے رہنے والوں کا باہمی اتحاد اور یگانگت باعث رشک تھی۔ اسی موانست و مفاہمت کی خاطر انھوں نے اردو کی سرپرستی کی اور اس زبان میں ایسی ایسی بلند پایہ کتابیں لکھیں اور لکھوائیں جن پر اردو ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔

یوں تو قطب شاہی سلطنت کے بانی سلطان قلی کا تعلق اس سرزمین سے ۸۹۱ھ میں پیدا ہو چکا تھا جب وہ تلنگانہ کا صوبہ دار بنایا گیا تھا لیکن جب سنہ ۹۰۱ھ میں گولکنڈہ اور اس کے اطراف و اکناف کا علاقہ اس کو بطور جاگیر کے دیا گیا تو اس نے اس کا نام محمد نگر رکھا اور قدیم قلعہ کو مستحکم کر کے اس میں متعدد محلات تعمیر کیے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اپنے علاقہ کو وسیع کرنا شروع کیا۔ چنانچہ بیس بائیس سال کے عرصہ میں پانگل، کمّن پیٹ، کوئیل کنڈہ، اور ملگندل وغیرہ اس کے قبضہ میں آ گئے۔ سنہ ۹۲۲ھ میں اس نے قلعہ میں بالا حصار کے دامن میں مشہور مسجد صفا بنائی جس میں آخر کار سنہ ۹۵۰ھ میں اسکے فرزند یار قلی جمشید کے اشارے سے سلطان قلی قطب شاہ کو ننانوے (۹۹) سال کی عمر میں عصر کی نماز پڑھتے وقت شہید کیا گیا۔ اس نے دوسرے صوبہ داروں کی طرح بہمنی بادشاہ کے خلاف علم بغاوت نہیں بلند کیا بلکہ آخر تک ان کی مدد کرتا رہا اور جب بریدیوں نے بہمنیوں پر پوری طرح قبضہ کر لیا تو مجبوراً سلطان قلی کو بھی اپنی بادشاہت کا اعلان کرنا پڑا۔

سلطان قلی کو فنِ تعمیر کا خاص ذوق تھا۔ اس نے قدیم قلعہ (موجودہ بالا حصار) کے اطراف ایک عالیشان شہر بنایا۔ اور در اصل وہی اس طرزِ تعمیر کا بھی بانی ہے جو قطب شاہی کہلاتا ہے اور ایرانی، ہندو، اور پٹھان طرزہائے تعمیر کے امتزاج سے بنا ہے۔ اس کی وفات کے وقت اس کی سلطنت شمال میں دریائے گوداوری، مشرق میں اڑیسہ اور ساحلِ سمندر اور جنوب میں دریائے کرشنا تک پھیل چکی تھی۔

۲ جمشید قلی قطب شاہ تخت نشین ہوتے ہی اپنی سلطنت کے استحکام و وسعت میں مصروف ہو گیا۔ اگرچہ اس کا سات سال کا مختصر سا عہد حکومت زیادہ تر جنگ و جدل، سخت گیریوں اور پریشانیوں میں گذر گیا۔ لیکن اس نے نارائن کھیڑ، احسن آباد اور میدک پر قبضہ کر کے قطب شاہی سلطنت میں اضافہ کیا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ لیکن اس کے عہد میں گولکنڈہ اردو شعر و سخن کا مرکز نہ بن سکا۔ اس کی وفات سنہ ۹۵۷ھ پر اس کے کمسن لڑکے سبحان قلی کو تخت نشین کیا گیا لیکن چند ماہ بعد ہی اس کا دوسرا بھائی ابراہیم قلی کوئیل کنڈہ کے نایک واڑیوں کی مدد سے قلعہ گولکنڈہ میں داخل ہوا۔ اور اپنے بھائی کے مظالم کی تلافی کرنے میں مصروف ہو گیا۔

۳ سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ کی شخصیت کو دکن کی سیاست میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اسی کے زمانہ میں سنہ ۹۷۲ھ میں تالی کوٹہ کی مشہور لڑائی ہوئی جس میں وجیانگر کی عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی گولکنڈہ کو مال و دولت اور سیاسی حیثیت سے کافی اہمیت حاصل ہو گئی۔ بعد میں ابراہیم قطب شاہ نے راجمندری، قائم کوٹ اور کھم میٹ وغیرہ کے علاقے بھی فتح کر لئے۔ اس نے سنہ ۹۸۸ھ میں انتقال کیا۔ اس کو بھی اپنے باپ کی طرح تعمیر کا شوق تھا۔ چنانچہ بالا حصار کی سیڑھیوں کی مسجد، موسیٰ ندی کا پہلا پل، حسین ساگر، بدویل کا تالاب، ابراہیم باغ، باغ گلشن، اور قصبہ ابراہیم پٹن اس کی تعمیری یادگاریں ہیں۔ اس کے عہد میں گولکنڈہ اردو زبان کا مرکز بن گیا۔ اور فیروز، محمود، احمد، اور وجہی جیسے بلند پایہ شعراء

اُسی کی قدردانی اردو کی وجہ سے متعدد بیش بہا کتابیں اِس زبان میں تصنیف کرسکے ۔

۴ ابراہیم کے بعد اس کا تیسرا لڑکا سلطان محمد قلی تخت نشین ہوا جس نے ۹۹۹ھ میں اپنی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر بھاگ نگر کی بنا ڈالی ۔ اور عالیشان محلات، حمام، مساجد، مدارس اور بازار وغیرہ تعمیر کیے۔ بھاگ نگر کے اطراف واکناف بیس میل تک باغات بنائے گئے ۔ نرکھوڑہ، ابراہیم پٹن، بھونگیر، اور پٹن چیرو اس شہر کے حدود پر واقع تھے ۔ سترہ برس کے بعد غالباً اپنی اکلوتی لڑکی شہزادی حیات بخشی بیگم کی شادی کے موقعہ پر بادشاہ نے اس پر کیف بستی بھاگ نگر کا نام حیدرآباد قرار دیا۔

محمد قلی قطب شاہ نے ۱۰۰۰ھ میں سلم گر اور نندیال وغیرہ فتح کیا۔ اس کے زمانہ میں گولکنڈہ ہر لحاظ سے معراج کمال کو پہنچ گیا۔ شاہ عباس صفوی کا سفیر اغزلو سلطان اسی عہد میں گولکنڈہ آیا تھا۔ علم و فضل اور شعر و سخن کے لحاظ سے بھی یہ دور دکن کا عہد زرین سمجھا جاتا ہے۔ اسی دور میں اردو نے قطب شاہی سلطنت اور خاص کر گولکنڈہ اور حیدرآباد میں معراج کمال حاصل کیا اور اس سرزمین نے تمدن و معاشرت کے وہ تمام منازل طے کر لیے جو کسی ملک کو متمدن اور شائستہ ثابت کرتے ہیں اسی زمانہ میں گولکنڈہ مختلف اقطاع عالم کے سیاحوں اور علما و فضلا کا مرجع ۔ مامن بھی بن گیا تھا ۔

سلطان محمد قلی نے جنگ و جدل سے زیادہ امن و امان، اور ملک کی وسعت سے زیادہ اہل ملک کی خوش حالی اور رعایا کی تعلیمی ترقی پر زور دیا۔ وہ خود بہت بڑا شاعر اور قدردان سخن تھا۔ اس نے تین زبانوں فارسی اردو اور تلنگی میں اپنے دیوان مرتب کیے تھے۔ اس کا اردو کلام نہایت اعلیٰ پایہ ہے۔ اس کا دربار شاعروں سے معمور رہتا تھا۔

حیدرآباد کی اکثر عمارتیں اسی صاحب ذوق بادشاہ کی یادگار ہیں۔ ان میں سب ذیل قابل ذکر ہیں :-

چار مینار، چار کمان، چارسو کا حوض، دارالشفا، جامع مسجد، داد محل، ندی محل، نبات گھاٹ، باغ دلکشا، خداداد محل (جو ہفت منزلہ تھا اور ہر منزل کا نام جدا تھا مثلاً الٰہی محل، محمدی محل، حیدری محل، حسینی محل، حسنی محل، جعفری محل، اور موسوی محل) باغ محمد شاہی، کوہ طور، جنان منزل، اور بادشاہی عاشور خانہ وغیرہ۔

۵ محمد قلی قطب شاہ کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد سلطان محمد قطب شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس کی شادی حیات بخشی بیگم بنت سلطان محمد قلی کے ساتھ ۱۰۱۶ھ میں نہایت تزک و احتشام سے ہوئی تھی۔ اس کا عہد حکومت بھی امن و امان اور خوش حالی میں گذرا۔ اس کے دور میں شہزادہ خرم نے جو بعد میں شاہجہاں کے لقب سے جہانگیر کا جانشین ہوا باپ سے بغاوت کرکے اور اس کی فوجوں سے ہزیمت پاکر قطب شاہی سلطنت میں پناہ لی تھی۔ سلطان محمد نے اس کے ساتھ ہمدردی کی اور ایسے وقت میں اس کی قیمتی امداد کی جب کہ وہ بالکل محتاج تھا اور اکثر رفیقوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

سلطان محمد قطب شاہ نے اپنے چچا کی قدردانی شعر و سخن کو جاری رکھا۔ لیکن وہ شاعر ہونے کے علاوہ عالم و فاضل بھی تھا۔ اس نے شعر و سخن اور علم و فضل کے ساتھ زہد و تقویٰ اور اخلاق و آداب کا بھی خاص خیال رکھا۔ اسی کے عہد میں اس خاندان کی مشہور تاریخ سلطان محمد قطب شاہی لکھی گئی۔ اس کے دور میں بھی دکن کے حکمرانوں کے علاوہ جہانگیر اور شاہ عباس صفوی کے سفرا گولکنڈہ آئے تھے۔ اس کے عہد کے اردو شاعروں میں وجہی کے علاوہ غواصی اور ابن نشاطی کے نام خاص کر قابل ذکر ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ سلطان محمد کو بھی اپنے اجداد کی طرح فن تعمیرات سے خاص شغف تھا۔ اس نے قلعہ محمد نگر گولکنڈہ کے مقابل میں حیدرآباد کے مشرقی جانب چھ میل کے فاصلہ پر ایک قلعہ سلطان نگر کی سنہ ۱۰۲۳ھ میں بنا ڈالی لیکن اس کا بہت جلد انتقال ہو گیا اور وہ قلعہ ناتمام رہا۔ اس کے علاوہ اسی سلطان نے مکہ مسجد، محلہ سلطان شاہی، اور گوشہ محل کی بھی بنا ڈالی تھی مگر اس کا کوئی کام اس کی زندگی میں تکمیل نہ پا سکا۔ اس کی جوانمرگی نے اس کو ہر طرح حرماں نصیب رکھا۔ اگر وہ چند اور سال زندہ رہ جاتا تو گولکنڈہ کی سلطنت اس قدر جلد زوال پذیر نہ ہونے پاتی۔

۶ سلطان محمد کے بعد اس کا اکلوتا لڑکا عبداللہ ہر ز سنہ ۱۰۳۵ھ میں بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور بادشاہ کی یہ کم عمری اور ناتجربہ کاری قطب شاہی سلطنت کی کمزوری کا باعث ہوئی۔ سلطان عبداللہ کی کمزوریوں سے سب سے زیادہ محمد سعید میر جملہ نے فائدہ اٹھایا۔ آخر کار جب بادشاہ نے اس سرکش کا استیصال کرنا چاہا تو اس نے شہزادہ اورنگ زیب کے یہاں پناہ لی اور قطب شاہی سلطنت اور اس کے حکمران کی کمزوریوں سے غنیم کو واقف کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گولکنڈہ کی آزادی قائم نہ رہ سکی۔ اور اس کی عظمت و شوکت کا آفتاب غروب ہونے لگا۔

ان سیاسی پریشانیوں کے علاوہ سلطان عبداللہ کے عہد میں حیدرآباد کو ایک تباہ کن قحط اور پھر ایک زبردست طغیانی رود موسیٰ کی وجہ سے بھی سخت صدمے اٹھانے پڑے۔ لیکن ان سب صدموں سے بڑھ کر اہل حیدرآباد اس پریشانی اور ذلت سے متاثر ہوئے جو سنہ ۱۰۶۶ھ میں میر جملہ کی وجہ سے اورنگ زیب کے حملہ کی شکل میں نمودار ہوئی۔ اس وقت مغلوں نے لوٹ مار کے سلسلہ میں حیدرآباد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور تمام شہر کو تباہ کر کے چھوڑا۔

غرض عبداللہ قطب شاہ کی زندگی پریشانیوں اور کشمکشوں میں گذر گئی۔ وہ آخر دم تک اولاد نرینہ کا متمنی رہا۔ اور اسی یاس و امید میں ایک پوری نصف صدی گذار دی۔ پچاس سال کی طویل حکومت کے بعد سلطان عبداللہ نے سنہ ۱۰۸۳ھ میں انتقال کیا اور دراصل اس کے ساتھ ہی قطب شاہی حکمرانوں کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ وہ بھی اردو زبان کا ایک اچھا شاعر تھا اس کے عہد میں بھی علم و فضل اور شعرا و شاعری کی قدر دانی جاری رہی فارسی کی مشہور فرہنگ برہان قاطع اور اردو کی مشہور کتابیں سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ، پھول بن، اور ماہ پیکر وغیرہ۔ اسی دور کی یادگار ہیں۔

۷ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے بعد اس کا چھوٹا داماد ابوالحسن تانا شاہ تخت نشین ہوا وہ چودہ برس تک قطب شاہوں کی اس امانت یعنی سلطنت گولکنڈہ کو دشمنوں سے بچاتا رہا۔ وہ نہایت دور اندیش اور فضا رنمش حکمران تھا۔ اس نے قلیل عرصہ میں قطب شاہی سلطنت کے ان تمام کل پرزوں کو درست کر لیا جو سلطان عبداللہ کے پچاس سال کے طویل عہد حکومت میں بالکل کمزور اور منتشر ہو گئے تھے۔ اگر شہنشاہ اورنگ زیب جیسے طاقتور دشمن سے مقابلہ نہ ہوتا اور تمام ہندوستان کی فوجیں اس کے مقابلہ کے لئے جمع نہ ہو جاتیں تو وہ قطب شاہوں کی اس امانت کو اپنی اولاد تک نہایت مستحکم اور طاقتور حالت میں منتقل کر سکتا۔ اس کے عہد میں بھی حیدرآباد اردو شاعروں اور انشا پردازوں کا مرکز بنا رہا طبعی اور غلام علی جیسے بلند مرتبہ شاعر اس وقت بھی موجود تھے۔ جنھوں نے وجہی و غواصی کے خدمات شعر و سخن کو بوجوہ احسن جاری رکھا۔

سلطان ابوالحسن قطب شاہ نے جس خوبی اور مردانگی سے مغلوں کا مقابلہ کیا اور اثنائے جنگ میں اس کا برتاؤ جیسا شریفانہ اور بہادرانہ رہا اس کے تذکرے خاص و عام کی زبان پر اب تک جاری ہیں اس نے قطب شاہی افواج کی اخلاقی حالت اس قدر درست کر دی تھی کہ دشمن بھی اعتراف کرتے تھے۔ اگر اورنگ زیب کا تدبر اور میر جملہ کے جانشین غدار قطب شاہی امرا کا مکر و فریب کارگر نہ ہوتا تو شاید ہی گولکنڈہ فتح ہو سکتا۔

(ماخوذ از سیر گولکنڈہ)

سید محی الدین قادری زور

سلطان قلی قطب شاہ

(سنہ ۹۲۴ھ تا سنہ ۹۵۰ھ)

سلطان قلی قطب شاہ سلطنت گولکنڈہ کا بانی ہے۔ وہ ترکستان کے ایک بہت بڑے اور مشہور حکمران قبیلے قرا قونیلو کا رکن تھا وہ دو مرتبہ دکن آیا تھا۔ اس کے دکن آنے کا سبب خاندان شاہ بیگ کی تباہی اور قبیلۂ قرا قونیلو کا ترکستان پر تسلط ہے۔ وہ اپنے چچا اللہ قلی کے ساتھ قیمتی تحفے وغیرہ لے کر ہندوستان آیا تھا۔ سلطان قلی ترکستان سے سیدھا دکن آیا۔ یہ محمود شاہ بہمنی کا عہد حکومت تھا جبکہ بیدر تمام ممالک عجم کا مرجع بن گیا تھا۔ ان کے خاندانی حالات اور وجاہت کو دیکھ کر بہمنی دربار نے ان کی بہت آؤ بھگت کی۔ سلطان قلی اپنے چچا کے ساتھ جب پہلی مرتبہ دکن آیا تو دونوں کے لئے تا قیام وظیفہ قائم رکھا گیا تھا۔ دوسری مرتبہ آیا تو بہت سی عنایتیں ہوئیں اور وہاں ٹھہر جانے کے لئے مجبور کیا گیا۔ یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے سلطان قلی دربار دکن سے بہت متاثر ہوا تھا۔ چند دنوں کے بعد ترکستان کے حاکم امیر یعقوب کے مرنے کی خبر آئی اور یہ ہمدان کے شاہی خاندان کے لئے اچھا موقع تھا۔ اللہ قلی بیگ نے بادشاہ سے مراجعت کی اجازت چاہی۔ اللہ قلی کے اصرار پر اس کو تو اجازت مل گئی لیکن بادشاہ نے کہا کہ "اللہ قلی بیگ اگر تو می روی مختاری، مگر سلطان قلی بیگ را بہ ہیچ وجہ رخصت انصراف نمی دہیم"۔ اس کے علاوہ خود سلطان قلی بھی واپس نہیں جانا چاہتا تھا اس لئے اللہ قلی کو مجبوراً تنہا لوٹنا پڑا۔ اور سلطان قلی دکن میں رہ گیا۔

سلطان قلی کی استقامت سے محمود شاہ بہت خوش تھا۔ اس کو اپنے مقرب درباریوں میں شریک کر لیا۔ اس کی ترقی کا بڑا سبب اس کی ذاتی قابلیت تھی۔ شکار کے مشہور واقعہ کے بعد اس کو ایک سو پچاس عربی و ترکی گھوڑے مع سازوسامان عطا ہوئے اور خلعت عنایت کی گئی اور اس کے اخراجات کے لئے کوڈنگل اور اس کے مضافات دئے گئے اور خواص خاں خطاب سے سرفراز ہوا سلطان قلی علم حساب اچھا جانتا تھا اور خوش خط بھی تھا اسی لئے بادشاہ نے اس کو شاہی محلات کا محاسب بنایا۔ اس کی بڑی قابلیت کا اظہار تلنگانہ کے پرگنوں میں ہوا جہاں وہ خود اپنی خواہش سے ڈاکوؤں کی سرکوبی اور ادائی مالگزاری کے لئے رعایا کو پابند کرنے گیا تھا۔ چونکہ اس میں علمی اور فوجی دونوں قابلیتیں تھیں اس کو فرامین میں صاحب السیف و القلم کہا جاتا تھا۔

اس کے بعد سلطان قلی کی قابلیت اس وقت ظاہر ہوئی جبکہ سنہ ۸۹۶ھ میں اہل بیدر نے باہر والوں سے انتقام لینے کے لئے قلعہ پر حملہ کر دیا تھا۔ خود بادشاہ کی جان سخت خطرے میں تھی قلعہ دار حسن علی سبزواری اور سید مرزائی مشہدی کے ساتھ سلطان قلی بھی مع دس ہزار سلحدار جوانوں کے موجود تھا۔ یہاں سلطان قلی کی سچی وفاشعاری اس کی غیر معمولی ترقی کا باعث ہوئی۔ چنانچہ بادشاہ نے خوش ہو کر اس کو قطب الملک کا خطاب دیا تھا۔ اس کے تین سال بعد سنہ ۸۹۹ھ میں جمشید ساحل کی بغاوت سلطان قلی کے لئے مزید ترقی کا باعث ہوئی۔ یعنی وہ تمام ممالک تلنگانہ کا صوبہ دار بن گیا۔ بہمنی امیر بہادر گیلانی کی سرکوبی میں اس نے بڑا حصہ لیا۔ جب بادشاہ جمشید ساحل کی مہم سے فارغ ہو کر بیدر آیا تو قطب الملک سلطان قلی کو تلنگانہ کا صوبہ دار بنا دیا۔ اور اس کی قدیم جاگیر میں گولکنڈہ اور ورنگل کا اضافہ کیا۔

دکن کے سیاسی انتشار نے بھی سلطان قلی کی مدد کی۔ اسی انتشار میں وہ ترقی کر کے گولکنڈہ کی خود مختار سلطنت قائم کر سکا۔ دکن میں ملکی اور غیر ملکی عناصر کی کشمکش اور حکومت کی کمزوریوں سے جب بہمنی سلطنت کا دسویں صدی ہجری کے اوائل میں خاتمہ ہوا اور اس کے حصے بخرے ہونے لگے تو بیجاپور، احمد نگر،

اور برار کے ساتھ گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت بھی قائم ہوگئی۔

۹۲۴ھ میں سلطان محمود کے انتقال کے بعد وہ خودمختار ہوا اور اس کے بعد اس نے گولکنڈہ کو پائے تخت بنایا قلعہ اور شہر کی تعمیر کی۔ فوجی نقطۂ نظر سے گولکنڈہ نہایت موزوں سمجھا گیا۔ اپنے مرکز کے استحکام کے بعد اس نے شرقی تلنگانہ کے مختلف صوبوں پر وار کرنے شروع کئے تقریباً ۲۰ سال کے دوران میں ساٹھ ستر قلعے اور حصار فتح کئے۔ اور سلطنت کو ونڈل کی سرحد سے بنگالہ و مچھلی پٹم تک پہنچا دیا۔

۹۵۰ھ اواخر جمادی الاول میں اس کے بیٹے جمشید نے تخت سلطنت کی ہوس میں اسے قتل کروایا۔ اس نے تقریباً پچاس سال دکن میں حکومت کی۔ اگر اس کا ابتدائی زمانہ بھی شامل کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے تقریباً ساٹھ سال سیاست دکن کی رہنمائی کی۔ اسی مدت میں اس نے جنوبی ہند کے تمدن و سیاست میں ایک بڑا تغیر پیدا کیا تھا۔ یہاں کی منتشر اکائیوں کو ایک رشتہ میں منسلک کرکے اس ملک کی خاطر خواہ شیرازہ بندی کر دی تھی اور باضابطہ نظم و نسق سے یہاں امن و امان قائم کر دیا تھا۔

جمشید قطب شاہ (۹۵۰ھ تا ۹۵۷ھ)

سلطان قلی قطب شاہ نے ۵۰ سالہ عہد حکومت کے بعد ننانوے سال کی عمر میں انتقال کیا تھا۔ گولکنڈہ کی نوخیز سلطنت کو مستحکم حالت میں چھوڑ گیا تھا۔ اس کے ۶ بیٹے تھے۔ فرزند اکبر حیدر قلی جو جانشینی کے لئے نامزد ہو چکا تھا باپ کی زندگی میں انتقال کر گیا۔ اس کے بعد سلطان قلی قطب شاہ نے اپنے دوسرے بیٹے قطب الدین کو ولیعہد بنایا لیکن اس کے مقابلہ میں اس کے دوسرے بھائی جمشید قلی، عبدالکریم اور دولت قلی بہت تیز طبیعت اور حوصلہ مند تھے۔ چھٹا بیٹا ابراہیم قطب دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ لائق تھا۔ عبدالکریم باپ کی زندگی ہی میں بغاوت کی پاداش میں مارا گیا۔ اور جمشید اور دولت بھی بنظر احتیاط قید رکھے گئے تھے، لیکن جمشید قلی جو گولکنڈہ ہی میں مقید تھا، اپنے لئے قید میں سے راستہ صاف کرنے لگا اور سازش کی اور ایک شخص میر محمود ہمدانی کے ذریعہ اپنے باپ کو قتل کروایا۔ باپ کے مرنے کے بعد جمشید قید سے باہر نکلا اور اپنے ہمدردوں کے زور سے سلطنت کے سیاہ و سفید اپنے ہاتھ کر لیے۔ قطب الدین ولیعہد سلطنت اندھا کر دیا گیا۔

۹۵۰ھ میں جمشید قطب شاہ کی تخت نشینی عمل میں آئی اور ۹۵۷ھ تک سات سال اس نے حکومت کی۔ اگرچہ تخت نشینی کے بعد جمشید نے رعایا اور امرا کو خوش کرنے کی کوشش کی اور انھیں مختلف انعامات سے سرفراز کیا لیکن راعی و رعایا میں کچھ خوشگوار تعلقات نہ پیدا ہو سکے۔ پہلے تو اس کے کرتوت ہی اس کی بدنامی کے لئے کافی تھے پھر تخت نشینی کے بعد جبکہ اس کی عمر ۲۰ سال کی تھی، طبیعت کی ترشی اور تند مزاجی نے اس کے بہت سے مخالف پیدا کر دئے۔ جمشید کا چھوٹا بھائی ابراہیم جو دیورکنڈہ سے بھاگ کر ملک برید کے پاس بیدر پہنچ گیا تھا برید کی امداد کے ساتھ گولکنڈہ کی دیواروں تک پہنچ گیا۔ اگرچہ یہ حملہ برہان نظام شاہ والئی احمدنگر کی تائید سے رفع ہو گیا تھا لیکن ملک برید اس حملہ کے بعد سے گولکنڈہ کی اندرونی سیاسی فضا اور جمشید کی کمزوریوں سے واقف ہو گیا۔ بیدر کی بریدشاہی سلطنت بہت مختصر تھی لیکن اس زمانہ میں برید دکن کی لومڑی کہلاتے تھے۔ وہ آپس کے جوڑ توڑ میں بہت مشاق تھے کبھی بیجاپور کا ساتھ دیا تو کبھی احمدنگر کا۔ ہر حیلہ و بہانہ سے ان سلطنتوں کو لڑا دیا کرتے تھے تاکہ اس طرح سے ان کا فائدہ ہو جائے۔ چنانچہ جمشید کے زمانے میں بھی لڑائیاں بہت کم ہوئی ہیں۔

برہان نظام شاہ نے جمشید علی قطب شاہ سے زیادہ دوستی بڑھائی تو شولاپور پر احمد نگر نے حملہ کیا تو عماد الملک اور جمشید دونوں احمد نگر کے ساتھ شریک تھے لیکن ابراہیم عادل شاہ کی تائید پر برید کی فوجیں تھیں۔ کہتے ہیں کہ اس موقع پر جمشید ہی نے بڑا کام کیا۔ ان کے آگے بڑھنے سے ابراہیم اور برید میدان چھوڑ کر بھاگ گئے اور جمشید نے برید کا بیدر کی دیواروں تک تعاقب کیا۔

اس شکست کے بعد برید خاموش کیسے بیٹھ سکتا تھا۔ انتقام لینے کے لئے برید نے غالباً ۹۴۲ھ میں گولکنڈہ پر حملہ کر دیا۔ لیکن جمشید نے بڑی ہوشیاری کی۔ تھوڑی سی فوج یہاں چھوڑ کر چپکے سے بیدر پر حملہ کر بیٹھا۔ برید کی فوجیں لوٹ گئیں اور دونوں کا مقابلہ ہوا۔ یہاں بھی گولکنڈہ کی فتح ہوئی۔

برید کا جذبۂ انتقام اس کی شکستوں سے اور بڑھ رہا تھا۔ اب اس نے چوتھی مرتبہ ابراہیم عادل شاہ بیجاپور کے اتحاد سے جمشید پر حملہ کیا۔ کئی دن لڑائی ہوئی مگر اس میں بھی جمشید ہی کے سر فتح کا سہرا رہا۔

اس کے بعد جمشید نے ہمیشہ کے لئے برید کا خاتمہ چاہا۔ اس نے دکن کی تمام دوسری ریاستوں کو ہموار کر کے برید پر متفقہ حملہ کیا۔ بیجاپور بھی جو اب تک برید کا دوست تھا، اس اتحاد میں شریک ہو گیا۔ چنانچہ جب برید ہار مان کر بیجاپور بھاگا تو بجائے امن دینے کے ابراہیم نے اسے گرفتار کر لیا لیکن دکن کی سلطنتوں میں کچھ ایسی رقابت تھی کہ بعد کو خود جمشید نے برید کو چھڑا لیا اور بیدر لے جا کر صحیح سلامت چھوڑ دیا۔

بیدر سے واپسی کے بعد جمشید کے دو تین سال آرام میں گزرے لیکن بہت زیادہ دن تک آرام نہ لے سکا۔ وہ بڑے سخت مرض میں مبتلا ہو گیا۔ فرشتہ اسے دق بتاتا ہے لیکن تاریخ قطب شاہی العاذا میں یہ مرض سرطان تھا جس کے صدمہ سے بالآخر ۹۵۰ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے صرف سات سال حکومت کی۔ اس کو سلطان قلی قطب شاہ کے قریب دفن کیا گیا۔

انتہائی برائیوں کے گھٹا ٹوپ میں جو جمشید سے سرزد ہوئی تھیں اس کے کوئی اوصاف روشنی میں نہ آ سکے۔ لیکن اس کی برائیوں کو قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اس میں بہت سے اوصاف ایسے بھی ملتے ہیں جو سراہنے کے قابل ہیں۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے جمشید قطب شاہ ہندوستان کے اچھے حکمرانوں میں سے تھا۔ دکن کی سیاست پر اس کی وسیع نظر تھی۔ سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے وہ ہمیشہ کامیاب ہتھکنڈے اختیار کرتا تھا۔ چنانچہ برید کے شر و فساد سے امن چھڑانے کے لئے احمد نگر اور بیجاپور سے اتحاد کیا تھا۔ اس کی فوجی تنظیم نہایت اچھی تھی۔ وہ خود جری سپاہی تھا اور فوج میں بذات خود حصہ لیتا تھا۔ اس کی دلیری اور جرأت کا یہی نتیجہ تھا کہ سوائے جنگ نانکیڑ کے جہاں عین الملک کے بیٹے کی غفلت سے کام خراب ہوا تھا، گولکنڈہ کی فوجوں کو کبھی شکست نہیں ہوئی اور سلاطین دکن ہمیشہ اس کی امداد کے طالب ہوتے تھے۔ وہ شجاعت کے ساتھ خودداری کا جوہر بھی اپنے اندر رکھتا تھا۔

ان اوصاف کے ساتھ جمشید میں علمی قابلیت بھی تھی۔ وہ اچھا شاعر تھا۔ بعض دفعہ اس نے فی البدیہہ اشعار کہے تھے۔ اس نے فرصت کے موقعوں میں بہت سے قصیدے اور غزلیں بھی لکھی تھیں۔

عبدالحفیظ صدیقی

ابراہیم قلی قطب شاہ

(۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ)

جمشید قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد تخت گولکنڈہ کے کئی دعویدار کھڑے ہوگئے۔ جمشید کا صغیر سن بیٹا سبحان قلی تخت پر بٹھا تو دیا گیا لیکن دو زبردست حریف اٹھ بیٹھے۔ دولت قلی نے گولکنڈہ میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اور ابراہیم قلی بیجانگر سے حصول تخت کے لئے روانہ ہوا۔ دولت قلی کو کسی نہ کسی طرح مقید کر لیا گیا پر ابراہیم قلی کے سامنے کسی کی کچھ پیش نہ گئی اور ۹۵۷ھ میں تخت گولکنڈہ ابراہیم قلی قطب شاہ سے زینت پایا۔ ابراہیم قلی قطب شاہ بڑا مدبر اور دوربین بادشاہ تھا۔ اس نے مصطفےٰ خان کو اپنا وزیر مقرر کیا اور اپنی بہن اس سے منسوب کر دی۔

۹۶۲ھ میں حسین نظام شاہ اور ابراہیم قطب شاہ کے متحدہ لشکر نے گلبرگہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن رام راج والیٔ بیجانگر کی گفت و شنید نے محاصرہ اٹھانے پر مجبور کیا۔

۹۶۶ھ میں علی عادل، رام راج اور ابراہیم قطب شاہ تینوں نے احمد نگر پر حملہ کر دیا۔ قریب تھا کہ احمد نگر فتح ہو جائے لیکن چونکہ اس فتح سے علی عادل کی قوت بہت بڑھ جاتی تھی۔ اور سلطنت گولکنڈہ کو اس سے خدشہ تھا۔ ابراہیم راتوں رات اپنا لشکر لے کر چلا آیا۔ حسین نظام شاہ نے اپنی بیٹی ابراہیم کے عقد میں دی۔ اور اپنے کھوئے ہوئے قلعے واپس لینے کے لئے ابراہیم کی مدد چاہی۔ ابراہیم نے اپنی فوج بھیج دی۔ لیکن یہ مہم مستقل طور پر نہیں لڑی گئی۔ کچھ دن بعد فوج بغیر کسی نتیجہ کے واپس لوٹی۔ اس وقت گولکنڈہ بیرونی حملہ آوروں کی زد میں تھا۔ رام راج کی فوج اندر تک گھس آئی تھی اور بادشاہ کو گولکنڈہ، گھن پورہ، اور پانگل کے قلعے دے کر صلح کرنی پڑا۔ بیرونی دشمن دفع ہو چکا تو اندرونی دشمنوں نے سر اٹھایا۔ ابراہیم قلی نے گولکنڈہ کے حصار کی مرمت کروائی اور شہر کو ہر طرح محفوظ کر لیا۔ اسی اثنا میں نائب وزیروں کا فساد ہوا لیکن بہت جلد فرو کر دیا گیا۔

رام راج کی قوت بہت بڑھ چکی تھی۔ اور وہ اسی زعم میں اپنی ہمسایہ سلطنتوں کو چھیڑ چھیڑ کر اپنی طاقت جتلا رہا تھا۔ مسلمان تو نہیں ایک دوسرے کی دشمن سہی لیکن وقت پر متحد ہونا بھی جانتی تھیں۔ ابراہیم قلی قطب شاہ، حسین نظام شاہ، علی عادل، اور علی برید نے رام راج پر حملہ کر دیا۔ اور مشہور فیصلہ کن جنگ تالی کوٹ ہوئی۔ راجہ کو شکست فاش ہوئی۔ اور ابراہیم کے کھوئے ہوئے قلعے پھر اسے واپس مل گئے۔

۹۷۸ھ میں ابراہیم نے رفعت خاں لاری کو راجمندری کی فتح کے لئے بھیجا۔ دو زبردست معرکوں کے بعد راجمندری پر قطب شاہی افواج قابض ہو گئیں۔

ابراہیم کا دور حکومت نہایت پر آشوب اور معرکہ آرائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ایک فتنہ کا سر دبایا گیا تو دوسرا اٹھا۔ بادشاہ کا لشکر کبھی اتحادیوں کو ان کی بدعہدی کی سزا دینے میں مصروف ہوتا تو کبھی چھوٹے موٹے راجاؤں کو ان کی سرکشی کی۔ شاہی اقبال ہمیشہ یاوری کرتا اور ہر جگہ بادشاہ کو فتح ہوتی۔ ابراہیم قلی قطب شاہ کا انتقال ۹۸۸ھ میں ہوا۔ کل تیس۳۰ سال نو۹ مہینے اس کی حکومت کا زمانہ ہے۔ اس کے زمانے میں گولکنڈہ میں کئی عمارتیں بنیں۔ لنگر دوازدہ امام، ریاض محل، باغ ابراہیم شاہی، حوض حسین ساگر، کنکور، کنکورہ بدویل، کے علاوہ مساجد، مدارس بھی تعمیر پائے۔

رشید قریشی

گولکنڈے کا نیا قلعہ

(قلعہ گولکنڈہ کے پہلو میں سلطان عبداللہ قطب شاہ نے جو نیا قلعہ بنایا تھا اس کی ایک جھلک)

اب بھی رونق پا رہا ہوں تیرے ویرانہ میں، میں
سُن رہا ہوں کچھ، سکوتِ شب کے افسانہ میں، میں

موجزن ہے تشنگی، حوضوں میں پانی کیلئے
ابر جن پر چھا رہا ہے، دُرفشانی کیلئے

ہیں نقوشِ جستجو، تیرے شکستہ بام و در
جن میں کھو جاتی ہے دل کی دھڑکنیں لے کر نظر

تیرے سائے میں ہے اب تک بھی جھلک تلوار کی
تیرے خود رو دشت میں فرحت سی ہے گلزار کی

تیرا ہر پربت ہے، اپنی عظمتوں کا رازداں
تیری خاموشی کے دامن پر ہیں نغموں کے نشاں

نوحہ خواں ہے پُرسکوں تالاب کی سرسبز دُوب
شام کو جس کے کنارے مہر ہوتا ہے غروب

جو خموشی میں ہے کیفیت، کہاں فریاد میں؟
سر بہ سجدہ ہے خدا کا گھر خُدا کی یاد میں

عکسِ ماضی دیکھتا ہوں میں تری تصویر میں
حُسن کاری کا تخیل ہے تری تعمیر میں

پیکرِ مردہ میں تیرے زندگی کی آن ہے
اب بھی محلوں کے کھنڈر کی جاودانی شان ہے

تھی تری بیداری تقدیر سونے کیلئے
تو یوں ہی چھوڑا گیا برباد ہونے کیلئے

آج کر دوں گا نمایاں بے حسی کے داغ کو
اپنے دل کے خون سے سینچوں گا تیرے باغ کو

آج میں تعبیر مانگوں گا فسونِ خواب سے
تیرے حوضوں کو بھروں گا آنسوؤں کے آب سے

ڈوب جائیگی اثر میں آج آہِ آتشیں
ثبت کر دوں گا تری مسجد میں میں نقشِ جبیں

تیرے کھنڈروں میں سکونِ زندگانی پاؤں گا
تیری خاموشی میں ماضی کے ترانے گاؤں گا

میکش

گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت

قطب شاہی خاندان کی حکومت سرزمین حیدرآباد پر تقریباً دو سو سال یعنی ۹۰۱ھ سے ۱۰۹۸ھ تک رہی اور اس عرصہ میں ان حکمرانوں نے یہاں تہذیب، تمدن، تمول، ثروت، علم و فضل اور شعر و سخن کی ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس پر دکن کی تاریخ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ ان بادشاہوں نے شیعہ و سنی اور مسلمان و ہندو غرض ہر مذہب و ملت کے باشندوں میں ایک مشترک کلچر کے پیدا کرنے میں یہاں تک کامیابی حاصل کی تھی کہ دوسروں کے لئے اس ملک کے رہنے والوں کا باہمی اتحاد اور یگانگت باعث رشک تھی۔ اسی موانست و مفاہمت کی خاطر انھوں نے اردو کی سرپرستی کی اور اس زبان میں ایسی ایسی بلند پایہ کتابیں لکھیں اور لکھوائیں جن پر اردو ہمیشہ نازاں رہے گی۔

یوں تو قطب شاہی سلطنت کے بانی سلطان قلی کا تعلق اس سرزمین سے ۸۹۱ھ میں پیدا ہو چکا تھا جب وہ تلنگانہ کا صوبہ دار بنا یا گیا تھا لیکن جب ۹۰۱ھ میں گولکنڈہ اور اس کے اطراف و اکناف کا علاقہ اس کو بطور جاگیر کے دیا گیا تو اس نے اس کا نام محمد نگر رکھا اور قدیم قلعہ کو مستحکم کر کے اس میں متعدد محلات تعمیر کئے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اپنے علاقہ کو وسیع کرنا شروع کیا۔ چنانچہ بائیس سال کے عرصہ میں پانگل، کھمن پیٹھ، کوئیل کنڈہ اور ملگندل وغیرہ اس کے قبضہ میں آ گئے۔ ۹۲۴ھ میں اس نے قلعہ میں بالا حصار کے دامن میں مشہور مسجد صفا بنائی جس میں آخر کار ۹۵۰ھ میں اپنے فرزند یار قلی جمشید کے اشارے سے سلطان قلی قطب شاہ کو ۹۹ ننانوے سال کی عمر میں عصر کی نماز پڑھتے وقت شہید کیا گیا۔ اس نے دوسرے صوبہ داروں کی طرح بہمنی بادشاہ کے خلاف علم بغاوت نہیں بلند کیا بلکہ آخر تک ان کی مدد کرتا رہا اور جب بریدیوں نے بہمنیوں پر پوری طرح قبضہ کر لیا تو مجبوراً سلطان قلی کو بھی اپنی بادشاہت کا اعلان کرنا پڑا۔

سلطان قلی کو فن تعمیر کا خاص ذوق تھا۔ اس نے قدیم قلعہ (موجودہ بالا حصار) کے اطراف ایک عالیشان شہر بنایا۔ اور دراصل وہی اس طرز تعمیر کا بھی بانی ہے جو قطب شاہی کہلاتا ہے اور ایرانی، ہندو، اور پٹھان طرز ہائے تعمیر کے امتزاج سے بنا ہے اس کی وفات کے وقت اس کی سلطنت شمال میں دریائے گوداوری، مشرق میں اڑیسہ اور ساحل سمندر اور جنوب میں دریائے کرشنا تک پھیل چکی تھی۔

۲ جمشید قلی قطب شاہ تخت نشین ہوتے ہی اپنی سلطنت کے استحکام و وسعت میں مصروف ہو گیا۔ اگرچہ اس کا سات سال کا مختصر سا عہد حکومت زیادہ تر جنگ و جدل سخت گیریوں اور پریشانیوں میں گذر گیا۔ لیکن اس نے نارائن کھیڑ، احسن آباد اور میدک پر قبضہ کر کے قطب شاہی سلطنت میں اضافہ کیا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ لیکن اس کے عہد میں گولکنڈہ اردو شعر و سخن کا مرکز نہ بن سکا۔ اس کی وفات ۹۵۷ھ پر اس کے کمسن لڑکے سبحان قلی کو تخت نشین کیا گیا لیکن چند ماہ بعد ہی اس کا دوسرا بھائی ابراہیم قلی کوئیل کنڈہ کے نائیک واڑیوں کی مدد سے قلعہ گولکنڈہ میں داخل ہوا۔ اور اپنے بھائی کے مظالم کی تلافی کرنے میں مصروف ہو گیا۔

۳ سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ کی شخصیت کو دکن کی سیاست میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اسی کے زمانہ میں ۹۷۲ھ میں تالی کوٹہ کی مشہور لڑائی ہوئی جس میں وجیانگر کی عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی گولکنڈہ کو مال و دولت اور سیاسی حیثیت سے کافی اہمیت حاصل ہو گئی۔ بعد میں ابراہیم قطب شاہ نے راجمندری، قائم کوٹ اور کھم میٹھ وغیرہ کے علاقے بھی مسخر کئے۔ اس نے ۹۸۸ھ میں انتقال کیا۔ اس کو بھی اپنے باپ کی طرح تعمیر کا شوق تھا۔ چنانچہ بالا حصار کی سیڑھیوں کی مسجد، موسیٰ ندی کا پہلا پل، حسین ساگر بدویل کا تالاب، ابراہیم باغ، باغ گلشن، اور قصبہ ابراہیم پٹن اس کی تعمیری یادگار ہیں۔ اس کے عہد میں گولکنڈہ اردو زبان کا مرکز بن گیا۔ اور فیروز، محمود، احمد، اور وجہی جیسے بلند پایہ شعراء

اُسی کی قدر دانی اُردو کی وجہ سے متعدد بیش بہا کتابیں اس زبان میں تصنیف کر سکے ۔

۴ ابراہیم کے بعد اس کا تیسرا لڑکا سلطان محمد قلی تخت نشین ہوا جس نے ۹۹۹ھ میں اپنی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر بھاگ نگر کی بنا ڈالی۔ اور عالیشان محلات، حمام، مساجد، مدارس اور بازار وغیرہ تعمیر کیے۔ بھاگ نگر کے اطراف و اکناف بیس میل تک باغات بنائے گئے۔ ترکھوڑہ، ابراہیم پٹن، جہانگیر، اور مومن پیٹ اس شہر کے حدود پر واقع تھے۔ سترہ برس کے بعد غالبًا اپنی اکلوتی لڑکی شہزادی حیات بخشی بیگم کی شادی کے موقعہ پر بادشاہ نے اس پر بستی بھاگ نگر کا نام حیدرآباد قرار دیا۔

محمد قلی قطب شاہ نے ۱۰۰۳ھ میں سگر اور ہندیال وغیرہ فتح کیا۔ اس کے زمانہ میں گولکنڈہ بہ لحاظ سے عروج کمال کو پہنچ گیا۔ شاہ عباس صفوی کا سفیر اغزلو سلطان اسی عہد میں گولکنڈہ آیا تھا۔ علم و فضل اور شعر و سخن کے لحاظ سے بھی یہ دور دکن کا عہد زرین سمجھا جاتا ہے۔ اسی دور میں اور بنے قطب شاہی سلطنت اور خاص کر گولکنڈہ اور حیدرآباد میں معراج کمال حاصل کیا اور اس سرزمین نے تمدن و معاشرت کے وہ نادر مثال [illegible] ایسے جو کسی ملک کو متمدن اور شائستہ ثابت کرتے ہیں۔ اسی زمانہ میں گولکنڈہ مختلف اقطاع عالم کے سیاحوں اور علماء و فضلا کا مرجع و مامن بھی بن گیا تھا۔

سلطان محمد قلی نے جنگ و جدل سے زیادہ امن و امان، اور ملک کی وسعت سے زیادہ اہل ملک کی خوش حالی اور رعایا کی تعلیمی ترقی پر زور دیا۔ وہ خود بہت بڑا شاعر اور قدر دانِ سخن تھا۔ اس نے تین زبانوں فارسی، اردو اور تلنگی میں اپنے دیوان مرتب کیے تھے۔ اس کا اردو کلام نہایت [illegible] ہے۔ اس کا دربار شاعروں سے معمور تھا۔

حیدرآباد کی اکثر عمارتیں اسی صاحب ذوق بادشاہ کی یادگار ہیں۔ ان میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں:۔

چار مینار، چار کمان، چار سو کا حوض، دار الشفا، جامع مسجد، داد محل، ندی محل، نبات گھاٹ، باغ دلکشا، خداداد محل (جو ہفت منزلہ تھا اور ہر منزل کا نام جدا تھا مثلاً الٰہی محل، محمدی محل، حیدری محل، حسینی محل، حسنی محل، جعفری محل اور موسوی محل)، باغ محمد شاہی، کوہ طور، جنان منزل اور بادشاہی عاشور خانہ وغیرہ۔

۵ محمد قلی قطب شاہ کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد مرزا، سلطان محمد قطب شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس کی شادی حیات بخشی بیگم بنت سلطان محمد قلی کے ساتھ سنہ ۱۰۱۶ھ میں نہایت تزک و احتشام سے ہوئی تھی۔ اس کا عہد حکومت بھی امن و امان اور خوش حالی میں گذرا۔ اس کے دور میں شہزادہ خرم نے جو بعد میں شاہجہاں کے لقب سے جہانگیر کا جانشین ہوا باپ سے بغاوت کرکے اور اس کی فوجوں سے شکست پاکر قطب شاہی سلطنت میں پناہ لی تھی۔ سلطان محمد نے اس کے ساتھ ہمدردی کی اور ایسے وقت میں اس کی مالی امداد کی جب کہ وہ بالکل محتاج تھا اور اکثر رفیقوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

سلطان محمد قطب شاہ نے اپنے چچا کی قدر دانی شعر و سخن کو جاری رکھا لیکن وہ شاعر ہونے کے علاوہ عالم و فاضل بھی تھا۔ اس نے شعر و سخن اور علم و فضل کے ساتھ زہد و تقویٰ اور اخلاق و آداب کا بھی خاص خیال رکھا۔ اسی کے عہد میں اس خاندان کی مشہور تاریخ سلطان محمد قطب شاہی لکھی گئی۔ اس کے دور میں بھی دکن کے حکمرانوں کے علاوہ جہانگیر اور شاہ عباس صفوی کے سفرا گولکنڈہ آتے تھے۔ اس کے عہد کے اردو شاعروں میں وجہی کے علاوہ غواصی اور ابن نشاطی کے نام خاص کر قابل ذکر ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ سلطان محمد کو بھی اپنے اجداد کی طرح فن تعمیر سے خاص شغف تھا۔ اس نے قلعہ محمد نگر گولکنڈہ کے مقابل میں حیدرآباد کے مشرقی جانب چھ میل کے فاصلہ پر ایک قلعہ سلطان نگر کی سنہ ۱۰۳۲ھ میں بنا ڈالی لیکن اس کا بہت جلد انتقال ہو گیا اور وہ قلعہ ناتمام رہا۔ اس کے علاوہ اسی سلطان نے مکہ مسجد، محل سلطان شاہی، اور گوشہ محل کی بھی بنا ڈالی تھی مگر اس کا کوئی کام اس کی زندگی میں تکمیل نہ پا سکا۔ اس کی جوانمرگی نے اس کو ہر طرح سرماں نصیب رکھا۔ اگر وہ چند اور سال زندہ رہ جاتا تو گولکنڈہ کی سلطنت اس قدر جلد زوال پذیر نہ ہونے پاتی۔

۶ سلطان محمد کے بعد اس کا اکلوتا لڑکا عبداللہ مرزا ۱۰۳۵ھ میں بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور بادشاہ کی یہ کم عمری اور ناتجربہ کاری قطب شاہی سلطنت کی کمزوری کا باعث ہوئی۔ سلطان عبداللہ کی کمزوریوں سے سب سے زیادہ محمد سعید میر جملہ نے فائدہ اٹھایا۔ آخر کار جب بادشاہ نے اس سرکش کا استیصال کرنا چاہا تو اس نے شہزادہ اورنگ زیب کے یہاں پناہ لی اور قطب شاہی سلطنت اور اس کے حکمران کی کمزوریوں سے غنیم کو واقف کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گولکنڈہ کی آزادی قائم نہ رہ سکی۔ اور اس کی عظمت و شوکت کا آفتاب غروب ہونے لگا۔

ان سیاسی پریشانیوں کے علاوہ سلطان عبداللہ کے عہد میں حیدرآباد کو ایک تباہ کن قحط اور پھر ایک زبردست طغیانی رود موسیٰ کی وجہ سے سخت صدمات اٹھانے پڑے۔ لیکن ان سب صدموں سے بڑھ کر اہل حیدرآباد جس پریشانی اور ذلت سے متاثر ہوئے جو ۱۰۶۶ھ میں میر جملہ کی وجہ سے اورنگ زیب کے حملہ کی شکل میں نمودار ہوئی۔ اس وقت مغلوں نے لوٹ مار کے سلسلہ میں حیدرآباد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور تمام شہر کو تباہ کر کے چھوڑا۔

غرض عبداللہ قطب شاہ کی زندگی پریشانیوں اور کشمکشوں میں گذر گئی۔ وہ آخر دم تک اولاد نرینہ کا متمنی رہا۔ اور اسی یاس و امید میں ایک پوری نصف صدی گذار دی۔ پچاس سال کی طویل حکومت کے بعد سلطان عبداللہ نے ۱۰۸۳ھ میں انتقال کیا اور در اصل اس کے ساتھ ہی قطب شاہی حکمرانوں کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ وہ بھی اردو زبان کا ایک اچھا شاعر تھا اس کے عہد میں بھی علم و فضل اور شعرا و شاعری کی قدردانی جاری رہی فارسی کی مشہور فرہنگ برہان قاطع اور اردو کی مشہور کتابیں سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ، پھول بن، اور ماہ پیکر وغیرہ۔ اسی دور کی یادگار ہیں۔

۷ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے بعد اس کا چھوٹا داماد ابوالحسن تاناشاہ تخت نشین ہوا وہ چودہ برس تک قطب شاہوں کی اس امانت یعنی سلطنت گولکنڈہ کو دشمنوں سے بچاتا رہا۔ وہ نہایت دوراندیش اور قلندر منش حکمران تھا۔ اس نے قلیل عرصہ میں قطب شاہی سلطنت کے ان تمام کل پرزوں کو درست کر لیا جو سلطان عبداللہ کے پچاس سال کے طویل عہد حکومت میں بالکل کمزور اور منتشر ہو گئے تھے۔ اگر شہنشاہ اورنگ زیب جیسے طاقتور دشمن سے مقابلہ ہوتا اور تمام ہندوستان کی فوجیں اس کے مقابلہ کے لئے جمع نہ ہو جاتیں تو وہ قطب شاہوں کی اس امانت کو اپنی اولاد تک نہایت مستحکم اور طاقتور حالت میں منتقل کر سکتا۔ اس کے عہد میں بھی حیدرآباد اردو شاعروں اور انشا پردازوں کا مرکز بنا رہا۔ طبعی اور غلام علی جیسے بلند مرتبہ شاعر اس وقت بھی موجود تھے۔ جنھوں نے وجہی و غواصی کے خدمات شعر و سخن کو بوجہ احسن جاری رکھا۔

سلطان ابوالحسن قطب شاہ نے جس خوبی اور مردانگی سے مغلوں کا مقابلہ کیا اور اثنائے جنگ میں اس کا برتاؤ جیسا شریفانہ اور بہادرانہ رہا اس کے تذکرے خاص و عام کی زبان پر اب تک جاری ہیں اس نے قطب شاہی افواج کی اخلاقی حالت اس قدر درست کر دی تھی کہ دشمن بھی اعتراف کرتے تھے۔ اگر اورنگ زیب کا تدبر اور میر جملہ کے جانشین غدار قطب شاہی امرا کا مکر و فریب کارگر نہ ہوتا تو شاید ہی گولکنڈہ فتح ہو سکتا۔

(ماخوذ از سیر گولکنڈہ)

سید محی الدین قادری زور

(۹۲۴ھ تا ۹۵۰ھ)

سلطان قلی قطب شاہ سلطنت گولکنڈہ کا بانی ہے۔ وہ ترکستان کے ایک بہت بڑے اور مشہور حکمراں قبیلے قراقونیلو کا رکن تھا وہ ۹۰۰ھ میں دکن آیا تھا۔ اس کے دکن آنے کا سبب خاندان شاہیہ کی تباہی اور قبیلہ آق قونیلو کا ترکستان پر تسلط ہے۔ وہ اپنے چچا اللہ قلی کے ساتھ قیمتی تحفے وغیرہ لے کر ہندوستان آیا تھا۔

سلطان قلی ترکستان سے سیدھا دکن آیا۔ یہ محمود شاہ بہمنی کا عہد حکومت تھا جبکہ بیدر تمام ممالک عجم کا مرجع بن گیا تھا۔ ان کے خاندانی حالات اور وجاہت کو دیکھ کر بہمنی دربار نے ان کی بہت آؤبھگت کی۔ سلطان قلی اپنے چچا کے ساتھ جب پہلی مرتبہ دکن آیا تو دونوں کے لئے تاقیام وظیفہ قائم رکھا گیا تھا۔ دوسری مرتبہ آیا تو بہت سی عنایتیں ہوئیں اور ان کو ٹھہر جانے کے لئے مجبور کیا گیا۔ یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے سلطان قلی دربار دکن سے بہت متاثر ہوا تھا۔

چند دنوں کے بعد ترکستان کے حاکم امیر یعقوب کے مرنے کی خبر آئی اور یہ ہمدان کے شاہی خاندان کے لئے اچھا موقع تھا۔ اللہ قلی بیگ نے بادشاہ سے مراجعت کی اجازت چاہی۔ اللہ قلی کے اصرار پر اس کو تو اجازت مل گئی لیکن بادشاہ نے کہا کہ "اللہ قلی بیگ اگر نمی رود مختاری، مگر سلطان قلی بیگ را بہ ہیچ وجہ رخصت انصراف نمی دہم"۔ اس کے علاوہ خود سلطان قلی بھی واپس نہیں جانا چاہتا تھا اس لئے اللہ قلی کو مجبوراً تنہا لوٹنا پڑا۔ اور سلطان قلی دکن میں رہ گیا۔

سلطان قلی کی استقامت سے محمود شاہ بہت خوش تھا۔ اس کو اپنے مقرب درباریوں میں شریک کر لیا۔ اس کی ترقی کا بڑا سبب اس کی ذاتی قابلیت تھی۔ شکار کے مشہور واقعہ کے بعد اس کو ایک سو پچاس عربی و ترکی گھوڑے مع ساز و سامان عطا ہوئے اور خلعت عنایت کی گئی اور اس کے اخراجات کے لئے کوڑنگل اور اس کے مضافات دئیے گئے اور خواص خاں خطاب سرفراز ہوا۔ سلطان قلی علم حساب اچھا جانتا تھا اور خوش خط بھی تھا اسی لئے بادشاہ نے اس کو شاہی محلات کا محاسب بنایا۔ اس کی بڑی قابلیت کا اظہار تلنگانہ کے پرگنوں میں ہوا جہاں وہ خود اپنی خواہش سے ڈاکوؤں کی سرکوبی اور ادائی مالگزاری کے لئے رعایا کو پابند کرنے گیا تھا۔ چونکہ اس میں علمی اور فوجی دونوں قابلیتیں تھیں اس کو فرامین میں صاحب السیف والقلم کہا جاتا تھا۔

اس کے بعد سلطان قلی کی قابلیت اس وقت ظاہر ہوئی جبکہ ۸۹۲ھ میں اہل بیدر نے باہر والوں سے انتقام لینے کے لئے قلعہ پر حملہ کر دیا تھا۔ خود بادشاہ کی جان سخت خطرے میں تھی قلعہ دار حسن علی سبزواری اور سید میرزائی مشہدی کے ساتھ سلطان قلی بھی مع دس ہزار سوار جوانوں کے موجود تھا۔ یہاں سلطان قلی کی سعی و جانثاری اس کی غیر معمولی ترقی کا باعث ہوئی چنانچہ بادشاہ نے خوش ہو کر اس کو قطب الملک کا خطاب دیا تھا۔

اس کے تین سال بعد ۸۹۵ھ میں مغربی ساحل کی بغاوت سلطان قلی کے لئے مزید ترقی کا باعث ہوئی۔ یعنی وہ تمام ممالک تلنگانہ کا صوبہ دار بن گیا۔ بہمنی امیر بہادر گیلانی کی سرکوبی میں اس نے بڑا حصہ لیا۔ جب بادشاہ مغربی ساحل کی مہم سے فارغ ہو کر بیدر آیا تو قطب الملک سلطان قلی کو تلنگانہ کا صوبہ دار بنا دیا۔ اور اس کی قدیم جاگیر میں گولکنڈہ اور ورنگل کا اضافہ کیا۔

دکن کے سیاسی انتشار نے بھی سلطان قلی کی مدد کی۔ اسی انتشار میں وہ ترقی کر کے گولکنڈہ کی خود مختار سلطنت قائم کر سکا۔ دکن میں ملکی اور غیر ملکی عناصر کی کشمکش اور حکومت کی کمزوریوں سے جب بہمنی سلطنت کا دسویں صدی ہجری کے اوائل میں خاتمہ ہوا اور اس کے حصے بخرے ہونے لگے تو بیجاپور، احمد نگر،

اور برار کے ساتھ گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت بھی قائم ہوگئی۔

۹۲۴ھ میں سلطان محمود کے انتقال کے بعد وہ خودمختار ہوا اور اس کے بعد اس نے گولکنڈہ کو پایۂ تخت بنایا۔ قلعہ اور شہر کی تعمیر کی۔ فوجی نقطۂ نظر سے گولکنڈہ نہایت موزوں سمجھا گیا۔ اپنے مرکز کے استحکام کے بعد اس نے مشرقی تلنگانہ کے مختلف صوبوں پر وار کرنے شروع کئے۔ تقریباً ۲۰ سال کے دوران میں ساٹھ ستر قلعے اور حصار فتح کئے۔ اور سلطنت کو بنگال کی سرحد سے تقریباً متصل بنا دیا۔

۹۵۰ھ اواخر جمادی الاول میں اس کے بیٹے جمشید نے تخت سلطنت کی ہوس میں اسے قتل کروادیا۔ اس نے تقریباً پچاس سال دکن میں حکومت کی۔ اگر اس کا ابتدائی زمانہ بھی شامل کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے تقریباً ساٹھ سال سیاست دکن کی رہنمائی کی۔ اسی مدت میں اس نے جنوبی ہند کے تمدن و سیاست میں ایک بڑا تغیر پیدا کیا تھا۔ یہاں کی منتشر امیروں کو ایک رشتہ میں منسلک کرکے اس ملک کی خاطر خواہ شیرازہ بندی کردی تھی اور باضابطہ نظم و نسق سے یہاں امن و امان قائم کر دیا تھا۔

جمشید قطب شاہ
(۹۵۰ھ تا ۹۵۷ھ)

سلطان قلی قطب شاہ نے ۵۰ سالہ عہد حکومت کے بعد ۹۹ سال کی عمر میں ... گولکنڈہ کی زرخیز سلطنت کو منتظم حالت میں چھوڑ گیا تھا۔ اس کے ۶ بیٹے تھے۔ فرزند اکبر حیدر قلی جو جانشینی کے لئے نامزد ہوچکا تھا باپ کی زندگی میں انتقال کرلیا۔ اس کے بعد سلطان قلی قطب شاہ نے اپنے دوسرے بیٹے قطب الدین کو ولیعہد بنایا لیکن اس کے مقابلہ میں اس کے دوسرے بھائی جمشید قلی، عبدالکریم اور دولت قلی بہت تیز طبیعت اور حوصلہ مند تھے۔ چھوٹا بیٹا ابراہیم قطب دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ لائق تھا۔ عبدالکریم باپ کی زندگی ہی میں بغاوت کی پاداش میں مارا گیا۔ اور جمشید اور دولت بھی بنظر احتیاط قید رکھے گئے تھے۔ لیکن جمشید قلی جو گولکنڈہ ہی میں مقید تھا اپنے لئے قید میں سے راستہ صاف کرنے لگا۔ اس نے سازش کی اور ایک شخص میر محمود ہمدانی کے ذریعہ اپنے باپ کو قتل کروایا۔ باپ کے مرنے کے بعد جمشید قید سے باہر نکلا اور اپنے ہمدردوں کے زور سے سلطنت کے سیاہ و سفید اپنے ہاتھ کرلیے۔ قطب الدین ولیعہد سلطنت اندھا کردیا گیا۔

۹۵۰ھ میں جمشید قطب شاہ کی تخت نشینی عمل میں آئی اور ۹۵۷ھ تک سات سال اس نے حکومت کی۔ اگرچہ تخت نشینی کے بعد جمشید نے رعایا و برایا کو خوش کرنے کی کوشش کی اور انھیں مختلف انعامات سے سرفراز کیا لیکن راعی و رعایا میں کچھ خوشگوار تعلقات نہ پیدا ہوسکے۔ پہلے تو اس کے کرتوت ہی اس کی بدنامی کے لئے کافی تھے پھر تخت نشینی کے بعد جبکہ اس کی عمر ۰ سال کی تھی، طبیعت کی ترشی اور تند مزاجی نے اس کے بہت سے مخالف پیدا کردئے۔ جمشید کا چھوٹا بھائی ابراہیم جو دیورکنڈہ سے بھاگ کر ملک برید کے پاس بیدر پہنچ گیا تھا برید کی امداد کے ساتھ گولکنڈہ کی دیواروں تک پہنچ گیا۔ اگرچہ یہ حملہ برہان نظام شاہ والی احمد نگر کی تائید سے رفع ہوگیا تھا لیکن ملک برید اس حملہ کے بعد سے گولکنڈہ کی اندرونی سیاسی فضا اور جمشید کی کمزوریوں سے واقف ہوگیا۔ بیدر کی بریدشاہی سلطنت بہت مختصر تھی لیکن اس زمانہ میں برید دکن کی لومڑی کہلاتے تھے۔ وہ آپس کے جوڑ توڑ میں بہت مشاق تھے کبھی بیجاپور کا ساتھ دیا تو کبھی احمد نگر کا۔ ہر حیلہ و بہانہ سے ان سلطنتوں کو لڑادیا کرتے تھے تاکہ اس طرح سے ان کا فائدہ ہو جائے۔ چنانچہ جمشید کے زمانے میں ایسی لڑائیاں بہت کم ہوئی ہیں۔

برہان نظام شاہ نے جمشید قلی قطب شاہ سے زیادہ دوستی بڑھائی۔ بیجاپور پر احمد نگر نے حملہ کیا تو عماد الملک اور جمشید دونوں احمد نگر کے ساتھ شریک تھے۔ لیکن ابراہیم عادل شاہ کی تائید پر برید کی فوجیں تھیں۔ کہتے ہیں کہ اس موقع پر جمشید ہی نے بڑا کام کیا۔ اس کے آگے بڑھنے سے ابراہیم اور برید میدان چھوڑ کر بھاگ گئے اور جمشید نے برید کا بیدر کی دیواروں تک تعاقب کیا۔

اس شکست کے بعد برید خاموش کیسے بیٹھ سکتا تھا۔ انتقام لینے کے لئے برید نے غالباً ۹۴۲ھ میں گولکنڈہ پر حملہ کر دیا۔ لیکن جمشید نے بڑی ہوشیاری کی۔ تھوڑی سی فوج یہاں چھوڑ کر چپکے سے بیدر پر حملہ کر بیٹھا۔ برید کی فوجیں لوٹ گئیں اور دونوں کا مقابلہ ہوا۔ یہاں بھی گولکنڈہ کی فتح ہوئی۔ برید کا جذبۂ انتقام اس کی شکستوں سے اور بڑھ گیا تھا۔ اب اس نے چوتھی مرتبہ ابراہیم عادل شاہ بیجاپور کے اتحاد سے جمشید پر حملہ کیا۔ کئی دن لڑائی ہوئی مگر اس میں بھی جمشید ہی کے سر فتح کا سہرا رہا۔

اس کے بعد جمشید نے ہمیشہ کے لئے برید کا خاتمہ چاہا۔ اس نے دکن کی تمام دوسری ریاستوں کو ہموار کر کے برید پر متفقہ حملہ کیا۔ بیجاپور بھی جو اب تک برید کا دوست تھا اس اتحاد میں شریک ہو گیا۔ چنانچہ جب برید ہار مان کر بیجاپور بھاگا تو جان دینے کے ابراہیم نے اسے گرفتار کر لیا لیکن دکن کی سلطنتوں میں کچھ ایسی رقابت تھی کہ بعد کو خود جمشید نے برید کو چھڑا لیا اور بیدر لے جا کر صحیح سلامت چھوڑ دیا۔

بیدر سے واپسی کے بعد جمشید کے دو تین سال آرام میں گزرے۔ لیکن یہ کچھ زیادہ دن تک آرام نہ لے سکا۔ وہ بڑے سخت مرض میں مبتلا ہو گیا۔ فرشتہ اسے دق بتاتا ہے لیکن تاریخ قطب شاہی کے الفاظ میں یہ مرض سرطان تھا جیسے صدمہ سے ماہ آخر ۹۵۰ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے صرف سات سال حکومت کی۔ اس کو سلطان قلی قطب شاہ کے قریب دفن کیا گیا۔

انتہائی برائیوں کے گھٹا ٹوپ میں جو جمشید سے سرزد ہوئی تھیں اس کے کوئی اوصاف روشنی میں نہ آسکے۔ لیکن اس کی برائیوں کو قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اس میں بہت سے اوصاف ایسے بھی ملتے ہیں جو سراہنے کے قابل ہیں۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے جمشید قطب شاہ ہندوستان کے اچھے حکمرانوں میں سے تھا۔ دکن کی سیاست پر اس کی وسیع نظر تھی۔ سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے وہ ہمیشہ کامیاب ہتھکنڈے اختیار کرتا تھا۔ چنانچہ برید کے شر و فساد سے دامن چھڑانے کے لئے احمد نگر اور بیجاپور سے اتحاد کیا تھا۔ اس کی فوجی تنظیم نہایت اچھی تھی۔ وہ خود بھی سپاہی تھا اور فوج میں بذات خود حصہ لیتا تھا۔ اس کی دلیری اور جرأت کا یہی نتیجہ تھا کہ سوائے جنگ ناانکیرا کے جہاں عین الملک کے بیٹے کی غفلت سے کام خراب ہو گیا تھا گولکنڈہ کی فوجوں کو کبھی شکست نہیں ہوئی اور سلاطین دکن ہمیشہ اس کی امداد کے طالب ہوتے تھے۔ وہ شجاعت کے ساتھ خودداری کا جوہر بھی اپنے اندر رکھتا تھا۔

ان اوصاف کے ساتھ جمشید میں علمی قابلیت بھی تھی۔ وہ اچھا شاعر تھا بعض دفعہ اس نے فی البدیہہ اشعار کہے تھے۔ اس نے فرصت کے موقعوں میں بہت سے قصیدے اور غزلیں بھی لکھی تھیں۔

عبدالحفیظ صدیقی

ابراہیم قلی قطب شاہ

(سنہ ٩٥٧ھ تا سنہ ٩٨٨ھ)

جمشید قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد تخت گولکنڈہ کے کئی دعویدار کھڑے ہو گئے۔ جمشید کا صغیر سن بیٹا سبحان قلی تخت پر بٹھا دیا گیا لیکن دو زبردست حریف اٹھ بیٹھے۔ دولت قلی نے گولکنڈہ میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اور ابراہیم قلی بیجا نگر سے حصولِ تخت کے لئے روانہ ہوا۔ دولت قلی کو کسی نہ کسی طرح مقید کر لیا گیا پر ابراہیم قلی کے سامنے کسی کی کچھ پیش نہ گئی اور سنہ ٩٥٧ھ میں تخت گولکنڈہ ابراہیم قلی قطب شاہ سے زینت پایا۔ ابراہیم قلی قطب شاہ بڑا مدبر اور دور بین بادشاہ تھا۔ اس نے مصطفےٰ خان کو اپنا وزیر مقرر کیا اور اپنی بہن اس سے منسوب کر دی۔

سنہ ٩٦٢ھ میں حسین نظام شاہ اور ابراہیم قطب شاہ کے متحدہ لشکر نے گلبرگہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن رام راج والئی بیجا نگر کی گفت و شنید نے محاصرہ اٹھا لینے پر مجبور کیا۔

سنہ ٩٦٥ھ میں علی عادل، رام راج اور ابراہیم قطب شاہ تینوں نے احمد نگر پر حملہ کر دیا۔ قریب تھا کہ احمد نگر فتح ہو جائے لیکن چونکہ اس فتح سے علی عادل کی قوت بہت بڑھ جاتی تھی۔ اور سلطنت گولکنڈہ کو اس سے خدشہ تھا۔ ابراہیم راتوں رات اپنا لشکر لے کر چلا آیا۔ حسین نظام شاہ نے اپنی بیٹی ابراہیم کے عقد میں دی۔ اور اپنے کھوئے ہوئے قلعے واپس لینے کے لئے ابراہیم کی مدد چاہی۔ ابراہیم نے اپنی فوج بھیج دی لیکن یہ مہم مستقل طور پر نہیں لڑی گئی۔ کچھ دن بعد فوج بغیر کسی نتیجہ کے واپس لوٹی۔ اس وقت گولکنڈہ بیرونی حملہ آوروں کی زد میں تھا۔ رام راج کی فوج اندر تک گھس آئی تھی اور بادشاہ کو گولکنڈہ، گھن پورہ، اور پانگل کے قلعے دے کر صلح کر لینا پڑا۔ بیرونی دشمن دفع ہو چکا تو اندرونی دشمنوں نے سر اٹھایا۔ ابراہیم قلی نے گولکنڈہ کے حصار کی مرمت کروائی اور شہر کو ہر طرح محفوظ کر لیا۔ اسی اثنا میں نائب وزیروں کا فساد ہوا لیکن بہت جلد فرو کر دیا گیا۔

رام راج کی قوت بہت بڑھ چکی تھی۔ اور وہ اسی زعم میں اپنی ہمسایہ سلطنتوں کو چھیڑ چھیڑ کر اپنی طاقت جتلا رہا تھا۔ مسلمان قومیں ایک دوسرے کی دشمن سہی لیکن وقت پر متحد ہو جانا بھی جانتی تھیں۔ ابراہیم قلی قطب شاہ، حسین نظام شاہ، علی عادل، اور علی برید نے رام راج پر حملہ کر دیا۔ اور مشہور فیصلہ کن جنگ تالی کوٹ ہوئی۔ راجہ کو شکست فاش ہوئی۔ اور ابراہیم کے کھوئے ہوئے قلعے پھر اسے واپس مل گئے۔

سنہ ٩٧٦ھ میں ابراہیم نے رفعت خاں لاری کو راجمندری کی فتح کے لئے بھیجا۔ دو زبردست معرکوں کے بعد راجمندری پر قطب شاہی افواج قابض ہو گئیں۔

ابراہیم کا دورِ حکومت نہایت پر آشوب اور معرکہ آرائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ایک فتنہ کا سر دبایا گیا تو دوسرا اٹھا۔ بادشاہ کا لشکر کبھی اتحادیوں کو ان کی بد عہدی کی سزا دینے میں مصروف ہوتا تو کبھی چھوٹے موٹے راجاؤں کو ان کی سرکشی کی۔ شاہی اقبال ہمیشہ یاوری کرتا اور ہر جگہ بادشاہ کو فتح ہوتی۔ ابراہیم قلی قطب شاہ کا انتقال سنہ ٩٨٨ھ میں ہوا۔ کل تیس سال نو مہینے اس کی حکومت کا زمانہ ہے۔ اس کے زمانے میں گولکنڈہ میں کئی عمارتیں بنیں۔ لنگر دوازدہ امام، ریاض محل، باغ ابراہیم شاہی، حوض حسین ساگر، کنکورہ، کنکورہ بدویل، کے علاوہ مساجد، مدارس بھی تعمیر پائے۔

رشید قریشی

ابراہیم قلی قطب شاہ
۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ

محمد قلی قطب شاہ
بانی حیدرآباد
۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ

قومی تعمیر کی بنیاد رکھی اور اس کو آگے بڑھانے کی پوری کوشش کی، دوسری طرف ترقی صنعت کے ذریعہ ملک کا تمدنی پایہ بلند کیا۔ اس کے زمانہ کے عظیم الشان تعمیری آثار اس حقیقت کی پوری نشان دہی کرتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ تلنگی زبان کا بڑا عالم تھا اور روایت ہے کہ اس نے تلنگی میں ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ وہ پہلا آدمی ہے جس نے حیدرآباد میں اردو میں شاعری کی۔ اس کی نظمیں اور غزلیں اس کے ادبی ذوق اور ارتقائے اردو کے بہترین نمونے ہیں۔ ان نظموں سے معلوم ہوتا ہے اس کو مقامی معاشرت اور روایات سے بھی گہری دلچسپی تھی۔

محمد قلی قطب شاہ کے تمدنی کارناموں کی ایک بڑی فہرست ہے۔ صرف شہر حیدرآباد اور اس کی تعمیر اس بادشاہ کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے حیدرآباد کی تعمیر کی صحیح تاریخ نامعلوم ہے۔ شہر کے بیچ میں ایک سڈول عمارت چارمینار کی تاسیس ۹۹۹ھ میں ہوئی تھی غالباً یہ ڈیڑھ دو سو سال میں تیار ہوئی اور "یا حافظ" سے اس کی تاریخ نکلتی ہے۔ شہر کی تعمیر کا بڑا مقصد ملک میں ایک اجتماعی زندگی پیدا کرنا تھا۔ بادشاہ نے شہر کی تعمیر کے ساتھ اس بات کا پورا لحاظ رکھا تھا کہ اس میں ایک متمدن زندگی کی تمام ضرورتیں مہیا ہوں۔ شہر و عمارات کی خوش اسلوبی و عظمت کی وجہ سے گولکنڈہ کے مورخ کا یہ کہنا کہ "تمامی ہندوستان عدیلے ندارد" بڑی حقیقت پر مبنی ہے۔

عبدالحفیظ صدیقی

سلطان محمد قطب شاہ

(۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵ھ)

سلطان محمد قلی وصیت کر گیا تھا کہ اس کے بھتیجے سلطان محمد کو تخت پر بٹھایا جائے۔ اس لئے سلطان محمد [illegible] شاہ تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر [illegible] سال تھی سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ راجہ [illegible] کی مہم کا تصفیہ کرنا تھا۔ راجہ [illegible]

[illegible]

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مغلوں کا اثر دکن پر روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اور مصلحت وقت یہی تھی کہ [illegible] مغلوں سے صلح کر لی گئی۔ [illegible] شاہ جہاں [illegible] شہزادہ [illegible] کی حیثیت سے دکن میں مارا مارا پھر رہا تھا سلطان محمد نے اس کی بڑی مہمان داری کی۔ سلطان محمد بہت مہمان نواز اور فراخ دل بادشاہ تھا۔ اس کے دربار میں دور دور کے [illegible] حاضر رہتے اور بڑی بڑی تنخواہیں پاتے۔

سلطان محمد کا بڑا بیٹا عبداللہ ۱۰۲۳ھ میں پیدا ہوا۔ بادشاہ نے ۱۲ سال تک اس کی صورت نہ دیکھی۔ کیونکہ نجومیوں اور رمالوں کی رائے تھی۔ بارہ سال [illegible] بادشاہ نے اپنے بیٹے کی صورت دیکھی بھی تو کچھ نہ ہوا۔ [illegible] بادشاہ کو [illegible] طبیبوں کے باہمی اختلاف نے مرض کو اور بڑھا دیا اور ۱۰۳۵ھ میں ۳۳ سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا۔ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کی صحیح تاریخ ملنی بہت مشکل ہے [illegible] انہوں کے قصے کہانیوں سے کچھ حال معلوم ہو سکا۔ اس کے جنگی کارنامے بھی معلوم نہ ہو سکے۔ [illegible] کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے عادات و اطوار نہایت ستودہ اور زبان زد خاص و عام تھے۔ یہ صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔ کہتے ہیں کہ جس وقت بادشاہ کو [illegible] کیا۔ کہنے ایسے آدمی کی تلاش ہوئی جس کی تکبیر تک قضا نہ ہوئی ہو تو خود بادشاہ ہی ایسا شخص تھا۔ شعر کہنے کا بھی شوق تھا اور خوب کہتا تھا۔ حیدرآباد کی جامع مسجد (جو آج مکہ مسجد کہلاتی ہے) اسی کے عہد میں شروع ہوئی لیکن مسجد کے ختم ہونے سے پہلے ہی بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔

محمد قلی قطب شاہ

(۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ)

محمد قلی قطب شاہ کا عہد حکومت ۹۸۸ھ سے شروع ہوتا ہے۔ اسی عہد میں قطب شاہوں کا تمدن پیدا ہوا۔ یہ اپنے کارناموں کے لحاظ سے ایک زرین دور رہا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ سے پہلے صرف گولکنڈہ کی تاسیس ہوئی تھی اور اس کے ضروری لوازم جمع کئے گئے تھے۔ اس دور کے کار فرما سلطان قلی قطب شاہ اور اس کا بیٹا جمشید قطب شاہ تھے۔ دوسرے دور میں جبکہ ابراہیم قطب شاہ تخت نشین ہوا تھا اس سلطنت کا استحکام عمل میں آیا۔ اس طویل عہد حکومت میں جو تقریباً ۳۰ سال پر حاوی ہے اس سلطنت کو ہر طرح سے مستحکم کیا گیا۔ اندرونی انتظام ٹھیک کیا گیا۔ نظم و نسق کے کل پرزے مضبوط کر دئے گئے۔ اس کے بعد محمد قلی قطب شاہ کا جو کام تھا وہ اس سلطنت کو تمدن کے نقش و نگار سے آراستہ کرنا تھا۔ یہ گولکنڈہ کا تیسرا دور ہے۔

محمد قلی قطب شاہ ابراہیم قطب شاہ کا تیسرا بیٹا تھا۔ چونکہ اس کے بڑے بھائی مر چکے تھے، باپ کے انتقال کے بعد ہی تخت کا وارث ہوا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر صرف ۱۵ سال کی تھی۔ دسویں صدی ہجری یا سولھویں صدی عیسوی کا آخری زمانہ جبکہ محمد قلی قطب شاہ کو عنان حکومت ملی تھی تمام دکن کے لئے سیاسی حیثیت سے بہت پیچیدہ ہو رہا تھا۔ شمال سے مغلوں کے سیلاب آنے لگے تھے اور دکن کی آزادی خطرہ میں تھی۔ ۹۶۵ھ میں دکن کے اسلامی حکمرانوں نے وجیانگر کی عظمت کے لئے خاتمہ کر دیا تو اب جنوب سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ محمد قلی قطب شاہ نے پرانے رئیسوں اور جاگیرداروں کی سرکوبی کر دی تھی جو کبھی کبھی بغاوت کر بیٹھتے تھے۔ اس کی سلطنت نے تو اپنی وسیع کششوں سے کرناٹک کا تمام مشرقی علاقہ فتح کر لیا تھا اور عبداللہ قطب کے عہد میں قطب شاہی سلطنت کرناٹک کے ایک بڑے حصہ پر جس میں مدراس بھی شامل تھا چھا گئی تھی۔

لیکن اب دکن کو شمال کا مقابلہ کرنا تھا۔ یہ مغلوں کی بڑی طاقت سے ٹکر تھی۔ ۹۹۵ھ میں اکبر شمالی ہند سے مطمئن ہوا تو وہ دکن کی طرف متوجہ ہوا۔ گولکنڈہ کو احمد نگر کے جنوب میں ہونے کی وجہ زیادہ خطرہ نہ تھا لیکن مغلوں کے سیلاب سے بچنے کے لئے حفاظت ضروری تھی۔ جب برہان کی بہن چاند بی بی جو بیجاپور میں تھی احمد نگر کی مدد کو دوڑی آئی اور شہزادہ مراد کے مقابلہ میں نظام شاہی فوجوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لی تو ابراہیم عادل شاہ ثانی اور قلی قطب شاہ نے بھی اس کی مدد کی۔ شاید اسی امداد نے احمد نگر کے بچانے میں بڑا کام کیا تھا۔ اس کے بعد ۱۰۰۶ھ میں مغلوں کا احمد نگر پر دوبارہ حملہ ہوا۔ اور اس موقع پر بھی گولکنڈہ اور بیجاپور نے احمد نگر کی مدد کی۔ مغلوں کو اس حملہ میں بڑی دقت سے فتح ہوئی لیکن ان کو کافی نقصان بھی ہوا۔ چاند بی بی کے مرنے کے بعد ملک عنبر احمد نگر کی گرتی ہوئی سلطنت کو بچانے کے لئے کھڑا ہوا تو اس کی بھی خاطر خواہ مدد کی گئی۔ اس سے گولکنڈہ کی بیدار مغزی اور احساس ذمہ داری ثابت ہوتی ہے۔

مغل سیلاب کی روک تھام اور دکن کی آزادی کی حفاظت گولکنڈہ کا ہمیشہ مطمح نظر رہا ہے۔ لیکن محمد قلی قطب شاہ کی وسیع سلطنت کے چاروں حدود پر بھی پڑتی تھی۔ شمال مشرق میں فوجیں متعین تھیں۔ راجمندری ایک بڑا فوجی مستقر تھا اور اس کے بعد نصف نگر گنٹہ مغربی چھاؤنی تھی۔ خود محمد قلی قطب شاہ نے بیجاپور پر کئی حملے کئے۔

لیکن کسی قوم و مملکت کا تمام تر سرمایہ جنگ و جدل ہی نہیں بلکہ قومی تعمیر اور تمدن کی آبیاری ہے۔ قطب شاہوں کو یہ امتیاز ہے کہ انھوں نے باوجود ایرانی نژاد ہونے کے تلنگانہ کو اپنا گھر بنا لیا تھا اور تلنگی رعایا کو اپنی رعایا سمجھا۔ نہ صرف اس ملک کی زبان اور روایات کو ترقی دی بلکہ تمدنی خدمات کے ذریعہ سے اس ملک کی اس قدر سرپرستی کی کہ تاریخ اس کو نہیں بھول سکتی۔ محمد قلی نے آندھرا دیش کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ ایک طرف اس نے گولکنڈہ میں

سلطان محمد قطب شاہ
۱۰۲۰ء – ۱۰۳۵ء

سلطان محمد قلی قطب شاہ
۱۰۲۳ء – ۱۳۶ء

بنا لیا اور روانہ کیا اور نہایت حیرانی سے شہنشاہ کو لکھا کہ "ہم آپ سے بے تابی کرتے ہیں۔ سنبھاجی کو بھی پناہ اکسا دیتے ہیں دیکھیں گے آپ کن کن سے مقابلہ کرتے ہیں" اورنگ زیب کی نظر سے یہ تحریر گزری تو بہت غضبناک ہوا اور شاہزادہ شاہ عالم بہادر شاہ کو فوج کثیر کے ساتھ گولکنڈہ کی طرف روانہ کیا۔ ابوالحسن کی فوج نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن جلد قطب شاہی سپہ سالار مغلوں سے مل گئے اور فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ دوسرے دن پھر لڑائی ہوئی اس اثنا میں بادشاہ اپنے سپہ سالاروں سے بدظن ہو گیا۔ جمیل اللہ خاں جو گولکنڈہ کا نہایت نامی سپہ سالار تھا۔ ان سے ٹوٹ کر مغلوں سے جا ملا۔ اب ابوالحسن نے قلعہ گولکنڈہ میں پناہ لی۔ اور مغل سپاہیوں نے حیدرآباد میں وہ قیامت برپا کی کہ قتل نادری اس کے سامنے ماند تھا۔ ابوالحسن کی درخواست پر جدال و قتال روک دیا گیا اور صلح کے شرائط طے ہونے لگے۔ صلح کی شرط ایک یہ بھی تھی کہ مادنا و اکنا کو قید کر کے بھیج دیا جائے۔ بادشاہ نے منظور نہ کیا۔ بادشاہ نے میر ہاشم کو صلح کے لئے بھیجا لیکن گولکنڈہ سے میں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اصل میں میر ہاشم تانا شاہ کو اکسا رہا تھا۔ چنانچہ عبدالرزاق لاری اور شہزادہ خاں نے میر ہاشم پر حملہ کر دیا اور اسے قتل کر دیا۔ اورنگ زیب کو شہزادہ کی سستی اور تانا شاہ کی چال بازی کی خبر ہوئی تو بہت کبیدہ ہوا اور دوسری جنوری کو قلعہ گولکنڈہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ابوالحسن نے صلح کی بہت کچھ کوشش کی لیکن اورنگ زیب نے گولکنڈہ کو محاصرہ کر لیا۔ تمام آبادی تنگ آ گئی۔ ابوالحسن نے بھی سخت مقابلہ کیا لیکن عبداللہ خاں پنی کی غداری سے اورنگ زیب نے قلعہ فتح کر لیا۔ عبدالرزاق لاری نے اس موقع پر جو شجاعت و نمک حلالی کا ثبوت دیا وہ تاریخ میں یادگار ہے۔

قلعہ فتح ہو گیا جب لوگ قلعہ میں داخل ہوئے تو بادشاہ نے قلعہ میں جگہ لی۔ چاروں طرف آہ و شیون کی صدائیں تھیں۔ اس وقت نرمی تنہا تانا شاہ سلطان ابوالحسن اپنے نوکروں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر شہزادہ کے پاس گھوڑے پر سوار ہو کر آیا۔ تین سو برس کی سلطنت اس کے گھر میں رہی۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ ابوالحسن کی عمر کے ۱۴ سال طفلی میں۔ ۱۴ سال تحصیل علوم میں ۱۴ سال سید راجو کی خدمت میں ۱۴ سال حکمرانی میں اور چودہ سال قلعہ دولت آباد میں گزرے۔ ابوالحسن کی تین بیٹیاں تھیں۔ اور ایک لڑکا خدابندہ جس کو اورنگ زیب نے بندہ سلطان کا خطاب دیا تھا۔ اس بادشاہ کی زندگی نے جس قدر افسانوی حیثیت حاصل کر لی ہے وہ تاریخی مطالعہ سے بے بنیاد ثابت ہوتی ہے۔ بادشاہ کی نزاکت، عیش پرستی اور سادہ لوحی کے جو قصے بیان کئے جاتے ہیں وہ اس کے تاریخی کیرکٹر کو بگاڑ نہیں سکتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مستقل مزاج، مدبر اور متوکل بادشاہ تھا جس کی پیشانی عین گرفتاری کے وقت بھی شکن آلود نہ ہوئی۔

تانا شاہ کو ایک لڑکا اور تین لڑکیاں تھیں۔ اورنگ زیب نے دوسری لڑکی کی شادی سکندر عادل شاہ سے اور تیسری کی اسد خاں وزیر کے فرزند سے کر دی۔ پہلی لڑکی نے یہ کہہ کر شادی سے انکار کر دیا کہ وہ اپنے بزرگ باپ کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کر دینی چاہتی ہے۔ تانا شاہ کے لڑکے خدابندہ کو باپ کی وفات کے بعد اپنے دربار میں طلب کیا اور بندہ سلطان خطاب دیا، لیکن جب یہ شہزادہ دربار میں آتا تو اہل دربار جن میں دکنی امرا بھی تھے اس کی تعظیم کرتے۔ جس کی وجہ سے اورنگ زیب کو شبہ ہوا اور پھر یہ لڑکا کبھی نظر نہ آیا۔

رشید قریشی

سلطان ابوالحسن قطب شاہ
(تانا شاہ)
۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۸ھ

وداعِ شاہ

تانا شاہ کی روانگی کے وقت اہلِ گولکنڈہ کی زبان سے

باحال تباہ جا رہا ہے — کانٹوں کی ہے راہ جا رہا ہے
کس یاس سے آہ جا رہا ہے — اب قلعہ سے شاہ جا رہا ہے
کس طرح غبارِ راہ دیکھیں
ٹوٹے ہوئے دل کی چاہ دیکھیں

مٹ جائیں گے خود ہی اے عدو ہم — آئیں گے نہ تیرے روبرو ہم
کریں گے تباہ رنگ و بو ہم — بیچیں گے نہ اپنی آبرو ہم
کس آس پہ اب رہیں جہاں میں
اڑتے ہوئے رنگ گلستاں میں

ہم کو تو ملا تھا تاج شاہی — کن آنکھوں سے دیکھیں یہ تباہی
آتا ہے ہمیں بھی رقص ماہی — پائیں گے نہ نے بے گناہی
واللہ تڑپ کے جان دیں گے
مر کر ہی تجھے مکان دیں گے

پامال ہوں آفتاب ہو کر — مر جائیں شرابِ ناب ہو کر؟
چھپ جائیں نظر سے خواب ہو کر؟ — بے کیف رہیں شباب ہو کر؟
جب شاہ نہیں تو ہم رہیں کیوں!
غیروں سے حدیثِ غم کہیں کیوں

بے آبروئی سے ڈر رہی ہیں — ٹکرا کے جہاں کو مر رہی ہیں
نعشوں سے کنوئیں کو بھر رہی ہیں — کام آنے کا کام کر رہی ہیں
امواج پہ رقصِ آب و گل ہے
اس جنس کا دل بھی مرد دل ہے

میکش

مشاہیرِ گولکنڈہ

اس نام سے ایک کتاب آج کل زیرِ ترتیب ہے جس میں گولکنڈہ کے جملہ مشہور اصحاب (بادشاہوں سے لے کر غلاموں تک) کے تاریخی حالات نہایت دلچسپ پیرایہ میں قلمبند کئے جا رہے ہیں۔ اسی کتاب سے چند اصحاب کے حالات یہاں درج ہیں۔

(وزرائے گولکنڈہ) **جملۃ الملک مرزا محمد امین**

اصفہان کے رہنے والے حیدرآباد آ کر دربارِ شاہی کی ملازمت اختیار کی۔ سلطان محمد قلی نے حضرت میر مومن استرآبادی کی سفارش پر ۱۰۱۱ھ میں خدمت میر جملگی پر دکی اور جواہرات کا ایک ایسا مرصع قلمدانِ وزارت عنایت کیا جس کی روشنی سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ دو لاکھ ہون ماہانہ تنخواہ مقرر کی گئی جو حال کے نو لاکھ روپیوں کے برابر ہوتے ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ قطب شاہی وزیر اعظم کی تنخواہ عہدِ حاضرہ کے وزیر اعظم کی تنخواہ سے تقریباً دس گنا زیادہ تھی۔ محمد امین نے میر جملہ ہوتے ہی باغیوں اور سرکشوں کو زیر کیا اور ہواری راؤ برہمن کو کاروبارِ سلطنت سے بے اثر کر دیا ۱۰۱۱ھ میں جب آگرہ اور دہلی کے مغل سوداگر حالتِ نشہ میں شاہی محل میں بغیر اجازت کے دیکھنے کے لئے داخل ہوئے اور بادشاہ نے علی آقا کوتوال کو حکم دیا کہ انھیں باہر نکال دیا جائے تو شہر کے اوباشوں کو موقع مل گیا اور انھوں نے ان سوداگروں کے مال و اسباب کو لوٹنا شروع کیا اس ہنگامۂ عظیم کو محمد امین نے بڑی ترکیب سے فرو کیا اس اثنا میں محمد امین کا اثر بہت بڑھ گیا تھا۔ اسی وجہ سے دکنی امرا نے بادشاہ سے ناخوش ہو کر اس کے بھائی خدا بندہ کو بغاوت کے لئے اکسایا لیکن اس بغاوت میں وہ ناکام ہوئے۔

۱۰۱۹ھ میں محمد امین نے بادشاہ کی ایک شاندار دعوت کی اور اپنے مکان کو رشکِ فردوس بنا کر پا اندازمیں زربفت و اطلس اور مخمل و مشجر کے کپڑے بچھا دئے۔ جب بادشاہ تشریف لائے تو شاعروں نے قصیدے سنائے اور مطربوں نے نغمے۔ آخر میں محمد امین نے تیس ۳۰ عربی گھوڑے بیس ۲۰ ہاتھی اور بلور کا ایک مدور آئینہ جس کے اطراف قسم قسم کے جواہر نصب کئے ہوئے تھے ایک سونے کی زین جس پر جواہر کا کام کیا ہوا تھا چودہ جلد خوش خط قرآن شریف اور دیگر قیمتی اشیاء بطور نذر پیش کئے اور طعام کے بعد نغمہ خوانوں اور ندیموں کو پچاس ہزار ہون انعام میں دئے بادشاہ نے چلتے وقت اپنے کندھوں سے زردوزی چادر نکال کر محمد امین کو عنایت کی

۱۰۲۰ھ میں پرتاب راؤ کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے محمد امین کو روانہ کیا گیا مگر وہ ناکام رہے اسی سال محمد قلی نے وفات پائی۔ ان کی وفات سے قبل ہی محمد امین نے شہر سے ملحق ایک عالی شان تالاب بنایا جو تالاب میر جملہ کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ اسی تالاب کے کنارے مشرق رویہ محمد امین کی ڈیوڑھی بھی تھی جو اپنی آرائش اور خوبی تعمیر کی وجہ سے مشہور تھی اور جس میں آخر زمانے تک بڑے بڑے سفرا اور معزز مہمان ٹھیرائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ محمد امین نے موسیٰ ندی کے کنارے ایک امین باغ بھی بنایا تھا جو اس عہد کا ایک نہایت پرفضا مقام تھا اس امین باغ میں آج کل سرکاری زچگی خانہ ہے۔

جب سلطان محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا تو مرزا محمد امین نے حج کو جانے کے لئے رخصت حاصل کی اور اپنی پوری دولت کے ساتھ گولکنڈے سے نکل کر بیجاپور کا رخ کیا۔ وہاں ان کی خاطر خواہ آؤ بھگت نہیں ہوی تو وہ ایران چلے گئے اور گولکنڈہ سے لائے ہوئے ایک لاکھ روپے کے جواہر شاہ عباس کی خدمت میں پیش کئے۔ لیکن شاہ عباس میں بھی انھیں محمد قلی جیسی خوبیاں نظر نہ آئیں تو دوبارہ ہندوستان آ کر ۱۰۲۷ھ میں جہانگیر کے دربار میں ملازمت اختیار کی اور پچاس ہزار روپے کے جواہر نذر کئے۔ وہاں بھی انھیں وہ عروج حاصل نہ ہو سکا جو گولکنڈہ میں نصیب ہوا تھا البتہ میر بخشی کے خطاب سے سرفراز ہوئے آخر کار ۱۰۴۶ھ میں شاہجہاں کے عہد میں لقوہ اور فالج سے انتقال کیا۔

غواصی ملک الشعرائے گولکنڈہ

مرزا محمد حسن مرحوم

خواجہ افضل ترک

سلطان محمد قطب شاہ نے ۱۰۲۵ھ میں منصب سرخیلی پر سرفراز کیا تھا اور چار لاکھ ہون کی مشروط خدمت جاگیر دی تھی لیکن آخر زمانہ میں ۱۰۳۵ھ میں بادشاہ نے ان کو معزول کر کے مرزا روز بہان کو سرخیل بنایا اور ان کی جاگیر میر محمد تقی طباطبا کو عنایت کر دی تھی۔

اس واقعہ کے دو ماہ بعد ہی جب سلطان عبداللہ تخت نشین ہوئے تو منصور خاں میر جملہ نے مرزا روز بہان کو معزول کرادیا۔ خواجہ افضل پھر دوبارہ عہدہ پائے۔ اور بعد کو علامہ ابن خاتون کے ساتھ مل کر اتنا اثر پیدا کیا کہ ۱۰۳۶ھ میں شاہ محمد مینو کو معزول کرادیا۔ جس علامہ ابن خاتون کی رمضان ۱۰۳۶ھ میں منصب پیشوائی پر سرفرازی کے بعد خواجہ افضل بھی زیادہ دن تک پائے تخت میں نہ رہ سکے چنانچہ مرتضیٰ نگر و مچھلی پٹن کے عامل میر محمد حاجی دیانت خاں کو جب وہاں کی رعایا نے مار دیا تو بادشاہ نے خواجہ افضل ترک کو وہاں کی حکومت تفویض کر کے اواخر ۱۰۳۶ھ میں دارالسلطنت سے روانہ کیا۔ خواجہ افضل پورے تزک و احتشام اور فوج کے ساتھ مرتضیٰ نگر کی طرف روانہ ہوئے اور راستہ میں جہاں کہیں چوروں اور رہزنوں کا پتہ چلا سب کو تہ تیغ کیا اور اس سمت کے چار سو عیار اور چار ہزار چوروں کو بیک وقت گرفتار کر لیا اور راستوں پر جگہ جگہ ان کو سولی پر لٹکا دیا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور سرکشوں کی تنبیہ ہو سکے۔ غرض اس علاقہ کو خس و خاشاک سے پاک کر کے تھوڑے زمانہ میں ہی خلایق کی حفاظت اور غلہ رسانی وغیرہ کا بڑا اچھا انتظام کیا۔

ابھی خواجہ افضل مرتضیٰ نگر کے صوبہ دار ہی تھے کہ ۱۰۴۱ھ میں باقر خاں صوبہ دار بنگالہ نے قطب شاہی علاقہ کسیمکوٹ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا وہاں کے عاملوں اور فوجیوں نے بادشاہ سے مدد طلب کی۔ بادشاہ نے خواجہ افضل کے یہاں آدمی دوڑائے اور ان کو فوراً تمام با... پہنچنے کا حکم دیا۔ چنانچہ خواجہ افضل اسی فرسخ کے فاصلہ کو ایک ماہ دیا گھوڑے پر صرف تین دن میں طے کر کے بارگاہ بادشاہی میں پہنچے۔ بادشاہ بہت خوش ہوئے اور تحسین و تعریف و خلعت خاص اور گھوڑے اور نقدی و انعامات سے سرفراز کیا اور باقر خاں سے مقابلہ پر جانے کا حکم دیا۔ شیخ الملک شیر خاں و رحیم دکنی سرداروں کے حوالہ کیا اور چار ہزار سواران خاصہ خیل ان کے ساتھ کر دیا اور تمام حکام کسیمکوٹ کو اطلاع کرادی کہ سب خواجہ افضل کی نوکری اور اس کے مطیع و منقاد رہیں اس کے علاوہ میاں حسینی حوالہ دار دروازۂ محل بادشاہی کو راجہ مندری روانہ کیا تاکہ خواجہ افضل کے لشکر کے لئے غذا پانی کا پہلے سے انتظام کر رکھے۔ چنانچہ خواجہ افضل ایک زبردست لشکر کے ساتھ کسیمکوٹ کی طرف روانہ ہوئے اور جیسے راجمندری ہوتے ہوتے راستہ میں ہر جگہ خواجہ کی فوج میں اضافہ ہوتا جاتا تھا مرتضیٰ نگر میں خواجہ افضل کا جو لشکر تھا وہ بھی مدد کو آیا اور دریا سے لڑتا ہوا عبور کر کے مصطفیٰ نگر کے پاس خواجہ کے شاہی لشکر سے مل گیا۔ اس عظیم الشان لشکر کے ساتھ خواجہ افضل کسیمکوٹ پہنچے تو معلوم ہوا کہ باقر خاں کو شاہ جہاں نے واپسی کا حکم دیا ہے اور جتنے علاقوں پر قبضہ کر لیا گیا تھا ان کو چھوڑ کر باقر خاں کی فوجیں واپس ہو رہی ہیں اس طرح لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اور خواجہ افضل کو چند روز راجمندری میں قیام کرنے کا حکم دیا گیا۔

خواجہ افضل ابھی راجمندری ہی میں تھے کہ مرہری پنڈت سپہ سالار عادل شاہی نے ۱۰۴۳ھ میں قطب شاہی علاقہ پر حملہ کیا اور قلعہ کولاس کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت اگرچہ بادشاہ نے دوسرے امرا کو مقابلے کے لئے روانہ کر دیا تھا تاہم اعظم الامرا خواجہ افضل کو پورے لشکر اور انتظام کے ساتھ راجمندری سے گولکنڈہ آنے کا حکم دیا۔

خواجہ افضل اس اثنا میں سخت بیمار ہو گئے تھے اور اسی حالت میں وہ حیدرآباد آئے لیکن جانبر نہ ہو سکے چنانچہ ۱۰ جمادی الآخر ۱۰۴۴ھ کو

حیدرآباد میں وفات پائی۔

خواجہ افضل معدن محمد کے زمانہ میں نمایاں خدمت سرخیلی پر اور سلطان عبداللہ کے زمانہ میں چھ سال سپہ سالاری صوبہ داری اور وزارت کے عہدہ پر مامور رہے۔ دولت و ثروت میں اپنے امثال و اقران میں ممتاز تھے اسی لئے حدیقہ میں ان کو اعظم الامرائے الملک لکھا ہے۔ ان کے ملازمین جن میں ایک ہزار ترکی و عرب و عجمی سوار تھے پوتی بیگ کے سپرد کئے گئے۔ اور ان کی جاگیر منصب نامبر فصیح ایبن خطغرشی کو سرفراز کی گئی۔

میرزا روزبہان اصفہانی

سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے عمائدین سلطنت سے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی وفات سے ۲ ماہ قبل ربیع الاول ۱۰۳۵ھ میں ان کو خواجہ افضل ترک کی معزولی کے بعد سرخیلی کے منصب ارجمند پر سرفراز کیا تھا لیکن سلطان عبداللہ کی تخت نشینی کے بعد جب خانم آغا اور منصور خاں حبشی کا دربار پر اثر جم گیا تو میرزا روزبہان کو معزول کر کے جلیسان حضور کے زمرہ میں شریک کر دیا گیا۔ لیکن جب منصور خاں میر جملہ کا انتقال ہو گیا اور علامہ ابن خاتون پیشوائے سلطنت اور مختار دربار ہو گئے تو انھوں نے میرزا روزبہان کے لئے کوشش شروع کی اور بادشاہ کے سامنے ان کی بڑی تعریف کی چنانچہ ۳ ربیع الاول ۱۰۴۱ھ کو میرزا روزبہان دوبارہ منصب سرخیلی پر مامور کئے گئے اور انھوں نے پوری قوت کے ساتھ فوج اور رعایا کے معاملات انجام کرنے شروع کئے لیکن بادشاہ کو ان پر اعتبار نہ آیا اور وہ ہمیشہ ان کو شبہ کی نظر سے دیکھتے رہے۔ آخر کار بددیانتی کے الزام میں منصب سرخیلی سے ۱۰ صفر ۱۰۴۲ھ میں معزول کئے گئے اور مصلح الدین محمد کو سرخیل بنایا گیا۔

عین الملک منصور خاں حبشی

سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے اکابر سلطنت سے ہیں حوالہ داری لشکر کا بہ عہدہ کے علاوہ وزارت عین الملکی پر مامور تھے۔ اور بادشاہ اور ان کی والدہ کے مزاج میں خوب رسوخ حاصل تھا چنانچہ جب بادشاہ مرض موت میں مبتلا ہوئے تو ان کے علاج کے بارے میں اطبائے ہند اور اطبائے عراق کے مابین اختلاف پیدا ہو گیا۔ بادشاہ کی والدہ کا خیال تھا کہ اطبائے ہند علاج کریں کیونکہ جو مزاج ہندوستان کی آب و ہوا میں پرورش پاتے ہیں ان کے لئے مناسب ہے کہ ہندوستانی طبیبوں کا علاج کرایا جائے۔

اگرچہ والدۂ بادشاہ کی اس رائے سے اکثر امرائے دربار کو اختلاف تھا لیکن منصور خاں کی تائید کی وجہ سے ہندوستانی اطباء نے علاج کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت منصور خاں کتنے صاحب اقتدار تھے۔

سلطان محمد کے انتقال کے بعد سلطان عبداللہ کو تخت نشین کرانے میں اور پایۂ تخت میں انتظام اور امن و امان قائم رکھنے میں منصور خاں نے بڑا حصہ لیا اس وقت بادشاہ کی کم عمری کی وجہ سے سلطان محمد کی والدہ ہی کاروبار سلطنت میں دخیل تھیں اور انھوں نے زور دے کر منصور خاں کو میر جملہ بنایا۔ نظام الدین احمد مؤلف حدیقۃ السلاطین چونکہ علامہ ابن خاتون کے طرف داروں میں سے تھے اس لئے انھوں نے اپنی تاریخ میں منصور خاں کی خدمات کے اعتراف میں بخل سے کام لیا ہے اور جگہ جگہ ذم کا پہلو نمایاں کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ منصور خاں اور ملک یوسف وغیرہ اس وقت کے ان ملکی امرا اور جاں نثاران سلطنت سے تھے جن کو علامہ ابن خاتون اور دیگر اجنبی امرا اپنے راستے میں حائل سمجھتے تھے اور چونکہ سلطان عبداللہ کی طبیعت بہت کمزور واقع ہوئی تھی اس لئے انھوں نے بااقتدار امرائے عراق کے زیر اثر اپنے قدیم امرا اور خدمت گزاروں کو بہت جلد بے اثر کر دیا۔

منصور خاں کی میر جملگی کا پہلا اثر یہ پڑا کہ مرزا روز بہان اصفہانی جن کو صرف دو ماہ قبل سلطان محمد نے خواجہ افضل ترک کو معزول کر کے سر خیل بنایا تھا اپنے عہدے سے معزول ہو گئے منصور خاں نے برہمنوں کو بھی برسرکار کیا۔ گو کہ نظام الدین احمد مورخ کا بیان ہے کہ خود میر جملہ کو لکھنا نہیں آتا تھا۔ تاہم اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ منصور خاں سپاہیوں پر خوب نظر رکھتے تھے اور انھوں نے اس طبقہ کی حالت کو درست کر دیا۔ اگرچہ غیر ملکیوں کے ساتھ ان کا سلوک اچھا نہ تھا۔

منصور خاں نے وزارت پناہ خواجہ افضل ترک کو پھر سے ایک لاکھ ہون تنخواہ کی جاگیر دے کر سرفراز کر کے امرائے عظام کے طبقہ میں شامل کر دیا۔ منصور خاں نے اس شان و شوکت سے میر جملگی کی خدمت انجام دی کہ دارالسلطنت میں ان کے غلاموں کا بھی رعب بیٹھا ہوا تھا اور بڑے بڑے عہدہ دار بھی ان سے ڈرتے تھے چنانچہ حدیقہ میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ۹ محرم ۱۰۳۷ھ کو دیوان کے ایک حبشی غلام نے میدان دربار میں شب چراغاں کا اہتمام کرتے وقت قاسم بیگ کوتوال کے ساتھ بے ادبی کی لیکن چونکہ میر جملہ کا آدمی تھا قاسم بیگ کچھ نہ کر سکے اور رنجیدہ ہو کر گھر بیٹھ رہے اور منصب کوتوالی سے استعفا دے دیا۔

نظام الدین احمد کا بیان ہے کہ حملۃ الملک منصور خاں قاسم بیگ کوتوال اور شاہ محمد ہر دو کو ہٹا کر ملا محمد تقی کو خدمت کوتوالی اور میر سید اسٰمعیل کو پیشوائی دلانا چاہتے تھے چنانچہ اول الذکر کو مچھلی پٹن سے اور موخر الذکر کو دہلی سے بلا بھیجا تھا۔ ملا محمد تقی تو دارالطلاب حیدر آباد پہنچ بھی گئے۔ منصور خاں نے کئی بار کوشش کی کہ بارگاہ شاہی میں پیش کر کے منصب کوتوالی دلا دیں لیکن بادشاہ پر علامہ ابن خاتون کا اثر پڑنا شروع ہو چکا تھا وہ انجان ہوتے گئے اور آخر کار قاسم بیگ کی جگہ پر ملا محمد تقی کو مامور کرنے کے بجائے ... بیگ نائب کوتوال کو خدمت کوتوالی پر ترقی دے دی۔ اب جو محمد تقی کو مایوسی ہوئی تو میر جملہ نے اپنی پیشی میں مقرر کر کے میر جملگی کا کام جو کوتوال کے کام سے ارفع ہے ان کے سپرد کر دیا اس طرح ۱۰۳۷ھ میں عملاً امور دیوانی میں ملا تقی نائب میر جملہ ہو گئے اور ایک سال تک اس خدمت کو انجام دیا۔

آغاز محرم ۱۰۳۷ھ میں منصور خاں نے دو سال سات مہینے اور چند روز میر جملگی کی خدمت انجام دے کر لگایک انتقال کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ منصور خاں کی وفات کے بعد چھ سال دس مہینے تک منصب میر جملگی پر کوئی بھی فائز نہ ہو سکا آخر کار ۹ شوال ۱۰۴۳ھ میں علامہ ابن خاتون نے منصور خاں کی جگہ لی۔ اس اثنا میں منصور خاں کی خدمات کو تین چار امرا میں تقسیم کر دیا گیا تھا یعنے ملا محمد تقی سر خیل، آدم خاں عین الملک اور پسر منصور خاں حوالہ دار فوج رکاب خانہ وغیرہ۔

شریف الملک ملا محمد تقی

سلطان محمد قطب شاہ کے دور میں بندر مچھلی پٹن کے حوالہ دار تھے۔ سلطان عبد اللہ کے دور میں جب منصور خاں حبشی میر جملہ نے اقتدار تمام حاصل کیا تو ان کا خیال تھا کہ قاسم بیگ کوتوال کی جگہ ملا محمد تقی اس خدمت پر سرفراز ہوں چنانچہ ۱۰۳۲ھ میں ملا محمد کو لکھا کہ پایۂ تخت چلے آئیں۔ ملا بہت خوش ہوئے اور ایک ہاتھی پانچ ہزار ہون نقد اور دیگر تحف و ہدایا کے ساتھ محرم ۱۰۳۷ھ میں حیدر آباد آئے۔ منصور خاں ان کی آمد سے بہت خوش ہوئے اور چاہتے تھے کہ بادشاہ ان کو منصب کوتوالی پر سرفراز کریں چنانچہ تین مہینوں تک برابر دولت خانۂ عالی میں ساتھ لے جاتے رہے اور ایک دفعہ تو زر نقد ہاتھی اور دیگر تحفے بادشاہ کی خدمت میں پیش بھی کر دئے مگر بادشاہ نے ملا تقی کو باریاب نہ کیا بادشاہ یہ چاہتے تھے کہ ملا تقی بجائے کوتوالی کے منصور خاں کے قائم مقام بن کر منصب سر خیلی انجام دیں اور اسی لئے وہ ٹال رہے تھے تاکہ کوتوالی کا مستقل انتظام ہو لے تو ملا محمد تقی کو

باریاب کرکے سرخیلی بنا دوں آخرکار ۲۰ ربیع الاول ۱۰۳۲ھ کو بادشاہ نے حسن بیگ نائب کوتوال کو حیدرآباد کی کوتوالی کل پر سرفراز کردیا۔

اب منصور خاں بڑے پریشان ہوئے لیکن انھوں نے ملا محمد تقی کو اپنے ہی ساتھ رکھ کر میر ملکی کے جملہ مہمات کو ان کے سپرد کردیا اس طرح ملا محمد تقی کوتوالی سے زیادہ اہم اور بڑے عہدہ کا کام انجام دینے لگے۔ انھوں نے ایک سال تک منصور خاں کے نائب کی طرح دیوانی کی خدمات اور میر جملگی کے جملہ امور انجام دئے بادشاہ بھی یہی چاہتے تھے۔

محرم ۱۰۳۳ھ میں منصور خاں نے یکایک انتقال کیا تو ان کی جگہ کے لئے بہت سے امراء نے کوشش کی اور نذرانے پیش کرنے شروع کئے لیکن ملا محمد تقی پہلے ہی سے امور دیوانی انجام دئے رہتے تھے، منصور خاں نے بھی کئی بار ان کے کام کی تعریف کی تھی اور بادشاہ پر ان کی کاردانی کا سکہ بیٹھا چکا تھا اس کے علاوہ اس دفعہ ملا نے دوسروں کے نذرانوں سے زیادہ پیش کش دیا اس لئے بادشاہ نے انہی کو پسند کیا اور ۳۴ صفر ۱۰۳۳ھ کو منصب جلیل القدر سرخیلی پر سرفراز کیا۔ اس موقع پر دوسرے شاعروں کی طرح ملا نظام الدین احمد مولف حدیقۃ نے بھی ایک قطعہ تاریخ ملا کی خدمت میں پیش کیا تھا جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

خسرو یوسف رخ جمشید جاہ	شاہ عبداللہ شاہ کامیاب
مولوی را بہر سرخیلی نمود	از میان جملہ اعیاں انتخاب
تربیت بنمود او را ہمچو مہر	تا کہ شد یاقوت سال باآب و تاب
عقل بہر منصبش تاریخ گفت	دائما سرخیل بادا کامیاب

سرخیل ہونے کے بعد ملا تقی نے بادشاہ کے مزاج سے کافی واقفیت پیدا کرلی اور جملہ مہمات دیوانی اور کل معاملات سلطانی پر ایسا قبضہ کرلیا کہ دوسروں کو دخل دینے کا موقع نہ دیا، خاص کر برہمنوں کے لئے رعایا پر ظلم و ستم کرنے کا موقع نہ رہا۔ اور محاصل کی رقمیں اچھی طرح داخل خزانہ ہونے لگیں۔ چنانچہ صرف نارائن راؤ مجموعہ دار سے ایک سو تیس ہزار ہون وصول کرکے داخل خزانہ کئے گئے اور جو چودھری اور صاحبان جائداد منافق مغرور اور ظالم ہوگئے تھے ان کو قتل کرکے ان کی جائداد اور ذخیروں پر شاہی قبضہ کرادیا۔

ان خدمات کے صلہ میں بادشاہ نے ملا کو شریف الملک کا خطاب عطا کیا اور وہ قلمدان مرصع جو مرزا محمد امین میر جملہ کے بعد سے کسی کو مرحمت نہیں کیا گیا تھا ملا شریف الملک کو عنایت کیا گیا۔ اس اثنا میں مغلوں کے حملہ دکن کی خبریں مشہور ہونے لگی تھیں اس لئے سلطان نے شریف الملک کو پچاس ہزار ہونوں کی جاگیر دی تاکہ ایک لشکر تیار رکھے اور فیل خانۂ خاص سے چند مست ہاتھی بھی عنایت کئے۔ اس طرح سرخیلی اور سرداری ایک ہی جگہ جمع ہوگئی۔ ملا نے بہت جلد دکنیوں، مغلوں اور پٹھانوں کی ایک فوج تیار کرلی اور میدان دکنشاہ واقع محل میں لاکر بادشاہ کو دکھادی۔ بادشاہ بہت خوش ہوئے اور ملا کے مدارج میں اور بھی اضافہ کردیا۔ اس طرح شریف الملک کی عزت و وقعت اور اثر و رسوخ اور بھی بڑھ گیا۔

جب شریف الملک کی ذات میں دو عہدے یعنے سرداری اور سرخیلی جمع ہوگئے تو مہمات دیوانی اور ضبط و ربط امور مملکت کے ساتھ ساتھ شہسواری اور سپہ گری کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی۔ چنانچہ دو روز آنہ شام کا وقت ندی محل کے برابر رود موسی کے کنارے وسیع میدان میں کمان داری اور چوگان بازی میں گذارتے تھے۔ ایک وقت گھوڑے پر سے گرے اور چوٹ کھائی بدن نحیف میں کچھ کمی ہوئی تھی کہ آخر شعبان ۱۰۴۰ھ میں

ملا نظام الدین احمد
مورخ گولکنڈہ

علامہ شیخ محمد ابن خاتون
پیشوائے گولکنڈہ

گولکنڈے کے سپہ سالار

موسیٰ خاں

حسات خاں

علی باغ میں جشن رمضان میں شرکت کی اور غذا میں بے احتیاطی کی وجہ سے ہیضہ و اسہال کا مرض لاحق ہوگیا اور اس حالت بیاری میں رمضان بھر صبح و شام بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اس حاضری میں اور مسلسل لکھنے کی وجہ سے طبیعت اور بگڑتی گئی آخر کار رمضان کی عید کے دن جب بادشاہ نے دربار کیا اور ملا شریف الملک عصر تک برابر کھڑے ہوکر لشکر اور رعایا کے معروضے پیش کرتے رہے تو طبیعت بالکل بگڑ گئی اور اس روز کے بعد دربار کو آنا نصیب نہ ہوا حکیم اسمعیل گیلانی اور دیگر ہندوستانی طبیبوں نے علاج کیا بادشاہ نے اپنے غلام حسن علی خاں کو پرسش احوال کے لئے بھیجا اور آخر میں اپنے خاص طبیبوں کو بھی علاج کرنے کے لئے حکم دیا لیکن پیمانۂ حیات پر ہوچکا تھا ملا محمد تقی شریف الملک نے ۱۹ شوال سنہ ۱۰۴۰ھ میں انتقال کیا

انھوں نے دو سال آٹھ ماہ بڑے کر و فکر اور اثر و اقتدار کے ساتھ حکومت کی دربادشاہ کی خیر خواہی اور آداب عبودیت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ان کے انتقال کا بادشاہ کو بھی صدمہ ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ملا شریف الملک کو اولاد نہ تھی کیونکہ بادشاہ نے ان کی بیوہ اقربا اور ہم نشینوں کے حال پر خاص نوازشیں کیں اور ان کو پورے سامان کے ساتھ عراق جانے کی اجازت دی

ابن خاتون

شیخ محمد نام ابن خاتون طوسی عاملی کے بیٹے اور شیخ بہائی کے بھانجے تھے سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے علماء میں سے ہیں ان کے علم و فضل کی وجہ سے بادشاہ نے ان کو منشی الملک اور دبیر سلطنت بنا کر بارگاہ سلطانی کے مقربان خاص میں شامل کرلیا تھا جب سلطان محمد قلی کی وفات کے بعد شاہ عباس صفوی کا سفیر حسین بیگ قبچاچی حیدرآباد آیا تو اس کی واپسی کے وقت بادشاہ نے سنہ ۱۰۲۲ھ میں علامہ شیخ محمد ابن خاتون کو بیش قیمت تحفے دے کر اس کے ساتھ ایران کو روانہ کیا جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور وہ تقریباً دس سال مقیم رہے اور پھر جب واپس آنے لگے تو شاہ ایران نے ان کے ساتھ قاسم بیگ سپہ سالار ماژندران کو روانہ کیا اور سنہ ۱۰۳۵ھ میں اس وقت حیدرآباد واپس ہوئے جب کہ سلطان محمد قطب شاہ کا انتقال ہوچکا تھا سلطان عبداللہ نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور اپنے پھوپھا شاہ محمد ولد شاہ علی حرب شاہ سبزوار پیشوائے سلطنت کا نائب مقرر کیا۔ اور پیشوا کی طرح ان کو بھی اپنی مجلس میں بیٹھنے کی اجازت دی چونکہ یہ خدمت مشترک تھی اس لئے بادشاہ نے محمد رضا استر آبادی سے منصب دبیری لے کر دوبارہ ابن خاتون کو دبیر سلطنت بھی بنا دیا۔

ان دو خدمات جلیلہ کی وجہ سے ابن خاتون کی عزت و احترام میں بہت اضافہ ہوگیا اور انھوں نے دربار کے تمام امور میں دخل پاکر اپنے توسط سے بہت سے لوگوں کو نوجوان بادشاہ کے مراحم خسروانہ سے فائدہ پہونچایا اس بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر شاہ محمد پیشوا ان سے کھٹکنے لگے اور دربار میں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں ہونی شروع ہوئیں آخر کار جب سنہ ۱۰۴۲ھ میں شاہ جہاں کا ایلچی شیخ محی الدین حیدرآباد آیا تو بعض باتیں ایسی ہوئیں کہ بادشاہ شاہ محمد پیشوا سے بالکل ناراض ہوگئے اور ان کو معزول کرکے ۹ رمضان سنہ ۱۰۴۳ھ میں ابن خاتون کو پیشوائی کل سے سرفراز کیا اس خوشی میں ابن خاتون کے طرف دار علما، و فضلا، اور شعرا، نے مبارک باد کے قصائد اور قطعے لکھے جن میں سے ایک قطعہ حدائق السلاطین کے مصنف نے لکھا تھا جو درج ذیل ہے ؎

شہ یوسف رخ جمشید حشمت	کہ حاتم می کند از وے گدائی
ز فرط مرحمت کردہ ممکن	محمد را بصدر پیشوائی
بساماں شد مہام ملک و ملت	کہ بود ابتر ز آفات سمائی
متاع فضل و دانش بود کاسد	کنوں بگرفت در عہدش روائی
جہاں معمور گردیدہ بدانساں	کہ شد محو از خلائق بے نوائی
بالہام آمد ایں مصراع تاریخ	محمد یافت از حق پیشوائی

پیشوا ہونے کے بعد ہی علامہ ابن خاتون نے شیخ محی الدین ایلچی شاہ جہاں کو واپس کردیا اور کچھ ایسی ترکیب کی کہ وہ شاہ جہاں کے پاس معتوب قرار پایا۔

ابن خاتون اگرچہ بہت صاحب ثروت تھے اور نواب علامہ کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے لیکن ساتھ ہی مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف بھی جاری تھی بے حد علم دوست تھے اور روز اُن کے مدرسہ میں بڑے بڑے علماء و فضلا جمع ہوتے اور علوم معقول و منقول پر مباحثے اور مذاکرے کیا کرتے۔ ہر منگل کو جو قطب شاہی سلطنت میں چھٹی کا دن ہوتا ان کے یہاں شعراء جمع ہوا کرتے اور شعرائے متقدمین کے کلام کے مذاکرہ کے علاوہ طرحی غزلوں کا مشاعرہ بھی کرتے تھے۔

ابن خاتون خود بھی بہت بڑے مصنف تھے شرح ارشاد، ترجمہ کتاب اربعین، حاشیہ جامع عباسی ان کی تصانیف ہیں جامع عباسی کی تکمیل بھی انہی نے کی تھی۔ یہ اپنے عہدہ کے لحاظ سے جملہ مذہبی امور کے بھی ذمہ دار تھے۔ چنانچہ جب ۱۰۴۰ھ میں حیدرآباد میں بڑا زبردست قحط ہوا تو شہر کے تمام علماء و فضلا و اتقیا سہ روزہ روزہ رکھ جمعہ کی صبح میں پابرہنہ علامہ ابن خاتون کے یہاں پہونچے اور ان کے ساتھ نماز استسقاء کے لئے شہر سے باہر نکل کر موسیٰ ندی کے کنارے جمع ہوئے اور بعد نماز دعا پڑھی۔ آخر میں ابن خاتون نے صدر مجلس میں بیٹھ کر اشرفیوں کی سفید اور لال تھلیاں بادشاہ کی طرف سے تمام مستحقوں میں تقسیم کیں اور ہاتھیوں اور اونٹوں پر جو پیسے بادشاہ نے خیرات کے لئے روانہ کئے تھے وہ بھی تقسیم کرنے کے بعد میں بادشاہ کی افزونی عمر کی دعا کر کے شہر کو مراجعت کی۔

اس عزت و احترام کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ ابن خاتون کے مخالفین برابر کام کر رہے تھے چنانچہ جب بیجاپوری لوگ حیدرآباد آئے تھے تو ابن خاتون کا اثر کم ہوگیا اور ۱۳ جمادی الآخر ۱۰۴۲ھ کو یہ اپنی خدمت سے معزول کردئے گئے اور میر محمد رضا استرآبادی پیشوا مقرر ہوئے اس زمانے میں ابن خاتون خانہ نشین ہوگئے لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد جب شہزادی کی پالکی بیجاپور روانہ ہوئی تو عبداللہ قطب شاہ پھر علامہ کی طرف متوجہ ہوئے اور جو کدورت پیدا ہوئی تھی دور ہوگئی چنانچہ اپنے ایک مقرب خاص کو طلائی پاندان دے کر علامہ کے یہاں روانہ کیا اور چند روز کے بعد خود ان کو طلب کر کے نوازش خاص کا اظہار کیا اور صدر الشریعت صدر جہاں کی جگہ ان کے بیٹھنے کے لئے معین کی اور سلطنت کے جملہ امور کے متعلق پہلے سے زیادہ مشورہ لینا شروع کیا۔ آخر کار ابن خاتون کو ۹ شوال ۱۰۴۳ھ کو جملۃ الملکی کا خلعت حاصل ہوا۔

(باقی آئندہ) سید محی الدین قادری زور

۳۰۱

ابن نشاطی — شاعر گولکنڈہ

۳۰۲

محمد سعید میر جملہ گولکنڈہ

گولکنڈے کے صوفیائے کرام

سید شاہ راجو

شاہ میر محمود

ملک الشعرا غواصی

غواصی کی تاریخ ولادت و وفات ابھی تحقیق طلب ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا اور محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں شاعری شروع کی۔ اس کی ابتدائی زندگی غربت میں بسر ہوئی سرکاری ملازمت اس کی گذراوقات کا ذریعہ تھی عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی سے اس کے دن پھرے۔ شاہی دربار میں رسوخ حاصل ہوا اور رفتہ رفتہ ملک الشعرا کے درجہ تک پہنچا۔ امورِ سلطنت میں بھی غواصی کو دخل تھا چنانچہ ۱۰۴۵ھ میں شاہی سفیر کی حیثیت سے بیجاپور بھیجا گیا۔ اس کی آخری زندگی پھر ایک مرتبہ تاریکی میں نظر آتی ہے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ سلطان عبداللہ کے زمانے میں اس کا انتقال ہوا۔

غواصی ایک قادر الکلام شاعر تھا اس کی درباری حیثیت نے اس کی شاعری کو شہرت دی۔ یہاں تک کہ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں امرا، عہد کے شعرا، میں سے صرف غواصی کا ذکر کیا ہے۔ سلطنت گولکنڈہ کا آخری ملک الشعرا، غواصی ہے

اس وقت تک علاوہ چیدہ چیدہ غزلوں اور مرثیوں کے غواصی کی صرف دو مستقل تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔ مثنوی "سیف الملوک بدیع الجمال" اور "طوطی نامہ"۔ دونوں اتفاق سے فارسی کے ترجمے ہیں۔ غواصی اپنے آپ کو فن شعر میں اس قدر کامل خیال کرتا ہے کہ وہ دوسرے کسی شاعر کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس تعلی اور ہمہ دانی کا ثبوت کوئی ایسی پیداوار سے نہیں ملتا۔ البتہ ان ترجموں میں اس نے اپنی پوری قوت صرف کی ہے اور اصل کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بڑی حد تک اپنی کوشش میں کامیاب اترا۔ اس کی پرگوئی کا ثبوت یہ ہے کہ مثنوی سیف الملوک جو دو ہزار سے زاید اشعار کی نظم ہے صرف ایک مہینے کی قلیل مدت میں ختم ہوئی ہے۔ ان مثنویوں کے وہ حصے جو غواصی کی اپنی پیداوار ہیں آورد شان لئے ہوئے ہیں جن میں غضب کی روانی پائی جاتی ہے۔

غواصی کی زبان میں ہندی عنصر غالب ہے۔ مبالغہ بہت کم اور کلام سادہ اور تصنع سے پاک ہے۔ اسلوب بہ لحاظ مضمون بدلا جاتا ہے چنانچہ مکالمہ کے مقام پر سادگی اور سلاست اور مدح و منقبت میں بلند خیالی اور شان دار الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔

یہاں مثالاً غواصی کی دونوں مثنویوں سے چیدہ چیدہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

قلم کاف و نون سے جو نکلیا بہار ۔۔۔ سو پہلے بچن کوں کیا آشکار
بچن عرش کرسی پو تے دہانے ہیں ۔۔۔ بچن آدمی کے بال آئے ہیں
بچن تے سوالاں جواباں ہووتیں ۔۔۔ بچن تے حساباں کتاباں ہووتیں
بچن تے ہوی نام نیکی بدی ۔۔۔ بچن تے ہوئے منتہی مبتدی
بچن تے چلے دین و دنیا تمام ۔۔۔ بچن کے ہیں محتاج سب خاص و عام
بچن غیب کے ہیں عجب جوہراں ۔۔۔ بچن کے سو ہیں جوہری شاعراں

میر سعادت علی رضوی

تاناشاہ کے ہندو دیوان

مادنا پنتلو اور اکنا پنتلو کے بارے میں مستند فارسی کتب میں کوئی مواد نہیں البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابوالحسن تاناشاہ کے وزراء تھے۔ کوئی فارسی تاریخ ایسی نہیں ہے جو ان کو بدکردار اور جاہل نہ لکھتی ہو۔ تعجب کا مقام ہے کہ ان کی کسی کتاب میں بھی ان کی بدکرداری کا کہیں ذکر نہیں جس سے ان مورخوں کی رائے کی تائید ہو سکے۔ یورپی کمپنیوں کے مکاتیب سے ان کی زندگی پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ان کی رائے اس وجہ سے قطعی تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ یہ فریق متعلقہ بھی ہیں اور خود غرض بھی۔ مقامی روایات، قصے، کہانیاں ہی ہمارے وہ ماخذ ہیں جن سے ہم کچھ مستفید ہو سکتے ہیں۔ ان واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان وزراء کی زندگی کا مختصر تذکرہ ذیل میں لیا جاتا ہے اور حتی المقدور اس امر کی کوشش کی جائے گی کہ ان کی زندگی کا کوئی ایسا پہلو پیش نہ کیا جائے جو موجودہ مواد کی بنا پر مابہ النزاع بن سکے۔

دیوان مادنّا

اکنا اور مادنا ہنمکنڈہ کے بھانوجی پنتلو کے فرزندان نیک بخت تھے۔ بھانوجی پنتلو ہنمکنڈہ کا عامل یا عہدہ دار تھا۔ اس نے اپنے چاروں بیٹوں کی عمدہ تعلیم و تربیت کا انتظام کیا تھا۔ اکنا اور مادنا ختم تعلیم کے بعد عبداللہ قطب شاہ کے درمیانی عہد سلطنت میں حیدرآباد آئے۔ مرزا سعید احمد نے ان کو اپنے صیغہ حساب میں ملازم رکھا تھا اور حالات کی ناموافقت کے باوجود وہ اپنی ان تھک محنتوں کی وجہ سے درجہ بدرجہ ترقی کرتے گئے اور ۱۶۶۶ء کے بعد مادنا سید مظفر سپہ سالار عبداللہ قطب شاہ کا پیشکار مقرر ہوا۔ اس طرح جب اس کو قلمدان وزارت سپرد کیا گیا تو یہ اس کے وسیع تجربوں کی بنا پر تھا نہ کہ کسی اور ذریعہ کے تحت۔

(۱) ۱۶۷۲ء کے انقلاب میں مادنا نے سید مظفر سے کسی طرح کم حصہ نہ لیا تھا۔ سید مظفر اور موسیٰ خاں علی الترتیب میر جملہ اور سرخیل مقرر ہوئے اور مادنا میر جملہ کا پیشکار مقرر ہوا۔ سید مظفر کی حرص اقتدار نے اسے ایک ایسی مصلحت اختیار کرنے کی ترغیب دی جس کے نتیجے بادشاہ حکومت کا برائے نام صدر رہ جاتا ہے۔ سید مظفر اہم معاملات میں بھی بادشاہ کا مشورہ نہیں لیتا تھا جس سے علانیہ مخالفت کی بو آتی تھی۔ ابوالحسن جیسے عاقل اور برحکمران سے یہ حرکت کب برداشت ہو سکتی تھی لیکن وہ کھلم کھلا اس کو بے دخل کر دینے پر بھی آمادہ نہ تھا اس لئے اس نے اکنا اور مادنا دونوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور ان کے ذریعہ سید مظفر کے متعلقین اور فوج کے عہدہ داروں کو ہمنوا بنا کر ۱۶۷۴ء میں بھرے دربار میں سید مظفر کی نازیبا حرکتوں کا راز فاش کر دیا اور اس سے قلمدان وزارت لے کر مادنا کے سپرد کر دیا۔ اس طرح مادنا اپنی غایت وفاداری اور تجربے کی بنا پر عہدہ وزارت عظمیٰ پر فائز ہوا۔ اور دربار شاہی سے سوریا پرکاش راؤ کا خطاب اور خلعت پایا۔ اکنا اپنے بھائی کا پیشکار رہا۔ اب ہم کو ان کی حکومت کے تین پہلوؤں سے واقف ہونا ہے۔ (۱) اندرونی مصلحت (۲) خارجی حکمت عملی (۳) فوجی تنظیم۔

اول الذکر کے بارے میں ان کے اصول حکومت کے متعلق کوئی تفصیلی معلومات اب تک فراہم نہ ہو سکیں تاہم موجودہ قلیل معلومات کی بدولت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے پیشرووں کی حکومت سے زیادہ ان کے طریقہ کار سے ملک میں باضابطگی اور امن قائم ہو سکا۔ تجارت، کان کنی، جہاز رانی اور زراعت میں بہت ترقی ہوئی البتہ گولکنڈہ کے کرناٹکی مقبوضات میں جو بعد میں حاصل کئے گئے تھے نظم و نسق قائم کرنے کا موقع نہیں ملا۔ قبل اس کے ہم کوئی قطعی رائے پیش کریں ہمارا اخلاقی فرض یہ ہوگا کہ ہم ملک کے ان حالات پر غور کریں جن کی وجہ سے ملک کو ناگفتہ بہ مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اورنگ زیب کی حکمت عملی کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ گولکنڈہ کو اس قدر

نیک نام خان — وزیر گولکنڈہ

سید مظفر — وزیر گولکنڈہ

غریب بنایا جائے کہ حکومت کا انتظام درہم برہم ہو جائے اور فوج منحرف ہو جائے۔ اس غرض سے انھوں نے آئے دن مطالبات میں اضافہ کرنا شروع کیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بادشاہ اپنے خانگی اور حرم کے جواہرات فروخت کرکے مطالبات پورے کرتے تھے۔ ملک و مالک کی محتاجی سے مادنا کی حکومت کے بنیادی اصول کا ایک پہلو مثلاً تخفیف میں ظاہر ہوا تو دوسرا عدیم المثال ضبط و تنظیم میں۔ گولکنڈہ کی تاریخ میں یہ دونوں بہت اہم اور نئی باتیں ہیں۔ تمام امراء و عہدہ داروں کی تنخواہوں میں تخفیف کی گئی۔ اعلیٰ اور ادنیٰ تمام عہدہ دار اس قانون کی پابندی کرنے پر مجبور کئے گئے۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ تمام لوگ وزیر کے مخالف ہوگئے۔ مادنا کی غیر ہر دلعزیزی کا یہ ایک اہم اور بنیادی سبب ہے۔ اس واقعہ میں مادنا سے زیادہ قدیم امراء قابل الزام ٹھیرتے ہیں جو اپنی تنخواہ کا ایک قلیل حصہ حکومت کو دینے کے لئے تیار نہیں تھے اور ایک واویلا مچاکر حکومت کو کمزور بنا دیا۔ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مادنا کی عزت عوام میں زیادہ تھی ۱۶۸۶ء تک وزیر اعظم نے تین مرتبہ پورے ملک کا دورہ کیا ہے۔

دوسرا پہلو خارجی مصلحت کا ہے۔ دکنی آزاد سلطنتیں ذاتی تحفظ کیلئے مغلوں کے مقابلہ میں ایک دوسرے کی مدد کرتی تھیں چنانچہ عبداللہ قطب شاہ نے مرزا راجہ جے سنگھ کے خلاف علی عادل شاہ ثانی کی مدد کے لئے نیک نام خاں کے تحت بارہ ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادوں کی ایک جرار فوج روانہ کی۔ مادنا اور ابوالحسن نے اسی مصلحت کو برقرار رکھا اور مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے لئے ایک قومی محاذ بنا کر لیا یہ اسی کا انتہائی تدبر اور سیاست دانی تھی کہ اس نے سیواجی کے ہاتھوں کو دوستی اور اخوت کے رشتے سے باندھ دیا اور اس طرح سلطنت گولکنڈہ سیواجی کی تاخت و تاراجی سے بچی رہی اس دوراندیشی کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ اس نے قلعہ جات ونگل کنڈہ دیپ، درلنڈہ و بیر کو مستحکم بنوا کر ہر ایک کی حفاظت کے لئے بارہ ہزار سپاہیوں کو متعین کر دیا۔ بیجاپور میں اپنے بھائی اکنا کو بحیثیت حاجب اس لئے مقرر کیا تھا کہ وہاں کی خارجی مصلحت کی رہبری کرے۔ مادنا نے ابوالحسن کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ قلعہ گولکنڈہ میں محصور نہ ہو جائے بلکہ کسی دور دراز کے قلعہ میں جائے اور بصورت ضرورت گولکنڈہ کو فوجی امداد روانہ کرے لیکن چونکہ شیخ منہاج کے مشورے کا زیادہ اثر تھا اس لئے اس مشورہ پر عمل نہیں کیا گیا

"مادنا اور اکنا منصب کے لالچ میں ابوالحسن کو اورنگ زیب کے ہاتھوں فروخت کرنا چاہتے تھے" یہ الزام تاریخ کے کسی طالب علم کے وہم و گمان میں بھی ٹھہر نہیں سکتا۔ یہ دونوں بھائی اورنگ زیب اور ابوالحسن سے بخوبی واقف تھے۔ فوجی تنظیم کے بارے میں بجائے اس کے کہ ہم اپنی رائے کا اظہار کریں مناسب ہوگا کہ واقعات کا اظہار کر دیا جائے جس سے ناظرین کو خود رائے قائم کرنے کا موقع مل سکے ۱۶۵۶ء میں گولکنڈہ کی فوج دکن کے مغل صوبہ دار کے لشکر کا مقابلہ ایک دن بھی نہ کر سکی اور قلعہ گولکنڈہ مغل گولہ باری کی تاب نہ لاسکا۔ لیکن ۱۶۸۵ء اور ۱۶۸۶ء میں شہنشاہیت کی ساری قوت ملکھیڑ کے میدان میں تین مہینے تک روکی گئی اور تمام تاریخیں گولکنڈہ کی فوج کی بہادری کے کارناموں سے بھری پڑی ہیں۔ اگر محمد ابراہیم باغی نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ مغلوں کو ملکھیڑ کے میدان میں ایسی شکست فاش ہوتی کہ مغل پھر ادھر کا رخ نہ کرتے محاصرۂ گولکنڈہ سے ہر شخص واقف ہے ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ناظرین اپنی ذاتی رائے قائم کرسکتے ہیں۔

مادنا پر ظالم اور متعصب ہونے کا جو الزام لگایا گیا ہے وہ شہنشاہی اغراض کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہے۔ "گولکنڈہ پر حملہ کرنے کا ایک حیلہ ہے"۔ ناظرین پر یہ واقعہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ مغل مدبر سے مسعود خاں اور شرزاخاں کے بارے میں بھی بیجاپور میں یہی مصلحت اختیار کی گئی تھی مختصر یہ کہ ۱۶۸۶ء میں اعیان سلطنت نے سازش کی اور ان کو قتل کرا دیا۔ جمشید نامی ایک غلام نے چند اور دوسرے غلاموں کے ساتھ ان کے سر تن سے جدا کر دئے اور شہزادہ شاہ عالم بہادر کے پاس روانہ کئے حرم سے سرو ما اور جانی بی بی نے اس سازش میں زیادہ حصہ لیا ہے۔

شہزادہ نے ان کے سروں کو بہادر خان کے ذریعہ شولاپور میں اورنگ زیب کے پاس روانہ کیا جہاں وہ ہاتھی کے پیروں تلے روندے گئے ۔

اکنا پیشکار

یہ مادنا کا بڑا بھائی تھا ۔ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص غیر مہذب ، منہ پھٹ اور صاف گو تھا ۔ مادنا کے وزیر اعظم بننے کے بعد یہ ان کا پیشکار مقرر ہوا ۔ اور پھر قطب شاہی کرناٹک کا صوبہ دار بنا صوبہ داری کے عہدے سے سرلشکری پر ترقی پائی ۔ عہد نامہ بیجاپور کے بعد وہاں کا حاجب مقرر ہوا ۱۶۸۴ء میں بیجاپور سے واپس ہوا اور ۱۶۸۶ء میں مادنا کے ساتھ قتل کر دیا گیا ۔

اس نے کرناٹک اور مشرق کا دو مرتبہ دورہ کیا ۔ بندر گاہوں کے انتظام میں نہایت بے مروتی سے کام لیا اور اس طرح گولکنڈہ کی آمدنی میں اضافہ کیا فوج کی تنظیم میں اس کا بہت حصہ ہے اس کے دو بھانجوں رستم راؤ اور پودلی لنگنا نے بادشاہ کی کئی اہم خدمات انجام دیں ۔ خافی خاں رستم راؤ کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے کہ وہ صاحب السیف والقلم تھے پودلی لنگنا نے انگریزوں کو سر بلند ہونے نہ دیا اور بار بار زک دے کر گولکنڈہ میں انھیں برسر اقتدار ہونے سے روکتا رہا اس کے مدد و معاون اس کے دونوں ماموں تھے جو ہر طریقے سے اس کی اس کام میں مدد کرتے تھے ۔ اکنا کے ایک خط میں انگریزوں کو بدیں الفاظ تنبیہ کی گئی کہ وہ پودلی لنگنا کے اقتدار کو تسلیم کریں ۔ اس کے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈہ کی بحری تجارت بھی تھی ۔ اور خود ان بھائیوں کے تجارتی جہاز تھے ہیاورٹ نامی ولندیزی رسالے میں ان کو مغرور اور شریر النفس بیان کیا گیا مگر اس کی تائید کسی اور تاریخ سے نہیں ہوتی ۔ موجودہ معلومات کی بنا پر ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ان کی طبیعت میں روکھا پن زیادہ تھا ۔

بہرکیف دونوں بھائیوں نے ملک و مالک کی بے لوث خدمت کی ہے لیکن ان کی محنت کا انھیں معاوضہ نہیں ملا ۔ انھیں حکومت کو ایسی نا گفتہ بہ حالت میں چلانا پڑا جس میں کامیابی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ تاہم چودہ سال تک جس قابلیت سے ان بھائیوں نے ملک کے اس ٹمٹماتے دیئے کو گل ہونے سے روکا ہے وہ قابل تحسین ہے بہت ممکن ہے کہ مارخ دان اس حقیقت کے اظہار کی طرف متوجہ ہو کر ان الزامات کو غلط ثابت کر دیں گے ۔ اور زمانہ بتادے گا کہ ملک و مالک کے بہی خواہ کبھی نہ کبھی اپنی حقیقی قدر و منزلت حاصل کر کے رہیں گے ۔

کے، وی بھوپال راؤ

عبدالرزاق لاری گولکنڈہ کے دروازے پر

اک شیر زیاں ہے کہ کھڑا جھوم رہا ہے
زخموں سے لہو گر کے قدم چوم رہا ہے

تلوار بھی اک ہاتھ میں بل کھائی ہوی ہے
معلوم نہیں کس کی قضا آئی ہوی ہے

دروازے میں اک جان ہے اور لاشوں کے انبار
اور سمتِ مقابل میں ہے تلواروں کی جھنکار

معلوم ہے اس کو کہ کوی ساتھ نہ دے گا
بیتا کو اٹھانے میں کوئی ہاتھ نہ دے گا

پر اک دلِ لاری ہے کہ جو جانِ وفا ہے
یہ مطلعِ انوارِ وفا، کانِ وفا ہے

اکبر وفاقانی

گولکنڈہ کا آخری سپہ سالار عبدالرزاق لاری زخموں سے بے ہوش ہوکر گرنے سے پہلے

سلطنت ابد مدت آصفجاہی

اور

سلاطین آصفی

سلطنت آصفیہ کا قیام تاریخ ہند کا ایک نہایت درخشاں باب ہے۔ اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد کوئی شخصیت نواب نظام الملک سے زیادہ نمایاں نہ تھی جو منتشر قوتوں کو یکجا کر کے مرکزیت پیدا کرنے یا بڑی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ چنانچہ نواب نظام الملک نے اول تو سلطنت مغلیہ کے بقا، اس کی اصلاح اور استحکام کے لئے ممکنہ کوشش کی لیکن جب اس میں کامیابی کی صورت نظر نہ آئی تو انھوں نے حریفوں کو شکست دے کر سلطنت آصفیہ کی بنا رڈالی (سنہ ۱۱۳۷ھ) نواب نظام الملک کے بعد جس شخصیت نے سینہ سپر ہو کر مشکلات کا مقابلہ کیا اور سلطنت کے لئے جو خطرات تھے ان کو دور کیا اور سلطنت آصفیہ کی صحیح معنوں میں تعمیر کی وہ بانیٔ سلطنت کے فرزند آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں بہادر تھے۔

قیام سلطنت آصفیہ سے بہت سے فوائد حاصل ہوئے۔ اول تو دکن کی بدنظمی اور بدامنی کا خاتمہ ہو کر امن و امان اور عدل و انصاف کا دور شروع ہوا۔ دوم یہ کہ ملک میں زراعت کی سرسبزی، صنعت و حرفت کی ترقی اور تجارت کی گرم بازاری ہونے لگی۔ بالخصوص شاہان آصفیہ کی شہرۂ آفاق رواداری اور لاثانی حب الوطنی روایتی فیاضی اور عدیم المثال رعایا پروری نے ملک کی خوشحالی میں چار چاند لگا دئے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہان آصفی کی حکومت اپنی ساری رعایا پر نہ صرف منصفانہ رہی۔ بلکہ ہمیشہ مشفقانہ اور پدرانہ رہی ہے۔ انھوں نے قیام امن اور عدل و انصاف تک ہی خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ آثار قدیمہ کی حفاظت اور علم و فن کی سرپرستی میں بڑا حصہ لیا۔ اور جدید قوم ساز سررشتوں کو قائم کر کے رعایا کی مادی، اخلاقی اور تعلیمی ترقی میں دن دونی اور رات چوگنی اضافہ کیا۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ وسط انیسویں صدی ہی سے یعنی سالار جنگ اول کی وزارت کے زمانہ سے ترقی اور اصلاح کا دور شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس وقت مبارک عہد عثمانی میں جس تیز رفتاری کے ساتھ دکن میں ہمہ جہتی ترقی ہو رہی ہے۔ وہ تاریخ ہند میں عدیم المثال ہے۔ حیدرآباد کی تعمیر کے سلسلے میں اعلیٰ حضرت بندگان عالی کا نام رہتی دنیا تک یادگار رہے گا کہ زراعت صنعت و حرفت تجارت تعلیم تعمیرات اور حفظان صحت غرض ہر شعبۂ زندگی میں غیر معمولی چہل پہل ہے۔ نتیجہ یہ کہ اب دکن صرف مشرقی تمدن اور قدیم معاشرت ہی کا مرکز نہیں رہا ہے بلکہ اپنے عصری ترقیات کے اعتبار سے حیدرآباد مشرقی اور مغربی تہذیب کا گہوارہ اور قدیم و جدید تمدن کا سنگم بن گیا ہے۔ موجودہ ہمہ جہتی ترقی کی رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل نہیں کہ دور عثمانی میں حیدرآباد مستقبل اس کے بہمنیہ اور قطب شاہیہ ماضی سے کہیں شاندار ہوتا جا رہا ہے۔

نواب نظام الملک آصفجاہ اوّل بانی سلطنت آصفیہ

(۱۷۲۴ء تا ۱۷۴۸ء)

نواب نظام الملک آصفجاہ اول کا خاندانی سلسلہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ تک اور آگے حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے۔ نواب نظام الملک کے دادا عابد خاں عہد شاہ جہاں میں ہندوستان آئے تھے اورنگ زیب کے زمانے میں منصب پنج ہزاری، ور صدارت کل کے عہدہ پر فائز تھے گولکنڈہ کے محاصرہ میں گولے کے زخم سے شہید ہوئے۔

اُن کے فرزند میر شہاب الدین خاں اورنگ زیب کے مشہور امراء میں سے تھے جن کو منصب ہفت ہزاری اور غازی الدین خاں فیروز جنگ کا خطاب عطا ہوا تھا۔ انھیں کے نامور فرزند نواب نظام الملک آصفجاہ اول تھے۔

اُن کا اصلی نام میر قمر الدین تھا اور ولادت ۱۶۷۱ء میں ہوئی تھی۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں "چین قلیچ خاں" کا خطاب اور منصب پنج ہزاری سے سرفراز ہوئے بعد ازاں بیجاپور کی صوبہ داری پر فائز ہوئے تھے۔ غرض اورنگ زیب کی اُن پر خاص عنایت تھی۔ حتیٰ کہ اورنگ زیب نے خاندانی حالات، وجاہت، بہادری ور تدبر کی بنا پر ان کو اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کام بخش کی لڑکی بیاہ دینی چاہی تھی لیکن مصلحت کی بنا پر نظام الملک نے اس کو پسند نہیں کیا۔

فرخ سیر کے زمانہ میں ان کو "نظام الملک بہادر فتح جنگ" کا خطاب ہفت ہزاری منصب اور دکن کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ چنانچہ ۱۷۱۳ء میں وہ بہ حیثیت صوبہ دار دکن اورنگ آباد آگئے تھے۔ لیکن اورنگ زیب کے نااہل جانشینوں کے زمانہ میں جب ملک کی حالت خراب ہوتی گئی اس وقت نظام الملک کو بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ وہ دکن سے مالوہ کی صوبہ داری پر بھیجے گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سارا ملک بادشاہ گر سیدوں (سید حسین علی اور سید عبداللہ دونوں بھائیوں) کے مظالم سے تنگ آگیا تھا۔ اس وقت سب کی نظریں نظام الملک کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اُس نازک موقع پر نواب نظام الملک نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ مخالفین سے سخت لڑائی ہوئی (جس میں سید دلاور علی خاں اور سید عالم علی خاں نائب صوبہ دار دکن مارے گئے) اس طرح نواب نظام الملک نے بزور شمشیر حیدرآباد اور برار وغیرہ کے علاقوں کو فتح کیا۔ غرض سیدوں کا خاتمہ کرکے نہ صرف محمد شاہ کو انھوں نے نجات دلائی بلکہ سارے ملک پر ایک بڑا احسان کیا۔ محمد شاہ نے اس کے صلہ میں آصفجاہ کا خطاب دے کر ان کو سلطنت دہلی کا وزیر مقرر کیا لیکن دربار کی حالت دیکھ کر انھوں نے اپنے بڑے فرزند غازی الدین خاں کو دہلی میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود حیدرآباد تشریف لائے۔

راستہ میں برار کے قریب ان کو مبارز الدین خاں سے لڑنا پڑا جس میں وہ مارا گیا۔ غرض یہ وہ زمانہ ہے کہ ملک میں فتنہ و فساد کا بازار گرم تھا۔ کوئی مرکزی طاقت موجود نہ تھی جو امن و امان قائم کرسکتی ہو۔ اصل تو نواب نظام الملک نے سلطنت مغلیہ کو بچانے کی انتہائی کوشش کی لیکن جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو مجبوراً ۱۷۲۴ء میں سلطنت آصفیہ کی خود مختاری کی بنا ڈالی (یہی وجہ ہے کہ حسب فرمان خسروی ہر سال ۲۹ رجب کو اسی خود مختاری سلطنت آصفیہ کی یادگار میں عام تعطیل دی جاتی ہے) لیکن اس کے باوجود سلطنت دہلی کی خیرخواہی اور وفاداری میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ چنانچہ ۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تو وہ فوراً

نواب میر قمر الدین خاں فتح جنگ نظام الملک آصف جاہ اول

نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی

دہلی پہنچ گئے اور وہاں غیر معمولی جرأت سے کام لے کر نادر کو لوٹ مار اور قتل عام سے روکا۔

دہلی سے دوبارہ دکن آکر انھوں نے مرہٹوں کا سدباب کیا اور دریائے تاپتی سے لے کر جنوبی ہند اور کرناٹک تک سارے ممالک محروسہ میں امن وامان قائم کیا۔ اس سے رعایا کو اطمینان نصیب ہوا۔ اس طرح سلطنت آصفیہ کے قیام سے ملک میں معاشی خوشحالی کا آغاز ہوا۔ نظام الملک بڑے رحم دل اور فیاض بادشاہ تھے۔ ان کو ہمیشہ اپنی رعایا کا بڑا خیال رہتا تھا۔ آخر کار ۱۷۴۸ء میں بمقام برہان پور انتقال کیا۔ چنانچہ دولت آباد میں ان کا مقبرہ موجود ہے۔

مختصر یہ کہ نواب نظام الملک نہ صرف اوائل اٹھارویں صدی کے سب سے بڑے قائد، زبردست سپہ سالار اور بہترین مدبر کی حیثیت سے یاد کئے جائیں گے بلکہ موجودہ سلطنتِ آصفیہ کے بانی ہونے کی وجہ سے تاریخ میں ان کی شخصیت ہمیشہ نمایاں رہے گی

نواب میر نظام علی خاں آصفجاہ ثانی

(۱۷۶۱ء تا ۱۸۰۳ء)

نواب نظام الملک کی وفات پر دکن میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا اسی سلسلہ میں انگریزی اور فرانسیسی کمپنیوں کو ریشہ دوانیوں کا خوب موقع ہاتھ آیا۔ اولاً یہاں پر نظام الملک کے دوسرے فرزند ناصر جنگ نے دو سال تک حکومت کی ان کی شہادت پر نظام الملک کے نواسے مظفر جنگ چند روزہ حکومت کے بعد مارے گئے اس کے بعد امراء نے صلابت جنگ کو تخت نشین کیا جو اور بھائیوں کی بہ نسبت عمر میں بڑے تھے۔ لیکن ان کا زمانہ شروع سے آخر تک ایک کمزور زمانہ تھا۔ جب کہ مرہٹہ اور فرانسیسی دکن پر چھا گئے تھے اور ملک کے انتظامی حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے۔ اس لئے امراء کے مشورہ سے محض ملکی مفاد کے مدنظر صلابت جنگ کی علحدگی عمل میں آئی اور نواب آصفجاہ ثانی تخت نشین ہوئے

نواب میر نظام علی خاں بہادر نظام الملک کے چوتھے فرزند تھے اُن کی ولادت ۱۷۳۴ء میں ہوئی تھی بچپن ہی سے وہ بہادر اور فنون سپہ گری سے خوب واقف تھے۔ چونکہ اپنے بھائی صلابت جنگ کے زمانہ میں وہ وزیر رہ چکے تھے اس لئے ان کو سلطنت کے معاملات کا بہت وسیع تجربہ تھا بادشاہ ہوتے ہی انھوں نے کھوئے ہوئے علاقے مرہٹوں سے حاصل کئے اور فرانسیسی اثرات کو دکن سے دور کیا بعد ازاں نہایت دور اندیشی سے کام لے کر انگریزوں سے رابطہ اتحاد قائم کیا۔ اس زمانہ میں ٹیپو سلطان کی قوت بڑھ رہی تھی۔ اس لئے انگریزوں نے آصفجاہ ثانی اور مرہٹوں کو ملاکر "اتحاد ثلاثہ" قائم کیا اور میسور کے خلاف کامیابی حاصل کی اس کے کچھ عرصہ بعد جب مرہٹوں نے چوتھ کے مطالبہ کے سلسلہ میں حیدرآباد پر حملہ کیا تو انگریزی گورنر جنرل سر جان شور نے عدم مداخلت کا بہانہ کرکے مدد دینے سے انکار کردیا جس کی وجہ سے سرکار نظام کو بمقام کھرڈلا ناکامی ہوئی اور سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

اس پر آصفجاہ ثانی نے انگریزی فوجوں کو برخاست کرکے ان کی جگہ موسیو ریموں کی ماتحتی میں فرانسیسی فوجیں ملازم رکھیں لیکن موسیو ریموں کی موت کے بعد جب انگریزی کمپنی کا مشہور ومعروف گورنر جنرل ولزلی ہندوستان آیا تو اس نے نہایت حکمتِ عملی سے

آصفجاہ ثانی کو پھر اپنی طرف کرکے فرانسیسی فوجوں کو دکن سے برخاست کرادیا۔

حیدرآباد کے عہد معاونت قبول کرنے کے بعد یہاں سے رقمی اور فوجی امداد حاصل کرکے ولزلی نے میسور کی ریاست پر حملہ کیا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت اور ریاست میسور کے خاتمہ کے بعد کچھ علاقے مثلاً کڑپہ، کرنول اور بلاری وغیرہ حیدرآباد کو برائے نام ملے تھے لیکن فوجی مصارف کے نام سے بہت جلد واپس لے لئے گئے۔

سنہ ۱۸۰۰ء میں آصفجاہ ثانی اور انگریزوں کے درمیان عام اعانت وحفاظت باہم دیگر کا مشہور عہدنامہ ہوا چنانچہ اُس وقت سے آج تک تاج برطانیہ اور ریاست حیدرآباد کے جو خوشگوار تعلقات قائم ہیں وہ اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آصفجاہ ثانی نے انگریزوں سے مستقل تعلقات قائم کرکے سلطنت آصفیہ کے لئے فرانسیسیوں، ٹیپو سلطان اور مرہٹوں کے جو زبردست خطرات تھے ان کو رفع کیا اور اندرون ملک سے فسادات کو دور کیا اور امن قائم کیا۔ اس طرح سنہ ۱۷۶۱ء سے سنہ ۱۸۰۳ء تک نہایت کامیابی کے ساتھ انھوں نے حکومت کی اور اپنی حکمت عملی اور دور اندیشی سے نہ صرف سلطنت کی ڈوبتی ناؤ کو بچا لیا بلکہ اپنے عہد حکومت میں ممالک محروسہ کا رقبہ وسیع کرکے سلطنت آصفیہ کا وجود ہمیشہ کے لئے مستقل اور مستحکم کردیا۔ ان وجوہات کی بنا پر اور خصوصاً اٹھارویں صدی کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب کہ ہندوستان میں ہر نقطہ نظر سے ایک عام انحطاط کا دور چلا آرہا تھا۔ ہمیں آصفجاہ ثانی کی شخصیت کیا بلحاظ بہادری اور کیا بلحاظ تدبر اپنے ہم عصروں میں سب سے ممتاز نظر آتی ہے۔ اور وہ بجا طور پر سلطنت آصفیہ کے حقیقی معمار سمجھے جاسکتے ہیں۔

نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث

(سنہ ۱۸۰۳ء تا سنہ ۱۸۲۹ء)

نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثانی کے بڑے بیٹے تھے اور ان کا نام میر اکبر علی خاں تھا۔ ان کے اوائل حکومت کا اہم ترین واقعہ مرہٹوں اور انگریزوں کی جنگ ہے۔ چونکہ نواب سکندر جاہ نے اس لڑائی میں ہر طرح سے انگریزوں کی امداد فرمائی تھی اس لئے کامیابی حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے دولت آباد وغیرہ کے علاقے نواب سکندر جاہ کو واپس کردئے۔ لیکن اسی زمانہ سے فوجی اور ملکی معاملات میں انگریزوں نے زیادہ دخل دینا شروع کیا۔ چنانچہ میر عالم کے انتقال پر مدار المہام کے تقرر کا مسئلہ پیش ہوا تو رزیڈنٹ وقت کپتان سڈنہم نے بہت کچھ مداخلت کی لیکن سکندر جاہ نے منیر الملک ہی کو اپنی مرضی سے وزیر منتخب کیا البتہ اتنا ضرور ہوا کہ سارے اختیارات پیشکار مہاراجہ چندو لال کے ہاتھ میں آگئے، (جن کی تائید میں رزیڈنٹ تھا) چنانچہ اس کے بعد تقریباً تیس سال تک ریاست میں چندو لال ہی کا بڑا عمل دخل رہا۔ ریاست کے انتظامی اور فوجی معاملات میں رزیڈنٹ رسل کی پیش قدمی انگریزوں سے مہاراجہ چندو لال کی غیر معمولی ہمدردی اور پامر کمپنی سے سودی قرضہ کا لین دین یہ وہ چیزیں تھیں جس کی وجہ سے ریاست حیدرآباد کی مالی اور انتظامی حالت بد سے بدتر ہوگئی۔ چنانچہ دوسرے رزیڈنٹ مٹکاف نے جایزہ لیتے ہی صاف طور پر یہ کہہ دیا کہ نئی اعانتی فوجیں حیدرآباد کے خزانہ پر بہت بار ہیں اور پامر کمپنی کا جال ایک دوسری مصیبت ہے۔ اس لئے اس نے بعض مفید تجاویز پیش کئے چنانچہ گورنر جنرل وقت مارکوئس آف ہسٹنگز نے پامر کمپنی کا قرضہ تو انگریزی حکومت

نواب میر اکبر علی خاں سکندر جاہ آصف جاہ ثالث

نواب میر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ آصف جاہ رابع

کی طرف سے ادا کرا دیا لیکن شمالی سرکاروں کی جو پیشکش آصفجاہ ثانی کے زمانہ سے جاری تھی وہ اس سلسلہ میں ہمیشہ کے لئے بند کر دی۔ اور فوجی بار حسب حال ریاست پر پڑتا رہا۔

مہاراجہ چندولال کے عمل دخل کو دیکھ کر نواب سکندر جاہ نے خود امور سلطنت میں زیادہ حصہ نہیں لیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کے معاملات میں انگریزوں کی مداخلت روز بروز زیادہ بڑھتی گئی۔

نواب سکندر جاہ ایک خدا ترس رحمدل اور نیک بادشاہ تھے۔ ان کو اپنی رعایا کے آرام و آسایش کا بڑا خیال تھا چنانچہ انھوں نے کئی تالاب سڑکیں وغیرہ تعمیر کرائیں۔ غرض رفاہ عام کے بہت سے کام انجام دیے۔ انگریزی اعانتی فوج کے لئے سکندرآباد کا شہر انھیں کی یادگار ہے۔

نواب ناصر الدولہ آصفجاہ رابع

(۱۸۲۹ء تا ۱۸۵۷ء)

میر فرخندہ علی خاں نواب ناصر الدولہ سکندر جاہ کے صاحبزادے تھے۔ تخت نشین ہوتے ہی انھوں نے ملکی انتظامات کو درست کرنے کی کوشش کی، رزیڈنسی کے اثرات کو کم کیا اس سلسلہ میں مہاراجہ چندولال کے استعفاد دینے کے بعد کچھ عرصہ تک بغیر کسی مدار المہام کے بذات خود وہ حکومت کے کام انجام دیتے رہے۔ اور پھر کئی مدار المہاموں کو خود ہی مقرر کیا اور معطل علحدہ کر دیا۔ انگریزوں کے قرضہ کی رقم بڑھتی جا رہی تھی چنانچہ جب ڈلہوزی گورنر جنرل ہو کر ہندوستان آیا تو اس نے سخت تقاضا کیا کہ قرضہ کے معاوضہ اور فوجی اخراجات کے لئے ملک کے بعض اضلاع انگریزوں کے حوالے کئے جائیں۔ اُس زمانہ کا رزیڈنٹ جنرل فریزر نہایت منصف مزاج اور ریاست کا خیر خواہ تھا۔ اس طرح کی ناواجبی مداخلت کو پسند نہ کر کے اس نے خود استعفا دے دیا۔

لیکن ڈلہوزی نے پھر دباؤ ڈالا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد کی اعانتی فوج کے اخراجات اور قرضہ کے سلسلہ میں نواب ناصر الدولہ پر انتہائی دباؤ ڈالا گیا۔ چنانچہ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی رو سے رائچور کا دوآبہ اور برار کا علاقہ عارضی پٹہ پر انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا اس واقعہ کا حیدرآباد کے وزیر سراج الملک پر اتنا اثر ہوا کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ ان کے بھتیجے میر تراب علی خاں سالار جنگ اول مدار المہام مقرر ہوئے جنھوں نے نہ صرف تین بادشاہوں کے زمانہ میں مدار المہامی کی اہم ترین خدمت انجام دی بلکہ جدید حیدرآباد کے بنانے میں شاید سب سے زیادہ حصہ لیا

نواب ناصر الدولہ کے زمانہ ہی سے انھوں نے سیاسی اصلاحات اور معاشی و تعلیمی ترقیات کا کام شروع کر دیا تھا جس کو بعد کے دو فرمانرواؤں کے زمانہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ملک کے حصے بخرے ہو کر چھوٹے چھوٹے اراضیات سرمایہ داروں اور عرب جمعداروں کے پاس رہن تھے سالار جنگ نے ان علاقوں کو چھڑا لیا۔ اور دوسری اصلاحات کے کام میں مصروف تھے کہ ادھر شمالی ہند میں غدر کی آگ پھوٹ پڑی اور ادھر نواب ناصر الدولہ نے رحلت فرمائی۔

نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس

(سنہ ۱۸۵۷ء تا سنہ ۱۸۶۹ء)

ہندوستان کی تاریخ میں سنہ ۱۸۵۷ء کی اہمیت غیر معمولی ہے کیوں کہ اس سال شمالی ہند میں غدر ہونے کی وجہ سے دہلی اور میرٹھ سے لے کر وسط ہند تک ہر جگہ ہندوستانی فوج نے سرکشی کی تھی۔ غرض وہ وقت انگریزوں کے لئے نہایت درجہ نازک تھا۔ حیدرآباد کے لئے بھی وہ زمانہ کچھ کم اہمیت کا نہ تھا کیونکہ ناصر الدولہ کے انتقال کے بعد یہاں ان کے بڑے صاحبزادے نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ تخت نشین ہوئے تھے۔ انھوں نے نہ صرف ریاست حیدرآباد اور جنوبی ہند میں غدر کی آگ کو پھیلنے سے روکا بلکہ انگریزوں کی ہر طرح سے مدد فرمائی مختصر یہ کہ نواب افضل الدولہ اور ان کے وزیر سالار جنگ نے انگریزوں کی ڈوبتی ناؤ کو بچالیا چنانچہ سنہ ۱۸۵۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمہ کے بعد ہندوستان کی حکومت جب راست شاہان انگلستان کے ہاتھ آگئی تو نواب افضل الدولہ کی خدمات کے صلہ میں شوراپور اور رائچور کا دوآبہ حیدرآباد کو واپس مل گیا۔

نواب افضل الدولہ کے زمانے سے حیدرآباد جدید کی ابتداء ہوتی ہے۔ اب بھی ایسے سن رسیدہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے نواب افضل الدولہ بہادر اور ان کے خیر خواہ اور وفادار وزیر سالار جنگ اول کو اصلاح اور ترقی ملک کے کاموں میں ہمہ تن مصروف دیکھا تھا چنانچہ ان کی زبانی اس زمانے کے حالات سننے سے اس عہد کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔

اسی طرح حیدرآباد میں بہت سی نشانیاں اور کئی عمارتیں ایسی موجود ہیں۔ جیسے افضل گنج۔ افضل گنج کا پل۔ مسجد افضل گنج یا چوملہ پیالیس وغیرہ جو اسی عہد کی یادگار ہیں۔

نواب افضل الدولہ کا عہد حکومت صرف بارہ سال تک رہا لیکن سچ تو یہ ہے کہ حکومت آصفیہ کے موجودہ نظام حکومت اور انتظامات مملکت کی داغ بیل اسی عہد میں ڈالی گئی۔ اول تو سارے ملک کی پیمایش کراکے مالگزاری مقرر کی گئی دوسرے یہ کہ سارے ملک کو چار صوبوں، سترہ ضلعوں اور بہت سے تعلقوں میں تقسیم کرکے صوبہ دار۔ تعلقدار اور تحصیلدار مقرر کئے گئے۔ انتظامی اور مالی اصلاحات کے علاوہ سررشتہ عدالت اور پولیس کی تنظیم عمل میں آئی۔ نیا سکہ جاری ہوا۔ اس طرح امن وامان اور عدل وانصاف کے سررشتوں کی تنظیم کے بعد قوم ساز سررشتوں کے قیام کی طرف توجہ کی گئی اور رعایا کے آرام وآسایش، علمی اور مادی ترقی کی خاطر سررشتہ جات تعلیم۔ طبابت اور تعمیرات وغیرہ کا قیام عمل میں آیا۔ خاص کر تعلیم کے معاملہ میں دورجدید کی تاریخ میں پہلا قدم نواب افضل الدولہ کے عہد میں اٹھایا گیا کہ ایک طرف تو ہر ضلع اور ہر تعلقہ میں مدارس قائم کئے گئے۔ اور دوسری طرف خاص شہر حیدرآباد میں دارالعلوم اور مدرسہ عالیہ کا قیام عمل میں آیا۔ جہاں عام طور پر ذریعہ تعلیم فارسی زبان تھی۔

ذاتی حالات کے اعتبار سے افضل الدولہ بہادر بڑے خداترس، بہت نیک ملنسار اور سادہ مزاج بادشاہ تھے۔ رفاہ عام کے کاموں میں غیر معمولی دلچسپی لینے کے علاوہ بڑے فیاض اور علم وفن کے بڑے قدردان تھے۔ تاریخ میں ان کا اور ان کے وفادار وزیر سالار جنگ اول کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اس رحمدل بادشاہ اور خیر خواہ وزیر نے ریاست حیدرآباد کی اصلاح اور ترقی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور اس طرح حیدرآباد جدید کی تعمیر کا کام آغاز کیا۔ جس کو بعد کے زمانہ میں ترقی ہوتی گئی۔

نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ آصف جاہ خامس

نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس

نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس

(۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء)

تاریخ میں ایسی مثالیں شاذ ہی ہوں گی جب کہ ایک نہایت کمسن شہزادہ کو تخت نشین کیا گیا ہو۔ اور پھر بھی حکومت کامیابی سے چلی ہو چنانچہ یہ ایک اہم واقعہ ہے کہ ۱۸۶۹ء میں افضل الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے چہیتے فرزند نواب میر محبوب علی خاں کو تین سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا گیا اور ایک مجلس تولیت قائم ہوئی جس کے اراکین نواب سالار جنگ اول اور نواب شمس الامراء تھے۔ اور انھیں کے سپرد حکومت کے جملہ کاروبار تھے۔

نواب میر محبوب علی خاں کے سن بلوغ کو پہنچنے سے قبل کے چند واقعات نہایت اہم ہیں ایک تو یہ کہ سالار جنگ اول نے واپسی برار کا مسئلہ چھیڑ دیا اور اسی سلسلہ میں خود انگلستان گئے جہاں آپ کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۷۷ء میں اعلیٰ حضرت کو ساتھ لے کر سالار جنگ اول نے دہلی دربار میں شرکت کی اور تیسرا اہم واقعہ خود سالار جنگ کے ۱۸۸۳ء میں انتقال کر جانے کا ہے۔ ایسے وفادار اور مدبر وزیر کسی ملک کی تاریخ میں شاذ ہی گذرے ہوں جو اپنے ملک اور مالک کے لئے ہمہ تن وقف ہو گئے ہوں۔ چنانچہ سالار جنگ کو یہ شرف حاصل رہا کہ ناصر الدولہ، افضل الدولہ اور نواب میر محبوب علی خاں جیسے تین ہر دلعزیز بادشاہوں کے زمانے میں تقریباً تیس سال تک انھوں نے نہایت تدبر اور وفاداری سے ملک اور مالک کے خدمات انجام دے۔ اور سچ تو یہ کہ حیدرآباد جدید کی ترقیوں کی داغ بیل ڈالنے میں بڑا حصہ لیا۔

سالار جنگ نہایت ہر دلعزیز تھے ان کی وفات کا صدمہ یوں تو ساری رعایا کو ہوا لیکن سب سے زیادہ اعلیٰ حضرت کو ہوا کیونکہ اعلیٰ حضرت دل سے ان کی قدر کرتے تھے۔ سالار جنگ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سالار جنگ ثانی، پھر سر آسمان جاہ، سر وقار الامراء اور آخر کار مہاراجہ سر کشن پرشاد یکے بعد دیگرے مدار المہام مقرر ہوئے۔

اعلیٰ حضرت مرحوم بڑی خوبیوں کے انسان اور بڑے ہر دلعزیز بادشاہ تھے سرکار انگریزی سے ان کے زمانہ میں دوستانہ تعلقات میں اضافہ ہوا لارڈ رپن نے پہلی مرتبہ حیدرآباد آکر اس رسم کی ابتداء کی کہ گورنر جنرل کو ضرور حیدرآباد آنا چاہئے۔ چنانچہ اس کے بعد سے ہر وائسرائے اپنی واپسی سے قبل ضرور حیدرآباد آجایا کرتے ہیں۔ تاریخ دکن میں مسئلہ برار یوں بھی کوئی دل خوش کن چیز نہ تھی۔ اس پر ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے حیدرآباد آکر برار کے دوامی پٹہ پر مجبوراً اعلیٰ حضرت کے دستخط لے لئے کہ برار مملکت تو سرکار نظام کی ہو لیکن اس پر قبضہ ہمیشہ کے لئے سرکار انگریزی کا رہے۔ اور اس کے لئے سالانہ ۲۵ لاکھ کی پیشکش سرکار نظام کو دی جایا کرے۔ چنانچہ یہ رقم اب تک ہر سال وصول ہوتی ہے۔

اعلیٰ حضرت مرحوم کا زمانہ جدید ترقیات کے آغاز کا ہے اس دور میں نہ صرف بہت سی عمارتیں تعمیر ہوئیں جیسے زنانی شفاخانہ، محبوبیہ ٹاؤن ہال وغیرہ بلکہ بہت سی سیاسی اصلاحیں عمل میں آئیں۔ مثلاً سکہ محبوبیہ جاری ہوا۔ کیبنٹ کونسل اور لیجسلیٹو کونسل کا قیام عمل میں آیا۔

۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی کی طغیانی حیدرآباد کے لئے ایک زبردست سانحہ تھا اس وقت اعلیٰ حضرت نے جس طرح رعایا کی مدد فرمائی ہے وہ عدیم المثال ہے۔

غرض اعلیٰ حضرت نہ صرف خود بڑے شاعر عالم اور قدردان علم و فن تھے بلکہ غیر معمولی خوبیوں کے چرچے نہ صرف ریاست حیدرآباد میں بلکہ دور دراز ملکوں تک پہنچے ہوئے تھے۔

۱۹۱۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ملک پر ان کے احسانات اس قدر ہیں کہ حیدرآباد اپنے محبوب بادشاہ کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

میر محمود علی

باغِ عام

اور مدح حضرت آصف سابع خلد اللہ

کیا حسین ہے صورت گلفام باغِ عام کی
آنکھ ہو اور شکلِ دل آرام باغ عام کی

صبح اس گلزار کی آئینہ رخسار حور
شانۂ گیسوئے لیلیٰ شام باغ عام کی

دیگر

نرگس شہلا میں عشوے چشم دلآشام کے
سنبلِ پیچاں میں گھونگر زلف عنبر فام کے

بارک اللہ حسن قدرتی پانی کے چشمے میں یہاں
سب ہیں آئینے جمال روئے باغ عام کے

دیگر

روئے گل پر کاکل سنبل ہے بل کھائی ہوئی
برگ گل میں لعل لب کی ہے جھلک آئی ہوئی

وہ ہے باغِ عام پر جوبن کہ انساں کیا جلیل
بن گئے چشم شوق نرگس بھی تماشائی ہوئی

دیگر

آج باغِ عام سے ہی اور ہی شانِ دکن
ہر کلی اس بوستاں کی ہے گلستانِ دکن

پتی پتی نے لکھا ہے کلکِ قدرت سے جلیل
شاہِ عثماں آصفِ سابع سلیمانِ دکن

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

حیدر یار خان شیر جنگ صدر الدولہ صدر الملک

درگاہ قلی خان سالار جنگ مؤتمن الدولہ خان دوران

چار مینار

عظمتِ شاہانِ ماضی کی نرالی یادگار
اے وطن کی سرزمینِ حسن کے آئینہ دار

تجھ میں ذوق و شوق کی تابندگی پاتا ہوں میں
تجھ میں پختہ حوصلوں کی زندگی پاتا ہوں میں

شہر کے سینے میں روشن ہے ترا نقشِ وفا
تیرے میناروں میں دل کی رفعتیں جلوہ نما

چار سُو جلتا ہے تیرے عشقِ دوام کا چراغ
دیکھ کر تجھ کو فلک کی سمت جاتا ہے دماغ

بادۂ سرمستیِ الفت کا تو اک جام ہے
اتحادِ میکدہ کا تجھ میں اک پیغام ہے

ثبت ہیں سکوں کے دل پر تیری تصویریں ہنوز
ظلمتوں میں تیری ہیں ثبت تیری یادیں ہنوز

تو جہانِ حسن کے نایاب شہ کاروں میں ہے
عشق کی برقِ تجلی تیری دیواروں میں ہے

رات کی اٹھتی ہے جب دم تیرے چہرے سے نقاب
جب چمکتا ہے دکن کی سرزمیں پر آفتاب

سربلندی کی فضا پر ناز فرماتا ہوا
تو نظر آتا ہے اک تلوار چمکاتا ہوا

باقی

وزرائے آصفی

شیر جنگ تولد ۱۱۱۳ھ وفات ۱۱۸۹ھ

خاندان سالار جنگ کے مورث اعلیٰ منیر الدولہ منیر الملک شیر جنگ بہادر یار خان ہیں جو حضرت اویس قرنی کی اولاد سے تھے۔ اویس قرنی تاریخ اسلام میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ آنحضرت کے زمانہ میں موجود تھے۔ حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کے ہمراہ جنگ صفین میں شامل تھے اور اسی جنگ میں جام شہادت پیا۔ اویس قرنی کی اولاد سے اویس شاہ التفات اپنے فرزند محمد علی کے ہمراہ مدینہ منورہ سے دکن آئے اور بیجاپور پہونچے یہاں اس زمانہ میں علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۶ھ تا ۱۰۸۳ھ) حکمران تھا۔ بادشاہ نے آپ کی بڑی عزت کی اور آپ کے فرزند محمد علی کی شادی ملا احمد نائطی کی دختر سے کردی گئی اور دبیر سلطانی کا عہدہ بھی دیا گیا۔

علی عادل شاہ کے بعد شیخ محمد علی کے دونوں فرزند محمد باقر اور محمد حیدر بادشاہ مغلیہ سے متعلق ہوگئے۔ عالمگیر اورنگ زیب نے دو ہزاری منصب سے سرفراز کیا۔ محمد باقر کے فرزند محمد تقی بھی عالمگیر کے عہد میں منصب [illegible] تک پہنچ چکے تھے [illegible] کے زمانہ میں ان کو اورنگ آباد میں داروغہ جزیہ کی خدمت [illegible]۔

حضرت آصفجاہ اول نے ان کو قلعہ جات دکن کا داروغہ مقرر کیا۔ انہیں محمد تقی کے فرزند شمس الدین محمد حیدر یار خان شیر جنگ ہیں۔

شیر جنگ کی ولادت اورنگ آباد میں ۱۱۱۳ھ میں ہوئی حضرت آصفجاہ اول نے سب سے پہلے دو صدی منصب کے ساتھ فیل خانہ کا داروغہ مقرر کیا اس کے بعد آپ کو مختلف خدمات عطا ہوئیں جن کو آپ نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ آصفجاہ کا بڑا اعتماد آپ پر تھا۔ حیدر یار خان کا خطاب بھی آصفجاہ نے عطا کیا تھا۔

نواب ہدایت محی الدین خان مظفر جنگ کے مارے جانے پر نواب صلابت جنگ کی مسند نشینی شیر جنگ کی جرأت کی وجہ سے ہوئی تھی کیونکہ بعض امرا کی خواہش تھی کہ نواب نظام علی خان (آصفجاہ ثانی) کو مسند نشین کیا جائے، چونکہ نواب صلابت جنگ بڑے بھائی تھے اس لئے شیر جنگ نے کہا کہ بڑے بھائی کے ہوتے چھوٹے کو مسند نشین کرنا خاندان آصفی کی روایات کے خلاف ہے۔ اور پیش قدمی کر کے نواب صلابت جنگ کو مسند نشینی کی نذر پیش کردی۔ آپ کے بعد دوسرے امرا نے بھی آپ کی پیروی کی

نواب صلابت جنگ کے زمانہ میں شیر جنگ نے دیوانی کے اہم فرائض بھی انجام دئے (۱۱۷۲ھ) نواب آصفجاہ ثانی کے ابتدائی ایام میں چونکہ شیر جنگ سے موافقت نہیں تھی اس لئے انھوں نے پونہ میں اقامت کرلی تھی، بعد میں شیر جنگ مورد عنایت شاہی ہوئے۔ رکن الدولہ کے مشیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے مختلف اہم خدمات کو انجام دیا اور آخر زمانہ میں جبکہ ان کا سن بھی زیادہ ہوگیا تھا ان کو صوبہ اورنگ آباد کی نظامت کے عہدہ پر سرفراز کیا گیا اس خدمت کو بھی وہ پانچ سال تک انجام دیکر ۱۱۸۹ھ میں انتقال فرمایا۔ اورنگ آباد میں سپرد خاک کئے گئے۔

شیر جنگ، سخاوت، شجاعت میں مشہور تھے۔ علمی قابلیت بہت اچھی تھی۔ ان کو دو لڑکے تھے۔ بڑے محمد صفدر خان غیور جنگ بہادر جو درگاہ قلی خان کے داماد تھے۔ اور دوسرے تقی یار خان ذوالفقار جنگ جنھوں نے عنفوان شباب میں انتقال کیا۔
اول الذکر کی اولاد سے نواب سالار جنگ بہادر ہیں، جو آپ کی چھٹی پشت کے دادا ہوتے ہیں۔

مہر مہو مہی دا یہ رکں ااد ول

سہراب جنگ معین الدولہ مشیر الملک اعظم الامرا ارسطو جاہ

رکن الدولہ میر موسیٰ خان

وفات سنہ ۱۱۸۹ھ

میر محمد یار نام اور رکن الدولہ میر موسیٰ خان احتشام جنگ خطاب تھا۔ آپ کے اجداد بخارا کے رہنے والے تھے رکن الدولہ کے دادا ہندوستان آئے اور نواب غازی الدین خان فیروز جنگ کے فرزند میر قمر الدین خان آصف جاہ اول کی تعلیم و تربیت پر مامور کئے گئے ترکی خان ان کو خطاب ملا۔ ان کے فرزند میر موسیٰ تھے، جو دیوکنڈہ کی وقائع نگاری پر مامور کئے گئے پھر مظفر جنگ کے یہاں ایک رسالہ کے افسر مقرر ہوئے، ان کے بعد ان کے فرزند محمد یار کو باپ کی جگہ مامور کیا گیا نواب مظفر جنگ کے مارے جانے پر صلابت جنگ نے محمد یار کو موسیٰ خان کے لقب کے ساتھ ایک خاص فوج کی کمانداری پر مقرر کیا۔ رفتہ رفتہ انھوں نے ترقی کی نام پیدا کیا اور بخشیگری سایر پر ترقی پائی چونکہ طالع یاور تھا حضرت آصف جاہ ثانی کی نظر عنایت مبذول ہو گئی اور سنہ ۱۱۸۰ہجری میں خطاب رکن الدولہ احتشام جنگ کے ساتھ منصب ہفت ہزاری اور شش ہزار سوار کا اعزاز ملا اور خدمت دیوانی سے سرفراز کئے گئے ان کے دیوانی کے کاروبار میں نواب نظام جنگ کو زیادہ دخل تھا، وہ مشیر خاص کی حیثیت رکھتے تھے

سنہ ۱۱۸۹ہجری میں ایک سپاہی فیضو نام نے آپ کو شہید کر دیا کوہ مولا کے دامن میں دفن کئے گئے

ان کی دیوانی کے اہم واقعات یہ ہیں۔

(۱) حیدر علی کو انگریزوں کے ساتھ جنگ کرنے میں آصفی فوج نے مدد دی۔ مگر حیدر علی کو ناکامی ہوئی محمد علی والا جاہ نے نظام اور انگریزوں میں صلح کرا دی۔ اس صلح کے لئے رکن الدولہ مدراس گئے۔

(۲) مرہٹوں سے دو دفعہ جنگ ہوئی

(۳) موسیٰ ندی میں طغیانی آئی اور فصیل توڑ کر پانی اندر چلا آیا

رکن الدولہ کو اولاد نہ تھی۔ لیکن ان کے بھائی نواب شمس الامرا کی اولاد موجود ہے۔ ان کے سلسلے میں نواب تہور جنگ رکن الملک کی ایک قابل ذکر ہستی تھی جو اپنے کردار اور زندہ دلی کی وجہ سے سب میں مشہور تھے۔

ارسطوجاہ

تولد ۱۱۴۵ھ   وفات ۱۲۱۹ھ

غلام سید نام اور معین الدولہ سہراب جنگ شجیع الملک اعظم الامرا ارسطوجاہ فرزند ارجمند وکیل مطلق مختار دولت آصفیہ خطاب تھا۔ ۱۱۴۵ھ میں تولد ہوئے۔ نوشیروان عادل کی اولاد سے تھے۔ آپ کے باپ فرخ نژاد خان کو حضرت آصفجاہ اول نے صوبہ دار برار مقرر کیا تھا۔ غلام سید خان آصفجاہ ثانی کے رفیق و مصاحب تھے۔ جیدر جنگ کے مارے جانے کے بعد معین الدولہ سہراب جنگ کے خطاب کے ساتھ محالات صوبہ برار و خجستہ بنیاد کی دیوانی پر مامور کئے گئے۔

اس کے بعد پونہ اور ناگپور کی سفارت پر بھیجے گئے۔ چنانچہ سہراب جنگ نے راؤ پنڈت پردھان اور رگھوجی بھونسلہ کے پاس جاکر اپنا مفوضہ کام نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا۔ اس کے بعد ایک عرصہ بعد شجیع الملک اعظم الامرا کے خطاب کے ساتھ خدمت دیوانی سے سرفراز کئے گئے (۱۷۸۱ء ۱۱۸۹ھ)

آپ کی دیوانی کے اہم واقعات کی بڑی تفصیل ہے، جن کی صراحت کا یہ موقع نہیں ہے، مختصراً اس کا اظہار کیا جاتا ہے:-

(۱) سلطنت آصفیہ نے مرہٹوں کی تائید سے میسور پر چڑھائی کی، مگر عین وقت پر مرہٹوں نے ساتھ نہیں دیا۔ اس لئے تنہا آصفی فوج نے میسور پر حملہ کیا اور فتحیاب ہوئی۔

(۲) انگریزوں کے ساتھ شریک ہوکر سلطنت آصفیہ نے میسور کی تیسری لڑائی میں حصہ لیا۔

(۳) مرہٹوں کے ساتھ جنگ کھرڑلہ واقع ہوئی، جس میں بعض وجوہ سے آصفی فوج ناکام رہی۔

(۴) اعظم الامرا پونہ میں نظر بند کئے گئے۔

(۵) پونہ میں اعظم الامرا نے سیاسی چال چلی، روسا مرہٹہ میں نفاق ڈالکر ان کو آپس میں جدا کر دیا، اور پھر اپنی سیاسی چال اور توڑ جوڑ سے ان کی خانہ جنگی کرادی، اور صفائی کرانے کے بعد جنگ کھرڑلہ کے نقصانات کی تلافی میں ایک کروڑ نقد تین کروڑ کے دستاویزات معافی چوتھ کی سند ممالک دولت آباد وغیرہ واپس لیکر حیدرآباد واپس ہوئے۔

(۶) میسور کی چوتھی لڑائی میں انگریزوں کی مدد کی گئی اور فتحیاب ہوئے

(۷) آصفجاہ ثانی کا انتقال ہوا اور آصفجاہ ثالث مسند حکومت پر جلوہ گر ہوئے، اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ۱۲۱۹ھ میں ارسطوجاہ کا انتقال ہو گیا سرور نگر میں دفن ہوئے۔ ارسطوجاہ اپنے ملک اور مالک کے سچے خیرخواہ رہے، مرتے دم تک آپ نے ملک اور مالک کی خدمت نہایت دیانت داری سے انجام دی، وہ اپنے وقت کے بڑے سیاست داں تھے، انھوں نے بیسیوں موقعوں پر سیاسی دل و دماغ سے کام لیکر کامیابی حاصل کی

ارسطوجاہ مذہبی آدمی تھے۔ فرائض کی پابندی سختی کے ساتھ کرتے تھے، جود و سخا میں مشہور تھے۔ علما، و فضلا، کی صحبت سے بڑی دلچسپی تھی۔ شعر و سخن سے شغف تھا، ان کے دربار نے اردو شاعری کی بھی بڑی خدمت کی۔

صدا ادوا قاسم صدء ء ام

صدر ابو القاسم صدر عالم

میر عالم

تولد سنہ ۱۱۶۶ھ وفات سنہ ۱۲۲۳ھ

ابوالقاسم میر عالم کے والد سید رضی شوشتر (ایران) کے شیخ الاسلام کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سید رضی شوشتر ہی میں پیدا ہوئے مگر سنہ ۱۱۳۰ھ میں وہ اپنے بھائی کے ہمراہ ہندوستان آئے۔ شاہ جہان آباد میں چند روز قیام کے بعد شجاع الدولہ ناظم بنگال کے پاس بنگال چلے گئے اور وہاں ان کے داماد مرشد قلی کی رفاقت میں رہنے لگے۔ اور مرشد قلی کے ساتھ حیدرآباد آئے، آصف جاہ کی ملازمت اختیار کی۔ دارالانشا میں مامور کیے گئے حضرت آصف جاہ نے ایک جاگیر بھی مرحمت فرمائی تھی۔ سنہ ۱۱۹۴ھ میں سید رضی کا حیدرآباد میں انتقال ہوا دائرہ میر مومن میں دفن ہوئے۔

سید رضی بڑے قابل فرد اور مجتہد کا درجہ رکھتے تھے شاعری کا بھی شوق تھا اقدس تخلص کرتے تھے۔

میر ابوالقاسم المخاطب بہ میر عالم کی ولادت حیدرآباد میں سنہ ۱۱۶۶ھ م سنہ ۱۷۵۳ء ہوئی عربی اور فارسی میں بڑی اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ ریاضی میں بھی مہارت تھی قلم برداشتہ عربی لکھا کرتے تھے۔ فارسی شاعری اور انشاپردازی کا خاص ذوق تھا۔ بہرحال میر عالم اپنے وقت کے ایک بلند پایہ ادیب و قابل فن شاعر تھے

یہ امر خاص طور سے قابل تذکرہ ہے کہ میر عالم کی ابتدائی ملازمت اسی شاعری کے طفیل ہوئی اگرچہ ان کو باپ کی جاگیر مل چکی تھی مگر ملازمت کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ ایک مرتبہ جب ارسطو جاہ کی مدح میں قصیدہ لکھا تو ارسطو جاہ نے ان کے کلام کی فصاحت و بلاغت سے متاثر ہو کر اپنا سکریٹری بنا لیا۔ اس وقت سے ان کی ترقی ہونے لگی

اس کے بعد وہ صدر تعلقدار بنائے گئے انہوں نے اپنے علاقہ کا انتظام نہایت عمدہ کیا۔ رعایا اور مالک دونوں کی خوشنودی حاصل کی

صدر تعلقداری کے بعد میر عالم کو وکالت کی خدمت دی گئی۔ جب کمپنی کی جانب سے ایک سفیر حیدرآباد آیا تو ارسطو جاہ نے اپنے اور اس انگریز سفیر کے درمیان ان کو وکالت پر مامور کیا۔ معاملات نہایت عمدگی سے طے پاگئے۔ اس کے بعد میر عالم کو سفارت کے لئے منتخب کیا گیا اور وہ حضرت آصف جاہ ثانی کی جانب سے گورنر جنرل کارنوالس کے پاس بھیجے گئے سنہ ۱۲۰۲ھ میر عالم اس سفارت میں کامیاب ہو کر کلکتہ سے واپس آئے۔ اس کامیابی کے صلہ میں ان کو خطاب میر عالم کے ساتھ دیگر اعزازات سے بھی ممتاز کیا گیا۔ اب وہ پیشوا کے پاس پونہ روانہ کئے گئے۔ اور اس کے بعد میسور کی چوتھی لڑائی میں حیدرآبادی فوج کی سپہ سالاری کے فرائض ان کے تفویض کئے گئے۔

ارسطو جاہ کے انتقال پر آصف جاہ ثالث نے میر عالم کو دیوانی کی اہم خدمت عطا فرمائی (سنہ ۱۲۱۹ھ)

میر عالم نے اپنی دیوانی کے زمانہ میں کئی اصلاحیں کیں۔ چنانچہ قلمرو آصفی میں سب سے پہلے ڈاک کا انتظام کیا گیا حیدرآباد، کلکتہ، مدراس، بمبئی، پونہ اور مچھلی بندر تک ڈاک کا انتظام ہوا۔ اس کے لئے راستے میں مسافر خانے جدید بنوائیں اور باؤلیاں کھدوائیں آج تک بھی اکثر سرائیں موجود ہیں

سنہ ۱۲۲۰ھ میں ایک قحط ہوا میر عالم نے اس کا معقول انتظام فرمایا۔ بہرحال میر عالم ایک منتظم اور بہترین دیوان ثابت ہوئے۔

شوال سنہ ۱۲۲۳ھ میں میر عالم کا انتقال ہوا دائرہ میر مومن میں اپنے والد کے پہلو میں دفن کئے گئے۔

میر عالم کی بنائی ہوئی کئی چیزیں آج تک موجود ہیں مثلاً میر عالم کا تالاب، میر عالم کی منڈی بارہ دری اور اس کا باغ وغیرہ میر عالم صاحب تصنیف تھے فارسی نثر و نظم میں کئی کتابیں ہیں ان میں سے حدیقۃ العالم اور مثنوی مدح ماہ لقا بائی چندا مشہور ہیں۔

میر عالم بڑے سخی تھے ہر روز ان کے باورچی خانہ سے ۵۰۰ مساکین کو کھانا ملتا تھا وہ بڑے معاملہ فہم، دور رس دوربیں، صاحب تدبیر، حزم و احتیاط کرنے والے اور عاقبت بیں تھے۔

شمس الامرا ثانی امیر کبیر

تولد ۱۱۹۵ھ   انتقال ۱۲۶۹ھ

نواب محمد فخر الدین خان، تیغ جنگ ابو الفتح خان شمس الامرا اول کے فرزند ہیں۔ حیدرآباد میں آپ کی ولادت ہوئی (۱۱۹۵ھ) باپ کے انتقال کے وقت بہت کم سن تھے۔ آپ کی کم عمری سے ہی آصفجاہ ثانی کے نوازشات مبذول ہوتی رہیں۔

موروثی خطابات تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامرا (ثانی) کے ساتھ امیر کبیر اول، کا جلیل القدر خطاب بھی ملا۔

امیر کبیر مختلف حیثیتوں سے خاندان پائگاہ کے چشم و چراغ ہیں، آپ کی ممتاز ہستی نہ صرف امرا ء پائیگاہ بلکہ تاریخ دکن میں بھی اہم حیثیت رکھتی ہے۔ اور تاریخ دکن اپنے اس قابل فخر سپوت پر ہمیشہ فخر کریگی۔

امرا ء پائگاہ میں آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں، جو بادشاہ کی دامادی کے رشتہ میں منسلک کئے گئے۔ چنانچہ ۱۲۱۵ھ میں حضرت آصفجاہ ثانی نے اپنی صاحبزادی بشیر النسا بیگم کی شادی آپ سے فرماکر دامادی کے رشتہ سے ممتاز کیا۔ اور آج تک آپ کی اولاد کو یہ فخر حاصل ہو رہا ہے کہ وہ خاندان آصفی کی شہزادیوں کے ساتھ ازدواج کا امتیاز حاصل کرتے ہیں۔

نواب شمس الامرا [illegible]ھ میں منصب مدار المہامی پر فائز ہوئے مگر چھ ماہ نہایت کامیابی کے ساتھ کام کرنے کے بعد خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔

امیر کبیر کی ذات علما، شعرا، اور مصنفین کے لئے ملجا و ماوی تھی۔ آپ علم و فن کی ترویج کے لئے لوگوں کی ہمت افزائی کا پورا سامان کرتے تھے۔ ان کو فکر معاش سے مستغنی کرنے کے لئے مناصب اور ماہوار مقرر فرماتے تھے چنانچہ حضرت فیض، قیس، آفاق، مشتہرت وغیرہ کو ماہوار یں ملا کرتی تھیں۔

ترقی تعلیم سے آپ کو بڑی دلچسپی تھی۔ اپنے صرفے سے کئی مدرسے قائم کئے تھے۔ یہاں کے مدرسین کو بیش قرار ماہوار اور طلبہ کو وظائف کے علاوہ کتابوں وغیرہ سے بھی مدد دی جاتی تھی

امیر کبیر کے سب سے بڑے اور قابل فخر کارنامے یہ ہیں کہ آپ نے مغربی علوم و فنون خصوصاً سائنس اور ریاضی وغیرہ کی کئی کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے شائع فرمائیں اور اُن کی تعلیم کا انتظام فرمایا۔ اردو زبان میں مغربی علوم کے ترجمہ کرنے کی یہ سب سے پہلی کوشش تھی۔ دہلی کالج، علی گڈہ وغیرہ کی تحریکیں سب اس کے بعد کی ہیں۔ ارباب کمپنی نے کلکتہ میں نثر اردو میں قصہ کہانیاں وغیرہ کی کتابیں مرتب کرائیں تھیں، یہ کارنامہ ان دنوں تاریخ ادب اُردو کا ایک ممتاز باب سمجھا جاتا ہے، لیکن امیر کبیر نے زبان اُردو کی جو خدمت سائنس کے کتابوں کے ترجمہ کی کی ہے، وہ ان قصے کہانیوں کے کارناموں سے زیادہ درخشاں اور زیادہ سود مند ہے۔

امیر کبیر کو فن تعمیر سے بھی بڑی دلچسپی تھی آپ نے کئی عالی شان عمارتیں اور بازار وغیرہ تعمیر کرائے۔

محمد ابوالفخر فخرالدین خان امام جنگ ثالث خورشید الدولہ
خورشید الملک

مہاراجہ چندولال

مہاراجہ چندولعل

تولد ۱۱۸۰ھ انتقال ۱۲۶۱ھ

مہاراجہ چندولعل بہادر، اکبری نورتن کے ایک رتن راجہ ٹوڈرمل کی اولاد سے تھے۔ آپ کے جد اعلیٰ رائے مول چند جو راجہ ٹوڈرمل کی پانچویں پشت سے تھے حضرت آصفجاہ اول کے زمانہ میں کروڑگیری کی تعلقداری پر مامور تھے۔ ان کے بعد ان کے فرزند رائے چھمی رام کو آصفجاہ ثانی نے اس خدمت سے سرفراز فرمایا۔ ان کے دو لڑکے تھے، رائے نانک رام اور رائے نارائن داس۔ نارائن داس کے فرزند رائے چندولال ہیں۔

چھمی رام کے مرنے پر نانک رام کو ان کی موروثی خدمت ملی۔ اور ان کے بعد ان کے فرزند رائے مکھپت رائے اس جگہ مامور ہوئے مگر دو سال بعد انھوں نے انتقال کیا۔

مہاراجہ چندولعل ۱۱۸۰ھ میں تولد ہوئے۔ رواج زمانہ کے موافق فارسی اور عربی کی تعلیم پائی اور کافی قابلیت پیدا کی۔ سن شعور کو پہونچکر چچا نانک رام کے ماتحت سررشتہ کروڑگیری میں ایک خدمت پر مامور ہوئے اور جب رائے مکھپت رائے کے مرنے پر تعلقداری کروڑگیری ہوگئے سطوت جاہ نے چندولعل کی قابلیت اور لیاقت سے واقف ہوکر ان کو قلعہ مدہوٹ وغیرہ کے انتظام پر روانہ کیا۔ راجہ بہادر کا خطاب بھی عطا ہوا سابقہ خدمت بھی بدستور بحال رہی جس پر آپ کے غیاب میں آپ کے بھائی کارگزار رہے۔

میر عالم بہادر کی وزارت میں آپ کو خدمت پیشکاری پر سرفراز کیا گیا اور مہاراجہ کا خطاب عطا ہوا منیر الملک کی دیوانی میں آپ پیشکاری کے ساتھ دیوانی کے کاموں میں دخیل رہے اور ان کے انتقال پر اگرچہ آپ کو باضابطہ دیوانی کی خدمت نہیں ملی تھی مگر چونکہ کوئی اور شخص دیوان نہیں تھا اس لئے آپ ہی دیوانی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے خطاب راجایان مہاراجہ سے ممتاز کئے گئے

مہاراجہ چندولعل نے اپنے زمانہ میں خوب ہی داد و دہش کی ہیسیوں انسی ... گویا برات۔ انعام اور مناصب بہاں کر دیا

۱۲۵۹ھ میں مہاراجہ چندولعل خدمت پیشکاری سے مستعفی کئے گئے اور ۱۲۶۱ھ میں وفات پائی

آپ ایک علم دوست، ذی علم، فیاض، سخی، امیر تھے۔ علما، فضلا، ادبا کی بڑی قدر کرتے تھے۔ شعر و سخن کے دلدادہ تھے سخن فہم اور سخن سنج تھے اس کے ساتھ ہی بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ کے فارسی اور اردو کلیات شائع ہوچکے ہیں شاداں آپ کا تخلص تھا

آپ کا کلام سنجیدہ شگفتہ اور پسندیدہ مضامین کا گنجینہ ہے، کلام کی رنگینی، انداز بیان کی جدت اور تخیل کی بلندی آپ کی قادر الکلامی کے شاہد ہیں، آپ کے کلام کا بڑا حصہ معرفت و تصوف سے بھرا ہوا ہے

آپ کے دربار میں ہر وقت شعرا کا جمگھٹا رہا کرتا تھا۔ ان کی بڑی بڑی تنخواہیں مقرر تھیں۔

مہاراجہ کی سخاوت اور خیرات عام و خاص میں مشہور تھی بلا لحاظ مذہب و ملت فقیروں، مستحقین، گوسائیں، تماشبین وغیرہ کو روزینے یومیے کے علاوہ روز میوہ اور شیرینی پارچے، دوشالے وغیرہ بھی تقسیم ہوا کرتے تھے، بعض مرتبہ ایک ایک ہزار دوشالے روزانہ تقسیم ہوتے تھے۔

آپ کو تعمیرات سے بھی دلچسپی تھی۔ بارہ دری مشہور ہے جو باغ راجہ سے موسوم تھی۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے کئی عمارتیں بنائی ہیں۔ بہرحال تاریخ دکن میں مہاراجہ چندولعل بھی اہم شخصیت کے مالک ہیں۔

نیر الملک ثانی

تولد ۱۱۹۴ھ وفات ۱۲۴۸ھ

علی زمان خان المخاطب غیور جنگ، نیر الدولہ، امیر الامرا، نیر الملک ثانی، غیور جنگ، صفدر یار خان کے فرزند اور تہور جنگ نیر الملک کے پوتے تھے۔ صفدر یار خان غیور جنگ کے انتقال پر ان کے چاروں لڑکوں نے جائداد آپس میں تقسیم کر لی تھی۔ آصفجاہ ثانی نے ان کو نیر الملک کے خطاب کے ساتھ پنج ہزاری منصب اور سہ ہزار سوار کا اعزاز عطا فرمایا اور بخشیگری فوج کی خدمت سے سرفراز کئے گئے۔

نیر الملک، میر عالم کے داماد تھے۔ ان کی دو لڑکیاں یکے بعد دیگرے آپ سے بیاہی گئیں۔ میر عالم نے آپ کو خانہ داماد کی حیثیت سے اپنے ہی پاس رکھا تھا۔ ان کے انتقال کے چند ماہ بعد نیر الملک خدمت دیوانی سے سرفراز کئے گئے (۱۲۲۴ھ)

آپ کی دیوانی کے اہم واقعات حسب ذیل ہیں :-

(۱) پنڈاروں کا ہمیشہ کے لئے انسداد ہو گیا۔ ان کی لوٹ مار سے قلمرو آصفی کو نجات ملی۔

(۲) سکھوں اور عربوں میں سخت فساد ہوا۔ فتنہ فرو ہونے کے بعد سکھوں کو شہر بدر کیا گیا۔

(۳) شہزادہ مبارز الدولہ نے دوبارہ ہنگامہ برپا کیا اور ان کو تا دیا قلعہ محمد نگر میں نظر بند کیا گیا۔

(۴) رود موسی کو قیامت خیز طغیانی ہوئی۔

(۵) حضرت آصفجاہ ثالث نے انتقال فرمایا اور آصفجاہ رابع نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

۱۲۴۸ھ میں نیر الملک کا انتقال ہوا۔ دائرہ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ آپ کو چار لڑکے تھے: اشجع الدولہ، شجاع الدولہ، سراج الملک، اکرم الدولہ۔ نیر الملک بھی اپنے دادا کی طرح بڑے سخی تھے، محرم میں بڑی خیرات کیا کرتے تھے، سادات اور حجاج وغیرہ ہمیشہ آپ کے مہمان رہا کرتے۔ لذیذ کھانوں سے بھی آپ کو رغبت تھی، ہر وقت باورچی خانہ گرم رہا کرتا۔ فی باورچی دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ دیا کرتے تھے۔

تعمیر سے بھی آپ کو دلچسپی تھی۔ چینی خانہ، آئینہ خانہ آپ ہی کی یادگار ہیں۔ اورنگ آباد میں بھی آپ نے ایک محل تعمیر کیا تھا۔

سراج الملک

تولد ۱۲۲۴ھ وفات ۱۲۶۹ھ

میر عالم علی خان المخاطب تہور جنگ، سراج الدولہ، سراج الملک، منیر الملک امیر الامرا کے تیسرے فرزند اور میر عالم کے نواسے تھے۔

سراج الملک دو مرتبہ دیوانی کی خدمت سے سرفراز کئے گئے، پہلی مرتبہ ۱۲۵۹ھ میں اور دوسری مرتبہ ۱۲۶۷ھ میں۔ پہلی بار تو کچھ عرصہ کے بعد سبکدوش ہو گئے اور دوسری بار تقریباً سات سال تک یہ خدمت انجام دی اور برسر خدمت ہی آپ کا انتقال ہوا۔ دوسری مرتبہ دیوانی کے لئے رزیڈنٹ صاحب نے بڑی کوشش کی تھی۔ آپ کی دیوانی کے زمانہ میں حسب ذیل اہم واقعات ہوئے :-

(۱) عربوں اور روہیلوں میں فساد ہو گیا۔ (۲) مبارز الدولہ نے مولوی سلیم کے بہکانے سے ایک ہنگامہ کیا۔ آخر مبارز الدولہ قلعہ محمد نگر میں نظر بند کر دیے گئے اور مولوی سلیم کو حبس دوام کی سزا ہوئی۔ (۳) راجہ چندو لعل کی داد و دہش کے باعث خزانہ عامرہ خالی ہو گیا تھا۔ انگریزی فوج کنٹنجنٹ کی تنخواہ ادا نہ ہو رہی تھی، کئی لاکھ روپیہ اس کی ماہوار کا فاضل ہو گیا تھا، اس لئے حسب مطالبہ لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ملک برار کو بطور امانی انگریزوں کے تفویض کرنا پڑا۔ طے یہ ہوا تھا کہ بعد وضع اخراجات باقی رقم سرکار عالی کے خزانہ میں داخل کی جائیگی (۱۸۵۳ء ۱۲۶۹ھ)

اس معاہدہ کے کچھ عرصہ بعد نواب سراج الملک کا انتقال ہو گیا۔ آبائی مدفن دائرہ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ سراج الملک سلیم سخن، صاحب اخلاق و مروت، باریک بیں، دور رس، صاحب تدبیر امیر تھے۔ اہل کمال کے بڑے قدرداں تھے۔ علما و فضلا سے بڑی محبت تھی

نواب سراج الملک بہادر وزیر اعظم دولت آصفیہ

سر تراب علی خان شجاع الدولہ نواب مختار الملک سالار جنگ بہادر اول
وزیر اعظم دولت آصفیہ

ہز ایکسلنسی سر سالار جنگ مختار الملک جی سی اس آئی۔ ال ال ڈی

میر تراب علی خاں المخاطب سالار جنگ شجاع الدولہ مختار الملک جی سی اس آئی۔ محمد علی خاں سالار جنگ شجاع الدولہ کے فرزند اور امیر اعظم منیر الملک کے پوترے تھے۔ میر عالم کی دختر آپ کی دادی تھیں ان کو غلطی سے سالار جنگ اول لکھا جاتا ہے حالانکہ یہ اپنے خاندان میں چوتھے سالار جنگ تھے۔ کیونکہ ان کے والد شجاع الدولہ کو بھی سالار جنگ کا خطاب تھا۔ اور شجاع الدولہ کو یہ خطاب ان کے والد منیر الملک کے منصبای خطابات میں سے ملا تھا۔ کیونکہ ان کے ماما درگاہ قلی خاں اور ماموں دونوں کا خطاب سالار جنگ تھا اور چونکہ ان کے ماموں نے لاولد انتقال کیا اس لئے منصبای معاش اور جاگیرات کے ساتھ خطاب سالار جنگ بھی اس خاندان میں منتقل ہو گیا۔

نواب مختار الملک کی ولادت ۱۲۴۴ھ میں ہوئی۔ کم سنی میں باپ کے سایہ سے محروم ہو گئے۔ دادی اور چچا سراج الملک نے تعلیم و تربیت دی عربی، فارسی کے ساتھ انگریزی سے بھی آپ بخوبی واقف تھے، فنون سپہ گری کی بھی آپ کو تعلیم دی گئی تھی۔

سراج الملک نے صرف کتابی علم کا انتظام نہیں فرمایا تھا بلکہ کاروبار ریاست کے تجربہ کا بھی انتظام ہوا۔ شہ ڈپٹیوں کی جگہ آپ تعلقدار بنائے گئے اور سراج الملک نے اپنی جاگیرات کا انتظام بھی آپ کے ذمہ فرمایا تھا ان وجوہ سے آپ کو عملی کام کرنے کا اچھا موقعہ ہاتھ آیا۔ آپ نے جاگیرات اور سرکاری علاقے کا نہایت عمدہ انتظام فرمایا تھا۔

سراج الملک کے انتقال پر ۱۲۶۹ھ میں حضرت آصفجاہ رابع نے دیوانی کے لئے آپ کو منتخب کیا، اور قلمدان وزارت آپ کے سپرد ہوا۔ اس وقت آپ چھبیس سالہ نوجوان تھے لوگوں کو تعجب ہوا تھا کہ نواب ناصر الدولہ نے اتنی کم عمری میں آپ کو وزیر بنا دیا جس کے جواب میں حضور نے فرمایا کہ وہ اگرچہ کم عمر ہیں، لیکن بڑے بڑوں سے زیادہ عمدہ کام کر سکتے ہیں۔

نواب مختار الملک کی دیوانی اہم واقعات، اصلاحات اور جدید تنظیم وغیرہ کے لحاظ سے تاریخ دکن میں اپنی آپ نظیر ہے۔ اس مختصر یادداشت میں ان کا اظہار دشوار ہے لیکن بعض اہم واقعات کے اظہار کے بغیر یہ مختصر یادداشت بھی بے کار ہو جائے گی اس لئے اجمالاً لکھا جاتا ہے۔

(۱) حضرت آصفجاہ رابع غفران منزل کا ۱۲۷۳ھ میں انتقال ہوا اور یہ زمانہ بڑا نازک تھا کیونکہ تمام ہندوستان میں غدر کی آگ پھیل چکی تھی اور حیدرآباد بھی اس سے متاثر ہو رہا تھا لیکن نواب مختار الملک نے اپنے ذاتی تدبر سے ریاست کو اس آگ سے محفوظ رکھا ورنہ آج دوسری صورت ہوتی۔ اس کے بعد بھی آپ ہی کی وزارت میں آصفجاہ خامس نے بھی ۱۲۸۵ھ میں عالم جاودانی کی راہ لی۔ اعلیٰ حضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں مسند حکومت پر بٹھلائے گئے اور ریجنسی کے ذریعہ ریاست کا کام ہونے لگا۔ یہ وقت بھی بہت نازک تھا کیونکہ اکثر اراکین ریجنسی کے مخالف ہو گئے تھے لیکن نواب مختار الملک کی وجہ سے تبدیلی نہ ہونے پائی۔ (۲) آپ پہلے دیوان ہیں جو سرکاری کام سے یورپ تشریف لے گئے اور انگریزوں نے آپ کے شایان شان عزت کی۔ (۳) مالگزاری، تعلیم، عدالت، تعمیرات وغیرہ کی تنظیم ہوئی اور مختلف محکموں میں اصلاحات عمل میں آئیں جن کی مختصر روئداد حسب ذیل ہے:۔

(الف) مالگزاری کا جدید انتظام ہوا۔ قدیم طریقہ ملک کو قول اور ٹھیکہ پر دینے کا موقوف کیا گیا، اس کے بجائے سرکار نے خود محاصل کے وصول کرنے کا قاعدہ نافذ کیا، تحصیلدار، تعلقدار، صوبہ دار مقرر ہوئے، ملک کو چار صوبوں میں تقسیم کیا گیا مجلس مالگزاری قائم ہوئی ان وجوہ سے ساہوکاروں اور دولت مند اصحاب کے ظلم و ستم سے رعایا محفوظ و مامون ہو گئی۔

(ب) عدالت کے لئے جدید محکمے، فوجداری، دیوانی، عدالت عالیہ کا قیام عمل میں آیا اور منظم طور پر عدالت کا کاروبار ہونے لگا۔ عدالتوں کے لئے شرع اسلام اور دھرم شاستر کو قانون قرار دیا گیا اسی کے لحاظ سے فیصلے ہونے لگے۔

(ج) ملک کی تعلیم کی طرف پوری توجہ کی گئی اضلاع اور تعلقات میں مدرسے کھولے گئے حیدرآباد میں مدرسۂ دارالعلوم، مدرسۂ عالیہ وغیرہ کا افتتاح کیا گیا۔

(د) تعمیرات کے لئے جدید محکمہ قائم ہوا۔ نئے راستے بنائے گئے، قدیم عمارات کی ترمیم ہونے لگی۔

(ہ) قلمرو آصفی میں ریل اور تار جاری ہوئے (۱۰) فوج کی اصلاح ہوئی باقاعدہ فوج کی بنیاد قائم ہوئی۔

غرض کہ اصلاحات اور انتظامات کی ایک طویل فہرست ہے، بہ حال نواب مختارالملک نے یک باقاعدہ اور نظم ریاست کی صورت میں سلطنت آصفیہ کو مبدل کر دیا۔

۱۳۰۰ھ میں نواب مختارالملک کا ہیضہ سے انتقال ہوا اور دائرۂ میر مومن میں دفن کئے گئے مختارالملک بنا بریں خوش خلق حسن سیرت کے انسان تھے، ان کا حافظہ غضب کا تھا، معاملہ فہمی میں اپنی آپ نظیر تھے تدبر و سیاست میں ان کا ثانی نہیں تھا، جو شخص دیکھ لے اس کی عادت اور خصلت سے بخوبی واقف ہو جاتے تھے۔ ان کی مردم شناسی مشہور تھی۔ برٹش گورنمنٹ نے ان کو جی۔سی۔ایس۔آئی کا خطاب دیا تھا اور سترہ توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ انھیں دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔

راجہ نریندر بہادر

تولد ۱۲۴۴ھ انتقال ۱۳۰۶ھ

راجہ نراین پرشاد نریندر بہادر، راجہ دھرراج بالا پرشاد کے فرزند اور مہاراجہ چندو لال کے پوتے تھے، راجہ راجایان راجہ بہادر کے خطاب سے سرفراز تھے۔

۱۲۴۴ھ میں تولد ہوئے عربی، فارسی کے علاوہ انگریزی سے بھی واقف تھے۔ ۱۲۶۹ھ میں خدمت پیشکاری سے سرفراز ہوئے سالارجنگ مختارالملک کے انتقال پر بہ شرکت عمادالسلطنت بہادر دیوانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس زمانہ کا اہم واقعہ اعلیٰ حضرت غفران مکاں آصف جاہ سادس کا پورے اختیارات کے ساتھ مسند نشین ہونا ہے۔

راجہ نریندر بہادر ایک مدبر، فیاض، تجربہ کار، سیر چشم انسان تھے، آپ کو صرف ایک دختر تھیں جو راجہ ہری کشن بہادر سے بیاہی گئیں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر آپ کے نواسے اور جانشین ہیں۔ ۱۳۰۶ھ میں راجہ نریندر بہادر کا انتقال ہوا۔

میر لائق علی خان سالار جنگ مدار الدولہ عماد السلطنت

عمادُ السّلطنت

تولد ۱۲۸۰ھ   وفات ۱۳۰۶ھ

میر لائق علی خان المخاطب سالار جنگ منیر الدولہ مختار الملک عماد السلطنت مختار الملک اوّل کے بڑے فرزند تھے ۱۲۸۰ھ میں حیدرآباد میں آپ کی ولادت ہوئی، قابل باپ کی نگرانی میں تعلیم و تربیت ہوئی ابتدائی تعلیم میں آپ مرحوم اعلیحضرت غفران مکان کے ساتھ شریک اور ہم مکتب رہے اس کے بعد مدرسہ عالیہ میں شریک ہوئے تکمیل تعلیم کے لئے انگلستان بھی روانہ کئے گئے تھے (۱۲۹۰ھ)

اعلیحضرت غفران مکان نے اختیارات کے ساتھ مسند نشین ہوتے ہی آپ کو عہدہ دیوانی مرحمت فرمایا (۱۳۰۱ھ) آپ کی دیوانی کے اہم واقعات حسب ذیل ہیں۔

(۱) اعلیحضرت نے کونسل آف اسٹیٹ قائم فرمائی اور اپنی صدارت میں منعقد کیا (۲) دفتر فینانس قائم ہوا (۳) مجلس وضع قوانین کا قیام ہوا۔ (۴) وائسرائے ہند کے حیدرآباد آنے کا سلسلہ قائم ہوا (۵) سرکاری زبان اردو قرار دی گئی تمام سرکاری دفاتر میں اردو میں کاروبار ہونے لگا۔

سنہ ۱۳۰۴ھ خدمت دیوانی سے آپ مستعفی ہو گئے علحدگی کے بعد آپ نے یورپ کی سیاحت فرمائی قسطنطنیہ میں سلطان عبدالحمید خان سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔

یورپ کے سفر سے واپسی کے بعد ۱۳۰۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا خاندانی مدفن دائرہ میر مومن میں سپرد خاک کئے گئے۔

عماد السلطنت نہایت قابل فرد تھے، ذہن اور حافظہ میں وہ اپنے باپ سے بھی سبقت لے گئے تھے، آپ کی ذہانت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ قسطنطنیہ میں ایک ہفتہ میں ترکی زبان میں اتنا ملکہ حاصل کیا کہ اس زبان میں تقریر فرمائی آپ کے مضامین موقر رسالوں میں شائع ہوتے تھے، آپ کے ایک مضمون پر گلاڈسٹون نے تعریفی خط لکھا تھا۔

آپ کی خوش اخلاقی اور ملنساری کا سب کو اعتراف تھا۔ فنون سپہ گری سے بھی آپ کو دلچسپی تھی ولنٹیئر کو آپ ہی نے قائم فرمائی تھی اعلیحضرت غفران مکان کے ساتھ اکثر سیر و سیاحت میں ہم رکاب رہا کرتے تھے

امیر اکبر سر آسمان جاہ

تولد ۱۲۵۶ھ   انتقال ۱۳۱۶ھ

محمد مظہر الدین خان آسمان جاہ کے والد محمد سلطان الدین خان سیف جنگ تھے ۱۲۵۶ھ میں تولد ہوئے آپ کی کمسنی ہی میں والد کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے چچا محمد رفیع الدین خان امیر کبیر ثانی نے آپ کی پرورش فرمائی اور ان ہی کی نگرانی میں تعلیم ہوئی نواب حشمت یار جنگ بہادر کوتوال بلدہ آپ کے استاد تھے

مختلف اوقات میں آپ کو حسب ذیل خطابات عطا ہوئے۔

"رفعت جنگ بشیر الدولہ عمدۃ الملک امیر کبیر آسمان جاہ" سرکار عالی کی مختلف خدمات کو آپ نے بحسن و خوبی انجام دیا جن کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

۱۲۸۶ھ میں نواب مختار الملک نے سلطنت آصفیہ کی جدید تنظیم فرمائی تھی، چار صدر المہام مقرر کئے تھے، ان میں سے ایک نواب بشیر الدولہ آسماں جاہ بھی تھے۔ عدالت کا سررشتہ آپ سے متعلق تھا۔ مولوی سید محمد مودودی صاحب معتمد تھے۔ آسمان جاہ یہ خدمت بلا تنخواہ انجام دیتے تھے۔
اس کے بعد جب نواب مختار الملک انگلستان تشریف لے گئے تو آپ سررشتہ کا کام مدار المہام کی حیثیت سے کرتے رہے، اور مختار الملک کے انتقال پر ریجنسی کے رکن ہوگئے۔ اس زمانہ میں آپ ہی نے وسیلۂ کی خدمت میں مرحوم اعلیٰحضرت غفران مکان کو پورے اختیارات کے ساتھ مسند نشین کرنے کی تحریک فرمائی۔
پرنس آف ویلز (اڈورڈ ہفتم) کے ہندوستان آنے پر بمبئی میں آسماں جاہ نے سلطنت آصفیہ کی جانب سے استقبال کے فرائض انجام دئے تھے اور اس کے بعد ۱۳۰۴ھ میں ملکہ وکٹوریہ کی پنجاہ سالہ جوبلی میں سرکار عالی کی جانب سے شرکت فرمائی تھی۔
اسی ۱۳۰۴ھ میں جبکہ آپ لندن میں تھے آپ کو قلمدان مدار المہامی سے سرفراز کیا گیا۔ خاندان پائگاہ میں آپ ہی سب سے پہلے شخص ہیں جن کو یہ خدمت عطا ہوئی تھی، آسماں جاہ کے زمانہ وزارت میں مختلف اصلاحیں ہوئیں، سررشتہ عدالت اور کروڑگیری میں اصلاح ہوئی۔ موازنہ، مداخل مخارج میں تنظیم ہوئی۔ آبرسانی، حسبہ پنشن کے دفاتر قائم ہوئے۔
اس کے علاوہ بعض سیاسی مقدمات مثلاً جیکب کا ہیرا کا مقدمہ، سردار جنگ کا ریوے و معدنیات کا مقدمہ، مہدی حسن کی میم کا مقدمہ، سرور الملک کے رشوت کا مقدمہ وغیرہ بھی آپ کی وزارت کے اہم ترین واقعات ہیں جو حیدرآباد کے میدان سیاست میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔
۱۳۱۱ھ میں آسماں جاہ نے مدار المہامی سے علحدگی اختیار کی اور ۱۳۱۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ درگاہ برہنہ شاہ میں مدفون ہوئے۔
آسماں جاہ کو سیر و سیاحت سے دلچسپی تھی یورپ کے کئی ممالک دیکھے، مصر میں خدیو مصر سے ملاقات کی، ہندوستان کے شمالی و جنوب کے کئی شہر کا معائنہ کیا۔
انگلستان میں آپ کی بڑی عزت و وقعت ہوتی تھی، کئی دعوتیں ہوئیں تھیں زمانہ وزارت میں "سر" کا خطاب ملا تھا۔
آپ کو تعمیر عمارات کا بڑا شوق تھا، بشیر باغ، آسمان گڈھ، اکبر باغ، سرور نگر کا باغ سب آپ کی یادگار ہیں، اس کے علاوہ اجمیر کا سماع خانہ، درگاہ حضرت شاہ خاموش، عمدہ ساگر، چوک کی گھڑیال آپ ہی کے تعمیر کئے ہوئے ہیں۔
آسماں جاہ نہایت وسیع اخلاق، شرم و حیا کے پتلے تھے، اپنے ملازمین کی بڑی قدر کرتے ان کے متوسلین کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے تھے۔
نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کی صاحبزادی سے آپ کی شادی ہوئی تھی، مگر ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔
نواب معین الدین خان (امانت جنگ معین الدولہ بہادر) آپ کے اکلوتے فرزند ہیں۔ جو معین المہامی کی خدمت کئی سال تک انجام دے چکے ہیں اور شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا دیوان معین سخن آج کل زیر طبع ہے۔

محمد مظہر الدین خان رفعت جنگ بشیر الدولہ عمدۃ الملک
اعظم الامرا امیر کبیر سر آسمان جاہ

محمد فضل الدین خان سکندر جنگ اقبال الدولہ اقتدار الملک
سر وقار الامراء

اقبال الدولہ وقار الامراء

تولد ۱۲۵۲ھ وفات ۱۳۱۹ھ

محمد فضل الدین خان المخاطب سکندر جنگ اقبال الدولہ اقتدار الملک وقار الامراء کے والد محمد رشید الدین خان امیر کبیر میں آپ خورشید جاہ کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے ۱۲۵۲ھ میں ولادت ہوئی اور ۱۳۱۹ھ میں عالم جاودانی کو تشریف لے گئے

ابتداً اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم پائی، جوانی میں انگریزی تعلیم سے بھی استفادہ فرمایا

نواب آسمان جاہ کی وزارت کے زمانہ میں آپ نے صدر المہام مالگزاری کی خدمت انجام دی اور ان کے بعد مدار المہامی کی خدمت جلیلہ پر سرفراز ہوئے (۱۳۱۱ھ) سات سال سے زیادہ اس خدمت کو انجام دیکر ۱۳۱۹ھ میں مستعفی ہوئے، اور چند ماہ کے بعد انتقال فرمایا۔ خاندانی قبرستان، درگاہ برہنہ شاہ میں سپرد خاک کئے گئے۔

نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کی دختر نیک اختر سے آپ کا عقد ہوا، ان کے بطن سے آپ کے بڑے فرزند نامور جنگ سلطان الملک کی پیدائش ہوئی آپ کے دوسرے فرزند محمد ولی الدین خان المخاطب ولی الدولہ مرحوم تھے۔

وقار الامراء یورپ بھی تشریف لے گئے تھے اور آٹھ ماہ تک وہاں آپ کا قیام رہا یورپ کے طریقہ تعلیم سے بڑے متاثر ہوئے اور اپنے دونوں لڑکوں کو وہاں تعلیم کے لئے روانہ فرمایا۔ ولی الدولہ مرحوم کئی سال تک رگبی کالج میں زیر تعلیم رہے۔

وقار الامراء داد و دہش میں بڑے مشہور تھے۔ نہ صرف اپنے ذاتی خزانہ سے بلکہ دیوانی کے زمانہ میں سرکاری خزانہ سے بھی آپ نے خوب سخاوت فرمائی۔

آپ کے زمانہ وزارت میں سررشتہ علوم و فنون کا قیام عمل میں آیا تھا مولانا سید علی بلگرامی نے کئی کتابوں کا ترجمہ فرمایا اور پھر مولانا شبلی مرحوم اس سررشتہ کے ناظم قرار پائے تھے۔ مولانا نے کئی کتابیں اسی زمانہ میں تالیف فرمائیں۔

وقار الامراء نے بصرف کثیر فلک نما کی تعمیر فرمائی تھی۔ مگر اس کے بعد قرضہ کی وجہ سے ۲۲ لاکھ میں اس کو اعلیٰ حضرت کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

نواب وقار الامراء کے چھوٹے فرزند نواب ولی الدولہ بہادر نے کئی سال تک صدر اعظمی کی خدمت انجام دی وہ پسندیدہ اخلاق سادگی اور نیک طبع کی وجہ سے بہت ہر دل عزیز تھے چنانچہ دو سال قبل جب وہ حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے اور وہیں انتقال فرمایا تو اہل ملک کو ان کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔ ان کی بیگم صاحبہ کو علم و فضل اور اصلاح نسواں سے خاص شغف ہے اور حیدرآباد کی کوئی مجلس نسواں ان کے مشوروں اور امداد سے محروم نہیں رہتی

مہاراجہ یمین السلطنت بہادر

تولد ۱۲۷۹ھ

رائے کشن پرشاد الخاطب راجہ راجایان مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت بہادر، راجہ ہرکشن کے فرزند اور راجہ نریندر بہادر کے نواسے ہیں۔

حیدرآباد میں ۱۲۷۹ھ میں آپ کی ولادت ہوئی نانا کی نگرانی میں تعلیم و تربیت ہوئی، گھر کی تعلیم کے بعد مدرسہ عالیہ میں تعلیم پائی۔ اردو، فارسی، عربی، انگریزی وغیرہ میں کافی مہارت حاصل فرمائی۔

نانا کے انتقال پر ان کی جاگیرات آپ کے نام بحال ہوئیں اور ۱۳۱۰ھ میں خدمت پیشکاری و معین المہامی فوج سے سرفراز کئے گئے، سروقارالامراء کے مستعفی ہونے پر خدمت جلیلہ مدارالمہامی پر اولاً منصرم ۱۳۱۹ھ اور پھر مستقل کئے گئے ۱۳۲۰ھ کامل دس سال کے بعد ۱۳۳۰ھ میں اس سے مستعفی ہوئے۔ دوبارہ ۱۳۴۲ھ میں صدارت عظمیٰ پر آپ کا تقرر ہوا۔ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ میں بوجہ پیرانہ سالی آپ نے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

آپ کا زمانہ مدارالمہامی اور صدارت عظمیٰ اہم واقعات اور انتظامات سے مملو ہے جس کی مختصر صراحت بھی طویل صفحات کی متقاضی ہے۔

اعلیٰحضرت آصفجاہ سادس غفران مکاں نے آپ ہی کی مدارالمہامی کے زمانہ میں فردوس بریں کی راہ لی اور اعلیٰحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ برار کے متعلق قطعی تصفیہ ہوا، بیسیوں جدید محکمے قائم ہوئے، بیسیوں قانونی اصلاح اور تنظیم ہوئی، نئی اسکیمیں جاری ہوئیں محکمہ جات فینانس، تعمیرات، مالگزاری، عدالت، تعلیمات، فوج غرض ہر ہر سررشتہ میں اس قدر اصلاحیں ہوئیں کہ ان کا اظہار دشوار ہے۔

مہاراجہ بہادر کی ذات محاسن اور اخلاقی خوبیوں سے مملو ہے، آپ کی عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت، تلنگی، مرہٹی، اردو، ہندی لیاقت مسلمہ ہے آپ اردو اور فارسی کے زبردست شاعر اور ادیب ہیں، داغ اور آصف سے تلمذ حاصل ہے نعت اور تصوف میں آپ کا کلام بیحد دلچسپ اور دل آویز ہوتا ہے، شاد آپ کا تخلص ہے۔

مشرقی امراء کا آپ زندہ نمونہ ہیں، حسن و اخلاق، سخاوت، مروّت، رواداری آپ کے خصوصی اور امتیازی جوہر ہیں، فقیر دوست، فقیر منش اور صوفی مشرب ہیں، آپ کے یہاں ہمیشہ فقرا، صوفیا، مشائخین، شعرا، اور اہل کمال کا مجمع رہا کرتا ہے۔ مشاعرے ہوا کرتے ہیں۔

مہاراجہ بہادر کو تصنیف و تالیف سے بھی شغف ہے کئی درجن کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں نظم و نثر پر آپ کو پورا عبور حاصل ہے، نہایت خوش خط ہیں، درگاہوں، مندروں، مسجدوں کی زیارت کا شوق ہے۔ ہندوستان کے مشہور زیارت گاہوں خواہ ہندوؤں سے متعلق ہوں یا مسلمانوں کی آپ نے دونوں کی زیارت کی ہے۔

علم دوستی، سخاوت، رواداری میں آپ اپنے جد اعلیٰ مہاراجہ چندولعل کے مکمل نمونہ ہیں۔

گورنمنٹ انگریزی میں بھی آپ کو اعزاز حاصل ہے چنانچہ "کے، سی، آئی، ای" اور "جی، سی، آئی، ای" کے خطابات آپ کو ملے ہیں۔

بہرحال مہاراجہ بہادر ایک نیک مزاج، خوش مذاق اور ملک کے وفادار امیر ہیں۔

(ولادت ۱۳۰۶ھ)

نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ بہادر، عماد السلطنت مختار الملک ثانی کے اکلوتے لخت جگر ہیں ۱۴ ر شوال ۱۳۰۶ھ کو بمقام پونا آپ کی ولادت ہوئی، ایک ماہ کے اندر ہی سایۂ پدری سے محروم ہو گئے

آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور پھر مدرسہ عالیہ میں شریک کئے گئے ۱۹۰۲ء میں آپ نے مڈل کا امتحان کامیاب کیا اور پھر میٹرک میں کامیاب ہوئے۔ آپ نے مدرسہ میں اپنے عمدہ اخلاق سے نہ صرف ہم کلاس طلبہ کو گرویدہ کر لیا بلکہ اساتذہ کو بھی اپنا مداح بنا لیا مسٹر سیٹن سابق پرنسپل آپ کی طالب علمانہ خوبیوں کا ہمیشہ اعتراف کرتے رہے۔

اعلیٰ حضرت سلطان العلوم نے اپنی مسند نشینی کے پہلے ہی سال آپ کے اسٹیٹ کی کورٹ کی نگرانی کو برخاست کر کے آپ کی نگرانی میں دے دیا۔ با اختیار ہو کر آپ نے اپنے جاگیرات کا دورہ کیا۔ رعایا کی حالت بچشم خود معائنہ کر کے ان کی اصلاح اور اصلاح و فلاح کے احکام دئے۔

اس کے چند ماہ بعد ۲۵ رجب ۱۳۳۰ھ میں آپ مدار المہامی کی جلیل القدر خدمت سے سرفراز کئے گئے تقریباً تین ۳ سال آپ نے اس خدمت کو انجام دیا آپ کے زمانہ میں کئی جدید محکمے قائم ہوئے، آب پاشی، آب رسانی کو وسعت ہوئی، تعمیرات کی ترقی ہوئی، تعلیمات میں جدید اسکیم نافذ ہوئے جس کی تفصیل آخر میں درج ہے۔

محرم ۱۳۳۳ھ کو آپ نے خدمت مدار المہامی سے علحدگی حاصل کی علم و فن، تعلیم، صنعت و حرفت سے آپ کو بڑی دلچسپی ہے، اس کی تفصیلی صراحت کا یہاں موقع نہیں ہے۔ البتہ چند امور درج کئے جاتے ہیں:-

مدرسۂ دار العلوم کی ساٹھ سالہ جوبلی کی آپ نے صدارت فرمائی اور حوصلہ افزا خطبہ سنایا، آپ ہی کے عہد وزارت میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔

مسلم یونیورسٹی کو ایک لاکھ کا گراں قدر چندہ عطا فرمایا۔ اور سالانہ بارہ ۱۲ سو روپیہ بحال رکھے۔ انجمن ترقی اردو کو دس ہزار کا چندہ دیا اپنے اعزہ اور متوسلین کی تعلیم کی طرف خاص توجہ مبذول ہے ہونہار طلبہ کو ہندوستان اور یورپ میں تعلیم پانے کے لئے وظائف سے امداد فرماتے ہیں۔

صنعت و حرفت کے فروغ کے لئے آپ نے دلچسپی سے کرانی کمپنیوں کی ڈائرکٹری قبول فرمائی ہے اور بہت سی کمپنیاں خود آپ نے قائم کیں جو کامیابی سے چل رہی ہیں۔

آپ کا سب سے زیادہ قابل قدر کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے "ولی" کے دو صد سالہ جشن کی صدارت فرمائی اور دکھنی ادب کی سرپرستی کا اعلان کیا چنانچہ آپ کی توجہ اور گراں قدر عطیہ سے بیسیوں دکھنی ادب کی قابل قدر کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو رہی ہیں۔ یہ آپ کا وہ کارنامہ ہے جس پر موجودہ اور آئندہ نسلیں فخر کریں گی زمانہ مٹا سکے گا اور نہ حوادثات اس کو محو کر سکیں گے۔

ایک اور مہتم بالشان اسکیم آپ کے زیر غور ہے وہ یہ ہے کہ آپ کا ارادہ ہے کہ ایک عالی شان محل تعمیر کیا جائے اور اس میں

آپ کے یہاں کے نوادرات اور نادر تصویروں کا اشیاء اور نایاب کتابیں وغیرہ پبلک کو استفادہ کا موقع دیا جائے۔
یہ اسکیم جس قدر مفید جس قدر ضروری اور کارآمد ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، خدا سے دعا ہے کہ آپ کے نیک ارادے کو جلد عملی صورت نصیب ہو جائے۔

نواب سالار جنگ بہادر کے عہد وزارت میں قانون و قواعد اوزان و پیمانہ جات جاری کئے گئے۔ مساجد پر سند یافتہ ملاؤں کا جو ماہوار رہائش ہوں تقرر کرنے کا حکم دیا گیا عارضی دستور العمل تحط ممالک محروسہ سرکارعالی نافذ کیا گیا اور مسٹر ویکفیلڈ کمشنر قحط مقرر کئے گئے۔ اراضی نامہ جات جو بند وبست کی شنوائی کے وقت پیش ہوں ان کا قطعی تصفیہ تعلقداران ضلع کو کرنے کا حکم ہوا۔ سیول سروس کلاس قائم ہوئی اور قواعد داخلہ و انتخاب طلبہ بنائے گئے۔ قانون تادیب خانہ جات ممالک محروسہ سرکارعالی نافذ ہوئے۔ جدید جوڈیشل کمیٹی کی تنظیم عمل میں لائی گئی، ٹائپنگ بورڈ کا قیام منظور فرمایا گیا انگریزی الفاظ کے سرکاری مراسلات میں استعمال کرنے کی ممانعت فرمائی گئی۔ ضابطہ جوڈیشل کمیٹی ممالک محروسہ سرکارعالی نافذ کیا گیا قواعد پولیس ٹریننگ اسکول جاری کئے گئے حسب ذیل طلبہ کو وظیفہ تعلیمی یورپ و ایشیاء دیا گیا:-
(۱) سمیع اللہ شاہ بی ایس، سی ولد سید امیر اللہ سول انجینیرنگ ۔ ۲۔ سید محمد یونس بی اے ولد سید عطا حسین سول انجینیرنگ ۔ ۳۔ حیدر علی خاں بل یم یس ولد حکیم داد علی طبابت ۔ ۴۔ محمد الیاس برنی ام، اے ولد محمد ابراہیم (زیر تصفیہ)

وظایف تعلیم ایشیا

۱۔ محمد سراج الدین احمد ولد ڈاکٹر معین الدین انجینیرنگ ۔ ۲۔ ام، اے ۔ لماریلو ولد یم ل انڈیا طبابت ۔ ۳۔ دی ایچ کوناپور ولد ہنمنت راؤ کوناپور طبابت محکمہ آثار قدیمہ ممالک محروسہ سرکارعالی قائم کیا گیا اور غلام یزدانی صاحب بی، اے کا س کی نظامت پر تقرر ہوا قانون انجمن ہائے امداد قرضہ نافذ ہوا۔ قواعد نگرانی اقوام جرائم پیشہ جاری کئے گئے اور قواعد امتحان زبان دانی عہدہ داران سررشتہ تعلیمات نافذ ہوئے۔

نواب صاحب نے گذشتہ نو سال کے عرصے میں تقریباً پچانوے ہزار روپے سے ہندوستان اور انگلستان میں تعلیم پانے والے طلبہ کی امداد فرمائی اور تقریباً اٹھارہ ہزار روپے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور مدرسہ آصفیہ کی ماہانہ امداد میں اور تقریباً بیس ہزار روپے اخبارات و رسائل کے چندوں میں عطا کئے ہیں۔ اس کے علاوہ موقتی طور پر علمی و ادبی انجمنوں اور اصحاب کو بھی خاطر خواہ رقمی امداد کرتے رہتے ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی

ایمان سخن

ادارۂ ادبیات اردو کے سلسلۂ انتخابات شعرائے دکن کی ایک دلچسپ کتاب جس میں مولوی سید محمد صاحب ام، اے نے نواب نظام علی خان آصف جاہ ثانی کے عہد کے ملک الشعراء کا کلام انتخاب کرکے اپنے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے قیمت ۱۲ر

نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ بہادر

سر سید علی امام مؤید الملک مرحوم

سر سید علی امام المخاطب مؤید الملک مرحوم آپ کے والد سید امداد امام مرحوم المتخلص بہ اثر پٹنہ کے رؤسا سے تھے آپ کا خاندان سادات بارہہ سے تعلق رکھتا ہے۔

سید علی امام کی پیدائش ۱۸۶۹ء میں مضافات پٹنہ میں ہوئی والد کی نگرانی میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی سید امداد امام بڑے خوش قسمت تھے کہ ان کے دونوں فرزند سید علی امام اور حسن امام ہندوستان کے افق پر آفتاب اور ماہتاب بن کر چمکے۔

سید علی امام گھر کی تعلیم کے بعد ضلع آرہ کے اسکول میں شریک ہوئے پھر پٹنہ میں کالج کی تعلیم پائی اس کے بعد انگلستان جاکر بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی ۱۸۹۰ء میں یورپ سے واپس آئے اور پٹنہ میں وکالت شروع کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں پٹنہ ہائی کورٹ کے وکلاء میں ممتاز شخصیت پیدا کرلی۔

آپ ہی وہ پہلے مسلمان ہیں جو وائسرائے ہند کی کونسل میں ممبر کی حیثیت سے مامور کئے گئے کئی سال تک آپ نے اس خدمت کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ ایک طرف گورنمنٹ آپ کے کام کی قدردان اور آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی تو دوسری طرف رعایا میں بھی ہر دل عزیز تھے اس قسم کی خوش نصیبی بہت کم اصحاب کو میسر آتی ہے۔

اس خدمت کے بعد پھر آپ نے وکالت شروع کی مگر بہت جلد پٹنہ ہائی کورٹ میں جج ہوگئے اور اس کے بعد صوبہ بہار کی کونسل میں مامور ہوئے اسی خدمت سے آپ حیدرآباد میں طلب کئے گئے ۱۳۳۷ھ (۱۹۱۹ء) اور صدارت عظمیٰ کی جلیل القدر خدمت آپ کے تفویض کی گئی۔ زمانہ مابعد میں مؤید الملک کا خطاب بھی آپ کو دیا گیا۔ آپ کے صدارت عظمیٰ کے زمانہ میں یہاں کئی اصلاحیں ہوئیں اور جدید تنظیمات ہوئے جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:۔
(۱) باب حکومت کا قیام ہوا اور سررشتہ جات کی جدید تنظیم ہوئی (۲) دفتر ترقیات عامہ کا قیام ہوا جو غیر آباد مقامات کو آباد کرنے اور آبادی کو وسعت دینے کی بڑی اسکیم پیش نظر تھی۔ (۳) عدالت اور مال کے حکام کی علحدگی عمل میں آئی تعلقدار اور تحصیلدار ان سے عدالتی اقتدار علحدہ کر کے عدالت کے لئے جدید عہدہ دار مقرر کئے گئے (۴) دفاتر سرکار عالی میں تنخواہوں سے متعلق جدید تسلیم شدہ اسکیل کا نفاذ عمل میں آیا (۵) معاہدات پر نظر ثانی ہوئی اس کے علاوہ بھی جدید کئی اصلاحیں ہوئیں ان کی صراحت طوالت کا موجب ہے۔

حیدرآباد ہی کے زمانہ میں آپ جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنز) میں ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے نامزد کئے گئے ۱۳۴۱ھ میں سر مؤید الملک نے صدارت عظمیٰ سے کنارہ کشی اختیار کرلی مگر اس کے بعد بھی وہ مشیر کی حیثیت سے اپنے انتقال تک حیدرآباد آتے رہے۔

سر علی امام نے بحیثیت ہندوستانی اور بحیثیت مسلمان ہندوستان میں بہت کچھ کام کئے ہیں وہ مسلم لیگ کے صدر نشین بھی ہوئے تھے ہندو اور مسلم دونوں میں وہ ہر دل عزیز تھے۔

سر علی امام بڑے خوددار، مدبر، سیاست داں تھے وہ حسن اخلاق اور حسن سیرت سے آراستہ تھے۔ ۱۹۳۲ء میں انتقال ہوا رانچی میں دفن کئے گئے۔

رائٹ آنریبل سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم دولتِ آصفیہ

محمد اکبر المخاطب رائٹ آنریبل سر حیدر نواز جنگ بہادر کے والد نذر علی مرحوم کھمبات کے متوطن اور بمبئی کے نامی گرامی تاجر تھے، حیدری آپ کا خاندانی لقب ہے۔

سر اکبر کی ولادت نومبر ۱۸۶۹ء میں بمبئی میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنی والدہ اور نانی سے پائی۔ آپ کی نانی بمبئی کے مشہور جسٹس بدر الدین طیب جی کی حقیقی بہن تھیں۔ بمبئی کے سینٹ زیویر کالج سے سترہ سال کی عمر میں آپ نے بی اے میں کامیابی حاصل کی۔ اس سے آپ کے تعلیمی شوق، خداداد حافظہ اور غیر معمولی ذہن کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

تعلیم کے بعد سر اکبر گورنمنٹ آف انڈیا کی سلک ملازمت میں داخل ہوگئے اولاً ناگپور کے [illegible] حسابات میں [illegible] افسر کی حیثیت سے مامور ہوئے (۱۸۸۸ء) اس کے بعد لاہور پھر کلکتہ میں کارگذار رہے اور وہاں سے الہ آباد کی محاسبی [illegible] اسسٹنٹ [illegible] جنرل کی جگہ پر ترقی ملی الہ آباد سے آپ کا تبادلہ بمبئی میں ہوا اور پھر بمبئی سے [illegible] کی ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرلی پر مامور کئے گئے [illegible] خدمت سے آپ حیدرآباد میں طلب کئے گئے۔

اس کی ملازمت کے زمانے میں آپ ہندوستان و برما کے سرکاری مطابع کی جانچ پڑتال پر مقرر کئے گئے تھے۔ اس کام کو بھی آپ نے نہایت خوبی سے انجام دیا۔

۱۹۰۵ء (۱۳۱۶ف) میں سر اکبر حیدری کا تقرر صدر محاسبی سرکار عالی پر ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر ۳۶ سال کی تھی۔ دو سال کے بعد معتمدی فینانس پر آپ کا تقرر ہوا اور پھر ۱۳۲۳ف (۱۹۱۱ء) میں معتمد عدالت و کوتوالی امور عامہ پر تبادلہ ہوگیا۔ اس خدمت پر ایک طویل زمانے تک مامور رہے۔ کچھ عرصے تک اس خدمت کے ساتھ آپ نے صدر ناظم صنعت و حرفت کا کام بھی انجام دیا۔

۱۳۳۲ف (۱۹۲۰ء) میں سر اکبر سرکار عالی کی ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کرکے بمبئی میں اکاؤنٹنٹ جنرل کی خدمت پر مامور ہوگئے مگر اس کے چند ماہ بعد پھر جولائی ۱۹۲۱ء میں صدر المہام فینانس کی جگہ آپ کا تقرر ہوا اس طرح آپ دوبارہ سرکار عالی کی سلکِ ملازمت میں شامل ہوگئے۔

صدر المہامی فینانس کے بعد ۲۶ ذوالحجہ ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۶ء) میں سر اکبر صدر اعظم کی جلیل القدر خدمت پر مامور کئے گئے اور تقریباً ۲ سال سے آپ اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔

جس زمانہ میں سر اکبر حیدرآباد آکر صدر محاسب ہوئے تھے، اس وقت صدر المہامی اور مدار المہامی (صدر اعظم) کے خدمات حیدرآباد کے مخصوص امراء اور جاگیرداروں کے لئے مختص تھے کسی اعلیٰ عہدہ دار کا خواہ وہ معتمد ہی کیوں نہ ہو ترقی پاکر صدر المہام یا صدر اعظم ہوجانا محال تھا اس لئے اس وقت یہ شائبہ نہیں تھا کہ ایک دن سر اکبر صدر اعظم کی جلیل القدر خدمت پر مامور ہو جائیں گے۔

لیکن ایک زمانہ وہ آیا کہ اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع کے تدبر اور دوربین نظر کے باعث قابل اور لائق اشخاص اپنی اعلیٰ قابلیت اور عمدہ لیاقت کے باعث صدر المہام اور صدر اعظمی پر ترقی پانے لگے۔ اس قسم کا سب سے پہلا اعزاز سر فریدون الملک کو ملا تھا

سر سید علی امام مؤید الملک

رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم

سرکار عالی کی ایک معمولی خدمت سے ترقی کرتے ہوئے سب سے اعلیٰ خدمت صدر اعظمی پر مامور کئے گئے تھے۔ ان کو یہ اعزاز محض ان کی لیاقت، قابلیت، دیانت اور وفاداری کے طفیل ملا تھا۔ سر فریدون الملک کے بعد سر اکبر وہ شخص ہیں جو سرکار عالی کی صدر محاسبی سے ترقی کرتے ہوئے صدر اعظمی پر سرفراز کئے گئے ہیں، سر اکبر کو بھی یہ خدمت انہی کی طرح لیاقت قابلیت کے بل بوتے پر ملی ہے

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے سر اکبر ہندوستان کے کئی صوبوں سی پی، پنجاب، بنگال، یوپی، بمبئی اور مدراس میں مامور رہے ہر جگہ آپ نے سرکاری خدمات کو حسن و خوبی سے انجام دیا اور اپنے بعد وہاں اپنی خوش گوار یاد چھوڑی۔ حیدرآباد میں بحیثیت معتمدی اور صدر المہامی مختلف سررشتہ جات آپ سے متعلق رہے، ہر سررشتہ میں دلچسپی لے کر آپ نے اصلاح کی کوشش فرمائی۔ جن کی تفصیل اس موقع پر طوالت کا موجب ہوگی۔

لیکن خصوصیت سے بعض سررشتہ جات کا ذکر ضروری ہے کیونکہ اس کے اظہار کے بغیر آپ کے حالات مکمل نہیں ہو سکتے سررشتہ آثار قدیمہ کا قیام آپ کی توجہ کا رہین منت ہے۔ سررشتہ طبابت کی اصلاح آپ کا ایک کارنامہ ہے،

سررشتہ تعلیمات کی جدید تنظیم اور جامعہ عثمانیہ کا افتتاح آپ کے نمایاں خدمات سے تعلق رکھتا ہے یوں تو حیدرآباد میں مختلف اوقات میں "جامعہ" کے قیام کا مسئلہ زیر بحث ہوا۔ اور مختلف اصحاب حل و عقد نے اس کی طرف توجہ کی مگر عملی کام کسی نے نہیں کیا۔ بہر حال "جامعہ عثمانیہ" کا سہرا آپ ہی کے سر ہے سررشتہ داری سہ سالہ مالیاتی تنظیم، قاعدہ ریلوے کی خریدی، سررشتہ صنعت و حرفت میں اس کی ترقی کے لئے ایک گراں قدر رقم کا مختص کرنا حیدرآباد سیول سروس کی مکرر تنظیم اور ان کو اعلیٰ خدمات پر مامور کرنا یہ سب رائٹ آنریبل سر اکبر کی کارگزاریوں میں شامل ہے یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ سر اکبر کو خوش قسمتی سے اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ جیسا حکمراں نصیب ہوا اور آپ کی ہر اسکیم کو اپنی معارف نوازی اور رعایا پروری کے باعث منظوری سے ممتاز فرمایا۔

صدر المہامی فینانس کے زمانہ میں سر اکبر نے حیدرآباد کے نمائندہ کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شرکت فرمائی ہے۔

نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر کو پبلک امور سے بھی دلچسپی رہی ہے طغیانی رود موسیٰ، طاعون، انفلوئنزا وغیرہ کے زمانہ میں نہایت توجہ اور دلچسپی سے آپ نے کام کیا ہے۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے صدر آپ ہی ہوئے تھے اور آپ کی توجہ سے کانفرنس نے بہت کچھ کامیابی حاصل کی تھی۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مسلمانان جنوبی ہند کی تعلیمی کانفرنس کے آپ صدر رہ چکے ہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سینیٹ کے رکن ہیں بہر حال آپ کے سرکاری خدمات کی طرح پبلک خدمات کی تفصیل بھی طویل صفحات کی متقاضی ہے۔

سر اکبر کو مذہب سے بڑا شغف ہے وہ صوم و صلوٰۃ کے سختی سے پابند ہیں بزرگان دین کے قبور کی زیارت اور مشائخین و صوفیاء کی ملاقات کا آپ کو بڑا اشتیاق رہا کرتا ہے۔ آپ سادگی پسند، بیجا اسراف کو ناپسند کرنے والے اوقات مقررہ کی پابندی کرنے والے سرکاری کام کرنے کے شوقین، ہر وقت مصروف رہنے کے عادی ہیں۔

سر اکبر بحیثیت ایک ماہر فینانس، بحیثیت ماہر تعلیم، بحیثیت سیاسی مدبر، بحیثیت معاشی و اقتصادی ماہر اپنی آپ نظیر ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی

عہدِ آصفی کے امراء

اس کے قبل عہد آصفی کے مدار المہاموں اور صدر اعظموں کے حالات اور تصاویر درج کی گئیں۔ اب عہد آصفی کے اُن خاص خاص امراء کے حالات اور تصویریں شامل کی جاتی ہیں جو اپنے کارناموں اور شہرت کی وجہ سے بہت مشہور تھے یا جو نائب حضور کے درجے تک پہنچے تھے۔

نواب درگاہ قلی خاں سالارجنگ

نواب ذوالقدر [illegible] نام تھا ۱۱۲۲ھ میں بمقام سنگمنیر پیدا ہوئے ان کے والد خاندان قلی خاں کی پرورش اور حضرت غفران مآب نواب آصف جاہ اول کی تربیت سے ان کی فطری قابلیت بہت جلد نمایاں ہوگئی سن رشد کو پہنچنے سے قبل ہی اکثر علوم و فنون میں مہارت حاصل کرلی منکسر المزاجی کے ساتھ طبیعت میں شوخی اور ظرافت بھی تھی۔ فن موسیقی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے ۱۱۵۱ھ میں آصف جاہ بہادر کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا نادر شاہی حملے کے زمانے میں اپنے مربی کی حفاظت میں غیر معمولی جاں بازی کا ثبوت دیا جس سے ان کی شجاعت کا ثبوت ملتا ہے دہلی سے واپس ہوکر اپنے سفر کے حالات کا ایک تفصیلی تذکرہ قلمبند کیا جو مرقع دہلی کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے جس میں بارھویں صدی کی دہلی کے معاشرتی، تمدنی، تاریخی اور ادبی حالات نہایت تفصیل سے درج ہیں شاعری سے فطری لگاؤ تھا اکثر فی البدیہہ اشعار کہتے تھے خود مشاعرے منعقد کرتے اور اپنی غزل آپ پڑھتے تھے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی افسوس ہے کہ بجز چند مرثیوں کے ان کا اردو و فارسی کلام دستیاب نہ ہوسکا چیدہ چیدہ اشعار کہیں کہیں تذکروں میں ملتے ہیں

دکن کے اکثر عہدہائے جلیلہ پر فائز رہنے کے بعد تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں ۱۱۸۰ھ میں ان کا انتقال ہوا اور اپنے خاندانی مقبرہ واقع اورنگ آباد میں مدفون ہوئے۔ نمونۂ کلام حسب ذیل۔

قصیدہ

پڑی ہے آکے گلے ناگہاں بلائے سفر
سفر نہیں ہے سفر با سقر ہے بدتر

غرض کہ شوق مصیبت میں ہیں وضیع و شریف
غنی فقیر سبھی احتیاج میں مضطر

اسی تردد افطار میں لگی تھی نیند
کہ ناگہ خواب میں دیکھا قریب وقت سحر

کھڑا ہے آکے سرہانے پہ پیر نورانی
لطیف عنصر و خوش منظر و خجستہ سیر

کہ کمال عنایت سے کب ہے فکر تجھے — ہے تیرے کام کا حامی امام جن و بشر
شہ سریر کرامت امیر کل امیر — ولی حضرت مولیٰ وصی پیغمبر
امام جن و ملک تاجدار افلاک و ملک — کہا ہے لحمک لحمی جسے شہ سرور
سوائے اس کے کہوں کون شاہ مرداں ہے — خدا نے سیف دی اور رسول نے چتر
ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہوں سے — کمینہ بندۂ درگاہ صاحب قنبر
مراد بندۂ درگاہ زود ہے کہ کرے — ابوتراب کی تربت کی خاک کحل بصر

مرثیہ

عالم میں پھر کے لایا پیغام غم محرم — سب انبیا ہیں غمگیں اور اولیا پہ ماتم
اہل حرم ستم میں دل چاک دیدہ پرنم — فریاد کر کے کہتے اے سرور دو عالم
اولاد پر تمہارے یہ کیا پڑے ہیں غم — کوئی لہو میں تلملاتے کوئی خاک میں ہے بیدم
درد و الم تو اتنی جور و جفا ست پیہم — سب مبتلا بلا میں فرصت نہیں ہے یکدم

ہیہات بیکساں را تقصیر چیست یا رب
در ورطۂ ملالت تدبیر چیست یا رب

یہ قصۂ مصیبت ہے سخت درد جاں کوں — کیا لکھوں کہ کہوں اب طاقت نہیں بیاں کوں
موقوف کر اے دل غمناک داستاں کوں — سب پر عیاں ہوا ہے حاجت نہیں بیاں کوں
توں سامع الدعا ہے مقصود بندگاں کوں — تجھ پاس مانگتا ہوں امید دو جہاں کوں
دنیا میں آبرو دے چند روزہ مہماں کوں — محمود عاقبت کر اہل طلب اشناں کوں

فیض طواف درگاہ باشد نصیب عاصی
از فضل تو تمنا دارد غریب عاصی

میر سعادت علی رضوی

تیغ جنگ شمس الامراء (وفات ۱۲۰۵ھ)

ابوالفتح خاں تیغ جنگ کے والد ابوالخیر خاں تھے، سلسلۂ نسب حضرت شیخ فریدالدین شکر گنج سے ملتا ہے۔

ابوالخیر خان کو دربار مغلیہ (محمد شاہ) سے "خان بہادر" کا خطاب عطا ہوا تھا۔ حضرت آصفجاہ اول کے ہمراہ رکاب دکن آئے۔ آصفجاہ نے دو ہزاری منصب پانچ سو سوار کا اعزاز عطا کیا اور کئی ہزار کی جاگیر ذات مرحمت فرمائی تھی۔

وہ مالک کے بڑے وفادار اور جاں نثار تھے، چنانچہ جب ناصر جنگ شہید نے باپ کے خلاف صف آرائی کی تو ابوالخیر خاں کو بھی اپنا طرفدار بنانا چاہا۔ لیکن انھوں نے آصفجاہ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اسی وفاداری کے طفیل میں زمانہ مابعد میں خود ناصر جنگ نے ان کو "شمشیر بہادر" اور صلابت جنگ نے امام جنگ کے خطاب سے عزت افزائی کی۔ برہان پور میں ابوالخیر خاں کا انتقال ۱۱۶۵ھ میں ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

تیغ جنگ کی پیدائش برہان پور میں ہوئی، والد کے انتقال کے بعد اپنی جاگیر میں خانہ نشین تھے، نواب صلابت جنگ نے اپنے سفر برہانپور (۱۱۷۱ھ) کے وقت آپ کو دربار کے امیروں میں شامل فرمایا۔ اس کے بعد آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علیخاں نے خاص توجہ مبذول فرمائی اور آپ کے مراتب میں ترقی ہوتی گئی۔ تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامرا (اول) کے خطابات عطا ہوئے۔ کئی لاکھ کی جاگیر مرحمت ہوئی۔

نواب رکن الدولہ میر موسیٰ خان کے انتقال پر حضرت آصفجاہ نے آپ کو قلمدان دیوانی سے بھی سرفراز کرنا چاہا، مگر آپ نے میدان جنگ کے مقابلہ میدان سیاست کو پسند نہیں فرمایا۔

پائیگاہ کے آپ ہی بانی ہیں، حضرت آصفجاہ ثانی نے کئی لاکھ کی جاگیر فوج کے لئے عطا فرمائی تھی، علاوہ جاگیرات کے نقد رقم بھی اس کے لئے مرحمت ہوتی تھی۔ پائیگاہ کی یہ فوج شاہی محافظ (باڈی گارڈ) کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے سوار بہادر اور دلاور ہوتے اور معقول تنخواہ پاتے تھے، تیغ جنگ کے چار رشتہ دار امجد الملک، سردار الملک، امام الملک اور اعظم الملک اس فوج کے اعلیٰ افسر تھے۔ تیغ جنگ کو اپنی فوج کے ساتھ بڑا شغف تھا۔

بحالت سفر پانگل کے مقام پر ۱۲۰۵ھ میں انتقال ہوا۔ لاش کو حیدرآباد لاکر درگاہ برہنہ شاہ میں دفن کیا گیا۔

شمس الامرا (ثالث) امیر کبیر (ثانی) (ولادت ۱۲۲۰ھ وفات ۱۲۹۴ھ)

امیر کبیر ثانی کا نام محمد رفیع الدین خان تھا۔ آپ فخرالدین خان امیر کبیر (اول) کے بڑے فرزند تھے جن کا ذکر وزرائے سلطنت کے سلسلہ میں گزر چکا ہے۔
شوال ۱۲۲۰ھ میں آپ کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی۔ نامور جنگ عمدۃ الدولہ عمدۃ الملک شمس الامرا (ثالث) امیر کبیر (ثانی) کے خطابات آپ کو سرفراز ہوتے تھے۔
نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کے انتقال پر اعلیحضرت غفران مکان کی صغیر سنی کے باعث آپ نائب حضور کی حیثیت سے سلطنت آصفی کے کاروبار انجام دیتے رہے۔ اسی نائب حضوری کے زمانہ میں آپ کا انتقال ہوا (۱۲۹۴ھ) میں خاندانی مدفن درگاہ حضرت برہنہ شاہ میں دفن کئے گئے۔

آپ کو علوم و فنون خصوصاً ریاضی اور ہیئت سے بڑی دلچسپی تھی۔ ریاضی میں آپ نے چند کتابیں تالیف فرمائی ہیں۔

ابوالفتح خان نصرت جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء

محمد رفیع الدین خان قاسم جنگ عمدۃ الدولہ عمدۃ الملک
شمس الامراء امیر کبیر ثانی

رشید الدین خان وزیر الامرا شمس الامرا امیر کبیر

محی ا الدین خاں تہم جنگ مر خو رشید جاہ

فن تعمیر کا بھی شوق تھا۔ آپ کی بنوائی ہوئی کئی عمارتیں موجود ہیں۔ داد و دہش میں مشہور تھے۔ آپ کی سخاوت اور فیاضی کا شہرہ دور دور تک پہنچا تھا۔ چنانچہ زمانہ شباب میں (سنہ ۱۲۶۹ھ) آپ ایک مرتبہ بیمار ہو گئے تھے۔ یونانی حکماء کے علاج سے فائدہ نہیں ہوا۔ انگریزی علاج شروع کیا گیا جو اس زمانہ میں ایک عجوبہ سے کم نہیں تھا۔ ڈاکٹر آپ کے لئے تبدیل آب و ہوا ضروری قرار دیا کلکتہ لے گئے۔ وہاں جہاز کے ذریعہ سمندر میں تفریح ہونے لگی اور خدا کے فضل سے آپ کو صحت کلی حاصل ہو گئی۔ ایک سال تک یہاں قیام رہا کلکتہ میں آپ نے اس قدر داد و دہش فرمائی اور ولایتی سامان اس کثرت سے خرید فرمایا کہ یورپ میں بھی آپ کا نام سخاوت اور قدردانی کے لحاظ سے مشہور ہو گیا تھا آپ کو کوئی اولاد نہیں تھی

محمد رشید الدین خان شمس الامراء (رابع) امیر کبیر (ثالث)

(ولادت سنہ ۱۲۳۰ھ وفات سنہ ۱۲۹۹ھ)

محمد رشید الدین خاں، امیر کبیر فخر الدین خان کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ بمقام حیدرآباد سنہ ۱۲۳۲ھ میں ولادت ہوئی اور سنہ ۱۲۹۹ھ میں انتقال ہوا۔ پہلے آپ کو ابو الخیر خان بہادر، جنگ، اقتدار الدولہ، اقتدار الملک، وقار الامراء کا خطاب عطا ہوا تھا۔ اس کے بعد جب امیر کبیر ثانی رفیع الدین خان کا انتقال ہوا تو آپ کو خاندانی خطاب شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء امیر کبیر کے موروثی خطاب سے سرفراز کیا گیا اور نائب حضور بنائے گئے۔ نواب آصفجاہ ثالث سکندر جاہ بہادر کی صاحبزادی سے آپ کا عقد ہوا تھا۔ جن کے بطن سے آپ کو دو صاحبزادے خورشید جاہ اور وقار الامراء تولد ہوئے۔

محمد رشید الدین خاں اپنے وقت کے صاحب تدبیر و سیاست تھے۔ اس زمانہ میں آپ کو سیاسی خدمات اور پولٹیکل مسائل کے تصفیہ پر جس طرح عبور حاصل تھا وہ اپنی آپ نظیر تھا۔ داد و دہش میں مشہور تھے، اپنے بڑے بھائی کی طرح ان کو بھی سخاوت اور خیرات سے دلچسپی تھی۔ علوم و فنون کے قدردان تھے۔ علماء، فضلاء اور شعراء کی ہمت افزائی کرتے اور کافی صلہ دے کر ان کی قدردانی فرماتے تھے۔

تاریخ سے خاص شغف تھا اسی شوق کے باعث تاریخ "رشید الدین خانی" آپ کی سرپرستی میں مرتب اور شائع ہوئی۔

محمد محی الدین خان خورشید جاہ شمس الامراء (خامس) امیر کبیر (رابع)

(ولادت سنہ ۱۲۵۷ھ وفات سنہ ۱۳۲۰ھ)

محمد رشید الدین خان کے بڑے فرزند تھے۔ سنہ ۱۲۵۷ھ میں ولادت ہوئی۔ آپ کی والدہ محترمہ حضرت حشمت النساء صاحبہ، آصفجاہ ثالث کی صاحبزادی تھیں۔ آپ کی تعلیم و تربیت کا خاص انتظام ہوا تھا۔ عربی، فارسی، ریاضی وغیرہ کی تعلیم کے لئے عالم و علماء و قابل اساتذہ مامور کئے گئے تھے۔ سواری اور فنون سپہ گری کا بھی اہتمام تھا۔ بہ حال دادا کی نگرانی میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ دادا کی خاص توجہ [illegible]

سنہ ۱۲۷۳ھ میں آپ کی شادی نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کی صاحبزادی حضرت حسن النساء بیگم صاحبہ سے ہوئی۔ [illegible] بقید حیات تھے، بڑی دھوم سے یہ شادی ہوئی۔ دو ہفتہ تک شادی کے جشن ہوتے رہے۔ [illegible] شب برات ہوتی تھی [illegible] شادی اپنے دھوم دھام کروفر شان و شوکت کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر تھی۔

دربار آصفی سے مختلف اوقات میں آپ کو حسب ذیل خطابات سے متمتع کیا گیا ۔ ابو الخیر خاں، تیغ جنگ، خورشید الدولہ، خورشید الملک، خورشید جاہ، شمس الامراء امیر کبیر ۔

شمس الامراء اور امیر کبیر کے خطابات آپ پر ختم ہو گئے، پھر کسی کو آج تک یہ خطاب نہیں ملا ۔

سرکار انگریزی میں آپ کے بڑے اعزاز تھے ۔ "سر" کا خطاب ملا تھا اور آپ کی زندگی میں جس قدر وائسرائے حیدرآباد آئے وہ آپ کے یہاں ضرور مدعو ہوتے تھے ۔

سر خورشید جاہ کو اپنے باپ کی طرح میدان سیاست سے بڑی دلچسپی تھی ۔ آپ اپنے زمانہ کے مدبر اور صاحب فراست تھے، کونسل آف اسٹیٹ کی رکنیت پر اعلیحضرت غفران مکاں نے آپ کا تقرر فرمایا تھا ۔

علم و فن سے دلچسپی تھی، تاریخ خورشید جاہی آپ کی سرپرستی میں شائع ہوئی ۔ ادب میں بھی شہرت رکھتے تھے، حجاز ریلوے کی تعمیر کے لئے پچیس ہزار کا چندہ دیا تھا ۔ سیر و سیاحت کا شوق تھا ۔ شمالی ہند اور جنوبی ہند کے کئی شہر دیکھے تھے ۔ اپنی فوج کو باقاعدہ مرتب کیا تھا ۔ فوجی وردی اور عمدہ ہتھیار دئے جو پائیگاہ میں اس سے پہلے نہیں تھے، ۱۳۲۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا درگاہ پہاڑی شاہ میں دفن کئے گئے ۔ آپ کو دو صاحبزادے تولد ہوئے، امام جنگ اور ظفر جنگ ۔ آخر الذکر شہزادی حسن النساء بیگم صاحبہ کے بطن سے تھے ۔

مکرم الدولہ میر پرورش علیخاں حسام جنگ

میر پرورش علی خان المخاطب حسام جنگ مکرم الدولہ، آپ کے والد نواب قبلہ الدولہ نواب سراج الملک کے داماد تھے اس طرح مکرم الدولہ نواب مختار الملک کے ہمشیرہ زادے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ مکرم الدولہ آپ کے داماد بھی تھے، نور النساء بیگم صاحبہ آپ سے بیاہی گئی تھیں ۔

مکرم الدولہ کی تعلیم مدرسۂ دار العلوم میں ہوئی، اس مدرسہ کے افتتاح کے ساتھ ہی آپ نے اس میں شرکت فرمائی تھی، عربی، فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے ۔

نواب مختار الملک نے مجلس مالگزاری قائم کی (۱۲۸۶ھ) تو اس مجلس کا آپ کو میر مجلس بنایا گیا، اس کے بعد جب مجلس برخاست ہو کر صدر المہام مقرر ہوئے تو اس وقت آپ صدر المہام مالگزاری ہوئے ۔

نواب مختار الملک کے سفر یورپ کے زمانہ میں آپ بشیر الدولہ کے ساتھ مل کر مدار المہامی کا کام بھی انجام دیتے رہے، آپ کی قابلیت مسلمہ تھی، اور عام و خاص میں آپ کی لیاقت کا شہرہ تھا ۔

شادی کے ایک سال بعد (۱۲۹۶ھ) میں آپ خلل دماغ کی وجہ سے خانہ نشین ہو گئے، ۱۳۱۳ھ میں آپ کا انتقال ہوا ۔ دائرۂ میر مومن میں دفن کئے گئے ۔ آپ کو کوئی اولاد نہیں ہوئی ۔

نصیر الدین ہاشمی

قلمبند کیا۔ اس کی وجہ سے ملکہ کا نام اس وقت تک باقی رہیگا جب تک کہ یہ مثنوی باقی ہے، سلطانہ شہر بانو کی علمی فیاضی کو تذکرہ خیابان نسواں میں تفصیل سے کیا جاچکا ہے۔ اس لئے یہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں دوسرا نام ماہ لقا بائی چندا کا پیش ہوسکتا ہے، اس کی علمی قدر دانی شعرا مصنفین اور مورخین کے لئے بہت سی تصنیفات کا باعث تھی۔ چندا کا مفصل تذکرہ آگے آتا ہے۔

نورالنساء بیگم مرحومہ بنت نواب مختار الملک اول کا نام نامی اس سلسلہ میں لانا ضروری ہے جن کی تعلیمی دلچسپی اور نسوانی ہمدردی کے باعث تذکرۂ جمیل ان کے اسم گرامی پر معنون ہوا ہے، اور ان کی سرپرستی میں اس کی اشاعت ہوئی ہے۔

موجودہ دور میں۔ اس ذیل میں شہزادی ہر ہائینس درشہوار دردانہ بیگم صاحبہ اور شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ کا اسم گرامی بہت لیا جاتا ہے جن کے اسمائے گرامی پر کئی کتابیں معنون ہوئی ہیں، مثلاً ہر ہائینس کے اسم گرامی پر راقم کی کتاب "خواتین عہد عثمانی" اور جہاں بانو بیگم نقوی کی "پرواز خیال" اور شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ کے اسم گرامی پر بسمل صاحب کی تصنیف "صنف نازک" اور راقم کی خیابان نسواں کو معنون ہونے کا افتخار حاصل ہے۔

اس عنوان میں صغرا بیگم ہمایون مرزا کا نام بھی پیش ہوسکتا ہے، جو عموماً اپنی علمی ہمدردی اور خصوصاً اردو کی دلچسپی کے باعث ادبائے اردو کے معاونین کے زمرہ میں شامل کی گئی ہیں۔

شعر گوئی اور نثر نگاری

اب ہم خواتین دکن کی شاعری اور نثر نگاری کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ مورخ اور ادب کے لئے یہ دشوار ہے کہ وہ صدیوں کی خواتین کی ادبی خدمتوں کا تذکرہ کرسکے، اول تو اس لئے کہ پردہ کے باعث خواتین کے علمی کارنامے بھی پردۂ خفا میں رکھے گئے، اور آج بھی بعض گھرانوں میں اسی پر عمل ہے۔

دوسرے یہ کہ زمانہ گزشتہ میں عام طور سے تعلیم نسواں کا رواج نہیں تھا۔ اور تعلیمی سہولتیں حاصل نہیں تھیں۔ اس لئے خواتین نے کچھ کام بھی کیا تو وہ پوشیدہ رہا۔

گو یہ صحیح ہے کہ بعض خاندانوں میں عورتوں کی تعلیم کا رواج تھا، مگر ان میں بھی زیادہ تر ابتدائی اور مذہبی تعلیم کا رواج تھا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کا کام نہیں تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہم کو گزشتہ صدیوں کے ادبی خدمات کی مفصل بیان کی توقع نہیں، جو کچھ صراحت اس موضوع کے تحت کی جاسکتی ہے وہ زیادہ تر چودھویں صدی ہجری سے متعلق ہوگی۔

چودھویں صدی ہجری کے قبل ہم جن شاعر خواتین کا تذکرہ کرسکتے ہیں وہ صرف چندا، لطف النساء اور عاقلہ ہیں۔

چندا۔

ماہ لقا بائی چندا ایک ماہر فن موسیقی اور شاہی طوائف تھی [illegible]

ے مولف کی دوسری تالیف جو عصمت بک ڈپو دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

جداگانہ تھی، اس کی علمی قابلیت اور شعرا و مصنفین کی قدردانی کے باعث آج تک اس کا نام زندہ ہے۔

۱۱۸۱ھ میں تولد ہوئی اور ۱۲۳۶ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ حیدرآباد میں کوہ مولا کے قریب مدفون ہے۔

وہ صاحب منصب و جاگیر تھی، اس لحاظ سے بلند پایہ اور اعلیٰ حیثیت رکھتی تھی، اس کے موسیقی کے جلسوں میں ارسطوجاہ، اور میر عالم وزرائے حیدرآباد آتی خصوصیت کے اصحاب شریک ہوتے تھے، اور میر عالم نے تو ایک مثنوی اس کی مدح میں لکھی ہے، چندا کے پاس صرف پہرہ کے لئے پانچ سو سپاہی ملازم تھے، اس سے اس کی دولت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ ایک باکمال ماہر موسیقی ہونے کے علاوہ وہ ایک نازک خیال اور بلند پرواز شاعرہ بھی تھی، اس کا دیوان ۱۲۱۳ھ میں ارسطوجاہ کے حکم سے مرتب ہوا ہے، جس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، جو سر جان ملکم کو بطور تحفہ دیا گیا تھا۔

وہ شاعری کے ساتھ شعرا کی قدردان بھی تھی، اس کے پاس ہمیشہ شعر و شاعری کی گرم بازاری رہا کرتی، شعرا کی ہمت افزائی بندھانا اور حوصلہ افزائی بھی اس کا معمول تھا

چندا کو موسیقی، شاعری کے ساتھ تاریخ سے بھی شغف تھا، اسکی سرپرستی سے ایک تاریخ "دل افروز" کے نام سے لکھی گئی ہے، جو دکن کی معتبر تاریخوں میں شمار ہو سکتی ہے۔

بہرحال چندا نے نہ صرف اپنی شاعری کے ذریعہ بلکہ شعرا و مصنفین کی سرپرستی کر کے بھی اردو زبان کی خدمت گزاری میں حصہ لیا ہے چندا کو شیر محمد خان ایمان سے تلمذ تھا۔

موضع "اڈیکمٹ" اسی کی جاگیر میں تھا، جہاں آج جامعہ عثمانیہ کی پرشوکت اور شاندار عمارت تیار ہو رہی ہے،

چندا کا دیوان کوئی ضخیم دیوان نہیں ہے، اسکے کلام میں پاکیزگی اور لطافت کے ساتھ شعریت اور موسیقی بھی ہے جسکی وجہ سے دلآویزی پیدا ہو گئی ہے۔ مبتذل جذبات اور عامیانہ خیالات سے بھی اسکی شاعری پاک ہے، اس سے بھی اس کے بہترین اخلاق کا پتہ چلتا ہے،

"حیات ماہ لقا بائی" کے نام سے اس کی ایک سوانح عمری بھی غلام صمدانی خاں گوہر نے تالیف کی ہے، "یورپ میں دکھنی مخطوطات" "دکن میں اردو" اور "مرقع سخن" جلد اول میں اس کے حالات موجود ہیں۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ جسطرح اس کی جاگیر "اڈیکمٹ" تعلیمی مرکز بن رہا ہے اسی طرح اسکی پروردہ لڑکی "حسن لقا بائی" کا باغ بھی زنانی مدرسہ کے لئے منتخب ہوا ہے[1]۔

چندا کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

قتل پر کس کے آج ہوتی ہے — توسن حسن پر سوار شراب

کب تک رہوں حجاب میں محروم وصل سے — جی میں ہے کیجے پیار سے بوس و کنار خوب

---

[1] نام پلی ہائی اسکول۔

محشر میں فاطمہ کہنے والی ہے فاطمہ | پھر جادہ امت کو پلادیں گے فاطمہ
کر فضل سو ان اس کو چھڑا دیں گے فاطمہ | مظلوم فاطمہ کے حسین علی گئے

(از بیاض کتب خانہ مولوی صفی الدین مرحوم)

افسوس ہے کہ تیرھویں صدی ہجری کے دیگر کسی شاعر خاتون کا تعارف کرانے سے ہم معذور ہیں۔ ممکن ہے کبھی اس باب میں اضافہ ہو سکے۔

اس کے بعد چودھویں صدی کے شعرا اور تذکرہ نگار خواتین کا تذکرہ کیا جائیگا۔ سہولت کے مدنظر ان کی تقسیم کی گئی ہے، دور محبوبی، دور عثمانی کے تحت ان کو متعارف کیا گیا ہے فقط

نصیر الدین ہاشمی

اورنگ زیب اور تانا شاہ

"اچھا تو نماز ہو رہی ہے!"

تانا شاہ نے کہا اور ساتھ ہی اس کا چہرہ غصے سے تمتما گیا۔

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ مغل ہمارے نشانہ بازوں کی اتنی تحقیر کریں گے! قلعہ کے اس قدر قریب اور ہمارے تیر و تفنگ کی زد میں کھڑے ہو کر نماز جماعت ادا کرنا مصلحت اور دور اندیشی سے یقیناً بعید ہے! کیا اورنگ زیب جیسا دور اندیش اور ہوشیار بادشاہ بھی غلطی کر سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں یا یہ کہ محض تحقیر ہے! دیکھنا ہے کوئی ہمارا اچھا نشانہ باز؟"

اورنگ زیب کئی مہینوں سے گولکنڈہ کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ مغل فوجیں چاروں طرف سے ایک مہیب سمندر کی پرجوش موجوں کی طرح قلعہ کی فصیلوں سے آکر ٹکراتی ہیں۔ اور ہر مرتبہ دکنی سپاہی پہاڑوں کی چٹانیں بنکر انہیں پیچھے ہٹا دیتے ہیں۔ اس وقت آفتاب کی تمازت میں خاصی کمی ہو گئی ہے اور غنیم مسلسل اپنی پوری قوت کے ساتھ حملوں پر حملے کئے جا رہا ہے۔ ان صفوں کے ذرا پیچھے دو تین ہموار قطاریں نظر آتی ہیں کیونکہ اورنگ زیب اور اس کے کئی ایک مصاحب بھی نماز کیلئے صف بستہ کھڑے ہیں۔ چند لمحے گذرنے نہیں پاتے ہیں کہ امام یکایک تڑپ کر آگے کی طرف گر پڑتا ہے۔

"خوب! شاباش!! امام کو لے لیا۔ دیکھنا صف میں سے ایک دوسرا شخص امامت کیلئے آگے بڑھ رہا ہے۔ ہاں چھوڑنا نہیں۔ کوئی امام نہ بچنے پائے۔ اس کو کہتے ہیں انتقام تحقیر!!"

شاہی حکم بجلی بن کر دوسرے امام پر گرتا ہے اور وہ بھی دکنی گلنداز کا نشانہ ہو جاتا ہے

دو تین پیش اماموں کے یکے بعد دیگرے اس طرح نذر اجل ہو جانے کے بعد امامت کیلئے صف میں سے آگے بڑھنا کسی معمولی دل و دماغ والے کا کام نہیں! اس سرے سے اس سرے تک پس و پیش کا ایک عجیب عالم چھا جاتا ہے۔ لیکن ابھی چند لمحے بھی گذرنے نہیں پاتے ہیں کہ خود اورنگ زیب امامت کے لئے بڑھتا نظر آتا ہے، اور جب گولکنڈہ کا شاہی نشانہ باز بندوق خالی کرنے ہی کو ہے کہ تانا شاہ لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

"ظالم! کیا ایک بادشاہ کو بھی نشانہ بنائے گا؟ دکھائی نہیں دیتا کہ خود اورنگ زیب اس وقت امام ہے!!"

سید محی الدین قادری زور

حیدرآباد اور دیہی تنظیم

ہر ملک اپنی آب و ہوا، موسمی خصوصیات، قدرتی حالات اور جغرافی ماحول کے مطابق اپنی آبادی کی گذر اوقات کے لئے آمدنی حاصل کرنے کے چند شعبوں کا انتخاب کر لیتا ہے۔ ان مختلف شعبوں میں زراعت سب سے اہم ہے کیونکہ اس میں نہ صرف پودے اگا کر زرعی پیداوار حاصل کرنا شامل ہے بلکہ فصلوں کو بیماریوں اور وباؤں سے بچانے کی تدبیریں، زرعی پیداوار کی نکاسی کا انتظام، مویشیوں کی غور و پرداخت، اچھی نسلیں پیدا کرنا، زمین کے مختصر ٹکڑوں سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی کوشش بھی اسی کے دائرہ میں داخل ہے۔ اور دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ اسی شعبہ سے آمدنی حاصل کر رہا ہے۔

۱۷۵۰ء کے صنعتی انقلاب سے پہلے ہر ملک میں زراعت کی بڑی اہمیت تھی، مگر انقلاب کے بعد حالات بدل گئے۔ بھاپ پر انسانی اقتدار اور نئی نئی طاقتوں کی ایجاد نے پیدائش دولت کو آسان کر دیا۔ دولت کی کثیر تعداد قلیل وقت میں انسان کی معمولی کوشش سے پیدا ہونے لگی۔ اس نئے طریقہ نے کس طرح قدیم مذہبی رجحانات، انفرادی آزادی، خانگی زندگی، گھریلو صنعت کو مٹایا، چھوٹے دستکاروں اور غریب صناعوں کا خاتمہ کیا۔ کیا: مفلس کو مفلس ترین اور دولت مند کو دولت مند ترین بنانے میں مدد دی، یا میکانی قوت جس کی ابتدا انسان کے ایک تابع غلام کی حیثیت سے ہوئی اس نے کس طرح انسان کو اپنا غلام بنا لیا ہمارے موضوع سے خارج از بحث ہیں۔ مگر انقلاب کا ایک اہم نتیجہ یہ ہوا کہ زراعت کو غیر اہم اور صنعت و حرفت کو اہم سمجھا جانے لگا۔ ہر ملک یہ سمجھنے لگا کہ ہمارا کام صنعتی اشیا پیدا کرنا ہے اور زرعی پیداوار ہمارے لئے دوسرے مہیا کرتے ہیں۔ اگر صرف چند ممالک اس اصول کو اختیار کرتے تو کچھ بے جا نہ تھا بلکہ تجارت خارجہ کے نظریہ کے مطابق کہ ہر ملک وہی چیزیں پیدا کرے جس کے لئے وہ موزوں ترین ہو، اور آپس میں تبادلہ کر کے اپنی ضروریات پوری کر لے بہت اچھا تھا کیونکہ اس کی بدولت ہر قوم دوسری قوموں کے قدرتی عطیات اور کسبی کمالات سے پوری پوری طرح مستفید ہو سکتی تھی اور مجموعی حیثیت سے دنیا میں کثیر دولت پیدا ہو سکتی اور دنیا کی خوشحالی میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا بلکہ ہر ملک نے اس اصول کو اختیار کرنے کی کوشش کی، حالانکہ یہ ان ملکوں کا رجحان تھا جن کے یہاں قدرتی حالات، موسمی خصوصیات، زمین کی ساخت کے اعتبار سے زراعت کے کچھ اچھے امکانات نہ تھے، مگر دنیا کے ہر ملک نے اس رجحان کو ایک کلیہ بنا لیا اور صنعتی دوڑ میں ایک عالمی مسابقت شروع ہو گئی۔

زرعی معاشیات میں جنگ عظیم سے پہلے جو ادب کی قلت نظر آتی ہے اس کی وجہ یہی عالمی رجحان تھا مگر جنگ عظیم کے تلخ تجربوں نے ماہرین اور منتظمین پر اس امر کا انکشاف کر دیا کہ اگر جنگ طویل ہو جائے، ملک کا محاصرہ کر لیا جائے، رسد آمد و رفت کو مسدود کر دیا جائے تو ملک میں زرہ بکتر، مشین گنوں، خطرناک توپوں، ہوائی جہازوں، غوطہ خور کشتیوں اور جنگی جہازوں کی کثرت کے باوجود لڑائی جاری رکھنے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں کیونکہ جنگ کا انحصار آلات حرب سے زیادہ سپاہیوں کی خوراک پر ہے اور جب ان ہی کی قلت ہو جائے تو نہ لڑنے والے رہ سکتے ہیں نہ آلات حرب کام دے سکتے ہیں۔ چنانچہ جنگ کے بعد یہ اصول تسلیم کر لیا گیا تھا کہ قوم کی مدافعت اور ملک کی حفاظت کے لئے زراعت ایک ناگزیر شئے ہے۔ اب دنیا نے زراعت کی طرف توجہ شروع کی، زرعی پروگرام بنائے گئے، زراعت کو ترقی دینے اور زرعی آبادی کو بڑھانے کی کوشش شروع ہوئی اور حکومتوں نے اس سلسلے میں بے دریغ روپیہ خرچ کرنا شروع کیا اور زراعت کی ہر طرح سے مدد کی جانے لگی۔

ہندوستان، اسکے صوبے، اور ریاستوں میں زراعت کا حال بالکل ہی مختلف ہے، اگر دوسرے ممالک میں زرعی آبادی کی قلت ہے تو ہمارے یہاں زرعی آبادی کی کثرت ہی نے زراعت کی حالت کو خراب کر رکھا ہے، اگر ان کے یہاں دیہی آبادی کم ہے تو ہمارے یہاں شہری آبادی کی کمی ہے۔ دراصل ہندوستان کلکتہ، بمبئی، دہلی یا حیدرآباد جیسے عظیم الشان شہروں، ان کی سربفلک عمارتوں خوشنما اور وضع دار بنگلوں، چوڑی سمنٹ دار سڑکوں، جگمگاتی ہوئی دوکانوں کا نام نہیں ہے۔ ہندوستان نام ہے اس کثیر آبادی کا جو کچے جھونپڑوں یا پھوس کے ٹوٹے ہوئے مکانوں میں رہتی ہے۔ محنت مشقت سے جسکے چہرے زرد ہیں، گال پچکے ہوئے آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں، بدن پر جھریاں ہیں، جسکی اکثر غذائیں ایسی ہیں جن میں غذائیت کا جز نہیں، جسکے بدن کا اکثر حصہ شرمندۂ لباس نہیں، جسکا ماحول ملیریا، انفلوئنزا، ہیضہ، چیچک، طاعون، دق، سل اور اسی طرح کے دیگر متعدی امراض کے جراثیم سے پُر ہے۔ جو دنیا کے لئے غذا مہیا کرتا ہے مگر اپنی غذا کے لئے دوسروں کا محتاج ہے، جو ہمارے شہروں اور گھروں کی رونق کا باعث ہے مگر خود اس کے گھر اجڑے ہوئے اور بے چراغ ہیں، وہ محنت کرتا ہے تو اس کی محنت کے پھل دوسرے کھاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ زراعت کی ان خرابیوں کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا ہر جگہ زراعت میں وہی خرابیاں ہیں جو ہمارے یہاں ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملکی حالات نے مجموعی حیثیت سے زراعت کی حالت کو خراب کر رکھا ہے، اور قدرت، سماج، کاشتکار اور حکومت ہر ایک اپنی جگہ پر اس کی تباہی کا ذمہ دار ہے۔

قدرتی اسباب میں سیلاب، خشک سالی، بارش کی غیر مساوی تقسیم، موسموں کی غیر یقینی حالت، کہر، اولا، پالا، اور ٹڈی دل شامل ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ان میں سے بعض اسباب کو دور کیا جا سکتا ہے۔ گویا انسان اگر قدرت کے قابو سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا تو کم از کم اسکا اتنا مطیع اور فرمانبردار بھی نہیں رہ سکتا جتنا کہ وہ آج نظر آرہا ہے۔

مجموعی حیثیت سے سماج پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس نے زراعت کو معزز پیشہ نہ سمجھا، دیہاتیوں کے متعلق اچھی رائے قائم نہ کی، معلمین قوم اور محبان وطن کا فرض تھا کہ وہ اس طرف توجہ کرتے مگر انہوں نے کثیر آبادی کو چھوڑ کر شہری آبادی کو جسکی ہمارے ملک میں قلت ہے اپنی اصلاح کا مرکز بنایا۔ انھوں نے کارخانے کے مزدوروں کیلئے جنکی تعداد ۲۰ سے ۴۰ لاکھ کے درمیان ہے قوانین بنانے اور ان کیلئے سہولتیں بہم پہونچانے کی جانب اپنی توجہ مبذول کی اور ۲۵ کروڑ آبادی سے تغافل برتا۔ اس خصوص میں سب سے زیادہ موردالزام وہ تعلیم یافتہ اور صاحب حیثیت افراد ہیں جنہوں نے دیہات میں جنم لینے اور پرورش پانے کے بعد دیہات سے لاپروائی اختیار کی۔ یہ اپنی واقفیت اور قدیم اقتدار کی بناء پر بہت کچھ کر سکتے تھے، مگر انھوں نے بھی اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے کیلئے شہروں کو ہی انتخاب کیا۔ ایسی صورت میں یہ کہنا نہ چاہیئے کہ ان میں صداقت و خلوص کا نام نہ تھا بلکہ وہ شہرت اور تشہیر کے خواہاں تھے، وہ خدمت خلق کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ دنیا پر اپنی قابلیت و عظمت کا سکہ بٹھانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ دور افتادہ گاؤں میں یہ ذرائع کہاں، ان کے لئے تو بڑے بڑے شہر ہی موزوں ہیں جہاں جذبۂ شہرت کو تسکین دینے کیلئے مختلف قسم کے ذرائع موجود ہیں۔ ذات پات کے طریق کی ذمہ داری بھی سماج ہی کے ہے، اس نے کسی کو ادنیٰ اور کسی کو اعلیٰ بنایا۔ سماج ہی نے مذہب کی اوٹ لیکر رسومات کی بنا ڈالی، اور ان کو وہ اہمیت دی کہ گویا ان ہی کی ادائی مذہب ہے۔

زرعی مذہب کی سب سے پوشیدہ کڑی خود کاشتکار ہے، کیونکہ زراعت کی بہتری اور بدتری کا انحصار اسی پر ہے۔ وہ دنیا کے حالات سے بے خبر، ان پڑھ، مفلس، قرض دار، فضول خرچ، قدامت پرست اور قسمت پرست ہے۔ کسان کے لئے منظم تعلیمات کی تربیت نہ ہونے سے اکثر و بیشتر کاشتکاروں کو پیداوار کی کمی سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا ان کی جہالت عظیم سے ہوتا ہے۔ وہ مفلس اور قرض دار ہے، مگر تقاریب، شادیوں اور رسومات پر خوب خرچ کرتا ہے۔ اس کے پاس آمدنی و خرچ کا کوئی حساب نہیں۔ اس کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کیا آمدنی ہو رہی ہے اور اس کے اخراجات کیا ہیں۔ ناواقفیت کی بنا پر وہ اچھی قسم کی فصلیں پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا، کبھی کبھی کم عقلی کی بنا پر عاقبت نا اندیشی کے ساتھ وہ اچھی فصلوں میں خراب فصلوں کی آمیزش کر دیتا ہے۔ قدرت پرستی اور قسمت پرستی اس کو نئے طریقوں کے اختیار کرنے سے روکتی ہے۔

حکومت جس کا کام رعایا کی فلاح و بہبود کے ہر ممکنہ ذرائع اختیار کرنا ہے اس نے بھی اس حامی بنان کے تحت جس کا ذکر کیا جا رہا ہے اس طرف سے لاپروائی برتی اور مقامی حالات کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ خود اہل ملک نے بھی حکومت کو اس جانب متوجہ کرنے کی کوشش نہ کی۔ اس وقت ہندوستان کے قائدین اس بات پر زور دیتے تھے کہ چونکہ ہندوستان کی قدیم صنعتوں کو ختم کر دیا گیا ہے اس لئے دوبارہ ان کو زندہ کیا جائے۔ انڈین نیشنل کانگریس جیسے قومی ادارے نے ۱۹۰۵ء میں صنعت و حرفت کی ترقی و احیاء کے لئے ایک الگ شاخ قائم کی مگر زراعت کی جانب ۱۹۳۶ء سے پہلے توجہ نہ کر سکی۔

جنگ میں حکومت برطانیہ کے تلخ تجربات سے حکومت ہند نے بھی فائدہ اٹھایا اور ۱۹۱۹ء کی اصلاحات میں وزیر زراعت کا عہدہ قائم ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں زرعی کمیشن مقرر ہوا جس کی رپورٹ پر غور کرنے کیلئے شملہ میں صوبوں کے وزرا و ناظمان زراعت اور امداد باہمی کے رجسٹراروں کی کانفرنس منعقد ہوئی، ۱۹۲۹ء میں شاہی زرعی تحقیقاتی کونسل مستقل اراکین کیساتھ وجود میں آئی۔

دیہی تعلیم یا دیہات سدھار بالکل حالیہ اصطلاح ہے۔ ملک میں ۱۹۳۱ء سے پہلے اسکی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کہ ایک جانب کانگریس نے دیہات سدھار کو اپنے نظام نامے میں شامل کیا تھا، دوسری جانب عالمی کساد بازاری نے زرعی پیداوار کی قیمتیں سطح سے بہت نیچے قرار دی تھیں، موازنوں میں خسارہ آ رہا تھا اور زرعی آبادی کو سخت معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ۳۵-۱۹۳۴ء کے موازنہ میں ایک کروڑ کی رقم مرکزی حکومت نے دیہات سدھار کیلئے منظور کی۔

ممالک محروسہ میں زراعت کے کم و بیش وہی حالات ہیں جو برطانوی ہند یا ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں ہیں۔ یہاں ۲۱۲۲ دیہات ہیں۔ آبادی کا ۱۱ فیصد شہروں میں اور ۸۹ فیصد دیہات میں رہتا ہے کو یہاں زراعت کے تحفظ کیلئے مختلف تدابیر پہلے بھی اختیار کی جاتی تھیں مثلاً قحط کے زمانہ میں کاشتکاروں کی امداد، یا خشک سالی میں مالگزاری میں معافیاں، یا زرعی آبادی کی بہبودی کیلئے ۱۹۱۳ء میں قانون امداد باہمی کا نفاذ وغیرہ، مگر سب عارضی۔ بحران کے تحت زراعت کی جانب کوئی خاص توجہ نہ تھی۔ مگر حالات کے بدلتے ہی یہاں بھی تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ گو زراعت کا محکمہ ۱۹۱۲ء سے قائم ہے مگر ابتدا میں اس کا خاص مقصد "کرانی" روئی کو تباہی سے بچانا تھا۔ مگر ۱۹۲۹ء میں اس کا مقصد ملک کی عام زراعت کی ترقی قرار پایا۔ اس نے تحقیق، تجربے اور تشہیر سے اپنے مقصد کو پورا کرنا شروع کیا۔ تحقیق کا مقصد یہ تھا کہ معلوم ہو سکے کہ کونسی فصلیں اچھی ہیں یا ان کو کس طرح عمدہ بنایا جا سکتا ہے، چنانچہ اس وقت تک صد مقامی اعلیٰ قسم

کی قسمیں دریافت ہو چکی ہیں۔ تحقیقاتی نتائج جانچے اور نئے ایجادات یا نئے طریقوں سے زمین کی پیداوار بڑھانے کے لئے مزرعے قائم کئے گئے تاکہ علمی اور
معاشی حیثیت سے نتائج کا امتحان ہو سکے۔ کامیاب تجربوں کو کاشتکاروں کے سامنے پیش کرنے اور تشہیر کی ضرورت پیش آئی تاکہ کاشتکار جن کے
لئے یہ سب کچھ کیا گیا ہے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اسوقت محکمۂ زراعت کے تحت دس مزرعے ہیں جہاں یہ کام ہو رہے ہیں، فصلوں کی بیماریوں کا
علاج، مویشیوں کی بیماریوں اور ان کی نمو وغیرہ، [illegible] کی جانب بھی توجہ ہو رہی ہے۔ مرغیوں کے سلسلے میں بھی کافی تجربات ہو چکے ہیں۔ دیہی تنظیم
کے سلسلے میں ممالک محروسہ میں دیہی تنظیم کا ایک مرکزی بورڈ قائم ہے جس میں باب حکومت کے چار ارکین، مالگذاری اور صنعت و حرفت کے
معتمدین، زائد معتمد مالگذاری، چاروں صوبیداران، ناظمان تعلیمات، صحت عامہ و طبابت، زراعت، صنعت و حرفت، معلومات عامہ کے ناظماء
امداد باہمی کے رجسٹرار، مرکنٹائل آفیسر اور سنٹرل کو آپریٹو یونین کے نمایندے شامل ہیں۔ مرکزی بورڈ ایک عام خاکہ تیار کرتی ہے اور اسکو عملی جامہ
پہنانے کے لئے اضلاع و تعلقوں میں مقامی بورڈ قائم ہیں۔ جن میں سرکاری ارکین بھی شامل ہوتے ہیں۔ غرضکہ دیہی تنظیم کا سب سے اہم مرکز
ہے، زراعت کی ترقی و اصلاح، مویشیوں کی اصلاح، اور معاشرتی اصلاح نظام العمل کے اہم جز ہیں۔ زراعت کی ترقی میں دوسرا قدم
جو اٹھایا گیا وہ مختلف قوانین کا سلسلہ تھا۔ ۱۹۱۱ء کے قانون امداد باہمی جس کی رو سے زرعی اور غیر زرعی انجمن قائم ہوئیں، تعلقہ داری اور مرکزی
بنک، اور صدر جمعیت اتحاد کا قیام عمل میں آیا اسکا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ۱۹۲۳ء سے موازنہ میں امداد قحط و حفظ قحط کی مدات داخل ہوئیں اور
تقریباً ۲۰، ۲۲ لاکھ سالانہ کی رقم قرضوں یا امدادی اور تعمیری کاموں کیلئے مخصوص کی جانے لگی۔ ۱۹۲۱ء میں قانون زرعی بازارات کا نفاذ ہوا۔
اسکا مقصد باضابطہ منڈیوں کا قیام تھا تاکہ کاشتکاروں کو غیر منظم منڈیوں کے نقصانات سے محفوظ رکھا جائے۔ باضابطہ منڈیوں میں دھرم یا خیرات کے
نام سے پیداوار وصول کرنے کی ممانعت کی گئی۔ صحیح اوزان کو رائج کیا گیا، تولنے والوں کے لئے اجازت نامہ ضروری قرار پایا، خریداروں
کو کاروبار کی جملہ کارروائی درج کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اس قانون کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ برطانوی ہند کے قانون کی طرح صرف روئی کیلئے
مخصوص نہیں ہے بلکہ اسکا اطلاق تمام زرعی پیداوار پر ہوتا ہے۔

زراعت کی پستی کا ایک بڑا سبب قرضداری ہے، کاشتکار مفلس ہے اور اسکو اپنے روزمرہ کی ضروریات، مویشی، آلات، تخم خریدنے
یا کلچائی اور کٹائی کی اجرت ادا کرنے کیلئے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ رقم وہ ساہوکار سے لیتا ہے۔ ساہوکار نہ صرف گراں شرح سود اور
سود مرکب وصول کرتا ہے بلکہ دوسری مختلف ترکیبوں سے بھی کاشتکار کو لوٹنے کی فکر کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کاشتکار کو قرضہ
کا بار ابھرنے نہیں دیتا۔ مسٹر ایس ایم بھروچہ جنہوں نے ممالک محروسہ میں زرعی قرضداری کی تحقیقات کی تھی ممالک محروسہ کے زرعی قرضہ
کا اندازہ ۶۴½ کروڑ سے کچھ زائد بتایا ہے۔ آپ نے ۳۲۱ مواضعات کی تحقیقات کے بعد زرعی آبادی کے قرضہ کا اوسط ۲۰ روپیہ فی کس
بتایا ہے۔ مجھے حال میں ایک موضع کی تحقیق کے سلسلہ میں معلوم ہوا کہ اسکے زرعی قرضہ کی تعداد ایک لاکھ ۵۴ ہزار ہے جبکہ اسکی آبادی
۲۶۵۲ ہے۔ ۵۰ روپیہ فی کس کل آبادی پر اور ۸۰ روپیہ فی کس زرعی آبادی پر قرضہ کا اوسط آتا ہے۔ مسٹر بھروچہ نے بتایا ہے کہ دس لاکھ
ایکڑ مزروعہ زمین میں سے ۳ لاکھ ایکڑ مکفول ہو چکی ہے اور ایک لاکھ ۶۰ ہزار ایکڑ کاشتکاروں کی ملکیت سے نکل کر قرض خواہوں کے قبضہ میں
جا چکی ہے۔ تصویر کا یہ ایک بھیانک اور تاریک رخ تھا جس نے ان مختلف خرابیوں کے انسداد کیلئے حکومت کو فوری اقدام پر مجبور کیا اور

معاملت نفر منہ، قرض دہندگان، اور انتقال اراضی کے نئیں دستور العمل نافذ ہوئے، اگرچہ ان میں بعض خامیاں ہیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان سے کاشتکاروں کو بڑا فائدہ پہونچنے کی امید ہے، یہ ڈوبتے ہوؤں کیلئے سہارا، اور جو ڈوبے نہیں ہیں ان کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہیں۔

دیہی تنظیم کا کام جو ریاستوں یا صوبہ داری حکومتوں کے یہاں بہت ہی شاندار نظر آتا ہے فی الحقیقت اس قدر شاندار نہیں ہے ہندوستان جہاں تقریباً ، لاکھ گاؤں ہوں وہاں چند سو دیہی مرکزوں کی وہی مثال ہے جیسے سمندر میں چند قطرے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آخر یہ کام کس طرح ہو؟ کیا مروجہ طریقہ کو جاری رکھا جائے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ڈیڑھ دو سو برس بعد ہم وہاں پہونچیں گے جہاں دنیا آج ہے گویا دنیا سے دو صدی پیچھے رہنا ہماری قسمت میں لکھا ہے۔ کیا حکومت سے یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ ہر گاؤں کو دیہی تنظیم کا مرکز بنا دے، اور دس پانچ سال میں ملک کی حالت بدل دے، اس طرح یہ سانپ کے منہ کی چھچھوندر ہوگی جسکو نہ اگلا جا سکتا ہے اور نہ اگلا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسا پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے جسکا کوئی حل ہی موجود نہ ہو، حل موجود ہے مگر اس میں مشکلات ہیں، اور ان پر غالب آنا ہمارا کام ہے، میرا خیال ہے کہ یہ مسئلہ حکومت، سماج، مصلحین معاشرت، محبان وطن اور سب سے زیادہ اور سب سے اہم تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اشتراک سے طے ہو سکتا ہے۔

یہ سمجھنا کہ اصلاح دیہات کیلئے کثیر رقم کی ضرورت ہے ایک گمراہ کن خیال ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر نئے کام کیلئے روپیہ کی سخت ضرورت ہوتی ہے اسی طرح دیہات سدھار کیلئے بھی کچھ روپیہ کی ضرورت ہے، مگر روپیہ سے زیادہ ایسی چیزوں کی ضرورت ہے جن کو دولت مہیا نہیں کر سکتی، ان چیزوں کو خلوص، ہمدردی، ایثار، قربانی اور انسانیت کہا جاتا ہے ہمارے سامنے ایسے کامیاب ادارے موجود ہیں جن کے پاس ابتدا میں سرمایہ بہت قلیل تھا مگر کام کرنے والوں میں مندرجہ بالا خصوصیات موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جس سرعت، تیزی اور استواری سے کام کیا کسی کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ دیہات سدھار کے سلسلہ میں متعدد کام ایسے ہیں جن میں روپیہ کی قطعی ضرورت نہیں، اور متعدد کام ایسے ہیں جن میں روپیہ کی بچت ہوتی ہے۔

ہم اپنے کسان کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میں اچھائی اور برائی سمجھنے کی تمیز نہیں، یا وہ نفع و نقصان میں امتیاز نہیں کر سکتا، لیکن اس کے باوجود وہ پرانی لکیر کا فقیر نظر آتا ہے اس کی وجہ قسمت پرستی ہے۔ اس میں آگے بڑھنے کا شوق اور راہ چلنے کی امنگ مفقود ہو چکی ہے۔ اس قنوطیت کا اصلی سبب وہ حادثات ہیں جو برسوں سے اس کو اپنا شکار بنا رہے ہیں۔ انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں تک ملک میں امن و امان نہ تھا، حملہ آور آتے اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے اسکے کھیتوں کو روندتے، اسکی فصلیں کاٹ لیتے یا ان کو جلا دیتے تھے، جب ملک میں امن و امان قائم ہوا تو حملہ آوروں کا خوف کم ہو گیا مگر سیلاب، خشک سالی، اولا، پالا، اور ٹڈی دل نے اس کی فصلوں کو نقصان پہونچایا۔ مختلف بیماریاں اسکو اپنا لقمہ بناتی رہیں۔ رفتہ رفتہ اس کو یہ یقین ہو گیا کہ ارضی و سماوی مصیبتیں انسان کی بدکرداریوں کا نتیجہ ہیں۔ اس نے قدرت کو غیر منصف تصور کر لیا۔ مگر یہ سوال اس کے ذہن میں پیدا ہوتا تھا کہ قدرت خصوصیت سے اس پر ظالم کیوں ہے۔ اس بات کا کھوج نہ لگانے کی وجہ سے اس کے ذہن میں یہ احساس قوی تر ہو گیا کہ اپنی بھلائی اور برائی کا کوئی کام وہ خود نہیں کر سکتا، اس کی قسمت کو بگاڑنے یا بنانے والی ایک ایسی ہستی ہے جس پر اس کا قابو نہیں اس لئے اس نے اپنے تمام کام اسی کے حوالہ کر دئے نتیجہ

قسمت پرست یا قناعت پسند اور بالفاظ دیگر سست، کاہل اور نکما ہو گیا۔

آج سے چند سال پہلے اس میں سے اکثر چیزوں کو برداشت کیا جا سکتا تھا، مگر اب سائنس، فن انجینیری، فن زراعت، اور علم طب کی ترقی نے انسان کا قابو قدرت پر بڑھا دیا ہے۔ گویا قسمت پرستی کا دور ختم ہو گیا مگر وہ بدستور قسمت پرست ہے، اس میں یہ احساس پیدا ہو گا کہ ماضی ختم ہو چکا ہے اور خوشگوار مستقبل سامنے ہے۔ وہ ماضی کا دلدادہ ہے اور حال و مستقبل کے فکر سے بے نیاز ہے۔ ماضی خواہ کتنا ہی شاندار کیوں نہ ہو اس کو یاد کرنا بیکار ہے، گزرا ہوا زمانہ واپس نہیں آتا۔ آنے والے زمانہ کی فکر کرنا اور اس کو خوشگوار بنانا سب سے اہم فریضہ ہے۔

دیہی زندگی جمود و سکون کا نام ہے، وہاں بے حسی، غفلت اور ناواقفیت کے دیوتاؤں کا راج ہے، ان کے دل مردہ اور امیدیں پژمردہ ہیں، ضرورت ہے کہ ان کے جمود و سکون کو توڑا جائے، بے حسی اور غفلت کے پردوں کو چاک کیا جائے، مردہ دلوں میں اور پژمردہ امیدوں میں شوق اور امنگ پیدا کی جائے، ان کو بیدار کر کے متحرک اور جاندار بنا دیا جائے، ان کے رگ و ریشہ میں برقی رو دوڑا دی جائے ان کو خود اعتمادی کا سبق پڑھایا جائے، یہ کام ملک کے نوجوان ہی انجام دے سکتے ہیں۔ یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ ان کی یہ صلاحیتیں مٹ چکی ہیں۔ کانگریس نے برسر اقتدار آنے سے پہلے چھوٹے چھوٹے دیہات میں زندگی کی روح پیدا کی تھی، اور خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر دیا تھا۔ وہ اس قوت کو حکومت سے ٹکرانا چاہتی تھی جن میں اس کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی، مگر اس طرح سادہ لوح کسان بھٹک گئے، اور جب کانگریس نے عہدے قبول کر لئے تو وہ اس نئی حکومت سے ٹکرانے لگے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسانوں میں آگے بڑھنے، اور ترقی کرنے کے جراثیم ضرور موجود ہیں، اب اس کا انحصار کام لینے والوں پر ہے کہ وہ ان کا رخ کس طرف پھیرتے ہیں۔

میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان یا ممالک محروسہ سرکار عالی جیسے زرعی خطوں کے دیہات کی اصلاح حکومت کے بس کی بات نہیں ہے، حکومت بزور قانون اصلاح نہیں کر سکتی، اصلاح کا احساس خود پس ماندہ لوگوں میں پیدا ہونا چاہئے۔ جبری اصلاح کا ہمیشہ یہ خاصہ رہا ہے کہ جب جبر اٹھا لیا گیا اصلاح ختم ہو گئی، ضرورت ہے کہ ملک کے سنجیدہ، مخلص اور ٹھوس کام کرنے والے تعلیم یافتہ نوجوان دیہات میں مستقل سکونت اختیار کریں اور اپنا ایک نصب العین بنا کر اس کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔ کام کرنے والوں کو اپنے آپ کو حاکم یا مخدوم نہ سمجھنا چاہئے بلکہ وہ کاشتکاروں کے دوست، مشیر کار اور خادم بننے کی کوشش کریں، مخدوم بننا آسان ہے اور خادم بننا مشکل۔ ان کو اس کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ گاؤں ہماری تہذیب کا قدیم ترین مرکز ہے، کسی قدیم شئے کو مٹا کر اس کی جگہ اسی مسالہ سے نئی عمارت تعمیر کرنا آسان نہیں، ان کو ابتدا میں مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا ان کو قدم قدم پر ناکامیوں کا منہ دیکھنا ہوگا، ان کو دلی اذیت اور روحانی تکلیف بھی ہوگی کہ جو چیزیں جن کی بھلائی کے لئے پیش کی جا رہی ہیں وہی اس کو ٹھکرا رہے ہیں، مگر ان کو ناامید نہ ہونا چاہئے اور رنج و غصہ سے الگ رہ کر خلوص سے کام کرتے رہنا چاہئے۔ خلوص اور قربانیوں کا درخت پھل ضرور لائیگا اور بار آور ہونے میں جتنا زیادہ عرصہ لگے گا اتنے ہی اس کے پھل عمدہ اور شیریں ہوں گے۔

محمد احمد سبزواری

بیڑ کی چھاگل اور پیٹی کی صنعت

ہندوستان کی صنعتی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں قدیم زمانہ میں مختلف گھریلو صنعتیں تھیں صرف ان کا وجود ہی نہ تھا بلکہ یہ نہایت ترقی پر تھیں اور دیگر ممالک میں بھی وہ شہرت حاصل کر چکی تھیں لیکن صنعتی انقلاب کے بعد جب مشین کا بنا ہوا دکھاوا اور سستا مال یہاں کے بازار میں آنے لگا تو یہاں کی صنعتوں کو زوال ہوا۔ اس کے علاوہ چند معاشرتی اور سیاسی اثرات بھی تھے جن کی بدولت یہاں کی بہت سی دستی صنعتیں فنا ہوئیں اور کئی صناعوں نے زراعت کا پیشہ اختیار کیا۔

اس کی مثال ہماری ریاست حیدرآباد کے ضلع بیڑ کی چھاگل کی صنعت ہے۔ یہ صنعت آج سے کچھ کم دو سو سال قبل یہاں عروج پر تھی اس صنعت کے ذریعہ بہت سے لوگ روزی حاصل کرتے تھے، لیکن آج اس کی حالت بالکل ناگفتہ بہ ہے۔ اب خاص بیڑ میں اس صنعت کے واقف کار صرف دو افراد ہیں، ایک کا نام وٹھوبا اور دوسرے کا نام راما ہے۔ ان کا یہ پیشہ اب ضمنی ہے اور یہ لوگ زراعت میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ ان کے پاس ایک یا دو چھاگلیں تیار رہتی ہیں۔ وہ بھی اس خیال سے کہ یہاں کی یہ صنعت مشہور ہے اور ممکن ہے کہ کوئی خواہشمند خرید لے۔

ان صناعوں میں سے ایک کو اولاد ہے دوسرا لاولد ہے۔ ان کے چند رشتہ دار ہیں جو بیڑ کے نزدیک کے دیہات میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی بیڑ کے ہفتہ واری بازار میں معمولی قسم کی چھاگلیں لاتے ہیں۔

بالخصوص طور پر چھاگلیں بنوائی جائیں تو اعلیٰ قسم کی بنائی جاتی ہیں۔ خوبی کے لحاظ سے ان کی قیمتیں ۴ روپیہ سے ۱۵ روپیہ تک ہوتی ہیں۔ چمڑا نہایت ہی ملائم کمایا جاتا ہے۔ پھر اس چمڑے کی چھاگل بنائی جاتی ہے۔ چھاگل پر مختلف قسم کے عجیب و غریب نقش تارے جاتے ہیں۔ اور ان نقشوں میں رنگین کاغذات لگائے جاتے ہیں۔ چمڑا اگانے اور بیل کا لیا جاتا ہے۔ ایک جانور کی کھال مقامی بازار میں ۵ روپیہ سے ۱۰ روپیہ تک ملتی ہے اور اسمیں غالباً دو یا تین چھاگلیں تیار کی جاتی ہیں۔ عموماً ایک چھاگل کا پانی موسم گرما میں دو آدمیوں کو ایک دن کے لئے کافی ہوتا ہے۔ چھاگلوں کی زیادہ قیمت کی ایک وجہ ان کی قلت بھی ہونی چاہئے۔ کیونکہ ان لوگوں کو کبھی کبھی چھاگلیں بنانی پڑتی ہیں ظاہر ہے کہ یہ وہ زیادہ قیمت وصول کر لیتے ہوں۔ ایک چھاگل تیار کرنے کے لئے دو دن درکار ہوتے ہیں ان کے پاس ملازم نہیں ہوتے بلکہ یہ اپنی بیوی بچوں کی مدد سے چھاگلیں تیار کرتے ہیں۔

ان کی عمرانی زندگی سے ہمیں یہاں بحث نہیں لیکن وہ بھی غور طلب ہے۔ ان کی رہائش اچھوت ہونے کی وجہ سے آبادی کے باہر ڈھور واڑہ نامی محلہ میں ہے۔ یہ محلہ ان کی ذات کے نام سے ہی مشہور ہے۔ ان کے مکان کے سامنے سے ایک پکی سڑک گزرتی ہے لیکن وہاں نالیوں یا موریوں کا انتظام نہیں ہے سڑک کے کنارے جو موریاں ہیں ان میں غلاظت ہمیشہ جمع رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہاں سے کوئی شہری ناک بھوں چڑھائے نہیں گزرتا۔ یہ پڑھنا جانتے ہیں نہ لکھنا۔ ان کا لباس اتنا میلا ہوتا ہے کہ اسمیں سے ان کا آدھا جسم دکھائی دیتا ہے۔
جب ہم صنعت کے زوال پر غور کرتے ہیں تو ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی طلب آبادی کے صرف ایک محدود حصہ سے ہے۔

یعنی یہ چمڑے کی بنی ہوئی ہونے سے ہندو لوگ مذہبی نقطۂ نظر سے انہیں کا پانی پینا جائز نہیں سمجھتے۔ اس وجہ سے اس کی طلب کم ہوئی۔ لیکن یہاں پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ پہلے بھی ہندو مسلمان یہ دو فرقے تھے۔ پہلے یہ صنعت انہیں معاشرتی حالات میں عروج پر تھی۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زوال کی محض یہی ایک وجہ نہیں ہے۔ بلکہ بڑی وجہ یہ ہے کہ آج کل جدید قسم کے گاگلٹ ملتے ہیں جو بڑے چھوٹے ہونے میں اس وجہ سے ایک سے دوسری جگہ لے جانے میں آسانی ہوتی ہے اور وہ سستے بھی ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی طلب بڑھی اور چھاگلیں پیچھے رہ گئیں۔ اس کے باوجود بھی صنعت باقی رہتی اگر عہدہ داران مقامی اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاتے بالخصوص پولیس کے ملازمین سے ان لوگوں کو اس بارے میں خوب نقصان پہنچا۔ پہلے ہی ان کی صنعت کمزور اور کچھ مقامی بازاروں میں بکتی تھیں لیکن اس حالت میں ان ملازمین نے ہر سال موسم گرما میں کئی چھاگلیں مفت لینی شروع کیں۔ اس وجہ سے انہیں نقصان ہوا اور انھوں نے اس میں اپنی خیر بہت دیکھی کہ اس پیشہ ہی کو چھوڑ دیا جائے۔

انہیں وجوہات کی بنا پر وہ لوگ زراعت میں منتقل ہوگئے اور ملک کی ایک صنعت مٹ گئی۔ اب اس کو ترقی دی جاسکتی ہے لیکن وہ بہت گراں بار ثابت ہوگی۔ اگر ان لوگوں کو حکومت بغیر سود کے قرضہ دے یا انہیں مزدوروں کی حیثیت سے چھاگلیں بنانے کے لئے نوکر رکھے، اور اس کی نکاسی اپنے ذمہ لے تو یہ صنعت پھر زندہ ہوسکتی ہے۔ اب چونکہ اس صنعت کی زیادہ طلب نہیں ہے اور اس میں کام کرنا نفع بخش نہیں ہے اس لئے اس پیشہ میں زیادہ لوگ نہیں ہیں۔ لیکن اگر اس میں فائدہ کی امید ہو تو اب بھی کم از کم ۳۰، ۴۰ لوگ اس پیشہ میں شریک ہوں گے اس کی نکاسی شہروں کے بجائے بڑے بڑے دیہاتوں میں ہوگی۔ اس صنعت کی تحقیق سے مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اب اس میں تازہ روح پھونکنا مشکل ہے لیکن پھر یہ خیال آیا کہ اس صنعت کے زوال کے اسباب پر نظر ڈالنے سے اور اس کی طرف آپ لوگوں کی توجہ مبذول کرنے سے ممکن ہے ملک کی دوسری صنعتیں جو اسی راہ پر لگی ہیں فنا ہونے سے بچ جائیں کیونکہ اب بھی میں بعض سرکاری ملازمین کو دیکھتا ہوں کہ وہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو اپنی ہی ذاتی ملک سمجھتے ہیں۔ اور کسی چپراسی یا ضعدار کو صناعوں کے مکان پر بھیج کر ایک دو چیزیں بے تکلفی سے منگوا لیتے ہیں۔ یہ بات ایک شخص کے لئے ایک وقت کیلئے معمولی ہے لیکن بعض اوقات یہی معمولی بات مہلک ثابت ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے لوگ بیروزگار ہو جاتے ہیں۔

اب ہم بیڑ کی دوسری صنعت پر غور کریں گے۔ اس صنعت کا نام گپتی کی صنعت ہے۔ اس کو وجود میں آئے ہوئے کوئی پچاس سال ہوتے ہیں۔ آپ میں سے اگر کسی نے بیڑ کی بنی ہوئی گپتی دیکھی ہوگی تو اس پر ضرور آپ نے جان محمدؐ کا نام انگریزی میں یا اردو میں لکھا ہوا پڑھا ہوگا۔ یہ شخص شروع میں تلواریں بناتا تھا لیکن نہ معلوم اسے کیا سمجھائی دیا کہ اس نے تلوار بنانا چھوڑ کر گپتیاں بنانی شروع کیں۔ اب یہ شخص زندہ نہیں ہے اس کا بیٹا شیخ احمد نام موجود ہے جس کی عمر اب (۶۰) سال کی ہے اور جس کا ایک بیٹا اور دو نواسے ہیں جو اس کے ہاں یہی کام کرتے ہیں عموماً ان کے ہاں تین چار نوکر رکھے جاتے ہیں۔ اور ضرورت کے لحاظ سے ان نوکروں میں اضافہ بھی کیا جاتا ہے۔ اس طرح اس صنعت میں کوئی (۸) اشخاص ہمیشہ لگے ہوتے ہیں۔

گپتی بنانے کے لئے بیر اور ساگوان کی لکڑی استعمال کی جاتی ہے۔ اس میں سے بیر کی لکڑی تو بیڑ ہی میں ملتی ہے لیکن ساگوان کی لکڑی احمد نگر اور بمبئی سے منگاتے ہیں یا وہاں بھی کسی دوکان سے خریدتے ہیں۔ گپتی کے لئے فولاد کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی بمبئی

سے منگایا جاتا ہے۔ گپتیاں اس قدر بہترین بنائی جاتی ہیں کہ اس کی جلد شناخت نہیں ہوتی کہ آیا یہ لکڑی ہے یا تلوار۔ چھپتے بھی بنائے جاتے ہیں۔ لکھنے کے قلم میں فولاد کا پتہ بٹھایا جاتا ہے گویا لکھنے کا قلم ہی گپتی ہے۔ اس طرح یہ چاقو بھی بناتے ہیں۔ گپتیوں پر بارہ سنگھے، چاندی، لکڑی اور جرمن سلور کے دستے بنائے جاتے ہیں۔ ان دستوں پر مختلف نقش و نگار اور تصاویر کھینچی جاتی ہیں۔ اور خریدار کا نام بھی خواہش کرنے پر کھودا جاتا ہے۔ گپتی کی اصیل تلواری اور فولادی اس طرح دو قسمیں ہیں۔ اصیل تلواری درجہ اول ۲۵ روپیوں میں اور درجہ دوم ۲۰ روپیوں میں بکتی ہیں۔ فولادی گپتی درجہ اول (۱۵) روپیہ میں اور درجہ دوم (۱۲) روپیہ میں فروخت ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ معمولی گپتیاں ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰ روپیوں میں خوبی کے لحاظ سے بیچی جاتی ہیں۔ ایک شخص ایک گپتی دو دن میں مکمل تیار کرسکتا ہے۔

ان لوگوں کو مختلف نمائشوں میں تمغے ملے ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد میں جو نمائشیں ہوئیں ان میں ان کو تمغے ملے ہیں۔ نواب معین یار جنگ بہادر صوبہ دار اورنگ آباد اور بعض تعلقداروں نے بھی تمغے دیئے ہیں۔ اور اصل میں پہلے ایسے ہی عہدہ داران اور امرا ان کی صنعتوں کو باقی رکھتے تھے۔

ان لوگوں کا پیشہ محض گپتی سازی ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اپنی صنعت کی تشہیر نہیں کرتے۔ جو لوگ بیڑ کے رہنے والے ہیں یا جو ملازمین بیڑ سے تبادلہ ہوکر دوسرے اضلاع میں جاتے ہیں ان کے ذریعہ سے اس صنعت کی تشہیر ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی طرح یہ صنعت کسی قدر مشہور ہوئی اور اب ان کے پاس اورنگ آباد، ناندیڑ، پربھنی، ورنگل، نظام آباد، گلبرگہ سے گپتیوں کے لئے آرڈر آتے ہیں۔

موجودہ کساد بازاری کا اثر ان پر بھی پڑا ہے۔ پانچ سات سال پہلے ان کی خالص آمدنی ۵۰ تا ۱۰۰ روپیہ تھی لیکن اب ۱۵ تا ۲۵ روپیہ ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ پانچ سات سال پہلے ان کے نوکر اسے کام نہیں کرتے تھے ان لڑکوں کو مڈل تک تعلیم دی گئی ہے۔ انہوں نے برٹش انڈیا میں اس صنعت کی تجارت کرنے کی اجازت حاصل کی تھی لیکن بعد انہیں منع کیا گیا۔ آجکل فیشن کے لحاظ سے لوگ لکڑی ہاتھ میں پکڑتے نہیں اس وجہ سے گپتی کی خرید بھی کم ہوتی ہے۔

اگر حکومت ان صناعوں میں سے ایک کو صنعت و حرفت کے مدرسہ میں ملازم رکھے تو کئی لوگ اس فن سے واقف ہوجائیں گے شیخ احمد اب ۱۰۰ روپیہ ماہانہ کی تنخواہ پر آنے کے لئے راضی ہے۔ یہ مطالبہ میرے خیال میں ضرورت سے زیادہ ہے۔ میں نے اس سے اپنا شبہ ظاہر کیا تو اس نے جواب دیا کہ لوگ ملتے بھی نہیں ہیں۔ اگر حکومت رکھے تو ہمیں کو رکھے ان کے پاس سرمایہ نہ ہونے سے یہ ترقی نہیں کرسکتے اگر انہیں سرمایہ بہم پہنچایا جائے تو یہ مشین کا بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک مسئلہ یہ پیش آتی ہے کہ مذہبی خیالات کے لحاظ سے یہ لوگ بغیر سود کے قرضہ چاہتے ہیں۔ اس مسئلہ کو دور کرنے کے لئے حکومت یہ کرسکتی ہے کہ محکمۂ پولیس میں کرچ اور بایونٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر محکمۂ پولیس کرچ اور بایونٹ انہیں کے پاس سے خریدے اور انہیں کچھ دام دے یا پہلے کچھ قیمت ادا کرے تو ان کو سرمایہ ملیگا اور مشین استعمال کرسکیں گے۔ اب وہ اپنے ہاتھ سے روغن تیار کرتے ہیں۔ اگر گپتیاں کثیر مقدار میں بنائی جائیں اور ان کی کھپت بھی ہو تو یہاں روغن کی صنعت بھی ترقی کرسکتی ہے۔ اس صنعت کی عمر ابھی چھوٹی ہے۔ اس لحاظ سے ابھی اس میں ترقی کی گنجایش ہے۔ اس کے لئے انہیں اصل مہیا کرنا چاہئے اور صنعت کی تشہیر اور نکاسی کا بندوبست کرنا

چاہئے۔ آج کل تشہیر نہ ہونے پر بھی ان کو ۱۵۰۰ ۔ ۲۰۰۰ روپیہ ماہانہ ملتے ہیں اگر ان کا اشتہار کیا جائے تو اس کساد بازاری کے زمانہ میں بھی زیادہ آمدنی ہوگی اور ساتھ ہی ملک کی ایک صنعت ترقی کرےگی جس میں ابھی بہت سے مزدوروں کی کھپت ہو سکتی ہے۔

ایک شوقیہ

حسین ساگر

ایک غمگین صبح

اپنے عالی حوصلہ شاہوں کے گن گاتی ہوئی
اٹھ رہی ہے سطح سے ہر موج لہراتی ہوئی

ہر ادا میں شان ہے "شاہوں کے استقبال" کی
ساحل ماضی سے ٹکراتی ہیں موجیں حال کی

بس گئی دنیا، اجڑتی تھی ابھی اجڑی نہ تھی
بات یوں اس کی بنی جیسے کبھی بگڑی نہ تھی

اس کے سینے میں تمنا کی تپش باقی رہی
مادی رونق میں روحانی کشش باقی رہی

اس کی موجوں کو نظر سے چومتا تھا آسماں
اب بھی خاموشی سناتی ہے وہ خونیں داستاں

قافلہ گذرا تھا جب اس پر سے تاناشاہ کا
اس نے گذرانا تھا تحفہ نالۂ جانکاہ کا

بے کسی میں اپنے شہ کی دے دیا جو بھی تھا پاس
اس کے پانی نے بجھائی تھی خدا بندے[1] کی پیاس

داغ دل بن کر قطب شاہوں کے ہیں نقش قدم
سوکھنے پاتا نہیں اس کا کبھی دامانِ نم

سیر کرنے والے ان رنگینیوں میں کھو نہ جا
حال کے جلووں میں یوں ماضی سے غافل ہو نہ جا

قہقہوں کی گونج میں پوشیدہ آہوں کو نہ بھول
ذرہ ذرہ کہہ رہا ہے قطب شاہوں کو نہ بھول

رو رہا ہے آسماں یہ شبنم افشانی نہیں
اشک کا سیلِ رواں ہے دیکھ یہ پانی نہیں

میکش

[1] تاناشاہ کا اکلوتا فرزند

دکن میں اُردو مثنوی کا ارتقا

اردو مثنوی، اور اصناف کی طرح اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے اس کی مقبولیت، اس کی خصوصیات اور اس کے لوازم مختلف زمانوں میں کچھ نہ کچھ بدلتی رہیں۔ اس کا پورا سرمایہ کم و بیش سو سال کی پیداوار پر حاوی ہے۔

مثنوی کو دوسرے اصناف کے مقابلہ میں ہمیشہ دیکھنے کی بعض وقت ضرورت اور خواہش اس وجہ سے داعی ہوتی ہے کہ یہ صنف چند معین خیالات کے اظہار کا آلہ رہی ہے چنانچہ اس کی اصطلاحی آسانیوں کی وجہ سے ابتدا میں صوفیائے کرام نے اس کو ذریعہ بنایا تھا۔ بعد میں جب یہ زیادہ ادبی بن گئی تو قصے کے ساتھ اس کا پیوند لگا۔ اس کے بعد ایک زمانہ اس پر ایسا بھی آیا کہ یہ کسی قدر کم طویل قصوں یا مرقع کی نظموں کی صورت میں فروغ پاتی رہی۔ موجودہ زمانہ میں یہ صنف نظم کی نئی شکل و صورت اور مثنوی ہر اعتبار سے بہت کچھ بدل گئی ہے۔

اس طرح اردو مثنوی کی پوری ارتقائی رفتار کو ہم چند منازل میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ مثلاً (۱) ابتدائی عہد کے مثنوی پارے جو زیادہ تر صوفیائے کرام کے رشحات پر مشتمل ہیں۔ یہ موجودہ رسم الخط میں لکھی ہوئی ایسی بھاشا کے نمونے ہیں جن میں عربی اور فارسی کے الفاظ بھی موجود ہیں ان کی بحریں عموماً ہندی کی ہیں اور یہ منتشر پارے ساتویں صدی ہجری کے نصف آخر سے لے کر دسویں صدی ہجری کے زمانہ پر حاوی ہیں۔ (۲) دوسرا دور ابتدائی مکمل اور طویل مثنویوں کا ہے اس میں پنجاب، گجرات اور بیجاپور کے ابتدائی دور کے چند کارنامے شامل ہیں۔ اور یہ تقریباً سب کے سب ارشاد و ہدایت اور تصوف و عرفان کے حامل ہیں ان میں قابل ذکر گجرات کے حضرت خوب محمد چشتی کی مثنوی "خوب ترنگ" اور بیجاپور کے ایک نہایت مقدس بزرگ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق اور ان کے خاندان کے ملفوظات ہیں جو نظم اور نثر دونوں پر مشتمل ہیں۔ اسی دور میں اردو مثنوی کا حقیقی ڈول ڈالا گیا۔ اور اس کے آخری زمانے کا تعلق دکن اور خاص طور پر بیجاپور سے ہے۔

دکن میں مثنوی کا ارتقا ڈھائی سو سال سے زیادہ مدت پر حاوی ہے۔ حضرت شاہ میراں جی کی وفات ۹۰۲ھ میں ہوئی آپ کے زمانہ سے لے کر ۱۱۶۰ھ میں حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی کی مثنوی "بوستان خیال" کی تحریر تک، مثنوی کو مسلسل اور بلحاظ خاطر خواہ ترقی ہوتی رہی۔

اس ڈھائی سو سال کے طویل عرصہ کی پیداوار کو ہم کم سے کم تین عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا عنوان عہد زرین کی مثنویاں۔ دوسرا عنوان عہد مغلیہ کی مثنویاں اور تیسرا عنوان آصفجاہی عہد کی دکنی مثنویاں ہو سکتی ہے۔ اس طرح پہلا عنوان اردو مثنوی کے ارتقا کا گویا تیسرا باب ہوگا۔ اور دوسرا اور تیسرا عنوان بہ ترتیب چوتھا اور پانچواں باب

حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کی ولادت مکہ معظمہ میں ہوئی تھی۔ آپ اوائل عمر میں ہندوستان تشریف لائے اور بیجاپور کو اپنا مستقر بنایا۔ آپ کے علم و فضل، تقدس اور بیعت کے اثرات نے ارادت مندوں کا ایک بڑا گروہ آپ کے اطراف جمع کر دیا تھا۔ چونکہ ان میں سے اکثر عربی زبان سے ناواقف اور فارسی سے بھی کچھ زیادہ مانوس نہیں تھے اس لئے آپ نے خود ان کی زبان سیکھی اور اسی میں ارشاد و ہدایت فرمائی۔ یہ ملفوظات آپ کے مریدین اور معتقدین نے عوام کے فائدے کی خاطر لکھ لئے۔ اس وقت اسی طرح

کے کئی مخطوطے دستیاب ہوتے ہیں، جو اسی قریبی زمانے کے لکھے ہوئے ہیں، اور نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہیں۔

نظموں میں آپ کی مثنویاں "خوش نامہ" اور "خوش نغز" کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں شامل ہیں۔ ان کے اقتباسات، موجودہ زمانے کی اکثر ایسی کتابوں میں شایع ہو چکے ہیں، جو اس دور سے متعلق ہیں۔

حضرت شاہ میراں جی کے فرزند، حضرت شاہ برہان الدین جانم بھی بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ آپ کے ملفوظات میں "سکھ سہیلا" "منفعت الایمان" اور "ارشاد نامہ" وغیرہ اب منظر عام پر آچکے ہیں۔ اسی طرح حضرت شاہ برہان الدین جانم کے فرزند حضرت شاہ امین الدین اعلےٰ کے ملفوظات میں بھی کئی نظمیں اور کسی قدر طویل مثنویاں شامل ہیں۔ ان میں "رموز السالکین" "نظم وجودیہ" "نظم قربیہ" "محب نامہ" قابل ذکر ہیں۔ اس خاندان کے ارشادات تمام تر مذہبی اور صوفیانہ خیالات پر مشتمل ہیں۔

اسی طرح کے اور بھی نظم و نثر کے رسالے موجود ہیں، جو صوفیائے کرام کے ملفوظات پر مشتمل ہیں۔ یہ رسالے زیادہ تر بیجاپور کے ابتدائی چار حکمرانوں کے عہد سے متعلق ہیں۔

دکن کی ادبی تاریخ بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ) اور گولکنڈے کے محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کے عہد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان دونوں سلاطین کی سرپرستی میں، ادبی ذوق کی ترقی شروع ہوئی اور بلند پایہ شعرا نشو و نما پانے لگے۔ ان میں محمد قلی کے درباری شاعر، وجہی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جس کی مثنوی "قطب مشتری" (۱۰۱۸ھ) عمدہ شاعری کا نمونہ ہے۔ وجہی کے بعد اس فن کو سب سے زیادہ ترقی، عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے عہد کے مشہور ملک الشعرا شاعر غواصی نے دی۔ غواصی کی دو مثنویاں "سیف الملوک و بدیع الجمال" (۱۰۳۵ھ) اور "طوطی نامہ" (۱۰۴۹ھ) قدیم اردو کے ترقی یافتہ اور بسیط شعری کارنامے ہیں۔ اس نے اردو مثنوی کو جس معیار تک پہنچا دیا تھا، وہ بعد کے شعرا کے لئے نمونہ بن گیا۔

مقیمی جو اسی عہد کا شاعر ہے اور بیجاپور کے ابتدائی ادبی مثنوی نگاروں میں سے ہے، اپنے آپ کو غواصی کا خوشہ چین بتلاتا ہے۔ اس کی مثنوی "چندر بدن و مہیار" جو ۱۰۴۰ھ سے قبل لکھی گئی ہے، ادبی اعتبار سے زیادہ اہمیت تو نہیں رکھتی، لیکن اس کا قصہ عرب کے لیلےٰ مجنوں کے قصے کی طرح بے حد مشہور رہے۔

مقیمی کے زمانے سے مثنوی لکھنے کا طریقہ بیجاپور میں عام ہوگیا۔ اب مذہبی مثنویوں کے بجائے ادبی مثنویاں لکھی جانے لگیں۔ چنانچہ امین جو مقیمی ہی کا معاصر اور ہم وطن تھا، اس کے اثر سے فارسی کے ایک قصے کا ترجمہ "بہرام و حسن بانو" کے نام سے کیا لیکن اس کی تکمیل وہ نہ کر سکا۔ اور بعد کے ایک بیجاپوری شاعر دولت نے ۱۰۵۰ھ میں اس کی تکمیل کی۔

مقیمی تک زیادہ تر اردو مثنویوں کا مواد یا تو طبعزاد ہوتا تھا یا برج بھاشا سے ماخوذ صرف محمد قلی کے زمانے کے ایک شاعر، احمد نے فارسی سے استفادہ کر کے "لیلیٰ مجنوں" لکھی تھی۔ لیکن "بہرام و حسن بانو" کے بعد سے جو مثنویاں اردو میں لکھی جانے لگیں ان میں زیادہ تر فارسی مثنویوں سے استفادہ کیا گیا۔ چنانچہ اس زمانے میں محمد عادل شاہ کے دربار کے ایک شاعر صنعتی نے ۱۰۵۵ھ میں حضرت تمیم انصاری صحابی رسول کی حیات کے ایک قصے "قصۂ بے نظیر" کا ترجمہ کیا۔ اور اس کے دوسرے سال اسی کے ہم وطن شاعر، ملک خوشنود نے "ہشت بہشت" کو

اُردو نظم کا جامہ پہنایا۔ ۱۰۵۹ھ میں بیجاپور ہی کے ایک اور شاعر کمال خاں رستمی نے ابن حسام کے مشہور فارسی رزمیہ "خاور نامہ" کو نظم کیا۔ یہ اُردو کی پہلی قابلِ ذکر رزمیہ مثنوی ہے۔ نہ صرف اس لحاظ سے، بلکہ بیان اور زورِ قلم کے اعتبار سے بھی یہ کارنامہ قابلِ قدر ہے۔

"خاور نامہ" کے بعد، جو مثنوی لکھی گئی وہ گولکنڈے کے شاعر، جنیدی کی "ماہ پیکر" (۱۰۶۵ھ) ہے لیکن اس کا مخطوطہ نایاب ہے۔ اس کا ذکر مختلف حوالوں کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس کے دو سال بعد گولکنڈے کا ایک اور شہ کار لکھا گیا یہ ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" ہے جو اس میں شک نہیں کہ ایک فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے لیکن آزاد ہے چنانچہ اس میں جگہ جگہ ماحول اور عہد کے اثرات نمایاں ہیں۔ غواصی کے بعد یہ دوسرا بڑا اور اسی کی طرح کا شاعر تھا جس نے مثنوی کے معیار کو، اسلوب اور تخیل کی حد تک بلند کیا۔ بعد کے شاعروں نے، غواصی کی طرح اس کے کارنامے کو نمونہ بنایا چنانچہ ہنر فرزند مشرقی، کی مثنوی "تحفہ درپن" (۱۳۴۴ء) میں اس کے ثبوت ملتے ہیں۔

بیجاپور میں علی عادل شاہ ثانی کے عہد تک اُردو شاعری کا ذوق خاطر خواہ ترقی کر چکا تھا۔ چنانچہ خود اس کے دربار نے ملک الشعرا نصرتی جیسے زبردست سخن پردازوں کی پرورش کی۔ نصرتی بیجاپور کے لازوال شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی دو مثنویوں میں ایک "گلشن عشق" جو ۱۰۶۸ھ میں لکھی گئی ہندوستان کے مشہور قصے "منوہر مدمالتی" کی عشقیہ داستان ہے۔ اس کی دوسری مثنوی "علی نامہ" رزمیہ اور تاریخی مثنوی ہے اس میں علی عادل شاہ اور دشمنوں کی جنگوں کے حالات نہایت تفصیل سے پیش کئے گئے ہیں۔ لفظیات کے اعتبار سے "علی نامہ" کی وسعت کو اُردو کے بہت کم کارنامے پہنچ سکتے ہیں نصرتی کے اسلوب میں ادبیت اور لطف بھی موجود ہے۔ وہ جنگوں کے نقشے نہایت عمدگی سے اور حقیقی پیش کر سکتا تھا۔ "علی نامہ" کی تکمیل ۱۰۷۶ھ میں ہوئی۔

اس عہد کی آخری مثنویوں کے ذکر سے پہلے گولکنڈے کی ایک مثنوی "بہرام و گل اندام" کا تذکرہ ضروری ہے جو ۱۰۸۱ھ میں لکھی گئی۔ یہ بہت زیادہ اہم کارنامہ نہیں ہے تاہم غواصی اور ابن نشاطی کے دبستان کی تمام خوبیوں اور خصوصیات کا حامل ہے۔

دوسری مثنوی "ظفر نامہ نظام شاہ" ایک رزمیہ ہے جو تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں رام راج سے دکن کی دوسری سلطنتوں کی جو جنگ ہوئی تھی، اس کا شاعرانہ حال درج ہے۔ اس کا مصنف حسن شوقی، بلند پایہ شاعر تھا جس کو پہلے، نظام شاہی دربار (احمد نگر) سے توسل رہا۔ پھر وہ بیجاپور آیا۔ آخر میں خود قطب شاہ کے زمانے میں گولکنڈہ آگیا تھا۔ اس کی ایک اور مثنوی "میزبانی نامہ" بھی ہے۔

نصرتی کے بعد، سوائے ہاشمی کے بیجاپور میں ایسے بلند پایہ شاعر کم پیدا ہوئے جن کے کارنامے دیر پا ہستی کے حامل ہوں۔ صرف شاہ ملک کا ذکر اس کی ضخیم مذہبی مثنوی "شریعت نامہ" کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۰۸ھ میں لکھی گئی تھی۔ ہاشمی وسیع پیمانے کا انسان تھا، عادل شاہی سلطنت کے زوال کی وجہ سے زمانہ بھی بدل چکا تھا اس لئے اس نے اپنی شاعری میں، عام راستے سے تجاوز کیا اور اس دور میں دکن کی آخری مثنویاں زیادہ تر گولکنڈے میں لکھی گئیں۔ چنانچہ امین، غلام علی، فائز اور لطیف، جن کی تصنیفات ۱۰۹۰ھ سے لے کر ۱۱۰۰ھ کے زمانے پر حاوی ہیں، اسی گولکنڈے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

امین، حضرت عمر کے فرزند ابو شحمہ کے متعلق ایک فرضی قصے کا مصنف ہے، جو ۱۱۰۹ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس نے ایک سال بعد

غلام علی نے "پدماوت" کے حصے کو منظوم کیا۔ اس کا ماخذ فارسی سے زیادہ ہندی قصہ تھا۔ فائز "رضوان شاہ روح افزا" (۱۰۹۲ھ) کا مصنف ہے۔ ...... لطیف نے ایک رزمیہ مثنوی لکھی ہے جو "ظفرنامہ" کے نام سے موسوم ہے اس میں "خاورنامہ" کا زور بیان اور "علی نامہ" کا لطف موجود نہیں ہے۔

۱۱۰۰ھ کے قریب دو ڈھائی سال کے اندر اندر بیجاپور اور گولکنڈے کے ادبی اور علمی مرکزوں کا خاتمہ ہوگیا۔ وہ علما اور خاص طور پر اردو زبان کے شاعر جو عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین کی سرپرستی میں اپنے ذوق کی تکمیل میں منہمک تھے منتشر ہونے لگے کیونکہ ان سلاطین کے جانشین یعنے مغلیہ امرا کو اردو شاعری کا چسکا ابھی نہیں لگا تھا۔ شہنشاہی احساس کے ساتھ فطرتاً وہ شہنشاہی دربار کی ادبی روایات اپنے ساتھ لائے تھے۔ تاہم اردو شاعروں کے قدم اکھڑے تو اس سرزمین میں فارسی شعرا کے قدم بھی نہ جم سکے۔ اور شعرا ہی نے دکن کے اگلے ادبی ذوق کو جاری رکھا۔ لیکن یہ خود منتشر ہوگئے، ان کی شعری پیداوار کی یکسانیت منتشر ہوگئی۔

چنانچہ دکن میں مغلوں کے تسلط کے بعد، جو کارنامے ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ بڑی حد تک ان کے پیدا کرنے والوں کی ذہنی حالت کا عکس پیش کرتے ہیں۔ اس زمانے کی شعری پیداوار کو ہم اس طرح تقسیم کرسکتے ہیں۔ (۱) مرثیے (۲) مذہبی نظمیں (۳) متصوفانہ نظمیں، (۴) نیم مذہبی نظمیں۔

دکن کے شعرا نے مرثیہ کے لئے متنوع شعری صنفوں کا استعمال کیا ہے۔ لیکن اس طرز کا زیادہ کلام قافیہ کی ترتیب میں قصیدے کی شکل رکھتا ہے، اس لئے یہ ہمارے دائرہ سے باہر ہے۔ دوسری قسم کی نظموں میں، ولی ویلوری کی "روضۃ الشہدا" ( ) ضعیفی کی "ہدایت ہندی" ذوقی کی "وصال العاشقین" جیسی طویل مذہبی نظمیں شامل ہیں۔ اس دور میں تیسری قسم کی نظمیں بہت زیادہ مقبول ہوئیں۔ ان میں سب سے پہلے قاضی محمد محمود بحری کی "من لگن" کا ذکر ضروری ہے۔ بحری اصل میں بیجاپور کے رہنے والے تھے۔ بیجاپور کی تباہی کے بعد بہ حال تباہ گولکنڈہ پہنچے۔ دو سال بعد، گولکنڈے کی سلطنت کا سایہ بھی سر سے جاتا رہا۔ "من لگن" تصوف کی قدیم نظموں میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ اور وجدی کی "پنچھی باچھا" جو منطق الطیر کا ترجمہ ہے، بہت پڑھی جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ عشرتی کی متصوفانہ نظمیں "چیت لگن" اور "دیپک پتنگ" بھی کافی مقبول تھیں۔

نیم مذہبی نظموں میں محمد علی عاجز کے قصے قابل ذکر ہیں۔ ان میں فقہ عقائد وغیرہ کے مسائل کو قصے کے پیرایہ میں بیان کیا جاتا تھا۔ ان قصوں کو بھی اپنے زمانہ میں کافی مقبولیت حاصل رہی۔

دکن میں مثنوی کی ترقی کا آخری زمانہ آصفجاہی سلطنت کے قیام کا ابتدائی دور ہے۔ یہ ایک عبوری زمانہ ہے، جس میں قدیم خیالات اور قدیم روایات کی کچھ تو شکست و ریخت ہوئی، اور کچھ نئی تعمیر شروع ہوئی۔ زبان اور اظہار خیال کے سانچوں کے لحاظ سے، اس دور سے بڑا انقلاب رونما ہونے لگا۔

اس دور کا سب سے بڑا شاعر، ولی ہے۔ جس نے اپنی شاعری میں نئے ماحول اور بدلے ہوئے مذاق کو سب سے زیادہ جگہ دی اس کے بعد، شعرا کو ان کے نقش قدم پر چلنا آسان ہوگیا۔ مثنوی کی حد تک ولی کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ انھوں نے صرف دو تین

چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں۔ ان میں سے دو بزرگوں کی تعریف میں ہیں۔ مگر ایک مثنوی جو تین بتیس شعر کی ہے، نہایت اہم ہے۔ اس مثنوی کا عنوان "مثنوی در تعریف صورت" ہے۔ یہ اگلی تمام مثنویوں کے مقابلہ میں جداگانہ نوعیت رکھتی ہے۔ اس وقت تک اردو میں مثنوی مرقع نگاری کے لئے استعمال نہیں ہوئی تھی۔ ابتدائی چھوٹی چھوٹی مثنویاں متصوفانہ تھیں۔ بعد میں وجہی کے زمانہ سے اس میں قصے لکھے گئے۔ کچھ رزمیہ مثنویاں بھی لکھی گئیں۔ عربی شعرا اس نوع کے خیالات کے لئے، قصیدہ کا استعمال کرتے تھے۔ فارسی شعرا نے بھی انہیں کی پیروی کی۔

ولی کے اثر سے، جب دہلی میں اردو شاعری کو فروغ ہوا تو ابتدائی زمانہ کے شعرا، جیسے شاہ حاتم اور آبرو نے ولی کی اسی مثنوی کی پیروی کی۔ میر تقی میر کے سامنے یہ نمونے تھے۔ اس لئے ان کی وہ مثنویاں، جو فارسی کی تقلید میں نہیں لکھی گئی ہیں، اسی طرز کی ہیں۔ فارسی کی قصہ دار مثنویوں کے نمونے پر میر نے جو مثنویاں لکھیں وہ، ابتدائی نوعیت کی ہیں۔

ولی کے بعد دکن میں دونوں طرح کی مثنویاں رائج ہوگئیں۔ خود ان کے جانشین، حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی نے ایک طویل مثنوی "بوستان خیال" کے ساتھ ساتھ کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی لکھیں، جو متصوفانہ خیالات سے مملو ہیں۔ سراج کی طویل اور قصہ دار مثنوی، "بوستان خیال" اس دبستان کی دکنی مثنویوں کا سب سے بہتر کارنامہ ہے، اور اردو کی تمام مثنویوں میں اس کا درجہ "سحر البیان" کے بعد ہے۔ انداز بیان، صداقت جذبات، تکمیل اور شعری خوبیوں کی بدولت "بوستان خیال" ہر زمانہ میں قدر کی نظر سے دیکھی جائیگی۔

"بوستان خیال" کے بعد، دکن میں مثنوی نگاری کے ذوق پر تنزل طاری ہونے لگا تاہم اس آخری دور میں بھی دو تین مثنویاں ایسی لکھی گئیں، جن کی ادبی اہمیت کبھی کم نہیں ہوسکتی۔ ان میں سب سے پہلے قابل ذکر، لالہ لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی کی "تصویر جاناں" ہے۔ جو قصے کی ندرت، اصلیت اور ادبی معیار کی بلندی کے باعث اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ دوسری "لعل و گوہر" ہے۔ جس کے مصنف عارف الدین خاں عاجز اورنگ آباد کے شعرا میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ مثنوی قدیم طرز کے فوق فطری قصوں سے کچھ زیادہ امتیاز نہیں رکھتی۔ لیکن عاجز کا انداز بیان صاف ستھرا اور موجودہ روزمرہ سے بہت قریب ہے چونکہ اس زمانے میں اورنگ آباد کو سیاسی مرکزیت حاصل تھی، اس لئے، یہاں اچھے اچھے شاعر جمع ہوگئے تھے۔ اور دکن کے دارالخلافہ کے حیدرآباد میں منتقل ہونے تک، اورنگ آباد ہی کو ادبی مرکزیت حاصل رہی۔ چنانچہ کئی سخن پرداز اکناف ہند سے آکر یہیں فروکش ہوگئے تھے۔ ان میں شاہ غلام قادر سامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ برہان پور سے آکر یہاں فروکش ہوئے تھے۔ یہ اچھے شاعر تھے اور ان کے اطراف شاگردوں کا ایک خاصہ مجمع تھا۔ یہ شفیق کے ہم عصر اور دوست تھے۔ شفیق نے اپنے تذکرے "چمنستان شعرا" میں ان کی ایک مثنوی "شمشاد و صنوبر" کے اقتباسات دئے ہیں۔ یہ مثنوی خاصی ضخیم بتلائی جاتی ہے۔ لیکن اب تک اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مثنوی اچھی ہوگی۔

اس مضمون کے ختم کرنے سے پہلے ایک اور سخن سنج کا ذکر ضروری ہے، جو اپنے زمانے کے استاد شمار کئے جاتے تھے۔ یہ میر محمد ایمان، شاگرد حضرت شاہ تجلی ہیں۔ ایمان کا نشو و نما نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کے آخر عہد میں ہوا۔ یہ پرگو شاعر تھے۔ انہوں نے

کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی لکھی ہیں، جو پڑھنے اور لطف اندوز ہونے کے قابل ہیں۔

یہ آخری سخن سنج دراصل قدیم دبستان کے آخری شاعر تھے۔ اس کے بعد نئے عہد کے نئے تخیلات اور نئے روزمرہ کے اثرات نے قدیم دبستان کو متاثر کرنا شروع کیا۔ اور قدیم تخیلات پر بڑی شکست و ریخت طاری ہوئی اس دوران میں، دکن کی اُردو شاعری پر پژمردگی سی چھائی رہی۔ یہاں تک موجودہ عہد سے پہلے، جب یہ شکست و ریخت مکمل ہوگی، نئے جدید اُردو شاعروں میں ایک نئی روح پھونک دی گئی۔

عبدالقادر سروری

گوداوری گھاٹ کی ایک حسین صبح

شب تاریک چلی زلفوں کو سلجھاتی ہوئی
صبح کے خوف سے ڈرتی ہوئی گھبراتی ہوئی

چور کی طرح دبے پاؤں چلی باد صبا
ہر قبائے گل نوخیز کو مسکاتی ہوئی

آئی گردوں سے زمیں دھندلکے میں عروس شبنم
موتیوں کو ذرہ و دیوار پہ بکھراتی ہوئی

جل بجھی شمع ہوئی رات کی محفل خاموش
بزم تاروں کی چلی آنکھوں کو جھپکاتی ہوئی

اڑ چلی نکہت گل چھوڑ کے دامن گل کا
باد سرشار چلی جھومتی اتراتی ہوئی

جلوہ گر صبح کی دیوی ہوئی رفتہ رفتہ
شب کا یہ آنچل رخ پرنور سے سرکاتی ہوئی

دور تاریکی ہوئی گھاٹ کی تقدیر کھلی
ٹکڑیاں آئیں حسینوں کی ستم ڈھاتی ہوئی

نقرئی شانوں پہ بکھرائے ہوئے بال کوئی
قلزم حسن کی ہر لہر میں لہراتی ہوئی

ذرے ذرے کو تبسم سے بناتی رنگیں
بجلیاں چشم فسوں ساز سے برساتی ہوئی

کوئی انگڑائیاں لیتی ہوئی بدمستی میں
ساغر عشق سے مے حسن کی چھلکاتی ہوئی

اپنی گستاخ اداؤں سے الجھتی ہر دم
خود بہکتی ہوئی دنیا کو بھی بہکاتی ہوئی

کرنے اشنان کوئی کھول کے جوڑا آئی
کوئی ساحل پہ کھڑی رہ گئی شرماتی ہوئی

بھیگے کپڑوں میں جو عریاں ہوئے جسم حسین
بجلیاں بھرنے لگیں ابر میں گھبراتی ہوئی

کوئی کھولے ہوئے بالوں کو چلی ندی میں
نکلی پانی سے کوئی زلفوں کو سلجھاتی ہوئی

چلی ہر ایک نہا دھو کے خراماں آخر
موتی ان بھیگے ہوئے بالوں سے برساتی ہوئی

ہو گیا جلد ہی روپوش یہ رنگیں منظر
آنکھوں آنکھوں میں نظر رہ گئی للچاتی ہوئی

علی احمد

اورنگ آباد کا سنہری محل

سنہری محل دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا جو بحمد اللہ پورا ہوا۔ یہ عمارت اورنگ آباد کی قدیم عمارت سے ہے جو مقبرۂ رابعہ دورانی سے تقریباً ۲ فرلانگ کے فاصلے پر جانب غرب پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ اس عمارت کا محل وقوع نہایت ہی بلند اور مرتفع ہے اس کے اطراف کھلے میدان اور مشرق و شمال کی جانب پر فضا پہاڑی ہے مقبرہ اس عمارت کے بالکل مقابل میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہ عمارت آباد تھی اس کی دیواروں پر سونے کا ملمع کیا ہوا تھا یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ فی زمانناً گو عمارت صحیح و سالم ہے لیکن دیواروں کے ملمع کا کہیں پتہ نہیں ہاں نقش و نگار کے کہیں کہیں نشان پائے جاتے ہیں۔ یہ محل دو منزلہ ہے نیچے کے حصہ کی تفصیل یہ ہے۔ بیچ میں ایک ہال اس کے دونوں جانب دو دو کمرے ان کمروں کے بازو ایک ایک وسیع ہال۔ اوپر کی منزل نہایت شاندار ہے۔ بیچ میں ایک بہت بڑا ہال اس کے آگے پیش جس میں نہایت کشادہ اور خوشنما کنگرہ دار کمانیں نکلی ہوئی ہیں پیش کے مقابل میں وسیع صحن بڑے ہال کے ہر دو جانب دو دو کمرے اور ہر ایک کمرے کے بازو کھلا ہوا صحن اور صحن کے کنارے پر حد کی دیوار سے لگا ہوا ایک ایک پختہ مسقف بیت الخلا۔ بالاخانہ کے عقبی حصہ میں بھی کشادہ صحن واقع ہے بالاخانے کے اوپر چاندنی ہے جس کے اطراف دیوار کھنچی ہوئی ہے۔ چاندنی پر چڑھنے کے بعد تمام شہر ہتھیلی میں نظر آتا ہے اور نظر ریلوے اسٹیشن سے پرے جنوبی پہاڑی سلسلے تک بلا روک ٹوک کام کرتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارت کوسوں تک گرد و پیش کے وسیع رقبہ پر حکومت کر رہی ہے اس عمارت کے اطراف پختہ دیوار بنی ہوئی ہے جس میں کمانیں نکلی ہوئی ہیں اور دیوار کے اندر عمارت کے عقب و پیش نہایت وسیع مسطح و ہموار صحن ہے علامات و آثار سے پایا جاتا ہے کہ اس صحن میں چمن بندی کی گئی ہوگی کیونکہ اس وسیع چبوترے پر جس پر عمارت قائم کی گئی ہے۔ ایک حوض بنا ہوا ہے جس میں سے پانی ایک چھوٹی سی نہر میں جاتا تھا اور پھر نہر میں سے پشت ماہی آبشار پر سے ڈھلکتا ہوا صحن کی روشوں میں پہونچتا تھا۔ حوض اور نہریں اب خاک اٹی ہی ہے اور چبوترے پر لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی ہے عمارت کے نیچے کا حصہ آج کل نہایت خراب حالت میں ہے اس کی اکثر کمانیں پتھروں سے چن دی گئی ہیں جس کی وجہ اندرونی حصہ کسی قدر تاریک ہے فرش پر کوڑے کرکٹ کی کوئی حد نہیں اس کے علاوہ جابجا مویشیوں کے گوبر کے ڈھیر پڑے ہوئے ہیں غالباً عدم نگرانی کی وجہ سے مویشی اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ بالاخانہ اب بھی ایسا ہے کہ وہاں کوئی بیٹھ جائے تو چھوڑ جانے کو جی نہیں چاہتا لیکن افسوس متعدی مالیخولیا کی علامات سے سفید دیواریں سیاہ ہوگئی ہیں۔ آہ! بالاخانہ کچھ نہ پوچھئے کیا چیز ہے شاید ہی ایسا ہوادار مقام کہیں ہو اطراف کا کشادہ منظر کوسوں تک نظر کے روبرو بازو میں پہاڑی کا سلسلہ گوناگوں دلفریبیوں سے مع اپنے حسن کی آب و تاب کیساتھ بے نقاب نظر آتی ہے انواع و اقسام کے مناظر کے اجتماع سے ایک عجیب و غریب منظر پیدا ہو گیا ہے غرضکہ منظر کی لطافتیں حد بیان سے باہر ہیں صرف وہی لوگ بخوبی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں جو بذاتہ اس کا لطف اٹھا چکے ہوں۔ اس عمارت کے استحکام کی یہ حالت ہے گویا سیسہ اور اینٹ فولاد کے مماثل ہے یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے بادوباراں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر رہی ہے۔

اس عمارت کی ویرانی کو دیکھ کر اور بانیان عمارت کی عظمت گزشتہ کا خیال کر کے دل پر کچھ ایسا عالم طاری ہو گیا کہ یہ چند اشعار

بے اختیار قلم سے نکل پڑے ۔

(۱)

ہے بہت خوشنما سنہری محل　　دلکشا پر فضا سنہری محل
مرتفع اور بلند ہے یہ قصر　　روبروئے نظر ہے سارا شہر
ہے محلِ وقوع فرحت زا　　گرد حلقہ ہے اک پہاڑی کا
وادیٔ کوہِ قاف میں گویا　　یہ سنہری محل ہے پریوں کا

(۲)

خوبصورت وہ دامنِ کہسار　　اور اس میں وہ سایہ دار اشجار
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائے جاں پرور　　چاروں جانب کھلا ہوا منظر
ہر طرف اس کی حکمرانی ہے　　جو جگہ ہے یہاں سہانی ہے

(۳)

ہے مقابل میں مقبرہ[1] ایسا　　تعزیہ اک دھرا ہوا گویا
دیکھ کر مقبرے کی زیبائی　　ایک تشبیہہ خوب یاد آئی
کیا ہی دلکش ہے خوش قرینہ ہے　　سبزہ زاروں میں اک نگینہ ہے
قصرِ زریں تیرا کیا کہنا　　عہدِ رفتہ کا ہے تو افسانا
قصر کیا ہے سرائے عبرت ہے　　دیکھو جس سمت جوشِ حسرت ہے
اب ہے ویران تھا کبھی آباد　　شانِ رفتہ ہے شوکت برباد
تازیانہ پئے تخیل ہے　　نقشِ بربادیٔ تجمل ہے

(۵)

ہوگئی ہے یہ تیری حالتِ زار　　جا بجا سے جگر ہے تیرا فگار
اب کہاں وہ طلائی رنگ ترا　　اب نہ وہ آب و تاب ہے نہ ضیا
تھیں کبھی جو نگار دیواریں　　ہوگئیں دل فگار دیواریں
فرش جو مثلِ آئینہ تھا صاف　　جا بجا اس میں پڑ گئے ہیں شگاف

---

[1] مقبرۂ رابعہ دورانی

کس مپرسی کی تیری حالت ہے ‌ تیرا ویرانہ جائے عبرت ہے
حوض ہیں خشک صحن میں تیرے ‌ خاک اڑتی ہے تجھ جہاں چشمے
روشیں ہیں وہ اب کہاں باقی ‌ ہیں کہیں کچھ ابھی نشاں باقی

(۶)

کہہ رہے ہیں ترے در و دیوار ‌ تھا کبھی تو بھی غیرت گلزار
کیا ہی ذی شان ہوں گے تیرے مکیں ‌ صاحب اقتدار ذی تمکیں
پیش خدمت تھے جن کے جاہ و حشم ‌ نصرتیں چومتی تھیں جن کے قدم
اب کہاں ہیں وہ مالک دولت ‌ کیا ہوئی ان کی حشمت و ثروت
قصر جن کے تھے مثل قصر جناں ‌ گھونسلے زاغ و بوم کے ہیں وہاں
گردش دہر نے کیا پامال ‌ وہ رہے اور نہ ان کا مال و منال
نہ رہا ان کا کر و فر باقی ‌ یادگار ان کے ہیں کھنڈر باقی

(۷)

اے محل اے وہ یادگار کہن ‌ اے وہ تصویر انقلاب زمن
جو تجھے دیکھنے کو آتا ہے ‌ نقش عبرت وہ لے کے جاتا ہے

سید اللہ بخش توحید

مدارس میں اردو زبان اور ادب کی ترقی و اشاعت کا مسئلہ ہندوستان میں ہمہ گیر توجہ حاصل کر رہا ہے۔ کانگریس نے ہندوستانی کو وہاں کی سرکاری زبان بنانے کا تہیہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں ہندی کے رواج کے لئے بڑی کوشش کی جا رہی ہے ایسی صورت میں اردو کے ہی خواہوں کو اردو کی بھی فکر دامنگیر ہوگئی ہے اور ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح مدراس میں اردو زبان کی حالت اور اردو ادب کے نشو و نما کے بارے میں عام معلومات حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے ادارۂ ادبیات اردو نے مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی سے یہ مبسوط کتاب لکھوائی ہے۔
اس میں گزشتہ ڈھائی صدیوں سے مدراس میں اردو کا جو کام کیا گیا ہے اس کا تفصیلی ذکر درج کیا گیا ہے قیمت عہ

سب رس کتاب گھر یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہے۔

قاضی جی کی کارگزاری

۱۳۹۸ء میں دیول رائے والئی بیجانگر فیروز شاہ بہمنی پر حملہ کرنے کی غرض سے ایک ٹڈی لشکر لے کر طوفان کی طرح اٹھا تاکہ مدگل اور رائچور وغیرہ کے قلعوں کو مسمار کرتا ہوا پائے تخت تک پہنچے اور تمہ سلطنت کو الٹ کر شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔

دیول رائے شمالی سرحد کی طرف سے بڑھتا ہوا دریا کرشنا کے ساحل پر پہنچا اور وہیں ڈیرے ڈال دیئے فوراً راؤٹیاں اور خیمے نصب کر دئے گئے، دوکانیں لگا دی گئیں اور یار لوگ جنگل میں منگل منانے لگے۔ یہ کیمپ تقریباً بارہ تیرہ میل تک پھیلا ہوا تھا جس میں تیس ہزار سوار اور نوے ہزار پیادوں کا لشکر جرار بحر ناپیدا کنار کی طرح موجیں مار رہا تھا، ہر پیشہ کے لوگ اس میں موجود تھے، خرید و فروخت ہو رہی تھی، بازاروں میں چہل پہل تھی، شراب خانے کھلے ہوئے تھے، دور پر دور چل رہے تھے، ارباب نشاط طوائفین اور کسبیاں نغمہ سرائی میں مصروف تھیں اور رقص و سرود سے محفلوں کو گرما رہی تھیں۔

اُدھر سلطان کو خبر پہنچی تو وہ فوراً بارہ ہزار سرفروش اور جان نثار سپاہیوں کا لشکر اپنے ساتھ لے کر آندھی کی طرح اٹھا اور گلبرگہ سے کوچ کر کے کرشنا کے دوسرے ساحل پر جا پہنچا۔ برسات کا زمانہ تھا، سیلاب کے طوفان نے دریا کا پاٹ اس قدر چوڑا کر دیا تھا کہ پار اترنا مشکل نظر آیا۔ اس لئے سب اپنا شاہی وہیں سراپردہ نصب کر دیا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد سلطان نے اپنے ارکان دولت اور سپہ سالاروں کو مشورہ کرنے کی غرض سے طلب کیا۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ہر شخص نے اپنی اپنی سمجھ کے موافق تدبیریں بتائیں لیکن سلطان کو تشفی نہیں ہوئی اور کوئی تصفیہ نہ ہو سکا۔ بہرحال نشستند و گفتند و برخاستند کے بعد سلطان کو بہت زیادہ فکر دامنگیر ہو گئی۔

ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، اندھیری رات میں سنسان جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا اور گھوڑے سے لے کر سوار تک کوئی سانس نہیں لے رہا تھا، لیکن سلطان بدستور اسی غور و فکر میں غرق تھا کہ دریا کس طرح عبور کیا جائے اور غنیم کی فوج پر کس پہلو سے حملہ کیا جائے۔

یکایک نظر اٹھائی تو دیکھا کہ سامنے کوئی بزرگ کھڑے ہوئے ہیں، چمکدار روشن آنکھیں، نورانی چہرہ، لانبی ستواں ناک، لمبی ڈاڑھی، دراز قد، جسم پر سفید براق کپڑے، ادھر سلطان نے ذرا غور سے دیکھا، اُدھر وہ بزرگ بھی سلام کرتے ہوئے آگے بڑھے تو معلوم ہوا کہ قاضی سراج[1] ہیں۔ سلطان نے تعجب سے پوچھا کہ اس وقت تم کدھر؟ دست بستہ عرض کی کہ پیر و مرشد، اس وقت لوگ خاموشی کے ساتھ جنگ کی تیاری میں مصروف ہیں مگر حضور کے چہرہ سے غور و فکر کے آثار نمایاں ہیں۔ اب حضور زیادہ تردد نہ فرمائیں، اس بہی خواہ دولت کو ایک تدبیر سوجھی ہے، اگر جان کی امان پاؤں تو حرف مدعا زبان پر لاؤں اور ایک تدبیر بتاؤں۔ سلطان فیروز عام طور پر علما، فضلا اور ارکان دولت سے نہایت بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ باتیں کرتا تھا، قاضی جی کی گفتگو سن کر مسکرایا اور کہا کہ قاضی صاحب! اللہ اللہ کرو، بھلا تم کو جنگ سے کیا واسطہ، کیوں خواہ مخواہ اس جھگڑے میں پڑتے ہو، تم تو اپنے خیمہ میں بیٹھے ہوئے اللہ اللہ کرو اور فتح فیروزی کی دعائیں مانگتے رہو۔

---

[1] قاضی سراج بادشاہی امیروں میں سے ایک نامی عہدہ دار اور امیران صدہ کا ایک نامی فرد تھا (فرشتہ)

قاضی جی بھلا کہاں چوکنے والے تھے، دست بستہ عرض کی کہ خداوند نعمت، فتح و فیروزی کی دعا تو ہر وقت زبان پر رہے گی خواہ میں خیمہ میں رہوں یا میدانِ جنگ میں مگر عرض یہ ہے کہ قاضی سمجھ کر میرا نام بہادروں کی صف سے خارج نہ فرمائیے۔ باپ دادا سے فنِ سپہ گری ورثہ میں چلا آرہا ہے اس لئے میں اہلِ قلم سے ہی نہیں ہوں بلکہ اہلِ سیف بھی ہوں۔

سلطان نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو اپنی تدبیر بھی کہہ ڈالو۔ قاضی جی نے کہا کہ حضور تدبیر یہ ہے کہ میں نے دریا پار اترنے کے لئے چند چھوٹے ٹوکرے اور لکڑی کی کشتیاں تیار کرلی ہیں۔ اس وقت غنیم کی فوج غافل ہے اگر حکم ہو تو تھوڑی سی فوج لے کر جاؤں اور شب خون ماروں۔

سلطان نے کہا کہ قاضی صاحب آپ نے ٹوکروں اور کشتیوں کی تدبیر تو بہت ہی اچھی بتائی مگر شب خون مارنے کی تدبیر مجھے پسند نہیں آئی، اس لئے کہ میں فتح کو حیلہ سے حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ پھر غنیم کی فوج ایک لاکھ تیس ہزار ہے، اور ہماری صرف بارہ ہزار اگر یہاں سے آپ چار سو یا پانچ سو آدمی لے کر بھی گئے تو کیا فائدہ ہے، غنیم کی فوج تو دس بارہ میل تک پھیلی پڑی ہے شب خون کسی طرح پورا نہیں پڑیگا۔

قاضی جی کی طبیعت ان معاملات میں بلا کی رسا واقع ہوئی تھی۔ فرمایا مثل مشہور ہے کہ الحرب خدعۃ، بس ہمیں بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ چار پانچسو آدمی تو ان کے لئے کافی سے زائد ہیں۔ خدا ہمت نہ ہارے تو یہی لوگ ان کو خرگوشوں کی طرح جھاڑیوں میں بھگا بھگا کر مارا ہیں گے۔ ہاں اگر کسی مصلحت کی بنا پر پیر و مرشد اس کے خلاف ہیں تو اتنی اجازت مرحمت فرمائی جائے کہ میں اپنے ساتھ چند بھروسے کے آدمی لے کر دریا کو عبور کروں اور خفیہ طور پر غنیم کے لشکر میں پہنچ جاؤں اور اس کے بیٹے کا کام تمام کردوں۔ اس عرصہ میں ہماری فوج بھی ٹوکروں اور کشتیوں سے دریا کے اس پار اتر آئے، جب شور بلند ہو تو فوراً ہمارے لشکری دشمن پر گریں اور اس کے پرخچے اڑادیں۔

بادشاہ قاضی جی کی یہ تدبیر سن کر مسکرایا اور خاموش ہوگیا مگر قاضی جی پارے کی طرح بے قرار تھے، بادشاہ کے سکوت کو "السکوت کالرضا" سمجھے فوراً سلطان سے رخصت ہو کیمپ پہنچے اور سات جوان مرد اپنے ساتھ لئے، جو آٹھوں اپنا کام کیے تھے، اور فقیروں کا بھیس کرکے چل کھڑے ہوئے۔ صبح ہوتے ہوتے غنیم کے کیمپ میں پہنچے، تھوڑی دیر تک ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے، جب کہیں دال گلتی نظر نہ آئی تو ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر آپس میں کھچڑی پکانی شروع کردی۔ قاضی جی نے ذرا مراقبہ کیا، ہزاروں عیاریاں اور چالاکیاں ہاتھ باندھے ہوئے سامنے حاضر ہوگئیں، پھر کیا تھا، فوراً داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور ساتھیوں کو بشارت دی کہ ایک ترکیب سوجھی ہے اب انشاءاللہ فتح ہی فتح ہے۔ ساتھیوں نے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ تو فرمایا کہ راجہ کی فوج کے ساتھ سامانِ نشاط، طوائفیں اور کسبیوں کے طائفے بھی موجود ہیں، بس ہمیں وہیں چلنا چاہیئے، وہیں میں سوا آنہ امید ہے کہ وہاں پہنچ کر ضرور کامیابی کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ ساتھیوں نے پھر پوچھا کہ آخر وہاں جاکر کیا کیجئے گا؟ تو قاضی جی نے فرمایا کہ تمہیں کیا معلوم کہ فقیر جھولی میں کیا ڈالتا ہے اور کیا نکالتا ہے۔ بس تم لوگ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ اور جو کچھ میں کہوں اسی پر بے چون و چرا عمل کئے جاؤ۔ الغرض سب نے مل کر کسبیوں اور طوائفوں کے کیمپ کی طرف دھاوا بول دیا، قاضی صاحب شاہ صاحب کا بھیس بدلے خضرِ راہ بنے ہوئے آگے آگے تھے اور ان کے چیلے اور مرید اپنے مرشد کے پیچھے قدم بقدم چل رہے تھے۔ اول خرابات میں پہنچے اور وہیں دھونی رمادی، دو چار روز کے بعد یہ درویشوں کی ٹولی کسبیوں کے کیمپ میں پہنچی اور ان کا نہایت تفصیل کے ساتھ بھید لینا شروع کردیا۔ ایک مقام پر دیکھا کہ ایک طوائف، نہایت طرحدار، حسین، مہ جبین، نوکیلی چھبیلی، کنگھی چوٹی سے درست قیمتی زیور

سے آراستہ و پیراستہ شمعِ محفل بنی بیٹھی ہے۔

اس وقت قاضی جی کو سات خون معاف تھے، اسے دیکھتے ہی رال ٹپک پڑی، کانوں تک باچھیں کھل گئیں، دل سینہ میں بانسوں اچھلنے لگا، ڈورے ڈالنے کے لئے پروانہ وار آگے بڑھے اور اس کے سامنے بیٹھ کر وہ وہ باتیں بنائیں کہ رہے نام سائیں کا۔

اس موقع پر قاضی جی نے اپنے آپ کو پرلے نمبر کا عاشق مزاج، دل پھینک اور رنگیلا ثابت کرنے کی کوشش کی۔ جو جان سے قربان ہو رہے تھے، جو کچھ روپیہ پیسہ اپنے ساتھ لائے تھے بے دریغ اس پر سے نثار کرنا شروع کر دیا، وہ وہ باتیں بنائیں، وہ وہ روغن قاز ملا کہ طوائف بھی ان پر ریجھ گئی اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ مجھ پر لٹو ہے۔ رات بھر خوش مذاقی اور ظرافت کی آتشبازی چھوٹتی رہی۔ تمام رنڈیاں اور ڈوم ڈھاڑی قاضی جی سے چپٹے ہوئے تھے اور قاضی جی اپنی مضحکہ خیز حرکتوں اور پرلطف باتوں سے اس محفل کو خوب گرما رہے تھے۔ اس وقت بقول انشاء اللہ خاں، قاضی جی کی یہ کیفیت تھی کہ۔

شب محفل ہولی میں جو وار و ہوا زاہد ۔ رندوں نے لپٹ کر
ڈاڑھی کو دیا اس کی لگا نیل ترملونا ۔ اور جھینے لگی گت
تب منہچے کہنے لگے ٹک پر لو ناچو ۔ رکھ ناک پہ انگلی
اور آئے جی آنے سے برا مانے سو بھڑوا ۔ ہے موسم عشرت

دو چار روز اسی طرح گزرے، اتفاقاً ایک روز رات کے وقت قاضی جی کی معشوقہ راج کنور کے دربار میں مجرے کے لئے طلب کی گئی اور وہ جانے کیلئے تیاری کرنے لگی، قاضی جی کو جیسے ہی یہ پتہ لگا، بس مچل گئے، فوراً آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور لگے ٹسوے بہانے پھر یہ ہی نہیں بے تاب ہو کر پروانہ وار اس کے گرد پھرنے لگے اور قدموں پر گر گر کر عرض کرنے لگے کہ جدائی کی گھڑیاں مجھ سے نہیں کٹ سکیں گی، خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو یا تو تم وہاں نہ جاؤ یا مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ طوائف نے کہا کہ قاضی جی کیا عقل ماری گئی ہے، اپنے ہوش کے ناخن لو۔ ہم تو راجہ کے نوکر ٹھہرے، پھر بڑی بات یہ کہ خود کنور جی نے طلب فرما کر ہماری عزت افزائی فرمائی ہے ایسی صورت میں بھلا میں حکم عدولی کیسے کر سکتی اور اپنے ساتھ راج سبھا میں تمہیں کیسے لے جا سکتی ہوں۔ اس لئے کہ وہاں تو صرف وہی شخص جا سکتا ہے جو گانے بجانے اور ناچ رنگ میں مشاق ہو۔

قاضی جی نے جواب دیا کہ اے جانِ جہاں! کیا تم نے اوروں کی طرح مجھ کو بھی نرا کاٹھ ملا سمجھ لیا ہے، رام کی دیا سے میں بھی گانے بجانے سے اچھی طرح واقف ہوں، اس کے علاوہ وہ وہ کمالات جانتا ہوں کہ راجہ صاحب بھی دیکھ لیں تو بھوچکا ہو کر رہ جائیں۔ طوائف نے خیال کیا ڈون کی لے رہا ہے، مسکرائی، اور اپنا ستار ان کی طرف کھسکا کر کہا کہ لیجئے ذرا اس کو تو چھیڑیئے۔ قاضی جی نے فوراً ستار ہاتھ میں لے، پردوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا، پھر جوڑا اور باج کے تاروں کو ٹٹولا اور طربوں کے سُر ملا کر وہ استادی سے بجایا، وہ وہ گت سازی اور ہنرمندی کاری کے کمالات دکھلائے کہ طوائفیں اور کسبیاں تو رہیں ایک طرف ان کے سازندے بھی سن کر دنگ رہ گئے۔ اب تو ان کی معشوقہ کا ماتھا ٹھنکا، سوچی کہ اس کا ساتھ رکھنا تو باعث فخر و عزت ہے، ناچ گانے سے بھی خوب واقف ہے، باتیں بھی خوب بناتا ہے

بہت ممکن ہے کہ اس کے طفیل سے ہم پر بھی ہن برسنے لگے، فوراً سب کو طائفہ میں شریک کر لیا اور انہیں اپنے ساتھ لئے راج کنور کے دربار میں جا پہنچی۔

محفل کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، دیول رانے کا سپوت اور اس کے احباب آپس میں ہنس بول رہے تھے، شراب کا دور چل رہا تھا۔ اس طائفہ کے پہنچتے ہی گانا شروع ہوگیا، طبلہ پر تھاپ پڑی، سارنگی ریں ریں کی، منجیرے بجنے لگے۔ طائفہ کی سریلی آواز اور گھنگرو کی چھم چھم سے محفل کا رنگ ہی بدل گیا، دیر تک محفل رقص و سرود گرم رہی۔ گانا ختم ہوا تو نقالوں کی باری آئی۔ قاضی جی فوراً ایک ساتھی کو لے کر اکھاڑے میں کود پڑے۔ یہ دونوں زنانہ لباس پہنے، سرمہ، مسّی اور زیور سے سدا سہاگن بنے، ناز و غمزے کرتے، مٹکتے، ٹھمکتے، تالیاں بجاتے اور کمر مٹکاتے ہوئے اس مضحکہ خیز انداز میں راج کنور کے سامنے آئے کہ اہل محفل ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ پھر ان بہروپیے نقالوں نے وہ تمسخر، طرب سازی اور گت بازی کی، وہ وہ کمالات بتائے کہ راج کنور اور پوری محفل اش اش کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد قاضی جی نے اپنی غیر معمولی چلت پھرت اور دلفریب تڑت کے ساتھ رقص شروع کر دیا۔ لے میں ڈوبا ہوا ساز، سُروں میں ڈوبی ہوئی آواز اور وقتیہ راگ راگنی کے سوز و گداز نے محفل پر جادو سا کر دیا، ہر شخص بت بنا ہوا ان کو ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہا تھا، اسی اثنا میں دونوں نے کمر سے خنجر کھینچ، بھاؤ بتانے شروع کر دئے اور نہایت سبک روی کے ساتھ وہ وہ جوڑ توڑ دکھائے اور وہ وہ ہاتھ اور پینترے نکالے کہ پھر محفل وجد کرنے لگی۔

آخر کار پاؤں کاٹتے اور پینترے بدلتے ہوئے دونوں کے دونوں راج کنور کی طرف آہستہ آہستہ بڑھے، پھر لپک کر اس کے سینے و شکم میں دونوں نے بیک وقت ایسے کاری خنجر بھونکے کہ وہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ اس کے ساتھی اور تماشائی نشہ میں چور اور مست و مخمور تھے۔ جو لڑکھڑاتے ہوئے باہر بھاگے انہیں قاضی جی کے ان ساتھیوں نے سنبھالا جو باہر کھڑے ہوئے تال دے رہے تھے جو بھاگ نہ سکے وہ وہیں کے ہو کے رہ گئے۔

اب قاضی جی اور ان کے ساتھیوں نے کیمپ کے چراغ گل کرنے شروع کر دیئے۔ پھر کیا تھا۔ چراغ گل، پگڑی غائب، لشکری حیران و پریشان، اصل واقعہ سے بے خبر، سمجھے کہ سلطان کے لشکر نے شب خون مارا ہے۔ شراب کا نشہ، کچی نیند اور رات کی تاریکی میں ایک دوسرے پر پل پڑے، ہر طرف صدائے دار و گیر بلند ہوگئی، ادھر قاضی جی نے اپنے ساتھیوں کو اطلاع دینے کی غرض سے سلطان کی طرف روانہ کر دیا اور خود کسی گوشۂ عافیت میں منہ چھپا کر بیٹھ گئے۔

دیو رانے نے یہ کیفیت دیکھی تو ہوش پرّاں ہو گئے۔ بس اندھیرے منہ اپنے لڑکے کی لاش لے کر نعرہ لڑاتے بدا سے بیجا نگر روانہ ہوگیا۔ دوسرے روز جب مشرق کا شہسوار نتارہ اس کی فوج کو شکست دے کر شعاع کا نیزہ ہاتھ میں لئے نکلا، فیروز شاہ سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق، جسم پر زرہ بکتر اور چار آئینے، سر پر خود فولادی، کمر میں شمشیر اصفہانی، پشت پر سپر، کندھے پر کمان، کمند ابریشمی شکار بند میں آویزاں، عربی گھوڑے پر سوار اپنی فوج ظفر موج کو لئے ہوئے آ پہنچا۔ نقارے پر چوٹ پڑی کہ دل سینوں میں دہل گئے، "اللہ اکبر، اللہ اکبر" کے نعروں سے دشت و ہامون گونج اٹھا۔ بہادروں نے بڑھ کر حملہ کیا، پھر کیا تھا، تلوار چلی

تلواریں اور نیزوں سے نیزے اژدہوں کی طرح زبانیں نکالے ہوئے ایک دوسرے سے گتھ گئے، تیروں کی دھواں دھار بارش سے آسمان پر ایک ابر سا چھا گیا، جس میں برچھیوں کی سانیں اور بھالوں کی انیاں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر بجلیاں گرا رہی تھیں۔ بڑے گھمسان کی لڑائی ہوئی، ستم کا رن پڑا۔ جدھر دیکھو کشتوں کے پشتے لگے تھے، خون کا سیلاب بہہ رہا تھا، کوئی سسک رہا تھا کوئی ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور کوئی رقص بسمل کر رہا تھا۔ غرض یہ کہ قاضی جی کے ناچ نے سب کو گنگی کا ناچ نچا دیا تھا۔

بارہ ہزار بہادروں نے وہ جی توڑ کر حملہ کیا کہ ایک دھاوے میں پینسٹھ ہزار سے زیادہ کا کھیت کر دیا جو باقی رہے ان کے پاؤں اکھڑے اور ایسے اکھڑے کہ پھر نہ جمے۔ یار لوگ عجیب عجیب طرح بھاگ رہے تھے، کوئی بے تحاشا بھاگا، کوئی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا، کوئی ٹوک دم بھاگا اور کوئی دم دبائے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ پیادوں کو ہوش نہ تھا کہ ہاتھ میں تلوار ہے یا میان کا ٹکڑا، سوار کو خبر نہ تھی کہ وہ گھوڑے پر سیدھا سوار ہے یا الٹا۔ فتحیابوں نے کئی کوس تک ان کا پیچھا کیا بلکہ ان کے گھر تک پہنچا کر واپس آئے۔ راستہ میں زخمیوں کی کمریں اور مردوں کی ہمیانیاں کھول کھول کر اپنے کمر کیسے خوب ٹھوک ٹھوک کر بھرے اور اس قدر زر و جواہر، مال و دولت ہاتھ آیا کہ جس کا حد و حساب نہیں۔

گھوڑوں کی ٹاپوں سے میدان جنگ میں جو غبار اڑا، قسمت نے ہاتھ بڑھا کر نیزے کی انی سے اس پر فیروز شاہ کا نام لکھ دیا۔

الغرض راجہ کو ایسی شکست فاش ہوئی کہ اس کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔ سلطان فیروز شاہ اپنے لشکر کے ساتھ کامیابی کے جھنڈے اڑاتا ہوا اور فتح و فیروزی کے نقارے بجاتا ہوا اپنے دار السلطنت واپس ہوا۔ اس خدمت کے صلہ میں قاضی سراج خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوئے اور گروہ امرا میں داخل ہو کر چین کی بنسی بجاتے رہے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

باغِ دکن

یہیں بہار کا پہلے پہل بنا ہے چمن — عجیب خطۂ دلکش ہے خاکِ پاکِ دکن
نگاہِ شوق کو کیا کیا سماں دکھاتا ہے — انوکھی شان زمانہ کو یہ بتاتا ہے
نمونہ کرم و لطف کردگار ہے یہ — یہ باغ علم ہے گہوارہ بہار ہے یہ
گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمیں شاداب — لطیف و سرد ہوا پاک صاف چشمۂ آب
کمی نہیں ہے کسی شئے کی اس گلستاں میں — عجب بہار ہے کچھ اس کے سرو و ریحاں میں
طلسم حسن کا خاکِ دکن ہے گلدستہ — بہم کھڑے ہیں شجر اور کوہ صف بستہ
مسافر آکے جو اس جا قیام کرتے ہیں — مناظر اس کے انہیں جلد رام کرتے ہیں
بلندیوں سے جو ہو مائل نشیب نظر — فریب دیتا ہے تالاب کا حسین منظر
وہ دیکھو دور سے پانی ہے یوں نظر آتا — سفید سانپ چلا جائے جیسے بل کھاتا

اقبال الدین احمد
سابق اڈیٹر کامریڈ و ادبی دنیا

دکن کے نسوانی ادارے

عہدِ عثمانی میں جہاں ملک و ابنائے ملک کی فلاح و بہبود کی خاطر سیکڑوں اصلاحیں عمل میں آئی ہیں وہاں طبقۂ نسواں کی تعلیم و تربیت اور اصلاحِ حال کے لئے بھی ہمارے بیدار مغز سلطان العلوم کی علم پرور حکومت نے اپنی امکانی کوششیں کی ہیں اور مسلسل کئے جا رہی ہے۔

تعلیمِ نسواں کے سلسلہ میں جو تجاویز عمل میں آئی ہیں اور جو اقدامات کئے گئے ہیں ان کی اہمیت اور وقعت دوسری تجاویز سے کہیں زیادہ ہے! تعلیمِ نسواں کی اہمیت مردوں کی تعلیم سے بہت زیادہ ہے، اسی پر قوم کے ارتقا کا دارومدار ہے، ہماری آنیوالی نسلوں کی تعلیم و تربیت، ان کی اخلاقی اصلاح اور ان کی بہتری کے لئے عورت کا صحیح تعلیم و تربیت یافتہ ہونا ازبس ضروری ہے، عورت نہ صرف مرد کا بلکہ ساری قوم کا "نصف بہتر" ہے، اس کو جاہل اور تعلیم و تربیت سے محروم رکھکر ہم کبھی اس شاہراہِ ترقی پر گامزن نہیں ہوسکتے۔

عہدِ عثمانی میں تعلیمِ نسواں نے ترقی کے جو مدارج طے کئے ہیں اور خواتینِ دکن نے اصلاحِ معاشرت و تمدن کی جو کوششیں کی ہیں یہاں ان کا اجمالاً تذکرہ کیا جاتا ہے۔

سنہ ۱۳۲۰ف میں جبکہ موجودہ فرمانروائے دکن نے زمامِ سلطنت اپنے دستِ مبارک میں لی صرف (۹۱) مدارسِ نسواں ممالکِ محروسہ سرکارِ عالی میں قائم تھے جن میں (۶۳۴۶) لڑکیاں زیرِ تعلیم تھیں۔ سنہ ۱۳۴۶ف کے اعداد و شمار سے تعلیمِ نسواں کی ترقی کی رفتار اس طرح واضح ہوتی ہے کہ نسوانی درسگاہوں کی تعداد (۷۶۲) ہوگئی جن میں ساڑھے پچپن ہزار لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں۔ ان مدارس میں ۶۹۶ تحتانیہ ہیں جن میں (۴۶۱۸۶) طالبات شریک ہیں، مدارسِ وسطانیہ سو ہیں جن کی طالبات کی تعداد ۲۴۰۰ ہے۔ مدارسِ فوقانیہ نو ہیں ان میں ۲۶۲۳ لڑکیاں ہیں۔ تعلیمِ نسواں پر معتد بہ رقم جو ہر سال صرف ہو رہی ہے اس کا ایک معمولی سا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ صرف سنہ ۱۳۴۴ف میں ہماری علم دوست اور فیاض حکومت نے کوئی ساڑھے نو لاکھ روپے اس طبقہ کی تعلیم پر صرف کئے ہیں۔

ذیل میں چند سرکاری، امدادی و خانگی نسوانی مدارس اور خواتین کے اصلاحی و معاشرتی اداروں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ہم یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ عہدِ عثمانی میں تعلیم و تمدنِ نسواں نے ترقی کی منزلیں کس حسن و خوبی سے طے کی ہیں اور خواتینِ دکن میں تحصیلِ علم اور اصلاحِ معاشرت کے جذبات کس حد تک کارفرما ہیں۔

نامپلی زنانہ اسکول

مدرسۂ فوقانیہ نسواں نامپلی کا قیام سنہ [illegible]ف میں عمل میں آیا، اس وقت اسکول میں صرف سولہ لڑکیاں شریک تھیں، رفتارِ ترقی تقریباً ناپید تھی مگر سلطان العلوم کے تحتِ دکن پر متمکن ہوتے ہی ایک عظیم تغیر رونما ہوا، طالبات کی تعداد تدریجاً بڑھنا شروع ہوئی چنانچہ اس وقت اس میں ۶۶۱ لڑکیاں زیرِ تعلیم ہیں۔ لکھنے پڑھنے کے علاوہ لڑکیوں کو امورِ خانہ داری، دستکاری، مصوری، سلائی اور کھانا پکانے کی بھی باقاعدہ صحیح اصول پر عملی تعلیم دی جاتی ہے۔

کلیۂ اناث

تعلیمِ نسواں کا معیار بلند کرنے اور طبقۂ نسواں کو اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور کرنے کیلئے سنہ ۱۳۴۳ف میں کلیۂ اناث کا بنیاد عمل میں آیا۔ اس کالج کے ابتدائی اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم پانیوالی طالبات کی تعداد

نصف درجن سے زیادہ نہیں تھی۔ اسٹاف صرف ایک پرنسپل اور ایک پروفیسر پر مشتمل تھا اور اب کوئی ایک درجن خاتون پروفیسر ساٹھ ستر لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے زینے طے کرا رہی ہیں۔

وظائف تعلیمی

کلیۂ اناث کی کامیاب طالبات کو ان کی مخصوص اور امتیازی کامیابیوں کے مدنظر ہماری علم پرور حکومت سے ممالک غیر میں تکمیل تعلیم کے لئے وظائف عطا کئے جاتے ہیں اور اکثر خواتین باہر جاکر امتیازی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ خدمات پر اسی کالج میں مامور ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس وقت ایسی کئی خواتین کالج کی خدمات پروفیسری کو انجام دے رہی ہیں۔

محبوبیہ زنانہ اسکول

یہ اسکول ۱۳۱۶ف سے قائم ہے، اس میں سینیئر کیمبرج تک تعلیم دی جاتی ہے۔ یہاں زیادہ تر امرا اور معزز طبقہ کی لڑکیاں شریک ہیں یہاں کی اکثر طالبات سینیئر کیمبرج کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے کلیۂ اناث میں داخل ہوتی ہیں، اسمیں طالبات کی تعداد ۱۳۴۶ف کے آخر میں (۴۰۹) تھی، اس اسکول میں کمسن لڑکے بھی داخل ہوسکتے ہیں، علاوہ تعلیم کے دستکاری، مصوری، موسیقی، خانہ داری، سلائی اور پکوان کی بھی عملی تعلیم دی جاتی ہے، سادہ معاشرت کا عادی بنانے، ان میں سادگی پیدا کرانے اور لڑکیوں کو کفایت شعار بنانے کے لئے اس اسکول کی دوراندیش اور تجربہ کار پرنسپل طالبات کو سادہ لباس استعمال کرنے اور زیوارات کو ترک کرنیکی ترغیب و ہدایت دیتی رہتی ہیں، اسکول کی عمارت میں چند سال پہلے کافی توسیع کی گئی ہے۔ اس اسکول میں بھی ہر قسم کے میدانی کھیل ڈرل اور جمناسٹک کا اچھا انتظام ہے۔

مدارس تعلیم المعلمات

یہ اس حصہ میں معلمات کو طرز تعلیم سے واقف کرانے کے لئے قائم کئے گئے ہیں ان میں علاوہ (۱۰۴) طالبات کے (۹۰) معلمات بھی مصروف طرز تعلیم و تدریس ہیں، ان کو طرز تعلیم کے جدید طریقوں سے واقف کرایا جاتا ہے۔

ماڈل پرائمری اسکول

یہ اسکول ۱۳۴۴ف میں قائم کیا گیا ہے اس میں مخلوط اسٹاف چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کو تعلیم کے لئے تیار کرتا ہے یہاں باغبانی بھی سکھائی جاتی ہے۔

گرل گائیڈ

کوئی آٹھ سال سے "گرل گائیڈ" کی تحریک جاری ہے، اس تحریک کے بنیادی اصول انسانوں اور جانوروں کے ساتھ ہمدردی، ایک دوسرے کی تائید، زخمیوں کی فوری امداد، تیمارداری اور خود اعتمادی ہیں۔ اس تحریک میں کلیۂ اناث، مدرسہ نسواں نامپلی، محبوبیہ زنانہ اسکول اور تعلیم نسواں کے بعض دوسرے ادارے بھی شریک ہیں کھلی فضا میں سیر و تفریح کے مواقع اور معاشرتی پارٹیاں لڑکیوں کے لئے نئی دلچسپیوں کا باعث ہوئے ہیں۔

انجمن ترقی تعلیم و تمدن نسواں

تعلیم نسواں کی ترقی اور اعلیٰ تعلیم کی نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ خواتین دکن کی معاشرت، تمدن اور ذہنیت میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ اعلیٰ تعلیم اور صحیح تربیت پائی ہوئی خواتین علم کی خوبیوں سے واقف ہونیکے بعد اپنی ان بہنوں کو جنہیں حصول تعلیم کے ذرائع میسر نہیں علم کی برکات سے واقف کرانے اور روشن خیال بنانیکی پوری کوشش کر رہی ہیں اسی خیال کے تحت یہ انجمن ۱۹۲۶ میں قائم کیگئی ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ سماجی اور معاشرتی اصلاحات کا تبلیغی کام بھی یہ انجمن بحسن وجوہ انجام دے رہی ہے۔ اس انجمن کی صدر محترمہ بیگم صاحبہ نواب ولی الدولہ اور نائب صدر مشہور پارسی خاتون مسز رستم جی فریدوں جی ہیں، ان دونوں روشن خیال اور ملک و قوم کا درد رکھنے والی معزز خواتین کی سرپرستی میں یہ انجمن خوب پروان چڑھ رہی ہے، اشاعت تعلیم، اصلاح معاشرت و رسم و رواج کے مختلف اصول اور طریقے اس انجمن کے پیش نظر ہیں، یہ انجمن متعدد

زنانہ مدارس کی امداد اور نگرانی کرتی ہے، غریب اور شوقین لڑکیوں کو وظائف تعلیمی بھی اس انجمن سے دئے جاتے ہیں۔ اس انجمن کے تحت پانچ مدارس قائم ہیں، ان میں تقریباً چار سو بچوں کو مفت ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔

دارالاقامہ | اس انجمن کی سرپرستی میں ایک دارالاقامہ شہر کے وسط میں قائم کیا گیا ہے، اس میں باہر سے آئی ہوئی خواتین بلالحاظ مذہب و ملت قیام کر سکتی ہیں، یہ اقامت خانہ خاص طور پر ان غریب خواتین کی ضرورت کو پورا کرتا ہے جو دایہ گری اور تیمارداری کی عملی تعلیم شفاخانوں میں حاصل کرتی ہیں اور ختم تعلیم پر مختلف دواخانوں اور ہسپتالوں میں ملازم ہوتی ہیں۔

دارالمباحثہ | اس انجمن کے زیر سایہ ایک دارالمباحثہ بھی قائم ہے۔ اس میں تعلیم یافتہ خواتین تقریری مقابلے کرتی ہیں۔ اس قسم کے تقریری مقابلوں سے خواتین میں علمی ذوق پیدا کرنے کے علاوہ تقریر کرنے کی قابلیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس سال دارالمباحثہ کی جانب سے ایک پرجوش مناظرہ اردو میں ہوا۔ اس جلسہ میں بلطف آراء یہ طے ہوا کہ ہندوستان میں بچوں کی پرورش کا موجودہ طریقہ ناقابل اطمینان ہے۔

ذیلی کمیٹیاں | اس انجمن کی کئی ذیلی کمیٹیاں ہیں جو خواتین کے حقوق کی حفاظت، کمسنی کے ازدواج کی مخالفت، عورتوں اور بچوں کی جسمانی اور اخلاقی بہتری کے لئے مناسب تجاویز عمل میں لاتی ہیں۔ تقریروں کے ذریعہ اس انجمن کی اراکین اپنی بہنوں کو ان کے حقوق اور فرائض سے آگاہ کرتی ہیں اور ان کو اپنی صحت و تندرستی کی جانب بطور خاص توجہ کرتی ہیں۔ ایک کمیٹی عورتوں کی قانونی دشواریوں پر غور کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہے۔ اس سال ہر کمیٹی کا ایک عام جلسہ ہوا جس میں کئی اداروں کی مسلم خواتین شریک ہوئیں۔ اس جلسہ میں وہ "نکاح نامہ" پیش کیا گیا جس کو مسز حامد علی خان نائب صدر کل ہند خواتین کی کانفرنس نے مرتب کیا ہے۔ یہ نکاح نامہ ایک اقرار نامہ کی شکل میں ہے جس میں مسلم خواتین کو تحت قانون شرع طلاق کا حق دیا گیا ہے۔ جملہ شرکائے جلسہ خواتین نے بلطف آراء اس نکاح نامہ کو منظور کیا۔

اس انجمن کو کل ہند خواتین کی کانفرنس کی مستقل کمیٹی نے حیدرآباد کی خواتین کی نمائندہ انجمن تسلیم کر لیا ہے۔ اس انجمن سے اس کے نمائندے سالانہ کل ہند کانفرنس کے جلسوں میں بھیجے جاتے ہیں اور کانفرنس کی مستقل کمیٹی میں اس انجمن کا ایک رکن حیدرآباد کے نمائندے کی حیثیت سے شریک رہتی ہے۔

دی گرلز اسکول کوآپریٹیو بلڈنگ سوسائٹی لمیٹڈ | مسز رستم جی کی صدارت میں معزز و ذمہ داریوں کی ایک سوسائٹی زنانہ مدارس کی عمارتوں کی تعمیر کے لئے ۱۳۴۲ف میں قائم کی گئی ہے۔ اس سوسائٹی کا مقصد عمدہ اور غریب لڑکیوں کے مدارس کے لئے مختلف مقامات پر تعمیر کرنا ہے، چنانچہ ایک ایسی ہی عمارت خیریت آباد میں تعمیر کی گئی ہے اس میں ایک اسکول قائم ہے۔

زنانہ کلب | گزشتہ چند سال کے اندر حیدرآباد اور سکندرآباد میں خواتین کے کئی کلب قائم ہو گئے ہیں۔ ان کے لئے نہایت کشادہ اور شاندار عمارتیں تیار کی گئی ہیں۔ پردہ کے عمدہ انتظام کے ساتھ کلب کی اراکین مختلف قسم کے کھیل و تفریحات سے مستفید ہوتی ہیں۔ کھیل اور تفریح کے علاوہ تقاریر کے ذریعہ دماغی اور اخلاقی ترقی بھی ہوتی ہے۔

لیڈیز اسوسی ایشن کلب | اس کلب کی بنا کسی زمانہ میں مسز حیدر نواز جنگ مرحومہ نے ڈالی تھی۔ اس وقت یہ کلب نہایت اعلیٰ پیمانہ پر قائم ہے، اس کی صدر لیڈی حیدری ہیں، جن کی نگرانی میں اس کی شاندار اور خوبصورت عمارت تیار ہوئی۔ اس کلب کے اراکین کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ ہے۔ اس کلب کی جانب سے ہر سال دو طلائی میڈل ان طالبات کو عطا کئے جاتے ہیں جو انگریزی اور اردو کے مضامین میں امتیازی کامیابیاں حاصل کرتی ہیں۔ غریب لڑکیوں کو تعلیمی وظائف بھی دئے جاتے ہیں۔ اس کلب کی اراکین مختلف تفریحات اور میدانی کھیلوں کے علاوہ تقریری مقابلوں میں بھی شریک ہوتی ہیں۔

لیڈیز ریکریشن کلب | گزشتہ چند سال سے یہ کلب قائم ہے۔ اس کی صدر ... انی شاہ راج بہادر ہیں۔ اس کے اراکین کی تعداد تقریباً دو سو ہے، میدانی

کھیلوں اور دوسری تفریحات کے علاوہ اس میں ایک تیرنے کا تالاب بھی ہے۔ اس میں خواتین تیراکی کا شوق بھی پورا کرتی ہیں۔

متذکرہ صدر اداروں کے علاوہ خواتین کی اور کئی انجمنیں بھی ہیں مثلاً انجمن خواتین دکن، انجمن خواتین اسلام، مرہٹہ خواتین کی انجمن، گجراتی خواتین کی انجمن، عیسائی خواتین کی انجمن، بہبودیٔ اطفال کے متعدد مراکز وغیرہ۔

انجمن خواتین دکن خواتین کی انجمنوں میں اس انجمن کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ یہ انجمن ۱۳۲۳ھ ہجری میں مسز صغرا ہمایوں مرزا کی صدارت میں قائم ہوئی۔ اس انجمن کی سرپرست رانی شام راج راجونت بہادر ہیں۔ اس انجمن کے مقاصد میں ہر مذہب و ملت کی غریب و شریف خواتین کی امداد، غریب لڑکیوں کی شادی میں امداد دینا، بیوہ عورتوں اور نادار لڑکیوں کو دستکاری سکھانا، معذور عورتوں کو ماہانہ امداد وظائف کی شکل میں دینا، ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینا، فضول رسم و رواج کو ترک کرانا ہے۔

اس انجمن کی کامیابیاں زیادہ تر محترمہ مسز صغرا ہمایوں مرزا کی عالی ہمتی و ایثار کی مرہون منت ہیں۔ اس انجمن نے اب تک کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ تقریباً بیس معذور و بے یار و مددگار عورتوں کو ماہانہ امداد دی جاتی ہے۔ اس انجمن کی زیر نگرانی زنانہ صنعت و حرفت کا ایک مدرسہ قائم ہو گیا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہوگا جس میں ادبی تعلیم کے ساتھ دستکاری، امور خانہ داری اور مختلف فنون کی عملی تعلیم کا خاص انتظام کیا جانے کا۔ صدر انجمن نے بڑی فیاضی سے اپنی جائیداد کا بڑا حصہ اس ادارہ کے لئے وقف کر دیا ہے۔ ہر سال انجمن کی سرپرستی میں ہر سال دستکاری اور پکوان کی نمائش کی جاتی ہے۔ اس نمائش میں تعلیم نسواں کے مختلف ادارے حصہ لیتے ہیں۔ اس انجمن کی نگرانی میں اس وقت تین زنانہ اسکول قائم ہیں۔ ان کی کارگزاریاں دیکھنے کے بعد مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے یہاں بھی ایسی حساس خواتین موجود ہیں جو اپنی صنف کی تن من دھن سے خدمت کر رہی ہیں۔

بستان طالبات یہ ادارہ کوئی دس سال سے قائم ہے۔ اس میں یتیم بے یار و مددگار لڑکیوں کے قیام و طعام کا انتظام کیا جاتا ہے اور ان کو تعلیم و تربیت کے ساتھ امور خانہ داری، سوزن کاری اور پکوان وغیرہ کی عملی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس وقت اس میں کوئی چالیس یتیم لڑکیاں زیر پرورش ہیں۔ اس ادارہ کی معتمد محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ بانو نظامی ہیں۔ علاوہ یتیم لڑکیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے پردہ نشین مفلس بیوہ عورتوں کی امداد بھی کی جاتی ہے۔ سلائی کا کام ان کے لئے فراہم کیا جاتا ہے اور اجرت پر ان سے کام لیا جاتا ہے اور ان کو کشیدہ کاری اور سلائی کی تعلیم بھی مفت دی جاتی ہے۔

چند خانگی ادارے چند خانگی مدارس بعض حساس اور ہمدرد ملک و قوم خواتین کی سرپرستی اور نگرانی میں قائم ہیں۔ بیگم سید محمد [illegible] صاحب پروفیسر نظام کالج نے ایک خانگی اسکول اپنے مکان پر ملازمین کی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے قائم کیا ہے جس میں سلائی کی تعلیم وہ خود دیتی ہیں۔ مسز امیر حسن صاحب نے ایک ایسا ادارہ اپنی قیام گاہ جوبلی ہل پر قائم کیا ہے جس میں صرف بیچارہ عورتوں کو سلائی اور کشیدہ کاری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مسز [illegible] نے اپنے مکان پر ایک مختصر سا اسکول ادنی نوکروں کی اولاد کے لئے قائم کیا ہے جس کو وہ خود تعلیم دیتی ہیں۔

متذکرہ صدر اعداد و شمار سے واضح ہوگا کہ خواتین دکن میں بیداری کے احساسات کس تیزی سے پیدا ہو گئے ہیں اور اس طبقہ نے ہمارے آقائے ولی نعمت کے عہد میمنت مہد میں اپنی ہر جہتی فلاح و بہبود کے لئے کیسے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ تعلیمی، ذہنی و معاشرتی ترقی کے زینے کس حسن و خوبی سے طے کئے جا رہے ہیں۔ ترقی کی اس رفتار کو دیکھ کر دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ طبقہ مستقبل قریب میں ذیل کے مدارج طے کر کے بہت جلد بام ترقی پر پہنچ جائے گا۔ تعلیم نسواں کی یہ رفتار پیش خیمہ ہے اس طبقہ کے درخشاں مستقبل کا۔ وہ دن دور نہیں کہ ہماری ملکی بہنیں دوسرے ممالک متمدنہ کی خواتین کی طرح زیور علم سے آراستہ اور صحیح تربیت یافتہ ہو کر علم و عمل کی روشنی سے جہالت کی تاریکی کو ملک سے دور کر دیں گی۔

مرزا سیف علیخاں

دنیا کا سب سے بڑا ہیرا ہے کیونکہ اس کا وزن (۵۳۹) قیراط[ا] ہے۔

"الماس نظام" کے ابتدائی تاریخی واقعات کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہ ہیرا نواب میر فرخندہ علی خاں بہادر آصفجاہ رابع کے عہد حکومت میں دستیاب ہوا تھا۔ صاحب گلزار آصفیہ نے (جو اس دور کے معتبر ترین مورخ سمجھے جاتے ہیں اور جنہیں ایک عرصہ تک دربار شاہی کے تقرب کا بھی اختصاص حاصل رہا) اس کے حالات کی تحقیق میں جو غالباً اُن کے چشم دید ہیں یہ بیان کیا ہے کہ قصبہ جٹ پول میں ایک بقال رہتا تھا معلوم نہیں کہ یہ الماس اُسے کہاں سے ہاتھ لگا، مگر اُس نے اس کی حفاظت بگاسے کے سینگ میں چھپا کر اپنے ہی گھر میں زمین میں دفن کر کے رکھی تھی اور اس کے ساتھ اُس کی فرد کیفیت بھی اُسی سینگ میں لکھ چھوڑی۔ چند دنوں بعد وہ مر گیا اور اس کا حال کسی کو نہ بتا گیا چنانچہ یہ ہیرا اسی طرح دو سو برس تک زمین ہی میں پوشیدہ رہا اور اس دو صدی کے امتداد نے اُس کے مکان کو کہنہ و افتادہ کر کے ویران کر دیا اور صرف کھنڈر ہی باقی رہا تھا۔ اتفاق سے کسی نے اس زمین کو خرید کر اس پر مکان بنانا شروع کیا کھنڈر کی صفائی وغیرہ اور پایہ کھودنے کی وجہ سے اس مکان کی مٹی دوسری طرف منتقل ہوتی رہی یہاں تک کہ اس زمین کا وہ دفن شدہ سینگ بھی جس میں کہ ہیرا چھپا تھا سارے خس و خاشاک کے ساتھ پھینک دیا گیا اس لئے کہ ایسی حقیر چیز کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی اور اس کے راز اور بھید سے کون واقف تھا۔

اس کے بہت دنوں بعد ۱۲۰۰ھ میں اسی قصبہ کا ایک کمہار برتن بنانے کے لئے مٹی کی خاطر اس مقام پر پہنچا اور یہاں اس نے خاک میں دبی ہوئی ایک سینگ پائی صرف اس خیال سے کہ زمین کھودنے اور مٹی حاصل کرنے میں اس سے سہولت ہوگی اٹھالی، جب اسے صاف کرنے لگا تو اس سینگ میں اس کو ایک خوبصورت مگر بے رونق پتھر نظر پڑا چونکہ وہ ایک گنوار تھا اس لئے اس نے اس "سنگ رنگین" کو کوئی اہمیت نہ دی۔ مٹی ساتھ لا دی اور اس پتھر کو بھی اپنے بچوں کے کھیلنے کے لئے رکھ لیا۔ چنانچہ گھر پہنچ کر اس نے اس پتھر کو اپنی لڑکی کے حوالہ کیا اور لڑکی اس کی رنگینی و دل آویزی کو دیکھ کر ہیرا لئے خوش خوش باہر نکلی اپنے ساتھ کھیلنے والے بچوں کو جمع کیا اور ان بچوں نے دوڑ دوڑ کر سیتا پھل (شریفوں) کے بیج اکھٹے کئے۔ خود بیٹھی ترازو کے ایک پلڑے میں یہ رنگین پتھر رکھے بیجوں کو اس کا ہم سنگ کرتی اور سارے بچوں میں انہیں تقسیم کرتی جاتی تھی۔

ان ہی دنوں سے چند روز پہلے لڑکی کی ماں نے اپنے گاؤں کے ایک سنار سے اس لڑکی کے لئے کسی زیور کے تیار کرنے کی فرمائش کی تھی اتفاق سے وہ اسی دن چاندی لینے کے لئے اس کے گھر آیا تو لڑکی کو گھر کے پہلو میں چند بچوں کے ساتھ بیٹھے

[ا] "الماس متن" نامی ایک اور ہیرا ہے یہ ایک علاقہ کا نام ہے جہاں کا حاکم راجہ متن کہلاتا ہے چونکہ یہ الماس اسی کے قبضہ میں ہے اسی لئے اس نام سے مشہور ہوا۔ یہ ہیرا ابھی ناتراشیدہ بیضوی شکل کا ہے جس کا وزن (۲۷۷) قیراط یعنی ½۱۲ ماشہ ہے جوہریوں نے اس کی قیمت دو کروڑ سے زیادہ قرار دی ہے تو اس لحاظ سے غور کرنا ہے کہ "الماس نظام" کس قیمت کا ہوگا جو اس سے (۲۷۷) قیراط زیادہ وزنی ہے "کوہ نور" جیسا مشہور ترین ہیرا تو غالباً بارہویں نمبر پر شمار ہوتا ہے جس کا وزن ½۱۰۶ قیراط اور قیمت چودہ لاکھ ہے صرف اس کو اس کی تاریخی حیثیت سے اتنی بڑی شہرت نصیب ہوی۔ ورنہ اس کا قیمت و وزن کے لحاظ سے کوئی درجہ نہیں۔

اس بے نظیر پتھر سے کھیلتے ہوئے پایا' اور اس نے اپنی واقفیت کی بنا پر اس پتھر کی حقیقت سمجھ لی کہ یہ ایک بے بدل آب دار ہیرا ہے' دوسرے دن جب کہ کمہار کے گھر کوئی نہ تھا' سنار موقع پاکر اپنے ساتھ مٹھائی لے آیا' اور نہایت عاجزی کے ساتھ لڑکی کو سمجھا منا کر مٹھائی دی اور اس سے وہ پتھر مانگنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کچھ ضدی تھی۔ اُس کی اس طلب پر برہم ہوگئی' اور غصہ میں فوراً بھاگ کر گھر دوڑی چلی آئی' اور کمرے میں جاکر ہیرے کو طاق پر رکھ دیا۔ جب ماں آئی تو سارا قصہ بیان کیا کہ فلاں سنار نے مجھے مٹھائی دی' اور اس پتھر کو بڑی عاجزی سے مانگنے لگا' لیکن میں نے اُسے نہ دیا' ماں نے یہ خیال کیا کہ وہ شاید چاندی تولنے کے لیے اس کو تنگ رہا تھا' اس لئے اس نے اس پتھر کو ایک پوشیدہ مقام پر چھپا دیا۔ جب دوبارہ سنار آیا' اور اس نے لڑکی سے وہ پتھر مانگا' تو ماں کو معلوم ہوگیا' اس نے سنار سے کہا معلوم نہیں کہ اس دیوانی بچی نے اُسے کہاں کھو دیا۔ سنار یہ سن کر بے قرار ہوگیا' اور کہنے لگا کہ "افسوس تو نے یہ کیا کیا' اری وہ تو ہیرا تھا! اگر تو مجھے دے دیتی تو میں تجھے تیرے منہ مانگے پیسے دیتا۔" جب لڑکی کا باپ آیا تو ماں نے یہ سارا قصہ اُسے کہہ سنایا' اس پتھر کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد کہ یہ ہیرا ہے' شاید کمہار زرگر سے ملا' اور ان دونوں میں بعد تصفیہ یہ طے پایا کہ وہ اس معاملہ کو نہایت پوشیدہ رکھیں گے اور آپس میں نصف نصف تقسیم کرلیں گے' چنانچہ بہ ہزار دقت ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اُسے توڑا' اور ہیرے کا وہ حصہ جس کو سنار نے اپنے لئے پسند کیا تھا' اس کے دو تین ٹکڑے ہوگئے' اور وہ حصہ جو کمہار کے لئے مختص تھا محفوظ رہا' اور یہی ٹکڑا وزن میں پختہ چھ تولے پانچ ماشے نکلا[1]۔ صاحب گلزار آصفیہ لکھتے ہیں کہ یہ اپنی تمام و کمال حالت میں گیارہ تولے تھا

سنار اپنے حصے کے ٹکڑوں کو لے آیا' اور دوسرے سناروں کے ہاتھ ایک ایک کرکے فروخت کردیا۔ اس فروخت کی شہرت ہونے لگی' اور ہوتے ہوتے وہاں کے زمیندار تک بھی پہنچی' فوراً اس نے اس سنار کو گرفتار کرلیا' اور اس پر سختیاں کرکے اس ہیرے کی تحقیقات کی' واقعات کے معلوم ہونے پر اُن سب سناروں اور اُس کمہار کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان دنوں' اس علاقہ کی تعلقداری پر بھجا راؤ نامی ایک شخص مامور تھا' اُس نے اس الماس کی ساری حقیقت مدار المہام وقت مہاراجہ چندو لال بہادر کو لکھ بھیجی۔ مہاراجہ نے محمد قمر الدین جمعدار مندوزی کو جو تعلق ارنگا نڈہ تھے' بھجا راؤ کے ہمراہ اُس زمیندار کے پاس بھیج کر اُسے طلب کیا' زمیندار نے نوبت و نقارہ اور دس ہزار کی جاگیر پانے اور اپنی اولاد کے لئے بطور آل تمغہ' سرفراز ہونے کی شرط پر اس ہیرے کو مہاراجہ بہادر کے حوالہ کردیا۔ راجہ صاحب نے حضور کی نظر اشرف میں گذرانا' اور اُسے حسب وعدہ اعلیٰ حضرت سے عرض کرکے جاگیر سے سرفراز کرایا۔ جوہریوں نے اس "نادر العصر رقم" کو دیکھ کر اور پرکھ کر' بالاتفاق عرض کی کہ یہ الماس عجائبات روزگار سے ایک لاقیمت چیز ہے' کسی ملک میں ہم نے ایسا نادر روزگار' اس قدر بڑا ہیرا دیکھا اور نہ سُنا۔ اور ایسے جوہر نایاب کی قیمت لگانے سے ہم عاجز ہیں

ہند اور ولایت' ایران کے حکاکوں کو اس الماس کی تختیاں تراشنے کے لئے حکم ہوا' تو ان لوگوں نے اس کی مزدوری پانچ لاکھ روپئے طلب کی' اور کہا کہ ہم اس الماس سے سات عمدہ باریک اور شفاف تختیاں تراش کر تیار کریں گے کہ جس کے آگے "دریائے نور" اور "کوہ نور" بے رونق و بے آب نظر آنے لگیں گے۔ غالباً حضور نے کسی خاص وجہ سے منظور نہیں فرمایا' یہ جس حالت میں دست یاب ہوا تھا' اسی طرح جواہر خانہ میں محفوظ کرلیا گیا[2]

---

[1] گلزار آصفیہ صفحہ ۶۰۰ مؤلفہ حکیم غلام حسین خاں مطبوعہ مطبع محمدی سنہ ۱۳۰۸ھ

"تاریخ ریاست حیدرآباد دکن" کے مولف نجم الغنی خاں رام پوری نے اپنی کتاب کے صفحہ انیس[1] پر اس ہیرے کے تراشنے کی اجرت پچاس ہزار لکھی ہے جو درست معلوم نہیں[2] ہوتی۔

"آئینۂ جواہر" کا مولف کہتا ہے کہ اس ہیرے کا شمار دنیا کے بڑے بڑے ہیروں میں ہے اور نظام حیدرآباد کے پاس رہنے کی وجہ سے "الماس نظام" سے مشہور ہوا ہے۔ اس کا وزن (۳۴۰) قیراط یعنی ۱۰ تولہ ۴ ماشہ[3] ہے۔ یہ کان کلور سے برآمد ہوا تھا اور ۱۸۳۵ء میں ایک شخص کے پاس بطور کھلونے کے تھا۔ ایک اور روایت یہ نقل کی ہے کہ کسی سوار نے اسے ایک مٹی کے برتن میں پایا تھا۔ جو بعد کو ایک ہندو زرگر کے ہاتھ لگا اور اس نے اس کی آزمایش کے لئے کہ یہ ٹوٹ سکتا ہے یا نہیں اس پر ضرب لگائی جس کی وجہ سے اس کے تین ٹکڑے ہو گئے[4]۔ اس کی شکل ایک چینی عورت کے پاؤں کی طرح ہے جس کا انگوٹھا نہ ہو[5]۔

کنگ صاحب (Mr king) نے بھی اس کی شکل و شباہت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ناتراشیدہ الماس ہے اسی شکل کا ہے اس کے تاریخی حالات لکھنے میں انھوں نے بھی سخت غلطی کی ہے اور ہمارے نزدیک ان کے ایسے مشہور ماہر و نقاد کے بیانات بھی قابل اعتبار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "کسی حادثہ سے ہندوستان کے غدر میں اس سے ایک ٹکڑا علیحدہ ہو گیا اور اس کا وزن (۲۴۰) قیراط ہے" بعض نے یہ شک ظاہر کیا ہے کہ کنگ صاحب نے اس کی کوئی صراحت نہیں کی کہ آیا یہ وزن اس الماس کے ٹوٹنے سے قبل کا ہے یا بعد کا؟ ایک اور انگریز ڈیولے فیٹ (Dieula Fait) کا بیان ہے کہ اس کا وزن اس کے ٹوٹنے سے پیشتر (۲۸۰) قیراط سے کم نہ تھا۔ مبصرین کے نزدیک صاحب گلزار آصفیہ کے سے معتبر مورخ کے آگے ان لوگوں کے گمانوں اور مختلف بیانوں کی کوئی وقعت نہیں اس لئے کہ انھوں نے وزن کی تصریح صاف طور پر کر دی ہے۔ باربٹ نامی ایک ماہر نے اس فرضی وزن کی بنا پر اس کی قیمت (۵) لاکھ ڈالر لکھی ہے جو بیس لاکھ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

"آئینۂ جواہر" کا مولف امرناتھ کہتا ہے کہ اس ناتراشیدہ الماس کی قیمت ٹھیک ٹھیک نہیں کہی جا سکتی۔ کیونکہ کاٹنے کی وجہ سے ناتراشیدہ الماس اکثر وزن میں کم ہو جایا کرتے ہیں، لیکن غیر تراشیدہ حالت میں اس الماس نظام کی شکل چنداں بے ڈھب بھی نہیں۔ البتہ کٹوانے میں نصف سے زیادہ کے نقصان کا احتمال نہ ہوگا۔ تاحال یہ الماس نظام حیدرآباد کے جانشینوں کے پاس[6] خیال کیا جاتا ہے۔

---

[1] تاریخ ریاست حیدرآباد دکن مطبوعہ نول کشور پریس ۱۹۳۰ء۔

[2] صاحب گلزار آصفیہ نے جو وزن چھ تولے پانچ ماشہ لکھا ہے اس کے کل (۷۷) ماشے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ وزن غلط اور ناقابل تسلیم ہے اور مولف موصوف کا ہی بیان بہت زیادہ قابل اعتبار ہے۔ ۱۲

[3] آئینۂ جواہر کے مولف نے غالباً یہ قصہ انگریزی کتابوں سے لیا ہے اور انگریز محققین نے بلا تحقیق جس طرح روایت سنی تھی اسے اپنی کتابوں میں قلم بند کر لیا گویا قصہ ان لوگوں نے غلط لکھا ہے۔ مگر گلزار آصفیہ کے ہی واقعہ کی الٹ پھیر ہے۔ غلط قصوں ہی سے صاحب گلزار آصفیہ کی تحقیقات اور سچائی کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہے۔ کمہار کے بجائے مٹی کے برتن کا ذکر کیا گیا ہے شاید مولف ظرف یہ ہے کہ ظروف کا قاعدہ نو مراد نہیں لے رہے ہیں۔ سوار کا اس ہیرے کو پانا بالکل غلط ہے۔ البتہ ایک ہندو زرگر اور اس کے تین ٹکڑے ہونا یہ صحیح ہے۔

[5] آئینۂ جواہر مصنفہ پنڈت امرناتھ حاشیہ صفحہ ۱۶۴ مطبوعہ خادم التعلیم پریس لاہور ۱۹۱۳ء

[6] آئینۂ جواہر صفحہ ۱۶۴

رہبر فاروقی

پاؤں میز

یعنی پاؤں ناپنے کی رسم

"یہ مضمون تقی عابدی صاحب کی اس دلچسپ کتاب کا ایک ٹکڑا ہے جو حیدرآباد کی شادیوں پر لکھی جا رہی ہے۔"

سانچے موتی کی ایک لڑ چاندی کی تھالی میں رکھ کر تھالی رسم کی کشتی میں رکھ دی جاتی ہے۔ دوسری کشتی میں بناری دوپٹہ جس پر مسالا ٹکا ہوا ہوتا ہے۔ رکھا جاتا ہے۔ تیسری کشتی میں مالیدہ، کھوپرہ کا چورا، مصری ڈلیاں، لے سبز پان، بڑلی سپاری، مالیدہ کے لڈو طشتریوں میں جما کر۔ ایک چاندی کی کٹوری میں صندل۔ چاندی کے ڈبے۔ لے پان جس کو لال ناڑہ باندھا جاتا ہے۔ چاندی کے لڈو۔ چاندی کی سپاری وغیرہ کو کشتی میں جما کر رکھا جاتا ہے۔ جملہ سامان رسم کو چاندی کا ورق لگا کر رکھ دیا جاتا ہے پھر زردوزی تھالی پوش اڑھا کر کشتیوں کو لال بستنی میں باندھ کر زردوزی کشتی پوش اڑھا دئے جاتے ہیں۔ ایک پلیا یا آدھا پاؤ مصری خوانوں میں رکھ کر بستنی سے باندھ کر ان پر مخملی خوان پوش اڑھا دئے جاتے ہیں۔ چاندی کی چنگیر میں پھولوں کا گہنا رکھ کر خاص طور پر مشاطہ کے ہاتھ چنگیر دیا جاتا ہے۔ یہ خدمت سوائے مشاطہ کے دوسرا کوئی انجام نہیں دے سکتا۔ ورنہ مشاطہ لڑائی جھگڑے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ رسم بھیجتے وقت مشاطہ کو لال چادر اوڑھنا ضروری ہے۔ اگر چادر سفید ہو تو اس پر لال لال چھینٹے دے دیئے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سہاگ کے کام میں سفید چادر بھی نہ رہے۔ حیدرآباد میں بیوہ عورتیں سفید کپڑے استعمال کرتی ہیں۔ رنگین کپڑے۔ مہندی۔ پھول۔ چوڑیاں وغیرہ استعمال کرنا "ترکِ لذت" کے منافی ہے۔ اور پھر یہ چیزیں بیوہ اور سہاگن کی علامت امتیازی قرار پا چکی ہیں۔ چنانچہ بیوہ عورتیں بجائے کانچ کی چوڑیوں یا جوڑے کے سونے یا چاندی کی چوڑیاں پہنتی ہیں جنہیں "چوڑ" کہا جاتا ہے۔ جملہ سامان رسم ایک زردوزی شامیانے کے نیچے جسے "ڈنڈا پیشگی" کہتے ہیں۔ اس ترتیب سے ہوتا ہے کہ آگے آگے مشاطہ پھولوں کی چنگیر لئے ہوئے اور پیچھے مزدوروں کے سر پر جملہ رسم کی کشتیاں۔

دکن میں شامیانہ صرف میت کے وقت استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ میت کے وقت اس کو شامیانے کا نام دیا گیا ہے۔ اس لئے اس کو ڈنڈہ پیشگی کہتے ہیں حالانکہ یہ دونوں کوئی علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔ اسی طرح رواہ کھویا اور روغن زردے جو میٹھا پکایا جاتا ہے عام طور پر اس کو میٹھا یا حلوہ کہتے ہیں۔ مگر کسی کے ماتم یا چہلم میں اسی میٹھے کا نام "بھیکا" رکھا جاتا ہے۔

بہرحال جملہ سامان رسم بہ ترتیب متذکرہ جب شامیانہ یا ڈنڈہ پیشگی کے نیچے آجاتا ہے تو مختلف باجہ نواز تاشہ، نفیر، روشن چوکی، ڈھول۔ بینڈ وغیرہ کے ساتھ جو آگے آگے بجتا رہتا ہے۔ دلہن کے گھر بھیجا جاتا ہے۔ سر شام دلہن کے گھر دولہا کی سہاگن رشتہ دار عورتیں یعنی سمدھنیں رسم کرنے آتی ہیں۔ دولہا کی ماں کے ساتھ چاندی کی تھالی میں سو، سوا سو، روپیہ، اشرفیاں یا کسی قسم کا زیور ہوتا ہے جو بطور چڑھاوے کے دلہن کو دیا جاتا ہے۔ اور سمدھنیں کے ساتھ ایک میراثنیوں کا طائفہ بھی ضرور رہتا ہے۔ میراثنیوں کا وجود ان کے مخصوص گانوں کی وجہ سے شادی اور رسم کا جزو لاینفک ہے۔

---- ۲ ----

ادھر دلہن کے گھر کو فرش فروش سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ دالان میں گاؤ تکیے لگائے جاتے ہیں۔ بیچ دالان میں ایک

تاش کا منڈپ باندھا جاتا ہے۔ منڈپ باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو شل ہے بیل منڈوے چڑھے تو گویا منڈپ تو منڈوہ ہے اور بیل آل اولاد کی جو آگے چڑھے گی۔ غریبوں میں تو اب تک لکڑیوں کو رنگ، کر سبز سبز پتوں سے منڈپ باندھا جاتا ہے۔ مگر امیروں اور صاحب استطاعت لوگوں نے منڈوے سے منڈپ اس طرح بنا لیا ہے۔ اسی منڈپ کے نیچے ایک لال رنگ کی "پاؤں گھڑی" یعنی پا انداز بچھاتے ہیں تاکہ سمدھنیں منڈپ کے نیچے اور اس پاؤں گھڑی پر سے چلتی ہوئیں دالان میں داخل ہو سکیں۔ منڈپ کے نیچے دلہن کی کوئی ایک ان بیاہی رشتہ دار لڑکی چاندی کی کٹوری میں صندل لے کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اور جب سمدھنیں آنا شروع ہوتی ہیں تو ہر سمدھن کو "صندل ہاتھ" دیا جاتا ہے۔ صندل ہاتھ دینے کا طریقہ یہ ہے کہ صندل کی کٹوری میں چار انگلیاں ڈبو کر ہر سمدھن سے اس طرح ہاتھ ملایا جائے کہ اس کے ہاتھ میں ہی صندل لگ جائے کہ یہ نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ انہی آنے والی سمدھنوں میں اگر کوئی سمدھن "امید" سے ہوں تو وہ منڈپ کے نیچے نہیں آ سکتیں اور نہ ان کا گود بھرا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قدرتاً تو ان کا گود بھر جانے والا ہے۔ اب اگر گود بھرا جائے گا تو وہم یہ ہے کہ بچہ ضائع ہو جائے گا۔ اور گود خالی ہو جائے گا۔ اسی طرح چونکہ منڈپ میں بھی گود ڈالا جاتا ہے اس لئے یہ اس کے نیچے بھی نہیں جا سکتی۔ منڈپ میں گود اس لئے ڈالتے ہیں کہ منڈپ ایک ایسا منڈوہ ہے جس پر آل اولاد کی بیل چڑھتی ہے۔ گود میں پان شریک ہوتے ہیں۔ و پان کی بیل ہوتی ہے اس لئے ابتدا ہی سے گویا منڈپ میں گود ڈال کر بیل چڑھا دی جاتی ہے۔ تاکہ آئندہ آل اولاد کی بیل ہمیشہ ہری بھری اور چڑھتی ہی رہے۔

منڈپ کے قریب ہی ایک طرف میراثنیوں کا طائفہ بیٹھا ہوا گاتا رہتا ہے۔ ان لوگوں کے گانے بہت و قدیم ہوتے ہیں۔ ہر موقعہ اور رسم کے لحاظ سے یہ لوگ مخصوص گانے گاتے جانتے ہیں۔ ان کے گانے اپنے وقت پر درج ہوں گے۔ چنانچہ جس وقت سمدھنیں آتی ہیں تو میراثنیں یہ مخصوص گانا گاتی ہیں۔

ساجن آئی رے اللہ پیر منائی رے

میری ساجن آئی رے

جب سمدھنیں دالان میں گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتی ہیں تو انھیں "مصری چنائی" جاتی ہے۔ دو مامائیں سمدھنوں کے سر پر ایک تاش کا مسالا ٹکا ہوا دوپٹہ پکڑ لیتی ہیں اور دلہن کی ایک سہاگن رشتہ دار بیوی چاندی کی طشتری میں مصری کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں جن پر چاندی سونے کا ورق لگا ہوا ہوتا ہے لاتی ہیں اور ہر سمدھن کے آگے باری باری سے پیش کرتی ہیں۔ ہر سمدھن ایسے موقعہ پر شرم اور جھینپ کا اظہار ضرور کرتی ہے۔ اب خواہ یہ فطرتاً ہو یا رسماً بہرحال رسم کی پابندی انھیں ضرور کرنی پڑتی ہے۔ نئی لڑکیاں جو نا کتخدا ہیں مصری لینا تو کجا آنکھ تک اوپر نہیں اٹھاتیں۔ مگر مصری لانے والی بیوی جبر و قہر اور زور و زبردستی کے ساتھ ان کے منہ میں مصری ٹھونس ہی دیتی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ فقرے بھی کستی جاتی ہیں جس سے وہ بیچاری تو مارے شرم کے عرق عرق ہوتی جاتی ہے اور ادھر خوب فرمائشی قہقہے اڑتے ہیں۔ مصری چنائی جاتے وقت میراثنیاں گاتی ہیں

سمدھن میری مصری کھاوے

اس کے بعد گانا شروع ہوتا ہے۔ ٹھمری۔ دادرا غزل وغیرہ جب میراثنیں گا چکتی ہیں تو دلہن کو لاڈ کی جلدی شروع کی جاتی ہے۔ ادھر تو جلدی ہوتی ہے اور ادھر دلہن کو سنوارا جاتا ہے۔ دلہن بیچاری کا شروع شادی سے اخیر شادی تک

اپنے اوپر کوئی اختیار نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ اپنی آنکھوں کو بند رکھے باقی جملہ کام اوپر والے جو چاہتے ہیں کرلیتے ہیں۔

دلہن کو کسی ایک قسم کا قیمتی جوڑا کپڑوں کا پہنایا جاتا ہے اور وہ زیور بھی جو دلہن کو جہیز میں دیا جانے والا ہے۔ پہنا دیتے ہیں آنکھوں پر "آرائش" لگاتے ہیں۔ یعنی باریک کٹے ہوئے مقیش سے افشاں چنا جاتا ہے۔ سرمہ لگایا جاتا ہے۔ اور ایک لمبا سا گھونگھٹ کھینچ کر کوئی ماما۔ انا۔ ودا یا چھوکری دلہن کو گود میں اٹھاکر باہر اس زردوزی مسند پر لا بٹھاتی ہے جو دالان میں منڈپ کے نیچے اسی رسم کے لئے بچھائی جاتی ہے۔ ایک مخصوص گیت ہوتا ہے جو ایسے وقت میں میراثنیاں نہایت جوش میں گاتی رہتی ہیں۔ اس وقت کا سماں قابل دید اور اس وقت لوگوں کے جذبات دیکھنے کی چیز ہیں سب سمدھنیں خاموش دلہن کے کمرے کی طرف نگاہیں لگائے سراپا انتظار اور مجسم اشتیاق بنی بیٹھی ہوتی ہیں۔ جیسے ہی دلہن نظر آتی ہے۔ میراثنیوں کا جوش اور بڑھ جاتا ہے۔ سمدھنوں کے چہرے پھول کی طرح کھل جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ تبسم۔ ہنسی سے بدل جاتا ہے۔

آئی بنو آئی - ہریالی بنو آئی
اماں کی پیاری بنو آئی باوا کی پیاری بنو آئی
آئی بنو آئی

کا گیت سمدھنوں میں ایک عجیب جوش و خروش پیدا کر دیتا ہے۔ باہر نوبت نوازی شروع ہو جاتی ہے۔ اور اب رسم شروع ہوتا ہے۔ رسم دولہا کی سہاگن پھوپی یا بہن کو کرنا پڑتا ہے۔ دولہا کی والدہ اُن سے نہایت عجز و انکسار اور منت کے ساتھ کہتی ہیں آپ بزرگ ہیں۔ اگر آپ کے ہاتھ سے یہ "کاج" ہو جائے تو میری خوش نصیبی ہے۔ خدا آپ کی چھاؤں (سایہ) دلہن پر بھی ڈالے اور وہ دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ اگر دولہا کے رشتہ داروں میں سے کوئی بزرگ نہ ہو اور خود دولہا کی ماں سہاگن ہوں تو رسم کرنے بیٹھتی ہیں۔ رسم کرنے کے لئے سہاگن کا ہونا ضروری ہے۔

کشتیاں اور چنگیر جو دولہا کے گھر سے آتے ہیں وہ مسند کے قریب رکھ دئے جاتے ہیں۔ رسم کرنے والی بیوی پہلے اپنے گلے کو صندل لگاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ خود سہاگن ہیں اور پھر وہ سہاگن جن کا سہاگ بہت قدیم ہے مطلب یہ کہ ان کی طرح دلہن کا بھی سہاگ تا دیر قائم رہے۔ اپنے گلے کو صندل لگا لینے کے بعد دلہن کے گلے۔ سینہ اور پیٹھ پر صندل لگا کر سات۔ نو یا گیارہ سہاگنوں کو بھی بہ ترتیب متذکرہ صندل لگایا جاتا ہے۔ اگر دلہن کمسن ہو تو پھر دلہن کو صندل لگانے کے بعد علاوہ سہاگنوں کے اَن بیاہی لڑکیوں کو بھی صندل لگایا جاتا ہے تاکہ اُن کی شادی بھی جلدی ہو جائے۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ رسم ہوتے وقت اگر کوئی چھینک دے تو رسم تھوڑی دیر کے لئے روک دیا جاتا ہے۔ حالانکہ چھینکنے کے بعد مسلمان الحمد اللہ کہہ کر شکر ادا کرتے ہیں۔ تاہم اس کو کسی کام کی ابتدا میں منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح باہر نکلتے وقت کوئی چھینک دے یا کوئی سامنے آجائے یا ٹھوکر لگ جائے تو تھوڑی دیر کے لئے باہر جانا موقوف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ناکامیابی کی علامت ہے بجائے اس کے اگر کوئی مہتر یا کوئی شخص "دہی" لے کر سامنے آجائے تو کامیابی یقینی سمجھی جاتی ہے۔

صندل لگاتے وقت میراثنیں گاتی ہیں۔

صندل لگاؤ ہریالی بنو کو۔ راج دلاری بنو کو

صندل لگا چکنے کے بعد گود بھرے جاتے ہیں۔ پہلے رسم کرنے والی بیوی اپنا گود بھر لیتی ہیں۔ اس کے بعد دلہن کا گود چاندی کی سپیاری اور چاندی کے لڈو سے حسب مقدور روپیہ رکھ کر بھرا جاتا ہے۔ دلہن کے قریب دلہن کی ایک رشتہ دار سہاگن بیٹھتی ہیں۔ شرم کی وجہ سے دلہن جھکی ہوئی بیٹھتی ہے۔ اس لئے یہ بیوی دلہن کا سر بھی تھامے ہوئے رہتی ہیں اور موقعہ بموقعہ دلہن کو امداد بھی دیتی جاتی ہیں۔ چنانچہ جس وقت دلہن کا گود بھرا جاتا ہے تو یہ بیوی ایک ریشمی رومال دلہن کے گود میں بچھا کر گود حاصل کر لیتی ہیں۔ دلہن کا گود بھرنے کے بعد منڈپ میں بھی ایک گود ڈالا جاتا ہے اور پھر سات "نو" یا گیارہ سہاگنوں کے گود بھرے جاتے ہیں۔ گود بھرتے وقت میراثنیاں یہ مخصوص گیت گاتی ہیں۔

ہریالی کا گود بھراؤ۔ پیا کے کارن۔ راج دلاری کے گود بھراؤ
سب مل کر گود بھراؤ۔ سہاگنوں کا گود بھراؤ پیا کے کارن
گود بھراؤ مانگ لگاؤ۔ موتیوں کے چوک پراؤ پیا کے کارن

گود بھرائی ہو چکنے کے بعد دلہن کا منہ میٹھا کیا جاتا ہے۔ رسم کرنے والی بیوی مصری دلہن کے منہ کے پاس لے جاتی ہیں اور وہ بیوی جو دلہن کے قریب بغرض امداد بیٹھتی ہیں ہاتھ بڑھا کر مصری لے لیتی ہیں۔ اس کے بعد "چوبا" کھلایا جاتا ہے۔ مصری کھلاتے وقت کا مخصوص گیت یہ ہے۔

مصری کھاوے بنو میری۔ یہ سہاگن کے ہاتھ سے کھاوے
یہ بچہ والی کھلاوے۔ بنو میری مصری کھاوے

چوبا کھلاتے وقت بجائے مصری کے چوبا کھاوے گاتے ہیں۔ بقیہ گانا یہی ہوتا ہے۔ چوبا کھلانے کے بعد دلہن کو پان کھلایا جاتا ہے۔ پان پر سونے چاندی کے ورق لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس وقت کا مخصوص گیت یہ ہے۔

بنڈری کو پان کھلاؤ ری البیلی سہاگن

پان کھلا کر پھولوں کا گہنا اور ہار پہنائے جاتے ہیں۔ اس وقت یہ مخصوص گیت گایا جاتا ہے۔

ہار وری ماں یہ لال بنو کے گلے
اماں پیاری کے گلے۔ باوا پیاری کے گلے
جائی۔ جوئی اور بیلا چنبیلی۔ اچھے گلابوں کے ہار
یہ چاند بنو کے گلے۔ ہار وری ماں یہ لال بنو کے گلے

یہ جملہ رسوم گویا تمہید تھے اصل پاؤں ناپنے کی رسم کے۔ کیونکہ جب تک یہ سارے رسوم نہ ہوں کوئی رسم ہی نہیں کہلاتا۔ بہرحال یہ سب مراحل طے ہو جانے کے بعد وہ موتیوں کے لڑ جو ساتھ لائی گئی ہے۔ رسم کرنے والی بیوی نکالتی ہیں اور ادھر سے دلہن کے پاس بیٹھی ہوئی دلہن کی رشتہ دار سہاگن دلہن کا سیدھا پاؤں آگے بڑھا دیتی ہیں اور اس "لڑ" سے پاؤں ناپ لیا جاتا ہے۔ یہ لڑ جس سے پاؤں ناپا گیا ہے جلوہ کے روز دلہن کی نتھ میں ڈالی جاتی ہے۔

اس کے بعد "رونمائی" ہوتی ہے اور جو روپیہ، اشرفیاں یا زیور لایا گیا ہے وہ اس طرح دلہن کو "سلامی" میں

دیا جاتا ہے کہ دلہن کے قریب بیٹھی ہوئی بی بی دلہن کے دونوں ہاتھ آگے پھیلا دیتی ہیں اور رسم کرنے والی بیوی "سلامی" دلہن کے ہاتھوں میں ڈال دیتی ہیں اور ساتھ ہی دلہن کے سر سے جھٹ جھٹ بلائیں لے لیتی ہیں اس کے بعد "وارن پھیرن" شروع ہوتا ہے۔ ایک میراثن دلہن کے قریب آکر کھڑی ہو جاتی ہے تاکہ "وارن پھیرن" کے روپے حاصل کرے کیونکہ یہ حق میراثن ہی کا ہوتا ہے اس طرح اسے بھی سو سوا سو روپے مل جاتے ہیں۔ بہرحال ایک ایک سمدھن آتی جاتی ہیں دلہن کا منہ دیکھتی ہیں اور حسب مقدور روپیہ وار کر میراثن کو دیتی جاتی ہیں۔ بقیہ میراثنیاں یہ مبارک بادی گاتی رہتی ہیں جس کے بعد یہ رسم ہوجاتا ہے اور دلہن کمرہ میں پہونچائی جاتی ہے۔

تمھیں یہ شادیاں جم جم مبارک ہو مبارک ہو
مچی ہے دھوم شادی کی مبارک خانہ آبادی
دہ شہزادہ یہ شہزادی مبارک ہو مبارک ہو

تقی عابدی

کوہِ نور

(گولکنڈہ کا مشہور ہیرا جو اب شہنشاہ انگلستان کے تاج کی زینت ہے۔)

بحرِ ظلمات میں ڈوبا ہوا تارا تھا کوئی
پردۂ خاک سے سورج کی کرن نکلی ہے
کسی معشوق جواں سال کا نگین دل ہے
سنگ کی شکل میں اک نور نظر آتا ہے
شعلۂ حسن ہے یہ جلوۂ نیرنگ ہے یہ
جو یہی دیکھ کے کہتا ہے کہ "لا قیمت ہے

راکھ کے ڈھیر میں خوابیدہ شرارا تھا کوئی
جلوہ بردوش تمنائے دکن نکلی ہے
زر پرستوں کے لئے شمع سرِ محفل ہے
پرتوِ جلوہ گہہ طور نظر آتا ہے
رونق تاج ہے یہ زینت اورنگ ہے یہ
جس کی قسمت میں یہ آجائے وہ خوش قسمت ہے"

ذرہ کہتا ہے کہ "یہ کیا ہے تماشا یارب؟
مہر تابندہ سے بڑھ کر ہے یہ ذرہ یارب؟
کس سے یوں نور کہ اب میری نظر ششدر ہے
یہ تو چرخ پر مہر ہے اور ارض پہ یہ پتھر ہے
ایک ہے دور بہت ایک ہے آنکھوں سے قریب
کس کو سجدہ کرے حیران ہے یہ بیچارہ غریب"

میکش

سمستانِ جٹپول

ہماری سلطنت آصفیہ کے زیر اقتدار بہ عنایت الٰہی ایسے متعدد علاقے ہیں جو اپنی وسعت اور آمدنی کے اعتبار سے ہندوستان کے ان اسٹیٹوں سے بڑھے ہوئے ہیں جن کے حکمران ہز ہائینس کے خطاب سے ممتاز اور توپوں کی سلامی کا اعزاز رکھتے ہیں بلکہ ان میں کے بعض تو یورپ کی چھوٹی چھوٹی خود مختار سلطنتوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ایسے تمام علاقوں کے والی (نواب یا راجہ) کی جانشینی و علیحدگی، تبنیت و وراثت، عطائے اختیارات عدالتی و کوتوالی، اعلیٰ عہدہ داران اسٹیٹ کا تقرر و تنزل کلیتہً حکومت عالیہ آصفیہ نظامیہ کی منظوری کا تابع ہے۔ ان ہی علاقوں میں سے ایک سمستان جٹ پول ہے جس کا رقبہ ۵۰.۵۴۵ مربع میل (تو سو ساٹھ ایکڑ) اور جس کی مردم شماری ۵۰،۸۰۹ ہے

جٹ پول کا صحیح تلفظ جٹ پرول ہے۔ جٹایو ایک پرندہ کا نام ہے اور پرول کے معنی شہر کے ہیں۔ وجہ تسمیہ اس کی یہ ہے کہ جب راون، رام چندر جی کی باعصمت بیوی کو ان کے بن باس کے زمانہ میں اڑائے جا رہا تھا تو یہ پرندہ اس مقام پر راون کا سدراہ ہوا۔ راون کو جو نشۂ حکومت میں سرشار تھا۔ جٹایو کی یہ مزاحمت غضب آلود کر دی اور اس نے اس پرند کو مار ڈالا یا کم از کم یہ کہ اس کو زخمی کر دیا اور اس کا بازو اسی مقام پر گر گیا جس کی یادگار میں جٹیشور نام کی ایک دیول تعمیر کی گئی جو اب تک موجود ہے اور یہیں ایک شہر جٹ پرول نام کا بسا جو اب ایک معمولی سا قریہ رہ گیا ہے۔ بعد میں یہ علاقہ بھی اسی نام سے موسوم ہو گیا۔

سنسکرت میں سنوستھان راجہ کے رہنے کی جگہ کو کہتے ہیں کثرت استعمال سے واؤ اور ھ حذف ہو گئے اور نون میم سے بدل کر سمستان ہو گیا اور اس سے مراد ایسا علاقہ عطیہ شاہی قرار پایا جس میں ملک کا ایک حصہ ایک رقم معینہ کے ٹھیراؤ سے کسی کو عطا کیا گیا ہو اس رقم معینہ کو اعزازاً پیش کش کہتے ہیں۔ اس طرح ان دونوں الفاظ کی ترکیب سے اب یہ علاقہ سمستان جٹ پول کہلاتا ہے۔ مگر سمستان کا مستقر اب جٹ پول نہیں بلکہ کولاپور ہے جو حیدرآباد سے (۱۴۰) میل جانب جنوب ضلع محبوب نگر میں ہے حیدرآباد سے براہ جڑچرلہ و کتہ کوٹہ یا پرال تک ۱۱۰ میل کی سیدھی سڑک تعمیرات سرکار عالی کی ہے۔ اس کے بعد ۲۰ میل کا راستہ علاقہ سمستان جٹ پول کا ہے جو دریائے کرشنا کے متوازی کولاپور تک چلا گیا ہے۔

یہاں کے راجہ ریچرلہ گوترم سے سر بھی خاندان کے ارکین ہیں جو جنوبی ہند کا ایک بڑا معزز اور قدیم خاندان ہے۔ اس خاندان کے دیگر اراکین علاقہ مدراس میں بوبلی، وینکٹ گری، پتھاپور، میلارم کے راجہ ہیں آخری والی سمستان جٹ پول راجہ وینکٹ لچھماراؤ یہاں کے تائیسویں راجہ تھے ان کا اصلی نام کرشنا چندریا ہے راجہ وینکٹ جگناتھ راؤ نے انھیں ۱۸۶۷ء میں متبنیٰ لیا اور وینکٹ لچھماراؤ نام رکھا بعد میں اعلیٰ حضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہٗ نے نظام نواز ونت کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

مستقر سمستان کولاپور جس کی مردم شماری ۳۱۵۸ ہے دریائے کرشنا کے شمال میں ۶ میل پر ایک وسیع میدان

میں سطح سمندر سے ۱۴۹۵ فٹ مرتفع مقام پر آباد ہے اس کی جدید آبادی راجہ کے شاندار اور خوبصورت اسم بامسمیٰ چندر محل کے اطراف سلیقے سے بسائی گئی ہے اس چھوٹی سی مگر خوشنما آبادی میں صاف وشفاف پانی ایک باؤلی پر پمپ لگا کر نل کے ذریعہ پہونچایا جاتا ہے اور بجلی کی روشنی بھی ہوتی ہے سڑکیں اگرچہ مورم کی ہیں مگر صاف ستھرے عوام کے مکانات گو چھوٹے چھوٹے ہیں لیکن باہر سے خوش وضع معلوم ہیں کہ اجازت تعمیر مکان دیتے ہوئے باہر کے ایلیویشن کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

راجہ صاحب کے عالی شان چندر محل کے علاوہ یہاں ایک بڑا دو منزلہ گسٹ ہوس ہے ایک پختہ مسافر خانہ ہے ڈاکٹر خانہ کی پختہ تعمیر ہے مدرسہ وسطانیہ ہے اسٹیٹ کے دفاتر کی عمدہ پکی عمارت ہے یہ سب جدید ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ وینکٹ لچھا راؤ المخاطب بہ نظام نواز ونت بہادر آنجہانی جو ۱۲۹۶ف سے ۱۳۲۷ف تک یہاں کے راجہ رہے پسند اور تزئین آبادی کے شایق تھے اور مولوی محمد علی صاحب اعلیٰ عہدہ دار اسٹیٹ کا تجربہ سلیقہ وتمیز جو انھوں نے سرکار عالی کی ملازمت میں عہدہ داران سرکار عالی سے حاصل کیا اسٹیٹ کے لئے بڑا مفید رہا صاحب موصوف ۱۳۰۸ف سے یہاں کار فرما ہیں اور تحصیلداری تبدیل کرتے ہوئے اسٹیٹ کی سب سے بڑی خدمت پر اس وقت مامور اور جس طرح والی اسٹیٹ کی نظروں میں باوقعت رہے۔ اسی طرح عوام میں ہر دل عزیز ہیں۔

اس سمستان کے ۶۸ مواضع اور ۲۸ مزرعے ہیں جو بہ استثنا ایک موضع چیٹیال کے باقی سب ایک ہی سلسلہ میں واقع ہیں البتہ شمال میں سمستان ونپرتی اور گوپال پیٹھ یا زبردست خاں کی جاگیر کے ۲۰۔۴ مواضع اس علاقہ میں آگئے ہیں۔ اس سمستان کے مغرب میں تعلقہ عالم پور ضلع رائچور اور علاقہ سمستان ونپرتی ہے (ونپرتی بھی ہمارے ہی علاقہ کا سمستان ہے) مشرق میں دریائے کرشنا اور سرحد تعلقہ امرآباد ضلع محبوب نگر۔ جنوب میں دریائے کرشنا اور شمال میں تعلقہ ناگر کرنول ضلع محبوب نگر ہے۔ سمستان کی سالانہ آمدنی پانچ لاکھ ہے جس کے منجملہ کوئی ـــ ہزار طبابت، تعلیمات، آبرسانی، الکٹرک، سڑک کی ترمیم اور نگہداشت اور خیرات مبرات میں خرچ کیے جاتے ہیں۔ بمقابلہ آمدنی ان مدات میں (تقریباً) صرف ۶ فیصد مصارف یقیناً ناکافی ہیں ـــ ہزار میں بھی تعلیمات کا حصہ کل ـــ اور طبابت کا ـــ ہے جو بہت ہی کم ہے لیکن یہ اطمینان بخش ہے کہ اسٹیٹ بہرحال ترقی کے لئے کوشاں ہے چنانچہ حال میں ـــ کے صرف سے ڈاکٹر خانہ کی عمارت بنائی گئی ہے مدرسہ وسطانیہ کی تعمیر میں ـــ ہزار صرف کیے گئے تزئین آبادی کے مساعی بھی حال کی پیداوار ہے برقی روشنی اور نل کے ذریعہ آب رسانی بھی یہاں جدید چیزیں ہیں۔

کولاپور کے مغرب میں آبادی سے کچھ ذرا سا ہٹا ہوا ایک وسیع ہموار میدان ہے یہ گویا یہاں کا وسیع میدان ہے جو پولو، کرکٹ اور اسپورٹس کے کام آتا ہے۔ راجہ صاحب آنجہانی کے داماد اور فرزند کو ایسے مردانہ کھیلوں کا شوق رہا ہے۔ اس میدان کے کنارے ایک دو منزلہ بنگلہ ہے جو بالعموم گسٹ ہوس اور دسہرہ وغیرہ کے موقع پر پویلین کا کام دیتا ہے اس بنگلہ سے سامنے کا یہ وسیع میدان اور سرسبز جنگل اور پہاڑ پر لطف منظر ہے۔

ـــ کے مشرق میں اسٹیٹ کا ایک باغ میوہ اور پھولوں سے لدا ہوا ہے جس کے بیچوں بیچ سندر محل اسم بامسمیٰ ہے۔

اس کی تعمیر ۱۳۱۷ف میں ہوئی۔ ڈاکٹرخانہ کی پختہ عمارت جس کی بنا مسز گرانٹ (اہلیہ صدر ناظم ومعتمد مال حکومت سرکار عالی) نے ۹ اردی بہشت ۱۳۳۵ف کو رکھی اور جس کا افتتاح ۴ شہریور ۱۳۴۰ف کو ہوا ضرورت مقامی کے لئے ایک مکمل عمارت ہے اس کا نقشہ ناظم صاحب طبابت سرکار عالی نے دیا تھا۔ اس عمارت میں زنانہ اور مردانہ مریضوں کے لئے علحدہ علحدہ وارڈ ہیں۔ ادویات اور آلات جراحی کا کافی ذخیرہ ہے سند یافتہ ڈاکٹر مامور ہیں اور خوبی کی یہ بات ہے کہ دواؤں کا موازنہ جو عوام کے لئے ہے محل کی ضروریات سے متاثر نہیں ہونے پاتا بلکہ ڈیوڑھی کے ادویہ کا خرچ محل ہی کے موازنہ سے پورا ہوتا ہے۔

راجہ صاحب کے محل کے شمالی ومشرقی گوشہ پر دو ہاتھیوں کا تھان پر جھوناشان دار صدر دروازہ پر رسالہ کے باڈی سپاہی ہاتھ میں برچھا لئے پہرہ دیتا۔ اس دروازے کے مقابل ہی خوبصورت برجی میں برجی گھڑیال دروازہ کے منزل بالا پر نوبت ونقارہ مشرقی امرا کے شان کا ایک پر رعب و پرجلال منظر ہے اس صدر دروازہ سے داخل ہونے پر سیدھے طرف ایک مختصر سے چمن کے وسط میں سرزی راجہ وینکٹ لچھا راؤ نظام نواز ونت بہادر کا تپلا (اسٹیچو) ہے جس کے پائین کتبہ لگا ہے جس سے واضح ہے کہ ان کی تاریخ پیدایش ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء اور تاریخ وفات ۵ اپریل ۱۹۲۸ء م ۱۱ خورداد ۱۳۳۷ف ہے۔ حکومت سرکار عالی کی منظوری کے بعد یہ ۶ مارچ ۱۸۸۶ء (مطابق ۴ فروردی ۱۲۹۶ف) کو اس علاقہ کے راجہ ہوئے۔

جو حالات سنے گئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آنجہانی راجہ بڑے شکاری تھے۔ ۲۹ شیر ۵۸ پونچے اور ۲۹ ریچھ مارے ہیں۔ شکار اور شکاریوں کی تاریخ میں یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ ۶ ستمبر ۱۹۲۲ء کو راجہ صاحب نے سوا گھنٹہ کے اندر ۵ شیر مارے۔ ان میں جہاں سپاہیانہ جوہر نظر آتے ہیں۔ وہیں انتظامی قابلیت بھی عیاں ہوتی ہے۔ اسٹیٹ کی موجودہ ترقیاں انہی کے عہد سے شروع ہوئی ہیں اب انہی کی رانی صاحبہ سرجی وینکٹ رتنما جو ویلی واڑہ تعلقہ سرسلہ ضلع کریم نگر کے دیسائی کی صاحبزادی ہیں اسٹیٹ کے کاموں کی نگران ہیں اور باوجودیکہ گوشہ کی سخت پابند ہیں حتیٰ کہ ان کے اعلیٰ عہدہ دار بھی انھیں بے پردہ نہیں دیکھ سکے پھر بھی اسٹیٹ کا انتظام خوبی سے کر لیتی ہیں۔

کیا میں اس موقع پر کہہ سکتا ہوں کہ گوشہ اور پردہ کو جو تجدد پسند ترقی وانتظام دنیوی میں ہارج سمجھتے ہیں وہ اس مختار جائداد پردہ نشین ہندو رانی کے عمل کو دیکھیں۔ میں نے محترمہ بیگم صاحبہ سر بلند جنگ کا ایک مضمون کسی اخبار میں چند دن قبل پڑھا تھا جس میں موصوفہ نے بعض بڑے گھرانوں کی بیگمات کے نام گنائے تھے کہ وہ باوجود پردے میں رہنے کے کامیابی کے ساتھ اپنے وسیع علاقہ کا انتظام کرتی ہیں ان مثالوں میں رانی سرجی وینکٹ رتنما صاحبہ کے نام کا اضافہ کر لینا چاہیئے۔

ہم راجہ صاحب کے محل کا ذکر کر رہے تھے جس کے صدر دروازے سے داخل ہونے کے بعد آنجہانی راجہ صاحب کے اسٹیچو (پتلے) کے سلسلے میں ان کے اور ان کی رانی صاحبہ کے کچھ حالات لکھ دیئے اس محل کو جو چندر محل سے موسوم ہے ۱۸۰۷ء میں راجہ وینکٹ جگناتھ راؤ نے بنوایا۔ یہ ایک قدیم وضع کی عمارت بڑے بڑے نیل پایوں پر ہے اس کی دیواریں کسی قلعہ کی فصیل معلوم ہوتی ہیں اسی محل پر راجہ وینکٹ لچھا راؤ نے ایک اور منزل ۱۲۹۹ف میں بڑھائی اور ۱۳۲۰ف میں اسی کے عقب وجیا محل کے نام سے زنانی حصہ تعمیر کرایا۔

بہت بڑے کمپونڈ میں بلند وبالا عمارات کا تسلسل بیسیوں دریچے اور دروازے متعدد برآمدے اور شاہ نشین سے

تمکین کی شوکت وحشمت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس احاطہ میں آنے کے بعد یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ ہم تین ہزار کی مردم شماری والے قصبہ میں ہیں بلکہ گمان ہوتا ہے کہ دفعتہً حیدرآباد جیسے بلدۃ الامراء میں کسی بڑے امیر کی دیوڑھی میں پہونچ گئے۔ چندر محل کے شان دار ڈرائینگ روم میں جس کے فرش وفرنیچر اور دیواروں پر راجہ نظام نواز ونت آنجہانی کے شکار کئے ہوئے جنگلی جانوروں کی کھالیں مختلف طرح پر بچھی یا لٹکی ہوئی تھیں ہم نے دو تصویروں کو بڑی دیر تک دیکھا۔ ان میں سے ایک تو راجہ وینکٹ جگنا تھ راؤ آنجہانی کی تھی جو بڑا سا پگڑ باندھے، انگرکھا پہنے، کندھے پر تلا لٹکائے تلوار ہاتھ میں تھامے پوچی بنے کھڑے ہیں دوسری انہی کے ہم نام انہی کے نوجوان پوتے کی جو سوٹ بوٹ میں ملبوس یوروپین وضع قطع بنائے مسکرا رہے ہیں۔ یہ دونوں تصویریں تبدیل لباس، تبدیل مذاق، تبدیل وضع کی معاشرتی تاریخ آنکھوں کے سامنے پیش کرتی ہیں۔

یہاں کی عمارتوں میں بہم رسانی قوت برقی کا مکان (پاور ہوس) بھی قابل ذکر ہے۔ اس مکان میں جو بالکل تجارتی اصول پر بقدر ضرورت اور سستے داموں میں بنایا گیا ہے۔ دو مشین لگے ہیں ایک (۲۰) گھوڑوں کی طاقت کا دوسرا اس کا نصف اس کے ذریعہ محل میں روشنی اور پنکھے دن رات اور عوام کے لئے سر مغرب سے ۹ بجے شب تک چلتے ہیں۔ آٹے کی دو چکیاں اور تیل کے دو گھانے کام کرتے ہیں۔ تیل کے گھانوں کو روزآنہ پانچ روپے پرگتہ دے رکھا ہے۔ چھلی پھوڑنے کا مشین بھی لگایا ہے مگر یہ مشین ابھی چالو نہیں کیا گیا آب رسانی کے لئے پانی یہیں کی برقی قوت سے کھینچا جاتا ہے جو مشین باؤلی پر لگا ہے وہ ۴۲ ہزار گیالن روزآنہ کھینچ سکتا ہے مگر موسم گرما میں یہاں صرف ۱۰ ہزار گیالن تک پانی خرچ ہوتا ہے۔ کیونکہ پانی مقررہ اوقات پر کھولا جاتا ہے۔ اس لئے باؤلیوں کا استعمال بھی جاری ہے۔

آخری راجہ وینکٹ لچھا راؤ نظام نواز ونت بہادر متوفی کو صلبی دو لڑکیاں ہیں چونکہ اولاد نرینہ نہ تھی۔ اس لئے وینکٹ جگنا تھ راؤ کو متبنیٰ لیا ہے یہ ۱۳۲۶ف میں پیدا ہوئے ہیں۔ ۱۳۲۹ف کو ان کی شادی اندرا دیوماتے ہوئی۔ جو نظام نواز ونت بہادر کی چھوٹی صاحبزادی سرسوتی دیوی کی دختر ہیں یہ نوجوان پسر بھی اپنے سپاہی منش متبنیٰ پدر کی طرح شکار اور مردانہ کھیلوں کے شائق ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس چھوٹی سی عمر میں ۱۱ شیر انھوں نے شکار کئے ہیں۔

متوفی راجہ صاحب کی بڑی صاحبزادی راجیشوری راجہ صاحب تیپروال کو ۱۳۱۸ف میں بیاہی گئی ہیں اور دوسری جن کا نام سرسوتی دیوی ہے وینکٹ کرشنا راؤ زمیندار پرتاپور کو دی گئی جو افسوس کہ عالم جوانی میں بیوہ ہوگئیں ان کے شوہر پرواز کے بڑے شوقین تھے چنانچہ کولاپور سے مدراس کو پرواز کرتے ہوئے ۲۵ اگست ۱۹۳۰ء کو طیارہ کے ٹوٹنے سے گر کے مر گئے۔ کولاپور گسٹ ہوس کے متصل ایک سنگی ستون ان کی بیوہ رانی کی طرف سے لگایا گیا ہے جس کی عبارت ان دونوں میاں بیوی کی محبت کی خاموش داستان ہے۔

اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے میں اپنی اس آرزو کا اظہار کرتا ہوں جو رہ رہ کر میرے دل میں پیدا ہوتی ہے کہ کاش ہمارے ملک کے سارے جاگیرات خصوصاً بڑے بڑے علاقوں کا انتظام ایسا ہی ہوتا ہم یہ نہیں کہتے کہ گمنتان جٹ پول میں ساری ترقیاں ہو چکی ہیں نہیں۔ بلکہ جس حد تک بھی یہاں ترقی کی گئی ہے۔ وہ بہ حیثیت موجودہ بھی دوسرے جاگیری علاقوں کے لئے قابل تقلید ہے۔

ابو ظفر موید الدین حسن فاروقی

ایک سیر میر محمود صاحبؒ کی پہاڑی پر

میر محمود صاحبؒ کی پہاڑی ہمارے وطن میں ایک مشہور مقام ہے۔ میر عالم کے تالاب کے کنارے ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے اور اس پر اُس بزرگ کی درگاہ بنی ہوئی ہے۔ درگاہ کے اس طرف گھنا جنگل ہے جہاں ہماری پردہ نشین خواتین نہایت خوشی سے اپنے بال بچوں کے ساتھ تفریح مناتی ہیں جس طرح عام دستور ہے ہم لوگ کسی بزرگ کی ذات سے اتنا فائدہ نہیں اٹھاتے جتنا ان کی درگاہ سے اٹھاتے ہیں۔ یہی حال اس درگاہ کا بھی ہے، لوگ اس پُرسکون اور خاموش مقام میں دنیا کی فکروں کو ایک بزرگ کے فیض صحبت سے روحانی چین میں مبدل کرنے کم آتے ہیں اور زیادہ تر اس لئے تکلیف فرماتے ہیں کہ تالاب کا لطف حاصل کیا جائے اور مناظر کی دلچسپیوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

ایک مرتبہ ہم اس مقام پر پہنچ گئے۔ موٹر سیکل پر سوار تھے خیال ہوا چلو آج اس مقام کی سیر کرلیں جس کی شہرت مدتوں سے سنتے آئے ہیں سرما کی تعطیلات تھیں، ٹھنڈا ٹھنڈا موسم نرم نرم دھوپ، نیلا نیلا آسمان فوراً موٹر سیکل تیز کی اور درگاہ کی طرف چلے۔ لوگ کہتے ہیں سیدھا راستہ چلنا چاہئے مگر بعض وقت راستہ گم کرنے اور اٹکل پر چلے جانے میں غیر معمولی لطف آتا ہے، خصوصاً ایسے وقت جب کہ فطرت اور اس کے اسرار کے سوا کوئی رہنما نہ ہو ہماری نظر پہاڑی کی طرف تھی مگر راستہ بالکل اس کی مخالف سمت نظر آرہا تھا۔ پیدل ہوتے تو دور نکل جانے کا خوف ہوتا مگر جب "پیٹ بھری" موٹر سیکل ہو (آپ پیٹ بھری کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے) تو اور ہمت بڑھتی ہے۔ ہم دیکھتے رہے پہاڑی کی طرف اور چلتے رہے دوسری طرف راستہ پیچیدہ تھا ایک شاعر کو جو معشوق کی زلفوں کے پیچ و خم دیکھ چکا ہو بھلا راستے کی پیچیدگی کیا ستا سکتی؟ ہم سبز درختوں کی چھاؤں چھاؤں چلتے ہی رہے۔ بڑی دیر کے بعد منزل مقصود آئی پہاڑ کے دامن میں پہنچے، موٹر سیکل گرم ہوچکی تھی، ہم نے کچھ اس خیال سے کہ پہاڑ پر جاکر آنے تک کہیں یہ غائب نہ ہوجائے اور کچھ اس لئے کہ گھنے سائے میں اس کی گرمی دور ہوگی اسے شاداب جھاڑیوں کے اندر کھڑا کر دیا اور اوپر کی طرف چلے۔ جنگل، ساگوان کے درخت، پرند کے چہچہے، ٹھنڈی ہوائیں اور دس بجے کی نرم دھوپ بڑا روپ دکھا رہی تھی، ہم نے خیال کیا کہ سب سے پہلے بزرگ کے مزار پر فاتحہ پڑھ لینی چاہئے۔ معاف کیجئے ہم ذرا مذہبی قسم کے آدمی ہیں فوراً جیب میں ہاتھ پہنچ گیا کہ دیکھیں پھولوں اور خیرات کے لئے کھلے پیسے ہیں بھی یا نہیں بارے ایک اٹنی نکلی ورنہ ہر موٹر سوار کی جیب سے پیسوں سے زیادہ روپیوں کی جھنکار آتی ہے راستہ بائیں طرف کو مڑتا تھا ہم اپنی وطنی خاکساری کے ساتھ سر جھکائے زمین جھانکتے چلے جارہے تھے۔ یکایک اوپر جو نظر پڑی تو دیکھتے کیا ہیں کہ دو فرلانگ تک اونچا راستہ ہے سیڑھیوں کی قطار ہے اور اوپر بزرگ کا مزار نظر آرہا ہے۔ فوراً دل پر اثر ہوا۔ ہم نے خیال کیا کہ سچ ہے روح کی بلندی بہر حال قائم رہتی ہے ہم نے سیڑھیاں چڑھنی شروع کیں اوپر پہنچنے تک برا حال ہوگیا سب سے زیادہ تکلیف ہمارے پیٹ کو پہنچی کیونکہ ہمارا پیٹ کسی قدر گول ہے! درگاہ کے چبوترے پر پہنچنے کے بعد ایک قدیم روایت یاد آگئی۔ یہاں کے متعلق مشہور ہے کہ کسی بزرگ کی بد دعا سے اس درگاہ کے تین گوشے آباد ہیں اور ایک ویران۔ ہم نے بڑے شوق سے اس کی توثیق کرنی چاہی گوشوں کی آبادی کا حال سنئے دو چار بکریاں، آٹھ دس کبوتر، تھوڑی سی عدم صفائی اور ایک حافظ صاحب! ویرانی کی طرف عمارت شکستہ اور کچھ نہیں۔ بہر حال ہم نے درگاہ کا ایک معتقدانہ طواف کیا اور درمیانی گنبد کے نیچے مزار کی ایک جانب بیٹھ گئے۔ تکان اور مراقبے میں ایک روحانی تعلق معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس وقت

کسی نہ کسی کیف میں ڈوب گئے اور آنکھیں بند کرلیں یقین مانئے ایسا معلوم ہوا ہم کسی اعلیٰ مقام میں پہنچ گئے ہیں۔ سوائے رنگینیوں کے کچھ
نظر نہ آرہا تھا، مگر توجہات کی زد دل پر پڑ رہی تھی۔ ایسے وقت میں قرآن مجید بہت جلد یاد آتا ہے ہم نے قرآن خوانی اور درود پڑھنا شروع کیا
جس وقت ہم پہنچے تھے تو دس بج کر بیس منٹ ہوئے تھے جب آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ بارہ بج گئے ہیں ہم نے کہا خوب اصحاب کہف کی نیند کا ایک
جھونکا ہم نے بھی دیکھ لیا۔ آنکھ کھلتے ہی پھر وہی پیٹ کی تکلیف بھوک محسوس ہوئی اور بری طرح محسوس ہوئی۔ درگاہ کے باہر نکلے نہ تھے کہ
ایک بزرگ صورت فقیر نے ہمارے سامنے قدرتی باغ کی ایک ڈالی پیش کی کچھ سیتا پھل، کچھ موز، عمدہ بیر، دو چار جام، ایک سنگترہ
بیچ میں پھولوں کا ایک گلدستہ۔ ہم نے بزرگ کو حیرت سے دیکھا اور کہا حضرت آپ کون ہیں یہہ کیا ہے؟ کوئی تحفہ تو ہے ہمیں یہہ
محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے ذریعے غیبی امداد دی جا رہی ہے۔ انھوں نے فرمایا "جی ہاں تحفہ ہے غریب کا لے لیجئے" ہم نے یہہ تحفہ فوراً پیٹ میں
اتار لیا اور آگے بڑھے جس وقت ہم چلے تو بزرگ نے ہماری طرف غور سے دیکھا ہم نے بھی انھیں غور سے دیکھا تھوڑی دور نکل جانے کے بعد خیال ہوا
کہ انھیں کچھ پیسے دیدینے چاہیں۔ ہم نے جیب ٹٹولا تو اس میں نہ چوانی نہ دوانی نہ پیسہ سب روپے آپ ہی خیال کیجئے کتنی ندامت ہوئی ہوگی بھلا
غریب کو ایک روپیہ کیسے دے دیا جائے؟ ہم سوچ ہی رہے تھے کہ بزرگ نے کہا "میں آپ کی مشکل سمجھ گیا تکلیف نہ کیجئے۔ ادھر آئیے
میں آپ کو ایک چیز دکھاؤں"

اُن کے ساتھ چلتے ہوئے سچ جانئے ہمیں کچھ خوف ہونے لگا کیونکہ اس جنگل میں سوائے اُن کے اور ہمارے کوئی نہ تھا ہاں ایک
تکلیف دہ ساتھی تھا جو عجیب وغریب طریقے سے ہماری رفاقت کر رہا تھا اور یہہ کوّا تھا۔ کم بخت ہمارے ساتھ ساتھ ڈالی ڈالی اڑتا
اور برابر کائیں کائیں کیا جا رہا تھا۔ ایک آدھ میل چلنے کے بعد تالاب کا کنارہ آیا۔ قدرت کا سُہانا پن عجیب لطف دے رہا تھا ہم پانی کے
کنارے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے قریب ہی ایک جھونپڑی نظر آئی ہم اور وہ بزرگ دونوں خاموش تھے کہ یکایک فضا میں
ایک دوشیزہ آواز بلند ہوئی "ابا جان کھانا تیار ہے" ہم نے چونک کے ادھر اُدھر دیکھا کچھ نہیں جھونپڑی کے دروازے پہ نظر پڑی۔ ایک
رنگین اجالا ایک چمکتی پیشانی ایک چاندی سی کلائی اور ستارے جیسی ایک آنکھ ہم نے فوراً درود پڑھا اور کہا "جل جلالہ"

ہر حسن کا حسن کو بڑا مقدس سمجھتا ہے، ہم نے اس وقت یہہ محسوس کیا کہ اس نازنین کی معصومیت کے آگے ہمارا دل کا بھی تقدس کچھ
دور جا پڑا ہے۔ ہم نے دماغ پر زور ڈال کے سوچنا شروع کیا کہ کسی طرح اس برق تجلی کی پوری دنیا میں آنا چاہئے ہم نے کچھ کہنے
کے لئے بزرگ کی طرف دیکھ کے ایک سوال کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ انھوں نے فرمایا "میاں چلو کھانا کھالیں" ہم نے کہا بسم اللہ
اور موصوف سے پہلے کٹیا میں پہنچ گئے۔ ایک نازنین ہاتھ نے سلام کیا ہم نے دعا تو نہیں، سلام ہی کا جواب دیا اور بیٹھ گئے۔ پھر آواز
پھر بلند ہوئی۔ جناب ہم غریب ہیں، کھانا پسند نہ آئے گا۔ ہم نے کہا۔ "جناب۔ نہیں جناب! آپ کیا کہتی ہیں اس وقت بھوک کی
شدت ہے، اور یہہ کھانا من وسلویٰ معلوم ہو رہا ہے" کھانا کھانے تک وہ تو یہ شغل تھا، وہ آنکھوں کے سامنے ہی رہا۔ پندرہ منٹ
گذرے ہوں گے کہ خدا حافظ کہنا پڑا ہم بادلِ ناخواستہ باہر نکلے۔ اتنے میں اُس نازنین نے مجھے آواز دی قریب بلا کے ایک
بلور جس پر دھاریاں تھیں میرے ہاتھ پر رکھا "ابا جان نے دیا ہے، اسے اپنے قلمدان میں رکھ لیجئے" ہم نے اس تحفے کو
آنکھوں پر لیا اور شکریہ کرکے چلے ہم تنہا تھے راستہ بڑی مشکل سے طے ہو رہا تھا۔ روحانی دنیا میں محبت کی پیاس تھی!

شاید یہہ لطف جنت ہی میں حاصل ہو یا نہ ہو۔ ایک درخت کے نیچے ہم نے دیکھا کہ پگڈنڈی پر دھوپ کی طرف ایک بڑا سیاہ بچھو چلا جا رہا ہے ہماری نظر اس پر اس وقت پڑی جب کہ ہم اس پر پاؤں رکھنے ہی والے تھے ہم دور اچھل پڑے اور بچھو کو بہت غور سے دیکھنا شروع کیا پیلی پچھو تھا جسم پر بڑے بڑے بال تھے اور ڈنکوں کی طرف دو بڑے سیاہ پٹے اس کی جسامت بڑی پتیلی کے برابر ہوگی۔ تماشا دیکھئے جوں ہی ہماری نظر اس پر پڑی بچھو اس طرح تملا اٹھا جیسے اسے کسی تیز اور گرم سیخ سے پڑا دیا گیا ہے۔ وہ سکڑنے لگا اور ایک دو منٹ میں سکڑ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ ہم نے دس منٹ تک اس کے چلنے کا انتظار کیا مگر وہ مرا پڑا ہوا تھا۔ ہم نے ایک بڑی لکڑی سے کرید کر دیکھا مگر وہ مر چکا تھا! ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی ہم اس تحفے کو ایک بڑے پتے پر اٹھا کر گھر لے آئے دو گھنٹوں میں وہ پانی پانی ہو گیا۔ اب ہم کو میر محمود صاحبؒ کی پہاڑی کے دو تحفے اکثر یاد آتے ہیں ایک تو اب تک قلمدان سے زیادہ دل میں ہے، اور دوسرا حافظے کی دنیا میں، ہماری سمجھ میں نہ آسکا کہ اس پہاڑی پر ہم کو یہہ تحفے کیوں ملے۔

محمد عبدالقیوم خاں باقی

نیا پل اور شام

شام کی سندر فضا میں دور کی تنویر ہے
خواب دوشیزہ کی میرے سامنے تصویر ہے

ہر طرف طوفانِ نغمہ ہر طرف طغیانِ نور
حضرت انساں کی سرگرمی میں گم شورِ طیور

نور کی سرگرمیوں میں غرق ایوانِ بلند
شام کی دیوی نے بڑھ کر پھینک دی اپنی کمند

گنبدوں پر نور کی پرچھائیاں ہیں پربہار
اور فضا پر چھا گیا ہے نور و ظلمت کا غبار

اک طرف تعمیرِ عدل[1] و اک طرف دار الشفا[2]
دور پر اک مدرسہ[3] ہے نیند میں کھویا ہوا

سامنے دار الکتب[4] کی دل نشیں تعمیر ہے
جس کی خشت و گل میں عقل و ہوش کی تخمیر ہے

رُودِ موسیٰ پر نیا پل دہر کی تصویر ہے
جس کی دو رنگی میں دونوں دور کی تعبیر ہے

ایسے خوش منظر میں میری ذات ہی کھوئی ہوئی
جاگتی ہے آنکھ، ور تقدیر ہے سوئی ہوئی

سید محمد اکبر وفا قانی

---

[1] عدالت العالیہ ۔ [2] عثمانیہ دواخانہ ۔ [3] کلمہ تمدہ ۔ [4] کتب خانہ آصفیہ

نشان ثبت آصفیہ (۱۵۴)

نشان ثبت برطانیہ (ل) M 395

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

زیرِ نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش — سکینہ بیگم

خواجہ حمید الدین شاہد — معین الدین احمد انصاری

جلد (۲)، شمارہ (۱۲)

ڈسمبر ۱۹۳۹ء

فہرستِ مضامین

---

(۱) اردو تصنیف، تالیف اور انشا پردازی کا ذوق رکھنے والے اصحاب ادارہ سے مشورہ کر سکتے ہیں۔ ادارہ کے مختلف شعبوں میں ہر موضوع اور ہر فن کے ماہرین موجود ہیں جو خوشی سے مدد دیتے ہیں۔

(۲) اردو زبان سے متعلق جو بھی کام ہو اس کے بارے میں "ادارۂ ادبیاتِ اردو" کی خدمات ہر وقت حاضر ہیں۔

(۳) اردو کی ترقی و اشاعت کے لئے اردو کے بہی خواہ جو بھی مفید تجویزیں اور مشورے ادارہ میں روانہ کرتے ہیں ان پر سنجیدگی سے غور کیا جاتا ہے اور ان کے روبہ عمل لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۴) اردو مطالعہ کا ذوق ہو تو ادارہ کے سب رس کتاب گھر کی فہرست منگوائیے۔

(۵) اگر اردو کتابیں خریدنی ہوں تو پہلے سب رس کتاب گھر سے مشورہ کیجئے۔

(۶) مراسلت کرنے والے اصحاب اس امر کا ضرور خیال رکھیں کہ اگر ادارہ سے جواب حاصل کرنا ہو تو جوابی کارڈ یا ایک آنے کے اسٹامپ لازماً روانہ کریں۔ ورنہ ادارہ پر جواب کی ذمہ داری نہیں رہتی۔

(۷) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع ۱۵ تاریخ کے اندر دیجئے۔ دیر سے اطلاع آنے پر یا تو پرچے ختم ہو جاتے ہیں یا گزشتہ مہینے کے پرچوں پر زیادہ محصول ڈاک ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے تاریخ مقررہ کے بعد اطلاع آئے تو پرچہ روانہ کرنے میں تامل ہوگا۔

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے عہد آفریں مشن پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد سے شائع ہوا

ادارہ

یہ سب رس کے دوسرے سال کا آخری شمارہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ رسالہ برابر ترقی کرتا جا رہا ہے اور اس کے قدردانوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے ہر شمارہ میں مختلف ذوق کے مضامین نظم و نثر پیش ہوتے رہے اور اس طرح اردو زبان کی طرف زیادہ سے زیادہ اصحاب کو متوجہ کرنے کا موقع ملا۔

اردو نمبر کی بعض خصوصیتیں سب رس کے تیسرے سال کا پہلا شمارہ یا سالگرہ نمبر اردو زبان اور ادب کی ضروری معلومات کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ یہ جنوری ۱۹۴۰ء کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوگا اور سب رس کے گذشتہ سالگرہ نمبر یعنی دکن نمبر سے زیادہ شاندار اور کامیاب ثابت ہوگا۔ اس میں اردو کے بہترین شعرا مثلاً جوش، اثر، فانی، جگر، سیماب، علی اختر، علی منظور، عزیز، آرزو، تمکین، احسان، دانش، ساغر، ماہر، بہزاد، محروم، وجد، شاد عارفی، بخشش اور محمد وحید وغیرہ کے تازہ ترین کلام کے علاوہ اردو کے ایسے نامور اہل قلم مثلاً شبلی، حالی، آزاد، داغ، شاد عظیم آبادی، اقبال اور تسلیم کے غیر مطبوعہ خطوط بھی پہلی دفعہ اردو دنیا کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔

اس وقت ہندوستان کی مختلف جامعات میں جو اصحاب اردو کے پروفیسر ہیں ان کے حالات زندگی مع تصویر کے بھی شریک کئے گئے ہیں۔ اس سال یعنی ۱۹۳۹ء کی بہترین اردو کتابوں کا ایک تذکرہ بھی درج ہوگا۔ اس کے علاوہ چند مضامین اردو ادب کے اہم اور تشنہ پہلوؤں پر لکھے گئے ہیں کہ ان کا مطالعہ دلچسپی اور افادہ سے خالی نہ ہوگا۔ اور اس ایک شمارہ میں اردو کے متعلق جتنی مستند اور شائستہ معلومات حاصل ہوسکیں گی وہ کسی بڑی سے بڑی تاریخ سے نہیں ہوسکتیں۔ مضامین اور معلومات کے علاوہ اس نمبر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں تصاویر کی بڑی اہمیت رکھی گئی ہے۔ مشاہیر اردو کی نادر اور پاکیزہ تصویروں کے ساتھ ساتھ ایسے بہترین شعرا و مصنفین کی دلچسپ تصویریں بھی اس میں شامل ہیں جن کی تحریروں کا اردو ادب پر خاص اثر پڑا ہے۔ جو اصحاب دکن نمبر کی تصویریں دیکھ چکے ہیں وہ خود اندازہ کر سکیں گے کہ اردو نمبر کی تصویریں کس شان کی ہوسکتی ہیں۔

نمائش مطبوعات اس سال طیلسانین عثمانیہ کی ساتویں سالانہ کانفرنس کی وجہ سے اورنگ آباد علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ اس کانفرنس کی خواہش پر طیلسانین کی تصنیفات و تالیفات کی ایک نمائش منعقد کرنے کا کام ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے انجام دیا گیا۔ مولوی معز الدین صاحب اور مولوی عبد العلی صاحب نے اورنگ آباد میں ادارہ کے نمائندوں کی حیثیت سے اس کی ترتیب کی۔ یہ نمائش ہر حیثیت کے لحاظ سے بے حد کامیاب رہی۔ یوں تو اورنگ آباد جیسے تاریخی ماحول میں اس کانفرنس کا انعقاد ہی اپنی جگہ نہایت کامیاب تھا لیکن عالی جناب شہزادہ نواب اعظم جاہ بہادر کی دلچسپی بھی اس کی بڑی ممد و معاون ثابت ہوئی۔ اس کانفرنس کی صدارت پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی نے کی تھی جو ادارۂ ادبیات اردو کے مؤسسین میں سے ہیں۔ اور جن کی محققانہ کتاب تاریخ گولکنڈہ حال ہی میں ادارہ سے شائع ہوئی ہے۔ موصوف کا خطبۂ صدارت علمی اور سنجیدہ حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس میں نہایت بالغ نظری اور سنجیدگی سے ان مسائل پر بحث کی گئی ہے جو آج کل ملک میں زیر بحث ہیں۔ اور جن کو سلجھانا نہایت ضروری ہے۔

ادارہ کے معتمد اعزازی ڈاکٹر زور نے بھی اس کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں مطالعۂ تاریخ حیدرآباد پر ایک پُر مغز تقریر کی۔ مولوی عبد القادر سروری صاحب نے بھی شاہ سراج اورنگ آبادی پر ایک مفید مقالہ تیار کیا تھا جو اگرچہ وقت کی قلت کی وجہ سے پڑھا نہ جا سکا لیکن کانفرنس کی روداد کے ساتھ مجلۂ طیلسانین میں شائع ہو رہا ہے۔

شاہ سراج کا گنبد اورنگ آباد اور اس کے اطراف و اکناف کی سرزمین بڑے بڑے شاہان ہند کی آخری آرام گاہ ہے۔ انہی میں ایک اردو کے مشہور شاعر شاہ سراج اورنگ آبادی بھی ہیں جن کا گنبد نہایت خستہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ ادارہ کی طرف سے اس کی تعمیر و مرمت

نے مولوی غلام احمد خاں صاحب سابق صوبہ دار اورنگ آباد کو توجہ دلائی گئی تھی۔ اور ایک سال سے اس بارے میں مراسلت جاری تھی جس کا تذکرہ اس سے قبل کئی بار سب رس کے اداریوں میں گزر چکا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ غلام احمد خاں صاحب کی توجہ سے اس کی مرمت کے لئے محکمہ امور مذہبی کی طرف سے احکام جاری ہو گئے اس سفر کے موقع پر ڈاکٹر زور اور پروفیسر سروری اور پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نے اس مسجد کا معاینہ کیا اور اوّل الذکر نے مولوی عبدالباسط خاں صاحب ناظم کو اس کی مرمت کی طرف توجہ دلائی صاحب موصوف نے آغاز تعمیر کے لئے فوراً احکامات جاری کر دیے چنانچہ ان اصحاب کی روانگی سے قبل کام شروع ہو چکا تھا توقع ہے کہ یہ گنبد جلد درست ہو جائے گا۔ آئندہ نمبر میں انشاءاللہ مرمت سے قبل اور بعد کی تصویریں شائع کی جائیں گی۔

آثار قدیمہ | اس ماہ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی کا وہ مضمون اور تصویریں شائع کی جا رہی ہیں جو حیات آباد کے تاریخی معاینہ کی یادگار ہیں ہم محکمہ آثار قدیمہ حیدرآباد کو اس قدیم تاریخی مسجد کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں جو قطب شاہوں کی ایک عظیم الشان یادگار ہے اور جو قریب میں تباہ ہو جائے گی اگر یہ محکمہ اس کی طرف توجہ نہ کرے۔ کیونکہ اس پر جگہ جگہ پیپل کے درخت اگ آئے ہیں

اسی طرح ادارہ کے چند ارکان نے اس ماہ قلعہ کویل کنڈہ کا بھی معاینہ کیا ہے۔ یہ بھی نہایت اہم تاریخی مقام ہے کیونکہ سلطان ابراہیم قطب شاہ نے وادی کلنڈہ کو فتح کرنے کی مہم کا آغاز یہیں سے شروع کیا تھا۔ چنانچہ یہاں تلنگی میں ایک اہم کتبہ بھی موجود ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ محکمۂ آثار قدیمہ نے اس قلعہ کی طرف بھی اب تک کوئی توجہ نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس محکمہ کی توجہ زیادہ تر اجنتا، ایلورا اور بیدر کے شاندار حال ہے۔ اور وہاں کے کاموں سے اس کو ایک گونہ عشق سا ہو گیا ہے۔ جب ہی تو ملک کے دور کے دو سرے اہم تاریخی مقامات اور دارالسلطنت سے قریب ہی کے آثار محروم نظر ہیں۔ قلعہ گولکنڈہ، قلعہ سلطان نگر اور حیات آباد تو شہر حیدرآباد سے صرف چند میل ہی کی مسافت پر واقع ہیں لیکن ان کی طرف سے غفلت شاید "چراغ تلے اندھیرے" والی مثل کو ثابت کرنے کے لئے کی جا رہی ہے۔

چند مضمون | اس ماہ کے مضمونوں میں دو کا تذکرہ ضروری ہے۔ دعوت ایک قصہ ہے محترمہ معتصمۃ الرحمن کا۔ جو اپنی قصہ نگاری اور انشا پردازی کی وجہ سے اردو دنیا میں کافی تعارف حاصل کر چکی ہیں چونکہ یہ قصہ محترمہ نے اپنی شادی میمنت آبادی سے چند ہی روز قبل ہمارے یہاں روانہ کیا ہے اس لئے ہم اس کو ان کی زندگی کا ایک تاریخی قصہ سمجھتے ہیں کیونکہ کدخدائی کے بعد ان کی انشا پردازی کا بھی متاثر ہونا ضروری ہے۔ اس مضمون کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ہم محترمہ کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

دوسرا مضمون پیرس ہے جو ہمارے دیرینہ کرم فرما پروفیسر شروانی صاحب کے سلسلۂ تاثرات سفر یورپ کی ایک دلچسپ کڑی ہے یہ سلسلہ گذشتہ سال ماہ ڈسمبر سے شروع ہوا تھا اور محترم موصوف کی تصویر بھی شائع کی گئی تھی۔ مسرت کی بات ہے کہ یہ پابندی کے ساتھ جاری رہا اور اب قریب الختم ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ شروانی صاحب اس کو آئندہ ایک کتابی صورت میں بھی شائع فرمائیں گے کیونکہ ان کے مضمون ندرت معلومات کے علاوہ اس لئے بھی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں جنگ سے عین قبل کے یورپ کے متعلق مفید اور اہم معلومات قلمبند ہو گئی ہیں۔

نئی کتابیں اس ماہ ادارہ نے اور تین نئی کتابیں شایع کیں جن میں پہلی مغربی تصانیف کے اردو تراجم ہے۔ یہ ان تمام اجتماعی اور انفرادی کوششوں کا محققانہ تذکرہ ہے جو اردو کو جدید ترین علوم و فنون سے مالا مال کرنے کے لئے گزشتہ سوا سو سال سے کی جا رہی ہیں۔ اس کا ذکر گزشتہ مہینہ کے اداریہ میں کیا جا چکا ہے۔ دوسری کتاب محبت کی چھاؤں ہے جس کے مصنف مولوی مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے عثمانیہ ہیں یہ کسی دلنواز کے نام معنون کی گئی ہے اور اس کے جو افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں ان کا حسن و جمیل سرورق دیکھتے ہی اس کتاب کے بیباک اسلوب اور اس کے افسانوں کی بے پناہ شوخی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

تیسری کتاب شعرائے عثمانیہ ہے جو ادارہ کے سلسلہ مرقع سخن کی چوتھی جلد ہے۔ اس میں چھبیس ۲۶ شعرا کے کلام کا انتخاب درج ہے۔ اس کی خصوصیات اخبار صبح دکن حیدرآباد مورخہ ۲۴ نومبر کی تنقید کے اس اقتباس سے معلوم ہو سکتی ہیں جو اس اداریہ کے آخر میں درج ہے۔

ادارہ کی شاخیں ادارہ ادبیات اردو اپنے مقاصد کے تحت مملکت کے مقامات میں اپنی شاخیں قائم کر رہا ہے چنانچہ اس وقت تک اورنگ آباد اور محبوب نگر میں اس کا آغاز کر دیا گیا ہے دوسرے مقامات کے علم دوست اصحاب سے بھی توقع ہے کہ وہ اپنے یہاں اس کام کا آغاز کریں گے اور اس بارے میں معتمد صاحب اعزازی سے مراسلت فرمائیں گے۔

محبوب نگر میں ۲۳ نومبر کو مولوی سید تقی صاحب بلگرامی بی اے بیرسٹر ناظم ضلع کی صدارت میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا جس میں مولوی احمد عبداللہ صاحب مسدوسی بی اے ال ال بی وکیل نے ڈاکٹر زور صاحب معتمد اعزازی کو ادارہ کے متعلق تقریر کرنے کی فرمائش کی۔ نتیجہ کے طور پر وہاں علم دوست اصحاب کی ایک مجلس منتخب کی گئی۔ اس شاخ کے متعلق بھی مزید تفصیل آئندہ شمارہ میں درج رہے گی۔

شعبۂ تنقید گزشتہ ماہ اس شعبہ کی روداد اداریہ میں جگہ نہ پا سکی تھی اس شعبہ کا ایک جلسہ ۲۹ ستمبر کو منعقد ہوا تھا جس میں پروفیسر سروری و اراکین شعبہ کے علاوہ ڈاکٹر زور، پروفیسر فضل حق، مولوی نصیر الدین ہاشمی، نواب سیف علی خاں صاحب جاگیردار نے شرکت کی۔

(۱) میتھو آرنلڈ کے ترجمہ کے متعلق مترجمین نے ترجمہ کی دقتوں کے مد نظر نومبر میں پہلی جلد دینے کا وعدہ کیا۔

(۲) ستر کتابیں و رسائل وغیرہ تنقید کے لئے وصول ہوئے جو تقسیم کر دئے گئے۔

(۳) تنقید کی کتابیں جو گزشتہ جلسہ میں اراکین کو تنقید کے لئے دی گئی تھیں وہ سب سوائے نجیب صاحب کے پاس کی کتابوں کے وصول ہو گئیں۔

(۴) باتفاق آرا طے پایا کہ حسب ذیل حضرات شعبہ کے رکن بنائے جائیں

۱. مولوی عبدالمجید صدیقی صاحب ۲. ڈاکٹر عبدالحمید خاں صاحب ایم اے پی ایچ ڈی

۳. ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب ایم اے پی ایچ ڈی ۴. مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے ڈپ ایڈ

۵. مولوی غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے ۶. ابو ظفر عبدالواحد صاحب ایم اے سٹی کالج۔

۷. محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے ۸. محترمہ محمدی بیگم صاحبہ بی اے ۹. مولوی صابر علی صاحب ہاشمی

۱۰. محترمہ زہرہ بیگم صاحبہ سعید بی اے ۱۱. محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ ۱۲. ڈاکٹر جعفر حسن صاحب پی ایچ ڈی

(دوسرے شعبوں کی رودادیں آئندہ شمارہ میں شایع کی جائیں گی)

"ادارہ"

شعرائے عثمانیہ | رائل سائز صفحات ۲۳۱ قیمت ۱۲؎ ملنے کا پتہ دفتر ادارۂ ادبیات اردو و خیریت آباد دکن۔

جامعہ عثمانیہ کے ہونہار شاعروں کا کلام متفرق رسالوں اور جرائد میں شایع ہو رہا تھا اور نوجوانوں کے دل و دماغ کو متاثر بھی کر رہا تھا۔ کم و بیش بیس سال سے یہ جواہر پارے بکھرے ہوئے پڑے تھے بڑی خوشی کی بات ہے کہ جامعہ کے دو مشہور اور صاحب ذوق فرزندوں سید معین الدین صاحب قریشی اور محمد عبدالقیوم صاحب باقی نے ان کو جمع کر دیا ہے جس سلیقے سے یہ ضروری کام ان دو حضرات کے ذمہ دار ہاتھوں سے انجام پایا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔

اس مجموعہ کی متعدد خصوصیات قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ اردو زبان میں آج تک کوئی مجموعہ ایسا مرتب نہیں ہوا جو جدید شاعری کے رجحانات کو اتنی خوبی اور تنوع کے ساتھ ظاہر کرتا ہو۔ نظم نگاری دور جدید کی پیداوار ہے اس مجموعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ نے شاعروں کو ریزہ خیالی کے علاوہ ٹھوس اور مربوط خیالات کے اظہار پر بھی قادر کر دیا اور ان میں بلند ذوق پیدا کر دیا ہے دوسرے اس میں ہر قسم کے حسن و کمال کی نظمیں ملتی ہیں جو مختلف اور پاکیزہ عنوانات پر لکھی گئی ہیں۔ اس کی وجہ سے اہل علم کے ایک نئے طبقے کو اس میں دلچسپی کے سامان مل سکتے ہیں۔ نظمیں نہایت ذوق انگیز اور دلفریب ہیں۔ ان کی گوناگونی اور ان کے مضامین کی کثرت کے باوجود جیسا کہ اس مجموعے کی فاضلانہ تقریب میں لکھا گیا ہے شعرائے عثمانیہ کے کلام میں ایک قسم کی ہم آہنگی بھی پائی جاتی ہے۔ اس میں ۱۵۲ نظمیں اور کم و بیش ایک سو غزلیں منتخب ملیں گی۔ جن میں کہیں خیالات کا لطف ہے تو کہیں زبان کا کہیں جذبات کی تازگی اور بلندی ہے تو کہیں نئے اسلوب بیان کی جدت۔

ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ غزل کے آزمودہ اور دیرینہ میدان میں بھی ان باہمت شاعروں نے اپنا خاص کمال دکھایا ہے۔ ہر شاعر پر جو جامع و مانع اشارات لکھے گئے ہیں وہ جناب باقی صاحب کی وسعت ذوق و نظر اور حسن اظہار کا ثبوت ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے دریا کو کوزے میں بند کیا گیا ہے۔ کلام کا انتخاب اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ ہر شاعر کی عظمت اور اس کا معیار پورے طور پر سامنے آتا ہے۔ بظاہر یہ کہنا دشوار معلوم ہوتا ہے کہ کونسا شاعر زیادہ اچھا ہے اور کون کم۔ کیونکہ یہاں "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" کا معاملہ ہے۔ یہ بھی لائق مرتبین کے انتخاب کا کمال ہے۔ اس میں بطور خاص ہم "فاؤسٹ" جیسے شاہکار کے اردو ترجمے کے اقتباس اور "عمر خیام" کے آپرا کو شریک کرنے کی داد دیں گے کیونکہ یہ دونوں چیزیں اردو شاعری کے لئے بالکل نئی ہیں۔ اور ان سے مجموعے کا ادبی معیار خاصہ بلند ہو گیا ہے۔

آخر میں ہم ادارۂ ادبیات اردو کے فاضل ناظم ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کو جو خود بھی شاعر ہیں دلی مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے اعلیٰ اور نفیس طباعت اور بلند خیالی کے ساتھ اس بے نظیر مجموعے کی اشاعت فرمائی۔ ہم پر زور سفارش کرتے ہیں کہ جامعہ عثمانیہ کے تمام طلبہ اور مدارس کے نوخیز شاعر اسے خرید کر اس سے لطف اندوز اور مستفید ہوں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہ بھی طے فرمایا ہے کہ مجموعے کا ایک ایک نسخہ ان شاعروں کی خدمت میں تحفۃً پیش کیا جائے گا جن کا کلام اس میں شامل ہے یہ امر بھی ان کی وسیع علمی ہمدردی کو ظاہر کرتا ہے۔ (روزنامہ صبح دکن مورخہ ۲۳ نومبر ۱۹۳۹ء)

"عقیدت کے پھول"

دن کے کھیل کود اور سیر و تفریح کے بعد رضیہ اور اس کی سہیلیاں گھر جانے کیلئے تیار ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ رضیہ کا بھائی شمیم بھی ہے دن کا تھکا ماندہ آفتاب بھی رات بھر کے لئے مغرب کی پہاڑیوں میں روپوش ہونے کو ہے رضیہ سلطانہ، شہناز موٹر میں بیٹھ گئیں شمیم نے موٹر کا ٹاپ کھول دیا اور خود بیٹھ کر چلانے لگا شمیم کی بائیں طرف شبانہ بیٹھی تھی۔

یہ لوگ پورب کی سمت روانہ ہوئے۔ یہ منظر نہایت دلفریب تھا۔ ڈوبتے سورج کی کرنوں سے سامنے کے تمام وادی و کہسار نہائے ہوئے ہیں۔

موٹر اپنی پوری رفتار سے جا رہی تھی ہوا کے گستاخ جھونکے بار بار سب کے آنچلوں کو چھیڑتے اور چمپئی رخساروں پر مستانہ نقش بناتے۔ آنچل بار بار سر سے ڈھلک جاتے اور سر کے بال بے ترتیبی سے بکھر جاتے۔ سب کی سب آنچل سنبھالنے اور الجھے ہوئے بالوں کو سنوارنے میں مصروف اور شمیم اسٹیرنگ کی مدد سے موٹر کا ہارن بجانے میں مشغول تھا دل کی کشتی جو محبت میں ہچکولے کھا رہی تھی، وہ شبانہ کی ریشمی ساڑی کا سرمئی آنچل دامن خیال کو چھیڑتا، اور ہوا کی سرد لہریں اس کے سینہ میں گدگدیاں پیدا کرتیں شبانہ کی ذرا سی مسکراہٹ اس کے دل کی کلیاں کھلا دیتی۔

"یہ لوگ جنگل و بیابان وادی و کہسار سے ہو کر گزر رہے تھے طائران خوش الحان نغمہ سرائیاں کر رہے تھے درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے اور ذوق و شوق میں خوشی کے گیت گا رہے تھے آہوانِ صحرا وحشت زدہ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے، کوئل کی کوک اور پپیہا کی پیہو سے عجیب پرکیف سماں تھا۔

جابجا قدرتی چشمے جاری تھے بادِ صبا رقص کرتی ہوئی آتی اور سطح آب سے اٹکھیلیاں کرتی گزر جاتی۔

جذبۂ شوق میں آب حباب بن کر اٹھتا پھر ان موجوں کو پھوٹ پھوٹ روتا جو ساحل تک نہ پہنچ سکتیں۔ دن بھر کے بچھڑے چرند پرند اپنے اپنے مقام پر واپس جا رہے تھے ادھر ادھر کے بھولے بھٹکے اکے دکے مسافر بھی اپنی منزل مقصود تک جلد پہنچنے کے لئے قدم بڑھائے چلے جا رہے تھے اب کچھ اندھیرا ہو چلا تھا کالے کالے بادل منڈلانے لگے۔ دھیرے دھیرے سیاہی بڑھتی گئی اور تاریکی ساری فضا میں پھیلتی گئی گویا رات نے اپنا ماتمی لباس پہن لیا ہر طرف گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔

کبھی کبھی بجلی کالے بادلوں سے کوندتی زمین پر آتی اور پھر بل کھا کر نکل جاتی۔ بیم و رجا میں سب کے دل دھڑک رہے تھے۔ ہر ایک پر سکوت طاری تھا۔ یکایک زور کی آواز ہوئی ایک دھچکا لگا موٹر رک گئی لوگ سہم گئے نیچے اتر کر دیکھا تو پہیا ہوا سے خالی ہو گیا تھا۔ وہاں سے کچھ دور روشنی معلوم ہوئی جہاں سے گانے کی آواز آ رہی تھی شہناز کہنے لگی اپنے اپنے بنگلوں میں چین کی بانسری بجانے والوں اور راگ الاپنے والوں کو ہمارے اس حال کی کیا خبر۔

رضیہ نے کہا ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن ہم بھی تو کبھی آرام چین سے اپنے شاندار بنگلوں میں عیش و عشرت اور رنگ رلیاں منایا کرتے ہیں۔ مینہ کی جھڑی اور اس کی پیہم آواز سے جو فضا میں ایک موسیقیت پیدا کرتی ہے

لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بچوں پر کھڑے ہو کر اس کا جائزہ لیتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لمحہ کے لئے بھی ان غریب انسانوں کا خیال دل میں نہیں آتا جو اپنے جھونپڑوں میں غمگین اور افسردہ خاطر رہتے ہیں آنے والے کل کی فکر معاش ان کو ستاتی رہتی ہے۔ ان ہواؤں کے حال زار سے بالکل بے خبر رہتے ہیں جو بارش کے ساتھ ساتھ اپنی چشم دریا بار سے اشک بہاتی رہتی ہیں اور اگر بادل ایک گھنٹہ برستا ہے۔ تو ان کی ٹوٹی ہوئی جھونپڑیاں دو دو گھنٹے ٹپکتی رہتی ہیں۔

شمیم کا خیال ہوا کہ آبادی اب قریب ہے ہم لوگوں کو یہاں سے پیدل چلنا چاہئے۔ بالآخر روشنی کی جانب روانہ ہوئے راستہ ایک باغ سے ہو کر گیا تھا۔ باغ کی چاردیواری منہدم ہو چکی تھی صرف نشانات باقی تھے جس کے اندر اونچے اونچے خاموش درخت کھڑے اپنی قدامت کا ثبوت دے رہے تھے اندر داخل ہونے پر معلوم ہوا کہ یہ عدم کی نیند سونے والوں کا سنسان محل ہے۔

صف در صف کچی قبروں کے بوسیدہ نشانات تھے بے کسی ان پر رو رہی تھی چاروں طرف وہی سنسان بستی وہی ہو کا عالم اور حسرت برس رہی تھی۔

شہناز ایک جگہ جھک کر ٹارچ کی روشنی میں کچھ پڑھنے لگی سب اس کی طرف بڑھیں اور ہر ایک کی متجسس نگاہیں اس کتبہ پر پڑیں جس کو شہناز پڑھ رہی تھی پتھر پر کندہ تھا۔

"جا کے جب تازہ مزاروں پہ چراغاں کرنا۔
ایک ٹوٹی ہوئی تربت پہ بھی احسان کرنا"

"متوفی فیروز شاہ اصفہانی" اس کا پتہ نہ چل سکا شہناز کے دل میں فیروز کی یاد تازہ ہو گئی۔ گزرا ہوا بچپن کا زمانہ یاد آ گیا وہ وہ سماں نظروں میں پھر گیا جو کبھی ہر سنگار کے درخت سے متصل مزار کے قریب اپنے بھولے پن اور معصومانہ انداز میں لیا تھا کہ فیروز! اگر ان مزاروں کے مجاور تم ہوتے تو میں عقیدت کے ان کھلے ہوئے چند پھولوں کو چن لیتی اور ان کو سلک محبت میں پرو کر گلے میں ڈال لیتی۔ چند لمحے وہ خیالات کی دنیا میں گم تھی مگر افشائے راز اور سہیلیوں کے ستانے کے خوف سے فوراً کھڑی ہو گئی اور ٹھنڈی سانس کے ساتھ کہنے لگی۔ اس شعر میں کیسی التجا و آرزو ہے۔ نہ جانے کون اصفہانی جوان اس خاموش حدیقہ میں گہری نیند سو رہا ہے۔

صورت حال سے تو ہر ایک متاثر تھی ہی مگر شہناز کے دل پر ایسی سخت ٹھیس لگی کہ اس کا شیشہ دل چور چور تھا اب وہ عدم آباد بستی سے باہر نکل چکے تھے۔ ہوا تھم چکی تھی بادل غائب ہو گئے تھے آسمان نکل آیا تھا ستارے نمودار ہو چکے تھے چشمۂ مہتاب سے نور کی ندیاں رواں تھیں سبزہ زاروں اور کھیتوں کو پار کرتے سرسبز شاداب فصلوں سے گزرتے ہوئے ایک چوراستے پر پہنچے جہاں شاہانہ کا بنگلہ قریب تھا شمیم کو شاہانہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں خدا حافظ کہا اور اپنی سہیلیوں سے رخصت ہو کر اپنے بنگلے کے صدر پھاٹک میں داخل ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد رضیہ وغیرہ بھی اپنے بنگلہ پر پہنچ گئیں۔

اس کے بعد سے شہناز روزانہ شام کو گورغریباں کی سیر کو جاتی اور اپنے اصفہانی جوان کی قبر پر جھاڑو دیتی اور ایک چراغ جلا دیتی۔ قبر کے سرہانے ہر سنگار کا ایک درخت بھی لگا دیا تھا۔ مدت کے بعد جب آپس کی سہیلیاں اپنی اپنی شادیوں کے بعد ایک دوسرے سے جدا ہو کر، دلی اور لکھنؤ کے شہروں میں رہنے لگیں سلطانہ اب بڑی ہو چکی تھی جو اس وقت اپنی سہیلیوں میں سب سے کمسن تھی۔ ایک شام اسی قبرستان سے گزری جس میں فیروز کی قبر تھی اس کے پہلو میں اب ایک اور قبر تھی دونوں پر ہر سنگار کے مرجھائے ہوئے پھول بکھرے تھے اور ایک بجھی ہوئی شمع تھی۔

عزیز احمد فراہی

منصورآباد اور حیات آباد

(ادارہ کی ایک تاریخی تفریح)

۱۰ اکتوبر مطابق ۴ آذر ۱۳۴۹ ف کو منگل کے دن شعبۂ تاریخ دکن کا تاریخی دورہ ہوا۔ اس میں ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ، عبدالقادر صاحب سروری، عبدالحفیظ صاحب صدیقی بی اے سی اور عبدالمجید صدیقی شریک تھے۔ اس شعبہ کے ایک اجلاس میں یہ طے ہوا تھا کہ حیدرآباد کے مشرق میں جو تاریخی آثار پائے جاتے ہیں ان کا تحقیقی معائنہ ہونا چاہیئے، کیونکہ مشرقی جانب اس شاہراہ کے اردگرد جو مسولی پٹم کو جاتی ہے قطب شاہوں کے زمانے کے بہت سے تاریخی آثار موجود ہیں۔ خود شاہراہ بھی جو مسولی پٹم کی شاہراہ کہلاتی ہے تاریخی ہے اور یہ اب بھی بجواڑے پر سے گذرتی ہوئی مسولی پٹم پہنچتی ہے۔ قطب شاہی دور میں اس شاہراہ سے تاجروں اور سیاحوں کی بہت آمد و رفت ہوتی تھی۔ مغربی تاجر اور سیاح اسی کے ذریعے مسولی پٹم سے حیدرآباد آتے تھے اور قطب شاہی تاجر حیدرآباد سے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ان راہروؤں کی سہولت کے لئے قطب شاہی حکومت کی جانب سے اس راستے پر کئی سرائیں بنائی گئیں اور کنوے کھدوائے گئے جو اب تک موجود ہیں اور مسولی پٹم تک برابر پائے جاتے ہیں۔ اور کچھ انہیں ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے گولکنڈے کے سلاطین اور امرا اور خواتین نے اس شاہراہ پر کئی قصبے بھی آباد کئے اور ان میں عالی شان عمارتیں بنائیں۔

پہلے ہم نے منصورآباد کا معائنہ کیا جو موجودہ سڑک سے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ [illegible] سڑک کی دوسری جانب حال میں سرکاری [illegible] ہے۔ منصورآباد سڑک کے شمالی جانب ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ قریب جانے تک باہر سے اس قصبے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ یہ اس وقت ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس میں پرانے اور نئے مکانات پائے جاتے ہیں لیکن بعض کھنڈروں سے معلوم ہوتا ہے کہ گیارہویں صدی ہجری کے وسط میں جب کہ اس کی بنیاد پڑی تھی یہ قصبہ زیادہ آباد ہوگا اور یہاں مسافر ٹھیرتے ہوں گے چنانچہ فرانسیسی سیاح ٹیورنیر نے اپنے سفرنامے میں اس قصبے کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے سفر میں یہاں دو ایک روز ٹھیرا ہو۔ اور حیدرآباد سے جو شاہی جلوس حیات آباد یا اس کے آگے جاتے تھے وہ منصورآباد پر سے گزرتے تھے۔ اس وقت اس قصبے کی تاریخی یادگار صرف ایک مسجد ہے جو اس زمانے کی رہنمائی کرتی ہے یہ قطب شاہی طرز کی ایک پرانی مسجد ہے جو بلند کرسی پر تعمیر ہوئی ہے اس کی عمارت اور مینار چونے اور پتھر سے بنائے گئے ہیں اور کافی بلند ہیں۔ اس کے درمیان میں ایک حوض ہے۔ غالباً اس میں پانی پہنچانے کا بھی انتظام تھا۔ مسجد کے قریب ایک باؤلی بھی ہے جو اسی زمانے کا ہے اور اچھی حالت میں ہے۔ قرائن یہ ہیں کہ یہ قصبہ منصور خاں حبشی کا آباد کیا ہوا ہے اور اسی کے نام سے موسوم ہے۔ منصور خاں سلطان محمد قطب شاہ و عبداللہ قطب شاہ کے اوائل عہد میں سلطنت کی بڑی خدمتوں پر فائز تھا۔ لشکر رکاب خانے کی حوالداری سے ترقی کر کے سلطان محمد کے عہد میں عین الملک کی خدمت پر فائز ہوا جو فوج کی وزارت تھی چنانچہ عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت اسی نے گولکنڈے اور حیدرآباد

بیں امن قایم رکھنے کی کوشش کی اور کمسن بادشاہ کی
تخت نشینی کا انتظام کیا اور عبداللہ قطب شاہ کے اوائل
عہد میں خانم آغا کی سفارش سے جو بادشاہ کی دادی
تھی میر جملہ کی خدمت پر فائز ہو گیا۔ چونکہ یہ دکنی فریق کا
طرفدار تھا اس لئے اس کی موجودگی میں باہر والوں کو
ملک میں ترقی کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اور اس کے اثر
سے ملا محمد تقی جیسے لایق لوگ مختلف خدمتوں پر فائز
ہوئے۔ جب اس کا ۱۰۳۸ھ میں انتقال ہوا تو شیخ محمد
ابن خاتون اور دوسرے فوراً دربر سر حکومت ہو گئے۔

منصور آباد کے بعد حیات آباد کا معائنہ ہوا۔
جس کو آج کل بالعموم حیات نگر کہتے ہیں۔ یہ منصور آباد
سے دو میل اور شہر حیدرآباد سے ۹ میل کے فاصلے پر
واقع ہے۔ یہ مشہور قصبہ جو ایک زمانے میں ایک شہر
تھا قطب شاہی خاندان کی مشہور خاتون حیات بخشی بیگم
کا بنایا ہوا ہے جو "حیات ماں صاحب" کے ہر دلعزیز
لقب سے مشہور تھی اس کی تعمیر غالباً ۱۰۳۵ھ میں شروع
ہوئی تھی جب سلطان محمد قطب شاہ کا انتقال ہوا
اور اس کا کمسن بیٹا عبداللہ قطب شاہ تخت نشین
کیا گیا۔ شہر سے قریب اور مسولی پٹنم کی شاہراہ پر
ہونے کی وجہ سے اس کا موقع محل بہت اچھا تھا۔ اور ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ حیات ماں نے اس کو ایک بڑے شہر کی
صورت میں آباد کیا تھا یعنی اس میں عالی شان عمارتیں اور
باغ بنائے گئے اور کثرت سے تاجر صناع اور اہل علم
جمع کئے گئے۔ کیونکہ اس زمانے کا مورخ نظام الدین کہتا
ہے کہ "از وفور اہل صنعت وجمعیت اصناف طبقات انام
وکثرت ابنیہ وعمارات رفیعہ بسیارے باغات وبساتین
مشابہ شہرے شدہ"۔ دو تین سال میں یہاں اس قدر
چہل پہل ہو گئی تھی کہ لوگ بے ساختہ داد دیتے تھے۔
جب ۱۰۴۱ھ میں حیات ماں نے یہاں اپنے بیٹے
عبداللہ قطب شاہ کی رسم مونڑاشی انجام دی تو اس
قصبے کی رونق اس کے بلند محلات اور باغات کے ساتھ
بہت بڑھ گئی۔ اسی وجہ سے نظام الدین اس کے متعلق
کہتا ہے کہ "حیات آباد قطعہ ایست از بہشت بریں و
بقعہ ایست بہشت آئین" ان الفاظ سے اس قصبے
کی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ ۱۰۴۱ھ میں عبداللہ
کی رسم مونڑاشی کے موقع پر شاہی جلوس موضع سید آباد
اور منصور آباد میں ٹھیرتا ہوا حیات آباد پہنچا تھا۔ اس میں
حکومت کے تمام اعضائے سیاسی کے علاوہ ایران اور
مغل سلطنت کے سفیر بھی تھے اور ان کی بہت مہمان نوازی
ہوئی اور تقریباً ایک مہینے تک یہاں رقص وسرود کی
محفلیں گرم رہیں

لیکن افسوس یہ ہے کہ اس وقت اس کی وہ آبادی
ہے نہ اس کی عمارتیں باقی ہیں۔ اب اس کی پرانی یادگار
ایک عالی شان مسجد ہے جو اپنی وسعت اور بلندی کے اعتبار
سے قطب شاہی حسن کاری کا بہترین نمونہ ہے اور وسعت و
بلندی کے اعتبار سے مکہ مسجد کے بعد اسی مسجد کا درجہ ہے۔ یہ
ایک وسیع اور بلند عمارت ہے جو ایک بلند کرسی پر تعمیر ہوئی
ہے۔ مسجد اور اس کے میناروں کا نظارہ دیکھنے والوں کو
متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ اگرچہ تمام تعمیر قطب شاہی طرز
کی ہے لیکن اس کی ساخت میں جگہ جگہ لطیف اختراعیں
بھی پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے یہ مسجد دوسری تمام
قطب شاہی عمارتوں میں ممتاز ہو جاتی ہے۔ ان اختراعوں

معلوم ہوتا ہے کہ اس آخری دور میں جب کہ اس سلطنت کا
زوال شروع ہوگیا تھا قطب شاہی تعمیر کاری بہت
ترقی کرگئی تھی۔ مرکزی محراب اور اس کے آس پاس
کی کمانوں کو بڑے سلیقے سے سجایا گیا ہے اور ہر کمان
نئے طریقے سے تعمیر ہوئی ہے۔ نیز سقف پر نت نئے
نقش ونگار ہیں چنانچہ ہر سقف جو چار ستونوں کے
درمیان ہے نئے نقش سے آراستہ ہے۔ اس کے
میناروں کی ساخت بھی دوسری قطب شاہی مسجدوں سے
مختلف ہے ان میں بڑی جدت ہے ان کا نچلا حصہ عجیب
طرز سے بنایا گیا ہے یعنی اس کے چاروں طرف لٹکتی ہوئی
کئی کمانیں اس طرح بنائی گئی ہیں کہ عمارت سے علیحدہ
معلوم ہوتی ہیں گویا وہ بالکل معلق ہیں۔ اس کے بعد
میناروں کا درمیانی حصہ جو ان کمانوں کے اوپر سے
ایک سڈول صراحی یا مرتبان کی شکل میں ڈھالا گیا
ہے اور بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے اور بالائی حصہ جس پر
کلس نصب ہے انناس کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ اور جہاں
سے مینار شروع ہوتا ہے مینار کے چاروں طرف گچ سے
ایسا لطیف نقش بنایا گیا ہے کہ گویا مینار کو جواہر کا ہار
پہنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مسجد کی تمام چھت اور
اس کے تمام کنگوروں میں بے حد گچ کاری کی گئی ہے
اور چاروں طرف خوبصورت جالیاں کھڑی کی گئی ہیں قبلہ
کی طرف جو چھوٹے مینار ہیں وہ بھی بہت خوشنما معلوم
ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جالیوں اور میناروں
میں اندلس کی تعمیر کاری کی نقل کی گئی ہے۔

مسجد کے اندر ایک بہت بڑا صحن ہے جو دوسری
قطب شاہی مسجدوں کو نصیب نہیں۔ چاروں طرف
چار بڑے بڑے صدر دروازے ہیں لیکن سب سے
زیادہ دلچسپ چیز یہ ہے کہ چاروں طرف طلبہ اور مسافروں
کے ٹھیرنے کے لئے متعدد کمرے بنائے گئے ہیں جن کی
تعداد تقریباً ۱۲۰ ہے اگرچہ کمرے چھوٹے ہیں اور ان کی
مختصر وسعت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک شخص کی سکونت
کے لئے تھے لیکن ان کے باہر کشادہ برآمدے ہیں جو دھوپ
اور پانی سے حفاظت کرتے ہیں اور مشہور یہ ہے کہ یہ تمام
کمرے تعلیمی اغراض کے لئے تعمیر ہوئے تھے اور ان میں
طالب علم ٹھیرتے تھے۔ اور یہاں ان کی تعلیم کا خاطر خواہ
انتظام تھا صحن کے درمیان ایک بڑا حوض ہے جس میں
باہر سے پانی کا انتظام تھا اور غالباً اس حوض میں باؤلی
سے پانی آتا تھا جو مسجد کے شمالی جانب موجود ہے۔ بہت
بڑی سنگ بستہ باؤلی ہے اور مشہور یہ ہے کہ اس باؤلی
سے ہاتھی کے ذریعے پانی کھینچا جاتا تھا

اگرچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کئی باغ
اور عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں لیکن اب صرف ایک باغ رہ گیا
ہے جو "خاص باغ" کے نام سے موسوم ہے باغ کی
بنیادی روشوں سے جو گچ سے بنی ہوئی ہیں معلوم ہوتا
ہے کہ یہ قطب شاہی زمانے کا باغ ہے۔ اس کا نام بھی
پرانا ہے۔ بلند عمارات اور محلات میں سے جن کا ذکر
تاریخ میں ہے سوائے ایک چبوترے کے جس کو ایک
عمارت کی کرسی کہنا چاہئے کوئی چیز باقی نہیں ہے چبوترہ
یا کرسی مسجد کے سامنے ہے اس کی ساخت اور اس کے
خوشنما پہلوؤں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ایک اچھا
محل بنایا گیا تھا لیکن زمانے کے دست برد سے تباہ ہوگیا اور
اب اس محل کا صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کیونکہ جو

آئندہ مسجد کا بھی یہی حال ہو کیونکہ اس کی پشت پر کئی جگہ پیپل کے درخت اُگ آئے ہیں اور عجب نہیں کہ درختوں کی جڑوں سے جو پتھروں میں بُری طرح نفوذ کر جاتی ہیں مسجد کی پشت شق ہو جائے۔

عبدالمجید صدیقی

احساسِ زندگانی

دوڑا ہوا جبیں پر اک رنگ شادمانی عارض کی سرخیوں میں رقصاں نئی جوانی
وہ جسمِ مرمریں وہ ملبوس زعفرانی تم بن کے آگئے تھے اک حورِ آسمانی
اس وقت ہاں ہوا تھا احساسِ زندگانی

بے کیف زندگی سے گھبرا کے آگئے تھے تم اپنی بندشوں کو ٹھکرا کے آگئے تھے
بے مہریوں پہ اپنی پچھتا کے آگئے تھے روئے حسیں پہ زلفیں بکھرا کے آگئے تھے
اس وقت ہاں ہوا تھا احساسِ زندگانی

میں گنگنا رہا تھا تم مسکرا رہے تھے بجلی گرا رہے تھے جادو جگا رہے تھے
میں پاس آ رہا تھا تم دور جا رہے تھے شوخی سے تمکنت کی عظمت بڑھا رہے تھے
اس وقت ہاں ہوا تھا احساسِ زندگانی

آنکھوں میں اک چمک تھی رخ تمتما رہا تھا اک رنگ آ رہا تھا اک رنگ جا رہا تھا
سر سے ڈھلک کے آنچل شانوں تک آ رہا تھا تارا کہیں جبیں پر اک جھلملا رہا تھا
اس وقت ہاں ہوا تھا احساسِ زندگانی

عشرت کے زمزموں سے معمور تھیں فضائیں بے خود بنا رہی تھیں گاتی ہوئی ادائیں
اٹھتی تھیں مستیوں میں ڈوبی ہوئی نگاہیں تم مسکرا رہے تھے ڈالے گلے میں باہیں
اس وقت ہاں ہوا تھا احساسِ زندگانی

سینے سے نقشِ وہمِ باطل مٹا گئے تم صدقے میں اس کرم کے جینا سکھا گئے تم
کافر ادائیوں سے بندہ بنا گئے تم دل میں سما گئے ہستی پہ چھا گئے تم
اس وقت ہاں ہوا تھا احساسِ زندگانی

رشید احمد رشید
(عثمانیہ)

معاشرت میں سادگی (آخری قسط)

جس گھر میں بچے کی پیدائش کے ساتھ اس قسم کی تقریبوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور اس کی عمر کے ساتھ اس سلسلہ کی درازی بھی بڑھتی جاتی ہے، ایسے گھر کے بچے کی ذہنیت اور خیالات کیا ہو سکتے ہیں؟ قیمتی سے قیمتی لباس کی اس کو ضرورت ہوگی، اقسام کی فضول خرچیاں اس کی فطرت میں داخل ہو جائیں گی، خود پسندی اور انانیت کے زہریلے جراثیم اس کے دماغ میں گھر کر لیں گے، کاہلی اور عیش پرستی اس کی طبیعت ثانیہ بن جائے گی۔ غرض کہ ایسے ناز و نعم کے گہوارے میں جو بچے پرورش پاتے ہیں وہ دنیا میں کسی مرض کی دوا نہیں ہوتے، نہ ان کے عاقبت نااندیش والدین ہی کو انہی محنت کی وجہ ان کی تعلیم و تربیت کا خیال ہوتا ہے اور نہ ایسے بچوں میں پڑھنے لکھنے یا کوئی ہنر سیکھنے کا شوق ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی فضا میں پرورش پانے ہوئے بچے اگر کچھ پڑھ لکھ بھی لیں تو اپنی بری عادتوں کی وجہ اپنے بزرگوں کے نیک ناموں کو بدنام کرنے والے بن کر زمین کی پیٹھ کا بوجھ بن جاتے ہیں اور اپنے وجود سے دوسروں کو انسام کے نقصان پہنچاتے ہیں۔

اس موقع پر اسی قسم کے بگڑے ہوئے ایک صاحب کے فرزند ارجمند کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا۔ تعلیم کی غرض سے ایک صاحب نے اپنے صاحبزادے کو کلکتہ بھیجا، برخوردار کے ساتھ ایک اتالیق بھی بھیجے گئے، دو سو روپے کرایہ کا مکان لیا گیا اور صاحبزادہ صاحب نمائش میں شریک کرادیے گئے۔ لڑکے کے ساتھ پدر بزرگوار بھی محض اس کی دلجوئی کے لئے مہینہ ڈیڑھ مہینہ کلکتہ میں رہے۔ صاحبزادے کے لئے عمدہ فرنیچر خریدا گیا اور مکان کو خاطر خواہ سجا دیا گیا۔ کالج جانے کے لئے ایک چھوٹی سی کار بھی خریدی گئی شوفر رکھا گیا۔ ایک صاف ستھرا بٹلر بھی آ گیا باورچی حیدرآبادی اس لئے پسند کیا گیا کہ صاحبزادہ کی مرضی سے واقف تھا۔ سارے انتظامات کر کے جب پدر بزرگوار لوٹنے لگے تو باپ بیٹے مل کر خوب دھاڑیں دھاڑیں روئے اسٹیشن پر بھی ان دونوں کی جدائی کا عجیب منظر تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں روپے صرف ہونے کے بعد برخوردار بی اے پاس ہو گئے۔ جب بی اے کی کامیابی کا تار آیا تو گھر میں اعلیٰ پیمانہ پر جشن منایا گیا۔ کئی روز تک دعوتیں ہوتی رہیں۔ صاحبزادہ اور ان کے دن کلیوشی ہوئی کئی طوائف کے مجرے ہوئے ساتھ بہ شان دار ڈنر دیا گیا اور برخوردار کو پھول پہنا کر سب سے ملایا گیا۔ اس تقریب میں بی اے کے خوشنما پیالے کئے یعنی لباس پر دو ڈھائی سو روپے بھینٹ چڑھ گئے۔ چند روز کے بعد صاحبزادے کی صفتیں کھلنے لگیں۔ لیجا شریف کر ناداں باپ کو جب یہ معلوم ہوا کہ صاحبزادے بچے جواری شرابی بن کر [illegible] لن کی آنکھیں کھلیں۔ اپنے آپ [illegible] تعلیم کے زمانے میں [illegible] نہ یہ نوبت آتی مگر اب کیا ہو سکتا ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

جو لوگ فضول رسم و رواج کے پابند ہیں اور ان کو اپنے مذہب یا معاشرت کا جزو سمجھتے ہیں وہ کبھی سکھ چین سے زندگی نہیں بسر کر سکتے مسلسل تقریبوں کی وجہ سے کی پریشانیوں میں وہ ایسے مبتلا ہو جاتے ہیں کہ [illegible]

اولاد کی تعلیم و تربیت کی طرف کچھ توجہ نہیں کر سکتے' بچوں
کی پرورش اور صحیح تعلیم و تربیت سمجھدار والدین کی
کوششوں سے ہوتی ہے' اگر باپ فضول رسم و رواج
اور اپنی حیثیت سے زیادہ گھر کے مصارف کی وجہ سے
قرض کے ناقابلِ برداشت بار سے بوجھل ہو کر اپنے قرض
خواہوں کو سمجھانے' منانے اور اپنی عزت و آبرو بچانے
کی فکر میں لگ جائے تو ظاہر ہے کہ اکیلی ماں کیا کر سکتی
ہے! ہماری وہی لڑکیاں قوم کی مائیں بنتی ہیں جنھیں برائے نام
صرف تعلیم دی جاتی ہے' تربیت کی تو قطعاً ضرورت نہیں
سمجھی جاتی' حالانکہ تربیت تعلیم سے زیادہ ضروری ہے اور
یہی وہ چیز ہے جو ایک حیوان کو بھی انسان بنا دیتی ہے!
لڑکیوں کو اسکول بھیج کر ہم سمجھتے ہیں کہ ایک دن وہ صحیح معنوں
میں "عورت" بن کر نکلے گی. مگر جب وہ تھوڑی بہت تعلیم
پاکر اسکول سے نکلتی ہیں اور اپنے والدین کو جاہل یا پاگل
سمجھتی ہیں تو تب کہیں ان کی آنکھوں پر سے غفلت کے
پردے اٹھتے ہیں اور تربیت نہ کرنے پر انھیں کفِ افسوس
ملنا پڑتا ہے.

اکثر ایسی نظیریں بھی موجود ہیں کہ لڑکا انیس
بیس سال کا بھی نہیں ہونے پاتا کہ ماں باپ کو اپنے لختِ جگر
کے بیاہ کا خیال ستانے لگتا ہے' اگر بیاہ ممکن نہ ہو تو کم از کم
منگنی کی رسم تو کرنا واجب ہو جاتا ہے' یہ رسم ہوتے ہی نورِ چشم
کے سسرال سے سمدھیانے کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے اور
دونوں طرف سے عید بقر عید کے موقعوں پر حصے بخرے
آنے جانے شروع ہو جاتے ہیں. کہنے کو تو یہ عید کے
حصے ہوتے ہیں مگر ان کی تیاری میں کافی فضول خرچی کی
جاتی ہے اور موازنہ میں جو پہلے ہی سے غیر متوازن تھا
ایک مستقل مدِ خرچ کا اضافہ ہو جاتا ہے' اس طرح چند سال بھی
گزرنے نہیں پاتے کہ والدین کو فکر ہوتی ہے کہ اگر بیاہ جلد
نہ کیا جائے تو کہیں برخوردار "آوارہ" نہ ہو جائیں اور کسی
بازاری جنس سے چپکے سے سودا نہ کر لیں.

ہمارے گھروں میں شادی بیاہ کے موقعوں پر جو فضول خرچی
کی جاتی ہے اور بیہودہ رسوم میں جو اسراف ہوتا ہے.
اس کا صرف تصور ہی ایک سمجھ دار انسان کے لئے کافی
خوفناک اور شرمناک ہے' اپنی حیثیت سے بڑھ کر
اپنی شخصیت کو ظاہر کرنے کی خواہش ایک ایسا مرض
ہے جس میں تقریباً ہر شخص مبتلا نظر آتا ہے' تقاریب
کے موقعوں پر تو اس مرض میں کافی شدت ہو جاتی
ہے' عروس کے والدین خواہ صاحب ثروت ہوں
یا نہ ہوں مگر ان پر واجب ہے کہ اپنے برخوردار داماد
کے بیش قیمت لباس اور سواری یا "گھوڑے جوڑے"
کے لئے ایک کثیر رقم کسی صورت سے فراہم کریں. اس کے
علاوہ دلہن کے لئے قیمتی زرین لباس کے پچاس ساٹھ
جوڑے' مرصع زیور کا سراپا' نئی وضع کا عمدہ فرنیچر' نئے
ماڈل کی شان دار موٹر کار غرض کہ اقسام کی سیکڑوں چیزیں
جہیز میں دیں اور نکاح کے دن ایک ایسی پر تکلف دعوت
کریں کہ جس میں دولھا میاں کے سارے عزیز و احباب'
ان کے ہمسائے' دور دور کے رشتہ دار' اگر کہیں ملازم
ہیں تو دفتر کا پورا عملہ اور عہدہ دارانِ متعلقہ و غیر متعلقہ
سب کے سب بغیر کسی شکایت کے اقسام کے مزیدار کھانے
نوشِ جان کریں اور ناچ گانے کی محفل کا لطف اٹھاتے'

گپیں اڑاتے، تاش کھیلتے شام تک رونق افروز رہیں تاکہ
اس تقریب میں ایک "عصرانہ" بھی ہو جائے، اسی قسم
کی شادیاں اکثر خانہ بربادی کا باعث ہوا کرتی ہیں، اسی لئے
ہمارے ایک محترم دوست جنھیں خدا رکھے آدھی درجن
لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں ہمیشہ کہا کرتے ہیں

"بیٹی کیا آتی ہے اک گھر میں بلا آتی ہے"!

شادی بیاہ اور دوسری تقریبوں کے علاوہ محرم،
شب برات، اور عیدین کے موقعوں پر بھی ہم اپنی فضول خرچی
کا اپنی حیثیت سے بڑھ کر خوب مظاہرہ کرتے ہیں، جہاں کہیں
کوئی عید آئی دو چار ہفتے پہلے ہی سے دکانوں پر میلا لگ
جاتا ہے، اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک اپنے اور اپنے اہل وعیال
کے لئے سر سے پیر تک نیا لباس بنواتا اور نیا سامان خریدتا
ہے، یہاں تک کہ محرم کے متبرک دنوں میں بھی شہیدان کربلا
کی یاد کو تازہ کرنے کے عوض نئے نئے لباس بنائے جاتے
ہیں اور شب برات کے مقدس گھنٹوں میں عبادت کو بالائے
طاق رکھ کر آتشبازی سے جی بہلایا جاتا ہے اور بڑی
بیدردی سے روپے کی ہولی جلائی جاتی ہے۔

ہماری فضول خرچیوں اور رسم ورواج کی تباہ کاریوں
کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے، مرنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری
رہتا ہے، زیارت، دسواں، بیسواں، چہلم، سہ ماہی، چھ ماہی
نو ماہی، برسی وغیرہ کے ناموں سے جو تقریبیں کی جاتی
ہیں ان میں بھی جی کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے،
اور نہایت پر تکلف اقسام کے کھانوں سے مہمانوں کو
شاد کام کیا جاتا ہے، بعض لوگوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ
چہلم میں کم از کم چالیس قسم کے کھانے ہونے چاہئیں ورنہ
مرحوم یا مرحومہ کی روح کی بھوک پیاس تشنہ رہ جاتی
ہے اور اپنے پسماندوں کو پریشان کرتی، سرگرداں رہتی
ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ہمیں اپنے ایک دوست کی بیوی
کے چہلم میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی دسترخوان پر بلا مبالغہ
ہم نے چالیس قسم کے کھانے دیکھے۔ وفادار شوہر نے اپنی چہیتی بیوی کے
چہلم میں شریک ہونے والوں کی خاطر خواہ تواضع کی بڑی خوشی سے
آپ نے کھانے پکوائے تھے، جب دوست احباب اور عزیز و اقارب
رخصت ہونے لگے تو آپ نے سب کا شکریہ ادا کیا اور کھانوں کی
نسبت پوچھا کہ "کسی کو ناپسند تو نہیں ہوئے؟ مزے میں کیسے
تھے؟ میٹھے کیسے پکے تھے"؟ غرض کہ پکوان کے متعلق آپ نے
اقسام کے سوال کر ڈالے!! گویا کہ یہ تقریب آپ نے محض اپنا
سلیقہ اپنی لفاست اور اپنے کھانے کا مذاق دکھانے کے لئے کی تھی!!!

خوشی کی تقریبوں کی طرح زیارت، دسواں،
چہلم وغیرہ کو بھی تقریب کا رنگ دیا جاتا ہے، فرق صرف
اتنا ہوتا ہے کہ ان تقریبوں میں "ارباب نشاط" کو مدعو نہیں
کیا جاتا مگر بعض گھروں میں "قوالی" ہوا کرتی ہے، دوست احباب،
عزیز و اقارب، شناسائی، پڑوسی، حوالی موالی سب کے
سب جمع ہوتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور ہنس بول کر غم
غلط کرتے ہیں بقول اکبر الہ آبادی کے

بتائیں ہم تمھیں مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

فاتحہ اور نیاز بری چیزیں نہیں ہیں بشرطیکہ ان کو
صحیح معنوں میں انجام دیا جائے، محتاج، یتیم اور مستحقین
کے عوض ایسے لوگ مدعو کئے جاتے ہیں جن کی شرکت قطعاً
باعث ثواب نہیں ہو سکتی! اس طرح ایصال ثواب کا
مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اور فاتحہ "تقریب" بن
جاتی ہے!!

سخت ضرورت ہے کہ اپنی معاشرتی خرابیوں، رسم و رواج کی تباہ کاریوں اور فضول خرچیوں کی طرف ہم اپنی پہلی فرصت میں توجہ کریں کہ ہماری خوشی اور غمی کی یہ تقریبیں اپنے اندر کس حد تک تخریب کے سامان رکھتی ہیں اور کہاں تک ہمارے افلاس اور نکبت کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں، ہماری آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور ہم فیشن پرستی، مغرب کی اندھی تقلید، رسم و رواج اور توہمات کی بھول بھلیوں میں کچھ ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ ہمیں کچھ سوجھتا ہی نہیں! خدا ہمیں سمجھ دے کہ ہم فضول رسم و رواج کی پابندی اور مغرب کی اندھی تقلید کرنا چھوڑیں جس کی وجہ آئے دن ہماری دولت دوسری اقوام کی جیبوں میں چلی جا رہی ہے اور ہم افلاس اور بربادی کے بھنور میں غوطے کھا رہے ہیں، خدا وہ دن لائے کہ ہم برائی اور بھلائی میں امتیاز کرنا سیکھیں، کفایت شعاری کو اپنا شعار بنائیں اور اپنی آمد خرچ کے توازن کو برقرار رکھنے کی ہمیشہ کوشش کریں اپنی جھوٹی شان و شوکت کی نمائش کے عوض ہم میں وہی سادگی، راست بازی، عزتِ نفس اور صداقت شعاری کے جذبات پیدا ہوں جو ہمارے اسلاف میں تھے جن کی بدولت انھوں نے ساری دنیا کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور اپنا امتیاز دوسری اقوام سے منوا کر چھوڑا تھا

مرزا سیف علیخاں

دِل

بادۂ عشق سے لبریز ہے پیمانۂ دل　　بےخودی ہے صلۂ لغزشِ مستانۂ دل
وہمِ فردوس ہے اور زاہدِ بیگانۂ دل　　ورنہ کچھ راز نہیں خاکِ صنم خانۂ دل
حسنِ بیدار ہے آرائشِ کاشانۂ دل　　کس تکلف سے سجایا ہے پری خانۂ دل
تیز ہے عشق کی مے وہ ہیں براگندہ نقاب　　ڈر رہا ہوں کہ چھلک جائے نہ پیمانۂ دل
نغمۂ سازِ محبت کوئی سنتا ہی نہیں　　آج تک منتظرِ گوش ہے افسانۂ دل
محوِ نظارہ ہے وہ شمعِ شبستانِ جمال　　کس قدر شوخ ہے بےتابئ پروانۂ دل

داغِ پنہاں نے عجب پھول کھلائے کاوش
غیرتِ گلشنِ فردوس ہے ویرانۂ دل

کاوش

گل بوٹے

ہمیں ایک عمدہ قالین کی ضرورت تھی ! ملکی مصنوعات
کی دکان سے ہم نے اسکی تلاش شروع کی، ساری دکان
چھان ماری مگر ہمارے کمرے کے ناپ کا قالین نہ ملنا تھا نہ ملا!
یہاں سے ہم چلے دوسری دکان کی تلاش میں !! ایک صاحب
نے پتہ دیا کہ قدیم کتب خانہ کی عمارت میں جیل کی مصنوعات
کی [illegible] دکان ہے وہاں اگر قالین نہ ملے تو عمدہ نقشی دری تو
[illegible] ملے گی جب ہم مرحوم کتب خانے کے احاطہ میں داخل ہوئے
تو یہ محسوس ہوا کہ اس کے پچھلے جنم میں جہاں کتابوں کے
انبار [illegible] لگے رہتے تھے اب وہاں انجمنوں کے انبار
[illegible] ہوئے ہیں !

انجمنوں کی اس پرسکون اور دلکش دنیا میں ایک طرف
[illegible]

[illegible] ہم نے ان سے پوچھا
"جیل کے سامان کی دکان کہاں ہے"؟
جواب ملا "وہ معلوم نہیں یہ ترک مستورات کا دفتر
ہے"

ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ یہ نیا دفتر کب سے قائم ہوا ہے!
اور [illegible] میں کام کیا ہوتا ہے !! جستجو کے شوق نے ہمیں اندر جانے
پر مجبور کیا، یہاں "صیغہ دار" قسم کے ایک صاحب رونق افروز
تھے ہم نے ان سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ "ہر قسم کی
نشہ بازی کو ترک کرانے کا دفتر ہے" !!!
جب ہم نے اپنے پہلے اور دوسرے دونوں لاجواب
سوالات کے جوابات پر غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ دفتر "ترک مستورات"
اس لئے کہلاتا ہو گا کہ عورت بھی ایک قسم کا نشہ ہے!

اور یہ "وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے"!!
کسی زمانے میں بعض ولایتی گنڈیوں پر "دختِ رز"
کی بوتل کے ساتھ ایک ناچنے والی "دختِ حوا" کی تصویر
بھی ہوتی تھی اور اس کے نیچے "بربادی کا راستہ" لکھا ہوتا تھا،
گویا "بنت عنب" اور "بنت حوا" دونوں ہم اثر ٹھیرے! مگر اب
سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دفتر کو پہلے کس نشہ کے ترک
کرانے کی کوشش کرنی چاہیے !! یا ان لوگوں کو جو اس دوسری
قسم کے نشے میں چور رہ کر اپنی دین و دنیا خراب کر رہے ہیں "ایک
گونہ بیخودی" ہی میں مبتلا رکھنا چاہیے !!! اس مسئلہ کو "ترک
مستورات" کا دفتر ہی بہتر سلجھا سکتا ہے!

دل ہی دل میں اس مسئلہ پر غور کرتے ہم چلے جیل کی دکان
کی تلاش میں! اسی "دنیائے انجمن" کے ایک گوشے میں سر راہ
یہ دکان برآمد ہوئی اور بڑی مشکل سے "دست یابی" کے برآمدے
سے نیچے اتر کر ہم اس دکان میں نازل ہوئے!! دیکھتے کیا
ہیں کہ ملکی مصنوعات کو بڑے جیل خانوں سے نکال کر ایک "کال
کوٹھڑی" میں بند کر دیا گیا ہے! جسمیں چلنا پھرنا تو کجا سانس تک
لینا بھی دشوار ہے!!
اور جب ہمیں بے ساختہ ایک دوسری ریاست کی
مصنوعات کا شو روم یاد آیا تو بلا مبالغہ سینے میں دم رکنے لگا!!
جیل کی مصنوعات کی اس دکان میں ہم نے کچھ ایسی
چیزیں بھی دیکھیں جنھیں بعض "خوش مذاق" لوگوں نے کچھ بیعانہ
دیکر اپنے لئے محفوظ کرا لیا ہے! مگر اب نہ تو وہ باقی
روپے دے کر انہیں لیجاتے ہیں ورنہ کبھی اپنے نوکر کو بھیج کر
ان کو صاف کراتے ہیں!!

یہاں بھی ہمیں اپنے کمرے کے ناپ کا نہ قالین ملا نہ دری!
اگر وہ بارہ اس "کال کوٹھڑی" میں جانے کی ہمیں سعادت حاصل

ہوتی تو اس کی سج دھج پر شائد کچھ اور بھی عرض کرتے، اسی خیال سے حال ہی میں ہم نے اس دکان میں دوبارہ جانا چاہا تو دروازے پر کسی انجمن کا نام نظر آیا! بھلا انجمنوں کی اس "محفل" میں بیچارے غریب قیدیوں کی دستکاریاں کیا کیا دکھاتیں!!!

ایک خاتون جو "خوردن برائے زیستن و ذکر کردن" کی حقیقی معنوں میں پابند ہیں، کم از کم غذا کے استعمال کا ریکارڈ قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، موصوفہ کے اس مختصر مفید کھانے پینے کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

صبح (ناشتہ) آدھا بسکٹ، آدھی پیالی چاء،
دوپہر (لنچ) چانول دو تولہ، دال چھ ماشہ
سہ پہر۔ سنگترے کی ایک پھانک اور پاؤ پیالی چاء
شام (ڈنر) شیرمال ۲ تولہ، قورمہ ۲ ماشہ

کیسی ہی شدت کی گرمی کیوں نہ ہو مقررہ مقدار سے پانی تک زیادہ پینے کی آپ نے قسم کھا رکھی ہے اور اپنی پیاس پر بڑی خوبی سے آپ نے کافی قابو رکھا ہے، چنانچہ دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں صرف چار اونس پانی استعمال کرتی ہیں، وہ اس طرح کہ ناشتہ اور دوپہر کے کھانے کے درمیان ایک اونس، دوپہر کے کھانے اور سہ پہر کی چاء کے درمیان ایک اونس، سہ پہر کے اور شام کے کھانے کے درمیان ایک اونس سوتے وقت ٹھیک آدھی رات کو ایک اونس۔

غذا کی اس قلت نے اگرچہ کہ موصوفہ کو لکھنو کی ککڑی بنادیا ہے مگر روحانی قوت میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے اور بینائی اس قدر صاف اور تیز ہوگئی ہے کہ دن میں تارے نظر آرہے ہیں۔ اگر کسی کو ہمارے بیان کی صداقت میں شبہ ہو تو موصوفہ کے اس پروگرام پر عمل کر کے دیکھ لے کہ کس طرح وہی "آدمی" جس کے متعلق حضرت غالب فرماتے ہیں۔

"آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"!

کتنی سرعت کے ساتھ "انسان" بن جاتا ہے، اور "خوردن برائے زیستن و ذکر کردن" کا حقیقی مفہوم سمجھنے لگتا ہے!!

ایک دن صبح سویرے یہ منحوس خبر ملی کہ ہمارے ایک دوست نے اس سنسار سے اچانک رحلت فرمائی، ہمیں اس "مرگِ ناگہانی" پر کچھ تعجب نہیں ہوا، اس وجہ سے کہ آجکل پچاس فیصدی روحیں مسٹر عزرائیل اسی طرح اڑا لیجاتے ہیں اور عہدہ بیچارے "دل" پر رہتا ہے کہ اس نے بغیر کسی نوٹس کے "حرکت ہڑتال" کردی۔

کوئی دس بجے ہونگے کہ ہم مرحوم کے مکان پر پہنچے، گھر خاصہ ماتم کدہ تھا، عورتوں کے بین جگر کے ٹکڑے کر رہے تھے، بچوں کی شور و شین سے کلیجہ پانی پانی ہو رہا تھا، مرحوم کے عزیز اور دوست جمع ہو رہے تھے کہ آپ کو "منزل" تک پہنچادیں۔

کچھ دیر بعد سب کے سب اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں مرحوم ایک سفید شال کے نیچے قیامت کی نیند سو رہے تھے، جگہ جگہ اگربتیاں جل رہی تھیں، عود و لاگر کی خوشبو سے کمرہ طبلۂ عطار ہو رہا تھا اور آپ کے سرہانے دو حافظ جی تلاوت کر رہے تھے، کچھ عجب عبرت خیز منظر تھا، جو انسان چند گھنٹے پہلے بھلا چنگا، چلتا پھرتا تھا کسے خبر تھی کہ اس طرح رفو چکر ہو جائیگا۔ مرحوم کی خوبیوں کو یاد کر کے ہم سب نے آٹھ آٹھ آنسو بہائے

اور مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ہونے کی دعائے خیر کی، مرحوم کے بھائی سے معلوم ہوا کہ آپکی چھوٹی بہن کو جب آپ کی وفاتِ حسرت آیات کی خبر ملی تو اس قدر صدمہ ہوا کہ اس نے کوٹھے پر سے خود کو گرا دیا اور غش کر گئی اور کئی گھنٹوں سے بے ہوش ہے، آپ کی بھانجیوں نے اپنے سروں کو دیوار سے اس بری طرح ٹکرایا کہ لہولہان ہوگئیں، ہم نے حتی الامکان حقِ تعزیت ادا کیا اور مرحوم کے عزیزوں کو ضبط و صبر کی تلقین کی۔

جب مرحوم کے چھوٹے بھائی نے بچشم گریاں شال ہٹا کر ہم سب کو مرحوم کا "دیدار" کرایا تو ہم سب نے مرحوم کی "جوانا مرگی" پر اظہار افسوس کیا، مرحوم کی بے وقت موت اور آپ کے ننھے معصوم بچوں کے مستقبل پر ہم [illegible] رہے تھے کہ ہمیں مرحوم کے جسم میں کچھ حرکت معلوم ہوئی اور ہماری حیرت و پریشانی کی کوئی حد نہ تھی جب ہم نے دیکھا کہ "مرحوم" کلمہ پڑھتے اٹھ بیٹھے، "مرحوم" کا زندہ ہونا ہی تھا کہ ایک بھگدڑ پڑ گئی، بچے چیخیں مارتے بھاگ نکلے، دونوں حافظ جی ایک کونے میں چپک گئے اور بغیر آواز کے "لاحول" اور "برب الناس" پڑھنے لگے، دو چار جیوٹ جو "ترسیدم پائے رفتن بہ بست" کے چکر میں تھے وہ زبانِ حال سے کہہ رہے تھے۔

"این کہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب"

"مرحوم" کے بھائی ایک طرف کھڑے مسکرا رہے تھے اور "مرحوم" کے چہرے پر بھی ہنسی کی ایک ہلکی سی لہر رقص کر رہی تھی، ہم نے ڈرتے ڈرتے آپکے اس "ڈرامائی" موت کے متعلق جو استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ "کوا کوٹھی" کے "ملاپ" کا نظارہ اس ساری "ستم ظریفی" کا باعث ہوا، سب کو اسکی جھینپ پر ہی کہ کوا کوٹھی کے کارن انہیں "اُلّو" بننا پڑا، ہمیں یہ فکر ہوئی کہ ان پرندوں کی "شرارت" کے واقعات میں اگر کچھ تھوڑا سا اضافہ ہو جائے تو کوئی تعجب نہیں جو "موت ستی" میں شرکت کی رسم ہی سماج سے اٹھ جائے، جو کچھ بھی ہو ہمیں یہ سن کر مسرت ہوئی کہ "مرحوم" کی والدہ معظمہ بے حد خوش ہیں کہ اب آئندہ "سوا سو برس" تک "مرحوم" سے مسٹر عزرائیل ملاقات کی جرأت نہیں فرما سکتے، بڑی بی صاحبہ کو اسکی بھی خوشی ہے کہ "مرحوم" نے بڑی "سعادتمندی" سے اس معاملہ میں ان کے احکام کی لفظاً بلفظ تعمیل فرمائی، سچ ہے!

"این سعادت بزور بازو نیست"!!

ایک بزرگوار نے فتح میدان کے چوراہے کے "بجلی محل" کی دیوار پر جلی حروف میں لکھا دیکھا

"برقی قوت زیادہ استعمال کیجئے"،

اسی بات سے آپ نے اپنے مکان میں بجلی کے تمام چراغ روشن رکھنا شروع کر دئے! بیگم نے چیخ پکار کی تو فرمایا

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو! کسی ایسے ویسے سے نہیں سنا ہے!! سرکاری محکمے کے "بجلی محل" پر سونے سے حرفوں میں لکھا ہوا ہے" برقی قوت زیادہ استعمال کرو" سرکاری محکمہ جھوٹ کیسے لکھ سکتا ہے"!!!

غرض کہ پورا مہینہ آپ کے دولت خانہ میں ساری رات "چراغاں" ہوتا رہا، بیگم کی نیند حرام ہوگئی مگر آپ نے کسی کی نہیں سنی، برقی قوت زیادہ استعمال کرنے کے خاطر زیادہ قوت کے گولے لگائے گئے، اللہ اللہ کر کے مہینہ ختم ہوا، ہمیشہ پندرہ بیس روپے کا بل آیا کرتا تھا اس دفعہ پورے ڈیڑھ سو روپے کا بل آیا! بیگم نے سر پیٹ لیا، اتنے میں آپ

تشریف لائے، بیگم نے خوب صلواتیں سنائیں، آپ نے بل دیکھا اور لگے بغلیں بجانے! فرمایا

"دیکھا تم نے! اس مہینہ میں کتنا ڈسکونٹ ملا ہے"

چونکہ بل کی رقم زیادہ تھی اس لئے ڈسکونٹ کی مقدار بھی زیادہ ہو گئی تھی اور آپ کی نظر ہمیشہ ڈسکونٹ پر رہا کرتی تھی۔ بل ہاتھ میں پکڑے تھوڑی دیر آپ نے ادھر اُدھر چہل قدمی کی پھر بیگم کے بازو بیٹھ کر مسکراتے ہوئے بڑی متانت سے فرمایا:

"برقی قوت زیادہ استعمال کرنے میں فائدہ ہی فائدہ ہے کہیں "بجلی گھر" والے بھی جھوٹ بولتے ہیں"

باغبان

دنیائے خواب

جہاں دریا کی موجیں نور کے آنسو بہاتی ہیں
جہاں سورج کی کرنیں وادیوں میں منہ چھپاتی ہیں
جہاں چشموں پہ جل پریاں صف ماتم بچھاتی ہیں
وہ اس خاموش آبادی میں میٹھی نیند سوتی ہے

اسے بھاتی نہ تھی دنیا کی یہ ہنگامہ آرائی
رہا کرتی تھی اس کو جستجوئے کنج تنہائی
جدا بزم جہاں سے ہو کے وہ سوئے وطن آئی
وہ اس خاموش آبادی میں میٹھی نیند سوتی ہے

نہ دیکھے گی وہ اب کہسار کی رنگیں بہاروں کو
سنہرے لالہ زاروں کو، چھلکتے آبشاروں کو
شفق کی سرخیوں کو صبح کے غمگیں ستاروں کو
وہ اس خاموش آبادی میں میٹھی نیند سوتی ہے

ابد کی نیند سے اس کو جگا سکتا نہیں کوئی
حجابِ ظلمتِ شب کو اٹھا سکتا نہیں کوئی
سکوتِ موت پر آنسو بہا سکتا نہیں کوئی
وہ اس خاموش آبادی میں میٹھی نیند سوتی ہے

(ماخوذ از روزیٹی)

نعیم الدین صدیقی

جو کور ہونے کے ساتھ ساتھ انگلیاں بھی جو کور رہوں، انگلیوں کے
جو کور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ پتلی اور گول نہ ہوں بلکہ
گوشت سے بھری ہوئی ہوں اور ان کو ظاہر بظاہر دیکھ کر یہ
سمجھا جاسکے کہ یہ جو کور ہیں' جو کور ہاتھ والا عمل کے لئے بے چین
رہتا ہے' زندگی کا مطالعہ مادی اسباب اور عملی نقطۂ نظر سے
کرنے کے علاوہ عاقبت اندیشی سے کام لیتا ہے اس کے
خیالات میں ایک خاص قسم کی ترتیب اور تنظیم ہوتی ہے' محبت
کی جانب بہت کم مائل ہوتا ہے لیکن اگر کسی سے محبت ہوجاتی ہے
تو پھر مرتے دم تک نباہنے کی کوشش کرتا ہے ان سب
باتوں کے علاوہ کاروبار میں قابل اعتماد بھی ہوتا ہے لیکن جہاں
اتنی اچھائیاں ہیں وہاں کچھ برائیاں بھی ہیں' اختراع و ایجاد کا
مادہ نہیں ہوتا لکیر کا فقیر بنا رہتا ہے اور گہرائی میں جانے سے
بھاگتا ہے جو ظاہر بظاہر جو چیز جیسی بھی علم میں آجاتی ہے اس کو
ویسا ہی سمجھ لیتا ہے۔

چپٹا ہاتھ اس کو کہہ سکیں گے جس کی ہتیلی اور انگلیوں کے
سرے معمار کی کنی کی طرح چپٹے اور پھیلے ہوئے ہوں اس قسم
کا ہاتھ مضبوط اور اس کا انگوٹھا بڑا ہوتا ہے ایسے ہاتھ والے
میں اعتماد نفس' قوت ارادی کی مضبوطی' خیالات کی آزادی'
اختراع و ایجاد کی صلاحیت' پیش بینی کی قوت' سفر و سیاحت
کرنے کا شوق' مشنری کے کاموں میں دلچسپی' اور انتقام لینے کی
امنگ ہوتی ہے لیکن ایسے ہاتھ والا ہمدردی کے موقعوں پر
اکثر پیچھے ہٹ جاتا ہے چونکہ ایسے لوگوں کو آرٹ یا فنون لطیفہ
سے دلچسپی نہیں ہوتی اس لئے کسی چیز کی ظاہری جسامت اور
ضخامت ان کے دل و دماغ پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے
حسن کا احساس کمزور ہونے کی وجہ سے خوبصورتی کو بھی زیادہ
اہمیت نہیں دیتے' مذہبی معاملات میں کچھ غیر متعصب ہوتے ہیں
اور صرف انہی باتوں کا یقین کرلیتے ہیں جو ان کی عقل میں
کسی طریقے سے آجایا کرتی ہیں۔

گاؤدم ہاتھ والا صنعت اور فن کی جانب زیادہ مائل رہتا ہے
ایسے ہاتھ کی ہتیلی انگلیوں کی جڑ کی جانب نسبتاً کم چوڑی ہوتی ہے اور
ہتیلی تقریباً ایک تہائی حصہ اوپر کی جانب دبیز ہوتی ہے اس کی
کلائی کی طرف ہتیلی کا حصہ تدریجاً پتلا ہونا ضروری ہے ناخنوں
کی طرف ہاتھ کا حصہ بالکل گاؤدم سا معلوم ہوگا اور سارا ہاتھ اگر
انگلیوں کو ملا کر دیکھا جائے تو انگشتانے کی طرح دکھائی دے گا
جس کو درزی بیچ کی انگلی میں پہن کر سیتے پروتے ہیں' ایسے ہاتھ
والا جذبات کا فرماں بردار ہوتا ہے اور قوت عقل و تمیز کے سرمائے
کو ہاتھ لگانا قریب قریب امانت میں خیانت کردینے کے برابر
سمجھتا ہے اس کا قلب کسی چیز یا بات کے اثر کو بہت جلد قبول
کرلیتا ہے اس کی محبت اور دوستی' بودی اور جنسی ہوتی ہے
لیکن جب وہ کسی سے محبت کرتا ہے تو اندھا بن کر پرستش کرنے لگتا ہے
اس کا مزاج گھڑی میں تولہ اور گھڑی میں ماشہ ہوتا ہے
ابھی ابھی مسرتوں سے کھیل رہا تھا دیکھتے دیکھتے غم والم کا مجسمہ
بن گیا' بغیر کسی خاص وجہ کے کسی چیز سے محبت اور کسی سے
نفرت کرنا تو سمجھو کہ اس کی خاص خصوصیت ہے لیکن اس کے
ساتھ ہی ساتھ خطا پوشی اور عطا و بخشش کے موقعوں پر کبھی
پیچھے نہیں ہٹتا' اس کا غصہ کڑھی کا ابال سمجھو' طبیعت میں
جوش اور حقیقی باتوں کے مقابلہ میں خیالی امور پر توجہ اس کا
طرۂ امتیاز ہوتا ہے اگر ایسے ہاتھ والے کا انگوٹھا سخت ہوا تو
انہی خصوصیات میں قوت ارادی کا اضافہ ہونا ضروری ہے
صنعتوں سے کھیلنا اسکا خاص شغل ہوگا' پبلک کا کام کرنے
والے لوگوں میں ایسے ہاتھ والے اپنی ذہانت کی بہ نسبت
جوش سے زیادہ کامیاب ہوجاتے ہیں

مخلوط یا گدگدا ایسا ہاتھ کہا جاسکے گا جس میں گذشتہ تین قسموں کی
علامتیں ملی جلی پائی جائیں اس کی خصوصیات بھی اسی ہاتھ کی
جیسی ہونگی جس کی خصوصیات اس میں زیادہ پائی جاتی ہوں
مثلاً اگر کسی چوکور ہتھیلی والے ہاتھ کی انگلیاں ملی جلی یا مخلوط
ہوں تو ایسا شخص خیالی دنیا کا بادشاہ ہوگا لیکن ساتھ ساتھ
اس کا ہر خیال عملی سانچے میں ڈھلنا ضروری ہے کیونکہ ایسے
ہاتھ کا مالک کسی ماحول کے مطابق اپنے کو بنا لینے میں
تقریباً کامل ہوتا ہے۔ چپٹے ہاتھ کی مخلوط انگلیاں بھی انہی
خصوصیات کو ظاہر کرینگی لیکن ایسے شخص میں سیمابیت زیادہ
ہوگی، نئے نئے مناظر کا دلدادہ اور ایجادات کا شائق ہوگا
لیکن افسوس ہے کہ غیر مستقل مزاجی کی وجہ سے ناکام رہے گا۔
مخروطی یا گاؤدم ہتھیلی میں اگر ملی جلی انگلیاں ہوں تو
یہ سمجھنا چاہئے کہ ایسے شخص کے خیالات وحرکات آرٹ سے
زیادہ متاثر ہیں۔ گرہ دار ہاتھ سے مراد وہ ہاتھ ہوسکتا ہے
جس کی انگلیوں کے جوڑ زیادہ واضح اور نمایاں ہوں اور جوڑ
گرہوں جیسے دکھائی دیں۔ ایسے ہاتھ کو فلسفیانہ ہاتھ کہا جائیگا۔

اس علم میں انگوٹھے کی بڑی اہمیت ہے دوسری
انگلیوں کی طرح انگوٹھے کے بھی تین حصے یا پوریں ہوتی ہیں پہلی پور تو
وہ ہے جس میں ناخن شامل ہے دوسری پور درمیانی اور
تیسری پور اس کو کہا جائیگا جس میں ہتھیلی کا ایک حصہ شامل ہے۔
پہلی پور ارادے کی قوتوں کو ظاہر کرتی ہے، دوسری عقل
اور تدبر کو اگر یہ دونوں پوریں برابر کی ہوں تو سمجھنا چاہئے کہ
یہ دونوں قوتیں برابر کی ہیں اور ایسا انسان معاملات پر عقلمندی سے
دل سے غور کرنے کے علاوہ عمل بھی کرتا ہے لیکن اگر پہلی پور
نوکیلی ہوگی تو ایسے آدمی پر ماحول کا اثر اس طرح اثر پڑے گا جیسے
مقناطیس کا فولاد پر۔ اگر پہلی پور دوسری پور سے چھوٹی اور
چوڑی ہوگی تو خودرائی کا مادہ زیادہ پایا جائے گا۔ اگر پہلی پور کا
زیادہ بھرا ہوا حصہ جوڑ کے قریب ہو یہاں تک کہ دوسری پور
تک چلا گیا ہو تو ایسا شخص اپنی ہٹ کا پکا ہوگا اس کو جب تک
پوری پوری طور پر کسی بات کا یقین نہ ہو اپنے خیال سے باز آنے
کا نام نہ لے گا اگر پہلی پور بہت چھوٹی ہوگی تو قوتِ ارادہ نام
کو بھی نہ ہوگی، ایسا شخص بس خیالی دنیا میں ہوا میں مارا کریگا یہی
وجہ ہے کہ عورتوں کے انگوٹھوں کی پہلی پور بہت چھوٹی ہوتی ہے
ابھی ابھی عرض کیا گیا ہے کہ دوسری پور قوتِ فہم وفیصلہ کو
ظاہر کرتی ہے اگر دوسری پور لمبی اور پہلی پور کے برابر ہوگی
تو معلوم ہوگا کہ ایسے شخص کی قوتِ استدلال وفیصلہ اٹل ہے
لیکن اگر اسی کے ہاتھ کی پہلی پور چھوٹی ہوگی تو اس کی قوت
عمل پژمردہ ہوگی اور ایسا شخص اپنے خیالات وتجاویز کو شکل
سے عملی صورتوں میں تبدیل کرنے پر قادر ہو سکیگا۔ دوسری پور
اگر چھوٹی ہوئی تو قوت استدلال نہ ہونے کے علاوہ اس سے
دوستی اور وفاداری کی امید کرنا کاغذی پھول سے خوشبو کے
تمنی ہونے کے برابر ہے۔ اگر دوسری پور پہلی کے برابر ہوتی
ہوگی تو اس پور کی خصوصیات بہت زیادہ واضح اور نمایاں
ہوں گی۔ تیسری پور ہتھیلی میں شامل ہے اور اس کا تعلق محبت
وغیرہ سے ہے۔ انگوٹھا دو قسم کا ہوتا ہے، نرم اور سخت، نرم
انگوٹھا پھیلاتے وقت پیچھے کی طرف جھکا رہتا ہے اور سخت ہمیشہ
سیدھا کیونکہ اس کا جوڑ مضبوط ہوتا ہے۔ نازک جوڑ کے انگوٹھے والا ضدی
نہیں ہوتا معقول بات سن لیتا ہے، ہنستے کھیلتے زندگی گذارنا
مروت، اخلاق اور فیاضی سے کام لینا اس کا خاص جوہر ہوتا ہے
ہاتھ کی انگلیاں پھیلانے میں انگوٹھا انگلیوں سے جتنا زیادہ دور رہیگا
اتنا ہی ایک انسان فیاض دل اور فضول خرچ ہوگا اور جتنا انگلیوں کی طرف
کھنچا رہیگا اتنا ہی کنجوس ہوگا اور قدم قدم پر احتیاط سے کام لیگا سخت جوڑ کے

انگوٹھے والا تند خو ہوتا ہے پہلے تو وہ کسی بات کو تسلیم ہی نہیں کرتا جب تک اس کو پورا ثبوت نہ مل جائے لیکن اگر وہ کسی بات کو دل میں ٹھان لیتا ہے تو پھر اس کو کئے بغیر چین نہیں لیتا۔ تنہائی پسندی، غرور، ضد، اس کی خاص صفات ہیں۔ بعض انگوٹھوں کا سرا نہایت ہی بھدا اور موٹا ہوتا ہے انگوٹھے کی یہ قسم اچھی نہیں ہوتی کیونکہ ایسے انگوٹھے والے جاہل، وحشی اور ظالم ہوتے ہیں یہاں تک کہ سنگین سے سنگین جرم بھی کرتے ہوئے نہیں ڈرتے۔

اس وقت تک جو کچھ بھی عرض کیا گیا ہے اس میں ہاتھوں کی بناوٹ اور انگوٹھے کی ساخت پر مختصر الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے یہ نہیں ظاہر کیا گیا کہ اگر ایسے ہاتھوں کے ساتھ دوسری انگلیوں کی پوریں ایسی ہوں یا ناخن ایسے ہوں تو [illegible] طبیعت کا رخ اور فطرت کا رجحان کدھر ہوگا ہاتھوں کے ساتھ ساتھ ناخنوں اور پوروں کی کیفیت اور خاص طور پر لکیروں کے اتار چڑھاؤ کے اثرات کا بھی دخل ہے اس لئے تاوقتیکہ کسی ہاتھ کی تمام چیزیں سامنے نہ ہوں لب کشائی ذرا مشکل ہی ہے۔

گو یہ علم اپنی جگہ پر بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن اس میں ایک خامی ایسی ہے جس کی تلافی ذرا مشکل ہی معلوم ہوتی ہے یعنی ہاتھ کی لکیریں گھٹنے بڑھنے کی وجہ سے قطعیت کے ساتھ کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا لیکن باوجود اس قابل لحاظ کمزوری کے لوگوں نے اس کے پیچھے اپنی زندگیاں تباہ کر دیں اور گھربار تج دیا۔ ہندوستان میں عام طور پر اس علم سے دلچسپی پائی جاتی ہے، گاؤں میں چلے جائیے بہت سے پنڈت اس بلا میں گرفتار دکھائی دیں گے، قصبوں کے جوتشی بھی کچھ کم نہیں ہیں، شہروں کے تعلیم یافتہ حضرات بھی اس کی چاشنی کے مزے لے رہے ہیں بہر حال اس کا چرچا ہر طرف ہے میرے ذاتی مشاہدات ہیں کہ وہ لوگ جو اس فن اور اس فن کے جاننے والوں کو ذلت اور بے اعتباری کی نظروں سے دیکھتے ہیں کسی نہ کسی وقت اپنا ہاتھ ان میں سے کسی ایک کے سامنے پھیلا ہی دیتے ہیں خواہ وہ مذاق اور تفریح کی خاطر ہی کیوں نہ ہو۔

دنیا کے ایسے علوم جن کا تعلق پیشین گوئی وغیرہ سے ہے زیادہ تر مذہبی بنیادوں پر قائم ہیں اس لئے ایسا شخص جو مادہ کو ہی کائنات کا خالق سمجھتا ہو اور جس کی نظروں میں حشر و نشر کی کوئی حقیقت اور اہمیت نہ ہو اور جس کی عقلی رسائیاں یہاں تک پہنچ کر جواب دے گئی ہوں کہ انسان صرف چند کیمیائی اجزا کی آمیزش کا نام ہے [illegible] اس کا فنا ہو جانا محض انہی اجزا کا بکھراؤ ہی ہو سکتا ہے ظاہر ہے کہ اس کی نظروں میں ایسے علوم [illegible] نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر ایسے لوگ ادھر ایک قدم بھی بڑھائیں تو سمجھو کہ آفت ہی آجائے اس لئے کہ اس کو ماننے کے بعد ایک ناقابل فہم برتر و بالا قوت کا ماننا ان پر واجب ہو جائے اور پھر ان کی تمام عیش ایسی آزادیاں خاک میں مل کر رہ جائیں لیکن یہ قدرت کا کھیل سمجھو یا فطرت کا کرشمہ کہ ان کی زندگی میں بھی ایسے لمحے ہوتے ہیں یا آجایا کرتے ہیں کہ ان کو ایسی چیزوں کے سامنے مجبوراً جھک جانا پڑتا ہے۔ گو بظاہر یہ بات مشکل سے ہی سمجھ میں آتی ہے کہ انسان کے ہاتھ پیر آنکھ ناک سر سینہ گردن ناخن، پوروں اور بالوں کی وضع قطع یا ان کی نرمی سختی بھی ایسی چیزیں ہو سکتی ہیں جن کا انسانی زندگی سے تعلق ہو سکتا ہے لیکن باوجود اس کے علم قیافہ اور سمدرک دنیا میں موجود ہے اور اچھی اہمیت کے ساتھ پھل پھول رہا ہے۔ ہندو بھائیوں کے ہاں تو

سدرک اور زائچے وغیرہ کی تقریباً پچانوے فیصد اہمیت ہے اور وہ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اس کی اہمیتوں کو پیش نظر رکھتے ہیں، اور ہر بچہ پیدا ہوا کہ زائچہ تیار، جس میں وقت گھڑی، ساعت، دن تاریخ سب ہی کچھ موجود۔ زائچہ بیکار چیز نہیں ہے اس سے ستارے وغیرہ بھی دیکھے جاسکتے ہیں علاوہ اس کے دوسرے علوم کے سلسلہ میں بھی کام آتا ہے ان سب کے قطع نظر … بات … ہو جانا کیا کرے کہ خاندان میں کس کی کتنی عمر رہی اور … کے بعد اس میں کتنی کمی و زیادتی ہوئی میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ علم سدرک اور قیافہ کے کے علاوہ اور بہت سے علوم ایسے ہیں جن کی مدد سے فطرت انسانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن خدا بھلا کرے ہماری کم علمی کا جو ہمارے ساتھ ہر وقت پہاڑ بنی رہتی ہے جس کی وجہ سے نہ تو ہم آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اس کا کیا دم گیا؟

ایک زمانہ تھا کہ اسی سدرک کو ترقی دینے کی سیکڑوں کوششیں کی گئیں اور بعض اہم کتابیں بھی لکھی گئیں لیکن بعض وجوہ کے تحت خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی یہاں تک کہ دنیا اس کی طرف سے قریب قریب بالکل بے خبر ہو گئی لیکن زمانے کی رفتار نے دنیا کو پھر گردش دی اور اس علم کے دن پھرے، چنانچہ آج یوروپی اور مخصوص طور پر فرانسیسی زبان کے دامن تو تقریباً اس علم سے مالامال ہیں۔ یہ خیال میرے لئے سخت تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے جب میں محسوس کرتا ہوں کہ اردو اس علم سے تہی آغوش ہے وہ حضرات جو اردو داں ہونے کے علاوہ دوسری زبانوں سے بھی واقف ہیں اس جانب توجہ فرمائیں۔

شجاع احمد قائد

(یہ مضمون حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا تھا)

بادۂ شباب

نغمۂ غم جب کبھی … کر سنا دیتا ہوں میں
اپنے قدموں میں دو عالم کو جھکا دیتا ہوں میں

جب نیا … کے پردے اٹھا دیتا ہوں میں
دہر کی تاریکیوں کو جگمگا دیتا ہوں میں

جب وفورِ شوق میں خود کو بھلا دیتا ہوں میں
رفعت و پستی کو اک مرکز پہ لا دیتا ہوں میں

وہ سراپا … اور میں مجسم درد و غم
پھر بھی اس کو دل کا آئینہ دکھا دیتا ہوں میں

تیرے … آیا ہے … لطف و کرم کی یاد میں
ہر قدم پر اک نئی دنیا بسا دیتا ہوں میں

اس بلندی سے جہاں وہ خود نہ اب تک آسکا
کیا خبر ہے کس لئے اس کو صدا دیتا ہوں میں

ہائے وہ معصوم آنکھیں جن میں شاید میں بھی تھا
کس قدر بدبخت ہوں ان کو بھلا دیتا ہوں میں

اس تمنا میں کہ تا … تم نہ مجھ کو پا سکو
اپنی قیمت اپنی نظروں سے گرا دیتا ہوں میں

جذب ہو جاتی ہے … آنکھوں میں زندگی
اپنی محرومی پہ جب اس کو رلا دیتا ہوں میں

یہ … نہ پوچھو … ساقی کو نظر
مست ہو کر ہستیوں لے کر سلا دیتا ہوں میں

چھیڑتا ہوں جب … لے تا دائم نظر
… میں ایک … چھپا دیتا ہوں میں

نظر

دعوت

روز کی طرح آج پھر صبح ہوئی۔ مگر اب تک سورج نہیں نکلا تھا کالے بادلوں سے آسمان ڈھکا ہوا تھا۔ آنکھیں کھلنے سے پہلے ہی شکیلہ نے محسوس کیا تھا کہ آج کا دن بے رونق ہوگا مگر وہ ہمت کر کے اٹھی اسی لئے کہ صبح چھ بجے اٹھنا روز کا معمول تھا اور اس لئے بھی اٹھی کہ وہ یہ معلوم کرنے کے لئے بے چین تھی کہ کل شاکر کے انٹرویو کا کیا حشر ہوا۔ رات جب وہ آیا تو شکیلہ سو رہی تھی۔ شکیلہ نے اٹھتے ہوئے آہستہ سے شاکر کو پکارا۔ مگر وہ غافل سو رہا تھا۔ اس کے چہرے سے خوشی یا غم کے آثار ظاہر نہیں تھے۔ ہاں ایک قسم کا اطمینان ضرور ظاہر ہوتا تھا۔ وہ اس کے چہرے سے کل کے انٹرویو کی کامیابی یا ناکامی معلوم کرنا چاہتی تھی۔ مگر بے سود شاکر کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی عمر چالیس سے کچھ زیادہ ہے اور ذرا بھاری بدن کا آدمی ہے۔ جب تک وہ اٹھ کر بولنا نہیں شروع کرے گا وہ کچھ بھی معلوم نہ کر سکے گی۔ جب وہ رات کو دیر میں گھر آتا تو کبھی شکیلہ کو نہ جگاتا تھا شکیلہ نے بھی اس وقت اس کی نیند خراب کرنی گوارا نہیں کی اور آہستہ کمرے کے باہر چلی گئی۔

غسل خانے کی صاف ستھری چیزوں اور صابن کی ہلکی ہلکی خوشبو میں وہ موسم کی خرابی کو بھول گئی۔ بارہ سال کی شادی شدہ زندگی میں اسے بہت سے تجربے ہوئے۔ کتنے ہی غم اور خوشیاں دیکھنے میں آئیں۔ دنیا کی بہت سی چیزیں بدل گئیں۔ مگر یہ گھر جیسا تھا ویسا ہی رہا۔ اس لئے شکیلہ کو اپنے گھر سے بہت محبت تھی۔

اب وہ باورچی خانے میں گئی، ہر ایک چیز صفائی سے اپنی جگہ پر رکھی تھی۔ چھوٹا سا نعمت خانہ اور دوسرا باورچی خانے کا سامان آج سے گیارہ سال پہلے حسین بی کو نوکر رکھنے سے کچھ دن قبل خریدا تھا بالکل اسی طرح اپنی جگہ پر رکھا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی اسے اپنی وفادار نوکرانی یاد آ گئی۔ ناشتہ پکاتے پکاتے وہ سوچنے لگی، کہ اگر نوکر ہمارے زیادہ عرصے تک رہیں تو ہم کس طرح ان کے دکھ درد کے ساتھی بن جاتے ہیں۔

حسین بی کے جانے سے شکیلہ کو اتنا ہی رنج ہوا تھا جتنا اس کے مرنے سے ہوتا۔ وہ دونوں خوب روئی تھیں "بیگم صاحب جب تک سرکار کو نوکری نہیں ملتی بغیر تنخواہ کے کام کروں گی۔"

لیکن شکیلہ نے کہا "بیوقوفوں جیسی باتیں مت کرو تم محنتی ہو تمہیں ابھی سے اچھی نوکری مل سکتی ہے۔ جب وہ نوکر ہو جائیں گے میں تم کو پھر بلاؤں گی۔ فی الحال بوڑھا قاسم کافی ہے۔"

حسین بی کو نوکری مل گئی پہلے سے اچھی۔ اس دوران میں کہ شکیلہ یہ سب باتیں سوچ رہی تھی شاکر کے غسل خانے میں جانے کی آواز آئی "یہ آبادی میں رہنے کی خرابی ہے۔ موٹروں اور گاڑیوں کی گھڑگھڑاہٹ اور گلی کے بچوں کی چیخ پکار سے انسان آرام سے نہیں سو سکتا۔ شکیلہ نے جلدی جلدی ناشتے کی سب چیزیں رکابیوں میں نکالنی شروع کیں "کچھ بھی ہو میں یہ نہ معلوم ہونے دوں گی کہ مجھے کچھ فکر ہے" قبل اس کے کہ وہ سب چیزیں ٹھیک کرے شاکر باورچی خانے کے دروازے میں کھڑا تھا۔

"اوہو آپ آ گئے لیجئے ناشتہ بھی تیار" شکیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں صاحب بھوک۔ تو بہت لگ رہی ہے" شاکر نے سر کھجلاتے ہوئے کہا اور وہیں چوکی پر بیٹھ گیا "ہاں تو بڑے منصف صاحب بھی، ہاں تھے۔ ان کو ایک مددگار کی ضرورت ہے

وہ اپنا جیسا ہی آدمی چاہتے ہیں۔

"اپنا جیسا آدمی چاہتے ہیں! اس کا کیا مطلب ہے؟ وہ خود کیسے ہیں"؟

"کیا بتاؤں کیسے ہیں دقیانوسی بڈھے آدمی ہیں" شاکر تھوڑی دیر کے لئے کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ "سمجھتے ہیں ان سے اچھا افسر دنیا میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اور ان کا خیال ہے کہ کاروبار میں انسانیت سے کام لینا چاہیئے۔"

"مگر جب آپ نے کہا کہ مجھے نوکری کی ضرورت ہے تو انھوں نے کیا کہا۔ میں جب سے یہ معلوم کرنا چاہ رہی ہوں" شکیلہ کے اس سوال سے شاکر کو بڑی الجھن ہوئی

"یا اللہ" تم نے آخر مجھے سمجھ کیا رکھا ہے میں ان سے نوکری کے لئے کس طرح پوچھ بیٹھتا؟ اگر ان کو سرسری طور پر بھی یہ معلوم ہو جاتا کہ میں نوکری کے لئے آیا ہوں، تو شاید وہ مجھ سے بات بھی نہ کرتے۔ یہ کام تو سلیقے سے کئے جاتے ہیں۔ شوکت اور حامد نے ان سے میرا ذکر کیا تھا۔"

"آپ کا کیا ذکر کیا تھا"؟

"یہی کہ میں دفتر میں نوکر تھا۔ وہاں تخفیف کی وجہ سے میں الگ کر دیا گیا ہوں۔ اور یہ کہ میں بہت محنتی اور قابل ہوں"

"تو پھر آپ سے منصف صاحب نے کیا کہا"؟

"یہی کہ مجھ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ہمارے ہاں آنے کی خواہش ظاہر کی اور کہا کہ میرے ساتھ کسی دن کھانا کھائیں گے"

"ہمارے پاس کھانا کھائیں گے"؟

"ہاں وہ" شکیلہ کو سمجھانے لگا "انھیں گھر کے پکے ہوئے کھانے بہت پسند ہیں۔ تین سال ہوئے کہ ان کی بیوی مر گئی ہیں۔ جب سے اچھا کھانا انھیں میسر نہیں آیا۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ آج شام کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں"

"آپ نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ نہیں کہ۔ ۔ ۔ ۔"

آخر شاکر کے صبر کا پیالہ لبریز ہو گیا۔ "ایک تو نوکری تلاش کرتے کرتے میرا ناک میں دم آگیا ہے اور گھر آؤ تو تم سوال کر کر کے جان کھا جاتی ہو۔ منصف صاحب سے تو مجھے کچھ اطمینان نہیں ہوا۔ آج دو تین جگہ اور جانا ہے بھاگتے بھاگتے میرا برا حال ہے اور تم سے ایک آدمی کی دعوت کا سامان بھی نہیں ہو سکتا۔ اب یہ بھی میں ہی بتاؤں کہ تم کیا کیا پکاؤ۔ آخر تم کو خدا نے دماغ کس واسطے دیا ہے"؟

جھگڑا بڑھنے کے خیال سے وہ ہنس دی: "اچھا جانے دیجئے۔ خیر کچھ بھی پکا لیں گے۔"

"نہیں زیادہ تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہم جو ہر روز کھاتے ہیں وہ کافی ہے۔ دستر خوان پر صرف ایک دو کابی زیادہ رکھ دینا اور بس۔

گھبرانے نہیں آج کل ہی میں نوکری مل جائے گی"

"کیا سچ مچ آج کل ہی میں مل جائے گی" وہ سوچنے لگی۔ سوائے مایوسی کے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ شاکر کی عمر چالیس سے اوپر ہو چکی ہے۔ اس عمر میں نوکری ملنی بہت مشکل ہوتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شاکر کو نوکری نہ ملے اور ہمیں اپنا مکان بیچ دینا پڑے۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ سال بھر سے روپے کی قلت نے ان کو کتنا ستا رکھا ہے شادی کے بعد آج پہلی دفعہ اسے یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ ان کے کوئی بچہ نہیں ہے۔

وہ سب باتیں سوچتے سوچتے ایک دم چونک پڑی وہ کتنی ہی پست ہمت کیوں نہ ہو۔ اس پر کتنی ہی مصیبتیں کیوں نہ پڑیں مگر اسے گھر کا کام کرنا تو ضروری ہے۔ اور آج تو

شاکر نے منصف صاحب کی دعوت بھی کر دی ہے۔ ایک
ایسے آدمی کی دعوت جس کو ان سے بالکل ہمدردی نہیں؛
جس سے دوستی کی توقع نہیں۔ غربت کے زمانے میں
ایسے آدمی کی دعوت کرنا بہت ہمت کا کام ہے "بڈھے تو
ہیں کیا خبر پرہیزی کھانا کھاتے ہوں" اس کو آج ایک ایسے
آدمی کے لئے کھانا پکانا تھا، جس کے سہارے شاکر کو نوکری
ملنے کی ہلکی سی امید تھی اور دیوان خانہ بھی صاف کرنا تھا۔
اتنا سارا کام اور وہ اکیلی کرنے والی۔

شکیلہ نے قاسم کو آواز دی اور اسے دعوت کا
سامان بتانے لگی: "اچھا سیر بھر گوشت لے آؤ۔"

"سیر بھر گوشت بیگم صاحب!!"

"ہاں" شکیلہ کا منہ ندامت سے سرخ ہو گیا شاکر
کی نوکری چھوٹنے کے بعد اس نے پہلی مرتبہ سیر بھر گوشت
لانے کو کہا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ قصائی کی قرضدار تھی

"بیگم صاحب آج کیا پکائیں گے"

"گوشت بھونا جائے گا اور بہت سی چیزیں پکانی
ہیں۔ آج دعوت ہے۔"

"بھنا ہوا گوشت بیگم صاحب مجھ کو بھی بہت پسند ہے۔
مگر جب سے دانت ٹوٹے ہیں کھانا چھوڑ دیا۔"

"شائد منصف صاحب کے بھی دانت ٹوٹے
ہوئے ہوں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ بڈھے آدمی ہیں۔"
شکیلہ نے سوچا "اچھا گوشت مت لاؤ۔" پھر سوچ میں پڑ گئی۔
"ان سے کیوں نہیں پوچھ لیا کہ منصف صاحب کے دانت
ٹوٹے ہوئے تو نہیں ہیں۔" جیسے شاکر اسے بتا دیتا تھا
اسے تو پہلے ہی غصہ آ رہا تھا۔ "معمولی فیرنی پلاؤ اور آلو کا
قورما بس ٹھیک ہے جب وہ معمولی گھر کی پکی ہوئی چیزیں
چاہتے ہیں تو مجھے کیا مصیبت پڑی ہے کہ پر تکلف کھانے پکاؤں
اس نے قاسم کو سودا بتایا۔ ۔ ۔ وہ چلا گیا۔

قاسم کے جانے بعد وہ باورچی خانے جانے والی
ہی تھی کہ ایک لڑکے نے خط لا کر دیا۔ یہ بجلی کے کارخانے کا
خط تھا۔ اور اطلاع تھی کہ "۔۔ مہینے سے آپ نے بجلی کا
بل ادا نہیں کیا۔ اگر آج شام تک آپ نے دس روپئے
نہیں بھیجے تو کارخانے والے تار کاٹ دیں گے ہم
اس لئے یاد دلاتا ہوں کہ شائد آپ بھول گئے ہوں۔"

"اچھا آج بھیج دیا جائے گا" شکیلہ نے لکھ دیا
وہ دونوں بجلی کے بل کو تو بالکل بھول گئے تھے آج بھی
اگر بے وقت اطلاع نہ مل جاتی تو منصف صاحب کی دعوت
اندھیرے میں ہوتی مگر یہ دس روپئے آئیں گے کہاں سے۔
شکیلہ کے پاس تو صرف چھ روپئے تھے اب چار روپئے
کی کمی کس طرح پوری ہو۔ اس نے گھر کے سارے ڈبے
دیکھ ڈالے شاکر کی تمام پرانی شیروانیوں کی جیبیں دیکھ ڈالیں
مگر سوائے آٹھ آنے کے کچھ نہیں ملا۔ اس کو یہ بھی احساس تھا
کہ وقت گزر رہا ہے اور اس نے دعوت کا کچھ سامان نہیں کیا
آخر وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی۔ مایوسی سے اس کی
آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اگر گھر میں سے روپے نہ نکلے تو
وہ کیا کہے گی کس سے مانگے گی۔ اور پھر رات کی دعوت کا
کیا ہوگا۔ شکیلہ اور شاکر تو موم بتی بھی جلا کر گزار سکتے ہیں،
مگر منصف صاحب کو کیا کریں گے۔

آخر مایوس ہو کر اس نے شاکر کے ایک پرانے
گرم کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو پانچ روپیے کا نوٹ نکلا
وہ بچوں کی طرح زمین پر بیٹھ کر ہنسنے لگی پانچ کا نوٹ
اس میں کب رکھا گیا تھا اچھا ہوا پہلے نہیں ملا۔ ورنہ آج

کیا بنتا" قاسم کو روپیہ دے کر چلتا کیا۔ یہ سب مرحلے
طے کرنے تک بارہ بج گئے" اب شام تک منصف صاحب
کی دعوت کی تیاری کرنی ہے۔ جب شکیلہ نے دیوان خانے
میں جاکے دیکھا کہ کتنی صفائی کی ضرورت ہے تو کیا دیکھتی ہے
دروازوں اور کھڑکیوں کے پردے بہت میلے ہیں اور
دیواروں پر جالے بھی لگے ہوئے ہیں پردے دھونے
تو آسان تھے مگر ان کی استری بہت محنت کا کام تھا جب وہ
استری کر رہی تھی تو ایک اینگلو انڈین لڑکی کتابیں بیچنے آئی
اور لگی بیٹھ کر کتابوں کی تعریف کرنے شکیلہ نے دیکھا کہ اس کی
بکواس ختم ہی نہیں ہوتی تو کہنے لگی "تم میرے پاس کیا
کتابیں بیچنے آئی ہو میں خود لکھ سکتی ہوں"۔ وہ لڑکی اس کا
منہ تکنے لگی۔ شکیلہ کو شرارت سوجھی "تم کیا سوچ رہی ہو۔
تمہاری کتابوں سے اچھی کتابیں میں گھنٹہ بھر میں لکھ سکتی ہوں"
وہ شکیلہ کے بے وقت کے مذاق سے ایسی گھبرائی کہ کتابیں اٹھا
چپ چاپ چلی گئی۔ شاید یہ سمجھی کہ اس عورت کا دماغ خراب ہے
فیرنی پکاتے پکاتے اسے خیال آیا کہ اگر آئس کریم
بنائی جائے تو کیسا رہے۔ آج کل رات کی دعوتوں میں لوگ
آئس کریم ضرور دیتے ہیں دودھ تو بچا ہوا ہے مگر کیوڑا تو
جتنا منگایا تھا سب فیرنی میں ڈال دیا۔ شاید پہلے کا بچا ہوا
کہیں پڑا ہوا ہو۔ وہ نعمت خانے میں ڈھونڈنے لگی۔
"تین بج گئے ہیں میں نے اب تک کھانے کا سامان بھی
پورا نہیں کیا۔" منصف صاحب تم کو خدا سمجھے تمہیں کبھی اس
بات کا احساس نہیں ہوگا کہ تمہاری دعوت کے لئے مجھے
کتنی تکلیفیں اٹھانی پڑیں" شکیلہ اچک کر اوپر کے تختے پر دیکھنے
لگی دوسرے تختے سے اتنی زور کی چوٹ لگی کہ دماغ بھنا گیا
مگر اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ گلاب مل گیا۔ "خیر یہی سہی۔ اگر یہ نہ
ملتا تو منصف صاحب آج شام کو آپ آئس کریم سے محروم
رہتے۔ آپ کو کچھ نہیں لٹے گا آپ کا کیا ہے جو بنا جائے
آپ کھاتے جائیں گے کام کرتے کرتے میری جان نکل جائیگی"
اب صرف روٹی پکانی اور آئس کریم بنانی باقی تھی
شکیلہ منہ دھونے حمام میں گئی۔ کھڑکی میں سے جو جھانکا تو
کیا دیکھتی ہے حسین صاحب کی بیگم صاحبہ کا تانگا چلا آرہا ہے
"ان کو انجمن کے لئے چندے کی ضرورت ہوگی" شکیلہ کا
خیال ٹھیک نکلا۔ انھوں نے آتے ساتھ وہی قصہ نکالا۔
مگر وہ حسین بی کے متعلق بھی کچھ پوچھنے آئیں تھیں "آپ نے
پرانی ماما کو کیوں نکال دیا"
شکیلہ بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اس بکواس میں بیکار وقت
ضائع ہو رہا ہے۔ ان کے اس سوال سے شکیلہ کی آنکھوں
میں حسین بی کی سال بھر پہلے کی صورت پھر گئی۔ اور اس کا
گڑگڑا کر [illegible] کھانے کپڑے پر [illegible] کی التجا [illegible] یاد
آگیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ ابھی بہت سوں کو تو اس کی نوکری
چھٹنے کا حال معلوم نہیں۔
"میں نے اسے کسی قصور پر نہیں نکالا وہ کام بہت اچھا
کرتی تھی اور میں اسے زیادہ تنخواہ نہیں دے سکتی۔ اس
بڑے گھر میں نوکری کرے گی تو دگنی تنخواہ دینگے"
"اچھا تو بڑے گھر کی تلاش میں اس نے پرانی نوکری
چھوڑ دی"
"ہاں.. ..ہاں کچھ ایسا ہی ہوا......
"یہ نوکر بھی بڑی بے وفا قوم ہے... اب تو بچہ
کیا ہوگا۔ اتنا نازک معاملہ ہے"
"اس کے بچے کو کیا ہوگیا جب وہ یہاں تھی
تو بچہ بالکل تندرست تھا۔

"اس کی نوکری چھوٹ گئی اور وہ بچہ بیمار ہے۔ کل میرے پاس مدد کے لئے آئی تھی۔"

"میاں لڑائی ہوگئی ہوگی ورنہ ہرگز آپ سے مدد نہ مانگتی"۔ شکیلہ نے افسوس کی صورت بنا کر کہا۔

"بہرحال مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ برسوں سے آپ کے پاس نوکر تھی۔ اس لئے میں نے پوچھا کہ آپ کے ہاں سے کیوں نکل گئی تو ذرا سوچ کر کہنے لگی "وہ بیگم صاحبہ تو بہت اچھی تھیں مگر میرا دل آرام کرنے کو چاہتا تھا" ذرا سوچئے تو سہی اتنی تندرست مضبوط عورت کو آرام کی ضرورت پڑ گئی"

"اس کی وفاداری کا خیال آکر شکیلہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ جان دے دے گی مگر گھر کا راز کسی کو نہ بتائے گی۔"

"میری سفارش پر صادق صاحب کی بیگم صاحبہ نے اسے نوکر رکھ لیا تھا۔ آج صبح کو ان کے پاس سے آدمی آیا کہ وہ نہیں آئی اور بچے کی بیماری کا بہانہ کرتی ہے۔ اگر بچہ سچ مچ بیمار ہے تو ہم مدد کرنے کو تیار ہیں مگر مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض بہانے ہیں کیونکہ آج ان کے پاس دعوت ہے۔ کام سے گھبرا کر بھاگ گئی۔"

حسین صاحب کی بیگم نے نوکروں کی بیوفائی کے لمبے چوڑے قصے سنانے شروع کئے۔ ان کی سستی اور کاہلی کے دفتر کھول دئے سامنے لگی ہوئی گھڑی میں ایک ایک منٹ کرکے آدھ گھنٹے سے زیادہ گزر چکا تھا

"میں خود اس کے پاس جاکر دیکھوں گی کہ اس کے بچے کو کیا ہو گیا ہے۔ ان کو تو مر بھی جائے تو کچھ نہ بتائے۔ اگر بچارا بچہ سچ مچ بیمار ہے تو مجھے ضرور دیکھنا چاہئے"۔ ساڑھے پانچ کے قریب حسین صاحب کی بیگم صاحبہ گئیں صورت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ خفا ہیں خفا ہونے کی بات بھی تھی۔ شکیلہ نے نہ ان سے چائے پینے کے لئے کہا نہ ان کو پان ہی دیا اس کے برعکس یہ بھی کہہ دیا کہ شاکر نے آج اپنے ایک دوست کی دعوت کی ہے۔ وہ اشارہ پاتے ہی چل دیں

شاکر نے شکیلہ کو یہ نہ بتایا کہ منصف صاحب کب آئیں گے۔ نہ اپنی واپسی کا وقت بتایا۔ اور حسین بی مدد کے لئے اس کے پاس کیوں نہ آئی، اس کا جواب دینا آسان تھا۔ وہ شکیلہ کی مصیبتوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کا بچہ مر بھی جاتا تو وہ اس سے مدد نہ مانگتی یہ ہے شان وفاداری کی جو کوئی نہ معلوم کر سکا۔ شکیلہ نے آخر سوچا کہ وہ اس کے بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے جائیگی اور حسین بی کو میاں اسکریم بنانے اور روٹی پکانے کو بھیج دے گی۔ جانے سے پہلے اس نے جو کچھ پکایا تھا اچھی طرح دیکھ لیا اور قاسم سے تانگا منگا کر حسین بی کے گھر چلی۔ راستے کی ٹھنڈی ہوا سے اس کے سر کا درد ٹھیک ہوگیا۔ "مجھے ہر وقت اس کا افسوس رہتا تھا کہ بنک میں صرف دو سو روپے رہ گئے ہیں اگر ان کو جلدی نوکری نہ ملی تو کیا کریں گے لیکن خدا نخواستہ اگر ہمارے ہاں بھی ایک بیمار بچہ ہوتا اور گھر میں ایک کوڑی نہ ہوتی تو کیا کرتے"

"گھوڑے کو دوڑاؤ۔ مجھے جلدی پہنچنا ہے"۔ خدا خدا کرکے شکیلہ حسین بی کے چھوٹے سے گھر پہنچ گئی جہاں وہ ایک اور کرایہ دار کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ صحن میں کرایہ دار کے بچوں نے ایک اودھم مچا رکھا تھا۔ وہ ان سے بچتی بچاتی چلی جا رہی تھی کہ راستے میں پرانا ڈاکٹر ملا۔ شکیلہ کو دیکھ کر وہ ٹھیر گیا۔ "ابھی میں آپ کی ماما کے بچے کو دیکھ کر آرہا ہوں۔ اس کی حالت بہت نازک ہے۔ نمونیہ کا اثر ہے میں اس سے

کہہ رہا ہوں کہ اتنے چھوٹے بند مقام میں بچے کا رہنا بہت
مضر ہے۔ ہسپتال لے چل مگر مانتی نہیں اب آپ ہی سمجھائیے
آپ کا کہنا ضرور ملنے گی۔ وہ ڈاکٹر سے پیچھا چھڑا کر حسین بی
کی طرف چلی۔

وہ پہلے رو رہی ہوگی مگر اب خاموش بیٹھی سوچ رہی
تھی۔ "ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں اسے ہسپتال لے جاؤ میرے
پاس تو ٹانگے کا کرایہ بھی نہیں۔ ہے نہ اسے کیسے لے جاؤں
اور ہسپتال والے اسے لیں گے بھی کہ نہیں"

"ضرور لینگے۔ آخر کیوں نہیں لیں گے"؟

"کیا معلوم بیگم صاحب ان لوگوں نے بھی حسین صاحب
کی بیگم صاحب کی طرح سوال پوچھ کر نکال دیا تو کیا کروں گی"
سامنے کسی دوکان کی گھڑی نے چھ کے گھنٹے بجائے
شکیلہ سوچنے لگی "ابھی ایس کریم بنانی اور روٹی پکانی باقی ہے
وہ اب تک گھر پہنچے ہیں یا نہیں۔ اگر منصف صاحب آنے سے
پہلے آگئے تو کیا ہوگا گھر تو بند پڑا ہے بڈھا قاسم کیا کرے گا
کنجیاں تو میرے پاس ہیں اس بچے کی حالت نازک ہے اور ادھر
منصف صاحب کی دعوت بہت اہم چیز ہے شاید ہماری قسمت
آج ہی پلٹا کھائے اور میں یہاں بیکار کھڑی ہوں" سنو حسین بی
آج رات ان کے ایک بہت عزیز دوست کی دعوت ہے
اور کھانا ابھی آدھا تیار ہے۔ تم جاکر اس کو پورا کرو اور میں
بچے کو ہسپتال لے جاؤں گی۔ تم مجھ پر تو اعتبار کرتی ہو یہ لو
کنجیاں اور چل دو۔

جب شکیلہ گھر پہنچی ہے تو سات بج چکے تھے۔ . . . . .
وہ باورچی خانے میں پہنچی تو ہر ایک چیز بالکل تیار تھی اور حسین بی
دستر خوان بچھا رہی تھی۔ شکیلہ نے پورا قصہ اسے سنا دیا "تمہارا لڑکا
بالکل آرام سے ہے" ڈاکٹر کہتا ہے کہ کچھ خطرے کی بات نہیں
انشاءاللہ جلدی ہی اچھا ہو جائے گا۔ اس کمرے کی نرس بھی
بہت اچھی ہے اب کچھ گھبرانے کی ضرورت نہیں"

وہ ابھی یہ باتیں کر کے اپنے کمرے کی طرف جارہی تھی
کہ شاکر اسے راستے میں ملا "آخر تم کہاں غائب ہوگئی تھیں"
شاکر نے غصے سے پوچھا "میں جب گھر آیا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں
کہ حسین بی ہمارے اور اپنے خاندان کے سب قصے منصف صاحب
کو سنا رہی ہے اتنی تمیزدار نوکرانی اور ایسی بیہودگی کہ کانوں
سے سنتا تو یقین نہ آتا۔

ہاں مجھے یاد ہے کہ میں نے کہا تھا کہ آپ کے بہت
عزیز دوست آرہے ہیں۔ اس لئے اس نے کہانی شروع
کردی کہ وہ سب باتوں سے واقف ہی ہوں گے۔ اگر باتیں
نہ کرتی تو روتی رہتی۔ آپ کو کیا معلوم اس نے کتنی مصیبتیں
اٹھائی ہیں۔

"اس پاگل پن سے تو یہی بہتر تھا کہ وہ بیٹھا رہتا
. . . "خیر اب فکر کی کوئی بات نہیں منصف صاحب نے
حامد سے کہہ دیا ہے کہ انھوں نے ایک آدمی کا انتخاب کیا ہے"
شکیلہ مایوسی سے ہونٹ چبانے لگی۔ اس نے آہستہ سے
دیوان خانے کا پردہ اٹھا کر دیکھا منصف صاحب۔ بہت
تھے نہ دقیانوسی ہی معلوم ہوتے تھے ان کے دانت بھی
پورے تھے۔

"آج مجھے آپ کے گھر آکر بہت خوشی ہوئی" وہ
شاکر سے کہہ رہے تھے۔

"ہاں کیوں خوشی نہ ہوگی منصف صاحب نے بتائیے
مفت میں اتنے اچھے کھانے کھانے کو ملے اب آپ کو
کیا خبر مجھے آپ کی اس دعوت کی وجہ سے کتنی مصیبتیں اٹھانی
پڑیں" شکیلہ نے سوچا "اور ہمیں آٹھ دن کا خرچ ایک دن

کر دیا تھا۔"

ہاں تو میں ابھی آپ سے کہہ رہا تھا کہ میں نے ایک مددگار چن لیا ہے۔ ایک ایسا آدمی جس نے عمر بھر دفتر کے کام میں غلطی نہ کی ہو۔" منصف صاحب نے کہا۔

شکیلہ کا دماغ چکرا گیا۔ اس کا پیارا گھر چند روز میں دشمن خواہوں کی نذر ہو جائے گا۔ منصف صاحب کی آنکھوں سے ایک قسم کا تمسخر ٹپک رہا تھا۔ حسین بی دیوان خانے کے ایک کونے میں اس بات کے انتظار میں کھڑی تھی کہ وہ لوگ باتیں ختم کریں تو کہے کہ خاصہ تیار ہے۔

"ہاں تو میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ شاکر صاحب سے اچھا مددگار مجھے کہیں نہیں مل سکتا۔"

"حسین بی تم نے اچھا کیا کہ سب کچھ منصف صاحب کو سنا دیا۔" شکیلہ نے سوچا۔ اس کو صبح سے پہلی مرتبہ تسکین محسوس ہوئی۔ "سرکار خاصہ تیار ہے" حسین بی نے کہا اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

معصومۃ الرحمٰن

جنگ

"جنگ" ہاں مانتا ہوں ایک تبہ کاری ہے　　بلکہ یہ کہیے کہ "دانستہ سیہ کاری ہے
ہنستے ملکوں کو ہدفِ ناوکِ طوفان کرنا　　ملک گیری کے لئے جانوں کو قربان کرنا

حق ہے تخریب کا آپ اپنی ہے ساماں کرنا
دوسرے لفظوں میں شیطاں کو ہے شاداں کرنا

اپنے بچوں کو بنانا ہے یتیم و بے یار　　اپنے ماں باپ کو کرنا ہے غمِ نو کا شکار
اپنی بیوی کو رنڈاپے کا ہے تحفہ دینا　　اپنے محبوب کو ہے سوگ کا ہدیہ دینا!
ملک الموت سے کہنا ہے خود، آؤ آؤ　　ساتھ دوزخ کے فرشتوں کو بھی لاؤ لاؤ

اس طرح دہر کی بنیاد ہلا دینا ہے
اس کو اک جرعۂ تلخاب پلا دینا ہے

ہے مگر کوئی جو یہ بات سمجھا دے مجھ کو　　یعنی از راہِ کرم اتنا بتا دے مجھ کو
کیا یہی دین ہے مذہب یہی تہذیب یہی　　آدمیت یہی ہمدردی کو تادیب یہی؟
عدل و انصاف یہی الفت و اشفاق یہی　　زور ایمان یہی قوتِ اخلاق یہی؟!
تو بہت خوب ہے جنگ ہوتی رہے ہوتی رہے　　ہم پہ دنیا یونہی تنگ ہوتی رہے ہوتی رہے

آئے وہ روز کہ دنیا کا بھلا ہو جائے!
آئے وہ روز کہ دنیا ہی فنا ہو جائے۔

سلیمان ادیب

آج کا بچہ

آج کے بچے کی واقعی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے ہم کو کل کے بچے کے متعلق تاریخی واقعات کی چھان بین کرنی ہوگی۔ قدیم ترین زمانے میں جب کہ انسان وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے اولاد کی پرورش وبال جان تھی لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا انسانی زندگی کے طریقوں میں بھی تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ انفرادی زندگی اجتماعی زندگی سے بدل گئی۔ معاشرتی قوانین بنے سیاسی اور معاشی نظام قائم ہوئے اور مذہب نے اپنا اقتدار قائم کیا۔ اس طرح انسان نے تہذیب و تمدن کی منزلیں طے کیں۔

یہ تو صاف ظاہر ہے کہ ہر ملک کی تہذیب دوسرے ملکوں سے مختلف ہے اسی مناسبت سے ہر ملک میں معاشرتی قوانین بھی مختلف ہیں۔ اب ہم مختصر طور پر مختلف ممالک کے معاشرتی قوانین سیاسی قوانین اور مذہبی قوانین میں معصوم بچوں کا درجہ معلوم کریں گے۔ تاریخ شاہد ہے کہ کسی عالمگیر مذہب نے بچے کو ادنیٰ یا حقیر نہیں جانا بلکہ اس کو ہمیشہ بالغوں سے برتر ہی سمجھا۔ حضرت عیسیٰ چھوٹے بچوں کو بہت عزیز رکھتے تھے اور لوگوں کو اس بات کا یقین دلاتے تھے کہ انسانی نسل کی ترقی اور رہبری کا انحصار ان ہی ہونہار بچوں کی صحیح تربیت پر ہے۔

پیغمبر اسلام نے تو متعدد مرتبہ صحابۂ کرام کو اس بات کی عملی تعلیم دی کہ ان کو اپنے بچوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرنا چاہیے۔ آنحضرتؐ اپنی لڑکی اور نواسوں کو اس قدر عزیز رکھتے تھے کہ ان کی دلجوئی کے لئے ہر قسم کی زحمت گوارہ کرنے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ یہاں تک کہ مذہبی تقریر وعظ وغیرہ کے وقت اگر آپ کے نواسے آجاتے تو آپ ان کو اٹھا لیتے اور بوسہ دیتے۔

ہندوستان کی بزرگ ترین ہستی گوتم بدھ کی تعلیمات میں سب سے زیادہ اہمیت اس پر دی گئی ہے کہ جانداروں کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کیا جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ گوتم بدھ کا سلوک بچوں کے ساتھ کیسا ہوگا۔ ایسے جانداروں کے ساتھ جن سے نقصان پہنچنے کا ہمیشہ اندیشہ رہتا تھا جب نرمی سے سلوک کی تلقین کی گئی تو بھلا بچوں کے ساتھ جو مجسم نیکی ہوتے ہیں کیا سلوک تجویز کیا ہوگا۔

ان پاک اور محبت بھرے خیالات کے برخلاف جو بچوں کے متعلق مسلمہ پیغمبروں نے ظاہر کئے ہیں ان ممالک نے جہاں کسی پیغمبر دین نے اپنی نورانی تعلیمات سے بااثر تمدن کے دلوں کو روشن نہیں کیا یا پھر جہاں کے لوگوں نے ان بزرگ ہستیوں کی ہدایات پر عمل نہ کیا بد ترین رسم و رواج اور توہمات نے جنم لیا اور خود غرض افراد اور انسان نما دشمنوں نے بچوں کی قربانی شروع کر دی۔

چنانچہ شام کے قدیم تمدن میں دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے بچوں کی قربانی کی جاتی تھی جس کا سلسلہ تقریباً حضرت موسیٰ کے زمانے تک قائم رہا۔

ہندوستان بھی اس قسم کے مکروہ توہمات سے خالی نہ تھا یہاں بھی کسی بڑی عمارت کی تعمیر اور قلعوں اور پلوں کی ساخت کے وقت معصوم نونہالوں کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی۔ اور خاص خاص امراض میں بچوں کے خون پینا طغیانی اور قحط کے زمانے میں ان کو دیوتاؤں کے نام پر قربان کرنا جنگ کے شروع اور بادشاہوں کی تخت نشینی کے وقت ان کی قربانی کرنی ضروری تھی غرض جہاں تک بچے کا تعلق مذہب سے ہے کسی سچے مذہب نے اس کو

برا نہیں سمجھا۔ لیکن بعض قوموں نے بدترین رسوم و رواج
کو جاری کیا جن کی وجہ سے تمدنِ انسانی کی تاریخ کا دامن
ہمیشہ داغ دار رہے گا۔

یہ تو بچہ اور مذہب کا تعلق تھا اب ہم سیاسیات اور
بچے کے تعلق کا جائزہ لیں گے۔ سیاسیات نے کہیں کھلم کھلا
اور کہیں پوشیدہ طور سے بچوں پر بڑے بڑے ظلم ڈھائے
ہیں۔ نمرود نے حضرت ابراہیم کی پیدائش کی خبر سن کر
اپنی حکومت کے زور سے تمام نوزائیدہ بچوں کو قتل کروا دیا
تا کہ حضرت ابراہیم بھی قتل ہو جائیں اسی طرح فرعون نے
بھی حضرت موسیٰ کی ولادت سے خوف کھا کر بچوں کا قتل
عام کر دیا تھا اس کے علاوہ بعض ممالک میں ایسے قوانین
جاری تھے جن کی رو سے والدین کو اپنی اولاد پر پورا اختیار
حاصل تھا اگر وہ چاہیں تو ان کو قتل بھی کر سکیں مثلاً چین
میں والدین کو اپنی اولاد کے قتل کا قانونی حق حاصل تھا۔
جاپان میں والدین کے جرموں کی پاداش میں بچوں کو سزائیں
دی جاتی تھیں۔ قدیم زمانے میں معاشی مشکلات کی وجہ سے
بھی ایسے رسم و رواج وجود میں آئے جن کی وجہ سے
بچوں کا قتل جائز قرار دیا گیا۔

نوگنی کے باشندوں کو بچوں سے بڑی نفرت تھی
ان کو عذابِ جان تصور کر کے تولد کے بعد ہی قتل کر دیتے تھے
اسٹریلیا کے قبائل میں بھی یہ رسم عام تھی۔ عرب میں
لڑکیوں کا قتل بھی ان ہی معاشی مشکلات کا نتیجہ تھا۔

یہ تھی مختصری حالت معصوم بچوں کی عہدِ قدیم میں
بیچ کے زمانے میں جہاں قوموں نے انسانی زندگی
کے ہر شعبے میں ترقی کی وہاں بچوں کے ساتھ برتاؤ میں بھی
تبدیلیاں ہوئیں۔ لیکن پھر بھی ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں
کیا جاتا تھا جس کے وہ مستحق تھے۔ قتل و قربانی کی ظالمانہ
رسوم کی جگہ غلامی کا شرمناک طریقہ رواج پایا۔ اور جب
اس کے تباہ کن نتائج ناقابلِ برداشت ہو گزرے تو متمدن
ممالک میں اس طریقہ کا خاتمہ ہو گیا۔ گو بعض ممالک میں غلامی
کا رواج ابھی تک پوشیدہ اور محدود طور پر جاری ہے۔

موجودہ زمانے میں بچے کو جو اہمیت حاصل ہو گئی ہے
اس کا تعلق بہت بڑی حد تک تعلیم کی اشاعت ہے یہ بالکل
درست ہے کہ تعلیم کی ابتدا تو اسی وقت سے ہوئی جب
سے نسلِ انسانی کی ابتدا ہوئی۔ لیکن تعلیم کی ذمہ داری فطرت
پر تھی جس کے قوانین اٹل تھے۔ مثلاً فطرت یہ بتلاتی ہے
کہ اگر آگ میں ہاتھ ڈالنے سے وہ جھلس جاتا ہے۔ اگر اس کے
خلاف کیا تو اس کی ذمہ داری کرنے والے پر ہوگی۔ لیکن
زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ تعلیم کا فرض صرف فطرت کے
ہاتھوں باقی نہیں رہا۔ بلکہ اس کام کو خود انسانوں نے اپنے
ہاتھوں میں لے لیا۔

ایک زمانے تک یہ تعلیم تو نہایت سادہ تھی۔ لیکن بعد
میں اس میں تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ نشاۃ ثانیہ کے قبل تک
جس قسم کی تعلیم دی جاتی تھی اس کا تعلق روزمرہ کی زندگی
سے بہت کم تھا۔ یہ محض قدما کے کلام کو زبانی یاد کرنا۔ مذہبی
اور سماجی رسومات کے ذریعہ ان کے کارنامے دہرانا۔ دیوتاؤں
کی پوجا۔ سورماؤں اور بہادروں کی قصیدہ خوانی پر مشتمل تھی۔
طریقۂ تعلیم جماعتی تھا جس کی ذمہ داری مذہبی لوگوں کے سر تھی
یہاں بھی بچوں پر ایسے مظالم ڈھائے جاتے تھے کہ سننے
سے تکلیف ہوتی ہے۔ استاد رحم دلی اور ہمدردی جانتے
ہی نہ تھے۔ بید کا استعمال عام تھا کوڑوں اور ڈنڈوں سے
سزا دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اٹھا بیٹھی کروانا کرسی بنانا

مرغا مرغی بنانا، کان کی لو میں کنکر رکھ کر دبانا، ناک گھسوانا
اور قسم کے متعدد طریقے سزاؤں کے جاری تھے۔ مختصر یہ کہ
بچے کے زمانے میں جہاں تعلیم کو تمام ترقیوں کا ذریعہ خیال
کیا جاتا تھا۔ بچوں کی تعلیم میں جس پر نسلوں کی ترقی کا انحصار ہے
بچوں کی فطرت ان کے میلانات اور رجحانات کو بالکل نظر انداز
کیا جاتا تھا نہ صرف یہ بلکہ ان کے ساتھ رحم دلی اور ہمدردی
کا سلوک بھی روا نہ رکھا جاتا تھا۔

سترھویں صدی سے جو تعلیمی انقلاب کی ابتدا ہوئی
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ماہرانِ تعلیم نے نہ صرف مواد تعلیم میں ترمیم
کی بلکہ طریقہ تعلیم بھی بدلنے کی کوشش اور اطفال کے مسائل
خیال پر سنجیدہ دلی سے غور کرنا شروع کیا کہ فرد یا حکومت
اس وقت تک باقاعدہ اور عمدہ طریقے سے کسی لڑکے کو تعلیم
نہیں دے سکتی جب تک کہ تعلیم کے آغاز سے پہلے ہی وہ
طالب علم کے متعلق جانچ نہ کرے۔ وہ اس کا اس بھی بہت بہتر
ماہرانِ تعلیم نے مطالعۂ اطفال پر زور دیا۔

مطالعۂ اطفال کی تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف ممالک
میں متعدد انجمنیں مختلف ناموں سے قائم ہوئیں جن کا مقصد
یہ تھا کہ بچے کی تعلیم و تربیت میں جو جو آسانیاں ہو سکتی تھیں
فراہم کی جائیں۔

اس سلسلے میں بہی خواہانِ قوم نے ایسی انجمنوں کے
قیام پر زور دیا جو بچوں میں گداگری اور دوسری خلاف اخلاق
عادتوں کا انسداد کریں۔ مطالعۂ اطفال کی تحریک سے پہلے
یہ خیال عام تھا کہ ڈاکو کی اولاد ڈاکو ہوتی ہے۔ لیکن تحقیقات
سے پتہ چلا کہ ... ... کا بھی بڑا اثر
پڑتا ہے۔ اس لئے بچوں کے لئے ... ...
... سمجھا گیا۔ اور چونکہ یہ کام بغیر حکومت کی مدد کے پورا نہیں

ہو سکتا تھا، عوام نے حکومت کو مجبور کیا کہ وہ بچوں کی نگرانی
کا کام اپنے ذمہ لے لے۔

۱۹۰۴ء سے بچوں کی نگرانی کے قوانین کا سلسلہ
شروع ہوا اور ۱۹۰۸ء کے قانونِ اطفال کی رو سے
والدین پر بھی چند پابندیاں عائد کی گئیں۔ مثلاً والدین کا یہ فرض
قرار پایا کہ سولہ سال سے کم عمر لڑکوں کے لباس، خوراک اور
تعلیم کا معقول انتظام کریں۔ ان کو خراب عادات میں پڑنے
نہ دیں ان پر کسی قسم کا ظلم نہ کیا جائے۔

قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں ان کو عدالت
میں پیش کیا جاتا ہے اور عوام کو اس بات کی اجازت دی
گئی ہے کہ اگر وہ کسی وقت بھی کسی شخص کو بچوں سے قانون
کے خلاف پائیں تو اس کو
عدالت اطفال میں چالان کریں۔

آج کل ایسے قوانین کا نفاذ بڑی تعداد میں ہو رہا ہے
جو صرف بچوں کی حفاظت سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہبودی
اطفال، تحفظ شیر خوارگی وغیرہ کی بہت سی انجمنیں حکومت اور عوام
کی توجہ سے قائم ہو گئیں اور ہر متمدن ملک میں ایسی بیسیوں
بلکہ سیکڑوں انجمنیں موجود ہیں جو بچے کی تعلیم و تربیت کا کام
بڑی ذمہ داری سے انجام دیتی ہیں۔

بیسویں صدی کے شروع میں مغربی ممالک میں
جبری تعلیم شروع ہو گئی لیکن جو لڑکے ابتدائی تعلیمی عمر سے
کم ہوتے تھے ان کی تعلیم کا انتظام کرنا تعلیمی نظام کی
کامیابی اور بچوں کی تربیت کے لئے ضروری تھا اس لئے
بالک سیوا اور شسو ... کی تحریکیں عام ہو گئیں ان اداروں
میں کم سن بچوں کو رکھ کر ان کے نفسی اعمال کا مطالعہ کیا
جاتا اور خراب میلانات کی روک تھام کی جا کر ان کی جگہ

اچھے میلانات پیدا کئے جاتے ہیں۔ ایسے بچوں کے لئے
جو نہایت چالاک ہوتے تھے لیکن مفلسی کی وجہ سے اپنی ذہانت
برے کاموں میں صرف کرتے اور قبل از وقت بدترین
بیماریوں میں مبتلا ہو کر موت کا شکار ہوتے تھے بالک سیوا
ادارے قائم ہوئے جہاں ہر قسم کی سہولت پہنچائی جاتی
اور ذہین بچوں کو بجائے ڈاکو، راہزن وغیرہ بننے کے
محب وطن اور ذمہ دار شہری بننے کی تربیت دی جاتی ہے
بالک سیوا کے علاوہ اور ایک ادارہ جو چھوٹے
بچوں کی تعلیم و تربیت میں بہت کامیاب ثابت ہو رہا ہے
ششو گھر ہے

ششو گھر ہے۔ بچے تربیت یافتہ معلمات کی نگرانی
میں رہتے ہیں جو ان کی سیرت و کردار کا مشاہدہ کرتی ہیں
اور بچوں کی فطرت کی مناسبت سے ان کی جسمانی، جذباتی
اور ذہنی ترقی کو مواقع دیتی ہیں۔ یہاں لکھائی پڑھائی
اور حساب نہیں سکھایا جاتا۔ بلکہ بچہ اگر خاص رغبت ظاہر کرے
تو اس کا انتظام کیا جاتا ہے

ششو گھر کی تنظیم میں جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے
وہ بچوں کی صحت کی نگرانی ہے۔ بچوں کا طبی معائنہ پابندی
کے ساتھ ہوتا ہے اور اگر کسی بچے میں کوئی نقص ہو تو بڑی
احتیاط کے ساتھ اس کو دور کیا جاتا ہے۔ بچوں کی تدریجی
ترقی کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا ہے اور والدین کو طبی معائنوں سے
مطلع کیا جاتا ہے۔

ششو گھر میں بچوں کی غذا پر بھی بہت زیادہ
توجہ کی جاتی ہے اور صحت بخش غذا مثلاً میوہ۔ ترکاری
دودھ مکھن کا استعمال کثرت سے کیا جاتا ہے۔ اور جو
بچے کمزور ہوتے ہیں ان کو مچھلی کا تیل بھی دیا جاتا ہے

جب بچے بالک گھر سیوا، ششو گھر وغیرہ سے بالک گھر
جاتے ہیں تو یہاں بھی ان کی پوری نگہداشت ہوتی ہے
اور ہر بچے کو آزادی کے ساتھ پھلنے پھولنے اور تعلیم حاصل
کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔

موجودہ زمانے میں بچے کی اہمیت کا اندازہ اس سے
ہو سکتا ہے کہ بچہ ہر قوم کا بہترین سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔
ہر وہ قوم جو متمدن اور مہذب کہلاتی ہے بچے کی حفاظت
اور تعلیم و تربیت اپنا سب سے بڑا فرض خیال کرتی ہے
یورپ اور امریکہ میں تو بچوں کی نگہداشت کا اتنا خیال ہے
کہ ان کی بہبودی کے ذرائع فراہم کرنے میں بڑے
جوش کے ساتھ مسابقت جاری ہے بچوں کی پرورش اور
تعلیم و تربیت پر کثیر رقمیں صرف کی جاتی ہیں۔ ان
کی حفاظت اور بہتری کے لئے نئے نئے قوانین نافذ
کئے جاتے ہیں جن ممالک میں بچوں کی اہمیت کا انکشاف
نہیں ہوا وہاں یہ بات ضرور تعجب کی نگاہ سے دیکھی جاتی
ہوگی۔ کہ چھوٹے بچوں پر اس قدر کیوں توجہ کی جاتی ہے
اور کیوں قوم کا کثیر روپیہ ان پر صرف کیا جاتا ہے۔ لیکن جو
قومیں دنیا میں ترقی کرنا چاہتی ہیں، وہ خوب جانتی ہیں کہ
قوم کی ترقی اور بچوں کی تعلیم و تربیت میں چولی دامن کا ساتھ ہے
آج کا بچہ ہی تو ہوگا جو کل بالغ شہری کی حیثیت سے
قوم کی ہر تحریک میں جوش اور ولولے کے ساتھ حصہ لے گا۔ اسی لئے
کہا جاتا ہے کہ جس قدر بچوں کے دماغ روشن، قوی اور مضبوط
ہوں گے اسی قدر قومی دولت اور ثروت میں اضافہ ہوگا
آج کے بچے کی نگہداشت تعلیم و تربیت کی ترقی
کے لئے لازمی سمجھی گئی ہے اور متمدن ممالک نے یہ اہم کام
اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ حکومتوں کی سرپرستی اور امداد کے

علاوہ خود عوام میں بچے کی اہمیت کا اس قدر احساس پیدا ہوگیا ہے کہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں ادارے خانگی طور پر چلائے جاتے ہیں جہاں ضروری پیش بندیاں ان کی پیدائش سے پہلے ہی سے کی جاتی ہیں۔ ہونے والی ماؤں کے ساتھ طرح طرح کی رعایتیں برتی جاتی ہیں ان کو مفید مشورے دئے جاتے ہیں۔ طبی معائنے مفت ہوتے ہیں۔ مالی امداد دی جاتی ہے اور سیر و تفریح کا انتظام کیا جاتا ہے۔
غرض آج کے بچے کو ساری دنیا میں بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے

(یہ مضمون حیدرآباد لاسلکی نشرگاہ سے نشر کیا گیا تھا)

میر نجابت علی خاں

سجدہ

آہ نکہت کیوں جگاتی ہے مجھے بہر نماز
آہ نکہت کیوں بلاتی ہے مجھے بہر نماز

مجھ سے کیوں کہتی ہے اب اٹھو سحر ہونے کو ہے
چہرۂ خورشید ظہور نظر ہونے کو ہے

کروٹیں لیتی ہے خوشبو پھول کی آغوش میں
نیند سے بے ہوش کلیاں آ رہی ہیں ہوش میں

دھو رہی ہے صبح اپنے منہ کو آب نور سے
اٹھ کے دیکھو وہ حسیں ہے آسماں کی حور سے

کر رہی ہے رقص گلشن میں خوشی سے ڈالیاں
دے رہی ہیں داد انھیں پتے بجا کر تالیاں

بارگاہ ایزدی میں اٹھ کے سر اپنا جھکاؤ
بھول جاؤ ہاں خیال ماسوا کو بھول جاؤ

آشنائے حاصل ذوق عبادت میں بھی ہوں
آشنائے لذت شوق عبادت میں بھی ہوں

لیکن اپنے سر کو جب سجدے میں نیوڑھاتا ہوں میں
سامنے صورت تمہاری جلوہ گر پاتا ہوں میں

اس جہاں میں جلوہ فرما ہو نہیں تم ہو بہو
ہر گھڑی ہر آن ہر ساعت ہے میرے روبرو

خالق مطلق کے آگے سر جھکاؤں کس طرح
تم کو اپنے دل کے مسند سے اٹھاؤں کس طرح

خوف ہے مجھ کو کہ حاصل بندگی کا کھو نہ جائے
میں اسے سجدہ کروں سجدہ تمھیں کو ہو نہ جائے

مہدی علی خاں

([illegible] ماہنامہ [illegible] لاہور)

گریہ و تبسم کے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی ایڈیٹر صدق لکھتے ہیں:
"مکش صاحب مدت سے اپنے میخانے سے شعر و ادب کے جام بھر بھر کر تقسیم کر رہے ہیں۔ گریہ و تبسم انھیں کے کلام کا مجموعہ ہے اور رنگ و بو کا ایک خوش منظر گلدستہ ہے۔ بعض بعض نظموں پر بے اختیار کلام اقبال کا دھوکا ہو جاتا ہے۔"
(صفحات (۱۹۲) قیمت مجلد دو روپیے)

نفسیات اور ادب

ادب کا موجودہ دور نفسیات کا دور کہا جا سکتا ہے ادب اب محض تفنن کی چیز نہیں تفنن کے سوا اس کا کچھ اور بھی مقصد ہے وہ اب محض ہجر و وصال کے راگ نہیں الاپتا۔ اب وہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے ان کا محاکمہ کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے۔

اخلاقیات اور ادبیات کی منزل مقصود ایک ہی ہے صرف ان کے طرز خطاب میں اختلاف ہے۔ اخلاقیات بھی حقائق و معارف سے بحث کرتے ہیں اور ادب بھی۔ اخلاقیات کا ذریعۂ استدلال ہے وہ براہین و دلایل سے عقل و ذہن کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے ادب نے اپنے لئے کیفیات اور جذبات کا دائرہ چن لیا ہے اور انہیں حقایق کو جذبات کے ذریعہ ہمارے دل تک پہونچاتا ہے اس کا کام جذ[illegible]سات کو بیدار کرکے سعی و عمل کی تحریک کرنا ہے۔

ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے ہم ابھی رومانیت کے دور سے گزر رہے ہیں اسے حیات سے کوئی بحث نہ تھی ہمارے ادبا تخیلات کی ایک دنیا بنا کر اس میں من مانے طلسم باندھا کرتے تھے شعرا پر تو انفرادیت کا رنگ غالب تھا اور اب بھی ہے۔ افسانے منظوم یا منثور بہ استثنا چند زندگی سے بے علاقہ ہوتے تھے اس وقت کا ذوق سخن اسی سے محظوظ ہوتا تھا اور آج بھی اس کے پرستاروں کی کمی نہیں ہے مگر اب ہم حیات کے دائرے سے ایک انچ بھی باہر نہیں جا سکتے یہ خیال بہت صحیح ہے کہ ادب اپنے زمانے کا آئینہ ہے اس کا منشا یہ بھی ہے کہ جو خیالات اور کیفیات اور تاثرات دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ادب ان کی ترجمانی کرتا ہے اس کسوٹی پر آپ اس دور کے شاعر اور ادیب کو جانچئے تو آپ دیکھیں گے کہ ان کی دنیا کتنی محدود تھی اور زندگی کے حالات سے وہ کتنے بے اثر تھے جب ادب پر دنیا کی بے ثباتی کا رنگ غالب ہوا اور اس کا ایک ایک لفظ معاشقے میں ڈوبا ہوا ہو تو کوئی تعجب نہیں کہ قوم جمود اور انحطاط کا شکار ہو چکی تھی اس میں سعی اور اجتہاد کی قوت فنا ہو چکی تھی اس نے جذبات عالیہ کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں مشاہدے کی قوت زائل ہو چکی تھی مگر اب حالات بڑی سرعت سے تبدیل ہوتے جا رہے ہیں آج کا ادب حالات کے گرد و پیش سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ آج اگر وہ معاشرتی اور مذہبی مسائل سے بے حس ہے تو اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

زمانہ قدیم میں مذہب کے ہاتھ میں سوسائٹی کی لگام تھی۔ انسان کی روحانی اور اخلاقی تہذیب مذہب کے احکام پر مبنی تھی اب ادبیات نے یہ خدمت اپنے ذمے لے لی ہے مذہب تحریص سے کام لیتا تھا عذاب و ثواب اس کے آلۂ کار تھے ادب ذوق حسن کو اپنا آلۂ کار بناتا ہے ایسا کوئی انسان نہیں جس میں حسن کا احساس نہ ہو ادب اسی ذوق حسن کو پیدا کرنے کی کوشش کا نام ہے۔ ادیب یا شاعر میں فطرت کے مشاہدے اور اپنی ذکاوت احساس کے باعث جذبۂ حسن کی اتنی شدت ہو جاتی ہے کہ جو کچھ غیر مستحسن ہے اسے وہ برداشت نہیں کر سکتا اس پر وہ بیان اور جذبات کی ساری

قوت سے وار کرتا ہے یوں کہیے کہ وہ انسانیت کے علویت کے شرف کا علمبردار ہے جو پامال ہیں مظلوم ہیں مجروح ہیں۔ وہ فرد ہوں یا جماعت ان کی حمایت ......
اور وکالت ان کا فرض ہے اس کی عدالت سوسائٹی ہے اسی عدالت کے روبرو وہ اپنا استغاثہ پیش کرتا ہے اور عدالت کے احساس حق و انصاف اور جذبۂ حسن کی تالیف کرکے اپنی سعی کو ناکام سمجھتا ہے مگر عام وکلا کی طرح سے وہ اپنے موکل کی طرف سے جا و بیجا دعوے نہیں پیش کرتا۔ مبالغہ نہیں کرتا۔ اختراع سے کام نہیں لیتا۔ وہ جانتا ہے کہ ان ترکیبوں سے وہ سوسائٹی کی عدالت کو متاثر نہیں کر سکتا اس عدالت کی تالیف جب ہی ممکن ہے جب ہم حقیقت سے ذرا بھی منحرف نہ ہوں ورنہ عدالت ہم سے بدظن ہو جائے گی اور ہماری گزارش پر اعتنا نہ کرے گی اور عدالت کے سامنے اپنے آپ موکل کے ظاہر سے جتنی ہی بحث کرتے ہیں اتنی ہی یا اس سے زیادہ اس کے باطن کے مشاہدے سے آپ اس کے ظاہر کی تشریح کر سکتے ہیں مگر اس کے باطن کی تشریح کے لئے ہمارے پاس نفسیات کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ انسانی ذہن کی خصوصیات کے باوجود بیشتر حالات میں ہمارے جذبات عام ہوتے ہیں فرق صرف اثر کے مدارج کا ہوتا ہے بعض طبائع میں وہ اثر اتنا شدید ہوتا ہے کہ عمل کی صورت میں ظاہر ہو جاتا ہے اکثر طبائع میں وہ جمود یا غیر شعوری حالت میں پڑا ہوتا ہے۔ ادب ان اثرات کو غیر شعوری اثرات سے شعوری حالت میں لانے کی کوشش کرتا ہے مگر اس حقیقت کو وہ کبھی نظر انداز نہیں کرتا کہ انسان میں جو ذوقِ جمال ہے وہی اس کا

مذکر خطاب ہے پند و نصیحت کا دروازہ اس کے لئے بند ہے ہاں طنز اور استہزا اور تضحیک میں بھی جذبۂ حسن کو جگانے کی طاقت ہے اور ادبا حسب ضرورت اس کا استعمال کرتے ہیں اس قید کے ساتھ کہ حسنِ مذاق کا دامن ملوث نہ ہونے پائے۔ ابتذال ادب کے دائرے سے خارج ہے ان سے حسن کی بجائے نفرت کے جذبات کی تحریک ہوتی ہے۔

تہذیب نفس ہمیشہ ادب کا مقصد اولیٰ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا یہ دعویٰ کہ ادب کسی خاص مقصد کا تابع نہیں وہ تو محض لطف کی چیز ہے سطحی ہے ادب اور کسی تحریک کا تابع ہو یا نہ ہو جمالیات کا تابع ضرور ہے اور جمالیات کی تہہ میں بھی تہذیب نفس کا جذبہ کارفرما ہے۔ ہم آہنگی جمالیات کی روح ہے اور ہم آہنگی جب ہی پیدا ہوتی ہے جب ہم مادیت کی جانب سے روحانیت کی جانب مائل ہوتے ہیں ادب اسی روحانی ہم آہنگی کی شیریں نوائی ہے اور ہم آہنگی نام ہے خلوص کا ایثار کا، ہمدردی کا، محبت کا۔ جہاں یہ جذبات ہیں وہیں اتحاد ہے استحکام ہے اور زندگی ہے، جہاں ان جذبات کا فقدان ہے وہیں افتراق ہے، نفرت ہے، خود پروری ہے، حسد ہے اور موت ہے۔ جمالیات ہمارے معنوی احساسات کو مستحکم کرتے ہیں ہم میں وہ ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں جس سے ہم میں اور فطرت میں اتحاد اور مساعدت پیدا ہوتی ہے۔

اس اعتبار سے ادب اور جمالیات کے مقاصد میں بڑی حد تک یکسانیت ہے ہمارا جذبۂ حسن اسی حالت میں متاثر ہو سکتا ہے یا دوسرے لفظوں میں جب

ادب سے اُسی حالت میں لطف و سرور حاصل ہو سکتا ہے جب وہ فطرت سے ہم آہنگ ہوں۔ بسا اوقات غیبت اور بدگوئی سے بھی ہمیں حظ حاصل ہوتا ہے نفس پروری بھی اکثر ہمارے حظ کا باعث ہوتی ہے تاریخ میں ایسے دور بھی گزرے ہیں جب انسان کو درندوں کے قتل ہوتے ہوئے دیکھ کر لطف آتا تھا۔ اور اس فرقے کے آدمیوں کی آج بھی کمی نہیں ہے لیکن اسے ہم لطف یا سرور نہیں کہہ سکتے اس کا . . . نام جنون یا نشہ ہے لطف و سرور وہ احساس ہے جس سے سکون ہو۔ جس سے ہماری روح میں شگفتگی اور تازگی پیدا ہو۔ جو ادب ہم میں جمود پیدا کرے اس کو ہم سفلی کہہ سکتے ہیں علوی ادب وہی ہے جو ہم میں عقل صالح ضبط اور قوت حیات کی تحریک کرے اور ادب میں یہ صلاحیت اسی وقت آئے گی جب اس کا منبع ہماری معاشرت اور اس سے متعلق مسائل ہوں۔ نئے ادب کا مفہوم ہی یہی ہے اس میں زندگی کے مسایل سے بحث ہو زندگی کی تنقید ہو یہی حیاتی مشاہدے اور تاثرات ادیب کے جذبات کے محرک ہوتے ہیں جن پر اس کی تخلیق کی بنیاد کھڑی رہتی ہے اور زندگی کا صحیح مرقع کھینچنے کے لئے ہمیں قدم قدم پر نفسیات کے علم کی ضرورت ہوتی ہے جب تک ہم میں وہبی، اکتسابی علم نفسیات نہیں ہے یہ غیر ممکن ہے کہ ہم اپنی قوتِ فکر کو بہنے سے روک سکیں۔ مشاہدہ تخلیق کے ظاہری اسباب پیدا کر دیتا ہے لیکن اُسے واقعیت کا رنگ دینے کے لئے ہمیں اس کے محرکات کے اندر جانا پڑتا ہے اور ادیب میں یہ قوت جتنی ہی پختہ ہوتی ہے اتنی ہی اس کی تخلیق میں حرکت، حرارت اور جذبات پیدا ہوتی ہے۔

شنکر موہن لال ماتھر

نوائے سازِ دل

کون میرے دل میں بیٹھا چھیڑتا ہے سازِ دل
طور کی بجلی جو ہنس کر پوچھتی ہے رازِ دل

بعدِ مردن اب ہوئے ہیں وہ مرے پرسانِ حال
کیا مبارک موت ہے تیرے لئے اے رازِ دل

دل کو دل سے راہ ہوتی ہے مثل مشہور ہے
لاکھ پردوں میں نہاں ہو پاس ہی ہمرازِ دل

تیغ ابرو کے اشاروں سے وہ سو ٹکڑے کریں
ہے شہیدِ ناز ہونا باعثِ صد نازِ دل

آنکھ میں مقتول کی تصویرِ قاتل بھی رہے
تیرِ مژگاں کا نشانہ ہو یہ ہے پروازِ دل

گو بظاہر ہی فقط اک ؟ بے بال و پر
کل فضائے شش جہت ہی وسعتِ پروازِ دل

اک جھلک ہٹ کر دکھا اے پردۂ حسنِ مجاز
دیکھ پھر انجامِ جوشِ طاقتِ پروازِ دل

محرمِ غم ہائے پنہاں شمعِ بزمِ حسن و عشق
تارِ اشکِ فرقتِ جاناں ہی سوز و سازِ دل

اُکھڑی سانسوں کے اشاروں سے بتاتا ہے حبیب
میری رگ رگ سے قریں تر ہے مرادِ سازِ دل

سید حبیب حسن

بھکاری کا خونیں انتقام

(بسلسلہ گزشتہ)

سرکار ــــ میں اپنے وجود کے بارے میں چند باتیں ضروری کہنا چاہتا ہوں ــــ اپنی صفائی یا اپنی جان بخشی کے لئے نہیں بلکہ میرا مقصد دنیا والوں کے سامنے بعض معمولی واقعات کی اہمیت کو واضح کرنا ہے قبل کہ واقعات سے ہٹتے ہوئے دوسرے واقعات میں بغیر سرکار کی اجازت کے بیان کرنا نہیں چاہتا۔" جج نے ملزم کو اجازت دی کہ وہ بلاکم و کاست اپنے واقعات بیان کرے ملزم نے دوبارہ ایک سرد آہ بھری اس نے رکتے رکتے کہنا شروع کیا۔

"سرکار ــــ میں ایک غریب انسان ہوں محنت مزدوری میرا پیشہ ہے میں نہیں جانتا کہ میں کہاں پیدا ہوا اور کس حالت میں۔ لیکن یہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ میں نے ایک جھونپڑے سے گاؤں میں ہوش سنبھالا۔ مجھ سے محبت کرنے والی، میرے ہر دکھ کو اپنا دکھ سمجھنے والی صرف میری ایک ماں تھی۔ (اس موقع پر ملزم کی آنکھ سے آنسو بہنے لگے۔) وہ مجھ سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ وہ مجھے ہمیشہ خوش دیکھنے کے لئے سخت سے سخت کام کرتی اور اپنی کمائی سے میرے لئے کھلونے اور دوسری چیزیں مہیا کرتی تھی لیکن ــ ــ آہ وہ ہمیشہ رنجیدہ رہتی تھی ــــ اس کی بڑی بڑی آنکھیں ہمیشہ حسرت و یاس کے دریا میں غوطہ زن ــــ اگر وہ زندہ ہوتی تو صرف مجھے دیکھ کر ــــ جب مجھ میں عقل و تمیز پیدا ہوئی اور میں محلے کے لڑکوں میں اٹھ بیٹھ کر دنیا سے واقف ہوا تو مجھے اس بات کی تشویش ہونے لگی کہ دنیا میں میرا باپ کون ہے۔

تقریباً ہر روز اور ہر وقت میں اپنی ماں سے لڑتا تھا کہ وہ مجھے میرے باپ کا نام اور پتہ بتادے۔ لیکن وہ اس بات کا جواب دینے سے ہمیشہ گریز کرتی رہی۔ یہاں تک کہ میں بالغ ہوگیا۔ اور وہ منحوس وقت بھی آگیا جب کہ میری ماں جو میری امیدوں کا سہارا تھی مجھ کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے لگی ــــ اس نے اس وقت مجھے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ اس کا گرم جسم ــــ اور اس کی بے ترتیب سانسیں ــــ اس کی سفیدی مائل پھٹی ہوئی بے تاب آنکھیں ــــ اس کے دھڑکتے ہوئے دل کی بلند آواز کے ساتھ میرے کانوں نے سنا کہ میری ماں ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی ــــ معصوم ــــ بھولی بھالی ــــ بنسی لال کے مکان میں ملازمہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ خوبصورت تھی ــــ جوان تھی ــــ غریب تھی ــــ بنسی لال نے ان باتوں سے فائدہ اٹھایا مستقبل کی زندگی کے وہ دلخوش خواب پیش کئے جو سراسر فریب وعدوں پر مبنی تھے۔ اپنے شیطانی جذبات اور نفسانی خواہشات کو دولت کی لالچ ــــ اور جھوٹے وعدوں کی آڑ میں پورا کیا طاقت والے انسان نے کمزور عورت کی زندگی تباہ کی اس کے ساتھ ناجائز طور پر ایک طویل مدت تک عیش کرتا رہا۔ اور اپنی شادی کی مسرتوں میں خود کو گم کرنے کے لئے اس غریب کو ٹھوکر مار کر گھر سے نکال دیا تاکہ اس کی شرافت پر دھبہ آنے کے مواقع نہ پیدا ہو جائیں اور اس کی ہونے والی شادی ملتوی نہ ہو جائے۔ دنیا کی نظروں سے بچتے ہوئے بیکس و ناچار عورت نے اپنی زندگی گاؤں میں گزارنا شروع کی۔

اس کے چند دن بعد میں پیدا ہوا — ملزم نے اپنے سینے کو ابھارتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہنا شروع کیا "سرکار — میری ماں کی مقدس روح نے اس سے پہلے کہ وہ قفسِ عنصری کو خیرباد کہے مجھے میرے دیرینہ سوالات کا جواب دیا۔ اس نے بتایا کہ میرا باپ کون ہے — کیا ہے — اور کہاں رہتا ہے — اس نے رو رو کر مجھ سے کہا کہ میں نے تم کو بچپے سے جوان صرف اس لئے کیا اور بجائے تمہارا گلا گھونٹنے کے کھلا پلا کر اس لئے پرورش کیا کہ تم وہ کام کرو جس کو میں کمزور عورت ہونے کی وجہ سے نہ کرسکی — یعنی اپنے باپ — ظالم باپ سے انتقام لو۔"

"مجھے جب اپنی حقیقت معلوم ہوئی کہ میں کون ہوں اور جب میری ماں کی مصیبتوں کا حال میں نے سنا تو مجھے از خود اس درندہ خصلت انسان سے نفرت پیدا ہونے لگی، جو میری ماں کی برباد شدہ زندگی کا باعث تھا اور جس نے مجھ جیسے قابلِ نفرت انسان کو پیدا کرنے میں حصہ لیا تھا۔ اس کے ناقابلِ معافی گناہوں اور شیطانی خصلتوں کا میں نچوڑ ہوں جس کو دنیا میں جینے کے قابل نہیں سمجھا جاتا — جس کو آپ کی عدالت کا بنایا ہوا قانون اور آپ کا سماج ٹھکراتا ہے — لیکن اس پر غور نہیں کیا جاتا کہ مجھ جیسے حرامی اور ناپاک افراد کا دنیا میں اضافہ کرنے والا — معصوم لڑکیوں کو اپنی شہوت پرستی کا شکار بنانے والا انسان نما شیطان کس سزا کا مستحق ہے اور اسے دنیا میں زندہ رہ کر لطفِ زندگانی حاصل کرنے کا کہاں تک حق حاصل ہے — سرکار — میں نے اپنے باپ کو وہ سزا دی ہے جس کا وہ مستحق تھا۔ آپ کی عدالت کا قانون مجھے مجرم اور خونین مجرم سمجھتا ہے لیکن میرے ضمیر کا فتویٰ یہ ہے کہ میں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔"

جج کو پہلی مرتبہ بھکاری کو یہ ہدایت کرنے کی ضرورت پیش آئی کہ وہ ایسے جملے نہیں کہہ سکتا جس سے عدالت کی توہین ہوتی ہو — ملزم نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا "میں آگے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ سوائے اس کے کہ مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ میں نے جنسی لال یعنی اپنے باپ کو قتل کیا۔ اور عمداً۔"

چونکہ عدالت کا وقت ہوچکا تھا اس لئے اجلاس برخاست کردیا گیا۔

تقریباً ایک مہینہ تک عدالتی مرحلے طے ہوتے رہے یہاں تک کہ وہ دن بھی آگیا جس دن اس مقدمہ کا فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔ اس دوران میں میرے دل میں بھکاری کی طرف سے بجائے دہشت کے ہمدردی پیدا ہوچلی تھی۔

جج کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ملزم کو حاضر کیا گیا۔ جج نے آہستگی سے فیصلہ پڑھ کر سنا دیا۔ حاضرین کی خوف زدہ ہلکی چیخوں سے عدالت کا کمرہ تھوڑی دیر کے لئے گونج اٹھا۔ ملزم کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے کہا۔

"میں مطمئن ضمیر اور مسرور دل کے ساتھ اس حکم کا خیر مقدم کرتا ہوں"

لوگ ہمدردی اور حیرت کے ساتھ اس کے چہرے کو دیکھنے لگے۔

خلیل اللہ

موسیقی اقطاع عالم میں

اگر ہم ان تمام آلات کو ایک جگہ دیکھیں جن سے کہ حضرت انسان نے آواز پیدا کی ہے تو وہ ایک عجیب و غریب مجموعہ ہوگا۔ ایک طرف افریقہ کے قدیم لکڑی و مٹی کے ڈھول ہوں گے تو دوسری طرف اسی کی ترقی یافتہ شکل دور جدید کا طبلہ ہوگا۔ جہاں ایک عجیب بے ڈھنگا سا تاروں والا باجا (جو کھوکھلی چیز مثل کدو وغیرہ سے تیار کیا جاتا ہے) پڑا ہوگا۔ وہیں پر ایک خوش اسلوب بربط و قرون وسطیٰ کی سات تاروالی سارنگی یا موجودہ تہذیب کا مشہور باجا وائلن دھرا ہوگا۔ نرسلوں سینگوں اور ہاتھی دانت کے غلیظ و بد وضع قرنے و شہنائیاں اور خوش وضع ارگن مذاق قدیم و جدید کا نمونہ پیش کر رہے ہوں گے۔

ان تمام قسم کے قدیم و جدید باجوں کو تین گروہ میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے ضربی یعنی وہ باجے جو مار پیٹ پر آواز دیں مثلاً نقارہ ڈھول طبلہ وغیرہ دوسرے تاری یعنی وہ باجے جو تاروں سے بنائے گئے ہوں مثلاً سارنگی وائلن ستار وغیرہ تیسرے ہوائی یعنی وہ باجے جو ہوا کی مدد سے آواز دیں مثلاً ہارمونیم وغیرہ۔ انسان نے ابتدائے آفرینش سے آج تک آواز پیدا کرنے کے مختلف طریقے ایجاد کئے ہیں مگر ہر طریقہ ان تینوں گروہوں میں سے ایک نہ ایک میں ضرور شامل ہے۔

زمانۂ قدیم کے باشندوں نے اپنی ذاتی آواز کے علاوہ کسی دوسرے طریقے سے اپنی خواہش و جذبات کے اظہار کی کوشش کی۔ اسی خواہش و شوق کے تکملہ کے سلسلے میں یہ لوگ آلاتِ موسیقی کی طرف مائل ہوئے۔ ابتدائی آلات جن کے بنانے میں وہ کامیاب ہوئے ایسے باجے تھے جو کسی دوسری چیز سے پیٹنے کے بعد آواز دیتے تھے تاہم اس نے اس خصوص میں جلد ترقی کی۔ انھوں نے ایک کھوکھلی چیز پر کسی جانور کا چمڑا مڈلیا تو ایک ڈھول کی شکل ترتیب پاگئی یا اس نے ایک تیز اور صاف آواز نکالنے کے لئے نرسلیں استعمال کیں جو چند روز کے بعد قرنے اور شہنائی کی شکل میں ترقی کر گئیں۔ جب قدیم انسان نے دیکھا کہ ایک کھوکھلی چیز میں چھوٹی چھوٹی گولیاں سی ڈال کر ہلائی جائیں تو ایک جھنجھنے کی سی آواز پیدا ہوتی ہے تو اس طرح سے اس نے ایک تیسرا آلۂ صوت تیار کر لیا۔ آج تک بھی دنیا کے بعض حصوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ڈھول قرنے اور جھنجھنے کو خاص آلاتِ موسیقی کا درجہ دیتے ہیں۔ قدیم اور ابتدائی آواز پیدا کرنے کے طریقے اور دورِ جدید کی ترقی یافتہ موسیقی میں صدیوں کا زمانہ حائل ہے تاہم اگر ہم کسی قدیم جاننے والے کو بغور دیکھیں تو اس کے سر اور دیگر اعضاء کے حرکات و سکنات سے پتہ چلتا ہے کہ تال کا قائم رکھنا اس کے لئے ضروری چیز ہے۔ جیسے ہی امریکہ کا سرخ ہندی اپنے ٹم ٹم (ایک قسم کا ڈھول) میں یا افریقہ کا حبشی اپنے ڈھول میں نغمہ اور راگ سے زیادہ تال کا خیال رکھتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ زمانہ قدیم کی جاہل اقوام کے دماغوں میں نغمہ، راگ اور الاپ سے زیادہ تال کی اہمیت بسی ہوئی تھی۔ افریقہ کے حبشیوں کے نزدیک ڈھول بجانا ایک خاص فن ہے جس میں وہ کامل مہارت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہی ڈھولوں کی آواز سے وہ میلوں تک پیغام رسانی کرتے ہیں۔

حبشیوں کے گانے اور بجانے کا اصول ہم آہنگی پر

جو ہر سننے والے کے لئے ایک بیزار کن امر ہے۔ اگرچہ کہ
جب وہ مذہبی جوش میں بجانے میں تو ایک غمگین اور
موثر نغمہ پیدا کر لیتے ہیں جس کو وہ "مقدس ترانے"
کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وسط افریقہ کے اکثر قبائل
موسیقی میں کامل دسترس رکھتے ہیں اور کسی قبیلہ
کا ایک فرد جو گانا بجانا اور ناچنا جانتا ہے۔ کسی علاقہ
میں جاتا ہے تو اس کا پرجوش خیر مقدم کیا جاتا ہے
مگر ان کا طریقہ استقبال سخت بے رحمی سے تعلق رکھتا ہے
جیسا کہ ایک سیاح کا بیان ہے کہ جب کبھی ایسا شخص دوسرے
قبیلہ میں جاتا ہے تو اس قبیلہ کا سردار اس کی آنکھیں
نکلوا دیتا ہے تاکہ ایسی خوبیوں والا انسان ادھر ادھر
مارا مارا نہ پھر سکے۔

اگر چینیوں کے گانوں اور موسیقی کی شہرت ان کی
تال سے ہے تو مشرق راگ اور سرگم کا دلدادہ ہے۔
حتیٰ کہ تقاریر میں بھی اس کی جھلک نظر آتی ہے کیونکہ
مشرقی ممالک میں ایک ہی لفظ آواز، نشیب و فراز
یا لب و لہجہ کے لحاظ سے مختلف معنی دیتا ہے۔ ملایا میں
میں علم موسیقی کو نشوونما پانے کے مواقع دستیاب نہیں
ہوئے کیونکہ یہاں ہر چیز گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہونے
کی وجہ سے رفتار ترقی بہت سست ہے۔ حالانکہ جاپان
میں نغمہ، راگ اور الاپ کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا
جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں کی موسیقی جلد ترقی پا رہی ہے
ہر مشرقی قوم اپنے ہاں ایک خاص آلۂ موسیقی
روایتاً رکھتی ہے۔ اہل چین "دی کنگ" نامی آلۂ موسیقی
کو بہت عزیز رکھتے ہیں جو ایک قسم کا سلاخ دار باجا ہوتا
ہے جس میں سولہ پتھر دو قطار میں بندھے ہوتے ہیں۔
جن کو ایک لکڑی کی موگری سے بجایا جاتا ہے۔
اہل برما ایک خاص قسم کے ڈھول کے شیدائی ہیں۔
جس میں اکیس[۲۱] مختلف سائز کے چھوٹے بڑے ڈھول
ایک نصف دائرے کی شکل میں جڑے ہوتے ہیں اور
بجانے والا نصف دائرے کے بیچ میں کھڑا یا بیٹھا
رہتا ہے۔ جاپانی بانس کی نلیوں والے باجے کو پسند
کرتے ہیں جس کو وہ "اینک لانگ" کہتے ہیں۔ ہندوستانی
موسیقی دیگر ممالک سے بہت آگے ہے "بین" ہندوستان کا
ایک ایسا باجا ہے جو ہندوستانی موسیقی کی ساری
خصوصیات کا حامل ہے۔

شمالی امریکہ میں ہر ابتدائی قسم کے ڈھول،
سیٹیاں، جھنجھنے اور بانسریاں استعمال ہوتی ہیں یہاں
موسیقی کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ وسطی اور جنوبی امریکہ
کے اکثر قبائل علم موسیقی کے بہت عاشق ہیں جو مختلف
قسم کے تار والے آلات استعمال کرتے ہیں جو کھوکھلی چیزوں
از قسم کدو وغیرہ پر محویت انگیز آواز پیدا کرتے ہیں۔
قدیم مصری تین ہزار قبل مسیح میں فن موسیقی کو اوج کمال
پر پہنچا چکے تھے وہ تار والے آلات استعمال کرتے تھے
مثلاً چنگ، بربط اور ستار کی قسم کا ایک مثلث نما باجا
وغیرہ اس کے بعد سے فن موسیقی کو انحطاط شروع ہوا۔
یہودیوں نے موسیقی مصریوں سے حاصل کی۔ یونانیوں
نے موسیقی کو اصولی اور فنی حیثیت سے ترقی دی اور
یہی پہلی قوم تھی جس نے علم موسیقی پر قلم اٹھایا۔ موسیقی
ان کی رہین منت ہے۔ اس قوم نے موسیقی پر مفید
مواد فراہم کیا۔ آرفیوس اور اس کے بربط کی سحر انگیزیاں
آج تک زبان زد خاص و عام ہیں کہ جب وہ بجاتا تھا تو

ساکن پہاڑ بہتے دریا اور خاموش درخت اس کے کمال کی داد میں سر دھنتے تھے۔ عرب اس خصوص میں بڑے حساس واقع ہوئے تھے وہ بجائے تال اور آواز کے نغمہ اور راگ کے جویا تھے بانسری، بربط، چنگ اور دف ان کے ہر دلعزیز آلاتِ موسیقی ہیں۔ زمانہ تاریک میں جب یورپ جاہلانہ دور سے گزر رہا تھا ان کے گرجاؤں نے علم موسیقی کو زندہ رکھا اور وہ قومی ناچ اور گانے جو آج تک موجود ہیں انہیں گرجاؤں کے ممنون ہیں ان گرجاؤں کے علاوہ اس زمانہ میں گانے اور بجانے والے ادھر ادھر پھرا کرتے تھے مثلاً جنوبی یورپ کے غزل گو شعراء اور شمالی فرانس و جرمنی کے عشقی شعراء اور برطانیہ کے گویّے اور بھروپیے وغیرہ آلات موسیقی کی جدید ساخت یا مسئلہ پیدا ہونے کے ذریعہ علم موسیقی کو پوری ترقی حاصل ہوئی ہے اس سے دنیا کے ہر گوشہ میں پھیلا ہوا ہے۔

محمد اعتبار فاروقی
(گلبرگہ)

شرارت

کوئی شرارت پھر کر جاؤ — اٹھو اٹھ کر سامنے آؤ
سامنے آؤ نظریں ملاؤ — مجھ سی اپنی شکل بناؤ
کوئی شرارت پھر کر جاؤ

ساون آیا بھادوں آئی — الفت عالم پر مستی چھائی
تم بھی اٹھو لے کر انگڑائی — دونوں عالم پر چھا جاؤ
کوئی شرارت پھر کر جاؤ

اک پل آنا اک پل جانا — خوب آتا ہے تم کو ستانا
سن کر میرا سارا فسانا — میرا فسانہ تجھ کو سناؤ
کوئی شرارت پھر کر جاؤ

چاند آیا ہے، تم بھی آؤ — اپنا روپ انوپ دکھاؤ
بدلی چھائی، تم بھی چھاؤ — بالوں کو چہرہ پر لاؤ
کوئی شرارت پھر کر جاؤ

مجھ سے پردہ پوشی کیسی؟ — دوست میرے خاموشی کیسی؟
ہوش میں ہوں بے ہوشی کیسی؟ — سامنے آکر ہوش اڑاؤ
کوئی شرارت پھر کر جاؤ

شور تمہاری پیت نرالی — بات نرالی جیت نرالی
خوب لکھی یہ گیت نرالی — اور کوئی طوفان اٹھاؤ
کوئی شرارت پھر کر جاؤ

شور عابدی

آج کل کی لڑکیاں

اس سے قبل کہ آج کل کی لڑکیوں سے میں آپ کا تعارف کراؤں آپ ہی کے رنگین تصورات آپ کے سامنے ایک پیکر لا کر کھڑا کر دیں گے۔ جس کا خاکہ الفاظ کے ذریعہ اُتارنا ٹیڑھا سوال معلوم ہوتا ہے۔ جدید لباس میں ملبوس بال کٹے ہوئے شانوں پر بکھرے چہرہ پر سرخ و سفید غازہ ملا ہوا ابروؤں کی جگہ خالی لیکن ان سے دو انگشت اوپر ہٹ کر باریک سلائی سے بنائی ہوئی کمان دار بھویں ناخن اور ہونٹوں پر سرخ رنگ چڑھا ہو غرض کہ یہ معلوم ہوگا کہ فطرتی صورت پہ کوئی مصنوعی غیر مانوس چہرہ لگا دیا گیا ہے۔ یہ تو آج کل کی لڑکیوں کی خیالی تصویر آپکے ذہن میں ہوئی۔ لیکن کیا آج سے نصف سال قبل جب بے چاریوں پر پھبتیاں اڑائی نہیں جاتی تھیں [illegible] توہین میں بڑی بوڑھیاں حصہ نہیں لیتی تھیں۔ بیس سال بلکہ سو سال پہلے جس طرح لڑکیوں پر فقرے کسے جاتے تھے اسی طرح آج کل کی لڑکیوں کے خلاف بھی مخالفت کی آواز بلند کی جاتی ہے۔ کسی عہد میں اصل مرض کی تشخیص نہ کی گئی اور نہ اب بھی کسی کے بس کی بات ہے۔

ایک ایسے زمانہ سے جس کا تعین آسان نہیں ان حرماں نصیبوں کی امنگوں خوشیوں اور احساسات کو کچل دیا گیا اور فطرتی طور پر پھلنے پھولنے اور نشو نما پانے نہ دیا گیا اور پھر یہ بڑی بڑی امیدیں رکھی گئیں کہ وہ ایک ذمہ دار ہستی بن کر رہیں۔ حالانکہ ان کے قویٰ کمزور ان کی نظر تنگ ان کے خیالات پست ان کی ذہنیت ادنیٰ ہوتی چلی گئی وہ ایک علحدہ دنیا میں رہنے لگیں۔ مرد کی شریک حیات نہیں بلکہ ایک زبردست ہستی بن کر غلامی کی زنجیروں میں جکڑی رہیں۔ اس کے رحم و کرم کے لئے منہ تکتی رہیں حالت یہ ہوئی کہ صنف مقابل سے وہ ہراساں رہنے لگیں۔ اس کے سائے سے خوف زدہ بھٹکے ہوئے ہرن کی گت بن گئی اس لحاظ سے ہماری آبادی کا نصف حصہ نکما بنا رہا۔ اور اس رسم و رواج نے لڑکیوں کو بیکار کر دیا اور زمانہ کی عادت کے مطابق اس کا ردعمل لازمی ہو گیا۔ اب جو ذرا آزادی دی جا رہی ہے۔ اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر آ رہی ہیں تو ان کو اس چار دیواری سے کوئی انس یا لگاؤ باقی نہیں رہا مغرب کی اندھی ریس کے کنوئیں میں گری جا رہی ہیں۔ گونا گوں فضولیات میں الجھ رہی ہیں۔ مغربی تہذیب کے بُرے طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں۔ زیب و زینت بناؤ سنگھار اور نئی تہذیب کے نئے طریقوں میں وقت برباد کیا جاتا ہے۔ فیشن کی دوڑ میں یورپ سے بھی آگے بڑھنے کی دھن ہے۔ بہت سی باریکیاں اور نزاکتیں اس فیشن میں پیدا کی جاتی ہیں۔ جس پر ان کی دولت اور وقت کا بہت سا قیمتی حصہ صرف ہو رہا ہے۔ اور صحت پر بھی برا اثر پڑ رہا ہے۔ یہ خصوصیت اس وقت زیادہ واضح ہوتی ہے جب کہ کوئی تقریب منائی جاتی ہے یا شادی بیاہ کے موقعوں پر جہیز تیار کیا جاتا ہے اور کمرے سجائے جاتے ہیں تو سیکڑوں جدتیں تراشی جاتی ہیں۔ اور اس کا خاص خیال رہتا ہے کہ تمام چیزیں موزوں ہوں ایک دوسرے سے "میاچ" کریں ورنہ بھدی اور بے رونق کہلائی جانے کا خوف

سوہان روح بنا رہتا ہے۔ آج کل کی لڑکیوں کے
مذاق کی وجہ سے کہئے یا ان کے تخیلات کے اثر سے
کہئے ایسے مضحکہ آمیز واقعات پیش آتے ہیں جو سلامت روی
سے کوسوں دور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ضرورتوں کا دائرہ
وسیع ہوتا چلا جارہا ہے۔ خیالات ہزاروں جانب
بٹے جارہے ہیں۔ آج کل کی لڑکیاں چاہتی ہیں کہ
شوہران کے مرید بنے رہیں اور ان کے گاڑھے پسینے
کی کمائی کی گویا صرف وہی حق دار ہیں اور اس کو لغویات
اور فضولیات پر خرچ کردینا چاہتی ہیں۔ وہ اقتصادی اور
معاشرتی اصولوں سے محض ناآشنا ہوتی ہیں۔ حالانکہ
اس دور میں نسوانیت کا احترام اور وقار بڑھ رہا ہے۔
ہے۔ تعلیم یافتہ اور متمدن شوہر اپنی رفیقۂ حیات کو زندگی
کی تمام مسرتوں میں شریک رکھنے کے لئے آمادہ نظر
آتے ہیں۔ لیکن آزادیٔ خیالات کے زہریلے اثر سے
میاں بیوی میں باہمی خلوص و محبت کا سدا بہار چشمہ
رات دن کے اختلافات سے گدلا ہوجاتا ہے اور
مردوں کو یہ یقین ہوجاتا ہے کہ حسن سیرت اور شرافت
ذاتی اس نئی روشنی میں کھوئی جارہی ہے۔ پتہ ہوتا کہ
پھر وہی قدیم روایتی اصول قائم ہوجاتے کیونکہ
جدید تغیرات اور اصلاحات پریشانی کا سبب بنتے
نظر آرہے ہیں اور خیال پیدا ہورہا ہے کہ ان کے
حقیقی جوہر ضائع ہورہے ہیں۔ وہ اپنی امتیازی
خصوصیتوں اور فطری خوبیوں سے کوسوں دور
ہوتی جارہی ہیں اور اندیشہ ہوتا ہے کہ نسوانیت برقرار
نہیں رہے گی۔

ہمہ گل از بستاں آمایستہ ۔ وغش از داماں ناشستہ ۔

ایسی حالت میں آج کل کی لڑکیوں سے یہ کس طرح
امید ہوسکتی ہے کہ وہ اچھی مائیں اور اچھی بیویاں ہیں
گی جن کا معیارِ زندگی موجودہ نام نہاد تہذیب کے
مطابق ہو اور وہ اس کی دلدادہ ہوں، ہر وقت اپنے
بناؤ سنگھار اور جدید لباس میں ملبوس رہنا باعث
عزت و فخر سمجھتی ہوں اور بے جا اخراجات کے باعث
والدین اور شوہروں پر ایک بار گراں معلوم ہوتی ہوں۔
اور پھر یہ فکر بھی لگی ہوئی ہے کہ ان کی گود میں نئی نسل
کی سیرت کس طرح بنے گی کیا وہ اپنی اولاد کی ایسی
اعلیٰ تربیت [illegible] گی [illegible] معنوں میں [illegible]
کہلا سکے [illegible] تعلیم [illegible]
[illegible] حاصل [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] حالات [illegible]
کرنے والی خرابیوں پر یک لخت سکون چھایا ہوا ہے۔ نئی
تحریکیں پیدا ہورہی ہیں تعلیم نسواں کا چرچا بڑھ رہا ہے
اور آج کل کی لڑکیوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہے
جو معاشرت میں سادگی اختیار کرتی ہیں۔ اور وہ اپنا
جائز حصہ اور اپنے فطرتی حقوق اور حکم حاصل کرنے کے
لئے جنابی کے ساتھ آگے قدم بڑھا رہی ہیں۔ زندگی کے
بعض شعبوں میں ترقی کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر، وکیل، بیرسٹر
مجسٹریٹ، اسکولوں کی استانیاں اور پروفیسر بن رہی
ہیں۔ انجمنوں اور کانفرنسوں میں کام کر کے یہ ثبوت
دے رہی ہیں کہ اجتماعی زندگی میں حقیقی طاقت کا ذریعہ
عورت ہی ہے۔ جس کا انحصار ہماری نوجوان [illegible]

بیداری پیدا ہوتی ہے۔ وہ پہلے کی لڑکیوں کی طرح سست نہیں ان کی جمودی حالت میں ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ وہ ہم عصر اقوام کے ساتھ ساتھ قدم اٹھانا چاہتی ہیں۔

ترقی کے میدان میں وہ کسی سے پیچھے رہنا پسند نہیں کرتیں۔ ہندوستانی کالجوں اور اسکولوں کی تعلیم ان کے لئے کافی نہیں وہ یورپ جا کر اعلیٰ تعلیم پاتی ہیں۔ وہ اونچے عہدوں پر کھڑے ہونے کے لائق بن سکتی ہیں۔ اور بوقت ضرورت اپنی تعلیم سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ بہرحال ان کے لئے ترقی کے راستے خود بخود کھل رہے ہیں۔ لیکن اگلے زمانہ میں جو مذہبی اور اخلاقی تعلیم کا خاص خیال رکھا جاتا تھا وہ اب بالکل بھلا دیا جا رہا ہے۔ شریفوں کے گھرانوں میں خاص توجہ لڑکیوں کے اخلاق اور عادتوں کے درست کرنے پر کی جاتی تھی ان کو نیک نفس اور پاکباز بنایا جاتا تھا۔ مذہب کے احکام کی پابندی لازمی کردی جاتی تھی۔ لیکن اب اس کا چرچا نہیں اس سے تو ظاہر ہوا کہ ہماری تربیت ہی میں نقائص پیدا ہوگئے ہیں۔ ان تمام کمزوریوں کو ہماری نوجوان بہنیں اور لڑکیاں کامیابی کے ساتھ دور کر سکتی ہیں۔ وہ دماغی توازن تیز نظری اور دانشمندی کے مضبوط ہاتھوں سے کام لیں اور ان موقعوں سے پورا پورا فائدہ حاصل کریں ان کو اس وقت صرف ایسے چند رہنماؤں کی ضرورت ہے، جو خلوص اور صدق دل سے ان کی رہبری کرکے خود نمونہ اور مثال بن جائیں تاکہ ان کی بھولی بھالی روشن سیرت پر سے بدنما داغ مٹا دئے جائیں جو خوش قسمتی سے ابھی طبیعتِ ثانیہ بنے نہیں ہیں۔

مسز صوفی

عید ہوگئی

(انیسہ ہارون حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا)

اب تو نشاط و عیش کی تمہید ہوگئی
رویت سے تیری اے مہِ نو! عید ہوگئی

صائم جو روزہ دار تھے بہرِ رضائے رب
ان کی خوشی کی غیب سے تائید ہوگئی

انساں تھا پاس دارِ امانت قدیم سے
عہدِ وفا کی خوب یہ تجدید ہوگئی

کہتے ہیں جو کہ مائلِ پستی و ضعف ہے
"دینِ بلند" ان کی بھی تردید ہوگئی

آمادۂ خدمتِ ملت ہیں جو نفوس
ان کی مثال زندۂ جاوید ہوگئی

مانگی دعا جو واسطۂ صائمین سے
صد شکر مغفرت کی کچھ امید ہوگئی

روٹھا ہوا ہے آج ہمارا عزیز دوست
من جائے وہ تو پھر بخدا عید ہوگئی

انیسہ ہارون بیگم شروانیہ

پیرس

(تاثرات سفر یورپ از ۱۹ راگست تا ۳۰ راگست)

چونکہ ہم پیرس رات کے وقت پہنچے تھے اس لئے بالفعل اسٹیشن کے قریب ہی ایک ہوٹل میں قیام کر لیا تھا۔ لیکن یہ ہوٹل "قومی کتب خانے" BIBLIOTHÈQUE NATIONALE سے کئی میل کے فاصلے پر تھا اور اس خیال سے کہ اس میں مستقل قیام کیا تو آنے جانے میں بہت وقت ضائع ہوگا' دوسرے روز میں نے کتب خانے کے قریب ہی ایک ہوٹل تلاش کر لیا اور اس میں منتقل ہو گیا۔ قومی کتب خانہ ایک عالی شان تاریخی عمارت میں ہے اور جو رتبہ انگلستان میں برطانوی نوادرخانے کے کتب خانے کو حاصل ہے وہی فرانس میں اس کتب خانے کا ہے۔ جس عمارت میں کتب خانہ ہے اس کی ابتدا لوئی ۱۴ شاہ فرانس کے مشہور وزیر مازارین نے سترھویں صدی کے شروع میں ڈالی تھی اور اسی عمارت کے ایک دوسرے حصے میں فرانس کا ایک دوسرا وزیر کولبرٹ رہا کرتا تھا۔ مطالعہ خانے میں کام کے لئے ایک اجازت نامے کی ضرورت پڑتی ہے جس کے لئے غیر فرانسیسیوں کو اپنے سفارت خانوں سے ایک تعارف نامہ پیش کرنا پڑتا ہے' لیکن اگر کوئی شخص صرف سات روز علاوہ ان تعطیلات کے جو درمیان میں آجائیں مطالعہ کرنا چاہے تو بغیر تعارف نامے کے صرف دو فرانک ادا کرنے پر اجازہ مل جاتا ہے۔ شکر ہے کہ مجھے مطبوعات کا مطالعہ کرنا اور محمود کاواں کے لئے المنوا لاہم کو اپنے لندن کے قیام کے آخری دن دیکھ چکا تھا ورنہ بڑی دقت پڑتی اس لئے کہ ہر سال ۱۴ راگست سے یکم ستمبر تک مطبوعات کا شعبہ تنقیح وغیرہ کی اغراض سے بند رہتا ہے اگر مخطوطات کی بھی یہی کیفیت ہوتی تو میرا پیرس آنا ہی بے کار ہوتا لیکن مخطوطات کا شعبہ اگست میں بند نہیں ہوتا بلکہ اس کی تنقیح صیغہ مطبوعات کھلنے کے بعد کی جاتی ہے۔

قومی کتب خانے کے قریب ہی وہ مشہور ایوان ہے جسے "ایوان شاہی" (Palais Royale) کہتے ہیں اور جس میں آج کل فرانس کی عدالت فیصلہ (Conseil d'État) (مجلس مملکت) واقع ہے جو مختلف عدالتی اختیار سماعت کے تنازع کے موقع پر آخری تصفیہ کرتی ہے۔ یہ "ایوان شاہی" ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس میں بہت مشہور ہو گیا اس لئے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں کے باغیچے میں جو اس وقت تک سجا ہے مشہور انقلابی خطاب ڈے مولین (Desmoulin) نے فرانسیسیوں کے سامنے نعرہ بلند کیا تھا کہ اب ظلم و ستم کی انتہا ہو گئی اور وقت آگیا ہے کہ ظالموں کے پنجے سے نکلنے کے لئے ایک خلاف ہتھیار اٹھاؤ۔ ڈے مولین کا مجسمہ جس میں وہ انبوہ کو مخاطب کر رہا ہے' باغیچے کے ایک نمایاں حصے میں نصب ہے اس "ایوان شاہی" کو لوئی کے وزیر کاردینل رشلیو نے ۱۶۲۹ء میں تعمیر کرنا شروع کیا تھا اور اسی میں ۱۶۴۲ء میں اس کا انتقال ہوا۔ انقلاب فرانس سے ذرا پہلے ڈیوک آرلینز نے' جسے "فلپ مساوات پسند" کہتے ہیں اسے چاروں طرف سے دوکانات اور قہوہ خانوں سے گھیر لیا اور اس کے ایک کونے میں انجمن اقوام کی شاخ "بین الاقوامی ادارہ برائے ارتباط ذہنی" International Institute INTELLECTUAL CO-OPERATION کا مرکز ہے۔

اگلے دن صبح کے وقت میں نے ٹامس کک کے یہاں ڈاک لی۔ خطوں میں سے ایک قومی کتب خانے کے ناظم کے نام ایک تعارف نامہ تھا جو میری علمی پر انڈیا آفس کے ڈپٹی لائبریرین Knaster صاحب نے بھیجا تھا' لیکن مجھے

اس کی ضرورت پیش نہ آئی اس لئے کہ میرا ارادہ سات آٹھ
روز سے زیادہ پیرس میں رہنے کا نہ تھا اور اس مدت کے
لئے بغیر تعارف نامے ہی کا اجازہ مل جاتا ہے۔ شعبہ مطبوعات
وہ ایک ہی دن میں بند ہونے والا تھا اس لئے میں نے
اس مہلت کو غنیمت جان کر اس پر ایک نظر ڈالی۔ مطالعہ خانہ
مطبوعات میں ایک کتبے سے معلوم ہوا کہ یہ کتب خانہ سب سے
پہلے عوام الناس کے لئے سنہ ۱۶۹۲ء میں کھولا گیا تھا۔ اس
میں شبہ نہیں کہ یہ مطالعہ خانہ اس قدر عالی شان نہیں جتنا برطانوی
نوادر خانہ کا مطالعہ خانہ ہے لیکن یہاں ایک ایک چیز سے
تاریخی اہمیت ظاہر ہوتی ہے جو لندن والے ذخیرے میں
اتنی نمایاں نہیں۔ دونوں میں یہ بھی فرق ہے کہ لندن میں تو
مشرقی اور مغربی کتابوں کے مطالعہ کے لئے جدا جدا کمرے ہیں
لیکن پیرس میں کتابوں کی جو تقسیم کی گئی ہے وہ مشرقی اور مغربی
کتابوں میں نہیں ہے بلکہ یہاں مطبوعات اور مخطوطات میں
کتابیں منقسم ہیں۔ مخطوطات کا مطالعہ خانہ بالکل جداگانہ بلکہ
محاذی ہی کی ایک بالکل علیحدہ عمارت میں ہے۔ میں نے آخر الذکر
میں چند گھنٹے کام کیا اور کتاب میں الاسرار کا مطالعہ کیا۔ یہ
روز پونے پانچ بجے بند ہو جاتا ہے۔ میری خوش نصیبی سے
کتب خانے ہی میں اس زمانے میں ایرانیات کی نمائش
ہو رہی تھی اور جب دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ۶ بجے
تک کھلی رہتی ہے تو میں مطالعہ خانے سے نکل کر نمائش دیکھنے
چلا گیا۔ اس نمائش میں نہایت بیش بہا فارسی مخطوطات قدیم
تصاویر قدیم ایرانی چینی کے برتن قبل اسلام اور اسلامی سکول
کا نہایت نایاب ذخیرہ شیشہ آلات اور ایسی جو بھی اشیاء
جمع کی گئی تھیں۔ سوا گھنٹے میں سرسری طور پر حسب ذیل قابل لحاظ
اشیاء نظر آئیں۔ کلیلہ و دمنا کی تصاویر جو سنہ ۱۲۲۲ء اور سنہ ۱۲۳۰ء کے
درمیان بنائی گئی تھیں۔ مقامات حریری کی تصاویر جو ان تصاویر
کی ہمعصر تھیں۔ نویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا باتصویر یونانی
زبان میں خواص الادویہ کا نسخہ جس پر ہسپانوی عرب علماء
طب رحمہم اللہ علیہم اجمعین نے مختلف پودوں کے نام عربی
زبان میں لکھ دیئے ہیں۔ شاہنامہ باتصویر مخطوطہ سنہ ۱۳۳۱ء
وغیرہ۔ جو سکے نظر آئے اس میں سب سے اہم حسب ذیل ہیں
پہلا عربی دینار جسے خلیفہ عبدالملک بن مروان نے مسکوک کیا
خلیفہ ہارون الرشید کا دینار، غزنوی، تیموری اور صفوی
سلجوقی سکے وغیرہ۔ اشیاء کے اعتبار سے تو یہ محض ایرانیات
کی نمائش تھی لیکن ظاہر ہے کہ ایرانیات کی نمائش میں
اسلامیات کا عنصر غالب تھا۔

شام کے وقت میں اور میری اہلیہ پیرس کے ہنگری
ریستوران (Restaurant Nedou) کھانا کھانے
گئے جو آپرا کے قریب واقع ہے۔ یہاں محض اتفاقاً
عبداللطیف خاں صاحب جج ناگپور اور ان کی بیگم صاحبہ
سے جو نواب محمد یار جنگ بہادر (حیدرآباد) کی دختر ہیں
ملاقات ہوئی۔ میری اہلیہ بیگم عبداللطیف خاں صاحب سے پہلے
سے واقف تھیں اس لئے یہ صحبت بہت پر لطف رہی۔ بیگم صاحبہ
گلے کے کسی آپریشن کے لئے یورپ آئی تھیں اور یہ آپریشن ویانا
میں ہوا۔ کہتی تھیں کہ محض انجکشن کے ذریعے سے جراحی عمل
کی جگہ بالکل سن کر دی گئی تھی اور باوجودیکہ عمل برابر چالیس منٹ
ہوتا رہا لیکن انہیں مطلق تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ جس ریستوران
میں ہم گئے تھے وہاں نہایت اعلیٰ قسم کا کھانا ملا۔

۱۴ اگست کو صبح ۱۰ بجے دوبارہ ایرانیات
کی نمائش دیکھنے گیا اس لئے کہ کل طبیعت سیر نہیں ہوئی تھی
اور حسب ذیل مزید قابل لحاظ اشیاء دیکھیں۔ کیخسرو دوم کی

تصویر کا درہم جو جنگ فارسیہ کے سال (۲۲۳ھ) میں
مشکوک ہوا تھا۔ بہت سے دوسرے درہم جو عربوں کے
بنائے ہوئے تھے اور جن پر یزدجرد ثانی آخری ساسانی
شہنشاہ ایران کی تصویر تھی ایسے سکے جن پر پہلوی زبان میں
مسلمان گورنر کا نام تھا قدیم ایرانی شہنشاہوں مثلاً اردشیر،
شاپور، بہرام وغیرہ کے سکے، نگوں اور کانچ پر منبت کاری
میں شبیہیں جن میں سے بعض نہایت ہی قدیم تھیں۔
قبل اسلام کے کپڑوں کے نمونے وغیرہ وغیرہ حقیقت
یہ ہے کہ اس نمائش میں جو اشیاء مختلف نوادر خانوں
اور نمائشی مجموعوں سے لے کر جمع کی گئی ہیں لاتعداد تو نہیں
لیکن ندرت میں ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔

اسی روز شام کے وقت یعنی مخطوطی مطالعہ خانے
کے بند ہونے کے بعد میں پیرس کی مشہور مسجد گیا جو جنگ عظیم
کے بعد فرانس اور فرانسیسی سلطنت کے ان حصوں کے چندوں
سے بنائی گئی ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے مسجد دراصل
پیرس کے "ادارۂ اسلامی" (INSTITUT MUSULMANE) کا ایک حصہ ہے مسجد نہایت حسین ہے۔
صدر دروازہ نہایت اعلے درجہ کا ہے۔ اور طرح طرح کی
ہندسی اشکال سے معمور ہے مسجد کے صحن میں ایک کے
چاروں طرف اسلامی کتب خانہ خطاب گاہ وغیرہ ہیں
اور دوسرا حصہ خاص مسجد جس کے مخصوص صحن میں کچھ کچھ الحمرا
غرناطہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کا اندرونی حصہ بہت ہی
مزین ہے۔ منبر جس میں سیپ کی پچی کاری ہے سلطان
مراقش کا عطیہ ہے صدر دروازے کے محاذ میں (اکثر مرفی
اور مغربی مساجد کی طرح) صرف ایک منارہ ہے جو مسجد سلطان حسن
قاہرہ کے نمونے پر بنایا گیا ہے معلوم ہوا کہ پنج وقتہ اذان
منار پر کھڑے ہو کر نہیں دی جاتی بلکہ مسجد کے اندرونی حصہ
میں ہی دی جاتی ہے اور منار پر صرف عیدین کی اذان ہوتی ہے
امام صاحب سے، جو خود مراقشی ہیں معلوم ہوا کہ جس زمین
پر "ادارۂ اسلامی" کی تعمیر ہوئی ہے وہ حکومت فرانس نے
دی۔ شمالی افریقہ کے مسلمانوں نے تقریباً دو ارب فرانک
(تقریباً ۱۲ کروڑ روپیہ) چندہ کرکے اس کی تعمیر کی۔ مسجد کے پشت
پر قہوہ خانے (جس میں عربی موسیقی بھی ہوتی ہے) طعام خانے
عربی کھانے مہیا ہوتے ہیں حمام اور شمالی افریقہ کی بنی ہوئی
اشیاء کی دوکان واقع ہیں۔ یہ سب چیزیں قابل دید ہیں
مسجد میں مغرب کی نماز باجماعت پڑھی اور اس کے طعام خانے
میں مراقشی کھانے کا لطف اٹھایا۔

۱۵ راگست کو (عید انتقال العذرا) ([illegible]) کی وجہ سے تمام فرانس میں تعطیل تھی۔ رومن کیتھولک لوگوں
کا عقیدہ ہے کہ ۱۵ راگست کو حضرت عیسیٰ آسمان سے
اترے اور فرشتوں کی مدد سے حضرت مریمؑ کی نعش کو اٹھا کر
آسمان پر لے گئے۔ چنانچہ اس دن کی برسی کے طور پر ۱۵ راگست
کو رومن کیتھولک لوگوں کا بڑا بھاری تہوار ہوتا اور فرانس
میں تمام کتب خانے، مدارس، سرکاری دفاتر وغیرہ بند
ہوتے ہیں۔ چنانچہ مخطوطاتی مطالعہ خانہ بھی بند تھا صبح
کے وقت ہوٹل ہی میں رہا شام کو ایک نہایت دلچسپ
مذ[illegible] پیرس کے قریب ترین جو میدان [illegible] ہے اسے
دیکھنے گیا چونکہ پیرس میں صرف چند روز ہی قیام کا
ارادہ تھا۔ اور وقت تنگ تھا [illegible] "بساز" کے
[illegible] ایک موقیمتی تھا اس لئے میں نے [illegible]
میدان [illegible] بنا [illegible] تو یہ جاتا تھا کہ فلاں [illegible] کے میدان

دیکھ آؤں۔ پیرس سے مختلف میدان ہائے جنگ کو نہایت
آرام دہ (Pullman motors) جاتی ہیں
جن میں ۲۰، ۳۰، ۳۰، ۲۵، ۲۵، ۲۰ اشخاص کے لئے جگہ ہوتی ہے
اور ہر مسافر کو نہایت عمدہ گدے اور نشست، سردی
کے بچاؤ کے لئے کمبل اور ہر طرح کے آرام کا انتظام
ہوتا ہے چونکہ قریب ترین میدان وہ ہے جہاں جنگ عظیم
کے آخر میں امریکی لڑے تھے اس لئے سوائے میرے
اور دو ایک اور اصحاب کے باقی سب کے سب مسافر
امریکی ہی تھے۔ ہم شام کے دو بجے چلے اور آٹھ بجے واپس
آگئے۔ پیرس سے صرف انیس میل پر وہ مقام ہے جو جرمن
اقدام کی آخری منزل ہے۔ یہاں شہر کے مشہور محافظ سپاہی
گالی اینی کا مجسمہ ہے جو اس پہاڑی کی طرف اشارہ کرتا ہوا
نظر آتا ہے جہاں تک جرمن پہنچ گئے تھے۔ جرمن ابتدائے
جنگ ہی میں یہاں تک آگئے تھے۔ تقریباً تمام فوج مختلف
محاذوں پر بھیجی جا چکی تھی۔ اور قریب تھا کہ ایک ہی حلے میں
پیرس کی شہر پناہ تک جرمن پہنچ جائیں۔ گالی اینی نے تو
سب سے پہلے تو پیرس کی بارہ سو ٹیکسی موٹروں پر قبضہ
کیا اور ان میں جتنے بھی سپاہی پیرس میں تھے ان سب کو بھر کر
جرمنوں کے خلاف بھیجدیا۔ جرمن سپہ سالار فون کلک
VON KLUCK کو کیا معلوم تھا کہ پیرس بالکل خالی ہے
ورنہ اطمینان سے پیرس اور اس فوج کے بیچ میں آجاتا
اور پیرس پر قبضہ کرلیتا۔ بہرحال دونوں میں مڈبھیڑ ہوئی
اور جرمنوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ یہ پہلی زک تھی جو جرمنوں کو
فرانس میں ملی۔ ہمارا راستہ برابر تارکول کی سڑک پر ہو کر تھا
جس کے دونوں طرف نفیس سرو قد درخت لگے ہوئے تھے
راستے میں وہ مکان دیکھا جسے مشہور جنگ دریائے مارن کے
زمانے میں مارشل ژوفر (Joffre) نے اپنا مستقر بنایا تھا
ہمارے راستے میں مایول (Mayeul) اور ایور نے
(Iverney) پڑے یہاں جنگ مارن سے پہلے
جرمن فوجیں پندرہ روز تک رہی تھیں۔ کہیں کہیں چند چھوٹے
پتھر نظر آئے جو بوربون خاندان شاہی کے زمانے میں
میلوں کا کام دیتے تھے اور جن پر ان کا سوسن کا نشان
بنا ہوا تھا۔ مو (Meaux) ایک تاریخی
شہر ہے۔ اس کی تیرھویں صدی کی گرجا اور شہر کی فصیل جو
جون آف آرک کے زمانہ کی بنی ہوئی ہے اس وقت تک
موجود ہیں۔ کہتے ہیں جب جرمن اس قصبے کے قریب آئے تو
شہر فوجوں سے خالی تھا۔ جنرل گالی اینی نے حکم دیا کہ سب
لوگ روشنیاں گل کردیں اور اپنے آپ کو اپنے گھروں میں
بند کرلیں اور ایسے خاموش ہو جائیں کہ یہ بھی معلوم نہ ہو کہ
قصبے میں کوئی ہے بھی یا نہیں۔ جرمنوں نے آکر یہ فضا دیکھی
کہ سڑکوں پر عورتوں مردوں بچوں کا پتہ نشان ہی نہیں اور
خیال کیا کہ ہو نہ ہو فرانسیسیوں نے ہمارے لئے کوئی پھندا
تیار کیا ہے ورنہ حقیقت یہ تھی کہ پھندا یہی تھا کہ کوئی
پھندا نہ تھا۔ الغرض بغیر شہر پر فوجی قبضہ کئے ہوئے شہر چھوڑ کر
دوسری طرف چل دیئے!

اس قصبے سے باہر نکلنے پر ایک ایسی سڑک
ملتی ہے کہ اس پر دو رویہ درخت ہیں وہ اوپر جاکر ایک دوسرے
سے مل گئے ہیں اور ایک طرح کی قدرتی چھت کا کام دیتے ہیں
اس کے بعد مشہور آفاق دریائے مارن (marne)
اور شہر ترلپورٹ (Trilport) آتا ہے یہاں
مارن پر دو پل ہیں ایک ریل کے لئے اور ایک گاڑیوں
وغیرہ کے واسطے۔ جب ۱۹۱۴ء میں انگریزوں اور فرانسیسیوں

کی پسپائی ہوئی تو انگریزوں نے دونوں پلوں کا ایک ایک
در باروت سے اڑا دیا' چنانچہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ
پلوں کا کونسا حصہ جدید اور کونسا قدیم۔ اس کے بعد شہر
(La Ferte) ہو کر گزرے جس کے قریب
ہی ایک چھوٹی سی پہاڑی پر وہ عمارت ہے جو جنگ عظیم
میں امریکی شفاخانے کا کام دیتی تھی۔ یہاں سے ہم بیلو جنگل
(BELLEAU WOOD) پہنچے جہاں جرمنوں اور
امریکیوں کے درمیان ایک مہینے مسلسل دست بدست لڑائی
ہوتی رہی تھی اور اس کی ایک ایک انچ زمین سنگینوں
اور تلواروں کی مدد سے امریکیوں نے جرمنوں سے فتح کی
تھی۔ ہم تقریباً ایک گھنٹہ پھرتے رہے آج کوئی اسے دیکھے
تو یہ اندازہ مشکل سے ہوتا ہے کہ بیس بائیس سال سے
پہلے یہاں کی زمین میں کیسا کیسا قتل و غارت ہوا ہوگا
اور بنی نوع انسان نے ایک دوسرے کو کیسی کیسی بہیمیت
سے ذبح نہ کیا ہوگا۔ اب بھی اس جنگل میں جرمن توپیں
ٹوٹی پڑی ہیں۔ اور ذرا غور سے دیکھئے اور زمین کھکھوریے
پر جلے اور بے چلے کارتوس خودوں کے ٹکڑے اور ایسی
چیزیں پڑی ملتی ہیں' درخت تقریباً سب کے سب تازہ
لگے ہوئے ہیں اس لئے کہ پورا جنگل گولہ باری کی وجہ سے
تہس نہس ہو گیا تھا۔ بعض خندقوں میں چھت سی پٹی ہوئی ہے
یہ وہ خندقیں ہیں جن میں کسی نہ کسی طرح کا دفتری کاروبار
کیا جاتا ہوگا۔ غرض عجیب و غریب عبرت کا مقام ہے
ایک چھوٹا سا نوادرخانہ بھی ہے جو یہاں کی باقیات سے
بھرا ہوا ہے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس میں جو اشیاء رکھی
ہیں ان کی صفائی کا انتظام نہیں اور میں نے دیکھا کہ خود دو
بندوقوں' تلواروں' توپوں' طیاروں کے ٹکڑوں سب
ہی پر گرد جمی ہوئی تھی۔

بیلو جنگل سے چل کر مشہور پہاڑی "204" ہوتے ہوئے
امریکی فوجی قبرستان پہنچے جہاں دو ہزار سے زیادہ امریکی
مقتول دفن ہیں۔ یہ قبرستان خود ممالک متحدہ امریکہ کے قبضے
اور انتظام میں ہے اور اس چھوٹے سے خوبصورت گرجا
پر جو اس کے سرے پر واقع ہے دھاری چاندوں
(Stars & Stripes) کا باوٹا اڑتا ہوا دور
نظر آتا ہے یہاں کی ہر چیز صاف ستھری اور سلیقے کی نظر آئی
اور ہر چیز میں تنظیم اور ضبط کا اثر پایا گیا۔ ہمارے ساتھ
ایک بیچاری بوڑھی خاتون تھیں جنہیں اپنے بیٹے کی قبر کا پتہ
لگانا تھا! وہ اترتے ہی قبرستان کے دفتر میں گئیں جہاں
پورے قبرستان کا نقشہ اور مدفونوں کی ہجائی فہرست
موجود تھی۔ شاید دو منٹ بھی نہ لگے ہوں گے کہ انہیں قبر کا
پتہ لگ گیا۔ یہاں عیسائی اور یہودی مدفونوں کی قبریں
جدا جدا نمونے کی ہیں' یعنی عیسائی قبروں پر ایک صلیب اور
یہودی قبروں پر ایک تارہ بنا ہے اور ہر صلیب یا تارے
پر قبر والے کا نام' جس ریاست سے آیا تھا۔ اس کا نام'
بٹن وغیرہ سب کندہ ہیں۔ قبریں ایسے عظیم الشان باغیچے
میں ہیں جہاں کی خوبصورتی اور نفاست کی وجہ سے چلنے
کو جی نہیں چاہتا گو فضا میں حسرت اور عبرت بھری ہوئی ہے
قبرستان سے چل کر ہم شہر شاتو تئیری (Chateau Thierry) کی طرف گئے جہاں امریکیوں نے فرانس
کے ساتھ باہم دوستی اور اتحاد کی ایک عظیم الشان یادگار
بنائی ہے۔ اس یادگار سے شاتو تئیری کا مشہور میدان جنگ
بالکل نقشے کی طرح پھیلا ہوا نظر آتا ہے اور وہ قلعہ بھی دکھائی
دیتا ہے جس کے نام پر شہر کا نام پڑا اور جس میں [illegible]

(Charles Martel) نے اپنے آقا
تھیوڈری (Thierry) کو قید کیا تھا۔ یہ وہی چارلس مارٹل
ہے۔ جس نے پیرس سے ۲۲ میل جنوب کی طرف
سنہ ۷۳۲ء میں پہلی مرتبہ اس میدان میں جسے عرب
"بلاط الشہداء" کہتے ہیں، مسلمانوں کے امنڈتے ہوئے
بادل کو روکا تھا۔

ہمارے قافلے میں ایک معمر امریکی تھا جو دورانِ
سفر میں اتفاقاً میرے پاس بیٹھا تھا۔ اس سے بہت باتیں
ہوئیں اور میں نے حیدرآباد کی اہمیت اور اس کی گوناگوں
ترقیوں کا ذکر کیا۔ جس کا اس پر بہت اثر ہوا۔ مگر سب سے زیادہ
جس چیز سے اسے دلچسپی تھی وہ ہندوستانی سیاسیات کا
مسئلہ تھا۔ جب میں حیدرآباد کی باتیں ختم کر چکا تو وہ بولا کہ
یہ تو سب کچھ ہے، یہ تو بتاؤ کہ گاندھی جی کیا کر رہے ہیں
اور ذات پات توڑنے کے مقابلے میں کیا کیا ہو رہا ہے۔
عجیب بات ہے کہ یورپ (اور بظاہر امریکہ میں ہندوستان کے
معنے گاندھی جی کے اور گاندھی جی کے معنے ہندوستان کے
ہیں۔ ان صاحبوں کو یہ بات مشکل سے سمجھ میں آتی
ہے کہ گاندھی جی کے ادارے علاوہ کوئی دوسرا ہندوستان
بھی ہے!!

[illegible] ت کے دن کا زیادہ تر وقت کتب خانے
میں صرف ہوا۔ آج سے شعبہ مطبوعات بند ہے اور صرف
مخطوطات کا حصہ کھلا ہے جس میں ہر وقت ساٹھ ستر مرد عورت
انتہائی انہماک سے مصروف مطالعہ رہتے ہیں۔ یہ ہمارے
ہندوستانی اساتذہ اور طلبہ دونوں کے لئے ایک سبق ہے
کہ جامعہ اور مدارس میں تعطیلات میں کتب خانے کا ایک بڑا
حصہ بند ہے اور یہ حقیقی طالب علم پیرس کے خدا جانے
کس کس گوشے سے آ کر علم کی تلاش میں مصروف کار
ہیں، کوئی عربی کتاب پڑھ رہا ہے کوئی پرانے قلمی GOTHIC
نوشتہ پر دیدہ ریزی کر رہا ہے، کوئی پرانے مصری نوشتے کے مطالعہ
میں مصروف ہے کوئی کسی نپولین کے فرمان سے نتائج اخذ
کر رہا ہے، اور باوجود ایک ہی کمرے میں اتنے آدمیوں کے
بیٹھے رہنے کے کیا مجال جو ذرا سی آواز ہو، اتنی خاموشی
ہے کہ سوئی گرے تو اس کی آواز آ جائے۔

شام کے وقت تولی لیری کے باغیچہ میں گیا جس کے
ایک طرف لوور کا عظیم الشان نوادر خانہ ہے جو شاہی
زمانے میں پیرس کا شاہی محل تھا۔ تولی لیری باغیچہ سے
زیادہ مشکل سے کوئی دوسرا باغیچہ ہوگا۔ ہر طرف یک رنگ
پھولوں کے بڑے بڑے جھنڈ، جگہ جگہ مجسمے، تالاب،
قہوہ خانے، نفیس ترین روشیں، کھیلتے ہوئے بچے، کرسیوں پر
ہر عمر کے فرانسیسی اور فرانسیسنیں، غرض عجیب و غریب و دلفریب
جگہ ہے۔ اس کے آگے وہ چوک ہے جسے اب "اتحاد
چوک" (P ACE DE LA CON ORDE)
کہتے ہیں اور جسے انقلاب فرانس کے زمانے میں "انقلاب
چوک" (PLACE DE LA REVOLUTION) کہتے تھے
اور یہی مقام ہے جس کے وسط میں گلوٹین لگی تھی اور سیکڑوں
مرد عورتوں کے سر کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارے جاتے تھے
اس کے آگے "باغ بہشت" CHAMPS ELYSEES
ہے جو تقریباً دو میل سڑک کے دو رویہ "محراب فتح"
(ARC DE TRIOMPHE) تک چلا گیا
ہے۔ یہ "محراب فتح" نپولین کی فتوحات کی یادگار ہے
اور یہی وہ مقام ہے جس کے نیچے "فرانس کے نامعلوم سپاہی"
کی قبر ہے۔

دوسرے روز دونوں وقت کتب خانے میں
کام کیا اور علامہ طرطوشی کی کتاب سراج الملوک کا مطالعہ
کرتا رہا۔ کتب خانہ بند ہونے کے بعد گرجا NOTRE DAM DES VICTO
دیکھا جو شاہ لوئی ۱۳ نے ۱۶۲۹ء میں اپنی ایک فتح کی یادگار
میں بنایا تھا۔ مثل اکثر دوسرے رومن کیتھولک گرجاؤں
کے اس کے اندرونی حصہ میں بعید تاریکی ہے۔ یہاں تک کہ
جو کتبے ہیں وہ بھی بغیر روشنی کے پڑھنے میں نہیں آتے۔
اس کے بعد ہم ایفل ٹاور دیکھنے گئے جو دنیا کی بلند ترین
عمارتوں میں سے ہے۔ ایفل ٹاور کی تعمیر ۱۸۸۷ء میں
شروع ہوئی اور افتتاح ۱۸۸۹ء میں ہوا۔ اس پر جو دولا گا۔
اس کا وزن ایک لاکھ پچھتر ہزار من ہے اور اس میں بارہ ہزار
گرڈر ۲۵ لاکھ ریویٹ کے ذریعہ سے جوڑے گئے ہیں۔
اس کی چار منزلیں ہیں۔ پہلی منزل ۵۷ میٹر پر، دوسری ۱۱۵
میٹر پر، تیسری ۲۷۴ میٹر پر اور چوتھی پورے ۳۰۰ میٹر پر۔
پہلی منزلوں تک لفٹ جاتا ہے اور چوتھی منزل پر دنیا میں
سب سے اونچا لاسلکی کا اسٹیشن ہے۔ اسی میدان میں ۱۹۳۷ء
میں بین الاقوامی نمائش ہوئی تھی جنھوں نے یہ نمائش دیکھی
ان کا تو کیا کہنا ہے صرف اس کی تصویریں ہی دیکھنے سے
گویا بھوک بھاگتی تھی۔ یہ تمام ایوان توڑے جا رہے تھے
اور اب اکثروں کی جگہ سوائے بانس کی کھپچیوں اور پلاسٹر
کے تودوں کے کچھ باقی نہیں رہا۔ دنیوی زینت اور خوبصورتی
کو جاتے ہوئے کتنی دیر لگتی ہے!

۱۸ اگست کو دونوں وقت کتب خانہ میں علامہ
اسدودی کی کتاب عقد الفرید کا مطالعہ کیا۔ کتب خانہ بند ہونے کے
بعد نپولین اعظم کے مقبرے کی زیارت کے لیے گیا۔ نپولین کا
مقبرہ دنیا کی ان عمارتوں میں سے ہے جہاں جا کر انسان کی
طبیعت پر خاص اثر شروع ہوتا ہے۔ جس قبے کے نیچے
شہنشاہ کا تابوت ہے اس کی تعمیر ۱۷۰۶ء میں یعنی لوئی ۱۴
کے زمانے میں ختم ہو چکی تھی اور کہتے ہیں کہ یہ قبہ پہلے دراصل
اس کے محاذ کے گرجا کا ایک حصہ تھا۔ یہ بھی نشاۃ جدیدہ
کا ایک شاہکار ہے۔ لیکن حقیقت میں اسے وہ اہمیت
جو اس وقت اسے ہے اس وقت تک حاصل نہیں ہوئی
جب تک کہ ڈھائی سو برس بعد یعنی ۱۸۴۰ء میں نپولین کی
ہڈیاں سینٹ ہلینا سے لا کر یہاں دفن کر دی گئیں۔ نپولین
کا انتقال تو ۱۸۲۱ء میں ہوا اور اس کے بعد اس کی لاش
جزیرہ سینٹ ہلینا سے جہاں وہ انگریزوں کی قید میں تھا
تھا، پیرس میں از سر نو دفن کیا گیا یا یوں کہیے کہ جہاں
وہاں رکھ دیا گیا اس لیے کہ اس کی لاش زمین میں دفن نہیں
بلکہ زمین سے تقریباً دو گز اونچے چبوترے پر ایک تابوت
میں رکھی ہے۔ ۱۸۴۰ء میں فرانس کا بادشاہ لوئی فلپ تھا
جسے یورپی میدان [illegible]
جاتا تھا کہ فرانسیسیوں [illegible]
محض قوم کو خوش کرنے کے لیے [illegible]
تزک و احتشام سے پیرس منگوایا اور حکم دیا کہ [illegible]
[illegible] (۱۵۰۰۰) [illegible] پیرس تک [illegible]
گاڑی میں لایا جائے۔ خود بادشاہ [illegible]
گاڑی کے ساتھ ساتھ چلا۔ کہتے ہیں کہ [illegible]
سے متاثر ہو کر [illegible] لوئی فلپ اور [illegible]
درمیان نمایاں تھا [illegible] پیدا ہوا [illegible]
چند ہی مہینے بعد افسوس [illegible] لوئی فلپ [illegible]
پر مجبور کیا اور اس نے [illegible] سال [illegible]
[illegible] فرانس سے [illegible]

جس کی وجہ سے نپولین کے مرقد سے دل پر ایک خاص اثر
ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اول تو وہ دفن نہیں بلکہ سرخ
چمکدار پتھر کے ایک خوشنما تابوت میں ہے، اور برخلاف
قبر کی کیفیت کے آپ مین وہ جگہ دیکھ سکتے ہیں جہاں گویا
نپولین کی لاش ہوگی۔ پھر گرجا میں جاتے ہی ایک سناٹا سا
ہوتا ہے، کوئی شخص آواز سے بات نہیں کرتا، ایک کنواں سا
ہے اس کے نیچے ایک خوبصورت مدور دالان ہے اور
دالان کے ہر ستون پر نپولین کی بڑی بڑی فتوحات کے
مثالی مجسمے ہیں جو ٹکٹکی لگائے ہوئے شہنشاہ کے تابوت کو
دیکھ رہے ہیں۔ اس برآمدے میں جانے کے لئے چند
سیڑھیاں اترنی پڑتی ہیں اور تقریباً صدر داخلہ دینا پڑتا ہے
دروازے کی چوکھٹ پر وہ وصیت کندہ ہے جو شہنشاہ نے
اپنے مرنے پر کی تھی، وہ یہ ہے:۔

"میری خواہش ہے کہ میری خاک دریائے سین کے
کنارے دفن ہو تا کہ میرا تعلق ابدالآباد تک اس
پیاری فرانسیسی قوم سے قائم رہے جو مجھے جان سے
زیادہ عزیز ہے"

شہنشاہ کے گنبد ہی کے نیچے اس کے بھائیوں جوزف
شاہ اسپین اور ژیرم شاہ ویسٹ فالیہ کی قبریں ہیں اور
ایک کونے میں پچھلی جنگ عظیم کا فرانسیسی سپہ سالار مارشل فوش
مدفون ہے۔

اسی روز بین الاقوامی تاریخی کانگریس کے مشرقی
ماموریہ (EASTERN COMMISSION) کی معتمد
مس ہیلن لاقش (?) کا خط آیا کہ میری تحریک پر ماموریہ کے
پیش نامے میں تاریخ ہند اور تاریخ اسلام کے مسئلہ کو خاص طور پر
رکھا گیا ہے۔ فالحمد للہ۔

دوسرے روز عقد الفرید کا مطالعہ ختم کیا۔ دوپہر کو
جمعہ کی نماز مسجد میں پڑھی۔ کم و بیش دو سو مسلمان شریک تھے
جن میں زیادہ تر تعداد الجزائر، تونس اور مراکو والوں کی تھی۔
خطبہ کلیۃً عربی میں تھا۔ اکثر لوگوں نے کوٹ اتار کر مراکشی جبے
پہن لئے تھے جن میں پیچھے کی طرف سر ڈھکنے کے لئے
ایک ٹوپی سی جڑی ہوتی ہے۔ خاص بات یہ ہے
کہ نماز کے بعد ایک کونے میں "ذکر" ہوا اور لا الہ الا اللہ
کا شور بچ گیا۔ میں نے واپسی میں عربی دوکان سے چند
اشیاء خریدیں اور عربی قہوہ خانے میں بیٹھ کر عربی قہوہ پیا۔
یہاں سے سیدھا (INVALIDES) کے فوجی
نوادرخانے گیا جس میں تاریخ فرانس کے نہایت دلچسپ اور
اہم فوجی آثار محفوظ ہیں۔ اس کے تفصیل سے دیکھنے کے لئے
کئی روز درکار ہوں گے۔ میرے پاس وقت کم تھا اس لئے
صرف چند ہی اشیاء دیکھ سکا جن میں اہم حسب ذیل ہیں۔
فرانسس اول، لوئی ۱۴ اور دوسرے شاہان فرانس کے
زرہ بکتر اور خود، نپولین اعظم کے کپڑے، جنگ عظیم کے
آثار جن سے کئی کمرے بھرے ہوئے ہیں، انقلاب فرانس کے
علم، جنگ آزادی امریکہ کی یادگاریں، ان ۱۲۰۰ ٹیکسیوں
میں سے ایک جن میں جنرل گالی ایانی (?) پیرس کی محافظ فوج کو
جرمنوں کے خلاف لے گیا تھا، یہ چیزیں دیکھنے میں آئیں۔
جس عمارت میں یہ نوادرخانہ ہے اس کی تعمیر لوئی ۱۴ (۱۶۴۳ء
تا ۱۷۱۵ء) کے عہد میں ہوئی تھی اور اس میں جملہ ۳۶ ہزار
اشیاء اور ۲۲ ہزار اشیاء کی تصاویر اور نقول ہیں۔
دوسرا دن یعنی ۲۰ اگست ۳۸ء پیرس کے قیام کا
آخری دن تھا۔ صبح کے وقت کتب خانے میں امام ابن تیمیہ
کی کتاب السیاسۃ الشرعیہ کے ایک جزو کا مطالعہ کیا۔

یہ نسخہ ساتویں صدی ہی کا لکھا ہوا ہے۔ شام کے وقت مجھے اور میری اہلیہ کو عبداللطیف خانصاحب جج ناگپور اور ان کی بیگم نے اپنے ہوٹل واقعہ Rue de (Moscou) میں چاء پر مدعو کیا تھا۔ اسی ہوٹل میں ایک جنوبی ہندی عیسائی جن کا نام (Ross) تھا مقیم تھے ان سے عبداللطیف خانصاحب نے ملاقات کرائی۔ یہ غالباً پرانی اشیاء کا بیوپار کرتے ہیں اور اپنی ملو کہ اکثر اشیاء انہوں نے دکھائیں۔ قران مجید دکھایا اور بیان کیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی سرحد کی ایک مہم میں یہ کسی انگریز سپاہی کو زمین پر پڑا ملا تھا اور ان صاحب نے اسے ان سے ۱۲ سو روپیہ میں خریدا۔ بظاہر یہ پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی کا لکھا ہوا معلوم ہوا حالانکہ خود روس نے اسے رسول اکرم صلعم کا ہم عصر بتایا جو یقیناً بالکل غلط ہے

اس کے علاوہ ان کے پاس رامائن اور مہابھارت کے پرانے نسخے اور ایک قیمتی نوشتہ بھی تھا۔ یہ تمام اشیاء اتنی نایاب ہرگز نہیں جتنی روس صاحب بتاتے تھے۔ عبداللطیف خانصاحب مجھ سے کہتے تھے کہ خدا جانے آپ نے کیا افسوں پھونکا ہے کہ آپ کو یہ چیزیں دکھا دیں ورنہ ہم نے کئی مرتبہ یہ دکھانے کے لئے کہا لیکن یہ ہمیشہ لیت و لعل ہی کرتے رہے!

رات کے سوا دس بجے کی گاڑی سے ہم نے پیرس کو خیرباد کہا اور سوئیٹسان روانہ ہو گئے ریل نہایت تیز رو تھی اور رات بھر میں مشکل سے چار یا پانچ اسٹیشنوں پر رکی۔ صبح ہونے چھ بجے سرحدی اسٹیشن والورب آیا جہاں ہمارے پاسپورٹ وغیرہ دیکھے گئے اور ہم سوئیٹسان میں داخل ہو گئے۔

ہارون خاں شروانی

رُباعیات

آشفتہ نگاہ

آشفتہ نگاہ سیر فرما تو سہی
معشوق نظر کے ناز دکھلا تو سہی
پامالِ خرام ہیں نظارے کتنے
دو چار مہ و مہر کو ٹھکرا تو سہی!

نازک کلائی

چھلکاتے ہوئے شراب ساغر آئی
محصورِ یہ گرداب جواہر آئی
اک ریشمی سیلاب کے منجدھاروں سے
نازک سی کلائی دیکھ باہر آئی

زندگی کی آواز

ہر پھول میں سوز ہر کلی میں اک ساز
گلزارِ سماعت ہے بہت نغمہ نواز
جو سنتے ہی رہتی ہیں نہ سننے کی صدا
پوچھے کوئی ان سے زندگی کی آواز باقی

تنقید و تبصرہ

تنقیحات:- ابوالاعلیٰ مودودی۔ دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" ملتان روڈ، لاہور۔ قیمت ۲ر صفحات ۲۴۰ غیر مجلد کیجئے

مودودی صاحب نے اپنی زندگی تبلیغ اسلام کے لئے وقف کردی ہے۔ سات سال سے ایک رسالہ "ترجمان القرآن" شایع کر رہے ہیں جو مذہبی رسالوں میں بہت اچھا تصور کیا جاتا ہے۔ اسی رسالے میں انھوں نے "اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر مختصر تبصرے کئے تھے۔" اب ان کو کتابی شکل میں شایع کیا گیا ہے اور یہ کتاب "سلسلۂ مطبوعات ادارۂ دارالاسلام" کی چوتھی اشاعت ہے۔ پنجاب کی اکثر اردو کتابوں کی طرح اس کتاب کی کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ کاغذ بھی اچھا ہے۔ صفحوں کی تعداد ۲۴۰ ہے باریک خط میں لکھی ہوئی تقریباً ڈھائی سو صفحوں کی کتاب کی قیمت صرف ۲ر بہت کم ہے۔

اس کتاب میں کل ۱۵ مضمون ہیں جن کے موضوع "نظام تعلیم کا بنیادی نقص" "تعلیمی پالیسی" "ایمان اور اطاعت" "لارڈ لوتھن کا خطبہ" وغیرہ ہیں۔ کئی مضمون ایسے ہیں جن کے عنوانوں میں پورے مضمون کی جھلک موجود ہے اور صرف عنوانوں کو پڑھنے سے معلوم ہو جا سکتا ہے کہ آیندہ کیا آنے والا ہے۔ مثلاً ایک عنوان ہے۔ "**عقلیت کا فریب**" ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس مضمون میں فلسفۂ عقلیت پر کیا کیا عنایتیں ہوئی ہوں گی۔ "مغربی تہذیب کی خودکشی" اور "دورِ جدید کی بیمار قومیں" دوسرے مضمونوں کے عنوان ہیں۔ ان ہی سے لکھنے والے کے قلبی تاثرات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ عنوان ہی ایک طرح کے فیصلے ہیں اور ان کے بعد تحقیق اور تبصرے کی گنجائش ہی کم ہو جاتی ہے۔

مغربیت کی مخالفت کرنا کوئی عیب نہیں مگر مغرب زدگی کی مخالفت میں خود مشرق زدہ ہو جانا بھی تو مناسب نہیں

ح ۔ ج

قتیل اور غالب:- مصنفہ سید اسد علی انوری فریدآبادی۔ کراؤن سائز ۱۲۰ صفحے، لکھائی چھپائی متوسط مطبوعہ کتبہ جامعہ قیمت درج نہیں ہے کتبہ جامعہ دہلی سے مل سکتی ہے۔

یہ رسالہ مرزا غالب اور قتیل کے معرکے کی تفصیلات پر مشتمل ہے اور نہایت عمدگی سے لکھا گیا ہے۔ مرزا غالب کی زندگی کے ایک آدھ واقعہ کی طرح یہ ہنگامہ بھی ایک ناخوش گوار واقعہ ہے۔ اس کا سبب کچھ تو غالب کے مخالفین کا جوش و خروش اور کچھ غالب کی نازک مزاجی تھی، جس چیز پر غالب کو سب سے زیادہ ناز تھا ان کی فارسی دانی ہے، اس کی نفسیاتی بنیاد یہ بھی تھی کہ وہ دہلی کے ذوقِ سخن کے مقابلے میں کسی دوسرے مقام کے صاحبان علم کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ کلکتہ میں جب ان کے کلام پر قتیل کا نام لے کر حملے کئے گئے تو وہ بے حد جزبز ہوئے اور ایک پورا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ یہ تمام واقعات رسالے میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ غالب کی زندگی اور ان کے کلام پر پچھلے دنوں میں جو مختلف کتابیں شایع ہوئی ہیں ان میں یہ ایک اچھا اضافہ ہے۔ آیندہ عظیم تر اور مکمل تر غالب کے لئے یہ اچھا رسالہ ثابت ہوگا۔

نیا ادب:- مرتبہ سبط حسن، علی سردار جعفری، اسرار الحق مجاز سائز درمیانی حجم ۲۰۴ صفحات قیمت عہ پتہ حلقۂ ادب لکھنؤ۔

یہ مجموعہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سلسلہ کی پہلی اشاعت ہے۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک ملک میں مقبولیت حاصل کرتی جا رہی ہے۔ اس انجمن کی شاخیں شمالی ہند کے اکثر شہروں میں قائم ہو چکی ہیں۔ یہ تحریک وقت کا اقتضا ہے۔ جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا جا رہا ہے علوم و فنون میں بھی نئے نئے خیالات اور رجحانات کا

اضافہ ہو رہا ہے۔ ادب اور شاعری میں تو اس کا اثر سب سے زیادہ نمایاں ہے کیونکہ یہی وہ اصناف ہیں جو کسی قوم اور ملک کے احساسات اور جذبات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ملک میں بیسیوں ادیب اور شاعر ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو ترقی پسند خیالات کے حامی ہیں جو زمانہ کے سیلاب کے ساتھ بہے جا رہے ہیں اور جو اپنے گرد و پیش کے حالات میں انقلاب کو رو نما ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ زندگی کے فرسودہ اصول، توہمات اور قدیم روایات جن سے جدید نوع کو گھن لگ گیا ہے نا پید ہو جائیں اور دنیا میں صلح و آشتی محبت اور امن کا دور دورہ ہو۔ یہ بڑی خوش آئند تحریک ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی تاسیس نے حیدرآباد کی نوجوانوں کے دماغوں میں کچھ ایسے ہی ذہنی انقلاب کے بیج بیس سال قبل بوئے تھے۔ اور آج اس کے نونہال علم و ادب کے میدان میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ ممکن ہے ترقی پسند انجمن کے قیام کے لئے دکن کی سر زمین کسی خاص وجہ سے راس نہ آئی ہو۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہاں کے نوجوان ترقی پسندی میں ہندوستان کے کسی صوبہ سے پیچھے ہیں۔

"نیا ادب" کا یہ دلکش مجموعہ تین عنوانات پر مشتمل ہے۔ تنقید، شاعری اور افسانے۔ مضامین کا انتخاب بہترین ہے۔ ملک کے اچھے لکھنے والے نوجوان ادیب اور شاعر اس میں شریک ہیں۔ اس قسم کے مجموعوں کی ملک کو ضرورت ہے تاکہ اس تحریک کے طرز و نفوذ سے اہل ملک واقف ہوتے رہیں۔

"ش"

سازِ ہستی — مصنفہ عبداللہ محمد نور چکوری جمیری تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۹۸ صفحات قیمت درج نہیں ہے۔ پتہ دار الادب پنجاب لاہور۔ یہ کتاب صوبہ بہار کے ایک نوجوان مصنف کی پہلی تصنیف ہے جس پر حکومت بہار نے ساڑھے تین سو روپیہ انعام بھی دیا ہے۔ مصنف پاؤں سے معذور ہیں انھوں نے کہیں باقاعدہ تعلیم بھی حاصل نہیں کی بلکہ ان کے قول کے مطابق اردو کی دوسری کے بعد کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب بھی طے نہیں کیا بلکہ محض اپنی کوششوں اور محنت سے حصول علم کی طرف متوجہ ہوئے اور ادب کا اچھا ذوق پیدا کیا اس لحاظ سے ان کی یہ کوشش قابل تعریف ہے۔

زیر نظر کتاب میں مصنف نے ناول کے پیرایہ میں اپنے احوال کے تجربات کو قلمبند کیا ہے۔ یہ کتاب نہ پوری آپ بیتی ہے اور نہ ناول۔ اس میں جہاں عشق و محبت کے قصے ہیں، وہاں سیاسیات حاضرہ پر تبصرہ بھی ہے۔ ریل کے ایک درجہ سوم کے سفر، مسافرین کی تکالیف اور حکام ریلوے کی زیادتیوں کو ۱۵۰ صفحات میں بیان کیا گیا ہے۔ قصہ میں بھی کوئی خاص جاذبیت نہیں ہے۔ بعض جا غیر مانوس الفاظ کے استعمال سے عبارت میں بے ربطی پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً قوت تفہیم، سنگلاخ، متہوع ہوا، قبیل، بااستکراہ، تشائم، خیالات کشاکشات، ملوث و متہور، نا مکمل، اصطلاح، مضبار، دیوقیہ

تاہم چونکہ یہ مصنف کی پہلی کوشش ہے اور اس وقت لکھی گئی جب کہ ان کی عمر اٹھارہ انیس سال کی تھی قابل قدر ہے۔ جو ان کی آئندہ کوششوں کو کامیاب بنانے میں دلیل راہ ثابت ہو گی۔

"ت - ش"

مجلہ طیلسانین — ابتدا ہی سے مجلہ نے اپنے بلند پایہ مضامین اور مقالوں کی وجہ سے ملک میں کافی اہمیت حاصل کر لی تھی لیکن مالی دقتوں کی وجہ سے یہ اپنے معیار کو برقرار نہ رکھ سکا۔ بخشکر کا مقام ہے کہ جدید انتظام سے شائع

اس مجلہ کی نہ صرف مالی حالت سنبھل گئی ہے بلکہ یہ اب پھر طیلسانین عثمانیہ کے علمی وقار کے شایان شان طریقہ پر شایع ہونے لگا ہے۔ اس شمارہ کے جملہ مضامین پر از معلومات اور دلچسپ ہیں۔

"ش"

متاع اقبال۔ یہ کتاب چھوٹی نصابی کتابوں کی تقطیع کے ٹھیک سو صفحات پر چھپی ہے۔ اس کے مرتب مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب ام آ لکچرار سٹی کالج ہیں۔ اقبال کے متعلق گذشتہ چند برسوں میں کئی کتابیں اور مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ اور ان کے انتقال کے بعد سے تو یہ موضوع اہل اردو کے لئے خاص دلچسپی کا باعث بن گیا ہے۔ اکثر اردو رسالوں نے اقبال کی یاد میں اپنے مخصوص نمبر شایع کئے۔ اور شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ سائنس اور دوسرے علوم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب نے بھی اقبال کے کلام کا مطالعہ شروع کیا اور اس کی خوبیوں کے اعتراف میں طویل مقالے تحریر کئے۔

"متاع اقبال" میں تین اہم عنوانوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ پہلے عنوان کے تحت اقبال کی شاعری کے پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔ اور ہندستان کی تاریخ اور تمدنی حالات کا سرسری خاکہ کھینچ کر ہر زمانہ کے اردو ادب کے متعلق نہایت مختصر الفاظ میں رائے ظاہر کی ہے اور اقبال کی شاعری کے آغاز کے وقت ہندستان کا جو رنگ تھا اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دوسرا عنوان "اقبال کا ذہنی ارتقا" ہے۔ اسی عنوان کے تحت مصنف نے زیادہ لکھا ہے۔ خاص کر غالب اور اقبال کا موازنہ شرح و بسط سے کیا ہے۔ اور پھر اقبال کی نظموں کے مجموعوں پر تاریخی ترتیب کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

تیسرا اور آخری عنوان اقبال کا شاعرانہ فلسفہ ہے جس میں اصل موضوع سے زیادہ مصنف نے اقبال کے متعلق اپنے نتائج فکر کو پیش کیا ہے۔ یہ اصل میں ابتدائی صفحات میں جو کچھ لکھا گیا اس کا نچوڑ یا نتیجہ ہے۔

اس کتاب میں اگرچہ بعض جگہ غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں بھی نظر سے گزرتی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی یہ ایک کامیاب کوشش ہے اور اقبال سے متعلق تحریروں میں ایک چھوٹا سا اضافہ۔

"ق"

کلیات بحری۔ آج کل اردو زبان میں نئی کتابوں کے ساتھ ساتھ پرانی کتابیں بھی شایع ہو رہی ہیں اور یہ بات عجیب معلوم ہوگی لیکن واقعہ ہے کہ پرانی کتابوں کو صحت کے ساتھ چھاپنا نئی کتابوں کے چھاپنے سے زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ پرانی کتابوں کی زبان بھی پرانی ہوتی ہے۔ اور ان کی کتابت و طباعت کے وقت کاتب اور مطبع کے لوگ پرانے لفظوں کو غلط سمجھ کر ان کی جگہ نئے لفظ رکھ دیتے ہیں اور اس طرح کتابوں کے مسخ ہو جانے کا اندیشہ ہمیشہ لگا رہتا ہے۔

ترقی یافتہ زبانوں میں بہت کم ایسی ہوں گی جن کی قدیم کتابیں ابھی تک چھپ کر منظر عام پر نہ آچکی ہوں۔ اردو کو اسی لئے پوری طرح ایک ترقی یافتہ زبان نہیں کہا جاتا کہ اس میں ابھی بہت سے کام باقی ہیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کیونکہ اس کے بعض بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کے کارنامے ابھی مخطوطوں ہی کی شکل میں ہیں۔ جب تک ہر دور اور ہر مقام کی جملہ اہم اردو کتابیں شایع نہ ہو جائیں گی۔ اس وقت تک اردو ادب کی ایک مکمل تاریخ مرتب نہیں ہو سکتی۔ اور اسی وجہ سے کوئی مکمل تاریخ اب تک لکھی بھی نہیں گئی۔

قاضی محمود بحری اردو کے ایک بہت بڑے شاعر اور صوفی ہیں ان کی ایک کتاب من لگن بہت عرصہ پہلے چھپ چکی ہے اور اب ان کا کلیات بڑی تقطیع کے تین سو سے زیادہ صفحات پر نولکشور پریس لکھنؤ سے شایع ہوا ہے۔ اس کلیات کو ڈاکٹر محمد حفیظ سید ام اے پی ایچ ڈی لٹ پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی نے ایک مفید مقدمہ اور تشریح کے ساتھ شایع کیا ہے۔

مقدمہ میں پانچ باب ہیں جن میں بحری کے عہد کی تاریخ، ان کے ہم عصر شعرا، سوانح حیات، تصانیف اور کلام بحری کی لسانی خصوصیت پر اچھی بحث کی ہے۔ بحری بیجاپور اور گولکنڈہ کے آخری بڑے شاعروں میں سے ہیں۔ انھوں نے ان سلطنتوں کے زوال کے بعد بھی عرصہ تک اردو شعر و شاعری کی شمع کو روشن رکھا ان کی زبان ولی اورنگ آبادی کی طرح ایک عبوری دور کی زبان سمجھی جاسکتی ہے نہ قدیم شعرا مثلاً وجہی، غواصی و نصرتی کی طرح ہندی آمیز ہے اور نہ دور متوسط کے شعرا آبرو و تاجی اور حاتم و مظہر کی طرح فارسی آمیز۔ کلیات بحری کے مطالعہ سے تصوف و عرفان کی چاشنی بھی پیدا ہوسکتی ہے کیونکہ بحری خود ایک بہت بڑے صوفی اور اہل اللہ تھے۔ ڈاکٹر سید کی یہ کوشش قابل قدر ہے اور یقین ہے کلیات ولی کی طرح کلیات بحری کو بھی اہل ذوق نعمت غیر مترقبہ سمجھیں گے۔

"ق"

ہلال و صلیب:- یہ اردو اکیڈیمی لاہور کی طرف سے شایع کی گئی ہے۔ اور اس کے مصنف اردو کے مشہور افسانہ نگار ایم اسلم ہیں۔

کتاب چھوٹی کراؤن سائز کے ۱۴۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے مبسوط سوانح حیات درج ہیں۔ کتاب کے آغاز میں مشہور شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری کی ایک نظم بھی دیباچہ کے طور پر شامل کی گئی ہے۔ نظم اور کتاب دونوں ہیرو پرستی کے جذبات سے مملو ہیں۔ خاص کر حیات صلاح الدین کے لکھنے میں ایم اسلم صاحب نے اپنے دلچسپ اسلوب بیان کا پورا زور صرف کیا ہے۔ اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ وضعی واقعات نگاری کی جگہ اب تاریخی میدان میں اتر آئے ہیں۔ یہ کتاب تاریخ اور افسانہ دونوں کا لطف دیتی ہے اور یقین ہے کہ مقبولیت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

"ق"

گیس کا دفاع:- یہ چھوٹی سی مفید کتاب راجہ صاحب محمود آباد کے قائم کئے ہوئے سلسلۂ مطبوعات کی ایک کڑی ہے۔ اور بڑے ضروری اور اہم موضوع پر لکھائی گئی ہے۔ اس کے مصنف سید ہادی حسین صاحب رضوی (بی۔ کام) ہیں جنھوں نے گیس کی مختصر تاریخ گیس کی قسمیں اور ان سے حفاظت کے طریقوں پر سلیقے سے روشنی ڈالی ہے۔

عہد حاضر میں خاص کر آج کل ایسی کتابوں کی بے حد ضرورت ہے اور توقع ہے کہ ہر اردو داں اس کتاب کا مطالعہ کرکے اپنی معلومات میں اضافہ کرے گا اور وقت پر اپنی حفاظت کر سکے گا۔

"ق"

عصمت کی کہانی اور وداع راشد:- دو چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں جو سلسلۂ مطبوعات عصمت کی ۵۱ ویں اور ۵۵ ویں کڑی ہیں مولانا راشد الخیری نے مطبوعات کا ایک ایسا اچھا سلسلہ قائم کیا ہے کہ اس کی وجہ سے اردو کے نسوانی لٹریچر میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔

یہ دونوں کتابیں راشد الخیری مرحوم ہی کی خدمات سے متعلق لکھی گئی ہیں۔ اور ان کے مصنف مرحوم کے فرزند رازق الخیری ہیں۔ ان کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ راشد الخیری نے اردو ادب

کتنا احسان کیا ہے اور اپنی قوم کے طبقۂ نسواں کی کیسی پرخلوص
خدمات انجام دی ہیں۔ "م ق"

کیلے کا چھلکا اور دوسرے مضامین

از سند باد جہازی۔ ۷۶ صفحات

قیمت ۱۰ ناشر اردو اکیڈیمی پنجاب لوہاری دروازہ۔ لاہور

یہ کتاب اٹھارہ مزاحیہ افسانوں اور مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں زیادہ تر انگریزی زبان کے افسانوں کے ملخص اور ترجمے شامل ہیں بعض افسانوں کا ترجمہ اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ "ترجمہ" نہیں معلوم ہوتا بالکل اپنا لیا گیا ہے جو مضامین اور افسانوں میں علم و ادب کی جھلک کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کے پہلو بھی روشن ہیں۔ جناب سند باد جہازی مشہور مزاح نگار ہیں۔ آپ کے مضامین اور افسانوں میں صرف ہنسنے ہنسانے کی باتیں ہی نہیں ہوتی ہیں بلکہ [illegible] سدھار کی کوششیں بھی لطیف پیرایہ میں نمایاں ہیں۔ زیر نظر مجموعہ [illegible] "س"

پطرس کے مضامین (تیسرا ایڈیشن)

از احمد شاہ صاحب بخاری ۹۶ صفحات

قیمت ۱۲ ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ پطرس کے مضامین کی مقبولیت کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ اس قدر قلیل مدت میں یہ مجموعہ مضامین تیسری دفعہ شائع ہو رہا ہے۔ اس مجموعہ میں گیارہ مضامین ہیں پچھلے دو ایڈیشنوں میں اس کا آخری مضمون "لاہور کا جغرافیہ" شریک نہیں ہے۔ جناب پطرس کہنہ مشق مزاح نگار ہیں، آپ اس سلسلہ میں بڑی تہ کی بات کہہ جاتے ہیں، آپ کا طرز نگارش اور اسلوب بیان نہایت پاکیزہ ہوتا ہے آپ کے مضامین میں شگفتگی، چلبلاپن، زندہ دلی، شوخی، روانی، نازک خیالی سب ہی کچھ موجود ہے اور انداز بیان اس قدر دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے کہ کوئی مضمون شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر چین نہیں پڑتا۔ "م س"

ایک کہانی

چھ ادیبوں کی زبانی ۹۰ صفحات قیمت ۸

لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن والوں نے چھ مشہور افسانہ نگاروں سے یہ کہانی لکھوائی ہے اس کی پہلی قسط جناب نیاز کے رشحات قلم کی منت کش ہے نیاز کہانی کے ہیرو مرزا سعید کو ان کی بچپن کی منکوحہ ریحانہ کے کمرہ میں چھوڑ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ سید علی عباس حسینی کی کاوش کو جس کا آغاز نیاز نے کیا تھا مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں اور احمق سعید کو ریحانہ کے کمرے سے بھگا دیتے ہیں۔ ل۔ احمد سعید کو پیرزادہ غلام صاحب کے قتل کے جرم سے ریحانہ کے تالیف قلب کی سعی لاحاصل میں سرگرداں رکھتے ہیں جناب بلدرم ریحانہ کی تسخیر کے عوض سعید پر الٹی سینگی چلا کر [illegible] ہیں۔ ریحانہ کی ذہنی الجھن کو [illegible] ریحانہ کی سہیلی سلمیٰ کے بھائی محمود کو ریحانہ کا منظور نظر بنا دیا۔ بلدرم کی الٹی سینگی کو ناچ کے [illegible] ہوا کہ وہ کباڑی کی دکان پر جا کر [illegible] کا لباس خریدتے ہیں اور چوں چوں کا مربہ بن کر سینما تشریف لے جاتے ہیں۔ خان بہادر [illegible] سعید کو اس حالت کذائی میں چار آنے والے [illegible] میں بٹھا کر انہیں دہاڑنے اور چنگھاڑنے لگا دیتے ہیں اور اسی حالت میں ریحانہ سے جو اپنی سہیلی سلمیٰ کے ساتھ سینما دیکھنے آئی تھی مڈبھیڑ کرا دیتے ہیں، جب ریحانہ سلمیٰ سے کہتی ہے کیا سلمیٰ مجھے اپنی ساری زندگی اس حیوان کے ساتھ گزارنی ہوگی؟ سلمیٰ کہو الدستن لیتے ہیں اور ریحانہ کو طلاق دلا کر چھوڑتے ہیں۔ ریحانہ محمود کی ہو جاتی ہے اور سعید فن تسخیر میں مشغول رہتے ہیں۔

ہر افسانہ نگار نے اپنے زور قلم سے اس کہانی کو دلچسپ
مزاحیہ اور نتیجہ خیز بنانے کی خاطر خواہ کوشش کی ہے اور کتب خانہ
علم و ادب دہلی نے بڑے سلیقہ اور نفاست سے اس کو چھپوایا ہے۔
"س"

سنہرا حلقہ از جناب ناظر کاکوری، چھوٹی تقطیع، ۸۰ صفحات قیمت درج نہیں، ناشر انوار بک ڈپو لکھنؤ۔

یہ چھوٹی سی کتاب مجموعہ ہے ایک بیکس خاتون کی المناک
داستان حیات کے اوراق پریشاں کا۔ اس خاتون کے دل و دماغ
پر عالم خواب کے کچھ ایسے تاثرات مرتسم ہوگئے تھے کہ جن کی وجہ سے
اس کی زندگی ناخوش گوار بن گئی تھی۔ اور اس کا مستقبل تاریک
ہوگیا تھا۔ ان ہی خیالات کے تحت اس نے اپنی ایک سہیلی کو کئی
خط لکھے تھے، ان خطوں کے مجموعہ کا نام "سنہرا حلقہ" اس لئے
قرار پایا کہ اس خاتون کو خواب میں سنہرا حلقہ کے اندر ایک عمدہ سا
چہرہ نظر آیا کرتا تھا۔ ان خطوط میں بقول جناب ناظر کے "صرف
الفاظ ہی کی جادوگری نہیں ہے بلکہ اس ساغر میں تلخ شراب بھی
کہیں کہیں چھلکتی نظر آئے گی۔" اس تلخ شراب کے ایک دو
گھونٹ ملاحظہ ہوں۔

"افسوس یہ ہے کہ ہمارے سماج کی حالت اس قدر
گندی اور گھنونی ہوگئی ہے کہ اس میں عورت کا
وجود ہی خطرناک ہوگیا ہے لڑکی کا پیدا ہونا منحوس
سمجھا جاتا ہے اور جہیز قرار داد اور سلامی کی
رسموں نے تو غریب لڑکیوں کو سسرال کی دہلیز
دیکھنے سے محروم کردیا ہے"۔

ان خطوط میں جو بیراہ سماج کی آبادی کے نام معنون کئے
گئے ہیں، دلچسپی اور دلکشی کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور سماجی
اصلاحات کے کافی سبق ہیں، ذہنی اور سماجی جکڑبندیوں سے
ہماری آزادی کے طریقے قابل عمل اور گمراہ سماج کی رہبری کی یہ
کوششیں قابل داد ہیں۔

شہزادی نیلوفر از محترمہ سرور جہاں صاحبہ رضا ۱۲۰ صفحات قیمت ۸؍ ناشر عصمت بکڈپو دہلی

زیر نظر کتاب میں گیارہ چھوٹی چھوٹی دلچسپ سبق آموز اور نصیحت خیز
کہانیاں بچوں اور بچیوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ ان کہانیوں کی
زبان نہایت سلیس اور آسان ہے۔ یہ کہانیاں اس قابل ہیں کہ
چھوٹے بچوں اور بچیوں کو پڑھائی جائیں۔ بعض کہانیوں میں
تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ "س"

شیطان کا انتقام یہ ایک دلچسپ و جدید کتاب ہے جس کو جامعہ عثمانیہ کے ایک فارغ التحصیل
مولوی سید جلال الدین صاحب اشک بی اے ال ال بی نے بڑی
خوبی سے تصنیف کیا ہے۔ اس میں بقول مصنف دور حاضرہ کے
علمی، اخلاقی، اور سیاسی رجحانات پر ایک تیز اور تند اور تلخ
تبصرہ کیا گیا ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ عہد حاضرہ کے حالات
اس سے زیادہ تیز و تند اور تلخ تر تبصرے کے مقتضی ہیں۔
یہ کتاب جیسا کہ مصنف نے ان الفاظ میں لکھا ہے "ایک مسرت سے
محروم دل کی آہ سرد اور دلدوز نقش ہے۔" یہ سچ ہے کہ ایک محروم مسرت
انسان اگر اس دنیا پر نظر ڈالے تو اسے یہ تمام کائنات واقعی شیطان کے
انتقام کی کارگاہ نظر آئے گی۔ اس کے مطالعہ سے وہ لوگ ضرور متاثر ہوں گے
جن کی زندگیاں اسی انتقام کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی ہیں بشرطیکہ
شیطان ان کو اس کے مطالعہ کا موقع دے جس کی بظاہر امید
نہیں ہے، اس لئے یہ کتاب اگر محروم مسرت دلوں ہی کو اطمینان و
مسرت کی طرف راغب کر دے تو مصنف کی بڑی کامیابی ہوگی۔
اور اسی کامیابی کی خاطر یہ لکھی بھی گئی ہے۔ "ق"

جدید مطبوعات

۱۔ سیرتِ اقبال (سوانح) از محمد طاہر فاروقی ۲۹۴ صفحات قیمت ۳ ؍
۲۔ کمال اتاترک (محمد توفیق کی ترکی تصنیف کا ترجمہ) ۲۰۰ صفحات قیمت عا ؍
۳۔ شہید کسوینی (آئرش محب وطن کی سوانح عمری) ۱۲۲ صفحات آزاد پریس پٹنہ
۴۔ پریت افسانے حصہ دوم (مختصر افسانے) از گوربخش سنگھ ۲۵۵ صفحات۔
۵۔ ہاشمی و شہزادہ حصہ اول و دوم (عہد عباسی کا تاریخی ناول) از محمد صادق حسین ۴۰۰ صفحات۔
۶۔ مرقع لسان (تاریخ) از سید محمد اولاد علی گیلانی ۶۱۲ صفحات۔
۷۔ مقالاتِ شبلی جلد ہشتم (مولانا شبلی نعمانی کے مذہبی، ادبی، سیاسی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ) ۲۰۴ صفحات
۸۔ ریاضِ حیدر (مرثیوں کا مجموعہ) از حیدر عباس رضوی ۲۰۰ صفحات۔
۹۔ نغمۂ نانک (مجموعۂ کلام) از نانک چند نانک لکھنوی ۱۵۸ صفحات۔
۱۰۔ فہمِ انسانی (فلسفی ہیوم کی کتاب کا مجموعہ) ۱۹۴ صفحات قیمت عہ ؍
۱۱۔ مقالاتِ ہاشمی (ادبی و تنقیدی مضامین) از نصیر الدین ہاشمی ۲۶۴ صفحات عا ؍
۱۲۔ ہندوستان کی صنعت و تجارت از منت اللہ ۲۱۲ صفحات۔
۱۳۔ نقوشِ سلیمانی (مضامین و تقاریر کا مجموعہ) از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی ۴۶۴ صفحات عا ؍
۱۴۔ فرحتِ دل (منتخب اشعار) از نواب بہادر سید عبداللہ خان ۲۷۱ صفحات قیمت عہ ؍
۱۵۔ معارفِ جمیل (مجموعۂ کلام) از حکیم آزاد انصاری ۲۵۶ صفحات قیمت عہ ؍
۱۶۔ چوپال (دیہاتی افسانے) از احمد ندیم قاسمی ۲۰۴ صفحات قیمت عہ ؍
۱۷۔ افسانہ پدمنی از احتشام الدین ایم اے ۱۵۰ صفحات قیمت عہ۔
۱۸۔ گلِ نغمہ (نظموں کا مجموعہ) از ڈاکٹر عظیم الدین احمد اعظم غیر مجلد قیمت عا۔
۱۹۔ کیلے کا چھلکا اور دیگر مضامین (مزاحیہ افسانے و مضامین) از چراغ حسن حسرت ۱۵۲ صفحات قیمت ؍
۲۰۔ ہلال و صلیب (سلطان صلاح الدین کی سوانح عمری) از ایم اسلم ۱۵۰ صفحات قیمت عا ؍
۲۱۔ انمول کہانیاں (انقلابی افسانے) از جناب شوکت عثمانی ۱۳۱ صفحات قیمت ۱۲ ؍
۲۲۔ عصمت کی کہانی (رسالہ عصمت دہلی کی سوانح عمری) از رازق الخیری ۹۰ صفحات قیمت ۸ ؍
۲۳۔ وداعِ راشد (عصمت کا آخری باب) از رازق الخیری ۸۸ صفحات قیمت ۸ ؍
۲۴۔ جدید جغرافیہ پنجاب (پنجاب کی سیاست پر مزاحیہ تبصرہ) از چراغ حسن حسرت قیمت ؍
۲۵۔ شہزادی نیلوفر (مختصر کہانیاں) از محترمہ سرور جہاں رضوانی بی اے ۱۲۰ صفحات قیمت ۸ ؍
۲۶۔ تنقیحات (اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم پر تبصرہ) از سید ابوالاعلیٰ مودودی ۲۹۴ صفحات قیمت ۱۲ ؍
۲۷۔ پیامِ روح (مجموعۂ کلام) از حامد اللہ افسر قیمت ۳ ؍

۲۸۔ جذباتِ بسمل (تیسرا مجموعۂ کلام) از سکھ دیو پرشاد بسمل قیمت عہ ؍
۲۹۔ ابوالہول (ٹالسٹائی کے ڈرامے کا ترجمہ) از جناب مجنوں گورکھپوری قیمت ؍
۳۰۔ گلبدن بیگم (شہزادی گلبدن کی سوانح عمری) از سید ابن حسن شارق ۱۰۰ صفحات۔
۳۱۔ محاوراتِ اردو از حافظ عبدالکریم صاحب عفتر ۲۴۲ صفحات قیمت ۸ ؍
۳۲۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت از سعید احمد ۲۶۲ صفحات قیمت عا ؍
۳۳۔ اقبال اور اس کا پیغام (اقبال کی شاعری پر تبصرہ) از ڈاکٹر تصدق حسین قیمت ۸ ؍
۳۴۔ صنعت و حرفت کے قیمتی راز از مہاشہ ندی قیمت عہ ؍
۳۵۔ نقیبِ فطرت (مجموعۂ کلام) از احسان دانش قیمت عہ۔
۳۶۔ تاریخ ائمہ (انبیاء کرام و ائمہ طاہرین کے حالات) از سید علی حیدر ۲۰۴ صفحات۔
۳۷۔ معاشدار (عطیہ معاش کی وضاحت) از کاشی ناتھ راؤ وکیل قیمت عہ ؍
۳۸۔ سیاحِ حق (اسلامی سیاست) از سید ابرار احمد ۱۵۸ صفحات قیمت ۸ ؍
۳۹۔ خوراک صحت (مہاتما گاندھی جی کے تجربات) ۱۷۶ صفحات قیمت ۱۲ ؍
۴۰۔ سفرنامہ حکیم امیر خسرو از حرمت اللہ کرمانی ۱۵۰ صفحات۔
۴۱۔ فنِ تفسیر از مرزا عزیز فیضانی ۲۰۰ صفحات۔
۴۲۔ گرہست جیون (مہاتما گاندھی جی کے تجربات) ۱۵۰ صفحات قیمت ۱۲ ؍
۴۳۔ جوہرِ تخلیق (شاہنامہ کی جنگ کا مرس کا منظوم ترجمہ) از سید محمد علی عبدالحکیم قیمت ۸ ؍
۴۴۔ تمثیلی مشاعرہ از پنڈت کیفی ۱۰۰ صفحات قیمت عہ۔
۴۵۔ برہمچریہ (مہاتما گاندھی جی کے تجربات) ۹۶ صفحات قیمت ۹ ؍
۴۶۔ کرشنا سیکنیکل گائیڈ از پنڈت کشن چند ۳۲۰ صفحات۔
۴۷۔ مخزنِ اخلاق (پانچواں ایڈیشن) از رحمت اللہ سبحانی ۴۸۸ صفحات۔
۴۸۔ انقلابِ حبش (حبش پر اطالیہ کے مظالم) از محمد اشرف خاں عطا قیمت عہ ؍
۴۹۔ جادۂ نو (قطعات) از احسان دانش قیمت ۸ ؍
۵۰۔ بے انصافی کا انصاف (ڈراما) از پنڈت سالیودت شرما ۲۱۰ صفحات قیمت عہ
۵۱۔ سرسید احمد خاں مرتبہ ظہیر الدین احمد ایم اے، ایچ سی ایس ۹۶ صفحات قیمت ۲ ؍
۵۲۔ سرسالار جنگ اعظم مرتبہ فیض محمد بی اے۔ ڈپٹی ایڈیٹر ۴۸ صفحات قیمت ۶ ؍

مرزا سیف علیخاں

مطبوعات

صحرانورد کے خطوط اردو کے بہترین رومانی انشا پرداز کا مجموعہ جس کا ہر صفحہ آپ کو قعر حیرت میں گم کر دیگا۔ ملک کے بہترین نقادوں کی متفقہ رائے ہے کہ ایسی دلچسپ و رنگین کتاب آج تک اردو میں شائع نہیں ہوئی۔ سرورق نہایت دلآویز، صفحات پونے چار سو، تقطیع کلاں۔ قیمت صرف ڈھائی روپے

طلسمِ خیال اس مجموعے میں وہ افسانے درج ہیں جنہوں نے دنیائے اردو میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ مصنف نے رومان، محبت کی جنت اور واقعیت و نفرت کے جہنم کو ساتھ ساتھ پیش کر دیا ہے۔ تخیل و حقیقت کا اتنا عمدہ امتزاج آپ کو کہیں بھی نہیں ملے گا۔ ٹائیٹل پیج رنگین، کتابت، طباعت کی پاکیزگی نے کتاب کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے

تین پیسے کی چھوکری اور دیگر افسانے یہ کتاب قاضی عبدالغفار کی شہرۂ آفاق انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ ہر افسانہ اتنا دلچسپ اور دلفریب ہے کہ قاری اسے بار بار پڑھ کر بھی سیر نہیں ہوتا۔ العاقل ... قاضی صاحب کے اس شاہکار کو دیکھئے۔ سرورق ... قیمت مجلد

چاند کا گناہ اور دیگر افسانے اس مجموعے میں دنیا کے مسلم الثبوت افسانہ نگاروں کے شاہکار افسانے درج ہیں۔ دنیا کے مختلف ملکوں ... یہ کتاب ایک شمار کتابوں سے بے نیاز کر دیگی۔ ٹائیٹل پیج رنگین۔ کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ۔ مجلد قیمت

دنیا کی حور اور دیگر افسانے بے مثال مجموعہ ... افسانے درج ہیں جن کے مطالعے سے ایک عورت بہترین بیوی اور کامیاب ماں ثابت ہو سکتی ہے۔ ہر عورت کو یہ کتاب پڑھنی چاہئے۔ کوئی گھر بھی اس سے خالی نہ ہونا چاہئے۔ ٹائیٹل پیج رنگین۔ کتابت طباعت نہایت اعلیٰ۔ قیمت مجلد

عورتوں کے افسانے عورتوں کے دکھ اور درد کو سمجھنے کے لئے اس مجموعے کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ اس مجموعہ میں بتایا گیا ہے کہ عورت ... مردوں کے باعث کیسی کیسی مصیبتیں برداشت کرتی پڑتی ہیں۔ ہر عورت کا فرض ہے کہ وہ کتاب کو پڑھ کر اپنی ... دور کرے۔ ٹائیٹل پیج نہایت عمدہ۔ کتابت، طباعت دیدہ زیب۔ قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے

حاجی لق لق کے افسانے حاجی لق لق کی مزاح نگاری کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس مجموعہ میں حاجی لق لق کے بہترین مزاحیہ افسانے درج ہیں جنہیں پڑھ کر افسردہ سے افسردہ دل انسان بھی قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ٹائیٹل پیج خندہ آور۔ کتابت، طباعت نہایت اعلیٰ۔ قیمت صرف بارہ آنے

شعلے اس میں پروفیسر احمد علی مصنف ضبط شدہ کتاب انگارے کے لاجواب افسانے درج ہیں۔ موجودہ سوسائٹی کی ... دیکھنی ہو تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے۔ زبان بامحاورہ ... ٹائیٹل پیج رنگین۔ کتابت و طباعت بہت پاکیزہ۔ قیمت

پیغمبرِ صحرا یہ کتاب علامہ ... کی شہرۂ آفاق کتاب ... کا ترجمہ ہے۔ کتاب میں حضور اکرمؐ کی زندگی ... واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب کا مطالعہ ... کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کتابت، طباعت نہایت پاکیزہ۔ قیمت مجلد مع طلائی حروف دو روپے

نغمۂ حرم اس مجموعہ میں ہندوستان کے لاجواب لاثانی شاعر حضرت اختر شیرانی کی بہترین رومانی نظموں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ ہر نظم بے حد رنگین و پرکیف ہے۔ اختر صاحب کی تمام خصوصیات اس مجموعہ میں موجود ہیں۔ ٹائیٹل پیج رنگین۔ کتابت و طباعت بہت خوشگوار۔ قیمت ... روپیہ

نقش و دام یہ حضرت عدم کی بہترین نظموں کا مجموعہ ہے۔ جدید نظم گوئی کے ارتقا اور فلسفیانہ جذباتی رنگ سخن سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ کتابت و طباعت نہایت پاکیزہ۔ قیمت مجلد مع طلائی حروف دو روپے

باسی پھول عہد حاضرہ کے بہترین افسانہ نگار کے ان پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں ہر ایک کو نقادانِ فن نے شاہکار تسلیم کیا ہے۔ اس مجموعے میں المیہ افسانے بھی شامل ہیں۔ ... رومان بھی ہے اور سوشلزم بھی اور ... پروفیسر صاحب کا مخصوص طنز اور مہذب ظرافت میں چھپی ہوئی ہے۔ اس مجموعے کے بغیر کوئی لائبریری مکمل نہیں ہو سکتی۔ لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ۔ قیمت صرف

لینن۔ ترکی جمہوریہ۔ سوشلزم۔ لینن کی حکومت۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو۔ ...

مکتبہ اردو لاہور

بچوں سے

نہایت خوشی کی بات ہے کہ گزشتہ پرچہ میں جو تحریک کی گئی تھی وہ کامیاب ثابت ہوئی۔ بہت سے بچے اور بچیوں نے اس کی تائید میں نہ صرف حیدرآباد سے بلکہ باہر سے بھی خطوط بھیجے ہیں۔ ہم سب سب ننھے بھائیوں اور بہنوں کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اب ان میں ایک بیداری پھیل چکی ہے اور قوی امید ہے کہ وہ آگے چل کر ملک کے لئے قابل ناز ثابت ہوں گے۔

پہلے ہم کو ایک جلسہ کرنا ہوگا جس میں نہ صرف خریدار بلکہ وہ سب طالب علم جو میٹرک تک کی جماعتوں میں تعلیم پاتے ہوں بلاتفریق مذہب و ملت اس جلسہ میں شریک ہوں گے۔ اس جلسہ میں سب کی متفقہ رائے سے ضروری امور کا تصفیہ کریں گے بعض جو بہت ہی چھوٹے سب رس بھائی ہیں وہ جلسہ میں شریک ہونے سے گھبرائیں گے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ان کی ایک اور چھوٹی سی انجمن قائم ہو جائے گی جس میں پرائمری تک کے جماعتوں کے بچے شریک رہیں گے مگر اس کا تعلق اسی ایک انجمن سے رہے گا یہ انجمن دراصل ادارۂ ادبیات اردو کا شعبۂ طلبہ ہے مگر اس کے لئے ایک موزوں نام اسی جلسہ میں تجویز کریں گے بچے اس کے لئے اچھے اچھے نام سوچیں اور جلسہ میں پیش کریں چونکہ خیریت آباد (دفتر ادارہ) دور ہے اور سب کو آنے میں تکلیف ہوگی جس کا ہم کو خود احساس ہے اور جس کا مناسب انتظام ہم کرچکے ہیں صرف پہلا جلسہ دفتر سب رس میں کریں گے اس کے بعد کہیں وسط شہر میں ہمارے جلسے ہوں گے جہاں ہر ایک بہ آسانی آسکے گا جس کا تصفیہ جلسہ میں ہوگا۔ اس انجمن کے قیام کا سب سے بڑا مقصد سب رس میں تحریری دلچسپی کے ساتھ ساتھ تقریر میں بھی مہارت پیدا کرنا ہے۔ آپ اس جلسے میں ضرور آئیں اور کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ آپ کے دوست احباب اس میں شریک ہوں خواہ وہ سب رس کے خریدار ہوں یا نہ ہوں مگر یہ ضروری ہے کہ وہ میٹرک تک کی جماعتوں میں تعلیم پاتے ہوں۔ ہندو ہوں یا مسلمان یا کسی اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں وہ سب اس انجمن میں شریک ہو سکتے ہیں مگر اپنے والدین سے یا سرپرست سے ضرور اجازت لے آئیے انھیں اطمینان دلا کر آئیے کہ ہم ایک نیک کام میں حصہ لینے جا رہے ہیں بہتر تو یہی ہے کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے تم انھیں بتا دیں وہ ضرور اجازت دے دیں گے۔ توقع ہے کہ آپ مع اپنے دوست احباب کے بتاریخ ۲۲ ڈسمبر ۱۹۴۳ء مطابق ۱۰ بہمن ۱۳۵۳ف بروز جمعہ بوقت ۴ بجے شام دفتر ادارۂ ادبیات اردو رفعت منزل خیریت آباد ضرور آئیں گے۔ خیریت آباد میں آنے کے بعد کسی سے بھی دریافت کر لیجئے کہ دفتر سب رس یا رفعت منزل کہاں ہے کوئی بھی بتا دے گا۔ اسی طرح حیدرآباد کے باہر اور اضلاع میں انجمن کی شاخیں قائم ہو سکتی ہیں۔ لڑکیوں کے لئے بھی اسی طرح کی انجمن بن سکتی ہے۔ جو اس میں دلچسپی لینا چاہتی ہوں وہ ہم سے مراسلت کریں۔

مس بی فخرالدین نے ہمارے پاس لکھ بھیجا ہے کہ ان کی طرف سے آپ سب کو دیوالی اور عید مبارک چھاپ دیں ہم بھی آپ سب کی طرف سے انھیں عید مبارک کہتے ہیں۔ گزشتہ پرچہ میں جو انعامی معمہ دیا گیا تھا اس کی تاریخ بڑھائے دیتے ہیں کیونکہ اکثر حل غلط آئے ہیں۔ ۲۰ ڈسمبر تک بھیج دیں۔ جلسہ کی تاریخ بھولنا نہیں۔ اچھا خدا حافظ۔

معین الدین احمد انصاری

جواہر پارے

(۱) لینا چاہتا ہے تو دعائیں لے (۲) توبہ کرنا چاہتا ہے تو گناہ اور ظلم سے توبہ کر (۳) دیکھنا چاہتا ہے تو حق اور ناحق کے فرق کو دیکھ (۴) سننا چاہتا ہے تو خدا کی تعریف اور مظلوم کی پکار کو سن (۵) رونا چاہتا ہے تو اپنے اعمال پر رو۔ (۶) ہنسنا چاہتا ہے تو اپنی قسمت پر ہنس۔

(ماخوذ) **سید خواجہ معین الدین** (گلبرگہ شریف)

ایک مسافر اور ریچھ

دیکھیے میاں! ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک مسافر کسی گھنے جنگل میں سے چلا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے کیا دیکھتا ہے کہ ایک ریچھ اور ایک اژدہا دونوں گتھے ہوئے ہیں۔ ریچھ تڑپ رہا ہے اور اژدہا اسے مضبوط پکڑے ہوئے نگلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مسافر نے یہ حال دیکھا تو ریچھ پر ترس آ گیا۔ فوراً درخت کا ایک موٹا سا ٹہنا کاٹا اور اژدہے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ جوں ہی اس نے منہ پھاڑا اور اس نے اژدہے کے منہ میں وہ ٹہنا اڑا دیا۔ جس سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور ریچھ فوراً نکل بھاگا۔

ریچھ اژدہے کے منہ سے نکل کر مسافر کی طرف بڑھا اور اس کے قدموں پر گر کر لوٹنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد مسافر چلا تو وہ بھی دم ہلا کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ چلتے چلتے دونوں ایک کنویں کے پاس پہنچے۔ مسافر ذرا تھکا ہوا تھا، ٹھنڈی چھاؤں دیکھ کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا اور ریچھ اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔

اتنے میں ایک شخص اُدھر سے گزرا۔ اس نے یہ تماشا دیکھا تو وہیں کھڑا ہو گیا۔ جگا کر پوچھا کہ حضرت! یہ کیا ماجرا ہے اور یہ ریچھ سائے کی طرح تمہارے پیچھے کیوں پڑا ہے۔

مسافر نے اژدہے اور ریچھ کا قصہ بیان کیا اور پھر اپنی کارگزاری ظاہر کی۔ اس نے یہ رام کہانی سن کر کہا کہ خیر تم نے یہ تو ثواب کا کام کیا جو ریچھ کو اس موذی کے پنجے سے چھڑا دیا مگر پھر اس کو پالتو بنا کر ساتھ کیوں رکھ چھوڑا ہے۔ میاں! یہ تو بڑا بے وقوف جانور ہے۔ تم اس پر کبھی بھروسہ نہ کرنا ورنہ یہ اپنے ساتھ تم کو بھی لے ڈوبے گا۔

مسافر نے کہا کہ جا بابا، جا! اور اپنا کام کر، میں کوئی ننھا بچہ تو ہوں نہیں جو تو مجھے نصیحت کر رہا ہے بھلا سوچنے کی بات ہے کہ یہ بے چارہ مجھے کیا نقصان پہنچا سکتا ہے۔

جب اس نے دیکھا کہ مسافر کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور کہا کہ میں سچ کہتا ہوں کہ دیکھ اس نادان کی صحبت نہ اختیار کر ورنہ پچھتائے گا اور کسی نہ کسی دن مصیبت میں گرفتار ہو جائے گا۔

مگر مسافر کے سر پر تو شامت سوار تھی وہ بھلا کہاں ماننے والا تھا، فوراً ہاتھ جھٹک کر چھڑا لیا اور کہا کہ بابا! میں نے اپنے بال دھوپ میں سفید کئے نہیں۔ مجھے اپنی برائی بھلائی اچھی طرح معلوم ہے۔ براہ کرم اب آپ تشریف لے جائیے اور خدا کے واسطے میرا پیچھا چھوڑ دیجیے۔

آخر کار اس شخص نے دیکھا کہ یہ کسی طرح سیدھے راستے پر نہیں آتا تو مجبور ہو کر کہا کہ اچھا! تم میری بات نہیں سنتے تو نہ سنو، اب تم جانو اور تمہارا کام۔ میں تو یہاں سے یہ چلا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جائے۔ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اسے برا بھلا کہتا ہوا چل دیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ مسافر پھر اسی طرح درخت کے نیچے ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد اسے نیند آ گئی۔ اِدھر ریچھ اس کے سرہانے کھڑا مکھیاں اڑانے لگا۔

اب اتفاق دیکھئے کہ ایک مکھی بار بار اڑکر مسافر کی ناک پر آبیٹھتی۔ ریچھ اُسے بار بار اڑاتا، وہ اڑتی اور پھر وہیں بیٹھ جاتی۔ مکھی کی یہ ڈھٹائی دیکھ کر ریچھ بہت جھنجھلایا، سوچا کہ یہ میرے مالک کو بہت ستا رہی ہے اس کو ضرور سزا دینا چاہیے۔ بس فوراً دوڑ کر ایک بھاری پتھر اٹھا لایا اور دل میں ٹھان لی کہ اگر اب کے مکھی آکر بیٹھے گی تو بس اس کا کچومر ہی نکال دوں گا۔

تھوڑی دیر میں بھن بھن کرکے وہ مکھی پھر ناک کی پھننگ پر آبیٹھی۔ ریچھ تو پتھر تانے ہی کھڑا تھا بس آنکھیں بند کرکے وہ پتھر ناک پر دے مارا۔ مکھی تو اڑ گئی مگر اس غریب کا سر چکنا چور ہوگیا اور بھیجا پاش پاش ہوکر بہہ گیا۔

کر نہ بے عقلوں کی صحبت اختیار
کر نہ ان کی دوستی پر اعتبار
کر بھروسہ کچھ نہ ان کی بات پر
وہ تو بالکل جانور ہیں جانور
بات یہ کہتے ہیں ہم ایمان کی
دوستی اچھی نہیں نادان کی

مرزا عصمت اللہ بیگ

مٹھو

امّی نے ہے مٹھو پالا — کیا اچھا بھولا بھالا
آؤ بھیّا دیکھو آکر — آپا روٹی ڈالو آکر
اَنّی اِس کی صورت دیکھو — دل یہ چاہے گود میں لے لو
پیارا چہرہ بانکی گردن — آنکھ رسیلی تیکھی چتون
چال ہے دیکھو کیا متوالی — چونچ پہ ہر دم پان کی لالی
سر سے لے کر دُم تک پورا — سبز پروں کا پہنے جوڑا
لال گلے میں کنٹھی ڈالے — بیٹھا ہے کیا چونچ نکالے

لطیف النساء بیگم

شوقِ مطالعہ

امریکہ کا مرحوم صدر جمہوریہ لنکن ایک نہایت
ہی غریب خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کو بچپن
میں مطالعہ کا بہت شوق تھا مگر غربت و تنگدستی اس بات
کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ اپنی علمی تشنگی کو بجھانے کے لئے
ذاتی صرفہ سے کتابیں خرید کر پڑھے اور اس زمانے
میں نہ تو اخبارات و رسائل کی افراط تھی نہ ہی ایسے
دارالمطالعے تھے کہ جن سے عوام مستفید ہو سکیں۔ اس کے
اپنے مکان میں چند پرانی کتابیں تھیں جن کو وہ اکثر
و بیشتر پڑھتا تھا۔ ان مخصوص کتابوں کے کثرتِ مطالعہ
کے سبب وہ ان کا حافظ ہو گیا تھا۔

اسی زمانے میں اس کو پتہ چلا کہ کرافرڈ نامی
ایک شخص اس کے پڑوس کے گاؤں میں مقیم ہے۔
اور اس کے پاس "مشاہیر واشنگٹن" نامی کتاب
ہے۔ لنکن کو یہ معلوم ہوتے ہی وہ پیدل ہی کرافرڈ
کے گاؤں کو جو اس کے گاؤں سے دس میل دور تھا چلا گیا۔ کرافرڈ
کے پاس پہنچ کر لنکن نے نہایت اشتیاق سے سوال
کیا "کیا آپ مجھ کو اپنی کتاب "مشاہیر واشنگٹن" مطالعہ
کے لئے مستعار دے سکتے ہیں؟" کرافرڈ نے لنکن کے لب و لہجہ
اور حرکات و سکنات سے اس کے علمی ذوق کا پتہ چلا
لیا اور جب اس کو اطمینان ہو گیا کہ واقعی لنکن اپنی علمی
تشنگی کو بجھانا چاہتا ہے تو کرافرڈ نے کتاب دے کر کہا "دیکھو!
یہ کتاب بہت قیمتی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بداحتیاطی سے
اس کو خراب کر دو۔" لنکن نے جواب دیا "نہیں! ہرگز نہیں!!
یہ جوں کی توں آپ کو واپس کر دی جائے گی۔"

کتاب لے کر لنکن نہایت فاتحانہ انداز سے اپنے
گاؤں کی طرف لوٹا مگر چونکہ اس کا شوقِ مطالعہ حد سے
بڑھ گیا تھا اس لئے اس سے صبر نہ ہو سکا کہ وہ گھر جا کر
اطمینان سے مطالعہ کرے۔ چنانچہ وہ راستے ہی میں
چلتے چلتے مطالعہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ لنکن اپنے گاؤں
پہنچنے سے قبل ہی سورج غروب ہو گیا تھا۔ لنکن نے جب
دیکھا کہ تاریکی بڑھ رہی ہے تو کتاب بند کر کے دوڑتا
ہوا اپنے گھر آیا اور نہایت اشتیاق سے چراغ کی روشنی
میں "مشاہیر واشنگٹن" کے مطالعہ میں غرق ہو گیا
حتیٰ کہ اس پر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ کتاب کو تپائی پر
رکھ کر سو گیا۔ رات جب کہ لنکن میٹھی نیند سو رہا تھا موسلا
دھار بارش ہوئی اور لنکن کے گھر میں پانی اتر آیا کیونکہ
لنکن کا گھر کوئی محل نہ تھا بلکہ ایک غریب کی جھونپڑی
تھی۔

جب لنکن بیدار ہوا تو اس کو کتاب کا خیال آیا اور وہ
گھبرا کر اٹھا کہ آیا کتاب خراب تو نہیں ہو گئی۔ اس نے
فوراً کتاب کو دیکھا تو کتاب بھیگ کر بہت خراب ہو گئی تھی
اس کے اوراق ایک دوسرے سے چپک گئے تھے۔
اور جلد تو بالکل گل گئی تھی۔ کتاب کی یہ بری حالت دیکھ کر
لنکن کا دل دھک سا ہو گیا کیونکہ اس نے کرافرڈ سے
کتاب کو جوں کی توں واپس کرنے کا وعدہ کیا تھا
کتاب کی یہ بری حالت دیکھ کر اس کی نیند کافور ہو گئی
اور اس نے فوراً کتاب کو آگ سے سینکنا شروع
کیا اور اس کے درست کرنے کے لئے اپنی ساری
کوششیں صرف کر دیں مگر افسوس کہ کتاب اپنی اصلی
حالت پر نہ آ سکی بلکہ آگ پر سینکنے کی وجہ اس کے اوراق میں

سختی پیدا ہو گئی تھی۔

لنکن کو کتاب کے خراب ہو جانے کا بے حد رنج تھا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے جھٹلائے جانے کا بھی از حد ملال تھا۔ گر پھر بھی اس نے ہمت و جرأت سے کام لیا اور دوسرے دن کتاب لے کر کرا فرڈ کے پاس پہنچا اور کتاب واپس کر دی۔ کرا فرڈ نے اپنی کتاب کو خستہ حالت میں دیکھ کر درشت لہجہ میں پوچھا "تم نے تو کتاب کی حالت بدل ڈالی! کیا تم نے اپنے الفاظ کی یہی قدر کی؟" یہ سن کر لنکن مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا اور نہایت سنجیدگی سے جواب دیا "مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں آپ کی کتاب کو جوں کی توں واپس نہ کر سکا لیکن میں بالکل بے قصور ہوں کیونکہ یہ اس اچانک بارش کا سبب ہے کہ آپ کی کتاب محفوظ نہ رہ سکی۔ میں اس کا معاوضہ ادا کرنے کے لئے ہمہ تن تیار ہوں۔ لیکن معاوضے کے لئے میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے بلکہ میں صرف اپنی خدمات پیش کر سکتا ہوں۔ آپ مجھ سے جو چاہیں خدمت لے سکتے ہیں۔"

کرا فرڈ اس کی گفتگو سن کر مبہوت ہو گیا اور خیال کیا کہ واقعی لڑکا بالکل بے قصور ہے۔ گر پھر یکایک اس کے دل میں لنکن کی آزمائش کا خیال پیدا ہوا کہ آیا وہ اپنے اس قول پر اس کا معاوضہ ادا کرنے کے لئے تیار ہے پورا اترتا ہے یا نہیں۔ اس نے لنکن سے کہا "تم کو اس کتاب کا معاوضہ ادا کرنے کے لئے تین دن تک میرے پاس کام کرنا ہوگا" لنکن نے مسکراتے ہوئے اثبات میں جواب دیا اور مسلسل تین دن تک لنکن کو جو کام بھی دیا گیا نہایت مستعدی سے پورا کیا۔ تین دن کے بعد جب لنکن نے اس سے گھر جانے کی اجازت طلب کی تو اس وقت کرا فرڈ لنکن کی خود داری، استقلال اور عزم راسخ کا گرویدہ ہو گیا اور نہایت مشفقانہ لہجہ میں یہ کہتے ہوئے کتاب اس کے حوالے کی "لنکن! بے شک میری کتاب بہت قیمتی ہے گر تمہارا معاوضہ بھی کتاب کی قیمت سے ہزار گنا زیادہ ہے۔ اس لئے میں تمہیں یہ کتاب انعام دیتا ہوں" کتاب کے اس طرح مل جانے سے لنکن کو انتہائی مسرت ہوئی وہ عالم کیف میں ڈوبا ہوا گھر لوٹا۔ اب لنکن کا معمول تھا کہ اکثر و بیشتر اسی کتاب "مشاہیر واشنگٹن" کا مطالعہ کرتا اور اس کے مطالعہ میں اس کو بے حد سرور حاصل ہوتا تھا کیونکہ اس کتاب کو اس نے ایک گراں معاوضے پر حاصل کیا تھا۔

جب تک لنکن امریکہ کا صدر جمہوریہ رہا ہمیشہ اپنی تقریروں میں یہ ضرور کہا کرتا تھا کہ اس کا یہ اعزاز محض "مشاہیر واشنگٹن" کے مطالعہ کی بدولت ہے۔

محمد عبدالقادر فاروقی
(حمایت نگر)

نصیحت کا اثر

موہن کا باپ ایک معمولی خدمت پر کسی دوسرے شہر میں ملازم تھا جس کی تنخواہ بیس روپے تھی موہن اس وقت ساتویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ موہن روزانہ حسب معمول صبح سویرے اٹھ کر شہر سے باہر جاتا اور لکڑیاں توڑ کر سورج نکلنے سے پہلے گھر لوٹ آتا تھا۔ جب یہ ساتویں جماعت سے آٹھویں جماعت میں داخل ہوا تو بہت سے نئے لڑکے اس کے دوست ہو گئے۔ ان نئے ساتھیوں میں اکثر مل داروں کے لڑکے تھے۔ موہن ان سے صرف اسکول میں ملا کرتا تھا لیکن ان کے گھر کبھی جانے کا اسے اتفاق نہ ہوا تھا۔ اور اس نے خود اپنے کو پابند بنا لیا تھا کہ وہ ان کے گھر ملنے نہ جائے گا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ان لڑکوں سے ملنے جائے گا تو وہ بھی اس کے گھر ضرور آئیں گے۔ لیکن جس گھر میں یہ رہا کرتا تھا وہاں نہ تو دیوان خانہ تھا اور نہ بیٹھنے کے لئے فرش۔ اس لئے وہ ان لڑکوں سے ملتے ہوئے گھبراتا تھا۔ لیکن جب دوستی زیادہ بڑھ گئی تو ادھر گھر کے کاروبار میں خلل آنے لگا۔

ایک روز موہن رات میں ۱۰ بجے گھر لوٹا۔ ماں نے دیر سے آنے کا سبب دریافت کیا تو وہ کہنے لگا وہ ایک دوست کے ساتھ کھیلنے کلب پر گیا تھا اور جب وہاں سے ۸ بجے گھر آ رہا تھا اس کے دوست نے گھر چلنے پر مجبور کیا اور وہیں اسے ۱۰ بج گئے۔ ماں نے اسے گھر کے کاروبار کی جانب توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ تین روز سے وہ لکڑیاں لانے نہیں گیا ہے اور لکڑیاں اب بالکل ختم ہو چکی ہیں اگر تو کل لکڑیاں نہ لائے گا تو کل کھانے کا بھی خدا حافظ ہے۔ موہن چونکہ قصوروار تھا اس لئے خاموش ہو رہا۔ تھوڑی دیر بعد پھر اس نے اپنی ماں سے اس دوست کا ذکر شروع کر دیا اور کہنے لگا اس کے دوست کے مکان میں ایک اچھا صاف ستھرا کمرہ ہے جہاں بجلی کی روشنی ہے فرش نہایت ہی صاف ستھرا تھا میز کرسیاں صوفے وغیرہ نہایت آراستہ و پیراستہ سلیقہ سے اپنی اپنی جگہ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اس نے ماں سے کہا کہ وہ بھی ایک کمرہ اس طرح ہی رکھے ماں نے جواب دیا کہ بیٹا یہ تمام باتیں امیروں کی ہیں ہم غریب یہ تمام چیزیں کہاں سے لائیں گے۔ تمہارے والد کو دیکھو کہ وہ اپنے کھانے کے لئے صرف آٹھ روپے رکھ لیتے ہیں اور تمہارے لئے بارہ روپے بھیج دیتے ہیں اس میں ہی ہماری زندگی بسر ہونا مشکل ہے تو یہ ٹھاٹ باٹ اور شان و شوکت کہاں سے کریں۔ موہن خاموش تھا اس کی ماں کی نصیحت کا اس پر اثر ہو چکا تھا وہ اٹھا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ صبح سویرے اٹھا۔ اور ایک رسی لے کر جنگل کی راہ لی۔ لکڑیاں توڑ لایا اور اب روزانہ پھر وہی معمول جو پہلے تھا اس کی پابندی کرنے لگا۔

موہن نے اب جماعت نہم میں قدم رکھا تھا اور ایک سال بعد وہ جماعت دہم میں تھا۔ اس نے لگاتار محنت کی اور گھر کے بھی کاروبار انجام دیتا رہا۔ لیکن اس کو ان دوستوں کی شان و شوکت اور جاہ و حشم کا کبھی خیال

بگڑا۔ چنانچہ دہم کی کامیابی کے بعد اس نے اسکول کو خیرباد کہہ دیا اور ملازمت کے لئے اس نے درخواست دی اور ایک سو پچاس روپے کا ملازم بھی ہوگیا۔ اب اس نے ماں سے آکر پوچھا کہ اب کیوں ہم ایک اچھا گھر نہ لیں اور وہی چیزیں جو دوست کے گھر میں تھیں اپنے پاس نہ رکھیں ماں نے اسے اجازت دے دی اور اب وہ ایک عمدہ مکان میں تھا۔

موہن کو جب کبھی رات میں نیند نہ آتی تو وہ اس وقت اپنی ماں کی نصیحتوں کو یاد کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ محض ان نصیحتوں کے سبب آج اس کی زندگی کامیاب ہے ورنہ اس کی زندگی تاریک ہو جاتی۔

عبد المجید خان یوسف زئی

بھوکا مرغا

ایک مرغا بھوک سے بیتاب تھا
دیکھا اک انبار کوڑے کا لگا
دیر تک کی جستجو تو ناگہاں
دیکھ کر موتی کو رنجیدہ ہوا
کوئی دولت مند اسے پاتا اگر
قدر اس کی کرتا کوئی جوہری
یہ نہ بخشے گا خوشی دل کو مرے
جستجو میری ہوئی سب رائگاں
کام یہ دانے کا کر سکتا نہیں

جستجو میں چند دانوں کی چلا
خوب سا اس کو کریدا جا بجا
بیش قیمت اک ملا موتی وہاں
ہو کے غمگیں دل سے یہ کہنے لگا
اس کا دل خوش ہوتا موتی دیکھ کر
شاہ پاتا تو اسے ہوتی خوشی
اب نہ جاں بر ہوں گا ہرگز بھوک سے
آہ اک دانہ کہاں موتی کہاں
آہ موتی پیٹ بھر سکتا نہیں

حاصل

یہ نصیحت یاد رکھ المختصر
قیمتی دانہ ہے موتی سے کہیں
عظمت ایسی فکر صبح و شام کر

دہر میں بے فائدہ زینت نہ کر
بے غذا کے زندگی ممکن نہیں
جس سے بھوکے سیر ہوں وہ کام کر

سید عظمت اللہ حسینی
(متعلم دہم مدرسہ چنچل گوڑہ)

بہادر لڑکا

لڑکا جہاز کے جلتے ہوئے تختے پر کھڑا تھا جب کہ سب اپنی اپنی جانیں بچا کر بھاگ گئے تھے۔ لیکن وہ ہمت کر کے کھڑا تھا۔ شعلوں کی روشنی میں سپاہیوں کی لاشیں لڑکے کے اطراف پڑی ہوئی نظر آ رہی تھیں وہ اب بھی بشاش و خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ جیسا کہ وہ جہاز پر حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوا گو وہ ایک چھوٹا لڑکا تھا مگر بہت بہادر تھا۔ شعلے بلند ہونے لگے وہ اپنے باپ کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔ باپ زندگی کی آخری سانس لے چکا تھا۔ اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے زور سے پکارا "ابا! بولو! بولو! کیا میرا فرض ابھی پورا نہیں ہوا" اس کو معلوم نہیں تھا کہ اس کا باپ بے خبر پڑا ہوا ہے۔ "ابا! بولو" اس نے پھر چلایا "کیا میں یہاں سے ہٹ سکتا ہوں؟" مگر اس کو جواب میں بندوقوں کی آوازیں سنائی دیں۔ شعلے اور بلند ہونے لگے۔ اس کو اپنے بالوں اور پیشانی پر گرمی محسوس ہونے لگی۔ اب بھی وہ اس خطرناک جگہ بہادرانہ انداز میں کھڑا تھا۔ اس نے پھر ایک دفعہ چلایا "میرے ابا! کیا مجھے یہاں ٹھیرنا ہوگا؟" آگ جہاز کے مرچھنے تک پہنچ گئی تھی۔ جہاز کا جھنڈا جل رہا تھا اور اس کے شعلے ہوا کے زور سے فضا میں لہرا رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک سنہری جھنڈا لڑکے کے اوپر فضا میں لہرا رہا ہے۔ آگ بارود کے گودام کے قریب پہنچ گئی تھی۔ ایک دھماکہ ہوا۔ آہ! لڑکا وہ کہاں تھا۔

یہ تھا ایک بہادر فرانسیسی لڑکے کی موت کا منظر جس کو انگریزی زبان کی مشہور شاعرہ ہیمن نے اپنی نظم "کاسا بیانکا" میں پیش کیا ہے۔ سب رسی بھائیو واقعہ یہ ہے کہ ایک بحری جنگ میں ایک فرانسیسی جہاز کے کپتان نے اپنے لڑکے کاسابیانکا* کو جو اس کے ساتھ تھا ایک محفوظ جگہ بٹھا کر یہ ہدایت کی کہ وہ وہاں پر بیٹھے رہے اور وہاں سے اٹھنے کی جرأت نہ کرے جب تک کہ اس کو وہاں پر سے ہٹنے کا حکم نہ دیا جائے۔ دشمنوں نے آتش باری کی جس کی وجہ سے جہاز کو آگ لگ گئی اس سلسلے میں کاسابیانکا کا باپ کپتان بھی مرگیا لڑکے نے جب جہاز کو آگ لگتے دیکھا تو اپنے باپ سے وہاں سے ہٹنے کی اجازت مانگی۔ باپ تو مرچکا تھا مگر کاسابیانکا کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس کا باپ مرچکا ہے وہ سمجھ رہا تھا کہ باپ وہیں کہیں موجود ہوگا۔ چنانچہ اس نے کئی بار اپنے باپ سے وہاں پر سے ہٹنے کی اجازت مانگی مگر اس کو کوئی جواب نہ ملا۔ اگر وہ چاہتا تو بھاگ کر اپنی جان بچا سکتا لیکن اس کو اپنے باپ کی ہدایت یاد تھی اس لئے اس نے بغیر باپ کی اجازت کے اپنی جان بچا کر بھاگنے سے موت کو ترجیح دی۔ یہ ایک چھوٹا سا سچا واقعہ ہے جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اپنے فرائض ادا کرنے میں پیچھے نہ ہٹنا چاہئے گو اس میں ہماری جان تک کیوں نہ چلی جائے۔

سب رسی بھائیو اور بہنو! تم بھی اس بہادر لڑکے کاسابیانکا کی طرح اپنے فرائض ادا کرنے میں کبھی دریغ نہ کرنا اس لڑکے کو مرتے ہوئے بہت عرصہ ہوا

---

* لڑکے کا نام

مگر دنیا اب تک اس کو یاد کر رہی ہے اور تاریخ میں اس کی
اس قربانی کو سنہری الفاظ میں لکھا جا رہا ہے۔ دنیا اب تک
اس کی لافانی قربانی سے سبق حاصل کر رہی ہے۔ کاسابیانکا
مرا نہیں۔ کون کہتا ہے کہ وہ مرگیا؟ وہ زندہ ہے۔ دیکھو!
وہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے "دنیا والو! میری اس زبردست
قربانی کو شمع ہدایت بناؤ اور اپنے فرائض کو انجام دینے
میں کبھی پیچھے نہ ہٹو گو اس میں تمہاری جان تک کیوں
نہ چلی جائے۔ دنیا میں ترقی پانا اور سرخرو رہنا چاہتے
ہو تو اپنے فرائض کو استقلال کے ساتھ انجام دو۔ اگر
تم یہ چاہتے ہو کہ دنیا تمہیں تمہارے بعد بھی اچھے نام
سے یاد کرے اور تمہیں زندہ تصور کرے تو یاد رکھو اپنے
فرائض کی تکمیل میں کبھی غفلت نہ کرنا آج کے کام کو کل پر
نہ چھوڑنا یہی تمہاری ترقی کا راز ہے اور اسی میں ہی
ترقی کا بھید مضمر ہے۔"

عظیم قادری صدیقی

سالگرہ کا تحفہ

کل سلمیٰ کی سالگرہ ہونے والی تھی۔ وہ سالگرہ کا
خیال کرتے ہوئے سو گئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی ماں
اس کو عمدہ عمدہ کپڑے پہنا رہی ہے۔ وہ خوش ہو رہی
تھی کہ اتنے میں اسے آسمان پر کوئی چیز اڑتی ہوئی
نظر آئی۔ چونکہ اس کو پریوں کی کہانیوں سے بہت
دلچسپی تھی اور ان کے دیکھنے کی بہت مشتاق تھی اس
پری کو دیکھ کر سہم گئی پری نے کہا پیاری سلمیٰ میں تم کو
کچھ ضرر نہ پہونچاؤں گی ہماری ملکہ تم کو بلا رہی ہیں۔
چلو پرستان کی سیر کرائیں اس نے پوچھا کہ آپ کے
علاوہ وہاں اور بھی پریاں ہوں گی؟ پری نے مسکرایا
سلمیٰ پرستان چلنے کی خوشی میں اپنی ماں سے اجازت
لینا بھول گئی۔ اور پری کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ وہ
اڑتی ہوئی جا رہی تھی یکایک وہ ایک نئی دنیا میں پہونچ کر
رک گئی۔ اس نے دیکھا کہ وہاں کی زمین مثل چاندی کے
چمک رہی ہے باغوں میں طرح طرح کے پھول لگے ہیں
ہر طرف سونے چاندی کے مکانات کی قطاریں ہیں سونا
چاندی مٹی کی طرح زمین پر پڑی ہے۔ سلمیٰ ان چیزوں کو
دیکھ کر کہہ رہی تھی کہ کاش ہمارے ملک میں بھی اس
قسم کی چیزیں ہوتیں۔ پری اس کو لئے ہوئے آگے
بڑھی۔ انہی مکانات پر سے گزر کر پری ایک مکان کے
آگے رک گئی سلمیٰ نے دیکھا تو اس میں بیش قیمت جواہر
لگے تھے۔ سارا مکان سونے چاندی سے بنا ہوا تھا۔ پری
نے کہا کہ یہ ملکہ کا محل ہے۔ ملکہ کے طلب کرنے پر دونوں
اس کے کمرے میں پہونچ گئے۔ ملکہ اٹھ کر سلمیٰ کے پاس
آئی اور کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ سلمیٰ مجھے اس
کی اطلاع تھی کہ تم نے اپنی ماں سے کہا تھا
اماں ایک دن پریوں سے ملنے چلو۔ میں نے خیال
کیا کہ تم کو سالگرہ کے موقع پر بلا کر کچھ تحفے دوں یہ دو
دو پریاں ان کو لگا رہی۔ وقت تم پرستان آسکتی ہو
اور یہ ایک طلسمی آئینہ ہے۔ اگر تم جب دوستوں کو
دکھاؤ گی اس وقت آئینہ پر وہ آئے گی جو تم کو پرستان
کا راستہ بتائے گی۔ سلمیٰ نے ملکہ سے پوچھا کہ کیا؟

پرستان کی سیر کے لئے روز آ سکتی ہے۔ ملکہ نے اس کو جواب دیا کہ وہ روز آ سکتی ہے۔ اتنے میں اس نے دیکھا کہ اس کی ماں اس کو جگا رہی ہے اور کہہ رہی ہے، بیٹی اٹھو آج تمھاری سالگرہ ہے تم کب تک سوتی رہو گی۔ سلمیٰ کی آنکھ کھل گئی اب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ خواب دیکھ رہی تھی۔

مرزا محمد انور

جاپانی طلبا

(یہ مضمون انگریزی کتاب "جاپان" سے ماخوذ ہے)

ہمارے پیارے بھائی بہنو۔ تم نے جاپان کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ یوں تو اس ملک کی بہت ساری چیزیں بیان کرنے کے قابل ہیں لیکن آج ہم تمھیں جاپانی طالب علموں کا کچھ حال سناتے ہیں۔ جس طرح کسی ملک کی ترقی میں نوجوانوں کو بہت دخل ہوتا ہے اسی طرح جاپان کی ترقی میں وہاں کے طلبا کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

جاپانی طلبا کو تمھاری طرح تحتانی جماعتیں ختم کرنے کے بعد وسطانی درجے میں قدم رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن انھیں تمھاری نسبت زیادہ مدت گزارنی پڑتی ہے۔ اگر تمھیں صرف چار سال کے بعد طبقۂ وسطانیہ میں شرکت کی اجازت مل جاتی ہے تو جاپانی طلبا کو چھ سال تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے۔

وسطانی تعلیم کے بعد طلبہ کی کثیر تعداد صنعتی مدارس میں شریک ہو جاتی ہے۔ تم نے اپنے بزرگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ جاپان ایک صنعتی ملک ہے۔ اور خود تم بھی اپنی ضرورت کی بہت سی چیزیں جاپان کی بنی ہوئی خریدتے ہو۔ جدھر دیکھو جاپانی مال کی کھپت ہے۔ یہ سب کچھ ان محنتی طلبہ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

بعض طلبا ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہ فوقانی جماعتوں میں شریک ہو کر آئندہ تعلیم جاری رکھتے ہیں اور چھ سات سال کے بعد انھیں دستارِ فضیلت مل جاتی ہے۔

بھائی اور بہنو! تم نے دیکھا جاپانی طلبا کی مدتِ تعلیم بہت طویل ہے۔ لیکن طلبا بہت ہی سرگرمی سے محنت کرتے ہیں اور نہایت ہنسی خوشی سے زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ہماری طرح یہ تعلیم پانے کے بعد ملک و قوم کے لئے وبال نہیں بن جاتے بلکہ اپنی روزی آپ کما سکتے ہیں۔

جاپان کے مدرسوں کا آغاز انگریزی مہینے اپریل سے ہوتا ہے۔ یہ دن بہار کے ہوتے ہیں۔ پُر لطف موسم میں سکورا کے پھولوں کا منظر قابلِ دید ہوتا ہے۔ سکورا جاپانیوں کا بہت ہی عزیز پھول ہے۔ جس طرح ہم گلاب کے پھول پر جان دیتے ہیں سکورا بھی جاپانیوں کا بہت ہی چہیتا پھول ہے۔ کوئی گھر ایسا نہیں ہوتا جہاں سکورا کے پودے نہ لگے ہوں، کیا غریب اور کیا امیر سب ہی چمن بندی سے دلی لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان کے چمن

کی نوعیت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ طلبہ اپنا فالتو وقت
ایسے کاموں میں ہی صرف کرتے ہیں۔ بالکل تمھاری
طرح ان کا بھی پہلی میقات کے ختم پر سہ ماہی امتحان ہوتا
ہے۔ یہ زمانہ بارش کا ہوتا ہے۔ سب پڑھنے میں مصروف
دکھائی دیتے ہیں۔

سب رسی بھائیو! تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ گرما کی
ہم کو بھی چھٹیاں ملتی ہیں۔ لیکن نہ تو ہمارے ہاں کوئی
نظام نامہ ہی ہوتا ہے۔ اور نہ جاپانیوں کا سا اہتمام یہی
جدھر بن پڑے چل کھڑے ہوئے۔ اور کسی نہ کسی طرح
چھٹیاں گزار دیتے ہیں اور کتنے ہم میں سے گھر گھسنے
ایسے ہیں جو کہیں جانا تو کجا شہر ہی کی بہت ساری
تاریخی یادگاروں سے ناواقف ہیں۔

گرما میں طلبا پہاڑیوں پر چڑھتے ہیں۔ اور
بعض ٹولیاں پیدل سفر بھی کرتی ہیں یہ ان کا بہت ہی
دلچسپ مشغلہ ہے۔ جاپانی طلبہ سفر کے حالات قلمبند
کرتے ہیں اور لوٹنے پر اپنے دوست احباب
کو ان سے مستفید ہونے کا موقع دیتے ہیں بلکہ کئی کئی دن
تک ایسی تقاریر کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے جس میں طلبہ
اپنے سفر کے حالات اپنے دوستوں کو سناتے ہیں۔ یہی چیزیں
ہیں جن کے باعث جاپانیوں نے اتنی ترقی کی ہے۔

جاپانی طلبا کی اکثر جماعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو
ساحلی علاقوں کی سیر و تفریح کے لئے چھٹیوں کو وقف
کر دیتی ہیں۔ اور قدرتی مناظر کا لطف اٹھاتی ہیں پیراکی
ان کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں دوش
بدوش کشتی چلانے اور پیراکی میں حصہ لیتی ہیں۔

غالباً تم بھی اچھی طرح واقف ہو کہ بعض طلبہ
کے والدین بہت غریب ہوتے ہیں اور ان طلبہ کو اپنی کفالت
آپ کرنی پڑتی ہے۔ ایسے طلبہ ان چھٹیوں میں اپنے
والدین کا بھی ہاتھ بٹاتے ہیں۔ ایسے طلبہ کی جاپان میں
بہت بڑی تعداد ہے۔ آفریں ہے ان کی قومی خودداری
کہ طرح طرح کی تکلیفیں اٹھانے کے باوجود کسی کے آگے
دستِ سوال نہیں پھیلاتے۔

جاپانی طلبہ کے اکتسابِ علمی کا یہ عالم ہے کہ وہ گرمیوں
کی چھٹیوں میں غیر ملکوں کی زبانوں اور نئے نئے علوم
و فنون کے حاصل کرنے میں سخت محنت کرتے ہیں۔ تم نے
دیکھا جاپانی طلبہ کی چھٹیاں کتنی دلچسپ ہوتی ہیں۔
تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ تو ان ملکوں کی بات ہے۔
جو ہم سے ترقی میں بہت آگے ہیں۔ ہندوستان
بھلا ان کی برابری کیا کرے۔ نہیں! ان سے زیادہ
ترقی کے تمھیں مواقع حاصل ہیں۔ اگر چاہو تو وہ سب کچھ
کر سکتے ہو جو ناممکن ہے۔

اچھا تو اب ذرا مدرسے کھلنے کے بعد کا حال سنو۔
ستمبر کے مہینے میں پھر مدرسے کھل جاتے ہیں۔ طلبا ایک
دوسرے سے اپنی اپنی گرما کی مصروفیتوں کے قصے
سناتے دکھائی دیتے ہیں۔ اچھی اچھی تقریریں سننے میں
آتی ہیں۔ تقریر کا جاپان میں خاصہ اہتمام کیا جاتا ہے۔
خود طلبہ بھی تقریر کرتے اور دوسرے بزرگوں کی
تقریریں سنتے ہیں۔

تم نے سنا ہوگا کہ اکثر ملکوں میں فوجی تعلیم بھی دی
جاتی ہے۔ جاپان بھی ان ہی ملکوں میں سے ہے۔

جاپانی طلبہ ایک ایک ہفتہ کے لئے سپاہی بن جاتے ہیں
اور وہ شہروں کو چھوڑ کر چھاؤنیوں میں چلے جاتے
ہیں۔ اور بہت ہی محنت اور جانفشانی سے فوجی قواعد
سیکھتے ہیں۔ فوجی تعلیم میں یوں تو بہت سے فوائد ہیں
جن میں دو بہت ہی اہم ہیں ایک تو اس سے ملک میں خاصی
حفاظت ہوتی ہے اور دوسرے خود ان کی اپنی جسمانی
صحت اچھی رہتی ہے۔

ہر ملک و قوم نے ایک دن قومی عید کے
لئے مقرر کیا ہے۔ جس طرح ہم پہلی
آذر کو اپنے ہاں قومی عید مناتے ہیں، جاپانیوں
کے ہاں بھی عید نوروز سرما کے دنوں میں منائی
جاتی ہے۔ شہر ہو کہ گاؤں ہر جگہ چہل پہل نظر آتی
ہے۔ اور دوست احباب ایک دوسرے کو مبارکباد
کے کارڈ اور تحفے تحائف دیتے ہیں۔ اس عید نوروز
میں بلالحاظ مذہب و ملت سب ہی شریک ہوتے ہیں۔
تحفے بھیجنے میں ایک لحاظ ضرور کیا جاتا ہے۔ یعنی جو چیز
بطور تحفہ بھیجی جاتی ہے یا تو وہ ان کی اپنی بنائی ہوئی
ہوتی ہے ورنہ ملکی ضرور ہوگی۔

دیکھا ترقی کس طرح کی جاتی ہے۔ اسی مستقل مزاجی
نے انسان کو پستی سے نکال کر بلندی پر پہنچا دیا۔ جاپان
جس کی کہ آج ہم اس قدر تعریف کر رہے ہیں۔
کچھ دن پہلے ایک معمولی جزیرہ تھا۔ اگر تم بھی چاہتے
ہو کہ ترقی یافتہ اقوام کی صف میں اپنے لئے جگہ بناؤ
تو اپنے حوصلوں کو بلند کرو اور کوشش کئے جاؤ۔ دنیا
میں کام کا ہی بول بالا ہے۔ وہی کچھ پاتا ہے جو کچھ
کرنا چاہتا ہے۔

شیخ رحیم الدین (ظہیرآبادی)

ہمارے مولوی صاحب

جب کبھی ہم لوگ آپس میں گفتگو کرتے کرتے تعلیم و
استاد کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں تو یقین جانئے کہ ہمارے جسم
میں ایک برقی لہر سی دوڑ جاتی ہے اور وہ تمام مناظر آنکھوں
کے سامنے پھر ناچنے شروع ہو جاتے ہیں جب کہ ہم لوگ گھر پر تعلیم
پاتے تھے۔ اباجان نے ہماری تعلیم کے لئے ایک "استاد" کو
مقرر کیا تھا۔ استاد کیا تھے سچ مانئے جلاد تھے جلاد —
ہم لوگوں کی روح ان سے کانپ جاتی تھی — ہر روز
دعا مانگتے تھے کہ خدا اس استاد سے نجات دلائے —

استاد صاحب روز آنہ ایک موٹی بید کے ساتھ تشریف
لاتے تھے ان کا رعب ہی کیا کم تھا مگر بید کی ہمراہی ان کو آتے
دیکھ کر ہم لوگوں کے ہوش و حواس کا جنازہ نکل جاتا تھا۔ ذرا سی
آواز ہوئی اور ایک طمانچہ پڑ گیا۔ پڑھتے پڑھتے ذرا رکے اور چپت
سی پڑی۔ ذرا غلطی ہوئی اور ایک "دست کان گرفتی" —
بہر حال استاد صاحب کی موجودگی میں ہم پر جو گزرتی تھی وہ ہم جانتے
ہیں اور ہمارا دل —

ایک روز کا ذکر ہے کہ ہمارے بڑے بھائی نے "ہوم ورک"
نہیں کیا اور جب حضرت کے آنے کی اطلاع ملی تو سب میں پہلے تعظیم زمی
کر کے بڑے دور دور سے ہی سلام میں نہایت بندگی کرتے ہوئے
کہے "آداب ڈیٹ"۔ (آداب حضرت) "آداب" مولوی صاحب نے
منہ کھیر کے جواب دیا — "ڈیٹ آج ہمرال ڈبلا کا ہوم ہوٹ
نہیں ٹلے"۔ (حضرت آج ہم الجبرا کا ہوم ورک نہیں کرے) —

"کیوں نہیں کیا" مولوی صاحب نے سخت لہجے میں کہا — "پاپی شوڈ ٹی ڈٹ" (کاپی کھو گئی حضرت) "جھوٹ، بالکل جھوٹ، کاپی خود چھپا دیا اور جھوٹ کہہ رہا ہے۔ ذرا اندر دیکھ تو آ" — حضرت نے کہا — قسمت کے مارے بڑے بھائی آگئے بڑے تو استاد نے اس بے رحمی سے ان کا کان مروڑا کہ بے چارے "مل ڈیا ہٹ" (مر گیا حضرت) کہتے ہوئے تڑپنے لگے۔

چھوٹے بھائی جان جو ذرا دلیر تھے سبق میں رکنے لگے کیونکہ انھوں نے سبق برابر یاد نہ کیا تھا، اس کی سزا میں مولوی صاحب نے ان کی دونوں انگلیوں کے درمیان قلم رکھ کر اس زور سے دبایا کہ "اماں ڈان بچاؤ — اماں ڈان بچاؤ" (اماں جان بچاؤ) کہتے ہوئے اچھلنے لگے —

بڑی آپا ہماری پٹتی ضرور تھیں مگر ہم سے کم — ہم لوگوں کے دل میں مولوی صاحب کا رعب اور خوف اتنا بیٹھ گیا تھا کہ نیند سے چونک چونک کر اٹھتے تھے — ایک مرتبہ بڑی آپا دوپہر میں سو گئی تھیں کہ اتنے میں "مولوی صاحب" تشریف لائے — چھوکری نے جگایا، بے چاری نیند میں سے چونک کر اٹھیں اور حواس باختہ ہو کر ہیبت میں بجائے کتابوں کے "بیگ" کے سرہانے کا تکیہ لئے ہوئے سیدھے جلدی جلدی مولوی صاحب کے پاس گئیں، بندگی کر کے بیٹھ گئیں اور تکیہ کو میز پر رکھ دیا۔ "یہ کیا ہے" مولوی صاحب نے بری صورت بناتے ہوئے کہا "جی کتابوں کا "بیگ" ہے مولوی صاحب" بڑی آپا نے کہا "بیگ ہے، دیکھ آنکھیں کھول کر دیکھ" — بڑی آپا نے اب جو دیکھا تو روح فنا ہو گئی کیونکہ کتابوں کے بیگ کی بجائے بڑی آپا نے "تکیہ" اٹھا لایا تھا — "قصور ہو گیا حضرت معاف کر دیجئے" اتنا کہنے پر بھی تو مولوی صاحب کو رحم آیا اور غصہ اترا، انھوں نے اسی تکیہ سے بڑی آپا کے سر پر تین چار رسید کئے۔ آپا بلبلا رہی تھیں۔

اب میری کہانی بھی سن لیجئے۔ میں فطرتی طور سے کم گو واقع ہوئی تھی۔ چونکہ میں ان سب سے چھوٹی ہوں اس لئے مولوی صاحب کو خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ وہ مجھ پر سختی نہ کریں۔ مولوی صاحب کے سامنے میں منہ سے ایک حرف تک نہیں نکالتی تھی، جو کچھ وہ کہتے میں سن لیتی ہوں۔ لیکن کبھی منہ سے ایک لفظ نہ دہراتی، مولوی صاحب نے مجھے کئی مرتبہ کہا کہ اگر میں صرف ایک لفظ کہوں تو وہ مجھ کو اس دن کی پڑھائی معاف کر کے چھٹی دے دیں گے، وہ لاکھ لالچ دیتے لیکن میں بالکل خاموش رہتی تھی — بعض اوقات تنگ آ کر وہ مجھ کو کان گوشی دیتے، لیکن میں صبر کرتی اور پھر خاموش رہتی — اس طرح کئی دن گزر گئے۔ ایک روز انھوں نے مجھ سے کہا کہ اگر میں اب نہ بولوں تو میرا منہ جلا دیا جائے گا۔ لیکن میں پھر بھی خاموش تھی — مولوی صاحب نے اندر سے آگ کی ایک ڈلی منگوائی اور اس کو پھونکنا شروع کیا اور جب وہ بالکل سرخ ہو گئی تو میرے منہ کے قریب لے آئے، اب تو میرے اوسان جاتے رہے، لاکھ ضبط کی لیکن میرے سے بے اختیار نکلا "اللہ مر گئی" اتنا کہا اور کرسی چھوڑ کر اندر ایسا بھاگی کہ پھر مولوی صاحب نے لاکھ کوشش کی لیکن باہر نہ آئی —

والد مجھے بے حد چاہتے تھے، میں نے مولوی صاحب کی شکایت کی، میرے ساتھ بڑے بھائی جان اور بڑی آپا نے بھی ہمنوائی کی، تو وہ بے حد متاثر ہوئے اور مولوی صاحب کو ہمیشہ کے لئے رخصت کر دیا گیا۔ جس دن مولوی صاحب کو علحدہ کر دیا گیا اس دن بڑی اطمینان کی نیند آئی ہے۔ اتنی مدت گزر گئی ہو، خدا بخشے مولوی صاحب کا انتقال ہوئے چار سال ہو چکے ہیں لیکن جب کبھی ان کا خیال آتا ہے کلیجہ کانپ اٹھتا ہے۔

اسد احمد زبیری

کابلی والا

میری پانچ سالہ منی بغیر بک بک کئے خاموش نہیں رہتی۔ میری تو یہ حالت ہے کہ اگر کبھی خلاف معمول اس کو خاموش دیکھتا ہوں تو دل میں ہلکا سا اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے وقت میں خود چھیڑ چھیڑ کر سوالات کیا کرتا ہوں۔

ایک دن صبح کو میں حسب معمول ناول کے لکھنے میں نہایت سرگرمی کے ساتھ مستغرق تھا۔ یکایک اس نے بلند آواز کے ساتھ میوہ فروش کو آواز دی۔ اس سے مجھے بڑی تکلیف محسوس ہوئی اور میرا دماغ اور خیالات منتشر ہو گئے۔ میں نے دریچہ سے دیکھا رحمن نامی کابل کا رہنے والا میوہ فروش گزر رہا تھا۔ جوں ہی وہ اندر داخل ہوا منی اسے دیکھ کر پریشان و سراسیمہ اندر چلی گئی اور اپنی ماں کے آنچل میں پناہ گزیں ہوئی۔ مجھے چند قسم کے میوے خریدنے بغیر نہ پڑا۔ اس نے مجھ سے پوچھا "آپ کی لڑکی کہاں ہے؟ کیا وہ مجھے دیکھ کر گھبرا گئی ہیں؟" یہ سن کر میں بو تفکر میں ڈوب گیا۔ جس طرح چھونوں سے پانی ابلا کرتا ہے اسی طرح میرے دل میں خیالات پیدا ہونے لگے کہ کہیں اس کے دل پر ہمیشہ کے لئے کابل والے کا رعب نہ چھا جائے۔ میں نے منی کو جبراً اندر سے اپنے ساتھ لے آیا۔

وہ گھبرا گئی۔ ڈرتی ہوئی میری کرسی کے قریب کھڑی تھی۔ اس نے استعجاب کی نگاہوں سے رحمن اور اس کے تھیلے کی طرف نظر دوڑائی۔ میں نے نہایت حزم و احتیاط سے رحمن کے چہرے پر پیدا ہونے والے تاثرات کا مطالعہ کیا۔ رحمن نے منقّٰی اخروٹ اور بادام اس کے سامنے پیش کئے۔ لیکن منی نے اس کا ہدیہ قبول نہ کیا۔ میرے قریب تر آگئی۔ یہ تھی ان دونوں کی پہلی ملاقات۔

۲

کچھ دنوں بعد منی اس سے ایسی مانوس ہو گئی گویا برسوں کی جان پہچان تھی۔ ان دونوں کا آپس میں مذاق ہوا کرتا تھا اور دونوں ہشاش بشاش رہتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں باہم ایک دوسرے کی صحبت سے نہایت خوش تھے۔

اسی طرح سے دن گزرتے گئے — ان کی روز افزوں محبت کو دیکھ کر میرے دل میں پریم کی لہریں اٹھنے لگیں۔

ایک دن صبح کو میں نے دریچہ سے دیکھا کہ رحمن پولیس کے سپاہیوں سے گھرا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہتکڑیوں سے جکڑے ہوئے ہیں۔ استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ اس نے کسی کو ضرب شدید پہنچایا۔ منی نے حسب معمول دلفریب تبسم کے ساتھ اسے دیکھا۔ اس واقعہ کے بعد ان دونوں کی ملاقات قطعی طور پر بند ہو جاتی ہے کیونکہ اس کو آٹھ سال کی قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ طویل مدت کی وجہ سے میرے ذہن سے رحمن کا خیال کلی طور پر نکل گیا اور منی نے بھی اسے بالکل فراموش کر دیا۔ اس طرح آٹھ سال گزر گئے۔

۳

منی کی آج شادی ہونے والی تھی۔ اس کے بیاہ کا دن تھا۔ صبح سے بارش ہو رہی تھی۔ میں ضروری انتظامات میں مشغول تھا۔ یکایک رحمن بیرونی کمرے میں داخل ہوا اور مجھے مودبانہ سلام کیا۔ اس کی عمومی ہیئت کو دیکھ کر میں پہچان نہ سکا۔ اس نے کچھ تبسم کیا۔ تب میں نے اسے غور کرنے کے بعد پہچانا۔ خواب کی طرح ایک تبدیلی آگئی۔ گزشتہ واقعات کی یاد کے سوا اب میرے پاس کچھ نہ تھا۔ میں نے پوچھا "تم یہاں کب آئے؟" اس نے جواب دیا "مجھے کل شام کو قید خانہ سے نجات ملی اور اب یہاں آیا ہوں۔"

اس جملے نے میرے دل پر نشتر کا کام کیا۔ ایسے خوشی کے موقع پر ایک ایسے شخص کا آنا کہ جو قید سے نکلا ہوا اچھا گمان اور نیک فال نہ تھا۔ میں نے اس سے کہا "آج میری لڑکی کی شادی رچی ہے تم کسی اور وقت آنا!" آنسو کے چند قطرے دل کی گہرائیوں سے اٹھ کر اس کی آنکھوں میں جمع ہو گئے۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر پوچھا "کیا آپ اپنی لڑکی کو ایک منٹ کے لئے بھی یہاں نہیں بھیج سکتے؟" شاید رحمٰن یہ سمجھ رہا تھا کہ منی ابھی چھوٹی سی ہو گی۔ میں نے اسے صاف کہہ دیا "منی کسی طرح سے بھی یہاں نہیں آسکتی" رحمٰن مایوس ہو گیا۔ اس کی آنکھیں پر آب ہو گئیں اور اسی سے چہرہ اترنے لگا۔ اس نے عاجزانہ میری طرف نظر دوڑائی اور "خدا حافظ" کہتا ہوا کبیدہ خاطر ہو کر میرے کمرے سے نکل گیا۔ میرا دل بھر آیا۔ پھر وہ دوبارہ واپس آیا۔ مجھے کاغذ کا ایک پوڑا بتاتے ہوئے کہا "میں یہ چیزیں منی کے لئے لائی ہیں۔ آپ کی لڑکی کی ہمعمر میری بھی ایک لڑکی ہے جو اپنی ماں کے پاس میرے وطن میں ہے۔ جب کبھی مجھے اپنی لڑکی کی یاد بے چین کرتی تھی میں یہاں آجایا کرتا تھا" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک لمبی سانس لی۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا کہ

ایسی بے مروتی برتنا کس قدر معیوب ہے۔ میں فوراً منی کو اپنے ساتھ لے آیا۔ عورتیں منع کرتی رہیں لیکن میں نے ایک نہ سنی۔ منی عروسانہ لباس پہنی ہوئی تھی۔ جوانی خوب نکھری تھی۔ اس کے چہرے پر شرم سے پسینہ آگیا۔ شرما کر نیچی نظریں کئے کھڑی رہی۔ رحمٰن کسی حواس باختہ کی طرح گم سم ہو کر منی کی طرف دیکھنے لگا۔ تھوڑے تامل کے بعد مسکرا کر پوچھا "کیا تم اپنے سسرال کے یہاں جلد ہی ہو؟"

معاً میرے دل و دماغ کو ان دونوں کی محبت اور ملاقات کے گزشتہ واقعات نے پراگندہ کر دیا۔ وہ کئی آرزوئیں اور خیالات کو اپنے دل میں مہمان بنا رہا تھا۔ کبھی تو خیال کرتا کہ میری لڑکی بھی شاید اس عمر کو پہنچ چکی ہو۔ کبھی یہ خیال اس کو پریشان کر رہا تھا کہ معلوم نہیں اتنے طویل عرصہ میں اس پر کیا گزری ہو گی؟

شادیانے بجنے لگے، جوتی آنے لگے، ہر شخص شاداں و فرحاں نظر آرہا تھا۔ لیکن رنجور اور سوختہ جان رحمٰن ایک جگہ بیٹھا ہوا اپنے وطن کا تصور کر رہا تھا۔ میرا دل بے تاب ہو گیا۔ میرے دل میں اس کی طرف سے ہمدردی پیدا ہوئی۔ میں نے اسے دس روپیہ کے قیمت نوٹ دیتے ہوئے کہا "رحمٰن تم اپنے وطن جاؤ اور اپنی لڑکی سے ملو۔ تمہارا اپنی لڑکی سے ملنا میری منی کے لئے نیک گمان اور اچھا شگون ہو گا" خوشی کا ایک لطیف جذبہ مجھ پر طاری ہوا۔ میں نے راحت کا تسکین بخش اثر اپنے میں محسوس کیا۔ ایسے وقت میں ہر چیز روحانی کیف اور سرور سے لبریز نظر آرہی تھی۔ اس وقت کی خوشی اور مسرت کا حال کوئی میرے دل سے پوچھے کہ بانسوں اچھل رہا تھا۔

(ٹیگور) (ترجمہ)

مس زیبا حمید

سب رس

نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۴)
نشان ٹپہ برطانیہ (M3950)

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش   سکینہ بیگم

خواجہ حمید الدین شاہد   معین الدین احمد انصاری

جلد (۲) شمارہ (۱۰)   اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء

(فہرست مضامین)

سب رس اور بچوں کا سب رس دونوں رسالے ہر عیسوی مہینے کی پہلی کو شائع ہو کر ایک ہفتہ کے اندر اندر ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیئے۔ ورنہ دفتر پر ذمہ داری نہ رہے گی۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

سب رس کی قیمت چار روپے سالانہ اور محصول ڈاک کے ساتھ ۴ر ملعہ

بچوں کے سب رس کی قیمت ایک روپیہ سالانہ۔ اور محصول ڈاک کے ساتھ ۱ر عصہ

سب رس کتاب گھر اور ادارہ ادبیات اردو کی مطبوعات کی فہرست ار کا ٹکٹ پر مفت ارسال کیجاتی ہے

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے عہد آفریں پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

ادارئیہ

سب رس کے مضامین نظم و نثر کا معیار بے حد مقبول ہوتا جارہا ہے۔ اس نے اپنی اصلی خصوصیتیں باقی رکھیں اور ظاہری و معنوی خوبیوں میں برابر اضافہ کر رہا ہے۔ اس کامیابی کا سہرا سب سے زیادہ ہمارے قلمی معاونوں کے سر ہے جن کا شکریہ ہم کسی طرح بھی ادا نہیں کرسکتے۔ البتہ ہمیں اس امر کا اعتراف ہے کہ بعض اصحاب کو اپنے رشحات قلم کی اشاعت کے لئے دیر تک منتظر رہنا پڑتا ہے جس کے لئے معذرت چاہنے کے سوا ہم سے کچھ بن نہیں پڑتا۔ کیونکہ اس امر کی کوشش کے باوجود کہ ہر ماہ زیادہ سے زیادہ مضامین شامل ہوسکیں ہمیں اپنے ارادے میں ناکامی ہوتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ جتنے زیادہ جتنے دلچسپ اور جتنے متنوع مضامین سب رس میں چھپتے ہیں اردو کے کسی رسالے میں نہیں چھپتے۔ یہ فطرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مضامین نظم و نثر شایع کرنے کے اس ارادے میں (جنگ کی وجہ سے) کاغذ کی قیمت کا حیرت انگیز اضافہ بھی خلل ڈالتا نظر آتا ہے مگر ہم برابر کوشش کریں گے کہ رسالہ کی ضخامت میں غیر معمولی کمی نہ ہونے پائے۔

مذہبی مضامین اور نظمیں

اس موقعہ پر ہمیں یہ بات پھر کہہ دینی ہے کہ سب رس محض ایک ادبی رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مضمون اور نظمیں کم جگہ پاتی ہیں۔ اس لئے بھیجنے کی زحمت گوارا نہ کریں۔

ادارہ کا کتب خانہ

نواب سیف علی خاں صاحب ناظم اعلیٰ اطلاع دیتے ہیں کہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں اردو رسالوں کے فائل کی تکمیل کے سلسلہ میں حسب ذیل حضرات نے [illegible]

مولوی سید یوسف علی صاحب معتمد مجلس دستوری پیام تعلیم ۲ عدد۔ مجلہ نظامیہ ۱۷ پھلجڑی ۱۔ ارشاد ۵۔ پھول ۱۔ اسلامی دنیا ۲۔ عارف ۲۔ الاعظم ۱۔

پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری۔ نگار ۴۳۔ شہاب ۴۸ جامعہ ۱۷۔ خیابان ۹۔ آئینۂ ادب ۹۔ الناظر ۴۔ ارتقا ۳۔ کتبیہ ۴۔ زبان ۸۔ معارف ۲۔ سالنامہ سٹی کالج ۲۔ تحفہ ۳۔ شاہکار ۲۔ تنظیم ۱۔ چمنستان ۲ عصمت ۱۔ انیس النساء ۱۔ نیرنگ خیال ۱۔ حسن کار ۲ سالگرہ نمبر صبح دکن ۲۔ سالگرہ نمبر رہبر دکن ۱۔

مولوی سید خواجہ صاحب وکیل نے اردو اور فارسی کی قلمی اور مطبوعہ کتابیں عنایت کی ہیں جن کے منتشر صفحات کو مرتب کیا جارہا ہے جس کے بعد ان کی فہرست بھی شایع کی جائے گی۔

مولوی خواجہ عبدالعزیز صاحب رکن ہائی کورٹ نے بھی ادارہ کو کئی نسخوں سراج نامہ بلاقی اور وفات نامہ کے قدیم قلمی نسخے عنایت کئے ہیں۔ ادارہ ان سب اصحاب کا شکرگزار ہے اور متوقع ہے کہ دوسرے علم دوست بھی اسی طرح اپنے مطبوعہ ادارہ کے کتب خانہ کی تکمیل میں مدد دیں گے جہاں ان کی کتابیں خاص احتیاط اور تنظیم کے ساتھ محفوظ رہیں گی اور عطیوں کے نام فہرست کتب میں شایع ہوتے رہیں گے۔

شعبۂ نسواں

آٹھواں اجلاس ۱۰ ستمبر کو ہوا جس میں ابو بیگم صاحبہ جہاں بانو بیگم صاحبہ امۃ [illegible] بشیر النساء [illegible] صاحبہ [illegible] صاحبہ اور [illegible] بیگم صاحبہ معتمد شعبہ نے شرکت کی۔ [illegible] شعبہ نے بحیثیت خازن [illegible] شعبہ [illegible] میں نواب [illegible] [illegible]

[illegible] فیاض الدین صاحب [illegible]

استفسار کرنے کے تصفیے ہوئے۔ شعبہ کا اجلاس عام شوال کے پہلے یا دوسرے ہفتہ میں منعقد کرنے پر غور کیا گیا۔

شعبۂ شعرا و مصنفین دکن نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز، ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری، مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی، اور مولوی سید محمد صاحب معتمد شعبہ نے شرکت کی۔ اس میں شاہ سراج کے گنبد کی مرمت اور کتبے کی تنصیب صوبہ دار صاحب اورنگ آباد کی طرف سے کئے جانے کی اطلاع دی گئی اور طے پایا کہ حضرت توفیق کے مزار پر کتبہ لگانے کے بارے میں مرحوم کے فرزند توصیف صاحب سے مراسلت کی جائے۔ مرقع سخن کی طرز پر ۳۰ نثر نویسوں کا ایک تذکرہ مرقع نثر کے نام سے شایع کیا جائے جس کی عام ترتیب کا کام مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کے سپرد ہو۔ مرقع سخن جلد (۳) کے لئے (۵۰) شاعروں کا انتخاب کیا جائے۔

شعبۂ تاریخ دکن پروفیسر سراج الدین صاحب، ڈاکٹر زور، اور عبد المجید صدیقی صاحب معتمد نے شرکت کی۔ بارش کی وجہ سے دوسرے اصحاب شریک نہ ہو سکے۔ پروفیسر سراج الدین صاحب نے سلسلہ آصفیہ کے تیسرے رسالے کی تالیف کا ذمہ لیا جس میں حضرت مغفرت منزل سکندر جاہ بہادر کے حالات درج ہوں گے۔

نے قلعے کے معائنے کی رپورٹ معتمد صاحب نے سنائی اور طے پایا کہ سب رس میں اشاعت کے لئے روانہ کی جائے۔ منصور آباد کی سیاحت کا تصفیہ ہوا۔

شعبۂ تالیف و ترجمہ پروفیسر سید فضل حق صاحب ایم اے ڈاکٹر قاضی معین الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی، مولوی فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ، ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری، مولوی عبد القیوم خاں صاحب باقی ایم اے، مولوی میر حسن صاحب ایم اے اور ظہیر الدین احمد صاحب ایم ایس سی اس معتمد نے شرکت کی۔ متذکرہ اصحاب کے علاوہ مولوی ابو الفضل صاحب ایم اے اور مولوی شاہ محمد صاحب ایم ایس سی کو اس شعبہ کا رکن منتخب کیا گیا جسب ذیل امور طے پائے۔ بچوں کے لئے ہندوستان کے بڑے آدمی کا جو سلسلہ لکھا جا رہا ہے اس کی ہر کتاب میں فی الحال کم سے کم چار اکابر کے حالات ہوں گے اور انتظام کیا جائے کہ ہر ایک کے حالات علحدہ بھی فروخت ہو سکیں (۲) مولوی باقی صاحب نے ادارہ کا چوتھائی حصہ، مولوی ظہیر الدین احمد صاحب نے سیاسی کے اصول و مظاہر کا تین چوتھائی حصہ اور مولوی فیض محمد صاحب نے عماد الملک اور سالار جنگ کے سوانح کا جو ترجمہ کر لیا ہے اس پر نظر ثانی کرنے کے لئے مختلف اصحاب کے نام منتخب کئے گئے (۳) ڈاکٹر قاضی معین الدین صاحب "کیمیائی جنگ" ایک دلچسپ چھوٹی سی کتاب شعبہ کے لئے تالیف کریں گے (۴) مولوی ابو الفضل صاحب عربی مشاہیر پر مختصر کتابیں شعبہ کے لئے لکھ دیں۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل فہرست مرتب کی گئی۔

۱۔ ابو العلا المعری۔ ۲۔ امرا القیس۔ ۳۔ ابو فراس۔ ۴۔ متنبی۔ ۵۔ جریر و فرزدق
۶۔ اخطل و اعشی۔ ۷۔ ثعالبی۔ ۸۔ اغانی۔ ۹۔ حریری۔ ۱۰۔ ابو ریحان البیرونی
۱۱۔ ابن بطوطہ، ۱۲۔ ابن خلدون، ۱۳۔ فارابی ۱۴۔ ابن سینا، ۱۵۔ ابو بکر الرازی، ۱۶۔ جابر حیان، ۱۷۔ محمد بن موسی الخوارزمی
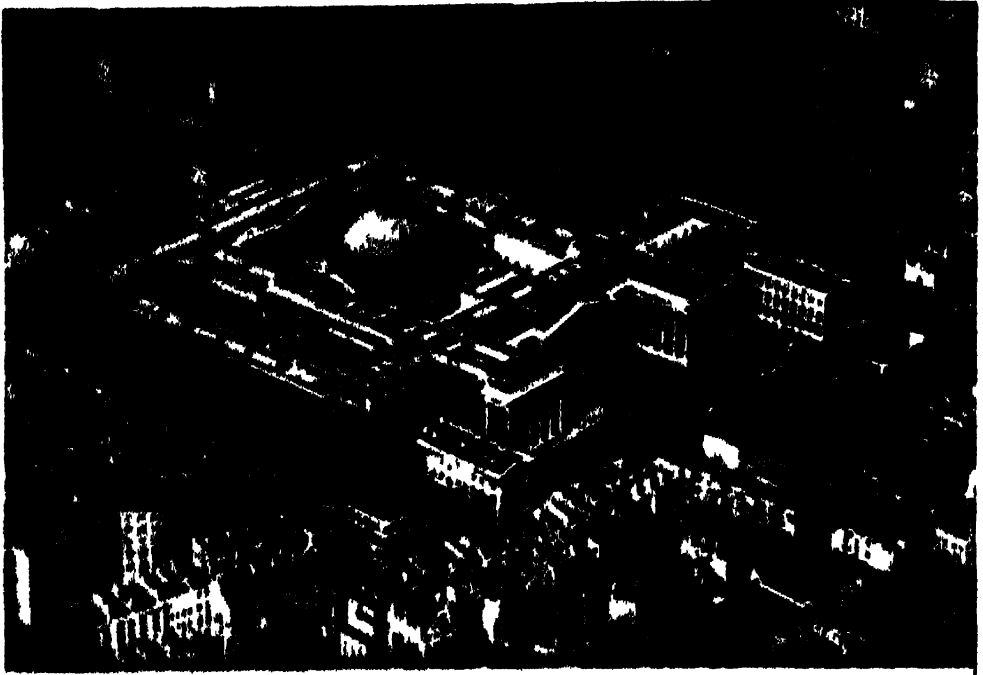
برٹش میوزیم لندن

جنم پتری

آئندہ زندگی یعنی ہونے والی باتوں کے بتانے والے مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک تو وہ ہیں جو تشی جی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے پاس چھپا ہوا سلیمانی سالنامہ یا پرانی کانپوری جنتری ہوتی ہے۔ ادھر آپ نے ایک پیسہ نذرانہ کتاب کے کسی خانہ پر رکھا اور ادھر انھوں نے جنتری کا ورق الٹ طوطے کی طرح قسمت کا حال بولنا شروع کر دیا۔ اب ہماری قسمت ہے جنتری میں جو نکل آئے۔

دوسرے وہ ہیں جو پامسٹ ہیں۔ ان کو گنوار "ہاتھ دیکھے" کہتے ہیں اور پڑھے لکھے دست بیں یا ماہر علم الید کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ لوگ تو لکیر کے فقیر ہیں۔ ہاتھ کی لکیروں کو ناخن سے کھرچ کھرچ کر دبے ہوئے قصے نکالتے ہیں اور ایسی ایسی باتیں بیان کرتے ہیں کہ سننے والا بھی سر کھجاتا ہے اور لکیر پیٹتا رہتا ہے۔

تیسرے رمّال اور جفّار ہیں جو پانسے پھینک کر خود کاغذ پر لکیریں کھینچتے ہیں اور ان لکیروں کو دیکھ کر اگلی پچھلی باتیں بتاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور بھی ہیں جو نجومی یا جوتشی کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ تو آسمان سے تارے توڑ لاتے ہیں۔ ذرا کوئی اپنی پیدائش کی تاریخ اور مہینہ بتا دے۔ بس یہ فوراً بول دیں گے کہ اس کا ستارہ آفتاب ہے یا ماہتاب، زہرہ ہے یا مریخ، عطارد ہے یا زحل۔ پھر حمل، ثور، سرطان اور اسد وغیرہ کی پیٹھ پر سے پھلانگتے ہوئے اس برج تک پہنچ جاتے ہیں، جس برج میں ان کا ستارہ ہے پھر ان بیل بکروں کو ایک جگہ جمع کر کے ابتدا سے انتہا تک پورے حالات بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ جن صاحب کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ وہ برا برا ہوں، ہوں کر کے واقعات کی تصدیق بھی کرتے رہتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان لوگوں میں سے بعض کو الٹپ بھی اڑا جاتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب صرف سر دیکھ کر زندگی بھر کے حالات بتایا کرتے تھے ایک روز کسی مشہور کرکٹ کھیلنے والے کے سر کا معائنہ کر کے ان کی زندگی کے حالات بتا رہے تھے۔ اتفاقاً اس کا ہاتھ سر کے اس حصہ پر جا پڑا جو ذرا ابھرا ہوا تھا۔ اس نے اچھی طرح سے ٹٹول ٹٹال کر کہا کہ دیکھیے جناب! ایک بات اور پتے کی کہتا ہوں۔ یہ غدود اس بات کی علامت ہے کہ آپ بچوں سے بہت محبت کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ ممکن ہے کہ آپ کی بات سچ ہو۔ مگر یہ تو وہ مقام ہے جہاں گذشتہ ہفتے ایک لڑکے کا کرکٹ بال میرے سر پر لگا تھا اور اس روز سے اب تک یہ حصہ پھولا ہوا ہے۔

یا یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ کسی صاحب نے اپنے لڑکے کو نجوم کی تعلیم دلوائی۔ جب وہ لکھ پڑھ کر فارغ ہوا تو باپ نے ایک چھلا اپنی مٹھی میں دبا کر پوچھا کہ اچھا بیٹا! اپنے نجوم کے حساب سے ذرا یہ تو بتاؤ کہ میری مٹھی میں کیا چیز ہے۔ لڑکے نے اصطرلاب ملایا اور بتاؤں کو اچھی طرح سے سوچ کر کہا کہ آپ کے ہاتھ میں کوئی گول چیز ہے۔ باپ نے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ لڑکے نے پھر کہا کہ دیکھئے اس کے بیچ میں ایک سوراخ بھی ہے۔ باپ نے کہا کہ یہ بھی ٹھیک ہے۔ پھر لڑکے نے دماغ پر زور ڈال کر کہا کہ دیکھئے اس کے نام کا پہلا حرف "چ" ہے چونکہ اس کے ہاتھ میں چھلا تھا۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوا اور کہا کہ شاباش بیٹا شاباش۔ بالکل سچ کہا،

اچھا اب آگے کا حرف بتاؤ۔ اس نے پھر دماغ لڑایا اور
کہا کہ ابا جان! اب آگے کا حرف بتلانے کی کیا ضرورت
ہے۔ میں آپ کو پورا نام ہی بتا دیتا ہوں۔ دیکھئے آپ کی
مٹھی میں چکی کا پاٹ ہے۔ باپ نے یہ بات سن کر بہت
افسوس کیا اور کہا کہ ہائے، تو نے سب کی کرائی
محنت پانی میں ڈبو دی۔

سچ تو یہ ہے کہ بقول شخصے ایک من علم کے لئے
دس من عقل کی ضرورت ہے۔ عقلمند آدمی بعض باتیں
ایسی کہہ جاتا ہے کہ بڑے بڑے عقلمند سن کر حیران
رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ مشہور بات ہے کہ محمود غزنوی
کا نجومی ایسے ایسے حکم لگاتا تھا کہ سننے والے دنگ
رہ جاتے تھے۔ مگر اس میں ایک بڑا عیب یہ تھا کہ
اوّل تو وہ بادشاہ سے بے تکلف ہو کر باتیں کرتا تھا
دوسرے اس کی مرضی کے خلاف مشورہ دیتا
تھا۔ اس لئے بادشاہ کو اس سے سخت نفرت
تھی۔ ایک روز محمود غزنوی کوٹھے پر بیٹھا ہوا تھا۔
اتفاقاً نجومی بھی حاضر ہوا اور لگا زمین و آسمان کے
قلابے ملانے۔ بادشاہ نے کہا کہ اچھا جا یہ تو بتاؤ کہ
اب میں یہاں سے اٹھ کر کس رستے سے باہر جاؤں گا۔
نجومی نے فوراً ستاروں کی ساعت اور کواکب کو تقویم کیا
اور جواب ایک کاغذ پر لکھ لفافہ میں بند کر کے ایک طرف
رکھ دیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ محل کی شرقی دیوار توڑ
دی جائے۔ فوراً دیوار توڑ دی گئی اور بادشاہ
اس رستے سے نکل کر باہر آگیا۔ مگر باہر آکر جو لفافہ
چاک کر کے دیکھا تو اس میں یہی لکھا ہوا تھا۔ بادشاہ
یہ دیکھ کر بہت جھنجلایا اور حکم دیا کہ نجومی کو کوٹھے سے
نیچے پھینک دیا جائے۔ حکم حاکم مرگ مفاجات۔ لوگوں نے
اسے ہانڈا ڈولی کر کے نیچے پھینک دیا مگر وہ کسی ایسی
چیز پر گرا کہ اسے مطلق کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ بادشاہ
نے کہا کہ کہو تمہیں یہ بات بھی پہلے سے معلوم تھی یا نہیں۔
نجومی نے فوراً اپنے غلام کو اشارہ کیا اور اس نے وہ
سربمہر تحریر بادشاہ کے حضور میں پیش کی جو نجومی نے
صبح اٹھتے ہی لکھ کر اسے دی تھی۔ بادشاہ نے مہر توڑ کر
لفافہ چاک کیا تو دیکھا کہ اس میں یہ تمام واقعات
تفصیل سے لکھے ہوئے ہیں۔ پھر تو بادشاہ کو بہت
تعجب ہوا اسے خلعت فاخرہ عطا فرمایا اور اس دن
سے اس کی بہت عزت کرنے لگا۔

بہرحال جنم پتری بنانے کے لئے نجوم یا جوتش
جاننے کی ضرورت ہے۔ اب جس نے آسمان کے سات
ستارے اور ستاروں کے مدار پر جو برج ہیں انھیں
اچھی طرح سے رٹ لیا تو سمجھ لو کہ وہ پاؤ جوتشی ہو گیا اور
اگر کسی نے ان کی سعادتیں، اثرات اور ان کا مطلب بھی
سمجھ لیا تو وہ آدھا جوتشی کہلانے کا مستحق ہو گیا۔ اب
آگے کوئی روک ٹوک نہیں۔ میدان صاف ہے یعنی پاؤ اور آدھے
جوتشی ہونے کے بعد ہم ہر وقت پون یا پورے جوتشی
ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

وہ سات ستاروں کے نام ہر جنتری اور ہر
جغرافیہ کی کتاب میں مل جاتے ہیں۔ جب وہ گردش
میں آتے ہیں تو ہماری تقدیر بھی گردش میں آجاتی
ہے اور جہاں ستارے پھرے تو ہماری تقدیر بھی
پھری۔ اسی طرح بارہ برج بھی ہیں۔ ان کی تفصیل بھی
ہر جنتری میں موجود ہے۔ اور تصویریں بھی بنادی گئی

ہیں۔ ایک برج کی شکل کیکڑے کی طرح ہے یاروں نے
اس کا نام سرطان رکھ دیا ہے۔ دوسرے برج کو دیکھو تو
معلوم ہوتا ہے کہ شیر کھڑا ہوا ہے اس لئے اس کا
نام اسد رکھ دیا ہے۔ اسی طرح دوسرے برجوں کے
نام ہیں۔ انھیں بارہ برجوں سے انسان کی روحانی،
جسمانی اور ذہنی قوتوں کا اندازہ کیا جاتا ہے اور
کیرکٹر یا سیرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔

آج کل رصدگاہوں میں اعلیٰ سے اعلیٰ قیمتی
سے قیمتی اور بہترین سے بہترین دوربینیں اور
آلات موجود ہیں مگر آج سے ہزارہا سال پیشتر
قدیم لوگوں نے جو ستاروں کے نام، ان کی جسامت
ان کی رفتار، ان کے اثرات اور دورے کی مدت
بتائی ہے اس کو اب تک لوگ بغیر کسی اعتراض کے
برابر مانتے چلے آرہے ہیں۔

یہی سات ستارے اور بارہ برج ہیں جن کی
مدد سے جنم پتریاں تیار کی جاتی ہیں۔ گذشتہ
اور آئندہ کے واقعات بتائے جاتے ہیں۔ نجومی
پیشین گوئیاں کرکے زمین و آسمان کے قلابے ملاتے
رہتے ہیں اور فلکیات کے ماہر بڑی بڑی دوربینیں آنکھوں
سے لگائے رات دن انھیں تکتے رہتے ہیں۔

سیاروں کے اثرات کے پرانے لوگ ہی قائل
نہیں تھے بلکہ آج کل بھی ہر شخص قائل ہے۔ چاند کے
اثرات جو دنیا پر ہوتے ہیں ان سے تقریباً ہر شخص واقف
ہے۔ سب جانتے ہیں کہ چاند کا اثر دماغ پر پڑتا ہے تو
دماغ کی قوت سلب ہو جاتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ
پندرھویں رات کا چاند جب ماہ کامل کی شکل اختیار
کر لیتا ہے تو سمندر میں جوار بھاٹا ہونے لگتا ہے۔ گہرے
سمندروں میں اس کی کشش کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ
دریا کی موجیں سمندر کی سطح سے بلند ہو کر طوفانی شکل
اختیار کر لیتی ہے۔ اسی طرح زمین کے اندر ایک ہلچل
کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور چاند سے متاثر
ہونے والے اجزا میں، چاند کی کشش سے تلاطم اور
زلزلہ برپا ہو جاتا ہے۔

بھلا چاند جو سب سے چھوٹا سیارہ ہے آئے دن
اس کے اثرات سمندروں کی موجوں پر، ٹھوس
زمین کے اندر اور انسان کے اعضائے رئیسہ پر
ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو پھر وہ سیارے
جو چاند سے ہزارہا گنا بڑے ہیں بھلا کیا کیا آفتیں
نہ ڈھاتے ہوں گے۔

قدیم لوگوں نے تو دین و دنیا کی ہر چیز کو انھیں سات
ستاروں پر تقسیم کر دیا ہے۔ اور سات عدد کو اس قدر
اہمیت دی ہے کہ ہر چیز انھیں سات اعداد پر منسوب
کر دی ہے۔ مثلاً زمین کے سات طبقے، سات آسمان،
سات سمندر، ہفت اقلیم، ہفت خط، ہفت قرأت،
ہفت زبان، سات رنگ۔ دنیا کے سات عجائبات ہفتے
کے سات دن وغیرہ۔

ہفتے کے سات دن جو مقرر ہیں وہ انھیں سات سیاروں کے نام
سے موسوم ہیں مثلاً اتوار کو ہندی میں روی وار اور انگریزی میں
سنڈے کہتے ہیں جس کے معنی ہیں آفتاب کا دن پیر کو سوموار
کہتے ہیں اور انگریزی میں منڈے یعنی مون ڈے جس کے معنی ہیں
چاند کا دن ہفتہ کو شنیوار یا سنیچر کہتے ہیں اور انگریزی
میں سیٹرڈے یعنی سیٹرنس ڈے جس کے معنی ہیں زحل کا دن

اور اسی طرح بقیہ اور دن بھی ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ ہر دن کا تعلق ایک ستارے سے ہے۔ گویا اس روز روئے زمین پر وہی ستارہ حکومت کرتا ہے جس ستارے کے نام سے وہ دن موسوم ہے۔

مختصر یہ کہ وقت، تاریخ، دن، مہینہ اور سال ان تمام کا تعلق انہیں سات ستاروں اور بارہ برجوں سے ہے، جب یہ ستارے گردش کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے کسی برج میں داخل ہوتے ہیں تو دنیا میں وہی اثرات ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں جو اس ستارے میں موجود ہیں۔ اس طرح دنیا کا ماحول کیفیت اور فضا بدلتی رہتی ہے اور جس طرح کہ ایک موسم میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے اسی طرح لوگوں کے عادات و اطوار، عام خیالات، دماغی کیفیتیں اور خواہشات میں بھی ایک زبردست تغیر پیدا ہو جاتا ہے خصوصاً وہ لوگ جو اس زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں ان میں تو وہ خصوصیات خاص طور پر موجود ہوتی ہیں جو اس برج اور ستارے میں پائے جاتے ہیں۔

اب جس طرح دنیا میں ہر چیز کا ایک مرتبہ اور سلسلہ کا نمبر ہے اسی طرح ہر شخص کا ایک ستارہ اور اس ستارے کا ایک مقررہ عدد ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کائنات کے کس شمار و قطار میں ہے۔ اس لئے اگر کسی کو اپنا عدد اور اپنے ساتھیوں کا عدد معلوم ہے تو وہ اپنی زندگی میں یکجہتی، ہم آہنگی اور سریلے نغمے پیدا کر سکتا ہے اور اپنے ہمنوا پردوں کو چھیڑ کر خوشی کے نغمے اور مسرت کے راگ پیدا کر سکتا ہے۔

یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جو شخص جس مہینے میں پیدا ہوتا ہے اس کا وہی ستارہ ہوتا ہے جو ستارہ اس زمانہ میں حکمراں ہے یا جو ستارہ اس زمانے کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے اور اس ستارے کا عدد خود اس شخص کا عدد ہے جو اس زمانہ میں پیدا ہوا ہے۔ یہ عدد اس کی زندگی کا آئینہ ہے جس سے اس کا مزاج، دماغی کیفیتیں، عام زندگی کے حالات، بیماریاں، مسعود و مبارک گھڑیاں اور اس کے دوست احباب کا پتہ نہایت آسانی سے چل سکتا ہے۔ (باقی آئندہ)

مرزا عصمت اللہ بیگ

رباعیات عمر خیام

(۱)

یہ دہر سرائے فانی ہے دروازے ہیں جس کے روز و شب
آئین یہاں کا ہنگامہ، دستور یہاں کا پیچ و تعب
ہر روز مسافر آتے ہیں دو چار گھڑی بس جاتے ہیں
اس کو نہ غریبوں کی پروا اس کو نہ سلاطیں سے مطلب

(۲)

ہے خندۂ گل درسِ عبرت، خونیں نوا اس کی سرخی
ہر غنچۂ گل میں پوشیدہ اک مہوش رفتہ کی شوخی
ہے سنبلِ پیچاں میں جو شکن وہ طرۂ لیلیٰ کی ہے پھبن
ہر سروِ چمن میں جلوہ فگن اک سرو سہی قد کی مستی

تاثراتِ سفرِ یورپ

(انگلستان ۱۵ جولائی تا ۱۱ اگست ۱۹۳۸ء)

پیرس سے ۱/۲ ۱۰ بجے صبح کے چلے ہوئے لندن تقریباً ۱/۲ ۴ بجے پہونچے۔ ڈوور پر انگلستان کے ساحل پر قدم رکھا۔ ہمارے پاسپورٹ دیکھے گئے اور محصول خانے میں ایک آدھ چیز کھلوائی گئی۔ یہاں ایک لطیفہ ہوا۔ ریل بھری ہوئی تھی۔ اور بیٹھنے کے ڈبے میں اتنی جگہ نہ تھی کہ ہمارا اسباب بھی ساتھ ہی رکھا جائے جس کی وجہ سے انگریز قلی نے اسباب ایک جگہ رکھا اور بٹھایا دوسری جگہ۔ میں نے اس سے کہیں یہ کہہ دیا کہ بھائی، کوئی صاحب ہماری چیزوں کو لے کر چمپت نہ ہو جائیں۔ یہ سنتے ہی قلی میری طرف مڑا اور انتہائی خودداری اور وقار سے جواب دیا - This is England - ان چار الفاظ سے انگریزی قوم کی خودداری اور ایمان داری کا پتہ لگتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس قلی کو اپنے ہم وطنوں پر کس قدر بھروسہ تھا کہ اس کو گوارا نہ ہوا کہ کوئی غیر ان کی بابت شبہہ بھی کرے۔ ریل بھی ٹھیک ۱/۲ ۴ بجے وکٹوریہ اسٹیشن میں داخل ہوئی اور ہم بالفعل برطانوی نوادرخانے کے قریب جہاں مجھے کام کرنا ہے امپیریل ہوٹل میں ٹھیر گئے۔ آفتاب تقریباً ۹-۱۵ پر غروب ہوا اور دن بجے رات تک روشنی رہی۔

دوسرا تمام دن مستقل مکان تلاش کرنے میں لگا۔

میرے عزیز دوست نواب ناظر یار جنگ بہادر نے اس مکان کا پتہ از راہِ عنایت مجھے بھیج دیا تھا جس میں سالِ گذشتہ وہ اور ان کی بیگم صاحبہ رہے تھے لیکن یہ میرے لئے بیکار تھا۔ اس لئے کہ یہ ہائی گیٹ میں واقع تھا جہاں سے نوادرخانہ پہونچنے کے لئے کم از کم آدھا گھنٹہ بلکہ اس سے بھی زیادہ درکار ہوتا۔ باوجود جولائی کے مہینے کے یہاں کا موسم بہت ہی سرد تھا اور لوگ کہتے ہیں کہ انگلستان میں مدت سے ایسی سرد گرمیاں نہیں پڑیں۔ اشیاء کی قیمت میں براعظم سے زیادہ گرانی ہے۔ روپیہ سستا اور چیزیں مہنگی ہیں۔ براعظم کے ہوٹلوں میں کمرہ کھانا سب فی کس بارہ پندرہ شلنگ سے زیادہ نہ ہوتا تھا، لیکن لندن میں کمرے اور صبح کے ناشتے ہی میں اتنا خرچ ہو جاتا تھا۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ جنگ کے بعد سے جنوبی اور مغربی یورپ کے تمام سکوں کی قیمت بڑھ گئی ہے اور معیاری سکے چاندی کے بجائے پیتل کے ہو گئے ہیں۔ مثلاً جنگ سے پہلے فرانک، لیرا، یونانی درہم، سربی دینار، بلغاری لیوا سب ہم وزن اور ہم قیمت چاندی کے تھے اور ایک پونڈ کے پچیس پچیس آتے تھے لیکن اب حال یہ ہے کہ ایک پونڈ کے معاوضے میں اطالوی لیرے ۹۴ سے ۴۰ آمک، فرانک ۱۷۰، لیوے ۴۱۲، دینار ۲۲۵، یونانی درہم ۵۰۰ ملتے ہیں۔ گو انگریزی پونڈ بھی سونے کے بجائے کاغذ کا ہو گیا ہے لیکن انگلستان میں اشیاء کی قیمتوں میں اس کے اعتبار سے معتدبہ فرق نہیں آیا۔ یہ سب سلطنت برطانیہ کے وسائل کی فراوانی کی برکت ہے۔

۱۰ جولائی کو اتوار کا دن تھا اور لندن میں سناٹا تھا۔ سب دوکانیں علاوہ (ریستورانوں کے) بند تھیں۔ مجھے موقع مل گیا کہ میں اپنے لئے اچھی جائے قیام برٹش میوزیم کے قریب تلاش کروں جہاں مجھے مطالعہ کرنا تھا۔ مجھے Upper Bedford Place میں اچھا ہوٹل مل گیا جہاں ہم نے سامان وغیرہ منتقل کر دیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ جب ۱۹۰۷ء میں جناب والد ماجد مدظلہ کے ساتھ

پہلی مرتبہ لندن آیا تھا اس وقت بھی اسی سڑک پر اور سڑک کے اسی جانب قیام کیا تھا جس طرف یہ ہوٹل واقع ہے اور بغیر کسی ارادے اس مرتبہ بھی اسی سڑک پر اُترا ہوں۔ پہلے مکان کا نمبر ۲۴ تھا لیکن اب وہ ایک دوسرے ہوٹل کا جزو بن گیا ہے ورنہ شاید غیر شعوری طور پر اس مرتبہ بھی شاید وہیں قیام رہتا۔

۱۸ جولائی کو اپنا اسباب جو نیپلز اور استنبول سے راست روانہ کیا تھا اسٹیشن سے اور کک کے یہاں سے لایا۔ شام کے وقت ایک نظر برطانوی نوادرخانے پر ڈالی جو ہمارے ہوٹل سے قریب ہی ہے۔ اس نوادرخانے کی ابتدا ۱۷۵۳ء میں اور افتتاح ۱۷۵۹ء میں ہوا تھا۔ کتب خانے میں تقریباً چالیس لاکھ کتابیں ہیں اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر تمام کتابیں ایک دوسرے کے پاس رکھی جائیں تو زمین کے چاروں طرف کتابوں کا ایک خط کھنچ جائے گا اور اس کی الماریاں ایک دوسرے کے پاس رکھی جائیں تو ساٹھ میل میں آئیں گی!!

۱۹ جولائی کے تمام دن مطلع نہایت غبار آلود رہا اور بارش ہوتی رہی۔ مجھے ہز ایکسی لنسی رائٹ آنریبل نواب سر اکبر حیدری نے سر فیروز خاں نون صاحب ہائی کمشنر ہند متعینہ لندن کے نام ایک تعارفی خط دیا تھا۔ اسے لے کر میں انڈیا ہاؤس گیا۔ لندن میں ہندوستان کے دو دفتر ہیں ایک انڈیا ہاؤس اور دوسرے انڈیا آفس۔ انڈیا آفس [illegible] کی حکومت کی ایک [illegible] برطانوی کابینہ کا ایک رکن ہوتا ہے اور برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے (نہ کہ کسی ہندوستانی ادارے کے سامنے) اپنے کئے دھرے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ۱۹۱۹ء کے اصلاحات سے پہلے ہی معاملات ہند کے متعلق یہی ایک دفتر تھا۔ ۱۹۱۹ء میں وزیر ہند کے جتنے عملی کام Agency functions تھے وہ سب ایک ہائی کمشنر کے سپرد کردئے گئے۔ یہ عملی کام زیادہ تر خرید و فروخت، وظائف (پنشن) "مطالبات وطن" Home charges. اور دیگر مالیاتی امور سے متعلق ہیں۔ ہائی کمشنر حکومت ہند کا نمائندہ ہوتا ہے اور اسی کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے اور ابتدا ہی سے ایک ہندوستانی ہوتا آیا ہے۔ انڈیا ہاؤس ایک بہت بڑا ایوان آسٹریلیا ہاؤس کے قریب محلہ Aldwych میں ہے اور اس کی تزئین زیادہ تر ہندوستانی اصول پر کی گئی ہے میں نے پہلے سر فیروز کے پرائیوٹ سکریٹری نسیم حسین صاحب سے ملاقات کی تو معلوم ہوا کہ سر فیروز غیر معمولی طور پر مصروف ہیں اور انھوں نے مجھ سے دوسرے روز آنے کے لئے کہا۔

نسیم حسین صاحب بہت مہربانی سے پیش آئے۔ شام کو انڈیا آفس یعنی وزیر برطانیہ کے دفتر جا کر اپنا کارڈ چھوڑا اور وزیر ہند کی ملاقات کی کتاب پر دستخط کئے۔ وزیر ہند کی مشاورتی مجلس" یعنی مجلس ہند" کے ایک رکن سر عبدالقادر بھی ہیں جن سے میری نہایت پرانی ملاقات ہے۔ امید تھی کہ ان سے بھی ملاقات ہوگی۔ لیکن انڈیا آفس میں معلوم ہوا کہ وہ ۱۲ اگست تک کے لئے فرانس گئے ہوئے ہیں۔ چونکہ میرا ارادہ اسی زمانے میں لندن سے چلے جانے کا تھا اس لئے افسوس ہے ان سے ملاقات ہی نہ ہو سکے گی۔

۲۰ جولائی کو صبح کے وقت سر فیروز خاں نون سے ملنے انڈیا ہاؤس گیا۔ ۱۱½ بجے کا وقت مقرر تھا۔ نہایت خلق سے پیش آئے۔ میرے بعض رسالوں کو جو انھیں دینے کے لئے

لے گیا تھا، دیکھا اور کہا کہ اس کی بہت ضرورت ہے کہ تاریخ
تمدنِ ہند اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھی
جائیں اس لئے کہ انگریزی میں ان موضوعات پر کتابیں نہیں
ہیں اور ہمارے متعلق یورپ والوں کو بڑی بڑی غلط فہمیاں
ہیں۔ میری مبادئی سیاسیات دیکھنے کا بہت اشتیاق ظاہر کیا۔
اور کہا کہ حیدرآباد لکھ کر ایک نسخہ منگادو۔ جب میں نے اپنا
عندیہ ظاہر کیا کہ یہاں لندن میں کتب بینی کے مواقع چاہتا
ہوں تو فوراً اپنے مددگار R. J. M. Kanaster کو
بلایا اور کہا کہ جس قسم کی مدد میں چاہتا ہوں فوراً دی جائے۔
Kanaster کے سپرد ہائی کمشنر کا تعلیماتی کام ہے۔
آرنلڈ صاحب کے بہت معترف تھے، کہتے تھے کہ انھیں کے
زمانے سے ہندوستان سے تعلق ہے۔ ان کے کہنے سے انڈیا آفس
کے کتب خانے کا داخلے کا فارم لایا۔ اتنے میں انھوں نے
برٹش میوزیم کے ڈائرکٹر کے نام خط تیار کردیا تھا اور ایک
خط لندن اسکول آف اورنیٹل اسٹڈیز کے معتمد کے نام
لکھ دیا تھا۔ میرے آنے پر انڈیا آفس کتب خانے کے فارم پر
دستخط کردئے۔ اسے لیجا کر میں نے کتب خانہ دار کو دیا۔
جس نے فوراً کتب خانے کے استعمال کا کارڈ تیار کر کے مجھے
دے دیا۔

انڈیا آفس محکمہ خارجہ کے محاذ میں سینٹ جیمز پارک
کے سامنے واقع ہے اور اس کے بالکل مقابل کلائیو کا مجسمہ
ہے۔ انڈیا آفس میں داخل ہونے والے کو ایک نہایت ہی
مختصر دروازے میں ہو کر داخل ہونا پڑتا ہے لیکن اندر
ایک عظیم الشان ایوان ملتا ہے۔ یہاں کے کتب خانے
میں ہندوستان کی ہر ایک زبان کی کتابوں کا ذخیرہ ہے
چنانچہ اردو کتابوں سے بھی الماریاں بھری ہوئی ہیں اور
عصر جدید کے ہندوستان کی تاریخ لکھنا تو بغیر اس کتب خانے
کی مدد کے نہایت مشکل ہے قریب ہی مشہور آفاق نمبر ۱۰
اور نمبر ۱۱ ڈاؤننگ اسٹریٹ بھی دیکھے جن میں وزیر اعظم
اور وزیر خزانہ رہتے ہیں۔ شاید دنیا میں کسی وزیر کی جائے
قیام بظاہر اس قدر مبتذل نہ ہوگی جیسے نمبر ۱۰ اور معلوم
ہوتا ہے کہ سامنے کے حصے کی صدیوں سے مرمت نہیں ہوئی
اندر کی طرف کیسی ہی فراخی کیوں نہ ہو باہر سے تو یہ مکانات
انگلستان کے غربا کے مکانات سے بہتر نہیں ہیں۔ یہ انگلستان
کی زندگی عامہ کا ایک عجیب مظاہرہ ہے۔ پبلک عمارتوں میں
سب سے خوبصورت اور وسیع عمارت پارلیمنٹ کی ہے
جو ملک کے نمائندوں کی مجلس ہے اور یہ ایوان قصر بکنگھم اور
قصر سینٹ جیمز سے کہیں زیادہ عالی شان ہے لیکن چونکہ
وزیر اعظم کی حیثیت ایک پبلک ملازم کی سی ہے اس لئے
اس کے مکان کی حیثیت شاندار جان بوجھ کر معمولی ہی رکھی
جاتی ہے۔

۱۱ جولائی کو صبح میں وہ خط لے کر جو انڈیا ہاؤس سے
ملا تھا۔ اسکول آف اورنیٹل اسٹڈیز کے سکرٹری مسٹر رفیدی
کے پاس گیا۔ یہ "اسکول" جس میں لندن یونیورسٹی
کے مشرقیات کی پڑھائی بی۔ اے، ایم۔ اے تک ہوتی ہے بالفعل
نا تکمیل عمارت جدید، ویسٹ منسٹر میں واقع ہے۔ جدید
عمارت لندن یونیورسٹی اور برٹش میوزیم کے قریب تیار ہو رہی
ہے۔ روزفیلی صاحب نہایت اخلاق سے پیش آئے
اور کہا کہ افسوس ہمارے یہاں آج کل تعطیلات کا زمانہ
ہے اور بہت سے لوگ لندن سے باہر گئے ہوئے ہیں ورنہ

یہاں مشرقیات کے پروفیسروں سے آپ مل کر بہت محظوظ
ہوئے۔ فوراً ٹیلیفون سے اپنے کتب خانہ دار مس میری براؤن
سے میرا تعارف کرا دیا۔ موقتی عمارت ہونے کی وجہ سے
کتب خانہ اصل اسکول سے علحدہ ایک دوسری جگہ واقع ہے
میں نے مس براؤن کی معیت میں کتب خانے پر ایک نظر ڈالی
اس میں مشرقی کتابوں رسالوں اور مخطوطات کا ایک نفیس
ذخیرہ ہے۔ مطبوعہ کتابیں چار لاکھ کے قریب ہیں اور لطف
یہ ہے کہ افسرِ اعلیٰ سے لے کر متعمل شخص سے چپراسی تک تمام
کام عورتوں کا ہے جو نہایت خوش اسلوبی سے کارہائے مفوضہ
انجام دیتی ہیں۔ یہاں سے چل کر قریب ہی لندن کی قدیم
ترین تاریخی عمارات میں سے ایک یعنی ویسٹ منسٹر ہال
دیکھنے گیا۔ ہندوستان میں لوگ اس کے نام سے واقف
ہیں۔ اس لئے کہ اسی کے اندر شاہ اڈورڈ ہفتم اور شاہ
جارج پنجم کے تابوت لوگوں کے نظارے کے لئے رکھے گئے تھے۔
لیکن تاریخی اعتبار سے اس کی اہمیت محض تابوت گاہ ہونے
سے کہیں زیادہ ہے' اس لئے کہ اسی کے اندر ۱۳۰۵ء میں
اسکاٹ لینڈ کے محبِ وطن ولیم والیس' ۱۶۴۹ء میں چارلس
اول ۱۷۸۸ء میں ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل
وارن ہیسٹنگز پر مقدمے چلائے گئے' اور یہیں کے مقدمے
میں وہ حکم سنایا گیا جس کے بموجب چارلس اول کا سر قلم کیا
گیا' اور یہی وہ ہال ہے جس میں رچرڈ دوم تخت سے
اتارا گیا اور جہاں اسٹیون سے جارج چہارم تک تمام
بادشاہوں کی تاجپوشی عمل میں آئی۔ غرض اس ہال نے
خدا جانے کیا کیا تماشے دیکھے ہیں اور آخری تماشا
شاہ جارج پنجم کی جوبلی کا ہے' اس لئے کہ اس میں ایوانِ عام
اور ایوانِ امراء کی طرف سے بادشاہ کے سامنے تہنیت نامہ
پیش کیا گیا تھا۔ لیکن باوجود ان سب باتوں کے یہ ہال
تزئین سے بالکل عریاں ہے۔ صرف سادہ دیواریں ہیں
اور لکڑی کی چھت ہے' لیکن اس سے اس وقار اور خودداری
کا مظاہرہ ہوتا ہے جو تاریخ انگلستان کی گویا جان ہے۔ ویسٹ منسٹر
ہال سے برٹش میوزیم آیا جہاں Mr. Knaster
کا تعارفی خط نوادر خانے کے ناظم کو دیا جنھوں نے فوراً
دو اجازت نامے ایک عام مطالعہ خانے کے لئے اور دوسرا مشرقی
مطالعہ خانے کے لئے بھیج دئے۔

۲۲ جولائی کو برطانوی نوادر خانے میں مطالعے میں
مصروف رہا۔ اگلے دن صبح کے وقت سر فیروز خاں نون
صاحب ہائی کمشنر ہند سے ملنے ان کے مکان نمبر (۴۵)
Putney Hill گیا لیکن نون صاحب باہر گئے ہوئے
تھے اس لئے کارڈ چھوڑ دیا اور کتاب پر دستخط کر دئے۔

میں اس مرتبہ پچیس سال کے بعد انگلستان آیا ہوں
اور اس دوران میں بود و ماند میں جو فرق پیدا ہو گیا
ہے وہ نہایت بین طور پر نظر آتا ہے۔ یہاں کی طرز معاشرت
میں پہلے سے زیادہ آزاد منشی نظر آتی ہے۔ مثلاً پچیس سال
پہلے کوئی شریف آدمی لندن میں ننگے سر یا بغیر سخت کالر لگائے
ہوئے نہیں نکل سکتا تھا' آج عورتیں مرد سب ننگے سر نکلتے ہیں
اور سخت کالر تو گویا لگایا ہی نہیں جاتا۔ عام اخلاقی معیار بھی
پہلے سے بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے اور یہ باوجود عورتوں مردوں
کی انتہائی آزادی کے۔ نیز غالباً چونکہ اس دوران میں
پہلے انگریزوں کا واسطہ پہلے سے زیادہ غیر ممالک کے باشندوں
کے ساتھ ہو چلا ہے اس لئے اسی تناسب سے رواداری کی

پہلے سے زیادہ نظر آتی ہے اور کالے یا بھورے چمڑے
والوں کے ساتھ بظاہر نسبتاً بہتر سلوک کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے
اس کی ایک وجہ یوروپی سیاسی فضا کے تردودات ہوں
لیکن وجہ کچھ بھی ہو نتیجہ خوش گوار معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور
بدیہی فرق یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ پہلے سے بھی زیادہ جفاکش
ہوگئے ہیں اور بہت سوں نے تو جفاکشی اپنا شعار بنا لیا ہے۔
سڑکوں پر بہت سے لوگ عورتیں، مرد، جوان، ادھیڑ اپنی
پشت پر تھوڑی سی ضروری چیزوں کے تھیلے لگائے جو تسموں کے
ذریعے کندھوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ رنگین چک کے
میل خورے کپڑے کی قمیص اور بعض مرتبہ چمڑے کے
جانگئے پہنے یا پیدل لندن کی سڑکوں پر نظر آتے ہیں۔
یہ وہ لوگ ہیں جو بڑے بڑے سفروں پر اپنے اپنے
گھروں سے پیدل نکلتے ہیں اور دو دو تین تین کی
ٹولیوں میں سیکڑوں میل بقول شخصے بناس پتی کھاتے
چشموں کا پانی پیتے بسر کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ جدید
انگریزی اصطلاح میں اسے Hiking کہتے ہیں
اور Hiking اب اچھا خاصہ فیشن ہوگیا
ہے۔ میں نے لندن میں ایسی ٹولیاں جرمنوں، ڈینمارکیوں،
ولندیزوں وغیرہ کی بھی دیکھیں جو اسی طرح سے اپنے
ملک سے پیدل یورپ کا سفر کرنے کو نکل آئے ہیں۔ ایک
ہم ہیں کہ ہاتھ دھونے یا کپڑے پہننے کے لئے بھی ملازم
کی ضرورت پڑتی ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

۲۵ جولائی کو مجھے زیوآخ کانگرس کے صدر ڈاکٹر
نیمبرلی نے لنچ پر کیمبرج مدعو کیا تھا۔ ڈاکٹر نیمبرلی زمانہ حال
کے بڑے مورخوں میں شمار کئے جاتے ہیں اور آج کل جنگ
کریمیہ کی تاریخ لکھنے میں مصروف ہیں۔ آپ حال ہی میں
سر جارج برڈوڈ کی جگہ کیمبرج کے سب سے قدیم کالج پیٹر ہاؤس
کے ماسٹر مقرر ہوئے ہیں۔ ہندوستانیوں کے لئے یہ امر
باعث دلچسپی ہوگا کہ صرف آٹھ برس پہلے سر جارج برڈوڈ
ہز ایکسی لنسی سپہ سالار افواج ہند تھے اور اس عہدے
سے سبکدوشی کے بعد وہ پیٹر ہاؤس کے ماسٹر مقرر ہوئے۔
میں ۹½ بجے کی گاڑی سے لیورپول اسٹریٹ اسٹیشن سے
چل کر ایک گھنٹے کے اندر کیمبرج پہونچا۔ کیمبرج کی شکل اس
۲۵، ۳۰ سال میں بالکل بدل گئی ہے۔ کالج اور سڑکیں
وہی ہیں لیکن اب بجائے پرانی گھوڑوں کی ٹرام کے ہر جگہ
گدے دار بسوں نے جگہ لے لی ہے اور بہت سی دکانیں
جدید تعمیر ہوگئی ہیں۔ سب سے پہلے اپنے پرانے
کالج کرائسٹ کالج گیا۔ جہاں میں نے ۱۹۰۸ء میں تین میقات
یعنی تقریباً ۹ ماہ گذارے تھے۔ میرے زمانے سے اس وقت
تک یکے بعد دیگرے تین ماسٹر فوت ہوئے ہیں اور اب
Dr. C. E. Darwin (جو ڈارون اعظم کے پوتے ہیں)
ماسٹر ہیں۔ وہ آج کل کیمبرج میں نہیں ہیں! اس لئے
میں نے کارڈ چھوڑ دیا۔ کرائسٹس کالج ۱۴۴۲ء میں
"بیت اللہ" God's House کے نام سے
قایم ہوا تھا اور ہمارے لئے یہ امر باعث دلچسپی ہے کہ
جس کمرے میں جسٹس سید محمود مرحوم اپنی تعلیم کے زمانے
میں رہتے تھے (Second court stare-case II)
اس کے سامنے کی دیوار پر انھوں نے نہایت جلی حروف
کے خط نسخ میں "سید محمود" کھود دیا ہے جو اب تک

موجود ہے۔ میں یہاں سے کنگز کالج جس کی ابتدا ۱۴۴۱ء
میں ہوئی تھی گیا۔ افسوس ہے کہ اس کا چیپل جو اپنی
خوبصورتی کی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور ہے، نہ دیکھ
سکا اس لئے کہ کہتے ہیں کہ اس کی پانچ سو برس کی
زندگی کے بعد اس کے پتھر پہلی مرتبہ دھل رہے تھے۔
جس کی وجہ چیپل بند تھا۔ یہاں سے ٹیمپرلی صاحب کے ہاں
پیٹر ہاؤس پہونچا۔ آپ نہایت اخلاق سے ہیں۔ کھانے کے
وقت اور کھانے کے بعد اکثر گفتگو۔ استنبول، ترکی،
سیاسیات اسلام تاریخ ہند وغیرہ پر ہوتی رہی۔ میرے
علاوہ پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر وارڈ بھی مدعو تھے۔
جب میں نے اپنی جامعہ عثمانیہ کے تاریخ ہند کے غیر مذہبی
نقطہ نظر اور قدیم، وسطی اور حالیہ کی جدید تقسیم کا ذکر کیا
تو دونوں نے نہایت دلچسپی لی۔ میں نے کہا کہ اس کی ضرورت
ہے کہ اس زاویہ نگاہ سے یورپ کو آگاہ کیا جائے تاکہ
تاریخ ہند کا تخیل ایک مسلسل تاریخ کا ہو جائے اور ہندو مسلم
عہدوں کی تقسیم کی وجہ سے جو رخنہ پڑ رہا ہے اس سے
چھٹکارا حاصل ہو سکے۔ ٹیمپرلی صاحب نے اس کے بعد
اپنا کالج تفصیل سے دکھایا۔ پیٹر ہاؤس کی ابتدا ۱۲۸۴ء
میں ڈالی گئی تھی۔ انھوں نے بعض حصے دکھائے۔
جن کی دیواریں اس عہد کی بنی ہوئی ہیں۔ اس کے
بعد ماسٹر یا پرنسپل کا مکان دکھایا جو ملکہ این کے زمانہ کا
بنا ہوا ہے اور چیپل دکھائی جس کی بعض کھڑکیاں کرامول
کے عہد میں بنی تھیں۔ تقریباً تین بجے میں نے ٹیمپرلی صاحب
کو خدا حافظ کہا اور وہاں سے شہرہ آفاق پروفیسر
براؤن آنجہانی کے پیمبروک کالج (جس کی تاسیس
۱۳۴۷ء میں ہوئی تھی) ہوتا ہوا اور گرجا St. Biddulph
دیکھتا ہوا جس کے بعض حصے ۱۱۲۳ء کے ہیں کیمبرج کے
مشہور نوادرخانے Fitz William Museum گیا۔
افسوس ہے کہ وقت کی قلت کی وجہ سے میں اس کے
صرف بعض حصوں پر سرسری نگاہ ڈال سکا ورنہ اس کے لئے
دن نہیں بلکہ ہفتے درکار ہوتے۔ یہاں سے سیدھا اسٹیشن
گیا اور وہاں سے شام کے ۷½ بجے لندن پہونچ گیا۔
۲۶ جولائی کو دوپہر کے وقت لنچ ایک Milk Bar
میں کھایا۔ "بار" دراصل شراب خانے کو کہتے ہیں اور اسی
مناسبت سے شیر خانوں کو Milk Bar کے نام سے
کہتے ہیں۔ جب ۲۵ سال پہلے ہی انگلستان میں تھا تو
سوائے شراب خانوں اور ریسٹورانوں کے کوئی طعام خانہ
نہ تھا اب اس دفعہ جگہ جگہ یہ شیرخانے کھلے ہوئے دیکھے
جن میں نہایت صاف شفاف غیر مسکراتی کھانے پینے کی
چیزیں اور دودھ کی اشیاء ملتی ہیں۔ میرا خیال
ہے کہ آج کل متوسط طبقے کا نصف حصہ انھیں شیرخانوں
میں جا کر اپنی بھوک پیاس بجھاتا ہوگا اس لئے کہ دوپہر
اور شام کو یہ دوکانیں لبالب بھری ہوتی ہیں۔ ہمارے
ہندوستان میں تو شراب خانہ خراب کی کثرت ہوتی
جاتی ہے اور انگلستان میں دودھ کا استعمال بڑھتا جاتا
ہے!!! امریکہ نے شراب قانوناً ناجائز قرار دی تو
لوگ قبضے میں نہیں آئے۔ انگلستان نے محض تبلیغ و
ترکیب سے اپنے یہاں شراب کا استعمال کم کر دیا۔
میں نے سر فیروز خاں نون صاحب سے خواہش
کی کہ اگر ممکن ہو تو مجھے دارالعوام میں داخلہ کا ٹکٹ بھجوادیں

چنانچہ آج کے لئے ٹکٹ آگیا۔ آج وزیرِ اعظم خارجی معاملات پر بولنے والے تھے اس لئے مجھ جیسے سیکڑوں خوش پوشوں نے ٹکٹ حاصل کئے تھے اور چونکہ ایوانِ عام میں نشستیں محدود ہیں اس لئے سب کو بہت انتظار کرنا پڑا اس لئے کہ مباحثے کی دلچسپی کی وجہ سے جو پہنچ جاتا تھا وہ ٹلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ میں ایوانِ عام میں ۲ یا ۲½ بجے تک رہا۔ وزیرِ اعظم کی تقریر ختم ہو چکی تھی اور Sir Wardlaw Milne بول رہے تھے۔ ان کے علاوہ میرے سامنے Rt Hon'ble Col Wedwood, Mr. Sorensen, Mr. Acland, Mr. Crossley, Mr Beecham Miss. Rathbone نے تقریریں کیں اور حکومت کے جدید خارجی طرزِ عمل پر موافق اور مخالف تنقیدیں کیں۔ مسئلہ زیرِ بحث اس طرح پیدا ہوا تھا کہ خارجی معاملات کے معاوضے میں لبرل گروپ نے ایک سو پاؤنڈ گھٹانے چاہے تاکہ حکومت کی خارجی حکمتِ عملی پر عام بحث ہو جائے۔ مباحثے کے روز بھی وزیرِ اعظم مسٹر نیویل چیمبرلین اور سر جان سائمن وزیرِ داخلہ برابر موجود رہے۔ میں آٹھ بجے دار العوام سے ہوٹل چلا آیا۔

۲۷ جولائی کو صبح کے وقت برٹش میوزیم میں مطالعہ کیا۔ شام کو ۴½ بجے ایوانِ امرا گیا۔ رائٹ آنریبل لارڈ زیٹ لینڈ وزیرِ ہند نے از راہِ مہربانی میری خواہش کے مطابق اس کے لئے پاس بھیج دیا تھا۔ ایوانِ امرا کی نشست میں شریک ہونا نہایت دشوار ہے۔ اس لئے کہ تاوقتیکہ کوئی لارڈ اجنبی کی ضمانت نہ کرے اس کا اجازہ نہیں ملتا۔ مجھے اس کا ارمان تھا کہ ایوانِ امرا اور ایوانِ عام کے ضابطۂ کارروائی کے متعلق جن امتیازات کا ذکر میں نے صرف کتابوں میں دیکھا ہے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ منجملہ دیگر امرا کے لارڈ ہیلی فیکس (سابق لارڈ ارون سابق وائسرائے ہند و حال وزیرِ خارجہ) لارڈ زیٹ لینڈ وزیرِ ہند لارڈ اسٹین بلوپ وزیرِ تجارت، لارڈ ہیلشم سابق لارڈ چانسلر۔ لارڈ کریو سابق وزیرِ ہند لارڈ سموئیل سابق ہائی کمشنر فلسطین و اسقفِ اعظم کینٹربری موجود تھے۔ ایوانِ عام اور ایوانِ امرا کے ضابطوں میں جو نمایاں فرق معلوم ہوئے وہ حسبِ ذیل تھے (۱) ارکانِ ایوانِ عام صدر یعنی اسپیکر کو مخاطب کرتے ہیں۔ ارکانِ ایوانِ امرا لارڈ چانسلر کو مخاطب نہیں کرتے بلکہ My Lords! کہہ کر تقریر کرتے ہیں اور لارڈ چانسلر کی نشست جو ایوانِ امرا کے وسط میں رکھی جاتی ہے دراصل اس کے باہر تصور کی جاتی ہے۔ (۲) چونکہ اکثر امرا کنزرویٹیو ہوتے ہیں اس لئے سوالات و جوابات بالکل ملی بھگت ہوتے ہیں اور دریافت کرنے سے پتہ چلا کہ یہ مسئلہ کہ ہر دو جانب سے کسی خاص مسئلے پر کون کون بولے گا دراصل "رہنمائے ایوانِ امرا" ہی (جو وزارت کا سر آوردہ رکن ہوتا ہے) طے کرتا ہے (۳) ہر سوال کا جواب دینے سے پہلے پورا مباحثہ ہوتا ہے اس لئے جواب مباحثہ کے بعد دیا جاتا ہے اس کے برعکس ایوانِ عام میں سوال جواب اور تحریک مباحثہ میں بین فرق یہ ہے کہ کسی سوال پر مباحثہ نہیں ہوتا بلکہ محض جواب دیا جاتا ہے۔

(۴) ایوانِ امراء میں ترتیب و تنظیم خود بخود رہتی ہے۔ لارڈ چانسلر کی مداخلت محض شاذ ہی ہوتی ہے اور بعض ارکان اطمینان سے ان گدوں پر جو لارڈ چانسلر کے سامنے پڑے ہیں اس کی طرف پشت کرکے بیٹھے رہتے ہیں (۵) برخلاف ایوانِ عام کے ایوان امراء کے مباحثہ میں اصلیت کا پہلو بہت کم نظر آتا ہے (۶) طلائی گرز جو ایوانوں کی نشست کی علامت ہے ایوان عام میں صدر کے سامنے میز پر اور ایوان امرا میں لارڈ چانسلر کی پشت کی طرف رکھا ہوتا ہے۔ میں نے حسب ذیل حضرات کی تقریریں سنیں۔ بشپ چیسٹر، وائی کاؤنٹ سیموئیل، لارڈ ایلین، مارکوئس ریڈنگ (سابق وائسرائے آنجہانی کے صاحبزادے) لارڈ مارکے ارل پلی متھ (نائب وزیر خارجہ) لارڈ اسنل، مارکوئس آف کریو۔ وائی کاؤنٹ ایلس بنک، لارڈ سیسل آف چیل وڈ، لارڈ پونسونبی، لارڈ ہیلی فیکس (وزیر خارجہ) مسئلہ زیر بحث ان یہودیوں کی شہریت کا تھا جو جرمنی اور آسٹریا سے فرار ہوکر برطانوی حکومت میں آگئے ہیں یا آنا چاہتے ہیں۔ سب سے زیادہ موثر بلکہ دردناک تقریریں دو یہودی امراء یعنی مارکوئس ریڈنگ اور وائی کاؤنٹ سیموئیل کی ہوئیں۔ میں ۸ بجے واپس ہوٹل آیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ کل جس اجلاس میں میں ایوانِ امراء گیا تھا۔ اس کی پوری روداد دوسرے دن صبح دس بجے۔ Government Publication Department میں فروخت ہو رہی تھی۔ ایوانِ امراء کا اجلاس رات سوا آٹھ بجے برخاست ہوا اور دوسرے دن صبح نو بجے مکمل روداد جس میں مشکل سے کوئی ٹائپ کی غلطی ہوگی، ہر شخص کے ہاتھ میں آگئی۔ ہمارے ملک میں اول تو یہ ممکن ہی نہ تھا اور دوسرے اگر ممکن بھی ہوتا تو چھاپے کی سیکڑوں غلطیاں ہوتیں۔ جیسا جیسا مباحثہ ہوتا جاتا مختصر نویسی ٹائپ تصحیح کے مدارج طے ہوتے جاتے اور کاغذات مکمل حالت میں موٹر میں فوراً سرکاری مطبع بھیج دیے جاتے تھے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ طباعت کے کل مدارج صبح پانچ بجے ختم ہوکر سیون، جلد بندی وغیرہ سب آٹھ بجے ہوگئی اور روداد دوکانوں پر پہنچ گئی۔ یہی کیفیت ایوان عام کی روداد کی بھی ہے۔ اسی دکان سے منشور اعظم کی ایک عکسی تصویر شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ کو ہدیتاً دینے کے لئے خریدی۔ شام کے وقت نوادرخانہ برطانیہ میں مطالعہ کیا اور ابن ابی ربیع کی سلوک الممالک ختم کی۔ ڈاکٹر ٹیمپرلی کا خط آیا جس میں انھوں نے مجھے مطلع کیا کہ میرا مضمون زیورچ کانگریس کے پہلے باضابطہ اجلاس میں یعنی پہلے ہی دن رکھا گیا ہے۔ اور مجھے اس پر مبارکباد دی۔ یہ ایک بڑا اعزاز ہے جسے میں اعلیٰ حضرت خسروِ دکن کی برکت خیال کرتا ہوں کہ دنیا کے چوٹی کے مورخوں کی کانگریس میں مجھ ایسے میرز کے مقالے کو اس قدر وقعت کی نظر سے دیکھا گیا۔

باقی آئندہ

ہارون خاں شروانی

"مس بی، سی"

چند دنوں سے میری بینائی میں فرق آگیا تھا کچھ تو مطالعہ کی کثرت اور کام کی زیادتی کی وجہ سے نظریں کمزور ہو گئی تھیں، اور پھر ناقص چشموں کے استعمال سے آنکھوں سے پانی بہا کرتا، بعض دفعہ راتوں کو زیادہ دیر تک کام کرنے کی وجہ سے آنکھوں میں درد ہونے لگتا میرے ایک ڈاکٹر دوست نے مشورہ دیا کہ فوراً میں اپنی آنکھوں کا آپریشن کراؤں۔ ورنہ بہت جلد بینائی سے ہاتھ دھونا پڑیگا۔ میں عجیب مشکل میں پھنسا ہوا تھا۔ اپنے ان اہم فرائض کس کے سر تھوپوں، ایک آدھ مہینے سے لطیف صاحب اپنی بیوی کی علالت کے سلسلے میں بنگلور میں مقیم تھے، رسالہ کا کام البتہ ایک آدھ ماہ تک التوا میں رکھا جا سکتا ہے، لیکن پریس کا کام رکنا ذرا مشکل تھا۔ بہرحال میں نے مصمم ارادہ کر لیا، اس ہفتہ میں اپنی آنکھوں کا اپریشن ضرور کرواؤں گا۔ سب سے پہلے مجھے اپنی صحت کو برقرار رکھنا پڑے گا، فوراً اپنی علالت کی اطلاع بذریعہ تار لطیف صاحب کو دی، وہ بیچارے بدحواسی کے عالم میں تیسرے دن حیدرآباد اتر پڑے، سارا پریس کا کام اور رسالے کی ذمہ داریاں ان کے تفویض کر کے میں ہسپتال میں شریک ہو گیا۔ ڈاکٹر اور اس کے مددگار نے میری آنکھوں کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ اور یہ پاس کیا گیا کہ کل صبح میری آنکھوں کا آپریشن ہو گا، اور ایک نرس ہنس مکھ دبلی پتلی سی میرے لئے متعین کی گئی گندمی رنگ ہونے کے باعث وہ زیادہ حسین کہلانے کی مستحق نہ تھی، لیکن ناک نقشہ کے اعتبار سے وہ کچھ بری بھی نہ تھی، اس کا دلفریب نمکین چہرہ دیکھنے والوں کی نگاہوں کے لئے سامانِ تفریح تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک تبسم کی لہر موجزن رہتی، اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں دوشیزگی کا ایک خاص جذبہ پنہاں تھا۔ وہ میری ہر بات کا خاص خیال رکھتی۔ دوسرے دن علی الصبح مجھے آپریشن روم میں پہنچایا گیا، جہاں ڈاکٹر اور اس کا مددگار مخصوص لباس میں نرس و کمپونڈر کو ساتھ لیے ہوئے میرا انتظار کر رہے تھے۔ بہت جلد مجھے بیہوشی کی دوا سنگھائی گئی۔ اس کے بعد۔

تین گھنٹے تک مجھ پر غشی طاری رہی، میں کس حالت میں پڑا رہا مجھے اس کا مطلق علم نہ تھا، قدرے ہوش آنے پر میں نے محسوس کیا کہ میرے بدن کے تمام حصہ میں درد ہو رہا ہے اور آنکھوں میں کچھ کھٹک سی معلوم ہو رہی تھی، جسم میں بھی کچھ حرارت سی آگئی تھی، معمولی ہلکی سی غذا استعمال کرانے کے بعد ایک خوراک دوا پلائی گئی۔

"ہاشمی صاحب" میرے نگرانکار ڈاکٹر نے مخاطب کیا، "آپ مطمئن رہئے۔ آپ کا آپریشن توقع سے زیادہ کامیاب رہا بہتر ہے آپ چند گھنٹے آرام کریں"۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر اپنی مصروفیات کے تحت چلا گیا، دو تین گھنٹے تک مجھ پر عجیب سی حالت طاری تھی آنکھوں میں حد درجہ خراش محسوس ہونے لگی۔ اور یہی خراش مجھے بے چین کرنے کیلئے کافی تھی۔ نرس ابھی تک میرے کمرے میں موجود تھی، میرے منہ سے مختلف مدھم درد بھری آوازیں نکل رہی تھیں۔

"آپ کو بہت تکلیف ہے"؟ نرس نے ازراہِ ہمدردی مجھ سے پوچھا۔

"نرس، میں نے بے چینی کی حالت میں کہا۔ "ڈاکٹر کہاں ہے؟ میری آنکھوں سے پٹی کھول دیجئے" "نہیں آپ ایسا نہ کریں

آپ کو تکلیف ہو گی، اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو تھام
لیا۔ میں ابھی ڈاکٹر صاحب کو بلاتی ہوں کیا بجا ہے۔
چار بج رہے ہیں جناب آپ دوا پی لیجئے قدرے
آرام ہو گا۔ نرس نے مجبور کر کے مجھے ایک خوراک دوا پلا دی
اور خود ڈاکٹر کو اطلاع کرنے چلی گئی۔
"کیا ہے ہاشمی صاحب، آپ اتنے پریشان نہ ہوں" ڈاکٹر کا
لہجہ تسلی دہ تھا" کل صبح دوسری پٹی بدلنے پر آپ کو قدرے
آرام ملے گا"۔ ڈاکٹر نرس کو مزید ہدایات کر کے چلا گیا۔
نرس ایک حد تک رحمدل شریف واقع ہوئی تھی، اس
دوران میں اس نے مجھ سے مختلف سوالات کیے اور
بہت کچھ تسلی آمیز جملے کہتی رہی، آخر میرے کہنے پر "تمہیں
زیادہ رات جاگنے سے تکلیف ہو گی" چلی گئی۔
دوسرے دن میری آنکھوں کی پٹی بدلی گئی۔ واقعی
ڈاکٹر کے قول کے مطابق مجھے قدرے آرام نصیب ہوا،
اس دن لطیف صاحب مجھ سے ملنے آئے تھوڑی دیر
وہ میرے پاس بیٹھے رہے۔ ڈاکٹر نے زیادہ گفتگو کرنے
کی ممانعت کر دی تھی، بس چپ چاپ ان کی گفتگو سنتا رہا
ان کے چلے جانے کے بعد نرس دوائی لیے میرے سر پر
آ کھڑی ہوئی، ایک خوراک پلانے کے بعد اس نے کہا۔
"اب مزے کے ساتھ لیٹے رہیئے"۔
"اور تم کہاں چلیں نرس"۔ میں نے اس سے دریافت
کیا۔
کیوں؟
صبح سے دکھائی نہیں دی،
واہ۔ اس نے کچھ شوخ لہجہ لیے ہوئے کہا
آپ کو دکھائی دے تو نا کئی مرتبہ تو آ گئی۔ مگر آپ۔۔۔

"اندھا ہوں۔ یہی نا"۔ میں نے اس کے جملے کی تکمیل کی۔
ایک حسین قہقہہ کمرے کی فضا میں گونج اٹھا۔
ہنسی آ گئی تمہیں۔
آپ کی باتوں پر۔
کیوں؟
آپ اندھے ہیں ؟
نہیں تو پھر کیا۔ ؟
اندھے بھی آنکھیں رکھتے ہیں۔
ارے۔ یہ نئی بات تم نے کہی۔
پھر ایک دلکش قہقہہ
نرس تم مجھے بنا رہی ہو۔
نہیں اندھے آنکھوں سے نہیں دیکھتے۔ لیکن دل کی
نگاہوں سے تو ضرور دیکھ سکتے ہیں۔
اوہ! تم نے بڑی دور کی کہی۔ اچھا بیٹھو۔ کھڑی تم
وہ میرے نزدیک ہی پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ بولیئے،
اچھا نرس تمہارا نام؟
کیوں پوچھتے ہیں آپ میرا نام؟
یونہی۔ دل چاہا۔
بی، سی!
س بی سی،
نہیں صرف بی سی کہئے آپ!
کتنا سندر نام ہے،
کیا؟ ـــ
تمہارا نام۔
آپ کو پسند ہے؟
بہت پسند ہے بی، سی۔

ہوں۔
اچھا ایک اور بات پوچھوں بتاؤگی؟ ۔ تم یہاں کب سے ملازم ہو؟
کوئی ڈیڑھ دو سال سے۔
لیکن میں نے تمہیں چند دنوں سے یہاں دیکھا ہے
تو میں آپ کے نزدیک جھوٹی ٹھہری۔
نہیں ۔ بی، سی تم بڑی اچھی لڑکی ہو۔
سچ مچ ۔ اس کے ملائم نازک ہاتھ کی انگلیاں میری پیشانی کو چھو رہی تھیں۔
ہاں ۔ میرے ہاتھ بڑھے اور ان انگلیوں سے مس ہوگئے ۔ اور اسی طرح چند سکنڈ میں وہ ملائم انگلیاں میرے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں آگئیں۔
"چھوڑیئے میرے ہاتھوں کو" چند لمحوں کے بعد بی، سی نے کسی خیال کے تحت گھبرا کر کہا "مجھے دوسرے بیماروں کے پاس جانا ہے"۔
"بیٹھی رہو، کہاں چلیں" میں نے اس کے ہاتھوں کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔
دیکھئے ہاشمی صاحب! ڈاکٹر صاحب نے آپ کو زیادہ بولنے سے منع کیا۔ خدا کے لیے آپ آرام کیجئے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
پھر کب آؤگی بی۔ سی؟
آٹھ بجے ۔ لیکن ایک شرط پر ۔ اور وہ شرط یہ ہے کہ آپ کچھ نہ بولیں ۔ ایک قہقہہ اڑا۔ اور پھر غائب ۔ عجیب نرالی شرط ہے، دیکھنے سے معذور، بولنے سے مجبور ۔ کمرے میں سکوت پھیلا ہوا تھا، شاید وہ جا چکی تھی ۔ اب میرے دل میں ایک خلش آمیز لذت محسوس ہونے لگی، ایک میٹھا سا درد، میں نے خیال کیا ۔ آہ بی، سی کتنی اچھی لڑکی ہے، وہ میرا پورا خیال رکھتی ہے، اس کے چلے جانے سے میں نے ایک کمی محسوس کی ۔ وہ، شاید اس کی رفاقت، اس کی قربت میرے لئے طمانیت بخش تھی، حالانکہ میری نظریں اس کی ظاہری ادا کو دیکھنے کے لیے قطعئ مایوس تھیں، اس کے میرے پاس سے چلے جانے کے بعد مختلف خیالات میرے دماغ میں چکر لگا رہے تھے، اور ان ہی خیالوں میں کھویا ہوا میں غافل ہوگیا۔
دفعۃً میری پیشانی کو کوئی ملائم چیز مس کرگئی ۔ میں نے ایک کروٹ کے ساتھ ہلکی سی جھرجھری لی "آپ سو رہے ہیں آپ سو رہے ہیں" ایک دلکش آواز میرے کانوں میں گونج اٹھی ۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش کیا، کہئے مزاج تو اچھا ہے پھر اسی نے سوال کیا،
میں بدستور خاموش رہا۔
کیا بات ہے، آپ بولتے نہیں ۔ مجھے خاموش پاکر اس نے سوال کیا،
ارے آپ کو کیا ہوگیا، اس نے بے چینی کا اظہار کیا، آپ نے چپ کیوں سادھ لی، کہئے مزاج تو نہیں بگڑا آپ کا، ڈاکٹر کو بلا لاؤں ۔ یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگی۔
ہوں، میں نے فوراً اس کی نازک سی کلائی تھامی، ہاشمی میں پریشان ہوں، آپ زبان سے کہئے کیوں نہیں بولتے، وہ شاید میرے اوپر جھکی ہوئی تھی، اس کی سانس کی گرم گرم رفتار میرے منہ کے قریب تک آ رہی تھی، بتلایئے آپ چپ کیوں ہیں ۔ اس نے محبت بھرے لہجہ میں میرے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا "صرف تمہاری خاطر"

میں نے اس کے دونوں بازو کو گرفت میں لے کر دبے ہوئے لہجے میں کہا

"میری خاطر آپ نے خاموشی اختیار کرلی" حیرت کے تمام یہ جملہ اس کی زبان سے نکلا۔

"ہاں بی' سی تم نے نہ بولنے کی شرط جو لگائی تھی"

شاید وہ ہنس رہی تھی' اس کے بدن کا سارا حصہ میرے ہاتھ میں تھرتھرا رہا تھا "آپ نے مجھ سے یہ پہلے ہی کیوں نہ بتایا"۔

"تمھیں پریشان کرنے کے لیے۔ کہو ڈر تو نہیں گئیں"

ہاں۔

تمھیں میرے ساتھ ہمدردی ہے بی' سی۔

ہاں آپ بڑے اچھے آدمی ہیں ۔۔

تمھاری طرح۔۔

وہ چپ ہو گئی۔

"خاموش کیوں ہو بولو۔ کیا شرما گئیں" میں نے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ اس کے رخساروں کی گرمی میری روح کی لہرائیوں میں جذب ہو کر سرور آمیز لذت پیدا کر رہی تھی' چند آنسوؤں کے گرم گرم قطرے میرے رخساروں پر ٹپک پڑے' ارے یہ آنسو؟ ۔ میں نے اس کی پرنم آنکھیں ٹٹول کر کہا "تم رو رہی ہو بی' سی' بتاؤ' تمھیں مجھ سے کیا تکلیف پہنچی"۔ وہ فوراً میری گرفت سے نکل کر کھڑی ہو گئی ۔۔ پھر تیز قدموں کی آہٹ اور دروازے کے پٹ بند ہونے کی آواز سنائی دی' شاید وہ میرے کمرے سے جا چکی تھی' میں نے خیال کیا۔ آج وہ کیوں مغموم ہے' اس کی آنکھوں میں یہ آنسو کیسے!

کیا اس کو مجھ سے محبت ہے' میرا دل اس کی یہ حالت دیکھ کر مضطرب سا ہوا' میں ان ہی خیالوں میں کچھ دیر تک الجھا رہا' چند لمحے گزرے ہوں گے وہ دوبارہ میرے کمرے میں داخل ہوئی'

کون' نرس؟ میں نے آواز دی۔ کہاں چلی گئی تھیں

"ڈاکٹر سے رپورٹ لکھوانے"

نرس' اللہ بتاؤ یہ میری آنکھوں کی پٹی کب کھلے گی'

بہت جلد شاید تیسرے دن۔

آہ بی' سی میرا دل اتنا کیوں مضطرب ہے تمھیں کچھ معلوم ہے'

"اپنے بچھڑے ہوؤں کی یاد ستاتی ہو گی" اس نے کچھ متاثر کن لہجے میں کہا۔

"ہاں بی' سی' تم نے ٹھیک کہا" میں نے کچھ سوچ کر اسے آزمانے کی خاطر کہا۔ صرف ایک کی؟ "وہ کوئی آپ کی محبوبہ ہو گی؟"۔ اس نے کھلے الفاظ میں کہا۔

آپ انھیں یہاں بلا لیجئے۔ لیکن نرس وہ بڑی سنگ دل ہے۔ اسے میرا تڑپنا دیکھ کر بڑا لطف آتا ہے۔

آپ کو اس سے محبت ہے' اس نے مجھ سے ایک انوکھا سوال کیا۔

بے حد محبت ہے اس کے بغیر میری زندگی تلخ ہو گی'

وہ کچھ دیر چپ کھڑی رہی۔ میں حیران تھا کہ اپنے جذبات کا اظہار کن الفاظ میں کروں فوراً ایک ترکیب ذہن میں آئی' مذاق کا مذاق اور مطلب کا مطلب نکل آئے گا "ایک کام کرو گی میرا" میں نے کچھ دیر تامل کرکے اس سے دریافت کیا۔

کام؟ کیا آپ مجھ سے کوئی کام لیں گے۔ کاش میں اس قابل ہوتی'

تم نے کچھ اُردو پڑھی ہے؟
اُردو تو میں نے بہت کم پڑھی ہے، صرف چٹھی جاٹ تک۔
"لکھ سکتی تو ہو، نا"
ہاں، معمولی ۔
میں تم سے ایک چٹھی لکھوانا چاہتا ہوں، تم
لکھ دو گی؟
ہاشمی صاحب، میں بخوشی یہ کام کرنے کے لئے تیار
ہوں، یقین مانئے! میں آپ کے ادنیٰ اشاروں پر
بڑی بڑی قربانی کرنے کے لئے تیار ہوں ۔
کاغذ اور قلم تمھارے پاس ہوگا ۔
قلم تو میرے پاس موجود ہے لیکن کاغذ دفتر سے
لے آتی ہوں، یہ کہہ کر بی اسی فوراً روانہ ہوئی۔ اور چند
سکنڈ میں کاغذ لے کر چلی آئی ۔ ہاں فرمائیے، میں کاغذ
لے آئی ہوں ۔
تم ذرا قریب آن بیٹھو بی اسی، آواز سے بولنے میں
حرج ہوگا،
اس کا خوبصورت سا نازک جسم میرے بدن کو مس
کر رہا تھا، میں نے کہا اچھا لکھو ۔

جانِ حیات! تیری معیت ہے زندگی
کرتا ہے کون زیست کا دعویٰ ترے بغیر

تمھیں معلوم ہے کہ میں دواخانہ میں کس مپرسی
کی حالت میں پڑا ہوا ہوں، آنکھ کے آپریشن کے ساتھ
ساتھ دل کا آپریشن بھی ہوا ہے ۔ لیکن دل والا آپریشن
کچھ یونہی سا رہ گیا ہے، ایک نیکی کا فرشتہ ہمیشہ اپنا محبت
آمیز سایہ ڈالتا ہوا میرا نگہبان بنا ہوا ہے۔ دیوی یہاں
مجھے یہ سب کچھ میسر ہے۔ لیکن میرا دل اور روح تشنۂ محبت
کے لئے ہنوز تشنہ لب ہے، میں کہہ نہیں سکتا مجھے تم سے
کتنی محبت ہے بے حد ۔ چاند اور چکور سے زیادہ ۔
ایک لمحے کے لئے میں نے توقف کیا ۔
"کیا لکھا ہے بی اسی" میں نے کہا، ذرا پڑھو تو ۔
مجھے تم سے بے حد محبت ہے چاند اور چکور سے زیادہ،
اس نے کچھ الفاظ رُک رُک کر ادا کئے ۔ گویا الفاظ
اس کے حلق میں پھندا بنا رہے تھے ۔
"اچھا لکھو" میں نے اس کو مخاطب کیا،
جب تم میرے پاس سے چلی جاتی ہو، میرا دل بیتاب
ہو جاتا ہے، تمھارے بغیر میری زندگی بے کیف ہوگی
سچ تو یہ ہے کہ تم میرے حق میں ایک بہترین ساتھی ثابت
ہوگی، میں نہایت بے تابی کے ساتھ تمھارا فیصلہ
سننے کے لئے مضطرب ہوں ۔ للہ میری محبت کا جواب
محبت سے دو ۔
"اچھا ختم کرو خط کو" ۔ میں نے بی اسی سے کہا۔
"نام لکھوں آپ کا" ۔ بی اسی نے کہا ۔
ہاں، ہاں نیچے لکھ دیجئے ۔ گنہگار محبت
فرید ہاشمی
خط کے لکھ چکنے کے بعد وہ کاغذ کو میرے ہاتھ
میں دے کر اٹھ کھڑی ہوئی، اور بغیر کچھ کہے کمرے
سے چلی گئی میں نے محسوس کیا وہ متاثر ضرور معلوم ہوتی
ہے، رات کچھ عجیب بے چینی کے ساتھ کٹی ۔ صبح ڈاکٹر
میرے کمرے میں آیا۔ اس کے ساتھ نرس تھی ۔ اس کے
جانے کے بعد لطیف صاحب ملنے آئے اور بہت
دیر تک پریس اور پرچے کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔
میں نے ان سے اس پرچے کی پشت پر بی اسی کے نام کا

پتہ لکھوایا۔ اور ان سے کہا آپ جاتے ہوئے یہ چٹھی، نرس کو دیتے جائیے۔ دوسرے دن میری آنکھوں سے پٹی نکالی جائے گی، ڈاکٹر ایک دوسری نرس کے ساتھ میرے کمرے میں آیا، اس نے کہا ہاشمی صاحب! کیا آپ کو اس نرس سے کوئی شکایت ہے،

میں کچھ دیر کے لئے چپ ہو رہا، مختلف خیالات مجھے کہاں سے کہاں کھینچ لے گئے۔

کونسی نرس ڈاکٹر، میں نے پوچھا۔

وہی نرس بی، سی

[illegible]

میں نے اپنے دل میں کہا۔ کیا مجھے بی، سی سے کوئی شکایت ہو سکتی ہے، وہ سارا سارا دن میرے پاس کھڑی رہتی تھی۔ اُسے مجھ سے کتنی ہمدردی تھی، لیکن میں نے اس میں مصلحت سمجھی کہ اس کو یہاں سے علیحدہ کروا کر میں اس کے لئے کچھ کر سکتا ہوں،

ہاں ڈاکٹر، میں نے کچھ دیر تامل کر کے کہا، مجھے بی، سی سے ضرور شکایت ہے، وہ وقت پر میرے پاس حاضر نہیں رہتی، میری اکثر دوا اُس کی وجہ سے ناغہ ہو جاتی ہے۔ آہ میں کتنا جھوٹ بول رہا تھا۔

ہاں دوسرے مریضوں کو بھی یہی شکایت ہے ہاشمی صاحب، وہ وقت پر حاضر نہیں رہتی، معلوم نہیں سارا سارا دن کہاں گزارتی ہے، میں دیکھتا ہوں کہ چند دنوں سے وہ کچھ عجیب خیالوں میں گم رہتی ہے۔ خدا معلوم اسے کیا ہو گیا ہے بھلا ایسی نرس ہمارے کس کام کی اسے علیحدہ کرنا چاہیئے۔

"ہاں ہاں ڈاکٹر اسے ضرور علیحدہ کروائیے" میں نے ڈاکٹر کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا، وہ بہت کاہل ہو گئی ہے۔ "میں ایک ہوشیار اور ہمدرد نرس کو آپ کے پاس متعین کرتا ہوں"۔ ڈاکٹر نے کہا۔

اس کے بعد اس نے احتیاط سے میری آنکھوں سے پٹی نکالی۔ کل مجھے یہاں سے رخصت ہونا تھا۔ میں مسرور ہونے کے بجائے بہت زیادہ مغموم تھا۔ میرا دل کسی نامعلوم جذبات کی تحت مضطرب تھا۔ میں نے نئی نرس سے بی، سی کے متعلق دریافت کیا۔ معلوم ہوا وہ آج ہی ملازمت سے برطرف کی گئی ہے، آہ میں بھی عجیب انسان ہوں، میں نے خیال کیا۔ میں نے خود ہی خواہ مخواہ اس کی شکایت کر دی۔ وہ مجھ سے ضرور محبت کرتی ہے، میرا دل اس سے ملنے کے لئے تڑپنے لگا، وہ میرے متعلق کیا خیالات رکھتی ہوگی۔ میں نے ایک چٹھی اس کے نام سے لکھی۔

"پیاری بی، سی! میری آنکھیں اب بالکل اچھی ہو گئی ہیں۔ تمہیں تعجب ہوگا میں نے خود تمہیں ملازمت سے علیحدہ کیا۔ یہ ایک راز ہے، جو تم سے ملنے کے بعد وا ہوگا۔ کل صبح نو بجے تم میرا مکان پر انتظار کرو"

صبح تکلیف صاحب مجھے لینے کار لیے آئے، ڈاکٹر اور اس کے مددگار کا میں شکریہ ادا کر کے دواخانہ سے رخصت ہوا۔ راستے میں تکلیف صاحب سے میں نے موٹر رکوانے کو کہا، وہ کسی قدر حیران سے ہوئے،

میں نے کہا یہاں ایک نرس سے مل کر شکریہ ادا کرنا ہے قبل ازیں میں نے دواخانہ کے ملازم سے بی، سی کے مکان کا پتہ دریافت کر لیا تھا، اس نے

مجھے اس کا مکان معلوم کرنے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی۔
ایک معمولی کھپریل کے مکان پر میں نے بی اسی
کے نام کی تختی دیکھی، میں نے زنجیر کھٹکھٹائی فوراً دروازہ
کھلا، بی اسی میرے سامنے متبسم کے ساتھ کھڑی تھی،
"آئیے اندر"
"تمھیں غالباً میرا ہی انتظار ہوگا" میں نے مکان
کے اندر داخل ہو کر کہا۔
"ہاں کل آپ کی چٹھی ملی ــ ... س کے بعد
برطرفی کا آرڈر فارم"۔ اس نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔
میں حیران ہوں یہ کیا معاملہ ہے، ہم دونوں
مکان کے سامنے والے حصہ میں پڑی ہوئی بید کی
کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ خیر جو کچھ ہوا تمھارے لیے بہتر ہے،
مس بی اسی میں نے اس کے مکان کا سرسری جائزہ
لینے کے بعد کہا۔ میرے لئے بہتر ہے؟ اس نے حیرت
کے ساتھ کہا۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں ہاشمی ــ
آزادی تو میسر ہوئی ــ ہمارے لیئے اب میں
تم سے بے روک ٹوک مل سکتا ہوں، لیکن آپ
جانتے ہیں۔ اس نے کچھ مایوس کن لہجے میں کہا، میری
حالت ــ

بی اسی تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا، میں نے بات
کاٹ کر کہا ــ میں شرمندہ ہوں ــ اس لیے تو آپ
اس کا یہ صلہ دے رہے ہیں ــ اس کا لہجہ طنز آمیز تھا۔

ہاں ــ بی اسی، میں نے صاف صاف لفظوں
میں کہنا شروع کیا۔ تمھیں اپنے ہی ہاتھوں لکھی ہوئی
تحریر مل گئی ہوگی، اور پھر ــ میں نے تمھیں ملازمت
سے علیحدہ کروانا ہی بہتر سمجھا اس لئے کہ میں تمھیں
اپنا بنانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ تم ایک نرس کی حیثیت
سے رہ کر میری شریک حیات بن نہ سکوگی ۔ میرے
پاس تمھارے لئے نہ تو شکریہ کے الفاظ ہیں،
نہ کوئی اسی بڑی تعداد میں۔ تم ــ عطیے کے لئے،
سوائے چند آنسوؤں کے قطروں کے جو تمھاری محبت
کی خاطر میں نے بہائے ہیں ــ
بی اسی میں خوش ہوں کہ میں نے آنکھوں کے
ساتھ ساتھ ایک ایسی ہستی کو پا لیا جو میرے غموں کو
پامال اور مسرتوں کو دوگنا کر سکتی ہے" آہ میں بڑا
خوش نصیب ہوں دفعتاً میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔
آواز میں رقت طاری ہوگئی ــ

آپ ــ آپ ــ رو رہے ہیں ــ
بی اسی تیزی سے اٹھی ــ بڑھ کر اس نے میرے
آنسوؤں کے چند قطروں کو اپنے مقدس دامن میں
جذب کر لئے ــ میں نے دیوانہ وار اس کی صراحی دار
گردن اپنے ہاتھوں کے حلقہ میں لے کر اس کے احمریں ہونٹوں پر
ایک طویل گرم مہر ثبت کر دی ــ

صابر کوسکوی

بدرالنساء بیگم خفی مرحومہ

موجودہ زمانے میں تعلیم نسواں کی جو آسانیاں اور سہولتیں میسر ہیں، وہ آج سے پچاس سال پہلے بالکل مفقود تھیں۔ اس کے باوجود جن خواتین نے کمال اور عزت حاصل کی تھی وہ قابل قدر اور لائق تحسین ہیں، اسی زمرہ میں ایک بدرالنساء بیگم المتخلص خفی بھی ہیں۔

خفی کے والد محمد ابو الفیض سعید الدین مرحوم تھے، جو سرکار عالی کے سررشتہ عدالت میں منصفی کی خدمت پر مامور تھے، اپنے وقت کے عالم متبحر اور قابل فرد تھے، واعظ بھی تھے اور عملیات میں بھی پوری مہارت حاصل تھی۔

بدرالنساء بیگم خفی کی پیدائش سنہ ۱۲۸۰ھ کے قریب ہوئی، تعلیم اور تربیت گھر پر خانگی طور سے ہوئی، چونکہ اس زمانے میں کوئی سرکاری زنانہ مدرسہ نہیں تھا۔ اور عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام نہیں تھا اس لیے انھوں نے کوئی سند یا ڈگری تو حاصل نہ کی مگر اپنے والدین سے عربی، فارسی اور اردو کی اعلیٰ تعلیم پائی، اور پھر انگریزی میں بھی مہارت پیدا کی تھی۔ اس زمانے میں انگریزی تعلیم حاصل کرنا لڑکوں کے لئے بھی کسی قدر دشوار تھا چہ جائے کہ عورتیں اس تعلیم کو حاصل کریں۔ بہر حال خفی کی اس تعلیم سے اس امر کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ مولوی سعید الدین زمانے کے رنگ سے واقف اور رفتار زمانہ سے باخبر اور روشن خیال بزرگ تھے کہ انھوں نے اپنی دختر کو بھی انگریزی تعلیم دلائی تھی۔

بدرالنساء بیگم کا ماحول چونکہ مذہبی تھا اس لئے وہ بچپن سے صوم وصلوٰۃ کی بے حد پابند تھیں مطالعہ کا خاص شوق تھا۔

ضلع محبوب نگر میں نارائن پیٹھ ایک مشہور مقام ہے جو زمانہ سابق میں اپنی دست کاری صنعت کے باعث خاص طور پر شہرت رکھتا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ یہاں قابل اشخاص جمع ہو گئے تھے، منصف، تحصیلدار، ڈاکٹر، صدر مدرس، یہ سب علم وفضل شعر و شاعری کے دلدادہ اور اپنے وقت کے اچھے شاعر تھے، خصوصاً ڈاکٹر احمد حسین صاحب مائل جو حیدرآباد کے قابل ترین شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں، اسی مقام پر کارگزار تھے۔

اس ماحول کے مدنظر بدرالنساء بیگم نے بھی چودہ سال کی عمر سے شعر گوئی شروع کر دی حضرت مائل سے تلمذ رہا۔ اپنے شوق اور قابل استاد کی دلچسپی کے باعث بہت جلد ان کو اچھا ملکہ حاصل ہو گیا۔ "خفی" تخلص تھا۔ سنہ ۱۳۱۰ھ میں ان کا دیوان شائع ہوا ہے، جس کو آج ۴۶ سال کا عرصہ ہوتا ہے۔

اردو شاعری کا رنگ آج سے چالیس پچاس سال پہلے بالکل جداگانہ تھا۔ قدیم طرز پر غزل گوئی کا بازار گرم تھا۔ عشق و عاشقی، گل و بلبل، شاہد و ساقی پر قافیہ بازی ہوتی تھی۔

مگر خفی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کو صرف مدح رسول اور عشق حقیقی تک محدود رکھا تھا۔ ان کا پورا دیوان جو ردیف وار ہے شروع سے آخر تک نعتیہ ہے۔

آپ کی شاعری کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ ایک مرتبہ آپ کے والد مولوی سید سعید الدین صاحب

حسبِ معمول وعظ فرما رہے تھے، وعظ کا موضوع سیرتِ رسول کریم تھا۔ اور بیان کچھ ایسا دلنشیں تھا کہ "مخفی" پر اس کا خاص اثر ہوا اور وہ بیہوش ہو گئیں۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ اپنا سر رسول کریم صلعم کے قدموں پر ہے۔ اور رسول اللہ صلعم نے آپ کا سر اپنے ہاتھ سے اٹھا کر ارشاد فرمایا **ذالک الفضل اللہ یوتی من یشاء**۔ کہا جاتا ہے، اسی وقت سے آپ کی شاعری مدح رسول میں ہونے لگی۔

آپ کی شادی سولہ سال کی عمر میں ہوئی۔ خوش قسمتی سے رفیق زندگی بھی شاعر ملا۔ مولوی حفیظ الدین بھی حیدر آباد کے ایک اچھے شاعر تھے، آپ کا دیوان "مخم خانۂ خواجہ" کے نام سے شایع ہوا ہے۔

بدرالنسا بیگم کو شاعری کے ساتھ دستکاری میں بھی کافی دستگاہ حاصل تھی۔ امورِ خانہ داری سلیقہ شعاری کا بھی پورا ملکہ رکھتی تھیں۔

۱۳۳۱ھ میں بدرالنسا بیگم مخفی کا انتقال ہوا اور حیدر آباد میں مدفون ہیں۔

اس تفصیل کے بعد آپ کے کلام کا مختصر نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

ناز سے آئے گا جس وقت وہ محبوبِ خدا　　دیکھنا حشر میں ایک حشر نمایاں ہوگا
خود کرے گا مری بیماریٔ عصیاں کا علاج　　رشکِ عیسیٰ مرا آمادۂ درماں ہوگا
کب ملے گی مجھے وہ دولتِ دیدار تری　　کوکبِ بخت یہ کب مہر سا تاباں ہوگا

ہوتی ازل میں گر نہ تری ذات جلوہ گر　　جمتا نہ رنگ تا بہ ابد کائنات کا

دلِ مضطر کو بہلایا تو ہوتا　　کبھی پھر خواب میں آیا تو ہوتا

وہ بھی اک دن تھا کہ روئے پاک پاتا تھا نظر　　اب الٰہی یہ مقدر میرا کیسا ہو گیا

توبہ کرتی ہوئی بھاگی ہیں بلائیں ساری　　بن گیا جب سے محمد مرے دل کا تعویذ

قریب ہو وقت موت کا جب جو آئے آنکھوں میں دم ہمارا　　دکھا دو مجھ کو وہ پاک چہرہ نقاب منہ سے اٹھا اٹھا کر
لحد میں جس دم نکیر آئیں طرح طرح سے ہمیں ڈرائیں　　تو دستگیری کرو ہماری جمالِ باطن ہمیں دکھا کر

مدحِ رسول کی ہے مجھے حرص بالخصوص　　ہرگز نہیں ہے مجھ کو نام و نشاں کی حرص

آپ چاہیں تو مدینہ سے دکن دور نہیں — ہجر کی آگ میں ہم دل کو جلائیں کب تک

حجاب منہ سے اٹھا چکے ہیں مجھے وہ صورت دکھا چکے ہیں — مری نظر میں سما چکے ہیں نظر سے پھر دل میں آ چکے ہیں
غضب ہے سن کر بھی پھر نہ سننا ستم ہے انجان ان کا ہونا — کہ نالہ و شیون و فغاں میں تو درد دل ہم سنا چکے ہیں
فنا ہماری بقا کے اندر بقا ہماری فنا کے اندر — بتائیں نام و نشاں کسے ہم کہ اپنی ہستی مٹا چکے ہیں

فراقِ احمد میں دل تپاں ہے اور اشکِ حسرت ٹپک رہے ہیں — وہ ہیں جدائی کے تیز کانٹے دل و جگر میں کھٹک رہے ہیں
جو کور باطن ہو دیکھے کیونکر بھری ہے یوں راہِ عشق احمد — ہزاروں بسمل تڑپ رہے ہیں بہت سے عاشق سسک رہے ہیں

کاش تدبیر سے تقدیر موافق ہوتی — خانۂ دل میں ہم اس شاہ کو مہماں کرتے
راز کی باتیں جو ارشاد وہ کرتے ہم کو — گنجِ مخفی ہی سمجھ کر انھیں پنہاں کرتے
اے خفیؔ حضرت یوسف اگر اس دم ہوتے — حسنِ احمد کو دکھا کر انھیں حیراں کرتے

اے آفتابِ حشر نہ آنکھیں دکھا ہمیں — ہم شاہِ دیں کے سایۂ دامن میں آئیں گے
پُرزے کریں گے جامۂ ہستی کے شوق سے — ہم اے خفیؔ جو روضۂ اقدس پہ جائیں گے

یہ ایک مختصر نمونہ ہے جو خفیؔ کے مطبوعہ دیوان سے اخذ کیا گیا، اگرچہ یہ مطبوعہ ہے مگر اب کم یاب ہے، اس نمونہ سے خفیؔ کے اندازِ بیان، زبان، اور طرزِ ادا کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ خفیؔ اپنے زمانے کی بلند پایہ اور قابلِ فخر شاعرہ تھیں مگر ان کے کلام کو دیکھ کر اس امر کا اعتراف کرنا ہوگا کہ وہ اچھی شاعرہ تھیں ان کے دیوان کو شائع ہو کر چالیس سال سے زیادہ عرصہ ہوتا ہے اور خود ان کو انتقال کئے ہوئے تقریباً تیس سال ہوتے ہیں۔ مگر بہت کم لوگ ان سے واقف ہیں، نہیں معلوم ایسے کتنے شعرا گوشۂ گمنامی میں ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی

مدراس میں اُردو (مجلد)۔ اس کتاب میں مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل نے مدراس میں اُردو کے نشو و نما اور اس کے ارتقا کی تاریخ پیش کی ہے۔ کتاب کو ۱۰ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر دور کے شاعروں اور نثر نگاروں کے سوانح حیات اور نمونہ کلام کو پیش کیا ہے۔ تاریخ ادب اُردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ (صفحات ۲۰۰ قیمت مجلد عہ)

آم

جاڑوں کی رات تھی، آٹھ بج چکے تھے، میں کھانے سے فارغ ہو کر سگریٹ سے شغل کر رہا تھا۔ سلیم کپکپاتا ننگے پاؤں کمرے میں داخل ہوا۔ سلیم میرا کالج کا ساتھی تھا، ہم دونوں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ اس کے آج غیر معمولی طور پر دیر سے ننگے پیر آنے پر مجھے تعجب ہوا۔ میں نے اس سے اس کا سبب پوچھا۔ میرے سوال کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور بے پروائی سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اور اس کا دھواں چھت کی طرف چھوڑنے لگا۔ اس کی نظریں دھویں کے ان حلقوں پر جمی ہوئی تھیں۔ جو اس کے منہ سے نکل کر اوپر جاتے اور فضا میں غائب ہو جاتے تھے۔ اس کی خاموشی نے مجھے اور زیادہ بے چین اور متجسس بنا دیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے صوفے کے بازو پر بیٹھتے ہوئے پوچھا "کیوں بھائی سلیم مزاج تو اچھا ہے نا؟ کونسی افتاد پڑی جس سے تم اسقدر متاثر نظر آتے ہو! اور ہاں تمھارے جوتے کیا ہوئے"؟ سلیم پھر بھی خاموش رہا اس کی نظریں چھت کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی، اور اسی طرح دیکھتے ہوئے دبی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ "وحید آج میں نے ایک نہایت ہی بھیانک منظر دیکھا ہے، بے چارے ایک غریب لڑکے کا خون ہوا جس کی ابتدا کرنے والا میں تھا!"

میں حیران ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔ مجھے شبہہ سا ہونے لگا کہ اس کے حواس بجا نہیں تھے۔ لیکن وہ فوراً میری طرف پلٹ کر کہنے لگا۔

"وحید! آج میں چار بجے شہر سے اپنی خالہ صاحبہ سے مل کر ہاسٹل واپس آ رہا تھا کہ خیال آیا کہ لگے ہاتھوں جوتا بھی سلوا لوں ورنہ پھر بات آئندہ جمعہ پر جا پڑے گی۔ اسی خیال میں راستہ طے کر رہا تھا کہ ایک چھوٹی سی دکان پر نظر پڑی جس پر ایک ادھیڑ عمر کی موچن بیٹھی آنے جانے والوں کو حسرت سے تک رہی تھی۔ وہ چہرے سے بہت ہی ستم زدہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کی حالت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی زندگی بہت ہی تلخ اور کٹھن ہو گئی ہے۔ میں نے دل میں کہا چلو اس غریب کی کچھ مدد بھی ہو جائے گی اور میرا کام بھی بن جائے گا۔ فوراً سیکل سے اتر پڑا اور اس کو اسٹانڈ لگا دکان پر گیا، دکان اس قدر چھوٹی اور اس کی چھت اس قدر پست تھی کہ میں اس میں سیدھا کھڑا بھی نہ رہ سکتا تھا۔ ہر چیز سے انتہائی فلاکت کے آثار ہویدا تھے۔ کھونٹیوں پر میلے کچیلے چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ ایک کونے میں پانی کا ایک پرانا سیاہ گھڑا رکھا تھا۔ جس پر پیندے کے قریب کائی اُگ آئی تھی۔ گھڑے کے قریب ہی دو سیاہ ہانڈیاں کھلی ہوئی خالی پڑی تھیں۔ جن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ سارے کمرے میں چمڑے کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔ اور ایک ناگوار سی بُو ساری دکان میں پھیلی ہوئی تھی۔ میرا وہاں ٹھیرنا دشوار سا ہو رہا تھا۔ لیکن جوتا سلوانا جو منظور تھا، مجبوراً ٹھیرنا ہی پڑا۔

دو چھوٹے بچے جن کا سن تین برس اور پانچ برس کا ہوگا اس موچن کے بازو ننگے بیٹھے ضد کر کے رو رہے تھے۔ کبھی وہ موچن ان کو دھمکا کر خاموش رہنے کو کہتی اور کبھی پیار سے چھوٹے بچے کو اپنے سینے سے لگا کر منانے اور خاموش کرنے کی

کوشش کرتی ۔

مجھے ہاسٹل جانے کی جلدی تھی، اس لئے بار بار اس کو جلد سینے کے لئے کہہ رہا تھا۔ اِدھر بچے اسے علٰحدہ تنگ کر رہے تھے ۔ آخر موہن کو غصہ آ ہی گیا، اور وہ غصے میں چھوٹے بچے کو پیٹنے لگی ۔ جب خوب پیٹ چکی اور بچہ مار کھا کر سہما ہوا اپنے بھائی کی گود میں دبک کر بیٹھ گیا تو موہن اپنی جگہ پر آ بیٹھی اور پھر جوتا سینا شروع کیا ۔ اب وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی، اس کا ہاتھ کام کرنے سے قاصر تھا۔ پھر بھی وہ جوتے میں ٹانکے لگانے کی ناکام کوشش کیے جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے جو جوتے پر گرنے لگے ۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ میں نے اس سے بچے کی ضد اور رونے کا سبب دریافت کیا موہن نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "سرکار صُبّو (صبح) سے بھوکا ہے کیا کروں ایک پیسہ بھی نجک (نزدیک) نیں (نہیں) ہے۔ جب سے آم کھاتوں بول کر جد (ضد) کرتا ہے۔ وہ آم والی چنڈال بھی آج صُبّو سے ہینچ (یہاں ہی) دکان لگا کر بیٹھے نا۔"

دکان کے مقابل سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک آم والی بُڈھیا سڑے گلے آموں کے دو دو تین تین کی ڈھیریاں ایک ٹاٹ پر لگائے بیٹھی تھی ۔ بچے ان آموں کی طرف جن کا رنگ سڑک کی گرد جمنے سے بھورا ہو گیا تھا حسرت سے دیکھ رہے تھے میں نے اپنے جیب سے تین پیسے نکال کر بڑے بچے کی طرف بڑھائے ۔ بچہ منہ کھول کر پیسوں کو تکنے لگا ۔ موہن ممنون نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی ۔ اس نے بچے سے کہا "جا بیٹا، سرکار پیسے دے رئیں ۔ دو پیسے مجھے دے اور ایک پیسے کے آم لے کو آ" بچہ جھجکتا ہوا میرے پاس آیا اور میرے ہاتھ سے پیسے لے کر آم والی کی دکان کی طرف لپکا۔ موہن دو پیسے واپس دینے کے لیے پکارنے لگی .... آہ ..... بچہ بے ساختگی میں ایک تیز رفتار موٹر سے ٹکرا گیا اور اس کا سر پاش پاش ہو گیا۔ اس کی ماں ایک زخمی جانور کی طرح چلاتی ہوئی اس کی طرف دوڑی اور اپنے بیٹے کی لاش پر گر کر بے ہوش ہو گئی ۔ بہت سے لوگ جمع ہو گئے، پولیس آئی، لڑکے کی لاش اور موہن کو موٹر میں ڈال کر دواخانے کر چلی گئی۔ میں اسی جگہ دم بخود کھڑا یہ سب کچھ دیکھا کیا۔ مجھے اپنے آپ کا ہوش نہ تھا۔ جب مجمع منتشر ہو گیا تو میں بھی اپنی جگہ سے آگے بڑھا۔ دیکھا کہ میری سیکل غائب تھی۔ اس وقت میرا دماغ عجیب خیالات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ سیکل کے گم ہونے کی پولیس میں اطلاع بھی نہ کی اور اسی طرح پیدل چل پڑا۔ مجھے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ میں نے اس قدر لانبا راستہ کتنی دیر میں اور بغیر جوتے کے کیونکر طے کیا۔"

سلیم اپنی آپ بیتی سنا کر بغیر کھانا کھائے سو گیا۔ لیکن آدھی رات کو چیخیں مارتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

"وحید میں آم نہیں کھاؤں گا، وحید میں آم نہیں کھاؤں گا۔"

شمشیر علی

اطلاع

رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع ۱۵ تاریخ کے اندر بھیجنی چاہئیے ورنہ دفتر پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔

میرا دیہاتی وضع کا مختصر مفید گھر سڑک کے کنارے بن رہا تھا، حمام، بیت الخلا، ڈرائینگ روم اور خوابگاہ تیار ہو چکے تھے اب پڑھنے کا کمرہ تیار ہو رہا تھا، میری خواہش تھی کہ الماریاں رکھنے کی گنجائش نکالنے کے لیے دیواروں کی چوڑائی کم کر دوں یا پھر سرے سے الماریوں کی بجائے دیواروں میں ایسے تابدان اور گوشے لگا کر اپنا کام نکال لوں .. .. میں چاہتا تھا کہ کام کم خرچ بالانشیں ہو اور اسی خیال سے میں نے تابدان لگوانے شروع کیے، ہر سمت میں پانچ، دو کے تین تین تابدان تیار ہو گئے، یہ میرا اسٹڈی روم تھا۔

ہال تیار ہو رہا تھا کہ چچا جان آئے، انہوں نے مکان نقشہ دیکھا دیواروں کے حجم پر غور کیا، گز بھر اونچی سرحدی دیوار کا بھی ملاحظہ فرمایا، سب کمروں کی تعریف کرتے لیکن ہر ایک کمرے میں کوئی نہ کوئی نقص نکالتے ہوئے اسٹڈی روم پہنچے اور ان تابدانوں کو دیکھتے ہی کہہ اٹھے "ارے یہ کیا! کیا معقوے کا گھر بنا رہے ہو اور گڑیا کے جہیز میں دینے کی تیاری ہے!" میں حیرت میں تھا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں اس جملے کا مطلب یوں صاف ہوا، تابدان میں دیوار پر انہوں نے ایک کھا لگایا اور دیوار دھڑام سے گر گئی، سڑک پر موٹریں، سیکلیں، آدمی سب چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے، ثقہ لوگوں نے اپنی دستیاں ناک سے لگالی تھیں اور اپنے ہونٹوں کو ناک سے ملا دینے کی ناکام کوشش کر رہے تھے دن دھاڑے ان کی آنکھوں میں مٹی پڑ رہی تھی، اینٹ کے ٹکڑوں پر سے سیکلیں اچکتی، پھُر — پھُر، دھچک — دھچوک کرتی ہوئی گزر رہی تھیں ۔ شاید مجھے گالیاں دے رہی ہوں یا پھر چچا جان کو۔ ایک دو مقدس ہستیاں بھی گزرتی ہوئی دکھائی دیں، انہوں نے نہایت اطمینان سے سڑک پر سے میری مقبوضہ اور ملکی ایک اینٹ اٹھائی اس کو دوسری پر پٹکا، ڈھیلے اٹھا لیے اور معلوم نہیں کہ ان ٹکڑوں پر کیا پڑھ کے پھونکا، ان میں سے ایک ہاتھ میں رکھا اور باقی جیب پھر تابدان میں سے اندر کی طرف دیکھا، اپنے لبوں کو جنبش دیتے ہوئے گویا کہ مجھے دعائیں دے رہے ہوں گزر گئے۔

یہ بزرگانِ دین ابھی اپنی تکمیل احتیاج کے لئے بیٹھنے بھی نہ پائے ہونگے کہ "پاپڑ بھجیے" کی صدا لگاتا ہوا ایک بھٹیارا سامنے آیا۔ پیچھے سے — پاپڑ والے او پاپڑ بھجیئے ۔ کی طفلانہ آوازیں بھی سنائی دیں، بھٹیارے نے فوراً اپنا بانس کا اسٹانڈ نیچے اور اس پر ٹوکرا رکھ کر بچوں کی فرمائشوں کی تکمیل کر دی۔ بچے واپس ہوتے ہوئے تابدان کے سوراخ میں سے — چھاں ۔ کی ایک ایک صدا لگاتے ہوئے جانے لگے۔ بھٹیارا جب چلنے کو ہوا تو میری طرف دیکھ کر کہنے لگا "میاں! آپ نے اچھا کیا جو ادھر سے کھڑکی بنا دی میری بکری خوب ہو گی"۔ وہ چلتا بنا۔ پانچ منٹ اور پچاسوں باتیں سے فکر ہر کس بقدر ہمت اوست میں غصہ کے گھونٹ پیتا مزدوروں کو ضروری ہدایتیں دیتا تھر دروش بجان دروش کی تفسیر بنا ہوا چچا جان کے ہمراہ گھر آگیا۔

اکبر صدیقی

دردِ دل

اے نامہ بر ادب سے　　سب حال زار کہنا
اور ہو سکے تو رو کر　　زار و نزار کہنا
کہنا کہ زندگی میں　　کچھ لطف اب نہیں ہے
آؤ کہ نوجوانی !!　　محوِ طرب نہیں ہے
مجھ کو مری خطا کا　　احساس کیا نہیں ہے
ہاں آپ کی عنایت　　شرطِ طلب نہیں ہے
اے نامہ بر ادب سے　　سب حال زار کہنا
اور ہو سکے تو رو کر
زار و نزار کہنا

کہنا کہ ڈھونڈتی ہیں　　تم کو مری نگاہیں
بیتاب ہو کے آخر　　میں کھینچتا ہوں آہیں
کیوں خاص ہو گئی ہیں　　وہ عام جلوہ گاہیں
کب مجھ سے تھی محبت　　کیوں آپ مجھ کو چاہیں
اے نامہ بر ادب سے　　سب حالِ زار کہنا
اور ہو سکے تو رو کر
زار و نزار کہنا

کہنا کہ رات دن میں　　فریاد کر رہا ہوں
[illegible]　　برباد کر رہا ہوں
[illegible]　　آباد کر رہا ہوں
[illegible]　　[illegible] رہا ہوں
اے نامہ بر ادب سے　　سب حالِ زار کہنا
اور ہو سکے تو رو کر　　زار و نزار کہنا

کہنا کہ اس طرح کیوں　　آمادۂ جفا ہو
کیا ہو گیا ہے تم کو　　کیوں مجھ سے تم خفا ہو
اس دوستی کے صدقے　　اس چاہ کا بھلا ہو
میری یہی دعا ہے　　دل درد آشنا ہو
اے نامہ بر ادب سے　　سب حالِ زار کہنا
اور ہو سکے تو رو کر
زار و نزار کہنا

کہنا کہ یوں تو رقصاں　　ہے زندگی چمن میں
اور حسن جاگتا ہے　　مہتاب کی کرن میں
ہے نغمہ کوش بلبل　　پھولوں کی انجمن میں
کانٹا سا چبھ رہا ہے　　اے دوست میرے من میں
اے نامہ بر ادب سے　　سب حالِ زار کہنا
اور ہو سکے تو رو کر
زار و نزار کہنا

کہنا کہ سانس بھی اب　　بس میں نہیں کسی کے
کیا ختم ہو گئے ہیں!　　ایام زندگی کے
پھر تم کو ڈھونڈتے ہیں　　ارمان دل لگی کے
مجبوریاں ہیں میں ہوں　　کیا دن ہیں بیکسی کے
اے نامہ بر ادب سے　　سب حالِ زار کہنا
اور ہو سکے تو رو کر
زار و نزار کہنا

کہنا کہ زندگی سے ۔ بیزار ہو گیا ہوں
ہنگامۂ جہاں کو گھبرا کے دیکھتا ہوں
اک یاس کا مرقع ، درماندۂ وفا ہوں
امید کے سہارے اب تک میں جی رہا ہوں
اے نامہ بر ادب سے سب حالِ زار کہنا
اور ہو سکے تو رو کر
زار و نزار کہنا

کہنا مسرتیں بھی غم کوش ہو گئی ہیں
اور حسرتیں بھی رو کر خاموش ہو گئی ہیں
سب زیست کی امیدیں روپوش ہو گئی ہیں
پھر منتظر نگاہیں بے ہوش ہو گئی ہیں
اے نامہ بر ادب سے سب حال [illegible] کہنا
اور ہو سکے تو رو کر
زار و نزار کہنا

[illegible] اب زندگی ہو فانی
[illegible] جام غم ہے پانی
رحم و کرم کے قابل [illegible]
[illegible] وہ بھی ہیں یہ دکھ بھری کہانی
اے نامہ بر ادب سے سب حال زار کہنا
اور ہو سکے تو رو کر
زار و نزار کہنا

انسب کلیانوی (گرگنٹہ)

پرچھاؤں

شمع کی روشنی دیوار پر عجیب و غریب شکلوں میں پرچھائیں ڈالتی ہے [illegible] اور جب میں شمع [illegible] دیتی ہوں تو چاند کا پرتو کتنا سحر آگیں ہوتا ہے [illegible] مرغزاروں اور سبزہ زاروں کے ارد گرد درختوں میں سورج کی روشنی جب چھنتی ہے [illegible] تو ہلتے ہوئے سبزہ پر سیاہ لہروں کی رنگسازی کی جاتی ہے .... اور دیہات میں جب کہ بادل آفتاب کے درخشاں چہرہ [illegible] لگتا ہے تو سارے دھان کے سنہری کھیت پر چھاؤں رقص کرتی ہوئی دوڑتی ہے [illegible] انسانی زندگی پر بھی چھاؤں آتی اور جاتی ہے [illegible] معلوم ہی ہے ... [illegible] تو اسی لیے جب تم پر اضطراب اور الم کے بادل چھا جاتے [illegible] افسردہ دل پر ایک شعاع کا بھی گزر نہ ہو .... تو یاد رکھو چھاؤں آتی بھی [illegible] نہیں ہوتی جتنی کہ وہ نظر آتی ہے .. . .

مس شاہ جہاں صوفی

پس پردہ ۔ رسالہ زمانہ کے مشہور افسانہ نگار چندر بھوش سنگھ صاحب کے سات مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جو ابھی ابھی شایع ہوا ہے ۔ افسانے بہت دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہیں ۔ موجودہ مختصر نویسی کے رجحانات کا یہ اچھا نمونہ ہے ۔ قصوں کے عنوان یہ ہیں ۔ (۱) پس پردہ (۲) شکست پیہم (۳) طلوع سحر (۴) انجام نخچیر (۵) راہ نجات (۶) ستا متی کی گود (۷) [illegible] یہ کتاب حیدر آباد میں کہیں نہیں ملے گی ۔ سب رس بک ڈپو نے خاص طور پر اس کی چند جلدیں منگوائی ہیں ۔ کتاب مجلد ہے کتابت طباعت اعلیٰ قسم صفحات (۱۲۸) قیمت (عہ) ۔

اکتوبر ۱۹۳۹ء

"تم نہ آئے"

تم اپنا ارو مال چھوڑ گئے تھے۔ میں سب کچھ پاگئی تھی۔ میرے لیے بھی کیا کم تھا اسی کے سہارے میں زندگی بسر کر رہی ہوں۔ تمہارے وعدے مجھے بے چین کر رہے ہیں۔ شہر کی گوناگوں مصروفیتوں میں تم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ کوئی تمہارے لیے مضطرب ہے۔

تم نے وعدہ کیا تھا کہ بہت جلد واپس آکر مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سہارا دے سکو گے۔ کیا یہ بھی بھول گئے؟ کیا یہ بھی بھولنے کی بات تھی؟

میں انتظار کرتی رہی۔ چارپائی پر لیٹی تمہارے ہی رومال میں اپنے معصوم آنسو خشک کرتی رہی۔ ہر آہٹ پر چونک جاتی کمرہ سے نکل کر دروازے پر آبیٹھتی۔ لیکن تمھیں نہ آنا تھا تم نہ آئے۔

رات بھر تاروں میں تمہاری منور تصویریں دیکھ کر دیوانوں کی طرح انہیں پکڑنے دوڑتی۔ صبح میرا اُداس چہرہ دیکھ کر ماں مجھے بیمار سمجھتی ہیں۔ تمیں اس کا اندازہ نہیں کہ وہ مجھے پریشان دیکھ کر کس قدر متاثر ہوتی ہیں۔

میں تصورات میں کھو جاتی ہوں۔ تم سامنے کھڑے مسکراتے ہو۔ لیکن جب ہوش آتا ہے تو تم نہیں ہوتے۔

شہر سے آنے والی ہر قسم کی گاڑیوں پر تمھیں تلاش کرتی ہوں۔ ہر کارے کی جھنکار سے باہر آجاتی ہوں تم اب خط بھی نہیں بھیجتے۔

چاندنی راتوں میں سامنے والے ٹیلے پر بیٹھی منتیں مانگتی رہی چاندنی بھی ختم ہوگئی۔ اندھیری راتیں بھی ختم ہوئی جارہی ہیں میری سہیلیاں مجھے طعنے دیتی ہیں۔ تمھیں اب اس کی بھی پروا نہیں۔

تمھیں نہ آنا تھا تم نہ آئے۔

تم کس قدر ظالم ہو۔

خورشید سلطانہ

روح غالب۔

اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مکمل سرگذشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب جس کو جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ نے نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ نواب مہدی یار جنگ بہادر ام اے (کیمبرج) صدر المہام تعلیمات و معین امیر جامعہ عثمانیہ نے تحریر فرمایا ہے۔

اس کتاب میں سب سے پہلی دفعہ غالب کے خاندان و اعزہ اور ان کے سسرالی اعزہ و اقارب کے دو تفصیلی شجرے بھی شایع کیے گئے ہیں۔

غالب کے حالات زندگی جس خوبی اور اجمال کے ساتھ اس میں درج ہیں آج تک کسی سوانح غالب میں نہیں شایع ہوئے۔

صفحات (۱۷۶) تعداد تصاویر (۳) کتابت و طباعت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم قیمت عمر

تعلیمی سفر یورپ (ڈائری کے دو ورق)

برسلز (بلجیم) جمعہ ۱۰ جون ۱۹۳۲ء تقریباً ایک بجے ہم ایک مقام پر پہونچے۔ اس کو سنٹرل جو سرتی کہتے ہیں۔ یہ مزدور پیشہ افراد کی قیام گاہ ہے۔ ڈیڑھ دو سو کے لئے رہایش کے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ جن میں وہ بہت ہی کم کرایہ پر ٹھیر سکتے ہیں۔ کمرے چھوٹے چھوٹے ہیں لیکن آرام دہ۔ چند وسیع ہال بھی ہیں جہاں وہ اکٹھا ہوتے ہیں۔ مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ ان کا اجتماع ہوتا ہے۔ تقریریں اور مباحثے ہوتے ہیں۔ غرضکہ ہر طرح کا آرام ہے اور خرچ کم۔ اس سات منزلہ شاندار عمارت میں مزدوروں کی جانب سے ہم مدعو ہوئے تھے۔ ہم نے ان کے ساتھ درمیانی میز پر کھانا کھایا۔ یہی کھانا جو ان کو روز دیا جاتا ہے۔ نہایت سادہ اور بدمزہ تھا۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ بیس پچیس لڑکیاں غول باندھ کر کھڑی ہوگئیں اور ناچنے لگیں اور کچھ گاتی بھی جا رہی تھیں۔ ان کے قائد نے ہمارے اعزاز میں تقریر کی اور اس ادارے کی تاریخ بیان کی۔ مسز دتا نے جواب میں شکریہ ادا کیا اور ہم سب وہاں سے روانہ ہو گئے۔ شہر میں گھومتے رہے کلیسائیں دیکھیں۔ ہسپتال "پورٹ ڈی ہال" پہونچ کر اس عالیشان شفاخانے کے صرف چند کمرے ہی دیکھنے پائے تھے کہ وقت تنگ ہوگیا۔ بستر ستھرے ہوا دار کمروں میں ہزارہا آلاتِ جراحی رکھے ہیں۔ ہم نے خاص طور پر سرطان کا ادارہ دیکھا۔ بڑے بڑے بابوں میں سانپوں کو رکھ چھوڑا ہے۔ ہندوستان سے ناگ منگوا کر رکھے ہیں۔ ان سے انجکشن تیار کئے جاتے ہیں۔ یہاں سرطان کا کئی طرح سے علاج ہوتا ہے۔ شعاعوں سے انجکشن سے اور عمل جراحی سے لیکن صرف جسم کے بیرونی حصہ کے لئے علاج مفید ثابت ہوا ہے ورنہ اندرونی حصہ شاید ہی اچھا ہوتا ہو۔ ڈاکٹروں نے یہ بھی کہا کہ ابھی اس مرض کے لئے کوئی قطعی علاج معلوم نہیں ہوا تحقیقات جاری ہیں۔ ہم نے اپنی گائیڈ سے خواہش کی یہاں سے ہم کو سوشیل اسکول لے چلیں ہمارے وہاں پہونچتے پہونچتے مدرسہ بند ہونے کا وقت ہو چکا تھا لیکن سکریٹری نے ہم کو از راہِ عنایت تمام جماعتیں دکھائیں اور اپنی شکستہ زبانی میں (اس کی مادری زبان فرانسیسی تھی) وہاں کی پڑھائی کے حالات بیان کئے اور بتلایا کہ تمام دنیا کے سوشیل سکولوں کا یہ مرکز ہے۔ یہاں کے خاص مضامین معاشیات، تعلیم بہبودی اطفال، پرورش اطفال، خیاطی، تدبیر منزل، مذہبی تعلیم اور اخلاقیات شامل کئے ہیں۔ اٹھارہ سال کی عمر سے پہلے اس مدرسہ میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی اور پھر تو سن کی کوئی قید ہی نہیں۔ گھر والی عورتیں دن کو آکر پڑھتی ہیں اور شام کو چلی جاتی ہیں۔ طالبات کے لئے دارالاقامہ بھی ہے۔ نصاب تین سال میں ختم ہوتا ہے پہلے سال میں عام تعلیم دی جاتی ہے۔ دوسرے میں خاص مضامین پڑھائے جاتے اور تیسرے سال عملیات پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ بلجیم کی آبادی کا کثیر حصہ کیتھولک ہونے کے باعث اکثر مدرسے انہیں کے ہیں چنانچہ اس مدرسہ کا تعلق بھی ان سے ہی ہے۔
واپس آکر ہم نے اپنے میزبانوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ مسز دتا اور دیگر ہندوستانی خواتین کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ سردی غضب کی تھی اس لئے دیوان خانہ میں آگ جلائی گئی اور سب نے آتشدان کے قریب [illegible] ایک عرصہ تک [illegible]

بالخصوص موسیقی ہند رہا۔

شنبہ ۱۹ جون۔ صبح نو بجے انٹورپ روانہ ہوئے۔ باغوں کھیتوں اور مرغزاروں پر سے گزرتے ہوئے شہر میں پہنچے یہاں بھی وہی مجسمے اور گرجائیں ہیں۔ وہی آراستہ دکانیں اور ویسی ہی اونچی اونچی عمارتیں ہیں۔ ہم سیدھے الماس کے کارخانہ میں داخل ہوئے یہاں ہیرے صاف کئے جاتے ہیں اور الماس تراشنا سکھایا جاتا ہے۔ ۱۴ سال کی عمر سے لڑکے شریک کئے جاتے ہیں۔ اس وقت تک ان کی ثانوی تعلیم ختم ہو چکتی ہے۔ اس کارخانہ میں کشادہ دالان بنے ہیں۔ ان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک میزیں رکھی ہوتی ہیں۔ دو رویہ قطاروں میں کارآموز تپائیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کے سامنے الماس تراشی کے آلات دھرے ہوتے ہیں خوردبینیں لگائے ہوتے ہیں معلمین ہدایتیں دیتے جاتے ہیں اور وہ کام کرتے جاتے ہیں۔ وہاں سے ہم بارہ بجے نکلے۔ مسٹر اور مسز ڈی ڈیکر کے ساتھ لنچ کھایا اور ڈھائی بجے بمقام لوین آئے۔ یہاں کی شہرہ آفاق جامعہ کے مختلف ادارے دیکھے۔ ہماری رہنمائی پروفیسروں نے کی ایک ایک چیز کا معاینہ کرواتے تھے اور اپنے الفاظ میں توضیح کرتے جاتے تھے۔ یہاں بہت سی زبانیں نصاب میں شامل ہیں۔ فرانسیسی، المانی، انگریزی، لاطینی و یونانی۔ پہلی تین زبانوں میں عموماً یہ لوگ اچھی طرح بول لیتے ہیں۔ لکچر ہال میں تقریریں ہوئیں۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ پروفیسروں نے ہم کو عشائیہ پر مدعو کیا ہے۔ میرے پاس ہی میز پر ایک عالم پروفیسر تمکن تھے۔ انھوں نے تھوڑی دیر پہلے ہمارے اعزاز میں تقریر کی تھی اور فرمایا تھا کہ ہند اپنی خاص وسیع تہذیب رکھتا ہے اور اس کی روحانیت تو اپنی آپ نظیر ہے لیکن افسوس ہوتا ہے کہ ہندوستانی بھی چینیوں کی طرح اپنا طرزِ تمدن بدلتے جا رہے ہیں اور غیر تہذیب کے دلدادہ بن رہے ہیں۔ میں نے اثنائے گفتگو میں دریافت کرنا چاہا کہ غریب ملک کے لئے یہ کہاں تک درست ہے تو کہا کہ نقل کرنا کسی حال میں بھی ٹھیک نہیں بلکہ افعال ارادی اور جذبات نفسانی میں انطباق پیدا کرنے اور ان کو اعتدال سے بڑھنے نہ دینے سے۔ طرز معاشرت اور اخلاق میں فطرتی حسن اور قدرتی خوبیوں کے بہم پہونچانے سے کوئی قوم اپنی پرانی تہذیب کو قائم رکھ سکتی ہے اور اس کو اجتماعی ترقی بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ روحانی مسرت کی اگر تلاش ہو تو حقیقی وقار اور عزت کی حفاظت کیجائے اور اس کو سب سے مقدم رکھا جائے۔ تحقیقات کا سلسلہ منقطع نہ ہو۔ واقعات کے اسباب کی تجسس برقرار رہے۔ کھانے کے بعد ہم سب اپنی اپنی قیام گاہ پر پہونچا دئیے گئے۔

یکشنبہ ۲۰ جون۔ آج تمام ساتھی ہواخوری کے لئے دن گزارنے گئے ہیں۔ مجھ کو تھکن محسوس ہو رہی تھی اس لئے میں نے عذر چاہا اور گھر ہی پر رہ گئی۔ ڈائری لکھتی رہی۔ مسز ٹامسن گرجا ہو کر جلدی سے واپس آگئیں۔ ان کی لڑکیاں میرے پاس بیٹھی رہیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا ہے آج شام کھلونے خریدنے چلیں گے۔ مسز ٹامسن کو ایک ریشے کا پنکھا دیا جس کو میں نے سوڈان میں عرب سے خریدا تھا۔ تحفہ لے کر وہ بہت خوش ہوئیں۔ کہا کہ میں اس کے لیے کانچ کا گھر بناؤں گی۔ بچوں نے اپنی تصویریں لا کر دیں۔ عصر کے بعد ہم دکانیں دیکھنے نکلے۔ نہایت قیمتی مرصع زیورات دیکھے۔ تمام الماریوں میں ہیرے اور الماس جگمگا رہے تھے۔ برقی روشنی نے اور بھی ان کی آب و تاب میں اضافہ کر دیا تھا اور یوں دکھلائی دیتا تھا کہ بیسیوں آفتاب نکل آئے ہیں۔ گھر واپس ہوئے۔ سونے سے پہلے میں نے اپنا اسباب باندھ لیا کیونکہ ہم صبح لندن روانہ ہوں گے۔

منیر صوفی

معاشرت میں سادگی (تیسری قسط)

عادات کی سادگی کا مطلب یہ ہے کہ ہماری عادتوں میں تکلف نہ ہو، وہ بالکل سادہ ہوں، ہمیں اپنا کام آپ کرنے میں عار نہ ہو، سادہ عادتیں ہماری زندگی میں بہت ساری آسانیاں پیدا کرتی ہیں اور ہماری معاشرت کو کم خرچ بالانشیں بناتی ہیں۔ بچپن میں جو عادتیں پڑجاتی ہیں وہ تادم آخر برابر قائم رہتی ہیں۔ بچوں کی عادتوں کو سنوارنے اور ان میں سادگی پیدا کرنے کی ذمہ داری زیادہ تر ہماری خواتین کے سر ہے، ماں کی گود بچہ کا پہلا مکتب ہے اگر اس مکتب میں وہ فضول خرچی کی عادت سیکھ لے اور گراں معاشرت کا خود کو عادی بنالے تو پھر اس کی اصلاح دشوار ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہوجاتی ہے۔

ہماری بہنوں کو چاہیئے کہ بچوں میں ایسی سادہ عادتیں پیدا کرائیں جو ان کی زندگی کے نظام میں آسانیاں مہیا کریں اور ان کی معاشرت کو تکلفات سے بہت دور کردیں۔ بچوں میں ضد اور ہٹ کا مادہ بہت ہوتا ہے اس کی روک تھام اگر بچپن ہی میں نہیں کی گئی تو ان کی آئندہ زندگی خود ان کے لئے باعثِ عذاب اور سخت تکلیف دہ ہوجاتی ہے، ان کے رگ و ریشہ میں خود پسندی اور انانیت سرایت کرجاتی ہے ان کی زندگی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی ہر خواہش اور ہر آرزو کسی طرح پوری ہو خواہ اس میں ان کے والدین اور متعلقین کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔

بچوں میں ابتدا ہی سے سادہ مگر صاف ستھرا لباس اور سادہ زود ہضم غذا استعمال کرنے کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ قیمتی لباس اور مرغن غذائیں ان کے دماغ اور ان کے نظام جسمانی کو تباہ و برباد کردیتی ہیں۔ لباس حتی الامکان دیسی کپڑے کا بنانا چاہیئے، دس دس پندرہ پندرہ روپیہ گز کے بدیسی ٹویڈ اور سرج ہمارے ملک کی موسمی اور مالی حالت کے اعتبار سے بالکل غیر ضروری ہیں، بعض حضرات محض فیشن کی خاطر برس کے بارہ مہینے ٹویڈ اور سرج استعمال کرتے ہیں، ہمارے ملک میں سردی کا موسم مہینہ سوا مہینہ سے زیادہ نہیں رہتا اور اس مختصر مدت میں بھی اتنی سردی نہیں ہوتی کہ موٹے موٹے ٹویڈ کی شیروانیاں اور سوٹ استعمال کرنے کی ضرورت ہو۔ یہ اور بات ہے کہ محض فیشن کی خاطر بلاضرورت اپنا روپیہ قیمتی لباس پر صرف کرکے ایک طرف اپنی آمد و خرچ کے توازن کو بگاڑا جائے اور دوسری طرف اپنی صحت برباد کی جائے کیونکہ جب ہم اپنے لباس پر ضرورت سے زیادہ روپیہ صرف کریں گے تو اپنی صحت و تندرستی کو قائم رکھنے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا! اس کے علاوہ گرم ملک میں گرم کپڑے کا استعمال بھی صحت کی خرابی کا باعث ہوتا ہے۔

جو لوگ اپنی معاشرت کے معیار کو گھٹانے اور اس کو سادہ بنانے کو کسرِ شان اور باعثِ ذلت سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ تمام عمر کی پریشانیوں میں مبتلا رہتے ہیں اور اپنی طرح اپنے بچوں کو بھی گراں معاشرت کا عادی بنا کر اور نت نئے فیشن سکھا کر ان کی زندگی تباہ کردیتے ہیں۔ بعض بچوں کو ہم نے لکھنے پڑھنے میں مصروف رہنے کے عوض پوڈر اور کریم منہ پر ملتے اور طرح طرح کے لوشن اور ہیئر کریم بالوں میں لگا کر لڑکیوں کی طرح سنگار کرتے دیکھا ہے۔ ان کے والدین فخر سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے فرزند ارجمند کی سنگار میز پر آدھی درجن کریم، اتنی ہی لوشن اور کوئی ایک درجن سنٹ کی شیشیاں موجود رہتی ہیں اور یہ کہ صاحبزادے کے مزاج میں بڑی نفاست اور سلیقہ ہے، کوئی کم قیمت چیز نگاہوں میں جچتی ہی نہیں! بڑی اونچی نظر ہے!! صاحبزادے کی فرمائشیں پوری کرتے کرتے والدین کا دیوالہ نکل رہا ہے مگر برخوردار قیمتی سوٹ پہنے منہ میں اعلیٰ چروٹ لگائے، سولہ سنگار کئے روپیہ پانی کی طرح بہاتے اور اتراتے پھرتے ہیں۔۔۔

ایسے لاڈ پیار اور ناز و نعم میں پلے ہوئے بچے دنیا میں کسی مرض کی دوا نہیں ہوتے، اس قسم کے بچے اگر خوش قسمتی سے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کریں تو ان کی ذات سے نہ ملک کو کوئی فائدہ پہونچ سکتا ہے نہ قوم کو، بلکہ وہ ملک اور قوم کی بربادی کا باعث ہوتے ہیں، کیونکہ اپنی قیمتی معاشرت اور آرام طلبی و عیش پسندی کے سبب بجز ملازمت کے کسی اور پیشہ کو اختیار کرنا ذلت سمجھتے ہیں اور جب انھیں بمشکل سیکڑوں درخواستوں اور کوششوں کے بعد یا محض اثرات سے کوئی ملازمت مل جاتی ہے تو اپنی معاشرت کے اونچے معیار کو برقرار رکھنے کے لئے اقسام کی بے ایمانیاں کرنے اور ناجائز آمدنیاں پیدا کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ اس طرح خود کو مخلوق کی آسایش کا ذریعہ بنانے کے عوض اس کی بربادی کا باعث ہوتے ہیں۔

ہماری قوم کی نکبت اور فلاکت کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہمیں صنعت و حرفت، زراعت اور تجارت سے بہت کم دلچسپی ہے، ملازمت صرف ایک ہی شخص اور اس کے متعلقین کو فائدہ پہونچاتی ہے۔ مگر تجارت اور دوسرے کاروبار سے کئی افراد کی پرورش ہوتی ہے، ایک معمولی سے چھوٹی دکان بھی ہزاروں انسانوں کی منت کش ہوتی ہے، اس میں جو چیزیں ہوتی ہیں ان کے بنانے میں سیکڑوں انسان شامل ہیں تجارت، زراعت، صنعت و حرفت اور اسی قسم کے دوسرے پیشے اختیار کرنے والے علی العموم معاشرت میں بہت سادہ ہوتے ہیں ان کی زندگی میں تکلفات بہت کم جگہ پائے جاتے ہیں اور رات دن کی مصروفیت کی وجہ ان کے دماغ برائیوں کی طرف بہت کم متوجہ ہوتے ہیں اگر ہم میں تجارت کا ذوق پیدا ہو جائے اور صنعت و حرفت یا زراعت کو ہم نیچی نظروں سے دیکھنا چھوڑ دیں تو ہماری قوم کے کتنے افراد ذلت، افلاس، بے روزگاری اور اقسام کی پریشانیوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ شریف پیشے ہماری قوم کے بہت کم اشخاص اختیار کرتے ہیں، قوم کا بڑا طبقہ ملازمت ہی کو حصول معاش کا ذریعہ سمجھتا ہے، جو لوگ دوسرے پیشے اختیار کرتے ہیں وہ ملازمت پیشہ طبقہ میں ذلیل نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں، چھوٹے سے چھوٹے سرکاری ملازم کی جو عزت کی جاتی ہے وہ ایک بڑے دکاندار کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔

تعلیم یافتہ نوجوان اگر تجارت، زراعت یا صنعت و حرفت کے پیشے اختیار کریں تو وہ موجودہ جاہل طبقہ سے کہیں زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں، وہ لوگ جو مالدار ہیں اپنی دولت کے گھمنڈ میں اس قسم کے پیشوں کو ذلت کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور جو تعلیم یافتہ ہیں اپنی قابلیت کی وجہ ان پیشوں کو اختیار کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ تاجر بہ نسبت کسی جاہل سوداگر کے اپنے کاروبار کو نہایت خوش اسلوبی سے چلا سکتا ہے اور اپنی قابلیت سے اپنی دکانداری کو بہت کچھ فروغ دے سکتا ہے۔ یہ سب کچھ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ بچپن ہی سے بچوں کو سیدھا سادہ رکھا جائے، پرتکلف معاشرت کا انھیں خوگر نہ بنایا جائے، ان کی عادتوں کو نہ بگاڑا جائے اور انھیں محنت و مشقت کا عادی بنایا جائے۔

بعض والدین بچوں کی بری عادتوں کو یہ کہہ کر ٹال جاتے اور برداشت کر لیتے ہیں کہ "ابھی تو بچہ ہے آتے آتے آ جائے گا اس کو خیال! جب سمجھ آ جائے گی تو خود ہی بری عادتیں چھوڑ دے گا"، مگر جب بچہ میں بری عادتیں راسخ ہو جاتی ہیں تو پھر ان کا چھوٹنا ایک طرف بلکہ جہاں صرف چند عادتیں خراب تھیں وہاں کئی ایک نئی پیدا ہو جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنی ہی بربادی کا باعث نہیں ہوتا بلکہ اپنے گھر، اپنے خاندان، اپنے دوست احباب اور اپنے ملک و قوم کے لئے بھی اس کا وجود تباہ کن اور باعث ننگ و عار ثابت ہوتا ہے اور آخر میں وہ زمین کی پیٹھ کا بوجھ بن کر رہ جاتا ہے۔

غذا کی سادگی سے یہ مراد ہے کہ مرغن، چکنی اور گرم غذائیں ہمارے ملک کی گرم آب و ہوا کے مدنظر ہمارے لئے مفید نہیں ہو سکتیں۔ چکنی غذائیں ہمارے جسم میں چربی پیدا کر کے جسم کو موٹا اور بھدا بنا دیتی ہیں، جسم کی خوبصورتی کے علاوہ ہم اپنی صحت و تندرستی بھی کھو بیٹھتے ہیں اور آئے دن نت نئے امراض کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ تازہ دودھ، تازہ ترکاریاں، تازہ پھل، انڈے، مچھلی، وغیرہ استعمال کرنا چاہیئے۔ آج کل چاء بکثرت استعمال ہو رہی ہے، ہر گھر میں اس کا رواج ترقی پر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چاء کی یوروپین کمپنیوں نے جو ہندوستان میں چاء کی تجارت کرتی ہیں چاء کی فروخت کو ترقی دینے کے لئے ایک مشترک بورڈ قائم کر لیا ہے جو تمام [illegible] ذریعوں سے پبلک کو چاء کی خوبیوں پر مائل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ سرد ملکوں میں اگر چاء ضروریات زندگی میں شریک کر لی جائے تو مقام تعجب نہیں لیکن ہندوستان جیسے گرم ملک میں چاء کا استعمال مفید نہیں ہو سکتا بلکہ ایک حد تک مضرت رساں ہے، چاء میں خوبیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی، جہاں وہ تکان دور کرتی ہے وہاں ان لوگوں کو جن کے گردے کمزور ہیں سخت نقصان پہنچاتی ہے۔ باوجود اس کی مضرتوں سے واقف ہونے کے چاء کا استعمال روز افزوں ہے چاء کو غذا کا اہم جزو سمجھا جاتا ہے بعض لوگ تو اس کو غذا پر ترجیح دیتے ہیں اور گھنٹوں چاء خانوں میں میٹھے چاء کی پیالیاں اڑاتے گپ شپ میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔ اگر چاء کا استعمال ناگزیر ہی ہے تو اس کو ہلکی بنانا چاہیئے اور اس میں دودھ زیادہ ڈالنا چاہیئے۔ غرض یہ کہ ہماری غذا سادہ، زود ہضم مگر کافی اور مختلف قسم کی ہونی چاہیئے۔ ہر روز ایک ہی قسم کی غذا کا استعمال بھوک کو کم کر دیتا ہے۔

توہمات اور فضول رسم و رواج بھی ہماری معاشرت میں سادگی قائم نہیں رہنے دیتے، غیر ضروری و بیجا رسوم کی پابندیوں میں ہم نہایت بے دردی سے روپیہ صرف کرتے ہیں، خوشی اور غمی کی تقریبوں اور موقعوں پر دولت کا اندھا دھند اسراف روا رکھا جاتا ہے۔ اگر کچھ پاس نہ ہو تو بھاری سے بھاری شرح سود پر قرض لے کر ان لغویات اور خرافات کو پورا کیا جاتا ہے، ہماری معاشرت میں بیہودہ رسم و رواج کے یہ بھونڈے داغ دھبے نہایت بدنما ہیں۔ یہ ہماری معاشرت کی سادگی کو برباد کرنے کے علاوہ ہماری دولت اور اخلاق کو بھی تباہ کر رہے ہیں، ان فضول رسم و رواج کی پابندیوں نے خاندان کے خاندان تباہ کر دئیے ہیں اور آئے دن ہماری دولت دوسروں کے قبضہ میں چلی جا رہی ہے۔ ہمارے روز افزوں افلاس کی روک تھام کے لئے یہ فضول رسم و رواج بڑی حد تک اصلاح طلب ہیں۔

ان فضول رسم و رواج اور توہمات کی اصلاح کا ہماری مستورات سے زیادہ تعلق ہے۔ وہی ان لغویات میں بھی کھول کر حصہ لیتی ہیں خوشی و غمی کے موقعوں پر وہ ان مذموم رسوم کی اس حد تک پابند ہو گئی ہیں کہ ان رسوم کو صرف اپنی معاشرت ہی کا نہیں بلکہ اپنے مذہب اور قومیت کا بھی ایک اہم جزو سمجھتی ہیں، ہماری بہنوں کی اس توہم پرستی نے ہمارے بھائیوں کو بھی ان فضول رسوم کا پابند کر دیا ہے۔ اپنی ماں، بہن، بیوی یا بیٹی کی خاطر مردوں نے بھی خود کو اسی رنگ میں رنگ لیا ہے۔ کبھی مخالفت کرتے بھی ہیں تو دبی زبان میں، مگر "نازک اصرار" "تند انکار" پر غالب آ جاتا ہے اور پھر وہی ہوتا ہے جو "صنف نازک" کے توہم پرست دل و دماغ میں بسا ہوا ہے! وہ برملا کہتی ہیں

ہم وہی آخر کریں گے جو ہمارے دل میں ہے!!!

مرزا سیف علی خاں

اندرا

چک منگلور، کنٹری زبان کا لفظ ہے اور یہ تین لفظوں سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں چھوٹی چٹی کا گاؤں۔ قدیم زمانہ میں جنوبی ہند علاقہ میسور میں، شنکر رایا ایک بڑا پالیگار زمیندار تھا۔ اس کی راجدھانی شنکرا پٹن تھی جو اسی کے نام سے موسوم ہے اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ چھوٹی بیٹی کے جہیز میں یہ گاؤں دے دیا گیا تھا۔ اب یہ گاؤں ضلع کا صدر مقام ہے۔ اس کے آس پاس بہت سے کافی کے باغ ہیں، جن کے مالک زیادہ تر انگریز ہیں۔ مغربی گھاٹ کا سلسلہ اس شہر کو گھیرے ہوئے ہے اور ان پہاڑوں کی مشہور چوٹی بابا بڈھن گری کہلاتی ہے۔ گری بھی کنٹری لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں پہاڑ، اس پہاڑ کی وادی میں ایک بزرگ کا گزر ہوا جن کا نام حضرت داداحیات قلندر تھا، یہ جگہ آپ کو پسند آئی، یہیں قیام کر لیا اور کئی سال تک چلہ کشی کی، اور اپنی کرامات کے زور سے یہاں کے پالیگاروں کا کفر توڑا۔ اسی زمانہ سے یہ خطہ بے نظیر جو کشمیر کے مثل بنگ ہے نور اسلام کی کرنوں سے جگمگا اٹھا۔

چک منگلور سے کوئی چوبیس میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس کا نام بالے ہنور ہے۔ یہاں بھی قدیم زمانہ میں پالیگار رہتے تھے یہاں باغوں اور خوفناک جنگلوں کی کثرت ہے ان ہی جنگلوں میں سے ایک ندی بہتی ہے جو بھدرا کے نام سے مشہور ہے۔ اس چھوٹے سے شہر کو اگر ہم "جنگلی جزیرہ" کہیں تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ قدیم زمانہ میں یہاں ایک زمیندار تھا جس کا نام بالیا تھا۔ بالیا ایک مشہور آدمی تھا، دولت اس کے گھر کی لونڈی تھی۔ چھوٹے چھوٹے قصبے اس کے ماتحت تھے اور گاؤں والے اس کے غلام۔ بالیا کی عورت مر چکی تھی، اس کی جدائی بالیا کے لئے ناقابل برداشت تھی، نرینہ اولاد کوئی نہ تھی مگر خدا نے ایک بیٹی دی تھی جس کا نام اندرا تھا۔ اندرا کا وجود اس جنگل کے خونخوار وحشی درندوں میں ایسا تھا، جیسے کووں کے جھرمٹ میں ہنس کا وجود، بالیا اندرا کو بہت چاہتا تھا، اور پیار سے اس کو "دیوی" کہا کرتا تھا۔ وہ واقعی دیوی ہی تھی یہ خطہ بد تہذیبی کا گہوارہ تھا۔ دنیا بھر کی برائیاں یہاں پلتی تھیں۔ ہر گھر میں کئی بت ہوتے تھے اور ان کا ہر کام بت اور پجاری کے اشاروں پر ہوتا تھا۔ عورت اور بیٹی میں کوئی تمیز نہ تھی۔ معمولی سی معمولی بات پر ایک خونریز جنگ ہو جاتی تھی جس میں انسانی خون پانی کی طرح بہایا جاتا تھا۔ ان جھگڑوں کا فیصلہ کرنے والا پجاری ہوتا تھا اور پجاری کا فیصلہ معلوم ہے کہ کس قدر انصاف و عقل کا حامل ہو سکتا ہے۔

بالے ہنور کو کرہ زمہریر کہنے میں کچھ شبہ نہیں کیونکہ یہ مغربی ساحل سے بالکل قریب ہے۔ یہاں بارش کثرت سے ہوتی ہے۔ موسم بہار اور برسات میں آپ جدھر نظر دوڑائیے سبزہ ہی سبزہ نظر آئے گا۔ ہر طرف سبز وردی پہنے ہوئے پہاڑ، لہلہاتے کھیت، وادیوں میں جنگلی بیل بوٹے قطار در قطار جنگلی سرو کے درخت، چھوٹے چھوٹے تالابوں میں کنول کے کھلے ہوئے پھول، بے شمار گھنے جنگل جن میں قسم قسم کے درندے، سانپ بندر، ہرن، چیتل، ریچھ چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ ایک مسافر کو جہاں ان خونخوار جانوروں سے خوف ہوتا ہے وہاں اس جگہ کے پرندوں کی میٹھی میٹھی بولیں، درختوں کی چھاؤں، اور دل فریب مناظر سے دل کو ہٹانا مشکل ہو جاتا ہے، اور وہ اپنا جی بہلاتا ہوا بے تکان منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے بارش کے دنوں میں اس قدر موسلا دھار بارش ہوتی ہے کہ درختوں، چٹانوں اور گھروں کے کھپریلوں پر سبز کائی اور جنگلی خود رو پودے تک اگ آجاتے ہیں۔ آپ راستہ چلتے ہوئے کافی اور چائے کے باغوں میں بندوقوں کی گولیوں کی آوازیں گونجتی ہوئی سن کر خوف سے سہم جائیں گے، اور آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ کسی غنیم کی فوج پہاڑوں کے پیچھے مصروف پیکار ہے۔ موسم بہار میں کالی گھٹاؤں کا جھومتے ہوئے اٹھنا، پہاڑوں کی

چوٹیوں تک پہنچنا اور پھر وادیوں میں دب کے چھپنا اور اس وقت جنگل کی ہواؤں کی سرسراہٹ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کی ماں اپنے بچے کو پالنے میں سلا کر جھولا جھلا رہی ہو اور لوریاں سنا رہی ہے۔ شفاف اور ٹھنڈے پانی کے چھوٹے چھوٹے نالے فطرت کے خود رو پھولوں کی کیاریوں میں ناگن کی طرح بل کھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شیر کی پکار، اژدہوں کی پھنکار سے آپ خوف کھائیں گے مگر ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے تھپیڑے آپ کی روح کو تازہ، جنگلی پھولوں کا تبسم، آپ کے دل کو بیخود اور پتوں کا تکلم آپ کے جذباتِ دل میں ایک بے پناہ طوفان برپا کر دیگا اور آپ اس جنتِ ارضی کی سیر کرتے ہوئے کھو جائیں گے۔ ہوش کا کوسوں پتہ نہ ہوگا۔

یہ وہ پُر آشوب زمانہ تھا جس وقت حیدر علی اور اس کے بعد ٹیپو سلطان ہندوستان کے دونوں ساحلوں پر اپنی تلوار کی دھاک بٹھا چکے تھے اور مسلمانوں کے اخلاق سے ان جنگلیوں کے دلوں میں ایک انقلاب پیدا ہو چکا تھا۔ وہ اس راست باز، صداقت شعار، بہادر جرنیل کے اشارہ پر مرنے مارنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ ٹیپو نے انھیں ہر طرح کی مذہبی آزادی دے رکھی تھی اور انہی کو زمینوں کا مالک قرار دے دیا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ ٹیپو کی آخری سانس تک برابر تابع فرمان رہے۔ کبھی انھوں نے سلطان کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند نہیں کیا اور نہ ٹیپو کے حریفوں سے اپنے تعلقات قائم کئے۔ سلطان کی سلطنت کو مٹانے میں بنگلور، کولار، اور چیتلدرگ والوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور انگریزوں نے مل کر خوب خوب مکر و فریب سے کام لیا، لیکن کیا مجال کہ ان جنگلیوں نے اس غداری میں ان کا ہاتھ بٹایا ہو۔

میسور کی دوسری جنگ ہو رہی تھی۔ ٹیپو اس جنگلی وحشی خطہ سے گزر رہے تھے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں اور سامان حرب کی جھنکار سے جنگلوں میں ایک شور برپا تھا۔ درندے خوف کے مارے بھٹوں سے باہر نہیں نکلتے تھے اور پرندے پر نہیں مارتے تھے۔ جنگلی باشندے ٹیپو کی آمد کی خبر سن کر راستے کے دونوں طرف قطاروں میں کھڑے ہوئے سلطان کو دیکھ کر جھک پڑتے تھے اور اپنے وحشیانہ انداز میں اس کا خیر مقدم کرتے تھے۔ ان کی طرز ادا اور یہاں کے مناظر سے سلطان کا دل اثر پذیر ہوا اور فوج کو اس ندی کے کنارے دو ایک دن ٹھیرنے کا حکم دیا۔ تمام فوجوں نے ڈیرے تانے اور سپاہی اپنے اپنے گھوڑوں کے دانے چارے کا انتظام کرنے میں مصروف ہو گئے۔ آن کی آن میں جنگل ایک بڑا شہر بن گیا۔

رات کا وقت تھا، سارے جنگل پر مدہوشی چھائی ہوئی تھی۔ لشکر کے سپاہی مصروف خواب تھے۔ پہرہ والے سپاہی "ہوشیار خبردار" کے نعرے لگا رہے تھے۔ ارنڈ کے تیل کی مشعلیں جل رہی تھیں۔ لشکر کے قلب میں آگ روشن تھی اور اس کی روشنی تمام لشکر کا جائزہ لے رہی تھی۔ چاند کی روشنی پتوں سے چھن چھن کر گر رہی تھی۔ شیر، ہرن، اور چیتل وغیرہ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ایک طرف دور فاصلے پر ڈھول اور انسانوں کی چیخ پکار سنائی دے رہی تھی سلطان کو اس آواز نے خواب سے بیدار کر دیا۔ انھوں نے دربار بخشی کو آواز دی اور پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ دربار بخشی نے لاعلمی ظاہر کی۔ سلطان کا اشتیاق بڑھا۔ وہ بھیس بدل کر دربار بخشی کے ہمراہ جنگل کے قلب میں پہنچ گئے۔ راستہ نہایت خطرناک تھا۔ خاردار جھاڑیاں، چھوٹے چھوٹے نالے، اونچے اونچے ٹیلے راستہ میں حائل ہو رہے تھے۔ جنگلی خرگوش ادھر ادھر کودتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ جھاڑیوں کے کانٹے سلطان کے دامن کو تھام تھام کر التجا کر رہے تھے کہ راستہ خطرناک ہے، جان کا خوف ہے۔ مگر وہ بے خطر آگے بڑھ رہے تھے۔ کانٹوں سے لباس پرزے پرزے اور جسم چھلنی ہو گیا تھا مگر اس بہادر کے قدم نہ رکے۔ اب آوازیں نزدیک ہونے لگیں۔ آگ کی روشنی نے جنگل کے پتوں کو سنہری بنا دیا تھا۔ یہاں پہنچ کر سلطان نے تھوڑی دیر کے لئے دم لیا لیکن ان جنگلیوں کی آوازوں نے سلطان کو گھبرا دیا۔ وہ بے قرار ہو کر اور آگے بڑھ رہے تھے کہ کسی کے کراہنے کی آواز نے ان کے قدم روک لئے اور ان کی آنکھیں خود تلاش میں مصروف ہو گئیں۔ بڑی بڑی جھاڑیوں کو انھوں نے اپنی تلوار سے چھانٹا اور اندر پہنچ گئے۔ دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے ایک کنواری لڑکی سیاہ ساڑی میں منہ چھپائے کراہ رہی ہے۔ انھوں نے

اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ وہ اندھیرے میں چاند کی طرح چمک رہی تھی۔ اس کی کالی زلفیں چاند پر سایۂ ابر کی طرح سایہ کئے ہوئے تھیں، وہ رو رہی تھی۔ اس کے آنسو زلفوں میں الجھ کر وہیں ٹھیر گئے تھے اور ایسے معلوم ہوتے تھے کہ سیاہ تاگے میں آبدار موتی پرو دئے گئے ہیں۔ تمام جسم کانٹوں سے چھل گیا تھا۔ آدھے جسم پر سیاہ ساری لپٹے ہوئے تھی اور یہی ان جنگلوں کا لباس تھا۔ جب اس کو ہوش آیا تو اس نے آنکھیں کھولیں، سلطان کو دیکھ کر پھر دونوں ہاتھوں سے اپنے خوبصورت چہرے کو ڈھانپ لیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر شاہی رعب نے اس کی زبان پر مہر بٹھادی۔ مگر اس کی آنکھوں نے اس کی بے کسی کی پوری پوری ترجمانی کردی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور سلطان تصویرِ حیرت بنے ہوئے اس کی حالت کا مطالعہ کر رہے تھے۔ انھوں نے دربار بخشی کو اشارہ کیا کہ اس کو سہارا دے۔ مگر دربار بخشی سلطان سے زیادہ خوف زدہ تھا، وہ اس کو ایک شیطان سمجھ رہا تھا اور ہاتھ لگانے سے ڈر رہا تھا۔ اس کے خیالات دیووں اور بھوتوں کی کہانیوں کی سیر کر رہے تھے۔ وہ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آیا یہ لڑکی واقعی انسان ہے یا بھوت جو انسانی پیکر میں جلوہ گر ہے۔

وہ بھوکی شیرنی کی طرح اٹھی اور گرداب کی طرح اندر ہی اندر بل کھانے لگی۔ وہ انسان تھی مگر انسانی صورتوں سے بیزار۔ وہ چاہتی تھی کہ ان انسانوں کو تلوار کی گھاٹ اتار دے مگر یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ اس کا چہرہ موسم گرما کے سورج کی طرح تمتما رہا تھا آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں، ہرن کی طرح اس نے چھلانگ ماری اور جھاڑیوں سے نکل کر کہا: "تم سلطان ہو، حاکم ہو، ہماری جانوں کے محافظ ہو" "ہاں" سلطان نے جواب دیا، بخشی نے تلوار سنبھالی۔ "وہ دیکھو" اس نے آگ کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ کیا ہے" سلطان نے پوچھا۔ "وہ ارضی جہنم ہے۔" "کس نے بنایا" "پنڈتوں نے، مہاتماؤں نے، پجاریوں نے اور کس نے!" "کیوں؟ کس لئے؟" "اپنے دل کی آگ بجھانے کے لئے، ہوس پرستی کے لئے، معصوم و بے گناہ عورتوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے لئے۔" "تم لوگ تو ان کو دیوتا مانتے ہو نا؟" "دیوتا!" اندرا نے بری صورت بناکر کہا۔ "ہاں" سلطان نے جواب دیا۔ "آپ بھی ان کی قدر کرنے لگے۔" "کیوں نہیں؟" "شاہا! یہ برائیوں کے غار ہیں۔ اور گندگی کے مخزن، جن لوگوں کو آپ روحانی پیشوا سمجھتے ہیں، جن کی رہنمائی دین و دنیا کی نجات سمجھی جاتی ہے۔ یہ محض سراب ہے، جادو ہے، ڈھکوسلا ہے۔ ان کا غنڈاپن، ان کی بے حیائی، ان کا مکر و فریب مجھ سے پوچھئے۔ اس آگ کے سامنے ایک دیول (مندر) ہے۔ اس دیول میں برائیاں ڈھلتی ہیں شیطانیت اس کے تنگ و تاریک حجروں میں تربیت پاتی ہے۔ سیکڑوں معصوم عورتیں، کنواری لڑکیاں پجاریوں کی آتشِ شوق کو ٹھنڈا کرنے کے لئے وہاں بھیجی جاتی ہیں یہ ہمارے ہاں کی قدیم رسم ہے۔ یہ زندگی کی دوسری مثال ہے۔ کیوں؟ آپ نہیں جانتے کہ ہماری گردنیں ہمیشہ نوکِ خنجر پر رہتی ہیں۔ اس دنیا میں اور اس برائیوں کی ٹکسال میں کتنی بے گناہ لاشیں دفن ہیں جنھیں صرف ایک "نہیں" پر جامِ مرگ پلادئے گئے۔ آہ وہ آگ جو جل رہی ہے، اور وہ انسان نما درندوں کی آوازیں جو آپ سن رہے ہیں، وہ میری موت کا آخری پیغام ہیں۔ دنیا میں جدائی پر ماتم ہوتا ہے، آمد پر شادیانے بجائے جاتے ہیں لیکن یہاں میری موت پر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ اگنی دیوتا کا جلال اندرا پر ٹوٹ پڑا ہے۔ وہ اس کی خوشامد کے لئے جمع ہو رہے ہیں" "کیا یہ بات سچ ہے؟" سلطان نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ سراسر جھوٹ ہے۔ اگنی دیوتا کا جلال کیوں ہوتا۔ وہ تو اس مندر کے پجاری کا جلال میرے حال پر ہے کیونکہ اس نے میرے دامنِ عصمت پر دھبا لگانا چاہا۔ میں نے اس کا جواب چانٹوں سے دیا اور بھاگ کر اس جھاڑی میں پناہ لی۔ جب اس پجاری کی آرزو پوری نہ ہوئی تو اس نے اپنی روحانیت کی آڑ میں لوگوں کو فریب دیکر انتقام کی یہ صورت نکالی۔ میرا خیال ہے کہ دنیا کے انقلابات، عوام کا برائیوں کی طرف التفات، گناہوں کی ایجاد، فرقوں کی پیداوار، جنگ و جدال کی

نوبت، غریبوں کی بے کسی، دولتمندوں کا غرور سب کچھ انھیں روحانی پیشواؤں کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ انسان شیطان سے ڈرتے ہیں، بھوتوں سے خوف کھاتے ہیں۔ جادو، منتر سے ان کا پیچھا چھڑاتے ہیں لیکن ان زندہ شیطانوں کا کوئی علاج نہیں۔ ان سے بچنے کے لئے کسی نے منتر تنتر نہیں نکالا۔ دیوؤں کے خلاف میں انسانوں کو بہکایا جاتا ہے، پریوں کے قصے سنا سنا کر ڈرایا جاتا ہے مگر افسوس کسی نے بھی ان بھوتوں کی خبر نہ لی جو بستی میں رہ کر ایک دوسرے کے سر کھاتے ہیں۔"

اس کی زبان نہیں تھی، قینچی تھی جو اپنے مذہبی پیشواؤں کی پارسائی کے پردے چاک کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے کف نکل کر ہونٹوں پر آرہا تھا وہ ہر لفظ، ہر جملے پر ہاتھوں کو اٹھاتی اور پاؤں کو زمین پر مارتی تھی۔ اندرا ایک زبردست اور تُرّانداز لکچر دے کر خاموش ہوئی۔ سلطان بت کی طرح کھڑے تھے۔ ان پر سناٹا چھایا ہوا تھا اور کچھ خبر نہ تھی۔ اتنے میں آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ ڈھول کی آواز گونجنے لگی، اس نے پھر سلطان سے کہا دیکھئے یہ میری موت کا پیغام ہے" "تم تو یہاں ہو، پھر کیا فکر ہے" سلطان نے کہا۔ "یہاں [illegible] اب وہ مجھے تلاش کریں گے [illegible]" یہ کہہ کر اس نے بھاگنا چاہا، لیکن بخشی نے اس کو پکڑ لیا۔ سلطان نے کہا "ڈرو نہیں، تمہاری جان بچ جائے گی" وہ خوف سے [illegible] رہی تھی اور اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی تھی۔ چاند پر سیاہ ابر کے ٹکڑے چھا گئے تھے، ہوا تھم گئی تھی، تاریکی میں اس کی شمع زندگی چراغ سحری [illegible] ٹمٹما رہی تھی۔ سلطان نے میان سے شمشیر آبدار نکالی اور جھاڑیوں کے سایہ میں پناہ لے کر اس کا انتظار کرنے لگے ادھر بخشی نے اپنی جیب سے تمنچہ [illegible] اندرا کو لے لیا اور سلطان سے دو قدم آگے بڑھ کر موت کے مقابلے میں ڈٹ گیا۔ جنگل کے سکوت میں ہل چل سی پیدا ہوئی۔ لگاتار جھاڑیوں کے ٹوٹنے کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں۔ "مانگو" "مانگو" کی سست، دھیمی، مدھم اور کرخت آواز کا شور رفتہ رفتہ بڑھتا چلا گیا۔ بادل چھٹ گئے تھے، چاند کا جوبن بہار پر تھا، جنگل کی ہر شے سیمابی شکل لئے ہوئے آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی، سامنے ایک کالی کلوٹی شکل، گردن میں ہڈیوں کی مالا ڈالے ہوئے نظر آئی۔ سلطان کی عقابی آنکھوں نے اس کو پہچانا اور فوراً آگے بڑھ کر اس کو روکا۔ اس نے برچھی کا وار کیا مگر سلطان نے اس وار کو اپنی ڈھال پر لے لیا اور ایک ہی وار میں اس کی گردن اڑا دی۔ آن کی آن میں بیس پچیس کا جتھا سلطان کے سامنے آموجود تھا، وہ ان کے وار ڈھال پر لے رہے تھے۔ ادھر بخشی نے ایک دو کو گولی کا نشانہ بنایا۔ تین چار کا گرنا ہی تھا کہ یہ مختصر حملہ آور جتھا منتشر ہو گیا۔ چاند ڈھل چکا تھا، ہوا میں سردی پیدا ہو چکی تھی۔ سلطان نے اب زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ جانا اور اندرا کے ساتھ کیمپ کو روانہ ہو گئے۔

گرمی کا موسم تھا، ندی جنگل کی گود میں اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ ندی میں اگرچہ بہت سی چٹانیں اور اونچے اونچے پتھر پڑے تھے مگر ندی کا پانی ان سے کنارہ کر کے مختلف راستے بنا کر بہہ رہا تھا۔ ندی کے دونوں بازوؤں میں خاردار جھاڑیاں تھیں اور ان جھاڑیوں پر مختلف قسم کے جنگلی بیل بوٹے۔ گہرے کہر کے دھندلے پن نے عروس فطرت کو حالت مرگ میں تبدیل کر دیا [illegible] کی شدت سے پرندوں کی آوازیں دھیمی پڑ گئی تھیں۔ نقارہ کی چوٹ نے لشکر سلطان میں زندگی کی ہل چل پیدا کر دی تھی۔ سلطان نیند سے بیدار ہوئے۔ نماز فجر ادا کی اور بخشی کو حکم دیا کہ اندرا کو حاضر کرے۔ بخشی اندرا کے ڈیرے میں گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ پہرہ دار بری طرح زخمی ہو کر دم توڑ رہا تھا۔ اندرا غائب تھی وہ مایوس لوٹا اور سلطان کو خبر کر دی۔ اس حادثہ نے سلطان کی آتش غضب کو بھڑکا دیا، فوراً فوج کی تیاری کا حکم ہوا اور آن کی آن میں لشکر جرار سمندر کی موجوں کی طرح ٹھاٹیں مارتا ہوا جنگلیوں کی سرکوبی کے لئے روانہ ہو گیا۔

صبح کے سات بج چکے تھے، سلطانی لشکر نے گاؤں اور مندر کا محاصرہ کر لیا تھا۔ بہت سے لوگ پکڑے اور پیٹے گئے مگر اندرا کا پتہ نہیں چلا تھا۔ گاؤں کی بوڑھی عورتیں اور مرد سلطان کے حضور میں اپنی بے گناہی کا ثبوت دے رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے برہنہ بچے اپنی جھونپڑیوں سے

باہر نکل کر ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے کہ ہٹو، بچو کی آواز نے وحشیوں کو محو حیرت بنا دیا۔ یہ سلطانی لشکر کے سپہ سالار دلیر خاں کی آمد تھی وہ سلطان کے سامنے حاضر ہوا، فوجی سلام کیا اور مندر میں چلنے کا اشارہ کیا۔ سلطان مندر میں داخل ہوئے اور انھیں ایک تہ خانے میں سے جایا گیا۔ جہاں انسانی ہڈیاں، ان مردم خوار وحشیوں کی خونخواری پر نوحہ کر رہی تھیں۔ تہ خانہ میں کئی کوٹھڑیاں اور ان میں پہونچنے کے لئے سنگین سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں، جابجا موٹے موٹے پتھر کے ستون کھڑے تھے، جن میں موٹی زنجیریں لگی تھیں۔ ہر ستون کا درمیانی فاصلہ پانچ پانچ گز تھا۔ سلطان نے ان سب کا بغور معاینہ کرتے ہوئے ایک ایسے بڑے دالان میں پہونچے جہاں ایک بڑا بت رکھا ہوا تھا، اس کے سامنے ایک سنگین چوکی تھی۔ بت کے داہنی طرف کئی تہ خانے تھے اور ان تہ خانوں کے دروازوں پر ایک ایک پجاری دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ سلطان نے ان سب کو قید کرنے کا حکم دیا اور ہر ایک تہ خانے کا معاینہ کیا جب جو تھا تہ خانہ کھولا گیا تو سلطان کی حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ اندرا یہاں زنجیروں میں جکڑی ہوئی پڑی تھی۔ سلطان نے اس کی زنجیریں کٹوائیں اب اندرا کا سر سلطان کے قدموں پر تھا، پھر وہ بے ہوش ہو گئی۔ اندرا مندر کے باہر لائی گئی اور ہوش میں لانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی مگر افسوس اس کی معصوم جان اس کے جسم نازنین سے سلطان کے دیدار کے ساتھ ہی پرواز کر چکی تھی۔ عجیب دن تھے، عجب جوش کا زمانہ تھا سر نیاز تھا، ٹیپو کا آستانہ تھا۔

عبدالواسع عصری

نیرنگِ آرزو

تیرے شوقِ دید میں یوں جھومتا آیا تھا میں
ہر قدم پر زندگی کو چومتا آیا تھا میں!!
دل میں پنہاں اک جہانِ آرزو لایا تھا میں
اپنی آنکھوں میں ادائے جستجو لایا تھا میں!

آہ، لیکن جب درِ مقصد پہ پہونچا بیقرار
اپنی ہستی کو بھلائے بیخود و دیوانہ وار
تو نہ تھا، اور میرے دل پر غم کے بادل چھا گئے
درد نے انگڑائی لی، آنکھوں میں آنسو آ گئے!

آہ جس جا میں نے چھیڑا تھا محبت کا رباب
جس جگہ آیا تھا میری زندگی میں انقلاب
جس جگہ پایا تھا میرے دل نے حسنِ زندگی
درد کی لذت، جوانی، روح کی تابندگی!!
جس جگہ دیکھی تھی میں نے تجھ میں پوشیدہ کبھی
پھول کی رنگت، ہوا کی روح، تاروں کی ہنسی
آہ، لیکن اب ہر اک شئے واں کی دل آزار تھی
تو نہ تھا تو ساری دنیا بر سرِ پیکار تھی!
جی میں آیا اس بہشتِ رنگ و بو کو چھوڑ کر
آرزوؤں کے حسیں جام و سبو کو توڑ کر!!
اپنی ہستی کو بھلا دوں کیفیاتِ ہوش میں!
روح کو تسکین دوں یوں موت کی آغوش میں!!

نظر

پل پر

گنجان شہر کے بیچوں بیچ سے ایک ندی بہتی ہے جس نے غالباً افلاس اور تمول کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم کی ہے اس پر ایک پل ہے نہایت آباد اور ہمیشہ رواں ——— جس پر مخلوق کا دریا قسم قسم کے پہیوں پر سوار ہو کر بہتا ہی رہتا ہے۔

نیچے ٹھاٹیں مارتا ہوا دریا نہیں ہے۔ بلکہ سیاہ اور گندے پانی پر بطخیں تیر رہی ہیں — اور اوپر۔ اوپر وہ مہذب شہری کھڑے "منظر پرستی" کی داد دے رہے ہیں۔

اسی پل پر سے اکثر امارت فراٹے بھرتی ہوئی نکل جاتی ہے — شاید افلاس کو شرمندہ کرنے کے لئے — اور کبھی افلاس — خستہ حال، زار و نزار، گردن جھکائے لنگڑاتے لنگڑاتے ادھر جا نکلتا ہے — اپنی زندگی کا دکھڑا رونے کے لئے اور شاید یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ زندگی نہ مر سکنے کا نام ہے۔

عجیب عجیب شکل اور ہیئت کے لوگ نظر آتے ہیں —— بعض خوب یحیم و شحیم جن کے چہرے سے زیادہ تر ندے بے فکری اور آسودگی کا اظہار ہوتا ہے بگھیوں یا موٹروں میں سوار، ماحول پر لاپروائی سے نظر ڈالتے گزر جاتے ہیں — بعض خستہ و پریشان، چہروں پر ہوائیاں اڑتی ہوئی، فرسودہ اور چرچراتی سیکلوں پر جھکے ہوئے گزر جاتے ہیں — پردے پڑی ہوئی سواریاں —— شکرمیں، تانگے اور موٹریں پھٹے ہوئے پردوں سے راہ رووں کو متوجہ کرتی ہوئی نکل جاتی ہیں

بعض شوقین طبع اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ٹولیاں —— اکثر شیروانی پر ننگے سر —— سگریٹ کے کش لگاتی گزر رہی ہوتیں — کسی جدید فلم کا تذکرہ — تعریف —— تنقید —— بحث —— کسی تقریر، مشاعرے، ڈرامے کا ذکر — کوئی کہتا "زبان پر کتنا عبور ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حاضرین پر کسی نے افسوں پھونک دیا ہے۔ جناب جادو بیانی اس کا نام ہے"!! فصاحت کی تعریف میں بلاغت کے دریا بہائے جا رہے تھے — اور غل کا سفینہ اس میں ہچکولے کھا رہا تھا! —

کوئی سخن فہمی کی داد چاہتا —— "کیا بلند فکر شاعر ہے۔ کلام میں کتنا سوز ہے۔ ترکیبِ لفظی، تشبیہات و استعارات کی موزونیت اور لطافت بس انہیں کا حصہ ہے" "اس کا جواب تھا" لیکن مضمون عموماً پامال رہتا ہے" —— اور بحث کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا —— کوئی کسی کردار کی تعریف میں رطب اللسان تھا —— "جذبات کی صحیح ترجمانی ہی اداکاری کا کمال ہے" —— اور بات بڑھ کر آرٹ پر بحث شروع ہو جاتی —— یہ موضوع گفتگو کا نتیجہ خیز تھا —— لفظی جنگ —— فصیح و بلیغ تیر — تنقیدی مضامین سے چھانٹے ہوئے جملوں کے بم بے تکلف استعمال کئے جا رہے تھے۔ سبحان اللہ کتنے کام ہیں "مادرِ وطن" کے فرزندوں کو —— جس ماں کے پیارے بچے ابھی سے جنگ کی مشق نہ کریں وہ اس کی آزادی کے لئے کیا لڑیں گے —— اس کے آڑے وقتوں میں کیا کام آئیں گے!!!

اسی نفسی نفسی کے عالم میں کچھ تجارت بھی ہو رہی تھی۔ کوئی رہرؤں کو اخبار خریدنے پر مجبور کر رہا تھا۔ کوئی سینما کے اشتہارات تقسیم کر رہا تھا۔ کوئی جاپانی اشیا کا ایجنٹ تھا۔

پُل کی ریلنگوں سڑک کے دونوں جانب کچھ لوگ ملگجی اور سیاہ رنگ کی گٹھریاں سی بنے بیٹھے تھے۔ جن کے ہاتھ بڑھ بڑھ کر راستہ چلنے والوں سے کچھ مانگ رہے تھے۔ یہ تمدن اور معاشرے کے سفید دامن پر سیاہ دھبے سے معلوم ہوتے تھے

ندی کے ایک کنارے پر ایک خوبصورت عمارت کے احاطہ میں آدمیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ یہ کوئی بنک معلوم ہوتا تھا جہاں لوگ غالباً اپنی دن بھر کی کمائی جلد جمع کرا دینے کے لئے بے چین تھے۔ اس کے سامنے پل اتر کر دوسرے کنارے پر ایک شاندار عمارت عالمانہ سنجیدگی سے کھڑی تھی۔ اندر بھی علمی فضا طاری تھی۔ اکثر لوگ عالم انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس عمارت کے سامنے شہر کے پیشہ ور گداگروں نے ایک "دارالمتاجین" کھول رکھا تھا۔ اور کثافت و غلاظت کی نمائش میں کافی حصہ لیا تھا۔

ایک جانب زنانہ ہاسپٹل میں نئی زندگیاں عالم وجود میں آ رہی تھیں۔ اور اس پار دوسری جانب کچھ لوگ روتے پیٹتے ایک گیٹ سے نکل رہے تھے۔ ان کی آہ و بکا میں قریبی پارک کے ریڈیو کی نغمہ نوازیاں گم ہو رہی تھیں

محمد مزمل صدیقی

غزل

عجیب ہے میری سادہ لوحی کہ شاد ہوں گنگنا رہا ہوں
چمن میں کوندا لپک رہا ہے، میں آشیانہ بنا رہا ہوں

میں بزم ہستی میں رنگ توحید اس ادا سے جما رہا ہوں
تمام دنیا کو دل کی قوت سے ایک مرکز پہ لا رہا ہوں

ادھر غرور جمال ان کا ادھر مرا شوق ناشکیبا
وہ مجھ سے نظریں ہٹا رہے ہیں میں ان سے نظریں ملا رہا ہوں

بہشت میں تاب و تب کہاں ہے یہ گردش روز و شب کہاں ہے
یہ سرخوشی، یہ طرب کہاں ہے کہ پی رہا ہوں، پلا رہا ہوں

تمہیں وہی درس دے رہا ہوں جو راز ہے بزم آب و گل کا!
میں شاعری کی زباں میں کاوشؔ! ازل کی باتیں سنا رہا ہوں

کاوش

پیاری بہنو

ہاں اٹھو تاب و تواں تم میں نہیں کیا باقی
ہائے کیا ڈال کے منہ دے گیا تم کو ساقی

آدمی کو انسان بننے کے لئے اخلاقی جرأت اور تعلیم اناث کی ایسی ہی ضرورت ہے، جیسے زندگی کے برقرار رکھنے کے لئے جوالعیانی کی ضرورت ہے اور تاریخ اس کی شاہد ہے کہ ہر زندہ قوم کی تعمیر میں عورت کا زندگی بخش ہاتھ ابتداء کارفرما رہا ہے۔ وہ اپنے آغوش آغوش کرنے والے کو اپنی ولولہ انگیز تھپک سے میدان جنگ کا بہادر اور سورما بناتی ہے۔ وہ جسموں میں آب زندگی دوڑاتی ہے۔ دلوں میں گرمی اور تازگی پیدا کرتی ہے۔ ارادوں میں پختگی اور چال چلن میں راستبازی قائم کرتی ہے۔ وہ اپنے لخت جگر کو بندوقوں۔ توپوں۔ گولوں۔ ٹینکوں جنگی جہازوں اور خون کی ندیوں کے جرأت آموز خواب دکھا کر جواں مرد بناتی ہے۔ وہ عملی طور پر ثابت کرتی ہے کہ وہ حقوق اور انسانیت کی پاسبان جنگ اور نگہبان معرکہ قتال ہے (بچوں کو بزدل اور خوف زدہ بنانے سے قبل ہماری زندگیاں ختم ہو جائیں تو اچھا ہے)

انقلاب انگیز یہ ہے مسلمان عورتوں کا خاصہ ہے جو ظلم و جبر کو ختم کرنے کے لئے اور انسانیت پیدا کرنے کے معرض وجود میں آئی ہیں۔ ان کی حیات افروز فطرت اور ان کی تقریباً (۵) سال تک کی تربیت اپنے نونہال کو مجسمہ تیغ و تفنگ اور پاسبان وقار ملت بنا دیا کرتی ہے۔ اور یہ حقیقت روز روشن کی طرح ثابت اور واضح ہو چکی ہے کہ خوددار اور آزاد قوموں کی عورتیں مردوں کے دوش بدوش بری اور بحری، فضائی اور تحتی آلات حرب و ضرب پر کامل دستگاہ رکھ کر اس دور کشمکش حیات میں مردوں کا دست راست صرف اس سبب سے بنی ہیں کہ انہوں نے اسلامی قانون "العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ" پر عملاً کاربند ہیں

لیکن افسوس کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اس بڑھتی ہوئی پستی اور زبوں حالی کے دفعیہ کے واحد علاج تعلیم اناث کو اس طور پر جاری اور ساری نہیں کیا گیا جس کے باعث وہ تا حال نہ سنبھل سکے۔

اگرچہ سر سید مرحوم نے کالج بنا کر مغربی تہذیب کو حقیقت کی عینک سے دیکھنے کا انتظام کیا۔ کسی حیدرآبادی صاحب نے نومبر ۱۹۳۰ء کے علی گڑھ منتھلی میں اس ترقی یافتہ قوم کی عورتوں کی بعض پردہ جاریہ کی پردہ داری میں دیکھ کر اصلاح پردہ میں خوب قلم توڑے۔ اور بعض نے میونسپل بورڈ سے امداد طلب کر کے مدارس نسوانیہ اس قسم کے بنا لئے جس میں اسلامی تعلیم اور خودداری مسلم کا فقدان تھا اور اکثر لوگوں نے عورتوں کو تو صرف خادمہ، گھر کی محافظہ گردان کر ان کو بھی عدم تشدد ستیاگرہ اہمسا کی تعلیم اور تقریریں دے کر ان کی رہی سہی زندگی کو یاس نا امیدی۔ اور نامرادی میں مبدل کر کے انسانیت سے کوسوں دور پھینک دیا اور چونکہ مسلم عورتوں میں علم و عمل مفقود ہے اس لئے ہماری جاہلی، ثقافتی اور قومی ترقی محدود ہو گئی ہے۔ اور وہ مغربی تہذیب کی نشہ آور مست کن جھولوں میں اپنی خودداری اور مذہبیت کو ختم کر کے لا شئے لا شئے پینگ لے رہی ہیں ان کو اپنی مالی اور اقتصادی حالت کی اصلاح کے لئے گھریلو تجارت و صنعت کی طرف کوئی رغبت نہیں ہے۔ اور اس ذلت و خواری کا اندازہ صرف یہی

لوگ اچھی طرح کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں جن کے دلوں میں اسلام کی سچی محبت اور بناءِ عظیم کی حقیقی تڑپ موجود ہے۔ اور ایسے لوگوں کے دل جس طرح کڑھ رہے ہیں اس کے اظہار کے لئے زبان میں طاقت ہے اور نہ قلم میں قوت۔ لیکن ہمارا ایمان اور اسلامی تعلیمات بہ بانگ دراہم کو ارتقا کی طرف بلا رہے ہیں لیکن ہندی مسلمان صرف کسی اخبار کے مطالعہ۔ کسی جلسہ کی شرکت کسی کانفرنس کی صدارت۔ کسی مکتبہ کی شمولیت۔ کسی انجمن کو ادائگی چندہ کے بعد یہ یقین کر کے کہ انگریزی حکومت میں معمولی تجارت۔ ادنیٰ مزدوری اور حقیر ملازمت کی آمدنی سے مغرب کی روحانیت کش تہذیب کو خرید کر چند دن تک اس حیات جدید میں مگن رہ کر عالم جاودانی کو کوچ کر جانا زندگی اور اعلیٰ زندگی ہے۔

نمبر۲ باعث تعمیرِ حیات و ملت یعنی عورت مذہبی۔ سیاسی۔ اقتصادی۔ معاشرتی اور تمدنی ارتقا کے خیال سے دور صرف آرائش ظاہری کئے ہوئے مفید اور ضروری علم و فن سے علٰحدہ چولھے کی ڈیوٹی اور گھر کی غیر مشقت کن زندگی میں تخت پر بیٹھی ہوئی حکمرانی کرتے ہوئے عیش پرور بچوں کی ناز برداریاں غشا زندگی خیال کر رہی ہے۔ اور کئی صدیوں سے افسوس ہے کہ اس نے طارق۔ محمد بن قاسم۔ خالد۔ محمد فاتح اور غازی صلاح الدین۔ جیسے دلاور اور فاتح فرزند میدان عمل میں بھیجنا بند کر دئے ہیں اس نے اپنے شاندار ماضی کے حالات اور آبائے سابق کے حیات آموز کارنامہ اور واقعات طاق نسیاں بنا کر اپنی ظاہری خودداری کے تم و پیچ میں اپنے نفس کو بہلا کر مجاہدانہ حرارت کو سکون اور برف زدگی سے مبدل کر دیا ہے۔ اس وقت ہندوستان ایک انقلابی دور سے گزر رہا ہے۔ اگر غفلت و بے پروائی کی وہی حالت رہی جو ۔ ۔ ۔ ۔ واجد علی شاہ بادشاہ کے زمانہ سے اب تک رہی ہے تو یاد رکھو کہ ایسا ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑے گا جس کی پابجائی محال ہوگی۔ رہبر اور قائدین ہی پر تکیہ لگانا تمہارے سیاسی وقار اور دماغی ارتقا کا جانی دشمن ہے۔ ایک طرف قائدین سیاست جبکہ اجتماعی طور پر کام کر رہے ہیں اور مردان کے شریک کار ہیں تو تم عورتوں کو چاہیئے کہ انفرادی نہج پر اصلاحی اور تبلیغی کام شروع کر دیں۔ کیا کوئی بہن جواب دے سکتی ہیں کہ اجتماعی مفاد کے لئے انھوں نے انفرادی طور پر اصلاحی اور تعمیری کام آغاز کر دیا ہے؟

. . . . بہنو۔ تم کو مایوسی اور اہمسا کی تعلیم نہیں دی گئی ہے۔ تم اپنے فرض تربیت اولاد سے کیوں غفلت برت رہی ہو۔ خدارا اب بھی تم اپنی کمر ہمت چست کر کے . . . . . .

حالت قوم کو بدلنے کے لئے جبکہ تم معمار قوم ثابت ہو چکی ہو عملی قدم اٹھاؤ۔ تو ہندی مسلم کی سب مشکلیں اسی طرح آسان ہو سکتی ہیں جس طرح زرین قرآنی تعلیمات کی برکت سے آزاد قوموں کی عورتوں نے پیکر انقلاب و جنگ بن کر حریت حاصل کی ہے سرحد آزاد کو دیکھو کہ آفریدیوں۔ مہمندیوں۔ مسعودیوں اور وزیریوں کی مجاہد عورتیں مردوں کے دوش بدوش غیرت قومی کی پاسبانی میں آج تک لڑ رہی ہیں۔ عزیزو۔ بھائیوں اور خاوندوں کے کھانا کھانے کی فرصت میں خود ان کی جگہ مورچوں میں بیٹھ کر گولیاں چلا رہی ہیں سلطنت عثمانیہ کے جب حصہ بخرے کئے جا رہے تھے اور دشمن ترکان احراریہ طے کر چکے تھے کہ استنبول پر انگریز کا قبضہ ہوگا۔ سمرنا اور تھریس یونانیوں کے مقبوضات ہوں گے۔ ترکوں کی آبادی حد مقررہ سے تجاوز کرنے نہیں پائے گی۔ ترکی فوجوں کو نگہداشت فرانسیسیوں کے ذمہ ہوگی۔ ترکی نونہالوں کی تعلیم اٹلی کے سپرد ہوگی۔ ان کو یورپ سے نکال دیا جائے گا۔ مسجد ایاصوفیہ کو گرجا کی صورت میں تبدیل کر دیا جائے گا تو اس وقت باعثِ تعمیرِ حیات ترک خواتین نے

میدان عمل میں آکر وہ شاندار اور اولوالعزم خدمات انجام دیں کہ اگر ترک خواتین کو استقلال ترکی کا باعث نہ کہیں تو یہ انصاف کا خون ہوگا جیسا کہ محترمہ خالدہ ادیبہ خانم نے جامعہ ملیہ دہلی میں ایک لکچر کے دوران میں فرمایا تھا کہ ترکی کے استقلال میں ترک خواتین کا زندگی خیز ہاتھ تھا جس نے ترک سپاہیوں کے حوصلوں اور ارادوں میں تقویت دی۔

اللہ اللہ وہ عورت جس کے چہرہ کی ہڈیاں نکلی ہوئی۔ پیشانی بلند۔ بھویں گہری اور موٹی۔ چمکیلی آنکھیں۔ جن میں جادو خوف اور قساوت تھی۔ اعصاب میں توانائی اور روح میں آتش و برف کی یکجائی تھی۔ اس نیک اور صالحہ بی بی زبیدہ خانم نے ایک شکستہ حال کسٹم کے کلرک آقائے علی رضا افندی کے بطن سے ۱۸۸۱ء میں بمقام سلانیک فولادی اعصاب والا آہن و آتش میں قیادت کرنے والا۔ بحر حیات میں لاکر ایک مرد بنایا ہے۔ بالاشت [illegible] اس کی جولانگاہ اور ہر گردش کار کو اس کی گردش رفتار بنا کر لباس جنگ سے ملبوس کرکے آہن و برف کا جما ہوا ایک کارکن [illegible] بنا کر سالار کرد

پس اے میری پیاری بہنو۔ اس دور انقلاب میں اپنے مردوں کے دوش بدوش [illegible] میدان عمل میں کود کر اپنے شوہروں۔ بیٹوں بھائیوں اور عزیزوں کی دکانوں اور کارخانوں کو ہاتھ میں [illegible] ریلوں۔ ڈاک ٹیلیفون۔ ملکی نظم ونسق پر تم نظر آؤ - - - -

- - - - - - - نہ صرف یہی بلکہ اپنے مردوں سے جو قوم اور مذہب کے خاکسار ہیں ان [illegible] کہ تم ہم عورتوں کی عصمت و آبرو کے پاسبان ہو دشمن کو ہم پر فتح نہ پانے دو اور آزادی پر کٹ مرو۔ تاکہ اس دور [illegible] میں تمہارے مرد متفقہ قوت اور متحدہ عمل سے امیر عسکر کی قیادت میں حیات کا نیا دور آغاز کر سکیں۔ تم آج صمیم قلب سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد واثق کرلو کہ دوسروں پر نکتہ چینی ترک کر دلی — کسی کی غیبت نہ کروں — بیکار اور فضول باتوں میں اپنی عمر گراں مایہ برباد نہ کر دلی — اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو عمل کرکے دور کر دلی — اور اپنا قابل تقلید نمونہ نوخیزوں کے لئے پیش کروئی — کمال اتاترک مرحوم کی والدہ ماجدہ بی بی زبیدہ خانم۔ خالدہ ادیبہ خانم۔ مولانا محمد علی مرحوم کی والدہ بی اماں دکن کی جنگ جو اور جنگ پرور سلطانہ چاند بی بی فاتح قلعہ احمد نگر (دکن) اور محترمہ فاطمہ جو جنگ اتحاد میں سامان ڈھو کر لاتی تھیں ان سب کی اچھائیوں کو لے کر ایک نیا "خذ ما صفا" کا نمونہ بن کر اپنے جسم میں صحیح اسلامی روح پیدا کروں — جملہ لغویات اور توہمات اور غیر اسلامی رسومات کو یک لخت قطع کر دوگی — کسی پیر زبان کے یہاں مانگ کا گھنا پہن کر نہ جاؤں گی — لڑکوں کے ہاتھوں میں منت کے کڑے نہ ڈالوں .. .... اور ایسے لڑکوں کے سر پر چوٹی نہ پالوں — دن بھر تخت پر بیٹھے بیٹھے ٹلی نہ کترا کروں گی — چٹورا پن نہ کر دلی — اپنے باورچی خانہ کو ماما جی کے بالکلیہ سپرد نہ کروں — بچوں کی دیکھ بھال بذات خود کروں گی۔ کم از کم (۱۲) سال تک کے بچوں کو تعلیم خود دوں — ان کی تربیت میں ایسی صورت اختیار کروں۔ کہ وہ بری چیزوں سے نفرت اور اچھی چیزوں سے الفت کریں اور ایسی تمام واقفیتیں پیدا کردیں۔ جن سے بچوں کو انسانی زندگی کے سمجھنے میں مدد ملے - - - - - - - ان کو ہری سنگھ نلوہ۔ دال چپاتی۔ بڈھے۔ کتے بلی اور باؤ سے نہ ڈراؤں — بچوں کے نام کلوا۔ جما۔ چاند پاشاہ نہ رکھوں — گر ایسی تربیت دوں جس کے سبب بچے ابتداء اپنے معقول افعال پورے کرکے اپنی زندگیاں غازی اتاترک مرحوم رضا شاہ پہلوی۔ اور ۔ محمد علی مرحوم۔ کی طرح بنا سکیں۔ ان میں اخلاق حسنہ پیدا کر سکیں

کوشش کیجائے گی۔ ان کے غلط میلانات کو راہِ راست پر لائیں گی۔ ان کو تیراندازی اور شمشیر زنی سکھاؤں گی۔
غرض انہیں ہر قسم کے مردانہ اور جنگی کاموں کی مہارت کا شوق دلاؤں گی۔ ان کو مصلحین اور
پیغمبروں کے حالات سنایا کروں گی۔ تاکہ ان میں صبر اور استقلال پیدا ہو جائے۔ بڑے بڑے لوگوں کے حالاتِ زندگی
سناؤں۔ اور مختلف قسم کی بڑی بڑی شخصیتوں سے براہِ راست ملنے جلنے کے مواقع بہم پہونچاؤں گی تاکہ بچے ان میں سے اپنا
نمونہ انتخاب کر سکے۔ ان کو قرآنی تعلیمات اور ابتدائی ریاضی۔ انگریزی۔ فارسی اردو۔ کی خود تعلیم دوں گی۔ اور ہمیشہ
کم قیمتی سادہ اور صاف ستھرے کپڑے پہنایا کروں گی۔ اور اپنے بچوں کو بھی تصنع اور ریاکاری سے دور رکھوں گی۔ اور
ان کو مردِ مجاہد بناؤں گی۔

پیاری بہنو۔ جہالت جو ایک بڑی معصیت اور لعنت ہے اس سے گلو خلاصی حاصل کرو۔ آپس میں خلوص دیانتداری
محبت و مروت۔ اتحاد و اتفاق کو کام میں لاؤ۔ اپنی مالی و اقتصادی حالت میں اصلاح کرو اور جبکہ ارضِ ہند میں تم پر مصیبت
پہاڑ ٹوٹا ہے تو گھر ہی کی چار دیواری میں مقید رہ رہ کر آزادی کی طلب میں کچھ کاڑھ کر کچھ بنا کر۔ کچھ پکا کر۔ کچھ سی
پرو کر سود اور قرضہ کے تباہ کن اثرات سے محفوظ رہ کر فارغ البالی حاصل کرو۔ عملی طور پر اپنی بہنوں کی ہمدردی اور حوصلہ افزائی
کرو۔ اگر تم کو اپنی جسمانی صحت درکار ہے تو کسی نہ کسی قسم کی روزانہ پابندی کے ساتھ ایسی عملی رفتار اختیار کرو جس سے
صحت اچھی رہے اور اقتصادی حالت زیادہ سے زیادہ بہتر ہو سکے۔ اس لئے کہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ داری اور اجتماع
دولت حسب احکام خداوندی "ان نورث الارض من عبادی الصالحین" تمہارے مقدرات ہیں۔

بنی نوع انسان کو ظلم و زیادتی سے بچانے کے لئے اور انسانیت کے بلند درجہ تک پہونچانے کے لئے اس دورِ انقلاب
میں تمہاری ہی معاونت لازمی ہے۔ تم۔ دخترانِ وطن کے رسم و رواج کو ترک کر کے "امہات المومنین" اور حضرت فاطمہ
رضی اللہ اجمعات" کی اتباع و پیروی کرو۔ اللہ اور صرف اللہ کے رنگ میں ایسی رنگ جاؤ کہ تمہارے اخلاق کردار،
رواداری اور بجا سلوک سے غیر بھی تمہارے گرویدہ ہو جائیں۔ اگرچہ ہمدردی اور ترحم تم میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے لیکن
سیرت دراصل عادت سے پختہ ہوتی ہے بچوں کو مارنا یا ان کا ناشتہ تھوڑی دیر کے لئے بند کرنا اگرچہ اچھی چیز ہے مگر بار
بار ان سے یہ سلوک ان کے اعتماد اور عزتِ نفس کے شریف جذبات کو جو بالکل کم عمری ہی سے ان میں فطرتاً موجود ہوتے ہیں
ان کو بری عادتوں کا مرکز بنا دے گا۔ تم بچوں کے جذبات سے سنجیدہ طور پر اپیل کرو تاکہ وہ اپنی ذلت اور رسوائی کو پسند نہ
کر کے تمہارے عمدہ اور قابل عمل احکام کے پابند ہو جائیں۔ اور پھر اس کی ہر اچھی عادت اس کی سیرت کو پاک وصاف
اور پختہ کرتی جائیگی پابندی وقت۔ ایفائے وعدہ۔ ذمہ داری کے احساس۔ ہمت اور استقلال۔ تدبر اور روشن خیالی
آزادیِ وطن اور حریت قوم کے اخلاق پر نمایاں ہو جائے تو پھر تم میں کی ہر ہر عورت۔ مثل والدہ مصطفیٰ کمال مرحوم بن جائیگی
تمہاری نکبت و ذلت دور ہو جائے گی تم آزاد و بشاش نظر آؤگی۔ اور آزاد ملک کی حریت پرور ملکہ کے نام سے موسوم
ہوگی اور پھر تمہارے ملک کی آزادی کے لئے دوسری اقالیم کے باشندے اور ان کی حکومتیں معاہدہ کریں گی۔ اور تمہارے
نونہال ان معاہدوں کو قبول کر کے اس کی نشر و اشاعت کریں گے۔ تم ان معاہدوں کو زیر نظر لاؤگی اور پھر اس وقت تمہارے

دلوں میں ویسی ہی بغاوت مگر جوش زن ہوگی جیسی بغاوت جناب رسالت مآب صلعم نے فرمائی تھی۔ اب تم اپنے مردوں کو . . عسکری تعلیم و تربیت کے لئے روانہ کردو اور صبر و استقلال کے ساتھ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں منہمک ہو جاؤ۔ اور خود طب، قانون، آرٹ، سائنس، خیاطی، انجینیرنگ، اور جراحی کی تعلیم حاصل کرنے کی پوری کوشش کرو تاکہ تم بھی اپنے بازوؤں کی قوت پر نظر ڈال سکو۔

اگر ہندوستان تمہارا اس قسم کا بدنصیب خطہ باقی رہے گا جہاں کمزوری موجود، پردہ، عدم تشدد، اہمسا اور . . . . گھر کی چار دیواری کی قید جاری ہے تو یاد رکھو کہ شاہراہ ترقی پر گامزنی، سہولتیں، ارمانوں کی تکمیل، حقیقی وقار اور صحیح قدر و قیمت بالکل نسیاً منسیاً ہو جائے گی۔

اب دور حاضر کی جنگ میں جبکہ انسانی حقوق کی حفاظت میں جنگ ناگزیر ہے تو ہم کو تمہارے نسوانی انقلاب کی ضرورت ہے۔

خون حیات دوڑا کر ان کی بے حسی کو دور کردو　اور ان میں حرکت پیدا کردو　تاکہ افراتفری دور ہو کر تمہارے مرد منظم اور ایک محاذ پر متحد ہو جائیں　ان کی گھریلو زندگی میں تمہاری آتش افروز حیات سے مجاہدانہ نظام پیدا کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ عورتوں ہی کے سبب سے قومیں زندہ ہوئیں۔

بہنو۔ تہذیب مغرب کی نشیلی اور مسموم لہریں جس میں تم آج تک جا رہی ہو تمہاری کشتی حیات کو ایسے سمندر میں غرق کردیں گی کہ پھر تمہارا یا تمہاری اولاد کا ابھرنا مشکل کیا بلکہ محال ہوگا۔ تم جانتی ہو کہ عورت کی سپاہیانہ زندگی ہی اس کی عصمت و آبرو کی پاسبان ہے۔ پس تم اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے بوجھ کو خود برداشت کرتے ہوئے سپاہیانہ زندگی کو اپنے اخلاق و کردار کا اہم جزو تسلیم کرلو۔ تاکہ بدکردار مردوں کی شیطانی سیرتوں کو . . . . بے بارگی اپنی اعلیٰ سیرت۔ بے پناہ روحانیت اور خطرناک عملی تقدیم سے ختم کرتے ہوئے شاہراہ زندگی پر گامزن ہو کر ترکی۔ ایرانی اور افغانی بیگموں کی طرح عرصۂ حیات پر زندگی دوام حاصل کرلو۔ اگر تم نے تصنع اور خود رائی ترک کردی اور میری بتائی ہوئی راہ اختیار کی تو مغربی شیطانوں کے طلسمات ٹوٹ جائیں گے

اقبال الدین احمد (مولوی فاضل)

ایک گناہ

مجھے صبیحہ سے محبت تھی۔ سچی محبت۔ ایسی محبت جس کی راہ میں سبھی بندشیں اور سماجی موانعات چند پھونک میں اُڑ جانے والے تنکوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ایسی محبت جو یقیناً ہر مذہب میں جائز ہے۔ وقت کے آنے پر جس کی بے لوثی کے آگے سماج کی ساری بدگمانیوں کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑے گا۔

صبیحہ کا بیاہ ہوئے ہفتے گزر گئے لیکن میرے دل کی دنیا کے لئے اس کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی کہ بیاہ سے پیشتر۔ کچھ دنوں پہلے تک میں یہی سمجھتا رہا کہ اس کی محبت کا دعویٰ کرنا میرا حق ہے اور اس کی صورت کو پوجنا میرا فرض۔ لیکن آہ وہ قیامت خیز ساعت جب کہ میرے دعوے کو باطل اور میرے فرض کو گناہ قرار دیا گیا۔

رات پہلی پہر سے گذر چکی تھی۔ چاندنی کو چھٹکتے ہوئے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ چاند کبھی ابر کے سیاہ سیاہ پردوں سے جھانکتا اور کبھی شفاف نیلگوں آسمان پر اپنی پوری ضیا باریوں کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ جہاں جہاں ابر کے ٹکڑے نہ تھے بے شمار تارے بساطِ فلک پر جواہرات کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ گرمیوں کا موسم دم توڑ رہا تھا اور کائنات کی فضا میں بہار کی آمد آمد کے شادیانے بج رہے تھے۔ وہ صحن میں ایک نیم آرام کرسی پر دراز آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھیں سامنے ایک چھوٹی سی تپائی رکھی ہوئی جس کے ساتھ ان کے نازک نازک پاؤں حنا بازی کر رہے تھے۔۔ وہ یکایک آدھمکنے سے چونک تو گئیں لیکن ساتھ ہی یہ معلوم کرکے کہ آنے والا میں ہی تھا اپنے سکون پر قابو پا لیں۔

"او ہو! آج فلکیات کا مطالعہ کر رہی ہیں آپ" میں نے مذاقاً ہنستے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ خدا کی شان دیکھ رہی ہوں۔ آسمان کیا ہے ایک موجیں مارتا ہوا نور کا سمندر ہے۔ چاند ایک طلائی کشتی ہے جو کبھی کہر میں چھپ جاتی اور کبھی صاف فضا میں چمکتی ہوئی راستہ کاٹ رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس نورانی منظر سے ایک پل کے لئے نظریں نہ ہٹاؤں۔ بس دیکھتی ہی رہوں۔ دیکھتی ہی رہوں"

"حتیٰ ایں کہ سویرا ہو جائے۔ دھوپ نکل آئے۔ آفتاب کی تیز تیز شعاعیں آنکھوں کو چندھیانے لگیں۔ ہے نا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"رشید تمہیں تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔ شاید تمہیں قدرتی مناظر بھلے نہیں لگتے۔ کوئی حسین چیز تمہارے من کو نہیں بھاتی" "بالکل صحیح صبیحہ۔ کوئی خوبصورت چیز میرے من کو نہیں بھاتی۔ یہ چاند جسے تم اس قدر حیرت کے ساتھ تک رہی ہو، ہے ہی کیا چیز۔ اس میں رکھا ہی کیا ہے۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے جس کی ساری روشنی آفتاب سے مستعار مانگی ہوئی ہے اور جیسا کہ تمہاری دادی ماں کہتی تھیں اس میں ایک بڑھیا بیٹھی ہوئی چرخہ کات رہی ہے اور قیامت تک یہی کام کرتی رہے گی ادھر صور پھونکا گیا کہ ادھر بڑھیا کی روح قبض ہوئی۔ کیوں کہتی تھیں کہ نہیں؟" "جی ہاں کہتی تھیں۔ اور آج کل کے سائنس دانوں نے بھی صدہا قسم کی تحقیقات کے بعد دادی ماں ہی کے بیان کے ساتھ اتفاق کیا ہے۔ اب تو خوش ہوئے آپ"

"سچ تو یہ ہے صبیحہ۔ (میں نے سنجیدہ بنتے ہوئے کہا) میں ایک زمین کے چاند کو دیکھنے میں اس قدر محو ہوں کہ آسمانی چاند کی طرف آنکھ اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی۔ جی چاہتا ہے کہ اس چاند کو اپنے دل میں اتار لوں۔ رات دن اسی کو دیکھتا رہوں اسی کو دیکھتے ہوئے جیوں اور اسی کو دیکھتے ہوئے اپنا آخری سانس لوں۔ اے کاش یہ ممکن ہوتا۔

جوں جوں میرے منہ سے یہ الفاظ نکلتے گئے صبیحہ کے چہرے کا تبسم کافور ہوتا گیا۔ وہ خاموش مجھے ٹکٹکی لگائے دیکھنے لگیں۔ میں نے بھی اپنی بات ختم کی اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔ اب مجھ میں اس سے نظر چار کرنے کی تاب نہ رہی تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں اور سامنے والی تپائی پر اپنا سر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد سر اٹھایا اور دیکھتا کیا ہوں کہ وہ اسی طرح میری طرف دیکھ رہی ہیں۔ صبیحہ کے اس غیر معمولی طور سے میں گھبرا گیا۔ بے اختیارانہ میرا سر تپائی کی طرف جھکنے لگا۔ یہاں تک کہ صبیحہ کے نرم نرم پیروں پر میں نے اپنی پیشانی رکھ دی۔

"میں تمہاری پرستش کرتا ہوں صبیحہ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا نہ جانے یہ بات کیوں ہوئی۔ کیسے ہوئی اور جب کہ تم دوسرے کی ہو گئی ہو کیوں ختم نہیں ہو جاتی۔

"جس دن آپ کی غرض پوری ہوئی اس دن شاید یہ بات بھی ختم ہو جائے۔ صبیحہ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا

ایک بجلی سی میری آنکھوں میں کوندی۔ میرے سینے پر سانپ سا لوٹ گیا۔ میرے دل و دماغ کو ایک دھماکہ سا محسوس ہوا۔ غرض۔ کیسی غرض۔ کس کی غرض۔ آہ کتنی ہیبت ناک بدگمانی۔ کیا یہی محبت کا انجام ہے۔ کیا سماج کے پہلو میں جو دل ہے وہی دل میری صبیحہ کے پہلو میں بھی تھا۔

نہیں نہیں۔ ایسا نہیں۔ کسی نے صبیحہ کو میرے خلاف بھڑکایا ہے۔ میری محبت کو جھوٹے اور ذلیل رنگ میں پیش کر کے اسے مجھ سے بدظن کرایا ہے۔ ورنہ جو بات اب تک نہ ہوئی وہ آج کیسے ہوتی۔ کاش مجھے آج سے پہلے ہی موت آ گئی ہوتی۔ میرے خیالات پریشان تھے۔ مجھ سے ایک لمحے کے لئے بیٹھا نہ گیا۔ اٹھا اور صبیحہ سے کچھ کہے سنے بغیر چل نکلا۔ وہ ہرچند مجھے روکتی رہیں رشید ٹھیرو۔ کہاں جا رہے ہو۔ خفا ہو گئے کیا۔ لیکن میں نے ایک نہ سنی اور اپنے گھر پہونچ کر دم لیا۔

میری نظروں میں کچھ دیر پہلے کا دہشت ناک منظر سمایا تھا۔ میرے لئے نہ تو موت اس سے بڑی کوئی لعنت تھی اور نہ میری قسمت کا اس سے مہلک کوئی پھیر۔ دنیا میری محبت کو شبہ کی نظروں سے دیکھتی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ میری صبیحہ کے دل میں اس کی قدر ہے۔ افسوس اس نے بھی مجھے نہ پہچانا۔ جی تو چاہتا تھا کہ زہر کھا لوں۔ ریلوے لائن پر اپنا سر رکھ دوں یا رود میں کود پڑوں۔ مگر بے حیائی اور بے شرمی کی موت کو غیرت نے گوارا نہ کیا۔ میرے جذبۂ خودداری میں ابھار ہوا۔ دل کو مضبوط کیا اور یہ ٹھان لی کہ اگر سماج سے لڑنے کی طاقت نہیں۔ کم از کم صبیحہ سے اپنی پاک اور سچی محبت کا لوہا منوا لوں۔ لیکن اس کے لئے وقت اور موقع کی ضرورت تھی۔

(۲)

صبیحہ نے مجھ سے معافی مانگتے ہوئے کہا رشید مجھے سخت ندامت ہے میں نے تمہاری کوئی قدر نہیں کی تمہاری محبت کو بہت

ہی سرد مہری سے ٹھکرا دیا۔ مگر میرے لئے یہ رسمی معافی کہاں کافی ہو سکتی تھی۔ میں تو یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ جو خیال صبیحہ کے دل میں پیدا ہوا ہے وہ بالکل تہمت ہے اور یہ کہ دنیا والوں کی شک آمیز باتیں سنتے سنتے صبیحہ کے دل سے بھی محبت کا بے لوث تصور غائب ہو گیا ہے۔ میں نے اپنے تئیں یہ تہیہ کر لیا کہ اگر میں اپنے اس مقصد میں ناکام رہوں تو پھر کبھی سچی محبت کا دعویٰ نہ کروں گا۔ میں جھوٹا۔ میری محبت گناہ۔ صبیحہ نے مجھ سے معافی چاہ لی تھی۔ میں نے بھی کہہ دیا تھا کہ مجھے اب کوئی شکایت نہیں ہم پہلے کی طرح ہنسنے بولنے بھی لگے۔ اور آخر کار وہ وقت بھی آ پہنچا جس کی دنوں سے مجھے آرزو تھی۔

ایک رات کوئی دس بجے ہوں گے میں نے کہا چلو صبیحہ تفریح کریں۔ وہ اندھیری رات میں تفریح کا نام سن کر کچھ جھجک سی گئیں لیکن فوراً اپنی دہشت دور کرتے ہوئے مسکرا کر کہا چلئے۔ اور میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔ صبیحہ کی میرے ساتھ اندھیری اندھیری رات میں اس طرح تنہا چلنے پر رضامندی اور وہ بھی اس زمانہ میں جبکہ میری طرف سے بدگمانی کا ڈر بھی دل میں کھٹک رہا ہو۔ میرے لئے سخت حیرت کا باعث تھی۔ میں اور وہ گھر سے نکلے۔ کچھ دور چلنے کے بعد مکانات کا سلسلہ ختم ہو گیا ہم چلتے گئے۔ چلتے گئے۔ "آخر جائیں گے کہاں" صبیحہ نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ "۔ہاں جہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ ہو" میں نے ایک پتھر کی ٹھوکر سے سنبھلتے ہوئے جواب دیا گیارہ بج چکے تھے۔ آبادی سے کوئی دو تین میل کا فاصلہ طے کیا ہو گا۔ ہم ایک پیدل راستے پر چل رہے تھے۔ راستے کے دونوں طرف جنگل ہی جنگل تھا۔ مجھے خود خوف محسوس ہو رہا تھا نہ معلوم صبیحہ کے دل کا کیا حال ہو۔ مگر وہ بغیر کسی خوف اور دہشت کے اظہار کے میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ کوئی فرلانگ بھر اور آگے جانے کے بعد وہ راستہ ختم ہو گیا اور کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ قریب ہی کھیت میں ایک چٹان نظر آئی۔ میں مینڈوں پر سے ہوتا ہوا اس چٹان پر جا پہونچا۔ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے ہی آئیں اور اس چٹان پر مجھ سے کوئی دو گز کے فاصلہ پر بیٹھ گئیں۔

"اب ہم شہر سے کوئی ساڑھے تین میل کے فاصلہ پر ہیں۔ اور ایسی جگہ ہیں جہاں ہمارے سوا کوئی نہیں۔" میں نے سوکھے ہوئے حلق کو تر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ صبیحہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش میری طرف دیکھتی رہیں۔ میں نے بھی اپنی نظریں صبیحہ کے چہرے پر جما دیں۔ اندھیرے میں ایک دوسرے کی نظریں تو نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن دھندلے دھندلے چہرے ایک دوسرے کی طرف رخ کئے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ کوئی پانچ منٹ اسی طرح گزرے۔ یہ میری زندگی کا سب سے نازک وقت تھا جبکہ ایک حسین لڑکی جنگل میں آبادی سے دور میرے ساتھ تنہا تھی۔ میں بھی آخر انسان ہی ہوں۔ اور انسان ہونے کے اعتبار سے نفس سرکش نے جتنے داؤ پیچ اپنے حدود امکان میں تھے مجھ پر صرف کئے۔ "جب سچی محبت اور صداقت دو ایسے لفظ ہیں جو ان دنوں شرمندہ معنی ہی نہیں تو ان کے پیچھے دنیا کی لذتوں کو کھونے سے حاصل ہی کیا ہے۔ جس نے محبت کو اپنی بدگمانیوں کے نشتروں سے اس طرح زخمی کیا ہو اس سے انتقام لینے کے لئے اس سے زیادہ کوئی موزوں وقت ہو ہی نہیں ہو سکتا" غرض ہزاروں قسم کے وسوسے میرے دل میں پیدا ہوتے رہے میں ان تمام نفسانی تحریکات کو اپنی پوری قوت کے ساتھ رد کئے ہوئے تھا۔ مجھے تو اپنا امتحان دینا تھا۔ . . . امتحان

اپنی زندگی کا سب سے کٹھن امتحان۔ میرے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ ہونٹ خشک تھے حلق سوکھا ہوا تھا۔ بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن زبان لٹ پٹائی جا رہی تھی۔ بارے ہمت کی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا "قریب آؤ"۔ "ہاں" بھرائی ہوئی آواز میں صبیحہ نے جواب دیا۔ میں آگے بڑھا۔ اور بے تاب تھا کہ اپنا سر صبیحہ کے پیروں پر رکھ دوں۔ میں اپنے آنسوؤں سے تر کروں اور پوچھوں کہ کیا اسی لئے آدھی آدھی رات کو خدائے قدوس سے التجائیں کر کر کے تمہاری محبت حاصل کی تھی۔ کیا کوئی کسی پر مجنونانہ طور پر فدا ہو تو غرض اور صرف غرض ہی اس کی بے اختیاریوں کی محرک ہے کیا یہ ... دی نہیں آئی کہ دنیا والے ہمیشہ اچھوں کو برا مانتے آئے ... اگر تمہیں ابتدائے محبت ... پر خلوص شب زندہ داریوں کا اقرار ہے۔ اگر تمہیں اس بات سے اتفاق ہے کہ سچی محبت ہمیشہ بے لوث رہی ہے اور سچوں کو دنیا نے ہمیشہ متہم کرنے کی کوشش ... کی ہے تو پھر کیوں تم نے میری محبت کو شبہ نظروں سے دیکھا۔ کیوں تم نے اس بات ... زندگی کے چند سرد لمحوں کو ... یہ فقرہ کی نشتر زنی سے مجبور ہو کر کیا تھا۔ میں پھر ایک مرتبہ کہتا ہوں کہ مجھے تم سے سچی محبت ہے۔ آج تک تمہاری محبت کو اپنے تصفیہ نفس اور تزکیہ باطن کا ذریعہ سمجھا اور اب بھی جب دنیوی آلائشیں مجھے اپنی طرف کھینچنا چاہتی ہیں تو تمہارا ... خیال مجھے اپنی مقدس دنیا میں پناہ دیتا ہے۔

چاہتا تھا کہ دل کی ساری بھڑاس نکال دوں صبیحہ کو اپنی بدگمانی ... دن کے آنسو رلا دوں۔ مگر سینے نے کا ملاج ہی کہاں۔ لوہا میرا ہاتھ صبیحہ کے پیروں سے مس ہوا کہ اُدھر وہ جھک کر اٹھ کھڑی ہو گئیں ... بس دیکھ لیا آپ کو ... میں نے آپ کو آزما لیا ... آپ کے ... ملنے ہی کے لیے میں اندھیری رات میں تنہا یہاں تک ... آئی تھی ... اتنا کہہ کر وہ رک گئیں۔ تاریکی میں آنسو نظر نہیں آرہے تھے لیکن لہجے اور آواز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ میں نے ہر چند کہا صبیحہ! یہ تمہاری غلطی ہے کاش تم مجھے سمجھتیں۔ تم دیکھیں کہ میں نے تمہیں کس غرض کی ... ت یہاں لایا تھا صبیحہ نے ایک نہ سنی اور خدا حافظ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ گھر تک ساتھ رہا۔ راستہ میں کوئی بات نہیں ہوئی ... میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر صبیحہ کے سامنے اپنی بے لوثی ثابت کرنے میں کامیاب نہ رہوں تو اپنے آپ کو جھوٹا سمجھوں گا اور اپنی محبت کو گناہ کے نام سے یاد کروں گا۔ میں اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ میں نے محبت کی تھی ... نہیں نہیں محبت نہیں ... گناہ کیا تھا۔

آہ جو محبت میری نظروں میں ایک ملکوتی ... صفات رکھنے والی دیوی کی طرح تھی اب وہ ایک ایسی ڈائن کی طرح ہے جس کے لانبے لانبے بال حرص اور ہوس کی ... پھنکارتی ہوئی ناگنیں ہیں۔ نفس پرستی جس کا شعار، تصنع جس کا آئین اور بوالہوسی جس کا مذہب ہے۔

اس زبردست ذہنی انقلاب ... کی وجہ صفائے قلب کا انعطاف نہیں بلکہ میرے تخیل کا ایک پاکیزہ معیاری بلندی سے اس گندی سطح پر جبراً پھینکا ... میں مجبور ہوں ... کہ اسی تصور پر مجبور رہوں۔ اور دنیا اس کی ذمہ دار ہے۔

محمود قطبی

برلے کا نواب

"میں تمھیں روزانہ دیکھتا رہا ہوں" اس نے اس کے کان میں آہستہ سے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم بھی مجھے چاہتی ہو" اور آہستہ آواز میں اس نے جواب دیا۔ "دنیا میں کوئی لڑکی ایسی نہیں ہے جسے میں تمھاری طرح چاہتی ہوں"۔

وہ ایک معمولی مصور تھا اور یہ ایک غریب دیہاتی لڑکی۔ اس نے اپنے ہونٹ اس کے نازک کانپتے ہوئے ہونٹوں پر پیوست کر دیے دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ اور انھوں نے لڑکی کے والد کا گھر چھوڑ دیا۔

"میں شادی کا کوئی تحفہ نہیں دے سکتا" اس نے ندامت کے انداز میں کہا "میں اپنی بیوی کو کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ لیکن محبت ہمارے جھونپڑے کو دلفریب بنا دے گی۔ کیونکہ میں تمھیں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں"

چمنوں اور قیام گاہوں کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ عالی شان محلات دیکھتے رہے۔ گرما کی ہوا درختوں سے گزر کر آواز پیدا کر رہی تھی۔ ایک گہرے خیال سے چونک کر اس نے کہا "پیاری۔ آؤ ہم ان عالی شان رہائش گاہوں کو دیکھیں جن میں دولتمند نواب بستے ہیں" وہ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ اس کی گفتگو محبت سے سنتی رہی اور ان تمام عالی شان اور خوبصورت چیزوں کو دیکھنے لگی جو اس کے اور اس کے جھونپڑے مکان کے درمیان واقع تھیں۔ خوبصورت اور سایہ دار درختوں والے چمن، آراستہ باغ، امرا کے قدیم محلات جو آرائش اور شوکت کے خیال سے بنائے گئے تھے۔ اس نے تمام چیزیں دیکھیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس جھونپڑی کی طرف غور سے دیکھ رہی ہے جو اب قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ اور جہاں وہ دونوں مل کر زندگی گزاریں گے۔ "میں اس کے ساتھ بسر کروں گی" اس نے دل میں خیال کیا "اس طرح ہم نہایت مسرت آمیز زندگی بسر کریں گے۔ میں گھر پہنچتے ہی تمام چیزوں کو سلیقے سے سجاؤں گی۔ اسے بے حد آرام پہنچاؤں گی" اس طرح اس کا دل خوش ہو رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ ایک کمان کے پاس آ گئے جس پر نہایت خوبصورت اور شاندار نقش و نگار کیے ہوئے تھے۔ اور جب وہ اس کے نیچے سے گزر گئے تو اس نے ایک نہایت ہی عالی شان محل دیکھا جس کے مماثل اب تک اسے کوئی محل نظر نہ آیا تھا۔ دروازہ پر بہت سے خوشنما وردی والوں نے اسے سلام کیا۔ اور جب اس نے ان سے کچھ دریافت کیا تو نہایت ادب سے انھوں نے جواب دیا۔ اس نے اسے ساتھ لے کر محل میں گھومنا شروع کیا۔ ایک ہال سے دوسرے ہال میں اور ایک کمرہ سے دوسرے کمرہ میں۔ وہ حیران تھی کہ آخر راز کیا ہے۔ ایک فخریہ انداز میں پلٹ کر نرم لہجہ میں اس نے کہا "یہ سب میرا ہے۔ اور اب تمھارا۔"

وہ برلے کا نواب تھا۔ جو اس عظیم الشان محل میں شان و شوکت کی زندگی گزارتا تھا۔ اس علاقہ بھر میں کوئی نواب اس کے برابر عظیم المرتبت نہ تھا۔ اس کا حسین چہرہ ابرو سے ٹھوڑی تک یکدم سرخ ہو گیا۔ جیسے وہ شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی ہو۔ اس کی روح جسم کے اندر گھبرا رہی تھی۔ اور پھر یک بیک اس کا چہرہ موت کی طرح زرد ہو گیا۔ لیکن نواب نے اپنی بیوی کو محبت کے ساتھ لپٹا لیا۔ اور محبت سے اس کی روح کو خوش کرتا رہا۔ اس نے اپنی کمزوری پر قابو پا لیا۔ گو اکثر اس کی ہمتیں جواب دے دیتی تھیں۔ مگر اس نے اپنے آپ کو ان فرائض میں مشغول کر لیا جو اس کے مرتبہ کے لحاظ سے ضروری تھے۔ اس کے شریفانہ سلوک نے اسے بہت جلد

استعاراتِ تبسم

تجھ پہ اے "موجِ تبسم" انبساطِ دل نثار
"نغمۂ رنگیں" ہے گویا زیبِ آغوشِ بہار

شہدِ خالص کے کٹورے "شیشۂ عنابِ لب"
"آبِ حیواں کی لطافت" "لذتِ سیب و عنب"

"خوشنما محرابِ میخانہ پہ عکسِ ماہتاب"
بابِ رحمت کے دریچوں پر "گلابی سا حجاب"

حوض کی شفاف سطحِ آب خوابیدہ سی لہر
"صبح کے سینے میں منظر" چاندنی راتوں کی نہر

"ساغرِ زریں جم پہ بیخودی چھائی ہوئی"
"کشتیِ مے کے کناروں تک شراب آئی ہوئی"

مشتعل چنگاریاں اجزائے مقناطیس پر
دھندلے دھندلے سے نقوشِ جوہرِ تیغِ دو سر

"[illegible] سے نور برساتی ہوئی کالی دھار"
میکدہ سے لڑکھڑاتے آرہے ہیں میگسار

"آتشِ سیال پر آبِ خنک چھڑکا ہوا"
روشِ گل پر تھوڑا سا نمک چھڑکا ہوا"

"صبح کی پہلی کرن بامِ فلک پر زرفشاں"
شام کی سرخی میں بل کھاتی ہوئی مرغابیاں

وارِ عشرت کا پیدا زمزمہ معدوم ہے
موجِ لب ہائے حسیں پر "زاویہ" مرقوم ہے

اس کے ہونٹوں پر بنی ہے ربطِ تجدیدِ لطف
"ربط کا آغاز" "اظہارِ کرم" "تمہیدِ لطف"

مسکراہٹ رازِ الفت کے لئے غماز ہے
"رقصِ زیرِ یاقوتِ لب پر شعلۂ آواز ہے"

اٹھتے ہیں سازِ سخن سے لحن بن بولے ہوئے"
"رقصِ انگڑائی میں ہیں الفاظ پر کھولے ہوئے"

حسنِ آوارہ وفا پر لب ہلا کر رہ گیا
بات کرنی چاہتا تھا مسکرا کر رہ گیا

شاد عارفی

روحِ غالب

اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مکمل سرگذشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب جس کو جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا ہے اس کتاب کا پیش لفظ نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم اے (کیمبرج) صدر المہام تعلیمات و معین امیر جامعہ عثمانیہ نے تحریر فرمایا ہے اس کتاب میں سب سے پہلی دفعہ غالب کے خاندان و اعزہ اور ان کے سسرالی اعزہ و اقارب کے دو تفصیلی شجرے بھی شایع کئے گئے ہیں غالب کے حالات زندگی جس جامعیت اور اجمال کے ساتھ اس میں درج ہیں آج تک کسی سوانح غالب میں نہیں شایع ہوئے۔

صفحات (۲۴۰) تعداد تصاویر (۳) کتابت و طباعت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم قیمت ۱۲؎

فنونِ لطیفہ کی تخلیق

فنون لطیفہ کی تخلیق "تخیل" کے تحت بیان کی جاتی ہے۔ وہ نفسیات سے اس حد تک متعلق ہے کہ اس کا مبدا، اور اثر دونوں نفسیاتی عمل ہیں۔ لیکن آرٹ کا کام خود ایک طبیعی شئے ہے۔ ماہر نفسیات کے دائرے کے اندر نہیں ہے۔ چونکہ آرٹ کا ہر ایک کام آرٹسٹ کے ذہن سے پیدا ہوتا ہے اور اس میں ذہنی عمل مضمر ہیں ان معنوں میں آرٹسٹ ایک ماہر نفسیات ہے۔ ماہر نفسیات کا فرض ہے کہ وہ اس کی توضیح کرے کہ کن نفسیاتی عملوں سے ذہن آرٹ کو پیدا کرتا ہے۔ اور کن نفسیاتی عملوں کے ذریعہ وہ آرٹ سے محظوظ ہوتا ہے۔ اول الذکر ماہر نفسیات کے ذاتی مشاہدے کے باہر ہے۔ اس کی توضیح کے لئے اس کو پچھلے واقعات پر نظر ڈالنی ہوگی۔ دیکھنے والے پر آرٹ کا جو خوشگوار اثر ہوتا ہے اس کی نفسیات کا مطالعہ ماہر نفسیات کے ذاتی جمالی جذبات کے تجزیے کے ذریعے سے کیا جاسکتا ہے۔ یہ تخلیقی قوت ہم نہ صرف نمویاب دماغوں میں پاتے ہیں بلکہ ہم اس کا بچے کے کھیل کود کے آرٹ، ابتدائی قوموں کے آرٹ، اور جانوروں کے کھیلوں تک بآسانی سلسلہ باندھ سکتے ہیں۔ ہم فن لطیفہ (آرٹسٹک) یا جمالی تخلیق کے اہم ترین عناصر جانوروں کے کھیلوں میں پاتے ہیں۔ ہم کو یہی اور بہت زیادہ پیچیدہ قسمیں وحشیوں کی زندگی میں ملتی ہیں۔ ان کے سنجیدہ کاروبار میں بھی متوازن گانے شامل ہوگئے ہیں۔ ان کے ناچ، ان کی مسرت جو وہ خود کو اور اپنی رہائش گاہوں کو سنوارنے میں محسوس کرتے ہیں ماہر نفسیات کے لیے بہت کچھ مواد مہیا کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کی مذہبی رسومات بھی آرٹ کا ثبوت دیتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ قوت ادنیٰ اور اعلیٰ جانوروں نیز انسان میں کتنی گہری جڑ کی ہوئی ہے۔ انسان میں یہ تخلیقی قوت اعلیٰ ترین درجے کو پہنچی ہے۔ ماہر نفسیات کو اپنے فنون لطیفہ کی پیدائش کے مطالعے میں بالخصوص شاعروں، نقاشوں، صناعوں وغیرہ کی سوانح عمریوں سے بے حد مدد ملتی ہے، وہ اس قوت کا جو مختلف دوروں اور مختلف مقامات کے افراد میں پائی جاتی ہے غائر مطالعہ کرتا اور بالآخر تخلیقی عملوں اور ان حالات کا جن کے تحت یہ واقع ہونے یا ہوتے ہیں ایک عام نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ تخلیقی عمل سادہ توجہ، امتناع اور تجویز یا ایما سے تعلق رکھتے ہیں، دوسری طرف خواب اور التباسات سے نیز خود بینی اور جنون کے غیر معمولی انفعال سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔

آرٹسٹ عمل کا آدمی ہوتا ہے۔ وہ نظریے قائم کرنے کی زیادہ پروا نہیں کرتا۔ وہ اپنے تخیل کی پرواز پر بھروسہ کرتا اور نظریوں سے بے اعتنائی ظاہر کرتا ہے۔ لہذا قوت تخیل کا نشوونما بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ایک بچے میں ایسی قوت کے عناصر موجود ہوتے ہیں لیکن اس کے نشوونما کا بالکلیہ انحصار اس کے ماحول اور اس کی تعلیم و تربیت پر ہے جو کہ وہ حاصل کرتا ہے۔ بچوں میں جمالی مذاق اور احساس لطیف پیدا کرنا اور ان کو ترقی دینا اساتذۂ فنون لطیفہ پر منحصر ہے۔ لیکن اس لحاظ سے ہمارا موجودہ تعلیمی نظام کچھ ناقص ہی ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ اس کا زیادہ خیال رکھا جائے گا۔

نفسیات اور آرٹ میں کیا تعلق ہے؟ کیا آرٹ کا کام خود ایک نفسیات کی کتاب نہیں ہے؟ کیا ایک شاعر یا آرٹسٹ ہمیں نفسیات سکھا سکتا ہے؟ بے شک، آرٹ اور شاعری کی ایجادات ہمارے لئے انسان کے نفسیاتی مطالعہ کے لئے مواد فراہم کرتی ہیں۔ شاعر کا کام پڑھنے والے میں تجویز کے ذریعے ذہنی زندگی پیدا کرنا ہے۔ یہی صنعت ایک ماہر موسیقی یا آرٹسٹ کی ہے۔ اس لحاظ سے شاعر، ماہر موسیقی اور آرٹسٹ ماہرین نفسیات ہیں۔ وہ اپنی تجویزی قوت سے ہم کو اپنے ساتھ محسوس کروانے اور اپنے جذبات اور خیالات میں حصہ لینے کے قابل بناتے ہیں۔ آج کل عملی نفسیات میں خواہ کتنی ہی ترقی ہو گئی ہے اور یہ علم بہت ساری چیزوں پر حاوی ہو گیا ہے۔ مثلاً حافظہ، تخیل، مرافقت، ادراک، خیالات اور جذبات، غیر نوایاب اور غیر معمولی ذہنی حالات، جمالی تخیلات وغیرہ۔ شاید عملی تحقیقات فنون لطیفہ کے مسئلہ سے نزدیک تر ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے مطالعات کے نتائج تصویر کھینچنے میں کس حد تک ابتدائی یا تجویزی ہو سکتے ہیں۔ یہاں بھی ہمیں خوبصورت اشیاء کے علل اور اثرات پر غور کرنا چاہیئے۔ علل کے مطالعہ سے ہم کو یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ طلبہ کی جمالی قوت کا کس طرح نشوونما کرنا چاہیئے اور اثرات کا مطالعہ ہم کو بتائے گا کہ ان کو کس طرح ایسے سادہ اور رنگین نقشے کھینچنے کی تعلیم دیں جو دیکھنے والوں کو محظوظ کریں۔ اگر ہم وہ علل سمجھ جائیں جو ایک خوبصورت نقشہ پیدا کرتے ہیں اور اگر ہم اپنی تعلیم سے بچے کے مرکزی نظام پر اثر ڈالیں تاکہ ایسے کام کے علل قائم ہو جائیں تب مقصد حاصل ہو جائے گا۔ جمالی مذاق کا نشوونما اس ماحول پر منحصر ہے جس میں کسی کی پرورش ہوتی ہے اور اس تعلیم و تربیت پر جو کوئی کمرۂ درس میں یا دوسرے طریقہ پر حاصل کرتا ہے۔ اس طرح آرٹ کی نفسیاتی رُو سے اس کے علل اور اثرات دونوں کے لحاظ سے توضیح کی جا سکتی ہے۔ آرٹ کا نفسیات سے جو تعلق ہے اہم اور تجویزی ہے۔

ایک آرٹسٹ اپنے لئے ایک اپنی خاص دنیا بنا لیتا ہے۔ وہ خود ساختہ دنیا میں جیتا ہے، التباسات سے کھیلتا ہے۔ آرٹ اور شاعری دونوں میں خود ساختہ ذہنی فضا پر کو حقیقی اور اصلی تصور کرنا ایک تفریحی بہانہ ہے۔ یہ ابتدائی آرٹسٹس کے لئے بہت اہم ہے اور اس سے زیادہ اہم شاعرانہ تخلیق سے لطف اٹھانے کے لئے ہے۔ ڈکنس ([illegible]) اپنی تصنیف "ڈیوڈ کاپرفیلڈ" (Daniel Coperfield) میں کہتا ہے کہ یہ معلوم کر کے پڑھنے والے کو شاید ہی کچھ دلچسپی ہو گی کہ کس رنج و ملال کے ساتھ دو سال کے تخیلی کام کے بعد قلم رکھ دیا جاتا ہے یا کس طرح ایک مصنف محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے کچھ حصے کو تاریک دنیا میں خیر باد کر رہا ہے جب کہ اُس کے دماغ کی مخلوق کا ایک ہجوم اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہو۔ تاہم مجھے اور کچھ کہنا نہیں ہے تاوقتیکہ درحقیقت میں یہ نہ قبول کروں کہ کوئی بھی اس قصے کو پڑھ کر کبھی بھی اس سے زیادہ یقین نہیں کر سکتا جتنا کہ میں نے اس میں اس کو لکھتے وقت یقین کیا ہے"۔

تعمیری تخیل کی پرواز کتنی ہی زبردست کیوں نہ ہو وہ بالکلیہ نئے نتائج نہیں برآمد کر سکتی۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ

اس کا نتیجہ سابقہ تاثرات کی نئی تشکیل اور عجیب و غریب اور مختلف ملاپ یا ترکیبیں ہوتی ہیں۔ تصاویر جو ذہن میں بنتی ہیں ایک بڑی حد تک غیر ارادی ہوتی ہیں۔ ذہنی عملوں کے رجحان پر توجہ کے ارتکاز میں ارادہ ممد و معاون ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں متعدد صورتوں میں بڑے آرٹسٹس اور بڑے آدمیوں کے کام الہاموں کے نتیجے رہے ہیں۔

اپنے خود کے گھڑے ہوئے قصے بیان کرنے کی چھوٹے بچوں کی کوشش حقیقی تعمیری تخیل کی بہترین مثال ہے۔ حیوانیات، عمرانی نفسیات اور انسیات کی کتابوں سے ہمیں (courtship) کے آرٹ کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ادنیٰ جانوروں میں وہ گانے اور ناچنے کی شکل اختیار کرتا ہے۔ انسان میں محبت کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ صنفی جبلت اور آرٹسٹک پیداوار کے مابین متعدد مثالوں میں زیادہ راست تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ صنفی ہیجان کو ابھارنے یا جنبش دینے سے جسم اور ذہن توانائی حاصل کرتا ہے۔ کوئی غیر معین چیز کے لئے نامعلوم جذبہ اور خواہش ہوتی ہے۔ اس زاید توانائی کا نمو کبھی اور از خود فعلیتوں مثلاً ناچ اور گانوں کی شکل میں اظہار ہوتا ہے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ صنفی توانائی کی ایسی شکلیں اختیار کرنے کی کیا وجہ ہے۔ جواب کے لئے ہمیں صنفی جبلت کے اندرا کی پہلو کی اندرونی تنظیم کو پہلے سے زیادہ تسلیم کرنے کی ضرورت ہے۔ ادنیٰ جانوروں کی (courtship) میں بھی ہم کو صنف اور آرٹ کے درمیان جو تعلق ہے اس کے سمجھنے کے لئے ملتا ہے۔ اس سلسلے میں پرندوں کی (courtship) قابل توجہ ہے۔ بعض پرندوں میں نر گا کر مادہ کو فریفتہ کرتے ہیں اور بعض پرندوں میں خصوصاً جب کہ مادہ، نروں سے زیادہ تعداد میں ہوتی ہیں، تو اول الذکر مختلف طریقوں سے نروں کو اپنی طرف راغب کرتی ہیں۔ صنفی جبلت کی اس طرح تنظیم ہے کہ وہ ان اثرات سے متاثر ہوتی ہے۔ انسانی سوسائٹی میں ہم سمجھتے ہیں کہ عوام کی دل بہلائی میں کامیابی اسی وقت ہوتی ہے جب کہ ان کے صنفی ہیجان کو جگایا جاتا ہے۔ بے شک آرٹسٹس کی اعلیٰ قسمیں تعجب و ستایش اور تعظیمی رجحان پیدا کرتی ہیں جو صنفی ہیجان پر حاوی ہو جاتے ہیں۔

آرٹ کے کام پیدا کرنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے تخیلی قوت درکار ہوتی ہے۔ آرٹ کا کام ایک ہیجان ہے اور جواب مشاہدہ کنندہ کو دینا پڑتا ہے۔ جواب ایجادی ہوتا ہے۔ جب ہم کسی افسانے میں ایک کیرکٹر کو پڑھتے ہیں تو ہم اپنے تخیل کو وسعت دیتے اور ایک تخیلی کیرکٹر بنا لیتے ہیں جس میں وہ سب اوصاف موجود ہوتے ہیں جو کہ افسانے میں بیان کئے گئے ہیں۔ یہی حال نقاشی اور موسیقی کا ہے۔ ایک افسانے میں اس وقت عام مقبولیت ہوگی جب کہ اس میں کوئی کیرکٹر ایسا ہو جس میں پڑھنے والا اپنے آپ سے مطابقت کر سکے۔ مختلف آرٹس مختلف ہیجانات کو متاثر کرتے ہیں۔ آرٹ نہ صرف جذباتی اثر رکھتا ہے بلکہ عقلی اثر بھی۔ آرٹ کو زیبایش کا ایک بڑا انتظام یا نمونہ تصور کرنا چاہیئے جو اپنے وجود کے لئے فطرتِ انسانی پر اثر انداز ہونے پر منحصر ہے۔

محمد سعید الدین

نتیجۂ ہمدردی

رات کے کوئی ۱۱ بجے تھے کہ میں نے منشی پریم چند کا گراں قدر ناول "میدانِ عمل" ختم کیا۔ خواب گاہ کی تیز روشنی گل کر کے تھرمری قمقمہ جلایا اور لباس تبدیل کر کے بستر پر لیٹ گیا۔ ابھی آنکھ نہ لگی تھی کہ صدر دروازہ پر گھنٹی بجنے لگی۔ چونکہ پیشہ کے اعتبار سے مجھے رات کو بھی کام کرنا پڑتا ہے اس لئے میں نے گھنٹی کمپونڈ کے گیٹ پر لگا دی تھی تاکہ ہر ضرورت مند آسانی سے مجھے رات کو جگا سکے اشرف کو میں نے آواز دینی مناسب نہ سمجھا کیونکہ بے چارہ تھک کر اپنے کمرہ میں سو رہا تھا۔ جلد جلد میں نے لباس پہنا بیگ ہاتھ میں لیا اور صدر دروازہ پر پہونچ گیا۔

ایک دیہاتی دروازہ پر نہایت پریشانی کے عالم میں کھڑا تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہنا شروع کیا۔ "مہربان ڈاکٹر فوراً چلئے ایک مالدار دیہاتی درد شکم سے تڑپ رہا ہے آپ کے پاس میں اس امید سے آیا ہوں کہ آپ بہت ہمدرد ہیں اور کبھی کسی مریض کو دیکھنے سے آپ نے آج تک انکار نہیں کیا۔

میں نے لفظ مالدار کو دماغ میں جمالیا اور اس آدمی سے بیمار کی حالت دریافت کرنے لگا۔ آدمی نے کہا کہ آپ اگر چلیں تو بہتر ہے کیونکہ حالت بہت خطرناک ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ کتنی دور جانا ہوگا۔ اس نے کہا کہ ظہیر آباد تک چلنا ہوگا یہ سن کر میں نے موٹر گیراج سے نکالی اور آدمی کو بٹھا کر ظہیر آباد کی جانب نہایت تیزی سے روانہ ہوا۔ موٹر کا مسافت بتانے والا میٹر ۴۰ پر رہتا تو کبھی ۵۰ پر۔ آخر کار ظہیر آباد کا ڈاک بنگلہ آ گیا۔ آدمی نے کہا بس یہیں ٹھیر یئے۔ میں نے موٹر روک لی اور بیگ لے کر آدمی کے پیچھے چل کھڑا ہوا۔ آدمی ایک جھونپڑی میں جو کہ ڈاک بنگلے کے پیچھے تھی داخل ہوا۔ اندر تاریکی تھی میں باہر ہی ٹھیرا رہا۔ کوئی آدھ گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد میں نے آدمی کو آواز دی جب کوئی جواب نہ آیا تو اندر داخل ہوا۔ جھونپڑی میں بے حد تاریکی تھی۔ میں نے ٹارچ جلائی تو معلوم ہوا کہ جھونپڑی خالی ہے۔ اور جھونپڑی کی دوسری جانب اتنی کشادہ شگاف ہے کہ ایک آدمی اس میں سے گزر سکتا ہے۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ آدمی۔ ۔ ۔ ظہیر آباد کا رہنے والا تھا۔ ۔ ۔ شہر دیکھنے چلا آیا۔ ۔ ۔ یہاں رات ہوگئی۔ کسی طرح اسے ظہیر آباد پہونچنا تھا۔ ۔ ۔ اس نے یہ ترکیب سوچی۔ ۔ ۔ کہ کس ڈاکٹر کو گھیرے اور اس طرح ۔ ۔ ۔ اس کی ہمدردی سے فائدہ اٹھا کر ——— اپنا مقصد پورا کرے۔ اُف ہمدرد ہونا بھی کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے

سید خدا بخش سلیم

اطلاع

براہ کرم کوئی صاحب رسالہ کا چندہ یا ادارہ کی کتابوں کی قیمت مطبوعہ رسید نمبری حاصل کئے بغیر نہ دیں۔ ورنہ دفتر اس کا ذمہ دار نہ ہوگا۔

مہتمم

جدید مطبوعات

ربیعہ (افسانہ) از خالدہ ادیب خانم مترجمہ عبدالرحیم صاحب شبلی حجم ۲۴۰ صفحات قیمت عہ مطبوعات عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور۔

قتیل او غالب از سید اسد علی صاحب انوری فرید آبادی حجم ۱۲۰ صفحات قیمت ۸ مطبوعہ مکتبہ جامعہ۔ دہلی

درس غالب (مجموعہ کلام غالب بہ طرز جدید) مرتبہ ابراہیم حنیف صاحب۔ قیمت عہ۔ مطبوعہ حجازی پریس۔ لاہور

سیاسیات کی پہلی کتاب از محمد عاقل صاحب حجم ۶۰ صفحات قیمت ۲ مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی

جام طہور (مجموعہ رباعیات قطعات) از جناب اثر صہبائی۔ مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ۔ لاہور۔

ہندوستان میں برطانوی حکومت کے بعض معاشی اور مالی پہلو از ڈاکٹر زین العابدین احمد صاحب حجم ۱۱۵ صفحات قیمت ۸ مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی

جوہر اقبال (رسالہ جوہر کا خاص نمبر) حجم ۲۲۶ صفحات قیمت عہ مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

مشاہیر پولیس با تصویر جلد اول (پنجاب پولیس کے چند افسروں کے کارنامے) از مرزا فریدالدین بیگ صاحب حجم ۳۹۱ صفحات ہند الیکٹرک پریس جالندھر

انسپکٹر کی لڑکی (افسانہ) از بی حبیب صاحب حجم ۱۶۰ صفحات حجازی پریس لاہور۔

افسانہ بابل از سردار محمد اقبال صاحب سیف حجم ۱۶۰ صفحات مفید عام پریس لاہور۔

تاریخ نظم و نثر از آغا محمد باقر صاحب حجم ۲۱۶ صفحات۔ کیپٹل پریس لاہور۔

قطرات شبنم (ادبی مضامین) از لالہ گوردھن داس صاحب حجم ۱۴۴ صفحات۔ مرکنٹائل پریس لاہور۔

رہنمائے اساتذہ (تعلیم کے نئے طریقوں پر عملی اشارات) از سیارام صاحب حجم ۲۵۶ صفحات علمی پرنٹنگ پریس لاہور۔

سرود جاوید (مثنوی سحرالبیان پر تبصرہ) از شمس الحسن صاحب شمس حجم ۲۰۴ صفحات ہاشمی پریس بدایوں

طبیب نسواں (ساتواں ایڈیشن) از حاجی محمد اصغر علی صاحب حجم ۱۹۲ صفحات ہند الیکٹرک پریس جالندھر۔

کالا علم (طلسمات پر ایک مصری کتاب کا ترجمہ) ۲۱۶ صفحات۔ امرت الیکٹرک پریس لاہور۔

ترکاری (ترکاریاں بونے کی نسبت ہدایات) از جی۔ ایم ملک صاحب حجم ۲۰۰ صفحات کیپٹل پریس۔ لاہور

قندیل نور (مرثیوں کا مجموعہ) از نور لدھیانوی حجم ۲۰۴ صفحات ہند الیکٹرک پریس جالندھر۔

علم تمدن از کنہیا لال صاحب ورما حجم ۲۱۵ صفحات۔ علمی پریس۔ بنارس

ارمغان جذب (رباعیات) از راگھویندر راؤ صاحب جذب حجم ۱۲۰ صفحات قیمت ۱۲ ادارہ ادبیات اردو۔ حیدرآباد دکن

تحریک ترقی مملکت آصفیہ از خواجہ حمید احمد صاحب عثمانیہ حجم ۱۳۲ صفحات قیمت مجلد ے۔ عہد آفریں برقی پریس حیدرآباد

پس پردہ (افسانوں کا مجموعہ) از چندر بھوشن سنگھ صاحب حجم ۱۲۰ صفحات قیمت عہ۔ سب رس کتاب گھر حیدرآباد

ہندوستانی اسلام (دو خاص مذاہب کی تاریخ) از قاضی احمد الدین صاحب حجم ۵۰ صفحات قیمت ۲

مرزا سیف علیخاں

تنقید و تبصرہ

زندگی کے کھیل از جناب لطیف الدین احمد صاحب حجم ۱۶۰ صفحات قیمت ایک روپیہ مطبوعہ آرمی پریس شملہ۔ جناب ل۔ احمد صاحب نے جو دنیائے ادب و افسانہ میں تعارف سے بے نیاز ہیں اپنی بارہ کہانیوں کا ایک مجموعہ شایع کیا ہے۔ کہانیوں کے نام ہیں دھرم کے دا، پریم کی لاج، جینے کی قیمت، جیون مٹھا، انعلاف، پریم کا سپنا، ڈھونگی بھگت، جوانی کا خواب، پریم کتھا، زندگی کے کھیل، قربانی، ٹکٹکی۔ یہ کہانیاں نہایت سادہ ہندی ملی ہوئی زبان میں لکھی گئی ہیں، ان کہانیوں میں بقول مصنف "کسی طلاطم کی شورش انسانیت کی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے"۔ ان میں عبرت بھی ہے اور نصیحت بھی، عورت کے لطیف احساسات کی بولتی ہوئی تصویریں بھی ہیں اور تہذیب و تمدن کے فریب کی عریاں صورتیں بھی، سماج کی نام نہاد مجبوریاں بھی ہیں اور ان کے بُرے نتائج بھی، سوسائٹی کے مظالم بھی ہیں اور اس کی غلط کاریاں بھی، ان کہانیوں میں لالچی انسانوں کا دولت کی خاطر اپنی کمسن لڑکیوں کو بوڑھوں کی بھینٹ چڑھا کر ان کو عصمت فروش بنانا، مکار سادھوؤں کا نیک دیہاتی لڑکیوں کی عزت بگاڑنے کی کوشش کرنا، بڑے شہروں کی نظر فریب طوفانی زندگی میں مفلسی اور غربت کی تاریکیاں اور سماج کی بیدردیوں میں عورت کی رسوائی اور قربانی کی پرچھائیاں قابل دید ہیں۔ (س)

گفتگوئے مصالحت ناشر دائرہ طلوع اسلام دہلی حجم ۸ صفحات، مفت، یہ چھوٹا سا رسالہ دو مضامین پر مشتمل ہے۔ ایک میں جناح، بوس، گاندھی کی گفتگوئے مصالحت پر قرآنی آیات کی روشنی میں نظر ڈالی گئی ہے اور مسٹر جناح کے اس مطالبہ کو کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد عمل کی صرف یہی صورت ہے کہ ان دونوں کے درمیان من حیث الجماعت معاہدہ ہو اور ایک فریق کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے اور دوسرے کو غیر مسلموں کی نمائندہ جماعت، احکام قرآنی کے مطابق قرار دیا گیا ہے۔ دوسرا مضمون مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے جو ۱۹۱۲ء کے الہلال کے پرچوں سے نقل کیا گیا ہے جس میں مولانا نے بھی متذکرہ بالا نظریہ کو ۲۸ سال قبل پیش کیا تھا۔ ب۔ ش۔

شاعر الطبیعت جیل میں اس چھوٹی سی کتاب میں سرفراز قومی پریس لکھنؤ نے حضرت نجم آفندی کی ان نظموں کو ایک جگہ شایع کر دیا ہے جن میں تحریک تبرّیٰ کے سلسلہ میں جیل میں جانے، وہاں کے قیام، مشقتیں اور رہائی کے بعد تک کے حالات شاعرانہ انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ سرورق پر شاعر کی ایک تصویر بھی چھاپی گئی ہے جو زندان میں لی گئی ہے اور قیدی شاعر دریچۂ زندان کی سلاخوں کے پیچھے سے اپنے قلب و روح کی آزادی کا مجسمہ نظر آتا ہے۔ اس مجموعہ میں گو تبرّیٰ نظمیں محض طنز و طعن سے مملو ہیں لیکن اکثر ایسی ہیں جو زندگی اور زندہ دلی کے درس دیتی ہیں اور ان کا مطالعہ افادہ اور دلچسپی سے خالی نہیں ۲۴ صفحات قیمت ۳ر

ہندوستان کے آثار قدیمہ پچاس صفحوں کی یہ چھوٹی سی کتاب بہت دلچسپ اور اس کی کتابت و طباعت نہایت پاکیزہ ہے۔ اس میں ہندوستان کے مختلف عہد کے آثار کی کئی خوبصورت اور نفیس تصویریں بھی شامل ہیں۔ یہ وہ مقالہ ہے جو اردو اکیڈیمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی فرمایش پر مولوی غلام یزدانی صاحب ایم اے او بی ای نے تیار کیا تھا اور اب جامعہ ہی کی طرف سے کتابی صورت میں شایع ہوا ہے۔ اپنے ملک کے آثار قدیمہ کی حفاظت کرنا اور ان سے عوام کو روشناس کرنا ہر مہذب ملک کے اولین فرایض میں

داخل ہے۔ افسوس ہے کہ اردو زبان میں اس موضوع پر بہت کم کتابیں ملتی ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ اردو کا ذوق رکھنے والے اصحاب بھی جب کبھی اپنے ملک کے آثار قدیمہ کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو انگریزی ہی میں لکھتے ہیں۔ مسرت کا مقام ہے کہ اب اردو میں بھی لکھنے کا خیال پیدا ہو چلا ہے۔ اور مولوی غلام یزدانی صاحب قابل شکریہ ہیں کہ انھوں نے پہل کی امید ہے کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو سرسید کی کتاب آثار الصنادید کے بعد سے اردو زبان نے اس موضوع کی طرف سے جو غفلت برتی تھی اس کی تلافی ہو جائے گی۔

زیر نظر کتاب ہندستان کے آثار قدیمہ کی زبان، اور بیان بہت شگفتہ اور پاکیزہ ہے اور اس کے مطالعہ سے بہترین معلومات کے علاوہ اس موضوع کا صحیح ذوق بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کتاب میں اگر کوئی ناقابل فراموش کمی ہے تو وہ یہ ہے کہ اس میں دکن کے عہد بہمنیہ قطب شاہیہ و عادل شاہیہ کے آثار کا کما حقہ تذکرہ درج نہیں ہے حالانکہ اس دور کے آثار کسی طرح قابل درگزر نہیں ہیں۔

بزم تاریخ یہ ایک رسالہ ہے جو جامعہ عثمانیہ کی بزم تاریخ کی جانب سے شایع ہوا ہے۔ جس کے مدیر ملک صفدر حسین صاحب ہیں۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ ماہوار ہے یا سہ ماہی یا سالانہ۔ اس پرچہ میں حسب ذیل مضامین شامل ہیں۔

(۱) اصول بالادستی اور اس کے عملی نتائج از شہاب الدین صاحب ایم اے
(۲) برطانوی شہنشاہیت کا مستقبل۔ از ہنمنت راؤ صاحب مانوی کر ایم اے۔
(۳) سلطنت گولکنڈہ کی سیاسی حالت (۱۶۳۶ء سے ۱۶۵۶ء تک) از عبد الوہاب صاحب مسلم ایم اے

یہ مضامین ایم اے کے مقالہ جات کے اجزا ہیں، اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے جامع ہیں، توقع ہے کہ رسالہ اس قسم کے مفید تاریخی مضامین سے ملک کی تاریخی خدمت انجام دینے میں ساعی رہے گا۔ کتابت، کاغذ وغیرہ دیدہ زیب ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ حجم ۸۰ صفحات

تاریخ گولکنڈہ مجلد از مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ایم اے ال ال بی استاد تاریخ جامعہ عثمانیہ صفحات (۳۲۰)

سائز ناشر ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

"تاریخ گولکنڈہ" قطب شاہی سلاطین کی تاریخ ہے جو جدید اصول کے طرز پر مرتب ہوئی ہے۔ اولاً مختصر طور پر اس کے مضامین کا تعارف کرایا جاتا ہے تاکہ اس کے نفس مضمون سے آگاہی ہو جائے۔

تاریخ گولکنڈہ پانچ حصوں میں تقسیم ہے اور پھر ہر حصے میں کئی باب ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

حصۂ اول سلطنت کی تاسیس۔ پہلا باب قطب شاہی گھرانا۔ دوسرا باب سلطنت کا آغاز تیسرا باب عہد انتشار

حصہ دوم سلطنت کا استحکام چوتھا باب ابراہیم قطب شاہ تخت نشینی سے پہلے (۵) ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی (۶) سلاطین دکن کی باہمی کشمکش (۷) جنگ تالیکوٹ (۸) سلطنت کی تعمیر۔

حصہ سوم سلطنت کا عروج (۹) دکن کا سیاسی توازن (۱۰) دکن پر مغلوں کے حملے (۱۱) سلطنت کی توسیع و ترقی (۱۲) عہد ارتقا۔

حصہ چہارم سلطنت کا زوال (۱۳) حکومت کی کمزوری (۱۴) احمد نگر کا خاتمہ اور گولکنڈہ کی حکم برداری (۱۵) کرناٹک کی فتوحات اور ان کا بندوبست (۱۶)

مغلیہ سلطنت سے پرخاش (۱۷) ابوالحسن قطب شاہ کی تخت نشینی (۱۸) مادنا کی وزارت (۱۹) جنگ ملکھیڑ (۲۰) گولکنڈہ کا محاصرہ اور اس کا خاتمہ۔

حصہ پنجم گولکنڈہ کا تمدن (۲۱) سیاست و معاشرت (۲۲) معاشی حالت (۲۳) علمی سرپرستی (۲۴) نہر اور عمارات

اس صراحت سے تاریخ گولکنڈہ کے مندرجہ واقعات کا علم ہوسکتا ہے اب ہم چند اور امور کا تذکرہ کرتے ہیں۔

(۱) اس کتاب کے پڑھنے سے بعض ایسی باتوں کی اصلیت معلوم ہوجاتی ہے جو عام طور سے غلط مشہور ہوگئی ہیں مثلاً

(الف) سلطان قلی کا گھوڑوں کے تاجر کی حیثیت سے گولکنڈہ میں آنا۔

صدیقی صاحب نے تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کی غلطی بتائی ہے اور سلطان قلی کی حیثیت واضح کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے وہ وسط ایشیا کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اور قسمت آزمائی کے لئے دکن آیا تھا۔

(ب) سلطان قلی کا محمود شاہ بہمنی کے زمانے میں خودمختار ہونا۔

دکن کی دوسری تاریخوں میں اس امر کا تذکرہ ملتا ہے کہ دکن کی پانچوں سلطنتیں بہمنی سلطنت کے زوال سلطان محمود شاہ کے زمانے میں خودمختار ہوگئیں۔

مگر اس تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ سلطان قلی محمود شاہ بہمنی کے انتقال کے چار سال بعد گولکنڈہ میں آیا تھا۔ اور آخر تک سلطنت بہمنیہ کا وفادار اور جاں نثار رہا۔

(ج) دکن کی دوسری تاریخوں میں عام طور سے چاند بی بی کا مقتول ہونا مذکور ہے۔ مگر اس تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس نے خودکشی کرلی تھی۔

بہرحال یہ اور اس قسم کی بیسیوں باتیں اس سے معلوم ہوسکتی ہیں۔

(۲) تاریخ گولکنڈہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ گولکنڈہ یا قطب شاہیوں کے متعلق آج تک اردو زبان میں کوئی کتاب اس سے جامع اور مفصل نہیں ہے۔ اور یہ امر دعوے کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آئندہ بیس پچیس سال تک اس سے زیادہ مواد کی کوئی کتاب لکھے جانے کی بھی کوئی توقع نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ جو بیش بہا اور کثیر مواد صدیقی صاحب نے جمع کردیا ہے اس میں آئندہ اضافہ کی بہت کم گنجایش نظر آتی ہے۔

(۳) تاریخ گولکنڈہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ جدید اصول پر مرتب ہوئی ہے اس سے بادشاہوں کے عادات اور خصائل ملک کی سرسبزی اور ذرائع آمدنی اہل ملک کا تمدن و معاشرت، بادشاہوں کی علمی سرپرستی وغیرہ امور پر جس طرح تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے وہ ہماری قدیم تاریخوں میں ایک جگہ بہت کم نظر آئے گا۔

(۴) صدیقی صاحب نے نہایت دیانت کے ساتھ اپنے ماخذوں کا حوالہ دیا ہے۔ ہر صفحہ پر انھوں نے ان کتابوں کا تذکرہ کردیا ہے جس سے انھوں نے مدد لی ہے۔

(۵) تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے۔ اس میں گیارہ تصاویر ہیں۔

بہرحال یہ تاریخ ایک بہت عمدہ پیش کش ہے جو دارالعلوم اور جامعہ عثمانیہ کے سپوت نے اہل ملک کے سامنے پیش کی ہے۔

" ہ "

بچوں سے

ٹھیک ایک ماہ بعد پھر ہم آپ سے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ دوسرے سال کا دسواں شمارہ ہے سال کے ختم ہونے کے لئے صرف اور دو پرچے باقی ہیں۔ اس کے بعد کا جنوری کا پرچہ اُردو نمبر رہے گا جس کی تیاری ابھی سے شروع ہو گئی ہے اور ان شاء اللہ دوسرے پرچوں کی طرح کامیابی کے ساتھ شایع ہوگا۔

اس پرچے میں بعض بہت اچھے اچھے مضامین شایع ہو رہے ہیں۔ مثلاً "طوفان" یہ ایک انگریزی قصہ کا ترجمہ ہے۔ آپ بھی اسی طرح آسان اور سلیس زبان میں ترجمہ کر کے روانہ کیجئے ضرور شایع ہو جائے گا۔ اور ایک اچھا مضمون 'حامد کا امتحان' شایع ہو رہا ہے یہ ایک سبق آموز اور دلچسپ مضمون ہے اس کو ضرور پڑھیئے اور بھی اسی طرح کے مضامین شایع ہو رہے ہیں۔ دلچسپ معلومات اور معمہ بھی شایع کیا جا رہا ہے اسے ضرور حل کر کے دی تاریخ تک بھجوا دیجئے۔ معمہ میں محبوب علی صاحب نے جانوروں کے نام بھجوائے ہیں۔

بعض بچوں کے چندے ختم ہو چکے ہیں ان کے پرچوں پر نشان بھی لگا دیا گیا ہے کہ "ان کا چندہ اس پرچہ کے ساتھ ختم ہو چکا ہے" وہ اس طرف توجہ کریں۔ اور اسی دو ماہ کے عرصہ میں خریداروں میں اضافہ کرنے کی کوشش کریں تاکہ "اردو نمبر" کا وہ بھی مطالعہ کر سکیں۔ گذشتہ پرچہ میں ایک خط شایع کیا گیا تھا اس کا جواب شایع کیا جاتا ہے۔

معین الدین احمد انصاری

خط کا جواب

سب رسی بہن حسن بانو!

آپ کا خط ملا جس کو دیکھ کر خوشی بھی ہوئی اور رنج بھی۔ رنج اس بات کا کہ آپ کا خط میرے خط سے پہلے ہی مل گیا۔ آپ کے خط میں وہی باتیں تھیں جن کو میں نے دریافت کیا تھا۔

امید کہ آپ ٹکٹ جمع کرنے میں مجھے مدد دیں گی۔ میں بھی ایک برادری کی ممبر ہوں۔ اسی برادری کے طفیل میری بہت ساری لڑکیوں سے دوستی ہو گئی ہے اور بہت فائدہ پہونچا۔

مجھے ساری دنیا کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق ہے۔ آپ کے پاس کہاں کہاں کے ٹکٹ ہیں؟ کیا آپ مجھے ترکی کے ٹکٹ روانہ کریں گے؟ آپ کو کون سے مالک کے ٹکٹ چاہیے مطلع کیجئے۔ امید کہ خط کا جواب جلد ملے گا۔

آپ کی سب رسی بہن

شوکت باسط علی خاں ناظم خفیفہ

خیریت آباد

حامد کا امتحان

حامد ایک منصبدار صاحب کے فرزند ارجمند مدرسہ میں شریک تو تھے لیکن غیر حاضری کے عادی، پڑھنا لکھنا چھوڑ ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے امتحان کا زمانہ آیا تو ان کے والد نے کہا "حامد اب کھیل کود چھوڑ دو امتحان کے دن کم رہ گئے ہیں خوب محنت کرو۔" باپ کی تاکید کا اثر بیٹے پر اتنا ہوا کہ شام کا کھانا کھانے سے فارغ ہوتے ہی حامد نے اپنی والدہ و ہمشیرہ سے کہا "دیکھو بھئی میں اب پڑھتا ہوں تنہائی اور خاموشی کی ضرورت ہے گھر میں کھٹ پٹ اور غل غپاڑہ نہ ہو کہ میرے مطالعہ کی یکسوئی میں خلل واقع ہوگا۔"

غرض حامد کمرے میں جاکر دروازہ بند کر لیتے اور لمپ کی بتی کو خوب اکسا دیتے اور پلنگ پر دراز ہو کر گھوڑے بیچ کر یوں آرام کرتے کہ لمپ میں تیل نہ رہتا اور چمنی کالی ہو جاتی جب کبھی صبح کو والدہ کمرے میں جاتیں بہت خوش ہوتیں کہ میرا بچہ بڑی محنت سے پڑھ رہا ہے اس خیال سے کہ دماغ کمزور نہ ہو جائے اپنے لاڈلے کو سوکھا میوہ کھانے اور روغن بادام تالو پر ملنے کے لئے دیتیں۔ شوہر سے کہتیں کہ دیکھو جی چراغ کی چمنی کالی ہوگئی، مگر اپنا ہونہار برخوردار پڑھنے سے بیزار نہیں ہوتا۔ باپ نے بیٹے کو دعائیں دیں ماں نے چٹ چٹ بلائیں لیں بہن نے گلے لگایا۔ گھر بھر نے چشم بد دور کا شور مچایا۔ چونکہ امتحان قریب تھا، حامد نے کہا اباجان لباس چاہئے، دربار آبا جان کم قیمت کپڑے میں نہ پہنوں گا مجھے چند جوڑے قیمتی سلوا دیجئے والد نے کہا "اچھا بیٹا فرصت کے دن میرے ساتھ بازار جاکر اپنی پسند کا کپڑا خرید لو۔ حامد نے کہا ابا جمعہ کا دن بہت اچھا ہے تو باپ نے کہا ہاں بیٹا نہایت نیک عید المومنین کا دن ہے۔ بہرحال جمعہ کے دن بہتر سے بہتر کپڑوں کے چھ جوڑے بنا لئے۔ امتحان کو دو روز باقی تھے۔ حامد نے والدہ سے کہا "اماں جان امتحان دینے کے لئے کیا میں پیدل جاؤں گا یہ تو ہرگز نہ ہوگا لہذا سواری کا انتظام بھی کرو۔۔۔ ماں نے کہا اچھا بیٹے دل میں ملال نہ کرو خالو سے موٹر کی پروانگی لے لوں گی۔ ابھی کہا بھیجتی ہوں ملازم گیا اور موٹر کی خوشخبری لایا۔

آج حامد کے امتحان کا پہلا روز ہے بیچے وہ موٹر پر سوار ہوئے اور یوں یوں کرتے امتحان گاہ میں پہونچ گئے۔ جب سوالات کا پرچہ دیا۔۔ دماغ نے جواب دے دیا۔ گھبراہٹ میں کچھ نہ سوجھا پرچے میں تمام لکیریں کھینچ دیں اور آخر صفحہ پر یہ لکھ دیا۔

خواجہ میری بگڑی بنا دو

انڈول ہوا۔ حامد کے گھر سے خوان آیا جس میں بریانی اور بہت سی مرغن غذائیں تھیں

حامد نے اپنے دوستوں کے ساتھ کھانا کھانے سے فارغ ہو کر پان چبایا۔ سگریٹ کے دم دھواں دھار اڑا امتحان کی جگہ واپس آیا جب دوسرا پرچہ پایا بہت گھبرایا مگر فوراً ہی یاد آیا۔ کاغذی میدان میں قلم کے ٹٹو کو یوں دوڑایا۔

خواجہ میری بگڑی بنا دو

امتحان کے آٹھ یوم اسی طرح ختم کئے اور گھر آکر ماں باپ سے کہا کہ دیکھئے میں نے تین گھنٹے کا پرچہ صرف ڈیڑھ گھنٹے میں حل کیا ہے اب فقط آپ سب کی دعا ہونی چاہیئے۔ یہ سن کر حامد کی ماں فوراً ہی حضرت بابا شرف الدین صاحب کی پہاڑی پر جاکر یہ دعا کی کہ یا حضرت اگر میرا بچہ امتحان میں پاس ہو جائے تو میں ساٹھ فقیروں کو کھانا کھلاؤں گی اور مزار مبارک پر پھولوں کی چادر چڑھاؤں گی۔ گھر لوٹیں تو بیٹے سے کہا کہ میرے نور نظر میں نذر کر آئی ہوں تمہاری کامیابی ہو تو پھر پھولوں کی چادر بھی مزار پر چڑھاؤں گی اور ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤں گی۔ حامد نے کہا "اماں خوب گڑگڑا کر دعا مانگنا تھا" ماں نے کہا ہاں میرے لخت جگر ایسی ہی دعا کر آئی ہوں یہ سن کر حامد نے کہا بس تو میں اول میں کامیاب ہو جاؤں گا انشاءاللہ تعالیٰ۔ ممتحن صاحب حامد کے والد کے دوست تھے اس لئے ان سے کہہ دیا گیا کہ میرے لڑکے پر ذرا نظر عنایت رکھنا۔ ممتحن صاحب نے بخوشی منظور کر لیا اور حامد کا نام اور رجسٹر نمبر بھی نوٹ ہو چکا۔ جب پرچے جانچے جانے لگے اور سفارش کا خیال آیا تو ممتحن صاحب نے حامد کا جامٹری کا پرچہ دیکھنا شروع کیا۔ جس میں حامد صاحب نے مثلث کے سوال کے جواب میں مربع بنا دیا تھا۔ باقی آڑی ٹیڑھی لکیریں کھینچی ہوئی تھیں اور آخر صفحہ پر لکھا ہوا تھا

خواجہ میری بگڑی بنا دو

پرچے کی یہ حالت دیکھ کر ممتحن صاحب حیران ہو گئے اور سوچنے لگے کہ میں نمبر کیسے دوں جب کہ پرچے میں مواد کامیابی کا کہیں ذرا بھی قرینہ نہیں۔ آخر انھوں نے چٹھی کے ذریعہ سے حامد کے والد کو بلوایا تاکہ امر واقعہ سے آگاہ کیا جائے۔ حامد کے والد نے جب اپنی طلبی سنی تو اچھل پڑے۔ سمجھے کہ میرے لڑکے نے قابل تعریف کامیابی حاصل کی ہوگی اور ممتحن نے مجھے مبارک باد کہنے کے لئے بلوایا ہے۔ ٹیکسی منگوا کر دوڑے گئے۔ ممتحن صاحب نے بعد علیک سلیک اور خاطر مدارات کے امتحان کے جملہ پرچے حامد کے والد کے سامنے لاکر رکھ دئے اور کہا کہ آپ مناسب سمجھ کر نمبر ڈال دیجئے میں وہی نمبر درج رجسٹر کروں گا۔

حامد کے والد نے جب ہر ایک پرچہ دیکھا تو اس میں فقط آٹی سیدھی لکیروں کے سوا کچھ نہ پایا۔ ہر

پرچے کے آخر میں لکھا ہوا تھا۔

خواجہ میری بگڑی بنا دو

اب تو منصبدار صاحب حیران و پریشان ہوئے اور اپنے دوڑے آنے پر نہایت نادم و پشیمان گھر آکر بیوی سے قصہ بیان کیا۔ بیوی نے اپنا سر پیٹ لیا اور ہائے میری قسمت ہائے میرے نصیب کہتی تھیں۔

حبِ وطن

میر باقر علی
(طالب علم بی اے آنرز)
دارالشفا

رات کے بارہ کا وقت ہے تمام جنگل میں سکوت کا عالم ہے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے ہیں تمام جنگل کے جانور اپنی اپنی جگہ آرام کر رہے ہیں۔ جنگل گھنے درختوں سے بھرا پڑا ہے چاند اپنی پوری روشنی سے منور ہے تارے اسے گھیرے ہوئے ہیں اور درخت اپنے لمبے لمبے ساے جھنک رہے ہیں۔ ہوا کی سرسراہٹ سنائی دے رہی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ ایک سپاہی ان گھنے درختوں کے سایے کے نیچے سے چلا جا رہا ہے یہ نوجوان اپنے وطن کے دشمنوں کو ڈھونڈنے نکلا تھا

یہ بیچارہ جواں مرد سپاہی خیالات میں غرق چلا جا رہا ہے۔ کبھی اس کو اپنی ماں کا خیال آ رہا ہے کہ وہ بیچاری مکان میں اکیلی میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ میں روز ان کا دل بہلایا کرتا تھا لیکن آج ان کا دل بہلانے کے لئے صرف میری بیوی اور بچے ہیں۔ میری ماں مجھ سے روز کہا کرتی تھیں کہ دیکھو بیٹا وطن کی محبت سے بڑھ کر دنیا میں دوسری چیز نہیں۔ ہمیشہ وطن پر سے قربان ہونے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ ہوا کی سنسناہٹ سے چونک اٹھتا ہے۔ کچھ دور چلنے کے بعد خیالات میں غرق ہوجاتا ہے اپنی بیوی بچوں کا خیال کرتا ہے کہ بیوی بچوں کو گود میں لئے ہوئے کہانیاں سنا رہی ہوگی۔ بچے ماں سے پوچھ رہے ہوں گے۔ ماں بابا کب آئیں گے؟ ماں یہ کہہ کر دل بہلا رہی ہوگی۔ بیٹا باپ بازار گئے ہیں آتے ہی ہوں گے وہ آتے ہوئے تمہارے لئے مٹھائی وغیرہ لیتے آئیں گے

یہ نوجوان سپاہی فوراً چونک جاتا ہے اور اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ کچھ دور جانے کے بعد چند آدمیوں کی باتوں اور سیٹیوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں نوجوان سپاہی رک جاتا ہے۔ اور چاروں طرف دیکھنے لگتا ہے سامنے کیا دیکھتا ہے کہ چند لوگ آ رہے ہیں نوجوان سپاہی تو تاڑ جاتا ہے کہ یہ دشمن ہیں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دشمن قریب آتے ہیں اور اس کو گھیر لیتے ہیں اور کہتے کہ خبردار اگر تو نے ذرا بھی ہل چل کی یا پکارا تو تجھے ہم ختم کر ڈالیں گے۔ یہ کہتے ہوئے دشمنوں میں سے ایک شخص اس نوجوان محب وطن گرتا ہے۔ یہ نوجوان پکار کر کہتا ہے او آو یر [illegible] کے رہنے والو۔ آؤ آو بچا

(Neremangen) کے رہنے والو تیار ہوجاؤ دشمن آگئے ہیں یہ کہہ کر کچھ دیر بھی نہ گزری تھی اور دشمنوں نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اور یہ نوجوان سپاہی دلھن کی محبت میں شہید ہوگیا۔

(ترجمہ) احمد محی الدین رؤف
(مدرسہ فوقانیہ دارالشفاء)

سحر

اذان کی وہ صدا اٹھی ۔۔۔ درا کی وہ ندا اٹھی
نمازی اٹھ کھڑے ہوئے ۔۔۔ مسجدوں کے در کھلے
ہیں شیخ اور برہمن ۔۔۔ عبادتوں میں غوطہ زن
امیر چونک کر اٹھے ۔۔۔ اٹھے پھر اٹھ کے سو گئے
پرند بھی چہک اٹھے ۔۔۔ گلاب بھی مہک اٹھے
پروں کو جھاڑتا ہوا ۔۔۔ پرند بھی کھڑا ہوا
وہ شاخ گل پہ بیٹھ کر ۔۔۔ وہ چیخ کر پکار کر
سنا رہا ہے داستاں ۔۔۔ زباں میں اپنی بے زباں
کبھی ہے گل کو چومتا ۔۔۔ کبھی کبھی ہے جھومتا
نسیم زور سے چلی ۔۔۔ تو جھومنے لگی کلی

ستارے چل کھڑے ہوئے
روانہ قافلے ہوئے

میر سردار علی الہام

معلومات

۱۔ شہر لندن میں سب سے پہلی بار کوئلہ استعمال کیا گیا۔ ۲۔ ایک موسم میں گھڑیال تقریباً ۹۰ انڈے دیتی ہے۔
۳۔ یہ بات تحقیق کی گئی ہے کہ حافظہ موسم سرما کی بہ نسبت موسم گرما میں زیادہ قوی رہتا ہے۔
۴۔ افریقہ میں سب سے اونچا ہاتھی نو ہاتھ لمبا ہوتا ہے یعنی ۱۳½ فٹ اس کی قیمت ۴۵۰۰ روپیہ ہوتی ہے
۵۔ شترمرغ کے انڈے کا وزن ڈیڑھ سیر ہوتا ہے اس کا اندرونی رقیق مادہ مرغی کے چوبیس انڈوں کے برابر ہوتا ہے۔

محمد حسین (صدر دوم نانڈیڑ)

سہیلی

رادھا خوبصورت تھی مگر غریب، اسے یہ آرزو تھی کہ وہ اپنی سہیلی مایا کی برابری کر سکے لیکن ناداری اور مفلسی نے اس چیز کو اس کے لئے دشوار کر دیا تھا۔ مایا امیر کی لڑکی تھی، دولت مند تھی، اور رادھا غریب کی —— رادھا جب اپنی سہیلی کو دیکھتی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ وہ دل ہی دل میں کہتی "آہ وہ کیسی اچھی ساڑی پہنی ہوئی ہے اور میں ایک معمولی ململ کی ساڑی پہننے پر مجبور ہوں۔ خدایا کیا یہ تیرا انصاف ہے کہ ایک کو اس قدر امیر بنائے اور دوسرے کو اتنا غریب —— آہ وہ گھر پر استاد کے پاس پڑھتی ہے لیکن میں پڑھنے کے لئے ترستی ہوں، وہ بھی مایا کی مہربانی ہے کہ خود مجھ کو پڑھا دیتی ہے ورنہ میں ابھی تک انپڑھ اور جاہل رہتی اور لوگ مجھ پر الھڑ اور بے علم کہہ کر طعنے کستے۔ لیکن خدا نے مایا کے دل میں میرے لئے محبت دی ہے اور وہ پڑھا دیتی ہے۔ تھوڑے دنوں میں مایا کالج میں شریک ہوگی شاید اس کے دل میں خیال آجائے اور مجھے بھی ساتھ لے جائے۔ پھر میں خوب پڑھوں گی اور لائق ہو جاؤں گی، مایا کے جیسی عمدہ ساڑی پہنوں گی، اس وقت یہ کون کہے گا کہ رادھا غریب ہے۔"

یہ تھے رادھا کے خیالات جو ہمیشہ اس کو سناتے رہتے۔

ایک دن جب رادھا، مایا کے گھر گئی تو وہاں مایا کو کالج بھیجنے کے مشورے ہو رہے تھے ——
رادھا کی خوشی کی انتہا نہ تھی جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی سہیلی مایا نے اپنے والد ڈاکٹر پرشانت کو اس بات پر راضی کر لیا ہے کہ رادھا بھی اس کے ساتھ کالج میں تعلیم پائے۔۔۔

اب رادھا اور مایا کالج میں شریک ہو کر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ چند سال بعد جب مایا نے امتحان میں کامیابی حاصل کی تو اسے کالج کو خیرباد کہنا پڑا اب اس کی شادی ہونے والی تھی۔۔ مگر رادھا تحصیل علم کی خواہاں تھی ——

امتحان قریب ہونے کے باوجود رادھا شادی میں شریک ہوئی اس کی آنکھوں میں مسرت اور خوشی کے آنسو چمک رہے تھے لبوں پر اس کی عزیز ترین سہیلی [illegible] —— مایا سسرال جا چکی تھی۔

رادھا [illegible] کچھ عرصہ بعد ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کلکتہ روانہ ہو گئی —— دیکھتے ہی دیکھتے اس کی تعلیم ختم ہو گیا اور وہ امتحان میں کامیاب ہو گئی —— اس کی دلی تمنا بر آئی۔ اس کی قسمت پلٹ گئی —— اس کی ناداری اور مفلسی کا دور ختم ہو گیا —— اب وہ غریب رادھا نہیں بلکہ لیڈی ڈاکٹر مس رادھا بالی کے نام سے مشہور ہے —— ایک دن جب رادھا باہر

جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی تو اسے ایک تار ملا' یہ مایا کے خاوند کا تار تھا جس میں مایا کی بیماری کا ذکر تھا اور رادھا کو جلد آنے کے لئے لکھا گیا تھا ——— رادھا فوراً اسٹیشن روانہ ہو گئی' دوسرے دن مایا کے گھر پہونچی ——— جس وقت رادھا' مایا کے گھر گئی تو مایا بسترِ مرگ پر پڑی ہوئی اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی ——— مایا نے رادھا کو دیکھتے ہی کروٹ بدلی' رادھا مایا سے لپٹ گئی' اپنی عزیز ترین سہیلی کی اس حالت کو دیکھ کر رادھا کا دل بھر آیا' اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے آہ اس کی عزیز سہیلی مایا' وہ سہیلی جس نے رادھا کا ہر برے وقت میں ساتھ دیا تھا' یا یوں کہئے کہ جس کی بدولت رادھا اس رتبہ کو پہونچی تھی' رادھا کو حسرت بھری نگاہوں سے تک رہی تھی' ——— مایا نے رادھا کے آنسوؤں کو پونچھا' اور اپنی ننھی لڑکی شکنتلا کا ہاتھ رادھا کے ہاتھ میں دیا اور یہ کہتی ہوئی اس دنیا سے چل بسی کہ" رادھا یہ میری آخری نشانی ہے تم اس سے خبردار رہنا' اس کی نگہداشت کرنا' یہ تمہاری پیاری سہیلی مایا کی لاڈلی شکنتلا ہے" ——— مایا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکی تھی' ——— رادھا سکتے کے عالم میں اس کے پلنگ کے قریب کھڑی ہوئی آنسو بہا رہی تھی معصوم شکنتلا روتے ہوئے اپنی مردہ ماں کی صورت تک رہی تھی ———

بلقیس میر حسن علیخاں

چار مینار

رونقِ شہر و پُر بہار ہے تو — زینتِ بزمِ روزگار ہے تو
سکّے پر سکہ کیوں نہ بیٹھے گا — حسنِ کارانہ شاہکار ہے تو
رائج الوقت ہے ترا سکہ — نقشِ دلچسپ شہر یار ہے تو
غافلوں کو جگا کے سوتے سے — وقت بتلاتا بار بار ہے تو
راہ بھٹکوں کو راہ دکھلائے — شمعِ روشن ہے خضر وار ہے تو
کہہ رہا ہے بلند ہمت رہ — اپنی ہمت کا اعتبار ہے تو
کیسے ثابت قدم تھے وہ جن کی — دستگیری سے استوار ہے تو
انقلابات سے بچا کیسا — مردِ میدانِ کارزار ہے تو
جن کے زیرِ قدم تھے معدنِ لعل — ان کی شوکت کا قلعہ دار ہے تو
ہائے رے بے ثباتیٔ دنیا — بے ثباتی میں پائیدار ہے تو
قطب شاہوں کے عہدِ دولت کی — چار مینار یادگار ہے تو

قدرت احمد راز

خانہ داری کے فرائض میں خوشی حاصل کرنا

"گھر کی خوشی کے بڑے حصہ کا دار و مدار ہم عورتوں پر ہے"

عورتیں ایسی بھی ہیں جو گھر کے کاروبار کو ہنر کے درجہ پر پہنچا دیتی ہیں۔ لیکن ایسی عورتوں کی بھی کمی نہیں جو خانہ داری کے فرائض کو ذلیل سمجھتی ہیں۔ اور اس سے بچنا چاہتی ہیں۔

پہلی قسم کی عورتیں گھر بنانے والی اور دوسری قسم کی عورتیں گھر بگاڑنے والی کہلائے جانے کی مستحق ہیں۔

عورتوں کو گھر کا کام ہنسی خوشی سے کرنا چاہیئے۔ چاہے وہ پکوان ہو یا بستر فرنیچر وغیرہ صاف کرنا۔ کام کرنے میں خوش ہونا اور اس کو ایک ہنرمند انداز سے انجام دینا چاہیئے۔ سب سے زیادہ کامیاب اور خوش وہ عورتیں ہوتی ہیں جو ہر ایک کام کو ہنر کی بلندی پر پہنچا دیتی ہیں۔ وہ معمولی سے معمولی کام کو عمدگی خوشی اور بے تکلفی سے انجام دیتی ہیں گھر کو ایسا سجاتی ہیں جس سے ان کا ذوق سلیم ظاہر ہوتا ہے اور گھر کی پوری نفاست سکھ چین اور شانتی ٹپکتی ہے۔

دوسری قسم کی عورتیں کام کو ناپسند کرتی ہیں۔ وہ ہر ایک کام جہاں تک ہو سکے ٹالتی رہتی ہیں اور ہر چیز خراب ہو جاتی ہے۔ گھر صاف نہیں رہتا۔ فرنیچر اور دوسری چیزیں موزوں جگہ پر نہیں ہوتیں۔ جب نوکر بیمار ہو جاتا ہے یا گھر پر نہیں رہتا تو ان کو بہت گراں گزرتا ہے۔ ایسے گھر میں خوشی نہیں ٹپکتی۔ اور ہر چیز بے اطمینانی اور افسردگی کا احساس پیدا کرتی ہے۔

"عورت کے متعلق رائے قائم کی جا سکتی ہے"

گھر کی ظاہری حالت سے یہ پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ آیا اس گھر کی عورتیں سلیقہ شعار محنتی اور سمجھ دار ہیں یا سست بد مزاج جاہل اور سطحی دماغ والی ہیں۔ نئی روشنی کی لڑکیاں گھر کے کام اور باورچی خانے میں پکانے کو ذلیل کام سمجھتی ہیں اور آرام سے لیٹ کر ناول پڑھنے یا غیر نسوانی کاموں میں حصہ لینے میں اپنی شان سمجھتی ہیں۔ ایسی لڑکیاں کامیاب مائیں اور بیویاں ثابت نہیں ہو سکتیں جب تک کہ وہ اپنے طور طریق کو درست نہ کریں۔ اگر وہ صرف خانہ داری کے کام عمدگی سے انجام دیں اور ماں بہنوں کا ہاتھ بٹائیں تو ان کو خود پر قابو حاصل ہو جائے گا۔ ان کی قوت ارادی بڑھے گی اور دوسری سیکڑوں نیکیاں حاصل ہوں گی جو سست اور کاہل لڑکیوں کو نہیں نصیب ہو سکتیں۔

"نئی روشنی کی عورتوں کے لئے سبق"

آج کل کی عورتیں کبھی سلطنت کی حکمرانی کے خواب نہیں دیکھ سکتیں لیکن اپنے گھر کی رانی بن سکتی ہیں۔ مشکلات پر قابو پانے کے لیے ہمت اور استقلال سے کام لینا چاہیئے۔ اپنے خاندان کے لوگوں کے ساتھ مہربانی اور محبت سے پیش آنا اور خانہ داری کے پریشان کن سوالات کے سلجھانے میں اپنی فراست عقلمندی کو کام میں لانا چاہیئے۔ لیکن اس کے لئے پوری معلومات اور اچھی تربیت کی ضرورت ہے اگر صحیح طریقہ پر تعلیم و تربیت کی جائے تو ترقی کی امید ہو سکتی ہے۔ (ترجمہ) اکرام النساء ایم اے پی ایچ ڈی اکملا

طوفان
(شکسپیر کے ایک ڈرامہ سے)

پرانے زمانے میں ایک ملک میں فیروز بخت نامی بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ دن رات مطالعۂ کتب میں مصروف رہتا اور جادو کی کتابیں خاص دلچسپی سے دیکھتا' کیونکہ اس زمانے میں جادو کا فن بہت عروج پر تھا۔ مطالعہ کی مصروفیت کی وجہ سے اس نے اپنی سلطنت کا روبار اپنے بھائی بیدار بخت کے ہاتھ میں دے دیے تھے۔ بیدار بخت کچھ عرصہ تک تو سلطنت کا کام اپنے بھائی کے نام سے انجام دیتا رہا لیکن اس کی نیت بدل گئی اور اس نے اپنے ہمسایہ بادشاہ امداد بخت سے ساز باز کر کے اپنے بھائی فیروز بخت کو مع اس کی لڑکی سلطانہ کے ایک رات کشتی میں سوار کر کے سمندر میں چھوڑ دیا۔ فیروز بخت کے نوکر جاں نثار نے جو اس کو دل سے چاہتا تھا' بیدار بخت کی بغیر اطلاع کچھ کھانے پینے کی چیزیں اور کچھ جادو کی کتابیں پوشیدہ طور پر اس کشتی میں رکھ دی تھیں۔ بیدار بخت نے ان دونوں کی جان لینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی مگر جس کو خدا بچائے اسے کون مار سکتا ہے۔ جاں نثار کا دیا ہوا توشہ باپ بیٹی کو اس وقت تک کام دیتا رہا جب تک کہ ان کی کشتی ایک جزیرے کے ساحل پر جا کر ٹھیری۔ یہ جزیرہ بالکل سنسان اور ویران تھا اور اس میں صرف ایک شخص کالو نامی رہتا تھا جو سوسن نامی ایک جادوگرنی کا بیٹا تھا۔ فیروز بخت نے اس جزیرہ پر اترتے ہی جادو کے زور سے معلوم کر لیا کہ سوسن نے بہت سے موکلوں کو وہاں قید کر رکھا ہے۔ اس نے ان سب کو قید سے رہائی دلا کر اپنے قبضے میں کر لیا ان میں سب سے زبردست باد پا تھا۔

کالو کی اصلاح میں فیروز بخت نے بہت سر کھپایا۔ لیکن وہ راہ پر نہ آیا۔ آخر تنگ آکر اس کو گھر کے کام کاج میں لگا دیا۔ اگر وہ کبھی کام کاج میں سستی کرتا تو باد پا اس کی تنبیہ کر دیتا۔ فیروز بخت اپنا تمام وقت کتابوں کے مطالعہ اور اپنی پیاری بیٹی سلطانہ کی تعلیم میں صرف کرتا۔ اسی طرح رہتے رہتے ایک عرصہ گزر گیا۔ اور سلطانہ بھی سیانی ہو گئی۔ ایک دن فیروز بخت نے اپنے جادو کے زور سے معلوم کیا کہ اس کا بھائی اور شاہ امداد بخت جہاز میں سوار سمندر پر جا رہے ہیں فیروز بخت نے اس موقع کو غنیمت جانا اور باد پا کو بلا کر حکم دیا تمہیں معلوم ہے کہ میرا بھائی اور اس کا ساتھی امداد بخت جہاز میں سوار جا رہے ہیں تم جاؤ اور سمندر میں ایک طوفان ایسا برپا کرو کہ آج تک اتنے زور کا طوفان نہ آیا ہو اور اس جہاز کو مع مسافروں کے اس جزیرے کی جانب لے آؤ۔ باد پا نے کہا "حکم کی تعمیل کی جائے گی۔"

فیروز بخت۔ "مگر یہ یاد رکھو کہ نہ تو جہاز ادھر اس کا

کوئی مسافر ضائع ہو۔ البتہ جہاز والوں کو اس طرح ایک دوسرے سے علٰحدہ کردو کہ ہر شخص یہی سمجھے کہ طوفان سے صرف وہی ایک شخص بچا ہے اور امداد بخت کے بیٹے فرخ کو اپنے ساتھ لاؤ اس کے بعد دوسروں کو بھی یہاں لے آنا (تھوڑی دیر ٹھیر کر) بس جاؤ اپنا کام کرو۔"

بادپا۔ آپ کے حکم کی حرف بحرف تعمیل کی جائے گی۔

بادپا فوراً روانہ ہوگیا اور سمندر میں اسی وقت ایسا طوفان شروع ہوا کہ جہاز والوں کی جان کے لالے پڑ گئے کئی لوگ سمندر میں کود پڑے جن میں امداد بخت کا بیٹا فرخ بھی تھا۔ باپ نے بیٹے کو سمندر میں گرتے اور موجوں کا شکار ہوتے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنا کلیجہ تھام کر رہ گیا۔

سمندر کی یہ حالت سلطانہ نے بھی دیکھی جو اپنے باپ کے ساتھ اپنی جھونپڑی کے باہر کھڑی تھی۔ جہاز اور اہل جہاز کی حالت پر اسے رحم آتا تھا اس وقت باپ نے اس کو بتایا کہ وہ کون ہے؟ اور کب اور کس طرح اس غیر آباد جزیرہ میں آئی؟ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سامنے سے فرخ آتا ہوا دکھائی دیا۔ سلطانہ اور فرخ کی نظریں جب چار ہوئیں تو دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ فیروز بخت نے ان کی محبت کا امتحان کرنے کے لئے شروع شروع میں تو بظاہر فرخ سے سخت برتاؤ کیا لیکن آخرکار اسے اجازت دیدی کہ وہ اس سے شادی کرسکتا ہے۔ ادھر دوسرے جہاز والوں کی حالت سنئے کہ ان کو بادپا نے جزیرے کے مختلف حصوں میں منتشر کر کے جہاز کو بندگاہ میں لا کھڑا کیا۔ ہر ایک شخص بے ہوش تھا لیکن جب اس کو ہوش آتا تو خود کو خشک زمین پر پڑا دیکھ کر یہی خیال کرنے لگتا کہ طوفان کی آفت سے صرف وہی ایک بچا ہے۔ جب ان کی تھکن ذرا کم ہوئی تو وہ آگے بڑھے اور بیدار بخت، امداد بخت، جاں نثار وغیرہ فیروز بخت کی جھونپڑی کے سامنے ایک دوسرے سے مل گئے اور لگے ایک دوسرے کو ان کی سلامتی پر مبارکباد دینے۔ لیکن امداد بخت اپنے بیٹے کی تباہی سے بہت رنجیدہ تھا ان کو دیکھ کر فیروز بخت بھی ان کے پاس آگیا لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس کو نہ پہچانا۔ فیروز بخت نے جونہی جاں نثار کو دیکھا وہ اس سے بغلگیر ہوا اور اسے بتایا کہ وہ کون ہے۔ اس کے بعد بیدار بخت اور امداد بخت کو بھی جب یہ حال معلوم ہوا تو وہ اپنے کئے پر بہت پشیمان ہوئے اور اس سے معافی چاہی اور فیروز بخت نے بھی معاف کرتے ہوئے کہا "آب ہمیں پچھلی باتوں کو بھول جانا چاہیئے" یہ کہتے ہوئے وہ امداد بخت سے مخاطب ہوکر بولا "میں نے آپ کے لئے ایک اور تحفہ رکھا ہے" یہ کہہ کر اس نے اپنی جھونپڑی کا دروازہ کھول دیا۔ جس میں فرخ اور سلطانہ بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے تھے۔ باپ کی نظر جونہی بیٹے پر پڑی اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ بیٹے نے جب باپ کو دیکھا تو چلایا "ابا! میں نے

آپ کی بغیر اجازت اس لڑکی سے شادی کا اقرار کر لیا ہے۔

امداد بخت۔ خدا مبارک کرے میں بھی اس سے خوش ہوں۔

اس کے بعد فیروز بخت نے کاتو کو بلا کر کھانا تیار کرنے کا حکم دیا اور سب کو ایک دن اپنے ہاں مہمان رکھا۔ دوسرے دن یہ پوری جماعت جہاز میں سوار ہو کر امداد بخت کے ملک کو روانہ ہو گئی۔ روانگی سے پیشتر فیروز بخت نے بادپا کو آزاد کر دیا اور اپنی تمام کتابوں کو زمین میں دفن کر دیا اور عہد کیا کہ آئندہ وہ کبھی جادو نہ کرے گا۔

اسما تبریزے سے روانہ ہو کر پوری جماعت امداد بخت کے ملک میں آ پہنچی جہاں فرخ کی شادی دھوم دھام سے سلطانہ کے ساتھ ہو گئی اور وہ ہنسی خوشی وہاں رہنے لگے۔

فیروز بخت شادی سے فراغت حاصل کر کے اپنے ملک کو چلا آیا جہاں وہ آخر دم تک اپنے ملک کا انتظام نہایت خوش اسلوبی سے کرتا رہا۔

انجم جمالی

دمِ واپسیں کے دلخراش فقرے

دنیا میں بسنے والے انسان دنیا کی محبت کو اپنے آخر دم تک یاد رکھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ مرتے وقت جو خیال دل میں ہو بالعموم وہی زبان پر آتا ہے۔ ہم ذیل میں چند مختصر فقرے درج کرتے ہیں۔

الکزنڈر شاہِ روس اپنی چہیتی بیوی کی جانب مخاطب ہو کر کہتا ہے

"میں سخت تھکا ہوا ہوں"

یونان کا ایک اسکول ماسٹر انیگے گورس جب اپنا آخری دم توڑ رہا تھا تو لوگوں نے دریافت کیا کہ اس وقت تمہاری کیا خواہش ہے تو وہ کہنے لگا

"میرے طالب علموں کو ایک دن کی چھٹی دے دینا"

انگلستان کے بادشاہ شاہ جارج چہارم کی آخری سانس یہ کہتے ہوئے پرواز ہوئی "اور کیا یہ موت ہے"

انگلستان کے شاعر بائرن نے یہ کہتے ہوئے جان دے دی

"اب مجھے سوجانا چاہیئے"

لارنس اپنے مرتے وقت واقعاتِ زندگی کو دہراتے ہوئے کہتا ہے

"جہاز کو مت چھوڑنا"

ایک مشہور مدبر جان ایڈن کہتا ہے

"آزادی ہمیشہ رہے"

انگلستان کا ایک ماہر ادب سر والٹر اسکاٹ اپنی زندگی کے آخری لمحوں کو غنیمت سمجھتے ہوئے کہتا ہے

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک مرتبہ میں پھر تندرست ہوں"

اسکاٹ لینڈ کا بہادر سپہ سالار جیمز کیمرون جب میدانِ جنگ میں سسک سسک کر زندگی کے آخری لمحات کو طے کر رہا تھا اس وقت اس کی زبانِ شیریں کلام ان الفاظ کو دہرا کر خاموش ہو گئی۔

"میرے دوستو میرے پیچھے چلے آؤ"

محمد ابراہیم جاوید
(علیگڑھ)

تمھاری زبان

عزیز بچو! ہندوستان جس میں ہم تم رہتے ہیں، اس میں مختلف رنگ و نسل کے لوگ آباد ہیں جن کی زبانیں الگ الگ ہیں۔ مگر ملک و قوم کی زبان تمھاری زبان ہے جس کو اردو یا ہندوستانی کہا جاتا ہے اور جو ہندوستان کے ہر حصے میں بولی جاتی ہے اور ہندوستان کی مشترک زبان ہے۔ اردو کے معنی زبان ترکی میں لشکر کے ہیں اور لشکر ہی سے اس زبان کی نشوونما اور ترقی کو گہرا تعلق رہا۔ اردو یا ہندوستانی ایک مخلوط بولی ہے۔ یعنی اس زبان میں مختلف زبانوں کے الفاظ موجود ہیں۔ اردو کے اہم اجزاء ہندی عربی اور فارسی ہیں۔ اردو اور ہندی کا ماخذ ایک ہے لیکن یہ دونوں زبانیں جدا جدا ہیں۔ اردو میں بڑے بڑے انشا پرداز پیدا ہوئے اور انھوں نے تمھاری زبان کو بام عروج پر پہونچایا۔ جن میں سر سید احمد خاں، حالی، شبلی، نذیر احمد، محسن الملک وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اردو یا ہندوستانی کی ترقی میں مسلمانوں کے دوش بدوش ہندوؤں نے بھی کافی حصہ لیا۔ دیا نارائن نگم۔ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر تارا چند وغیرہ، زبان اردو کے زبردست حامی ہیں۔ اور ہمیشہ اس زبان کی ترقی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ ہندوؤں کی بھی زبان ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے سالہا سال کے اتحاد کا نتیجہ ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گزشتہ دو ڈھائی صدیوں میں اردو نے جو ترقی کی ہے اس میں ہندوؤں نے مساوی حصہ لیا ہے۔ اردو کا رسم الخط نہایت سہل ہے۔ اردو یا ہندوستانی میں جس نے سب سے پہلے نظم لکھی وہ اردو شاعری کے باوا آدم حضرت ولی اورنگ آبادی ہیں۔

پیارے بچو! جب تم ہندوستان کا سفر کرو گے تو تمھیں یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ تمھاری زبان راس کماری سے لے کر کشمیر تک جتنی ہندوستان کے گوشے گوشے میں بلا لحاظ مذہب و ملت بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ تمھاری زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اعلیٰ حضرت حضور پرنور نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصفجاہ سابع جیسا بیدار بخت بادشاہ اس کی سرپرستی کر رہا ہے۔ اس پر تمھاری زبان اور ادب جتنا ناز کرے کم ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی حیدرآباد علم و فن اور شعر و شاعری کا مرکز ہے۔ عہد عثمانی کا گراں قدر کارنامہ جو تاریخ میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے وہ جامعہ عثمانیہ ہے۔ جہاں کا ذریعہ تعلیم اردو ہے اور انگریزی بطور زبان ثانوی رکھی گئی ہے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی کی دفتری زبان تمھاری زبان ہے۔ جو ہندوستان میں سب سے زیادہ نمائندہ زبان ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے زیر نگرانی دارالترجمہ قائم ہے۔ جس میں دوسری زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ تمھاری زبان میں کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس وقت تک کئی

زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ سلیس اردو میں ہو چکا ہے اور جو تمام ہندوستان میں مقبول ہے۔ دار الترجمہ کے علاوہ انجمن ترقی اردو بھی قائم ہے جو مخصوص کام کر رہی ہے اور ابتدائی قیام کے زمانے سے اس وقت تک برابر ترقی کر رہی ہے

اس کے معتمد ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی کوشش کی وجہ سے ہندوستان کے اکثر حصوں میں انجمن کی شاخیں قائم ہیں۔ انجمن سے دو رسالے بھی نکلتے ہیں جن میں (اردو) خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

انجمن ترقی اردو کے علاوہ ادارۂ ادبیاتِ اردو بھی ہے جو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کی نگرانی میں اعلیٰ اور مفید کام انجام دے رہا ہے اور جس سے کئی مفید کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور جس کا رسالہ تمہارے ہاتھوں میں ہے۔

عزیز بچو! حیدرآباد آج کل اردو کا مرکز بن گیا ہے۔ اور تمہاری زبان عہدِ عثمانی کے طفیل میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔

زندہ کردی چوں مسیحا علم و فن را در دکن
زندہ باش اے حضرتِ عثمان علیخاں زندہ باش

پرندے کی فریاد

سید اشرف حسین

چھوڑ دے مجھ پر رحم کر میرے آقا چھوڑ دے ۔۔۔ حال پر میرے کرم کر اور قفس کو توڑ دے
بے زباں قیدی ہوں میں محبس کے در کو توڑ دے ۔۔۔ ہوں مقدر کا ستایا تو مقدر جوڑ دے

چھوڑ دے مجھ پر رحم کر میرے آقا چھوڑ دے

یاد ہیں مجھ کو وہ دن جب کہ میں خوش تھا شاد تھا ۔۔۔ لہلہاتے کھیت میں جب گھونسلا آباد تھا
میرے ہمسایوں کی طرح میں بھی جب آزاد تھا ۔۔۔ الغرض میں ہر طرح مسرور تھا اور شاد تھا

چھوڑ دے مجھ پر رحم کر میرے آقا چھوڑ دے

میں وہ مجرم ہوں کہ جس کا جرم ہی کچھ بھی نہیں ۔۔۔ میں وہ قیدی ہوں کہ جس کا کوئی پرساں ہی نہیں
میں وہ مظلومِ جہاں ہوں جس کی دنیا ہی نہیں ۔۔۔ دیکھنے کو میں ہوں زندہ پر میں زندہ ہی نہیں

چھوڑ دے مجھ پر رحم کر میرے آقا چھوڑ دے

کس طرح تجھ سے کروں میں التجائیں چھوڑ دے ۔۔۔ ہو چکیں جو کچھ کہ ہونی تھیں سزائیں چھوڑ دے
دیکھ لوں اپنے وطن کی پھر فضائیں چھوڑ دے ۔۔۔ بیٹھتے اٹھتے تجھے دوں گا دعائیں چھوڑ دے

چھوڑ دے مجھ پر رحم کر میرے آقا چھوڑ دے

دیکھ ہوں بے کس مری آہ و فغاں اچھی نہیں
ہاں اثر رکھتی ہے بے بس کی زباں اچھی نہیں

متین (عثمانیہ)

کیوں؟

پانی سے آگ کیوں بجھ جاتی ہے؟

یوں تو آگ دیگر اشیاء سے بھی بجھ جاتی ہے لیکن سب سے موثر ذریعہ پانی ہے اس کی دو وجوہات ہیں۔

(۱) پانی کی قابلیت حرارت سب اشیاء سے زیادہ اور یہ فوراً اپنے قریب کی اشیاء کی حرارت حاصل کر لیتا ہے۔ جب آگ پر پانی ڈالتے ہیں تو یہ آگ کی حرارت خود لے لیتا ہے اور بھاپ بن کر غائب ہو جاتا ہے۔

(۲) جب آگ پر پانی ڈالتے ہیں تو اس کی ایک ہلکی تہ آگ پر جم جاتی ہے جس کی وجہ سے آکسیجن آگ تک نہیں پہنچ سکتی اس لئے آگ بجھ جاتی ہے۔

پانی کے باہر مچھلی کیوں مر جاتی ہے؟

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پانی کے باہر مچھلی پانی کی غیر موجودگی کی وجہ مر جاتی ہے اور اسی خیال کے تحت ایک محاورہ "ماہی بے آب" تراشا گیا ہے۔

لیکن مچھلی کے اس طرح مرجانے کی وجہ پانی کی غیر موجودگی نہیں ہے بلکہ ہوا کی غیر موجودگی ہے وہ اس طرح کہ مچھلی کو دوسرے جانوروں کی طرح سانس لینے کے لئے نتھنے نہیں ہوتے بلکہ اس کا ایک خاص قسم کا عضو ہوتا ہے جس کو "گلپھڑے" یا "خیشوم" کہتے ہیں یہ عضو مچھلی میں سانس لینے کا فعل انجام دیتا ہے۔ جب مچھلی کو پانی کے باہر نکالتے ہیں تو ہوا میں خیشوم سانس لینے کا فعل انجام نہیں دیتے اور بیکار ہو جاتے ہیں اس لئے مچھلی پھڑک کر مر جاتی ہے۔

محمد مختار احمد

جانوروں کے نام بوجھو

ذیل کے جملوں میں جانوروں کے نام چھپے ہوئے ہیں جو بظاہر دکھائی نہیں دیتے لیکن غور سے دیکھا جائے تو نظر آجائیں گے۔ مثلاً پہلے جملے میں الفاظ "شمس" "انپڑھ" کو لو۔ شمس کا "س" اور انپڑھ کا "انپ" ایک ہی ترتیب میں ہیں۔ ان کو ملا کر لکھو تو لفظ "سانپ" بن جائے گا جو ایک جانور کا نام ہے۔ اسی طرح دوسرے جملوں میں جانوروں کے نام تلاش کرنے کی کوشش کرو۔

(۱) میرا دوست شمس انپڑھ آدمی ہے (۲) رات کے وقت لوگ گھروں کے دروازے بند رکھتے ہیں۔

(۳) میری چھری بہت تیز ہے (۴) ڈاکٹر مجید آنکھوں کا علاج اچھا نہیں کرتا بلکہ اس کا ماہر نعیم ہے۔

(۵) کاشی رام بڑا بخیل شخص ہے۔ (۶) پرسوں ہمارے محلہ کا موچی تا نبیل ... [illegible]

محمد ... علی

اِدارے کی کتاب رُوحِ غالب پر رائیں

شاہکار۔ لاہور ستمبر ۱۹۳۹ء

غالب کی نثر یوں بھی اردو کی جان ہے۔ پھر اس نثر میں سے ڈاکٹر زور صاحب نے ایسے ایسے ادب پارے منتخب کئے ہیں کہ غالب اپنی زبان کی لطافت، ادبی گلکاریوں، ندرتِ خیال اور دلکش اسلوبِ بیان کے لحاظ سے اپنی معیاری رفعتوں پر نظر آتے ہیں۔

روحِ غالب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مرتب نے خطوطِ غالب کے صرف ایسے حصے پیش کئے ہیں جن میں غالب اپنی عمیق ترین فنی اور علمی گہرائیوں میں جانے کی بجائے خاص ادبی رنگ میں سامنے آتا ہے ...... آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ جیسے آپ خود غالب سے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ کتاب کے پہلے حصے میں غالب کی زندگی کے حالات درج ہیں۔ ان کی تصنیفات و تالیفات سے متعلق معلومات اور پھر ان کے رشتہ داروں، دوستوں اور شاگردوں کے تذکرہ و تعلقات نے ان خطوط کے مطالعہ میں ایک مزید دلچسپی اور لطف کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر زور ملک کے ایک بلند پایہ ادیب ہیں اور ادبِ غالب کا یہ فنکارانہ انتخاب ان کی قابلیت کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ملک روحِ غالب کا استقبال بڑی گرمجوشی کے ساتھ کرے گا۔

شاعر۔ آگرہ اگست ۱۹۳۹ء

روحِ غالب بڑی محنت اور بالغ نظری سے مرتب کی گئی ہے۔ ڈاکٹر زور جیسے نقاد سے امید بھی ایسی ہی تھی۔ اس میں غالب کی مکمل سوانح حیات ان پر تقریظیں، تنقیدیں اور ان کے کلام کی شرح لکھنے والوں پر تبصرہ۔ ان کے کلام کی اشاعت کی تفصیل۔ غالب کی نثری تصانیف۔ غالب کے اعزا و احباب اور خاندانی شجرہ کو بالکل نئے اسلوب سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کتاب کا اصل حصہ شروع ہوتا ہے جس میں غالب کے اردو خطوط سے دلچسپ ادبی حصے اخذ کئے گئے ہیں......

روحِ غالب یقینی ایک عمدہ اور قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔

ہمایوں۔ لاہور ستمبر ۱۹۳۹ء

یہ مرزا غالب کی زندگی اور ان کے کارناموں کی ایک مجمل لیکن پُر معلومات سرگذشت ہے۔ ابتدا میں نواب مہدی یار جنگ بہادر نے مقدمہ لکھا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں ان سوانح عمریوں اور شرحوں کا تذکرہ ہے جو غالب اور اس کے دیوان کے متعلق شائع ہوئیں۔ دوسرا باب حیاتِ غالب سے متعلق ہے۔ تیسرے باب میں غالب کے ادبی کارناموں کا ذکر اور ان کی تصانیف کی مفصل فہرست پیش کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں غالب کے اعزہ و احباب کا ذکر ہے۔ اور پانچویں باب میں ان کے خطوط کے ادبی حصوں کا اقتباس ہے۔ یہ کتاب غالب کے متعلق شائع شدہ کتابوں میں ایک مفید اضافہ ہے۔

صدق لکھنؤ ۱۵ اگست ۱۹۳۹ء

ڈاکٹر زور کے نام سے حلقۂ اردو خاصہ روشناس ہو چکا ہے۔ روحِ غالب انہیں کے تازہ زورِ قلم کا نتیجہ ہے...... یہی باتیں اور لوگوں نے بھی پھیلا کر لکھی ہیں لیکن زور صاحب کے یہاں کچھ دلکشی ہی اور ہے...... یہ طراوت یہ تازگی۔ یقیناً ایں سعادت بزورِ بازو نیست کا مصداق۔ لیکن اس انتخاب کی حد تک زور کا حسنِ مذاق تو ضرور کسی حد تک ذمہ دار ہے...... صحیح معنوں میں لطافتِ غالب کا عطر گویا قرابہ کاغذی میں روحِ غالب کشید ہو کر آگئی۔

مشیرِ دکن۔ ۳ اگست ۱۹۳۹ء

شاعر کے حالات جس جامعیت اور خوبی کے ساتھ قلمبند فرمائے ہیں اس کی مثال شاعر کی کسی دوسری سوانح عمری میں نہیں ملتی۔ غالب کی فارسی اور اردو تصانیف کا تذکرہ اور ان کے متعلق ضروری معلومات کا اندراج (بقید تاریخ و سنہ) تاریخِ ادبِ اردو کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے نہایت مفید چیز ہے۔ شاعر کے خاندان اور ان کے سسرالی اقارب کے دو شجرے اس کتاب میں غالباً پہلی دفعہ شائع ہوئے ہیں۔ خطوطِ غالب کے ادبی حصوں کا نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انتخاب کیا ہے گویا کہ نفیس دلچسپ ادب پاروں کا ایک دلفریب گلدستہ بنا کر پیش کیا ہے۔ غالب کے خطوط سے علمی و فنی باتوں کو الگ کر دینے کے بعد یہ مجموعہ اس قدر دلکش بن گیا ہے کہ اس کا اندازہ مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے...... یہ کتاب لطیف پاکیزہ ادبی ذوق رکھنے والوں کے لئے بہترین تحفہ ہے۔

سب رس

نشان نمبر آصفیہ (۱۵۴)
نشان نمبر برطانیہ (M355)

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش — سکینہ بیگم

خواجہ حمید الدین شاہد — معین الدین احمد انصاری

جلد (۲) ، شمارہ (۱۱)

نومبر ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

---

(۱) اردو تصنیف و تالیف اور انشا پردازی کا ذوق رکھنے والے اصحاب ادارہ سے مشورہ کر سکتے ہیں ادارہ کے مختلف شعبوں میں ہر موضوع اور ہر فن کے ماہرین موجود ہیں جو خوشی سے مدد دیتے ہیں۔

(۲) اردو زبان سے متعلق جو بھی کام ہو اس کے بارے میں ادارۂ ادبیات اردو کی خدمات ہر وقت حاضر ہیں۔

(۳) اردو کی ترقی و اشاعت کے لئے اردو کے بہی خواہ جو بھی مفید تجویزیں اور مشورے ادارہ میں روانہ کرتے ہیں ان پر سنجیدگی سے غور کیا جاتا ہے اور اُن کے روبہ عمل لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۴) اردو مطالعہ کا ذوق ہو تو ادارہ کے سب رس کتاب گھر کی فہرست منگوالیجئے۔

(۵) اگر اردو کتابیں خریدنی ہوں تو پہلے سب رس کتاب گھر سے مشورہ کیجئے۔

(۶) مراسلت کرنے والے اصحاب اس امر کا ضرور خیال رکھیں کہ اگر ادارہ سے جواب حاصل کرنا ہو تو جوابی کارڈ یا ایک آنے کے اسٹامپ لازماً روانہ کریں۔ ورنہ ادارہ پر جواب کی ذمہ داری نہیں رہتی۔

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے عہد آفرین پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

اداریہ

اردو نمبر سب رس کا تیسرا سال جنوری ۱۹۳۹ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس مہینہ کا شمارہ اردو نمبر ہوگا۔ جس طرح سے سب رس کا دوسرا سال ایک عالی شان دکن نمبر سے شروع کیا گیا تھا جس میں دو سو صفحات اور تقریباً سو تصویریں تھیں اُسی طرح کوشش کی جا رہی ہے کہ تیسرے سال کا آغاز بھی سب رس کے شایان شان ہو۔ اردو نمبر کی تیاری کئی ماہ سے جاری تھی۔ اس کے لئے اب تک بیسیوں تصویروں کے بلاک بن چکے ہیں اور ابھی بن رہے ہیں۔ اس کے مضامین بڑے اہتمام سے لکھوائے گئے ہیں۔ عہد حاضر کے اکثر بڑے بڑے شاعروں اور انشا پردازوں کے نتائج قلم کے علاوہ اردو کے گزرے ہوئے مشہور و معروف ادیبوں کے اہم غیر مطبوعہ خطوط بھی اشاعت کے لئے فراہم کئے گئے ہیں۔ اس اردو نمبر میں اردو زبان اور ادب کے اکثر پہلوؤں کے متعلق ایسی مفید اور ضروری معلومات شایع کی جائیں گی جو بڑی بڑی کتابوں کے پڑھنے کے بعد بھی آسانی سے معلوم نہیں ہو سکتیں۔ اس کے مضامین نظم و نثر کی طرح اس کی تصویریں بھی نادر اور بڑی قیمتی ہیں۔ جن اصحاب نے سب رس کے اقبال نمبر، محرم نمبر اور دکن نمبر دیکھے ہیں وہ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اردو نمبر کس پایہ کا ہو سکتا ہے۔ یہ نمبر اگرچہ سب رس کے سالانہ خریداروں کو مفت دیا جائے گا لیکن علیحدہ خریدنے والوں کے لئے اس کی قیمت دو روپے ہوگی۔ اگرچہ جنگ کی وجہ سے ہر شے میں گرانی محسوس کی جا رہی ہے۔ لیکن سب رس انشاء اللہ اپنی آب و تاب کو باقی رکھے گا اور اس کی قیمت میں بھی کوئی اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ توقع ہے کہ سب رس کے قدر دان ہمارے اس ایثار سے متاثر ہوں گے اور اس کی توسیع اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

اردو امتحانات اس ماہ ادارۂ ادبیات اردو نے اپنے ایک اور شعبہ یعنی شعبۂ امتحانات کے کام کا آغاز کیا۔ اس شعبہ کا پہلا اجلاس مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے کنٹب ناظم تعلیمات ممالک محروسہ کی صدارت میں سٹی کالج میں منعقد ہوا جس کے پرنسپل مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے کنٹب نائب صدر شعبۂ اردو امتحانات نے اس کا انتظام کیا تھا۔ اس شعبہ کے معتمد پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ال ال بی اور اراکین حسب ذیل اصحاب ہیں۔

(۱) ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی لندن، صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ معتمد اعزازی ادارۂ ادبیات اردو۔

(۲) مولوی غلام ربانی صاحب بی اے بی ٹی پرنسپل گورنمنٹ چادر گھاٹ ہائی اسکول حیدرآباد دکن

(۳) مولوی طاہر الدین صاحب ایم اے ایچ ڈی ایس مہتمم محکمہ ریلوے حیدرآباد دکن

(۴) مولوی محمد عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ال ال بی لکچرار تاریخ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

(۵) مولوی سید محمد صاحب ایم اے اردو لکچرار نظام کالج حیدرآباد۔

(۶) مس جیسی سندی بی اے آنرز (لندن) صدر مہتمم تعلیمات

(۷) مولوی میر اکبر علی خان صاحب بی اے ال ال بی (آنرز) بیرسٹر ایٹ لا۔

(۸) مولوی ملا فخر الحسن صاحب بی اے بی ٹی اردو لکچرار کلیہ تعلیم المعلمین حیدرآباد دکن۔

(۹) پنڈت نرسنگ راؤ صاحب ایڈیٹر رعیت حیدرآباد۔

اس شعبے کے تفصیلی اغراض و مقاصد اور قواعد و ضوابط اور امتحانات کے پرچے نصاب کی کتابیں اور دیگر امور ایک علیحدہ کتابچہ معلومات میں شایع کئے گئے ہیں جو فی الحال مفت تقسیم کیا جا رہا ہے بشرطیکہ ادارہ کے دفتر سے دست بدست حاصل کیا جائے۔ بذریعہ ڈاک منگانے والوں سے ایک آنہ کے ٹکٹ طلب کئے جاتے ہیں۔ اس کام کو اتنا پسند کیا گیا ہے کہ اب تک سیکڑوں اصحاب یہ کتابچہ معلومات حاصل کر چکے ہیں۔ اور اس کے متعلق اخبارات نے بھی بڑی اچھی رائیں لکھی ہیں۔ چنانچہ آئندہ صفحوں میں بعض موقر جرائد کے ادارئیے درج کئے جا رہے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے جہاں اس کتابچے کے متعلق رائے عامہ کا علم ہو سکتا ہے ان امتحانات کی اہمیت اور ضرورت بھی محسوس ہوگی۔

ادارہ نے شرکت امتحانات کی فیس بھی بہت قلیل رکھی ہے۔ یعنی اردو دانی ایک روپیہ۔ اردو عالم پانچ روپے۔ اردو فاضل سات روپے۔ خوش نویسی دو روپے۔ خطاطی و کتابت (یعنی کاپی نویسی) سات روپے۔ ان سب امتحانوں میں ہر وہ فرد بلا امتیاز مذہب و ملت و جنس شریک ہو سکتا ہے جس نے مقررہ نصاب کتب کی تکمیل کر لی ہو۔ خواتین کے لئے امتحان گاہ میں پردہ کا انتظام کیا جائے گا۔ پہلے امتحانات جون ۱۹۴۰ء یعنی امرداد ۱۳۴۹ف میں لئے جائیں گے۔ چونکہ ادارے کی جگہ محدود ہے اس لئے افسوس ہے کہ اس سے زیادہ معلومات نہیں دی جا سکتیں۔ مزید علم کے لئے کتابچہ معلومات دیکھ لیا جائے۔

افتتاح تعلیم

ان امتحانات کی تیاری اور امتحان میں بیٹھنے والوں کی سہولت کے لئے ادارہ ہر ممکنہ کوشش کرنا چاہتا ہے۔ ملک کی تمام انجمنوں سے اشتراک عمل کی توقع کی جا رہی ہے۔ اور بعض نے تو خود ہی ہاتھ بٹانے کے لئے آمادگی ظاہر کی۔ چنانچہ درسگاہ علوم شرقیہ کی خواہش پر جناب ڈاکٹر زور صاحب معتمد اعزازی ادارہ نے ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو شام کے پانچ بجے اس درسگاہ میں اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات کی تعلیم کا افتتاح کیا۔ انھوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں اردو زبان کی اہمیت اور مطالعہ کی ضرورت اور اردو امتحانات کے اغراض و مقاصد پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی۔ حاضرین کی کثیر تعداد سے ظاہر ہوتا تھا کہ اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والوں میں زندگی کے آثار پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ اس تقریب میں ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے معتمد امتحانات پروفیسر سروری صاحب کے علاوہ پروفیسر مجید صدیقی صاحب پروفیسر سید محمد صاحب ایم اے اور مولوی فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ نے بھی شرکت کی۔

نئی کتابیں

اس مہینے ادارہ نے بچوں اور بچیوں اور عوام کی معلومات کے لئے تین مفید کتابیں سرسید احمد خاں۔ سالار جنگ اعظم اور سوتیلی ماں شایع کیں۔ پہلی دو کتابیں ادارہ کے شعبہ تالیف و ترجمہ کی طرف سے شایع ہوئی ہیں۔ کتاب سر سید احمد خاں میں شعبہ کے معتمد مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے۔ ایچ سی ایس نے مسلمانوں کے محسن اعظم

سرسید احمد خاں کے مختصر حالاتِ زندگی نہایت سادہ اور سلیس پیرایہ میں قلمبند کئے ہیں۔ کتاب کے سرورق پر سرسید کا نہایت پاکیزہ فوٹو بھی ہے قیمت صرف ۲ر رکھی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کو خرید کر پڑھ سکیں۔

شعبۂ تالیف و ترجمہ کی دوسری کتاب سالار جنگ اعظم کے مولف مولوی فیض محمد صاحب بی اے۔ ڈپٹی ایڈیٹر ہیں جن کو سوانح نگاری کا بڑا ملکہ حاصل ہے۔ چنانچہ مشہور مصلحان تعلیم کی سوانح عمریوں کے علاوہ ان کی کتاب ابن سعود کئی سال قبل شایع ہو چکی ہے۔ سالار جنگ اعظم کے متعلق انھوں نے جملہ ضروری اور مفید معلومات کو بڑے دلچسپ اور سادہ پیرایہ میں قلمبند کر دیا ہے۔ یہ کتاب بھی با تصویر ہے اور مدرسوں کے طلبہ اور عوام کے مطالعہ کی خاطر اس کی قیمت بھی بہت کم یعنی صرف ۶ر رکھی گئی ہے۔

شعبۂ تالیف و ترجمہ کی طرف سے ایک اور کتاب مغربی تصانیف کے اردو تراجم زیر طبع ہے۔ یہ ان تمام اجتماعی اور انفرادی کوششوں کا مستند تذکرہ ہے جو صدیوں سے اردو زبان کو مالامال کرنے کے لئے دوسری زبانوں کی کتابوں کو منتقل کرنے کے سلسلہ میں کی جاتی رہی ہیں۔ اس کے مصنف مولوی میر حسن صاحب ام اے مصنف "دو بڑ ورتھ اور اس کی شاعری" اور "ہوش کے ناخن" وغیرہ ہیں۔

اس ماہ کی تیسری مطبوعہ کتاب شعبۂ نسواں کے سلسلۂ مطبوعات کی چوتھی کڑی ہے۔ اس سے پہلے "تذکرۂ دکن" اور "دکن کی جنتا" اس شعبہ کی طرف سے شایع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ یہ کتاب اگرچہ نفسیاتی اور اخلاقی موضوع پر لکھی گئی ہے لیکن طرز ادا ایسی دلچسپ ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہے گا۔ اس کی مصنفہ محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ (مسز انوار اللہ صاحب) صدر شعبۂ نسواں ہیں جو اردو کی اچھی ادیب اور شاعرہ ہیں۔ اس کتاب کی طباعت و کتابت ایسی نفیس ہے اور اس کا سرورق اور جلد ایسی خوش نما ہے کہ اس کے مقابلہ میں اس کی قیمت محض ۱۴ر ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ ادارہ نے محض مطالعہ کا ذوق عام کرنے کے لئے ایسی کم قیمتیں مقرر کی ہیں۔

شعبۂ نسواں کی طرف سے مرحومہ طیبہ بیگم بلگرامی کے جو رسالے عرصے سے خاص اہتمام سے زیر طبع تھے ان کا کام اب مکمل ہو چکا ہے اور ان شاء اللہ اس رسالہ کی اشاعت کے ساتھ ساتھ وہ بھی منظر عام پر آ سکیں گے۔

اس ماہ شعبۂ نسواں کی طرف سے ایک اور اہم کتاب سوانح آزاد کی طباعت کا کام شروع ہو چکا ہے۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کے مکمل حالات زندگی اب تک شایع نہیں ہونے تھے محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ام اے نے بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ ان کو مرتب کر لیا ہے اور ان شاء اللہ یہ کتاب نومبر کے ختم تک شایع ہو جائے گی۔

امداد کتب خانہ

ناظم صاحب اعزازی کتب خانۂ ادارہ اطلاع دیتے ہیں کہ حسب ذیل اصحاب نے اس ماہ ادارہ کو کتابیں اور رسائل عنایت کئے ہیں۔

محترمہ صغریٰ ہمایوں مرزا صاحبہ۔ النساء ۱۷ صفیٔ ۱۲ ظل السلطان ۸۔ مسلمہ ۰۔ شباب اردو ۰۔ تہذیب نسواں ۰ نجات ۶۔ خادمہ ۵۔ اشاعت اسلام ۵۔ متفرق ۱۱۲۔ ۱۱۰ انگریزی رسالے ۳۶۔ آصف اللغات ۰ جلدیں۔ انوار اللغۃ ۲ جلدیں

گلشن ترنم۔ خیابات فطرت۔ حالات ابن رشد۔ خیابانِ فطرت۔ کرشمۂ تقدیر۔ مکاتیب۔ سرگذشت ہاجرہ۔ مخزنِ معرفت۔ مشیر نسواں۔ شاہراہِ نجات ایک ایک جلد۔ متفرق کتب ۶۶ جلد

ان کے علاوہ حضرت شاہ عظیم آبادی کے قلم سے لکھے ہوئے رسالے جن کی فہرست مرتب کی جا رہی ہے

محترمہ فخر الحاجیہ بیگم امیر حسن صاحب۔ رباعیات شاداں۔ عیسائی آشرم۔ پروفیسر سید محمد صاحب ایم اے۔ رسالۂ الہادی کے تین مکمل فائل اور دیوان انشاء کا قلمی نسخہ۔

مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب۔ شہاب ۱۸۔ عصمت ۱۹۔ مست قلندر ۸۔ زیب النساء ۱۴۔ حیا ۶۔ اور متفرق رسالے۔ رسالۂ کرہ ارض شمس الامراء۔ دکن میں اردو۔ مقالات ہاشمی۔ خواتین عہد عثمانی۔ مکتوبات امجد۔ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ رسالہ سراج الحیات قلمی۔ قصۂ ہندی قلمی ہشت بہشت قلمی۔

مولوی موید الدین حسن صاحب دوم تعلقدار۔ چار متفرق رسائل اور سالنامے۔

مولوی حمید اللہ حسینی صاحب (عثمانیہ) ایک ضخیم اور قدیم قلمی بیاض جس میں حسب ذیل اردو مثنویاں، غزلیں اور مرثیے شامل ہیں۔ قصۂ ہرنی۔ ترکیب بند عغفار۔ کشف المعراج۔ غزلیات شغلی۔ غزلیات سلطان۔ مکالمۂ عشق و عقل۔ مرثیہ شغلی۔ رسالۂ وجودیہ۔ رسالۂ بصل نامہ۔ محی الدین نامۂ افضل۔ مراثی مرزا۔ مرثیہ تبیم احمد۔ مرثیہ شفیع۔ مراثی آقا۔ مرثیہ علی عادل شاہ۔ مراثی اشرف۔ قلندر۔ حیرت۔ غیرہ۔ کلام معجز۔ غزل عبد اللہ قطب شاہ۔ درالاسرار۔ قصۂ حکمت سلیمان۔ مراۃ المصلی۔ منظومات شیخ اسمٰعیل۔ مثنوی علی وغیرہ

بچوں کا سب رس

سب رس کے ناظرین اس امر سے واقف ہیں کہ ہر مہینے سب رس کے علاوہ اس کا ضمیمہ بچوں کا سب رس علیحدہ بھی شائع ہوتا ہے۔ یہ بچوں کا ماہنامہ اضلاع اور بیرون ریاست کے بچوں میں بہت مقبول ہو چکا ہے۔ اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مدیر سے لے کر مضمون نگار تک اکثر بچے اور بچیاں ہیں۔ ان کے علاوہ اس میں بڑوں کے جو مضمون، کہانیاں اور نظمیں درج کی جاتی ہیں وہ خاص طور پر بچوں کی ضرورتوں اور خصوصیتوں کا لحاظ رکھ کر لکھوائی جاتی ہیں۔ اس پرچے میں ۱۶ تا ۲۴ صفحوں تک کے مضامین اور نظمیں درج رہتی ہیں اور کبھی کبھی تصویریں بھی چھاپی جاتی ہیں۔ اس کی قیمت صرف ۱۲ معہ محصول ڈاک ہے جو کوئی زیادہ نہیں بلکہ اس کے رنگا رنگ سرورق اور عمدہ کاغذ کے اخراجات ہی پر صرف ہو جاتی ہے۔ لیکن خریداروں کی کثرت کی وجہ سے یہ بچوں کا پرچہ بھی اپنے اخراجات آپ پیدا کر لیتا ہے۔ اس لئے کوشش کی جا رہی ہے کہ نئے سال سے اس میں بھی بہت سی خوبیوں کا اضافہ کیا جائے۔ جو والدین اور سرپرست اپنے بچوں کو پڑھنے لکھنے کی طرف راغب کرنا چاہتے ہیں اور ان کی عام معلومات میں اضافہ کے خواہشمند ہیں وہ سب رس کے اس ضمیمہ کو ضرور پسند کریں گے۔ اس میں بچوں کو مطالعہ اور لکھنے کا شوق دلانے کے لئے انعامی معمے اور مقابلے بھی شامل رہتے ہیں۔ چنانچہ سال میں کئی دفعہ متعدد بچے انعام میں کتابیں وغیرہ حاصل کرتے ہیں۔

اراکین اعزازی

اس ماہ ادارہ کی مجلس عاملہ نے طے کیا کہ مولنا سید سلیمان ندوی اور سر شیخ عبد القادر کو ان کی اعلیٰ علمی و ادبی خدمات اور

ان عملی دلچسپیوں کی وجہ سے جو وہ ادارہ کے معاملات میں لیتے رہتے ہیں، ادارۂ ادبیات اردو کا رکن اعزازی یعنی رفیق منتخب کیا جائے۔

معاونین و اراکین

معتمد صاحب ادارہ نے ملک کے اکثر علم دوست اصحاب کے یہاں ادارہ کی رکنیت یا معاونت قبول کرنے کے لئے دعوت نامے روانہ کئے ہیں جن کو اکثر اصحاب نے قبول کر لیا ہے۔ اس وقت تک حسب ذیل خواتین اور اصحاب کی طرف سے رقمیں وصول ہو چکی ہیں۔

معاونت۔ مولوی حبیب الرحمن صاحب بی اس سی آنرز

رکنیت دوامی۔ نواب بہادر یار جنگ بہادر۔ محترمہ صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا مرحوم۔

رکنیت الف۔ مولوی میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر۔ مولوی سید یوسف علی صاحب ایچ سی اس۔ مولوی محمد حسین خان صاحب مولوی محمد شجاع الدین خاں صاحب۔

رکنیت ب۔ مولوی سید سلطان احمد صاحب۔ مولوی سید امیر اللہ حسینی صاحب۔

معتمد صاحبہ شعبۂ نسواں نے اطلاع دی ہے کہ حسب ذیل خواتین سے رکنیت کے چندے وصول ہو چکے ہیں۔ قمر النساء بیگم صاحبہ۔ انور جہاں قریشی صاحبہ۔ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر۔ تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ۔ ہارون بیگم صاحبہ شروانیہ۔

توقع ہے کہ اور خواتین اور اصحاب بھی ادارہ کی معاونت یا رکنیت قبول کر کے اردو سے ہمدردی کا ثبوت دیں گے۔

شعبۂ نسواں

حیدرآباد کی علمی و ادبی ذوق رکھنے والی خواتین میں اس شعبہ سے دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس شعبہ کی مجلس عاملہ ایسی خواتین پر مشتمل ہے جو اپنے جذبۂ عمل کی وجہ سے ممتاز ہیں اور یقین ہے کہ ان کا خلوص اور سرگرمی کامیاب ہوگی۔

اس مہینہ بھی اس کا ایک جلسہ ہوا۔ اس کا قایم کیا ہوا مدرسۂ بالغات محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ کی نگرانی میں کامیابی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ دوسرے محلوں یا اضلاع کی رہنے والی خواتین کو بھی اسی طرح ان پڑھ عورتوں کو پڑھانے کا انتظام کر کے خلق اللہ کی خدمت اور اردو کو تقویت دینے کی سعادت حاصل کرنی چاہئیے۔ جو خواتین مدارس بالغات قائم کرنا یا ان میں کام کرنا چاہتی ہیں وہ شعبۂ نسواں کی معتمد محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کوہ نور کیم باغ، جوبلی ہلز، حیدرآباد سے مراسلت یا گفتگو کریں۔ وہ ہر ایسے کام میں مدد اور مشورہ دینے یا دوسروں کی تجویزوں یا مشوروں پر ہمدردی کے ساتھ غور و خوض کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار ہیں۔

اس شعبہ کی طرف سے وقتاً فوقتاً خواتین کے علمی و ادبی اجتماع کی بھی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ باہمی میل جول سے علمی ذوق میں ترقی ہو اور ایک دوسرے کے کام اور خیالات سے واقفیت پیدا ہوتی جائے۔ اس طرح سے توقع ہے کہ ادارہ کا یہ شعبہ رفتہ رفتہ حیدرآباد کی جملہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال خواتین کی ذہنی کاوشوں کا مرکز بن جائے گا۔

شعبۂ تالیف و ترجمہ

اس ماہ کے اجلاس میں سید فضل حق صاحب ام اے پروفیسر نظام کالج، پروفیسر عبد القادر صاحب سروری، مولوی فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ، ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور اور مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ام اے ایچ سی ایس۔

معتمد شعبہ نے شرکت کی۔ طے پایا کہ شعبہ کی طرف سے زیر
طبع کتاب مغربی تصانیف کے اردو تراجم کے علاوہ حسب ذیل
تین کتابیں بھی اشاعت کے لئے دیدی جائیں۔ (۱) سر
سید احمد خاں مرتبہ ظہیر الدین احمد صاحب (۲)
سپہ سالار جنگ اعظم مرتبہ مولوی فیض محمد صاحب (۳)
بچوں کی کہانیاں مرتبہ مولوی میر حسن صاحب ام اے۔
شعبۂ امتحانات کی ضرورت کے پیش نظر حسب ذیل
تین کتابوں کے ترجمے یا ترتیب کا کام بعجلت ممکنہ عمل میں
آئے (۱) ترجمہ تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر بیلی (مولوی
سید محمد صاحب ام اے) (۲) عام دفتری معلومات از مولوی
ظہیر الدین احمد صاحب ام اے ایچ سی اس (۳) سائنس کے
کرشمے مرتبہ مولوی میر حسن صاحب ام اے۔

شعبۂ زبان

اس ماہ مولوی قاضی عبد الغفار
صاحب ایڈیٹر پیام، ڈاکٹر رضی الدین
صاحب صدیقی، ڈاکٹر جعفر حسن صاحب، ڈاکٹر راحت اللہ
خاں صاحب، ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور اور
پروفیسر عبد القادر صاحب سروری نگران کار معتمد شعبہ نے
شرکت کی۔ چونکہ مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری کے
بیرون شہر تبادلہ ہونے کی وجہ سے پروفیسر سروری صاحب نے
عارضی طور پر یہ کام اپنے ذمہ لیا تھا اس لئے ڈاکٹر راحت اللہ
خاں صاحب ام اے پی ایچ ڈی مہتمم کتب خانۂ آصفیہ کو
اس شعبہ کا معتمد منتخب کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب علوم شرقیہ
کے فارغ التحصیل اور کتب خانوں کے کام کے بہت بڑے
ماہر ہونے کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کے ان اعلیٰ تعلیم یافتہ
اصحاب میں سے ہیں جنھیں اردو کی خدمت کا شوق
ہے اور جو اپنی زبان اور ادب کا درد رکھتے ہیں۔
اس جلسے میں جمال الدین حیدر صاحب رینج افسر
جنگلات کے مرتب کردہ دکنی محاورے اور ضرب الامثال
وغیرہ کے مسودے پر غور وخوض کیا گیا۔ اور یہ مسودہ مولوی
قاضی عبد الغفار صاحب کو نظر ثانی کے لئے دیا گیا۔ مولوی
ضیاء الدین صاحب انصاری نے بھی ایسے محاورے وغیرہ
روانہ کئے تھے نیز انھوں نے ایسے چند الفاظ کی فہرست بھی
بھیجی تھی جن کی تذکیر و تانیث حیدرآباد کی زبان میں
معین نہیں ہے۔ ان پر مجلس نے دیر تک بحث ومباحثہ کیا
اور طے پایا کہ ادارہ کی طرف سے حسب ذیل الفاظ کے
بارے میں قطعی طور پر ایک ہی جنس استعمال کرنے کی
سفارش کی جائے۔

طلاق۔ دق۔ مار (بمعنی چوٹ)۔ آواز۔ بندگاہ۔ جنگ — مؤنث
گلاس۔ ہوٹل۔ گنبد۔ مزار۔ پھاٹک۔ طاپ۔ چکر — مذکر

ڈاکٹر جعفر حسن صاحب نے حیدرآباد کی دفتری اردو
کے نمونے اور ان پر ایک اصلاحی نوٹ لکھ دینے کا
وعدہ کیا۔ یہ شعبہ اردو کے متعلق ہر قسم کی مفید تجویزیں
اور ضروری مشورے قبول کرنے اور ان کے متعلق غور و
خوض کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اور توقع ہے کہ جن
اصحاب کو اپنی زبان کے لغوی اور لسانی پہلوؤں کے
متعلق دلچسپی ہے وہ ضرور اس کے ساتھ تعاون عمل کریں گے۔

ادارہ

اطلاع

رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع ۱۵ تاریخ کے اندر
دیدیجئے۔ دیر سے اطلاع آنے پر یا تو پرچے ختم ہو جاتے
ہیں یا گزشتہ مہینے کے پرچوں پر زیادہ محصول ڈاک
ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے تاریخ مقررہ کے بعد اطلاع
آنے تو پرچہ روانہ کرنے میں تامل ہوگا۔

مہتمم مدیر

شہریارِ صحرا

نواب معین الدولہ بہادر متین حیدرآباد کے اُس عظیم الشان خاندان کے فردِ فرید ہیں جو اپنی علم دوستی اور تصنیف و تالیف کے لحاظ سے اردو ادب کی تاریخ میں زندۂ جاوید رہے گا۔ کون ہے جو نواب صاحب کے دادا امیر کبیر شمس الامراء کی ستۂ شمسیہ اور دوسری کتابوں کی اہمیت سے واقف نہیں۔ نواب معین الدولہ بہادر کے اعلیٰ ذوقِ سخن کا ایک ادنیٰ نمونہ ذیل کی نظم ہے جو انھوں نے اپنے خاص موضوع یعنی شیر پر لکھی ہے۔ نواب صاحب کو شیر کے شکار سے بے حد دلچسپی ہے اور ہندوستان ہی کیا دنیا میں چند ہی لوگ ایسے ہوں گے جو اس فن میں اُن کی ہمسری کر سکیں۔

اس نظم کے ساتھ جو تصویر شائع کی جا رہی ہے اس سے معلوم ہو جائے گا کہ انھوں نے کیسے کیسے شیروں کے شکار کئے ہیں۔ (سبک)

آ! اے مرے شہریارِ صحرا
ہیں تیری خصوصیات مشہور
ہیں یوں تو ہزاروں جانور اور
مشہورِ جہاں تری دلیری
ہمت میں نظیر آپ اپنی
اُف ری شانِ جلال تیری
ہر جانِ حزیں ہو کیوں نہ خائف
گزرے جو تیری رہ گزر سے
کیا تجھ سے کوئی نظر ملائے
آساں کب تیرا سامنا ہے
تیرے پنجے سے کون چھوٹا
ہے موت کا وار وار تیرا
جو تیری ادا ہے وہ ہے پیاری
کیا کیا ہو صفت بیان تیری
سانبر چیتل کے دعوے باطل
سب سے نازک مزاج تیرا
تیرے آگے ہر ایک مغلوب
زاغ و کرگس و سگ و ثعالب

اے صاحبِ اقتدارِ صحرا
اے شیر تری ہر اک بلا دور
ہے بات ہی تیری کچھ مگر اور
کیا بات ہے واہ شیر تیری
غیرت میں نظیر آپ اپنی
ملتی ہی نہیں مثال تیری
ساری دنیا ہے تجھ سے واقف
چلنا دشوار ہے ترے ڈر سے
تجھ سے سب کو خدا بچائے
آفت کا [illegible] سامنا ہے
[illegible] کا تمام عمر ڈرتا
دیکھے کوئی شکار تیرا
تو ایک ہزار پر ہے بھاری
ہے سب سے انوکھی شان تیری
سب ہیچ ہیں یہ ترے مقابل
سارے جنگل میں راج تیرا
بچہ بچہ ہے تجھ سے مرعوب
کھا کر چلتے ہیں تیرے [illegible]

ہے چشم غضب تری بلا کی　　جس کو دیکھو وہ اس کا شاکی
غصہ تیرا غضب قیامت　　چالیں تیری عجب قیامت
غصے ہیں کبھی صدا جو نکلی　　گویا بجلی فلک پہ کڑکی
رفتار تری صبا کی رفتار　　بلکہ پیک قضا کی رفتار
کیا لکھے کوئی ترا سراپا　　صد رشک شباب ہے بڑھاپا
دست قدرت نے کیا بنائی　　گردن تیری تری کلائی
تو بھی تری مست آنکھ بھی مست　　ہے ایک تجھے بلند اور پست
پنجہ شاخ نہال آفت　　ناخن شکل ہلال آفت
ہے رنگ ہر ایک سے نرالا　　پیلا کہہ سکتے ہیں نہ کالا
دلچسپ ہے تیری زندگانی　　حیرت انگیز سخت جانی
آتا ہے تری پکار میں لطف　　ملتا ہے ترے شکار میں لطف

دل سے ہے **معینؔ** ترا فدائی
جنگل جنگل [illegible] دُہائی

اِدارۂ ادبیاتِ اردو کی ایک جدید اور مفید تجویز

یوں تو حیدرآباد میں ادبی انجمنوں اور اداروں کی کچھ کمی نہیں ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ضرورت سے بہت زیادہ ہیں لیکن علمی اور تعمیری کام کرنے والے ایسے ادارے جن کے اراکین ادبی صحبتوں کی رنگینیوں سے گزر کر بھی کوئی نتیجہ خیز کام کرتے ہیں دو چار سے زیادہ نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک "ادارہ ادبیات اردو" ہے جو بلحاظ اپنی کم عمری کے زیادہ مشہور نہ ہو لیکن بلحاظ اپنے کام کے ایک بہترین ادارہ ہے جو اس ملک میں اردو زبان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر رہا ہے۔ اور اس خدمت کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خاموش خدمت ہے ــــ پروپیگنڈے کے نقارے اس کے ساتھ ساتھ نہیں ہیں۔ اور اس کے متعلق مقامی خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعے سے نہ تو ہر روز کوئی بیان شائع ہوتا ہے اور نہ وقتاً فوقتاً کوئی بلند آہنگ شاندار مظاہرہ ہوتا ہے جو اس کو شہرت کی سند عطا کرتا رہے!

ادارہ ادبیات خاموش کام کرنے والوں کی ایک جماعت ہے جس نے اردو زبان و ادب کی ترقی و تعمیر میں جو کچھ محنت کی ہے اس محنت کے نتائج ہماری نظر کے سامنے ہیں۔ اس ادارے کی مخلصانہ جد و جہد سے اردو زبان کے جدید لٹریچر کا ایک بہت اچھا ذخیرہ جمع ہوتا جاتا ہے اور اس کے ذریعے سے چند نئے اہل قلم میدان میں آ گئے ہیں۔

ہم نے بارہا اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جہاں تک اردو زبان کی اشاعت اور ترقی کا تعلق ہے بہت سی چھوٹی چھوٹی انجمنوں کو کسی ایک مرکز پر متحد ہو کر کام کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ مقامی اہل قلم کی کوششوں کا موجودہ انتشار اس تحریک کی اجتماعی قوت کو کم کرتا ہے۔ اس وقت ہم اس بحث کو طول دینا نہیں چاہتے بلکہ اہل ملک کو "ادارۂ ادبیات اردو" کی ایک جدید تحریک پر توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ جو "اردو امتحانات" کے نام سے شروع کی گئی ہے۔ اس تحریک کے مقاصد کو حسب ذیل الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔

"اردو زبان اور ادب کی حفاظت، بقا اور ترقی کے سلسلہ میں ضروری ہے کہ اردو مطالعہ کا ذوق عام کیا جائے اور ان لوگوں یا نوجوانوں کے لئے جو کسی جامعہ یا سرکاری ادارہ کی زبان اردو کی تعلیم سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے یا ایسے اصحاب کے لئے جو دوسرے مضامین کے تعلیم یافتہ یا سند یافتہ تو ہوتے ہیں لیکن اردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں اردو زبان اور ادب کے ایسے نصاب اور امتحانات مقرر کئے جائیں جن کی پابندی اور شرکت سے وہ اپنی اردو قابلیت اور ادبی ذوق کی تکمیل ایک باضابطہ معیار کے مطابق کر سکیں۔ اس اہم مقصد کے پیش نظر ادارۂ ادبیات اردو نے اپنے دوسرے شعبوں کے ساتھ ایک شعبہ اردو امتحانات بھی قائم کیا ہے جو مقررہ قواعد

ضوابط کے ماتحت امتحانات لے گا اور کامیاب
طلبۂ امیدواروں کو ادارہ کی طرف سے صداقت
نامے اور سندیں اور شوق دلانے کے لئے امتیاز
کے ساتھ کامیاب ہونے والوں کو انعامات عطا
کرے گا۔ ان امتحانات میں ہر فرد بلا امتیاز
مذہب و ملت و جنس شریک ہو سکے گا۔ ادارہ
کوشش کر رہا ہے کہ اپنے مقررہ نصاب کی تعلیم
کے لئے مختلف مقامات پر مدرسہ بالغان بھی
قائم کرے چنانچہ ایک مدرسہ بالغات اڈیکمیٹ
میں قائم ہو چکا ہے۔ ہفتہ وار عام تقریروں کا
بھی انتظام کیا جا رہا ہے جو ادارے کے مقررہ
نصاب کے مطابق کی جائیں گی۔"

مجلس امتحانات جو قائم کی گئی ہے اس میں ملک کے بہترین ماہرین فن تعلیم کو شریک کیا گیا ہے۔ مجلس کے صدر مولوی سید علی اکبر صاحب نائب ناظم تعلیمات ہیں اور نائب صدر مولوی سجاد مرزا صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج ہیں۔ اس مجلس کے معتمد مولوی عبد القادر صاحب سروری اردو لکچرار جامعہ عثمانیہ ہیں۔ امتحانات کے قواعد و ضوابط کو ہم عنقریب اپنی کسی اشاعت میں شائع کریں گے لیکن اس قدر بتا دینا ضروری ہے کہ مجوزہ نصاب کی تکمیل کے تین درجے رکھے گئے ہیں (۱) سند اردو دانی (۲) اردو پروفیشینسی یعنی اردو عالم (۳) اعلیٰ پروفیشینسی یعنی اردو فاضل۔ نصاب جو تجویز کیا گیا ہے اس کے لئے بہترین قدیم و جدید تصانیف منتخب کی گئی ہیں اور ادبیات و علوم کے ہر پہلو کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

درحقیقت یہ تحریک تعلیم بالغان کا ایک اہم جزو ہے اور جیسا کہ بتایا گیا ہے ادارہ کا خود بھی یہ ارادہ ہے کہ وہ مختلف مرکزوں پر مدارس بالغان قائم کرے بمقصود یہ کہ اردو زبان کے ذریعہ سے عام تعلیم کا دائرہ وسیع ہو اور مدرسوں اور مکتبوں کی پابندی کئے بغیر بھی عوام کے اندر تعلیم کے رجحانات پیدا کئے جائیں۔ درحقیقت ادارہ کے اس مقصد سے دو مقصد حاصل ہوتے ہیں ایک طرف تعلیم بالغان کی تحریک قوت حاصل کرتی ہے اور دوسری طرف زبان اردو کے منظم اشاعت کا ایک نتیجہ خیز نقشہ مرتب ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اپنے فرصت کے اوقات میں اپنے علمی ذوق کی ترقی چاہتے ہوں اس کے لئے "ادارۂ ادبیات اردو" نے ایک ایسی تنظیم پیدا کر دی ہے جس کے ماتحت وہ بہترین ماہرین علوم کے مشورے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اردو زبان میں ادبیات و علوم کے ایک وسیع میدان کو طے کر سکتے ہیں۔

ہم "ادارۂ ادبیات" کی اس کوشش کا خیر مقدم کرتے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ اہل ملک کی تائید اور دلچسپی ادارہ کی کوششوں کو سرسبز اور کامیاب بنائے گی اور کچھ زمانہ گزرنے کے بعد یہ ادارہ تعلیم عامہ کی غیر سرکاری کوششوں کا ایک ایسا مرکز بن جائے گا جس کے کارناموں کو اہل ملک فخر کے ساتھ بیان کر سکیں گے۔

تعمیری کام کی یہ اسکیم اپنے اندر وزن رکھتی ہے اور ہماری تمنا ہے کہ اس کے نتائج توقعات سے بھی زیادہ مفید پیدا ہوں اور ملک میں اس کی تحریکات کو موثر مرکزیت حاصل ہو۔ انجمنیں اور ادارے قائم کر لینا تو بہت آسان کام ہے۔ خصوصاً حیدرآباد میں ــــ لیکن صبر اور استقلال کے ساتھ تعمیری اور اصلاحی کام کرنا آسان نہیں۔ اس مشکل کام کو آسان وہی لوگ بنا سکتے ہیں جو اپنے مقاصد پر اعتماد رکھتے ہوں اور اپنی قوت عمل کو پھول جھڑیاں چھوڑنے میں ضائع نہ کریں۔ ادارہ ادبیات اردو نے اپنے لئے جو پروگرام مرتب کیا ہے وہ ماہرین فن کے وسیع تجربے پر منحصر ہے اور ایسے اصحاب کا منحصر ہے جن کے جذبۂ عمل پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ (پیام مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۹ء)

قاضی عبد الغفار

اردو امتحانات

"ادارۂ ادبیات اردو" نے "اردو امتحانات" کے نام سے ایک ذیلی ادارہ قایم کیا ہے جس کے قواعد و ضوابط اس وقت ہمارے آگے ہیں اس نے ایک "مجلس امتحانات" بنادی ہے جس کے صدر، نائب صدر اور معتمد علی الترتیب مولوی علی اکبر صاحب نائب ناظم تعلیمات۔ مولوی سجاد مرزا صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج اور مولوی عبدالقادر صاحب سروری اردو لکچرار جامعہ عثمانیہ اور [illegible] اور قابل اشخاص اراکین ہیں۔

طے ہوا کہ فی الحال اس ادارہ کا یہ شعبۂ امتحانات اردو ہر سال پانچ امتحانات لیا کرے گا۔ جن میں ہر وہ شخص شریک ہو سکے گا جس نے مقررہ نصابوں کی تکمیل کی ہو۔ اس کے امتحانات (۱) اردو دانی (۲) اردو ایف یعنی منشی یعنی اردو عالم (۳) اعلیٰ ایف یعنی منشی یعنی اردو فاضل (۴) خوش نویسی (۵) خطاطی، کتابت یعنی کاپی نویسی پر مشتمل ہیں۔ اردو عالم کے نصاب میں (۱) نثر و قواعد (۲) نظم و عروض (۳) تاریخ ادب و مضمون نگاری اور (۴) عام معلومات کے علاوہ ایک اور مضمون اختیاری ان مضامین میں سے بھی لینا ضروری ہوگا "خوش نویسی خطاطی وکتابت۔ ٹائپ، مختصر نویسی۔ عام دفتری معلومات" اور نصاب "اردو فاضل" میں بھی اردو زبان کی آگاہی کو بلند رکھنے کے ساتھ ساتھ اونچے درجہ کی "عام معلومات" پیدا کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ قواعد و ضوابط میں تمام نصابی کتابوں کی تفصیل دیدی گئی ہے۔ ان امتحانوں کے اغراض و مقاصد حسب ذیل بیان کئے گئے ہیں۔

"اردو زبان اور ادب کی حفاظت۔ بقاو ترقی کے سلسلہ میں ضروری ہے کہ اردو مطالعہ کا ذوق عام کیا جائے اور ان سن لوگوں یا نوجوانوں کے لئے جو کسی جامعہ یا سرکاری ادارہ کی زبان اردو کی تعلیم سے بہرہ مند نہیں ہوسکتے یا ایسے اصحاب کے لئے جو دوسرے مضامین کے تعلیم یافتہ تو ہوتے ہیں لیکن اردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں اردو زبان اور اردو ادب کے ایسے نصاب اور امتحانات مقرر کئے جائیں جن کی پابندی اور شرکت سے وہ اپنی اردو قابلیت اور ادبی ذوق کی تکمیل ایک باضابطہ معیار کے مطابق کرسکیں۔"

لیکن ان امتحانوں کے نصابی مضامین پر نظر ڈالنے سے یہ واضح ہورہا ہے کہ ان کے ذریعہ نہ صرف اردو کی قابلیت اور ادبی ذوق ہی پیدا کرانا منظور ہے بلکہ ان امتحانوں سے فراغت حاصل کرنے والوں کو روزگار کے قابل بنانا بھی۔

ٹائپ۔ مختصر نویسی اور عام دفتری معلومات تو سرکاری ملازمتوں کامیابوں کے لئے آسان کرسکتے ہیں اور خطاطی و خوش نویسی کے امتحان سرکاری ملازمت کے دائرہ کے اندر اور باہر دونوں جگہ فراہمی کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو اپنی اس تازہ سعی کے لئے قابل مبارکباد ہے اور ہماری آرزو ہے کہ اس کی یہ سعی مشکور ہو۔

رہبر مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء — سید احمد محی الدین ایڈیٹر رہبر دکن

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا ایک مستحسن اقدام

" ادارۂ ادبیاتِ اردو " کا شمار حیدرآباد کے ان چند اداروں میں ہے جو اپنا پروپیگنڈہ کم کرتے ہیں اور کام زیادہ ۔ گزشتہ چند سال سے یہ ادارہ اردو ادب کی خاموش خدمت کر رہا ہے۔ اس ادارہ کا اردو ادب کی خدمت کے سلسلہ میں تازہ ترین اقدام ایک شعبۂ امتحاناتِ اردو کا قیام ہے۔ اس شعبہ کے اغراض و مقاصد دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس ادارہ کا بڑا مقصد تعلیم بالغان بھی ہے۔

" ان سن لوگوں یا نوجوانوں کے لئے جو کسی جامعہ
یا سرکاری ادارہ کی زبان اردو کی تعلیم سے
بہرہ مند نہیں ہو سکتے یا ایسے اصحاب کے لئے
جو دوسرے مضامین کے تعلیم یافتہ یا سند یافتہ تو
ہوتے ہیں لیکن اردو ادب سے دلچسپی رکھتے
ہیں اردو زبان اور ادب کے ایسے نصاب
اور امتحانات مقرر کئے جائیں جن کی پابندی
اور شرکت سے وہ اپنی اردو قابلیت اور
ذوق کی تکمیل ایک باضابطہ معیار کے مطابق
کر سکیں۔"

اس مقصد کے تحت اس ادارہ نے شعبۂ امتحانات قائم کیا ہے جو مقررہ قواعد و ضوابط کے تحت امتحانات لے گا۔ اور کامیاب امیدواروں کو صداقت نامے اسناد اور انعامات عطا کیا کرے گا۔ گویا اس اقدام سے ادارہ ایک طرف تو " اردو " کی اشاعت کر رہا ہے دوسری طرف معیاری امتحانات کے ذریعے ملک کی ایک بڑی ضرورت کو بھی پورا کر رہا ہے۔ اس ادارہ کے امتحانات میں ہر شخص بلا اختلاف مذہب و ملت شریک ہو سکتا ہے۔ بہت سے اشخاص ایسے ہیں جنہیں اردو زبان کا ذوق و شوق ہے لیکن کوئی ایسا ادارہ نہ تھا جو ان کے اس بڑھتے ہوئے ذوق کو پورا کرتا۔ اس ادارہ کا قیام اس سلسلہ میں ایک فالِ نیک ہے۔ امتحان کے ساتھ ہی ساتھ

ادارہ کوشش کر رہا ہے کہ اپنے مقررہ نصاب تعلیم کے لئے
مختلف مقامات پر مدرسہ بالغان بھی قائم کرے چنانچہ
ایک مدرسہ بالغات اڈیکمٹ میں قائم ہو چکا ہے۔ ہفتہ وار
تقریروں کا بھی انتظام کیا جا رہا ہے جو ادارہ کے مقررہ
نصاب کے مطابق کی جائیں گی۔"

ہمیں امید ہے کہ عوام اس ادارہ کی قدر کریں گے اور جہاں تک ہو سکے غیر تعلیم یافتہ اشخاص کو اس ادارہ کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے کی طرف متوجہ کروائیں گے۔ قواعد و ضوابط امتحانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ فی الحال یہ شعبہ ہر سال پانچ امتحانات لیا کرے گا۔ یعنی (۱) سند اردو دانی (۲) اردو عالم (۳) اردو فاضل (۴) خوش نویسی (۵) خطاطی و کتابت۔ امتحانات کے لحاظ سے نصاب بھی اس کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ مجلس امتحانات میں ملک کے بہترین انشا پردازوں اور اعلیٰ دماغ ہستیوں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کے صدر مولوی سید علی اکبر صاحب نائب ناظم تعلیمات۔ نائب صدر مولوی سجاد مرزا صاحب اور معتمد مولوی عبدالقادر صاحب سروری ہیں۔ ادارہ ہذا کی مذکورہ بالا مساعی قابلِ قدر اور قابلِ مبارکباد ہیں۔ امید ہے کہ یہ ادارہ بہت جلد عوام میں مقبول ہو جائے گا اور اس کی اسناد بھی معیاری تصور کی جائیں گی۔ دفاتر میں آج کل زبان دانی خصوصیت کے ساتھ اردو دانی کی جو شرائط رکھی گئی ہیں اگر وہ اس ادارہ کے معیار کو تسلیم کریں اور اس امتحانات سے فارغ شدہ اصحاب کو ترجیح دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ ادارہ بہت جلد ترقی نہ کرے۔ ہم اس ادارہ کی کامیابی کے دلی متمنی ہیں اور اس کی سرخروئی کے خواہشمند۔ امید ہے کہ ملک کے اور دیگر ادارے بھی اس قسم کے مفید نصب العین کو اختیار کر کے حقیقی معنوں میں قومی خدمت کریں گے۔

۱۹ر اکتوبر ۱۹۳۹ء

احمد عارف ایڈیٹر صبح دکن

ایک دلہن کو ڈولی میں سوار ہوتے دیکھ کر

اے صدق وصفا کی دیوی!

اگر تیرے شیشۂ دل میں یہ آرزوئے لطیف شرر
شوق بن کر جھلک رہی ہے کہ ہم آباد ہستی کی سنگلاخ
منازل اور دشوار گزار مراحل میں ہمیشہ شادکام رہے
تو اپنے پیمانۂ حیات کو اس طرح نور کے سانچے میں ڈھال کہ
تیرا رفیقِ حیات خود بخود تیرا دامن پکڑ لے اور تیری طرف
جھکا رہے۔

تیرا دل ایک پھول کی مانند ہے شگفتہ بھی اور نازک
بھی۔ ذرا سی ٹھیس لگے تو چکنا چور۔ خوشی اور مسرت
میں بحرِ بے پایاں۔ درد سے آشنا۔ پاکیزگی اور ہمدردی
سے لبریز۔ صدق وصفا آئینہ!!

لاوارث اور بیکس جو کبھی تجھ ایسی ہی کسی عورت
کی آنکھوں کا تارا اور کلیجے کا سرور تھے اب تیری آغوشِ
محبت میں پناہ لیں۔

اے نوجوان حسینہ!

تیرا شباب قدرت کا ایک نفیس اور پاک عطیہ ہے۔
اس میں ہزاروں برکتیں مستور ہیں ہوشیار باش! زندگی
کی آخری منازل میں یہ تیرے لئے چراغِ راہ کا کام دے
گا۔ اور تیرے نام کو درخشاں اور تاباں رکھے گا۔

اے سرچشمۂ وفا!

دیکھ قدرت نے تجھے رفیقِ حیات کیا اچھا
عطا کیا ہے۔ لیکن اسے بگاڑنا یا سنوار کر رکھنا اب تیرا
کام ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تیری بے معنی سرد مہری،
بے اعتنائی اور خودسری اس کے شیشۂ دل کو چکنا
چور کر دے۔ تو وہ عمل اختیار کر کہ تو اس کی ہم نوا
ہو اور وہ تیرا ہم نوا۔

اے مہربان!

اگر ادبارِ زمانہ نے تجھے پریشان کر رکھا ہو تو
ہراساں نہ ہو۔ اگر مال و زر کا مینہ برستا ہے تو غرور
نہ کر۔ بزمِ گیتی میں تیرا جو قدم بھی اٹھے۔ وہ دوسرے
کے لئے برکت ہو۔ صبر اور شکر تیرا شیوہ ہو
تو جویائے علم ہو اور پاکیزہ خیالات تیرا زیور
ہوں۔ کسی کے عیوب کو عریاں کرنے میں جلدی نہ کر
شاید کہیں تیرے دامن پر بھی کوئی دھبہ نہ ہو۔ غمازی
سے پرہیز کر۔ اور خاموشی اور متانت سے دلوں کو
تسخیر کر۔ اگر تیرے لب کبھی اظہارِ حقیقت کے لئے
وا ہوں تو ان سے وہ گوہر برسا کہ کوئی نامراد نہ رہے۔

اے روحِ پاک!

ایامِ زندگی کو گناہ کی آلودگیوں سے پاک رکھنے
کے لئے اگر سینے کا خون بھی تجھے بھینٹ چڑھانا پڑے
تو یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔ تو جب چاہے نیک بن
سکتی ہے اور نیکی کا راستہ دوسروں کو دکھا سکتی ہے۔
زندگی حوادثِ زمانہ سے اگر تلخ ہے تو کچھ پرواہ نہیں۔ تو
عورت ہے اور عورت کا کام ضبط اور تحمل! تیری فریاد
طائرانِ سدرہ کو بھی بے قرار کر دیتی ہے۔ آسمان کی
راہیں تیری فریاد کے لئے ہر وقت کھلی ہیں۔
خدا تجھے نیکیوں کی توفیق دے!!

ایم اسلم

غزل

چارہ گر کو نظر نہیں آتا ۔۔۔ داغِ دل کیوں ابھر نہیں آتا
جو نظر آتا ہوں، نہیں ہوں میں ۔۔۔ اور جو کچھ ہوں، نظر نہیں آتا
اُس کی آنکھوں میں کچھ جگہ پاؤں ۔۔۔ مجھے ایسا ہنر، نہیں آتا
میرے ہم رہ ہے راہبر میرا ۔۔۔ پھر بھی میں راہ پر نہیں آتا

نہ کرو کوئی آرزو امجد
اِس شجر میں ثمر نہیں آتا

امجد

کیفِ جاوید

تخئیل کی نوازش وہ روبرو نہ آئیں ۔۔۔ جلووں کو لوٹ لیں گی یہ بوالہوس نگاہیں
اب صبح ہو رہی ہے وہ آئیں یا نہ آئیں ۔۔۔ آ پیکرِ تصور لے لوں، تری بلائیں
پیغامِ صد محبت مدہوش سی ادائیں ۔۔۔ مخمور تر جوانی شرمیلی سی نگاہیں
اللہ خیر کرنا دردِ حسین تر کی ۔۔۔ وہ آ رہی ہیں جیسی تسکیں فروش ہوائیں
ٹوٹے ہوئے ستارے گیتی پہ مسکرائے ۔۔۔ جلووں نے تیرے بڑھ کر لے لیں مری بلائیں
تفسیرِ صد محبت انعامِ نوجوانی ۔۔۔ ہاں ہاں وہی وہی تو شرمیلی سی نگاہیں

کہنا تو تھا بہت کچھ افسوس دل کے ہاتھوں
ہم کہہ سکے نہ کچھ بھی پوچھا تو کیں نگاہیں

نوابزادہ جاوید قیصری
(کانپوری)

معاہدہ معاشری

مشہور فلسفی ہیگل کا خیال ہے کہ "مملکت بجائے خود ایک مقصد ہے۔ یہ وہ نصب العین ہے جس کے تمام افراد پابند ہیں ان کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ مملکت کے رکن بنے رہیں۔" ایک ہیگل ہی کیا کئی ایک مفکروں نے انسانی معاشرہ کی عظمت کو جتایا ہے۔ اسی معاشرہ کو سیاسیات کی زبان میں مملکت کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی بڑی انجمن ہے جس کا ہر شخص رکن ہے۔ نہ تو کوئی اس کے رکن ہونے سے انکار کر سکتا ہے اور نہ اس سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہم مملکت کے جزو ہیں اور مملکت ہمارا جزو ہے۔ لیکن یہ بات کیا ہے کہ اس ادارہ کو اس قدر اہمیت حاصل ہو گئی؟ غالباً اس کا اصلی سبب اس کی منظم کیفیت ہے یہ کیفیت اس قدر نمایاں ہے کہ اگر اس کو مملکت کی روح کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ آپ دنیا کے کسی حصہ میں چلے جائیے، آپ کو ایسے ہی انسانوں سے سابقہ پڑے گا جو چند اصول اور قاعدوں کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ اس دعوے کی تصدیق فرمانے کی غرض سے کسی ایسے جزیرے میں پہنچ جائیں، جہاں دوسرا کوئی نہ ہو۔ وہاں اگر آپ تنہا رہنے کی بنا پر رابنسن کروسو کی طرح یہ خیال فرمانے لگیں کہ میں انسان کے بنائے ہوئے کسی قاعدہ کا پابند نہیں ہوں تو آپ کا ایسا سمجھنا درست نہ ہو گا لیکن آپ کو، وہاں اپنی فطرت سے بڑی جنگ کرنی پڑے گی جس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ایک دوسرے سے مل جل کر زندگی بسر کرے۔ وہاں آپ تنہائی سے اکتا کر ایسے مقام کی آرزو کرنے پر مجبور ہوں گے جہاں انسان بستے ہوں۔ اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ انسان ایک سماجی جانور ہے جو مل جل کر رہنے پر مجبور ہے۔

جب انسانوں کا مل جل کر رہنا طے ہے تو زندگی کا چند اصول و قواعد یعنی تنظیم کے تابع ہونا بھی ضروری ہے۔ تنظیم کے ساتھ ہی اس کا بھی تصور کیا جاتا ہے کہ کوئی اصول اور قوانین بنانے والا بھی ہو اور دوسرے ان کی پابندی کرنے والے۔ جہاں اس قسم کے تعلقات ہوں تو سمجھیے کہ وہی سیاسی معاشرہ یعنی مملکت ہے۔ لیکن سیاسیات جیسے مشکل علم کا وجود نہ ہوتا اگر اس سیاسی معاشرہ کو جوں کا توں چھوڑ دیا جاتا۔ انسانی فطرت ہمیشہ جستجو اور کھوج میں لگی رہتی ہے۔ کیا تھا؟ اور کیا ہوگا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کی خیال آرائی سے انسان کبھی نہیں تھکتا۔ اس لئے وہ دریافت کرنے لگا کہ مملکت کی ابتدا کیسے ہوئی اور کیوں ہوئی؟ مملکت سے پہلے انسان کس طرح زندگی گزارتا تھا؟ اور اب ایسا کیوں ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے ایک منظم طریقے کے ماتحت ہے؟ قیام مملکت سے پہلے اور بعد کی حالت پر غور کرنا محض ایک دل خوش کن تخیلی کوشش ہی نہیں ہے بلکہ اس کا گہرا تعلق تاریخ کے علاوہ اس اہم اخلاقی سوال سے بھی ہے کہ مملکت کا قیام کن بنیادوں پر درست سمجھا جائے؟ مملکت بجائے خود ایک مقصد کیوں ہے اور کیوں افراد پر یہ پابندی ہے کہ وہ اس کے رکن بنے رہیں؟

ان کے جوابات دینے کی مشرق اور مغرب دونوں نے کوشش کی۔ کسی نے کہا کہ انسان کی حالت ابتدا میں بالکل مکمل تھی لیکن رفتہ رفتہ اس میں انتشار پیدا ہو گیا اور قوم چار ذاتوں میں منقسم ہو گئی۔ ایک اور صاحب نے بتایا کہ مملکت سے پہلے بالکل نیائے ہی راج تھا۔ انسانوں کی وہی حالت تھی جو سمندر میں مچھلیوں کی ہوتی ہے۔ یہ حالت اس قدر ناقابل برداشت ہو گئی کہ آخر لوگوں نے

چین کی خاطر ایک حکمران کی ماتحتی قبول کرلی اور اس طرح سیاسی معاشرہ قائم ہوگیا۔ غور کرنے والے برابر سقراط کے زمانہ سے اس پر غور کرتے رہتے ہیں کہ آخر یہ راز ہے کیا۔ یہاں تک کہ سترھویں اور اٹھارویں صدی میں، بعض لوگوں نے باقاعدہ طور پر وہ مشہور نظریہ پیش کیا جس کو "معاہدۂ معاشری" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے

اس نظریہ کا پرچار کرنے والے ہوبز، لاک اور روسو تھے۔ لیکن اس کو یاد رکھنا چاہئے کہ ان تینوں مفکروں کے نظریوں نے جدا جدا راہیں اختیار کریں۔ انگلستان کے فلسفی ٹامس ہوبز نے، جو چارلس دوم کا اتالیق بھی رہ چکا تھا، اپنی کتاب لیویاتھن میں اس نظریہ کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے اپنے نظریہ کی بنیاد انسانی فطرت پر رکھی ہے۔ انسانی فطرت کے متعلق اس کا خیال کہاں تک درست ہے، اس کا فیصلہ آپ خود فرمالیں۔ بہرحال اس کا کہنا ہے کہ انسان بالکل ہی خودغرض خودبیں اور مطلب پرست حیوان ہے۔ اس کے افعال اور حرکات یہی بتلاتے ہیں کہ وہ محض اپنی نفسانی خواہشوں کا بندہ ہے۔ حالت فطری میں یعنی مملکت کے قیام سے پہلے جبکہ انسان کسی قاعدہ سے قانون کا پابند نہ تھا" تو ہر روز جنگ وجدال کا بازار گرم رہا کرتا تھا اس جھگڑے سے تنگ آکر جس میں " ہر وقت کا خوف اور اچانک موت کا ڈر لگا رہتا ہے" لوگوں نے آپس میں ایک معاہدہ کرلیا۔ اور یہی معاہدہ "معاہدۂ معاشری" کہلایا ہوبز کے خیال کے مطابق لوگوں نے یہ طے کرلیا کہ اگر جان ومال کی سلامتی منظور ہے، تو ضرورت ہے کہ ہر شخص اپنی آزادی سے دست بردار ہوجائے اور یہ آزادی ایک شخصیت کے حوالہ کردی جائے، جو ملک میں امن وامان قائم رکھنے کی ذمہ داری لے۔ غرض اس طرح تمام لوگوں نے مل کر حکومت کرنے کے اختیار کو ایک شخص کے حوالے کردیا۔ اسی کو مقتدر اعلیٰ یا بادشاہ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس معاہدہ کے بعد لوگوں پر ہمیشہ کے لئے یہ پابندی عائد ہوگئی کہ وہ بادشاہ کے احکام کو مانتے رہیں، خواہ وہ احکام ان کے نزدیک غلط ہی کیوں نہ ہوں۔ اس طرح ہوبز نے اس نظریہ سے مطلق العنان بادشاہی کی حمایت کا کام لیا ہے۔

ہوبز کے بعد جس شخص نے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی وہ اسی کا ہمعصر اور ہم قوم، جان لاک ہے، لیکن لاک نے جس طرح اس نظریہ کو پیش کیا ہے اس کی صورت مختلف ہے۔ وہ حالت فطری کو محض جنگ کی حالت نہیں سمجھتا تھا بلکہ اس کے خیال میں اس وقت بھی انسان عقل وشعور سے بے بہرہ نہ تھا اور وہ حق اور ناحق میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس وقت انسان جن قاعدوں کا پابند تھا وہ فطرت کے قاعدے تھے۔ ان ہی قاعدوں کو "قانون فطرت" کا لقب دیا گیا ہے۔ ہوبز کے نزدیک تمام دقت اس وجہ سے تھی کہ حالت فطری میں کوئی قانون نہ تھا لیکن لاک کے نزدیک اس قانون کے ہوتے ہوئے بھی مشکل حل نہیں ہوتی۔ بات یہ تھی کہ ہر شخص کو قانون کی تاویل کرنے کا اختیار تھا یعنی وہی ملزم بھی تھا اور جج بھی۔ بھلا غور کیجئے کہ جہاں یہ متضاد خصوصیتیں ایک ہی جگہ جمع ہوجائیں وہاں اگر ملزم کے خلاف جج کوئی فیصلہ ہی نہ کرسکے تو کیا تعجب ہے۔ لاک کہتا ہے کہ اس کے باوجود کام خیر وخوبی سے چل جاتا اگر بعض لالچی اور خودغرض لوگ، دوسروں کی چیزوں پر قبضہ کرنے کی کوشش نہ کرتے غرض اس کے بعد پھر وہی معاہدہ کی نوبت آئی اور لوگوں نے اپنی جان ومال، عزت وآبرو اور آزادی کی حفاظت کی خاطر یہ طے کرلیا کہ قانون فطرت کی تاویل اور نفاذ کے حق کو ہر شخص سے چھین کر پوری قوم کے حوالہ کردیا جائے اور اس کے بعد یہ اختیارات ایک شخص کو

کو دے دئے جائیں۔ ہوبز کے نزدیک تو بادشاہ، نہ معاہدہ کا فریق تھا اور نہ اس کا پابند۔ لیکن لاک کی رائے میں بادشاہ بھی معاہدہ کا ایک فریق ہے اور وہ اپنے منصب پر اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک وہ معاہدہ کے مقصد کو پورا کرتا رہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر بادشاہ معاہدہ کی خلاف ورزی کرے تو قوم کو انقلاب کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ لاک کے خیالات دراصل اس کشمکش کو ظاہر کرتے ہیں جو اس وقت شاہ انگلستان اور رعایائے انگلستان میں جاری تھی۔ لاک نے معاہدہ کی ابتدا کے متعلق ایک دلچسپ استدلال پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ محض منطقی دلیلوں سے ممکن ہے کہ اس کا ثبوت نہ دیا جا سکے لیکن اس کا امکان ہے کہ اس کی بنیاد تاریخی واقعات پر ہو، اور محض اس لئے کہ ہمارے پاس اس کا ثبوت کم ہے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ واقعہ پیش ہی نہ آیا ہوگا۔

یہ عجیب بات ہے کہ ایک ہی نظریہ، جس کو ہوبز نے شخصی بادشاہی کی حمایت کا آلہ بنایا تھا اور لاک نے محدود شاہی اور جمہوریت کے لئے پیش کیا تھا، وہ فرانس کے مشہور مفکر روسو کے ہاتھ میں آکر عوام الناس کے اقتدار کا ہتھیار بن گیا۔ انقلاب فرانس کا یہ "روحانی باپ" ان لوگوں میں سے تھا جو حال کی نسبت ماضی کو زیادہ سراہتے ہیں۔ فرانس کے انقلابیوں کے نزدیک اس کی مشہور کتاب "معاہدۂ معاشری" کی وہی حیثیت تھی جو اشتراکیوں کے پاس کمیونسٹ مینی فسٹو یا نازی جرمنی میں ہیر ہٹلر کی خود نوشتہ سوانح عمری کو حاصل ہے۔ اس کی رائے میں حالت فطری کا زمانہ انسان کا زرین دور تھا۔ اس عہد میں انسان نہایت ہی آرام اور چین کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس وقت، کوئی چیز کسی کی نہ تھی۔ گو انصاف اور اخلاق کا تخیل نہ تھا مگر چونکہ "فطری آزادی" ہر شخص کو نصیب تھی اس لئے وہ دوسروں کے جذبات اور احساسات کا پاس کرتا تھا لیکن جاہ و زر کے رواج اور طاقتور انسانوں کی حرص نے اس دور کا خاتمہ کر دیا اور "انسان جو فطرتاً آزاد پیدا ہوا ہے" ہر جگہ پا بہ زنجیر نظر آنے لگا۔ جب ظالموں کے ظلم بڑھنے لگے تو امن کی ایک ہی ترکیب نظر آئی، وہ یہ کہ تمام افراد مل کر ظالموں کا مقابلہ کریں۔ اس مقصد کے لئے تمام لوگوں نے ایک رائے ہو کر اپنے جملہ اختیارات قوم کے حوالہ کر دئے اور اپنے آپ کو قوم کی مرضی کا تابع بنا دیا۔ اس مرضی کو وہ "مشیت عامہ" سے موسوم کرتا ہے۔ یہاں مشیت عامہ اور مشیت عوام کے فرق کو ذہن نشین کر لینا چاہئے جس کو خود روسو نے محسوس کیا تھا۔ ہر شخص کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں (ایک انفرادی، دوسری اجتماعی۔ انفرادی حیثیتوں کا مجموعہ کسی طرح اجتماعی حیثیتوں کا مجموعہ نہیں کہلایا جا سکتا) اسی لئے روسو نے اجتماعی ارادوں کو مشیت عامہ اور انفرادی ارادوں کے مجموعہ کو مشیت عوام کا لقب دیا ہے۔ اس موقع پر روسو نے بڑی عجیب منطق پیش کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اختیارات کے اس طرح دے دینے سے کسی شخص کی بھی آزادی میں کمی نہیں ہوئی کیونکہ ہر شخص اس معاہدہ میں شریک تھا جس کے ذریعہ قوم کو اختیارات دئے گئے تھے اور چونکہ ہر شخص اس میں شریک تھا اس لئے اس کی کھوئی ہوئی آزادی دوبارہ واپس مل گئی۔

شہاب الدین

تاثراتِ سفرِ یورپ

بسلسلۂ گذشتہ

۲۹ جولائی کو جمعہ کا دن تھا۔ انڈیا ہاؤس گیا اور نسیم حسین صاحب سکریٹری ہائی کمشنر صاحب سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ لندن میں نماز جمعہ Eccleston) میں ہوتی ہے جو وکٹوریا اسٹیشن کے قریب ہے۔ افسوس ہے کہ تلاش و دو کے باوجود مجھے پہنچنے میں ذرا دیر ہوگئی اور نماز نہ مل سکی۔

شام کے وقت حسب معمول نوادر خانۂ برطانیہ گیا اور مطالعہ کیا۔ انڈیا ہاؤس میں ایک اشتہار کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ Imperial Institute) میں ہر روز کئی کئی مرتبہ سیاحتی اور تعلیمی فلم دکھائے جاتے ہیں۔ جن میں برطانوی سلطنت کے مناظر، پرندے درخت چوپائے وغیرہ کی چلتی بولتی تصویریں ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک میں سینماؤں میں جو فلمیں دکھائی جاتی ہیں وہ اکثر ایسی ہوتی ہیں کہ ان سے اخلاق پراگندہ ہی نہیں بلکہ خراب ہوجاتے ہیں۔

یہاں یورپ میں ایک تو ایسے سینما ہیں یہاں ذرا چٹپٹی فلمیں ہوتی دوسری وہ جن میں محض خبریں ہوتی ہیں اور تیسرے وہ تعلیمی اور سیاحتی فلمیں دکھاتے ہیں۔ اول الذکر سینماؤں میں بھی بعض فلمیں جنہیں (A Film) کہتے ہیں، وہ ہوتی ہیں جن میں بچے نہیں جا سکتے، B) وہ فلمیں جن میں بچے محض اپنے والدین یا گارجین کے ساتھ جا سکتے ہیں اور C) وہ فلمیں جن میں بچے آزادی سے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض وسیع اداروں مثلاً Imperial Institute اور دوسری انجمنوں میں خاص طرز کی جغرافی اور سیاحتی فلمیں دکھائی جاتی ہیں لندن میں ایسے بھی سینما ہیں جن میں تصاویر کی شکل میں دنیا کی خبریں دکھائی جاتی ہیں۔ یہ "شو" ڈیڑھ گھنٹے رہتا ہے اور اس میں یہ پابندی کی جاتی ہے کہ کوئی تصویری خبر زیادہ سے زیادہ ہفتہ بھر یا زیادہ دس روز سے زیادہ پرانی نہ ہو۔ خاص بات یہ ہے کہ سیاحتی اور اخباری فلموں کی نمائشوں کو دیکھنے کے لئے بھی لوگ اسی طرح جوق جوق آتے ہیں جیسے معمولی سینماؤں میں۔ "مغربی بد اخلاق" یورپ میں تو یہ موشگافیاں اور یہ شوق اور ہمارے "خوش اخلاق" ہندوستان میں رطب و یابس کی یہ عام آزادی!!

۳۱ جولائی کو اتوار کی وجہ سے برطانوی نوادر خانے کا مطالعہ خانہ بند تھا اس لئے اس موقع کو غنیمت خیال کر کے میں نے نوادر خانے کی بعض نایاب اشیاء کا معائنہ کیا۔ نوادر خانہ اسم بامسمی ہے اور جس شعبہ میں جاؤ نوادر خانے بھرے پاؤ گے میں صرف سرسری طور پر چند کمرے ہی دیکھ سکا۔ جو اشیاء میں نے دیکھیں ان میں زیادہ دلچسپ اور اہم حسب ذیل تھیں۔ (ایشیائی کمرہ) محمد شاہ رنگیلے کا بیش قیمت موتی کے بنے ہوئے اشیاء (ہندوستانی کمرہ) ٹیپو سلطان شہید کا عطردان۔ اس کے تخت کا ایک ٹکڑا کندھار (قندھار) کے مجسمات۔ رومن برطانوی کمرہ) رومن عہد کا زیور، مٹی، شیشے اور دھات کے برتن، نیز خاص کر ہادریانوس (ہیڈرین) کا خود دار سر والا مجسمہ رومن سپاہیوں کے اسناد وغیرہ۔ زینے کے دونوں طرف اور سامنے کا حصہ امراوتی کی نادر ترین مورتیوں

اور سنگ تراشی کے نمونوں سے بھرا پڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بدھ مت کی آثار سب کے سب یہاں لے آئے گئے ہیں اور اصل موقع کو بالکل عریاں چھوڑ دیا گیا ہے۔

یکم اگست کو نوادر خانے میں محمود گاواں کے متعلق جستجو کی۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے (جو مشہور نقاش عبدالرحمن چغتائی کے بھائی ہیں) مجھے ایک مخطوطے کا پتہ دیا تھا جس میں محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ اور محمود گاواں کے خطوط کی نقلیں ہیں۔ اس مخطوط کو برآمد کیا۔ اس میں دراصل محمد فاتح کے وہ خطوط ہیں جو اس نے فتح کے بعد دنیائے اسلام کے بادشاہ وزیروں عالموں اور دوسرے امور لوگوں کے نام لکھے تھے۔ اس مجموعے میں وہ خط بھی ہے جو سلطان نے محمود گاواں کو لکھا اور وہ بھی جو خواجہ نے اس کے جواب میں تحریر کیا۔ مطالعہ خانہ پانچ بجے بند ہوا تو میں نے اس کمرے کی بعض نایاب اشیاء دیکھیں جو تاریخی خطوط کے لئے وقف ہے۔ جو خطوط وغیرہ میں نے دیکھے ان میں سے حسب ذیل بھی تھے۔ ملٹن (وہ وثیقہ جس کے ذریعے سے قرار پایا کہ اس کی تصنیف Paradise Lost کی فروخت پر اسے پانچ پونڈ ملیں گے) سر ٹامس مور، بیکن، لاک، ڈکنز، ڈرائیڈن، ڈیفو، جنگ طرف الغرب (۱۸۰۵ء) کا روزنامچہ، فریڈرک اعظم، نپولین، ہوئی ہینا دوم، ہنری چہارم شاہ فرانس، چارلس اول، جیمز اول، ایلزبتھ، میری، فلپ دوم شہنشاہ چارلس پنجم، ولیم سوم، ملکہ وکٹوریا، گلیڈسٹن، پیمبرانٹ وغیرہ کے خطوط۔ ان کے علاوہ انجیل کا قدیم ترین نسخہ (Codex Sinuitic) جو حال ہی میں طورسینا کے راہبوں سے خریدا گیا ہے اور جو چوتھی صدی عیسوی کا لکھا ہوا ہے۔

اگلے دن ۲ اگست کو میرے قدیم استاد اور زمانۂ حال کے ایک بڑے مورخ (R. B. Mowat) نے جو برسٹل یونیورسٹی کے میر شعبۂ فنون ہیں مجھے برسٹل بلایا تھا۔ موویٹ صاحب بے شمار کتابوں کے مصنف ہیں اور گو ۲۰ سال سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن اس دوران میں انھوں نے از راہ عنایت مجھ سے خط و کتابت برابر جاری رکھی۔ انگلستان میں قاعدہ ہے کہ بعض ریلیں ایسی ہیں کہ منزل مقصود سے پہلے کسی اسٹیشن پر نہیں کھڑی ہوتیں چنانچہ جس ریل سے میں برسٹل گیا اس نے ۱۲۰ میل کا فاصلہ بغیر کسی جگہ قیام کئے ہوئے دو گھنٹے میں طے کر دیا! برسٹل کے اسٹیشن پر اترتے ہوئے سب سے پہلے میں اکبر شاہ ثانی شہنشاہ ہند کے مشہور سفیر، ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے حامی اور زمانۂ حال میں ہندو مذہب میں نعرہ توحید بلند کرنے والے برہمو سماج کے مؤسس راجہ رام موہن رائے کی سمادھ پر گیا جو (Aornos cemetry) میں واقع ہے اور ہندوستانی طرز پر بنائی گئی ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر سال جاترا ہوتی ہے اور بہت سے برہمو آکر گویا تبرکہ کرتے ہیں۔ تعجب ہے کہ جو کتاب "رہنمائے برسٹل" میں نے خریدی اس میں اس سمادھ کا کہیں ذکر نہ تھا۔ قبرستان تمام یوروپی قبرستانوں کی طرح پھولوں سے آراستہ گویا پارک بنا ہوا تھا اور اس میں یہ سمادھ بہت بھلی

معلوم ہوتی تھی اس کے بعد میں برسٹل کا اسقفی گرجا دیکھنے گیا جس کے بعض حصے اینگلو سیکسن زمانے کے ہیں۔ یہاں سے موونٹ صاحب کے یہاں گیا۔ وہ اور ان کی اہلیہ صاحبہ نہایت ہی مہربانی سے پیش آئے۔ باوجودیکہ بیسیوں کتابوں کے مولف ہیں اور ہر وقت بس لکھتے ہی رہتے ہیں لیکن ذرا بھی تکبر یا نخوت نہیں پائی جاتی۔ ۷۶ برس کی ماں ہیں اور یہ یورپ کی آب و ہوا کی برکت ہے کہ ٹہلنے جاتی ہیں، خط لکھ لیتی ہیں، اخبار پڑھتی ہیں اور کھانے پر خوب ضدیں کرتی ہیں۔ کھانے کے بعد بھی خوب روشنی تھی۔ چنانچہ موونٹ صاحب اور مسز موونٹ مجھے لیکر یہاں کے مشہور Clifton Downs لے گئے۔ اس کے نیچے دریائے ایوون کا نظارہ اور مشہور کلفٹن پل قابل دید ہیں۔ رات کو انہیں کے مکان میں سویا۔

اگلے دن صبح ساڑھے نو بجے برسٹل سے چلا اور ٹھیک بارہ بجے آکسفورڈ پہونچا جہاں میرے پرانے استاد A.E.W. Hazel صاحب نے جو اب میرے کالج یعنی جیزز کالج کے پرنسپل ہیں، مجھے چائے پر بلایا تھا۔ بارہ بجے سے چار بجے تک اپنی پرانی جامعہ سے ملاقات کا احیا کیا۔ آکسفورڈ اس ۱۵ برس میں بہت بدل گیا ہے۔ شاید لارڈ نفیلڈ کے موریس موٹر کے کارخانے کی وجہ سے شہریت میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ مشہور آفاق Cornmarket کی سڑک کلیتہً ربڑ کی ہوگئی ہے اور اس میں بڑی بڑی دوکانیں بن گئی ہیں۔

چائے پر جانے سے پہلے میں نے چند کالج دیکھے۔ سب سے پہلے کرائسٹ چرچ گیا جس کا نفیس طعام خانہ کارڈنل وولزی نے ۱۵۲۹ء میں بنوایا تھا اور جس کی چیپل آکسفورڈ کا اسقفی گرجا ہے۔ اس گرجا کے بعض حصے ۱۱۰۰ء کے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں سے آکسفورڈ یونین ہوتا ہوا گرجا St. Michael گیا۔ جس کے بعض حصے ۱۰۰۶ء کے ہیں اور جس کے نیچے وہ قید خانہ تھا جس میں اپنی پھانسی سے پہلے کرینمر، رڈلی اور لاٹیمر جو انگلستان کے تین پروٹسٹنٹ شہدا تھے، قید رہے۔ اس کے بعد سینٹ ماڈلین گرجا دیکھا جس کے بعض حصے بارہویں صدی کے ہیں۔ نیز مرٹن کالج جسے کیمبرج کا سب سے قدیم کالج سمجھا جاتا ہے، سینٹ جان کالج جس کا باغیچہ نہایت نفیس ہے، بیلیل کالج جس کی ابتدا تیرہویں صدی میں پڑی اور جو ویکلف، لارڈ کرزن، لارڈ گرے، ایسکوتھ اور ریڈنگ کا کالج تھا۔ اور ماڈلین کالج ہوتا ہوا جیزز کالج آیا جہاں پرنسپل اور مسز ہیزل نے مجھے خوش آمدید کہا۔ جیزز کالج اس لئے ممتاز ہے کہ "اصلاح" کے بعد یہ پہلا کالج تھا جس کی آکسفورڈ میں تاسیس کی گئی۔ ہیزل صاحب نے اپنے ساتھ مجھے کالج کا ہال، چیپل اور پرانی چیزیں دکھائیں اور پرانی باتیں کیا کئے۔ میں ان کے ساتھ دو گھنٹے رہا۔ اس کے بعد آکسفورڈ کے عربی کے معلم پروفیسر گب سے ملنے گیا جن کے لئے لندن اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز کے معتمد روز صاحب نے مجھے خط دیا تھا۔ گب صاحب کو تاریخ فلسفہ سیاسیات اسلام پر جو میں نے کام کیا ہے وہ دکھایا اور ان سے مختلف تاریخی امور کے متعلق تبادلۂ خیالات کیا۔ پروفیسر صاحب نہایت

افسوس ظاہر کرتے تھے کہ ہندوستان سے جو طلبا آتے ہیں وہ عربی نہیں جانتے ورنہ عربی زبان میں تاریخ ہند پر عظیم الشان مواد ہے جس کا کسی نے تجربہ نہیں کیا۔ مثلاً تاریخ نہان ہند اور صوفیائے کرام کی تحریروں سے ابھی تک کافی استفادہ حاصل نہیں کیا گیا۔ محمود گاواں کے متعلق انھوں نے مشورہ دیا کہ کیمبرج کے عربی کے استاد پروفیسر (C.E Story سے (جو کسی زمانے میں علیگڈھ میں عربی کے پروفیسر تھے) مشورہ کروں۔ کاش کہ میں آکسفورڈ زیادہ ٹھیر سکتا لیکن مجھے لندن پہونچنا ضروری تھا اس لئے ۸ بجے کی گاڑی سے لندن گیا۔

اس کے دوسرے دن برطانوی نوادر خانے میں محمود گاواں اور سلطان محمد فاتح کے خطوط کی نقل جاری رکھی۔ شام کو پروفیسر اسٹوری (کیمبرج) کو خط لکھا کہ محمود گاواں کے متعلق کوئی خطوط وغیرہ کی براہ کرم نشان دہی کریں۔ نیز رفیع حیدری صاحب اور بیگم رفیع حیدری نے اپنے مسکن Palace Chambers میں چائے پر بلایا تھا وہاں گیا۔ اگلے دن ۵ اگست کو بھی محمود گاواں والے خطوط کی نقل جاری رکھی۔

۶ اگست کو صبح کے وقت ڈاکٹر میک لاغلن صاحبہ سے ملا جو بین الاقوامی تاریخی کانگریس کی فارایسٹرن کمیشن کی معتمد ہیں۔ جب میں نے مس میک لاغلن کو لکھا تھا تو انھوں نے خود میرے پاس آنے کے لئے کہا تھا لیکن اسی دوران میں برشل آکسفورڈ وغیرہ جانا ہو گیا۔ مس صاحبہ کیمبرج کے گرٹن کالج میں تاریخ کی لکچرار ہیں اور نہایت قابل بی بی ہیں۔ نہ صرف ایم اے پی ایچ ڈی ہیں بلکہ انھیں کیمبرج کے چوٹی کے تمغے (یعنی پرنس کانسرٹ تمغہ اور سیلی تمغہ) ملے ہیں جو کیمبرج کے طلبہ اور طالبات کے لئے اول درجے کا اعزاز ہے۔ میں نے مس صاحبہ سے کہا کہ جس کی ضرورت ہے اور جسے کانگریس میں بہت کم اہمیت دی گئی ہے وہ تاریخ ہند اور تاریخ اسلام ہیں۔ اسلامی انقلاب ایک عالمگیر انقلاب تھا اور ضرورت اس کی ہے کہ جس طرح مختلف ممالک کی ایک (Bibliography: ترتیب دی جارہی ہے اسی طرح اسلامی اثرات پر کتابیں لکھی ہوں ان کی فہرست ترتیب دی جائے اور اس میں جو کتابیں ولندستان جرمنی وغیرہ میں طبع ہوئی ہوں ان کا ذکر ہو۔ انھوں نے اپنی کمیشن کے اجنڈے میں یہ مسئلے داخل کر لئے۔ میں نے اپنی جامعہ کے جدید تخیل تاریخ ہند اور اس کی جدید تقسیم کا بھی ذکر کیا جس کی رو سے اب بجائے "ہندو، مسلم، برطانوی" ادوار کے اسے قدیم تا ۱۲۰۶ء وسطی ۱۲۰۶ء تا ۱۷۶۵ء معاصر از ۱۷۶۵ء میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ دلچسپ صحبت ڈیڑھ گھنٹے تک رہی۔

شام کے وقت میں پارلیمنٹ کے ایوانوں کو دیکھنے کے لئے گیا۔ اور منجملہ دوسری چیزوں کے بادشاہ کے کپڑے بدلنے کا کمرہ، ایوان امرا، ایوان عام شاہی تخت کی کرسی اور بہت سی دلچسپ اشیاء دیکھیں۔ یہاں سے واپس آکر برطانوی نوادر خانے میں قدیم یوروپی (زمانہ قبل تاریخ) اور مصری گیلری دیکھی جن میں سب سے دلچسپ

اور اہم سب ذیل اشیا تھیں۔

قدیم شاہان مصر کے مجسمے از ۲۰۰۰ ق م ' روزیٹا کا پتھر جس کے ذریعے سے قدیم مصری تحریر پڑھی جا سکی۔ ممیاں اور "مُردوں کی کتاب" یورپ کے پتھریلے زمانہ کی اشیاء اور اینگلو اسکیس اور شمالی زمانے کی برطانوی اشیاء وغیرہ۔

اگلے دن اتوار کی وجہ سے کتب خانہ بند تھا اس لئے زیادہ تر میں ہوٹل ہی میں مقیم رہا۔ شام کے وقت حیدرآباد کے صدیقی صاحب نے جو سٹی کالج حیدرآباد دکن میں مددگار ہیں اور جو تعلیم کا ڈپلوما لینے کے لئے آئے ہوئے ہیں مجھے International Club for Students دیکھنے بلایا تھا جو رسل اسکوائر میں واقع ہے۔ یہ کلب لندن یونیورسٹی اور عیسائی مشن سے متعلق ہے لیکن ہر مذہب والوں کے لئے کھلا ہوا ہے۔ بڑے بڑے کمرے مطالعہ خانے مباحثہ خانے۔ رہنے کے کمرے غرض اوسط طریقے پر ہر طرح آرام ہے۔ بہت سے ہندوستانی رکن بھی ہیں اور اکثر اعزازی طور پر مختلف ملک کے طلبہ کرتے ہیں۔ کلب پر عیسویت غالب معلوم ہوتی ہے۔

لندن سے چلنے میں صرف دو تین دن باقی رہ گئے تھے اس لئے کوشش ہے کہ اس قلیل عرصے میں محمود گاواں کے متعلق جو بھی مواد ممکن ہو اسے جمع کروں۔ پروفیسر اسٹوری کا خط آیا جس میں انھوں نے میرے استفسار پر ازراہ مہربانی کچھ حوالے دئے تھے۔ ان کتابوں کو برطانوی نوادر خانے میں دیکھا۔
رفیع حیدری صاحب بیگم رفیع حیدری صاحبہ اور ان کے بچوں کو چائے پر بلایا تھا وہ سب آئے۔

۹ اگست کو برطانوی نوادر خانہ جاکر کتاب "ظفرالدولہ" میں محمود گاواں کے متعلق جو اندراجات ہیں ان کا مطالعہ کیا۔ اس میں ایک حوالہ کتاب ضوءاللامع لاہل قرن التاسع کا تھا۔ یہ کتاب نوادر خانے میں تلاش کی اس کے بعد انڈیا آفس کے کتب خانے میں دیکھی لیکن کہیں پتہ نہیں چلا۔ اس پر پروفیسر اسٹوری کو خط لکھا کہ مہربانی کرکے مطلع کریں کہ یہ کتاب کہاں ملے گی۔ انڈیا آفس کے کتب خانے میں بہت سی ایسی نایاب چیزوں کا ذخیرہ ہے جو تاریخ ہند کے طالب علم کے لئے غایت درجہ دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہیں۔ اتنا وقت تو نہ تھا کہ جو نوادر یہاں تھے وہ سب دیکھتا لیکن حسب ذیل اشیاء دیکھنے کا موقع مل ہی گیا۔ اصل عہدنامہ ۱۷۶۵ء (یعنی صلح نامہ الہ آباد) جس کے بموجب بنگالہ، بہار، اوڑیسہ اور کرناٹک کے دیوانی اختیارات لارڈ کلائیو کے ذریعے سے انگریزوں کو ملے تھے؛ ٹیپو سلطان شہید کی بعض اشیاء مثلاً ان کے پڑھنے کا قرآن مجید اور ان کے خوابوں کی کتاب، شاہ عالم کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید، بعض انگریزوں کی مہریں جن پر شہنشاہ دہلی کی طرف سے جو خطابات "ملک" اور "جنگ" کے ملے تھے وہ اور "فدوی" بادشاہ وقت فارسی میں کندہ ہے۔ یہ سب چیزیں دیکھیں۔ افسوس یہ سب اشیاء بہت ابتر حالت میں رکھی ہیں۔ یہ تو ایسے نوادر ہیں کہ ان کے لئے ایک کمرہ بطور خاص علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا دن اسباب کے جائزے میں صرف ہوا۔ ۱۱/اگست کو چلنے کا دن تھا اور میں مایوس ہو چلا تھا کہ اسٹوری صاحب کا جواب اب کیا آئے گا لیکن صبح کی ڈاک سے کیا دیکھتا ہوں کہ میرے استفسار کے جواب میں ان کا خط آرہا ہے جس میں انھوں نے الضوء اللامع کا پورا پتہ مع صفحے اور جلد کے دیا ہے اور لکھا ہے کہ کتاب ۱۳۵۵ھ میں طبع ہوئی۔ اور غالباً اس وقت تک برطانوی نوادر خانے کے کارڈ انڈکس پر نہ آئی ہوگی اس لئے مشرقی مطالعہ خانے جاکر فلاں شخص سے دریافت کیا جائے۔ مجھے اس کتاب کی بڑی ڈھونڈ تھی۔ اس لئے کہ شائد یہ واحد معاصر کتاب ہے جس میں محمود گاواں کے حالات درج ہیں۔ باوجودیکہ انگلستان کو خیرباد کہنا تھا لیکن سب کام چھوڑ کر نوادر خانہ گیا اور مشرقی مطالعہ خانے والوں کو اسٹوری صاحب کا خط دکھایا۔ آخر کار کتاب مل گئی۔ میں نے اس کے وہ حصے جو محمود گاواں سے متعلق تھے نقل کئے۔ انگریز علماء جنھیں ہمارے یہاں کے عالم ہیچ سمجھتے ہیں حقیقت میں بڑے متبحر ہوتے ہیں۔ کہاں محمود گاواں کا ایک عربی کتاب میں ذکر کہاں کیمبرج کے ایک پروفیسر کی اس قدر باخبری! حقیقت میں یہی لوگ دنیا کی بادشاہت کے مستحق ہیں!

۱۰ بجے کی گاڑی سے وکٹوریا اسٹیشن سے روانہ ہوا۔ ہماری اسباب راست پیرس کو رجسٹری کرانا پڑا۔ ۱۲½ بجے ڈوور بغیر راستے میں کسی جگہ رکے ہوئے پہنچے۔ پانچ سے ۶½ بجے تک رودبار انگلستان کو عبور کیا۔ ۱۰½ بجے پیرس۔ جہاز نہایت تیز تھا اور ہوا تند۔ چونکہ پیرس میں بارش ہو رہی تھی اس لئے اسٹیشن کے قریب ہی ایک ہوٹل میں قیام کیا تاکہ دوسرے دن "قومی کتب خانہ" تلاش کر لے اسی کے قریب کسی ہوٹل میں منتقل ہو جاؤں۔

ہارون خاں

غزل

جب کبھی کاری لگی ضربِ جنوں — عقل کے ماتھے سے پھوٹی جوئے خوں
تیشۂ فرہاد کی جھنکار سن — موم ہے ہمت کے آگے بے ستوں
خواب ہیں اہلِ نظر کے سامنے — جلوہ ہائے دولتِ دنیائے دوں
قوتِ تدبیر بھی کچھ کم نہیں — بے عمل تقدیر کو روتا ہے کیوں

مہربانی تھی نگاہِ حسن کی
دل کی بربادی کا قصہ کیا کہوں

سکندر علی وجد

معاشرت میں سادگی

چوتھی قسط

ہماری موجودہ معاشی و اقتصادی پستی کے مدنظر اس وقت ہمیں اپنی معاشرت کی اصلاح اور فضول رسم و رواج و توہمات کے انسداد کی شدید ضرورت ہے۔

دورِ جدید کی نظر فریب طرزِ زندگی اور اس کی دلچسپیوں میں ہم کچھ ایسے کھو گئے ہیں کہ کبھی بھول کر بھی ہم کو اپنی اصلاح کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جو قوم مفلس ہوتی ہے اس میں اظہارِ قابلیت کی صلاحیت عموماً معدوم ہو جاتی ہے اور جس قوم میں کوئی صلاحیت نہ ہو وہ دوسری اقوام کے ساتھ شاہراہِ ترقی پر کس طرح گامزن ہو سکتی ہے ہماری قوم کا افلاس حد سے سوا ہو گیا ہے اور ہم پر ادبار و نکبت کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، مگر ہماری آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں، اور ہم کچھ ایسے محوِ خواب ہیں کہ

حشر تک جاگنا قسم ہے!

دنیا میں شاید ہی کوئی قوم اس قدر مفلس ہونے کے باوجود اتنی مسرف ہوگی! افلاس اچھی طرح ہم پر مسلط ہو چکا ہے مگر ہم اپنے فضول رسم و رواج میں پیسے پیسے روپے کا خون کرنا عین وضع داری خیال کرتے ہیں، تجارت زراعت یا صنعت و حرفت کے کسی پیشے کو اختیار کرنا عار اور اپنی شان کے خلاف ہے۔ مگر بیہودہ رسم و رواج کی خاطر قرض خواہوں کی دام دوپٹ ڈگریوں میں اپنے آباؤ اجداد کی جائیدادیں نیلام چڑھوانا شان وضع داری ہے!!

ہم اپنی معاشرت کو اپنے ہاتھوں آئے دن گراں بنا رہے ہیں اور اپنے معیارِ زندگی کو دوسری متمول اقوام کی اندھی تقلید میں بتدریج اونچا کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں ہماری معاشی اور اقتصادی حالت روز بروز بدتر ہوتی جا رہی ہے، ہمارا خرچ ہماری آمدنی سے سوا ہو گیا ہے اور ہم قرض کے شکنجوں یا ساہوکاروں کے پنجوں میں بری طرح پھنستے جا رہے ہیں۔ مغربی قوموں کی تقلید کے عوض اگر ہم اپنی ہمسایہ قوموں کی ایک حد تک تقلید کریں اور باوجود مال و دولت کی فراوانی کے ان کی سادہ زندگی سے سبق حاصل کریں تو بیجا نہ ہوگا۔

جن مغربی قوموں کی اندھی تقلید میں ہم اپنی معاشرت کو گراں اور اپنے معیارِ زندگی کو بلند کر رہے ہیں وہ قومیں اپنے معیارِ زندگی کو اس لئے اونچا کر رہی ہیں کہ جس رفتار سے ان کی زندگی کی ضرورتوں میں اضافہ ہوتا جائے گا اسی رفتار سے ان میں کسبِ معاش کا خیال خود بخود ترقی کرتا جائے گا اور اس سلسلے میں وہ اپنے بنی نوع کی امداد و اعانت کرنے کے قابل ہو سکیں گی اور بے روزگاری کا بتدریج قلع قمع ہوتا جائے گا۔ مغربی اقوام کا یہ اصول ضرور قابلِ ستائش ہے کیونکہ وہ اپنے اس خیال کو بحسن و خوبی عمل میں لا رہی ہیں مگر باوجود ان کی ان تھک کوششوں کے اب تک بے روزگاری کا انسداد نہ ہو سکا۔

ہم مشرقی جو مغرب کی اندھی تقلید کرنا اپنا دین و ایمان سمجھتے ہیں، آئے دن زندگی کے معیار کو تو بڑھاتے جا رہے ہیں مگر مغربی قوموں کی طرح کسبِ معاش اور صنعت و حرفت کی طرف بالکل متوجہ نہیں جس کی وجہ ہمارے افلاس میں روزافزوں اضافہ ہو رہا ہے، آمدنی کی کمی اور خرچ کی زیادتی ہماری آمد و خرچ کے توازن کو بری طرح گرا رہی ہے، اس توازن کو برقرار رکھنے کی ایک ہی تدبیر ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے ضروری اخراجات کا تعین

کرلیں اور اس امر کا لحاظ رکھیں کہ آمدنی کا کتنا فیصد کس مد پر صرف کیا جانا چاہیئے اور کتنا غیر مرئی آنے والی ضرورتوں کے لئے مدِ محفوظ میں رہنا چاہیئے' اس طرح اگر ہم اپنا بجٹ بنالیں اور اپنی زندگی کے معیار کو اپنی آمدنی کے لحاظ سے گھٹادیں تو ہمارا افلاس بڑی حد تک دور ہوسکتا ہے اور زندگی کی حقیقی مسرتیں ہمیں حاصل ہوسکتی ہیں۔

ہمارا کوئی گھر ایسا نہیں جہاں سال میں دوچار بلکہ دس پانچ فضول تقریبیں نہ ہوتی ہوں اور قرض کے روپے سے پرتکلف دعوتیں اور رقص وسرود کی رنگین محفلیں برپا نہ کی جاتی ہوں' ہماری قوم کا مسلک یہ ہے کہ انسان صرف کھانے اور اڑانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے' یا لباسِ فاخرہ پہن کر اپنی جھوٹی شان' وشوکت کا مظاہرہ کرنے کے لئے عالم وجود میں آیا ہے' خواہ اس قسم کی نمائش میں جگ ہنسائی کی نوبت ہی کیوں نہ آئے اور ذلت وخواری کی حد وانتہا ہی کیوں نہ ہوجائے!

بچے کی تاریخِ پیدائش سے لے کر عمرِ طبعی کو پہونچ کر دوسری دنیا میں سدھارنے تک بلکہ اس کے بعد بھی کوئی نہ کوئی تقریب ایسی ہوتی رہے جس کی وجہ سے گھر میں خاصی چہل پہل ہو اور صاحبِ خانہ کی میزبانی' دریادلی اور خوش سلیقگی کے خوب چرچے ہوا کریں' چاہے اس میزبانی میں میزبان صاحب کی عزت وآبرو پر ایک دن پانی ہی کیوں نہ پھر جائے اور گھر کا اچھی طرح صفایا ہی کیوں نہ ہوجائے!

بچہ پیدا ہوتے ہی فضول اور غیر اسلامی رسموں کا طوفان برپا ہوجاتا ہے "چھٹی" "چھلہ" بوٹ چٹائی' ناک چھدائی وغیرہ وغیرہ ان فضول رسموں کا کرنا واجب اور قرض لے کر پرتکلف ضیافتیں کرنا لازم ہوجاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر بچے کے لئے قیمتی زریں لباس تیار کیا جاتا ہے' بچے کے ساتھ اس کے محترم والدین بھی "مرغ زریں" بن جاتے ہیں۔ اور اعلیٰ پیمانے پر دعوتیں کی جاتی ہیں۔ بعض گھروں میں چھٹی' چھلہ کی تقریبیں کچھ اس طرح منائی جاتی ہیں کہ گویا بچے کی پیدائش کوئی عجیب وغریب بات ہے یا بچہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے۔ گھر کی یہ فضا بچے کو بسم اللہ کے گنبد میں بٹھا دیتی ہے اور کچھ ایسے نازونعم اور بیجا لاڈ پیار میں اس کی پرورش ہوتی ہے اور اس کی ذہنیت پروان چڑھتی ہے کہ وہ بڑا ہوکر اپنے عاقبت نااندیش والدین کے نقشِ قدم پر چلتا ہے اور آگے چل کر اسی قسم کی لغویات اور خرافات کا عادی ہوجاتا ہے۔

چھٹی' چھلہ وغیرہ وغیرہ کا بوجھ ابھی ہلکا نہیں ہونے پاتا کہ نامراد سالگرہ کی تقریب قریب آتی ہے۔ سالگرہ بھی کیسی؟ پہلی سالگرہ!!! اس میں تو خوب ہی کھول کر روپیہ سستی کرنا چاہیئے! برس کا یہ ایک دن بھلا بار بار کہاں آتا ہے!! نوبت نقارے کے ذریعہ یا ڈنکے کی چوٹ سالگرہ کا اعلان ہوتا ہے۔ اور ایک شاندار دعوت کے ساتھ کسی اچھی جان کا مجرا بھی کرایا جاتا ہے' غرض کہ

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق!!

مگر اس رونق کے سلسلے میں ایک دن وہ بھی آتا ہے کہ نوبت نقارے کے عوض نیلامی ڈگری کا "نوحۂ غم" سننا پڑتا ہے کیونکہ ہماری اکثر وبیشتر تقریبیں کسی نہ کسی ساہوکار کی شرمندۂ منت ہوا کرتی ہیں۔ جھوٹی شان وشوکت کے مظاہرہ میں

ہماری قوم کی حالت بد سے بدتر کر دی ہے مگر ہم کو اپنی تقریبوں
کی خوش سلیقگی اور تکلف پر بڑا فخر و ناز ہوتا ہے کہ ایسے
پیمانے پر ہماری تقریبیں ہوا کرتی ہیں کہ ہر مہمان ہمارے
سلیقے اور فراخ دلی کی جی کھول کر داد دیتا ہے اور ہر جگہ
ہماری خوب واہ واہ ہوتی ہے اگرچہ کہ کسی دن اس
"واہ واہ" کے سلسلے میں قرض کی ڈگریاں "ہائے وائے"

پہلی سالگرہ کی تقریب سے نجات بھی نہیں ہونے پاتی ہے
ایسے میں ختنہ یا لڑکی کی ناک اور کان چھدائی کی تقریب
آ پہونچتی ہے یہ تقریب بھی اسی روایتی آن بان سے
منائی جاتی ہے ورنہ والدین کے ساتھ سارے خاندان
کی ناک کٹ جانے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ یہ سب خرافات
اور لغویات واجبات سے سمجھے جاتے ہیں، خواہ ان "واجبات"
کی سربراہی اور انجام دہی میں ایک دن سارا اثاث البیت
ہی کیوں نہ نیلام کرانا پڑے! ان تقاریب کے ساتھ ساتھ
ہر سال دھوم دھام سے سالگرہ کرنا فرض ہو جاتا ہے، اگر
یہ رسم کسی سال ناغہ ہو جائے تو بڑی بدشگونی سمجھی جاتی ہے
اور بچے کی جان اقسام کے نام نہاد خطروں میں گھر جاتی ہے۔
چوتھا سال شروع ہوتے ہی والدین کو تسمیہ خوانی
یا "بسم اللہ" کی فکر لگ جاتی ہے، اس رسم کو بڑی اہمیت دی
جاتی ہے، اور اب تک جتنی تقریبیں ہوئی تھیں ان سب سے
اعلیٰ پیمانہ پر یہ تقریب سعید منائی جاتی ہے۔ بیش قیمت زرین لباس
وہی کھانے کھلانے کی پرتکلف دعوتیں، رقص و سرود کی رنگین
محفلیں، شاندار آتش بازی کا دھواں دھار مظاہرہ، ان
سب پر مستزاد یہ کہ "بسم اللہ" کے نوشہ کی برات گھوڑے
یا موٹر پر چکا چوند کرنے والی روشنی، فضا کو گندہ کرنے والی
آتش بازی اور کان پھاڑ باجوں کے ساتھ عزیز و اقارب
اور دوست احباب کی پلٹن کی ہمراہی میں دو چار گھنٹے
کی گشت کے بعد بخیر و خوبی گھر لوٹتی ہے۔

چھٹی، چھلہ، عقیقہ، ختنہ، ناک چھدائی، کان چھدائی
سالگرہ، بسم اللہ وغیرہ میں روپے کا جو دریا بہایا گیا تھا اس کا
اثر والدین کی اقتصادی حالت کو برسوں سنبھلنے نہیں دیتا۔
قرض کی رقم تو رہی ایک طرف اس کا سود تک ادا کرنا دشوار
ہو جاتا ہے۔ والدین اپنے اس چشم و چراغ کی مسرت افروز
روشنی میں کچھ ایسے کھو جاتے ہیں کہ ان کو اپنے برے
بھلے کی کوئی سدھ نہیں رہتی، انکی ناسمجھی اور شیفتگی آپ ہی کی
وجہ کسی دن یہ "گھر کا چراغ" سارے گھر کو پھونک دیتا
ہے اور ایک دن وہ بھی آتا ہے کہ

"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

کہنا پڑتا ہے، بعض حضرات تو قرض کے شعلوں میں بالکل
ہی بھسم ہو جاتے ہیں اور بعض جو نیم سوختہ ہوتے ہیں انہیں
چند سال کے بعد اپنے اس آتش افروز چراغ کی روز کتخدائی
کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ اس تقریب کو بھی فرض سے ہٹ کر
لغویات کا مظہر بنا دیا جاتا ہے، اس میں بھی وہی جھوٹی
شان و شوکت کا مظاہرہ اور اسراف کی نمائش کی جاتی
ہے۔ نام و نمود کا شوق ہماری طبیعتوں میں کچھ ایسا راسخ
ہو گیا ہے کہ جب تک ہر تقریب میں جی بھر کر فضول
خرچی نہ کریں چین ہی نہیں پڑتا۔ (باقی)

مرزا سیف علی خاں

سکون و اضطراب

کس کی آرزو میں ہوں؟ آہ کیسی بدنامی!
کس کی جستجو میں ہوں؟ واہ کیسی ناکامی!

جس پہ جان دینے کی ہے مری وفا حامی
مجھ سے ہے خجل اس کے التفات کی خامی

حسن، دلربا کیوں ہے؟ حسن آفریں جانے
میں تڑپ گیا سن کر یہ جواب الزامی

مانتا ہوں کیفیت در بیاں نمی گنجد
جانتا ہوں میں ہی کچھ لطفِ خوش کلامی

نامرادیں ہی تھا بامرادیں ہی ہوں
لطفِ کامیابی ہے رازِ رنجِ ناکامی

بے سبب دل آزاری ہے جب اتنی جانِ سرور
کتنی جاں فزا ہو گی اے حسیں دل آرامی

بند ہو گئیں منظور آج بے قرار آنکھیں
دور ہو گئی شاید تھی جو عشق میں خامی

مست کیا کرے مجھ کو بادۂ خمِ جامی
مختص ان سے تھا ان کا حالِ مے آشامی

اپنے عہد کا ساقی ہر نقیبِ دوراں ہے
کیف بخش میخواراں اب نہیں ہے "خیامی"

کام آئی غیروں کے جن کی بیخودی کل تک
لے رہا ہوں میں ان سے آج درسِ خودکامی

لاج اس تلون کی میری عقل رکھ لے گی
عامیوں میں ہوں عارف عارفوں میں ہوں عامی

فرقِ ظاہر و باطن کیا مجھے بنا دے گا
احتساب کا دشمن انقلاب کا حامی

ہے بشارتِ ذہنی انقلابِ آئندہ
جلد مٹنے والا ہے فرقِ حامی و سامی

عام ہو گی ہمدردی اور دینِ فطرت کی
غیر مسلموں میں بھی ہو گی شانِ اسلامی

رنگ تھا یہی منظور ارتقا پسندوں کا
بیسویں صدی کی ہے یہ غزل بھی الہامی

علی منظور

لمباڑے

لمباڑے یا بنجارے دکن کے قدیمی باشندے ہیں، جنگلوں میں کھلی فضا میں اپنی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنا کر رہ پڑتے ہیں۔ خانہ بدوشی ان کی عادت ہے۔

یہ لوگ اہلِ ہنود سے ہیں، جہالت و توہمات نے جو ان کا وتیرہ ہے، انھیں بہت پست درجہ کا بنا رکھا ہے۔ یہ لوگ ممالکِ محروسہ سرکارِ عالی کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں جنگلی جانور اور درندے جو بھی ان کا شکار ہوں، یہ اسے چٹ کر جاتے ہیں۔ ان کی بولی خاص ہوتی ہے، مگر مقامی زبان بھی بول لیتے ہیں۔

صدی پون صدی پہلے جب کہ ریلوے اور موٹر حمل و نقل کے ذرائع نہ تھے، یہ قوم کافی مالدار ہوا کرتی تھی۔ کثیر مویشی، گائے بیل ان کی ملکیت ہوا کرتے۔ جو "لمباڑوں کے تانڈے" کے نام سے مشہور تھے ان پر وہ نمک وغیرہ دور دور سے لاکر بیچتے تھے اور جب کبھی موقع ملتا جنگلوں میں مسافروں کو لوٹ بھی لیا کرتے ان کی وحشیانہ حرکتوں، ان کے جرائم، ان کی جرأت سے لوگ خائف رہتے تھے، خاص کر ان کی ہیئت کذائی بھی مرعوب کرتی۔

لیکن اس روشن زمانے میں جب کہ لوٹ مار کے موقعے باقی نہیں رہے اور نہ ان کی تجارت! اس لئے یہ لوگ مفلس ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور ان کے وہ تانڈے شاذ ہی کسی کے پاس ہوا کرتے ہیں۔ اب بسر اوقات کے لئے کچھ لوگ زراعت بھی کرنے لگے ہیں۔ ملازمت اور مزدوری بھی کرتے ہیں۔ ان کی عورتوں نے شہروں میں اپنا ناچ دکھا کر بھیک مانگنا بھی شروع کر دیا ہے۔

لمباڑنوں کا لباس خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ ایک لباس دو دو سال ان کے استعمال میں رہتا ہے۔ ایک دفعہ نیا پہننے کے بعد وہ پھٹ کر ہی اترتا ہے۔ یہ بڑے اور خوب گھیر دار لہنگے پہنتی ہیں، جو پنڈلیوں تک آتے ہیں۔ اس پر وہ اپنے ہاتھ سے کام نکالا کرتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گول آئینہ اور ابرک کے ٹکڑے کمر کے حصے میں کئی کئی قطاروں میں ٹانکا کرتی ہیں، جو مثل بلٹ کے نظر آتا ہے۔ ان کے اطراف مثل "ہولڈے" کے سیا کرتی ہیں۔ ایک طرح کی چولی یا انگیا پہنتی ہیں جس سے سامنے کا تمام حصہ لہنگے تک پوشیدہ رہتا ہے۔ اس میں بڑی بڑی جیبیں اور گلا کھلا ہوتا ہے۔ اس کے گوٹ بطور پھننگ کے لگایا کرتی ہیں۔ پیچھے پیٹھ کا تمام حصہ کھلا ہوتا ہے۔ اس پر ایک اوڑھنی جو پیچھے پیٹھ پر سے لے کر اوڑھ لیا کرتی ہیں۔ ان کا یہ لباس رنگین اور چھاپے کی کھادی کا ہوتا ہے ان کے زیورات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ خوب چوڑی ہڈیوں کی چوڑیاں کہنیوں تک پہنتی ہیں۔ اس کے آگے چاندی کی پٹیاں بھی ڈال لیتی ہیں۔ ہر ایک لمباڑن خاص قسم کے چاندی کے کرن پھول جو بڑے بڑے ہوتے ہیں پہنتی ہیں۔ یہ کان کے نزدیک بالوں کی لٹ میں باندھ لئے جاتے ہیں۔ بالوں کا سنگار اس طرح ہوتا ہے۔ بالوں کی پٹیاں بھنوں تک لائی جاتی ہیں اور سامنے سے پتلی چوٹی "مہریاں" کانوں تک گوندکر چوٹی ڈال لیا کرتی ہیں۔ گلے میں گلبوں وغیرہ کے

کئی کئی ہار ہوتے ہیں۔ اکثر پاؤں میں بھی چاندی کے زیور پہنتی ہیں۔

ان کا رقص خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ کئی کئی عورتیں ایک حلقہ سا بنا لیتی ہیں۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں کو کبھی سر سے اونچا اور کبھی جھک کر اور کمر سے خم کھا کر نیچے تک لیجاتی ہیں اور ہاتھوں کو خاص انداز سے حرکت بھی دیتی رہتی ہیں۔ نیز زمین پر پاؤں بھی ایک انداز سے ارتی جاتی ہیں۔ جن سے زیور کی چھن چھن کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ اپنی خاص زبان میں گاتی جاتی ہیں۔ گیت وہی فطری سادہ اور دیہاتی زندگی کا نقشہ ہوتے ہیں۔ ایک شعر کے معنی سن لیجئے۔

"اے میرے اچھے ماموں میری ممانی کو نہ مار اس نے کھانا پکایا مگر ہنڈیا کوئی اٹھا لے گیا' اے میرے اچھے ماموں میری بے قصور ممانی کو نہ مار"

مگر آواز اتنی بلند اور کرخت ہوتی ہے کہ سننے والوں کا سر چکرانے لگتا ہے۔ حیدرآباد کے اطراف و اکناف میں بھی بہتیرے لمباڑے آباد ہیں۔ حیدرآباد کی وہ پر فضا پہاڑی جو اب "بنجارہ ہل" یا "جوبلی ہل" کے نام سے مشہور اور عالی شان و خوش نما عمارتوں سے مزین ہے، پہلے ان ہی بنجاروں کا مسکن تھا۔ اب بھی اس کے قریب لمباڑے موجود ہیں۔

اس موقع پر محترمہ مسز امیر حسن صاحبہ کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا جو حیدرآباد کی ایک مشہور مگر خاموش کام کرنے والی خاتون ہیں۔ آپ جوبلی ہل پر رہتی ہیں۔ اور لمباڑنوں کی اصلاح و ترقی کے ضمن میں نمایاں کام کیا ہے۔ انھیں حفظانِ صحت وغیرہ جس سے وہ نابلد ہوتی تھیں، بڑی حد تک واقف کرا دیا ہے۔ لمباڑنیں اپنی خاص سوزن کاری میں دست گاہ رکھتی ہیں۔ محترمہ موصوفہ نے ان کو ریشمی تاگوں، باریک قینچیوں وغیرہ کا استعمال سکھایا ہے اور ان سے مزدوری سے اپنی نگرانی میں ریشم و اطلس وغیرہ کی باڈروں پر ان کی اپنی صنعت کا کام نکلواتی ہیں۔ اس میں چمکتی ہوئی ٹکیوں کمخواب کے ٹکڑوں وغیرہ کا استعمال اور نفیس "ہول ورک" نہایت باقاعدہ و دیدہ زیب۔ ڈزائین دیکھ کر اس جدت طرازی و خوش نمائی پر عش عش کرنا پڑتا ہے۔ یقین نہیں آتا کہ یہی گنوار لمباڑنوں نے یہ کام نکالا ہے۔ جو بے حد پُر تعجب و جاذبِ نظر ہوتا ہے۔ اور یہ عمدہ و قیمتی باڈریں اس قابل ہو جاتی ہیں کہ مہذب و معزز خواتین نہایت شوق سے اسے استعمال کر سکیں۔

حقیقت میں یہ تمام محترمہ بیگم امیر حسن صاحب کی محنت و جانفشانی کا نتیجہ ہے جنھوں نے ایک وحشی قوم کو مانوس کر کے ان کی صنعت کو اس قدر ترقی دی ہے۔

کاش! اسی طرح وسیع پیمانہ پر ان کی سرپرستی کی جا سکتی، اس طرح اس قوم کی جو مفلسی کا شکار ہے۔ ان کی بسر اوقات ہو سکتی، اور ہمیں بھی اپنے لباس و آرائشی اشیاء کے لئے اپنے ملک کی خاص چیز میسر آ سکتی مگر ــــ کس میں ہے یہ ہمت و استقلال!

حفیظہ جمال، متعلمہ بشیر الدین ہائی اسکول [illegible]

مالن

چاند اور تارے رہ گئے تکتے — پھول بچارے رہ گئے تکتے
ننھے شرارے رہ گئے تکتے — مالن کتنی البیلی ہے

کوئل گاتی رہ گئی ظالم
شور مچاتی رہ گئی ظالم
راگ سناتی رہ گئی ظالم
مالن کتنی البیلی ہے

کلی کلی کا دم گھٹتا ہے
قافلہ عشرت کا لٹتا ہے
دل میں ظالم درد اٹھتا ہے
مالن کتنی البیلی ہے

پھولوں کی معصوم جوانی
تاروں کی ہے پریم کہانی
اللہ اللہ! یہ سب فانی
مالن کتنی البیلی ہے

باغ کا والی فریادی ہے
ڈالی ڈالی فریادی ہے
بھولا مالی فریادی ہے
مالن کتنی البیلی ہے

کون ہے اس کی پریت کا مارا — اتنا مہ صورت اتنا پیارا
صبح طرب کا روشن تارا — مالن کتنی البیلی ہے

انسب کلیانوی
(گرگنڈ)

موت سے!

نہ چھیڑ "موت" ذرا مجھ کو اور جینے دے!

ابھی تو "مہر درخشاں" سے نور مانگا ہے
ابھی تو "مسند انجم" بچھائی ہے میں نے

ابھی تو "برق تپاں" سے لی ہے مجھ کو تڑپ
ابھی تو "موج جوانی" اڑائی ہے میں نے

ابھی تو گردش لیل و نہار دیکھی ہے
ابھی تو "کشتیٔ ارماں" سجائی ہے میں نے

ابھی تو "ربط ہستی" کے تار چھیڑے ہیں
ابھی تو "دولت احساس" پائی ہے میں نے

ابھی تو "حسن ازل" کا ہوا ہوں مدح سرا
ابھی تو "شعر کی محفل" جمائی ہے میں نے

ابھی تو جذبۂ "رومان داد" کے صدقے
نقاب "چہرۂ رنگیں" اٹھائی ہے میں نے

ابھی تو "شاہد رعنا" کی عشوہ ریزی سے
"حریم شوق" پہ بجلی گرائی ہے میں نے

ابھی تو "حسن گریزاں" کے چند جلووں میں
شباب و کیف کی بستی بسائی ہے میں نے

ابھی تو "چشم غزالیں" کے اک اشارے پر
سکون و چین کی دنیا لٹائی ہے میں نے

ابھی تو "محفل رنداں" میں روح پھونکی ہے
ابھی تو شہرِ ہستی لٹائی ہے میں نے

ابھی تو "درد وطن" سے ہوا ہے دل معمور
ابھی تو جبر کی بنیاد ڈھائی ہے میں نے

نہ چھیڑ "موت" ذرا مجھ کو اور جینے دے
شباب و کیف کے رنگین جام پینے دے

مرتضیٰ مجتہدی

جنم پتری

ہم آپ کو اُن لوگوں کے کیریکٹر اور واقعات سناتے ہیں جو ۲۳ جولائی سے لے کر ۲۱ اگست تک پیدا ہوئے ہیں مگر یہ خیال رہے کہ یہ حالات بالکل عام ہوں گے۔ اگر اس سے زیادہ حالات اور خاص خاص باتیں معلوم کرنی ہوں تو [illegible] کے علاوہ پیدائش کا روز، صحیح وقت اور سنہ کی ضرورت ہوتی ہے پھر حساب کرنے کے بعد اس شخص کی تفصیلی کیفیت اور اہم خصوصیات بتائے جاتے ہیں۔

۲۲ جولائی سے ۲۱ اگست تک آفتاب برج اسد میں رہتا ہے۔ اسد کا تعلق دل سے ہے جس سے دلیری اور ہمت پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے جو لوگ اس زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں یہ صفتیں ان میں خاص طور پر پائی جاتی ہیں جوانی میں نڈر، چوکنے، شیر دل اور سمجھ دار ہوتے ہیں مگر بچپن میں ان لوگوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ہمیشہ کسی نہ کسی خیال میں ڈوبے رہتے ہیں اور گھنٹوں اکیلے بیٹھے ہوئے خیالی پلاؤ پکاتے رہتے ہیں۔ اگر ابتدا سے انھیں کسی رستے پر لگا دیا جائے تو اس خیالی فضا سے نکل کر عملی میدان میں دوڑ دھوپ شروع کر دیتے ہیں ورنہ اپنے ساتھیوں اور قریب ترین لوگوں کے عادات و اطوار اختیار کر لیتے ہیں۔

جو لوگ اس زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں وہ کسی چیز کو تفصیل سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کو بحیثیت مجموعی دیکھنا پسند کرتے ہیں یہ لوگ بلند خیال، عالی حوصلہ اور دلیر ہوتے ہیں۔ ادنیٰ درجے کا مذاق اور معمولی کاروبار سے انھیں نفرت ہوتی ہے۔ ان کے بڑے بڑے خیالات ہوتے ہیں اور ہر کام کو وسیع پیمانہ پر انجام دینے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ یہ لوگ فیاض، [illegible] کشادہ دل، بیباک، صاحب عزت اور صاحب [illegible] ہوتے ہیں اور ان میں انتظامی قابلیت بھی بہت اچھی ہوتی ہے۔ یہ لوگ خاص خاص اصولوں کے پابند، خود رائے اور صاحب [illegible] ہیں اور فوراً اپنی رائے کا اظہار کر دیتے ہیں۔

یہ لوگ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے مقابلے میں جرأت و بے پروائی برتتے ہیں۔ انھیں اپنی طاقت اور قوت پر گھمنڈ [illegible] ہمیشہ بات کو ٹالتے رہتے ہیں مگر جب غصہ آتا ہے تو چیتے کی طرح جھپٹتے ہیں اور شیر کی طرح پل پڑتے ہیں۔ ان کی طبیعتیں عام طور پر رحم اور بخشش کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ یہ ہمدرد، [illegible] اور نہایت شریف ہوتے ہیں۔

ان لوگوں کا ایک عدد ہے۔ اور یہ ایک عدد آفتاب کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ روشن دماغ، غیر معمولی طور پر ذہین اور طباع ہوتے ہیں۔ ان میں نئی نئی باتوں کی چھان بین، علم کی تلاش اور ایجاد کا مادہ ہوتا ہے۔ یہ اپنے ارادوں کے پکے اور دھن کے پورے ہوتے ہیں۔ طبیعت میں ضد اور ہٹ ہوتی ہے اور مزاج میں [illegible] پائی جاتی ہے۔

عام طور پر یہ ایک عدد ان لوگوں کا [illegible] کی بھی [illegible] ۹ [illegible] اثرات ان پر خصوصیت سے پائے جاتے ہیں جو ۲۲ جولائی سے ۲۱ اگست تک پیدا ہوئے ہوں۔ [illegible] ہوتے ہیں۔ [illegible] اور بے پروائی سے سخت نفرت ہوتی ہے

کمزوریاں

ان میں ایک بڑی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ یہ اپنی موت اور کارگذاریوں پر مغرور ہوجاتے ہیں اور اکثر خود ستائی پر اُتر آتے ہیں بعض بڑے تند مزاج اور مغلوب الغضب ہوتے ہیں۔ خود کو دلیر اور جواں مرد ثابت کرنے کے لئے دوسرے کی جان لینا ایک کھیل سمجھتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے خیالات اِس قدر اونچے ہوتے ہیں کہ معمولی سے معمولی کاروبار کی تکمیل میں ہزاروں دشواریاں پیدا ہوجاتی ہیں۔

دوست احباب

اِن کے دوست احباب کا حلقہ بہت وسیع ہوتا ہے مگر اصلی معنوں میں جو دوست ہیں وہ دو چار ہی ہوتے ہیں۔ خصوصاً اُن لوگوں سے تو بہت گاڑھی چھنتی ہے جو خود اُن کے زمانے میں پیدا ہوئے ہوں یا جن کی پیدائش جنوری، نومبر یا دسمبر کے مہینے میں عمل میں آئی ہو۔

پیشہ یا کاروبار

یہ لوگ ترقی کرکے بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ سرکاری ملازمت ہو یا غیر سرکاری یہ اپنے فرائض بڑی محنت، دیانت داری اور بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے کام کو نہایت صلاحیت اور قابلیت سے کرتے ہیں۔ عورتیں بہترین شاعر، ادیب، مضمون نگار اور موسیقی کے فن میں ماہر ہوتی ہیں۔ ان کا رجحان بچوں کی تعلیم و تربیت کنڈر گارٹن، مانٹسوری اور اسی قسم کے فنون پر زیادہ ہوتا ہے۔ انھیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس، کام کرنے شوق اور اپنے فرائض کی انجام دہی کا ذوق ہوتا ہے مگر عیب یہ ہے کہ کسی کی ماتحتی کرنا انھیں مطلق گوارا نہیں۔

صحت اور بیماریاں

ان کی جسمانی قوتیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ اگر احتیاط برتیں تو صحت اور تندرستی کے ساتھ بڑی عمر تک پہنچ جاتے ہیں۔ اِن لوگوں کو عام طور پر دل جگر گلے اور سینے کی بیماریاں کثرت سے ہوتی ہیں۔ بڑھاپے میں خون کے دباؤ، اختلاج، گٹھیا اور آنکھوں کے مرض میں بھی اکثر مبتلا ہوجاتے ہیں۔

۱۹ اور ۵۵ سال کی عمر میں ان کی صحت میں اہم تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ ساتویں سال سے ۱۴ سال کی عمر تک حلق کی بیماریوں کا اندیشہ ہے۔ ۲۰ سے ۲۵ سال تک دل اور جگر کی بیماریوں کا خوف ہے۔ انھیں ۴۹ سے لے کر ۵۵ سال تک اپنی صحت کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اسد کے برج کو آگ سے بہت لگاؤ ہے۔ اس لئے انھیں آگ سے ہمیشہ بچنا چاہیئے۔ اکتوبر، دسمبر اور جنوری میں انھیں زیادہ کام کرنا نہیں چاہیے اور آنکھوں کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے۔ روزانہ تھوڑا بہت آرام اور مقام کی تبدیلی ان کے لئے ہزار دوا کی ایک دوا ہے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

صنفِ قصیدہ پر ایک ناقدانہ نظر

قصیدہ اصنافِ سخن میں بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اردو شاعری میں قصیدہ گوئی کا آغاز قدما کے نہایت ابتدائی دور میں ہو گیا ہے اور نہ صرف اردو میں بلکہ فارسی شاعری میں بھی ایران نے سب سے پہلے قصیدہ گوئی کی ابتدا کی۔ قصیدہ کی غیر معمولی شہرت و ہر دلعزیزی کے دو وجوہ ہیں۔ اولاً یہ کہ ہر ذی حیات خواہ وہ بنی نوعِ انسان ہو یا بہائم تعریف و تحسین کو پسند کرتا ہے اور انسان بدرجۂ اولیٰ کیونکہ وہ ذی حیات ہونے کے علاوہ ذی شعور ذی فہم اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ فی الارض تسلیم کیا گیا ہے۔ خدائے ایزد تبارک تعالیٰ ستائش و تعریف، تشکر و امتنان سے خوش ہوتا ہے ہماری ریاضت، عبادت کی تاسیس اسی حمد و ثنا پر ہوئی روزہ، نماز، حج یہ سب اس خالقِ کون و مکاں کے شکر و تعریف کے مختلف طریقے ہیں۔ ہمارے لئے اس سے افضل و اعلیٰ اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ کلامِ مجید کی ابتدا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور الحمد للہ رب العالمین" سے ہوتی ہے۔

ثانیاً یہ کہ انعام، صلہ، بخشش کی توقع صرف قصیدہ سے ہو سکتی ہے۔ قصیدہ لکھنے کے صلے میں شاعروں کے منہ موتیوں سے بھر دیے گئے، سونا چاندی بیش بہا جواہر انعام دیے گئے۔ جاگیر، منصب، خلعت حکمرانِ وقت کی طرف سے عطا کئے گئے اس طرح شعرا کی قدر، منزلت، عزت حرم میں چار چاند لگ گئے انوری جو فارسی قصائد کا پیغمبر مانا جاتا ہے، ظہیر فاریابی جو استادِ قصیدہ تسلیم کیا جاتا ہے ان کے علاوہ دوسرے دیگر شعرا نے بھی اسی صنف کی وجہ سے خوش حال زندگی بسر کی۔ اردو میں مصحفی، سودا، ملک الشعراء خاقانیِ ہند ذوق۔ غالب کی زندگی آشفتہ حالی، بے نوائی، تنگدستی اور بے روزگاری میں گزری اور جو کچھ مالی امداد حاصل ہوئی وہ قصیدہ کی بدولت۔

اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ افلاس ہمارے بڑے بڑے شعرائے نازک خیال کا طرۂ امتیاز رہا ہے اور اس تنگدستی نے ان کو مجبور کیا کہ وہ شاعری کے کسی ایسے میدان میں گامزن ہوں جس سے ان کو مالی منفعت اور امداد حاصل ہو اور اقتصادی پستی دور ہو چنانچہ قصیدے نے ان کی مفلسی کو ایک حد تک تمول میں تبدیل کر دیا۔

سودا نے مستقل طور پر قصیدہ گوئی کی ابتدا اردو شاعری میں کی اور عرفی، انوری، خاقانی کے مماثل قصائد اردو میں لکھنے شروع کئے۔ سودا کا زمانۂ شاعری سنہ ۱۷۱۳ء سے سنہ ۱۷۸۱ء تک ہے۔ ان سے قبل وجہی کے زمانہ میں بھی قصائد لکھے گئے قصیدہ کی تمہید میں عشقیہ اشعار ہوتے ہیں جن کو تشبیب کہتے ہیں۔ پہلے شاعر اپنے ممدوح کو حسن و عشق محبت اور لطافت کے دل خوش کن نغمے سناتا ہے اور ابتدائی اشعار میں اس کے سامنے حسن کی سحر کاریاں، عشق کی وارفتگیاں معشوق کے عشوہ و ناز و دلفریب خاکے کھینچتا ہے، شراب، ساقی جام و مل، گل و بلبل کا ذکر کرتا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر چند شعرا کی تشبیب ملاحظہ ہو۔

نعمان سے عذار و خط و رخسار و لب و [illegible]

[illegible]

زلف و رخ خوب و خطِ سبز و لبِ لعلش
چمن ساخته و ہوا ساختہ و گل آراستہ و گہر ریختہ

قاآنی ؎
شمع رخش ہمہ نور است ہمانا خرد است
چین زلفش ہمہ مشک است ہمانا ختن است

تا نگرد و ہمی آن آتش رخسارہ خموشش
زلفش آن آتشِ افروختہ را بادزن است

ظہیر فاریابی ؎ دل مرا کہ فراموش کرد عہدِ وصال
نسیم بادِ صبا بوئے زلفِ یار دہد

سپیدہ دم چو صبا مژدۂ بہار دہد
دم ہوا مدد نافۂ تتار دہد

ذوق ؎ سحر جو گھر میں بشکل آئینہ تھا میں بیٹھا نزار و حیراں
تو اک پری چہرہ حور طلعت بشکل بلقیس ماہ کنعاں

پری کی صورت چمن کی رنگت گر اس کا شیوہ تو اس کا جلوہ
زبان شیریں، بیان رنگیں، کلام رنداں، خرام مستاں

انیسِ خلوت جلیسِ جلوت حریفِ حکمت ظریفِ صحبت
بہ بزم یاراں بدل بہاراں، با ہلِ عزلت گلے بداماں

ذوق (در مدح ابوظفر بہادر شاہ)
کرتا ہے ہلال ابروئے ہر خم سے اشارہ
ساقی کو کہ بھر بادہ سے کشتی طلائی

ہے عکس فگن جام بلوریں سے مئے سرخ
کس رنگ سے ہوں ہاتھ ہ میکش کے حنائی

اے سروِ چمن بر گل اندام	از عارض تو خجل مہ شام
باز آئی کہ ہجر جانگداز است	بردازدلِ من قرار و آرام
از دانۂ خال و دام زلفت	مرغِ دلِ من فتادہ در دام

تشبیب کے بعد مدح شروع ہوتی ہے جس کو "گریز" کہتے ہیں جس میں شعرا ممدوح کی تعریف و تحسین کرتے ہیں اس کے اوصافِ حسنہ بیان کرتے ہیں اور اکثر تعریف میں ایسے محیر العقول پل باندھتے ہیں کہ اس کو کہیں بشریت سے تعلق نہیں ہوتا ان اوصاف سے کوئی شخص موصوف نہیں ہو سکتا۔

مثلاً ظہیر فاریابی نے ایک قصیدہ مظفر الدین قزل ارسلان کی مدح میں لکھا ہے اس میں ممدوح کی تعریف میں جو مبالغہ اور ناممکن الوجود اشیا کا ذکر کیا گیا ہے ملاحظہ ہو ؎

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پائے
تا بوسہ بر رکابِ قزل ارسلاں دہد

یعنی میرے ممدوح کا رتبہ اس قدر بلند و اعلیٰ ہے کہ نو آسمان جیسی بلند کرسیاں اگر پیر کے نیچے رکھی جائیں تو اس وقت شاید کوئی اس کے رکاب کو بوسہ دے سکے۔ ؎

بیروں ز کائنات پرد صد ہزار سال
سیمرغ وہم تا ز جنابش نشاں دہد

انوری نے ایک قصیدہ سلطان سلجوق کی مدح میں لکھا ہے وہ اپنے ممدوح کو لاثانی تصور کرتا ہے۔ کائنات کی کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ فرماتے ہیں ؎

آسمانی نے کہ ثابت پائے نبود آسماں
آفتابی نے کہ زاید نور نبود آفتاب

سیر امرت چوں سیر اختراں بے ارتداد
دورِ عزمت چوں قضائے آسماں بے انقلاب

پائے حلم تو ندارد خاک ہنگام درنگ
دست حکم تو ندارد باد ہنگام شتاب

ممدوح کے قہر و عتاب، لطف و کرم کو بیان فرماتے ہیں۔

قہرت اندر جام زہرہ زہر گرداند عقار
لطف اندر کام افعی نوش گرداند لعاب

گر نشیند بائے باست در برتائے تبت
(۲) خوں شود در ناف آہو بار دیگر مشکناب

(۱) انوری اپنے ممدوح کے غیظ و غضب کو بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب بادشاہ کا قہر و عتاب ہوتا ہے تو اس وقت بہتر سے بہتر چیز بری ہو جاتی ہے یہاں تک کہ شراب باوجود خوبصورت پیالے میں ہونے کے زہر مہلک بن جاتی ہے اور جب اس کی طبیعت لطف و کرم عنایت و مراحم خسروانہ کی طرف راغب ہوتی ہے تو اس وقت برائی اچھائی میں متبدل ہو جاتی ہے۔ رطب یابس کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ سانپ کے منہ کا زہر بھی نوش دارو بن جاتا ہے۔

(۲) اگر میرے ممدوح کے باس (غصہ) کی ب تبت کی ب سے بدل جائے یعنی اگر تبت میں ممدوح کا غصہ پہونچے تو وہاں کے لوگوں کے علاوہ وحشت و گرمی سے ہرن کا نافہ دوبارہ خون ہو جائے۔ (تبت میں ہرن بکثرت ہوتے ہیں اور ان کے نافوں میں مشک بھرا رہتا ہے)

ذوق کے ایک قصیدہ کا گریز ملاحظہ ہو جس میں مبالغہ کی انتہا ہو گئی۔ ایسی چیزیں بیان کی گئی ہیں جو انسانی طاقت سے بالکل بعید تر ہیں صرف شاعرانہ تخیل کی داد دی جا سکتی ہے۔

تہنیت خواں ہے تو آج اس شہ دریا دل کا
جس کے نزدیک ہے اک قطرہ سے کم قلزم و نیل

ماہِ نو چشم زدن میں مہ کامل ہو جائے
نظرِ مہر میں ہے اس کے وہ نور تکمیل

پابوس نقش پا سے تیرے جو کنکری ہو
جا کر فلک پہ اس کو تاروں سے برتری ہو
(در مدح اکبر شاہ ثانی)

گریز و مدح کے بعد شاعر ممدوح کی دعا پر قصیدہ ختم کرتا ہے۔

قاآنی نے ایک قصیدہ حسین خاں صاحب اختیار کی مدح میں لکھا ہے جس کے دعائیہ اشعار یہ ہیں۔

الا تا نسبت صد را اگر با چار صد سنجی
چناں چوں نسبت دہ با چہل یک با چہار آید
حباب دولتت افزوں از آں کہ اندر حساب افتد
شمار مدتت بیروں از آں کاندر شمار آید

ذوق ــ
ہو سیر رفعت نیری گر اوج میمنت پر
رفتار بخت اعدا بر رجع قہقری ہو

جو ہو ویں اس کے ہوا خواہ وہ رہیں سرسبز
ہوں اس کے دشمن بدکیش خاک الٓمی الغلہ

عام طور پر ہمارے شعراء نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اختتام کے لئے کوئی سبیل تلاش کرتے ہیں مثلاً۔

سودا
سودا اب خموش کہ جائے ادب ہے یہ
اس نظم کو تو کر بدعائیہ اختتام

غالب
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے مجھے نہیں سروکار

بعض شعراء دعائیہ اشعار کے ساتھ اپنے اغراض ذاتی بھی شامل کر دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دعا کے ساتھ ان کا کام بھی نکل جائے مثلاً امیر احمد صاحب فرماتے ہیں

نفس چند جو باقی ہوں مرے زیست کے بھی
انہی قدموں کے تلے جائیں بڑے لطف سے کٹ

قصیدہ کی ابتدا اور انتہا یعنی تشبیب اور دعا، یہ دو چیزیں قصیدہ کی جان ہیں اور بڑی حد تک انہی دو کی اچھائی پر قصیدہ کی کامیابی اور فصاحت مبنی ہے۔ ابتدا بہت اچھی ہونی چاہیئے۔ انگریزی میں ایک مقولہ ہے "well begun half done"

قصیدہ کی دعا یعنی آخری اشعار خاص طور پر عمدہ اور دلکش ہونے چاہئیں۔ کیونکہ وہی اشعار کانوں میں دیر تک گونجتے رہتے ہیں اگر قصیدہ کا خاتمہ اچھا ہوا تو قصیدہ اچھا ہے ورنہ بُرا۔ اعمال کا دارومدار جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اس کے خاتمہ ہی پر ہے" انگریزی میں مقولہ ہے۔
"all's well that ends well"

قصیدہ گوئی کو ہم تین دور میں منقسم کرسکتے ہیں۔
(۱) قدما (۲) متوسطین (۳) متاخرین

قدما کے دور کے سب ذیل خصوصیات ہیں۔

(۱) تکلف، مبالغہ اور آورد نہ تھی سادہ اور سادہ خیالات کو معمولی الفاظ میں ادا کرتے تھے۔ آدم الشعراء استاد رودکی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی — یادِ یار مہرباں آید ہمی
ریگ آموے و درشتیہائے او — پائے ما را پرنیاں آید ہمی
اے بخارا شاد باش و شاد زی — شاہ نزدت شاداں آید ہمی
شاہ ماہ است و بخارا آسماں — ماہ سوئے آسماں آید ہمی
شاہ سرو است و بخارا بوستاں — سرو سوئے بوستاں آید ہمی

بوئے جوئے مولیاں کس قدر سادہ الفاظ ہیں۔ شاعر نکہت، شمیم اور دیگر خوشبوؤں کا استعمال نہیں کرتا۔ گل گلزار سبزہ زار کا اعادہ نہیں کرتا بلکہ ریگ آموے سے سب مطالب ادا کردیتا ہے یعنی دریا اور اس کی ریت (اموی دریائے جیحون کا نام ہے)

دریائے جیحون کا ذکر کس قدر سادگی سے کیا گیا ہے جو بات واقعی تھی بیان کردی گئی۔ اس وقت اگر کوئی ہمارا شاعر ہوتا تو دریا اور اس کی موجوں اور سبزہ زار کی تعریف میں آسمان و زمین کے قلابے ملادیتا۔ معلوم نہیں کیسی کیسی مفرد مرکب تشبیہیں اور حسن تعلیل، استعارہ استعمال ہوتے۔

(۲) قدما کے کلام میں مترادف الفاظ اور انواع و اقسام کی لفظی صنعت گریاں بھی کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ انوری نے اس طرز کو تبدیل کیا۔ ظہیر فاریابی نے مضمون آفرینی کا آغاز کیا۔ متوسطین اور متاخرین انہی کے مقلد ہیں۔

تشبیب کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے اشعار مدحیہ اشعار سے زیادہ نہ ہوں۔ چنانچہ ابن رشیق کا مقولہ ہے۔
"وَمِنْ عُیُوبِ هٰذَا الْبَابِ اَنْ یَکُوْنَ النَّسِیْبُ کَثِیْرًا وَالْمَدْحُ قَلِیْلًا"
(عمدہ جلد اول صفحہ ۱۵۵)

بعض شعرا طویل عاشقانہ اور رندانہ تشبیب لکھتے ہیں جو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھی جاتی۔ متاخرین میں حکیم جلال لکھنوی نے ایک قصیدہ کی تشبیب بہت طویل لکھی ہے مثال کے طور پر چند اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں

یں شب کو بند کئے دیدۂ تماشا بیں
بنور دیکھتا تھا سیرِ آسمان و زمیں
جہان کے تھے نشیب و فراز پیشِ نگاہ
فلک نشیں تھا کبھی اور گاہ خاک نشیں
کبھی تھا پیرِ مغاں میکشوں کے جلسوں میں
کبھی تھا زاہدوں کی انجمن میں قبلۂ دیں
کبھی تھا ساقیٔ محفل کبھی تھا ساغر کش
کبھی سرور سے مملو کبھی خمار آگیں
کہیں ترنم عنبا گرانِ گل رخسار
کہیں چمائی ہوش کا بادۂ رنگیں
یکایک آگئی نیند اور بن کے بھرنے لگی
مری نگاہوں میں اک نازنینِ بانکیں
وہ نازنین کہ شرم و حجاب پر جس کے
ہزار دل سے فدا شاہدانِ پردہ نشیں

(۱) عربی اور فارسی کے مقابلہ میں اردو میں بہت کم قصائد لکھے گئے۔ عربی سے قصیدہ گوئی فارسی میں آئی اور فارسی سے اردو نے حاصل کیا۔ عربی قصیدہ گوئی کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مبالغہ، تصنع، لفاظی قطعاً نہیں ہوتی۔

ایک قصیدہ کا شعر ملاحظہ ہو۔

وَنُكْرِمُ جَارَنَا مَادَامَ فِينَا
وَنُتْبِعُهُ الْكَرَامَةَ حَيْثُ كَانَا

"یعنی ہم اپنے پڑوسی کی جب تک وہ ہم میں رہتا ہے عزت و تکریم کرتے ہیں اور اس کے بعد بھی جہاں ہے اس کا احترام کرتے رہتے ہیں۔" اس شعر میں کوئی غیر معمولی بات نہیں اور نہ کوئی مبالغہ ہے بلکہ ایک صحیح واقعہ کا اظہار ہے۔ برخلاف اس کے سودا ایک قصیدہ میں شاہی گھوڑے کی تعریف میں فرماتے ہیں ؎

روبرو سے اگر آئینہ کے اس کلگوں کو
پھینک دے چڑھ کے جو شرق سے لے غرب تلک
اتنے عرصہ میں پھر آوے کہ اسے باور کر
عکس بھی آئینہ سے ہونے نہ پاوے منفک

مبالغہ اگر ایک حد تک کیا جائے تو درست ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ایک وصف کو بالکل ناممکن بنا دیا جائے۔

(۲) متاخرین شعراء ایران نے قصیدہ کو ایک میدانِ تخیل تصور کر لیا تھا اور اس میں اپنی جولانیٔ طبع کا مظاہرہ کیا کرتے تھے، ہمارے شعراء نے بھی وہی روش اختیار کی اور اپنے سمندِ خیال کو بے لگام چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ وہ منزلِ تخیل کو طے کر کے تصورات و مفروضات کے بحرِ ناپیدا کنار کو بھی عبور کر گیا۔ یہاں ایک جائز و معقول سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب بحرِ ناپیدا کنار ہے تو وہ عبور کیونکر کیا گیا' اس کا جواب یہ ہے کہ شاعری میں اور خصوصاً قصائد میں ایسے ناممکن الوجوہ واقعات اکثر آیا کرتے ہیں اور اس کے لئے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

حقیقتاً ممدوح کی مدح اس اسلوب سے ہونی چاہئے کہ اس کی ذات ان تمام خصوصیات کا مجسمہ بن کر ناظرین یا سامعین کے سامنے آجائے۔

(۳) مدح کے بعد ایک یا دو شعر دعائیہ ہونے چاہئیں اور اس میں کسی قسم کی خود غرضی کا لگاؤ نہیں ہونا چاہئے۔ اور نہ دعائیں غیر مربوط الفاظ میں کی جائیں۔

(۴) ممدوح کے انہی اوصاف پر روشنی ڈالنی چاہئے جس کا کہ وہ واقعی حامل ہو اور وہ اوصاف اس سے مناسبت رکھتے ہوں۔ جیسے قاضی یا جج کے لئے بہترین مناسب الفاظ یہ ہو سکتے ہیں' عدل گستر ہے۔ غریب اور امیر میں انصاف کے معاملہ میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ حق دار کو اس کا حق دلواتا ہے۔ احکام تعزیری کے نفاذ میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں کرتا وغیرہ۔

بادشاہ یا وزیر کے لئے یہ الفاظ مستعمل ہو سکتے ہیں۔

دانشمند' مدبر' سیاست داں' عالم و فاضل' روشن دماغ' رعایا پرور' عادل' رحم و کرم سے کام لیتا ہے' فیاض ہے۔

سپہ سالار یا کسی فوجی افسر کے لئے۔

شجاعت' ایثار' وفاداری' استقلال' صبر و تحمل' جفاکش' محنتی' اگر کوئی شاعر اس فرق مراتب کا لحاظ نہیں رکھتا ہے تو اس کا قصیدہ مقبول و کامیاب نہیں ہو سکتا اور اس کی مدح بلاغت کے اصول سے غیر مستحسن و مسترد متصور کی جائے گی۔ مثلاً اگر شاعر کسی ادیب عالم کی مدح میں یہ لکھے کہ وہ بڑا شجیع باہمت بہادر ہے اور قاضی کی مدح حمیت اور تدبر سپہ سالار کی مدح علمی قابلیت اور انشا پردازی سے کرے تو صحیح نہیں ہے۔

اسی طرح مثنوی میں غزل اور صحیح جذبات و واقعات کا اظہار شاعر کرتا ہے۔ لیکن قصیدہ میں چونکہ آورد ہوتی ہے اس لئے شاعر کو الفاظ' واقعات محاورات و تلمیحات خود پیدا کرنے پڑتے ہیں جس کے لئے قادر الکلامی کی ضرورت ہے۔ ہر شاعر قصیدہ گو نہیں ہو سکتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو اس کے کلام میں بہت سے مبتذلات' متروکات خامیاں پائے جاتے ہیں۔

قصائد کے معائب

(۱) سب سے پہلا نقص یہ ہے کہ قصائد بہت طویل ہوتے ہیں اور وہ طوالت بھی بالکل غیر ضروری ہوتی ہے خصوصاً بادشاہوں' امیروں کے دربار میں طویل قصائد بہت نامقبول ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ نازک مزاج لوگ طوالت کو پسند نہیں کرتے' طویل قصیدہ سے بہت جلد گھبرا جاتے ہیں جریر نے اپنے پوتے عمارہ کو نصیحت کی تھی۔

"فرزند من! جب مدح کرو تو طول بیانی سے کام نہ لو کیونکہ اس طریقہ سے اشعار بھلا دیئے جاتے ہیں۔ اور ہجو کہو تو اس کے مخالف روش اختیار کرو"

(۲) قصائد میں پرخلوص جذبات کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ اپنے ممدوح کو کسی نہ کسی طرح خوش کرنا ہوتا ہے' میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ مذہب شاعری نے جھوٹ' مبالغہ' بغض بے جا بہتان کو بالکلیہ جائز قرار دے رکھا ہے اور یہ شاعری کا جزلاینفک سمجھ لیا گیا ہے۔ اور جس میں یہ جواہر پارے نہ ہوں وہ شاعری کہلائے جانے کی مستحق نہیں ہوتی اور قصیدہ میں از بس ضروری سمجھی جاتی ہے چنانچہ خلفائے عباسیہ کے عہد سے آج تک یہ چیز برابر چلی آرہی ہے لیکن یہی ایک ایسا کیڑا ہے جو

اندر ہی اندر جسم شاعری کو زوال پذیر کر رہا ہے اور اس میں گھن لگتا چلا جارہا ہے۔ عرب شعرا تعلی، مبالغہ جھوٹ سے بے حد احتراز کرتے تھے۔ زہیر بن ابی سلمٰی جو قادر الکلام شاعر گزرا ہے اس کا قول ہے کہ

"اَحسَنُ القَولِ مَا صَدَّقَهُ الفِعلُ" یعنی سب سے بہتر کلام وہ ہے جو صداقتِ افعال پر مبنی ہو۔ حضرت عمر فاروقؓ زہیر کے متعلق فرماتے ہیں "اِنَّهُ اَشعَرُ الشُّعَرَآءِ لَا یَمدَحُ اِلَّا مُستَحِقًّا" یعنی وہ افضل ترین شعراء میں سے ہے کیونکہ وہ اُسی کی مدح کرتا ہے جو مستحق مدح ہو"

(۳) ایسے اوصاف بیان کئے جاتے ہیں جن کا اطلاق صرف ممدوح ہی پر نہیں بلکہ ان کے خاندان کے کسی فرد پر نہیں ہوتا۔

(۴) کسی وصف کی تعریف اس قدر کی جاتی ہے کہ اُس وصف کو بالکل ناممکن بنا دیا جاتا ہے۔

(۵) تشبیب میں خود ممدوح کو معشوق بنا دیا جاتا ہے جیسے سید انشا، فرماتے ہیں ؎

حاضر ہوا ہوں یوسف کنعاں کے سامنے
یا آگیا ہوں میں مہ تاباں کے سامنے

یاد آوے تیری چشم کی شوخی تو پھر وہیں
ساقی کرے مراقبہ زنجاں کے سامنے

قمری کی طرح طوقِ غلامی پہن ہی لے
جو آوے تجھ سے سرو خراماں کے سامنے

(۶) قصائد میں مغلق اور ثقیل سے ثقیل الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے قصیدہ مشکل اور ادق الفاظ و اصطلاحات کا مجموعہ بن جاتا ہے۔
مثال کے طور پر صرف ایک شعر لکھا جاتا ہے

زیادہ لکھنا طوالت کا باعث ہوگا۔

دوش گردوں پہ ہوتا فرغلِ سنجاب غمام
سبزہ تا خاک پہ ہو پیرہن استبرق

(۷) قصیدہ میں دعائیہ اشعار سے پہلے شاعر لکھتا ہے کہ اب میں دعا دیتا ہوں حالانکہ دعائیہ شعر خود صاف معلوم ہوتا ہے۔ جدت پسند طبائع اس طریقہ کو پسند نہیں کرتے چنانچہ مولانا طباطبائی مرحوم نے غالب کے اس شعر پر اعتراض کیا ہے ؎

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے مجھے نہیں سروکار

ایک عمدہ فصیح و بلیغ قصیدہ کا معیار کیا ہونا چاہیے؟

(۱) قصیدے کے الفاظ متین سنجیدہ۔ پرمعنی، موزوں جزیل اور شان دار ہونے چاہئیں۔ الفاظ میں کسی قسم کا تصنع، غلو، مبالغہ نہیں ہونا چاہیے۔

غالب کا ایک قصیدہ ان تمام خصوصیات کا حامل ہے۔ چند اشعار مثال کے طور پر درج ذیل ہیں۔

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ مظہر ذو الجلال والاکرام
شہسوار طریقۂ انصاف نو بہار حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورت اعجاز جس کا ہر قول معنیٔ الہام
بزم میں میزبان قیصر و جم رزم میں استاد رستم و سام
اے ترا لطف زندگی افزا اے ترا عہد فرخی فرجام

قصیدہ گوئی بہ نسبت دیگر اصناف سخن بہت مشکل چیز ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق آورد سے ہے اور دوسری شاعری مثلاً مثنوی غزل، مرثیہ، ہجو وغیرہ آمد سے ہوتی ہے۔ اگر شاعر کسی غم کے منظر سے متاثر ہوا اور اُس کیا

طبیعت میں جذباتِ رنج والم برانگیختہ ہوئے اُس وقت اس آمد کو اس نے قلمبند کر دیا انہی کو اب ہم مراثی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ شاعر جس قدر کسی واقعۂ سانحہ سے زیادہ متاثر و مغموم ہوگا اسی قدر عمدہ مرثیہ لکھ سکے گا۔ اس کا بیّن ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں متمم بن نویرہ بہت زبردست مرثیہ گو شاعر تھا۔ اس کو اپنے بھائی سے بہت زیادہ محبت تھی۔ اتفاق سے وہ ایک لڑائی میں خالد بن ولید کے ہاتھوں مارا گیا۔ متمم بن نویرہ پر کوہ رنج والم ٹوٹ پڑا اس سانحۂ عظیم سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور اس نے ایک مرثیہ اپنے مرحوم بھائی پر لکھا۔ حضرت عمرؓ نے بھی اس مرثیہ کو مسموع فرمایا اور آپ بھی اس کے جمال کردار اشعار سے بہت متاثر ہوئے اور اس کے بعد آپ نے اس سے فرمایا کہ "میرے بھائی زید کا مرثیہ لکھو"

اس نے حسب الحکم مرثیہ لکھا لیکن وہ اس قدر بہتر اور دردناک نہیں تھا۔ حضرت نے فرمایا۔ "کہ اس میں وہ سوز و گداز، وہ الم و یاس نہیں ہے" اُس نے یہ عرض کیا "امیر المومنین، زید آپ کے بھائی تھے میرے بھائی نہ تھے" (از موازنۂ انیس و دبیر)

فخریہ :-

فخریہ نوعیت کے لحاظ سے قصیدہ کا مترادف ہے صرف ان دونوں میں قابلِ امتیاز چیز یہ ہے کہ قصیدے میں شاعر کا ممدوح کوئی دوسرا شخص ہوتا ہے۔ اور فخریہ میں وہ خود اپنی تعریف کرتا ہے اپنے محاسن اور اپنے آباء و اجداد کے اوصاف کا اعادہ کرتا ہے۔

اپنی قوم کی ستائش کرتا ہے۔

فخریہ اردو فارسی شاعری میں بہت کم ہیں البتہ عربی شاعری میں زیادہ پائے جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ فخریہ شاعری کی ابتدا مقابلہ اور کشمکش سے ہوئی۔ جہاں دوسرے قبائل یا دشمنوں سے مقابلہ ہوتا ہے وہاں اس صنفِ شاعری کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ غنیم کے سامنے اپنی اور اپنے خاندان۔ اپنی قوم کی تعریف کرکے اس پر رعب قائم کیا جائے اور خود میں شجاعت، بہادری پیدا کی جائے۔ مثلاً عربی کا شاعر متنبّی کہتا ہے ؎

انا وان احسابنا کرمت   لسنا علی الاحساب نتّکل
نبنی کما کانت اوائلنا   تبنی و نفعل مثل ما فعلوا

یعنی اگرچہ ہمارا نسب نہایت معزز ہے لیکن ہم صرف بزرگوں کی شرافت پر قانع نہیں بلکہ ہم خود بھی وہی کام انجام دیتے ہیں جو ہمارے آبا و اجداد انجام دیا کرتے تھے۔

غالبؔ کا یہ شعر فخریہ ہے ؎

یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

عربی شاعر بشار کا یہ شعر افتخار کا بہترین نمونہ ہے ؎

اذا ما غضبنا غضبة مضرية
هتكنا حجاب الشمس او امطرت دما

یعنی جب ہم کو مضری غصہ آتا ہے تو سورج کا پردہ چاک کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ خون برسانے لگتا ہے۔

اردو میں میر انیسؔ کا یہ شعر جواب ہو سکتا ہے۔

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

سیّد انشاء فرماتے ہیں ؎

کیا چیز دیو مرد سخنداں کے سامنے
پر جلتے ہیں فرشتوں کا انساں کے سامنے

صدمہ ہی پہونچے رعد کی گردن پہ ایک لٹھ
آوے کبھی جو نعرۂ مردان کے سامنے

کیا چیز بھلا قصر فریدوں مرے آگے
کانپے ہے پڑا گنبد گردوں مرے آگے

میر انیس اپنی شاعری پر فخر کرتے ہیں ؎

جب تک یہ چمک مہر کی پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلمرو سے نہ جائے

تعریف میں چشمہ کو سمندر سے ملا دوں
قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں

میر ؎ ریختہ رتبے کو پہونچایا ہوا اس کا ہے
معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

داغ ؎ نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

میر ؎ سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

؎ جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحبِ صاحب نظر بنے ہے

سید ممتاز علی وارثی

مجنوں سے خطاب

(یہ نظم اورنگ آباد کے ایک وداعی جلسہ میں سنائی گئی تھی)

مجنوں کا وہ فیض صحبت کہاں ہے — وہ بے غرض و بے لوث عنایت کہاں ہے
مرے بھائی بہنوں کے جیسے مربّی — مرے دوستوں کی محبت کہاں ہے
کہاں ہے وہ خدمات قوم و وطن کی — وہ جوش جنون و ریاضت کہاں ہے
مری دستگیری مری رہنمائی — مرا ساتھ دینی وہ طاقت کہاں ہے
دیں انجام خدمات کس کے بھروسے — بتا مجھ کو اب میری ہمت کہاں ہے
الٰہی یہ نقشے کو بدلا ہے جس نے — اسے سوچنے کی یہ فرصت کہاں ہے
مرا دل ہے یا ہے وہ تصویر خانہ — مجنوں کی معکوس صورت جہاں ہے

رہیں شاد و آباد احباب ہم سے
خداوند عالم کی برکت جہاں ہے

مسٹر ڈی برکت رائے

اشتراکیت کی حدیں

(برنارڈ شا سے آزاد ترجمہ)

کیا آپ کو کبھی خیال بھی آیا تھا کہ اشتراکیت جس کو اخبار والے اس کے خونخوار انقلابیوں کی ایجاد کہتے ہیں وہ در اصل باہمی امداد کے ایک شائستہ طریقہ کا نام ہے۔ اشتراکیت جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی تہذیب وتمدن میں ترقی ہوگی اشتراکیت نہ ہو تو اپنی سڑک آپ بناؤ، رات کو قندیل ہاتھ میں لے کر نکلو۔ گھر کا کچرا اٹھا کر بستی کے باہر جاکر خود پھینک کر آؤ۔ ندیوں پر پل بناؤ۔ لوگ بلدیہ کا ٹکس دینے کو جز بز ہوتے ہیں وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس حقیر رقم سے وہ جتنا فائدہ اٹھاتے ہیں اتنا اپنی پوری آمدنی سے نہیں اٹھاتے۔ اگر وہ غور کرتے تو اس کی تمنا کرتے کہ کاش ان کی پوری آمدنی ان سے لے لی جائے اور چیزیں اسی طرح اشتراکیت کے اصول پر مفت ملے۔

لیکن یہ قابل عمل نہیں کہ ضرورت کی ہر چیز اشتراکیت کے اصول کے تحت تقسیم کی جائے۔ سڑک اشتراکیت سے اس لئے بنائی جاتی ہے کہ ہر شخص اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس طرح یہ ایک قاعدہ کلیہ سمجھ لو کہ جو چیز ہر شخص کے کام میں آئے وہ مشترک بنائی جا سکتی ہے۔ مثلاً کیوں نہ روٹی اور دودھ مشترک کر دیا جائے۔ کیا اچھا ہو کہ دنیا میں کوئی بھوکا نہ رہے۔ ریل کو مشترک کر دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بہت سی چیزیں ہیں۔ لیکن ان چیزوں پر آکر رک جانا پڑتا ہے جو سب کے فائدے کی ہیں۔ دودھ کو مشترک بنا لو لیکن شراب کے متعلق کیا ہو۔ شراب کو مشترک بنانے کے معنی یہ ہوں گے کہ ٹیکس اس سے بھی وصول کیا جائے جو شراب نہیں پیتا اور شرابی کو جی بھر کر پینے دیا جائے۔ جو شراب نہیں پیتا اس کو دہرا اعتراض ہوگا ایک یہ کہ اس سے ایسی چیز کے واسطے چندہ لیا جا رہا ہے جو اس کے استعمال میں نہیں آئے گی دوسرے یہ کہ شراب اس کی رائے میں بدمستی، بیماری، اور جرائم پیدا کرتی ہے اس لئے اگر اس کے لئے چندہ دینے کا قانون بن بھی جائے تو وہ اس کی خلاف ورزی کر کے جیل جانا پسند کرے گا۔ غرض کہ جہاں تک خیالات اور ضروریات کا اتحاد وہاں تک اشتراکیت۔ جہاں اختلاف ہو وہاں اشتراکیت ممکن نہیں۔ اگر ہر چیز کے لئے اشتراکیت ممکن ہوتی تو دنیا میں روپیہ کا وجود غیر ضروری ہوتا لیکن چونکہ ایسا نہیں اس لئے کم از کم غیر مشترک ضروریات کے لئے ہر شخص کو روپے کی ضرورت ہے۔ اس لئے پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر شخص کو کتنا دیا جائے۔ اشتراکیت اس کو صرف ایک حد تک حل کرتی ہے۔ پورے طور پر حل کرنے کے لئے کوئی اور تدبیر سوچنا ہوگی

سات حل جو تجویز کئے جاتے ہیں

ایک حل یہ پیش کیا جاتا ہے کہ ہر شخص کو ملک کی دولت میں سے اتنا حصہ دیا جائے جتنا وہ پیدا کرتا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر شخص کو اتنا دو جتنے کا وہ مستحق ہو۔ بعض اس کی تائید میں ہیں کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس" جس میں جتنی طاقت ہو اتنی دولت اس کو مل جائے۔ بعض کہتے ہیں کہ عوام یعنی غریب غربا کو اتنا ملنا چاہیے جس سے وہ زندہ رہ سکیں اور باقی خواص یعنی امرا کا حصہ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آبادی کو چند طبقوں میں تقسیم کرنا چاہیے

اور ہر طبقے کے اندر دولت کی تقسیم مساوی ہو البتہ مختلف طبقوں کا حصہ مساوی نہ ہو بعض یہ کہتے ہیں کہ جس طرح چل رہا ہے اسی طرح چلنے دو۔ اور سوشلسٹ یہ کہتے ہیں کہ ہر شخص کو مساوی حصہ دیا جائے خواہ وہ کسی پیشہ کا ہو۔

اگر ان میں سے کوئی طریقہ یا سب طریقے تم کو ناپسند ہوں اور ناگوار گزریں تو مصنف کا کوئی قصور نہیں وہ تو صرف یہ بتا رہا ہے کہ کتنے مختلف طریقے تجویز کئے گئے ہیں اگر تم ان کے علاوہ کوئی طریقہ تجویز کرتے ہو تو تم کو اختیار ہے لیکن اس مسئلہ سے یہ کہہ کر انجان نہ ہو جاؤ کہ "اونہہ ہم کو کیا پڑی ہے۔ شہر کے اندیشے سے ہم کیوں دبلے ہوں"۔ یہ سوال خود تمھاری غذا، تمھارے رہنے سہنے اور تمھاری زندگی کا ہے۔ اگر تم اپنی کوئی رائے نہ رکھو گے تو دوسرے لوگ اس سوال کو طے کریں گے اور یاد رکھو کہ وہ اپنے حصے کا خوب تحفظ کریں گے اور ممکن ہے کہ تمھارا حصہ سرے سے غائب ہی کر دیں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم کو اس وقت جو حصہ مل رہا ہے وہ پہاڑ کی طرح اٹل ہے تو یہ تمھاری غلطی ہے۔ دنیا بہت تیزی سے بدل رہی ہے۔

ہر ایک کو اس کا پیدا کیا ہوا

دیکھنے میں یہ بہت منصفانہ طریقہ ہے کہ ہر ایک کو اتنی دولت دی جائے جتنی وہ اپنی محنت سے پیدا کرے لیکن جب اس پر عمل کرنے بیٹھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ ناممکن ہے۔ کیونکہ اشیا کے پیدا کرنے میں بہت سے لوگوں کا ہاتھ رہتا ہے اور یہ قرار دینا ناممکن ہے کہ کس شخص نے کتنا پیدا کیا ہے۔ اور اکثر لوگوں سے تو کچھ پیدا کرنے کا کام لیا ہی نہیں جاتا بلکہ وہ کسی قسم کا انتظامی کام کرتے ہیں۔

جب ایک کسان اور اس کے مزدور مل کر ایک کھیت بوتے اور کاٹتے ہیں، تو یہ کہنا مشکل ہے کہ ہر ایک نے کتنا غلہ پیدا کیا ہے۔ ایک کارخانہ لاکھوں سوئیاں بناتا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ مشین کے موجد نے کتنی سوئیاں بنائیں، فورمین نے کتنی، مزدوروں نے کتنی اور دوسرے عملے نے کتنی۔ اگر ایک شخص ایک غیر آباد جزیرہ میں اکیلا جا کر آباد ہو جائے تو بے شک وہ کسی چیز کو بنا کر خالص اپنی پیداوار کہہ سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے ساتھ کسی قسم کے اوزار نہ لے گیا ہو۔ مگر موجودہ متمدن دنیا میں تو کوئی شخص ایک چھوٹی سے چھوٹی چیز پر ہاتھ رکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ خالص میری پیداوار ہے۔ مثلاً ایک کرسی کو اس کے بنانے میں لکڑہاروں کا ہاتھ ہے جنھوں نے جنگل سے لکڑی کاٹی ان مزدوروں کا ہاتھ ہے جنھوں نے اس کو بستی تک پہونچایا۔ آرہ کشوں کا ہاتھ ہے۔ بڑھائی کا ہاتھ ہے۔

غرض کہ ہر شخص کو اس کی پیداوار تقسیم کرنا عملاً ناممکن ہے۔ یہ البتہ کیا جا سکتا ہے کہ ہر شخص کو اس لحاظ سے دولت تقسیم کی جائے کہ اس نے کام میں کتنا وقت صرف کیا ہے لیکن یہ بھی اتنا آسان نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ بعض کاموں کے لئے تعلیم، ٹریننگ اور تجربہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً ڈاکٹری کا فن ہے کہ چونکہ اس کی تحصیل میں ایک طویل زمانہ بغیر اجرت کے بلکہ اپنی گرہ سے خرچ کر کے گزرتا ہے اس لئے ڈاکٹر یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ ان کا وقت زیادہ قیمتی ہے۔ یہ مطالبہ واجبی ہے لیکن اس کی قیمت ٹھیک ٹھیک کیا ہو اس کا مقرر کرنا مشکل ہے۔

اسی طرح ہوشیار کاریگر کی مزدوری معمولی کاریگروں سے زیادہ ہونی چاہیئے۔ لیکن کس قدر زیادہ اس کا یقین مشکل۔

بہت سے پیشہ ور ایسے ہیں جو بظاہر کچھ پیدا نہیں کرتے۔ مثلاً علماء، سرکاری ملازم، ڈاکٹر، خانگی ملازم، ایکٹر، بادشاہ اور ملکہ۔ غرض کہ ہر ایک کی اس کی پیدا کی ہوئی دولت دینے کی تدبیر ہر عمل ممکن نہیں۔

ہر ایک کو اتنا جس کا وہ مستحق ہے

دوسری تدبیر یہ ہے کہ ہر ایک کو اتنا دیا جائے جتنے کا وہ مستحق ہے۔ بہت سے لوگ خصوصاً جو خوش حال ہیں سمجھتے ہیں کہ دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ محنتی اور معتدل عادتوں کے اور کفایت شعار لوگ بہت کم مالی مشکلات میں مبتلا ہوتے ہیں اور افلاس زیادہ کاہلی، نشہ بازی، جوّے بازی اور فضول خرچی کی وجہ سے آتا ہے۔ لیکن غور کرکے دیکھو تو اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ تم اپنی "روٹی کھاؤ بھی اور بچاؤ بھی" یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تم کو روٹی کا جو حصہ ملا تھا وہ صحیح تھا۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض بری عادتوں کی وجہ سے انسان مفلس ہو جاتا ہے۔ لیکن لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ بعض بری عادتوں کی وجہ سے انسان مالدار بھی ہو جاتا ہے۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ انسان کی عادتیں بننے سے بہت پہلے اس پر مفلسی یا دولتمندی مسلط ہو جاتی ہے اور یہ اس کے ماں باپ کی وجہ سے ہوتی ہے۔

اس کے جواب میں کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر دولت اچھے اوصاف کے لحاظ سے تقسیم نہیں ہوتی تو اس کو ہونا چاہیئے اور ہم کو اپنا قانون ایسا بنانا چاہیئے کہ اچھے آدمیوں کو زیادہ دولت ملے اور بروں کو کم۔ اس میں کئی مشکلیں ہیں اور پہلی ہی مشکل ایسی ہے کہ اس کو ناممکن بنا دیتی ہے۔ وہ یہ کہ اچھے اوصاف کو کس طرح ناپا اور تولا جائے۔ مثلاً گاؤں کے پیش امام اور لوہار کو لو اور بتاؤ کہ ان کو کتنا کتنا ملنا چاہیئے۔ پیش امام کو لوہار کے برابر یا اس سے دگنا یا آدھا یا کتنا۔ پیش امام عربی پڑھ سکتا ہے اور لوہار عربی نہیں پڑھ سکتا۔ لیکن لوہار نعل بنا سکتا ہے پیش امام نعل نہیں بنا سکتا۔ اب تصفیہ کرو کہ کتنی عربی ایک نعل کے برابر ہے۔ غرض کہ یہ مضحکہ خیز ہے۔

جتنا جس کے ہاتھ لگ جائے

تیسری تدبیر یہ ہے کہ جتنا جس کے ہاتھ لگ جائے۔

اگر اس پر عمل ہو تو دنیا سے امن اور اطمینان رخصت ہو جائے گا۔ اگر ہر شخص مساوی جسمانی طاقت رکھتا تو مضائقہ نہ تھا لیکن دنیا میں بچے بوڑھے عورتیں بیمار اور کمزور موجود ہیں۔ اور تندرست جوان مرد بھی طاقت میں برابر نہیں ہوتے تو اس سے دنیا بہت جلد عاجز آ جائے گی۔ چور اور لٹیرے اور ڈاکو بھی اپنی چوری اور لوٹ کی کمائی کو صلح اور صفائی سے تقسیم کرنا پسند کرتے ہیں نہ یہ کہ چوری اور لوٹ کے بعد پھر آپس میں بھی لوٹ مار ہوتی ہے۔ سوسائٹی میں اگرچہ کہ چوری اور لوٹ منع ہیں لیکن تجارت کو ہم بڑی حد تک اسی اصول پر چلا رہے ہیں کہ ہر شخص صرف اپنا فائدہ دیکھا اور دوسروں کا خیال کئے بغیر جتنا پیسہ گھسیٹ سکتا ہے گھسیٹے۔ اس کے نتائج کتنے برے ہوتے ہیں کہ اس کی روک تھام کے لئے

مسلسل قوانین بننے لگے ہیں۔

خوش باش طبقہ

چوتھی صورت یہ ہے کہ دس یا سو میں سے ایک کو بغیر کام کئے مال دار بنا دیا جائے اور باقی نو یا ننانوے دن بھر کام کریں اور خود صرف اتنا لیں کہ زندہ رہ سکیں اور بچے پیدا کر سکیں تاکہ ان کے بعد ان کی نسل کے ذریعے یہ غلامی کا سلسلہ جاری رہے۔ اس زمانہ میں کم و بیش یہی ہوتا ہے۔ کل آبادی کا دس فیصدی وہ آدمی ہیں جو نوے فیصدی جائداد پر قابض ہیں۔ اور باقی نوے فیصدی گویا بغیر کسی جائداد کے ہیں اور صرف اپنی روزآنہ مزدوری پر بہ مشکل جیتے ہیں۔ اس صورت کے فائدے یہ بتائے جاتے ہیں کہ اس طرح ہم کو امرا اور شرفا کا ایک طبقہ ہاتھ آتا ہے یعنی ایسا طبقہ جو اعلیٰ اور گراں تعلیم حاصل کر سکے۔ ملک پر حکومت کرنے کے قابل ہو۔ علیٰ علوم یعنی سائنس، فنونِ لطیفہ، علم ادب، فلسفہ، دینیات کو زندہ رکھ سکے۔ غرض کہ اس تمدن کو قائم رکھے جو شہروں کو دیہات سے ممتاز کرتا ہے۔ اس سے زیادہ زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ ان کو ضرورت سے زیادہ پیسہ دینے سے وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ سرمایہ جمع کریں اور بڑی بڑی صنعتوں کو رواج دیں۔

یہ "چند امیر اور بہت سے غریب" ایک بڑا پرانا نظام ہے اور اب تک رائج ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اگر امیروں کی دولت چھین کر سب غریبوں پر تقسیم کی جائے تو ان کا افلاس کچھ بہت کم نہیں ہوگا۔ اور تمدن کی جتنی باتیں ہیں فنا ہو جائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت لوگ غریب ہو کر بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر اس نظام کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔

یہ تو اس نظام کے فائدے ہوئے لیکن اس کے نقصانات اتنے ہیں کہ اب دنیا اس سے بیزار ہو رہی ہے۔ اگر اس کو جاری رکھنے کا تصفیہ ہو تو پہلا سوال یہ ہے کہ وہ دس میں ایک کون خوش نصیب منتخب ہو جو دوسروں کی محنت سے مال دار ہو کر صرف حکومت کرے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ قرعہ اندازی کی جائے اور ہر دس میں سے ایک ایسا شخص انتخاب کیا جائے اور یہ منتخب طبقہ آپس میں شادی بیاہ کر کے اپنے طبقہ کو قائم رکھے۔ لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ لوگ اپنے وہ فرائض انجام دیں گے جس کے لئے ان کو مال دار بنایا جا رہا ہے۔ یہ امرا کا طبقہ اگر نیک نیت ہو تو بھی عام لوگوں سے دور دور رہنے کی وجہ سے ان کی ضروریات کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ یہ لوگ اپنے اقتدار کے ذریعے غریبوں کو اور غریب بناتے ہیں۔ علوم اور فنون پر کم روپیہ صرف کرتے ہیں اور کھیل تماشوں اور کھانے پینے میں زیادہ۔ یہ غریب لوگوں کو بجائے پیدائش دولت کے کاموں میں لگانے کے ان کو اپنی ٹہل سیوا میں لگاتے ہیں جس سے دولت کی پیدائش گھٹتی ہے اور غریبی اور بڑھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اقتدار امرا کے طبقہ سے چھین کر سول سروس، مجالس مقننہ، مجالس بلدیہ وغیرہ کو دے دیا جاتا ہے۔

اور جب یہ صورت ہے تو پھر امرا کے طبقہ کی ضرورت کیا رہی۔ اب وہ نرے مفت خورے ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگ اور حکومت دونوں اس طبقے کے خلاف ہیں۔ اور نسلاً بعد نسل ان کا اقتدار اور تمول توڑا جا رہا ہے۔

اور چند دنوں میں یہ بالکل آثار قدیمہ ہی رہ جائیں گے۔ اپنی اپنی جاگیروں میں تو جیران کا اقتدار باقی ہے لیکن شہروں میں ان کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔ اس لئے موجودہ تمدن یعنی ریلوں، موٹروں، تار، ٹیلیفون، ریڈیو کا تمدن ہے، ان لوگوں کی کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔

البتہ ابھی ایک دلیل پر غور کرنا باقی ہے جس کو معاشی طبقہ سب میں بڑی دلیل سمجھتا ہے جو یہ ہے کہ اس طبقہ کی فاضل دولت کی وجہ سے سرمایہ فراہم ہوتا ہے جس کی وجہ سے بڑی بڑی صنعتیں فروغ پاتی ہیں۔ اگر دولت سب پر تقسیم کردی جائے تو ہر ایک کے پاس اس کی ضرورت کو کافی ہو کر اتنا تھوڑا بچے گا کہ وہ بھی خرچ ہو جائے گا اور ریلوں مشینوں اور کارخانوں کے قیام کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ تمدن کی بقا کے لئے پس انداز روپیہ کی ضرورت ہے لیکن اس طریقے سے زیادہ بے کفایت طریقہ شاید ہی ہوسکتا ہے۔ کسی قوم کو یہ لازم نہیں کہ کافی خرچ کرنے سے پہلے پس انداز کرے۔ خرچ کرنا مقدم ہے۔ جو قوم اپنے بچوں کو دودھ سے محروم کرکے ریل تیار کرتی ہے وہ بے وقوف ہے۔ اور پھر اس کی بھی کیا ضمانت ہے کہ یہ مال دار طبقہ اپنی پس انداز کو صنعتوں کی ترقی میں صرف کرے گا۔ ان کا تو یہ حال ہے کہ وہ جب تک خرچ کرتے کرتے تھک نہ جائیں اس وقت تک کچھ نہیں بچاتے۔ اور اگر بچائیں اور صنعتوں میں روپیہ لگائیں تو کیا ضروری ہے کہ ملک کے اندر ہی لگائیں۔ انگلستان کا سرمایہ جنوبی امریکہ، افریقہ اور چین میں لگ رہا ہے اور انگلستان میں اتنا سرمایہ نہیں کہ آبادی کے غلیظ محلے از سر نو تعمیر کئے جاسکیں۔ انگلستان کے سرمایہ دار کہتے ہیں کہ باہر سرمایہ لگانے سے زیادہ منافع ملتا ہے اور اس منافع کو ملک میں خرچ کرنے سے زیادہ لوگوں کے لئے روزگار فراہم ہوتا ہے۔ لیکن یہ منافع سارا کا سارا انگلستان میں صرف ہوتا ہے۔ زیادہ تر رانٹی کارلو اور مصر وغیرہ کی نذر ہوتا ہے۔ اور انگلستان میں صرف ہوتا بھی ہے کن کاموں میں اور کیا روزگار فراہم کرتا ہے۔ ہمارے ہاں بہترین موٹریں ہیں۔ بہترین گالف کے میدان ہیں۔ بہترین گرنیاں ہیں۔ بہترین ہوٹل ہیں۔ ان کام کرنے والے ویسے ہی نکمے یعنی پیدائش دولت کے ناقابل ہوتے ہیں جیسے ان کے آقا۔ اب فرض کرو کہ باہر کے کسی ملک میں جس میں ہمارا روپیہ پھنسا ہوا ہے سیاسی انقلاب واقع ہو اور وہ ہمارے سرمایہ کو تسلیم کرنے سے انکار کردے یا ہمارے منافع پر بھاری ٹکس قایم کردے تو ہمارا کیا حشر ہوگا۔ انگریز نوکر جوتے کو بہترین پالش کرنا جانتا ہو لیکن جب لکھ پتی کا دیوالہ نکل جائے اور اس کے پاس پالش کرانے کو جوتا نہ ہو تو یہ نوکر کس مصرف کا۔ غرض کہ یہ صورت بھی بے کار ہے۔

ضیاء الدین انصاری

کچھ گولکنڈے کے نئے قلعہ سے متعلق

(یہ مضمون ایک ایسے بزرگ کا لکھا ہوا ہے جو گولکنڈہ ہی میں پیدا ہوئے وہیں رہتے ہیں اور
وہاں کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ قلعہ اور شہر حیدرآباد کے اکثر اصحاب اور خاص کر معتقدین
علیات عملیات اور تعویذوں پر اعتقاد رکھنے والی عورتوں میں "قلعہ کے مرشد" کے لقب سے مشہور ہیں۔)

جہاں گولکنڈے کے دیگر قابلِ ذکر مقامات ہیں۔ وہاں اس حصہ کو بھی اہمیت حاصل ہے جو "نیا قلعہ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مقام گولکنڈے کے مشرقی اور شمالی رُخ پر واقع ہے یہ جگہ ایک فصیل سے محصور ہے جو قلعہ قدیم کے ایک (شمالی) دروازے سے شروع ہو کر دوسرے (شرقی رخ کے) دروازے کے کونے میں ختم ہوتی ہے اس فصیل کی لمبائی تقریباً ایک میل ہو گی۔ نئے قلعے کی تعمیر کی وجہ یہاں کے عوام یوں بیان کرتے ہیں کہ سلطان تاناشاہ کے زمانے میں ایک معمار اپنے فن میں یکتا تھا اس نے یہ محسوس کیا کہ قلعہ قدیم کی شرقی و شمالی فصیل کا کچھ حصہ بمقابلہ تمام فصیل کے نشیبی ہے اگرچہ کہ اس طرف سے دشمن کے حملہ کا بہت کم امکان ہے پھر بھی اس کمی کو پورا کیا جانے اس نے اپنی رائے دربار سلطان میں پیش کی سلطان نے اس کی دوراندیشی کی بہت قدر کی اور معاونی فصیل کی تعمیر کا حکم صادر فرمایا۔ جب سے اس حصہ کا نام نیا قلعہ مشہور ہو گیا۔[1]

قلعہ کی قدیم فصیل اور اس معاونی فصیل کے درمیانی حصے میں ایک چھوٹا سا تالاب متعدد حوض اور کئی باؤلیاں ہیں جو پانی کی بیرونی آمد سے ہمیشہ معمور رہتی ہیں اور افراط آب کی وجہ سے یہاں چاول کی دو فصل کاشت ہوتی ہے اور دیگر ثمردار وغیرہ کے درخت کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ دائمی کاشت کی وجہ سے یہ مقام شادابی میں اپنی آپ نظیر ہے۔ اس محصورہ مختصرہ میں دو مسجدیں بھی بنی ہوئی ہیں ان میں ایک مسجد تو ملا خیالی کی ہے اور دوسری لن تبر کی وجہ سے قابل ذکر ہے یہ مسجد نئے قلعے کے شرقی جانب نہایت ہی خوبصورت و سنگ بستہ ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مجھے جہاں تک خیال ہے ممالک محروسہ سرکار عالی میں اس ساخت کی مسجد میری نظر سے نہیں گزری۔ اس مسجد کے راست و چپ دو کمرے عجیب ترتیب سے بنے ہوئے ہیں یعنی باہر سے دیکھا جائے تو یہ کمرے مسجد ہی معلوم ہوتے ہیں اور اندر جا کر معین تو ان کمروں کا مسجد سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ طرفہ یہ کہ صدہا سال ہونے پر بھی کسی نے بھی ان کمروں کی تحقیق نہیں کی تھی تقریباً تیس سال پہلے جب کہ میں کم سن تھا مجھے خوب یاد ہے کہ ایک شب نئے قلعے کی جانب سے ایک مہیب دھماکے کی آواز سنائی دی۔ دوسرے روز معلوم ہوا کہ اس سنگ بستہ مسجد میں دو کمرے تھے جس میں قطب شاہی زمانے کی بارود محفوظ تھی۔ چوروں کو کسی طرح سے اس کا پتہ لگ گیا تھا۔ اور سرنگ

---

[1] اس قلعہ کی اصل وجہ تسمیہ [illegible] بابت ستمبر ۳۹ء میں شایع ہو چکی ہے۔ (مدیر)

وہ بارود چھپائے جایا کرتے تھے۔ جس روشنی کی مدد سے
وہ چوری کرتے تھے غلطی سے بارود میں لگ گئی پھر کیا تھا
تمام کمرے کی بارود بیک وقت جل اٹھی اور لوگوں نے
دیکھا کہ چار نعشیں شل کوئلے کے سیاہ جلی ہوئی پڑی تھیں۔
اس وقت جانب راست کا کمرہ محفوظ تھا جو بعد کو کھولا گیا
وہ بھی بارود سے معمور تھا۔ پھر وہاں سے بارود اٹھوا کر
سرکاری توپ خانے میں داخل کر دی گئی۔ آج کل اس ایوان
مسجد کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہو رہی ہے چھت اور دیواروں
پر غیری پودے خوب نشو و نما پا رہے ہیں۔ ان کی جڑیں پھیل کر
خوب صورت پتھروں کو اپنی نشستوں اور جوڑوں سے
جدا کر رہے ہیں اب یہ لاثانی عمارت محکمہ آثار قدیمہ کی توجہات
کی امید وار ہے۔

نئے قلعے میں شمالی رخ کی طرف معادی فصیل سے
متصل ایک درخت عجائب روزگار سے اس وقت تک موجود
ہے اس درخت کو عام لوگ ہتنیان کا درخت کہتے ہیں اس کی
وجہ کچھ معلوم نہیں ہوئی کہ ہتنیان سے کیا مراد ہے غالباً یہی
وجہ ہوگی کہ اس درخت کا پوست ہاتھی کی جلد کے مشابہ ہے
اس درخت کے تنے کا دور نوے فٹ اندازہ کیا گیا ہے زمین
سے دس فٹ بلندی کے بعد اس درخت کے تنے کا بالائی
حصہ قدرے گنبد نما بنا ہوا ہے اور کچھ نیچے کی جانب ایک
دریچہ قدرتی واقع ہوا ہے جب اس دریچہ سے اندر کی
طرف جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ درخت کی پیڑ کا اندرونی
حصہ تمام تر کھوکھلا سا بنا ہوا زمین تک گیا ہے۔ اور
اندرونی زمین کا حصہ نہایت صاف و مسطح ہے اور روشنی
اور ہوا آنے کا بہترین ذریعہ وہی قدرتی دریچہ ہے جس کا
ذکر کیا گیا۔ کیا تعجب ہے کہ کسی زمانے میں چوروں نے اس
درخت سے فائدہ اٹھایا ہو۔

ایک دفعہ میرے ایک مخلص نے ہراج میں نئے قلعے کا
چوبینہ خریدا تھا۔ کٹوائی کے اختتام پر اتفاق سے میرا گزر
اس طرف ہوا دیکھتا ہوں کہ آٹھ دس تبر انداز بیٹھے اپنی
کلہاڑیاں تیز کر رہے ہیں اور میرے مخلص بھی تشریف فرما
ہیں۔ میں نے کہا "بھائی کہو کیا ہو رہا ہے اب تو کٹوائی بھی
ختم ہو چکی ہے"۔ میرے مخلص نے اس کوہ پیکر سے درخت کی
طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "اب اس کی باری ہے"۔
یہ سن کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی میں نے کہا "بھائی یہ
وہ شئے ہے جس کے دیدار کے تمنائی ابھی ہزاروں کیا بلکہ
لاکھوں موجود ہیں اور رہیں گے۔ افسوس کہ اس کی یہاں
یہ قدر ہو رہی ہے!"

پھر میں نے کہا "اگر تم قبول کرو تو میرا مشورہ یہ ہے کہ
ایک درخواست سرکار عالی میں گزرانی جائے۔ ممکن ہے کہ
اس نمائشی درخت کے عوض چند درخت تری مل جائیں
جس کی وجہ سے تمہارا نقصان بھی نہ ہوگا اور یہ دکن
کی عجیب قطب شاہی یادگار تلف ہونے سے بچ جائے
گی"۔ یہ سن کر میرے مخلص نے کہا "واللہ کیا بات کہی۔
میرے بھی دل میں ایک دھڑکن سی تھی کہ سالہا سال
کا درخت ہے نہیں معلوم اس پر کتنے بھوتوں اور جنوں کا
تسلط ہوگا۔ خدا جانے اس کے کاٹنے سے کیا آفت بپا
ہو۔ بھائی آپ نے اس وقت تدبیر بتلا کر بڑا احسان
کیا جس کے بار سے گردن دبی جاتی ہے"۔ میں نے کہا
انسان خود اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے خبیث کہلانے کا

مستحق بن جاتا ہے باقی بھوتوں وغیرہ کا خیال عبث ہے۔ رہا احسان یہ انی ہوئی بات ہے احسان کا بدلہ احسان تم جو کہتے ہو بارِ احسان سے گردن دبی جاتی ہے تو دو بنڈی لکڑیاں میرے یہاں رعایتی قیمت سے روانہ کر دیجئے چلو گو غلامی ہو گئی" اس پر میرے مخلص بات کاٹ کر دوسری طرف متوجہ ہو گئے۔

بہر حال ان کی درخواست پر سرکار عالی سے عوضی درخت عطا ہوئے اس طرح یہ صد ہا سالہ درخت ۱۳۳۵ف میں قتل ہونے سے بال بال بچ گیا۔ اگرچہ مجھے رعایتی قیمت میں لکڑی کی بنڈیاں تو نہ ملیں۔

سید رحمت علی شاہ قادری
(اگرگنڈوی)

ادارہ کے شعبۂ نسواں کی کتاب نذرِ دکن کے متعلق رائیں

شاعر آگرہ۔ ماہ اگست ۱۹۳۹ء اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سب مضامین خواتین کے لکھے ہوئے ہیں۔ ہر مضمون اپنی جگہ نہایت خوب ہے۔ اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ دکن کے متعلق ایک بڑا ذخیرہ اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو کی مساعی قابلِ داد ہیں کہ اس نے خواتین کی ایک بڑی جماعت میں ادبی رجحانات پیدا کر دیئے ہیں " شاعر " کے ناظرین اپنی اپنی خواتین کے لئے نذرِ دکن کی ایک ایک جلد منگا دیں تاکہ وہ بھی دکن کی اس بیداری سے متاثر ہو سکیں۔

رہنما مراد آباد۔ ۴ اگست ۱۹۳۹ء سب رس کا یہ خواتین نمبر " نذرِ دکن " کے نام سے کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے۔ دکن کی تعلیم یافتہ و انشا پرداز خواتین کے دکن کے متعلق علمی و ادبی و تاریخی مضامین نثر و نظم اس میں درج کئے گئے ہیں امید ہے یہ مجموعہ مضامین بہت دلچسپ و قابلِ ستائش ...

شاہکار لاہور۔ ماہ ستمبر ۱۹۳۹ء دکن کے اردو نواز اداروں میں ادارۂ ادبیات اردو کو ایک نمایاں شہرت حاصل ہے۔ اس

ادارہ کے زیر اہتمام نہ صرف اردو علم ادب کی بہتر سے بہتر کتابیں نشر ہو رہی ہیں بلکہ اس کے زیر سرپرستی مشہور خواتین دکن کی ایک علمی انجمن بھی قائم ہے۔ چنانچہ اس انجمن کی بدولت آج وہاں کی خواتین بھی ایک حیرت انگیز قابلیت کے ساتھ خدمت علم و ادب میں پیش پیش نظر آتی ہیں۔

حال میں بزم خواتین کی سرگرم معتمد محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے " سب رس " کا خواتین نمبر " نذرِ دکن " کے نام سے کتابی صورت میں شایع کیا ہے جس میں دکن کے متعلق خواتین دکن کے مضامین اور نظمیں درج ہیں۔ اس مجموعہ میں شروع سے لیکر آخر تک جتنے مضامین اور نظمیں ہیں سب کا معیار بلند ہے اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہماری خواتین میں بھی اب علم و ادب کا صحیح اور سلجھا ہوا ذوق پیدا ہو رہا ہے۔ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے سب رس کے اس نمبر کی ترتیب و تدوین میں جس محنت ہمت اور قابلیت کا ثبوت دیا ہے ہم اس کی داد دئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔ خواتین دکن کا یہ گلدستۂ رنگ و بو تعلیم یافتہ گھرانوں کی زینت بننے کے لائق ہے

بھکاری کا خونین انتقام

"سرکار میں بھوکا ہوں. کچھ پیسے دلوا دیجئے." ایک
بھکاری نے اپنا ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ بنسی لال نے
پائپ سلگاتے ہوئے جواب دیا" بھوکا ہے محنت مزدوری
کیوں نہیں کرتا۔ جوان ہے، ہٹا کٹا ہے، تجھ کو دینا تو
الٹا پاپ ہے۔" بھکاری ۲۰ یا ۲۲ سال کا خوب صورت
جوان لیکن غربت نے سونے پر پارہ کا کام کیا تھا۔
ایک معمولی دھوتی اور ایک بوسیدہ کمبل جس میں رنگ
برنگ کے پیوند لگے ہوئے تھے، یہی اس کی پوشاک تھی
ہوٹل میں ہم لوگ ایسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے، جہاں سے
سڑک کا منظر بخوبی دکھائی دیتا تھا۔ میں اس بھکاری کو
ہوٹل میں بیٹھے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ اس وقت
کسی سے بھیک نہیں مانگ رہا تھا۔ حالانکہ متعدد لوگ
ہوٹل میں داخل ہوئے اور باہر گئے۔ مگر ہم کو ہوٹل
سے نکلتے ہوئے دیکھ کر وہ ہمارے سامنے ہاتھ پھیلانے
کے لئے آگے بڑھا۔ جیسے وہ صرف ہمارا ہی منتظر تھا۔
ہوٹل سے نکلنے کے بعد سے موٹر میں سوار ہونے تک
اس کی خوفناک عمیق نظریں بنسی لال کے چہرے پر گڑی
ہوئی تھیں۔ بنسی لال کے روکھے جواب سے اس کے
چہرے پر سرخی دوڑ گئی اور اس کے تیور عتاب آمیز
ہوگئے۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو سکیڑتے ہوئے اپنی
نظروں کو میری طرف پھیر دیا۔ وہ ایک معمولی بھکاری
کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس کی نظروں میں افلاس
وفقر کی سطوت کچھ اس طرح نمایاں تھی کہ میں اس کی طرف
دیکھنے کی ہمت نہ کر سکا۔

"یقیناً بھیک مانگنا بالکل معیوب بات ہے" میں نے
چند پیسے بھکاری کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔
"سچ کہتے ہیں آپ ـــــ بھگوان آپ پر دیا کرے"
بھکاری نے اپنی پُر رعب آنکھوں کو بنسی لال کے چہرے پر
جما کر کہا۔ چند منٹ بعد ہماری موٹر بھکاری کو اسی طرح
چھوڑ کر ہوٹل سے بہت دور ہو گئی۔ میں نے موٹر سے
اپنا سر نکال کر دیکھا۔ بھکاری چھوٹے سے کاغذ پر کچھ لکھ
رہا تھا۔

دوسرے روز شام میں تقریباً ۸ بجے میں بنسی لال
کے مکان سے نکل رہا تھا سڑک کی دوسری طرف وہی
بھکاری اپنی خونخوار نظروں سے مجھ کو گھور رہا تھا۔
میرے دل میں ایک نامعلوم خوف کی لہر دوڑ گئی۔ قدم
بھاری ہو گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ پُراسرار ہستی
آخر ہے کون؟ میں آہستہ آہستہ ترچھی نگاہوں سے
اس کی طرف دیکھتا ہوا قدم بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔ اور وہ
ـــــ ہاں وہ بھی میرے پیچھے چل رہا تھا۔ لیکن اس کے
قدم تیز تھے۔ خود بخود میرے قدم تیز ہو گئے۔ میں نے پیچھے
پلٹ کر دیکھا وہ بھاگتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ اس نے
چیخ کر کہا۔ "ٹھہریئے ـــــ مجھے آپ سے کچھ کام ہے"
ایک فوجی کے لئے اس کے کمانڈر کا حکم جتنا اثر رکھتا ہے۔
اس سے کہیں زیادہ اس بھکاری کے تحکمانہ لہجے نے مجھ پر
اثر کیا۔ اور میں اسی جگہ جم کر رہ گیا۔
"یہ آپ کا مکان ہے سرکار" اس نے دھیمی
آواز میں کہا۔ "نہیں تو ـــــ میرا مکان یہ نہیں ہے"

—— کیوں۔ اس سوال سے تمہارا مطلب؟"
میں نے اپنے خوف کو چھپانے کے لئے سگریٹ سلگاتے
ہوئے لاپروائی سے کہا۔" یہ مکان آپ کا نہیں——
تو پھر بنسی لال کا ہے۔ کیوں؟—— بھکاری
نے کہا——" ہاں—— لیکن کیا تم انھیں جانتے
ہو؟"

" ہاں جانتا ہوں——۔ اور آپ سے زیادہ
بہتر طریقہ پر—— اچھا آپ کو میں نے زحمت
دی معاف کیجئے گا۔" اتنا کہہ کر بھکاری تیزی سے آگے
بڑھ گیا۔ اس وقت میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی چند
منٹ تک تو میں گزرے ہوئے واقعہ پر غور کرتا ہوا
کھڑا رہا—— اس کے بعد لوٹ کر بنسی لال کے
مکان پر پہنچا۔

" بنسی لال—— کل شام میں جب کہ ہم لوگ
" گرانڈ ہوٹل" سے نکل رہے تھے تو ایک بھکاری
نے ہم سے بھیک مانگی تھی—— تمھیں یاد ہے"۔

" بھکاری ہاں اچھی طرح یاد ہے——
وہی نا جس کو تم نے پیسے دیکر نصیحت بھی کی تھی"۔ ہاں
—— بنسی لال—— وہ تو مجھے کوئی خطرناک
انسان معلوم ہوتا ہے۔ ابھی ابھی تمہارے پاس سے
واپس جانے کے بعد قریب ہی وہ مجھ سے ملا تھا——
وہ تم سے بخوبی واقف ہے"۔

" ہوگا آخر ہم کوئی معمولی آدمی تھوڑی ہیں——
ہم اُسے بھیک تو نہیں دیں گے—— نوکری چاہتا ہے
تو نوکر رکھ لیں گے؟" لیکن وہ بھکاری بھی تو نہیں ہے۔
—— بنسی لال وہ تو—— کیا تم نے کبھی اسے دیکھا
تھا۔" میں نے پریشان ہوتے ہوئے دریافت کیا۔" وہ
بھکاری نہیں—— تو پھر—— آخر تم اتنے پریشان
کیوں ہو؟" میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا—— لیکن
جگدیش"۔ بنسی لال کچھ پریشان ہوتے ہوئے چلایا۔
" وہ کہاں سے آیا ہے!—— کیا نام ہے؟۔ اس نے
کچھ کہا؟" " اس نے یہ کچھ نہیں بتلایا مگر اس کی باتیں
صاف ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ بھکاری نہیں بلکہ——
بنسی لال نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔" جگدیش کیا تم
نے کچھ غور کیا—— مجھے تو شبہ ہے—— کہ وہ
میری جان کا دشمن ہے" " تمہاری جان کا دشمن——
یہ کیوں—— اس میں تو غور کرنے کی گنجائش بھی
نہیں"۔ میں نے حیرت کے ساتھ جواب دیا۔

" خیر تم نہیں جانتے—— تم نہیں سمجھ سکتے
لیکن مجھے یاد ہے——۔ اچھی طرح یاد ہے۔
زمانہ ماضی کے واقعات میں کبھی نہیں بھول سکتا"۔ بنسی لال
پر گھبراہٹ اور اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ ان واقعات کو
پیش آئے ہوئے تقریباً ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ بنسی لال
روز بروز پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اور اس کی
صحت نمایاں طور پر بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ متعدد
بار میری تجسس فطرت نے اس بھکاری کے متعلق سوالات
کرنے پر مجھے مجبور کیا لیکن وہ ہمیشہ یہ کہہ کر ٹالتا رہا۔

" جگدیش اس ذکر کو چھیڑ کر میری پریشانیوں میں اضافہ
نہ کرو۔ کسی اور موضوع پر گفتگو کرو۔ اس کے جاننے
کی تمھیں کوئی شدید ضرورت تو نہیں ہے"۔ آج وہ حد سے

زیادہ پریشان تھا۔ چہرہ پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے خاص طور پر اپنے یہاں بلایا۔ شام میں بارش نے خوب فیاضی دکھائی۔ موسم کافی سرد ہوگیا تھا۔ ہوا میں خنکی پیدا ہوگئی تھی۔ جنسی لال نے موٹر لانے کے لئے حکم دیا اور ہم دونوں تفریح کے لئے حسین ساگر کے چھوٹے سے خوبصورت چمن کو چلے گئے —— جنسی لال لکھ پتی تھا اس کی عمر تقریباً چالیس کے لگ بھگ تھی اس کی عیاشی اور شراب نوشی کے چرچے ہر جگہ ہوتے تھے۔ جنسی لال کے قماش کے لوگ عموماً ایسے ہی لوگوں سے زیادہ خوش رہتے ہیں جو ان کی خواہش کے مطابق ہر اس کام میں شریک ہوں جو وہ کرتے ہیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ باوجود میرے ان تمام لغویات سے نفرت کرنے کے وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اور ہمیشہ مجھ کو ساتھ رکھتا تھا۔ جب کبھی میں سنجیدگی سے ان بری عادتوں کو چھوڑنے کے لئے رائے دیتا تو وہ ہنس کر خاموش ہو جاتا تھا۔

چنانچہ اس وقت بھی اس کے ساتھ شراب کے شیشے موجود تھے۔ میری بار بار کی ہدایتوں کے باوجود وہ اس وقت تک دو شیشے خالی کر چکا تھا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ابر اب بھی چھایا ہوا تھا۔ بعض وقت اکا دکا تارے بھی دکھائی دیتے تھے۔ اور پھر گھٹاؤں کی چادر میں چھپ جاتے تھے۔ تالاب کا پانی کٹھے سے ٹکراتا اور ہلکے سے خوفناک شور سے سکوت کو توڑتا ہوا واپس ہو جاتا تھا۔ سڑک کی بجلی اپنی روشنی سے مفلس کے چراغ کی طرح اس چمن کو بھی فیضیاب کر رہی تھی۔ اس مدھم روشنی میں میں نے دیکھا کہ کوئی شخص چمن کی کیاریوں کو آہستگی سے طے کرتا ہوا ہماری طرف چلا آرہا تھا۔ مجھے زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں نے فوراً پہچان لیا کہ آنے والا شخص کون ہے؟ میرے جسم میں ایک کپکپی سی پیدا ہوئی۔ سانس رکنے لگی۔ میں نے جنسی لال کے بازو کو زور سے دباتے ہوئے آہستہ سے کہا "جنسی لال —— بھکاری —— ادھر آرہا ہے"۔

جنسی لال کی حالت نشہ سے تباہ ہو چکی تھی۔ اس کو مطلق ہوش نہ تھا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے جواب دیا "آنے دو —— میں اسے پہچان گیا —— وہی ہوگا —— میں لٹا کسی زمانے میں کسی سے شاید تھا۔ لیکن جگدیش —— اوہ —— (جنسی لال نے کچھ دیر کے بعد کہا) اگر تمہیں اس کے جاننے کی ضرورت نہیں کہ وہ کون ہے —— اور اس کا مجھ سے کیا تعلق ہے"۔

بھکاری سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ایک لانبی سانس کھینچی اور اس کا جیب میں چھپا ہوا ہاتھ اپنے ساتھ چھوٹا سا چمکدار خنجر لئے ہوئے باہر نکلا قبل اس کے کہ میں کچھ اپنے آپ کو سنبھال سکوں، وہ عقاب کی طرح جنسی لال پر جھپٹا اور چشم زدن میں اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔ ذرا سی دیر میں جنسی لال کا سرخ خون سبز گھانس پر بہنے لگا۔ میری حالت اس وقت مردے کی سی ہوگئی تھی۔ اپنی جگہ بت بنا ہوا کھڑا تھا۔ موت کے بھیانک تصور سے آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔ سر چکرا رہا تھا۔ مجھے صرف اتنا خیال ہے کہ بھکاری نے اپنے خون میں تیتھڑے

ہوئے ہاتھوں کو جنسی لال کی قمیص سے صاف کیا اور مطمئن
چال سے واپس چلا گیا۔

میرے قدم بھاری ہو چکے تھے۔ تعاقب کا خیال
ہی میرے لئے موت سے بھیانک ثابت ہو رہا تھا۔ جب
وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میری حالت میں کچھ
تغیر پیدا ہوا۔ بے شمار خیالات نے متحدہ طور پر میرے
دماغ پر یورش کی اور میں دیوانہ وار "خون ——
پولیس" چلاتا ہوا دوڑا اور چمن کے باڑ والے ناکہ
میں داخل ہوا۔ وہاں پہونچتے ہی مجھ پر پھر بے ہوشی
طاری ہونے لگی۔ بھکاری وہاں موجود تھا۔ اس نے
کانسٹبل کو مخاطب کر کے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے
کہا" آپ گواہ ہیں اس بات کے کہ میں نے جنسی لال کو
قتل کیا"۔ اس کے بعد مجھ کو خبر نہیں کہ کیا ہوا۔ البتہ جب
مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو اسپتال میں پایا۔
قریب میں چند دوست احباب اور ڈاکٹر کھڑے ہوئے
تھے۔ دو موٹی اور کالی نرسیں میرا سر سہلا رہی تھیں۔

۲۲ رجون کا دن شہود وکلا اور شوقین حضرات
کے علاوہ میرے لئے خاص اہمیت رکھتا تھا۔ کیونکہ یہی
وہ میری زندگی کا قابل یادگار دن تھا جس میں جنسی لال
کے حیرت انگیز قتل کے مقدمہ کی پہلی پیشی مقرر تھی۔ ساری
رات عجیب کرب و اضطراب میں گذری۔ صرف اس
خیال ہی سے کہ مجھے اس خوفناک بھکاری کے روبرو
جواب قاتل کی حیثیت رکھتا ہے اسی کے خلاف کہنا پڑے
جسم سرد ہو رہا تھا۔

اگر مجھے اس مقدمے سے بذاتِ خود کوئی تعلق
نہ ہوتا اور مجھے بحیثیت گواہ عدالت طلب نہ کرتی تو میں
بالیقین کہہ سکتا ہوں کہ قتل کی واردات پیش آنے کے
بعد ہی میں کسی دوسرے ملک کو چلا جاتا۔ لیکن میں
مجبور ہو گیا تھا۔ پولیس کے لئے صرف میری واحد شخصیت
ہی ان کے مقدمہ کو کامیاب بنانے اور ان کی ملازمت
میں ترقی کے مواقع پیدا کرنے کے زرین خواب پیش
کر رہی تھی۔

صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر میں اپنے دوست
سندر لال کے ساتھ عدالت پہنچا۔ کمرۂ عدالت مشہور
بیرسٹروں اور عوام سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ٹھیک
دس بجے مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی مقدمہ کی سماعت
ہو رہی تھی۔ لیکن ملزم ان تمام باتوں سے بالکل لاپرواہ
دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھیں تقریباً بند تھیں اور
وہ کٹہرے پر اپنے ہاتھ کے سہارے اپنی ٹھوڑی
ٹیک کر کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

جج نے ملزم کو مخاطب کرتے ہوئے بیان دینے
کے لئے حکم دیا۔ ملزم نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے
اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے جج کو نرم لہجے میں مخاطب
کیا۔

" مقتول کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ میرا باپ
تھا۔ اس کو قتل کرنے کی وجہ صرف یہی ہے کہ مجھے دنیا
میں زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں ہے تو پھر میرے وجود کا
باقی دنیا میں کیسے رہ سکتا ہے ——

(باقی آئندہ)

خلیل اللہ

جدید مطبوعات

۱۔ عرفان نانک (سکھوں کی دعا کا اردو ترجمہ) از برج بلب سنگھ صاحب بیدی حجم ۲۲۲ صفحات۔ مرکنٹائیل پریس لاہور۔

۲۔ ید بیضا (اسلام اور مسلم سوسائٹی پر مضامین کا مجموعہ) از ڈاکٹر سید نجم الدین احمد صاحب جعفری حجم ۱۴۰ صفحات۔ آرمی پریس شملہ۔

۳۔ مظاہر ذہنیات (نفسیات کے متعلق) از ڈاکٹر مفضل الرحمن صاحب حجم ۱۴۰ صفحات قیمت عہ۔ کوثر چاند پوری بھوپال۔

۴۔ مشیر الصحت عرف دیہاتی چٹکلہ (چند مجرب نسخے) مولفہ میر مصطفےٰ علی صاحب دوم تعلقدار نلگنڈہ۔ قیمت عہ

۵۔ دیوان ثاقب از مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب لکھنوی حجم ۵۰۰ صفحات۔ قیمت عہ۔

۶۔ انیس الاخلاق (انیس کی رباعیوں کا مجموعہ) مرتبہ سید محمد عباس صاحب۔ قیمت ۵ر

۷۔ تصویر احساس (مجموعہ کلام) از الطاف صاحب مشہدی قیمت مجلد عہ

۸۔ شب غم (ناول) از میاں ایم اسلم صاحب قیمت مجلد عہ ۴ر

۹۔ خواب کی دنیا (خواب کی ماہیت اور اس کا فلسفہ) مترجمہ عبد المالک صاحب قیمت عہ ۸ر

۱۰۔ دیہاتی گیت (گیتوں کا مجموعہ) از ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی قیمت ۸ر عصمت بک ڈپو۔ دہلی

۱۱۔ زندگی کے کھیل (افسانے) از لطیف الدین احمد صاحب اکبر آبادی حجم ۱۶۰ صفحات قیمت عہ۔ آرمی پریس شملہ۔

۱۲۔ ضبط تولید و اصلاح نسل (رسالہ ہمدرد صحت دہلی کا خاص نمبر) مرتبہ حکیم عبد الحمید صاحب حجم ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۲

۱۳۔ حیات و کلیات اسمٰعیل باتصویر (سوانح حیات و مجموعہ کلام) دوسرا ایڈیشن مرتبہ محمد اسلم صاحب سیفی حجم ۶۰۸ صفحات قیمت للعہ مکتبہ جامعہ دہلی

۱۴۔ سر سید (سوانح حیات) مرتبہ انصار الحق صاحب حجم ۴۶ صفحات قیمت ۵ر حالی پبلشنگ ہوس۔ دہلی۔

۱۵۔ عہد حاضر کے بڑے لوگ باتصویر حصہ اول و دوم (چند سیاسی رہنماؤں کی سوانح حیات) حجم ۲۵۶ صفحات قیمت عہ۔ دائرہ ادبیہ۔ دہلی

۱۶۔ جو بار (نظموں اور غزلوں کا مجموعہ) از بسیم سین صاحب ظفر حجم ۹۶ صفحات قیمت عہ۔ ادارۂ تصنیف و تالیف۔ عزیز گنج۔ دہلی

۱۷۔ سیرت سید احمد شہیدؒ (مجاہد اسلام حضرت سید احمد صاحب بریلوی کی سوانح حیات) از سید ابو الحسن علی صاحب حجم ۴۶۴ صفحات قیمت عہ۔ نامی پریس لکھنو۔

۱۸۔ آب حیات کے لطیفے (آزاد مرحوم کی سوانح حیات مع لطیفے) از آغا محمد اشرف صاحب حجم ۱۴۴ صفحات قیمت عہ ۴ر عالمگیر پریس۔ لاہور

۱۹۔ رسول پاک از عبد الواحد صاحب سندھی حجم ۱۶۵ صفحات قیمت ۸ر مکتبہ جامعہ دہلی

۲۰۔ کلیات بحری مرتبہ ڈاکٹر محمد حفیظ سید صاحب حجم ۲۱۲ صفحات قیمت (۴ روپے) نول کشور پریس۔ لکھنو

۲۱۔ رحمۃ اللعٰلمین صلعم (جلد اول) از قاضی محمد سلیمان صاحب حجم ۴۶۴ صفحات قیمت عہ۔ مکتبہ جامعہ دہلی

۲۲۔ وصلی کی دستکاری از سید رضا احمد صاحب جعفری حجم ۵۶ صفحات قیمت ۸ر عصمت بک ڈپو۔ دہلی

۲۳۔ لکڑی کا باریک کام از سید رضا احمد صاحب جعفری حجم ۵۰ صفحات قیمت ۸ر عصمت بک ڈپو۔ دہلی

۲۴۔ تاریخ بجکنڈہ (تاریخ دکن کا ایک ورق) از سید مراد علی صاحب طالع حجم ۴۰ صفحات قیمت ۵ر

۲۵۔ روح حیات (مکتوبات کا مجموعہ) از اختر صاحب قریشی حجم ۸۰ صفحات قیمت ۴ر عہد آفریں برقی پریس۔ حیدر آباد

۲۶۔ سوتیلی ماں۔ از محترمہ صالحہ بیگم صاحبہ (دام فضلہا) حجم ۵۰ صفحات قیمت ۴ر ادارہ ادبیات اردو۔

مرزا سیف علیخاں

تنقید و تبصرہ

مرتبہ شعبۂ تنقید ادارۂ ادبیات اردو

آبِ حیات کے لطیفے۔ یہ ۱۴۴ صفحے کی ایک دیدہ زیب تصنیف ہے۔ کاغذ لکھائی چھپائی نہایت عمدہ قیمت عہ ۱۲ یہ چھوٹی سی کتاب ایک کوزہ ہے جس میں آب حیات کا چشمہ بند ہے۔

آغا محمد اشرف ام اے کا نام ادبی حلقہ میں محتاج تعارف نہیں۔ آپ شمس العلماء محمد حسین صاحب آزاد کے پوتے اور محمد ابراہیم صاحب کے فرزند ہیں۔

فاضل مولف نے دیباچے میں اپنا مافی الضمیر نہایت مدلل پیرایے میں ظاہر کیا ہے۔ آزاد کے غیر محققانہ رویے پر جو موٹا علمائے ادب کا حملہ ہوتا ہے اس کو ایک ٹھنڈے دل سے پی جانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک ملیح انداز میں اس کے اسباب پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

کتاب باتصویر ہے۔ سب سے پہلے آزاد مرحوم کی تصویر دی گئی ہے۔ پھر باقر صاحب کی مسجد ہے جو آزاد کے والد تھے پھر باقر صاحب کے مکان کا اندرونی حصہ بتایا گیا ہے۔ مقبرۂ آزاد کا ایک سہانا عکس بھی اس میں شامل ہے۔

اس کتاب میں نہ صرف آپ کو آب حیات کے لطیفے ہی ملیں گے بلکہ آزاد مرحوم کی مکمل سوانح حیات بھی ایک دلچسپ پیرایے میں آغا صاحب نے مرتب کی ہے۔ (۱۲۰) صفحات محض آزاد کے خاندانی حالات، ان کی ملازمت، دیوانگی غرض سب انہیں سے متعلق باتیں ہیں۔

گو یہ ضرور نہیں کہ تذکرہ یا تاریخ یا حالات کے لئے ہم سوانح عمری کا لفظ لکھیں۔ کیونکہ سوانح دراصل سانحہ کی جمع ہے۔ سانحہ کے معنی صدمہ و مصیبت کے ہیں۔ محض مصائب یا صدمات ہی زندگی میں ہوں تو اس کے حالات کے لئے سوانح کا لفظ موزوں ہے۔ اقبال عروج شہرت نام و نمود عزت و وقار کے ضمن میں اس لفظ کا استعمال نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن آزاد کی زندگی کے حالات کچھ ایسے ہی آلام و افکار سے مملو ہیں کہ ان کی زندگی کو سوانح عمری سے معنون کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کی الم انگیز زندگی کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسرا لفظ تراشنا اپنے بس کی بات نہیں۔

پس اس طرح (۱۲۰) صفحہ پر یہ حوادث و سانحات سے بھری ہوئی زندگی کا افسانہ درافسانہ تکمیل پاجاتا ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ ان حکایات و قصص پر محیط ہے جو دیگر شعراء سے متعلق ہیں۔ مثلاً امیر خسرو، مضمون، فغاں، مظہر، سودا وغیرہ کے لطائف و اشغال کا بیان ہے اور یہ انتخاب کا ایک بے مثل ذخیرہ ہے۔ "ج"

ارمغانِ باز۔ کرؤن سائز ۴۸ صفحات۔ لکھائی چھپائی اچھی مطبوعہ عثمانیہ المعارف پریس حیدرآباد دکن قیمت اور ملنے کا پتہ دیا نہیں گیا۔

باز حیدرآباد کے خوش فکر شعرا میں سے ہیں۔ اس سے پہلے ان کے کلام کا ایک چھوٹا سا انتخاب "باز کے سو شعر" کے نام سے شایع ہوکر کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ انتخاب اس سے کسی قدر وسیع ہے۔ اس کی ابتدا میں مولوی سردار علی صاحب سابق ایڈیٹر "تجلی" کا تعارف ہے۔ جس میں ان کے حالات اور شاعرانہ قابلیتوں پر تنقید لکھی گئی ہے۔ باز کی شعری تربیت حضرت کیفی حیدرآبادی کی صحبتوں میں ہوئی تھی۔ زبان کے سلیس اور پرلطف استعمال کا ذوق انہیں وہیں سے ملا ہے۔ لیکن وہ اس زمانے کے مخصوص شعری رجحانات سے بھی کچھ کم متاثر نہیں ہیں۔ نظم بہر وہ کم کہتے ہیں لیکن خوب لکھتے ہیں۔ "ع س"

رپورٹ نظم و نسق جنگلات : سال ۱۳۴۵ ف ۔ حسب ہدایت خاص مبارک ایک دکن مرتبہ جناب مرزا محمد علی بیگ صاحب ناظم جنگلات سرکار عالی حجم ۲۸ صفحات

اس کے آغاز میں صرف خاص مبارک کے صحرا کی حوالگی کی مختصر تاریخ
لکھی گئی ہے اس کے بعد فارسٹ پالیسی، بند وبست صحرا، پیداوار
صحرا اور مالیاتی نتایج وغیرہ پر بڑی قابلیت اور وضاحت
کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ سنین ماضیہ کی آمدنی کا اوسط
بہت کم تھا، حال: ناظم صاحب جنگلات کے زمانے میں آمدنی بہت
بڑھ گئی اور مصارف کم ہوگئے۔ ناظم صاحب حال کے حسن انتظام
اور قابلیت کا اس سے بہتر ثبوت نہیں مل سکتا کہ آمدنی میں چند
سے زیادہ اضافہ ہوا اور اخراجات بہت گھٹ گئے۔ گزشتہ
پچیس سال میں صرف خاص مبارک کے جنگلات کی نہ کوئی رپورٹ
مرتب ہوئی اور نہ شایع کی گئی، اس رپورٹ کو صرف خاص مبارک
کے جنگلات کے نظم ونسق کی پہلی رپورٹ ہونے کا فخر حاصل ہے۔

نیرنگ خیال (حرب و ضرب نمبر) مرتبہ حکیم محمد یوسف حسن
صاحب حجم ۲۰۸ صفحات قیمت ۸ر لاہور کے قدیم اور مشہور رسالہ
نیرنگ خیال کا یہ خاص نمبر بابتہ جولائی ۱۹۳۹ء کوئی چالیس جنگی
مضامین پر مشتمل ہے، جن میں سے چند کے عنوان ہیں۔ جوان ترک
جرمنی کی موجودہ جنگی قوت، کیا امریکہ جنگ سے علٰحدہ رہ سکتا
ہے؟ برطانیہ کی حکمت عملی کیا ہونی چاہئیے؟ کیا رومانیہ دوسرا
اسپین بنے گا؟ سیاسیات عالم اور عرب، فرانس کی ماژینولائین،
چین اور جاپان کی جنگ، برطانیہ کی جنگی طاقت، دنیا کی سات
بڑی طاقتوں کی جنگی قوت وغیرہ وغیرہ۔ تقریباً جملہ مضامین دلچسپ
ہیں اور ان میں سے اکثر بڑی تحقیق اور جستجو کے بعد لکھے گئے
ہیں۔ موجودہ جنگ کے زمانے میں ان مضامین کے پڑھنے
سے اقسام کی جنگی معلومات اور مختلف حکومتوں کی بری، بحری
اور فضائی قوتوں کی تفصیل معلوم ہوسکتی ہے۔

مکمل شرح انتخاب اردو۔ از حکیم ابوالانتظار صاحب فخر
والوالمحاسن متین صاحب حیدرآبادی حجم ۲۳۶ صفحات قیمت ۱۲
مولوی سید محمد صاحب ایم اے پروفیسر سٹی کالج کی
مرتبہ "انتخاب اردو" کی یہ مکمل شرح ہے، اصل کتاب اسکول
فائنل کے نصاب میں شریک ہے، اس میں مشہور انشا پردازوں
اور شاعروں کے منتخب مضامین، نظمیں اور غزلیں ہیں، اس
کتاب کی زیر نظر شرح میں ہر مضمون کے ادق الفاظ کے معنی لکھے
گئے ہیں اور خاص خاص محاورات و مصطلحات کی توضیح
اور تاریخی و جغرافی ناموں کی تشریح کی گئی ہے اور ہر مضمون
کا خلاصہ مشکل لفظوں کے معنوں کے آخر میں سلیس زبان میں
لکھا گیا ہے، کتاب کے آخر میں تیس مشہور نثر نگاروں، ادیبوں
اور شاعروں کے مختصر حالات بھی درج ہیں، غرضکہ یہ شرح
محنت سے مرتب کی گئی ہے۔ چھٹی فارم کے طلبہ کو اس شرح
کے ساتھ "انتخاب اردو" پڑھنے میں کافی مدد ملے گی، خصوصاً
وہ طلبہ جو اردو ادب کے مضمون میں کمزور ہوں اس شرح کو
ضرور استفادہ کریں۔ "س"

زیب النساء (افسانہ ودستکاری نمبر) بابتہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۹ء
مرتبہ محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ چیف ایڈیٹر حجم ۱۲۸ صفحات قیمت ۸ر
محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ کا نام ادبی دنیا میں محتاج
تعارف نہیں ہے۔ آپ کی ادارت میں ایک عرصہ تک "النساء"
نکلتا رہا اور اب اس کے دوسرے روپ میں "زیب النساء"
شایع ہو رہا ہے۔ ان ہر دو رسائل کی ظاہری اور باطنی خوبیاں
موصوفہ کی علم دوستی اور حسن قابلیت کی آئینہ دار ہیں۔ زیر نظر
خاص نمبر کے افسانوں میں "عورت کا انتقام" "معصوم محبت"
"مایوس تمنا" "شادی کیسے ہو" "گرداب کا جوڑا" نہایت
پاکیزہ اصلاحی، اخلاقی اور سماجی افسانے ہیں، چند عمدہ نظمیں
بھی اس نمبر میں شامل ہیں۔
دستکاری نمبر کو محترمہ سعیدہ اشرف صاحبہ نے مرتب

کیا ہے۔ اس میں مغربی زردوزی صنعتوں اور دستکاریوں کے نمونے مشرقی مذاق کے مطابق متعدد نقشوں کے ذریعہ آسان طریقوں سے پیش کئے گئے ہیں۔ غرضکہ یہ خاص نمبر عمدہ افسانوں بلند پایہ نظموں اور کار آمد دستکاریوں سے مملو ہے اور اس کے جملہ مضامین، قابل انشا پرداز خواتین کے رشحات قلم کے منت کش ہیں۔ "س"

محکومیتِ نسواں . مترجمہ معین الدین صاحب انصاری کراؤن سائز تقطیع قیمت عہ . یہ جان اسٹوارٹ مل کی "سب جکشن آف اومن" کا ترجمہ ہے اور صاف ستھری زبان میں کیا گیا ہے۔ مولوی معین الدین صاحب انصاری بیرسٹر نے اس سے پہلے بھی بعض کتابوں کے ترجمے کئے اور بہت اچھے کئے ہیں۔ اس ترجمے میں بھی انھوں نے ایسا طرز تحریر اختیار کیا ہے جو کم استطاعت لوگوں کی سمجھ میں آ جائے۔ اصل کتاب جو چار ابواب پر مشتمل ہے، مل کے ان مفکرانہ خیالات کو پیش کرتی ہے۔ جو وہ عورتوں کی محکومیت کی حالت اور ان کی آزادی کی حمایت میں رکھتا تھا۔ یہ ان کتابوں میں سے ہے جن کے مطالعہ سے انگلستان کے باشندوں میں سماجی بیداری پیدا ہوئی اور قدیم رسم و رواج کے بندھن توڑنے اور سماجی ترقیوں کی شاہراہ کھولنے کی عام تحریک پیدا ہوئی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مل کی محکومیت نسواں کو عورتوں کی آزادی کا صحیفہ سمجھنا چاہیے۔

تاریخ بچکنڈہ . از سید مراد علی صاحب طالع مدرس کراؤن تقطیع . ۴ صفحات قیمت ۵ر . ضلع ناندیڑ تعلقہ دیگلور کے تحت ایک قصبہ بچکنڈہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مختصر رسالہ اسی قصبے کی تاریخ ہے۔ اس قصبے کی اہمیت یہ ہے کہ کسی زمانے میں ایک مشہور مقام تھا۔ یہاں کا تالاب اور مندر دونوں تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب یہ مقام بہمنی سلطنت کے ختم ہو جانے کے بعد قطب شاہیوں کے قبضے میں آیا تو یہاں پارس پتھر برآمد ہونے کا ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ یہاں قطب شاہی عہد کی ایک خوبصورت مسجد بھی ہے جو معسکری مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ مندر پورے کا پورا سنگ سیاہ کا اور بہت ہی قدیم ہے۔ یہاں ایک بڑے بزرگ حضرت خواجہ سید احمد کبیر روشن ضمیرؒ کا مزار بھی ہے اور سالانہ آپ کا عرس بہت اہتمام سے ہوتا ہے۔ قدرتی مناظر کے لحاظ سے بھی یہ مقام قابل دید ہے۔ قابل مولف نے بہت سلیقے سے اس مقام کے متعلق تمام ضروری باتیں تاریخی اور عصری ایک رسالے کی صورت میں جمع کر کے شایع کی ہیں۔

شاہ نعمت اللہ ولی . از محمد عبدالحفیظ صاحب جونیا تقطیع قیمت ۱۴ر . حضرت شاہ نعمت اللہ صاحبؒ مشہور عالم بزرگ گزرے ہیں۔ قیامت کے بارے میں آپ سے جو پیشین گوئی منسوب ہے اس کی وجہ سے تو ہر شخص آپ کے نام نامی سے واقف ہے۔ مولوی عبدالحفیظ صاحب نے آپ کے حالات زندگی نہایت تلاش اور کوشش سے فراہم کر کے یہ سوانح عمری مرتب کی ہے۔ اس میں آپ کا کلام بھی مختلف تذکروں اور ماخذوں سے لے کر شایع کیا ہے۔ کتاب بہت تحقیق اور سلیقے سے مرتب کی گئی ہے۔

مجلہ عثمانیہ جلد ۱۲ نمبر ۱ اور ۲ . یہ مجلے کی بارہویں جلد کا پہلا مشترک نمبر ہے جو عبدالعلی خاں صاحب بی اے اور عابد علی خاں صاحب متعلم بی اے کی ادارت میں شایع ہوا ہے۔ مضامین مختلف عنوانات معاشیات، سیاسیات، فلسفہ، ادبیات

سائنس، سوانح عمری، افسانے اور سفرنامے کے تحت دئے گئے ہیں اور اکثر و بیشتر مضامین کافی محنت اور توجہ سے لکھے گئے ہیں۔ نظم کا حصہ بھی دلچسپ ہے۔ رسالہ مجموعی طور پر بہت سلیقہ اور خوبی سے ترتیب دیا گیا ہے۔ "س۔م"

روحِ رواں۔ کراؤن سائز۔ ۱۴۲ صفحات مجلد مطبوعہ نامی پریس قیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں ہے۔

یہ اردو کے مشہور شاعر جگت موہن لال رواں کی نظموں، غزلوں اور رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ رواں اپنی شاعری کی بدولت ادبی حلقوں میں کافی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

ان کی شاعری کے پس منظر میں ایک طرف فارسی شعر و سخن کا ذوق اور قدیم اساتذہ اردو کے کلام کے وسیع مطالعہ کے نقوش نمایاں ہیں اور دوسری طرف جدید علوم و فنون کے اثرات۔ لیکن یہ رواں کی وضعداری ہے کہ وہ موجودہ زمانے کی ندرت کاریوں کے درمیان رہ کر بھی قدیم اساتذہ کے نقش قدم سے تجاوز نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے باوجود ان کی شاعری میں جو جدید اثرات شامل ہوگئے ہیں زمانے کا اقتضا ہے۔

رواں نہایت خوش فکر اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا مقصد معین ہوتا ہے۔ اور وہ لفظی صناعیوں پر زیادہ وقت صرف کرنا نہیں چاہتے جیسا کہ ایک شعر میں فرمایا ہے۔

میرے جذبات کی ندرت ہے غالب حسن لفظی پر
نہیں ہے اس لئے کچھ فکر انداز بیاں مجھ کو

ان کا انداز بیاں صاف ستھرا ہے۔ خیالات کے اظہار کا طریقہ راست اور ایچ پیچ سے خالی ہوتا ہے۔ جیسا کہ توقع ہو سکتی ہے ہندو مذہب کی روایات اور تاریخ کے متعلق بعض بہترین نظمیں رواں کی فکر کا نتیجہ ہیں۔ سرور، چکبست وغیرہ کی اس طرح کی نظموں کو شامل کرکے یہ اردو شاعری کا ایک ضروری اور اہم سرمایہ ہیں۔ مذکورۂ بالا نظموں کے علاوہ شعر و سخن پر جو نظم انھوں نے "شاعری" کے عنوان سے لکھی ہے وہ اور "دیوانے" خاص چیزیں ہیں۔

رواں کی غزلیں بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ان میں غزل کے تمام لوازم کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی ان کے انداز بیان میں موجودہ زمانے کی بہت سی ندرتیں داخل ہوگئی ہیں۔ بعض ایسے مضامین کو بھی جو عام غزل گو شعراء کے دائرے سے خارج تھے انھوں نے غزل میں داخل کرکے اس میں تھوڑی سی وسعت پیدا کرلی ہے۔ اس میدان میں ان کی پختہ مشقی ان کو اساتذہ کے رتبہ تک پہنچا دیتی ہے۔

رواں کی رباعیاں جو غزلوں سے تعداد میں کم نہیں ہیں خاص شہرت رکھتی ہیں۔ یہاں بھی ان کی عام شاعری کی خصوصیت سادہ بیانی اور سلاست موجود ہے۔ ان رباعیوں کے موضوع حضرت امجد کی رباعیوں کی طرح اخلاقی اور حکیمانہ ہیں۔

رواں کی شاعری کی شہرت کے مدنظر ان کے کلام کی اشاعت ایک ضرورت تھی جو "روحِ رواں" سے پوری ہو رہی ہے۔ "ع۔س"

نغمہ و الہام۔ کراؤن سائز ۴۸ صفحے قیمت ۱؍ ملنے کا پتہ سب رس کتاب گھر۔

یہ مسٹر سجاد علی خاں ساجد حیدری کی نظموں کا مختصر مجموعہ ہے۔ جو کم و بیش چار سال کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ابتدا میں جناب ضامن کنتوری کا ایک خط تعارف کے طور پر شامل ہے۔

زاہد حیدری باوجود نوعمری کے اچھا اور دلچسپ کلام سرانجام کرنے لگے ہیں۔ عمر اور کلام کا مقابلہ کیجیے تو مجموعے کا عنوان غلط نہیں معلوم ہوتا۔ تعارفی خط میں جناب ضامن نے ' ان نظموں کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے ' جس قدر کلام اس مجموعے میں شامل ہے ' وہ یک لخت جذبات سے معمور ہے " نظموں کے موضوع ' کچھ شاعرانہ اور جذباتی ہیں اور کچھ مذہبی اور گرد و پیش کے مسائل ' لکھنے کا انداز سادہ سیدھا اور دلچسپ ہے۔ توقع ہے کہ زاہد صاحب کی مشق اسی طرح جاری رہی تو وہ جلد اچھے شاعروں کی صف میں جگہ حاصل کریں گے۔ بعض غلطیاں بھی کہیں کہیں نظر سے گزریں مثلاً پہلی ہی نظم کے تیسرے شعر میں " منصور " کو " مقصور " لکھ دیا گیا ہے۔ صفحہ ۴ پر آخری شعر " خوشا ے دشت وحشت " " خوشا اے دشت وحشت " اسی شعر میں " رکھلی " کا املا " رکھ لی " ہونا چاہیے۔

راز و نیاز۔ کراؤن سائز۔ ۸۰ صفحے چھپائی اچھی مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی۔ قیمت درج نہیں ہے۔

یہ حبیب اشعر دہلوی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ ابتدا میں مصنف کا دیباچہ ہے ' جس میں نظموں کی طباعت پر مسرت اور " کوتاہ نظر طبائع کے ایرادات و اعتراضات " سے خائف نہ ہونے کا اعلان کیا گیا ہے اور اپنے " کمال فن " کو " کسی " شباب سے بھرپور " ہستی کی " چشم سحرکار " کی " افسوں طرازی " کا نتیجہ " بتلایا گیا ہے۔ غزلوں کی زبان صاف اور سلیس اور خیالات پاکیزہ ہیں اور امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھی جائیں گی۔

نادر خطوط غالب۔ کراؤن سائز ۶۲ صفحے۔ طباعت معمولی ' مطبوعہ دی فائن پریس لکھنؤ قیمت ۸/ ۔ یہ غالب کے ۲۷ خطوط کا مجموعہ ہے۔ جس کو جناب سید محمد اسمٰعیل صاحب ہمدانی گیاوی نے مرتب فرمایا ہے۔ ابتدا میں غالب کی تصویر اور مرتب کا ۱۵ صفحوں کا مقدمہ ہے۔ جس میں غالب کے کمالات فن پر بحث کی ہے اور غالب کی نثر نگاری کے سلسلے میں " یادگار غالب " کا اقتباس خطوط کے طرز تحریر سے متعلق پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں غالب کے تین بہاری تلامذہ ' (۱) صوفی منیری بہاری (۲) صفیر بلگرامی (۳) کرامت ہمدانی بہاری کے مختصر حالات بھی درج ہیں ' جن کے نام کے خطوط اس مجموعے میں شامل ہیں۔ پچھلے چند مہینوں میں ' غالب کے حالات ' شاعری ' خطوط سے متعلق کئی اہم اور قابل ذکر تصنیفات اور تالیفات شایع ہو چکی ہیں۔ ان میں ایک اضافہ ہے ' جس سے آئندہ زمانے میں غالب کے حالات اور کمالات کا وسیع تر اور زیادہ صحت بخش نقطہ نظر سے مطالعہ ہو سکے گا۔ مرتب کے دادا سید شاہ علی حسین ہمدانی عالی نے وہ خطوط جو اپنے والد سید شاہ کرامت حسین ہمدانی بہاری کے نام حضرت غالب نے بھیجے تھے۔ " نادر خطوط غالب " کے نام سے ایک جا کر کے شایع کرنا چاہا تھا۔ لیکن چند مجبوریوں نے اس خدمت سے انہیں محروم رکھا لیکن " اگر پدر نتواند پسر تمام کند " ستائیس سال کے بعد لائق پوتے کو دادا کی یہ خواہش پوری کرنے کا موقع ملا۔ اس سے غالب کے حالات کے ایک رخ پر صحیح زاویہ سے روشنی پڑ سکتی ہے۔ مقدمہ میں مرتب نے کرامت ہمدانی کا دیوان غالب کی اصلاحوں کے ساتھ شایع کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ امید ہے کہ یہ قیمتی مرقع بھی جلد شایع ہو جائے گا۔ " ع۔ س "

اجتماعی زندگی کی ابتدا۔ از محمد عاقل صاحب ایم اے استاد معاشیات جامعہ ملیہ۔ چھوٹی سائز حجم (۱۱۲) صفحے قیمت ۸/

اس کتاب میں حضرت انسان کے بن مانس سے ترقی کرکے آدمی

بن جانے کے حالات جمع کئے گئے ہیں اور قیاسی امور کو اس طرح لکھا گیا ہے کہ وہ گویا واقعی امور ہیں، اشرف المخلوقات کا بن مانس سے ترقی کرکے انسان بن جانا ڈارون کا نظریہ ہے لیکن کم از کم اسلامی نقطہ نظر سے اس کی کوئی وقعت نہیں ہوسکتی۔ جامعہ ملیہ کے پروفیسروں کا اس نظریہ پر عمل تعجب سے خالی نہیں ہے۔

ہندوستان کا دیہی قرض۔ از محمد عاقل صاحب ایم اے

چھوٹی سائز حجم ۷۶ صفحات قیمت ۴ر۔ معاشی اور معاشرتی مسئلہ کی تحقیقات دو طرح سے جاسکتی ہیں۔ ایک تو تحقیقات کو وسیع رقبہ پر پھیلا کر سرسری جائزہ لیا جائے اور دوسری صورت یہ ایک مختصر محدود رقبہ کو متعین کرکے جزئی اور تفصیلی امور کی صراحت کی جائے۔

اس مختصر رسالہ میں اولاً قرض خواہوں کی قسمیں، قرضے کے اسباب، سود کی شرح، تقاوی کے نرخ وغیرہ امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرے حصے میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کا دیہی قرض کس قدر ہے اور اس پر کتنا سود حاصل ہوتا ہے۔

کتاب نہایت محنت سے لکھی گئی ہے، اور ہر اس شخص کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے جو معاشی امور سے دلچسپی رکھتا ہے۔

سیاسیات کی پہلی کتاب۔ از محمد عاقل صاحب ایم اے

حجم ۹۰ صفحے قیمت ۱۲ر۔ اس کتاب میں سیاسیات کے مبادیات کو اختصار کے ساتھ دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

پہلا باب ریاست کی تعریف کے عنوان پر ہے جس میں ریاست کے لازمی عناصر آبادی۔ علاقہ۔ حکومت، اقتدار اعلیٰ وغیرہ سے بحث کی گئی ہے دوسرے باب میں ریاست کی ابتدا کے بارے میں "نظریے" کا بیان ہوا ہے۔ تیسرا باب ریاست کا اقتدار اعلیٰ اور افراد کی آزادی کے عنوان پر ہے۔

تاریخ ہندوستان کی تمہید۔ از پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)

حجم ۴۲ صفحے قیمت ۵ر۔ یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، پروفیسر صاحب کی زیر تصنیف تاریخ ہندوستان کی تمہید ہے۔ یہ حقیقت اب عالم آشکار ہوچکی ہے کہ ہمارے مدرسوں میں جو تاریخ ہند کا درس ہوتا رہا ہے وہ حقیقت سے دور اور قصداً ہندوستانی ذہن کو مسخ کرنے کے لئے ہوتا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ اب اس نقصان کی تلافی کی طرف لوگ متوجہ ہوچکے ہیں، چنانچہ زیر نظر کتاب اس کی تمہید ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے۔ ہندوستان خصوصاً جنوبی ہند (دکن) اس وقت بھی مہذب اور متمدن تھا جب کہ یونان اور مصر بھی تہذیب کے علم بردار نہیں بنے تھے۔ "ن۔ م"

سوتیلی ماں۔ از محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ۔ چھوٹی تقطیع کے ۷۶ صفحات عمدہ طباعت قیمت ۴ر سب رس کتاب گھر رفعت منزل خیرت آباد۔

اس مختصر مفید کتاب میں قابل مصنفہ نے اصلاح معاشرت کے بعض اہم پہلوؤں پر بڑی قابلیت سے روشنی ڈالی ہے۔ مختلف عنوان مثلاً ماں اور سوتیلی ماں، ارث و ماحول، فطرت، بچوں اور ماں کا عزہ و اقربا، سوتیلی ماں، باپ، دوسری بیوی لانے سے قبل سوتیلے بچے وغیرہ کے تحت نہایت وضاحت سے سوتیلی ماں اور سوتیلے بچوں کے تعلقات خوش گوار بنانے کے مفید طریقے بیان کئے ہیں اور اس سلسلے میں باپ، سوتیلی ماں اور بچوں کے فرائض اور حقوق پر سبق آموز پیرایے میں اپنے اعلیٰ تاثرات قلمبند کئے ہیں، یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر وہ مرد جو اپنے بچوں کے لئے سوتیلی ماں لانے پر مجبور ہوا ہو اور ہر وہ خاتون جو سوتیلی ماں بن چکی ہو یا بننے والی ہو اور وہ ذی شعور بچے جو سوتیلی ماں کے

زیر سایہ آ چکے ہیں خصوصیت کے ساتھ اس کو غور سے پڑھیں۔ اور ہمیں امید ہے لایق مصنفہ کی قیمتی نصیحتوں پر عمل کر کے اپنی زندگیوں اور گھر کی فضا کو خوش گوار بنائیں۔ ہر مرد اور ہر عورت کو بھی اس کتاب کے پڑھنے کی اسی لیے ضرورت ہے کہ نہ معلوم کب کس مرد کو اپنے بچوں کے لیے سوتیلی ماں لانے کی ضرورت ہو اور اسی طرح کسی خاتون کو بھی کبھی سوتیلی ماں بننا پڑے۔ "س"

نوائے کارگر
آتش خاموش
چراغاں

احسان ایک غریب مزدور شاعر ہے جس کا کلام زندگی کی تلخیوں کو بے نقاب کرنے میں بڑی حد تک کامیاب سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ ان بدمست اور نقال شاعروں میں سے نہیں ہے۔ جو خود تو اچھا کھاتے اچھا پہنتے اور موج کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اندھی تقلید یا فیشن کی خاطر غریبوں کی زندگی سے متعلق نظمیں لکھتے ہیں۔ یہ لوگ پرانے قصیدہ گو شاعروں کی طرح فرضی اور فرمائشی شاعری کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بے چارے قصیدہ گو روپے پیسے کے لالچ میں لکھا کرتے تھے اور یہ شاعر نام و نمود اور جدت پسندی کی ہوس میں لکھا کرتے ہیں۔

" احسان کا پہلا مجموعہ نوائے کارگر ہے یہ ۲۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا ایک دیباچہ یا تعارف سے ہوتی ہے جو اشارات کے عنوان سے لکھا گیا ہے اس کو شاعر کے ایک دوست محمد توقیر صاحب طاہر گنگوہی نے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

احسان میرا عزیز دوست ہے اور قریب ترین اعزا سے بھی عزیز تر۔ لیکن بدقسمتی سے زندگی کے تلخ تجربات نے اسے اعزا سے خائف اور احباب سے مایوس کر دیا ہے۔" شاعر کے حالات کے سلسلے میں لکھا ہے۔

" لاہور میں احسان نے مزدوری بھی کی اور معماری بھی۔ پہرہ داری بھی کی اور باغبانی بھی۔ لیکن اسے کبھی رات کو بارہ بجے سے پہلے اور صبح کو چار بجے کے بعد مصروف خواب نہیں دیکھا اور آج تک اس کا یہی پروگرام ہے۔"

اس کتاب میں شاعر کی ایک اچھی تصویر بھی ہے جس کو دیکھ کر اس مزدور شاعر کا وہ قول یاد آ جاتا ہے جو اس کے دوست نے اپنے اشارات میں نقل کیا ہے کہ

" یاد رکھو میری بوریے پہ آنکھیں کھلی ہیں اور قالین پر دم نکلے گا"

نوائے کارگر میں سو سے زیادہ نظمیں اور تقریباً بیس غزلیں ہیں۔ نظموں کو مختلف عنوانوں مثلاً حسن خیال، مناظر، قلب و نظر، زبود محبت، ہجوم خیال اور لہریں وغیرہ کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے عنوان میں حمد و نعت ہے۔ نعت میں ایک بڑی پاکیزہ نظم ہے جس کے چند آخری شعر یہ ہیں۔

غلاموں کو دیا اس شان سے پیغام آزادی
کہ گردش میں پیالہ ہے تیرہ سو برس سے جام آزادی
کتاب اس پر وہ اتری ہے جسے قرآن کہتے ہیں
تمدن کی تدبر کی وفا کی جان کہتے ہیں
وہ قرآں جس کی ضو سے بزم باطن میں اجالا ہے
وفا میں سربلندی حریت کا بول بالا ہے
جہاں جب تک جہاں میں عظمت قرآں باقی ہے
عمل یادگار سید ذی شان باقی ہے
جو ہے قرآں کا منکر اس کا ایماں ہو نہیں سکتا
غلامی کا جو حامی ہے مسلماں ہو نہیں سکتا

" احسان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ چراغاں ۲۳۰ صفحات میں چھپا ہے اس میں تقریباً " پونے سو نظمیں اور بیس سے زیادہ غزلیں ہیں۔ ان نظموں میں بھی حقیقت کی تلخیوں کو اس خاص رنگ میں

بے نقاب کیا گیا ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک ایسی نظم کے چند شعر پیش کیے
جو ہم میں سے شاید اکثروں کے حالات زندگی پر منطبق ہوتی ہوگی۔

اک دن کہ دوپہر کی جوانی تھی کامیاب
آتش فشانیوں میں تھا مصروف آفتاب
تھی بام و در پہ روح جہنم فسانہ خواں
جھنجلائی سی زمین بھڑکتا سا آسماں
طیارہ دھوپ میں جو اٹھے گل کے گر پڑے
طائر اڑے ہوا میں تو پر جل کے گر پڑے
ایسے میں اک مریض ادب خستہ و زبوں
لے کر عقیدتوں کا ابھارا ہوا جنوں
ہر سانس میں خلوص کی خوشبو لئے ہوئے
دل میں خیال خدمت اردو لئے ہوئے
سودا رسوخ کا نہ جنونِ مصاحبت
سرسام منتوں کا نہ خبطِ ملازمت
خواہش نہ قرض کی نہ سفارش کی آرزو
شہرت کی اور نہ دادِ نگارش کی آرزو
ملنے کو اک محافظِ اردو کے گھر گیا
روکا ہزار ذوقِ خودی نے مگر گیا
نیکی کا جس کی سارے زمانے میں شور ہے
اس میں بھی زور اس کے قلم میں بھی زور ہے
ہے جس کے رنگِ رخ کا زر و سیم پر مدار
قرنوں سے کامگار ہے پشتوں سے مالدار
لیکن بغیر پوچھے کہ آنے کا کیا سبب
اس دھوپ میں عذاب اٹھانے کا کیا سبب
باصد غرور جاہ و بانداز پیچ و تاب
دولت کی بے خودی نے یہ بڑھ کر دیا جواب
آرام کا یہ وقت ہے اس وقت جائیے
گر ہو سکے تو شام کو تشریف لائیے
ارماں بھری نگاہ کو چکر سا آگیا
دنیائے آرزو میں اندھیرا سا چھا گیا
رنگیں بیانیوں کے قدم رک کے رہ گئے
خودداریوں کے سبز علم جھک کے رہ گئے
ثابت ہوا کہ فطرتِ زر میں غرور ہے
شہرت کا طمطراق حقیقت سے دور ہے

احسان بن دانش کی نظموں کا تیسرا مجموعہ آتش خاموش ہے۔ اس میں ڈیڑھ سو صفحات کی نظمیں اور پچاس صفحات کی غزلیں ہیں۔ ان تین مجموعوں کے علاوہ اور دو مجموعے 'نفیر فطرت' 'جادۂ نو' کی اشاعت کا بھی اعلان کیا گیا ہے۔ یہ سب کتابیں اردو شاعری میں ایک صحت مند اور مفید اضافہ ثابت ہوں گی۔ اور ان نوجوانوں کے لئے خضر منزل کا کام دیں گی جو شاعرانہ ترنگوں، شبابیاتی کیفیتوں اور آزادی و رعنائی خیال کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ مذہب شائستگی اور تہذیب کو گالیاں دیئے بغیر گزر نہیں۔ احسان کے کلام میں حریت و آزادی اور خلوص و صداقت اور پاکیزہ جذبۂ عمل نے جس خوبی سے امتزاج پایا ہے اس کی نظیر جدید اردو شاعری میں مشکل سے ملے گی۔ اور یہ تمام خوبیاں نتیجہ ہیں علم و کمال اور محنت و عمل کے دوش بدوش چلنے کا۔ جہاں ان میں سے ایک نے دوسرے کا دامن چھوڑا اور وہ بے ڈھنگا پن اور بے راہروی پیدا ہوگئی جو عہد حاضر کے بعض برخود غلط نوجوان شاعروں اور ادیبوں کا طرۂ کمال ہے۔

زور

سال گرہ نمبر ۳۹ء

ہر عمر کے بچوں کے لئے

پہلے ہم

اس مرتبہ سال گرہ نمبر عجیب و غریب چیز ہوگا۔ کاغذ بہت اچھا تصویریں دلچسپ غرض ظاہری صورت بہت شاندار
ہوں گی اور مضمونوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ تم اگر خریدار نہیں ہو تو فوراً ہو جاؤ۔ خریداروں سے اس کی قیمت الگ نہیں لی جاتی۔ ویسے اس کی قیمت ۸ ہے۔ سالانہ ۲/

منیجر پیام تعلیم، قرول باغ، نئی دہلی

بچوں سے

اس ایک ماہ کے عرصے میں کیا کیا ہوا۔ حیدرآباد نے جشن سال نو منایا۔ کیونکہ حیدرآباد کے سب سرکاری کاموں کا تعلق فصلی مہینوں اور سال سے ہوتا ہے۔ سال نو نہ صرف حیدرآباد بلکہ بعض اضلاع خاص کر نظام آباد وغیرہ میں بھی بڑی کامیابی کے ساتھ منایا گیا اس موقع پر میلا اور دوسرے دلچسپ مشاغل بھی ہوتے ہیں مشاعرہ بھی ترتیب دیا جاتا ہے۔ آپ نے بھی کسی جلسے میں ضرور شرکت کی ہوگی۔

ہاں ایک بات آپ سے یہ کہنی ہے۔ بعض بچوں نے ہمارے پاس لکھ بھیجا اور بعضوں نے گفتگو کی ہے کہ سب مل کر ایسا ایک مجلس قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں بچے ہی تقریر کریں گے۔ بچے ہی نظمیں پڑھیں گے اور اس طرح کے دوسرے مفید مشغلے رہیں گے۔ ہمارا بھی کئی دن سے یہی خیال تھا اس طرح آپ تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر میں بھی مہارت پیدا کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ جلد سے رائے لکھ بھیجئے۔ دیکھیں اس طرف پہلے حیدرآبادی بچے توجہ کرتے ہیں یا باہر کے۔ اگر یہ تحریک کامیاب رہی تو اس سے متعلق اور چند باتیں بتائیں گے۔

صفحہ ۵ پر جو اعلان کیا گیا ہے اسے ضرور پڑھیں۔ ہمارے بھائیوں اور بہنوں کی خط و کتابت کامیاب طریقہ پر چل رہی ہے۔ نورالقمر الدین جنگاؤں کو توجہ دلائی جاتی ہے کہ وہ عارف علی انصاری سے خط و کتابت کریں۔

گزشتہ پرچے میں ایک معمہ دیا گیا تھا اس کا صحیح حل یہ ہے۔ (۱) سانپ (۲) بندر (۳) ریچھ (۴) ہرن (۵) شیر (۶) چیتا۔ بہت بچوں نے اس میں حصہ لیا جن اصحاب کے بالکل صحیح حل وصول ہوئے ان کے نام نیچے لکھے جاتے ہیں۔

(۱) عارف علی انصاری (۲) حبا شطاری (۳) فیروز الدین صدیقی (۴) سید محمود علی (۵) سید یوسف علی۔
(۶) احمد علیم الدین (۷) حبیب شمس (۸) عطیہ سلطانہ۔

اس ماہ میں ایک اور معمہ دیا جاتا ہے۔ یہ بھی بڑا ہی دلچسپ ہے اس کو حل کر کے ۱۵ نومبر تک بھیج سکتے ہیں۔

معین الدین احمد انصاری

انعامی معمہ

سوال:۔ آٹھ خطِ مستقیم ایسے کھینچے جائیں جس میں کا ہر خط آٹھ زاویے بناتا ہو۔

نوٹ:۔ صحیح حل والے صاحب کو ایک جلد "نظام الملک آصفجاہ اوّل" مصنفہ شیخ چاند صاحب با تصویر دی جائے گی۔ اگر زیادہ صحیح حل وصول ہوں تو قرعہ اندازی سے انعام نکالا جائے گا۔ تمام حل ۱۵ نومبر تک دفتر میں آجانا چاہیئے۔

سید خواجہ معین الدین (متعلم ہشتم الف فوقانیہ گلبرگہ شریف)

"میں چگوں سو کیا؟"

ایک تھی چڑیا، وہ نکلی کہیں چگنے، دور سے
اس کو ایک چنے کا دانہ نظر آیا، یہ بھوکی تو تھی ہی
فوراً اتر پڑی اور جھٹ سے دانہ اٹھا چلی وہاں سے
اڑتی ہوئی کہ کہیں چین سے بیٹھ کر اسے کھائے۔
اڑتے اڑتے وہ ایک مکان کی چھت پر
پہنچی، وہاں پڑا تھا ایک کاٹھ کا ٹکڑا، یہ چونچ
میں چنے کا دانہ لئے ہوئے اس پر جا بیٹھی اور دانہ
کاٹھ پر رکھ کر ستانے لگی۔

کاٹھ میں ایک سوراخ تھا چنے کا دانہ اس میں
گر پڑا۔ جب چڑیا دم لے چکی تو اس نے چاہا کہ چنے کا دانہ
کھائے لیکن دانہ سوراخ میں پھنسا ہوا تھا۔ اس نے
بہت کوشش کی کہ چونچ سے اس کو نکال لے لیکن
سوراخ تھا چھوٹا سا اس میں سے دانہ نہ نکل سکا۔
چڑیا نے جب دیکھا کہ دانہ نکلتا نہیں ہے تو
بڑی عاجزی سے کاٹھ سے کہنے لگی۔

کاٹھ کاٹھ چنا دے، کاٹھ کاٹھ چنا دے
"میں چگوں سو کیا"

کاٹھ نے چنا دینے سے انکار کر دیا۔ یہ وہاں
سے گئی بڑھائی کے پاس اور بڑھائی سے کہا۔

"بڑھائی بڑھائی کاٹھ چیر
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟"

بڑھائی نے کہا "ایک چنے کے دانے کے لئے
میں کاٹھ کہاں چیرتا بیٹھوں۔ دور ہو یہاں سے۔"
چڑیا گئی راجہ کے پاس فریاد لے کر اور کہا۔

"راجہ راجہ بڑھائی ڈانٹ
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا۔"

راجہ نے ہنس کر کہا "خوب! اتنی سی بات کے لئے
میں بڑھائی کو ڈانٹوں؟ نکل جا یہاں سے۔"
چڑیا گئی رانی پاس اور رانی سے کہنے لگی۔

"رانی رانی راجہ روٹھ
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟"

رانی نے کہا "دیوانی ہوئی ہے تیرے چنے کے
دانے کے لئے میں اپنے راجہ سے روٹھوں؟ یہ تو مجھ
سے نہیں ہو سکتا۔" چڑیا گئی چوہے کے پاس اور چوہے
سے التجا کرنے لگی کہ

"چوہے چوہے رانی کھٹولا کاٹ
رانی راجہ روٹھتی نہیں
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟"

چوہے نے کہا "بی چڑیا، میں کھٹولا کاٹوں نہ

تمھارا چنے کا دانہ لے گا۔ تم کہیں اور جاؤ۔" چڑیا گئی
بلی کے پاس اور دل میں یہ سوچنے لگی کہ "ٹھیرو میاں
چوہے کو مزا چکھاؤں گی۔" بلی سے کہنے لگی۔

" بلی بلی چوہے کو کھا
چوہا رانی کھٹولا کاٹتا نہیں
رانی راجہ روٹھتی نہیں
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ پھیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟"

بلی نے کہا " میری بلا سے میں کیا کروں ؟
میں تو چوہے کو کھانے سے رہی!" چڑیا اپنا سا منہ
لے لکڑی کے پاس پہنچی کہ بی بلی کو کچھ سزا دلوائے۔
لکڑی سے کہنے لگی۔

" لکڑی لکڑی بلی مار
بلی چوہا کھاتی نہیں
چوہا رانی کھٹولا کاٹتا نہیں
رانی راجہ روٹھتی نہیں
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟"

لکڑی نے کہا " چل چل میں ان باتوں میں
نہیں پڑتی۔" چڑیا چلی آگ کے پاس اور آگ سے
یوں بولی۔

" آگ آگ لکڑی جلا
لکڑی بلی مارتی نہیں
بلی چوہا کھاتی نہیں
چوہا کھٹولا کاٹتا نہیں
رانی راجہ روٹھتی نہیں
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟"

آگ نے کہا " جانے میری بلا سے! میں کیا جانوں
کہ تم کیا چگو!" چڑیا پھر چلی سمندر کے پاس اور سمندر سے کہا۔

" سمندر سمندر آگ بجھا
آگ لکڑی جلاتی نہیں
لکڑی بلی مارتی نہیں
بلی چوہا کھاتی نہیں
چوہا رانی کھٹولا کاٹتا نہیں
رانی راجہ روٹھتی نہیں
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟"

سمندر نے کہا " مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکے گا۔" چڑیا چلی
ہاتھی پاس اور ہاتھی سے کہا کہ۔

" ہاتھی ہاتھی سمندر سوکھ (پی جا)
سمندر آگ بجھاتا نہیں

آگ لکڑی جلاتی نہیں
لکڑی بلی مارتی نہیں
بلی چوہا کھاتی نہیں
چوہا رانی کھٹولا کاٹتا نہیں
رانی راجہ روٹھتی نہیں
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟"

ہاتھی نے یہ سب سن کر اپنی گردن ہلائی اور کہا "اونہہ ہونہہ میں تو اس معاملہ میں دخل نہ دوں گا۔ زبردستی سمندر کا پانی کیوں سوکھوں؟" اب چڑیا لگی سوچنے کہ کیا کروں۔ جھٹ اس کو خیال آیا کہ چلو چیونٹی پاس چلیں اس کام میں تو وہی مدد کر سکے گی۔ فوراً چیونٹی پاس پہنچی اور اس سے کہا کہ

"چیونٹی چیونٹی ہاتھی کی سونڈ میں گھس
ہاتھی سمندر سوکھتا نہیں
سمندر آگ بجھاتا نہیں
آگ لکڑی جلاتی نہیں
لکڑی بلی مارتی نہیں
بلی چوہا کھاتی نہیں
چوہا رانی کھٹولا کاٹتا نہیں
رانی راجہ روٹھتی نہیں
راجہ بڑھائی ڈانٹتا نہیں
بڑھائی کاٹھ چیرتا نہیں
کاٹھ چنا دیتا نہیں
میں چگوں سو کیا؟"

چیونٹی نے کہا "بہن یہ کتنی بڑی بات ہے۔ چلو میں ابھی چلتی ہوں"۔ یہ کہہ کر چیونٹی جونہی لگی ہاتھی کی سونڈ میں گھسنے۔
ہاتھی نے کہا "میری سونڈ میں نہ کوئی گھسیو میں سمندر سوکھتا ہوں"
سمندر نے کہا "مجھے کوئی نہ سوکھیو میں آگ بجھاتا ہوں"
آگ نے کہا "مجھے کوئی نہ بجھائیو میں لکڑی جلاتی ہوں"
لکڑی نے کہا "مجھے کوئی نہ جلائیو میں بلی مارتی ہوں"
بلی نے کہا "مجھے کوئی نہ مارے میں چوہا کھاتی ہوں"
چوہے نے کہا "مجھے کوئی نہ کھائیو میں رانی کھٹولا کاٹتا ہوں"
رانی نے کہا "میرا کھٹولا نہ کوئی کاٹیو میں راجہ روٹھتی ہوں"
راجہ نے کہا "مجھے نہ کوئی روٹھے میں بڑھائی ڈانٹتا ہوں"
بڑھائی نے کہا "مجھے کوئی نہ ڈانٹے میں کاٹھ چیرتا ہوں"
کاٹھ نے کہا "مجھے کوئی نہ چیرے میں چنا دیئے دیتا ہوں"

"سب رس" کے ناظرین اسی طرح کی دلچسپ کہانیاں بڑی بوڑھیوں سے سن کر لکھ لیں اور سب رس کے لئے روانہ کریں تو سال بھر کی بہترین کہانی پر سب رس کی طرف سے انعام دیا جائے گا۔

یہ کہہ کر کاٹھ نے چنا دے دیا۔ چڑیا جھٹ سے اپنا چنا اٹھا یہ چل وہ چل چلتی بنی۔ چلو ہو گئی کہانی اور اب کہانی پر تبصرہ ... اللہ میاں کا چھپر۔

سکینہ بیگم

پتنگ

نہایت ہے پیارا مجھے یہ پتنگ — نہ کھاتا ہے کنّا نہ کھاتا ہے لنگ
بڑے اچھے ہیں اس کے ٹھڈی کماں — ذرا دیکھئے آپ بھی بابا جاں
بہت مجھ کو بھاتا ہے یہ روپ رنگ — یہ پھندنا گلابی یہ دھانی پتنگ
ابھرتا ہوا اور لچکتا ہوا — یہ اڑتا ہے کیا اکڑتا ہوا
وہ پھر تیر سا نیچے آ کر اُٹھا — یہ بجلی سا پھر غوطہ کھا کر اُٹھا
یہ اُڑنے میں کیا تیز ہے واہ واہ — ذرا ڈھیل دی بس ہوا ہو گیا
کبوتر سا پر پھٹ پھٹاتا ہوا — ہوا پر چلا سرسراتا ہوا
اُڑانا تو ہے آ گیا مجھ کو ہاں — لڑانا سکھا دو ذرا بھائی جاں
تو پھر دیکھنا اتنے کاٹوں پتنگ — کہ ہو جائیں بس دیکھ کر آپ دنگ

تقریر

لطیف النساء بیگم

میرے خیال میں ملک و قوم کی خدمت کرنے کے لئے تقریر کے سوا کوئی دوسرا بہترین ذریعہ نہیں ہم تقریر کے ذریعہ قوم کی اصلاح کر سکتے ہیں اور ملک کو شاہراہ ترقی پر لا سکتے ہیں۔ عموماً ہر طالب علم کی یہی خواہش ہوتی ہے اور خصوصاً ہماری یہی دلی خواہش رہی کہ کسی نہ کسی طرح سے ملک و قوم کی خدمت کریں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ہم کو ایسا کونسا طریقۂ کار اختیار کرنا چاہیئے جو ہم کو بڑے ہو کر ملک و قوم کی خدمت کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو سکے۔ چنانچہ ہم نے یہ رائے قائم کی کہ ہم کو ابھی سے تقریر کرنے کی مشق کرنی چاہیئے اور مضمون نویسی میں مہارت پیدا کرنی چاہیئے جو کہ آئندہ چل کر ہمیں ملک و قوم کی خدمت کرنے میں بے حد مدد دے گی۔ اس قیاس آرائی کے بعد سے ہی ہم نے مختلف رسائل خصوصاً "سب رس" کا خاص دلچسپی سے مطالعہ شروع کیا۔ تا کہ ہم کو مضمون لکھنے کے طریقے معلوم ہو جائیں اور کالج میں جتنی بھی تقاریر ہوتیں انھیں بغور سنتے اور مقرر کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے۔ مثل مشہور ہے۔

"برباد کسی شخص کی محنت نہیں جاتی"

الغرض اتنی محنت و جانفشانی کے بعد ہم میں تقریر کرنے اور مضمون لکھنے کا کسی قدر ملکہ پیدا ہو چکا تھا۔

خدا کے فضل و کرم سے ہم نے ششم کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد علم کی ساتویں منزل میں قدم رکھا۔ گویا ہمارے سوتے ہوئے نصیب جاگے۔

خدا خدا کر کے وہ دن بھی آن پہونچا جبکہ ہماری دلی مراد جو رہ کر ستاتی تھی بر آئی۔ چنانچہ ہماری مادر کلیہ کے ایک پرانے اور تجربہ کار استاد محترم جناب مولوی فیض الحسن صاحب نے ہماری دلی آرزو پوری کرنے کا بیڑا اٹھایا یعنی ایک انجمن قائم کی اور مڈل کی جماعتوں (الف، ب، ج، د) سے ارکین و معتمدین منتخب کئے گئے۔ اس کے بعد سے ہمارا عملی پروگرام شروع ہوا۔ ہر جماعت میں ہر پنجشنبہ کو تقریری مقابلہ منعقد کیا جانے لگا۔ اور ہر ماہ گریٹ ہال میں مڈل کی جماعتوں کا تقریری مقابلہ ہونے لگا۔ گریٹ ہال کے سب سے پہلے مقابلہ کا عنوان سینما بینی کے فوائد یا سینما بینی کے نقصانات تھا۔ جس میں ہفتم الف نے شایان شان کامیابی حاصل کی اور صف اول میں جگہ پانے کی مستحق قرار پائی۔ یہ بعض طلبائے ہفتم الف کی کوشش اور محترم جناب فیض الحسن صاحب کی حسن توجہ کا نتیجہ ہے۔ اسی سلسلہ میں طلباء ہفتم الف نے اپنے محترم استاد و صدر انجمن کے اعزاز میں ایک ٹی پارٹی ترتیب دی تھی جس میں مختلف طلباء الف نے موصوف کے اوصاف پر روشنی ڈالی ان تقاریر کے بعد موصوف کو پھول پہنائے گئے اس کے بعد تصویر کشی ہوئی اور جلسہ برخاست ہوا اسی موقع پر وصیراج کمار متعلم ہفتم الف نے ایک دلکش نظم سنائی جس کو حاضرین نے بے حد پسند کیا اس نظم کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

اے قلم حاجت ہے مجھ کو اب تری امداد کی
آج لکھنی ہے ثنا مجھ کو مرے استاد کی

ہاں رواں ہو جا خدا را اے مری طبع رواں
ہو عیاں ہر شعر سے خوبی مبارکباد کی

شفقتیں ان کی بیاں ہوں مجھ سے یہ کیا مجال
تربیت تعلیم میں کیا کہہ سکوں استاد کی

علم کی دولت سے مالا مال کرتے ہیں ہمیں
جس کے آگے ہیچ ہیں سب دولتیں اجداد کی

ان کے احساں سے بری ہوں حشر تک ممکن نہیں
حیثیت ماں باپ سے بھی بڑھ کے ہے استاد کی

سید واحد حسین انیس (ہفتم الف سٹی کالج)

مدرس سے خطاب

جو خلق میں افضل ہے لقب جس کا ہے انساں
کہتے ہیں یہ سب تجھ سے اجالا ہے جہاں میں
اک تیرے اشارے سے ہو دنیا تہ و بالا
رفتار سے گفتار سے کردار سے اپنے
تو خلق سراپا ہے تو ایثارِ مجسم
فاقوں میں بھی دینا ہے تجھے درسِ تحمل
جوں شمع تپش سے ہے تری بزم چراغاں
تو کارگہہ دہر میں عرفاں کی ہے تفسیر
غفلت سے تری دم میں اجڑ جائے گی دنیا
آرام کی خواہش کو میں بے جا نہیں کہتا
میں یہ نہیں کہتا کہ تو انسان نہیں ہے
معبود نے تجھ کو بھی دیئے ہیں زن و فرزند
لیکن ہوسِ زر ترا مقصود نہیں ہے
چوکھٹ پہ کسی کی نہ جبیں تیری ہو نیچی
کوتاہ نظر صاحبِ زر کے ہیں پرستار
ٹکڑا انھیں دولت کے دھنی ڈال بھی دیں گے
پیسہ تو طوائف بھی کما لیتی ہے لیکن
جو آن پہ مرتے ہیں وہ ایسا نہیں کرتے
پھٹکنے دے نہ خوشامد ترے نزدیک خدارا
جگ میں جسے کردار کی تعمیر ہے کرنا
ہاں خوف کے عنصر کو تو دنیا سے مٹا دے
ماں باپ سے بڑھ کر ہے معلم ترا رتبہ
دنیا ترے انصاف سے ہو جائے مسخر
ہندو ہی سمجھنا نہ مسلمان سمجھنا
تو درسِ صداقت سے انھیں رام کرے گا
اٹھ دیس کو گردابِ فنا سے تو بچا لے

خالق نے بنایا ہے تجھے اس کا نگہباں
مشہور ہے تو مشعلِ نفس کون و مکاں میں
ہو جائے جہالت کا وہیں دیس نکالا
بھٹکے ہوئے انسانوں کو تو راہ بتا دے
رکھتا ہے تری لاج بہت خالقِ عالم
ہستی تری مٹ جائے پہ دہلے نہ ترا دل
رہنا ہے تجھے سوزِ دروں ہی پہ نازاں
واقف ہے کم و بیش سے اے صاحبِ تدبیر
توکل سے جو بیٹھے تو بگڑ جائے گی دنیا
راحت کی طلب سے تجھے باز آ نہیں کہتا
جذبات میں تیرے کوئی ہیجان نہیں ہے
فطرت یہی کہتی ہے رکھے تو انھیں خرسند
اے نائبِ حق یہ ترا معبود نہیں ہے
اجرت تری جز تحفۂ دل ہو نہیں سکتی
کتوں سے بھی بدتر ہیں خراب ان کے ہیں اطوار
آوارہ یہ سگ ہیں انھیں یوں ٹال بھی دیں گے
عزت جو گئی اس کا مداوا نہیں ممکن
خوددار کبھی ذات سے بے جا نہیں کرتے
تو جھیل لے سختی پہ اسے کر نہ گوارا
بھاتا نہیں ہر خورد و کلاں سے اسے ڈرنا
بنیاد کو نخوت کی محبت سے تو ڈھا دے
بدبخت ہیں وہ تجھ سے جو کرتے ہیں محابا
دے درسِ عمل نیند کے ماتوں کو جگا کر
سب بھائی ہیں تیرے انھیں انسان سمجھنا
ٹوٹے ہوئے دل جوڑ کے تو نام کرے گا
جھوٹے ہیں یہ لیڈر انھیں میداں سے ہٹا دے

مرزا سرفراز علی (ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول کیتی)

اچھی صورت

قمرجہاں کو خدا نے ایک معزز اور دولت مند خاندان کی آغوش عطا فرائی تھی۔ لیکن افسوس حسن کے خزانے سے یہ کچھ اس طرح محروم کر دی گئی تھی کہ سیاہ فام تو تھی ہی اس پر چیچک کے چوڑے چکلے اور گہرے داغ اور سامنے کے دو زردی مائل دانتوں نے اور بھی غضب کر دیا تھا۔ ان سب باتوں پر طرہ یہ کہ جاہل اور بے ہنر بھی تھی۔ ماں کے لاڈ پیار نے اور بھی تباہ کر دیا تھا۔ قمر کا باپ بے چارہ نہایت ہی شریف آدمی تھا۔ اس کے ماں باپ کی دلی خواہش تھی کہ قمر کسی اچھے شخص سے بیاہی جائے۔ بات چیت چھڑنے پر ان کو کچھ عزیزوں اور دوستوں نے مشورہ دیا کہ لڑکی کی شادی کسی خاندانی مگر غریب شخص سے کر دو جو تمہارے گھر میں تمہارے ہی ٹکڑوں پر پڑا رہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ قمر کے والد رضا احمد نے کیوں اس مشورے کو نہ سنا اور انہوں نے مشہور کر دیا کہ اپنی جائیداد میں سے دو گاؤں (جو تقریباً دو لاکھ کی مالیت کے تھے) اپنی لڑکی قمر کے جہیز میں دوں گا۔ اس بیاہ سے پہلے ہی لڑکے والوں میں سے کسی نے لڑکی کو دیکھ لیا اور یہ سب بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ قمر کی عمر اب بیس سال کی ہو چکی تھی اگر دور اندیشی سے کام لیتے تو علم و ہنر کے زیور سے آراستہ کر کے کسی غریب کے حوالے کر دیتے جو دولت کے دباؤ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کا غلام بن کر رہتا۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اولاد خواہ کتنی ہی بدصورت اور بدسیرت کیوں نہ ہو ماں باپ کی نظروں میں اچھی ہی معلوم ہوتی ہے۔ ہر وقت انکی خواہش ہوتی ہے کہ جو بھی ہو اولاد خوش و خرم شاد و آباد رہے۔ یہی وجہ تھی کہ قمر کے والدین اس کی شادی کے لئے سخت متفکر تھے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی چاہتے تھے کہ جس تدبیر سے بھی ہو یہ کسی اچھے اور بڑے گھر میں چلی جائے۔ اسی اثناء میں ایک اجنبی نوجوان کا تبادلہ جس کا نام اختر تھا اور جو فوج میں کسی اچھے عہدے پر تھا اتفاقاً اس مقام پر ہوا جہاں قمر کے ماں باپ رہتے تھے اور کسی پیغام رساں کے ذریعہ سے اس کا پیغام قمر کے لئے آیا دریافت کرنے پر معلوم ہوا لڑکا نہ صرف خاندانی بلکہ نیک اور خوش مزاج بھی ہے۔ بس پھر کیا تھا دو چار دن میں نسبت ٹھیر گئی۔ قمر کے والد رضا احمد نے بات کی بات میں تیاریاں کر کرا کے شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی اور قمر کو مانجھے بھی بٹھا دیا گیا۔ مہمان جمع ہونے لگے لیکن اسی سلسلے میں کسی دشمن نے جا کر اختر سے کہہ دیا کہ بھائی کہاں کی شادی کرنے بیٹھے ہو ذرا تو تحقیق کی ہوتی لڑکی ایسی بدصورت ہے کہ اگر تم اندھیرے میں دیکھ لو تو چیخ مار سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہو گے۔ کہاں کی آفت میں پڑ رہے ہو۔ زندگی وبال ہو جانے کی خود تو ماشاء اللہ سے ایسے حسین ہو اور دلہن ایسی کہ بس بالکل چڑیل کی خالہ معلوم ہوتی ہے یہ سن کر اختر کے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ گھبرا گیا اور فوراً قمر کے گھر یہ پیغام بھیجا کہ میں نے ایسی خبریں سنی ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو مجھے معاف فرمائیے۔ یہ خبر قمر کے ماں باپ پر کڑکتی ہوئی بجلی کی طرح گری اور وہ بے چین و مضطرب ہو گئے لیکن مجبور

ہوش و حواس کو یکجا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے عزیزوں کو جمع کر کے کہا چونکہ شادی کا سامان ہو چکا اور تاریخ مقرر ہو چکی اور مہمان بھی آ گئے ہیں اس لئے اب جس طرح بھی اس بدنامی سے جان بچ سکتی ہو بچائی جائے۔ چنانچہ سوچ ساچ کر لڑکے والوں کو یہ جواب بھجوا دیا گیا کہ یہ خبر جو تم نے سنی ہے سراسر غلط ہے۔ شادی [illegible] کی صورت دیکھنے دلہن کو دکھلا دو علاوہ اس کے تم کو آرسی مصحف کے وقت بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ بات جھوٹ ہے یا سچ۔ اس سے چھٹی پا کر اب اس مسئلہ پر غور کیا گیا کہ آخر اس بے سروپا جھوٹ کو نباہا کس طرح جائے۔ مشورہ دینے والوں نے کہا یہ کتنی بڑی بات ہے کسی خوبصورت لڑکی کو دکھلا دیا جائے گا اب رہا آرسی مصحف اس میں اللہ مالک ہے۔ شادی کے بعد پھر کوئی کر ہی کیا سکتا ہے۔ مجبوراً راضی ہو کر نباہنا ہی پڑے گا۔ قمر کی ایک سہیلی سلطانہ جو انتہائی خوبصورت اور قمر کی ہم سن تھی اس کی شادی ہوئے تقریباً چار سال کا عرصہ ہوا تھا چنانچہ اس کی ایک لڑکی بھی تھی۔ تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر کے اس کو اس کام کے لئے منتخب کیا گیا اور طے پایا کہ اس کو دلہن بنا کر بٹھایا جائے یہ تجویز یقیناً کامیاب ثابت ہوتی اگر اختر اس راز سے واقف نہ ہو جاتا لیکن وہاں تو کوئی بھیدی ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا تھا۔ اس نے سارا راز اختر سے فاش کر دیا۔ اختر یہ تمام باتیں سن کر آگ بگولا ہو گیا۔ چاہتا تھا کہ فوراً اس طلسمات سے اپنی جان چھڑائے کہ پھر اس کو کچھ خیال آیا اور اس نے تمام باتوں پر غور کر کے اپنی جگہ پر ایک رائے قائم کی اور بالکل خاموش ہو رہا۔

۲

برات کا جلوس بڑی دھوم دھام سے فراماں خراماں آ رہا ہے۔ دولہا بڑا خوش خوش ہے لیکن دلہن کے قریبی رشتہ دار نہایت مضطرب و پریشان ہیں۔ ان کے چہروں پر ایک خاص قسم کی اداسی چھائی ہوئی ہے۔ نکاح ہو چکا اب وقت آیا کہ رسومات کی تکمیل کے لئے دولہے کو اندر بلایا جائے اور آرسی مصحف کی رسم ادا کی جائے۔ سلطانہ کا شوہر کسی ضروری کام پر دو چار روز سے غائب تھا اس وقت تک جو بھی تدبیریں کی گئی تھیں اور سلطانہ سے اس سلسلے میں کام لیا جانے والا تھا اس کا ذکر بھی سلطانہ سے نہیں کیا گیا۔ اس لئے جب سلطانہ کے سامنے یہ تمام باتیں لائی گئیں وہ سخت پریشان ہو گئی اور سوچنے لگی کہ اس کو کیا کرنا چاہئے۔ بالآخر جب سب نے کہا کہ کوئی ڈر کی بات نہیں تمہارے شوہر کو یہ راز معلوم نہ ہو سکے گا تم مطمئن رہو۔ اس کے علاوہ قمر نے بھی اپنی عزیز سہیلی کو بلا کر کہا کہ دیکھو سلطانہ تم اس معاملہ میں پس و پیش نہ کرو میرے خاندان کی عزت کا سوال ہے تم میری غمگسار سہیلی ہو میری مدد کرو۔ غریب سلطانہ ہر طرف سے یہ باتیں سنتے سنتے تھک گئی تھی اور اس کے دماغ میں اتنی گنجائش باقی نہیں تھی کہ وہ کچھ بھی اس مسئلہ پر غور کر سکے۔ وقت کی تنگی نے اور بھی مجبور کر رکھا تھا چنانچہ اس نے مرتے جیتے قبول ہی کر لیا اور اپنی چھ ماہ کی بچی طیبہ کو دودھ پلا کر دوسروں کے حوالے کر کے خود نہا دھو دولہنوں کا جوڑا پہن تیار ہو گئی۔

دلہن کو تبدیل کرنے کے لئے ضرور لوگ آئیں گے دلہن یعنی سلطانہ کو دالان میں روتے روتے صبح ہو گئی۔ منہ اندھیرے نماز سے قبل دلہن کی طرف کے آدمی اختر کے یہاں پہنچ گئے۔ پہلے تو یہاں اختر کے آدمیوں نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا لیکن جب اللہ اللہ کر کے دروازہ کھلا اور میاں اختر آنکھیں لال پیلی کئے ہوئے باہر برآمد ہوئے تو ان لوگوں نے کہا کہ ہم لوگوں کی رسومات کے مطابق دلہن کو اس وقت میکے جانا چاہئیے۔ آپ بھی ایک گھنٹے کے لئے تشریف لا سکتے ہیں۔ دلہن شام تک رسومات کی تکمیل کے بعد واپس بھیج دی جائے گی۔ اختر نے کہا اب میں ہرگز ہرگز دلہن کو واپس نہ لے جانے دوں گا۔ مجھے یہ فضول رسومات منظور نہیں اور نہ میں گھڑی گھڑی آنا جانا پسند کرتا ہوں۔ پہلے تو دلہن والوں نے کہا کہ یہ ایک قسم کی بدشگونی ہے۔ اگر اس رسم کی تکمیل نہ ہو گی تو دولہا اور دلہن دونوں کے لئے خرابی ہے لیکن جب ہزار ہا تدبیروں کے بعد بھی نتیجہ صفر ہی رہا تو مجبور ہو کر اصل واقعہ کا اظہار کرتے ہوئے منت سماجت پر اتر آئے اور کہنے لگے کہ اب تک جو ہونا تھا ہو چکا تم خوشی خوشی سلطانہ کو رخصت کرتے ہوئے قمر کو بلوا لو۔ کل بھری مجلس میں بدنامی کے خیال سے ہم لوگوں نے سلطانہ کو جو ایک شخص کی ہو چکی تھی برائے نام تمہارے ساتھ کر دیا تھا۔ اب ہماری عزت و آبرو تمہارے ہاتھ ہے۔ لیکن اختر نے ایک نہ سنی آخر میں یہ کہتے ہوئے کہ میری دلہن میرے گھر میں موجود ہے۔ برائے مہربانی آپ لوگ تشریف لے جائیے دروازہ بند کر لیا۔ دلہن کے رشتہ دار مایوس ہو کر چلے گئے۔ یہاں حمید یعنی سلطانہ کا شوہر واپس آ ہی چکا تھا اب تک تو وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ سلطانہ اپنی سہیلی قمر کی شادی میں شرکت کی غرض سے گئی ہے۔ وہ شادی کے گھر آیا تو بجائے سلطانہ کے اپنی بچی طیبہ کو بلکتے اور بلبلاتے ہوئے دیکھا۔ دریافت کرنے پر انہی رہبر صاحب نے جو ابتدا سے اختر کی رہبری فرما رہے تھے ہمارا حال تفصیل سے کہہ سنایا۔ جس کو سن کر حمید نے سر پیٹ لیا اور بے عزتی کے ناقابل برداشت صدمے سے دیوانہ سا ہو گیا۔ بے چارے رضا احمد حمید کو صورت نہیں دکھا سکتے تھے گو ان کی نیت سلطانہ کے ساتھ بدی کرنا تھی لیکن تقدیر کے سامنے تدبیر کی ایک نہ چل سکی۔ وہ ہارے اور بہت بری طرح ہارے۔ اب دنیا ان کی نظروں میں ہیچ معلوم ہو رہی تھی اور آسمان و زمین گھومتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ بدنامی رسوائی اور جگ ہنسائی کا خوف تھا ہی حمید کی صورت دیکھ کر ان پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ رضا احمد افیون کھا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو رہے اور ساری مصیبتوں سے نجات حاصل کر لی۔ حمید نے اپنی حسین بیوی کو حاصل کرنے کے لئے قانون سے مدد چاہی۔ لیکن یہ عجیب قسمت کا مقدمہ تھا۔ اختر بھی خوب مقدمہ لڑا اس نے عدالت کے روبرو واقعات کا صاف صاف اظہار کر دیا اور کہا سیکڑوں بلکہ ہزاروں آدمیوں کے روبرو اس دلہن کو میرے ساتھ بٹھایا گیا اور پھر میرے ساتھ روانہ بھی کر دیا گیا۔ میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں یہ میری بیوی ہے۔

سرور فاطمہ عصمت

نصیحت

سدا رات کو چاند سے لڑنے والو — سناتا ہوں آؤ تمہیں اک کہانی

بہت دور تاروں کی دنیا سے آگے — کسی شاہ کی تھی وہاں راجدھانی

وہ ملکِ حسیں جو تھا حوروں کا مسکن — جہاں کی ہر اک چیز تھی غیر فانی

جہاں راج تھا بادشاہوں کے شہ کا — جہاں مسکراتی تھی پریوں کی رانی

وہاں ایک دن اک غریب اور بوڑھا — گدا ہوں میں جس کی نہاں ناتوانی

چلا آیا دربار میں جانے کیسے — جسے دیکھ کر ڈر گئی راج رانی

یوں کہنے لگا عرض شاہِ فلک سے — مبارک ہو تجھ کو تری حکمرانی

گدائے سدا مال و زر دینے والے — یہ کیوں چھین لی تو نے میری جوانی؟

کہا شاہ نے اس سے بے چین ہو کر — سنی ہم نے دلچسپ تیری کہانی

گدائے شکایت پہ خوش ہونے والے — خبر بھی ہے تجھ کو، تری نوجوانی!

ستاتی تھی کتنے غریبوں کو ناداں — مٹاتی تھی کتنے گھروں کی نشانی

جوانی نہیں اس لئے دی گئی تھی — کہ لے اس سے تو کارِ ریشہ دوانی

جوانوں سے کہہ اپنی دنیا میں جا کر — رہے پاک کلیوں سے ان کی جوانی

وہ یوں پھر سے جینے کے گُر سیکھ جائیں
اڑا کر فلک سے ستاروں کو لائیں!

نظر

روہنی کی بلّی

روہنی نے جب اپنا ہوش سنبھالا اور کچھ باتیں سمجھنے کے قابل ہوئی تو اس کے ماں باپ نے اسے مدرسے میں داخل کیا۔ اور یہ مدرسہ جانے لگی۔ روہنی کی سالگرہ آئی۔ اس کی پھوپی نے کہا روہنی تمہیں میں اس مرتبہ تمہاری سالگرہ پر کیا تحفہ دوں۔ روہنی کی زبان سے بلی نکلا۔ اور بولی دیکھو پھوپی۔ مجھے سفید اور خوبصورت بلی چاہیئے۔ پھوپی نے جب دیکھا کہ روہنی کو بلی پسند ہے تو انھوں نے ایک چھوٹی خوبصورت بلی روہنی کی سالگرہ پر اس کو دی۔ اور کہا لو روہنی یہ تمہاری سالگرہ کا تحفہ ہے۔ روہنی بلی کو لے کر بہت خوش ہوئی۔ دن رات روہنی بلی کے ساتھ کھیلتی اس کا اور اپنا جی بہلاتی۔ ایک روز روہنی نے خیال کیا کہ چلو اس بلی کا نام رکھیں۔ اور اپنے ہم جماعت لڑکیوں کو بھی دعوت پر بلائیں۔ آخر کار اتوار کا دن مقرر کیا گیا پھر روہنی اس روز کی تیاریوں میں مشغول ہوگئی۔ اس دن کے لئے بہت ہی بے قرار اور بے چین رہتی تھی۔ غرض بڑی دھوم دھام سے اس بلی کا نام رکھا گیا۔

روہنی اپنے بچپن کا زیادہ حصہ اس بلی ہی کے ساتھ کھیل کود میں گذارتی۔ یہ جہاں جاتی بلی کو اپنے ساتھ لے جاتی۔ .... بلی کو بھی روہنی سے کافی محبت ہوچکی تھی۔ روہنی نے اپنی عمر کے پندرہویں سال میں قدم رکھا۔ تو اس کے ماں باپ نے اس کی شادی کرنے کی جی میں ٹھانی۔ خدا کے فضل سے روہنی کے لئے بر ڈھونڈنے میں کوئی بھی مشکل پیش نہ آئی ایک مہینے کے اندر روہنی کی شادی ہوگئی۔ اس پر بھی روہنی نے اپنی بلی کو نہیں چھوڑا۔ اپنی سسرال میں اپنے ساتھ لے گئی۔ اس کے ساتھ ویسے ہی برتاؤ اور محبت سے پیش آتی تھی۔ بلی بھی جب کبھی باہر جاتی اور چوہے کا شکار کر کے میاؤں میاؤں کرتی ہوئی روہنی کے کمرے میں داخل ہوتی تو روہنی سمجھ جاتی کہ بلی مجھے بھی اس کے کھانے میں شریک ہونے کے لئے بلا رہی ہے۔ اور اگر روہنی اس وقت لاپروائی سے اس کے ساتھ پیش آئے تو وہ مرے ہوئے چوہے کو وہاں پر ہی چھوڑ کر کئی گھنٹے بھوکی بیٹھی رہتی.......

اگر روہنی اس کے ساتھ محبت سے پیش آتی۔ کچھ میٹھی باتیں کرتی تو بلی بھی خوشی کے ساتھ چوہے کو چٹ کر جاتی۔

جب کبھی روہنی باغ میں جاتی تو بلی بھی وہاں موجود رہتی اور اس کے ساتھ ادھر ادھر پھرتی۔ اور جب روہنی تھک کر کسی جگہ بیٹھ جاتی تو وہ بھی جلد آ کر اس کے پہلو کی طالب رہتی اور میاؤں میاؤں کر کے روہنی کا دل بہلاتی۔ اور خوش کرنے کی کوشش کرتی غرض انہی باتوں سے روہنی کے دن بغیر بیزارگی' تکلیف اور رنج کے گزر جاتے تھے۔ اگر بلی نہ ہوتی تو دلجوئی کے لئے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ روہنی کی بلی اس کی نظروں میں اس کی سہیلیوں سے بہت زیادہ عزیز تھی۔

چند دنوں کے بعد روہنی نے دیکھا کہ اس بلی کو بچے ہونے والے ہیں اور جب وقت آیا تو اسے چار چھوٹے چھوٹے سفید بچے ہوئے۔ روہنی بچوں کے

لینے کی بے حد کوشش کرتی گر بلی کامیاب ہونے نہ دیتی
بے چاری بلی دن میں کئی مرتبہ باہر جاتی اور اپنے بچوں
کے لئے کھانے کے واسطے کچھ نہ کچھ کہیں نہ کہیں سے
ڈھونڈھ ہی لاتی۔ اور ان کا پیٹ بھرتی۔ جب بچے
آنکھیں کھولتے تو ان کو اپنے ساتھ لے جایا کرتی۔
اور ان کو شکار میں ماہر بناتی۔

جب بچے چھ مہینے کے ہوئے تو بلی نے ان کو
اپنے سے دور کردیا اور بولی کہ جاؤ تم اپنا پیٹ آپ پالو۔
بچارے بچے ہر چند کوشش کرتے کہ وہ اپنی ماں کے
پاس جائیں۔ مگر پنجوں کے مار کھانے کے ڈر سے
کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ روہنی نے ان سب باتوں
سمجھا کیونکہ وہ سمجھ دار تھی۔ اس نے اپنے دل میں خیال
کیا کہ بلی واقعی ہم کو ایک ایسا سبق سکھاتی ہے جس کو
ہم لاپروائی کی وجہ سے ذرا بھی غور نہیں
کرتے۔

جب روہنی کے ہاں خدا نے ایک نہایت ہی
خوبصورت بیٹا دیا تو روہنی کی خوشی میں اضافہ ہوا۔
اور بہت سی خوشیاں منائی گئیں۔ مگر ان باتوں کے
ہونے پر بھی روہنی کے دل میں بلی کی وہ بات پتھر کی
لکیر کے مانند بیٹھ گئی۔

جب روہنی کے راج کمار کی پانچویں
سالگرہ ماں کے گھر میں منائی گئی تو ماں نے
دو تین روز بعد اس کو ایک اچھے بورڈنگ میں
داخل کردیا۔ اگرچہ راج کمار اس کا ایک ہی بچہ
تھا مگر روہنی نے ماں کی ممتا پر ایسی ٹھوکر ماری کہ
جو سنتا تعجب کرتا۔

روہنی کی ایک سہیلی لیلا بمبئی سے ملنے کے لئے
آئی روہنی کو تو پایا۔ مگر راج کمار نظر نہیں آیا۔ جب
اس سے رہا نہ گیا تو بولی بہن لڑکا کہاں ہے روہنی
کھل کھلا کر ہنس پڑی اور کہنے لگی۔ واہ بہن راج کمار
کی یاد بہت جلدی آئی میں نے تو اسے بورڈنگ میں
شریک کردیا ہے۔ بچوں سے زیادہ لاڈ پیار کرنے سے
بچوں پر برا اثر ہوتا ہے۔ اور ہم اپنی محبت کے
فرض کو ایک حد تک نہیں پہچان سکتے۔ اور یہی ہماری
محبت آگے چل کر آرام دہ نہیں رہتی۔ بلکہ ہمیشہ ہم کو
دکھ پریشانی اور مصیبت میں پھانستی ہے۔ یہ باتیں
سن کر لیلا بولی واقعی تم نے مجھے اس بات سے
آگاہ کیا جس کی میں ممنون ہوں اور وعدہ کرتی
ہوں کہ میں بھی اپنے بچوں سے کبھی بھی زیادہ
پریم اور محبت نہ کروں گی۔

روہنی خدا تمہیں کامیاب اور بامراد کرے
یہ میری دعا ہے۔

راجہ جتیندر پرشاد جوہر

عورت کی پہلی آزادی

حضرت موسیٰؑ کے قوانین کی رو سے عورت کی حیثیت منقولہ جائداد سے زیادہ نہ تھی وہ گویا مرد کے عیش اور اس کی خدمت گزاری کے لئے بنائی گئی تھی اور درجہ میں غلام اور نوکر کے برابر تھی ان قوانین میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جو عورت کے مرتبہ کو بڑھانے کی طرف مائل ہو۔

ہندوستان میں منوؔ کے قوانین یہ بتلاتے ہیں کہ مرد عورتوں کا مالک اور محافظ ہے اس کو چاہئے کہ وہ انھیں دن رات تابعداری کی حالت میں رکھے۔ گویا ہندو دھرم کے قوانین نے عورت کو مرد کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے۔ بدھ مت نے بھی عورت کی کوئی قدر نہ کی مہاتما بدھ کے چیلے آنندا نے ان سے پوچھا کہ "اے مہاتما عورتوں کے ساتھ ہمارا برتاؤ کیسا ہونا چاہئے"؟ جواب ملا "ان پر نظر نہ ڈالو"۔

حضرت عیسیٰؑ نے عورتوں کے بارے میں حضرت موسیٰؑ کے قوانین کی پیروی کی۔ آپ نے نہ شادی کی اور نہ عورت کے ساتھ سلوک کے بارے میں کوئی ایسی نصیحت چھوڑی جس پر عمل کیا جائے۔ اگر ہم لیوک (Luke) کی بات کا یقین کریں تو حضرت عیسیٰؑ نے تو اپنی ماں کی قدر اور عزت بھی نہیں کی۔ سینٹ برنارڈ (St. Bernard) نے عورت کے متعلق کہا تھا کہ "اس کا چہرہ جھلسا دینے والی ہوا کے جیسا ہوتا ہے اور اس کی آواز سانپ کی پھنکار کے جیسی ہوتی ہے"۔ سینٹ انتھونی، سینٹ جیروم، سینٹ گرگری، سینٹ کیپرین اور سینٹ بوناونچر سب نے عورت کی لعنت ملامت کی۔ انھوں نے اس کی نسبت یہ جملے اور الفاظ استعمال کئے ہیں۔ "بچھو جو ہمیشہ ڈنک مارنے تیار ہو" "شیطان کا آلہ" "شیطان" "بدی کا راستہ" "ڈیکوری کا زہر" "اژدہے کا کینہ" وغیرہ۔ میں یہ اُن بہنوں کے لئے لکھ رہی ہوں جو عیسائی مذہب کے پھیلانے والوں کی جھوٹی کہانیوں سے متاثر ہو جاتی ہیں۔

عورتوں کا محافظ

جب عورتیں اس طرح کی باتیں برداشت کر رہی تھیں سب پیغمبروں سے افضل حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں آئے۔ انھوں نے عورت اور مرد کے درجے برابر کر دیا اور عورت کے درجے کو اتنا بلند کیا کہ اس سے پہلے اس کو نصیب نہ ہوا تھا۔ عورتوں کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ اور ان کے خاص پیروؤں کے خیالات کے مقابلہ میں دیکھئے کہ پیغمبر اسلام کے ارشادات کیا ہیں! (۱) "مسلمانوں کو اپنی بیوی سے نفرت نہ کرنی چاہئے۔ اگر اس کی کوئی بات بھلی نہ لگتی ہو تو اس کی کسی دوسری اچھی صفت سے خوش ہونا چاہئے" (۲) "عورت گھر کی رانی ہے"۔ (۳) جنت ماں کے قدموں میں ہے"۔ (۴) "دنیا اور اس کی سب چیزیں قیمتی ہیں لیکن شریف بیوی کی قیمت ان سب سے سوا ہے"۔ میں اس کے ثبوت میں پچاسوں حوالے دے سکتی ہوں کہ پیغمبر اسلام نے عورت کے درجے کو اونچا کیا ہے اور اس کو مرد کے برابر حقوق دئیے ہیں۔ حضرت محمد عورتوں کے سب سے بڑے نجات دلانے والے ہیں۔ عورتوں پر آپ کا ہمیشہ احسان رہے گا۔ (ترجمہ) اکرام النساء زاہلی شاہی

نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۳)
نشان ٹپہ برطانیہ (M395)

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

سب رس

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

جلد (۲) شمارہ (۹) — ستمبر ۱۹۳۹ء

فہرست تصاویر

گولکنڈہ کے نئے قلعہ کے مناظر

۱۔ ہتیان کا درخت (فتوح اور پیڑ کی سطح) ۲۔ نئے قلعہ میں سے قلعہ گولکنڈہ کا منظر ۳۔ ملا خیالی کی مسجد ۴۔ ملا خیالی کی مسجد کا پچھلا حصہ۔ ۵۔ نئے قلعہ کے حوض اور جزیرہ ۶۔ نئے قلعہ سے قطب شاہی گنبدوں کا منظر۔ نئے قلعہ میں شہنشاہ اورنگ زیب اور عبداللہ قطب شاہ کا کتبہ

فہرست مضامین

سب رس اور بچوں کا سب رس دونوں رسالے ہر عیسوی مہینے کی پہلی کو شایع ہوکر ایک ہفتہ کے اندر اندر ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیئے ورنہ دفتر پر ذمہ داری نہ رہے گی۔ جواب طلب امور کے لیئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

سب رس کی قیمت چار روپے سالانہ علاوہ محصول ڈاک

بچوں کے سب رس کی قیمت ایک روپیہ سالانہ علاوہ محصول ڈاک

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے عہد آفرین پریس میں چھپ کر دفتر ادارۂ فعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن سے شایع ہوا

اداریہ
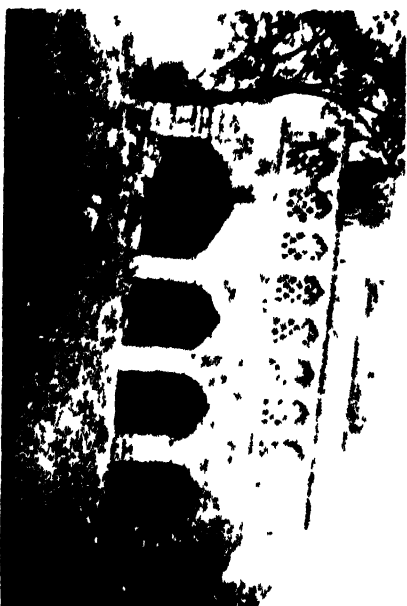
اس مہینے ادارۂ ادبیات اردو بے حد مصروف رہا۔ اس کے مختلف شعبوں کے سات اجلاس ہوئے، ایک دلچسپ مشاعرہ ہوا، اُردو کے مشہور ادیب سر شیخ عبدالقادر ادارہ میں تشریف لائے، درس گاہ تعلیم بالغات کا افتتاح کیا گیا، اور دو دفعہ ادبی و تاریخی مقامات کے معائنے کئے گئے۔

سر شیخ عبدالقادر شیخ صاحب اُردو کے مستند و مشہور ادیبوں اور خاص صاحبانِ ذوق میں سے ہیں اردو کا پہلا جدید طرز کا رسالہ **مخزن** ان ہی نے نکالا تھا اور علامہ سر محمد اقبال جیسے جوہر قابل کو اُردو سے روشناس کرنے کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔ آپ انگلستان سے واپس ہوتے ہوئے سالگرہ ہمایونی کی تقریب میں حیدرآباد تشریف لائے تھے اور یہاں کے چار روزہ قیام میں سرکاری اور قومی تقریبوں میں اگرچہ بے حد مصروف رہے لیکن ادارۂ ادبیات اُردو کے معاینہ اور اربابِ ادارہ سے ملنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کا بھی وقت نکال لیا چنانچہ ۱۷ راگست کو صبح میں ساڑھے نو بجے ادارہ میں تشریف لائے اور ڈیڑھ دو گھنٹے تک ٹھہر کر ادارہ کے کاموں کا تفصیلی معاینہ کیا اور کہا کہ "اگر میں یہاں نہ آتا تو مجھے بڑا افسوس ہوتا"۔ ادارہ کی تصنیفات، طریقہ کار، اور کتب خانہ وغیرہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ "کام کرنے کے ایسے ہی طریقے سب کو یورپ سے سیکھنے چاہئیں"۔ جب آپ کو ادارہ کے کتب خانہ کی عمارت کا نقشہ دکھایا گیا تو نواب احسن یار جنگ بہادر اور مولوی سید عارف الدین صاحب سے اس بارے میں تبادلۂ خیال کیا۔ اور ناظم اعزازی نواب مرزا سیف علی خاں صاحب کو اُردو کے رسائل کے فائل کی تکمیل کے لئے نہایت مفید مشورے دیئے۔ لفظ اُردو اور ہندوستانی کے رواج کے بارے میں ڈاکٹر زور معتمد ادارہ اور نواب بہادر یار جنگ بہادر کے ساتھ تقریباً آدھ گھنٹہ تک گفتگو کی۔ سر عبدالقادر کے ساتھ شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹر مدیر انیس نسواں دہلی بھی تشریف لائے تھے۔ اس یادگار ادبی صحبت کا ایک گروپ فوٹو بھی لیا گیا جو آئندہ سب رس میں شائع کیا جائے گا۔

مشاعرہ ادارہ کی طرف سے شعرائے عثمانیہ کا جو دلچسپ انتخاب کلام شائع ہو رہا ہے اس کے سلسلہ میں ۲ رجب ۱۳۵۵ھ کو ایک خاص مشاعرہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں شعرائے عثمانیہ کے علاوہ دیگر شاعر بھی مدعو تھے کئی شعرا اور اہل ذوق اضلاع سے بھی تشریف لائے تھے جن میں جذب، جوہر، وجد، رشدی، اشک اور معین الدین قریشی صاحبان اور مقامی شاعروں میں علی منظور، صفی اورنگ آبادی، خنجر، ڈاکٹر رگھونندن راج، باقی، مخدوم، میکش، شکیب، مہندر راج سکسینہ راز اور ذکی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ نہایت دلچسپ اور یادگار صحبت تھی۔ ادارہ کے اکثر معاونین، رفقا، اور متعدد اہل ذوق اصحاب نے شرکت کی۔ تقریباً تین گھنٹے یہ ادبی ضیافت جاری رہی اور دو گروپ فوٹو بھی لئے گئے۔ اکثر حاضرین نے اس امر پر زور دیا کہ ادارہ کی طرف سے اسی طرح خاص خاص مشاعرے منعقد ہوتے رہا کریں۔

درس گاہ تعلیم بالغات ادارہ کا شعبۂ نسواں ان پڑھ عورتوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں خاص دلچسپی لے رہا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اس طرح سے اپنے طبقہ کی خاطر خواہ خدمت کی جائے۔ اس سلسلہ میں

یہ امر موجب مسرت ہے کہ شعبہ نے اس قسم کی پہلی درس گاہ کا افتتاح سالگرہ ہمایونی کے یوم سعید یکم رجب ۱۳۵۸ھ سے کردیا ہے یہ مدرسہ صدر شعبہ محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ کی نگرانی میں ان ہی کے مکان پر قائم ہوا ہے اور اس میں فی الحال ہفتہ میں تین روز تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ شعبہ نے غیر مستطیع عورتوں کو لانے لے جانے کے لئے اپنی طرف سے ایک گاڑی کی فراہمی کا بھی انتظام کرلیا ہے۔ اس مدرسے کی افتتاحی تقریب بھی یادگار رہے گی۔ شعبۂ نسوان کی اراکین نے مل کر فاتحہ خوانی اور تقسیم شیرینی کے ساتھ اس کے کام کا آغاز کیا اور اس موقع پر محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر نے ایک برجستہ نظم سنائی جو اس رسالے کے صفحہ ۴۸ پر درج ہے۔

تاریخی آثار شعبۂ تاریخ دکن کی طرف سے اس ماہ تاریخی مقامات کے معائنوں کا دوبار انتظام کیا گیا تھا۔ پہلی بار گولکنڈے کے نئے قلعے اور دوسری دفعہ منصور آباد کی سیاحت کی گئی۔ پہلے معائنہ کی رپورٹ اور تصاویر وغیرہ اس ماہ شایع کئے جارہے ہیں۔ توقع ہے کہ اسی طرح کی تاریخی سیاحتیں اور معائنے جاری رہیں گے اور اس طرح ملک کے بعض اہم تاریخی مقامات کے متعلق سب رس کے ذریعہ سے دلچسپ اور مفید معلومات شایع ہوتی رہیں گی۔

گنبد حضرت شاہ سراج ادارہ کی طرف سے جہاں بہت سے قدیم اُردو شاعروں اور ادیبوں کی تصنیفات و تالیفات کی حفاظت و اشاعت کا کام ہورہا ہے ان کے دیگر آثار کی حفاظت کی طرف بھی توجہ کی جارہی ہے چنانچہ متعدد شاعروں کی قبروں پر سنگ مرمر کے کتبے لگائے جانے کا تذکرہ پہلے کیا جاچکا ہے۔ اسی سلسلے میں حضرت شاہ سراج کے گنبد کی حفاظت و درستی اور کتبہ وغیرہ کے متعلق مولوی غلام احمد خاں صاحب صوبہ دار اورنگ آباد کو توجہ دلائی گئی تھی جنھوں نے خاص دلچسپی لے کر اس کام کی تکمیل کے اسباب پیدا کردیئے ہیں۔ توقع ہے کہ بہت جلد یہ تاریخی گنبد محفوظ ہوجائے گا۔ صوبہ دار صاحب نے موجودہ حالت کا ایک فوٹو بھی روانہ کیا ہے جس کے لئے ادارہ ان کا شکر گذار ہے۔

شاہ سراج کا گنبد جس مقام پر واقع ہے وہ بعد کو ان کے خلیفہ شاہ چراغ کے تکیہ کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اور اسی لئے اورنگ آباد میں بعض لوگ شاہ سراج اور شاہ چراغ کو ایک ہی شخص سمجھتے ہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے اس رسالہ میں مولوی عبدالقادر صاحب سروری کا ایک مضمون صفحہ ۹ پر شایع کیا جارہا ہے۔ پروفیسر سروری نے شاہ سراج پر جو بلند پایہ تحقیقی کام کیا ہے وہ عنقریب ایک مبسوط کتاب کی صورت میں شایع ہوجائے گا۔

درگاہ حضرت فیض استاد کل حضرت میر شمس الدین محمد فیض کی درگاہ حیدرآباد کے لال دروازہ کے باہر ہے جہاں حضرت کی خانقاہ وغیرہ کے کھنڈر بھی موجود ہیں۔ اور حضرت کے معتقدوں اور شاگردوں کی قبریں بھی اسی احاطہ میں موجود ہیں جس کے اطراف چار دیواری نہیں ہے۔ اس کے لئے ادارہ کی طرف سے کئی ماہ سے محکمہ امور مذہبی کو توجہ دلائی جارہی ہے۔ اور اس کے مراسلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں کارروائی جاری ہے۔ امید ہے کہ یہ محکمہ اس کام کو بھی شایانِ شان اہمیت دے گا۔

سوتیلی ماں اس عنوان سے اس ماہ سب رس میں محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ کا ایک مضمون شایع ہورہا ہے یہ اصل میں اس دلچسپ اور مفید کتاب کا ایک ٹکڑا ہے جو اسی نام سے ادارہ کی طرف سے زیر طبع ہے۔ یہ کتاب اس قدر دلچسپ

پیرائے میں لکھی گئی ہے اور ایسے مفید اور کار آمد مشوروں سے مالا مال ہے کہ اس کا مطالعہ ہر ایک کے لئے دلچسپی اور فائدہ کا باعث ہوگا

ادارہ کا کتب خانہ

ادارہ کا کتب خانہ رفتہ رفتہ بہت ترقی کرتا جا رہا ہے اور اس کے ناظم اعزازی نواب مرزا سیعف علی خاں صاحب جاگیردار کی دلچسپیاں اس کو مستقبل قریب میں اردو کا ایک ایسا منظم اور باضابطہ کتب خانہ بنادیں گی جو اس زبان اور مملکتِ حیدرآباد کے شایانِ شان ہوگا اور جس سے جملہ تشنگانِ علم و تحقیق فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اس کتب خانہ کی امداد کے لئے صاحبانِ ذوق کو خاص طور پر دعوت دی جا رہی ہے۔ یقین ہے کہ اس مفید کام میں ادارہ کا ضرور ہاتھ بٹایا جائے گا۔

شعبۂ نسواں

۳ اگست ۳۹ء کو شعبۂ نسواں کا ساتواں اجلاس منعقد ہوا جس میں رابعہ بیگم صاحبہ، سارہ بیگم صاحبہ لطیف النساء بیگم صاحبہ ام اے، جیلانی بیگم صاحبہ، بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر اور سکینہ بیگم صاحبہ (معتمد) نے شرکت کی۔ رسمی امور کے تصفیوں کے بعد شعبہ کے اراکین میں اضافہ کرنے کی طرف توجہ مبذول کی گئی۔ مدرسہ تعلیم بالغات کے بارے میں بقیہ انتظامات کی تفصیل طے پائی چنانچہ اس کے مطابق بعد کو ۸ اگسٹ کو جملہ اراکینِ مجلس انتظامی نے مل کر اس درس گاہ کا آغاز بھی کر دیا۔ شعبہ نے اپنا اجلاس عام ۲۲ شعبان مطابق ۲ اکتوبر کو مقرر کیا ہے جس میں ادبی، اصلاحی، سماجی و معاشرتی مضامین پڑھوائے جائیں گے اور لطیف النساء بیگم صاحبہ ایک اصلاحی نسوانی ڈرامہ بھی اس موقعہ پر ترتیب دیں گی۔ جو خواتین اجلاس سے دلچسپی رکھتی ہیں معتمد ۱۰-۶/اری - کوہ نور - کریم آباد جوبلی ہلز سے مراسلت فرمائیں۔

شعبۂ تالیف و ترجمہ

اس ماہ شعبۂ تالیف و ترجمہ کے دو اجلاس ہوئے۔ پہلے میں ۶ اگسٹ کو پروفیسر فضل حق صاحب عبدالقادر صاحب سروری، فیض محمد صاحب، ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور اور ظہیر الدین احمد صاحب (داعی شعبہ) نے شرکت کی اور طے پایا کہ شعبہ کا نام شعبۂ تالیف و ترجمہ قرار دیا جائے ۲ بچوں کے لئے عام فہم انگریزی کتابیں اردو میں منتقل کی جائیں جن کے انتخاب کا کام فیض محمد صاحب اور پروفیسر سروری کے سپرد کیا گیا - ۳ - ڈاکٹر رضی الدین صدیقی سے درخواست کی جائے کہ وہ شعبہ کے لئے ایک مختصر کتاب "مسلمان ریاضی داں" کے عنوان پر لکھ دیں - دوسرے جلسوں اور شعبوں کی روداد بہ آئندہ ماہ درج کی جائیں گی۔

بزم ادب عثمان آباد

عثمان آباد میں ۲ مہر ۱۳۴۸ف کو بزم ادب عثمانیہ کا دوسرا سالانہ جلسہ بصدارت مولوی سید محمد قاسم صاحب ہمدوی منعقد کیا گیا تھا اس کی تفصیلی روداد وصول ہوئی ہے جس سے واضح ہے کہ علم دوست اصحاب اضلاع میں بھی علمی و ادبی چہل پہل پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بزم ادب قابل ستائش ہے کہ اس نے لوگوں کو اپنے کام کی طرف راغب کرانے میں ایک حد تک کامیابی حاصل کی۔ مختلف انعامی مقابلے مثلاً زود نویسی، قرأت، خوشنویسی، مضمون نگاری، لطیفہ گوئی و تقریر ہوئے گئے۔ ان میں اول و دوم آنے والوں کو انعامات دئے۔ جو مشاہیر اردو کے ناموں سے منسوب تھے۔ مثلاً سرشار پرائز، سید پرائز، ولی پرائز، حالی پرائز، ذوق پرائز، اقبال پرائز، چکبست پرائز وغیرہ۔ یہ طریقہ صرف قابلِ ستائش بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔

جلسہ میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور، ڈاکٹر رضی الدین، مولوی ابوالحسن سید علی صاحب رضوی کے پیامات سنائے گئے۔ اس قسم کی علمی و ادبی انجمنیں زندگی کی نشانی ہے۔ توقع ہے کہ بزم ادب عثمانیہ دوسرے اضلاع کے لئے ایک اچھی مثال ثابت ہوگی۔ ادارہ ادبیات اردو ایسی انجمنوں کو مدد دینے اور سہولتیں بہم پہنچانے میں حتی الامکان کوشش کرے گا۔ کیونکہ اس کا اہم مقصد یہ ہے کہ ملک کے گوشہ گوشہ میں علمی و ادبی ذوق عام ہو جائے۔ ادارہ

تلقینِ وفا

(سالگرہ ہمایونی ۱۳۵۸ھ)

نظر آئی سب کے دل میں مجھے جائے شاہِ عثماں
یہ نثارِ شاہِ عثماں وہ فدائے شاہِ عثماں

علما کا پاس ان کو، علما قریب ان سے　　　شعرا کی قدر ان کو، شعرا ثنا گران کے
میں ہر ایک سمت سنتا ہوں ثنائے شاہِ عثماں

وہ ہیں حسنِ بیگانہ دل خلق ان پہ مائل
متعراں کا ہے زمانہ نہیں کون ان کا قائل

ســخن ان کا جاذبِ دل کہ وہ جدت آفریں ہیں　　　ہیں مدبر ان کے قائل کہ وہ صاحبِ یقیں ہیں
نہیں مُضطرب کسی جا کبھی رائے شاہِ عثماں

وہ ہنروروں کا ملجا ہنر ان کے آشکارا
وہ سخنوروں کا ماوی سخن ان کا محفل آرا

نظر ان کی ہر کسی پر وہ نہیں کسی سے غافل　　　انہیں علم ہے کہ دنیا میں ہے کون کون قابل
جسے مستحق ہی پائے وہ عطائے شاہِ عثماں

وہ مُستغنی سب کے حق میں یہ ترا وطن ہی کیا ہے
یہ ترا وطن ہی کیا ہے کرم ان کا جابجا ہے

بہ عطا وجود اکنوں نہ بود کسے مثیل اش　　　کہ برائے آشنہ کاماں شدہ وقف سلسبیل اش
مجھے مل رہے ہیں ہر سو عرفائے شاہِ عثماں

نہیں یاد دوسروں کو یہ طریق حکمرانی
تجھے خسرو دکن کا نہ ملے گا کوئی ثانی

انہیں دھیان ہمائیوں کا ہیں مطیع ان کے ہندو　　　وہ نشاطِ روح مسلم دل مسلم اور وہ خوشخو
طربِ دل رعایا ہر ادائے شاہِ عثماں

علی منظور

نئے قلعہ کا معاینہ

۲۸ شہریور ۱۳۴۲ف مطابق ۴ اگست جمعہ کے دن شعبۂ تاریخ دکن کی طرف سے نئے قلعے کے معاینہ کا انتظام کیا گیا۔ اس میں ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور، عبد القادر صاحب سروری، سید محمد صاحب، عبد الحفیظ صدیقی [illegible] اور عبد المجید صدیقی شریک تھے۔ اس نئے قلعے کے احاطے میں جو پرانے قلعہ گولکنڈہ کے شمالی مشرقی جانب اور [illegible] متصل ایک بلند اور مستحکم فصیل سے محصور ہے قابل دید آثار پائے جاتے ہیں بعض آثار تو اس قلعے کی تعمیر سے پہلے کے ہیں۔ اس قلعے کی تعمیر سنہ ۱۰۶۶ھ ۱۶۵۶ء کی یادگار ہے جب کہ شاہزادہ اورنگ زیب نے فاتح دکن کی حیثیت میں قلعہ گولکنڈہ پر حملہ کیا تھا اس کا باعث دوسری الجھنوں کے ساتھ محمد سعید میر جملہ کی غداری تھی۔ مغل حملہ آوروں کو قلعے سے باہر اس کے مشرقی سمت ایک قدرتی پہاڑی مل گئی جس پر انھوں نے ایک بلند پختہ مورچہ باندھ کر قلعے پر زد کی جس کی وجہ سے حکمران وقت عبد اللہ قطب شاہ کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور کمزور شرائط پر صلح کرنی پڑی تھی۔ یہ پختہ مورچہ اب تک موجود ہے۔ جب حملہ آور فوج واپس ہوگئی تو عبد اللہ قطب شاہ نے اس پہاڑی کو جس پر اورنگ زیب نے اپنا مورچہ باندھا تھا باہر چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ مدافعی نقطۂ نظر سے یہ قلعے کی آئندہ بقا کے لئے بہت خطرناک تھا۔ اس لئے کہ جو حملہ آور آتے ان کو قلعے پر حملہ کرنے کے لئے اچھے موقعے مل جاتے۔ چنانچہ اس پہاڑی کے اطراف کہ یہ فصیل کے اندر آجائے اور دشمن کو قابو پانے کا موقع نہ ملے ایک بڑا احاطہ محصور کرلیا گیا اس کو نیا قلعہ کہتے ہیں حسب موقع فصیل پر مستحکم برج بنائے گئے تاکہ حملہ آوروں کی خاطر خواہ مدافعت ہوسکے۔ چنانچہ اورنگ زیب کے مورچے کے قریب ایک بہت بڑا قطب شاہی برج ہے جو اپنے موقع اور استحکام کے لحاظ سے قابل دید ہے۔ وہاں سے بہت دور تک توپوں کی زد ہوتی ہے۔ یہ تعمیر غالباً دھرماچار میستری کے ہاتھوں سے ہوئی تھی جس نے اسی جنگ کے بعد موسیٰ برج بھی بنایا تھا۔

اس احاطے میں سب سے پرانی چیز ملا خیالی کی مسجد ہے جو ابراہیم قطب شاہ کے عہد کا مشہور دکنی شاعر [illegible] اس کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وجود قلعے کی تعمیر سے پہلے تھا۔ اگرچہ یہ ایک چھوٹی مسجد ہے لیکن بلند [illegible] تعمیر ہوئی ہے اس کے کمان اور محراب تعمیر کاری کے اچھے نمونے ہیں۔ درمیانی محراب میں خط ثلث میں قرآن شریف کی آیتیں لکھی ہوئی ہیں جو بہت خوش نما اور نمایاں ہیں۔ محراب کے اوپر اور دونوں جانب کمانوں پر بھی [illegible] بہت سی آیتیں لکھی گئی تھیں جو اب مٹ گئی ہیں۔ دروازے پر قرآنی آیات کے بعد حسب ذیل قطعہ کندہ ہے جس میں سنہ تعمیر، بانی مسجد اور شاہِ وقت کے نام پائے جاتے ہیں جو ادبی اور تاریخی دونوں حیثیتوں سے معنی خیز ہیں۔

قطعہ

منت یزداں کہ در دوران شاہ دیں پناہ — قطب عالم شاہ ابراہیم آں نیکو سرشت
کردہ ایں مسجد بنا ملا خیالی کز شرف — می سزد کاندر حوران بہشتی سنگ و خشت
رکنے از جنت برائے پیش آمد با خدا — از برائے آں بود تاریخ او رکن بہشت (۹۷۰)

اس کے علاوہ ایک اور خوش نما مسجد جو خاص اہتمام سے بنائی گئی تھی نرالی یادگار ہے اس کے کتبے سے معلوم ہوتا ہے

وہ محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں تیار ہوئی تھی لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کے بانی کون تھے۔ اس احاطے کی دوسری قابل دید چیز دو وسیع اور طویل حوض ہیں جو مسلسل بنائے گئے تھے۔ چونکہ یہ ایک وسیع احاطہ تھا اس لئے قطب شاہوں کے پاکیزہ ذوق نے اس کو تنہا عمارت ہی چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس میں تفریح کے سامان جمع کئے گئے۔ چنانچہ اس کے جنوبی سمت یکے بعد دیگرے متعدد حوض بنائے گئے جن کو حوض در حوض کہنا چاہئے۔ ان کی سطح ایک دوسرے سے مختلف ہے یعنے سب سے پہلے حوض کی سطح جس میں تالاب سے پانی آتا تھا بہت بلند ہے اور دوسرے حوض علی الترتیب اس کے نیچے ہیں تاکہ ایک حوض کا پانی دوسرے حوض میں اس طرح آئے کہ اس کے بہاؤ سے ایک کیف آور منظر پیدا ہو اور اس کے علاوہ آبشار پیدا کرنے کا انتظام بھی کیا گیا ہے یعنے دو حوضوں کے درمیان جہاں پانی بلندی سے نیچے گرتا ہے ایسے ایسے ڈھلوان بنائے گئے ہیں جن کا رخ نیچے کی طرف ہے اور ان ڈھلوانوں میں ایک ہی پیمانے کی گہرائیاں اور ابھار ہیں تاکہ ان پر پانی لڑھک کر ایک دلکش منظر پیدا کرے۔ نیز ان حوضوں کے دونوں طرف دو نہریں بھی دوڑتی تھیں اور ان درختوں کی قطاروں کے ساتھ جو ان کے برابر نصب کئے گئے تھے دلفریب منظر پیدا کرتی تھیں۔ سب سے آخری حوض اس قدر وسیع ہے کہ ایک بڑا تالاب معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کے بیچ میں ایک سڈول چبوترہ بنایا گیا ہے جہاں غالباً بادشاہ تفریح کے لئے ٹہلتے تھے لیکن چبوترے پر جانے کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے۔ غالباً اس کے لئے کشتی استعمال کی جاتی ہوگی۔ تفریح کا یہ انتظام ہندوستان کے اور آثار قدیمہ میں نہیں پایا جاتا۔ ان حوضوں کے شمال میں ایک تالاب ہے جس کے ذریعے ان میں پانی آتا تھا اور زائد پانی فصیل کے باہر خارج کردیا جاتا تھا۔

احاطے کے مشرقی جانب بارہ دری کی طرح ایک اور عمارت ہے جو اپنی تعمیری طرز میں آصفجاہی معلوم ہوتی ہے غالباً یہ حضرت غفراں مآب نواب نظام علی خاں کی بنائی ہوئی ہے اور تفریح کے لئے استعمال کی جاتی ہوگی۔ یہ عمارت تو بہت بڑی نہیں ہے لیکن اس کے مشرقی سمت آبشار کا بڑا دلچسپ انتظام ہے۔ یعنے ایک بلند ٹیلے سے متصل دیواریں کھڑی کرکے پانی نیچے گرانے کا انتظام کیا گیا تاکہ ایک آبشار کی شکل پیدا ہو۔ کچھ فاصلے سے نالیوں کے ذریعے سے پانی لایا جاتا تھا غالباً یہ پانی ایک خزانۂ آب سے آتا تھا جس کی عمارت قریب میں پائی جاتی ہے اور یہ پانی بہتے ہوئے بلند سطح سے نیچے گرتا تھا اور جہاں پانی گرتا تھا وہاں حوض نما تین دیواریں بنائی گئی ہیں جن پر متعدد طاقچے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان طاقچوں میں شب کو ماہی بتیوں کی روشنی کی جاتی تھی تاکہ یہ روشنی اپنے گوناگوں تموج کے ساتھ آبشار میں منعکس ہو اور دلفریب منظر پیدا کرے۔

عبدالمجید صدیقی

تاریخ گولکنڈہ

حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعۂ عثمانیہ کے استاد تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ال ال بی نے اس کتاب میں سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے۔ دکن کا تمدنی ارتقاء بادشاہوں اور امیروں کے حالات، مختلف ادوار میں علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ صفحات ۲۵۰، مجلد قیمت ے ۲ ر

شاہ سراج اور شاہ چراغ

اورنگ آبادی

حضرت سید شاہ سراج الدین، سراج اورنگ آبادی کے یوں تو کئی شاگرد، معتقد اور مرید تھے، لیکن ان میں سے جن سے انہیں خاص ربط تھا، وہ شاہ عبدالرسول چشتی، شاہ ضیاالدین پروانہ، شاہ تاج الدین، اور شاہ چراغ ہیں۔ شاہ عبدالرسول اور شاہ ضیاءالدین کے متعلق تو پتہ چل سکتا ہے کہ ان سے شاہ سراج کی دوستی عنفوان شباب سے تھی۔ اور آخر عمر تک قایم رہی۔ لیکن شاہ تاج الدین اور شاہ چراغ کی شناسائی کس زمانے میں ہوئی، اس کا پتہ چلانا دشوار ہے۔ قیاس یہ ہے کہ، یہ لوگ، شاہ سراج کی طرف اس وقت رجوع ہوئے تھے، جب انھوں نے دنیا کو ترک کرکے فقیری اختیار کر لی تھی۔ انھوں نے اپنے پیر کی ایسی خدمت کی کہ بہت جلد منظورِ نظر ہو گئے۔

عجیب اتفاق ہے کہ آخری زمانے میں، جب شاہ سراج ہر وقت علیل رہا کرتے تھے، ان معتقدین میں سے کوئی بھی ان کے پاس نہ تھا۔ شاہ ضیاءالدین پروانہ، ملازمت کے سلسلے میں، بیجاپور چلے گئے تھے، شاہ تاج الدین بھی اورنگ آباد میں نہیں تھے اور شاہ چراغ، احمد نگر میں مقیم تھے۔

حسنِ اتفاق سے یہ تمام تفصیلات، شاہ سراج کے فارسی خطوط کے ذریعے ہماری دسترس میں آگئی ہیں۔ شاہ ضیاءالدین پروانہ کو جو خطوط، سراج نے اس زمانے میں تحریر کیے ہیں، ان میں اکثر اپنی علالت کا حال لکھا ہے۔ وہ گھر میں تنِ تنہا رہا کرتے تھے، اور دو خدمت گار، گھر کے کام کاج کے لئے رکھ لئے گئے تھے۔ ایک خط میں وہ پروانہ کو لکھتے ہیں۔

> "از ہفدہ ماہ، بواسیر بادی و ضعف قوائے رئیسہ، خصوصاً ضعف معدہ غالب است اگرچہ مطابق فعل الحکیم لایخلو عن الحکمۃ، خود را بمصلحت حکیم حقیقی حوالہ کردہ شدہ، لاکن بحکم داد مراتب و ادائے شان عبدیت، بطبیبان شہر رجوع آوردہ موافق مزاج اینہا، بدوا و غذا پرداختہ می آید دو روزہ اگر قدرے آثار شفاء تب می شود، باز بحکم مصلحت حقیقی ہماں دوا بمضرت می پردازد۔ بہر حال ہر دو صورت خالی از علامت غما نیست دریں ولا باز از یک ہفتہ آثار شفا است آیندہ باید دید کہ رضا در چہ کار دارد و اوراں چہ بار۔ ضعف بدن بمرتبہ ایست کہ بسیر جوک ہم معذور است"

سی تکلیف و تنہائی کی وجہ سے اس زمانے میں وہ شاہ چراغ کو اورنگ آباد آنے کے لئے لکھتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"فقیر تا حال بہمان بیماری از مدت یک و نیم سال گرفتار است و ہر روز دوائے حکیماں بعمل می آید۔ بجز بیماری و تنہائی و کسے دلسوز در خدمت نیست"

ایک اور خط میں انہیں کو لکھتے ہیں۔

"در یں ولا سبب بیماری تا یک ہفتہ زندگانی بالکل نبود۔ بلکہ مرزا سنجر بیگ دراں وقت حاضر بودند آنچہ لازمہ دوستی بود بجا آوردند"

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ چراغ، ذرا لاابالی طبیعت کے انسان تھے۔ اور وقت سے پہلے میدان میں نکل آنا چاہتے تھے۔ چنانچہ سراج ہی کے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے احمد نگر میں اپنے آپ کو رونق شاہ مشہور کر رکھا تھا۔ اور اپنا رنگ جما رہے تھے۔ خود مرشد نے انھیں شاہ چراغ کا لقب عطا کیا تھا۔ اس کو چھوڑ کر دوایک اور لقب اختیار کرنا چاہتے تھے۔ شاہ سراج انہیں بار بار منع کرتے تھے کہ فقیری کے یہ ڈھنگ نہیں کہ جہاں جائیں ایک نئے نام سے اپنے آپ کو مشہور کریں۔ اس پر بھی وہ اپنی ہٹ پر قائم تھے۔ مرشد کی خدمت میں حاضر ہونا تو درکنار خط بھی لکھنے میں انہیں تساہل ہوتا تھا۔ اس لئے شاہ صاحب کبھی کبھی ان سے خفا ہو جاتے تھے اس کا سبب یہ تھا کہ شاہ صاحب کو شاہ چراغ سے بڑا انس تھا بار بار بلانے کے بعد بھی جب وہ خدمت میں حاضر نہیں ہوتے تو ایک دفعہ طنزیہ انداز میں تحریر فرماتے ہیں۔

"بتوجہ شما بارحق تعالیٰ فضل کرد بیماری تخفیف یافت و الحال خیاج آمد شما نیست اگر قصد سیر شہر باشد مبارک است"

ایک اور خط میں شاہ صاحب نے ان سے بازپرس کی تھی کہ میرے بار بار بلانے پر بھی تم حاضر خدمت نہیں ہوتے اور وہاں ایک ایسے نام سے جو مرشد نے تمھیں نہیں دیا اپنے آپ کو مشہور کر کے اپنا رنگ جمانا چاہتے ہو فقیری کے شیوے نہیں فقیری کرنا ہو تو یہاں آؤ میں تم کو بتاتا ہوں کہ فقیری کیا چیز ہے۔ لیکن جب اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا تو ایک دفعہ رنجیدہ ہو کر لکھ دیا کہ بیماری سے میرا برا حال ہے اگر میں مرجاؤں تو اچھا ہے کہ میری لاش پر تمھارا سایہ نہ پڑے۔ شاہ چراغ کی بیوی للن جی یا لالن جیو کو بھی شاہ صاحب نے اسی مضمون کے خط لکھے ہیں۔ اور اگر شاہ چراغ نہ آنا چاہیں تو خود انہیں آنے کی ہدایت کی ہے۔

غالباً مرض کی تکلیف جب بہت بڑھ گئی اور بیکسی کا وہی حال رہا تو انھوں نے اپنے عزیز دوست شاہ عبدالرسول چشتی کے پاس لشکر میں جاکر رہ جانے کا تصفیہ کر لیا۔ جانے سے پہلے ایک خط میں انھیں

اس کی اطلاع اس طرح دیتے ہیں ۔

"فقیر لاعلاج عزم جزم دارد کہ پیش رسول خاں صاحب بروم .... اگر آمدن نمی شود جواب صاف بنویسند کہ انتظار آمدن یا جواب شماست ۔ فقیر پا در رکاب است ۔"

یہ خط بھی پہلے تمام خطوں کی طرح بے اثر رہا تو جاتے ہوئے ایک خط لکھا کہ میں شکر جا رہا ہوں تکیہ خالی ہے گا تم چاہو تو آکر اس میں مقیم ہو سکتے ہو ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سراج کے انتقال کے بعد شاہ چراغ تکیہ میں آکر فروکش ہو گئے تھے چنانچہ نواب نظام علیخاں کے عہد میں یہ اسی تکیہ میں رہا کرتے تھے شاہ تجلی علی نے جو دربار کے مشہور مورخ ہیں اپنی تاریخ تزک آصفیہ میں ایک واقعہ لکھا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس زمانے میں اورنگ آباد کے خرقہ پوشوں میں بہت شہرت رکھتے تھے اور شاہ سراج کے مرید خلیفہ اور جانشین کی حیثیت سے مشہور تھے نواب نظام علیخاں کے دربار کے ایک امیر راز دار الدولہ بہادر جن کو مدت سے خرقہ پوشی کی آرزو تھی شاہ چراغ کے مرید ہوئے اور ترک دنیا کر کے فقیری اختیار کر لی ۔ شاہ چراغ نے انھیں سراج ثانی کا لقب عطا کیا تھا اور یہ اسی نام سے مشہور تھے (تزک آصفیہ صفحہ ۱۴۹)

چونکہ شاہ چراغ کا زمانہ بعد کا ہے اس لیے وہ تکیہ جہاں حضرت شاہ سراج رہا کرتے تھے شاہ چراغ کے نام سے موسوم ہو گیا اور اب عام طور پر اورنگ آباد میں یہ شاہ چراغ کا تکیہ ہی کہلاتا ہے ۔ اسی تعلق کی وجہ سے غالباً شاہ سراج کا مزار بھی شاہ چراغ کے نام سے موسوم ہو گیا ہے ۔ حالانکہ یہ گنبد شاہ چراغ کی زندگی ہی میں ان کے برادر طریقتی شاہ ضیاء الدین پروانہ نے اپنے مرشد کی یادگار باقی رکھنے کے لیے تعمیر کرائی تھی ۔ شاہ پروانہ بہت متمول آدمی نہیں تھے اس لئے گنبد زیادہ پائیدار نہ بنا سکے بلکہ یہ اینٹ اور چونے سے تعمیر کر لیا گیا اسی لئے مرور زمانہ سے اب اس کی حالت نہایت خستہ ہو گئی ہے ۔

محمد عبد القادر سروری

اطلاع

براہ کرم کوئی صاحب ۔ سالہ کا چندہ یا ادارہ کی کتابوں کی قیمت مطبوعہ رسید مہری حاصل کئے بغیر نہ دیں ۔ ورنہ دفتر اس کا ذمہ دار نہ ہوگا ۔

مہتمم

خلجان

"نت نئے جھگڑوں اور روز کی دانتا کِل کِل سے تو ماٹ کا جل بھی سوکھ جاتا ہے میں تو پھر آدمی ہوں ۔ نہیں ماں مجھ نربھاگی کے لئے تو کیوں دکھ سہے ۔ پتاجی کی آنکھ مند تے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ اس سنسار میں میرا سہارا نہیں پھر من کی ڈھیر بندھا تھا کہ ماں ۔ میری ماں سب کچھ ہے میری ڈھارس میرا آسرا موجود ہے لیکن ماں جس دن سے تو نے سہاگ کی چوڑیاں پہنی ہیں میرے جیون کا سوگ شروع ہو گیا جو چاچا جی کی باتوں میں آکر تو بھی میرے کرے دھرے پر پانی پھیر دیتی ہے میں سب سہہ سکتا ہوں مگر اپنے پتا پر یہ دوش دیا جانا نہیں سن سکتا کہ اس نے مجھ ایسے پاپی کو سنسار میں لا کر ایک مہا پاپ کمایا ہے ۔ میرا یہی پاپ ہے نا ۔ ماں کی سنوں چپ رہوں چاچا دکھی سکھی نہ دیکھے جھوٹی سچی لگائے سب کام کرائے اگر میں روٹی کیسا تھ تیوں (سالن) مانگ لوں تو نکھٹو اگر کچھ نہ کہوں اور رو دوں تو ..... گھنگوٹے نیچے جاتے ہیں ۔ ماں اشیرباد (دعا) دے کہ میں جاؤں اور جیون (زندگی) میں کچھ کروں اور چاچا جی کو دکھا دوں کہ میری قدر نہیں ہوئی ۔ میرے پتا نے پن کیا تھا پاپ نہیں"۔ شام کی پلکوں پر آنسو تھے اور اس کے باریک سنولائے ہوئے ہونٹ خزاں زدہ پتی کی طرح کانپ رہے تھے ۔ اس نے اپنی ململی پگڑی کو سر پر لپیٹا گدلی چادر کندھے پر ڈالی لاٹھی جو اس نے نلائی (کھیت میں کھرپے سے زمین کھودنا) کرنے کی مزدوری میں خرید کی تھی سنبھالی اور ماں کے قدموں پر جھک گیا" ماں اشیرباد دے ایشور کی کرپا سے میں پردیس میں دیس سے زیادہ سکھی رہوں گا" ماں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر جھکے ہوئے شام کی ململی پگڑی کی سلوٹوں میں جذب ہو رہے تھے چوڑیاں پہننے کے بعد وہ خود کو سہاگن سمجھنے لگی تھی لیکن آج اسے پھر احساس ہوا کہ یہ سہاگ جھوٹا سہاگ ہے بیوگی کی زردی اس کے چہرے پر لرز رہی تھی شام جھکا ہوا مصر تھا کہ ماں اسے اجازت دے ۔ ماتا جی یہ سیس چرنوں سے نہیں اٹھے گا اجازت دو سورج ڈوب رہا ہے سانجھ ہوتے وزیرآباد نکل جاؤں گا۔

"کہاں جائے گا اس کی ماں نے پوچھا"

"جہاں ایشور لے جائے گا ماں"

"میں بھی تیرے ساتھ چلوں گی"

"چاچا جی کا گھر سونا ہو جائے گا"

"تو نہ جا میں مر جاؤں گی"

"ماں کسی کے جانے سے کوئی نہیں مرتا ۔ لے اب اشیرباد دے نہیں تو تیرے نیر (آنسو) مجھے پردیس میں دکھی کریں گے ۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا ہنس کہ میں بھی ہنستا ہوا جاؤں ۔ ماں پتا کی عزت میرا دھرم ہے چاچا نے

مجھے کسی جوگ کا نہیں رکھا چھوٹے چھوٹے بالک بھی شام پر بولی (پھبتی) مارتے ہیں۔ ماں رام رام" اور شام اس سرعت سے گھر سے نکلا کہ اس کی ماں کے لفظ کپکپاتے ہی ہونٹوں میں رہ گئے وہ دوڑ کر دروازے پر آئی مگر شام کھیتوں کی بلند ہریالی میں ڈوب چکا تھا سورج پر شام کی سرخ بدلیاں آگئی تھیں اور سیاہی بستی کا رخ کیے تیزی سے چلی آرہی تھی۔ شام قدم اٹھائے وزیرآباد کی پگ ڈنڈی پر بڑھا چلا جارہا تھا کسان دو کڑیوں (بیٹھک) کے باہر بیٹھے حقہ پی رہے تھے کہ شام وزیرآباد کی حدود پار کر گیا افق سے چاند نے سر ابھارا تھا کہ شام جمنا کے دوسرے کنارے پر اپنا لنگ سکھا کر جگت پور کے جنگل میں ایک پرانے برگد کے درخت کے نیچے بیٹھا اپنے مستقبل کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ندھر جائے اور کدھر نہ جائے آس پاس کے تمام دیہات اس کے واقف ہیں اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا کہے گا اس نے جیب میں سے بیڑی نکالی اور ایک راہگیر کی چلم سے سلگا کر پھر درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔
"زمانہ بھرم (بھروسہ اور نیکی) کا نہیں" اس نے اپنے دل سے کہا اور لاٹھی کاندھے پر رکھتا ہوا لاچی پور کی چوپال کی طرف چل دیا کنھیا بچپن کا ساتھی مل گیا۔

"شام"

"کنھیا"

"کیسے آیا ماں راضی ہے؟"

"سب چوکھے ہیں ذرا سسرال جا رہا ہوں" شام جھوٹ بولا لیکن اس کی معصوم روح کو جھٹکا سا محسوس ہوا کہا کنھیا سے بھی ملتا چلوں۔ سنا چھورے گنڈاسے[1] کا کیا حال ہے؟"
"چوکھا اور خوب ہے تو ہوڑیا کب لائے گا" کنھیا نے پوچھا اور دونوں ہنس دیئے۔ برابر والے جب بھی کہیں مل جاتے ہیں تو حشر بپا کر دیتے ہیں گاؤں کے چھ سات ہم عمر لڑکے "پاہنے" (مہمان) کے پاس آبیٹھے اور ہنسی مذاق شروع ہو گیا شام نے حتی المقدور دل کے درد کو چھپانا چاہا لیکن آنکھوں میں تیرتی ہوئی افسردگی کنھیا کی دوست آشنا نگاہیں نظرانداز نہ کرسکیں۔

"شام آؤ ذرا کھیتوں پر چکر لگائیں آج کل مرگ اور ہرن بہت نسکان (نقصان) کرتے ہیں"

"ہم بھی چلیں گے" دو لڑکوں نے کہا۔

"نہیں" کنھیا نے انھیں جھڑکا اور شام کا بازو پکڑ کرلے گیا راستے میں ہزاروں ہی قسمیں دے ڈالیں واسطے دیئے مگر شام کے دل کی نہ جان سکا۔

صبح ہوتے ہی شام نے جانے کی جلدی مچادی کنھیا کی ہونے والی ساتھ کے لئے بھی روٹی باندھ دی شام انکار کرتا رہا مگر دونوں میاں بیوی کے اصرار کے سامنے چوکا ہی پڑا۔ تمام دن شام چلتا رہا۔ خان پور، ... پور، ... پور۔

---

[1] گنڈاسہ خاص دیہاتی بندش ہے جس کے معنی ہیں ... بیوی کا کیا حال ہے۔ حادی

سب کو چھوڑتے ہوئے اور واقف کاروں سے نظر بچاتے ہوئے شام ۔شام کے قریب آبادیوں سے بہت دور نکل چکا تھا۔ آج چاند گھنٹہ ٹیک کر نکلا ۔تاریکیوں میں چلتے چلتے شام اصل راستہ چھوڑ کر جنگل کے وسط میں جا پہنچا پتیوں سے چھنتی ہوئی چاند کی روشنی اب زمین کے سینے کو داغ رہی تھی دور جھاڑیوں میں سے سسکیوں کی آواز نے شام کو اپنی طرف "کھینچ" لیا۔یہ بے خوف وخطر اپنے دامن کو وحشی خار دار جھاڑیوں سے بچاتا وہاں پہنچا کوئی عورت گھٹنوں میں سر دیئے رو رہی تھی سامنے ایک میلی سی پنچی (پوٹلیا) بندھی ہوئی رکھی تھی شام کھڑا ہو گیا ۔رونے والی کی سسکیاں ہچکیوں میں تبدیل ہوئیں اور ان کی رفتار سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ عورت اب بیہوش ہوئی فضا سے ہچکیوں میں جو "دھچکے" پیدا ہورہے تھے انھوں نے شام کے نرم دل کو اور بھی نرما دیا اسکی اپنی موجودہ بے بسی پر آنکھوں میں آنسو بھر آئے مگر اس نے ان نادان رازداروں کو وہیں روک لیا اور آپ آگے بڑھا۔

"کیوں رو رہی ہے"

رونے والی نے سر اٹھایا ابر کا نیلا ٹکڑا چاند پر آگیا اور شام اس کی شکل اچھی طرح نہ دیکھ سکا وہ نزدیک ہی بیٹھ گیا اور چاند نکلنے کے انتظار میں بڑی سلگا . . . یا سلائی کی روشنی میں اسے ایسا معلوم ہوا کہ ایک بجلی سی اس کی نگاہوں میں کوند گئی۔ ابر چاند پر سے ہٹ چکا تھا لڑکی اپنے آنسو پونچھ لینے کے بعد خاموش بیٹھی تھی ۔

"تو کیوں رو رہی تھی" شام نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"قسمت رلا رہی تھی"

"تو کہاں رہتی ہے"

"کہیں بھی نہیں"

"گام (گاؤں) کونسا ہے"

"ایشور جہاں بسا دے" شام جھنجھلا گیا "تو گھر سے بھاگ آئی ہے کہاں جائے گی ساتھی کہاں ہے۔" اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"میرا کوئی بھی نہیں ساتھی ہوتا تو روتی ہی کیوں"

"تیرا نام کیا ہے"

"تو کیا کرے گا"

"جو تو کرنا چاہتی ہے" اور شام کے ذہن میں ایک پرشباب ماحول رقص کرنے لگا۔ اس کی تمام تھکن دور ہو گئی

"میں مرنا چاہتی ہوں"

"اور میں بھی"

"کیوں" لڑکی نے چونک کر پوچھا۔

"میرا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں" شام کو حلق میں دکھ محسوس ہونے لگا الفاظ گلے میں اڑ گئے"

"ماں بھی" لڑکی نے پوچھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"ماں ہے پر میری نہیں"

"میری ماں نہیں میرا باپ دوسری کا ہے" اور رونے لگی شام نے اسے تسلی دی۔ ان چند اکھڑی اکھڑی ہوئی باتوں نے ہی دونوں کو مانوس سا کر دیا شام نے کہا اب تو نام بتا دے میرا تیرا ایک ہی ٹھور ٹھکانہ معلوم دے ہے"

"سونا" لڑکی نے جواب دیا۔

"میرا نام شام ہے سونا تو کہاں جا رہی تھی اب کہاں جائے گی"

"شام۔ ایشور جانے" سونا نے شام کے چہرے پر نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا میری ماں مرگئی باپ نے دوسری شادی کر لی اور اس نے میری کاٹ کرنی شروع کی عیب لگائے پرسوں شام پنچایت میں میرے باپ کا حقہ پانی بند ہونے لگا تھا کہ اگر وہ مجھ جیسی "چھوری (لڑکی) کو گھر میں رکھے گا تو . . ماسی نے (سوتیلی ماں نے) باپ کو ایسی پٹی پڑھائی کہ مجھ سے جھوٹ غصے کی باتیں کرنے لگا میں پچھلی رات اٹھی اور نکل آئی شام اب میں سوچ رہی تھی کہاں جاؤں کہ تو نے مجھے رونے بھی نہ دیا"

"سونا رونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کام کرنے سے ہوتا ہے بیٹھے سے نہیں ہو اٹھ چلیں" "کہاں"

"جہاں دھرتی اپنی ختم ہو جائے آکاش گود میں لے لے"

(۲)

جلمولی کے نمبردار نے رحم کھا کر شام کو اپنے ہاں رکھ لیا۔ سونا گھر کا کام کاج کرتی اور شام کھیتوں پر جاتا، رہٹ چلاتا، رکھوال کرتا۔ دو سال اسی کش مکش میں گزر گئے شام گاؤں سے مانوس ہو چکا تھا اور گاؤں والے اس کی خوش مزاجی کے مداح۔ نمبردار کے ہاں کی لڑکی بالیاں سونا کو بھابی پکارتیں انہیں امتیازِ آقا و بندہ تھا ہی نہیں شام کو وہ بھائی کہتی تھیں لیکن شاما شام کا نام ہی لے کر پکارتی تھی رادھا اس کی ہم عمر تھی دونوں اکثر شام کے تذکرے ہی میں اپنی فرصت کے اوقات کاٹتی تھیں۔ سونا کو اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ ان میں بیٹھتی گھر کے کام کاج سے ہی اسے فرصت نہ تھی۔ صبح تاروں کی چھاؤں میں ڈھوروں (مویشیوں) کی "سانہی" کرتی، دونوں وقت کا اناج پیستی اور جب مویشی جنگل چلے جاتے گوبر سمیٹتی اور تھواردوں میں چلی جاتی، اپلے تھاپتی، تھوڑے بناتی اور دوپہر کو ہالیوں (کسانوں) کی روٹی لے کر کھیتوں پر پہنچتی۔ لیکن اس دو سال کے عرصے میں ایک بار بھی ایسا موقع نہ آیا کہ وہ اور شام اپنی موجودہ زندگی پر تبصرہ کر سکے ہوں۔ ایک مشین چلا دی گئی تھی جس کے کل پرزے اپنے مقررہ کام انجام دے رہے تھے۔

کھرسا (موسم گرما) کی کڑاکتی دھوپوں میں دیہات میں مردنی سی چھا جاتی ہے وہ رونق وہ کیف جو دیہاتی زندگی کا جزو خیال کیا جاتا ہے ایک اجنبی کی نظروں میں قریب قریب بالکل مفقود ہو جاتا ہے۔ ہالی بھی ٹھنڈے ٹھنڈے ہل چلا لیتے ہیں اور دوپہر یا تو کسی درخت کے سائے میں اور یا اگر کھیت بستی کے نزدیک ہوئے تو وہ باریوں، بیٹھک میں گزار دیتے ہیں لوؤں کے تپتے ہوئے تھپیڑے اور گرم طمانچے یخت جان، بقان بھی ناقابل [illegible]

جیٹھ کی دوپہریں تو سمان میں نظریں برداشت ہی نہیں کر سکتیں وہ سکوتِ قوی بیابان وبستی پر کار فرما ہوتا ہے کہ الاماں۔ ایسی ہی ایک دوپہر تھی تھکی ہاری سونا منہ لپیٹے سونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی کہ شاما کے منہ سے شام کا نام سن کر اس کے کان کھڑے ہوئے اس نے اپنی خفیف سی حرکت پر بھی قابو پانے کی کوشش کی اور سانس بھی رُک رُک کر لینے لگی۔

"ایسا کٹھور، سنگدل امرد بھی ہم نے نہیں دیکھا" رادھا نے شاما سے کہا "سونا بھی عجیب ہے کبھی کوئی خیال ہی نہیں۔ جیسے غیر ہوں۔ اور شاما تو بھی پگلی ہوئی ہے چالا ہونے والا ہے اور تو برائی (پرائی) چھاد چھاچھ) بولنے کو پھر رہی ہے" کیسے مانوں رادھے جسے آنکھ بھر کے بھی نہ دیکھا اسے تو پتی (خاوند) دھار لوں اور من جس کی پوجا کرے ہے..... کچھ بھی نہ سمجھوں ..... رادھے تو کیا کرتی"

"کچھ بھی نا۔ یہ سمجھتی کھلونا پایا تھا ٹوٹ گیا۔ کھو گیا"

"تو کیوں نہ کہیگی۔ میری طرح تو بھی چار بچوں کے باپ سے بیاہی جائے تو پوچھتی کہ اب ناج کیا بھاؤ ہے سکھی؟"

"ابھی تو تو کہہ رہی تھی کہ آنکھ بھر کے بھی نہ دیکھا ابھی بڈھا بنا رہی ہے کیا چچا بوڑھا ہے۔" اور رادھے مسکرا دی ایک غمگین تبسم اسکے چہرے پر نمایاں تھا

"مجھے کیا بیرا (علم)"

"پھر کیسے جانا"

"سنا ہی ہے رادھا" شاما نے ہلکی سی آہ کھینچتے ہوئے کہا۔ شام۔ رادھا۔ شام شام ہی ہے۔ چندری ملتی ہے۔ وہ اکیلا ہے وہ منکور ہے وہ سب شام ہی شام پکارتی ہیں"

"اور رادھا"

"وہ تو شام کی ہے" دونوں ہنس دیں۔

"چل ری اپنی بلا دوسرے کے سر منڈھتی ہے۔ میں تو اسے بھائی سمجھتی ہوں" سونا نے جس کے دل کی دھڑکنیں بہت تیز ہو چکی تھیں اطمینان کا سانس لیا اور کروٹ بدلی شاما چونک اٹھی۔

"چپ" اس نے رادھا سے کہا "سونا جاگ نہ رہی ہو"

"سونا" رادھا نے آواز دی "سونا" شاما نے پکارا مگر سونا مزید سننے کے لیے خاموش پڑی رہی "بیچاری بہت تھکی ہے" رادھا نے کہا تم بہنوں نے جب سے یہ آئی ہے کام ہی کرنا چھوڑ دیا۔ چاچا جی نے اسے نوکر تو نہیں رکھا شام کو بیٹا بنایا ہے "آج کو منوہر ہو گا کل انھوں نے باپو سے کہا" تو وہ بھی شام کو بھائی کہہ کر پھولے نہ سماتا سچ تو یہ ہے ایشور نے غم دھونے کو شام مجھے دے دیا ہے سونا اس کی بہو۔ یا (بیوی) اسنے تو گھر کو سونا ہی بنا دیا"

سونا نے دل ہی میں نبر دار کو دیوتا کہا اور کان شاما کی آواز پر لگا دیئے۔

"رادھا آج میں شام کو کہہ ہی دوں گی"

"کیا"

"یہی کہ شام اگر یونہی ستانا ہے تو مار ڈالو کہ میری مکتی ہو جائے"

"اور تجھے لاج نہ آئیگی" رادھا نے شاما سے پوچھا۔

"دیوتاؤں سے دان مانگنے میں لاج نہیں آتی رادھا" سونا کو کھری چارپائی کا ایک ایک بان سلگتے ہوئے انگاروں کی طرح محسوس ہونے لگا اس نے پھر کروٹ بدلی "سونا" رادھا نے پکارا جو دیر سے سونا کی مرتعش انگلیوں کو دیکھ رہی تھی سونا خاموش رہی "تو جگا ئیگی" شاما نے جھنجھلا کر کہا "میری باتیں بری لگتی ہیں تو کہد ے اپنی ویر (بار۔ دفعہ) کسی کو نہ جگانے دیا"

"میں نے کونسی ایسی باتیں کی ہیں" رادھا نے سر کی ہوئی چندریا سنبھالتے ہوئے کہا "ادھوری بھولی۔ شنکر کو بھول گئی"

"شاما سب ہی بھول کرتے ہیں جوانی میں بھول ہو ہی جاتی ہے"

"تو مجھے کیوں روکتی ہے۔ رادھا میں بھی جوان ہوں"

"ہاں ہے تو ہی مگر پاگل" شاما کچھ کہا ہی چاہتی تھی کہ اس کی چھوٹی بہن روتی ہوئی آئی اور شاما کے دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

تقایا دوپہر سونا نے آگ پر گزاری۔ ابھی سائے ڈھلے ہی تھے کہ وہ گھڑے اٹھا پنگھٹ کو چلدی۔ شام رل پر جا رہا تھا اس نے آواز دی۔ شام کو دیکھتے ہی سونا رونے لگی بیچارا گھبرا گیا۔

"کیا ہوا سونا"

"شام..." اور وہ کچھ کہو سی گئی "تمہارا دے کر چھوڑ دو گے"

"کس نے کہا" اور وہ کوئیں کی منڈیر پر بیٹھ گیا سونا اب بھی رو رہی تھی "دکھو یا ہوا اٹھا۔ اور بڑی ہوئی مایا سے کرمیں کہیں نہیں جاؤں گا یہاں چچا جی تمہا نہیں کہتے۔" رادھا اور شاما بھی پانی لینے آگئیں۔ سونا اور شام کو باتیں کرتا دیکھ کر شاما کے چہرے پر زردیاں کھنڈ گئیں اور مٹکا ہاتھ سے چھوٹ کر پاش پاش ہو گیا۔

"کیا ہو۔ بہن!" اور شام ہل ہانکتا ہوا چلا گیا۔

حاوی نقوی

(لاہور)

قیدی جن

(انقلاب فرانس کا ایک واقعہ)

کاونٹ دی ترولان، فرانس کے زمینداروں میں ایک نہایت ممتاز خاندان کا نوجوان رئیس تھا۔ پولین سے پہلے جب فرانس میں ملوکیت کے خلاف ہنگامے اور فسادات برپا ہوئے، امن و امان کا نام و نشان بھی نہ رہا، تو فرانس کے بہت سے شرفا ہجرت کر کے انگلستان آ گئے، کاونٹ بھی انھیں تارکینِ وطن کے ساتھ انگلستان پہونچا۔

کاونٹ دی ترولان کا تعلق فرانس کی اس پارٹی سے تھا جو جمہوریت پسندوں کو شکست دے کر تخت فرانس پر باربون کے خاندان میں سے کسی کو بٹھانا چاہتی تھی۔ معرکہ کیبرون میں جب بادشاہ پسندوں کو جمہوریت پسندوں کے ہاتھوں شکست فاش اٹھانی پڑی تو شکست خوردہ سپاہیوں میں کاونٹ دی ترولان بھی تھا، لیکن کسی طرح ان کے پنجوں سے نکل کر انگلستان کو فرار ہو گیا۔ اس طرح کاونٹ کو اپنا وطن ہی چھوڑنے پر مجبور نہ ہونا پڑا بلکہ اپنی حسین اور نوجوان بیوی سے بھی جدا ہونا پڑا جس سے شادی ہوئے ابھی بہت تھوڑے ہی دن گزرے تھے۔

کاونٹ لندن آ گیا، اور لندن میں اس کے لئے حکومت انگلستان کی طرف سے تھوڑا سا وظیفہ بھی مقرر ہو گیا۔ اس زمانہ میں انگلستان اور فرانس کے درمیان ناچاقی تھی اس لئے جو لوگ جمہوریت پسندوں سے چھوٹ کر انگلستان آ جاتے تھے حکومت انگلستان ان کی تھوڑی بہت مدد کیا کرتی تھی۔

فرانس کے ہنگامہ پروروں کی عدالت میں ہجرت [illegible] خیانت [illegible] کا جرم تھا [illegible] کی سزا موت کے سوا کچھ نہ تھی۔ اس سے کاونٹ کو معلوم تھا کہ اگر کسی طرح اس نے فرانس کی زمین پر قدم رکھا تو موت سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ اسے ایسی حالت میں جمہوریت پسندوں سے نجات کی کوئی دور کی امید بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن جلاوطنی، اور بے کاری کی زندگی دنیا کے اولوالعزم انسانوں کے لئے ہمیشہ سوہانِ روح ہوتی ہے۔ اس لئے کیسے ممکن تھا کہ کاونٹ دی ترولان صبر و شکر کے ساتھ انگلستان میں زندگی بسر کرتا، کچھ ہی دنوں میں وہ انگلستان کی زندگی سے اکتا گیا، اور اس فکر میں رہنے لگا کہ کسی نہ کسی طرح فرانس چلا جائے یا کم از کم ایسی کوئی صورت نکل آئے کہ وہ فرانس کے سواحل کو ہی دیکھ سکے، اسی فکر میں تھا کہ اس کی ملاقات کپتان سر سڈنی اسمتھ سے ہو گئی اور آہستہ آہستہ دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔

سر سڈنی اسمتھ میر ہوریشیو نیلسن کے بعد برطانوی بیڑے کا سب سے زیادہ مشہور کپتان تھا۔ فرانس کے جمہوریت پسند اس شخص کو دنیا میں اپنی تحریک کا سب سے بڑا دشمن اور [illegible] سب سے زیادہ خطرناک آدمی سمجھتے تھے، اور واقعہ بھی یہی تھا کہ کپتان شمالی فرانس میں شاہ پسندوں کی طرح درپردہ ہمیشہ مدد کیا کرتا تھا۔ اور جب کبھی موقع مل جاتا وہ اپنی کشتیوں کے ذریعہ وہاں سے بہترین [illegible] لیکر انگلستان بھی پہونچا دیا کرتا تھا۔

شمالی فرانس میں شاہ پسندوں اور جمہوریت پسندوں کے مابین معرکہ جدال [illegible] جاری [illegible] شاہ پسندوں کے نام [illegible] پیام [illegible] علاوہ [illegible] سامان جنگ [illegible] کرتا تھی [illegible] واکہ ان کو جنگ کے لئے آمادہ بھی [illegible] نے کیا۔

سر سڈنی اپنے [illegible] جلد [illegible] ایک جنگ [illegible] بحریوں نے [illegible] ان [illegible] حرکتوں کی وجہ سے عظمت [illegible]

نام رکھ دیا تھا، جب کبھی فرانسیسی بیڑے سے اس کا مقابلہ ہوا، فرانسیسیوں کو ہمیشہ سخت نقصانات اٹھانے پڑے۔ اس لئے کچھ جاہل بحری سپاہی دل سے یقین کرنے لگے تھے کہ یہ انسانی شکل میں کوئی عفریت ہے۔

کاونٹ دی ترو ملان سے اس کی دوستی کو کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ اس نے کاونٹ کو اپنے ساتھ جہاز میں رہنے کی دعوت دی، یہ واقعہ ۱۷۹۶ء کا ہے۔ اس وقت سر سڈنی ایک جہاز ”ڈائمنڈ“ کا افسر تھا، یہ جہاز برطانوی دوسرے بیڑوں کے ساتھ فرانس کے سواحل کے محاصرہ میں شریک تھا۔

کاونٹ دی ترو ملان نے لندن کی پر سکون زندگی پر، اس ہنگامہ پرور حیات کو ہزار درجہ ترجیح دی، اور سر سڈنی کے ساتھ ”ڈائمنڈ“ میں رہنے لگا، چھوٹی چھوٹی بحری جنگوں، ہنگاموں، اور آب و خون کی دلچسپیوں میں اس کا جی اچھی طرح لگتا تھا، ساحل دیپ سے لے کر آخری نارمن حصہ تک اس جہاز کی دوڑ ایسی چیز تھی جس میں کاونٹ کے دل بہلانے کا کافی سامان تھا، اسی لئے کاونٹ دل سے چاہتا تھا کہ یہ صورت حال طویل تر ہو جائے، لیکن دنیا میں کبھی ایسا ہوتا نہیں ہے، کسی حالت کو قرار نہیں، ایک دن چاندنی رات میں ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس کا ابتدائی حصہ بہت ہی خوش آئند تھا، مگر آخری، بڑا ہی ہولناک اور خوفناک ثابت ہوا۔

سڈنی نے سوچا کہ آج کی رات اپنے دوست کو شاندار بہادری کا جدید کارنامہ دکھائے، اور اپنے جہاز ڈائمنڈ کو لے کر سواحل ”ہافر“ کی طرف چل دیا۔ اس ساحل پر فرانس کی پانچ چھ ننی چھوٹی کشتیاں حفاظت کے لئے لنگر انداز تھیں، راستہ میں اس کو ایک فرانسیسی جنگی کشتی ملی کپتان نے اس کشتی کا راستہ روک کر اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ کشتی کو لوٹ لیں، جب لوٹ مکمل ہو چکی اور سڈنی اپنے جہاز کو ساحل سے دور لے جانے کی کوشش کر رہا تھا، زور کی آندھی چلی اور باوجود ہزار کوششوں کے ”ڈائمنڈ“ جنوب کی طرف کھنچ کر نہر ”سین“ کے دہانے پر جا پڑا، فرانسیسی کشتیوں نے جہاز کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور آن کی آن میں ”ڈائمنڈ“ اور اس کا عفریت انگریز کپتان فرانس کا قیدی ہو گیا۔

سڈنی پر اس ناشدنی واقعہ کا جو بھی اثر پڑا ہو کم ہے، لیکن بہادرانہ طریقہ پر اس نے صورت حال کو دیکھا، اور غور کیا، اتفاقات کو برا کہنے اور دنیا کو گالیاں دینے میں اولوالعزم اشخاص وقت ضائع نہیں کیا کرتے، اس نے بار بار سوچا مگر خلاصی کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا، اسے معلوم تھا کہ اس کا اور اس کے ساتھیوں کا جو بھی حال ہو، بہر حال، انجام ان کے لئے برا نہیں ہو سکتا، زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ قید میں رہنا پڑے گا، اور آخر میں جب جنگ ختم ہو جائے گی، جنگ کے عام قیدیوں کے ساتھ اس کی رہائی یقینی ہے، ہاں اس کے دوست کاونٹ دی ترو ملان کا پوزیشن بڑا نازک ہے، فرانس کا ایک مَیں شاہ پسند، جنگجو، فراری اور گرفتار ہوتا ہے، دشمنوں کے ایک جہاز پر، اس کے لئے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر موت کے سوا اور سزا ابھی کیا ہو سکتی ہے، یہ تمام نقشہ کپتان کے سامنے تھا، اس نے اپنے کو چھوڑ کاونٹ کی رہائی پر غور کرنا شروع کیا، اور جب تک فرانسیسی جہاز کا جائزہ لے رہے تھے اس نے نہایت تیزی کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو یکجا کیا اور جنگی انداز میں حکم دیا۔

” اس گھڑی سے کاونٹ دی ترو ملان میرا خادم

خاص ہے اور اس کا نام "جان برولی" ہوگا۔"

ایک افسر نے کہا وہ تو ایک لفظ انگریزی کا نہیں جانتا۔

افسر نے جواب دیا۔ ہاں وہ کینیڈا کا رہنے والا ہے اور وہیں سے میرے ساتھ ہوگیا ہے۔ مجھے بہت عزیز ہے اور میرا خاص ملازم ہے۔"

اس اثنا میں فرانسیسی جہاز پر پوری طرح قبضہ حاصل کرچکے، کپتان سرسڈنی نے اپنی تلوار فرانسیسی کپتان کے حوالہ کی اور اپنے بحری سرداروں کو نام بنام ایک ایک کرکے اس کے سامنے پیش کرتا رہا، فرانسیسی افسر نے حکم دیا کہ جہاز "ضبط" اور قیدی جنگ کے قیدی قرار دئے جاتے ہیں۔ فوراً انگریزی جھنڈا جہاز سے اتار دیا گیا، اور جمہوریت فرانس کا علم لہرانے لگا۔

کاونٹ دی ترو ملان یعنی کپتان کا ملازم خاص جان برولی جسے ہم آئندہ جان برولی کے نام سے یاد کریں گے، ان تماشوں میں شریک نہ تھا، بلکہ اس نے نہایت تیزی کے ساتھ اپنے نفیس کپڑے اتار کر خادموں کا لباس پہن لیا اور بحری افسر کے پیچھے نوکروں میں آکر کھڑا ہوگیا، اس نے دیکھا کہ فرانسیسیوں نے خادموں سے کچھ دریافت نہیں کیا، یہ وہاں سے کپتان کے کمرے میں آگیا اور کپتان کے کپڑے وغیرہ درست کرکے صندوق میں رکھنے لگا اس کے سکون و اطمینان سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، یا اگر کوئی واقعہ ہوا ہے تو اس سے اس کو کوئی فائدہ یا نقصان پہونچنے کی امید نہیں ہوسکتی۔

۱۹ اپریل ۱۷۹۶ء کی صبح بھی عجیب صبح تھی، جہاز کے پکڑے جانے کی خبر راتوں رات پھیل گئی، بہت سویرے ہی سے ساحلی حصہ کے چھجے، سڑکیں اور کھڑکیاں سب اس گرفتار بھوت کو دیکھنے والوں سے بھری پڑی تھیں، لوگوں نے دیکھا کہ جسے وہ بھوت سمجھے ہوئے تھے، وہ ایک انسان، بلکہ اس وقت وہ بہت ہی بے دست و پا انسان تھا، لوگ مذاق اور طعن دونوں ہی طرح کے جملے کس رہے تھے، گر سڈنی نہایت کشادہ پیشانی کے ساتھ ہاتھ میں ہیٹ لئے، مسکراتا اور سلام کرتا ہوا گذر رہا تھا جب سڈنی ہوٹل میں پہونچا، جہاں اسے احکام کے درود تک قید رکھنا قرار پایا تھا تو اس نے نگہبانوں سے ہنس کر کہا۔

اچھا ہوا اس طرح مجھے فرانس کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا، تمنا کسی طرح پوری ہوئی، لیکن بہرحال پوری ہوئی۔

چار دن کے بعد حکام اعلیٰ کی طرف سے حکم نامہ آیا کہ کپتان سرسڈنی اور اس کے سکرٹری مسٹر رائٹ کو پیرس بھیج دیا جائے، اور بقیہ قیدیوں کو تاحکم ثانی وہیں رکھا جائے، حکم کی تعمیل میں سرسڈنی اور رائٹ کو ایک ڈاک گاڑی میں سوار کرا دیا گیا، جان برولی بغیر کچھ کہے سنے کوچبان کے برابر بیٹھ گیا، گویا آقا کے ساتھ نوکر کا چلا جانا ایک طے شدہ امر ہے۔ افسروں نے بعض لحاظ سے خلاف ورزی سمجھی لیکن آخر میں یہ طے پایا کہ وفادار خادم کو آقا کے ساتھ ہی رہنے دیا جائے، پیرس میں اس کے متعلق فیصلہ ہو جائے گا۔

پہلی مئی کو یہ لوگ پیرس پہونچے اور "التامپل" کے قیدخانہ میں داخل کر دئے گئے۔

"التامپل" بڑے بڑے سیاسی قیدیوں کا زندان ہونے کی وجہ سے سارے یورپ میں مشہور تھا، ابھی کچھ ہی سال پہلے اس میں بدنصیب بادشاہ لوئی شانزدہم اور اس کے خاندان قید رہ چکے تھے۔ یہ قیدخانہ ایک بہت ہی مضبوط قلعہ تھا، جس کی آسمان سے باتیں کرنے والی دیواریں، مضبوط و مستحکم برج، اور پہرہ داروں کی کثیر جمعیت جو وہاں متعین تھی ظاہراً قیدیوں کا بہترین انتظام معلوم ہوتی تھی، لیکن واقعہ یہ تھا کہ جمہوری انقلابات کے بعد جو

"مجلس ڈائرکٹرس" ملک پر حکومت کرنے کے لیے قایم کی گئی تھی وہ دیانت دارانہ تھی، رشوتوں، سفارشوں، اور شخصی مفاد کے لئے خطرناک جرائم خود اعلیٰ عہدہ داروں میں اس قدر بے تکلفی کے ساتھ موجود تھے کہ ملک کے تمام چھوٹے بڑے ادارے اس مرض میں مبتلا ہو گئے، قید خانہ بھی اس سے مامون تھا جتنی زیادہ جمیعت محافظت کے لئے متعین کی جاتی تھی اتنے ہی زیادہ مواقع قیدیوں کی فراری کے ہو جاتے تھے، کوئی نہ کوئی رشوت لالچ میں مبتلا ہو کر قیدی کے لئے آلہ کار بن جاتا تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ قلعہ "الناسبل" کے آس پاس کی سڑکیں فوجوں، سپاہیوں، جاسوسوں اور خفیہ نویسوں سے بھری رہتی تھیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گرد و نواح کے اکثر مکانات شاہ پسندوں کے قبضہ میں تھے جو بھیس بدل کر وہاں رہتے اور طرح طرح کی سازشیں کرتے تھے، اگر وہ نہایت صفائی کے ساتھ قیدی کو نکال لے جاتے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی۔

سر سڈنی کو "الناسبل" کے متعلق بہت کچھ سنی سنائی باتیں معلوم تھیں، اس کو وہ بعض قصے بھی معلوم تھے جو یہاں سے قیدیوں کی فراری کے متعلق دور دور ملکوں تک پہونچ چکے تھے اس لئے اسے کچھ زیادہ تعجب نہ ہوا جب کہ اس نے پہلی ہی شب کو ایک تماشا دیکھا۔

جس برج میں یہ قید تھا اسی کے سامنے ایک عالی شان مکان واقع تھا، اس مکان کی ایک کھڑکی میں سفید کپڑا لگا ہوا تھا، اس کپڑے پر لیمپ کے ذریعہ بات کو روشن حروف بنائے جاتے تھے، جس سے پوری عبارت بنتی تھی، نیچے سے پہرہ دار اس کے سوا کچھ نہ دیکھ سکتے تھے کہ دریچہ سے روشنی آرہی ہے اور یہ کوئی شبہ کی بات نہ تھی، مگر برج کے اوپر رہنے والے قیدی جو اس دریچہ کے اندر دیکھ سکتے تھے، پوری عبارت پڑھ سکتے تھے۔

سر سڈنی کو معلوم ہوا کہ یہ طریقہ قیدیوں کو مخاطب کرنے کا ...ب۔ یہ مکان ایک عورت "دی لونواہ" نامی کا تھا، اور یہ طریقہ بھی اسی کی ایجاد تھا، یہ عورت شاہ پسندوں سے تعلق رکھتی تھی، اور اس مکان میں غالباً اسی غرض سے رہتی تھی کہ ان کی مدد کر سکے۔

کیپٹن کو مذکورہ بالا طریقۂ خطاب سے معلوم ہوا کہ "کاونٹس دی تروطان" کو جب لندن سے اطلاع ملی کہ جہاز "ڈائمنڈ" گرفتار ہو گیا اور اس کا شوہر بھی قیدیوں میں شامل ہے تو کاونٹس نے پیرس آکر اسی مکان کے قریب ایک مکان لے کر رہنا شروع کیا، اور اسی فکر میں رہتی کہ کسی طرح اپنے شوہر کو رہا کرائے۔

یہ ایک طبعی بات تھی کہ کاونٹ کی رہائی کے متعلق کاونٹس اور "دی لونواہ" دونوں کو غیر معمولی فکر تھی، کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ اگر کاونٹ پہچان لیا گیا، تو اس کے لئے موت کے سوا کوئی دوسری شکل نہیں ہو سکتی، اور اس کا ہر وقت خطرہ تھا کہ اس کو کوئی شخص پہچان لے یا اسے دیکھ کر کوئی دوست اصلی نام سے پکارے، یہاں کاونٹ کا یہ حال تھا کہ ایک ادنیٰ ملازم کی حیثیت سے کپتان کے ساتھ رہتا تھا۔ اس پر کوئی پابندی نہ تھی۔

قید خانے کے افسروں کو اس پر بڑا رحم آتا تھا، کہ اس نے اپنے آقا کی وفاداری میں اپنے کو پھنسا رکھا ہے۔ انھیں یقین تھا کہ یہ ایک احمق خدمت گار ہے، انگلستان اور فرانس کی جنگ سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہو سکتا، اس کی نہ تو پیرس میں کسی سے جان پہچان ہے اور نہ اس کے پاس اتنا روپیہ ہے کہ کوئی اہم کام انجام دے سکے، اس لئے اسے اجازت

تھی کہ قلعہ میں جہاں چاہے آئے جائے، تھوڑے دنوں تک
دیکھتے رہنے کے بعد جب انھیں معلوم ہو گیا کہ یہ شخص صاف دل
گر احمق ہے تو انھوں نے اپنے فرائض اور قانون کے خلاف
بھی رعایتیں شروع کیں، حتیٰ کہ اس کو پیسے دے کر بازار
سے چیزیں منگوایا کرتے تھے، کاونٹ بھی خدمتگاری میں
اس قدر چست بے عذر وفاداری میں سچا اور باقاعدہ
ثابت ہوا کہ کسی کو شبہ کی گنجائش نہ مل سکی، وہ شراب
لا لا کر نگہبانوں کو پلاتا اور بیٹھا بیٹھا بے وقوفوں کی طرح باتیں
بناتا۔

خفیہ کے افراد نے ملازم کو جب باہر آتے جاتے دیکھا تو
ابتداءً انھیں شبہ ضرور ہوا اور انھوں نے اس کا پیچھا بھی
کیا، مگر جلد ہی انھیں معلوم ہو گیا کہ راستہ میں کسی سے
ملتا، نہیں نہ ایسی کوئی حرکت کرتا جس سے شبہ پیدا ہو سکے
اس ملازم کی عادت سے بعید ہے اور نوا اور انھوں نے بارہا
دیکھا کہ ایک اجنبی عورت کے پاس وہ جیل خانے کے قریب ہی
والے مکان میں جایا کرتا ہے، مگر وہاں سے نکلتے وقت جب
کبھی اس کے چہرہ کا مقابلہ کیا تو ان کا یقین بڑھتا گیا کہ
یہ صرف دو گھڑی کو جیل کی کلفت مٹانے چلا جاتا ہے اس کے
بشرے سے دلی علامت بظاہر نہ ہوتی تھی،
حالانکہ یہ عورت کاونٹس کے سوا کوئی دوسری نہ تھی جو اپنے
شوہر اور کپتان کی رہائی کے لئے تدابیر سوچا کرتی تھی۔
خفیہ والوں نے اسے بارہا روکنا چاہا مگر یہ سوچ کر
چپ ہو رہے کہ جب یہ خود جانا نہیں چاہتا اور کوئی برا ارادہ
نہیں رکھتا تو سختی کا برتاؤ کر کے جیل کے محافظین
سے کیوں بگاڑلیں۔
ادھر کاونٹس بڑے بڑے نامی شاہ پسندوں کی

مدد سے جن کے سروں کے لئے حکومت نے گراں بہا انعامات
مقرر کر رکھے تھے، اس کی رہائی کے لئے تدابیر اختیار کر رہی تھی۔
یہ بات اب کوئی راز نہ تھی کہ تامپل کے اردگرد جو مکانات
ہیں وہ شاہ پسندوں کے مامن اور ان کی ریشہ دوانیوں کے
مرکز ہیں، اور ایک مدت سے ان لوگوں نے جو کہ ان مکانات
کو اپنا مرکز بنا رکھا تھا، اس لئے اس زمین میں چھوٹی چھوٹی
سرنگیں بھی پائی جاتی ہیں، [illegible] کے بعض دوستوں نے
[illegible] کو ایک مکان کا پتہ بتایا، کاونٹس نے [illegible]
لیا، بڑی محنت سے کس نے سرنگ کے بند دہانے کا پتہ
چلا لیا، اب کام صرف اس قدر باقی رہ گیا تھا کہ [illegible] میں سے
مٹی نکال کر راستہ صاف اور وسیع کر لیا جائے، اور تقریباً بارہ
مزید کھود کر جیل خانے کے اس کمرہ تک پہنچا جائے جہاں
کپتان اور کاونٹ کو باہر لا کر ملنے پایا تھا، یہ کام بھی کاونٹس
نے شاہ پسندوں کی مدد سے انجام دے لیا، صرف ایک [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
شاید [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] دونوں نے سنا۔
محافظ سپاہیوں کی ایک بڑی جماعت [illegible]

کسی کی سمجھ میں یہ نہ آسکا کہ ساری جدوجہد اتنے قیدیوں
میں کس قیدی کی رہائی کے لئے کی گئی تھی، کیونکہ خوش قسمتی
سے اس جگہ کوئی قیدی موجود نہ تھا۔ ادہر کاونٹس نے
جو ناکامی دیکھی اپنی اور اپنے مددگاروں کی جان بچاکر
نکل گئی، سپاہیوں کو اُس سرنگ کا دوسرا سرا معلوم
کرنے میں کچھ وقت صرف ہوا، اور جب تک اس کھوہ تک
سپاہی پہونچیں، وہاں کوئی نشان ان کا باقی نہ تھا۔
اس واقعہ کی خبر ارباب اقتدار کو پہونچائی گئی۔
تحقیقات کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا، مگر یہ راز نہ کھل
سکا کہ معاملہ کیا تھا، اور کس قیدی کو رہا کرنے کے لئے یہ تدبیر
اختیار کی گئی تھی، لیکن کپتان اور اس کے خادم کی طرف اب
ذرا شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا، اور جیل کے مہتمم کو احکام
دئے گئے کہ انگریزی قیدی کی نگرانی شدت سے کی جائے۔
نیز یہ کہ اس کے نوکر کو الگ کرکے انگلستان بھیج دیا جائے،
کیونکہ کپتان کے پاس اس کے رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں۔
تامبل کے رہنے والوں میں شاید ہی کوئی ہو جس کو
اس حکم سے تکلیف نہ ہوئی ہو بلکہ خود نگرانوں کو بھی افسوس
تھا کہ ایک اچھا دوست ہاتھ سے جاتا رہے گا مگر کیا کیا جاسکتا
تھا احکام کی تعمیل ہوئی، اور ایک چھوٹی سی سرکاری گاڑی
چند سپاہیوں کی حراست میں خادم کو لینے آگئی، کاونٹ
ایک ایک سے بڑے حزن وملال کے ساتھ رخصت ہوا۔
خاص کر وہ منظر بڑا ہی دردناک تھا، جب کہ وفادار خادم
جان بروملی اپنے آقا کپتان سڈنی سے رخصت ہورہا تھا
غریب خادم کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا ابلے آتے
تھے، اور وہ آقا کے ہاتھوں کو بوسہ دے رہا تھا، آنکھیں
کہہ رہی تھیں کہ میں آپ کی رہائی کے لئے جان تک کی بازی
لگادینے سے دریغ نہ کروں گا، یہاں تک کہ اس نے سارے
مجمع کے سامنے ہی کہہ دیا، کہ میں آپ کے لئے انگلستان میں سب
کچھ کروں گا، سپاہی اُس منظر سے بہت متاثر ہوئے، اس کے
آنسو پونچھنے اور دلاسا دینے لگے، خود کپتان بھی بے حد متاثر
ہوا اور اپنی تھیلی میں سے وہ ساری رقم جو بچ رہی تھی، اس کے
حوالہ کردی، ایک صداقت نامہ حسن خدمت کا لکھ کر اس کے
حوالہ کیا، چلتے وقت تک کپتان اس سے اپنے گھروالوں کو
سلام وپیام پہونچانے کے لئے کہتا رہا، اور یہ بھی کہا کہ میرے گھروالے
تمہاری سفارش کرکے کسی اچھے انگریزی گھرانے میں نوکری دلادیں گے۔
جان بروملی کا پیرس سے ساحل تک کا سفر بھی اپنی نوعیت کا عجیب وغریب
سفر تھا، فرانس میں بدامنی شروع ہونے کے بعد یہ پہلا اتفاق تھا کہ کاونٹ
دی تروملان، جمہوریت پسندوں کا سب سے بڑا دشمن، اور
مشہور سازشی شاہ پسند جس کے سر کے لئے حکومت کی جانب سے
گرانقدر انعامات کا بار بار اعلان کیا جارہا تھا، سرکاری گاڑی
میں سوار، پولیس کی معیت کے ساتھ کھلے خزانے دن کے وقت
اپنی جان کی طرف سے مامون، ومطمئن سفر کررہا تھا، یہ وہی
جلاوطن تھا، جو فرانس میں داخل نہیں ہوسکتا تھا، یہی دشمن
حکومت تھا جو راتوں کو اور جنگلوں میں چل چل کر فرانس سے
اپنی جان سلامت لے جاسکتا تھا، آج سرکاری سپاہی اس کی
جان کی حفاظت اور راحت کا سامان کررہے ہیں، تاکہ بخیر و
خوبی اسے انگلستان پہونچا دیا جائے، تقدیر کی ستم ظریفیاں بھی
عجیب ہوتی ہیں۔
جان بروملی نے اپنے محافظین کو شکریہ کے ساتھ گودی پر رخصت
کیا، اور جہاز پر چڑھ گیا، جہاز انگلستان کے لئے لنگر اٹھا دیا،
اور جان بروملی عرشہ جہاز سے محافظین کو رومال کے اشارے
کررہا تھا، اور ہنس رہا تھا، وہ ہنسی جس کا سبب اس کے سوا

کوئی دوسرا نہیں جانتا تھا، لیجئے جہاز دور نکل گیا، اور جان بروملی اپنے کمرہ میں آکر بیٹھا، اب اسے بڑے زور کی ہنسی آئی اور خوب قہقہہ مار کر ہنسا، اب جمہوریت فرانس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی، وہ فرانس میں رہا اور جمہوریت پسندوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر صاف نکل آیا، لیکن کاونٹ دی [illegible] جیسا بہادر، اپنی جان بچ جانے کو غنیمت جان کر چپ بیٹھ سکتا تھا؟ کیا اس کی غیرت یہ گوارا کر سکتی تھی، کہ اس کا رفیق کپتان "تابیل" میں قیدی کی حیثیت سے دن گزارے اور وہ انگلستان میں رنگ رلیاں اڑاتا رہے، وہ ابھی موت کے منہ سے نکلا تھا، لیکن اس نے دل سے عہد کر لیا تھا، کہ وہ کپتان کو ضرور رہا کرے گا، وہ انگلستان سے پھر فرانس چلا آیا، اور نئے نام سے اپنی بیوی کے ساتھ رہنے لگا۔

اسی سلسلہ میں سب سے دلچسپ بات یہ تھی، کہ فرانس کے شہر کالیاں میں کاونٹ دی ترولان فرضی نام کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے، اور حکومت پیرس کے پاس انگلستان سے جان بروملی کپتان سڈنی کے ملازم کے متعلق اطلاعات پہونچ رہی ہیں، فرانس کی باخبر حکومت ملازم کو رہا کرنے کے بعد بے خبر نہیں ہے، وہ ہمیشہ جان بروملی کے متعلق اطلاعات حاصل کر رہی ہے، اور جب اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ جان بروملی نے ایک انگریز خاندان میں ملازمت کر لی ہے اور لندن میں خانہ [illegible] زندگی بسر کر رہا ہے تو اسے اس ملازم کی طرف سے بالکل اطمینان ہوجاتا ہے۔

کپتان سڈنی کو معلوم تھا کہ اس کے نام آنے والے تمام خطوط کھول کر دیکھ لئے جاتے ہیں اس لئے وہ احباب و اعزہ کو جان بروملی کے ساتھ اچھے برتاؤ اور کسی دوسری جگہ سفارش کے لئے لکھا کرتا تھا، وہ ہر ایک کے جواب و [illegible]

جان بروملی کی خیریت، اور احوال لکھا کرتے تھے، ایک مرتبہ اس کے بھائی نے لکھا کہ جان بروملی کنیڈا یعنی اپنے گھر گیا ہے۔ حکومت فرانس ان اطلاعات سے مطمئن تھی کہ مسکین ملازم جان بروملی کسی شک وشبہ کی نظر سے دیکھے جانے کے قابل نہیں اور واقعہ یہ تھا، کہ کاونٹ اپنی چہیتی بیوی کے ساتھ فرانس میں بیٹھا کپتان کی رہائی کے لئے تدابیر سوچ رہا تھا۔

کالیان میں کاونٹ کی اقامت کو ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ ہیڈ دی نوفیل، فلیبو، اور بوجیرار کے جیسے خطرناک سازشی اور انتہا پسند شاہ پرستوں کی جماعت اس کے گرد اکٹھا ہوگئی، اور یہ تدبیر سوچی جانے لگی کہ کپتان سر سڈنی کو قید خانے سے کیسے رہا کیا جائے، طرح طرح کی تجاویز پر غور کیا گیا، یہاں تک کہ ایک ایسی تجویز پر اتفاق ہوا، جو بلا کی چابکدستی اور عظیم الشان جرأت چاہتی تھی، اس تدبیر میں ضرورت تھی کہ وزیر پولیس کے دفتر سے [illegible] کا چھپا ہوا فارم اڑایا جائے، اور اس پر وزیر کی خصوصی مہر بھی لگائی جائے، پھر کپتان کو دوسرے قید خانے میں منتقل کرنے کا فوری حکم لکھ کر وزیر کی جعلی دستخط کر دی جائے، اب رہا سرکاری گاڑی کا مسئلہ جو قیدی کو منتقل کرنے میں کام آتی ہے۔ جب یہ سب کچھ ہوجائے گا تو وہ کچھ زیادہ مشکل نہیں۔

اتفاق سے اس تدبیر کی دقتوں پر قابو پانے کی جدوجہد میں ان کو ایک غیر ملکی جاسوس سے ملاقات کا موقع مل گیا، جو حکومت کی طرف سے یہاں متعین تھا، اس جاسوس کا نام ویسکوفنٹس تھا، یہ شخص دائرہ امن عامہ میں ملازم تھا، اور ایک دوسری حکومت سے جاسوسی کے لئے تنخواہ پاتا تھا، ایک بھاری رقم کے بعد وہ اس پر راضی ہوا کہ [illegible] " [illegible] جیسے پولیس کی اصطلاح میں

"مہر بر سفید" کہتے ہیں، اور وزیر اس پر مہر کر کے اپنے انتہائی اشد ضروری احکام جاری کرتا ہے، کسی نہ کسی طرح [illegible] ان کو لا دے گا۔

۱۴ اپریل ۱۹۰۹ء کی شام کے وقت ایک شاندار گاڑی "تامبل" کے دروازے پر رکی، کوچبان کے بازو میں [illegible] لوبی پہنے ہوئے پولیس کی وردی میں ایک شخص [illegible]، اس نے ٹوپی اور رومال سے اپنا چہرہ ایسا نیم پوشیدہ کر رکھا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا، گاڑی سے دو امین پولیس اترے، اور نہایت متانت سے "تامبل" کے دروازہ میں داخل ہوئے، ایک زرین لباس افسر گاڑی کے پاس کھڑا ہے، یہ شخص کوئی ذمہ دار افسر معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ کاؤنٹ دی ترو ملان کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔

دونوں امین جیل کے مہتمم کے پاس گئے اور اسے حکم نامہ حوالے کیا، اس حکم نامے میں مرقوم تھا کہ حامل حکم نامہ کی نگرانی میں آج راتوں رات سر سڈنی اسمتھ انگریزی کپتان قسطنطنیہ کے جیل خانے میں منتقل کر دیا جائے، داروغہ جیل نے حکم نامہ کو غور سے دیکھا، مہر و دستخط پر نگاہ کی، اس کے بعد دونوں امینوں کے چہرے کو غور سے دیکھا، جب یقین ہو گیا تو اس نے روزنامچہ جیل نکالا، اس حکم کا اندراج کیا، اور قیدی کی سپردگی کے احکام جاری کر دئے۔

کپتان لایا گیا، اس نے اپنے اسباب کے متعلق کچھ ہدایات دیں، اور چلنے کو تیار ہو گیا، دونوں امینوں میں سے ایک نے داروغہ جیل سے درخواست کی کہ کچھ تھوڑے [illegible] گاڑی کے ساتھ حفاظت کے لئے روانہ کئے [illegible] نے اس [illegible] کرتے ہوئے کہا [illegible] خفیہ طور پر قیدی [illegible] وہاں پہونچانے کا حکم ہے، سپاہی ساتھ چلنے ہوں گے تو ساری دنیا اسی کو غور سے دیکھے گی، اس کے بعد اس نے کپتان کو گھور کر دیکھا، اور بولا،

تم فوجی ہو؟

کپتان: بلا شبہ،

امین: دیکھو فوجیوں میں عزت کی قسم سب سے بڑی قسم ہے، جو توڑی نہیں جا سکتی،

کپتان: ہاں اس میں کیا شک ہے؟

امین: کیا تم اپنی عزت کی قسم کھا سکتے ہو کہ ہمیں دھوکا دے کر نہیں بھاگو گے، تاکہ ہم پہرہ داروں سے بے نیاز ہو جائیں۔

کپتان: دونوں ہاتھ اٹھا کر، میں اپنی عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم جہاں لے جاؤ گے میں بے چون و چرا چلا جاؤں گا، اور تمھارے احکام کی پابندی کروں گا۔

امین: بس کافی ہے،

جیل کا دروازہ کھلا، اور کپتان دونوں امناء کی حفاظت میں گاڑی میں جا بیٹھا، گاڑی چلی اور اس زور سے چلی کہ جیسے زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہوں۔ کچھ دور نکلنے کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا، [illegible] بھاگتا ہوا ایک میوہ فروش کی دوکان سے ٹکرا گیا، دوکان دار چیخنے اور چلانے لگا، ایک ہنگامہ ہو گیا اور بہت سے لوگ اکٹھا ہو گئے۔

اس ہنگامہ میں لوگوں نے دیکھا کہ کوچبان کے پاس جو شخص بیٹھا تھا، اس نے اتر کر [illegible] لوگوں [illegible] پتہ [illegible]۔ تین اشخاص سرکاری وردی میں اترے اور جلد [illegible]

گلیوں میں ہو لئے، رات کا وقت تھا جدھر جس کا منہ اٹھ گیا چھپتا چھپاتا نکل گیا، ایک شاہ پسند کے گھر میں کاونٹ دی ترو ملان اور کپتان نے پناہ لی، اور صبح علی الصباح کسانوں کے لباس میں غیر معروف راستہ سے شہر روان کی راہ لی، اور وہاں سے فلیپو کی معیت میں جو دوسرے راستے سے وہاں پہونچ گیا تھا، انگلستان کو روانہ ہو گیا، کاونٹ دی ترو ملان کا بان میں اپنے گھر واپس آ گیا، جہاں اس کی بیوی شدید بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی، بقیہ دو شریک کاربورگ، اور بو اجیرا دوسری سازشوں کے لئے پیرس ہی میں رہ گئے، یہ دونوں روزآنہ اخباروں میں سرسڈنی کی فراری، یا گرفتاری کی خبر تلاش کرتے رہے، تین چار روز تک جب اس قسم کی کوئی خبر شایع نہ ہوئی، تو انھیں بڑی حیرت ہوئی، اور مامن سے نکل کر کچھ پتہ چلانے لگے: انھوں نے تامبل کے پاس جا کر دیکھا وہاں کوئی نئی بات معلوم نہ ہوئی تھی، روزآنہ کی سی معمولی صورت حال تھی، اس کے بعد انھوں نے اس گاڑی کی خبر لگائی تو معلوم ہوا کہ لوگوں نے کوچبان کو پولیس میں پہونچا دیا تھا، مگر پولیس نے یہ عذر قبول کر لیا، کہ گھوڑے اس کے قابو سے باہر ہو گئے تھے، دکان دار کو کچھ تاوان دے دلا کر معاملہ ختم کر دیا۔

گاڑی والے سے جب سواریوں کے متعلق دریافت کیا گیا تو معلوم ہوا راستہ سے کرایہ لیا تھا، ان کے متعلق گاڑی والا کچھ نہیں جانتا، باعزت لوگ تھے: پولیس کے جھمیلوں سے بچنے کے لئے اتر کر اپنے گھر چلے گئے: پولیس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور گاڑی کا معاملہ رفت و گذشت کر دیا گیا۔

سب سے عجیب بات تو یہ تھی کہ حکام بالا کو بھی مدتوں تک کپتان سر سڈنی اسمتھ کی فراری کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملی، اور ملتی بھی تو کیسے جیل خانہ سے قیدی قانونی احکام کے تحت باہر ہوا، مہتمم کو اس کی رپورٹ دینے کی کوئی وجہ نہ تھی، اور نہ حکام بالا، یا کوتوالی کو کسی اور ذریعہ سے اطلاع ملی، جو تلاش و تحقیق شروع ہوتی، نہ جانے یہ معاملہ کب تک چھپا رہتا، لیکن وزیر پولیس نے ڈاکٹر انچارج "تامبل" کو کھانے پر بلایا، اور باتوں باتوں میں اس سے کپتان سڈنی کا حال پوچھنے لگا۔ ڈاکٹر نے جواب میں کہا جب سے کپتان کو نوٹبلو میں منتقل کر دیا گیا ہے اسے کچھ نہیں معلوم۔ اب وزیر کے کان کھڑے ہوئے اور ساحلوں پر ہر جگہ تلاش شروع ہوئی لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، جب کہ قیدی کئی دن پہلے انگلستان پہونچ چکا تھا۔

کاونٹ دی ترو ملان نو سال تک فرضی نام سے وہیں لوئیس میں زندگی بسر کرتا رہا، جب جنرل بونا پارٹ نے امپرر نپولین کے نام سے اپنی شہنشاہیت کا اعلان کیا اور نام نہاد سیاسی مجرموں کے لئے معافی کا حکم جاری ہوا تو کاونٹ دی ترو ملان بھی پیرس میں آ کر رہنے لگا، ایک دن پولیس نے اس کو کسی قضیہ میں پھانس کر تو ال کے پاس پیش کیا، وہاں کاونٹ نے اپنی شخصیت واضح کر دی، وزیر پولیس نے طلب کیا، یہ قصہ نپولین تک جا پہونچا، نپولین نے بااکرام سارے داستان سنی۔ اور اپنے یہاں فوج میں جگہ دیدی۔

واٹرلو کے تاریخی میدان میں جو آخری شخص ہمنوا کے مقابلے سینہ سپر تھا وہ کاونٹ دی ترو ملان تھا۔

پکا شاہ پسند، اور زبردست سازشی" (ترجمہ)

حفیظ جیلانی اعدادی

روحی

"تو بہ۔ تمھیں کیسے یقین دلاؤں" وہ کہہ اٹھتا۔ "تم نے مانا میری ایک لڑکی سے ملاقات ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ اور جو کچھ لکھتا ہوں وہ اپنی ہی داستان ہوتی ہے"؟

وہ افسانہ نویس تھا۔ اس کے افسانے کافی مقبولیت حاصل کرتے جا رہے تھے۔ اس کی خانگی زندگی بڑی الجھی ہوئی تھی۔ خستہ خاندان کا فرد، تعلیم حاصل کرنے کا شوق، اعلیٰ تعلیم کے اخراجات نے اسے مقروض بنا دیا تھا۔ حصولِ معاش کی خاطر اسے سخت محنتیں اٹھانی پڑتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک خوش اخلاق اور ہنس مکھ نوجوان تھا۔ مطالعہ کا دلدادہ، ادب کا شایق وہ فطرتاً افسانہ نویس پیدا ہوا تھا اور اس کے اس ذوق پر کوئی چیز اثر انداز نہ ہو سکی۔

اس کے پڑوس کے خالی مکان میں ایک خاندان فروکش ہوا۔ متمول لوگ تھے۔ مگر ایسے نہیں کہ غریبوں سے نفرت کرتے ہوں، بحیثیت افسانہ نویس یہ متعارف ہوا۔ آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا اور چند دنوں میں خاصی بے تکلفی پیدا ہو گئی۔ یوں روحی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ روحی کوئی بارہ تیرہ سال کی ہوگی۔ طبیعت میں الھڑپن، گفتگو میں معصومیت، بھولی بھالی سی۔

اب اس کے افسانوں کا ایک نیا باب کھل گیا۔ کبھی "سلمہ سے خطاب" شایع ہو رہا ہے تو کبھی دوست کے روپ میں حالات سنائے جا رہے ہیں۔

" سلمہ اب ساری دنیا سوتی ہوتی ہے۔ فضا پر چاند حکومت کرتا ہے۔ زمین اور آسمان، درخت اور پہاڑ، جنگل اور میدان جھونپڑے اور محل نور کے دریا میں غوطہ زن ہوتے ہیں۔ ندی اور آبشار پگھلی ہوئی چاندی کے معلوم ہوتے ہیں۔ جب درخت ان مناظر کا لطف اٹھاتے اور وجد کرنے لگتے ہیں۔ اس وقت میں تمھاری یاد میں آنسو بہایا کرتا ہوں۔

لیکن سلمہ ـــــ تمھارے دل کی وسعتوں میں بھی میرے لئے کوئی جگہ ہے؟ ـــــ"

ہر دیکھنے والا جو حالات سے واقف ہو آسانی سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ حضرت کی اپنی ہی سرگذشت ہے مگر اس خدا کے بندے نے ہمیشہ انکار ہی کیا۔

" لیکن تمھارا نیا افسانہ میں نے دیکھا۔ حالات میں اتنی مطابقت، چھپائے سے باتیں چھپ نہیں سکتیں۔ تم چاہے اقرار کرو یا انکار تمھیں روحی سے محبت ضرور ہو گئی ہے ـــــ" میں اس سے بحث کرتا۔

وہ جواب دیتا "بھئی افسانے کے لئے پلاٹ چاہئے۔ کہیں سے کوئی کام کی بات ہاتھ لگی اور ہم نے اس پر ایک افسانہ لکھ ڈالا۔ اب اگر آپ ہر افسانہ کو لکھنے والے کی آپ بیتی اور شعر کو شاعر کے حقیقی واقعات کی تصویر سمجھنے لگیں تو سخت مصیبت آن پڑے گی۔

لیکن مجھے اس سے کبھی تشفی نہ ہو سکی۔ چہرہ کی پژمردگی، طبیعت کی افسردگی، ہر وقت کا غور و فکر، آخر یہ سب کیا معنی

رکھتے تھے۔ صبح صبح اس کی آنکھوں کا سرخ رہنا آخر کس چیز کو ظاہر کرتا تھا۔ کیا اسے روحی سے واقعی محبت نہیں ہو گئی تھی؟ کیا وہ بناوٹی قہقہوں کے پردے میں اپنے جذبات کو چھپانے کی کوشش میں کئی بار ناکام نہ ہو چکا تھا؟ کیا اس کی سرخ آنکھیں نہیں بتاتی تھیں کہ اس نے رات تارے گن گن کر گذاری ہے؟

افسانے پر افسانے شایع ہو رہے تھے۔ بار بار وہ سلمہ سے خطاب کیے جا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ تمام اس کے وہ جذبات ہیں جنھیں وہ افسانوں اور خطاب کی شکل میں روحی تک پہنچا دینا چاہتا تھا۔

مگر اس کا انکار برابر جاری تھا۔ اور میں جانتا ہوں کہ کبھی روحی کے سامنے معصومانہ مذاق اور سادی سیدھی باتوں کے سوا اس نے اپنے جذبات کو ذرا بھی ظاہر نہ ہونے دیا۔

روحی جوان ہو گئی اور اس کی نظروں سے پوشیدہ۔ اب وہ پردہ کرنے لگی تھی۔ پھر سلمہ سے ایک خطاب شایع ہوا "آہ سلمہ دنیا مجھے تم سے جدا کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ تم میری نظروں سے دور کر دی گئیں۔ لیکن میرے دل سے تمھیں کوئی دور نہ کر سکے گا"

روحی کی شادی مقرر ہو گئی۔ ایک نہایت معزز اور دولت مند خاندان میں وہ بیاہی جا رہی تھی۔ اور ادہر اس کی حالت ابتر ہو گئی۔ پھر سلمہ سے اس نے اقرار کیا کہ "سلمہ شمع کی طرح گھلتا بھی رہوں گا اور اپنی زبان کو خاموش بھی رکھوں گا۔ اس موتی کی طرح جو صدف کے سینے میں بند رہ کر سمندر کی تاریک گہرائیوں میں دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رہتا ہے میری محبت بھی میرے دل میں پوشیدہ رہے گی۔ اور دنیا کبھی اس کا حال نہ جان سکے گی۔"

اس کے چہرے کی پژمردگی میں اضافہ ہو گیا اس کی خاموشی ہمیشہ سے زیادہ ہو گئی صبح ایسے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے رات اس نے نہ صرف تارے گن گن کر بلکہ رو رو کر گذاری ہے۔ آنکھیں سوجنے لگی تھیں۔ روز بروز اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی مجھ سے رہا نہ گیا۔

"آخر تمھیں یہ ہو کیا گیا ہے۔ میں جانتا ہوں تمھیں روحی سے محبت ہے" میں نے اس سے کہا "لیکن تم اسے چھپا رہے ہو۔ محبت کرنا جرم نہیں، گناہ نہیں، انسان ہو، انسان ہی محبت کرتے ہیں۔ مگر تم اسے چھپا کیوں رہے ہو۔ کہو تو میں تمھاری طرف سے کوشش کرتا ہوں۔ یہ ناممکن نہیں ہے کہ روحی تم سے بیاہ دی جائے۔ اب بھی وقت نہیں گیا ہے"

"دیوانے ہوئے ہو" وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگا "کیسی محبت، کہاں کا عشق، آخر تم کو یہ کیا خبط سما گیا ہے۔ تمھیں یہ یقین کیسے ہو گیا ہے کہ میں روحی پر عاشق ہو چکا ہوں۔ میں غریب بھلا اس کے قابل کہاں"

میں حیران کہ اللہ یہ معمہ کیا ہے۔ مجھے یقین کہ یہ شخص روحی کو چاہتا ہے مگر اسے اس سے انکار۔

دن گذرتے گئے۔ روحی کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی اور ادہر اس کی افسردگی میں اور اضافہ ہوتا گیا۔ آخر شادی کی تاریخ آ گئی۔ وہ بھی انتظامات میں مصروف رہا۔ بارات دلہن کو لے کر رخصت ہوئی۔ اس کے بعد دو دن تک کسی نے اس کو نہ دیکھا۔ تیسرے دن جب میں اس کے مکان پر پہنچا تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں [illegible] رہی تھی۔ چہرہ سوکھا ہوا، آنکھیں اندر دھنسی ہوئی [illegible] پلکیں [illegible] جھلسی ہوئی [illegible] حالت [illegible]

لاکر سامنے کھڑا کر دیا گیا ہو۔

اب بھی وہ افسانے لکھتا ہے۔ درد و غم میں ڈوبے ہوئے۔ ہجر و فراق کی شکایتیں بیان کرتا ہے۔ سلمہ سے چھوٹے جانے پر آنسو بہاتا ہے۔ درد انگیز الفاظ میں اپنی المناک زندگی کا نقشہ کھینچتا ہے۔ "سلمہ ہم ایک دوسرے سے جدا کر دئے گئے۔ اب ہم دور ہو چکے ہیں۔ اتنی دور کہ شاید اب قیامت تک ایک دوسرے سے نہ مل سکیں۔ تم شاید مجھے بھول جاؤ۔ لیکن میں تمھیں کبھی نہ بھول سکوں گا۔ ایک آگ ہے کہ رہ رہ کر سینے میں تیز ہو رہی ہے۔ شعلے بھڑک رہے ہیں۔ یہ میرے دل و دماغ کو پھونک ڈالیں گے۔ خرمن عقل و ہوش کو جلا کر خاک کر ڈالیں گے۔ بلکہ شاید میری زندگی ہی بھسم ہو جائے گی۔"

نہ اس میں وہ اگلی مسکراہٹ ہے نہ ظرافت۔ نہ دوستوں سے ملتا ہے نہ باہر نکلنا۔ اب وہ ہے اور انتہائی فکرمند رہنا اور آنسو بہانا۔ بیٹھے بیٹھے سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ سوچتے سوچتے آنکھیں غمگین ہو جاتی ہیں۔ وہ سراپا درد و الم بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی زندگی پر غم کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ لیکن اب بھی جب کبھی میں اس سے کہتا ہوں کہ تمھیں روحی سے محبت ہے تو وہ مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہہ اٹھتا ہے "نہیں۔ تم غلطی پر ہو!"

محمد ولاور رضا مہدوی

ایک اخلاقی غزل

علامہ اقبال ؎ تجھے کیا فکر ہے اے گل دلِ صد چاک بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک کو پہلے رفو کر لے

مقیدِ شوقِ مے کو کیوں یہ انداز سبو کر لے
کسی ترکیب سے ساقی کو ہی اپنا نہ تو کر لے؟

یہ دنیا کیا ہے؟ اک مجموعہ تلخی و ناکامی
یہ بہتر ہے کہ تو صبر و رضا کی اپنی خو کر لے

اگر دنیا میں تجھ کو ایک کا ہو کر ہی رہنا ہے
تو پھر قطع خیال ارتباط ماو تو کر لے

مزا آئے اگر دامن جھٹک کر گردِ کثرت سے
دلِ آزاد کو پابندِ ذاتِ وحدہٗ کر لے

وہ فخر خدمتِ ملکی و قومی ہے مگر اپنا
مقدم چاک دامانِ مسلمانی رفو کر لے

ہند تقلید اہلِ غرب کب ہے آدمیت کی
نہ یہ زیبا ہے سب کچھ جو کہ وہ کرتے ہیں تو کر لے

[illegible] عند اللہ اتقیٰ ہے
اگرچہ ہے تو پیدا تو بھی ایسی آبرو کر لے

[illegible] تجھے اک روز جانا ہے
ابھی اچھی طرح سے خاک بیزی کو بہ کو کر لے

کلیم اللہ پہونچے طور تک شوق تکلم میں
وہ دل میں جلوہ فرما ہے۔ جو چاہے گفتگو کر لے

انیسہ خاتون ہارون بیگم شیروانی

[illegible] عند اللہ اتقکم قرآن یعنی تم میں سے زیادہ قابل عزت وہ ہے جو زیادہ متقی ہے ۱۲

شاعر

شاعروں کے متعلق کچھ کہنا، بڑے دل گردے کا کام ہے۔ تعریف کی تو خیر "قصیدوں" کا ایک پلندا ہماری میز پر جمع ہو جائے گا اور ہم ان کو پڑھیں گے یا نہیں پڑھیں گے، یہ ہماری مرضی پر موقوف ہے۔ "تشبیب اور گریز" کی یہ دنیا ہمارا دماغ خراب کرنے کے لیے کافی ہوگی اور اگر مذمت کی تو ہماری جانب ہجو کے اتنے تیر پھینکے جائیں گے کہ ہمارا سینہ چھلنی ہو جائے گا اور انجام کار، شاعروں کی شان میں ہمیں ایک فی البدیہہ قصیدہ سنانا ہوگا۔ کسی کی برائی کو ظاہر کرنا ہماری فطرت کے خلاف ہے اس لئے صرف اچھائی سے فائدہ اٹھا کر ہم شاعروں کے متعلق کچھ کہیں گے۔ اب شاعروں کا کام ہے کہ وہ اسے سنیں یا نہ سنیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس وقت کئی شاعر "فکر سخن" میں اپنی پیشانیوں سے پسینہ پونچھ رہے ہوں گے تاکہ مشاعرہ میں ان میں سے ہر ایک کی غزل، دوسرے کی غزل سے بازی لے جائے کئی ایسے جو دوسروں کے اصرار سے پہلے ہی اپنی عنایت سے جھوم جھوم کر اپنا کلام سنا رہے ہوں گے۔ کئی ایسے جو مشاعرہ جلانے کی تیاری میں ریہرسل کر رہے ہوں گے۔ کئی ایسے جو اپنی تازہ غزل کے لئے قافیے جمع کر رہے ہوں گے اور کئی ایسے جو کسی چائے خانے میں چائے کی پیالی منہ سے لگائے ہوئے پان کی طرف للچائی نظروں سے دیکھ رہے ہوں گے۔ تو غرض یہ ہے کہ شاعروں کی اس معروف زندگی میں مخل ہونا بالکل ویسا ہی ہے جیسے شہد کی مکھیوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا۔ دوسروں کی مصروف زندگیوں میں مخل ہوتا ہے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس وقت دنیا میں شاعروں کی آبادی کا کیا تناسب ہے! افسوس ہے کہ مردم شماری کی کسی رپورٹ میں اس قسم کے اعداد و شمار نہ مل سکے۔ آئندہ سے مردم شماری کے تختہ میں ایک خانہ اس قوم کے لئے بھی ہونا چاہیئے۔ یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ کون شاعر ہے! صرف یہ دریافت کرنا ہے کہ کون شاعر نہیں ہے۔ بہرحال باضابطہ تحقیق کی عدم موجودگی میں صحیح اندازہ یہ ہے کہ دنیا کے بہت کم بدنصیب انسان ایسے ہوں گے جو شاعر نہیں ہیں۔ جدائی کی راتوں میں آسمان پر بکھرے ہوئے تاروں کو گننے والے ان تاروں سے کسی طرح کم نہیں ہو سکتے جب شاعروں کی آبادی اتنی کثیر ہے تو ہونا یہ چاہیئے کہ ہر شاعر پر ٹیکس لگایا جائے تاکہ "اشاعت شاعری" کا مالی کام چل سکے۔ مگر ہمیں اندیشہ ہے کہ متواتر جو یہ نظمیں ٹیکس کی صورت میں ملیں گی وہ بھی واپس لینی ہوں گی اور ایک ایسا فنڈ قائم کرنا ہوگا جس کے ذریعے سے شاعروں کی امداد ہو سکے۔ یوں تو شاعر سمرقند و بخارا بھی بخش دیتا ہے لیکن اکثر وہ "سخن در این است" کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اس لئے ٹیکس لگانے کے بارے میں ہم اپنے الفاظ واپس لیتے ہیں۔ البتہ امدادی فنڈ کے متعلق ہمیں کئی کروڑ شاعروں کی نمائندگی کا فخر حاصل ہے۔

لیکن یہاں ہماری توجہ صرف ان شاعروں کی طرف ہے جن کا معشوق خدا جانے کیا حلیہ رکھتا ہے لیکن ان کے شعروں سے تو بڑا کریہہ اور ہیبت ناک معلوم ہوتا ہے۔ فرض کیجیے ایک آدمی ہے جس کے بال سنبل کی طرح، پیشانی چوڑی، ابرو خنجروں کی مانند، پلکوں کی جگہ تیروں کا پرا، آنکھیں نرگس، دہانہ تنگ، اس کے نیچے چاہ زنخداں۔ کمر پتلی اور بعض وقت بالکل نہیں تو آپ ہی فرمائیے کہ اس کا تصور کیا اس قابل ہے کہ ہم اس میں کھو جائیں۔ یہی تصویر تعبیر اصل میں خواب پریشاں

بن جاتی ہے جس کے خون سے ہمارے شاعر راتوں کو جاگ
جاگ کر اختر شماری کرتے ہیں۔ بہر حال عشق کا بھوت معشوق کو
انسانی تصور سے بلند کر دیتا ہے اور اس طرح وہ اس دنیا کا
باشندہ نہیں رہتا۔ شاید معشوق کے نزدیک بھی عاشق کا
یہی تصور ہوتا ہو چنانچہ کسی شاعر نے کہا ہے کہ

با ہم شب وصال غلط فہمیاں ہوئیں
مجھ کو پری کا دھوکا ہوا ان کو بھوت کا

شاعر اس تصوری معشوق کے عشق میں کبھی صحرا کے
بگولوں سے اٹکھیلیاں کرتا ہے۔ کبھی کپڑے پھاڑ کر دیوانہ
ہو جاتا ہے اور کبھی زخموں کے لئے نمک داں خریدتا پھرتا
ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ وہ قیس عامری ہے۔ جو اکثر نا لیلیٰ کے
نعرے لگاتا ہے، اکثر فرہاد جانباز کی طرح جوئے شیر کی جستجو میں
کوہ کنی کرتا ہے اور کبھی کبھی طور کی سیر بھی کر لیتا ہے۔

اس کی دنیا ہمیشہ نالہ و فریاد کے شراروں میں
جلتی رہتی ہے جس پر آہوں کا دھواں منڈلاتا پھرتا ہے،
وہ کبھی بلبل بنتا ہے اور پنجرے میں قید ہو جاتا ہے یا اپنے
آشیانہ کے لئے ایسے تنکے چنتا ہے جن پر کسی نہ کسی طرح بجلیاں
گریں اور کبھی پروانہ بنتا ہے اور شمع کے گرد گھوم گھوم کر جل
جاتا ہے۔ اس کے باغ میں ہمیشہ خزاں رہتی ہے اور کبھی
نصیب دشمناں بہار آتی ہے تو وہ گریباں چاک کر کے
صحرا کی طرف نکل جاتا ہے۔

گھٹائیں چھاتی ہیں تو شراب نہیں ملتی اور چشم ساقی
یاد کر کے بے پیے سرشار رہتا ہے۔ اکثر اتنی پی جاتا ہے کہ نشے سے
غرض نشاط نہیں رہتی۔ شراب پینے کے کئی طریقے ہیں۔ بعض
وقت خم کے خم لنڈھاتا چلا جاتا ہے۔ بعض وقت چلوؤں میں چھٹ
ہی کو غنیمت سمجھتا ہے۔ ہمیشہ شراب کی بھٹی یا میخانے کی دہلیز
بستر لگا رکھتا ہے۔ نہ کام نہ کاج۔ توبہ کرتا ہے لیکن بادل کا
رنگ دیکھ کر طبیعت بدل جاتی ہے اور رحمت کو باتوں میں
بہلا کر پھر پی جاتا ہے۔ اس کی توبہ جام شکن رہتی اور جام توبہ
شکن اس طرح اس کے سامنے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا ڈھیر
لگا رہتا۔

اس کا معشوق کیا ہے؟ اس کے لئے طبیعت پر زور ڈالنا
پڑے گا اور طبیعت پر زور ڈالنے کے ہم قائل نہیں۔ آمد اور
آورد میں بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔ آمد تو وہی کہ بس بولتے
چلے جاؤ۔ اس لئے ہم اپنی "آمد" کو طبیعت پر زور ڈال کر
برباد نہیں کریں گے البتہ صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ اس کے
کپڑے زنانی ہوتے ہیں لیکن وہ ایک چلتا پھرتا فتنہ ہوتا
ہے۔ آتا ہے، جاتا ہے، ستاتا ہے، اس کے پازیب کی
جھنکار، اس کے بندوں کی چمک، اس کے ڈوپٹہ کا رنگ۔
بہر حال کسی نے دیکھ کر کہہ دیا کہ

آسماں رنگ بدلتا نظر آتا ہے مجھے

یہی نہیں بلکہ یہ معشوق جو ڈوپٹہ پہن کر کیک دری کی طرح
مشق خرام کرتا ہے۔ جس کی کلائی پھول اچھالنے سے درد
دینے لگتی ہے، جس کے تلوؤں میں گلاب کی پتی سے خراش
ہونے لگتی ہے۔ جس کے بدن پر نسیم سحری کا ہلکا جھونکا بھی
بوجھ معلوم ہوتا ہے۔ ہمیشہ تلوار اور خنجر لئے ہوئے اپنے
عاشق کو قتل کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اور جب قتل کرتا
ہے تو نعش گھر کے سامنے لٹکاتا ہے۔ اکثر وہ کند چھری سے
بھی ذبح کرتا ہے اور مقتول کو مقتل میں تڑپتا ہوا چھوڑ کر
چلا جاتا ہے۔ خدانخواستہ کبھی وہ یہ ارادہ نہیں رکھتا تو

شاعر پہلے تو اس کے سامنے خنجر رکھ دیتا ہے۔ پھر کلیجہ پھر دل اور پھر سر۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ

تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

یہ تو اپنے دوست سے شاعر کے تعلق کا حال ہے، اب اس کے دشمنوں کی کیفیت سنیے۔ دنیا کا ذرہ ذرہ اس کا دشمن ہے، لیکن پانچ دشمن بہت اہم ہیں آسمان تقدیر، ناصح، زاہد اور رقیب۔ آسمان اور تقدیر تو خیر پیدائشی دشمن ہیں۔ لیکن محبت کی ابتدا کے ساتھ ہی رقیب ایک طرف سے ستاتا ہے اور ناصح دوسری طرف سے۔ رقیب معشوق سے مل جاتا ہے اور معشوق بھی رقیب کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ ناصح عشق ہی کی ممانعت کرتا ہے۔ لیکن شاعر ان دونوں سے نہیں ڈرتا۔ وہ رقیب کو خوب گالیاں دیتا ہے اور ناصح سے کہتا ہے "میاں جاؤ، تم بھی کسی کو دل دو تمھیں کیا معلوم کہ محبت میں کس قدر لذت ہے، مے نوشی کے وقت زاہد اس کی راہ میں حائل ہوتا ہے اور شاعر "ارے کم بخت تو نے پی ہی نہیں" کہتے ہوئے اس کے سر پر ایک تڑاق سی لگاتا ہے۔ اور پھر ہاتھ ملتا ہے کہ اچھی پڑی نہیں۔

شاعر کا جس طرح گھر نہیں ہوتا اور وہ خانماں برباد صحرا نوردی کرتے پھرتا ہے اسی طرح اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ وہ "کفر و ایمان" سے آزاد ہوتا ہے۔ دل کو کعبہ سمجھتا ہے۔ کوچہ یار میں سجدے کرتا ہے۔ ابروئے یار کو طاقِ حرم سے تشبیہ دیتا ہے۔

غرض اس کی ساری زندگی یوں ہی گذرتی ہے اور زیادہ تر ہجر و فراق میں۔ کبھی کبھی نظارۂ دوست ہوتا ہے تو آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں اور اس کا دوست ایک طرف شرماتا ہے۔ جبین پر شکن اور ابرو میں بل ڈال کر منہ پھیر لیتا ہے اور نظر نہیں ملاتا۔ اور دوسری طرف شاعر خود اتنا تڑپتا ہے کہ کوچۂ یار کی زمین بھی ہموار ہو جاتی ہے۔ وہ پریشانیٔ خاطر کا مواد اپنے ذہن میں لاتا ہے لیکن کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ اکثر عمر بھر وصال نہیں ہوتا۔ اور وہ یوں ہی آلام و مصائب جھیلتا ہوا آنسوؤں کی ندیاں بہاتا ہوا تصور کو اپنا چارہ ساز بنا کر نزع کی حالت تک پہنچ جاتا ہے۔ اکثر نزع کے وقت اس کا معشوق آتا ہے۔ بس معشوق کی آمد کے ساتھ ہی یا تو پھر سانس کا ڈورا چلنے لگتا ہے یا وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے اور اکثر وہ جب مر چکا ہوتا ہے تو اس کا معشوق آ کے سرِ بالیں کہتا ہے کہ

مر گیا، اچھا ہوا، بدبخت تھا، دیوانہ تھا

آپ نے اکثر شاعروں کو مشاعرہ میں زندہ بیٹھے ہوئے یہ کہتے سنا ہوگا کہ وہ مر چکے ہیں۔ ان کی لحد کو ان کا معشوق کل ہی ٹھکرا تا گیا۔ ان کے مزار پر کی شمع بجھا دی گئی۔ قبر تک بھی ان کے شانے ہلائے جاتے ہیں۔ غالباً یہ شاعر، شاعر نہیں ہوتے بلکہ شاعروں کے جنازے ہوتے ہیں جو مشاعرہ کی خبر سن کر قبر سے نکل آتے ہیں۔ جنت اور دوزخ کے سارے چشم دید حالات سناتے ہیں۔ حوروں سے ان کی ملاقات ہوتی ہے۔ کوثر و تسنیم سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں اور فرشتوں کو ایسے دندان شکن جواب دیتے ہیں کہ بے چارے سٹ پٹا کر رہ جاتے ہیں۔

بہرحال شاعر جب مر جاتا ہے تو اس کی وصیت رہتی ہے کہ "عاشق کا جنازہ ہے بڑی دھوم سے نکلے" ایسے موقع پر کبھی کبھی تو قاتل شاعر معشوق جنازے کو کاندھا دینے آ جاتا ہے۔

اگر رسوائی کے ڈر سے نہیں آتا تو راتوں کو اٹھ عاشق کی قبر پر جاکر ماتم کرتا ہے اور اس کی یاد میں بال بکھرا کر غم کی صورت تو ضرور بنا لیتا ہے۔

شاعر کی زندگی بھی کتنی شاعرانہ ہے اور موت بھی کتنی شعر پرور۔ اب اس کو یہیں چھوڑئیے اور اس کے تخلص پر غور کیجئے۔ تخلص کا انتخاب شعروں کے انتخاب سے زیادہ اہم ہے۔ اچھے شاعر کے لئے اچھا تخلص چاہیئے۔ مثلاً محبوب، بہتر شاعر کے لئے تخلص کے بعد بھی کچھ ہونا چاہیئے۔ جیسے محبوب عقبائی اور بہترین شاعر کے لئے نام کے پہلے بھی کچھ ہونا چاہیئے اور بعد میں بھی جیسے ابوالانفعال عقبائی اب کہیں الحمدللہ والمنۃ کہ دریں ایام فرجام ایک دیوان الموسوم بہ "گلزار محبوبی" مرتب ہو سکتا ہے اور اما بعد ہر ردیف کی سنگلاخ زمین پر دو غزلے، سہ غزلے سنائے جا سکتے ہیں۔ اگر دیوان اور کلام کی ضرورت نہیں تو صرف تخلص ہی شہرت کے لئے کافی ہے۔

جب تخلص کی مشکل حل ہوگئی اور کوئی مشکل اور طویل تخلص مل گیا تو سوچنا چاہیئے کہ کس طرح شاعری کی جاتی ہے۔ گنجینۂ قوافی اور آئینِ شاعری کی دو تین کتابیں جو بادامی رنگ کے کھردرے کاغذ پر چھپی ہوئی مل جائیں گی، خرید لینا چاہیئے اور ان کے بھروسہ پر کچھ دنوں کے بعد بہ بانگ دہل کہہ دینا چاہیئے کہ

شاعری کھیل نہیں ہے جو کہ بچے کھیلے
ہم نے پینسٹھ برس اس فن میں ہیں پاپڑ بیلے

لیکن یہ شاعری تو کتابی ہوئی۔ اکتسابی شاعر کا مقابلہ کیا کر سکے گی۔ اس کے لئے کسی استاد کے دروازے کو کھٹکھٹانے کی ضرورت ہے۔ استاد کے پاس جانے سے پہلے چند باتیں ضرور سیکھ لینا چاہیئے۔ پاؤں دبانا، حقہ بھرنا، دوزانو ہو کر ادب سے بیٹھنا، بٹوے میں پان کھانا اور اپنی غزل استاد کے گھر میں پھینک کر استاد کی دی ہوئی غزل کو مشاعرے میں اپنے نام سے پڑھنا۔ یہ آگیا تو بس نام کے آگے اور ایک سند کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ اب پورا تخلص سنئے اور سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ ابوالانفعال محبوب عقبائی تلمیذ ملک الشعرا، پہلوان کلام زبدۃ الناظمین ابوالادب والشاعری حضرت عاشق وحدانی۔

دیکھا آپ نے شاعر بننا کتنا مشکل کام ہے۔ جب فنِ شاعری سے واقف ہو گئے۔ بے کاری بھی ہے اور استاد بھی مل گیا تو مشاعرہ میں دوسروں کے ہر شعر پر واہ واہ اے سبحان اللہ، کیا برابر کا مصرع ہے، زبان پائی ہے اور اس قسم کی چند باتیں ضرور کہنی چاہئیں تاکہ جب اپنی باری آئے تو اس کے صلہ میں دوسرے بھی اسی قسم کی باتیں اپنے لئے کریں اور جب مشاعرہ سے اٹھیں تو راستہ بھر مشاعرہ میں شریک ہونے والے تمام شاعروں پر اعتراضات کرتے ہوئے گھر پہنچ جانا چاہیئے۔ اور چائے کی وجہ سے نیند نہ آئے تو بس معشوق کو یاد کر کے تارے گننا چاہیئے یا فکر سخن کرنی چاہیئے تاکہ صبح ہو جائے اور لوگوں کو اپنا کلام سنا کر داد حاصل کرنے کا موقع ملے۔

میکش

بارش سے پہلے

سمندر پر ہوائیں رقص میں ہیں — ہمالہ پر گھٹائیں رقص میں ہیں
زبانوں پر دعائیں رقص میں ہیں — حسینوں پر ادائیں رقص میں ہیں

شباب انگیز جھونکے آرہے ہیں
شراب آمیز جھونکے آرہے ہیں

کوئی مہندی لگانے پر تلی ہے — کوئی چندری سکھانے پر تلی ہے
کوئی جھولا جھلانے پر تلی ہے — کوئی ہنسنے ہنسانے پر تلی ہے

سروں پر ابر چھاتا جا رہا ہے
مگر نزدیک آتا جا رہا ہے

ترنم گنگ میں ڈوبا ہوا ہے — رباب و چنگ میں ڈوبا ہوا ہے
تبسم رنگ میں ڈوبا ہوا ہے — دہان تنگ میں ڈوبا ہوا ہے

"رخ گلگوں پہ گیسو کی سیاہی"
شفق کی بادلوں میں بے پناہی

صراحی ساقیٔ منظر لئے ہے — "شراب" انگور کی دختر لئے ہے
شباب میکدہ ساغر لئے ہے — سکوں بخشِ دلِ مضطر لئے ہے

جو خست شیوہ ساقی نہیں ہے
صراحی میں مئے "باقی" نہیں ہے

جگر کی ٹیس دونی ہو رہی ہے — محبت میں ترقی ہو رہی ہے
ترقی سے تسلی ہو رہی ہے — نثارِ شاد بجلی ہو رہی ہے

وہ "بجلی" کون۔ پھولوں کی جوانی
"بھری برسات" جس کی مہربانی

شاد عارفی

(رام پور)

قدم، قلم، سخن، رقم کا شکریہ

فریدہ ۔ مری پیاری بچی میں تمھاری شکر گذار ہوں تم نے مری بڑی خدمت کی ۔
فوزیہ ۔ کس لئے شکریہ کس بات پر شکریہ میں نے کیا خدمت کی جو آپ شکریہ ادا کر رہی ہیں۔ آپ بزرگ ہیں اماں جان آپ کی خدمت کرنی مری عزت ہے ۔ شکریہ ادا کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔
فریدہ ۔ مری بچی تم نے مری بیماری میں مری بہت خدمت کی میں تمھاری وجہ سے زندہ ہوں ۔
بچی ۔ شکر ہے خدا کا کہ اس نے ایسی پیاری لائق بہو مجھے دی ۔ لڑکی سے زیادہ تم نے میری خدمت کی کیا کسی کی بہو ایسی دن رات خدمت کی ہوگی ؛
فوزیہ ۔ اماں جان مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔ میرا فرض تھا میں نے ادا کیا دراصل آپ کا شکریہ مجھے ادا کرنا چاہیے کہ آپ نے اپنے لڑکے کو ایسی اچھی تعلیم و تربیت دی کہ ان کی صحبت میں مرے خیالات درست ہوئے ورنہ میرا خیال پہلے یہ تھا کہ ساس نند بہت برے ہوتے ہیں ان کے نام سے مجھے نفرت تھی ۔ چونکہ مرے شوہر خود آپ کی خدمت کرتے ہیں آپ کی عزت کرتے ہیں آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں ۔ مجھے ہمیشہ یہ کہا کرتے ہیں مری اماں کو اگر تم نے خوش رکھا تو گویا مجھے خوش کیا ۔ مری اماں کی اگر تم نے خدمت کی تو گویا مری خدمت کی بعض وقت آپ کے لڑکے نے مجھے یہ بھی کہا کہ تم مری خدمت نہ کرو بلکہ مری اماں کی خدمت کرو ان کو اس کا خیال نہ آنے دو کہ وہ بیوہ ہیں ان کا دل اس وقت چور چور ہے ان کو خوش کرنا گویا خدا کو خوش کرنا ہے ۔ اماں جان لڑکا اگر اچھا رہا تو بہو بھی خود بخود اچھی ہو جاتی ہے لڑکا جب ہی اچھا ہو سکتا ہے اس کو تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی دی جائے ۔ میں آپ کی شکر گذار ہوں کہ آپ نے میرے شوہر کو تعلیم کے ساتھ تربیت بھی اچھی دی ان کے اخلاق بہت اچھے ہیں جس کے سبب سے میں بھی اچھی ہو گئی یہ سب ان کی صحبت کا سبب ہے ورنہ میں کچھ بھی نہیں ہوں ۔
شاہ پور (باہر سے کمرے کے اندر آکر) اماں جان اب مزاج کیسا ہے دوا آپ نے پی یا نہیں ؟
فریدہ ۔ شکر ہے خیریت سے ہوں دوا ابھی تمھاری دلہن نے پلائی تمھاری دلہن کو دعائیں دے رہی تھی شکریہ ادا کر رہی تھی ۔ انھوں نے بہت محبت سے مری تیمار داری کی ان کی خدمت اور نرسنگ کی وجہ سے میں زندہ رہی ورنہ خدا جانے میرا کیا حشر ہوتا ۔ تمھارے باپ کا غم تم نے تمھاری بی بی نے بھلا دیا ۔ خدا تم لوگوں کو خوش رکھے ۔ صبح سے تم کہاں تھے جواب آئے ہو ۔ دفتر سے بہت دیر کر کے آئے چائے پی یا نہیں ۔
شاہ پور ۔ جی ہاں آج دیر ہو گئی چند کام ایسے لگ گئے تھے کہ دیر سے آنا ہوا ۔ اماں جان آپ بار بار شکریہ ادا کیوں کرتی ہیں میں آپ کا خادم ہوں مری بی بی آپ کی خادمہ ہے ۔ ہم دونوں آپ کی خدمت کو ہر وقت تیار ہیں آپکی

دعا کے ہم محتاج ہیں آپ کی دعا ہماری آئندہ زندگی کو کامیاب بنائے گی شکریہ کا لفظ نہ فرمایا کیجیے۔

فوزیہ۔ آج دیر کیوں ہوئی چند کام کونسے زیادہ ہوئے کیا چائے منگاؤں؟

شاہ پور۔ چائے میں نے پی لی ہے چند نیک کام میں نے آج کئے ہیں اپنے قلم، قدم، سخن، رقم کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ انہی کی وجہ سے میں نے نیک کام کئے۔

فوزیہ۔ (ہنس کر) کیا آج شکریہ ادا کیا جائے گا۔ اس وقت سے اماں جان صاحب میرا شکریہ ادا کر رہی تھیں اب آپ قدم، قلم، سخن، رقم کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ یہ کیوں ادا ہو رہا ہے کچھ کہو بھی۔

شاہ پور۔ آج صبح کو دو غریب یتیم لڑکے میرے ہاں آئے ان کو میں نے اپنے ہمراہ یتیم خانے میں لے جا کر شریک کروا دیا ان کی مدد کو کوئی نہ تھا ایک غریب ضعیف لڑکوں کا دادا ہے جس کو کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ میرے ہمراہ لڑکے جانے سے یتیم خانے کے مہتمم نے شریک کر لیا ورنہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ماں باپ والے لڑکوں کو دھوکا دے کر یتیم خانے میں شریک کر رہے ہیں۔ جب میں یتیم خانے سے واپس آیا تو میرے دل نے میرے قدم کا شکریہ ادا کیا اس کے تھوڑی دیر بعد ایک غریب آیا کہ اس کی بی بی مر گئی ہے روپے نہیں ہیں میں نے سیکل پر آدمی اس کے گھر بھیج کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ در اصل جنازہ پڑا ہوا ہے دفن کفن کو کچھ نہیں ہے میں نے روپئے بھجوا دئے جب دفن کر کے میرے آدمی واپس آئے ان لوگوں نے کہا کہ آپ کو اس غریب نے بہت دعائیں دیں یہ سن کر میرے دل نے اپنی رقم کا شکریہ ادا کیا کہ رقم کی وجہ سے میں ایک نیک کام کر سکا جس کے سبب سے مجھے خوشی حاصل ہوئی اگر میرے ہاں رقم نہ ہوتی تو میں یہ حقیقی خوشی حاصل نہ کر سکتا۔

فوزیہ۔ آپ نے اپنی رقم اللہ میاں کی بنک میں جمع کر دی اس کا منافع خوشی ہمیشہ ملتا رہے گا۔ بڑا اچھا کام کیا نیکی کرنے کا موقع ملنا بھی خدا کے ہاتھ ہے اور دو کام بتاؤ کیا کئے۔

شاہ پور۔ آج ایک شخص دفتر میں آیا کہا ناظم صاحب سے سفارش کر کے نوکری دلوا دیجئے۔ میں بہت غریب ہوں بچے والا ہوں۔ میں نے سفارش کر دی۔ ناظم صاحب نے وعدہ کیا ہے غریب بہت خوش خوش اپنے گھر چلا گیا۔ میں نے میرے دل نے اپنے سخن کا شکریہ ادا کیا۔

فوزیہ۔ قلم کا شکریہ تو بہت کچھ ہے میرا شکریہ ادا کرتے ہو یا قلم کا؟ میں بھی تو شکریہ کی مستحق ہوں۔

شاہ پور۔ ہنس کر۔ تمہارے قدم کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تمہارے قدم سے میری ترقی ہوئی۔

فوزیہ۔ یہ قافیہ تو خوب نکالا۔ قدم، قلم، سخن، رقم۔ شاید ہی کسی نے ان چاروں کا شکریہ ادا کیا ہوگا۔ ہمیشہ اور اکثر لوگ خوشی میں یا غم میں خدا کا شکریہ ادا کرتے ہیں تم نے تو نئی ترکیب شکریہ کی نکالی ہے۔ قدم، قلم، سخن، رقم گویا چار اقلیم قائم کر دیئے یا چار یار اپنے لئے بنا لئے۔ قلم کا کیا شکریہ ادا کیا۔ بتاؤ اس کو محروم نہ رکھنا ان باتوں میں کہیں

قلم کو بھول نہ جانا۔

شاہ پور۔ قلم کا شکریہ تو ادا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نے مجھے کامیاب بنایا اسی کی بدولت آج ہزار روپے ماہوار مل رہی ہے۔ اسی کی وجہ آرام سے زندگی گذر رہی ہے اسی کی بدولت تم مجھے ملیں۔ گزشتہ شب کو میں پریشان تھا مگر قلم نے مجھے ایک ایسا اچھا مضمون لکھوایا جس کی وجہ سے میرا دل شاد ہوا مرے قلم نے مجھے حقیقی خوشی دی۔ اس لئے میرے دل نے قلم کا شکریہ ادا کیا۔

زبیدہ۔ بٹیا تم نے قلم، رقم، سخن، قدم کا شکریہ ادا کیا میں ہزاروں دعاؤں کے ساتھ تمھارا تمھاری دلہن کا شکریہ ادا کرتی ہوں تم نے میری بیماری میں خدمت کی۔

شاہ پور۔ آپ شکریہ کا لفظ نہ کہیے بلکہ دعا دیجیے۔ ہمارا فرض تھا ہم نے ادا کیا آپ نے کتنی خدمت کی ہوگی جو آج میں اتنا بڑا ہوا تعلیم حاصل کی یہ سب آپ کی وجہ سے ہے آپ کے قدم کے نیچے جنت ہے۔

زبیدہ۔ یہ سچ ہے لیکن اس کا خیال کون کرتا ہے یہ کہا جاتا ہے ماں باپ کا فرض تھا ادا کیا۔ یہ تمھاری اور تمھاری دلہن کی سعادت مندی ہے خدا تم لوگوں کو خوش اور بامراد کرے۔

صغرا ہمایوں مرزا

رباعیات

(حسنِ مخمور)

پھر جھوم کے ساغر کو اٹھاتا ہے کوئی
مدہوش کو پھر ہوش میں لاتا ہے کوئی
اے بادہ نیوش اٹھ کہ میخانے میں
بے پردہ ترے سامنے آتا ہے کوئی

(جنونِ شوق)

آوارۂ وحشتِ شوق رہنے دے مجھے
تکلیفِ تلاشِ حسن سہنے دے مجھے
اے عرش نشیں، سنبھل سنبھل کر تجھ سے
جو بات زباں پہ آئے، کہنے دے مجھے

عبد القیوم باقی

بیڑ اور اس کے تاریخی واقعات

ریاست حیدرآباد میں یہی ایک ایسا ضلع ہے جہاں آمد و رفت کے ذرائع کافی طور پر مہیا نہیں ہیں جس کی وجہ سے یہاں کی تجارت دوسرے اور اضلاع سے گری ہوئی ہے۔ یہ شہر قدرتی طور پر دو حصوں پر منقسم ہے۔ اس شہر کے بیچوں بیچ ایک ندی "بند سورا" گذرتی ہے۔ ندی کے جانب مغرب جو آبادی ہے اس کو "قصبہ" کہتے ہیں۔ یہاں ہر گھر میں ایک ایک کنواں تو ضرور ہے اور اس طرف کے لوگوں کو پانی کا انتہا درجہ کا آرام ہے۔ ندی کے جانب شرق جو آبادی ہے جس کو "پیٹھ" کہتے ہیں۔ وہاں پانی کی سخت تکلیف ہے اور باشندے عموماً ندی کا پانی پیتے ہیں۔ موسم گرما میں پانی خراب ہو جانے کی وجہ سے آب و ہوا ذرا خراب ہو جاتی ہے۔

یہ شہر بہت پرانا اور تاریخی ہے یہاں ہندو مسلم آثار قدیمہ بکثرت پائے جاتے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) کوتوالی دروازہ کے نام سے ایک کمان مشہور ہے جو ندی کے جانب مغرب کنارہ ہی پر واقع ہے یہاں حسب ذیل کتبہ لکھا ہوا ہے۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم سلطان ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بادشاہ غازی .... فرمودہ ملک بیجاپور و آدونی و نرنالہ و جنجن وغیرہ مفتوح ساختہ و سنہ چہل و ہفت کہ پس از فتح قلعہ کہلنا ...... بہ وادی بیجاپور نامجستہ بنیاد بنام نامی نواب فلک جناب عمدۃ الملک غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ تعلق داشت باہتمام احقر العباد حاجی سعد اشاہ کہ بہ نیابت عمدۃ الملک بہ بند و بست . رمضان سنہ مذکور از جلوس میمنت مانوس مطابق یک ہزار و یک صد و ......

(۲) تقریباً سو سال ہو چکے ہیں کہ اس شہر میں زبردست طغیانی آئی تھی۔ طغیانی کو ظاہر کرنے کے لئے اور حصار بندی کے راز کو آشکارا کرنے کے لئے اسی دروازہ پر ایک کتبہ لکھا ہوا ہے۔

الواحد۔ بتاریخ دوازدہم جمادی الاول ۱۲۰۰ھ رود بار قصبہ بہیڑ طغیانی نمودہ ہمہ حصار از پائے برد ہمدرین سنہ مذکور نواب فلک جناب امیر نواز جنگ بہادر خلف الصدق دولہ خاں مرحوم دام اقبالہ از سر نو سد حصار مرتب فرمودند ماہ و تاریخش انیست

"سدی شدہ چوں سد سکندر انیست"
۱۲۰۱ھ

(۳) کوتوالی دروازہ کے جانب شرق ایک خانقاہ ہے۔ جس کی بناوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارت غارہائے ایلورا کی طرح بنی ہوئی ہے۔ کیونکہ اس کی بناوٹ غارہائے مذکور کے مشابہ ہے

(۴) اسی دروازے کے جانب شمال مشرق دو میل کے فاصلہ پر "کھنڈکالی" کے نام سے ایک مندر مشہور ہے جہاں ایک مینار بھی ہے جو چونے اور مٹی سے مل کر بنا ہے۔ لیکن اتنا پختہ کہ اگر کوئی گرانا چاہے تو ناممکن ہے۔ اس مینار کی

بلندی ۶۰ یا ۷۰ فٹ کے قریب ہوگی اور یہ ہندوؤں کے عہد قدیم کی یاد تازہ کرتا ہے۔

(۵) کوتوالی دروازے کے جانب مغرب دو فرلانگ کے فاصلہ پر ایک کمان ہے جس کو "جونا بازار" کی کمان کہتے ہیں اس کا کتبہ درج ذیل ہے۔

"بانی دین رواق پسخ بنیاں صف شکن خاں مرید شاہ جہاں"

(۶) جونا بازار کی کمان کے جانب مغرب ایک دروازہ ہے جس کو احمد نگر کا دروازہ کہتے ہیں اور بعضے راجوری دروازہ بھی اس لئے کہ راجورہ اور احمد نگر اس طرف واقع ہیں۔ اس دروازے پر دو کتبے لکھے ہیں ایک مرہٹی میں ہے اور دوسرا فارسی میں یہ کتبہ محمد شاہ کے عہد کا ہے جو حسب ذیل ہے۔

"درعہد خلافت خاقان خواتین زمین و زماں محمد شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ شہامت و عوالی مرتبت راؤ سلطان جی بنالکر"

جاگیردار پرگنہ بیڑ تعمیر این احمد نگر دروازہ فرمود سنہ ۱۲ مطابق سنہ ۱۱۴۲ھ۔

(۷) قصبہ کے جانب شمال ایک دروازہ "بالی دروازہ" کے نام سے موسوم ہے اس پر ایک کتبہ لکھا ہوا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شاہ عالم کے عہد کا ہے۔

"در عہد شاہ عالم بادشاہ غازی در زمان صوبہ داری نظام الدولہ میر نظام علی خاں بہادر مطابق حکم عمدہ امرائے نواب شرف الدولہ بہادر باہتمام خان ذیشان علی محمد خاں تعمیر این دروازہ در سنہ ۱۱۸۱ھ باتمام رسید۔"

(۸) ڈھونڈھاجی دیسپانڈیہ کے نام کا دروازہ ساحل "بند سورا" کے جانب مغرب واقع ہے۔ جس کو آج کل "ڈھونڈہ پورہ کا دروازہ" کہتے ہیں اس پر تین کتبے ہیں۔ دو بزبان فارسی اور ایک مرہٹی میں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(الف) "در زمان بادشاہ جہاں ماہی نقش دین نبوی محی سنن مصطفوی ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر کہ خدمت صوبہ داری ملک دکن بہ عمدۃ الملک غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ و نیابت سرکار بیڑ بہ حاجی الحرمین الشریفین حاجی صدر شاہ بیگ بودہ بمعرفت ڈھونڈھاجی دیسپانڈیہ"

عمارت برج "ڈھونڈا پورہ" سنہ ۱۱۱۶ھ مطابق سنہ ۴۹ جلوس والا ظہور یافت۔

(ب) کمترین بندہ ڈھونڈھاجی بشن دیسپانڈیہ پرگنہ بیڑ سنہ ۱۱۰۲ف۔

(۹) گنج دروازے پر جو کتبہ ہے وہ اشعار میں ہے۔

در زمان شہنشہ عادل — کہ بود در زمانہ بے ہمتا
شاہ اورنگ زیب عالمگیر — صیت عدلش گرفتہ ارض و سما
خان و مردان شجاع .... — معدن جود و کان حلم و سخا
زبدۂ خانان خاندان معنوی — کہ ازو یافت چشم دہر ضیا

گردو ربیر .... کہ از آں کردہ است دست قضا سال تاریخ این بنا جستم بتفرع ز خالق یکتا

گشت ساعی این بنا ظاہر ز آنکہ او ہست خود ز اہل وفا ..... کہ از غیب ..... از سر لطف ہاتفی ز سما

شد بہ معمور بعدہ آں مشہور .... باد بقا سر پے بگیرد ..... بگو باشد این پورہ جنت دنیا"

(۱۰) پورہ محامی ایک مقام ہے جہاں حسب ذیل کتبہ لکھا ہوا ہے۔

"یا فتاح در عہد خلافت بادشاہ دین پناہ ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر غازی و صوبہ داری و فوجداری نواب عالی جناب عمدۃ الملک غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ از دار الظفر بیجاپور تا خجستہ بنیاد باہتمام حاجی الحرمین الشریفین حاجی صدر شاہ بیگ نائب فوجداری واتفاق سد سوجی دیسکھہ و ڈھونڈ حاجی دیشپانڈیہ شنبھو شہید این بال شہید این پورہ مبارک غازی الدین نگر در قصبہ بیڑ بنا نمودہ صورت اتمام داد" سنہ ۴۲

(۱۱) شہر کے بیچ میں جامع مسجد بنی ہوئی ہے جس کا کتبہ یہ ہے۔

"در زمان خلافت حضرت عالمگیر شاہ غازی رفعت و عوالی دستگاہ سردار خاں فوجدار جبر این دکن ..... فرش سنگین و بیتر پختہ تعمیر ساخت واقعہ غرہ شوال سنہ ۱۱۰۱ مطابق سنہ ۳۲ جلوس والا"

"داروغہ عمارت بندۂ درگاہ اختیار خاں ..... ساکن بہارنپور"

(۱۲) راجوری دروازے کے قریب ایک مسجد ہے جس میں پانچ کمان ہیں اس کا کتبہ درج ہے۔

"ھو الاول و الآخر و ھو معکم این ما کنتم افضل الذکر لا الہ الا اللہ و اکمل الفکر محمد رسول اللہ انما یعمر مساجد اللہ من آمن باللہ و الیوم الآخر فاولئک ان یکونوا من المھتدین ہ در عہد خلافت بادشاہ محمد شاہ غازی ظل اللہ ہ بتائید الٰہی بانی این مسجد خادم الشرع متین قاضی محمد رکن الدین۔ متوطن قصبہ چلبی محلہ بھار باہتمام محمد تاج الدین برادر سنہ ۱۱۳۵ باتمام رسید"

۲

یہاں بہت سے اولیاء کرام آرام فرما ہیں بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ دکن میں بزرگان دین کی زیادہ تعداد اورنگ آباد، قندہار شریف، گلبرگہ شریف، بیجاپور اور بیڑ ہی میں آتی ہے۔

(۱) حضرت شاہ کوچک رح المعروف شہنشاہ ولی رح کوتوالی دروازے کے جانب مشرق ایک میل کے فاصلہ پر استراحت فرما ہیں آپ حضرت خواجہ قاضی الاولیا و قاضی مہذب الدین قبلہ قدس اللہ العزیز جن کی زیارت گاہ مرجع خاص و عام قصبہ کیج شریف تعلقہ مومن آباد میں ہے۔ محمد تغلق کے زمانہ میں جو چودہ سو ولیوں کی پالکی دکن میں آئی تھی ان ہی ولیوں کے آپ قاضی الاولیا تھے۔ آپ نبیرہ حضرت شیخ فرید گنج شکر رح کے ہیں اور خرقہ خلافت آپ نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی دہلوی سے

حاصل فرمایا تھا) نے قاضی الاولیاؒ سے خرقۂ خلافت حاصل فرمایا۔ حضرت قاضی الاولیاؒ کے واقعات انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ صحبت میں گیسوؒ کے واقعات کے تحت زیب تحریر کئے جائیں گے۔ حضرت شاہ کوچکؒ نے جس وقت خرقۂ خلافت حاصل فرمایا۔ اور آپ کو دربار قاضی الاولیاؒ سے حکم ہوا کہ بیڑ جاؤ تو آپ نے اپنے مرشدؒ کے حکم کی تعمیل کی۔ آپ نے بیڑ جانے تک کبھی گلبرگہ کی جانب پشت نہیں کی بلکہ آپ ۲۶ میل تک پیچھے چلتے رہے حضرت شہنشاہ کی درگاہ کے متعلق حسب ذیل کتبات ہیں یہ کتبہ درگاہ کے قریب ہے۔

(الف)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افضل الذکر لا الٰہ الا اللہ　　واکمل الفکر محمد رسول اللہ

حمد بے حد صلوٰۃ مفتخر　　مر خدا را او علی خیر البشر
باو بر آل و صحابش صد سلام　　نیز زین اخضر بعتبہ السلام
بعد گویم گنج بخش بیدرنگ　　عمدۃ الصمد او ہم فیروز جنگ
رکن بیت دین و دنیا در نظام　　غازی الدین خاں نہاں نیک نام
بہر مسجد گشت حاجی صدر شاہ　　نائب او ملتمس در بارگاہ
حکم صادر شکر کہ مسجد را بساز　　تا بجمعیت ادا کردہ نماز
شکر اللہ یافت تعمیر انصرام　　ہم چنیں یا بد مرادش انتظام
کار غازی بود و ہم غازی نمود　　آمدہ تاریخ ہم غازی نمود
از محمد شاہ نظم ایں بارگاہ　　یاد در دوراں الٰہی یوم القرار

گر کسے پرسد کہ ناظم کیست آں
گو غلام درگہہ حاجیست آں

(ب) مزار مبارک کے قریب ہی مسجد ہے جس کا کتبہ یہ ہے۔

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

من بنی مسجدا للہ کان صغیرا او کبیرا بنی اللہ بیتا فی الجنۃ

کرد مسجد بنا امیر نواز　　جنگ دولہ کہ دولتش دامت
پس بگفتا کہ اے خدائے کریم　　ایں بنا گشت شکر انعامت
کار نیکاں تو نکو ساز د　　اہتمامی امر الہامت
اجرایں ریز بر مزار شریف　　شاہ کوچکؒ بفضل اکرامت
شمس برج ولایت خاصہ　　قطب در کرامت عامت
قدس اللہ سرہ العالی　　آسمان و زمین ما دامت

بہر تاریخ تیز شد ایما
گو بنا ر الصلوٰۃ قد قامت

۱۱۵۵ھ

(ج) درگاہ کے قریب ہی ایک حجرہ ہے جس کا کتبہ یہ ہے۔

"زعفراں۔ مجاور مرتب شدہ در ۱۱۹۵ھ ہجری"

(د) مزار مبارک کے ۱۰ فٹ کے قریب ایک چھوٹا سا حجرہ ہے جہاں آپ مصروف عبادت رہتے تھے۔ یہی وہ کمرہ ہے جس میں حضرت خواجہ گیسو درازؒ کو نیوڑکر اندر تشریف لے جانا پڑا۔ اور اسی کمرہ سے آپ کو "بندہ نواز" کا خطاب بھی (جو لبے بدل ہے) ملا۔ اور آپ کے ساتھ جو اولیا کرام آئے تھے (کیونکہ ان بزرگان دین کی ولایت آپ بزور قوت سلب

فرما چکے تھے)۔ اسی کمرہ سے ان تمام اولیائے کرام کو اُن کی خدمت کی ہوئی نعمت انھیں دیدی گئی۔ اور اسی کمرہ سے حضرت خواجہ صاحب استفادہ حاصل فرما کر بطرف گلبرگہ راہی ہوئے۔ اسی دروازہ پر یہ کتبہ لکھا ہوا پایا گیا۔

بہین حجرۂ شاہ کوچک ولی بنا کرد اسمٰعیل بصدق ولی
چو تاریخ او جستم از عقل خویش نمودا زگل گلشن نادِ علیؓ
سنہ ۱۱۱۱ھ

(۵) درگاہ شریف کے باہر ایک باؤلی ہے جس پر پیتل کے ورق پر یہ کتبہ لکھا ہوا ہے۔

شاہ کوچک دام .... شاہ عالم بہادر بادشاہ غازی در عہد خلافت بادشاہ زمین وزماں .... ولدہ ایزائے ین روپ چند قوم کھتری عرف باتھ متوطن خوشاب پنجاب بحسب قسمت در قصبہ بیر قیام گزنہ بروضۂ منورہ حضرت وہین چاہ آب و سبیل بنا نمودہ سنہ جلوس والا مطابق ۱۱۲۲ھ

(ز) آپ کی درگاہ کے قریب کم سے کم دو فرلانگ کے فاصلہ پر حضرت گوشہ نشینؒ آرام فرما ہیں آپ ہی وہ بزرگ ہیں جو پہلے بیڑ تشریف لے آئے۔

(ح) کوتوالی دروازے کے شمال و مشرق کی جانب حضرت منصور شاہؒ کی زیارت گاہ مقبول عام ہے۔ آپ کی مزار مبارک اور گنبد و فرش تمام سنگ مرمر سے بنے ہوئے ہیں۔ مہاراجہ گوالیار حضرت قبلہ سے عقیدت رکھتے ہیں اور گوالیار ہی سے اس درگاہ کی تعمیر و ترمیم کے لئے سنگ مرمر آیا ہے۔ آپ کی اولاد گوالیار ہی میں فروکش ہے۔ جس کی وہاں مہاراجہ گوالیار بہت تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ ہماری مملکت میں اس درگاہ کے لئے جاگیر بھی ہے۔

(ح) احمد نگر کے دروازہ کی طرف تقریباً دو میل کے فاصلہ پر حضرت پیر بالے شاہؒ کی درگاہ نہایت ہی پُر فضا مقام پر واقع ہے۔ باشندگان بیڑ ہمیشہ اسی طرف تفریح کے لئے آتے ہیں اور کیوں نہ ہو کہ ایسی جائے تفریح کسی اور جگہ نظر نہیں آتی۔ درگاہ کے قریب مسجد ہے۔ مسجد کا کتبہ حسب ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدا

شرف الدولہ والی ایں ملک ہست از فضل حق سراپا جود
بخشی او علی محمد خاں چوں بنا کرد ایں مکاں بسجود
سال تاریخ کرد رقم ہمونی خانۂ طاعت الہ ودود

"باہتمام محمد اشکری ملازم سرکار تیار ساختہ و آراستہ گردادن"

(ط) درگاہ حضرت پیر بالے شاہؒ اور احمد نگر دروازے کے بیچ و پتھر کے ستون زمین پر مرہٹی میں کچھ لکھا ہوا ہے لیکن زمانہ کے انقلاب کی وجہ سے حرف مٹ چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پتھر "رن کھم" کے نام سے موسوم ہے اور یہ پتھر زمانۂ راجہ اشوک کو یاد دلاتا ہے۔

(ی) کوتوالی دروازے جانب جنوب ۲ میل کے فاصلہ پر ایک باؤلی "خزانہ باغ کی باؤلی" کے نام سے موسوم ہے۔

اس باؤلی میں تین نالیاں بنی ہوئی ہیں جس میں دو طرف سے پانی آتا ہے اور ایک طرف سے پانی شہر میں جاتا ہے۔ خوبی تو یہ ہے کہ باؤلی میں پانی کمر سے کم ہی ہوتا ہے۔ چاہے موسم سرما ہو یا موسم گرما۔ اس باؤلی میں پانی کہاں سے آتا ہے ابھی تک کسی کو اس کا علم نہیں ہوا صرف پہاڑ تک (جو تین میل ہے) اس کا پتہ ملا ہے۔ اس کے آگے نہیں لیکن سنا جاتا ہے کہ یہ نالی احمد نگر کے قلعے کی ہاتھی باؤلی سے لائی گئی ہے واللہ اعلم بالصواب۔

ایک طرف کی نالی (جو پانی آبادی کی طرف لاتی ہے) اتنی اونچی ہے کہ ایک آدمی کھڑا رہ کر نالی میں سے گذر سکتا ہے۔ نالی زمین کے اندر سے نکالی گئی ہے اور "بند سورا" ندی کی تہہ سے لائی گئی ہے اور اس نالی پر جابجا دو دو فرلانگ کے فاصلہ پر (شاید پانی لینے کے لئے) راستے بھی بنائے گئے ہیں۔ اس نالی سے یہاں کے زمینیں سیراب ہوتی ہیں۔ اس نالی سے پانی شہر کے بیچ میں ایک حوض میں جس کا نام "کارنجہ" ہے آتا تھا۔ لیکن اب حوادث زمانہ کی وجہ سے پانی کا آنا بند ہے۔ اب اس جگہ گھڑیال گھر بنوایا گیا ہے۔ اگر حوض کو درست کرکے اور نالی سے مٹی وغیرہ نکال کر صاف کیا جاتا اور پانی کو یہاں لایا جاتا تو اور ہی کچھ لطف ہوتا۔

ابوالفیض قاضی سراج الدین احمد نیرؔ کیجی

چرواہی

اے جوانی کے حسیں خوابوں کی متوالی بہار
چھوڑ دے بھیڑیں مرے کھیتوں میں اور گیسو سنوار

آہ کانٹے چبھ رہے ہیں تیرے نازک پاؤں میں
بیٹھ جا کچھ دیر اس شیشم کی ٹھنڈی چھاؤں میں

جم رہی ہیں پپڑیاں ہونٹوں پہ تیرے پیاس سے
وہ اٹھا لا چھاچھ کا برتن لپک کر گھاس سے

کھینچ کر آنچل ذرا سینے کو اپنے ڈھانپ لے
راز تیری نوجوانی کا نہ کوئی بھانپ لے

کوئی بانکا نوجواں کر دے نہ تجھ کو بے قرار
زندگی تیری نہ ہو جائے الم سے ہم کنار

تیری آنکھوں میں نہ آنسو مسکرانا سیکھ جائیں
دلنشیں ہونٹوں پہ آہیں گنگنانا سیکھ جائیں

دل کی خواہش ہے کہ کھیتوں پر تری شاہی رہے
جب تلک زندہ ہے تو اک مست چرواہی رہے

الطاف مشہدی
(پنجاب)

میری خطا

دفتری مصروفیت، دورہ گھر کے کام، دعوتوں میں پھرنے، دوستوں سے ملنے، گپ شپ مارنے، سونے اور کھانے کے بعد جمائیوں اور انگڑائیوں نے وزیٹنگ کارڈ نہ بھیجا تو کبھی کچھ پڑھتا اور لکھتا ہوں۔ مگر اس میں بھی خلل پڑتا ہے جب بیگم کمرۂ مطالعہ میں داخل ہو کر نرم آواز سے پوچھتی ہیں "کیا کر رہے ہیں آپ" انہیں واپسی پر آمادہ کرنے اگر کہا جائے کہ دیکھو مردانہ آجائے گا تو وہ لوٹ جانے کے عوض ڈرائینگ روم کے جانب کا دروازہ جلدی سے بند کرکے بولٹ لگا دیتیں اور ہماری کرسی پر ایک ہاتھ ٹیک کر یا بازو والی کرسی پر بیٹھ کر "سنئے تو" کے زیر عنوان کوئی مشورہ طلب مسئلہ چھیڑ دیتی ہیں غرض ان سارے جھمیلوں کے بعد بھی گر پڑ کر کچھ لکھ لیتا ہوں۔

۲

ایک قابل ادیب، یورپ کے تعلیم یافتہ "ام، اے پی، ایچ، ڈی" کا مکتوب گرامی صادر ہوا کہ "آپ کی عبارتوں میں خدا اور مذہبی ذکر زیادہ رہتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کو آج کل کے نوجوان پسند نہیں کرتے اور لکھنے والے کو دقیانوسی سمجھتے ہیں۔"

فاضل دوست بہت سنجیدہ ہیں کہ اتنا ہی لکھا ورنہ جرم کی سنگینی تو ایسی تھی کہ "ملا"، "قل اعوذی"، مذہبی مجنون وغیرہ وغیرہ سب ہی کا لکھا جانا بجا ہوتا۔

جب میرا یہ گناہ مجھے بتایا گیا تو الہ آباد کے ایک "خطا کار" شاعر کا یہ شعر مجھے بے ساختہ یاد آگیا۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

۳

جانتا ہوں کہ "آج کل کے نوجوان" تو یہ پسند کرتے ہیں کہ الفاظ عریاں ہوں مضامین عریاں ہوں، تصاویر عریاں ہوں، لباس بھی نیم عریاں ہو۔ اسی کو شبابیات کا نام دیا گیا ہے، حیا سوز سفلی جذبات کو رومانیت کہا جاتا ہے اور اسی "پسند" کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوتی جاتی ہے تا عشق بازی سے پیشتر آنکھوں کے گناہ، ذہنی تعیش اور دماغی معصیت کی لذت اٹھائیں اس کا جو ساتھ نہ دے وہ اولڈ ٹائپ یا دقیانوسی ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کیا کروں کہ دماغ کو گرد و پیش کی وسعت کافی نہیں وہ بلند پروازی کرتا ہے نظر پھیلتی ہے اور دیکھتا ہوں کہ صدہا سال پہلے قوی الجثہ طویل القامت ایسی قومیں گزری ہیں جنھوں نے مخلوق کو معبود سمجھا بندے کو رب جانا پہاڑوں پر عظیم الشان قصر بنائے۔ عیش و عشرت کی نئی نئی راہیں نکالیں حتیٰ کہ عورتوں کے کام لڑکوں سے لینے لگے شبابیات کا اس زمانے میں بھی رنگ تھا۔ اللہ کے نیک بندوں نے انھیں سمجھایا تو قوم نے انھیں مفتری، بے وقوف، ساحر اور جادوگروں کا استاد کہا اپنی بستی سے نکال دینے سنگسار کرنے کی دھمکی دی۔

زمانہ آگے بڑھتا ہے ایک قوم پر اللہ کے ظاہری اور باطنی احسان ہوتے ہیں۔ غلامی کی زندگی سے نجات دی جاتی ہے۔ ہر مشکل میں اعانت ہوتی ہے۔ ترنجبیں اور بٹیر بھیجے جاتے ہیں مگر ان پیاپے نعمتوں پر شکر کے عوض کفر کیا جاتا ہے۔ گردن جھکانے کے عوض سرتابی ہوتی ہے اور نصیحت کرنے والوں کی محنت رائگاں جاتی ہے۔ اس کو بھی کئی سال گزر گئے عرب میں وہ زمانہ آیا جس کو ایام جاہلیت کہا جاتا ہے اس عہد میں شراب خواری تمغۂ شرافت سمجھی جاتی ہے۔ جس قدر زر اس پر صرف کیا جاتا ہے کرم میں شمار ہوتا ہے۔

قمار بازی کو مکارم اخلاق کی فہرست میں ممتاز جگہ ملتی ہے
جوا بازی سے جو رقم جیتتے ہیں وہ فقرا اور مساکین میں تقسیم کی
جاتی ہے۔ قوم کی بہو بیٹیوں کے حسن کے چرچے علی الاعلان
ہوتے ہیں۔ امرء القیس جو مشہور شاعر اور شہزادہ تھا اپنی
چچیری زاد بہن کے ساتھ اپنی بدکاری کا قصہ مزہ لے لے کر
بیان کرتا ہے اور یہ قصیدہ کعبہ پر آویزاں کیا جاتا ہے۔
لڑکیاں زندہ دفن کی جاتی ہیں باپ کی منکوحہ سعادت مند
پسر کو وراثت میں ملتی ہے۔ بیٹی سے شادی ہوتی ہے ایسے
وقت اس ذات قدسی کا ظہور ہوتا ہے جو بعد از خدا بزرگ
ہے یہ ان بدراہوں کو صراط المستقیم پر لاتی ہے۔

ان امم سابقہ پر جنھوں نے نصیحت نہ مانی خیر خواہوں
کی قدر نہ کی کبھی طوفان آیا کبھی زلزلہ اور کڑک۔ کہیں پتھر
برسے طبقۂ زمین اوندھا کر دیا گیا اور کسی کو مسخ کر دیا۔
مگر جنھوں نے بات سنی سر اطاعت خم کیا انھیں دولت
وحشمت ملی، سلطنت وحکومت ملی، عز وجاہ ملا اور اخروی اجر
جو کچھ ہے اس کا حساب اللہ ہی جانے۔

۴

اب آج کل کے زمانے کو دیکھیے جو کہ بجلی اور بھاپ کا
ہے، ریل اور جہاز کا ہے، تار اور ریڈیو کا ہے، طیارہ
اور کلون کا ہے، تہذیب وتمدن کا ہے، ترقی اور تجدد
کا ہے اور سمجھ یا غلط عقل ودانش کا ہے اس زمانہ میں
شراب کا استعمال کہاں نہیں کس تہذیب جدید کے شیدائی
کے کمرۂ طعام، کس فیشن ایبل محفل، کس ڈنر، کس اٹ ہوم،
کس ہوٹل اور کس شائستہ کلب میں وہ موجود نہیں
امریکہ میں چند دن کی بندش کے بعد یہ امتناع اٹھا دیا جاتا
ہے تو ہر شراب کی دکان پر رندوں کا ایسا اجتماع ہوتا ہے
جیسے جوتے پر مکھیاں (اس زمانہ کے مصور اخبار ذرا
دیکھ لیجئے) بمبئی میں امتناع شراب کے خلاف احتجاج کرنے
بڑے بڑے دولت مند شرفا سر او منائٹ جمع ہوتے ہیں۔
جوا پرانا نام قابل نفرت ہے مگر ریس، برج، لاٹری کے
نئے نام سے کہاں یہ مہذب شغل جاری نہیں، برج ٹورنمنٹ
میں شرکت اور اس میں جیت روشن خیالی اور زندہ دلی
کی عین علامت ہے جو روپیہ اس سے جیتا جائے اس کو
بعض اصحاب کرم چاریٹی فنڈ میں داخل کر دیتے ہیں۔

عورت جسے عز و شرف کا نام لے کر آزاد وبے پردہ
کیا جا رہا ہے درحقیقت اس کے حسن کی نمایش اس کے
سینے، بازو اور پنڈلی کی ستایش میں بڑی بڑی محفلیں منعقد
اور مشہور زمانہ اخبارات کے صفحے کے صفحے تصویروں اور
مضامین سے پُر کر کے رسوا کیا جا رہا ہے۔ اس کی خلوت کی
تصویریں اس کے جسم کا اتار چڑھاؤ اس کے نازک اعضا کا
پیچ وخم ابھار اور نیلی لکیریں فنون لطیفہ کے بہانے سے
نمایاں کر کے اس کے شرم وحیا کا جنازہ نکالا جا رہا ہے۔
کبھی لڑکی زندہ دفن کی جاتی تھی بنی اسرائیل کے لڑکے
مارے جاتے تھے تو آج برتھ کنٹرول کے نام سے لڑکے
اور لڑکیوں دونوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔

مضمون طول ہو رہا ہے اس لئے قلم روکتا ہوں ورنہ
ایسی بیسیوں باتیں اور بتاؤں۔

۵

عہد حاضر جس کو تمدن اور ترقی کا زمانہ اور نئی روشنی
سمجھتے ہیں جاہلیت اور ایام ضلالت کا ہم رنگ ہے اس وقت
نبی آتے تھے قانون الٰہی لاتے تھے مگر اب تو یہ سلسلہ بند
ہو گیا۔ البتہ اسی قانون کا ایک دفعہ ہے کہ تم میں ایسے

لوگ ہوں جو نیکی کی طرف بلائیں اچھے کاموں کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں پس فرمائیے میں "آج کل کے نوجوان" کی پسند کو ملحوظ رکھ کر انہیں سوز و مستی جذب و شوق کے دریائے بے پایاں میں ڈوبنے چھوڑ دوں یا اس دفعہ کے تحت انہیں طوفانِ موج افزا سے کھینچ کر باہر نکالوں۔

عنفوانِ شباب کی رعنائیوں میں بھٹکنے والے "آج کل کے نوجوان" کی واہ واہ بہ آسانی حاصل کی جا سکتی ہے مگر اس کے لئے قوم کے اخلاق پر تیشہ لگانا پڑے گا اور میں اس سے لرزہ براندام ہوں اسی لئے انجام غفلت، دھن کا پکا، قتالہ، بے مثل محبت وغیرہ مختصر افسانے لکھا یا ہمایوں اور زبیدہ، عاصمہ، جیسے طویل ناول میں تو اس کا لحاظ رکھا کہ نہ تو وہ پند نامہ ہو کر نوجوان کے لئے اس کا پڑھنا اجیرن ہو جائے اور نہ شبابیات کا گندہ لٹریچر کہ نونہالان قوم کے اخلاق کو تباہ کر دے۔ اس لئے "حسن و شباب" شاہد و سے کشمکش و فراق، محبت و وصال، کی داستان سناتا تو ہوں مگر صرف اس لئے کہ در حقیقت ویران "نوجوان" کو بھلے اور برے کی تمیز کرا دوں۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ بہترین کردار ہے اور یہ قابل نفرت۔ میں "نوجوان" کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس رنگین دنیا اس خوشنما چمن سے فائدہ اٹھانے کے طور طریق ہیں بس حکمت کے ساتھ متعین کر دئے گئے ہیں ذرا اس کا مطالعہ کرو۔

پھول چنو گر خار سے دامن بچاؤ ۔۔ اور بس یہی میری خطا ہے

ابوظفر مؤیدالدین حسن

غزل

دل سے خیالِ یار بھلایا نہ جائے گا ... ایسا یہ نقش ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

ہم سے غمِ حیات اٹھایا نہ جائے گا ... یہ سلسلہ اب اور بڑھایا نہ جائے گا

اے عشق! چھیڑ چھیڑ کے گستاخیاں نہ کر ... وہ روٹھ جائیں گے تو منایا نہ جائے گا

افسانۂ جنوں ہے کچھ اس درجہ خوں چکاں ... سننا بھی چاہیں وہ تو سنایا نہ جائے گا

رنگِ بہار دید کے قابل سہی، مگر ... آنچل تمھارے رخ سے ہٹایا نہ جائے گا

میں وارداتِ عشق مگر تم سے کیا کہوں ... تم سے حسیں کو مجھ سے رلایا نہ جائے گا

افشائے رازِ عشق میں رسوائیاں سہی ... ہم سے تو دل کا حال چھپایا نہ جائے گا

وہ مسکرا کے دیکھ رہے ہیں مری طرف ... بجلی سے آشیانہ بچایا نہ جائے گا

کاوشؔ! میں ان کی یاد میں مٹ جاؤں گا مگر
اُن کا خیال دل سے مٹایا نہ جائے گا

کاوشؔ

شیلی کی زندگی کے چند دلچسپ پہلو

شیلی انگلستان کا مشہور شاعر بنی نوعِ انسان سے
بے انتہا محبت رکھتا تھا اس کا حساس دل مظلوموں اور
کمزوروں کے دکھ اور درد سے بے حد متاثر ہوتا تمام جذباتی
انسانوں کی طرح اس کی خواہش ہوتی کہ دنیا کا نظام
آنِ واحد میں بدل جائے وہ چاہتا تھا کہ تیزی کے ساتھ
حالات میں تبدیلی واقع ہو انسان جس عذاب کی زندگی
میں مبتلا ہے اس سے جلد چھٹکارا پا جائے۔

شیلی کی انسانیت سے محبت کرنے والی فطرت کو
جس قدر سراہا جائے کم ہے لیکن اس کو کیا کیا جا سکتا ہے کہ
دنیا کے حالات اتنی تیزی سے نہیں بدلتے یہی سبب ہے کہ
انگلستان کے اس نظریہ پرست شاعر کی زندگی ناکامیوں
کی ایک المناک داستان ہے۔

شیلی کتابوں میں جو اصول اور نظریے پڑھتا عملی
دقتوں کا لحاظ کئے بغیر ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتا اور
دوسروں سے بھی اس بات کی توقع رکھتا کہ وہ ان نظریوں پر
اس کی طرح عمل پیرا ہوں گے۔ لیکن جب اس کی یہ توقعات
پوری نہ ہوتیں تو اسے دنیا اور دنیا والوں سے بڑی
مایوسی ہوتی۔

شیلی کے خیالات پر گاڈون کی کتاب (Poli-
tical Justice) "سیاسی عدل" کا بڑا اثر
رہا اس کتاب میں مصنف نے نکاح کو مذموم قرار دیا ہے
خود شیلی کا خیال تھا کہ مرد اور عورت کی باہمی محبت،
ان کے باہم دگر، زندگی گذارنے کے لئے، کافی ہے
سیاسی عدل کے مصنف کی طرح وہ بھی نکاح کو غیر ضروری
تصور کرتا لیکن جب گاڈون کی لڑکی نے اپنے باپ کے
اس نظریہ پر عمل کیا اور شیلی کے ساتھ بغیر نکاح کئے زندگی
گذارنی شروع کی تو اس کو اپنی لڑکی کی اس حرکت سے
روحانی اذیت پہونچی شیلی نے جب اس کو نکاح کے بارے میں
اس کا اپنا نظریہ یاد دلایا تو وہ اور بھی چراغ پا ہوا اس
زمانہ میں اس نے جو خطوط شیلی کو لکھے ان کے پڑھنے سے
اس عمیق رنج و غم کا اندازہ ہوتا ہے جو اس کی روح
پر مستولی تھا۔

گاڈون نے ایک اور ستم ظریفی یہ کی تھی کہ نکاح کے
بارے میں اپنے نظریہ کے خلاف دو مرتبہ نکاح کیا اس کی
پہلی بیوی کے انتقال کے بعد اس نے ایک بیوہ عورت سے
دوبارہ شادی رچائی۔

شیلی طالب علمی کے زمانہ میں بھی اور لڑکوں سے
بہت مختلف تھا اس کے ساتھی جب کرکٹ کھیلتے یا کوئی
اور کھیل میں مشغول ہوتے تو وہ کتابیں بغل میں دبائے
کسی کنج کی تلاش میں نکل جاتا وہاں جاکر وہ یا تو مطالعہ
میں مصروف ہو جاتا یا پھر نظمیں کہتا اس کے ساتھی اسے
"پاگل شیلی" کے نام سے پکارتے اور طرح طرح سے
دق کرتے لیکن ساتھیوں کی اس ایذا رسانی سے اس کی
عادتوں میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی۔

شیلی اپنے انوکھے خیالات کی وجہ سے اپنے والد کی
بارگاہ میں ہمیشہ معتوب رہا اس کو وہاں سے بہت کم
مالی امداد ملتی۔ مال و متاع اور عیش و عشرت کو اس نے
اپنے معتقدات پر سے قربان کر دیا تھا وہ اگرچہ کہ ایک
امیر گھرانے سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس نے نہایت سادہ

زندگی گزارنے کی خُو ڈال لی تھی۔

شیلی پریشان حالی کے زمانہ میں بھی محتاجوں کی امداد سے کبھی دریغ نہ کرتا اس کی زندگی کے اوراق پر جگہ جگہ ایثار اور قربانی کی عدیم المثال نظیریں ملیں گی۔

کالج کے زمانہ میں شیلی نے " دہریت کی ضرورت" کے عنوان پر ایک مقالہ لکھا ارباب جامعہ نے اسے اس بنا پر کالج سے نکال دیا۔

اس کے والد بھی اس سے بہت برافروختہ اور انتہائی ناراض ہوئے اور مرتے دم تک ناراض رہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ شیلی کی خالہ زاد بہن ہیریٹ نے جس سے شیلی کو بہت محبت تھی صاف کہہ دیا کہ وہ اس سے شادی کرنا نہیں چاہتی یہ سانحہ شیلی کے لئے بہت الم انگیز تھا۔

بدل گئیں وہ نگاہیں یہ سانحہ تھا اخیر
پھر اس کے بعد کوئی انقلاب ہو نہ سکا

لیکن یہ سب کچھ اس نے انتہائی صبر و تحمل سے برداشت کر لیا آلام و مصائب کا اس غیر معمولی انسان نے آخر دم تک مردانہ وار مقابلہ کیا۔

شیلی نے کئی دفعہ اس امر کا اعتراف کیا کہ وہ خدا کا قایل ہے دہریت کی ضرورت کے موضوع پر اس نے جو مقالہ لکھا اس کے متعلق اس نے بیان کیا کہ وہ مذہبی دیوانوں کی انتہائی پسندی کا جواب ہے شیلی نے اپنے عادتی جوش میں اس امر کا احساس نہیں کیا کہ وہ جس انتہا پسندی اور دیوانگی کا الزام دوسروں پر عاید کر رہا ہے۔ ٹھیک اسی جرم کا وہ خود بھی مرتکب ہو رہا ہے شیلی کا جہاد دراصل رائج الوقت نام نہاد مذہب کے خلاف تھا۔

لیکن اس نے اپنے فطری جوش میں خدا ہی کے وجود سے انکار کر دیا...... حالانکہ وہ خدا کے وجود کا دل سے معترف تھا۔

شیلی کے دوست ٹری لانی نے ایک دفعہ بیان کیا کہ "شیلی کا حیات بعد الموت پر اعتقاد ہے جن لوگوں نے اسے دہریہ سمجھ رکھا ہے وہ دراصل اس سے واقف نہیں ہیں اس نے خود مجھ سے بیان کیا کہ وہ اٹھارویں صدی کے فرانسیسی فلسفہ کو غلط اور مضر سمجھتا ہے"۔

دوی رات کے فلسفہ کا اس پر زیادہ عرصہ تک اثر نہیں رہا۔ آخر میں وہ افلاطون اور ڈانٹے کے فلسفہ سے متاثر تھا۔

کہا جاتا ہے کہ بعض لوگ آزاد طبع پیدا ہوتے ہیں سوسائٹی کے قوانین ان کی فطری آزادی کے راستے میں ایک مستقل رکاوٹ ہیں اس لئے وہ ان قوانین کے خلاف بغاوت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں شیلی نے ایک دفعہ کہا تھا "اس بات کا جھوٹا ادعا کیا جاتا ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے قوانین ہماری فطری خواہشوں کو منضبط کرتے ہیں۔ یہ خیال کتنا مہمل ہے"۔ شیلی کی رائے میں یہ خیال کتنا ہی مہمل کیوں نہ ہو لیکن ہے صداقت سے لبریز (LEWIS) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "قانون کی وجہ سے افراد کے اقوال اور افعال پر قابو حاصل ہوا اور انسانوں میں باہمی اعتماد اور بھروسہ پیدا ہوا قانون امن و امان کی ضمانت ہے اس کی بدولت افراد میں بے یقینی، شک اور خوف کا ازالہ ہو گیا" اس میں شک نہیں کہ دنیا میں بہت سے ایسے قوانین بھی نافذ ہیں جو غیر ضروری اور بحیثیت مجموعی انسانیت کے لئے ضرر رساں ہیں لیکن بہت سے قوانین ایسے بھی

ہیں جو ہماری حیات اجتماعی کے لئے ضروری ہیں اگر یہ قوانین نہ ہوں تو انسانوں کا مل جل کر رہنا ناممکن ہو جائے۔

شیلی کی موت خلیج اسپزیا میں کشتی کے الٹ جانے سے واقع ہوئی اس کے ساتھیوں میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا۔ جب کئی دن کے بعد ان کی نعشیں ساحل سمندر پر ملیں تو شیلی کی نعش کو شناخت کرنا دشوار ہو گیا جامہ تلاشی پر کیٹس Keats کی نظموں کا مجموعہ جس نعش کے ہاں سے ملا اس کے متعلق یقین ہو گیا کہ وہ شیلی کی نعش ہے۔

مذہب سے متعلق شیلی کے جو خیالات تھے ان کے مدنظر اسے قبرستان میں جگہ نہ مل سکی اس لئے ساحل سمندر پر بائرن ٹری لانی اور لے ہنٹ کے روبرو اس کی نعش کو نذر آتش راکھ کو سمندر میں بہا دیا گیا۔

اس کے سوانح نگار آندرے موروا نے لکھا ہے۔

"شیلی کو زندگی نے جو سبق دیا وہ یہ تھا کہ کمال اس دنیا میں حاصل نہیں ہو سکتا اس سے کم درجہ کی کسی چیز کو قبول کر لینا چاہیئے"۔

میر عزیز الحق

مدرسہ تعلیم بالغات کے افتتاح پر

نظر آتی ہیں تاثیریں نصیبِ زور آور کی
کہ جاری چشمۂ شیریں ہوئے دشت و بیاباں میں

خبر آئی کہ اب سرسبز ہوں گے پھر نئے سر سے
وہ اشجارِ خزاں دیدہ جو ہیں گلزارِ نسواں میں

بڑی مصروف ہے آرایش و تنظیم میں دنیا
سفیدی ہو رہی ہے اب پرانے کاخ والوں میں

کسے معلوم تھا سوئی ہوئی تقدیر جاگے گی
خبر کیا تھی کہ آئے گی بہار اجڑے گلستاں میں

یہی سرگرمیاں ہوتیں اگر اس کے زمانے میں
تو اسکندر نہ یوں پھرتا تلاشِ آبِ حیواں میں

شعاعِ مہر سے اب مندمل خود زخم ہوتے ہیں
"پھرا کرتے نہیں مجروحِ الفت فکرِ درماں میں"

مقدر میں سعادت ہو تو یوں اسباب بنتے ہیں
اسیروں کو نہ رہنا چاہیئے مایوس زنداں میں

خدا رکھے وہ اب کچھ زندگی کا لطف پائیں گے
کٹی ہے جن کی ساری عمر ماحولِ پریشاں میں

اڑیں گے اب فضاؤں میں طیورِ پر شکستہ بھی
کہاں تاثیر تھی اتنی بھلا تختِ سلیماں میں

یہ اقدامِ عمل اے بانیٔ شعبہ مبارک ہو!
خدا جوشِ عمل دے شعبۂ نسواں کے ارکاں میں

"یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گام زن محبوبِ فطرت ہے"

بشیر النساء بیگم بشیر

ترکِ مسکرات

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے
اک درد جگر میں ہوتا ہے
ہم چپکے چپکے روتے ہیں
جب سارا عالم سوتا ہے

مسلمہ امر ہے کہ رات کے وقت ہر درد احساس زیادہ ہوتا ہے۔ خواہ امراض جسمانی ہو یا آلام روحانی۔ رات کا وقت ہے آسمان پر کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ رامپور کے گلی کوچوں پر سناٹے کا عالم ہے۔ سڑک کے دو رویہ چراغ اپنی نیم باز مستانہ آنکھوں سے ٹمٹما رہے ہیں۔ ادھر دیکھو وہ کیا ہے؟ کوئی شیطان بھوت تو نہیں؟ آہا! یہ تو ایک عورت ہے۔ جلد جلد قدم اٹھاتے چلی جا رہی ہے۔ گود میں ایک نو عمر بچہ ہے۔ نیند کا ماتا، ماں کے سینے پر منہ رکھے خوابِ نوشین کے مزے لے رہا ہے۔ رات کے سناٹے میں ایک عورت کا اس طرح جانا کیا معنی؟ دیکھو وہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی بھی جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے تعاقب سے بچنا چاہتی ہے۔

"ذرا نزدیک ہو جائیں۔ کچھ آپ ہی آپ کہہ رہی ہے۔ صبر کی انتہا ہو گئی۔ بھائی بھائی کر کے کمبخت کی نذر سب کچھ کر چکی۔ اس کے ظلم و تعدی کو برداشت کیا لیکن منہ سے اُف نہ کی۔ اب اس کی سنگدلی بھی نہیں جاتی۔ میرا جتنا جہیز جتنا تھا سب اس کی مے نوشی میں صرف ہوا۔ قرض سر سے اونچا ہوا۔ اوراق کی رحمت نہ رہی۔ ساہوکار قرقی لے آیا۔ عدالت میں نالش کر دی۔ اب رہی سہی آبرو بھی جا رہی ہے۔ خاندان کا نام ڈوب رہا ہے۔ میں تو اس پر بھروسہ کئے ہوئے تھی۔ سچ ہے روپیہ پیسے کے آگے ایمان خیرباد کہہ جاتا ہے۔ شرم و حیا کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔ روپیہ حاصل کرنا اس کا نصب العین ہے۔ خواہ کسی ذریعے ہی سے کیوں نہ ہو۔ آج میری امیدوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اب وہ میرے معصوم کو اس کے آبائی ورثہ سے محروم کرنا چاہتا ہے۔

سچ ہے۔ میں اس کی بہن ہوں۔ میرا فرض ہے کہ میں اس کی مدد کروں۔ اڑے وقت پر کام آؤں۔ میں نے اپنا حق بے دریغ ادا کیا۔ جس دن سے بیوہ ہو کر اس کے گھر آئی اس دن سے اس کی معاشرتی زندگی سنبھالنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اس کی آوارہ زندگی کو دیکھ کر کلیجے پر برچھیاں چلتی تھیں۔ سمجھی کہ بہن ہوں۔ میرا تو گھر اجڑ چکا۔ ارمانوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ماں باپ کوئی سر پر نہ رہے کہ میرے بھائی موہن کا گھر بسا دے۔ خیر میں ہی کیوں نہ اس کا گھر بساؤں۔ شاید بیوی کے آنے سے اس کی آوارہ زندگی میں انقلاب ہو۔

نتیجہ الٹا ظہور پذیر ہوا۔ بیاہ کے بعد چند دن تک تو خوب رنگ رلیاں منائی گئیں۔ عیش و عشرت کے مزے لوٹے۔ روپیہ پانی کی طرح صرف ہونے لگا۔ جی کھول کر ارمان نکالے۔ جب فضول خرچی کا چسکا لگا پھر سونے پر سہاگا ہوا۔ جائیداد کی آمدنی کافی نہ ہوئی قرضہ لیا جانے لگا دوستوں کی صحبت میں شراب نوشی سیکھی۔ اب نہ بیوی کا خیال رہا نہ بہن کا۔ بیاہ کے بعد چھ ماہ بھی نہ ہونے تھے کہ جائیداد نیلام پر چڑھی۔ گاؤں میں بدنام ہوئے۔ خاندان کے نام کو کلنک کا ٹیکا لگایا۔ گھر میں فاقے ہونے لگے بیوی کو میکے روانہ کیا جو تے میں شراب بارہ دی۔ گھر میں جو کچھ اسباب تھا سب کا سب

قرض خواہوں نے اٹھالے گیا۔ اب کچھ نہ رہا تو اس معصوم کی جائیداد پر خیانت کی نظر ڈال رہا ہے۔ اب پنڈت گروانند کے پاس جاؤں گی۔ اور ان سے اس معاملہ میں انصاف چاہوں گی۔"

باب دوم

لو۔ صاحب یہ تو پنڈت گروانند کے مکان کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ پیچھے ہولو۔ سنیں تو وہ کیا کہتے ہیں۔

پدمنی ۔۔ پنڈت جی اسکا رعرض ہے۔ غریب کی بے وقت آمد سے پریشان نہ ہوجیئے۔ میں آپ کے در پر عرض لے کر آئی ہوں ناامید نہ کیجئے۔

گروانند ۔ کہو بیٹا تمہارا اس وقت کیسے آنا ہوا! ہائیں! گوپی کو بھی لے آئی ہو۔ کہو کیا بات ہے؟ اس طرح ہانپ کیوں رہی ہو۔ کیا پیدل آئی ہو؟ بیٹھو تو۔ میں تمہاری مدد کے لئے ہر وقت تیار ہوں۔ کہو کیا ہے؟ خاموش کیوں ہو؟ یہ آنسو کیسے؟ کیا موہن سے لڑائی ہوگئی۔

پدمنی ۔ پنڈت جی بات صرف اتنی ہے کہ موہن آج کل شراب کے نشے میں بدمست ہو رہا ہے۔ میری اور موہن کی جائیداد نیلام چڑھی۔ قرض خواہ گھر میں جو کچھ تھا سب لے گئے۔ اور موہن ایک دن خلاف قانون جوا کھیلتے ہوئے پکڑے گئے۔ یہ خبر سن کر میں نے سر پیٹ لیا۔ میرا زیور فروخت کر کے جرمانہ ادا کیا۔ اور موہن کو حراست سے رہائی ہوئی۔ لیکن اب مجھ سے یہ نہ ہوگا کہ گوپی کے نام کی جائیداد بھی موہن کے ہاتھوں پامال ہوتے دیکھوں۔ جب میں نے اس سے گوپی کی جائیداد کے دستاویز کا مطالبہ کیا تو کہتا ہے کس کی جائیداد؟ کہاں کی جائیداد؟ پنڈت جی میں لوٹ گئی۔ لیکن مجھ سے یہ نہ ہوگا کہ جیتے جی اس معصوم کو بھی لٹتے دیکھوں۔ اب میرا اس کے ساتھ اس گھر میں نباہ نہ ہوگا۔

گروانند ۔ آخر تمہارا کیا مطلب ہے میں نہیں سمجھا۔ مانا کہ موہن نے تمہیں دغا دی اور اب گوپی کی حق تلفی پر تلا ہوا ہے۔

پدمنی ۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ پنچایت میری انصاف کرے۔

گروانند ۔ تو بیٹا کیا تم یہ گوارا کرو گی کہ خانگی معاملات پنچایت میں طے پائیں۔ اور ناموس خاندان تمہارے ہاتھوں برباد ہو؟

پدمنی ۔ پنڈت جی۔ گستاخی معاف ناموس خاندان کو تو موہن نے برباد کر دیا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ باپ دادا کی آن میں فرق نہیں آیا؟ عزت و ناموری اسی وقت رخصت ہوئی۔ جب جاگیر نیلام پر چڑھی۔ اور عدالت سے قرقی آئی۔

گروانند ۔ بیٹی! تو مجھ سے وہ چیز مانگتی ہے کہ کیا کہوں

پدمنی ۔ میں جانتی ہوں کہ آپ موہن کو پنچایت کی نفرین و ملامت سے بچانا چاہتے ہیں۔ لیکن میرے صبر کی انتہا ہوگئی۔ اب میرا ارادہ مصمم ہے۔ اگر آپ میری امداد نہ کریں گے تو مجھے گاؤں کے پٹواری سے بالمشافہ بات کرنی پڑے گی

گروانند ۔ اگر تمہارا عزم مصمم ہے تو مجھے یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہم آپس میں ہی فیصلہ کرلیں۔ میں نہیں چاہتا کہ موہن کی رہی سہی عزت اور خاندان کی لاج پنچایت کے ہاتھوں برباد ہو۔ اچھا تو تم ابھی گھری سے سو رہو۔ رات بہت گزر گئی ہے معاملہ کل طے ہو جائیگا۔

پدمنی ۔ پنڈت جی آپ کا بے حد شکریہ۔ خدا حافظ۔

باب سوم

کل جگ نہیں کرجگ ہے یہ پتہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے پتہ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

صبح کا سہانا وقت ہے پرندے یاد الٰہی میں مصروف ہیں۔ مہر عالم تاب نے اپنا سر مشرق سے نکالا ہی تھا کہ ادھر موذن نے اذان دی۔ کلیسا والے نے گھنٹہ بجایا۔ مندر میں برہمن نے صدائے ناقوس بلند کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی کل جو رات کو چند گھنٹوں کے لئے ٹھہر گئی تھی پھر چلنی شروع ہوگئی۔ لوگ ادھر ادھر تیز تیز قدم اٹھاتے اپنے اپنے کام پر جارہے ہیں۔ پنڈت گردانند تو ابھی تک مندر میں سرگرم عبادت ہیں۔ اے لو۔ پوجا پاٹ سے فارغ ہوکر چل کھڑے ہوئے ہیں۔ ہم بھی ساتھ ہولیں تو معلوم ہو کہ معاملہ کیسے طے پاتا ہے۔ اے ہے! یہ کون ہے جو پنڈت جی سے سرگرم کلام ہے۔

گردانند۔ بیٹا موہن کہاں جارہے ہو؟

موہن راؤ۔ نمسکار عرض ہے پنڈت جی۔ میں تو آپ ہی سے ملنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ یہ میری عین خوش نصیبی ہے کہ آپ راستے ہی میں مل گئے۔ اگر غریب خانہ پر تشریف لے آئیں تو بہت مہربانی ہوگی۔

گردانند۔ آخر ایسی کونسی ضرورت ہے جو تمہیں میرے گھر تک آنے کا خیال ہوا۔ ورنہ مہینے گزر جاتے لیکن کبھی غریب بوڑھے پنڈت کی یاد تمہیں نہ ستاتی۔

موہن۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں؟ میں اور آپ کو بھول جاؤں! یہ ناممکن بات ہے۔ یہ گوشت پوست میرا نہیں۔ آپ کا پروان چڑھایا ہوا ہے۔ آپ ہی کے سایۂ عاطفت میں میں اس رتبہ پر پہنچا۔ ورنہ بن باپ کا یہ بچہ دنیا کے تھپیڑوں میں کیسے اکیلا پرورش پاتا؟ اگر میں تمام عمر آپ کے قدموں پر سر جھکائے رہوں تو بھی یہ احسان ادا نہ ہوسکتا۔ خیر۔ گھر آگیا۔ آئیے۔ اندر تشریف لائیے۔ آپ کے بھاگوں میرا چوکا پوتر ہوجائیگا۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے، کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

پنڈت جی (بیٹھتے ہوئے کہتے ہیں) اچھا تو بتاؤ کہ تمہاری صورت پر یوں فقے کیوں اڑ رہے ہیں۔ کیوں کیا پرملا کے دشمنوں کا مزاج خراب ہے؟ خیر تو ہے!

موہن۔ آپ سے کیا چھپاؤں رات سے پدمنی غائب ہے۔ ننھے گوپی کو بھی ساتھ لے گئی ہے۔ کہاں گئی کچھ پتہ نہیں۔ رات کو کھانا کھاتے وقت باتوں ہی باتوں میں جاگیر کے متعلق تکرار ہوگئی۔ بھگوان جانتا ہے کہ وہ کہاں گئی ہے۔

گردانند۔ وہ رات کو میرے پاس آئی تھی۔ بہت پریشان تھی اور پنچایت میں ترکہ کے متعلق فیصلہ کروانا چاہتی تھی۔ میں نے بہت کچھ روکا لیکن وہ ایک نہ مانی۔ ناچار ہوکر میں نے اس معاملہ کو ست نراین اور رتن ناتھ کے آگے رکھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

موہن۔ بھائی بہن کی نااتفاقی میں غیروں کی مداخلت کی کیا ضرورت تھی۔ اگر آپ ہی فیصلہ کر دیتے تو کافی تھا۔ اے وہ وہ آگئے۔

ست نراین اور رتن ناتھ۔ نمسکار عرض ہے۔

گردانند۔ جیتے رہو بچو۔ آؤ یہاں بیٹھ جاؤ۔ بچو میں نے تمہیں ایک اہم معاملہ میں رائے دینے اور گواہ بننے کے لئے بلوایا ہے۔ سوچ سمجھ کر کام لینا۔

یہ بھائی بہن میں کچھ ناچاقی ہوگئی ہے ۔ پدمنی ۔ بھی اب آگئی تو دونوں کا بیان سن کر اپنی رائے دینا ۔ پھر میں اپنا فیصلہ سناؤں گا ۔ اور تم اس کے شاہد رہنا ۔ اسے لو پدمنی بھی آن پہنچی ۔ کہو موہن کیا بات ہے ۔

موہن ۔ پنڈت جی ۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے صرف میں پدمنی کی جائداد آگئی ہے ۔ لیکن میں نے اڑے وقت پر مدد نہ کی ۔ اور پناہ نہ دی ۔ اور اب اگر اپنی مصیبت کے وقت اس کی جائداد سے فائدہ اٹھاؤں ۔ تو کیا گنہگار ٹھہروں ؟ آپ ہی انصاف کیجئے ۔ میں نے گوپی کا کچھ نہیں دبا رکھا ۔ اس کا کچھ روپیہ پیسہ نہ تھا ۔ اب پھر یہ الٹی زبردستی کیسی ؟ پدمنی گوپی کی جاگیر کے دستاویز مانگتی ہے ۔ جب جائداد ہی نہیں تو دستاویز کہاں سے آئے ؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا ۔

گرو انند ۔ پدمنی کیا بھائی کا بیان سچ ہے ؟

پدمنی ۔ پنڈت جی ۔ یہ انصاف کا آسن ہے ۔ پہلے آپ پر بیٹھ جائیے اور پھر میرا بیان سنئے ۔ میں آج بہن بن کر نہیں بلکہ مظلوم بن کر فریاد کرنے آئی ہوں ۔ آسن پر بیٹھئے اور ذرا یاد رسی کیجئے ۔ موہن ! اگر تیری رگوں میں چھتری خون ہے تو سچ کہہ کیا گوپی کا کچھ ترکہ نہ تھا ؟ کیا تجھے شرم نہیں آتی کہ ایک بیوہ بہن کے ترکے کو پامال کرنے کے بعد ایک یتیم بچے کی حق تلفی کرنا چاہتا ہے ؟ سر جھکائے زمین پر کیا دیکھ رہا ہے ؟ اگر تجھ میں باپ دادا کی ذرا بھی حمیت باقی ہے تو سر اٹھا کر چھتریانہ غرور کے ساتھ اپنی زبردستی کا اقبال کر۔ سچ کہہ ۔ کیا تیرا ارادہ امانت میں خیانت کرنے کا نہ تھا ؟ چھتری بچے جوانمرد ہوتے ہیں ۔ خدا نے تجھے قوت و صحت عطا کی ہے کہ تو اپنی عمر کمزور اور بے بس لوگوں کی مدد میں صرف کرے نہ یہ کہ لاوارث اور بیکس مسکینوں کے مال پر ناجائز نظر رکھے ۔ تیری عقل پر بے ایمانی کا پردہ پڑا ہے ۔ تیرا ایمان متزلزل ہو چکا ہے ۔ تیری آنکھیں جذبات حیوانی کے نشے میں مخمور ہیں ۔

" شہد میں جیسے مگس ہم حرص میں پابند ہیں ۔
آہ افسوس اس سیاہ زندان میں یوں خرسند ہیں "

تیری حالت زار مجھے خون کے آنسو رلاتی ہے ۔ ابھی وقت باقی ہے ۔

اپنے خواب غفلت سے بیدار ہو اور آنکھیں کھول کر دیکھ کہ دنیا میں کیا ہو گیا اور کیا ہوا جاتا ہے ۔ تو کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے ۔

" اٹھو ورنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی ۔ دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا "

میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے ۔

میں نے تیرے ساتھ جو کچھ کیا اس کا خدا شاہد ہے ۔ دیکھو کفران نعمت انسان کی کمینہ خصلتوں میں سے ہے ۔ ایسی حرکت نہ اختیار کر کہ چھتری قوم کو بٹہ لگے ۔ اب سب کے آگے خدا کو شاہد کر کے کہتی ہوں کہ موہن گوپی کو اپنے آبائی ترکہ سے محروم رکھنا چاہتا ہے ۔ اس نے مجھے گوپی کے نام کے کاغذات دینے سے انکار کیا ہے ۔ لیکن پھر بھی مجھے امید ہے کہ اگر وہ اپنا معاملہ نظر غور سے کرے تو معلوم ہو کہ اس کی اس ناسمجھی کی زبان نے کس طرح اس کے دھرم ۔ ایمان ، اور عزت کو برباد کیا ہے ۔ یہی ایک گوشت کا پارہ کذب و افترا کا آلہ ہے ۔ فحش بکنے کا وسیلہ اور عناد و فساد کی بنیاد بنی ہے ۔ اگر اس کو اپنی زبان پر قابو ہوتا اور اپنے ضمیر کی ملامت آمیز آواز کو سنتا اور سننے سے پرہیز کرتا تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا اس بیٹے نے اس کے

اخلاق کو بگاڑا۔ اس کی صحت کے درپے ہوئی۔ اس کے
دل سے خدا کا خوف اور دنیا کا لحاظ مٹ گیا۔ ساقی اس کا خدا
اور مے خانہ اس کا مندر بنا۔ نہ بیوی کی فکر رہی نہ دھرم کی لاج
دو دو دن گذر جاتے۔ گھر میں آگ نہ جلتی۔ اور آپ ہیں کہ گھر
آنے کا نام نہیں لیتے۔ بیوی مر جائے۔ جائیداد نیلام چڑھے۔
یا ناموس خاندان برباد ہو۔ اسے کسی کی پروا نہیں۔ پنڈت جی
جو کچھ کہنا تھا کہہ چکی۔ اب انصاف آپ کے ہاتھ ہے۔ آسن
پر بیٹھے ہو۔ اس کے مقدس نام کی لاج رکھئے۔ اور انصاف
کیجئے۔

گرداننداٗ۔ ست نرائن۔ رتن ناتھ۔ تم نے تو دونوں
کا بیان سنا ہے۔ کہو تمہاری کیا رائے ہے۔ ارے بیٹا ذرا دیکھو
تو، دروازے پر کوئی کنڈی کھٹکھٹا رہا ہے۔

رتن ناتھ اٹھ کر جاتے ہیں۔ اور تھوڑی دیر میں ایک
شخص کو ساتھ لئے واپس آتے ہیں۔ اپنی وضع قطع سے
کوئی خانگی ملازم معلوم ہوتا ہے۔ سب کو جھک کر نمسکار کرتا ہے۔
اور پھر موہن کو مخاطب کر کے کہتا ہے:۔

ملازم۔ بابو جی میں سہارنپور سے آیا ہوں۔ اگر آپ
کی اجازت ہو تو پیام سناؤں۔

موہن۔ ہاں کہو۔ کیا ہے؟ سب خیریت سے
ہیں نا؟

ملازم۔ سب خیریت سے تو ہیں لیکن

موہن۔ تمہارا پس و پیش کرنا مجھے اور تکلیف دیتا ہے۔
کہو کیا ماجرا ہے؟۔

ملازم۔ کاش! میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ جو آج اس شبہ
کا سامنا ہوتا۔ (گرداننداٗ) ارے تو کہے گا بھی کہ نہیں؟

ملازم۔ کیا کہوں سرکار۔ پریلا دیوی نے جس وقت
قرقی اور نیلام کی خبر سنی تو اسی شب کو سنکھیا کھا کر دنیائے دنی کو
خیرباد کہا۔

موہن۔ کیا؟ پریلا؟!

ملازم۔ ہاں۔ اور جس وقت لاش پہ آگ دی
گئی۔ اس وقت بھگوان جانے کہ بسنت بابو کہاں سے دوڑتے
ہوئے آئے اور اپنی ننھی سی جان آغوش مادری کی بھینٹ قربان کر دی۔

موہن پہ پھر سکتہ زار۔ قطار رونے لگتا ہے۔ [illegible] سب
اس کیفیت سے متاثر ہو کر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔

"اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے۔ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے"

چند لمحوں تک سب پر سکوت طاری رہتا ہے۔ پھر
پنڈت جی موہن سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:۔

گرداننداٗ۔ موہن بیٹا۔ بے شک تمہاری حالت
بہت قابل رحم ہے لیکن احکام ایزدی کے آگے انسان کی
کیا مجال ہے کہ خلاف ورزی کچھ کر سکے۔ یہ صدمہ جانکاہ ہے۔
لیکن پھر بھی مجھے امید ہے کہ یہ صدمہ جانکاہ تمہاری زندگی
میں ایک نیا ورق الٹے گا۔ اور تم اپنی آوارہ گردی اور نشے
سے باز آؤ گے۔ دیکھو خدا کے قہر سے بچو۔ اس کی خلاف مرضی
تم نے یہ سب کچھ کیا اور نتیجہ بھی دیکھ لیا۔ نشے پر مستی میں اتنے
ہوئے کہ معبود حقیقی کی یاد دل سے محو ہو گئی اور تم ہلاکت
ذلت و معصیت کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ اب پرمیشور
نے تمہاری آنکھیں کھول دی ہیں۔ تم دونوں کے بیان
سے تو کچھ نتیجہ ہی نہیں نکلتا۔ ایک دوسرے کی بات کو [illegible]
ہو۔ سچ کیا ہے خدا ہی جانتا ہے۔ [illegible]
حق تلفی [illegible] سے باز آؤ۔ [illegible] تمہارے حق [illegible]

سود مند نہ ہوئی۔ اب اس کی خاطر ایک معصوم بچے کے مال پر نظر خیانت نہ ڈالو۔ پریملا۔ اور بسنت کی موت سے عبرت حاصل کرو۔ غور کرو کہ یہ دو کس کے ظلم کے کشتہ ہیں۔ تمھاری مئے نوشی اور بے اعتنائی نے دو کا خون کیا۔ اب بیوہ بہن اور یتیم بھانجے کی آہوں کا کھٹکا نہ ہو۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ غلطی ہر انسان سے ہوا کرتی ہے۔ لیکن خدا نے تمھیں عقل سلیم عطا کی ہے۔ اس سے کام لو۔ اور اس کے آگے سر جھکا کر عفو کے خواستگار ہو۔ وہی سب کا پتا و ماتا ہے۔ اسی کے کرپا پر دنیا چلتی ہے۔

باب چہارم

ایشور تو ہے دیالو ☆ دکھ دور کر ہمارا

تیری شرن میں آیا ☆ پربھو دیجئے سہارا

موہن اٹھ کر کمرے میں جاتے ہیں۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ایک پوٹلی اور چند کاغذات لاکر پدمنی کے آگے رکھ دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔

"پدمنی خدارا مجھے معاف کرو۔ میں نے تمھارے ساتھ بہت ظلم کیا۔ اور یہ تمھارے دستاویز اور زیور بھگوان کو گواہ رکھ کے ان سب کے آگے کہو کہ تم نے مجھے معاف کیا۔ ورنہ ابھی جان دے دوں گا۔ دنیا میں میرا اب کوئی نہیں رہا تو پھر اس ہستی کا نابود ہو جانا ہی بہتر ہے۔ دیکھو میری حالت زار پر رحم کرو۔ اور مجھے معاف کر دو۔ تاکہ میری روح کو آنند ہو۔"

پدمنی آگے بڑھتی ہے۔ اور دونوں بھائی بہن لپٹ کر بہت دیر تک روتے ہیں۔ سب پر ایک سکوت چھا جاتا ہے۔ اور پھر پدمنی آنچل سے آنسو پونچھ کر کہتی ہے۔...

پدمنی۔ میں آج اپنے آپ کو دنیا کی سب سے خوش قسمت ہستی سمجھتی ہوں۔

کیوں؟ اس لئے کہ آج میرے بھائی کی نئی زندگی کا پہلا دن شروع ہوتا ہے۔ وہ آج دنیا کی نظر میں ایک مفلس قلاش تصور کیا جاتا ہے۔ نہ اس کے پاس دولت ہے۔ نہ عزت۔ نہ رفیق زندگی ہے نہ راحت جان فرزند۔ لیکن پھر بھی میں اسے سب سے زیادہ خوش نصیب سمجھتی ہوں۔ اس لئے کہ اس نے سب کچھ کھو کر ایمان کو حاصل کیا۔ اگر اس کا ایمان پکا رہا تو اسے دنیا میں کسی کا ڈر نہیں۔ یہ فانی چیزیں اسے پھر مل سکتی ہیں۔ موہن۔ اب اس ایمان کو جان شیریں سے عزیز سمجھ۔ اور راہ راست پر قدم جمائے رکھ۔ خدا جو کچھ دیتا ہے اس پر قناعت کر۔ اور سجدۂ شکر بجالا۔ ہاں۔ یہ زیور میرا نہیں پریملا کا ہے۔ کیا تیرا ارادہ یہ ہے کہ میں زیور کو پہن کر جیتے جی گناہ کی آگ میں جلوں؟ مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ لے یہ رکھ جب کوئی تیری آئیگی تو پہنے گی۔ لیکن کیا بات ہے کہ میرا دل اس کی گواہی نہیں دیتا کہ پریملا کی خبر سچ ہے۔ اگر خدا کی مرضی ہے تو یہ خبر ضرور جھوٹ ہوگی۔ کیسے معلوم تیرے ہزار دشمن ہیں۔ شاید انہیں کی سلگائی ہوئی یہ آگ ہو۔ کچھ بھی ہو جب تک کوئی خط سہارنپور سے نہ آئے میں کبھی اس خبر کو سچ نہ مانوں گی۔

ملازم۔ سرکار۔ مجھے خدارا معاف کیجئے۔ میں نے یہ جو کچھ خبر سنائی ہے غلط ہے۔

گروانند۔ غلط! اس سے تمھارا مدعا کیا ہے؟

ملازم۔ پنڈت جی واقعہ یہ ہے کہ میں اور میرا ساتھی جگت سنگھ اس موضع کو (ترک مسکرات) کی کمیشن پر آئے ہوئے ہیں زمانہ قیام میں ہمارا یہی مدعا رہا ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح یہاں

کے حالات سے بخوبی واقف ہوں۔ اور لوگوں کو مے سے
پرہیز کرنے کی ہدایت کریں۔ ہمارے آنے کے بعد ہی بہت سے
مے خانے۔ قہوہ خانوں سے مبدل ہوگئے ہیں۔ پرسوں
رات کو ہم دونوں یونہی ٹہل رہے تھے کہ کہیں کہیں رات کی
تاریکی میں تو مے نہ فروخت ہوتی ہو۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک
عورت گود میں ایک نوعمر بچہ کو لئے جلد جلد قدم اٹھائے جا رہی
ہے۔ ہم بھی پیچھے ہو لئے۔ اور شروع سے اب تک تمام
واقعات کو دیکھتے آئے۔ جس وقت آپ لوگوں میں
باتیں ہو رہی تھیں اس وقت میرے ساتھی باو جگت سنگھ محلہ داروں
سے بابو موہن راؤ کے خانگی حالات دریافت کر آئے۔ اور
صلاح دی کہ میں اندر پہنچ کر یہ من گھڑت قصہ سناؤں۔ اور اس
کے اثر کو دیکھوں ۔ غرض میں نے گڑھی کہانی کہی۔ اور اس
کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ کو معلوم ہے۔ بمصداق۔

دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز

ہمارا منشا یہ تھا کہ کسی طرح اندر تک پہنچیں اور ایک
معصوم ہستی کو قعر ذلت و معصیت میں گرنے سے بچائیں۔
اب آپ لوگوں پر ظاہر ہے کہ مے کا اثر انسان کے
تمام قوا پر ہوتا ہے۔ صحت مختل ہو جاتی ہے۔ بری صحبتوں
سے سابقہ پڑتا ہے۔ مہذب مذاق فحش گوئی اور کمینہ خصلتی سے
بدل جاتا ہے۔ فضول خرچی اور آوارگی طبیعت میں پیدا
ہو جاتی ہے۔ انسان سے اصلی شرم و حیا رخصت ہو جاتی
ہے۔ نہ اس کو دنیا کی پروا اور نہ دین کا لحاظ رہتا ہے
اس کے نشے کی کیفیت جام ایک نئی دنیا پیدا کر دیتی ہے۔
اسی شراب نوشی کے باعث ہزاروں خاندان تباہ اور لاکھوں
گھر اجڑ گئے۔

بابو صاحب نہیں اب شکریہ الہٰی ادا کرنا چاہئے کہ تمہاری
زندگی کی کشتی تباہ کن طوفان سے بچائی گئی ہے۔ آپ کی جانثار
بیوی اور نور عین بسنت خیریت سے ہیں۔ انہیں یہاں کی کچھ خبر نہیں۔
اب ہم آپ سے اس بات کی التجا کرتے ہیں کہ آپ ہماری کمیٹی
کی کامیابی کا بیڑا اٹھائیں اور جس طرح آپ کی زندگی میں
ایک خوش آئند انقلاب پیدا ہوا ہے اسی طرح اپنے ہم
وطنوں کی زندگی میں انقلاب پیدا کریں۔ کتنی ہستیاں ہماری
غفلت کے باعث بحر معصیت میں غرقاب ہوئی جاتی ہیں۔

"سرخرو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد"

القصہ بابو موہن راؤ نے بہت ہی کم عرصہ میں اپنی محنت کی
کمائی سے اپنی معاشرتی حالت کو سنبھالا۔ بیوی اور بچہ کو میکے سے
لے آئے۔ اور اب خانگی زندگی کی نعمتوں سے لطف اٹھا رہے
ہیں۔

رامپور جاؤ تو ہر ایک بچے کی زبان پر بابو موہن راؤ کا
نام سنو گے۔ وہی جو اس نئی پود میں ایک تازہ روح
پھونک رہے ہیں۔ ان کی زندگی ایک خوش آئند نمونہ
ثابت ہوئی ہے۔

اب اسی گھر میں جہاں خانہ جنگی، بے ایمانی،
اور نکبت و افلاس برستا تھا۔ وہاں۔ اتحاد، محبت،
صداقت، حق شناسی اور حق گوئی کی سچی تصویر
نظر آتی ہے۔

خورشید بیگم

ہندوستان کا رسم الخط

مجھے اکثر مدارس دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے ان مختلف
زبانوں کی تعلیم کو جاری رکھنے کے لئے جو انتظامات اور اہتمام دیکھنے
میں آتا ہے وہ دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طریقہ سے
مدارس کے اخراجات بھی زیادہ ہوتے ہیں اور معلموں اور بچوں کے
اوقات بھی ضایع ہوتے ہیں۔ مختلف قسم کے رسم الخط کو سیکھنے میں
جو محنت بچوں کو اٹھانی پڑتی ہے اس کا اثر آئندہ طلباء کی اس
دماغی نشو ونما اور عملی قابلیت پر پڑتا ہے۔ جو کہ فراغت تعلیم کے
بعد ان کو حاصل ہونی چاہئے تھی۔ اور جو اخراجات کسی مدرسہ میں
مختلف زبانوں کی تعلیم پر صرف کئے جاتے ہیں۔ اگر جملہ تعلیم
ایک رسم الخط میں رکھی جائے تو اتنے ہی اخراجات سے موجودہ
تعداد سے چار گنا زیادہ طلباء کو تعلیم دی جا سکتی ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ مختلف زبان اور رسم الخط کو سیکھنے
کے لئے مختلف فرقے اپنی اپنی کلاس میں حاضری دیتے ہیں۔
لیکن انگلش کی کلاسوں میں سب ہی بچے شرکت کرتے ہیں۔ لہٰذا
انگلش میں ان کا تعلیمی نصاب رکھ کر دیگر مقامی زبانوں کے لئے
رومن رسم الخط رکھا جائے اور رومن رسم الخط ہی میں ہندوستانی
زبان کی تعلیم دی جائے تو ہماری مشکلات رفع ہو سکتی ہیں۔
ابتدائی جماعتوں میں انگلش نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ رومن رسم الخط
میں ہندوستانی یا مقامی زبان کی بھی حسب ضرورت تعلیم دی
جا سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بچے بہت قلیل مدت میں
تمام نصاب ختم کر لیں گے اور علم سے بہرہ ور ہو کر
ان کو اعلیٰ قابلیت حاصل کرنے غور و خوض کر کے اپنی دماغی
قابلیت کو بڑھانے کا موقع ملے گا۔ سچا ہے ہیں کہ مختلف
... بچے ... اور ان کے ... ترجمہ کرنے میں مالی
... ہے۔ ملک کا جو روپیہ انگلش سے بڑی بڑی
کتابوں کے دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے میں صرف ہوتا ہے
وہی روپیہ تعلیم کے ملک میں پھیلانے میں لگایا جا سکتا ہے۔

اب رہی عوام الناس کی رائے کہ ہماری زبان کو کیسے چھوڑیں
یہ محض ایک ہٹ ہے۔ جب ایک فرقہ اپنی مادری زبان کو نہیں
چھوڑنا چاہتا۔ تو دوسرا فرقہ بھی اس کے مقابل میں مادری زبان
کے لئے اڑ جاتا ہے۔ بدنصیبی سے جب کہ مادر وطن کی ایک زبان
ایک رسم الخط ہی نہیں ہے تو پھر میرے خیال میں مادری زبان
کا دعوے ہی بے بنیاد ہے۔ ہم کو تو وقت اور اس کی ضرورت
کو دیکھنا چاہئے۔ جو طریقہ ہماری زندگی کی ضرورت کو پورا کرنے
میں مدد دیتا ہے اور سہولت پیدا کرتا ہے۔ اس کو اختیار کرنے
میں کبھی بھول یا دیر نہ کرنی چاہئے۔ آپ یاد کیجئے کہ ابتدائے
آفرینش سے اب تک خدا جانے ہم نے کتنی زبانیں بدل دی ہیں
اور حقیقت میں ایک انسان کی قدرتی زبان کیا ہو سکتی ہے یہ نہیں
معلوم فرض کیجئے کہ ایک بچہ کو جنگل میں چھوڑ دیا جائے۔ تو وہ
کونسی زبان بولے گا۔ اور ہم لوگ ضرورت اور مصلحت کے لحاظ سے
اپنا لباس تبدیل کر دیتے ہیں۔ خوراک بدل دیتے ہیں۔ مکان کا نقشہ
بدل دیتے ہیں مقام رہائش بدل دیتے ہیں تو رسم الخط کیا ہے اس کو بدلنا کیا مشکل ہے۔
جب اس کے بدلنے سے ہماری بڑی بڑی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں ہندو مسلم
میں اتحاد ہو جاتا ہے، رومن رسم الخط میں اگر اردو ہندی ایک ہو جاتی ہے۔
مختلف فرقے اور صوبہ جات اس کو بغیر استاد کی مدد کے پڑھ سکتے ہیں اور ایک
دوسرے کی زبان سمجھنے کے قابل بن سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں رومن رسم الخط
آج ساری دنیا کا رسم الخط ہے البتہ خاص طور پر اس کا عالم بننے والوں
کے لئے یونیورسٹیوں میں مختلف زبانوں کے رسم الخط کو جاری رکھا جا سکتا
ہے لیکن عام طور پر تعلیم پانے والے بچوں کے لئے تو سہولت پیدا کرنا چاہئے۔
آخر میں میری یہ استدعا ہے کہ کم از کم ایک اسکول میں اس طریقہ کا نمونہ قائم کیا جائے
اور دیکھیں کہ اس کا نتیجہ کیسا مفید ثابت ہوتا ہے مسٹر ڈی برکت رائے

کہ ایک گھنٹہ اندر بارہ پہنچا خوراک حلق میں ڈال دی جائے۔ شاعر کہتا ہے کہ

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

اس شعر کے پڑھنے کے بعد حکیم صاحب نے مجمع پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ ہر شخص متوجہ تھا اور وہ دوا دیکھنے کے لئے بے قرار تھا۔ اس نے تین چار شیشیاں ہاتھ میں لے کر سب کو بتائیں اور پھر اس طرح تقریر شروع کی، کہ

منزو! اس دوا کے کھاتے ہی جوع البقر ہو جاتا ہے یعنی بھوک اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ انسان کنکر پتھر چبانے شروع کر دیتا ہے اور معدے میں اتنی گرمی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ لوہے اور پتھر کے ٹکڑوں کو بھی ہضم کر جاتا ہے۔ یہ دوا دیابیطس، کھانسی، نزلہ، زکام، درد سر، درد دل، درد جگر، امراض چشم، امراض کبد، پلیگ، ہیضہ، کالا بخار، لال بخار، گردن توڑ بخار، غرض یہ کہ جملہ امراض انسانی اور حیوانی، جسمانی اور روحانی کے لئے نسخہ مجرب المجرب اور سریع التاثیر ہے۔

دوستو! اشتہار بازوں کی زہریلی اور خطرناک دواؤں سے بچو۔ ڈاکٹر اور حکیموں کو فیس دے دے کر اپنا روپیہ برباد نہ کرو۔ اگر تمہارے بردوں میں نین اور گردوں میں آنکھیں ہیں تو اس دوا کو خود سے دیکھو جس کو میرے گرو جی نے ہمالیہ پربت کی سب سے بلند چوٹی پر بیٹھ کر جس دم کا عمل سادھ کر تین سو سال ریاضت کرنے کے بعد خاص دیسی بوٹیوں سے تیار کیا ہے۔ مسلمان بھائیوں کو ایمان کی قسم اور ہندو بھائیوں کو دھرم کی سوگند دے کر کہتا ہوں کہ یہ دوا سرتا پا دیسی ہے جس کی تصدیق تو سب کر رہے ہیں۔ اس میں ہزاروں دیسی بوٹیوں کے علاوہ دو بیر بہوٹیاں، بارہ تولہ شہد، اٹھارہ تولہ رس کپور، اٹھارہ تولہ گھٹا، وتر تولہ نیش عقرب اور پندرہ تولہ خالص دیسی زہر دن کی روح ہے، جس کو صاف کرنے میں منفرد کر کے تانکہ نچوڑ کر روغن تیار کیا گیا ہے۔

اگر کسی کے معدے میں گیس اور دماغ میں خبس بھر گیا ہو، یا خدانخواستہ دل کی جگہ جگر اور جگر کی جگہ مثانہ منتقل ہو گیا ہو تو چلو آگے بڑھو اور نین بند کر کے اس دوا کو نوش جان کر جاؤ۔ شاعر کہتا ہے کہ

وقت پر قطرہ بہت ہے ابر خوش انجام کا
جل گئی کھیتی اگر برسا تو پھر کس کام کا

دوستو۔ اس دوا کی دوسری تاثیر یہ ہے کہ اس کی ایک قطرہ پتھر کو پانی اور پانی کو خون بنا دیتی ہے۔ یہ دیکھئے آپ کے سامنے اس گلاس میں جل ڈالتا ہوں، ذرا نین جما کر دیکھئے اور بتائیے کہ اس کا رنگ کیسا ہے؟

تمام لوگوں نے پانی کو غور سے دیکھ کر کہا کہ جناب اس کا رنگ سپید ہے۔ اس کے بعد حکیم صاحب نے کوئی سپید رنگ کی دوا ڈال دی جس سے پانی بالکل لال ہو گیا۔ اور کہا بھلا بتاؤ کہ اب اس کا رنگ کیسا ہو گیا لوگوں نے بغور دیکھا اور کہا کہ اب اس کا رنگ لال ہو گیا۔ حکیم صاحب یہ سن کر اکڑ گئے پھر مونچھوں پر تاؤ دے کر نہایت فخریہ لہجہ میں فرمایا کہ

ہاں! لال ہو گیا یعنی پانی مثل گلال ہو گیا یہ دیکھو جادوگر کمال ڈالے سپید نکالے لال۔

دوستو جس طرح دوا کے ایک قطرہ نے پانی کو خون بنا کر رکھ دیا۔ اسی طرح وہ روگی ضعف نے جس کا خون نچوڑ کر زرد پتی کی طرح زعفرانی کر دیا ہے ایک خوراک میں اس کے جسم میں شراب ارغوانی کی طرح سرخ خون دوڑنے لگے گا، جسم کندن کی طرح چمکنے لگے گا اور چہرہ چقندر کی طرح لال ہو جائے گا۔

دوستو! میرا دعویٰ ہے کہ سو برس کا بڈھا کھوسٹ ایک خوراک میں بیس برس کا نوجوان گبرو بن جائے گا۔ یہ دوا ہندو ہو یا مسلمان عیسائی ہو یا پارسی، کوتاہ بڑھ ہو یا ٹانگ کا آیر ٹیٹر۔ روگی ہو یا تندرست، بیمار ہو یا تندرست، مردہ ہو یا زندہ سب کے لئے یکساں مفید ہے

خوب وہ گنتے رہے خدا معلوم ان بے چارے خریداروں پر کیا گزری مگر ہمارے حکیم جی کے پو بارہ ہو گئے اور جو روپے گننے کے بعد بچ رہا کچھ اوپر تیس کا تھا اور خوب وہ بینڈ بجا کے (یہ مضمون حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا تھا) میں چھنک رہا تھا۔ یہ ہے ہمارے حکیم کی سرگزشت اور اسی کو چلتی ہوئی حکمت کہتے ہیں۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

سوتیلی ماں

(ادارہ کی ایک دلچسپ زیرِ طبع کتاب کا ٹکڑا)

بڑے بوڑھے کہا کرتے ہیں کہ "ماں" کہنے میں دونوں ہونٹ مل جاتے ہیں جو دلیل ہے اس بات کی کہ یہ رشتہ تمام تعلقات سے قریب تر و شیریں تر ہے کوئی شک نہیں کہ اس رشتہ کی شیرینی جیسی لب بند کرنے والی، اس کی قربت جیسی روح کو بالیدہ بنانے والی ہے کوئی تعلق کوئی رشتہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر تو انہیں کو ہو سکتی ہے جو اس کو کھو چکے ہوں۔ ماں کا وجود سراپا رحمت اور اس کی محبت کا خوش اثر و نیک انجام ہونا یقینی ہے برخلاف اس کے سوتیلی ماں کا رشتہ تمام رشتوں میں بعد و تلخی کے اعتبار سے زبان زدِ خاص و عام ہے اس کا تلخ تعلق ہمیت سے ملا اس کی قربت کا ہشِ جان، اس کی ہستی ہمہ تن زحمت اس کے طرزِ عمل کے تاثرات کا بدنتیجہ ہونا امرِ حقیقی خیال کیا جاتا ہے۔ سوتیلی ماں وہ پرہول ارتعاش انگیز موقع ہے جس سے روح دہل اٹھے وہ حسیات سے عاری سنگین مجسمہ ہے جس کو لطیف سے لطیف جذبہ بھی متاثر نہ کر سکے وہ ایک ایسی مشین ہے جو اپنے ہی کل پرزوں کو پارہ پارہ کرکے رکھ دیتی ہو۔ ایک ایسا شکنجہ ہے جو قریب تر ہی آنے والے کو پیس ڈالے۔ طوفان خیز بارال اور خرمن سوز بجلی۔ غرض سوتیلی ماں کو جو بھی کہئے عام ذہنیت کا اس پر صاد ہے سوتیلی ماؤں کی حیثیات جداگانہ ہیں۔ مگر اس وقت میری مراد ایسی سوتیلی ماں سے ہے جو بچوں کی ماں کے فوت ہونے پر لائی گئی ہو۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سوتیلی ماں اور بچوں کے تعلقات کے ناگفتہ بہ نتائج ظاہر ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں۔ اگرچہ موجودہ تعلیم سے آراستہ اور مہذب دور میں بے شبہ اس کے پیکر نے بھی ایک اصلاحی جامہ زیبِ تن کر لیا ہے۔ مگر "خاموش ہیں گوشۂ دل چور ہوئے ہیں" یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اکثر و بیشتر گھروں میں اس تعلق کے ناخوشگوار اثرات ہر متعلقہ ہستی کے لئے عذابِ جان اب بھی بنے ہوئے ہیں۔

اگرچہ متعدد اصحاب موضوعِ بالا پر طبع آزمائیاں کر چکے ہیں۔ مضامین لکھے گئے افسانے تحریر ہوئے ناولوں پر خامہ فرسائیاں کی گئیں۔ مگر اتنا کہنے پر میں مجبور ہوں کہ سب بس ایک لکیر کو پیٹتے رہے ہیں کہ سوتیلی ماں آئی باپ اس کے ہاتھ میں کٹ پتلی بن گیا اس نے بچوں کے ساتھ ظالمانہ بہیمانہ سلوک شروع کر دیا۔ کوئی بچہ راہیٔ عالمِ بقا ہوا۔ کوئی دائم المریض بن کر عمر بھر کے لئے بیکار ہو گیا۔ کسی کو ایسی سسرال اور شوہر کے حوالے کر دیا گیا جو اس کے لئے دوسرا جہنم ثابت ہوا کسی کو محروم الارث کرکے ویران و سرگرداں کسمپرسی میں چھوڑ دیا گیا۔ بہرحال وہ ستمگارانہ درندگیاں کہ الامان الحفیظ!

یہ باتیں خالی از صداقت اور مبالغہ بے بنیاد ہرگز نہیں۔ بلاشک سیکڑوں معصوم ہستیاں سوتیلی ماؤں کے دستِ ستم کی بھینٹ چڑھ گئی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ اس کی ذمہ دار کیا صرف ایک اس کی ہستی ہے۔ اگر اسی کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کے انسداد کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ اس ہستی کو خارِ راہ بننے ہی نہ دیا جائے۔ صاحب اولاد اشخاص کی

ماں کے اتلاف کے بعد اپنی زندگی بچوں کے لئے وقف کر دیں مگر ایسا نہیں ہوا۔ نہیں ہوتا اور فطرتاً نہیں ہو سکتا۔

جب یہ رشتہ ناگزیر ہے تو پھر یہ امر غور طلب ہے کہ وہ کونسے اسباب اور وہ کون کون ذمہ دار ہستیاں ہیں جو اصل الاصول اور جن کے کندھوں پر اس رشتہ کے شیریں و خوش گوار یا تلخ و ناگوار بنانے کا بوجھ ہے سب پہلی چیز ہے۔

(۱) ارث و ماحول۔ جس گھر میں انسان پیدا ہوتا جس فضا میں پلتا بڑھتا ہے اُس کے اثرات نہایت استحکام و پختگی کے ساتھ اس کے دل و دماغ میں جاگزیں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وراثت کے تواتر و مداومت سے فطرت انسانی طبیعت کا پیکر اختیار کر لیتی ہے۔ مشہور ہے کہ عادت طبیعت ثانی کا حکم رکھتی ہے۔ علم و جہل ظلم و رحم دانش و نافہمی، حق شناسی و ہٹ دھرمی، حق طلبی و حق رسانی، ایثار و خود غرضی، حسد و فراخ دلی، نفسانیت و نفس کشی، حرص و قناعت، وسیع الخیالی و تنگ نظری۔ ربوبیت و خود پروری۔ نیکی و حسن سلوک، ضبط و غصہ نرم کلامی و تیز زبانی، تحمل، شعلہ خوئی، مذہبیت و الحاد خوف خدا و ناخدا ترسی، شرم رسول و محاسبۂ نفس، فکر عاقبت و پاس دنیا یہ سب باتیں انسان اپنے ارث و ماحول سے اخذ کرتا ہے۔ اگر چہ اس کے متعلق ایک کلیہ نہیں قائم کیا جا سکتا۔ کیونکہ کبھی ولی کے پیٹ میں شیطان اور شیطان کے پیٹ میں ولی جنم لیتے ہیں نا اہلوں کی اولاد اہل اور صالحوں کی اولاد طالح نکلی ہے۔ برے ماحول اور بد طینتوں کی صحبت میں رہ کر بھی اکثر افراد مابہ الامتیاز کردار کے حامل ہوئے ہیں مگر الشاذ کالمعدوم۔

قوت اکثریت کو حاصل ہے اور اکثریت کلیہ کا حکم رکھتی ہے۔ ادبی مذاق رکھنے والے خاندان سے ادیبوں کی پیدائش روزمرہ مشاہدہ ہے۔ شریف النفس بزرگ سیرت اسلاف کے اخلاف بھی اکثر انہیں کے قائم مقام ثابت ہوئے ہیں۔ نیک طینتی وراثتاً پشت بہ پشت عجیب عجیب مظاہرے دکھاتی رہی ہے۔ جیسے حاسد موذی مستبد پست عادات بد اخلاق والدین کی اولاد کا بھی انہیں کے نقش قدم پر گام زن ہونا امر بدیہی ہے۔ سپاہی کا بیٹا سپاہی اور چور کا پوت بالعموم چور ہی نکلتا ہے۔ الغرض انسان جو کچھ اپنے ارث و ماحول سے حاصل کرتا ہے۔ اس پر ارادتاً نہیں بلکہ بلا ارادہ عامل ہونے پر مجبور رہتا ہے۔ پس نہایت ضروری ہے کہ یہ رشتہ قائم کرنے سے پیشتر فریقین اس امر کا بخوبی اطمینان کریں کہ جس خاندان میں وہ عمر بھر کے لئے سلسلۂ قرابت باندھ رہے ہیں وہ کس سیرت و کردار کے افراد، کیسے اخلاق معاشرا اور کن صحبتوں کے خوگر ہیں۔ لڑکی والوں کی ناقابل معافی غلطی ہے کہ شرافت ذاتی اور اوصاف [illegible] سے اغماض کر کے ہوس زر طلب امارت اور [illegible] کی خاطر دو زندگیوں کو بے چینی کی قربانی بنانے کا سبب بنیں۔ اس طرح فریق مقابل کا دوشیزگی۔ حسن و جوانی، مال و متاع، جائداد املاک منصب جاگیر۔ سونے موتی گھوڑے جوڑے کے لالچ میں وقتیہ حظ نفس و خیالی آسائش کے تحت چند معصوم جانوں اور ایک ناکردہ گناہ ہستی کو زہر جہنم میں ڈھکیل دینا انتہائی نفس پرستی غایت درجہ سنگ دلی اور خانہ انداز ورگند۔

کو تقویت دیتی ہے۔ ہر دو فریق کا فریضہ ہے کہ رشتہ یہ توازن احسن قائم کرنے کی بہ حد ممکنہ بہ غور و تدبر کوشش کریں کیونکہ مکارم اوصاف دنیائے معاشرت میں بجائے خود ایک زبردست ادیب اور کامیاب مصلح ظاہر ہوئے ہیں اس صورت خاص میں بھی فریقین کا شرف نفس اور علو کردار گھر کی دنیا کی کایا پلٹ دے سکتے ہیں۔

فطرت فطرتاً اس تعلق میں بعد و بیگانگت موجود ہوتی ہے۔ قرابت اور ان کی قربت کی جدا جدا حیثیات ہیں جنھیں فطری طور پر خوش گوار و شیریں مستحکم و پر از محبت بنانے والا خون کا جوش ہے جیسے اولاد ماں باپ بھائی بہن، نانا نانی، دادا، دادی، ماموں چچا، پھوپی اور پھر خالہ ماموں پھوپی چچا زاد وغیرہ۔ جوں جوں خون کا قرب کم ہوتا جاتا ہے تعلق خاطر بھی کم ہوتا ہے ظاہر ہے جن دو ہستیوں میں کوئی رشتہ ہی نہ ہو ان میں قلبی لگاؤ کیونکر پیدا ہو سکتا۔ مثلاً دو بیگانہ مرد یا دو بیگانہ عورتیں۔ ایک اجنبی عورت یا ایک اجنبی مرد ایک ناآشنا ہستی یا کئی ناآشنا ہستیاں۔ ان میں تعلق پیدا ہوتا ہے معاملے باہمی اور خارجی سبب سے جیسے میاں بیوی سوتیلی ماں اور بچے، دوست، احباب ہمسائے اہل ملک، اخوان ملت اس قسم کے تعلق کو خوش گوار بنانے والی چیز باہمی حسن سلوک اور رواداری ہے اور یہ اسی وقت ظہور میں آ سکتا ہے۔ جب کہ جانبین حق شناس و حق گذار ہوں۔ سوتیلی ماں اور بچوں کی کشیدگی تعلقات کی ایک بڑی وجہ ہم دگر فقدان حق شناسی اور عدم حق گذاری ہے۔

(۳) بچوں اور ماں کے عزیز و اقربا۔ دوست احباب، قدیم ملازم آیا، انا، دائی، میانی نوکر چاکر آنے جانے والے وغیرہ۔ ازاں جملہ یہ بالکل حقیقت ہے کہ ناخوش گواریوں کی تخلیق و پرورش میں بچوں کے عزیزوں کا بہت زیادہ دخل ہوتا ہے یہ وہ نکتہ ہے جس پر آج تک کسی کی امعانی نظر نہیں پڑی ہے۔ جس قدر یہ امر سرسری سمجھا گیا محض جذبات محبت پر محمول کیا گیا ہے اسی قدر اہم اور رسمی اثرات سے بھرا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ "محبت اندھی ہوتی ہے"۔ محبت کا اندھا پن جس قدر اس موقع پر خطرناک اور بد انجام ظاہر ہوتا ہے شاید ہی کسی اور موقع پر ہو۔ نادان دوست دشمن برابر۔ جانبین یعنی سوتیلی ماں اور بچوں کی آنکھوں پر خیر خواہی اور جوش محبت کے نقش و نگار کا پردہ ڈال جاتا ہے مگر درحقیقت وہ کھلی ہوئی [illegible] زہر ملے سانپ بچھوؤں سے پٹا ہوا جنگل ثابت ہوتا ہے۔ [illegible] کے آنے سے پیشتر ہی غم و الم ماتم و واویلا [illegible] جاتے ہیں۔ بچوں کو لپٹ لپٹ چمٹا چمٹا کر آنسو بہائے جاتے ہیں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے سانس بھرے جاتے ہیں۔ بدقسمت و بدنصیب بچوں کے نام سے ان کو خطاب کیا جاتا ہے۔ ان آوازوں سے ان کے کان بھرے جاتے ہیں کہ ہائے ان کی ماں جیتی ہوتی تو سوتیلی اماں کے ہاتھ میں جلنے بھننے کو کیوں پھنستے بچارے۔ ان میں باپ کی نظر پھیر دی گئی۔ اب گھر اس کا۔ اس کے خزانہ کا سانپ بن کے وہ بیٹھے گی ان کا حق پوچھنے والا کون ہے۔ باپ کا دوسری شادی کرنے کا خیال ہی پہلی سسرال میں ایسا زبردست گناہ تصور کیا جاتا ہے جو معاف کرنے کے قابل نہ ہو۔ نہ صرف ملنے بلکہ وہ صورت دیکھنے کے بھی لائق نہیں سمجھا جاتا

سوتیلی ماں کا نام تحقیر انگیز اور اس کا ذکر تنفر خیز ہوتا ہے
بچے سمجھنے لگتے ہیں کہ سوتیلی ماں کوئی آفت آسمانی اور
بلائے ناگہانی ہوتی ہے۔ ان احمقانہ ہمدردیوں کا یہ
نتیجہ ہوتا ہے کہ بچوں کے دل میں دہشت، نفرت، شبہ
عدم اعتماد، سرکشی اور نہ صرف بیگانگت بلکہ عداوت کے
احساسات جاگزیں ہوتے ہیں جن کا رشتے کے ساتھ ہی
عملی صورت میں اظہار شروع ہو جاتا ہے۔

آنے والی ماں کے دل و دماغ بھی انہیں خیالات
اسی قسم کی آوازوں سے بھرے ہوتے ہیں کہ باپ سوت
ہو سوت کے پوت نہ ہوں۔ سوتیلے بچے سانپ کے سنپولے
کبھی پنپنے نہیں دیتے۔ سوتیلے بچوں پر دینے سے تو
کنویں میں ڈھکیل دینا ہزار درجہ بہتر ہے کہ ایک ہی
دفعہ مر جائے گی۔ یہ ہر آن کے ملک الموت اور رات
دن کی جانکنی میں تو نہیں پھنسے گی۔ ماں بھی بچوں کو
لائق تنفر، ناقابل بھروسہ، آفت جان اور سد راہ مقاصد
خیال کرنے لگتی ہے۔ جب بلا سابقہ دونوں طرف سے
دل باہم مشتبہ و متنفر ہو جائیں تو پھر خوش دلی و رواداری
کے ساتھ نباہ کی گنجائش ہی کہاں باقی رہی! معاملے سے
پہلے ہی نفرت اپنا عمل شروع کر دیتی ہے اور شبہ اتنی
بھی فرصت نہیں دیتا کہ ایک دوسرے کو ٹھنڈے دل سے
حقیقی طور پر آزما ہی لیں۔ نہ صرف رشتہ کرنے سے
پہلے ہی اس قسم کی باتیں ہوتی ہیں بلکہ بچوں کے اعزا
بعد میں تو اور شدت کے ساتھ اس کو تلخ سے تلخ تر بنانے
میں حصہ لیتے ہیں یا تو ملتے ہی نہیں یا سلسلہ آمد و رفت
رہے تو آنے والی کو کھاتے پیتے پہنتے اوڑھتے خوش و خرم
دیکھ کر قسم قسم کے آوازے کستے ہیں اشارات کنایات
الفاظ میں ناگواریوں کا اظہار ہوتا ہے۔ حسرت و حرماں
رشک و حسد سوز و جلن کی نگاہوں سے اسے برمایا جاتا
ہے ایسے طعن طنز کئے جاتے ہیں کہ گویا مرنے والی سے
ان کے محروم ہونے کا اصل سبب وہی ہے۔ بچوں سے
ماں کی رفتار گفتار کردار برتاؤ کے متعلق عجیب نا روا
طریقے سے سوالات کئے جاتے ہیں۔ پند و نصائح کے دفتر
اس کے لئے کھول دئے جاتے ہیں کہ ہائے بے ماں کے
بچے ہیں ان کا دل نہیں دکھانا چاہئے خدا ناخوش ہوتا
ہے عرش کا کنگرہ ہل جاتا ہے "ساس مت کر برائی تیرے
آگے بھی ہے جائی" غرض سوتیلی ماں سے تو بہ شدت توقع
کی جاتی ہے کہ وہ بچوں کے لئے فرشتے سے بھی بالاتر ہو جائے
مگر کبھی بھولے سے بھی بچوں کو تو یہ نہیں دلائی جاتی کہ
انھیں ماں سے کس طرح پیش آنا چاہئے۔

کس قدر غیر منصفانہ خیال اور نا روا عمل ہے کہ
بچوں کی ماں تو ہر عیش عشرت آرام آسائش زینت
زیبائش۔ اقتدار اختیار کی بے تکلف مستحق جیسا سلوک
جس کے ساتھ وہ کرے۔ بر سر حق مگر اس کی جانشین
ان کے نقطہ نظر سے ہر چیز کی نہ صرف غیر مستحق بلکہ اس کو
اپنے تمام حقوق سے محروم ہو جانا چاہئے۔

علاوہ ازیں نانی، دادی، خالہ، پھوپی وغیرہ بچوں کی
حامی بن جاتی ہیں۔ اور بات بات میں پشتی لے کے ماں کے
خلاف انھیں سرکشی پر کھڑا کر دیتی ہیں یا ماں سے بالکل
الگ کر لیتی ہیں۔ گرچہ کہ اس عارضی علٰحدگی سے رشتہ تو
منقطع نہیں ہو سکتا ماں سے نہیں تو باپ سے تعلقات
گوارا یا ناگوار قائم رہتے ہی ہیں۔

رابعہ بیگم

بچوں سے

سب رس کے سال بھر میں کئی خاص نمبر نکلتے ہیں اس سال کا جنوری کا پرچہ بچن نمبر تھا جو اتنا مقبول ہوا کہ ہر ایک اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ابھی تک اس کی مانگ جاری ہے۔ اسی طرح آئندہ جنوری میں ایک اور خاص نمبر "اردو نمبر" کے نام سے نکلنے والا ہے۔ امید ہے کہ یہ نمبر دوسرے خاص نمبروں کی طرح کامیاب ثابت ہوگا۔ اس میں اچھے اچھے مضامین رہیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کئی اچھی نایاب تصویروں کا دلچسپ مرقع رہے گا۔ اس پرچے کے لئے ابھی سے مضامین لکھ کر بھیج دیجئے تاکہ آپ کے مضمون کے لئے بھی اس خاص نمبر میں جگہ نکل جائے۔

چند ماہ پہلے دو بہنوں کے پتے دیئے گئے تھے وہ برابر ایک دوسرے سے خط وکتابت کر رہی ہیں ایک بہن کا خط شایع کیا جاتا ہے جنھوں نے پہلی دفعہ ایک دوسری بہن کو خط لکھا تھا اس خط کا جواب آئندہ پرچے میں شایع کیا جائے گا۔ یہ خط اس لئے شایع کر رہے ہیں کہ آپ بھی پہلی مرتبہ کچھ اسی طرح لکھیں اور اس کی نقل ہمارے پاس بھیج دیں۔ وہ بھی شایع ہو جائے گا۔

اس ماہ ان دو بھائیوں کے پتے دیئے جاتے ہیں یہ ایک دوسرے سے خط وکتابت کریں اور پہلے خط کی نقل ہمارے پاس بھیج دیں۔

۱۔ محمد عارف علی انصاری مکان نمبر ۱۱۲۴ محلہ اردو شریف بلدہ (۲) سید نور القمر الدین بمکان سید نور العلی صاحب منصف جگاؤں ضلع نلگنڈہ۔

عارف علی انصاری کا مشغلہ مطالعہ ہے اور سید نور القمر الدین کا فوٹوگرافی یہ پتے اس لئے دیئے جا رہے ہیں کہ مطالعہ سے ہر ایک کو دلچسپی ہوتی ہے اور ہونی چاہیئے۔ یہ ایک دوسرے سے ضرور خط وکتابت کریں اور جب کوئی نیا بھائی شریک ہو جس کا مشغلہ وہی ہو جو ان کا ہے اس صورت میں ہم ان دونوں کو پھر دوسرے پتے دیں گے۔

خط

بہن شوکت! میں پہلے اپنا تعارف کرانا چاہتی ہوں اگر میں پہلے تعارف نہ کراؤں تو یقیناً آپ پریشان ہو جائیں گی اور ضرور اپنے دل میں کہیں گی یا اللہ یہ کون لڑکی ہے۔ ہاں تو میں آپ کی سب رسی بہن ہوں۔ بہن یہ تو ہمارے سب رس کے لوگوں کی نوازش ہے کہ آپ کو میری اور مجھ ناچیز کو آپ کی دوست اور بہن بنایا۔ میرا پورا نام حسن بانو فخر الدین ہے میرا اور آپ کا مشغلہ ایک ہی ہے۔ آپ کے پاس کونسے ممالک کے ٹکٹ ہیں اور آپ کن سے تبادلہ کرنا چاہتی ہیں مطلع کیجیے۔ میں ٹکٹ ہی نہیں بلکہ فلم سٹار کی تصویریں اور مونوگرام بھی جمع کرتی ہوں آپ کا ٹکٹ کے علاوہ اور بھی کوئی مشغلہ ہو تو معلوم کرا دیجیے۔ شائد میں کچھ مدد دے سکوں۔ میرے اور بہت سے دوست ہیں جن کے پتے ایک برادری کی طرف سے دیئے گئے ہیں (جس کی میں ممبر ہوں) وہ سب کی سب بہت اچھی ہیں۔ امید کہ آپ بھی اچھی ثابت ہوں گی جواب جلد دیجیے۔ فقط آپ کی سب رسی بہن

حسن بانو فخر الدین

"اگر آپ لوگوں کی خط وکتابت کامیاب طریقے پر ہو رہی ہے تو ہم ممالک غیر کے پتے بھی دیں گے۔

معین الدین احمد انصاری

حضرت

ایک ضلع کے مدرسے میں جو لڑکیوں کی تعلیم کے لئے تھا۔ طالبات بنڈی میں بیٹھ کر مدرسہ پہنچتی تھیں۔ تعلیم کا انتظام تو یاد نہیں کہ کیسا تھا۔ البتہ یہ یاد ہے کہ وہاں کی استانی کا نام تعظیماً حضرت بیگم رکھا گیا تھا۔ جس طرح لوگ آپا بیگم، خالہ بیگم، اماں بیگم پکارا کرتے ہیں۔ یہ ذکر کوئی دس پندرہ برس پہلے کا ہے۔

یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں تغیر ہوتا ہے اور یہ تغیر کبھی ترقی کی طرف مائل ہوتا ہے یا کبھی تنزل کی طرف۔ اسی اٹل اصول کے مطابق حضرت بیگم کا لقب بھی ترقی کرتے کرتے حیدرآباد پہنچا اور مسافت طے کرتے کرتے اس کا آخری لفظ "بیگم" گھس کر اتر گیا۔

اب یہاں ایک تعلیمی ادارہ ہے جس میں کئی حضرت ہیں ...... حضرت کے معنی ہیں۔ نزدیکی، حضور، درگاہ، محضر ہونا۔ نہ اس میں خالص مونث ہونے کا مفہوم نکلتا ہے نہ مذکر ہونے کا۔ لیکن اس کے باوجود غالباً صنف لطیف کی تخصیص کے لئے "حضرت" کی عجیب و غریب اصطلاح کا رواج پڑ گیا ہے۔ جس کی کرختگی کو اصحاب ذوق بھی محسوس کرتے ہیں۔ اس میں شاید صنف لطیف کے متعلق تعین پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ورنہ جب زنگی کا نام کافور رکھا جا سکتا ہے تو اس تنگ نظری کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ کم از کم میرا تصور "حضرت" کے متعلق یہ ہے کہ اس مقام پر لقب کے حامل وہی لوگ ہوا کرتے ہیں جن کے سر پر عمامہ بمقدار علم و عمر رہا ہو، آنکھوں پر موٹے شیشے کی نہیں تو کم از کم باریک شیشے ہی کی عینک چڑھی ہو۔ جس کو نریم چاندی کا ا... کہیں کہیں سے سبزی مائل ہو ــــ کرتا ململ کا گلے پر چنا بنی ہوئی اور کاندھے پر کاج جس میں کپڑے کی گھنڈیاں لگی ہوئی ہوں۔ پورے آدھے تھان کا پائجامہ۔ ہاتھ میں جریب ہو اور پاؤں میں اپاشاہی جوتا۔ یہ ان بزرگوں کا خاکہ ہے جن کو صدیوں سے ہر عمر کی لڑکیاں اور لڑکے "حضرت" کے رعب آور لقب سے پکارتے آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صاحب الکرامات شخصیت اس معصوم ہستی سے کس قدر تضاد رکھتی ہے۔ جن کو لڑکیوں نے آج کل زبردستی "حضرت" بنا لیا ہے۔ سب سے بیّن فرق یہ ہے کہ مؤخر الذکر "کالمنو" کے مستقل مظہر ہیں اور تقدس کے "سن بورڈ" کے بجائے سر پر ایک لہراتی ہوئی ساڑی رکھتی ہیں۔

اس کے علاوہ "حضرت" کس قدر وسیع المعنی لفظ ہے۔ فرض کیجئے کہ کوئی آپ کو یوں مخاطب کرے کہ "آپ تو بڑے حضرت ہیں" فرمائیے اس جملہ کا آپ پر کس قدر خوشگوار ردعمل ہوگا ....

میں ان خواتین کی وسعت نظری کی قائل ہوں جو اس بلیغ لقب کو بڑی طمانیت کے ساتھ برداشت کرتی ہیں۔ میں تو ایک معقول استانی کو "حضرت" پکارنا اخلاق سے بعید سمجھتی ہوں۔ اس سے تو بہتر یہ ہے "آتوں جی" پکارا جائے۔ جس سے کم از کم ان کی صنف تو ظاہر ہو جاتی ہے۔ مگر "حضرت" تو متضاد تصورات کا معجون ہے۔ جس کی جنس بمشکل متعین ہو سکتی ہے۔ گو شاید یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اردو زبان میں کم از کم اسمائی رنگت تذکیر و تانیث کے فرق کو نظر انداز [illegible] کرنے کی

کوئی "جدید تحریک" ہے۔ چنانچہ حیدرآباد کی ایک ممتاز درسگاہِ اناث میں اکثر لڑکیاں ..... میں آتا ہوں۔ میں گیا تھا۔ میں بولتا ہوں۔ میں سنتا ہوں۔ بولنے پر مفتخر معلوم ہوتی ہیں۔ پہلے ہی سے اس درسگاہ میں اردو زبان سے کونسی محبت برتی جاتی ہے۔ یہاں تو انگریزی، انگریزیت، آبی طرۂ امتیاز ہے۔ پھر جب کہ موجودہ اردو والوں کے لالے پڑے ہوں تو اس بے چاری زبان پر یہ نیا ظلم کس لئے توڑا جا رہا ہے؟ اس کا سبب میں نہیں بتا سکتی۔ اس کا جواب آپ کو اس درسگاہ کی زنانہ لباس پہنے۔ الی گرمردانہ بولی بولنے والی لڑکیوں سے مل سکے گا یا ان کے والدین سے جن کے اندر میں اس عجیب طرز عمل کے خلاف بہت کم ردِ عمل دیکھتی ہوں۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ یہ بزرگ اپنی لڑکیوں کی "ایسی بولی" پر علانیہ نہیں تو اندرونی طور پر ضرور کچھ فخر کرتے ہیں۔ کہ ہماری اولاد کی یہ بولی ایک خاص مدرسے کی تعلیم کا "ٹریڈ مارک" ہے۔ کاش ان اردو زبان کے محسنوں سے کوئی پوچھے کہ یہ زنانہ لباس پہننے والی لڑکیاں جو مردانہ بولی بولتی ہیں ان کا تم نے کیا نام رکھا ہے۔

شاہ زمانی بیگم

بربادِ کسی شخص کی محنت نہیں جاتی

ابھی آفتاب طلوع نہیں ہوا تھا۔ فلک پر کچھ سرخی نمودار ہو رہی تھی۔ بہت سے بندگانِ خدا بیدار ہو کر عبادت میں مشغول ہو گئے۔ چڑیاں اپنے آشیانہ میں بیٹھی چیں چیں کر رہی تھیں۔ پپیہا پیو پیو کے نعرے سے جنگل کو سر پر اٹھا رہا تھا۔ کسان اپنے بیلوں کو لئے کھیت کا رخ کر رہے تھے۔ بچے منہ ہاتھ دھوکر شانہ کرکے مکتب جانے کی تیاریوں میں مشغول تھے۔ جھاڑ پہاڑ غرض قدرت کی ہر ایک کائنات نئے رنگ اور روپ میں دکھائی دے رہی تھی۔

۲۔ بالو اپنے جھونپڑے سے آنکھیں ملتا ہوا ا سیاں بیتا ہوا باہر نکلا۔ اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کی خاطر ایک بیڑی سلگائی۔ اور اپنا سیاہ کمبل کاندھے پر ڈال کر ایک ٹیلے پر جا بیٹھا۔ ایک آدھ گھنٹہ گذارنے کے بعد اپنا سفید گر میلا اور تھوڑی جگہ سے ٹوٹا ہوا جال لے کر ندی جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کا کام ہر روز مچھلیاں پکڑنا اور اس کو بازار میں بیچ کر اپنا پیٹ بھرنے کا تھا۔

۳۔ ندی کا فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ مشکل سے دو میل ہوگا۔ راستہ میں ایک گھنا جنگل بھی تھا۔ جو دن کو بھی اماوس کی رات بنا دیتا تھا۔ بالو اپنا آدھے من کا جال لئے ہوئے چلا۔ اور ندی پر پہنچا۔ ندی کا پانی بالکل خاموش تھا۔ اور کوئی ایک چھوٹا کنکر اس میں ڈالے تو کئی حلقے بناتا ہوا تہ تک چلا جاتا تھا۔ بالو کے پہنچنے سے پہلے ہی بہت سے مچھیرے اپنا جال پانی میں ڈالے ہوئے بیٹھے تھے۔ بالو نے جال ڈالا اور بیٹھ گیا۔ کئی گھنٹے گذر گئے شام ہونے لگی آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ بالو اپنا جال پانی سے باہر نکالا اور دیکھتے ہی اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ جیسے کسی حلق کا ہوا ہے۔ کچھ مچھلیاں

اس کی زندگی کا سہارا تھیں اب یہ خیال کرنے لگا آج میں میری بیوی بچے کیا کھائیں گے۔

۴۔ اسی سوچ بچار میں وہ اپنے گھر پہنچا۔ اور بیوی سے کہا آج مجھے ایک بھی مچھلی نہیں ملی۔ ساری محنت بیکار گئی۔ اب ہمیں بھوکے پیٹ ہی سونا ہوگا۔ بیوی نے جب میاں کو ناامید ہوتے دیکھا تو تسلی دینے کی خاطر کہنے لگی آج نہیں تو کل سہی۔ ایسے بھی دن برداشت کرنے کی عادت ہونی چاہیئے۔ کسی کو ہر وقت اچھے دن تھوڑے ہی نصیب ہوتے ہیں۔ کیا ہم کو کبھی مچھلیاں نہیں ملیں گی۔

۵۔ بالو کئی دن تک مچھلیاں پکڑنے جاتا رہا۔ جب وہ ایک شام مایوسی میں ڈوبا ناامید جھونپڑے کی طرف آ رہا تھا۔ اس کو ایک آواز سنائی دی مگر یا تو اس سے کوئی بھی نتیجہ نہیں نکال سکا۔ اس کی پریشانی میں اور بھی اضافہ ہونے لگا۔ آواز قریب آئی تو اس نے ایک فقیر کو پایا جو یہ گا رہا تھا۔

"برباد کسی شخص کی محنت نہیں جاتی"

بالو نے اس کو کان بھر کے سنا اور کہنے لگا کہ مجھ کو ہمت نہ ہارنا چاہیئے کیونکہ صبر کا پھل کبھی نہ کبھی ضرور ملتا ہے۔ ہمت نہ ہارنا چاہیئے۔ رات کو وہ بھوکا پیٹ ہی سو گیا۔

۶۔ دوسرے روز وہ پھر اپنا جال لئے ہوئے ندی پہنچا۔ جال ڈالا اور حسب معمول شام کو نکالا۔ کچھ وزنی پایا۔ اور جب پانی سے باہر نکالا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی مچھلیاں تعداد میں زیادہ تھیں۔ اس کو بازار میں لیجا کر بیچا۔ اور سامان لا کر اپنے بھوکے پیٹ کو بھرا۔ اس کے بعد اپنی بیوی سے کہنے لگا۔ اب ہمارے دن پھر گئے۔ بھاگ جاگ اٹھے۔ مجھے مرے دم تک ایک فقیر کی نصیحت یاد رہے گی۔ بیوی نے پوچھا۔ وہ کیا؟ کہنے لگا۔

"برباد کسی شخص کی محنت نہیں جاتی"

جتیندر پرشاد جوہر

جواہر مالا

۱۔ جرأت و طاقت خوش زندگی کے لوازم ہیں۔

۲۔ بہادری، ضبط و صداقت کے بغیر آزادی و خودداری حاصل نہیں ہو سکتی۔

۳۔ تمام انسانی قرابتوں کی اصل — شادی — میاں بیوی کی محبت اور سلوک سے زندگی بسر کرنا ہے۔

۴۔ حسن معاشرت کیا ہے؟ اپنی راحت کی تلاش اور حقوق کی حفاظت کرتے وقت دوسروں کے حقوق اور راحت کا خیال!

۵۔ اگر تم اپنا اعتبار قائم کرنا چاہتے ہو تو دوسروں پر اعتبار کرو۔

۶۔ حسن اخلاق اور آداب مجلس کی اعتدال کے ساتھ پابندی کا نام تہذیب ہے۔

۷۔ ناخلف ہیں وہ لوگ جو بزرگوں کی شائستگی اور زندہ دلی میں اضافہ نہیں کرتے۔

۸۔ [illegible] کا نتیجہ حسرت نہیں نفرت ہے۔

محمد حسین (۱۶ دیز)

بچپن کا خواب

میری عمر کوئی پانچ سال کی تھی جب کہ میں اپنی چھوٹی بہن سلیمہ کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ ہم دونوں بہن بھائی ایک ہی وقت کھاتے۔ ایک ہی جگہ بیٹھتے اور ایک ہی جگہ سویا کرتے تھے وہ کبھی گڑیوں کا بکس لاتی اور میرے ساتھ کھیلا کرتی۔ کبھی چھوٹی ہارمونیم پر ہاتھ صاف ہوتا اور کبھی موٹر اور ریل کی ٹکر ہمارے بچپن کے کھیل تھے۔ اس طرح ہم مختلف کھلونوں سے اپنا وقت کاٹتے اور دل بہلایا کرتے تھے۔ ایک لکڑی کا گھوڑا تھا جس پر میں بیٹھا کرتا تھا۔

ایک روز اتفاقاً میں کھیلتے کھیلتے سو گیا۔ اس وقت میں اگرچہ کہ مزے کی نیند سو رہا تھا لیکن میری بہن سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں گڑیوں کا بکس تھا اور دوسرا ہاتھ میرے سر پر تھا۔ دیگر کھلونے اطراف پھیلے ہوئے تھے۔

میں خواب دیکھ رہا تھا کہ اپنے لکڑی کے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا رہا ہوں گھوڑا تیزی سے دوڑا جا رہا ہے وہ اچانک رک گیا۔ اور میں گرتے گرتے بچ گیا۔ گھوڑا اپنی شرارت پر تلا ہوا مجھے پٹک دینا چاہتا تھا۔ اس وقت سلیمہ رو رہی تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ دست بدعا ہیں۔ آنکھ کھلی تو گھوڑے کو قریب پایا اور بہن کو سر پر ہاتھ رکھے ہوئے دیکھا۔

محمد عبد المنعم صدیقی
(سٹی کالج)

ہماری ناؤ

آنگن میں پانی آیا ہے
کیا اچھا تالاب بنا ہے

کاغذ ہم اچھے اچھے لائیں
پھاڑ کے ان کو ناؤ بنائیں
کھیلیں، کودیں، دل بہلائیں
کیا اچھا تالاب بنا ہے

ناؤ تمہاری ٹوٹی اختر
ڈوب رہی ہے چکر کھا کر
دوڑو اکبر اس کو بچائیں
کیا اچھا تالاب بنا ہے

پانی میں سب مل کر جائیں
اپنی اپنی ناؤ بہائیں
بیڑا سب کا پار لگائیں
کیا اچھا تالاب بنا ہے

کھیل میں رونا دھونا کیسا
یہ نہیں اچھی دوسری لینا
سب سے آگے اس کو بڑھائیں
کیا اچھا تالاب بنا ہے

دیکھو یہ کیا تیز چلی ہے
سب سے آگے جا پہنچی ہے
آؤ اس کو ناچ نچائیں
کیا اچھا تالاب بنا ہے

دیکھو دیکھو پھیل گئیں وہ
دیکھو کیسی مل کے چلیں وہ
جانے دو جس سمت بھی جائیں
کیا اچھا تالاب بنا ہے

تیر رہی ہے یوں پانی پر
پھول کھلے ہیں جیسے پانی پر
آؤ ذرا امی کو دکھائیں
کیا اچھا تالاب بنا ہے

اشرف الدین فیضی (پہلی)

جھوٹ کا انجام

عزیز بچو! آج ہم تمھیں ایک بڑا ہی دلچسپ اور
نصیحت آمیز قصہ سناتے ہیں۔ تمھیں معلوم ہوگا کہ اکثر
انسانوں میں بہت ساری بری عادتیں ہوا کرتی ہیں۔
بری عادت یا بری خصلت خواہ کسی قسم کی کیوں نہ ہو
وہ بری ہی ہوا کرتی ہے۔ برے آدمیوں کی صحبت
سے انسان بری عادتیں سیکھتا ہے ہم کو چاہیے کہ کبھی
بھول کر بھی برے آدمیوں کی صحبت اختیار نہ کریں
یہی وہ بدترین چیز ہے جو انسان کو دوسروں کی نظروں
میں ذلیل کرتی ہے انسان اوروں کی نگاہوں سے
گر جاتا ہے۔ لوگ بری عادت رکھنے اور بری صحبت
میں اٹھنے بیٹھنے والوں سے ملنا پسند نہیں کرتے۔ ہمیشہ
ایسے لوگوں سے کنارہ کشی کرتے ہیں۔

بری عادتوں کی وجہ سے آدمی بدنام اور
دوسروں کی نظروں میں ذلیل وخوار ہوجاتا ہے۔ ہم
تمھیں جھوٹ کا ایک بڑا مزےدار اور سبق آموز قصہ
سناتے ہیں۔

سنو! یہ ایک قدیم زمانے کا واقعہ ہے کہ کسی
گاؤں میں ایک چرواہے کا لڑکا رہا کرتا تھا۔ وہ ہر روز
جنگل میں بکریاں چرآتا تھا۔ اس کے پاس بہت ساری
بکریاں تھیں وہ ان بکریوں کے ریوڑ کو لے کر صبح
سویرے جنگل چلا جاتا۔ اور تمام دن اس کام میں مشغول
رہتا اس کو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے بکریوں کا بہت سا
دودھ مل جاتا جس کو پی کر وہ خوب موٹا تازہ ہوگیا تھا۔
جنگل کی تازہ اور خوشگوار ہوا بھی اس کی صحت اور
تندرستی کے لیے اس کو میسر تھی۔ ان تمام چیزوں کی
وجہ سے وہ ہمیشہ تندرست اور خوش رہا کرتا تھا اس کی
زندگی ایک خوشحال دیہاتی کی طرح بسر ہو رہی تھی۔

بچو غالباً تمھیں معلوم ہوگا کہ جب انسان خوشحالی
اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے تو اس کو طرح
طرح کی باتیں سوجھتی ہیں وہ اپنی اچھی خاصی خوشحال
زندگی میں اپنے ہاتھوں آپ روڑے اٹکانا شروع کردیتا
ہے جب انسان اس طرف ایک قدم اٹھاتا ہے تو شیطان
اس کو اور چار قدم آگے بڑھاتا اور بڑھاتے بڑھاتے
ایک نہ ایک دن تباہی کے خوفناک اور بھیانک غار میں
جھونک دیتا ہے۔ جب چرواہے کی شامت آئی تو اس نے
بھی اسی طرح کیا۔ دیکھو وہ اپنے ہاتھوں آپ کس طرح
تباہ ہوا اور اپنی ساری کائنات کھو بیٹھا جھوٹ نے
اس کو کس قدر نقصان پہنچایا اور ذلیل کیا۔

یوں تو وہ ہر روز ہمیشہ کی طرح بکریاں چرایا کرتا تھا
لیکن ایک دن اس کو شرارت سوجھی اور وہ ایک بڑے
ٹیلے پر جا کر چیخ چیخ کر پکارنے لگا: "شیر آیا شیر آیا دوڑو۔"
یہ سنتے ہی گاؤں میں آس پاس کے رہنے والے
لاٹھیاں اور ڈنڈے لے کر اس کے پاس پہنچ گئے
اور جب سب لوگوں نے وہاں آکر دیکھا تو شیر کا کہیں
پتہ نہ تھا۔ جب چرواہے سے دریافت کیا تو اس نے
کہا "شیر ور" آیا نہیں میں تو صرف مذاق کر رہا تھا
تمام گاؤں والے یہ سن کر اس پر برہم ہوئے اور غصے
سے اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔

اس واقعہ کو گذر کر کچھ روز ہوئے تھے کہ چرواہے نے

پھر وہی حرکت کی۔ ٹیلے پر جاکر پھر "شیر آیا شیر آیا دوڑنا" چلانے لگا اس مرتبہ بھی تھوڑے سے بہت گاؤں والے اس کی مدد کو بھاگ کر آئے لیکن ان کو اس وقت بھی پہلے کی طرح واپس ہونا پڑا۔ تمام گاؤں والوں نے چرواہے کو خوب لعنت ملامت کی اور برا بھلا کہا اس نے ان کو دومرتبہ دھوکا دیا۔

اس کے بعد کئی روز گذر گئے۔ ایک دن جب وہ سب معمول جنگل میں بکریاں چرا رہا تھا سچ مچ شیر آگیا۔ اس وقت وہ پہلے سے بہت زیادہ چیخ پکار کرنے لگا خوب چلایا اور غل مچایا کہ "شیر آیا شیر آیا دوڑنا" لیکن چونکہ وہ اس سے پہلے دومرتبہ گاؤں والوں کو جھوٹ کہہ کر دھوکا دے چکا تھا اس لئے تمام گاؤں والوں نے یہ خیال کیا کہ اس مرتبہ بھی چرواہا جھوٹ کہہ کر دھوکا دینا چاہتا ہے جس کی وجہ سے کوئی اس کی مدد کو نہ آیا اور شیر اس کی تمام بکریاں چیر پھاڑ کر کھا گیا۔

بچو دیکھا تم نے چرواہے کو جھوٹ کہنے اور دھوکا دینے کی وجہ سے کس قدر نقصان پہنچا۔ برائی کتنی بری چیز ہے ایک تو اس کا نقصان ہوا دوسرے لوگوں کی نگاہوں میں اس کی کوئی وقعت نہ رہی۔

باقر علی زاہد

علم

علم وہ جوہر لطافت ہے
عرشِ اعظم پہ جس کی شہرت ہے

گوشِ دل سے سنو مری بہنو
میں جو کہتی ہوں وہ حقیقت ہے

آؤ بہنو عمل کے میداں میں
آج اس کی بڑی ضرورت ہے

ہے تڑپ علم کی مرے دل میں
میری آواز میں صداقت ہے

علم سے قوم کو کرو بیدار
میری بہنو جو تم میں ہمت ہے

وقت نازک ہے اب اٹھو بہنو
ہم پہ واجب دکن کی خدمت ہے

علم کی روشنی کو پھیلاؤ
شمع بن کر جو ذوقِ فطرت ہے

یا الٰہی سدا رہے قائم
عہدِ عثماں بھی ایک نعمت ہے

سچ تو یہ ہے کہ اے مری بہنو
قوم ان کی رہینِ منت ہے

میرے نزدیک وہ فرشتہ ہے
علم کی جس کے دل میں عظمت ہے

مانو "بے رام" کا کہا بہنو
علم ہی سے ہماری عزت ہے

رضیہ بیگم

عفو سے دشمن کو فتح کرنا

قدیم زمانے میں بنارس میں برہم نامی راجا کی حکومت تھی۔ برہم کی وسیع سلطنت میں دولت اور فوجی قوت کی کمی نہ تھی۔ دشمنوں کا خوف نہ تھا۔ اسی عہد میں ملک کوسل کا راجا وجے تھا جس کی سلطنت بہ نسبت برہم کی سلطنت کے چھوٹی اور فوج کم تھی۔ دونوں میں جنگ چھڑی۔ برہم کو فتح نصیب ہونے سے راجا وجے نے اپنے ملک کو خیرباد کہہ کر جنگل کا رخ کیا۔ اور بندھیاچل کے غاروں میں بے سرو سامان زندگی بسر ہونے لگی۔

بھگوان کی کرپا سے غاروں میں ایک لڑکا تولد ہوا جس کا نام دنیا بھوشن رکھا گیا۔ جیسے جیسے بھوشن کی عمر بڑھتی گئی اس کو یہ احساس ہوتا گیا کہ میرے باپ کی موجودہ مصیبت کا تنہا ذمہ دار والی بنارس ہے

قانونِ قدرت کے مطابق وجے عمر طبعی کو پہونچا۔ ایک دن بہ حالتِ نزع اپنے لختِ جگر کو نصیحت کی کہ "میرے پیارے! اب میرا وقت قریب ہے۔ جیسا کہ پکا ہوا پتا درخت سے جھڑتا ہے اسی طرح مجھے بھی اب سنسار کے درخت سے جھڑنا ہے۔ اس وقت تجھیں دینے کے لئے نہ سلطنت ہے اور نہ دولت البتہ مجھ سے عفو حاصل کرکے دشمنوں کو زیر کر سکتے ہو"۔ یہ کہتے ہوئے راجا ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سو گیا۔

اب بے یار و مددگار دنیا بھوشن نے بنارس کے راجا کے پاس ملازمت اختیار کی اور رفتہ رفتہ اپنی قابلیت سے ترقی کی۔ ایک دن دنیا بھوشن اپنے روزمرہ فرائض سے فارغ ہوکر راگ الاپتا ہوا دراز تھا۔ اس کی سُریلی آواز نے راجا برہم کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس درد بھری اور رسیلی آواز سے دنیا بھوشن راجا کو خوش کرکے رتھ بان بنا۔

اس طرح کچھ عرصہ گذرنے کے بعد برہم دنیا بھوشن شکار کی خاطر جنگل گئے۔ اثنائے راہ میں شکار کی دھن میں راستہ بھول گئے۔ اتفاق سے رتھ میں دونوں ہی تھے۔ سفر کی تکان سے ادھر راجا سوتا پڑا اور ادھر اپنے باپ کے انتقام کی فکر میں دنیا بھوشن نے میان سے تلوار نکالی۔ لیکن عین اس وقت جب کہ راجا برہم قتل ہونے کو تھا دنیا بھوشن کو اپنے باپ کی نصیحت یاد آئی کہ "عفو سے دشمن کو فتح کرنا"۔ افسوس کے ساتھ اس نے اپنی تلوار میان کے اندر رکھ لی۔ راجا یہ سب حرکات خواب کی شکل میں دیکھ رہا تھا نیند سے ہوشیار ہوکر دریافت کیا اور عفو کی قوت سے نادم ہوکر کوسل کی سلطنت دنیا بھوشن کو دے دی۔

کاشی ناتھ (دامرگدہ)

تاریخ گولکنڈہ حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ال ال بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں سے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقا، بادشاہوں اور امیروں کے حالات اور اربابِ علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو انتہائی محنت سے لکھی گئی ہے۔ تاریخ گولکنڈہ مصور ہے اور اس کی تصویریں بھی [illegible] کی طرح قدیم تاریخی ماخذ سے حاصل کی گئی ہیں [illegible] سے زیادہ صفحات قیمت

کبابی پسندے

(۱)

پڑوسن نے لکھا زلیخا بوا کو — ذرا شام کو میرے گھر تک تو آؤ
پکائے ہیں میں نے کبابی پسندے — نہیں ہوتے گو مجھ سے اب تو یہ دھندے
مگر جی میں آیا کہ تم کو بلاؤں — کبابی پسندے تمھیں بھی کھلاؤں
تمھیں ہیں پسند یہ پسندے ہمارے

(۲)

زلیخا بوا نے لکھا یہ جواباً — سدا خوش رہو تم ہماری پڑوسن
مرے گھر میں ہیں آج مہمان آئے — اور آئے بھی ہیں آج یہ بن بلائے
میں خوش ہوں کہ یہ آج کھائیں گے کھانا — کہاں پھر یہ اور ہے کہاں میرا آنا
پسند تو ہیں مجھ کو پسندے تمھارے

(۳)

پڑوسن نے لکھا زلیخا بوا کو — نہیں شام کو تو ذرا شب میں آؤ
تمھیں میزبانی مبارک مبارک — تمھیں ہے خوشی کچھ نہیں اس میں اب شک
ہمیں بھی کرو خوش تو ہے مہربانی — محبت کی ہوتی یہی ہے نشانی
نہیں میرے ہیں یہ پسندے تمھارے

(۴)

زلیخا بوا نے لکھا بی پڑوسن! — تمھاری نذر ہو ہمارا یہ تن من
مگر میں ہوں مجبور آنے سے اب تو — میری اچھی بہنا مجھے معاف کر دو
مگر کل صبح کو تم آجاؤ بہنا! — نئی ماما کا امتحاں بھی ہے ہونا
رہیں اور کسی دن پسندے تمھارے

(۵)

پڑوسن نے لکھا زلیخا بوا کو — نہیں کچھ صبح آج تم گر نہ آؤ
صبح کو ہے آنا یہ مشکل ہمارا — برا مت منانا اسے تم خدارا
سینما ہے جانا ہمیں بس ضروری — بہت ہو خوشی تم بھی ہو میری ساتھی
گئے بھاڑ میں یہ پسندے ہمارے!

(۶)

زلیخا بوا نے جواباً یہ لکھا — اتارا بہن تم نے تو خوب بدلا
نئے دوست تم کو مبارک مبارک — ہیں ہم تو پرانے نہیں اس میں کچھ شک
نئے دوستوں کو کرو اب تو خوش تم — پڑا سڑنے دو ہم کو بس اب ہیں ہم
کہاں ہم کہاں وہ پسندے تمھارے!

(۷)

یہ سوچیں پڑوسن کہ کل ہی صبح کو — منائیں گے چل کر زلیخا بوا کو
چنانچہ یہ نکلیں صبح ہی سویرے — سویرے بھی اتنا کہ تھا منہ اندھیرے
زلیخا بوا کو جگا کر بٹھایا — اور اک پان ان کو لگا کر کھلایا
کہا! کھاؤ گی تم پسندے ہمارے؟

(۸)

زلیخا بوا تھیں مگر منہ پھلائے — کہ گویا کبھی گلگلے تھے پکائے
نہ وہ منہ سے بولیں نہ وہ سر سے کھسکیں — جو بولیں تو ایسا کہ بس سر ہی ہو میں
سمجھ میں نہ آیا یہ قصہ ہمارے — جو ہونے لگا واں ہمارے تمھارے
گئے بھاڑ میں یوں پسندے ہمارے

(۹)

ادھر بی پڑوسن کا غصہ غضب تھا — زباں کو تو ازاں کی بس اب کہاں تھا
چلی ایسی گویا کہ وہ تھی کترنی — رکے اب تو کیسے شروع ہو جو چلنی
رکی یوں کہ اٹھیں وہ اک دم سے جھٹ — کہیں اک دو باتیں نکلتے نکلتے
کہا ہم نے ہیں! وہ پسندے ہمارے؟!

(۱۰)

غرض اس طرح ٹوٹا یک دم وہ رشتہ — برس پندرہ میں جو محکم ہوا تھا
مگر یہ لڑائی نہ تھی دشمنی کی — کہ تھی یہ خفائی محبت دلی کی
لہٰذا لڑائی یہ تم اس کو سمجھو — اسی سے محبت کی ہستی کو پرکھو
ختم یوں ہوئے وہ پسندے ہمارے

مولوی شکم پرور

نورجہاں کی آخری آرامگاہ

(یہ مضمون حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا)

لاہور میں دریائے راوی کے کنارے ایک مزار واقع ہے۔ چاندنی رات تھی۔ ہم کشتی میں سوار ہو کر چاندنی کا لطف اٹھا رہے تھے۔

باتوں باتوں میں ملاح سے پوچھا یہ مقبرہ کس کا ہے۔

ملاح۔ جناب یہ نورجہاں کا مزار ہے۔

ساتھ ہی دل میں خیال آیا یہ وہی نورجہاں ہے جو جہانگیر کے دل پر حکومت کرتی تھی جس کے کپڑوں میں الماس، زمرد، لعل ٹکے رہتے تھے۔ جو پھولوں سیج پر سویا کرتی مگر آج بستر خاک پر دراز ہے۔ یہ دریا وہی دریا ہے جس پر اکثر جہانگیر چاندنی کا لطف اٹھانے کے لئے آیا کرتے۔ جہانگیر اور بیگم اسی دریا میں کشتیوں میں بیٹھ کر گشت لگاتے۔ آتش بازیاں چھوٹتیں، ساغر کے دور چلتے۔ یہاں تک کہ چڑیاں بولنے لگتیں اور سویرا ہو جاتا

آج نہ وہ ہیں نہ ان کا زمانہ مقام وہی ہے لیکن وہ خاک میں مل گئے۔

ہم دریا کو عبور کر کے قریب پہونچے سامنے ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت ہے۔ جس پر اکثر جگہ گھاس پات اگی ہوئی ہے۔ جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ زمانہ قدیم کی یادگار ہے۔

ہم اندر داخل ہوئے۔ کتبہ پر یہ شعر کندہ ہے۔

برمزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

اور واقعی یہاں نہ شمع ہے نہ پروانہ نہ پھول ہے نہ بلبل ایک سناٹا سا چھایا ہوا ہے۔ وہ نورجہاں جو ہندوستان کی ملکہ تھی آج بے مونس وغم خوار اکیلی سو رہی ہے۔

مقبرہ میں چند کبوتروں کے گھونسلے ہیں جو اپنی غٹرغوں سے نورجہاں کا دل بہلا رہے ہیں اور لوری دے دے کر سلا رہے ہیں۔ اور وہ ان کی لوری سے ایسی مدہوش ہو گئی ہے کہ ہوش میں آنے کا نام تک نہیں لیتی۔

نورجہاں خوبصورتی اور حسن تدبیر میں بے مثل تھی بادشاہ اس سے ہر بات میں مشورہ کرتا تھا۔ مردانہ کھیلوں سے نورجہاں کو بہت دلچسپی تھی چنانچہ اس کو شیر کے شکار کا بہت شوق تھا۔ شعر و ادب کا بھی ذوق تھا۔ جہانگیر نے عید کا چاند دیکھنے کے بعد کہا۔

ہلال عید کہ بر اوج فلک ہویدا شد
(عید کا چاند جو کہ آسمان پر دکھائی دے گیا)

اور ثانی مصرعہ کی فکر تھی۔ اسی اثنا میں نورجہاں کو خبر ملی کہ بادشاہ سلامت کچھ پریشان سے ہیں۔ وہ آئی پریشانی کا سبب دریافت کیا۔ مسکرائی اور کہنے لگی ذرا سے مصرعہ کے لئے اتنی فکر۔

کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد
(میخانے کی کنجی جو کھو گئی تھی پھر مل گئی)

ایک دفعہ نورجہاں نے موتیوں کی لڑیاں اپنی مانگ میں آویزاں کیں۔ جہانگیر نے اس کو دیکھ کر یہ مصرعہ کہا۔

سلک مروارید بر فرق سرت دانی کہ چیست
([illegible])

نورجہاں نے فی البدیہہ دوسرا مصرعہ کس طرح کہا۔

تشنگان شوق را جوئیست از آب حیات
(شوق کے پیاسوں کے لئے آب حیات کی ایک نہر جا رہی ہے)

جب جہانگیر کی طبیعت ناساز تھی۔ نورجہاں نے [illegible] کر کے دعا

جہانگیر کے آنسو نکل آئے اور اس نے یہ مصرعہ کہا۔

نمی آید بغیر از گریہ دیگر کار از چشم

(میری آنکھوں کو رونے کے سوا اور کوئی کام نہیں آتا)

نورجہاں نے فی البدیہہ کہا۔

بلے از مردم بے دست و پا دیگر چہ می آید

(بیشک بے ہاتھ پاؤں کے آدمیوں سے اور کیا ہو سکتا ہے)

اس مصرعہ میں لطف یہ ہے کہ مردم کا لفظ دو معنوں میں آتا ہے۔ آدمی اور آنکھ کی تپلی۔ یہ اشعار نورجہاں کی قابلیت پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔

سید اشرف حسین عابدی

اندھوں کی تعلیم

تقریب دو صدی سے متمدن ممالک میں اندھوں کی تعلیم کا طریقہ رائج ہے۔ متمدن ممالک میں ماہران خصوصی کے زیر اہتمام اندھوں کے لئے اسکول قائم ہیں۔ جہاں وہ لکھنے پڑھنے کا کام اور علوم و فنون سیکھتے ہیں ــــ اس طرح ان کے لئے خاص خاص مدارس اور ادارے قائم ہیں اسی طرح ان کے لئے خاص خاص مطابع ہیں۔ جہاں انہیں کے لئے کتابیں چھپتی اور شایع ہوتی ہیں ــــ ان کے لئے اخبارات بھی نکالے جاتے ہیں جس کے ایڈیٹر اندھے نامہ نگار اندھے اور خریدار سب اندھے ہوتے ہیں ــــ اندھوں کے لئے خاص خاص کتب خانے قائم ہیں جہاں ان کے لئے کتابیں فراہم کی جاتی ہیں۔

اندھوں کی تعلیم کا سب سے پہلے باقاعدہ انتظام فرانس میں جاری کیا گیا ــــ "والنٹین ہوے" نے ۱۷۸۴ء میں اندھوں کی تعلیم کے لئے سب سے پہلا مدرسہ پیرس میں قائم کیا۔

فرانسیسیوں کے سات سال بعد انگریزوں نے پہلی مرتبہ "لیورپول" میں ایک مدرسہ اندھوں کی تعلیم کے لئے جاری کیا اس کے بعد ۱۷۹۹ء میں خاص لندن میں اس قسم کا سب سے پہلا مدرسہ قائم کیا گیا۔ اس کے بعد عام طور پر اندھوں کی تعلیم کے لئے مدارس قائم ہوتے رہے، اور تھوڑے ہی دنوں میں اس قسم کے مدارس کا عام رواج ہوگیا۔ اور اب یورپ کے ہر حصہ میں ان کی تعلیم کا انتظام ہے۔

اب حیدرآباد میں بھی ان کی تعلیم کے لئے ایک خاص مدرسہ قائم کیا گیا ہے۔ ان کی تعلیم کا مروجہ عام طریقہ یہ ہے کہ کاغذ پر ابھرے ابھرے حروف بنائے جاتے ہیں جن کو چھو چھو کر طلبا پڑھتے ہیں۔ گو ابتداً دشواری ہوتی ہے، لیکن نابینا طلبا اسی طریقہ سے تھوڑی مشق اور عادت کے بعد اس قدر تیزی و روانی سے چھو چھو کر پڑھتے ہیں جیسے ہم اپنی کتابوں کو دیکھ کر پڑھتے ہیں۔

یورپ میں یہ طریقہ اب بہت اہمیت حاصل کر چکا ہے، اور روز بروز اس طریقہ میں جدید اصلاحوں کی کوشش کی جارہی ہے، بعض کتابیں اور مختلف مضامین بھی اب تک اس موضوع پر طبع ہوگئے ہیں، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نابیناؤں میں بہت سے باکمال پیدا ہوگئے ہیں جو اس طریقۂ تعلیم کی کامیابی کا کھلا ثبوت ہے۔

محمد غوث محی الدین (درجۂ وسطانیہ مدرسۂ فوقانیہ گلبرگہ)

جھوٹا خواب (ڈرامہ)

ڈرامہ کے افراد

۱۔ سوہن لال ..... ایک ساہوکار ۔ ۳۔ لڈن .. . سوہن لال کا بچہ

۲۔ لتا .... سوہن لال کی بیوی ۔ ۴۔ محمد علی۔ سوہن لال کا دوست

۵۔ رتن ... . ڈاکٹر

(سوہن لال احمد آباد کے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ وہ اس گاؤں کا ساہوکار تھا اور سب گاؤں والے اس سے بخوبی واقف تھے کیونکہ وہ ہر ایک کو قرض دیا کرتا تھا۔ محمد علی سوہن لال کا بہت دوست تھا اور اس سے قرض لیا کرتا تھا۔ پیر کے روز سوہن لال کو گھر آنے میں ذرا دیر ہو گئی۔)

لتا۔ کیوں جی آج تمہیں اتنی دیر کیوں ہوئی۔

سوہن لال۔ (جواب دئے بغیر) کھانا جلدی دو۔ نیند آ رہی ہے۔ (لتا ایک تھالے میں کھانا لے کر آئی۔ جب کھانا ختم ہوا تو سوہن لال شب بخیر کہہ کر اپنے پلنگ پر جا لیٹا۔ تھوڑی دیر پر وہ سو گیا اور خوب خراٹے لینے لگا۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اور ہو کا عالم ہے۔ سوہن لال نے سوتے سوتے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور چلانے لگا) "میں لٹ گیا۔ میرا گھر برباد ہو گیا۔" (اتنے میں اس کی نظر گھڑیال پر پڑی۔ اس وقت ٹھیک دو بجے کا عمل تھا وہ زور زور سے چلانے لگا۔ اس کے شور و غل سے اس کی بیوی "لتا" دوڑتی ہوئی آئی)

لتا۔ ہائے میں کیا کروں۔ آدھی رات کو تمہیں کیا ہو گیا۔

سوہن لال۔ "لڈن کی ماں، لڈن کی ماں" کیا کہوں۔ میرے مرنے کا وقت قریب آ گیا دیکھو دیکھو دو بج گئے۔ اب صرف میں ایک گھنٹے کا مہمان ہوں۔ ذرا میرے لڈن کو جلدی لاؤ تاکہ اسے آخری مرتبہ پیار کروں۔

لتا۔ (اور بھی پریشان ہو کر رونے لگتی ہے اور کہتی ہے) میں لٹ گئی، میں لٹ گئی۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر آپ نہیں جا سکتے۔ ہائے میرا لڈن کس کو پتا جی کہہ کر پکارے گا۔ (ان لوگوں کے شور و غل سے پڑوسی سب جاگ اٹھے اور سب کے سب جمع ہو گئے)

سوہن لال۔ ادھر آؤ لڈن کی ماں! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ دیکھو گھبراؤ نہیں اب میں تھوڑی دیر کے بعد مر جاؤں گا۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ اچھا دیکھو محمد علی اور دو تین اشخاص کے ہاں میرے روپے ہیں ان سب سے وصول کر لینا اور یہ کنجیاں لو اور دیکھو یہ راز کسی کو نہ کہنا۔ جاؤ اور میری الماری کھولو۔ بیچ کے خانے میں کپڑے ہیں ان کپڑوں کو اٹھاؤ۔ ایک کنجی ملے گی اس کنجی کو لے کر میری تجوری کھولو ایک پوٹلی میں اشرفیاں ہیں اور دوسری میں روپے۔ ان کو حفاظت سے رکھنا اور کسی کو نہ بتانا۔

لتا۔ (خوب زور زور سے رو کر کہتی ہے) ہائے میں یہ سب لے کر کیا کروں۔ جب آپ ہی نہیں تو یہ دولت میرے کس کام کی۔ ہائے خدا تو ان کے خواب کو جھوٹا کر دے، تو جو چاہے کر سکتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اور دعائیں مانگنے لگی۔

محمد علی۔ (لتا کے قریب جاتا ہے اور پوچھتا ہے) کیا ہوا (پھر سوہن لال کے قریب جاتا ہے۔) تم ہی بتاؤ آخر بات کیا ہے؟

سوہن لال۔ دوست تم آگئے (یہ کہہ ہی رہا تھا کہ گھڑیال نے ڈھائی بجائے۔ گھڑیال کی آواز سن کر چلا اٹھتا ہے) اب صرف آدھ گھنٹہ ہے۔ اس کے بعد مرجاؤں گا۔ ہاں محمد علی تم جو میرا روپیہ دینا باقی ہو وہ لڈن کی ماں (یعنی لتا) کو دینا۔

لتا۔ (رو کر کہتی ہے) دیکھو بھائی (یعنی محمد علی) ذرا جاکر ڈاکٹر صاحب کو بلا لاؤ۔ ذرا جلدی کرو (محمد علی ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا)

سوہن لال ہائے ڈاکٹر کو کیوں بلایا! یہاں پیسے ہی کس کے پاس ہیں جو ڈاکٹر کو دئے جائیں۔ خیر اگر محمد علی نے ڈاکٹر رتن کو بلایا تو اچھا ہے کیونکہ وہ ہمارا پکا دوست ہے (اتنے میں محمد علی رتن کو ساتھ لے کر آتا ہے اور سوہن لال کے کمرے میں لے جاتا ہے۔)

رتن۔ ہلو (Hello) سوہن لال۔ کہو کیا ہوا۔

سوہن لال۔ ارے بھئی کیا کہوں میں نے رات کو تقریباً ایک بجے خواب دیکھا کہ میں تین بجے تک مر جاؤں گا (گھڑی دیکھتا ہے) اور کہتا ہے کہ ہائے اب صرف پندرہ منٹ ہی رہ گئے ہیں۔ "لڈن کی ماں" (پکارتا ہے جب وہ آئی تو کہتا ہے) جاؤ ایک سفید چادر لے آؤ اب وقت بہت قریب آگیا ہے۔ جاؤ جلدی جاؤ۔

لتا۔ (دوڑتی ہوئی آتی ہے اور چادر دے کر روتی ہوئی کہتی ہے) ہائے میں برباد ہوگئی۔ اب میں کیا کروں پھر خدا سے دعا مانگتی ہے کہ بھگوان تو جو چاہے کر سکتا ہے۔ مگر ان کے خواب کو جھوٹا کردے۔

سوہن لال (گھڑی دیکھ کر سب کو خدا حافظ کہتا ہے اور لتا کو بلا کر کہتا ہے) سب سے پیسے وصول کر لینا (یہ کہہ کر چادر اوڑھ لیتا ہے)۔

لتا۔ خوب روتی ہے اتنے میں تین بجتے ہیں۔ لتا آہ سرد بھرتی ہے اور پھر گر جاتی ہے

رتن (تھوڑی دیر تک بیٹھتا ہے اور ۳½ کے بعد سوہن لال کی نبض دیکھتا ہے اور خوشی سے کہتا ہے۔ یہ زندہ ہے مرا نہیں (یہ آواز سن کر لتا آتی ہے)

لتا۔ (خوشی سے چلا اٹھتی ہے) ان کا خواب جھوٹا تھا۔

سوہن لال۔ (رتن سے کہتا ہے) گھڑی تیز ہوگی مجھے تین بجے مرنا ہی ہے

(رتن بیٹھا انتظار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ چار بج جاتے ہیں)۔

رتن۔ سوہن لال اب ہماری فیس کہاں ہے؟

سوہن لال۔ محمد علی سے ایک روپیہ لے لو۔ یہ تمھاری فیس ہے (رتن اور محمد علی چلے جاتے ہیں)

لتا۔ (خوش ہو جاتی ہے اور پھر چلا کر بولتی ہے ان کا خواب جھوٹا تھا۔ دونوں خوشی سے اچھل پڑتے ہیں اور آپس میں گلے ملتے ہیں۔

ایس، ایم، عباس

سفید جھوٹ

احمد اور محمود کی عمروں میں صرف دو تین سال کا فرق تھا۔ دونوں ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے احمد ہمیشہ جماعت میں اول یا دوم رہتا تھا اور محمود گیارھویں یا بارھویں درجہ میں رہتا تھا۔ دونوں میں بے حد دوستی تھی۔ دونوں اول جماعت سے شریکِ سبق تھے۔ احمد اور محمود کی طبیعت میں ایک زبردست فرق تھا۔ احمد سنجیدہ اور جفاکش، محمود شوخ اور کاہل۔ مدرسہ میں وقفہ ملتا تو احمد کھانا کھاتے ہی مطالعہ کے کمرہ میں جاکر رسالے اور میگزین وغیرہ پڑھتا مگر محمود جلد کھانا کھاکر دوسرے لڑکوں کے ساتھ گپ شپ مارا کرتا تھا۔

۲

احمد اور محمود ہشتم تک برابر کامیاب ہوتے رہے۔ اب محمود کی طبیعت پہلی سی نہ تھی۔ اس کی طبیعت میں ایک زبردست انقلاب ظہور پذیر ہو چکا تھا۔ اس کو احمد سے کچھ نفرت سی ہوگئی تھی وہ اس کے پاس بیٹھنا بھی نہ چاہتا تھا۔ احمد کی حالت محمود کی طبیعت کے بالکل برعکس تھی۔ اس کو محمود سے کچھ محبت سی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کو محمود کی سختی اور برے برتاؤ سے قلق ہوتا تھا پھر بھی وہ محمود کا خیرخواہ تھا۔ اس نے اس سے علیحدگی کا سبب پوچھا، بہت منت سماجت کی لیکن محمود کا دل نہ پسیجا۔ اس نے ترش روئی سے احمد کو روکھا سا جواب دیا۔ اس جواب سے احمد کے ٹوٹے ہوئے دل پر اور بھی ایک چوٹ لگی اور وہ گھر جاکر بہت رویا اور مدرسہ کا کام تک بھی نہیں کیا اور اسی پریشانی کے عالم میں سو گیا۔ دوسرے دن مدرسہ گیا جماعت میں کتابیں رکھ کر باہر آ رہا تھا محمود سے مڈبھیڑ ہوئی۔ محمود نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا سلام کا جواب بھی نہ دیا اور چلتا بنا۔ احمد بہت ہی بالکل شکستہ رہا اور کسی سے بات تک نہ کی۔

۳

تعطیل تھی محمود گھر میں بہت خوش تھا۔ مگر احمد اپنے گھر میں بہت رنجیدہ [illegible] بستر پر بیٹھ کر محمود کو اس طرح خط لکھنے لگا۔

پیارے دوست محمود!

تسلیم۔ میں نے آخر ایسا کونسا گناہ کیا ہے جس کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔ آپ کو مجھ سے نفرت کیوں ہے۔ کیا میں نے کوئی کام آپ کی مرضی کے خلاف کیا؟ نہیں ہرگز نہیں کیا پھر مجھ سے دور دور کیوں رہتے ہو۔ کیا یاد نہیں کہ ہم کتنے [illegible] دوست تھے [illegible] وقت [illegible] ساتھ [illegible] اور ایک [illegible] دونوں [illegible] کا ایک ساتھ پڑھنا ایک ساتھ کھیلنا اور ایک ساتھ لکھنا آپ میرے دل کی گہرائیوں [illegible] ہیں اور مجھے ہمیشہ وفاشعار اور اپنا خیرخواہ پائیں گے مہربانی فرماکر اس خط کا جواب دیجئے۔ فقط

آپ کا مخلص دوست

احمد

احمد نے خط [illegible] لفافہ میں [illegible] کے [illegible] بھیج دیا۔ محمود [illegible] خط بھی نہ پڑھ [illegible] غصہ سے [illegible] یا اور اس نے خط پھاڑ کر ڈالا اور [illegible]

کہلا بھیجا کہ پھر کبھی وہ کچھ لکھنے کی جرأت نہ کرے۔ احمد جو جواب کے لئے منتظر کھڑا تھا یہ روکھا سا جواب سن کر دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔

۴

احمد کئی مرتبہ محمود کے گھر گیا مگر محمود نے احمد کو کہلا بھیجا کہ اسے فرصت نہیں ہے یا وہ اس سے ملنا نہیں چاہتا۔ ان ہی دنوں محمود کے گھر ٹیلیفون آیا۔ جوں ہی احمد کو معلوم ہوا کہ محمود کے گھر ٹیلیفون ہے تو اس نے کئی دفعہ محمود سے بات کرنے کی کوشش کی مگر بے سود جب احمد نے پوچھا کہ محمود گھر میں ہے تو محمود ہی نے ٹیلیفون پر کہا کہ وہ گھر میں نہیں ہیں۔ ایسے واقعات آئے دن ہوتے تھے۔ ایک دن محمود نے چاہا کہ احمد کو جھوٹ بول کر پریشان کرے۔ اس لئے جب احمد نے اس کے پاس ٹیلیفون کیا تو محمود نے کہا کہ جب وہ بازار سے گذر رہا تھا تو موٹر سے ٹکرا گیا اور اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی ہے اور وہ ہسپتال میں ہے احمد نے جب یہ بات سنی تو اس نے سچ سمجھا اور ہسپتال میں محمود کو دیکھنے کے لئے وہاں پہنچا۔ اسے محمود تو کجا محمود کے فرشتے بھی نہ ملے۔

اس دن محمود بہت خوش تھا کیونکہ اس نے احمد کو بے وقوف بنانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔

۵

محمود سائیکل پر بازار سے کتاب لانے کے لئے گھر سے نکلا۔ بازار میں آدمیوں کا انبوہ تھا موٹریں بہت گذر رہی تھیں محمود بجائے سائیکل سے اترنے کے اسی پر بیٹھا رہا یہاں تک کہ ایک موٹر سے واقعی ٹکر ہو گئی اور اس کا ایک پاؤں ضائع ہو گیا۔ بڑی مشکل سے لوگوں نے گھر پہنچا دیا بہت دن تک محمود کا علاج ہوتا رہا آخرکار وہ چلنے کے قابل ہو گیا مگر اس کا پیر ٹھیک طریقہ سے درست نہ ہو سکا۔ کبھی اس کے پیر میں درد محسوس ہوتا ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب احمد کی بد دعا کا اثر ہے۔ مگر وہ کبھی یہ خیال نہیں کرتا کہ کسی کو ٹیلیفون پر جھوٹ کہہ کر بے وقوف بنانے کا نتیجہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

محمد کمال خاں گمنام

(مدرسہ عالیہ)

جہالت

۱۔ وہ جہالت جو علم کے پردہ میں پوشیدہ ہو زیادہ خطرناک ہے۔

۲۔ جاہل کی زندگی ہمیشہ بد مزگی سے بسر ہوتی ہے۔

۳۔ جاہل میں دور اندیشی تو درکنار حالات حاضرہ کے سمجھنے کی اہلیت بھی نہیں ہوتی۔

۴۔ جاہل آدمی کی مثال اس کھوٹے سکے کی سی ہے جو کبھی کام نہیں آتا۔

۵۔ میرے نزدیک جہالت اور انسانیت ایک سطر میں لکھے نہیں جا سکتے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔

عالیہ سلطانہ

جدید مطبوعات

شیطان کا انتقام۔ (عہد حاضر کے اخلاقی اور سیاسی رجحانات) از محمد جلال الدین صاحب اشک حجم ۹۰ صفحات قیمت ۸ مطبوعہ انتظامی پریس حیدرآباد

مسلمان ہند کی سیاست وطنی۔ (سیاسی حالات) مرتبہ محمد امین صاحب زبیری حجم ۱۹۲ صفحات قیمت ۱ مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ۔

اقبال اور اس کا پیغام۔ (اقبال کا فلسفۂ حیات) از ڈاکٹر تصدق حسین صاحب خالد حجم ۶۴ صفحات قیمت ۸ مطبوعہ جامعہ ملیہ دہلی۔

انقلاب میں کسانوں کا ہاتھ (کسانوں کی تنظیم) از منظر رضوی حجم ۱۱۵ صفحات قیمت ۸ مطبوعہ آزاد پریس میرٹھ

حرف و حکایت (نظموں کا مجموعہ) از جوش ملیح آبادی حجم ۲۴۸ صفحات قیمت ۱۲ کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔

شجرۂ آصفیہ (تاریخ خاندانِ آصفیہ) از حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری حجم ۹۵ صفحات معہ متعدد شجرے قیمت ۸ مطبوعہ عہد آفریں برقی پریس حیدرآباد

مشاہیر ہند (چند مشاہیر کے حالات) از سید بادشاہ حسین صاحب حجم ۱۳۱ صفحات قیمت ۸ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد۔

بنیادی قومی تعلیم کا نصاب از ذاکر حسین صاحب حجم ۲۴۰ صفحات قیمت ۸ مطبوعہ جامعہ ملیہ دہلی

محمد علی جناح (سوانح حیات) از احسان اللہ صاحب کرانی حجم ۲۴۰ صفحات قیمت ۸ مطبوعہ سلطانیہ برقی پریس لکھنؤ۔

حاجی لق لق کے افسانے از حاجی لق لق صاحب حجم ۱۶۰ صفحات قیمت ۱۲

پھول والوں کی سیر (بہادر شاہ کے زمانے کے حالات) از فرحت اللہ بیگ صاحب حجم ۴۴ صفحات قیمت ۴ کتب خانہ علم و ادب دہلی

انقلابی شرارے (اقوال کا مجموعہ) از لالہ چھبیل داس صاحب حجم ۲۴۰ صفحات قیمت ۱۲ ارباب پبلشرز اینڈ سنز لاہور۔

سالنامہ عالمگیر لاہور بابتہ جون ۱۹۳۹ء۔ مرتبہ حافظ محمد عالم صاحب حجم ۲۱۶ صفحات قیمت ۸

راز و نیاز (غزلوں کا مجموعہ) از حبیب اشعر صاحب دہلوی حجم ۸۴ صفحات۔ منزل بک ڈپو۔ بلی ماراں۔ دہلی

ڈرامہ نمبر ادب لطیف لاہور مرتبہ چودھری برکت علی صاحب حجم ۲۲۰ صفحات قیمت ۱۲

سکھی کسان (کسانوں کی بہبودی کے متعلق) از عبدالحمید صاحب تحصیلدار آرمور نظام آباد حجم ۲۱۹ صفحات قیمت ۱

رپورٹ کمیٹی اصلاحات مع ضمیمہ نمبر ۱ اعلان مقامی حکومت مرتبہ سید یوسف علی صاحب ایچ سی ایس حجم ۲۱۶ صفحات قیمت ۸

ماہ عرب (تاریخی ناول) از جرجی زیدان مترجمہ عظمت علی صاحب حسرت لکھنوی قیمت ۸

مختار دلہن (اصلاحی افسانے) از محمد مرزا خاں صاحب حجم ۱۰۰ صفحات قیمت ۸

انقلاب روس (تاریخ) حجم ۲۰۰ صفحات قیمت ۸

مکمل باورچی خانہ (پکوان کے طریقے) از فہمیدہ خاتون صاحبہ نزہت حجم ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۲

آصفی کہانیاں با تصویر از محمد عبدالسلام ذکی حجم ۱۰۰ صفحات قیمت ۸ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد

وحدت ملت از محمد بخش صاحب مسلم حجم ۴۶ صفحات قیمت ۸ مطبوعہ چشتی پریس بمبئی۔

مدح صحابہ اور تبرا (اقتباسات اخبار مدینہ بجنور) حجم ۹۶ صفحات قیمت ۴ مطبوعہ مدینہ پریس بجنور۔

مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

روحِ حیات از جناب اختر قریشی صاحب حجم ۸۰ صفحات قیمت ۱۲ مطبوعہ عہد آفریں برقی پریس حیدرآباد

جناب اختر قریشی کے مکتوبات کے اس مجموعہ میں کوئی ڈھائی درجن دلچسپ مکتوب ہیں، جن میں عورت کے حقوق، نظریۂ محبت، بچوں کی تعلیم و تربیت، مغرب پرستی، ازدواجی زندگی توہم پرستی، عورت کی فطرت، تمدن و معاشرت اور موجودہ سماجی خرابیوں کی نسبت جناب اختر نے اپنے تاثرات مختصر پیرایہ میں بیان کئے ہیں اور بعض مکتوب میں مزاحیہ انداز میں بڑی پتہ کی باتیں لکھی ہیں، بہ حیثیت مجموعی کتاب دلچسپ اور سبق آموز ہے۔

وصلی کی دستکاری مولفہ سید رضا احمد صاحب جعفری حجم ۵۶ صفحات قیمت ۸ مطبوعہ محبوب المطابع دہلی عصمت بک ڈپو دہلی سے مل سکتی ہے زیر نظر کتاب چار باب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں وصلی یا کارڈ بورڈ کی قسمیں بتائی گئی ہیں اور کارڈ بورڈ کے نمونے دراصل بنانے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے ان کی تفصیل دی گئی ہے دوسرے باب میں وصلی کی دستکاری کے اصول اور عام ہدایتیں درج ہیں، تیسرے باب میں ابتدائی یا بنیادی شکلیں وضاحت کے ساتھ نقشوں کے ذریعہ سمجھائی گئی ہیں اور چوتھا باب چند آسان نمونوں پر مشتمل ہے۔ وصلی یا کارڈ بورڈ کی دستکاری بقول مولف بچوں کے لئے بدرجہ اتم مفید اور ساتھ ہی آسان اور ارزاں ہے، اس کی کاٹ چھانٹ چھوٹے سے چھوٹے بچے کے لئے بھی ممکن اور سہل ہے، اگر اس صنعت کو جرمنی اور جاپان اسکولوں کی طرح ہندوستانی مدرسوں میں بھی بطور ”مینوئل ٹریننگ“ داخل کر لیا جائے تو بلا شبہ مفید نتائج مرتب ہوں گے۔

ترکِ شراب معہ اسلام اور گداگری از جناب عبد الحمید خان صاحب حجم ۴۴ صفحات قیمت ۳ مطبوعہ تاج محل فائن آرٹ لیتھو ورکس بمبئی، اس مختصر مفید رسالہ میں شراب کی برائیاں اور نقصانات اور صحت و نسل انسانی پر اس کے مضر اثرات نہایت موثر پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں یہ کتاب کا کچھ کم آدھا حصہ ”بنت عنب“ کی تباہ کاریوں سے مملو ہے باقی اوراق انسداد گداگری کے لئے وقف کئے گئے ہیں ”دکن میں گداگری“ کے عنوان سے جناب مولف نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے دکن میں قانون انسداد گداگری نافذ ہوا اور ملک کے معذور و محتاج طبقہ کی فلاح و بہبود کے لئے مدارس و مکاتب قائم ہوئے ہیں جناب مولف نے یہ اطلاع ذرا قبل از وقت دی ہے، قانون انسداد گداگری کا مسودہ حکومت کے زیر غور ہے، معذورین، پیشہ ور گداگروں اور ان کے بچوں کے لئے بیت المعذورین، کارخانے اور مدارس قائم کرنے کی تجویزیں ہو رہی ہیں، خدا وہ دن جلد لائے کہ پایۂ تخت دکن کے کوچہ و بازار اور خوبصورت شاہراہیں اقسام کے گداگروں کی چیخ پکار اور بھانت بھانت کی بولیوں سے پاک صاف ہو جائیں ”اسلام اور گداگری“ کے عنوان سے جو مضمون درج ہوا ہے اس میں کئی سرخیاں قائم کی گئی ہیں اور ان پر مدلل بحث کی گئی ہے، مثلاً بھیک مانگنے کے مختلف طریقے، تعویذ گنڈے، جنتر منتر اور جھوچھا کا پیشہ اختیار کرنا، خیرات کسے دی جائے فقیر کون ہے، بھیک مانگنے والوں کا انجام، فرمانِ رسالت، بھیک میں برکت نہیں وغیرہ وغیرہ۔ کتاب کے آخر میں ”صداقت کی روشنی“ کے عنوان سے امام الاحرار علامہ شیخ عبدہ مصری کے ایک مضمون کا آزاد ترجمہ درج کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں علامہ موصوف نے علمائے اسلام کو مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت کی طرف خاص طور پر متوجہ کیا ہے اور ان کو اپنے فرائض اور

ذمہ داریاں محسوس کرانے کی کوشش کی ہے۔

انسداد گداگری از محترمہ سارہ بیگم صاحبہ سابق معلمہ محبوبیہ گرل اسکول حجم ۶۰ صفحات قیمت ندارد

مطبوعہ رحیم پریس حیدرآباد۔ محترمہ سارہ بیگم صاحبہ نے روزنامہ "پیام" کی دو اشاعتوں میں اپنا ایک طویل مضمون "انسداد گداگری" درج کرایا تھا اب اس کو بعد نظر ثانی ایک مختصر رسالہ کی شکل میں شایع کیا گیا ہے، اس رسالہ میں موصوفہ نے چند مفید قابل عمل آسان تجاویز ملک وقوم کے سامنے پیش کی ہیں اور ان تجاویز کی بنیاد "خیرات فنڈ" کو قرار دیا ہے۔ مختلف عنوان مثلاً منع خیر، اجتماعی زکوٰۃ، قانون انسداد گداگری، خیرات فنڈ، خیرات بنک، محکمہ خیرات، محکمہ فراہمی روزگار۔ اور انسداد گداگری کے تحت تفصیلی بحث کی گئی ہے، ضرورت ہے کہ ہر پڑھا لکھا شخص اس رسالہ کو غور سے پڑھے اور سمجھے۔

محبت کا فسانہ از جناب لطیف الدین احمد صاحب حجم ۲۴۴ صفحات مجلد قیمت عہ۔ ادبی دنیا میں شہرت رکھنے والے جناب "ل۔ احمد" صاحب محتاج تعارف نہیں ہیں۔ اردو ادب اور دنیائے افسانہ میں انھیں جو عزت حاصل ہے اس سے ہر علم دوست بخوبی واقف ہے۔ ان کے افسانوں میں فلسفہ، علم و حکمت، اور جذبات و نفسیات کی تصویریں بولتی نظر آتی ہیں، اصلاح معاشرت اور اخلاقی مسائل پر یہ جو کچھ لکھتے ہیں اس میں حقیقت ہوتی ہے اور خلوص ہے، ان کا اسلوب بیان نہایت دلکش ہوتا ہے، ان کے افسانوں میں سلاست، نازک خیالی، پاکیزہ بیانی، نفاست، اعلیٰ تخیل، لطافت، شگفتگی، زندہ دلی، ظرافت، غرضکہ سب ہی کچھ موجود ہے۔

زیر نظر افسانہ بھی ان ساری خوبیوں کا حامل ہے اور اپنے اندر غضب کی دلچسپی اور کشش رکھتا ہے۔ یہ ایک طویل فسانہ ہے جس میں کبھی ہیرو کبھی ہیروین اور کبھی ہیرو کے دوستوں کی زبانی یہ کہانی بیان کرائی جاتی ہے، اس لحاظ سے یہ اپنی وضع کا انوکھا فسانہ ہے۔

اس فسانہ کا خلاصہ یہ ہے کہ "جمالی" کا بیاہ کورٹ شپ کے بعد "دردانہ" سے ہوتا ہے اور یہ جوڑا دریائے جہلم پر کشتی میں "ہنی مون" مناتا پھرتا ہے۔ راستہ میں کہیں طوفان سے سابقہ پڑتا ہے، کہیں کسی اسٹیمر سے ان کی کشتی ٹکرا جاتی ہے اور کہیں ان کی "جل پری" انھیں جل دے کر رفوچکر ہو جاتی ہے، غرضکہ اس سفر میں اس قدر دلچسپی کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں بے ساختہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کاش وہ بھی ان کا ہمسفر ہوتا!

جناب مصنف اس تصنیف کا مقصد یہ بیان فرماتے ہیں۔

> "آپ نے اگر اپنی پسند سے شادی کی ہے اور اس پسند کو تا بہ آخر برقرار رکھ سکتے ہیں یا آپ کے والدین نے آپ کو ایک کھلونا دلا دیا تھا اور آپ اس کھلونے سے اپنی دلچسپی دائم رکھ سکتے ہیں، تو مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنی اس کوشش کو آپ کے کمال فن سے منسوب کروں! کہ اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں!!"

اس فسانہ میں فلسفہ محبت، فلسفہ ازدواج، اسرار فطرت، جنسی تعلیم اور نظریہ حیات کے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

پیار اور محبت، میاں بیوی کی چھیڑ چھاڑ، طنز و مزاح اور دوسرے اقسام کی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ معاشری، سماجی، اخلاقی، مذہبی اصلاحات اور تاہل کی زندگی کی نسبت پند و نصیحت کی بہت سی باتیں نہایت دلکش پیرایہ میں درج کی گئی ہیں، باوجود ان ساری نصیحتوں کے اس غضب کی دلچسپی اس کے اندر بھر دی گئی ہے کہ ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد ختم کرنے تک چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ فسانہ اس قابل ہے کہ ہر مرد اور عورت اس کو غور سے پڑھے اور سمجھے اور اپنی متاہلانہ زندگی کو خوشگوار بنائے۔

یس۔

مضامین محمد علی مرتبہ جناب محمد سرور صاحب بی۔ اے آنرز استاد تاریخ اسلام جامعہ ملیہ حجم ۴۹۰ صفحات چھوٹی تقطیع مجلد قیمت عہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

سرسید کے بعد مسلمانان ہند میں سب سے زبردست شخصیت رئیس الاحرار مولانا محمد علی کی ہے جنھوں نے اپنے زندہ جاوید کارناموں سے ملک ملت میں زندگی کی روح پھونکی اور ایسے دور میں جب ہندوستان میں اہم دستوری تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں مسلمانوں کی کامیاب رہنمائی کی ہے۔ مولانا کی زندگی مسلمانوں کے لئے ہر وقت سبق اور عبرت کا سرچشمہ بنی رہے گی۔

ملک و قوم کے لئے انھوں نے جو ایثار اور قربانی کی، فقر و فاقہ کیا، مدتہائے جیل کی سختیاں برداشت کیں اور وہ سب کچھ کیا جس کی ایک مسلمان قوم سے توقع ہے اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ لیکن اس کے برعکس قوم نے ان کے ساتھ کیا کیا؟ تصویر کا یہ رخ تاریک ہے۔ ان کے مضامین کا وہ حصہ جس میں انھوں نے ملک کی ناقدریوں اور بے اعتنائیوں کا دکھڑا رویا ہے بڑا درد انگیز ہے۔

کامریڈ اور ہمدرد کو اجرا کرکے مولانا محمد علی نے مسلمانوں میں جو بیداری اور سیاسی شعور پیدا کیا وہ ہندوستانی صحافت کا ایک زرین باب ہے۔ یہی وہ دو اخبارات تھے جن کے اداریوں سے اگر ایک طرف وائٹ ہال میں زلزلہ پڑ جاتا تھا تو دوسری طرف وائسریگل لاج لرز اٹھتا تھا۔ مسلمانوں کی سیاسی بیداری در اصل ہمدرد ہی کا نتیجہ ہے۔ اس میں مولانا نے ہر قسم کے مضامین لکھے ہیں۔ مذہبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، اقتصادی۔ اگرچہ یہ مضامین ایک روزنامہ کے اداریوں کے لئے قلم برداشتہ لکھے جاتے تھے اور ان کے لکھنے میں کسی اہتمام کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا تھا لیکن ان کے گراں قدر ہونے کے لئے مولانا کا نام کافی ہے۔ ہر مضمون میں انھوں نے اپنا دل چیر کر رکھ دیا ہے۔ اور پھر طرز تحریر انتہائی شگفتہ، زبان نہایت پاکیزہ، اور معلومات کا یہ عالم کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دریا ہے کہ امڈا چلا آرہا ہے۔ مولانا کو رحلت فرمائے آٹھ دس سال کا عرصہ ہوتا ہے اور انھوں نے ہمدرد کے صفحات پر جو ذہنی نقوش چھوڑے ہیں وہ محو ہوتے جا رہے تھے۔ ملک کو مکتبہ جامعہ اور مرتب کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے ان مضامین کو یکجا کرکے ان میں دوام کی سند عطا کر دی۔ کیا اچھا ہوتا اگر مکتبہ مولانا کے ان مضامین کو بھی شائع کر دے جو مولانا نے کامریڈ میں تحریر فرمائے تھے مبادا یہ زمانہ کے دستبرد کا [illegible] نذر ہو جائیں۔

"مضامین محمد علی" کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے ناگزیر ہے جو ملک کے اس محسن اعظم کے خیالات اور احساسات معلوم کرنا چاہتا ہے جس نے ایک درماندہ قوم کی ناخدائی کے لئے تحریر فرمائے تھے۔ مکتبہ جامعہ قابل مبارکباد ہے کہ ان مضامین کو شائع کرکے اس نے نہ صرف مسلمانان ہند پر احسان کیا بلکہ مولانا کی روح کی بھی خوشنودی حاصل کی۔ "ش"

لکڑی کا باریک کام یہ چھوٹی سی کتاب دستکاری کے شائقین کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔ اس کے مرتب مولوی سید رضا احمد صاحب جعفری ہیں ادارۂ عصمت بک ڈپو نے شائع کیا ہے۔ جہاں سے عورتوں کے لئے اکثر ایسی ہی مفید اور کارآمد کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

اگرچہ یہ پرانا مقولہ صحیح ہے کہ تجربہ ہی سب کچھ سکھاتا ہے اور ہر علم و فن میں محنت و مشقت کے بغیر کامیابی نہیں ہوسکتی تاہم اس قسم کی کتابوں سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ان دقتوں اور پریشانیوں سے دوچار ہوئے بغیر جو ہر نئے کام میں لازمی ہیں، مبتدی جلد ترقی حاصل کرسکتا ہے۔

یہ کتاب فریٹ ورک کے متعلق لکھی گئی ہے۔ لکڑی کا نفیس کٹاؤ کے کام سے بے شمار وضع اور قطع کی زیبائشی اور کارآمد اشیا بنائی جاسکتی ہیں۔ تصویروں اور آئینوں کے فریم، گلدان، قلمدان، الماریاں، اسٹیشنری کیس، گڑیوں کے مکان اور دوسرے کھلونے وغیرہ بڑے خوبصورت بن سکتے ہیں۔ اور اس فن میں یہ خوبی ہے کہ اس سے مرد اور عورت اور بچہ اور بوڑھا ہر ایک فائدہ یا لطف اٹھا سکتا ہے خاص کر پردہ نشین عورتوں اور لڑکیوں کے لئے یہ نہ صرف ایک دلچسپ مشغلہ اور ورزشی ہنر ہے بلکہ ایک مفید کام اور آمدنی کا ذریعہ بھی ہے۔

سید رضا احمد صاحب نے اس کتاب کو پانچ بابوں میں تقسیم

ادارہ کی کتاب من کی دنیا پر رائیں

نگار۔ جولائی ۱۹۳۹ء } مجموعہ ہے جناب رشید قریشی کے بائیس افسانوں کا جن میں سے بعض مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعہ کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کا تعلق صرف دل کی دنیا سے ہے اور دل کی دنیا چونکہ عالمِ تخیل بہت آزاد ہوئی ہے۔ اس لئے بعض افسانے بڑی حد تک کھل کھیلنے کی مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

نوجوان فسانہ نگار نے کوشش کی ہے کہ جو کچھ ان پر گذری ہے یا اپنے اوپر گذارو دینا چاہتے ہیں وہی قلمبند کریں اس لئے افسانوں میں نہ تازگی و جدت کی کمی ہے اور نہ بیباکی و جراتِ رندانہ کی۔ اندازِ بیان میں ادبیت بھی ہے اور سلاست و روانی بھی۔

ادبِ لطیف لاہور۔ جولائی ۱۹۳۹ء امید کی جاتی ہے کہ ہمارا یہ نووارد صاحبِ قلم مستقبل میں ضرور اردو کے مشاہیر کی صف میں شامل ہوگا۔ اندازِ نگارش کے تیور صاحبِ قلم کی صلاحیتوں کا پتہ دے رہے ہیں۔ اس مجموعہ کی قدر کرنی چاہیئے۔

جامعہ۔ رسالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ جولائی ۱۹۳۹ء ہر افسانے میں زندگی کی اور جذبات کی صحیح تصویر نظر آتی ہے۔

معارف۔ جولائی ۱۹۳۹ء تقریباً کل افسانے وارداتِ شباب کی تعبیریں ہیں۔ ہونہار مصنف میں فسانہ نگاری کی صلاحیت موجود ہے۔

ماہ نیم ماہ۔ یکم و ۱۶ رمئی ۱۹۳۹ء عہدِ حاضرہ میں ٹالسٹائے اور چیخوف وغیرہ یورپی مصنفین کے نقشِ قدم پر چل کر ہندوستانی نوجوان اہلِ قلم حضرات بھی بہت کچھ لکھ رہے ہیں۔ آج کل کا مختصر افسانہ دس پندرہ سال پہلے کے مختصر افسانے سے قطعی مختلف ہوتا ہے۔ آج کل اختصار کی حد ہو گئی ہے "من کی دنیا" کے اکثر افسانے ڈھائی ڈھائی تین تین صفحات پر ختم ہو جاتے ہیں۔

رشید قریشی کے مختصر افسانے ان کے طبعزاد ہیں اور ان کے محسوسات کے ترجمان ہیں مصنف کی طرزِ تحریر میں سادگی اور روانی ہے۔ اور ظرافت کی تازگی اور بیساختہ پن کی شگفتگی بھی موجود ہے۔

شاعر آگرہ۔ مئی ۱۹۳۹ء تمام افسانے دلچسپ ہیں۔ زبان نہ بہت آسان ہے اور نہ بہت الجھی ہوئی ان افسانوں میں سوز بھی ہے۔ مستی بھی ہے اور جذب و شوق بھی۔ بعض افسانوں کا پلاٹ بہت اچھا ہے۔ جہاں رشید قریشی کردار کی زبان میں گویا ہوتے ہیں وہاں وہ جذبات کے اظہار پر بڑی قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔ امید کہ ملک ہمارے اس نوجوان افسانہ نگار کی قدر کرے گا۔

نیرنگِ خیال۔ اپریل ۱۹۳۹ء جس طرح سے حضرت اختر انصاری صاحب نے عام رومان انگیز افسانوں سے ہٹ کر مزدوروں اور غریبوں کی دنیا کے متعلق افسانے لکھے ہیں۔ اسی طرح سے رشید قریشی صاحب نے من کی دنیا کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا ہے جو زیادہ تر مشاہدات پر مشتمل ہے یہ رومان اور افسانے کی طرز کے علی الرغم کسی صاحبِ نظر کے مشاہدات ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ من کی دنیا میں جذبات انگیزی اور عبارت کی رنگینی بھی کسی حد تک موجود ہے۔ اختر انصاری کے افسانوں میں واقعہ نگاری اور سلاست ہے مگر تاثرات گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اور تلخی کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ افسانوں کے دونوں مجموعے نرالی طرز اور جدید خیالات سے بھرپور ہیں۔ ناظرین ضرور خریدیں۔

قیمت مجلد (عہ)

ادبی اعلانات

علامہ راشد الخیری کے خطوط

"مسٹر صادق الخیری (دفتر عصمت۔ دہلی) قارئینِ "سب رس" سے درخواست کرتے ہیں کہ ان کے یا ان کے کسی دوست کے پاس حضرت علامہ راشد الخیری مرحوم کا کوئی نجی یا تحزن و تمدن وغیرہ کے سلسلہ میں صحافتی خط ہو تو از راہِ کرم ان کے پاس فوراً بھیج دیں۔ اگر مکتوب الیہ کو اصرار ہو تو موصوف اس کی نقل رکھ کر اصل بحفاظت و بہ اظہارِ شکریہ واپس کر دیں گے۔ نیز جن اصحاب و خواتین کے پاس علامہ مرحوم کے آٹوگراف ہوں وہ اسے ارسال فرمائیں، باعثِ ممنونیت ہوگا"

اُردو اکادمی

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

دو سو روپے کے بجائے ڈھائی سو (۲۵۰) روپے انعام

اُردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے ذیل کے ہر مضمون پر مبلغ دو سو روپے انعام دینا تجویز کیا تھا مگر اب اسے بڑھا کر ڈھائی سو کر دیا گیا ہے۔ جن صاحب کا مقالہ سب سے بہتر ہوگا انہیں مذکورہ بالا انعام دیا جائے گا۔ اکادمی کا فیصلہ ناطق ہوگا۔ اس کے علاوہ اکادمی منتخب مقالہ جات کے حقوق واشاعت اپنے ذمہ رکھے گی۔ مقالہ میں تقریباً پچاس ہزار الفاظ ہونے چاہئیں۔ اور تمام مقالے سکرٹری اردو اکادمی کے پاس ۳۰ ستمبر تک پہنچ جانا چاہئیے۔ جو صاحب اس مقالہ نویسی میں شرکت پسند کریں وہ پہلے اپنے مضمون کے انتخاب سے سکرٹری کو مطلع کر دیں۔

۱۔ اشتراکیت۔ ۲۔ فاسزم ۳۔ نازی الزام ۴۔ سامراج ۵۔ وطنیت ۶۔ سرمایہ داری ۷۔ بحیرہ روم کی سیاست ۸۔ بحرالکاہل کی سیاست ۹۔ امریکہ اور سیاستِ عالم۔ ۱۰۔ وسطی یورپ کی سیاست ۱۱۔ نوآبادیوں کی تقسیم ۱۲۔ ممالکِ اسلامی کی سیاست۔

سکرٹری اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

اِدارہ ادبیاتِ اُردو

اردو زبان اور ادب کی خدمت کر رہا ہے۔

اس کی مطبوعات تمام اردو دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں

ہر دلچسپ اور مفید موضوع پر اس نے کم قیمت کتابیں شائع کی ہیں۔

اس کی کتابیں کتابت، طباعت، کاغذ اور عام دلکشی کی وجہ سے مشہور ہیں۔

اس نے ملک میں مطالعہ کا ذوق عام کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔

اس کی باتصویر اور مجلد کتابیں اپنی نفاست کی وجہ سے بہت پسند کی جاتی ہیں۔

بچوں، بوڑھوں، مردوں اور عورتوں ہر ایک کی ضرورت کی کتابیں شائع کر رہا ہے۔

اس کی مطبوعات کی فہرستیں طلب کرنے پر مفت بھیجی جاتی ہیں۔ سب سے بہتر یہی ہے کہ صرف ایک کارڈ ڈال کر منگوا لیں۔ اردو کتابیں خریدنی ہوں تو ادارہ کے سب رس کتاب گھر خیریت آباد سے ضرور مشورہ کیجئے جو ہر طرح آپ کے ذوقِ مطالعہ کی تکمیل میں مدد دے

ادارۂ ادبیات اردو کی مشہور و معروف کتابیں

روح غالب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگذشت اور ان کے خطوط کا دلچسپ ادبی انتخاب مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صفحات ۲۰۰ معہ تصاویر قیمت عا ۸ر	**سرگذشت غالب** غالب کی حیات اور اعزہ و احباب کا ایک مجمل تذکرہ. غالب کی تصویر اور خاندانی شجرے بھی شایع کئے گئے ہیں مرتبہ سید محی الدین قادری زور صفحات ۶۴ قیمت ۸ر	**نظام الملک** بانیٔ سلطنت آصفیہ کے مجمل حالات مستند واقعات زندگی عوام اور طلبہ کے لئے سلیس اور شگفتہ زبان میں تحریر کئے گئے ہیں. مرتبہ شیخ چاند مرحوم ام اے ال ال بی (ریسرچ اسکالر) صفحات ۴۰ معہ تصویر قیمت ۴ر	**من کی بپتا** متوسط طبقہ کی خواتین کی معاشرتی اور اخلاقی کمزوریوں کو بے نقاب کرکے زندگی کی تلخیوں سے کامیاب مقابلہ کرنے کے طریقے پیش کئے گئے ہیں. مصنفہ لطیف النساء بیگم ام اے صفحات ۸۰ قیمت ۸ر
فیض سخن انتخاب کلام حافظ میر شمس الدین محمد فیض. مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور معہ سوانح فیض صفحات ۱۴۴ قیمت ۱۲ر	**بادۂ سخن** انتخاب کلام ڈاکٹر احمد حسین مائل مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور معہ سوانح و تصویر صفحات (۱۲۸) قیمت ۱۲ر	**سراج سخن** انتخاب کلام شاہ سراج اورنگ آبادی مرتبہ. پروفیسر عبدالقادر سروری معہ سوانح شاہ سراج صفحات (۹۲) قیمت ۱۲ر	**ایمان سخن** انتخاب کلام شبیر محمد خاں ایمان مرتبہ مولوی سید محمد صاحب ام اے معہ سوانح ایمان صفحات (۱۳۰) قیمت ۱۲ر
کیف سخن انتخاب کلام سید رضی الدین حسن کیفی مرتبہ. ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور معہ سوانح و تصویر صفحات (۱۲۲) قیمت ۱۲ر	**متاع سخن** انتخاب کلام نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز مرتبہ. ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور معہ سوانح و تصویر صفحات (۱۲۵) قیمت ۱۲ر	**ورڈزورتھ اور اسکی شاعری** مشہور انگریز شاعر کے حالات اور کلام پر تبصرہ. از مولوی میر حسن صاحب ام اے معہ تصویر شاعر صفحات ۴۸ قیمت ۳ر	**ٹیگور اور انکی شاعری** ہندوستان کے مشہور شاعر رابندرناتھ ٹیگور کے حالات اور کلام پر تبصرہ از مولوی مخدوم محی الدین صاحب ام اے معہ تصویر شاعر صفحات ۱۲۰ قیمت عہ
ہوش کے ناخن (ڈرامہ) حیدرآباد کی سماجی زندگی کا خاکہ مصنفہ مخدوم محی الدین و میر حسن صاحبان صفحات (۹۶) قیمت عہ	**نذر ولی** ولی اورنگ آبادی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی مضامین کا مجموعہ از لطیف النساء بیگم ام اے نجم النساء بیگم ام اے نعیم النساء بیگم ام اے جہاں بانو بیگم ام اے صفحات ۲۴۰ قیمت ۸ر	**نقد سخن** کلام فانی پر نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کی تنقیدوں کا مجموعہ قیمت عہ	**گریہ و تبسم** صاحبزادہ میکش کی دلکش نظموں کا مجموعہ قیمت مجلد دو روپے.
مشاہیر قندھار دکن دکن کے مشہور مردم خیز خطہ کی دلچسپ با تصویر تاریخ از اکبر صدیقی بی. اے قیمت عہ	**من کی دنیا** نوجوان انشا پرداز رشید قریشی کے ولولہ انگیز افسانے مجلد قیمت عہ	**مدراس میں اردو** مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کی محققانہ تالیف صفحات (۲۰۰) مجلد قیمت (عہ)	**نذر دکن** (با تصویر) دکن کے متعلق خواتین دکن کے رشحات قلم معہ عکس تحریر و تصاویر صفحات (۱۱۴) مجلد قیمت عہ

سب رس

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش — سکینہ بیگم

خواجہ حمید الدین شاہد — معین الدین احمد انصاری

جلد (۲) شمارہ (۸)	سب رس	اگست سنہ ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

ادارہ کی مطبوعات اور سب رس کتاب گھر کی فہرست جملہ علم دوست اصحاب کی خدمت میں مفت روانہ کی گئی ہے۔ کسی صاحب کو نہ پہنچی ہو تو اطلاع دینے پر روانہ کر دی جائے گی۔

مہتمم

اداریہ

یہ عجیب بات ہے کہ جیسے جیسے سب رس کی قدر دانوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اس کی اشاعت بڑھتی جاتی ہے اور اس کے قلمی معاونین کا حلقہ وسیع ہو رہا ہے ساتھ ہی اس کے خلاف افواہ اڑانے والوں اور جھوٹی خبریں پھیلانے والوں کے دلوں میں بے چینی پیدا ہو رہی ہے۔ کبھی اس کی مجلس ادارت کے متعلق کوئی مضحکہ خیز بات مشہور کر دی جاتی ہے اور کبھی اس کی رفتار ترقی یا بقائے متعلق کوئی خبر پھیلائی جاتی ہے۔ اس کو ہم سب رس کی کامیابی سمجھتے ہیں۔ دل بلاشبہ حسد و خصائل ہونا ہر ایک کی قسمت میں نہیں ہوتا۔ اور اس واقعہ کا ہم نے محض اس لئے تذکرہ کر دیا کہ سب رس کے خلاف کہنے والوں کو اس امر کا یقین دلا دیا جائے کہ ان کی طرز روش سے سب رس کو نقصان تو نہیں پہنچ سکتا۔ غالب ہے کہ اس سے فائدہ ہی پہنچ جائے۔ کیونکہ سب رس کسی کا ذاتی پرچہ نہیں ہے کہ جب تک دل میں آیا نکالا اور جب جی چاہا بند کر دیا۔ یہ اردو کے ایک ایسے باوقار اور مسلم الثبوت ادارہ کا ترجمان ہے جس کی کتابیں اردو دنیا میں عزت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں اور جہاں سے آئے دن مطبوعات شائع ہوتی رہتی ہیں جس کے کتب خانہ کے لئے ایک شایان شان عمارت کی تعمیر کے نقشے اور نقشہ بن چکے ہیں جس کے سرپرست صدر معاونین اور رفقا میں ملک کے جملہ اہل ذوق اور اکثر ارباب اردو شامل ہیں۔ ایک ایسے ادارہ کے ترجمان کے معیار اور رفقا و لوگوں کے متعلق غلط سلط باتیں مشہور کرنا سوائے حاسدوں کے کسی معقول انسان کا کام نہیں۔ خدا کے فضل سے قلیل عرصہ میں سب رس نے اپنے قدر دان پیدا کر لئے ہیں کہ وہ برابر ترقی کرتا جائے گا۔ اگر خدانخواستہ اس کو عوام سے اتنی مدد حاصل نہ بھی ہوتی تو ادارہ اس کو برابر جاری رکھتا۔ کیونکہ وہ اس کے لوازمات ضروری میں شامل ہے۔ رہی مجلس ادارت تو اس کی تشکیل پہلے ہی سے اس طرح کر دی گئی ہے کہ سب رس کی ترقی اور ترتیب میں روز افزوں سہولتیں محسوس ہو رہی ہیں اور کسی ایک رکن پر نہ زیادہ بار پڑ جاتا ہے اور نہ کوئی شکایت کا موقع ملتا ہے۔ مجلس ادارت کا ایک بار ادارہ کے شعبۂ تنقید نے اپنے اوپر لے کر مجلس کے فرائض اور ہلکا کر دیا ہے۔ یعنی ہر ماہ کی وصول شدہ کتابوں پر تنقید و تبصرہ کرنا اردو کی جدید مطبوعات اور رسائل و جرائد کے متعلق معلومات بہم پہنچانا اور رسالہ کے معیار پر تنقیدی نظر رکھنا ایسے اہم کام ہیں جن کی وجہ سے سب رس کے ادبی معیار اور علمی شان میں اضافہ ہو رہا ہے اور اردو دنیا میں اس کے تبصروں کو اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے چنانچہ ہندستان کے کل ناشرین کتب کے یہاں سے ہر ہفتے نئی نئی کتابیں وصول ہوتی جاتی ہیں جن کو تاریخ وصولی کے لحاظ سے رجسٹر میں درج کر لیا جاتا ہے۔ اور ہر مہینہ شعبۂ تنقید کے اجلاس میں اراکین اپنے اپنے ذوق کی کتاب تنقید کرنے کے لئے پسند کر لیتے ہیں اور تنقیدیں سب رس میں شائع ہو جاتی ہیں۔ ناشرین اور مصنفین و مولفین کو مطمئن رہنا چاہئے کہ موصولہ کتابوں پر سب رس میں ضرور تنقیدیں چھپیں گی اور آئندہ اس امر کی بھی کوشش کی جائے گی کہ تنقیدیں جلد چھپیں اور ان کے لئے رسالہ میں زیادہ جگہ وقف کی جا سکے۔

چنانچہ اس ماہ بھی شعبۂ تنقید کا اجلاس ہوا جس میں پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری (داعی شعبہ کے علاوہ) فضل حق صاحب ایم اے (پروفیسر انگریزی نظام کالج) ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور، سید محمد صاحب ایم اے (لکچرار اردو سٹی کالج)

سید ہاشمی حسن صاحب بلگرامی بی اے، نواب میر اسد علی خاں صاحب جاگیردار، بدرالدین خاں صاحب شکیب بی اے ال ال بی اور نصیر الدین ہاشمی صاحب نے شرکت کی۔ موصولہ تقریبیں جو تنقید کے لئے پیش ہوئیں ان میں سے اکثروں پر آئندہ ماہ میں تنقید شائع ہو جائیں گی۔

ڈاکٹر حبیب صاحب نے جو رسالہ کی شعبہ تنقید کی طرف سے ایک خصوصی تنقیدی رسالہ شائع کیا جانے۔ اس تحریک کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد یہ مناسب پایا گیا کہ رسالہ کے اجرا میں جو دقتیں ہیں ان کے پیش نظر فی الحال یہ تو زیادہ مناسب ہے کہ "سب رس" کے صفحات تنقید میں اضافہ کر دیا جائے۔

تنقید کے بہترین انگریزی اور دوسری زبانوں کے ترجموں کے سلسلہ میں یہ طے ہوا کہ داعی شعبہ اور پروفیسر فضل حق صاحب آزاد کے مضامین کا ترجمہ آئندہ مہینے تک ختم کریں تاکہ رسالہ میں اس سلسلہ کی ابتدا کی جا سکے۔

اس مہینے شعبۂ تاریخ دکن کا ایک اجلاس ہوا جس میں مولوی سید محمد صاحب صدیقی ام اے ال ال بی داعی شعبۂ تاریخ کے علاوہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری، مولوی خواجہ محمد صاحب ام اے، مولوی میر محمود علی صاحب ام اے نے شرکت کی۔ حیدرآباد کے تاریخی مسائل پر غور و خوض کیا گیا۔ مولوی نذیر احمد صاحب کی یہ تجویز منظور کی گئی کہ سلاطین آصفیہ کے خاندان کے حالات کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے اور جس کی پہلی کتاب نظام الملک آصف جاہ شائع ہوا، مکمل ہو چکی ہے، اس سلسلے کی دوسری شاہی خاندانوں کے متعلق بھی چھوٹی چھوٹی کتابوں کے سلسلے شائع ہوں۔ اس شعبے کے اراکین میں اضافہ کرنے پر غور ہوا اور طے پایا کہ علی حسن صاحب ام اے ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ اور محمد غوث صاحب ام اے کو اس کی مجلس عاملہ کے رکن بنائے جائیں۔ تاریخ دکن سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کی فہرست میں حسب ذیل کا اضافہ کیا گیا۔ مسٹر زین یار جنگ، مولوی علی اکبر صاحب، نواب عنایت جنگ بہادر، ڈاکٹر مرزا حسن علی خاں صاحب اور ڈاکٹر امیر علی خاں صاحب ہاشم۔ اس فہرست میں جن اصحاب کے نام شریک لئے جاتے ہیں ان کو یہ شعبہ اپنا تعاونی رکن سمجھتا ہے اور بعض مسائل پر ان سے مفید مشورے حاصل کرنے کے علاوہ شعبہ کے غیر معمولی جلسوں میں ان کو شرکت کی دعوت بھی دی جاتی ہے۔

اس شعبہ کی اہم کتاب تاریخ گولکنڈہ شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ توقع ہے کہ اور کتابیں بھی جلد شائع ہو سکیں گی۔
اس شعبہ نے تاریخ دکن کے متعلق تحقیقات کرنے کے سلسلہ میں بعض دوسرے شعبوں سے اعانت طلب کی ہے اور ایک مشترکہ جماعت بنائی گئی ہے تاکہ حیدرآباد اور اس کے اطراف و اکناف کے ایسے آثار کا معائنہ کرے اور ان کے حالات قلمبند کرے جن کے متعلق اب تک کافی معلومات حاصل نہیں ہیں۔ یہ جماعت اپنا کام شروع کر چکی ہے اور آئندہ رسالہ میں بہت سی مفید معلومات شائع کرے گی۔

اس مہینہ شعبۂ نسوان کا چھٹا اجلاس منعقد ہوا جس میں سکینہ بیگم صاحبہ (داعی شعبہ)، رابعہ بیگم صاحبہ، سارہ بیگم صاحبہ، لطیف النساء بیگم صاحبہ ام اے، جہاں بانو بیگم صاحبہ ام اے، جیلانی بیگم صاحبہ اور رشید النساء بیگم صاحبہ بشیر نے شرکت کی۔ معمر عورتوں کی تعلیم کے لئے مکتب کے افتتاح کے متعلق ضروری امور طے پائے۔ مکتب کے اخراجات اور سواری وغیرہ کا تصفیہ کیا گیا۔ یہ مکتب رابعہ بیگم صاحبہ اور سائرہ بیگم صاحبہ کی نگرانی میں اہل الذکر کے مکان واقع اڈیکمیٹ میں قایم ہو رہا ہے۔ احمد النساء بیگم صاحبہ (محل عبد اللطیف صاحب) ملکہ بیگم صاحبہ، قمر النساء بیگم صاحبہ اور محل ڈاکٹر عنایت علی خاں صاحب وغیرہ سے مکتب میں تعلیم دینے کی استدعا کی جا رہی ہے۔ احمد النساء بیگم صاحبہ کی منتخبہ نظموں اور مناظروں

مجموعے اشاعت کے لئے پیش ہوئے جن کے متعلق آئندہ اجلاس میں اراکین رائے دیں گی۔ ان کے ترتیب اللفظ پسند کئے گئے۔ اور ان کے کارڈ بنوا لینے کا تصفیہ ہوا۔ نیز اسی طرح چھوٹے کارڈوں پر اسما، افعال، اور حروف چھپوانے کی تجویز بھی منظور ہوئی تاکہ بچوں کو آسانی سے جملے بنانے اور کھیل کھیل میں پڑھنے سے دلچسپی پیدا کرنے میں سہولت ہو۔

شعبۂ نسواں کی طرف سے ایک اجلاس عام منعقد کئے جانے کا بھی تصفیہ ہوا جس میں ممکن ہو تو ایک اصلاحی ڈرامہ بھی شعبہ کی طرف سے ترتیب دیا جانے گا

"ادارہ"

ایک مایوس نوجوان کے نام

آئینہ صفا ہے وہ تیرا دل حزیں گرد ریا کا جس پہ نشاں تک نہیں کہیں
تیرے سلوک سے ہیں پشیماں اہل کیں تیری روش پہ سر بگریباں ہیں نکتہ چیں

تیرے دل و دماغ کو پہچانتا ہوں میں
تو مجھ کو جانتا ہے تجھے جانتا ہوں میں

کیوں ختم ذوق بادۂ سرجوش ہو گیا؟ بزم ادب سے کس لئے روپوش ہو گیا؟
اپنی زباں کا حق بھی فراموش ہو گیا؟ افتاد کیا پڑی ہے کہ خاموش ہو گیا؟

ناکامیوں کا غم ہے تو ناکامیاب ہے
چھا جائے جو شکست پہ وہ کامیاب ہے

طرز نوائے مرغ گرفتار چھوڑ دے دام اجل ہے سایۂ دیوار چھوڑ دے
اندیشہ ہائے اندک و بسیار چھوڑ دے کشتی کو سمت قلزم زخار چھوڑ دے

ڈوبنے کا خوف ہے ترے سیلاب پاؤں میں
موتی لٹائے گا ترے پرچم کی چھاؤں میں

ناقدریِ کمال کا شکوہ فضول ہے　　　آئیں نیا نہیں، یہ پرانا اصول ہے

اصلاحِ انتظامِ جہاں تیری بھول ہے!　　　ہاں ہر گدھے کی پیٹھ پہ اطلس کی جھول ہے

یہ ننگ ہے حیاتِ گرامی کے واسطے

کیا رو رہا ہے جنسِ غلامی کے واسطے!

جوشِ عمل کو اور ذرا اشتعال دے　　　نامنصفوں کے پاؤں میں زنجیر ڈال دے

خوف و ہراس خانۂ دل سے نکال دے　　　بتپا اگر پڑے تو نہ ڈر ہنس کے ٹال دے

تو مرد ہے زبانِ شکایت کو بند کر!

مشکل میں اور نعرۂ ہمت بلند کر!

موسم نہیں ہے دوست! یہ چنگ و رباب کا　　　لہرا رہا ہے سر پہ علم انقلاب کا

اب کام آئے گا نہ یہ مسلک حباب کا　　　اس وقت امتحان ہے تیرے شباب کا

طوفان آگیا ہے مجسم چٹان بن!

ہستی کو جس پہ ناز ہو ایسا جوان بن!

باطل کے نقش خاکِ وطن سے مٹا کے چل　　　ہو کوئی سدِّ راہ تو ٹھوکر لگا کے چل

آئیں مصیبتیں تو اکڑ، مسکرا کے چل　　　سر جھک گیا تو موت ہے یاں سر اٹھا کے چل

جھکتی ہے خلق صرف دلاور کے سامنے

دبتی ہے موجِ دستِ شناور کے سامنے

سکندر علی وجد

حسبِ ذیل کتابیں ادارہ کے شعبۂ تنقید کے پیش نظر ہیں۔ ان میں سے اکثروں پر آئندہ رسالہ میں تنقید شایع ہوگی۔
(۱) کلیات بحری (۲) رحمتہ اللعالمین (۳) رسول پاک (۴) ہندستانی (۵) محکومیت نسواں (۶) دنیا کی کہانی (۷) مضامین محمد علی (۸) ترک شراب (۹) راز و نیاز (۱۰) ارمغان باز (۱۱) وصلی کی صنعت۔ (۱۲) لکڑی کا باریک کام (۱۳) بزم تاریخ (۱۴) تاریخ بھگنڈہ (۱۵) روح حیات (۱۶) گفتگوئے مصالحت (۱۷) نغمہ و الہام (۱۸) تاریخ گولکنڈہ۔

مہتمم ادارہ

گولکنڈے کے نئے قلعہ میں ملّا خیالی کی مسجد

قلعہ گولکنڈہ کے شمال مشرق کی جانب فصیل سے متصل ایک اور چھوٹا سا قلعہ ہے جو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۶۶ھ میں بنایا گیا تھا۔ کیونکہ اس سنہ میں جب گولکنڈہ کے غدار وزیر میر جملہ کے اشارے سے اورنگ زیب نے قطب شاہی سلطنت پر اچانک حملہ کیا تو مغل فوجوں نے ایک ٹیلے پر مورچہ بنا کر قلعہ پر گولہ باری شروع کی جس نے محصورین کو صلح کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس صلح کے بعد عبداللہ قطب شاہ نے اس ٹیلے اور مغل مورچے کے اطراف ایک عالی شان فصیل بنا کر اس حصہ کو محصور کر لیا۔ اس طرح نیا قلعہ وجود میں آیا اور اب تک اسی نام سے مشہور ہے

اس نئے قلعہ میں جہاں بہت سی چیزیں تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے قابل دید ہیں۔ ہتھیان کا درخت اور اس کے قریب ملا خیالی کی مسجد بھی لایق تذکرہ ہے۔ ملا خیالی اردو کے ایک بہت بڑے شاعر اور صاحب ثروت اہل ذوق تھے۔ اور انہوں نے جو مسجد بنائی وہ دو منزلہ اور نہایت خوبصورت ہے۔

نیا قلعہ اپنے روح پرور مناظر، خاموش ماحول، سرسبز و شاداب مرغزار، پرفضا پہاڑیوں، عظیم الشان فصیلوں، جھیل، تالاب اور گھنے درختوں کی وجہ سے اب بھی ایک بہترین تفریح گاہ ہے جو حیدرآباد سے اس قدر قریب واقع ہے۔ لیکن عہد قطب شاہیہ میں تو یہ جگہ ایک عجیب و غریب تفریح گاہ ہوگی۔ جب اس کے عظیم الشان حوض پانی سے لبریز ہوں گے اور ایک حوض میں سے دوسرے حوض میں پانی آبشار کی طرح گرتا ہوا جاتا ہوگا۔ اور اسی طرح کئی بڑے بڑے حوضوں میں سے گذرتا ہوا اس بڑے تالاب تک پہنچتا ہوگا جس کے درمیان ایک مصنوعی جزیرہ بنایا گیا ہے جو اب تک عہد ماضی کے جلسوں اور کشتی رانی کے دلچسپ مشغلوں کی یاد تازہ کرنے کے لئے موجود ہے۔

اس زمانہ میں اس اٹکھیلیاں کرتے ہوئے پانی اور [illegible] کے قریب ایک عجیب و غریب درخت بھی موجود ہوگا جو صدیوں سے گرم و سرد زمانہ کے تجربے کرتا آیا تھا۔ اور جو آج تک جوں کا توں موجود ہے یہ درخت اس وقت بھی موجود تھا جب خود نئے قلعہ کا وجود بھی نہ تھا اور جس وقت مغل سپاہی گولکنڈہ کو مسمار کرنے کے خیال سے اسی کے قریب ایک ٹیلہ پر مورچہ بنا رہے تھے اس وقت بھی وہ اسی طرح عجائبات میں شمار ہوتا ہوگا جس طرح آج ہوتا ہے اور مغل سپاہیوں کی ٹولیاں اس کو دیکھنے کی طرح جمع ہوتی ہوں گی جس طرح آج دور دور کے لوگ اور انگریز سیاح جو اس کو دیکھنے آتے ہیں۔

اس درخت کی عجیب و غریب خصوصیات میں نے سیر گولکنڈہ میں بیان کی ہیں [illegible] صرف اس مسجد کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس درخت کے قریب اردو کے ایک بلند پایہ [illegible] سال قبل تعمیر کی تھی اس لئے بنائی گئی کہ جو لوگ اس درخت کو دیکھنے آتے ہیں وہ صانع حقیقی کی قدرت کو دیکھ کر [illegible] عبادت بھی کریں سجدہ شکرانہ بجا لائیں اور اس مسجد کے نیچے کی خانقاہ میں تھوڑی دیر دم لیں اور اس عجیب و غریب درخت کا لطف اٹھائیں۔

اس مسجد میں یوں تو کئی کتبے اندر کی دیوار اور محراب پر موجود ہیں لیکن دروازے پر جو لگتا تھا وہ مرور ایام اور ابنائے سلف کی بے پروائی کی وجہ سے ٹوٹ کر گر پڑا ہے۔ راقم نے اس کتبہ کو پڑھنے کی کوشش کی تو یہ معلوم ہوا کہ یہ مسجد جہاں میں بیسیوں بار گذر چکا ہوں اردو ہی کے ایک قدیم شاعر اور خدمت گذار نے بنائی تھی۔ میں اس کتبہ کو ذیل میں نقل کرتا ہوں اس کے دوسرے کتبے اور خود مسجد کی تصویریں اور دوسری خصوصیتیں وغیرہ آئندہ ادارہ ادبیات اردو کے شعبہ تاریخ دکن اور شعبہ شعرا و مصنفین دکن کی مشترکہ کوششوں سے منظر عام پر آسکیں گی۔

منت یزداں کہ در دوران شاہ دیں پناہ — قطب عالم شاہ براہیم آں نیکو سرشت

کردہ ایں مسجد بنا ملا خیالی کز شرف — می سزد کارند حوران بہشتی سنگ و خشت

رکنے از جنت برائے پیش آمد با خدا — از برائے آں بود تاریخ او رکن بہشت

اس سلسلہ میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ ملا خیالی اردو کے بہت ہی قدیم شعرا میں سے ہیں۔ جیسا کہ کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے وہ ابراہیم قطب شاہ کے ہم عصر تھے اور ۹۷۰ھ میں اتنے صاحب ثروت ہو چکے تھے کہ قلعہ گولکنڈہ کے باہر ایک خوبصورت دو منزلہ مسجد بنائی تھی۔ کیا تعجب کہ یہ زمین جس کو سلطان عبداللہ نے محصور کر لیا اور جو اب نیا قلعہ کہلاتی ہے انہی کی ملک ہو!

عام طور پر سلطان محمد قلی قطب شاہ کو اردو شاعروں کا پہلا صاحب دیوان اور پہلا بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کتبہ کی دریافت کے بعد سے اس خیال میں تبدیلی کرنی پڑے گی۔ کیونکہ اس کی رو سے ملا خیالی اس وقت ہی اردو کے ایک مشہور شاعر بن چکے تھے جب کہ وہ ابھی تین چار سال کا بچہ تھا۔ فی الحال یہ نہیں کہا جا سکتا کہ محمد قلی کے عہد حکومت تک ملا خیالی زندہ رہے یا نہیں اور اگر زندہ تھے تو اس اردو پرست بادشاہ نے ان کی کیا قدر کی تھی۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ نہ صرف محمد قلی کے بلکہ اس کے جانشینوں سلطان محمد قطب شاہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں بھی خیالی کی بڑی شہرت تھی۔ چنانچہ اس مسجد کی تعمیر کے نوے سال بعد گولکنڈہ کا ایک دوسرا مشہور شاعر ابن نشاطی اپنی نظم پھول بن میں ملا خیالی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ موجود نہیں ہیں ورنہ میرے کمال کی داد دیتے اور میری قدر کرتے۔ ابن نشاطی کا شعر یہ ہے ؎

اچھے تو دیکھتے ملا خیالی — یو میں بر تیہ ہوں سو صاحب کمالی

سید محی الدین قادری زور

رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیئے اس تاکید کے باوجود بعض اصحاب دیر میں اطلاع دیتے ہیں جس کی تعمیل میں ادارہ قاصر ہے۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔ خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

سب رس کی قیمت:۔ حیدرآباد کے لئے چار روپے سالانہ علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ۔ رفعت منزل خیرت آباد حیدرآباد دکن

Istanbul. Sultan
Mosquée Sultan

SULTAN
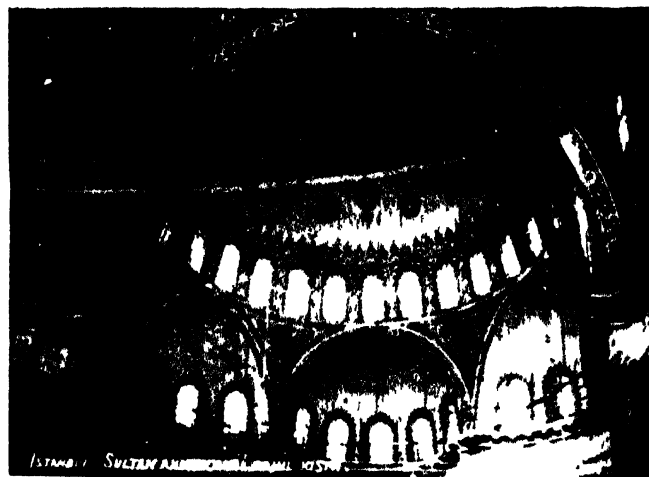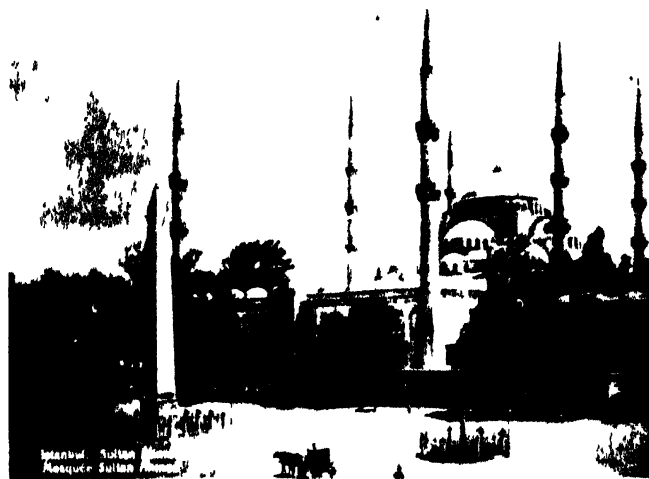
ترکی کی جامع سلطان احمدؒ

اپنے قیام استنبول کے [illegible] زمانے میں ہم نے خیال کر رکھا تھا کہ ہر روز مغرب کی نماز کسی نئی مسجد میں ادا کی جائے گی۔ چنانچہ دو تین روز مسجد نیلی جامع میں (جس کو [illegible] امام [illegible]) جاتے رہے نماز ادا کرنے کے بعد ایک روز جامع سلطان احمد میں حاضر ہوئی۔ واضح رہے کہ [illegible] مسجد کے لئے جامع کا لفظ استعمال [illegible] کیا جاتا ہے۔ مسجد سے متصل مرحوم سلطان احمد کا مقبرہ بھی ایک معمولی گنبددار عمارت میں واقع ہے۔ مسجد کی رفعت منزلی اور از سرتا پا بے نظیر مرصع صنعت کاری کے مشاہدہ کے بعد جب سلطانؒ بانی مسجد کی اس بالکل سادہ آرام گاہ پر نگاہ جاتی ہے۔ تو بے اختیار اسلامی تعلیم سادگی کا ایک غیر فانی نقش دل پر ثبت ہو جاتا ہے۔ اللہ اکبر یہ کیسی عبرتناک و سبق آموز بات ہے۔

اس مسجد کا محل وقوع قسطنطنیہ کی مشہور و معروف مسجد ایاصوفیہ سے کچھ فاصلہ پر ہے۔ چنانچہ ایاصوفیہ کا وسیع ہیولا اور چھوٹے بڑے گنبدوں کا عظیم الشان جال دور ہی سے پیش نظر تھا۔ آج کل اس میں عجائب گھر ہے۔ کیونکہ [illegible] ایک مرتبہ مرمت کی غرض سے اس کی دیواروں کو کھرچا گیا تو کچھ کلیسائی نقوش برآمد ہوئے۔ جس کی وجہ سے عیسائیوں نے اس کو پھر گرجا قرار دینے کے لئے بیرونی طاقتوں کے گھمنڈ پر شورش برپا کرنی چاہی لیکن کمالی حکمت عملی نے اس کو نہ گرجا ہونے دیا نہ مسجد باقی رہنے دی۔ بلکہ عجائب خانہ بنا دیا ہے۔ اور اس کی فیس داخلہ کا روپیہ اسی کی مرمت پر صرف کیا جاتا ہے۔ جامع سلطان احمد کے تین احاطے ہیں۔ جن کی تفصیل اس طرح بیان کی جا سکتی ہے۔ سب سے پہلے سڑک کے قریب ایک نہایت وسیع احاطہ ہے جس کی دیوار میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے لوہے کے مربع جالی دار دروازوں کا نمونہ بنا ہوا ہے اور یہ پوری دیوار اسی طرح کھنچی گئی ہے۔ اس احاطہ میں داخلہ کے لئے ایک ہی سمت میں تین بڑے بڑے پھاٹک ہیں۔ دو بالکل کناروں پر۔ اور ایک درمیان میں۔ دونوں اطرافی پھاٹک مسدود تھے۔ اور صرف ایک درمیانی آمد و رفت کے لئے کھلا ہوا تھا۔

اس وسیع احاطے کے بعد سیڑھیوں پر چڑھ کر ایک عظیم الشان پھاٹک کے ذریعہ ایک دوسرے وسیع احاطہ یا صحن میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ مسجد کا دوسرا حصہ ہے۔ اس کے عین وسط میں وضو کا جالی دار گنبد نما حوض ہے۔ جس کے چاروں طرف ٹوٹیاں اور کنڈیاں بنی ہوئی ہیں۔ لیکن اس وقت یہ خالی تھا۔ معلوم ہوا کہ مسدود ہے۔ اس احاطہ کے اندر چاروں طرف مسقف دالان بنے ہوئے ہیں۔ جن کی چھت گنبددار ہے۔ اور دونوں پہلوؤں میں گیلریوں سے متصل باہر نکلنے کے لئے دو مزید بڑے پھاٹک چڑھتے ہوئے ہیں۔ اور صدر میں مسجد کا باب الداخلہ ہے۔ جہاں سے مسجد کی اصل عمارت میں داخل ہوتے ہیں۔ جو کہ مسجد کا تیسرا اور اصل حصہ ہے امام صاحب کی زبانی معلوم ہوا اگر کسی [illegible] یا کسی اور موقع پر اجتماع مسجد کی وسعت سے زیادہ ہو جائے تو درمیانی پھاٹک (جس [illegible] ہوتا ہے) [illegible] کھول کر اس دوسرے حصہ میں بھی نماز ادا کی جاتی ہے۔ اس وسطی حصہ کی قبلہ رخ سمت [illegible] جانب تقریباً ایک ہاتھ بلند دو چبوترے بھی بنے ہوئے ہیں۔ جن کے وسط میں دونوں جانب چھوٹے چھوٹے [illegible]

موجود ہیں۔ صدر باب الداخلہ پر جہاں پردہ آویزاں تھا اوپر آیۂ مبارک اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا کا بہت بڑا کتبہ ہے۔ اطراف میں اور بھی جلی و خفی کتبات شان و دلکشی پیدا کر رہے تھے۔ غرض ہم اس پردہ کو ہٹا کر بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اصل مسجد میں داخل ہوئے۔ اللہ اکبر و للہ الحمد۔ کیا نظارہ آنکھوں کے سامنے تھا!!! گویا عالم خواب میں کسی افسانوی پرستان کے اندر اچانک داخل ہو گئے ہوں۔ دور ہی سے اس کی رفعت زیب و زینت، چمک دمک اور حسن و دلکشی سے آنکھیں چندھیا گئیں۔ اور پاؤں آگے بڑھنے سے ٹھٹکنے لگے!! عمارت کے وسط سے ذرا آگے بڑھ کر ایک بڑا عظیم الشان بلند گنبد تھا جو ہزار ہا قسم کی رنگ برنگ چینی کی گلکاریوں اور آیات قرآنیہ کے جھلملاتے ہوئے مذہب کتبات سے جگمگا رہا تھا۔ اس کے اطراف متعدد محراب نما گنبد اسی طلا کاری رنگ سازی اور چینی کے کام سے مزین بڑے گنبد سے متصل بنے ہوئے تھے۔ عمارت کی پوری چھت اسی وضع کی تھی۔ ان اطرافی گنبدوں اور مرکزی گول گنبد کی بلند کمانوں کی رنگ کاری کا نقشہ کھینچنا حد امکان سے باہر ہے۔ یہ تمام ستون نصف بلندی تک صرف شفاف سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہیں۔ اس سے اوپر اندازاً پون گز کی چوڑائی میں آیات قرآنی کے جلی سنہری کتبات کی پٹیاں پوری گولائی میں بنی ہوئی ہیں۔ اس کے بعد اوپر کے بقیہ نصف ستونوں پر رنگ برنگ چینی کے مستطیل نقش و نگار ہیں۔ ہر کمان کی چوڑائی پر اتنے حسین و دل آویز باریک اور موٹے ہر قسم کے چینی نقش و نگار ہیں کہ ان پر غور کرنے سے نگاہ بالکل عاجز تھی۔

درمیانی گول قبے کے چاروں ستونوں کی گولائی زمین کے ایک بہت بڑے حصے کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور گائیڈ بک کی تحریر کے مطابق ستر فیٹ عریض ہے۔ میں نے خود ناپا تو تقریباً ۲۳ گز کا دور تھا۔ اس میں سے دو پچھلے ستونوں میں وضو کا انتظام تھا۔ یعنی اندر پانی کا خزانہ اور باہر نل لگے ہوئے تھے۔ ان کے نیچے کنڈیاں بنی ہوئی تھیں جن کے ذریعہ پانی زیر زمین جاتا ہے۔ اس جگہ شاید تین چار گز لمبا موم جامہ زمین پر بچھا ہوا ہے۔ اور نل کی ٹونٹی کے ساتھ زنجیر سے بندھی ہوئی برنجی کٹوریاں پانی پینے کے لئے آویزاں ہیں۔ اگلے سیدھے ہاتھ والے ستون کے ایک چھوٹی سی بارہ دری کی شکل کی عمارت ہے معلوم ہوا کہ یہ مکبر ہے۔ اس پر تکبیر کہنے کے لئے آدمی استادہ ہو کر نماز ادا کرتا ہے۔ تاکہ اس کی صدائے تکبیر پوری مسجد میں پہنچ سکے۔

مسجد کے محرابی حصہ والی دیوار یکسر رنگین شیشوں اور چینی کی رنگا رنگ عجوبۂ روزگار صناعی کا حیرت خیز مجموعہ تھی۔ اس پوری دیوار پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے بڑے بڑے دریچہ نما طاقوں کی قطاریں تھیں۔ جن کے اندر رنگ برنگ کے شیشوں کا جڑاؤ تھا۔ اور ہر جڑاؤ کا نمونہ جداگانہ طرز کا تھا۔ ان سب پر غور کرنے سے نگاہ خیرہ ہو رہی تھی۔ قبلہ رخ دیوار کی پوری بلندی میں طاقوں کے جڑاؤ اور ترتیب کا یہی عالم تھا۔ اور ان کے بیچ بیچ میں دیوار کی رنگین گلکاریاں چینی کا جڑاؤ اور آیات قرآنی کے کتبات عجیب سحر آگیں منظر پیش کر رہے تھے۔ محراب کے دائیں جانب دیوار میں تقریباً ڈیڑھ گز لمبا اور ایک گز چوڑا بھورے رنگ کا ایک چوکٹا سا لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ ایک یمنی پتھر ہے۔ جس کو مریضانِ جذام (اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا) چھو کر اپنے جسم پر ملتے ہیں اور بفضل خدا شفایاب ہوتے ہیں۔ سلطان المعظم مغفور نے رفاہ عام کی غرض سے اس کو یہاں لگوا دیا ہے۔ اس سے کچھ فاصلہ پر اسی لائن میں ایک مستطیل سلیٹی رنگ کا دوسرا چوکٹا بھی دیوار میں جڑا ہوا تھا۔ اس کی بابت معلوم ہوا کہ یہ مرقد مبارک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خارجی لپیٹ کا باقی ہے!

جس کو تبرکاً یہاں رکھا گیا ہے۔

محراب کے سیدھے جانب ایک بہت بلند و بالا سنہری ابھرے ہوئے کام سے مزین منبر خطبہ خوانی کے لئے بنا ہوا تھا۔ جس کا دروازہ سنہری کا مدار سیاہ رنگ پردے کے ساتھ ڈھکا ہوا تھا۔ یہ بھی صناعی کے اعتبار سے بے مثل تھا۔

محراب کے الٹی طرف سلطان وقت کے لئے دوسری منزل پر نہایت نفیس مسجد کے شایان شان جال دار گیلری تھی۔ معلوم ہوا کہ سلطان اسی جگہ نماز ادا کیا کرتے تھے۔

محرابی حصے کے دونوں پہلوؤں پر موم بتیوں کے دو بڑے بڑے گول ستون عمارت کی ایک ربع بلندی تک کھڑے ہوئے تھے۔ ابتداءً خیال ہوا کہ شاید یہ کوئی پتھر ہے جس کو مومی صورت کا تراشا گیا ہے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خالص موم کی بتیاں ہیں۔ جو بالکل ستون کی طرح دونوں جانب ایستادہ ہیں۔ یہ بھی عجیب حیرت ناک چیز تھی۔

مسجد کے پہلوؤں میں دونوں جانب گنبد دار چھتوں کی دو منزلہ گیلریاں بنی ہوئی ہیں۔ جن کے گنبدوں کے نیچے چھوٹے چھوٹے خوشنما ستون ہیں۔ اور دیوار کے نچلے حصہ میں اوپر تک کچھ کچھ فاصلے سے برابر بڑے بڑے دروازے بنے ہوئے ہیں۔ جن میں سفید شفاف شیشوں کا جڑاؤ ہے، بطور بند کھڑکیوں کے۔ لیکن چونکہ ان کی جسامت معمولی کھڑکیوں سے عرض و طول میں دوچند تھی اس لئے دروازہ لکھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ سب بالکل بند غالباً روشنی کے اہتمام کے پیش نظر بنائے گئے ہیں۔ ان کی دوسری منزل کی رنگا رنگی اور کمانوں کے نقش و نگار بھی قابل دید شئے تھی۔ معلوم ہوا کہ جب جمعۃ الوداع یا کسی دوسرے موقع پر یہ مسجد معمور ہو تو یہ بالائی حصہ عورتوں کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے۔ ان پہلو کی گیلریوں میں دونوں طرف باہر نکلنے کے دو بڑے بڑے دروازے بھی تھے جن کے پھاٹک مقفل تھے۔ مسجد کی آخری دیوار والے حصہ میں بھی اسی طرح دو منزلہ گیلری بنی ہوئی ہے۔ لیکن باب الداخلہ کے دونوں جانب اندرون مسجد دو چھوٹے چھوٹے دالان علٰحدہ بنے ہوئے ہیں۔ جن کو سترۃ المصلی کے بقدر اونچی دیوار سے گھیر دیا گیا ہے۔ گویا تنہا یا مختصر جماعت کے لئے ایک چھوٹی سی محدود جگہ ہے۔ آج کل عام طور سے عورتیں اسی جگہ نماز پڑھتی ہیں۔ ان چھوٹے دالانوں کے ستون سنگ سماق کے تھے۔ جن کی قدرتی رنگ آمیزی بغور دیکھنے سے بہت ہی دلکش نظر آ رہی تھی۔ یہ رنگینی انسانی صنعت کا نمونہ نہیں۔ بلکہ ان پتھر کی تخلیق ہی قدرت کی طرف سے اس رنگا رنگی کے ساتھ ہوئی ہے۔ جس کو انسانی ہاتھوں کی تراش و خراش نے اور زیادہ حسین بنا دیا ہے۔

تمام صحن مسجد میں بڑے بڑے حسین و جمیل استنبولی قالینوں کا فرش تھا۔ جن پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے ایک ہاتھ اونچی دو منزلی شہتیری صورت کی لکڑی کی صندلیاں لمبی لمبی قطار میں رکھی تھیں۔ یہ جوتیاں وغیرہ رکھنے کے کام آتی تھیں۔

وسطی بڑے گنبد کے نیچے روشنی کے لئے اسی وضع کا ایک گول آہنی جال دار جھاڑ لگا ہوا تھا۔ جس میں سیکڑوں برقی گولے آویزاں تھے۔ ان گولوں کے علاوہ بھی مسجد کا پورا عظیم الشان صحن آہنی جال سے گھیرا ہوا تھا جس میں شاید ایک ایک ہاتھ کے فاصلہ سے بجلی کے گولے لگے تھے۔ مسجد کی تمام روشنی اگر ایک دم جلائی جائے تو واللہ اعلم کتنا حیرت انگیز نور علیٰ نور کا منظر پیش ہو۔

یہ ... و خال جو اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ ترکی کی ایک معمولی مسجد کے ہیں ورنہ اس سے زیادہ عظیم الشان اور خوشنما
مساجد قسطنطنیہ میں موجود ہیں۔ جن کی بابت یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان میں سے اکثر ترکی کے مشہور و معروف
معمار سنیان بے کی تعمیر کردہ ہیں۔ اس بے مثل صناع کو قدرت کی طرف سے واللہ اعلم کس قسم کا دماغ عطا کیا گیا تھا۔
جس کے پرواز خیال کی یہ زندہ یادگاریں قسطنطنیہ میں قدم قدم پر پائی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کرے اور
اپنی جوارِ رحمت میں اس کو جگہ دے۔ آمین ثم آمین۔

انیسہ ہارون بیگم شروانیہ

یادگار محبت

پو پھٹی مہر منور نے اٹھایا گھونگٹ — شب دیجور نے کملی کو سمیٹا جھٹ پٹ
پھر چلی باد صبا غنچوں سے شوخی کرتی — چھیڑتی اس کو کبھی اس سے خموشی کرتی
سرو سرگوشیاں کرتے ہوئے گلے ملتے تھے — اپنی قامت پہ بہت جھومتے اتراتے تھے
جھک کے سبزے کے لئے غنچوں نے سو سو بوسے — خنکیٔ بادِ صبا سے ہوئے سب نم خوشے
پھر تخیل کو مرے از سر نو پر پھوٹے — تنِ پژمردہ میں جاں جیسے مسیحا پھونکے
جی میں آئی کہ کروں حسنِ ازل کا چرچا — عشقِ آدم کا لکھوں ایک انوکھا قصہ
بادشاہ ایک دکن کا کہ نظیر اپنی تھا — بسملِ عشق پری زاد حرم اپنی تھا
اس کو ... محبت کا تھا اپنی اظہار — سنگ مرمر میں تھا کہنا اسے قصہ درکار
د... ہر سو سے جمع — کاریگر آئے کھنچے جیسے پتنگے سوئے شمع
مندِ عشقِ ازل کی پڑی آخر بنیاد — آب و گل سے پڑی جذبات کی جا کر بنیاد
سنگ مرمر کا تھا اک خواب عمارت کیا تھی — دور کی اپنے وہ تعمیر بھی بس یکتا تھی
دور سے جس کو عمارت وہ نظر آتی تھی — جو خوشی شاہ کو تھی آنکھوں میں پھر جاتی تھی
دیکھنے کو بھی عمارت کا نہیں نام و نشاں — حسبِ دستور گیا میٹ اسے دورِ زماں
نقش جس نے کہ محبت کو تھا اپنی گایا — چودھویں صدی میں پھر آج اسے ہم نے پایا
اپنی الفت کو بھی ہم خون سے لکھ جاتے ہیں — مندرِ عشق نیا اپنے لئے پاتے ہیں
پختہ تعمیر ہو ایسی جسے ڈھائے نہ بنے — نکتہ چیں لاکھ بھی چاہے تو بگاڑے نہ بنے

نقی

عورت کا دل

پڑھنے والے اسے محض ایک افسانہ سمجھیں یا آپ بیتی، یہ ان کے دلوں کے احساس کی بات ہے ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں اس کا تعلق دل سے سمجھنا چاہیئے۔ زندگی میں بہت سی باتیں کہنے سننے کی ہیں، مگر جن کے دل پر سچائی کے زخم لگے ہیں وہ زندگی میں سچی بات سننے کیلئے تڑپتے ہیں اور تڑپ کر سچی بات سنتے ہیں۔ اس پُر شور دنیا میں آوازیں آتی اور گذر جاتی ہیں مگر کبھی کبھی قدرت بڑی دھیمی آوازمیں بولتی ہے اور اس کے اظہار کا ذریعہ کسی انسان کا دل بن جاتا ہے۔ جب یہ آواز اپنی فطری حدوں سے نکل کر انسانی حدِ سماعت اور انسانی دنیا میں آتی ہے تو ہم اسے اچھی اور بُری سے تعبیر کرتے ہیں اور درحقیقت وہ کیا ہے اس کا احساس درد رکھنے والوں اور پاک بیں نگاہوں کے سوائے بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔

خیر تو ہماری کہانی عورت کے دل سے متعلق ہے اور ایک پاک جذبے کی کہانی ہے جو دنیا کے الفاظ میں ایک کدر ماحول سے پیدا ہوئی۔ عام نظریہ تو یہ ہے کہ محبت حسن ہی سے متعلق ہے۔ یہ کہانی آپ کو اس پر سوچنے کی دعوت دے گی۔ اور عام طور پر عورت کے دل کو ایک معمہ سمجھا جاتا ہے، ممکن ہے ایسا ہو۔ مگر ہم کہیں گے جتنا اس کا دل چھپا ہوا ہے اتنا ظاہر بھی ہے۔ یہ اپنے معمے کو بعض وقت آپ ہی سمجھا دیتی ہے۔ کیا ایسا کہنے کا حق اس شخص کو بھی حاصل ہے جو عورتوں کے دلوں سے پوری طرح واقف نہیں، اس کا جواب ہم نہیں دے سکتے۔ ہماری کہانی دے گی۔

ایک دن ہمارے ایک کم سن مگر بے تکلف دوست نے ہم سے فرمائش کی کہ ہم ان کے ہمراہ "کسی دلچسپ مقام" پر چلیں۔ ہمارے یہ دوست نہ صرف کم سن تھے بلکہ بہت حسین بھی تھے۔ ممکن ہے دنیا کا بعض حصہ انھیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہو مگر ہم انھیں صرف اپنا دوست سمجھتے تھے اور یہ سن کر حیرت کرتے تھے کہ ابھی سے ان کے دل پر کسی عورت کی نگاہوں کا زخم لگ چکا ہے۔ ہمیں یقین نہ آتا تھا۔ کس چیز کا یقین نہ آتا تھا، یہ آپ سمجھ لیں۔ مگر ہمیں یقین نہ آتا تھا۔ شرط ہوئی کہ اگر محبت کا تماشہ آنکھوں سے دکھا دیا جائے تو ہم ہار مان جائیں۔ شام کے سات بجے تھے کہ ہم بلا کشانِ محبت بن کر ان کے ساتھ کوئے یار کی طرف چلے۔ یاد رہے کہ ہم بھی اس کوچے سے نا آشنا تھے اور صرف اس زعم میں چلے جا رہے تھے کہ بات جھوٹ ہوگی اور ہر ایک کم سن لڑکے کے مقابلے میں ہماری پختہ کاری یقیناً فتح حاصل کر لے گی۔ "دلچسپ مقام" کا پتہ ہمیں معلوم نہ تھا۔ اس لڑکے کی سائیکل آگے تھی اور ہم پیچھے۔ بڑے دور دراز سفر کے بعد ہم ایک ایسے قدیم محلے میں پہنچے جو کسی گذشتہ اور سوکھے ہوئے مشہور تالاب کے قریب آباد تھا۔ ایک گلی کے سیدھے بازو سامنے بڑا دو منزلہ مکان نظر آیا۔ مکان کے سامنے ہمارے کم سن دوست ٹھیر گئے۔ اور نہایت بے تکلفی سے آواز دی۔ آواز ابھی پوری نہ ہوئی تھی کہ جھروکے سے ایک پھولوں بھرا سر باہر نکلا نیچے جھکا اور کہنے لگا۔ "کب سے انتظار کر رہی ہوں۔ خوب آئے۔ کیا اب پانچ بجے ہیں"؟ ہمارے ساتھ ایک اور دوست تھے جو گو ہمارے ہم سن تھے مگر عملی تجربات میں خاصے تھے۔ ہم نے ان کی طرف دیکھا، انھوں نے بھی ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے مسکرایا، اور انھوں نے بھی مسکرایا اس کے ساتھ ایک آنکھ بند کی۔ ایک لمحہ نہ گزرا ہوگا کہ آیئے آیئے کی صدا بلند ہوئی۔ سامنے ایک حسن کا جلوہ نظر آیا جو سر سے پاؤں تک سفید لباس پہنے ہوئے تھا۔ اسے مختصراً "دکن کی سانولی" کہنا چاہیے۔ ہر ادا کہہ رہی تھی۔

"حُسن کی صبح دل افروز کی اک شام ہوں میں"

ہم بنگلے پر پہونچے، ہم کو سفید چاندنی کے صاف فرش پر بڑے چاؤ کے ساتھ بٹھایا گیا۔ اس آؤ بھگت میں دو باتیں خاص تھیں جو کہانی کی جان ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارے کمسن میزبان اور اس کے دل کی طرح گھر کی ہر چیز صاف تھی، دوسرے ہر ادا میں دو محبتوں کی وہ جنگ نظر آ رہی تھی جسے جوانی کا کھیل کہنا چاہیے۔ ہمارے دوست اور ان کے محبوب کی بے تکلفیاں گلے شکوے دیکھ کر ہماری عقل حیران رہ گئی۔ ہم نے پہلی ہی نظر میں اپنی ہار مان لی۔ اور دوستی کی سچائی کا اندازہ کر لیا۔ ہمارے برتاؤ کے کیا کہنے، ہم چاہنے والے نہیں چاہے جانے والوں کے دوست تھے۔ اس لئے ہمارے ساتھ دوگنا خلوص برتا جا رہا تھا، یہاں تک کہ چند باتوں ہی میں معلوم ہو گیا کہ ایک نسوانی دل ایک بے پروا پر بُری طرح ریجھا ہوا ہے۔ بھولے سے ایک دن نہ آنے کا ذکر ہوتا ہے، مذاقاً کہیں دو روز کے لئے باہر جانے کی دھمکی دی جاتی ہے اور ادھر وہ نازک ہاتھ، ہمارے سامنے دعا اور التجا کے لئے اٹھ جاتے ہیں کہ "خدا کے لئے آپ ان کو باہر جانے نہ دیں، میری خاطر روک لیں ورنہ انھیں بغیر دیکھے میں مر جاؤں گی۔

اس دلچسپ مقام پر یہ ملاقاتیں جتنی طویل، پُر لطف اور بے تکلف ہوتی تھیں ان کا ذکر کرنا الفاظ کے بس کی بات نہیں۔ ایک مہینہ ایسا گذرا جیسے کوئی زندگی کا خواب دیکھتا ہو۔ دن بھر اور دو دو بجے رات تک ہم چار دن کی محبت رشکِ جنت بنی ہوئی تھی۔ اس نازنین کے مزاج میں اتنی نفاست، خوش خلقی، ذہانت اور طباعی تھی کہ معلوم ہوتا تھا، محض ان خوبیوں کی بنا پر اسے سارے گھر کی حکومت دیدی گئی ہے اور نام نہاد بڑھی بڑھیاں اس کی ہر شانِ بے نیازی کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی ہیں۔ خریدار آتے ہیں، تقاضے ہوتے ہیں۔ مگر یہ محبوب ہماری محبت میں ان سب کو ٹھکرا دیتا ہے اور لطف یہ کہ پیسے کا بھی کوئی سوال نہیں۔ پیسہ رقیب کی طرح نظر سے گرا ہوا تھا۔ اسی رنگ میں کبھی کبھی ہنڈولے پر بیٹھنا اس پر سفید چادر، بنگلے کا بڑا دالان، تنہائی، بیچ میں اس فتنۂ دوران کا لیٹے رہنا اور ہمارا ارد گرد بیٹھے ہوئے جھولنا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حسن اور جوانی کی جنت میں ہیں۔ کبھی حسن کے ہاتھوں ہمارے ہنڈولے کی پینگ بڑھتی تو محسوس ہوتا جیسے دونوں طرف فرشتے ہمارا دامن چھونے کے لئے ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔

خیر کئی دن ان رنگ رلیوں میں گزر گئے اور درمیان میں خاصی بے تکلفی کے باوجود کوئی میل نہ آنے پایا۔ محبت کی پاکی پھول بن کر برستی رہی۔

ایک دن ۵ بجے شام کا وقت تھا۔ ہمارے البیلے کمسن دوست میاں نجیب (چلئے ہم نے ان کا نام بھی بتا دیا) اپنے وعدے پر ہمارے گھر تشریف نہ لائے، ادہر ہم دونوں یعنی یوسف اور ہم نے سخت ترین بے چینی کی گھڑیاں کاٹیں۔ گھر انتظار میں کاٹے کھا رہا تھا۔ جب چھ بجنے کو آئے تو ہم نے کہا، یوسف چلو وہیں چلیں، شاید میاں نجیب سیدھے پہنچ گئے ہوں۔ یوسف نے کہا اچھی بات ہے۔ یہ کہہ کر ہم دونوں وہاں پہنچے، سیدھے بنگلے پر آ دھمکے (اب ہمیں آواز دینے کی ضرورت باقی نہ رہی تھی) دیکھا کہ بی شارو ہا (کمسن محبوب کا نام) کی نرگسی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ ہم نے خیریت پوچھی، جواب ملا کہ "وہ نہیں آئے"۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ ہچکیوں کے ساتھ رو رو کر یہ گلا شکوہ کیا گیا کہ میاں نجیب اپنی کمسنی کی وجہ سے نہ محبت کے

تقاضے کو پوری طرح سمجھتے ہیں نہ اس کی ذمہ داریوں سے سر بر ہوتے ہیں۔ شارد ہا کے الفاظ میں "ایک ایسے ظالم سے کام پڑا ہے۔ جسے دیکھ کر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔

آپ کیا جانیں محبت کا تقاضا کیا ہے — آپ کمسن ہیں ابھی آپ نے دیکھا کیا ہے

یہ رنج و الم دیکھ کر ہم نے شاردھا کو پوری تشفی دی اور تشفی کیوں نہ دیتے، شاید ہمارے دل کو بھی بُرا معلوم ہوا تھا۔ جب دو دلوں نے تشفیوں کو محسوس کیا تو تسکین بہت جلد آ پہنچی۔ اس دوران میں جانے ہم نے کیا کہہ دیا کہ شاردھا کی اداؤں نے رہ رہ کر ہمارا یعنی مصنف کا سہارا لینا شروع کیا۔ ایسا معلوم ہوا گویا ہم نے اپنی ذہانت اور تجربے اور احساس سے وہ بات کہہ دی ہے جس کے سننے کے لئے شاردھا کا دل تڑپ رہا تھا۔ سچ ہے غم میں انسان تنکے کے سہارے کو بھی غنیمت سمجھتا ہے۔ اب غم دور ہوا، ہنسی دل لگی ہونے لگی، ہم نے اپنا پوزیشن صاف کرنے کے لئے کہہ دیا "شاردھا معاف کرنا، ہم نجیب بیمار ہے سمجھ کر چلے آئے ورنہ۔" شاردھا نے بات کاٹ کر کہا "بس بس، تکلف کی باتیں رہنے دیجئے۔" پھر کانوں سے ایک پھول نکال کر کہا۔ "دیکھئے، میں اس گلاب کے رنگ کو نہیں پسند کرتی، اس کی خوشبو پر جان دیتی ہوں۔" شاردھا کو صفائی کے علاوہ پھولوں سے بڑی رغبت تھی۔ ہم اس کا یہ جواب سن کر حیران رہ گئے۔ ہم نے کہا "تمھارا گلاب رنگین بھی ہے، اور خوشبودار بھی۔" خیر انھیں چٹکلوں اور فقرہ بازیوں میں چار گھنٹے گزر گئے، ہم نے شاردھا کا دل خوب بہلایا، کیونکہ ہمارے نزدیک یہ غریب آج اپنے محبوب سے بچھڑی ہوئی فراق کی گھڑیاں جھیل رہی تھی۔ لیکن ہم قسم کھانے کو تیار ہیں کہ اس کے سوائے ہماری جذنیں کسی اور طرف رخ نہ کر سکیں۔ شاید یہی وہ صفائی قلب تھی کہ شاردھا نے ہم سے کہا۔

"آپ لوگ اسی طرح کبھی کبھی ضرور آیا کریں۔ میرا دل بہت بہلتا اور خوش ہوتا ہے" اس اجازت پر دل نے لبیک کہا اور ہم نے تیسرے چوتھے دن آنے جانے کی رسم ڈال دی۔ کبھی کبھی نجیب کے بغیر وہاں آنے جانے میں ہم کو اس کوئی تامل نہ ہوتا تھا کہ نجیب کی محبت نے وہاں خاصی بے تکلفی کی فضا پیدا کر دی تھی اور ہم اس دنیائے محبت میں آزادی کے مزے لوٹ رہے تھے۔

ان واقعات سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم کس قسم کے مقام کا ذکر کر رہے ہیں۔ نہیں آپ نے غلط سمجھا۔ یہ دیکھنے کو تو شاید عصمت کی خرید و فروخت کا مکان تھا مگر جس سانولی کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ جسمانی حیثیت سے آلودہ سہی مگر دل اور روح کی دنیا میں ہم کو بہت پاک نظر آتی تھی۔ اس کا اندازہ ہم کو ایک وقت ہوا جب کہ اس نے ہم سے خود بخود فرمایش کی کہ کسی ایسے مقام پر چلنا چاہئے جہاں تفریح کے علاوہ آنے جانے میں بہت وقت صرف ہو۔ کھوٹ اس کا جی اکتا گیا تھا۔ ہمارے دوست یوسف تھے بڑے چلتے پرزے اور سید ھے سادے۔ انھوں نے ایک اور معصوم جوانی پر تاک لگائی تھی جو اس وقت بستر علالت پر تھی، لیکن اپنی ہر ادا سے یہ کہہ رہی تھی کہ ایک دن صحت چاند کے چہرے سے بادل ہٹا دے گی۔ انھوں نے شام کے وقت تفریح کی فرمایش کو زیادہ پسند کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ حضرت کی نظر حسن کے علاوہ جیب پر بھی رہا کرتی تھی۔ مگر ہم کو شاردھا کی اس فرمایش میں حرص و ہوا کا کوئی شائبہ نظر نہیں آیا۔

شاردہا۔ "کہاں ہے بتاؤ۔ ۔ ۔ آؤ میں دیکھوں کیسی بنی ہے؟"

ہم۔ "نہیں یہ تازہ تصویر ہے جو ابھی لی گئی ہے اور یہیں موجود ہے۔"

شاردہا۔ اس جملے پر وہ رک گئی، کچھ سوچنے لگی، پھر مسکرا کر کہا۔ "مذاق نہ کرو، بتاؤ تصویر کہاں ہے؟"

ہم نے شاردہا کو قریب آنے کا اشارہ کیا، وہ اتنی قریب آگئی کہ اس کا سر ہم کو چھونے لگا۔ ہم نے جیب سے دھوپ کی عینک نکالی۔ چراغ کی روشنی کے مقابل ہاتھ کی آڑ لگائی اور شیشے کی طرف بتا کر کہا۔ دیکھو تمہاری تصویر اس آئینے کے پیچھے ہے۔ ذرا غور سے دیکھنا۔

شاردہا نے بڑی معصومیت سے عینک کے شیشے میں جھانکا اور پھر عجب ادا سے مسکرا کر دور ہو گئی اس نے اس مذاق کا کوئی جواب نہ دیا، کہنے لگی "یہ تو زندہ تصویر ہے۔" یہ کہہ کر اس نے دو چار پھول ہماری طرف پھینکے۔ نجیب کی عدم موجودگی میں ہماری بے تکلفی کی یہ تیسری منزل تھی۔

اب کی بار آتے آتے ہم نے شاردہا کے لئے ایک تحفہ خریدا اور دیتے وقت یہ کہہ دیا۔ "شاردہا! اگر یہ تو ہمارے خلوص کی یہ نشانی نجیب کے سامنے نہ کر دیں۔" شاردہا نے بڑی محبت سے تحفہ اٹھا لیا اور ہنس کر کہنے لگی "ایک ہی بات ہے۔" یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لئے چلی گئی۔ ہم انتظار میں اپنے دوست یوسف سے باتیں کرتے رہے۔ یوسف اس وقت حسن بیمار کی دلداری میں مصروف تھے۔ یکایک ہم نے دیکھا کہ شاردہا روتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ ہم نے خیریت پوچھی۔ شاردہا نے کہا۔ "بائی جی کا وہی سوال۔ جاگیردار صاحب آئے ہوئے ہیں۔ خدا اس جاگیردار کو غارت کرے۔ میرے دوست (ہماری طرف مخاطب ہو کر) میں اس مصیبت سے تنگ آگئی ہوں۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔" ہم نے یوسف کی طرف اس نگاہ سے دیکھا گویا شاردہا کی یہ پارسائی ہمارے نزدیک بناوٹ ہے۔ دلدار نے اب کی دفعہ بھی ایک آنکھ بند کی، مگر ہمارے ضمیر نے ہمیں خاموش رہنے کے لئے کہا اور دور سے بھری چٹکی لی۔ ہم خاموش ہو گئے۔

شاردہا افسوس میں بیٹھی رہی۔ ہم نے خیال کیا کہ اس کے دل سے غم دور کرنا چاہیئے۔ ہم نے کہا شاردہا، چلو آج سینما چلیں سینما کا نام سنتے ہی شاردہا اچھل پڑی۔ پوچھا "کونسا کھیل ہے" لیکن جواب سنا بھی نہیں فوراً کھانا کھانے کپڑے پہننے چلی گئی۔ یوسف نے پھر جیب ٹٹولی۔ روپے کافی تھے۔ ہم نے کہا، یوسف کہنے کو تو کہہ دیا مگر نجیب اس دوسرے شہ کے جانے کو پسند نہ کرے گا۔ ہمیں امید نہ تھی کہ شاردہا رضامند ہو جائے گی۔ یوسف نے بھی اتفاق کیا مگر اب سوچنے کا موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

ہم سینما پہنچے، آدھا کھیل ہوا۔ وقفہ تھا، ہم چائے خانے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ دیکھتے کیا ہیں۔ نجیب غصے میں بھرا ہوا موٹر میں دو ایک غنڈا نما دوستوں کے ساتھ آپہنچا ہے۔ موٹر سے اتر کر اس نے یوسف کو آواز دی اور کہا "کہاں ہے شاردہا۔ میں ابھی اسے گھر لے جانا چاہتا ہوں۔" یوسف موٹر کے قریب جا چکے تھے، ہم نجیب کی حماقت پر کچھ افسوس اور کچھ غصے میں تھے اس لئے قریب نہ گئے۔ یوسف نے واپس آکر ہم سے پوچھا۔ ہم نے کہہ دیا۔ "شاردہا کی مرضی پر موقوف ہے، وہ چاہے جائے یا نہ جائے۔" واقعات کے لحاظ سے اگر نجیب ہم پر شک کرتا ہے تو وہ شاردہا کو لے جا سکتا ہے۔ ہم نے جواب یہ سمجھ کر بھی دیا تھا کہ شاردہا اس سے محبت کرتی ہے۔ چلی جائے گی۔ لیکن نتیجہ خلاف توقع الٹا نکلا۔ شاردہا نے نجیب سے کہا۔

"نجیب تیری اس حرکت سے میں شرمندہ ہوں۔ اس لئے ساتھ نہیں آؤں گی"۔
نجیب۔ "شرمندہ تو مجھے ہونا چاہیئے۔ شاردہا"۔
شاردہا۔ "بس آگے نہ بڑھو اور سنو۔ تم کو اپنے دوستوں پر بھروسہ نہیں۔ مجھ پر بھی بھروسہ نہیں تو پھر کیا ہے۔ بس اس وقت ان لوگوں کے ساتھ آئی ہوں۔ تم بھی سینما دیکھ لو۔ مل کر گھر چلیں گے"۔
نجیب۔ "نہیں تم کو ابھی چلنا ہوگا"۔
شاردہا۔ "نجیب، سوچو، تم کس پر حکومت کر رہے ہو"۔
نجیب۔ "اچھا تم نہ آؤ گی تو میں چلا"۔
یہ کہہ کر نجیب نے شاردہا کے جواب کا انتظار تک نہ کیا بلکہ موٹر پلٹا کر یہ جا وہ جا
اس واقعہ کے بعد نجیب کئی دنوں تک نہ آیا۔ غم میں انسان دوسرے انسان کے دل کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ ہم نے شاردہا سے کھل کے باتیں کیں اور ایک دفعہ اسی ترنگ میں پوچھ لیا۔
"شاردہا سچ بتاؤ۔ تم ہمیشہ غمگین کیوں رہتی ہو"؟
شاردہا نے اسے ٹالنا چاہا، مگر ہم نے اسے مجبور کیا تو کہنے لگی۔
"میں اس لئے ناخوش رہتی ہوں کہ ہر شخص مجھے چاہتا ہے"۔
شاردہا کا یہ جواب ہمارے دل پر تیر سا لگا پھر ہم نے کہا "نجیب کے ساتھ تو تم بہت خوش رہتی ہیں"۔
شاردہا "ہاں، میں نجیب کے ساتھ اس وقت تک خوش رہی جب تک وہ مجھے نہ چاہتا رہا۔ میں سن بلوغ سے دنیا کی اس چاہت اور محبت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہوں اور یہی غم مجھے کھائے جا رہا ہے۔
ہم۔ شاردہا۔ "تم کو کسی سے محبت بھی ہوئی ہے"
شاردہا۔ "یہ نہ پوچھو، یہ شاید اس وقت زبان سے نکلے جب میں اور کچھ کہنے کے قابل نہ رہوں"۔
عجیب اتفاق ہے کہ شاردہا کا قول لفظ بہ لفظ اس کے حق میں پیشین گوئی ثابت ہوا۔ ہماری مجنوں کے وہ پاک دن دیکھتے دیکھتے مٹ گئے اور شاردہا جیسے مرض دق لاحق تھا تیسرے درجے کی شدت سے بیمار ہوگئی۔ اس کی علالت کا سلسلہ ایک مہینہ رہا۔ آخری وقت تک اس کے ہوش و حواس قائم تھے۔ اس کے مرنے کے دس روز قبل نجیب اُسے دیکھنے کے لئے آیا۔ ہم بھی تھے۔ شاردہا اُسے دیکھ کر آنکھ میں آنسو لائی اور گردن پھیر لی۔
دو چار روز کے بعد ایک دفعہ شاردہا کے بستر کے قریب بیٹھے ہوئے اسے سیب کھلا رہے تھے۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ اس نے ہم سے فرمایش کی اور کہا — گوش نزدیک ہم آر کہ آوازے ہست۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ آہستہ سے کہنے لگی "میں تم کو چاہتی ہوں کیونکہ تم نے مجھے کبھی نہ چاہا"۔ یہ شاردہا کے آخری الفاظ تھے جس کے بعد ہچکی لگ گئی اور دو گھنٹوں کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

عبدالقیوم خاں باقی

تعلیمی سفر یورپ

بلجیم ۱۶ر جون ۱۹۳۱ء چہار شنبہ۔ چار گھنٹے ریل کا سفر طے کرنے کے بعد ہم برسلز پہونچے۔ دیہات کے مکانات چھوٹے چھوٹے خوش وضع ہوتے ہیں اور ان کے دونوں طرف چمنیاں ہوتی ہیں۔ مکانوں کے سامنے باغ لگائے جاتے ہیں۔ دور دور تک صاف میدان نظر آرہے تھے۔ جن میں سرسبز و شاداب کھیتیاں لہلہا رہی تھیں۔ عورتیں اور مرد مل کر کھیتوں میں کام کرتے ہیں بعض مقامات پر صنوبر کے جھنڈ کے جھنڈ کھڑے ہیں۔

اسٹیشن پر گائیڈز نے ہم کو اتارا اور بین الاقوامی طلبار کی کلب میں ہمارا استقبال کیا گیا۔ چائے کے بعد کلب کے معتمد نے تقریر کی اور ہم سے مل کر خوشی کا اظہار کیا۔ ہمارے ساتھیوں میں سے مس سنجانا پارسی خاتون نے جواب میں تقریر کی پھر ہم کو مختلف مقامات پر گھروں (فیملی) میں رہنے کے لئے ایک ایک دو دو کر کے پہنچا دیا گیا۔ مجھ کو مسز ولیم تھامسن نے آئیں مجھ کو دو سجے ہوئے کمرے ملے ہیں۔ بازو کے کمروں میں ان کی لڑکیاں رہتی ہیں۔ یہ تینوں بہنیں نہایت سلیقہ مند ہیں ذرا شور نہیں کرتیں۔ یہاں تک کہ بات بھی نہایت آہستہ کرتی ہیں۔ انہی کمروں میں کھیلتی بھی ہیں 'لکھتی' پڑھتی بھی ہیں۔ لیکن مجھ کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ بازو کے کمرے میں کوئی رہتا بھی ہے۔ سب سے بڑی لڑکی کی عمر چودہ ۱۴ سال کی دوسری بارہ ۱۲ سال کی اور تیسری دس ۱۰ سال کی ہے۔ ان کے اخلاق بہت ہی شائستہ ہیں۔ نہایت مؤدب لڑکیاں ہیں۔ ان کو ابھی ٹیبل پر بٹھایا نہیں جاتا۔ صرف ناشتہ سب کے ساتھ کرتی ہیں۔

یہاں سردی فرانس سے زیادہ ہے۔ کہتے ہیں کہ دو تین روز سے یہاں ابر و باد و باراں ہو رہا ہے۔ ورنہ موسم نہایت خوشگوار تھا۔ ہم نے اندر گرم کپڑے پہنے ہیں لیکن پھر بھی ٹھنڈ سے دانت بجتے ہیں۔

پنجشنبہ ۱۷ر جون ۱۹۳۱ء۔ آج صبح ناشتہ کے بعد ہم سب کلب میں اکٹھا ہوئے اور وہاں سے گنٹ روانہ ہوئے۔ راستے میں دیہات کی سیر کرتے گئے اکثر گلاب کے باغ نظر آئے۔ نہایت پر بہار منظر رہتا ہے۔ دس کے قریب کونٹس ڈی ہمپٹائین کے ہاں پہنچے۔ انھوں نے ہم کو قہوہ اور ہلکا سا ناشتہ دیا۔ اس تواضع کے بعد کونٹس اپنی موٹر میں ہمارے ساتھ ہو گئیں اور سارا باغ کو ان کے اس مکان پر آکر ٹھیرے جو موسم گرما کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس کا نام "پیڈیکرن" ہے بنگلہ خوب آراستہ اور باغ نہایت نفیس لگایا گیا ہے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے کونٹس اور ان کے شوہر کے ساتھ کھایا۔ بہت ہی لذیذ کھانے تیار کئے گئے تھے۔ آج کل یہاں اسٹرابری کا موسم ہے بہت بڑی بڑی خوش ذائقہ ہوتی ہیں۔ تفصیلی طعام کے کارڈ پر ان کے مکان کی تصویر اتری ہوئی تھی اسی پر ہم نے کونٹس سے دستخط کروالی۔ ان کے تین بچے گورنس کے ساتھ آئے اور ہم سے مل کر پھر واپس اپنے کمروں کو چلے گئے۔

واپسی میں ہم نے ایک ہسپتال دیکھا جہاں تمام چھوٹے بچوں کا علاج ہوتا ہے۔ بچوں کے لئے چھوٹے چھوٹے کمرے کانچ کے بنے ہیں۔ جس میں ان کا پلنگ' جھولا' ٹیبل کرسی اور دیگر ضروریات کی اشیا' رہتی ہیں۔ ہر ایک اطاق میں ایک بچہ اور اس کے ساتھ ایک نرس نگرانی کے لئے رہتی ہے۔ ان میں بعض بچے ایسے بھی ہیں جن کو تولد ہونے کے بعد ماں سے الگ کر دیا گیا ہے تاکہ علحدہ رہنے میں ماں کو آرام ملے اور وہ بخوبی استراحت کر سکے۔ اس ہسپتال کی خوبی یہ ہے کہ

یہ نہایت صاف شفاف اور ہوادار مقام ہے۔ زیادہ تعداد شیرخوار بچوں کی ہے۔ جو نہایت بشاش و تندرست نظر آتے ہیں۔ وہاں سے نکل کر ہم ایک عجیب جگہ پہنچے جہاں گونگے اور بہرے بچوں کا مدرسہ ہے۔ اس کو مشنریوں نے قائم کیا ہے۔ تمام ننیں پڑھانے میں مشغول تھیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بڑی مشکل سے صبر و استقلال کے ساتھ کئی سال کی محنتِ شاقہ کے بعد کہیں گونگے بچے باتیں کرنے لگے ہیں۔ پرنسپل نے ہم کو ایک ٹیلیفون جیسا آلہ بتلایا جو حال ہی میں ایجاد ہوا ہے۔ اس کے ذریعہ بہرے کچھ سن سکتے ہیں۔ ہم کو تمام جماعتیں دکھلائی گئیں۔ ایک جگہ لڑکیوں نے پڑھ کر سنایا اس وقت ان کے کانوں سے آلے لگے ہوئے تھے۔ دوسری جماعت نے اپنی استانی سے باتیں کیں اس طرح سے کہ ہونٹوں کی حرکت کو دیکھتی جاتی تھیں اور جواب دیتی جاتی تھیں لیکن تلفظ ذرا کرخت ہوتا تھا اور چبا چبا کر بولتی تھیں۔ پھر معلمہ نے ان سے کہا کہ نیچے دیکھو سبھوں نے نظریں نیچی کر دیں۔ اور سر جھکا دیئے اور اپنے کانوں پر آلۂ مکبر السماعت رکھ لیئے اور چند لڑکیوں نے استانی کے سوالات کا جواب بھی دیا۔ اب ہم تیسری جماعت میں پہنچے یہاں کیا دیکھتے ہیں کہ ان کو ریڈیو پر بیانڈ سنایا جا رہا ہے جب ان کے کانوں میں باجے کی سریلی آواز پہنچتی ہے تو ان کے مسرت کے ساز بھی چھڑ جاتے ہیں۔ وہ اچھل پڑتی ہیں اور ہاتھوں سے اشارے کرنے لگتی ہیں۔ ان تمام کرشموں کو دیکھ کر ہم سب متحیر تھے۔

وہاں سے ہم بروش گئے شہر میں گردش کرتے ہوئے بمقام اسوسٹ پہنچے اور رات کے ساڑھے سات بجے مسٹر موریسوینٹ امیر جامعہ اور ان کی خاتون محترمہ کے ساتھ کھانا کھایا۔ ان کی لڑکیوں سے ملاقات ہوئی۔ ہم سے ہندوستان کے حالات پوچھتی رہیں اور کہا کہ ہم تاج محل دیکھنے کبھی ہندوستان ضرور آئیں گے۔ ہم کو رخصت کرتے ہوئے انھوں نے خوبصورت پھولوں کے گلدستے دیئے۔ گلدستے کیا تھے۔ چھوٹے چھوٹے کونڈوں میں ان کے باغ کے خوش رنگ پھولوں کی ڈالیاں لگی تھیں۔ ساڑھے دس بجے رات کو گھر پہنچے۔ شدت کی سردی ہو رہی تھی۔ مسز تھامسن نے اپنا موٹا کوٹ لا کر مجھ کو پہنایا۔ ہم چند منٹ کے لئے ڈرائینگ روم میں بیٹھ گئی اور آگ تاپتی رہی اور پھر اوپر اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلی گئی۔

جمعہ ۱۸۔ جون ۱۹۳۷ء۔ آج ہم اسٹریا کی ملکہ سے ملنے گئے۔ راستے میں مسز دتا نے ان کی زندگی کے المناک واقعات بیان کئے۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں ویانا اور بوداپسٹ کے انقلابات کے زمانہ میں شہنشاہ چارلس نے سلطنت سے دست بردار ہو کر خانہ بدوشی زندگی اختیار کر لی گردش افلاک اور زمانہ کی نیرنگیوں نے ان کو کہیں چین لینے نہیں دیا آخر ۱۹۲۲ء میں ہسپانیہ کے کسی صوبہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ملکہ بیوہ ہو گئیں اور اپنے آٹھ بچوں کو ساتھ لے کر بلجیم تشریف لے آئیں اور یہیں مقیم ہو گئیں۔ لوین یونیورسٹی میں ان کے شہزادے اور شہزادیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ملکہ زیتا نہایت دانشمند خاتون ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی اپنے بچوں کو اخلاقی اور دماغی تعلیم و تربیت دینے کے لئے وقف کر دی۔ شاہ بلجیم ان کی ہر طرح اعانت کرتے ہیں۔ ہم گیارہ بجے ان کے محل پر پہنچے۔ اس پرانے قصر کے دونوں جانب تالاب ہیں نہایت سنسان جگہ ہے۔ فاختہ کی کوکو نے اور بھی اداس بنا رکھا تھا۔ دروازہ پر پہرہ لگا ہے۔ ان کی لیڈی ان ویٹنگ نے آ کر ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہم کو اندر لے گئیں۔ ملاقات کے کمرے میں بٹھایا۔ تھوڑی دیر بعد ملکہ زیتا اور ان کی ایک شہزادی تشریف

لائیں۔ ہم سب نصف حلقہ میں کھڑے ہو گئے اور اپنے اپنے طریقہ پر سلام کیا۔ پھر مسز دتا نے ہر ایک سے تعارف کروایا۔ ملکہ سب سے مصافحہ کرتی تھیں اور ان کے مختصر حالات دریافت فرماتی تھیں۔ پھر اپنی دستخط کر کے سب کو کارڈ دیئے۔ ان پر محل کی تصویر بنی تھی۔ جب ہم واپس ہونے لگے تو ہماری تصویر سیڑھیوں پر لی گئی۔ ملکہ زیبا سب کے بیچ میں آکر کھڑی ہو گئیں بہت ہی بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کے اخلاق میں رطب اللسان ہو کر نیچے اترے۔ تمام شہر کی سیر کی عدالت العالیہ، شاہی محلات، بند اور بڑی بڑی عمارتیں دیکھیں۔

مسز صوفی

ساون کی ایک رات

نصف شب کو خلق پر طاری ہے جب خوابِ گراں
کائناتِ ہوش پر چھائی ہیں جب مدہوشیاں

ہاتھ خالی سو رہے ہیں جب امیر و بے نوا
سسکیاں بھرتی ہے جب خود غرضیوں کی آتما

پڑ گئی ہے ماند جب ظلم و ستم کی بارگاہ
جھڑکیوں سے جب یتیموں کو ملی ہے کچھ پناہ

جب کہ ہے ہر پیکرِ سرمایہ داری محوِ خواب
سو گیا ہے چیخ کر۔ و رو کے جب بیوہ کا شباب

کروٹیں لیتی ہیں جب ساون کی بھیگی فطرتیں
بر سرِ پیکار جب ہوتی ہیں دل کی قوتیں،

شرق سے ہوتے ہیں پیدا ابر پار۔ ں کے ہجوم
مضمحل ہوتے ہیں چمکیلے ستاروں کے ہجوم

دلکشا دلکش ہوا آتی ہے اٹھلاتی ہوئی
سرسراتی اور کچھ ملہار سے گاتی ہوئی

جب سمٹ جاتے ہیں آکر بدلیوں کے کارواں
اوڑھ لیتے ہیں سیہ چادر جب اطرافِ جہاں

سہم جاتی ہیں ہوائیں فطرتِ بیباک سے
یک بیک گرتی ہیں بوندیں دیدۂ افلاس سے

مینہ بڑھ جاتا ہے بن جاتے ہیں سارے کوہسا
نقرئی بنتے ہوئے پانی کے دلکش آبشار

ہر طرف ہوتے ہیں پیدا حسن کے نقش و نگار
ساتھ ہی کانوں میں آتی ہے صدائے دل فگار

مایلِ تخریب ہو جاتا ہے چرخِ رو سیاہ
بام و در ہوتے ہیں طوفانی تھپیڑوں سے تباہ

کانپنے لگتی ہیں بنیادیں رگِ احساس کی
اور چھا جاتی ہیں ہر جانب گھٹائیں یاس کی

تھرتھرا اٹھتے ہیں انساں آسمانی دھاک سے
اور دعائیں مانگنے لگتے ہیں ربِ پاک سے

دلوں کی باؤلی تاریکیاں، یہ رات میں
لگ رہی ہے آگ فضلی کے دبے جذبات میں

فضلی آندھروی

جنوں تماشا

جعفر تیزی کے ساتھ سینما کے احاطہ میں داخل ہوا' اس کا سانس پھول رہا تھا' اور سر کے بال پیشانی پر بے ترتیبی کے ساتھ بکھرے ہوئے پسینے میں تر ہو گئے تھے' بوکھلاہٹ کے مارے کچھ عجیب سی حالت ہو گئی تھی' کل دیر سے پہونچنے کے باعث اسے کھیل کا ٹکٹ نہ مل سکا تھا' اور آج بھی جعفر کو گھر سے نکلنے میں کچھ دیری سی ہو گئی۔ اس کی بیوی چند دنوں سے علیل تھی۔ آج اس پر اچانک اختلاج کا دورہ ہوا تھا' ڈاکٹر کے معائنہ اور دوا استعمال کرانے کے بعد جب اس کی بیوی کو قدرے افاقہ ہوا تو اسے سینما دیکھنے کا خیال پیدا ہوا' ان دنوں شہر کے عالی شان سینما گھر میں ایک بہترین تماشا پیش کیا جا رہا تھا' جو مقبول ہونے کے باعث مسلسل کئی ہفتے چلتا رہا۔ دونوں وقت سینما کے ہال اور احاطہ میں کافی مجمع لگا رہتا' آج اسی دیر رسی کی وجہ سے جعفر کو پہلے کھیل کے لئے ٹکٹ نہ مل سکا' ٹکٹ ماسٹر سے اس نے کئی مرتبہ التجا کی' جس کے جواب میں اس سے کہا گیا کہ چار آنہ والا ٹکٹ ختم ہو چکا ہے۔ البتہ تمہیں آٹھ آنہ والا ٹکٹ مل سکتا ہے' مگر اس وقت جعفر کی مٹھی میں صرف ایک چونی تھی' اس نے پھر ٹکٹ ماسٹر سے التجا کی کسی صورت سے ایک ٹکٹ چار آنہ والا دیجئے۔ لیکن ماسٹر کے انکار نے اس کا حوصلہ پست کر دیا۔ پھر منیجر کے سامنے جعفر نے اپنا مدعا پیش کیا' وہاں بھی اسے ناکامی نصیب ہوئی۔ نغموں کی دلکش تانیں ہال کے دریچوں سے چھن چھن کر جعفر کی بیتابی میں اضافہ کر رہی تھیں' اس کا دل تماشائیوں کے لطیف قہقہوں پر مچل رہا تھا۔ وہ مجبور و مایوس تھا۔ کیونکہ اس کے پاس اس مسرت آگیں تماشے میں حصہ لینے کے لئے دو چونیاں نہ تھیں' کچھ دیر تک وہ حسرت بھری نظروں سے دیواروں پر آویزاں کی ہوئی خوبصورت فلمی تصاویر کو تکتا رہا' ایک حسین و جمیل عورت کا جاذب نظر چہرہ اس کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس کی زبان سے ایک دبی ہوئی آہ نکل کر فضا میں گم ہو گئی' پیہم خیالات اس کے دماغ میں گشت لگا رہے تھے۔ دفعتہً وہ اپنے خیال سے چونکا' اور نہ جانے کیا سوچ کر گھر کا راستہ لیا' آہستہ سے وہ اپنے مکان کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا' مکان پر موت کی سی خاموشی اور اداسی چھائی ہوئی تھی' مٹی کے تیل کا چراغ مکان کے ایک کونے میں رکھا ہوا ٹمٹما رہا تھا' اس کی بیمار بیوی ایک بوسیدہ چٹائی پر پڑی ہوئی کراہ رہی تھی' صحن میں گھر کا مریل کتا پڑا بھوک کی شدت سے ہانپ رہا تھا' جعفر چپ چاپ مکان میں داخل ہوا' اس نے نہ تو اپنی بیوی کی طرف توجہ کی نہ مکان کی بدحالی پر کوئی دھیان ــــ وہ کسی گہرے خیال میں الجھا ہوا تھا' اس کے سر پر تماشا دیکھنے کا بھوت سوار تھا' اس نے تہیہ کر لیا کہ کسی طرح آج تماشا دیکھ کر چین لے گا' چاہے اس کے لئے کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے' کمرے میں داخل ہو کر جعفر نے اپنی بیوی کا صندوق کھولا۔ اور اس کے کونے میں پڑا ہوا اپنی بیوی کا میلا سا چاندی کا کڑا نکال کر کوٹ کے جیب میں رکھا۔ اور ویسے ہی چپ چاپ گھر سے باہر نکلا ــــ کھلی فضا میں پہونچ کر اس نے پیشانی پر کے پسینے کی بوندوں کو اپنے کوٹ کی میلی آستین سے صاف کیا اور خاموشی کے ساتھ بازار کا راستہ لیا' سیٹھ چنی لال کی دوکان پر پہونچ کر جعفر نے اپنی بیوی کا زیور رہن رکھنے کے لئے دیا' سیٹھ نے دو آنہ سود وضع کر کے ایک چونی اس کے ہاتھ میں پکڑا دی ــــ چند لمحوں میں جعفر سینما کے احاطہ میں کھڑا ہوا نظر آنے لگا۔ کھیل کے اختتام کی گھنٹی بجی ــــ اور تماشائیوں کی ایک ریل باہر نکلی۔

جعفر تماشائیوں کے چہروں کا ایک سرسری جائزہ لیتا رہا۔ ان کے چہرے دلی کیفیات کا اظہار کر رہے تھے' دفعتہً جعفر کے کندھوں کو جنبش ہوئی۔

"خوب ملے دوست، انور نے اس کے کندھے ہلا کر کہا۔

انور ——— تم ——— جعفر نے مصافحہ کے بعد سوال کیا "کہو یار کھیل کیسا رہا"

"بہترین کھیل ہے" انور نے جواب دیا "تم دیکھو گے تو یاد کرو گے"

شوقِ تماشا نے جعفر کو کسی قدر مضطرب بنا دیا ———

"سچ کہتے ہو" جعفر نے اپنی چونّی والی مٹھی کس کر کہا ———

"بھئی سچ اور جھوٹ کا اندازہ تم اس وقت لگا سکتے ہو' جب "کینن" کی مدبھری نگاہوں سے مست ہو جاؤ گے"

جعفر نے کچھ بے تابو سا ہو کر انور سے پرجوش مصافحہ کیا' وہ اب بے حد خوش تھا' کیونکہ آج اسے آٹھ آنہ والا ٹکٹ ضرور ملے گا۔

ٹکٹ گھر کے پاس بہت زیادہ ہجوم لگا ہوا تھا ——— جعفر ان سب کے آگے کھڑا مسکرا رہا تھا ———

دریچے کے دو نوں پٹ کھل گئے' جعفر نے فوراً اپنا چونّی والا ہاتھ' اس کے اندر بڑھایا' لیکن ٹکٹ ماسٹر نے یہ کہتے ہوئے اس کی دونوں چونّیاں واپس کر دیں کہ یہ کھوٹی اور ٹلکے کی ہیں۔ یہ سن کر جعفر کے پیروں تلے زمین نکل گئی' اور آنکھوں میں اندھیری سی چھا گئی' آہ اس کی امیدوں کا خون ہو گیا' لے دے کر یہی دو چونّیاں اس کی امیدوں کا سہارا تھیں لوگوں کے ہجوم میں وہ بری طرح پھنس کر رہ گیا' اس وقت اس کا دماغ چکرانے لگا' پسینے میں شرابور ہو کر وہ مشکل کے ساتھ ہجوم سے نکلا' جعفر نے اپنی بیچارگی اور غربت پر سرد آہیں بھرنی شروع کیں اس کی حسرت میں ڈوبی ہوئیں نگاہیں ان افراد پر پڑ رہی تھیں' جو خوشی خوشی ٹکٹ لئے سینما ہال میں داخل ہو رہے تھے' اسے ان کی قسمت پر رشک ہونے لگا' جعفر کو اپنی قسمت سے زیادہ اس بے رحم ٹکٹ ماسٹر اور دغا باز مارواڑی چینی لال پر غصہ آ رہا تھا' کیونکہ ان دونوں نے اس کی حسرتوں کا گلا گھونٹا ——— برقی کھمبے کے پاس جا کر اس نے بغور چونّی کو دیکھا' واقعی اس پر ٹانکی لگی ہوئی تھی' اسے یاد آیا کہ یہ کھوٹی چونّی چینی لال نے دی ہے' تاریکی میں اسنے اچھی طرح دیکھ کر نہیں لیا ——— جعفر نے تہیہ کر لیا' اب میں اس دغا باز مارواڑی کی خبر لوں گا' سیدھا بازار کا راستہ لیا' مگر ہر دفعہ اسے ناکامی اور مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا ——— جعفر کے پہونچنے تک چینی لال کی دوکان بند ہو چکی تھی ——— دل پر ایک حسرتوں کا بار لئے ہوئے وہ گھر پہونچا' گھر پر بدستور اداسی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی' مٹی کے تیل کا دیا کبھی کا گل ہو چکا تھا' اس کی بیمار بیوی دالان کے ایک ستون کا سہارا لئے بیٹھی کھانس رہی تھی دروازے کے کھلنے کی آواز سن کر وہ چونکی' گھر کا کتا بھونکنے لگا ——— لیکن بہت جلد مالک کی آواز پہچان کر چپ ہو گیا' اور جعفر کے پیروں کے پاس آکر لوٹنے لگا۔ بتی روشن کرو ——— جعفر نے ذرا تند لہجہ میں بیوی کو مخاطب کیا ——— تیل ختم ہو گیا ہے۔

اس کی بیوی نے کچھ ڈرتے ڈرتے جواب دیا ——— جعفر خاموشی کے ساتھ کمرے میں پہونچ کر لباس تبدیل کرنے لگا ———

اس کی بیوی بستر سے اٹھ کر کھانا لے آئی' جس کو اس نے اندھیرے ہی میں ختم کیا ——— جعفر دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا' مختلف خیالات اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا' میں غریب ہوں' اس لئے مجھے دنیا کی

کوئی مسرت میں حصہ لینے کا حق نہیں ہر غریب انسان کے حرکات دنیا کی نگاہوں میں ذلیل نظروں سے دیکھے جانے کے ضرور مستحق ہیں چاہے وہ بے گناہ ہی کیوں نہ ہو، مگر سزا پا کر رہے گا۔ آہ دنیا کی بے انصافی! رات گئے تک جعفر ان ہی خیالوں میں الجھا رہا۔ اسے اس بڈھے مارواڑی، ڈسٹرکٹ ماسٹر کی حرکت پر غصہ آ رہا تھا۔ جنھوں نے علانیہ طور پر اسے دھوکا دے کر اس کی تمناؤں کو خاک میں ملا دیا — اس نے تہیہ کر لیا کہ کل ان کی اچھی طرح خبر لی جائے گی۔ علی الصبح وہ جاگ اٹھا، اور ناشتہ کئے بغیر باہر چلا گیا۔

چینی لال اپنی دوکان پر بیٹھا ہوا سپیاری کھول رہا تھا، جعفر کو وہ اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہوا، جعفر نے چونی کو چینی لال کے سامنے ڈالتے ہوئے کہا لالاجی اسے بدل دو، سیٹھ نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا کیا ہے؟

یہ چونی — جعفر نے کہا کھوٹی نکلی ہے،

کھوٹی — کیسی کھوٹی؟ چینی لال نے تعجب کا اظہار کیا —

"کب لی تھی تم نے مجھ سے یہ چونی"

جعفر نے قدرے طیش میں آ کر کہا، انجان نہ بنو لالا — کل آپ نے جو دی تھی، مجھے تو یاد نہیں، سیٹھ نے لاعلمی ظاہر کی، جھوٹا دغاباز — جعفر نے انتہائی طیش کی حالت میں کھا کھا کر کہا، بھولے انسانوں کو فریب دے کر فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، یاد نہیں کل شام کے وقت کڑا گروی رکھ کر یہ چونی دی تھی،

"تم نے کبھی مجھ سے یہ معاملہ نہیں کیا، جھوٹ کہتے ہو" لالا نے کھلے الفاظ میں انکار کیا،

اب جعفر میں ضبط کی طاقت باقی نہیں رہی، اس نے طیش کی حالت میں لالاجی کے گال سہلائے اور پھر اس نے جو ہاتھ اٹھانا چاہا دوسرا انسپکٹر جعفر نے رسید کیا، ذرا سی دیر میں دوکان پر ایک تماشا ہو گیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ قریب کے لوگوں نے معاملہ کو رفع دفع کیا —

جعفر غصہ میں بھرا ہوا گھر کی طرف روانہ ہوا، انتقام کی آگ اس کے سینے میں بھڑک رہی تھی، اس نے تہیہ کر لیا کسی طرح سے ان دغابازوں سے بدلہ لوں گا۔

ایک ہفتہ کے بعد پولیس نے جعفر کو اس جرم میں گرفتار کیا کہ وہ سیٹھ چینی لال کی دوکان کو آگ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے پایا گیا۔

صابر کوسگوی

اچھا مکان یا آئیڈیل ہوم

مکان بنانا بھی ضروریات زندگی ہی میں سے ہے۔ لیکن اس میں اس کا خیال ضروری ہے کہ اس کا اندازہ اپنے معیار سے تجاوز نہ ہونے پائے اس میں شک نہیں کہ ہر فیاملی کی ضروریات جدا جدا ہوتی ہیں۔ اور ساتھ ہی آمدنی کا توازن بھی مختلف ہوتا ہے۔ حکمت عملی تو یہی ہے کہ ضروریات کو خواہشات سے متبدل نہ کیا جائے۔ ورنہ قارون کا خزانہ بھی اس کا تکملہ کرنے سے قاصر رہے گا۔

اس غلطی کی ابتدا پہلے تو میاں اور بیوی سے شروع ہوتی ہے۔ اور پھر صاحبزادے اور صاحبزادیاں اس میں کچھ زیادتی فرمادیتی ہیں۔ اور کچھ دوست احباب کی عنایت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ شلاً مکان بناتے وقت میاں اپنے (Study) روم اور ڈرائینگ روم کی طرف توجہ مبذول فرماتے ہیں اور بیوی لیڈیز سٹنگ روم کی طرف مہربانی کرتی ہیں۔ ہر ایک اس کوشش میں رہتا ہے کہ اس کا کمرہ ایک دو گز زیادہ طول و عرض کا ہو تو مناسب۔ کبھی تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تقریب کے لئے کوئی بڑا ہال ہو تو مناسب ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ کسی امیر آدمی کا دیکھا ہوا مکان حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اس حالت جذب میں میاں اپنی آمدنی کو بھول بیٹھتے ہیں اور بیوی صاحبہ میاں کے اس حوصلہ پر داد دیتی رہتی ہیں۔ بسم اللہ سرکاری قرضے سے ہوتی ہے۔ اور خانگی قرض پر ختم ہوتی ہے۔ اس پر بھی بعض وقت مکان کی چھت باقی رہ جاتی ہے یا پیش دالان، موٹر گیراج اور آؤٹ ہاؤز کا تو کیا ٹھکانا۔ اگر بالفرض مرضی کے موافق سب کمرے تیار بھی ہو جائیں تو سامنیٹری فٹنگس کا خدا حافظ رہا۔ مکان کی رنگوائی اور فرنیچر اس کا خیال ذہن سے کوسوں دور رہتا ہے بعد میں سوائے افسوس اور تکلیف کے اور کچھ نہیں ملتا۔ مکان شروع کرنے سے قبل آپس میں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے کہ دراصل کتنے کمروں کی ضرورت ہے۔ اور اس کے ساتھ اپنے طرز معاشرت کے لحاظ سے کیسے ہونے چاہئیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ سب کمرے بڑے ہوں۔ (Pantry) پانٹری کی سائز ڈرائینگ روم کے برابر رکھنے کی ضرورت نہیں۔ نہ (Bed Room) کی سائز (ڈائننگ) روم کے برابر ہونی چاہئیے۔ یہ سوچ لینا چاہیئے کہ اپنی ضروریات کے موافق چند کمرے اگر سلیقے کے ساتھ بغیر جگہ کو ضائع کئے ہوئے ترتیب دئے جائیں تو ایک بڑے مکان سے زیادہ آرام دہ اور خوش وضع ہو سکتے ہیں اور اس کا نام ایک آرام دہ اور آئیڈیل ہوم ہے۔

کمرے جتنے بڑے ہوں گے اتنا ہی ان کے سنوارنے میں اخراجات زیادہ ہوں گے۔ شطرنجی اور قالین سے لے کر فرنیچر تک زیادہ کرنا ہوتا ہے۔ اور پھر ان کو صاف رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ کم قیمت رنگ برنگ کا سامان اور ہر زمانہ کی تاریخ کا نمونہ ہراج خانہ سے لاکر گھر میں بھر دیا جائے، اور اس کو ہر عید کی صبح صاف کیا جائے۔

چھوٹا کمرہ چند ضروری نفیس سامان اور خوش سلیقگی کے ساتھ صاف پاک رکھا جائے تو وہ اس بڑے محل سے بہتر ہے۔ جہاں ہر قسم کے کھٹمل اور مکڑیوں کے جالے جمع ہوتے ہیں۔

بڑے سے بڑا مکان تکلیف دہ اور چھوٹے سے چھوٹا مکان آرام دہ ہو سکتا ہے۔ نہایت عالی شان مکان یا محل بغیر رنگ و روغن کے اور عمدہ فرنیچر کے غیر مکمل حالت میں کبھی بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ ان سب باتوں کا خیال شوہر کو ہی نہیں

بلکہ بیوی کو چاہیئے اس لئے کہ وہ اپنا زیادہ حصہ عمر کا اس میں گذارتی ہے اور اس کے صاف پاک اور خوش وضع رکھنے کی ذمہ دار ہے بنے مکان کو صاف پاک رکھنا زیادہ تعداد میں نوکروں کے رکھنے کا باعث ہوجاتا ہے جو نہ صرف اخراجات کو بڑھا دیتے ہیں بلکہ گندگی کا سبب بن جاتے ہیں۔ مکان بنانا یوں تو ہر ہوشمند کا کام ہے۔ میاں بیوی چاہے لاکھ صاف پاک ہوں مگر ابتدا اور خرابی کی نوکروں سے ہی ہوتی ہے۔ مکان کے ساتھ نوکروں کو صاف پاک رکھنا اور ان کو ہر طرح تربیت دینا ایک اچھے گھرانے کا ضروری فرض ہے۔ جو ہمارے ملک میں تقریباً معدوم ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ جس گھر میں چھوٹے بچوں کی نگرانی کرنے والی آیا اگر غلیظ رہے تو اس کا اثر ننھے بچوں پر کیسا ہوگا جو کم از کم بارہ گھنٹے اس کی گود میں گذارتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ مکان بنانا اور مکان کو صاف رکھنا اہلِ فرنگ سے سیکھنا چاہیے۔ اس لئے دنیا میں انگلش کا ٹیبج اپنی نوعیت میں مشہور ہے۔

حیدرآباد میں جدید وضع کے مکانات تو ہزاروں بن رہے ہیں کوئی جرمن کوئی فرینچ مگر اندر جا کر دیکھیئے تو وہی چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ گستاخی معاف۔

مسز فیاض الدین

(جوبلی ہل)

پنگھٹ

آ رہی تھی صبح کی دوشیزہ شرماتی ہوئی
زیرِ لب کچھ مسکراتی، راگنی گاتی ہوئی

بج رہی تھیں میرے دل میں نور کی شہنائیاں
سن رہے تھے سرمدی نغمے زمین و آسماں

بجلیاں سی میری آنکھوں میں فروزاں ہوگئیں
آسماں کی دیویاں جنت بداماں ہوگئیں

گاگریں ہاتھوں میں تھامے تھیں برہمن زادیاں
حسن کی شہزادیاں، دیہات کی آبادیاں

آ رہی تھیں ہر قدم پر پھول برساتی ہوئی
مسکراہٹ سے فضا میں نور پھیلاتی ہوئی

شرمگیں رخسار پر سرخی سی دوڑاتی ہوئی
نیچی نظروں میں تمناؤں کو جھلکاتی ہوئی

مست ناگن کی طرح رستے سے کتراتی ہوئی
میرے دل میں، میری آنکھوں میں جگہ پاتی ہوئی

اپنے دل کی بات پر مجھ کو سنا سکتی نہ تھیں
اپنی خوابیدہ تمنا کو جگا سکتی نہ تھیں

محمد نعیم الدین صدیقی پرویز

بھاگ متی یا حیدر محل

قطب شاہی تاریخوں کے علاوہ کلیات محمد قلی سے بھی بھاگ متی کے واقعہ کے متعلق کوئی تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ محمد قلی قطب نے اپنے اشعار میں اپنے متعدد محبوبوں کے نام لئے ہیں اور ان میں سے بعض کی تعریف و توصیف میں کئی کئی نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن بھاگ متی کا نام کہیں نظر سے نہیں گزرتا۔ بعض شعروں سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ

"قطب شاہ اپنے اس بخت پر نازاں ہے کہ اس کا معشوق اس کی محفل میں رقاص بنا جس کے شکرانہ میں وہ اس کے طاق ابرو میں سجدہ کرنا چاہتا ہے۔"

ایک اور شعر میں لکھا ہے

"قطب شاہ کو ایک ایسا بے بہا ور مل گیا جو اپنے رقص میں کامل الفن ہے۔"

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ

"نبی کے صدقے میں اے معشوق میں اس شہر میں رہتا ہوں جو تیری محبت میں آباد ہوا ہے اور جس کے مقابلہ میں مجھے کوئی شہر پسند نہیں آتا۔"

بھاگ کا لفظ اس نے کئی اشعار میں استعمال کیا ہے لیکن اس کے معنی حصہ یا قسمت کے ہیں اور اکثر جگہ یہ لفظ اپنے لغوی معنوں کے لحاظ سے ٹھیک بیٹھتا ہے اس لئے یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ بھاگ متی ہی کے لئے ہوگا۔ اس سلسلہ میں محمد قلی کے حسب ذیل شعر قابل ذکر ہیں

ٹیلا سو تج پیشانی اتے بھاگ کی نشانی — کن موتی ہے نورانی زہرا و مشتری کا

نبی صدقے تج نیہہ شہر میں ہے قطب — نہیں کوئی شہر اس شہر تے الذ

بھواں کے طاق میں سجدا کروں میں — ہوئے سائیں مری محفل میں رقاص

قطب شہ پایا ہے بے بہا ور — ہوئی اپ ناچ تے کامل میں رقاص

شب برات کے موضوع پر سلطان محمد قلی نے متعدد نظمیں لکھی ہیں جن میں ایک نظم بھاگ متی سے متعلق معلوم ہوتی ہے۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ

"شب برات کی سہانی تقریب میں میری محبوبہ ایک دربار میرے گھر آرہی ہے۔ اور اپنے زرق برق کپڑوں کی وجہ سے اپنے ساتھ آسمان کے چاند اور سورج سے زیادہ روشنی والے لاکھوں چاند اور سورج لے آرہی ہے جس کی وجہ سے کیا تعجب کہ زمین آسمان پر طعنہ زنی کرے۔ کیونکہ میری پیاری نے زمین کو صاف و شفاف آسمان کی طرح جھلکا دیا ہے۔ اور میری سکھیوں کو اپنے چین اور سکھ کے لئے جن جن چیزوں کی خواہش تھی ان سب اس نے ان کی خواہش کے مطابق مہیا کر دیا ہے۔

دنیا سال بھر سے اس کے درشن کی مشتاق تھی اس لئے اس نے اپنا دیدار دکھا کر میری دنیا کو اپنا دیوانہ بنا لیا۔ اس نے اپنے پھول جیسے جسم کو عروسی خوشبوؤں سے خوب مہکا لیا ہے تاکہ میں لطف کے ساتھ اس سے بغلگیر ہو سکوں۔

اے قطب شاہ ہی کے صدقے میں بھاگ سے مل کر تو اپنے ہُوکے یا ہوس کے مطابق وصال کے مزے اڑا کیونکہ وہ خود کو قطب شاہ کے داسی سمجھ کر خوب سج سجا کر آئی ہے۔"

اس کا امکان ہے کہ بھاگ متی کو اپنا حرم بنا لینے کے بعد محمد قلی نے اس کو کسی خطاب سے سرفراز کیا ہوا اور یہ خطاب حیدر محل ہو سکتا ہے۔ اس کی معشوقاؤں کے متعدد ناموں اور کیفیتوں کا ذکر گزر چکا ہے ان میں دو نام یا خطاب ایسے ہیں جو شاید بھاگ متی ہی کے لئے استعمال کئے گئے تھے۔ ایک مشتری اور دوسرا حیدر محل۔

مشتری محمد قلی کے درباری شاعر ملا وجہی کے مشہور قصۂ قطب مشتری کی ہیروئین ہے۔ اس قصہ میں محمد قلی قطب شاہ کے زمانۂ ولی عہدی کی عشق عاشقی کی داستان نہایت خوبی سے قلمبند کی گئی ہے اور لکھا ہے کہ شہزادہ نے بنگالہ کے ایک راجہ کی لڑکی کی تصویر دیکھ پائی اور اس کے عشق میں اتنا والہ و شیدا ہوا کہ خواب و خور تک حرام کر لیا۔ تو اس وقت بادشاہ نے ملک ملک کی دوشیزاؤں کو اس کے ساتھ چھوڑ دیا تاکہ اس کا دل بہلائیں اور مشتری کا خیال اس کے دل و دماغ سے نکال دیں۔

اس قصہ میں بہت ممکن ہے کہ وجہی نے بھاگ متی کا نام لینے کی جگہ ایک فرضی نام مشتری رکھ دیا ہوا اور اس کو رقاصہ بتانے کی بجائے ایک راجہ کی بیٹی ظاہر کیا ہو۔ کیونکہ جب یہ قصہ لکھا جا رہا ہوگا بھاگ متی موجود ہوگی اور بادشاہ اور دربار پر اس کا بڑا اثر ہوگا[1] ایسی صورت میں شاعر اس کو ایک قصبہ کی معمولی رقاصہ لکھنا پسند نہ کرتا ہو۔ یہ بات خود عاشق کے لئے بھی جو اس وقت بادشاہ تھا شاید مناسب معلوم نہ ہوئی ہو۔ بہرحال مشتری محمد قلی قطب شاہ کی ایک معشوقہ ضرور تھی۔ جس پر اس نے اپنی کلیات میں دو نظمیں اور مختلف جگہوں پر اشعار لکھے ہیں۔ نظمیں کلیات کے صفحہ ۲۶۲ تا ۲۶۴ پر درج ہیں۔ ایک نظم میں وہ مشتری کو اپنی آنکھ کی پتلی کہتا ہے اور اس کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے

"سب کو تیرے جوبن سے عشق ہے۔ تیرے ہونٹ کوثر کا پیالہ پلاتے ہیں۔ ان پر محبت کا نشان ہے اور ان کے چومنے سے نجات شرما جاتی ہے۔ ہوشیار عورتوں میں تو ہوشیار ہے اس لئے میں تجھے منا کر اپنے دل میں بٹھاتا ہوں۔ وغیرہ"

ایک دوسری نظم میں وہ لکھتا ہے

"اے قطب شاہ تو اپنے معشوق کی سلامتی کے لئے دعا کر کیونکہ اس کے جینے سے تمام دنیا پر تیری فرمانروائی ہے۔ زندگی اس کا نام ہے کہ جسم میں دل ہو۔ اور ہمارا معشوق ہمارا دل ہے جس پر عشق کی مستی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ہمارے دل میں عرصہ سے جگہ پائے ہوئے ہے۔ جہاں اس کا نور سورج کی شعاعوں سے زیادہ خوشنما اور روشن ہے۔ زحل نے بہت سے دشمنوں کے طالعوں کو مٹا دیا ہے اور مشتری کے طالع کی وجہ سے ہمارے طالع کو بقا حاصل ہے۔ اس لئے اے خدا قطب شاہ کے اس تارے کو اپنی عنایت سے سرفراز رکھ۔"

ان دو نظموں کے علاوہ محمد قلی نے مختلف جگہوں پر حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے کہ اے قطب شاہ تو شادی و خوشی کر کہ تیرا رشتہ اس کے رشتہ سے بندھا ہوا ہے اور مشتری تیرے لئے باعث برکت ثابت ہو رہی ہے۔

---

[1] بعض تاریخوں میں اس امر کا ذکر درج ہے کہ بھاگ متی جب کبھی دربار کو جاتی تو اس کے جلو میں ایک ہزار سوار ہوتے۔

تو ثانی سلیمان ہے اور فتح و فیروزی تیرے ہی لئے ہیں۔ اور تو نے اپنا منظور نظر بنا کر مشتری کو بھی شرف یاب کر دیا۔
اس کے شعر ہیں ؎

رشتہ ترا اس رشتہ سوں ہے بند معانی — شادی و خوشی کر کہا ہے مشتری تج راس
توں سلیمان ثانی و تج برج فیروزی و فتح — مشتری پایا شرف تیری نظر منظور تجے

بعض شعروں میں وہ مشتری کو اپنی بزم میں رقص کناں ظاہر کرتا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ بھاگ متی ہی ہو۔

ع کرے مشتری رقص مجھ بزم میں نت

ع زہرہ و مشتری سوں پاتر رنبھار چاؤ

ندی روما ولی موتیاں کی آرتی بھر کر — سو زہرہ و مشتری کے ہت پلاؤ لائی آج

اسی طرح حیدر محل یا حیدر پیاری کے متعلق بھی اس کی کلیات میں تین نظمیں اور مختلف اشعار دستیاب ہوتے ہیں جن سے
ظاہر ہوتا ہے کہ حیدر محل فن موسیقی کی ماہر تھی اور محمد قلی کی خاص معشوقہ۔

وہ ایک نظم میں کہتا ہے کہ حیدر محل محبت سے نبات گھولتی اور روز بروز عیش و عشرت کے ساتھ عشق کے طبل بجاتی ہے۔
اس کے سرو جیسے قد پر نور حسن کا جلوہ نظر آتا ہے اور سب معشوقائیں اس کو دیکھ کر شرماتی ہیں
وہ اپنی پیشانی پر عشق کا ٹیکا (قشقہ) لگاتی ہے اور چاروں طرف نور حسن کے تار بجتے ہیں۔ وہ عشق کی چادر اوڑھ کر بہوٹی کی طرح سرخ
نظر آتی ہے اے قطب شاہ شکر کر کہ حیدر کی غلامی کی وجہ سے تجھ کو یہ موہنیں ملی جس کی وجہ سے تیرے سر پر تاج سجتا ہے (دیکھو صفحہ ۲۵۷)
ایک دوسری نظم میں لکھتا ہے کہ

"نبی کے صدقے میں حیدر پیاری ملی ہے جس نے اپنے مختلف انداز سے میرے دل کو اپنے دل سے باندھ لیا ہے۔
وہ عشق کے پُراسرار راگ گاتی ہے۔ اس کے بال میں کنول کی تازگی اور آفتاب کی چمک ہے وہ اپنی بھوؤں میں کاجل
لگاتی ہے۔ جسم میں نارنگی رنگ کی تنگ چولی پہنتی ہے۔ اور آنکھوں کے خطرہ کے ذریعہ سے میرے دل پر حملہ
کرتی ہے"

ایک تیسری نظم میں جو نامکمل دستیاب ہوئی ہے لکھتا ہے کہ

"حیدر محل محبت و عشق کا جلوہ گائے اور یزدانی نغمہ بجائے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں جلوے کے لئے کنگن پہن رکھا ہے
وہ اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو تیلیوں کی طرح نچانے وغیرہ (دیکھو صفحہ ۲۵۰)

محلات شاہی کے سلسلہ میں ایک نظم حیدر محل پر لکھی ہے اور اس میں بھی اس حیدر پیاری کا ذکر کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ محمد قلی نے اسی
حیدر محل یا حیدر پیاری کے لئے ایک محل بھی بنا دیا تھا جس کا نام بھی حیدر محل رکھا تھا۔ اس نظم میں لکھتا ہے۔

"حیدر محل میں حیدر پیاری کا جلوہ گاؤ اور اس خوشی میں زمین آسمان اور عرش پر فتح و نصرت کے طبل بجاؤ۔ اے ساقی
سیم ساق میری بزم میں صراحی لے آ۔ اور پیالے کی روشنی میں مجھے اپنے سائیں کی صورت دکھا! یہ قاعدہ ہے کہ جلوہ کے وقت
آئینہ میں دلہا کو دلہن کی صورت دکھاتے ہیں؛ سورج کے طبق سے لے کر نقل و شراب اپنے گا اس میں رکھو اور پیاری کی

محبت کے ہار پیارے کے گلے میں ڈالو۔ اس نیک ساعت میں سینوں پر پستانیں زیب دیتی ہیں۔ دودھ اور مصری سے آب حیات کے گھڑوں کو بھردو۔ اس جلوسے کے وقت بادشاہ اتنا اچھا نظر آتا ہے کہ پدمنیاں اور چتنیاں سب شاہ کے روپ کی دیوانی ہوگئی ہیں۔ اے سکھیو ان کے ہاتھ سے قول کا بیڑا اٹھا کر شہ کو کھلاؤ۔ نبی کے صدقے میں آج قطب شاہ کو جلوے میں بیٹھنا نصیب ہوا۔ اس لئے مردوں اور پریوں کو چاہیئے کہ شہ پر سے خود کو وار یں۔"

کیا تعجب کہ یہ نظم حیدرمحل کے ساتھ شادی کرنے کی تقریب میں لکھی گئی ہو۔ اور یہ حیدرمحل اصل میں بھاگ متی ہی ہو جس کو نکاح کے وقت حیدرمحل کا خطاب دیا گیا ہو۔ اور بعد کو شاید اسی کے خطاب کے لحاظ سے بھاگ نگر کا نام حیدرآباد میں تبدیل کر دیا گیا۔

ان معلومات کے پیش نظر ہر شخص حسب ذیل نتیجے اخذ کرنے پر مائل ہوگا کہ

۱۔ بھاگ متی کا نام پہلے مشتری مشہور رہا یا مشہور کیا گیا۔

۲۔ بعد کو جب مغل بادشاہوں کی طرح محمد قلی قطب شاہ نے بھی اپنی اس چہیتی بیگم کو حیدرمحل کا خطاب دیا تو اس خطاب کے ساتھ اس کے قصر اور شہر کا نام بھی حیدرمحل اور حیدرآباد پڑ گیا۔

سید محی الدین قادری زورؔ

بھکاری

گرد سر پر اور جامہ پاش پاش　　در بدر کی ٹھوکریں فکرِ معاش

آ رہا ہے سر جھکائے غم زدہ　　ضعف سے طاری بدن میں ارتعاش

تیسرا فاقہ ہے کچھ کھایا نہیں　　ایک چلو بھی کہیں پائی نہ آش

سر چھپانے کے لئے تھوڑی سی جا　　کر رہا ہے آنکھوں آنکھوں میں تلاش

آہ اے منعم فدائے مال و زر!　　دیکھ لیتا تو بھی اِس منظر کو کاش

دیدۂ بے نور، بے سانسوں کی جان　　قالبِ بے رُوح، نقشِ بت تراش

جسم پر نیلی رگیں ابھری ہوئیں　　زرد چہرہ، ہلکی ہلکی سی خراش

سامنے تیرے اگر چنگ و رباب　　عیش و عشرت منعمانہ بود و باش

تو ہو مصروفِ نیاز و نازِ حسن　　اور تیرے در پہ کھڑی ہو زندہ لاش

شورؔ عابدی (ٹونکی)

معاشرت میں سادگی

(دوسری قسط)

عہد حاضر میں ہم نے جو طرز معاشرت اختیار کر رکھی ہے اس کا اصول سادگی نہیں بلکہ تکلف و نمایش ہو گیا ہے، سادگی سے قطعی جدائی ہمارا شعار ہو گیا ہے۔ اب ہمارا مقصد یہ ہے کہ کسی چیز کو جس حالت میں پائیں اس کے برعکس بنادیں۔

اگر ہم معاشرت میں سادگی پسند کریں تو یہی آدمی سے زیادہ تکلیفوں اور مشکلوں پر غالب آسکتے ہیں۔ سادہ عادات، سادہ خیالات، سادہ مشاغل تفریح، سادہ ضروریات زندگی غرض کہ ہماری معاشرت میں سادگی کا دور دورہ ہو پھر دیکھئے دنیا مع اپنے سارے تکلفات کے ہم کو مغلوب نہیں کر سکتی کیونکہ سادگی نیچر پر حکومت کرتی ہے۔

ہم نے اکثر بچوں کو راستے کے کنارے خاک میں لوٹتے ہوئے دیکھا ہے، وہ اپنی اس حالت میں بہت زیادہ خوش و خرم دکھائی دیتے ہیں، اتنا زیادہ جتنا کہ ہم اپنے قیمتی لباس میں بھی نہیں ہوتے، ہماری تہذیب انھیں گندہ کہتی ہے مگر یہ مسئلہ غور طلب رہتا ہے کہ آیا ہم زیادہ گندہ ہیں یا وہ؟ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے بچہ ہماری تہذیب اور معاشرت میں گرفتار ہوتا جاتا ہے، یہاں تک وہ اپنے گذشتہ مشاغل تفریح کو عہد طفلی کی لغویات پر محمول کرتا ہے۔ سادہ اور حقیقی خوشی جو اس کے دل میں اس کے ارد گرد کی چیزوں سے پیدا ہوتی تھی کم ہونا شروع ہوتی ہے اور تھیٹر، سینما، راگ رنگ، رقص و سرود اور ایسے ہی دوسرے تہذیبی تکلفانہ مشاغل تفریح میں مسرت حاصل کرتا ہے، غرض کہ اس کی معاشرت میں سادگی کے عوض بتدریج تکلفات جگہ پاتے ہیں۔ اور سادہ معاشرت کی جملہ خوبیاں اور آزادیاں تہذیب و تمدن کے بند صندوں میں مقید ہو جاتی ہیں۔

سادہ معاشرت کی مختلف قسمیں ہو سکتی ہیں، گھر کی سادگی، لباس کی سادگی، عادات کی سادگی، غذا میں سادگی، رسم و رواج اور دوسری ضروریات زندگی میں سادگی وغیرہ

گھر کی سادگی سے یہ مطلب ہے کہ ہم اپنے مکانوں کو سادہ مگر صاف ستھرا رکھیں، پر تکلف اور قیمتی سامان سے مکان کو آراستہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جن مکانوں میں فضول چیزیں بھری رہتی ہیں ان کے مکینوں کی جان ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہتی ہے، شب و روز ان کو ان غیر ضروری چیزوں کی ترتیب اور تہذیب کی فکر لگی رہتی ہے اور ان کا سارا فرصت کا وقت ان چیزوں کی دیکھ بھال میں صرف ہوتا ہے، اول اول کچھ عرصہ تک آرایش اور صفائی کا شوق جوش پر رہتا ہے لیکن رفتہ رفتہ یہ شوق سرد پڑ جاتا ہے، جو چیزیں روزمرہ استعمال میں نہیں آتیں ان پر گرد و غبار کے ڈھیر لگ جاتے ہیں، جو چیزیں اس لئے خریدی گئی تھیں کہ ان سے گھر کو آراستہ کیا جائے اب وہی آرایشی سامان نے گھر کو کباڑی کی دکان بنا دیا ہے اور آرایش و زیبایش کے عوض مکان کی بدنمائی کا باعث ہو رہا ہے۔

آج کل اکثر حضرات اس مرض میں مبتلا ہیں کہ خواہ ضرورت ہو نہ ہو نیلاموں سے بغیر سوچے سمجھے بہت سی بیکار اور فضول چیزیں لا کر جمع کر لیتے ہیں اور دوسروں سے مقابلے کے شوق میں بازاری قیمت سے زیادہ قیمت پر سامان خریدتے ہیں، چند روز کے بعد جب طبیعت ان چیزوں سے سیر ہو جاتی ہے اور ان کے بے ضرورت ہونے کا احساس ہوتا ہے تو پھر نیلام میں بھیج دیتے ہیں۔ اس خرید و فروخت میں جو نقصان ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ بخوبی کر سکتے ہیں جو اس مرض میں مبتلا ہیں۔ اس موقع پر نیلام میں بیجا طور پر سامان خریدنے والے ایک صاحب کا واقعہ ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

ایک صاحب کو جن کے والد کافی جائیداد اور دولت چھوڑ گئے تھے، فرنیچر اور دوسری آرائشی چیزیں خریدنے کا شوق ہوا! ایک دن آپ ایک "عظیم الشان" نیلام میں رونق افروز ہو گئے اور اندھا دھند سامان خریدنا شروع کر دیا، نیلام کرنے والے نے جو یہ رنگ دیکھا طرح طرح سے آپ کو اکسانا شروع کیا، اگر آپ نے ایک ہی وضع کی دو چیزوں میں سے ایک خرید لی تو پکار اٹھا "جوڑی بگڑ گئی"! کبھی کسی چیز کو زیادہ قیمت لگنے کی وجہ سے چھوڑ دینا چاہا تو جتلا دیا کہ "یہ چیز تو آپ ہی کے لایق ہے"! غرض کہ اس طرح ہمارے نا عاقبت اندیش دوست نے کوئی تین چار ہزار کا سامان خرید لیا۔ گھر تھا پرانی وضع کا اس میں یہ نئی قسم کا "ماڈرن" فرنیچر گیا بھلا لگتا! چونکہ مکان کرایہ کا تھا اس لئے دوستوں کی رائے ہوئی کہ گھر بدلنا چاہیئے، فوراً مکان چھوڑ دیا گیا۔ اس تقریب میں بہت سارا چینی کا نچ کا سامان ٹوٹ پھوٹ گیا، میز کرسیوں اور الماریوں کی چولیں ڈھیلی ہو گئیں، الغرض یہ سارے اسباب کے ساتھ جس مکان میں منتقل ہوئے تھے وہ بھی کچھ قرینہ کا نہیں نکلا! جب یہ نئی وضع کا فرنیچر اور دوسری آرائشی چیزیں اس میں سجائی گئیں تو بعض احباب کی رائے ہوئی کہ اس بیش قیمت سامان کے لئے یہ مکان بھی کچھ زیادہ موزوں نہیں!!

اس مکان کو بھی وداع کیا گیا ایک بڑا جرمن ڈزائن مکان معقول کرایہ پر لیا گیا، حالانکہ اب بھی سرمایہ اس قدر موجود تھا کہ ایک عمدہ مکان بنایا یا خریدا جا سکتا تھا، یہ مکان کچھ ٹھیک نکلا۔ پہلے مکان سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں منتقل ہونے کی وجہ سے جو سامان ٹوٹ پھوٹ گیا اور جو چیزیں اس مکان کے لئے موزوں ثابت نہ ہوئیں انھیں جب نیلام میں بھجوایا گیا تو آدھی سے بھی کم قیمت پر فروخت ہوئیں اور اس قیمت کا بھی ایک حصہ نیلامی کے کمیشن کی نذر ہو گیا، دو تین مہینے بھی اسی مکان میں چین سے گزرنے نہ پائے تھے کہ ہمارے دوست کا تبادلہ ہو گیا! اور اس تقریب میں آپ کو گھر بدلنے کا کچھ ایسا چسکا پڑ گیا کہ آج تک یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

مکان کی طرح ہمارا لباس بھی سادہ مگر صاف ستھرا ہونا چاہیئے "مرغ زرین" بنے رہنے سے ہمیں بہت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے، جو لوگ زیادہ قیمتی لباس استعمال کرتے ہیں ان کو ہر وقت اپنے لباس کو ہتھیلی کے پھپھولے کی طرح حفاظت سے رکھنا پڑتا ہے، جہاں کسی نے ذرا ہاتھ لگایا ان کا دل دھڑک گیا، ہمیں چاہیئے کہ نوق البھڑک لباس کی قید میں خود کو نہ پھنسائیں، لباس ایسا استعمال کرنا چاہیئے کہ تن پوشی کے علاوہ تراش خراش میں بھی اچھا ہو۔

اس کی ضرورت نہیں کہ ہمارے ہاں درجنوں سوٹ، شیروانیاں، شوز وغیرہ ہوں چیزوں کی افراط ان کی دیکھ بھال سے ہمیں بے نیاز کر دیتی ہے اور یہ قیمتی چیزیں برسوں کام دینے کے عوض مہینوں میں ناکارہ اور ناقابل استعمال ہو جاتی ہیں، شوز اتنے ہوتے ہیں کہ ان کی صفائی اور پالش کے لئے ہمارے نوکر کو وقت نہیں ملتا، سڑے چلے جا رہے ہیں! نوکر صاحب اگر ذرا "چابک دست" ہیں تو ہر مہینہ بلکہ ہر ہفتہ ایک آدھ چیز کم ہو رہی ہے!! تعداد کی کثرت میں یاد بھی نہیں رہتا کہ کتنی چیزیں خریدی گئی تھیں اور اب کتنی ہیں! غرض کہ ہر چیز کی افراط ہر طرح کے نقصان کا باعث ہوتی ہے۔

لباس میں فیشن کی لعنتوں نے شریک ہو کر اس کو انسانی صحت کے لئے مختلف طریقوں سے مضرت رساں بنا دیا ہے، فیشن کی نظر فریب رنگینیوں سے ہر دو صنف کی صحت اور خوش حالی کو ناقابل تلافی نقصان پہونچ رہا ہے، قیمتی فیشنیبل لباس کی خاطر ہم اپنی دوسری اہم ضروریات زندگی سے اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو محروم رکھتے ہیں۔ غذا جیسی استعمال کرنی چاہیئے نہ خود کھاتے ہیں

:۔ اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہیں مگر قیمتی لباس پہن کر اکڑتے پھرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ ہماری صحت کی خرابی اور نسل کی کمزوری کی جہاں اور بھی وجوہات ہیں ان میں ایک بڑی وجہ قیمتی لباس کا استعمال بھی ہے۔

عادات اور خیالات کی سادگی بھی بڑی چیز ہے، جس کو یہ حاصل ہو اس کو حقیقی مسرت اور سچی خوشی کے ساتھ بڑی آزادی ہے۔ بعض لوگ خواہ مخواہ اپنے دماغ کو بیجا خواہشوں اور بڑی بڑی تمناؤں کا آماجگاہ بنا لیتے ہیں۔ ان کی آرزوئیں اس قدر بلند اور ختم نہ ہونے والی ہوتی ہیں کہ ان کا سلسلہ کبھی ٹوٹتا ہی نہیں، انہی کے لئے یہ کہنا درست ہوگا۔

"ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے"!

ایسی موہوم امیدوں کے خیالات ان کے دل و دماغ پر حاوی ہوجاتے ہیں کہ ان کا پورا ہونا اس دنیا میں قرین قیاس نہیں ہوتا۔ وہاں آسائشوں اور مسرتوں کے حاصل کرنے کا خیال کرتے ہیں جن کے حصول کی امید خیال خام ہوتی ہے "دماغ بیہودہ پخت و خیالِ باطل بست" کا مشہور مقولہ ان ہی لوگوں پر صادق آتا ہے۔ فضول خواہشوں کے ہوائی قلعے نہ بنانا چاہیئے، سادگی اسی میں ہے کہ ہم ایسی خواہشوں کے حاصل کرنے کی فکر کریں جن کا حصول ممکن ہو اور جو ہمارے اور ہمارے ابنائے جنس کے لئے مفید ہوں، ایسے خیال اور اصول کو ہم اپنا رہبر بنائیں جو ہماری زندگی کے لئے مفید اور ضروری ہوں، زندگی کو فضولیات اور خرافات سے آزاد رکھنا چاہیئے۔

غزل

مرزا سیف علی خاں

کوئی اس دنیا میں میرا یار و ہمدم نہ تھا — ہائے اس صدمے سے دل کب مبتلائے غم نہ تھا

پردۂ آدم میں خود نورِ خدا تھا جلوہ گر — اے فرشتو! سجدۂ حق سجدۂ آدم نہ تھا

تیرے غم نے زندگی میں لطف پیدا کر دیا — زندگی بے لطف تھی جب تک کہ دل میں غم نہ تھا

اس کو شوخی نے ملطف کی کبھی رخصت نہ دی — کب وہ کافرِ عاشقِ ناشاد سے برہم نہ تھا

امتیازاتِ نظر نے کر دیا چھوٹا بڑا — ورنہ دنیا میں کہیں یہ فرقِ بیش و کم نہ تھا

حق نے قدرت صرف کی دل کے بنانے کے لئے — یعنے یہ شہکارِ قدرت کوئی جامِ جم نہ تھا

کب نہ تھا دل میں مرے زلفِ پریشاں کا خیال — کب مرا شیرازۂ طبعِ رسا برہم نہ تھا

قوسِ رنگینِ فلک سے بھی تلون ہے سوا — اس کی طبعِ ناز کا پہلے تو یہ عالم نہ تھا

بس گیا تھا حسنِ جاناں میرے دل میں اس قدر — بےخودی ہی بےخودی تھی فکرِ کیف و کم نہ تھا

سرد مہری سے تری خونِ رواں بھی سرد ہو — جم گیا ایسا کہ گویا آشنائے رم نہ تھا

حسن کا احساس دنیا کو نہ تھا جب تک ذکی — انتظامِ بزمِ ہستی درہم و برہم نہ تھا

محمد عبد السلام ذکی

انوکھی منت

شادی ہوکر دس سال گذر گئے، مگر آرزو کی کلی کبھی نہ کھلی۔ خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ کھیت تھے، گھر تھا، بھگوان کی دیا سے گھر میں دودھ کی نہریں بہتی تھیں۔ زندگی آرام سے گذر رہی تھی۔ نریندر کی ایک بوڑھی والدہ تھی اور سیتو اس کی بیوی۔ تین افراد کا یہ مختصر کاروان زندگی کے صحرا میں شانتی اور اطمینان کے ساتھ گذر رہا تھا۔

سیتو صبح سویرے اٹھتی، اشنان کرتی، ماتھے پر ٹیکا لگاتی سورج دیوتا کو پرنام کرتی اور گائے بیلوں کا گوبر صاف کرکے گھر کے آنگن کو گوبر سے لیپتی پھر دودھ دوہ کر لاتی، کھانا پکا کر، ساس ماتا کو کھلاتی پھر ہر روز اپنے پتی کے لئے کھیت کو کھانا لے جاتی تھی۔ یہی اس کا روز کا مشغلہ تھا۔

ایک روز سیتو کو کھیت سے آنے میں دیر ہوگئی۔ بڑھیا سو رہی تھی، بچھڑا گھر میں گھس کر چاول کھا رہا تھا اور اس نے سارے برتن نیچے گرا دئے تھے۔ برتن کی آواز نے بڑھیا کو نیند سے بیدار کر دیا۔ وہ مشکل سے اٹھی اور لکڑی کے سہارے کمرے میں پہنچ کر بچھڑے کو ہانکا اور باہر لاکر کھونٹے سے باندھ دیا۔ یہ ایک بڑی مہم تھی جس کو بڑھیا نے سر کیا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے، سانس چڑھ رہی تھی اب وہ باہر آئی اور لکڑی پھینک کر درخت کے سایے میں بیٹھ گئی۔ سورج کی کرنیں پتوں سے چھن چھن کر گر رہی تھیں۔ گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں برتن بغلوں میں دبائے کنویں کی طرف جا رہی تھیں۔ شانتا بھی اپنی سہیلی سیتو کو لینے آئی، بڑھیا کو آنگن میں بیٹھے ہوئے دیکھ کر پرنام کیا اور پوچھا "ماتا! کیا سیتو ابھی نہیں آئی"۔ "بیٹی! وہ اپنے پتی کے لئے کھانا لے گئی ہے۔ نہ جانے آج کیوں اتنی دیر ہوگئی۔ نگوڑی گھر کیا آئی، گھر سنسان بن گیا، اب تک پرماتما نے ایک بچہ نہیں دیا کہ آنکھ بھر کر دیکھتی، کلیجے سے لگاتی، میری جندگی کا بھروسہ ہی کیا آج رہی کل نہ رہی"۔ "نہیں ماتا جی! دل میلا نہ کیجیو۔ بھگوان دے گا، ابھی دن ہی کیا گئے ہیں، سیتو تو ابھی جان جوان چھوکری ہے، اب کے برس پرماتما کی کرپا سے سیتو کے لعل جیسا بیٹا ہوکر رہے گا"۔ شانتا نے کہا۔ "نہیں بیٹی! میں گلہ گذاری نہیں کر رہی ہوں، میں تو اپنی آرجو کا بیان کر رہی ہوں۔ اس کی شادی کو دس سال ہوگئے، مگر ابھی تک گود خالی ہے، لاکھوں جتن کئے، منتیں مانی، شیوجی کی پوجا کی، برت رکھا۔ سب کچھ بے کار۔ اب کے میں نے منت مانی ہے کہ اگر نریندر کو بیٹا ہوجائے تو پوری کچوری اور حلوا بنا کر سات برہمنوں کو کھلاؤں گی۔ برہمن کی دعاؤں سے پرماتما میرے گھر میں اجیالا کرے گا کہ نہیں"۔ بڑھیا نے جواب دیا۔ "ہاں ماتا جی! سچ ہے، برہمنوں کے چرنوں میں مرادیں جھولی پھیلتی ہیں"۔ شانتا نے کہا اور چلی گئی۔

بڑھیا رینگتی ہوئی گھر میں پہنچی اور دروازہ بند کرکے پھر سو رہی۔ دھوپ پھیل چکی تھی، گرمی زیادہ ہو رہی تھی۔ سیتو پسینے میں ڈوبی ہوئی برتنوں کی پوٹلی سر پر رکھے ہوئے گھر پہنچی دروازہ بند تھا۔ نہ جانے اس کے دل میں کیا بات آئی کہ بوڑھی ساس کو آواز دیئے بغیر برتن باہر رکھ کر، پانی بھرنے کے لئے کنویں کو چلی گئی۔ شانتا وہیں کھڑی پانی بھر رہی تھی، اس نے پوچھا "کیوں بہنا! آج اتنی دیر کیوں ہوگئی؟" سیتو نے کہا، "کھیت کٹ رہے ہیں، انھیں کھانا کھانے میں دیر ہوگئی۔ گھر میں کوئی بچہ نہیں کہ سہارا دے۔ گھر کے سارے کام کاج مجھے کرنے پڑتے ہیں"۔ "سارے گاؤں، ساری برادری میں تیرا ہی چرچا (ذکر) رہتا ہے۔ معلوم نہیں پرماتما تیری آرجو پوری کب کرے گا۔ تیری ساس نے مجھ سے تیری گود خالی رہنے پر بڑا دکھ ظاہر کیا۔ اس نے برہمنوں کو کھانا کھلانے کی بھی منت مانی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

شانتانے پوچھا۔ میں کیا جانوں اس بڈھی کھوسٹ کی کیا کیا آرزوئیں ہیں۔ بچہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ مجھ سے بات تک نہیں کرتی۔ تو ہی ایمان سے کہہ بہنا! میں مشین تھوڑی ہی ہوں کہ بچے پیدا کروں۔ بھگوان دے، بندہ لے" سیتو نے جواب دیا اور رونے لگی۔ شانتا نے کہا۔ بہنا! روتی کیوں ہے۔ میں تجھ کو ایک بات بتاتی ہوں۔ مانے گی کہ نہیں۔ تیرا میرا بھید تو ایک ہے ہی"۔ "مانوں گی کیوں نہیں" سیتو نے جواب دیا۔

کل شام میں ٹھاکر کے ہاں گئی تھی۔ ٹھاکر صاحب کی زمین ساہوکار نے چھین لی ہے۔ اگلے سال کی پھسل کاٹنے کے لئے ٹھاکر نے ساہوکار سے کچھ روپیہ لیا تھا۔ پھسل خراب ہوگئی، پیسہ ادا نہ ہوا، ساہوکار نے تقاضا کیا، وہ دیتے کہاں سے، مقدمہ چلا۔ کسی کے سمجھانے بجھانے سے ٹھاکر صاحب کی بیوی نے ناگوروالی کی منت مانی۔ آخر وہ مقدمہ میں جیت گئے۔ دو ہزار روپیہ اور زمین سب کچھ واپس ملا۔ دیکھا تو نے ٹھاکر کی مراد کیسے بر آئی۔ وہ آج کتنا خوش ہے۔ گاؤں والوں کو کیا خبر، کہ ٹھاکر نے مقدمہ کیسے جیتا۔ اس کی بیوی نے مجھے یہ سارا قصہ سنایا۔ میں نے تیرا قصہ سنایا۔ اس نے کہا ناگوروالی کی منت مانو۔ تمہیں سنتوش ہوگا۔ بہاتما، درگوروں تو سب کے ہوتے ہیں۔ وہ بھی مہاتما ہیں۔ مگر ان کی پوجا ہندو بھی کرتے ہیں۔ یہاں جات، ذات کہاں رہی۔ پرماتما سب کا ایک ہے۔ ٹھاکر کی بیوی کہتی تھی اس درگاہ میں ہندو مسلمان کی تمیز (تمیز) نہیں۔ سب ایک بھائی بہن نظر آتے ہیں۔ پارسال بھی ہمارے گاؤں سے کرشن، چند، کوسلیا سب گئے تھے وہاں سے پرشاد لائے تو بھی اگر ان برہمنوں کو چھوڑ کر ان کی منت مان لے تو دیکھنا پرماتما تیری گود بھر دے گا"۔

"میں تو تیری بات مان گئی۔ پر بڈھی کو منوانا مشکل ہے" سیتو نے کہا۔

"بڈھی کو چھوڑ، تو اپنے پتی کو منوالے۔ شانتا نے جواب دیا۔ پانی سے بھرے ہوئے گھڑے کو کمر پر رکھ دونوں باتیں کرتی اور ہنستی ہوئی گھر پہنچیں۔

شام کا وقت تھا، گاؤں کی خاموش زندگی میں ہلچل پیدا ہوگئی تھی۔ پرندوں کی پکار سے ہوا میں کیف پیدا ہوگیا تھا۔ کسان کندھوں پر ہل، سر پر گھاس اور ہاتھ میں بیلوں کی رسی لئے ہوئے گھروں کی طرف آرہے تھے۔ عورتیں باہر نکل نکل کر گئوشالوں میں گائے بھینسوں کو باندھ رہی اور دانہ چارہ ڈال رہی تھیں۔ نریندر بھی بیلوں کو ہانکتا ہوا گھر پہنچا۔ سیتو نے بیلوں کی رسی اپنے ہاتھ میں لی اور پانی کا لوٹا پیش کیا۔ اس کے منہ ہاتھ دھونے تک سیتو بیلوں کو باندھ کر گھر میں آئی۔ آج اس نے نریندر کے لئے آلو کے پکوڑے پکائے تھے۔ تھالی میں پکوڑے اور چپاتی لئے ہوئے دالان میں آئی جہاں نریندر تھکا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے تھالی رکھ دی۔ نریندر خوشی خوشی تمام پکوڑیوں کو ہضم کر گیا۔ بوڑھی ساس "اپنا دل بہلانے کی غرض سے پڑوسن کے ہاں جا بیٹھی نریندر جب کھا چکا تو سیتو نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور کہا میرے پتی! میری گود کھالی (خالی) اور گھر سنسان ہے۔ ساری برادری ناراج (ناراض) ہے۔ میری ایک آرجو ہے۔ حکم ہو تو کہہ دوں۔ نریندر نے کہا برادری ناراج ہو تو تیری بلا سے مجھے اس کا کیا غم۔ پرماتما جاہے گا تو دے ہی دے گا۔ تیری کیا آرجو ہے۔ جی چاہتا ہے کل ناگوروالی کی منت مانوں، شانتا نے بھی یہی کہا ہے" سیتو نے کہا۔ ہاں ہاں کل صبح ٹھاکر صاحب بھی یہی کہتے تھے۔ اماں سے نہ کہنا میں اور تو کل اشنان کرکے سوامی جی کی منت کریں گے۔ اگر اس سال بچہ ہوگیا تو اس کے ان کے چرنوں میں ڈال دیں گے۔" نریندر نے جوش سے کہا۔ "یہی میری آرجو ہے" سیتو نے خوش ہوکر جواب دیا۔

دن گزرے، راتیں کٹیں، بہار آئی، خزاں گئی۔ مگر گاؤں کی زندگی میں کوئی انقلاب نہ آیا۔ آیا بھی تو صرف اتنا کہ نریندر کی

بیوی حاملہ ہوگئی۔ گاؤں میں چرچے ہوئے دوستوں نے نریندر کو مبارک باد دی، خزاں دیدہ چمن میں بہار امید کھل کھلا اٹھی بڈھی ساس کی خوشی نہ پوچھو، بہو کا ذکر ہر ایک سے کرتی اور خوش ہوتی تھی، سختی کا کام کرنے سے منع کرتی اور اپنے ضعف کے باوجود گھر کے چھوٹے موٹے کام خود سنبھالتی تھی۔ آخر خدا خدا کر کے سیتو کو بھگوان نے چاند سا بیٹا دے ہی دیا۔ ساری برادری جوتا۔ امی تھی خوش ہوگئی۔ برہمنوں کو کھانا اور خیرات دل کھول کر دی گئی۔ مگر کسی کو کیا خبر کہ منت کیا تھی! کس کی تھی؟ اس بھید کا علم شانتا کے سوا کسی کو نہ تھا۔

تین مہینے گذر گئے، بچہ گود میں کھیلنے لگا۔ ناگور ولی کی جاترا میں صرف دو چار دن باقی تھے۔ گاؤں کے مرد اور عورتیں بھی جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ جمعرات کا دن تھا، بیل گاڑی نریندر کے گھر کے پاس تیار کھڑی تھی۔ سارا گاؤں جاترا کی وجہ سے خالی ہوگیا تھا۔ بہت سے لوگ پیدل ہی چل کھڑے ہوئے۔ نریندر بھی اپنی عورت کے ساتھ پیدل ہی چلا جاتا مگر بوڑھی ماں کی وجہ سے اس کو بیل گاڑی میں جانا پڑا۔ سیتو تیار ہو کر شانتا کو لینے دوڑی، مگر وہ جا چکی تھی، سیتو مایوس ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئی اور یہ مختصر قافلہ صبح کے دس بجے ناگور پہنچا جو اس گاؤں سے پانچ میل فاصلے پر ہے۔ عرس کا دن تھا، صندل نکلنے میں دو گھنٹوں کی دیر تھی۔ نریندر اور سیتو نے مزار کے قریب کنویں میں اشنان کیا، ٹیکا لگایا، نریندر نے نئی دھوتی باندھی، سیتو نے نئی ساڑی پہنی، بچہ کو لے کر آستانے پر پہنچے۔ شکر کی پڑیا کھولی، عود بتی جلائی، مجاور نے فاتحہ پڑھی۔ سیتو نے بچے کو حضرت کے قدموں میں ڈالا اور سجدہ کیا۔ دونوں کے چہرے تمتما رہے تھے۔ فاتحہ کے بعد انھوں نے بچے کو لیا اور اپنی منت پوری کرنے کے لئے مینار پر پہنچے جو مزار کے احاطے ہی میں سیدھے بازو پر واقع ہے، سامنے بازار کی گلی ہے۔ دونوں نے مینار کے بالائی حصے پر پہنچ کر اپنی اپنی آنکھوں پر پٹی باندھی، ماں کے آنسو نکل پڑے، باپ کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ مگر انھوں نے دل پر جبر کر کے بچے کو نیچے پھینک دیا اور دونوں روتے ہوئے اتر آئے۔

شانتا بڑی ٹوکری سر پر رکھے ہوئے کچھ سامان، ناریل، عود خریدنے کے لئے قریب کی ایک دکان پر پہنچی، ٹوکری اتاری، مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے یہ دیکھا کہ بچہ ٹوکری میں پڑا کلیلیں کر رہا ہے۔ وہ پہچان گئی۔ فوراً سامان لئے بغیر مقبرے میں پہنچی۔ بچے کو حضرت کے قدموں میں ڈال کر خلوص سے محو سجود تھی کہ سیتو اور نریندر ہانپتے کانپتے مقبرے میں پہنچے۔ انھوں نے دیکھا شانتا سجدے میں پڑی رو رہی ہے اور بچہ صحیح سلامت پڑا کھیل رہا ہے۔ دکھیا ماں باپ کا دل فرط محبت سے بھر آیا اور انھوں نے بچے کو زندہ دیکھ کر گود میں لے لیا، ان پر جنون سا طاری تھا، ہوش بجا نہ تھے، خلوص کہو یا دیوانگی، وہ بچہ سمیت شام تک مقبرے کے چکر لگاتے رہے۔ جب صندل ختم اور لوگوں کا ہجوم کم ہوا تو انھوں نے اپنے گھر کی راہ لی۔

عبدالواسع عصری بیگ
(میسور)

مثنوی بے نظیر

(یعنے قصۂ تمیم انصاری)

یہ منظوم قصہ، جو عام طور پر "قصۂ تمیم انصاری" کے نام سے موسوم اور مشہور ہے، تین سو سال پہلے کی اردو کا نمونہ ہے۔ اس کی تالیف گیارہویں صدی کے وسط میں ہوئی تھی۔

اس قصے کا مصنف بیجا پور کا رہنے والا اور، عادل شاہی خاندان کے چھٹے حکمران، محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۷ھ) کا معاصر تھا۔

مصنف کے متعلق، خارجی ذرائع سے کچھ معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ کسی تذکرے میں اس کا حال درج نہیں ہے۔ حالانکہ محمد شاہ کے زمانے میں بیجا پور کی علمی و ادبی چہل پہل کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے کافی ذرائع موجود ہیں۔ محمد قاسم فرشتہ نے اپنی مشہور تاریخ، محمد کے پیش رو، ابراہیم ثانی (۹۸۸ھ۔ ۱۰۳۷ھ) کے عہد میں لکھی تھی۔ غالباً ابراہیم کے زمانے میں صنعتی بہت کم عمر تھا اور اس کو شہرت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ فرشتہ فارسی سے انس کے سبب، اس زبان کے شعرا کا تذکرہ تو کرتا ہے، لیکن اردو شاعروں کا ذکر اس نے بہت کم کیا ہے۔ بجز اس کے کہ وہ، دربار میں خاص اہمیت رکھتے ہوں۔ ابراہیم کے حالات میں، اس نے، اس کے لڑکے علاء الدولہ کی ولادت کے جشن کے سلسلہ میں اکثر شعرا کا ذکر کیا ہے۔ اگر صنعتی کی شہرت ہوتی، تو اس کا بھی ذکر کرتا۔

تاریخ فرشتہ کے علاوہ، اس عہد کے علمی اور ادبی اذکار کا دوسرا تفصیلی ماخذ تاریخ بیجاپور "بساتین السلاطین" ہے۔ محمد کے بیان میں "بساتین" کے مصنف نے، ایک ذیلی سرخی (در بیان بعضے شاعر کہ دراں زمان بودند) کے تحت، سب سے پہلے، ایک شاعر کا ذکر کیا ہے، جس کا نام وہ، ابراہیم خاں اور تخلص صنعتی بتلاتا ہے۔ اس شاعر کا ذکر مصنف نہایت ادب اور احترام کے ساتھ کرتا ہے۔ ظہور ابن ظہوری کے حوالے سے وہ بیان کرتا ہے کہ محمد شاہ نے ابن ظہوری سے ۱۰۵۱ھ میں حالاتِ دکن پر ایک کتاب لکھنے کی فرمایش کی تھی۔ اس سلسلہ میں وہ ابن ظہوری کی عبارت نقل کرتا ہے۔

> "تمام احوالاتِ پادشاہان راکہ در تاریخ مسطور بود، و احوالِ سعادت مآل و فتوحات برکات آیات پادشاہ جمجاہ، سلطان خاقان ابن خاقان، سلطان محمد ادام اللہ ظلالہٗ علی مفارق البرکات، آنچہ خود شاہد نمودہ، و آنچہ از ثقات صادق القول مسموع داشتہ بر صفحہ ایام خجستہ فرجام نگاشتم۔ اوّل کسے کہ از مجلسیان حضور اعلیٰ بہ تحقیق این مقدمہ پرداخت، ابراہیم خاں صنعتی است۔ کہ مجموعہ علم عقلی فراہم آوردہ، نقل مقالات او ہست و مقدمات جمیع علوم در اشارہ معلوم نمودن یک نفس کوش بر استاداو بودن است۔ در دقیقہ یابی و نکتہ دانی، موجب است کہ از قلزم تفکر ش برخاستہ و از تازگی بیانش سوسن سیراب باآراستگی، زبان خود آراستہ، در بزم گاہ سخن سنجیش شعر فہمانِ سخن رس را تا مسیح نفس موزوں از سینہ سر برزند دم زدن بخیال محال است اندازہ بلندش کمندے است کہ بر کنگرہ گردوں پیچیدہ و فکر فلک پیوندش صد بند الیست کہ

سرگرم شکار ملک و ملک گردیدہ۔ و قصیدہ و غزل معنی پیچیدہ و معانی رنگین برجستہ چنداں بستہ کہ از پار تحسین آں، زبان حرف گیراں چون زنگ روئے نشان درہم شکستہ۔ نیسان فکرتش از ہر مخزن اسرار ہزاراں در برروئے کار آوردہ و پیک فرخندہ پے خیالش بہ نہان خانہ معرفت پروردگار پے بردہ۔ نظم۔

زہے نکتہ پرداز عالی مکان	کہ پیر درکہ فکرش قدر و شان
در آید صنعت کشتہ ہر صبح و شام	مضامین نایاب بہر سلام
بہ میدان معنی چو تاز و سمند	سر اہل دعوے کند در کمند
ہو دریائے طبعش شود موج زن	زند جوشش گوہر زمین و زمن"

(بساتین السلاطین۔ مطبوعہ مطبع سیدی۔ حیدرآباد دکن۔ صفحہ ۳۲۳ - ۳۲۴)

پہلے تو اس کتاب میں طباعت کی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ دوسرے اس کے ناشر کو اس کی صحت کے متعلق شبہات ہیں۔ صبحی اور صنعتی میں جو مشابہت ہے وہ ظاہر ہے۔ ممکن ہے کہ اسی تجنیس خطی نے 'صنعتی' کو صبحی بنا دیا ہو۔ بہر حال، اس وقت سوائے قیاس کے، ان دونوں کو ایک سمجھنے کی ہمارے پاس کافی دلائل موجود نہیں ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ صنعتی نے متن کتاب میں کہیں اپنے حالات کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ تاہم اس کے بعض بیانات سے اس کے زمانے اور قصے کے سنہ تصنیف کے متعلق معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ قصے کی اندرونی شہادتوں سے اس کے خیالات، مذہب اور عقائد پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔

محمد عادل شاہ کی مدح میں اس نے ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔ جس میں وہ اس کی رعایا پروری، عدل گستری اور علم و ہنر کی سرپرستی کا ایسا واضح طور پر ذکر کرتا ہے کہ اس میں کوئی بات مبہم باقی نہیں رہ جاتی۔ مثلاً وہ لکھتا ہے۔

مبارک ہے وہ جھاڑ جس چھاؤں تل	خلق آئیں آسودگی کے بدل
اول ان کون لیا، چھاؤں میں غریب	بزاں پاک میویاں سوں بخشے نصیب
مسیحا جگت میں وہی آج ہے	کہ جس دم تے سب خلق کا کاج ہے
اچھو جھاڑ سرسبز ایسا مدام	کہ جس جگ میں ہے فیض اس تے تمام
اچھو کیوں نہ وہ جھاڑ یوں باردار	کہ ہے جس سوں آرام سنسار کار
کہ ہے جگ پو وہ سایہ کرد گار	اچنبا ہے یو چھانوں پروردگار
محمد شہ داد گردین پناہ	کہ ہر دم محمد جسے دستگاہ
براہیم کے بعد از ہوا نام دار	جگت میں محمد شہ کامگار

دکھن کا توں ہے خسرو تاج دار
جتے تاجداران اتے باج دار

شریعت سنے عالم آرا ہے تو
سو پیارے محمدؐ کا پیارا ہے تو
بخشش خلق کون آب گل کے نگر
لیا خلق کے پل میں دل کے نگر

کیا پایۂ عدل کوں استوار
لیا دین ایمان تجہ تے قرار
تری بخشش و فضل کا باغباں
جگت کے کیا شش چمن بوستاں
اگر ابر برسائے باران تر
ترا ہات برسائے لعل و گہر

خلایق کے دل اے شہ کامگار
تجہ احسان کے دام کے ہیں شکار

سخن پروراں کا توں پرکھے سخن
رتن پارکھی جیوں پرکھتا رتن
تری قدر دانی سوں اے شہریار
ہنر کا خزاں جا کو آیا بہار

سبب تالیف کے طور پر جوابیات لکھی ہیں، اس میں وہ بتلاتا ہے کہ ایک مبارک رات جب میں محو فکر تھا اور دل میں خیالات کے دریا امنڈ رہے تھے، مجھ پر ایسی مسرت طاری تھی گویا معلوم ہوتا کہ معانی کے دروازے مجھ پر کھل گئے ہیں سوچ یہ تھی کہ حیاتِ ابدی کس کو حاصل ہے! دل نے کہا کہ دنیا میں کوئی شخص ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے نہیں آیا ہے صرف وہ شخص زندہ رہ سکتا ہے جس نے کوئی اچھی یادگار چھوڑی ہو۔ نام باقی رہنا بڑی چیز ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا ذریعہ سخن ہے، جو ایک اچھے فرزند سے بھی زیادہ قیمتی شئے ہے۔ جس شخص سے کوئی یادگار باقی نہ رہے اس کا جینا اور نہ جینا دونوں یکساں ہیں۔

یہ خیال آتے ہی میں سوچنے لگا کہ کیا لکھوں؟ کسی من موہن کی حکایت بیان کروں یا کسی گلبدن کا قصہ شروع کروں؟ اسی سوچ میں تھا کہ ملہم نے کہا کہ جو میں کہتا ہوں اسے نظم کر۔ یہ دیو اور پریوں کی حکایت نہیں بلکہ پیارے نبی کی روایت ہے۔ حضرت تمیم انصاری پر جو حادثات گزرے، ان کو بیان کر۔ اسی لئے یہی قصہ اختیار کیا۔ آگے وہ لکھتا ہے۔

"اسے فارسی بولنا ذوق تھا
وتے لئی عزیزاں کوں اس ذوق تھا
کہ دکھنی زبان سوں اسے بولنا
جو سیپی کے موتی نمن رولنا

قصے کی زبان کے متعلق وہ بیان کرتا ہے کہ "جو زبان میں نے اختیار کی ہے، اس میں سنسکرت کے الفاظ کم ہیں۔ اس سے قصے کا سمجھنا آسان ہوگیا ہے۔

"رکھیا کم سہنسکرت کے اس میں بول
ادک بولنے تے رکھیا ہوں امول
جسے فارسی کا نہ کچھ گیان ہے
سو دکھنی زبان اس کوں آسان ہے
سو اس سہنسکرت کا ہے مراد
کیا اس تے آسانگی کا سواد
کیا اس تے دکھنی میں آسان کر
جو ظاہر کیس اس میں کئی کئی ہنر
اتھا اگرچہ قصّے میں اس اختلاف
صحی کر کو بولیا ہوں میں بےخلاف
دیا اس رسالے کوں میں سعی کر
سو ترتیب بارہ مقامات پر

سنہ تصنیف ذیل کی بیت سے ظاہر ہے۔

ہزار یک پر لساں پنجاہ و ہر پنج
ہوے تب ہوا پر جواہر یو گنج

ان ابیات میں غالباً قصے کا عنوان بھی بتلا دیا ہے۔

یو قصہ عجب پاک ہے دل پذیر
جو پاکاں کہے ہیں جسے بےنظیر

کلام اب تو اے قصۂ بےنظیر
شتابی سوں لک مختصر دل پذیر
نہ کوتہ مطول نہ نزدیک دور
کہ اوسط کو بولتے ہیں خیر الامور

پوری مثنوی "بارہ مقامات" کے علاوہ کئی تمہیدی ابواب پر مشتمل ہے۔ اکثر مثنویوں کی طرح اس کی ابتدا بھی حمد سے ہوئی ہے۔ جو کافی طویل ہے۔ حمد کے (۱۰۹) اشعار کے بعد نعت شروع ہوتی ہے۔ جو (۷۶) اشعار پر حاوی ہے۔ نعت کے بعد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی منقبت میں (۴۹) شعر لکھے ہیں۔ اس کے بعد "سخن" یعنے شعر کی تعریف میں (۵۰) اشعار اور پھر محمد عادل شاہ کی مدح میں (۵۷) اشعار ہیں۔ مدح کے جستہ جستہ اشعار اوپر نقل کئے گئے ہیں۔ آغاز داستان سے پہلے، سبب تالیف سے متعلق (۶۳) اشعار ہیں اصل قصہ چار سو اشعار کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔

شعر کی تعریف میں جو ابیات لکھی گئی ہیں، ان سے، شاعر کے ذاتی خیالات کا بہت کچھ پتہ چل سکتا ہے۔ "شعر" کے لئے صنعتی نے "سخن" ایہام کے طور پر استعمال کیا ہے اور اس سے متصوفانہ مطلب بھی نکالے ہیں۔ ذیل کے اشعار جو خاص شاعری پر صادق آتے ہیں، پڑھنے کے قابل ہیں سخن کی وسعت کے متعلق وہ لکھتا ہے۔

"جو کچھ ہے شہادت میں ہور غیب میں
سخن کے سماتا ہے آ جیب میں

جہاں کا لبد ہور سخن جیو ہے
سخن جیو ہور جیو میں پیو ہے"

آگے وہ بتلاتا ہے کہ ہر شخص شعر سر انجام نہیں کر سکتا، بلکہ اس کے لئے فطری لگاؤ چاہیئے۔

" نہ ہر کوئی سخن کا سزا وار ہے
نہ ہر قطرہ لولوئے شہوار ہے
نہ ہر نافہ خوش باس نافہ کرے
نہ ہر یک گر سر میں عنبر دھرے

کہاں ہوئے کودن تے شعر سلیم
کرے کاٹ کاں اَرَہ برگ نیم

اس طرح شعر فہمی کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ ہر شخص شعری نزاکتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے لئے فطری ملکہ درکار ہوتا ہے اور اس کو وہ سخن سنجی پر بھی ترجیح دیتا ہے۔

" سخن میں کا بھی کوئی کاڑے رتن
سخن واں سمجھتے ہیں قدر سخن
زیادہ ہے نزدیک اہل قیاس
سخن بولنے تے سخن کا قیاس
سمجھتے اگر سب سخن کا قرار
تو ہرگز نہ رہتا سخن کا وقار
نہ گوہر کو بوجھے بجز گوہری
نہ جوہر کوں سمجھے بجز جوہری

اسی موقع پر محمد شاہ کے شعری ذوق کی تعریف اس طرح کرتا ہے۔

مکمل ہے اس دور میں یو رتن
کہ تب دو ریو دور شاہ سخن
" دیا اس گہر کوں عجب آب و تاب
شہنشاہ کے طبع کا آفتاب
سدا فہم جس کی کیا بندگی
سخن جس سخن تے لیا زندگی
جس اس کا سخن دل کوں آباد ہے
سخن شہر میں، شہر استاد ہے
ہوا خاتم الحق سخن شاہ پر
سخن کی صفت یاں تے قول ختم کر

قصہ کا اسلوب بیان نہایت سادہ سیدھا ہے۔ یہ ایک مہماتی طرز کا قصہ ہے۔ جس کی مرکزی شخصیت، حضرت تمیم انصاری ہیں۔ " ہر مقام " گویا ایک نئی مہم کی داستان ہے۔ " مقام " کا استعمال فصل، باب یا بیان کی جگہ اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں تصوف کی اصطلاح کا شائبہ موجود ہے۔

اس قصے کا ماخذ، جیسا کہ مصنف نے بتلایا ہے، کوئی خاص فارسی قصہ نہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے کے تمام قصوں سے، مصنف نے، اپنے خیال کی حد تک صحیح اور مستند معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمیم انصاری کی مہمات کے قصے بہت مقبول تھے۔ مرتب اوراق ہٰذا کے پاس، یہی قصہ غلام رسول المتخلص بہ غلامی، باشندۂ کھمبایت کا نظم کیا ہوا بھی موجود ہے۔ جو " تمیم انصاری " کے عنوان سے رئوف پرنٹنگ پریس، جوہری بازار بمبئی میں طبع ہوا ہے اور جس کو حسین مرزا بک سیلر۔ فاکلینڈ روڈ بمبئی نے شایع کیا ہے۔

غلامی، کوئی بڑا شاعر نہیں تھا۔ دونوں قصوں کا عام خاکہ ایک ہی ہے۔ لیکن جزئیات میں، دونوں بالکل مختلف ہیں۔

اس مثنوی کی اہمیت، قدیم کارناموں میں یہ ہے کہ یہ طویل ادبی نظموں کے اولین نقوش میں سے ہے۔ اس سے

پہلے بیجاپور کی صرف ایک مثنوی "چندر بدن اور ماہ یار" (۱۰۴۵ھ سے قبل) ایسی لکھی گئی، جو اہم ہے۔ اور گولکنڈے کی سرپرستی میں جو مثنویاں لکھی گئیں، ان میں سے اس سے قبل کی صرف دو مثنویاں "قطب مشتری" (۱۰۱۸ھ) اور "سیف الملوک و بدیع الجمال" (۱۰۳۵ھ) قابل ذکر ہیں۔

صنعتی کے زمانے میں، بیجاپور اردو شاعری اور انشاپردازی کے چرچوں سے گونج رہا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ۔۱۰۳۷ھ) نے اردو شاعری کی سرپرستی اور قدردانی کی جو مثال قائم کی تھی، وہ اس کے جانشین، محمد اور علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ۔۱۰۸۳ھ) کے عہد میں معراج کمال کو پہنچ چکی تھی۔ انھیں سرپرستیوں کے باعث، وہ حیرت انگیز نتائج پیدا ہوئے جن سے علمی دنیا آج تک متاثر ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ بیجاپور، اس وقت اردو کے اچھے اچھے اور نہایت خوش گفتار شاعروں کا مرکز بن گیا تھا۔ عرب، ایران اور ہندوستان سے لوگ بیجاپور آتے اور اردو زبان سیکھ کر، اس میں شعر و سخن کی داد دیتے اور شہرت حاصل کرتے تھے۔

بیجاپور میں اس وقت جو شاعر مشہور تھے، ان میں "خاور نامہ" (۱۰۵۹ھ) کا مصنف رستمی، "یوسف زلیخا" اور "ہشت بہشت" کا مصنف ملک خوشنود (۱۰۳۵ھ۔۱۰۶۰ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

گولکنڈہ کے معاصرین میں غواصی، مصنف "سیف الملک و بدیع الجمال" اور "طوطی نامہ" کی شہرت اس وقت بام عروج پر تھی۔ وجہی، جو قدیم اردو شاعری اور خاص طور پر انشا کے اولین معماروں اور اب آلابا میں سے ہے، اور جس کے نغموں نے محمد قلی کے د بار کو مسحور کر رکھا تھا، اس وقت بھی زندہ تھا۔ گویا صنعتی کا مقابلہ ایسے زبردست اور بلند پایہ شاعروں سے تھا۔ یہی اس کے حقیقی مخاطب بھی تھے۔ بلند ذوق رکھنے والے شعرا کی موجودگی کا اثر کسی ادبی کارنامے پر نہایت ترقی پرور ثابت ہوتا ہے۔ صنعتی پر بھی یقیناً اس کا اثر تھا چنانچہ اس کارنامے میں، سادگی لطافت، جذبات، اور توضیحات کے علاوہ، وہ تمام خوبیاں کم و بیش پائی جاتی ہیں، جو اس عصر کی تصنیفات کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود، صنعتی اور اس کی مثنوی کو وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی، جو دوسرے کارناموں کو حاصل ہے۔ اس کا سبب ہرگز یہ نہیں کہ "قصہ بے نظیر" دوسرے کارناموں کے مقابلہ میں قابل فراموش تھا۔ بلکہ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ یہ مثنوی، عرصہ تک نظروں سے اوجھل رہی۔ اس کا کوئی مخطوطہ یورپ کے کسی کتب خانہ میں موجود نہیں ہے۔ ہندوستان اور دکن میں بھی اس کے مخطوطے عام طور پر دستیاب نہیں ہوتے۔ جہاں تک راقم الحروف کو علم ہو سکا ہے، اب تک اس کے صرف، دو قلمی نسخوں کا پتہ چل سکا ہے۔ ان میں سے ایک نسخہ کتب خانہ جامعۂ عثمانیہ، حیدرآباد دکن کا مملوکہ ہے۔ دوسرے نسخے کے متعلق، مولوی عبدالحق صاحب، معتمد انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ وہ انجمن کے کتب خانے میں ہے، لیکن یہ نسخہ ناقص ہے۔ کتب خانہ جامعۂ عثمانیہ کا نسخہ مکمل اور صاف ستھرا ہے۔ یہ خط نسخ میں لکھا ہوا ہے۔ اور ۶ × ۱۰ انچ کی تقطیع کے (۹۳) اوراق پر ختم ہوا ہے۔ ہر صفحہ میں نو سطریں ہیں۔ کاغذ قدیم دیسی کھرا ہے عنوانات کی

جگہ سادہ چھوڑ دی گئی ہے۔ اس میں کوئی تحریر یا ترقیمہ متن کے علاوہ موجود نہیں ہے۔ اس لئے اس کی کتابت کے سنہ اور کاتب وغیرہ کا کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔

ابتدا میں لوح کے اوپر اور اختتام پر میر محمد مظہر علی" (۱۳۱۱ھ) کی مہریں ثبت ہوئی ہیں۔ یہ نسخہ کتب خانے میں داخل ہونے سے پہلے، مولوی میر مظہر علی صاحب، مولوی کامل، وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد دکن کا مملوکہ تھا جو، مولانا سید شاہ حافظ شجاع الدین (۱۱۹۱ھ ۱۲۶۵ھ) مصنف "کشف الخلاصہ ہندی" کے نواسے ہوتے ہیں۔ یہی نسخہ اس ترتیب کی بنیاد ہے۔ صنعتی کی مثنوی کا سب سے پہلا تذکرہ "کتب خانہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی توضیحی اور تفصیلی فہرست اردو مخطوطات" مطبوعہ جامعہ عثمانیہ (۱۹۲۹ء) میں کیا گیا ہے۔ اسی زمانے میں مرتب اوراق ہذا نے اس پر ایک مضمون رسالہ "معارف" بابتہ ماہ اپریل ۱۹۳۰ء (م ۱۳۴۸ھ) میں شایع کیا تھا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ کی تالیف "اردو شہ پارے" (جلد اول) میں صنعتی کا ذکر محمد عادل شاہ کے زمانے کے شعرا میں کیا گیا ہے۔ اور اس کی مثنوی سے تین اقتباسات بھی درج کئے گئے ہیں۔

ان چند تذکروں کے علاوہ صنعتی اور اس کی تصنیف سے متعلق، کوئی اور تحریر راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا۔

عبدالقادر سروری

غزل

دیکھ لو بے قراریاں نہ گئیں
اپنی قسمت کی خواریاں نہ گئیں

تم سمجھتے ہو چین حاصل ہے
مری اختر شماریاں نہ گئیں

آپ کے غم میں راحت عالم
وہ مری اشک باریاں نہ گئیں

جھوم جاتے ہیں ذکر مئے پر شیخ
آپ کی پختہ کاریاں نہ گئیں

سخت افسوس ہے ہمیں شاکر
اب تلک خام کاریاں نہ گئیں

سید عزیز حیدر شاکر بلگرامی

جدید مطبوعات

۱۔ گئودان (ناول)، از منشی پریم چند آنجہانی قیمت ۸ر

۲۔ محکومیت نسواں (متعلق حقوق نسواں) ترجمہ معین الدین صاحب انصاری قیمت عہ۔

۳۔ اجتماعی زندگی کی ابتدا از محمد عاقل صاحب پروفیسر جامعہ ملیہ دہلی ۱۱۲ صفحات قیمت ۸ر

۴۔ ہندوستانی (مجموعہ تقاریر) از ڈاکٹر تارا چند۔ مولوی عبدالحق وغیرہ قیمت ۱۲ر

۵۔ جوہر اقبال (مجموعہ مضامین) از ڈاکٹر ذاکر حسین۔ مولوی عبدالحق وغیرہ قیمت عہ ۸ر

۶۔ مضامین محمد علی مرتبہ پروفیسر محمد سرور ۶۰۰ صفحات قیمت عاں ۸ر

یہ جملہ کتابیں مکتبہ جامعہ۔ دہلی سے مل سکتی ہیں۔

۷۔ کارنامۂ غم (مجموعۂ کلام) از سید علی احسن۔ ۵۶ صفحات قیمت ۸ر پتہ مصنف، مارہرہ، ایٹہ، یوپی۔

۸۔ میری کہانی! سنئے گا؟ (افسانہ) از جناب سید علی شاکر ۱۲۶ صفحات قیمت عہ پتہ مودی لیڈ بک ڈپو۔ سکندرآباد۔

۹۔ مذاہب اور انسانیت (مذاہب کے اصول و ضوابط) از لالہ ہردیال ۲۰۸ صفحات قیمت عہ ۱۲ر پتہ لدچیت رائے اینڈ سنز۔ لوہاری دروازہ لاہور

۱۰۔ اربعہ عناصر۔ (رباعیات کا مجموعہ) از حکیم محمود علی خاں ماہر ۲۰۸ صفحات قیمت عہ پتہ مصنف۔ فراش خانہ۔ دہلی

۱۱۔ گیتا امرت از چودھری روشن لال۔ ۲۲۸ صفحات قیمت ۱ر پتہ مصنف۔ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، ملتان

۱۲۔ آثار ترک باتصویر (سوانح حیات) از محمد مرزا آزاد قیمت عاں پتہ کتب خانہ علم و ادب۔ اردو بازار، دہلی۔

۱۳۔ رہنمائے تاریخ اردو از حاجی محمد عبدالقادر قیمت ۱۲ر پتہ معارف پریس۔ اعظم گڈھ۔

۱۴۔ انقلابی پارے (اشتراکی قوال کا مجموعہ) از حامد ملتانی۔ ۲۰۷ صفحات قیمت ۵ر پتہ فیض بخش صاحب نسیم بلڈنگ شیدی پورہ، نئی دہلی۔

۱۵۔ تاریخ و تنقید (مجموعہ مضامین) از پروفیسر حامد حسن ۲۲۴ صفحات قیمت عہ ۸ر پتہ لکشمی نارائن اگروال۔ آگرہ

۱۶۔ روح غالب باتصویر (سوانح حیات) از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور پروفیسر جامعہ عثمانیہ ۲۴۰ صفحات قیمت عاں ۸ر

۱۷۔ تاریخ گولکنڈہ۔ باتصویر، از مولوی عبدالمجید صدیقی پروفیسر جامعہ عثمانیہ ۲۱۴ صفحات قیمت عاں ۸ر

یہ دونوں کتابیں سب رس کتاب گھر، خیرت آباد، حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہیں۔

۱۸۔ جوبلی نمبر مدینہ باتصویر، ۲۴ صفحات قیمت ۸ر پتہ دفتر مدینہ بجنور، یوپی۔

۱۹۔ خدائی راج اور دوسرے افسانے (افسانے) از حضرت علامہ راشد الخیری مرحوم عہ۔ ۲۰۔ زیور اسلام (مذہبی مضامین) از علامہ موصوف قیمت عہ

۲۱۔ شادی کا انتخاب (اولاد کی شادی کے متعلق مضامین) از علامہ موصوف قیمت ۸ر۔ ۲۲۔ عالم نسواں (اصلاحی مضامین) از علامہ مرحوم قیمت ۸ر

۲۳۔ فریب ہستی (اصلاحی معاشرت) از علامہ مرحوم قیمت ۶ر

۲۴۔ بکھری ہوئی پتیاں۔ (مضامین اور نظموں کا مجموعہ) از علامہ مرحوم قیمت عہ۔ پتہ عصمت بک ڈپو دہلی۔

۲۵۔ محبت کا فسانہ (ناول) از لطیف الدین احمد صاحب ۲۴۴ صفحات قیمت عاں۔ مجلد پتہ مصنف منٹولہ۔ آگرہ۔

مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

پس پردہ۔ کراؤن تقطیع، ۱۲۰ صفحات۔ لکھائی چھپائی عمدہ، مطبوعہ انتظامی پریس کانپور۔ ملنے کا پتہ، ٹھاکر اجیراج سنگھ، بی اے، ال ال بی وکیل جونپور۔ یہ جناب چندر بھوشن سنگھ صاحب کے سات مختصر قصوں کا مجموعہ ہے جو ابھی ابھی شائع ہوا ہے۔ اسی نام سے جناب آغا حیدر صاحب لکچرار اردو نظام کالج حیدرآباد دکن کے مضامین کا ایک مجموعہ اس سے پہلے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس میں ہندوستانی زندگی کے سات مختلف قصے بیان کئے گئے ہیں جو خاصے دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ مصنف پر منشی پریم چند آنجہانی کے اسالیب کا اثر ہے۔ لیکن ان کا ایک علٰحدہ رنگ ہے۔ پریم چند کے قصوں کا پس منظر عموماً دیہات کی سادہ سیدھی زندگی ہوتی ہے اور اسی مناسبت سے ان کے کردار بھی بے تکلف دیہاتی افراد ہوتے ہیں۔ اس میں پریم چند کو خصوصیت حاصل تھی۔ ان قصوں کا انداز اس میں شک نہیں کہ پریم چند سے ملتا جلتا ہے، اور ان کا پس منظر بھی ویسا ہی ہے لیکن ان کے کردار مختلف ہیں۔ یہ کردار زیادہ موجودہ ہندوستانی گھریلو زندگی کے، متوسط، اعلیٰ اور پڑھے لکھے طبقوں سے چنے گئے ہیں۔ اور اپنے موزوں ماحول میں عمدگی سے بٹھائے گئے ہیں۔ مصنف کا انداز بیان موثر اور جزئیات کے پیش کرنے میں ان کا تخیل سازگار رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض قصوں میں واقعات کی زیادتی کی وجہ سے اثر میں انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی موجودہ اردو مختصر قصہ نویسی کے رجحانات کا یہ اچھا نمونہ ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو توقع ہے کہ مصنف کو اردو مختصر قصہ نگاروں کی صف میں نمایاں جگہ حاصل ہو جانے کی۔

(س)

حیاتِ عثمانی حصہ اول مؤلفہ شیخ یعقوب علی عرفانی ایڈیٹر ... سائز ... صفحات ۱۰۰،

کاغذ، کتابت، طباعت دیدہ زیب قیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں ہے۔

اعلیٰ حضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع کے جشن سیمین کے موقع پر جو علمی کام ہوئے ہیں ان کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی ہے تاریخی اور علمی ذخیرہ اس کثرت سے شائع ہوا ہے کہ ان کا مطالعہ ایک زمانہ وقت کا متمنی ہے۔

زیر بحث کتاب بھی اسی مبارک موقع کی یادگار ہے جو ابھی حال میں شائع ہوئی ہے، یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے سلطان العلوم کے حالات اور سیرت پر مشتمل ہے۔

"حیاتِ عثمانی" تین حصوں پر منقسم ہے، اور ہر حصہ میں کئی باب ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

حصہ اول میں آٹھ باب ہیں، پہلے باب میں دولت آصفیہ کی ابتدائی خاندانی تاریخ اور نسبی تحقیق وغیرہ کا بیان ہے، دوسرا باب دولت آصفیہ کی تاسیس و توسیع حکومت، تیسرا باب حضرت آصفجاہ اول کے حالات، چوتھے باب میں ناصر جنگ، مظفر جنگ کی خانہ جنگیاں، پانچواں باب آصفجاہ ثانی چھٹا باب نواب سکندر جاہ اور نواب ناصر الدولہ، ساتواں باب نواب افضل الدولہ اور آٹھواں باب اعلیٰ حضرت غفران مکان۔

"حیاتِ عثمانی" کے دوسرے حصہ میں اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی پیدائش تعلیم و تربیت اور مسند نشینی وغیرہ حالات پر مشتمل ہے۔

تیسرا حصہ "سیرتِ عثمانی" کے لئے مختص ہے، اس حصہ میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ حضرت سلطان العلوم کے اخلاق اور عادات کا تذکرہ کیا گیا ہے، اور اس کا کافی ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔

امور قابل ذکر ہیں، اول تو یہ کہ "حیاتِ عثمانی" اپنے بعض مخصوص خصوصیات کے لحاظ سے قابل قدر ہے۔ جن میں سے بعض یہ ہیں

اس کتاب کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مؤلف

آصفی رعایا میں شامل نہیں ہیں، اس لئے ایک غیر متعلق شخص کی رائے اور اس کے خیالات جو اس کتاب کے ذریعہ پیش ہوئے ہیں خاص طور پر غور کے قابل ہیں۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ "حیات عثمانی" خصوصاً آثر عثمانی پر جس قدر تفصیلی ذخیرہ اس میں جمع کیا گیا ہے، وہ اس قدر صراحت کے ساتھ کسی اور کتاب میں شاید ایک جگہ نہیں ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں سرکار آصفیہ اور سرکار دولت مدار کے درمیان جو معاہدات ہوئے اور کس طرح ان پر عمل ہوا، اس موضوع پر نہایت واضح طور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کتاب میں دو ایک فروگذاشتیں بھی ہوئی ہیں جن کی صراحت بھی ضروری ہے۔

(۱) جو حصہ گذشتہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے، اس میں ماخذ کا بہت کم حوالہ دیا گیا ہے۔

(۲) بعض واقعات کو غلط لکھا گیا ہے مثلاً (ا) الف موسیو ریمان کی قبر تاج بیگم پیٹھ میں ہونا۔ صہ۹ حالانکہ بیگم پیٹھ میں اس کی قبر نہیں بلکہ سرور نگر کی طرف واقع ہے۔

(ب) حیدرآباد کی بے قاعدہ فوج "بیسرم" سے موسوم ہے۔ صہ۹ سرکار آصفیہ کی بے قاعدہ فوج بیسرم کے نام سے موسوم نہیں ہے بلکہ صرف عرب پلٹن جس کو جمعیت "نظام محبوب" بھی کہتے ہیں وہ بیسرم سے موسوم ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا قیام جس مقام پر ہے وہ مقام "بیسرم" کے نام سے موسوم ہے۔

(ج) سالار جنگ اعظم کے والد کو خیر الملک لکھا گیا ہے۔ صہ۹

آپ کے والد کا خطاب خیر الملک نہیں تھا بلکہ دادا کا خطاب خیر الملک تھا۔ آپ محمد علی خاں شجاع الدولہ کے فرزند تھے

ان فروگذاشتوں کے قطع نظر جس کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی، مولف نے جس محنت اور جانفشانی سے اس کو مرتب کیا ہے وہ قابل ستائش اور لائق داد ہے۔ ہر حیدرآبادی کا فریضہ ہے کہ اس کا مطالعہ کرے۔

(ن۔ ھ)

آواز ہند دہلی۔ زیر ادارت ایس، ایم۔ نور الٰہی دہلوی کراؤن سائز تعداد صفحات (۴۲) کھرا کاغذ، طباعت و کتابت معمولی۔ سالانہ چندہ (عہ) یہ رسالہ ہر انگریزی مہینے کی پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے مضامین نظمیں اور افسانے دلچسپ اور قابل مطالعہ ہوتے ہیں۔ دنیا کی موجودہ سیاسی کشمکش کے متعلق مختلف اخباروں سے اقتباسات شائع ہوتے ہیں۔ زیر نظر رسالہ میں ایک اصلاحی مضمون ہے جو ریاست سے نقل کیا گیا ہے "یہ دنیا ہے" کے عنوان سے معلومات عامہ شائع کئے جاتے ہیں۔ یہ رسالہ مجموعی لحاظ کرتے اچھا ہے عوام ضرور اس کا مطالعہ کریں۔

(ش)

من کی بتیا

ایک دلچسپ ادبی کتاب جس کو محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ نے بچیوں کی بہترین تربیت کے لئے لکھا ہے۔ اس میں حسب ذیل عنوانوں پر بڑی مفید اور کار آمد باتیں لکھی ہیں۔ گھر، سواری، ہمارے نوکر، خورد و نوش، لباس، بچوں کی تعلیم اور ان کی ضرورتیں اخبار، کتابیں اور رسالے، نذر و نیاز، چندے، مختلف رسومات، علاج معالجہ، متعلقین اور لواحقین، سیر و تفریح، سینما، فیشن، ہر تعلیم یافتہ گھر میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔ کتاب بہت خوبصورت اور مجلد ہے (۰۰ صفحات) قیمت صرف ۸ر

(بچوں کے لئے رعایتی قیمت ۶ر بشکل اسٹامپ)

برہن کا گیت

(یہ گیت ۲۰ مئی کو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹ ہوا)

آؤ سناؤں من کی کہانی

ساون آیا بدلی چھائی
سبزے نے لی پھر انگڑائی
چٹکے پھول، بجی شہنائی
برکھا رُت پھر آئی سہانی

آؤ سناؤں من کی کہانی

آؤ میرے سندر سجنا
تم بن کھوٹی موری ڈگریا
گہری ندیا دُور کنارا
ڈگمگ ڈولے ناؤ پرانی

آؤ سناؤں من کی کہانی

بہتے بہتے نیر کی دھارا
سُوکھ گئی نینن کی گنگا
کھوئی ساری پیت کی مایا
بیتی جائے یونہی جوانی

آؤ سناؤں من کی کہانی

رین اندھیری جیسے ناگن
تھر تھر کانپی جائے برہن
آؤ! آؤ! آؤ ساجن
نبتی کرے داسی دیوانی

آؤ سناؤں من کی کہانی

علی احمد

ساگر کی سیر

صبح کا سہانا سماں تھا ...... دور پہاڑیوں سے سورج جھانک رہا تھا ہم اس رنگین وادی میں داخل ہوئے۔ دیہاتی عورتیں اور لڑکیاں گاگر لئے پنگھٹ پر جمع تھیں۔ ان کی چھاجنوں کی جھنکار ایک موسیقی پیدا کر رہی تھی ...... منظر بدلا .... کسان ہل چلانے میں مشغول تھا۔ اور دوسرا اپنی آرزوؤں کے بیج بو رہا تھا ... یہ منظر بھی آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ اب سامنے ساگر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

شکیلا، جمیلا اور راج کماری سرخ، پیلی اور ہری ساڑیوں سے اپنے جسم مرمریں کو چھپائے گلگشت کے لئے تیار ہوئیں۔ راج کماری بیر بہوٹی پکڑ پکڑ کر اپنے آنچل میں چھپا رہی تھی —

سبز مخملیں فرش پر سرخ رنگ کی متحرک چیز کتنی خوشنما معلوم ہوتی ہے — ہم ساحل پر پہنچے۔ یہاں کا سماں ہی نرالا تھا ...... شکیلا جو اس فضائے رنگ و بو میں محو تھی کچھ گنگنانے لگی .... آواز بے حد مترنم تھی ... اس کی زبان سے جو نغمہ نکل رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری کائنات اس کی ہم آہنگ ہو رہی ہے۔ .....

راج کماری لجاتی ہوئی اٹھی اور ایک خوش رنگ پھول توڑ کر ہنستی ہوئی، ہنسی لٹاتی ہوئی، اور ہنسی سے دلوں کو موہتی ہوئی آئی۔ شکیلا کے گھونگر والی زلفوں میں اس پھول کو الجھا دیا ....

اب وہ رقص کر رہی تھی .... اس کی ایک ایک جنبش میں جوش تھا ...... ولولہ تھا .... نغمہ بھی ختم ہوا اور رقص بھی .... سب ہنس پڑیں۔

جمیلہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا "چلو ہم کہیں اور چلیں" ......

ہم ایک طرف کو چلنے لگے ... میں نے پوچھا۔ مجھے کہاں لئے جا رہی ہو؟ — کہنے لگی "چلو مندر کی سیر کریں اور پجاری کی پوجا دیکھیں ...... ہم برابر چل رہے تھے۔ نشیب و فراز میں سے گزرتے ہوئے ...... اور سبزے کو روندتے ہوئے۔

.. مندر کے دروازے پر جا پہنچے۔ دروازہ کھلا تھا .. لیکن وہاں کوئی پجاری نہ تھا .... بت ... زبانِ حال سے کہہ رہا تھا۔ مجھے دیکھو اور سبق لو ..... میرے بھی ایک زمانے میں ہزاروں پجاری تھے۔

ہم وہاں سے پھر "لبِ ساحل" پہنچے .... وہاں راج کماری کی خوبصورت ساڑی کا آنچل خاردار درخت میں الجھا ہوا تھا۔ اور وہ اس کے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی .. کہ اس کا پیر پھسلا اور وہ کیچڑ میں گر پڑی۔ ایک نہ شد دو شد ... میں اور جمیلہ پانی سے کھیلنے لگے .. پیر پانی میں تھے .... اور جمیلہ کی ساق بلوریں سے پانی اٹکھیلیاں کر رہا تھا ... شکیلا نے ٹفن باسکٹ منگوایا .... اور ہم کھانے پر ٹوٹ پڑے .. شام تک اسی "کھیل کود" میں مصروف رہے .... اور اندھیرا ہوتے ہوتے گھر لوٹ آئے .... ساگر کی سیر بس اتنی ہی مختصر ہے .....

ذکیہ سمیع اللہ شاہ

(جوبلی ہلز)

تاریخ گولکنڈہ

حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ام اے، ال ال بی نے سلاطینِ قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے۔ جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں، نظم و نسق کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ بڑی سائز ڈھائی سو سے زیادہ صفحات قیمت ہے

اعتماد

دوستوں کے اصرار اور برج کی بڑھتی ہوئی دلچسپی
نے مجھے اٹھنے نہ دیا۔ میں کھیلتا رہا۔ جیتتا رہا۔ اور
آٹھ، نو، دس بج گئے۔ میں خوش خوش اٹھا۔ گیارہ
کا عمل ہوگا۔ آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ جلد جلد
قدم اٹھاتا گھر کی طرف چلا۔ گھر جوں جوں قریب آتا جاتا
دل میں خوف اور دہشت کا اثر بڑھتا جاتا۔ والد نہ معلوم
کس جذبے میں ہوں۔ وہ مجھ پر شک کرتے تھے۔ میری ذری
ذری سی بھول انہیں گھنٹوں مجھ سے بدگمان کر دیتی۔
یہ بدگمانی ان کی فطرت ثانی تھی۔ میں نے کئی دفعہ بے گناہی
کا یقین دلانے کی کوشش کی لیکن ہر وقت اس کوشش
کو بہانہ سازی، حیلہ جوئی اور مکاری پر محمول کیا گیا۔
آج بھی مجھے کامل یقین تھا کہ اگر میں سچ سچ کہہ دوں کہ فلاں
دوست کے ہاں رک گیا تھا تو وہ سوچنے لگیں گے ـــ
"جھوٹ۔ دوست کے پاس نہیں، کسی جوئے خانے
میں گئے ہوں گے ــ برے دوست کیسی کیسی عادتیں نہیں
ڈلواتے۔ شراب بھی پی ہوگی ـــ اور معلوم نہیں کیا
کیا ـــ!" ـــ میرے قدم آہستہ اٹھنے لگے۔
سوچنے لگا۔ "واقعی آج بہت دیر ہوگئی۔ خدا ہی خیر کرے
ــ ــ" اتنے میں کچھ بوندا باندی ہونے لگی۔ میں دوڑ کر ایک
مکان کے چھجے کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ بارش زوروں
سے ہونے لگی۔ بجلی کی چمک میں میں نے اس گھر کی دیوار
کا جائزہ لیا۔ اوسط درجہ کی استرکاری، دروازے رنگین،
کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے۔ اتنے میں والد کا
خیال گرجتا ہوا آموجود ہوا۔ میں نے اس موسلا دھار بارش
میں گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ چاہے اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر
گر پڑوں، زخمی ہو جاؤں، بھیگنے سے بیمار ہو جاؤں،
مر جاؤں، کچھ ہو۔ مجھے والد کے شک اور خفگی کا خیال تھا
اور میں جانا چاہتا تھا۔ ہمت کر کے باہر آگیا۔ کوئی دس
بیس قدم گیا ہوں گا کہ بارش نے اوسان خطا کر دیے
سوچنے لگا۔ "والد ہوں تو کیا اس قدر سنگدل بن جائیں
کہ اپنے جگر و بیٹے پہ ذرہ برابر بھی اعتبار نہ کریں ـــ
مجھے یقین ہے کہ ان کا یہ شک مجھے تباہ کر کے رہے گا۔
مجھے کچھ نہ کچھ قربانی دینی ہوگی ـــ" بجلی چمکی۔
وہ نالے دکھائی دیئے۔ جو بہہ نکلے تھے ـــ
بادل اس زور سے گرجا کہ میں سہم گیا۔ دوڑتا ہوا پھر
آیا اور اسی مکان کے چھجے میں بارش سے محفوظ، بھیگے
کپڑے نچوڑتے کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد بارش کم ہونے
لگی۔ بادل چھٹ رہے تھے۔ نظروں کے سامنے ابر
کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا کونوں کونوں پر روشن دکھائی دے رہا
تھا۔ پھر اس میں سے کرنیں چھوٹ چھوٹ کر نکلنے لگیں ــ ــ
آسمان پر چاندنی پھیل گئی۔ چاندنی میں میں نے بارش کی
ہلکی پھوار کو دیکھا۔ چاندنی ـــ برسات کی چاندنی! کس قدر
خوشگوار اور عجیب ... میں دیکھتا رہا ـــ اور باوجودیکہ
دانت سے دانت بج رہے تھے میں گنگنانے لگا۔
کسی کے قدموں کی اور دروازہ کھولے جانے کی
آواز ہوئی۔ میں نے ہاتھ کو فضا میں بڑھا کر اندازہ کرنا چاہا کہ

کہ آیا بارش کم ہوتی ہے یا نہیں۔ بارش بڑھنے لگی تھی میرا دل گھبرانے لگا۔ پلٹ کر دیکھتا ہوں تو کھڑکی کے پردے میں سے روشنی باہر نکل رہی تھی۔ "اس گھر کے اندر کون رہتا ہے؟ —— چڑیل ——؟" میں کانپ رہا تھا شاید سردی بہت تھی۔ اور میں اب باہر نکلنے ہی کو ہوا تھا کہ دروازہ کھلا۔ میں خوشبو کے ایک جھونکے میں بہہ گیا۔ اور جب دو متحیر آنکھیں مجھے سر سے پیر تک گھورنے لگیں —— تو میں ڈوب گیا۔

عورت سے مجھے دلی محبت ہے —— لیکن والد صاحب کا خیال ہے کہ عورت ایک زہریلی ناگن ہے۔ اور مجھے تاکید تھی کہ میں اس کے سائے سے بھی دور بھاگوں۔ وہ فرماتے۔ "تم اگر نیک ہو۔ راہ راست پر ہو تو عورت تمھیں ورغلائے گی۔ بہکائے گی۔ اور تم نوجوان ہو، ناتجربہ کار ہو بہک جاؤگے۔ اس کے کہنے پر چلنے لگوگے۔" میں کچھ غیر مطمئن سا رہتا تو وہ کہہ اٹھتے۔ "وقت آنے پر تمھیں میری صداقت کا اعتبار آئے گا۔" —— "میں بھی اپنی صداقت کے اعتبار کے لئے وقت کا منتظر ہوں" میں نے اپنے دل میں کہا تھا۔ وہ جو مجھے غور سے دیکھ رہی تھی وہ ایک عورت تھی۔ اس کا لباس اس قدر چمکدار اور دیدہ زیب تھا کہ میں بڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ اور جب چہرہ پر نظر پڑی تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں بوکھلا گیا —— بھاگ جانے کے خیال سے راستہ کی طرف دیکھا۔ دور تک کچھ سجھائی نہ دیا۔ بجلی چمکی تو اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے دانت چمک رہے تھے۔

"آئیے اندر آئیے ——" میں نے کوئی حرکت نہ کی۔

"دیر سے بھی آئے۔ اور پھر اندر بھی نہیں آتے —— "——

میں نے سمجھا وہ عورت مجھے اپنا خاوند سمجھ رہی ہے۔ اور اندھیرے کی وجہ سے پہچاننے سے قاصر ہے۔ میں آگے بڑھا تاکہ وہ روشنی میں مجھے اچھی طرح دیکھ سکے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا —— آخر آگئے —— " اس نے مسکراتے ہوئے کہا —— اور مجھے گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئی ——

"اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ اس نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "او تو —— گیلے کپڑوں میں کیوں بیٹھے ہو" میں ابھی کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ میرے قمیض کے بٹن کھولنے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا —— ایسا معلوم ہوا جیسے مجھ میں بجلیاں دوڑ رہی ہیں —— "شکریہ ——" میں نے آہستہ سے کہا۔ کیا آپ کے مکان میں کوئی مرد نہیں" —— میں نے رکتے رکتے پوچھا۔ "آپ نہیں ہیں کیا؟ اس نے آنکھوں کو ایک خاص حرکت دیتے ہوئے کہا۔ گھڑیال نے گھنٹہ بجانا شروع کیا —— ایک ۱ دو ۲ —— تین ۳ —— چار ۴ —— میں آٹھ تک گن سکا۔ میرے دماغ کو دھکہ سا لگا۔ والد جاگ رہے ہیں یا سوگئے۔ میری تلاش میں تو نہیں نکلے۔ آٹھ بجے کے بعد دروازہ بند ہو جائیگا۔ میرے کانوں میں گونجنے لگا میں نے جھپٹ کر اپنا کوٹ اٹھا لیا —— اور دروازہ کا رخ کیا۔

"کہاں چلے! —— سنو بھی! —— یہ میری برساتی تو لو۔ بھیگ جاؤگے" میں بے تحاشا دوڑ رہا تھا —— گھر پہنچ کر میں نے دم لیا۔ زنجیر کھٹکھٹائی پہلے آہستہ

پھر زور سے ۔ اور جب کوئی جواب نہ آیا تو سوچنے لگا کہ
اب کیا کرنا چاہئے ــــ میں نے نوکر کا نام لے کر زور زور
سے پکارا ۔ پھر خیال آیا وہ کمبخت تو تھک تھکا کے
سو رہا ہوگا، کیا جاگے گا ۔ یہ چیخ چیخ کر "دروازہ کھولو
دروازہ کھولو" کی آواز دی ۔ لیکن ہوں نہ ہاں وہاں
تو صرف میری ہی آواز کی گونج تھی ــــ دیوار پھاندنے
کی ترکیب ذہن میں آئی ــــ دیواریں کافی بلند تھیں ۔
لیکن دروازے کا سہارا لے کر چڑھ جانا ممکن نظر آیا ۔ میں
دروازے کی لکڑیوں پر پاؤں جمانے اور چڑھنے لگا ۔
دیوار پر اپنے ہاتھ مضبوطی سے گڑا دئیے ۔ لیکن بھیگنے
کی وجہ سے دیوار میرا بوجھ نہ سہار سکی اور میں ایک دھماکہ
کیساتھ زمیں پر آ رہا ۔ گرنے سے زیادہ کوفت اس
بات کی ہوئی کہ کوئی اس آواز سے بھی تو نہ جاگا ـــ
کوٹ جھٹکنے لگا تو والد کے دئے ہوئے پانچ روپئے
بجنے لگے ۔ بارش پھر شروع ہونے لگی تھی ۔ میں آسرے
کی تلاش میں چل کھڑا ہوا ۔ منزل مقصود پر پہنچا تو پہلے
کی طرح اندھیرا چھایا ہوا تھا ۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا
مکان کے اندر اندھیرا ہی رہا ۔ لیکن جواب ملا ــــ
"نہیں کھولتے ــــ" "تو میں توڑتا ہوں" میں نے
جوش سے کہا ۔ اور آگے بڑھ کر کاندھے سے دھکا
جو دیا ہوں تو دھڑیل سے دروازے کے پٹ کھل گئے
اور میں ــــ ٹکرا گیا ــــ توبہ ــــ
"پھر کیوں آئے ــــ" ــــ اس نے برا
مانتے ہوئے پوچھا ـــ
"گھر کا دروازہ بند ہے ۔ میں نے بھیگے غمگین لہجے میں
کہا ـــ

"اتنے ڈرپوک کیوں ہو؟ ــــ کیا بات ہے؟ مجھ سے
کہو تو ــــ" ــــ ۔
"میرے والد مجھ پر شک کرتے ہیں ــــ آج ذرا دیر ہوگئی
کل معلوم نہیں کیا گت بنتی ہے"۔ وہ ہنسنے لگی ــــ میرے
بھولے راجا ــــ شک ــــ نوجوانوں پر نہیں تو کیا بوڑھوں
پر کرینگے ۔ میری بات سنو ۔ شک کا بھوت قسموں' اور
جھوٹ کے منتر سے کافور ہوتا ہے ۔ تمہیں قسم کھانی آتی ہے؟
"ہاں" میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا ۔
"تو پھر کھاؤ کوئی قسم ــ" ــــ
تمھارے سر کی ــ ــ" مری جان کی ــ رات کی
ــ ــ برسات کی ــ " دیکھو چار قسمیں تو کھالیں ــــ"
میں نے مسکراتے ہوئے کہا
!!

صبح کو گھر پہنچا ۔ امید کے موافق والد صاحب آنکھیں
سرخ کئے صحن میں ٹہل رہے تھے ــــ مجھے اندر داخل ہوتے
دیکھا تو غصہ سے کہنے لگے ۔
"میرے گھر میں رہنے کی ضرورت نہیں ۔"
"کیوں؟ ــــ" میں نے گردن جھکاتے ہوئے ۔
دبی آواز میں پوچھا ۔
"اس لئے کہ تم ناشدنی ۔ آوارہ اور بے شرم
ہو ــــ"
"میں ــــ"
"ہاں ــــ تم ــــ اور تم ــــ" ۔
"میں قسم کھانے تیار ہوں ــــ"
چپ رہو ــ " انھوں نے غصے سے کانپتے
ہوئے کہا ۔

"آپ کو مجھ پر بدگمانی ہے۔" میں نے لہجہ کو سخت بناتے ہوئے پوچھا۔

"تم ہو ہی ایسے ——"

میں کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ وہ ٹہل رہے تھے۔ میرے قریب پہنچے تو میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"آپ ابا جان۔ کسی کو نیک سمجھتے ہی نہیں۔ میں نے اپنی بے گناہی کے بارے میں آج سے نہیں بچپن سے یقین دلانے کی کوشش کی۔ لیکن آپ نے مجھ پر کبھی بھروسہ نہ کیا۔ اب اگر میں کہوں کہ رات کو وعظ تھا۔ تو آپ ہرگز یقین نہ فرمائیں گے۔ دوسرے دیکھنے والے بھی کہیں کہ "ہاں آپ کا بیٹا تو موجود تھا" آپ کو باور نہ ہوگا۔ میں آپ کی بزرگی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں رات تمام وعظ میں تھا۔ مشہور مشہور راگوں کی تقاریر سنتا رہا۔ میں آپ کی دو آنے نہ لے سکا وہ روپیے میں نے ایک یتیم خانے کو دیدئے۔ رسید میرے پاس موجود ہے۔ میں آپ کو خدائے پاک کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ آپ مجھے اپنے اعتماد کی بھیک دیں۔ ورنہ میں مر جاؤں گا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی ہر ہدایت میرے لئے مشعلِ راہ ہے۔ قدم قدم پر میں انہیں کا سہارا لیتا ہوں۔ میں آپ کا فرمانبردار لیکن ناقابلِ اعتبار بیٹا ——" میں رک گیا۔ میری آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ "میں قسم کھا کر کہتا ہوں اگر آپ کا شک قائم رہا تو میں آیندہ سے گھر کے باہر نہ نکلوں گا" میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے ——

والد خاموش تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ان کی آنکھوں میں یقین اور مسرت کی چمک آگئی ہے۔ میں نے اور بھی زور سے رونا شروع کر دیا۔

"بیٹا ہم تو تمہارے بھلے ہی کے لئے کہتے ہیں۔" ان کی آواز بھرا گئی۔ میں نے والد صاحب کے پیر پکڑ لئے —— "میں گنہگار ہوں" میں گڑگڑا رہا تھا۔

"نہیں —نہیں۔ تم پر مجھ کو پورا اعتماد ہے۔" میرا دل اور میری روح اس اعتماد کے بوجھ سے کچلے جا رہے تھے۔

رشید قریشی

غزل

(۱)
داستانِ دردِ دل ہم کہہ گئے
زیرِ لب وہ مسکرا کر رہ گئے

(۲)
شمع پر پروانے جل کر رات بھر
سوزِ الفت کا فسانہ کہہ گئے

(۳)
اس قدر رویا میں ان کی یاد میں
خون ہو کر دل کے ٹکڑے بہہ گئے

(۴)
دل سے کیا نکلی تھی آہِ شعلہ بار
ٹوٹ کر انجم فلک پر رہ گئے

(۵)
برق چمکے جس طرح برسات میں
وہ مرے رونے پہ ہنس کر رہ گئے

(۶)
منزلِ مقصد پہ سب پہنچے نظام
ایک ہم ہی پا شکستہ رہ گئے

نظام انصاری

رومان

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ہمارے کالج کو تعطیل تھی اور ہم فکر میں تھیں کہ یہ طویل تعطیلات صرف گھر کی چار دیواری میں ایک دوسرے سے ملے بغیر کیسے گزاری جائیں۔ عذرا نے سوچ کر ایک تجویز نکالی کہ سب مل کر کسی ایک جگہ تفریح کے لئے جائیں اور چند مقامات کی سیر کرتے ہوئے اپنے اپنے مکانوں کو واپس ہو جائیں اب سوال یہ تھا کہ اس پارٹی کا قائد کون ہو صرف بوڑھی مس کارٹ رائٹ رہ گئی تھی وہی تند مزاج بوڑھی جس سے ہم سب خوف کھاتے اور اس کو دق کرتے رہتے تھے مجبوراً ہم نے اسے ہی ساتھ لینے کی ٹھانی سچ تو یہ ہے کہ یہ بڑی دلچسپ بوڑھی تھی۔ اکثر ہمیں اپنی جوانی کے واقعات پرلطف پیرائے میں بیان کرتی روحوں کے عجیب و غریب قصے اور اپنی سرگذشت شباب خوشی کے وقت بے تکلفانہ انداز میں سناتی لیکن مشکل یہ تھی کہ اس سے کہا کیسے جائے سب نے مجھے مجبور کیا کہ میں جا کر اسے راضی کروں۔

میں جانتی تھی کہ بوڑھی مس کارٹ رائٹ کو نرگس کے پھولوں کا بے حد شوق ہے میں نے نرگس کے پھولوں کا ایک گلدستہ لیا اور دبے پاؤں اس کے کمرے میں داخل ہوئی اس وقت وہ بیٹھی ہوئی ایک لذیذ کیک جلد جلد کھا رہی تھی مجھے دیکھتے ہی یکدم چیخ اٹھی " او بیٹی نگار مجھے تم بہت بھلی معلوم ہوتی ہو" اس نے جلد جلد کیک کے ٹکڑے نگلتے ہوئے کہا پھر مجھ سے رازدارانہ لہجے میں پوچھنے لگی " یہ سب بلائیں کہاں گئیں نگار "

میں سمجھ چکی تھی کہ اس کا اشارہ میری بقیہ ساتھیوں کی طرف ہے میں نے کہا " وہ سب باغ میں ہیں مادام " یکدم سے اس کی بھنویں تن گئیں " مجھے ان کے لچھن ذرا نہیں بھاتے خصوصاً اس نازک کے ہمیشہ ہنستی رہتی ہے میں نہیں جانتی یہ لڑکیاں کس قسم کی ہیں دن بھر سیر دن بھر تفریح یاد ش بخیر جب ہم اتنی عمر میں تھیں تو مجھے خوب یاد ہے ہم کو حکم تھا کہ بوڑھوں کی صحبت میں رہ کر تجربہ حاصل کریں " ایں تم ہنس رہی ہو " اس نے خشمگیں لہجے میں مجھ سے سوال کیا میں گھبرا گئی میں نے جلدی سے کہا " نہیں تو " دراصل یہ تھا کہ نازک پیچھے سے منہ بنا بنا کر اسے چڑا رہی تھی جس سے مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی تھی میں نے اس کی خفگی دور کرنے کو جھٹ وہ گلدستہ پیش کر دیا " ہا ہا شکریہ تم یہ کہاں سے لائیں نگار۔ بالکل ویسے جیسے مسٹر چارلس نے کرسمس کے موقع پر دئیے تھے (مسٹر چارلس ان کے ایک دوست ہیں جن کی بہادری کے افسانے وہ متعدد مرتبہ بیان کر چکی ہیں) میں نے گھبرا کر جلدی سے ٹوکا کہیں وہ مسٹر چارلس کی بہادری کی کوئی طویل داستان نہ چھیڑ دے کہا " معاف کیجئے مادام میرا خیال تھا آپ اس وقت بیکار ہیں مجھے کچھ عرض کرنا ہے " کہو نگار شوق سے کہو میں ہمہ تن گوش ہوں " اس نے کہا آخر میں نے درخواست کی جو چند عذروں کے بعد منظور ہو گئی ان کے چند عذر یہ تھے کہ ابھی ابھی خرگوشنی نے بچے دئے ہیں ان کی نگہداشت کون کرے گا دوسرے بلی ان کا [illegible] کتا بیمار ہے وغیرہ وغیرہ لیکن میرے باادب اصرار سے آخر وہ راضی ہو گئیں

ہم نے گھروں سے اخراجات منگوا لئے اور لکھ دیا کہ ہم

دس پندرہ روز بعد سیر کرتے ہوئے واپس ہو گئیں او. تو ہم نے جانے کا طے کر لیا یہ سمندر کے کنارے بڑا پر فضا مقام ہے جس کے مناظر خصوصیت سے بہت مشہور ہیں جانے کی تیاری شروع کر دی گئی جس صبح نکلنا تھا وہ رات ملبوسات کی دیکھ بھال اور رکھ رکھاؤ میں صرف ہوئی۔

صبح ۴ بجے ہم چل پڑے بڑا دلکش منظر تھا شفاف چاندنی پھیلی ہوئی تھی پھیکی پھیکی یہ کا بڑا سا چاند اونچے اونچے درختوں کے گنجان پتوں کی اوٹ میں سے جھانک رہا تھا پون کے جھونکے دنیا کو تھپک تھپک کر سلا رہے تھے اور ساری دنیا چاندنی اوڑھے محو خواب تھی وادی و کہسار کا سماں نشاط افروز نظر آتا تھا اور پھولوں کی مہک فضا کو معطر بنائے ہوئے تھی۔ اور میں جوش کے اس خیال سے

"معاذ اللہ یہ رنگین فضائیں پتہ نہیں دنیا ہیں خلد بریں ہے"

کی ہمنوائی پر مجبور نظر آتی تھی ہم باری باری سے موٹر چلاتی جا رہی تھیں کبھی کبھی کوئی جوان طبیعت مزے میں آکر سیر کی تان بھی اڑا دیتی جو لطف کو اور دونا کر دیتی الغرض صبح صبح تو ہم پہنچ گئے پہلے ہی سے ڈاک بنگلہ میں انتظام کر دیا گیا تھا جو سمندر کے کنارے نہایت پر فضا جگہ واقع تھا سامنے گل پوش پہاڑیاں تھیں جن کے دامن میں سمندر کی موجیں ٹکراتی رہتی تھیں اس کے کنارے ایک وسیع میدان پھیلا ہوا تھا آبادی سے دور انسانی مذاق کی حکمرانی ہوئی۔ یہاں پیچراں خوبصورتی دیہاتی دوشیزہ کی طرح شباب کی رنگینیوں سے بے خبر شادماں نظر آتی تھی ہم کو اس بات سے بڑا اطمینان ہوا کہ یہاں گنجان آبادی نہیں اور یہ کہ ہماری آزادی میں کوئی مخل نہ ہوگا۔

دو تین دن بڑے لطف میں بسر ہوئے روز سمندر کی سیر ہوتی شام میں محفل موسیقی ترتیب دی جاتی ہم مستقبل کی ستم رانیوں سے ناآشنا حال کی حشر سامانیوں میں محو تھیں بوڑھی مس کارٹ رائٹ پر غالباً جوانی کی فضا اثر انداز ہو چکی تھی اور اب وہ ایک شفیق ساتھی بن گئی تھی۔

ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہم ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھی تھیں کہ بیرے نے ایک خوبصورت لفافہ یہ کہتے ہوئے لا کر دیا کہ ایک بیرسٹر صاحب آئے ہیں وہ یہاں ٹھیرنا چاہتے ہیں میں نے کہا "اجازت نہیں آپ لوگ ٹھیری ہوئی ہیں" انھوں نے یہ رقعہ دیا کہ آپ کو دے دوں ہم نے پڑھا تو نہایت انکسارانہ تحریر میں اس بات کی اجازت چاہی تھی کہ یہاں فروکش ہو سکیں۔ ہم نے جواب دیا کہ معاف کیجیے فی الحال تو نہیں البتہ ہم دو تین بعد جانے والی ہیں پھر آپ ٹھیر سکتے ہیں بات رفت گذشت ہوئی ہم یہ قصہ بھول بھی گئیں۔

اس کے بعد ایک دن شام میں ہم سب چہل قدمی کرتی جا رہی تھیں۔ ساحل کی ہواؤں میں کسی قدر خنکی آ گئی تھی اور ہم نے اپنے اور کوٹ اوڑھ لیے تھے۔ سب مسرت کی موجوں سے کھیلتی جا رہی تھیں۔ میں اور پروین کسی قدر فاصلے پر باتیں کرتی جا رہی تھیں۔ اس وقت ہمارا مبحث "فلسفۂ محبت" تھا میں محبت کی قائل تھی لیکن آج کل کی افسانوی اور رومانی محبت مجھے سخت ناپسند تھی۔ علیٰ ہذا القیاس پروین بھی میری ہم رائے تھی۔ کس قدر لغو چیز ہے میرا خیال ہے کہ یہ ہمارے مشرقی شعرا کے تخیل کی پیداوار ہے" "میں نہیں سمجھ سکتی" میں نے کہا" آخر ان عشاق بیچاروں کو اتنی کیوں زحمتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ کوئی تیشہ مار کر جان دیتا ہے کوئی زہر پیتا ہے لاحول ولا کس قدر فضول چیز انمول زندگی کا

کتنا ستا ڈالا" پروین بھی میری تائید کر رہی تھی "یا اللہ محبت نہ ہوئی بلائے جان جس کتاب میں پڑھیے جو ڈرامہ دیکھیے اس کی سحرکاریوں سے مملو کس قدر بیہودہ چیز ہے" پروین کہہ رہی تھی۔

ہماری ساتھیوں میں چند ایسی بھی تھیں جو ہماری مخالفت کر رہی تھیں۔

یکایک باتیں کرتے کرتے پروین نے ایک خوبصورت سنگ کا پتھر اٹھا لیا جو ہیرے کی طرح چمک رہا تھا۔ آپ جانیں لڑکیاں ہوتی ہیں بھیڑ چال دھیان سب کی سب چننے میں مصروف ہوگئیں میں اور پروین بھی چنتے چنتے دور نکل گئے آخر میں تھک کر چٹان پر بیٹھ گئی اور پروین چنتی رہی۔ شام آسمان شفق کی وجہ سے لالہ گوں ہوگیا تھا۔ اس کا عکس خاموش سمندر کو جو شور و شغف سے دور نہایت متانت سے امواج کے زیر و بم سے دنیاوی چیز کی متلون مزاجی کا ثبوت دے رہا تھا بسنتی غلاف میں لپیٹے ہوئے تھا میں اس نظارہ میں محو ہوگئی اور منظر کی لطافت میں کھو گئی پروین چنتے چنتے غالباً دور نکل گئی وہ میری نظروں سے اوجھل ہوچکی تھی اور میں پروین کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اب شام کی سیاہی پھیلنا شروع ہوئی تمام لڑکیاں بھی ہمیں ڈھونڈھتی ہوئی یہاں آگئیں۔ لیکن پروین کا پتہ نہ تھا وہ خدا جانے کہاں گئی۔ ہم پریشان ہوگئیں مسز ... پر مادام آرانٹ کے بھوتوں کے قصے۔ ان کا خیال تھا کہ ضرور کوئی سمندری روح اٹھا لے گئی ہے۔ ہم تلاش و تجسس میں تھیں اب چاند کی روشنی بھی پھیل چکی تھی کہ تھوڑی دور پر پروین خوف زدہ سہمی ہوئی نظر آئی ہم سب نے دستیاں ہلانی شروع کیں وجہ دریافت کرنے پر وہ بمشکل "سانپ" کہہ سکی تسلی و تشفی کی گئی حالت سنبھلی۔

پر اس نے بیان کیا کہ پتھر چنتے چنتے وہ دور نکل گئی یکایک ایک بڑا سا کالا سانپ نظر پڑا جو پھن اٹھائے اس کی طرف آ رہا تھا۔ اگر غیبی امداد شامل حال نہ ہوتی تو اس دن یقینی اس کی موت تھی۔ لیکن غیبی امداد کا نہ ہم نے دریافت کیا اور نہ اس نے کچھ بیان کیا۔ اس کے بعد وہ دیر تک کسی قدر چپ چپ رہی لیکن پھر ہم تھے اور وہی سامنے فراز قہقہے۔

دوسرے دن ساحل کی جانب قدمی بھی موقوف رہی کیونکہ کل کے واقعہ کی وجہ سے ہم سب خوف زدہ ہوگئی تھیں شام کمرے ہی میں بیٹھ کر کھیلنے میں گذاری گئی رات میں سب سو رہے صبح اچانک میری آنکھ کھل گئی ہوا بڑا پر کیف سماں تھا۔ میں نے سب کو بیدار کر دیا گو ہم نے ساحل پر نہ جانے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن جس طرح نشیلے بادل میخوار کی توبہ توڑ دیتے ہیں اس سماں نے ہماری بھی توبہ توڑ دی اور ہم سب پھر پھول توڑنے چلی گئیں۔ یکایک پروین کا چہرہ سرخ ہوگیا میں ابھی آئی کہتے ہوئے وہ جھاڑیوں کی طرف چلی گئی ہم حیران کہ یا اللہ کیا ماجرا ہے لیکن خدا کا شکر وہ جلد واپس آگئی اس وقت سب لڑکیاں گول کمرے میں جمع تھیں صرف میں پروین کے انتظار میں برآمدے میں کھڑی تھی۔ وہ آتے ہی مجھ سے لپٹ گئی اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ میں نے پریشان ہوکر وجہ دریافت کی اس نے صرف دور سے نکلنے کی طرف انگلی اٹھا دی اس کی نظریں خوفزدہ اس سے کچھ بتایا نہیں۔ میرے دونوں ہاتھ تھامے کھڑی تھی پھر اس نے نیچے کی طرف انگلی اٹھا دی میں نے جھک کر پوچھا "آخر تم نے وہاں ایسی کیا خوفناک چیز دیکھی کیا کوئی سانپ تھا" اس نے

کہا "نہیں" کوئی اژدہا کوئی شیر بقول مادام رانٹ کوئی
بدروح اس نے کہا نہیں اس سے بڑھ کر خوفناک میں حیران
تھی یا اللہ کہیں تم نے ملک الموت کو نہیں دیکھ لیا۔ اس نے
روتے ہوئے کہا "آہ لڑکا ر میرا خیال ہے اس سے بھی بدتر
وہ . وہ مجھ سے محبت
عشق" اس نے رکتے ہوئے کہا "او خدا"
میں پورا مطلب سمجھ کر سہم سی گئی۔ آہ غریب افسانہ پرست
معصوم کلی۔ مجھے اس کی حالت قابل رحم نظر آ رہی تھی یہ
جانیں ایک نوشگفتہ معصوم کلی ایک افسانہ پرست روح کیلئے
یہ کس قدر مکروہ چیز ہے اف قید و بند" میں اس کے مستقبل
کے تصور سے لرز گئی ہم دونوں سہمی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں
کتنی معصوم قابل رشک زندگی تھی کمرے میں حسن، شوخی شرارت
کے معصوم مجسمے نظر آتے تھے، جو دنیا کی ان لغویات
سے قطعاً ناآشنا اپنے مشاغل میں مصروف تھے۔ شریر ناز
میز پوش پر بیٹھی سیب کھانے میں مصروف تھی عذرا اپنے حسین
گھونگھر والے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی صبیحہ ایک مصور رسالے
کی ورق گردانی میں مصروف نظر آتی تھی اور چند شریر غریب
عطیہ کو بنا رہی تھیں۔ سب کی سب اچک کر ہمارے قریب
گھیرا ڈال کر کھڑی ہوگئیں اور لگیں وجہ دریافت کرنے میں
نے کہا تم سب بیٹھ جاؤ تو کہتی ہوں" اتنے میں مادام کارٹر
رانٹ بھی اپنے عزیز میگی کو لیے ہوئے اس پارٹی میں
آ دھمکیں۔ اور چیخ کر کہا "کیا ہے لڑکیو تم سب بندروں کی
طرح کیوں ناچ رہی ہو او خدا تم چپ چپ کیوں ہو تم لڑکا،
پروین تم زرد کیوں ہوگیا تم نے کوئی بدروح دیکھی ہے ہم
نے دق ہوکر کہا مادام بہتر ہے آپ بیرے کو تیاری کا حکم
دے دیں کیونکہ آج ہم یہاں سے نکل جانا چاہتی ہیں۔

بوڑھی نے خوش ہوکر کہا بہت اچھا بہت اچھا یقیناً اب تم
راستہ پر آگئی ہو لیکن میں تو کہتی تھی کبھی ایسے سنسان ساحلوں
پر تفریح کے لئے مت جانا لیکن تم۔ تم شیطان کی خالائیں
کیا یہ ماننے والی تھیں وہ بڑبڑاتے ہوئے باورچی خانے کی طرف
گئی اب ہم نے اطمینان سے پروین کا قصہ سننا شروع کیا
اس نے بیان کیا "جس دن میں پتھر چنتے چنتے دور نکل گئی
تھی اس دن ایک بڑا سانپ درخت پر تھا اور قریب تھا کہ
مجھے ڈس لے لیکن ایک صاحب نے بروقت امداد دی اور
اس موذی سانپ سے مجھے بچایا وہ بڑے خوش رو شریف
آدمی تھے انھوں نے صرف اتنی التجا کی کہ میں تم لوگوں سے
یہ نہ کہہ دوں کہ وہ یہاں فروکش ہیں کیونکہ اس صورت میں ہم
ایک منٹ نہ ٹھیر سکتی تھیں۔ پھر پروین نے کہنا شروع کیا
دوسرے دن جب تم سب خوف زدہ کمرے میں ہی تھیں اس
دن بیرے نے مجھے ایک چٹھی لاکر دی جس میں لکھا ہوا تھا کہ
میں ان سے دو منٹ کے لئے اس درخت کے نیچے ملنا چاہتا
ہوں میں نے جواب لکھ دیا کہ معاف کیجئے آپ ایک شریف آدمی
ہوتے ہوئے ایک شریف لڑکی سے اس قسم کی توقع رکھتے
ہیں جو بالکل بیجا ہے بہتر ہے کہ آپ چلے جائیں۔ پھر آج
جیسا کہ تم سب جانتی ہو پھول توڑتے توڑتے میں نے دیکھا
تو دستی رل رہی تھی غیر ارادی طور پر میں چلی گئی پروین نے
ہم لوگوں کی طرف مڑکر کہا تم ناراض نہ ہو ان کا مجھ پر بیحد احسان
تھا اگر میں اتنی بات نہ سنتی تو یقیناً محسن کش شمار کی جاتی خیر
انھوں نے اپنے مختصر حالات بتائے، جاوید ان کا نام ہے
بیرسٹر ہیں ابھی ابھی انگلینڈ سے واپس ہوئے ہیں وہ شاعر
بھی ہیں اور ادیب بھی بغرض سیر و تفریح یہاں مقیم ہیں اس
سانپ والے واقعہ کی وجہ سے انھوں نے مجھے دیکھ لیا۔

وہ مجھ سے میرے والد کا پتہ پوچھنے لگے جس کے بتانے سے
میں نے انکار کیا لیکن وہ اس پر مصر ہیں۔ اب بتاؤ کیا کیا جائے"
پروین نے صورتِ سوال بن کر دریافت کیا۔ میں نے کہا
"ہوں کوئی ضرورت نہیں"

کچھ دیر بعد تنہائی میں پروین نے مجھ سے جاوید کا
ذکر کیا وہ ان کے احسان سے بہت متاثر نظر آ رہی تھی پروین
نے کہا آہ لڑکا بڑا تم کیا جانو کس عاجزی سے انھوں نے درخواست
کی تھی لیکن میں نے ٹھکرا دیا۔ میں نے شرارتاً دریافت کیا تو
تم جانتی ہو کہ میں لکھ بھیجوں بس نے ایک دم ڈر کر کہا نہیں
نہیں ایسا غضب نہ کرنا میں نے کہا تمہاری بھی عجیب کیفیت ہے
کبھی یوں کبھی یوں سچ تو یہ ہے کہ تمھیں کیوپڈ نے نہیں
بھی زخمی کیا ہے وہ سرخ ہو گئی میں چھیڑنے کے لئے جوش کا یہ
شعر گنگنانے لگی۔

خود کو بیبس نہ ہو گر [illegible] ہے [illegible] سینے میں اک حشر چھپائے ہوئے ہو تم

جب ہم تو ہو سے چلنے لگیں تو نہایت ہی لذیذ کیک ہمارے لئے روانہ
کئے گئے جن کو ہم نے بصد شکریہ واپس کر دیا لیکن خدا معلوم وہ
کیسے کار میں رکھ دیئے گئے اسی بنا پر اکثر اوقات ہم پروین کو
چھیڑتی تھیں کہ بھئی تمہارے طفیل بڑے لذیذ کیک کھائے۔

اس کے بعد کا ذکر ہے کہ یہ واردات اتفاقی کی طرح
ہمارے لئے آئی گئی بات ہو گئی پروین بی۔ اے کا امتحان دے کر
اپنے گھر چلی گئی ہماری علحٰدگی کے بعد چند دن تک باقاعدہ
خط و کتابت ہوتی رہی پروین نے کسی وقت بھی جاوید کا کوئی
ذکر نہ کیا اس کے بعد مسلسل ڈیڑھ سال تک کوئی خط نہیں آیا جب میں
اپنے عزیز کے پاس کانپور گئی ہوئی تھی میرے گھر پر ایک سرخ لفافہ
میرے نام آیا۔ یہ پروین کی شادی کا طلب نامہ تھا۔ میرے لوٹا
پہنچنے کے دو ہفتے بعد ایک تار ملا "مسٹر اور مسز جاوید آ رہے
ہیں"۔ میں خود کار لے کر اسٹیشن پہنچی اب پروین صرف پروین ہی
نہیں بلکہ مسز جاوید پروین تھی۔ گھر پہنچنے پر اس نے ایک خوبصورت
ڈبہ مجھے دیا دریافت پر معلوم ہوا کہ اس میں کیک ہیں۔ میں نے
کہا اس کی کیا ضرورت تھی پروین نے ایک ہلکا سا طمانچہ مجھے رسید
کیا کہنے لگی "تم ہو کے نرے بے ہمدرد کی نشانی" "مجھے یاد آ گیا خوب
شخص جاوید بھی ہنس دیے تھے پروین ایک کیک اٹھا کر کھا رہی تھی
میں نے پروین سے کہا "لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد بھی نرا تھے
ہوئے افسانے ہیں اب تو جاوید پروین کی کہانی
بہت بدتمیز ہو گئی ہے" پروین نے کہا۔

جاوید مسکراتے ہوئے کہنے لگے "لگا ریکیک کھائی
ہو یا واپس کر دئے جائیں"

پروین نے ریڈیو لگایا تو یہ گانا نشر
ہو رہا تھا۔

یہ جیون ایک کہانی ہے۔ یہ جیون ایک کہانی!

رفیعہ سلطانہ (اورنگ آباد)

صرف ایک مرتبہ

شکار کے موسم کی ابتدا تھی، مارکوئس دی برتران کے بنگلے پر شب کا کھانا ہو چکا تھا۔ گیارہ شکاری اور آٹھ عورتیں جو ابھی عالم شباب ہی میں تھیں، ضلع کے ڈاکٹر کے ساتھ روشنی سے منور پھلوں اور پھولوں سے سجی ہوئی ایک گول میز کے گرد بیٹھے "محبت" پر خیال آرائیاں کر رہی تھیں کہ آپس میں بحث چھڑ گئی۔

"آیا حقیقی محبت ایک ہی مرتبہ ممکن ہے یا بار بار"

مختلف مثالیں ان اشخاص کی دی گئیں جنھوں نے صرف ایک مرتبہ محبت کی تھی اور دوسری کئی مثالیں ایسے اشخاص کی بتائی گئیں جنھوں نے کئی مرتبہ محبت کی تھی اور انہی جوش و سرگرمی سے کی تھی۔ عام طور پر عورتوں کی یہ رائے تھی کہ جس طرح ایک بیماری کسی آدمی پر دو چار مرتبہ حملہ کرتی ہے، جذبۂ محبت بھی بار بار حملہ کرتا ہے اس کا مصداق ایسا ہی ہوتا ہے خواہ کوئی چیز اس کی مانع ہی کیوں نہ ہو۔

یہ سنجیدہ موضوع کا یہ رخ ناقابل بحث تھا لیکن عورتوں کے خیالات کا انحصار ہمارے مشاہدے کے شاعری پر تھا ہم لوگ اس بات پر مصر تھیں کہ محبت اور وہ بھی حقیقی محبت کسی شخص کو صرف ایک ہی مرتبہ عطا ہوتی ہے اور ایسی محبت جو ایک بجلی ہوتی ہے جس دل سے چھو جاتی ہے اس کو اس قدر جلا کر خاک اور تباہ و برباد کر دیتی ہے کہ کوئی دوسرا زبردست احساس یہاں تک کہ خواب بھی اس دل میں دوبارہ پیدا نہیں ہو سکتا۔

مارکوئس نے جو کئی مرتبہ محبت کر چکا تھا اس خیال کی سخت مخالفت کرتے ہوئے کہا "میں معزز خواتین کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ ایک شخص کئی مرتبہ محبت کر سکتا ہے اور بالکل اسی خلوص دل اور لطافت روح کے ساتھ۔ آپ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ بار بار محبت کرنا ناممکن ہے، ایسے اشخاص کی نظیر پیش کرتی رہی ہیں جنھوں نے محبت کی خاطر خودکشی کر لی مگر اس کا جواب میرے پاس یہ ہے کہ اگر انھوں نے خودکشی جیسی زبردست غلطی نہ کی ہوتی جس نے ان سے دوبارہ محبت کرنے کے سارے مواقع چھین لیے تو وہ ضرور اپنی پہلی محبت سے باز آ کر دوبارہ کسی اور سے محبت کرنے لگتے اور اس طرح اپنی طبعی موت تک متعدد مرتبہ محبت کرتے چلے جاتے۔ عاشقوں کی حالت شرابیوں کی سی ہے۔ جب ایک مرتبہ پی لیتے ہیں تو دوبارہ ضرور پیتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ ایک مرتبہ محبت کر چکتے ہیں دوبارہ بھی کسی سے ضرور محبت کرتے ہیں یہ اپنے اپنے جذبات پر منحصر ہے۔"

سبھوں نے بوڑھے ڈاکٹر کو، جو پہلے پیرس میں مطب کرتا تھا اور اب اپنے وطن میں آ گیا تھا، مجبور کیا کہ وہ ایک منصف کی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار کرے۔

حالانکہ خود ڈاکٹر صاحب حقیقی رائے نہیں رکھتے تھے بہ حال انھوں نے کہا "جیسا کہ مارکوئس فرما چکے ہیں اس کا انحصار زیادہ تر طبیعت پر ہے۔ اگر مجھ سے پوچھو تو میں صرف ایسی محبت سے واقف ہوں جو ایک دن کے وقفہ کے بغیر پورے پچپن سال تک ایک نازک دل میں بسی رہی اور جو صرف موت کے ساتھ ہی ختم ہوئی۔"

مارشیونس نے مسرت سے تالیاں بجائیں، اور کہا "اس طرح محبت کیا جانا کس قدر دل فریب خواب ہے وہ پچپن سال کی زندگی کتنی مسرت آمیز ہو گی جو اس گہری اور پرجوش محبت کے عالم میں بسر ہوئی اور کس قدر خوش قسمت ہو گا وہ شخص جو اس طرح پرستش کیا گیا۔"

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا "یقیناً بیگم! آپ اس حد تک غلطی پر نہیں ہیں کہ اس واقعہ میں معشوق ایک مرد تھا آپ اس کو جانتی ہیں کہ وہ اس شہر کا دوا ساز چوگے تھا اور وہ عورت! اس کو بھی آپ پہچانتی ہیں۔ وہ بید بننے والی بڑھیا تھی۔ جو ہر سال اس حویلی پر آیا کرتی تھی۔ میں اب ذرا وضاحت سے کام لوں گا۔"

اب عورت کا تمام جوش و خروش ٹھنڈا پڑ چکا تھا ان کے سرکش چہروں سے تحقیر ظاہر ہو رہی تھی گویا محبت صرف وہی شائستہ اور ممتاز اشخاص ہی کر سکتے ہیں جو خوش حال اور آسودہ زندگی بسر کرنے کے قابل ہیں۔

ڈاکٹر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "تین مہینے کا عرصہ ہوا کہ میں اس عورت کے بستر مرگ پر بلایا گیا تھا۔ ایک دن پیشتر وہ ایک گاڑی میں جو اس کا گھر بھی تھا یہاں آئی تھی جس میں ایک فرتوت کرایہ کا گھوڑا جتا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دو بڑے کالے کتے بھی تھے جو اس کے رفیق اور محافظ تھے۔ اس علاقے کا پادری وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ بڑھیا نے ہم پر اپنی آخری تمناؤں کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے اپنی ساری بپتا بیان کی۔ میرے علم میں اس سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ کوئی اور نہیں ہے۔

اس کے ماں اور باپ بید باف تھے وہ گاڑی کے سوا زمین پر بنائے ہوئے مکان میں کبھی نہیں رہی۔ اپنی کمسنی کے زمانے میں وہ ہمیشہ میلے اور گندے چیتھڑوں میں ادھر ادھر پھرا کرتی تھی۔ یہ لوگ گاؤں کی سرحد پر ٹھہرا کرتے۔ جھاڑی کے کنارے جب وہ گاڑی چھوڑ دیتے تو گھوڑا الگ گھاس چرنے لگتا اور کتا اپنی ناک اپنے پنجوں پر رکھ کر سو جاتا۔ جب اس کے ماں باپ سڑک کے کنارے کسی درخت کے نیچے اس قریہ کی پرانی کرسیوں کی درستی میں مشغول ہو جاتے تو یہ ننھی لڑکی بیٹھی کھیلا کرتی۔

ان لوگوں کی اس خانہ بدوشانہ زندگی میں آپس میں بہت کم گفتگو ہوا کرتی۔ بہت تھوڑے سے الفاظ میں اس بحث کو ختم کر دیتے کہ کون گاؤں میں "کرسی درست کراؤ" کی آواز لگا کر گشت کرے گا اور کون ایک دوسرے کے [illegible] متعلق بیٹھ کر [illegible]

جب یہ لڑکی ٹہلتے ہوئے ذرا دور نکل جاتی یا گاؤں کے کسی آوارہ لڑکے کو دوست بنانے کی کوشش کرتی تو اس کو اس کے باپ کی غصیلی آواز یہ کہتے ہوئے سنائی دیتی "اری چھوکری [illegible] ! کیا تو واپس یہاں آئے گی؟"

اس نے محبت کے صرف یہی الفاظ سنے تھے۔ جب وہ ذرا بڑی ہوئی تو بوسیدہ کرسیاں جن کے پیندے خراب ہو چکے ہوتے جمع کرنے جانے لگی اس طرح وہ گاؤں میں مختلف لڑکوں سے دوستی یا شناسائی پیدا کرتی۔ مگر اس کے نئے دوستوں کے والدین اپنے بچوں کو نہایت کرخت آواز میں پکارتے "ادھر آؤ [illegible] اگر پھر کبھی تم ایسی [illegible] لڑکی سے بات کرتے دکھائی دئے تو [illegible] ہوگا۔"

اکثر چھوٹے لڑکے اس پر پتھر پھینکا کرتے جو پیسے اس کو عورتوں سے ملتے وہ انہیں بہت احتیاط سے جمع کرتی ایک مرتبہ جب کہ اس کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ اتفاقاً اس کا اس راستہ سے گزر ہوا وہ قبرستان کے پیچھے پہنچی تو [illegible] اس کی نظر پڑی چونکہ اس کے ساتھی لڑکے [illegible] [illegible] لڑکی نے سب سے خوش حال لڑکے کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو اس کو اپنے جذبات

پر قابو نہ رہا۔ وہ اپنی معصوم دانست میں اس لڑکے کو بہت خوش
باش اور قانع خیال کرتی تھی۔ اس کے قریب گئی اور جب
اس لڑکے کے رونے کا سبب معلوم ہوا تو اس نے اپنی جمع کی
ہوئی ساری پونجی (جو کل سات پیسے تھے) اس کے ہاتھ میں رکھ
دی۔ آنسو پونچھتے ہوئے لڑکے نے وہ پیسے لے لئے
خوشی سے بے قابو ہوکر اس نے لڑکے کو پیار کرنے کی
جسارت کی   لڑکا چونکہ پیسوں کے خیال میں
محو تھا اس لئے اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ لڑکی نے
جب دیکھا کہ کسی نے اس کو روکا اور نہ کسی نے ٹوکا تو وہ وار
لڑکے کو اپنے سینہ سے لگا کر بہت خوشی سے پیار کرنے لگی۔
اور پھر وہ ایک طرف کو بھاگ گئی۔

اس آوارہ گرد لڑکی کے دل میں کس قسم کا ہیجان
برپا تھا   ؟ کیا اس لڑکے کا خیال اس کے دل
میں اس وجہ سے تھا کہ اس نے اپنی حقیر لیکن قابل قدر دولت
اس پر نثار کردی تھی   ؟
راز یہ ہے کہ اس کی صرف بچوں ہی کے ساتھ تخصیص ہے یا
بڑوں کے ساتھ بھی   ؟

مہینوں وہ اس گوشہ قبرستان اور اس لڑکے
کا خواب دیکھتی رہی دوبارہ اس نے لڑکے کو دیکھا تو ماں
باپ کی چوری سے پاؤں دبا کر نکلی اور دو چار پیسے ادھر ادھر
سے کرسیوں کی درستی اور تیاری سے اکٹھے کرکے دوا ساز
کی دکان پر سودے کے بہانے پہنچی۔ وہ اپنی واپسی تک
تقریباً دو فرانک جمع کرچکی تھی۔ لیکن ننھے دوا ساز کی صرف
ایک جھلک   دیکھ سکی۔
اس نے لڑکے کو مکان میں صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے
دیکھا تھا۔ وہ کھڑکی کے پیچھے شیشے کی بوتلوں
کے درمیان کھڑا ہوا تھا جن میں ایک خاص قسم کے کپڑے نمونتہً
محفوظ کئے گئے تھے شیشوں میں رکھے ہوئے رنگین پانی اور
چمکتے ہوئے آئینوں کے دلکش منظر نے اس کو
اکسایا -   دیوانہ بنایا   اور گرویدہ کرلیا
اب وہ اس پر اور زیادہ جان دینے لگی۔

اس کبھی پژمردہ نہ ہونے والی یاد کو اس نے اپنے دل
میں خزانے کی طرح مدفون کرلیا۔ ایک سال کے بعد وہ دوبارہ
اس سے اسکول کے پیچھے ملی۔ جب کہ وہ اپنے ساتھیوں کے
ساتھ گولیاں کھیل رہا تھا۔ اس نے دیوانہ وار اپنے آپ
کو لڑکے پر گرادیا اور اس قدر جوش کے ساتھ اس کو سینہ سے
لپٹایا اور بھینچ کر پیار کرنا شروع کیا کہ لڑکا خوف سے چلا اٹھا۔
اس کے رونے کو فرو کرنے کے لئے اس نے اپنی ساری جمع
شدہ رقم جو تین فرانک تھی اس کے حوالے کردی۔ لڑکے نے
آنکھیں پھاڑ کر اس رقم کو دیکھا اور اس کو اپنے محبت بھرے
ارمان نکالنے کا موقع دے دیا۔ پورے چار سال کی طویل
مدت تک وہ اپنی ساری کمائی اس لڑکے کو دیتی رہی اور
لڑکا اپنے بھولے پن سے اس رقم کو اپنے بوسوں کی قیمت
سمجھ کر لیتا رہا۔ لڑکی نے متعدد اوقات میں اس کو کبھی
تیس پیسے کبھی دو فرانک اور کبھی بارہ پیسے بھی دئے۔
(ایک بار وہ ذلت و رسوائی اور غم سے بے تاب ہوکر رونے
لگی۔ یہ سال اس کے لئے نہایت ہی برا ثابت ہوا تھا) اور
آخری مرتبہ اس نے پانچ فرانک کا ایک گول سکہ دیا جس نے
لڑکے کو غیر معمولی طور پر خوش کردیا۔

دنیا میں صرف اس لڑکے کی ذات اس کی دلچسپی کا سامان
تھی۔ اس بھولی لڑکی کا وہ ایک حد تک بے صبری سے
انتظار کرتا۔ اور جب کبھی وہ اس کو دیکھتا   -

دوڑتے ہوئے جاکر اس سے ملتا … اور لڑکی کا دل
خوشی سے چار چار ہاتھ اچھلنے لگتا … چند دن کے
بعد لڑکا اس کی نظروں سے غائب ہوگیا۔ مگر اس نے
لوگوں سے پوچھ کر اپنی فراست سے پتہ لگا لیا کہ لڑکے کے
والدین نے اس کو اسکول بھیج دیا ہے۔ اب اس نے اپنے
ماں باپ کو بڑی چالاکی سے اس بات پر آمادہ کرنا شروع
کیا کہ وہ تعطیلات کے اوقات میں اسکول کی راہ سے گذریں
وہ اپنی کوششوں میں کامیاب تو ہوئی لیکن پورے سال بھر
کی لگاتار جد و جہد کے بعد۔

اس طرح دو سال گزر گئے لیکن لڑکے کو وہ دیکھ
نہ سکی۔ اس عرصہ میں لڑکے میں اچھا خاصہ تغیر ہوگیا تھا۔
پہلی مرتبہ اس کے لمبے قد، مردانہ خوبصورتی اور بھڑکیلے
کرتے کو (جس میں چمکدار پالش کی ہوئی گنڈیاں ٹکی ہوئی تھیں)
دیکھ کر مشکل ہی سے پہچان سکی۔ لڑکا اس کو دیکھا لیکن انجان
اور … مغرورانہ انداز سے
اس کے برابر سے گذر گیا۔ اس غم سے وہ
دو تین دن تک مسلسل روتی رہی۔ اور اس وقت سے اس
نے ہمیشہ کے لئے ایک جان لیوا دکھ مول لیا۔

ہر سال وہ اس راستہ سے اس کے قریب سے ہوکر
گزرتی مگر اس کو کبھی جسارت نہ ہوتی کہ اس سے ملے یا سلام کرے
وہ لڑکا کبھی اس بیڈھنگا و غلط … اٹھانا بھی گوارا نہ کرتا تھا!
اب اس (عورت) کی محبت جنون کے درجہ کو پہنچ چکی تھی!
اس نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا "ڈاکٹر صاحب!
حقیقت تو یہ ہے کہ اب نہ کسی دوسرے کا میرے دل میں
خیال ہے اور نہ میرے لئے دنیا میں کسی دوسرے کا وجود۔
جب اس کے ماں باپ مر چکے تو اس نے تنہا اپنے آبائی
پیشہ کو جاری رکھا۔ مگر اب اس کے پاس بجائے ایک کے دو
کتے تھے۔ — دو ڈراونے کتے — جن کو دھتکارنے
کی کسی کو بھی ہمت نہ ہوتی تھی

ایک مرتبہ جب وہ اس گاؤں کو واپس ہوئی جہاں اس
کی محبت کی ابتدا ہوئی تھی۔ اس نے ایک دوشیزہ کو چوکے
کی دکان سے باہر آتے دیکھا وہ اس کے محبوب کے گلے میں
ہاتھ ڈالی ہوئی تھی۔ ان دونوں کی شادی ہو چکی تھی۔
اب وہ چوکے کی بیوی تھی۔

اسی دن شام میں وہ محبت کی دیوانی شہر کے ایک حوض
میں کود پڑی ایک شب گرد … نے اس کو باہر کھینچ نکالا
دوا ساز کی دوکان پر لے لیا تو اسے جو نسوانی لباس میں
تھا اس کے معالجہ کے لئے پیچھے آیا، اجنبی بنا ہوا اس کے لیے
کپڑے جدا کیا اس کے جسم میں گرمی پیدا کرنے کے لئے مالش کی
اور کرخت آواز میں کہا "تم کس قدر دیوانی ہو! تم کو ایسی حماقت
حرکت نہ کرنی چاہئے تھی۔"

یہ الفاظ اس کو ہمیشہ تک زندہ رکھنے کے لئے کافی تھے۔
لڑکے نے اس سے بات کی تھی — محض اس خیال نے اس کو
ایک زمانے تک خوش رکھا۔ چوکے اس مدت کا کوئی معاوضہ
لینا نہیں چاہتا تھا لیکن اس نے اپنی خواہش سے اس کا معاوضہ
ادا کر دیا۔ اس طرح اب اس کی زندگی کے دن گزرنے لگے۔
وہ چوکے کے آستانہ میں نوکر ہوکر کرسیاں درست کرتی تھی۔
اس نے مختلف قسم کی معمولی معمولی دوائیں اس کی دوکان سے
خریدنی شروع کیں اس حیلہ سے وہ اس کے قریب ہو جاتی
… گفتگو کرتی … اور اس ذریعہ سے
اس کو کافی رقم دیتی رہتی۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کر دیا ہے
اس نے گزشتہ موسم بہار میں انتقال کیا۔

اپنی یہ غلطیں بتا چکنے کے بعد اس نے مجھ سے التجا کی کہ اس کی زندگی کی ساری پس ماندہ رقم جو کے کو پہنچا دوں جس سے اس نے اس قدر صبر و تحمل کے ساتھ محبت کی تھی۔ اسی کے لئے تنہا اس قدر محنت و مشقت سے کام کیا تھا۔ حتیٰ کہ کئی مرتبہ فاقے کئے۔ مگر پیسے جمع کرتی رہی —— محض اس امید پر —— صرف اسی آس پر —— کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا محبوب کم از کم —— ایک مرتبہ —— "صرف ایک مرتبہ" —— تو اس کو یاد کرے گا۔ اس نے مجھے دو ہزار تین سو ستائیس فرانک دئے جب وہ آخری سانس لے کر دنیا سے چل بسی تو میں نے اس رقم میں سے ستائیس فرانک کفن اور دفن کے لئے پادری کے حوالے کئے۔ اور باقی رقم اپنے پاس رکھ لی۔

دوسرے ہی دن میں جو کے سے ملنے گیا۔ وہ لوگ ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہوئے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔

وہ موٹے تازے صحت مند، مغرور، اور بظاہر قانع معلوم ہو رہے تھے۔ دکان میں مختلف قسم کے رنگین خوشبودار اور معطر ادویہ رکھی ہوئی تھیں۔ انھوں نے مجھے کرسی دی اور شربت کا گلاس پیش کیا۔

شربت پیتے ہوئے اب میں نے اپنی اصل گفتگو ایک خاص آواز میں جو جذبات سے پر تھی اس طرح شروع کی۔ مجھے قوی امید تھی کہ وہ لوگ سن کر رو دیں گے۔ لیکن جب جو کے کو یہ معلوم ہوا کہ اس آوارہ گرد لڑکی نے اس سے محبت کی تھی —— اس بید بننے والی نے —— تو اس نے اس بات کو اپنی تذلیل خیال کیا اور ایسا محسوس کیا گویا کسی نے اس کی عزت، شہرت اور شخصی وقار چھین لیا ہے۔ یہ چیزیں اس کے نزدیک نہایت ہی نازک اور جان سے زیادہ عزیز تھیں اس کی بیوی بھی اس کے مانند طیش میں آکر بار بار چیختی تھی "وہ بھکارن" —— وہ "بھکارن"۔ جو کے کھڑا ہو گیا اور میز کے ادھر ادھر لمبے لمبے قدم ڈال کر ٹہلنا شروع کیا۔ اس کی ٹوپی ایک طرف ڈھل کر کان پر آگئی تھی۔ پھر اس نے ہکلاتے ہوئے کہا "ڈاکٹر! کیا آپ نے سمجھا! یہ بھی ایک خوفناک بلا ہے جو انسان پر نازل ہوا کرتی ہے۔ ایسی صورت میں کوئی شخص کیا کر سکتا ہے؟ اگر میں پہلے ہی اس کی زندگی میں اس بات سے واقف ہو جاتا تو میں اس کو پولیس کے ذریعہ گرفتار کروا کر قید خانہ بھجوا دیتا۔ اور میں اس کا یقین دلاتا ہوں کہ وہ قید سے کبھی رہائی نہ پا سکتی تھی۔"

میں اپنے اس نیک کام کے نتیجہ کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ مجھے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا کہ کیا کروں یا کیا کہوں —— مگر پھر بھی میں مجھے اپنا فرض ادا کرنا ضروری تھا۔ اس لئے میں نے کہا "اس لڑکی نے مجھے وصیت کی ہے کہ میں اس کی تمام جمع شدہ رقم جو دو ہزار تین سو فرانک ہے آپ تک پہنچا دوں اور اب تک جو کچھ میں نے آپ سے کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کو گراں گزرا۔ اسی لئے بہتر تو یہ ہوگا کہ یہ ساری رقم غریبوں کو خیرات کر دی جائے۔"

یہ سن کر ان دونوں نے حیرت سے میرا منہ تکنا شروع کیا۔ میں نے اپنی جیب سے رقم نکالی جو ہر ملک اور ہر دار الضرب کے سونے اور تانبے کے سکوں کا ایک اچھا خاصہ مجموعہ تھی۔ میں نے جو کے سے دریافت کیا "آپ کا کیا فیصلہ ہے" لیکن اس کی بیوی نے فوراً ہی کہنا شروع کیا "خیر چونکہ اس عورت کی یہ آخری خواہش تھی اس لئے میرا خیال ہے کہ ہم لوگ مشکل سے انکار کر سکیں گے"

اس کے شوہر نے کچھ شرمندہ ہو کر کہا "ہم اس رقم سے اپنے بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ خرید لیا کریں گے" میں نے بہت دکھے پن سے جواب دیا "جو آپ چاہیں"

پھر اس نے دوبارہ کہا "ہاں ٹھیک ہے اب ہم کو رقم لے لینا چاہئے کیونکہ اس نے آپ سے ایسا ہی کرنے کو کہا ہے۔ ہم کو بہتیرے ایسے موقعے مل سکتے ہیں جہاں ہم اس رقم کو نیک کام میں لگا سکتے ہیں"

میں نے رقم ان کے حوالے کردی سلام کر کے چلا آیا۔

دوسرے دن چوکی مجھے ڈھونڈھتا ہوا آیا اور بہت رکھے پن سے کہا "اس ـــــ اس عورت نے اپنی بنڈی بھی یہاں چھوڑی ہے۔ آپ وہ بنڈی لے کر کیا کریں گے؟"

"کچھ نہیں آپ چاہیں تو لے جا سکتے ہیں"

"ٹھیک! یہی تو میں چاہتا تھا۔ میں اس سے اپنے باغ کے باورچیخانہ کا سائبان بناؤں گا"

جب وہ جانے لگا تو میں نے اس کو واپس بلایا اور کہا "اس نے اپنا گھوڑا اور دو کتے بھی چھوڑے ہیں کیا آپ ان کو بھی لے جائیں گے؟"

وہ تھوڑی دیر رکا اور گھبرا کر کہا "نہیں نہیں! میں ان کو لے کر کیا کروں گا۔ آپ جس طرح چاہیں ان کا استعمال کر سکتے ہیں"

میں نے دو کتوں کو اپنے پاس رکھ لیا اور باورچی نے جس کے پاس چرائی کے لئے کافی زمین تھی گھوڑا رکھ لیا۔ چوکی اب بھی بنڈی کا سائبان بنا کر استعمال کر رہا ہے۔ اور اس رقم سے اس نے ریلوے کے پانچ حصے خریدے ـــــ

گہری محبت کا صرف یہی ایک واقعہ ہے جس سے مجھے اپنی زندگی میں سابقہ پڑا"

ڈاکٹر خاموش ہوگیا۔

اب مارکوئیس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بے شک! صرف عورت" ہی جانتی ہے کہ "محبت" کس طرح کی جاتی ہے ـــــ لیکن ـــــ "ایک مرتبہ"

موپساں (ترجمہ)

قمر جہاں (عثمانیہ)

سوز ناتمام

کیفِ ذوقِ حسن اتنا بڑھ گیا ـــ روحِ گل بھی خار بن کے رہ گئی

ہر تمنا نذرِ غم ہو کے رہی ـــ ہر خوشی اک خواب بن کے رہ گئی

اس نے دیکھا اور یوں دیکھا مجھے ـــ "ہر تمنا خواب بن کے رہ گئی"

دل کی دھڑکن بھی کسی کے سامنے ـــ دور کی آواز بن کے رہ گئی

آرزو نے زندگی میں اے نظر ـــ زندگی خود راز بن کے رہ گئی

نظر

شبابیات

ہر سانس میں عمر جاودانی آئی
آئی آئی وہ زندگانی آئی
تاروں کی سبز چھاؤں میں کھولے ہوئے بال
وہ جھومتی بدمست جوانی آئی

موسیقی میں ڈوبا ہوا پنگھٹ توبہ
بستی کی کنواریوں کا جمگھٹ توبہ
سورج کی شعاعوں میں نہانے کے لئے
تاروں کا اتر آیا ہے جھرمٹ توبہ

سوئی ہوئی کلیوں کو ہنسا کر جاؤ
ہر سانس کو ہنگامہ بنا کر جاؤ
ہنگام سحر ڈوبنے والے تارو
سورج کی شعاعوں کو جگا کر جاؤ

دنیا کی ہر اک چیز کو ٹھکراتی ہیں
دنیا کی ہر اک چیز سے ہٹ جاتی ہیں
جس دن سے نگاہوں میں سمایا ہے کوئی
اس دن سے نگاہیں مری اتراتی ہیں

میکش

بچوں سے

سب ننھی بھائیو اور بہنو!!

ٹھیک ایک ماہ بعد پھر ہم آپ سے باتیں کر رہے ہیں۔ جولائی کا پرچہ دیکھ کر آپ لوگ خوش ضرور ہوئے ہوں گے آخر ہم کو ہی صفحات زیادہ کرنے پڑے مگر قیمت میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ امید کہ سب ننھی بھائی اور بہنیں اس طرف توجہ کریں گے اور سب ہی کے خریداروں میں اضافہ کریں گے جو زیادہ خریدار بنائیں انھیں ہماری طرف سے انعام بھی دیا جائے گا۔ جس طرح ۱۶ سے ۲۴ صفحات ہوئے کیا عجب ہے کہ اس میں تصویریں بھی شامل رہیں۔

اس ماہ ہم کو مندرجہ ذیل کے کوپن وصول ہوئے۔ (۱) ذکیہ زیدی (۲) سلطان النساء بیگم (۳) محمد عارف علی انصاری مگر ہر ایک کا مشغلہ جدا جدا ہے اس لئے اس ماہ پتے نہیں دے سکتے۔ آپ کی خط و کتابت برابر اسی وقت ہوگی جب ہر ایک سب ننھی بھائی اور بہن اس میں حصہ لے۔ یعنی کوپن پر کرکے بھیجے۔ اس کے لیے ہم نے کوئی فیس وغیرہ بھی نہیں رکھی۔ گذشتہ پرچہ میں خط و کتابت کے فائدے لکھے گئے تھے۔ آپ نے ضرور پڑھا ہوگا۔ پھر ایک بار پڑھیے اور کوپن پر کرکے بھیج دیجئے۔ دیکھیں اس ماہ کتنے کوپن وصول ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کے زیادہ ہوتے ہیں یا لڑکوں کے۔ پھر ایک بار کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک جتنے کوپن وصول ہوئے ہیں ان میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ بھائیوں سے ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ بہنوں سے ہمیشہ آگے رہنے کی کوشش کریں گے۔ اور بہنوں سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ اسی طرح بھائیوں سے ہمیشہ بڑھی ہوئی رہنے کی کوشش کریں گی۔ دیکھیں ہمارے اس جملہ کا کس پر زیادہ اثر ہوتا ہے۔ گذشتہ مہینے جن بہنوں کے پتے دیے گئے تھے وہ برابر ایک دوسرے سے خط و کتابت کر رہی ہیں۔ ان کے خطوط کی نقلیں ہمارے پاس آچکی ہیں۔ انشاء اللہ کسی پرچے میں شائع کردیں گے۔ آپ کا کوئی نہ کوئی مشغلہ ضرور ہوگا۔ بیکاری اور فرصت کے وقت آپ ضرور کچھ نہ کچھ کرتے ہوں گے۔ اگر واقعی آپ کا کوئی مشغلہ نہیں تو مطالعہ تو ضرور کرتے ہوں گے بس اپنا محبوب مشغلہ مطالعہ لکھ دیجئے۔ چند مشغلے دیے جاتے ہیں اگر آپ کا کوئی مشغلہ نہیں تو اس میں سے کوئی مشغلہ پسند کر لیجئے۔

کھیل، مونو گرام، پھول پتے، پر دے تیار، جمع کرنا، تصویر کشی، مطالعہ

معین الدین احمد انصاری

میرا خواب

رات کے کوئی آٹھ یا نو بجے ہوں گے۔ میں اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میری آنکھ لگی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ میں اپنے کمرے میں کتابوں کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ اتنے میں بھائی جان نے آہستہ آواز میں کہا تم کو پپا بلا رہے ہیں۔ میں نے یہ سنتے ہی کہا کہ پپا کہاں ہیں۔ انھوں نے جواب دیا وہ اپنے کمرہ میں تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔ میں یہ سنتے ہی ان کے پیچھے چل پڑی۔ انھوں نے مجھے پپا کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا اور خود چلے گئے پپا نے مجھ سے کہا کل ہم لوگ بمبئی جا رہے ہیں یہ سنتے ہی میں خوشی سے اچھل پڑی۔ اور میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ وہی اپنا کمرہ ہے اور وہی بستر نہ بھائی جان ہیں نہ پپا۔

سعیدہ میر تراب علی خاں

(محبوبیہ گرلز اسکول)

انقلاب

سلطان گلشن میں آج شان دار دعوت تھی۔ میں کپڑے پہن کر
باہر نکلا ہی تھا کہ دروازے کے سامنے ایک آدمی کو کھڑا ہوا
دیکھا۔ کپڑوں اور چہرے سے صاف مفلسی کا اظہار ہو رہا تھا۔
اس نے سامنے آکر عاجزی اور دکھ بھری آواز میں کہنا
شروع کیا۔

"حضور کئی روز سے بھوکا ہوں۔ مدرسے میں پڑھتا تھا۔
ساتھیوں نے جھوٹی شکایتیں کر کے مدرسے سے نکلوا دیا ہے۔
کچھ دے دیجئے۔ عنایت ہوگی تاکہ دوبارہ کسی مدرسے میں
شریک ہو جاؤں۔"

میں نے اس کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ مجھے یقین ہو گیا
میں نے اس کو کہیں ضرور دیکھا ہے۔ آخر مجھے یاد آ گیا اور
میں نے کہا۔

"کیوں جی تم مجھے بھی دھوکا دیتے ہو، پرسوں ہی کالج
میں تم نے مجھے کہا تھا کہ میں مسافر ہوں صرف ٹکٹ دلوا دیجئے
چلا جاؤں گا، میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ مجھ کو خیال آیا کہ میں نے
کل اس کو چوک میں بھی دیکھا تھا" سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے
کہا "کل تم ہی چوک میں بے ہوش پڑے تھے نا! ہوش میں
آنے کے بعد تم نے مجمع کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا" "میں شفاخانے میں
زیر علاج تھا۔ اب مجھ کو دواخانہ سے نکال دیا گیا ہے۔
آپ حضرات میری مدد فرمائیں"

"کیوں وہ تم نہیں تھے؟"

میں نے نظر اٹھا کر اس کو دیکھا۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ
رہا تھا۔

"نہیں حضور میں طالب علم ہی ہوں۔ تندرست ہوں۔ کل
چوک کو گیا ہی نہیں۔ سچ کہتا ہوں"

میں اس کو دھکا دے کر آگے بڑھنا چاہتا ہی تھا کہ اس نے
بڑھ کر میرا دامن پکڑ لیا۔ اور روتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"میرا باپ شہر کا مشہور تاجر تھا اور اس کا میں اکلوتا لڑکا
ہوں۔ اس کے مرنے کے بعد میں دوکان کا وارث قرار پایا۔
دولت کی کچھ کمی نہ تھی۔ میں صبح سے شام تک دوکان پر رہتا
رات کو گھر آکر اپنی ضعیف ماں کی خدمت کرتا۔ میری محنت
اور ماں کی دعاؤں سے تجارت میں دن دونی رات چوگنی
ترقی ہونے لگی۔ اور میں بہت مشہور ہو گیا۔ اب ... اب"
اس کے بعد اس کی ہچکی بندھ گئی آنکھوں سے گرم گرم
آنسو ٹپکنے لگے۔ اس نے اپنی پھٹی ہوئی آستین سے آنسو پونچھ کر
کہنا شروع کیا

"میری اس ترقی کرتی ہوئی دولت کو دیکھ کر ایک میری دوستی
کا دم بھرنے لگا۔ میں زمانے کے عیب و ہنر سے ناواقف ان کی
منہ مانگی مرادیں پوری کرتا چلا گیا۔ یقین مانئے دوستوں کی
خوشنودی کے لئے میں اپنی خواہشات اور تمناؤں کی بھینٹ چڑھایا
کرتا تھا۔ اور ان کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتا تھا۔
دوست احباب کا دن رات گھر پر اجتماع رہتا۔ عیش و سرود
کی محفلیں گرم ہوتیں کوئی تھیٹر کوئی چائے خانہ کوئی سینما گھر
ایسا نہ تھا جہاں میرے ہمراہ دو چار دوست سایہ کی طرح نہ
رہتے ہوں۔ مختصر یہ کہ ہر روز روز عید اور ہر رات شب برات
تھی۔ ان ہی دوستوں کی صحبت نے مجھے شراب کی لت ڈال دی۔ میری
... ناتواں ماں مجھے منع کرتی اور کہتی۔ بیٹا یہ دوستی تمہاری
بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ یہ دوستی کے نقاب میں ... مسرت کے
ساتھی ہیں۔ کوئی دوست تمہارے آڑے وقت میں کام
نہیں آتا۔"

دنیا بدنیا بدلتی گئی۔ ... میری ماں تھی لیکن میں نے
نادانی سے ان نصیحتوں کو لاپرواہی سے ٹھکرا دیا۔ ان کی نصیحتیں

صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔ مجھ کو دوستوں پر کامل اعتماد تھا۔"

اس نے ایک آہ سرد بھری ...... اور کہا میری
یہ بھول تھی میں نے سخت غلطی کی۔ .... ع

"غرض کے بندے تھے دوست سارے جو دم محبت کا بھر رہے تھے
نہ تھا طلب گار کوئی میرا سب اپنی خواہش پہ مر رہے تھے"

یکایک میری "مسرتوں کی دنیا" مجھ سے چھین لی گئی اور رنج و غم
نے ان کی جگہ لی

قسمت نے پلٹا کھایا۔ دولت و ثروت تو جا ہی چکی تھی قدرت
نے میری پیاری ماں کو بھی مجھ سے چھین لیا ...آہ

دنیا میں اب ... اب میرا کوئی نہیں ہے
کوئی مونس نہیں غمخوار نہیں یار نہیں
بس ہوں اور شام و سحر گوشۂ تنہائی ہے

میں نے قدرت کے خلاف بغاوت کرنی شروع کی غم غلط کرنے
کے لئے میں رات دن شراب پینے لگا۔ کوئی مجھ کو نوکر نہیں
رکھتا ... بھوکا ہوں تو کھاؤں کہاں سے
سرکار ..." مجھ کو اس کی حالت پر رحم آنے لگا۔ تجارت کا
خسارہ ... ہوس کی بے وفائی ... دوست کی کنارہ کشی۔ ماں کی
موت ... کا یہ عالم۔ ان حالات پر میں نے غور کرنا شروع
کیا۔ میرا دل بھر آیا۔

میں نے کہنا شروع کیا

"میں تم جیسے شرابی کی کوئی مدد نہیں کرسکتا"

اس نے نہایت لجاجت سے کہنا شروع کیا۔

"نہیں سرکار اگر میں شراب پینا چھوڑ دوں تو"

ہاں، تب میں تمھاری مدد کرسکتا ہوں۔

اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ "میں آئندہ سے شراب کبھی
نہ پیوں گا۔"

"تمھارا نام کیا ہے" میں نے دریافت کیا۔

"حضور غلام کو یونس کہتے ہیں۔"

میں نے اپنے ملازم اسلم کو آواز دی۔ "دیکھو اسلم" میں نے
کہا "ان کو گاڑی نکال کر دو یہ صاف کریں گے۔"

اسلم اسے گاڑی خانہ کی طرف لے گیا۔ لیکن وہ اس پر عجیب
نظریں ڈال رہا تھا۔ وہ گاڑی خانہ کا دروازہ کھول کر اندر
چلا گیا۔

یونس زمین پر بیٹھ گیا اور کچھ سوچنے لگا!

اسلم نے گاڑی نکال کر سامنے کھڑی کردی یونس گاڑی کو صاف
کرنے لگا۔

میں نے باغ جاتے ہوئے ایک روپیہ اسلم کی طرف پھینک کر
کہا اسے دیدو اور کہو کہ ہر چوتھے روز آجایا کرے۔

اب یونس چوتھے پانچویں دن آجاتا کبھی گاڑی صاف کرتا
کبھی لکڑیاں چیرتا کبھی فرش صاف کرتا اس کے معاوضہ میں
اس کو کبھی پیسے اور کبھی کھانا یا کپڑے مل جاتے۔

سلطان عثمان سے واپس ہونے کے بعد خالد کے اصرار پر تفریحاً
سیر و شکار کی خاطر حیدرآباد جانا پڑا اسٹیشن تک یونس بھی اسباب کے ساتھ آیا۔

میں نے کہا "اچھا یونس اب تم شراب نہیں پیتے اور میرے کہنے کا
تم نے کافی اثر لیا ہے۔ ہر کام محنت اور دل جمعی سے کرتے ہو۔
تمہیں معلوم ہے کہ میں جاگیر جارہا ہوں۔ اس لئے میرے ایک
بھائی کی دوکان میں کام کرو۔ یہ خط تم انھیں دیدینا
وہ تمھاری ہر طرح مدد کریں گے۔ اور جو کام وہ بتائیں محنت سے کرنا"

اتنے میں انجن نے سیٹی دی جب گاڑی کو حرکت شروع ہوئی تو
یونس نے مجھ کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں
آنسو ڈبڈبا رہے تھے اس نے رکتے رکتے الفاظ میں کہا "میاں
... پھر کب ... ملنے گا ... یونس ... کو ... بھولنا
نہیں ......"

میں نے کہا نہیں یونس گھبراتے کیوں ہو۔ بہت جلد ملوں گا۔

مجھ کو بھائی سے اطمینان ہے وہ ہر طرح تمھاری مدد کریں گے۔
میں ان کو خط لکھا کروں گا تم مطمئن رہو۔
جب گاڑی روانہ ہوئی تو مجھے فخر تھا کہ میں نے ایک حیوان کو انسان بنا دیا ہے۔
ٹرین میں خالد، رشید، محمود، حامد کے علاوہ مسلم یونیورسٹی کے بعض طلباء بھی سفر کر رہے تھے۔
خالد نے یونس کے متعلق دریافت کیا کہ یہ کون تھا کب کا شناسائی ہے اور آپ کو اس سے اس قدر ہمدردی کی کیا ضرورت تھی۔
میں نے پورے واقعات سنائے وہ سن کر بہت دیر تک "انقلاب" انقلاب کے نعرے بلند کرتے رہے۔
اس اثناء میں مجھ کو رہ رہ کر یونس کا خیال آتا رہا۔
کچھ مدت کے بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ بھائی نے یونس کے لئے ایک علٰحدہ دکان قائم کر دی تھی اور اس قلیل عرصہ میں یونس نے اپنا قرضہ بھی ادا کر دیا۔
اب دکان کا تنہا مالک یونس ہی تھا۔

میں خرید و فروخت کے لئے بازار گیا۔ کالج کے سامنے ایک دکان نظر آئی مالک دکان پر نظر پڑی۔
او ہو یہ تو یونس ہے میں اس کے نزدیک گیا اور کہا "یونس اچھے تو ہو"
اچھا ہوں خدا کا شکر ہے۔ آج کل دکان کی کافی آمدنی ہے۔
مجھے بڑی خوشی ہوئی میں نے فخر کرتے ہوئے کہا "میں نے ہی تمھیں انسان بنایا ہے نا!" کیوں یاد ہے۔
یونس نے کہا "جی ہاں! اچھی طرح یاد ہے اگر آپ اس وقت میری مدد نہ کرتے تو اب بھی آپ کو مسافر یا طالب علم ہی بتاتا میں آپ کا زندگی بھر احسان نہ بھولوں گا۔
نہیں یونس یہ تو میرا فرض تھا۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔
اب میں اپنے کالج کے ساتھیوں کو مجبور کرتا کہ وہ یونس کی دکان سے مال خریدیں۔ معاملہ کی صفائی دیانتداری واجبی قیمت اور رکھ رکھاؤ کی وجہ کاروبار میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ پھر تو بازار میں یونس کی خوش معاملگی کی خاصی شہرت ہوئی۔ اس کی ماں کی دعائیں بارگاہ رب العزت میں مقبول ہو گئیں۔

سید عبدالعزیز قادری عزیز
(ن کاث)

جواہرات

۱۔ زندگی کی شاہراہ پر انسان ہزاروں قدم اٹھاتا ہے اور سیکڑوں منزلیں طے کرتا ہے۔ مگر وہ ایک غلط قدم صرف ایک غلط سانس، کبھی کبھی اس کی مادی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے۔ (شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم)

۲۔ قوموں اور زبانوں کی تاریخ ایک دن میں نہیں بنتی ان کا مادہ ہزاروں سال بنتے اور ان کی صورت پکڑتے صدیاں لگتی ہیں۔ (علامہ سلیمان ندوی)

۳۔ اگر ادب انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہو تو وہ ناکام اور ناتمام رہے گا۔ (ملٹن)

۴۔ زبان کا کوئی وطن نہیں۔ اس کی کوئی ذات نہیں جو کوئی بھی اسے بولے زبان اس کی ہے چاہے وہ کہیں کا ہو اور کوئی ہو۔ (عبدالحق)

۵۔ کسی ملک کی ادبی زندگی کا راز معلوم کرنا ہو تو اس ملک کی قومی زبان کے افسانے پڑھو۔ (انگریزی کہاوت)

سید اشرف حسین

لومڑی اور کوّا

کسی کوّے کو ایک چھوٹا سا
مل گیا گوشت کا کہیں ٹکڑا

بیٹھا اک شاخ پر درخت کی جا
چونچ میں گوشت کو دبایا ہوا

ایسے میں ایک لومڑی بھوکی
اس شجر ہی کے پاس سے گذری

دیکھا کوّے کو پیڑ پر بیٹھا
گوشت کا اس کے منہ میں ہے ٹکڑا

بیٹھی یہ نیچے پیڑ کے جا کر
سوچی کوّے سے گوشت لوں کیونکر

کہا کوّے نے پھر کھڑے ہو کے
راجا میری بھی بندگی لیجیے

کہئے کیا مزاج آپ کا ہے
بعد مدت کے آج دیکھا ہے

کیا ہی دلکش ہے آپ کی آواز
کہیں ایسی نہیں سنی آواز

کل بہت گا رہے تھے راجا جی
آج بھی کچھ نظر ہو کرپا کی

آئی ہوں دور سے سنا دیجیے
اپنی آواز تاکہ دل بہلے

لومڑی سے جو کوّے نے یہ سنا
ہوگیا خوش کہ بن گیا راجا

پیڑ پر کائیں کائیں کرنے لگا
گوشت کا منہ سے گر گیا ٹکڑا

لومڑی اس کو لے اٹھا جلدی
"دُہن ہو راجا جی" کہہ کے چلتی بنی

جا کے جنگل میں چٹ کیا ٹکڑا
کوّا بس کائیں کائیں کرنے لگا

ہے نتیجہ برا خوشامد کا
خود غرض کا نہ کھاؤ تم دھوکا

سنو فیّاض کی نصیحت کو
جو خوشامد کرے تم اس سے بچو

ابوالفیض فیّاض
(دیوہ کنندہ)

میرا محبوب مشغلہ

عزیز بہن بھائیو! جس طرح دنیا میں لاکھوں آدمی بستے ہیں لیکن باوجود اس کثیر تعداد میں ہونے کے ان تمام کی صورتیں اور ڈیل ڈول جدا جدا ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ہر شخص کے خیالات اور شغل بھی جدا ہوتے ہیں۔ ہر ایک کی ذہنیت اور فطرت ایک دوسرے سے مختلف ہوا کرتی ہے اس کی مثال بالکل ویسے ہی ہے جیسے ہر ایک پھول میں جدا رنگ و بو ہوا کرتی ہے۔ اسی طرح دنیا کے رہنے والے کے مشاغل اور مصروفیت بھی اس کی ذہنیت اور اس کی فطرت و ذہنیت کے مطابق ہوا کرتے ہیں کسی کو کوئی چیز پسند ہوتی ہے تو کسی کو کوئی ایک شخص سپاہ گری کے فن سے دلچسپی رکھتا ہے اس لئے کہ وہ ملک و قوم کی خاطر میدان جنگ میں بہادروں کی طرح لڑ کر جان دینا اپنی حیاتِ جاوداں سمجھتا ہے تو کوئی زبان اور قلم ہی سے تلوار کے جوہر دکھلانا اپنا مقصد حیات تصور کرتا ہے وہ اسی شغل میں منہمک ہوتا ہے اس لئے کہ اس کو اسی سے [illegible] دلچسپی ہوتی ہے کسی کو مطالعہ [illegible] ہر شخص کے مشغلے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔

اگر انسان پستی میں رہے تو کوئی پرواہ نہیں لیکن اس کے خیالات بلند ہونے چاہئیں۔ انسان ضعیف البنیاد، بحضرتِ آدم باوجود آب و گل میں ہونے کے اشرف المخلوقات کہلاتے ہیں تو کم از کم اشرف المخلوقات کہلانے کی لاج کو برقرار رکھنے کے لئے اس خاک نشین کے خیالات عرشِ معلی سے ٹکرائیں۔ خیالات اور عزم بلند ہوا اور یہی وہ ذہنی ارتقا ہے جس پر انسان کی کامیابی کا انحصار ہوا کرتا ہے نہ صرف یہ بلکہ انسان کے مشغلے اور مصروفیات اس کے خیالات اور ارادوں کے ایک حد تک حقیقی ترجمان ہوتے ہیں جس سے ہم بہ آسانی یہ پتہ چلا سکتے ہیں کہ اس انسان کا مقصدِ حیات کیا ہے۔ ہر انسان کا مشغلہ اس کی فطرت اور ذہنی لگاؤ کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ میں اوپر یہ بیان کر چکا ہوں کہ ہر انسان کے خیالات اور اس کے مشغلے جدا جدا ہوا کرتے ہیں۔ اور یہ ایک قدرتی چیز ہوتی ہے جس کی روک تھام ناممکن ہوا کرتی ہے جو انسان اپنی دھن کا پکا اور اپنے مقصد میں مستحکم ہوتا ہے وہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے تک اطمینان حاصل نہیں کر سکتا [illegible] نہ دنیا کی کوئی قوت اس کو [illegible] مقصد سے پھیر سکتی ہے۔ یہ تو ہی ایک [illegible] دنیا سے متعلق کہہ [illegible] میرا محبوب مشغلہ [illegible]

مطالعہ میرا محبوب ہی نہیں بلکہ محبوب ترین مشغلہ ہے۔ جس کے سہارے میرا بہت سارا زندگی کا وقت گذرتا ہے۔ یہی وہ جنسِ بہا دولت ہے جس کے حصول کے بعد میں اپنی کھوئی ہوئی دولت [illegible] دوبارہ حاصل کر لیتا ہوں مجھے اس مشغلے میں [illegible] مجھے روحانی غذا [illegible] [illegible] تنہائی پسند [illegible] ہوں مجھے [illegible] [illegible] مشغلے میں منہمک ہو گیا ہوں [illegible] سال سے جب سے میرا یہ مشغلہ جاری ہے [illegible] مجھے اس مشغلے نے سوائے اپنے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا [illegible] پہلے سے بھی زیادہ گوشہ نشین اور تنہائی پسند ہو کر رہ گیا میری یہ حالت [illegible] کسی نہ کسی کتاب یا رسالے کے مطالعہ میں گذرا کرتی تھیں اور اب بھی میں اسی مشغلے میں

کسی کتاب، رسالہ، اخبار کی ہمراہی میں آدھی رات کا چراغ جلایا کرتا ہوں۔

گو بظاہر میں دنیا والوں سے ملتا جلتا نہیں۔ لیکن دراصل اگر دیکھا جائے تو میں اپنے محبوب شغل کی وجہ سے دنیا والوں سے واقف ہوتا ہوں۔ اس لئے کہ گو میں تو ان سے ملتا نہیں مگر ہر اس دنیا والے سے غائبانہ طور پر ملاقات کیا کرتا ہوں جس کے دلی جذبات خیالات اور ارادے جنبش قلم میں ممور صفحۂ تحریر کے ذریعہ میرے سامنے آتے ہیں۔ یہی وہ بہترین ذریعہ اور میرا محبوب شغل ہے جس کی مدد سے میں دنیا والوں کے حقیقی خیالات سے ہم کنار ہوا کرتا ہوں۔ ان بیش بہا جواہر پاروں سے جو دنیائے ادب کے زریں صفحوں پر لکھے جانے کے مستحق ہیں۔ جن نایاب اقوال کو تاریخ عالم سنہری حروف سے لکھنا چاہے نہ صرف یہ بلکہ اپنے لوح دل پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کندہ کر لینا چاہیئے انہی ہاں انہیں سے، ایک زبردست درس حاصل کیا کرتا ہوں یہ شاید ہی مجھے کسی اور ذریعہ سے ایسے درس حاصل کرنے کا موقع ملے۔

یہ تو ایک مسلمہ امر ہے کہ ہر انسان کی تحریر اس کے دلی جذبات خیالات اور ارادوں کی حقیقی ترجمان، اس کی زندگی اور ماحول کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ انسان کے حقیقی خیالات اور جذبات "قلم کی نوک" سے ٹپک کر صفحہ کاغذ پر آیا کرتے ہیں۔ خواہ انسان کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے لیکن وہ اپنے خیالات اور ارادے اپنی تحریروں میں چھپا نہیں سکتا۔ جیسا کہ ایک مقولہ ہے۔ "حقیقت کبھی چھپائے سے چھپتی نہیں۔ مٹانے سے مٹتی نہیں"۔ حقیقت تو اسی کو کہتے ہیں جو کبھی نہ کبھی جلوہ گر ہو کر رہے۔ جس قدر اس کو مٹانے کی کوشش کریں اتنی ہی وہ بلند ہو کر رہے۔ میں دعوے کے ساتھ کہوں گا کہ دنیا کی ہر چیز مٹ سکتی ہے فنا ہو سکتی ہے۔ لیکن حقیقت اور کسی کی کوششیں کبھی نہیں مٹ سکتیں۔ کبھی کسی کی محنت برباد نہیں جا سکتی۔ ع "برباد کسی شخص کی محنت نہیں جاتی"

میرا شغل دنیا کے بہترین شغلوں کی صف میں بلاشبہ صف اول میں جگہ پا سکتا ہے۔ یہی وہ میرا محبوب شغل ہے جو تمام دنیا کے مشاغل کی فہرست میں سر فہرست جگہ حاصل کر سکتا ہے نہ صرف یہ بلکہ میں اپنے محبوب شغل کو انسانی زندگی کا جزو اعظم کہہ سکتا ہوں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ بغیر اس شغل کے انسان دنیا سے واقف نہیں ہو سکتا۔ اگر انسان کو مطالعہ کی عادت اور مطالعہ سے ذوق نہ ہو تو وہ دنیا کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا دوسرے گوشہ کی خبروں اور حالات کیسے معلوم کر سکتا ہے۔ ایک ملک والے دوسرے ملک کے واقعات سے کس طرح آگاہ ہو سکتے ہیں۔ ایک شخص دوسرے ناواقف شخص کے خیالات کا کیسے پتہ چلا سکتا ہے اگر آپ ان چیزوں کے خواہش مند ہوں تو میں یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ بغیر مطالعہ کے ان کو کسی طرح حاصل نہیں کر سکتے۔

آپ بغیر کسی اخبار یا رسالہ کا مطالعہ کئے یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ سلطنت برطانیہ آج کل کس حالت میں ہے اس کی معاشی، معاشرتی، تمدنی اور فوجی حالت کیا ہے۔ ہٹلر شیر کی طرح بھپرتا ہوا کس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ کس سلطنت کو ہضم کر جانا چاہتا ہے وہ کس قوم کو اپنی تلوار کے گھاٹ اتار کر اس کے خون کی ندیاں بہا دینا چاہتا ہے۔ اس کے مطالبات کیا ہیں "اشتراکی و نازی" جماعتوں کا برتاؤ اس کے ساتھ کیا ہے۔ مسٹر چیمبرلین کا اب کیا رنگ ہے۔ دنیا کی وہ کونسی قوم ہے جس کو ایک بڑی قوم بزدل کہا کرتی تھی۔ لیکن اس نے اپنی تلوار کے جوہر اور اپنی انتھک کوششوں سے بظاہر کر دکھایا کہ وہ بزدل نہیں بلکہ ایک بہادر اور مرد قوم ہے۔ یہی نہیں بلکہ مطالعہ کے ذریعہ ہم کو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ دنیا میں وہ کونسی بدنصیب قوم ہے جس کی گردن میں صدیوں سے غلامی کا فولادی طوق پڑا ہوا ہے۔ ان باتوں پر منحصر نہیں بلکہ دنیا کے تمام حالات صرف مطالعہ کے ذریعہ معلوم ہو سکتے ہیں۔ مطالعہ ایک ایسا آئینہ اور "جمشید کا جام جم" ہے جس میں دنیا کی ہر چیز صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔

زاہد

مینڈک اور چوہے کی کہانی

ایک مینڈک تھا اور ایک چوہا۔ مینڈک تالاب میں رہتا تھا۔ اور چوہا تالاب کے کنارے۔ دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی۔ جب مینڈک تالاب سے نکل کر خشکی میں آتا اور چوہے کے بل کے پاس آکر ٹر ٹراتا تو چوہا اس کی آواز سنتے ہی چیں چیں کرتا ہوا باہر آجاتا پھر دونوں کے دونوں اپنے سرسے سر جوڑے ہوئے گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔

ایک دن چوہے نے کہا کہ جب تم خشکی میں آکر مجھے آواز دیتے ہو تو میں فوراً سن لیتا ہوں۔ مگر جب میں تالاب کے کنارے آکر آواز لگاتا ہوں تو تمھارے کانوں تک نہیں پہنچتی۔ اس لئے کوئی ایسی ترکیب نکالو کہ میری بات تمھارے کانوں تک آسانی سے پہنچ جائے۔ دونوں کے دونوں دیر تک سوچتے رہے مگر کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد چوہا اُچک کر بولا کہ لاؤ ہاتھ! مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے۔ مینڈک نے کہا کہ وہ کیا؟ تو اس نے جواب دیا کہ وہ یہ کہ کہیں سے ایک ڈورا لائیں۔ اس کا ایک سرا میں اپنی ٹانگ سے باندھ لیتا ہوں اور دوسرا تمھاری ٹانگ سے باندھ دیتا ہوں جب ضرورت ہو ذرا ڈورا کھینچ دو۔ فوراً ہمیں خبر ہوجائے گی اس ترکیب سے مینڈک پریشان ہوا اور کہنے لگا کہ بھائی ٹانگ میں ڈورا باندھ کر کہیں مصیبت میں نہ پڑجائیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ کوئی اور ترکیب سوچو مگر چوہا کب سنتا تھا۔ مینڈک تو ٹراتا ہی رہا اور اس نے کہیں سے ڈوری لا اپنی اور مینڈک کی ٹانگ کس کر باندھ لی۔ پھر کیا تھا۔ ڈورے سے دونوں میں ہر وقت پیام سلام ہونے لگے۔ جب مینڈک کو ضرورت ہوتی تو وہ رسّی کھینچ کر چوہے کو بلا لیتا اور جب چوہے کو ضرورت ہوتی تو وہ ایک جھٹکا دے کر مینڈک کو بلا وا دیدیتا۔ اسی طرح مہینوں گذر گئے۔ ایک روز اتفاقاً ایک چیل اڑتی ہوئی آئی اور تالاب کے کنارے درخت پر بیٹھ کر ستانے لگی۔ اس نے چوہے اور مینڈک کی یہ انیچا تانی دیکھی تو منہ میں پانی بھر آیا وہیں

سب/س

گھات لگائے شاخ پر دبکی بیٹھی رہی۔ جوں ہی چوہا سوراخ سے باہر نکلا اور ڈورا کھینچنے کے لئے آگے بڑھا چیل بجلی کی طرح اس پر گری اور اسے پنجوں میں دبا کر لے اڑی۔ چوہا چیل کے پنجوں میں تھا اور چوہے کے ساتھ مینڈک دم چھلا بنا ہوا ڈوری میں لٹکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ لوگوں نے یہ کیفیت دیکھی تو چیخنا شروع کیا کہ دیکھنا چیل نے کس خوبی سے پانی میں گھس کر مینڈک کا شکار کیا ہے کہ وہ ڈوری میں بندھا ہوا ادھر چلا آ رہا ہے۔ مینڈک نے لوگوں کے منہ سے جب یہ بات سنی تو پکار پکار کر کہنے لگا کہ بھلا چیل کی کیا طاقت تھی جو مجھ تک پہنچ سکتی۔ ارے میاں یہ تو چوہے سے دوستی کرنے کا نتیجہ ہے کہ ایسی مشکل میں پڑے۔ اگر اس کے بدلے میں کسی پانی کے جانور سے دوستی کر لیتا تو مجھے یہ مصیبت نہ بھگتنی پڑتی۔

روشن جہاں عصمت

بڑھے گی غریبوں میں عزت تمہاری

اگر قوم کی ہے ترقی کی خواہش — سنو کان دھر کے ہماری گذارش

غرور و ہوس کا نمونہ امیری — بڑھی اس سے ہندوستاں میں فقیری

تونگر وہی ہے جو رہتا ہے قانع — غریبوں کی خدمت نہ ہو جس کو مانع

غریبوں سے ہنس ہنس کے کرتے ہیں نفرت — سمجھتے ہیں اپنے کو حق دار دولت

سزاوار ان کو امیری نہیں ہے — جنھیں عادت دستگیری نہیں ہے

تونگر غریبوں پہ کیوں نکتہ چیں ہیں — غریبی کسی کا گنہ تو نہیں ہے

بھرے ہیں جو دولت سے تم نے خزانے — کرو قائم اس سے یہاں کارخانے

گھٹے گی نہیں اس سے دولت تمہاری — بڑھے گی غریبوں میں عزت تمہاری

غریبوں کو محنت کا پیسہ ملے گا — دکانوں پہ سودیشی سودا ملے گا

ترقی ہے قوم و وطن کی اسی سے — بہاریں ہیں اپنے چمن کی اسی سے

جو گہرائیوں میں یہ پانی رواں ہے — کرو اس سے سیراب صحرا جو یاں ہے

مسز برکت رائے

بادشاہ پرستی اور ترقی

ہمارے ہندوستان کے ایک بہت بڑے آدمی جاپان کی سیر کو گئے تھے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں "مختلف مدارس کے لڑکوں سے جن میں کوئی چھوٹی کوئی بڑی عمر کا تھا میں نے سوال کیا کہ تمہاری زندگی کی سب سے بڑی آرزو کیا ہے۔ اس سوال کا جواب ہمیشہ یہی ملا کہ حضرت ہماری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ ہم کو اپنے ملک اور اپنے شہنشاہ کی شان و عظمت کے لئے اپنی جان قربان کرنے کا موقع حاصل ہو" یہ جواب ہمیشہ ایسے خلوص سے دیا گیا کہ مجھ کو وہ بہت ہی موثر معلوم ہوتا تھا۔

پیارے بچو! اس مضمون میں تم کو جاپان کے ایسے چند بچوں کے حالات بتائے جاتے ہیں جنھوں نے موقع ملنے پر اپنی اس آرزو کو سچی ثابت کر دکھایا۔ جاپان کے لوگ اپنے بادشاہ کی بہت عزت و تعظیم کرتے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے عقلمندوں کا خیال ہے کہ جاپان کی ترقی کا راز ان کی اس بادشاہ پرستی کے جذبہ میں مضمر ہے۔ اپنے شہنشاہ کی بزرگی اور ادب کا ان کو یہاں تک خیال ہے کہ وہ اس کا چہرہ ڈاک کے ٹکٹوں اور اپنے سکوں پر بنانا مناسب نہیں سمجھتے۔ کیونکہ یہ چیزیں استعمال کرنے سے بگڑتی اور خراب ہوتی ہیں اس لئے اگر ان پر بادشاہ کی مورت بنائی جائے تو وہ سخت بے ادبی اور توہین سمجھتے ہیں۔

ایک مرتبہ گاؤں کے ایک پٹیل نے جس کو اپنے بادشاہ کا خطابی نام معلوم تھا، کسی بچے کا نام بونسی ہے تو رکھنے کی اجازت دیدی اور یہی نام اپنی کتاب میں بھی لکھ لیا۔ لیکن جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ جاپان کے موجودہ شہنشاہ کا اصلی نام یہی ہے تو اس کو بہت رنج ہوا اور اس نے فوراً خودکشی کرلی۔ اس سے بھی زیادہ قابلِ تعریف واقعہ یہ ہے کہ ایک وقت ایک مدرسے کی عمارت کو آگ لگی۔ چونکہ جاپان کی اکثر عمارتوں میں لکڑی زیادہ استعمال کی جاتی ہے اس لئے آگ کے شعلوں نے بہت جلد پوری عمارت کو گھیر لیا۔ بہت سے لوگ کھڑے ہوئے دیکھ رہے تھے کہ ایک لڑکا ان شعلوں میں داخل ہوا اور تھوڑی دیر بعد اس لڑکے کو مدرسے کی دوسری منزل کے برآمدے میں دھڑام سے گرتے ہوئے لوگوں نے دیکھا جب سیڑھی لگا کر اس کی نعش کو نیچے اتار لیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس لڑکے کا پیٹ چیرا ہوا ہے۔ غور سے دیکھا گیا تو پیٹ میں ایک تصویر بھی نظر آئی۔ یہ تصویر جاپان کے شہنشاہ کی تھی۔ اب لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ لڑکا مدرسے کے ہیڈ ماسٹر کے کمرہ سے اپنے بادشاہ کی تصویر نکالنے کے لئے اس آگ میں گھسا تھا جب اس نے تصویر کو آگ سے بچا کر لے جانا ناممکن سمجھا تو اپنا پیٹ چیر کر اس میں تصویر رکھ لی اس ترکیب سے تصویر فدا سی مڑ گئی تھی مگر جلنے سے تو بچ گئی۔

پیارے بچو!! جب تک کسی قوم میں اپنے ملک و مالک کی خیر خواہی کا جذبہ اس حد تک نہ ہو وہ ہرگز ترقی نہیں کرسکتی۔

محمد عبدالقادر فاروقی
(اتاپنگر)

جولیس سیزر کا قتل

یوں تو دنیا میں بہت سارے انسان پیدا ہوئے اور مر گئے لیکن جنھوں نے شہرت و مرتبت حاصل کی ہے وہ ان کے ساتھ دفن نہیں ہوئی بلکہ دنیا میں حیات جاوید کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ جب ہم تاریخ عالم کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ہمیں ایسے اشخاص کا پتہ چلتا ہے جنھوں نے حقیقی معنوں میں اپنے وجود کو دنیا کے لئے وقف کیا۔ وہ اور بھی زیادہ مشہور ہوئے جو اہل ملک کے ہاتھوں بے گناہ قتل کئے گئے اس قسم کا دردانگیز اور پر الم واقعہ ہمیں روما کی تاریخ میں نظر آتا ہے۔ روم کی قوت اور جمہوریت کا خاتمہ اگر سیزر کے قتل سے تصور کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ وہ شخصیت تھی جو ادنیٰ درجے سے ترقی کرتے کرتے ترقی کے اعلیٰ منازل تک پہنچ گئی تھی۔ اہل روما پر اس کے احسانات قابل غور اور باعث فخر ہیں۔ باوجود اپنی ہستی کو قربان کرنے کے سیزر خود کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا بلکہ سازشوں کا شکار بن کر رومیوں کے ہاں ظالم ٹھیرا۔

یہ رومی فاتح اپنے عہد کا نہایت ہونہار منتظم اور بہادر سپہ سالار گذرا ہے۔ یہ ایک ایسی ہستی تھی جس پر اہل روم کو فخر حاصل ہے۔ روم کی شخصی حکومت کے خاتمہ پر سیزر نے ہسپانیہ، یونان، مصر، شام، ایشیائے کوچک اور لندن کو فتح کیا اور رومی سلطنت کو وسعت دے کر عالمگیر شہرت حاصل کی لیکن وہ اس وقت ایک قومی ڈکٹیٹر کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہسپانیہ کی فتح کے بعد جب سیزر کی شخصیت روما کے لئے سلطنت کی وسعت کا باعث ہوئی تو انطونی نے روما کی بادشاہت کے لئے تاج پیش کیا جس کو سیزر نے مصلحتاً قبول نہ کیا لیکن پھر بھی سیزر کے حاسدوں نے خیال کیا کہ انطونی کا تاج پیش کرنا خود سیزر کے ایما سے تھا۔ اس سے قبل روم کا حکمران نہایت جابر تھا اس لئے اہل روم شخصی حکومت سے گریز کرتے تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں کیسیس نے جو سیزر سے بغض و عداوت رکھتا تھا بروٹس کو اپنا ہم خیال بنا کر ایک سازش کی بنا ڈالی

چنانچہ اس بات کیسیس نے اہم امور حکومتی کاروباری مجلس عاملہ کے ارکان کو اپنے ہاں مدعو کیا اور اس سازشی کمیٹی میں سیزر کے قتل کی ان تمام منصوبوں کو کھولا گیا جو اس کے قتل میں رکاوٹیں پیدا کرتی تھیں بہت غور و خوض کے بعد چند شرائط مرتب کئے گئے۔ سیزر کے قتل کی تاریخ ۱۵ مارچ قرار دی گئی جو رومیوں کے عقیدہ میں نہایت ہی منحوس اور شگون بدخیالی کی جاتی تھی۔

اس کمیٹی میں سسرو کو شریک نہ کیا گیا جو اس زمانہ کا بہت بڑا مقرر اور صلاح کار تھا۔ مرتبہ شرائط یہ تھے کہ سیزر بغیر کسی ہتھیار کے سینٹ ہال میں داخل ہو اور ساتھ ہی سازشی ارکان اپنے ہمراہ کاغذات میں خنجر چھپا لائیں اور حسب ہدایت اپنے فرائض کی تکمیل کریں ساتھ ہی ہر شخص اس راز کو پردہ رکھنے کی حتی الوسع کوشش کرے۔

لیکن شرائط مرتب کرتے وقت ایک سوال یہ بھی پیدا ہوا کہ آیا سیزر ہی اکیلا قتل کیا جائے یا اس کے صلاح کار اور زندگی کے شعار احباب انطونی اور لیپی ڈس بھی کچھ دیر کے بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ سیزر کے ساتھیوں کا بے جا قتل ٹھیک نہیں چونکہ اس سازشی کمیٹی میں انطونی کے بہت سے عزیز بھی تھے جنھوں نے مخالفت میں رائے دی۔ آخر یہ طے پایا کہ جمیع ارکان سینٹ ہال

میں جلد از جلد حاضر رہیں اور سیزر کے سینٹ ہال میں داخل ہونے کے بعد انطونی اور سیسی ڈس کو دروازہ ہی پر کسی گفتگو میں مشغول کریں اور تمام ارکان سیزر کی کرسی کے اطراف جمع ہوں اور اپنی اپنی درخواستیں پیش کریں۔ ایک پوشیدہ مقام پر رفامی شعبہ بازوں کی طرح یہ مسلح جماعت رکھی گئی تاکہ بیرونی حملہ کی مدافعت بروقت کی جا سکے ۱۴ مارچ کی شب کو سیزر اپنے دوست لیپیڈس کے ہاں مدعو تھا۔ پہلے طعام بعد کلام کے مصداق کھانے سے فارغ ہو کر آپس میں گفتگو شروع ہوئی ۔ اثنائے گفتگو میں موت کے متعلق ایک مسئلہ چھڑا ، سیزر کاغذات دیکھنے میں مصروف تھا کسی دوست نے اس سے پوچھا کہ تم کس قسم کی موت پسند کرتے ہو۔ یکایک اس کے منہ سے نکلا "اچانک" یہ گفتگو تو صرف اس حد تک موقوف تھی لیکن یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ ایک کس خیال کا ذہن میں آنا اور پھر وقوع میں آنا تھا۔

یہ ظاہر ہے کہ کسی بڑے آدمی کی موت اچانک واقع ہوتی ہے تو وہ دنیا میں عجیب و غریب یادگار قایم کر دیتی ہے۔ اس رات جس کی صبح سیزر قتل کیا جانے والا تھا شہر میں بہت سارے لوگوں نے دیکھا کہ [illegible] ہوئی ہیں اور مردے کفن پہنے ہوئے اپنی اپنی قبروں سے نکل کر روم کے گلی کوچوں میں شور و غل مچاتے [illegible] ۔ بادلوں میں خوفناک سپاہی [illegible] زرہ بکتر پہنے ہوئے جنگ کرتے نظر آئے۔ سیزر کی بیوی کلپرنیان نے خواب میں [illegible] اور [illegible] کے ہاتھ اس [illegible] خون میں رنگے ہوئے دیکھے۔ آسمان پر دم دار ستارے دکھائی دیئے [illegible] بہت سے بدشگون ظاہر ہوئے۔ ان شگون بد کو ناگہانی بلاؤں سے تعبیر کر کے اس کے دفیعہ کے لئے جب قربانی [illegible] کے سینے میں دل نہ تھا۔

اسی دن سیزر بھی بےچین اور پریشان تھا اس کو قدرتی طور پر [illegible] بے چینی [illegible] معمول کے خلاف تھیں لیکن اس پر بھی سیزر متاثر نہ ہوا [illegible] کی صبح سینٹ ہال اراکین سے پر ہو گیا۔ دن کے آٹھ بج چکے [illegible] سیزر کی بیوی نے [illegible] کا حکم دیا اس پر تمام اراکین پریشان ہوئے [illegible] یہ صلاح ٹھیری کہ کسی طرح سیزر کو سینٹ ہال لایا جائے [illegible] ایک معتمد [illegible] بروٹس کو بھیجا گیا تاکہ وہ سیزر کو لے آئے بروٹس نے سیزر کو مجبور کیا [illegible] ملتوی کر دی جائے کی نوبت ممکن ہے کہ لوگوں کے خیالات آپ سے پلٹ جائیں جو آپ کی [illegible] پوشی کے لیے [illegible] ۔ بروٹس کے [illegible] سیزر سینٹ ہال چلنے کے لئے تیار ہوا جوں ہی وہ دالان سے گذر رہا تھا کہ اس کا [illegible] ہوئے۔ پھر بھی سیزر کے دل [illegible] قسم کا شبہ نہ پیدا ہوا۔ اثنائے راہ میں ایک [illegible] نے جس کو سازش [illegible] ایک [illegible] پیش کی [illegible] جملہ سازشی واقعات درج تھے۔ اس نے سیزر سے التجا کی کہ [illegible] سے متعلق آپ کی ذات [illegible] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایسی بات جو خاص مجھ سے تعلق رکھتی ہے [illegible] کا غذ [illegible] راہ چلتا بنا بہ مصداق

"چوں اجل آید حکیم ابلہ شود"

سیزر کے دل میں اپنی موت کے متعلق کسی قسم کا خیال نہ پیدا ہوا۔ ادھر سازشی اراکین قیاس آرائیاں کر رہے تھے کہ شاید آج سیزر کمیٹی میں شریک نہ ہوگا کیونکہ نجومیوں نے اس کی قسمت کے متعلق پیشین گوئی کر دی ہے۔ اتنے میں سیزر کے آنے کی خبر ہوئی اور تمام اراکین اپنی اپنی جگہ پر حسب دستور خاموشی سے بیٹھ گئے۔

سیزر سینٹ ہال میں داخل ہوا۔ انطونی کو جو سیزر کے ہمراہ تھا دروازہ پر روک کر گفتگو میں مشغول کیا گیا۔ سیزر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور تمام اراکین تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کی کرسی کے اطراف جمع ہوگئے۔ سیزر ان سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اپنے کام میں مشغول ہوا۔

مطلوس نے آگے بڑھ کر ایک درخواست سیزر کے آگے پیش کی اور اپنے بھائی کی جلاوطنی کے حکم کو منسوخ کرنے کے لئے مجبور کیا لیکن سیزر نے اس کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

اس پر مطلوس نے عاجزی سے سیزر کا گریبان پکڑ لیا اور ساتھ ہی اس نے بادشاہ کو پکڑ کر مونڈھے پر خنجر مارا کیسیس نے جو پیچھے کھڑا تھا حلق میں خنجر بھونک دیا۔ سیزر ایک چیخ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور کیسیس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن ساتھ ہی دوسرا خنجر سیزر کے سینے میں کاری زخم لگاتا ہوا پیوست ہوگیا۔ سیزر نے چاروں طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ لیکن اس کی نظریں اپنے کسی دوست کو دیکھنے سے قاصر رہیں ہر شخص تیغ بدست نظر آیا اور اس نے زخموں سے تڑپ کر جان دی۔

برٹوس سیزر کے خون میں خنجر ڈبو کر خوشی کے نعرے بلند کرنے لگا اور سسرو کو مبارک باد دی کہ اب ہم آزاد ہوئے۔ اور ظلم کا منہ کالا ہوا۔ تمام اراکین شور و غل کرتے خوف کے مارے بھاگ گئے اور شہر میں سیزر کے قتل کی خبر بجلی کی طرح پھیل گئی۔

انطونی کو معلوم ہوتے ہی سیزر کے خون کا بدلہ لینے کا مستقل ارادہ کرلیا اور یہ کہتا اٹھا کہ جنھوں نے سیزر کا خون کیا ہے وہ بھی نہ بچیں گے۔ بعض نے اپنے خنجروں اور ہاتھوں کو خون سے رنگ لیا اور چلّانے لگے کہ ظلم کا خاتمہ ہوا......... روم کو آزادی ملی۔

چند ہی ہفتہ پیشتر سسرو نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ سیزر کی زندگی روم کے حق میں بہت ضروری اور قیمتی ہے اور ہر رومی سیزر کے پسینہ کی جگہ خون بہانے کو تیار ہے۔

سیزر کے بعد روما کا وہی حال ہوا جو محمود گاواں کے قتل کے بعد بہمنی سلطنت کا بلکہ اس سے کہیں بہت زیادہ یعنی رومیوں پر خدائی قہر و غضب بھی نازل ہوا۔

اندرونی فتنے اور خانہ جنگیوں نے ملک کو پارہ پارہ کر ڈالا۔ خون ریزی اور قتل و غارت کی گرم بازاری ہوئی اور خوفناک مظالم ہوئے جن کے پڑھنے سے دل دہل جائے۔ ایک سیزر کے خونِ ناحق کے بدلے ساری سرزمین روم ہل گئی۔

محمد شفیع الدین صدیقی

(متعلم وسطانیہ شاہ علی بنڈہ)

سب کچھ تم ہو

ماں کی گود کے ننھے تارے ۔ دن کو چمکنے والے تارے
بچے ہیں یا ہیں مہ پارے ۔ پیارے پیارے نیارے نیارے ۔ اُن کے حق میں "سب کچھ تم ہو"

گلزار جیسے ہیں رخسارے ۔ جیسے راکھ میں ہیں انگارے
تم ہو جگت کے چاند ستارے ۔ دل کا ٹکڑا اور آنکھ کے تارے.... ان کے حق میں "سب کچھ تم ہو"

گورے گورے روئی کا گالا ۔ تن من دھن دنیا کا اُجالا
لاکھوں کی دولت کا نکالا ۔ تم ہو ان سب سے بھی اعلیٰ .. ان کے حق میں "سب کچھ تم ہو"

آرزو دل کی جان کے ارماں ۔ ماں کے دل و جاں باپ کے ایماں
گھر کے سب سے اچھے ساماں ۔ ہر اک دکھ اور درد کے درماں ۔ ان کے حق میں "سب کچھ تم ہو"

سکہ تم سے ہے راج تمہارا ۔ پگڑی تمہاری تاج تمہارا
پرسوں کل اور آج تمہارا ۔ نون تمہارا چھاج تمہارا ۔ ان کے حق میں "سب کچھ تم ہو"

زر تم ہو دھن دولت تم ہو ۔ گھر کی شان و شوکت تم ہو
سب سے بڑھ کر نعمت تم ہو ۔ اپنے بڑوں کی عزت تم ہو ۔ ان کے حق میں "سب کچھ تم ہو"

شب کو کوہِ نور سے بڑھ کر ۔ برقِ تجلیٔ طور سے بڑھ کر
جنت کی ہر حور سے بڑھ کر ۔ شمس و قمر کے نور سے بڑھ کر .. ان کے حق میں "سب کچھ تم ہو"

تمہاری ہر آن نرالی ۔ آن نرالی شان نرالی
چھوٹی سی یہ جان نرالی ۔ اڑ بھی نرالی مان نرالی .. ان کے حق میں "سب کچھ تم ہو"

دل میں جو آئی کر کے بتایا ۔ گر کوئی روکے ٹوکے ڈرایا
روٹھ گئے تو ناچ نچایا ۔ کیں کاں کر کے راگ بجایا ۔ ان کے حق میں "سب کچھ تم ہو"

کھانا، پینا، اٹھنا، سونا ۔ کبھی تو ہنسنا کبھی تو رونا
لاڈ ہیں گر مل جائے کھلونا ۔ کھیل میں اپنے وقت کو کھونا .. ان کے حق میں "سب کچھ تم ہو"

ہار تمہاری جیت تمہاری ۔ رین تمہاری ریت تمہاری
راگ تمہارا گیت تمہاری ۔ پریم تم ہی سے پیت تمہاری... ان کے حق میں "سب کچھ تم ہو"

منین
(سٹی کالج)

ایلومنیم کا زہر

یورپ کے اکثر ڈاکٹروں نے ایلومنیم کے زہریلے مرکبات کے متعلق تحقیق کی ہے۔ اور بعض مشہور ڈاکٹروں کو تو ایسے ایسے مریضوں سے واسطہ پڑا ہے جن کے مرض کی تشخیص کرتے کرتے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ایلومنیم کے برتنوں میں کھانے پینے سے ایک قسم کا زہر اُن مریضوں کے اجسام میں داخل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے پیشاب میں البومن زیادہ مقدار میں خارج ہونے لگتی ہے۔ یہ زہر تھوڑی تھوڑی مقدار میں خارج ہو کر اندر جمع ہوتا رہتا ہے۔ جب عرصے کے بعد جسم کی اندرونی مدافعت مغلوب ہو جاتی ہے۔ تو وہ ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور مرض کے بڑھنے کا موجب بنتا ہے۔ نہ معلوم کتنے لوگ ایلومنیم کی وجہ سے طرح طرح کے امراض کے شکار ہوتے ہیں۔ ایلومنیم کی ارزانی نے غریب طبقے پر بڑے مظالم ڈھائے ہیں۔ ان میں اتنی استطاعت نہیں ہوتی کہ زیادہ دام صرف کر کے تانبے اور پیتل کے برتن خرید سکیں۔ لیکن اگر وہ چاہیں تو مٹی کے برتن استعمال کر کے ایلومنیم کے مضر اثرات سے بچ سکتے ہیں۔ کیمیاوی زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایلومنیم میں چند اقسام کے نمک پیدا ہوتے ہیں۔ اسے برش سے کتنا ہی صاف کیوں نہ کریں۔ پھر بھی اس کی سطح پر اوکسائیڈ ... . ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر آپ ایک صاف کپڑا یا صاف روئی لے کر اس پر رگڑیں تو ہر دفعہ برتن پر سے سفیدی سی اترے گی۔ اگر کھانا ان برتنوں میں آٹھ دس گھنٹے تک پڑا رہے تو اس میں کچھ ایسی تبدیلیاں پیدا ہو جائیں گی جو صحت کے لئے بہت مضر ثابت ہوتی ہے۔ ہماری غذا میں الکلی نمک اور ایسڈ کے اجزاء پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ایلومنیم کے برتن میں کم از کم سالن نہ پکائیں ان میں پانی گرم کریں یا چاول وغیرہ پکا لیں تو چنداں مضائقہ نہیں۔ مگر چاول بھی بہت جلد نکال لئے جائیں۔ اگر ایلومنیم کی دیگچی میں پھل اور سبزیاں اُبال کر پکا لیں تو آپ کو غور سے دیکھنے پر معلوم ہوگا کہ دیگچی کے اندر کا حصہ معمول سے زیادہ سفید اور صاف نظر آئے گا۔ آپ جانتے ہیں یہ کیوں؟ اس لئے کہ پھل یا سبزی میں اوکسائیڈ کے اجزاء ضرور ہوتے ہیں۔ دیگچی کے اندر کی سطح پر اوکسائیڈ اثر انداز ہو کر اسے تحلیل کر دیتا ہے۔ یہ وہی تحلیل شدہ حصہ ہے جو صاف اور سفید نظر آتا ہے۔ اسی طرح ایلومنیم کے اجزاء سبزی یا پھل میں مل کر اسے زہریلا کر دیتے ہیں۔ بہر حال یہ احتیاط کرنی چاہیئے کہ ایلومنیم کی دیگچی میں اگر دودھ بھی گرم کریں تو اسے فوراً نکال لیں۔ خود تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ جب کوئی پھیکی چیز ایلومنیم کی دیگچی میں پکا کر رکھ لی جائے تو چند گھنٹے بعد اس کا ذائقہ نمکین ہوگا۔ یہی نمک زہر ہے جو معدے میں جا کر بیماری کی جڑوں کو مضبوط کرتا ہے آج کل "ذیابیطس" کا مرض عام ہو گیا ہے۔ امیر غریب سب اس میں مبتلا ہیں۔ کیونکہ ایلومنیم کا زہر معدے میں جمع ہو کر پیشاب کے ذریعہ خارج ہوتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ انسان کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ ایلومنیم کے برتنوں کے استعمال سے سر بھی چکراتا ہے۔ غرض ایلومنیم کے برتنوں سے ممکنہ احتیاط برتنی چاہیئے۔ (ماخوذ)

محمود علی

مدراس میں اُردو پریس کی نظر

عصمت دہلی جون ۱۹۳۹ء

اُردو کا یہ دور انقلابی کہا جا سکتا ہے جبکہ ہمارے ادیب تخیل کی بلندیوں سے حقیقت کی تلخیوں کی ترجمانی کی طرف متوجہ ہونے ہیں اور آئے دن اُردو زبان اور ادب سے متعلق تحقیقی مقالے شائع ہو رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں ہاشمی صاحب نے صوبہ مدراس میں اُردو نشو نما اور بتدریج ارتقا کی کیفیت کافی تحقیق اور جستجو کے بعد لکھی ہے اور مختصر الفاظ میں وہاں کے سب ہی قابل ذکر ادبا و شعرا کا حال قلمبند کر دیا ہے۔ کتاب جس محنت سے مرتب کی گئی ہے وہ داد طلب اور نفس مضمون اُردو کے حق میں نیک فال ہے کتاب عصمت کے نصف سائز کے ۲۰۰ سو سے کچھ کم صفحات پر ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن نے مجلد شائع کی ہے

شاعر آگرہ (ماہ مئی ۱۹۳۹ء) یہ ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن کی مطبوعات کا اٹھارواں شمارہ ہے جو موجودہ دور کے لیے ایک اہم تصنیف ہے۔ اب تک پنجاب میں اُردو مغل اور اردو وغیرہ متعدد کتب شائع ہو چکی ہیں لیکن ایک ایسے مقام کی اُردو تاریخ کو منضبط کرنا جس کے متعلق عوام خالی الذہن ہوں یقیناً ایک بڑی خدمت ہے۔

اس تالیف میں صوبہ مدراس کی مکمل تاریخ اردو۔ وہاں کے اُردو مشہور شعرا و انشا پرداز۔ اخبارات۔ رسائل سلاطین کے زمانے سے اُردو کی عہد بعہد ترقی کا مفصل ذکر ہے۔ یہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مدراس میں گو متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لیکن اُردو ہی سب سے زیادہ مستعمل ہے۔ زمانۂ قدیم سے لے کر آج تک وہاں بڑی بڑی خصوصیات کے مصنفین اور شعرا گزرے ہیں جو زبان کی مغائرت کے باوجود اُردو کے زبردست ماہر تھے۔

الموسی (حیدرآباد دکن) اسفندار ۱۳۴۸ف اُردو زبان ہندوستان کے ہر صوبے میں زمانہ قدیم سے رائج ہے اور تصنیف و تالیف کا کام بھی کم و بیش ہر صوبے میں انجام پاتا ہے۔ اب تک اس طرف بہت کم توجہ کی گئی تھی اور عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا کہ اُردو زبان صرف دہلی اور لکھنؤ تک محدود تھی یا زیادہ سے زیادہ اس کا دائرۂ عمل صوبہ متحدہ تک وسیع تھا لیکن حالیہ تحقیقات نے اس خیال کی تردید کر دی ہے اور "پنجاب میں اُردو" "دکن میں اُردو" اور "مدراس میں اُردو" وغیرہ کتابوں سے ان صوبوں اور علاقوں کی اُردو خدمات پر خاطر خواہ روشنی پڑ رہی ہے۔ اُردو ادب کے ہر طالب علم کو چاہیے کہ اس کتاب کا مطالعہ کر کے معلومات میں اضافہ کرے۔

نیرنگ خیال ماہ اپریل ۱۹۳۹ء جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی نے دکن میں اُردو کی پیشتر ایک کتاب لکھی تھی اس سلسلہ کی یہ دوسری کڑی ہے جس میں آپ نے صوبہ مدراس میں اُردو زبان کی تاریخ اور تدریجی ترقی پر روشنی ڈالی ہے اور قدیم شعرا اور اہل قلم کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے کلام کے نمونے بھی دئے ہیں یہ کاوش خالص علمی ہے۔

ماہ نیم ماہ یکم و ۱۶ مئی ۱۹۳۹ء مولوی نصیر الدین ہاشمی کی ادبی زبان کسی تعارف کی محتاج نہیں اپنے "دکن میں اردو" تصنیف کر کے دنیائے تحقیق میں کافی شہرت حاصل کر لی ہے "مدراس میں اردو" "دکن میں اردو" کا گویا دوسرا حصہ ہے جس میں موجودہ صوبہ مدراس کی ادبی اردو کی تدریجی ترقی کی تاریخ درج ہے جو عہد مغلیہ میں صوبہ کرناٹک کے نام سے موسوم تھا۔ ابتداً صوبہ کرناٹک کی مختصر تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تقدیر

خدا کا کھیل بھی عجیب ہوتا ہے۔ جس غریب کے
پاس کھانے کو کھانا اور پہننے کو کپڑا تک میسر نہیں ہوتا وہاں
دیکھنے درجنوں سے بچے اپنی غربت و افلاس کی زندگی
میں اسیر نظر آتے ہیں اور جن کے پاس مال و دولت سب
کچھ موجود ہوتا ہے وہ اولاد کی آرزو میں مرے جاتے ہیں
اولاد کا پتہ نہیں ہوتا اور گھر سونا رہتا ہے بالکل یہی حالت
نواب مومن علی خاں کی تھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا مگر اولاد کی
آرزو میں بیچارے سوکھ کر کانٹا ہوگئے تھے۔ اور دعا و
دوا کرتے کرتے عاجز آگئے تھے۔ ان کی بیگم بیچاری کا کیا
کہنا وہ غریب تو سراپا حسرت و آرزو بن گئی تھی۔ اور گھر کا
"چراغ" نہ ہونے کی وجہ سے سارا عیش و آرام سرد
ہوگیا تھا --- - نواب مومن علی خاں بڑے
نیک اور خدا پرست آدمی تھے ان کا خیال تھا کہ اگر
خدا نے اولاد عطا کی تو سب کچھ اس کے سپرد کر کے خود خدا
کی عبادت میں مصروف ہو جائیں اور حج کے لئے چلے جائیں۔
مگر قدرت اور قسمت کے آگے کس کا چلا ہے! شادی ہوئے
پانچ سال کا عرصہ گزر گیا تھا لیکن کوئی اولاد نہ ہوئی تھی۔
------ اولاد کی دعا کے لئے نواب
نے خدا کی راہ میں بہت کچھ خیرات کی، غریبوں اور مسکینوں
کو کھانا کھلایا، یتیموں اور بے بسوں کی مدد کی۔ اُدھر
ان کی بیگم جیسا کہ عموماً عورتوں کا اعتقاد ہوتا ہے تعویذوں
اور گنڈوں میں مصروف تھیں دو تین برس اور گزر گئے لیکن
اولاد ہونے کے کوئی آثار نظر نہ آئے ------
خدا کی باتیں خدا ہی جانے، ایک عرصہ کے بعد نواب
اور بیگم کی دعائیں قبول ہوئیں اور تھوڑے عرصہ میں نواب کے
ہاں گھر کا "چراغ" آنے والا تھا --- پھر کیا تھا سارے شہر
میں دھوم مچ گئی، تمام خاندان میں شہرہ ہوگیا اور ہر چھوٹے
بڑے کے لب پر یہی تھا۔ خدا خدا کر کے نواب مومن علی خاں
کے گھر چندے آفتاب، چندے ماہتاب لڑکی ہوئی۔ نواب
اور بیگم کا تو ذکر ہی کیا خوشی سے بیچاروں کی باچھیں کھلی جاتی
تھیں ---- اب کیا تھا بے شمار خیرات ہوئی، غریبوں
اور ناداروں کو چالیس روز تک کھانا کھلایا گیا، مسجدوں
میں چراغ روشن کئے گئے۔ ہزاروں منتیں پوری کی گئیں۔
ملاؤں اور مرشدوں کو تحفوں سے سرفراز کیا گیا ----
دن گذرتے گئے پیار میں پرورش پانے کی وجہ سے وہ
نواب کی نازوں کی پلی بیٹی نسیمہ بیگم اب بارہ برس کی ہو چکی
تھیں، مگر بیجا لاڈ پیار کی وجہ سے طبیعت میں الھڑ
پن اور غصہ بہت تھا۔ تعلیم سے دلچسپی نہ تھی نسیمہ بیگم ماں
کی خوب خبر لیتی۔ جو کچھ کرتی کم تھا۔ نواب نسیمہ بیگم کو بیحد
چاہتے تھے۔ چاہتے کیسے نہیں اکلوتی ایک بیٹی تو تھی۔
نواب کا لاڈ پیار نسیمہ بیگم کو روز بروز بد سے بدتر کر رہا تھا
جو بیٹی ماں کو ماں نہ سمجھے اور اس کا کہنا نہ مانے وہ
دوسروں کا کہا کیا سنتی، ہر ایک نسیمہ سے ڈرتا تھا اور
دل میں دعا مانگتا کہ کسی طرح اس کی شادی ہوجائے
اور یہ اپنے "میاں" کے گھر چلی جائے۔ تاکہ سارے گھر
کو آرام نصیب ہو۔ بیگم کو اپنی بیٹی کی شادی کی بہت
آرزو اور فکر تھی۔ بہت جگہ سے پیغام آئے مگر یہ معلوم
کر کے کہ لڑکی بڑی نکچڑی ہے، اور الھڑ اور بدسلیقہ ہے
ہر ایک نے انکار کر دیا --- ہوتے ہوتے ایک متوسط گھرانے
میں اس کی نسبت ٹھیر گئی۔ نواب اور بیگم مجبور تھے کہتے کیا

کب تک جوان بیٹی کو اپنے گھر میں بٹھا رکھتے۔

تیاریاں شروع ہوئیں نواب نے دل کھول کر روپیہ پیسہ خرچ کیا بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ نسیمہ بیگم سسرال کے گھر کو بھی اپنے ماں باپ کا گھر سمجھ کر ایک ایک سے لڑ بیٹھتی تھی۔ میاں کی شکایت ساس کے پاس اور ساس کی شکایت میاں کے سامنے کبھی میاں کو برا بھلا کہہ دیا تو کبھی ساس کو چڑیل اور بدتمیز کہہ دیا۔ سارے سسرال والے تنگ ہوگئے اور احمد میاں بھی کٹے کٹے رہنے لگے۔۔۔۔ سچ ہے مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی ادھر میاں اور ساس ناخوش تھے ادھر نسیمہ بیگم کی والدہ یکایک حرکت قلب بند ہونے سے چل بسیں۔۔۔ ماں کی موت نے نسیمہ بیگم کی طبیعت میں اور چڑچڑاہٹ اور غصہ پیدا کر دیا۔ اسی طرح سے تین سال گزر گئے۔ لڑائی جھگڑوں میں کوئی کمی نہ ہوئی اور آخر کار میاں احمد نے تنگ آکر ان کو طلاق دے دیا۔

ماں کا غم اور طلاق کا رنج، نسیمہ بیگم کے نازک دل پر دو تازہ داغ تھے۔ بیچاری اب بہت پریشان تھی قدرت نے اتنے بڑے گھر میں پیدا کیا۔ زندگی اس قدر آرام سے گذری مگر اب سارا عالم بدل گیا تھا نواب مومن علی خان کو جب اس کی خبر ہوئی کہ ان کی بیٹی کو "طلاق" دیدیا گیا تو اپنی عزت و آبرو لٹ جانے اور اپنی نوجوان بیٹی کے اس طرح برباد ہونے کے غم میں سر پکڑ کر بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے اور اسی بیچ رنج و غم سہتے ہوئے چل بسے۔

بیچاری نسیمہ بیگم اب بہت تباہ ہوچکی تھی۔ غرور اور نخوت، ماں کی موت، میاں سے جدائی اور باپ کی موت کے بعد دماغ سے نکل چکا تھا۔ بیچاری اب غریب کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھی۔۔۔ بتلایئے یہ تقدیر کا قصور تھا یا تربیت کا ۔ یہ تھا انجام اس ناز کا۔

بلقیس زہرہ سلطانہ (ذاتی البیان اسکول)

دو گھڑیاں

دو گھڑیاں آمنے سامنے ہیں۔

پرانی گھڑی ایک دن ۔ برسوں پہلے بازار سے خرید کر دیوار میں لگادی گئی تھی۔ گھڑی کو اس دن کی یاد اب تک تازہ تھی ۔۔۔ اس وقت اس کا ڈائل بھی صاف تھا اور چمکتا تھا! سوئیاں بھی نئی، گھنٹے کی آواز بھی صاف اور تیز تھی

اُف! اس بات کو کتنے دن گزر گئے! اس وقت سے اس گھڑی نے ۔ برابر

گھنٹے اور منٹ بتاتے تھے اکثر اوقات بغیر ٹھیک ٹھیک وقت ۔۔۔ جس قدر بھی اس سے ممکن تھا

رفتہ رفتہ اس کا ڈائل دھندلا ہوا اور [illegible] ہو گیا۔ سب ہی لوگوں کو وقت اس نے بتایا تھا۔ اور وہاں اپنے سامنے دکان کی سب الماری [illegible] بھی اس نے بتلائی تھی خوشی سے بیچ کر [illegible] سے ٹک ٹک کر کے اور گھنٹے بجا کر!

نیا مالک پیدا ہوا ۔ بیاہ کیا ۔ پھر اس نے نئی دلہن سے ہنس کر کہا تھا "والد قبلہ کی خریدی ہوئی ہے یہ!"

نئی دلہن نے مسکرا کر چکا چوند آنکھوں سے دیکھا تھا اُس
کی طرف۔ اور کہا تھا "خوب صورت ہے۔" اور گھڑی
نے ٹک ٹک کر کے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔
گھر میں بچے ہوتے۔ گھڑی ہنس ہنس کر ان
کے کھیل دیکھتی۔
مگر آج ....؟
آج اس کی حکومت میں ایک اور سوت آ گئی تھی۔
آج ہی اس کے مالک نے ایک نئی چمکدار ٹائم پیس
لا کر میز پر ــــ سامنے ہی۔ رکھ دی تھی۔
مالکہ نے ہنس کر کہا تھا "خوش نما ہے۔"
پرانی گھڑی کا سینہ چاک ہو گیا!
ٹائم پیس نے خوشی سے پھول کر اس کی
طرف دیکھا۔ شاید وہ کہہ رہی تھی "بڑھیا کہیں کی!"
گھڑی نے سوچا، دراصل بڑھیا تو ہو گئی ہوں، نہ
ڈائیل کی سفیدی باقی ہے نہ وہ چمک دمک ہی۔ پھیکا سا منہ
اور کانپتی ہوئی ٹک ٹک!
مگر کیا وہ وقت صحیح نہیں بتاتی تھی؟ پھر کیوں
اس کے مالک نے اس کی موجودگی میں دوسری کو لا بٹھایا!
چھوٹی گھڑی گھنٹی نہیں بجاتی تھی، پھر بھی پورے غرور سے
اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھا تھا۔ بڑی دیر تک،
ہنستے ہوئے، خوش ہوتے ہوئے۔
چھوٹی گھڑی نے بھی ایک ترچھی نظر سامنے ڈالی
اور زور سے کہا "ٹک ٹک!"
"ٹھہر جا!" پرانی گھڑی نے کہا "ٹن ٹن ٹن!"
بچوں کی اڑتی سی نگاہ اس پر پڑی۔ مگر پھر تو سبھی
کھیلنے لگے۔

پرانی گھڑی کا دل دھک دھک کر رہا تھا، بیٹھنے
لگا۔ آہ اس کی آخری کوشش بھی بیکار ثابت ہوئی!
اس نے دیکھا چھوٹی گھڑی کا منہ فتح کی مسرت سے
چمکنے لگا تھا!
"جی ہاں" اس نے کہا "نئی نئی ہوتی ہے
اور پرانی پرانی۔"
پرانی نے جھلا کر کہا "لیکن یاد رہے نیا نو دن
اور پرانا سو دن!"
نئی نے چمک کر کہا "تمہارے نو دن تو گزر گئے،
پھر بھی شوق باقی ہے رانی رانی بننے کا!"
پرانی گھڑی خاموش رہی۔ کون فتنہ پرداز کے منہ لگے
رفتہ رفتہ پرانی گھڑی نے دیکھا کوئی منہ پھیر کر
اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں! نہ مالک نہ مالکہ نہ بچے
نہ ان کے دوست!
اس کا دل اداس سا رہنے لگا۔
اب وقت کی دریافت بھی چھوٹی گھڑی ہی سے
ہوتی ہے۔
ایک دن مالک نے اندر سے پوچھا "بچے کیا
بجا ہے؟"
"ساڑھے نو۔"
"چھوٹی گھڑی میں دیکھا ہے نا؟"
"کیوں؟"
"بڑی کا کیا اعتبار؟ وہ تو پرانی ہو چکی ہے"
اس بات سے شاید اس کا سینہ ٹوٹ گیا!
سامنے دیکھا تو چھوٹی گھڑی مسکرا رہی تھی۔ شرم
سے بڑی کا دل بیٹھنے لگا [illegible]

بے عزتی ؟ ایک دن تو زندگی تھی مگر آج !

اُس دن سے اُس نے سامنے دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔

چپ چاپ اپنا کام کیے جاتی۔

گھنٹی بجنے میں گھرگھراہٹ تھی اور ٹک ٹک میں

سستی۔ وقت بتانے میں ابھی تک وہ سستی کر جاتی تھی۔

جب کوئی دیکھنے والا ہی نہیں تو کون پروا کرے؟

قدم قدم پر بے عزتی !

رفتہ رفتہ اُس کے سینے میں دھڑکن اور اختلاج

کا احساس ہونے لگا۔ کیا وہ سچ مچ بڑھیا ہو رہی تھی!

ایک دن مالک کے کچھ احباب بیٹھے چائے

خوری، گپ شپ، ہنسی مذاق کر رہے تھے۔" اتفاقاً

کسی نے سامنے کی طرف نظر ڈالی، وہ ایک نوجوان تھا

اُس نے کہا "کیا باوا آدم کے وقت کی گھڑی

ہے واہ! ڈرائنگ روم میں۔

معاف کیجئے گا۔ بھلی نہیں معلوم ہوتی!"

مالک اور مالکہ نے بھی اُس کو دیکھا۔ اور شرمندہ سے

ہوئے۔

"جی ہاں!" مالک نے کہا "والد بزرگوار کے زمانہ

کی ہے۔ اب اسے ہٹا دوں گا۔ پرانی تو

"

بے عزتی کے وار سے گویا گھڑی کا دم گھٹنے لگا۔

سامنے دیکھا، چھوٹی گھڑی قہقہہ مار کر ہنس رہی تھی!"

شرم سے، رنج سے بڑی گھڑی سسکیاں بھر رہی

تھی!

ایک دم سینہ میں ایک گھبراہٹ ہوئی اور بس!

* * * * * * * * * *

دوسرے دن کرسی پر چڑھ کر مالک نے گھڑی

اتارتے ہوئے کہا "ارے یہ تو بند ہو گئی ہے!"

"پرانی بھی تو ہو گئی تھی!" مالکہ نے کہا۔

نئی گھڑی اب رانی تھی رانی!

از: ین۔ ین کنٹی

منظوم عثمانیہ میگزین

ادارۂ ادبیات اردو کی مشہور و معروف کتابیں

مرقع سخن (جلد اول) حیدرآباد کے پچیس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ پچاس سے زیادہ تصاویر اور چار سو سے زیادہ صفحات مجلد قیمت [illegible]	**مرقع سخن (جلد دوم) حیدرآباد** کے پچاس مجرد شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ پچاس تصاویر ۴۰۰ صفحات مجلد قیمت [illegible]	**سراج سخن** انتخاب کلام شاہ سراج اورنگ آبادی مرتبہ ۔ پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب ایم اے سوانح شاہ سراج صفحات (۹۲) قیمت ۱۲/	**ایمان سخن** انتخاب کلام شیر محمد خاں ایمان مرتبہ مولوی سید محمد صاحب ایم اے سوانح ایمان صفحات (۱۳۰) قیمت ۱۲/
فیض سخن انتخاب کلام حافظ شمس الدین محمد فیض ۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور مع سوانح فیض صفحات ۱۴۴ قیمت ۱۲/	**بادۂ سخن** انتخاب کلام ڈاکٹر ماجد حسین مائل مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور مع سوانح و تصویر صفحات (۱۲۸) قیمت ۱۲/	**کیف سخن** انتخاب کلام سید رضی الدین حسن کیفی مرتبہ ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مع سوانح و تصویر صفحات ۱۲۲ قیمت ۱۲/	**متاع سخن** انتخاب کلام نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز مرتبہ ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مع سوانح و تصویر صفحات ۱۲۵ قیمت ۱۲/
ورڈزورتھ اور انکی شاعری مشہور انگریزی شاعر کے حالات اور کلام پر تبصرہ ۔ از مولوی میر حسن صاحب ایم اے مع تصویر شاعر صفحات ۱۸۴ قیمت صرف [illegible]	**ٹیگور اور انکی شاعری** ہندوستان کے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کے حالات اور کلام پر تبصرہ از مولوی مخدوم محی الدین صاحب ایم اے مع تصویر شاعر صفحات ۱۲۸ قیمت [illegible]	**یوسف ہندی قید فرنگ میں** مرزا غالب کی قید فرنگ کے حالات مرتبہ مولوی محسن بن شبیر صاحب بی اے ال ال بی صفحات (۸۰) قیمت [illegible]	**ہوش کے ناخن (ڈراما)** حیدرآباد کی سماجی زندگی کا خاکہ مصنفہ ۔ مخدوم محی الدین و میر حسن صاحبان صفحات (۹۶) قیمت [illegible]
نذر ولی ولی اورنگ آبادی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی مضامین کا مجموعہ از لطیف النساء بیگم بی اے نجم النساء بیگم بی اے نسیم النساء بیگم بی اے جہاں بانو بیگم [illegible] صفحہ [illegible] قیمت [illegible]	**نقد سخن** کلام فانی پر نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کی تنقیدوں کا مجموعہ قیمت [illegible]	**گریہ و تبسم** صاحبزادہ میکش کی دلکش نظموں کا مجموعہ قیمت مجلد دو روپے	**مشاہیر قندھار دکن** دکن کے مشہور مردم خیز خطہ کی دلچسپ باتصویر تاریخ از ۔ اکبر صدیقی بی ۔ اے قیمت [illegible]
من کی دنیا نوجوان انشاپرداز رشید قریشی کے ولولہ انگیز افسانے مجلد قیمت [illegible]	**مدراس میں اردو** مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کی محققانہ تالیف صفحات (۲۰۰) مجلد قیمت ([illegible])	**نذر دکن (باتصویر)** دکن کے متعلق خواتین دکن کے رشحات قلم مع عکس تحریر و تصاویر صفحات ۱۷۸ ۔ مجلد قیمت [illegible]	**محرم نامہ** شہادت کربلا کے متعلق دلچسپ معلومات ۔ باتصویر مجموعہ صفحات ۱۱۱ مجلد قیمت [illegible]

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ کی معرکۃ الآرا کتابیں

اُردو کے اسالیب بیان
اُردو نثر کی تاریخ ۔ انشاپردازوں کی نثر کے اسلوب اور ان کی خصوصیات پر تبصرہ جدید اردو نثر کے رجحانات اور مستقبل کے متعلق مشورے طبع سوم
۶۰۷ صفحات قیمت عہ

اُردو شہ پارے
آغاز اُردو سے ولی اورنگ آبادی تک کے اُردو ادب (نظم و نثر) کا محققانہ تذکرہ مع نمونہ کلام قدیم شعرا اور قدردان اُردو کی نایاب تصاویر۔ بڑی تقطیع صفحہ (۴۰۰) مجلد قیمت لے ۴ر

روح تنقید
فن تنقید پر اردو ادب کی واحد مستند کتاب جو مختلف جامعات کے نصاب تعلیمی میں شامل ہے طبع سوم ۔ صفحات ۲۵ قیمت ۲ر

تنقیدی مقالات
روح تنقید کا دوسرا حصہ اردو کے بہترین ادبی کارناموں پر جنید پایہ تنقیدیں ۔ طبع دوم
۲۹۶ صفحات
قیمت ۴ر

عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی
گذشتہ ربع صدی میں اُردو ادب میں جو ترقیاں ہوئی ہیں ان کا مفید اور مکمل تذکرہ جامعہ عثمانیہ کی مستند تاریخ حیدرآباد کے جملہ خدمت گذاران اُردو کی خدمات پر تبصرہ۔
۲۸۹ صفحات مجلد قیمت عیر

محمود غزنوی کی بزم ادب
غزنین کی فارسی شاعری اور وہاں کی ادبی و علمی چہل پہل کا مبسوط واحد تذکرہ صفحات (۱۱۷)
قیمت عہ

ہندستانی لسانیات
اُردو زبان کا لسانی تجزیہ و تحقیق اپنے فن میں اُردو کی پہلی کتاب اردو ہندی جھگڑے کی تاریخ
قیمت عح

ہندوستانی صوتیات
(بزبان انگریزی)
اردو زبان کا صوتی تجزیہ تشریح جدید ترین علمی صوتیاتی آلوں اور تجربوں کے نتائج
پچھتر فوٹو قیمت ۱۲ر

فن انشاپردازی
مضمون نگاری اور انشاپردازی کے راز فن تحریر میں کامیابی کے عملی طریقے ۔ انشاپردازی میں کامیابی حاصل کرنے کے وسائل
صفحات ۱۱۶ قیمت ۲ر

طلسم تقدیر
زوال گولکنڈہ کے وقت کا نیم تاریخی فسانہ
طبع سوم صفحات ۶۶
قیمت ۸ر

سیر گولکنڈہ
۱۱۶ افسانے ۔ ۱۲ تصاویر۔ گولکنڈہ کی زندگی کے مختلف پہلو افسانوں کی شکل میں قطب شاہوں کی مختصر تاریخ صفحات ۱۶۰
قیمت ۱۵ر

گولکنڈے کے ہیرے
۱۶ افسانے ۸ تصاویر
سیر گولکنڈہ کا دوسرا حصہ گولکنڈے کے آخری دور کے متعلق نیم تاریخی افسانے
صفحات ۱۳۶ قیمت مجلد ۱۲ر

سب رس

نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۴) نشان ٹپہ برطانیہ (M3950)

"ادارہ ادبیات اردو" حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

سب رس

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش — سکینہ بیگم

خواجہ حمید الدین شاہد — معین الدین احمد انصاری

جلد (۲) شمارہ (۷)	سب رس	جولائی ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

ادارہ کا رسالہ سب رس کم از کم ۶۴ صفحات اور زیادہ سے زیادہ ۹۶ صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

رسالہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔

خط وکتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔ اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی پی کے ذریعہ سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت حیدرآباد کے لئے چار روپے سالانہ۔ دو روپے آٹھ آنے ششماہی۔ چھ آنے فی پرچہ

،، ،، حیدرآباد سے باہر چار روپے آٹھ آنے سالانہ۔ تین روپے ششماہی۔ سات آنے فی پرچہ

اداریہ

ادارۂ ادبیات اردو کے شعبے برابر سرگرم عمل ہیں۔ لیکن گزشتہ رسالہ کے اداریہ میں جگہ کی قلت کی وجہ سے ان کی روداد و کے اہم اقتباسات درج نہیں کئے جاسکے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے شعبۂ نسواں کے دو اجلاسوں کا تذکرہ ضروری ہے جن میں معتمد شعبہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کے علاوہ محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ، محترمہ سارہ بیگم صاحبہ، محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم۔ اے۔ اور محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ ایم اے نے شرکت کی۔ (موخر الذکر دوسرے اجلاس میں شریک نہ تھیں) اس شعبہ نے ضرورت محسوس کی کہ چند اور خواتین کو مجلس انتظامی میں شریک کیا جائے۔ چنانچہ حسب ذیل کے نام تجویز پائے اور ان کو دعوت نامے روانہ کردیئے گئے ہیں۔ محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر (۲) محترمہ تہذیب النساء بیگم صاحبہ (بنت کرنل علی رضا صاحب) (۳) محترمہ عظمت النساء بیگم صاحبہ (۴) محترمہ غوث بیگم صاحبہ (محل نصاری صاحب) (۵) محترمہ امیر بیگم صاحبہ (محل محمد محسن صاحب مرحوم) اور (۶) محترمہ بتول بیگم صاحبہ (محل حبیب حسن صاحب) جو خواتین علمی و ادبی دلچسپی رکھتی ہیں اور شعبۂ نسواں کا ہاتھ بٹانا چاہتی ہیں وہ معتمد شعبہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کریم آباد جوبلی ہلز بلدہ کے پتہ پر مراسلت فرمائیں۔

ان اجلاسوں میں سب سے اہم مسئلہ نوکری پیشہ غریب اور نادار عورتوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے سے متعلق زیر بحث آیا اور جملہ اراکین نے وعدہ کیا کہ اپنے اپنے محلوں میں اس کام کے انجام دینے میں سعی کریں گی۔ اس بارے میں خود غیر تعلیم یافتہ عورتوں اور ان کے مردوں کے خیالات دریافت کرنے اور ان سے تبادلۂ خیالات کی ضرورت محسوس کی گئی۔ خوشی کی بات ہے کہ اراکین شعبہ نے دوسرے اجلاس تک اس مسئلہ کے بعض مرحلے طے کرلئے اور فیصلہ کیا کہ ہر محلہ میں علحدہ علحدہ مرکز قایم ہوں جن میں تعلیم کا صحیح انتظام ہوگا۔ سردست اسٹیٹ میں محترمہ سارہ بیگم صاحبہ اور محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ کی نگرانی میں ایک مدرسۂ شبینہ کے قیام کی تجویز عمل میں آئی۔ محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ بھی اس کے نشوونما میں حصہ لیں گی۔

ایک اور اہم تجویز یہ بھی منظور ہوئی کہ بیگم صاحبہ نواب غوث یار جنگ بہادر نے گلبرگہ میں جو تربیت گاہ قائم کی ہے اس کا اراکین شعبہ معائنہ کریں اور اپنی تربیت گاہوں یا مدارس کے قیام میں اس کے طریقۂ کار سے مدد مل سکتی ہو تو اس سے استفادہ کریں۔

شعبۂ زبان کا جلسہ بھی قابل ذکر ہے جس میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، قاضی عبدالغفار صاحب مدیر پیام، اور عبدالقادر صاحب سروری نے شرکت کی۔ حسب ذیل امور جو پیش اور طے ہوئے قابل ذکر ہیں

۱۔ شعبہ کے اعلان کے سلسلہ میں مولوی جمال الدین حیدر صاحب کے یہاں سے کئی الفاظ اور محاوروں کی جو فہرست وصول ہوئی ہے اس کے متعلق صاحب موصوف کا شکریہ ادا کیا جائے اور اس کو اشاعت سے قبل مولوی سروری صاحب اور قاضی عبدالغفار صاحب کے سپرد کیا جائے تاکہ ایک نظر ڈال لیں۔

۲۔ مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری (داعی شعبہ) کے ضلع پر تبادلہ کی وجہ سے ان کا کام عارضی طور پر پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کے سپرد کیا جائے۔ (جو صاحب شعبۂ زبان کے متعلق مراسلت کرنا چاہتے ہیں تا اطلاع ثانی موخر الذکر سے مراسلت کریں) -

۳۔ دفتری زبان کی موٹی موٹی یا غلط اصطلاحات کے جمع کرنے کا کام جو ڈاکٹر جعفر حسن صاحب اور ڈاکٹر رضی الدین صاحب کے ذمہ تھا ابھی تکمیل طلب ہے۔ جس کو تکمیل کے بعد آئندہ جلسہ تک پیش کیا جا سکے گا۔

ہم اردو زبان کی ترقی، اصلاح سے تعلق عام نہیں ہوئیں۔ عربی و فارسی کے بعض ایسے الفاظ کی جمع کی صورتیں پیش ہوئیں جو اردو زبان سے نامانوس تھیں ان کے بارے میں یہ طے پایا کہ اس عام قاعدے کی ہر جگہ پابندی ہونی چاہئے کہ جمع ہمیشہ اردو کے اصول کے مطابق بنائی جائے۔

مصنفین اردو ۔ حالی پبلشنگ ہاوس کتاب گھر دہلی نے ایک تفصیلی فہرست شائع کی ہے جس میں اردو مصنفین و مولفین و شعرا و مترجمین کے حالات اور کتابوں کی تفصیلی فہرست کے ساتھ ایک سو سے زیادہ مشاہیر اردو کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ جن میں متعدد نادر اور قابل دید ہیں۔ خاصکر قدیم شعرا مثلاً میر، درد، سودا، مصحفی، انشا، آتش، اور ذوق وغیرہ کی تصویریں۔

یہ فہرست جو ۲۳۲ صفحات پر مشتمل ہے ایک مختصر سی تاریخ ادب اردو کا کام بھی دے سکتی ہے۔ حیدرآباد کے شعرا و مصنفین میں اگرچہ اعلیٰ حضرت آصفجاہ سابع، مہاراجہ یمین السلطنت شاد، نواب فصاحت جنگ جلیل، نواب حیدر یار جنگ نظم طباطبائی، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری وغیرہ کے حالات اور تصویریں شائع کی گئی ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ اس کتاب میں عزیز، صفی، امجد، سید محمد اور نصیر الدین ہاشمی کی تصویریں وغیرہ شریک نہیں ہیں۔ حالانکہ یہ حیدرآباد کے وہ اصحاب ہیں جن کی اردو خدمات کی شہرت تمام ہندستان میں پہنچ چکی ہے اور جن کی تصویریں بھی شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ توقع ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں اس کمی کی تلافی ہو جائے گی۔

اردو ادب کے قدردان اس فہرست کے مطالعہ سے خوش ہوں گے۔ بلا تصویر فہرست صرف ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب کر سکتے ہیں۔ اور باتصویر کے لئے ۲ کے اسٹامپس روانہ کرنے پڑتے ہیں۔

دی نیو ایرا چند ماہ سے ایک ہفتہ وار انگریزی جریدہ "دی نیو ایرا" حیدرآباد سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے مدیر مولوی سید اسد اللہ صاحب بی اے ہیں۔ جنھوں نے پہلے بھی صحافتی دنیا میں کامیابی حاصل کی ہے۔ توقع ہے کہ یہ نیا ہفتہ وار بھی کامیاب رہے گا۔ اور اس کے قابل مدیر کی محنتیں ٹھکانے لگیں گی۔ یہ جریدہ اگرچہ زیادہ تر سیاسی امور اور حالات حاضرہ کے مسائل پر نظر رکھتا ہے لیکن ضرورت ہے کہ مہینے میں کم از کم اس کا ایک شمارہ علمی و ادبی مسائل کے لئے بھی وقف کر دیا جائے۔ یا ہر شمارہ کا ایک آدھ صفحہ اردو زبان و ادب کے مسائل پر مشتمل رہے۔ اردو زبان کے متعلق دوسری زبانوں اور خاصکر انگریزی میں عام معلومات کی اشاعت نہایت ضروری ہے۔ اگر مولوی سید اسد اللہ صاحب توجہ کریں تو انھیں اردو سے متعلق حیدرآباد ہی میں ایسا کافی مواد مل سکتا ہے کہ وہ ہر ہفتہ کا ایک صفحہ یا مہینہ کا ایک شمارہ اس کے لئے وقف کر سکتے ہیں۔ کم از کم حیدرآباد کی اردو خدمات کے متعلق تو اس میں ضرور معلومات شریک رہنی چاہئیں۔ یہ پرچہ سرعت سے ترقی کر رہا ہے۔ اور اپنے اداریوں کے سنجیدہ و منضبط نقطہ نظر کی وجہ سے مقبول ہو رہا ہے اس لیے توقع ہے کہ اہل ذوق اس کی قدر کریں گے۔

"ادارہ"

ادارہ کی مطبوعات اور سب رس کتاب گھر کی فہرست جملہ علم دوست اصحاب کی خدمت میں مفت روانہ کی گئی ہے۔ کسی صاحب کو نہ پہنچی ہو تو اطلاع دینے پر روانہ کر دی جائے گی۔

مہتمم
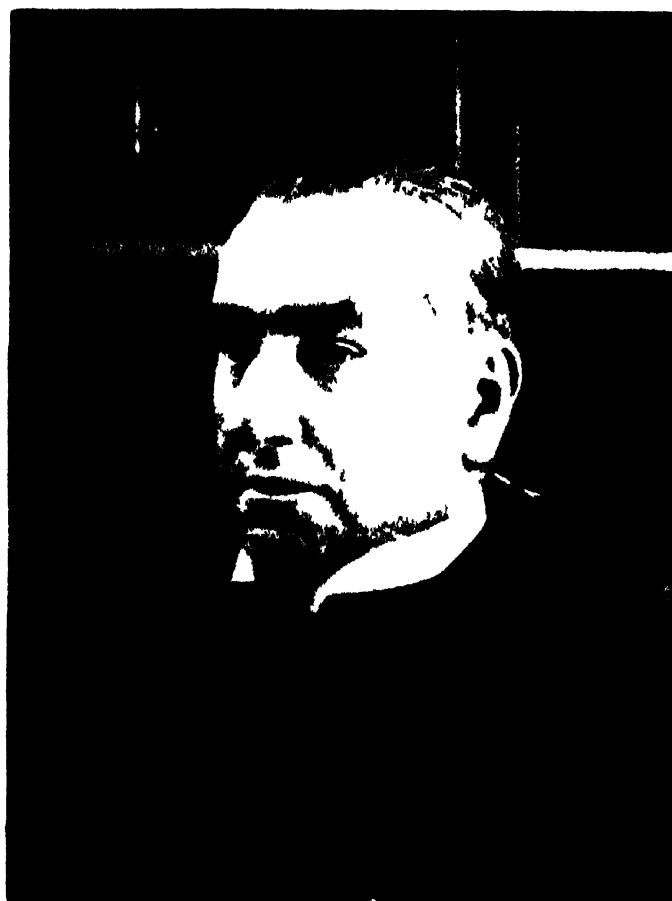
سر ڈینی سن راس

علامہ سر ڈینی سن راس

مشہور انگریز مستشرق ڈینی سن راس کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ سالہا سال سے لندن یونیورسٹی کی مشہور درسگاہ معارف شرقیہ "اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز" کے ڈائرکٹر یا ناظم رہے ہیں اور ابھی ابھی اپنے عہدہ سے وظیفۂ حسن خدمت لے کر علیحدہ ہوئے ہیں۔ ۶ رجون ۱۸۷۱ء کو پیدا ہوئے چنانچہ اس مہینے میں ان کی عمر پورے اڑسٹھ سال کی ہوئی ہے۔ ان کی زندگی کے حالات اور کارناموں کی تفصیل نہایت شاندار ہے۔ ان کی عظیم الشان شخصیت اور غیر معمولی مقبولیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکے گا گزشتہ سال ان کی وظیفہ پر علیحدگی کی تقریب میں ہندوستان کے سربرآوردہ مستشرقین اور خاص کر جامعہ لندن کی درسگاہ معارف شرقیہ کے فارغ التحصیل کو خیال ہوا کہ سر ڈینی سن راس کی طویل ہندوستانی و اسلامی خدمات کے اعتراف میں ایک مجموعۂ معارف ہندوستانی و ایرانی "راس ہومیج والیوم آف انڈین اینڈ ایرانین اسٹڈیز" مرتب کر کے ان کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ اس کام کے لئے ایک کمیٹی ترتیب دی گئی جس کے ارکین حسب ذیل مقرر ہوئے۔

ڈاکٹر سوشیل کمار ڈے — ڈاکٹر سدھیشور ورما — ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی — ڈاکٹر ہدایت حسین
ڈاکٹر بھاسکر آنند سالیٹور — مسٹر سید احسن شیر — ڈاکٹر ام آئی بورہ — ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
ڈاکٹر ایس ام کترے — مسٹر پی کے گوڈے

اس کمیٹی نے ۱۹۳۸ء میں تمام علماء قدردانان علوم شرقیہ کی خدمت میں اپنے دستخطوں کے ساتھ دعوت نامے روانہ کئے تاکہ اس عظیم الشان مجموعہ کی تیاری و ترتیب میں مدد دیں۔ ڈاکٹر ایس ام کترے اور مسٹر پی کے گوڈے نے اس کی ترتیب کا کام شروع کیا اور کرناٹک پبلشنگ ہوز بمبئی نے اس کی اشاعت کا ذمہ لیا چنانچہ تقریباً ایک سال کے اہتمام کے بعد یہ قابل قدر جلد اب مکمل ہو چکی ہے اور اسی مہینے سر ڈینی سن کی اڑسٹھویں سالگرہ کے موقعہ پر ۶ رجون ۱۹۳۹ء کو اس کا پیش نامہ شایع کر دیا گیا ہے۔ اس میں مجموعہ کے مرتبین نے اپنے پیش لفظ میں مذکورہ بالا ارکان مجلس انتظامی اور ناشر کا شکریہ ادا کیا ہے جن کے تعاون سے اس قدر مفید اور نفیس و عالی شان مجموعہ تیار ہو سکا۔

اس پیش لفظ کے بعد سر ڈینی سن راس کے نام وہ سپاس نامہ بھی مکتوب شایع کیا گیا ہے جو ارکان مجلس کی طرف سے ان کی خدمت میں اس پیش بہا مجموعہ کو پیش کرتا ہے۔ اس سپاس نامہ سے سر ڈینی سن راس کی عظمت واضح ہو جاتی ہے اس لئے اس کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے:-

سر ڈینی سن

ہمیں اس امر پر فخر و نیاز ہے کہ علوم شرقیہ اور خاص کر تاریخ ہند کے موضوعوں پر آپ کی قیمتی معلومات اور ٹھوس خدمات کے اعتراف میں معارف ہندوستانی و ایرانی پر ایک جلد بطور تحفہ پیش کرنے کی اجازت حاصل کریں۔ کلکتہ مدرسہ کے محبوب پرنسپل کی حیثیت سے آپ نے قابل ذکر قیام ہندوستان نے ... کے شرکائے کار اور طلبہ کے دلوں میں ناقابل فراموش نقش ثبت

کر دیے ہیں۔ دل و دماغ کی ان خوبیوں نے جو ہندستانی علما کے ساتھ آپ کے ابتدائی تعلق کی خاص خصوصیت تھی آپ کی ہندستانی و ایرانی دلچسپیوں کے غیر منقطع سلسلہ کو مضبوط کر دیا جس کی وجہ سے علوم مشرقیہ مالا مال ہو گئے اور آپ کے پیدا کئے ہوئے میدانوں کی طرف نئے نئے محققین کی توجہ منعطف ہو گئی۔

جامعہ لندن کے اسکول اف اورنیٹل اسٹڈیز کے پہلے اور مقبول ناظم کی حیثیت سے آپ نے اپنی اس خوش طبعی اور پرخلوص ہمدردیوں کے ذریعہ سے جو علوم مشرقیہ کی تاریخ میں بے نظیر رہیں گی، ہندستانی طلبہ کو گرانبار منت کر دیا ہے۔ علوم مشرقیہ کے متعلق آپ کے چالیس سال سے زیادہ کے غیر معمولی کارناموں کے ایک حقیر خراج تحسین کے طور پر اس مجموعۂ معارف کو پیش کرتے وقت ہم آپ کے لئے درازئ عمر اور خوشحالی کی دعا کرتے ہیں تاکہ آپ تاریخی تحقیقات کے اس مقدس کام کی اور زیادہ خدمت کر سکیں۔ اس کام کو آپ نے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے اور یہ آپ کی عرصہ کی فیض رسانی کی وجہ سے ظاہر کرتا ہے کہ آئندہ اور بھی بار آور ہوگا۔

ام ہدایت حسین	اس ام کترے	سوشل کمار ڈے
سنیتی کمار چیٹرجی	پی کے گوڈے	سید احسن شیر
سید محی الدین قادری زور	سد ھیشور ورما	ام آئی بورہ

۱۹ جون ۱۹۳۶ء — بھاسکر انند سالیٹور — ام ان کلکرنی

اس عالی شان مجموعۂ معارف مشرقیہ میں تمام دنیا کے مشہور و معروف مشرقین کے تقریباً پچاس بلند پایہ مقالے شامل ہیں۔ ان میں سے حسب ذیل ہمارے لئے خاص دلچسپی کا باعث ہیں:-

۱ عہد حکومت علی عادل شاہ بیجاپور از کے کے باسو

۲۔ قدیم ہند کے وزرا از بی بھٹاچاریا

۳۔ امیر حسن دہلوی کی ایک غیر مطبوعہ رومانوی مثنوی از ام آئی بورہ

۴۔ ٹامل کے چند صوتیاتی رجحانات از اے سی چیٹر

۵۔ بنگالہ کے پالہ سلاطین کے زمانہ میں سنسکرت ادب از اس کے ڈے

۶۔ سلاطین میسور اور شرنگری مٹ از وی آر رامچندر ڈکشتر

۷۔ ۱۴۰۰ء سے ہندستان میں توپوں اور بارود کا استعمال از پی کے گوڈ

۸۔ موہنجوڈارو رسم الخط کے ہندسے از اچ ہراس

۹۔ شاہ طاہر دکنی از محمد ہدایت حسین

۱۰۔ بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کے تعلقات پرتگالیوں کے ساتھ از پی ام جوشی

۱۱۔ پراکرت زبانوں کے نام از اس ام کترے

۱۲۔ قدیم پشتو قلمی کتابیں از جی مارگن سیٹرن

۱۳۔ جنوبی ہند کے مذہبی فرقے (عربی جغرافیہ دانوں کے بیان کے مطابق۔ از محمد حسین نینر۔

۱۴۔ ایک غیر معروف پراکرت محاورہ از وی پسانی۔

۱۵۔ ہتھرو پرانوں کا زمانہ اور اہمیت از پنڈت بشیشور ناتھ ریو۔

۱۶۔ جلال الدین فیروز خلجی کی زندگی از این بی رائے۔

۱۷۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی سوانح عمریوں پر ایک نوٹ از کے این وی شاستری۔

۱۸۔ پٹنہ میوزیم کے چند پہلو از سید احسن شیر۔

۱۹۔ بنگال اور راجپوت۔ از منۂ متوسط میں از جنیس چندر سرکار۔

۲۰۔ تنجور اور مدورا کی حکومتوں میں اسلامی بہت از سی آر سرنیواس چاری۔

سر ڈینی سن راس نے علوم شرقیہ کی جو خدمت کی ہے اس کا ایک اندازہ ان کے کارناموں کی حسب ذیل فہرست سے ہو سکے گا۔ اس فہرست میں ان متعدد مقدموں کا ذکر نہیں ہے جو انھوں نے مختلف کتابوں اور علماء کے سوانح حیات پر لکھے تھے اور نہ وہ مضامین اور مقالے شامل ہیں جو انھوں نے مختلف رسائل میں شایع کئے۔

۱۔ شاہ اسمٰعیل (بانی خاندان صفویہ) کے ابتدائی ایام (مطبوعہ ۱۸۹۶ء)
۲۔ ترجمہ و ترتیب تاریخ رشیدی مرزا محمد حیدر دغلات (مغول وسط ایشیا کی تاریخ) ۱۸۹۵ء۔
۳۔ قلب ایشیا (دی ہارٹ آف ایشیا) ۱۸۹۹ء
۴۔ مقدمہ تاریخ خلیفہ واثق (از ولیم بک فورڈ) ۱۹۰۰ء
۵۔ سوانح و مقدمہ رباعیات عمر خیام ۱۹۰۰ء
۶۔ کتب خانہ انڈیا آفس کے عربی، فارسی مخطوطات کی تفصیلی فہرست۔ ۱۹۰۲ء
۷۔ ترتیب عربی تاریخ گجرات مولفہ عبد اللہ محمد بن عمر علی المکی الغ خانی ۳ جلدیں ۱۹۱۰ء۔ ۱۹۲۱ء۔ ۱۹۲۸ء۔
۸۔ ترتیب تاریخ گجرات مولفہ میر ابو طالب ولی ۱۹۰۹ء
۹۔ ترتیب فہرست طبور (ترکی، منگول اور چینی) ۱۹۰۹ء
۱۰۔ ترتیب سنسکرت تبتی انگریزی ڈکشنری ۱۹۱۰ء
۱۱۔ چینی بدھی تری پتا کا کے کارناموں کے عنوانات کی ابجدی فہرست ۱۹۱۰ء۔
۱۲۔ ترتیب دیوان بابر بادشاہ ۱۹۱۰ء
۱۳۔ ترتیب دیوان فارسی و ترکی بیرم خاں خانخاناں ۱۹۱۰ء
۱۴۔ ترتیب مبانی اللغت (ترکی قواعد از مرزا مہدی خاں) ۱۹۱۰ء
۱۵۔ ترتیب و ترجمہ تسنہ تہد کن ون (جتنی) ۱۹۱۲ء
۱۶۔ رودکی اور نام نہاد رودکی ۱۹۲۴ء۔
۱۷۔ قصیدہ رودکی ۱۹۲۵ء۔
۱۸۔ شمالی ایران کی تین اسلامی سلطنتیں دسویں اور گیارہویں صدی میں ۱۹۲۵ء
۱۹۔ پنچ تنترا کی پانچویں جلد کا پیش لفظ ۱۹۲۶ء
۲۰۔ پریسٹر جان اور سلطنت حبشہ ۱۹۲۶ء
۲۱۔ ترتیب تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ۱۹۲۶ء
۲۲۔ اسلام ۱۹۲۶ء
۲۳۔ مشرقی آرٹ اور ادب ۱۹۲۸ء
۲۴۔ گجرات اور خاندیش ۱۹۲۸ء
۲۵۔ بابر ۱۹۳۰ء
۲۶۔ ہندستان اور اہل پرتگال (۱۴۹۰ تا ۱۵۰۰) ۱۹۲۹ء
۲۷۔ ترجمہ اسلام اس کے عقائد اور ادارے (مولفہ ایچ لیمنس)
۲۸۔ ترجمہ ہندستان اور ذات پات (مولفہ ایمل سینارٹ)
۲۹۔ ایرانی لوگ ۱۹۳۱ء
۳۰۔ ترتیب و شرح سیاحت مارکو پولو

۳۱۔ ترتیب سر نٹنی شرلے اور اس کا مہم ایران ۱۹۳۳ء
۳۲۔ فارسی نثر۔ فارسی نظم ۱۹۳۳ء
۳۳۔ مارکوپولو اور اس کی کتاب ۱۹۳۴ء
۳۴۔ مشرقی ترکی زبان کے مکالمے (سیاحوں کی دلچسپی سے متعلق) ۱۹۳۴ء
۳۵۔ ترتیب و اشاعت جریدہ رابرٹ سٹوڈارٹ ۱۹۳۵ء
۳۶۔ ترتیب ترکوں کے مباحث (مولفہ سینٹ ٹامس شرلے)

سر ڈینی سن راس نے جامعہ اسٹراس بورگ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ جامعہ لندن و جامعہ کلکتہ کے رفیق بنائے گئے۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے اعزازی رفیق منتخب ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں سی آئی ای کا خطاب ملا۔ اس کے بعد ہنگیرین اکاڈمی، پرتگالی اکاڈمی، رائل بٹاوین سوسائٹی اور پراگ یونیورسٹی کے کر سپانڈنگ رکن بنائے گئے۔
۱۹۱۸ء میں سر کا خطاب حاصل کیا۔ آ۔ ڈر اف دی نارتھ سکنڈ کلاس ملا۔ اس کے بعد جامعہ لندن نے ڈی لٹ کی ڈگری پیش کی اور ۱۹۳۳ء رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا طلائی تمغہ حاصل کیا۔ عہد حاضر کے کسی مستشرق کو سر ڈینی سن راس جیسی عظمت اور مقبولیت حاصل نہیں ہے۔

سید محی الدین قادری زور

غزل

جن کے جلوے یہ ہر طور نظر آتے ہیں　　دل کے پردے میں وہ مستور نظر آتے ہیں
نہ اشارہ نہ کنایہ نہ تبسم نہ کلام　　پاس بیٹھے ہیں مگر دور نظر آتے ہیں
جتنے ساغر ہیں چمن میں گل تر کے ساقی　　بادۂ حسن سے معمور نظر آتے ہیں
کس کا میں دیکھنے والا ہوں نہ پوچھو یہ کلیم　　اک نظر میں مجھے سو طور نظر آتے ہیں
میکدہ ہے کوئی یا جلوہ گہہ جاناں ہے　　بے پیے سیکڑوں مخمور نظر آتے ہیں
تھک گیا قافلۂ زیست بھی چلتے چلتے　　ابھی منزل کے نشاں دور نظر آتے ہیں

ہر نظر اس کی چھلکتا ہوا ساغر ہے جلیل
آج ہم پینے پہ مجبور نظر آتے ہیں

فصاحت جنگ جلیل

محسوسات

مرے حبیب! تو شرمندۂ وفا کیوں ہے — کسی غریب کی ہستی سے کھیلتا کیوں ہے
یہ کیوں کہوں کہ تری چاہ نے تباہ کیا — میں جانتا ہوں مرے دل نے جو گناہ کیا

ہے اپنے جرمِ محبت کا اعتراف مجھے!!
جنوں نواز!! نہ کرنا کبھی معاف مجھے!!

وہ دل جسے ترے لطف و کرم نے لوٹ لیا — وہ سازؔ جس کو تری چشمِ نم نے لوٹ لیا
نیازِ عشق کو ناز و ادا میں جذب کیا — نظامِ ہستیٔ دل کو وفا میں جذب کیا

اور اس پہ تو ہی پشیماں ہے کیا قیامت ہے!
وفا یہ کیسی ہے، کیسا یہ جوشِ الفت ہے!

ہر ایک سانس اگر اشک بن کے بہہ جائے — مرے لبوں پہ ہنسی آہ بن کے رہ جائے

تو جب بھی حقِ محبت ادا نہیں ہوگا
تری وفاؤں کا ہمدم بسا نہیں ہوگا

غلط غلط، کہ نہیں مجھ پہ اعتبار تجھے — بجا بجا، کہ کیا میں نے سوگوار تجھے
قبول کر کے مرے ہدیۂ محبت کو — بلند کر دیا میری نظر میں فطرت کو
اور اب یہ وہم نہ یاد آئے گی وفا تیری — مجھے یقیں کہ وہی وجہِ زندگی میری!

جواب بھی تجھ کو مرے دل سے بدگمانی ہے
یہ اعتمادِ محبت کی اک نشانی ہے!!

نہ ڈھونڈھ چاروں طرف اے نگاہِ یار مجھے — کہیں نہ پائے گی یہ چشمِ اشکبار مجھے
خود اپنے قلب کی گہرائی میں پکار مجھے — وہیں ملوں گا ملا ہے وہی دیار مجھے

زمانہ اس کو نہ سمجھے گا۔ تجھ سے کہتا ہوں!!
میں تیرے پاس۔ ترے ساتھ دل میں رہتا ہوں!!

وفورِ غم سے جگر پاش پاش ہونے دے — خدا کے واسطے جی بھر کے آج رونے دے
جو چاہوں ایک گھڑی کو ملے قرار مجھے — نہیں ہے اتنا بھی اب دل پہ اختیار مجھے

وہ دن قریب ہیں خود کو بھی جب بھلا دوں گا!!
تعینات کی سنگیں حدیں مٹا دوں گا!!

صمد رضوی سازؔ

دیوتاؤں کا فیصلہ

اگلے زمانہ میں لوگ انسان کو انصاف کرنے سے معذور سمجھ کر وقتاً فوقتاً طرح طرح کے دوسرے طریقے اختیار کر چکے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ آپ ان کے انصاف کو مشتبہ نظروں سے دیکھیں اور رخنوں سے بھرا ہوا خیال کریں۔ لیکن ہماری عدالتیں ان سے بری ہیں؟ اور اس زمانہ کا انصاف تو مفت ہوتا تھا مفت۔ لاکھوں کروڑوں روپے انصاف کے بہانے محکمے قائم کرنے کے لئے رعایا سے نہیں لوٹے جاتے تھے۔ اور یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ پچھلے دنوں جرائم آج کل سے ہزار گنا کم تھے اور کیا اچھے انصاف کی سچی جانچ جرائم کی کمی نہیں ہے؟

خیر یہ باتیں تو ایک طرف اب ہم آپ کو پچھلے زمانے کی ایک عجیب و غریب عدالت میں دائر کیا ہوا ایک عجیب مقدمہ کا حال سناتے ہیں۔

دوسری صدی عیسوی میں وسط ایشیا کے ایک بادشاہ نے دنیوی عدالتوں اور قوانین کو کھوکھلا پا کر انصاف کا ایک نرالا ڈھنگ ایجاد کیا تھا۔ یہ عدالت انسانی اثرات سے بالکل بری تھی یعنی یہاں انصاف دیوتاؤں کا ہوتا تھا۔

شہر کے ایک وسیع میدان میں یہ دیوتا اپنا فیصلہ سنایا کرتے تھے۔ اس عدالت کے وسط میں ایک حصہ لوہے کی سلاخوں سے گھرا ہوا تھا اس شے کے ایک طرف دو تہہ خانے تھے جہاں آمد و رفت بھی پوشیدہ سرنگوں کے ذریعے ہوا کرتی تھی۔ ان تہہ خانوں کا ایک ایک دروازہ سطح زمین پر سلاخوں سے گھرے ہوئے حصے میں کھلتا تھا۔ ان دروازوں کے بالکل مقابل عدالت کے دوسرے کنارے سلاخوں سے باہر دو طلائی تخت تھے جس پر شاہ اور اس کی بیٹی جلوہ افروز ہوتے تھے۔

یہ تو ہوا عدالت کا نقشہ۔ اب اس میں انصاف کس طرح ہوتا تھا؟ جب کوئی شخص کسی جرم کے الزام میں گرفتار ہو کر آتا تھا تو تمام شہر میں اعلان کر دیا جاتا تھا کہ فلاں دن دیوتاؤں کی عدالت میں اس شخص کا انصاف ہوگا۔ چنانچہ اس دن سب لوگ عدالت میں جمع ہو جاتے تھے۔ شاہ اور شہزادی اپنے اپنے تخت پر رونق افروز ہونے کے بعد ملزم کو عدالت میں پیش کیا جاتا تھا۔ ملزم پہلے شاہی تخت کے سامنے جا کر شاہی آداب بجا لاتا اور پھر واپس ہو جاتا اور سلاخوں کے اندر داخل ہو کر تہہ خانوں کے ان دو دروازوں میں سے کسی ایک کو اپنے ہی ہاتھوں کھول دیتا۔ اب ان دو تہہ خانوں میں کیا رہتا تھا؟

ایک میں تو ملک الموت یعنی ایک خونخوار شیر ہوتا تھا جو خاص طور سے اس انصاف کے لئے کئی روز سے بھوکا رکھا جاتا۔ اگر ملزم اس دروازے کو کھولتا تو شیر فوراً اس کا خاتمہ کر دیتا تھا۔ دیکھنے والے رنج و غم کرتے تھے۔ سوگ کی گھنٹیاں بجائی جاتی تھیں اور سیکڑوں غلام جو سوگ کے لئے خاص طور سے مہیا کئے جاتے تھے، زور زور سے رونا چلانا شروع کر دیتے تھے۔ لوگوں کو یقین ہو جاتا تھا کہ ملزم نے یقیناً جرم کیا تھا۔

اگر ملزم دوسرا دروازہ کھولتا تو اس میں سے ایک حور وش پری جمال نازنین برآمد ہوتی تھی جو اس شخص کے قریب آ کر اپنے گلے کا ہار اس کو پہنا دیتی تھی۔ فوراً مذہبی گرو طلب کئے جاتے تھے جو وہیں پر تیار رہتے تھے۔ اور اسی وقت اس حسینہ کی اس شخص کے ساتھ شادی ہو جاتی تھی۔ سب لوگ خوشیاں مناتے تھے اور دولہا دلہن کی خوشی

کے لئے دیوتاؤں سے دعائیں مانگتے تھے اور ان پر پھولوں کی بارش کرتے تھے۔

اب اگر اس شخص کو لوگوں نے اپنی ہی آنکھوں سے جرم کرتے دیکھا ہو تو کیا تھا۔ مانا کہ اس نے واقعی جرم کیا تھا لیکن جب دیوتا اس سے راضی ہیں اور جب دیوتاؤں کو اس کا جرم پسند ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی مردانہ حرکت انسانیت کے لئے نجات اور بھلائی کا باعث تھی۔ اس نے خود ہی اپنے ہاتھوں سے دروازہ کھولا تھا۔ دیوتاؤں نے اس کے دل میں وہی دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا تھا۔ اور دیوتاؤں کے انصاف پر بھلا کون سر ہلا سکتا تھا۔

ہماری نظروں میں یہ انصاف سچا ہوتا تھا یا جھوٹا لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس انصاف کا اثر قوم کے ضمیر پر تو خوب پڑتا تھا۔ سب لوگ سمجھتے تھے کہ انصاف دیوتا کرتے ہیں اور دیوتا تو دل کا سب حال جانتے ہیں ان کے لئے ظاہر و پوشیدہ سب برابر ہے۔ گناہ کریں گے تو ضرور سزا پائیں گے اور سزا بھی کیسی۔ موت!! اتنا جینا اس سے تو دوری اچھے۔

خیر انصاف تو پکا ہوتا تھا۔ اس کے خلاف کسی کو احتجاج کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی لیکن

ایک نوجوان فوجی عہدہ دار نے جو جرم سرزد کیا بالکل نرالا جس کی نظیر عدالت کی تاریخ میں ایک ہی تھی اس نے پریم کیا ... شہزادی سے!! اور پریم کے لئے تو کوئی بندھن نہیں ہے شہزادی بھی اس نوجوان سپاہی سے محبت کرنے لگی تھی ... کیا پریم کرنا پاپ تھا؟ نہ ہو۔ لیکن ایک اجنبی عورت سے بار بار ملنا۔ راتوں کو تنہا اور پہر گھنٹوں سرگوشیاں کرنا یہ ضرور پاپ تھا۔ اور یہ باتیں کیا کہیں چھپا کرتی ہیں۔ شاہ کو معلوم ہو گیا اور شاہ بھی بیچارہ انصاف میں جکڑا ہوا تھا۔ مجبور تھا وہ کیا ہی کر سکتا تھا۔ بجز اس کے کہ اس جرم کا فیصلہ عدالت کے سپرد کردے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نوجوان سپاہی کو عدالت میں حاضر ہو کر دیوتاؤں کا فیصلہ حاصل کرنے کی اطلاع دی گئی۔

چونکہ یہ جرم ایک خاص جرم تھا اور اس میں شہزادی اور شاہ کو خاص دلچسپی تھی اس لئے اس مقدمہ کے لئے خاص خاص اور بڑی بڑی تیاریاں کی گئیں۔ شاہی پنجروں کا سب سے زیادہ خونخوار شیر اور ملک کی سب سے زیادہ حسین لڑکی اس نوجوان پریمی کے لئے منتخب کئے گئے۔ اور ملک کے کونے کونے میں اعلان کر دیا گیا کہ فلاں دن اس فوجی نوجوان کا اس جرم کے الزام میں عدالت سے فیصلہ حاصل کیا جائے گا۔

آخر وہ دن بھی آگیا۔ سب لوگ عدالت کے میدان کے گرد اگرد جمع ہو گئے۔ کچھ دیر بعد نقارے پر چوب پڑی ساتھ ہی شاہ اور شہزادی اپنے اپنے تخت پر رونق افروز ہوئے اور نوجوان ملزم کو حاضر عدالت کیا گیا۔

لوگوں کی تعداد ہمیشہ سے بہت زیادہ تھی اور ان سب کا دل ملزم کے لئے ہمدردی سے لبریز تھا۔ یہ بانکا سپاہی نہایت خوش اخلاق اور ہر دل عزیز تھا۔ عدالت میں اس کو جاتے دیکھ کر لوگوں نے آہیں بھرنی شروع کیں اور صدق دل سے دعاؤں کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ ہر شخص بے اندازہ جذبات سے بے قابو ہو رہا تھا۔ سب کے دل دھڑک رہے تھے اور بے چینی کی ایک آگ لگی ہوئی تھی لیکن نوجوان سپاہی اطمینان و سکون کا مجسمہ بنا ہوا فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔

شہزادی نے بھی اپنے حصے کا پورا کام کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس مقدمے میں اس کو بے انتہا دلچسپی تھی۔ اپنی جان خطرہ میں ڈال کر اس نے تمام کٹھن منزلیں طے کر لیں اور وہ وہ باتیں معلوم کر لیں جو دیوتاؤں کے قانون کے مطابق خود شاہ کو بھی

معلوم نہ ہو سکتی تھیں۔ اور کیوں نہیں؟ ایک شہزادی، نوجوان، حسین، کیا کچھ نہ کر سکتی تھی۔ ان دیویوں کے بھید میں تو دیوتا بھی کئی مرتبہ چکر کھا چکے ہیں۔ غرض وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ کونسی لڑکی نوجوان کے لئے منتخب کی گئی تھی اور یہ بھی کہ کس نہ خانے میں اس کو رکھا گیا تھا۔

نقارے پر دوبارہ چوب پڑی اور مقدمے کی کارروائی شروع ہو گئی۔ نوجوان آگے بڑھا۔ شاہ اور شہزادی کے سامنے جھک کر آداب بجا لایا۔ اور سر اٹھاتے اٹھاتے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے شہزادی سے دریافت کرنا چاہا کہ کونسے دروازے کو کھلوایا جائے۔ نوجوان سمجھ چکا تھا کہ شہزادی نے سب کچھ معلوم کر لیا ہوگا۔ اور شہزادی یہ خوب جانتی تھی کہ اس کا دلبر اس سے ضرور دریافت کرے گا۔ اور اس نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کیا جواب دے گی۔

جب نوجوان نے استفسارانہ نگاہیں شہزادی کی طرف اٹھائیں تو شہزادی نے نہایت ہی اطمینان کے ساتھ اپنے سیدھے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ نوجوان نے بھی اطمینان کے ساتھ لوٹ کر قدم بڑھایا اور سلاخوں کے اندر داخل ہو کر سیدھی جانب کا دروازہ کھول دیا۔

کیا اس دروازے میں سے لڑکی نکلی؟ ہم کو یہاں پر ایک لمحہ غور کرنا چاہیئے۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ ایک نیم وحشی قوم کی شہزادی تھی جس میں حسد کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ شہزادی اس منتخب شدہ حسینہ سے واقف تھی، پہچانتی تھی اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے لاجواب حسن کے سبب اس سے کچھ جلتی بھی تھی۔ اپنے فرشتے کی گود میں اپنی جگہ اس حسینہ کا تصور اس کو مارے ڈالتا تھا۔ نوجوان میرا ہے صرف میرا۔ اگر دیوتا اس کو میرا نہیں ہونے دیتے تو پھر وہ کسی اور کا بھی نہیں ہو سکے گا!

وحشیانہ جوش کے ساتھ یہ خیال اس کے دماغ میں سمائے ہوئے تھا۔ نوجوان کی اس حسینہ کے ساتھ شادی دیکھنے کے بدلے مرجانا زیادہ پسند کرتی تھی۔

تو کیا اس دروازے میں سے شیر نکلا؟ کیا شہزادی نے اپنے پریمی کو شیر کے حوالے کر دیا ...... چاہے کچھ ہی ہو پھر بھی وہ نوجوان سے بیحد پریم کرتی تھی اس پر دل و جان سے فدا تھی۔ کیا یہ کسی طرح بھی ممکن تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اور اپنے ہی اشارے سے اپنے عاشق صادق کو، اپنے دل و جگر کو شیر کے خونی پنجوں کے حوالے کر دیتی، اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے سے جدا کر دیتی، بالکل ہی کھو دیتی، فرقت میں اپنی ساری عمر برباد کرتی اور اس کی یاد میں مر مر کے زندہ رہتی۔

آخر شہزادی نے کیا تصفیہ کیا؟ اپنے دلبر کو موت کے حوالے یا دوسرے کے حوالے کیونکہ اس کے سوائے کوئی چارہ نہ تھا۔
اس سوال کا جواب میں اس داستان کے پڑھنے والے دوستوں سے چاہوں گا کہ ہر پہلو پر مکمل غور کرنے کے بعد اس کا فیصلہ وہ خود کریں کہ دروازے میں سے کیا نکلا

ملک الموت یا پیام مسرت

ایم، اے شاکر

حسنِ آوارہ

حریمِ ناز کے پردے اٹھا رہا ہے کوئی — سرور و کیف کی دنیا بسا رہا ہے کوئی
نگاہِ شوق کو رنگیں بنا رہا ہے کوئی — گذشتہ دورِ نفس کو بلا رہا ہے کوئی

بہار و کیف کے جھونکے چمن میں آنے لگے
گلوں کو جوشِ مسرت سے گدگدانے لگے

قرار اب نہیں صبر و قرار جاتے ہیں — حواس ہوش بھی بے اختیار جاتے ہیں
مری نگاہ سے لیل و نہار جاتے ہیں — نیازمندِ غمِ روزگار جاتے ہیں

ستارے ڈوب رہے ہیں سحر کی آمد ہے
پُر آب چشم ہیں وقتِ سفر کی آمد ہے

درِ حبیب پہ فرقِ نیاز سجدے میں — قبول ہو گئی دل کی نیاز سجدے میں
تمام ہو گئی میری نماز سجدے میں — رہا نہ راز محبت کا راز سجدے میں

مری نگاہ میں کون و مکاں کے جلوے ہیں
کفِ نیاز میں عرشِ بریں کے پردے ہیں

ہجومِ شوق میں کھو دوں نہ ان نظاروں کو — اتار لایا ہوں میں آسماں سے تاروں کو
چھپا لوں گوشۂ خاطر میں لالہ زاروں کو — کہاں میں ڈھونڈنے جاؤں گا ان بہاروں کو

گلوں سے رات کو شبنم نے آشنائی کی
سحر ہوئی تو ستمگر نے بے وفائی کی

کسی کا حسن جہاں سوز جلوہ ریز ہے آج — نظر کی منزلِ اول سرور خیز ہے آج
نفس کی آمد و شد آندھیوں سی تیز ہے آج — گلاب دامنِ صحرا کا عطر بیز ہے آج

گلے لگا کے صبا سے نسیم کہتی ہے
گلی گلی میں حسن کی مہکتی ہے

عزیز احمد

تاثرات سفر یورپ

بسلسلۂ گذشتہ

یوگوسلافیہ ۹ تا ۱۱ جولائی ہم صبح چھ بجے یوگوسلافیہ کے مشہور و معروف پایۂ تخت بلغراد پہونچے اور اسٹیشن سے قریب ہی گرانڈ ہوٹل میں قیام کیا۔ تہذیب کے اعتبار سے بلغراد بجائے یورپ کے ایشیا کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ لوگ اول تو کوٹ پہنتے ہی نہیں اور جو مغربی فیشن کے دلدادہ ہیں وہ کوٹ ساتھ لے لیتے ہیں لیکن بجائے پہننے کے بے تعلف کندھوں پر ڈالے پھرتے ہیں۔ یہاں کی زندگی میں بہت کچھ مشرقیت نظر آتی ہے اور سڑکوں پر بے چھجے کی سیاہ ٹوپی اور پاجامہ تقریباً اسی وضع کا جیسا ہمارے یہاں پہنا جاتا ہے۔ اور کرتے پر صدری یہ سب لباس نظر آتے ہیں۔ عورتیں بجائے کسی قسم کی ٹوپی پہننے کے سر پر رومال باندھتی ہیں جس سے بال ڈھک جاتے ہیں اور بدن پر رنگ برنگ کی مشرقی طرز کی صدریاں پہنتی ہیں

یوگوسلافیہ کی آبادی تین پندرہ لاکھ مسلمان ہیں اور حکومتی کابینہ میں دو مسلمان وزرا یعنی جعفر یوہ وچ اور محمد سپاہو شامل ہیں۔ یہاں کے اکثر مسلمان دو صوبوں یعنی بوسنیہ اور ہرزیگووینہ میں آباد ہیں۔ برخلاف بلغاری مسلمانوں کے جو ترکی النسل ہیں، یہ سب خالص یوروپین اور اسلام قبول کئے ہیں اور ان کی مادری زبان سربی ہے۔ میں کوئی تو نہیں جا سکا لیکن تصاویر دیکھنے سے یہ شہر بالکل ایشیائی معلوم ہوتا ہے جس میں مسجدیں، مقبرے، خانقاہیں سب ہی نظر آتی ہیں۔ بہرحال جہاں تک بلغراد کا تعلق ہے۔ اب صرف ایک ہی مسجد باقی رہ گئی ہے۔ میں نے شہر کی رہنمائی کے لئے جو کتاب خریدی اس کا ایک فقرہ نقل کرنے کے قابل ہے اس کا مصنف کرنیہ شلی کہتا ہے کہ "سلطان سلیمان اعظم کے آثار مدت ہوئی مسمار ہو گئے۔ مسلمانوں کے قبرستان جو شہر کے وسطی حصے میں نظر آتے تھے، ان کا وجود باقی نہیں رہا۔ ان کی قبروں میں سے صرف ایک قبہ باقی ہے، وہ ایک مسلمان ولی شیخ مصطفےٰ کی ہے۔ بلغراد مساجد سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن اب شہر میں صرف ایک مسجد ہے جس کی تعمیر سولھویں صدی میں ہوئی تھی اور یہ بھی زمانۂ حال تک گرجا کا کام دیتی تھی۔ ملان شاہ سربیہ ۱۹۰۶ء تا ۱۹۱۲ء نے اسے از سر نو مسلمانوں کے سپرد کر دیا اس کے علاوہ کوئی مسجد بلغراد میں باقی نہیں ہے" انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یوگوسلافیہ کا سکہ دینار کہلاتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ قدیم روما اور خلافت اسلامیہ کے زمانے میں درہم اور دینار ساتھ ساتھ چلتے تھے لیکن یورپ میں جہاں دینار ہے وہاں درہم نہیں اور جہاں درہم کا چلن ہے وہاں دینار نہیں۔ جنگ سے پہلے ایک انگریزی اشرفی کے پچیس دینار آتے تھے، اب دو سو پینتیس آتے ہیں۔ بلغاری اور یوگوسلافی زبانیں تقریباً ایک ہی سی ہیں اور مجھ سے لوگوں نے بیان کیا کہ ایک ملک کا باشندہ دوسرے ملک کی بولی بہ آسانی سمجھ سکتا ہے، لیکن طرز تحریر میں فرق ہے۔ بلغاریہ میں روس کی طرح سریلی Cyrillic حروف رائج ہیں۔

یوگوسلافیہ میں لاطینی اور سریلی دونوں حروف کا رواج ہے۔ قدیم سربیہ میں جس کا مستقر بلغراد ہے، سوائے سریلی کے کوئی لاطینی حرف کا نام یا اعلان دیکھنے میں بھی نہیں آیا۔ اور کروایشیا (جس کا اصلی نام "خروات" ہے) کہیں

سربی حروف دیکھنے میں نہیں آتا بلکہ رسم الخط لاطینی (انگریزی) ہے۔ بلغراد کی آبادی جنگ سے پہلے صرف اسی ہزار تھی بلقان جنگ کے بعد جب ملک میں نئے علاقوں مثلاً سلووینیہ کروآتیہ جبل اسود وغیرہ شامل ہو گئے تو پایۂ تخت کی آبادی یکایک بڑھ گئی اور اب اس میں کم و بیش چار لاکھ نفوس آباد ہیں۔ یہاں کے تمام سرکاری ایوانات، مثلاً وزارتیں محلات اور دوسرے سرکاری دفاتر بالکل جدید ہیں اور نئی یوگوسلافیہ جیسی وسیع سلطنت کے نمایاں شان ہیں۔

ہوٹل میں تھوڑی دیر آرام لینے کے بعد اسی عظیم الشان قلعہ کی زیارت کو گیا جو مسجد کے بعد بلغراد میں ترکوں کی واحد یادگار ہے اور جس کے نام "قلعہ میدان" کو بگاڑ کر اب Kalemagdan کہتے ہیں۔ قلعہ میدان دریائے ڈینیوب اور دریائے ساوے کے سنگم پر ایک بڑی پہاڑی پر واقع ہے اور اس کے در و دیوار اپنی زبان حال سے ترکی حکومت کے نشان جس کا یہ سیکڑوں برس تک ناقابل تسخیر مورچہ تھا آٹھ آٹھ آنسو بہاتا ہے۔ اس کی بیشتر خندقوں کو پٹ کر ایک بہت بڑا پارک بنا دیا گیا ہے لیکن ایسے حصے بھی ہیں جہاں فوج رہتی ہے اور یہاں کوئی باہر والا نہیں جا سکتا۔ اس فوجی حصے میں ایسی عمارتیں ایسی نظر آئیں جو پہلے مسجدیں ہوں گی لیکن اب گرجا ہیں اور میری رہنما کتاب میں چند ایسی قبروں کا پتہ دیا تھا جہاں تک کسی کی پہونچ ممکن نہیں۔ پارک کے ایک کونے پر کسی نہ کسی ممتاز سربی کا مجسمہ ہے اور وسط میں ایک جغرافی نوادر خانہ ہے لیکن سب سے عجیب منظر وہ ہے جو دریائے ساوے کے سامنے قلعہ میدان کا حصہ ہے ترک جب اس حصہ کے مالک تھے تو انھوں نے اس کا نام "فکر ایری" یا "فکر کی جگہ" رکھا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ یہاں جو بنچیں پڑی ہیں وہاں سے کچھ ایسا لطیف منظر ہے کہ ان پر بیٹھ کر انسان سب کچھ بھول جاتا ہے اور دریائے فکر میں غرق ہو جاتا ہے۔ اس کے قریب میں فوجی نوادر خانہ ہے جو دراصل ترکی گورنر کا محل تھا اور اس وقت بھی اس کی کچھ ایسی مشرقی ہیئت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس میں سے کوئی ترک نکل آئے گا۔ قریب ہی ترکی فاتح بوسنیا داماد علی پاشا کی تربت ہے۔ آپ کسی زمانے میں سربیہ کے والی تھے اور انھوں نے اس خطہ میں اسلامی عدل و انصاف کا کچھ ایسا ڈنکا بجایا کہ آج بھی یوگوسلافی لوگ انھیں اپنا "ماں باپ" کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ قبر کے [illegible] سربی ترکی اور سربی زبان میں مناسب کتبہ ہے اور قبر پر سبز چادر پڑی رہتی ہے۔

قلعہ میدان سے نصف میل کے قریب بلغراد کی واحد مسجد ہے یہاں پہونچ کر عجیب لطیفہ ہوا یعنی مسجد میں شاید ان مظالم کے سبب سے جو عیسائیوں نے مسلمانوں پر ڈھائے ہیں (غالباً غیر مسلموں کو داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔ چونکہ میری ٹوپی یوروپی تھی اس لئے مجھے روک لیا (شاید امتحاناً مجھ سے مذہب کی اذان کہلوائی گئی) اور مجھے نماز کے لئے اقامت بھی کہنی پڑی۔ جو لوگ نماز میں شامل تھے وہ سب کے سب یوروپی تھے۔ امام صاحب کا طرز متقدمانہ تھا اور نام نعمت [illegible] تھا۔ بہرحال ان کے ساتھ ایک گھنٹہ نہایت پرلطف صحبت رہی بلکہ انھوں ہی نے داماد علی پاشا کے مقبرے کی نشان دہی کی۔

اگلے دن صبح کے وقت نوادر خانہ شاہزادہ پال دیکھنے گیا۔ یہ نوادر خانہ شاہزادہ پال کے وقف کئے ہوئے محل میں واقع ہے۔ پال کے نام سے بہت لوگ واقف ہوں گے اس لئے کہ یہ ڈچز آف کینٹ کے (جو شاہ جارج ششم کی سب سے چھوٹی بھاوج ہیں) چچا اور پیٹر دوم شاہ یوگوسلافیہ کی نابالغی کے زمانے میں متولی سلطنت ہیں۔ اس نوادر خانے میں علاوہ یونانی، رومن اور اسلامی اشیا کے، جو سلطنت یوگوسلافیہ میں ملی ہیں، سربیہ کی ابتدائی تاریخ کے بعض نایاب

دلچسپ آثار بھی ہیں، مثلاً سربیہ کے پہلے عیسائی حکمران میلوش کا لباس، قراجارج کے (جو پہلے شاہ سربیہ پیٹر اول کا باپ اور موجودہ حکمران کا پردادا تھا) کپڑے اور پیٹر اول کا لباس تاج پوشی، یہ سب چیزیں بہت دلچسپ ہیں۔ جو چیز خاص طور پر قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ باوجودیکہ میلوش اور قراجارج ترکوں کے جانی دشمن تھے تاہم ان کے لباس ایشیائی ہی نہیں بلکہ عربی وضع کے ہیں چنانچہ میلوش کا عمامہ اور قراجارج کا جبہ خاص طور پر قابل دید ہیں۔ حالانکہ میلوش وہ شخص ہے جس نے ۱۸۱۵ء میں ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ترکی بلغراد اور اس کی مساجد و مقابر کو مسمار کرنا شروع کیا تھا۔ ان لباسوں سے پتہ چلتا ہے کہ ترکوں نے دنیا کے اس حصے پر کس قدر اثر قائم کر لیا تھا اور موجودہ بلقانی ریاستیں اس اثر کو کس حد تک زائل کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔

بلغراد سے چلنے سے پہلے پھر ایک مرتبہ قلہ میدان کے ترکی آثار دیکھنے گیا اور داماد علی پاشا کی تربت پر آخری مرتبہ فاتحہ پڑھی۔ کھانا کھانے کے بعد جو زیادہ تر ترکی تھا ۲۵-۲ کی گاڑی سے بلغراد سے روانہ ہو گیا اور چند ہی منٹ میں دریائے ساوے عبور کر لیا جو صدیوں تک ترکوں اور آسٹریا ہنگری کی سرحد بنا ہوا تھا۔ ارادہ براہ راست آگے جانے کا تھا لیکن راستہ میں میری اہلیہ کا مزاج خراب ہو گیا۔ اور چونکہ وینس تک رات بھر کا سفر تھا اس لئے مجبوراً زاگریب میں (جس کا نام جنگ سے پہلے اگرام تھا اور جو کرواتیہ کا مستقر ہے) قیام کرنا پڑا۔ ریل یہاں ½۹ بجے پہونچی اور ہم یہاں کے [illegible] ہوٹل میں ٹھیر گئے۔

یہ اچھا ہوا کہ زاگریب میں ایک روز رہنا پڑا اس لئے کہ یہاں آنے کے بغیر اس عجیب ملک یوگوسلافیہ کی زندگی کے ایک رخ پر نظر ڈالنا مشکل ہوتا۔ یوگوسلافیہ منجملہ ان ممالک کے ہے جس میں ہماری اردو ہندی کی طرح تقریباً ایک ہی زبان کے دو مختلف رسم الخط ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ سربیہ خاص میں یہ زبان [illegible] حروف میں لکھی جاتی ہے جو روسی زبان کے لئے حروف ہیں۔ اور کرواتیہ میں کلیتاً لاطینی حروف رائج ہیں۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ سربیہ اور کرواتیہ کے الفاظ کے درمیان نہایت ہی کم فرق ہے اور جو ہے وہ محض جزوی مثلاً روٹی کو سربی میں [illegible] اور کرواتی میں [illegible] کہتے ہیں۔ لیکن سربی اپنی زبان لاطینی حروف میں اور کرواتی اپنی زبان سربی حروف میں لکھنا گوارہ نہیں کرتے۔ اس کے باوجود دونوں خطے کے رہنے والے ایک دوسرے کے ساتھ نہایت امن و امان سے زندگی بسر کرتے ہیں یوگوسلافیہ کے سرکاری کاغذات دونوں حروف ہی میں طبع ہوتے ہیں۔ بعض سکوں پر ایک قسم کے حروف ہیں بعض پر دوسری قسم کے حروف میں کتبہ ہوتا ہے۔ مثلاً ۱، ۲ اور پچاس دینار کے سکوں پر سربی میں اور ۱۰ اور ۲۰ دینار کے سکوں پر لاطینی میں اور نوٹوں پر ایک طرف لاطینی میں نہ جانے ہمارے ہندوستان میں اردو ہندی والوں کے درمیان کچھ اسی انداز کی مفاہمت کیوں ممکن نہیں۔ مذہبی اعتبار سے بھی یوگوسلافیہ میں تنوع ہے۔ یعنی کرواتی، رومن کیتھولک اور بوسنیہ والے سب کے سب مسلمان اور باقی ماندہ ملک والے ارتھوڈکس ہیں۔

زاگریب خود ایک نہایت خوبصورت شہر ہے۔ آبادی دو لاکھ ہے لیکن ہمارے بڑے بڑے شہروں میں بھی اس قدر خوبصورتی

اور صفائی نہیں جتنی اس شہر میں ہے۔ سات یا آٹھ مختلف قسم کے نوادر خانے ہیں جن میں زیادہ تر ایک ایک طرز عمارت، یہاں کے
مخصوص ملبوسات (جن میں ترکی اور اسلامی اثر صاف نمایاں ہے) یہاں کی صنعت و حرفت نقاشی اور پیکر تراشی کی نمائش
ہیں۔ یونیورسٹی جس میں کروآتی زبان میں تمام تعلیم دی جاتی ہے بند تھی لیکن کتب خانہ کھلا ہوا تھا۔ یونیورسٹی نسبتاً جدید ہے
اور Dr Strossmayer نے ۱۸۶۱ء میں قائم کیا تھا۔ اس کے نام پر ایک بڑا ایوان اور ایک سڑک کے نام رکھے
گئے ہیں۔ دوسری بلقانی اور یوروپی جامعات کی طرح یہاں کی جامعہ میں بھی یہاں کے کیتھولک مذہب کی تعلیم کا شعبہ نہایت اہم ہے
اور دریافت سے معلوم ہوا کہ بہت سے طلبہ اس مضمون کو اختیار کرتے ہیں۔ یہ کتب خانہ ایک نہایت ہی نفیس عمارت میں ہے اور
اس میں چار لاکھ کتابیں ہیں لیکن جس مددگار خاتون نے مجھے کتب خانہ کی سیر کرائی وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی کہ افسوس ہے کہ
ہمارے یہاں بہت کم کتابیں ہیں۔ جامعہ میں ساڑھے چار ہزار طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ علاوہ بڑے کتب خانہ کے ہر شعبہ کا ایک ایک
جداگانہ کتب خانہ بھی ہے جو کلیتہً اس شعبہ کے پروفیسر سے متعلق ہے اور ہر شعبہ واری کتب خانہ میں دو تین ہزار کتابیں ہیں
میں نے مطالعہ خانے بھی دیکھے۔ ہر شخص کے لئے دو میٹر جگہ، ایک بجلی کی خوبصورت لیمپ، ایک گدے دار کرسی ہے۔ خواہ کمرہ
طلبہ کے لئے مخصوص ہو یا اساتذہ کے لئے۔ طلبہ کے کمرہ میں ۲۶۰ طلبہ کی نشستیں ہیں۔ پروفیسروں کے مطالعہ خانے میں ۲۴
نشستوں اور دوسرے بڑے درجہ کے اشخاص کے مطالعہ خانہ میں ۱۲ نشستوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ ناظم کتب خانہ کا درجہ پروفیسر کا
ہے۔ فہرست کے لئے جداگانہ کمرہ ہے اور یہ بالکل کارڈ سسٹم پر ہے۔ کارڈ کے جو تقریباً ۲۰ × ۲۰ سنٹی میٹر کا ہے، ایک طرف مضمون
واری فہرست ہے اور دوسری طرف جداگانہ مصنف واری اور کتاب واری۔ یہ نہیں کہ سب کارڈ مخلوط ہوں۔

شام کے وقت یہاں کا اسقفی گرجا دیکھا جس کے بعض حصے تیرہویں صدی کے بنے ہوئے ہیں۔ راستہ میں
ہم نے دیکھا کہ سڑک کے دونوں طرف انسانوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ بندھے ہوئے ہیں اور بڈھے بوڑھے جوان عورتیں مرد سب
کسی کے منتظر ہیں۔ آخر سات بجے ایک عظیم الشان جلوس گرجا کے سامنے پہنچا۔ یہاں بیچ میں پادری صاحبان حضرت
عیسیٰ کی تصویریں لئے ہوئے تھے۔ بوائے اسکاؤٹ اور وردی پوش سپاہی یوگوسلافیہ کا جھنڈا لئے ہوئے تھے۔ جلوس
والوں کے پشتوں پر کھانے پینے اور سونے بچھونے کی اشیاء بندھی تھیں۔ جلوس میں کچھ نہیں تو چار پانچ ہزار آدمی تو ضرور
ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ ہر سال یہ جلوس ۹ جولائی کو زاگریب سے چلتا ہے۔ یہاں سے ۱۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گرجا
(St. Maria Baritza P Maria Baritza) کا ہے۔ وہاں جاتا ہے۔ ۱۰ جولائی کو رہتے ہیں اور
۱۱ کو واپس زاگریب جاتے ہیں۔ عورتیں، مرد، بوڑھے، بچے سب پیدل ہوتے ہیں۔ مذہبی اور قومی گیت گائے جاتے ہیں
اور گیت گاتے ہوئے واپس آتے ہیں۔ سب کے سب نہایت تھکے ماندے معلوم ہوتے تھے لیکن دوسروں کے بوجھ کو لئے جاتے تھے
ہمارے ہندوستان میں مذہب کے نام سے اب مذاق اڑایا جانے لگا ہے۔ یہاں مذہب کا مظاہرہ جاہل اور پڑھے لکھے
دونوں پر ہے۔ زاگریب میں انگریزی کوئی نہیں جانتا۔ فرانسیسی کم جانتے ہیں اور واحد غیر ملکی زبان جس کا رواج ہے
جرمن ہے۔

<u>سرحدیں</u> | ۱۲ جولائی کو صبح ۶-۵۰ پر زاگریب سے روانہ ہوئے۔ شہر سے نکلتے ہی نہایت نفیس پہاڑی مناظر شروع

ہو جاتے ہیں اور کئی گھنٹے تک ریل دریائے ساوے کے کنارے کنارے چل کر Dinaric Alps
کو عبور کرتی ہے۔ راستہ میں کئی صاف شفاف شہر اور گاؤں نظر آئے جو بیس سال پہلے آسٹریا کی عملداری میں تھے
اور جواب یوگوسلافی ہیں Rakek یوگوسلافیہ کا آخری شہر ہے۔ یہاں پاسپورٹ دیکھے گئے۔ اسٹیشن سے نکلتے ہی
ریل اطالوی سرحد کو عبور کرتی ہے اور دو میل پر اطالوی شہر پوستومیا واقع ہے۔ روس کے مشہور نراجی مصنف کروپوٹکن نے
لکھا ہے کہ ماسکو سے پیرس جاؤ تو مختلف ممالک میں سے ہو کر گذرنا پڑتا ہے جن میں سے کسی ملک پر سیادت حاصل نہیں پھر بھی
بغیر ریل بدلے ہوئے یورپ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہونچ سکتے ہو۔ اس کو وہ نراجی اصول کی ایک دلیل کے
طور پر پیش کرتا ہے۔ اس دلیل میں حقیقت کا پہلو ہو یا نہ ہو یہ ضرور سچ ہے کہ ایک ملک سے دوسرے ملک کو بلا تکلف براہ راست
گاڑیوں میں بیٹھ کر جا رہے ہیں اور سوائے اس کے سرحد پر عملہ بدل جاتا ہے گاڑیاں وہی رہتی ہیں۔ ریل کی پٹری کی
چوڑائی ایک ہی ہے اور شکل سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک، زبان، قوانین، رسم و رواج اور مذہب سب کے سب بدل گئے۔ ہم نے
دیکھا کہ ایک ہی گاڑی استنبول سے چلتی ہے اور سیدھی پیرس اور کیلے جاتی ہے اور راستہ میں پہلے ترکی پھر یونانی پھر ترکی
پھر بلغاری پھر یوگوسلافی پھر اطالوی پھر سوئیٹسانی پھر فرانس کی سرحد عبور کرتی ہے۔ اور باوجودیکہ کوئی مشترک انتظام نہیں باہمی خوش
معاملگی کے سبب سے کسی قسم کی دقت پیش نہیں آتی۔ ہماری ریل Triesta کے اسٹیشن پر تین گھنٹے ٹھیری۔ راستہ میں میرامار کا
قلعہ نظر آیا جو نہایت درجہ نفیس خلیج پر واقع ہے۔ ٹریسٹ جنگ سے پہلے آسٹریا کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی۔ میرامار کے خوش منظر قلعہ
میں شہنشاہ آسٹریا کا بھائی میکسی میلین اپنے اچھے وقتوں میں رہا کرتا تھا اور یہیں سے وہ میکسیکو کا شہنشاہ بن کر آمریکہ گویا گولی
مارے جانے کے لئے چلا تھا۔

چونکہ ریل بہت بھری تھی اس لئے رات کے لئے پلنگ کمرے کا انتظام کرایا تھا جو ونیس میں ہمیں مل گیا اور جس کے تقریبا
بیس روپے رات تمام کے دینے پڑے۔ چونکہ رات ہی میں سوئیٹسانی سرحد عبور کی جاتی ہے اس لئے اپنے پاسپورٹ وغیرہ
پلنگ گاڑی کے کنڈکٹر کو دے دیئے اس کے بعد ہم سوگئے۔

۱۳ر جولائی کو ہماری ریل مشہور آفاق سیمپلون ٹنل Simplon Tunnel میں ہو کر گذری اس ٹنل کے ایک
طرف اٹلی اور دوسری جانب سوئیٹسان ہے چنانچہ ریل داخل ہوئی تو اٹلی کا ملک تھا اور نکلی تو ہم سوئیٹسان میں تھے یہ ٹنل بارہ میل
طویل ہے اور کوہ Monte Leone کی تہہ میں کھودا گیا ہے۔ ریل پوری رفتار سے چلی اور تقریباً پندرہ منٹ میں ٹنل سے
نکلی۔ اس وقت سے لے کر لوزان تک (جہاں وہ صلح نامہ ہوا تھا جس کی رو سے موجودہ صدر جمہوریہ ترکی عصمت انونو کی کاوشوں اور
کوششوں سے ترکی اغیار کے خوفناک پنجوں سے نکلا تھا) مناظر نہایت ہی دلفریب تھے۔ صرف دو ڈھائی گھنٹہ اس ملک کی ہوا کھانے کے بعد
ریل والورب کے مقام پر فرانس میں داخل ہوئی اور پھر پاسپورٹ دکھانے کی ضرورت پیش آئی لیکن برخلاف ان ممالک کے جن کی حدیں
ہم نے پہلے عبور کی تھیں، سوئیٹسان اور فرانس میں صرف رسمی طور پر پاسپورٹ پر مہر لگائی گئی، وہ روپیہ کے استفسار اور
سامان کے جھگڑے جو بلقانی ریاستوں اور اٹلی میں تھے یہاں نام کو بھی نہ تھے۔
شہر دیژوں سے پہلے ہی روپیہ تبدیل کرنے کے لئے ایک شخص ریل میں آیا اور اس نے یوگوسلافی دینار اور اطالوی

یہاں تک کہ سب اسٹیشنوں کے پلیٹ فارموں پر لوگ مصروف ناچ رہے ہیں اور ناچتے ناچتے تھکتے نہیں۔ یہ مشغلہ برابر تقریباً رات بھر رہا۔ رات کو دریائے سین پر آتشبازی ہوئی۔

یورپی اخبارات میں خبریں اس پھرتی سے چھپتی ہیں کہ صبح کے فوجی ریویو کی مکمل تصاویر اور بیانات دو بجے کے اخبارات میں چھپ گئے اور لوگوں نے پڑھ لئے!!

۱۰ جولائی کو صبح ۹ بجے پیرس سے روانہ ہوئے۔ راستے میں ریل فرانس کے مشہور میدانِ جنگ یعنی دریائے سوم کے کنارے ایسے شہروں میں ہو کر گذری جیسے ایب وِل، آمیاں وغیرہ اور ہم نے جگہ جگہ فوجی قبرستان انگریزی امریکی اور دوسرے اتحادی ملکوں کی جنگی یادگاریں اور ایسے گاؤں دیکھے جو جنگ کے زمانے میں بالکل مسمار ہوگئے تھے اور جنھیں از سرِ نو تعمیر کیا گیا ہے۔ ان کی چراگاہیں کھیت پھول پھل دیکھنے سے کسے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جہاں ہماری ریل ہو کر گذری وہاں کسی زمانے میں کیا کچھ قتل عام نہ ہوئے ہوں گے۔ آج یورپ انھیں بھولے ہوئے ہے اور پہلے سے بھی زیادہ خونیں جنگ کی تیاری میں مشغول ہے۔ بائیس میل کی آبنائے ڈوور خدا کے فضل سے ایسی خاموش تھی کہ جیسے چھوٹی سی جھیل ورنہ عام طور پر یہ ڈیڑھ گھنٹہ کا عبور ڈیڑھ دن کے برابر ہو جاتا ہے۔ ہم نے ۲½ بجے کے قریب انگلستان کے ساحل پر قدم رکھا۔

ہارون خاں شروانی

حیات

برقِ نگاہ سے جو فنا ہوگیا ہوں میں
سرمہ بنا ہوں خاکِ شفا ہوگیا ہوں میں

میری تڑپ کو دیکھئے بجلی کو دیکھئے
مجھ کو نہ چھیڑئیے کہ بلا ہوگیا ہوں میں

اب شوقِ دید ہے نہ تمنائے وصل ہے
کیا بے نیازِ وقتِ دعا ہوگیا ہوں میں

سر میں کبھی غرور تھا اب لب پہ آہ ہے
یعنی حباب بن کے ہوا ہوگیا ہوں میں

ذرّے میں آفتاب ہے قطرے میں بحر ہے
بندہ پکارتا ہے خدا ہوگیا ہوں میں

شعلہ بنا دیا ہے مجھے سوزِ عشق نے
ان کی گلی میں راہنما ہوگیا ہوں میں

ماضی و حال مجھ کو دکھاتے ہیں آئینہ
حیران ہوں شمیم کہ کیا ہوگیا ہوں میں

نبی الحسن شمیم

معلّمہ

ساڑھے آٹھ بجے وہ سوار ہو کر شہر سے باہر نکل گئے۔

شاہ راہ پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ اپریل کا خوشنما سورج اپنی تمازت کے ساتھ چمک رہا تھا، لیکن گڑھوں اور جھاڑیوں میں اس وقت بھی برف پڑی ہوئی تھی۔ تکلیف دہ، تاریک اور طویل موسم سرما، بمشکل ختم ہوا کہ موسم بہار اچانک شروع ہو گیا۔ لیکن یہ خوشگوار گرمی، اور ہری بھری جھاڑیاں جو بہار کی سانس لیتی ہوئی سرسبز و شاداب ہو رہی تھیں، خوش منظر جھیلوں پر منڈلاتے پرندوں کے سیاہ سیاہ جھنڈ، اور غیر شفاف حیرت زا آسمان، جہاں بہتے ہوئے چلے جانے کی تمنا ہر دل میں اٹھنا بالکل فطری امر ہے، ان سب میں ماریا وسیلیونا کے لئے کوئی جدت یا دلچسپی مطلق نہیں تھی، جو اس وقت بنڈی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ تیرہ سال سے وہ معلمہ کی حیثیت سے گزر بسر کر رہی ہے۔ ان تمام سالوں میں، وہ اپنی تنخواہ لینے کے لیے، شہر جتنی مرتبہ گئی ہو گی ان کا شمار دشوار ہے۔ شاید موسم بہار میں، جیسا کہ اس وقت ہے، یا خزاں میں شام کے وقت جب کہ موسلادھار بارش ہو رہی ہو، یا سرما میں، یہ سب اس کے لئے مساوی تھے۔ غیر متاثر طور سے اس کی صرف یہی خواہش رہتی کہ جتنی جلد ہو سکے منزلِ مقصود پر پہونچ جائے۔

اس کو کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ وہ ایک عرصہ دراز، تقریباً کوئی سو سال سے ملک کے اس گوشے میں رہتی سہتی ہے، اور گویا شہر سے اسکول تک کے راستہ کی سب چیزیں یہاں تک کہ ہر پتھر اور درخت اس کے ذہن نشین ہیں۔ اس کا ماضی اور حال یہیں ہے، اور مستقبل کے متعلق تو مدرسہ، شہر جانے اور لوٹ آنے کا راستہ، پھر وہی مدرسہ اور راستہ ۔۔۔۔۔ ان کے سوائے اس کو کسی اور چیز کا تصور ہی نہیں ہوتا۔

وہ معلّمہ بننے سے پہلے ہی اپنے گذشتہ واقعات کے متعلق سوچنے کی عادت ترک کر دی، بلکہ وہ بڑی حد تک ان کو بھول چکی تھی۔ ایک زمانہ میں وہ اپنے ماں باپ کی آنکھوں کی روشنی تھی۔ یہ لوگ ماسکو میں ریڈگیٹ کے قریب ایک شاندار عمارت میں رہا کرتے تھے، لیکن اس زمانہ کے عیش و آرام کی زندگی اس کے حافظہ میں صرف ایک خواب کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس وقت اس کی عمر صرف دس سال تھی باپ اس جہان سے کوچ کر گیا، اس کے بعد ہی ماں نے بھی عدم کی راہ لی ۔ اس کا ایک بھائی تھا جو کہیں افسر رہا تھا۔ شروع شروع میں دونوں آپس میں خط و کتابت کیا کرتے تھے، چند روز بعد بھائی نے اس کے خطوط کا جواب دینا بند کر دیا۔ والدین کے اثاثہ میں سے اس کے پاس اپنی ماں کی صرف ایک تصویر رہ گئی، جو مدرسہ کی سرد فضا کی وجہ سے دھندلی سی ہو گئی، اب تو اس میں ابرو اور پلکوں کے ہلکے نشان نمایاں رہ گئے ہیں۔

جب وہ ایک دو میل نکل چکے، تو بوڑھے سیمون نے جو بنڈی چلا رہا تھا، مڑ کر کہا

"شہر میں ایک سرکاری ملازم گرفتار کیا گیا، اور وہ اس کو لے گئے ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ اس نے چند جرمنوں سے مل کر ماسکو کے میر بلدیہ الکسیو کو قتل کر دیا"

"تمہیں یہ واقعہ کس نے بتایا؟"

"ایوان انو کے سرائے میں لوگ اخبار میں یہ پڑھ رہے تھے۔"

پھر بڑی دیر تک ان دونوں پر خاموشی چھائی رہی۔

ماریا وسیلیونا، اپنے مدرسہ کے حالات، امتحان جو بالکل قریب تھا جس میں وہ ایک لڑکی اور چار لڑکوں کو پیش کر رہی تھی، انہی باتوں پر وہ سوچ رہی تھی۔ اور جب وہ امتحان کے

سب ہیں
متعلق غور کر رہی تھی، ایک ہمسایہ ہناؤ نامی زمیندار چار گھوڑے
والی گاڑی میں سوار اس کی گاڑی کے ساتھ ہو لیا۔ یہ وہی
شخص ہے جو گذشتہ سال اس کے مدرسے میں ممتحن مقرر
کیا گیا تھا۔ جب وہ اس کے قریب پہونچا تو پہچان کر تعظیماً سر
جھکایا۔

"آداب عرض ہے" اس نے کہا، "شاید آپ کہیں
تشریف لے جا رہی ہیں۔"

ہناؤ کی عمر چالیس سال معلوم ہوتی ہے، جس کی
شکل صورت میں کوئی خاص بات نہیں، چہرہ پر ماندگی کے آثار
اور کچھ عمر رسیدہ نظر آتا ہے، لیکن اب بھی وہ خوشرو ہے اور
عورتیں اس سے دلچسپی لیتی اور اکثر تعریفیں کرتی رہتی ہیں۔

وہ اپنے وسیع مکان میں تنہا رہتا اور اس نے کہیں
ملازمت اختیار نہیں کی۔ اس کے متعلق لوگ کہا کرتے کہ وہ
مکان میں سیٹی بجاتے ہوئے ادھر ادھر ٹہلنے رہنے یا اپنے
قدیم ملازم کے ساتھ شطرنج کھیلنے کے سوا اور کچھ کام کاج نہیں
کرتا۔ اور یہ بھی کہتے کہ وہ خوب پیتا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ
گذشتہ امتحان کے موقع پر اس نے جو کاغذات لائے تھے
ان میں وائن (Wine) اور عطر کی خوشبو مہک رہی
تھی۔ اس موقع پر وہ بالکل نیا لباس پہنے ہوئے تھا، اور
ماریا وسیلیونا اس کو نہایت پرکشش سمجھ رہی تھی، اور جس وقت
تک وہ اس کے قریب بیٹھی رہی۔ بے چینی سی محسوس کرتی رہی۔
اس کو ہمیشہ نازک مزاج اور صاحب سمجھ ممتحنوں سے اسکول
میں سابقہ پڑتا رہا۔ لیکن حضرت کی یہ حالت کہ ایک دعا بھی
یاد نہیں، اور نہ یہ جانتے کہ کیا سوالات کرنے چاہئیں، ہاں
انتہائی خلیق اور حلیم تھا، اور زیادہ سے زیادہ نمبر دیا کرتا تھا۔

"میں بکوسٹ سے ملنے جا رہا ہوں" ماریا سے مخاطب
ہو کر اس نے کہا "لیکن مجھ کو اطلاع ملی کہ وہ مکان میں موجود
نہیں ہیں۔"

وہ شاہراہ سے مڑ کر ایک چھوٹے راستے سے گاؤں کی طرف
روانہ ہوئے، ہناؤ رہنمائی کر رہا تھا اور سیمون اس کے پیچھے
ہانکتا رہا تھا۔ چاروں گھوڑے وزنی گاڑی کو کیچڑ میں سے
بدقت کھینچ رہے تھے۔ سیمون ناہموار زمین، گڑھے، برف سے
ڈھکے ہوئے دلدل وغیرہ سے بچا بچا کر راستے کے کنارے کنارے
ہانکتا چلا جا رہا تھا، اکثر اس کو گاڑی سے اتر اتر کر گھوڑے کی
مدد کرنی پڑتی۔ ماریا وسیلیونا اپنے مدرسے کے متعلق سوچنے
میں محو تھی، مثلاً وہ حیران تھی کہ آیا امتحان میں حساب کے
سوالات مشکل آئیں گے یا آسان۔ مجلس تعلیمی سے بھی اس کو
خدشہ لگا ہوا تھا، کیونکہ کل تک وہاں ایک بھی حاضر نہیں تھا۔
یہ کس قدر غیر اصولی باتیں ہیں! یہاں دو سال سے
التماس کرتی چلی آ رہی ہے کہ چوکیدار کو علٰحدہ کر دیا جائے، جو
نہایت نکما اور اس کے ساتھ درشتی سے پیش آتا اور مدرسے کے
بچوں کو زد و کوب کرتا، لیکن اس پر ایک نے بھی توجہ نہیں
کی۔ دفتر میں پریسیڈنٹ صاحب سے ملاقات کرنا ایک
دشوار امر تھا۔ اور خوش قسمتی سے کسی کو ان سے ملنا نصیب
ہو جائے تو وہ پُر اشک آنکھوں سے فرمایا کرتے کہ مجھے ایک
لمحہ کی بھی فرصت نہیں ہے۔ مہتمم صاحب ہر تیسرے سال
ایک مرتبہ معائنہ کے لئے مدرسہ تشریف لایا کرتے ہیں۔ خود
وہ پہلے سررشتہ آبکاری میں کارگذار تھے محض اثرات
کے تحت تعلیمات میں ان کو مہتمی کی جائداد مل گئی، جس کا
نتیجہ یہ کہ اپنے فرائض سے بالکل لاعلم ہیں۔ اسکول کونسل کے
اجلاس شاذ و نادر منعقد ہوا کرتے، لیکن یہ ہوتے کہاں تھے
اس کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ مدرسے کا سرپرست ایک جاہل کسان
ہے، یہ نرا احمق، تندمزاج، کسی چمڑے کے کارخانہ کا صدر ہے۔
اور خیر سے چوکیدار کے ساتھ اس کا گہرا یارانہ بھی ہے۔ اب

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ اپنے شکوے شکایات آخر کس کے
سامنے پیش کرے۔

ہناؤ پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے اس نے
دل میں سوچا " واقعی یہ قبول صورت آدمی ہے "

جوں جوں یہ جنگل میں بڑھتے گئے راستہ کی
حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ مڑنے کے لئے ذرا سی جگہ بھی نہیں
پہیے گہرے دھنستے چلے گئے، پانی اور کیچڑ میں شدید مل چل
سے ان کے چہروں پر سخت چھینٹے اڑ رہے تھے۔

" کیا واہیات راستہ ہے" ہناؤ نے ہنستے ہوئے کہا۔

سیلیا نے اس کی طرف کچھ غور سے دیکھا اور یہ سمجھنے سے
قاصر رہی کہ یہ سب آدمی اس نواح میں کیوں رہتا ہے۔ باوجود
دولتمند خوش اخلاق، خوش وضع شریف ہونے کے ایسے کیسے
اندر سے دور افتادہ اور کیچڑ زدہ مقام میں پڑا ہوا ہے جہاں
کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ وہ اپنی زندگی سے کوئی خاص لطف
بھی نہیں اٹھاتا اور یہاں دیکھو سیمون کی طرح۔ آفت مصیبت
اٹھاتا، دھکے اور جھٹکے کھاتا ایک تکلیف دہ راستے سے بے
اطمینانی کے ساتھ گاڑی میں چلا جارہا ہے۔ جب کہ یہ پیٹرزبرگ
یا اور بڑے بڑے شہروں میں رہ سکتا ہے، تو یہاں پڑے رہنے
کے لئے کیا شامت آئی ہے؟ اگر کوئی یہ خیال کرے کہ اس
جیسے امیر آدمی کے لئے یہ بالکل آسان تھا کہ یہاں ایک عمدہ سڑک
بنوادے، تاکہ آئے دن کی مصیبتوں سے نجات ملتی، اور اس
کو جان اور سیمون کو بھی سہولت اور آرام میسر ہوتا۔ لیکن
وہ اس قسم کی باتوں پر قہقہہ لگاتا، اور یہی ظاہر کرتا کہ اس کو
عیش و آرام کی زندگی کی خواہش نہیں ہے۔ وہ اس قدر
رحم دل، لطیف مزاج اور سادگی پسند شخص تھا کہ اس قسم کی
کشمکش کی زندگی اس پر بار خاطر نہیں گذرتی۔ وہ مدرسوں
میں صرف گلوبس (Globes) تقسیم کیا کرتا، اور اپنے کو
تعلیم کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں ایک مفید اور امتیازی رضاکار
تصور کرتا۔ لیکن ایسے مقامات میں اس کے گلوبس سے کیا فائدہ
پہونچتا ہے؟

" سنبھل بیٹھو، وسیلیونا!" سیمون نے خوفزدہ آواز میں کہا۔
گاڑی کو اتنا زور سے جھٹکا ہوا کہ الٹتے الٹتے رہ گئی، اور کوئی
چیز لڑھکتی ہوئی ماریا کے پیروں پاس آگئی ـــ یہ اپنی خریدی
ہوئی نئے جوتوں کا پارسل تھا۔ راستہ اونچائی سے اتار کی طرف
تھا، بارش نے زمین کاٹ کاٹ کر جگہ جگہ رخنے ڈال دئے،
اور بیچ راستے ایک چھوٹا سا نالہ کل کل کرتا بہہ رہا تھا۔ اب یہاں
سے آگے بڑھتے ہی گھوڑوں کی تو سانس پھولی ہوئی تھی۔
ہناؤ لمبا اوور کوٹ پہنے اپنی گاڑی سے اتر پڑا اور راستے کے کنارے
سے چلنے لگا وہ مضطرب تھا۔

" تو یہ کیا راستہ ہے!" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ "اس سے تو
کسی کی گاڑی بالکل جلد غارت ہوجانے کی۔"

" جناب عالی! ایسے موسم میں باہر سواری کرنے کے لئے
آپ کو مجبور کون کرتا ہے" سیمون نے رنجیدگی سے کہا "جناب
کو تو اس وقت دولت خانہ میں رہنا چاہیے تھا۔"

" گھر میں دل نہیں لگتا ہے نانا۔ مجھ کو تو گھر میں وحشت
معلوم ہوتی ہے۔"

سیمون کے بازو کھڑے ہوئے وہ مضبوط اور شکیل نظر
آتا ہے۔ لیکن اس کی چال ڈھال سے کچھ ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی ضرور ہے۔ جس کی وجہ سے
وہ آزردہ خاطر اور ضعیف نظر آتا ہے اور بربادی کی راہ پر
چلا جارہا ہے۔ یکایک اس میں اندرونی کشمکش شروع
ہوگئی۔ ماریا وسیلیونا کا دل اس شخص کے لئے دہشت اور
خوف سے بھر گیا۔ جو خواہ مخواہ بلا وجہ تباہی کے منجدھار میں بہا
چلا جارہا ہے، اور اس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ اگر وہ اس کی

بیوی یا بہن ہوتی تو اس کو تباہی و بربادی سے بچانے کی خاطر
اپنی پوری زندگی وقف کر دیتی۔ اس کی بیوی! ان کی
زندگی اس نہج پر چل رہی تھی کہ "وہ باوجود اپنے وسیع مکان کے
تنہا بود و باش کرتا ہے"۔ ا... یہ ایک منحوس گاؤں میں اکیلی پڑی
رہتی ہے۔" اس پر بھی محض اس قسم کا تصور کہ کبھی وہ اور یہ مساوی
حیثیت سے ایک دوسرے کے قریب رہیں گے "ناممکن اور
بعید از قیاس معلوم ہوتا۔ حقیقت میں زندگی کے روابط و
ضوابط" انسانی تعلقات ایسے پیچیدہ اور ناقابل فہم اصول کے
قائم کئے گئے ہیں کہ جب کبھی کوئی ان پر سنجیدگی سے غور کرتا
ہے تو نہ صرف یہ سب غیر معقول ہوتے ہیں بلکہ ان کے اثرات
سے اس کا دل بیٹھا جاتا ہے۔

" یہ چیز سمجھ سے بالکل باہر ہے" ماریا نے سوچا
" اللہ تعالی کمزور، بدقسمت اور ناکارہ لوگوں کو حسن، خوبی،
تمکین، خوشنما آنکھیں کس لئے عطا کرتا ہے — اور وہ لوگ
اس قدر دلکش کیوں ہوتے ہیں۔"

" یہاں ہمیں دائیں جانب مڑنا چاہئے"۔ یہ کہتے ہوئے
ہنا ؤ اپنی گاڑی میں سوار ہوگیا۔

"خدا حافظ! میری یہی آرزو ہے کہ تمھیں ہر طرح کی خوشی نصیب ہو"
اس کے بعد پھر وہ اپنے مدرسے اور شاگردوں کے معاملات میں غرق
ہوگئی۔

اس کی بیوی! صبح میں کڑاکے کی سردی رہتی، کوئی چولھا
جلانے والا موجود نہیں، چوکیدار بھی غائب، بچے علی الصبح کیچڑ اور
برف سے لدے چلے آتے اور شور پکار سے مدرسہ سر پر اٹھا لیتے۔
یہ سب کس قدر مصیبت اور تکلیف دہ ہے۔ اس کے رہنے کے لئے
ایک کمرہ اور ساتھ ہی باورچی خانہ لگا ہوا تھا۔ کام کرنے کے بعد
روزانہ اس کے سر میں درد شروع ہو جاتا، اور کھانے کے بعد
اس کے دل میں سوزش رہتی۔ اس کو لکڑیوں، چوکیدار اور
سرپرست کے لئے مدرسے کے بچوں سے پیسے جمع کرنے پڑتے
اس پر بھی اس تند مزاج اور پیٹ بھرے دہقانی سے التجا کرنی
پڑتی — کہ برائے خدا لکڑیاں بھیج دے۔ راتوں میں وہ
کسانوں، برف باری، اور امتحانات کے خواب دیکھا کرتی۔
اس قسم کی زندگی اس کو قبل از وقت ضعیف العمری کی طرف
لے جا رہی تھی اور ساتھ ہی روز بروز بدنما، بے رونق اور
گوشہ نشین بنتی جا رہی تھی۔ یہ ہمیشہ سہمی ہوئی رہتی۔ اگر
مجلس کا کوئی رکن یا مدرسے کا سرپرست ہی آجاتا، تو اپنی
نشست پر بیٹھے رہنے کی ذرا جرأت نہ ہوتی اور فوراً اٹھ
کھڑی ہوتی۔ اور جب ان میں سے کسی سے بات چیت کرنے کا
اتفاق ہوتا تو بہی آداب و احترام کے الفاظ اور جملے استعمال
کرتی۔ اس کی زندگی بے کیف تھی۔ کوئی چاہنے والا، ہمدرد
یا غمگسار نصیب نہیں، اور کوئی اس کی طرف توجہ نہیں کرتا تھا
ان حالات میں اگر آپ کسی کی محبت میں گرفتار ہو جائیں تو
انجام کس قدر بھیانک ہوتا!

" سنبھل بیٹھو وسیلیونا!"

دوبارہ پہاڑی پر ایک خوفناک مقام سے گذر ہوا

اس کا معلمہ بن جانا کسی کی خواہش و مطالبہ کی نسبت
خود اپنی احتیاج و ضرورت کا منت کش تھا۔ یہ خیال اس کو
کبھی نہیں گذرا کہ ملازمت کے لئے خاص طور سے کوئی اس کو
بلائے گا۔ نہ اس کے پیش نظر کبھی یہ مسئلہ رہا کہ تہذیب و تمدن
کی خدمات انجام دی جائیں۔ اپنے فرائض کی انجام دہی میں
اس کے پاس نزدیک شائستگی اور بچوں کی اتنی اہمیت نہیں
تھی جتنی کہ امتحانات کی فکر۔ شائستگی کی خدمت، یا اور ملک
کی نظر میں اپنی قدر و منزلت کے متعلق سوچ بچار کرنے کے لئے
اس کے پاس وقت ہی کیا بچتا تھا۔ مدرسین، معلمات، ڈاکٹر
اور ان کے مددگار، جن کی تنخواہیں ان کی حوائج اور معیار زندگی

مقابل کم ملتی ہوں، جن کو اپنے فرائض میں سخت محنت و مشقت کرنی پڑتی ہو، انہیں یہ سوچنے کا بھی موقع نہیں ملتا کہ وہ ایک اعلیٰ شعبۂ زندگی میں مصروف ہیں، یا کہ لوگوں کی اعلیٰ ترین خدمات ان کا شریف مشغلہ ہے، چونکہ رات دن، اپنے روز کی روٹی، آگ کے لیے لکڑیاں، ناہموار و ناقابل گذر راستے اور امراض جیسے امور کے غور و فکر میں ان لوگوں کے دل و دماغ لگے رہتے ہیں۔ اس طرح کی زندگی ایک آفت اور کشمکش کی زندگی ہوتی ہے، جس میں کوئی دلچسپی و دلبستگی کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا۔ ایسے حالات میں، خاموش، صابر، لذت و جانفروشی، زندگی گذار سکتے ہیں، جیسے کہ ماریا وسیلیونا کی زندگی گزر رہی تھی۔ ورنہ خوش مزاج، شوقین اور نازک مزاج والے جو تہذیب اور خدمت کے متعلق عموماً بڑی بڑی ہانکتے ہیں یہاں تو ایک دن بھی نہیں ٹک سکتے اور ملازمت کو بالائے طاق رکھ، الٹے پیر چمپت ہو جاتے ہیں۔

سیمون راستہ کاٹ کاٹ کر منزل مقصود کی دوری میں کمی کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کبھی میدانوں میں سے، کبھی گاؤں کی جھونپڑیوں کے عقب سے، کہیں کسان اس کو منع کرتے، کہیں پادری صاحب کا کھیت آجانے کی وجہ سے دوسرا رخ اختیار کرنا پڑتا اور کہیں تو عین راستے میں کسی نے زمین خرید لی اور حفاظت کے لیے اطراف سے کھائی کھدوا رکھی۔ غرض اسی طرح مڑتے جھٹتے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

یہ لوگ تیز نے گور وڈش (ایک مقام) پہونچ گئے۔ سرائے کے قریب اطراف و اکناف میں زمین گوبر اور برف سے لت پت ہے، یہاں بڑی بڑی گاڑیاں کھڑی ہیں، ان میں متعفن گندک کے تیزاب کی بڑی بڑی بوتلیں لادی گئیں۔ سرائے میں بہت سارے لوگ جمع ہیں۔ تقریباً سب ڈرائیور ہیں۔ اندر ووڈکا (ایک معمولی شراب)، تمباکو اور بھیڑوں کے چمڑوں کی بو پھیلی ہوئی ہے۔ آپس کی گفتگو اور جھولتے ہوئے دروازوں کی وجہ سے وہ شور غل مچا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ دکان کے اندر کا نسرمنیا (ایک قسم کا باجا) کی آواز، بغیر ایک لمحہ رکے، دیوار ولا کے باہر سنائی دے رہی ہے۔ ماریا وسیلیونا نے اپنی نشست سنبھالی، اور تھوڑی سی چائے پی، بازو کی میز پر کسان ووڈکا اور بیئر کے دور چلا رہے تھے، چائے کی گرمی اور سرائے کے دھوئیں کی وجہ سے یہ سب پسینے میں نہا رہے تھے۔

”کرو! میں جو کہہ رہا ہوں پہلے سنو!“ مختلف آوازوں کی چیخ پکار سے گڑ بڑ مچی ہوئی تھی۔ ”وہاں کیا ہو رہا ہے!“ ”ہم پر خدا کا فضل ہو جائے!“ ”ایون ڈیمنچ میں تمہیں وہ سب بتا سکتا ہوں!“ ”بڑے میاں، تلاش کرو!“

ایک شخص نے جس کے چہرہ پر پھنسیوں کے نشانات، جس کی داڑھی بالکل سیاہ، اور نشہ میں مست، یکایک کسی چیز سے برافروختہ ہو کر فحش بکنا شروع کر دیا۔

”کیا بیہودہ باتیں کر رہے ہو، اور کس کی قسم کھا رہے ہو؟“ سیمون جو کچھ دور بیٹھا ہوا تھا، گرجتے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہیں نوجوان خاتون نظر نہیں آ رہی ہیں؟“

”نوجوان خاتون!“ کسی نے ایک گوشہ میں ہنسی اڑائی۔

”اڑائی ہوئی بلبل ہے!“

”ہمارا کوئی منشا نہیں تھا.... “ محمود آدمی نے حواس باختہ حالت میں کہا۔ ”معاف کیجئے یہاں ہم اپنا روپیہ خرچ کرتے ہیں، اور نوجوان خاتون بھی اپنے پیسے خرچ کر رہی ہیں۔ آداب عرض ہے!“

”آداب!“ معلمہ نے جواب دیا۔

”ہم تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔“

ماریا و سیلیونا نے اطمینان سے چائے پی۔ اور پھر بھی کسانوں کی "مدرسہ" ہونے لگی، پھر جلانے کی لکڑی اور چوکیدار کے متعلق سوچ میں پڑ گئی۔

"ٹھیر جاؤ بڑے میاں" اس کے بازو کی میز سے یہ آواز سنائی دی۔ "یہ دیازو (مقام) کی معلمہ ہے...... ہم اس کو بخوبی جانتے ہیں، یہ ایک نہایت شریف نوجوان خاتون ہے"

"تب تو ٹھیک ہے!"

جھولتے دروازہ مسلسل آواز آرہی ہے، کوئی آرہے ہیں۔ کوئی جارہے ہیں۔ کنسٹرٹینا بھی چلا جارہا ہے۔ اب دوپہر کا وقت آگیا۔ کسانوں نے جو دوسری میز پر بیٹھے تھے کوچ کی تیاری شروع کردی مخمور آدمی جو کچھ بے قابو تھا، ماریا کے قریب پہونچا اور اپنا ہاتھ بڑھادیا، اس کی تقلید کرتے ہوئے اور لوگ بھی اس سے مصافحہ کرکے رخصت ہوئے۔

"سیلیونا، تیار ہو جاؤ" سیمیوں نے اس سے خطاب کیا

وہ یہاں سے روانہ ہوگئے۔ رفتار بہت دھیمی تھی۔

"کچھ عرصہ پیشتر تم نے گورودنیا کے باشندے ایک مدرسہ تعمیر کر رہے تھے" سیمیوں نے پلٹ کر کہا۔ لیکن جو کچھ ہوا، وہ بہت برا ہوا!"

"کیوں کیوں کیا بات ہے؟"

"لوگ کہتے ہیں، صدر صاحب نے ایک ہزار، اور مدرسہ کے نگرانکار صاحب نے ایک ہزار اور خیر سے مدرس صاحب نے پانسو اپنی اپنی جیبوں میں خاموشی سے اتار لئے۔"

مدرسہ کی پوری لاگت زیادہ سے زیادہ صرف ایک ہزار ہوگی۔ لوگوں پر تہمت لگانا، گناہ ہے، نانا۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔"

"تو بھائی میں کیا جانوں...... میں نے جو کچھ سنا وہ تم سے کہہ دیا۔

لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ معلمہ کی باتوں پر سیمیوں نے یقین نہیں کیا۔ کسان بھی اس پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کو معقول تنخواہ ملتی ہے، ماہانہ اکیس روبل... (ایک سکہ)، گویا پانچ کافی ہیں، نیز مدرسہ کے بچوں سے لکڑیوں اور نگہبان کے لئے جو پیسے جمع کرتی ہے اس کا ایک بڑا حصہ خود دبا دیتی ہے۔ سرپرست کا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا حالانکہ خود سرپرست حکام کی لاعلمی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کسانوں کو لکڑیاں بیچتا اور خوب کماتا تھا۔

شکر ہے کہ اب یہ لوگ گھنے جنگل سے نکل کر کھلے میدان میں آگئے یہاں سے دیازو تک بالکل کھلا میدان ہے، کچھ زیادہ دور بھی جانا نہیں ہے۔ اب انھیں ندی اور ریلوے لائن پار کرنا باقی ہے اس کے بعد تو بس یازو نظروں کے سامنے ہی ہے۔

"کس طرف ہانک رہے ہو؟" ماریا نے سیمیوں سے دریافت کیا۔ "دہ دائیں طرف سے پل کی جانب چلو۔"

"کیا ہوا" اس راہ سے بھی ہم چل سکتے ہیں۔ اتنا گہرا نہیں ہے کہ کچھ اندیشہ ہو۔"

"دیکھو کہیں گھوڑا ڈوب نہ جائے۔"

"کیا؟"

"دیکھو دیکھو ہنانو گاڑی میں بیٹھے ہوئے پل پر سے گذر رہے ہیں" سیدھے طرف دور چار گھوڑوں کو دیکھ کر ماریا نے کہا "میرے خیال میں یہ وہی ہیں"

"ہاں وہی تو ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بکوسٹ سے مکان پر ملاقات نہیں ہوئی۔ یہ کیسا خر دماغ آدمی ہے۔ اللہ ہم پر اپنا فضل نازل کرے! آخر وہ اس طرف سے جا کیوں رہا ہے؟ اس راہ سے تو پورے دو میل کی قربت ہو جاتی ہے۔"

یہ دریا لمک ہو گئے ہو گرما میں چھوٹا سا نالا بن جاتا ہے
جس کو آسانی سے پار کیا جا سکتا ہے۔ یہ ماہ اگسٹ میں عموماً خشک
ہو جاتا ہے لیکن اس وقت بہار کی کچھ طغیانیوں کی وجہ چالیس
فٹ چوڑائی سے بہہ رہا ہے۔ پانی کی دھاریں، سرد اور کیچڑ آلودہ
دونوں کناروں پہ پہیوں کے تازہ نشانات نظر آرہے ہیں۔
جس سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی ابھی گاڑیاں یہاں سے پار ہوئی ہیں
چلو آگے بڑھو! سیمون لگام کو زور سے کھینچے، اور
اپنے کہنیوں کو ہلاتے ہوئے جس طرح کہ پرندے اڑتے وقت
اپنے بازو تولتے ہیں، کچھ تیزی دہراسانی سے چلانے لگا۔ "چلو بڑھو
گھوڑا بڑھنے لگا۔ پانی اس کے پیٹ تک پہونچ گیا۔ یہاں
اس نے ذرا دم لیا اس کے بعد بڑی جدوجہد سے آگے چلنے لگا
ماریا کو اپنے پیروں سے چبھتی ہوئی سردی محسوس ہو رہی تھی
"چلو بڑھو!" وہ بھی اُٹھ کر چلائی "بڑھو چلو!" آخر کار وہ
کنارے پر جا پہونچے۔

کیا مدہ بنگمٹ ہے، اللہ رحم و کرم کرے، گھوڑے
کا ساز و سامان درست کرتے ہوئے سیمون نے کہا۔۔۔۔
"یمسٹو د مقام میں یہ بھی ایک مصیبت ہے۔۔۔۔۔"

ماریا کے جوتے، پائتابے پانی سے بالکل بھیگ گئے
اس کے لباس کا نچلا حصہ اور کوٹ اور آستین اس قدر تر
ہو گئی کہ ان میں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ لیکن ان سب سے
زیادہ تکلیف دہ واقعہ یہ ہوا کہ شکر اور آٹا بھی پانی پانی ہو گیا
نہایت مایوسی کی حالت میں اپنے ہاتھ ملتے ہوئے ماریا صرف
اس قدر کہہ سکی:

"اوہ سیمون تم کس قدر نقصان رساں ہو، ہاں
واقعی!۔۔۔۔۔"

سڑک سے ریل کی پٹری گذرتی ہے اسٹیشن سے
گاڑی آرہی تھی، اس لئے دروازے بند کر دئے گئے۔
ماریا واسیلیونا جو سردی کے مارے کانپ رہی تھی، گیٹ
کے قریب کھڑی ہو گئی تاکہ ریل چلی جائے تو آگے بڑھے۔ دیا رو
اب تو نظروں کے سامنے ہے مدرسہ اور اس کی سبز چھت،
گرجا جس کی صلیبیں شام کی دھوپ سے چمک رہی ہیں اسٹیشن کے
دریچے بھی چمک رہے ہیں: انجن سے سیاہ دھواں نکل رہا ہے۔
اس کو ایسا محسوس ہوا کہ سب چیزیں سردی سے تھر
تھرا رہی ہیں

ٹرین آگئی، اس کی کھڑکیاں ایسی چمک رہی ہیں جیسی
کہ گرجا کی صلیبیں ان کی طرف دیکھنے سے اس کی آنکھوں
میں تکلیف ہوئی۔ درجہ اول کے دو ڈبوں کے درمیان۔۔۔
چھوٹے سے پلاٹ فارم پر ایک خاتون کھڑی ہوئی تھی۔
جب وہ سامنے سے گزری تو ماریا نے اس کو دیکھ لیا۔ اس
کی ماں! کیا غضب کی مشابہت تھی! اس کی ماں کے بھی
اسی طرح گھنے بال خمدار تھے اور خوبصورت گردن تھی۔ ان
تیرہ سالوں میں آج پہلی مرتبہ، اس کی ماں، باپ، بھائی
ماسکو کی وسیع عمارت اور حوض کی چھوٹی مچھلیاں، یہاں
تک کہ ہر چھوٹی سی چھوٹی چیز جیتی جاگتی چلتی پھرتی آنکھوں
میں نظر آئی۔ پیانو کی صدا اور اپنے باپ کی آواز نہایت
صاف طور سے سنائی دی اور اس وقت اس کو کچھ ایسا
معلوم ہوا کہ وہ پہلے کی طرح نوجوان اور حسین ہے، اور
ایک آراستہ، گرم کمرہ میں اپنے چہیتے عزیزوں کے ساتھ
موجود ہے خوشی و مسرت کا ایک لطیف احساس اس کے
دل و دماغ اور جسم پر چھا گیا، ایک مدہوشی کے عالم میں اس
نے اپنے ہاتھ سے کنپٹیوں کو خوب دبایا
اور نہایت درد بھرے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جگر خراش، رقت انگیز لہجہ میں اس نے آواز دی،

"ماں!"

اور رونا شروع کر دیا، جس کی وجہ سے وہ خود لاعلم تھی۔

عین اسی لمحہ، ہناؤ اپنے چار گھوڑوں کی گاڑی میں یہاں آپہونچا۔ اس کو دیکھتے ہی ماریا نے اپنے میں ایک ایسی خوشی و خرمی محسوس کی کہ اس قسم کا تصور اس کو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اس نے اپنے ہم مرتبہ اور ایک دوست کی حیثیت سے تسلیم خم کیا، اور وہ پھول کی طرح مسکرا دی اور اس کو ایسا معلوم ہوا کہ حقیقی خوشی اور کامیابی چاروں طرف آسمان پر، دریچوں پر بلکہ ہر درخت کی پتی پر خنداں اور شاداں نظر آرہی ہے۔ گویا اس کے والدین کا انتقال ہی نہیں ہوا اور وہ کبھی مفلسہ نہیں رہی، اور ان واقعات کی حیثیت ایک طویل درد انگیز اور عجیب و غریب خواب کی سی ہے۔ لیکن اب وہ خواب پریشاں سے بیدار ہو چکی ہے۔

"وسیلیونا سوار ہو جاؤ!"

پلک جھپکتے ہی ساری چیزیں غائب تھیں۔ ریلوے گیٹ آہستے کھل گیا۔ ماریا وسیلیونا سردی سے اکڑی ہوئی کانپتی ہوئی گاڑی میں سوار ہو گئی۔ چار گھوڑوں والی گاڑی نے پل کی پٹری کو پار کیا۔ سیمون نے پیچھے سے ہاتھ ہلا کر سگنل دیا۔ اس نے اپنی ٹوپی اتار دی۔

"ویازوگ گیا۔ ہم یہاں پہونچ گئے!"

(انطون چیخوف)

(ترجمہ) ایس، بی، امنا

بیوہ

ہے خموشی فضا پہ چھائی ہوئی	چاند کو بھی ہے نیند آئی ہوئی
چل رہی ہے بہت ہی سرد ہوا	جسم کو کاٹتا ہے ہر جھونکا
ہے ہر اک گھر کا بند دروازہ	نہیں باہر نکلنے کا یارا؟
گرم ملبوس ہر بدن پر ہے	گرم اور نرم سب کا بستر ہے
گرم سب نے لحاف اوڑھا ہے	سب نے سردی سے منہ کو موڑا ہے
اک مکاں ہے بہت شکستہ حال	زندگی جس میں ہو بشر کی محال
ٹوٹی پھوٹی ہے چار دیواری	جس کے کاندھوں پہ چھت بھی ہے بھاری
ایک ٹوٹا لگا ہے دروازہ	جس کا اک پٹ ہی بند، ایک کھلا
اس قدر ہے مکاں میں ویرانی	گم جہاں ہوں حواس انسانی
شمع اک اس میں ٹمٹماتی ہے	شاید اس کو بھی نیند آتی ہے
شمع کو آگے رکھ کے اک دکھیا	نہیں حس، حس جس کو سردی کا
سر کو اپنے جھکائے بیٹھی ہے	لو کسی سے لگائے بیٹھی ہے
آنکھ میں ڈبڈبائے ہیں آنسو	روتی ہے شمع بے کسی پہ لہو
دوش پر بال سب پریشاں ہیں	جو کہ خود اک دلیل ہجراں ہیں
تن پہ ساڑی ہے اک غبار آلود	ہے نہ ساڑی، عدم ہے جس کا وجود
اس قدر اس میں ہیں لگے پیوند	اب رفو کی نہیں ہے حاجت مند
میلا میلا ہے جسم کا کرتا	اور وہ بھی جگہ جگہ سے پھٹا
آستیں پر ہے اور گریباں چاک	ہے سراپا شبیہ عبرت ناک
ہم شبیہ علم نشست اس کی	اک چٹائی پھٹی ہوئی ہے بچھی
ایک کمبل ہے جو بہت ہی خراب	جس پہ ہیں دو یتیم محو خواب
شکل دونوں کی پیاری پیاری ہے	جن پہ خوف و ہراس طاری ہے
لے کے معصوم ہاتھ بھائی کا	سینے پر رکھ کے سو گیا چھوٹا
ماں اڑھائی ہے ایک چھوٹی ردا	جس میں سوراخ ہیں کئی ہر جا
ننھے چہروں پہ چھائی ہے زردی	ہائے کتنی شدید ہے سردی
ہائے تقدیر کے یہ مارے ہیں	جیسے بدلی میں چاند تارے ہیں
شمع اس غم کا دیکھ کر منظر	نہ رہا ضبط، بجھ گئی آخر

ساری مخلوق ہے کہ سوتی ہے
ایک بیوہ ہے جو کہ روتی ہے

زاہد حیدری

شاد عظیم آبادی کا ایک خط

(سید ہمایوں مرزا مرحوم کے نام)

جناب اخی محترم روحی فداکم! تسلیم و دعائے ترقی عمر و اقبال

نامہ گرامی سرمہ چشم منتظر ہوا شکریہ قبول فرمائیے۔ بھائی اب ضعف پیری طویل طویل تحریروں کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ میں وہی ہوں جس نے بیک وقت مختلف اوزان کی غزلوں پر دس منٹ میں پندرہ پندرہ غزلوں پر اصلاحیں دیں اور اب یہ حالت ہے کہ لکھنو مدینہ دہلی وغیرہ وغیرہ کے احباب کی سیکڑوں غزلیں دھری پڑی ہیں تقاضے سن رہا ہوں اور اصلاح کی ہمت و طاقت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ خوب آگاہ ہے کہ اس عمر میں اب مجھ کو کسی بات کا نہ شوق ہے نہ ولولہ بقول اپنے سب خوش تھے اندھا سا بھی ہائے جوانی مرحوم اس بڑھاپے میں خدا نے بھی اگر پائے تو کیا البتہ یہ تمنا ضرور ہے۔ سید صاحب سلمہٗ کی ولادت کے لئے اگر کچھ ہو جائے تو بڑی بات ہے۔ عزیز گرامی قدر فخر قوم و ملت سید علی امام صاحب کو اگر موقع ملے کا تو شاید وہ کوئی صورت کریں گے ورنہ جو ان کا مقدر۔ تجربہ ساری عمر یہی گزر چکی اور کچھ نہ ہوا تو اب جب کہ گنتی کے دن زندگی کے رہ گئے ہیں کیا امید ہو سکتی ہے۔ میں نے گذشتہ نیاز نامے میں فقط اس امر کی استدعا کی تھی کہ مولوی ابراہیم کی خدمت میں دو برس ہوئے جو مثنوی حاضر کی تھی اس کا مجنسہ مسودہ جاتا رہا اس کے علاوہ جا بجا اس کے مضامین کی اصلاح مد نظر تھی تین مہینے ہوئے کہ بار بار یاد دہانی کی چودہ عریضے اخوی و کبھی حضرت مولانا نواب نذر ظلہٗ کی جناب میں بھیجے مگر کسی کا جواب نہ ملا کہ اگر آپ کو زحمت دی ممکن ہے کہ کوشش علالت و غم کے سبب سے اس کا پتہ نہ ہو اگر یہ بھی معلوم ہو جاتا سنا تو طلبیات سے اسی مسودہ نا مرتب کو مرتب کر دوں تاکہ کتاب ادھوری نہ رہے آپ نے اس کا جواب کچھ نہ دیا۔ ایسا سنا ہے کہ حیدرآباد میں خطوط المعلوم پڑھ لئے جاتے ہیں اس لئے میں کیا اپنے ہر دل عزیز گرامی قدر سلمہٗ کو کچھ لکھ بھی نہیں سکتا

میرے پیارے بھائی اب مجھ کو ہر طرح سے مایوسی ہے اور کوئی تمنا نہیں ہے۔ چھپے گی اپنی سوانح عمری جو خود اپنے قلم سے لکھی ہے اور جس کے چھاپنے کی وصیت کر دی ہے انشاءاللہ یہ ہے کہ جلد سے جلد شروع ہو گی اس کو پڑھ کر آپ بہت روئیں گے۔

کل بوجہ ضعف و اختلاج قلب ڈاکٹر مشتاق علی صاحب کے سخت اصرار و سخت ترکوشش کے سبب سے غالباً ایک برس بعد صحبت میلاد جناب امیر میں ایک مسدس پڑھنا پڑا تین سو بند کا مسدس ہے۔ خدا جانے کیا کر دیا گھنٹہ بھر ڈیڑھ ہزار آدمیوں سے کم نہ تھے۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جو شریک نہ ہو ورنہ جتنے اعیان قدیم و جدید ہیں سب تھے آپ شریک ہوتے تو دیکھ کر خوش ہوتے۔ جن جن لفظوں میں میری تعریفوں کا شور تھا یہ وہی عظیم آباد ہے جو آج میرے قدم قدم پر نثار ہو رہا ہے ابھی تو خیر جب مر جاؤں گا تب دیکھئے گا کہ یہی پٹنہ انشاءاللہ میری قبر کو پوجے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو آپ مجھ کو شاعر نہ سمجھے گا میری مخدومہ امین بھاوج کو میری دعائیں دے دیجئے۔ موقع ہو تو اس مثنوی کے بارہ میں میرے غمخوار فخر روزگار عزیز سے یوں فرمائیے کہ ایک شاعر جو آپ کے ملاحظہ کے لئے حاضر کی تھی اگر جلد بھیج دی جائے تو صاف کروا کر اپنے تصانیف میں داخل کر دوں سید سلمہٗ اور ان کے بچے قدم بوسی بجا لاتے ہیں

۴ شعبان ۱۳۴۲ھ
پٹنہ سٹی

تمہارا جان نثار و دعاگو

سید علی محمد شاد

دعا بیبی صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا مرحوم

بارگاہِ مصطفوی میں

اے بانیٔ اسلام! دل قبلہ نما دے — ان ٹوٹے ہوئے نالوں کو پھر آہِ رسا دے
جو خوگرِ لا ہیں انھیں الّا کا پتا دے — بھولے ہوئے اسباقِ کہن یاد دلا دے

پھر مصطفوی شان زمانے کو دکھا دے

کیا دیکھ رہا ہے ابھی؟ اسلام کے والی! — دنیا ترے پیغام سے ہونے کو ہے خالی
میخانہ لٹا، رہ گیا اک جام سفالی — ڈھائی ہوئی تعمیر نئے سر سے بنا دے

پھر مصطفوی شان زمانے کو دکھا دے

تاویل کے پھندوں میں ہے جکڑا ہوا قرآں — تہذیب کے الجھاؤ میں الجھا ہے مسلماں
سینوں سے لرزتا ہوا، رخصت ہوا، ایماں — اے ہادیٔ برحق! ہمیں پھر اپنا بنا دے

پھر مصطفوی شان زمانے کو دکھا دے

تو پڑ گئی قوم کے اربابِ نظر سے — مرعوب ہوئے جاتے ہیں الحاد کے اثر سے
خیرات بھی پانے لگے اشرار کے در سے — دے ہوش انھیں۔ یا ابدی نیند سلا دے

پھر مصطفوی شان زمانے کو دکھا دے

کٹھ پتلی بنے دین و مذاہب کے پجاری — آوارہ و سرگرداں ہے اب قوم بچاری
امت پہ تری حالتِ سکرات ہے طاری — جی اٹھے، یہ۔ ایسی کوئی اکسیر پلا دے

پھر مصطفوی شان زمانے کو دکھا دے

پیدا ہو یہاں پھر کوئی فاروقؓ کہ حیدرؓ — یا، بھیج دے، پھر خالدؓ و ٹیپوؒ کو مکرر
طارق کا جگر، جرأتِ ایوبی عطا کر — جاں بازیٔ شبیرؑ تن آساں کو سکھا دے

پھر مصطفوی شان زمانے کو دکھا دے

پھر جذبۂ ایمان پرستی کو جگا دے — پھر نعرۂ تکبیر کی تفسیر سنا دے
پھر قلبِ غنی، ماحصلِ بیم و رجا دے — پھر اپنے مسلماں کو مسلمان بنا دے

پھر مصطفوی شان زمانے کو دکھا دے

بشیر النساء بیگم بشیر

مختصر افسانہ

میں بھی وہاں سیر کو جاتا تھا۔ اور لوگ بھی آتے تھے اور وہ دونوں بھی آیا کرتے تھے۔ جوڑ ـــــ وہ دونوں بانہوں میں باہیں ڈالے آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے آتے تھے ـــــ مسرت ان کے چہروں پر رقص کرتی تھی۔ بات بات پر مسکراتے۔ ہری ہری گھاس پر بیٹھ جاتے ـــ گھومتے پھرتے۔ ـــ ہنکنے والی موجوں کا نظارہ کرتے ـــ پھولوں سے لدی در دبد کرتی ہوئی ڈالیوں سے کھیلتے ـــ پھر ایک ایک پھول توڑ کر سونگھتے ہوئے آہستہ آہستہ واپس چلے جاتے۔

وہ بڑے نیک تھے ـــ اُن کے آتے ہی فقیر صدا لگاتا "خدا تمہاری جوڑی کو سلامت رکھے بابا ـــــ دیتے جانا مائی باپ کچھ غریب کو بھی" وہ مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھتے اور پھر سنظر بیچی کر لیتے ـــــ ایک چمکدار سکہ فقیر کے ہاتھ میں گر پڑتا

یونہی بہت دن گذر گئے ـــــ لیکن ایک دن وہ نہیں آئے ـــــ دوسرے دن بھی نہیں ـــــ کئی دن تک نہیں ... ہفتے گذر گئے ـــــ لیکن مہینے ـــــ وہ نہیں آئے۔

"سائیں جی! اب وہ نہیں آتے" میں نے فقیر سے کہا۔

"ہاں بابا" فقیر نے کہا "بڑے نیک تھے وہ ـــــ مجھے روز کچھ نہ کچھ ل جاتا ـــــ بہت دنوں سے انہوں نے آنا چھوڑ دیا ہے جانے کیا بات ہے ـــــ یا کہیں جاتے ہوں گے ـــــ یہی ایک تفریح گاہ تو نہیں ہے ایک ہی جگہ سے اکتا گئے ہوں گے ـــ"

ہم انہیں تقریباً بھول چکے تھے ـــــ میں بھی اور فقیر بھی ـــــ کہ ایک دن وہ آیا ـــــ اکیلا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ـــــ اس نے نہ پانی کی سر ٹکرانے والی موجوں کی طرف پلٹ کر دیکھا نہ رنگ برنگ کے پھولوں سے لدی ہوئی ڈالیوں کی طرف ـــــ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور اس کے چہرہ پر افسردگی تھی ـــــ انتہائی افسردگی ـــــ وہ کسی خیال میں منہمک تھا اور ایسے چل رہا تھا جیسے کسی نامعلوم منزل کی طرف جا رہا ہو جہاں پہنچنے کی نہ اسے خواہش ہے نہ جلدی ـــــ فقیر اسے دیکھ کر چونک پڑا ـــــ اور اس نے وہی آواز لگائی "خدا تمہاری جوڑی کو سلامت رکھے بابا ـــــ دیتے جانا غریب کو بھی کچھ"

وہ ایک دم چونک سا پڑا ـــــ ایک چمکدار سکہ فقیر کے ہاتھ پر گرا ـــــ اس کے ساتھ ساتھ ایک گرم قطرہ بھی ـــــ فقیر نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھیں آبدیدہ ہو چلی تھیں۔

محمد دلاور خاں مہدوی

جنگل میں ایک صبح

جنگل میں حسنِ فطرت جادو جگا رہا ہے
خورشیدِ عالم آرا موتی لٹا رہا ہے

آہستہ رو ہوائیں نغمے مچل رہے ہیں!
خوابیدہ تھے جو چشمے تھم تھم کے چل رہے ہیں

سبزہ لہک رہا ہے غنچے چٹک رہے ہیں!
اک موجِ سرخوشی میں پودے لچک رہے ہیں

اک نور کا سا عالم کھیتوں پہ چھا رہا ہے!
میں اُن کو دیکھتا ہوں اور وجد آ رہا ہے!

گرمِ عمل ہے اِن میں اب بھی غریب دہقاں
ہے جس کے بازوؤں میں ہستی کا راز پنہاں

پھولوں میں اک تبسم، ذروں پہ اک تجمل
بیدار ہو رہا ہے سویا ہوا تخیل!!!

موتی ڈھلک رہے ہیں پتوں پہ جھاڑیوں کے
آنکھوں میں کھپ رہے ہیں منظر پہاڑیوں کے

خارِ غمِ زمانہ دل سے نکل رہا ہے!!
طوفانِ شعر و نغمہ پیہم ابل رہا ہے

خونِ بہار رقصاں ہے نبضِ خار و خس میں
مرغِ اسیر گویا آزاد ہے قفس میں

ہر سانس میں کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے
سینے میں حسنِ پنہاں نشتر چبھو رہا ہے

چونکے ہوئے ہیں دل میں احساس کے ترانے
آنکھوں پہ کھل رہے ہیں عرفاں کے سب خزانے

اللہ! یہ مناظر یہ حسنِ شادمانی
باور ہوا مجھے بھی اک شے ہے زندگانی

کاوش

غزل

مجھے وہ دیکھتے ہی مسکرائے
مری قسمت کہاں سے کوئی لائے

فلک سے پھر کہو بجلی گرائے
بڑی مدت ہوئی نظریں ملائے

زمیں تو کیا فلک بھی گونج جائے
اگر وہ ہولے ہولے گنگنائے

اسے کہتے ہیں تاثیرِ محبت
لبوں پر نام آیا تھا کہ آئے

گئی گذری ہوئی باتیں نہ چھیڑو
کہاں تک کوئی دل اپنا دکھائے

جگرؔ ان کی نظر ہے مزاجبیت
بڑی مشکل سے دونوں ہاتھ آئے

محبوب حسین جگرؔ

ویرانہ

ویرانہ؟

جو دل آرزوؤں اور تمناؤں سے نا آشنا ہو اس کا نام ویرانہ ہے۔

لیکن ع

تم کہو تو اس کو پھر آباد کر لیتا ہوں!

اور وہ بھی شاید اس لیے کہ ع

دلِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

میرے دوست!

جب زندگی خود ایک ویرانہ ہو تو پھر آبادیوں کی جستجو سے حاصل؟
ملمع کاری کب تک فریبِ نظر ہو گی جھوٹے نگینوں کی آبداری پر کوئی کب تک [illegible] جنس تو آشکار ہو کر رہے گی
حرص و ہوس! لالچ اور فریب کاری بھی تو [illegible] ذہنیتوں کا میوہ ہے۔

دوست!

اٹھ! ہم کسی ویرانے کو چل کر آباد کریں جو عورت کی فسوں سازیوں اور [illegible] سے پاک ہو۔
عورت! کتنا پیارا نام ہے لیکن اگر کوئی اس سے حلقۂ زنجیر [illegible] تو پھر دنیا [illegible] ہے! دنیا کا [illegible] عورت اور عورت کی
محبت سے زندگی کامران۔ لیکن یک بے ثبات [illegible]۔

ہمنشیں!

چل کوئی ویرانہ تلاش کریں جس کی مناظرِ قدرت [illegible] ہو وہ جگہ جو اصل [illegible] سے مطابق ہو [illegible]
من کی دنیا آباد وہ شادکام! جس کے من کی دنیا ویران وہ ناکام [illegible]
پھر سنگِ راہ سے پریشانی کیسی؟ ؎

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر!

ایم اسلم

سُوز و سَاز

نئی نئی حسرتوں کے خاکے بنا رہا ہوں مٹا رہا ہوں
میں جیسے دنیائے عشق میں تجربوں سزا ہی و حسن میں پا رہا ہوں

سکونِ درماندگی نے بخشی مرے دلِ مضطرب کو راحت
نہ اب میں فریاد کر رہا ہوں نہ اب میں آنسو بہا رہا ہوں

نمودِ بے اختیار پر خود خجل مری بیکسی ہے لیکن
کسی کو افسردہ دل بنانے میں دردِ دل کب سنا رہا ہوں

خبر نہیں کون جا رہا ہے نہ جانے یہ کون آ رہا ہے
نثار ہے جس پہ جان اسی سے میں نزع میں لو لگا رہا ہوں

نہیں ملی "جلوہ گاہ" اب تک اگر کسی وقت مل بھی جائے
بر آئے گی کیا مری توقع میں جس توقع پہ جا رہا ہوں

یہ بیم و امید کا دوراہہ مرے لئے ہے مقامِ حیرت
یہاں نہیں یہ خبر بھی مجھ کو میں رو رہا ہوں کہ گا رہا ہوں

معاملہ کی یہی ہے صورت نہیں ہی منظور آزمائش
نہ مجھ کو وہ آزما رہے ہیں نہ ان کو میں آزما رہا ہوں

وہ میٹھی باتیں بنا رہے ہیں تو ہاں میں ہاں میں ملا رہا ہوں
تصوراتِ جمیل کو یوں جمیل تر خود بنا رہا ہوں

اسی حیاتِ فنا اثر میں بقا کے آثار پا رہا ہوں
خود ان کے رنگ میں مٹ رہا ہوں کہ غیریت کو مٹا رہا ہوں

وہ ناز سے مجھ کو دیکھتے ہیں میں پیار سے ان کو دیکھتا ہوں
وہ اپنا جادو جگا رہے ہیں میں اپنا جادو جگا رہا ہوں

کمال کیا ضبطِ نفس کا ہے جمالِ پردہ نشیں سے سمجھا
میں ان کی خاطر سے اپنے دل میں حسین ارماں چھپا رہا ہوں

روابطِ حسن و عشق اب تک سمجھ سے باہر ہیں گرچہ پیہم
وہ مجھ کو سمجھائے جا رہے ہیں میں ان کو سمجھائے جا رہا ہوں

نہ چھپ سکے گا وہ دلنشیں اب کھلیں گے رازِ نہفتنی اب
نگہ کی قوت سے کام لے کر حجابِ دل کا ہٹا رہا ہوں

مجھے یہ منظور خاک سمجھے قیاس آرا ہیں اس کے سجدے
بتانِ مدہوش کو میں تو دل میں حقیقتہً پوجتا رہا ہوں

علی منظور

قسمت کا فیصلہ

"سلیمہ - حامد کے بارے میں تمہارے یہ گندے خیالات درحقیقت میرے لئے بے حد تکلیف دہ ثابت ہو رہے ہیں۔ اس دوست کی میرے دل میں کتنی وقعت ہے تم سمجھنے سے قاصر ہو۔" "خیر آپ تو سمجھ سکتے ہیں نا - بس چھٹی ہوئی جب آپ کے عزیز ترین دوست آپ کے ساتھ رہیں گے تو پھر وہاں میرا ہونا تو کوئی ضروری نہیں ۔"

بات معمولی تھی۔ سلیمہ اور ظہیر بطور تفریح بمبئی جانا چاہتے تھے - ظہیر چاہتا تھا کہ بجائے ہوٹل کے حامد کے ہاں مقیم ہو - لیکن سلیمہ اس بات کی مخالفت کر رہی تھی - اس کا کہنا یہ تھا کہ آج کل کے نوجوان اعتبار کے قابل نہیں ہوتے حامد پر بھی مجھے اعتبار نہیں - یوں وہ آپ کے کتنے ہی سچے دوست کیوں نہ ہوں - ظہیر بھلا اپنے دوست کی توہین کو کیونکر برداشت کر سکتا تھا ۔ برہم ہو گیا - اس نے کھلے الفاظ میں سلیمہ سے کہہ دیا کہ "ظہیر کی محبت میرے دل میں تم سے کہیں زیادہ ہے، تم میری رفیقۂ حیات ہو ، لیکن میری مسرتوں اور خواہشوں کے مقابلے میں تم نے ہمیشہ اپنے کلب ، سینما ، فیشن ، اور تنہا تفریح کو ترجیح دی - کیا یہی ایک مشرقی عورت کا فریضہ ہے ؟" بات اور زیادہ بڑھ جاتی اگر سلیمہ موقع کی نزاکت کا خیال نہ کرتی - سلیمہ ایک امیر گھرانے کی لڑکی تھی - ماں باپ کی چہیتی اور لاڈلی ۔ فیشن پرستی کی عادت شادی ہونے کے بعد بھی نہ چھوٹ سکی - تعلیم یافتہ تھی ، لیکن ازدواجی تعلقات کیا ہونے چاہئیں نہیں جانتی تھی - اس نے جب دیکھا کہ ظہیر اس کی اس مغربی آزادی سے خوش نہیں ہے تو پریشان ہو گئی وہ نہیں جانتی تھی کہ ظہیر کو اس کے بارے میں بہت ساری غلط فہمیاں ہو گئی ہیں - سلیمہ یقیناً اب تک خوشی کے دن بسر کر رہی تھی لیکن اس وقت وہ اپنی مسرتوں میں ایک قسم کی کمی محسوس کر رہی تھی اس نے کہا - "ظہیر تم کتنے شکی اور کتنے زود رنج ہو - اگر تمہیں میرا اس طرح بے باکی سے تفریح کے لئے جانا پسند نہ تھا تو تم نے پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا - میں تمہاری مرضی پر چلتی - خیر میں معافی چاہتی ہوں - میں تمہارے ساتھ چلوں گی اور تمہارے دوست حامد کے یہاں ہی ٹھہروں گی -

بمبئی کے پندرہ روزہ قیام میں سلیمہ کو حامد کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کا بہت اچھا موقع ملا اس نے حامد کو ظہیر کی تعریف کا پورا مستحق پایا - اس کے اخلاق اور سنجیدہ مذاق نے سلیمہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا - بمبئی جیسے خوشنما شہر میں یہ تینوں انتہائی عیش و مسرت کے دن بسر کر رہے ہیں - ماہم کا وہ حصہ جو زیادہ آباد نہیں ہے ، وہاں حامد کا خوبصورت مگر مختصر مکان ہے ذرا آگے دریا کا کنارہ ، ایک سنسان مقام ، جہاں نہ تفریح کے لئے چمن ہے اور نہ بیٹھنے کے لئے کوئی بنچ ، چمکتے ہوئے ریت کے ذرے ، نیلگوں آسمان ، ہچکولے لیتا ہوا سمندر ، تنہائی ، بے شمار موجوں کا بار بار کنارے سے ٹکرا کر واپس ہو جانا ، لہروں کا شور ، ان ساری رنگینیوں کو سمیٹا ہوا یہ دلفریب مقام سلیمہ جیسی مناظر پرست لڑکی کے لئے ارضی جنت سے کم نہ تھا۔

سورج ایک شکست خوردہ سپاہی کی طرح اپنا بچا کھچا سامان لپیٹے ہوئے مغرب کی طرف کوچ کر رہا تھا رات ایک فاتح فوج کی طرح بڑھ رہی تھی - سورج کی آخری کرن بھی غائب ہو گئی - اور سلیمہ کے لئے صرف موجوں کی آواز اور پرندوں کی پکار باقی رہ گئی - اس خاموش فضا میں سلیمہ کے پیچھے سے کوئی اس کی طرف بڑھتا ہوا معلوم ہوا ۔ سلیمہ پلٹ کر

دیکھنا ہی چاہتی تھی کہ ایک زبردست ہاتھ سلیمہ کے چہرہ پہ تھا ــــ ایک صنف نازک ــــ اور اس کی ناتوان کوششیں بیکار ثابت ہوئیں سلیمہ کے اعضا نے جواب دے دیا۔ اس کا سر چکرا گیا۔ اور اس کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا ــــ سلیمہ کو جب ہوش آیا تو اس نے خود کو حامد کی آغوش میں پایا ــــ اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور ایک جھٹکے کے ساتھ وہ حامد کے ساتھ علٰحدہ ہو گئی ــــ پریشانی ــــ شرم ــــ ندامت ــــ غصہ ــــ تعجب اور بے بسی ــــ وہ صبر نہ کر سکی ــــ اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا ــــ لیکن دل کا غبار کم نہ ہوا ــــ اس کی حقارت آمیز نظریں حامد پر گڑی ہوئی تھیں ــــ حامد ــــ افسوس اس کے متعلق رائے قائم کرنے میں اس نے جلد بازی سے کام لیا۔

غم اور غصہ کے اٹھتے ہوئے طوفان کو سلیمہ دبا نہ سکی ــــ اس سے صبر نہ ہو سکا ــــ حقارت آمیز لہجہ میں اس نے کہنا شروع کیا ــــ "حامد تم تو مجھے بہن کہہ کر پکارتے تھے اور ظہیر کے جان نثار دوست بھی تھے۔ کیا تم وہی حامد ہو ــــ بے شرم ــــ بیہودہ انسان ــــ خود غرض کتے ــــ پارسائی کا ڈھونگ تو خوب رچایا تھا لیکن اس کو زیادہ دن نباہ نہ سکا ــــ لیکن" اس نے کڑک کر کہا، اس کا جسم غصے سے تھر تھر کانپ رہا تھا ــــ "میں تم سے انتقام لوں گی ــــ یہ نہ سمجھنا کہ میں ایک کمزور عورت ہوں ــــ تم میری زبان نہیں بند کر سکتے ــــ ذلیل انسان ــــ سلیمہ اسی حالت میں بیہوش ہو کر گر پڑی۔

حامد اس وقت تو وہاں سے نکل گیا ــــ لیکن وہ کسی گہری سوچ میں تھا وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس دوستی کا طلسم کسی طرح ٹوٹے ــــ اور سچ پوچھو تو اس کے لیے ظہیر سے کشیدگی کا خیال بھی تکلیف دہ تھا کیونکہ اس کا بچپن کا دوست تھا اور وہ اس کو کسی قیمت پر اپنے سے علٰحدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسی سوچ بچار میں کئی گھنٹے گذر گئے ــــ آخر اس نے اپنے ڈرائیور معین کو آواز دی۔ "معین دیکھو سلیمہ اس کمرہ میں بے ہوش ہیں ان کو ہوش میں لانے کی فکر کرو ــــ یہ دس کا نوٹ تمہارے کارنامے کے سلسلہ میں اور ایک دس روپیہ اور آئندہ اس کام کے لئے جو میں تمہارے سپرد کروں گا ٹھیک نصف گھنٹہ کے بعد ــــ اس سامنے والے نیم کے درخت کے پیچھے میں آؤں گا ــــ میرے ساتھ ایک اور شخص ہوگا۔ جب ہم اپنے آپ کو اس درخت کی آڑ میں چھپا لیں اس وقت سلیمہ کو یہ کہہ کر کہ چلو گھر پہنچا دوں سامنے سے گذرنا اور کسی طرف چلے جانا ــــ نصف گھنٹہ بعد میرے مکان پر اُسے واپس لا کر چھوڑ دینا ــــ اور وہاں تمہاری کار کا نمبر ــــ" "جی ہاں حضور میں سب کچھ سمجھ گیا" ــــ "شاباش"

"دیکھو یہ وہی شخص ہے جس کا میں ابھی تمہارے سامنے تذکرہ کر چکا ہوں" حامد نے ظہیر کو اس موٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس میں معین اور سلیمہ بیٹھے ہوئے تھے۔ "میرے دوست میں تمہارا کس طرح شکریہ ادا کروں تم نے آج مجھے ایک عورت کے فریب سے ہمیشہ کے لئے بچا لیا اس کا اس طرح ہمیشہ غائب رہنا ــــ تفریح ــــ فیشن ــــ او مکار عورت تو میرے دل کے شبہات کو کس خوبی سے مٹا دیا کرتی تھی" ــــ اس نے غصہ سے ہونٹ چباتے ہوئے کہا ــــ "لیکن حامد میرا فیصلہ تم جانتے ہو کیا ہوگا"

حامد نے پریشان صورت بنا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہنے لگا۔ "لیکن ظہیر تم وعدہ کر چکے ہو کہ اس راز کو پوشیدہ رکھو گے" "اور اب میں قسم کھاتا ہوں کہ اس واقعہ کا علم ہمارے خدا کے سوا اور کسی کو نہ ہوگا"

"اور ہاں ظہیر ــــ جب تم کو سب کچھ معلوم ہی ہو گیا ہے تو بہتر ہے کہ تم اس سے قطع تعلق ہی کر لو" ظہیر خاموش رہا ــــ مکان آ چکا تھا۔

رات کے دو بج چکے تھے۔ ہر طرف سنسان سناٹا تھا۔ سلیمہ کا کمرہ اس کی بربادی پر ماتم کر رہا تھا روشندان سے جو چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی سلیمہ کے پلنگ پر پڑ رہی تھی۔ سلیمہ حسرت و یاس کی مورت بنی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئی۔ اس وقت وہ درد کی سراپا تصویر معلوم ہو رہی تھی۔ ترا ہوا معصوم چہرہ۔ آنسوؤں سے تر گال۔ پریشان بال۔۔ ڈگمگاتی ہوئی چال۔ اندر کو دھنسی ہوئی بے نور آنکھیں۔ وہ مسہری کے پاس ساکت کھڑی ہو گئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس سے آخر کھڑا نہ رہا گیا۔ اور مسہری پر دھڑام سے گر پڑی۔ دل کا غبار آنکھوں کے راستے بہہ نکلا۔

دروازہ آہستہ آہستہ کھلا۔ ایک آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک کے ساتھ ایک خنجر سلیمہ کے پیوست ہو گیا۔

سلیمہ جیسے بیدار ہوئی۔ "کون۔ ظہیر؟" اس نے شکستہ آواز میں کہا۔ "خیر تم نے اچھا کیا۔ آخر تم سے ایک نہ ایک کل صبح کو چھٹنا ہی۔ قسمت کا یہ فیصلہ تھا کہ میں تم سے جدا ہوئی"۔ سلیمہ کی خون آلود لاش کے قریب کھڑا ہوا حیرت زدہ ظہیر۔ قسمت کے فیصلہ پر سر دھن رہا تھا۔

خلیل اللہ

افغانی نوجوان!

آ رہا ہے وہ فرازِ کوہ سے گاتا ہوا
آتشیں نغموں سے دل کی آگ بھڑکاتا ہوا

کر رہا ہے "الغفل" سے عہد و پیمان ستیز
اپنی آبائی شجاعت کی قسم کھاتا ہوا

دل قوی، چہرے پہ شادابی، نگاہیں مطمئن
جا رہا ہے حُریت کا نور برساتا ہوا

چل رہا ہے پتھروں کے راستہ پر تیز تیز
ہر نفس پر ایک تازہ زندگی پاتا ہوا

گا رہا ہے کس مزے کے ساتھ آزادی کے گیت
گردِ فشاں کاکلوں کے پیچ سلجھاتا ہوا

ڈالتا ہے برگ و گل پر کس قیامت کی نگاہ
زندگی کی اک نئی تفسیر فرماتا ہوا

ملگجی ٹوپی، پھٹے جوتے، گریباں تار تار
چل رہا ہے چہرہ ہی سے دنیا کو ٹھکراتا ہوا

قبلہ رو ہو کر کھڑا ہو جو گیا بہرِ نماز
عظمتِ اسلام کی تاریخ دہراتا ہوا

ماہر القادری

"آپ ہی میری زندگی کا سہارا ہے"

رضیہ کی شادی ہوئے چار ماہ ہو چکے تھے۔ مگر اس عرصہ میں اس کی میری کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ وہ میری ہم جماعت تھی
میں اور وہ ایک ساتھ میٹرک تک تعلیم پاتے رہے تھے۔ امتحان دینے سے پہلے اس کی شادی ہوگئی اور میری تعلیم کا سلسلہ ابھی جاری تھا
سعیدہ اکبر بیگ کی لڑکی ہمارے ہاں اکثر آتی تھی۔ اسی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ اس کو ایک استانی پڑھانے آیا کرتی ہے
ایک روز کا ذکر ہے کہ ہم سب گنڈی پیٹ تفریح کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے اسی دن ہمارے ہمسایہ
اکبر بیگ کا بھی زنانہ آیا ہوا تھا۔ سعیدہ مجھے دیکھ کر دوڑتی ہوئی آئی اور آکر میرا ہاتھ پکڑ لی اور کہا کہ آپا! "ہماری استانی جی سے
ملو گی" میں نے کہا سعیدہ ضرور ملوں گی۔ تمہاری استانی جی ہے کہاں؟ دیکھو! آپا وہ خود آپ سے ملنے ہی آرہی ہیں۔
استانی صاحبہ کے نزدیک آتے ہی میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ رضیہ تم یہاں کہاں؟ تم اس قدر دبلی کیوں
ہوگئی ہو۔ میں نے سنا ہے کہ تمہاری شادی ہوگئی ہے۔ کیا یہ سچ ہے۔ غرض بیسیوں سوالات تھے جو میں نے کر ڈالے۔
جن میں سے ایک سوال کا بھی جواب نہ دیا گیا۔ میں اس کے چہرہ کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اس کا رنگ متغیر ہو رہا تھا وہ سنبھلی اور
میں نے موضوعِ سخن بدل ڈالا۔

اس واقعہ کے تیسرے دن بعد ہمارے ہاں دعوت تھی۔ امی نے میری کامیابی کی مسرت میں میرے دوستوں کو
چائے پر مدعو کیا تھا۔ رضیہ کو بھی دعوت دی گئی۔ رضیہ ہر تیسرے چوتھے روز میرے ہاں آجایا کرتی تھی۔ اب اس کی طبیعت
میں پہلے کی سی شگفتگی اور لبوں پر مسکراہٹ نہ تھی میں نے بشرے سے جان لیا کہ ضرور کچھ نہ کچھ راز ہے۔ میں نے سیکڑوں
مرتبہ پوچھنا چاہا کہ اس نے اپنی حالت ایسی کیوں بنا رکھی ہے۔ مگر یہ جملہ میری زبان پر آ آ کر رک گیا۔ آخر ایک دن بے ساختہ
میری زبان سے نکل ہی گیا رضیہ! تمہارے میاں کیسے ہیں کچھ ہمیں بھی تو سناؤ۔
میاں کا لفظ سنتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ شاہنی میں یہ قصہ کسی کے سامنے دہرانا نہیں چاہتی۔
میرا قصہ سن کر سوائے رنج کے اور کچھ نہ حاصل ہوگا آخر میرے اصرار پر اس نے کہنا شروع کیا۔
ایک حد تک میرا قصہ تمہارے لئے درس عبرت ہے اس کو سننے کے بعد تم مردوں پر کبھی بھروسہ نہ کروگی میں نے
افسانوں میں بدنصیبی قسمت کی عجیب و غریب داستانیں پڑھی ہیں۔ اس میں شاہ کو گدا اور گدا کو شاہ بنتے دیکھا ہے
آہ! تقدیر ایک سربستہ راز ہے گلیوں میں پھرنے والی بھکارنیں تختِ زرین پر متمکن ہوگئیں اور وہ نشۂ ثروت کے
متوالے جن کے ایک اشارے پر تقدیر بھی سر جھکاتی تھی آنِ واحد میں فقیروں سے بھی بدتر ہو گئے۔ مجھ پر جو بیتا بڑی
اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ ان واقعات کو یاد کرتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ میں اب تک کیسے زندہ رہی۔ میرا دل
بھی مسرتوں اور امیدوں کا گہوارہ تھا مگر آہ! اس بے داد کے ہاتھوں مر مٹیں۔ میں کیا جانتی تھی کہ وہی شخص جو میری
ایک ایک ادا پر جان دیتا تھا مجھے اس طرح ذلیل و خوار کرے گا۔

میری شادی ہوئے چار سال ہوتے ہیں۔ جب میں اس گھر کی ملکہ بنائی گئی تھی تو وہ میرے لئے ایک شگفتہ اور شاداب چمن تھا۔ میں اس چمن کی بلبل تھی۔ سارا چمن میرا تھا جہاں چاہتی اور جس ڈال پر چاہتی چہکتی اور جس پھول کو چاہتی سونگھتی اور جس شاخ میں چاہتی اپنا آشیانہ بناتی صیاد بھی میرا ہمراز و ہم ساز تھا وہ اپنی بلبل کی دلجوئی میں ہر وقت مشغول رہا کرتا تھا۔ باغ میں حوض بلوریں کے کنارے ہم محبت میں سرشار گھنٹوں راز و نیاز کی باتیں کیا کرتے۔ باغ کی روشوں میں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلا کرتے۔ وہ آہستہ سے میرے کان میں کہتے "تم میری جان ہو" میں اس کا جواب زیرلب دیتی تم میرے دلدار ہو"

ہماری جائداد وسیع تھی ہمیں زمانے کی کوئی فکر نہ زندگی کا کوئی غم تھا ہمارے لئے زندگی ایک طلسم بہا تھی جس میں مرادیں کھیلتیں اور خوشیاں ہنستی ہوئی ہم سے ہم آغوش ہوتی تھیں زمانہ ہمارا ہوا خواہ۔ آسمان ہمارا دمساز و بخت ہمارا مساعد تھا ایک دن وہ گھر میں ہنستے ہوئے داخل ہوئے اور کہا کہ "میں تم سے ایک التجا کرنے آیا ہوں دیکھنا ان مسکراتے ہوئے لبوں پر حرف انکار نہ آئے۔ میں اپنی تمام جائداد تمہارے نام منتقل کرا دینا چاہتا ہوں میرے لئے تمہاری محبت ہی کافی ہے میں چاہتا ہوں کہ تمہارے دروازے کا فقیر بن کر رہوں۔ تم میری نورجہاں بن جاؤ میں تمہارا سلیم بن جاؤں گا میری آنکھیں آبگوں ہوگئیں مسرتیں اپنے انتہائی عروج پر پہونچ کر قطرۂ اشک بن گئیں۔

دو سال بھی ہم کو اس پریم نگری میں قیام کرتے نہ گزرے تھے کہ زمانہ نے پلٹا کھایا۔ حامد کے مزاج میں تغیر پیدا ہو گیا اب اس کا دل میرے لئے دیوانہ تھا نہ اس کی اشتیاقانہ نظریں مجھ پر بار بار پڑتی تھیں۔ اب وہ رات رات بھر غائب رہا کرتا۔ اب وہ مجنوں کی طرح میرا مشتاق نہ تھا۔ میری جدائی اس کے لئے شاق نہ تھی۔ کچھ دنوں تک تو میں اس کی حالت کا بغور مطالعہ کرتی رہی روز بروز اس کی بے التفاتی ترقی کرتی گئی۔ مجھے اس کی محبت آمیز باتیں یاد آتیں میں گھنٹوں بلکہ پہروں اس کے لئے روتی صحت خراب ہو رہی تھی مگر اس کو مطلق فکر نہ تھی میں دن دن بھر اسی خیال میں غرق رہتی کہ کیا محبت اس قدر جلد فنا ہو سکتی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ محبت کا چشمہ لازوال ہے محبت کا لازوال چشمہ۔ اب بھی میں اس میں موجزن تھا مگر اس کا بہاؤ کسی اور طرف تھا اب وہ کسی دوسرے چمن کی شادابی میں منہمک تھا۔ میں بھی اس کی سردمہری کا جواب خاموشی سے دینے لگی۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ اس سے اس بے مہری کا سبب دریافت کروں مگر خودداری کا جذبہ اس نے بھی اجازت نہ دی۔

رفتہ رفتہ میری محبت نفرت سے بدل گئی حامد میرے لئے محبت کی گذشتہ بہار کا ایک بھولا ہوا نغمہ تھا سوز دل سرد ہو گیا اور شمع محبت بجھ گئی تھی۔ اس کی عزت میرے دل سے رخصت ہو گئی۔ جو شخص محبت کے پاک مندر میں کدورت کو داخل کرتا ہے وہ ہرگز پرستش کے لائق نہیں۔

اب میں اپنا زیادہ وقت کتب بینی میں صرف کیا کرتی تھی ایک روز صبح جب کہ میں چمن میں مالی کو کچھ درختوں کے لگانے کی فرمائش کر رہی تھی، ایک حسین عورت ایک [illegible] کے ساتھ باغ کی پھاٹک پر نظر آئی۔ اس کے بعد میں بغیر کچھ سوچے دروازے میں چلی آئی۔ میرے [illegible] کے [illegible] گھنٹہ بعد وہی عورت اندر آئی . . . . میں

ایک اجنبی عورت کو آتا ہوا دیکھ کر اُٹھی اور چاہتی تھی کہ اس سے اچانک آنے کا سبب دریافت کروں مجھے سیڑھیوں پر حامد کے چڑھنے کی آواز آئی دیکھتی کیا ہوں کہ حامد غیر معمولی طور پر مسکراتا ہوا آ رہا ہے۔ حامد اور اس عورت کو ایک ساتھ دیکھتے ہی میرے خیالات نے پلٹا کھایا۔ فوراً میری سمجھ میں آگیا کہ یہ عورت حامد کی محبوبہ ہے۔ دراصل واقعہ بھی یہی تھا۔ حامد خوش خوش اس کو اپنے ساتھ لئے میرے سامنے سے بارہ دری کی طرف چلا گیا۔ یہ دیکھتے ہی میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ انتقام کی آگ بھڑک اٹھی مگر کیا کرتی خاموش رہنا پڑا۔
برسات کا موسم تھا رات اندھیری تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اور بارش کی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ اس وقت مجھے حامد کی یاد رہ رہ کر ستا رہی تھی میں نے دل بہلانے کی خاطر کچھ اشعار گنگنانا شروع کیا غمزدہ دلوں کی تسکین کا سامان اس کے سوا اور کیا ہے

گیارہ بجے کے قریب اس عورت کو ساتھ لیتے ہوئے حامد آ موجود ہوا دونوں بالاخانہ پر چلے گئے محفل رقص و سرود منعقد ہوئی اور شراب کے دور چل رہے تھے میں کواڑ کی دراڑوں میں سے یہ سب تماشا دیکھ رہی تھی اس کی محبوبہ نے کہا "تمہاری بیگم کا دل یہ سب دیکھ کر کباب ہو رہا ہوگا۔ وہ ضرور یہاں پر چھپی تماشا دیکھ رہی ہوگی۔ حامد۔ "نہیں وہ تو اب کسی کمرے میں سو رہی ہوگی"۔ محبوبہ نے تیوری پر بل ڈال کر کہا "اگر میں اس کو اسی بالاخانہ پر ڈھونڈ نکالوں تو تم مجھے کیا دو گے۔" "جو تم مانگو گے" حامد مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ دیکھو اپنی زبان کو نہ پلٹو گے۔ نہیں بے شک جو تم مانگو دوں گا۔ اور تم جو کہو گی مجھے بسر و چشم منظور ہوگا۔ ان باتوں کو جانے دو مجھے ایک اور جام لبریز تمہارے ہاتھ سے پینے دو۔

یہ سنتے ہی وہ دروازہ کھول باہر نکل آئی۔ میں بھاگتی ہوئی سیڑھیوں پر سے اترنا ہی چاہتی تھی کہ اس نے مجھے پکڑ لیا میں نے اس کی گرفت سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کی مگر نہ بچ سکی۔ وہ بدطینت مجھے کھینچتی ہوئی حامد کے سامنے لے گئی ایک طرف گانا ہو رہا تھا دوسری طرف شراب کے دور چل رہے تھے۔ حامد بت بنا بیٹھا تھا۔ اس نے حامد سے مڑ کر کہا کہ اب میں اسے مارنا چاہتی ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی ملازمہ کے ہاتھ میرے ہاتھ پیر بندھوائے اور مجھے مارنا شروع کیا میں چیخ رہی تھی حامد ساکت و صامت یہ تماشا دیکھ رہا تھا میں زار قطار رو رہی تھی وہ کہتی جاتی تھی کہ محفل عیش میں مداخلت کرنے کی یہی سزا ہے اور مارتی جاتی تھی حامد مجھے ایک بازاری عورت کے ہاتھ پٹوا رہا تھا۔ اس کی عزت و حرمت خاک میں مل گئی تھی۔ اس نے یکے بعد دیگرے دو دفعہ اپنی محبوبہ سے کہا کہ مارنا بس کر دو مگر ایک نہ سنی جب وہ مار مار کر تھک گئی تو مجھے اس طرح بندھا ہوا چھوڑ آپ حامد کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اتر گئی اس کے ساتھ سب اہل محفل بھی نیچے چلے گئے۔ میں درد و کرب میں ساری رات تڑپتی رہی اپنی ذلت اور حامد کی بے وفائی پر آٹھ آٹھ آنسو روتی رہی۔ جب صبح ہوئی تو میں نے بڑی کوشش سے خود کو آزاد کیا اور بلا کسی عزم و ارادہ کے سڑک کی طرف چل پڑی۔ راستے میں میری ملاقات ایک طوائف سے ہوگئی میں نے اس کے سامنے اپنا تمام احوال دہرایا۔ اس کو رحم آیا وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے بالاخانہ پر لے گئی۔

مجھے گھر سے غائب ہوئے ایک ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا مجھے اس طوائف کے ذریعہ حامد کی خبریں ملا کرتی تھیں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ عورت بلا شرکت غیرے مکان پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہے اور حامد اس کے سامنے ایک غلام کی حیثیت سے کھڑا رہتا ہے۔

میں ایک روز بالاخانہ پر بیٹھی ہوئی تھی کہ حامد کی موٹر نظر پڑی۔ میں نے اپنے سر کو دریچہ کے باہر ڈال موٹر کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ میں موٹر کو دیکھ رہی تھی حامد مجھے دیکھ رہا تھا۔ میری اس کی آنکھیں چار ہوئیں۔ میں نے نگاہیں پھیر لیں میرا مقصد تو اس کو میری طرح آتشِ حسد سے جلانا تھا وہ پورا ہو چکا۔ مجھے دوسرے دن اطلاع ملی کہ حامد نے خودکشی کر لی ہے اور اس عورت کو بھی کسی نے قتل کر ڈالا ہے۔ لیکن جب میں مکان پہونچی تو ملازموں کی زبانی معلوم ہوا کہ حامد پہلے اس عورت کو گولی کا نشانہ بنا کر بعد خود موت کے گھاٹ اترا۔

میرے زخم مندمل ہو جائیں گے۔ وہ ذلت جو میں نے اس کے جلانے کی خاطر گوارا کی بھلادی جائے گی مگر وہ محبت کی ساعتیں جو اس کے ساتھ گزری تھیں تادم زیست یاد آئیں گی۔ بس یہی یاد میری زندگی کا سہارا ہے۔

صفیہ صدیق فریدہ

۲ دو شعر

روتے روتے آنکھ میں آنسو کی بوند گوہرِ نایاب بن کر رہ گئی

اِس نظر سے تم نے کیوں دیکھا مجھے ہر تمنّا خواب بن کر رہ گئی!

سکندر علی وجد

اعلان

اُردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے ذیل کے ہر مضمون پر مبلغ دو سو روپے انعام دینا تجویز کیا ہے۔ جن صاحب کا مقالہ سب سے بہتر ہوگا انھیں مذکورہ بالا انعام دیا جائے گا۔ اکادمی کا فیصلہ ناطق ہوگا۔ اس کے علاوہ اکادمی منتخب مقالہ جات کے حقوق اشاعت اپنے ذمہ رکھے گی۔ مقالہ میں تقریباً پچاس ہزار الفاظ ہونے چاہئیں اور تمام مقالے سکریٹری اُردو اکادمی کے پاس ۵ استمبر تک پہونچ جانا چاہئیں۔ جو صاحب اس مقالہ نویسی میں شرکت پسند کریں وہ پہلے اپنے مضمون کے انتخاب سے سکریٹری کو مطلع کر دیں۔

فہرست مضامین

اشتراکیت۔ نازی ازم۔ سامراج وطنیت سرمایہ داری۔ بحیرہ روم کی سیاست۔ بحرالکاہل کی سیاست۔ امریکہ اور سیاست عالم نوآبادیوں کی تقسیم۔ ممالک اسلامی کی سیاست۔ فاسزم

سکریٹری اردو اکادمی
(جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

غزلیں

روح کے راز کو سمجھ جسم کی زندگی نہ دیکھ
آئینہ کی تلاش کر سدِّ سکندری نہ دیکھ

نفس سے اپنے جنگ رکھ نفس کی برہمی نہ دیکھ
ترکِ تعلقات کر دہر کی آذری نہ دیکھ

رحم و کرم پہ رکھ نظر طاعت و بندگی نہ دیکھ
اس کی طرف نگاہ کر اپنی طرف کبھی نہ دیکھ

چہرۂ یار پر نہ جا اس کی شگفتگی نہ دیکھ
اس کے بھی دل میں درد ہے لب پہ جو ہے ہنسی نہ دیکھ

آتا ہے سامنے سے وہ خاک بسر ادھر کوئی
ہائے نگاہِ شوق سے اس کی شکستگی نہ دیکھ

خود ہی تمام جلوہ بن خود ہی بہارِ جلوہ بن
خود ہی ہر ایک شے پہ چھا اس کی طرف کبھی نہ دیکھ

غنچۂ ناشگفتہ کے رازِ نہفتہ کو سمجھ!
درد بھری صدا نہ سن حالتِ دل کبھی نہ دیکھ

دستِ طلب بڑھائے جا پردہ رخ اٹھائے جا
کام سے اپنے کام رکھ یار کی برہمی نہ دیکھ

تجھ کو خدا کا واسطہ حسن کہیں تڑپ نہ جائے
اشک بھری نگاہ سے عشق ادھر کبھی نہ دیکھ

جالبِ خستہ بزم میں داد نہ دے اگر کوئی
کام سے اپنے کام رکھ غیر کی ابلہی نہ دیکھ

محمد عادل مرزا جالب چغتائی (مراد آبادی)

۲

دل پر کچھ الزام نہیں ہے
قسمت میں آرام نہیں ہے

دل کی حالت عام نہیں ہے
اچھا ہوں، آرام نہیں ہے

جس کا مطلب عام نہیں ہے
شعر تو ہے الہام نہیں ہے

سجدہ اور بے مطلب سجدہ
قاصد ہے پیغام نہیں ہے

خالی ہاتھ لگا ہے منہ سے
ہائے تصوّر جام نہیں ہے

اپنی حد کے اندر رہ کر
کوئی طلب ناکام نہیں ہے

اب تک وہ پھرتے ہیں نظر میں
عشق خیالِ خام نہیں ہے

اس سے کام پڑا ہے مجھ کو
جس کو مجھ سے کام نہیں ہے

مجھ کو بے کس کہنے والو!
کیا یہ "اس کا" کام نہیں ہے

دل ہے ناموسِ محبت
جام ہے کیفِ جام نہیں ہے

چھوٹ رہا ہے اس کا دامن
اور مئے گلفام نہیں ہے

یارب اس کے صدمے مجھ کو
رونا اس کا کام نہیں ہے

شاد کبھی ہنسنا بھی ہوگا
رونا ہی انجام نہیں ہے

شاد عارفی

محمد قلی قطب شاہ کی بارہ¹² پیاریاں

سلاطین قطب شاہیہ میں محمد قلی قطب شاہ ہی ایک ایسا بادشاہ ہے جس کا زمانہ زیادہ سے زیادہ امن وامان اور راحت و آرام سے گذرا۔ اور جس نے اپنی تمام زندگی عیش و عشرت اور بہجت و کامرانی میں گذاردی۔ بعض مورخوں نے قطب شاہوں کے آخری یادگار ابوالحسن تانا شاہ کو بدنام کرنے اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی فتوحات کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے تانا شاہ کو بڑا عیاش اور رند بدمست مشہور کر رکھا ہے۔ لیکن حقیقت یہہ ہے کہ سلطان محمد قلی کو عیاشی کے جو موقعے حاصل ہوئے تانا شاہ کو ان کا عشر عشیر بھی نصیب نہ ہو سکتا تھا۔

محمد قلی نے بچپن سے محل کے ناز و نعم میں پرورش پائی اور اگر وہ بھاگ متی والا قصہ صحیح ہے (جس کی رو سے بھاگ متی کی خاطر اس نے زبردست طغیانی کے باوجود رود موسیٰ میں اپنا گھوڑا ڈال دیا اور بعد کو اس جرات کی پاداش میں محل سرا میں نظر بند کر دیا گیا اور وہاں ملک ملک کی حسین دوشیزاؤں کو اس کے ساتھ چھوڑ دیا گیا تاکہ اس کا دل بہلائیں اور بھاگمتی کا خیال اس کے دل سے دور کر دیں) تو ظاہر ہے کہ عنفوان شباب کے ساتھ ہی وہ مہہ جبینوں کے ماحول میں رہنے لگا جن میں سے ہر ایک اس پر جان و دل فدا کرنے تیار تھی۔

اس حسین و رنگین ماحول کے ثبوت خود محمد قلی کے کلام سے بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ ہر تقریب میں اس کے اطراف خوبرویوں کا جھمگھٹا رہتا اور رمضان اور محرم کے مہینوں کے سوا اس کی زندگی کے بہت کم لمحے ایسے ہوں گے جب شاہد و شراب و نغمہ اس سے دور رہتے ہوں۔ اتنا ضرور ہے کہ رمضان اور محرم میں وہ شراب قطعاً ترک کر دیتا تھا اور عیش و عشرت چھوڑ کر ایسا زاہد مرتاض اور متقی و پرہیزگار بن جاتا تھا کہ اس کے رند شاہد باز ہونے پر شاید شبہہ ہونے لگتا۔ یہہ اس کی طبیعت کا استقلال اور تربیت کی خوبی تھی۔

بھاگ متی کے متعلق تفصیل سے آئندہ لکھا جائے گا لیکن اس کے علاوہ سلطان محمد قلی کی بیسیوں اور معشوقائیں تھیں جن میں سے حسب ذیل کے نام باعث اس کی کلیات میں بار بار دستیاب ہوتے ہیں:۔

۱۔ ننھی ۲۔ سانولی ۳ کونلی ۔ ۴ پیاری ۵۔ گوری ۶ چھبیلی ۷۔ لالا ۸ لالن ۹ موہن ۱۰۔ محبوب ۱۱ ملقیس زمانی ۱۲ لعل تم ۱۳۔ ہندی چھوری ۱۴۔ پدمنی ۱۵ سندر ۱۶۔ سجن ۱۷ رنگیلی ۱۸۔ مشتری ۱۹ حیدر محل۔

ان بیسیوں مہہ جبینوں میں بارہ ایسی ہیں جو خاص طور پر اس کی منظور نظر تھیں۔ کیونکہ محمد قلی بارہ اماموں کی رعایت سے ہر چیز میں بارہ کے عدد کا لحاظ رکھتا تھا چنانچہ جب اس نے حیدرآباد کے جانب جنوب کی خوشنما پہاڑی پر (جہاں اب قصر فلک نما واقع ہے) ایک عالی شان قصر "محل کوہ طور" کی تعمیر کی تو اس میں انہی دوازدہ ائمہ معصومین کی رعایت سے بارہ برج بنائے تھے چنانچہ اسی محل سے متعلق اس نے ایک نظم بھی لکھی ہے جس میں ان برجوں کا ذکر اس طرح کرتا ہے "چونکہ ان بارہ برجوں پر بارہ اماموں کی نظر عنایت ہے اسی لئے ان پر ایمان کی بجلی جھلکتی رہتی ہے"

اس کا شعر ہے ؎

باره بروج پر ہے باره امام دشتی   تو اس اُپر جھلکتا ایمان کا اجالا

باره پیاریوں کی تخصیص کے متعلق بھی اس کے کلام سے مستند شہادت ملتی ہے ۔

شہر حیدرآباد کی تعمیر کے وقت محمد قلی نے کئی عالی شان قصر تعمیر کئے تھے ۔ اور خاص کر اپنے لئے ایک رفیع الشان سات منزلہ محل بنوایا تھا جس کا نام خداداد محل رکھا تھا ۔ اس محل کی آرائش و زیبائش کے متعلق اس کی ایک نظم اس کی کلیات میں موجود ہے (دیکھو صفحہ ۲۱۱) اس نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ اس محل میں آ کر رہا تو اپنے ساتھ صرف ان باره پیاریوں کو لے آیا تھا جو اس وقت اُس کی منظور نظر تھیں ۔ اس نظم کا ایک شعر ہے ؎

نبی صدقے بارا اماماں کرم تھے   کرو عیش جم باره پیاریوں سو پیارے

اسی طرح عید میلاد النبی کی ایک نظم (دیکھو صفحہ ۳۹) میں بھی اس نے ان باره مہ جبینوں کا پھر باره اماموں ہی کے ساتھ ذکر کیا ہے ۔ وہ کہتا ہے ؎

مبارک منج اچھو یو عید ہور مولود پیغمبر   ملے ہیں قطب سوں باره اماماں ہور لگاراں خوش

ان باره پیاروں میں سے چند کی خصوصیتیں ذیل میں درج کی جاتی ہے ۔ سب سے پہلے ننھی قابل ذکر ہے ۔ اس کی تعریف میں محمد قلی نے کئی نظمیں لکھی ہیں اور اکثر نظموں اور غزلوں میں اس کا ذکر بھی کیا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ :-

ننھی کی جیسی حسین تو آسمانوں میں بھی نہیں ۔ سرو اس کے قد کے مقابل کبھی نہیں آسکتا ۔ اس نے مدن پھول کے رنگ کی ساڑی باندھی ہے جس کے کنارے عجیب و غریب موتی ٹنکے ہوئے ہیں ۔ اس کی یاد کی مستی قطب شہ کو چڑھی ہوی ہے اور وہ اس کو ریجھانے کی خاطر دوتارے پر عجیب تان بجاتا ہے ۔

ایک دوسری نظم میں کہتا ہے :-

اے سکھیو ! میں ننھی کے پریم میں موتی بکھیر رہا ہوں ، تم سمیٹ کر ان کو خوشی سے گوندھو ۔ ننھی میرے ساتھ عشق کا داؤ کھیلتی ہے اور اپنے چاند سے چہرے پر نئی بہار دکھاتی ہے ۔ اے ننھی میں تیرے جسم کی خوشبو کا ذکر کروں یا تیرے راز کی کہانی بیان کروں ۔ کیونکہ تیری خوشبو کی مہکاٹ عاشق کی روح کو مہکا دیتی ہے خوشبو تیرے جسم سے اسی طرح مہکتی ہے جیسے سانت کی بارش سے مہکتی ہو ، تیری آنکھوں کی چک میں کاجل بہت سہانا نظر آتا ہے اور یہہ تو اس لئے لگاتی ہے کہ رقیبوں کے منتر تجھ پر کام نہ کریں ۔

ایک نظم میں ننھی کے ہنستے کھیلتے اور ڈلتے ہوئے پیالہ پلانے کا ذکر کیا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی ہنس مکھ ظریف اور حاضر جواب تھی ۔ وہ شراب کی صراحی ہاتھ میں لینے یا قطب شہ کو پیالہ بھر بھر کر دینے کو پسند نہیں کرتی تھی ، اور چاہتی تھی کہ قطب شاہ زیادہ شراب نہ پیئے اس لئے طرح طرح سے ٹالتی رہتی تھی ۔ اس کا ذکر سالگرہ کی ایک نظم میں بھی کیا ہے (دیکھو صفحہ ۱۵۰) یہہ تو بعد کے اوصاف تھے ۔ ابتدا میں ننھی کی کیا حالت تھی اور بادشاہ نے اس کو ننھی کا لقب کیوں دیا تھا ۔ اس کا علم ان دو نظموں سے ہوتا ہے جو صفحات ۲۰۸ تا ۲۳۱ میں درج ہیں جس میں وہ کہتا ہے کہ :-

اے نازک ننھی تو ابھی محبت سے ناواقف ہے۔ تیری آنکھیں کاجل کی وجہہ سے چمکتی ہیں لیکن تو نہیں جانتی کہ یہہ کیا جادو جگا رہی ہیں۔ تیرا دل عشق و عاشقی کی طرف بھی مائل نہیں نہ تو شیشہ و پیالہ میں شراب بھرتی ہے اور نہ میری عرض مانتی ہے۔ لیکن مجھے تجھ سے آس ہے۔ اگرچہ تو دل لگانے کے طریقوں سے ناواقف ہے لیکن میرا معشوق تو ہے۔ تجھے اپنے بچپن کے کھیلوں کا مول نہیں معلوم نہ یہہ جانتی ہے کہ تیرے ہونٹوں میں آب حیات ہے۔ اس لئے تو منہ سے صاف صاف بات نہیں کرتی۔ سچ تو یہہ ہے کہ تجھے ابھی اپنی قیمت معلوم نہیں۔ تجھے چاہئے کہ قطب زماں کو جانے، محبت کی باتوں کو پہچانے اور عشق کی سیوا کرے تو کب تک اسی طرح اپنے کو کھینچتی رہے گی۔

ایک اور نظم میں محمد قلی نے ننھی کے متعلق لکھا ہے کہ :۔

جب چمن میں ننھی محو خرام ہوتی ہے تو شرم کے مارے آنچل ڈال لیتی ہے۔ معلوم نہیں کہ اس ننھی ڈالی کو ابھی سے شباب کے پھل کیوں لگ گئے۔ جب وہ غصہ یا ناز سے خط سرمہ کے اشارہ سے بات کرتی ہے اور اس کے ہونٹ عرق آلود ہو جاتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ اس کو مگن دیکھوں۔ میری محبت کے نونہالوں میں سے ایک کو اچھے پھل رتن لگے ہیں۔ اے خدا وہ میرے باغ کا ایک سرو ہے اس کی حفاظت کر۔ اس کی بہشتی خوشبو سے جگ کے تمام پھول کھلتے ہیں۔ اس کی خوشبو خطا اور ختن بھی نہیں پا سکتے اے ننھی تیرے چہرے سے سب خوبرویوں کو روشنی ملی۔ تیرے چہرے کو زیور و جواہر کی کیا ضرورت! جب تو چاندنی میں نکلتی ہے تو چاند چھپ جاتا ہے اور تارے آسمان پر سے تجھ پر نثار ہونے کے لئے آتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ تو کیسے نور سے پیدا ہوئی ہے۔ سب پرند تیری چکا چوند روشنی کے لئے اپنا اپنا وطن چھوڑ آئے ہیں۔ تو غصہ سے کیوں میری طرف بھوؤں کی کمان چڑھا کر دیکھتی ہے۔ تجھے تو چاہیئے کہ ناز و غمزے کے ساتھ مجھے اپنے ہونٹوں کا بوسہ دے"

―――――― ۲ ――――――

کلیات میں ننھی کے بعد سانولی کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ اس کے متعلق محمد قلی نے لکھا ہے کہ میری سانولی من کی پیاری نظر آتی ہے کیونکہ وہ رنگ روپ میں بالکل کونلی عورت ہے۔ سب سہیلیوں میں اس کا قد ایسا بالا ہے کہ معلوم ہوتا ہے سرو کو اُس پر سے نثار کر دیا گیا ہے۔ جب وہ سکھیوں کے ساتھ عشق کا کھیل کھیلتی ہے تو اس کے چہرہ کی روشنی میں چاند ذلیل و خوار نظر آتا ہے۔ کوئل اس کے بولوں کے مقابلے میں ہاری ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کی اچھی چال سب کے دل کو بھاتی ہے اور وہ اپنے ساتھیوں میں ایک نادر پھول نظر آتی ہے۔ اگرچہ سکھیوں نے اپنے چہرہ کو طرح طرح سے غازہ لگایا اور اپنے جسم کو رنگین بنایا لیکن اس کے قدرتی رنگ کی بات کسی عورت میں نہیں آتی۔
دوسری نظم میں لکھا ہے :۔

سانولی پیاری نے اپنے سبز رنگ میں نزاکت دکھا کر ہمارے دل کو موہ لیا۔ اس کے ہونٹوں پر

پان کی رنگیلی دھڑی ایسی سہانی معلوم ہوتی ہے کہ دنیا کی تمام رنگینیاں اس پر ریجھ جاتی ہیں جب وہ ہنستی ہے تو اس کے کنول جیسے منہ سے موتی جھڑتے ہیں اور ان موتیوں سے عالم چمکنے لگتا ہے ۔

تیسری نظم میں لکھتا ہے کہ :۔

جب سے اے سانولی تجھ پر نظر ہے ہوش و حواس گم ہیں اور بے خبر ہو گیا ہوں ۔ جب تو اپنی شوخ آنکھوں سے ناز و غمزہ کرتی ہے تو میرا رواں رواں اس سے متاثر ہو جاتا ہے ۔ جب تو ناز سے ہنستی ہے تو تیرے دانتوں کی چمک چاند کی طرح جھلکتی ہے ۔ تیرا سرو جیسا قد جب محو خرام ہوتا ہے تو تیرے بالوں کا لمبا جوڑا چنور کا کام کرنے لگتا ہے ۔ جب تو لباس پہن کر صحن میں نکل آتی ہے تو تیرے چمکدار کپڑوں سے آسمان روشن ہو جاتا ہے ۔ جب تو موتی کے رنگ کی نیم تنی پہنتی ہے تو مجھے ایک بہشتی حور نظر آتی ہے قطب شہ تیری نزاکت سے ناواقف نہیں ۔

۳

سانولی کے بعد محمد قلی کو نلی کی تعریف میں رطب اللساں ہے ۔ وہ لکھتا ہے کونلی اپنے ہاتھ میں پیالہ لے کر کھڑی ہے اور اتنی دبلی پتلی ہے کہ ہوا سے ہل رہی ہے ۔ وہ بالوں میں پھول جاتی ہے اور چوٹی میں دونا و بالا باندھتی ہے اپنے کو نلائے ہوئے چہرہ پر وہ اپنی بھوؤں کو اس طرح چڑھاتی ہے کہ نورانی معلوم ہونے لگتی ہے ۔ اگرچہ بظاہر شرم و ناز سے کھنچی کھنچی کھڑی ہے لیکن آنچل کے اندر سے اپنی آنکھوں کی چنچل پتلیوں کو نچا رہی ہے ۔ اس کے جسم کے رنگ سے نورتن کو روشنی ملی ہے ۔ اور اس کے گلے میں چاند سورج کے حمائل بنا کر ڈالے گئے ہیں ۔

دوسری نظم میں لکھتا ہے کہ :۔

اے کونلی تیرا قد دیکھ کر چمن کے سرو اشارے کرنے لگتے ہیں ۔ تیرا قد باغ فردوس کے لئے بھی باعث زینت ہے ۔ میں نے اپنی پلکوں کو تکیے بنا کر رکھا ہے تاکہ اے مہندی پتلی تو میری آنکھ میں آکر آرام کرے تیرے دونوں ہونٹ ایسے رنگیلے ہیں کہ یاقوت نے ان سے رنگ مانگا اور عقیقوں نے یمن میں ان سے بھیک لی ۔ تیری باریک کمر کے عشق میں میں بال کی طرح باریک ہو گیا ہوں ۔ یہ اتنی باریک ہے کہ پیرہن کا کوئی تار اتنا باریک نہ ہوگا ۔ دلھن کی اس کونلی سکی کو دیکھ کر میری جتنی کالی اور گوری سہیلیاں تھیں میں ان سب کو بھول گیا ۔

تیسری نظم میں لکھتا ہے کہ :۔

اے اچھی پیاری جب تو نظر بازی کرنے کے لئے آنکھ سے آنکھ ملا کر کھڑی ہوتی ہے تو میرے لئے نظر لگانا دشوار ہو جاتا ہے ۔ تو کندنی رنگ کی ایک پتلی ہے ۔ جس کا روپ کونلا ہے ۔ تیری گلابی آنکھوں میں سمندر موجیں مارتا رہتا ہے ۔ اور تیرے سورج سے گالوں میں دانت نورتن کی طرح جڑے ہوئے ہیں ۔ تو بالے بالا رنگا رنگ اور چنچل ہے ۔ خوبرویوں پر راج کرتا تجھے سجتا ہے اے گلابی آنکھ والی سہیلی تو میرے دل کی پیاری ہے

ایک اور نظم میں لکھتا ہے کہ :-

یہ شگفتہ چنچل پھر میرے یہاں سبز آنچل اوڑھے اور پھولوں کی کلغی لگائی ہوئی آئی ۔ اس کی الھڑ چال سے شراب کا خمار اور آنکھوں میں رنگ کے ڈورے نظر آرہے ہیں ۔ اس حسین کی محبت اور اس کے پاؤں کی جھنکار دل کے لئے امید، تن کے لئے عیش اور کان کے لئے ذوق کا باعث ہے ۔ وہ گالی دیتی ہے اور دکھ سے کاری ہو کر گھات کرتی اور لاکھ خوشامد اور لوچ سے دروازے میں پیرے آڑے آتی ہے ۔ یہہ سب میں ہوشیار عورت ہے کیوں کہ بھید کو جانتی عشق کو پہچانتی اور اپنے گھر میں تخت پر بیٹھتی ہے ۔

---۴---

پیاری بھی محمد قلی کی نہایت چہیتی تھی ۔ لیکن وہ اپنے حسن و نزاکت پر اتنی مغرور تھی کہ ہمیشہ محمد قلی کو ترساتی اور ستاتی رہتی تھی اور وہ ہمیشہ اس کو منانے کی فکر میں رہتا چنانچہ کہتا ہے کہ :-

اے سکیو تم آج جا کر پیاری کو سمجھا منا کرے آؤ کیونکہ تمام عشوہ طرازوں کا تاج اسی کے سر سجتا ہے ۔ اس سے کہو کہ قطب شہ نے اپنے مکان کو بہت ہی زیبائش و آرائش سے سنوارا ہے لیکن تیرے بغیر گذارنا مشکل ہے اگر تجھے عشق ستاتا ہے تو آ اور دیوانہ بنا ۔ کیونکہ یہاں تیرا ہی راج ہے ۔ تیرا لباس حسن ایسا عجیب ہے کہ اس کے ساتھ یہہ عشوے تجھے زیب دیتے ہیں ۔ تو اپنے روپ کی وجہہ سے شاہِ خوباں ہے اس لئے سب تجھے خراج عشق ادا کرتے ہیں جس وقت میں تیرے چہرہ کا نور دیکھتا ہوں تو وہ ایک لمحہ سے لئے سو برس کی عشرت کے برابر ہے ۔

دوسری نظم میں کہتا ہے :-

اے پیاری تو جو بن سے غرور نہ کر جب یہہ جوانی چلی جائے گی تو خمیدہ ہو جائے گی ۔ یقین جان کہ یہہ بات دنیا میں مشہور ہے کہ ٹوٹے ہوئے موتی کا مول کم ہو جاتا ہے ۔ جوانی اور جوبن اسی لئے ہے کہ اپنے سائیں کے لئے باعث عیش ہو ۔ تو اپنے دل میں سائیں کی محبت قائم رکھ کیونکہ تیری ہی وجہہ سے اس کا عیش ہے جب تو عشوہ و ناز کے ساتھ سنگھار کر کے آتی ہے تو تیرے چہرے پر پسینہ کی بوندیں اسی طرح بھلی معلوم ہوتی ہیں جس طرح پھول پر شبنم ۔ تو اپنی شراب حسن سے سکیوں کو فیضیاب کرتی ہے اور تمام خوبرویوں میں اپنا علم سرفرازی بلند رکھتی ہے ۔

دوسری نظم میں یوں لکھا ہے :-

اے پیاری تیرے بچھڑنے کی وجہہ سے مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی ۔ مجھے قدرت نے ایسا اچھا گھڑا ہے کہ تیرے بغیر مجھے ایک گھڑی بھی محبت نہیں بھاتی ۔ جو دل سے تیرا عاشق ہے اس کو رات، اور دن کچھ بھی سہانا نہیں دیتا تیری یاد کچھ اس طرح لگی ہوئی ہے کہ پھر کچھ بھی یاد نہیں آتا ۔ تیرے بیمار محبت کا علاج لقمان بھی نہیں کر سکتا ۔ جب تک تو اپنے ہونٹوں کا شربت نہ پلائے گی تیرے عاشق کو کیونکر صحت ہوگی؟

یہ سچ ہے کہ تیرے ساتھ ایک رات رہنا میرے لئے سو راتوں کے برابر ہے۔ تو ہی کہہ کہ جب تو مجھے اپنے سیج پر نہ بلائے تو میں پھر کس کے سیج پر رہوں۔ تیری اس فرقت کی آگ میں میرا دل موم کی بتی کی طرح پگھل رہا ہے۔ لیکن تو مصری کی طرح سخت اور گھٹ ہے اور خود کو ذرا بھی نہیں پگھلاتی۔

تیری گفتار، تیری رفتار، تیرے تیور طرح طرح کے ہیں۔ تو جو کچھ برا بھلا کہنا چاہتی ہے کہہ لے لیکن مجھے ناامید نہ کر۔ تجھ کو خدا نے اتنی قدرت دی ہے کہ تو قطب شاہ کو سمجھا سکتی ہے۔

ایک اور نظم میں لکھتا ہے :-

اے پیاری تیرا بول مجھے مارے ڈالتا ہے۔ تیری ہر بات مجھے کٹاری نظر آتی ہے۔ تیری چوٹی ناگ کی طرح ہے جس کا زہر کڑوا ہوتا ہے۔ تو کھیلتے وقت اپنی اس ناگ جیسی چوٹی کی وجہہ سے سچ مچ سنپیہ معلوم ہوتی ہے۔ میں بھنورے کی طرح تیرے اطراف پھر پھر کر تیری خوشبو لیتا ہوں کیونکہ اس خوشبو میں نرگس کی طرح خمار نہیں ہے۔ تیرے جسم سے صندل اور مشک کی خوشبو نکلتی رہتی ہے۔ تو کانچ کی چوڑیاں پہنی ہوئی ہے اور ہاتھ میں اچھی باندھی ہے ٹھیکری اور کانچ میں وہ ہندی گنوار کیا فرق کرسکتی ہے۔ بھر بگڑ کر کہتا ہے تیرے بول میں نمک نہیں اور تیرے ہونٹوں میں رس نہیں ہے۔ تیری چولی کسی ہوئی نہیں ہے اور تیری چوٹی اندھیرا ہے۔

—— ۵ ——

محمد قلی کی بارہ پیاریوں میں ایک گوری بھی ہے۔ اس کی نسبت ایک نظم میں لکھتا ہے :-

گوری کا چہرہ حسن کی وجہہ سے اس قدر سہانا معلوم ہوتا ہے کہ اس چاند سے چہرہ سے شرماکر خود چاند نقاب پوش ہو جاتا ہے۔ وہ سرو جیسا قد نہیں بلکہ ایک کندنی درخت ہے جس سے سورج جیسی روشنی نکلتی ہے۔ اے گوری تو رنگ اور رس کے باغ کی کلی ہے اس لئے تیرے چہرہ سے زندگانی کا پانی ٹپکتا ہے۔ تیرے رسیلے ہونٹوں میں شراب بھری ہے۔ یہہ عاشقوں کے دل کو جلا کر کباب بنا دیتے ہیں۔

ان کو میں زلفیں کہوں یا تازہ سنبل جو تیرے پھول جیسے چہرہ پر اس طرح بکھرتی ہیں جیسے چاند پر ابر۔

تیری مستانہ چال سے ہاتھی شرماتے ہیں کیونکہ ان میں یہہ ناز اور شوخی نہیں۔ اے قطب نبی کے صدقے میں تجھے گوری ملی ہے تو اس کے گلے میں باہیں ڈال اور اس کے ساتھ شراب پی۔

دوسری نظم میں کہتا ہے :-

گوری عشق کی ایک رنگیلی پتلی ہے جو تمام خوبرویوں میں چھبیلی نظر آتی ہے۔ تجھے پدمنیوں کے چہروں کی بزم آرائیاں زیب دیتی ہیں۔ کیونکہ تو چاند جیسی صورت رکھنے والیوں میں سب سے زیادہ رسیلی ہے سولہ سنگار صرف تیرے جسم کی سج دھج کو دیکھ کر بنائے گئے ہیں کیونکہ تمام مہ جبینوں میں تو ہی سب سے زیادہ حسین ہے۔ تیرے سر پر نور کا جلوہ برستا ہے۔ تیری جیسی سندر سہیلی اور کوئی نظر نہیں آتی۔

بنی کے صدقے میں قطب شاہ سے ایسی پیاری حسن کا پرادا پہن کر آ ملی۔

تیسری نظم میں کہتا ہے:۔

اے عشق کی پتلی تو میرے دل میں کھڑی ہوئی ہے۔ اور عشق کی وجہہ سے تجھے تو پر لگ گئے ہیں۔ اس پتلی کو عشق و محبت پر ناز کرنا زیب دیتا ہے۔ وہ عشق بازی کے لئے کمر باندھ کر تیار اور جوبن کے پیالے اپنے ہاتھ میں لے کر کھڑی ہوئی ہے۔ اے پریم کی سہیلیو بتاؤ کہ پریم کے باغ میں یہ پیاری سجتی ہے کہ نہیں اے گوری تیرے جسم پر سرتا قدم پھول ہی پھول ہیں۔ تو اپنی پرستش کرانے کے لئے کھڑی ہے۔ تو مجھے عشق کی صحبتوں میں پیالہ پلا۔ مجھ پر تیرے عشق کی بھٹی کی مستی چڑھی ہوئی ہے۔ بنی کے صدقے میں مجھے ایسی گوری ملی ہے کہ سورج اور مشتری جس کے عکس ہیں۔

اسی طرح بارہ پیاریوں میں سے ہر ایک پر کئی کئی نظمیں لکھی ہیں جو کلیات کے صفحات ۲۲۲ تا ۲۶۴ پر درج ہیں اور ان خاص پیاریوں کے علاوہ اور دوسری پیاریوں پر بھی اس کی نظمیں موجود ہیں جو کلیات کے صفحات ۲۶۵ تا ۲۸۱ پر شائع ہوئی ہیں۔

ان سب پیاریوں کی نظموں کے خاکے یا خلاصے پیش کرنا موجب طوالت ہے اس لئے ہم یہاں اس کی صرف خاص خاص پیاریوں کے سراپا اسی کی نظموں سے اخذ کر کے نہایت مجمل الفاظ میں پیش کر دیتے ہیں۔

۱۔ **ننھی** بالا قد۔ چاند سا روشن چہرہ۔ چکدار آنکھیں۔ جسم میں ایک خاص خوشبو۔ ابتدا میں نہایت شرمیلی اور سیدھی سادھی لڑکی تھی جو بہت جلد عنفوان شباب کو پہنچ گئی۔ ملنے اور بات کرنے سے جھجکتی تھی۔ شراب سے نفرت کرتی تھی اور شراب کی صراحی اور پیالہ ہاتھ میں لینے اور پینے پلانے سے ہمیشہ بچتی تھی آنکھوں میں کاجل لگاتی اور خط سرمہ کھینچتی تھی مدن پھول کے رنگ کی ساری باندھتی جس کے کنارے عجیب و غریب موتی ٹکے ہوتے۔ وہ بعد کو بڑی ہنس مکھ، ظریف، اور حاضر جواب ہو گئی تھی۔

۲۔ **سانولی** بلند و بالا قد۔ دلفریب سانولا سلونا رنگ جس کی وجہہ سے وہ بہت نازک اور کونلی معلوم ہوتی تھی۔ خوش آواز خوش خرام۔ موتی کی طرح دانت۔ شوخ آنکھیں۔ زرق برق لباس پہننے والی موتی کے رنگ کی تیم تی زیب کرتی

۳۔ **کونلی** ایسی پتلی پتلی کہ ہوا سے ہلنے والی۔ جسم کو نرم و نازک سے اتنا چرالے رکھتی کہ کمر کے ہونے نہ ہونے کا شبہ ہوتا۔ دکنی مہ جبین۔ گندمی رنگ۔ گلابی آنکھیں جو نگین ڈوروں کی وجہہ سے ہمیشہ خماری نظر آتیں۔ چڑھی ہوئی بھویں یاقوت اور عقیق یمن کو شرمانے والے ہونٹ۔ چکدار رخسار موتی جیسے دانت۔ سرتاپا زنگار رنگ اور چنچل سبز آنچل اوڑھتی بالوں کو پھولوں سے سجاتی۔ بہت ہی ہوشیار۔

۴۔ **پیاری** ہمیشہ روٹھنے اور بگڑنے والی۔ بہت ہی خوبصورت اور اپنے حسن پر مغرور۔ روشن چہرہ۔ جب بن سنور کر نکلتی تو چہرہ پر پسینہ کی بوندیں ایسی بھلی لگتیں جیسے پھول پر شبنم۔ تند مزاج اور تلخ گفتگو کرنے والی ناگ کی طرح سیاہ بل کھائی ہوئی لانبی چوٹی۔ خوشبودار جسم۔ کانچ کی چوڑیاں پہنتی اور ہاتھ میں چھڑی باندھتی

بے حد عشوہ طراز۔

۵ گوری چاند سا چمکتا چہرہ۔ روشن پیشانی۔ پراگندہ زلفیں۔ رسیلے ہونٹ۔ مستانہ چال۔ ابھرا ہوا سینہ۔ پتلی جیسا خوبصورت اور پھولوں کی طرح نرم و نازک اور شگفتہ جسم۔

۶۔ چھبیلی رخسار پر تل۔ ژولیدہ زلفیں۔ شکاری آنکھیں۔ خط سرمہ کھنچا ہوا۔

۷ لالا ہونٹوں میں آب حیات۔ گلابی پھولوں کی طرح دانت۔ سر پستاں سے جوانی ٹپکتی ہوی۔ مست کرنے والی چال ہنسی سے رات کو دن بنانے والی۔ عشق و محبت کی پیاسی۔ غمزدۂ فراق۔

۸ لالن نُقل جیسے ہونٹ۔ ہنس جیسی چال۔ پھول کی کلی سے نازک کم عمر اور نادان۔

۹ موہن جادو سے بھری ہوئی آنکھیں عشوہ طراز اور گن والی۔ چہرہ پر عیش وصال کی کیفیت نمایاں۔ آنکھیں رات کی خماری سے متوالی۔ سہانی سبز ساری جس پر شفق رنگ کی کناری لگی ہوئی۔ محبت میں دیوانی۔

۱۰۔ محبوب گلاب کے پھول ایسے گال۔ باریک کمر۔ زرین پٹکہ کسی ہوئی۔ یوسف سے زیادہ حسین۔

بارہ پیاریوں میں سے ۱۰۔ دو پیاریوں مشتری اور حیدر محل کا ذکر آئندہ تفصیل سے آئے گا۔

ان پیاریوں کے علاوہ محمد قلی نے متعدد نظمیں ایسی بھی لکھی ہیں جو اُس کی عیش و عشرت کی ترجمان ہیں اور عشق عاشقی کی زندگی کی دلچسپ داستانوں کا کام دیتی ہیں۔ ان نظموں میں بعض بہت عریاں ہیں جن میں اس نے وصال کے پُر کیف مرقعے پیش کئے ہیں۔ اور بعض نظمیں اس کی جوانی کی راتوں اور مرادوں کے دنوں کے تفصیلی اور دلچسپ نظام العمل ہیں حسن و عشق کے راز و نیاز کا شاید ہی کوئی موضوع ہو جو چھوٹ گیا ہو۔ شباب کی رنگا رنگیوں اور جذبات کی جولانیوں کے اظہار میں اس کا قلم غیر معمولی قدرت رکھتا تھا۔ اور یہہ قدرت تخیلی یا فرضی عشق عاشقی سے نہیں پیدا ہو سکتی۔

محمد قلی صحیح معنوں میں اِس میدان کا مرد تھا۔ اس کے رفیع الشان محل نہ تھے بلکہ اصل میں بین قومی حسن و نغمہ کی وسیع اور آراستہ و پیراستہ نمائش گاہیں تھیں۔ ان میں کئی ملکوں، کئی مذہبوں اور ہر وضع و قطع کی نازنینیں آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنے حسن و جمال کی آرایش و زیبایش میں مصروف و منہمک اور عشق و مستی کی عجیب و غریب کیفیتوں اور جوانی و رعنائی کے بے پناہ جذبات کے مظاہرے کرتی رہتی تھیں۔

سید محی الدین قادری زور

گولکنڈے کے افسانے۔ گولکنڈہ کی کوئی سیر و تفریح ان کتابوں کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ جو گولکنڈہ دیکھ چکے ہیں وہ جب یہہ افسانے پڑھتے ہیں تو محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہم نے کچھ نہیں دیکھا اور جنھوں نے کبھی گولکنڈہ کی سیر نہیں کی ان کے دل میں ان کو پڑھنے کے بعد گولکنڈہ کی سیر کی امنگیں موجزن ہو جاتی ہیں۔ دونوں کتابیں با تصویر ہیں **سیر گولکنڈہ**۔ صفحات ۱۶۰ تصاویر ۱۲۔ اور قیمت صرف ۱۵ **گولکنڈے کے ہیرے** صفحات ۱۲۶۔ تصاویر ۹ قیمت صرف ۱۲

تنقید و تبصرہ

ظہورِ قدسی

تقطیع پاکٹ سائز۔ صفحات ۱۰۸ ۔ مطبوعہ فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور۔ قیمت ۱۸؍

جناب ماہر القادری صاحب نے **آنحضرت** صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارک اور زندگی کے واقعات کو نہایت خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ من گھڑت اور افسانوی روایتوں کو بالکل نظر انداز کرکے صحیح روایات اور سیرت کی مستند کتابوں سے واقعات چن کر ان کو نظم کا جامہ پہنایا ہے اور بارگاہِ رسالت میں بطور سلام کے نذر پیش کی ہے یہہ سلام بالکل نئی قسم کا ہے میلاد کے کئی جلسوں میں انہوں نے اس سلام کو سنایا تھا جو بہت مقبول ہوا اور اب کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے اس سلام کے چند شعر یہہ ہیں :-

سحر کا وقت ہے معصوم کلیاں مسکراتی ہیں ۔ ہوائیں خیر مقدم کے ترانے گنگناتی ہیں
پسینہ شادمانی سے ہے پھولوں کی جبینوں پر ۔ لبوں کا دیدنی ہے رقص تالابوں کے سینوں پر
ابھی جبریل آکر بھی نہ بیٹھے کعبہ کے منبر پر ۔ کہ اتنے میں صدا آئی یہہ عبداللہ کے گھر سے
مبارک ہو نبی آخری تشریف لے آئے ۔ مبارک ہو جہاں کی روشنی تشریف لے آئے
سلام اس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی نہ سونا تھا ۔ سلام اس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا
درود اس پر تبسم جس کا گل کے مسکرانے میں ۔ درود اس پر کہ جس کا فیض ہے سارے زمانے میں

اس مبارک کتاب کا تعارف مولٰنا مناظر الحسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ نے تحریر فرمایا ہے جو نہایت ہی بصیرت افروز ہے "ش"

عربی قواعد

مصنفہ حکیم ہبتہ اللہ صاحب۔ طباعت نہایت نفیس، قیمت ۶؍

یہہ کتاب بظاہر نئے اصول پر لکھی گئی ہے۔ اور اس میں قواعد کو ریڈر بنانے کی سعی بلیغ کی گئی ہے لیکن ریڈر کی سی دلچسپی کم پیدا ہوسکی ہے اور کتاب چند ضروری الفاظ کا مختصر سا مجموعہ بن کر رہ گئی جس کے پڑھنے سے طالب علم کو "گرامر" کا فائدہ مشکل ہی سے حاصل ہوسکے گا۔

تعلیم کسی زبان کی ہو اگر نفسیاتی اصول وضوابط پر دی جائے تو پڑھنے والوں کے لئے بہت آسان اور زود فہم ہوجاتی ہے۔ مگر اس کے سہل بنانے ہی میں ساری حکمت ہے۔ اس قسم کی تعلیم میں وہ تمام اہم مطالب جنھیں متعلم کے ذہن میں بٹھانا منظور ہوتا ہے سادہ ترین شکلوں میں اس کی نظر کے سامنے اس طرح لائے جاتے ہیں کہ ذہن کسی پیچیدگی سے دوچار ہونے نہیں پاتا بالفاظ دیگر ذہن کو ایک خاص نقطہ پر متمرکز کرکے اور اور سمتوں میں بھٹکنے سے روک دیا جاتا ہے مثلاً اسم کی بحث میں اسماء کی شکلیں ایک خاص ضابطہ کے تحت اس طرح پیش کی جاتی ہیں کہ ان سے ایک بڑا مقصد حاصل ہوتا ہے۔

اَلْبَيْتُ ۔ اَلشَّهْرُ ۔ اَلْقَلَمُ ۔ اَلطَّاوِلَةُ
اَلْكِتَابُ ۔ اَلْبَلَدُ ۔ اَلْخَاتَمُ ۔ اَلسَّاعَةُ

اس یکسانیت اور لفظ کے اول و آخر میں بعض حروف وحرکات کے التزام سے پڑھنے والے کی سمجھ میں خود بخود یہہ بات آتی ہے کہ عربی میں اسم کے اول "ال" اور حرف آخر پر ضمہ ضرور ہوتا ہے۔ مگر اس مقصد کے حصول میں ایک احتیاط یہہ ملحوظ رکھنی پڑتی ہے کہ اس فہرست میں کوئی اسم ایسا نہ آنے پائے جو "ال" کو قبول نہیں کرتا اور یہہ کوئی مشکل کام نہیں جب یہہ چیز پوری طرح ذہن نشین ہوجائے تو دوسری مشق تنوین کی دینی چاہئے۔ یہہ دوسرا طریقہ اسم کے لکھنے کا ہوگا

اگر اس مرتبہ وہی اسماء جن پر مشق اول میں "ال" داخل کیا گیا تھا تنوین کے ساتھ لکھے جائیں مثلاً :۔

بیتٌ مشہرٌ قلمٌ طاولۃٌ

کتابٌ بلدٌ خاتمٌ ساعۃٌ

تو یہہ بات آسانی سے متعلم کی سمجھ میں آجائے گی کہ "ال" کے دور کرنے کے بعد اسم کے حرف آخر پر دو پیش لگانا واجب ہے اگر اس التزام کے ساتھ ایک قاعدہ کو دوسرے قاعدہ سے علٰحدہ رکھ کر غلط ملط کئے بغیر روزانہ مشق و تمرین کے ساتھ پڑھایا جائے تو پڑھنے والے میں جودت، ذوق، حوصلہ و استعداد کا پیدا ہونا لازم ہے۔

حکیم صاحب نے قواعد کے مشکلات کو دور کرنے کا آسان طریقہ یہہ اختیار کیا کہ کسی مشکل کو چھیڑا ہی نہیں لیکن یہہ معلوم ہے کہ ذکر نہ کرنے سے مشکل دور نہیں ہوسکتی۔ صحیح طریقہ تو یہہ تھا کہ مشکل کو کھول کھول کر اتنا سادہ بنا دیا جاتا کہ مشکل مشکل ہی نہ رہتی۔ بہ ہر حال حکیم صاحب نے کتاب کی نظم و ترتیب سے طالب علم کے ذہن کو کسی قاعدہ کی طرف منتقل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اسم کی بحث میں اسم منون، اسم معرف بالام، اسم غیر منصرف اور حرف میں غلط ملط ہے کہ بچوں کا تو کیا ذکر قواعد عربی سے نابلد بڑے لوگ بھی اسے سمجھ نہیں سکتے تثنیہ کی بحث میں حالت رفعی، نصبی و جری تغیرات کی جو تشریح نوٹ کے ذریعے کی ہے وہ ناواقف کے لئے پھر بھی "بھیتاں" ہی رہی بھلا پیش کی حالت، زبر کی حالت، زیر کی حالت مبتدی کیا جانے۔ مجہول کی تعریف مجہول سے کرنے کی بجائے، وضاحت درکار تھی "ن"

رسالہ اُردو کا "اقبال نمبر"

حجم ۴۱۲ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی

انجمن ترقی اُردو کے مشہور سہ ماہی رسالہ "اُردو" نے علامہ اقبال کی یادگار میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ یہہ نمبر شایع کیا۔ اس میں اقبال کی شاعری، شخصیت، پیغام، تصور خودی، آرٹ، ذہنی ارتقاء، تصور زمان، تنوع افکار، تصور حیات، فلسفہ خودی، فلسفہ تمدن، تخیل، تصوف، نصب العین۔ ان سب پر بلند پایہ مقالوں میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس نمبر کا ہر مقالہ اس قابل ہے کہ ایک سے زیادہ مرتبہ غور کے ساتھ پڑھا جائے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین نے "اقبال کا تصور خودی" میں شاعری پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اقبال کی شاعری کو فلسفیانہ شاعری کہنے کے یہہ معنی نہیں ہیں کہ وہ حکمت کے نظریات کی طرح سوز و درد، زندگی اور حرکت سے خالی ہو اقبال کی شاعری تو آبِ حیات کا خزانہ ہے جس سے زندگی اور زندہ دلی کے چشمے ابلتے ہیں جن سے سیراب ہوکر مایوس دلوں کی خشک اور بنجر زمین میں جان پڑجاتی ہے اور امید کی کھیتی لہلہانے لگتی ہے۔ اقبال کے کلام کا موضوع فرقہ اور ملت کی زندگی کا ایک جامع نصب العین ہے جسے ہم فلسفۂ تمدن کہہ سکتے ہیں۔

خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے اپنے پُر مغز مقالہ "رومی، نطشے اور اقبال" میں وضاحت کے ساتھ یہہ بتایا ہے کہ تنوع افکار اور ثروت تصورات، فلسفہ جدید اور فلسفہ قدیم، تصوف اسلامی اور غیر اسلامی کے تمام انواع، مذاہب عالم کے گوناگوں تصورات معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی مسائل، فکر اور عمل کی تمام قدیم اور جدید تحریکات کو اقبال نے کس طرح اپنی شاعری میں پیش کیا ہے اور رومی نطشے کے فلسفہ خودی اور تصور انسان کی کس حد تک اپنی شاعری میں ترجمانی کی ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے "اقبال اور آرٹ" میں تبصرہ کیا ہے کہ کس طرح اقبال نے اپنی شاعری کا موضوع زندگی کی ان مہتم بالشان حقایق کو قرار دیا جو قوموں اور جماعتوں کی سیرت کی تشکیل میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔ اس نے شاعری کو مقصود بالذات کبھی نہیں سمجھا بلکہ اس کے ذریعے سے اشاروں اشاروں میں حیات انسانی، فطرت اور تقدیر کے اسرار و رموز ہمارے لئے بے نقاب کر دئے۔ وہ آرٹ کو زندگی کا خادم خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک حقیقی شاعر وہ ہے جو اپنی شخصیت کی قوت اور جوش عشق کی بدولت اپنے دل و دماغ پر ایسی کیفیت طاری کرے جس کے اظہار پر وہ مجبور ہو جائے۔ یہی کیفیت آرٹ کی جان ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اقبال کا آرٹ تنقید و تعریف کی حدوں سے بالکل بے نیاز ہے۔

ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب نے "اقبال کی شخصیت اور اس کے پیغام" پر جو مقالہ سپرد قلم کیا ہے، اس میں انھوں نے اقبال کی سادہ معاشرت، پسندیدہ اخلاق، خاکساری، صاف گوئی، جذبۂ قومیت، وطن پرستی، قومی شاعری، فطری شاعری، اسلامی شاعری، اصولِ ارتقاء، نظریۂ علم، تصورِ عشق، تصور خودی، روحانی اشتراکیت۔ غرض یہ کہ اس کی بہت ساری صفات اصول، نظریے اور تصورات پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

ابوظفر عبدالواحد صاحب نے اپنے مقالہ "اقبال کا ذہنی ارتقاء" میں اقبال کی بڑائی، علمیت، جامعیت، شاعری کا فلسفیانہ اور واعظانہ روپ، مذہبی رنگ، معتقدات اور رجحانات، پیام عمل، فلسفۂ حیات، روحانیت، تفکر، ذہانت، ہمہ دانی ہمہ گیری اور اس کی شاعری کے غیر فرقہ پرستانہ پہلو کو اچھی طرح اجاگر کیا ہے۔

سید بشیر الدین صاحب نے "اقبال کے تصور زماں" پر ایک تحقیقی و تنقیدی مقالہ تحریر کیا ہے۔ اقبال کی شاعری کی کامیابی کا راز بڑی حد تک زمان کے اس تصور میں مضمر معلوم ہوتا ہے کہ زمان ایک حقیقت ہے اور زندگی نام ہے زمان میں ایک مسلسل حرکت کا۔ زمان کا یہ تصور اس کے ادب میں جاری و ساری ہے اور اس کے پائدار اور لازوال ہونے کا بڑی حد تک ضامن ہے۔

سید نذیر نیازی صاحب نے علامہ اقبال کی آخری علالت کا حال بڑے پردرد پیرایہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ مضمون اقبال کی سوانح حیات کا ایک مستقل جزو ہے۔

سید آل احمد سرور صاحب لکچرار مسلم یونیورسٹی نے "اقبال اور اس کے نکتہ چیں" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے، اس میں بتایا ہے کہ اقبال نے بہت سی خوبصورت ترکیبیں وضع کی تھیں، بہت سے نئے استعارے اور تشبیہات پیش کئے تھے۔ وہ کانوں کو اجنبی معلوم ہوئے ان کا حسن بعض نگاہوں میں نہ جچا۔ سورج نکلنے والا ہوتا ہے تو بعض ستارے کچھ دیر تک آنے والی روشنی کا مقابلہ کرتے ہیں مگر کب تک۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ رخصت ہو جاتے ہیں اور سارا عالم مطلع انوار ہو جاتا ہے۔ بہت دن تک اقبال پر جو اعتراضات کئے گئے تھے وہ زبان سے متعلق تھے۔ وقت گذرتا گیا شاعر کا کلام مقبول ہوا اس کی شاعری کا سونا زندگی کی بھٹی میں تپا ہوا تھا۔ اس لئے اس میں صداقت بھی تھی اور حسن بھی۔ اب وہ وقت آیا کہ اقبال اپنے دور پر اثر انداز ہوئے۔ ان کا رنگ بھی مقبول ہوا اور بہت سے شعرا غیر شعوری طور پر اس کا اتباع کرنے لگے۔ اسی مضمون میں علامہ اقبال کے بعض معترضین کے اعتراضات بھی لکھے گئے ہیں اور ان کی تردید بھی کی گئی ہے۔

غرض یہ کہ اس اقبال نمبر کے جملہ مضامین نہایت قابلیت اور تحقیق و تنقید کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ یہ مضمون اس قابل ہیں کہ غور سے پڑھا اور سمجھا جائے۔ بعض جملے اور عبارتیں ایسی خوبصورت اور حسین لکھی گئی ہیں کہ بے ساختہ دل سے واہ نکلتی ہے۔ "اس

مطبوعات
مکتبہ اردو
اردو کے ممتاز ماہنامے کا شاندار اقدام
ماہنامہ ادب لطیف لاہور
کا
ڈراما نمبر!
جو
ہندوستان کے بہترین ڈراما نگاروں کے شاندار ڈراموں
ملک کے جلیل القدر شعراء کے وجد آور مکالموں
اور
اردو کے مایہ ناز نقادوں کے سیر حاصل مقالوں
کا
ایک جامع و مکمل مجموعہ ہے
ضخامت اڑھائی سو صفحات مع متعدد رنگین و دلآویز تصاویر
قیمت صرف بارہ آنے
چندہ سالانہ
ضخیم سالنامہ، ڈراما نمبر یا افسانہ نمبر سمیت صرف تین روپے آٹھ آنے
(علاوہ محصولڈاک)
ہر بڑے سٹیشن پر وہیلر بک سٹال سے یا اپنے مقامی ایجنٹ سے
طلب فرمائیں
ڈراما نمبر اپنی تمام دلآویزیوں کے ساتھ ماہ مئی کے آغاز میں اہل ذوق کے پاس پہنچ جائے گا
مقام اشاعت مکتبہ اردو لاہور
مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

سب رسی بھائیو اور بہنو!!

گرمی کی چھٹیاں ختم ہو چکیں مدرسے کھل گئے ہیں۔ اکثر مدرسوں میں نئے سال کا پہلا مہینہ ہے۔ ہم ان سب سب رسی بھائیوں اور بہنوں کو مبارک باد دیتے ہیں جنہوں نے اس سال ترقی پائی اور ہم ان سے توی امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔ اور اتفاق سے جو اس سال ناکامیاب رہے ان سے بھی ہماری گزارش ہے کہ وہ ناامید نہ ہوں بلکہ اس سال دل لگاکر پڑھیں اور اچھے نمبروں سے کامیاب ہوں۔

گزشتہ مہینے ایک تحریک کی گئی تھی جس کی طرف بہت کم بھائیوں اور بہنوں نے توجہ کی خصوصاً بھائیوں سے ہم کو سخت شکایت ہے کہ وہ ان معاملات میں لڑکیوں سے بہت پیچھے ہیں۔ ہمیں اب تک جو کوپن وصول ہوئے وہ یہ ہیں۔

(۱) مس بی فخرالدین (۲) سید نورالقمرالدین (۳) مس شوکت باسط علی خاں (۴) حبیب شمس (۵) تہذیب فاطمہ۔ اب کے مہینے ہم دیکھیں گے کہ بھائیوں کی تعداد زیادہ رہتی ہے یا بہنوں کی۔ اکثر بچے الگ کاغذ پر کوپن بھیجتے ہیں۔ جون کے پرچے میں جو کوپن چھپا ہے اسے چاک کرکے بھیجیں۔ کوپن جلد از جلد روانہ کیجئے۔ بالفعل دو نام دیئے جاتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے خط وکتابت کریں اور کچھ دریافت کرنا چاہیں تو دفتر کو خط لکھیں۔ براہ کرم ان ہی سے خط وکتابت کریں جن کے پتے دفتر کی طرف سے دیئے جائیں۔ خطوط کی ایک نقل ہمارے ہاں بھی روانہ کریں اگر وہ قابل اشاعت ہوں تو شایع کر دیے جائیں گے تاکہ دوسرے بھی اسی طرح لکھنا سیکھیں۔ اس تحریک سے ہمارا مقصد ایک دوسرے میں محبت و اتفاق پیدا کرنا اور ایک کو دوسرے کے خیالات سے آگاہ کرنا ہے اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ خط لکھنا آجائے گا۔ خط لکھنا بھی ایک ہنر ہے ایک دوسرے کو خط لکھتے لکھتے خاص مشق ہو جائے گی اور خط لکھنے کا صحیح طریقہ آجائے گا۔ اچھا تو اس ماہ ان دونوں بہنوں کے پتے دیئے جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے خط وکتابت کریں۔ دونوں کا محبوب مشغلہ ٹکٹ جمع کرنا ہے۔

(۱) مس بی فخرالدین باغ ظفر جنگ سیف آباد حیدرآباد دکن (۲) مس شوکت باسط علی خاں ناظم خفیفہ خیریت آباد حیدرآباد دکن

دیکھیں اس ماہ کتنے اور کس کے کوپن آتے ہیں۔

اس مہینے میں ہم نے اور آٹھ صفحے زیادہ کر دیئے ہیں۔ تاکہ ہمارے بھائیوں اور بہنوں کو پڑھنے کے لئے زیادہ مواد ملے۔ کوشش کریں کے اکثر رسالے بجائے ۱۶ کے ۲۴ صفحوں ہی کے تیار ہوں۔ اور ان آٹھ صفحات کی زیادتی کی وجہ سے سب رس کی سالانہ قیمت میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ اس کے بدلے میں توقع ہے کہ سب رسی بچے اور بچیاں خریداروں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

معین الدین احمد انصاری

دلچسپ معلومات

(۱) دنیا میں سب سے بڑا سینما ہال نیویارک امریکہ میں ہے۔ جس کا نام روکسی ہے اور اس سینما ہال میں (۶۵۰۰) اشخاص آسانی سے بیک وقت بیٹھ سکتے ہیں۔ (۲) دنیا میں سب سے بڑا جہاز کوین میری ہے جس کی لمبائی (۱۰۱۸) فیٹ اور چوڑائی (۱۱۸) فیٹ ہے اور اس میں ۸۰ ہزار ۳۰۰ ٹن بوجھ لادا جا سکتا ہے۔

مسیح الدین خاں متین

فارس

ملک ایران کے جنوب و مغربی جانب ایک خلیج واقع ہے جس کو خلیج فارس کہتے ہیں۔ اس کے کنارے ایک قطعہ زمین ہے جو نہایت ہی سرسبز و شاداب ہے اور جس کی آب و ہوا نہایت ہی خوشگوار ہے۔ جسے پارس کہتے تھے۔ جس کو اہل عرب بعد میں فارس کے نام سے پکارنے لگے۔ کہتے ہیں کہ اس شہر کا نام ہوشنگ کے بیٹے پارس کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ اس زمانہ میں تمام قطعہ ایران کو پارس کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ اب بھی سارے علاقۂ ایران کو پرشیا کہتے ہیں۔ لیکن جب سے کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور ہر ایک علاقہ کا علیحدہ علیحدہ نام رکھا گیا اس خاص علاقہ کو پارس یا فارس کہنے لگے۔

قدرتی طور سے یہ علاقہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک پہاڑی اور دوسرا میدانی۔ اس کے جنوبی سرے پر سمندر واقع ہے۔ یعنی خلیج فارس۔ اس قطعہ کی آب و ہوا کہیں نہایت گرم ہے تو کہیں نہایت سرد۔ اکثر صحرا سرسبز و شاداب ہیں۔ جابجا چشمے اور ندیاں جاری ہیں۔ یہاں ہمہ اقسام کے میوے کے درخت اگائے جاتے ہیں۔ یہاں کا گلاب بھی مشہور ہے جس کا عطر نکالا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ قطعہ ایک زمانہ میں اپنی شان و شوکت میں یکتا تھا۔ یہاں کی کانیں اور گرم پانی کے چشمے بہت مشہور ہیں۔ ایک زمانہ میں یہاں کے آثار قدیمہ کے متعلق لوگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ جن و پری کے کام ہیں۔ مثلاً خانۂ زردشت نقشِ شاہ پور۔ تختِ جمشید اور دخمۂ فریدوں۔

یہاں کی آب و ہوا جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ خوش گوار اور صحت افزا ہے۔ قویٰ میں شگفتگی و بالیدگی پیدا کرتی ہے انسان ہمیشہ تنومند اور چست و چالاک رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فارس کے اکثر شہر مثلاً یزد۔ فیروز آباد۔ بیضا۔ شیراز گازرون۔ وغیرہ مردم خیز سمجھے گئے ہیں۔ ان شہروں میں کثرت سے شاعر۔ ادیب۔ علماء۔ فضلاء پیدا ہوئے خصوصاً شیراز میں جو کہ صدہا سال تک ایران کا دار السلطنت بنا رہا اور جس کو دار العلم بھی کہا کرتے تھے۔ زبردست فصیح و بلیغ شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ مثلاً سعدی شیرازی۔ حافظ شیرازی اور عرفی شیرازی وغیرہ۔ زمانے کے تغیرات سے اس علاقہ کی موجودہ حالت ابتر ہے۔ لیکن یہاں کے موجودہ باشندوں کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم برتری و بزرگی اب بھی ان میں موجود ہے۔

شیراز کے گرد و نواح میں ایک صحرا ہے جس کو صحرائے شاہ پور کہتے ہیں۔ اس میں ایک عالی شان اور پُر رونق قطعہ ہے جس کو شعبِ بوّان کہتے ہیں۔ اس کا شمار دنیا کے ان تفریح گاہوں میں ہوتا تھا جو عربوں کے نزدیک لاثانی تھے وہ یہ ہیں۔ غوطۂ دمشق۔ نہرِ ابلہ۔ صغدِ سمرقند۔ اور شعب بوّان۔ اتابک ابو بکر سعد زنگی یہاں کا ایک مشہور بادشاہ گزرا ہے۔ کہتے ہیں کہ اسی کے زمانہ میں شیخ سعدیؒ نے گلستاں لکھی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ میری سلطنت میں صرف دو چیزیں ایسی ہیں جو خوف و اطمینان کی حالت میں بادشاہوں کے لئے ناگزیر ہیں۔ خوف کی حالت میں قلعہ سفید اور اطمینان کی حالت میں

شعب بوآن۔ اس قلعہ کی تعریف میں اکثر شعرائے عرب نے قصیدے لکھے ہیں۔ ایک مشہور شاعر کہتا ہے کہ اگر کوئی غم والم کی حالت میں قلعہ پر سے شِعب بوآن کی فضا کو دیکھتا ہے تو اس کی ساری تکلیفیں یک لخت معدوم ہو جاتی ہیں۔

محی الدین شرزہ

صنعت وتجارت

اگر ہم دنیا کی کامیاب اور متمدن اقوام کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو تجارت اور صنعت وحرفت کے پراسرار الفاظ سنہری حروف سے لکھے ہوئے نظر آئیں گے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ متمدن اقوام عالم کے جادۂ ترقی میں یہی دو چیزیں پہلے بھی جلوہ افروز تھیں اور اب بھی موجود ہیں۔ صنعت وحرفت ہی کی بدولت دنیا کے چارطرف عظیم الشان شہر پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر دنیا میں صنعت وحرفت کا وجود ہوتا تو آج بڑے بڑے اور مہیب سمندروں کے سینۂ پرخطر پر تیرنے والے عظیم الشان جہاز، فضائے آسمانی پر قادر ہوائی جہاز، ویران اور سنسان جنگلوں میں پھرنے والی ریل، آن کی آن میں خبر رسانی کرنے والا تار برقی اور ریڈیو، علم کی دولت کے محافظ چھاپے کی ایجاد اور بنی نوع انسان کو لباس پہنانے والے کپڑے کے زبردست کارخانے ہرگز ظہور پذیر ہوتے

اسی طرح اگر تجارت دنیا میں نہ ہوتی تو یہ تمام مفید ایجادات واختراعات جو حضرتِ انسان کی آسائش اور آرام کا باعث ہیں فضول متصور ہوتیں۔ فی الحقیقت تجارت ہی وہ چیز ہے جس کی بدولت دنیا کی مصنوعات ودیگر اشیا ہم تک پہنچتی ہیں۔ اگر آج ہم صنعت وحرفت سے ناواقف ہوتے تو انجینیری کے تعجب خیز مناظر اور سائنس کے محیرکن کرشمے جو انسانی ترقی کا بین ثبوت ہیں ناپید ہوتے اور دنیا ان کے بغیر بالکل بے لطف وبے کیف ہو جاتی سچ تو یہ ہے کہ انسان کو بامِ عروج پر پہنچانے اور ترقی کی منازل طے کرانے والی یہی دو چیزیں صنعت وحرفت اور تجارت ہیں۔

زمانۂ گذشتہ میں وہ کونسی چیز تھی جس نے عربوں کے بحری بیڑے کی عظمت کی دھاک اہلِ یورپ کے دل پر بٹھادی تھی، کولمبس کو کس چیز نے نئی دنیا کا پتہ دیا، فرانسیسی، پرتگیز اور انگریز کیوں سمندپار پہنچے اور وہ کیا چیز تھی جس کی بدولت انگریز ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ آج ایشیا، یورپ کا دست نگر ہے اور یورپ ہی کے ہاتھ ایشیا کی زیست کا دارومدار ہے حالانکہ مشرق اپنی روحانی عظمت اور بزرگی میں مغرب پر ہزار درجہ تفوق رکھتا ہے لیکن پھر بھی مغرب کی غلامی کا طوق اس کی گردن میں ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ مشرق نے صنعت وحرفت اور تجارت کو حرفِ غلط سمجھ کر بھلادیا اور مغرب نے اس کو ترقی کا راز سمجھ کر مضبوط پکڑ لیا۔

اگر ہم اپنے ملک اور قوم کا نام دنیا کی کامیاب اقوام اور متمدن ممالک کی فہرست میں لکھوانا چاہیں اور معاشی غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو کر مغربی اقوام کی طرح سطح زمین پر آزادی سے سانس لینا چاہیں تو ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی توجہ کو صنعت وحرفت اور تجارت کی طرف پھیردیں۔ تجارت اور صنعت وحرفت تہذیب وتمدن کی علامت ہے اور تجار وصناعوں کو خدا بھی محبوب رکھتا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو قومیں تجارت اور صنعت وحرفت میں کامل دستگاہ رکھتی ہیں وہ رات دن ترقی کے منازل طے کر رہی ہیں اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزادی کا دم بھرنے لگی ہیں

محمد عبدالقادر فاروقی
(حمایت نگر)

انتظام کیا کہ رعایا بہت خوشحال ہوگئی۔ اور سرکاری آمدنی بھی بہت بڑھ گئی۔

ملکی انتظام کے علاوہ اکبر نے کئی بری رسمیں بھی موقوف کردیں۔ ہندوستان کی رسم کے مطابق شوہر مرجانے پر اس کی بیوی بھی جل مرتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی شادی کردی جاتی تھی۔ کئی علاقوں کو فتح کرنے کے بعد وہاں کے لوگوں کو غلام بنا لیا جاتا تھا۔ شوہر کے مرجانے پر عورت دوبارہ شادی نہیں کرسکتی تھی۔ اکبر بادشاہ نے یہ تمام خراب رسمیں فوراً موقوف کرڈالیں۔ یہ تو سب کچھ ملک کے لئے کیا اب ذرا علم کی خدمت کا حال سنو۔ اس کے دربار میں اس زمانہ کے تمام قابل لوگ جمع تھے۔ تم اب ان کے نام پوچھو گے۔ اچھا وہ بھی سن لو۔ دو بھائی ابوالفضل اور فیضی اکبر کے بڑے دوست تھے۔ ابوالفضل بڑا لائق تھا اس نے اکبرنامہ لکھا نام ہی خود بتلاتا ہے کہ اس میں کس کے حالات ہیں۔ فیضی فارسی زبان کا بڑا شاعر تھا۔ ان کے علاوہ ٹوڈرمل، مان سنگھ، بیربل اور تان سین اکبر کے خاص مصاحب تھے۔

مان سنگھ فوج کا بڑا عہدہ دار تھا۔ ٹوڈرمل اپنے مالی انتظامات کی وجہ سے مشہور ہے۔ بیربل کے مزیدار چٹکلے تو تم یقیناً سن چکے ہوں گے۔ یہ اکبر کو چوبیس پہر ہنساتا تھا۔ گانے سے اگر تم سب کو نہیں تو بعض کو ضرور دلچسپی ہوگی جس کا گانا بہت ہی معلوم ہو بس اس کو تان سین کا شاگرد سمجھو۔ ان میں ہر ایک اپنے فن کا استاد اور اپنے علم کا زبردست جاننے والا تھا۔ اکبر کے دربار میں یہ لوگ آسمان پر ستاروں کی طرح چمکتے تھے اور یہی دربار اکبری کے نورتن یعنی نو ہیرے کہلاتے ہیں۔

اکبر بادشاہ کا آخری زمانہ بڑی پریشانیوں میں گذرا۔ اس کے بیٹوں نے بغاوتیں کیں اور سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ ڈالا انچاس برس کے سن میں اکبر نے انتقال کیا۔ اور اس کا بیٹا جہانگیر بادشاہ ہوا۔

ایک بڑھیا کے آخری چند لمحات

مسز احمد

ایک بڑھیا بستر مرگ پر اپنے آخری لمحات گزار رہی تھی۔ اس کی ایک بیٹی سوہنی تھی۔ بڑھیا کے سوہنی سے پیشتر کئی بچے گزر چکے تھے اس لئے بڑھیا نے سوہنی کو بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ گو اس بڑھیا نے غربت و نکبت میں عمر بسر کی تھی۔ لیکن جب تک اس کے ہاتھ پیر چلتے تھے کبھی سوہنی کی کسی فرمائش کو رد نہ کیا۔ رد کرنا تو کجا صرف سوہنی کا میٹھے آواز میں اتنا کہنا ہی اس کے لئے کافی تھا۔ "اماں "فلاں چیز (اچھی لگتی ہے) بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بڑھیا فوراً اس کی تکمیل کردیتی تھی۔

ہر وقت بڑھیا اسی خیالات میں منہمک رہتی تھی کہ "میرا کیا ہے آج گھر میں کل گور میں۔ میرے دم میں دم ہے تب تک میں سوہنی کی خواہشات و فرمائشات پوری کروں گی کیونکہ میرے سوا اس کی خواہش پورا کرنے والا کون ہے"۔ دم آخر۔ بڑھیا نے ایک آہ بھر کر کہا "آہ میری سوہنی تنہا رہے گی اور وہ میری یاد میں روتی رہے گی۔ لیکن اس کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا" کیونکہ سوہنی کے باپ بھائی سب گزر چکے تھے۔ اب کوئی دور دراز کے رشتے دار باقی تھے بھی تو بھلا غربت میں کون کسی کا ساتھی ہوتا ہے۔ حالانکہ سوہنی کا بہت بڑا قبیلہ تھا۔

لیکن ہائے افلاس وہ بری بلا ہے جس کی وجہ اپنے بھی پرائے ہوجاتے ہیں۔ بیچاری سوہنی اور بڑھیا کو کوئی کبھی بھار پلٹ کر بھی نہ دیکھتا کہ ان کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ وہ اپنی بیوگی میں بھی رشتے داروں کے گھر جاکر حقیر و ذلیل ہونا نہ چاہتی تھی۔ وہ کئی دفعہ بیمار ہوئی لیکن اس دفعہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ بڑھیا اس خیال سے سہمی ہوئی تھی۔ کیونکہ سوہنی بمشکل بارہ سال کی تھی۔ اگر وہ یہ سن پائے گی کہ اس کی ماں کا بھی سایہ اس کے سر سے اٹھنے والا ہے تو اس کا ننھا کلیجہ دہل جائے گا اور وہ ممکن ہے پریشان ہو کر پاگل ہوجائے۔ بڑھیا انہی خیالات میں غرق تھی کہ آیا آنے والی مصیبت سے سوہنی کو آگاہ کروں یا نہیں۔ وہ سوہنی کو کچھ آخری مرتبہ نصیحت کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کو غش پہ غش آتا تھا اور وہ بے ہوش ہوجاتی تھی۔

سوہنی ماں کے کنھرے پر ہی بیٹھی ہوئی تھی اور زار و قطار رو رہی تھی۔ سوہنی نے کسی کو مرتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ لیکن مرنے کا نام کئی دفعہ سن چکی تھی اور کئی جنازے سڑک سے گزرتے ہوئے دیکھے تھے۔ اس لئے ہیبت زدہ ضرور تھی کہ اب اس کی ماں کا نہ معلوم کیا حشر ہونے والا ہے۔

جب بڑھیا بے ہوش ہوجاتی تو سوہنی گھبرا کر فوراً ہلاتی اور کہتی "اماں ایسا کیوں کر رہی ہو آنکھیں کھولو کچھ تو کہو کہ تم پر کیا عالم ہے کیا مجھے تنہا چھوڑ جاتی ہو ایسا ہرگز نہ کرو کئی دفعہ سنا ہے کہ لوگ مرجاتے ہیں اور تم ہی خود کہتی تھیں کہ میرے باپ بھائی سب مرگئے۔ کیا تم بھی مر رہی ہو۔ للہ صحیح کہدو۔ سوہنی ایک سرد آہ کھینچتی اور آسمان کی طرف دیکھنے لگتی گویا وہ کسی سے فریاد کر رہی ہے اور چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتی کیونکہ اس کی آنکھوں میں تاریکی چھا رہی تھی اور دنیا اس کو تاریک نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک بار بلکہ آخری مرتبہ ماں کے سینہ پر گری اور چلانے لگی: "دنیا بڑی بری جگہ ہے خدایا۔ یا یوں کہوں کہ غریبی بہت بری بلا ہے۔ جس کی وجہ آج کوئی میرا ساتھی نہیں۔ ہائے میری دکھیا ماں جس نے مجھے اب تک پالا پوسا تھا وہ بھی مجھے آج تنہا چھوڑ کر سدھار رہی ہے۔" یہ سوہنی کے درد بھرے الفاظ بڑھیا کے کان میں پڑے اور وہ ہوش میں آئی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے آخری مرتبہ سوہنی کے آنسو خشک کئے اور کہنے لگی۔

"بیٹا موت انسانوں کو ہی آتی ہے یہ لازمی چیز ہے۔ کتنے ہی دن دنیا میں رہیں آخر ایک دن جانا ہے۔ گھبراؤ نہیں اب بھی سفر ہے۔ تمھارا خدا رزاق ہے اسی کی ذات پر بھروسہ رکھو (وہی سب کو روزی دیتا ہے) (اور وہی پالتا ہے) (اسی نے پیدا کیا ہے) اب میں تم کو کچھ بطور نصیحت کے کہنا چاہتی ہوں کیونکہ اب میں چند لمحات کی مہمان ہوں۔ اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یاد رکھو۔ اب تم سیانی ہوتی جا رہی ہو۔ کسی نیک اور شریف لڑکے سے بیاہ کرلو اور عاجزی انکساری کو ہمیشہ دوست بنائے رکھو۔ غریبوں اور مصیبت زدوں کی ہر وقت مدد کرنے کے لئے تیار رہو کبھی کسی حاجت مند کی مدد کرنے سے پہلوتہی نہ کرو۔"

بڑھیا اور کچھ کہنا ہی چاہتی تھی اس کی روح پرواز ہوگئی اور سوہنی نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کیا اور اس مرتبہ سوہنی کی ماں بے ہوش نہ ہوئی تھی۔ جو سوہنی کو دوبارہ ایک بار سمجھاتی اور گلے لگاتی۔

اتنے میں اس بڑھیا کا ہمسایہ ہمسایہ جو صبح سے اپنے کام پر گیا ہوا تھا آیا۔ سوہنی کی چیخ پکار سن کر جھونپڑی میں

داخل ہوا۔ بڑھیا کا یہ حال دیکھ کر پریشان ہوا اور سوہنی کو زمین سے اٹھا کر گلے لگا لیا۔ اور دلاسا دے کر کہا کہ "بیٹی رو نہیں یہ گھر نہیں تمہارا ہی گھر ہے اور آج سے میں تیرا باپ ہوں میرے جیتے جی تجھے ہرگز تکلیف نہ ہونے دوں گا" یہی ایک ہمسایہ تھا جو بڑھیا کے ساتھ ہمیشہ ہمدردی سے پیش آتا تھا اور اس کی ہر طرح مدد کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ سوہنی کو اس پر بھروسہ تھا۔ اس نیک بخت ہمسایہ کے ایک لڑکا تھا جو بڑھیا کی زندگی میں ہی سوہنی کو جھونپڑی سے باہر آتا جاتا دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔

چونکہ سوہنی کوئی بدشکل لڑکی نہ تھی بلکہ اس کے چہرے پر ملاحت تھی اور سوہنی کی ہر ایک ادا میں نزاکت تھی اس لئے وہ اس کو دل سے پسند کرتا تھا۔ بڑھیا بھی کئی دفعہ اس لڑکے کی نسبت ذکر کیا کرتی تھی اس لئے سوہنی بھی اس لڑکے سے نفرت نہ کرتی تھی۔ جب سے ایک گھر میں دونوں رہنے لگے۔ میل ملاپ بڑھتا گیا۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے سے زیادہ محبت کرنے لگے۔

ہمسایہ کو کوئی غریب نہ تھا اور طرفہ یہ کہ اکلوتا اس کا لڑکا تھا۔ بڑی آرزوؤں سے بڑے گھر کی لڑکی بیاہ لانے کی دل میں ٹھان رکھی تھی لیکن اب اس نے سوہنی سے ہی بیاہ کرنے کا ارادہ کیا۔ کیونکہ وہ سوہنی کے خاندانی حالات سے بخوبی واقف تھا۔ اس میں شک نہیں سوہنی غریب تھی اور نہ اس کا لین دین کچھ نہ تھا۔ ہمسایہ اکثر کہتا رہتا کہ "غریبی کوئی عیب نہیں ہاں جو لالچی ہوتے ہیں غریبوں سے نفرت کرتے ہیں لیکن مجھے نفرت نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ سوہنی سے بڑھ کر اور کم سخن فرمانبردار سلیقہ مند لڑکی نہیں ملے گی۔"

اس خیال کے آتے ہی اس نے بیاہ کی تیاری کی کیونکہ لڑکے کی مرضی بھی اسی میں تھی۔ جوں ہی سوہنی کا بیاہ ہوا اس گھر میں دولت کی دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔

بہو سے ساس سسر سب ہی خوش تھے۔ یہ سوہنی کے ہی اخلاق تھے جو سب کو اس طرح فریفتہ کئے ہوئے تھے۔ یہ بڑھیا کے آخری الفاظ تھے جو سوہنی کے دل پر گہرا اثر کئے ہوئے تھے۔ جس کی وجہ وہ ہر ایک سے محبت ملاپ عاجزی انکساری سے پیش آتی تھی۔ حالانکہ وہ اب بہت دولت مند ہو چکی تھی اور گھر کی اکلوتی بہو تھی لیکن غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرنے سے کبھی انکار نہ کرتی تھی بلکہ وہ ایسوں کی مدد کرنا زیادہ ضروری سمجھتی تھی۔

سوہنی کے نام کا ڈنکا گھر گھر بجنے لگا تھا۔ بلکہ دور دور تک اس کی سخاوت اور ہمدردی کی شہرت ہو چکی تھی۔ سوہنی اب دو تین بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ لیکن کبھی کبھی بڑھیا ماں کی یاد میں آنسو بہایا کرتی۔

اقبال النساء

اعلان۔ سب رس کتاب گھر کی بالتصویر فہرست چھپ گئی ہے۔ سب رس بھائی بہن اطلاع بھیج کر منگوا سکتے ہیں۔

ایک شیخی خورہ اور چربی کا ٹکڑا

ایک شخص پرلے درجے کا جھوٹا اور شیخی خورہ تھا۔ دیکھنے میں تو وہ چکنا چپڑا نظر آتا تھا مگر اس کا پیٹ ڈھول کی طرح خالی تھا اور اس میں ہر وقت چوہے قلابازیاں کھاتے رہتے تھے۔ اتفاقاً دُنبے کی چربی کا ایک ٹکڑا کہیں سے اس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ وہ روزانہ علی الصباح اس سے اپنے ہونٹ اور مونچھیں چکنی کرکے، شہر کے خوش حال لوگوں میں بیٹھا گپیں مارتا رہتا تھا۔ بات بات پر کہتا کہ آج تو ہم نے بڑے تر نوالے کھائے ہیں اور بار بار اپنی چکنی مونچھوں کو تاؤ دے دے کر بتاتا رہتا تاکہ وہ اس کی باتوں کو سچ سمجھیں۔

ایک روز کسی محفل میں بیٹھا ہوا اسی طرح بے پر کی اڑا رہا تھا۔ اتفاقاً اس کے گھر میں بلی آئی اور چربی کا ٹکڑا لے کر چل دی۔ بچہ اس کے پیچھے لپکا مگر وہ چھلانگ مار کر کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ اس وقت وہ شیخی خورہ باہر بیٹھا ہوا یار دوستوں میں شیخیاں بگھار رہا تھا کہ آج ہم نے یہ کھایا اور آج ہم نے وہ کھایا اور یہ دیکھو کہ یاروں کی مونچھیں اب تک چکنی ہیں ...... اتنے میں وہ بچہ دوڑتا ہوا باہر آیا اور کہنے لگا کہ ابا جان! جس چربی سے آپ روزانہ اپنی مونچھیں اور ہونٹ چکنے کرتے رہتے تھے، ابھی ایک بلی آئی اور اسے منہ میں دبا کر لے بھاگی۔ بچے کے منہ سے یہ بات نکلتے ہی اس کا چہرہ فق ہوگیا اور لوگوں نے یہ واقعہ سُن کر ایک فرمائشی قہقہہ مارا اس کے بعد، جب لوگوں کو اس کی مفلسی اور ناداری کا حال معلوم ہوا تو انھیں بہت رحم آیا اور اس کی امداد کرنے لگے۔ اس شیخی خورہ نے جب سچ بولنے کا یہ نتیجہ دیکھا تو شیخی اور تکبّر سے توبہ کی اور راستی کو اپنا شعار بنالیا۔

او چو ذوقِ راستی دید از کرام ۔۔۔ بے تکبّر راستی را شد غلام

(اس نے جب سچ بولنے پر لوگوں کی یہ مہربانی دیکھی ۔۔۔ تو تکبّر سے توبہ کی اور راستی کا غلام بن گیا)

نتیجہ:۔ شیخی اور تکبّر کا سر نیچا اور سچائی کا بول بالا رہتا ہے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

انمول موتی

(۱) مارنا چاہتا ہے تو نفس امّارہ کو مار (۲) فتح کرنا چاہتا ہے تو حواس خمسہ کو فتح کر۔

(۳) کھانا چاہتا ہے تو طیش و غضب کھا (۴) پینا چاہتا ہے تو شربتِ وحدانیت پی۔

(۵) پہننا چاہتا ہے تو نیکی کا لباس پہن۔ (۶) دینا چاہتا ہے تو نیچی نگاہ کرکے دے اور بھول جا۔

(۷) جانا چاہتا ہے تو متبرک مقامات پر جا (۸) آنا چاہتا ہے تو غریبوں کی مدد کو آ۔ (ماخوذ) **سید خواجہ معین الدین**

ہماری معاشرت

اتفاق و نفاق

اتفاق ایک ایسا لفظ ہے جس سے محبت کی بُو آتی ہے۔ نفاق کی آڑ میں برائیاں ہنستی ہیں۔ جہاں آپس میں اتفاق نہ ہو وہاں کی زندگی اطمینان سے نہیں گزرتی۔ محبت ایسی شے ہے۔ جس کی ہر ایک کو تلاش ہے۔ لیکن وہ بہت کم میسر ہوتی ہے۔ ہاں البتہ نفاق کا پلہ بہت بھاری ہے۔ محبت بھوکی ہوتی ہے۔ لیکن عداوت کی کمی نہیں۔ زندگی کا انحصار اتفاق پر ہے۔ آپ دیکھیں گے جن گھرانوں میں نااتفاقی ہو۔ وہاں محبت کا وجود غیر ممکن ہے۔ اس جہاں میں جتنے لوگ آباد ہیں ان میں پچاس فیصدی اس مہلک مرض میں مبتلا ہیں۔ پھر بھلا جس دل میں بغض ہو اس میں محبت کی جگہ کہاں۔ محبت اس سے کوسوں دور رہتی ہے۔۔۔۔ بات دراصل تو یہ ہے کہ ہم کو اتفاق پسند نہیں ہمیں نااتفاقی عزیز ہے دوسری اقوام کو دیکھئے۔ آپس میں شیر و شکر ہیں۔ اگر ایک پر مشکل آ پڑے تو سب ملکر اس کو آسان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہم میں سے کسی پر مشکل آ پڑے تو بجائے اس کو آسان کرنے کے اس کو اسی تکلیف میں دیکھکر خوش ہوتے ہیں اور طرح طرح سے مذاق اڑاتے ہیں۔ بھلا جس قوم کی یہ حالت ہو وہ کیا خاک ترقی کر سکتی ہے۔ ہمارا نقطۂ نظر تو یہی رہا ہے کہ اچھے سے اچھا کھائیں۔ اچھے سے اچھا پہنیں۔ گھر پر اعلیٰ قسم کی موٹریں ہوں دس بارہ نوکر ہوں تو بس زندگی ہے زندگی۔ لیکن افسوس ایسے حضرات غریب طبقہ پر نظر نہیں رکھتے کہ وہ اپنے اور اپنے بچوں کی خواہشات کو دبائے ہوئے بظاہر کس اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس زندگی میں جو لطف ہے وہ اعلیٰ طبقہ میں نہیں پایا جاتا۔ کیا ان کے سینے میں دل نہیں!

آج کل تو یہ حالت ہے۔ جہاں روپیہ زیادہ ہوا بس آپے سے باہر ہوئے ماضی کو بھول گئے۔ یہ خیال تک نہیں کرتے کہ ہم پہلے کیا تھے۔ چاہیئے تو یہ کہ جب آپ خوش حال فارغ البال رہیں تو ہمیشہ کم مقدرت لوگوں کی عزت کریں۔ ان سے محبت سے پیش آئیں۔ اگر وہ کچھ تکلیف میں ہوں تو ان کی دلجوئی کریں۔ گو کوئی اپنا سب کچھ کسی کو نہیں دیتا لیکن محبت کی بات چیت دینے لینے سے کہیں بہتر ہے۔ بجائے انسان سے انسان کو محبت ہونے کے یہاں روپیہ جان سے عزیز ہے۔ روپیہ کی خاطر ایک دوسرے کی جان لینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ جب ذرا مالدار ہو جاتے ہیں تو بے چارے غریب طبقے ملنا بھی پسند نہیں کرتے۔ بعض جگہ تو قریبی عزیز ہیں لیکن چونکہ وہ کم مقدرت ہوتے ہیں۔ اس لئے ان سے رشتہ بتلاتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ حالانکہ شرافت کی حد تک دونوں برابر ہوتے ہیں! جان پہچان تک ظاہر کرنے میں عار سمجھتے ہیں یہ اتفاق نہ ہونے کی وجہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مصیبت متوسط طبقہ پر ہے۔ نہ وہ اپنی زندگی بڑے آدمیوں کی سی بسر کر سکتے ہیں اور نہ غریبوں کی سی۔ خدا نے جن کو دولت مند بنایا ہے وہ تو اپنی دولت کے بل پر اپنی ہر خواہش کی تکمیل کرتے ہیں۔ اب رہا غریب طبقہ تو وہ محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھر لیتا ہے اور اس پر قانع ہے۔ آفت تو متوسط طبقے پر ہے نہ وہ اپنی زندگی غریب طبقے کی سی بسر کر سکتے ہیں اور نہ اعلیٰ طبقے کی سی۔ اگر کشمکش میں ہے تو

انھیں کی زندگی۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ متوسط طبقے کے لوگ بڑے آدمیوں کی سی شان پیدا کرنا چاہتے ہیں اور جب پیسہ ساتھ نہیں دیتا تو پریشان ہوجاتے ہیں۔ کئی ایک گھرانے ایسے دیکھے گئے ہیں جہاں اتفاق کا وجود ہی نہیں۔ اتفاق کی "ماں" محبت ہے۔ بھلا جب آپس میں محبت ہی نہ رہی تو اتحاد کہاں بڑھے گا اور جب تک آپس میں اتحاد نہ ہو ہم مسرور نہیں رہ سکتے۔ آپس کی نااتفاقیوں کی وجہ سے دلوں پر بار رہتا ہے۔ اور ہمارے متفق نہ ہونے کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ اگر ہمارا امعیار زندگی یہی رہا تو ہمارا خدا حافظ ہے۔

عزیز فاطمہ ضیاء الدین

درسِ علم

وہ بچے صاحبِ قسمت ہیں جو تعلیم پاتے ہیں　　　بڑے ہو کر بڑی توقیر سے روزی کماتے ہیں

جنھیں بے وقت کوئی کام کرنا ہی نہیں آتا　　　وہی راہِ ترقی میں قدم اپنا بڑھاتے ہیں

سمجھ لو پھل انھیں تعلیم کا اچھا نہیں ملتا　　　جو نام اسکول کا سن کر بری صورت بناتے ہیں

دلوں میں شوق ہے جن کے جو ہیں اوقات کے پابند　　　وہی بچے ہمیشہ امتحاں میں فرسٹ آتے ہیں

نہیں رہتے ہیں جو شام و سحر مصروف کھیلوں میں　　　نہیں رکتے کہیں بھی جب سبق اپنا سناتے ہیں

انھیں معلوم ہوگی آگے چل کر وقت کی قیمت　　　بری صحبت میں رہ کر وقت جو اپنا گنواتے ہیں

جو کوشش کر کے رکھتے ہیں نظر اللہ پر اپنی　　　وہ گویا امتحاں دے کر مقدر آزماتے ہیں

نصیحت کو جو رد کرتے ہیں ماں باپ اور معلم کی　　　جہانِ علم میں کب وہ درِ مقصود پاتے ہیں

ادب استاد کا اک پیش خیمہ ہے ترقی کا　　　سعادت مند بچے مدرسے سے فیض پاتے ہیں

وہ بچے ہیں بہت خوش بخت اُن کا پوچھنا ہی کیا　　　جو ہو کر کامیاب امتحان اسناد پاتے ہیں

فہیمؔ اللہ استادوں کو ہر دم شادماں رکھے

جو ہم بچوں کو محنت سے عنایت سے پڑھاتے ہیں

احمد معین الدین فہیم صدیقی

(دار العلوم)

میرا محبوب مشغلہ

مطالعہ ایک شریفانہ ہی نہیں بلکہ حکیمانہ فعل ہے۔ پڑھنے کی عادت بہت اچھی ہے۔ ہم کو چاہیئے کہ جس چیز یا کتاب کا مطالعہ کریں اس کو کسی مقصد کے تحت پڑھیں۔ ایک مصنف لکھتا ہے کہ بغیر کسی مقصد کے پڑھنا فضول ہی نہیں بلکہ مضر ہے۔ کسی مقصد کے بغیر پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ مطالعہ معمولی کتابوں کا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ہم کو اس سے زیادہ اچھی معلومات حاصل نہیں ہوتیں بعض لوگ فضول اور ادنیٰ درجے کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ جس سے ان کا خیال ہے کہ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ معمولی اور ادنیٰ معلومات دماغ میں بھرے جا رہے ہیں۔ جس سے اعلیٰ معلومات کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مطالعہ تو ضرور کرنا چاہیئے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ جس کتاب کا مطالعہ کیا جائے وہ مفید بھی ہو اور اس سے ہم کو اعلیٰ معلومات اور فائدے حاصل ہوں عمدہ کتابوں کے مطالعہ نے انسان کے اخلاق اور عادات پر بہت اثر ڈالا۔ خیالات میں بہت بڑا تغیر پیدا کیا قوموں میں ہلچل اور انقلابات بپا کیے۔ ممالک کی کایا پلٹ میں حیرت انگیز مدد دی ہے۔ بعض کتابیں اب بھی دنیا میں موجود ہیں جن کے پڑھنے سے مردہ دل انسان بھی زندہ دل ہو گئے۔ بہت سے سوتے ہوئے ہشیار ہو گئے۔ بہت سی قوموں میں قومیت اور انسانیت کی روح زندہ ہو گئی۔ مطالعہ کے ذریعہ اخلاق کی تعلیم دے سکتے ہیں۔ اعلیٰ اخلاق کی تعلیم یوں دی جائے کہ نوجوانوں کے دلوں میں اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات اس طرح متمکن ہو جائیں کہ دنیوی لالچ خود غرضانہ خواہشات دوستی اور مروت انھیں ڈانواں ڈول نہ کر سکے اس کے لئے ان کو ایک ایسی کتاب مطالعہ کے لئے دی جائے جو موثر بھی ہو دلکش بھی اور طبیعتوں میں ولولہ اور جوش بھی پیدا کرے۔ یعنی ان لوگوں کے حالات مطالعہ کے لئے دیئے جائیں جنھوں نے دنیا میں بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے انسان کے دل میں ولولہ اور جوش پیدا ہوتا ہے۔ مطالعہ میں انسان اتنا مشغول ہوتا ہے کہ اسے آس پاس کی خبر نہیں ہوتی۔ بس یہ تمام کرشمے مطالعہ سے ہی ظہور میں آتے ہیں۔

عارف انصاری

کسان اور اس کی لڑکی

ایک کسان چوری کرتے وقت چاروں طرف دیکھا کرتا تھا۔ لیکن ایک طرف نہیں دیکھتا تھا۔ ایک دن وہ اپنی لڑکی کو لے کر چوری کرنے گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا لڑکی نے کہا ابا تم چاروں طرف کیوں دیکھ رہے ہو اس نے کہا کہ دیکھتا ہوں کہ کوئی آتا تو نہیں ہے لڑکی نے کہا ابا تم چاروں طرف تو دیکھتے ہو مگر اوپر کی طرف نہیں دیکھتے۔ وہ دیکھو اوپر خدا دیکھ رہا ہے یہ سن کر کسان نے اس روز سے چوری کرنا چھوڑ دیا۔

سید خیرات حسین رضوی

ایک کوشش

امتحان! امتحان!! خدا کی پناہ امتحان!!!

امتحان کا روح فرسا سماں دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

ہمیشہ اس امر کی کوشش کرتا ہوں کہ ایسا خیال کبھی پیدا ہونے ہی نہ پائے۔ چونکہ یہ میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔

والد صاحب تھوڑے دنوں سے اسی موضوع پر پُر زور تقریر کر رہے ہیں۔

اور میری یہ حالت کہ جوں ہی کتاب چھوی۔ آنکھوں کے سامنے امتحان گاہ کا منظر کھنچ گیا۔

میٹرک میں قدم رکھے صرف پانچ ہی سال ہوئے ہیں۔ ناکام ضرور ہوا ہوں۔ لیکن اوروں کی طرح مایوس نہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ (مرد باید کہ ہراساں نہ شود) اس کے علاوہ والد صاحب نے بھی تو ہمت افزائی کا بیڑا اٹھایا ہے۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جو کوئی فیل ہو وہ سب کی نظر میں برا ٹھیرتا ہے۔ لیکن میرا معاملہ ہی کچھ اور ہے۔

پہلے سال جو فیل ہوا تو والد صاحب نے ایک لفظ تک اس ناکامی پر زبان سے نہ نکالا۔ اول اول تو میں سمجھ گیا تھا کہ یہ خاموشی کچھ نہ کچھ رنگ لاکر رہے گی۔ لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا۔ والدہ کی حالت سے تو وہی لوگ خوب واقف ہیں جنھیں ہماری طرح تجربہ ہوا ہو۔

پہلی مرتبہ ناکام رہے تو۔ خاموشی اختیار کی۔ دوسری مرتبہ تو میری مدارات میں اور اضافہ ہوا۔ میں ایسا بے فکرا بنا کہ کبھی کتاب چھونے کا نام نہ لیتا تھا۔ بھلا کیونکر چھوتا۔ جب کتاب ہاتھ میں آئی۔ دل ودماغ تفکرات کی آماجگاہ بن جاتے ہیں۔

کہتے ہیں پڑھنا دو طرح سے آتا ہے۔ ایک ڈر سے دوسرے شوق سے۔ شوق۔ ارے! ان کتابوں میں رکھا کیا ہے۔ ہاں کچھ نئی کتابیں ہوں تو دیکھ لو کہ ختم کئے بغیر دم نہ لوں گا۔

اب رہا ڈر۔ ڈر کس کا۔ والد تو اس معاملہ میں بڑے ہی رحمدل ہیں۔ کبھی کوئی لفظ زبان سے نہ نکالا۔

رہیں والدہ۔ ممتحن صاحب ہی ان کے مخاطب تھے۔ مجھے کبھی یہ شرف حاصل نہ ہوا۔

وہ صلواتیں سنائیں کہ میں ممتحن ہوتا تو کبھی کے توبہ کرلیتا۔ والدہ اور بہنوں کی نقل کرنا ناممکن ہے۔ ان کا منہ چمڑے کا نہیں بلکہ شاید لوہے کی کوئی کل ہوتا ہوگا کہ گھنٹوں بغیر رکے چلے چلتا ہے۔ ساتھی کالج کی خوشگوار زندگی ختم کرکے عملی زندگی میں قدم رکھ چکے تھے۔ مجھے بھی ان کا دیکھا دیکھی شوقِ ملازمت چرایا۔

ملازمت کے لئے بھی تو میٹرک کی قید ہے۔ اور اس پر طرفہ یہ کہ جج کے بیٹے اور تھرڈ گریڈ کی ملازمت کریں۔ غرض ملازمت کرنا چاہو تو بھی میٹرک ہوں۔ اور آگے بڑھو تو بھی اس کی کامیابی لازمی ہے۔

ایک روز کھانے پر والد صاحب نے کہا بیٹا! اب امتحان کے دن قریب آرہے ہیں۔ محنت کرو اور صبح اٹھ جانا۔ تم بہت دیر سے اٹھتے ہو۔ طالب علم اتنی دیر سے نہیں اٹھا کرتے۔

پہلی مرتبہ والد نے یہ الفاظ منہ سے نکالے تھے۔ مجھے بھی ان کا کہنا شاق نہ گزرا۔ اس لئے کہ ملازمت کا شوق تھا یا آگے پڑھنے کو جی للچاتا تھا غرض کہ میٹرک پاس کرنا چاہتا تھا۔ اور پھر والد کی جادو بیانی نے بھی متاثر کیا۔

۱۔ میں نے صبح اٹھنے کا پکا ارادہ کرلیا۔ اسی خیال میں سیدھے نانی اماں کے ہاں پہنچا۔ اس وقت نانی اماں کچھ کھارہی تھیں۔ دیکھتے ہی چیخ اٹھیں۔ وہ دیکھو مردود آیا۔ معلوم نہیں، اب کیا مصیبت ڈھاتا ہے۔

میں نے کہا۔ نانی اماں! آپ بھی عجیب ہو۔ میں تو ایک بات کہنے آپ کے ہاں آیا ہوں۔ بھلا وہ کب ماننے والی آسامی تھیں۔ کہنے لگیں۔ بس بیٹھے وہیں رہنے دو اپنی بات.......

میں نے بات کاٹ کر جواب دیا۔ نانی اماں بات یہ ہے کہ میرا امتحان قریب آرہا ہے۔ آپ روز صبح نماز کو اٹھتی ہیں مجھے بھی اٹھالیا کرنا۔

نانی اماں نے طنز سے کہا۔ او ہو بیٹا صبح اٹھو گے!

اچھا میں تم کو ضرور اٹھادوں گی۔

اب میں صبح اٹھنے کی وہ وہ تیاریاں کرنے لگا گویا کہ کوئی زبردست مہم سر کرنی تھی۔ کیوں نہیں۔ صبح خیزی سے زیادہ میرے لئے اور کیا مہم ہوسکتی ہے۔

رات کا کھانا کھا نانی اماں سے کہا کہ ٹھیک پانچ بجے اٹھادیں۔ احتیاطاً الارم بھی رکھ دیا۔ اپنے پڑھنے کے کمرے میں آیا۔ کتاب اٹھائی دو تین صفحے پڑھے۔ خیال ہوا کہ صبح جلدی اٹھنا ہے۔ اس لئے سیدھے بستر پر دراز ہوگیا۔

دماغ میں ادھر ادھر کے خیالات آنے شروع ہوئے۔ حتیٰ کہ امتحان کا سماں جو کچھ دیر پہلے پریشان کن تھا۔ خوش کن بن گیا۔ امید نظر آنے لگی کہ اس سال تو ضرور کامیاب ہوجاؤں گا۔ آنکھ جھپک گئی۔

۲۔ کواڑوں پر زور زور سے کھٹکے پڑنے لگے۔ جاگ گیا۔ آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف دیکھا۔ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ کواڑوں کے روزن سے روشنی آرہی تھی۔ اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی مجھے یقین ہوگیا کہ بھوت ہے۔ چادر اوڑھ لی۔ پھر کھٹکے پڑنے شروع ہوئے۔ لیکن اب کی مرتبہ تھرتھراتی ہوئی آواز بھی آئی کہ بیٹا اٹھو کتنی دیر سے جگا رہی ہوں۔ جاگنے کا نام نہیں لیتے۔ اب سمجھ گیا کہ بھوت نہیں بلکہ نانی اماں ہیں۔ بھلا اس میں میرا کیا قصور تھا۔ نانی اماں ہی کا طفیل ہے کہ میں بھی بھوت پر یقین رکھتا ہوں۔

میں نے چادر منہ سے ہٹائی اور دیکھا تو وہی اندھیرا تھا۔ میں نے کہا بڑی بی کو یہ کیا سوجھی کہ صبح چار بجے ہی جگا دینے آن کھڑی ہوگئیں۔

پانچ بجے کہا تھا۔ ابھی اتنا اندھیرا ہے۔ اب کھٹکے اور تیز ہوئے تو کہا ہاں نانی اماں میں جاگ گیا ہوں۔ نانی اماں یہ کہتی چلی گئیں کہ پانچ بجکر دیر ہوئی جلدی اٹھ جاؤ۔

بھلا ان کو وقت دیکھنا کس نے سکھایا۔ یونہی اندازہ سے کہہ دیتے ہیں۔ پھر اس پر فخر یہ کہ ان کا اندازہ گھڑیوں سے بھی زیادہ صحیح ہے۔ پھر سوچا کہ جلدی ہی کیا ہے تھوڑی دیر بعد ہی اٹھیں گے۔

اب دل و دماغ میں امتحان اور کامیابی کے خیالات آنے شروع ہوئے۔ واقعی صبح خیزی بھی کیا نعمت ہے۔ آنکھیں بند ہوگئیں۔

دیکھوں ممتحن صاحب کیونکر فیل کرتے ہیں۔ پانچ سے ساڑھے سات بجے ڈھائی گھنٹے ہوا اور پھر رات میں آٹھ بجے سے گیارہ تک اگر پہلی مرتبہ گیا۔ ۵ بجے تک نہ جاگا تو کیا مضایقہ ہے۔

اتنے گھنٹے پڑھوں اور کامیاب نہ ہوں دیکھوں کونسی قوت مجھے ناکام کرتی ہے ممتحن صاحب کو بھی میری لیاقت کا لوہا ماننا ہی پڑیگا اردو کا امتحان یہ تو گھر کی کھیتی ہے۔ مادری زبان ہے۔ اس میں تو زیادہ محنت کی ضرورت نہیں۔ ساٹھ فی صدی سے کیا کم ہیں گے۔ اچھا دیکھا جائے گا۔

سائنس ضرور دیکھنا اس کو رٹنا تو مجھ سے نہیں ہوتا۔ لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کی مجھے بالکل خبر نہیں البتہ جب اٹھا تو ٹھیک آٹھ بجے تھے۔

شیخ رحیم الدین
(ظہیرآبادی)

کلیم کی زندگی کا ایک ورق

کلیم میاں نصوح کے فرزند اکبر تھے۔ نصوح دہلی کے شہرہ آفاق دولتمند گھرانوں میں سے تھے۔ خدا نے ان کو دولت اور اولاد بھی دی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دہلی میں ہیضہ پھوٹ پڑا اور اتفاق سے میاں نصوح بھی اس کا شکار ہوتے ہوتے اور جان کے لالے پڑ گئے۔ موت کا منظر ہمیشہ میاں نصوح کے پیش نظر رہتا تھا۔ ڈاکٹر نے خواب آور کی دوا دی اور اس نے چند گھنٹوں تک آرام کیا۔ وہی تصور اس کو خواب پریشاں بن کر نظر آیا۔ جونہی وہ چونک پڑا اس کے چہرے سے وحشت اور خوف کے آثار نمایاں تھے۔ روز بروز صحت کی طرف میلان بڑھتا گیا۔ وہ جب کامل صحت پا چکا تو تہیہ کر لیا کہ دینی باتوں۔ پنج وقتہ نماز اور تلاوت قرآن سے فراموش نہ ہوگا۔ اب اس نے اپنے تمام خاندان کو راہ راست پر لانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ اس سے قبل اس کے گھر میں دینی باتوں کا چرچا نہ تھا اس سے اس کی اولاد بے بہرہ ہو چکی تھی اور ان کو دینی باتوں سے کچھ ایسی نفرت ہو گئی تھی کہ وہ ہرگز راہ راست پر آنا گوارا نہ کرتے تھے۔ خادمان تو کجا بیٹا بیٹی بھی والدین کے سخت مخالف ہو گئے۔ لیکن جو چھوٹے تھے وہ تو والدین کا کہا ماننے لگے لیکن اسی طرح کلیم نے والدین کا کہا نہ مانا۔ اس کے بدنفس نے اس کو گھر سے چل کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا لیکن اس نے بچپن سے اس قدر ناز و نعمت میں پرورش پائی تھی جو امیرزادوں کو بھی میسر نہیں آتی۔

میاں نصوح کی کوٹھی میں سب سے الگ تھلگ کلیم نے دو کمرے اپنے لئے علٰحدہ لے رکھے تھے۔ ایک کا نام بیت العشرت جس میں تمام دن اور پہر رات گئے دوست آشناؤں کا مجمع رہتا تھا۔ مختلف قسم کے کھیل ہوتے مثلاً گنجفہ چوسر۔ تاش وغیرہ۔

کلیم دوستوں کی ہر قسم کی ضروریات کو پورا کرتا مثلاً کھانا، چائے، پان، سگریٹ وغیرہ۔ خدمت گار بلا چون وچرا کلیم کے حکم کو بجالاتے کیونکہ وہ گھر کا بڑا بیٹا تھا۔

دوسرا کمرہ جس کو وہ خلوت خانہ کہا کرتا تھا بدراہوں کو گمراہ کرنے کے لئے وہ کافی وسعت رکھتا تھا اور بیہودہ خیالات میں محو کرنے کے لئے اس میں بہت گنجایش تھی۔

کلیم شاعری سے بھی دلچسپی رکھتا تھا بلکہ وہ کافی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اس لئے اس پر شاعری کی پھٹکار تھی۔ کیونکہ شاعر اکثر خود پسند اور داد و تحسین کے امیدوار رہتے ہیں۔ وہ اپنے کو ایسا بڑا شاعر سمجھا ہوا تھا کہ جہاں کہیں یہ چل کھڑا ہوگا۔ وہاں کا والیٔ ملک اس کی تشریف آوری کا متمنی اور منتظر ہوگا۔

گھر سے نکلا تو تہی دست لیکن اس خیال خام میں مستغرق کہ کوئی آن میں وہ دنیا کے خزانوں کا مالک بننے والا ہے۔ کلیم کو اپنے دوست احباب پر اعتماد تھا لیکن وہ دور اندیش اور سمجھدار نہ تھا جو آنے والی باتوں پر غور کرتا۔ مصیبت آتی ہے تو ایک طرف سے نہیں بلکہ چو طرف سے۔ بُرے وقت دوست بھی مدد دینے سے پہلو تہی کرتے ہیں۔

بہر حال اس نے گھر کو خیرباد کہہ کر صرف والدین کی ہی نافرمانی نہیں کی بلکہ طرح طرح کی آفتیں، مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلیں۔ آخر کار دو مرتبہ سپاہیوں کے نرغے سے اور جیل خانے سے اس مشفق باپ ہی کی وجہ رہائی پائی۔ تب بھی راہ راست پر نہ آیا۔ تیسری دفعہ فوج میں کپتان ہو کر لڑائی میں بری طرح زخمی ہوا اور زندگی کی کوئی امید باقی نہ تھی آخر کار دہلی لایا گیا اور ماں باپ کے سایۂ عاطفت میں پناہ گزیں ہوا۔

نصوح نے علاج میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا ایک چھوڑ دو دو ڈاکٹر بیٹھے رہے لیکن موت کا کوئی علاج نہیں اور مشیت ایزدی میں کسی کا دخل نہیں۔ کلیم بھی جان چکا تھا کہ وہ اس مرض سے جاں بر ہونے والا نہیں۔ وہ مرنے کو زیادہ ترجیح دیتا تھا اس نالائق زندگی پر جو اس نے رسوائی ذلت اور والدین کی نارضامندی اور حق کی نافرمانی میں بسر کی تھی۔ لیکن اب وہ بستر مرگ پر ہونے کی وجہ راہ راست پر آچکا تھا۔ اس کو تسلی اور تشفی تھی تو آتنی کہ وہ مرتے وقت ایسے لوگوں میں ہے جو اس کے شفیق اور ہمدرد تھے۔

اس نے یہ کہا کہ وہ اپنی زندگی سے خود مستفید نہیں ہوا لیکن اس کی زندگی دوسروں کے لئے نمونۂ عبرت ہوگی۔ اور ایسی زندگی کو وہ رائگاں اور عبث نہیں کہہ سکتا۔ ع "من نہ کردم شما حذر بکنید"

اب کلیم کی دلی حسرت تھی تو یہ تھی کہ باپ سے معافی مانگ لوں لیکن موت نے اتنی بھی مہلت نہ دی وہ بے ہوش ہوگیا اور ساتھ ہی ہچکیاں شروع ہوگئیں۔ نصوح تلاوت یٰسین میں مصروف ہوگیا۔ کلیم نے آخری مرتبہ آنکھیں کھولیں اور باپ کو نگاہِ حسرت سے دیکھ کر ہاتھ جوڑے وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن زبان بے قابو ہو چکی تھی۔ اس لئے اس نے آنکھ کے اشارے سے معافی چاہی اور جاں بحق ہوا۔

اقبال فاطمہ

اُردو رسالے اور جریدے

ادارۂ ادبیات اُردو کے کتب خانہ میں اُردو کی جو کتابیں آتی رہتی ہیں ان میں سے کسی نہ کسی پر سب رس کے ہر شمارہ میں تبصرہ یا تنقید شایع ہوتی رہتی ہے۔ اب تصفیہ کیا گیا ہے کہ ادارہ کے دارالمطالعہ کی میز پر جو ماہوار یا سہ ماہی رسالے اور پندرہ روزہ یا ہفتہ وار جریدے موجود رہتے ہیں ان کی فہرست بھی ہر سہ ماہی کو شایع ہوا کرے۔ اس لئے اس وقت جو رسائل و جرائد موجود ہیں ان کی فہرست درج ذیل ہے۔ بہت کم کتب خانے ایسے ہوں گے جہاں تقریباً تمام اُردو رسائل و جرائد مطالعہ کے لئے موجود رہتے ہوں۔ "ادارہ"

ادبی دنیا لاہور جون صلاح الدین احمد
ادب لطیف ″ ″ چودھری برکت علی
البیان امرتسر مئی محمد حسین
ایشیا لاہور جون ایم فتح اللہ
آوازِ ہند دہلی جون ایس۔ ایم۔ نورالٰہی دہلوی
بنات ″ اپریل رازق الخیری
بلاغ امرتسر ″ علیم الدین (ڈاکٹر)
برہان دہلی فروری۔ سعید احمد اکبر آبادی
پیام صحت کلکتہ مئی ڈاکٹر حکیم محمد علی قریشی
تندرستی جالندھر شہر۔ جون۔ ڈاکٹر علی شیر گوہیہ
جامعہ دہلی ″ پروفیسر محمد عاقل
جدید اُردو کلکتہ ″ پرویز شاہدی
حرم دہلی ″ سید عاشق علی بہتھندی
حشر جالندھر اپریل سرور
حکیم دکن حیدرآباد جنوری حکیم محمد ظفرالدین ناصر
تخلیق ″ ربیع الثانی۔ مرزا امام بیگ رونق قادری
خالد دیوبند جمادی الثانی۔ مولوی سید احمد فاضل دیوبند
خضر راہ لاہور مئی و جون حکیم محمد یوسف حسن

رہنمائے زندگی گوجرانوالہ جون حکیم ضیاء احمد صدیقی
رسالہ ترک مسکرات حیدرآباد جولائی محمد انجمن ترک مسکرات
THE READER'S DIGEST نیویارک مئی
زمانہ کانپور نومبر دیا نارائن نگم
زیب النساء حیدرآباد مارچ صفوا ہمایون مرزا۔
ساقی دہلی اپریل شاہد احمد دہلوی
سلطان المشائخ لاہور دسمبر سید عبداللطیف شاہ تبلیغ جاری
شمس المشائخ امرتسر مارچ مقبول انور داودی
شاعر آگرہ جون اعجاز صدیقی اکبر آبادی
شاہکار گورکھپور یوپی۔ نومبر۔ حکیم عارف بلگرامی
شہاب حیدرآباد فروری محمد عبدالرزاق بسمل
شاہکار لاہور جون محمود جاوید
شان اسلام بمبئی مارچ صاحبزادہ عبدالعلیم قریشی
صبح امید ″ جنوری محمد سعید چینیکر
صوفی اعظم حیدرآباد ربیع الاول، ربیع الثانی۔ مفتی سید شاہ احمد علی الصوفی
صور اسرافیل لاہور اکتوبر۔ ستمبر مولوی غلام احمد
طلوع اسلام دہلی اپریل محمد ضیاء الدین صدیقی
عارف لاہور جون محمد عبدالرحمن شوقی

عالمگیر لاہور جون حافظ محمد عالم

عصمت دہلی " رازق الخیری

قلم حیدرآباد " سعداللہ قادری

قائد مراد آباد ربیع الاول سید محی الدین اختر اسلام

کہکشاں دہلی اپریل سید کاظم دہلوی (ادیب عالم)

کامیاب " اگست تسنیم فدائی

کتاب نما " . مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ

کتابی دنیا " عالی پبلشنگ ہوز

مست قلندر لاہور جون ڈاکٹر پرتھی سنگھ

مولوی دہلی " عبدالحمید خاں

منزل " " سید محمود مورخ و صاحبزادہ عالمگیر شیدا

موج بہار لاہور جنوری رام ناتھ کپور

مجلہ نظامیہ حیدرآباد جون ابوالخیر کنج نشین اہل

معارف اعظم گڑھ مئی و جون۔ سید سلیمان ندوی

مشعل پشاور جون مفتی عزیز الرحمن

مووی لینڈ سکندرآباد۔ جون محمد حسام الدین خاں غوری

نیرنگ خیال لاہور مئی حکیم محمد یوسف حسن

نقیب حیدرآباد مارچ پرفیسر کرشن چندر سکسینہ

نغمہ فیض آباد نومبر سلام مچھلی شہری

نور جالندھر فروری اسد اللہ خاں

ہمایوں لاہور مئی بشیر احمد

ہل الہ آباد " شری ناتھ سنگھ

—— رسالے (سہ ماہی) ——

اُردو نئی دہلی۔ اپریل ڈاکٹر عبدالحق

المدرسہ حیدرآباد اسفندار۔ سید عباس و محمد مصلح الدین

تلمیذ حیدرآباد امرداد عبدالعزیز رضوی

علی گڑھ میگزین علی گڑھ مارچ آفتاب احمد صدیقی

مجلہ اللسانیین حیدرآباد۔ شمارہ سوم و چہارم۔ سید محمد

ہندوستانی الہ آباد اپریل مولنا سعید انصاری

مجلہ عثمانیہ حیدرآباد۔ جلد ۱۲ عبدالعلی خاں

—— رسالے ششماہی ——

THE PALMS جوگیشوری مارچ S.V. PANDIT (M.A)

—— رسالے۔ پندرہ روزہ ——

صدق لکھنو یکم جون ۱۵ جون۔ عبدالماجد

ماہ نیم ماہ دہلی جون حامد شاہجہان پوری

ہماری زبان نئی دہلی یکم اپریل انجمن ترقی اردو

—— اخبار۔ ہفتہ وار ——

الیشیا آگرہ ۱۴ جون۔ ۲۱ جون منظر صدیقی اکبرآبادی

انصاف بمبئی ۲۴ اکتوبر ایس۔ کوی راج

البرق سری نگر ۲۵ مارچ۔ ایم اے صابر۔ ایم نصیر الدین

اخبار تعلیم لاہور ۱۳ مارچ۔ منشی طالب علی پابند قریشی

جدوجہد ناگپور ۲۴ جنوری۔ سید قاسم علی رامپوری

رہنما مراد آباد ۱۴ جون۔ ایم اے اشفاق حسین صدیقی

شان ہند بمبئی ۱۴ جون ۲۱ جون۔ صاحبزادہ عبدالقیوم قریشی

کانگریس مراد آباد ۱۶ جون۔ افتخار فریدی

نیر اعظم " ۱۲ جون ۱۹ جون مالک دختر الیس ابن علی

نئی دنیا بمبئی ۲۴ دسمبر

اسلام آگرہ جون محمد اسحاق وارثی

وغیرہ وغیرہ

مَن کی پیتا پر سب کی نظر

معارف ۔ ماہ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ

ہماری معاشرتی خرابیوں میں عورتوں اور مردوں کے بے جا اسراف، لغو رسم و رواج بے جا نمود و نمائش، ظاہری شان و شوکت، تن آسانی اور جدید تمدن کی غلط نقالی نے متوسط الحال سفید پوش گھرانوں کے امن و سکون کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اس کی اصلاح کا دار و مدار بڑی حد تک ہماری خواتین کے سدھار، ان کی صحیح و صالح تربیت، پاکیزہ خیالی اور ان کی سادگی و جفاکشی پر ہے محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ جدید تعلیم کے باوجود ان اوصاف سے آراستہ اور صحیح نسوانی تعلیم کا اچھا نمونہ ہیں۔ انھوں نے مذکورۂ بالا کتاب میں ان تمام معاشرتی خرابیوں اور اس کے اسباب کو دکھا کر ان کی اصلاح کے طریقے بتائے ہیں اگر ہماری عورتوں میں اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ایسی صحیح روشنی اور پاکیزہ خیالات پیدا ہو جائیں تو ہماری زندگی سنور جائے یہہ کتاب اس قابل ہے کہ اسے لڑکیوں کے نصاب میں داخل کیا جائے ۔

صدق ۱۵ر جون ۱۹۳۹ء

"حریتِ نسوان" اور "تجدد" کے دور میں اہم ضرورت اس کی ہے کہ خود طبقہ خواتین ہی صاحب فہم ہستیاں اپنے طبقہ کی اصلاح کے لئے قلم ہاتھ میں لیں اور معاشرت و معیشت کی گونا گوں منزلوں میں راہ ہدایت دکھائیں اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ یہہ چھوٹی سی کتاب اس معیار پر پوری اترتی ہے مصنفہ دکن کی اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کی صف اول میں ہیں اور تربیت و تعلیم کا بھی تجربہ رکھتی ہیں کتاب ۱۶ چھوٹے چھوٹے عنوانات میں تقسیم ہے۔ گھر، سواری، خورد و نوش لباس، چندے، علاج، معالجہ، سیر و تفریح، فیشن وغیرہ اور ان کے اندر باتوں باتوں میں وہ سب کچھ سنا دیا گیا جس کی ضرورت موجودہ مسلم عورت کو ہے ۔

کتاب اصلاحی نقطۂ نظر سے اس قابل ہے کہ اسے ہر شریف گھرانے میں ہونا چاہئے۔ محترم مصنفہ نے اگر خدانخواستہ اس سلسلہ کو آگے نہ پھیلایا اور اپنی کوششوں کو اس مختصر رسالہ پر ختم کر دیا تو وہ اپنے اور اپنی قوم دونوں کے حق میں انصاف سے نہیں ظلم سے کام لیں گی ۔

عصمت، دہلی، ماہ مئی ۱۹۳۹ء

یہہ لطیف النساء بیگم صاحبہ بی اے کے چند معاشرتی و اصلاحی مضامین کا مجموعہ ہے جسے "ادارہ ادبیات اُردو" (ریت آباد حیدر آباد دکن) نے مجلد شایع کیا ہے ۔ مضامین کا موضوع اصلاح نسوان اور مقصود اپنی معاشرت کے نصب العین کو سدھارنا ہے ۔ یہہ دیکھ کر ہمیں بڑی خوشی ہوتی ہے کہ ہماری تعلیم یافتہ خواتین بھی اب مشرقی اوصاف کی قدر کرنے لگی ہیں ۔ اور وہ طبقہ نسوان کی بہبودی اس میں تصور کرتی ہیں کہ وہ نئیں مغرب زدگی کی بجائے اپنے آپ کو مشرقی جواہرات سے مرصع کریں موصوفہ حیات النسائی پر تنقیدی نظر رکھتی ہیں اور انھوں نے ان مضامین میں اپنی رائے کا

اظہار آزادی سے کیا ہے چند اچھے مضامین کے عنوانات یہہ ہیں۔ گھر، ہمارے نوکر، بچوں کی تعلیم اور ان کی ضرورتیں۔ اخبار، کتابیں اور رسالے، سینما اور فیشن۔ خواتین کو یہہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ ہے۔

شاعر (آگرہ) ماہ مئی ۱۹۳۹ء

یہہ کتاب "ادارۂ ادبیات اُردو" کا تیئیسواں شمارہ ہے۔ ادارۂ ادبیات اُردو جہاں مردوں کے خیالات اور تشحات سے ملک کو بہرہ مند کر رہا ہے وہاں یہہ چیز باعث مسرت ہے کہ وہ طبقۂ نسوان کے رجحانات سے بھی ہمیں آگاہ کر رہا ہے۔ بہت کم ایسے ادارے ہیں جو اس قسم کے مطبوعات شایع کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ جو عورتیں تصنیف و تالیف کا کام بہ طریق احسن انجام دے سکتی ہیں۔ ان کو ملک کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ ہندوستان کسی دوسرے ملک سے پیچھے نہ رہے۔

"من کی بپتا" میں مختلف موضوعات پر معاشرتی مضامین ہیں۔ تمام موضوعات میں اصلاحی پہلو نمایاں رکھا گیا ہے یہہ کتاب خواتین کے لئے بے حد مفید ہے۔ ناظرین "شاعر" خانگی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے اپنی خواتین کو "من کی بپتا" کی ایک جلد ضرور منگا دیں۔

نیرنگ خیال ماہ اپریل ۱۹۳۹ء

محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ بی اے نے خانگی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے یہہ مفید کتاب لکھی ہے۔ جس میں گھر، سواری، نوکر، خورد و نوش، لباس، بچوں کی تعلیم، نذر و نیاز، چندے، رسومات، سیر و تفریح، اور فیشن وغیرہ عنوانات پر مختصر مگر سلیس عبارت میں مفید باتیں لکھی ہیں جو لڑکیوں اور عورتوں کو ضرور مطالعہ کرنی چاہئیں۔

ماہ نیم ماہ یکم و ۱۶ مئی ۱۹۳۹ء

"من کی بپتا" میں محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ بی اے نے تدبیر منزل کے متعلق مستورات کو نہایت اہم اور مفید مشورے دیئے ہیں۔ اور عہد حاضرہ کی مستورات میں مغربی اثر کے ماتحت جو ظاہر داریاں رونما ہو رہی ہیں انھیں دلکش اور موثر انداز بیان میں واضح کیا ہے۔ مصنفہ محترمہ بیان فرماتی ہیں کہ "عورت کا یا ہر گھر کی بی بی کا پہلا فرض یہہ ہے کہ وہ اپنی معاشرت کا ایک صحیح نصب العین بنائے جس میں بے جا ظاہر داریوں کو دخل نہ ہو" عام طور پر ایک متوسط گھر کے خرچ کے مدات یہہ ہوتے ہیں گھر، سواری، خورد و نوش، نوکر چاکر، کپڑا لتّا، بچوں کی ضروریات، تعلیم، اخبار رسالے، عید، تہوار، نذر و نیاز، مختلف چندے مختلف رسومات، علاج معالجہ، متعلقین و لواحقین، انعام و اکرام، سیر و تفریح، سینما، فیشن، چنانچہ موصوفہ نے ہر مد پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

اُردو ادبیات میں اس قسم کا لٹریچر بہت کم ہے اور جو ہے مثلاً مرات العروس وغیرہ اس کے مفید ہونے سے انکار نہیں لیکن آج سے ساٹھ ستر برس پہلے کی لڑکیوں اور مستورات کے لئے عدم سے وجود میں آیا تھا اب حالات بدل گئے ہیں ضرورت تھی کہ عہد حاضرہ کی مستورات کو انھیں کی صنف نازک میں سے کوئی من کی بپتا سنائے اور انھیں راہ راست دکھائے۔ چنانچہ محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ نے اس کمی کو ایک حد تک پورا کر دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ "من کی بپتا" کا مطالعہ ان مستورات کے لئے جن پر خانہ داری کی ذمہ داریاں عاید ہیں اور ان لڑکیوں کے لئے جو مستقبل قریب و بعید میں ان ذمہ داریوں کی حامل ہونے والی ہیں۔ نہایت مفید ثابت ہوگا۔

ایک بچّی کی خواہش

میں تاریک گھر کا اجالا بنوں گی — جہاں جاؤں گی میں اُجالا کروں گی

میں ہر روز اعلیٰ سے اعلیٰ بنوں گی — جو آنکھوں سے دیکھوں گی سچ سچ کہوں گی

کسی کو میں دکھ دینے والی نہ ہوں گی — مشقت کروں گی مصیبت سہوں گی

میں ہر حال میں شکر کا دم بھروں گی — میں ہر روز اعلیٰ سے اعلیٰ بنوں گی

جہاں جاؤں گی میں اجالا کروں گی — صداقت کا میں بول بالا کروں گی

شکایت کروں گی نہ شکوہ کروں گی — مصیبت غریبوں کی ٹالا کروں گی

پلیڈر بنوں گی تو سچی پلیڈر — جو منصف بنوں گی تو بس عدل گستر

کروں گی غریبوں کی امداد اکثر — میں ہر روز اعلیٰ سے اعلیٰ بنوں گی

رکھوں گی یتیموں کے میں ہاتھ سر پر — میں ہر روز اعلیٰ سے اعلیٰ بنوں گی

سیدہ احمد النسا بیگم

ادارۂ ادبیات اردو کی مشہور و معروف کتابیں

مرقع سخن (جلد اول) حیدرآباد
کے پچیس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ پچاس سے زیادہ تصاویر اور چار سو سے زیادہ صفحات مجلد قیمت
صمہ

مرقع سخن (جلد دوم) حیدرآباد
کے پچاس دیگر شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ پچاس تصاویر ۴۰۰ صفحات۔ مجلد قیمت
صمہ

سراج سخن
انتخاب کلام شاہ سراج اورنگ آبادی مرتبہ۔ پروفیسر عبدالقادر سروری معہ سوانح شاہ سراج صفحات ۵۲
قیمت ۱۲ ار

ایمان سخن
انتخاب کلام شیر محمد خاں ایمان مرتبہ مولوی سید محمد صاحب ایم اے معہ سوانح ایمان صفحات ۱۳۰
قیمت ۱۲ ار

فیض سخن
انتخاب کلام حافظ امیر شمس الدین محمد فیض۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور معہ سوانح فیض صفحات ۱۴۴
قیمت ۱۲ ار

بادہ سخن
انتخاب کلام ڈاکٹر احمد حسین مائل مرتبہ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور معہ سوانح و تصویر صفحات ۱۲۸
قیمت ۱۲ ار

کیف سخن
انتخاب کلام سید رضی الدین حسن کیفی مرتبہ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور معہ سوانح و تصویر صفحات ۱۲۲
قیمت ۱۲ ار

متاع سخن
انتخاب کلام نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز مرتبہ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور معہ سوانح و تصویر صفحات ۱۲۵
قیمت ۱۲ ار

وڈزورتھ اور اسکی شاعری
مشہور انگریز شاعر کے حالات اور کلام پر تبصرہ۔ از مولوی میر حسن صاحب ایم اے معہ تصویر شاعر صفحات ۱۸۴
قیمت صرف عہ ۸ر

ٹیگور اور انکی شاعری
ہندوستان کے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کے حالات اور کلام پر تبصرہ از مولوی مخدوم محی الدین صاحب ایم اے معہ تصویر شاعر صفحات ۱۲۸ قیمت عہر

یوسف ہندی قید فرنگ میں
مرزا غالب کی قید فرنگ کے حالات مرتبہ مولوی محسن بن شبیر صاحب بی اے ال ال بی۔ صفحات (۸۰)
قیمت ۸ ار

ہوش کے ناخن (ڈرامہ)
حیدرآباد کی سماجی زندگی کا خاکہ۔ مصنفہ۔ مخدوم محی الدین و میر حسن صاحبان صفحات (۹۶) قیمت عہ

نذر ولی
ولی اورنگ آبادی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی مضامین کا مجموعہ از لطیف النساء بیگم بی اے نجم النساء بیگم بی اے نعیم النساء بیگم بی اے جہاں بانو بیگم بی اے صفحات ۲۴۸ قیمت عہ ۸ر

نقد سخن
کلام فانی پر نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کی تنقیدوں کا مجموعہ
قیمت
عہ

گریہ و تبسم
صاحبزادہ میکش
کی
دلکش نظموں کا مجموعہ
قیمت مجلد دو روپے

مشاہیر قندھار دکن
دکن کے مشہور مردم خیز خطہ کی دلچسپ باتصویر تاریخ
از۔ اکبر صدیقی بی اے
قیمت عہ

من کی دنیا
نوجوان انشا پرداز رشید قریشی
کے
ولولہ انگیز افسانے مجلد قیمت عہ

مدراس میں اردو
مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی
کی
محققانہ تالیف صفحات ۴۰۰
مجلد قیمت عہر

نذر دکن (باتصویر)
دکن کے متعلق خواتین دکن کے مضامین قلم معہ عکس تحریر و تصاویر صفحات ۱۱۴ مجلد قیمت عہر

محرم نامہ
شہادت کربلا کے متعلق دلچسپ معلومات۔ باتصویر مجموعہ صفحات ۱۱۲ مجلد قیمت عہ

پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کی مشہور و معروف کتابیں

دنیائے افسانہ
افسانہ نگاری کے اصول
اور مبادی پر سیر حاصل بحثیں
اردو افسانہ نگاری کی تاریخ پر
مستند تصنیف طبع دوم قیمت عہ

کردار اور افسانہ
افسانوں میں کردار پیدا کرنے کے
اصول، ان کی اہمیت، نوعیت
وغیرہ پر اردو کی واحد کتاب
قیمت صرف
عہ ۱۲ر

جدید اردو شاعری
حالی سے لے کر موجودہ عہد تک
اردو شاعری کے مختلف دبستانوں
کی تاریخ، شعراء کے حالات اور
تصاویر۔ قیمت عاں

حیدرآباد کی تعلیمی ترقی
(گزشتہ ربع صدی میں)
اس موضوع پر پہلی کتاب
قیمت صرف
عہ

قدیم افسانے
زیر نگرانی سروری صاحب
مرتبہ محمد محی الدین صاحب قیمت
۱۲ر

چینی اور جاپانی افسانے
قیمت
عہ ۱۲ر

انگریزی افسانے
قیمت
عہ ۱۲ر

فرانسیسی افسانے
زیر نگرانی سروری صاحب۔ مرتبہ
عزیز احمد صاحب بی اے۔ قیمت ۱۲ر

مولوی سید محمد صاحب ایم اے کی مشہور و معروف کتابیں

ارباب نثر اردو
فورٹ ولیم کالج کے
نثر نویسوں کا محققانہ
تذکرہ۔ قیمت
عہ ۱۲ر

گلشن گفتار
شعرائے اردو کا
قدیم ترین تذکرہ
قیمت ۱۲ر

مثنویات میر
میر تقی میر کی تمام
مثنویاں ترتیب تصحیح
کے ساتھ قیمت عہ

ابتدائی فارسی
براہ راست طریقۂ تعلیم
کے متعلق فارسی کی
صرف و نحو قیمت ۱۲ر

یادگار ولی
اردو شاعری کے
ابوالآباء ولی اورنگ آبادی
کے جشن دو صد سالہ کے
مقالات [illegible] کلام
قیمت عہ

حکیم الشعراء حضرت امجد کی تصنیفات

دفتر سب رس رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہیں

(مطبوعہ عہد آفریں برقی پریس)

سب رس

نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۳)
نشان ٹپہ برطانیہ (M3950)

"اِدارۂ ادبیاتِ اُردو" حیدرآباد دکن

کا

ماہ نامہ

بابت جون ۱۹۳۹ء جلد (۲)، شمارہ (۶)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خان میکش
خواجہ حمید الدین شاہد
سکینہ بیگم
معین الدین احمد انصاری

مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر "ادارہ" رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

سالانہ چندہ (للعہ) علاوہ محصول ڈاک فی پرچہ چھ آنے

اِدارۂ ادبیات اُردو کی نئی کتابیں

۱۔ **من کی بتیا** (صنفِ نازک کی ضرورتوں اور زندگی کی تلخیوں کے متعلق معرکتہ آلارا مشورے) از لطیف النسا بیگم صاحبہ ام اے۔ صفحات ۸۰ مجلد قیمت ۸ہر

۲۔ **نذرِ دکن**۔ دکن کے متعلق خواتین دکن کے شگفتہ ادبی اور تاریخی مضامین اور نظمیں مجلد با تصویر بڑی سائز صفحات ۱۱۲ قیمت ۸ہر

۳۔ **محرم نامہ**۔ سانحہ کربلا کے متعلق مضمونوں، مرثیوں، سلاموں، نوحوں اور تصویروں کا عظیم الشان مجموعہ بڑی سائز صفحات ۸۰ قیمت عہ

۴۔ **نظام الملک آصف جاہ اوّل** اس مختصر کتاب میں نظام الملک آصف جاہ اول کے مجمل حالات و مستند واقعاتِ زندگی نہایت سلیس اور شگفتہ زبان میں تحریر کئے گئے ہیں۔ ادارہ دوسرے سلاطین آصفی کے سوانح حیات بھی تیار کر رہا ہے۔ اس کتاب کو اس سلسلے کی پہلی کڑی سمجھا جائے۔ مصنفہ مولوی شیخ چاند مرحوم ام اے۔ ال ال بی (ریسرچ اسکالر) قیمت ۸ہر

۵۔ **روح غالب**۔ غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگزشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب اس کتاب کا پیش لفظ نواب مہدی یار جنگ بہادر ام اے (کیمبرج) صدر المہام تعلیمات و معین امیر جامعہ نے تحریر فرمایا ہے۔ مرتبہ۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب زور ام اے، پی اچ ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات اُردو جامعہ عثمانیہ۔ صفحات (۲۴۰) معہ تصاویر قیمت (عاں)

۶۔ **تاریخ گولکنڈہ** گولکنڈہ سیاسی، معاشرتی اور تمدنی حیثیتوں سے دکن کی ریاستوں میں ممتاز رہا ہے۔ مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ام اے ال ال بی پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ نے کئی سال کی محنت اور تحقیق کے بعد یہ مستند تاریخ تحریر فرمائی ہے۔ تاریخ اور خصوصاً تاریخ دکن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔ صفحات ۲۱۴ معہ تصاویر قیمت عاں ۸ر

ادارہ کی چند مقبول عام کتابیں

مرقع سخن جلد اول صہ — مرقع سخن جلد دوم صہ — سراج سخن ۱۲ر — ایمان سخن ۱۲ر

فیض سخن ۱۲ر — بادۂ سخن ۱۲ر — کیف سخن ۱۲ر — متاع سخن ۱۲ر

ورڈزورتھ اور اسکی شاعری ۸ہر — ٹیگور اور انکی شاعری ۸ہر — من کی بتیا ۸ر — ہوش کے ناخن (ڈرامہ) عہ

نذر ولی عاں — نقد سخن عہ — گریہ و تبسم عاں — مشاہیر قندھار دکن عہ

من کی دنیا عہ — مدراس میں اُردو ۸ہر — نذر دکن ۸ہر — محرم نامہ عہ

نظام الملک آصفجاہ اول ۸ہر — عاصمہ ۸ہر — سرگزشت غالب ۸ر — روح غالب عاں ۸ر

تاریخ گولکنڈہ عاں

سب رس کی قیمت حیدرآباد کے لئے چار روپے سالانہ۔ دو روپے [illegible] ششماہی۔ چھ آنے فی پرچہ
" " حیدرآباد سے باہر چار روپے آٹھ آنے سالانہ۔ [illegible] ششماہی۔ [illegible] آنے فی پرچہ

جلد (۱) شمارہ (۶) | سب رس | جون سنہ ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

اداریہ

یہ سب رس کی بسری جلد کا چھٹا شمارہ ہے گذشتہ پرچوں کی طرح اس میں بھی مضمونوں نظموں اور غزلوں کے تنوع اور معیار کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے ۔ خدا کا شکر ہے کہ سب رس توقع سے زیادہ تمام ہندوستان میں مقبول ہوتا جارہا ہے ۔ اب تک کئی بلند پایہ رسائل اور اہل الرائے اصحاب نے اس کے متعلق اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے بعض کرم فرماؤں کا خیال ہے کہ سب رس کا معیار پہلے پرچوں کی نسبت گھٹ گیا ہے ۔ حالانکہ سب رس کا وہی معیار ہے جو پہلے تھا ۔ البتہ حالات اور واقعات کے تحت تھوڑی بہت تبدیلی ہوتی رہتی ہے تاکہ تنوع پیدا ہو ۔ ہم نے بارہا اس کا ذکر کردیا ہے کہ سب رس ایک ٹھوس علمی اور تحقیقی پرچہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ عوام کے لئے ہے اور اس میں انہی کے ذوق کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس مقصد کی خاطر زبان اور ادب کے معیار کو نظر انداز کردیا جائے ۔

سب رس کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ اردو زبان اور ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ ملک میں لکھنے پڑھنے کا ذوق عام کرے ملک کے چپہ چپہ میں اس کی رسائی ہو اور معمولی قابلیت والا بھی اس کو شوق سے پڑھے خدا کا شکر ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا جارہا ہے لوگ اسے شوق سے پڑھتے ہیں اور اگر کبھی پرچہ ملنے میں دیر ہو تو بے چین ہوجاتے ہیں چنانچہ دفتر کو ہر ماہ ایسے خطوط وصول ہوتے ہیں سب رس ملک کی ایک بڑی کمی کو پورا کر رہا ہے اور جو لائحہ عمل اس کے پیش نظر ہے اس کا نتیجہ چند سال میں ظاہر ہوگا ۔ اس وقت معلوم ہوجائے گا کہ اس نے ملک میں کتنے انشاپرداز، افسانہ نگار اور شاعر پیدا کئے اور علمی و ادبی ذوق کو عام کرنے میں کس حد تک کامیاب ثابت ہوا

آج کل بدقسمتی سے اردو ہندی کا جھگڑا تمام ہندوستان کا ایک اہم اور پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے مختلف اصحاب اس پر غور و فکر کر رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کسی قوم یا مذہب کی زبان نہیں ہے وہ تمام ہندوستان کے رہنے والوں کی زبان ہے ۔ شمال سے لے کر جنوب تک اور مغرب سے لے کر مشرق تک بلا تفریق مذہب و ملت یہ زبان بولی یا سمجھی جاتی ہے اس لئے اردو کا تحفظ ہر ہندوستانی کا ایک مقدس فریضہ ہے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا پارسی ۔ جو لوگ اس کام میں لگے ہوئے ہیں ان کو اور زیادہ تیزی اور انہماک سے کام کرنا چاہئے ۔ اور جو اب تک اس فریضہ سے غافل ہیں ان کو اب بیدار ہوجانا چاہئے ۔ اس عام ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے جناب ماہر القادری صاحب نے اپنا ایک مضمون " اردو زبان کے بہی خواہوں سے " اشاعت کے لئے روانہ فرمایا ہے ۔ جو پیش نظر شمارہ میں شامل ہے ۔ اس مضمون سے متعلق اتنا کہدینا کافی ہے کہ ہر طبقے کو اپنے خیال کے اظہار کی پوری پوری آزادی دی گئی ہے ۔ اردو سے دلچسپی رکھنے والے ٹھنڈے دل سے اس مضمون کو پڑھیں اور غور کریں ۔ ماہر صاحب نے ایک مفید بحث چھیڑ کر وقت کی ضرورت کو پورا کیا ہے اور وہ آئندہ بھی اس سلسلہ کو جاری رکھیں گے ۔ توقع ہے کہ دوسرے صاحبانِ نقد و نظر بھی اس مضمون کی موافقت یا مخالفت میں اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے ۔ سب رس ان تمام بحثوں کو شکریہ کے ساتھ اپنے صفحات پر جگہ دے گا ۔

ڈاکٹر نجم الدین احمد صاحب بار ایٹ لا (الہ آباد) نے " عورت " کے عنوان پر ایک مضمون روانہ فرمایا تھا ۔ جو اس شمارہ میں شریک ہے آپ نے نہایت ہی تحقیق اور قابلیت کے ساتھ عورت کے حقوق پر روشنی ڈالی ہے جس کے پڑھنے کے بعد یقیناً ہماری عورتیں اثر لیں گی ۔ اور اس بصیرت افروز مضمون کی رہنمائی میں اپنی اصلاح اور ترقی کی منزلیں طے کریں گی ۔

یہ امر ہمارے لئے کس قدر مسرت کا باعث ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو کے رفقائے کار میں سے محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ (مصنفہ من حقی بیتا

مرزا اسد اللہ خاں غالب
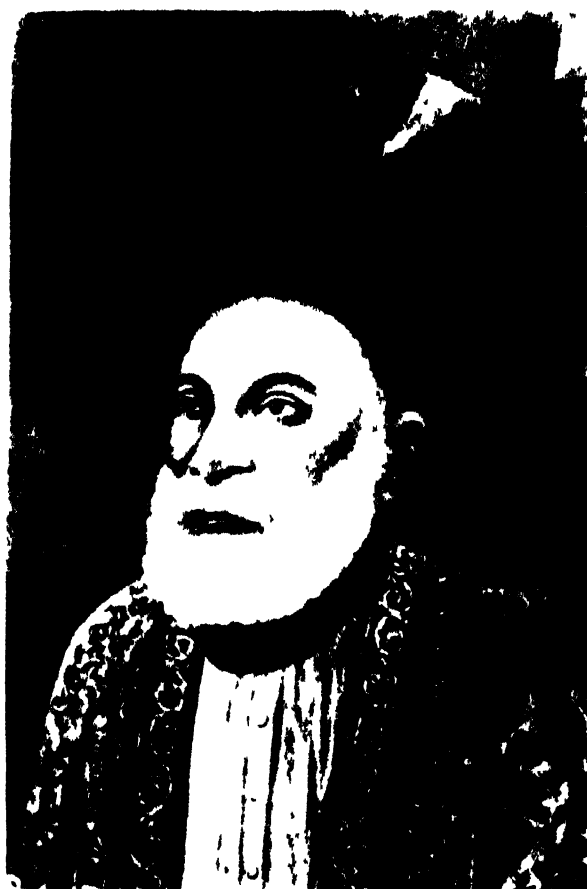
محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ مصنفہ رفتارِ خیال نے اس سال ایم اے کا امتحان کامیاب کرلیا ہے۔ اول الذکر نے تو درجہ اول کا بھی اعزاز حاصل کیا۔ حقیقت میں ان کی کامیابی نہ صرف عورتوں کے لئے بلکہ مردوں کے لئے بھی باعثِ صد رشک ہے قیام جامعہ سے اب تک اردو کا کوئی طالب علم ایم اے کے امتحان میں درجۂ اول میں کامیاب نہیں ہوا یہ سمجھا گیا تھا کہ اردو میں اول آنا ناممکن ہے لیکن ایک خاتون نے اس ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ ہم کس منہ سے کہیں کہ این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ ہم نہایت ہی خلوص کے ساتھ ان دو شاعرہ و انشا پرداز خواتین کی خدمت میں ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے ہیں اور توقع ہے کہ وہ اپنی تعلیمی مصروفیت سے فارغ ہو جانے کی وجہ سے اب پہلے سے زیادہ علمی و ادبی کاموں میں دلچسپی لیں گی اور اردو زبان و ادب کے لئے اپنے آپ کو کارآمد ثابت کریں گی۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو کو ایسے ہی ہونہاروں سے بڑی بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

اس مہینے میں ادارۂ ادبیات اردو نے دو نئی کتابیں روحِ غالب اور تاریخ گولکنڈہ شائع کی ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے خاص ذوق اور تحقیق سے اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کے سوانح حیات اور ان کے منظومات کے ادبی حصوں کو مرتب کیا ہے غالب کے متعلق بہت سی غلط باتیں مشہور ہو گئی تھیں اور ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کتاب میں نہایت سلیقہ اور خوبی کے ساتھ ان کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ غالب کی تصویر کے علاوہ ان کے خاندان اور ان کے سسرالی اعزہ کے شجرے بھی شریک ہیں جو پہلی مرتبہ شائع ہو رہے ہیں۔ اس کتاب کا پیش لفظ عالی جناب آنریبل نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم اے [illegible] صدر المہام تعلیمات و [illegible] جامعہ عثمانیہ نے تحریر فرمایا ہے۔ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور بالخصوص غالب کے پرستار اس کتاب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

گولکنڈہ نہ صرف سیاسی حیثیت سے دکن کی ریاستوں میں ممتاز رہا ہے بلکہ علم و ادب اور خصوصاً اردو زبان کا گہوارہ رہ چکا ہے جناب مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ نے کئی سال کی تحقیق اور مسلسل محنت کے بعد تاریخ گولکنڈہ تحریر فرمائی ہے۔ صاحب مصنف کو دکن کی تاریخ پر خاص عبور حاصل ہے اور تاریخ کی دنیا میں مستند مانے جاتے ہیں اس تاریخ کے مطالعہ کے بعد گولکنڈہ کی سیاسی، معاشرتی اور علمی و ادبی عظمت اور اہمیت واضح ہو جائے گی۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ ایک مفید اور بیش بہا کتاب ہے جو پہلی مرتبہ شائع ہو رہی ہے اگرچہ یہ کتاب عرصہ قبل چھپ کر تیار ہو چکی تھی اور سب رس میں اعلان بھی کیا جا چکا ہے لیکن تصویروں وغیرہ کی تیاری کی وجہ سے اس کی اشاعت میں چند ماہ کی تعویق ہو گئی

مطبوعات ادارہ اور سب رس کتاب گھر کی بالتصویر فہرست شائع کی گئی ہے۔ اخراجات ڈاک بھیجنے پر روانہ کی جا سکتی ہے۔ یہ فہرست بالکل نئے اصول پر مرتب کی گئی ہے۔

مئی کے پرچہ میں "مسولینی کی صحت" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ مضمون نگار کا اصل نام ام ستار ہے ہمایوں بخت غلطی سے شائع ہوا ہے براہ کرم ناظرین سب رس تصحیح فرمالیں

اس مہینے میں مولوی علی شبیر صاحب مددگار ہائی کورٹ کی انتقال کی وجہ سے علمی و ادبی کام کرنے والوں میں ایک کمی ہو گئی جس سے حیدرآباد کی علمی دنیا سوگوار ہے مرحوم کا تعلق اگرچہ دفتر سے تھا لیکن علمی ذوق نے انہیں تمام عمر خاموش رہنے نہ دیا ان کی اکثر تصانیف قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں وہ ایک اچھے شاعر اور صاحب ذوق انشا پرداز تھے خدا مرحوم کو اپنی آغوش رحمت میں جگہ دے ان کے پسماندگان خصوصاً حامد بن شبیر اور محسن بن شبیر کے ساتھ ہماری دلی ہمدردیاں شریک ہیں محسن بن شبیر صاحب بی اے ایل ایل بی ادارہ کے قدیم رکنوں سے ہیں اور ان کی کتاب یوسف سندی قید فرنگ میں ادارۂ ادبیات اردو کے مطبوعات میں شامل ہے

"ادارہ"

اُردو زبان کے بہی خواہوں سے

ضروری باتیں ـــــــــ اہم مسائل

خدا کا شکر ہے کہ اُردو کے مٹانے کے لئے جتنی زیادہ کوشش کی جارہی ہے اتنا ہی اُردو کو فروغ ہو رہا ہے اور اب تو اُردو کی عالمگیر قبولیت سے متاثر ہو کر مخالفین بھی دبی زبان سے اُردو کی اہمیت کا اقرار کرتے ہیں مگر یہ اقرار بربنائے ضرورت ضروری اور منافقت کا اقرار ہے اور سیاست کی دنیا میں ایسے "اقراروں" اور "وعدوں" کو پانی کے بلبلوں سے بھی کم ثبات اور تھوڑی زندگی حاصل ہوتی ہے۔ مخالفین اُردو کی ایک جماعت جو "قوم پرستی" "رواداری" اور "آزاد خیالی" کا غل پہنے ہوئے ہے، اعلان کر رہی ہے کہ "ہندوستانی" اور "ہندی" دونوں زبانیں ایک ہی ہیں اس لئے عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ "ناگری" کے الفاظ کو بھی ضرور جگہ ملنی چاہئے یعنی لعنت کو "سلھتا" تعلق کو "سمبندھ" اور ضرورت کو "آوا شکتا" کہنے سے "ہندوستانی" زبان پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ زبان کو اور وسعت حاصل ہوتی ہے یہ ایک ایسی گہری اور خطرناک چال ہے کہ اگر اس کا توڑ نہ کیا گیا تو اُردو زبان خصوصی طور پر "ناگری" بن کر رہ جائے گی اور وہ قلعہ جس کو کروڑوں انسانوں کی "لسانی ضروریات" نے تیار کیا ہے خود بخود گر پڑے گا۔

بظاہر تو یہ تجویز بہت زیادہ "روادارانہ" معلوم ہوتی ہے مگر اس تجویز کی گہرائیوں میں جانے سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو زبان کے لئے یہ تجویز انتہائی خطرناک اور تباہ کن ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بنی بنائی زبان کی بساط چند دن میں الٹ جائے گی اور جب "ناگری" اور "سنسکرت" کے الفاظ "ہندوستانی" میں داخل ہو جائیں گے تو مطالبہ کیا جائے گا کہ رسم الخط کو "ناگری" ہونا چاہئے کیونکہ "اردو رسم الخط" اب زبان کے الفاظ کے "اظہار" اور "ترجمانی" کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس وقت جب کہ اُردو زبان، واقعی طور پر مسخ ہو جائے گی، تو اس مطالبہ کی معقولیت سے کون انکار کر سکے گا؟

مخالفین اُردو کو دلائل و حقائق کے ساتھ سمجھانے بجھانے کا زمانہ نہیں رہا اور پھر سمجھایا تو اس کو جاتا ہے جو جانتا نہ ہو یا اس سے بھول چوک ہو گئی ہو، یہ لوگ تو ہر بات کی اونچ نیچ جانتے ہیں۔ اور خوب سوچ سمجھ کر ہی میدان میں آئے ہیں ان لوگوں کو معلوم ہے اور اچھی طرح معلوم ہے کہ اُردو زبان کے پھیلاؤ نے پورے ہندوستان کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ اور ایک چنڈال اور شودر سے لے کر اعلیٰ ذات کے برہمن تک سب کے سب اُردو بول رہے ہیں اُردو کی اسی قبولیت اور ہمہ گیری نے ان لوگوں کو اُردو کی مخالفت پر آمادہ کر دیا ہے، اور وہ "ناگری" زبان کو فروغ دینے اور اُردو کو مٹانے کے بعد "مہابھارت" کی تہذیب کو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ تو پھر جب ارادوں کی شدت اور گہرائی کا یہ عالم ہو، اس صورت میں ایسی ذہنیت کے لوگوں سے کہنا سننا بالکل بیکار ہے۔ اور وہ لوگ جو اس جماعت سے سمجھوتا کرنا چاہتے ہیں ان کی "سادہ لوحی" پر ہنسی کے ساتھ غصہ آتا ہے۔ سمجھوتا اور مصالحت ان دو فریقوں میں ہوتی ہے جن کے مقاصد میں کوئی چیز "قدر مشترک" کی حیثیت رکھتی ہو یہاں تو مقاصد میں اختلاف ہی اختلاف پایا جاتا ہے، ایک جماعت مشرق کی سمت جا رہی ہے اور دوسری مغرب کی طرف۔

قدم ہے کہ دنیا کی کوئی قوت مشرق اور مغرب کی دو مختلف سمتوں کو ایک سمت نہیں بنا سکتی' اب سمجھوتے کی یہی شکل ہے کہ دونوں جماعتیں ایک سمت اختیار کریں یعنی یہ "اپنی سمت" اور "اتفاق" کا مسئلہ ہی تو اختلاف کی بنیاد ہے' جو کسی طرح حل نہیں ہو سکتا۔

الفاظ نہیں قوت!

ہم اردو کے مخالفین کو برا نہیں کہتے۔ اردو اس لئے کہ ان کا ایک خاص پروگرام ہے جس کے تحت وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہے ہیں' ہر جماعت اور گروہ کو موقع ملنے پر اپنی ترقی اور بہبود کا حق حاصل ہے۔ جب ان لوگوں کو موقع ملا ہے تو وہ اپنے لئے ہاتھ پیر کیوں نہ ہلائیں؟ منطق و دلائل اور فلسفیانہ استدلال کا زمانہ گذر گیا اب تو زندگی صرف "قوت" کا نام ہے' دیکھتے نہیں ہو کہ ہٹلر اپنی قوم کی قوت کے بل بوتے پر وہ سب کچھ کر رہا ہے جس کے "نہ کرنے کی" اس سے ضمانت لی گئی تھی۔ ایک طرف تقریریں ہوتی ہیں حق دانستہ ان کی بھیک مانگی جاتی ہے' پرامن رہنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور دوسری طرف ان سب زبانی ہنگامہ آرائیوں کا جواب "عملی قوت" سے دیا جاتا ہے۔ اس وقت جب کہ سیاسی مصلحتوں پر لوگ غور کرتے ہوتے ہیں' ہٹلر اپنی فوج کے پھریروں کے سایہ میں کسی "مفتوحہ علاقہ" کے دارالسلطنت کے اسٹیج پر تقریر کرتا ہوتا ہے۔ زمانہ کے انقلاب نے سرخ حرفوں میں لکھ دیا ہے:-

"الفاظ نہیں قوت!" تو اب الفاظ سے کھیلنے کا وقت گذر گیا' وہ لوگ بڑے دھوکے میں ہیں جو خوش نما الفاظ کی چاردیواری میں بیٹھ کر اپنے کو محفوظ سمجھتے ہیں۔ مخالفین اردو کا اردو کے بہی خواہوں پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے سوتے ہوؤں کو نشتر چبھا کر جگا دیا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ لوگ جن کی زندگی' اخبارات و رسائل کے صفحات تک محدود تھی یا زیادہ سے زیادہ کسی ہال اور پنڈال میں ان کے الفاظ گونج پیدا کر دیا کرتے تھے اب میدان عمل میں آ گئے ہیں' اور ایثار و خلوص کے ساتھ اردو زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔ نام گنانے کی ضرورت نہیں ہے' ہر شخص جانتا اور سمجھتا ہے کہ کون کیا کر رہا ہے؟

ہندی الفاظ کا استعمال

اردو ادب کے بہی خواہوں کے جوش عمل کو دیکھ کر جس قدر خوشی ہوتی ہے اسی قدر یہ دیکھ کر رنج ہوتا ہے کہ جب سے "اردو ہندی" کا فتنہ برپا ہوا ہے اردو زبان کے بہت سے انشا پرداز' غیر محسوس طور پر اس تحریک سے متاثر ہو گئے ہیں اور وہ قصداً اپنے طرز نگارش کو سہل اور آسان بنانے کے لئے اردو کے مروجہ الفاظ کو چھوڑ کر "ہندی" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر یہ "ذہنی مرعوبیت" اردو ادب کے لئے نیک فال نہیں ہو سکتی' بلکہ اس سے بہت سی کمزوریوں اور پسپائیوں کے پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔ اس ذہنیت کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ اردو کی خدمت کر رہے ہیں اور ان کے اس طرز عمل سے زبان کو عام قبولیت حاصل ہوگی حالانکہ اس ذہنی انقلاب کے بعد انھوں نے اپنی شکست کا عملی طور پر اعتراف کر لیا ہے۔ اور عوام یہ سمجھ رہے ہیں کہ موجودہ اردو زبان میں واقعی "زبردست تبدیلی" کی ضرورت ہے میں اردو زبان کو "بادریا چی" اور "سبع معلقہ" بنانے کا حامی نہیں ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس بات کی بھی حمایت نہیں کر سکتا کہ مخالفین کی کوششوں اور پروپگنڈے سے متاثر ہو کر بنی بنائی زبان کو "کچھ اور" بنا دیا جائے میں نے بہت سے انشا پردازوں کے حالیہ مضامین کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ جن میں ان لوگوں نے اپنے اچھے خاصے طرز کو بدل کر ایک جدید طرز اختیار کرنے کی کوشش کی ہے' اس قسم کے مضامین اپنے پڑھنے والوں کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ قلم کی بے ساختگی اور روانی کا گلا گھونٹ کر

بالارادہ اور بالقصد نئی ترکیبیں اور الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تحریر میں بناوٹ پیدا ہو گئی اور زور بیان خاک میں مل گیا۔

ہم کو سب سے پہلے اس بات کا فیصلہ کرنا ہے کہ وہ ادب جس کو محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، پنڈت رتن ناتھ سرشار، سرسید احمد خاں، مولانا حالی، شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی، سید سلیمان ندوی اور مولوی عبدالحق وغیرہ حضرات کی کوششوں نے مل جل کر پروان چڑھایا ہے، کیا اس کو یکسر بدل دینے کی ضرورت ہے؟ اور اگر اس کی ضرورت ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں؟ اور اس تبدیلی کا ہماری زبان کے حال اور مستقبل پر کیا اثر پڑے گا بغیر سوچے سمجھے ہوا کے رخ پر بہہ جانا کمزوری کی دلیل ہے۔ اور پھر اہل قلم جو قوموں کی تقدیروں کے مالک ہوتے ہیں ان کو تو بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہئے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ بازار اور ریڈیو سے ایک آواز اٹھی اس کو سن کر آپ سہم گئے اور عقل کو "بدھی" محبت کو "پریم" اور خبر کو "سماچار" لکھنا شروع کر دیا۔ اگر ایسی آوازوں سے اہل قلم کی ذہنیتوں میں تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے تو پھر ایسے ادب اور ایسی زبان کا خدا ہی نگہبان ہے۔

آپ جو کچھ بولتے ہیں وہی لکھیئے! اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی نگارش کا کمال ہے۔ کسی خاص پروپگنڈے سے متاثر ہو کر یا کسی خاص ذہنیت کے افراد کو خوش کرنے کے لئے الفاظ کی بے ساختہ رو کا رخ نہ بدلیئے۔ ایسا کرنے سے اول تو آپ کی تحریر میں بناوٹ پیدا ہو جائے گی دوسرے آپ کی جرأت اور خود آگاہی کو صدمہ پہنچے گا۔

فرض کیجئے آپ کوئی مضمون لکھ رہے ہیں اور آپ کے قلم سے لفظ "غلطی" بے اختیار ٹپک رہا ہے مگر آپ زبان کو آسان بنانے کے خیال سے اور لوگوں کو خوش کرنے کے لئے "غلطی" کے بجائے "بھول یا چوک" لکھ دیتے ہیں، بس یہیں سے میرا اور آپ کا اختلاف شروع ہو جاتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کو میں "ذہنی مرعوبیت" سے تعبیر کرتا ہوں اور میرے خیال میں اردو زبان کے لئے یہ جذبہ "قاتل" بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر ہے۔
آپ بھول چوک سنسار گرو پرچار اور ایسے ہی دو چند الفاظ جو اردو زبان میں داخل ہو گئے ہیں ضرور استعمال کیجئے لیکن یہ نہ ہو کہ ان الفاظ کے پیچھے ان الفاظ کا استعمال آپ ترک کر دیں یا ان کا استعمال کرنا آپ پر بار ہو جائے جو اردو زبان میں گھل مل گئے ہیں۔ اسی طرح پڑھائی کو تعلیم کا اور سکھشا کو نصیحت کا بدل سمجھ کر آخر الذکر لفظوں کو چھوڑ دینا اردو زبان کی جڑ پر کلہاڑی چلانے کے برابر ہے۔

یہیں عوام سے نہیں بلکہ اہل قلم حضرات سے مخاطبت کر رہا ہوں، اس لئے یہ چند اشارات میرے خیال میں بہت کافی ہیں۔ اور تفکر اور ذہن دماغ اس اجمال سے بہت کچھ تفصیل پیدا کر سکتے ہیں۔

ہندی گیت دوسرا اہم مسئلہ ہندی گیتوں کا ہے جس پر خاص طور سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جب سے ہندی اردو کا جھگڑا پیدا ہوا ہے بہت سے شاعروں نے ہندی گیت لکھنا شروع کر دئے ہیں اور اس طرح وہ دونوں گروہوں میں مقبول ہونا چاہتے ہیں۔ فلموں اور ریکارڈوں نے شہرت کو بہت سستا کر دیا ہے، اس لئے بہت سے شاعر ہندی گیت اور ہندی کویتائیں لکھ کر شہرت کے مزے لوٹ رہے ہیں۔
میں ہندی گیتوں کا سرے سے مخالف نہیں ہوں، ہندوستانی موسیقی کے لئے گیتوں کی یقیناً ضرورت ہے لیکن "ضرورت" کی کچھ حدود ہونی چاہئیں۔ اور پھر بہت سے گیت تو اس قدر مشکل زبان میں کہے جاتے ہیں کہ اچھے خاصے ہندی پڑھے لکھوں کو ان کے سمجھنے میں مشکل ہوتی ہے۔ اب ریکارڈوں کے بازار میں اردو غزلوں کے بجائے ہندی گیتوں کی مانگ ہے۔ اور اس طرح اردو ادب کو غیر محسوس طریقہ پر نقصان پہونچ رہا ہے۔ اور مقام حیرت ہے کہ بڑے بڑے اردو کے بہی خواہ بھی نغموں کی شراب میں ملے ہوئے زہر کو گھونٹ گھونٹ کر کے پیتے چلے جا رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ میری اس بات کا اس وقت مذاق اڑایا جائے اور مجھ پر عصبیت اور جانب داری کی تہمت لگائی جائے لیکن میں جس طرح اپنی ہتھیلی کو دیکھ رہا ہوں، اسی طرح اردو غزل کا مستقبل میرے سامنے ہے۔ اگر گیتوں کی قبولیت کا یہی عالم رہا تو غزل کو عوام بھول جائیں گے۔ اور اس طرح اردو ادب کی قبولیت کو جو نقصان پہنچے گا اس کا اندازہ ہر شخص آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے۔

(ماہ اتحاد، ۶۔ ۶)

تجدیدِ حیات

سامنے تیرے جب افکار و حوادث آئیں گے — اور زمانے کی تجھے نیرنگیاں دکھلائیں گے
جب حجابات فریبِ رنگ و بو اٹھ جائیں گے — عہدِ رفتہ کے فسانے جب تجھے یاد آئیں گے
ساعتیں امید کی جب مختصر ہو جائیں گی — زندگی کی تلخیاں جب تلخ تر ہو جائیں گی
جب تو خود کو اس بھری دنیا میں تنہا پائے گا — جب ترا مایوس دل جینے سے اکتا جائے گا
چھین لی جائیں گی جب تجھ سے تری دلچسپیاں — پھیل جائیں گی ترے چاروں طرف تاریکیاں

وہ خلا ہو جائے گا دل میں ترے اے رازداں
پُر نہ کر پائے گی جس کو کائناتِ دو جہاں

میں کہ جس کی یاد تیری زندگی کا راز ہے — تیرے دل میں گرم جس سے بزمِ سوز و ساز؟
جس نے سلجھائی ہیں نظروں کو تکلم ریزیاں — چھین لی ہیں جس نے ہونٹوں سے تبسم ریزیاں

آؤں گا اور ایسی ہی تاریکیوں میں آؤں گا!!
میرے پیارے دوست!! تیری روح پر چھا جاؤں گا!!

جب بھیانک رات کی تاریکیاں چھا جائیں گی — تیرے دل میں میری باتوں کی صدائیں آئیں گی
جب شبِ مہتاب کی پریاں فلک پر گائیں گی — تیری نظریں چاند کے پہلو میں مجھ کو پائیں گی
شام کی دھندلی فضاؤں میں شفق کی سرخیاں — تجھ کو میری یاد میں لیجائیں گی جانے کہاں؟
گاہ انوارِ سحر میں مسکراتا آؤں گا! — گاہ ساون کی گھٹا میں گنگناتا آؤں گا

روزمرہ زندگی میں لاکھ حیلوں سے تجھے
یاد میری آئے گی۔ تو یاد آئے گا مجھے

لوٹ لوں گا تیرے قلب و روح کی افسردگی — بخش دوں گا پھر نئے سر سے نشاطِ زندگی
توڑ دوں گا پھر جمود و بے حسی کیفیات — پھونک دوں گا تیرے دل میں گرمی و زورِ حیات

مختصر یہ کہ تری دنیا جواں کر دوں گا میں!!
مضمحل جذبات میں پھر بجلیاں بھر دوں گا میں!!

آہ۔ او بیگانۂ اندیشۂ سود و زیاں — آہ۔ او بخشندۂ کیفِ حیاتِ جاوداں
اے خرابِ شوق۔ سازِ مضطرب کی کائنات — اے سراپا نور و نغمہ حاصلِ سوزِ حیات

میں ترے دل میں سکونِ زندگی بن جاؤں گا!!
تیرے چہرہ پر خوشی لب پر ہنسی بن جاؤں گا!!

صمد رضوی ساز

جیون ایک سپنا

شاہد ایک بوڑھا غریب جلاہا تھا۔ غربت کے ساتھ ساتھ اس میں یہ ایک بہت بڑا عیب تھا کہ وہ انتہا کا سست اور کاہل بھی تھا۔ کمبل بافی اس کا پیشہ تھا مگر اس کو ایک کمبل بننے کو مہینوں لگ جاتے، اور اس کے ساتھی کئی کئی کمبل بن کر ان کا ڈھیر لگا دیتے۔ یوں ہی ان کا جیون کٹتا رہا۔ زندگی کے گرم و سرد کا ہر ذائقہ اس کی زبان پر تھا مگر۔ غربت بڑی ہی سخت غربت میں اس کے دن کٹتے تھے۔ تاہم فطرتی کاہلی کیسے الگ ہو سکتی تھی گوشت سے ناخن کا جدا ہونا ممکن ہے مگر اس کا نہیں ——— اس کو نیند بڑی تھی۔ سنا تو پہروں سویا کرتا اٹھائے تک جنبش نہ ہوتی شاید قسمت بھی اس کو سوتا دیکھ کر سو رہی تھی کہ نہ یہ کروٹ لیتا نہ وہ ٹس سے مس ہوتی

دن، ہفتے، مہینے، سال یوں ہی گذرتے رہے۔ کئی تہوار آئے اور گئے۔ اس کے بدن پر چیتھڑا نہ تھا کوئی ترس کھا کر کچھ دے دیا اس نے کھا لیا۔ پہنا دیا، پہن لیا، تن من کی سدھ بدھ ہی نہ تھی۔ مانگنے کی زبوں عادت بھی نہ تھی بلا کا غیور خود دار تھا۔ اسی سے سب سمجھتے تھے کہ اس کے پاس انبوہ دولت ہے مگر خرچ نہیں کرتا۔

ایک دن یہ کسی گہری سوچ میں بیٹھا ہوا تھا کہ کوئی شخص اچانک گھوڑے پر سے کود پڑا دیکھا جتنے جلاہے ہیں سب کام میں لگے ہیں اور یہ بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ اس سے دیکھا نہ گیا اس نے کڑک کر کہا "میاں اٹھو اونگھتے کیا ہو؟ یہ اونگھنے کا وقت ہے؟ یہ لو یہ سوت ہے اس کا میرے لئے آج شام تک ایک کمبل تو بن دو" شاہد نے بوکھلا کر اس کو دیکھا۔ اور بس دیکھتا ہی رہ جاتا اگر اس کا تازیانہ اس کی درشتیٔ کلام سے بڑھ کر سر نہ توڑتا "اچنبھے کی کون سی بات ہے کیا تمہارے ساتھی کئی کئی کمبل بن بن کر شام تک ان کا انبار نہیں لگا دیتے۔ پھر میں نے ایسی کیا کوئی نادر فرمائش کی تھی؟" شاہد نے ایک اندازِ استغنا سے اس کا سوت لیا۔ اور بے نیازی کی شان سے بنانے میں مشغول ہو گیا سکندر نے کہا "ہو بھی سنو تمہارا نام شاہد ہے نا؟" "ہاں ہے تو سہی، پھر تمہیں کیا کہنا ہے شاہد سے؟" "یہی کہ اگر وہ میرا کمبل شام تک تیار کر دے تو اس کو دوگنی قیمت دوں، بلکہ وہ جو مانگے" "مگر یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے" شاہد اب بوڑھا ہو گیا اور کارِ زمانہ نے اس کو کہیں کا نہ رکھا اعضا نے سب جواب دے دیا۔ اس میں کہاں ہمت کہ پوچھو! وہ تانا! سکندر اب ماننے والی کہاں تھی وہ تو سینے پر سوار ہو کر جیسے مونگ دلنے لگا اور بیٹھ ہی گیا یہ تہیہ کر کے کہ کمبل لے کر ہی اٹھے ع یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید۔

شاہد نے جان توڑ کوشش شروع کی وجہ یہ کہ وہ جبر و قدر کے مسئلہ کا قائل تھا اس نے دنیا بہت دیکھی تھی۔ اور اس کے سارے ہتکنڈوں سے واقف تھا۔ وہ ایک ماہر فن کمبل باف تھا مگر واقعہ یہ ہے کہ کاہلی اور پیرِ ضعیفی نے اس کو نکما کر دیا تھا قریب بڑے سے پیالے میں قہوہ دھرا تھا جس پر ایک کاڑھی سی دھری تھی جس سے تھوڑی تھوڑی دیر سے وہ قہوہ پیتا جاتا تھا قریب آتش دان میں آگ سلگ رہی تھی جب قہوہ ٹھنڈا ہو جاتا اس پر گرم کر لیتا۔ سکندر نے سگار کا ایک کش پیتے ہوئے،

تیوری پر بل ڈالے منہ بنا کے آخر کہہ دیا "اگر تمہاری یہی رٹ ہے تو میں تمہارے ساتھ دور بھی تیار تو نہیں تھا" اس نے
کہا "آپ تو تین بات سے دوں تو لیں ہے نا؟" "اگر مجھے تو آج شام تک چاہئے۔ بس نواب تیار ہے اور تمہاری سرکار
سے وہ نکل جائے گی۔ خوب" مگر اس بحث کا فیصلہ آخر صبح ہی ہو رہا۔ شاہد چپ رہا۔ ایک انگڑائی اور اس کے ساتھ ہی جما
ہائی لیتے ہوئے شاہد نے کہا "اگر تھوڑی دیر تاب ہے تو ہم سو کر اٹھنے کی اجازت دے دو تو صبح میں بتا دوں گا وہ پھرتی
پر سلوں گا۔ مجھے غضب کی نیند آرہی ہے۔ ہاتھ پیر ڈھیلے ہوئے جاتے ہیں کہ نیند کے مارے مجھ سے ادھر آنے کی طرح
معلوم ہوتا ہے۔ بس اجازت ہو جاؤں؟

سکندر نے بڑی متانت سے سر ہلایا یعنی الفاظ میں اس کی تشریح یہ کہ اجازت دیتے ہی بنے گی۔ اب بیٹھا اونگھنے
ونکھنے کا بہانہ۔ شاہد خواب خرگوش میں بے جا پڑ رہا۔

سکندر بیٹھا ہوا اپنے مستقبل پر غور کر رہا تھا وہ بھی زمانہ کا تانا ہوا ایک بدنصیب سپاہی تھا جس نے بھرنے تک
جس کا سارا کنبہ ٹکڑوں کو محتاج ہو گیا تھا۔ اس کے ذرے ذرے سے نت نئے بھوت پیاس سے بلک بلک کر سن کی دنیا
میں جان پیارا کرتے تھے۔ اس کی ضعیف ماں کی زندگی کا یہی سہارا تھا۔ غرض اس فلک زدہ کو آج یہاں بند ہونا تھا۔
اس کو یہ وہ نیند نہ آتی تھی۔ بوڑھے شاہد کی نیند پر اس کو رشک ہو رہا تھا تھوڑے کا وہ لنبا دیوانہ تھا۔ مرنے کے مقابلہ
میں کسی کی بھی پروا نہ کی۔ سکندر کو یہ حسرت سوہان روح تھی کہ اے کاش ایسی ایک نیند مجھے بھی آجائے۔ وہ میری
راتیں اور میرے دن تو تخیل کی بستی بنانے اور پھر انھیں اجاڑنے میں بسر ہو جاتے ہیں۔ وہ یہی بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اس نے
دیکھا سوتے ہوئے شاہد کے منہ سے ایک سیاہ چھوٹا سا سانپ نکلا اور چلا اس نے اس کو دیکھا تو اس کے ہوش
جاتے رہے۔ اس کو یہ خیال ہوا مالک جانے یہ کس قسم کا انسان ہے جس کے منہ سے ایسے خوفناک زہریلے جانور نکلتے ہیں
اور پھر یہ زندہ بھی ہے۔ خیر۔ دیکھوں تو کیا ہونے والا ہے" دنیا کے نشیب و فراز انسان کو صابر اور خاموش بنا دیتے ہیں
سکندر بھی انھیں طوفان زدہ ہستیوں میں سے تھا جو کسی خلاف توقع حادثہ پر ایک دم پریشان نہیں ہو جاتے بلکہ ہر مسئلہ
پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں۔ اس نے کیا دیکھا؟ وہ سانپ نکلا اور چلا۔ اس کی نہوود کی پیالی جو ابسر د ہو چکی تھی
اس پر وہ چڑھ گیا پھر اس لکڑی کے ٹکڑے پر سے گذرتے ہوئے اس پار اتر گیا اور اس کمرہ کی منزل کو طے
کرتے کرتے ایک سوراخ میں گھس گیا پھر تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے نکلا اور اسی راستہ سے جیسے گیا تھا واپس آ گیا
پھر اسی شاہد کے منہ میں داخل ہو گیا۔ اب تو سکندر کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے۔ مگر اس کا کام تو دیکھنا تھا
اور خاموشی کے ساتھ دیکھنا۔ سانپ کا داخل ہی ہونا تھا کہ شاہد نے ایک انگڑائی لی اور آنکھیں کھول دیں انھیں
ملتے ہوئے سکندر کو گھور گھور کر دیکھنے لگا " ارے تم ابھی بیٹھے ہی ہوئے ہو؟ میں نے تو خوب لمبا سفر کیا۔" "تم نے
سفر کیا؟" سکندر نے چیں بر جبیں ہوتے ہوئے پوچھا " ہاں اور نہیں تو کیا جھوٹ موٹ مزے سے کہہ دیا ہے؟ اف۔
میں کیا بتاؤں تمھیں کہ میں نے کیا کیا دیکھا۔ ادھر میری آنکھیں بند ہوئیں اور ادھر میں گھر سے نکلا۔ ایک چٹیل میدان
میں میرا گذر ہوا۔ چلتے چلتے ایک بڑی چٹان سد سکندری بن کر حائل ہو گئی۔ لیکن میں اس پر بھی چڑھ گیا وہاں

دیکھتا کیا ہوں کہ ایک بڑا عمیق دریا حائل ہے اور اس پر ایک چوبی فصیل بنی ہوئی ہے۔ میں نے ہمت نہیں ہاری اور اس فصیل کو بھی طے کر کے دریا کو عبور کر لیا۔ اور پھر اس کے اس پار نکل گیا۔ وہاں بھی وہی لق و دق صحرا ملا اور میں چلتا گیا۔ چلتے چلتے بہت دور نکل گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ چڑیاں گھونسلوں میں سرگرداں تھیں مغرب میں آفتاب ایک دہکتے ہوئے تانبے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ دیہات کے جھونپڑوں سے دھواں نکل رہا تھا اور بہت دور وہ آتش فشاں اپنی آگ اگل رہا تھا۔ مجھے سر چھپانے کو کوئی مقام نہ ملا۔ میں بہت تھک گیا تھا۔ خیر میں نے اسی دیہاتی سرحد میں ایک جگہ شب بسر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہاں قدم رکھتا ہوں تو تاریکی کا سناٹا ہے روشنی کا کہیں نام نہیں لیکن فرش زمین پر جدھر دیکھوں لعل و جواہر پڑے جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ جیسے جواہرات کی روشنی میں میں نے یہ جواہرات دیکھے۔ جیسے کسی سانپ نے اپنا من وہاں اگل دیا ہے اور اس نے وہ تمام نور بنا دیا ہے اتنا کہ آنکھیں ان کے نظارے سے خیرہ ہوئی جاتی تھیں وہ تو کہا ہے نا کسی نے "بعض منظر ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی طرف دیکھنے کا نام ہے مر جانا" بس۔ میں نے بھی کچھ ایسا ہی دیکھا مگر مجھے یاد نہیں کب ہوا۔ میں نے جب سب کچھ دیکھ لیا تو پھر مجھے تمہارے محل کا خیال آیا۔ اور الٹے پھر اسی راستے سے گھر لوٹ گیا۔ اب دیکھوں تو نہ وہ جگہ دکھائی دیتا، نہ وہ آتش فشاں پہاڑ ہے۔ ہاں یہ آتش دان ضرور یہاں رکھا ہے۔ نہ وہ لعل و جواہر ہی ہیں غالباً میں نے کوئی خواب دیکھا ہے جس کی تعبیر تم مجھے بتا سکتے ہو؟ سکندر نے اس کیفیت کا خوب مطالعہ کیا تھا۔ اس کی تعبیر بھی اس سے پوچھی مگر چپ رہنا اس کا فطری شیوہ تھا۔ اس نے کہا "چلو اپنا کام کرو۔ میں کوئی ایسی طاقت نہیں رکھتا کہ تمہیں اس کی تعبیر دے سکوں۔ اس کی تعبیر یہی ہے کہ تم محنت و مشقت کرو گے تو تمہیں لعل و جواہر مل جائیں گے" بوڑھا شاہ بن سا منہ لئے ہوئے پھر کام میں مشغول ہو گیا۔ سکندر بیٹھا ہوا ہوائی قلعے بنا رہا ہے۔ اس کی فکر کی انتہا نہیں ہے۔ ایک نظر خوش آئند مستقبل اس کے پیش نظر ہے۔ وہ نت نئے منصوبے بنا رہا ہے۔ نت نئے خیال دل میں آ رہے تھے یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ کمبل کا کچھ ذرا سا حصہ باقی ہے اور صبح ہونے تک یہ حصہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ وہ تیار شدہ کمبل اس کے ہاتھوں میں دے دیتا ہے۔ بلکہ ایک گرانمایہ دولت اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ سکندر نے اپنی تلوار کے دستے سے اس جگہ کی زمین کھودنی شروع کر دی جہاں وہ سانپ جا کر باہر نکل آیا تھا۔ کھودنے کے تمام صدموں سے اس بوسیدہ مکان کی چھت گر کر ایک ساعت چشم زدن میں نیچے آ رہی۔ شاہ نے جب یہ حالت دیکھی تو دم بخود سا ہو گیا اس کی گھگی بندھ گئی۔ وہ سوچتا تھا کہ شاید اس میں بھی خدا کی کوئی مصلحت ہے۔ مگر میرے مکان کا تو یہ حشر ہوا اب میں کہاں رہوں گا۔ یہ سوچ رہا تھا اور سکندر اپنا کام کئے جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک زبردست جواہر کا زبردست دفینہ نکل آیا۔ جس میں کون سا پتھر تھا جو نہیں تھا۔ بیش بہا جواہرات کا ایک ڈھیر تھا کہ لگا ہوا تھا۔ شاہ بکا بکا کھڑا رہ گیا۔ اس نے پوچھا تو بس یہی "میاں صاحبزادے یہ کیا؟"

سکندر نے وہی شان استغنا سے مسکرا کر جواب دیا

تمہارے خواب کی تعبیر

جہاں بانو بیگم

شیراز دکن میں

عمائدین دکن میں نواب نصرت الملک کو پرندوں کے پالنے اور ان کی لڑائی دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ ہزاروں روپے اس شوق پر خرچ ہوتے تھے۔ ملک میں فراغت اور خوش حالی کا دور تھا، امراء کی ریس میں متوسطین اور عوام بھی کچھ ایسے ہی اشغال میں مشغول تھے سارے شہر حیدرآباد میں جا بجا پھیلیاں قائم تھیں، کہیں بلبل لڑائے جاتے کہیں تیتر بٹیر کہیں مرغ اور کہیں (مینا کے) لال

نصرت الملک کی دیوڑھی کیا تھی اچھا خاصہ "چڑیا خانہ" تھا، ایک حصہ بازبحری کے لئے مخصوص تھا دوسرا مرغوں کے لئے تیسرا تیتر بٹیر اور لال مینا کے لئے اور ایک عمارت کی عمارت بلبلوں کے لئے وقف تھی جسے "بلبلستان" کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ یہاں بیٹھ کر نواب صاحب بلبلوں اور دوسرے جانوروں کی لڑائی کا تماشا دیکھتے تھے۔ بلبلستان میں جدھر نگاہ اٹھائیے پنجرے ہی پنجرے دکھائی دیتے تھے باقاعدہ چکلسوں کے علاوہ کھونٹیوں پر بھی بلبل سوار تھے جن کی نغمہ کاریوں کے طفیل میں گھر سارا گلزار و چمن زار ہو رہا تھا۔

بیچارے پھولوں کے عاشق قید ہو کر جرم عشق کی سزا بھگت رہے تھے مگر جوش رقابت کم نہ ہوا تھا، آٹھوں پہر آپس میں لڑنے مرنے پر تلے رہتے تھے شاید اسی لئے ایک دوسرے سے دور پیٹیوں میں کسے چکلسوں یا کھونٹیوں سے بندھے پڑے تھے لڑائی کی انھیں اوقات مقررہ پر باضابطہ مشق کرائی جاتی تھی۔ سدھانے کی خدمت پر متعدد مشاق آدمی مامور تھے اور ان سب کی نگرانی کے لئے ایک "استاد" جو نہ صرف آدمیوں کو ہدایت دیتے، جانوروں کی دیکھ بھال کرتے ان کے علاج معالجہ کے ذمہ دار ہوتے بلکہ پھیلیوں کا انتظام کرتے اور جانوروں کو اہتمام کے ساتھ لڑاتے تھے

دولھے خاں استاد اس عہد میں بہت مشہور تھے۔ معمولی دوا درمن کے علاوہ انھیں ایسے ایسے نادر نسخے یاد تھے کہ جن کے استعمال سے مرتا ہوا بلبل بھی ایک دفعہ بڑے بڑے کر یچوں سے لڑ جاتا۔ وہ بلبل کو اس طرح تیار کرتے تھے کہ معمولی معمولی قسم کا بلبل دوسروں کے سدھے سدھائے معرکہ جھیلے ہوئے اعلیٰ قسم کے بلبلوں کو دم میں مار لیتا۔ اسی وجہ سے نواب نصرت الملک ان کی بڑی ناز برداری کرتے علاوہ تنخواہ کے انعام و اکرام بھی استاد کو بہت کچھ ملا کرتا تھا۔

یوں تو دولھے خاں نے بہت سارے بلبل تیار کئے لیکن "شیراز" پر اُن کو بڑا ناز تھا۔ ہر چند کہ وہ کوئی بڑی راس کا بلبل نہ تھا منجھولا ہی تھا، مگر آنگ کا سخت تلی پنجہ کا مضبوط، انگلی پر اونچا ہو کر باز کی سی شان سے بیٹھتا تھا۔ دولھے خاں کسی کو اسے ہاتھ لگانے نہ دیتے، اس کی ساری خدمتیں خود ہی انجام دے لیتے اولاد سے زیادہ اسے چاہتے تھے۔ نواب کو بھی شیراز نہایت عزیز تھا، اس کی لڑائی بہت پسند کرتے تھے۔

انھیں دنوں راجہ رام پرشاد کو بھی بلبل بازی کا بڑا شوق ہو گیا تھا۔ جاگیر کی آمدنی کا بڑا حصہ اور کاروباری حصوں کا منافع سب اسی شوق کی نذر ہو جاتا۔ بڑی بڑی تنخواہوں پر استاد مامور تھے۔ مگر باایں ہمہ

نصرت الملک کے مقابل راجہ کو کبھی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ بات یہہ تھی کہ جب کبھی نواب کے دو چار بلبل مار کھا جاتے پہیلی ہارنے کی نوبت آتی اور فتح کا پلہ راجہ کی طرف جھکتا دکھائی دیتا دولھے خاں شیراز کو لے آتے اور شیراز تو بس شیراز ہی تھا' اس کی تیز چونچ ولایتی قینچی کی طرح چلتی تھی۔ اس نے بارہا اپنے سے بڑے بڑے بلبلوں کو دم سے لے کر پیٹ تک چیر ڈالا تھا۔ اسی کی یہی وہ مخصوص پینچ تھی جس پر دولھے خاں کو ناز تھا۔ وہ حکم دیتے تھے اور بلبل برابر ان کی آواز پر کام کرتا تھا۔

شیراز کی ٹکر کا کوئی بلبل راجہ کے پاس نہ تھا۔ انھوں نے سیکڑوں عمدہ سے عمدہ بلبل تیار کرائے بھاری بھاری قیمتوں پر سدھے سدھائے بلبل خریدے لیکن جب مقابلہ ہوا شیراز ایک ایک کر کے ان سب کو ہڑپ کر گیا بار بار کی شکست سے راجہ رام پرشاد بہت کبیدہ خاطر تھے استادوں پر غصہ ہوتے' جرمانے کرتے تنخواہ روک دیتے' مگر کیا فائدہ؟ دولھے خاں کی جوڑ کا ملک میں ایک استاد بھی نہ تھا' تاہم وہ لوگ برابر کوششیں کرتے ہزارہا بلبلوں میں سے چن چن کر بلبل نکال لاتے' اسے سدھاتے اپنی ہی پہیلی میں بیسیوں بلبلوں سے لڑا لڑا کر مشق کراتے' طرح طرح کے نسخوں سے قوت دار بناتے تب کہیں راجہ سے عرض کرتے کہ "ان داتا! اب یہہ بلبل شیراز کو مارنے کے قابل ہوا ہے" مگر جب مقابلہ پڑتا تو ناکامی کے سوا اور کچھ نہ ملتا۔

ایک دن اتفاق سے راجہ کی پہیلی میں ایک شخص شیخ جی نامی وارد ہوا' بلبل اس کے ہاتھ پر تھا۔ دیر تک بلبلوں کی لڑائی اور استادوں کی منہ مندی دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ کر راجہ سے عرض کی "ذرا میرے اس بلبل کا کمال بھی ملاحظہ کیجئے' راجہ سمجھے بیچنے کو لایا ہے' بلبل کو دیکھا پسند تو آیا مگر ان کے پاس اس سے اچھے اچھے کئی بلبل موجود تھے پوچھا "اس میں کیا کمال ہے؟" کہا "لڑائی میں ظاہر ہوگا" راجہ نے اشارہ کیا فوراً ایک بلبل مقابلے کے لئے لایا گیا۔ دونوں کا سامنے اور منہ سے منہ ملانے میں شیخ جی کے بلبل نے مقابل کی زبان پکڑ لی اور اس بری طرح جھنجوڑا کہ بلبل پٹ پٹ بولے بغیر ہی بھاگ گیا۔ دوسرا بلبل لایا گیا۔ اس کا بھی وہی حشر ہوا' تیسرا بلبل جو آیا پہیلی کی ناک تھا' شیخ جی کے بلبل نے اس کی بھی زبان کھینچ ڈالی۔ اب تو راجہ کو یقین ہوگیا کہ یہ بلبل شیراز کو ضرور مارے گا دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے قیمت دریافت کی تو شیخ جی نے بیچنے سے انکار کیا بڑی سے بڑی قیمت لگائی تھوڑی بہت منت بھی کی مگر شیخ جی راضی نہ ہوئے۔ ان کی عمر بھر کی ریاضت یہی ایک بلبل تھا کہنے لگے "کیا میں اپنے بچے کو بیچ ڈالوں؟ نا صاحب یہ تو مجھ سے کبھی نہ ہوگا۔ اوہو! کس محنت سے میں نے "کالے پہاڑ" کو تیار کیا ہے؟ آپ کی قدردانی اور شوق کو دیکھ کر اس کا کمال دکھلا دیا۔ بیچنا مقصود نہ تھا" راجہ کو ایک تدبیر سوجھی کہنے لگے "خیر! تو پھر ایک کام کرو آج ہمارے یہاں ٹھیر جاؤ' کل جمعہ ہے ہمارے بلبل نصرت الملک کی پہیلی میں لڑیں گے تم ہمارے ساتھ چلو۔ اگر اس بلبل نے ان کے شیراز کو مار لیا تو سو روپے انعام ہم سے لو اور اپنا بلبل آپ لے جاؤ۔ شیخ جی راضی ہو گئے۔

جمعہ کے دن' خوشی خوشی مصاحبین اور استادوں سمیت سوار ہو کر راجہ صاحب نصرت الملک کی کوٹھی پہنچے یہاں بلبلستان کے وسیع دالانوں میں سفید چاندنی کا فرش کیا ہوا تھا' گاؤ تکیے دیواروں سے لگے تھے صدر میں

سرخ مخمل کی مسند بچھی تھی جس پر نواب نصرت الملک بڑے کروفر سے متمکن تھے مصاحبین جلوس، دوست احباب
اور تماشائی، اپنے بائیں ہر دو جانب تکیوں سے لگے بیٹھے تھے، حقے پان سے سب کی تواضع ہو رہی تھی۔ مسند کے
پہلو میں نواب صاحب کے خاصے کا نقرئی پاندان اور اگالدان رکھا تھا سامنے بیدری کام کی خوش وضع نفیس مٹک
دھری تھی جس کے عطر میں بسے ہوئے نیچے کا دھواں نکل نکل کر محفل کو معطر کر رہا تھا۔ ملازمین پگڑیاں باندھے کمر بستے
ادب کے ساتھ کھمبوں سے لگے کھڑے تھے۔ گزشتہ جمعہ کے ذکر اذکار ہو رہے تھے۔

راجہ کو دیکھا تو نواب صاحب تلوار ٹیک کر سر و قد تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے ان کے ساتھ ہی محفل کی محفل
کھڑی ہو گئی، پرتپاک ملاقات ہوئی راجہ کو نواب نے مسند پر جگہ دی رسمی مدارات کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں
گھڑیال نے ٹن ٹن دو بجائے تو لڑائی کا اہتمام شروع ہوا۔ بلبل جمع ہو چکے تو مسند کے سامنے جوڑیں پھڑکنے لگیں۔
پہلی جوڑ میں راجہ کا بلبل کامیاب رہا دوسری میں نواب کا، تیسری جوڑ سے رنگ بدلا چھٹی جوڑ تک برابر راجہ کے بلبل
مارتے رہے۔ ہار کے آثار دیکھ کر نواب نے دولھے خاں پر ایک معنی خیز نظر ڈالی دولھے خاں شکست کو فتح سے
بدلنے کا نسخہ جانتے تھے، اپنی جگہ سے اٹھے اور شیراز کو انگلی پر بٹھا لائے مجمع کی آنکھیں انھیں کی طرف لگی ہوئی تھیں
لوگ شیراز کی لڑائی دیکھنے کے مشتاق تھے۔

راجہ خود شیراز کی آمد کا آج بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ دولھے خاں کو دیکھتے ہی انھوں نے شیخ جی کو
اشارہ کیا شیخ جی کالے پہاڑ کو لے کر آگے بڑھے۔ دولھے خاں شیخ جی کی گھاتوں سے ناواقف، بڑے اطمینان سے
ڈوریاں کسانے لگے جب بلبلوں کو منہ سے منہ ملا کر گوندھا بتلایا تو فطرتاً دونوں جانوروں نے اپنی اپنی چونچ کھول دی،
پر پھیلا دئے اور بازوؤں کو جنبش دے دے کر لگے "پلپلیاں" کرنے۔ اسے دولھے خاں کی غفلت کہئے یا شیخ جی کی
ہوشیاری، بلبل جب گتھ کر فرش پر گرے تو شیراز کی زبان کالے پہاڑ کے منہ میں تھی اب شیراز تھا اور زبان چھڑانے
کی کوششیں کیا کیا نہ کیا؟ پنجے مارے، پھڑکا، اڑا گرا مگر کالا پہاڑ بھی بلا کا تھا نہ چھوڑنا تھا نہ چھوڑا زبان کو چونچ میں
دبائے بیٹھا تھا، چبائے جاتا تھا، جھنجھوڑے ڈالتا تھا۔ فرش پر دونوں گتھم گتھا پڑے تھے۔

نواب کی حالت متغیر ہونے لگی، لوگ انھیں حیرت سے تکنے لگے! کسی کو کیا خبر؟ شیراز کی زبان نہ تھی نواب کا
دل کالے پہاڑ کی چونچ میں تھا۔ دولھے خاں کا کلیجہ حلق کو آ رہا تھا یا زبان چھڑانے کا کوئی نسخہ انھیں یاد نہ تھا۔
اس کش مکش میں شیراز کی زبان کھنچ کر باہر نکل آئی تھی۔ بے جان سا ہو گیا۔

راجہ سے رہا نہ گیا مارے خوشی کے چیخ اٹھے " واہ رے کالے پہاڑ! کیا اچھی جگہ کاٹا!! دشمن کی زبان کھینچ لی ہے
زبان!"۔ نواب کے تیور بگڑ گئے چہرہ لال بھبوکا ہو گیا، آنکھیں انگارہ بن گئیں، تلوار زانوؤں پر رکھ لی، اور جھومنے لگے۔
جو لوگ ان کے مزاج سے واقف تھے سمجھ گئے کہ شیراز اگر ختم ہو گیا تو جانوں کی خیر نہیں ان کے ایک عزیز قریب تھرا
اٹھے متصل کمرے میں گھس کر مصلیٰ بچھایا ہاتھ اٹھا اٹھا کر لگے دعائیں مانگنے۔
ادھر شیراز کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے مردے کی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا جو لوگ اس کی پچھلی لڑائیاں

سب ہی
دیکھتے ہوئے تھے اس کی حالت پر ہاتھ مل رہے تھے کہ "افسوس کیسا نایاب بلبل تباہ ہوا ہے! ارے ظالم! کیا اس کی زبان اکھیڑ ہی لے گا۔ دیکھو تو! چھوڑتا ہی نہیں" اس قسم کی ہمدردیاں راجا کو بری معلوم ہونے لگیں نیلے پیلے ہو گئے کہنے لگے "یہ طرفداریاں کیسی! اس وقت کسی کو برا نہیں لگا جب اسی جانور نے دوسروں کے سینے چیر چیر ڈالے۔ آج یہ اس کی سزا پا رہا ہے۔ کوئی کیا جانے ہمارے کیسے کیسے چہیتے بلبل اس موذی نے کتر ڈالے" لوگ چپ چاپ تماشا دیکھنے لگے۔

کالے پہاڑ نے نہ جانے کس زور سے کاٹا شیراز تڑپ گیا اور تڑپ کے زور سے گرا۔ جب دونوں نیچے گرے تو لوگوں نے دیکھا کہ شیراز کالے پہاڑ کو دبوچے بیٹھا ہے۔ ایک پنجہ دشمن کے سینے پر ہے دوسرا اس کے دونوں پاؤں میں الجھا ہوا۔ زبان منہ کے باہر لٹک رہی ہے۔ بعض دیکھنے والے کانا پھوسی کرنے لگے۔ "وہ بٹ بولوں کے اڑ جاتا اگر یہ کالا پہاڑ اپنے پنجوں سے اس کی ٹانگ پکڑ نہ لیتا"۔

دولھے خاں نے آواز دی "دیکھ بیٹا! دشمن تیرے نیچے ہیں ہے۔ اب نہ چھوڑنا"۔ شیراز نے آواز سنی حکم کو بھی ناطر کیا مگر زبان جو پونچ کے باہر نکلی پڑی تھی کاٹتا ہے تو کٹتی ہی جاتی ہے۔ گردن آسمان کی طرف اٹھا کر چونچ کھول دی گویا کاٹنے سے عاجز ہونے کی شکایت کر رہا ہے۔ دیکھنے والوں کے دل تڑپ گئے دولھے خاں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔ تھوڑی دیر تک بلبل مدہوش سا بیٹھا رہا پھر یہ معلوم ہوا گویا کوشش کر کے کوئی چیز حلق سے اتار رہا ہے۔ لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے سکوت کا ایک عالم طاری تھا۔

"لو! وہ تو اپنی زبان کو نگل رہا ہے"

ایک ہلکی سی آواز تھی جو دولھے خاں کے منہ سے نکلی حقیقتاً بلبل اپنی زبان کو لونڈے کی طرح نگل جانے کی کوشش کر رہا تھا "بہادر پرندا" اس نے کہا اور اس کے گرم آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ نواب کی سانس زور زور سے چلنے لگی شیراز کی لٹکی ہوئی زبان آہستہ آہستہ چھوٹی ہونے لگی۔

"شاباش! شاباش! ایسا ایسا۔ ہاں ہاں۔ یہ ہے نا" دولھے خاں نے کہا اور زبان غائب ہو گئی! کالا پہاڑ پھڑکا ساتھ ہی شیراز کی چونچ دشمن کی لالی میں گڑ گئی۔ کالا پہاڑ فرش پر لوٹ رہا تھا۔ نواب کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔

"چیں چیں چیں" کالا پہاڑ چلانے لگا۔ راجا بے چین سے ہونے "واہ رے شیراز!" نواب کے وزیر نے کہا "کیا بڑی جگہ کاٹا"۔ "سرکار!" دولھے خاں بول اٹھے "میں نے اس کو سکھلایا ہے"۔ نواب مسکرانے لگے فرمایا دولھے خاں "اگر فتحمند ہوا تو اس کا انعام آزادی اور تمہارے لئے پانچ سو روپے" سفید چاندنی پر خون کی چھینٹیں پڑنے لگیں۔
"چیں چیں چیں" اور کالا پہاڑ خاموش ہو گیا۔ "چیر ڈالا! چیر ڈالا!" راجا نے پکارا "ظالم کی چونچ میں نشتر ہے"۔ "قینچی ہے قینچی" دولھے خاں بولے۔ لوگوں نے دیکھا کہ شیراز نے ہمیشہ کے موافق دشمن کو دم سے لے کر سینے تک چیر ڈالا "سرکار انعام" دولھے خاں بولے۔ نواب نے خزانچی کی طرف دیکھا "کچھ پروا نہیں" راجا نے کہا "بار میری نہیں ہوئی" نواب متعجب ہوئے، مجمع حیرت سے دیکھنے لگا۔ شیخ جی آنکھیں پونچھتے ہوئے آگے بڑھے "خداوند نعمت" انھوں نے

روتے ہوئے کہا "کالا پہاڑ میرا تھا، میرا بچہ" شیخ جی کی گھگی بندھ گئی، نواب افسوس کرنے لگے جیب میں ہاتھ ڈالا پانچ اشرفیاں نکال کر دیں، کہا "جانے دو غم نہ کرو، جو ہونا تھا ہو چکا" راجا آگے بڑھے سو روپے کی ایک تھیلی شیخ جی کی طرف بڑھائی، شیخ جی نے منہ پھیر لیا "بابا، یہ کاہے کا انعام ہے؟" کہتے ہوئے چلے گئے۔

بھّ رر (شیراز کے پروں کی آواز) "پٹ پڑوں، پٹ پڑوں" (زخمی زبان سے ظالم انسان کا شکریہ!)

نقی رضوی

آہ اور واہ

اے کشمکشِ الفت جی سخت پریشاں ہے — مرنے کی بھی حسرت ہے جینے کا بھی ارماں ہے
ساحل سے نہیں لگتی غرقاب نہیں ہوتی — کشتی ہے تھپیڑوں میں، یہ بھی کوئی طوفاں ہے
میں کیا مری الفت کیا تو اور مجھے پوچھے! — بس اے ستم آرا بس، حسرت ہے نہ ارماں ہے
یہ موجِ تبسم کیا ظالم، اسے دھو دے گی — جو رنگ پشیمانی چہرہ سے نمایاں ہے
مغرورِ محبت ہوں خود میری نگاہوں میں — یہ بے سروسامانی رازِ سروساماں ہے
اس حسنِ مجسم کی شرمیلی اداؤں کا — احساس محبت بھی شرمندۂ احساں ہے

منظور اسے رخصت کس دل سے کروں کا میں
دھڑکا ہے یہی ہر دم جب سے کہ وہ مہماں ہے

۲

نازِ بتِ مہوش پر قربان دل و جاں ہے — یہ شان خدا شاہد غارت گر ایماں ہے
جو بات بھی ہے پیاری جو چال بھی ہے اچھی — آن اس کی نہیں مخفی شان اس کی نمایاں ہے
ہمراہ چلوں اس کے کچھ بات کروں اس سے — مدت سے یہ حسرت ہے مدت سے یہ ارماں ہے
وہ مجھ کو دکھاتے ہیں ہر آن نیا جلوہ — میرے لئے ہر جلوہ سرمایۂ عرفاں ہے
گردابِ حوادث میں خوش ہوں کہ مری کشتی — نادیدۂ ساحل ہے پروردۂ طوفاں ہے
ہنستا ہوا آیا ہے ہنس ہنس کے رلائے گا — وہ عہد شکن پھر اب آمادۂ پیماں ہے

منظور اسے دل دینا دل دے کے خلش لینا
یہ بھی کوئی حسرت ہے یہ بھی کوئی ارماں ہے

علی منظور

عورت

تاریخ عالم پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی تمدن کا ارتقاء کچھ اس طرح ہوا کہ تھوڑا زمانہ بھی نہ گزرا تھا کہ بود و باش کی روش، کاروبار کا انداز، تقسیم کار کا رویہ کچھ اس طور سے چلا کہ مرد تمدن پر حاوی ہوگیا اور چونکہ بعض ایسے کام اس کے ہاتھ میں تھے جس سے اس کو خطرات کا سامنا کرنا پڑا، سنسان اور ہیبت ناک جنگلوں میں درندوں کا مقابلہ کرنا پڑا اس لئے ہیبت اس میں اس طرح غالب آئی کہ اس نے تمام دنیا کو مغلوب کرنے کی خواہش میں اپنی رفیقِ حیات یعنی عورت کو بھی مغلوب کرکے رکھنا چاہا جتنے معاشرت اور تمدن کے اصول بنے وہ سب مردوں کو غالب اور عورتوں کو مغلوب بنانے والے تھے۔ رومی تہذیب میں جس کا اتنا راگ گایا جاتا ہے عورت پر بھروسہ نہیں کیا جاتا تھا چنانچہ اس کا مشہور شاعر ورجل اس کو متلون مزاج کم درجے کی چیز بتاتا ہے۔ یونانی تہذیب میں بھی عورت قابل اعتبار نہ سمجھی جاتی تھی اور یونان کا مشہور فلاسفر سقراط کہتا ہے کہ "عورت کو ایک دفعہ مرد کے برابر تسلیم کرلو پھر دیکھو کہ وہ کس طرح تمہارے سر چڑھتی ہے۔"

چین میں عورت کی حیثیت کا اندازہ کنفیوشش کے اس قول سے ہوتا ہے کہ "عورت کا جو قدم آگے بڑھ جائے اس کو واپس لے آنا شاید قدرت کے بس میں بھی نہیں رہتا"۔ بنی اسرائیل میں یہ حالت تھی کہ مریم کی والدہ نے منت مانی تھی کہ ان کے یہاں جو بچہ پیدا ہوگا وہ اسے ہیکل مقدس میں بطور نذر پیش کردیں گی۔ مگر جب لڑکی پیدا ہوئی تو وہ بہت غمگین ہوئیں کہ اسے مقدس معبد میں کس طرح لے جائیں۔ توریت کے ماننے والوں میں عورت ایک ملکیت سمجھی جاتی تھی جو دیگر جائداد کی طرح سے ورثہ میں تقسیم ہوتی تھی۔ بائبل نے بھی عورت کو نہیں سراہا ہے۔ اور اس کی رو سے صرف لڑکی کو اس وقت تھوڑا سا حق جائداد میں سے مل سکتا ہے جب کہ کوئی اولاد ذکور نہ ہو۔ لیکن اب جہاں تک ہندوستانی عیسائی عورتوں کا تعلق ہے ان کے سامنے اپنا کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے ان کی وراثت وغیرہ کے قانون جو حکومت نے بنادئے ہیں اس سے ان کو کافی حق مل جاتا ہے۔ تعلیم کا بھی کافی انتظام ہے اور ان میں تعلیم پورے طور پر جاری ہے۔ شادی بیاہ بھی وہ اپنے پسند سے کرتی ہیں۔ اور اپنی اقتصادی حالت درست کرنے میں بھی ان کو کسی روایات کا سامنا نہیں کرنا ہے اور ان میں سے اکثر دفتروں اور دکانوں میں نظر آتی ہیں۔

بدھ مذہب میں عورت کو ایک گھناؤنی چیز سمجھ کر اس سے الگ رہنے کی تلقین کی گئی تھی لیکن اب جہاں جہاں بدھ مذہب کا اقتدار ہے وہاں نئی تہذیب کے اصول کا دور دورہ ہے اور عورت بہت کچھ آزاد ہے۔ ہندو مذہب کے ابتدائی وید کے زمانے میں تو عورت کی حالت زبوں نہ تھی مگر جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اس پر بندشیں بڑھتی گئیں۔ یہاں تک منو شاستر کے رو سے عورت کی حیثیت اتنی گر گئی کہ مال اسباب اور جان میں سے کسی چیز کے لئے اس کا اپنا کہنا غیر ممکن ہوگیا۔ اور آج بھی وہ کسی مال کو اپنی قطعی ملکیت نہیں کہہ سکتی اور تو اور اس کے مذہبی اعمال اور نیکیاں بھی مرد سے وابستہ ہیں۔ یہی نہیں بلکہ عقد بیوگان ممنوع ہوگیا۔ ان میں تعلیم بند ہوگئی اور ذات پات کے آغاز کے ساتھ ساتھ بڑی ذات والی عورتیں حدود و قیود میں رہنے لگیں یا یوں کہئے کہ مقفل ہوگئیں ٹھیک اسی طرح جیسے یونانی عورتیں قدیم زمانہ میں مکانوں میں بند رکھی جاتی تھیں۔

عرب میں ظہورِ اسلام سے قبل عورت کی جو حالت تھی قرآن میں اس طرح بیان کی گئی ہے "جب ان میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی تھی تو اس کا چہرہ غم سے سیاہ پڑجاتا تھا اور اس خبر کو شرم کے مارے اپنی قوم سے چھپانے کی کوشش کرتا تھا اور وہ سوچتا تھا کہ اس ذلت کو برداشت کرے یا اس لڑکی کو زمین میں گاڑدے" (النحل) چنانچہ واقعہ ہے کہ بعض خاندانوں میں لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ ہندوستان میں بھی بعض اطراف میں چھتریوں اور برہمنوں میں پہلے ہوتا تھا۔ اسلام نے عرب کی یہ حالت دیکھ کر حکم دیا کہ" خدا جسے چاہتا ہے لڑکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکی دیتا ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے" اور اس طرح اس رسم کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اور انھیں مذہب، معاشرت سیاست اور زندگی کے ہر شعبہ میں مردوں کے دوش بدوش لاکر کھڑا کر دیا۔ ان کے سارے حقوق بھی متعین کر دیئے۔ قرآن میں ہے" مردوں کی طرح عورتوں کے بھی پسندیدہ حقوق ہیں" (البقر) قرآن کی ایک اور آیت ہے" عورت جو خود کمائے اس کی ملکیت ہے"

وراثت میں اس طرح تعین کیا گیا کہ عورت کو اپنی ماں کی طرف سے اور اپنے باپ کی طرف سے اور اپنے شوہر کی طرف سے ترکہ کا مستقل حقِ ملکیت دیا گیا ہے اور اس ملکیت پر کسی قسم کے قیود عائد نہیں کئے گئے۔ جس طرح وراثت اور ترکے میں لڑکے کا حق مقرر کیا اسی طرح لڑکی کا بھی باپ کی جائداد میں بیٹی کا حصہ جو کم رکھا گیا اس کی تلافی شوہر کی جائداد سے دلاکر پوری کر دی اور یوں بھی شوہر کو تمام اخراجات کا کفیل بنا دیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ" عورت و مرد کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عورت مرد کے لئے لباس و زینت ہے اور مرد عورت کے لئے"۔ نکاحِ بیوگاں محض جائز نہیں قرار دیا گیا بلکہ اس کا حکم دیا گیا۔ عورت کی تعلیم کے لئے یہی حکم ہوا جو مرد کے لئے حدیث میں ہے کہ" علم کا حاصل کرنا ہر مرد و عورت دونوں پر فرض ہے۔ نکاح میں دونوں کو اپنا جوڑا منتخب کرنے کی صلاح دی گئی ہے"۔ لیکن اسلامی تعلیمات جو کچھ رہی ہوں امتدادِ زمانہ اور دیگر اثرات سے وہ پس پشت ڈال دی گئیں اور بعض اسلامی فرقوں میں عورتوں کو جائداد پر حقوق نہیں ملتے۔ حال میں مرکزی اسمبلی میں ایک قانون ایسا پاس کیا گیا ہے جس کی رو سے اب ان کو زمینداری اور کاشتکاری کے علاوہ باقی جائداد اور مال اسباب مع حقوق دلا دئیے گئے ہیں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ زمینداری وغیرہ میں وہ کیوں محروم رکھی گئیں ان کے ساتھ اور بھی طرح طرح کے قیود لگے ہوئے ہیں جن کو جزو مذہب بنا لیا گیا ہے ہم ہندوستانیوں کو کیا کہیں جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کا وہ خطۂ مغربی جو انسانی آزادی کا دم بھرتا ہے اور آج تہذیب و تمدن کا مسکن سمجھا جاتا ہے۔ وہاں بھی عورت پچھلے زمانہ میں کچھ بہتر نہ تھی اور آج بھی وہ ایک آزاد شخصیت اور مکمل شہری حقوق رکھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ انگلستان فرانس اور جرمنی کو دیکھئے تو ان کے قدیم قوانینِ وراثت میں عورت کا حصہ جائداد غیر منقولہ میں مطلق نہ تھا اور اینگلوسکسن زمانہ میں یعنی آج سے صرف دو صدی پیشتر یہ محسوس کیا گیا تھا کہ کسی حد تک بعض قیود کے ساتھ جائداد میں عورت کو حصہ دینے کی ضرورت ہے ابھی ڈیڑھ سو سال پیشتر تک انگلستان میں عورت کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ اپنی طرف سے کوئی معاہدہ کر سکے۔

مغربی تمدن عہدِ الزبتھ میں اوجِ کمال پر تھا اس عہد کا آئینہ دار مشہور زمانہ شکسپیر عورت کے متعلق کہتا ہے کہ" عورت ایک نازک ترین شیطان ہے جسے آج تک کوئی نہ سمجھ سکا" اسی ملک کا ایک اور مشہور شاعر بائرن کہتا ہے کہ" عورت قدرت کا ایک خوبصورت ترین عیب ہے" آج بھی مغرب میں باوجود اس قدر ترقی کے عورت شادی کے بعد اپنے تمام حقوقِ ملکیت کھو بیٹھتی ہے

اور اپنا خاندانی نام تک باقی نہیں رکھ سکتی۔ بلکہ شوہر کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ اس کی تقلید ہندوستانی بھی کر رہے ہیں۔ غرض کہ دور ماضی میں جو بندشیں عورتوں کے لئے رکھی گئی تھیں اور جس طرح مرد اپنے غلبہ سے انھیں محکوم و مظلوم بنائے ہوئے تھے اس کا اثر آج تک موجود ہے۔

کہتے ہیں کہ جب قومیں زیادہ دبائی جاتی ہیں تو ایک وقت وہ ضرور ابھرتی ہیں۔ بالکل یہی صورت عورتوں کی ہو رہی ہے دنیا میں کسی طبقے کے ساتھ اتنی بے انصافی نہیں ہوئی جتنی عورتوں کے ساتھ۔ ان کے بود و باش کے طریقے انوکھے بنائے گئے۔ ان کی زندگی نرالی کر دی گئی۔ معاشرتی نشوونما کا ان کے لئے سدباب ہو گیا تعلیم و تعلم سے وہ محروم رکھی گئیں۔ معاشی آزادی سلب کر لی گئی تو کیا عجب ہے کہ اب عورتوں میں بھی بیداری دوڑ گئی ہے اور وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے تیار ہو گئی ہیں اور ان کی ایک اچھی خاصی تعداد ہندوستان کے ہر حصے میں پائی جاتی ہے جو اپنے طبقے کو بیدار کرنے میں مصروف ہے اور طرح طرح کی معاشرتی اور ملکی خدمتیں کر رہی ہے۔ مسلم عورتیں اب بھی بہت پیچھے ہیں حالانکہ اگر اپنے مذہب کی تقلید کرتیں تو انھیں پیچھے رہنے کی کوئی وجہ نہ تھی یہ حال گزشتہ دسمبر میں پٹنہ میں بیگم حبیب اللہ اور بیگم وسیم کی ایک تحریک سے مسلم عورتوں کا ایک بڑا قدم آگے بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ تمام مسلم عورتوں کی سیاسی انجمنیں آل انڈیا اور صوبجاتی اور ہر ضلع میں قائم کرنا چاہتی ہیں۔ اگر وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئیں تو وہ وقت دور نہیں کہ مسلم عورتیں مردوں کے دوش بدوش ملک کو آگے بڑھانے میں معین و مددگار ثابت ہوں گی۔ انگلستان کی عورتیں جو سیاست میں آئی ہیں یعنی جنھیں ووٹ دینے کا حق ہے وہ زیادہ تر قدامت پرست پارٹی کے ساتھ ہیں۔ لیکن ہندو عورتیں جو اب تک میدان سیاست میں آئی ہیں انھوں نے اپنے وسعت قلب و بلند نظری کا ثبوت دیا ہے امید ہے کہ مسلمان عورتیں بھی اس کا ثبوت دیں گی اپنے حقوق کی حفاظت میں بھی ہندو اور مسلمان عورتیں کافی حصہ لے رہی ہیں ہندوستان کے جدید آئین میں انھیں ووٹ دینے کا اور نیز مجالس آئین ساز کے ممبر ہونے کا حق بہت کچھ دے دیا گیا ہے۔ عقد بیوگان کی بھی تحریک جاری ہے اور ایک نئے قانون کے ذریعے ہندو بیوگان کو جائداد پر بھی کچھ حق دے دیا گیا ہے۔ لڑکیاں بھی اپنے حق وراثت کے لئے صدائے احتجاج بلند کر رہی ہیں۔ نئی نسل کی سب لڑکیاں تعلیم سے مزین کی جا رہی ہیں اور شادی بیاہ میں ان کا مشورہ لازمی سمجھا جانے لگا ہے۔ ان کو اپنی اقتصادی کمزوریوں کا بے حد احساس ہو گیا ہے۔ اور وہ رفتہ رفتہ ان تمام موانع کو دور کر رہی ہیں جو ان کی ترقی میں سد راہ ہیں۔ آج ہمارے قومی ارتقا میں صرف ایک بازو کام کر رہا ہے مگر دنیا کی کشمکش ہم کو آہستہ آہستہ یہ سبق دے رہی ہے کہ ہمیں عنقریب اپنے دونوں بازوؤں سے کام بنانا ہے۔

نجم الدین احمد جعفری (الہ آباد)

اللہ تعالیٰ اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے " انک لعلیٰ خلق عظیم " خود زبان معجز بیان آنحضرتؐ شاہد ہے کہ
بعثت لاتمم مکارم الاخلاق حسب آیۂ کریمہ آپ کی تخلیق بھی خلق عظیم پر ہوئی ہے۔ اور بموجب حدیث قدسی آپ
مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث فرمائے گئے ہیں آپ نے اپنی مبارک زندگی کے ایک ایک شعبہ بچپن، جوانی
بڑھاپے میں خلوت جلوت میں، رزم بزم میں مجلس انس میں، میدان جنگ میں اپنے قول سے اپنے عمل سے بنا دیا کہ
خلق عظیم کی تفسیر کیا ہے اور کامل انسانیت کسے کہتے ہیں۔

حضور انورؐ کی ذات اقدس تمام صفات عالیہ اور اخلاق حسنہ کی جامع تھی۔ دوست تو دوست دشمن بھی آپ کے
اوصاف حمیدہ کے مداح و معترف تھے۔ نوعمری ہی میں آنحضرتؐ کی یہ شخصیت تھی کہ اکابر عرب اہم معاملات میں آپ کو
حکم مقرر کرتے تھے۔ خانۂ کعبہ کی مرمت کے موقع پر جب حجر اسود کے اٹھانے کے لئے اہل مکہ میں باہم اختلاف ہوا تو سب
آپ کی طرف رجوع ہوئے اور آپ کے فیصلہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا

راستبازی اور دیانت داری اس درجے پہونچی ہوئی تھی کہ قبل نبوت بھی آپؐ اپنی قوم میں صادق اور امین کے
لقب سے ملقب تھے بعد نبوت بھی باوجود شدید مخالفت کے اعدائے دین کو آپ پر اس قدر اعتماد تھا کہ اپنی امانتیں
آپؐ کے پاس رکھواتے تھے۔ چنانچہ بوقت ہجرت آنحضرت صلعم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو مکہ میں بلکہ دشمنوں میں
اسی لئے چھوڑ دیا کہ وہ امانتیں مالکوں کو پہنچا دیں۔

اعلائے کلمۃ الحق میں یہ ثابت قدمی کہ سرداران قریش نے ہر چند مال و دولت، حکومت سلطنت کا لالچ
دلایا حضرت ابوطالب کے ذریعے عدم تعاون کی دھمکیاں دیں لیکن آنجنابؐ نے نہایت استقلال سے جواب دیا "اگر میرے
دہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ دیں تو اس فرض سے جو اللہ تعالیٰ نے میرے ذمہ کیا ہے
باز نہیں آ سکتا۔"

ثبات و استقامت کی یہ شان کہ گوناگوں مصائب برداشت کئے لیکن تبلیغ دین برحق میں برابر سرگرم رہے
شجاعت و دلیری کا یہ عالم تھا کہ ہر خطرناک موقع پر پہلے پہنچ جاتے تھے غزوہ احد و حنین میں جب کہ لشکر اسلام، کفار
کی یورش سے منتشر ہو گیا اور صرف دو چار جاں نثار ہم رکاب رہ گئے پیشوائے دو عالم برابر آگے بڑھتے اور پکار پکار کر
فرماتے رہے "میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں جھوٹا نہیں۔"

حلم و تحمل اس حد پر پہنچا ہوا تھا کہ کوئی آپ کے ساتھ کیسا ہی نازیبا سلوک کرتا ابروئے مبارک پر بل بھی نہ پڑتا
ہر سخت و درشت بات کا از حد نرمی سے جواب دیتے

ایک مرتبہ ایک یہودی نے السلام علیکم کے بجائے آپ کو السام علیکم کہا۔ بی بی عائشہؓ نے ناراض ہو کر وہی فقرہ دہرایا تو حضرت نے فرمایا عائشہؓ اللہ کا ایک نام رفیق ہے وہ رفق و نرمی کو پسند کرتا ہے۔ اسی طرح ایک اور واقعہ ہے کہ ایک یہودی نے اپنے قرضہ کے مطالبہ میں آپ کو اتنی دیر روکے رکھا کہ آپ نے پانچوں وقت کی نماز وہیں ادا کی اس تشدد پر صحابہ کرام بے تاب و بے قرار تھے لیکن حضور کی پیشانی انور پر شکن تک نہ تھی حلم و تحمل کی یہ شان دیکھ کر یہودی صدق دل سے کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ حضرت کے رحم و عفو کا یہ درجہ تھا کہ فتح مکہ کے بعد سرداران قریش نگوں سار حاضر ہوئے یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے آپ کو ستانے اور دین مبین کے مٹانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا آپ کے راستے میں کانٹے بچھانے نماز پڑھتے وقت طرح طرح کی اذیتیں دیتے پتھروں کی بوچھار کرتے یہاں تک کہ جان کے درپے ہو گئے۔ عزیز وطن چھڑایا غریب الوطنی میں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا کبھی خود لشکر لے چڑھ دوڑتے کبھی دشمنوں سے سازباز کر فتنہ و فساد برپا کر دیتے لیکن رحمۃ للعالمین کا ارشاد ہوا۔ آج تم مجھ سے کس سلوک کی امید رکھتے ہو قریش جو شان عفو کے مظاہرے بارہا دیکھ چکے ہیں تو یہی ہو کر عرض کرتے ہیں آپ کریم ہیں۔ کریم کے بیٹے ہیں ارشاد ہوتا ہے لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم وھو ارحم الراحمین (آج کے دن تم پر کوئی مواخذہ نہیں اللہ تم کو معاف کرے وہ بڑا رحم والا ہے) آنحضرتؐ سراپا جود و کرم تھے کبھی کسی سائل کا سوال رد نہ فرمایا خود بھوکے رہتے اور بھوکوں کو سیر کرتے ایک وقت نوے ہزار درہم ایک نشست میں تقسیم کر دئے اور خالی ہاتھ اٹھ کھڑے ہوئے ؎

صدقے ترے اے دست گہر بار محمدؐ

خلق خدا پر شفقت و رقت کا یہ حال تھا کہ کبھی آپ نے ظالموں کے حق میں بھی دعائے بد نہ فرمائی۔ تیروں کی بارش۔ پتھروں کی بوچھار میں زبان فیض ترجمان پر جاری رہتا "اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون" (اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے وہ جانتے نہیں) سرور عالم کسی کی تکلیف گوارا نہ فرماتے اگر نماز میں کسی بچے کے رونے کی آواز سنتے تو نماز کو جلد ختم فرما دیتے کہ اس کی ماں کہیں جماعت میں شریک نہ ہو حضرت جبل بن معاذ کو نماز جماعت میں طویل قراءت کی ممانعت اس لئے فرمائی۔ نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ صحابہ کو حکم تھا کہ راتوں کو ذکر الٰہی بہ آہستگی کریں تاکہ ہمسایوں کے خواب راحت میں خلل نہ پڑے۔

اہل و عیال کے ساتھ حسن سلوک کی یہ کیفیت تھی کہ باوجود کئی بیبیوں کے سب کے راحت و آرام کا خیال رکھتے اور ان کے حقوق برابر ادا کرتے گھر کے کاروبار میں بنفس نفیس حصہ لیتے اولاد کے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آتے جب آپ کی صاحبزادی بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا حاضر خدمت ہوتیں تو آپ فرط محبت سے کھڑے ہو جاتے تھے بچوں کی ذرا ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جاتے اور ہر طرح ان کی ناز برداری کرتے۔

خادموں کے ساتھ آپ کا برتاؤ ایسا تھا کہ مالک بن انسؓ کہتے تھے میں آٹھ سال کی عمر سے اٹھارہ سال تک خدمت مبارک میں رہا۔ اس اثنا میں ایک دفعہ بھی یہ نہ فرمایا کہ تو نے یہ کام کیوں کیا کیوں نہ کیا حضرت زید بن حارثؓ

جو بی بی خدیجہ کے غلام تھے ایک شریف خاندان سے تھے جب ان کے والد کو خبر لگی تو بیٹے کی آزادی کے واسطے زر فدیہ لے کر حاضر حضور ہوئے آقائے دو جہاں نے تو پہلے ہی آزاد کر دیا تھا روپیہ واپس کر کے نہایت خوشی کے ساتھ انھیں جانے کی اجازت عطا فرمائی لیکن ؎

ہوں گرفتار الفت صیاد
گرچہ باقی ہے طاقت پرواز

کے مصداق تھے ہرگز باپ کے ساتھ جانے پر رضامند نہ ہوئے اور گھر کی آزادی پر آپ کی غلامی کو ترجیح دی۔

تواضع و انکسار آپ کے مزاج میں ایسا تھا کہ مجلس میں جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے مسکین کی عیادت کو جاتے غلام کی دعوت قبول کرتے صحابہ کے ساتھ خود کام کرتے کبھی مسجد نبوی کی تعمیر کے لئے پتھر ڈھوتے اور کبھی کدال لئے خندق کھودنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ شرم و حیا کا یہ عالم تھا کہ مسائل دینی بھی کنایتہً سمجھاتے تھے۔ کبھی ناشائستہ الفاظ سے زبان مبارک آلودہ نہ فرمائی اگر کسی شخص سے کوئی ناروا حرکت سرزد ہوتی نصیحت کے وقت اس کا نام نہ لیتے تاکہ وہ شرمندہ نہ ہو حضور کے عدل و انصاف کی یہ اہمیت تھی کہ مدینہ کے یہودی جو شب و روز آپ کی مخالفت کرتے رہتے تھے آپ کو اپنا جج بناتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک یہودی اور مسلمان میں نزاع ہوئی آپ نے فیصلہ یہودی کے حق میں کیا اور مسلمان کو زیادتی کرنے پر تنبیہ کی۔

ایک اور روایت ہے کہ ایک قریشیہ عورت چوری کے جرم میں ماخوذ ہوئی بعد ثبوت آپ نے شرعی حکم صادر فرمایا عمائد قریش نے سزا کو اپنے لئے عار سمجھ کر صحابہ کبار سے سفارش کروائی آپ نے فرمایا خدا گواہ ہے احکام شرعی سے فاطمہ بنت رسول بھی بری نہیں کی جا سکتی سرور کائنات کے بے دعوی کی یہ کیفیت تھی کہ آخر زمانے میں جب کہ کل ملک عرب بلکہ سرحد شام و عراق بھی آپ کے زیر نگیں ہے۔ جو کی روٹی کھاتے ہیں بوریا بچھونا ہے اور کمبل اوڑھنا۔ بی بی عائشہ سے مروی ہے ایک ایک مہینہ تک ہمارے گھر چولہا نہ سلگتا تھا صرف کھجور اور بکری کے دودھ پر بسر ہوتی بعض وقت رسول اللہ پر تین تین وقت کا فاقہ گذر جاتا تھا۔

عبادت اور ریاضت میں یہ سرگرمی کہ تمام تمام رات نماز میں قیام فرماتے یہاں تک کہ پائے مبارک ورم کر جاتے تھے۔ اپنے حبیب کی جفاکشی پر دریائے رحمت جوش میں آتا ہے حکم ہوتا ہے "یا ایھا المزمل قم اللیل الا قلیل"

حقیقت یہ ہے کہ وہ ذات پاک اخلاق حسنہ اور کمالات انسانی کی جامع ہے۔ ہر موقع پر اس کی خوبیوں کا پرتو نظر آتا ہے مشکلات و مصائب میں صبر و ثبات، تحمل و استقلال تسلیم و رضا کا جلوہ ہے اور نصرت و کامیابی کے وقت شکر و عطا، جود و سخا، عفو و کرم کا نور چمک رہا ہے۔

ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی
یا ایھا الذین امنو صلو علیہ وسلمو تسلیما

رابعہ بیگم

دیوانے کی داستان

کریم نوجوان تھا۔ صورت شکل سے شرافت کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن اس کی ہیئت کذائی اور عجیب و غریب حرکات کی وجہ سے لوگ اسے "دیوانہ کریم" کہہ کر پکارتے تھے۔ جہاں کہیں غریب کریم کھڑا ہوا نظر آتا تو لوگ اس کی دیوانہ حرکات کے متعلق آپس میں اشارے کرتے۔ جوان اور بوڑھے اس کا مذاق اڑاتے اور بچے اس کو دیوانہ کہہ کر ستایا کرتے تھے۔ مگر کریم کی دیوانگی دوسرے دیوانوں سے بالکل جدا تھی۔ وہ عوام کی ان ستم ظریفیوں کی کچھ پرواہ نہ کرتا نہ ان پر کسی قسم کا غصہ کرتا۔ بلکہ خاموشی سے ہر چیز برداشت کرتا تھا۔ نہ معلوم کیا بات تھی کہ مجھے کریم سے ایک خاص قسم کی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی جوانی اور زندگی کو یوں تباہ و برباد ہوتے ہوئے دیکھ کر میں بے حد مغموم ہوتا تھا۔ ہمیشہ میرا دل یہ چاہتا تھا کہ میں کریم کی زندگی کے ان تغیرات کے اسباب سے واقف ہو جاؤں کیونکہ کچھ زمانہ پیشتر کریم دیوانہ نہ تھا۔

غرض میں موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔ علانیہ راہ پر کریم سے گفتگو کرنے کے لئے میری طبیعت جھجکتی تھی اور میں اس کو مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

اس کے بعد کریم مجھے پھر نظر نہ آیا۔ میں اس کی وجہ سے تشویش میں پڑ گیا لیکن تقریباً ایک ماہ کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ "دلکش ٹاکیز" میں "غریب کی قسمت عرف محبت کا نتیجہ" کا پہلا روز تھا۔ مجھے سینما سے چنداں دلچسپی نہیں لیکن فلم کے نام میں کچھ ایسی خاص کشش تھی کہ میں وہاں جانے کے لئے مجبور ہو گیا۔ اس کے شروع ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ تمام سینما ہال تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ لوگ ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑ رہے تھے۔ میں دور کھڑا انتظار کر رہا تھا کہ مجمع کم ہو تو ٹکٹ خریدوں۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ دیوانہ کریم بھی ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے کوشش کر رہا ہے مگر ایسے موقع پر غریب کریم کو معمولی درجہ کا ٹکٹ کیا ملتا۔ غرض تماشائی ٹکٹ حاصل کر کے سینما ہال میں داخل ہو چکے تھے۔ لیکن کریم حسرت بھری نگاہوں سے سینما ہال کے دروازوں کو تک رہا تھا۔

میں جیسا کہ کہہ چکا ہوں۔ کریم سے گفتگو کرنے کے موقع کی تلاش میں تھا چنانچہ میرے نزدیک یہ بہترین موقع تھا۔ کیونکہ کھیل شروع ہو جانے کی وجہ سے سینما گھر میں کامل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں کریم کے نزدیک گیا اور اس کو مخاطب کیا۔ شروع شروع میں تو کریم بالکل خاموش رہا اور میرے سوالوں کے جواب میں تھنڈی سانسیں بھرنا شروع کیا اس کی یہ حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کریم متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور کہنے لگا "دوست میری داستان زندگی سن کر تم ملول و غمگین ہوں گے بہتر ہے کہ تم اس کو نہ سنو۔" میں نے اب تک نہ سنی اور برابر اصرار کرتا رہا۔ کریم مجبور ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اس کے ہونٹ تھرانے لگے، پھر اس نے کہا "دوست جب تم میری دکھ بھری داستان سننے کے لئے اس قدر مضطرب ہو تو سنو۔

"سنو دوست میں ایک متوسط درجہ کے شریف گھرانے کا فرد ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ تم میرے خاندان سے واقف ہو لیکن میں اپنے والدین کا نام تم کو بتلانا پسند نہیں کرتا اس لئے تم اس کے متعلق سوالات کر کے مجھے شرمندہ نہ کرو۔ لوگ مجھے دیوانہ

سمجھتے ہیں اور طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں مگر دوست میرے احساسات اس قدر مردہ ہو گئے ہیں کہ میں ان کی باتوں کی مطلق پرواہ نہیں کرتا۔ ان کی زندگی ہنسی خوشی سے معمور ہے اس لئے وہ مجھ دکھ درد بھرے پر ہنس رہے ہیں۔ میری زندگی سراپا رنج وغم ہونے کی وجہ سے اور اپنی مجبوری کی وجہ سے میں اس دکھ درد کو برداشت کرنے کا تنہا ذمہ دار ہوں۔ لوگ مجھ پر آوازے کستے ہیں' دیوانہ کہتے ہیں' کنکر اور پتھر سے مجھے اپنا نشانہ بناتے ہیں لیکن پھر بھی میں خاموش رہتا ہوں۔

دوست حقیقت میں میں بڑا بدقسمت ہوں۔ میں اپنے والدین کا ایک ہی بیٹا ہوں' میرے والدین نے مجھے بڑے ناز ونعم سے پالا مگر بدقسمتی دیکھئے کہ میں ابھی دس سال کا ہی تھا کہ میری والدہ اس دنیا سے چل بسیں۔ میرے والد نے میری ہر طرح نگرانی کی میرے والد کی ایک ہمشیر تھیں جو ہمارے گھر کا انتظام چلاتی تھیں۔ وہ مجھے بے حد عزیز رکھتی تھیں۔ بہرحال دن گذر رہے تھے۔ ..... میں انٹر کا امتحان دینے والا تھا' میرے والد کو میری شادی کی بہت آرزو تھی' اور ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اب والد کو اس چیز کا خیال اور زیادہ ہو گیا تھا۔ خدا کے فضل سے اتنی آمدنی اور جائداد تھی کہ شادی کے بعد ہم اچھی طور سے زندگی بسر کر سکتے تھے۔ چنانچہ میری نسبت میرے ایک رشتہ دار کی لڑکی سے طے پاگئی جو ابھی اسکول میں تعلیم پا رہی تھی — شادی ہم لوگوں کے امتحاب کے بعد قرار پائی جس کو صرف دو ماہ کا عرصہ باقی تھا۔

کریم کے چہرے پر غم کے آثار نمایاں ہو رہے تھے "غور سے سنو دوست" اس نے کہا' اب یہاں سے میری زندگی کی تباہی کا آغاز ہوتا ہے۔ میری رسم کے صرف تین ہفتہ بعد ہی میرے والد کی ہمشیر کا انتقال ہو گیا۔ ان کا انتقال میرے لئے کوئی معمولی غم نہ تھا۔ .... میں اس قدر متاثر ہوا کہ شدت غم کی وجہ سے میرے امتحان کی تیاری خاک میں مل گئی۔ میں نے بہت کچھ کوشش کی لیکن سچ ہے تقدیر کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔ بہرحال میں امتحان میں کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ نتیجہ نکلنے کے کچھ عرصہ بعد ہی میرے والد سخت بیمار ہو گئے اور وہ بھی باوجود ہر طرح کے علاج کے جانبر نہ ہو سکے اور انھوں نے مجھے تنہا۔ بالکل تنہا چھوڑ کر' دنیا کو خدا حافظ کہہ دیا۔

اب دنیا میں میرا کوئی نہ تھا۔ میری والدہ اس وقت مر چکی تھیں جب کہ میں صرف دس سال کا تھا۔ والد کی ہمشیر جنھوں نے مجھے بہت کچھ لاڈ پیار سے پالا تھا وہ دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں اور میرے والد' میرے ایک تنہا سرپرست' وہ بھی دنیا کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ اب میں دنیا میں تنہا تھا بالکل تنہا۔ بہرحال میں ضبط وصبر سے کام لے رہا تھا اور اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ زندگی کے دن گذرتے جا رہے تھے۔

اب یہاں سے میری زندگی ایک نیا رنگ بدلتی ہے۔ جہاں پر میری نسبت طے پائی تھی وہاں لوگوں نے یہی لوگوں نے جو میرے والدین کی زندگی میں ان کی خوشامد سے اپنے ہونٹ سکھاتے تھے' اور خود میرے دوستوں نے جن کے ساتھ میں نے ہمیشہ محبت کا سلوک کیا تھا اور جن کو میں اپنے عزیزوں سے بڑھ کر سمجھتا تھا' میرے متعلق غلط خبریں پہونچا دیں۔ چنانچہ میرے متعلق مختلف قسم کی افواہیں پھیل گئیں' کسی نے مجھے شرابی مشہور کیا' کسی نے مجھے جواری بتلایا' کسی نے مجھے آوارہ گرد ٹھیرایا' اور کسی نے یہاں تک مجھے بدنام کیا کہ رشیدہ — شہر کی ایک حسن فروش طوائف سے میرے تعلقات پیدا ہو گئے ہیں — آہ یہ سب چیزیں اس لئے تھیں کہ میرا دنیا میں کوئی

نہ تھا۔ بہرحال لڑکی والوں کے خیالات میرے متعلق روز بروز خراب ہوتے جا رہے تھے۔ میرا کون تھا جو ان کو میری نیک چلنی اور حقیقت حال کے متعلق سمجھاتا۔ میں بے کس تھا بے یار و مددگار تھا ـــــ مگر دوست خدا واقف ہے کہ ان افواہوں میں رتی برابر بھی صداقت نہ تھی۔ لڑکی والوں نے جب میرے متعلق اس قسم کی خبریں سنیں تو انھوں نے بلا تحقیق دریافت کے ارادہ کرلیا کہ وہ اپنی لڑکی کو میرے حوالے کرکے اس کی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ انھوں نے صاف طور پر اس کی اطلاع مجھ کو دیدی۔ یہ میرے لئے ایک تازہ زخم تھا۔ خیال کرو دوست اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔

ساحرہ۔ میری منسوبہ سے مجھے ملنے کے بہت کم موقعے ملے تھے مگر میں ساحرہ کو کئی بار دیکھ چکا تھا۔ کیونکہ وہ میرے رشتہ دار کی لڑکی تھی اور مجھ سے منسوب ہونے سے پیشتر وہ میرے سامنے آیا جایا کرتی تھی ـــــ نہ معلوم کیوں مجھے ساحرہ سے ایک قسم کی محبت ہی نہیں بلکہ عشق پیدا ہوچکا تھا۔ اس کے دونوں بھائیوں سے میری دوستی بہت گہری تھی مگر اب وہ بھی مجھ سے انجان رہنے لگے۔

غرض مصیبتوں اور غم کا سیلاب مجھ پر امڈا چلا آ رہا تھا میں نے ان لڑکوں کو خطوط لکھے کہ وہ اپنے والدین کے خیالات میرے متعلق صاف کریں اور حقیقت کا اظہار کریں لیکن افسوس میری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔

اپنی زندگی سے میں بیزار ہوچکا تھا' زندگی کی خوشی اور خوش گواری میرے لئے خار پہلو و بن گئی تھی اور ہر پہلو پر مجھے مصیبتیں تھیں۔

والدین کا انتقال امتحان میں ناکامی' دوست احباب کی بدسلوکی' بدنامی' اور سب سے زیادہ ساحرہ سے جدائی کا خیال یہ سب چیزیں ایسی تھیں کہ زندگی میرے لئے اب تلخ ہوگئی تھی چنانچہ اب مجھے اپنی دولت گھربار' دوست احباب اور سب چیزوں سے نفرت شروع ہوگئی اور یوں جوں دن گزرتے گئے میرے رنج و غم میں اضافہ ہوتا گیا' میری صحت روز بروز خراب ہوتی گئی اور اسی کے ساتھ ساتھ زندگی سے بے تعلقی اور بیکاری میں اضافہ ہوتا گیا' نوبت یہاں تک پہونچی کہ مجھے اب نہ کھانے اور کپڑوں کی تک فکر نہ رہی' یہی وجہ ہے کہ تم مجھے آج اس حالت میں دیکھتے ہو میرے بال بڑھ کر رشیوں کے جیسے ہوگئے ہیں میرے کپڑے پھٹ کر چیتھڑے چیتھڑے ہوگئے ہیں بھوک سے تین تین دن گزر جاتے ہیں۔ بعض اوقات دل چاہتا ہے کہ اپنی اس حالت میں اصلاح کروں مگر رفتار عالم اور دنیا کی کج روی اسے منع کرتی ہے۔ گزشتہ زمانے کے واقعات میری آنکھوں کے سامنے لہراتے ہیں۔ اور زندگی سے اس قدر تنگ آگیا ہوں کہ حالت میں اصلاح اب بے سود خیال کرتا ہوں دنیا کی ستم ظریفیوں نے میرے دل کی راحت اور طبیعت کی شگفتگی کو ہمیشہ کے لئے خاک میں ملا دیا۔ اور اب تو میں فقط اپنی زندگی کے دن پورے کررہا ہوں۔ اور یہ میری زندگی میری ساحرہ کی یاد میں بسر ہو رہی ہے۔ دوست سن رہے ہو میری داستان غم" کریم نے کہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں یک سکتے کے عالم میں تھا کریم کی دردبھری داستان نے حقیقت میں میری حالت عجیب و غریب کردی میں کریم کو تسلی دے رہا تھا اور اس کے غم کو کم کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

کریم کہنے لگا " دوست سنو ایک اور چیز سننے کے قابل ہے ۔ نہ معلوم کیا سبب ہے کہ غریب ساحرہ کو بھی مجھ بدنصیب سے کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور جب اس کے والدین نے اس کی شادی ایک متمول شخص کے ساتھ کر دینی چاہی تو اس نے صاف طور پر انکار کر دیا ۔ اور کہہ دیا کہ وہ سوائے میرے کسی اور سے شادی کرنے کے لئے ہرگز راضی نہیں ۔ ادھر اس کو ضد اُدھر اس کے والدین کو ضد ۔ سنتا ہوں کہ غریب ساحرہ کی صحت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے ۔ آہ ! غریب لڑکی مجھ بدقسمت کے لئے مصیبتیں جھیل رہی ہے ۔

مگر دوست سنو میرے سینما آنے کے متعلق تم مجھ سے سوال کر سکتے ہو کہ ان تمام مصیبتوں اور دنیا سے بیزارگی کے باوجود میں سینما کیوں آیا ۔ میرے محسن جب مجھے دنیا سے ہی دلچسپی نہ رہی تو سینما سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے ۔ واقعہ یوں ہوا کہ آج حسب معمول جب میں یہاں کھڑا ہوا تھا کہ ساحرہ کی موٹر سینما گھر میں جاتے ہوئے دکھائی دی ۔ اور میں بے ساختہ اس موٹر کو دیکھ کر تڑپ اٹھا اور اس موٹر کے ساتھ ساتھ سینما گھر میں داخل ہو گیا ۔ امید تھی کہ ساحرہ کو دیکھ سکوں گا مگر لوگ مجھے یہاں بھی رسوا کرنے کے لئے دیوانہ دیوانہ کہہ کر پکارنے لگے ۔ آہ ! میری آرزو برباد ہو گئی ۔ میں اپنی ساحرہ کو نہ دیکھ سکا ۔ اور اس طرح آج میری مصیبتوں میں ایک تازہ مصیبت اور غم کا اضافہ ہو گیا ۔ مگر کیا پرواہ ۔ میری زندگی خود سراپا رنج و غم ہو گئی ہے ۔ ان تمام حالات کے سننے کے بعد دوست تم ہی کہو میری زندگی کس قسم کی ہو سکتی ہے ۔ میں بھی انسان ہوں ، میرا دل پتھر کا نہیں ۔ بہر حال دوست جانے بھی دو اس قصہ کو ۔ میں بہت شرمندہ ہوں کہ ناحق تم کو میری طرف سے اس درجہ مغموم ہونا پڑا ۔ دوست شاید تم ہی پہلے شخص ہو جس نے مجھ بدنصیب کے ساتھ اتنی ہمدردی کا اظہار کیا ۔ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں سوائے اس کے کہ تمہارے لئے دعا کروں " وہ خاموش ہو گیا ۔ ایک بج چکا تھا ۔ کھیل ختم ہونے کے بعد لوگ باہر نکلنے لگے ۔ . . . . کریم میرے بازو کھڑا ہوا تھا خاموش ۔ پتھر کی طرح ۔ میں بھی خاموش تھا بالکل خاموش ۔

ایک موٹر کے گذرتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار ایک دلدوز چیخ نکل گئی اور ساتھ ہی کریم میرے بازو سے نکل کر باہر بھاگ گیا ۔ میں سکتے کے عالم میں کھڑا ہوا تھا ۔ میرے قدم بھاری ہو گئے ۔ میرا منہ بند ہو گیا تھا ۔ تھوڑی دیر کے بعد جب کسی قدر میری طبیعت سنبھلی تو میں گھر واپس آیا ۔ اس روز سے کریم پھر نظر نہ آیا خدا جانے غریب کا کیا حال ہوا ۔ زندہ بھی ہے یا مر گیا ۔

میر کاظم علیخاں (عثمانیہ)

افسانہ

جنت کے دروازے کا محافظ گلے میں کنجی لٹکائے خاموش اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ نیچے دور تک سیڑھیوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ یہاں تک کہ نشیب میں فضا تاریک ہو گئی تھی مگر سیڑھیوں کا یہ سلسلہ ختم نہ ہوا تھا۔ دروازہ کے اندر سے کبھی کبھی ہلکے سے قہقہوں کی آوازیں آجاتیں — ورنہ باہر ہر طرف سناٹا ہی سناٹا تھا۔ آہستہ آہستہ کسی کے قدموں کی آواز سنائی دینے لگی جو رفتہ رفتہ قریب ہوتی گئی۔ بوڑھا محافظ چونک سا اٹھا۔ اس نے معلوم کیا کہ نیچے کی تاریک گہرائی میں سے کوئی اوپر آرہا ہے۔ رفتہ رفتہ آواز بلند ہوتی گئی۔ آنے والا قریب ہوتا گیا۔ اور اب محافظ نے دیکھا کہ ایک جوان، حسین، مگر نحیف عورت آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہی ہے۔ اس کے پاؤں شل ہو رہے تھے۔ ناتوان جسم یہ سختی برداشت نہ کرسکتا تھا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس کے اندرونی کرب کا مظہر تھا۔ اس کی حالت زار دیکھ کر بوڑھا محافظ بھی کچھ دیر حیران رہ گیا۔ اس نے بڑھ کر اسے تھاما اور اوپر لے آیا۔

"تمہارا نام" بوڑھے نے دریافت کیا۔

"رضیہ" اس نے جواب دیا۔

"کرۂ ارض سے آئی ہو"

"ہاں"

"تم جا سکتی ہو تم کو اجازت مل چکی ہے" بوڑھے محافظ نے جنت کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی خوشبو کی ایک لہر باہر نکلی جس نے فضا کو معطر کر ڈالا۔ نازنین اندر داخل ہوئی۔ دروازہ پھر بند ہو گیا۔

رضیہ اندر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ سب لوگ بے حد خوش ہیں۔ کوئی مصروفِ خرام ہے تو کوئی مسرت کے راگ الاپ رہا ہے۔ کوئی سننے میں مست ہے تو کوئی بے خودی میں راگ کا ساتھ دے رہا ہے۔ ادھر کچھ لوگ حور و غلمان کے ساتھ جھیل کی سطح پر تیرتے پھر رہے ہیں۔ تو ادھر کچھ لوگ گلگشت میں مصروف ہیں عجیب سماں ہے۔ ہر ایک خود میں مست، بے فکر اور خوش ہے۔ اس کو دیکھ کر کچھ حوریں بڑھیں انھوں نے استقبال کیا۔ لیکن اسے ان سے کوئی سروکار نہ تھا جنت کی لذتوں اور لطافتوں نے اس پر کچھ اثر نہ کیا۔ وہ تلاش کر رہی تھی۔ شاید کسی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ حوروں نے چاہا کہ اسے جنت کے سب سے خوش گوار حصہ کی سیر کرائیں غلمان نے چاہا کہ اُسے سونے، زمرد، یاقوت، نیلم اور موتی کے محل دکھائیں کہ ان میں سے وہ کسی کو پسند کرے۔ اس کے رشتہ داروں نے لاکھ چاہا کہ اسے اپنی طرف متوجہ کریں۔ لیکن وہ محوِ تلاش تھی — کسی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ اس نے جنت کا کونہ کونہ چھان مارا۔ اس کا چہرہ اداس ہوتا گیا۔ اور آخر وہ مایوس جنت کے دروازہ کی طرف لوٹی۔

جنت کے اندر سے کسی کا آکر دروازہ کھلوانا بوڑھے محافظ کے لئے بالکل نیا واقعہ تھا۔ جنت میں داخل ہو جانے کے بعد کسی کے وہم میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ وہاں کی لذتوں سے ہٹ کر دروازہ کی طرف رخ کریں۔ وہ حیران تھا کہ کیا کرے۔

"کون" اس نے دریافت کیا۔
"رضیہ" اندر سے جواب آیا "مجھے تم نے یہاں کیوں جھونک دیا۔ میں اس سے ملنے آئی تھی۔ بتاؤ وہ کہاں ہے؟"
"کون" بوڑھا پوچھنے لگا "کون کہاں ہے۔ کس کو ڈھونڈ رہی ہو"۔۔۔۔
"تو تم نہیں جانتے۔ میں جنیدی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ بتاؤ وہ کہاں ہے۔ مجھے اس سے ملنے دو"
"جنیدی۔ کرۂ ارض سے آیا ہوا۔ تمہارے آنے سے کچھ ہی قبل جو آیا تھا؟"
"ہاں۔ وہی۔ وہ کہاں ہے؟"
"وہ دوزخ میں ہے۔ تم اس سے نہیں مل سکتیں"
"دوزخ میں ہے؟ تو پھر مجھے بھی اس کے پاس بھیج دو۔ دروازہ کھول دو" اس نے دروازے کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔
بوڑھا محافظ حیران تھا کہ کیا کرے۔ اسے عجیب عجیب واقعات سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔
"تم کرۂ ارض والے بھی عجب لوگ ہو" بوڑھے نے پیشانی پر شکن ڈالتے ہوئے کہا۔ "اور لوگ تو جنت میں آنے کے لئے خواہش کیا کرتے ہیں، . . . . اور تم جنت سے نکل کر دوزخ میں جانا چاہتی ہو۔ جس کا نام سن کر لوگ سہم جاتے ہیں"
"عشق دوزخ کی آگ سے نہیں ڈرتا۔ اور نہ جنت کی لذتیں اسے آرام کی نیند سلا سکتی ہیں۔ وہ محبوب کا طالب ہوتا ہے۔ اور ملنے تک چین نہیں لیتا"
"عشق محبوب ۔۔۔ یعنی؟" بوڑھے نے حیرت سے دریافت کیا۔
"یعنی میں اسے چاہتی ہوں اور وہ مجھے چاہتا ہے۔ ہم چاہتے تھے کہ ایک ہو جائیں۔ چاہتے تھے کہ ایک دوسرے کے شریک زندگی بن جائیں ۔۔۔ لیکن"
"لیکن کیا؟ چاہتے تھے تو کیا کیوں نہیں؟ ہو کیوں نہ گئے؟ مذہب نے تو تمہیں منع نہیں کیا تھا"
"مذہب نے نہ سہی رسم ورواج نے تو مجبور کر رکھا تھا۔ دنیا کو کیا خبر کہ ہمارے سینوں میں کونسے جذبات پرورش پا رہے تھے۔ ہم بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ کھیل میں بھی اور مکتب میں بھی۔ وہ بچپن کا زمانہ نہیں بھلایا جاتا۔ میں مٹی کا گھر بنائی تھی۔ وہ توڑ دیتا تھا۔ میں روتی اور وہ پشیمان ہو جاتا اور اس سے اچھا گھر بنا دیتا۔ لیکن جب کبھی میں نے اس کی سلیٹ توڑ دی اس پر سیاہی گرا دی یا اس کے ہاتھ میں سوئی کی نوک چبھو دی تو ہنس دینے کے سوا اس نے شکایت کا لفظ تک زبان پر نہ لایا۔ لیکن کسے خبر تھی کہ یہی جھگڑے۔ اگر یہ واقعی جھگڑے تھے ۔۔۔ ہمارے رشتۂ الفت کو اور استوار بناتے جا رہے تھے۔ لوگ دیکھتے تھے کہ ہم میں سے ایک کو دوسرے کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ ہم مل کر کھیلتے تھے۔ مل کر سبق یاد کرتے تھے اور مل کر لکھا کرتے تھے۔ مگر زمانہ نے ہم کو علحدہ کرنا شروع کیا۔ ابتدا مکتب کی علحدگی سے ہوئی۔ عمر کے اضافہ کے ساتھ ساتھ پردہ کی سب سے زبردست دیوار ہم دونوں کے درمیان حائل ہو گئی۔ لیکن یہ ہم کو بالکل علحدہ نہ کر سکی۔ اب بھی میں پردہ کی اوٹ سے اس کو دیکھ لیا کرتی اور خود کو اسے دکھا دیا کرتی۔ دل کی بات بہت زمانہ تک دل میں نہ رہ سکی۔

محبت کا اظہار ہو ہی گیا۔ اور ہم دونوں نے وعدہ کر لیا کہ ایک دوسرے کے شریک زندگی بن جائیں گے۔ لیکن افسوس میں حالات سے بے خبر تھی۔ مجھے ابھی اتنا شعور نہ تھا جو یہ سمجھتی کہ لڑکی زبان رکھ کر گونگی اور عقل رکھ کر بے عقل سمجھی جاتی ہے۔ اپنے شریک زندگی کو منتخب کرنا یا نہ کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ بلکہ کسی اور کے رحم و کرم پر منحصر ہے۔ تم نہیں جانتے کہ رسم و رواج نے غریب عورتوں کو کس طرح جکڑ رکھا ہے۔ اُدھر ہم ایک دوسرے سے وابستہ ہونا چاہتے تھے اور اِدھر زمانہ ہمارے مخالف حالات پیدا کرتا جا رہا تھا۔ آخر مجھے معلوم ہو ہی گیا کہ میری نسبت کسی اور سے قرار دیدی گئی ہے۔ اور میں بہت جلد اس کے حوالے کر دی جانے والی ہوں۔ جنیدی نے لاکھ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔۔ کیوں ۔۔ اس لئے کہ لوگوں کو ہماری محبت کا علم تھا۔ اور اسی لئے وہ جنیدی سے نفرت کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک ہماری محبت گناہوں کی پوٹ تھی۔ آخر ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ جنیدی نے خودکشی کر لی۔ دل پر بجلی سی گری۔ سکتہ سا ہوا۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ بعد کی مجھے خبر نہیں۔

"جب کچھ سمجھنے کے قابل ہوئی تو اسے ڈھونڈھتی ہوئی آئی اور تم نے مجھے یہاں جھونک دیا۔ آہ تم آسمان والے نہیں سمجھ سکتے کہ ہمارے دل ایک دوسرے سے ملنے کے لئے کتنے بے چین ہیں۔ کھول دو۔ دروازہ کھول دو۔ مجھے جانے دو۔"

"دیوانی لڑکی" بوڑھے محافظ نے سمجھانا شروع کیا۔ "اس کو خودکشی کے جرم کی سزا میں آگ میں جلایا جا رہا ہے۔ تو وہاں جا کر کیا کرے گی۔ اندر جا۔ جنت کی سیر کے لطف اٹھا۔ اپنا دل بہلا اور اُسے بھول جا۔۔"

"یہ ناممکن ہے۔ میں اسے نہیں بھلا سکتی۔ میں اس سے ضرور ملوں گی۔ میں بھی اسی آگ میں جلنے کو تیار ہوں جس میں وہ میرے لئے جل رہا ہے۔ دوزخ کی آگ مجھے اس جدائی کی آگ سے زیادہ نہیں جلا سکتی محافظ! دروازہ کھول دو مجھے جانے دو۔"

بوڑھا محافظ حیران تھا۔ نہ اب تک کسی نے باہر جانے کی خواہش کی تھی اور نہ بوڑھے کو اس کا علم تھا کہ اسے دروازہ کھول کر باہر جانے دینے کی اجازت ہے کہ نہیں۔

"ہا۔ دروازہ کھول دو۔ مجھے اُس سے مل لینے دو۔ اوہ مجھ پر رحم کرو۔ مجھے جانے دو۔" لڑکی دروازہ کو مار مار کر چلا رہی تھی۔ محافظ عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ لڑکی نے دیوانہ وار جنت کے دروازے پر سر رکھ کر رونا شروع کیا۔ جنت میں یہ پہلا واقعہ تھا۔ لڑکی کے آنسو موتیوں کی لڑی کی طرح دروازہ کے باہر نکلنے لگے۔ محافظ نے دیکھا کہ ان میں سیکڑوں آرزوئیں غوطے کھا رہی ہیں۔ غیب سے آواز آئی "بوڑھے محافظ یہ موتی ہیں چن لو۔ ضایع نہ جانے پائیں۔ انہیں سے ہم کو دوزخ کی آگ بجھا کر گلزار انعمت اگانے ہیں۔ اس کا نازک دل نہ دکھاؤ۔ دروازہ کھول دو اسے جانے دو۔"
بوڑھا سر بسجود ہو گیا۔

دروازے کا کھلنا تھا کہ لڑکی بے تحاشا بھاگی۔ اس کے پیر لڑکھڑانے لگے۔ لیکن وہ بھاگے جا رہی تھی۔ دوزخ کے ایک غار میں مہیب شعلوں کے درمیان اس کا محبوب کھڑا جل رہا تھا۔ وہ اور تیز بھاگنے لگی۔ دوزخ کے شعلے اس کی طرف

لپکنا چاہتے تھے۔ وہ اس کو جلا دینا چاہتے تھے۔ لیکن وہ بے خطر بڑھتی ہی گئی ـــــ اس نے اپنے آپ کو دوزخ کے شعلوں کے حوالہ کر دیا ـــــ لیکن موتی کے سے چند شفاف قطرے آگ پر گرے اور یک دم فضا بدل گئی۔ دوزخ کے مہیب شعلوں کی جگہ اب ایک خوشنما گلزار تھا اور اس کا محبوب جنت کا خوشنما لباس پہنے کھڑا ہوا تھا۔ وہ اس سے لپٹ گئی۔ دونوں ساتھ تفریح کرنے لگے۔ اس نے دیکھا کہ پوری جنت میں ایسا دلکش حصہ نظر نہ آیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ جنت والوں کو وہ حظ اور وہ لطف اس سے پہلے حاصل نہ ہوا تھا جو اس ٹکڑے کے اضافہ کے بعد جنت میں انھیں حاصل ہوا۔

محمد دلاور خاں مہدوی

من کی بپتا

"من کی بپتا" کی مصنفہ لطیف النساء بیگم صاحبہ کا شمار ملک کی ان چند اہل قلم ہستیوں میں کیا جاتا ہے جو صنف نازک بالخصوص حیدرآبادی بہنوں کو جہالت کی تاریکی سے علم کی روشنی میں لانے میں سب سے آگے آگے ہیں۔ اگرچہ کہ ظالم سماج نے میرے اور محترم بہن کے درمیان پردہ حائل کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے میں آپ کی تقاریر نہ سن سکا۔ لیکن اپنی دوسری بہنوں کی زبانی یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کی تقاریر نہایت ہی موثر اور نصیحت آمیز ہوا کرتی ہیں۔ "من کی بپتا" جیسی مختصر سی کتاب میں جسے حیدرآبادی خواتین کے لئے شمع ہدایت کہا جا سکتا ہے اور جس میں کوئی بات بھی صداقت سے بعید نہیں ہے قابل مصنفہ نے ان خواتین کا مختصراً تذکرہ کیا ہے۔ جنھوں نے معاشرتی مسائل سے بے خبر رہ کر اپنی زندگی کا معیار اپنی یا اپنے شوہر کی آمدنی سے زیادہ بڑھا رکھا ہے۔ اور جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ قرض کے بوجھ سے لدی رہتی ہیں۔ اگرچہ کہ اس کتاب میں متوسط طبقہ کا معیار کسی قدر بڑھا دیا گیا ہے تاہم معاشی مسائل کی رو سے ہمیں یہ معیار کوئی زیادہ غلط نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس عام مفلسی اور اقتصادی پستی کا راز جو مغرب کی کورانہ تقلید اور ان قیمتی ملبوسات کی وجہ سے جو ہمارے متوسط طبقے کی خواتین پہنا کرتی ہیں، ہم پر فاش نہیں ہو سکتا تھا وہ اس مختصر سی کتاب کے مطالعہ سے خود بخود نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

علاوہ ازیں، گھر، سواری، نوکر چاکر اور بچوں کی تعلیم اور ان کی ضرورتوں سے متعلق جو مختصر سی ہدایات ہیں وہ یقیناً اس قابل ہیں کہ ہماری ہر ایک بہن اس پر عمل کر کے اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کی کوشش کرے۔ ایک مشہور فلسفی کا قول ہے۔

"جو شخص اچھی زندگی بسر کرتا ہے اس کے لئے سب طرح کی زندگی اچھی ہے" اگر ہماری وہ بہنیں جن پر ملک اور قوم کی بڑی بڑی ذمہ داریاں عائد ہیں اور جو قوم کو بنا اور بگاڑ سکتی ہیں، اس فلسفی کے کہنے کے مطابق اچھی زندگی بسر کرنے لگیں تو بہت ممکن ہے کہ نہ صرف حیدرآباد بلکہ سارے ہندوستان سے اس اقتصادی پستی کا مرض دور ہو جائے۔ الغرض لطیف النساء بیگم صاحبہ کی یہ کوشش باوجود ان کی اپنی چار چار مصروفیتوں کے جن کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب کے پیش لفظ میں کیا ہے ایک کامیاب کوشش ہے اور ہماری جاہل اور مغرب زدہ تعلیم یافتہ بہنوں کے لئے ایک ایسی نصیحت ہے۔ جس پر عمل کئے بغیر وہ ترقی کی شاہراہ پر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتیں۔

ا۔ ع۔ وفا

ہیرے کا پہاڑ

ضلع نلگنڈہ کا ایک چھوٹا سا غیر معروف تعلقہ "حضور نگر" ہے (پرگنہ)، یہاں جملہ دفاتر نہایت خوش سلیقگی اور حسنِ خوبی کے ساتھ تعمیر کئے گئے ہیں۔ بالخصوص کلب کی عمارت کے لئے جو آج کل زیر تعمیر ہے، جو مقام آبادی سے باہر ایک پُر فضا ٹیلے پر جہاں قدرتی مناظر کی بہتات ہے، مولوی عثمان جعفر صاحب سیولین ناظم عدالت نے منتخب فرمایا وہ قابل دید ہے۔

اسی تعلقہ میں ایک گاؤں "گنڈلہ پہاڑ" ہے جس کے نواح میں ایک چھوٹی سی پہاڑی "وجرال گنے" سے موسوم ہے، اس کے اطراف جنگل ہے اور وہ بھی اسی نام سے موسوم ہے۔ سنسکرت میں "وجرال" ہیرے کو اور "گنے" معدن کو کہتے ہیں۔ یہاں عام طور پر مشہور ہے کہ اس پہاڑی میں ہیرے بکثرت موجود ہیں، اور اگر وہاں سے کوئی سفید پوش گذرے تو اس کے کپڑے زرد دکھائی دیتے ہیں وغیرہ۔ میں اکثر تبہ وہاں سے گذرا اور ہمیشہ غور کیا لیکن مجھے اس کا کوئی اثر واضح طور پر محسوس نہ ہو سکا۔ اس پہاڑی پر نہایت صاف اور سفید چمکیلے پتھر بکثرت ہیں جو سورج کی کرنوں سے بے حد جگمگاتے رہتے ہیں، وہاں کئی گڑھے ہیں جس سے خیال کیا جا سکتا ہے کہ کسی زمانے میں ہیرے وغیرہ کی برآمدی کے لئے کھدوائی کا کام ہوا ہوگا۔ اور اب بھی وہاں بہت ممکن ہے کہ ماہرین کی تلاش سے ہیرے کے پتھر وغیرہ برآمد ہو سکیں۔

اسی موضع میں ایک قدیم گنبد ہے جس میں نہایت عمدہ پچی کاری کا کام ہے جو تعمیری صنعت کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ لوحِ مزار پر حضرت "مصطفیٰ قادری" کا اسم گرامی کندہ ہے۔ تاریخ وفات پڑھی نہ جا سکی۔ مزار کی حالت محتاج توجہ ہے۔ گنبد کے قریب ایک چھوٹا شکستہ تالاب ہے وہاں ایک بڑے پتھر پر طویل عبارت بزبان عربی، فارسی کندہ ہے۔ افسوس کہ وہ بھی پڑھی نہ جا سکی۔

اسی تعلقہ میں ایک اور قصبہ میرلہ چرو ہے جو مستقر تعلقہ سے بہ لحاظ آبادی بڑا ہے، جہاں ایک قدیم دیول "سویمبو لینگ ایشور" کے نام سے مشہور ہے، جہاں ہر سال بیوار اتری کو جاترا ہوا کرتی ہے۔ دور دراز سے بھاری اور شاہین آتے ہیں۔ اس دیول کی خصوصیت یہ ہے کہ "لینگ ایشو" بت کے مقابل ایک پتھر کا دو فٹ مدور نالا زمین سے تقریباً چار فٹ بلند کھڑا ہوا ہے، جس میں ہمیشہ پانی بھرا رہتا ہے، اگر اس میں سے پانی خارج کر دیا جائے تو کچھ عرصہ میں پھر وہ معمور ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ غالباً کسی نامعلوم مقام پر اسی سطح کا کوئی چشمہ ہوگا جس کا زمین دوز نل وغیرہ سے تعلق ہوگا۔ عام لوگ دیول کی کرامت خیال کرتے ہیں اور معتقدین وہاں کا پانی تبرکاً پیتے ہیں۔ میں نے قصبہ واڈہ پلی (وزیرآباد) تعلقہ مریال گوڑہ میں ایک دیول (جو کرشنا کے کنارے قلعہ میں ہے) دیکھی وہاں بھی یہی صنعت وکمال نمیر ہے۔

یہاں ایک اور موضع "جان پہاڑ" ہے آبادی سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر حضرت "جان پاک شہید" کا مزار ہے جو پُر عظمت ہے، جس پر ایک گنبد بھی ہے۔ سادگی کے ساتھ ساتھ نفاست کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

حضرت کا اسم گرامی خواجہ معین الدین تھا۔ مزار کا طول نو سول ہے جس کے پہلو میں اور ایک مزار حضرت کے بھائی کی ہے۔ مزار شریف کے چاروں طرف جنگل ہے جو سید و انعام محصورہ جنگلات سے موسوم ہے' وہاں ایک مسافر خانہ اور ایک بڑی باؤلی ہے' حضرت کی کرامات مشہور ہیں۔ لوگ بے حد معتقد ہیں' سالانہ عرس بھی ہوا کرتا ہے اور ہر جمعہ کو ہزارہا زائرین بغرض زیارت و نذر و نیاز بلاتخصیص مذہب و ملت نہایت دور دراز مقامات سے آتے ہیں' بالخصوص علاقہ عظمت مدار سے بکثرت زائرین آتے ہیں' جن میں نو فیصدی ہندو ہوتے ہیں۔ جمعہ کو وہاں ایک میلا لگا رہتا ہے۔ لوگ بکرے ذبح کرکے نیاز کرتے ہیں' صرف بکروں کی کھال کی آمدنی ہزارہا روپے ہوا کرتی ہے۔ اس کے سوا معتقدین مویشی اور اپنے جسم کے سارے زیورات تک بطور نذر چڑھا دیتے ہیں۔ مزار شریف کے اطراف ایک قسم کے چھوٹے چھوٹے صاف ہر طرح پتھر زمین پر بکثرت بکھرے پڑے ہوئے ہیں۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر ایک پتھر لے کر اپنی انگلی کے ناخن پر رکھ کر دوسرے ہاتھ کی انگلی کے ناخن سے مس کیا جائے تو پتھر خود بخود گھومنے لگتا ہے۔ شاید اس میں لوہا یا مقناطیسی اجزا ہوں۔

محمد جمال الدین حیدر

اشکِ نظر

برقِ نظر کا واسطہ برقِ نظر گرائے جا
قلبِ طلب شعار کو راہِ وفا دکھائے جا

نغموں میں تیرے آگ ہے آگ نہ یوں لگائے جا
مطربِ درد آشنا دھیمے سروں میں گائے جا

موسمِ گل ہے ساقیا دیکھ گھٹائیں چھا گئیں
بربطِ دل کو چھیڑ دے جام اٹھا پلائے جا

حسرتِ دید مٹ گئی لذتِ درد کی قسم
مجھ پہ کبھی کرم نہ کر عشق کا غم بڑھائے جا

قلب و جگر کو تھام لے ضبطِ فغاں سے کام لے
منزلِ شوق سے نکل حسن کو آزمائے جا

حسرتِ ذوقِ آگہی تیرے لئے ہنسی سہی
تجھ کو تری خبر نہیں تو یونہی مسکرائے جا

اے میری جانِ آرزو حسنِ طلب کا واسطہ
لذتِ دید بخش دے ذوقِ نظر بڑھائے جا

نظر

ایک خط

ناہید پیاری!

ہزاروں پیار۔ اس وقت میں تجھے خط لکھنے نہیں بلکہ زندگی کی المناک داستان سنانے بیٹھی ہوں۔ ہاں سن! اگر تجھ میں سکت ہے ع داستاں میری سنو قصہ ماضی نہ سنو۔ تو نے اپنے پچھلے خط میں میری زندگی کے انقلاب پر حیرت واستعجاب ظاہر کیا ہے۔ ہاں تیری ناہید اب وہ ناہید نہیں۔ تو ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ کاش! خدا مجھے بھی ایسی طبیعت عطا کرتا اور شریر زرینہ تو مجھے ہمیشہ "بے حیا" "چکنا گھڑا" وغیرہ کے نام سے موسوم کیا کرتی کیونکہ مجھے بخوبی یاد ہے کہ جب کلاس میں ہمیں ہماری شرارتوں پر ڈانٹ پڑا کرتی تو تم لوگ گھنٹوں منہ لٹکائے بیٹھی رہتیں برخلاف میرے کہ مجھے اور ہنسی آیا کرتی یا جب کبھی امتحان کے بعد ہم سب اپنے پرچوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کیا کرتے تو اکثر کسی کا سوال غلط ہو جاتا یا چھوٹ جاتا تھا تم لوگ آزردہ ہو جاتیں لیکن .... آہ مجھ پر ان چیزوں کا ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ میرا خیال تھا کہ ناہید پیاری میں ہر قسم کی مشکلات کو یوں ہی جھیل لوں گی۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ میری زندگی میں ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوگا جس کا برداشت کرنا میرے مقدور سے باہر ہوگا۔ اور جو میرے لئے "پیام اجل" ہوگا۔ ہاں سنو لیکن میں سنانے سے پہلے یہ بیان کروں گی کہ میں یہ قصہ کیوں لکھ رہی ہوں! .... تاکہ ... دنیا عبرت حاصل کرے۔ پیاری ناہید! دنیا میں بہت سی ہستیاں اسی کی بھینٹ چڑھ گئیں اور چڑھ رہی ہیں۔ میں تو دنیا کو قاتل کہوں گی کیونکہ یہ معصوم ہستیوں کے قتل کی موجب ہوتی ہے۔

"محبت" عطیہ خداوندی ہے۔ ہر جاندار اس شئے کا تھوڑا بہت ضرور مالک ہوتا ہے میں تو کہوں گی کہ ہم فطرتاً محبت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس کے لئے کوشش کی ضرورت نہیں۔ اور ایسا ذی روح جو اس پاک جذبہ کو نہ رکھتا ہو بے جان ہے۔ اور ایسا انسان جو محبت کا جواب محبت سے نہ دے وہ پتھر ہے۔ اور ایسا شخص جس کو محبت کا جواب محبت سے نہ ملا ہو بدنصیب ہے اور میرا شمار بھی انہی میں ہے۔ عزیز ناہید! مجھے خیال ہے کہ تو میرے .... سے واقف ہوگی۔ خدا گواہ ہے ناہید میں نے کبھی زبان سے اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کیونکہ میں خوب جانتی تھی کہ یہ ہماری سوسائٹی میں "گناہ" ہے..... ہاں.... سخت ..گناہ چاہے وہ کتنا ہی پاک کیوں نہ ہو۔ لیکن اس کے بعد بھی دنیا والوں نے مجھے نہ چھوڑا.. ہاں یہ وہی لوگ ہیں۔ جنھوں نے اس چنگاری کو بڑھایا۔ یہ وہی ہیں جنھوں نے مجھے کہہ کہہ کر ایسا کرنے پر مجبور کیا اور مجھے فریب میں مبتلا کیا یہاں تک کہ میرے لئے اس کے سوا کوئی "مضمون" نہ رہا۔ میں اسی امید پر اپنی زندگی کی گھڑیاں ہنسی خوشی گذار رہی۔ مجھے تو یہ امید تھی کہ ایک دن میری "تمناؤں کا جہاز" لب ساحل آ پہونچے گا۔ میری "پریم کی ناؤ" ضرور بھنور سے نکل آئے گی۔ یہ سب کچھ میں نے کیوں سوچا تھا! کیا وجہ تھی؟ آہ میں پھر کہوں گی۔ دنیا والے۔ مغالطہ..... دھوکا.... فریب پیاری ناہید!! اب تم خود اندازہ لگاؤ اس شخص کا کیا حال ہوا ہوگا جس کی امیدوں پر پانی پھر گیا ہو۔ تمنائیں خون ہو گئی ہوں توقعات غلط ثابت ہوئی ہوں۔

ناہید پیاری! یہ واقعہ ایسا ہوا جس نے میری روح کی تحلیل کر دی۔ دل پر نشتر چبھو دیے۔ ہاں لیکن اب خوش ہوں کہ جلد ان مصیبتوں سے چھٹکارا پا رہی ہوں۔ دعا کرو کہ مجھے مالک حقیقی کے حضور میں دائمی مسرت اور ابدی چین نصیب ہو۔ پیاری ناہید! بہت کچھ لکھنا چاہتی ہوں۔ لیکن طاقت جواب دے رہی ہے۔ آنکھوں میں اندھیرا سا چھا رہا ہے۔ آخر میں میری التجا ہے کہ تم سب مل کر اس بات کی سعی کرو کہ "معصوم ہستیوں" کو .... "مغالطہ" کا شکار نہ ہونے دیا جائے اچھا .... پیار ... ی ... خدا ..... حا ... فظ

یہ وہ خط ہے جو مسوری ہاسپٹل کے وارڈ نمبر (۵) میں نرس بیلا کو ایک نوجوان مریضہ کے سرہانے سے اس کی موت کے بعد دستیاب ہوا۔

"نجمہ"
نامپلی گرلز اسکول

غزل

خیالِ یار میں دھونی رمائے بیٹھے ہیں — یہاں تو رنگِ حقیقت جمائے بیٹھے ہیں

ترا خیال ہی بہتر ہے سب خیالوں سے — ترے خیال میں دنیا بھلائے بیٹھے ہیں

ہمارے دِل کو زمانے کی آرزو کیوں ہو — یہاں وہ آنکھ میں دل میں سمائے بیٹھے ہیں

ہم ایک بار نہیں بلکہ سو طریقوں سے — تمام عمر انھیں آزمائے بیٹھے ہیں

نظر میں حسن کسی کا جچیگا کیا یاں تو — جمالِ یار کا نقشہ جمائے بیٹھے ہیں

جگر کے ساتھ ہی تن بھی جلے گا اے قیصر
جو دل میں آتشِ الفت لگائے بیٹھے ہیں

قیصر سلطانہ (متعلم)

پنگھٹ

(صبح کا دلفریب منظر۔ جمنا کے پرے دُور پہاڑیوں سے سورج جھانک رہا ہے۔ لیلا کپڑے دھو رہی ہے۔ پرشانت تیرتا ہوا لیلا کے قریب آتا ہے)

"تُو روز آتی ہے لیلا ——؟" پرشانت نے پیرتے ہوئے پوچھا

"ہاں۔ ہر روز تڑکے آتی ہوں۔"

"تو میں بھی آؤں گا لیلا۔"

"ضرور آ —— پرنتو یاد رکھ پرشانت۔ جب کبھی ماتا جی ساتھ ہوں تو بات نہ کرنا ورنہ وہ مجھ سے بگڑ جائیں گی۔"

"بہت اچھا —گر —لیلا —! ذرا تیرا گھاگر تو دے بیچ جمنا سے پانی بھر لاؤں۔ دیکھتی نہیں یہاں کا پانی کتنا گدلا ہو گیا ہے۔"

"اچھا —یہ لے (گھاگر دے کر) —مگر ذرا جلدی آنا بھلا"

پرشانت گھاگر لے تیرتا ہوا دور نکل جاتا ہے —"لیلا! اب جمنا کے پار جاؤں گا۔ تیرا گھاگر تو آنے سے رہا۔"

"پرشانت! پرشانت!! دیکھ میں روٹھ جاؤں گی۔" اس نے بھولی صورت بنا کر کہا۔

"روٹھ جا لیلا —دیکھیں تیرا پیارا روٹھنا بھی کیسا ہوتا ہے۔"

"تو ستاتا ہے پرشانت۔ پھر تو میں تجھ سے نہ بولوں گی۔"

"نہیں بولے گی تو ہم منائیں گے۔"

"ہونھ —— میں نہ مانوں گی۔"

"نہ مانے گی —تو —(ہاتھ سے بندھی مٹھی دکھا کر) ہم اس سے منائیں گے۔"

"آ ہا ہا ہا!!! —بڑا آیا کہیں کا منانے والا۔"

"ہو ہو ہو —— بڑی آئی کہیں کی، روٹھنے والی۔"

"نا ماں نا —اب میں نہ ٹھیرنے کی۔"

"نہ ٹھیر —— مری بلا سے۔"

"اچھا پرشانت —یہی بات نا —— لے میں چلی" (جانے لگتی ہے)۔

"لیلا! —اے لیلا!! —او لیلا —!!! لیتی جا تیرا گھاگر" (آ کر) "دیکھتا نہیں —کتنی دیر ہو گئی —ماتا جی راستہ دیکھ رہی ہوں گی۔"

"ہونھ —— اور!"

"اور —— تیرا سر پھوڑ دیں گی۔"

"میرا یا تیرا ——"

"نہ میرا —— نہ — تیرا — پرشانت کا۔"

"آہا ہا —— اور لیلا کا بھی ——"

"ہی ہی ہی ——" پرشانت پانی اچھالتا ہے لیلا تقریباً بھیگ جاتی ہے۔ "ارے بس۔ مورکھ کہیں کا —— جا با جا تو بڑا شریر ہے۔" پھر گاؤں کی طرف دیکھ کر "او پرشانت! دیکھ ماتا جی چلی آتی ہیں۔ میں نہ بولتی تھی کہ دیر ہو جائے گی۔ مجھے کوسنے سننے پڑیں گے۔ تو یہاں سے چلا جا۔" پرشانت پانی سے نکل جھاڑیوں کی جھنڈ میں چھپ جاتا ہے۔

"کیوں ری! صبح کی آئی ابھی تک پنگھٹ پر مر رہی ہے" جانا نا لگاتی ہے۔

"نہیں ماں —— پتا کی اچکن دھوتی تھی۔" "شرم نہیں آتی۔ چل جلدی مجھے کام ہے۔"

لیلا روئی صورت بنائے گھاگر اٹھا لیتی ہے۔ ماں چلی جاتی ہے اور پرشانت آتا ہے۔ "لیلا! تو روتی ہے۔"

"نہیں پرشانت"

"تو نہ رو لیلا — تیرے آنسو میرے من کی آگ کو اور بھڑکاتے ہیں۔ اب سے نہ میں پنگھٹ آؤں گا۔ اور نہ میری لیلا کو دکھ پہنچے گا۔"

"نہیں پرشانت نہیں — تو ایسا نہ کر — تیرے آنے سے مجھے پنگھٹ سندر معلوم ہوتی ہے۔ جمنا ہنستی دکھائی دیتی ہے — اچھا — تو اب میں جاتی ہوں۔"

"اچھا جا لیلا — تو چنتا نہ کر" جاتے ہوئے آنکھیں چار ہوئیں اور پرشانت کا پریم سندیسا لیلا کے دل تک پہنچ گیا۔ لیلا تو چلی گئی لیکن اس کا دل پنگھٹ پر ہی رہ گیا۔ جمنا حسب معمول ہلکورے لے رہی تھی اور پرشانت خاموش کھڑا تھا۔

۲

لیلا کے پتا موہن بابو باہر سے خوشی خوشی گھر میں آئے۔ پگڑی اتار کھونٹی سے لگا انگرکھے کے بند کھول رہے تھے کہ بیوی آگئیں۔ پوچھیں "میّا ابھی تک سیٹھ ہیرا چند سے باتیں ہو رہی تھیں۔ آج کیا سیٹھ نے جاتی دنیا دیکھی۔ جو گھر کے بھاگ جگادئے"

"ہاں۔ ان کی ہم پر بڑی دیا ہے"

"کیا اُدھار کی بابت آئے تھے"

"نہیں جی اس کی تو ان کو فکر ہی نہیں بڑی بات تو یہ ہے کہ دل والا آدمی ہے۔ آج تقریباً لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا گاؤں اُدھارا ہے مگر پھر بھی جو حاجت مند جاتا ہے تو اس کا دل میلا نہیں کرتے"

"ایشور سکھی رکھے"

"مگر چنتا تو اس بات کی ہے کہ بے چارہ ان دنوں کچھ پریشان بھی ہے"

"بھگوان نہ کرے یہ کیوں —!"

"اجی! بڑی بات تو یہ ہے کہ جہاں دھن ہے وہاں اولاد نہیں جہاں اولاد ہے وہاں دھن کا کال ہے۔ خیر یہ تو اس کے کھیل ہیں ہم پاپی کیا جانیں۔ مگر غریب کی بیوی بھی حال ہی میں بیکنٹھ سدھاری جس سے تو اور بھی کمر بیٹھ گئی ہے۔ گھر سونا پڑا ہے۔ لڑکی جاکر آیا گیا کا گھر میں راج ہے"

"جب ایسا ہے تو دوسرا لگن کیوں نہیں کرلیتے"

"بھئی یہ فرنگیوں کی کیا ہوا چلی ہے۔ ہر ایک ہی اپنے کو کچھ سمجھنے لگا ہے۔ نہ تو بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کا لحاظ نہ گروؤں کی عزت۔ جس کے جی میں جو آئے وہی کرتا ہے۔ دو لفظ "گٹ پٹ" آئے کہ نہیں بڑے بڑوں کو منہ چڑانے لگتے ہیں۔ اب ان کا دیکھا دیکھی وہ مورکھ سڑی جن کا پیٹ چیریں تو ایک لفظ نہ نکلے دو دو ہاتھ کودتے پھرتے ہیں۔ اب دیکھونا بے چارے کے ہاں کیا نہیں۔ دھن تو اس کے گھر کی داسی ہے۔ سرکار دربار میں آؤ ک جاؤک ہے۔ گاؤں میں ساکھ ہے۔ ٹیڑھی پگڑی لگانے والے بھی اس کے باتیدار ہیں۔ لیکن لڑکی صرف اس لیے بیاہ نہیں دیتے کہ وہ بوڑھا ہے"

"ہاں۔ بوڑھا تو ضرور ہے"۔ وہ کچھ سوچ کر بولیں۔

"چل دیوانی — تو بھی پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہے۔ مرد پھر بھی مرد ہے۔ املی کا جھاڑ بوڑھا ہونے سے کھٹاس تھوڑے ہی جاتی ہے۔ آہاہاہا"

"خیر کچھ بھی ہو۔ مگر۔ وہ ہم جیسے غریبوں کی بہتری کیوں کرنے چلے"

بوہی تیر نشانہ پر بیٹھتے دیکھ کر بولے "چھی چھی — ان کے پاس غریب امیر سب برابر ہیں۔ اونچ نیچ کا

کوئی خیال ہی نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی ہو مگر لڑکی ذرا شریف ہو" یہ کہتے ہوئے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال بیوی کے سامنے ڈال دی۔

"یہ کیسے ــــ؟

"سیٹھ نے شادی کا خرچہ دیا ہے۔ کہا ہے کہ لگن میں ذرا جلدی کرنا۔ ڈیڑھ لاکھ کی جائداد لیلا کے نام آج ہی لکھ دینے والے ہیں۔"

"کیا کہا ــــ؟ لیلا کے نام!"

"ہاں ہاں۔ تیری لیلا کے نام ــــ" میاں کا مسکراتے بیوی کی طرف فاتحانہ انداز سے دیکھتا تھا کہ بیوی کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہوگئی۔ مرجھائے لبوں پر ایک لطیف تبسم تیر گیا اور کملایا دل کنول کی طرح لہلہا اٹھا۔

۲

"اتنی رات گئے تم یہاں کیوں آئیں لیلا ــــ؟ کیا تمھیں ڈر نہیں لگا ــــ؟"

"ادنھ۔ ڈر۔ کیسی باتیں کرتے ہو پرشانت۔ اس پرتھوی کے رہن ہارے تو بڑے سے بڑا پاپ کرتے نہیں ڈرتے تو پھر مجھے اس اندھیاری رین کا کیا ڈر ــــ!"

"آج تم کیسی اکھڑی اکھڑی باتیں کرتی ہو لیلا ــــ بولو۔ یہ بے سمے آنے کا کارن۔"

"کارن کچھ نہیں۔ من موہن کی آخری سیوا کے لئے۔ ایک بار من مندر دیوتا کے چرنوں میں سیس رکھنے کے لئے۔ پرشانت صرف تمھارے درشن کے کارن اور کچھ نہیں۔"

"میری آتما کو اب زیادہ دکھ نہ پہنچاؤ لیلا۔ صاف صاف بول دو۔ کس لئے آئی ہو۔"

"ہاں بولتی ہوں پرشانت۔ اس پاپی جگ میں پریم کرنا بھی پاپ ہے۔"

"کیا کہا۔ پریت کرنا پاپ ہے۔ تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ اس دنیا میں کوئی اور پن بھی ہے۔"

"کیوں نہیں۔ یہ تمھاری بھول ہے۔ دھن کی قربان گاہ پر جوانی کی بھینٹ چڑھانا پن ہے۔ دیکھتے نہیں کھاتے زر کی ہوس میں جوان پتری کو بوڑھے کھوسٹ کے پلو باندھنا مہا پن ہے۔ سمجھے پرشانت۔"

"ہونھ۔ تو یہ بات ہے۔ اب میں سمجھا۔ سچ ہی ہے نا لیلا میرے پاس تجھ پر نچھاور کرنے کے لیے سونے چاندی کے ٹکڑے نہیں۔ البتہ تیرے چرنوں میں ڈالنے کے لئے پہلو میں ایک دھڑکتا دل ہے۔ تیرے رہنے کے لئے میرے پاس کوئی آکاش سے باتیں کرتی مہاڑی تو نہیں۔ مگر ہاں جمنا کے پار پہاڑی کی گودی میں ایک ننھی سی کٹیا ہے۔ جس سے آکاش کا چمکتا چندرماں جھانکتا ہے۔ سورج دیوتا کی پہلی کرن اسی سے مسکراتی ہے۔ میں کوئی سیٹھ نہیں جنگل کا رہن ہارا ایک غریب کسان ہوں۔ تیرے لئے شہر کی نعمتیں کہاں سے لاؤں گا۔ سندر سبھا (دنیا) کی اپسرا کون کی بناس پتی کیا جانے آسن کی۔ ہاں سنائل تو ضرور رکھتا ہوں کسی کی اڑان کھاٹیاں مرے ہوتے کام میں کمندیں ڈال سکیں گی۔ تجھے من میں بٹھاؤں گا۔ کلیجہ سے لگاؤں گا۔ تیرے کارن پرجیتا کو اپنے وکشس پر روں گا۔ خواہ اس میں مرے جیون و ستنا پن دکھ کیوں نہ پہنچے۔"

"نا نھ۔ تم مرے اندھیارے جیون کے دیا ہو۔ تم اس تن کی آتما ہو۔ تم بنا یہ جگ سونا ہے۔ ایسا دھن بھی کس کام کا جس میں جیون کو سکھ نہ ہو۔ مجھے وہ سبھا کاٹ کھانے کو جہاں پر تم نہ ہوں گے۔ تمھارے ہاتھ کے کھلائے ہوئے

چند باسی ٹکڑے ہی ساری نعمتوں سے بڑھ کر ہیں پرشانت
سچا سکھ تو وہی ہے جس کو من سمجھے۔"

تو پھر آ۔ مری دیوی وہاں چلیں۔ جہاں پریم ہی پریم ہو۔
ہم ایک نئی دنیا بسائیں گے۔ جو اس دنیا سے بالکل
الگ تھلگ ہو۔ جہاں کی ساری فضائیں پریم رنگینیوں سے
ہی رنگی ہوئی ہوں۔ اور اس پریم سنسار کی۔ تم مندر رانی۔"

اور میں ایک بات بولوں۔"

بولو ---"

اور تم اس کے راجہ --- آہا ہا --- ہو ہو ہو ---"

پرشانت نے دیوانہ وار اس کو آغوش میں لے لیا۔ پریم
پیاسے کے خشک ہونٹ چھلکتے جام یاقوتی کی طرف انتہائی
تیزی سے بڑھنے لگے۔ تنفس زور زور سے چلنے لگا۔ دلوں کی
ملی جلی دھڑکنوں نے من مندر میں پریم کا نیا دیا جلایا پھر اس کی
روپہلی روشنی میں دو پجاریوں نے پہلی مرتبہ اندر کے کیوپڈ
کی پوجا کی۔

--- ۴ ---

"کتنی بھیانک رات ہے پرشانت ---!"

"تم ڈرو نہیں ---"

"پرشانت میرا جی کیوں بیٹھا جا رہا ہے ---"

"کچھ وسواس نہ کرو لیلا ---"

"یہ کیسی آواز ---"

"ہوا کی سنسناہٹ ہے۔"

"یہ کیا ہے ---"

"دیوانی برگد کا سوکھا پیڑ ہے۔"

"کیا ابھی گاؤں کی سرحد پار نہیں ہوئی۔"

"ابھی ہو جائے گی ---" "دھن" کے ساتھ ایک
خوفناک آواز ہوئی اور سرحد پار کرنے والا ہمیشہ کے لیے
اس دنیا سے پار ہو گیا۔ پرشانت کی لاش زمین پر تڑپنے
لگی۔ "کیا ہوا پرشانت۔ بولو۔"

"دیوی --- پر --- پرنام ---"

"پرشانت --- اٹھو --- اٹھو۔"

"بس خاموش۔ دھرتی کا بوجھ تھا جو ہلکا کر دیا گیا۔"

"کون --- پتاجی!!"

"ہاں! پتاجی کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لگا کر پتاجی کہتے شرم نہیں آتی۔"
بوڑھا سیٹھ آنکھیں نکال کر بولا۔ "کل تو شادی کے نام سے چڑتی تھی۔
ماتا پتا سے اڑنگا لگائے بیٹھی تھی۔ آنکھوں میں خاک جھونک کر بھاگ
جانا چاہتی تھی۔ بول اب کہاں جائے گی؟" ایک تیسرے شخص نے
دانت پیستے ہوئے کہا جس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

"ہاں۔ میں وہاں جاؤں گی جہاں پردہ گیا ہے۔ اور اس پرمیشور
کے سامنے گڑگڑا کر بولوں گی۔ دیکھ تیرے دھرتی کے رہنے
والے پاپی کس طرح سماج کے جھوٹے بندھنوں سے باندھ کر دکھیارن
کے جیون لیا کرتے ہیں۔ دھن کے پجاری دولت کی قربان گاہ پر
کس طرح جوان بیٹیاں بھینٹ چڑھاتے ہیں۔" اس نے تنا کہا۔
اور پنگھٹ کی طرف دیوانہ وار دوڑنے لگی۔ ناہموار راستہ اور
بے ڈھنگے پتھروں کے سبب اس کے نازک اور پیارے پیارے پاؤں
خون آلود ہو گئے۔ جنگل کے کانٹے بری طرح گڑ گئے۔ خار دار درخت
اس کی ساری کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے آپس میں بانٹ لئے۔
پیچھے دوڑتا باپ بار بار پکارتا گیا۔ مگر پریم پجارن نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔
حتیٰ کہ اس ماتا جمنا کے پنگھٹ پہنچ گئی جہاں پر ماتا بانہیں کھولے
ہوئے اپنی سماج کی ماری بچی کو آغوش میں لینے کے لئے بیتاب تھی۔
اچانک وہ کود پڑی۔ اور ماتا نے اپنی آبی چادر میں ہمیشہ کے لئے
دکھیاری پتری کو چھپا لیا۔ ستارے تھرتھرانے لگے۔ جمنا خاموش سسکیاں بھرنے لگی۔

خطیب محمد سلیمان

میری سہیلیاں

کردار نگاری ادب کی ایک لطیف صنف ہے کسی کردار کو افسانوی بھیس میں پیش کرنا جدت ہے ہماری زندگی کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ دماغی تفریح کے لیے چھوٹی چھوٹی دلچسپ اور اثر انداز کہانیوں کی ضرورت ہے۔ ایڈگر ایلن پو کو اسی وجہ سے ادب جدید میں بڑا رتبہ دیا جاتا ہے۔

مادر وطن کے سپوتوں نے اس کو طرح طرح سے پیش کیا۔ میں نے بھی "صنفِ نازک" کے مختلف کرداروں کا خاکہ کھینچنے کا ارادہ کیا۔ میری پردہ نشین بہنیں مجھ سے اختلاف کریں یا اسے پردہ کی تذلیل گردانیں۔ لیکن یہ محض مختلف کرداروں کے خاکے ہیں جو وجود رکھتے ہیں اگر اس آئینہ میں کسی بہن کو اپنا عکس نظر آئے تو وہ اسے اپنی ہی تصویر پر محمول نہ کرے کیونکہ یہ مخصوص شخصیتوں کی طرف منسوب ہیں۔ ایک فلسفی ادیب کا قول ہے کہ "حقیقت اپنے لباس میں ممتاز جکڑ بندیاں محسوس کرتی ہے لیکن افسانے کے بھیس میں نہایت آزادی سے چلتی پھرتی ہے" اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ افسانہ ہی افسانہ ہے ہو سکتا ہے کہ اس میں سے بعض کردار حقیقی وجود بھی رکھتے ہوں

(۱) دلکش، دل فریب، مجسمہ شعریت، ہر شخص ایک بار دیکھنے کے بعد باز نگاہ ہے "کا تمنی رہتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مغرور حسین کی طاقتوں سے خوب واقف ہیں اسی کا بے پناہ حربہ لے کر میدان میں نکلتی ہیں۔ فنون لطیفہ کی غایت درجہ شائق جس طرح صنف میں نازک اسی طرح مزاج میں بھی نزاکت ہے ذرا سی بات پر ناراضی فطرت کا جزو بن چکا ہے۔ شاید یہ حسن کی دین ہے۔ فنونِ لطیفہ میں جتنا موسیقی کو پسند کرتی ہیں اتنی ہی سوزن کاری بھی مرغوب ہے بڑا حساس دل پایا ہے اگرچہ نزاکت مزاج اس بات کی متحمل نہیں کہ کسی سے ہنس کر بھی بات کریں لیکن اپنے غیر معمولی حسن اور فنون لطیفہ کے ذوق کی وجہ سے محفلِ احباب میں نمایاں جگہ کی مالک ہیں۔

(۲) نازک چھریرا بدن، موہنی صورت، دلکش آنکھیں جن میں ذہانت لوٹ لوٹ کر بھری ہے۔ بلند اور خوبصورت جگمگاتی پیشانی جو مستقبل کی کامرانیوں کی آئینہ دار ہے اس پر اکثر گھونگھر والے بال بے ترتیبی سے بکھرے رہتے ہیں۔ آئینہ کو کبھی محبت بھری نظروں سے نہیں دیکھتیں حسنِ خداداد کی رعنائیوں سے بے خبر مطالعہ کی بے حد شوقین غیر معمولی قابلیت کا سبب بھی یہی ذوق ہے۔ ہونہار ادیبہ ہیں ابھی شاعرہ تو نہیں لیکن مستقبل قریب میں ایسی توقع کی جا سکتی ہے۔ "تاثر" اور "احساس" کا جذبہ قدرت نے فیاضی سے بخشا ہے اچھے اشعار پڑھتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیوں سے محسوس کر رہی ہیں۔ اخلاق بے مثل ہر شخص ایک مرتبہ ملنے کے بعد گرویدہ ہو جاتا ہے۔ سوسائٹی کی آنکھ کا تارا۔ حلقۂ ملاقات نہایت وسیع جو اپنے وطن کے سوا ممالک غیر پر بھی محیط ہے۔ ذوق نہایت شستہ۔ زندگی میں کچھ بننا چاہتی ہیں قوم اور ملک کا بے حد درد۔ اصلاحی و رفاہی کاموں میں خوب حصہ لیتی ہیں۔ مناظروں، مباحثوں اور جلسوں میں حسن لیاقت اور سلیقہ کی وجہ سے خوب چمکتی ہیں غرض سوسائٹی کا یہ انمول ہیرا وقت آنے پر پوری آب و تاب کے ساتھ درخشاں ہوگا۔ حالت زیادہ تر بے فکر۔ آج کل سفر زندگی کی

کامیابی کی منزل تک پہونچنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ رہبر کامل رہنمائی کرے۔

(۳) حسین جمیل ، نسائیت کا مکمل نمونہ جذباتی اور بے حد رومان پسند۔ ہر وقت جذباتی شعراء کی نظمیں گنگناتی رہتی ہیں۔ افسانے محبت بڑے شوق سے پڑھتی ہیں۔ تخیلات پر محبت کی کارفرمائیاں ہیں۔ زندگی میں رنگینیوں کی دلدادہ ہیں چاہتی ہیں کشتی حیات گرداب میں پھنسے بغیر ساحل سے ہمکنار ہو جائے۔

ایک رومان پرور شام دن بھر کی محنت سے تھکی ہوئی زندگی کو ایک ملال عمیق بھر رہی تھی جسکو معبود نے ناحق اپنے بندوں کو عطا کیا میں اس سکون ابدی میں۔ وہ سکوت مقدس جسے لوگ موت کے بھیانک نام سے یاد کرتے ہیں دعائیں مانگ رہی تھی۔ اور فطرت اس وقت غم کا کوئی دل دوز نغمہ چھیڑ رہی تھی۔ فضا پر ایک غم انگیز خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کتنا روح فرسا منظر ہے۔ میں نے کہا کیا نیچر بھی میرے اس غم سے متاثر ہے مگر میں نے یہ پڑھا ہے کہ قدرت کے نظام العمل میں کچھ فرق نہیں آتا خواہ انسان میں کیسا ہی تغیر ہو۔ لیکن معبود اس وقت نیچر میرے ساتھ ہے؟ ورڈسورتھ کی تمام نیچرل نظمیں الہامی افسانوں کی طرح یکے بعد دیگرے میرے دل میں آ رہی تھیں۔ "شاعر بھی کتنا حقیقت طراز ہوتا ہے"۔ میں نے کہا — اس وقت میری یہ سہیلی پیکر ناز مجسمہ شعریت خرام ناز سے جادو جگاتی ہوئی میری طرف آ رہی تھیں۔ نہ جانے اس وقت اُن کے دل میں مسرت کا کون خزانہ چھپا ہوا تھا۔ وہ آ رہی تھیں ہنستی کھیلتی گنگناتی ایک کنول کی مانند جس نے ابھی ابھی کھل کر سورج کی روشنی میں غسل کیا ہو اور جو اُن امواج سے جو اس کو فنا کرنا چاہتی ہیں قطعی ناآشنا ہو۔

وہ سبز لباس پہنے ہوئے تھیں۔ وہ آ رہی تھیں ہنستی ہوئی ہنسی لٹاتی ہوئی باغ کو باغ باغ کرتی ہوئی میرے دل میں ایک خیال آیا میرے منہ سے بے تحاشا نکل گیا۔

شام ہیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

آہ انسانی فطرت میں بھی کس قدر تلون ہے — انھوں نے آتے ہی ایک دم کہا تکار میں نہیں سمجھ سکتی تم کیوں اس قدر قنوطیت پسند ہو گئی ہو آؤ تاہم دونوں مل کر اپنی پوری قوت سے ان پر — ان مصائب و آلام پر جو بہت جلد انسانی فطرت پر غالب آ جاتے ہیں۔ حملہ آور ہوں آؤ ہم رومان کی اس دنیا میں بس جائیں جو اس مکروہ دنیا سے بہت دور ہے اور جہاں یہ مکار اور جفا پیشہ انسان نہیں بستے۔ جہاں کی بستیوں میں مجروح امیدیں — سفاک نگاہیں اور ظلم و جفا نہیں وہ گنگنانے لگیں ع

اے طفل حسیں لے چل اے عشق ہمیں لے چل

اے عشق ہمیں لے چل اک نور کی وادی میں اک خواب کی دنیا اک طور کی وادی میں

وہ ایک لافانی نغمہ گا رہی تھیں۔ تمام کائنات ان کی ہم آہنگ نظر آ رہی تھی۔ وہی کائنات جو ابھی ابھی غم کا دل دوز راگ الاپ رہی تھی۔ اس تغیر پر میں حیران تھی۔ اُن کے دل سے جو نغمے نکل رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام باغ کی فضا پر چھائے جا رہے ہیں۔

وہی میں — وہی میرا دماغ جو خندۂ بے جا کا متحمل نہ نظر آتا تھا خود مائل بہ خندہ تھا۔ میں ہنس رہی تھی۔ میرا دل ہنس رہا
تھا۔ دنیا اپنی رنگینیوں کے ساتھ ہنستی ہوئی نظر آرہی تھی وہ میرے قریب آئیں میرا ہاتھ پکڑا اور باہر لے گئیں اب میں —
مجھ میں کیا باقی رہا تھا باہر کا ماحول کچھ ایسا جاذبِ نظر ہو رہا تھا کہ میں اور وہ اس میں جذب ہو گئے۔ اب بھی میں چشمِ باطن سے
وہ شام وہ فرحت انگیز شام یاد کرتی ہوں جو ساحل سمندر پر ایک باغ میں میں نے اپنی اس سہیلی کی معیت میں گزاری تھی۔
تو بے اختیار چاہنے لگتی ہوں کاش زندگی میں ایسی ہی رنگینیاں میسر آجائیں تو کون اس کو ملالِ عمیق سمجھے گا۔ اور اس سے
اپنا پیچھا چھڑانے کی فکر کرے گا۔

(۴) سرو قد۔ تندرست۔ مستقل مزاج۔ ارادہ کی اٹل۔ خطرناک حد تک "عمل" کسی کام کو اتفاق پر کبھی نہیں چھوڑنا چاہتیں۔
کارزارِ حیات کے تلخ تجربوں سے کبھی پست ہمت نہیں ہوتیں۔ قدرت نے ذکاوت و ذہانت کی عطا میں سخاوت سے کام لیا ہے۔
وہ اپنی تدابیر سے قدرت سے برسرِ پیکار ہونا چاہتی ہیں آج کل قسمت کی تعمیر میں مصروف ہیں جس طرح کوئی معمار دیوار اٹھاتا ہے
وہ گر جاتی ہے وہ پھر مستعدی سے اٹھانے لگتا ہے۔ اسی طرح یہ قسمت بنانے کی تگ و دو میں سرگرمِ عمل ہیں۔ ظاہر و باطن کو
ایک رکھنے کی مطلقاً ضرورت نہیں سمجھتیں۔ اگر سینہ میں شرر باری ہو رہی ہو تو وہ کبھی ان شعلوں کو ظاہر ہونے نہیں
دیتیں۔ چہرہ پر ایسا ہی خوفناک تبسم کھیلتا رہتا ہے جس طرح سمندر میں سخت طوفان کی وجہ تلاطم ہوتا ہے اور لہریں
بلند ہو کر طوفان اٹھاتی ہیں اسی طرح گو دل میں تلاطم بپا رہتا ہے لیکن وہ اس تلاطم کی لہروں کو چہرہ پر ہنسی کی لہروں
میں پیش کرتی ہیں۔ عیاری اور مکاری کو حاصلِ سیاسیات یعنی منزلِ مقصود پر پہونچانے کا رہبر خیال کرتی ہیں۔ ان کو رومان کا
کوئی دلچسپی نہیں۔ مسابقت میں اپنے حریف کو پامال کرنے کی کوششوں میں سرگرمِ عمل نظر آتی ہیں — یہ بھی میری سہیلی ہیں

رفعیہ سلطانہ

ایک شام

چھپتا ہے پھر رہی ہیں شوخ الھڑ لڑکیاں　　ٹولیاں باندھی ہوئیں کرتی ہوئیں اٹکھیلیاں
ہاتھ میں ساری کا آنچل ناز فرماتی ہوئیں　　چھیڑتی اک دوسرے کو اور کچھ گاتی ہوئیں
بجلیوں سے حسن کی دنیا کو چونکاتی ہوئیں　　مدعائے زندگی نازش کو بتلاتی ہوئیں
اس طرح آئیں کہ دنیا عشق کی لہرا گئی　　ذرہ ذرہ جگمگا اٹھا فضا تھرا گئی
ہائے وہ ان کا بلوریں جسم وہ ان کا جمال　　باتوں باتوں میں الجھ کر رہ گئی زلفِ جبال
ہائے وہ خاموش نظارہ وہ عریاں گردنیں　　گوری گوری ان کی باہیں وہ سنہری کنگنیں
وہ جوانی کی امنگیں وہ امنگوں کے شرار!　　کیا بتاؤں! ہو گئی پامال دنیائے قرار!

زین العابدین نازش

معبود! میں نے تیری تلاش شروع کی۔ میرے تخیل کی وسعت نے تجھ کو عرشِ منور پر تلاش کیا۔ زمینوں میں تلاش کی۔ نسیمِ سحر کے جھونکوں سے دریافت کیا۔ سربہ فلک پہاڑوں کی چوٹیوں سے اظہارِ تمنا کی۔ دشت و بیاباں کی خاک چھانی۔ گل شجر سے خواہش ظاہر کی۔ سمندر میں غوطہ لگایا۔ شفاف موجوں سے دریافت کیا۔ میری پریشان حالی پر، میری دریافت پر شجرِ گل نے حیرت کی، دشت و بیاباں نے خاک اڑائی، سمندر کی موجوں نے قہقہے لگائے اور پھر اپنی پُرنور دورانی پر مہرِ سکوت لگائی۔

اب میں نے اپنا رخ چمک دار آفتاب کی طرف پھیرا۔ التجا بھری نظروں سے اپنے معبود کو دریافت کیا۔ آفتاب نے اپنی سنہری خیرہ کن کرنیں مجھ پر ڈالیں اور اپنی آتشیں جلوہ ریزیوں کے ساتھ چمکتا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے اس کی تیز شعاعیں مدھم پڑ گئیں اور اس نے اپنا حسین چہرہ مغرب کی تاریک گھاٹیوں میں چھپا لیا۔

میں نے شفق آلود آسمان سے، پُرنور چاند سے، جگمگاتے تاروں سے اپنے معبود کا پتہ دریافت کیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ ٹکٹکی باندھے حیرت آمیز نظروں سے مجھے تک رہے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی روشنی بھی پھیکی پڑ گئی۔

میرے قدم گلستاں کی طرف بڑھے۔ عطر بیز نسیمِ صبح شوخ رفتاری کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتی ہوئی چل رہی تھی، شاداب و سرسبز باغ میں طائرانِ خوش نوا معبود کا راگ الاپ رہے تھے۔ بلبلِ شیریں ترنم آفریں گیت گا رہی تھی۔ سارے گلستاں پر عجیب پُرکیف فضا چھائی ہوئی تھی۔ اس جانفزا نظارے نے پھر میرے دل کی آگ کو بھڑکایا۔ میں نے ان سب سے معبود کے متعلق استفسار کیا۔ میری نادانی پر بلبلوں نے سرگوشیاں کیں، طائرانِ خوش الحان نے مذاق اڑایا، نرگس نے نگاہِ تعجب سے دیکھا، گلوں نے مسکرایا، غنچوں نے کھل کھلا کر ہنسا۔ سبزہ نے سر جھکا لیا۔ پھر سب پر سکوت چھا گیا۔

اب میرے شوق و وارفتگی نے مجھے عبادت گاہوں کی طرف پھیر دیا۔ میں نے خانقاہوں کو چھان مارا، دیر و حرم کا جائزہ لیا، مسجدوں میں تلاش شروع کی۔ اے معبود، اب کہاں تلاش کروں۔ میں اپنی ناکام کوشش سے تنگ آ کر بیٹھ گئی۔ مایوسی و ناامیدی کی حالت میں دیدۂ دل سے قلب کی گہرائیوں پر نظر دوڑائی۔ یہ ننھا تاریک گوشہ کچھ منور نظر آنے لگا۔ ایک موہوم سی امید بندھ گئی۔ ایک شیریں کیفیت ایک پُرخلش رقت محسوس ہوئی۔ کوئی نامعلوم سی صدا آنے لگی۔ آ، نادان جس کو تو تلاش کر رہی تھی وہ تیری عزیز ترین شئے، زندگی کا سہارا، شہ رگ سے بھی قریب ہے۔

گر ہے شوقِ دید پیدا دیدۂ بینا کریں
خاک کے ذروں میں سیرِ عالمِ بالا کریں

زبیدہ

شاعر کا گناہ

(بسلسلہ گذشتہ)

(۴)

مہینہ سال کی شکل میں تبدیل ہوا، وہ اپنے پیچھے کئی گنہ آلود دن چھوڑ کر پھر ظاہر ہوا، لیکن زلیخا کی امیدوں کا خون کرنے والا ناصر تاحال اپنے ہوس پرست ارادوں کے مادہ کو مغلوب نہ کر سکا، اس کے خیال میں کوئی پختگی نہ آ سکی، اس نے بھول کر بھی اُس پژمردہ پنکھڑیوں کی جانب نگاہِ ترحم نہ کی، اور نہ کوئی خط لکھا۔ اس کے جذبات میں کمی پیدا ہو گئی تھی، جی بھر کے اس نے ان نرم نازک پنکھڑیوں کا رس چوس لیا تھا، اس کے لئے اب یہ بیکار کھلونا تھا۔

زلیخا۔ فریب خوردہ زلیخا اپنے شجرِ امید کو تازہ رکھنے کی کوشش کر رہی تھی، اس نے ناصر کے پاس کئی خطوط روانہ کئے گذشتہ ہوس رانیوں کی یاد دلائی، قسمیں دہرائیں، موجودہ حالات کی تصویر کھینچ کر پیش کی، خدا اور رسول کا واسطہ دیا، عذاب کے خوف سے ڈرایا، سب کچھ۔ لیکن ناصر کے بے رحم دل کو ذرا بھی ٹھیس نہ لگی، اس کی آنکھیں برابر دوسرا لطیف شکار پھانسنے کے لئے محوِ جستجو تھیں، تاحال اس کا پیالۂ ہوس نہ چھلکا تھا۔

ناصر نے اپنے رفتہ واقعات کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی، لیکن ایسا نہ کر سکا، انسان آخر انسان ہے۔ کب تک خرافات میں مبتلا ہوگا، احساسِ گنہ کبھی ہو کر رہے گا، پیالۂ ہوس کبھی شکستہ ہو جائے گا۔ پردۂ غفلت پر دکھائے جانے والا ڈرامہ کبھی محو ہو کر رہے گا، ناصر اپنے سینے میں دل رکھتا ہے۔ یہ کوئی پتھر اور لوہے کا ٹکڑا نہیں، ہے تو ضرور مگر زیادہ نہیں متاثر ہونے والا۔ وہ اکثر راتوں کی انتہائی تنہائیوں میں اپنا بھولا ہوا افسانہ دہرانے لگتا، اس کے گذشتہ تخیلات کی دنیا میں رومانوی راتیں، ایک دھندلا سا خاکہ، دیکھا ہوا خواب، سنا ہوا افسانہ سے زیادہ حقیقت نہ رکھتیں۔ اس نے کوشش کی، افسانے اور نظمیں لکھنے کی۔ لیکن لکھ نہ سکا، اگر لکھا بھی۔ تو بالکل ٹھوس درد و اثر سے خالی۔

وہی ناصر۔ ایک سال پہلے جس کی نظمیں اور افسانے ملک کے لئے پیامِ مسرت تھے۔ آج وہ ایک حرف بھی لکھنے کے قابل نہ تھا، اس کے دل و دماغ میں شاعرانہ خیالات کے بجائے تفکرات کا دریا موجیں لے رہا تھا، اس کے پاکیزہ اور بلند جذبات ہوس کاریوں کے نذر ہو چکے تھے، گنہ کے بھینٹ چڑھ چکے تھے، انہیں وہ کثرتِ بادہ نوشی میں ختم کر چکا تھا۔

آہ۔ "شاعر کی زندگی کا انجام"

ایک زبردست خیال کبھی کبھی اس کے سفینۂ دل کو آ کر ہلا دیتا۔ وہ ناز کے رنگین خطوط۔ کہاں؟ انہیں وہ گنہ کی تاریکیوں میں کھو چکا۔ رسالہ فردوس کبھی کا بند ہو چکا تھا۔

ناز کے رنگین خطوط۔ ایامِ رفتہ کی یاد۔ اس پر اب کافی اداسی برس رہی تھی، ایک شام وہ ان سب کو لے بیٹھا۔ اور رات گئے ان ہی خیالوں میں محو رہا۔ ناصر زندگی کے پرخطر منازل طے کر رہا تھا، کائنات کا ذرہ ذرہ اسے تاریک اور گنہ آلود نظر آ رہا تھا۔ اور خود ناقابلِ معافی گنہ کا مجرم۔

"بزم خیال" ناصر کے ایک دوست نے حیدرآباد سے پرچہ نکالا ۔۔۔ اُسے اپنے دوست کے اصرار پر قلمی امداد کا وعدہ کرنا پڑا ۔۔۔ پرچے کے بلند معیار نے بہت جلد اسے ہندوستان کے کونے کونے تک پہونچا دیا ۔۔۔ جنوری کا رسالہ صحافتی دنیا میں پیام مسرت لئے ہوئے نکلا ۔۔۔ بالخصوص "راحت حیدرآبادی" کے قلم سے ۔۔۔ بلند پایہ افسانہ، "پھولوں کی شہزادی" نے تو اس میں چار چاند لگادئے ۔۔۔ لوگوں کے مٹے ہوئے جذبات ابھر آئے حسینوں کی دنیا از سر نو آباد ہوئی ۔۔۔ مثل گذشتہ کے اسے کئی تعریفی خطوط ملے۔ اور ایک خاتون کا ۔۔۔ جو مس ناز ۔۔۔ کے نام سے تعارف کرایا گیا ۔۔۔

ناز ۔۔۔ ناصر نے حسرت آمیز لہجہ میں کہا، میں نے تجھے پالیا ۔۔۔ کانپتی ہوئیں انگلیوں سے اس نے لفافہ چاک کیا۔ اور ذیل کی تحریر پڑھی ۔۔۔

"دنیا اپنی گودی میں طویل خاموشی کے ساتھ گہرا راز لئے ہوئے ہے: "بزم خیال" میں آپ کا تازہ افسانہ "پھولوں کی ۔۔۔" کے مطالعہ کے بعد یہ چند سطر لکھنے کی جرأت کرنی پڑی ۔۔۔ معاف کیجئے، عورت کی فطرت کا اندازہ لگانے میں آپ نے ضرور لغزش کھائی ہے، معلوم نہیں آپ کس خیال کے تحت یہ افسانہ لکھنے پر مجبور ہوئے، میرا دعویٰ ہے، مرد کبھی صنفِ نازک کے ہم خیال نہیں، آپ فضول موافقت پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، مرد فطرتاً دغاباز وعدہ فراموش نہیں تو اور کیا ہے ۔۔۔

معاف کیجئے! میرا مطلب آپ کی گراں قدر ہستی سے نہیں، ننانوے فیصدی میں آپ ایک، عورت! قدرت کا اچھوتا تخیل، فرشتوں سے زیادہ معصوم، مکر و فریب سے بے لوث مرد کے بے رحم ہاتھوں کا کھلونا بنے، آہ کس قدر قدرت کی ستم ظریفی ہے، مرد! جس کے سینے میں پتھر جیسا دل موجود ہے۔ عورت کی گہرائیوں کی تہہ تک نہیں پہونچ سکتا ۔۔۔ وہ فلسفۂ محبت سے قطعاً ناواقف ہے،

سنیئے! اور انصاف کیجئے، ایک شکستہ کلی شاخ گل پر جھولا جھول رہی ہے، بلبل کی بے رحم چونچ نے اُسے بہار آنے سے پہلے ہی نوچ ڈالا ۔۔۔ اپنے نمکین، رسیلے گیت سے مست اور سرشار بنا کر ....

پھول کی ایثار نفسی ملاحظہ ہو ۔۔۔ اپنے دیوانے بلبل کے لئے سیمیں دامن وا کر دیا ۔ حیف کہ بلبل کی بے رحم چونچ نے اسے خزاں کے حملوں سے پہلے ہی زخمی کرکے بکھر دیا، یہی حال ۔۔۔ میرا ۔۔۔۔۔

للہ بتلایئے، آپ مرد ہیں، مرد، مرد کے جذبات کو خوب سمجھ سکتا ہے، میں آپ سے یہ دریافت کرتی ہوں کیا مرد، ہوس کاریوں کا پجاری، بے گناہ معصوم دلوں کو زخمی کرکے مسرت کی فضاء میں اطمینان کا سانس لے سکتا ہے۔ کبھی نہیں، یاد رکھئے، اس کا فیصلہ ہوگا، نا معلوم معینہ وقت پر۔ آہ ۔۔۔

معاف کیجئے! میں آپ کو دادِ سخن دینا بالکل بھول گئی،

بدنصیب، ناز کلکتہ

نازؔ کا الم انگیز خط ناصرؔ کے بیتاب دل کے لیے خزاں کا تھپیڑا اور بجلی کے حملہ سے زیادہ روح فرسا ثابت ہوا ـــ اُس کے احساسات کو ٹھیس لگی، وہ دیر تک روتا رہا. کسی نامعلوم گناہ کے احساس سے ـــ
ناصرؔ نے اس کے جواب میں لکھا ـــ

نازؔ تمھارے خط کا ایک ایک حرف میرے دل کو پارہ پارہ کئے دیتا ہے.
نازؔ ـــ تم بتا سکوگی ـــ آخر وہ ـــ جس نے تمھارے
نازک سے دل کو چور چور کر ڈالا ـــ کون ـــ اچھی ناز
میں قسمیہ کہتا ہوں، ـــ اُسے ڈھونڈ نکالوں گا ـــ
اسے تم دنیا میں زندہ نہ پاؤگی ـــ جواب کا منتظر " دیوانہ راحت "

ایک ہفتہ کے اندر نازؔ کا خط آیا ـــ اور ناصرؔ کے خرمنِ دل پر بجلی بن کر گرا ـــ

ہمدردی کا شکریہ! معاف کیجیئے، میں ایک حرف بھی بتانے سے قاصر ہوں، براہ کرم آیندہ، ان باتوں کا خیال رکھیے گا ـــ ناز

اُف کتنا ستم، نازؔ تم سے یہ امید ـــ تم ایک مشہور ادیبہ، بلند جذبات کی ملکہ ـــ وفا کی پتلی، نہیں تم وفا کی پتلی نہیں فریب کا مجسمہ، سراپا بلاؤں کا پیکر، دھوکے کی ٹٹی ـــ عورت، آہ ایک زمانہ تھا، ـــ اس کے ادنیٰ کرشمہ پر میں اپنی جان قربان کرنے تیار تھا ـــ اس کے متعلق میرے خیالات کتنے پاکیزہ اور بلند تھے. لیکن اب نہیں، بالکل نہیں، میں اس کے خلاف پروپگنڈہ کروں گا، کمزور کم عقل، دغاباز مکر و فریب کی پتلی ـــ جنت سے روندی ہوئی. شیطان کی مرید ـــ عورت، ہاں عورت،

اور زلیخاؔ، تو ـــ لاکھوں میں ایک مجسمۂ اخلاق، بے گناہ، معصومیت کی پتلی، یوسف کی زلیخا کی طرح محبت کی دیوی، ـــ لیکن افسوس میں بدکار ـــ تیری محبت کو ٹھکرایا ـــ آہ، میں نے کیا کیا ـــ ایک زبردست گناہ ـــ جس کا کنارہ شاید کسی دنیا میں نہیں، میرے معبود ـــ مجھے معاف کر ـــ اُف میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے اب مجھے اپنی گناہ آلود زندگی ختم کر دی چاہیئے! اس نے میز کی دراز سے ایک چھوٹا سا ریوالور نکالا. اس کی آنکھیں چمک اٹھیں ـــ یہ لوہے کا ٹکڑا، اس نے ریوالور کی طرف گھورتے ہوئے کہا ـــ مجھے چند ہی سکنڈ میں ابدی نیند سلادے گا ـــ نہیں، ابھی نہیں، اس سے پہلے میں زلیخاؔ سے ملکر معافی چاہ لوں، گڑگڑا تا رہا ـــ اور رونا بھی اس کے بہنے والے منتشر سے آنسوؤں کے قطرے، کثیر گناہ کو کبھی دھو نہیں سکتے ـــ

وہ اٹھا ـــ مصمم ارادہ کرکے، لباس تبدیل کرکے اس نے اسٹیشن کی راہ لی ـــ کلکتہ ناصرؔ کے لئے نئی جگہ تھی، متعدد دفعہ ذاتی اغراض کے تحت آچکا تھا ـــ " لنڈن اسٹریٹ " میں لطیف منزل کا دریافت کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا.

لیکن اس وقت اُس کی مایوسی کی حد نہ تھی — جب وہاں کے رہنے والوں نے بتایا کہ چند دن ہوئے پروفیسر لطیف انتقال کر چکے ہیں — اور ان کی بیٹی یہیں کسی رشتہ دار کے یہاں مقیم ہے'

ناصر سکتہ کے عالم میں وہیں کا وہیں کھڑا رہا۔ اس کا سر چکرانے لگا' وہ چیخ چیخ کر رونا چاہتا تھا — اگرچند لوگ اس کے گرد جمع نہ ہوتے — مایوسی سایہ کی طرح اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی' رات کا بقیہ حصہ اُس نے رونے اور ہچکیاں لگانے میں کاٹا — وہ ایسا کرنے میں خوش تھا — شاید گناہ کی تلافی ہو جائے —

ناصر مسلم گرانڈ ہوٹل میں مقیم تھا' رات اور دن کا اکثر حصہ وہ تنہائیوں میں بسر کرتا' گو اُس وسیع آبادی میں اس کے کئی ایک ملنے والے تھے —

" کلکتہ اردو میگزین کا سالنامہ بڑی آب و تاب کے ساتھ شایع ہوا اُس میں شایع ہونے والے مضامین اور نظموں کے علاوہ " سنہری کانٹے " کے عنوان سے یہ افسانہ محترمہ ناز کلکتوی کے قلم سے خاص کر پبلک کے دلوں میں ہیجان پیدا کر رہا تھا —

ناصر شام کی تفریح سے گھر لوٹتے ہوئے' رات کے مطالعہ کے لئے میگزین کا سالنامہ خریدا اور فرصت کے لمحات میں اسے لئے بیٹھا — فہرست مضامین میں وہ ناز کا نام دیکھ کر اچھل پڑا —

ناز " اس نے دبے ہوئے یاس آمیز لہجہ میں کہا — آہ تو یہاں ہے۔

" سنہری کانٹے " راحت حیدر آبادی کا افسانہ " پھولوں کی شہزادی کے برعکس ڈھالے گئے تھے' اس کی تردید کی گئی تھی — یہ دکھایا گیا تھا کہ کس طرح سنہری کانٹے رنگین نازک پھولوں میں الجھ کر تباہی کا باعث ہوتے ہیں' طویل دلکش پیرایہ میں اس پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

ناصر اپنی زندگی کے چند بکھرے ہوئے ورق بالکل اس افسانہ کے پلاٹ کے مطابق پا رہا تھا۔ وہ حیران تھا' اس معمہ کو وہ سمجھ نہ سکا' ایک طویل پیرایہ میں اس نے خط لکھا —

" ناز — میں نے پھر تمہیں پالیا' یقین جانو — اب تمہیں حاصل کئے بغیر نہ چھوڑوں گا۔ تم یہ جان کر حیرت کرو گی' میں کلکتہ آگیا ہوں' میگزین والا افسانہ — کیا کہوں کتنا میرے دل کو تڑپانے والا ثابت ہوا' بتاؤ' تم نے اس افسانے کا پلاٹ کہاں سے حاصل کیا — تم ضرور میرے رازوں سے واقف ہو۔

اُف عجیب اتفاق ہے' میری زندگی کا خاکہ — اور تمہارے افسانہ کا پلاٹ۔ واللہ بالکل ایک' میری ناز — میں تمہارے قدموں کے پاس آگیا ہوں' مجھے زندگی بخشو — جانتی ہو — تمہاری ہاں اور نہیں پر میری موت اور حیات کا سوال ہے'

جواب کا منتظر
بدنصیب راحت گرانڈ مسلم ہوٹل کلکتہ'

دوسرے دن خط اپنا جواب لئے آن پہونچا،

"موت، اور حیات کا فیصلہ" ناصر نے لفافہ کو چاک کرتے ہوئے کہا،

"ہاں میں مل سکتی ہوں" یہ جملہ اس نے تیزی کے ساتھ پڑھا، لیکن چند منٹ کے لئے مقام اور وقت کی صراحت کیجئے۔

یا میرے اللہ، ناصر نے جوش کے ساتھ لفافہ کو سینے سے لگا کر کہا،

مقام اور وقت، آج بدھ، کل جمعرات، اس نے لکھا — ہاں کل رات کے [illegible] بجے گلی والے پارک کے قریب کوئین اسٹیچو کے پاس میرا انتظار کرو — سات بجے سے پہلے اسٹیچو کے قریب ایک تانگا [illegible] سایہ نمودار ہوا، دل دھڑکنے کی آواز خاموش فضا کو توڑ رہی تھی، منور چاند بادلوں میں آہستہ آہستہ تیر رہا تھا ———

ہلکی آہٹ۔ سفید ملبوسات میں لپٹا ہوا مجسمہ گلاب کی گھنی جھاڑیوں میں مجسم انتظار تھا ———

دو دل کانپ رہے تھے، نامحرم ملاقات کے احساس سے، آنے والا سامنے آکر رک گیا۔ دوسرا لحظہ گذرا ہوا، چاند نے بادلوں کی ردا اوڑھلی ——— اس کی روشنی قدرے ماند پڑگئی تھی ——— دونوں ——— خاموش ——— ساری فضا، خاموش، بادل، چاند خاموش ——— ایک ——— دو ——— تین سکنڈ، سکنڈ، مسلسل سکوت ——— چاند نے اس عرصہ میں اپنا سر بادلوں سے باہر نکالا ——— اپنی ضیاپاش کرنیں ان دونوں کے چہروں پر بچھا دیں ——— اف خدا! کتنا لطیف منظر ——— ایک دوسرے کے درمیان ——— اُن کی پُر شوق نگاہیں، ایک دوسرے کے چہرے پر پڑیں ———
اور آخر تڑپ اٹھیں ———

زلیخا ——— نوجوان ادیب نے چلایا ——— تم ———

ناصر اس کی محبوبہ کی زبان سے نکلا ———

اگر ناصر اسے تھام نہ لیتا تو زلیخا بری طرح نیچے گر پڑتی ——— زلیخا کو اٹھاتے ہوئے۔ ناصر نے ایک کاغذ کا ٹکڑا پایا ——— اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، یہ اس کی تحریر تھی۔

زلیخا ——— ناصر نے اسے علحدہ کرتے ہوئے کہا، پہلے مجھے اس کا جواب دو، ——— یہ تحریر تمہارے یہاں کیسے آئی

"یہ تحریر" زلیخا نے اطمینان کے ساتھ کہا، اس گنہ آلود اداکاری سے پہلے، میں ایک رنگین پُر لطف خواب دیکھ رہی تھی جس کے ہیرو مسٹر راحت حیدرآباد کے رومان پرست شاعر تھے ——— لیکن آہ ——— ہمارے تخیلات کے رنگین پھولوں کے درمیان سنہری کانٹوں نے الجھ کر مزاحمت پیدا کی ——— وہ کلکتہ آئے ہوئے ہیں، اس چٹھی کے ذریعہ مجھے یہاں بلوایا تھا۔

زلیخا ——— تم ناز ———

ہاں، ناز ——— زلیخا ———

اور میں، ناصر ——— راحت، راحت، ناصر

اف کتنا دلفریب انجام، لیکن گنہ آلود ———

"شاعر کے گنہ" کے مسلسل آنسو بہہ بہہ کر "عورت کے دامن" میں جذب ہو رہے تھے۔

صابر کوسگوی

محسوسات

حسن کی خوابیدہ محفل کو جگا دیتا ہوں میں
کس بلندی سے خدا جانے صدا دیتا ہوں میں

دردِ دل کا نام سن کر مسکرا دیتا ہوں میں
اپنی بربادی کا افسانہ سنا دیتا ہوں میں

اللہ اللہ! یہ مرے دستِ شوق کی گستاخیاں
اُن کی بزمِ ناز کے پردے اٹھا دیتا ہوں میں

کیا خبر دزدیدہ نظروں سے وہ کیا فرما گئے
روز اک امید کی محفل سجا دیتا ہوں میں

مبتلائے کشمکش ہے کب سے قلبِ ناتواں
ایک چنگاری کو مدّت سے ہوا دیتا ہوں میں

رحم کھاتی ہیں خدائی پر مری مایوسیاں
ولولے اٹھنے نہیں پاتے دبا دیتا ہوں میں

آج بھی قایم ہوں اپنی وضع پر تیرے لئے
اب بھی تیری راہ میں آنکھیں بچھا دیتا ہوں میں

اِس ترے روشن تبسم کا فسانہ چھیڑ کر
محفلوں میں حسن کی شمعیں جلا دیتا ہوں میں

چاہتا ہوں دیکھنا جب زہد کی محفل کا رنگ
خود کو عصیاں کی بلندی سے گرا دیتا ہوں میں

اب میں اُن کے جور کا شکوہ بھی کر سکتا نہیں
وہ یہ کہتے ہیں "تجھے دادِ وفا دیتا ہوں میں"

اور کچھ مقصد نہیں ماہر مرے اشعار کا
درد سے لبریز اک نغمہ سنا دیتا ہوں میں

ماہر القادری

دیہی بنک کی مصروفیات

(اس مضمون کی پہلی قسط اکتوبر ۱۹۶۳ء کے سب رس میں شایع ہو چکی ہے۔)

بہتر کاشت

اس طرح ان اصولوں کی وضاحت کے بعد جن پر دیہی بنک کو کام کرنا چاہئے، اب ہم یہ غور کریں گے کہ ان عمل جن معاشی، سماجی، مذہبی اور دوسری رکاوٹوں کے شکار بنے ہوئے ہیں انہیں دور کرنے کے لئے اسے کونسے خصوصی کام اپنے ذمہ لینے چاہئیں۔ بنک کو چاہیے کہ اس مسئلہ کے ہر پہلو کو اپنے سامنے رکھے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ کسان کے اخراجات کی تحدید اور آمدنی کے اضافہ کے ذریعہ وہ اس کی کس طرح مدد کر سکتا ہے۔ پہلے ہم اس ناکافی معاوضہ پر غور کریں گے جو کسان کو اپنی فصل سے ملتا ہے۔ پہلی ضرورت یہ ہے کہ نسبتاً کم اخراجات سے اور اسراف سے بچتے ہوئے بہتر فصل حاصل کی جا سکے۔ اس کے لئے اسے اولاً بہتر کھاد، بہتر تخم، بہتر زرعی آلات اور بہتر مویشی درکار ہوں گے۔ ان تمام امور میں بنک قابل قدر امداد دے سکتا ہے۔ اپنے اراکین کی مشترکہ کوشش سے بہتر طور پر ذخیرہ کردہ گوبر دیہی فضلہ وغیرہ جیسی فطری کھاد کی فراہمی کا انتظام کر سکتا ہے۔ وہ اچھی قسم کی میکانی کھاد، بہتر قسم کے مختلف تخم جو مقامی حالات کے تحت زیادہ مناسب ہوں اور بہتر زرعی آلات محکمہ زراعت کے توسط سے خود خرید کر اپنے اراکین کے لئے نفع بخش قیمتوں پر فراہم کر سکتا ہے۔ ایسے اراکین کے لئے جو اپنے لئے نہیں خرید سکتے بنک اپنے گودام سے ہل کرایہ پر دے سکتا ہے۔ وہ مسلمہ نسل کے سانڈ رکھ کر اور دیہاتیوں کو سارے ادنیٰ قسم کے بیلوں کو خصی کرنے کی ترغیب دے کر باربردار مویشیوں کی نسل کو بہتر بنا سکتا ہے۔ اگر مزارع ان مویشیوں سے بہتر جو وہ اس وقت دوسروں سے خریدتا ہے خود اپنے لئے لاذ و مویشی تیار کر سکے تو بیلوں کی خریدی پر جو بڑی بڑی رقمیں صرف کی جاتی ہیں وہ بچ رہیں گی، اور کسان ان سے بہت بہتر کام لے سکے گا۔ اس سلسلہ میں مویشی بیمہ کے سوال پر مرکزی یا صوبجاتی انجمنیں غور کر سکتی ہیں۔ مویشی کی عمر کے بہت کم ہونے اور کاشتکار کی آمدنی کے گھٹتے ہوئے ہونے کی وجہ سے یہ اس وقت تک ایک مشکل مسئلہ ثابت ہوا ہے۔ جب دیہی بنکوں کو اپنے اراکین کی معاشی حالت کو سدھارنے میں مدد دی جا چکے تو ممکن ہے کہ ان کے لئے اپنے مویشیوں کا بیمہ کرانا ممکن ہو جائے۔ اچھی قسم کے مویشی کی داشت کے لئے بہتر چارہ اور بہتر انتظام علاج حیوانات کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ ایک طاقتور دیہی انجمن کو گاؤں میں مناسب چراگاہوں کو محفوظ کرنے، اور موجودہ نقصان دہ طریقہ کے برخلاف جس کے مطابق سارا علاقہ ایک دفعہ چرا دیا جاتا ہے اس کے مختلف حصوں سے باری باری سے استفادہ کرنے کے سلسلہ میں حکومت سے مراسلت کرنے اور ساتھ ہی ساتھ خود اپنے اراکین سے اس قسم کی مفاہمت کرنے کے قابل ہونا چاہئے۔

بنک محکمہ علاج حیوانات سے بھی انتظام کر سکتا ہے، اور خود اپنے اراکین کو بہتر علاج حیوانات سے مستفید ہونے کی ترغیب دے سکتا ہے۔ اپنے اراکین کے مشترکہ عمل سے گوبر کو ایندھن کے طور پر استعمال کر کے ضائع کرنے سے روکنے کی غرض سے جلانے کے لئے لکڑی پیدا کرنے کا انتظام کر سکتا ہے۔ اراضی کی ذیلی تقسیم اور انتشار کی وجہ سے جو

وقت اور محنت ضائع ہوتی ہے، اور حاصل کم ہوتا ہے، اب اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہوگی، اور اس مقصد کے تحت بنک پنجاب کی اتحادی انجمنوں کے طریق کار کے مطابق اراضی کی یکجائی کا طریقہ اختیار کرسکتا ہے۔[1]

ایک دوسرا طریقہ مشترکہ کاشت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ متعدد اراکین اپنی اراضی کو یکجا کریں، اور اس پر ایک بڑے مزرعہ کی طرح کاشت کی جائے۔ اس کی بدولت قیمتی کلوں کا استعمال اور ایک بڑے پیمانہ پر قیمتی فصلوں کی کاشت ممکن ہوجاتی ہے۔ اور وہ رکاوٹیں دور ہوجاتی ہیں جو زراعت کی پیمانۂ صغیر پر تنظیم سے وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ ایک مشکل تجربہ ہوگا، اور ہر جگہ نہیں کیا جا سکے گا، لیکن جہاں حالات موافق ہوں، اور ضروری مواد بہم پہنچ سکے، اس کا تجربہ نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ .... زراعت کی ایک اور زبردست ضرورت آبپاشی ہے جہاں یہ سہولت نہ ہو اور اس کی ضرورت ہو ایک دیہی تالاب کی تعمیر اور ترمیم بشرطِ امکان مشترک چندہ سے کی جاسکتی ہے یا بنک باؤلیاں کھودنے کے لئے اراکین کو رقم دینے کا انتظام کرسکتا ہے۔ آبپاشی کی سہولتوں کے ساتھ فصول باغبانی اور میوہ کے درختوں کی کاشت پر مزارعین کو اکسایا جاسکتا ہے۔ مختلف اراکین کی اراضی کی نگرانی یا مشترک باڑ کی تیاری، فصلوں کی حفاظت اور جنگلی جانوروں پرندوں وغیرہ کے چھاپوں کو روکنے کے لئے ایک مشترک نگران کار کا تقرر بھی اراکین کے لئے کافی بچت کا باعث ہوگا۔ ممکن ہے خاص خاص مقامات کی فصلوں کی کاشت کے مسائل مختلف ہوں لیکن یہ سب اراکین کی مشترک جدوجہد سے جنھیں بنک کی امداد حاصل رہے گی، اسی طرح حل کئے جاسکتے ہیں۔

بہتر کاروبار اتحادی فروخت

فصلوں کی کارگر کاشت کے انتظام کے بعد ان کے لئے بازار فراہم کرنے کے مسئلہ کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس خصوص میں وہی بنک کیا کرسکتا ہے اس کا فیصلہ کرنے کے لئے، پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ بازار کی ان سہولتوں پر مختصر طور پر تبصرہ کیا جائے جو تحریک اتحادی اپنے اراکین کے لئے فراہم کرسکتی ہے۔ سب سے زیادہ ابتدائی اور سادہ ادارہ اتحادی دوکان کمیشن ہے۔ یہ درحقیقت اتحادی فروخت کا کام نہیں کرتی، کیونکہ یہ بازار میں ہر رکن کی پیداوار کی جداگانہ فروخت کے لئے صرف ایک کمیشن ایجنٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس طرح اتحادی دوکان کمیشن ایجنٹ کی جگہ لیتی ہے۔ اور کاشتکار کو اس سے واحد فائدہ یہ پہونچتا ہے کہ وہ اسے غیر قانونی منہائیوں سے محفوظ رکھتی ہے اور اس کے مفاد کی نگرانی پیشہ ور کمیشن ایجنٹ سے جو اکثر خریداروں کے مفاد کو زیادہ پیش نظر رکھتا ہے، بہتر طور پر کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ بدقسمتی سے دوکان کمیشن اس کو بہتر قیمت شاذ و نادر ہی دلا سکتی ہے۔ اور عام طور پر اس قدر سہولت بخش نہیں ہوتی جس قدر کہ کمیشن ایجنٹ

---

[1] بڑودہ کی حکومت نے اراضی کی ذیلی تقسیم اور یکجائی دونوں کے انسداد کے لئے اس موضوع پر ہمہ گیر قوانین منظور کئے ہیں۔ آر، بی، گوبند بھائی ایچ دیسائی (وظیفہ یاب نائب دیوان ریاست بڑودہ) نے اپنی کتاب "ریاست بڑودہ میں تقسیم و انتشار اراضی کا امتناع" میں اس اسکیم کا بیان تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

ہوتا ہے۔ اس قسم کی دوکان کمیشن عام طور پر صرف ایسے بڑے زمینداروں کے لئے قائم کی جاسکتی ہے، جو بڑی زمینات رکھتے ہوں اور جن کی پیداوار کثیر ہو۔ اس قسم کے صاحب ثروت لوگوں کی انجمن ایک کارگذار عملہ ملازم رکھ سکتی ہے، بازار سے قریبی واقفیت حاصل کر سکتی ہے، خریداروں کا اعتماد حاصل کر سکتی ہے، ان کی پیش کردہ بہتر جنس پر زر پیشگی حاصل کر سکتی ہے اور نمونہ کی اساس پر بیچ سکتی ہے۔ مثال کے طور پر پنجاب میں اوکاڑا زمینداروں کی انجمن اس طریقہ پر کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔ لیکن چھوٹے مزارعین کی انجمنوں کو یہ فائدے حاصل نہیں، اور یہ واقعی ٹھوس عملی نتائج پیش کرنے سے قاصر رہی ہیں۔ دیہی بنک کے لئے اس قسم کی فروخت کا آغاز زیادہ مفید نہیں ہوگا اور نہ وہ اس کام کو شروع کر سکے گا، جب تک کہ خود گاؤں میں کوئی بازار نہ ہو۔ لیکن جہاں فروخت کے لئے کوئی دوسری سہولتیں موجود نہ ہوں، اور ایک اچھی اتحادی دوکان کمیشن کسی موزوں فاصلہ پر کام کر رہی ہو، دیہی بنک اپنے اراکین کو اس سے استفادہ کرنے کی ترغیب دے سکتا ہے۔ اتحادی فروخت کا دوسرا طریقہ وہ ہے جس پر کوڈینار اور جنوبی ہند کی بعض انجمن ہائے قرض عمل کر رہی ہیں۔ یہاں پیداوار باضابطہ بازاروں میں نہیں، بلکہ خود گاؤں میں یا قریب کے کسی مرکز میں تجارتی ایجنٹوں اور بڑے تاجروں کو فروخت کی جاتی ہے، جو وہاں خریدنے کے لئے جاتے ہیں۔ اس طریقہ میں اتحادیت کا عنصر بڑی حد تک پایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ بڑی مقدار میں فروخت کے لئے تاجر سے گفت و شنید کی جاتی ہے، اور قدرے بہتر قیمت حاصل کی جاتی ہے۔ انجمن اپنے آپ کو کسی خطرہ میں نہیں ڈالتی۔ اس لئے کہ وہ اراکین کو کوئی رقم پیشگی نہیں دیتی، اراکین مال تاجر کو انفرادی طور پر پہونچا دیتے ہیں۔ اس کے لئے تمام اراکین کو ایک ہی درجہ کی فصلیں تیار کرنی پڑتی ہیں، لیکن چونکہ ایک گاؤں میں عام طور پر ایک ہی قسم بوئی جاتی ہے، اس لئے بالعموم زیادہ دشواری پیش نہیں آتی۔ دیہی بنک کے لئے اپنے اراکین کے واسطے ایک ہی قسم کے بیج فراہم کرکے ایک ہی قسم کی فصلوں کی کاشت کا یقین حاصل کرنا ممکن ہو جائے گا۔ اس لئے یہ دیہی بنک کے لئے اتحادی فروخت کا انتظام کرنے کا بہترین طریقہ ہے، اور یہ بہتر ہوگا کہ زیادہ پیچیدہ اسکیموں کے شروع کرنے سے پہلے بنک اس طرح مارکٹنگ کا تجربہ حاصل کرے۔ تیسرا طریقہ وہ ہے جس پر بمبئی کی کپاس فروش انجمنیں عمل کرتی رہیں۔ یہاں عام طور پر سارے اراکین کی پیداوار روئی دھننے کے ایک کارخانہ میں اکھٹی کی جاتی ہے۔ جہاں وہ دھنی اور دبائی جاتی ہے، اور پھر انجمن اسے پکے گٹھوں کی شکل میں فروخت کرتی ہے۔ انجمن عام طور پر اراکین سے اصرار کر سکتی ہے کہ وہ ایک خاص قسم کی کپاس فراہم کریں، اور مختلف قسمیں علیحدہ اکھٹی کی جاتی اور دھنی جاتی ہیں۔ اس نظام کے تحت اراکین زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا مال اسی شکل میں بکتا ہے جس میں اسے بازار میں پیش کیا جاتا ہے۔ صوبہ بمبئی کے مختلف حصوں میں اس قسم کی انجمنیں بڑی کامیابی سے کام کر رہی ہیں۔ مناسب ہوگا کہ جہاں ممکن ہو اس قسم کی مارکٹنگ انجمنیں قائم کی جائیں، جو اراکین کی پیداوار کو

اکٹھا کرسکیں، اُس کی درجہ بندی کرسکیں، اور فروخت سے قبل تیار کرکے ایسی شکل میں پیش کریں جس میں وہ عام طور پر
بازار میں فروخت کے لئے پیش کی جاتی ہے۔ جہاں ایسی انجمنیں موجود ہوں دیہی انجمن یا بنک کو اپنے اراکین کی پیداوار کو
فروخت کرانے کی غرض سے اُس سے ملحق ہوجانا چاہیئے۔ اس قسم کی مارکٹنگ انجمنیں عام طور پر اراکین کو اُن کی حوالہ کردہ
جنس کی مالیت کے ایک خاص فی صد تک رقمیں پیشگی دیتی ہیں، تاکہ وہ مال کے باالآخر فروخت ہونے تک اپنا کام جاری رکھ سکیں۔
اور دیہی بنک کو چاہیئے کہ ان کے فصلی قرضوں کی ادائی کے لئے ان پیشگیات کے حصول کا انتظام کریں۔ انتظام فروخت کے ان
تینوں طریقوں میں یہی نظر آئے گا کہ بہتر قیمت حاصل کرنے کی غرض سے جنس کو روک رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ انجمن
فروخت میں پیداوار صرف تیاری کے لئے اور خریدار کے ملنے تک رکھی جاتی ہے۔ ایک چوتھی قسم کی انجمن، انجمن گودام ہے جس کا
مقصد انبار کرنے کی سہولتیں فراہم کرکے، اور اس طرح انبار کردہ جنس پر اس کے مالک کو پیشگیات دے، یا پیشگیات حاصل
کرنے کے لئے سہولتیں بہم پہونچاکر، جنس کو اچھی قیمتوں کے ملنے تک روک رکھتا ہے۔ اس قسم کا کاروبار چھوٹے کاشتکاروں
کے لئے مناسب نہیں جنھیں صرف ایک چھوٹی مقدار میں مال فروخت کرنا ہوتا ہے، اور جن کی حد تک اس کا امکان ہے کہ
انبار کرنے کے اخراجات باالآخر زیادہ ملنے والی امکانی قیمت سے زیادہ ہوجائیں۔ اس کے لئے قیمتوں کی رو کے محتاط مطالعہ
بڑھتی ہوئی قیمتوں سے واقفیت کلی کی، دو طرفہ شرط بدکر اپنے آپ کو محفوظ رکھنے اور نہایت ترقی یافتہ بازار جنس کی دوسری
ساری خصوصیات سے واقفیت درکار ہوتی ہے، اور یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ ایک دیہی بنک ایسا سٹہ کا کاروبار شروع
کرے۔ ایک اور طریقہ ہے جس سے دیہی انجمن مارکٹنگ میں مدد دے سکتی ہے۔ ہندستان میں صرف چند مقامات پر بازار
حکومت کی جانب سے عاید کردہ ضوابط کے پابند ہیں، اور دوسرے مقامات پر انھیں صرف گتہ دار چلاتے ہیں جو ہراج میں
ان کے لیے بولی دیتے ہیں اور ہر قسم کی شرطیں عاید کرتے ہیں۔ یا تاجروں کی ایک انجمن چلاتی ہے جو فروخت کی رقم میں سے
متعدد منہائیوں کی اجازت دیتے ہیں۔ جہاں کوئی طاقتور دیہی انجمن موجود ہو۔ کوئی وجہ نہیں کہ بازار کے انضباط کا کام
وہ اپنے ذمہ نہ لے تاکہ جنس پیدا کرنے والوں کو اُن کے مال کا واجبی معاوضہ مل سکے۔ اور یہ انجمن اس قسم کی نگرانی کا
اختیار حاصل کرنے کے لئے حکومت سے درخواست کرسکتی ہے، یا کم از کم کاروبار کی تکمیل کے لئے مناسب اصول مرتب
کرواسکتی ہے۔

ذیلی دھندے

پیداوار اور انتظام فروخت کا انضباط کسان کی آمدنی میں اضافہ کرنے میں بڑی حد تک کارگر ثابت ہوگا۔
جیسا کہ تمہیدی تجزیہ میں بتلایا گیا تھا، کاشتکاری بجائے خود زیادہ فائدہ بخش نہیں، اور اگر کسان کی
عام معاشی حالت کو سدھارنا ہو تو یا تو ان پرانے دھندوں کو جنھیں وہ کھوچکا ہے، دوبارہ رائج کرنا چاہیئے یا ان کی جگہ
لینے کے لئے دوسرے دھندے دریافت کرنے چاہئیں۔ آج کل کسانوں کے لئے ذیلی دھندوں کے بارے میں بڑی
گرم باتیں ہو رہی ہیں۔ پارچہ بافی، نجاری، کھلونا بنانا [illegible] وغیرہ تجویز کئے گئے ہیں، اس حقیقت کو سمجھے بغیر دیہات کے جو لوگ یہ کام

کرتے ہیں خود ان کی حالت سقیم ہے. کاشتکاری کوئی کل وقتی کام نہ ہو لیکن مقصد اس کو کل وقتی بنانے کا ہونا چاہیے اور کسان آسانی اور فائدہ کے ساتھ جو واحد کام زراعت کے علاوہ کر سکتا ہے وہ وہی ہیں جو اس کے اصل دھندے سے قریبی تعلق رکھتے ہیں. کاشتکاری سے غیر متعلقہ گھریلو صنعتیں، اگر ان کی نکاسی کے لئے بازار مل سکے، بے زمین مزدور، یا گاؤں کے دوسرے بے روزگار طبقے شروع کر سکتے ہیں، اور جہاں دیہی بنک کی رکنیت میں ایسے افراد شامل ہوں اسے ایسے کام کے لئے ان کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہیئے. یہ زراعت پیشہ طبقہ کا دھندا ابھی نہیں رہا اور ان کی حد تک ہمیں ایسے دھندوں کی تلاش کرنی چاہیئے جو انھوں نے جدید حالات کی وجہ سے کھو دئے، اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا ان میں دوبارہ جان ڈالی جا سکتی ہے، یا کاشتکاری سے تعلق رکھنے والے دوسرے مناسب نئے دھندے تجویز کئے جا سکتے ہیں یا نہیں.

میر حسن

گداگر سے خطاب

روسیہ، بدبخت و بدکیش و زبون و زشت خو
اے گداگر نسلِ انساں کے لئے لعنت ہے تو

ہاتھ جو حق نے دئے ہیں کام کرنے کے لئے
وائے پھیلاتا ہے تو کاسہ کو بھرنے کے لئے!

تیرے اس کردار سے بیزار ہے روئے زمیں
ہاتھ سے مجروح کرتا ہے تمدن کی جبیں

کیسی عبرت ناک ہے یہ بات اے ناحق شناس
تو عطا کردہ قویٰ کا کچھ نہیں کرتا ہے پاس

کونسی رگ جسم میں تیرے بھری ہے زشت رو؟
موٹریں رکنے نہیں پاتیں کہ آجاتا ہے تو

کچھ جوانی کا بھی اپنی تجھ کو آتا ہے خیال
حیف ہے صد حیف، پھیلاتا ہے تو دستِ سوال

چھوٹے بچے ساتھ لے کر مانگتا ہے کو بکو
پھر نہ کیوں سیکھیں گے یہ تیری صدائیں ہو بہو؟

یہ تو ہیں معصوم مستقبل پہ ان کے رحم کر
دل کی آنکھیں کھول، اور فطرت پہ ان کی کر نظر

گر توانا ہے تو محنت سے کما اپنی معاش
ہاتھ پھیلا کر نہ بن تو جوہرِ غیرت کی لاش

سید حبیب حسن

آری اور بسولا

(ایک خوش خلق دنیا دار سے)

بہ ظاہر مسکرا کر ملنے والے — خدا دے تجھ کو جذبِ غمگساری
کبھی رہتے نہیں یکجا بیک وقت — یگانہ واری و بیگانہ واری

یہ دنیا، یہ کشاکش، یہ تماشا
ہے اک خوابِ ہجوم بے قراری

دلِ گمراہ پر انکارِ تقدیر؟ — غلامی پر غرورِ شہریاری؟
تپا کر دیکھ شامِ زر فشاں کو! — شفق میں ڈھونڈ رازِ لالہ کاری!
الٹ کر دیکھ شب کے تیرہ اوراق! — کرید اپنی سحر کی تابداری!
بصارت میں کر آسودہ ضیائیں! — عمل کو دے نہ اذنِ خام کاری!

تغافل نے فنا انجامیوں پر
لگا رکھی ہے مہرِ پائداری!!

نہیں یہ مرد کے جینے کا انداز — کہ ہے خود پروری عصیاں شعاری!

نہیں اچھا بسولا ہو کے چلنا
گذر بزمِ جہاں سے بن کے آری

احسان دانش

تاثراتِ سفر یورپ

(از استنبول تا لندن)

ادرنہ ۶ / ۷ جولائی

ہم استنبول سے رات کے ساڑھے آٹھ بجے چلے ہوئے صبح کے پانچ بجے یونانی سرحدی اسٹیشن پی تھیون پہونچے اور یہاں سے برابر ادرنہ یا نوپل تک ہماری ریل یونان کے اس حصہ میں ہو کر گذری جسے مغربی تھریس کہتے ہیں اور جو ۱۹۱۲ء تک ترکی علاقہ تھا۔ ادرنہ یا نوپل کو اب اس نام سے نہ ترک پکارتے ہیں نہ دوسروں کو پکارنے دیتے ہیں اس لئے کہ یہ ان شہروں میں سے ہے جن کے نام خالص ترکی کر دئے گئے ہیں۔ اور غیر ممالک کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ بھی ان کے لئے ترکی نام ہی استعمال کریں۔ دوسرے ایسے شہر استنبول (قسطنطنیہ) ازمیر ("سمرنا") انقرہ (انگورہ) طرابزون (ٹرے بی زونڈ) ہیں۔ یونانی علاقہ برابر ادرنہ سے دو میل تک رہتا ہے۔ ادرنہ کا معاشی (بلکہ سیاسی) خاتمہ کرنے کی اس سے بہتر کیا ترکیب ہو سکتی ہے کہ ریل کی جو واحد لائن استنبول سے اس تاریخی شہر کو ملاتی ہو وہ ایک غیر ممالک سپرد کردی جائے۔ بلقانیوں اور یورپ والوں کی شاطرانہ چالوں اور مرحومہ دولت عثمانیہ کی سادگی اور اپنی بہادری پر زعم کا نتیجہ ہے کہ یہ شہر پچھلے سو برس میں کئی مرتبہ (یعنی ۱۸۲۹ء ۱۸۷۸ء ۱۹۱۲ء اور جنگ عظیم میں) کبھی روسیوں کبھی بلغاریوں کبھی یونانیوں اور کبھی بین الاقوامیوں کے قبضے میں آچکا ہے اور آج بھی اس کے در و دیوار اس کی قدیم عظمت کو آٹھ آٹھ آنسو بہا کر آئندہ کے لئے گویا ناامیدی کا اظہار کرتے ہیں۔

ہماری ریل بیک یونانی حدود سے نکل کر قراغاچ کے عظیم الشان خوبصورت نئے اسٹیشن پر رکی جو ادرنہ سے دو میل کے فاصلے پر ہے۔ گو خاص ادرنہ میں ایک اسٹیشن (Edirne Sehir) "ادرنہ شہر" ہے لیکن قراغاچ سے اس کو دن میں صرف دو تین مرتبہ ہی ریل جاتی ہے اور اکثر مسافر قراغاچ ہی پر اتر جاتے ہیں۔ یہاں سواری کا انتظام خاطر خواہ نہیں ہے۔ گھوڑے گاڑیاں ہیں لیکن اسباب وغیرہ اتارنے اور محصول خانے سے فراغ ہونے تک سب گاڑیاں جا چکی تھیں جس کی وجہ سے ہمیں تقریباً ایک گھنٹہ تک اسٹیشن پر رکنا پڑا جہاں ہر ترکی افسر نے (خواہ اسٹیشن کے ہوں خواہ پولیس کے خواہ محصول خانے کے) ہماری نہایت درجہ خاطر و تواضع کی ان میں سے سب سے زیادہ مہربانی اسٹیشن پولیس کے افسر اعلیٰ (Bay Halit Akses) بائے خالد اقصے نے دکھائی۔ آپ نہایت خلق سے پیش آئے۔ چائے پانی، موٹر کے لئے ٹیلیفون دیا اور گاڑی آنے تک برابر اپنے دفتر میں مہمان رکھا۔ یوں تو ادرنہ میں کئی ہوٹل ہیں لیکن غالباً پروپاگنڈے کی وجہ سے سب سے مشہور ایک چھوٹا سا ہوٹل ہے جسے کسی زمانے میں (Hotel del Europe) کہتے تھے اور اب نئی ترکی میں (Avropa hoteli) کہتے ہیں اس کا نام بڑا اور درشن چھوٹے ہیں۔ مالکہ ایک جرمن بیوہ ہے جو اپنے آپ کو عیسائی ترکن کہتی ہے! کھانا ترکی لیکن استنبول کے ہوٹلوں سے ناقص اور قیمت میں مہنگا۔ خیر ہمیں تو چوبیس گھنٹے ہی رہنا تھا اس لئے صبر کیا۔ بیس پچیس سال پہلے دولت عثمانیہ کے اس قدیم پایۂ تخت کی آبادی دو لاکھ سے زیادہ تھی۔ لیکن اغیار کے پے در پے حملوں اور

دشمنوں کی چالوں کی وجہ سے یہ اب بالکل ویران ہو گیا ہے اور اب اس میں چالیس ہزار سے زیادہ نفوس آباد نہیں ہیں۔ بعض محلے مثلاً بایزید ایسے ہیں جن میں نفیس مساجد اعلیٰ درجہ کی جامع مسجد (جس کی تعمیر ۱۴[illegible]ء میں ہوئی تھی) عام شفاخانے، قومی بارکیس مکانات سب موجود ہیں لیکن آبادی چھ سو سے زیادہ نہیں! اس محلہ بایزید کی مسجد اور شفاخانہ خاص طور پر قابل دید ہیں۔ مسجد کے امام نے مجھ سے کہا کہ جنگ عظیم تک یہ محلہ خوب آباد تھا اور مسجد میں سیکڑوں نمازی ہوتے تھے لیکن اس کے بعد محلہ اجڑ گیا۔ یہاں کا قبرستان جس میں لاکھوں شہدا آرام کی نیند سو رہے ہیں اس خطے کے پرانے کروفر اور حق پرستی کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ شہر ادرنہ کی سب سے زیادہ ممتاز عمارت سلطان سلیم ثانی کی بنائی ہوئی مسجد یہاں کی بے شمار عمارتوں، مقبروں اور مسجدوں میں سب سے اعلیٰ اور افضل شمار کی جاتی ہے اور بقول ایک فرانسیسی محقق کے "اس مسجد سے ترکی قوم کے حقیقی خصائص کا صحیح اندازہ ہوتا ہے"۔ اس کے سنگ مرمر کے ستون، سنگ مرمر کے وضوخانے، اس کا عظیم الشان دروازہ جو سبز سنگ مرمر کے ستونوں پر کھڑا ہوا ہے، اس کی عجیب وغریب پچی کاری اور اعلیٰ درجے کی جالیاں یہ سب چیزیں اس عالی منش دور کی یاد تازہ کرتی ہیں جب ادرنہ سلطان آل عثمان کا پایۂ تخت تھا۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ میں نے مغرب کی نماز سلیمیہ میں پڑھی تھی۔ اس کے بعد جب ہم جا رہے تھے تو مسجد کے پیش امام جو نہایت خوش الحان پکے مسلمان اور ٹھیٹ یورپی ہیں۔ میرے پاس آئے اور عجیب بات کہی کہ دیمیر تاش پاشاہ فاتح ادرنہ دراصل سلطان علاء الدین خلجی فاتح دکن کی نسل سے تھے اور خود امام صاحب جن کا نام خلیل زیدی تھا۔ ان دیمیر تاش پاشاہ کی اولاد سے ہیں۔

سلیمیہ کے احاطے کے اندر ہی دو نوادر خانے ہیں ایک آثاریاتی اور دوسرا انسانیاتی۔ یہ بھی دیکھے۔ آثاریاتی نوادر خانے کے ناظم بھی بے نہایت درجہ خلق سے پیش آئے۔ لیکن دقت یہ تھی کہ وہ سوائے ترکی کے کسی زبان سے واقف نہ تھے۔ اور میں ترکی کے مشکل سے دس الفاظ سے واقف تھا۔ اس کے برعکس بائے خلیل زیدی جن کا ابھی ذکر کیا ہے۔ عربی زبان سے اچھی طرح سے واقف تھے۔

سلیمیہ کے علاوہ اور بہت سی دلچسپ عمارتیں ادرنہ میں ہیں۔ عکسی جامع جسے ۱۴۱۵ء میں فتح استنبول سے پہلے سلیمان چلپی (ولد سلطان بایزید یلدرم) نے تعمیر کیا تھا اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ فتح کے بعد کی اکثر مساجد کے برخلاف اس میں یونانی اثرات کا پتہ نہیں۔ شرف علی جامع کو سلطان مراد خاں ثانی نے ۱۴۲۶ء میں تعمیر کیا تھا اور اسی سلطان نے چھ سال پہلے وہ مسجد بنائی تھی۔ جسے اس کے نام کی نسبت سے "مرادیہ" کہتے ہیں۔ ترکوں نے ادرنہ کے عروج کے زمانے میں مرتضیٰ، طنبہ اور اردا نامی دریاؤں پر جو سب کے سب ادرنہ کے قریب مل جاتے ہیں اس پر پل بنائے اور یہ نہایت مضبوطی اور استقامت کے ساتھ اب تک قائم ہیں۔ شام کو ہوٹل واپس آنے پر ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ جونہی ہم داخل ہوئے ایک نوجوان لڑکے نے ہمیں سلام کیا اور ذرا کھڑی اردو میں بے تکلف گفتگو کرنی

شروع کردی۔ ہمیں سخت تعجب ہوا کہ اس دور افتادہ علاقے میں اردو جاننے والا بھلا کون ہو سکتا تھا! معلوم ہوا کہ یہ
شہر کاشغر (چینی ترکستان) کے رہنے والے ہیں۔ ہندوستان میں بھی رہے ہیں۔ عبدالعزیز نام ہے۔ عمر تقریباً
۱۶ سال کی ہوگی۔ ترکی حکومت کی طرف سے وظیفہ پاتے ہیں۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ترکی حکومت وسط ایشیا
والوں کو خواہ وہ چینی رعایا ہوں یا روسی، غیر ملکی تصور نہیں کرتی بلکہ اگر ان میں سے کوئی ترکی آئے تو ہر طرح کی امداد ہی
نہیں دیتی بلکہ فوج میں بھی لے لیتی ہے چنانچہ عبدالعزیز کا مقصد یہ ہے کہ اسکول کی خواندگی سے فارغ ہو کر طیارہ رانی
سیکھیں اور ترکی فضائی بیڑے میں بھرتی ہوں۔ گویا انور پاشاہ مرحوم نے تو ایک "تورانی" سیاسی فریق بنانے کی
کوشش کی تھی اب ترکی جمہوریہ ایک دوسرے راستے سے ترکمانوں میں ترکی محبت کا جذبہ پیدا کرنا چاہتی ہے۔ عبدالعزیز
ہمیں دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ کہتے تھے کہ میری ماں اور بہنیں سب چینیوں کے خلاف جہاد میں شریک
ہو چکی ہیں اور ترکستان کے مسلمانوں میں آپس میں پھوٹ نہ پڑ جاتی تو ترکستان یقیناً چینی جوا اپنے کندھے سے اتار
پھینک دیتا۔

باوجودیکہ بہ نسبت استنبول کے ادرنہ کا وسطی یورپ سے زیادہ جغرافی تعلق ہے تاہم اس میں استنبول سے
کہیں زیادہ ترکیت اور شرقیت پائی جاتی ہے یہاں کی عورتیں استنبول سے زیادہ اسلامی طریقوں کی پابند ہیں اور
(بے نقاب ہی سہی) اب تک قدیم سیاہ برقعہ پہنتی ہیں۔ بچے بچیاں ابھی تک پرانی سیدھی سادھی وضع میں بلا کسی
بناؤ سنگھار کے نظر آتے ہیں اور لوگوں میں کافی مذہبیت پائی جاتی ہے۔ شہر بھر میں کوئی شراب کی دوکان نظر
نہیں پڑی اور مسجد سلیمیہ میں مغرب کے وقت عورتوں مردوں کا کافی ہجوم تھا۔ خدا کرے اس شہر پر ترکی جھنڈا ہمیشہ
اڑتا رہے۔ آج کل تو چاروں طرف سے اغیار کے نرغے میں ہے۔

۸ر جولائی کو صبح کے وقت ہم نے ادرنہ اور ترکی کو خیرباد اور خدا حافظ کہا۔ ۶½ بجے بھی عبدالعزیز آ موجود ہوئے
اور چونکہ ترکی ان کی مادری زبان ہے اس لئے ان سے بہت مدد ملی۔ روانگی سے پہلے ترکی پولیس سے پاسپورٹ پر
دستخط کرانے اور استفسار پر جس قدر روپیہ اور چیک ہمارے پاس تھے ان کی مقدار بتائی۔ یونانی سرحد کا
نشان قراغاچ کے اسٹیشن سے ہی نظر آتا ہے اور دس منٹ کے اندر ہماری ریل یونان میں داخل ہو گئی۔

(بلغاریہ ۸ر ۹ر جولائی) یونانی سرحد از سر نو عبور کرنے کے بعد ریل دریائے مرتغنی کے کنارے کنارے چلتی ہے جس کے
ایک طرف یونان اور دوسرے طرف ترکی کا علاقہ چند میل تک چلا گیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس یونانی علاقے پر ۵ برس
پہلے تک ترکی عملداری اور اسلامی اثر تھا اب اس میں ایک مسجد یا مطلق کوئی مسلمان متنفس نظر نہیں آتا اور معلوم ہوتا
ہے کہ اسلامی معابد چن چن کر مسمار کئے گئے ہیں۔ نو بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے کہ بلغاری سرحد آئی ادھر ہم نے
دیکھا کہ دو ٹیلے ہیں۔ ایک پر سنگین لئے ہوئے یونانی سپاہی اور برابر کے ٹیلے پر سنگین لئے ہوئے بلغاری سپاہی

کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک پر یونانی جھنڈا اور دوسرے پر بلغاری جھنڈا لہرا رہا ہے۔ بلقانی ریاستوں میں سفر کرنے سے مختلف ملکوں کی مصنوعیت اور آج کل کے "تمدن" کا کھوکھلا پن نظر آتا ہے۔ اور اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب جغرافی "قومیت" اور "وطنیت" دراصل کس قدر غیر فطری ہو سکتی ہے کہ اگر سرحدوں پر سپاہیوں کی وردیاں مختلف نہ ہوں تو محض جغرافی کیفیات سے بہت سے ممالک کے درمیان امتیاز ہونا مشکل بلکہ بعض مرتبہ تو بالکل ناممکن ہوگا۔

نو بجے ریل (Svilengrad) کے اسٹیشن پر پہونچی جو ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان سے پہلے "مصطفیٰ پاشاہ" کہلاتا تھا اور جس میں اس زمانے میں زیادہ تر مسلمان آبادی تھی۔ لیکن یہاں کم از کم ریل میں سے ایک مسجد بھی نظر نہیں آئی۔ چونکہ یہ بلغاریہ کا پہلا اسٹیشن ہے اس لئے یہاں ریل چالیس منٹ ٹھیری اور پاسپورٹوں کی جانچ کی گئی۔ اور روپیہ کی مقدار کی بابت استفسار کیا گیا کہ کتنا روپیہ کس کے پاس ہے۔ ان بلقانی ریاستوں میں (اٹلی کی طرح) اس کی اجازت نہیں کہ جتنا روپیہ لے کر کوئی مسافر کسی ملک کی حد میں داخل ہو اس سے زیادہ لے کر اس ملک سے باہر لے جائے، چنانچہ بلغاریہ اور یوگوسلافیہ دونوں کے لئے داخلے اور خارجے کے وقت ہر شخص سے دریافت کیا گیا اور داخلہ کے وقت روپیہ کی تعداد کا جو سرٹیفکٹ دیا گیا وہ خارجے کے وقت دیکھ کر واپس لے لیا گیا۔

سابق مصطفیٰ پاشاہ حال سویلین گراڈ کے بعد مرتضیٰ کی دوسری جانب بھی ترکی باقی نہیں رہتی اور ریل کے دونوں طرف بلغاریہ ہی بلغاریہ ہے۔ یہاں یہ بات خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ جو نقشے بلغاری زبان میں ہماری ریل میں لگے ہوئے تھے انہیں پڑھنے سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے استنبول تک کا نام بدل کر زار گراڈ یا "شہنشاہ نگر" رکھ چھوڑا ہے۔ تاکہ جب خدانخواستہ اس شہر پر بلغاریوں یا روسیوں کا قبضہ ہو تو نام سوچنے کی ضرورت نہ پڑے

ایک بجے ہم (Plovdiv) کے عظیم الشان اسٹیشن پر پہونچے جو ترکی زمانہ میں فلیوپل کہلاتا تھا۔ اس شہر میں بھی کوئی مسجد نظر نہیں آئی حالانکہ ۱۸۷۸ء تک یہ اچھا خاصہ اسلامی اور ترکی شہر تھا۔ اس کے بعد مناظر نہایت لطیف ہو جاتے ہیں۔ ریل بیسیوں میل تک ایک ندی کے کنارے کنارے جاتی ہے اور دونوں طرف کوہ بلقان کا سربفلک زنجیرہ ہوتا ہے۔ راستہ میں ہر جگہ سورج مکھی کی کاشت نظر آئی۔ کھیتوں میں جدھر دیکھو سورج مکھی ہی سورج مکھی پٹی پڑی تھی اور پھولوں کی وجہ سے ملک زرد بنا ہوا تھا۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ اس پھولوں کے بیجوں سے تیل نکالا جاتا ہے اور اس سے کروڑوں روپیہ باہر سے بلغاریہ آتا ہے۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ انگور کی کاشت بھی تھی۔ بلغاریہ میں ریل کی صفائی کا خاص طور پر انتظام ہے۔ ایک عورت جھاڑو اور صفائی پر مامور رہتی ہے جس کا کام صرف یہ ہے کہ جہاں کوڑا کرکٹ دیکھا پھینک دیا۔

یورپ کی تمام تر ریلوں میں ایک برآمدہ ہوتا ہے جس کے ذریعے سے مسافر پوری ریل میں ادھر سے ادھر جا سکتا ہے۔ یہ عورت بس اس برآمدے میں برابر پھرتی تھی۔ بلغاریوں اور یونانیوں کے خصائص میں بظاہر فرق معلوم ہوتا ہے اور اول الذکر میں اس قدر تمدن نہیں پایا جاتا جتنا یونانیوں میں۔ یہاں والوں کا پہناوا ایک بڑی

حد تک مشرقی ہے. لوگ جس قسم کا جوتا پہنتے ہیں اس سے دہلی کے سلیم شاہی اور دکن کے بیدری جوتے کا شبہ ہوتا ہے.
بہت سے مرد، عورتیں کھیتوں میں ننگے پاؤں کام کرتے دکھائی دئے۔ مرد سموری ٹوپی اور سفید پاجامہ
پہنتے ہیں جو ٹخنوں پر تنگ ہوتا ہے اور کمر میں بجائے پیٹی کے ایسا پٹکا لپٹا ہوتا ہے جیسے عرب اپنے جبّے کے
نیچے باندھتے ہیں۔ الغرض بلغاریہ کے گاؤں سے اس وقت تک ترکی اثر گیا نہیں ہے۔

راستے میں ہمارے ڈبے میں بلغاریہ کی قومی بنک کا ایک قائم مقام آیا اور کہا کہ آپ بلغاری روپیہ
لینا چاہتے ہیں تو ہم دے سکتے ہیں۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور دو پونڈ کا ایک چک دستخط کرکے
اسے دیا۔ اس نے عجیب بات کی کہ اگر آپ پانچ پونڈ یا اس سے زیادہ بھنوائیں تو آپ کو تیس فی صد زیادہ ملے گا۔
جس کے دوسرے الفاظ میں یہ معنی ہوئے کہ پانچ پونڈ سے کم بھنوانے پر تیس فیصد بلغاری خزانے میں جائے گا۔
اور گویا ایک روپے کے صرف گیارہ آنے ملیں گے۔ آج کل یورپ عجیب و غریب طرح سے دونوں ہاتھوں سے
لوٹ رہا ہے اور گو ہر قوم نے جلب زر کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے ہیں لیکن مطلب ایک ہی ہے۔

صوفیہ ۶ بجے شام کو پہونچے اور (Boulevard Rakovsky) میں ہوٹل (Slavianska Beseda) میں قیام کیا۔ یہ ایک بالکل عصری ہوٹل ہے اور حال ہی میں بنا ہے. اسٹیشن سے
آنے میں ہمیں ایک مسجد ملی تھی۔ چنانچہ اسباب وغیرہ رکھ کر مغرب کی نماز کے لئے ہم اس مسجد میں گئے۔ مسجد ۱۵۶۸ء
کی بنی ہوئی ہے اور اس پر عربی زبان میں موسس سلطان سلیم خاں ثانی کا نام اور تاریخ درج ہے۔ باوجود منارہ
ہونے کے اذان منارہ پر نہیں بلکہ اندرون مسجد میں کہی جاتی ہے اور صدر دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے۔ اس کی
بجائے نمازی بازو کے چھوٹے دروازے میں داخل ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی تمام مسجدیں
مسمار کردی گئیں ورنہ گرجا وغیرہ بنادی گئیں اور یہ مسجد جو باقی رہ گئی ہے اس میں صرف خاموشی سے نماز پڑھنے
کی اجازت ہوگی۔ نقشہ میں ایک اور مسجد کا نام بھی لکھا تھا دریافت پر پتہ لگا کہ اس میں اب قومی نوادر خانہ ہے
بہرحال مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی جو سب کے سب ایک ہی لباس میں تھے یعنی ہر ایک پرانی وضع کی ترکی
ٹوپی (جو اب ترکی میں ممنوع ہے) اس پر سفید پگڑی (عربی نمونہ) اور سیاہ اورکوٹ یہاں سب مسلمان یہی
لباس پہنتے ہیں اور ترکی اور بلغاری دونوں زبانیں بولتے ہیں۔ ایک صاحب عربی اور فرانسیسی جانتے تھے۔
ان کا نام حافظ یوسف یعقوب تھا اور شہر شمن کے اسلامی مدرسے میں مدرس تھے۔ ان سے میں نے کھود کھود کر
بلغاری حکومت کی عدم رواداری کی داستان سننا چاہی لیکن انھوں نے صاف کوئی جواب نہیں دیا۔
انھوں نے کہا کہ اسلامی امور طے کرنے کے لئے تمام بلغاریہ میں مفتی ہیں اور ان کے متعلق ایک اسلامی مجلس
ہے۔ یہ مفتی صاحب بھی نماز میں شریک تھے لیکن بلغاری اور ترکی کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں جانتے تھے

دوسرے روز میں بلغاری سکوں کے الٹ پھیر میں آگیا۔ صبح کے وقت کک کے دفتر میں گیا اور خواہش کی کہ شام کی گاڑی سے بلغراد کے لئے دو پلنگ ریزرو کرا دیجئے۔ کک کے کارمدار نے جواب دیا کہ ریل میں میرے متعلق جتنے پلنگ تھے وہ سب ریزرو ہو چکے ہیں لیکن اسٹیشن پر یقین ہے کہ آپ کو خالی پلنگ مل جائیں اس لئے کہ ہمیں صرف چند ہی پلنگ دئے جاتے ہیں۔ ریل شام کے چھ بجے آتی ہے اور ساڑھے آٹھ پر جاتی ہے۔ اگر آپ سوا چھ بجے آجائیں تو شاید ٹیلیفون کرکے ہم ہی ریزرو کروا دیں۔ جب میں نے کہا کہ میرے پاس انگریزی پونڈ کے کک والے چک ہیں۔ تو جواب دیا کہ اس حالت میں ہم ریزرو نہیں کرا سکتے۔ اس لئے کہ ہمیں خود اپنے چکوں کے بھنانے کا اختیار نہیں!! یہ آپ صرف یہاں کی قومی بنک سے ہی کر سکتے ہیں۔ بہتر یہ ہو کہ آپ شام کو سیدھے اسٹیشن جائیں وہاں قومی بنک کا دفتر ہے جتنے چک آپ چاہیں بھنا سکتے ہیں۔ چونکہ ریل بلغاری سرحد کو رات کے دس ہی بجے عبور کرتی ہے اس لئے میں نے اسٹیشن پر صرف پلنگوں کے کرایہ کے بقدر روپیہ بھنانا چاہا لیکن جواب ملا کہ آپ پانچ پونڈ سے کم بھنائیں گے تو بیس فیصد کم لے گا لیکن اگر آپ زائد بھنائیں گے تو کسی حالت میں بلغاری سکہ تین سو لیوے (یعنی تقریباً گیارہ) سے زیادہ بلغاریہ سے باہر نہیں لے جا سکتے۔ اس سے زیادہ جو رقم آپ بلغاری سکہ میں لے جانا چاہیں گے وہ بحق بلغاریہ ضبط ہو جائے گی!! غرض عجب کشمکش کا سامنا تھا۔ پانچ پونڈ سے کم کے بلغاری لیوے لیتا ہوں تو کام نہیں چلتا اور تیس فی صد ضبط ہو جاتے ہیں۔ زیادہ لیتا ہوں تو تین سو لیوے سے زیادہ بچتے ہیں اور ملک سے باہر نہیں لے جائے جا سکتے۔ ان سب تجویزوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان روپیہ لے اور ملک میں خرچ کر دے باہر نہ لے جائے۔ پھر دوسرا لطف یہ ہوا کہ جب آخر روپیہ کا بیوپار ہو چکا اور پلنگ گاڑی کے کنڈکٹر ریزرو کروانے کے لئے کہا تو اس نے جواب دیا کہ میں کک کے یہاں ٹیلیفون کرتا ہوں کہ انھوں نے کون کون سے پلنگ چھوڑے ہیں۔ ٹیلیفون دیا تو معلوم ہوا کہ دوکان بند ہو چکی اور مجھے ہدایت کی گئی کہ اسٹیشن ہی پر سوا سات بجے تک انتظار کروں!! آخر سوا سات بجے کہیں ریزرو ہوا۔ الغرض اس تگ و دو میں تقریباً دو گھنٹے صرف ہوئے اور سخت پریشانی اٹھانی پڑی وہ جداگانہ یہ ہیں کک کے انتظامات اور بلقانی ریاستوں کی لوٹ مار کے بازار کا قضیہ۔

صوفیہ ہی میں دو اخبارات کے قائم مقام مجھے انٹرویو کرنے کے لئے آئے ایک (Naumoff) یہاں کے وسیع ترین اخبار (Outro) کی طرف سے اور دوسرے (Konyaroff) اخبار (Zora) کی جانب سے۔ اول الذکر اخبار کی اشاعت ایک ڈیڑھ لاکھ سمجھی جائے۔ اخبار اوترو کے قائم مقام صاحب نے تقریباً پون گھنٹے انٹرویو کیا اور مجھ سے ہندوستان۔ حیدرآباد اعلیٰ حضرت حضور خسرو دکن خلد اللہ ملکہٗ اور رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری کی بابت پوچھتے رہے اور ساتھ ہی تعلیم عامہ اور خصوصاً تعلیم اناث کی بابت گفتگو کرتے رہے۔

گو بلغاریہ اور موجودہ ہندی سیاسیات کے درمیان کوئی نسبت نہیں لیکن دونوں صاحبوں نے خاص طور پر مجھ سے مہاتما گاندھی کی بابت سوالات کئے اور گاندھی جی کے اچھوت اور عدم تحریک کی بابت دریافت کیا۔ میں نے اپنے جوابات میں جامعہ عثمانیہ کے ذریعہ تعلیم اردو کی اہمیت پر بہت زور دیا جس پر یہ لوگ متعجب ہوئے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ سوائے جامعہ عثمانیہ کے باقی ہندوستان کی سترہ یونیورسٹیوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہو۔ جب میں نے بلغاری تاریخ اور بلغاری سیاسیات سے دلچسپی ظاہر کی تو یہ صاحب مجھے اپنے ساتھ ایوان پارلیمنٹ میں (جسے سوبرانئے کہتے ہیں) لے گئے' جہاں مباحثہ ہو رہا تھا۔ یہاں کی پارلیمنٹ یک ایوانی ہے اور کئی سال تک جبری تعطل کے بعد ابھی حال میں دوبارہ منعقد ہوئی ہے ورنہ آمریت کا دور دورہ تھا۔ اب بھی سیاسی فریق بندی خلاف قانون ہے۔ تعجب ہے کہ باوجودیکہ ملک میں نصف لاکھ سے زیادہ مسلمان آبادی ہے اور خود صوفیہ میں تین سو بلغاری مسلمان آباد ہیں لیکن سوبرانئے یا پارلیمنٹ میں ایک بھی مسلمان نہیں نظر آیا۔ حالانکہ میرے وسیع رہنما کے قول کے مطابق مسلمانوں کو پورے سیاسی اختیارات حاصل ہیں۔

صبح کے وقت میں یہاں کا قومی کتب خانہ دیکھنے گیا۔ یہاں کے ناظم (Raitcho Raitcheff) نہایت خلق سے پیش آئے۔ یہ صاحب غیر زبانوں میں سے صرف تھوڑی سی جرمن جانتے ہیں اور انگریزی فرانسیسی سے بالکل نابلد ہیں۔ ویسے بہت بڑے عالم سمجھے دار شخص ہیں۔ کتب خانہ میں تین لاکھ سے زائد کتابیں ہیں اور باوجودیکہ حکومت نے اس کے لئے ایک اعلیٰ درجے کی عمارت علیحدہ کردی ہے لیکن ناظم صاحب بار بار کہتے تھے کہ افسوس ہے کہ آپ اس عمارت کی وجہ سے کتب خانہ کی بابت بہت بری رائے قائم کریں گے اور کاش کہ آپ اس وقت آتے جب کہ ہماری نئی عمارت تیار ہوجاتی! یہاں سے (Krum Naomoff) کی ہمراہی میں جامعہ دیکھنے گیا۔ گو یہ تعطیلات کی وجہ سے بند تھی لیکن ناؤموف صاحب کی مہربانی سے اسے اندر دیکھنے کا موقعہ مل گیا۔ اس کا ایک اہم شعبہ دینیات کا ہے جس کے طیلسانیوں کو گرجاؤں کی امامی اور داخلی وغیرہ کی طیلسان اور ڈپلومے دیئے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں روز بروز دینیات سے بے پرواہی بڑھتی جاتی ہے جس کی وجہ سے معیار زندگی ڈانواڈول ہوگیا ہے' لیکن یورپ کی تقریباً ہر جامعہ میں دینیات کی طرف خاص توجہ کی جاتی ہے جس کے باعث باوجود انتہائی آزادی کے ضبط اور تنظیم دوسروں کے لئے باعث تقلید بنے ہوتے ہیں۔ ناؤموف صاحب نے پروفیسر بابونوف سے ملاقات کرائی جو لاطینی اور یونانی کا درس دیتے ہیں اور ان گنے چنے نفوس میں ہیں جو تھوڑی بہت انگریزی سے واقف ہیں ورنہ یہاں جو لوگ تھوڑی بہت غیر ملکی زبانیں جانتے ہیں ان میں سے زیادہ تر جرمن سے اور کچھ فرانسیسی سے واقف ہوتے ہیں اور انگریزی بولنے والے تو بس شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ جامعہ کا دارومدار اس روپیہ پر ہے جو دو مالدار بلغاریوں نے وصیت کرکے اسے چھوڑا ہے اور جن کے مجسمے ایوان جامعہ کے سامنے بنے ہوئے ہیں۔ بڑے کمرے میں جس میں طیلسانیوں کو دستار دی جاتی ہیں ایک عظیم الشان تصویر ان ملی صاحب کی ہے جو اس جامعہ کے رکن رکین سمجھے جاتے ہیں۔ جامعہ کے کتب خانے میں ڈھائی لاکھ سے زیادہ کتابیں ہیں۔ ہم شام کی گاڑی سے صوفیہ سے روانہ ہوگئے۔ رات کے دس بجے (Czaribrod) کے اسٹیشن پر سرحد عبور کی۔ یہاں ریل ایک گھنٹے کے قریب ٹھیری۔ یوگوسلافیہ میں داخلے کے وقت حسب معمول ایک یوگوسلافی افسر نے پاسپورٹ دیکھ کر دریافت کیا کہ آپ کے پاس کتنا روپیہ ہے اور اس کا سرٹیفکٹ میرے پاس رکھنے کے بعد اسباب کا مطلق معائنہ نہیں کیا گیا۔ سرحد عبور کرتے ہیں وسط یوروپی وقت شروع ہوگیا اور ہمیں اپنی اپنی گھڑیاں ایک ایک گھنٹہ پیچھے کرنی پڑیں۔ باقی آئندہ

ہارون خاں شروانی

تنقید و تبصرے

اقبال کی شاعری

مرتبہ جناب عبد المالک صاحب آروی۔ صفحات ۶۲ قیمت ندارد۔ شاہ آباد اردو لائبریری۔ آرہ سے مل سکتی ہے۔

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جو "یوم اقبال" آرہ کے جلسہ کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس میں اقبال کی شاعری پر چند عنوانات مثلاً اقبال کی شاعری پر فارسی کا اثر، اقبال کی صوفیانہ شاعری، اقبال اور اسلامیات، اقبال کی فلسفیانہ شاعری، اقبال اور سیاسیات وغیرہ کے تحت نہایت دقت نظر سے بحثیں کی گئی ہیں۔ اور حتی الامکان ان بحثوں کو علمی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ رسالہ عام پڑھنے والے سے زیادہ صاحبانِ فکر کے مطالعہ کے موزوں ہے۔ چنانچہ اس مختصر سے رسالے میں، مختلف بحثوں کے دوران میں مرتب نے، تقریباً تمام مشرقی اور مغربی فلسفیوں اور ماہرانِ نفسیات کے حوالے سند میں پیش کئے ہیں۔ جس سے رسالہ خاصہ موثر بن گیا ہے۔ ہم کو اس طریقہ سے اس حد تک اختلاف ہے کہ جہاں کوئی بات بدیہی ہو اس میں سند پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ مثلاً مشاہیر کی قدر کی اہمیت کو بتلانے کے لئے پروفیسر میک ڈوگل کے مسئلہ آبادی اور اس میں اسلاف پرستی کی عمومیت کے اظہار کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا۔ ہم کو اس کا اعتراف ہے کہ اس دقتِ نظر سے اور اتنے چھوٹے رسالے میں کسی اور اردو شاعر کے کلام پر اتنی علمی بحثیں شاید ہی پیش کی گئی ہوں۔ اس کے علاوہ اصطلاحات اور الفاظ کے استعمال میں بھی اجتہاد سے کام لیا گیا ہے مثلاً "جگر ریزی" "قربان نواز" "طفل فریبی" "فلسفہ طرازی" جیسی ترکیبیں مضمون میں بہت ہیں، صرف بعض جگہ الفاظ کسی قدر ثقیل استعمال ہو گئے ہیں مثلاً مرابطت، ابتہاجیت ــــ وغیرہ۔ بہرحال یہ رسالہ ہمارے شاعرِ اعظم کے کلام کا اچھا مقدمہ ہے۔

"س"

ماہر القادری کے سو شعر

پاکٹ سائز صفحات ۴۰ مطبوعہ فیروز پرنٹنگ ورکس قیمت ۸ ملنے کا پتہ فرحت نمبر مکان (۱۸۹) جدید ملک پیٹھ حیدرآباد دکن

یہ جناب ماہر القادری کے ایک سو منتخب اشعار کا مجموعہ ہے جس کے ساتھ ان کی دو نظمیں "صبح بہار" اور "رخصت" ہونے کے بعد بھی شایع ہوئی ہیں۔ ابتداء میں جناب محمد عمر صاحب مہاجر بی اے عثمانیہ کا تعارف ہے جس میں انہوں نے ماہر صاحب کے حالات اور کلام پر سرسری نظر ڈالی ہے۔ کسی شاعر کے کلام پر تنقید کرنے کے لئے اس کا پورا کلام نظروں کے سامنے رہنا چاہئے۔ منتخب اشعار تنقید کے لئے ایک ہی پہلو رکھتے ہیں۔ آج کل یہ عام چیز ہو گئی ہے کہ شاعر اپنے سو شعر کا ایک مختصر مجموعہ شایع کر رہے ہیں۔ اس منتخب پڑھنے کے بعد شاعر کے کمالات کا پورا پورا اندازہ نہیں ہو سکتا بلکہ پڑھنے والوں کا ذوقِ ادب تشنہ رہ جاتا ہے اس سے بہتر تو یہ ہے کہ چند منتخب نظمیں اور غزلیں شایع کر دی جائیں۔ بہرحال اس انتخاب کے پڑھنے سے جناب ماہر کی شاعری کا خلاصہ سامنے آجاتا ہے اور اس کے رجحانات کی کہیں کہیں جھلک نظر آجاتی ہے۔ سادگی الفاظ کی بندش، اور ترنم ان کے کلام کے اہم اجزاء ہیں۔ حسن و محبت کے جذبات کے ساتھ ساتھ شبابیات کا عنصر بھی موجود ہے۔ اس مجموعہ کے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

اب تری محبت میں زندگی کی ہر مسرت
خطائے محبت کی اچھی سزا دی

یاد بن کے آتی ہے آہ بن کے جاتی ہے
مرے دل کی دنیا بنا کر مٹا دی
کچھ نہ پاکر بھی سمجھتا ہے کہ سب کچھ پا لیا

صدائیں دو مرے گزرے ہوئے زمانے کو
بنا رہا ہوں تصور میں آشیانے کو

شراب، نغمہ، جوانی، گھٹائیں، موسم گل
قفس میں بھی نہ کہیں بجلیوں کی زد میں ہو
زندگی سب سے بڑا دھوکا ہے انساں کے لئے

"ش"

مکتبہ جامعہ کے تازہ ترین علمی کارنامے

وقت کی تین لاجواب کتابوں کی اشاعت

(۱) ہندوستانی (۲) جوہر اقبال (۳) مضامین محمد علی

ہندوستانی:- جو تقریریں آل انڈیا ریڈیو نے ۲۰ فروری ۱۹۳۹ء سے ۲۵ فروری ۱۹۳۹ء تک نشر کرائی تھیں مکتبہ جامعہ نے ۲۶ فروری ۱۹۳۹ء کی صبح کو انھیں بیک وقت اپنے تینوں دفاتر دہلی، لاہور اور لکھنؤ سے شائع کرایا۔

ڈاکٹر تاراچند۔ مولوی عبدالحق۔ بابو راجندر پرشاد۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ۔ مسٹر آصف علی

نے

وقت کے اہم ترین مسئلہ کا حل جس طرح پیش کیا آپ کو صرف اس کتاب سے معلوم ہوگا۔ کتاب اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں شائع ہو گئی۔

قیمت اردو ایڈیشن ۱۲/ قیمت ہندی ایڈیشن ۱۲/

جوہر اقبال:- علامہ اقبال کی زندہ جاوید اور بے مثال شخصیت پر ہندوستان کے چوٹی کے ارباب علم و فضل۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ ڈاکٹر عابد حسین۔ مولوی عبدالحق۔ سید سلیمان ندوی۔ مہاتما گاندھی۔ سر اکبر حیدری پروفیسر رشید احمد صدیقی اور غلام السیدین کے مضامین و پیامات قیمت مجلد عہ

مضامین محمد علی:- مرتبہ پروفیسر محمد سرور صاحب۔ مولانا کی سیاسی۔ مذہبی۔ ادبی اور اجتماعی زندگی کی سرگرمیوں کا نہایت دلاویز مرقع جس میں ان کی شخصیت وطن و ملت کے مسائل سیاسی اور اجتماعی تحریکات کی شکل میں پیش کی گئی ہے یہ مولانا کی خود نوشت سوانح عمری بھی ہے اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ ضخامت ۶۰۰ صفحات قیمت مجلد عاں

نوٹ:- تینوں کتابوں کا محصول ڈاک ۱۵/ ہے جو حضرات رقم پیشگی بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں گے۔ ان کے ساتھ نصف محصول ڈاک رعایت ہوگی یعنی منی آرڈر عہ کے بجائے عہ کا بھیجئے۔

مکتبہ جامعہ

۱۔ قرول باغ .... نئی دہلی

۲۔ جامع مسجد .... دہلی

۳۔ امین آباد .... لکھنؤ

۴۔ لوہاری دروازہ .... لاہور

بچوں سے

عزیز سب رس بھائیو اور بہنو!

گرمی کا موسم شروع ہوگیا ہے اور روز بروز گرمی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ تمام مدارس کو تعطیل ہوگئی ہے۔ اکثر بچے چھٹیوں کا لطف اٹھا رہے ہوں گے۔ ہم کو بھی کچھ نہ کچھ کام ضرور کرنا چاہیئے۔ اچھا ایک بات ہم بتاتے ہیں۔ نیچے جو کوپن دیا گیا ہے اسے پُر کرکے بھیج دو۔ جب تم کوپن پُر کرکے بھیج دو گے تو ہم تم کو ایک ایسے بھائی یا بہن کا پتہ دیں گے جن کا محبوب مشغلہ وہی ہے جو تمہارا ہے مثلاً ٹکٹ، مونوگرام اور پھول پتے جمع کرنا وغیرہ۔ اس طرح تم ان سے اس بارے میں مشورہ اور تبادلۂ خیالات کرسکو گے۔ صرف خریدار ہی اس کوپن کو پُر کرکے بھیج سکتے ہیں۔ جہاں تک ہو سکے کوپن جلد بھیجنا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ آئندہ پرچے کے لئے ایک مضمون "میرا محبوب مشغلہ" لکھ بھیجو۔ جس کا مضمون سب سے اچھا ہوگا شائع کیا جائے گا۔

نام - - - - - - - - - - - - - - - -

پتہ - - - - - - - - - - - - - - - -

عمر - - - - - - نمبر خریداری

محبوب مشغلہ - - - - - - - - - - - -

مئی میں "معمۂ اقبال" جو شائع ہوا تھا اسے حسب ذیل اصحاب نے حل کرکے روانہ کیا ہے۔ (۱) اقبال باسط (خیریت آباد) (۲) مہر اقبال (عثمان آباد)۔ (۳) رحیم النساء بیگم (بشیر آباد) (۴) زاہد القادر (۵) حبیبہ حبیب الرحمن (۶) سید وحید شطاری (سٹی کالج) (۷) نذیر احمد (محبوب نگر)۔ پہلے پانچ نے صحیح حل بھیجے اور آخر دو اصحاب نے ایک غلطی کی ہے۔ صحیح حل یہ ہیں۔
(۱) بانگِ درا (۲) سیال کوٹ (۳) آرنلڈ۔

معین الدین احمد انصاری

من کی بتیا

ایک دلچسپ ادبی کتاب جس کو محترمہ لطیف النساء بیگم منا ام نے بچیوں کی بہترین تربیت کے لئے لکھی ہے۔ اس میں حسب ذیل عنوانوں پر بڑی مفید اور کارآمد باتیں لکھی ہیں۔ گھر کی سواری، ہمارے نوکر، خورونوش، لباس، بچوں کی تعلیم اور ان کی ضرورتیں، اخبار، کتابیں اور رسالے۔ نذر نیاز، چندے، مختلف رسومات، علاج معالجہ، متعلقین اور لواحقین، سیر و تفریح، سینما، فیشن۔ ہر تعلیم یافتہ گھر میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔ کتاب بہت خوبصورت اور مجلد ہے۔ ۹۰ صفحات قیمت صرف [illegible] لیکن سب رس بھائی اور بہنیں صرف ۱ر کے ٹکٹ روانہ کریں تو ان کے پتہ پر بھیجدی جائے گی۔

بولتی چڑیا

بہت دنوں کا ذکر ہے ملک پارس میں ایک بادشاہ رہتا تھا اس کا ایک ہی لڑکا تھا۔ وہ اس کو بہت چاہتا تھا۔ ایک روز شہزادے کو شکار کا شوق ہوا اور بادشاہ سلامت سے اجازت حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

بادشاہ نے کہا اے میرے پیارے لڑکے میں تیرے بغیر ایک منٹ نہیں رہ سکتا پھر تجھے شکار کی اجازت کیسے دوں۔ شہزادے نے بہت اصرار کیا آخر شہزادے کے اصرار پر بادشاہ نے اجازت دے دی۔ شہزادہ چند سپاہیوں اور وزیر کو ساتھ لے ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا۔ کچھ دور راستے ایک ہرن دکھائی دیا اس نے گھوڑے کو ایڑی لگاتے ہی گھوڑا ایسا دوڑا کہ چند منٹ میں وزیر اور سب سپاہیوں کی نظروں سے غائب ہو گیا ہرن جب نہیں ملا تو شہزادہ گھر واپس ہونا چاہا۔ مگر چونکہ وہ راستہ بھٹک گیا تھا اس لئے واپس نہ ہو سکا

جب وزیر نے دیکھا کہ اب تک شہزادہ واپس نہیں آیا تو اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ جاؤ اور بادشاہ سلامت کو اطلاع دو کہ شہزادہ ابھی تک نہیں آیا۔ حکم پاتے ہی دو سپاہی شہر کی طرف روانہ ہوے اور وزیر کے ساتھ شہزادے کو ڈھونڈتے جنگل کی طرف گئے پانچ چھ میل چلنے کے بعد واپس ہو رہے تھے کہ انھیں ایک فوج دکھائی دی وہ سمجھ لئے کہ یہ ہماری ہی فوج ہے چنانچہ وہ کچھ دور چل کر فوج میں مل گئے وزیر نے چند آدمی شمال کی طرف اور کچھ جنوب مشرق اور مغرب کی طرف بھجوائے اور شہر کو واپس ہو گیا۔ وزیر کا شہر کو جانا تھا کہ بادشاہ نے حکم دیا کہ تم کو تین دن کی مہلت دیتا ہوں اگر تم اس عرصے میں شہزادہ کو لے آئے تو بہتر ورنہ تم کو قتل کرا کر تمہارا گوشت چیل کوؤں کو کھلا یا جائے گا یہ سنتے ہی وزیر نیم مردہ ہو گیا اور تھر تھر کانپنے لگا۔ اپنے گھر میں آکر تمام ماجرا کہہ سنایا اور اپنے بیوی بچوں کو الوداع کہہ کر گھر سے باہر آ نکلا گھوڑے پر سوار ہو کر تیر کمان لیا اور دیکھتے دیکھتے نظروں سے غائب ہو گیا۔

اب شہزادے کی سنئے شہزادہ نہایت پریشان حال ایک پہاڑ کے دامن میں جا پہنچا اور پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد کیا دیکھتا ہے کہ ایک پنجرا ایک درخت پر لٹکا ہوا ہے اور اس میں ایک نہایت خوبصورت اور حسین چڑیا قید ہے وہ درخت کے نیچے گیا اور چڑیا کو یہ کہتے سنا اے پردیسی شہزادے تو اپنے وطن کو چھوڑ کر شکار کو کیوں نکلا اور وہ ہرن جو میری ساتھی ہے اس کا پیچھا کیوں کیا۔ اے بدنصیب شہزادے تو اس منحوس جگہ کیوں آیا۔

جب شہزادے نے چڑیا کو یہ کہتے سنا تو بہت گھبرایا اور چڑیا کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ اے چڑیا سچ بتا تو جن ہے یا بھوت جو تجھے یہ سب واقعہ بغیر دیکھے معلوم ہو گیا۔ یہ سن کر چڑیا ہنسی اور بولی اے شہزادے میں بھوت ہوں نہ جن میں ایک پری ہوں یہاں ایک راجا رہتا ہے اس کا نام ہے رام پتی وہ پریوں کا راجا ہے اس نے

مجھے اور میری بہن کو ایک گستاخی پر یہ سزا دی کہ مجھے چڑیا بنا کر اس قفس میں بند کر دیا اور میری بہن کو ہرن بنا کر اس جنگل میں چھوڑ دیا۔ جب تک وہ راجا نہ مارا جائے مجھے اس مصیبت سے رہائی نہیں ملے گی۔

یہ سنتے ہی شہزادہ بہت خوش ہوا اور کہا اس راجا کی جان کس میں ہے مجھے بتا۔

چڑیا۔ نہیں تم پہلے مجھے آزاد کرو تو میں تم کو سب بتا دیتی ہوں۔ یہ سن کر شہزادہ اسے اس قفس سے نکال دیا۔ چڑیا چھوٹتے ہی پہلے تو جا کر اپنی بہن سے ملی اور اس کو ساتھ لے کر آئی شہزادے سے کہا دیکھو یہی میری بہن ہے اور تم اسی کو پکڑنے گئے تھے اور مجھے یہ سب واقعہ میری بہن نے کہا تھا۔ تم اس سڑک سے جاؤ جو تمھارے سامنے دکھائی دیتی ہے۔ اور کچھ دور جا کر پھر سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ جاؤ تو تمھارا وطن ملے گا۔ اور میں ابھی تین مہینے تک پری نہیں بن سکتی اس وقت تک چڑیا ہی رہوں گی۔ اور یہ لو میرا پر جب کام پڑے اسے سورج کو دکھا دینا میں آ جاؤنگی۔ شہزادہ اس پر کو لے کر چڑیا سے رخصت ہوا اور اپنے وطن کو آ گیا جب اپنے وطن پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ بادشاہ اپنے بیٹے کے غم میں اندھا ہو گیا ہے۔ شہزادے نے وہ پر سورج کو بتایا۔ پر کو بتانا تھا کہ چڑیا آئی۔ چڑیا نے کہا کیوں شہزادے میری کیا ضرورت ہے۔ شہزادہ بولا اے میری پیاری چڑیا میرا باپ اندھا ہو گیا ہے تو کوئی دوا بتا۔ یہ سن کر چڑیا شہزادہ سے بولی تم یہیں ٹھیرو میں ابھی آتی ہوں۔ یہ کہہ کر چڑیا اڑ گئی اور دو منٹ میں جا کر ایک پھل لائی اور بولی شہزادے سے تم یہ بادشاہ سلامت کو کھلا دو۔ اچھا شہزادے دو مہینے کے بعد میں آؤں گی تم کو میرے ساتھ چلنا ہوگا یہ کہہ کر چڑیا اڑ گئی۔

شہزادہ محل میں گیا اور بادشاہ کی آنکھیں کھل گئیں اور باپ بیٹے دونوں گلے ملے اور خوب خوشیاں منائی گئیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد بادشاہ موت کی آغوش میں دراز ہو گیا۔ اب دو مہینے بھی ہو گئے تھے اور چڑیا آئی تو شہزادے نے کہا اے چڑیا میرا باپ مر چکا ہے کیا تو اسے زندہ کر سکے گی۔

چڑیا بولی شہزادے میں کیسے زندہ کر سکتی ہوں مارنا جلانا تو صرف خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جب بادشاہ کو مر کر کچھ عرصہ گزرا تو شہزادے کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اسی عرصہ میں وزیر بھی آ گیا اور شہزادہ نے کچھ عرصہ کے لئے تخت وزیر کے حوالے کیا اور خود دو ہزار مسلح فوج لے کر چڑیا کے ساتھ گیا دس دن کے راستہ کے بعد وہ ملک بھی آ گیا جہاں رام پتی راج کرتا تھا۔ دونوں میں خوب جنگ ہوئی حالانکہ رام پتی کی فوج شہزادے کی فوج سے کئی گنا زیادہ تھی لیکن شہزادے کو فتح نصیب ہوئی اور رام پتی مارا گیا۔ رام پتی کے مر جانے کے بعد چڑیا نے کہا یہاں ایک حوض ہے ایک پھول ہے جسے گل بکاولی کہتے ہیں۔ اس کے سنگھانے سے میں پری بن جاؤں گی۔ شہزادہ نے پھول سنگھا دیا سنگھانے کی دیر تھی کہ وہ پری بن گئی اور پھر دونوں کی آپس میں شادی ہو گئی۔ شہزادہ اور سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔

میر محمود علی اکبر

چاند کو دیکھ کر

بچہ	پیاری اماں! مجھے بتاؤ ذرا	چاند کیوں آسماں پہ ہے نکلا
ماں	میں بتاتی ہوں تجھ کو اے پیارے	چاند نکلا ہے روشنی کے لئے
بچہ	چاند مجھ سے بہت ہی چھوٹا ہے	کس طرح پھر وہاں چمکتا ہے
	یا کسی نے دیا جلایا ہے	چھوٹے تاروں کے کھیلنے کے لئے
	یا فرشتے نے آنکھ کھولی ہے	رات کا لطف دیکھنے کے لئے
ماں	اس نے سورج سے دوستی کر لی	نیک صحبت سے روشنی یہ ملی
بچہ	میں بھی ایسا ہی ہو سکوں گا کیا؟	دوست مل جائے مجھ کو گر اچھا
ماں	تو بھی دنیا میں نامور ہو گا	چاند سے بڑھ کے جلوہ گر ہو گا

اشرف الدین فیضی
(برلی)

ہمیشہ کا رنج

پڑھائی اور پھر ایک دو نہیں بلکہ سات مضامین کی پڑھائی!
حیات خاں کے لئے یہ ایک بہت ہی مشکل چیز تھی اور وہ اس کو ایک بہت ہی مشکل کام سمجھتا تھا اس کے بڑے بھائی ایف۔ اے میں تھے۔

ایک رات وہ لالٹین سامنے رکھ کر بڑے مزے سے "مرزا جنگی" نامی ایک دلچسپ ڈرامہ پڑھ رہا تھا کہ اس کے بھائی صاحب تشریف لائے اور لالٹین ذرا اپنی طرف موڑ کر کچھ حسابات حل کرنے لگے۔

کیا اس وقت آپ پڑھیں گے؟ حیات نے اپنے بھائی راحت سے پوچھا۔

"ہاں" راحت نے جواب دیا۔ میرا اصول ہے کہ جب میرا جی چاہتا ہے پڑھتا ہوں۔ کیونکہ اس طرح سے بہت جلد یاد ہو جاتا ہے۔

حیات خاں کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر اس کو راحت کے الفاظ میں اہمیت نظر آنے لگی "واقعی" اس نے سوچا جب جی خود ہی پڑھنے کو چاہے گا تو یقینی زیادہ یاد ہوگا اور جلدی بھی۔ جب جو مضمون پڑھنے کو طبیعت چاہے پڑھنا چاہئے۔

یہ سوچ کر حیات خاں نے ڈرامہ رکھ دیا اور اسی وقت تاریخ کی کتاب سامنے رکھ کر پڑھنا شروع کر دیا کیونکہ ان دنوں اس کو

بہت دلچسپی تھی۔

امتحان قریب آتا جا رہا تھا۔ اور یہ امتحان حیات خاں کے لئے امتحان نہ تھا بلکہ ایک شرمندگی کا طوفان۔

حیات اچھی طرح سمجھتا تھا کہ وہ سوائے اردو و تاریخ کے اور کسی مضمون میں کامیاب نہیں ہو سکتا چنانچہ اس نے مجبوراً امتحان کے خوف سے دوسری کتابیں اٹھائیں اور ان کو پڑھنے لگا۔

"یا میرے اللہ" یہ تو تمام کتابیں نئی ہیں۔ پندرہ دن میں کیا پانچ کتابیں یاد کر سکتا ہوں۔

وہ رنجیدہ ہو گیا اور اس پریشانی میں اس سے اور بھی پڑھا نہ گیا۔

امتحان کا وقت آ گیا اور نتیجہ وہی ہوا جو پیشتر ہی معلوم تھا چنانچہ وہ ترقی سے محروم رکھا گیا۔ اس کے تمام ساتھی اس سے ایک درجہ بڑھ گئے اور جو پیچھے تھے وہ اس کے برابر ہو گئے۔ سب خوش تھے مگر وہ رنجیدہ تھا۔ نئے آنے والے لڑکے اسے نہایت حقارت سے دیکھنے لگے اور وہ اپنا منہ چھپائے چھپائے پھرتا تھا۔

اس نے غور کیا اور معلوم کر لیا کہ یہ نتیجہ کس چیز کا ہے۔ دوسرے سال اس نے اپنی تمام کتابیں شروع ہی سے پڑھنی شروع کر دیں اور اب کے وہ اچھے نمبروں میں کامیاب ہو گیا۔

مگر اسے اپنے پرانے ساتھیوں کے چھوٹنے کا ہمیشہ سخت افسوس رہا۔ کاش وہ اس کا انجام پہلے ہی سوچ لیتا۔

سیّد نورالقمرالدین

ایمان داری

ایمان دار آدمی ہمیشہ سکھی اور نیک رہتا ہے۔ وہ معمولی زندگی بسر کرتا ہے۔ اور اس کی خواہشات بھی معمولی رہتی ہیں وہ کبھی کسی کی برائی نہیں چاہتا اور نہ کسی کو نقصان پہونچاتا ہے۔ ایسا آدمی کبھی جھوٹ نہیں کہتا خواہ کیسا ہی وقت کیوں نہ ہو۔ .. وہ چاہتا ہے کہ ہر وقت کسی نہ کسی کی مدد میں مشغول رہے اور دوسروں کے کاموں میں شریک۔ ایسے آدمی دنیا میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔

ہر ایک مذہب یہی ہدایت کرتا ہے کہ ایمان دار آدمی بنو اور ایمان داری سے ہر کام کرو۔ ایمان دار آدمی کی عزت بڑے بوڑھے سب ہی کرتے ہیں اس کے باوجود بھی اس نیک دل انسان میں غرور پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کوئی اس کی تعریف کرے یا اس کے متعلق کچھ برا کہے تو اس کو کچھ تکلیف نہیں ہوتی۔ نہ تعریف کرنے والے کا ممنون رہتا ہے نہ برائی کرنے والے کا شاکی۔ وہ غریبوں پر بہت ترس کھاتا ہے اور جہاں تک اس سے ہو سکے ان لوگوں کی مدد کرتا ہے۔

ایمان داری کی ہر وقت اور ہر موقع پر ضرورت ہوتی ہے۔ کھیلنے پڑھنے یا اور کوئی کام کرنے کے وقت اس کا ہونا لازم ہے۔ کھیلتے وقت اگر کوئی کھلاڑی غلط کھیلے تو یہ صاف ظاہر ہے کہ دوسرے کھلاڑیوں کے دلوں میں اس ایک کھلاڑی کے متعلق کیا خیال ہو گا وہ اسے بے ایمان سمجھیں گے اس کے علاوہ اسے بری نظر سے

دیکھیں گے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ کھلاڑی اپنی عزت ہاتھوں ہاتھ بانٹ دے گا۔

پڑھتے وقت یا امتحان کا پرچہ حل کرتے وقت اگر کوئی طالب علم کسی سے کچھ پوچھے اور اتفاقاً استاد اسے دیکھ لے تو ظاہر ہے کہ سوائے اس کے کہ اسے ہال سے باہر نکال دے اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ طالب علم جو ذرا سی غلطی پر ہال سے باہر نکال دیا جائے تو غور کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے طالب علموں کی نظروں میں وہ کتنا ذلیل وخوار ہو رہا ہے۔ دوسرے طالب علم جنھوں نے اس کو ہال سے باہر نکالتے ہوئے دیکھا تھا جہاں کہیں بھی اسے پائیں گے بری نظر سے دیکھیں گے۔ ان دونوں مثالوں سے ظاہر ہوا کہ ایمان داری کی ہر وقت ضرورت پڑتی ہے۔

طالب علم کو ایماندار ضرور بننا چاہیئے تاجروں کو بھی ایمان داری سے کام کرنا چاہیئے۔ اگر وہ لوگ اشیاء پر ضرورت سے زیادہ قیمت لگائیں اور زیادہ منافع لینا چاہیں تو ان کی تجارت چند ہی روز میں ختم ہو جائے گی۔ ہر شخص کو ایماندار بننا چاہیئے۔

سید ریاضت علی جعفری
(جامعہ دار کالج)

صحت

سب رس بھائی اور بہنو! یہ امر کسی تشریح کا محتاج نہیں کہ زندگی کا انحصار صحت پر ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ انسان کی زندگی پانی کا بلبلا ہے۔ اس کا کوئی بھروسہ نہیں۔ لیکن اکثر چیزیں ایسی واقع ہوتی ہیں جو قدرتی نہیں بلکہ خود اپنی غلطیوں اور صحت کی طرف سے لاپروائیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ہر اس انسان کے لئے جو زندگی اطمینان سے بسر کرنا چاہے ضروری ہے کہ صحت کا لحاظ رکھے۔

صحت سے مراد بیماری سے محفوظ رہنا ہے۔ جب بیماری آتی ہے تو انسان کسی کام کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ کام بند ہونے کے علاوہ تکلیف بھی ہوتی ہے۔ بیماری کا گھر دراصل غذا ہے۔ جب تک غذا میں احتیاط نہ کی جائے ممکن نہیں کہ آدمی تندرست رہے۔

ہندوستانی غذا میں بہت کم احتیاط برتتے ہیں جس کے سبب وہ آئے دن طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ آخر کار موت ہوتا ہے۔

کسی ڈاکٹر کا قول ہے کہ فی زمانہ غذا کی طرف سے لاپروائی اور بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ بری اور ناموزوں غذا جسم کی طاقت کو کم کر کے صدہا قسم کی بیماریوں کی افزائش کا موجب بنتی ہے۔

غذا موسم آب وہوا کا لحاظ کرتے کھانی چاہیئے۔ جو غذا کہ ہضم نہیں ہوتی اس سے ناقص اخلاط تیار ہوتے ہیں۔ جب غذا منہ سے چبائے جانے کے بعد منہ کی نالی کے ذریعہ پیٹ میں جاتی ہے تو یہ پانی سے مل کر ہضم ہوتی ہے اور اس سے چار خلط پیدا ہوتے ہیں۔ اور باقی پھوک انتڑیوں کے راستہ باہر نکل جاتا ہے۔ اگر ان چار اخلاط

یعنی خون، صفرا، سودا، بلغم کے تناسب میں فرق آجائے تو اس سے بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ جو بھی خلط بڑھ جاتا ہے اسی قسم کی بیماری لاحق ہوتی ہے۔

مثلاً اگر خون بڑھ جائے تو اس سے پھوڑا اور خارش ہوتی ہے۔ اکثر بچے بھوک سے زیادہ کھا جاتے ہیں۔ اور غذا ہضم نہیں ہوتی تو اس سے اخلاط ناقص بنتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے بیمار بھی ہو جاتے ہیں۔ جب غذا ہضم نہیں ہوتی تو کھٹی ڈکاریں آتی ہیں۔ اور ان میں بدبو بھی ہوتی ہے۔ کوئی اپنے پاس بٹھانا پسند نہیں کرتا۔ چورن وغیرہ سے گو صحت ضرور اچھی ہو جاتی ہے لیکن یہ سب دوائیاں عارضی ہیں سو دوا کی ایک دوا صحت ہے۔ اگر انسان تندرست رہے تو نہ اسے کسی قسم کی دوا چاہیئے اور نہ کسی تکلیف برداشت کرنے کی ضرورت ہے۔

صحت قائم رکھنے کے لئے چند ضروری ہدایات پر عمل کرنا چاہیئے اگر تم ان پر عمل کرو تو نہ بیمار ہوگے اور نہ دوا ہی کی ضرورت۔ اگر خدانخواستہ بیمار بھی ہو جاؤ تو بہت جلد صحت یاب بھی ہو جاؤ گے۔

صحت کے لئے پہلی احتیاط غذا میں کرنی چاہیئے۔ بھوک لگی تو کھائیں اور کھانے میں ہمیشہ احتیاط کریں یعنی زیادہ نہ کھا جائیں۔ کھانا وقت پر کھانا چاہیئے۔ چونکہ جب وقت ہو جاتا ہے تو معدہ غذا کی تحلیل کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس لئے بھوک میں اکثر لڑکے بجائے غذا کے مٹھائی وغیرہ کھا جاتے ہیں۔ اور جب یہ مٹھائی کھا چکتے ہیں تو معدہ غذا قبول نہیں کرتا اور غذا ہضم ہونے نہیں پاتی۔

بعض بچے ہر وقت کھانے کے عادی ہوتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ کھاتے رہتے ہیں۔ یہ ایک تو بدتمیزی ہے اور دوسرے معدہ ہمیشہ کام کرنے کی وجہ سے معطل ہو جاتا ہے۔ جس طرح ایک مشین کے کام کرتے کرتے کل پرزے گھس جاتے ہیں یہی حال معدہ کا ہے۔ غذا کے کھانے میں وقت کی پابندی ضروری ہے۔ اور بار بار کھانے سے بچنا چاہیئے۔

صحت کا انحصار تنفس پر بھی ہے۔ جب ہم سانس لیتے ہیں تو ہوا کے ساتھ آکسیجن اندر داخل ہوتی ہے اور پھیپھڑوں میں خون کے ساتھ کیمیائی ترکیب کھانے کے بعد کاربن ڈائی اکسائیڈ خارج ہوتی ہے۔ کاربن ڈائی اکسائیڈ ایک زہریلی گیس ہے۔ ایک کمرہ کو چاروں طرف سے بند کرنے کے بعد کسی سوراخ سے جب روشنی کمرہ میں داخل ہوتی ہے تو تم نے دیکھا ہوگا کہ باریک باریک ذرات ہوا میں اڑتے رہتے ہیں۔ ان ذرات کے ساتھ جراثیم ہوتے ہیں۔ جب ہم سانس منہ کے ذریعہ لیتے ہیں تو یہ اندر داخل ہو کر فساد پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہم سانس ناک کے ذریعہ سے لیں تو ذرات ناک میں چمٹ جاتے ہیں اور اندر داخل ہونے نہیں پاتے چونکہ ناک کی نالی لمبی ہوتی ہے۔

سانس لمبی لمبی لینی چاہیئے تاکہ اندر سے پوری طرح کاربن ڈائی اکسائیڈ خارج ہو جائے۔ جب انسان دوڑتا یا کھیلتا ہے تو لمبی لمبی سانس ضرور لیتا ہے لیکن ہر وقت لمبی لمبی سانس لینے کی عادت ڈالنی چاہیئے۔

تاکہ کاربن ڈائی اکسائیڈ کلیتاً نکل جائے۔ نباتات بھی انسان کی طرح آکسیجن کے بجائے کاربن ڈائی اکسائیڈ آفتاب کی روشنی میں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس کے خلاف رات میں وہ کاربن ڈائی اکسائیڈ کا استعمال نہیں کرتے چنانچہ راتوں میں درختوں کے نیچے سونا اسی لئے خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ لیکن صبح کے وقت باغ کی تفریح بہت مفید ہے۔ چونکہ درخت صبح میں آکسیجن خارج کرتے ہیں۔

گھر میں پودے لگانا صحت کے لئے بہت مفید ہے اور یہ ایک اچھا مشغلہ ہے۔ اکثر لوگ صبح اور شام گھر کے باہر نہیں نکلتے۔ صبح اور شام کی ہوا بہت ہی صحت بخش ہوتی ہے۔ صبح و شام گھر سے باہر نکل کر باغ یا جنگل میں نکل جانا چاہیئے تاکہ روح افزا ہوا میسر آسکے۔

ہر روز صبح نہانا چاہیئے۔ خوب بدن کو صاف کر لینا چاہیئے تاکہ جو مسامات کہ بدن میں ہیں وہ بند ہونے نہ پائیں۔ چونکہ ان ہی مسامات کے ذریعہ پسینے کے ساتھ اندر کی غلاظت بھی باہر نکل جاتی ہے۔ ریاضت بھی بہت مفید اور صحت کے لئے ضروری ہے۔

ریاضت کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک تو دوڑ، ند چلنا، بیٹھکیں لگانا وغیرہ۔ لیکن اس کے علاوہ گھوڑے کی سواری تفریح، اور پیرا کی بھی ورزش میں داخل ہیں۔ سب سے اچھی ورزش گھوڑے کی سواری ہے۔

اس کے بعد گھر کی صفائی بھی ضروری ہے۔ کمرہ میں کاغذ اور غذا وغیرہ کے باریک ٹکڑے پڑے رہتے ہیں۔ ان سے بھی جراثیم پیدا ہوتے ہیں۔ گھر کے قریب میں کچرا پھینکنا بھی مناسب نہیں

اگر تم ان ہدایات پر عمل کرو تو انشاءاللہ کبھی بیمار نہ پڑو گے۔ اور خدانخواستہ کسی کسی نامعلوم وجہ سے بیمار بھی ہو جاؤ گے تو بہت جلد شفا بھی پاؤ گے۔

تین مفید باتیں

شیخ رحیم الدین
(ظہیر آبادی)

اپنی مدد آپ کرو۔ اپنی قدر آپ کرو۔ اپنے آپ پر بھروسہ کرو۔

سب رس بھائیو! اس ملاقات میں میں آپ کو تین مفید باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ یہ باتیں نہ صرف مفید ہیں بلکہ انہی پر آپ کی ترقی اور آئندہ زندگی کا پورا پورا انحصار ہے۔ اگر آپ میں یہ تین چیزیں نہ ہوں تو آپکی زندگی میں ترقی کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ جس انسان میں یہ خصوصیات نہیں ہوتے اس کو انسان کہلانے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ وہ درحقیقت حیوانِ ناطق کہا جا سکتا۔ آپ سوچتے ہیں کہ میں نے "حیوانِ ناطق" کہہ دیا آخر "حیوانِ ناطق" کس کو کہتے ہیں۔ اچھا تو پہلے اسی کے متعلق سنیئے۔

"حیوانِ ناطق" اس کو کہتے ہیں جس جاندار میں بات کرنے کی قوت ہوتی ہے ہر جان رکھنے والے کو جاندار یا ذی روح کہتے ہیں جس میں درندے، چرندے، گائے، بیل سب شامل ہیں لیکن ان سب

جانداروں میں انسان اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے اس کو خدا نے کئی ایک خوبیاں عطا کی ہیں سمجھنے کی سوچنے تمیز کرنے کی سونگھنے کی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ بات کرنے کی بھی قوت دی ہے جو دوسرے جانداروں میں نہیں ہوتی ہے اگر دیکھا جائے تو انسان کو بھی جانور کہا جا سکتا ہے اس لئے کہ جانور کا لفظ مرکب ہے یہ جان اور ور" دو لفظوں کو باہم ملانے سے بنتا ہے اگر ہم ان دونوں لفظوں کے علٰحدہ علٰحدہ معنی دیکھیں تو اس مرکب لفظ کے معنی" جان رکھنے والا" ہوتے ہیں اس لئے کہ" ور" فارسی لفظ ہے جس کے معنی" رکھنے والے" کے ہوتے ہیں جیسے دام وریہاں دام پھندے کو کہتے ہیں اور ور کے معنی وہی رکھنے والا دونوں کو ملانے سے معنی دام رکھنے والا ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے اوپر کہا کہ اگر انسان ان تمام خوبیوں کو رکھنے کے باوجود اپنے کردار پر غور نہ کرے اور عقل سے کام نہ لے تو وہ انسان نہیں۔ اب میں اپنی تینوں باتوں کو یکے بعد دیگر سمجھانا چاہتا ہوں۔

اپنی مدد آپ کرو:۔ مدد کے معنی تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ کسی کے کار و بار میں ہاتھ بٹانا۔ کسی کے بوجھ کو ہلکا کرنا کسی کا ساتھ دینے ہی کو مدد کہتے ہیں لیکن یہاں میں آپ کو کہہ رہا ہوں کہ" اپنی مدد آپ کرو" آپ کہیں گے واہ یہ بھی خوب رہی۔ ہم دوسروں کی مدد نہ کرکے اپنی مدد آپ کریں یہ تو خود غرضی ہو جائے گی۔ لیکن دراصل ایسا نہیں اس کو ہرگز خود غرضی نہیں کہتے انسان کا پہلا فرض تو یہ ہے کہ وہ اپنی مدد کرے پہلے اپنے آپ کو سدھارے اور اس کے بعد دوسرے کی جہاں تک ہو سکے مدد کرے۔ آپ ہی دیکھئے ایک انسان جو اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتا تو وہ بھلا دوسرے کے لئے کیا کر سکتا ہے۔ ایک شخص جو خود بھوکا ہوتا ہے وہ دوسرے کا پیٹ کیسے بھر سکتا ہے۔ جو خود کچھ نہیں جانتا وہ دوسرے کو کس طرح کوئی چیز بتا سکتا ہے۔ اس لئے تو میں کہہ رہا ہوں کہ پہلے انسان خود اس قابل بن جائے کہ اس کا وجود دوسروں کے لئے مفید ثابت ہو سکے۔ پہلے گھر کو چراغ تو بعد مسجد کو۔ اسی طرح پہلے خود تو بعد میں دوسرے پہلے اپنی مدد تو بعد دوسرے کی۔ پہلے خویش بعدہٗ درویش۔

انسان کو چاہیئے کہ وہ کبھی کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو ہمیشہ اپنے پیر پر کھڑے رہنے کی کوشش کرے کسی کے احسان کی شرمندگی اٹھانا ایک غیرت دار اور حساس دل رکھنے والے انسان کے لئے روحانی اذیت سے کم نہیں۔ جس انسان میں غیرت اور خود داری ہوتی ہے وہ ہرگز اس کو گوارا نہیں کرتا۔ کہ اس کی زندگی دوسرے کی محنت اور کوشش کی رہین منت ہو۔ اور وہ خود کچھ نہ کرکے اپنی کمزوری کی وجہ سے دوسرے کا زیر اثر رہے۔ اگر آپ میں احساس خود داری ہے اگر آپ دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو چاہیئے کہ ہمیشہ بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے کار و بار مستقل مزاجی کے ساتھ انجام دیں۔ ہم کو اپنا کام اپنے ہاتھ سے انجام دینے میں کبھی رکنا اور جھجکنا نہ چاہیئے۔ اس میں کوئی بے عزتی یا ذلت نہیں ہے۔ انسان کو خدا نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ ہر دنیوی کامرانی اور ترقی انسان کے بس میں اور اس کی کوشش پر منحصر ہے جو انسان دنیا میں ناکارہ ہوتے ہیں وہ نہ اپنی آپ مدد کرتے ہیں اور نہ دوسرے کی مدد کے قابل ہوتے ہیں ان کا وجود وعدم برابر ہوتا ہے ان سے نہ صرف انہی کو

بلکہ ملک اور قوم کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ جو شخص خود اپنی مدد نہیں کرتا خدا بھی اس کی مدد نہیں کرتا۔ اس لئے انسان کا اولین فرض ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنی مدد آپ کرے۔

اپنی قدر آپ کرو:۔ آپ اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ عزت اور آبرو انسانیت کا بہترین زیور ہے جس انسان کو اپنی عزت و وقار کا خیال نہیں ہوتا جس کو احساس خودداری اور شرافت کا خیال نہیں ہوتا۔ وہ ہرگز ہرگز انسان کہلانے کا مستحق نہیں وہ بظاہر انسان ہوتا ہے لیکن اس کے افعال اس قدر شرم آمیز اور قابل حقارت ہوتے ہیں کہ جن سے شعار انسانیت کے دامن پر بدنامی کا دھبہ ہوتا ہے دامن انسانیت داغدار ہوجاتا ہے۔ اسی لئے ہم کو چاہیے کہ ہم نہ صرف انسان ہوں بلکہ اپنے افعال اور کردار کے اعتبار سے مکمل انسان کہلانے کے مستحق ہوجائیں۔ ہمارا ہر فعل شعار انسانیت کے حدود سے باہر نہ ہونے پائے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جو انسان اپنی قدر آپ نہیں کرتا۔ جو اپنی نظروں میں آپ ذلیل ہوجاتا ہے اس کی قدر دنیا میں کوئی نہیں کرتا - - - - - - - - وہ اپنی نظروں سے گرنے کے بعد دنیا کی نظروں میں بہت جلد ذلیل و خوار ہوجاتا ہے جو اپنی عزت آپ نہیں کرتا دوسرا بھی اس کی عزت نہیں کرتا علامہ اقبال نے انسان کو اپنی قدر اور اپنی حقیقت بلند رکھنے کے لئے کیا ابھارا دیا ہے۔ ؎

حقیقت کر بلند اتنی کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اگر آپ چاہیں کہ دنیا آپ کی قدر کرے دنیا والوں کی نظروں میں آپ کی عزت ہو ہر شخص آپ کو عزت کی نگاہوں سے دیکھے تو آپ کے لئے یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے آپ اپنی قدر کریں اپنی آپ عزت کریں آپ سے کوئی ایسی حرکات سرزد نہ ہوں جس سے آپ کی بے عزتی ہو آپ کی توہین اور ناقدری ہو آپ کو چاہیے کہ ہمیشہ سوچ سمجھ کر بات کریں اپنے حرکات اور کردار پر غور کریں لیکن آپ سے ایسی حرکتیں نہ ہوں جو آپ کے وقار اور شخصیت کے حق میں مضر ثابت ہوں۔ انسان کا ہر عمل اس کی خودداری اور وقار کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ اکثر انسان بیجا دخل اندازی، بلا ضرورت اور بے موقع لنترانی۔ چھچھوراپن، بے موقع مزاح اور حد سے زیادہ بے تکلفی کرجاتا ہے جس کی وجہ سے وہ دوسروں کی نگاہ میں بدتمیز، اوچھا، کم ظرف اور ذلیل و خوار ہوجاتا ہے۔ کوئی عزت نہیں رہتی۔ سوسائٹی اور محفلوں میں اس کی وقعت نہیں ہوتی۔ وہ خوددار انسانوں کے آگے ایک بے حیا اور ننگ وجود انسان سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کی عزت اور آبرو ہمیشہ کے لئے بے عزتی کے سیلاب میں بہہ جاتی ہے۔

جس انسان میں شرم اور حیا نہیں ہوتی وہ زندگی کے کسی شعبہ میں ترقی نہیں کرتا۔ خود فراموش کو ہمیشہ قعر مذلت کے سوائے کبھی بام ترقی کی صورت نظر نہیں آتی بے حیائی انسان کی فطرت ثانی بن جاتی ہے۔

جس کی وجہ سے عمر بھر اس کی قسمت میں ذلت اور توہین لکھی ہوتی ہے وہ اپنے ہاتھوں اپنی خودداری کو خاک میں ملاتا ہے۔ اپنی نظروں میں ذلیل ہو کر دنیا کے آگے بے حمیت ہو جاتا ہے دنیا میں اس کی آواز کوئی وزن نہیں رکھتی اس لئے کہا جاتا ہے کہ انسان کو ہمیشہ اپنی آپ قدر کرنا چاہیئے۔

اپنے آپ پر بھروسہ کرو:۔ اچھا تو اب آپ نے دو چیزوں کے متعلق تو سن لیا اب تیسری چیز کے متعلق سنئے۔ غالباً آپ جانتے ہوں گے دنیا ایک ڈھلتی چھاؤں ہے دنیا اتنی خود غرض ہوتی ہے کہ کبھی کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ اسی لئے تو دنیا کو "متضاد کیفیتوں کا دوسرا نام" کہا جاتا ہے۔ ہر شخص بڑی بڑی باتیں کرتا ہے اپنی قوت گویائی اور لسانی کے ذریعہ بڑا ہمدردِ قوم و ملک ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوستی اور ہمدردی کا دم بھرتا ہے لیکن دراصل دیکھا جائے تو یہ تمام چیزیں بالکل ظاہری ہوتی ہیں۔ ان میں کوئی اصلیت نہیں ہوتی صرف بناوٹ ہی بناوٹ ہوا کرتی ہے جو بھی ایسے دعوے کرتے ہیں وہ بڑے فریبی اور دھوکہ باز ہوتے ہیں ان کا ہر عمل فریب اور دکھاوے کا ہوا کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اگر ضمیر فروش کہا جائے تو نہایت مناسب ہے اس لئے کہ ایسے دعوے کرنے والے عمل اور تجربہ کے میدان میں نہتے اور کاغذی پُر فریب پھول سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ ہر شخص کی دوستی اور ظاہری ہمدردی میں کوئی نہ کوئی غرض وابستہ ہوتی ہے۔ اور بات بھی یہی ہے ع

سب دوست ہیں اپنے مطلب کے دنیا میں کسی کا کوئی نہیں۔

یہ ایسی چیزیں ہیں جن کو ہم اپنے چشم دید واقعات کہہ سکتے ہیں انسان خود جس قدر کام اور محنت کر سکتا ہے کرے۔ دوسرے کی مدد اور دوسرے کے بھروسہ پر رہ کر وہ نہ کسی مشکل کو آسان کر سکتا ہے اور نہ کسی مقصد کو حاصل کر سکتا ہے جو کچھ بھی کرتا ہے صرف اپنے بل پر کر کے جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ اپنا بل بیر بل دوسرے کا بل جائے جل۔

انسان کو اپنے نفس اور اپنے اوپر اعتماد رکھنا چاہیئے۔ اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر وہ اپنے دل میں چور رکھ کر کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرتا ہے یا کسی کو دھوکا دینا چاہتا ہے تو وہ دنیا کو دھوکا بہ آسانی دے سکتا ہے لیکن اپنے ضمیر کو نہیں دے سکتا۔ اگر وہ اپنی چال بازی سے کسی کو دھوکا دے تو اس کا ضمیر اس کو ملامت کرے گا۔ اس کا نفس اس پر لعنت بھیجے گا۔ اگر حق گوئی کے صلہ میں انسان کو دار پر بھی چڑھا دیا جائے تو اس کو اس کا رنج نہ کرنا چاہیئے اگر انسان اپنے آپ پر بھروسہ رکھے اور اس کا ضمیر مطمئن ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے بالکل حق بجانب ہے تو وہ "تلواروں کے سایہ میں بھی زندگی گزار سکتا ہے وہ "پسٹل" کی نوک پر پھر حیاتِ جاوداں پا سکتا ہے۔ بھروسہ انسان کے قوتِ ارادی کا بہترین معاون ہے اگر انسان اطمینانِ قلب اور مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے اوپر بھروسہ رکھ کر نار کی طرف بھی بڑھ جائے تو وہ بہت زیادہ اس سے

بہتر ہے کہ کسی دوسرے کا دامن پکڑ کر باغ کا رخ کرے۔ غیر کی مدد اور غیر کے بھروسہ پر جنت حاصل کرنے سے بہتر تو یہ ہے اپنے اوپر بھروسہ کرکے گمراہ ہو جائیں۔

آخر میں میں آپ سے پھر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے مذکورہ بالا تینوں مفید چیزوں سے متعلق پڑھا اور غالباً اب آپ کو یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہر انسان کے لئے یہ تینوں خصوصیات ضروری ہیں۔ بغیر ان چیزوں کے زندگی کی تکمیل نہیں ہوتی۔ سب سے زیادہ آپ لوگوں میں ان خصوصیات کا ہونا لازمی ہے آپ ہی گزشتہ قوموں اور نسلوں کی نشانی اور آئندہ ملک و قوم کی ترقی اور کامرانی کے ذمہ دار ہیں۔ تم ہی کاروانِ قوم کے میر کاروان ہونے والے ہو۔ تم ہی پر ملک و قوم کی ہست و بود بقا اور فنا منحصر ہے۔

مرزا باقر علی زاہد

یادِ ماضی

بادِ صبا کے جھونکے غنچوں کا جھوم جانا
ساگر کا وہ نظارہ چڑیوں کا چہچہانا

"یاد آرہا ہے مجھ کو گذرا ہوا زمانہ"

برکھا کا پیارا موسم بادل کا گھر کے آنا
موجوں کی وہ روانی سبزے کا لہلہانا

"یاد آرہا ہے مجھ کو گذرا ہوا زمانہ"

وہ کالے کالے بادل بجلی کا جگمگانا
بادِ صبا کی شوخی پھولوں کا مسکرانا

"یاد آرہا ہے مجھ کو گذرا ہوا زمانہ"

کوئل کی کوک پیاری اور میرا گنگنانا
بارش کی ننھی بوندیں بلبل کا آشیانا

"یاد آرہا ہے مجھ کو گذرا ہوا زمانہ"

میر محمود علی اکبر شبیر

غربت کی صبح

(افسانہ)

رات کو کھانے سے فارغ ہو کر میں اپنے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ دل تو چاہتا تھا کہ سب رس کا مطالعہ کرتے رہوں لیکن سردی کی شدت مجھ کو اپنے اس ارادہ کے پورا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ آخر کار دل نے یہ فیصلہ کیا کہ کل چھٹی کا دن ہے ہوم ورک سے فراغت پاتے ہی اس پر پھر ختم کر ڈالیں گے۔ اب میں اس تصفیہ پر متفق ہو کر اپنی چارپائی پر بلانکٹ (Blanket) اوڑھ کر دراز ہو گیا۔ پانچ منٹ تک آنکھیں بند کئے ہوئے نیند کا انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ نیند آگئی اور میں گہری نیند میں غرق ہو گیا۔

دیکھتا ہوں کہ صبح صادق کا وقت ہے — آسمان پر چاروں طرف کہر چھایا ہوا ہے — صبح کا ستارہ اپنی نیم باز مستانہ آنکھوں سے صبح خیزی کا سبق پڑھا رہا ہے — آسمان پر بادل کے منتشر ٹکڑے اس دلفریب گھڑی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں — فضا پر سنہری چادر پھیلی ہوئی ہے۔ صبح کے جھلملاتے ہوئے تارے ایک ایک کر کے روپوش ہو رہے ہیں — مشرق پر پھیلی ہوئی سپیدی آفتاب کی آمد کا پیغام دے رہی ہے — غرض اس دلفریب منظر کو دیکھ کر میں فوراً اپنے بستر سے اٹھا اور جنگل کی طرف چلا۔ حتیٰ کہ آبادی سے بہت دور نکل گیا تھا میری نظر ایک چرواہے پر پڑی جس کی عمر ۱۶ سال کی ہو گی کیونکہ سردی زیادہ تھی اس لئے یہ بیچارہ ٹھٹھرا ہوا تھا اس کے بدن پر سوائے ایک لنگوٹی کے اور کچھ نہ تھا — یہ ہے غربت کی صبح۔

میں نے اس سے پوچھا تمہارا گھر کہاں ہے۔

یہ سن کر چرواہے کی آنکھوں میں پانی بھر آیا اس نے ایک ٹھنڈی سی آہ بھری اور کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا کہ ہم اور ہمارا گھر یہ کہہ کر ایک جھونپڑی کو بتاتے ہوئے کہا کہ وہ دیکھیے سرکار وہی ہمارا گھر ہے —

میں حیران ہو گیا کہ اس میں اتنے اخلاق کہاں سے آئے۔ غور سے اس کی صورت دیکھا اور دل میں خیال کرنے لگا کہ یہ ضرور کسی شریف گھرانے کا لڑکا ہے — لیکن افسوس قسمت کے تغیر نے یہ دن دکھائے ہیں۔

"تمہارے ساتھ اس جھونپڑی میں اور کون رہتے ہیں" میں نے سوال کیا۔ "صرف ایک میری بوڑھی ماں" اس غریب نے جواب دیا۔

میں۔ کیا میں تمہاری اں سے مل سکتا ہوں۔

چرواہا۔ شوق سے۔ یہ کہہ کر چرواہا بھی میرے ساتھ ہو لیا۔

میں۔ تمہارے کاروبار میں میں نے بلاوجہ دخل دیا ہے۔ امید کہ اس کو معاف کرو گے۔ چرواہا میں اور میری بساط کیا کہتا ہوا میرے ساتھ مع مویشیوں کے واپس ہوا۔ اس کے چہرہ سے ایک قسم کی خوشی ظاہر ہوتی تھی اور میں بھی یہ دیکھ کر کہ اس کو میرے ساتھ چلنے سے کوئی رنج نہیں دل ہی دل میں بہت خوش تھا۔ چالیس

پچاس قدم آگے بڑھنے کے بعد جھونپڑی آگئی اور میں نے اس کی ماں کو دیکھا جس کی عمر شاید ساٹھ یا پینسٹھ برس کی ہوگی۔ اس کے بدن پر ایک میلی کچیلی پھٹی پرانی ساڑی تھی جس میں ان گنت پیوند لگے ہوئے تھے اور بیچاری سردی سے کانپ رہی تھی۔

میرے جاتے ہی ضعیف عورت نے ایک پھٹی چادر بچھائی اور میں اس پر بیٹھ گیا پندرہ منٹ تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ انہیں باتوں میں میں نے یہ بات معلوم کرلی کہ یہ لوگ پہلے مالدار تھے اور اس ضعیفہ کا شوہر ساہوکار تھا اسی زمانے میں اس لڑکے نے مڈل تک تعلیم پائی تھی بوڑھی بےحال ہوتی جاتی تھی اور پھوٹ پھوٹ کر روتی جاتی تھی۔ مجھ کو اس کی حالت دیکھ کر بہت رنج ہو رہا تھا کہ یکایک میری آنکھ کھل گئی اب میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے کمرے کی چاروں طرف دیکھ رہا تھا لیکن وہی بستر وہی میری خوابگاہ اور چارپائی تھی۔

معمولی مکھّی

مسیح الدین خاں تسکین

اہل سائنس نے یہ ثابت کیا ہے کہ معمولی گھر کی مکھی سخت خطرناک اور نقصان دہ ہوتی ہے۔ یہی ہوائی سیاح ہے جو ایک شخص کی بیماری دوسرے تک لے جاتی ہے۔ وہ لوگ جس میں صحت اور تندرستی کی قیمت محسوس کی جاتی ہو چاہیئے کہ ان کے کم کرنے میں خاص توجہ کرے۔

ان کی تعداد موسم گرما میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ایک مادہ مکھی تقریباً ڈیڑھ سو انڈے کوڑا کرکٹ غلیظ راستوں، سڑے گلے پتوں پر دیتی ہے۔ چند دن بعد ان انڈوں سے چھوٹے چھوٹے بےشمار کرم پیدا ہوتے ہیں۔ پانچویں یا چھٹے دن سیاہ گول چنے کے مانند ہو جاتے ہیں۔ نویں یا دسویں دن ان کے پاؤں و پر وغیرہ نکل آتے ہیں۔

"یہی مکھی ہے" (نیلے پیٹ والی مکھیاں زیادہ تر سڑے گلے گوشت میں انڈے دیتی ہیں)

یہی مکھیاں اپنے پاؤں کو غلیظ مقامات میں کیڑوں سے آلودہ کرلیتی ہیں۔ اور غذا کی تلاش میں اڑتی ہیں۔ اور جب کسی خور و نوش کی اشیاء یا جسم پر بیٹھتی ہیں تو وہ جراثیم پھیل جاتے ہیں۔ اور فوراً اپنا کام شروع کردیتے ہیں۔

بعض مکھیاں کیڑوں کو نگل جاتی ہیں۔ وہ اندر رہ کر بڑھتے ہیں اور جب یہ مکھیاں کسی چیز پر بیٹھتی ہیں تو وہ کیڑے فوراً نکل جاتے ہیں۔ جس سے انسان کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ بہتر ہے کہ اس بلا میں گرفتار ہونے سے پہلے اپنی حفاظت کی جائے۔

ان کے دور کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ "مکھی مار" کا غذ استعمال کریں۔ لیکن تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیادہ مفید نہیں۔ اس لئے کہ اس کے استعمال سے ان کی بڑی تعداد میں کوئی بڑی کمی واقع نہیں ہوتی۔
سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ صفائی کا بہت زیادہ لحاظ رکھا جائے۔ جہاں صفائی کا خاصہ انتظام ہے وہاں کیڑے نہ ہوں گے۔ اگر وہاں کیڑے غلاظت وغیرہ نہیں ہے تو مکھیاں بھی نہیں آئیں گی۔ اور جو بیماری ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہے اس سے ہم محفوظ رہیں گے۔

پس صفائی کی طرف خاص توجہ کی جائے۔ کم ازکم ہفتہ بھر میں پورے مکان کا معائنہ کریں۔ پہلے پہل باورچی خانہ کا معائنہ کریں۔ اس کے بعد برتن وغیرہ رکھنے کی جگہ دیکھیں۔ مودی خانہ کا جائزہ لیں۔ رہنے سہنے کی جگہ کو ہر طرح کی غلاظت و کثافت سے پاک رکھیں۔ خیال اس بات کا رہے کہ مکان کا ہر گوشہ صاف ہے یا نہیں کھانے پینے کی اشیاء ہمیشہ ڈھنکی رہنی چاہیئے۔ تاکہ ان قاتلوں سے محفوظ رہیں۔ چائے کی پتی، شکر، بچا ہوا کھانا، فرش پر پڑے رہنا، مکھیوں کو انڈے دینے کے لئے بلانا ہے۔

گرمیوں میں جو اکثر بیماریاں ہوا کرتی ہیں۔ مکھیوں ہی کے سبب سے ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان دنوں ان کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے صفائی کی بے احتیاطی۔ اگر مکان کو ہمیشہ پاک و صاف رکھیں تو مکھیوں کو صفائی سے کیا غرض ہو؟ وہ ہرگز نہیں آئیں گی۔ اور بیماری بھی ہم سے کوسوں دور رہے گی۔

معلوم ہوا کہ صفائی بہت بیش بہا جوہر ہے۔ جس کو نظر انداز ہماری سراسر غلطی ہے۔

عثمان بن احمد بصعار
(مفید الانام اسکول)

مفید معلومات

ایک پتنگے کے جسم میں ۴۰۱۶ اعصاب ہوتے ہیں (۲) برلن کے کتب خانہ میں ایک انجیل ہے جو کھجور کے پتوں پر لکھی گئی تھی۔ (۳) آکسفورڈ کے کتب خانہ میں ایک انجیل ہے جو اخروٹ کے چھلکے میں آسکتی ہے۔ (۴) دنیا میں آج کل ۵۰۶۰۷ قسم کے ڈاک کے ٹکٹ جاری ہیں (۵) دنیا میں کل مویشیوں کی تعداد (۵۱۰۶۲۹۰۰۰۰۰) کھرب ہے جس کا ⅓ تو صرف ہندوستان ہی میں پائے جاتے ہیں۔ (۶) روئی کی پیداوار ساری دنیا میں (۵۶۰۰۰۰۰) ٹن ہوتی ہے۔ (۷) امریکہ کے آبشار نیاگرا کی طاقت ستر لاکھ گھوڑوں کی ہے۔ (۸) ہاتھی کی اوسط عمر ۱۰۰ سال ہوتی ہے۔

عبدالمجید خاں یوسف زئی

نظام الملک آصفجاہ اول

مولوی شیخ چاند مرحوم نے بانی سلطنت آصفیہ کے مکمل حالات و مستند واقعات زندگی سلیس اور شگفتہ زبان میں تحریر کئے تھے جس کو ادارہ نے کتابی شکل میں شایع کیا ہے۔ مدرسہ کے طلبہ اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اس کو شوق سے پڑھیں گے۔ سب رسی بھائی اور بہنیں چار آنے کے ٹکٹ روانہ کریں تو ان کے پتہ پر بھیجدی جائے گی۔

سب رس

نشان ٹپہ تصفیہ ۱۵۲
نشان ٹپہ برطانیہ (M 8 3 ۱)

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن

کا

ماہ نامہ

سب رس

بابت مئی ۱۹۳۹ء یعنی جلد (۲) شمارہ (۵)

زیرِ نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

مجلسِ ادارت

مکتبۂ ابراہیمیہ پریس میں طبع ہو کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا
سالانہ چندہ (للعہ) علاوہ محصول ڈاک فی پرچہ ۸ آنے

اِدارہ ادبیات اردو

اردو زبان اور ادب کی خدمت کر رہا ہے۔

اس کی مطبوعات سارا اردو دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔

ہر دلچسپ اور مفید موضوع پر اس نے کم قیمت کتابیں شایع کی ہیں۔

اس کی کتابیں کتابت، طباعت، کاغذ اور عام دلکشی کی وجہ سے مشہور ہیں۔

اس نے ملک میں مطالعہ کا ذوق عام کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے۔

اس کی باتصویر اور مجلد کتابیں اپنی نفاست کی وجہ سے بہت پسند کی جاتی ہیں۔

بچوں، بوڑھوں، مردوں اور عورتوں ہر ایک کی ضرورت کی کتابیں شایع کر رہا ہے۔

اس کی مطبوعات کی فہرستیں طلب کرنے پر مفت بھیجی جاتی ہیں۔

اردو کتابیں خریدنی ہوں تو دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے ضرور مشورہ کیجیے۔

ادارہ کا رسالہ سب رس۔ کم از کم ۶۴ صفحات اور زیادہ سے زیادہ ۹۶ صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوا کرے گا۔
رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے۔ جواب طلب امور کے لیے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔
خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔ اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ دو چیریا وی پی کے ذریعہ سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی

سب رس کی قیمت حیدرآباد کے لیے چار روپے سالانہ۔ دو روپے آٹھ آنے ششماہی۔ چھ آنے فی پرچہ۔
" " حیدرآباد سے باہر چار روپے آٹھ آنے سالانہ۔ تین روپے ششماہی۔ سات آنے فی پرچہ۔

ادارہ کی چند مقبول عام کتابیں

مرقع سخن (جلد اول) صمہ
فیض سخن ۱۲/
ورڈز ورتھ اور اسکی شاعری عہ/
نذر ولی عا/
من کی دنیا عہ

مرقع سخن (جلد دوم) صمہ
بادۂ سخن ۱۲/
ٹیگور اور انکی شاعری ۴عہ/
نقد سخن عہ
مدراس میں اردو عہ/

سراج سخن ۱۲/
کیف سخن ۱۲/
من کی بپتا ۸/
گریہ و تبسم عا/
نذر دکن ۴عہ

ایمان سخن ۱۲/
متاع سخن ۱۲/
ہوش کے ناخن ڈرامہ عہ
مشاہیر قندھار دکن عہ
محرم نامہ عہ

نظام الملک آصف جاہ اول ۴/ عاصمہ ۴عہ/ سرگزشت غالب ۸/ روح غالب عا۸/

جلد (۲) شمارہ (۵) | سب رس | مئی ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

ضروری اطلاعیں

(۱) سب رس کے گذشتہ سال کے پرچے ہمیں نومبر اور ڈسمبر ۱۹۳۸ء کے مزید چند پرچوں کی ضرورت ہے جو صاحب علحدہ کرنے چاہتے ہوں براہ کرم دفتر کو مطلع فرمائیں۔ اصل قیمت پر پرچے خرید ے جائیں گے۔ نیز جن اصحاب کے یہاں سب رس کا گزشتہ سال کا فائل مکمل نہیں ہے اور وہ اس کو مکمل کرنا چاہتے ہیں تو دفتر سے مراسلت کریں۔ اگر ممکن ہو تو دفتر پرچے فراہم کرکے ان کے فائل کی تکمیل میں مدد دے گا۔

(۲) کتاب گھر ادارۂ سب رس کی خواہش ہے کہ علم و ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لئے ہر طرح کی علمی و ادبی سہولت فراہم کرے چنانچہ سب رس کتاب گھر میں جو کتابیں موجود نہیں رہتیں ان کو بھی کسی نہ کسی طرح سے فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ علم دوست اصحاب اپنی ضرورت کی کتابیں بے تکلف سب رس کتاب گھر کے توسط سے حاصل کر سکتے ہیں۔

(۳) رقمی دادو ستد ادارے کے بڑھتے ہوئے کاروبار کی وجہ سے مختلف اصحاب اس کے کاموں میں ہاتھ بٹا رہے ہیں اور سب رس کا چندہ اور ادارۂ ادبیات اردو کی کتابوں وغیرہ کی قیمت بھی وصول کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں علم دوست اصحاب کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ ادارہ سے متعلق کوئی رقم ادا کرتے وقت ادارہ کی مطبوعہ نمبری رسید ضرور حاصل کریں تاکہ ادارہ کے حسابات میں دقتیں نہ پیدا ہوں۔ دفتر صرف اسی رقم کی ذمہ داری لے سکتا ہے جس کے لئے مطبوعہ رسید جاری کی گئی ہے۔

(۴) ایجنٹوں کی ضرورت سب رس اور بچوں کے سب رس اور "ادارۂ ادبیات اردو" کی کتابوں کے لئے مختلف شہروں اور تعلقوں میں ایجنٹوں کی ضرورت ہے جن کو کافی کمیشن دیا جائے گا اور ہر قسم کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ ایجنسی کے تفصیلی شرائط دفتر سے معلوم کر سکتے ہیں۔

(۵) ادارۂ ادبیات اردو کی نئی کتابیں **عاصمہ** ایک دلچسپ اور مفید معاشرتی ناول جس میں ڈیوڑھی کی اک کنیز کے واقعات زندگی ادب کے ترقی پسند نظریوں کے مطابق قلمبند کئے گئے ہیں۔ مصنفہ مولوی ابوالظفر موید الدین حسن صاحب۔ صفحات ۲۰۰ مجلد معہ تصویر قیمت عہ

(۶) من کی بپتا صنف نازک کی ضرورتوں اور زندگی کی تلخیوں کے متعلق معرکتہ آلآرا مشورے۔ از لطیف النساء بیگم صاحبہ بی اے صفحات ۱۸۴ مجلد قیمت عہ

(۷) نذر دکن۔ دکن کے متعلق خواتین دکن کے شگفتہ ادبی اور تاریخی مضامین اور نظمیں مجلد باتصویر بڑی سائز صفحات (۱۱۲) قیمت عہ

(۸) محرم نامہ۔ سانحہ کربلا کے متعلق مضمونوں، مرثیوں، سلاموں، نوحوں اور تصویروں کا عظیم الشان مجموعہ بڑی سائز صفحات (۱۰۴) قیمت عہ

(۹) نظام الملک آصف جاہ اوّل اس مختصر کتاب میں نظام الملک آصف جاہ اول کے مجمل حالات و مستند واقعات زندگی نہایت سلیس اور شگفتہ زبان میں تحریر کئے گئے ہیں۔ ادارہ دوسرے سلاطین آصفی کے سوانح حیات بھی تیار کر رہا ہے۔ اس کتاب کو اس سلسلے کی پہلی کڑی سمجھا جائے۔ مصنفہ مولوی شیخ چاند مرحوم ام اے۔ قیمت صرف ۴ر

(۱۰) روح غالب غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگزشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب۔ اس کتاب کا پیش لفظ نواب مہدی یار جنگ بہادر ام اے (کیمبرج) صدر المہام تعلیمات و معین امیر جامعہ نے تحریر فرمایا ہے۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ام اے پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ صفحات (۲۸۸) معہ تصاویر قیمت (عہ)

اداریہ

اس مہینے اردو دنیا نے شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم کی برسی ہر جگہ خاص اہتمام سے منائی۔ اپنے محسنوں کی یاد تازہ رکھنا اور ان کی حیات اور کارناموں سے بصیرت حاصل کرنا ہر زندہ قوم کا اولین فریضہ ہے۔ سب رس نے گزشتہ سال نہایت قلیل عرصہ میں اس شاعر مشرق کے شایان شان اقبال نمبر شایع کرنے کی سعادت حاصل کی تھی جو توقع سے زیادہ مقبول ہوا۔ اور اب تک اس کی مانگ جاری ہے۔ اگرچہ اب اس کے بہت کم نسخے باقی رہ گئے ہیں۔ اس غیر معمولی قدر دانی کے پیش نظر ادارۂ سب رس اقبال مرحوم سے متعلق قریب میں ایک مبسوط کتاب "نذر اقبال" شایع کرنے والا ہے جس میں اقبال نمبر کے اکثر بہترین مضمونوں اور نظموں کے علاوہ متعدد نئے مضمون، تصویریں اور نظمیں جو خاص اہتمام سے تیار کرائی گئی ہیں شامل رہیں گی۔ ان کے علاوہ اب تک اردو رسائل وغیرہ میں حضرت اقبال پر جو بہترین ادب شایع ہوا ہے ان کے منتخبات بھی اس "نذر" میں شریک رہیں گے۔ توقع ہے کہ یہ کتاب خاص آب و تاب کے ساتھ شایع ہو سکے گی۔ زیر نظر شمارہ کا ایک حصہ بھی حضرت اقبال کے متعلق چند مضامین کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔

ناظرین سب رس کے اضافۂ معلومات کے لئے "دولت کی تقسیم" (جو اس شمارہ میں پیش نظر ہے) جیسے مضمونوں کی خاص طور پر ضرورت ہے۔ ادارہ مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ انھوں نے ہر شمارہ کے لئے اس قسم کی معلومات بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ سب رس میں معلومات جدیدہ اور زمانہ کی رفتار سے متعلق دلچسپ اور مفید مضامین شکریہ کے ساتھ شایع ہوتے رہیں گے۔ کیونکہ ادب اور زندگی کی جدائی قوم کو ذہنی زوال کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ بڑے شاعر اور باکمال ادیب وہی ہوتے ہیں جو زمانہ کے رجحانات اور ماحول کے حالات سے متاثر ہو کر اپنے رشحات قلم میں بروقت تبدیلی کرتے رہتے ہیں۔ جو لوگ قدیم ڈگر سے ہٹنا نہیں چاہتے اور ترقی پسند نظریوں اور اصولوں سے ناواقف رہتے ہیں ان کی تحریر بے اثر ہوتی ہے۔ ان کی ساری شاعری اور انشا پردازی لکیر کی فقیری سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ جو لوگ اب تک اردو زبان اور ادب کو میر و سودا، ناسخ و آتش، یا امیر و داغ کے زمانہ کے معیار سے جانچنا چاہتے ہیں وہ اردو کو ترقی کی بجائے تنزل کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ وہ دریا کی روانی کو روک کر پانی کو گدلا رکھنا پسند کرتے ہیں۔ وہ فطرت کے خلاف عمل کرنا چاہتے ہیں۔ زبان اور ادب بے جان پہاڑ نہیں ہیں جو زمانہ کی گردشوں اور موسموں کی نرمیوں یا سختیوں کو ایک ہی طرح کھڑے جھیلتے رہیں۔ یہ انسانوں کے حالات و خیالات کے ساتھ خود بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اور اپنی موجوں کی طغیانیوں کے مقابلہ میں کسی کی پروا نہیں کرتے۔

زیر نظر شمارہ میں حضرت علی منظور کا ایک مضمون "جواب تنقید" کے عنوان سے شایع ہو رہا ہے۔ یہ عرصہ تک شایع نہ ہو سکا کیونکہ سب رس سوال و جواب اور بحث و مباحثہ کے ذریعہ ہنگامہ آرائی نہیں کرنا چاہتا حالانکہ وہ جانتا ہے کہ بقول غالب ع ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ رونق اور سستی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے خواہ مخواہ جھگڑے پیدا کرنا سب رس کے مسلک کے خلاف ہے۔ لیکن حضرت منظور کے تلامذہ کے بار بار اصرار کرنے اور یقین دلانے پر کہ یہ مضمون جو شہاب کی کسی تنقید کے جواب میں لکھا گیا پہلے شہاب ہی میں اشاعت کے لئے روانہ کیا گیا تھا اور ایک عرصہ کے بعد واپس ہوا ہے، اب سب رس میں شایع کیا جا رہا ہے۔ بہتر تو یہ تھا کہ یہ اسی پرچہ میں چھپتا جس میں تنقید شایع ہوئی تھی۔

ادارہ ادبیات اردو اس امر کی خاص طور پر کوشش کر رہا ہے کہ علوم و فنون کو عام کیا جائے اور بڑے بڑے موضوعوں پر ایسی چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کی جائیں جن میں طلبہ اور کم علم اصحاب کے لئے مجمل اور ضروری معلومات صاف اور سادہ زبان میں دلچسپ طریقہ پر پیش کی گئی ہوں۔ وہی ادب زیادہ مفید ہے اور وہی ادیب اور شاعر قابل مبارکباد ہیں جو اپنی قوم کے زیادہ سے زیادہ افراد کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ زبان یا ادب کو کسی خاص طبقہ یا حلقہ تک ہی محدود رکھا جائے اور اس سے لطف اندوز ہونے والے چند خاص خاص اہل ذوق یا کسی مخصوص شہر یا حصۂ ملک کے رہنے والے ہی ہوں۔ اب ہر قسم کی بندشیں اور حدود ٹوٹتے جارہے ہیں اور اکثر کاموں کا عوام کے فائدے اور سب کی دلچسپی کے لیے ہونا ضروری ہے۔ حضرت نظام الملک آصفجاہ اول کے متعلق اس وقت تک بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن کوئی ایسی کوشش اب تک منظر عام پر نہ آسکی جو طلبہ اور عوام کی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہو۔ مولوی شیخ چاند مرحوم نے شاید اسی غرض سے اس کام کا آغاز کیا تھا۔

ان کی کتاب نظام الملک آصفجاہ اس مہینے ادارہ کی طرف سے شائع کردی گئی ہے اور دوسرے سلاطین آصفی کے مختصر سوانح حیات بھی علحدہ علحدہ کتابی صورت میں شائع کئے جارہے ہیں۔

حضرت نظام الملک آصفجاہ اول پر یہ چھوٹی سی کتاب نہ صرف اس لئے اہم ہے کہ اس میں سلطنت آصفیہ کے قابل احترام بانی کے حالات زندگی درج ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ یہ مرحوم شیخ چاند ایم اے ال ال بی ریسرچ اسکالر کی آخری تحریروں میں سے ہے اور پہلی دفعہ شائع ہورہی ہے۔ توقع ہے کہ مدرسوں کے طلبہ اور تاریخ سے عام دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔

شعبہ زبان کی خواہش پر دکنی کہاوتوں اور محاوروں وغیرہ کو جمع کرنے کا کام شروع ہوچکا ہے اور بعض اصحاب نے فہرستیں جمع کرکے بھی روانہ فرمائی ہیں جن میں مولوی محمد جمال الدین حیدر صاحب کی فہرست نہایت مفصل اور باضابطہ حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب کی ہوئی ہے۔ ہم صاحب موصوف کی اس علمی دلچسپی اور نفیس ذوق کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ دکنی محاوروں اور کہاوتوں وغیرہ کے علاوہ دکنی گیتوں اور قصوں اور کہانیوں کو بھی جمع کرنے کی ضرورت ہے۔ جو اصحاب اس کام میں ادارہ کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں، وہ دریغ نہ فرمائیں۔ شکریہ کے ساتھ ان کا مرسلہ مواد سب رس میں شائع کیا جائے گا۔ یہ کام کسی ایک شخص کے کرنے کا نہیں ہے اور خدا کے فضل سے ملک کے ہر حصے میں ایسے صاحبان ذوق موجود ہیں جن کی علمی و ادبی دلچسپی سے توقع ہے کہ بڑے بوڑھے لوگوں اور پردہ نشین خاتونوں سے فرمائش کرکے گیتوں اور کہانیوں وغیرہ کو قلمبند کرالیں گے یا ان سے پوچھ کر اور سن کر خود ہی قلمبند کرکے روانہ فرمائیں گے۔

اس ماہ نواب عزیز یار جنگ بہادر کی صدارت میں شعراء و مصنفین دکن کے شعبے کا جلسہ ہوا جس میں کئی تجویزیں منظور ہوئیں۔ جن میں سے حسب ذیل سب رس کے ناظرین کی معلومات کے لئے درج ہیں۔

(۱) مولوی میر سعادت علی صاحب رضوی نے دائرہ میر مومن صاحبؒ میں مدفون شعراء میں سے (۱۱) کی قبروں کا پتہ

سلیم حامد رضوی ایم۔اے۔ ایل ایل۔بی عثمانیہ

چلا کر ان کی فہرست پیش کی جس کے متعلق یہ طے ہوا کہ منجانب ادارہ سررشتہ امور مذہبی کو توجہ دلائی جائے کہ ان کے ورثا وغیرہ کے ذریعہ ان شعراء کی قبروں پر ان کے نام سنہ ولادت و سنہ وفات کے کتبے لگائے جائیں۔

(۲) حضرت شاہ سراج اورنگ آبادی کے مزار پر منجانب ادارہ کتبہ لگایا جائے۔

(۳) گنبد حضرت شاہ راجو قتال اور قبرستان قطبی گوڑہ میں جو شعرا و مصنفین مدفون ہیں ان کا پتہ چلایا جائے۔ مولوی سروری صاحب نے اول الذکر اور مولوی میر سعادت علی صاحب نے آخر الذکر کام اپنے ذمہ لیا۔

(۴) جلال الدین صاحب توفیق اور حفیظ الدین صاحب پاکس کی قبروں کا بھی پتہ چلایا جائے اور ان کے ورثا کو کتبے لگانے کے لیے توجہ دلائی جائے۔

(۵) مرقع سخن کی تیسری جلد کے لئے مولوی میر سعادت علی صاحب نے تقریباً ایک سو شعراء کی فہرست مرتب کر کے پیش کی اس کے متعلق قرار پایا کہ اس فہرست کو سب رس میں چھاپ کر پبلک سے درخواست کی جائے کہ اگر ان شعراء کے حالات اور ان کا کلام کسی کے پاس ہو تو ادارے کو اس سے مطلع کر کے شکریے کا موقع دیں۔

(۶) داعیٔ شعبہ مولوی سید محمد صاحب نے اب تک جن مشاہیر شعراء کی قبروں پر ادارہ کی طرف سے کتبے لگائے گئے ہیں ان کی تفصیل پیش کی اور شعبہ نے اس کام کے سلسلہ میں ان کا شکریہ ادا کیا۔ (دوسرے شعبوں کی روداد آئندہ مہینے شامل ہوں گی)

"ادارہ"

مسافر

آخرِ شب تھا طلوعِ صبح کے آثار تھے
تیرگی کے بھیس میں انوار ہی انوار تھے

ہر ستارہ پر گماں ہوتا چراغِ طور کا
آسماں پر موجزن تھا ایک دریا نور کا

نور و ظلمت سے زمین و عرش کے پست و بلند
بڑھ کے بامِ ہر نظر پر ڈالتے تھے کمند

شیشۂ احساس کر دیتا تھا اکثر پاش پاش
قلبِ گیتی کے دھڑکنے سے فضا کا ارتعاش

شرحِ ہستی کے لئے ذروں نے کھولی تھی زباں
دن کے ہنگاموں کی تھی شب کی خموشی داستاں

زندگانی کے لئے تھے عشرت و غم کی اساس
تنگ گلیوں کی اداسی شاہراہوں کا ہراس

اضطراب و کرب سے کروٹ بدلتے بار بار
مفلسوں کی بے زری سرمایہ داروں کا وقار

اہلِ مطلب جا چکے تھے کارواں در کارواں
شاہدِ ذوقِ طلب تھے جن کے قدموں کے نشاں

کر چکے تھے اہلِ دنیا کے گناہوں کا شمار
تیرگیٔ شب کے پردہ میں خطوطِ رہ گذار

نشر کرتی تھی سکوتِ شب میں ہر جانب فضا
دن کی پامالی سے ذروں کے سسکنے کی صدا

اِک مسافر یک بیک آیا نظر جاتا ہوا
اپنے قدموں سے سکوتِ شب کو ٹھکراتا ہوا

تمکنت سے گامزن تھا اک رہِ خاموش پر — جرأتِ منزل قدم میں، بارِ ہستی دوش پر
ہر خطِ ابرو عروسِ شب کی زلفِ مشکبار — حسنِ سلمائے سحر لوحِ جبیں سے آشکار
شکل و صورت دیکھنے سے خضر کا ہوتا گماں — انقلاباتِ جہاں نے رخ پہ چھوڑے تھے نشاں
سہہ چکا تھا خوب رنج راہِ عمرِ بے ثبات — ہر نفس تھا رہ گذارِ چشمۂ آبِ حیات
منکشف ہوتی تھی ہر قدسی کی تحریرِ جبیں — غیب کے در باز کرتی تھی نگاہِ دوربیں
بارہا حل کر چکا تھا، عقدۂ ذات و صفات — گوشِ جاں سے سن چکا تھا جنبشِ نبضِ حیات
نقشِ پا میں جذب تھے پست و بلند افلاک کے — گرمئ رفتار سے تھے مہر ذرے خاک کے
راستہ دشوار تر تھا پھر بھی فرشِ راہ تھا — اضطرابِ شوقِ پیہم بھی شگوں آگاہ تھا
رہنمائی کر رہے تھے آرزوؤں کے چراغ — رہگذر کے پیچ و خم تھے قربِ منزل کا سراغ

فرطِ امید و رجا سے اشک جاری ہو گئے
پاسِ منزل کے پہنچ کر پاؤں بھاری ہو گئے

بزمِ ہستی سے چلا تھا، بزمِ ہستی چھوڑ کر — یک بہ یک دیکھا نگاہِ یاس سے منہ موڑ کر
بزمِ ہستی میں نظر آئے بصد جوش و خروش — جنتِ مستی مناظر اور جلوے خلدِ ہوش
پھر نظر آنے لگے الفت کے رنگا رنگ خواب — پھر تصور سے اتاری ایک تصویرِ شباب
پھر حصولِ ہوش کی تھیں مستیوں میں کوششیں — پھر خرد نے کسب کر لی تھیں جنوں کی شورشیں
پھر نیازِ عشق کو شوقِ جبیں سائی ہوا — پھر حدیثِ حسن کا عنوان رسوائی ہوا
پھر محبت، دشمنی تھی انجمن در انجمن — پھر فریبِ دوستی دیتے تھے احبابِ کہن
پھر بعنوانِ عنایات و کرم آزار تھے — پھر عزیز و اقربا الفت کے دعویدار تھے
پھر غم و عشرت سے لذت گیر تھے کام و زباں — پھر احاطہ نفس کا کرتے تھے انعامِ جہاں
پھر حیاتِ مادی سے بڑھ چلا تھا ارتباط — پھر ہوس نے ڈال دی تھی طرحِ ایوانِ نشاط

ہو چکی تھی صبح لیکن رہگذر بے نور تھی
پھر جو دیکھا جانبِ منزل تو منزل دور تھی

مسعود الحسن تابش

مغربی خواتین

یوروپین خواتین اور ان کی تہذیب و معاشرت کی بابت بہت سی باتیں ہم عمر بھر سنتے رہے۔ اور آئے دن اخبارات میں بہت سے مضامین اور تنقیدیں ان کی بابت پڑھتے رہتے ہیں۔ اس لئے مغرب میں جا کر بعض یوروپین ممالک دیکھنے کے بعد جو ذاتی تاثرات اس بارے میں پیدا ہوئے ان کا لکھنا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

یوروپین خواتین میں بہت سی صفات و حالات مشترک پائے جاتے ہیں جو تمام یورپ میں یکساں موجود ہیں۔ لیکن بعض مخصوص باتیں بھی ہیں جو مختلف ممالک میں مقامی حالات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس وقت زیادہ تر یہاں ان کی مشترک خصوصیات کا ذکر کیا جائے گا جو تقریباً تمام خطۂ یورپ کی بیبیوں میں پائی جاتی ہیں۔

مغربی خواتین کا ایک نمایاں امتیاز یہ ہے کہ ہر جگہ ہر بات میں یہ مردوں پر فوقیت لے جانا چاہتی ہیں۔ اور کشمکش حیات میں ہمیشہ مردوں سے آگے نظر آتی ہیں۔ سیر و تفریح میں کاروبار میں تعلیم و تنظیم میں مردوں سے سبقت لے جانے کے لئے ہر وقت کوشاں رہتی ہیں۔ یہاں کا مقتضائے تہذیب یہی ہے کہ مرد عورت سے رفتار میں دو قدم پیچھے رہے۔ اگلی سیٹ یہاں ہمیشہ عورت کے لئے ہوگی یعنی صدر مقام پر عورت بیٹھے گی۔ اور پچھلی مرد کے لئے۔ مرد اس سے پیچھے رہے گا۔ مرد کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ عورت جس وقت کوٹ پہنے تو وہ اس کی مدد کرے یعنی اس کو کوٹ پہنائے بال روم میں اگر کسی لڑکی سے کوئی مرد آکر رقص کی درخواست نہ کرے تو اس کی توہین ہو جائے گی۔ غالباً اسی لئے یہاں عورتوں میں احساس برتری پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ ہر لمحہ مردوں سے بازی لے جانے کی کوشش میں مصروف رہتی ہیں۔

اوسط اور ادنیٰ طبقہ کی مستورات کبھی مردوں کی محتاج رہنا پسند نہیں کرتیں بلکہ ہمیشہ اپنے لئے خود روزی پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ دفتروں میں دوکانوں میں ہوٹلوں میں ڈاک خانوں میں اسٹیشنوں میں غرض ہر جگہ مردوں سے زیادہ تعداد میں عورتوں کو برسرکار دیکھا جائے گا۔ یوروپین ممالک کے کاروبار میں عورتوں کی اتنی اہمیت دیکھ کر ہم ہندوستانیوں کو ایک اچنبھا سا ہو جاتا ہے۔ مگر امر واقعہ یہی ہے۔ ایک مرتبہ میں نے سوئیزرلینڈ کے ایک گاؤں میں رہنے والی خاتون سے دریافت کیا کہ آپ لوگوں نے اپنے مردوں کے لئے بھی کوئی کام چھوڑا ہے یا نہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں دفتری کام ہمارے یہاں صرف مرد ہی کرتے ہیں۔ میں نے حیرت سے کہا کہ آپ کے شہروں کے تو دفتروں اور کارخانوں میں بھی عورتوں ہی کی ریل پیل نظر آتی ہے۔ شاید گاؤں میں اس قسم کی تقسیم کار ہوتا ہوگا۔ بچے یہاں کسی خاندان میں زیادہ نہیں پائے جاتے۔ اکثر ایک دو یا زیادہ سے زیادہ چار ہوتے ہیں۔ شاذ و نادر اس سے زیادہ۔ بحیثیت بیوی کے اپنے شوہر سے جب تک رضامند رہے اس پر جان و دل سے فریفتہ ہوتی ہے۔ اور چونکہ غیر معمولی عشقی مزاج رکھتی ہے اس لئے سائے کی طرح مرد سے ایک منٹ جدائی پسند نہیں کرتی۔ نہ خود اپنی طرف سے اظہار محبت و لگاوٹ میں کمی کرتی ہے۔ ہم نے بعض ایسے بوڑھے جوڑوں کو بھی دیکھا جو باہم بے حد اخلاص و محبت رکھتے تھے اور بیویاں خاوندوں پر غیر معمولی مہربان تھیں۔ لیکن اگر ذرا بھی مرد کا رخ بدلا دیکھے تو

اسے ہر طرح سیدھا بنانے اور عقل درست کرنے کے لئے بھی پوری طور پر تیار نظر آئے گی اور یہ ناممکن ہے کہ وہ مرد کی طرف سے کسی قسم کی بے اتفاقی یا بدسلوکی کو ذرا بھی روا رکھے۔

یہاں کی بیبیاں خانہ داری اور کھانے پکانے کے بکھیڑوں سے جہاں تک ممکن ہو بالکل آزاد رہنا چاہتی ہیں اور بے فکری کے ساتھ ہوٹلوں میں پکا پکایا ہوا کھانا کھانا اور چائے وغیرہ اڑانا زیادہ پسند کرتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اپنے مکان کی سجاوٹ صفائی اور زینت کی بدرجۂ اتم دلدادہ ہوتی ہیں اور اپنی ہنرمندی جدّت پسندی اور نفاست سے گھر کے گوشہ گوشہ کو آراستہ کرتی ہیں۔ پینٹنگ نٹنگ کارپٹ کروشیا وغیرہ ہر قسم کی دست کاری کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونے یہ ہمیشہ اپنے گھر میں اپنے بچوں اور خود اپنے لئے تیار کرتی رہتی ہیں۔ چونکہ تفریح کی طرح کام کی بھی دھن ہوتی ہیں۔ اس لیے کبھی بیکار رہنا پسند نہیں کرتیں۔ بالکل ردّی جرابوں کو بھی رفو کی بھرمار کر کے ان کو درست کر لیتی ہیں زیادہ تر اپنے ہی ہاتھ کے بنائے ہوئے سوئیٹر جرزیاں گرم بلاوز اور شالیں استعمال کرتی رہتی ہیں۔ اور اپنے بچوں کے لئے بھی قسم قسم کی اونی چیزیں ہمیشہ تیار کرتی رہتی ہیں۔

ان کے مکانوں کی کھڑکیوں میں روزانہ صبح کو دھلے ہوئے کپڑوں کی ایک بڑی تعداد رسیوں کے ذریعہ لٹکی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس سے ان کی صفائی لباس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

یورپ میں اعلیٰ طبقہ کی خواتین بھی جو رات دن اعلیٰ سے اعلیٰ فیشن ایبل اور قیمتی لباس دوکانوں سے خریدتی اور بنواتی رہتی ہیں وہ بھی اپنے گھر میں ایک منٹ کے لئے خالی ہاتھ نہیں بیٹھتیں۔ اور علاوہ لکھنے پڑھنے کے مشاغل کے ہمیشہ کسی نہ کسی دست کاری میں مصروف رہتی ہیں۔ ریل کے سفر میں ایک بار دیکھا گیا کہ ایک خاتون کو اپنے دستانہ میں ذرا سا شگاف نظر آگیا۔ فوراً ہینڈ بیگ میں سے ہم رنگ تاگا اور سوئی نکال کر اس کی مرمت کر ڈالی۔

یہ ہنرمندی رفتہ رفتہ ان کی ایسی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے کہ بڑھاپے میں بھی عورتوں کو عینک لگائے ہوئے قسم قسم کی گلکاریوں اور نٹنگ وغیرہ میں مصروف دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ بڑھاپے میں بھی اپنی اولاد کا منہ دیکھا ہونا پسند نہیں کرتے۔ اور جہاں تک ممکن ہو ہر طرح اپنے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔ ضعیف عورتیں چست لباس پہنے ہوئے لاٹھی ٹیکتی ہوئی زنبیلوں میں بازار سے سودا لاتی ہوئی بارہا نظر آتی ہیں۔ غرض کاہلی سے زیادہ کوئی عیب ان لوگوں میں بدتر نہیں سمجھا جاتا۔ اوسط طبقہ کی لڑکیاں شادی سے پہلے ہی نوجوانی کی عمر میں اپنے اپنے کام سے بے فکری کے ساتھ لگی رہتی ہیں۔ نہایت تندرست خوش و خرم چست و چالاک تفریح کی ذہنی ہنرمندی کی شایق دفتروں میں اہل معاملہ ان کی چتون ہی دیکھتے رہتے ہیں اور وہ وقار کے ساتھ اپنی خدمات انجام دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ہوٹلوں وغیرہ خانگی ملازمتوں میں ان کے ساتھ نہایت مہربانی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ جو خاتون میڈ کا مخصوص لباس پہنے صاف اور خوشنما ایپرن لگائے ہوئے ہم کو تمیز کے ساتھ کھانا کھلا رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد کھانے کے ختم پر اپنے ہینڈ بیگ میں سے حساب کی کاپی اور آویزاں پنسل نکال کر ہمارا حساب کھڑے کھڑے تیار کر کے بل ہمارے حوالہ کر دے گی۔ اور دوسرے فرصت کے وقت میں اس کو کوئی اخبار پڑھتے یا دست کاری کا عمدہ نمونہ تیار کرتے دیکھا جائے گا۔ چونکہ تعلیم جبری ہے۔ اس لئے زن و مرد یکسر

تعلیم یافتہ ہیں۔ کوئی شخص اَن پڑھ یورپ میں پایا ہی نہیں جاتا۔ اسکولوں میں علاوہ لکھنے پڑھنے کے ان کو قسم قسم کے ہنر بھی سکھائے جاتے ہیں۔ جن سے یہ موقعہ بہ موقعہ عمر بھر کام لیتی رہتی ہیں۔

جب ان کے کام کا وقت ختم ہو جاتا ہے تو کاروباری لباس اتار کر فیشن ایبل کپڑے پہن لیتی ہیں۔ اور بیگ ہاتھ میں لے کر کسی کے ساتھ تفریح کے لیے روانہ ہو جاتی ہیں۔ اس وقت شاید ان کو بھول کر بھی یہ خیال نہیں آتا کہ وہ دن بھر کسی کی ملازمت اور خدمت گزاری میں لگی رہی ہیں۔

کام کاج کے علاوہ تفریحی مقامات میں بھی یہ ہمیشہ مردوں سے چار قدم آگے ہی نظر آئیں گی۔ شہ سواری تیراکی کشتی رانی بیڈمنٹن وغیرہ مختلف کھیلوں میں ہمیشہ مردوں کا سخت مقابلہ کر کے ان کو ہرانے کی کوشش کرنا گویا ان کا خاص نصب العین ہوتا ہے۔ بناؤ سنگار اور نت نئے فیشن ایبل لباسوں کا شوق یورپ میں خبط کی حد تک پہنچا ہوا نظر آتا ہے۔ عورتوں کا رات دن آئینہ، پاؤڈر اور لپ اسٹک وغیرہ میں مصروف و منہمک رہنا ایک مشہور صفت ہے اور آزادی کے شوق کی انتہا یہ ہے کہ لباس سے بھی چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ جس کی وجہ سے عریانی یہاں روز بروز زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ جو خاتون جس قدر زیادہ اپ ٹو ڈیٹ ہو گی اسی قدر وہ کم سے کم لباس پسند کرے گی۔ تیراکی کے مقامات میں آزادانہ مردوں کے ساتھ برائے نام لباس میں تیرتی ہیں۔ کیونکہ یہ ان کا نہایت محبوب مشغلہ ہے۔ ان کو دیکھ کر اس وقت بے ساختہ خیال آتا ہے کہ لفظ "شرم" کا کوئی مفہوم اب یورپ میں باقی نہیں رہا۔ اور جس طرح نپولین اعظم فرانسیسی ڈکشنری سے لفظ "ناممکن" کو خارج کر دینا چاہتا تھا۔ اسی طرح یورپ کی ڈکشنری سے شرم کا لفظ خود بخود نکل گیا اور شاید کوئی شخص جان ہی نہیں سکتا کہ اس لفظ کے بھی کوئی معنی ہوتے ہیں۔

ہماری ملکی خواتین کو بھی لازم ہے کہ مغربی بہنوں کے اعلیٰ صفات و مشاغل سے سبق حاصل کریں ان کی اچھی باتوں پر غور کر کے خود اپنے یہاں ان کو رواج دینے کی کوشش کریں۔

اور جو عیوب و نقائص ان کی معاشرت میں پائے جاتے ہیں۔ ان سے احتراز کریں۔ کیونکہ بہ تقاضائے بشریت کوئی ملک و قوم اس سے خالی نہیں ہو سکتی

انیسہ ہارون بیگم شیروانیہ

من کی بتیا

ایک دلچسپ ادبی کتاب جس کو محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ نے بچیوں کی بہترین تربیت کے لئے لکھا ہے اس میں حسب ذیل عنوانوں پر بڑی مفید اور کارآمد باتیں لکھی ہیں۔ گھر، سواری، ہمارے نوکر، خورد و نوش، لباس، بچوں کی تعلیم اور ان کی ضرورتیں، اخبار، کتابیں اور رسالے، نذر و نیاز، چندے، مختلف رسومات، علاج معالجہ، متعلقین، اور لواحقین، سیر و تفریح، سینما، فیشن۔ ہر تعلیم یافتہ گھر میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔ کتاب بہت خوبصورت اور مجلد ہے۔ ۱۰۰ صفحات

قیمت صرف (۱۲)

پیرس — تعلیمی سفر یورپ

(ڈائری کے دو ورق)

۱۵ جون ۱۹۳۷ء۔ آج صبح شہرۂ آفاق بین الاقوامی نمائش دیکھنے کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ اس موقع کا ہم سب نہایت اشتیاق کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔ نمائش گاہ پر پہونچنے کے بعد اس کی اہمیت و عظمت کا اندازہ ہوتا تھا۔ سب سے پہلے تو مقام ہی کچھ ایسا پُر فضا و فرحت بخش تھا کہ جس کے نظارہ سے طبیعت سیر نہیں ہوتی تھی وسط پیرس میں دریائے سین کے دونوں جانب تقریباً دو سو ایکڑ رقبہ پر نمائش کا احاطہ پھیلا ہوا ہے۔ دنیا کے عام متمدن ممالک کو اس میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی تھی اور انھوں نے بھی اس میں پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا اور اسے کامیاب بنانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ہر ایک ملک کے لئے جداگانہ عمارت بنائی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حکومت فرانس نے صرف دیواریں کھڑی کر دی ہیں اور مجلس عوام نے یہ بھی تصفیہ کر دیا کہ ممالک خارجہ کے ہر بڑے شہر کے لئے ایک ہزار مربع گز رقبہ مختص رہے لیکن وہ خود اپنے صرفہ سے اس کو آراستہ کریں اور اہنیں کا اہتمام بھی رہے۔ فلک بوس عمارتوں اور دیو تمثیل ستونوں کے دیکھنے سے ولولۂ حیات کا ایک کرشمہ نظر آتا تھا۔

عہدِ حاضرہ کے تمام فنونِ لطیفہ، آلاتِ حرب، صنعت و حرفت، سائنس دانوں کی جدت پسند طبائع کے گوناگوں اختراعات، انسانی آرام و آسایش، عیش و عشرت، فنا و ہلاکت کے اشیاء، غرض کہ کوئی علم کوئی کاریگری ایسی نہیں تھی جس کے حیرت انگیز نمونے پیش نہ کئے گئے ہوں۔ تہذیب و تمدن کا زندہ مرقع تھا۔ عجائبات کا بصیرت افروز مجموعہ تھا۔ دورِ جدید کی کاروباری دنیا نے اپنے اپنے مساعی جمیلہ سے جو ثمرات حاصل کئے تھے اُن سب کو اہلِ نظر کے سامنے لاکر دھر دیا تھا تاکہ ان کو پرکھا جائے اور داد دی جائے۔ جدید معاشرت کی شان و شوکت و تجملات کی جلوہ گاہ کو دیکھ کر سیاحوں پر محویت طاری ہو رہی تھی۔ اس نمائش کا سرِ نہانی و اصلی مقصد بین الاقوامی صلح آشتی و آزادانہ تبادلۂ خیالات و رائے پر مبنی تھا۔ تمدنی اور معاشرتی زندگی کی ترقیات کا وسیع مرقع کہنا بیجا نہ ہوگا ایک غرض یہ بھی تھی کہ تجارت کو فروغ دیا جائے۔ ہزاروں کی تعداد میں تماشائیوں کا ہجوم تھا اور قابل دید نمونوں کو دیکھ دیکھ کر ششدر ہو رہے تھے اور اس نظریہ کا ثبوت ان کو حاصل ہو رہا تھا کہ وہی قومیں جو اپنی قوتوں کو عملی کاروبار میں صرف کرتی ہیں۔ موجودہ درجہ کو قائم رکھ سکتی ہیں اور سطحِ اعلیٰ تک ان کی رسائی ہو سکتی ہے اور ترقیوں کے میدان میں مقابلہ کر سکتی ہیں۔

سب سے پہلے ہم نے جرمن نمایش گاہ میں قدم رکھا۔ اس رفیع الشان عمارت کے دروازہ پر عقاب بنی ہے۔ غور سے دیکھو تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ چیل پروں کو تول رہی ہے اور جھپٹا مارا ہی چاہتی ہے۔ تصاویر، مجسمے، آلاتِ موسیقی، جواہرات اور بیسیوں چیزیں رکھی دیکھیں۔ اس کے بعد ہم نے بلجیم، روس و انگلستان وغیرہ کی عمارتوں کی سیر کی۔ سوئٹزرلینڈ نے لیس، گھڑیاں، زیورات اور جوتے تیار کئے تھے۔ بلجیم نے قابلِ دید جواہرات، تصاویر و مجسمے رکھے ہیں۔ ان سب کے وسط میں بادشاہ کا مجسمہ ہے۔ روس نے اپنے عالی شان دروازے پر ایک مرد اور ایک عورت کا مجسمہ نصب کیا ہے گویا کاروباری دنیا میں دونوں مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ عمارتوں کی کئی کئی منزلیں ہیں۔ اور بلند و کشادہ سیڑھیاں اطراف میں چمن آرائی ہوئی ہے۔

ہوٹلوں کا انتظام ہے۔ تمام اہلکار قومی وردیوں میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ نمایش کے ایک مقام سے دوسرے مقام تک نقل و حرکت کے لئے ریلیں اور موٹریں چل رہی ہیں۔ پھر بھی یہ نقص پایا جاتا ہے کہ اس نمایش کی تمام چیزوں کو کوئی شخص دیکھ نہیں سکتا تھا وہ نہایت وسیع وعظیم الشان ہے۔ ہر وقت اچھا خاصہ میلا لگا رہتا ہے۔ شائقین علم اہل نظر اور مشاہدہ کرنے والوں کے لئے زرین موقع ہے۔ اس نمایش کو منعقد کرکے فرانس نے غیر فانی شہرت حاصل کر لی۔ کامل ۵ گھنٹے چلنے کے بعد ہم نے چمن میں نشست قرار لیا اور ستانے بھی نہ پائے تھے کہ مسز دتا نے واپسی کا اشارہ کر دیا۔

آج شام ہم ایک پر تکلف عصرانہ میں مدعو کئے گئے۔ ہمارے میزبان نے اپنے خوش منظر اور شاندار مکان کے صحن میں ہمارا خیر مقدم کیا۔ بنگلہ کی آرائش نہایت خوش اسلوبی سے کی گئی تھی۔ تمام کمروں میں سرخ مخملی قالین کا فرش تھا۔ سرخ ریشم کے پردے دروازوں پر آویزاں تھے اور دیواریں بڑی بڑی طلائی تصاویر سے مزین تھیں۔ کمرے کے ایک جانب میز پر نہایت قدیم اشیاء اور سوزن کاری کے نمونے نہایت سلیقہ سے رکھے گئے تھے۔ چاء کے بعد خاتون محترمہ نے ایستادہ ہوکر اپنی تقریر دلپذیر اور شگفتہ بیانی سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ دوران تقریر میں فرمایا تیس سال کا ذکر ہے کہ ہمارے ہاں کی لڑکیوں کو تنہا کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ حتیٰ کہ مدرسہ کو بھی ہم بغیر محافظ کے نہیں جاتے تھے۔ میرے ساتھ ایک معمر خاتون سایہ کی طرح رہتی تھیں جو ایک طرف کو بیٹھی ہوئی کتاب کا مطالعہ کیا کرتیں یا بننے اور سینے میں مصروف رہتیں۔ ہم نے اپنے والدین کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی خوب لڑائیاں ہوئیں کہیں جاکر اب ہمارے ساتھ اتنی رعایت کی جاتی ہے کہ ہم تنہا مدرسوں کو جاتے ہیں اور دعوتوں میں شریک ہوتے ہیں لیکن ہم کو اب تک حق رائے دہی حاصل نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے تو آپ خواتین ہند ہماری پیشرو ہیں مجھ کو یقین واثق ہے کہ جتنی جد وجہد یورپی صنف نازک کو تحصیل حقوق میں کرنی ہوتی ہے اس کی عشر عشیر زحمت وکاوش آپ کے درپیش نہیں ہوتی۔ آپ کو نہایت آسانی سے اپنے حقوق مل جاتے ہیں۔ لیکن یاد رکھئے کہ حقوق کا حاصل کرنا اس قدر مشکل نہیں ہے جتنا کہ فرائض کی ذمہ داری کا مسئلہ اور ان کی انجام دہی میں جو دشواریاں لاحق ہوتی ہیں ان سے دوچار ہونا۔ ختم تقریر پر ہمارے ساتھیوں میں سے ایک نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے فرانس کو جس قدر کہ اس کی تعریف سنی تھی، اس سے کہیں زیادہ پایا۔ آپ کے حسن اخلاق کے ہم مداح ہیں۔ آپ کی مہمان نوازیوں اور آپ کے شہر کی دلچسپیوں کے تاثرات ہندوستان کی واپسی کے بعد بھی ہمارے دلوں میں تازہ رہیں گے۔

قیام گاہ پر پہونچ کر ہم نے اپنا سامان باندھا اور دوسرے روز برسل (بلجیم) جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

مسز صوفی

گولکنڈے کے افسانے

گولکنڈہ کی کوئی سیر وتفریح ان کتابوں کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ جو گولکنڈہ دیکھ چکے ہیں۔ وہ جب یہ افسانے پڑھتے ہیں تو محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہم نے کچھ نہیں دیکھا۔ اور جنھوں نے کبھی گولکنڈہ کی سیر نہیں کی ان کے دل میں ان کو پڑھنے کے بعد گولکنڈہ کی سیر کی امنگیں موجزن ہو جاتی ہیں

دونوں کتابیں باتصویر ہیں:۔ سیر گولکنڈہ صفحات ۱۶۰ تصاویر ۱۲ معہ قیمت صرف ۸ آر۔ گولکنڈے کے ہیرے صفحات ۲۶ تصاویر ۸ قیمت صرف ۱۲ آر

معاشرت میں سادگی

(پہلی قسط)

زندگی کی مسرتیں حقیقت میں اُسی کو حاصل ہیں جس نے طرزِ معاشرت میں اعتدال قائم رکھا اور سادگی کو اپنا مسلک قرار دیا ہو۔ ضروریات اور لوازمات زندگی میں ہمیشہ سادگی کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ یہ ایسی خصوصیت ہے کہ اس سے رفتہ رفتہ انسان کے خیالات خود بخود پاکیزہ ہونے لگتے ہیں۔ زیب وزینت، آرائش وزیبایش اور تہذیب جدید کے نئے نئے طریقوں میں جو وقت برباد ہوتا ہے، معاشرت میں سادگی اختیار کرنے والے انسان اوقات کو دوسرے مفید اور ضروری کاموں میں صرف کر سکتے ہیں۔ انسان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ کس قدر قیمتی ہوتا ہے، بشرطیکہ ہم اُس کی قدر و قیمت کرنا سیکھیں اور اس کی اہمیت کو محسوس کریں۔

ہم کو فطرتاً سادہ معاشرت کا پابند ہونا چاہیئے، مگر ہم پر تقلید کا مادہ اس قدر غالب ہے کہ بھول کر بھی ہم اس مسلک کو اختیار کرنا نہیں چاہتے۔ جس سے زندگی کی حقیقی مسرتیں حاصل ہوتی ہیں۔ جب تک ہم اپنی معاشرت میں سادگی نہ پیدا کریں، روپیہ اور وقت برباد کرنے والے زیب وزینت کے طریقوں اور نت نئے فیشنوں سے احتراز نہ کریں، ہمیں حقیقی مسرت کبھی حاصل نہیں ہو سکے گی۔

زمانہ کی رفتار اور حالات سے بے خبر ہم اندھوں کی طرح خوفناک غاروں اور خطرناک خندقوں کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ یہ علم رکھنے کے باوجود کہ اب تک سیکڑوں انسان فضول رسم ورواج اور گراں قیمت معاشرت کی قربان گاہ پر بھینٹ ہو چکے ہیں، ہمیں عبرت نہیں ہوتی اور نہ ہماری جھوٹی وضعداری میں فرق آتا ہے۔ گراں معاشرت اور رسم ورواج کی ان تباہ کاریوں کو دیکھتے ہوئے بھی اگر ہماری نت نئی خواہشوں میں فرق نہ آئے، اگر ہمارے قیمتی لباس میں تغیر نہ ہو۔ اگر ہمارے شادی بیاہ نے سادگی اختیار نہیں کی۔ اگر ہماری آمد و خرچ کے توازن کو ہم نے برقرار نہیں رکھا اور اگر ہم نے کچھ پس انداز نہیں کیا تو ہماری سمجھ پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہوگا۔ ہمیشہ ہم دوسروں کے دست نگر ہی رہیں گے۔ اور افلاس و ادبار کے بادل ہمارے سروں پر اسی طرح چھائے رہیں گے جیسے کہ اب چھائے ہوئے ہیں۔

دنیا میں جتنے بھی کاروبار ہیں ان کے نتائج کے لئے ہمیں کچھ دن توقف کرنا ہوگا، مگر سادہ معاشرت اور کفایت شعاری کا معاملہ ایسا ہے کہ فوراً نتیجہ نکل آتا ہے، ادھر ہم نے زندگی کے طرز کو بدلا سادگی اختیار کی، کفایت شعاری کو اپنا شعار بنایا اور اُدھر ہم میں شعور آگیا سرمایہ جمع ہونے لگا، غیروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت باقی نہ رہی ہماری عزت و وقعت میں اضافہ ہوا۔ ساکھ قائم ہو گئی، آئے دن کی فکروں سے نجات حاصل ہوئی۔ غرض کہ ہماری دنیا ہی بدل گئی۔

رشوت، سود، بے ایمانی کی آمدنی، دھوکہ دغا کی کمائی اور ایسے ہی سارے آمدنی کے ذرایع اختیار کرنے میں ہم پس و پیش نہیں کرتے اور نہ ہمیں شرم آتی ہے مگر سادہ معاشرت اختیار کرنا اور کفایت شعاری پر عمل کرنا عار اور شرم کا باعث! حالانکہ یہ چیز رشوت خواری اور دوسری ناجائز آمدنیوں سے کہیں زیادہ فائدہ بخش ہے۔ نہ ایمان بگڑتا، نہ ضمیر کی لعنت ملامت سننی پڑتی ہے۔ باوجود یہ یقین رکھنے کے کہ بے ایمانی کرنے سے کبھی کوئی دنیا میں پھولتا پھلتا ہے اور نہ آخرت میں سرخ روئی کی امید ہے اور اگر دنیا میں بے ایمانی اور دغا بازی کا پاپ ہمارے آگے نہ آئے تو ہماری اولاد کے آگے ضرور آئے گا ہماری آنکھوں پر کچھ ایسے غفلت کے پردے

پڑے ہوئے ہیں کہ ہمیں گناہ و ثواب میں کوئی امتیاز ہی نہیں ہوتا۔

جب یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ معاشرت میں سادگی اختیار کرنا اور کفایت شعاری سیکھنا دین و دنیا میں کامیابی کا باعث ہوسکتا ہے تو پھر اس نیک کام میں توقف کرنا اور فضولیات و خرافات کو ترک نہ کرنا یا ترک کرنے میں عجلت نہ کرنا سراسر خلافِ مصلحت ہے۔ ع در کارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست! ہم کبھی اپنے کسی مقصد میں بھی کامیاب نہیں ہوسکتے جب تک کہ جس کام کو ہم برا سمجھتے ہیں ترک نہ کریں اور جس بات کو اچھا سمجھتے ہیں اختیار نہ کریں۔

سب سے پہلے ہم کو اپنی آمد و خرچ پر غور کرنا چاہیے۔ اور دیکھنا چاہیے کہ کون سے مصارف ایسے ہیں جنھیں ہم اپنی عزت اور صحت کو نقصان پہنچائے بغیر کم کرسکتے ہیں، ایسے اخراجات کو کم کرنے سے یقیناً کچھ روپیہ پس انداز ہوگا، مگر ہمیں ایسی کوئی حماقت نہ کرنی چاہیے کہ اس "پس انداز" کے لئے دوسرا کوئی مصرف تلاش کریں، اس قسم کی کفایت شعاری سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا ہم اپنے کسی فضول خرچ کو گھٹا کر کوئی دوسرا خرچ کا مد بڑھا دیں۔ کفایت شعاری سے جو روپیہ پس انداز ہو اس کو محفوظ میں آئندہ آنے والے اخراجات کے لئے اٹھا رکھنا چاہیئے، اخراجات کے کم کرنے میں اپنے متعلقین سے ضرور مشورہ کرنا چاہیے تاکہ کسی قسم کی بے لطفی نہ ہو۔ سادہ معاشرت اور کفایت شعاری کے بے حد و شمار فوائد انہیں اچھی طرح سمجھا کر یہ بات ان کے ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ جو آدمی روپیہ پس انداز نہیں کرتا اور آنے والے "کل" کی فکر نہیں کرتا وہ ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے اور اپنے ہم چشموں میں ہمیشہ ذلیل و خوار ہوتا ہے۔

اگر ہم تھوڑا غور کریں تو یہ ضرور محسوس کریں گے کہ ہمارے اخراجات کے بہت سے مد بالکل فضول اور غیر ضروری ہیں، ان کے بغیر بھی ہم بغیر کسی تکلیف کے زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ مثلاً ہم اپنی سیر و تفریح پر بیدریغ روپیہ صرف کردیتے ہیں، مہینہ میں دس بیس دفعہ سینما دیکھتے ہیں، صبح سے شام تک تیس چالیس سگریٹ پھونک دیتے ہیں، چاء خانوں اور ہوٹلوں میں جاکر دس پندرہ چاء کی پیالیاں اور پانچ دس آئسکریم کے پلیٹ مع لوازمہ اڑا دیتے ہیں، بغیر کسی مقصد کے موٹر میں میلوں بھٹکتے پھرتے ہیں بلاضرورت دوکانوں پر جاکر ضرورتیں پیدا کرتے ہیں اور فضول سامان ادھار خرید لاتے ہیں، کافی لباس موجود ہوتے ہوئے بھی نئی وضع کے کپڑوں کی خاطر لباس بناتے ہیں، اچھی خاصی موٹر رکھتے ہوئے "نئے ماڈل" کی خوشی میں نئی کار خرید لیتے ہیں، غرض کہ ایسی سیکڑوں حماقتیں ہیں جو ہم روزانہ اپنی زندگی میں کرکے اپنے ہاتھوں اپنے پیروں پر کلہاڑی چلاتے ہیں اور پھر آمدنی کی کمی کا رونا روتے رہتے ہیں۔

یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر ہمیں کسی حادثہ یا اچانک آنے والے کسی خرچ کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوگی تو ہمارے کسی عزیز یا دوست سے روپیہ ملنے کی بہت کم توقع ہوسکتی ہے، اگر کسی نے ہماری کچھ امداد بھی کی تو ہمیشہ کے لئے اس کا شرمندہ اور زیر بار احسان رہنا ہوگا۔ ایسے موقعوں پر پس انداز کیا ہوا روپیہ ہی ہم کو کسی کا شرمندۂ منت کئے بغیر ہمارے کام آسکتا ہے اور ہمیں اقسام کی آفتوں سے نجات دلاسکتا ہے۔

وہ دولت مند اور متمول حضرات جن کو دنیا کی ساری نعمتیں، عیش و عشرت، زیب و زینت اور آرائش و زیبائش کے

اسباب حاصل ہیں کیا وہ واقعی ایسے قانع اور خوش وخرم ہیں جیسا کہ انھیں ہونا چاہیئے؟ غور کرنے سے نہیں تو خود ان ہی سے دریافت کرکے ہم معلوم کرسکتے ہیں کہ وہ حقیقت میں ایسے نہیں ہیں! آخر اس کے کیا اسباب ہیں! اس کی وجہ یہ ہے کہ جس قدر نعمتیں ان کو زیادہ میسر آتی جائیں گی اسی قدر ان کے تکلفات بڑھتے جائیں گے، جتنی ان کی خواہشیں پوری ہوتی جائیں گی ان سے دوگنی پیدا ہوتی رہیں گی، حقیقت میں زندگی کا لطف اسی کو حاصل ہے جو معاشرت میں سادہ ہے، اس قدر سادگی کی بھی ضرورت نہیں کہ مقدور ہو پھٹے کپڑے پہنے، حیثیت ہو اچھا کھانا نہ کھائے اور فراغت ہو کر تکلیف اٹھائے۔

اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے ارتقائے انسانیت کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو واضح ہوگا کہ کس طرح زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ "سادگی" سے نظر پوشی کی گئی۔ ایک زمانہ تھا کہ حضرت انسان غاروں اور درختوں کے سایہ میں رہا کرتے تھے، ہر طرف "نیچر" کی حکومت تھی۔ یہ آزاد میدانی زندگی صحت بخش، طاقتور اور بے لوث ہونے کے علاوہ اس میں فکر، رنج، تکلیف اور خجالت کا کہیں نام و نشان نہ تھا، نہ اس کثرت سے بیماریاں آتی تھیں نہ قحط پڑتے تھے، نہ بغاوتیں ہوتی تھیں نہ آزادی کے لئے کوششیں، صرف آزادی اور سادگی کی ہر طرف حکومت تھی، خیالات سادہ تھے مگر وسیع اور متفق، نہ وہ ہزاروں جانب منقسم تھے اور نہ فضولیات میں الجھے ہوئے۔ اس کے بعد "آگ" وجود میں آئی جس نے ہمارے تعلقات کو نیچر سے کامل طور پر جدا کردیا۔ اس آگ کے معلوم ہونے کے دن سے تہذیب و تمدن کی تاریخ شروع ہوتی ہے کیونکہ اس وقت سے انسان کی ضرورتوں کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ضرورتیں بے حد بڑھ گئیں اور ساری برکتیں غائب ہوگئیں۔

مرزا سیف علیخاں

غزل

مصیبت، رنج، غم، صدمہ، ہر اک منظور ہوتا ہے
محبت ایسی شے ہے آدمی مجبور ہوتا ہے

کہیں جاتے ہیں تو اس کی گلی سے ہو کے جاتے ہیں
اگرچہ راستہ اُس راستے سے دُور ہوتا ہے

کوئی مجنوں کی عزت عشق کی سرکار میں دیکھے
بڑی خدمت پہ ایسا آدمی مامور ہوتا ہے

حسینوں کا تنزل بھی نہیں ہے شان سے خالی
بڑھاپے میں بھی ان لوگوں کے منہ پہ نور ہوتا ہے

تری فرقت میں کچھ تو ہو نہیں سکتا غریبوں سے
تڑپ لیتے ہیں ان کا جس قدر مقدور ہوتا ہے

تجھے مشہور ہونا ہے تو جی بھر کے ستا مجھ کو
برائی سے بہت جلد آدمی مشہور ہوتا ہے

صفیؔ ہر دم تڑپنے کی بھلا طاقت کہاں مجھ میں
ذرا ان کو ستانا بھی کبھی منظور ہوتا ہے

صفیؔ اورنگ آبادی

شاعر کا گناہ

(افسانہ)

ناصر شاعر تھا اور راحت کے ادبی نام سے اتنا مشہور کہ ناظرین کی مشتاق نگاہیں ہر رسالہ کے صفحات پر اس کی نظم یا مضمون پاکر مطمئن ہوتیں، درد و اثر، سوز و گداز، حسن و شباب یہ چیزیں اس کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھیں، اس کا مطالعہ گہرا، معلومات وسیع، خیالات بلند اور پاکیزہ تھے، شاعرانہ عظمت کے قطع نظر دیگر ادبی اصناف میں ممتاز صف میں نظر آتا، ملک کے اکثر رسائل اس کے دلاویز مضامین اور کیف آگیں نظموں سے معمور نظر آتے۔ رسالہ "فردوس" کے سالنامہ میں اس کا بلند پایہ مقالہ "عورت اور محبت" کے عنوان سے شایع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکا تھا۔ اس کی تعریف میں ناصر کو مدیر رسالہ کے توسط سے کئی خطوط وصول ہوئے جنھیں فرصت کے لمحات میں دیکھنے کے خیال سے اس نے میز کے دراز میں رکھ دیا، رات کا کھانا کھا کر وہ ان سب کو لئے بیٹھا، وہ ان تعریفی خطوط پڑھتے پڑھتے تھک گیا، اس قدر مبالغہ آمیز تعریف اسے پسند نہ تھی، آخری خط جو اس نے پڑھا ۔۔۔ شاید دلچسپ ہو۔ جو نسوانی تحریر لئے ہوئے تھا، گہری نظر سے ناصر نے اس کا مطالعہ کیا لکھا تھا۔

"یوں تو سارے مضامین آپ کے خاص اثر اور دلچسپ موضوع لیے ہوئے ہوتے ہیں، میں انھیں وقعت کی نگاہ سے دیکھتی ہوں اور کافی وقت ان کے مطالعہ میں صرف کرتی ہوں، آپ جیسی دردمند ہستیاں ملک اور قوم کے لئے قابلِ فخر ہیں، میں آپ کے رومانوی سچے جذبات کی قدر کروں گی۔ صنفِ نازک کے متعلق آپ کے خیالات کتنے بلند اور پاکیزہ ہیں، آپ کا وہ جملہ "عورت قدرت کا لاجواب عطیہ ہے، جو مرد کی مسرت کو دوبالا اور غم کو جلا دینے کے لئے عطا کیا گیا ہے، اس کی تزئین و حفاظت مرد کا اولین فریضہ ہے"! قابلِ تحسین ہے جو غلط خیالات مردوں کے دلوں میں صنفِ نازک کے متعلق جاگزیں ہیں انھیں اپنے پاکیزہ جذبات سے دور کرنے کی آپ نے پوری کوشش کی ہے شکریہ۔ راقمہ

میں نہیں جانتا" ناصر نے دبے ہوئے لہجہ میں کہا یہ کون ہے؟ میری تعریف میں پر زور شکریہ کے الفاظ اس کی چنداں ضرورت نہ تھی مجھے اس کا راز معلوم کرنا چاہیئے ۔۔۔ لیکن کیسے؟ ۔۔۔ فرصت کے پہلے لمحے میں ناصر نے جواب لکھا اور ایڈیٹر کی معرفت روانہ کیا۔

"آپ کی مبالغہ آمیز تعریف نے میرے تعمہ خیال کو متزلزل کر دیا لیکن یقین مانئے! میں ان افراد میں نہیں جن پر تعریف کا نشہ چڑھ جاتا ہے۔ قدر افزائی کا شکریہ! رہا اب صنفِ نازک کے متعلق میرے خیالات، اس کا اظہار اور اندازہ میرے پچھلے مضامین اور نظموں کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ میں اس حسین ہستی کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں، میں نے اس کا کافی مطالعہ کیا ہے:

محترمہ! مجھے آپ کا نام اور سکونت پوچھنے کی اجازت دیجئے، "راحت"

خط کو لکھے ہوئے ایک ہفتہ گذرا۔ ناصر بے چینی کے ساتھ جواب کا منتظر تھا ۔۔۔ اس عرصہ میں کئی مرتبہ اُس نے ڈاکیہ سے استفسار کیا۔ اس دوران میں اس کی دلچسپ نظم "کیف نغمہ" کے عنوان سے شایع ہو کر ملک میں بہت جلد مقبول ہو چکی، یہ نظم ناصر کے بہترین خیالات کا مجموعہ تھی، رومانوی جذبات کا رنگین مرقع ۔۔۔ اس نظم کے ذریعہ اس نے جمالیات کا ایک باب کھول کر دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔

شام کی تفریح کے بعد ناصر گھر لوٹا۔ ملازم نے ایک سرخ لفافہ اس کے آگے پیش کیا' دھڑکتے ہوئے دل سے ناصر نے لفافہ کو چاک کیا اس کی مشتاق نگاہوں نے ذیل کی تحریر پڑھی۔

"محترم راحت! میں اپنے خط کے جواب کو پاکر کتنی خوش ہوئی یہ ظاہر کرنے سے قاصر ہوں' شکریہ! آپ نے جواب دے کر میری تشفی فرمائی۔ میرے پیش نظر اس وقت آپ کی دلکش نظم "گیت نغمہ" ہے' میں نے اسے بار بار پڑھا نامعلوم اور کتنی مرتبہ پڑھوں گی۔

آپ میرا نام اور مقام دریافت کرتے ہیں' فی الحال اس کی ضرورت نہیں' ہمیں اتنی جلد ایک دوسرے سے متعارف نہ ہونا چاہئے' اگر یہی ضد ہے آپ کی تو ــــ ناز کے ادبی نام سے یاد کیجئے۔ ناز۔ کلکتہ

ناز! ایک ہلکی سی چیخ کمرے میں گونج اٹھی' کلکتہ کی مشہور ادیبہ' جس کے مضامین' جس کی نظمیں صحافتی دنیا میں خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں' آج میری تعریف میں اس کا قلم زور زور سے جنبش کر رہا ہے' یقیناً میں خوش نصیب ہوں۔

جواب لکھنے کے لئے وہ میز پر آبیٹھا۔

"ناز! کیا واقعی تم ناز ہو' معاف کرنا میں "تم" کے بے تکلفانہ لفظ سے خطاب کر رہا ہوں' میں مجبور ہوں' شعرا اپنے فطری جذبات سے مجبور ہوتا ہے' بعض وقت اس کو دنیائے عمل سے ہٹ کر گزرنا پڑتا ہے' یہ کتنی ناانصافی ہے جو اُسے دنیاوی کشمکش میں مبتلا کیا گیا' کیوں نہ اسے شبستان کی رنگین وادی میں پھینکا گیا' اُسے تخیلات کی دنیا میں رومانوی زندگی بسر کرنے سے کیوں روکا جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے تخیلات کی رنگین فضا میں ہمیشہ پرواز کرتے رہے اور کچھ نہیں۔

ناز! یہ پوچھنے کی اجازت دو ــــ تم ابھی شادی کی سنہری زنجیروں میں جکڑ دی گئی ہو' یا دوشیزگی کی حسین آغوش میں پل رہی ہو' یہ جاننے کے لئے میں کتنا متمنی ہوں۔" جواب کا منتظر:۔ راحت حیدرآبادی

خط چلا گیا' ناصر کے جذبات میں اب ہلچل سی پیدا ہونے لگی ــــ دل تلاش سکون نہیں بلکہ ہجر و مفارقت کے صدمات سہنے کے لئے تڑپنے لگا ــــ طویل راتوں کا اکثر حصہ کسی نامعلوم خیالی پیکر کے رنگین تصورات میں بسر ہوتا۔

ایک مہینے سے زیادہ دن گذرے لیکن ناصر کو اس عرصہ میں ناز کا کوئی خط وصول نہ ہوا اُس کی آنکھیں راستہ تکتے تکتے تھک گئیں۔ اور دل آپ ہی آپ مایوسیوں کی گہرائیوں میں ڈوبا جانے لگا۔ ڈاک خانہ کو ملازم بھیج کر دریافت کیا' اڈیٹر سے استفسار کیا' لیکن کسی نے بھی اُسے تشفی بخش جواب نہ دیا۔ وہ حیران تھا' یہ طویل خاموشی کیا راز لیے ہوئے ہے' گرمی کی چھٹیاں ختم ہونے پر دفتر کھل چکے تھے' کام کی زیادتی' ودیگر مصروفیتوں نے ناصر کو اس لطیف خیال سے قدرے بھلا دیا ــــ ایک شام ــــ بارش کی حسین خوش گوار شام وہ مختلف خیالوں میں الجھا ہوا دفتر سے گھر پہونچا' بھولا ہوا خیال دل میں چٹکیاں لینے لگا' رنگین تصورات سے اس کا دماغ منور تھا ــــ کوئی خط نہیں ــــ اس نے کہنا شروع کیا ــــ آہ کیا اب بھی یہ ایک دوسرے کے درمیان خوش گوار سلسلہ پیدا کر سکتے ہیں' نہیں ــــ اب کبھی نہیں' محض خیال ہے ــــ ناصر اس دن بہت تھکا ہوا تھا' مختلف خیالات نے الگ پریشان کر رکھا تھا ــــ

رات کی تفریح کے لئے وہ کوئی موزوں ذریعہ تلاش کرنے لگا ــــ ملازم سے اس نے شام کی ڈاک پیش کرنے کو کہا جس میں

اُسے مختلف خطوط کے ساتھ ایک دعوتی رقعہ ملا۔ ناصر اس شادی کے رقعہ کو اپنی تفریح کا بہترین آلہ قرار دے کر مطمئن ہو گیا۔

آدھ گھنٹہ کی مصروفیت کے بعد وہ گھر سے روانہ ہوا، دعوت کے جلسے میں پہونچ کر اسے اپنے دوست کے توسط سے کئی حضرات و خواتین سے متعارف ہونا پڑا ——— اس کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا، وہ دیر تک محفل رقص و سرود میں حظ اٹھاتا رہا۔ اس کی نگاہیں محفل کے ہر فرد پر اٹھ اٹھ کر پڑ رہی تھیں، اور بالآخر ایک حسین مجسمۂ ملائک فریب پیکر اس کی نگاہوں کا مرکز بنا رہا ——— حسن و شباب کا نمونہ نگاہوں کے سامنے رقص کر رہا تھا۔ ع

شفق میں ڈوبے ہوئے نور میں نہائے ہوئے

رخصت کے وقت ناصر اپنے دوست کے توسط سے حسین خاتون سے مس زلیخا کے نام سے متعارف ہوا اور ناصر زبیری کے نام سے خود۔ رنگین فضاؤں کا سہارا لیے وہ گھر پہونچا ——— مستقبل کی رنگینیاں اسے تھپک تھپک کر سلانا چاہتی تھیں۔ وہ بہت جلد مسہری پر لیٹ کر نیند کے مزے لینے لگا۔

صبح ناصر بیدار ہوا ——— اس کے چہرے سے مسرت و شادمانی کے آثار ہویدا تھے ——— اس نے دلکش پیرایہ میں رات کا رنگین افسانہ، نظم کے ذریعہ قلمبند کیا۔

——— ۳ ———

جنوری کے ابتدائی دنوں میں حیدرآباد کی نمائش کا افتتاح ہوا، باغ کا وسیع احاطہ کئی ایک خوبیوں کے ساتھ کثیر تعداد میں تماشائیوں کو لیے ہوئے تھا، ناصر کو بھی اپنے ایک مخلص دوست کے اصرار پر ان دلچسپ نادیدہ وں میں حصہ لینا پڑا، دونوں دوست بڑی دیر تک باغ کے وسیع احاطہ میں گھومتے رہے، قدیر کو ناصر کے اصرار پر کسی پرسکون گوشہ میں چل کر بیٹھنے پر آمادہ ہونا پڑا، ہجوم کو چیرتے پھاڑتے وہ مشکل سے راستہ طے کر رہے تھے، دشوار گزار راستہ طے کر کے انھوں نے اطمینان کی سانس لی ——— لیکن جھیل کے پاس والے گروہ نے ان کے حواس منتشر کر دئے قدیر نے اپنا رحجان اس جانب مبذول کیا ——— اور ناصر کو اس کے قریب لے گیا۔

ناصر نے دیکھا گروہ کے ہر فرد کی نگاہ پانی کی سطح پر لگی ہوئی ہے وہ یہ معلوم کر کے ابھی ابھی ایک لڑکی پانی میں گر پڑی، فوراً کودا، پانی کی سطح ہنوز مرتعش تھی، چند سکنڈ کے بعد وہ ابھرا، ایک بے بس چیز ناصر کے کندھوں پر تھی، وہ کنارے پر آ لگا، اس کی سانس پھول رہی تھی، اعضا کمزور تھکے ہوئے تھے مدد کے لیے اس نے لوگوں کو چلانا شروع کیا، اس عرصہ میں لڑکی کا باپ بھی آ پہونچا۔

لڑکی کا باپ جنون کی حالت میں ناصر کے پیروں پر گرا۔ لیکن اس کے دل نے کبھی یہ فعل گوارا نہیں کیا۔ وہ اپنے اس عمل کو فرض کی ادائی سمجھا ہوا تھا، لڑکی کے والد ناصر کو اپنے ساتھ گھر لیجانا چاہتے تھے لیکن اس نے اپنی تمکن کا عذر پیش کر کے معافی چاہی مجمع کا ہر فرد ناصر کی کامیابی پر شاباش کہہ رہا تھا، اور ناصر خود بھی اپنے خیال کے مطابق بیحد خوش تھا، اس نے نامعلوم حسینہ کی جان بچالی۔

شام کے فرحت افزا لمحات میں ناصر لڑکی کے والد کے دئے ہوئے پتہ پر گھر پہونچا، پر فضا پہاڑی پر بنا ہوا جرمن وضع کا عالیشان بنگلہ ناصر کے دل میں قابل قدر وقعت پیدا کر رہا تھا، ملازم کے ذریعہ اس نے اپنا ملاقاتی کارڈ پیش کیا ——— ملازم اسے ایک باغیچہ کو گذار کر

اندر ہال کے بڑے کمرے میں پہونچا آیا' لڑکی مسہری پر دراز تھی' ڈاکٹر اور اُس کا باپ اس کے قریب کھڑے تھے' آپ آگئے! لڑکی کے باپ نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے۔

اب طبیعت کیسی ہے؟ ناصر نے مصافحہ کے بعد کہا'

خدا کا فضل شامل حال رہا۔ ڈاکٹر کہنے لگا' شکر ہے پانی کے زیادہ گھلے نہیں ہوئے۔ لڑکی آنکھ بند کئے ہوئے تھی' اس کا دل موہ لینے والا کافر حسن ناصر کی سیماب نواز آنکھوں کے لئے سامان تفریح تھا' چند سکنڈ تک اسے تکتا رہا۔ اور نہ جانے کب تک ــــــ

یقین جانئے ڈاکٹر صاحب! لڑکی کے والد نے مخاطب کیا' اگر یہ اس وقت نہ ہوتے' کبھی کا میرا چراغ گل ہوگیا ہوتا'

قسمت کی پھیر دیکھئے' پھر انھوں نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا' میں وہاں ایک صاحب سے باتیں کرتے ہوئے رک گیا' ان کی گفتگو میں اتنا منہمک رہا کہ لڑکی کے پانی میں گرنے تک کا مجھے مطلق علم نہیں۔ لڑکی میرے یہاں سے کل کر جھیل کے پاس آ چکی تھی' اور وہاں پہونچ کر پانی کا نظارہ کرنے لگی۔ اس اثنا میں آدمیوں کی ایک ایسی ریل آئی جس سے یہ گھبرا کر پرے سرک گئی' وہ پل کی منڈیر تک پہونچی' گھبراہٹ میں وہ اپنا توازن بھی قایم نہ رکھ سکی' لڑکھڑاتی ہوئی پانی میں آگری' خدا کا شکر ہے کہ اس نیکی کے فرشتہ نے بچالیا'

ناصر ان جملوں سے محجوب ہو رہا تھا'

بیٹا ــــ زلیخا آنکھیں کھولو' طبیعت کیسی ہے اب'

زلیخا کے لفظ میں نہ جانے کونسی ایسی تاثیر پنہاں تھی' جو ناصر کے بدن کے ہر حصہ میں بجلی کی طرح سرایت کرگئی' یہ نام اُس نے کہیں سن رکھا تھا شاید شادی کی محفل میں ــــ

فرط مسرت میں ایک ہلکی سی چیخ اس کی زبان سے نکلی ــــ اُسے لڑکی کے باپ اور ڈاکٹر کی موجودگی کا مطلق خیال نہ رہا۔

زلیخا نے نرگسی آنکھیں کھولیں' اس کی بیمار نیم وا آنکھیں اب ناصر کی نگاہوں کو دعوت نظارہ دے رہی تھیں'

بیٹا' یہ تمھارے محسن ہیں' باپ نے تعارفی لہجہ میں کہا' انھوں نے تمھیں ڈوبنے سے بچایا ــــ لڑکی نے ناصر کو دیکھا ــــ اُس کے لب ہل رہے تھے' شاید شکریہ کے لیے ــــ احترام کی خاطر وہ اٹھنا چاہتی تھی' لیکن باپ نے اسے سہارا دے کر لٹادیا ــــ

نہیں' نہیں' آپ لیٹے رہیئے' نہ معلوم ناصر نے یہ جملہ کس حالت میں ادا کیا' الفاظ اس کے حلق میں پھندا بنا رہے تھے۔

ڈاکٹر اپنے پیشہ کی مصروفیت کی وجہ رخصت ہونے لگا' لڑکی کا باپ اسے وداع کرنے موٹر تک گیا' آہ ــــ آپ میرے قریب آئیے' لڑکی نے ناصر سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا'

ناصر جھکا' اس ہوش ربا منظر کی وہ تاب نہ لاسکا' وہ آہستہ سے پلنگ کی پٹڑی پر بیٹھ گیا' اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ ایک ملائم ہاتھ کی مضبوط گرفت میں تھے' ایک میٹھی سی لہر آب حیات سے زیادہ لطیف' اس کے بدن میں دوڑی' محبت کا ہلکا سا خمار اس کی آنکھوں میں چھایا ہوا تھا ــــ اس عرصہ میں لڑکی کا باپ آچکا تھا' ناصر پہلی مرتبہ اپنی حرکت قابل گرفت سمجھا ــــ وہ اٹھا اور دوبارہ ملنے کا وعدہ کرکے گھر روانہ ہوا' دوسرے دن اس نے لڑکی اور باپ کے متعلق کافی معلومات حاصل کئے' وہ یہ معلوم کرکے کہ باپ بیٹی کسی عزیز کی شادی کے

سلسلہ میں کلکتہ سے حیدرآباد آئے ہوئے ہیں مطمئن ہو گیا ــــــ

ناصر ہر روز زلیخا کی مزاج پرسی کے لئے جاتا، گھنٹوں اُس کی پُر لطف صحبت میں گزار کر چلے آتا، محبت کا اثر قدرے ایک دوسرے کے دلوں پر منقش ہونے لگا۔

باپ اپنی بیٹی کی سلامتی، اور ناصر جیسی محسن ہستی کا تعارف اپنے معزز احباب میں کرانے کے لئے ایک شاندار ڈنر ترتیب دیا ــــــ لڑکی کے والد پروفیسر لطیف ایک آزاد منش بلند خیال ولایت کے تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ اعلیٰ خاندانی فرد تھے، لڑکی پروفیسر موصوف کی جائداد کی واحد مالکہ تھی، پروفیسر دوران دعوت میں بہت محظوظ تھے، ان کی زبان سے ناصر کے شکریہ کے لیے اچھے اچھے منتخب جملے ادا ہو رہے تھے، مہمان ایک ایک کر کے وداع ہونے لگے ــــــ

رات اپنی تاریک آغوش میں کئی گنہ لیے ہوئے نمودار ہوئی، محبت کا پرستار جوڑا باغ کے محفوظ حصہ میں بیٹھا ہوا پریمی راگ الاپ رہا تھا ــــــ

زلیخا حسین مجسمۂ اخلاق زلیخا، اپنے محسن، عاشق ناصر کی آغوش میں مچل رہی تھی ــ محبت کی کھیتی بوسوں کی بارش سے سرسبز کی جاتی ہے۔ دونوں شراب عشق سے مخمور تھے، عشق کا پرندہ جب سر پر منڈلانے لگتا ہے تو انسان اپنے ہوش حواس کھو بیٹھتا ہے۔ عیوب پردہ پوش ہو جاتے ہیں، ناصر کے جذبات دل کے ساگر میں بڑے زور و شور کے ساتھ لہریں لے رہے تھے، مردانہ قوتیں لطیف جذبات پر قابو پانے کی پوری جد و جہد کر رہی تھیں، اس نے اپنی فوری پیدا ہونے والی خواہش کا اظہار کر ڈالا ــــــ

عورت با غریب مستقبل سے ناآشنا، انجام سے ناواقف، مرد آسانی کے ساتھ اسے اپنے فریبی جال میں لا سکتا ہے ــــ اور لا کر رہا۔ آہ کتنا لطیف خوش گوار حملہ، چال اور مکر سے پُر ڈاکہ ــــ حسن کے رنگین شگوفوں پر ہلکی ارغوانی شراب کے نشہ میں ــــ اُف خدا! ناصر نے ایک پھول کو چھوا ــــ اور مسل بھی دیا ــــــ

چاند رموزِ محبت کا واقف کار چاند نکلا ــــ ناصر کے حرکات پر خندہ زن ہونے کے لئے۔ ہوس کا بندہ، رات کی تاریکیوں میں چھپے چھپے اپنی ہوس کاریوں کی تکمیل میں مصروف رہا، اس طرح دنوں ــــ اور ہفتوں تک، لیکن ناصر کا فریب گنہ کی کالی گھڑی میں زیادہ دیر تک نہ چھپ سکا۔

اس دوران میں وہ مختلف جگہ، مختلف خیالات میں تبدیل ہوتے رہے، ہوس پرست زیادہ دن تک مسرت کی خوش گوار فضا میں اطمینان کا سانس نہیں لے سکتے، ناصر محبت کی ناجائز شراب کا خمار اپنے اندر زیادہ دیر تک نہ رکھ سکا، وہ ضرورت سے زیادہ پی کر سیر ہو گیا تھا ــــ اس کے جذبات میں مردنی سی چھا گئی تھی۔

آہ ــــ پروفیسر کیا معلوم؟ اس کی نور نظر کو اس طرح بے نور بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، کیا خبر؟ کیسے حالات رونما ہوں گے، وہ ان دونوں کے ملاپ کو ایک اچھے جائز نتیجہ پر لانے کے کوشاں تھے، ان کا خیال تھا، ولن ہو چکے کر دونوں کو شادی کے خوش گوار سلسلہ میں منسلک کر دوں، ابتدا ــــ اور اس کے انجام سے وہ بالکل ناواقف تھے۔

پروفیسر کو بلدہ آئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گزرا، کاروبار کے تحت وہ اپنے وطن جانا چاہتے تھے۔ لیکن اس بارے میں وہ زلیخا کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کر سکے،

جدائی کی گھڑیاں بھی کتنی روح فرسا ہوتی ہیں۔ اشکوں کا سیلاب بہہ بہہ کر ایک طوفان مچا رہا تھا۔ "گنہ" کا ڈرامہ جو غفلت کے تاریک اسٹیج پر دونوں نے مل کر ادا کیا تھا، اس کا انجام فلک کے برباد ہاتھوں چھوڑ دیا گیا۔

ناصر، جذبات کا مغلوب ہوس پرست ناصر نے جھوٹے اور یقین نہ آنے والے وعدے اور طویل قسمیں کھائیں۔ (باقی آئندہ)

مرکزِ خیال

صابر کوسگوی

۱
سواد دیدہ حل کردم فرستم نامہ سوئے تو
کہ در ہنگام خواندن چشم من افتد بروئے تو

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جائے کہ اس کو حسرت دیدار ہے — غالب

۲
گفتہ بودم غم دل با تو بگویم چو بیائی
چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی — سعدی

میرے دل میں تھا کہ کہوں گا میں جو ہے دل پہ میرے ملال
وہ جب آگیا مرے سامنے تو نہ رنج تھا نہ ملال تھا — ظفر

۳
دشمنان طعنہ زنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اول ز تو پرسید چنیں خوب چرائی — سعدی

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے تھے گناہ
ان سے بھی تو پوچھتے "تم اتنے کیوں پیارے ہوئے" — میر

۴
از دماغ من برگشتہ خیال رخ دوست
بجفائے فلک و غصۂ دوران نہ رود
آنچہ از بار غمت در دل مسکین من است
برود دل ز من و از دل من آن نہ رود — حافظ

سر جاتا ہے سر سے ترا سودا نہیں جاتا
دل جاتا ہے دل سے تری الفت نہیں جاتی — داغ

۵
در فراق تو چہا اے بت محبوب کنم
صبر ایوبؑ کنم گریۂ یعقوبؑ کنم — مخلص

ہم نے کیا کیا نہ ترے ہجر میں محبوب کیا
صبر ایوبؑ کیا گریۂ یعقوبؑ کیا — مضمون

سکینہ بیگم

گزرے ہوئے لمحات

گندی ہوئی گھڑیاں۔

بھولی ہوئی باتیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔

رہ رہ کے یاد آتی ہیں۔

گائے ہوئے گانے اور بچھڑے ہوئے دوست۔۔۔۔۔

کیوں ہمیں آستاتے ہیں؟

کبھی درد۔ کبھی تبسم۔۔۔۔۔۔ ساتھ لاتے ہیں کبھی مجسمہ عیش۔

کبھی تصویر غم ہمیں بناتے ہیں۔

آہ!

گذرے ہوئے دن کیوں یاد آتے ہیں؟

ڈسمبر کی اک صبح۔ ہوا کے سرد جھونکوں نے مجھے بیدار کیا۔

ٹھنڈک معمول سے زیادہ تھی۔

اور ہوا کے جھونکوں کے ساتھ۔

کمرے کی سنسناہٹ میں۔۔۔۔۔۔۔

ایک دھیمی سی دلکش آواز داخل ہو رہی تھی میں

اٹھا کھڑکی کے سامنے گیا۔

اور باہر کے دلفزا مناظر کو غور سے دیکھنے میں محو

ہو گیا۔

ابر چھایا ہوا تھا۔ پھوار کے چھوٹے چھوٹے قطرے

درختوں کی ڈالیوں میں۔۔۔۔۔۔۔۔

آپس میں گنگنا رہے تھے۔

یکایک خیالات میں جنبش ہوئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ایک بھولا ہوا سماں آنکھوں کے سامنے آگیا۔۔۔۔

میں نے کیا محسوس کیا؟

بچپن کا زمانہ ہے!

حیدرآباد کی سرزمین!!

اسکول سے آتے ہوئے بارش آگئی۔ سڑک کے کنارے

پیپل کے درخت کی آڑ میں کھڑا ہوں۔

کیا دلکش نظارہ ہے۔

پودوں کی ہری بھری ڈالیاں چمک رہی ہیں۔ ان کی نازک

ڈالیوں سے موتی لٹک رہے ہیں۔

سامنے گرجا گھر کی چوٹی بادلوں سے

کھیل رہی ہے۔

بہتا ہوا پانی اک سریلی آواز پیدا کر رہا ہے۔ بھینی

بھینی خوشبو سے ہوا معطر ہوگئی ہے۔

میرا دل اچھل رہا!۔۔۔۔۔۔۔ ـــ

کیوں؟

ان پرکیف اور روح فرسا مناظر سے؟

نہیں!

ہرگز نہیں!!

بلکہ اپنے ہمجولی کرامت کی موجودگی سے!!!

بارش سے بچنے کی خاطر وہ میرے ساتھ لپٹا ہوا کھڑا ہے۔ اس کی

میٹھی آواز میرے کان میں آرہی ہے۔ "بھائی جان! ہماری محبت

غیر فانی ہے۔ زندگی کی طوفان خیز موجیں ہمیں علٰحدہ نہیں کر سکتیں"

یک لخت فلک پہ بجلی تڑکی جس نے مجھے چونکا دیا خود کو اپنے کمرے میں

اکیلا کھڑا پایا۔

مسکراہٹ جاتی رہی۔ اک خفیف سا درد پیدا ہوا۔

"آہ کاش کرامت ساتھ ہو"

عبدالحمید (علی گڑھ)

آرزو ناکام

تسلیم کہ ہم دید کا ارماں نہ کریں گے
کس طرح یقیں ہو کہ وہ حیراں نہ کریں گے

وحشت سہی، توہینِ بہاراں نہ کریں گے
جو کچھ بھی ہو، دامن کو گریباں نہ کریں گے

پیدا نظر و روح میں ہیجاں نہ کریں گے
آنکھوں کو خرابِ چمنستاں نہ کریں گے

ہم ترکِ محبت کسی عنواں نہ کریں گے
یہ کام فرشتے کریں انساں نہ کریں گے

اچھا گلۂ کاوشِ پنہاں نہ کریں گے
مرنے کے سوا اب کوئی ارماں نہ کریں گے

تجھ کو کبھی محسوس رگِ جاں نہ کریں گے
جب تک ہم کونین کا عرفاں نہ کریں گے

دانستہ تڑپ جانے کا ساماں نہ کریں گے
نظروں کو تری جذبِ رگِ جاں نہ کریں گے

سجدے تری راہوں میں پریشاں نہ کریں گے
کافر تری تقلید مسلماں نہ کریں گے

غارتگرِ تسکیں بھی ہیں وہ، دشمنِ جاں بھی
سوچا ہے کہ دل میں انہیں مہماں نہ کریں گے

قطعہ

کیا آج یونہی چاندنی مغرور رہے گی
کیا آج وہ پھر چاند کو حیراں نہ کریں گے؟

کیا آج رہیں گی یونہی خاموش فضائیں
کیا آج وہ کلیوں کو غزلخواں نہ کریں گے؟

کیا حسرتِ نظارہ رہے گی یونہی ناکام
کیا جلوۂ پنہاں کو وہ عریاں نہ کریں گے؟

کیا "تاج" کا ماحول رہے گا یونہی تاریک
کیا آج وہ پھولوں میں چراغاں نہ کریں گے؟

کیا آج لٹیں گے نہ مسرت کے خزانے
کیا آج بہاروں کو وہ خنداں نہ کریں گے؟

کب تک یونہی خاموش بہے جائے گی جمنا
کیا اس کو وہ نظروں سے خراماں نہ کریں گے؟

کیا آج بپا ہوگا نہ اک محشرِ رنگیں
کیا آج وہ ذروں کو پرافشاں نہ کریں گے؟

کیا تکملۂ وحشتِ دل آج نہ ہوگا
کیا آج وہ ترتیبِ گریباں نہ کریں گے؟

کیا عشق کی فطرت یونہی مغموم رہے گی
کیا دردِ محبت کا وہ درماں نہ کریں گے؟

میں اپنے خیالات میں گم تھا کہ یکایک
پہلو سے وہ بول اٹھے کہ ہاں ہاں نہ کریں گے؟

وہ یونہی کہے جائیں گے دل خوں نہیں ہے
اندازۂ نوکِ سرِ مژگاں نہ کریں گے

آسودہ و ہموار گلستاں کی فضا ہے
ایسے میں وہ کیا عزمِ گلستاں نہ کریں گے

اک دن انہیں آنا ہی پڑے گا پسِ درماں
کب تک وہ علاجِ غمِ پنہاں نہ کریں گے

کھل جائے گا اس وقت بھرم ان کے کرم کا
جب ہم گلۂ تنگیٔ داماں نہ کریں گے

اعجاز نہ آئے گی کبھی وجد میں دنیا
ہم بربطِ دل کو جو غزلخواں نہ کریں گے

اعجاز صدیقی اکبرآبادی
مدیر "شاعر" آگرہ

مطالعہ قدرت کی اہمیت کے متعلق چند علماء کے خیالات

کوئی حقیر سے حقیر پودا یا جانور بھی ایسا نہیں ہے جو سمجھ دار ت سمجھ دار انسان کو متحیر نہ کر دے (جان لاک)

جس وقت میں چھوٹی چھوٹی حقیر بوٹیوں کو دیکھتا ہوں جو زمین سے اگتی ہیں اور جو ادنیٰ ترین نباتات ہیں اور جب میں زندگی کی اس خفیہ چنگاری پر غور و خوض کرتا ہوں جو کہ ان میں موجود ہے جو جاذبیت رکھتی، بڑھتی، نمو پاتی اور خود کی اور اپنی نوع کی نمائش کرتی ہے، نیز جو خوبیاں ان بوٹیوں میں بلحاظ غذا، دوا اور زیادہ مکمل مخلوق کی خوشنودی کے لئے موجود ہیں تو میرا خیال اس خدا کی حمد و ثنا کی طرف کھینچا جاتا ہے جس کی دانائی، قوتِ اثر اور حکمرانی اس کی اچھائی کی ان چھوٹی چھوٹی چیزوں میں دکھلائی دیتی ہیں حتیٰ کہ آسمان کے زیر سایہ جتنے دانا سے دانا، قابل سے قابل، طاقتور سے طاقتور اور عالم سے عالم انسان ہیں ان سب کو لے لیجئے تو بھی وہ خدا کی اس دانائی کے برابر نہیں ہو سکتے جو گھاس کی ایک پتی میں ظہور پذیر ہے (سر ریم ہیل)

ایسی کوئی جستجو کی قدر و قیمت نہ گھٹاؤ جو انسانوں کو ان کے خالق کی کارگذاریوں پر سوچ بچار کرنے کی طرف مائل کرتی ہے جب آپ Entomologists کے جرنل کے صفحات پر نظر ڈالیں تو آپ کو اس کا سا فرمحض ایک ماہر نباتات معلوم ہوگا جس کی جستجو ایک مقصد رکھتی ہے جس میں وہ وقت گزارتا ہے اور جو اس کے دماغ میں سمایا ہوا رہتا ہے اور اس کے قلب کو سکون بخشتا ہے۔ ورنہ وہ مسرت جو اس کو کسی پودے کی ساخت کی تحقیق میں محسوس ہوتی ہے اس سے کم پاکیزہ ہے جو انسانی ذہانت کی اعلیٰ ترین مداوار کے مطالعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ (ساؤتھے)

گر ہم اپنی آنکھ کھولیں اور اس کا بندھن نکال پھینکیں تو ہم سب کو موسیٰ علیہ السلام کی طرح ایک جھاڑی میں بھی نور قدرت دیکھنا چاہیئے وغیرہ (کاؤلی)

ایک انسان کے لئے جو پریشان ہو اور متعدد خیالات میں گم ہو گیا ہو، قدرت سے نزدیک تر تماس میں آنا اور اس کے طریقوں اور اس کی سپرٹ کو سمجھنا اچھا ہوتا ہے۔ یہ یقین کرنا محض خیال نہیں ہے کہ موجودہ نسل کے بچوں کو بہ نسبت سابق کے قدرت اور قدرت میں خدا تعالیٰ کے طریقوں کے متعلق زیادہ معلومات حاصل کرائی جائیں تو ان کے پاس زیادہ تندرست اور زیادہ خوش حال اور کم پریشان کن اور کم فکرمند زندگی بسر کرنے کے لئے مواد مہیا ہوگا بہ نسبت ان زندگیوں کے جو ہم میں سے بیشتر بسر کر رہے ہیں (بشپ نلیس بروکس)

قدرت کی محبت ایک بڑا عطیہ ہے اور اگر اس کو منجمد کر دیا جائے یا دبوچ دیا جائے تو کیرکٹر اس نقصان کے اثر سے شاید ہی بچ سکتا ہے۔ میں درحقیقت یہ نہیں کہوں گا کہ ایک شخص جس کو قدرت سے محبت نہ ہو لازمی طور پر خراب ہے یا جو محبت کرتا ہے لازماً اچھا ہے بلکہ اکثر و بیشتر دماغوں کے لئے اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔ بہت سارے جیسے کہ کتاب کہتی ہیں مندر میں اس دروازے سے داخل ہوتے ہیں جس کو خوبصورت کہتے ہیں۔ (سر جان لبک)

یہ بہت زیادہ وسیع طور پر معلوم نہیں ہو سکتا کہ قدرت وسیع ہے و علم محدود، نیز یہ کہ کسی فرد کو بھی خواہ وہ اپنے درجے یا اکتساب کے لحاظ سے کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو عام خزانہ (معلومات) میں اضافہ کرنے کے متعلق امید ہونے کی ضرورت نہیں ہے (ہیوج ملر)

اس بات پر تعجب نہ کرو کہ شاعر پھولوں کے متعلق [illegible] زیادہ کیوں کہتے ہیں۔ کیا آپ نے کسی شاعر کے متعلق یہ سنا ہے کہ اس نے پھولوں کے متعلق کچھ نہ کہا ہو [illegible] ہمیشہ دنیا کے قائم [illegible] شعرا میں کھلیں گے۔ جیسے گرما میں کھیتوں میں کھلتے ہیں ہمیشہ پرانے اور ہمیشہ نئے (او [illegible] ڈبلیو ہوسن)

محمد سعید الدین

دلہن کی یاد میں

آے کہ تم تھے مری دنیائے طرب کی رونق
تم سے رنگین تھی دنیائے محبت کی شفق
یا کوئی فلسفۂ حسن کا مضمون ادق
یا کتاب شعر حسن کا زریں ورق

کس [illegible] مجھے علم نہ تھا عشرت فانی تم تھے

[illegible] دنیا دے کر
[illegible]
پھول [illegible] دل پہ میرے داغ تمنا دے کر
تشنہ شوق کو پیغام تماشا دے کر
میری امید کو الفت کا سہارا دے کر

نامکمل ہے محبت کا فسانہ افسوس
میری ہستی کو کچل دے گا زمانہ افسوس

غیرت رنگ شفق میری رنگیلی دلہن
عظمت درس حیا میری [illegible] دلہن
پیکر ناز و ادا بانکی سجیلی دلہن
عشرت صبح جوانی کی سہیلی دلہن

دل [illegible] بتاؤں کیونکر
تجھ کو [illegible] نہیں آتا تجھے پاؤں کیونکر

زندگی تھی تری وابستۂ یک شام نشاط
اس لئے لرزہ بہ اندام تھا پیغام نشاط
ہاتھ جو چھوٹ گیا، ٹوٹ گیا جام نشاط
آہ یہ درد الم ناک انجام نشاط

عشرت آباد میں دنیا کو بھلا بیٹھے ہیں
ہم تری یاد میں دنیا کو بھلا بیٹھے ہیں

انسب کلیانوی

برسوں سے واقف ہے' تم جاتے ہو بابو"——— کشن نے ٹھنڈی سانس لی اور زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"میں ایک غریب اور مفلوک الحال خاندان سے تعلق رکھتا ہوں' یہ احساس مرے دل میں پہلی مرتبہ پیدا ہوا ہے اور میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ امیروں کی زندگی کو رشک کی نظروں سے دیکھا ہے ——— اور وہ بھی اس لئے کہ رادھا ایک دولت مند خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور میرا اس کا کوئی جوڑ نہیں ہو سکتا۔"
کشن کی باتیں سن کر مجھ پر سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا' مجھے بھی رادھا سے محبت تھی اور میں نے اب تک اس کو کشن سے چھپائے رکھتا تھا' میں نے اپنے گھر میں تحریک کی تھی اور یہ اطلاع ملنے پر کہ ٹھاکر صاحب میرے رشتے کے لئے تیار ہیں' کچھ دنوں کے لئے گھر چلا آیا تھا اور اب کشن کو یہ خوشخبری سنانے کے لئے میں یہاں آیا تھا کیونکہ میری کوئی مسرت کشن کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی تھی' لیکن یہ مسرت! میں سوچ میں پڑ گیا ——— اس میں بھلا اس بیچارے کا کیا قصور تھا' مجھے اس کی باتیں یاد آنے لگیں ———
"اچھا ہوا بابو تم آ گئے' یہ بھید تو کچھ تمہارے کھولے ہی کھل سکے گا' دو تین مہینے سے نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ کشن کو ——— اداس رہتا ہے' کوئی دکھ ہے بڑا بھاری جو اس کے جی کو کھا رہا ہے' میں پوچھتی ہوں تو کچھ بتاتا ہی نہیں ———" میں نے کہا تھا "ماتا جی ——— آپ فکر نہ کیجئے' میں سب کچھ معلوم کروں گا۔" بیچاری بوڑھی عورت کے دل کو میرے الفاظ سے کچھ ڈھارس سی ہوئی' بھرائی ہوئی آواز میں اس نے مجھے دعائیں دیں اور کہا ——— "بیٹا اس اجڑے سنسار میں مری دھن دولت سب کچھ کشن ہے' وہ جیتا رہے اور سکھی رہے تو میرے یہی جیون جنت سے بھی بڑھ کر ہے۔"
ہم دونوں خاموش گھر کی طرف جا رہے تھے' میں نے کہا "کشن پاس ہونے کی کیا ضرورت ہے' تم آج بھی سرکاری ملازمت کرنی چاہو تو پھر تمہارے رشتے کے لئے کوئی مشکل باقی نہیں رہے گی ———"
کشن نے کہا ——— "بھائی میرے لئے یہی کافی ہے کہ ایشور نے مرے دل میں محبت کا پاک جذبہ پیدا کیا ہے' میں اس جذبے کا احترام کروں گا اور اپنی زندگی گزار دوں گا ———"
میں نے کہا "بھائی تم اپنے اس فلسفۂ محبت کو اپنے پاس ہی رکھو' اگر ملازمت سے طبعی نفرت ہے تو بھی گاؤں کی پنچایت ٹھاکر صاحب پر اثر ڈال سکتی ہے" ———
میں گھر چلا آیا ——— رات بھر مجھے ایک خلش اور بے چینی سی رہی' کشن کے فلسفۂ محبت نے مری آنکھیں کھول دی تھیں' میں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ کشن کی دوستی پر اپنی محبت کو قربان کر دوں گا۔
دوسرے روز میں نے اپنے والد سے باتیں چھیڑیں اور کہا ——— "بابو جی آپ ٹھاکر صاحب والوں سے کہہ دیں کہ شادی ابھی نہیں ہو سکتی وہ اگر ٹھیرنا چاہیں تو چار چھ برس تک اور ٹھیریں۔" بابو جی نے حیرت سے کہا "——— تو کیا اتنے دنوں تک وہ اپنی لڑکی کو بٹھائے رکھیں گے۔ اور میں کہتا ہوں کہ ٹھیرنے کی ضرورت ہی کیا ہے"
میں نے کہا "بابو جی میں ابھی اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتا ہوں' اور تعلیم کے ختم ہونے کے بعد شادی کا خیال ہے۔" بابو جی نے کہا ———

۔۔ اگر یہ بات تھی تو پھر مجھے اس قدر اصرار سے لکھنے کی کیا ضرورت تھی' اور کل تک تو تم راضی تھے اور بہت خوش تھے آج یکایک یہ تبدیلی کیوں ہوگئی ہے" بابوجی اس وقت برہم سو رہے تھے ——— میں نے سامنے سے ٹل جانے کی کوشش کی' لیکن کشن آتا ہوا دکھائی دیا۔ ——
پتا کشن سے کہنے لگے ——— "اچھا ہوا کشن تم وقت پر آگئے' تمھارے دوست کو یہ کیا ہوگیا ہے"۔
کشن نے کہا ——— "مجھے معلوم نہیں ——— کیوں خیریت ہے" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ پتاجی برہمی سے کہنے لگے —— "اس نے مجھے خط لکھا تھا کہ ٹھاکر صاحب کی لڑکی سے بیاہ کی بات چیت کروں۔ کل تک بھی یہ اس پر راضی تھا لیکن آج کہتا ہے کہ وہ چاہیں تو چار چھ برس ٹھیریں ورنہ کہیں اور بات پکی کریں ———"
یہ سن کر کشن نے میری طرف دیکھا۔ مجھ میں اس سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہ تھی۔ میں اس کے عزم اور ارادے سے واقف تھا۔
میں خاموش سامنے کسی بے جان چیز کو تکنے لگا۔ کشن نے کہا ——— "اچھا تو یہ بات ہے' بابوجی آپ مطمئن رہیے میں انہیں راضی کروں گا"۔
اس واقعے کو ایک برس گزر چکا ہے' میں اپنی سرکاری ملازمت کے سلسلے میں شہر میں رہتا ہوں' رادھا میری شریک زندگی ہے۔ مجھے اپنے گھر میں وہ سب کچھ میسر ہے جس کی کسی کو آرزو ہو سکتی ہے۔ ڈرائنگ روم میں بیچوں بیچ کشن کی تصویر ٹنگی ہوئی ہے جو ہر وقت اس کے جذبۂ ایثار کی یاد تازہ کرتی رہتی ہے'۔
کشن آج کل "دیس سیوک منڈل" کا سکریٹری ہے' اخباروں میں اس کے کارناموں کی بڑی دھوم ہے' پہلی بار اس کا خط آیا تھا اس میں اس نے لکھا ہے کہ۔
"میری زندگی بہت چین اور شانتی سے گزر رہی ہے' ملک کے فاقہ کش غریب اور بے زبان کسانوں کی سیوا میں میری آتما کو بڑا سکھ ملتا ہے۔ یہی میری زندگی کا مقصد ہے میں اسی میں خوش ہوں' رادھا کو دعا سلام۔"
رادھا سیوا منڈل کے لئے خاص اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے تحفے بھیجتی رہتی ہے۔

سید خلیل اللہ حسینی

رنگِ زمانہ

باغِ عالم کی ہوا کا رنگ ہی کچھ اور ہے — آج بلبل کی نوا کا رنگ ہی کچھ اور ہے
کس طرح منزل کو پہنچیں رہروانِ راہِ عشق — وائے قسمت رہنما کا رنگ ہی کچھ اور ہے
سن کے بھی ہوتا نہیں ہے جادہ پیما قافلہ — کیا کہیں بانگِ درا کا رنگ ہی کچھ اور ہے
گوشۂ عزلت ہے بہتر محفلِ ہستی میں آج — آشنا' ناآشنا کا رنگ ہی کچھ اور ہے
کس ادا سے ان کے رخ پر بال ہیں بکھرے ہوئے — آج اس کالی گھٹا کا رنگ ہی کچھ اور ہے
اب نہ وہ لطفِ محبت ہے نہ وہ شانِ ستم — اب وفا کا اور جفا کا رنگ ہی کچھ اور ہے

گل کھلائے ہیں زمینِ شعر میں کیا کیا عزیز
اب تری طبعِ رسا کا رنگ ہی کچھ اور ہے

عزیز اللہ عزیز (بنگلوری)

جواب تنقید

حیدر آباد کے مشہور شاعر حضرت علی منظور کی نظمیں ہندستان کے منتخب رسائل میں شائع ہوتی اور نہایت شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان کا کلام عہد حاضر کے لئے ایک اجتہادی حیثیت کا مالک ہے۔ انھوں نے اپنے کلام کی تنقید کا یہ جواب رسالہ شہاب میں اشاعت کے لئے روانہ کیا تھا۔ لیکن کئی ماہ کے بعد واپس ہو گیا اب ان کے متعدین کے اصرار پر سب رس میں شائع کیا جاتا ہے۔

تعلقہ ہمنا آباد سے پرسوں ایک "محبت نامہ" میرے نام آیا جس کا ملخص میں یہاں بطور تمہید پیش کرتا ہوں:-

منظور بھائی! ...... تمھاری نظم "جاسوس دوست" مجھے بہت پسند آئی تھی! اتنا یہ ہے کہ اس نظم پر جب تک میں نے اپنے خیالات ظاہر نہیں کر دئے دوسرا کوئی کام نہیں کیا۔ اب بھی اس نظم کے تصور کے ساتھ ایک ملت کش ضمیر فروش دوست کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ کیا کہوں اس گھومنے والے "متجسس" "ابن آدم" کی سخن آرائی کس کس کی "نظر بندی" اور "زبان بندی" کی علت غائی ہے۔ کل کی بات ہے کہ یہ ظالم بائیسکل پر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا تھا آج ہوائی جہاز میں بیٹھ کر پرکا کو آبنا اور اڑا رہا ہے، اپنی ترقی کے لئے یہ اپنوں کو بیگانوں میں ذلیل کرتا ہے، نہ یہ وطن پرست نہ قوم پرست نرا زر پرست ہے نرا زر پرست، گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔ کچھ سوچتے سوچتے موقع پر اس طرح بے ساختہ ہنس دیتا ہے کہ کسی کو بناوٹ کا گمان تک نہ ہو — پریشان نہ ہو کر پریشان نظر آتا ہے۔ ایسا پریشان کہ ناواقف انسان بھی اس کی ہمدردی پر تل جائے، اس نظم میں تم نے کردار نگاری کا کمال دکھایا ہے ...... مگر افسوس ہے کہ اس کے دو ایک اشعار پر بادی النظر میں (جناب عطارد کو) کچھ شبہ سا ہو رہا ہے۔[1]

یہ پورا جملہ عطارد صاحب ہی کا ہے — خالص شبہ نہیں بلکہ کچھ شبہ سا ہو رہا ہے، کیا خوب!!

خیر تم خود قلم اٹھاؤ یا مجھے اجازت دو۔

میں جانتا ہوں کہ شہاب کے تم نہ قلمی معاون ہو نہ "رقمی موید" (خریدار) اس لئے رسالہ مذکور اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ ... فقط۔

اپنے صدیق عزیز مولوی سید کریم الدین صاحب اکرم کا شکریہ ادا کرکے میں نے "نقد و نظر" کا مطالعہ کیا۔ مولیٰ بالا نظم کا چوتھا شعر ہے ؎

الاماں یہ تیری "آشفتہ نگاہی" الاماں — عمر و عیار کی بھی ہیچ ہیں چالاکیاں

"آشفتہ نگاہی مصنف کے عندیہ میں شاید جدید لفظ ہے اسی لئے اس کو واوین میں لکھا گیا ہے۔ آشفتہ یا آشفتہ حال پریشانی یا شوریدگی کو کہتے ہیں[2] اس لئے آشفتہ نگاہی کے معنی ہوئے پریشان نگاہی یعنی پریشانی اور گھبراہٹ سے ادھر ادھر دیکھنا۔ عیار یا جاسوس کے واسطے "آشفتہ نگاہی" تو کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی اس آشفتہ نگاہی سے تو عیاری کا بھانڈا پھوٹ جائے گا اور جاسوس دوست دھر لئے جائیں گے۔"

جناب عطارد! آشفتہ نگاہی نہ میرے عندیہ میں جدید لفظ ہے نہ آپ کے خیال میں لیکن میں نے اس کے ہم وزن لفظ دیدہ نگاہی

---

[1] رسالہ شہاب حیدر آباد دکن جلد (۶) نمبر (۱۱) آبان ۱۳۴۷ف

[2] آشفتہ یا آشفتہ حال پریشانی یا شوریدگی کو نہیں کہتے بلکہ پریشانی یا شوریدگی کے حامل کو کہتے ہیں۔ اگر آپ آشفتہ حال پریشانی کو کہتے ہیں تو کیا حاجت مند حاجت کہنا روا ہے؟"

موقع کے لحاظ سے اس کو ترجیح دی ہے اس لئے وہ واوین کی خصوصیت سے ممتاز نظر آ رہا ہے۔ اس شعر کے اوپر والے تین شعر نہیں، نہ سہی
صرف ایک شعر تو پڑھ لیجئے ؎

تیری آنکھوں سے عیاں اب تک وہ بہتی لہر ہے ٹھہرے تیری نگاہِ تیز ہاں ہاں ٹھہرے

بھائی صاحب! نظم کو غزل کی طرح نہ جانچئے۔ موخر الذکر صنف کا ہر شعر ایک نئے مضمون کا حامل ہوتا ہے برخلاف اس کے نظم کے تمام
شعر مربوط ہوتے ہیں مثلاً شاعرِ مشرق کا یہ شعر پڑھیئے۔

دیا اہلِ حرم کو رقص کا فرماں ستمگر نے یہ اندازِ ستم کچھ کم نہ تھا آثارِ محشر سے

سننے والے کہیں گے کہ اہلِ حرم کو بت کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو ستمگری کا ایک کمال سمجھا جاتا۔ یہ راجہ اندر بھی عجیب بزرگ ہیں کہ
اہلِ حرم کو رقص کرنے کا حکم دے رہے ہیں لیکن ماقبل و مابعد کے بھی گوش گزار کر دیجئے ؎

رُہیلہ کس قدر ظالم جفا جو کینہ پرور تھا نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے
بھلا تعمیل اس فرمانِ غیرت کُش کی ممکن تھی شہنشاہی حرم کی نازنینانِ سمن بر سے

اب خود سامعین کا ذہن غلام قادر رُہیلہ کی طرف منتقل ہو جائے گا اور دیر و حرم کی مناسبتیں جو پہلے ذہن میں آ گئی تھیں یک لخت
نکل جائیں گی ـ اسی طرح میری نظم کا یہ شعر تنہا پیش کیا جائے تو "آشفتہ نگاہی" لوگوں کی آنکھوں میں ضرور کھٹکے گی مگر بہتی لہر
والے شعر کے ساتھ پڑھا جائے تو یہی آشفتہ نگاہی بہت زیادہ موزوں معلوم ہوگی۔ آپ کا یہ فرمانا کہ ـ

عیار یا جاسوس کے واسطے آشفتہ نگاہی تو کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔

غورِ مکرر کا طالب ہے مولوی صاحب! ایک اچھے جاسوس کی آشفتہ نگاہی پر بڑے بڑے لوگوں کی سنجیدگی نظر حیران ہو جاتی
ہے۔ یہ ظالم ایک منٹ میں پوری محفل کا جائزہ لے لیتا ہے، اس کا گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنا بھی مصلحت سے خالی نہیں، غرض اس کی
کم نگاہی، کج نگاہی، خوش نگاہی، بد نگاہی کوئی چیز نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ بلاغتِ نظر سے کام لیجئے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ
برمحل آشفتہ نگاہی سے عیاری کا بھانڈا نہیں پھوٹتا۔ بلکہ یہ عیاری کا بھرم رکھ لیتی ہے۔ کچے جاسوس دھر لئے جاتے ہیں، میرا
دوست تو پکا جاسوس ہے ـــــ کیوں ہنسی آ گئی!!

"عمرو اس شعر میں ابرو کے وزن پر لکھا گیا ہے حالانکہ بفتح اول و سکون ثانی نام ہے ایک عیار کا جس میں"
"واؤ غیر ملفوظ اور زاید ہے یہ رسم الخط محض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اور اس نام کے فرق و امتیاز کے لئے"
"اختیار کیا گیا ہے۔۔۔۔۔ اس نام میں واؤ زاید ہے جو پڑھا نہیں جاتا۔۔۔۔ بغرض غلط عمرو میں واؤ کو جزو"
"نام قرار دیا جائے تو فارسی کے عام قاعدے کے لحاظ سے جس کلمہ کے آخر واؤ ہو اضافت کی حالت میں وہاں"
"ایک (ی) زیادہ کی جاتی ہے۔ جیسے رُو سے روئے زیبا۔۔۔۔۔۔ مگر اس شعر میں عمرو عیار ہی لکھا گیا ہے"
"یہ بھی صحیح نہیں بہرحال اس تصریح کے لحاظ سے بغیر واؤ کو پڑھے مصرع کا وزن متاثر ہو رہا ہے۔"

جناب عطار و! یہ واؤ میرے شعر میں بھی غیر ملفوظ اور زاید ہی ہے۔ میں نے بھی یہ رسم الخط محض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اور ابن عم کے فرق و امتیاز کے لیے اختیار کیا ہے۔ میرا یہ بیان دیکھ کر آپ حیران ہو جائیں گے کہ ایسی صورت میں کیا وزن شعر متاثر نہ ہوگا؟

جناب من! ہرگز نہ ہوگا ع سکھایا ہے بڑے استاد نے مجھ کو پھری گدکا ——— پڑھئے عمرو کے میم کو مشدد اور ملاحظہ فرمائیے مولانا رومؒ کا شعر نظیراً ؎

دید را بزخستنِ عمر گماشت [1]   رخت را و اسپ را ضایع گزاشت

چونکہ عمرو عیار کے واؤ کو میں اپنے شعر میں بھی غیر ملفوظ اور زایدؔ ثابت [2] کر چکا ہوں اس لئے فارسی کے اس قاعدے پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں رہی کہ

جس کلمہ کے آخر واؤ ہو اضافت کی حالت میں وہاں ایک (ی) زیادہ کی جاتی ہے ؎

کیوں میں حیراں ہوں جو ہر سو آج تیری دھوم ہے   تیری فطرت ابتدا ہی سے مجھے معلوم ہے

"ہوں اور ہوؤں میں ہوئے ہووے میں کیا کوئی فرق نہیں ہے؟"

آپ کا یہ سوال میری سمجھ میں اچھی طرح سے نہیں آیا' اگر آپ یہاں حال و مضارع کا امتیاز پیدا کرنا چاہتے ہیں تو صیغۂ مضارع بمعنی حال کی نظیر سنئے ؎

نالہ سینے سے کرے عزم سفر آخر شب   راہرو چلنے پہ باندھے ہے کمر آخر شب   (سوداؔ)

---

[1] عطار و میاں! یہ نام تو ہے ایک مگر پڑھا جاتا ہے تین طرح سے مثلاً۔

۱۔ من بہ تو مشغول و تو با عَمرو و زید ——— بہ فتح اول و سکون ثانی۔

۲۔ عُمَر پنجہ بر پیچ دیو مرید ——— بہ ضم اول و فتح ثانی۔

۳۔ تیسری صورت جو اوپر پیش کی گئی۔ یعنی بہ تشدید میم۔

پہلی نظیر گلستاں میں دوسری بوستاں میں تیسری مثنوی مولوی معنوی دفتر اول میں دیکھی جا سکتی ہے۔

[2] جب مشق سخن کی ابتدا تھی اور میں نے منشی فاضل کا امتحان بھی پاس نہیں کیا تھا وحید العصر علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل قطعہ کا ترجمہ کیا ؎

برخیز کہ آدم را ہنگام ظہور آمد   ایں مشت غبارے را انجم بہ سجود آمد

آں راز کہ پوشیدہ در سینۂ ہستی بود   از شوخی آب و گل در گفت و شنود آمد

دوسرے شعر کا ترجمہ ملاحظہ ہو ؎

پنہاں تھا جو راز کبھی موجودِ محض کے سینہ میں' شوخیٔ آب و گل کی بدولت کہنے سننے میں آیا۔

زیر خط لفظ کی تحقیق یہ تھی کہ بہ سکون ثانی ہے یا بہ فتح ثانی' میرے محتاط ذوق نے اس لفظ کو ایسی جگہ کھپایا کہ دونوں حالتوں میں اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا یعنی یہ مَحض ہے تو دال قبل یہ اشباع اور مَحَض ہے تو با اشباع۔ تقطیع کر کے دیکھ لیجئے' ابتدائی دور میں یہ حال تھا تو احتیاط کا اب کیا عالم ہوگا!!

اگر آپ مصرعِ اول کو نسبتاً سہل الاداکرنا چاہتے ہیں تو اس طرح بنا لیجئے :۔

کیوں کروں حیرت جوہر سو آج تیری دھوم ہے

بھائی صاحب ! ذرا ذرا سی بات پر آپ جیسے نقاد سے الجھوں ؟ یہ مجھے منظور نہیں :۔

تجھ سے مل کر آج مجھ کو مدرسہ یاد آگیا ——— پھر وہ طفلی کا مرقع دل مرا تڑپا گیا

"طفلی عربی لفظ ہے جس کے معنی نوزائیدہ کے ہیں"

طفلی و آغوشِ مادر خوش بہشتے بودہ است

" زبانِ عربی میں ابتدائے پیدائش سے سن کہولت تک کے مدارج کے نام جدا جدا ہیں جیسے طفلی، صبی، ترعرع،
" رہاق، فتی، وقوف، وغیرہ لیکن فارسی میں طفلی سے وہ زمانہ بھی مراد لیا جاتا ہے جو کم سنی کا ہوتا ہے۔۔۔"
" کالج کے طالب علم (کو) نہیں کہہ سکتے جماعتِ صغیر کا طالب علم طفل ہو سکتا ہے مگر اس شعر میں صغر سنی مراد نہیں ہے"
" ۔۔۔ نہیں ہو سکتی۔ مرقع کا لفظ بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتا"

مولنا ! عربی زبان کی وسعت کا کیا پوچھنا، سنتا ہوں کہ علامہ اصمعی نے گھوڑے کے پٹھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اس کے ہزار نام بتا سکتا ہوں۔ اردو زبان کے ضمن میں عربی کا ذکر کچھ بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہے، ہم کو تو علی الترتیب طفلی، جوانی، پیری، یہی تین زمانے یاد ہیں، میرانیس کے پیارے نواسے حضرت رشید لکھنوی فرماتے ہیں ؎

طفلی نہ رہی کہ تھی وہ جانے والی ——— کیا رہتی جوانی ؟ تھی مٹانے والی
پیری کو رشید بس غنیمت سمجھو ——— اب فصل نہیں ہے کوئی آنے والی

اس حساب سے طفلی کا انجام جوانی کے آغاز سے جا ملتا ہے۔ بے شک کالج کے طالب علم کو طفل نہیں کہہ سکتے، میرے شعر سے خود مدرسہ کی صراحت ہو رہی ہے میں اپنے جاسوس دوست کو اسکول ہی کی یاد دلا رہا ہوں اور اس کو فطری جاسوس ثابت کرنے کے لئے اس کی عمر کے ابتدائی حصہ کے رجحانات بیان کرتا چلا ہوں۔ قبل ازیں یہ نظم بطور خود رفع شبہات کے لئے آپ دو تین مرتبہ ملاحظہ فرما چکے ہیں، میرا یہ جواب دیکھ کر ازراہ کرم اور ایک بار مطالعہ کر لیجئے،

خداوند کریم چاہے تو اب ایک شبہ بھی باقی نہ رہے گا مولنا ! اپنے مدرسہ کا عشرت آگیں زمانہ آپ اب یاد کر لیجئے میرا ذمہ اگر دل نہ تڑپ جائے ——— ہائے وہ کمرہ ایک بنچ ادھر ایک بنچ ادھر آٹھ دس طالب علم اس طرف آٹھ دس طالب علم اُس طرف، وہ ننھے ننھے ہاتھ وہ چھوٹی چھوٹی سائز کی کتابیں، وہ پرلطف ساعتیں وہ بشاش چہرے ! خیر آپ کا وہ زمانہ تو رخصت ہو چکا۔ اب کسی ایک مدرسہ میں جا کر کسی ایک جماعت کا فوٹو لے لیجئے۔ دیکھئے کہ یہ مرقع کس قدر دل آویز ثابت ہوتا ہے میرے خیال میں تو مرقع کا لفظ یہاں بہت مناسبت رکھتا ہے، خدا جانے اور اہل نظر حضرات اس بارے میں کیا رائے دیتے ہیں۔

ہر کسی استاد کا تو منہ چڑھا شاگرد تھا ——— نام تیرا واقعی سب کی زباں کا ورد تھا

"ہر استاد کے عوض ہر کسی استاد سے قطع نظر" "زبان کا ورد ہونا" بھی نیا لفظ ہے جو ترجمہ ہے۔ ورد زبان کا۔ورد ہونا"
" غلط ہے فصحا کی یہ زبان نہیں ہے اردو میں بھی وردِ زبان ہونا یا خالی ورد ہونا ہی کہتے ہیں۔"

کونسی شب کو مرا وردِ چہل کاف نہیں "آتش مرحوم"

بھائی صاحب! میرا مصرع جو شخص بھی پڑھے گا میرا مطلب سمجھ جائے گا 'صاف صاف مصرع' ہے۔

نام تیرا واقعی سب کی زبان کا ورد تھا

لیکن اس کے لفظوں کو توڑ مروڑ کر اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ سطح بیں نظریں فوراً پریشان ہو جائیں گی ــــ "زباں کا ورد ہونا" بھی نیا لفظ ہے۔ مولوی صاحب! آپ نے وادین میں جو فقرہ لکھا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود زبان میں ورد بننے کی صلاحیت ہے' زبان کا ورد ہونا بے شک نیا لفظ ہے مگر اس مصرع سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی نہ میں نے اس کو وادین میں لکھا ہے' اپنا مصرع مکرر لکھتا ہوں۔

نام تیرا واقعی سب کی زباں کا ورد تھا

سب کی زباں کا وظیفہ یعنی سب کا وظیفہ تھا اس میں شک نہیں کہ یہ وردِ زباں کا ترجمہ ہے۔ سنئے جناب عطارد! ایک زبان کے محاورہ کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنا اگرچہ جائز نہیں مگر ہمارے پیشروؤں نے یہ فرق بھی اٹھا دیا۔ ناسخ

بھا گئی کونسی وہ چیز بتوں کی ہم کو نہ کمر رکھتے ہیں ظالم نہ دہن رکھتے ہیں

یہ حقیقت میں لفظی ترجمہ فارسی محاورہ کا ہے کہ نہ کمر دارند نہ دہن دارند۔ فرمایئے حضرت! وردِ زباں کا ترجمہ میں نے کیا تو کیا نئی بات ہوئی' ورد ہونا غلط ہے' ہوگا۔ ورد نہیں تو آپ کی پیش کردہ نظیر کی رو سے صحیح ہے ؎

کونسی رات مرا وردِ چہل کاف نہیں "آتش مرحوم"

جب ورد نہیں صحیح ہے تو ورد ہے بھی صحیح ہوگا' میر طبق فرماتے ہیں۔

دس میں کہوں سو میں کہوں یہ ورد ہے میرا

ورد ہے صحیح ثابت ہوگیا تو ورد تھا کیونکر غلط ہوگا!؟ مولانا! کڑی سے کڑی ملایئے اور فرمایئے کہ فصحا کی یہی زبان ہے۔

" واقعی کا لفظ حشو ہے وزنِ شعر کے سوا واقعی اور غیر واقعی کی یہاں کوئی ضرورت نہ تھی۔"

بھائی صاحب! جس بات میں شک و شبہ نہیں ہوتا وہ اسی طرح کہی جاتی ہے' استاد ذوق فرماتے ہیں۔ ؎

سن کے مجنوں نے مرے شورِ جنوں کو یہ کہا واقعی مجھ سے بھی یہ شور یدہ سر اچھا رہا

اب میں اپنا شعر لکھتا ہوں ؎

ہر کسی استاد کا تو منہ چڑھا شاگرد تھا نام تیرا واقعی سب کی زباں کا ورد تھا

بالغ نظر اصحاب انصاف کریں گے کہ واقعی کا لفظ حشو ہے یا اس سے قوت ایقان بڑھ رہی ہے۔

ہیں سیاہ اخبار سارے تیرے نام اور کام سے شاید اب تو آرہا ہے خاص ملک شام سے

"کیا ملک شام کے باشندے جاسوس ہوا کرتے ہیں؟ یا ملک شام کی آب و ہوا میں کچھ ایسی تاثیر ہے؟ شاہی پیر کے جلوہ کی یہ

؎ آب حیات صفحہ ۔ اس قسم کی بیسیوں نظیریں ملیں گی۔

پیشین گوئی تو نہ تھی ؟ یہ نظم جنوری میں لکھی گئی یا شایع ہوئی شامی پیر کا ظہور جیسے ہینے کے بعد ماہ جون میں ہوا لیکن شامی پیر جاسوس نہیں سمجھا گیا وہ تو تخت وتاج افغانستان کا مالک بننا چاہتا تھا۔ اس جاسوس دوست کو با ایں ہمہ صفات خاص ملک شام سے کیا تعلق تھا ؟ نہیں یہ سب قیاس آرائیاں غلط۔ بات صرف یہ ہے کہ شاعر نے صلح اور جنگت کی طرف رجعت کی ہے۔ محض اخبار کی سیاہی کی خاطر " شام " کا لفظ لانا پڑا ملک شام کے ساتھ لفظ خاص کا الحاق بھی معنی خیز نہیں ہے۔ غلط یا صحیح زبان وبیان کے متعلق میرے یہ شبہات ہیں "

" علم و فن کے اعتبار سے جانچنا صاحب فن شاعر کا کام ہے "

جناب عطار دا علی منظور حیدرآبادی کے ایک قدیم ترین دوست ' زمانۂ طفلی کے رفیق اور ہم مکتب کے تذکرہ پر اس قسم کے سوالات کہ کیا ملک شام کے باشندے جاسوس ہوا کرتے ہیں ؟ یا ملک شام کی آب وہوا میں کچھ ایسی تاثیر ہے ؟ .. لیے جا سکتے ہیں یا بجا — میں بھی اسی قسم کے اور کچھ سوال کروں ؟ نہیں ' طول نگاری سے کیا حاصل ' دقیقہ سنج حضرات خود سمجھ گئے ہوں گے — یہ شعر اور اس کے اگلے پچھلے صرف دو شعر یہاں پیش کر دیتا ہوں ؎

تیری فطری قابلیت تیرے کام آ ہی گئی	غیر ملکی حاکموں تک تجھ کو پہنچا ہی گئی
ہیں سیاہ اخبار سارے تیرے نام اور کام سے	شاید اب تو آرہا ہے خاص ملک شام سے
کر رہا ہے سیر دنیا بن کے اب جاسوس تو	آہ ! ابنائے وطن سے خاک ہو مانوس تو

کیا اب بھی شامی پیر' شام کی آب وہوا کی تاثیر اور دوسرے سوالات اپنی اپنی جگہ قائم رہ سکتے ہیں ؟

کرمی ! صلح جنگت سے میں اسی قدر نامانوس جس قدر مارواڑی گوشت سے ' از خود کوئی سخن گسترانہ لطافت صلح جنگت کے پردہ سے جھلکیاں دکھارہی ہے تو یہ اور بات ہے۔ شام اور فلسطین میں آج قیامت صغریٰ بپا ہے باوجود اس کے آپ پوچھتے ہیں کہ

اس جاسوس دوست کو با ایں ہمہ صفات خاص ملک شام سے کیا تعلق تھا ؟

جناب عطار دا شام اور فلسطین میں جو ربط ہے اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ' آل عثمان کے دور شہنشاہی میں شام و فلسطین ایک ہی گورنر کے زیر حکومت تھے ' غیر' حالات حاضرہ کے مد نظر خاص کا لفظ کتنا معنی خیز ہے اور " انتداب نتیجہ " کے منظروں کی کس حد تک رہنمائی کر رہا ہے۔ اس کے اظہار کی یہاں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

مولانا ! تلاش کیجئے آپ کے احباب میں بھی دو چار " جاسوس " ایسے نکل ہی آئیں گے جو اپنے ذاتی مادی فائدہ کے لئے قوم و وطن کا " بہر نوع " نقصان کئے جا رہے ہیں ' جناب عطار دا میں اسی قسم کے افراد سے قوم کو کبھی کبھی متعارف کرا دیتا ہوں — رہے استعارہ اور کنایہ کے پیچ ؟ تو ان کے بغیر یہ اکام چل سکتا ہے نہ آپ کا نہ کسی اور مفکر کا فقط

علی منظور

مسولینی کی صحت

اس وقت تقریباً ساٹھ برس کی عمر میں بنیٹو مسولینی دنیا کے ایک اہم ترین اور نہایت خطرناک عہدے پر ہوتے ہوئے بھی بالکل مگن نظر آتا ہے اس کی جسمانی مشین سو فی صدی خوبی کے ساتھ کام کرتی ہے۔ اس کی صحت و تندرستی پر رشک آتا ہے۔ اس کی پھرتی پر حیرت ہوتی ہے۔ بارہ سے چودہ گھنٹے تک روزانہ کام کرنا اس کے لئے معمولی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ قومی اور بین الاقوامی معاملات کا اس پر بے انتہا بار ہوتا ہوگا۔ ملک و ملت کے لاتعداد اہم اور پیچیدہ مسائل اس کے سر پر فکر کا ایک پہاڑ جمع کر دیتے ہوں گے۔ ایک مسئلہ کا حل بمشکل ختم ہوتا ہے دوسرا بظاہر پہلے سے کہیں اہم اس کی جگہ آموجود ہوتا ہے۔ اور پھر سیکڑوں کے راستہ کا وہ کانٹا ہے۔ سیکڑوں اس کے دشمن ہیں۔ سیکڑوں کے خون کا وہ ذمہ دار ہے۔ سیکڑوں اس کے خون کے پیاسے ہیں۔ لیکن اس کو کبھی دردِ سر تک نہیں ہوتا۔ اس کی جسمانی صحت کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکے گا کہ کوئی بارہ سال سے اب تک ایک دن بھی وہ اپنے دفتر سے بیماری کے بہانے غیر حاضر نہیں رہا۔ اس عمر میں اس کی اس قدر تندرستی اور پھرتی کی ذمہ دار آخر کونسی چیزیں ہیں؟۔ ایک مشہور اخبار کا نمائندہ جس نے حال ہی میں مسولینی سے ملاقات کی تھی بیان کرتا ہے کہ مسولینی کی اس بہترین صحت کے ذمہ دار اس کے اصولِ زندگی ہیں۔ جب مسولینی سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا آپ کی غذا معین ہے اور اگر ہے تو کیا ہے؟ مسولینی نے جواب دیا کہ میری غذا ان معنوں میں مقرر ہے کہ میں اپنی خوراک میں ترکاریوں کی مقدار زیادہ سے زیادہ رکھتا ہوں اور گوشت کا استعمال حتی الوسع کم کرتا ہوں۔ اس سوال کے جواب میں کہ کیا آپ شراب یا تمباکو کا استعمال کرتے ہیں۔ اس نے جواب دیا "میں شراب کو خاص و عام کی صحت کے لئے خطرناک سمجھتا ہوں۔ میں شراب صرف سرکاری ضیافتوں میں کبھی کبھی پیتا ہوں۔ لیکن جنگ عظیم کے بعد سے میں نے کبھی تمباکو کا استعمال نہیں کیا۔" جب چائے اور کافی کے متعلق سوال کیا گیا تو اس نے کہا میں کافی اور چائے کو انسانی زندگی کے لئے نہ صرف غیر ضروری بلکہ ایک حد تک مضر سمجھتا ہوں اور ان چیزوں کا قطعی استعمال نہیں کرتا۔ مسولینی نے اس نمائندے سے یہ بھی کہا کہ وہ روزانہ کم از کم آدھے گھنٹے سے پون گھنٹے تک ورزش کرتا ہے جس میں گھوڑے کی سواری اور تیرنا شامل ہے۔ مسولینی ہر قسم کے کھیل میں حصہ لیتا ہے اور بہت اچھا کھلاڑی ہے۔ باوجودیکہ تمام دنیا کی آنکھیں اس پر ہیں اس کے ہر لفظ اور ہر حرکت پر گرفت کی جاتی ہے اور دنیا میں شور مچتا ہے اور پھر پندرہ سال کی فاشستی حکومت کے دوران میں شروع سے آخر تک بڑے بڑے بین الاقوامی مسئلوں نے اس کے دماغ کو بے انتہا پریشان کیا لیکن مسولینی کی نیند میں ذرہ برابر خلل نہیں آیا۔ گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے مسولینی نے اس نمائندے سے کہا: "میں راتوں کو برابر سات یا آٹھ گھنٹے سوتا ہوں۔ میرے خواب کا وقت گیارہ اور سات بجے کے درمیان ہے۔ مجھے لیٹتے ہی فوراً نیند آجاتی ہے خواہ دن بھر میں نے کچھ ہی کیا ہو اور مجھ پر کچھ بھی گزرا ہو۔ مجھے نیند کی دعوت دینے کے لئے کبھی کسی دوا یا اور کوئی شئے کے استعمال کی ضرورت نہیں ہوئی۔

تمام چھوٹے موٹے عارضات کا علاج مسولینی کے پاس فاقہ کرنا یا روزہ رکھنا ہے۔ مسولینی روزے کو نہ صرف صحت کے لئے نہایت ضروری خیال کرتا ہے بلکہ ہر قسم کی چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا بہترین علاج سمجھتا ہے۔ جب کبھی وہ اپنی تندرستی میں ذرا سی بھی کمی محسوس کرتا ہے وہ فوراً روزہ رکھنا شروع کر دیتا اور کم از کم دو روز تک مسلسل کھانا نہیں کھاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری بہت ساری بیماریاں محض ہمارے خوراک کی بے توجہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً روزہ رکھنے یا دو ایک روز صرف میوجات کا عرق استعمال کرنے سے بہت ساری بیماریاں ابتدا ہی میں بہ آسانی دبا دی جاسکتی ہیں۔

جب مسولینی سے یہ سوال کیا گیا کہ وہ اس قدر زیادہ کام روزانہ کس طرح انجام دیتا ہے تو اس نے جواب دیا۔ میں نے اپنے عمل کو تقسیم کار کے اصول پر ترتیب دے رکھا ہے وقت ضائع کرنے اور بیکار کاموں میں شریک ہونے سے بچنے کی دائمی جد وجہد کرتا رہتا ہوں۔ اس سے میرے کام کی مقدار اور مجھ میں تکان کی عدم موجودگی کی تشریح ہو سکے گی۔ میں نے اپنی ہستی کو ایک مشین بنا رکھا ہے جو نہایت استقلال و باقاعدگی کے ساتھ کام کرتی ہے۔ جس کی متواتر نگرانی کی جاتی ہے اور پورے قابو میں رکھا جاتا ہے۔ یہی آخر کلام اور ساتھ ہی ساتھ اس کے پرہیز کی اصول مسولینی کی صحت و پھرتی کے ذمہ دار نظر آتے ہیں۔ انہی اصولوں کے پابند ہو کر ہم بھی یقیناً مسولینی کے مانند جسمانی صحت و تندرستی کو بدرجۂ کمال حاصل کر سکتے ہیں۔

ہمایون بخت

دل کی دنیا

کیا غم کی حقیقت ہے! کیا کیا ہے مرے دل میں! / آتش ہے مرے دل میں، دریا ہے مرے دل میں

برباد تمنا کیا آباد نہیں ہوتے؟ / ہر لحظہ غم تازہ پیدا ہے مرے دل میں

کیا جانے تو اے زاہد! کیا دل کی حقیقت ہے / ہر روز نیا عالم برپا ہے مرے دل میں

وسعت کو نہ پوچھ! اس کی، عالم ہیں یہ دل ہے / سرمستیٔ عرفاں کی دنیا ہے مرے دل میں

جو اٹھ نہ سکا ہرگز ارباب ملائک سے / وہ بار گراں دیکھو رکھا ہے مرے دل میں

امروز جو حاصل ہے، فردا کی ضرورت کیا / ہنگامۂ محشر اک برپا ہے مرے دل میں

جو طور کا حاصل تھا، جو ضرب سے بالا تھا / معبود کلیم اللہ رہتا ہے مرے دل میں

رخ ہوتے ہیں پھولوں کے جس درد سے پژمردہ / وہ درد مگر پہلے اٹھتا ہے مرے دل میں

دریاؤں کی طغیانی حیراں نظر آتی ہے / جب چھلکی پھر طوفاں اٹھتا ہے مرے دل میں

اک نغمۂ لاہوتی سکھلاتا ہے مدہوشی / جب عالم بالا سے آتا ہے مرے دل میں

جس شعلہ نوائی سے دل ہوتے ہیں سیمابی / وہ نالۂ غم اول آتا ہے مرے دل میں

اک پردۂ غفلت سے روپوش ہیں میں ورنہ / ہر ذرہ دو عالم بستا ہے مرے دل میں

جرأت ہے بھلا کس کی تردید کرے میری! / اللہ کی قدرت کا جلوہ ہے مرے دل میں

بشیر النساء بیگم بشیر

اُپج پیدا کرنا

جب آپ لکھنے کے لئے تیار ہوتے ہیں تو آپ کے قلم سے سب سے پہلے یہی عام لفظ اور جملے نکلنے لگتے ہیں جنھیں آپ اپنی روزمرہ کی زندگی میں بار بار سنتے یا پڑھتے ہیں. لیکن ان کے استعمال میں احتیاط کی ضرورت ہے. اس بات کی پیہم کوشش کیجئے کہ اپنے خیالات کو خاص اپنی ہی زبان میں ادا کیا جا سکے۔ پامال اور عام ترکیبوں کا استعمال آپ کی تحریر میں کسی قسم کی کشش پیدا نہیں کر سکتا۔

جہاں آپ نے مضمون یا افسانہ لکھ لیا اُس پر نظر ثانی کیجئے اور دیکھئے کہ اس قسم کی کوئی پامال فرسودہ اور عام طور پر مستعمل ترکیبیں باقی تو نہیں رہ گئیں۔ ساتھ ہی ہر لفظ کو جانچئے معلوم کیجئے کہ اس میں کہاں تک مناسبت، تازگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔

اثنائے تحریر اور پھر نظر ثانی میں زحمتیں اٹھانا کامیاب انشاپردازی کا ایک بڑا راز ہے. اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بعض دفعہ زیادہ کاٹ چھانٹ اور بار بار کی نظر ثانی تحریر کی جدت اور دلکشی میں جان باقی نہیں رکھتی لیکن یہ یاد رکھئے کہ بغیر مسلسل محنت اور خاص زحمت کے وہ انشاپرداز جن کی کامیابیاں دنیا میں روز روشن بن چکی ہیں، اپنی زندگیوں کو معمولی منشیوں ہی کی حیثیت میں ختم کر دیتے۔ اپج حاصل کرنے کے لیے زحمتیں اٹھانا لازمی ہے بغیر کاٹ چھانٹ، اعلےٰ تخیل، اور سوچ بچار کے ایک نظری اور ذاتی اسلوب نہیں بن سکتا اور بغیر ایک فطری اور ذاتی اسلوب کے آپ کی تحریر میں انفرادیت نہیں پیدا ہو سکتی۔ نیز یہ امر ہمیشہ ملحوظ خاطر رہنا چاہیئے کہ انفرادیت فن لطیف کے ہر شعبہ اور ہر پہلو میں نئی روح دوڑا دیتی ہے اور اہلِ ذوق اسی کو اچھی چیز سمجھنے لگتے ہیں۔

نومشق انشاپردازوں کو چاہیئے کہ ہمیشہ اس حقیقت حال کو پیش نظر رکھیں کہ ہر زبان کے ادبی شہ کار زیادہ تر وہی ہوتے ہیں جن کے لئے ان کے مصنفوں نے خاصہ وقت صرف کیا ہے اور جو کافی محنت اور توجہ کے ساتھ لکھے گئے ہیں. تاریخ ادب اُردو پر نظر رکھنے والے اس واقعہ کو نہیں بھول سکتے کہ محمد حسین آزاد مرحوم جن کی کتابیں آج اردو کے لئے مایۂ ناز ہیں اور اپنے بے نظیر اسلوب کے باعث ادبیاتِ عالیہ مانی جاتی ہیں اپنی تحریر میں متعدد بار کاٹ چھانٹ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی بعض تحریروں کے جو مسودے اس وقت موجود ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں ایک ایک لفظ کے لئے کتنی محنت اور تلاش اور ذوق ادب سے کام لینا پڑتا تھا۔ ایک جملہ لکھنے کے بعد جب اسے دو دو تین تین دفعہ کاٹنے کی ضرورت پڑتی اور اس جملہ کے اطراف کی خالی جگہ ان کے ترمیم جملوں سے بھر جاتی تو وہ مجبور ہو کر اس جملہ پر کاغذ کی ایک چیپی لگا دیتے۔ اکثر دفعہ تو ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی جملہ کے لئے ایک کے بعد ایک کاغذ کی کئی چیپیاں لگائی گئی ہیں۔

یہی غیر معمولی محنت اور توجہ تھی جس کی بناء پر آج آزاد کا اسلوب بے نظیر سمجھا جاتا ہے اور دوسرے انشاپردازوں کے لئے ناقابلِ تقلید ہے۔

یہی حال اردو کے ایک دوسرے بڑے ادیب علامہ شبلی نعمانی کی تحریروں کا ہے۔ ان کے متعلق بھی مشہور ہے کہ وہ اپنے ذاتی مسودوں کی طباعت کے لئے کتابت ہوجانے کے بعد بھی کاپیوں اور پروفوں کو نہایت احتیاط اور توجہ سے دیکھتے تھے اور ایک ایک لفظ میں ترمیم کرتے تھے۔

یہ تو ہماری زبان اردو کا ذکر تھا۔ دنیا کی دوسری زبانوں میں اگر اس قسم کے واقعات کی تلاش کی جائے تو سیکڑوں مثالیں دستیاب ہوسکیں گی اور ان کے نقل کرنے کے لئے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہوگی۔ تاہم ان حضرات کی خاطر جو ہر خیال کا ثبوت انگریزی زبان کے کسی مصنف یا کتاب سے حاصل کرنا چاہتے ہیں دو چار مثالیں یہاں درج کی جاتی ہے۔

سب سے واضح مثال گذشتہ صدی کے سب سے بڑے انگریز شاعر لارڈ ٹنی سن کے کلام کی ہے۔ وہ اپنی نظموں میں اس قدر ترمیم کیا کرتا تھا کہ جب کبھی اس کے کلیات کی نئی طبع (ایڈیشن) شایع ہوتی تو اس کی اکثر نظمیں بہت کچھ تبدیل شدہ شکل میں پائی جاتیں۔

دوسری مثال انگریزی کے ایک بہت بڑے نثر نویس کارلائل کی تحریروں کی ہے۔ وہ ان میں آخر دم تک اتنی تبدیلیاں کیا کرتا تھا کہ آخر کار خود اہل مطبع اس کی کتابوں کے شایع کرنے سے احتراز کرنے لگے تھے۔

لندن کے مشہور آفاق برٹش میوزیم میں کئی مصنفوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے متعدد مسودے موجود ہیں جن پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے اور مشاق انشاپردازوں نے بھی ایک ایک سطر میں کئی کئی بار ترمیمیں کی ہیں۔

وحید الدین سلیم فرمایا کرتے تھے کہ انھوں نے اپنے اخبار کے لئے کوئی مضمون ایسا نہیں لکھا کہ جس پر تین تین چار چار دفعہ انہیں نظر ثانی نہ کرنی پڑی ہو۔ کمزور ترکیبوں کے دور کرنے، جملوں میں جان ڈالنے، بھونڈی صفتوں کو ہٹا کر برمحل اور واضح صفتوں کے شامل کرنے، بھدے فعلوں کو بدلنے اور ہر جملہ کی موسیقیت کے خوشگوار بنانے کی مشق اور مسلسل مشق سے ان کے اسلوب میں انتہا کی سادگی، جوش اور موسیقیت پیدا ہوگئی تھی۔ وہ اپنے شاگردوں کے مضمونوں میں بھی انہی خصوصیات کے لحاظ سے کاٹ چھانٹ کیا کرتے تھے اور اس میں اس قدر شدت پسند تھے کہ بعض دفعہ طالب علم ان کے یہاں سے اپنے کام کی نسبت نہایت مایوس کن احساسات کے ساتھ واپس ہوتے تھے۔ جب میں اپنی تصنیف "روح تنقید" کے حصے سنانے کے لئے کالج کے وقت کے بعد ان کے یہاں جایا کرتا تو ان کے ہر پارے اور بعض دفعہ ہر جملے کے دہرا دہرا کر سننے اور ترکیبوں کی تبدیلی سے اس قدر اکتا جاتا تھا کہ مکان جاتے وقت تمام راستہ اسی کشمکش میں گذر جاتا کہ کل مولوی صاحب کے یہاں کتاب سنانے جاؤں بھی یا نہیں۔

اسی سلسلہ میں نئے انشاپردازوں کی تسلی کے لئے اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ یہ زحمت اور کاٹ چھانٹ ایک عرصہ کے بعد غیر ضروری ہوجاتی ہے۔ مسلسل مشق کی وجہ سے اکثر کہنہ مشق انشاپرداز اس قابل ہوجاتے ہیں کہ بغیر جھجک اور روک ٹوک کے بہتر سے بہتر عبارتوں کی تخلیق کرسکیں۔ اور گو اس وقت لطیفے صرف چند ہی گھنٹوں میں نمودار ہوسکیں گے لیکن یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اچھا لکھنے کی یہ قوت کتنے برسوں کی پیہم زحمت کا نتیجہ ہے۔

آپ کے خیالات جس طرح کے ہوتے ہیں آپ کا قلم انہیں اسی طرح کی زبان میں قلمبند کرتا ہے۔ اگر آپ کا دماغ دقیانوسی خیالات سے معمور ہوا اور پرانی لکیروں کا فقیر بنا رہے اور پھر آپ کو اپنی تحریر میں تازگی یا جدت کے آثار نظر آئیں تو سمجھ لیجئے کہ یا تو آپ دھوکہ کھا رہے ہیں یا آپ کی تحریر ایک معجزہ ہے۔

اگر آپ کا ذہن تھکا ہوا یا سست ہو گیا ہو تو آپ کی تحریر میں شگفتگی ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی۔ اپنے خیالات کو ہمیشہ نئے نئے اور غیر معمولی راستوں سے باہر لے آئیے اور اپنے ذہنی پیکروں کو ہر وقت نت نئے لباس میں ملبوس کیا کیجئے۔

پیش پا افتادہ ترکیبیں اور قدیم روایتی جملے عام طور پر آدھے خیالات کے حامل ہوتے ہیں۔ ہوشیار انشا پرداز ان کے مطلب سے واقف ہو جاتا ہے لیکن انہیں اپنی تحریر میں گھسنے نہیں دیتا اور ان کی جگہ چند ایسی نئی نئی اور تازہ ترکیبوں کو روشناس کرتا ہے جو اس کے کلام میں انفرادیت اور قوت پیدا کر دیتی ہیں۔

فرانس کا ایک مشہور فن کار فلابیرت وہاں کے ایک بہترین فسانہ نگار گی دے موپاساں کو مشورہ دیتا ہے کہ

” ہر اس بات پر جس کو کوئی شخص ظاہر کرنا چاہتا ہے کافی توجہ کے ساتھ نظر ڈال لینی چاہئے اور کافی عرصہ تک تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ اس میں کوئی ایسا پہلو ہے جس کو اب تک کسی نے یا تو نہیں دیکھا۔ یا ظاہر نہیں کیا۔ سب سے چھوٹی شے میں بھی کوئی نہ کوئی چیز ایسی موجود ہے جو نامعلوم ہے۔ اس کو دریافت کرو۔ تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو اس کے ظاہر کرنے کے لئے ایک ہی اسم ہوگا اس میں روح پھونکنے کے لئے ایک ہی فعل ملے گا اور اس کو واضح کرنے کے لیے صرف ایک ہی صفت ہوگی پس ڈھونڈو حتیٰ کہ وہی اسم، وہی فعل اور وہی صفت دستیاب ہو جائے۔ کبھی ”تقریباً“ پر قانع نہ رہو۔ کبھی لفظی چال نہ چلو خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو“ اور مشکل دور کرنے کے لئے زبان کی بے ہودگیوں سے فائدہ نہ اٹھاؤ‘ یہ ہے طریقہ انچ حاصل کرنے کا۔“

سید محی الدین قادری زور
ماخوذ از فن انشا پردازی

تیتری

حسن رسیدہ موجِ ہوا میں | رنگ پریدہ اوجِ فضا میں
طرفہ نظارہ کوہ و دمن میں | رقصِ شرارہ کہیے چمن میں
کہیے بسنت کی رانی آئی | حور و پری یا تتلی آئی
ابھری آنکھیں موٹی موٹی | پلکیں نشتر، لمبی لمبی
افشاں پروں پر گنگا جمنی | نازک جنبش کلکِ ازل کی
اللہ اللہ کیا جوبن ہے | سج دھج کتنا من موہن ہے
تھمت ہوا سے اتری نیچے | دیکھنے والا دیکھ کے تڑپے
پائے سبک سے فتنے اٹھاتی | پیت کا سویا جادو جگاتی
پھرتی ہے اٹکھیلیاں کرتی | رقصاں خنداں شوخیاں کرتی

سیم بروں کو دیکھ کے ٹھٹکی | پاس گئی کچھ پوچھ کے پلٹی
دیکھے نرگس آنکھ دکھادی | پھول ہنسے تو شان جتادی
کلیوں کا منہ چوم اڑی اب | بو سے ان کی جھوم اڑی اب
کام ہے اس کا صبح و مسا کا | کیاری کیاری پھرنا، چلنا
خود تو ہے محبوب سبھی کی | پھر ہے پھرتی عاشق بنتی
دیتی ہے وہ درسِ محبت | جان فدا سی اتنی ہمت
بھول نہ جانا پیاری میری | ابدی فطرت ہے یہ تیری
جیون نیا کھیتی رہنا | پیت سندیسہ دیتی رہنا
حسنِ ازل پہ مرتی رہنا | جان نچھاور کرتی رہنا

سلیمان ادیب

تنقید و تبصرہ

سریلی بانسری:۔ چھوٹی کراؤن تقطیع، ۲۰۰ صفحات مجلد، مطبوعہ انڈین بک ڈپو لکھنؤ۔ قیمت عاں۔

یہ جناب سید انور حسین آرزو لکھنوی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جناب آرزو اردو دنیا میں شاعر اور ادیب کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتے ہیں، یہ مجموعہ گویا خود جناب مصنف کی زبان میں "خالص اردو" میں لکھا گیا ہے۔ اور بجائے کسی شخص کا ممنون ہونے کے، "بھارت آتما کی بھینٹ" چڑھا گیا ہے۔ اس میں کوئی سوا سو غزلیں، چند قطعات، رباعیوں اور دو تین نظموں کے علاوہ ایک مضمون بھی شامل ہے۔ غزلیں، نہایت صاف سلیس اور عام فہم زبان میں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جناب آرزو کو اس میں تھوڑی بہت محنت اٹھانی پڑی ہوگی، لیکن اس میں انھیں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے، اس کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ کوشش کا اثر کہیں ظاہر نہیں ہوتا۔ حقیقت میں یہ ایک نمونہ ہے سلیس زبان کا اور پھر اس کا غزل میں کامیابی کے ساتھ استعمال ہونا شاعر کے قادر کلام ہونے کا ثبوت ہے۔ غزلیں اول سے آخر تک پرلطف اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ رباعیوں میں غالباً یہ رنگ چمک نہ سکا اس لئے ان کی تعداد دو سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔

مجموعے کی ابتدا میں جناب سید علی عباس حسین کا ایک تعارف بھی ہے، جس میں جناب آرزو کے مختصر سے حالات اور کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ خود مصنف کا ایک مقدمہ ہے، جو انھیں کے الفاظ میں "ایک علمی اور تحقیقی بحث کا ٹکڑا ہے"۔ اس میں مصنف نے ایک دلچسپ بحث "اردو" اور "خالص اردو" کی چھیڑی ہے۔ مصنف نے لکھا ہے: "خالص اردو" وہ ہے جس سے عربی اور فارسی کے الفاظ خارج کر دئے جائیں، اس بحث کی ضرورت ظاہر ہے کہ موجودہ فرقہ پرستی کی شدید رو سے تعلق رکھتی ہے، جو نئے نئے روپ میں ظاہر ہوتی جا رہی ہے۔ اور جس کے جواز کے فتوے تراشنے میں آج ہندوستان کے بعض بہترین دماغ لگے ہوئے ہیں۔

سروری

حیدرآباد میں فرقہ واری مسئلہ The Communal Problem in Hyderabad مصنفہ میرزا مدعلی صاحب کامل بی، اے ال ال بی (عثمانیہ) وکیل ہائیکورٹ چھوٹی سائز ۱۰۰ صفحات قیمت درج نہیں ہے۔

یہ کتابچہ مصنف نے زبان انگریزی ہندوستان پریس نیو دہلی کی ایک رپورٹ کے جواب میں تحریر کیا ہے جو آل انڈیا ہندو مہاسبھا کی جانب سے ممالک محروسہ میں ہندوؤں کی عام حالت سے متعلق کچھ عرصہ قبل شائع کی گئی تھی اور جس میں حیدرآباد کے ہندوؤں کی حالت کو انتہائی ناگفتہ بہ بتلا کر پورے ہندو جاتی کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مصنف نے بہت ہی مدلل طریقہ سے ان سوالات کا جو ترک وطن، تعلیم، شہری و مذہبی آزادی اور معاشی حالات سے متعلق ہیں، اعداد و شمار کی روشنی میں جواب دیا ہے جس کے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں ہندوؤں کی صحیح حالت کیا ہے اور اس کے ساتھ حکومت کتنی رعایتیں کرتی ہے جو کسی ہندو ریاست میں بھی ہندوؤں کو نصیب نہیں۔

کامل صاحب نے انتہائی کاوش و جانفشانی سے اس کتابچہ کو مرتب کیا ہے۔ ساتھ ہی اس میں مسلم زاویہ نظر کو بھی پیش کیا گیا ہے جس سے مسائل کے سمجھنے میں بڑی سہولت ہو گئی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ان لوگوں کے لئے بے حد ضروری ہے جو ملک کے صحیح حالات سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔

ترانۂ وطن از صدق جائسی۔ دیبانی سائز صفحات ۶ قیمت ار۔ جناب صدق جائسی کی یہ نظم (۱۰) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے ابتدائی دس اشعار تمہیدی ہیں جن میں اتفاق و یگانگت کی تلقین کی گئی ہے اور ان میں ناصحانہ رنگ غالب ہے۔ اس نظم کے آخری اشعار (۱۱ تا ۱۴) خوب ہیں اور اس پوری نظم میں یہی اشعار ترانہ کا کام دے سکتے ہیں۔ ان میں آمد ہے، بیان کی خوبی ہے اور روانی ہے بحیثیت مجموعی یہ نظم اچھی ہے اور طلبائے مدارس کے لئے ایک اچھا پیام عمل ثابت ہو سکتی ہے جن کے لئے غالباً یہ لکھی بھی گئی ہے۔ **بدر شکیب**

سالنامۂ نیرنگ خیال بابت ۱۹۳۹ء باتصویر مرتبہ حکیم محمد یوسف حسن صاحب۔ ۳۲۲ صفحات قیمت عہ۔ اس سالنامہ کا آغاز حضرت سلطان العلوم خسرو دکن خلد اللہ ملکہ کے قطعہ "سال نو" سے ہوا ہے۔ سر تیج بہادر سپرو کی وہ بصیرت افروز تقریر جو موصوف نے "یوم اردو" کے جلسہ میں فرمائی تھی "اردو زبان" کے عنوان سے درج ہوئی ہے۔ "جمہوریت اور اسلام" پر پروفیسر سید حسین صاحب نے انگریزی میں جو مقالہ تحریر کیا ہے اس کا ترجمہ جناب مولراج ٹنڈن صاحب نے درج کرایا ہے۔ اس قیمتی مقالہ میں اسلام کے مفہوم اس کے اصول اور اس کی خصوصیات پر مختصر پیرایہ میں مدلل بحث کی گئی ہے۔ مہر محمد خاں صاحب شہاب نے "ولی کی شاعری" پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس کے حالات بھی لکھے ہیں۔ امداد صابری صاحب نے "افسانہ کی تشکیل" میں افسانہ نگاری اور اس کی خصوصیات پر اچھی تنقید کی ہے۔ سید مسعود شاہ صاحب نے ایران کے مشہور شاعر "فردوسی" کی سوانح حیات لکھی ہے۔ شفاعت محمود صاحب نے محمد بن تغلق کے کارناموں اور اس کی فتوحات پر تبصرہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ مخبوط الحواس نہیں تھا۔ محمد شفیع صاحب نے ابوالاثر حفیظ جالندھری کے حالات بیان کئے ہیں۔ منظر حسین صاحب شمیم نے خان بہادر میر ناصر علی صاحب مرحوم کے ادبی کارنامے لکھے ہیں۔ محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ نے "ہندوستانی موسیقی" پر ایک تاریخی مضمون لکھا ہے۔ شہنشاہ حسین صاحب رضوی ایڈوکیٹ لکھنؤ نے "نورجہاں اور جہانگیر کی داستان عشق" دلچسپ پیرایہ میں بیان کی ہے۔ ادارۂ نیرنگ خیال نے حامد اللہ صاحب افسر کی شاعری کی مختلف النوع خصوصیات قلمبند کئے ہیں۔ محمود نظامی صاحب نے ساغر نظامی کے مجموعۂ کلام "بادۂ مشرق" پر تفصیلی تنقید لکھی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی چند دلچسپ اور کارآمد مضامین ہیں۔

ڈراموں میں "ایک لطیف طربیہ" "مہمان"۔ "ہسپانوی پناہ گیر" "اڈل کے لئے لازمی" اچھے ڈرامے ہیں۔ چند مختصر افسانے بھی اس نمبر میں شریک ہیں۔ حصۂ نظم میں والاشان شہزادۂ معظم جاہ بہادر شجیع۔ حفیظ جالندھری۔ ثاقب۔ محمود اسرائیلی۔ نظیر۔ فرحت۔ سید سلیمان ندوی۔ ضیا۔ حمید اور خاموش کی غزلیں اور نظمیں کیف آور اور روح پرور ہیں۔ اس نمبر کی چند تصویریں بھی نہایت حسین اور خوبصورت ہیں۔ **مرزا سیف علیخاں**

اردو کی جدید مطبوعات

سخنوران دکن (عہد عثمانی کے شعراء کا تذکرہ) مولفہ سید تمکین صاحب عابدی ۲۸۴ صفحات۔ قیمت (۲)

نغمۂ نور (جناب بہزاد لکھنوی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ) ۲۰۰ صفحات مجلد قیمت عہ

ترکی جمہوریہ (ترکی کی سیاست کے متعلق) از ضمیر احمد صاحب ہاشمی۔ ۴۳۶ صفحات مجلد قیمت عاں

لینن (سوانح حیات) از ڈاکٹر محمد اشرف صاحب۔ ۲۲۰ صفحات قیمت عہ

مراۃ العروس (جدید ایڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۳۲ صفحات قیمت ۱۲

بنات النعش (جدید ایڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۳۰ صفحات قیمت ۱۵

توبۃ النصوح (جدید ایڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۷۸ صفحات قیمت ۵ار

ریڈیو ڈرامے (آٹھ ڈراموں کا مجموعہ) از فضل حق صاحب قریشی ۱۹۲ صفحات قیمت عہ ۴ر

اندھی دنیا (افسانوں کا مجموعہ) از اختر انصاری صاحب دہلوی ۱۵۸ صفحات قیمت عہ ۴ر

بڑبس (مزاحیہ افسانہ) از شوکت تھانوی قیمت عہ ۴ر

لاشوں کا شہر (افسانے) از محترمہ بیگم صاحبہ عبدالقادر۔ قیمت عہ ۴ار

شمعِ راہ (خطبات) از پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ صاحب ۱۱۵ صفحات قیمت ۱۰ر

خوابِ فراموش (انگریزی ناول کا ترجمہ) ۲۵۰ صفحات قیمت عہ۔ ہندوستانی لٹریچر کمپنی ۴۲۔ بیڈن روڈ۔ لاہور

سالنامہ حقیقتِ اسلام بابت ۱۹۳۹ء ۱۴۴ صفحات قیمت ۸ر۔ پیکو لمیٹڈ۔ بیرون موچی دروازہ۔ لاہور

رہنمائے تعلیم (تپ دق نمبر) مرتبہ سردار صاحب۔ ماسٹر جگت سنگھ ۲۶۰ صفحات قیمت عار۔ دفتر رسالہ رہنمائے تعلیم۔ لاہور

لندن کی ایک رات (افسانہ) از سید سجاد ظہیر صاحب ۱۵۲ صفحات قیمت عہ۔ وزیر منزل۔ لکھنؤ۔

نوجوان اور مغلسی (اصلاحی مضمون) از سید صابر حسین صاحب قیمت ۱۰ر حلقۂ ادب۔ لکھنؤ۔

قرآن شریف کا تلنگی ترجمہ از چلکوری نارائن راؤ صاحب۔ ایم اے پی ایچ ڈی۔ معلم السنۂ شرقی۔ چار روپیہ۔ زمزم اننت پور

شہید پجارن (تاریخی افسانہ) از عبدالستار صاحب قمر قیمت ۲ر۔ سیٹھ آدم جی عبداللہ اینڈ کمپنی۔ نولکھا۔ لاہور

ماماہری۔ از خلیل احمد صاحب بی اے ۲۰۰ صفحات قیمت عہ۔ اردو لٹریچر سوسائٹی ۹۶ ٹمپل روڈ۔ لاہور

بچوں کی بیماریاں۔ از ڈاکٹر سید ممتاز حسین صاحب ۲۰۰ صفحات قیمت عہ۔ دفتر رسالہ زیب النساء لاہور

سازِ ہستی (ناول) از محزون صاحب قیمت عہ ۴ر دارالادب پنجاب۔ لاہور

انسدادِ گداگری۔ از سلطان احمد صاحب قیمت ۸ر۔ منیجر صاحب کتب خانہ شمسیہ۔ مدراس۔ امرتسر

ریاضِ قدسیہ (نوحوں کا مجموعہ) از محترمہ سیدہ قدسیہ خاتون صاحبہ قدسیہ۔ قیمت ۸ر۔ قصر الادب دفتر شاعر آگرہ۔

تاریخ الہ آباد۔ مولفہ مولوی سید مقبول احمد صاحب قیمت للعہ۔ کتابستان الہ آباد

بادۂ فطرت (نظموں اور غزلوں کا مجموعہ) از میر زیدی صاحب ۲۰۸ صفحات قیمت ۱۲ر اشرف بک ڈپو۔ نولکھا۔ لاہور۔

اسلامی سپہگری (فنِ حرب کے متعلق) از عبدالکریم صاحب قیمت عہ۔ نومسلم تبلیغی جماعت۔ نائی منڈی۔ آگرہ

حدیثِ حسن (نظموں کا مجموعہ) از شمیم احمد صاحب فطرت قیمت عہ۔

اردو مضمون نویسی از پروفیسر نانک پرشاد صاحب بی اے قیمت ۸ر۔ زمانہ بک ایجنسی۔ کانپور

راز و نیاز (ادبی مضامین) از سلطان احمد صاحب وجودی قیمت عہ۔ دفتر رسالہ عصمت کوچہ چیلان۔ دہلی

من کی بیٹا (اصلاحی و معاشرتی مضامین) از محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ بی اے قیمت ۸ر دفتر سب رس خیریت آباد

مسلمان عورت کے حقوق (حقوقِ نسواں کے متعلق) از حضرت علامہ راشد الخیری مرحوم قیمت ۱۲ر

ساجن موہنی (تسخیرِ شوہر کے طریقے) از علامہ مرحوم قیمت ۴ر باقی آئندہ

مرزا سیف علی خاں

فریب

جب چراغ ٹوٹ جاتا ہے تو اس کی روشنی ختم ہو جاتی ہے۔ جب بادل منتشر ہو جاتے ہیں تو قوس قزح کی رنگینیت فنا ہو جاتی ہے۔ جب ساز ٹوٹ جاتا ہے اس کے نغمے خاموش ہو جاتے ہیں۔ جب زبان اظہار مدعا کر دیتی ہے تو محبت کا بڑھتا ہوا جوش ٹھنڈا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ساز شکستہ سے نکلے ہوئے نغمے مسرور نہیں کر سکتے۔ روح کے شکستہ ساز سے ترانے نہیں، دل گداز آہیں نکلتی ہیں۔ وہ نغمے نہیں ہوتے۔ کسی عالی شان عیش محل کے کھنڈرات سے گزرتی ہوئی ہوا کی سائیں سائیں ——

جو دل کبھی کاشانہ محبت تھا جس کا ہر گوشہ مسرور نغموں سے گونجتا تھا۔ آج برباد ہے۔ اس کے کسی گوشہ میں اس کے مکین کی یادگار تک باقی نہیں۔

"محبت"! تو دنیا کی کمزوری کو دور کرتی ہے۔

"تو" کمزور ترین شئے یعنی "دل" میں پیدا ہوتی ہے۔ پھولتی پھلتی ہے اور فنا ہوتی ہے۔ یہ کیوں؟ تو نہیں جانتی کہ دل کی خواہشات تیری شان و شوکت کو برباد کر دیں گی۔ جس طرح سے عالی شان سے عالی شان محل بڑھتے ہوئے طوفان کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ تیری دلچسپ فضا میں افسوس ناک تغیر پیدا ہو جائے گا۔ جس طرح برسات کی گھنگھور گھٹائیں اور ننھی ننھی پھوہار کی کیفیات کو چمکتے ہوئے سورج کی ایک شعاع برباد کر دیتی ہے۔

تو اس خانہ بدوش پرند کی مانند ہو جائے گی جو شاداب درختوں میں گھونسلا بناتا ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ خزاں کا موسم اس درخت کے خوشنما لباس کو پرزے پرزے کر کے اتارنے کے درپے ہے۔

تو اس درخت کے مثل ہو جائے گی جو بہار کی رنگینیوں کو دیکھ کر ہمیشہ سرسبز رہنے کے خواب دیکھتا ہے مگر خزاں اس کو عریاں کر کے دنیا کی نظروں میں "بربادی کی یادگار" بنا دیتی ہے۔

احمد علی اکبر راز قاسمی
(ماخوذ از انگریزی)

غزل

گھرا ہے ابر اور موسم جواں ہے
کہاں ہے مطرب رنگیں کہاں ہے

ہوائیں کیف میں ڈوبی ہوئی ہیں
جوانی از زمیں تا آسماں ہے

زہے موسم کہ محفل جم رہی ہے
خوشا قسمت وہ مجھ پر مہرباں ہے

ہے رقصیدہ نظر میں بزم دنیا
نشے میں مجلس پیر مغاں ہے

حساب دوستاں میں جانتا ہوں
مرے دل میں حساب دوستاں ہے

مری کیا ہمسری کوئی کرے گا
مرا سکہ دو عالم میں رواں ہے

میر اک مصرعہ ہے اک تفصیل عشرت
بقا کیا خوب انداز بیاں ہے

مسیح الحسن بقا نقوی البخاری
(بجنور ہاؤس شیر افغان دروازہ)

نذرِ اقبال

۱۔ جگدیش چندر بوس کی جدائی کے بعد اقبال کی مفارقت ایک دوسرا سانحہ ہے اور عظیم تر

۲۔ حقیقت میں ایک بڑے انسان کی زندگی ساری قوم کی زندگی اور اس کی موت ساری قوم کی موت ہوتی ہے۔

۳۔ حسنِ نامعلوم ہمیشہ معلوم صورتوں میں پوشیدہ رہا۔ وہ کہیں بجلی ہے، کہیں کہیں ابر، کہیں پھول، کہیں بلبل اور کہیں شاعر کی زبان۔
اقبال کے منہ میں بھی زبان ہے جو کچھ بول رہی ہے اور کچھ سنا رہی ہے — ایسا بول جو سب سے بالا اور ایسا نغمہ جو روح القدس کے ضمیر وں میں نہیں!
دنیا کی تصویریں نسل و وطن بدترین خد و خال ہیں۔ انسان چاہے تو انھیں مٹا کر ایک عظیم الشان برادری کی بنیاد رکھ سکتا ہے۔ انسانیت کا تخیل کتنا ہی اہم سہی، لیکن اہم ترین وہ کوشش ہے جو اس کی طلب میں صرف ہو۔

۴۔ آہ مر گئی وہ آواز جو مژدۂ آزادی، نویدِ امن اور جہانِ نو کی بشارت بن کر دور و نزدیک سنائی دیتی تھی ———

اب اس کی ایک گونج ہو گی جو مستقبل کی وادیوں میں رہ جائے گی
ڈوب گیا وہ دن جو آل آدم کی تاریخ میں نہایت روشن اور شاندار تھا ——— ——

اب اس کی
ایک جھلک ہو گی جو آنے والی تاریکیوں میں رہنمائی کرے گی

۵۔ قدرت نے اقبال کو ہم سے چھین کر اپنی کمی پوری کر لی
اور ہم نے اقبال کو دے کر اپنا سب کچھ کھو دیا

۶۔ آج ہمارے دل افسردہ ہیں اور ہماری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز
کاش یہ آنسو نذرِ شاعر ہو کر
لافانی بن جائیں!

امیت راونگ آبادی

اقبال اور فلسفہ

فلسفۂ دنیا کے متعلق مختلف مدارسِ خیال ہیں لیکن سب کے سب انسان کو ترکِ عمل اور خواب کی تعلیم دیتے ہیں اس کے برعکس اقبال کا پیغامِ عمل انسان کو نیند سے بیدار کرنے والا ہے۔ اس خیال کو اس نظم میں ادا کیا گیا ہے و نیز اقبال کے فلسفہ سے دوسرے تمام مدارسِ خیال کے جواب دئے گئے ہیں۔

ابراہیم ادہم کی تلقین

اے زمزمہ سنجانِ طرب میری سنو کچھ
اے نوحہ سرایانِ الم مجھ سے کہو کچھ
ہاں میری نصیحت سے خبر ہو کہ نہ ہو کچھ
ہاں میری تسلی کا اثر لو کہ نہ لو کچھ

دنیا کو سرا اک اتر پڑنے کی جا نو
اک بات ہے حق کی اسے مانو کہ نہ مانو

کس بات پہ بھولا ہوا اس باغ میں تو ہے
ہستی نہیں تیری گلِ خوش رنگ کی بو ہے
اک قطرۂ شبنم ہے جو خورشید بہ رو ہے
یا ٹوٹنے والا تو حبابِ لبِ جو ہے

دو دن کی بہاروں سے نہ دل اپنا لگا تو
صدمہ سے خزاں کے نہ پھر اس دل کو دکھا تو

اس ہستیٔ فانی کی بہاروں پہ نہ جانا
اس گلشنِ خوش رنگ کے دھوکوں میں نہ آنا
دو روز کی دنیا کا یہ رنگیں ہے فسانا
گو عیش کی ہستی ہے نہ کچھ غم کا ٹھکانا

ہر رنگ کو گردش ہے طرب ہے کہ الم ہے
پائندہ بس اک دورِ تغیر کا علم ہے

اس دار کے دیوار و سقف گنبد و در چھوڑ
اس باغ کے گل چھوڑ شجر چھوڑ ثمر چھوڑ
یہ سیم دغل چھوڑ زر و لعل و گہر چھوڑ
یہ فتنۂ و شر چھوڑ زن و دختر و پسر چھوڑ

تنہائی میں کر بیٹھ کے حل راز یہاں کا
شاید کھلے جنگل میں طلسمات جہاں کا

پیامِ خیام

ہیں راز بڑے دہر پُر افسوں کے پرانے
حل کر نہ سکے جن کو حکیم اور سیانے
کچھ ساقی و مطرب کے سنا یار فسانے
کم وقت ہے دو چار تو خم دیدے لنڈھانے

اِس ذکر کے سننے کی نہیں ہے مجھے فرصت
جو وقت میسر ہے غنیمت ہے غنیمت

آئینۂ صفت زنگ سے تیور پہ نہ بل آئے   دل صورت گل خار کی کاوش ہی سے کھل جائے
مانا کہ یہہ دنیا ہے مصائب کی فقط جائے   رکھ عرش پہ دل ڈھونڈنے سے غم نہ جسے پائے

وہ صورت مینا نہ تو مخمورِ مسرت
اور عیش کی دے داد جو گردش میں ہے قسمت

خدام ہیں تیرے زِ سما تا بہ سمک دیکھ   جو گوشہ میں افسر شاہی کی دمک دیکھ
ہے خاک نشیں تو مگر انوارِ فلک دیکھ   تاریکیٔ شب میں مہ و انجم کی چمک دیکھ

اس عقل الم کوش کو ساغر میں ڈبو دے
سب کلفتِ دیرینہ بس اک جرعہ میں دھو دے

ویدانتی کا فلسفہ

کچھ پوچھ نہ اے دوست کہ کیا راز ہے عالم   اک خواب مسلسل ہے نظر آئے جو مبہم
تصویر خیالی ہے جو کچھ دیکھتے ہیں ہم   یا عکس تصور کہ جو ہو درہم و برہم

ہم دیکھتے ہیں اپنے تصور کے اثر کو
یہہ اصل حقیقت ہے کہ دھوکہ ہے نظر کو

اس مزرعِ بے بود میں بویا بھی تو پھر کیا   اس بازیٔ بے سود میں کھویا بھی تو پھر کیا
اس غمکدۂ وہم میں رویا بھی تو پھر کیا   اس عالم تصویر میں سویا بھی تو پھر کیا

حاصل ہی جو ہے خرمنِ بے اصل کا معلوم
پھر رنج و تعب کا بھی رہا اب کوئی مفہوم

اقبال کا پیامِ عمل

انسان جو اس بزم کا اک رکن رکیں ہے   جو اشرف مخلوق سماوات و زمیں ہے
مسجودِ ملک کنگرۂ عرش بریں ہے   کیا اپنے فریضہ سے وہ آگاہ نہیں ہے
معیارِ شرف گنج قناعت نہیں اس کا   مقصود اتم رنج و مسرت نہیں اس کا
بلبل کے لئے ہے کہ کرے نغمہ شعاری   ہے شمع کو زیبا جو کرے گریۂ و زاری
تو گوشۂ عزلت میں کرے عمر گذاری   جو کام کہ کرنا ہے تجھے کام ہے بھاری

مقصود تری زیست کا ہے ارفع واعلیٰ — جو تیرا فریضہ ہے وہ ان سب سے ہے بالا
یہ عمر جو ہر لحظۂ و ہر دم گزراں ہے — لاریب کہ قبضہ میں ترے نقدِ رواں ہے
اک آگ تری ہستیِ فانی میں تپاں ہے — اک برق ترے قلب میں ہنگامہ کناں ہے
للکار ہے جس کی کہ بڑھے جاؤ جہاں میں
ہے جذبِ قیامت کا اس آوازِ نہاں میں

اے نیند کے ماتے تو ذرا اٹھ کے سنبھل دیکھ — ہے تاک میں ہر ایک یا ہیچ کی اجل دیکھ
اس ذہن کے زنداں سے نکل اور تو چل دیکھ — گر خواب تری زیست ہے تو خوابِ عمل دیکھ
سب خوابوں سے دلکش ہے بہت خوابِ ترقی
تو کھولتا جا خواب میں ابوابِ ترقی

ہر شکل ہے کھولے ہوئے آغوشِ ترقی — ہر سینہ میں ہے موج زناں جوشِ ترقی
صوفی ہے بڑا سب سے قدح نوشِ ترقی — ہشیاروں سے ہشیار ہے مدہوشِ ترقی
ہے صاف عیاں حاجتِ اظہار نہیں ہے — قدرت کا عطیہ ہے یہ بیکار نہیں ہے
محکوم بنا بھاپ کو اور برقِ تپاں کو — محسوس بنا شکل مکاں بُعدِ زماں کو
جا ڈھونڈنے مریخ میں اسرارِ جہاں کو — لا توڑ کے افلاک کے انوارِ رواں کو
ہے فیض یہ نفسِ تپش آمادہ کا تیرے
تسکیں کے لئے جان ہی خود اپنی نہ کھو دے

جذبہ جو یہ بخشا ہے عنایت ہے خدا کی — ہاں اپنی کرو قدر کہ نعمت ہے خدا کی
سینوں میں تمہارے یہ ودیعت ہے خدا کی — ہرگز نہ تلف ہو کہ امانت ہے خدا کی
میدانِ ترقی میں قدم اپنے بڑھاؤ
اس نعمتِ عظمیٰ کو چلو کام میں لاؤ

ابو الفتح نصر اللہ برقی

فیض سخن (ادارۂ ادبیات اردو کی ایک اہم کتاب)

میر شمس الدین محمد فیض اردو شاعری کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ صاحب دل بزرگ مانے جاتے تھے اور عاشقانہ شاعری میں تصوف کی رنگ آمیزی کرتے تھے۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ نے حضرت فیض کے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے اور اس کے ساتھ ان کا مقدمہ بھی ہے جس میں فیض کی حیات اور شاعری پر بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۱۲ر تعداد صفحات ۱۴۴ مع تصویر مقبرۂ حضرت فیض (سب رس کتاب گھر سے طلب کیجئے)

نوحۂ غم

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

دنیا میں زندگی اور موت کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے تعمیر و تخریب فطرت کا ایک ابدی تماشا ہے جو ازل سے اس وقت تک جاری ہے اور ہمیشہ رہے گا جس طرح دنیا میں ہر لمحہ اور ہر گھڑی زندگی نئی نئی شکلوں میں ظہور پذیر ہوتی ہے اور نئے نئے قالب اختیار کرتی ہے اسی طرح فطرت پرانی شکلوں کو مٹاتی ہے اور پرانی عمارتوں کو ڈھاتی ہے تاکہ تجدد حیات کے لئے راہ نکالے۔

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے

سبھی جانتے ہیں کہ موت ایک یقینی اور ناگریز شئے ہے جس سے بچنا محال ہے۔

اَینَما تکونُوا یُدرِککُّمُ الموتَ وَلَو کُنتُم فِی بُرُوجٍ مُشیَّدَة
(قرآن)

تم جہاں بھی ہو موت تمہیں پالے گی خواہ تم مستحکم برجوں میں کیوں نہ بند ہو۔

لیکن اس علم کے باوجود شاید ہی کوئی شخص ہو جو موت کے منظر سے متاثر نہ ہوتا ہو۔ موت کسی کی بھی ہو اور کسی حالت میں کیوں نہ واقع ہو اپنے اندر صدہا سامان رنج و الم رکھتی ہے کون ہے جو دوستوں اور عزیزوں کی موت پر آنسو نہیں بہاتا اور عنان ضبط اپنے ہاتھوں سے کھو نہیں دیتا ہے عقل کی راہبری ایسے وقت کام نہیں دیتی ہے اور استدلال کے پائے چوبیں لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ خاندان کا جب کوئی بڑا بزرگ اٹھ جاتا ہے تو ہر فرد بے چین نظر آتا ہے ہر سینہ فگار اور ہر آنکھ اشکبار رہتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاندان کی عظمت و رفعت بھی مرنے والے کے ساتھ پیوند خاک ہو جائے گی یہی حال قوموں کا ہے۔ دنیا میں بہت کم لوگ پیدا ہوتے ہیں جو حقیقی عظمت کے مالک ہوں جنھوں نے اپنے خون جگر سے قومی زندگی کی آبیاری کی ہو جن کی ذات ملک و قوم کے لئے نازش و افتخار کا باعث ہو مگر جب کسی ایسے شخص کی موت واقع ہوتی ہے تو قومی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے جس کو پُر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ایسے افراد کی موت ایک قومی نقصان ہے جس کی تلافی صدیوں تک نہیں ہو سکتی ہے۔ جو قوم ان کو کیوں نہ روئے اور ان کے ماتم میں سیہ پوشی کیوں نہ اختیار کرے۔

اقبال کی موت ہمارے لئے ایک مصیبت عظمیٰ سے کم نہیں ہے۔ صدیوں کے بعد ایک ہستی پیدا ہوئی تھی جس کو پنجۂ موت نے ہم سے چھین لیا اور ہمارے دلوں کو فگار اور سینوں کو داغدار کر دیا۔ آہ وہ الفاظ کہاں سے آئیں جن سے ہم اپنے جذبات غم کا اظہار کر سکیں۔ شدت الم سے آنسوؤں کا دریا خشک ہے اور ماتم و فغاں کی زبان بند ہے۔ کیونکہ چمنستان ادب کا سب سے زیادہ خوبصورت پھول مرجھا گیا، شاعری کے باغ سے شادابی رخصت ہو گئی۔ عروس سخن سوگوار ہے کہ اس کا سہاگ لٹ گیا اور اس کی

زینت و آرائش کا سامان اس سے چھن گیا۔ شعر وسخن کی محفل سونی ہے کہ اس کا طائر خوش نوا ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا اب کون ہے جس کی زمزمہ سنجی سے دردمند قلوب اپنے زخموں کے لئے تازگی اور اپنی روح کے لئے سوز و گداز کی غذا حاصل کریں گے۔ کس کی آنکھیں زوال ملت پر خوننابہ فشانی کریں گی کس کا قلب مسلمانوں کے مصائب پر رنج والم سے بے قرار ہوگا کس کی زبان یاس و ناامیدی کی فضائے تاریک میں امید کا پیغام سنائے گی اور دلوں کو درد ملت سے آشنا کرے گی آہ موت نے ہمارے سرمایۂ ملی کا راس المال ہم سے لے لیا اور ہمارے متاع ذہنی کا سب سے زیادہ خوش آب موتی ہم سے چھین لیا۔

ہوتے جو کئی دیدۂ خونبابہ فشاں اور　　　ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا

اقبال کا پیغام

۔ اقبال کی قدر و عزت ہمارے دلوں میں صرف اسی لئے نہیں ہے کہ اس نے ہماری زبان و ادب کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ کیا اور ہماری شاعری کے لئے جس کے خیالات و افکار کا دائرہ اب تک محدود تھا ایک نئی شاہ راہ کھول دی۔ اقبال کا مایۂ ناز کارنامہ تو وہ پیغام زندگی ہے جس کے لئے عالم اسلام ایک مدت سے گوش بر آواز تھا۔ جس نے مسلمانوں کو غفلت کی نیند سے چونکایا، اور انھیں اخوت اسلامی کا درس دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت جمال الدین افغانیؒ کے بعد عالمگیر اسلامی اخوت کا اگر کوئی علم بردار تھا تو وہ اقبال ہی تھا۔ اقبال کی شاعری میں جو چیز بمنزلہ روح کے ہے وہ یہی پیغام اخوت اور درسِ اتحاد ہے۔ وطنیت اور قومیت کے جدید تخیل کے خلاف اقبال نے جس بے باکی سے اپنی صدائے مخالفت بلند کی ہے وہ اس کی اخلاقی جرأت کا ثبوت اور اس پر شاہد عادل ہے۔ اقبال نے محسوس کیا کہ وہ وطنیت اور قومیت موجودہ دنیا جس کی اس قدر دلدادہ ہے اور جو تہذیب جدید کی اساس و بنیاد ہے ان اوہام باطلہ میں سے ہے جنھوں نے وحدت انسانی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اس کی نگاہوں نے اس راز کو پا لیا کہ قومیت کا یہی محدود تصور امنِ عالم کا غارت گر اور اخوتِ انسانی کے لئے سمِ قاتل ہے۔ اس کی بجائے اس نے اسلام کا وہ تصورِ حیات پیش کیا جو قوموں اور جماعتوں کو شیرازۂ اخوت میں جوڑتا ہے اور انسانی قلوب میں محبت کی تخم ریزی کرتا ہے اور بغض و عداوت کے جذبات کو مٹاتا ہے۔ یہ تھا اقبال کا پیغام جس کے لئے وہ دنیا میں آیا تھا، جس کے لئے اس نے اپنی عمر عزیز صرف کی اور جس کی آرزو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔

اقبال کی شاعری کی ایک خصوصیت جو اس کا وصفِ امتیازی ہے اور جس کا فقدان ہماری شاعری کا ایک تاریک پہلو ہے اس کی رجائیت ہے جو ہماری کشتِ امید کو سرسبز اور آرزو کی شاخ کو تر و تازہ رکھتی ہے، جس کے اثر سے دل حزن و ملال کی گرد سے پاک و صاف ہو جاتے ہیں۔ اردو شاعری پر اب تک یاس و حسرت اور رنج والم کے جذبات کا غلبہ رہا ہے جس کی وجہ سے وہ قومی زندگی کے ضعف اور حیات اجتماعی کے اضمحلال کا سبب بنی رہی خواہ وہ اپنے رنگ میں کیسی ہی کامیاب کیوں نہ ہو۔ ہمارے شعرا کا بیشتر حصہ زندگی کے بجائے موت شادمانی کے بجائے افسردگی اور نشاط و مسرت کی جگہ حزن و یاس کا پیغامبر ہے۔ ہماری شاعری نغمۂ نشاط نہیں بلکہ نوحۂ غم ہے جس سے درد والم کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور جس دل تک پہونچتی ہیں اسے خوشی و مسرت امید و وسوسہ خواہش حیات اور جوشِ عمل سے خالی کر دیتی ہیں۔ اس کے برعکس اقبال کی شاعری بحیثیت مجموعی انسانی زندگی کا رخ روشن پیش کرتی ہے دلوں کو گرماتی ہے امید کو تازہ کرتی ہے اور دنیا کو

مژدۂ مسرت اور نوید کامرانی سناتی ہے۔ یہ وہ چشمۂ رواں ہے جس کا پانی انسان کو زندگی بخشتا ہے اس کی روح کو بالیدہ اور اس کی ہمت کو بلند کرتا ہے۔ یہی ہے جس سے قومی زندگی کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں اور اس کا درخت برگ و بار لاتا ہے۔

پھر اب کون ہے جو اس سوکھی ہوئی کھیتی کو پانی دے گا اور اس میں عمل پیہم اور یقین محکم کے وہ بیج بوئے گا جن سے قومیں پھلتی اور ترقی کرتی ہیں۔

محمد مظہر الدین صدیقی

اقبال

(یوم اقبال بریلی کالج کی ایک کامیاب نظم)

مشعلِ راہِ ہدایت ہستیٔ اقبال تھی ۔۔۔ اس کی نکتہ رس نظر آئینہ دارِ حال تھی
ہر زمینِ شعر اس کی آسماں اجلال تھی ۔۔۔ اس کے دم سے شاعری زندہ تھی مالامال تھی

نیرِ شعر و ادب اس نے درخشاں کر دیا
سنگ کو ہم پلۂ لعلِ بدخشاں کر دیا

شاعری نازاں ہے اس کی جدتِ گفتار پر ۔۔۔ ایشیا کو ناز ہے اقبال کے کردار پر
فخر کرتا ہے زمانہ شاعرِ خود دار پر ۔۔۔ رشک کرتا ہے ادب اس کے نئے افکار پر

شاعری اقبال کی "شمعِ جہاں افروز ہے"
"توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے"

اس نے چھیڑا زخمۂ احساس سے سازِ خودی ۔۔۔ نعرۂ تکبیر سے توڑا طلسمِ بے حسی
از سرِ نو قوم کو اس نے عطا کی زندگی ۔۔۔ اس کی تعلیم عمل نے ختم کر دی بیہشی

حال و مستقبل کی اس کی شاعری آئینہ ہے
نردبانِ بامِ رفعت علم کا گنجینہ ہے

ملتِ بیضا کو پھر اس نے نمایاں کر دیا ۔۔۔ امتِ اسلام کو گوہر بداماں کر دیا
مردِ مسلم کو نئے سر سے مسلماں کر دیا ۔۔۔ اور غلامِ ہند کو بیرونِ زنداں کر دیا

کون اس کا ہند میں شرمندۂ احساں نہیں
کون سیراب زلالِ چشمۂ حیواں نہیں

بادۂ منصور سے لبریز اس کا جام تھا　　راہ پر لانا مسلمانوں کو اس کا کام تھا
خیر خواہِ ملک تھا اور خادمِ اسلام تھا　　بت شکن تھا تابعِ لانعبد الاصنام تھا
جس قدر ممکن تھی خدمت اس نے کی اسلام کی
لاج رکھ لی بانیٔ دینِ خدا کے نام کی
دوڑتا تھا اس کی رگ رگ میں اخوت کا لہو　　تا دمِ آخر رہا "سرگرم ذوقِ جستجو"
قوم کی اصلاح تھی اس کی حقیقی آرزو　　اس کا فرمانِ عمل تھا "لا تذر لا تقنطو"

سرفروشی کا سبق اس نے مسلماں کو دیا
کر گیا زندہ وہ تعلیم علی موسیٰ رضا
اس کو رفتارِ زمانہ کا صحیح اندازہ تھا　　اس کا ہر اک شعر دنیا کو پیام تازہ تھا
شرق سے تا غرب اس خوددار کا آوازہ تھا　　اس کے ہاتھوں مجتمع اسلام کا شیرازہ تھا
رومی و تبریز کے اطوار سے آگاہ تھا
جاں نثارِ مصطفےٰ تھا بندۂ اللہ تھا
رحلتِ اقبال سے ہندوستاں ماتم میں ہے　　صرف ہندوستاں نہیں سارا جہاں ماتم میں ہے
اٹھ گیا مرغِ سحر اب گلستاں ماتم میں ہے　　ایک عالم از زمیں تا آسماں ماتم میں ہے
اس کے اٹھنے سے زمانے پر اندھیرا ہو گیا
گلشنِ اردو ادب ہم رنگ صحرا ہو گیا
"آرزو کو خون رلواتی ہے بیدادِ اجل　　مارتا ہے تیر تاریکی میں صیادِ اجل"
رہروِ ملکِ عدم کو چاہیئے زادِ اجل　　ہے ہر اک انسان پر لطفِ خداداد اجل
"موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے"
"اس ستمگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے"

پروانہ بریلوی

بچوں سے

عزیز سب رس بھائیو اور بہنو!!

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ اس ماہ سر محمد اقبال کی برسی ہر جگہ منائی جارہی ہے (یوں تو گذشتہ سال جون ۱۹۳۸ء میں اقبال نمبر نکل ہی چکا تھا جس کی ابھی تک مانگ ہے) اسی لئے ہم نے اس دفعہ بھی نصف پرچہ اقبال ہی سے متعلق وقف کردیا ہے۔ نیچے ایک معمہ بھی اقبال ہی سے متعلق دیا گیا ہے اسے ضرور حل کرکے ۱۵ رمئی تک ہمارے پاس بھیج دو۔

اپریل کے پرچہ میں مس اقبال باسط علی خاں کے جو پہیلیاں شایع ہوئی تھیں ان کو حسب ذیل اصحاب نے حل کرکے روانہ کیا ہے (۱) مسیح الدین خاں متین (۲) سید نور العمر الدین (۳) محمد ظہیر احمد (۴) محمد عبد العزیز۔ پہلے کے تین اصحاب نے ایک غلطی کی ہے اور آخر صاحب نے تین غلطیاں کی ہیں۔ صحیح حل یہ ہیں (۱) چاند (۲) سال، ماہ، دن (۳) آم (۴) بجلی۔ چونکہ بعض حل ۱۵ تاریخ کے بعد وصول ہوئے اس لئے شریک نہیں کیے گئے۔

بچوں کے سب رس کے علاوہ ادارہ چاہتا ہے کہ ہمارے بھائیوں اور بہنوں کی معلومات بڑھانے کے لئے چھوٹی چھوٹی اور دلچسپ سستی کتابیں بھی چھپتی رہیں تاکہ فرصت کی گھڑیوں میں ہم سب ان کو پڑھیں اور فائدہ حاصل کریں۔ گذشتہ مہینہ میں "من کی بیتا" کتاب چھپی تھی اور اس مہینہ میں ایک دوسری کتاب "نظام الملک آصفجاہ" چھپی ہے۔ اس میں سلطنت حیدرآباد کے محترم بانی حضرت آصف جاہ اول کے مستند حالات زندگی سادہ اور سلیس زبان میں لکھے گئے ہیں ان کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ ہمارے پہلے بادشاہ کے اخلاق و عادات اور ہمت اور بہادری کیسی تھی۔ یہ کتاب بچوں ہی کے لئے نہیں بلکہ ان بڑے لوگوں کے لئے بھی مفید ہے۔ جو بڑی بڑی تاریخی کتابیں نہیں پڑھنا چاہتے۔ اسی طرح ہمارے دوسرے بادشاہوں کے حالات بھی الگ الگ چھوٹی چھوٹی کتابوں میں چھاپے جائیں گے۔ یہ کتاب صرف چار آنہ کے ٹکٹ بھیجنے پر روانہ کی جائے گی اس میں حضرت آصفجاہ اول کی رنگین تصویر بھی ہے۔

"معمہ اقبال"

ہر لفظ کے سرحرف کو جوڑنے سے ایک نام نکلتا ہے۔ بتاؤ وہ کیا ہے؟ یہ سب الفاظ بے ترتیب لکھے ہیں۔ مثلاً باسط، قادر، احمد، لبیا، اکبر، کال، قیت، اقبال ہے۔

۱۔ بمبئی۔ ناگپور۔ احمد آباد۔ گوالیار۔ رائچور۔ دولت آباد۔ احمد نگر (۲) سمرقند۔ اعظم گڑھ۔ یادگیر۔ لاہور۔ ورنگل۔ کشمیر۔ ٹراونکور (۳) آگرہ۔ نظام آباد۔ راولپنڈی۔ ڈچپلی۔ لکھنؤ۔

معین الدین احمد انصاری

موسم گرما

موسم گرما ہے یا ہے نارِ نمرود اے خدا
روح جسموں سے تڑپ کر ہوتی جاتی ہے جدا

واہ رے ہمت تری انساں بڑا جرار ہے
تیرے استقلال نے اس کو کیا گلزار ہے

اپنے استقلال کا تو نے ثمر پایا ہے آم
ہیچ ہیں اس پھل کے آگے سنترہ، انگور، جام

محمد فخر الدین ارماں (اڈگیر)

ہندوستاں ہمارا

شہری ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
ہے یہ زمیں ہماری یہ آسماں ہمارا

ویدانت بھی ہمارا قرآن بھی ہمارا
اللہ بھی ہمارا بھگوان بھی ہمارا

گنگا و رودِ جمنا اور آبِ چاہِ زمزم
سیراب کر رہے ہیں دونوں جہاں ہمارا

دیوالی اور دسہرا عید الضحیٰ محرم
ڈنڈی کی یہ سواری اور یہ شان ہمارا

یہ پوجا پاٹھ اپنا روزہ نماز اپنی
اظہارِ عقیدت کا ہے یہ نشاں ہمارا

اوتار اور پیمبر ہیں پاسباں ہمارے
سجدے میں سرنگوں ہے ہندوستاں ہمارا

۲

پہلے تو دیش بھارت امن و اماں کا گھر تھا
رہتے تھے سب مزے سے دل میں نہ خوف ڈر تھا

کیا ہو گیا ہے اب یہ جھگڑے کی ہے سمائی
کچھ بھول ہو گئی ہے سدھ اپنی ہے گنوائی

اپنے ہی بھائیوں پر آفت جو ڈھا رہے ہیں
آپس میں پھوٹ کر کے عزت گنوا رہے ہیں

امن و اماں کی دنیا برباد کر رہے ہیں
ناحق و ناروا ہی فریاد کر رہے ہیں

۳

سنتا ہے کون اپنی ہم کس کو یہ سنائیں
یہ بھول ہے سراسر کس طرح یہ بتائیں

وحدت کے فلسفہ کو ہم نے مٹا دیا ہے
دنیا سے چند روزہ یہ بھی بھلا دیا ہے

کچھ یاد بھی ہیں تم کو ایکو برہمہ کے معنی
ہے لاشریک واحد پروردگار یعنی

سارے جہاں میں ہستی اس کی ظہور اس کا
آنکھوں میں نور اس کا دل میں سرور اس کا

کثرت کی یکسانی وحدت کا ہے نمونہ
ہر ذرّہ سے عیاں ہے الفت کا یہ نمونہ

اہلِ وطن سے اپنی اب التجا یہی ہے
باز آئیں جھوٹی ضد سے بس مدعا یہی ہے

جو بات ہو پتے کی اس کو ضرور مانو
جھگڑے فساد جھوٹے ہیں ان کو جھوٹ جانو

آپس میں میل کی اک تدبیر ہم بتائیں
منوائیں کچھ وہ اپنی کچھ دوسروں کی مانیں

دیر و حرم کے یکساں سب مل کے راگ گائیں
جب نام آئے ان کا سب مل کے سر جھکائیں

بھولے ہوئے کبھی کے سب راہ پر لگیں گے
بھٹکے ہوئے جہاں کے باہم گلے ملیں گے

ڈنکا یگانگت کا دنیا میں تب بجے گا
ہندوستانی ہم کو جب ہر کوئی کہے گا

تفریق کوئی ہم میں باقی نہیں رہے گی — اُس ایک ذات ہی سے تفریق جب مٹے گی
کثرت میں وحدۃ کا جلوہ دکھائی دے گا — پھر تو ہر ایک شے میں اللہ دکھائی دے گا
مذہب پریم کا ہے دنیا پریم کی ہے — جیون کو کھینے والی نیا پریم کی ہے
رہبر اصول قدرت الفت کا راز ہے یہ — چشمہ یگانگت کا وحدت کا راز ہے یہ

سستا کھانا

مسز برکت رائے

دیہاتیوں اور دوسرے غریبوں کو تھوڑے داموں میں ٹھیک اور پورا کھانا کیسے مل سکتا ہے؟ یہ ایسا سوال ہے جس کا حل کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ پھر بھی ہم اس جگہ اس کے تھوڑے سے طریقے بتاتے ہیں۔ ان پر غور کر کے عمل کرنے سے گھروں کی حالت بہت کچھ اچھی ہو سکتی ہے۔

۱۔ گیہوں کی جگہ مکا، باجرہ یا بجھر وغیرہ استعمال کیجئے۔ اٹلی کے لوگوں کا کھانا صرف مکا، تیل اور ترکاری ہے انھیں نہ دودھ ملتا ہے اور نہ وہ گوشت انڈا وغیرہ کچھ کھاتے ہیں، پھر بھی تندرست رہتے ہیں۔

۲۔ شکر کی جگہ گڑ استعمال کرنا چاہئے گڑ میں وٹامن 'اے' ہوتا ہے۔ جو شکر میں نہیں ہوتا۔ گڑ سستا ہوتا ہے اور اور پاخانہ بھی صاف لاتا ہے۔

۳۔ ہر موسم کا کھانا انھیں چیزوں کا ہونا چاہیئے جو اس موسم میں ہوتی ہوں۔ جب جس چیز کی فصل ہوتی ہے اس وقت وہ چیز بہت سستی ملتی ہے۔

۴۔ سستے پھل اور ترکاریاں خوب کھانے چاہئیں۔ یہ خیال کہ انگور، سیب وغیرہ میں زیادہ طاقت ہوتی ہے، بالکل غلط ہے ان میں وٹامن بھی زیادہ نہیں ہوتا۔ جام امرود اور جامن وغیرہ سستے پھل مہنگے پھلوں سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔ کھانے کی چیزوں کو صرف اسی لئے برا نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ سستی ہیں۔ "گراں بہ حکمت" اور "ارزاں بہ علت" والی مثل کھانے کی چیزوں کے لئے صحیح نہیں۔
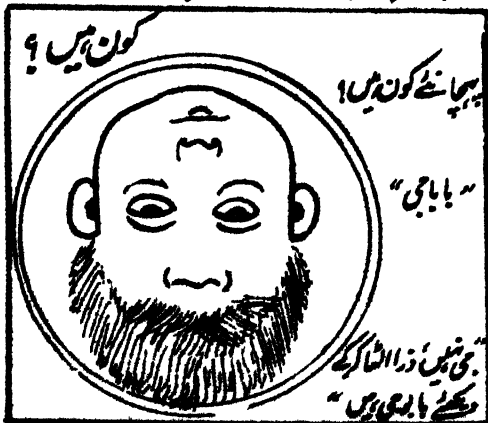
ماخوذ

(از ہل)

ہر ہٹلر

ہر ہٹلر جنگ عظیم میں جرمن فوج کا کپتان تھا۔ ۱۹۲۰ء تک کسی نے اس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ اس نے اپنی پیرو ایک جماعت قائم کی۔ یہ لوگ نازی کہلانے لگے۔ آہستہ آہستہ یہ جماعت بڑھتی گئی اور باوجودیکہ ہنڈن برگ (جنگ عظیم کا مشہور جرمن جنرل) جرمن ریپبلک کا پریسیڈنٹ تھا۔ نازیوں نے رفتہ رفتہ ملک کی تمام طاقت اپنے زیر کرلی۔ انھوں نے حکومت کی باگیں اپنے اختیار میں کرلیں۔ اس وقت سے ہٹلر جرمنی کا آہنی شخص کہلایا جاتا ہے۔ اور اس کی پوری کوشش یہی ہے کہ یہ جرمنی کو دوسری قوموں کے دباؤ سے محفوظ رکھے۔ یاد ہوگا کہ جنگ عظیم کے بعد جو صلح نامہ کے شرائط تھے ان کی رو سے اہل جرمنی کے اوپر بہت سی قیدیں لگائی گئی تھیں۔ اور انھیں اس وقت بہت نیچا دیکھنا پڑا تھا۔ ہر ہٹلر نے کچھ ہی عرصے میں صلح نامہ کے شرائط کو نظر انداز کرکے اپنی قوم کو پھر ایک طاقتور قوم بنالیا۔ چانسلر کی حیثیت سے بھی اس کی قدر ہنڈن برگ اعظم سے کم نہ تھی۔ ہنڈن برگ کی وفات پر ۱۹۳۴ء میں اہل جرمنی نے متفق الرائے ہوکر ہٹلر کو اپنا پریسیڈنٹ منتخب کیا۔ جون ۱۹۳۴ء میں ہٹلر نے ان تمام اشخاص کو جنھیں وہ اپنے سے باغی تصور کرتا تھا مروادیا۔ اس کی موجودہ پالیسی ہے کہ اپنے ملک والوں کو متحد اور ایک مضبوط قوم بنادے۔

اب ہٹلر کی بدولت جرمنی ایک آزاد قوم اور طاقتور ملک ہوگیا ہے۔ ہٹلر نے ملکی ترقی کے لئے نہایت مفید اسکیمیں بنائی ہیں۔ ملک کی ایک کثیر تعداد کو فوج میں بھرتی کیا۔ عمدہ آلوں سے زراعت کو ترقی دی۔ یہودیوں کو نکال دیا۔ صنعت و حرفت سے تجارت کو فروغ دیا۔ اس طرح اپنے ملک کو دوسرے ملکوں کے ہم پلہ کردیا۔ قومی انقلاب کا اگر پورا پورا ہٹلر کے سر سہرا نہیں تو کم سے کم اسی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ملک جرمنی پر جو بیجا خراج عاید کئے گئے تھے اس کی ادائی سے ہٹلر نے انکار کردیا۔ رائینلینڈ (Rhineland) پر قابض ہوگیا۔ اب وہ اسپین کی خانہ جنگی میں جنرل فرانکو کی مدد کر رہا ہے۔ دوسری طرف وہ اپنی نوآبادیوں کو طلب کر رہا ہے جو سارے یورپ کو خطرہ میں ڈال رہی ہیں۔

اس تھوڑی سی مدت میں ہٹلر نے جرمنی کو پھر وہی قوت دی جس کا کسی نے خواب بھی نہ دیکھا تھا اور اس نے اپنے رعب و جلال کا سکہ تمام اقوام پر ڈالا ہے۔ غالباً یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ہٹلر، مسولینی اور اسٹالن کی طرح قدم پھونک پھونک کر عوام میں نہیں پھرتا بلکہ اس کی بیباکانہ چال پر ہر طرف سے نعرے بلند ہوتے ہیں ــــ

تربیتِ طفلی کے نقایص

اکثر لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ لایق والدین بچوں کی تربیت اچھی طرح سے کر سکتے ہیں۔ میری رائے میں وہی اپنی بڑھی ہوئی مصروفیتوں اور دلچسپیوں کی وجہ سے اس سے بالکل بے پرواہ سے رہتے ہیں اور پھر لیاقت کے ساتھ یہ ضروری نہیں کہ تربیت کا مادّہ بھی ہو۔ مجھے خود اکثر ایسے والدین کو دیکھنے کا اتفاق ہوا جو باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے بچوں کی تربیت ایسی کرتے ہیں کہ شاید جاہل بھی اسے پسند نہ کریں۔ وہ والدین جو ہر طریقے سے لایق کہے جا سکتے ہیں بچوں کو ایسی ایسی فضول باتیں سکھاتے ہیں جو خود بچوں کے لئے زہر ہلاہل سے کم نہیں ہوتیں اور جب وہ بڑھ کر بھی وہی باتیں کرتے ہیں تو اس وقت انھیں بُرا معلوم ہوتا ہے اور عام طور پر ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ خصوصاً مسلمان بچوں کے اخلاق بُرے پائے جاتے ہیں۔ والدین تو اپنے وقت مقررہ پر تفریح کے لئے چلے جاتے ہیں اور بچوں کو نوکروں کے سپرد کر کے گھر پر چھوڑ دیا جاتا ہے اب نوکریں بچوں کو خواہ اچھی باتیں سکھلائیں یا بری۔ صرف یہی نہیں بلکہ نوکروں کو بچوں پر پورا پورا اختیار دیا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے بچوں کے اخلاق کیسے ہوں گے۔ بچوں کو شاید یہ سمجھ کر ہمراہ نہ لے جاتے ہوں کہ اور لوگ انھیں فیشن سے دُور اور بوڑھا خیال کریں گے۔

میں نہیں کہتی کہ والدین تفریح نہ کریں بلکہ بچوں کو بھی اپنے ہمراہ یا نوکروں ہی کے ساتھ کسی ایسی جگہ بھجوائیں کہ ان کی بھی خاطر خواہ تفریح ہو سکے۔ کیونکہ ان ہی نونہالاں سے قوم کی آئندہ امیدیں وابستہ ہیں۔ کسی نے کیا سچ کہا ہے کہ "ماں کی گود بچے کی پہلی درس گاہ ہے"۔ اسی لئے ایسی تربیت ہونی چاہئے کہ مسلمان بھی غیر قوموں سے آگے نکل سکیں بہت سی باتوں میں یورپ کی اندھا دھند تقلید تو ہوتی چلی جاتی ہے لیکن اس نظریہ پر غور نہیں کیا جاتا کہ یورپ میں بچوں کی تربیت کس خوبی سے کی جاتی ہے۔ اور وہاں کی معاشرت ان کی تربیت سے کس قدر موافق ہے۔ مختصر یہ کہ بچوں کی تربیت بہت عمدگی سے ہونی چاہئے کیونکہ یہ قوم کی امیدیں ہیں اور صرف انہیں پر قوم کی آئندہ امیدوں کا انحصار ہے۔

ممتاز (بیت الرحیم)

نظام الملک آصفجاہ اوّل

اتفاق

اگر غور کیا جاتا ہے تو یہ دنیا اتفاق ہی کا جلوہ معلوم ہوتی ہے کیا معنی؟ زمین پر کوہ اور صحرا، سمندر، اور دریا، نباتات اور حیوانات غرض کل کائنات جمع ہو رہے ہیں اور انہی کا نام دنیا ہے۔ اگر کوئی ایسی صورت ممکن ہو کہ ان میں اتفاق نہ رہے اور یہ خاک و باد آب و آتش وغیرہ کے عنصر جو اہل کیمیا نے دریافت کئے ہیں، سب تتر بتر ہو جائیں یک دوسرے میں جو اتفاق کی کشش ہے جس کو اہل علم کشش ثقل کے نام سے پکارتے ہیں باقی نہ رہے تو اس دنیا و مافیہا کا خاتمہ ہو جائے۔ ہم نیچر کے کارخانہ میں جدھر نظر ڈالتے ہیں اور جس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں ویرانہ بازار ہو یا گلزار اتفاق کا جلوہ نظر آتا ہے۔ جب چند پودوں کو جمع کیا جاتا ہے اور اس کو سجایا جاتا ہے تو وہ گلزار بن جاتا ہے۔

خود حضرت انسان کا وجود ہی اتفاق کی بدولت ہے اگر اتفاقاً انسان کے اعضا باہم متفق نہ رہیں تو زندہ رہنا مشکل ہے۔ کُل قدرتی سامان ہم کو بتا رہے ہیں کہ اتفاق بڑی شئے ہے اور چاہئے کہ ہم انسانوں میں بھی اتفاق قائم رہے جن لوگوں نے دنیا میں باہم اتفاق کیا ہے بڑے بڑے فائدے اٹھائے ہیں اتفاق کرنے سے مشکل سے مشکل کام آسان ہو جاتے ہیں۔ سمندر جو ایسا بڑا ہیبت ناک اور بے حد و حساب قوت کا مالک ہے آخر کیا ہے قطروں کا مجموعہ کیا قطرہ اور کیا اس کی حیثیت لیکن اکٹھا ہونے کی یہ کرامت ہے کہ بحر بن گیا۔ اتفاق ایک ایسی چیز ہے کہ جس سے بہت کچھ کر سکتے ہیں تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جس میں اتفاق رہا وہ ہمیشہ غالب رہے۔ اور جن لوگوں میں نااتفاقی ہے وہ ہمیشہ ذلیل رہے۔

جے چند اور پرتھی راج کے نفاق نے سلطان شہاب الدین غوری کو ملک دلوایا۔ محمد تغلق اور اس کے امراء کی لڑائی جھگڑے دیکھ کر امیر تیمور ہند پر چڑھ آیا۔ ابراہیم لودھی اور اس کے امیروں کی نااتفاقی نے بابر کو باہر سے بلوایا۔ محمد شاہی دربار کے اراکین کی نااتفاقی نے نادر شاہ کے ہاتھ سے دلی جیسے شہر میں قتل عام کرایا۔ انگریزوں کو یہ عروج کیونکر حاصل ہوا صرف باہمی اتفاق سے غرض اتفاق بڑی بیش بہا دولت ہے جہاں تک ہو سکے حاصل کرنا چاہئے۔ نفاق بہت بری چیز ہے اس سے بچنا چاہئے۔

سید حسین

من کی پتیا

ایک دلچسپ ادبی کتاب جس کو محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ نے بچیوں کی بہترین تربیت کے لئے لکھا ہے۔ اس میں حسب ذیل عنوانوں کی بڑی مفید اور کارآمد باتیں لکھی ہیں۔ گھر، سواری، ہمارے نوکر، خورد و نوش، لباس، بچوں کی تعلیم اور ان کی ضرورتیں، اخبار، کتابیں اور رسالے، نذر و نیاز، چندے، مختلف رسومات، علاج معالجہ، متعلقین اور لواحقین، سیر و تفریح، سینما، فیشن، ہر تعلیم یافتہ گھر میں اس کتاب کا ہونا ضروری ہے۔ کتاب بہت خوبصورت اور مجلد ہے۔ (۸۰ صفحات) قیمت صرف (عمر) پھول کے لئے خریدار جاتی قیمت ۸ ہر شکل اسٹاپ۔

پروردہ لڑکیاں

غریب لوگ مفلسی سے تنگ آکر اپنی جان سے زیادہ عزیز بچوں کو کچھ پیسوں کے عوض بڑے گھروں میں دے دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کے لخت جگر یہاں خوش وخرم زندگی گزاریں گے لیکن ان کو کیا خبر کہ وہ لوگ جوان سے ان کے بچے بھلائی کے بڑے بڑے وعدے لیتے ہیں اس کو بھلا کر تکلیفیں دینے لگیں گے۔

اکثر گھروں میں پالک لڑکیاں دکھائی دیتی ہیں جو گو کام کاج بڑے سلیقے سے کرتی ہیں لیکن ان کے کام لینے والے ایسی گالیوں اور سخت الفاظ سے ان کو مخاطب کرتے ہیں کہ سن کے دل دہل جاتا ہے۔ ان کے آرام کی کسی کو بھی کچھ فکر نہیں۔ سردی میں اکڑ جائیں تو بلا سے دھوپوں میں گرمی سے بھسم ہو جائیں تو کچھ ہرج نہیں برسات میں بھیگ جائیں تو کچھ مضائقہ نہیں غرض کبھی وہ بیمار ہو جائیں تو اس کی بھی کچھ پرواہ نہیں۔ رات میں سب کے سو جانے کے بعد سونا اور صبح سب کے پہلے اٹھنا گویا ان کا فرض ہے اگر ایسا نہیں ہوا تو بس اللہ ہی خبر کرے۔ میں اپنا ایک چشم دید واقعہ سناتی ہوں۔

میں ایک عزیز کی شادی میں گئی تھی وہاں بہت سے بڑے گھروں کی بیویاں جمع تھیں ان میں سے ایک کے ہمراہ ایک کمسن سات آٹھ برس کی لڑکی تھی جو اپنی بیگم صاحبہ کا پاندان جس کا وزن چار پانچ سیر ہوگا اٹھائے ہوئے بیگم کے ساتھ پھر رہی تھی گر جب رات زیادہ ہو گئی تو لڑکی سو گئی اور اسے اس پاندان کا کچھ خیال نہ رہا بیگم نے دیکھا کہ لڑکی پاندان سے بے خبر ہو کر سو گئی ہے تو پاندان چپکے سے اٹھا لیا اور پھر اس لڑکی کو جگا کر پوچھا کہ وہ پاندان کہاں ہے لڑکی گھبرائی اور چوطرف ڈھونڈنے اور رونے لگی بیگم صاحبہ کے غصے اور سزا کے ڈر سے اس کے حواس گم تھے۔ جب وہ میرے نزدیک کھڑے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو مجھے بہت برا معلوم ہوا۔ بیگم صاحبہ نے پاندان جہاں چھپایا تھا وہ جگہ مجھے معلوم تھی۔ میں چپکے سے وہ جگہ بتا دی اور اس نے پاندان کو پا لیا۔ جب اس کی پریشانی دور ہوئی تو میں نے آہستہ سے اسے بلایا اور پوچھا کہ اس کے ساتھ بیگم کا کیا سلوک ہے تو وہ بے اختیار رونے لگی جس کا مجھ پر بڑا اثر ہوا کیونکہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ننھی سی جان بڑی دکھی ہے نہ معلوم ایسی اور کتنی جانیں کمبخت سخت دل عاقبت سے غافل انسانوں کے ہاتھ سے سختی اور مصیبت جھیل رہی ہوں گی

بہنو۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ جن کو اپنی پناہ میں لیں ان سے انسانیت کا برتاؤ کریں انسان تو انسان جانوروں سے بھی برا برتاؤ خدا اور رسول کو پسند نہیں۔

سلطانہ صفیہ مؤید الدین حسن

اقبال نمبر

حضرت علامہ اقبال مرحوم سے متعلق مستند اور دلچسپ مضمونوں اور نظموں اور تصویروں کا یادگار مرقع۔ اگر آپ کو اپنے شاعر اعظم کے متعلق کچھ پڑھنے اور اس سے واقف ہونے کا شوق ہے تو یہ مرقع ضرور منگا لیجئے۔ کئی تصویریں ہیں۔ جن میں ایک ہفت رنگی تصویر بھی ہے۔ قیمت صرف ۱۲؍۔ بچوں کے لیے رعایتی قیمت صرف (۸؍) بذریعہ منی آرڈر

اقبال کے کلام میں بچوں کا حصہ

مشرق کا ایک عظیم ترین شاعر جس کو دنیا اقبال کے نام سے یاد کرتی ہے۔ آج ہم سے جدا ہو چکا اور موت نے اس کو ہم سے چھین لیا۔ مگر اس کا کلام زندۂ جاوید ہے۔ مدتوں لوگ اس کو پڑھیں گے اور مرنے والے کا نام یاد رکھیں گے۔

اقبال کے اردو کلام کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں جو بانگ درا، بال جبریل اور ضرب کلیم کے نام سے موسوم ہیں۔ بانگ درا سب سے زیادہ ضخیم کتاب ہے۔ اس میں ان کی بیسیوں نظمیں وغیرہ شامل ہیں۔ بانگ درا میں ان کا ابتدائی کلام بھی شامل ہے اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں "بچوں" کے متعلق بھی کئی نظمیں ہیں۔ ان کی یہاں تفصیل کی جاتی ہے۔

(۱) پہلی نظم کا عنوان "ایک مکڑا اور مکھی" ہے یہ نظم غالباً کسی انگریزی نظم سے ماخوذ ہے۔ اس نظم میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں خوشامد سے کیا کیا ہوتا ہے اور خوشامد کرنے سے ایک عقلمند بھی فریب میں آ سکتا ہے۔

(۲) دوسری نظم کا عنوان "ایک پہاڑ اور گلہری" ہے یہ بھی انگریزی نظم سے ماخوذ کی گئی ہے۔ پہاڑ گلہری سے کہتا ہے کہ تو ذرا سی ہے اس پر اتنا غرور کیوں ہے۔ گلہری اس کا جواب دیتی ہے اگرچہ تو بڑا ہے۔ مگر تجھ میں کوئی ہنر نہیں ہے۔ تجھ میں قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ہے اور میں درخت پر چڑھ سکتی ہوں خدا نے ہر ایک چیز اپنی حکمت سے بنائی ہے۔ دنیا میں کوئی چیز نکمی نہیں ہے۔

(۳) تیسری نظم کا عنوان "ایک گائے اور بکری" ہے یہ نظم بھی ماخوذ ہے۔ گائے آدمیوں کا گلہ شکوہ کرتی ہے۔ اور بکری ان کا لطف و احسان گناتی ہے۔

(۴) چوتھی نظم "بچے کی دعا" کے عنوان سے ہے۔ یہ نظم بھی دوسری زبان سے ماخوذ ہے۔

(۵) پانچویں کا عنوان "ہمدردی ہے" جو ولیم کوپر سے ماخوذ ہے۔

(۶) چھٹی نظم "ماں کا خواب" ہے یہ بھی ماخوذ ہے۔ (۷) ساتویں نظم کا عنوان "پرندے کی فریاد" ہے

یہ تمام نظمیں نصیحت آموز اور سلیس ہیں جن کو بچے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ ان نظموں میں سب سے چھوٹی نظم "بچے کی دعا" ہے جو بچوں کو زبانی یاد کرنی چاہیے۔ اس لئے اس کو یہاں درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو مری پروانہ کی صورت یا رب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

مسز ہاشمی

سر محمد اقبال

غالب کی موت کے بعد مولانا حالی اور ان کے زمانے کے دوسرے شاعروں کا یہ خیال تھا کہ اب غالب جیسا شاعر پیدا نہ ہوگا۔ یہ کسے خبر تھی کہ سیالکوٹ کے ایک نومسلم کشمیری خاندان میں ایک ایسا شخص پیدا ہوگا جو اردو شاعری کے قلب میں نئی روح پھونک دے گا۔ جس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا انداز بیان ایک بار پھر شاعری کو نصیب ہوگا۔ زبان اردو کی خوش اقبالی دیکھیے کہ جب شمع اردو دہلی اور لکھنؤ میں گل ہو رہی تھی اس دور میں پنجاب نے اقبال سا شاعر پیدا کیا جس کے کلام کا سکہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام دنیا میں بیٹھ گیا۔ اقبال نے ملک کو بیدار کرنے۔ قومی احساس پیدا کرنے اور مسلمانوں کے دور گزشتہ کی یاد تازہ کرانے میں نمایاں حصہ لیا۔ شکوہ اور جواب شکوہ کے ذریعے سے بندے کو خدا سے ہم کلام کرا دیا۔ غالب اور اقبال میں بعض لوگوں کو اس قدر مشابہت معلوم ہوتی ہے کہ مسئلہ تناسخ کے تحت یہ یقین کرنا بیجا نہیں کہ غالب کی روح نے اقبال کے جسم میں جنم لیا اور انگریزی تعلیم اور ... نے فلسفہ پر قادر ہو کر نقش اولین سے بہت کچھ بہتر نقوش دنیا کے سامنے پیش کئے۔
لیتے ہیں کہ شاعر پابندیوں کی تاب نہیں لا سکتا۔ چنانچہ اقبال نہ پروفیسری کی کرسی پر عرصہ تک بیٹھ سکے نہ زیادہ دن عدالت میں مقدمات کی پیروی کے لئے کھڑے رہ سکے۔ جس قدر ان کی شاعری ترقی کرتی گئی دنیا کے دوسرے افکار سے وہ آزاد ہوتے گئے۔ ملک اور ملت کی خدمت بھی انہوں نے شاعری کے ذریعہ ہی سے کی۔ ان کی "کوہ ہمالیہ" والی نظم نے دلوں میں ہیجان پیدا کر دیا۔ "نالۂ یتیم" نے ہنستوں کو رلا دیا فریاد امت نے سوتوں کو جگا دیا اور شکوے نے تو خدا اور بندہ کو ملا دیا۔ وہ صرف ظاہری شاعر نہ تھے۔ ان کو دنیا کی تاریخ پر عبور تھا۔ قوموں کے بڑھنے اور گھٹنے کے افسانے ان کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ترقی اور تنزل کے اسباب سے وہ واقف تھے۔ انہوں نے مغرب کے فلسفے سے مشرق کے فلسفہ کا مقابلہ کیا۔ وہ ایک دردمند دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ دل کے جذبات کے اظہار پر وہ قادر تھے۔ وطن پرستی ان کا شیوہ تھا اور ان خیالات کے اظہار کا موقع ان کو ایسے وقت نصیب ہوا جب ہندوستان کے بسنے والے اس کو سننے کے لئے بیتاب تھے۔ ان کا کلام سننے والوں کی ہمت بڑھاتا تھا۔ ان کا فلسفۂ خودی غلامی کی زنجیریں کاٹ رہا ہی تھا کہ ان کی زندگی ختم ہو گئی۔ ان کے کلام میں انگریزی خیالات فارسی بندشیں اور وطن پرستی کی چاشنی تھی۔

اسرار خودی والی مثنوی نے پروفیسر نکلسن کو بے خود کر دیا اور اس کا انگریزی ترجمہ کر کے پروفیسر موصوف نے ان کا تعارف یورپ و امریکہ سے کرایا۔ اب ان کی شاعری اور فلسفے کے اس قدر چرچے ہوئے کہ سرکار انگریزی نے انہیں "سر" کا خطاب دیا۔
آج وہ دنیا میں نہیں ہیں ان کا ماتم کیا جا رہا ہے۔ اور کہا جا رہا ہے کہ اب اقبال کا بدل ممکن نہیں۔ لیکن ہم بھی مسئلہ تناسخ ماننے والوں سے آگے بڑھ کر خود اقبال کے ان اشعار پر بھروسہ کیوں نہ کریں۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

ہستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

سید صفدر حسن "نجد"

اقبال بچوں کے لئے

یوں تو دنیا میں بہت بڑے بڑے شاعر گذرے اور اپنی بلند پروازی اور نازک خیالی کی بدولت ممتاز ہوئے ان کی شہرت عالمگیر ہوئی۔ لیکن بہت کم ایسے شعرا گذرے جنھوں نے بچوں کے لئے نایاب کارنامے چھوڑ کئے۔ اگر ہم مغربی دنیا کے بھی بڑے بڑے شعراء کو دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ایسا شاعر ان میں بھی نہیں پیدا ہوا جس کو بچوں سے انس و محبت ہو۔ مگر ہم خوش نصیب ہیں کہ ہمیں ایسا شاعر دستیاب ہوا جس کو ہم سے انس اور محبت ہے۔

اقبال نے ابتدا ہی سے بچوں کے لئے نظمیں لکھنی شروع کیں۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ کسی قوم یا کسی وطن کے آئندہ پھولنے پھلنے والے پودوں کے دل و دماغ کو تعلیم سے آراستہ کرنا چاہیئے۔ اسی لئے انھوں نے اپنا فرض سمجھا کہ بچوں کو اچھی تعلیم دی جائے۔ اخلاق ایک ایسی زبردست چیز ہے جو بہادر سے بہادر سپہ سالار کو بھی زیر کر دکھاتی ہے۔ اسی وجہ سے اقبال نے لڑکوں کے لئے چھوٹے چھوٹے سبق آموز قصے لکھے۔

یہ عام بات ہے کہ قصوں اور افسانوں سے بچوں کا دل بہل جاتا ہے۔ اور جو چیز ہنسی مذاق میں بتلائی جاتی ہے وہ ان کے دل پر زیادہ دن تک نقش رہتی ہے۔ یہ فطرت کا تقاضا ہے کہ نظم بہ نسبت نثر کے زیادہ دل آویز اور دلکش ہوتی ہے اس لئے جو چیز سلیس نظم میں سمجھائی جائے اسے لڑکے بہت جلد سمجھ جاتے ہیں۔ اقبال نے بھی اس خیال کے مدنظر ایسی نظمیں لکھیں جس سے چھوٹے لڑکوں کے عادات و اطوار درست ہو سکیں۔

مثال کے طور پر چند نصیحت آمیز نظمیں درج کی جاتی ہیں۔ جس میں شاعر کے تخیل اور نازک خیالی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اقبال کی ایک نظم بعنوان "ہمدردی" جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ نہایت تعجب خیز ہے۔ انھوں نے بیان کیا ہے کہ ہمدردی دنیا کو کس قدر فائدہ پہنچاتی ہے ؎

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے   آتے ہیں جو کام دوسروں کے

اس کے علاوہ اقبال نے ایک اور نظم میں پہاڑ اور گلہری کے درمیان مکالمہ سے ثابت کر دکھایا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز بیکار اور بری نہیں ؎

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں   کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

ایک اور نظم ایک مکڑا اور مکھی میں مکڑی کی مکاری اور مکھی کا دام فریب میں آنا جس خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے اس سے بچوں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے "ایک گائے اور بکری" کی نظم میں انھوں نے بکری کی زبانی گائے کو یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ انسان کس قدر رحم دل ہے اور جانوروں کے لئے کس قدر آسائش مہیا کرتا ہے۔ آخر مجبور ہو کر گائے کو کہنا پڑتا ہے ؎

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی   دل کو لگتی ہے بات بکری کی

اس کے علاوہ انھوں نے اپنی نظموں میں "عہد طفلی" کے زمانے کو نہایت خوش اسلوبی سے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے

جب کہ بچے کو ماں کی گود سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔

پرندے کی فریاد میں اقبال اس بدنصیب طائر کی داستان اس کے زبانی بیان کرتے ہیں جو قفس کی تنگیوں سے اکتا گیا ہے۔ اقبال نے ایک پرندہ اور جگنو کا قصہ اس عمدگی سے بیان کیا ہے کہ واقعی ہمارا دل دوستی اور سچائی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ ان کا مقصد اس سے یہ ہے کہ آپس میں ہمدردی، خلوص اور محبت بڑھے۔ اسی خیال کے مدنظر انھوں نے فرمایا ہے ؎

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی — اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

ان کے نزدیک بچہ سراپا نور ہے جو کہ اس محفل میں عریاں نہیں بلکہ منور ہے۔ آپ اس بچہ کو جو شمع کے حسن کو دیکھ کر محو ہو جاتا ہے یہ فلسفہ سمجھاتے ہیں کہ ساری دنیا، ساری چیزیں، ساری فطرتی اشیا جس کو خداوند تعالیٰ نے بنایا ہے وہ سب حسن سے معمور ہیں۔ پہاڑ، دریا، کوہ، چاند، سورج اور ستارے ان تمام میں حسن کا جلوہ نظر آتا ہے۔ ایک نظم میں چیونٹی اور عقاب کے متعلق فرماتے ہیں۔ ؎

چیونٹی۔ میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند — تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند

عقاب جواب دیتا ہے۔

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاک راہ میں — میں نہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

اسی طرح شیر اور خچر کے درمیان یوں مکالمہ کرواتے ہیں۔

شیر۔ ساکنان دشت و صحرا میں ہے تو سب سے الگ — کون ہیں تیرے اب و جد؟ کس قبیلہ سے ہے تو

خچر۔ میرے ماموں کو نہیں پہچانتے شاید حضور — وہ صبا رفتار! شاہی اصطبل کی آبرو

سینما کے متعلق ان کا خیال ہے کہ ع یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے۔

پرواز کی نظم میں درخت و صحرا کے درمیان جو مکالمہ بیان کیا ہے۔ وہ دلچسپی سے خالی نہیں اس لئے یہ نظم یہاں درج کی جاتی ہے ؎

یہاں میں لذت پرواز حق نہیں اس کا — وجود جس کا نہیں جذب خاک سے آزاد

دیا جواب اسے خوب مرغ صحرا نے — غضب ہے داد کو سمجھا ہوا ہی تو بیداد

طالب علم کے متعلق لکھتے ہیں ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو — کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

غرض اسی طرح اقبال نے کئی جگہ بچوں کو مخاطب کیا، ان سے کلام کیا، ان کو نصیحت کی اور ان کو سچائی کے راستہ پر لانے کی کوشش کی۔ ان کو اخلاق کا سبق سکھایا۔ ان کو اپنی حقیقت سے آشنا کیا اور علم و ادب کا ذوق دلایا۔

الحاصل جس طرح حضرت اقبال ایک بڑے فلسفی اور ایک بڑے شاعر ہیں۔ اسی طرح انھوں نے اپنا فرض سمجھا کہ اپنے ملک کے چھوٹے پودوں کو بھی سرسبز و شاداب کیا جائے۔

یادو راج

(درجہ ... [illegible])

سر محمد اقبال

دنیا میں آئے دن طرح طرح کے جاں کاہ واقعات اور حادثات پیش آتے ہیں۔ احباب اور عزیزوں کی موت سے بھی متعلقین کو صدمۂ عظیم پہنچتا ہے لیکن سر محمد اقبال کی ناگہانی اور بے وقت موت نے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام اسلامی دنیا میں تلاطم برپا کر دیا۔ خصوصاً بزم اردو کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔

اقبال ۱۸۷۶ء میں شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ یہ ایک ہندو کشمیری قبیلے سے ہیں، جو بعد کو مسلمان ہو گیا۔ اقبال بچپن سے ذہین تھے۔ چنانچہ اسکول اور اس کے بعد کالج میں ہمیشہ ایک ممتاز طالب علم رہے۔ اردو، فارسی، عربی میں کافی مہارت حاصل کی۔ ۱۹۰۵ء میں وہ انگلستان گئے اور تین سال کی مسلسل محنت سے اپنی دماغی قابلیت کو اور زیادہ آب و تاب کے ساتھ چمکانے لگے۔

اسی زمانے میں انھوں نے فارسی فلسفہ پر تنقید کی۔ اپنے دین کی چھان بین کی اور اسلام پر تقریریں کیں اور نظمیں لکھیں۔ اس طرح اپنی نظم و نثر کی بدولت تقریباً سارے ہندوستان اور اسلامی سلطنتوں میں ہر دلعزیز ہو گئے۔

یورپ کا سفر اقبال کی روحانی نشو و نما کا نہایت نازک وقت تھا۔ ایک بار یہاں تک نوبت پہونچی کہ وہ اپنی "روحِ شاعری" کو خیرباد کہہ رہے تھے۔ لیکن خوبیٔ قسمت انھوں نے وہ ارادہ ترک کیا اور مصمم ارادہ کیا کہ اب شاعری تا دمِ مرگ نہ چھوڑوں گا۔ یہاں ہی سے ایک نیا دور شروع ہوا اور اقبال ایک شہرۂ آفاق شاعر اور روشن خیال حکیم بن گئے

حقیقتاً اقبال ایک قومی شاعر تھے۔ وہ جو کچھ علمیت پیدا کرتے تھے وہ اپنی قوم تک پہنچا دیتے تھے۔ اور اسی لئے ان کی شاعری زندگی کے فلسفہ اور دنیوی معلومات کا مجموعہ ہے۔ یہی ان کے نزدیک اسلام کی تعمیر تھی۔ شاعر کی حیثیت سے اقبال ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے بگڑے ہوئے ملکوں کو بنایا اور پژمردہ اقوام کو خوابِ غفلت سے جگایا۔ مسلمانوں کے لئے جو انھوں نے خدمت کی وہ نہ صرف ہم بلکہ آئندہ آنے والی نسلیں ہرگز ہرگز فراموش نہیں کر سکیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے انتقال پر چھوٹا بڑا، امیر غریب سبھوں نے ماتم کیا۔

غالباً سب سے زیادہ بچے ان کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ انھوں نے سادہ اور بے لوث نظموں سے نئی روح پھونکی اور ہماری خوشی کے ساتھ ساتھ وہ جوش و ولولہ پیدا کیا جس کا اثر اس نئی پود کی بیداری ہے۔ ان کی بے لوث خدمت کا ہر بچہ بچہ دل سے شکر گذار ہے۔ اور ان کی موت کا اتنا ہی صدمہ پہنچا جو ایک عزیز بھائی کی جدائی سے ممکن تھا۔

اقبال مر گئے لیکن ان کا کلام زندہ ہے اور وہی ہماری ترقی کے لئے شمع ہدایت بنے گا۔ گو اس وقت ہم کو ایسی نایاب ہستی کی سخت ضرورت تھی۔ لیکن پھر بھی ان کا کلام انکی یاد تازہ کرے گا۔ اور ہر مسلمان کو اس کی مصیبت کے وقت یہ اشعار تقویت دیں گے ؎

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے ۔۔۔ نشہ سے کوئی تعلق نہیں پیمانے سے

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے ۔۔۔ پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کشتیٔ حق کا زمانے میں سہارا تو ہو ۔۔۔ عصرِ نو رات ہے دھندلا سا ستارا تو ہو

سید ریاض الحسن

اقبال بہ حیثیت معلّمِ اخلاق

خوں بہا لے اپنی بدبختی پہ اے ہندوستاں
تیری قسمت میں بھلا اب ایسے شاعر پھر کہاں!

غالب کے بعد مدتوں سے روحِ شاعری خوابیدہ تھی اور ادب کی محفلیں سونی پڑی ہوئی تھیں کہ ۱۸۷۶ء کی مبارک صبح کو افقِ پنجاب سے آفتابِ شاعری طلوع ہوا جس کی نورانی شعاعوں نے مشرق اور مغرب کو یکساں منور کیا لیکن ۶۲ سال کی ترشتہ منازل طے کرنے کے بعد ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی منحوس صبح کو آفتابِ شاعری ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ صبح کا وقت اور غروبِ آفتاب! مشرق اور جائے غروب! کیا یہ قیامت کی یہی نشانیاں نہیں ہیں؟ شاید یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ مشرق اور مغرب میں ایک محشر بپا ہے۔

آہ! وہ صاحبِ اقبال فلسفی شاعر جس نے اقبال نام پایا اب ہم میں کہاں؟ وہ اسم بامسمّیٰ تھا۔ جب تک زندہ رہا اقبال نے قدم چومے اور جب مرا تو سارے عالم نے کلیجے تھام لئے۔ اف! اپنے اشعار کے اعجاز سے سوتوں کو جگانے والا اور شعلۂ آواز سے خرمنِ باطل کو جلانے والا اجل نے لیا۔ فلسفہ کو جس پر ناز تھا تدبر کو جس پر فخر تھا ہمیشہ کے لیے وہ ہم سے جدا ہو گیا۔ غرض با کمال اقبال کے کمال کو کوئی کہاں تک گنا سکتا ہے؟ اگر وہ شریعت سے بھی واقف تھا تو رندی سے بھی آگاہ تھا اگر تصوف میں منصور کا ثانی تھا تو شعر و سخن میں ہم پلۂ خیام و خاقانی تھا لیکن افسوس صد افسوس کہ قمریٔ شمشاد معانی، رشکِ کلیم ہمدانی، مشرق کا شاعرِ اعظم اور غالب و حالی کا جانشین آج ہم سے بچھڑ گیا۔ ایسے زمانے میں جب کہ "گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ" تھی۔ ایسے دور میں جب کہ خود زبانِ اردو کی موت و حیات کا مسئلہ درپیش تھا اردو کے اس سرپرستِ اعلیٰ کی موت دنیائے ادب پر ایک ناقابلِ فراموش ضرب ہے۔ ایسے وقت میں جب کہ مسلمانوں کے دن پھر رہے تھے اور اقبال ان کی یاوری کر رہا تھا ان کا اقبال کو ہمیشہ کے لئے کھو دینا بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے؟ خود ہندوستان میں آج کل سیاسی اصلاحات کا دور دورہ ہے ایسے نازک دور میں اقبال جیسا ہونہار سپوت جو امن کا علمبردار اور اتحاد کا حقیقی بانی تھا مادرِ ہند کی گود سے چھین لیا گیا۔ لیکن بقول مرحوم ؎

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

اس لئے ہم ہندوستانیوں کا یہ فریضہ ہے کہ مغفور کے پیام کو جو اُن کی لازوال تصانیف کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ حرزِ جاں بنائیں ورنہ اندیشہ ہے کہ خدانخواستہ ہمارا وہی حشر نہ ہو جس کے متعلق وطن پرست شاعر نے کئی سال پہلے ہمیں آگاہ کر دیا ہے ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

حیف صد حیف کہ درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج کرنے والا مسیحا ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو گیا۔ سطورِ ذیل میں ہم صرف انہی منتخب اشعار پر طائرانہ نظر ڈالیں گے جن میں مشرق کے شاعرِ اعظم نے مغرب کے بڑھتے ہوئے سیلاب یعنی الحاد اور آزادی کے خطرے سے ملک و قوم کو متنبہ کیا ہے۔ سچ پوچھئے تو اکبر کے بعد اقبال ہی ایک ایسا شاعر تھا جس نے یورپ کی تہذیب

اور مغربی تمدن کو اصلی رنگ روپ میں پیش کیا ہے۔ دورِ حاضر کے متعدد معاشرتی مسائل پر اچھوتے انداز میں ناصحانہ تنقید کی ہے۔ چونکہ اقبال کی حیات کا تذکرہ یا اس نغمہ طراز کی شاعری پر تبصرہ ہمارا مقصود نہیں ہے۔ لہذا ہم صرف چند نمونے پیش کریں گے تاکہ ناظرین کو بخوبی اندازہ ہو سکے کہ دیگر کمالات کے قطع نظر اقبال کا درجہ بہ حیثیت ایک معلم اخلاق کے کس قدر بلند تھا۔

ا۔ نئی تہذیب | نئی تہذیب کی حقیقی تصویر ترجمان حقیقت اقبال نے جس خوبی کے ساتھ کھینچی ہے ناظرین خود اندازہ فرمالیں ؎

۱
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں　　　　نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الکشن، ممبری، کونسل، صدارت　　　　بنائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

۲
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی　　　　یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

۳
دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے　　　　کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی　　　　جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

ب۔ موجودہ تعلیم اور اس کے نتائج | سارا ہندوستان موجودہ تعلیم اور اس کے نتائج سے غیر مطمئن ہے سپرو کی رپورٹ میکنزی اسکیم اور واردھا کی تجاویز میں ایک چیز مشترک ہے یعنی سب اس مسئلہ پر متفق ہیں کہ موجودہ طریقۂ تعلیم ناقص اور قابل اصلاح ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ایک طرف تو بے کاری بڑھتی جارہی ہے اور دوسری طرف مذہب و اخلاق سے بیزاری عام ہوتی جارہی ہے۔ چنانچہ اقبال کی دور رس نگاہوں نے اس خطرے کو پہلے ہی محسوس کرلیا تھا۔ فرماتے ہیں ؎

۱
خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر　　　　لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم　　　　کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما　　　　لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

۲
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل　　　　دنیا تو ملی طائر دیں کر گیا پرواز

۳
تعلیم مغربی ہے بہت جرأت آفریں　　　　پہلا سبق ہے بیٹھ کے کالج میں مار ڈینگ

۴
تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ　　　　دفع مرض کے واسطے پل پیش کیجیے
تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض　　　　دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجیے

ج۔ موجودہ تعلیم نسواں | موجودہ تعلیم نسواں کو جس خوبی سے بے نقاب کیا ہے ملاحظہ ہو ؎

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی　　　　قوم نے ڈھونڈ لی فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مد نظر　　　　وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین؟　　　　پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

د- پردہ | "چراغ خانہ" کو "شمع محفل" بنانے کی کوشش ہر طرف جاری ہے اگرچہ مغرب نے بہت دیر میں مگر تلخ تجربوں کے بعد یہ معلوم کرلیا ہے کہ عورت کی کونسل سے زیادہ جنت ارضی میں ضرورت ہے۔ پھر بھی حیرت ہے کہ پرستاران مغرب روس، اٹلی اور جرمنی کے ردعمل کو نظر انداز کرکے خود بھی اسی غلطی کے مرتکب ہونا چاہتے ہیں حالانکہ ایک مشہور مقولہ ہے کہ "آزمودہ را آزمودن جہل است" ؎

۱ یہ کوئی دن کی بات ہے اے مرد ہوش مند!　　غیرت نہ تجھ میں ہوگی نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض　　کونسل کی ممبری کے لئے ووٹ چاہے گی

۲ شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں　　مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہوگئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف　　پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہوگئے

ھ۔ ابن الوقتی | اسلام دین فطرت ہے۔ اس کے اصول ہر زمانے اور ہر ملک کے لئے یکساں کارآمد ہیں اس کے باوجود بعض مذہبی پیشواؤں کا "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" پر عمل پیرا ہونا بہت معیوب ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

کچھ غم نہیں جو حضرت واعظ ہیں تنگ دست　　تہذیب نو کے سامنے سر اپنا خم کریں
رد جہاد میں تو بہت کچھ لکھا گیا　　تردید حج میں کوئی رسالہ رقم کریں

تمدن حاضر | مجلس اقوام کی بے بسی، دول عالم کی نام نہاد امن کو قائم رکھنے کے لئے اسلحہ بندی اور سرمایہ داروں و مزدوروں کی کشمکش کیا یہ سب اس حقیقت کی بین دلیلیں نہیں ہیں کہ ہمارے تمدن کی مثال اس قصر کی سی ہے جس کی بنیادیں ریت پر کھڑی کی گئی ہوں اور کیا اس سے کوئی انکار کرنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ اس کی تعمیر میں بنیاد کی پہلی اینٹ سے لے کر بلند ترین کنگرہ کے آخری کلس تک انسانی خون جھلکتا نظر آتا ہے ؎

ابھی تک آدمی صید زبون شہریاری ہے　　قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندان مغرب کو　　ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا　　جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

المختصر سطور بالا میں مشرق کے شاعر اعظم کے کلام بلاغت نظام کی صرف ایک خصوصیت پر روشنی ڈالنے کی وہ بھی ناتمام کوشش کی گئی ہے ورنہ اقبال کی فلسفیانہ شاعری پر تو مندرجہ ذیل شعر حرف بحرف صادق آتا ہے ؎

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

محبوب خاں یوسف زئی بی اے (عثمانیہ)
گلبرگوی مددگار مدرس فوقانیہ عسکریہ چنتاپور

سب رس

نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۳)

نشان ٹپہ برطانیہ (M 3950)

"ادارۂ ادبیات اردو" حیدرآباد دکن

کا

ماہ نامہ

سب رس

بابت مارچ ۱۹۳۹ء یعنی جلد (۱) شمارہ (۳)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش

خواجہ حمید الدین شاہد

سکینہ بیگم

معین الدین احمد انصاری

مکتبہ ابراہیمیہ پریس میں طبع ہو کر دفتر "ادارہ" رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

سالانہ چندہ (للعہ) علاوہ محصول ڈاک۔ فی پرچہ چھ آنے

تحفۂ لاجواب

یہہ تحفہ ہے لاجواب اَرے بس لے لو
مرغوب دل ہر کس و ناکس لے لو

سب کا لینا تو امرِ ناممکن ہے
سب میں بہتر یہہ ہے کہ "سب رس" لے لو

امجد

سب رس کے مقاصد و قواعد

۱ - یہہ "سلسلہ ادبیات اردو" کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اُردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

۲ - مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہیں ہوں گے۔

۳ - اُردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اُردو تصنیف و تالیف کا ذوقِ صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

۴ - غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اُردو میں منتقل کر کے اُردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

۵ - یہہ رسالہ کم از کم ۶۴ صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

۶ - رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہئے

۷ - جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے

۸ - خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

۹ - اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی۔پی یا وی پی کے ذریعہ سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
حیدرآباد کے لئے۔	چار روپے	دو روپے آٹھ آنے	چھ آنے
حیدرآباد سے باہر۔	چار روپے آٹھ آنے	تین روپے	سات آنے

نرخنامہ اجرت اشتہارات

	ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۵۰ روپے	۳۰ روپے	۱۵ روپے	۶ روپے
آدھا صفحہ	۳۰ "	۱۵ "	۱۰ "	۴ "
چوتھائی صفحہ	۱۵ "	۱۰ "	۴ "	۲ "

~~~~~

محرم نمبر ۱۲ / اقبال نمبر عہ / مرقع دکن نمبر عا / خواتین نذر دکن نمبر عہ
~~~~~

جلد (۱) شمارہ (۳) | سب رس | مارچ ۱۹۳۹ء

سب رس

فہرست تصاویر

فہرست مضامین

ادارہ کے شعبۂ نسواں کے اجلاس عام کی روئداد اور تقریریں صفحات ۲۶ تا ۳۶ میں ملاحظہ ہوں ۔

ضروری اطلاعیں

سب رس کے گذشتہ سال کے پرچے دکن نمبر کے اعلان کے بموجب ہمیں نومبر اور دسمبر ۱۹۳۸ء کے چند پرچے وصول ہوئے ہیں لیکن مزید چند پرچوں کی ضرورت ہے، جو صاحب علحدہ کرنے چاہتے ہوں براہ کرم دفتر کو مطلع فرمائیں۔ اصل قیمت پر پرچے خریدے جائیں گے۔

سب رس کے پہلے سال کی جلد۔ بعض علم دوست اصحاب نے سب رس کے گذشتہ سال کے مکمل بارہ پرچوں کی جلدیں طلب فرمائی ہیں، ایسے اصحاب کے لئے نہایت خوبصورت جلدیں (خاص طور پر بنواکر اور شیرازہ پر سب رس کی ڈائی معہ صراحت سنہ اور ان کا نام منقش کراکے) روانہ کی جارہی ہیں۔ اس قسم کی جلدیں بطور تحفہ بھی علم دوست احباب ایک دوسرے کی خدمت میں پیش کرسکتے ہیں کیونکہ یہ خوشنما جلد اردو کے کئی سو بہترین فسانوں، پاکیزہ نظموں، اور دلچسپ و مفید مضمونوں کا ایک خوبصورت مجموعہ ہونے کے علاوہ پچاس سے زیادہ دلفریب اور نادر تصویروں کا ایک مرقع بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ اور کسی تقریب کے وقت علم دوست اصحاب کے لئے اس سے بہتر تحفہ دستیاب نہیں ہوسکتا۔ اگر چاہیں تو جلد پر تحفہ دینے والے اور لینے والے دونوں کے نام بھی صراحت کے ساتھ منقش کردئے جاسکتے ہیں۔ سال بھر کے رسالوں کی جلدیں صرف پانچ روپئے میں روانہ کی جارہی ہیں۔

سب رس کے متفرق پرچے جن اصحاب کے یہاں سب رس کا گذشتہ سال کا فائل مکمل نہیں ہے اور وہ اس کو مکمل کرنا چاہتے ہیں تو دفتر سے مراسلت کریں۔ اگر ممکن ہو تو دفتر رعایتی قیمت سے پرچے فراہم کرکے ان کے فائل کی تکمیل میں مدد دے گا۔

کتاب گھر۔ ادارۂ سب رس کی خواہش ہے کہ علم و ادب کا ذوق رکھنے والوں کے لئے ہر طرح کی علمی و ادبی سہولت فراہم کرے چنانچہ سب رس کتاب گھر میں جو کتابیں موجود نہیں رہتیں ان کو بھی کسی نہ کسی طرح سے فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ علم دوست اصحاب اپنی ضرورت کی کتابیں بلا تکلیف سب رس کتاب گھر کے توسط سے حاصل کرسکتے ہیں۔

رقمی دادوستد۔ ادارہ کے بڑھتے ہوئے کاروبار کی وجہ سے مختلف اصحاب اس کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں، اور سب رس کا چندہ اور ادارۂ ادبیات اردو کی کتابوں وغیرہ کی قیمت بھی وصول کررہے ہیں۔ اس سلسلہ میں علم دوست اصحاب کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ ادارہ سے متعلق کوئی رقم ادا کرتے وقت ادارہ کی مطبوعہ نمبری رسید ضرور حاصل کریں تاکہ ادارہ کے حسابات میں دقتیں نہ پیدا ہوں۔ دفتر صرف اسی رقم کی ذمہ داری لے سکتا ہے جس کے لئے مطبوعہ رسید جاری کی گئی ہے۔

ایجنٹوں کی ضرورت سب رس اور بچوں کے سب رس" اور ادارۂ ادبیات اردو" کی کتابوں کے لئے مختلف شہروں اور تعلقوں میں ایجنٹوں کی ضرورت ہے جن کو کافی کمیشن دیا جائے گا اور ہر قسم کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ ایجنسی کے تفصیلی شرائط دفتر سے معلوم ہوسکتے ہیں۔

"ادارہ"

اداریہ

اس مہینے ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسوان کے اجلاس عام نے حیدرآباد کی خواتین میں ایک علمی و ادبی چہل پہل پیدا کر دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی علم دوست خواتین اپنے لئے ایک علمی و ادبی مرکز کی ضرورت محسوس کر رہی تھیں۔ اس اجلاس عام نے نسوانی کتب خانہ کے قیام کے متعلق ادارہ کی تجویز کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ اور اس سلسلہ میں جو کام انجام پا رہا ہے اس کی بناء پر توقع ہے کہ ادارہ جلد ایک ایسے کتب خانہ کا افتتاح کر سکے گا جہاں خواتین پردہ ہی میں رہ کر علم و ادب کے خزانوں سے مستفید ہو سکیں گی۔ اس سلسلہ میں جملہ علم دوست اور صاحب ذوق خواتین سے امداد و اعانت اور مشورے کی استدعا کی جاتی ہے۔ اور وہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ معتمد شعبۂ نسواں سے ادارے کے پتہ پر مراسلت کر سکتی ہیں۔ اجلاس عام کی مکمل رُوداد اور تقریروں کے خلاصے اس شمارہ میں شائع کئے جا رہے ہیں۔

محترمہ جہاں آرا بیگم صاحبہ کا ایک مضمون بھی اس نمبر میں شامل ہے جس میں انھوں نے بعض ایسے مسائل پر خیال آرائی کی ہے جو غلط فہمیاں پیدا کرنے کے باعث ہوں گے۔ اس کا جواب شعبۂ تنقید کی طرف سے آئندہ مہینے شائع کیا جائے گا۔ اس شعبہ نے اس اثنا میں سب رس کے لئے اردو کی جدید مطبوعات پر بڑی اچھی تنقیدیں لکھ دی ہیں لیکن یہ اور دوسرے شعبوں کی رُودادیں، نیز بعض اہم اور دلچسپ مضمون اور فسانے اور پاکیزہ نظمیں اس نمبر میں جگہ کی قلت کی وجہ سے شامل نہ ہو سکے۔

گذشتہ ماہ ادارہ نے دو کتابیں "تذکرۂ دکن" اور "محرم نامہ" شائع کیں۔ اس مہینے ایک اور کتاب شائع ہو رہی ہے۔ یہ ایک معاشرتی ناول "ماما" ہے جس میں ادب کے ترقی پسند نظریوں کے مطابق ڈیوڑھی کی ایک کنیز کے واقعاتِ زندگی بیان کئے گئے ہیں جس کو سماج کی ستم ظریفیوں نے ہر طرح سے لوٹ کر اور ناکارہ محض بنا کر چھوڑ دیا لیکن جس کی فطری صلاحیتیں آزادی اور زندگی کا گہوارہ تھیں۔

اس مہینے (۱۱ر فروری ۱۹۳۹ء کو) ادارۂ ادبیات اردو کے ایک عالی منش سرپرست نواب رفعت یار جنگ بہادر نے انتقال فرمایا۔ آپ علمی و ادبی دنیا میں بھی ایک خاص اہمیت رکھتے تھے۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے قدیم سرپرستوں اور معاونوں میں آپ کا نام سرفہرست رہے گا۔ ہندوستان اور دکن کے اکثر رسائل اور جرائد کی آپ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک اعانت کرتے رہے ہیں۔ آپ نے اپنے زمانۂ تعلقداری میں بیدر اور نظام آباد میں صنعت و حرفت کے مدارس قائم کئے جن کی وجہ سے حیدرآباد کی قدیم صنعتیں پھر سے زندہ ہو گئیں۔ اور ملک کے نوجوان اپنے اسلاف کے کھوئے ہوئے فن کاغذ سازی اور بیدری ظروف بنانے کے کمال سے بہرہ مند ہو گئے۔ بیدر میں آپ کی سرپرستی میں ایک اردو رسالہ بھی جاری ہوا تھا۔ ملک کے اکثر مصنفین و مؤلفین کی آپ ہر طرح سے امداد و قدر افزائی کرتے رہے۔

علم و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھنے کے علاوہ آپ ایک بڑے ہی روشن ضمیر اور صاحب دل بزرگ تھے۔ آپ کے اعلیٰ کردار، ایثار نفس اور وضع داری کا ان لوگوں پر خاص اثر تھا جن کو آپ سے کبھی ملنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ وضع داری کے ساتھ کسر نفسی کا جس خوبی سے آپ کی ذات میں میل ہوا تھا اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ امارت کی آن بان کے علاوہ علم و فضل اور زہد و تقویٰ کو جس شائستگی کے ساتھ آپ نے نبھایا وہ دوسرے صاحبانِ ثروت کے لئے ہمیشہ ایک نمونہ رہے۔

"ادارہ"

غزلیات

نگہِ شوق کو یوں آئینہ سامانی دے
عشق کو حسن بنا حسن کو حیرانی دے

کچھ تری چشمِ سخن ساز کا ایسا نہ کھلا
لبِ مے نوش کو تکلیف گل افشانی دے

آئینہ سنگِ در دوست ہوا بھی تو کیا
سر جو سجدے میں جھکے تو تری پیشانی دے

شمع درکار ہے قربانگہِ الفت کے لئے
دل کو اک شعلہ بنا شعلہ کو عریانی دے

کسی منزل میں ہو بے تاب ہی شبنم کی طرح
پرتو مہر جسے ذوقِ پر افشانی دے

عشرتِ ذبح تقاضا ترا سر آنکھوں پر
جب تڑپنے کی اجازت بھی گراں جانی دے

دلنوازی میں بھی ایذا ہے محبت کی قسم
تجھ کو فرصت جو کبھی شغلِ ستم رانی دے

ہر جراحت کو ہے اک تازہ جراحت کی ہوس
اور کچھ غمزۂ خونریز کو جولانی دے

چمن آرائی الفت کا جو سودا ہے اثر
اشک گلرنگ سے ہر شام و سحر پانی دے

جعفر علی خاں اثر (لکھنوی)

بے خودی میری بے اثر نہ ہوئی
تلخیٔ عمر کی خبر نہ ہوئی

درد درماں بنا رہا اپنا
ہم کو تو فکرِ چارہ گر نہ ہوئی

وعدہ موقوف ہے قیامت پر
لیکن اے مہرباں اگر نہ ہوئی

جب سے پیدا ہوئی ہے ہجر کی شب
کبھی منت کشِ سحر نہ ہوئی

وصل سے اور بھی جنون بڑھا
یہ بھی تدبیر کارگر نہ ہوئی

اس کے دامن نے پردہ داری کی
خاک میری جو دربدر نہ ہوئی

حشر میں لطف کچھ نہیں بسمل
چشم جاناں جو فتنہ گر نہ ہوئی

امین الحسن بسمل

سانولی شہزادی — اجنتا کے پہاڑی غار میں

مزدور کا مہمان

جہاں پر تھی سردی کی جوانی
ابھی بادل چھٹا تھا پڑ کے پانی

ب سب خنکیوں سے تھیں فضائیں
چلی آتی تھیں برفانی ہوائیں

فلک پر ٹھٹکتے پھرتے تھے بادل
نمی کے بار سے میداں تھے بوجھل

خموشی میں تھا شورش کا بسیرا
تھا غالب نور پر ٹھنڈا اندھیرا

جھکی تھیں ذرے ذرے کی نگاہیں
نگاہوں کے لئے تھیں بند راہیں

خمیدہ نرم شاخوں کی کمر تھی
سواری رات کی نزدیک تر تھی

لب فطرت پہ ساکن تھے ترانے
دھندلکے تھے کہ بھوتوں کے فسانے

ملمع دن کا کالا ہو رہا تھا
فلک اشکوں میں کاجل رو رہا تھا

اسی سردی میں اک بے چارہ مزدور
مشقت کا دھنی قسمت سے مجبور

ہوئی مدت نہ تھی شادی کو مدت
مگر اللہ رے پیسے کی قلت

سنہری آگ چولہے میں جلائے
تھا بیٹھا ہاتھ بغلوں میں دبائے

پرانے ٹاٹ کے ٹکڑے پہ بیوی
سمٹ سمٹا کے چپ بیٹھی ہوئی تھی

ستے چہرے پہ ضبطِ غم کے آثار
پھٹی چادر میں پیوندوں کی بھرمار

بدن میں کپکپی سردی کے مارے
جگر میں آتشِ غم کے شرارے

نحیف اعضاء میں کمیابی غذا کی
مگر بشرے پہ معصومی وفا کی

امنگیں فرطِ ناداری سے مایوس
جوانی خستہ پیراہن میں ملبوس

حیا و شرم کے آنکھوں میں درباز
نگاہیں پائے شوہر پر بصد ناز

یہ تھا مزدورِ بے چارے کا عالم
کہ امیدوں کا تھا ٹوٹا ہوا دم

نظر اٹھتی تھی جو بیوی کے رخ پر
ڈھلک آتی تھی کچھ گھبرانی سے کھا کر

امیدیں، ولولے، افکار و جذبات
ہوئے جاتے تھے ناموزوں خیالات

جوانی کا فسوں کم ہو رہا تھا
تبسم بھیگ کر نم ہو رہا تھا

گڑی جاتی تھی غیرت سے جوانی
شرافت ہو رہی تھی پانی پانی

۸

جبینِ سرد پر ساعت بہ ساعت　　　جھلک اٹھتا تھا عنوانِ ندامت

بدلتی تھی نظر شعلوں پہ کروٹ

کہ اتنے میں بجی باہر کی چوکھٹ

سنا مزدور نے جب شورِ زنجیر　　　بنا چہرہ پریشانی کی تصویر

ہوا اندیشۂ دل زوروں سے دھڑکا　　　ہو جیسے فجر کی موجوں میں تڑکا

گیا ڈیوڑھی پہ ڈرتا کپکپاتا

تو اک مہماں کو پایا مسکراتا

یہ حالت اور پھر مہماں کا آنا!　　　بدل کر رہ گیا کروٹ زمانہ

خوشی مہمان کے آنے سے طاری　　　مگر انجام سے دل بھاری بھاری

تبسم لب پہ شرمایا ہوا سا　　　تکلم گلبھٹیں کھایا ہوا سا

یہ ڈر اب انکشافِ حال ہوگا

غرورِ مفلسی پامال ہوگا

اسی ہستی پریشانی میں آخر　　　فریضہ جان کر مہماں کی خاطر

کرا کے خوب ڈیوڑھی کی صفائی　　　بچھا دی لا کے گھر سے چارپائی

خیال آیا کہ ہمسایوں میں جا کر

جو مل جائے تو اک لے آئے بستر

مگر احساسِ ناکامی نے ٹوکا

شرافت نے دہائی دے کے روکا

نہ خودداری نے جب گردن جھکائی　　　اوڑھا دی لا کے اپنی ہی رضائی

وہی اک ٹاٹ کا ٹکڑا جھٹک کر　　　بچھا رکھا تھا جس کو گھر کے اندر

لحاف اس کو سمجھ کر جسم ڈھانپا　　　کبھی اونگھا کبھی سردی سے کانپا

یونہی شب جاگتے سوتے گذاری　　　بمشکل صبح کی آئی سواری!

کہاں ہو مخملوں پر سونے والو!

سرابِ عیش پر خوش ہونے والو!!

ذرا یہ شانِ مہمانی تو دیکھو!

تمدن کی ستم رانی تو دیکھو!

احسان دانش

خواب گر

بسلسلۂ گذشتہ

ریحانہ :- شمیم۔ تم کو ایسی بداخلاقی نہیں کرنی چاہیے۔
مدن :- شمیم کے ساتھ تخلیہ میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں! ریحانہ کیا کھانا تیار ہے؟
ریحانہ :- او۔ مجھے جلد جانا چاہیے ورنہ تمام دوکانیں بند ہو جائیں گی۔ مگر میری واپسی تک یہاں ٹھیرے رہیے۔
مدن :- (ریحانہ کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے) میں کوشش کروں گا ... میں کوشش کروں گا۔
(ریحانہ باہر جاتی ہے۔ خاموشی جس کے دوران میں مدن مسکراتے ہوئے شمیم کی طرف دیکھتا ہے)
مدن :- اچھا۔ دوست کہو کاروبار اچھے چل رہے ہیں؟
شمیم :- اچھے! اگر بنسی ندی کو آپ کاروبار سمجھتے ہیں تو پھر تو اچھے چل رہے ہیں۔ خیر جیسے بھی ہو۔ میں نے تو آج ایک اچھا کام کیا ہے۔ ایک ایڈیٹر سے تصفیہ کر آیا ہوں کہ وہ میرا مضمون اپنے اخبار میں چھاپ دے گا۔ فائدہ تو ضرور ہوگا۔ اگا نے لگتا ہے۔
"جواب بھی نہ تکلیف فرمائیے گا تو پھر ہاتھ ملتے ہی رہ جائے گا"
یہ شعر بھی ناکام رہا تو تب بھی ہاتھ ملنا پڑے گا یہ نظم بھی مکمل نہیں ہوگی۔
مدن :- شمیم۔ اگر تم کو قارون کا خزانہ بھی ملتا تو تم مطمئن نہ ہوتے۔
شمیم :- کیا میں مطمئن نہیں رہوں گا؟ اچھا مجھے دنیا کی دولت دے کر دیکھو میں کیا کروں گا سب سے پہلے مدارس بناؤں گا تاکہ لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔
مدن :- دنیا کی جو بہترین چیزیں ہیں تم ان کو فراموش کر کے خیالی پلاؤ پکاتے ہو۔ اور ثروت و شہرت کے خواب دیکھتے ہو تم کو اطمینان نصیب نہیں ہوتا کیوں؟ اسی لئے کہ تم خوش رہنے کے طریقے نہیں جانتے۔
شمیم :- ندیا ہے سنسار بہتی ندیا ہے سنسار
ندیا ہے سنسار بابا ندیا ہے سنسار
سانس کا ڈورا ٹوٹ نہ جائے کر لے جلد شکار۔
بابا ندیا ہے سنسار چڑھتی ندیا ہے سنسار
مدن :- تم ایک ایسی نظم کیوں نہیں لکھتے جو کبھی ختم ہی نہ ہو سکے۔
شمیم :- یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ ختم تو کرنا ہی پڑے گا۔
مدن :- یہ اپنی طبیعت پر موقوف ہے۔ یہ ایسا ہی شاعر کر سکتا ہے جو ہمیشہ خوش رہتا ہو۔
شمیم :- اس کے لئے کچھ دن میرا پیشہ اختیار کرنا پڑے گا۔
مدن :- کچھ معاملہ کی باتیں بھی کرو گے!
شمیم :- شوق سے! فرمائیے آپ کو کونسی نشستیں پسند ہیں؟ پانچ چار تین اور دو روپے۔
مگر آپ تو سونے کی نشستوں پر بیٹھیں گے کہیے کتنی نشستیں چاہئیں؟
مدن :- تم نہیں جانتے میں کون ہوں۔
شمیم :- جاننا ضروری نہیں۔ ہم سب کو خوش آمدید کہتے ہیں۔
مدن :- شمیم میں ایک خواب گر ہوں
شمیم :- کیا کہا!؟
مدن :- لوگ جو خواب دیکھتے ہیں وہ سب میرے ہی بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔
شمیم :- دیکھیے آپ تھوڑی دیر کے لئے آرام کیجیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔
مدن :- تم میری بات نہیں سمجھ سکتے لیکن اسے عام لوگ بچے بڑے سب سمجھ جاتے ہیں۔ میں خواب بناتا ہوں۔ ننھے ننھے خواب جو لوگوں کے دلوں میں پہنچ کر انہیں مسرور کر دیتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ خزاں میں کونپل کہاں چلی جاتی ہے۔ وہ میرے کارخانے میں پہنچتی اور اطلاع دیتی ہے کہ خوابوں کی کن

لوگوں کو ضرورت ہے اور بہار میں وہ جو خواب اپنے ساتھ لے
گئی تھی ان کا کیا ہوا۔

شمیم :- کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کی ان باتوں کو باور کروں گا۔

مدن :- تم نے کبھی سوچا ہے کہ جب پھول مرجھائے جاتے ہیں تو
ان کی رنگینیاں کہاں جاتی ہیں۔ یا یہ کہ سرما میں تیتریوں کو کیا
ہوجاتا ہے۔ میرا کارخانہ خزاں کی زد سے باہر ہے۔

شمیم :- اس سے قبل ایسا خیال تو میرے دماغ میں آیا ہی نہ تھا۔

مدن :- میرا کارخانہ ایک اسٹور ہے جس میں وہ تمام حسین
چیزیں رکھی جاتی ہیں جن کی طرف دنیا نے کوئی توجہ نہ کی ہو۔
اور وہاں میں اپنا شاہکار یعنی خواب بناتا ہوں۔ وہ خواب
جس کی تعبیر محبت ہے۔

شمیم :- واللہ ؟

مدن :- تم محبت کے قایل نہیں !

شمیم :- قایل تو ہوں .... مگر محبت ایک ڈھلتی چھاؤں
ہے۔ اس کو قرار نہیں۔ جہاں روپ ہوتا ہے وہاں روح
نہیں ہوتی اور جہاں روح ہوتی ہے روپ نہیں ملتا۔ میں ایک
عرصہ تک دل کو ہاتھ پر رکھے پھرتا رہا۔ لیکن میرا تجربہ ہے کہ پہلے ہی
دھوپ میں ساری رعنائیاں اڑجاتی ہیں۔

مدن :- تمھیں نقلی جنس ملی ہے۔ انتظار کرو یہاں تک کہ اصلی
دولت مل جائے۔

شمیم :- مگر کوئی اسے پہچانے کیسے ؟

مدن :- اس کی کئی علامتیں ہیں جب کسی سے سچی محبت ہوجاتی ہے تو
دل میں ایک لطیف کسک پیدا ہوتی ہے۔ تخیل عرش پیمائی کرنے
لگتا ہے۔ پھر عاشق اکثر تاروں کے ساتھ مصروف خرام ہوتا اور
آسمان پر پہنچ کر چاند کو محبت کے گیت سنانا چاہتا ہے۔ اس کی وجہ
یہ ہے کہ میرے خوابوں میں چاندنی کا بڑا حصہ ہے۔ میں اسے توڑ
توڑ کر استعمال کرتا ہوں یہاں تک کہ وہ آسمان سے بالکل غائب
ہوجاتا ہے اور پھر اسے بڑھنے کا موقع دیتا ہوں۔ تم نے دیکھا ہوگا
وہ بہت جلد بڑھتا ہے ـــ اور دو ہفتوں میں پھر استعمال کے قابل
ہوجاتا ہے۔

شمیم :- خوب۔ اور کیا یہ سارے خواب کوئل لے کر آتی ہے ؟

مدن :- نہیں۔ میرے پیامبر اور بھی ہیں۔ اور رات جب گھڑی
بارہ بجاتی ہے۔ کیلنڈر سے ایک ورق جدا ہوجاتا ہے اور حقیقتاً ان
میرے کارخانے میں چلا آتا ہے۔ میں اسے سرخ اور سنہری
رنگ دے کر چمکا دیتا ہوں اور کہتا ہوں "ہمارے گزرے ہوئے
دن۔ اور زمانے میں ایک یادگار بنا رہ" میں بچے خریدتا ہوں اور
اور ان میں خواب دم کر کے پھونکتا ہوں اور پھر انھیں تکمیل کے بعد
دنیا میں بھیجتا ہوں۔

شمیم :- میں ساری عمر خواب دیکھتا رہا ہوں، لیکن وہ میرے ہی
بنائے ہوئے خواب تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے خوابوں کی آمیزش
ٹھیک نہیں رہتی۔

مدن :- اصل چیز تو تم بھول ہی جاتے ہو۔ تمھارے خواب ضرورت سے
زیادہ میٹھے ہوتے ہیں۔ تمھیں چاہیے کہ ان میں لطافت اور رعنائی
پیدا کرنے کے لئے تھوڑا سا رونا بھی شریک کرو۔ مجھے اس کا پتہ
فوراً چل گیا۔ اس لئے میں نے اول صبح کی شبنم کے موتی لئے اور اپنے
خوابوں کے گلدستوں کو اشک افشانی کی نعمت سے تروتازہ کردیا۔

شمیم :- (خوش ہوکر) اشک افشانی! کس قدر لطیف خیال ہے۔
میں تو ایک سچے آنسو کا تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔ خود میرا بنایا ہوا نہیں۔

مدن :- ان کی بڑی کثرت ہے تھوڑی سی تلاش شرط ہے۔

شمیم :- بالکل ٹھیک۔ لیکن منتشر خوابوں کی جستجو کون کرے گا۔

مدن :۔ ایک دفعہ میں نے ایک خواب بنایا تھا جو تمھارے لئے
بالکل موزوں تھا۔ میں نے اسے ایک بچی کے قالب میں رکھ دیا۔
یہ کوئی بیس برس کی بات ہے اور اب وہ ننھی ایک تازہ پھول
کی طرح شگفتہ عورت ہو گئی ہے۔ بڑی بڑی نیلی آنکھیں، اور
صبیح رنگ۔

شمیم :۔ اور فرمائیے۔

مدن :۔ ہاں اور سنو۔ جب میں نے اسے دنیا میں بھیجا تو اس کا
پتہ اپنے پاس رکھا۔ یہ لو اپنے پاس رکھ لو۔

شمیم :۔ شکریہ۔ مگر اس کا مصرف ؟

مدن :۔ مصرف۔ تم اس دولت کے مالک بن جاؤ گے۔ سچ کہتا ہوں
تم بڑے خوش قسمت ہو۔

شمیم :۔ کیا اس کے رخسار گلابی ہیں ؟

مدن :۔ نہیں۔

شمیم :۔ آہ ! پھر تو یہ کوئی اور ہے۔ مجھے وہ کہاں ملے گی ؟

مدن :۔ ڈھونڈنا تمھارا کام ہے

شمیم :۔ میں ابھی جاؤں گا۔ (جانا چاہتا ہے)

مدن :۔ میں تو اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ آج نہیں۔

شمیم :۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد اس کا پتہ لگالوں ورنہ کوئی
دوسرا اس کو ڈھونڈ لے جائے گا۔

مدن :۔ دیکھو شمیم ایک دفعہ ایک شخص کو سانپ کی چھتری[۱] کی تلاش تھی۔

شمیم :۔ (چیں بچیں ہو کر) سانپ کی چھتری !

مدن :۔ یہ سمجھ کر کہ کہیں لوگ اس سے پہلے آ کر اپنے قبضہ میں
نہ کر لیں وہ رات ہی کو تلاش میں روانہ ہوا۔ صبح ہو گئی لیکن
اسے کچھ نہ مل سکا اور وہ ناکام خراب و خستہ گھر لوٹا۔ جب اپنے
خانہ باغ میں سے گذر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ خود اس کی
چوکھٹ کے قریب رات میں سانپ کی ایک بڑی سی چھتری نکل
آئی تھی۔ جاننے والوں کی بات سنو اور ذرا صبر سے کام لو۔

شمیم :۔ اگر آپ کی یہ رائے ہے تو ۔ ۔ ۔ ۔ مگر صرف اتنا کہہ دیجئے
کیا وہ مجھے مل جائے گی ؟

مدن :۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ کیا اس معاملہ میں تمھارا
دماغ کچھ بھی کام نہیں کرتا۔

شمیم :۔ جی ہاں۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ ۔ ۔

مدن :۔ ہاں ہاں۔

شمیم :۔ مجھے خوف ہے کہ میں ۔ ۔ ۔ ۔

مدن :۔ تمھارے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ جب وقت تم
ستاروں پر نظر جمائے بڑے بڑے قدم اٹھا رہے ہو ممکن ہے
تم کسی جگنو کو روند ڈالو۔

(مدن کی شخصیت اور انداز گفتگو شمیم کو بھی متاثر کر دیتی ہے۔ بلکہ
اس نے ریحانہ کو متاثر کیا تھا۔ ان دونوں کی نظریں ایک دوسرے پر
تھیں اتنے میں کھڑکی میں سے ایک سنہری لٹ لٹکتی ہوئی نظر آتی ہے
اور ریحانہ داخل ہوتی ہے)

ریحانہ :۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ آپ ابھی تک یہیں ہیں۔

مدن :۔ مگر اب مجھے جانا چاہئیے۔ میں بڑا پھیرنے والا ہوں۔

ریحانہ :۔ (راستہ روکے ہوئے وہ دروازے میں کھڑی ہو جاتی ہے)
نہ جائیے۔

مدن :۔ جب ناخوش گوار واقعات پیش آتے ہیں تو میں کھڑکی کو
کود کر فرار ہو جاتا ہوں۔ دیکھو کہیں اب کے بھی مجھے ویسا ہی نہ کرنا پڑے۔

شمیم :۔ (بنانے کے انداز میں) ہمارے مہمان کو غور سے دیکھو۔
تمھیں اندازہ نہیں کہ یہ کون ہیں۔ یہ بزرگ خواب بناتے ہیں۔
رنگین خواب جو راتوں میں چمگادڑوں کی طرح اڑتے پھرتے ہیں۔

---

[۱] کلاہ باراں

انھوں نے مجھے ایک پری جمال کا پتہ دیا ہے۔ اب صرف تین نیل اور ایک گھوڑا ملنا باقی ہے۔ (معمولی انداز میں) کاش مجھے پتہ مل جاتا۔

مدن:۔ ہاں مل جائے گا ــ خدا حافظ

(وہ جھک کر سلام کرتا اور تیزی کے ساتھ دروازے سے نکل کر چل دیتا ہے۔ ریحانہ دروازے تک تیزی سے جاتی ہے اور باہر دیکھ کر)

ریحانہ:۔ کتنی تیزی سے چل دیئے۔ اب تو نظروں سے بھی غائب ہو گئے۔

شمیم:۔ بالآخر میری تمنائیں پوری ہونے کو ہیں۔ شادی بڑے دھوم دھام سے ہوگی۔ میں سرخ سن برج کی شیروانی پہنوں گا۔ (گاتا ہے)

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

ریحانہ:۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اب پریم کی رس بھری دنیا میں قدم رکھنے والا ہوں۔ وہ دنیا جو مرد کو آدم سے ورثے میں ملی ہے۔

ریحانہ:۔ خدا تمہیں ہر طرح خوش رکھے۔

ہمیں چاہیئے کہ اب خوب روپیہ کمائیں تاکہ تمھاری نئی دلہن کی ساری فرمائشات کی تکمیل ہو سکے۔ میں ناچوں گی۔ خوب ناچوں گی۔ اس قدر ناچوں گی کہ لوگ چلا اٹھیں... رے اس نے ناچ ناچ کر اپنا کام ہی تمام کر ڈالا۔

شمیم:۔ سچ کہتی ہو۔ ہم کو کسی صورت یہ کھیل مل کر چلانا ہی پڑیگا۔ اچھا میں اخبار کے لئے وہ اشتہار مکمل کر دیتا ہوں۔

(وہ دوات قلم اٹھا میز کے قریب بیٹھ کر لکھنا شروع کرتا ہے)

حال میں اس شہر میں ایک سیلانی تھیٹر آیا ہوا ہے۔ جنت نگاہ اور فردوس گوش کے سارے زرق برق لوازم موجود ہیں۔ ریحانہ کا ناچ سحر کا اثر پیدا کرتا ہے۔ ریحانہ سر تا پا حافظ کی غزل کی طرح حسین ہے۔ ناچتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہر عضو فضا میں پریم کے گیت لکھ رہا ہے۔ ریحانہ ایک ۲۰ سالہ ایکٹرس ہے۔ رنگ۔ ...... کون رنگ ہے!

ریحانہ:۔ صبیح ...... صبیح

شمیم:۔ واللہ کتنی عجیب بات ہے۔ بعض چیزیں جو ہمیشہ ہمارے سامنے رہتی ہیں ان کا رنگ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ صبیح رنگ اور آنکھیں!

ریحانہ:۔ نیلی شمیم۔

شمیم:۔ صبیح رنگ اور نیلی آنکھیں۔ صبیح! نیلی! واللہ کیسی عجیب بات ہے۔

ریحانہ:۔ کیا بات عجیب ہے۔

شمیم:۔ میں یونہی کچھ سوچ رہا تھا۔ اکثر لڑکیاں صبیح اور نیلی آنکھوں والی ہوتی ہیں

ریحانہ:۔ ہاں شمیم۔ ہم سب سورۂ رحمٰن کی حوریں تو ہیں ہی نہیں۔

شمیم:۔ تمھاری آواز کس قدر دلکش معلوم ہوتی ہے! معلوم نہیں کیوں۔ معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔

(جیب سے پتہ نکال کر پڑھنے لگتا ہے)

ریحانہ:۔ بات کیا ہے شمیم بولتے کیوں نہیں؟

شمیم:۔ ذرا روشنی میں آجاؤ۔

ریحانہ:۔ تمھیں ہو کیا گیا ہے؟

شمیم:۔ مجھے سب کچھ ہو گیا ہے...... (ریحانہ کو دیکھتے ہوئے پڑھنے لگتا ہے) "آنکھیں جو کہہ رہی ہوں۔ میں تم سے پریم کرتی ہوں: میں جو لپٹ جانے کے لئے بے چین ہوں۔ ہونٹ جو کہہ رہے ہوں تو بولتے کیوں نہیں"۔ ریحانہ کیا یہ ممکن ہے؟ تم آج کتنی سندر معلوم ہو رہی ہو۔ میں نے آج تک اتنی دلکشی محسوس نہیں کی تھی۔ تم بالکل بدل گئی ہو۔ میرے خیال میں تم نے اپنا اصل روپ اتار کر پھینک دیا ہے۔ اور سبزے کی شگفتگی

اور پھولوں کی رعنائیاں چھین لی ہیں۔

ریحانہ:۔ اُو! شمیم۔ آخر بات کیا ہے؟

شمیم:۔ محبت...... آخر میں نے اسے پا ہی لیا۔ سمجھیں تم۔
خیال تو کرو میں تم کو روز دیکھتا تھا۔ لیکن کبھی میں نے خواب نہیں دیکھا...... محبت کا خواب ہاں... ہاں.... یہ اس کا ایک حسین خواب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا دل نسیم بہار کی موجوں میں جھول رہا ہے۔

ریحانہ:۔ آہ! شمیم۔

شمیم:۔ وہ! میرے بازوؤں میں کیسی عجیب تحریک پیدا ہو رہی ہے میں اوپر کو اڑنا چاہتا ہوں۔ آسمانوں میں پرواز کرنے کے لئے میرے بازو تڑپ رہے ہیں۔ چلو آسمان کی چھت پر پہنچ کر تاروں کے حلقے میں پریم کے گیت الاپیں۔

ریحانہ:۔ میں کب سے چاند پر بیٹھی اپنے محبوب کی راہ تک رہی ہوں۔ شمیم میں تمھارے تبسم کو اپنے من میں بسانا چاہتی ہوں۔ اپنا تبسم مجھے ایک بوسے کے ذریعہ دے دو۔

(دونوں ایک دوسرے کی طرف جھکتے ہیں۔)

ریحانہ:۔ بوسہ کے بعد۔ مسرت کا سانس لیتے ہوئے اپنے لب ہٹا کر — میں کتنی خوش ہوں! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے ساری دنیا کی نعمت اور لذت مل گئی۔

شمیم:۔ ریحانہ آؤ۔ انگیٹھی کے کنارے خود کو گرمالیں۔ اب ہمارے دن ہمیشہ مسرتوں میں گذریں گے۔

(وہ صوفہ تک پہنچ چکے ہیں۔ شمیم گاتا ہے)

(شمع بجھنے کو ہے اور جس وقت پر وہ سرگوشیاں کرتا ہوا گرتا ہے شمع کی لو سرخ نظر آتی ہے)

(ماخوذ)

شوکت علی خاں

غزل

جو راز اب تک حجاب میں ہیں وہ خود بخود آئیں گے زباں پر
ادا تو کر سجدۂ عقیدت نگارِ فطرت کے آستاں پر

قفس میں ہوں ہم صفیر! آزادیوں کا قصہ خبر تو لیتا
کہ بجلیاں رقص کر رہی تھیں ابھی ابھی میرے آشیاں پر

وہ رہرو نامراد ہوں میں جو راہ میں تھک کے رہ گیا ہو
شکستہ پائی کا غم ہے دل میں نگاہ ہے گردِ کارواں پر

ترا یہ دعویٰ! رموزِ فطرت سے آشنا ہیں تری نگاہیں
پڑے ہوں تاریکیوں کے پردے جب اس قدر محفلِ جہاں پر

زمانہ سر دھن رہا ہے جس پہ نمود ہی سطح کی وہ اختر
نہ جانے کیا ہو جو روحِ شاعر کے بھید آجائیں بن زباں پر

علی اختر

ایک ماہر خصوصی کے مشورے

ماؤں کے لئے یہ امر عام طور پر پریشانی کا باعث ہوتا ہے کہ بچوں کو بھوک تو نہیں ہوتی۔ مگر پینے کے لیے برابر کچھ نہ کچھ مانگتے ہیں لیکن جب تک بچہ کو بظاہر کوئی بیماری نہ ہو اس میں پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کو گرما میں غذا کی ایسی ضرورت نہیں ہوتی جتنی کہ سرما میں محسوس ہوتی ہے۔ ماؤں کی معلومات کے لئے بچوں کی دیکھ بھال کے متعلق جو مشورے ماؤں کے دریافت کرنے پر انہیں دئے گئے ہیں ان میں سے چند ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) **سوال۔** میری چھوٹی بچی ہمیشہ کچھ نہ کچھ پینے کے لئے طلب کرتی ہے اور پھر بھی اس کو ہچکیاں آتی ہیں۔ کیا اس کو میں ضرورت سے زیادہ تو نہیں پلاتی ہوں۔

مشورہ۔ اس بچی کو جوش دیا ہوا ٹھنڈا پانی غذا کے درمیان پلایا جائے اور دودھ صرف کھانے کے بعد دیا جائے۔ بہتر ہوگا کہ دودھ میں قدرے پانی شریک کر دیا جائے۔

(۲) **سوال۔** یہ ایک بچہ ہے جو اگلے مہینہ میں ڈھائی سال کا ہوگا، چونکہ وہ پیدائشی طور پر کمزور ہے اس لئے اس کی پرورش ایسی غذا پر ہوتی رہی ہے جو پہلے سے مصنوعی ذرائع سے کام لے کر قابل ہضم بنائی جاتی تھی۔ بڑی دقت سے اس کو کھانے کے لئے راضی کرنا پڑتا ہے اور خصوصاً حال میں جب سے اسے زکام کی شکایت ہوئی ہے، اس وقت سے یہ دشواری بہت بڑھ گئی ہے

مشورہ۔ زکام سے اس کیفیت میں زیادتی نہیں ہوئی ہے اصل بات یہ ہے کہ ابتدائی دنوں میں جو غذا اس کو ملتی رہی چونکہ وہ پہلے ہی سے قابل ہضم حالت میں ہوتی تھی اس لئے اس کے ہاضمہ کی قوت جیسے چاہئے ترقی نہ کر سکی۔ اب اس کی ضرورت ہے کہ بتدریج اس کے ہاضمہ کو اعتدال پر لانے کی کوشش کی جائے۔ اس کو زیادہ چکنی اور نشاستہ دار غذائیں مثلاً بالائی، آلو، پراٹھا اور دودھ سے تیار کی ہوئی چیزیں نہ دی جائیں۔ کیونکہ یہ سب دیر ہضم ہیں۔ ترکاری اور میوہ (شروع میں صرف عرق نکال کر) جوش کیا ہوا ٹھنڈا پانی یا ہلکا جو کا پانی (آش جو) زیادہ تر پلائیں، پراٹھے کی بجائے چپاتی (جس میں بھوسہ شامل ہو) کھلائیں چند روز تک رات کو سونے کے وقت ایک چمچہ "ملک آف میگنیشیا" پلانے سے بچہ میں چستی اور چالاکی آجائے گی۔ مغرب کے وقت بلکہ اس کے قبل ہی، اسے کھانا کھلایا جائے۔ جس قدر ہو سکے بچہ کو کھلی ہوا میں کھیلنے کے لئے چھوڑ دیں، اس کو دوڑنے پر مجبور نہ کریں۔ تازہ کھلی ہوا، نیند اور آرام بھی غذا کی طرح از بس ضروری ہیں۔

(۳) **سوال۔** میں اپنی ڈھائی سالہ بچی کے لئے کیا کروں؟ وہ پیدائش ہی سے پتلی ہے اور نشوونما کافی نہیں ہو رہی ہے۔ صحت تو بظاہر اچھی ہے اور دبلی بھی نہیں ہے۔ کھانا بغیر بہلائے اور پھسلائے کبھی نہیں کھاتی اور اگرچہ وہ ہشیار اور اپنے ہاتھ سے خود کھانے کے قابل ہے لیکن ہر وقت سمجھا بجھا کر کھلانا پڑتا ہے۔ ایک بار ۲۴ گھنٹے تک بغیر کچھ کھائے ہوئے رہی۔ پھر بھی کھانے کی خواہش اس میں پیدا نہیں ہوئی۔

مشورہ۔ آپ کی بچی کو غذا سے نفرت کی وجہ یہ ہے کہ ابتداء سے اس کو بہلا پھسلا کر کھلانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ بچے سمجھتے ہیں کہ اس طرح غذا سے نفرت کر کے وہ اپنے نگران اشخاص کی شفقت اور دلچسپی حاصل کریں گے۔ میری تجویز یہ ہے کہ اس کو مسہل کی ایک خوراک دی جائے اور کامل (۲۴) گھنٹے کا فاقہ دیا جائے۔ اس دوران میں سوائے پانی کے کسی قسم کی غذا نہ دیں۔ اس کے سامنے تھوڑا سا کھانا رکھ دیں اور اس کو اپنے ہاتھ سے خود کھانے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ اگر وہ مناسب وقت کے اندر نہ کھائے یا کچھ چھوڑ دے تو کھانا اٹھا لیا جائے مگر اس کے نہ کھانے یا ادھورا چھوڑنے پر کسی طرح کے تعلق خاطر کا اظہار نہ کیا جائے۔ ممکن ہے کہ یہ طریقہ آپ کے لئے آسان نہ ہو، مگر بچی کو اس بری عادت سے باز رکھنے اور اس کو صحت مند اور سمجھ دار بنانے کے لئے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر بچی اس طرح چھوڑ دی جائے گی تو طبعاً وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوگی جب وہ خود بخود کھانا شروع کر دے تو رفتہ رفتہ اس کے باپ سے بچی کو سنا کر انجان بن کر باتیں کی جائیں کہ "اب تو بچی بڑی ہوشیار ہو گئی ہے اپنے ہاتھ سے خود کھا لیا کرتی ہے" اس کا نتیجہ آپ بہت جلد محسوس کریں گے۔ اور بچی اپنی بھوک اور غذا کی خواہش ظاہر کر کے آپ کی دلچسپی اسی طرح حاصل کرے گی جس طرح پہلے اپنی بے رغبتی سے حاصل کرتی تھی۔

(۴) **سوال۔** میرا بچہ دو برس کا ہے اور اپنی عمر کے لحاظ سے کافی بڑا ہے، یوں تو عام طور پر ہر چیز کھا لیا کرتا ہے۔ مگر انڈا یا انڈے سے بنی ہوئی ہر چیز سے اس کو نفرت ہے۔ کیا یہ اس کی ہٹ تو نہیں ہے؟

مشورہ۔ شاید کبھی یہ ہوا ہوگا کہ اس سے بڑی عمر کے کسی شخص نے کبھی بے خیالی میں اس بچہ کے سامنے انڈے سے نفرت ظاہر کی ہوگی یا حقیقتاً اس کو انڈے سے طبعی نفرت ہوگی۔ بچوں کو اس قسم کی طبعی خصوصیات کے خلاف مجبور کرنے سے ان کا ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے، بلکہ ایسی غذاؤں سے ان کی صحت خراب ہو جاتی ہے اور یہ عادت بہت وقت سے دیر میں چھوٹتی ہے۔ مگر خاص خاص غذاؤں سے بچہ کو جو نفرت ہوتی ہے وہ گویا اس کی صحت کی فطری ضمانت ہوتی ہے۔

(۵) **سوال۔** کیا آپ ازراہ کرم مجھے مشورہ دیں گے کہ میں اپنی گیارہ مہینے کی بچی کو کیا غذا دوں۔ نویں مہینہ تک تو اس کو اپنا دودھ پلاتی رہی۔ اس کے بعد سے دودھ کا خشک سفوف (جو بند ڈبہ میں بکتا ہے) پلا رہی ہوں۔ مگر یہ نہیں معلوم کہ اب اس کو کیا غذا دی جائے۔ اب تک اس کے دانت بھی نہیں نکلے ہیں۔ دانت دیر سے نکلنے کی وجہ آپ کی رائے میں کیا ہے۔

مشورہ۔ گیارہویں مہینے میں اس بچی کو آپ ناشتہ میں دلیا، گھنٹی یا دودھ کے ساتھ توس دیں۔ دوپہر کو شوربا یا یخنی کے ساتھ چپاتی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے یا نیم برشت انڈے کے ساتھ ڈبل روٹی اور کچھ میٹھا قلیل مقدار میں یا دودھ کی پڈنگ یا کھیر یا میوہ کا مغز۔ شام کو دودھ و ڈبل روٹی یا کوکو اور دودھ کے ساتھ بسکٹ یا توس کھلا سکتے ہیں اس کو پوری غذا اچھا اور پیاس سے کھلائیے دانت نکلنے میں جو دیر ہو رہی ہے اس کے لئے اپنے طبیب سے مشورہ کیجئے۔ ممکن ہے کہ بچی کو ایسی ادویہ کی ضرورت ہو جو ہڈیوں کی ساخت اور نشو و نما کے لئے ضروری ہیں۔ (ترجمہ)

مطیع الرسول (از فتر جامعہ عثمانیہ)

سوانح نگاری کا ایک شاخسانہ

سوانح نگاری ایک اچھا فن ہے۔ ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ مختلف قوموں کی مشہور ہستیوں اور نمایاں خدمات کرنے والوں کی زندگی کے حالات لکھنا تاکہ وہ دوسروں کے لئے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے نمونے کا کام دے سکیں، ہر ملک و قوم میں رائج رہا ہے اور اس فن کی جس قدر اہمیت جتائی جائے کم ہے۔ کون پسند کرے گا کہ مشاہیر اور محسنان بنی آدم نے کشمکش حیات کی راہ پر اپنی الوالعزمیوں اور بلند ہمتوں کے جو نقش قدم چھوڑے ہیں، وہ ہماری ہدایت کے لئے محفوظ نہ کرلئے جائیں۔

مگر معاف کیجئے مجھے یہاں صحیح سوانح نگاری کے محاسن پر کچھ لکھنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس عالم کون و فساد میں چونکہ اکثر اچھی چیزوں سے بھی، عالم اختلاط میں، فساد پیدا ہونے لگتا ہے، یہاں سوانح نگاری کی ایک نئی شکل کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے جو اگر مفسدہ پرداز نہیں تو فاسد ضرور ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ اس "نئی شکل" پر کچھ لکھا جائے آج کل کی اس فضا کا جائزہ لینا شاید بیجا نہ ہوگا۔ جس نے اس ترقی کے دور میں کچھ تخلیق ادب کی چاروں طرف ایسی لہریں دوڑادی ہیں کہ اس سے جو ہلچل مچ گئی ہے اس نے ایک عدم توازن پیدا کردیا ہے۔ جہاں اچھی اور مفید علمی و ادبی کتابیں پیدا ہورہی ہیں اور جہاں نئی پود حتیٰ کہ زیر تعلیم کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں کی بعض کوششیں بھی اس میدان میں آئندہ ترقی کی خاطر، قابل ہمت افزائی ہیں۔ وہاں کچھ خرافات بھی چھپ رہی ہیں۔ اور گندم نما جو فروشی کا بھی خاصا میدان کھل گیا ہے جس سے توازن کے بگڑ جانے، معیار کے گر جانے، اور صحیح مذاق کے نہ پیدا ہو سکنے کا اندیشہ قوی ہوتا جارہا ہے۔ تعلیم کی روشنی جیسی جیسی پھیلتی جائے گی۔ علم و ادب تصنیف و تالیف کا چرچا بڑھتا جائے گا۔ اور یہ ایک فطری چیز ہے۔ مگر ایک ایسا ہنگامہ تو برپا نہ ہونا چاہیئے کہ معیار اور چیزوں کی قدر و قیمت تہہ و بالا ہوجائے۔ کالج کے طلبا و طالبات کو تو چھوڑیئے کہ ان میں کچھ صلاحیتیں پیدا ہوچکتی ہیں اور ان میں سے بعض صحیح تربیت سے تصنیف کے راستہ پر ڈالے جاسکتے ہیں، گو یہ بھی اکثر اپنے متعلق غلط فہمیوں سے پاک نہیں ہوتے۔

کیا فرماتے ہیں اس مسئلہ میں علمائے شرع ادبیات و جبہ پوشان فن تنقید کہ:۔

(۱) اسکولوں کے بچے بھی اپنے کو مصنف سمجھنے لگیں اور لڑکوں اور لڑکیوں کو ان کے صحیح حدود میں رکھنے کی بجائے ان کو ان کے عزیز یا دوست مضامین لکھ کر دیا کریں تاکہ ان کا نام مضمون نگاروں کی فہرست میں رسالوں میں چھپنے لگے، جس سے ان کے ذہنوں میں عدم توازن پیدا ہو۔ اور یہاں تک کہ کسی اسکول کی چھٹی جماعت کے لڑکے کے فلسفۂ اقبال پر مضامین چھپنے لگیں اور پڑھنے والوں کو مضمون تو خاصا معلوم ہو مگر اس جماعت کے لڑکے اور اس کی عمر و ذہن اور فلسفۂ اقبال میں کوئی مناسبت معلوم نہ ہوتی ہو۔ اور پھر پڑھنے والوں کو پیسے دے کر ایسے مضامین پڑھنے پڑیں!

(۲) اور کس نفسیاتی کیفیت و ذہنی بنیاد پر مبنی ہے یہ واقعہ کہ تصنیف و تالیف کا میدان اپنے اوپر بلا وجہ تنگ کر کے ایسے

انھوں نے بھی جو دو چار کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے روشناس ہونے لگیں۔ کسی تعلیمی ترقی کے بیان کے سلسلہ میں ایسے افراد کی سوانح حیات لکھے جنھوں نے کچھ تعلیم پائی ہو یا جن کے کچھ مضامین شایع ہو گئے ہوں یا جن کے نام سے ایک آدھ مضمون چھپ گیا ہو۔

خصوصاً جب اس شق نمبر (۲) کے تحت ایک صاحب نے اپنے رجحان کے موافق ایک مخصوص صنف ہی کی خدمت کا ارادہ کر کے یہ بیڑا اٹھایا ہو کہ ہر تعلیم یافتہ خاتون یا ادب سے دلچسپی رکھنے والی عورت خصوصاً اگر اس کا یا اس کے نام سے کوئی مضمون کہیں چھپ گیا ہو، تو اس کی سوانح حیات پیروی کے ذریعہ حاصل کر کے اپنی کسی کتاب کی کوئی جلد مرتب کرنے میں صبح و شام دوا دوش فرمانے لگیں اور چونکہ اس فہرست میں کالج کی اکثر طالبات آجاتی ہیں، ان کے ساتھ جو غائبانہ ہمدردی ہے، اس کو معین اور مربوط شکل دینے کے لئے ان سے نامہ و پیام شروع کر دیا جائے؛ اب یہ ایک دوسری چیز ہے کہ اکثر گھرانے ابھی اس قدر "قدیم وضع" کے ہیں کہ ایک اجنبی مرد کی اس قسم کی پیام رسانی کو بن بیاہی لڑکیوں کے نام غیر موجہ اور بے ضرورت سمجھتے ہیں اور بعض تو شاید قابلِ برافروختگی بھی! یہ ان لوگوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ ہمیں یہاں اس مسئلہ کے سوشیل پہلو سے بحث نہیں۔

ہم تو صرف سوانح نگاری کے ایک شاخسانہ سے بحث کر رہے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ سوانح نگاری کے فن کو اس درجہ گرا دینا کہ اس میں کالج کی لڑکیوں کی سوانح بھی چھپنے لگیں۔ جب کہ ابھی اس طبقہ کی قابلِ لحاظ سوانح شروع بھی نہ ہوئی ہوں، آیا ادبیات کی کوئی خدمت ہے؛ یا فنِ سوانح نگاری کو ذلیل کرنا مقصود ہے؟ اور ایسی لڑکیوں کی سوانح جمع کرنے کی کوشش جنھوں نے ابھی زندگی کا مفہوم بھی پوری طرح نہ سمجھا ہو، آیا خود ان لڑکیوں کو اپنی زندگی کی اہمیت کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا کرنا نہیں ہے اور آیا خود فنِ سوانح نگاری اور تصنیف کی اس سے ان کی نظروں میں کوئی تحقیر نہیں ہو رہی ہے!

آج کل کچھ "ہمت افزائی" اور اس کے طریقوں کا بھی غلط استعمال ہونے لگا ہے۔ شاید کہا جائے کہ نوعمروں اور ہونہاروں کی ہمت افزائی کرنی مقصود ہے! اگرچہ اس خیال کو سوانح نگاری کی حد تک صرف لڑکیوں سے متعلق وسیع کیا گیا ہے اور نہیں معلوم کیوں ایسا کیا گیا ہے، مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کسی ترقی یافتہ قوم کے ادب میں اس قسم کی سوانح نگاری کی کہیں کوئی مثال پائی گئی ہے؟ یا محض کسی شخص کی کسی نفسیاتی بنیاد پر مبنی یہ اس کی ایک "ایجادِ بندہ" ہے اگر ایسا ہے تو اندیشہ ہے کہ وہ "گندہ" ہے۔ ہم نے نفسیاتی بنیاد کی طرف اشارہ اس مجبوری سے کیا ہے کہ ادب کی یا سوانح نگاری کے فن کی روایات اور عقل و روایت کی کوئی بنیاد اس تصنیع کی تائید نہیں کرتی۔ شاید یہ ان کیفیات میں سے ایک ہو جس کو ماہرینِ نفسیات کسی قسم کا (complex) کہتے ہیں۔

مگر نہیں، معاف کیجئے، ایک اور معمولی سی وجہ مجھ جیسی غیر نفسیات داں ہستی کی بھی سمجھ میں آجاتی ہے گو شاید اس کی بنیاد نفسیات ہی پر ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر فردِ انسانی اپنی خود اظہاری کے جذبہ کا شکار ہوتا ہے اور اخباروں، کتابوں، اور رسالوں میں کسی عنوان سے نام کا چھپ جانا بھی اس جذبہ کی تشفی کا باعث ہوتا ہے۔ تو اگر بھولی بھالی لڑکیاں یا عورتیں اس خصوص میں سوانح لکھ کر کتاب کی شکل میں چھپنے کے لئے بھیجنے کی استدعا کا شکار ہو جائیں تو کوئی تعجب نہیں۔ اس سے تو شاید ان کو ادبی نہیں تو اور قسم کا فائدہ ضرور پہنچے گا۔ کہ فلاں خاندان میں پیدا ہوئے ہیں۔ فلاں اسکول میں اس جماعت تک اور فلاں اسکول تک

اس جماعت تک تعلیم پائی پھر یا تو سینئر کیمبرج کی راہ سے یا اسکول فینل یا عثمانیہ میٹرک کے راستے سے کالج پہنچ گئیں۔ کچھ اس میں خاندان اور والدین کی وجاہت کا ذکر بھی آگیا۔ اور ماشاء اللہ سے دو چار مضامین "شہاب میں" سب رس میں یا بہت دور کی لی تو شمالی ہند کے کسی رسالے میں لکھ کر یا لکھوا کر بھجوائے ہیں۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ اس سے بڑھ کر شاندار زندگی اور کیا ہوگی؟ اور یہ شاید ایسے حالات زندگی ہیں۔ کہ اس زمانہ کے مصنف ان کو کتابوں میں شایع کریں! اور غالباً یہ بھی مقصود ہے کہ جب انشاء اللہ ملک میں تعلیم بہت زیادہ عام ہوجائے گی اور حقیقی تعلیم یافتگی مردوں اور عورتوں دونوں میں پیدا ہوگی تو آئندہ آنے والے اس وقت پر ہنسیں کہ ماشاء اللہ کیا مفید معلومات اور اہم مواد ہمارے لئے اسلاف نے برائے ہدایت و تشویق چھوڑا ہے؟ اور غالباً ایک صدی بعد اس کتاب پر۔ یہ بحث ہوگا کہ یہ مواد جو جمع کیا گیا تھا آیا اس سے کسی قسم کی ڈائرکٹری مرتب کرنی مقصود تھی یا ان کی سوانح لکھنی مقصود تھی! کیونکہ دونوں صورتوں میں ادھوری اور غیر مکمل ہوگی! مصنف کی نفسیات کیا تھی اس کا محرک کیا تھا؟ کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ سو سال بعد نفسیات کا علم بہت ترقی کر جائے گا اور ہر چیز کے نفسیاتی پہلو پر آج سے بہت زیادہ زور دیا جائے گا۔

ہاں البتہ نفسیاتی کمزوری کے اس پہلو سے کھیل کر مصنف ایک ذاتی قسم کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مثلاً ایک مقامی اخبار نے ایک ڈائرکٹری شایع کی جس میں ملک کے متعلق کچھ مفید معلومات تھیں مگر آپ جانتے ہیں کہ محض مفید معلومات لکھ دینے سے آج کل کتابیں نہیں بکتیں، تو اس ڈائرکٹری میں کیا یہ گیا کہ چار پانچ ہزار مڈل کامیاب لڑکوں کی فہرستیں شایع کردیں۔ چلئے ہر لڑکے نے ایک ڈائرکٹری اپنے چھپے ہوئے نام کی خاطر خرید لی تو چھٹی ہوئی۔ کوئی دوسرا اس کو خریدے یا نہ خریدے نفع خاصا ہوگیا۔ تو یہ پہلو ذاتی منفعت کا ہمارے زیر بحث "سوانح" کا بھی ہوسکتا ہے کہ جن خواتین کا اس میں نام آگیا وہ خود تو یقیناً خریدیں گی اور کچھ خرید کر عزیز اقارب اور سہیلیوں کو دیں گی کہ ان کی اس "نام چھپائی" کا چرچا ہو اور پھر جناب بعد کو تو ان خواتین کی نسلیں بھی غالباً خریدتی رہیں گی کہ آخر وہ ایک "خاندانی کارنامہ" رہے گا۔ ہم مانتے ہیں کہ یہ مالی پہلو اہم ہے اور تجارتی ڈائرکٹریوں کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ لیکن جو لوگ ملک کے مصنفین کہلاتے ہیں اور علمی و ادبی خدمات کے دعویدار ہیں آیا ان کے لئے بھی یہ چیزیں زیب دے سکتی ہیں؟

غرض کہ اس ایک موضوع پر نمونتاً کسی قدر طویل بحث سے میرا یہ مقصد ہے کہ میں ملک کے صحیح مذاق کے لوگوں کی اور اہل تنقید کی نظر اس پوری صورت حال اور اسی قسم کی مختلف بے راہ رویوں کی طرف پھیروں اور خصوصاً ارباب ادارۂ ادبیات اردو کی توجہ اس طرف منعطف کراؤں کہ زیر بحث اور دیگر بد عنوانیوں کے سد باب کی طرف عملی قدم بڑھائیں کیونکہ جس قدر زیادہ علم کی اشاعت ہوگی۔ مصنفین مترجمین، مولفین اور ان کے ساتھ ساتھ گندم نما جو فروشوں کی بھی کمی نہ رہے گی۔ اور تیسرے درجے کے مصنفین و مولفین کی جو چھاپے خانے کی سیاہی کو برباد کرتے رہتے ہیں اور اچھی کتابوں کے انتخاب کو مشکل اور گراں بناتے رہتے ہیں اب بھی کمی نہیں۔ لہذا کوئی قوت یا ادارہ ایسا ہونا چاہیے جو اردو ادب کی ہمدردی میں لغویات کو روکنے سیدھا راستہ بتانے اور اچھی چیزوں کی ہمت افزائی کا باقاعدہ کام اپنے ذمہ لے۔

مثلاً ایک مسئلہ جو نقادوں کے لئے قابل غور ہوسکتا ہے یہ ہے کہ اردو میں عام طور پر مضمون نگار اپنے: خذہ مواد کے اظہار کے

مسئلہ میں بہت کم ایمان داری سے کام لیتے ہیں اور عموماً یوروپی زبانوں سے مواد و خیال لے کر اپنی تصنیف کی صورت میں پیش کرنے کا مرض عام ہوگیا ہے۔ کیا حیدرآباد نے نہیں دیکھا کہ بعض انگریزی ڈرامہ نویسوں کے ڈرامے ترجمہ اور محرف کر کے "مصنفہ" فلاں کے نام سے پیش کیے گئے، اور شاید کہیں اصل مصنف سے منت پذیری کے اظہار کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔ بہرحال ہماری روزافزوں ادب کا یہ درآمد کردہ جزو زیادہ ادبی ایمان داری کا طالب معلوم ہوتا ہے۔

یہ سب چیزیں آج کل کے ادب اور اس کے رجحانات و رفتار کے متعلق میرے دماغ میں کچھ عرصہ سے آ رہی تھیں۔ میں اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ ان اہم اور دور رس مسائل تنقید و ادب وغیرہ کا حل پیش کر سکوں۔ مگر اتنا ضرور محسوس کیا کہ ہماری رفتار و کردار ادبی میں "سب کچھ ٹھیک نہیں ہے" کہیں پانی مرتا ہے۔ کہیں سے کچھ بو آتی ہے۔ کچھ مقامات کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اب یہ ماہرین فن تنقید اور اطبائے ادبیات کا کام ہے کہ ان امراض کی تشخیص کریں اگر ان میں' جیسا کہ مجھے شبہ ہے' بعض متعدی اور وبائی کیفیت رکھتے ہیں تو ان کا سدباب کیا جائے۔ پھیلنے سے روکا جائے اور اگر چند اشخاص وبا سے متاثر پائے جائیں تو ان کو مانع مرض ٹیکہ دیا جائے۔ ضرورت ہو تو ادبی آبادی سے باہر قیام کرنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ عمل اگرچہ ان چند اشخاص کے لئے تکلیف رساں اور رنج دہ ہوگا مگر ساری ادبی آبادی وبا سے محفوظ و مصئون رہ سکے گی۔ آخر یہی عمل پلیگ وغیرہ سے متعلق حفظان صحت والے کرتے ہی ہیں! اور ذہنی وبائیں پلیگ سے زیادہ مخدوش ہوتی ہیں۔ پھر جو مداوا و معالجہ ماہران خصوصی تجویز کریں! یہ بہرحال ان کا مسئلہ ہے۔

یہ پوری تحریر محض ادبیات کی فضا کو پاک کرنے اور رکھنے کی طرف متوجہ کرنے کی خواہش سے لکھی گئی ہے۔ اشخاص اور ذاتیات سے بحث نہیں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جو خیالات یہاں ظاہر کیے گئے ہیں ان سے سب متفق ہوں۔ لیکن اگر اس تحریر نے صحیح خیال اور صحیح درک و نظر رکھنے والے حضرات کو اصلاح حال کی طرف متوجہ کر دیا تو چلئے سمجھوں گی کہ یہ کاغذ سیاہی اور لکھنے میں جو وقت اور خیال صرف ہوا وہ ضایع نہ ہوا۔

جہاں آرا

نذرِ دکن

مرقع دکن کے ساتھ اس کا ایک **ضمیمہ خواتین** علیحدہ کتابی صورت میں شایع ہوا ہے جس میں دکن کی چھپن سے زیادہ انشا پرداز خاتونوں کے نہایت دلچسپ اور مفید مضمون اور نظمیں شامل ہیں۔ یہ اصل میں سی دکن نمبر کا حصہ ہے جو صنف لطیف کے نتائج قلم پر مشتمل ہے اور ادارہ ادبیات اردو کے شعبۂ نسواں کی طرف سے اس کے سرگرم معتمد محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کے پرخلوص سعی کی وجہ سے نہایت خوبی نفاست اور نفاست کے ساتھ مرتب اور شایع ہوا ہے۔ اس کی عام قیمت عہ مقرر کی گئی ہے لیکن صرف سب رس کے خریداروں کو نصف قیمت پر یعنی ۸ آنہ دیا جائے گا۔ کیونکہ سب رس ہی کا ایک حصہ ہے۔ ذیل میں خواتین دکن نمبر کے بعض مضمون نگاروں کے نام دیے جاتے ہیں۔

رابعہ بیگم صاحبہ (زنانہ کالج)　فاطمہ بیگم صاحبہ آذا　تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ　نجم النساء بیگم صاحبہ　کبریٰ اقبال عبد الرؤف

زبیدہ ضیاء الدین انصاری　بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر　رابعہ بیگم صاحبہ (معلمہ) محبوبیہ کالج　افسر النساء بیگم صاحبہ　ممتاز جہاں بیگم صاحبہ صوفی

صفیہ صدیق فریدہ بیگم صاحبہ　جہاں بانو بیگم صاحبہ بی۔ اے　لطیف النساء بیگم صاحبہ بی۔ اے　ذاکرہ بنت فضل اللہ احمد صاحب　تسنیم بانی بی۔ اے

مسز صوفی ام۔ اے　تصدق فاطمہ غلام پنجتن صاحب　نور جہاں تسنیمی صاحبہ　امیسہ اور دل بیگم صاحبہ شروانیہ　شہر بانو بیگم صاحبہ

اردو پر قابو پانے کے لئے اس کے بڑے بڑے مصنفوں کے کلام کا مطالعہ اور پھر مستقل مشق۔ ان دو باتوں کی سخت ضرورت ہے۔

"جتنا زیادہ تم اُن لوگوں کے کارناموں کا مطالعہ کرو گے جو پُرعظمت تھے اتنا ہی تمھاری قوتِ ایجاد میں اضافہ ہوگا۔" انگلستان کے مشہور نقاش اور نقادِ فن سر جوشیا رینالڈ کا قول ہے جو نہ صرف نقاشی بلکہ انشا پردازی پر بھی صحیح طور پر منطبق ہوتا ہے۔

آپ کو ان اچھے الفاظ کی ایک عمارت بنانی چاہیے جن سے آپ واقف ہیں۔ انہیں اعتماد کے ساتھ استعمال کرنا سیکھئے اور اس بات کی کوشش کیجیے کہ نئی نئی ترکیبیں بن سکیں اور اس طرح سے ایک شخصی اسلوب کا ارتقا ہو جائے۔

بعض اصحاب یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ ایک وسیع لفظی خزانہ جمع کرلینے کا آسان ترین ذریعہ کسی اردو لغت کو زبانی یاد کرلینا ہے۔ لیکن یہ خیال نہایت فریب دہ ہے کیونکہ تنہا الفاظ کو یاد رکھ لینا کافی نہیں ہے انشا پرداز کو چاہیے کہ انہیں دوسرے لفظوں کے صحیح تعلق کے ساتھ معلوم کرے۔

ایسے مصنفوں کی تقلید کرنے کی ہرگز کوشش نہ کرنی چاہیئے جن کا اسلوب خاص اور غیرمعمولی خصوصیتوں کا مالک ہوگیا ہو۔ محمد حسین آزاد، ملا رموزی، آغا حیدر حسن یا خواجہ حسن نظامی کے اسلوب کی نقل آتارنا نہ صرف مشکل بلکہ بے سود ہے۔ اس کے لئے ایک آزاد ایک رموزی ایک آغا حیدر حسن ایک خواجہ حسن نظامی ہی کے دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ نوجوان انشا پردازوں کو ان مصنفوں کی طرف بڑھنا چاہیئے جن کی زبان میں وضاحت، سادگی، جوش اور فطریت تناسب کے ساتھ ظاہر ہوتی رہتی ہو اور جن کی تقلید میں واقعی کامگاری نصیب ہو سکتی ہو۔

اس بارے میں سرسید، شبلی، حالی اور وحیدالدین سلیم زیادہ قابل توجہ ہیں۔ ان کے اسلوب بھی دلچسپ اور پُرتنوع ہیں اور وہ بھی اپنے موضوعوں کو ایک خاص دلچسپ پیرائے میں بیان کرتے ہیں ان کی تحریروں کی خصوصیات انشا پردازی کے طالب علموں کو یہ دو سبق سکھاتی ہیں کہ۔

۱۔ کامیاب انشا پردازی، پڑھنے والے میں دلچسپی پیدا کرنے اور پھر اس کو قائم رکھنے پر منحصر ہوتی ہے۔

۲۔ مطالعہ اس لئے تکلیف دہ نہیں ہوتا کہ ہر صفحہ ایک خاص دلچسپی رکھتا ہے، اور شبلی، حالی اور سلیم کی ایک اور خصوصیت تو یہ ہے کہ وہ پڑھنے والوں کے دلوں میں ادب اور تاریخ کا سچا ذوق موجزن کر دیتے ہیں۔

اس امر کا افسوس ہے کہ اردو میں ایسے روزناموں اور ہفتہ وار اخباروں کی کمی ہے جن کے مضامین انشا پردازی کے اچھے نمونوں کا کام دے سکتے ہوں اور جن کے مطالعہ سے وہ لوگ سبق حاصل کرسکیں۔ جو ایک سادہ اور فطری اسلوب کی مشق

کرنی چاہتے ہوں، یورپ کی زبانوں میں ایسے کئی پرچے نکلتے ہیں اور وہاں کے بعض انشا پردازوں نے تو انہی کے مطالعہ سے اپنے ادبی ذوق اور تحریری مشق میں ترقی کی ہے۔

انگریزی زبان میں ٹائمز اور مینچسٹر گارڈین اس لحاظ سے بہت مفید ہیں۔ ان کے علاوہ اوسط درجہ کے مقبول پرچوں میں ڈیلی ایکسپرس، ڈیلی میل، اور ایوننگ اسٹانڈرڈ، بھی اکثر اوقات نہایت اچھے نمونے پیش کرتے ہیں۔ ہفتہ وار پرچوں کی تو اچھی خاصی تعداد ہے لیکن اسپکٹیٹر میں انشا پردازی کے عمدہ نمونے اکثر نکلتے ہیں، اردو میں ابوالکلام آزاد کے الہلال، مولانا محمد علی کے ہمدرد، عبدالماجد کے سچ، اور صدق، خواجہ حسن نظامی کے منادی، قاضی عبدالغفار کے پیام، اور خلافت کے پرچوں میں اس قسم کی خصوصیات جھلکتی رہی ہیں۔ جہاں کوئی اس قسم کا اچھا مقالہ نظر آئے آپ کو چاہئے کہ نہ صرف ایک سے زیادہ مرتبہ اس کو پڑھا ہی بلکہ اس امر پر غور کریں کہ اس مقالہ کا پورا اثر کس نقطہ پر منحصر ہے اور یہ کہ جملوں کی ترکیبوں اور لفظوں کے استعمال میں کن امور کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ابوالکلام، محمد علی، عبدالماجد اور خواجہ حسن نظامی کی اس قسم کی تحریروں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے سے بھی انشا پردازی کے بہت سے راز بے نقاب ہو سکتے ہیں۔

اگرچہ اعلیٰ درجہ کی ادبی تحریروں کا گہرا اور بار بار مطالعہ کچھ کم فائدہ مند نہیں لیکن اس سے بڑھ کر کامیاب نتیجے مطلب نویسی کی مشق سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ لفظی خزانے کو وسیع کرنے کا بھی سب سے بہترین ذریعہ یہی ہے۔ دوسرے کی عبارت کو اپنی زبان میں ادا کرنا مطلب نویسی ہے۔ اور ایسا کرتے وقت فن انشا پردازی کے کسی طالب علم کو محض تبدیلی کی خاطر ایسے الفاظ نہیں استعمال کرنے چاہئیں جن سے اصلی عبارت کا مطلب فوت ہو جائے۔ اس طریقہ کار سے اس میں کوئی شک نہیں کہ اصلی عبارت کے اسلوب کی برابری نہیں کی جا سکتی لیکن لفظوں کا صحیح استعمال کرنا آجاتا ہے جو اچھی تحریر کی طرف بڑھنے کا پہلا قدم ہے۔

آپ نے اپنی عبارت میں جن الفاظ کا استعمال کیا ہے ان کا اصل عبارت کے الفاظ سے مقابلہ کیجئے اور لغت کی مدد سے دیکھئے کہ دونوں میں کن جزوی امور کا فرق ہے اور کونسا لفظ مطلب کو ٹھیک اور مختصر طور پر ادا کر سکتا ہے۔ اس طرح کی محنت سے آپ کے لفظی خزانے میں قسم قسم کے لفظوں کا اضافہ ہوتا جائے گا۔

ایک اور طریقہ "خلاصہ نویسی" ہے جس کی وجہ سے نو مشق انشا پرداز بہت جلد ترقی کر سکتے ہیں۔ خلاصہ نویسی سے مراد ہے۔ کسی عبارت کے مطالب کو اپنے الفاظ میں مختصر سے مختصر کر کے لکھنا۔ اس سے ضروری اور غیر ضروری الفاظ میں امتیاز کرنے کا مادہ پیدا ہو جائے گا جو ایک اچھے انشا پرداز کے لئے نہایت ضروری ہے۔

عبارت آرائی کی مشق کے ساتھ ساتھ انشا پرداز کو جن امور کی طرف سب سے زیادہ متوجہ ہونا پڑتا ہے ان میں مضمون کا خاکہ، اس کے آغازی جملے، اس کی مسلسل دلکشی، اور سب سے بڑھ کر مضمون کے مناسب ترین اور دلکش عنوان کا انتخاب نہایت اہم ہیں۔

تقریباً ہر کامیاب انشا پرداز اس راز سے واقف ہوتا ہے کہ مضمون لکھنے کے لئے موضوع کا انتخاب کر لینے کے بعد

سب سے پہلے اس کو اپنے کام کا ایک خاکہ بنا لینا چاہیئے۔ جس میں وہ دیکھتا ہے کہ زیر بحث موضوع پر کیا کیا لکھا جا سکتا ہے؟ اس خصوص میں آپ اس بات کا ضرور خیال رکھئے کہ خاکہ پر غور کرتے وقت جو جو خیالات دماغ میں جولانیاں دکھاتے ہیں وہ فوراً قلم بند کر لئے جائیں تاکہ بعد میں ان پر نظر ثانی کر کے اس امر کا تصفیہ کیا جا سکے کہ آیا کسی مضمون میں شامل ہونے کی ان میں سکت بھی ہے یا نہیں۔ نمونے کے طور پر یہاں حسب ذیل چند جملے پیش کئے جاتے ہیں جو ایک اچھے مضمون کے خاکہ کا کام دیں گے۔

وہ کونسی صفات ہیں جو کامیاب آدمی کو ممتاز کرتی ہیں؟

تحریک، جوش

استقلال، جرأت، اور کچھ اور

اُس میں آگے بڑھنے کی اہلیت ہوتی ہے اور وہ ایک خاص مقصد کی طرف چلتا ہے۔

وہ تعمیری طریقے پر سوچتا ہے، خیالات حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا ہے، اور کام کرنے کے بہترین طریقے ڈھونڈھتا ہے۔ زیادہ جانتا ہے اور زیادہ دیکھتا ہے کیونکہ اس کے خیالات بجائے سو راستوں کے ایک ہی جانب متوجہ رہتے ہیں۔ اپنے کام کی تہہ تک پہنچتا ہے اور دور تک کی سوچ لیتا ہے۔

خاکہ ڈال لینے کے بعد دوسری چیز جس پر انشا پردازوں کی کامیابی کا انحصار ہے، مضمون کے آغازی جملے ہیں۔ پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر لینے کے لئے مضمون کی اچھی ابتدا ہر حال میں لازمی ہے۔ انشا پرداز کو چاہیئے کہ مضمون کی باگ فوراً اپنے ہاتھ میں لے لے۔ بہترین تمہید وہی ہے جو موضوع سے دلچسپی پیدا کر دیتی ہے اور منکشف کرتی ہے کہ مضمون نگار کی نظر میں ایک معین مقصد ہوتا ہے۔ حسب ذیل دو نمونے ظاہر کر سکتے ہیں کہ متذکرۂ بالا موضوع (یعنے کامیاب انسان کو ممتاز کرنے والی صفات) پر کسی مضمون کے ابتدائی جملے کس طرز کے لکھے جا سکتے ہیں۔

(۱) کیا کامیابی کا کوئی راز ہے؟ کیا اس امر کی کوئی سادہ توضیح کی جا سکتی ہے کہ کیوں ایک آدمی آگے بڑھ نکلتا ہے۔ اور دوسرا ایک ہی جگہ ٹھہرا رہتا ہے۔

(۲) قمرالدین دفتر میں ملازم ہونے کے چند ہفتوں بعد ہی ترقی پانے والوں کے زمرہ میں شمار کیا جانے لگا وہ ایک زندہ آدمی اور سوچنے اور کام کرنے والا انسان ہے اور ان لوگوں میں سے ہے جن کا آگے بڑھنا یقینی ہے۔

جب میں نے پرسوں "مضامین سرسید" میں یہ خیال پڑھا کہ کامیابی کا تعلق محنت اور صرف مسلسل محنت سے ہے تو مجھے متذکرۂ بالا جملہ یاد آ گیا جو میرے ایک دوست عہدہ دار نے اپنے دفتر کے ایک اہلکار کی نسبت مجھے خط میں لکھا تھا۔

مضمون کا ایک جاندار آغاز توجہ پیدا کرنے کا بہترین ذمہ دار ہوتا ہے۔ لیکن دوسرا مسئلہ پڑھنے والے کی دلچسپی کو مسلسل رکھنے سے متعلق ہے۔ یہ ضروری ہے کہ آپ رفتہ رفتہ اپنے طریقۂ تحریر کی گہرائی دکھانے لگیں۔ اگر آپ متذکرۂ بالا موضوع پر

لکھتے وقت محنت اور اپنی مدد آپ کرو سے تعلق ہیں پا افتادہ اور معمولی خیالات اور زبان زد عوام اقوال پیش کر دیں تو آپ کے ناظرین بہت جلد اکتا جائیں گے۔ وہ جس چیز کے خواہشمند ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ موضوع پر بالکل نئے اور عملی طریقے پر روشنی ڈالی جائے اس بارے میں مضمون نگار کو اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اگر ساتھ ساتھ اپنے ذاتی تجربات بھی تناسب کے ساتھ پیش کر دئے جائیں تو بیان زیادہ دلچسپ ہو جائے گا۔

خیالات کو ہمیشہ ایک دلکش لباس یا پیرایہ میں پیش کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ یاد رکھئے کہ مستعمل اور پامال واقعات بھی دلچسپ بنائے جا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ انہیں اچھے فقروں سے ملبوس کیا جائے۔ اس بات کو بھی شروع سے آخر تک پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر اپنے خیالات اور واقعات کی واضح ترتیب کے علاوہ سادہ اور بولتے ہوئے لفظوں کے استعمال ہی سے اپنا گہرا اثر بٹھایا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں اور دو باتیں قابل ذکر ہیں۔ مضمون کی ظاہری شکل و صورت کا دلکش بنانا بھی ضروری ہے۔ طول طویل مسلسل عبارتوں کے لکھنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ چھوٹے چھوٹے علحدہ ٹکڑے زیادہ جاذب نظر ہوتے ہیں۔ اگر درمیان میں مختصر ذیلی سرخیاں آتی رہیں تو پڑھنے والے کو جلد بیزار ہونے سے روکنے کا کام دے سکتی ہیں۔

اس امر کی اہمیت سے بھی غالباً ہر صاحب ذوق واقف ہے کہ مضمون کا عنوان انتہائی جدت اور ہوشیاری کا نتیجہ ہونا چاہئے۔ اختصار، وضاحت اور مناسبت اچھے عنوان کی سب سے اہم خصوصیتیں ہیں۔

اچھا عنوان مصنف کے کارنامے کے لیے بہترین اشتہار کا کام دے سکتا ہے۔ تجربہ کار انشا پرداز اس راز سے بخوبی واقف رہتے ہیں اور ایک ایسا عنوان حاصل کرنے کے لئے جو لوگوں کو ان کا مضمون پڑھنے پر مجبور کر دے ہر طرح کی زحمت اٹھاتے ہیں۔

ایک کامیاب عنوان وہی ہوتا ہے جو دلکش اور مختصر ہونے کے علاوہ اس موضوع کو اچھی طرح واضح کر دے جس پر مضمون لکھا گیا ہو۔ بعض وقت اچھے اچھے مضمون بھی عنوان کے بھدے پن کی وجہ سے ناکام پڑے رہتے ہیں اور کوئی ان کی طرف توجہ نہیں کرتا۔

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر مضمون ناقص ہو تو مصنف کو موزوں اور موثر عنوان ملتا نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی کارنامہ معین مقصد کی پیداوار نہیں ہوتا تو ظاہر ہے کہ اس کا عنوان ذرا مشکل ہی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ فسانوں یا مختصر قصوں کے خاکوں کی کمزوریاں بھی اکثر اسی وقت ظاہر ہوتی ہیں جب مصنف اُن کے لئے دلچسپ اور موزوں عنوان حاصل کرنے کی فکر میں ہو۔

یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ کس طرح بھونڈے عنوانوں کو صرف لفظوں اور ترکیب کی تبدیلی کے ساتھ پُر زور، موثر اور دلکش بنایا جا سکتا ہے۔

بھدے عنوان	موثر عنوان
حد سے زیادہ کھانا کھانے کے نقصانات	زیادہ کھانا

اچھی غذا پکانے کے طریقے
آپ کی پسندیدہ غذا
پردے کی خرابیاں
پس پردہ
حالی کی نظم و نثر میں اُن کے کردار کے اثرات
حالی کی شخصیت ان کے کارناموں میں

سید محی الدین قادری زور

(ماخوذ از فن انشا پردازی)

اے دوست

وہ دن بھی یادگارِ زندگی ہے اے مرے ہمدم!!
نگاہیں ملتے ہی جب مل گئے تھے دل سے دل باہم
دلوں میں ایک طوفاں تھا مگر خاموش تھے دونوں
سراپا گفتگو لب تھے، مجسم گوش تھے دونوں
نظر نیچی کئے دامن سمیٹے کھوئے کھوئے سے
خمارِ خواب میں ڈوبے ہوئے، کچھ سوئے سوئے سے
لبوں کی لرزشوں میں ایک ہیجانِ تکلم تھا
حسیں جذبات کا خاموش طوفانِ تلاطم تھا
کہا کچھ تم نے زیرِ لب بڑھی اُلجھن مرے دل کی
ہوئے خاموش تم اور بڑھ گئی دھڑکن مرے دل کی
ملا کر مجھ سے نظریں مرے دل میں در آئے تم
شباب و شعر کی رنگینیوں کو ساتھ لائے تم

وہ غم!! جو حاصلِ سوز و فا ہو — دے دیا تم نے!!
سما کر مجھ میں آخر مجھ سے مجھ کو لے لیا تم نے!!

عزیز از زندگی!! مجھ کو بھی اب جینے کا ارماں ہے
مری دنیا کا ذرہ ذرہ اب گلشن بداماں ہے
یہی راتیں، یہی دن، یہ زمین و آسماں ہوں گے
نہ جانے دوست!! اس دنیا میں ہم دونوں کہاں ہوں گے

جو بھولے سے کبھی ہم راز تو مجھ کو نہ یاد آئے!!
تو بہتر ہے مجھے اُس دن سے پہلے موت آ جائے!!

بدل جائے گی شاید زندگی کی رسمِ دیرینہ
بکھر جائیں گے عہدِ رفتہ کے اوراقِ پارینہ
ہزاروں انقلابوں سے گذرتی جائے گی دنیا
خیال و فکرِ انساں سے سنورتی جائے گی دنیا
یہ ہو سکتا ہے دل اور عقل ہم آہنگ ہو جائیں
شباب و حسن غور و فکر کی دنیا میں کھو جائیں
یہ ممکن ہے چھپا لے آسماں تاروں کی بستی کو
یہ ممکن ہے نگل جائے زمیں اجزائے ہستی کو

مگر اے دوست!! تیری یاد اب دل سے نہ جائے گی!!
یہ میری زندگی ہے۔ میرا مستقبل بنائے گی!!

صمد رضوی ساز

سلام بہ جناب امام علیہ السّلام

السّلام اے نورِ عینِ رحمۃ للعالمین
السّلام اے راحتِ جانِ امیر المومنین

السّلام اے نوبہارِ بوستانِ مرتضیٰ
السّلام اے افتخارِ دودمانِ مصطفےٰ

السّلام اے فاطمہ کے نورِ دیدہ السّلام
السّلام اے ظلم و جور و غم رسیدہ السّلام

السّلام اے منبعِ عزم و ہمم فیض و عطا
السّلام اے معدنِ خلقِ اتم صدق و صفا

السّلام اے مصدرِ ایمان و تسلیم و رضا
السّلام اے مظہرِ مہر و کرم جود و سخا

السّلام اے سیدِ عالی نسب والا حسب
نازشِ دینِ مبیں سبطِ شہامی لقب

اے شہنشاہِ سریرِ انما تجھ پر سلام
ورثہ دارِ پادشاہِ ہل اتیٰ تجھ پر سلام

اے حسین ابنِ علیؑ ایماں کی تو جان ہے
تیرے جد کی شان میں لولاک کا فرمان ہے

باپ وہ جس کی فرشتوں نے ثنا کی بار بار
لا فتیٰ الّا علی لا سیف الّا ذوالفقار

ماں وہ کی تعظیم جس کی خود نبیؐ نے بارہا
بضعۃ منّی کہا جس کو پیمبر نے سدا

پلنے والے گودیوں میں احمدِ مختار کی
چوسنے والے زباں کے مخبرِ اسرار کی

واہ کیا کہنا ترا اے راکبِ دوشِ نبی
تو نے دی تاثیر دکھلا فاطمہؑ کے شیر کی

حشر تک باقی رہا اسلام پر احساں ترا
کارنامے نے ترے تاریخ کو چمکا دیا

ٹوٹتا ہے کفر کیونکر تو نے بتلایا ہمیں
کس طرح مرتے ہیں حق پر تو نے دکھلایا ہمیں

جس سے ہے دور تو وہ پیکرِ تنویر ہے
جس پہ قدرت نے قلم توڑے تو وہ تصویر ہے

تو نے عالم کو دکھا دی شانِ ضبط و اختیار
گود میں اصغر کی میت لب پہ شکرِ کردگار

محوِ حیرت ہے زمانہ تیری ہمت دیکھ کر
شکر کے سجدے کئے کڑیل جواں کی لاش پر

لعنت ایذا رسانی سے عدو بھی جھک گئے
تو مصائب سے نہیں تجھ سے مصائب تھک گئے

اے رضا جوئے خدا، تیری رضا حق کی رضا
اے سراپا مہر نفسِ مطمئنہ مرحبا

قربِ حق منزل تری ہے حوصلہ تیرا عظیم
تیرا پیرو جادہ پیمائے صراطِ مستقیم

ہمتِ عالی نے تیری دے دیا کونین کو
کفر سمجھا راہِ حق میں ترکِ نصب العین کو

لطیف النساء بیگم

حیدرآباد کی علم دوست خواتین کا پہلا اجتماع

(روئداد اجلاس عام شعبۂ نسوان)

شعبۂ نسوان کا پہلا اجلاس عام بتاریخ ۲۶ ذیحجہ ۱۳۵۰ھ صبح ساڑھے دس بجے بمقام حیدرآباد لیڈیز اسوسی ایشن کلب محترمہ لیڈی حیدر نواز جنگ بہادر و محترمہ مہدی یار جنگ بہادر کی مشترکہ صدارت میں منعقد ہوا جس میں اُردو علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والی صاحب ذوق ہندو و مسلم خواتین نے حصہ لیا۔

اجلاس کی ابتداء کلام پاک سے کی گئی جس کو شاہجہاں بیگم صوفی نے نہایت خوش الحانی سے سنایا اس کے بعد معتمد شعبہ کی تحریک اور محترمہ سارہ بیگم صاحبہ کی تائید کے بعد صدر صاحبہ کو محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ نے پھول پہنائے۔ لیڈی حیدری صاحبہ نے کرسی صدارت قبول کرتے ہوئے ایک مختصر سی تقریر فرمائی جس میں آپ نے شعبہ کے قیام و مقاصد پر خوشنودی کا اظہار کیا، اور خواتین سے درخواست کی کہ اس کی توسیع و ترقی میں ہاتھ بٹائیں اور اس کے کامیاب بنانے میں حتی الامکان سعی کریں۔

رالوہ بیگم صاحبہ سے ارشاد ہوا کہ خطبۂ صدارت پڑھ کر سنائیں، اور انھوں نے نہایت عمدگی سے اس فرض کو انجام دیا۔ اس کے بعد چونکہ موصوفہ دوسرے جلسہ میں جانے والی تھیں آپ نے جلسہ میں آخر تک شریک نہ رہ سکنے کی معذرت کی اور اجلاس کی رہنمائی کے لئے بیگم مہدی یار جنگ بہادر کا انتخاب کرتے ہوئے کرسی صدارت قبول کرنے کی درخواست کی۔

محترمہ رالوہ بیگم صاحبہ نے پھر ایک فاضلانہ تقریر کی جس میں آپ نے صدر و خواتین کا خیر مقدم کیا۔ شعبہ کے قیام اور اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور خواتین حیدرآباد کو علمی دلچسپی کی طرف توجہ دلائی، اس پُر مغز تقریر کے ختم پر ہماری مایۂ ناز شاعرہ محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر نے اپنی ایک نفیس نظم "عرض حال" واہ واہ اور تالیوں کی گونج میں سنائی، آپ کی نظم نے خواتین پر ایک خاص اثر کیا۔

اس کے بعد لطیف النساء بیگم صاحبہ نے "ادارہ ادبیات اُردو" اس کے شعبہ اور زنانہ کتب خانہ کے قیام سے متعلق ایک نہایت دلچسپ تقریر کی جس میں حیدرآبادی خواتین کو علمی و ادبی دنیا میں عملی حصہ لینے کی طرف راغب کیا، آپ کی تقریر کے اختتام پر محترمہ صغرا بیگم ہمایوں مرزا نے ایک مختصر سی تقریر کی اور کتب خانہ کی امداد کے لئے آمادگی ظاہر کی۔ ان کے بعد بیگم صاحبہ سید امیر حسن صاحب مرحوم نے حاضرین کو مخاطب کرکے اپنی شگفتہ تقریر سے انھیں محظوظ کیا، زنانہ کتب خانہ کے قیام پر اظہار مسرت کرتے ہوئے آپ نے پندرہ روپے کا عطیہ بھی اسی وقت کتب خانہ کے لئے عنایت کیا اور کتابیں بھی دینے کا وعدہ فرمایا۔

بشیر النساء بیگم صاحبہ نے ایک اور نظم بعنوان "احسان فراموش دنیا" سنائی جو جلسہ میں بڑی مقبول ہوئی۔

آخر میں معتمد شعبہ نے صدر و حاضرین کی خدمت میں مخلصانہ شکریہ پیش کیا اور طالبات مدرسہ محبوبیہ نے قومی ترانہ سنایا جو حاضرین نے ادب و احترام کے ساتھ ایستادہ ہو کر سنا۔

اختتام جلسہ پر اردو مطبوعات کی نمائش ترتیب دی گئی تھی جس کا خواتین نے نہایت شوق سے ملاحظہ کیا اور اکثر و بیشتر نے کتابیں بھی مول لیں۔

سکینہ بیگم

(شعبہ نسواں)

خطبہ صدارت محترمہ لیڈی حیدری صاحبہ

معزز خواتین!۔

علم و ادب کی ترقی کے واسطے ایسی بزموں اور انجمنوں کی ضرورت ہے جو ملک کے ادبی ذوق کو بڑھانے۔ اس کو اعلیٰ معیار پر پہنچانے میں صحیح رہنمائی کریں اور مصنفین و مؤلفین کی دماغی قابلیتوں کو عرصہ ظہور پر لانے کے ساتھ ساتھ ان کی نشر و اشاعت اور طباعت و فروخت کی موانعات و مشکلات سے انھیں نجات دیں۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کے قیام کا بنیادی مقصد یہی ہے۔ میں خوش ہوں کہ ادارۂ مذکورہ اپنے فریضے کو نہایت عمدگی سے انجام دے رہا ہے۔ اور اب تک کئی مفید ادبی کتابیں ملک کے سامنے پیش کر چکا ہے۔ امید ہے کہ اس میں اور ترقی ہوگی۔

مجھے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ اب اس ادارہ نے چند خواتین پر مشتمل۔ ایک انجمن بنام شعبۂ نسواں قائم کی ہے۔ جس کا اہم مقصد حلقۂ اناث میں ذوقِ علم، و شوقِ عمل اور ادبیاتِ اردو کا لطیف و سنجیدہ مذاق پیدا کرنا ہے۔ توقع کہ یہ شعبہ اپنے مقاصد میں کامیاب اور ہماری خواتین کے لئے مفید و کارآمد ثابت ہوگا۔

شعبہ نسواں حیدرآباد میں اپنی نوعیت کی پہلی انجمن ہے یہ حیدرآباد کی ایک خوش قسمتی کی علامت ہے کہ ادارہ کی توجہ اس طرف منعطف ہوئی ہے۔

آپ جانتی ہیں کہ اردو ہندوستان کی پیداوار اور یہاں کی مروجہ و مشترکہ زبان ہے۔ اگرچہ یہ زبان برابر ترقی کرتی چلی جارہی ہے اور ایک صدی کی بہ نسبت دوسری صدی میں زیادہ وسعت اور ہمہ گیری حاصل کر رہی ہے لیکن اب بھی ضرورت ہے۔ کہ اس کو وسیع سے وسیع تر بنایا جائے۔ تاکہ موجودہ زمانہ کی علمی و ادبی ضرورت کو پورا کرنے کی اس میں قابلیت و استعداد پیدا ہو سکے اور ہمارے سرمایہ علم و ادب میں روز افزوں اضافہ ہوتا جائے۔

اگرچہ ہماری گورنمنٹ یہ کام انجام دے رہی ہے۔ مگر علاوہ گورنمنٹ کی توجہ کے قوم کے افراد نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں کا بھی فرض ہے کہ اس میں حصہ لیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ایک ایسے اہم شعبہ میں حیدرآباد کی اکثر بیویاں کام کرنے کو تیار ہیں مجھے امید ہے کہ یہ کام جاری رہے گا۔ ترقی کرے گا۔ اور ملک کی خواتین زیادہ تعداد میں اس میں شریک ہوں گی۔ اور گرمجوشی سے حصہ لیں گی۔

صاحب عزم اور قابل کار اصحاب نے اصلاح و ترقی کے واسطے اب تک جتنی بھی کوششیں کی ہیں اُن سے ہماری بہنیں اسی وقت استفادہ کر سکتی ہیں جب کہ وہ اشتراک عمل کریں۔

چند باہمت خواتین نے اس ادارہ کے ذریعہ تہیہ کیا ہے کہ ترقی پرور اعلیٰ خیالات گھر گھر پہنچائیں۔ اور آپ گھر بیٹھے ان سے فائدہ حاصل کر سکیں۔ اب یہ آپ کا کام اور آپ کے فیصلہ پر منحصر ہے۔ کہ اس چھوٹے سے ادارہ کو کس طرح ترقی دیں اور کیونکر بام عروج پر پہنچائیں۔ آپ چاہیں۔ تو اس کو بڑا سا بڑا ادارہ بنا سکتی ہیں۔ اور دنیا پر ثابت کر دے سکتی ہیں کہ علمی میدان میں خواتین بھی پیچھے نہیں رہ سکتیں۔

میں چاہتی ہوں کہ اس موقع پر کارکنان ادارہ سے بھی یہ کہوں کہ انجمنیں بنتی ہیں۔ ادارے قائم ہوتے ہیں۔ مگر جلد سے جلد ان کی گرم رفتاری میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اگرچہ ہر ایک کی ابتدا تو شاندار ضرور ہوتی ہے۔ لیکن سعی و عمل کی کمی اور زمانہ کی سرد مہری و بدمذاقی انہیں پست ہمت اور سست کار بنا دیتی ہے۔

لیکن جو لوگ مستقل مزاج اور ثابت قدم ہوتے ہیں۔ کوئی وقت کوئی تکلیف ان کے پائے استقامت کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتی۔

پس آپ کو بھی کسی وقت دامن استقلال کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیئے۔ اپنے ارادوں اور مقاصد میں عزم بالجزم محنت و مشقت اتحاد و اتفاق۔ خلوص و صداقت اور ثابت قدمی کے ساتھ قائم رہنا چاہیئے۔ میری دعا ہے کہ ادارہ کا شعبۂ نسوان اپنے ارادوں میں کامیاب ہو اور روز افزوں ترقی حاصل کرے۔

احسان فراموش دنیا

صنفِ نازک جسے کہتے ہیں یہ اربابِ نظر
ہے اسی ذات پہ قوموں کی ترقی کا مدار

کیا غضب ہے کہ کریں مرد ترقی حاصل
اور عورت رہے یوں جہل و فلاکت پہ کنار

لازمی ہے کہ بنے قابل خدمت یہ بھی
کام کیونکر وہ کرے جس کا ہو بازو بیکار

آہ مضبوط اگر بندشِ بنیاد نہیں
کام کیا آئے گی پھر قوتِ فنِ معمار

اپنی تاریخ پہ جس وقت نظر پڑتی ہے
ہم پہ ہوتے ہیں عیاں اپنے نمایاں کردار

کس قدر زود فراموش ہے یہ دنیا
آج کہتی ہے ہیں ناقص و عضوِ بیکار

کارآمد رہے ہم کارگہِ ہستی میں
ہر زمانہ میں مسلم رہا اپنا ایثار

تھا قدم عالم اسلام میں پہلا کس کا!
کس کی جرات پہ تھے انگشت بدنداں کفار

تھے وہ آغشتہ بخوں کس کے جگر کے ٹکڑے؟
جن کے ایثار کا اب بھی ہے معترف ہر دیندار

چاند بن کر کیا دنیا کو منور کس نے؟
کس نے اکبر کے مقابل میں اٹھائی تلوار

کس کے افسانے سے توقیر ہے جھانسی کی سوا!
سطوتِ نور جہاں سے ہے کسی کو انکار

کس کے سحرِ عمل کا ہے گواہ "تاج محل"
اور یہ گوشۂ محل کس کی ہے حیات کا مزار

یاد رکھو! کہ ہے یہ عالم ہستی ہم سے
ہم جو مٹ جائیں تو مٹ جائیں گے لیل و نہار

بشیر النساء بیگم بشیر

(شعبۂ نسواں)

محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ کی خیر مقدمی تقریر

عالی جناب صدر نشین صاحبہ اور محترم خواتین

میں اس خیال سے نہایت مسرور ہوں کہ آج آپ کا خیر مقدم ادا کرنے کی سعادت مجھے حاصل ہوئی ہے۔ معزز بہنو۔ محترمہ لیڈی حیدری صاحبہ نے باوجود عدیم الفرصتی ہماری ہمت افزائی اور احساس علم پروری کے تحت جو ہمیشہ آپ کا مطمع نظر رہا ہے۔ اجلاس ہذا کی افتتاحی صدارت کو قبول فرماکر ہماری جو عزت افزائی فرمائی ہے اس کے ہم سب تہ دل سے شکر گذار ہیں اور اپنے دلوں میں ایک سرور آمیز تقویت محسوس کر رہے ہیں۔ اور بیگم صاحبہ نواب مہدی یار جنگ بہادر کے قدم رنجہ فرماکر اس جلسہ کو رونق بخشنے کا ہم بجان و دل شکریہ ادا کرتے ہیں۔

نیز آپ سب صاحبین کی تشریف آوری جو تعاون اور شرکت عمل کے جذبہ کا ثبوت دے رہی ہے۔ ہماری قلبی مسرت اور دلی سپاس گذاری کا باعث ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسواں کا یہ پہلا اجلاس عام ہے جس میں آپ سب کے اجتماع کا شرف نصیب ہوا ہے۔ اب ہمیں یہ زرین موقع میسر آیا ہے کہ شعبۂ نسواں اور اس کے اغراض و مقاصد کا آپ سے تعارف کروایا جائے۔

شعبۂ نسواں ادارۂ ادبیات اردو کی ایک شاخ ہے۔ اس ادارہ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اردو زبان اور اردو ادب کا صحیح ذوق پیدا کیا جائے۔ انشا پردازوں اور شعراء کے حلقہ میں تصنیف و تالیف کا شوق بڑھایا جائے۔ ملک کی علمی اور عملی جد و جہد میں اجتماعی تائید حاصل کی جائے۔

شعبۂ نسواں کا قیام ۱۹ نومبر ۳۶ء میں عمل میں آیا جس کے اجلاس کم و بیش ہر مہینہ میں ایک بار حسب سہولت منعقد ہوتے رہے ہیں مجلس عاملہ ۵ ارکین پر مشتمل ہے۔

اس قلیل مدت میں عملی طور پر شعبہ نسواں نے جو کام انجام دیا ہے وہ "نذر دکن" کے پیکر میں آج آپ کا طالب نظر ہے اور "ہماری طرز معاشرت" مصنفہ لطیف النساء بیگم صاحبہ اور "رسائل طیبہ" تصنیف طیبہ بیگم صاحبہ مرحومہ زیر طباعت عنقریب آپ سے طالب توجہ ہونے والی ہیں۔

ہماری انجمن کے اغراض یہ ہیں

(۱) باہم تقسیم عمل سے کاروبار میں سہولت پیدا کریں۔

(۲) مختلف خیال اور متضاد نظریے رکھنے والی خواتین کا تعاون و مشورہ حاصل کریں۔

(۳) ادارہ کے ہمدردوں اور رفیقان کار کے دائرہ کو وسیع بنائیں۔

(۴) صاحب الرائے خواتین کی ایک ایسی جماعت کو۔ جو ہر معاملے میں شعبہ کی مشیر ہو۔ ہو سکے مہیا کریں۔

آپ یقینی میرے اس خیال سے اتفاق فرمائیں گی کہ ایک زندہ زبان ایک قوم کو زندہ رکھنے کی ضامن ہے۔ زبان کی زندگی اس کی ہمہ گیری اور ہر جہتی ادائے مطالب کی قوت کا پیدا کرنا۔ شستہ بیانی سلیم المذاقی و قادر الکلامی کا حامل ہونا اور معتدبہ ذخیرہ علم و ادب کا فراہم رکھنا ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ زبان کا سرچشمہ خواتین ہیں۔ ملک کے نونہال اس چشمہ کی روانی سے سرسبز ہوتے یا اس کے رکاؤ سے مرجھا جاتے ہیں۔ ارباب نظر مادری زبان کی جو اہمیت تسلیم کرتے ہیں وہ محتاج تصریح نہیں۔ ایک خوش گو فصیح البیان ماں گہوارہ ہی میں بچے کو اپنی زبان و کلام سے گوش آشنا کردیتی ہے جس کے اثرات از "مہد تا لحد" زائل نہیں ہوتے۔ دنیا میں بڑے بڑے ادیبوں کی پیداوار کا پنہاں راز ماں ہے۔

لہذا ضرورت ہے کہ ہماری خواتین ادب اردو کی اہمیت پر غور فرمائیں۔ اور اپنی مشترک مساعی اور اتحاد عمل کے ساتھ۔ مقاصد بالا کو فائز المرام بنانے کی طرف توجہات مبذول فرمائیں اور اپنے لطیف سرمایۂ نظم و نثر سے شعبۂ نسوان کو ادب اردو کا ایک گراں بہا مخزن بنائیں۔ ہماری مستورات کو اپنی علمی، ادبی، سماجی اور اصلاحی قوتوں کو منصہ ظہور پر لانے کے لئے۔ اس سے بہتر موقع میرے خیال میں نہیں مل سکتا۔

یہ امر ہمارے لئے اس لئے حوصلہ افزا ہے کہ دور موجودہ کی متعدد خواتین تصنیف و تالیف شاعری و انشا پردازی۔ غرض مختلف النوع نظم و نثر کا ملکہ اور علم و عمل کا میلان رکھتی ہیں۔ ہماری امید کی نظریں آپ پر جمی ہوئی ہیں۔ آپ چاہیں تو شعبۂ نسوان کے نومولود طفل شیرخوار کو صف شکن سورما اور چلتن پہلوان بنا کر اکھاڑے میں لا کھڑا کر سکتی ہیں۔

لہذا جمیع خواتین سے جنھوں نے تشریف فرمائی سے اس جلسہ کو ممنون فرمایا ہے درخواست ہے کہ حتی الامکان اپنی اور اپنے اعزا اور دوست احباب کی شرکت سے شعبہ مذکور کو کامیاب فرمائیں۔ اور اپنی دماغی قابلیتوں اور نتائج فکر کے جواہر پاروں سے عالم نسوان کو منور کردیں۔

مشترکہ بےلاگ اجتہاد عمل پرخلوص ایثار اور جذبۂ خدمت۔ متحدہ گرم جوشی درد وطن صمیم کوہسان عزم و استقلال ہی اوج مقاصد پر پہونچا سکتا ہے۔

یقین محکم۔ عمل پیہم۔ محبت۔ فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

یہ امر کس قدر مسرت انگیز ہے کہ ہم ایسی حکومت کی پیداوار ہیں جو ہمارے چمنستان حیات کی آبیاری کو ہر طرح تیار ہے۔ ہماری علمی ضرورتوں تعلیمی سہولتوں کے مدنظر جامعہ کا قیام عمل میں آیا۔ دارالترجمہ قائم کیا گیا۔ دور حاضرہ کے مختلف علوم و فنون ریاضی۔ سائنس۔ فزکس۔ کیمیا۔ نباتیات حیوانیات۔ ڈاکٹری۔ انجینیری کے اردو ترجمے فراہم کئے گئے جس سے ادبیات اردو میں ایک کثیر سرمایہ معلومات کا اضافہ ہوا ہے اور ہماری انشا کی حدود وسیع ہوگئیں۔ ہم پر حکومت کا یہ احسان ہے۔ تو ہمارا بھی کام ہے کہ اس کا ہاتھ بٹائیں اور اپنا حق ہم بھی ادا کریں۔

زبان اردو ہمارے اسلاف کی امانت ہے اس کی نگہداشت پرورش و بالیدگی ہماری گراں بہا ذمہ داری ہے۔

شعبۂ نسوان کا افتتاح۔ میں توقع کرتی ہوں کہ دنیائے نسوان کا ایک امید پرور جالب توجہ مرکز رہے گا۔ اور آپ حضرات اس کو ایک مستقل کارکن انجمن بنانے میں۔ بدل و جان اپنی مساعی جمیلہ سے اس کی امداد فرمائیں گی اور ہمیشہ اپنے تعاون کا اسے مستحق گردانیں گی۔

میں ڈاکٹر زور صاحب کی توصیف و شکر گذاری کو فریضۂ انسانیت سمجھتی ہوں۔ کیونکہ آپ ہی کا حامیانہ التفات اور آپ ہی کی حوصلہ افزا توجہات شعبۂ نسوان کی تخلیق کا باعث ہیں۔ آپ نے خواتین میں ذوق عمل کی سرگرمی کی ایک لہر دوڑا دی ہے اور آپ ہی کی فکر و عمل نے ہمارے دماغوں میں علمی جدوجہد کی ایک روح پھونک دی ہے جس کے ہم اراکین شعبہ منت پذیر رہیں گے۔

علم دوست خواتین کو دعوت عمل

(شعبۂ نسواں)

محترمہ صدر صاحبہ اور میری معزز بہنو!

میں نے آپ کی بیسیوں مرتبہ سمع خراشی کی ہے لیکن آج صرف عرض حال کرتا ہے۔ بقول لیڈی حیدری صاحبہ کے "ہم عورتوں کا خاصہ ہے کہ کہتے بہت ہیں اور کرتے کم"۔ لیکن ہم نے عہد کیا ہے کہ آئندہ سے ہم کریں گے بہت اور کہیں گے کم۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کسی ادارہ یا انجمن کا قیام ہوتا ہے تقریریں تو بہت دھواں دھار اور بہت طول طویل ہوتی ہیں لیکن انجام میں کام برائے نام نظر آتا ہے اسی لئے ہم نے پہلے کام کیا اور بعد میں شعبہ کا افتتاحِ عام۔ چنانچہ شعبۂ نسوان کی پہلی تالیف "نذرِ دکن" آپ کی نظر سے گذر چکی ہوگی اور اس وقت بھی آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے موجود ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو گذشتہ آٹھ سال سے ڈاکٹر زورؔ صاحب کے زیرِ نگرانی سرگرم عمل ہے۔ اور اپنی زندگی کی اس قلیل مدت میں بہت کچھ کرچکا ہے۔ چنانچہ اس نے حسب ذیل کتابیں شایع کی ہیں۔ یہ واضح ہو کہ ادارہ نے گذشتہ سات آٹھ سال کے قلیل عرصہ میں جو بیش کتابیں شائع کی ہیں اُن میں اکثر ایسی ہیں جن کے متعلق ہندوستان کے مستند اصحاب علم و فضل اور جرائد و رسائل نے بہترین رائیں لکھی ہیں۔

۱۔ مرقع سخن جلد اوّل۔ ۲۔ مرقع سخن جلد دوم۔ ۳۔ مدھوسودن اور اس کی شاعری۔ ۴۔ ٹیگور اور ان کی شاعری۔ ۵۔ یوسف ہندی تیلنگ میں۔ ۶۔ نذرِ ولی۔ ۷۔ سراج سخن۔ ۸۔ فیض سخن۔ ۹۔ ایمان سخن۔ ۱۰۔ بادۂ سخن۔ ۱۱۔ کیف سخن۔ ۱۲۔ متاع سخن۔ ۱۳۔ مشاہیر قند ہار دکن۔ ۱۴۔ ہوش کے ناخن۔ ۱۵۔ گریہ و تبسم ۱۶۔ نقد سخن۔ ۱۷۔ سن کی دنیا۔ ۱۸۔ مدراس میں اردو۔ ۱۹۔ محرم نامہ۔ ۲۰۔ نذرِ دکن۔

ان کے علاوہ ۱۹۳۶ء سے ہر ماہ رسالہ سب رس اور اس کا ضمیمہ بچوں کا سب رس پابندی سے نکل رہے ہیں۔ اور اب تک جو نمبر شایع ہوئے وہ اپنی دیدہ زیبی اور عام دلچسپی کے لحاظ سے تمام ہندوستان میں مقبول ہوئے۔

ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ حسب ذیل کتب زیر طبع ہیں۔

۱۔ روح غالب۔ مرزا غالب کی نثر پر تبصرہ اور انتخاب مرتبہ ڈاکٹر زورؔ (۲) نذرِ اقبال علامہ اقبال کی حیات اور کارناموں پر تفصیلی نظر
۳۔ عاصمہ (ناول) ڈیوڑھیوں اور حرم سراؤں کی معاشرت کا مرقع مؤلفہ ابوالظفر سید الدین حسن صاحب۔
۴۔ تاریخ گولکنڈہ از مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ام۔ اے ال ال بی۔ ۵۔ گنج سخن انتخاب کلام میر احمد علی عصر مرتبہ مولوی سید محمد صاحب ام۔ اے
۶۔ کلیات فہیم۔ کلام قاضی صدیق احمد صاحب فہیم مرتبہ زین العابدین صاحب بی۔ سی۔ ایس اول تعلقدار نظام آباد

ان زیر طبع کتابوں کے علاوہ حسب ذیل کتب کے مسودے مکمل ہو چکے ہیں:۔

۱۔ تاریخ ادب انگریزی از مولوی میر حسن صاحب ام۔ اے۔ ۲۔ تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ
۳۔ تاریخ ادب عربی از مولوی سید ابوالفضل صاحب ام۔ اے۔ ۴۔ مرقع سخن جلد سوم مرتبہ ادارہ۔
۵۔ رمز سخن انتخاب کلام سدانند جوگی بہاری لال رمزؔ (۶) فردوس سخن انتخاب کلام محمد بہبود علی صاحب صفی اورنگ آبادی
۷۔ اردو مرثیہ نگاری از میر سعادت علی صاحب رضوی ام۔ اے۔ ۸۔ بالا حصار گولکنڈہ کی نظمیں از صاحبزادہ میر محمد علی خاں صاحب میکش۔
۹۔ کلام مزاج انتخاب کلام حکیم مظفر الدین خاں مزاجؔ۔ ۱۰۔ مشاہیر گولکنڈہ از ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ

سب رس

وہ کتابیں جن کے مسودے ابھی مکمل طور پر تیار نہیں ہوئے اور جو ادارے کی طرف سے لکھی جا رہی ہیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) متکلمین اسلام از مولوی عبد القادر صاحب صدیقی ام اے پروفیسر دینیات)

(۲) شمس الامرا کی اردو خدمات از نواب محمد ظہیر الدین خاں صاحب بی اے۔

(۳) تاریخ ادب ہندی از مولوی عبد القادر صاحب سروری ام اے ال ال بی۔

(۴) ہمنیوں کا تمدن از مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ام اے ال ال بی۔

(۵) رسائل طبیہ منتخب مضامین طبیہ بیگم صاحبہ

(۶) حیدر آباد بچوں کے لئے ایک دلچسپ معلومات کی کتاب از خواجہ حمید الدین صاحب شاہد

(۷) بچوں کی نظمیں از محترمہ لطیف النسا بیگم صاحبہ بی اے (۸) ہماری معاشرت از محترمہ لطیف النسا بیگم صاحبہ بی اے

(۹) دکن کی اردو نثر زیر ترتیب مولوی سید محمد صاحب ام اے۔

(۱۰) ترجمہ از مولوی فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ

(۱۱) ترجمہ از مولوی عبد القیوم صاحب باقی ام اے۔

(۱۲) ترجمہ THEORIES AND FORMS OF POLITICAL ORGANIZATION. از مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ام اے اچ سی ایس

یہ ہماری احسان فراموشی ہوگی اگر ہم ڈاکٹر زور صاحب کا شکریہ ادا نہ کریں جن کا ذوق علم و ادب شعبۂ نسواں کے وجود کا باعث ہوا ہے۔ اس شعبہ کے مقاصد سے آپ آگاہ ہو چکی ہیں۔ البتہ یہ بتلانا ہے کہ اس کا قیام صرف خالص علمی و ادبی اغراض کے تحت ہوا ہے ہمارے شعبہ کی داعی سکینہ بیگم صاحبہ ہیں اور ہم نے انھیں اپنا رہبر اس لئے بنایا ہے کہ ان کے سینہ میں دل ہے اور دل میں قوم کا درد اور ملک کی محبت وہ خاموش اور بے غرض کام کرنے والی ہیں انھیں نام و نمود اور ظاہر داری سے دور کا لگاؤ بھی نہیں وہ جو کچھ کرتی ہیں اپنے خلوص قومی اور درد نسوانی سے بے چین ہوکر۔ انھوں نے متمول طبقہ سے زیادہ غریب طبقہ کی خدمت کی ہے اور کر رہی ہیں جس پر ہمیں بجا طور پر فخر کرنا چاہیئے۔

دوسری محترم ہستی رابعہ بیگم صاحبہ کی ہے جن کی رہبری سے ہم ایک طرح کی قوت اور طمانیت محسوس کرتے ہیں بیگم موصوفہ بھی ایک پُرخلوص دل رکھتی ہیں اور یہ شعبہ کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ایسے مخلص اور صادق القول و عمل کارکن نصیب ہوئے۔

ہم محترمہ مسز ہمایوں مرزا صاحب کے بھی شکر گذار ہیں جنھوں نے ہماری درخواست پر اس اجلاس میں قدم رنجہ فرمایا ہے حالانکہ وہ ابھی تک سوگ میں ہیں اور آج ہی ہمایوں مرزا صاحب مرحوم کی وفات کے بعد گھر سے باہر قدم نکالا ہے۔

شعبہ کے زیر غور امور میں ایک امر زنانہ کتب خانہ یا دار المطالعہ کا قیام ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے وسیع ملک میں باوجود علمی و ادبی ذوق و شوق ایک بھی زنانہ کتب خانہ نہیں اور اس کمی کا احساس ان خواتین ہی کو ہو سکتا ہے جنھیں علمی اور تنقیدی کام کرنے پڑے ہوں۔ چنانچہ آپ بیتی ہے کہ ہمیں ام اے کے لئے مقالے لکھنے پڑے تو اگرچہ ذرا سا کام ہے لیکن پھر بھی ہمیں سخت مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ سرکاری کتب خانوں سے تو ہمیں دور سے ہی دھتکار دیا کہ یہاں زنانہ کا انتظام نہیں۔ ذاتی مقدرت اتنی نہیں کہ صدہا کتابیں وقت واحد میں خرید لی جائیں چنانچہ گھر گھر پھرنا پڑا اور در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں کس کس کے آگے ہاتھ جوڑے اور کس کس طرح کتابیں بہم پہونچائیں وہ خدا ہی جانتا ہے۔

کتب خانہ کے قیام کے سلسلہ میں پہلی مبارک خاتون جنہوں نے دامے درمے قدمے سخنے مدد دینے کا وعدہ فرمایا ہے وہ بیگم ہمایوں مرزا صاحبہ کی ذات ستودہ صفات ہے آپ بھی قوم کی ایک مخلص اور قابل قدر ہستی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی ہی ہستیاں ہیں جن کی ہمت کی صداؤں اور قدم کی ٹھوکروں سے مرتی ہوئی قومیں جی جاتی ہیں۔

اب آخر میں ہماری آپ سے عرض بلکہ التجا ہے کہ آپ بھی ہمارے ساتھ تعاون کار کریں۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ میں ہم سے بہت زیادہ کام کرنے والی بیبیاں موجود ہیں جن میں صدہا جوہر قابل پوشیدہ ہیں لیکن انہیں اپنی قابلیت کو ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملا یا زمانے نے ساتھ نہیں دیا لیکن اب وقت آگیا کہ ہم اپنے جواہر پاروں سے کام لیں اپنی قوتوں کو برسر کار لائیں اور دنیا کو دکھا دیں کہ جنس لطیف بھی علمی اور ادبی ذوق میں جنس قوی سے کسی طرح کم نہیں۔ آئیے ہم اپنی پر خلوص خدمت قومی سے شعبہ کو کار آمد بنائیں۔ یہ ہمارا اہم عورتوں کا شعبہ ہے اس میں ہم اور تم کی تخصیص نہیں۔ اس کے لئے ڈگری اور سند لازمی نہیں۔ ہر وہ بی بی جو اپنے ملک و قوم یا اپنی زبان و ادب کی کچھ نہ کچھ خدمت کرنا چاہتی ہیں آئیں اور ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ یہ مثل سچ ہے کہ: "لگے ہاتھ سب کا تو اٹھ جائے چھپر"

لیکن ایک دو سے کام نہیں ہو سکتا سب مل کر تعاون کار کریں تو ہم دکھا دیں گے کہ حیدر آباد کی خواتین کیا کر سکتی ہیں جنہیں فرصت ہو وہ تصنیف و تالیف کے کام انجام دیں۔ عدیم الفرصت ہوں تو صرف مضامین عطا کریں۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم اس شعبہ کی تالیفات و تصانیف کی مستقل خریدار ہی بن جائیں۔

آپ اچھی طرح سمجھ لیں کہ شعبہ نسواں کی ترقی اس بات کی بین دلیل ہو گی کہ خواتین حیدر آباد کو اپنے فرائض کا احساس ہے۔ اور اس کا تنزل ہماری بے حسی کا ناقابل انکار ثبوت اس لئے اپنے شعبہ کی حیات و موت اور عروج و زوال کی آپ خود ذمہ دار ہیں۔

لطیف النساء بیگم

غزل

پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں علم و کمال
ورنہ حاسد تری خاطر سے میں یہ بھی کر لوں

(مولانا شبلی رحمتہ اللہ علیہ)

ثبت ہوں جادۂ ہستی پہ مرے نقش قدم
دل میں ارماں ہے کوئی بات میں ایسی کر لوں

سخت ناداں ہوں اگر چھوڑ کے لطف باقی
دل کو میں شیفتۂ لذت فانی کر لوں

رہے ناسازیٔ عالم کی نہ اصلا پروا
کیا مزا ہو جو فقط "ایک" کو راضی کر لوں

"اس کی" کہلاکے اگر دوں غیر سے عرض مطلب
غیرت آتی ہے بہت ورنہ میں یہ بھی کر لوں

بے غمی کیوں نہ ہو اصلاح مفاسد سے جب
نسخۂ تجربہ شافی و کافی کر لوں

رنج ناکامیٔ پیہم کو مٹا کر دل سے
قصۂ حال کو افسانۂ ماضی کر لوں

ملک الموت مجھے تھوڑی سی مہلت دیدے
اپنے معبود کو اس وقت تو راضی کر لوں

مرتے دم لب پہ ہو توحید و رسالت کا سبق*
عمر رفتہ کی اسی طرح تلافی کر لوں

محبت احمد کا مجھے آج عنایت ہو صلہ
دل مایوس کی میں جس سے تسلی کر لوں

جوہر طبع کا جلوہ نہیں وہ شے ہرگز
لاکھ پردوں میں چھپا کر جسے مخفی کر لوں

انیسہ ہارون بیگم شروانیہ

---

* یعنی کلمہ طیبہ۔ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔

(شعبۂ نسواں)

اظہار ممنونیت

آج کے جلسہ کا سب سے لطیف اور خوش گوار فریضہ یعنی اظہار ممنونیت کا شرف مجھے بخشا گیا ہے۔

شکریہ کے دو بول بول لینا کوئی اہم کام نہیں لیکن نفس رسماً و لفظاً شکریہ ادا کر دینا میں سمع خراشی و تضیع اوقات سمجھتی ہوں اس لئے کہ اصل ممنونیت تو وہ ہے جس کو دل محسوس کرے اور دل کا احساس قید اظہار سے بری ہے۔ لیکن اظہار ممنونیت بھی ایک فرض انسانی ہے اس لئے لازم ہے کہ شکریہ ادا کیا جائے۔

وہ جذبات تشکر جو اس وقت اراکین شعبہ کے دلوں میں موجزن ہیں کسی انشا پرداز کے قلم کی روانی اور کسی مقرر کی زبان کی فصاحت کے محتاج تھے۔ وہی صحیح طور پر ان کی ترجمانی کر سکتے۔ نہ کہ میں جسے نہ تو لکھنے سے کام نہ بولنے سے واسطہ۔ یہ کام تو کوئی رابعہ بیگم یا لطیف النساء بیگم جیسی معجز بیان خواتین کے حوالے ہوتا تو پھر دیکھتے "انداز گل افشانی گفتار"! لیکن چونکہ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند" مجبوراً جس طرح بھی ہو سکے اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں مگر بخلوص دل ان جذبات شکر گذاری کو آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کرتی ہوں جن سے ہمارے دل آج لبریز ہیں اور جن کا ایک عشر عشیر بھی اگر آپ تک پہنچا سکوں تو اپنے آپ کو قابل مبارکباد تصور کروں گی۔

سب سے پہلے ہم آج اپنے آقائے ولی نعمت سلطان العلوم حضرت اقدس و اعلیٰ خلد اللہ ملکہ کی بے شمار عنایتوں، ان کی علم دوستی و علم نوازی اور ہماری صنف پر ان کے ان گنت احسانات کا اعتراف کرتے ہوئے نہایت ادب و احترام کے ساتھ سپاس گزار ہیں کہ آج ان کی بدولت حیدرآباد کی خواتین بھی علم و ادب کے میدان میں مردوں کے دوش بدوش نظر آ رہی ہیں۔

اس کے بعد ہم صدر جلسہ لیڈی حیدری صاحبہ کی خدمت میں ہدیۂ شکرانہ پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے باوجود اپنی مختلف النوع مصروفیتوں کے ہمارے اجلاس کی صدارت قبول کر کے ہم کو ممنونیت کا موقع دیا۔ موصوفہ کو علمی مشاغل سے جتنی دلچسپی و وابستگی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ان کے ہاتھوں اس جلسہ کا افتتاح ہمارے حق میں شگون نیک ہے۔ ان کی رہبری میں ہم کو یقینی ان اعلیٰ مقاصد کے حصول میں مدد ملے گی جس کی تمنا ہر ترقی یافتہ قوم میں ہونا چاہیے۔

ساتھ ہی بیگم صاحبہ نواب مہدی یار جنگ بہادر کے ہم بہ دل مشکور ہیں کہ انھوں نے اپنی شرکت سے جلسہ کو رونق اور کرسی صدارت کو زینت بخشی۔ نواب صاحب کو بحیثیت ادارہ کے صدر ہونے کے جو دلچسپی ہے وہ ظاہر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ بیگم صاحبہ موصوفہ خود بھی آج سے اس شعبہ میں دلچسپی اور عملی حصہ لے کر ہر منزل پر ہماری رہنمائی فرماتی رہیں گی۔

بیگم صاحبہ نواب ولی الدولہ بہادر گو اس وقت موجود نہیں لیکن ان کے نیک خیالات ضرور اس وقت ہمارے شریک حال ہیں۔ ہمارے معاملات میں ان کی دلچسپی خود اس بات کی ضامن ہے۔ افسوس کہ باوجود ان کی عین خواہش کے کچھ ایسے وجوہات مانع ہوئے کہ ہمارے اجلاس میں وہ حصہ نہ لے سکیں۔ ہم ان کی خدمت میں ان کی عدم موجودگی پر اظہار تاسف کرتے ہوئے ان کی موجودہ مہربانی و دلچسپی کا شکریہ اور آئندہ عملی حصہ لینے کی درخواست کرتے ہیں۔

ان تمام خواتین کا جنھوں نے اپنے اشتراک عمل اور تعاون سے جلسہ کو کامیاب بنانے میں مدد دی ہے ہم خلوص دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس زمرہ میں خصوصیت سے ہم مس پوپ صاحبہ کے مشکور ہیں کہ انھوں نے انتظامات میں ہماری ہر طرح امداد فرمائی۔

حاضرین کی خدمت میں جن کی موجودگی خود ان کے جذبۂ تعاون کی بین دلیل ہے ہم اپنی مخلصانہ ممنونیت کا اظہار بصد دل پیش کرتے ہیں۔ ان کی موجودگی سے آج بزم کی رونق دوبالا ہوگئی۔ آپ سب سے اب ہماری یہ درخواست ہے کہ جس عمارت کا سنگ بنیاد آج اس جذبۂ خلوص سے رکھا گیا ہے اس کی تعمیر میں ہر وقت ہاتھ بٹاتی اور امداد کرتی رہیں۔ کوئی وقت اس کی ترقی کے سد راہ نہ ہونے دیں۔

لیڈی حیدری صاحبہ نے خطبۂ صدارت میں ٹھیک فرمایا کہ " ابتداء تو شاندار ضرور ہوتی ہے لیکن سعی و عمل کی کمی اور زمانہ کی سرد مہری انہیں پست ہمت و سست کار بنا دیتی ہے۔"

آئیے ہم اپنی انتہا کو بھی شاندار بنانے کی کوشش کریں۔ زمانے کو دکھا دیں کہ ہم کبھی ہمت نہ ہاریں گے اور جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اُسے کر کے دکھا دیں گے ہمت کا حامی خدا ہے۔ بقول شاعر

بہ ہر کاری کہ ہمت بستہ گردد
اگر خاری بود گلدستہ گردد

سکینہ بیگم

عرض حال

خوشا قسمت نوید جاں فزا لائی صبا لائی
گلستان ادب میں اور اک تازہ بہار آئی

تعالیٰ اللہ کیا اعجاز دور شاہ عثماں ہے
کہ اس عہد مبارک میں ہر اک گھر گلستاں ہے

مبارک اے دکن! اہل دکن برکات عثمانی
مبارک ہو خواتین دکن معراج نسوانی

خدا کا شکر ہے قائم ہوا ہے شعبۂ نسواں
وہ جس کا مدتوں سے منتظر تھا طبقۂ نسواں

فریضہ اپنا اب یہ ہے کہ دیں ایسا فروغ اس کو
حیات جاوداں پا جائے دنیا مان لے جس کو

بہر صورت مدد جاری رکھیں کوشش ترقی کی
اب اپنے ہاتھ میں ہے لاج اس کی اور اپنی بھی

یہ بزم نو ہو ثابت کار آمد کامراں ہو کر
پھلے پھولے یہ شاخ گل جہاں میں گلستاں ہو کر

مرادیں بانی شعبہ کی یا رب ساری بر آئیں
خواتین دکن بام ترقی پر نظر آئیں

اگرچہ علم میں تعلیم کے چرچے زمانے میں
تاسف ہی مجھے لیکن حقیقت کے سنانے میں

بہت پیچھے ہیں اب تک ہم گزشتہ کارناموں سے
ہے لغزش ہر قدم پر اور شکایت ساتھ والوں سے

بپا ہیں اگرچہ ملک میں سامان ترقی کے
ترقی ہوگی جب حاصل کہ ہوں ارمان ترقی کے

ہماری فطرتوں میں ہیں ابھی کمزوریاں باقی
کہ اب تک ہم میں ہیں نقص بھی نادانیاں باقی

ضعیف و نازک طبیعت ہے طبیعت لاابالی ہے
ہماری اپنی دنیا بس خیالی ہی خیالی ہے

گرا دیتی ہیں کمتی ہیں فضا میں گلستانوں کی
تو ہو ذوق نظر کی یہ ادا یہ شان باغبانوں کی

کبھی تقدیر کے شکوے کبھی قسمت پہ روتے ہیں
ہم اپنے وقت کی دولت کو بس یوں ہی گنواتے ہیں

مبارک ہو وہ دن کم ہو وہ دن کم گزر جائیں
تذبذب میں رہتے ہیں سدا ناکام رہتے ہیں

حقیقت میں وہی انساں ہیں جو کچھ کام کرتے ہیں
سرانجام دیکے اپنی سرزمیں کا نام کرتے ہیں

یوں ہی گر بے عمل بیٹھے رہیں ہم آشیانوں میں
ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

بشیر النساء بیگم بشیر

تاثرات سفر یورپ (تیسری قسط)

برنڈزی سے استنبول تک

(۱۹ر جون ۱۹۴۸ء تا ۲۲ر جون ۱۹۴۸ء)

ہمارا جہاز اچھا بڑا تھا، اطالوی کمپنی کا تھا اور "پالستینا" (فلسطینیہ) نام تھا۔ حال کے زمانے میں جب سے اٹلی نے بحیرۂ روم کو اطالوی جھیل بنانے کا منصوبہ گانٹھا ہے، اس نے چاروں طرف اپنے جہازوں کا جال بچھا دیا ہے۔ چنانچہ اب اٹلی سے ایتھنز، استنبول، شام، فلسطین، مصر، تیونس، طرابلس، مراکو اور پرتگال وغیرہ کو جہاز جاتے ہیں۔ اطالوی ساحل چھوڑنے سے پہلے وہ فارم جو کولتے بیانا لگامانو پر اپنے روپے کے متعلق بھرا تھا وہ ہم سے واپس لے لیا گیا۔ برنڈزی سے استنبول تک کا راستہ نہایت دلچسپ ہے، اور جن مقامات کا ذکر پڑھتے عمر گزر گئی وہ سامنے آجاتے ہیں۔ تقریباً تین گھنٹہ تک تو جہاز اطالوی ساحل کے اتنے قریب ہو کر چلا کہ مشکل سے میل ڈیڑھ میل کا فصل ہوگا۔ اطالوی ساحل چھوڑتے ہی البانیہ کا ساحل نظر آنے لگا اور تقریباً چار بجے سے رات کے آٹھ بجے تک اس واحد خالص یوروپی اسلامی سلطنت کا کنارہ نظر آتا رہا جس پر اس وقت اٹلی کی نگاہِ حرص و آز بڑھ رہی ہے۔ ہم البانی بندرگاہ والونا کے بالکل قریب ہو کر گذرے لیکن چونکہ شہر جزیرہ نمائے لنگوئیتا کے پیچھے چھپا ہوا ہے اس لئے بھی نظر نہیں آیا۔ رات کے نو بجے ہم یونانی جزیرہ کورکیرا (کورفو) کے قریب ہو کر گذرے جہاں کسی زمانے میں ولیم دوم قیصر جرمنی اپنی بہن ملکۂ یونان کے پاس اپنی چھٹیاں بسر کیا کرتا تھا۔

جہاز میں اکثر یونانی اور نیم یونانی بھرے ہوئے تھے جن کے چہرے بشرے سے بربریت اور وحشت نمایاں ہے۔ ۲۰ر کو ہم اس تنگ خلیج میں داخل ہوئے جو جزیرہ نمائے پیلوپونیز (موریہ) اور تھسلی کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ ہمارے بائیں طرف مشہور آفاق شہر لیپانتو اور مسولونگی تھے، جو ترکوں اور عیسائیوں کی خونریزی سے تاریخ میں نہایت اہم ہیں۔ لیپانتو تو وہ مقام ہے جہاں ۷ر اکتوبر ۱۵۷۱ء کو ڈون جان شاہزادۂ آسٹریا نے ترکی امیر البحر عروج موذن زادہ کو شکست دی تھی اور یہ پہلی شکست تھی جو ترکوں کو عیسائیوں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ مسولونگی وہ مقام ہے جہاں بیٹھ کر بائرن نے جنگ آزادی یونان میں یونانیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا تھا اور جہاں اس کا ۱۹ر اپریل ۱۸۴۳ء کو انتقال ہوگیا۔ ساڑھے نو بجے کے قریب شمال کی طرف برف پوش کوہ پارناسوس نظر آیا جسے قدیم بت پرست یونانی اپولو دیوتا اور میوزدیبیوں کی آماجگاہ سمجھتے تھے۔ ان مقامات سے قدیم و جدید یونان کی تاریخ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ کلمہ گویان اسلام نے کہاں کہاں جا کر اپنا جھنڈا گاڑھا تھا اور یونانی قوم کی بربریت کی داستان پہاڑوں کی ان ناہموار چوٹیوں سے ظاہر ہوتی ہے جو صبح سے برابر ہمارے جہاز کو گھیرے ہوئے تھیں۔

دوپہر کے وقت کورنتھ نظر آیا اور ایک بجے جہاز نہر کورنتھ کے مقابل کھڑا ہو گیا جو بحیرۂ ترعینیہ اور بحیرۂ ایجین کو جدا کرنے والی خاکنائے کورنتھ کو کاٹ کر نکالی گئی ہے تاکہ جہاز جزیرہ نمائے موریہ کا دور کرنے سے بچ جائیں۔ یہ نہر نہایت ہی تنگ ہے اور بس اتنی ہی چوڑی ہے کہ صرف ایک ہی جہاز اس میں ہو کر نکل سکتا ہے، بلکہ ایک جہاز میں بھی دونوں طرف لکڑی کے موٹے موٹے پٹڑے باندھ دیے جاتے ہیں تاکہ اگر جہاز کی کنارے سے ٹکر ہو تو یہ پٹڑے حجاب کا کام دیں۔ ہمارا جہاز نہر کے دہانے پر اس لئے تقریباً ایک گھنٹہ کھڑا رہا کہ ادھر سے ایک

قبرستان ہیں جن میں وہ ہزاروں یوروپی دبے پڑے ہیں جنھوں نے ادھر کی طرف سے آستانہ کو فتح کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ رات کے ۲ بجے چناق اور سدالبحر کے قلعے نظر آئے۔ اس کے بعد آبادی ہی آبادی تھی اور جہاز کے دونوں طرف یعنی ایشیا اور یوروپ کے کناروں پر اندھیری رات میں بے شمار برقی قمقمے جگمگاتے ہوئے عجیب بہار دے رہے تھے۔ دفعتہً جہاز کی رفتار دھیمی ہوگئی اور چار افسر نہایت عمدہ چست وردی زیب تن کئے ہوئے ایک طلال تارے والی کشتی میں سے اتر کر جہاز پر سوار ہوگئے بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی بڑے ترکی فوجی افسر ہوں گے لیکن دریافت سے پتہ چلا کہ یہ محض پولیس کے عہدہ دار ہیں اور مسافروں کے پاسپورٹوں کی تنقیح کرنے آئے ہیں۔

دوسرے دن ۲۲؍ جون کو صبح کے وقت چاروں طرف بحیرہ مارمورا تھا، زمیں کہیں نظر نہ آتی تھی کہ بس چشم زدن میں باسفورس اور استنبول کا عجیب و غریب اور لاثانی منظر آموجود ہوا۔

ہارون خاں شروانی

تنہائی

تم پوچھتی ہو...... تنہائی سے تمھیں اس قدر کیوں انس ہے؟..... کیا تم نے کبھی سوچا بھی ہے یا یونہی پوچھ بیٹھیں؟ اپنی تنہائی کی دنیا کا نقشہ کھینچتی ہوں کیا پھر بھی میری تنہائی پر تمھیں اعتراض ہوگا۔

تمھارے ہنگامہ پرور شہر سے پانچ چھ میل دور ایک جھونپڑی ہے جس کے اطراف نہایت ہی خوبصورت ایک خودرو باغ ہے رنگ برنگ کے بے ترتیب پھول قدرت کی عریانی کا ایسا دلکش نظارہ پیش کر رہے ہیں کہ جی چاہتا ہے انہیں کو دیکھتے زندہ رہوں انہیں کو دیکھتے مرجاؤں....

.... روح پرور سویرا...... پرکیف شام.... جب سورج غروب ہوتا ہے شعاعیں آسمان پر پھیل جاتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افق مغرب میں آگ لگ گئی ہے۔ شام کی یہ دلفریبی کس قدر رومان انگیز ہے۔ تم ہی بتاؤ! کون اس میں گم ہوجانا نہ چاہے گا..........

کاش، تمھاری دنیا میں بھی ایسی ہی رنگینیاں میسر آتیں۔ کیف و سرور کی ایسی ہی چند گھڑیاں مل جاتیں...... تو کون اس سے پیچھا چھڑاتا؟

میں ایسی دنیا میں ہوں جہاں میری روح شعریت کے عمیق سمندر میں غرق رہتی ہے۔ میری دنیا زمانے کی تلخیوں سرد مہریوں اور آزمائشوں سے پاک ہے جہاں نہ تمھاری دنیا کا سا ہنگامہ ہے اور نہ دن رات کی گردش۔ یہاں ہر لمحہ کے بعد ایک نیا لطف و سرور ہے..... مجھے تم ایسی دنیا میں واپس بلانے کی کیوں خواہش کرتی ہو جہاں کے دوست دشمن سے زیادہ قاتل...... جہاں کا امن جنگ سے زیادہ خونیں اور جہاں کے بسنے والے ماضی کی یاد اور مستقبل کے تصور سے حال کو مکدر بنا دیتے ہیں...... میری دنیا کا ہر منظر جنت نظر ہے قدرت کے اعلیٰ ترین مظاہر یہاں بے نقاب ہیں اور دل یہاں درد کے احساس سے معمور ہوجاتا ہے۔ میری دنیا عقل کی نہیں جذبات کی دنیا ہے جہاں کی فنا دگی میں بھی ایک خاص لذت ہے۔

طاہرہ سلطانہ
(زنانہ ہائی اسکول نامپلی)

سانحاتِ کربلا

آہ کیا حسرت فزا ہیں سانحاتِ کربلا — کس قدر صبر آزما ہیں واقعاتِ کربلا

اے شہیدِ کربلا، اے جانِ بنتِ مصطفےٰ — اے امامِ تشنہ لب، اے نورِ چشمِ مرتضیٰ

مدتیں گذریں مگر تازہ، ترا افسانہ ہے — جو کبھی خالی نہیں ہوتا یہ وہ پیمانہ ہے

دل تری امت کا تیرے درد سے خالی نہیں — جب تلک دنیا ہے تجھ کو بھولنے والی نہیں

آج تک زخمی ہے سوزِ غم سے داغِ سینہ ہے — پھر چھلکتی ساغرِ نو میں مئے دیرینہ ہے

آہ مظلومی پہ تیری اشک خوں روتے ہیں ہم
تو سراپا صبر و رضا اور صبر کو کھوتے ہیں ہم

جس کے جھولے کو جھلاتے تھے کبھی روح الامیں — اپنے سینے پر سلاتے تھے جسے سردارِ دیں

مسکرا دیتا اگر آغوشِ زہرا میں کبھی — حوریں آتی تھیں بلائیں لینے کو فردوس کی

جو ہوا تھا فاطمہ کے شیر سے پل کر جواں — دست و بازو سے تھی جس کے حیدری سطوت عیاں

جس کی نسبت یہ سنا ہی فخرِ موجودات سے — روشنی ہے فاطمہ کے گھر میں اسکی ذات سے

جس کا دروازہ کھلا رہتا غریبوں کے لئے — وقف جس کا مال و زر رہتا یتیموں کے لئے

کیا خبر تھی جان پر اس کے یہ آفت آئیگی
ظلم پر آمادہ اپنی قوم ہی ہو جائے گی

آہ تجھ کو ظالموں نے بے سبب دھوکا دیا — نامے لکھ لکھ کر بلایا اور غلط وعدہ کیا

کون ہے ہمسر ترا اے مصدرِ صبر و رضا — گھر لٹا، کنبہ لٹا تو نے نہ کچھ شکوہ کیا

حلق پر لختِ جگر کے تیر چلتا دیکھ کر — کلمۂ حق تھا زباں پر آسماں پر تھی نظر

قلب گو مضطر ہے سبطِ احمدِ مختار کا — اذن تو دیتے [illegible] کا

ریت کا وہ گرم میدان اور وہ نازک قدم — جن کے چلنے کے لئے [illegible] صحنِ حرم

دوپہر کی دھوپ اور پھر وہ تمازت الاماں — اور اس پر پیاس کی شدت کہ [illegible] زباں

بچہ بچہ کافروں کا شاد تھا سیراب تھا — فاطمہ کا لال پانی کے لئے بے تاب تھا

تھا صف آرا چار سو لشکر ادھر کفار کا
اور ادھر تنہا سپہ تھا حیدرؓ کرار کا

شاہ نے تلوار کھینچی تو قیامت آ گئی — تیغ کھینچے ہی جلو میں فتح و نصرت آ گئی

ہو رہے تھے تیغ حضرت سے ہزاروں سر قلم — سامنے آنے کو تھراتے تھے اعدا کے قدم

برق آسا جب چمکتی تھی وہ سیف آبدار — سیکڑوں زخمی ہزاروں ختم ہوتے نابکار

پڑ گئی لشکر میں بھاگڑ چھپتے پھرتے تھے لعیں — مسکرا دیتے تھے ان کے بھاگنے پر شاہ دیں

درمیان جنگ دیکھا جب کہ ہے وقت نماز — پھینک کر شمشیر قبلہ رو ہوا ماہ حجاز

مو طاعت دیکھ کر کفار چلانے لگے — پا کے موقع ہر طرف سے تیر برسانے لگے

خون آلودہ زمیں پر جھک گیا سجدے میں سر — شمر نے تلوار رکھ دی گردن شبیر پر

اک اندھیرا چھا گیا، تھرا گیا عرش بریں
جب ہوا فرش زمیں پر غرق خوں وہ نازنیں

الوداع اے تاجدار دین و ملت الوداع — اے گل صد رنگ گلزار رسالت الوداع

دے کے سر تو نے بچا لی آبرو ایمان کی — ملت بیضا پہ اپنی جان تک قربان کی

موت ہو یا زندگی ہو سب ید قدرت میں ہے — ناشکیبائی مگر انسان کی فطرت میں ہے

چشم تر جس کی نہ ہو اسلام سے بیگانہ ہے — جو ترے غم سے ہو خالی دل نہیں ویرانہ ہے

اے بشیر حیرت فزا ہے داستان کربلا
شق ہوا جاتا ہے دل سن کر بیان کربلا

یہ نہیں وہ غم کہ اک ہنگامۂ بے جوش ہو — لب پہ تیرا نام ہو اور زندگی خاموش ہو

چاہنے والے ترے بے صبر یوں ہوتے نہیں — جان سے جاتے ہیں لیکن پھوٹ کر روتے نہیں

عہد ماضی پر نظر کر اے مسلماں غور سے — جان دی ہے حامیان دیں نے کس کس طور سے

درس جانبازی کا ہے یہ مسلم خوابیدہ کو — کارناموں کو سلف کے دیکھ اور بیدار ہو

"تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را"

بشیر النساء بیگم بشیر

عبداللہ قطب شاہ اور محرم

یوں تو کم و بیش تمام قطب شاہی فرماں رواؤں میں مذہبی پابندی ان کی سیرت کی ایک نمایاں خصوصیت کے طور پر نظر آتی ہے۔ لیکن عبداللہ قطب شاہ جو شہر حیدرآباد کے اولوالعزم آباد کار سلطان محمد قلی قطب شاہ کا نواسا اور مکہ مسجد کے نیک نہاد بانی کا چہیتا بیٹا تھا، بہت زیادہ پابند مذہب اور شعار اسلامی کا شیدائی تھا اس خاندان کا پہلا فرماں روا جو اپنے ایک ناخلف بیٹے کے ہاتھ شہید ہوا۔ مسجد میں عین حالت نماز میں فوت ہوا تھا۔ گولکنڈہ اور حیدرآباد میں قدیم اور عالی شان مسجدوں کی کثرت بھی ان بادشاہوں کی مذہبیت کا ایک پائندہ ثبوت ہے جو باوجود زمانے کی دست برد اور مغلیوں کی بے پروائی کے آج بھی اپنے بنانے والوں کی خدا ترسی کی یاد دلاتی ہے۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ کی ابتدائی تربیت بھی اس کے نامور باپ سلطان محمد قطب شاہ کی خاص توجہ سے میر قطب الدین نعمت اللہ، مرزا اشرف شہرستانی اور منشی الممالک خواجہ مظفر علی جیسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوئی جو نہ صرف فضیلت علمی اور اعزاز خاندانی کے مفتخر تھے بلکہ اپنی پاکیزہ سیرت اور شرافت نفس کے لحاظ سے بھی منتخب روزگار تھے۔ علاوہ ازیں وہ اپنی شہزادگی اور بادشاہی کے زمانے میں ایک عرصہ دراز تک اپنی نیک دل والدہ حیات بخشی بیگم کے زیر اثر رہا۔ یہ خاتون صوم وصلوٰۃ کی پابند تھی اور سادہ مذہبی زندگی کو بہت پسند کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ علما، فقرا و مشائخین کی خدمت کیا کرتی تھی۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ نے تخت نشین ہونے کے بعد بہت سے مذہبی مراسم اور اسلامی تقاریب جو قدیم سے چلی آتی تھیں ان کو نہ صرف برقرار رکھا۔ بلکہ اس کی توجہ سے یہ پہلے سے زیادہ اہتمام کے ساتھ کی جانے لگیں۔ میلاد النبی صلعم کا جشن جو سلطان محمد قطب شاہ کے زمانے میں موقوف ہوگیا تھا۔ سلطان عبداللہ کے حسن توجہ سے پہلے سے زیادہ اہتمام اور انتظام سے منعقد ہونے لگا۔

حیدرآباد کا محرم اپنی بہت سی خصوصیات کے لحاظ سے آج بھی ممتاز ہے۔ اور موجودہ مراسم عزاداری وغیرہ اکثر قطب شاہی زمانے کی یادگار ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ جیسے ہی محرم کا چاند آسمان پر نمودار ہوا حیدرآباد میں شہدائے کربلا علیہم السلام کے مراسم عزاداری شروع ہوگئے۔ عیش و عشرت کی محفلیں موقوف اور ماتم حسینؑ کی مجالس شروع ہوجاتی تھیں۔ شاہی نقارخانے میں بلکہ تمام امرا و وزرا کی ڈیوڑھیوں پر جو نوبت نقارے بجا کرتے تھے۔ موقوف کردیے جاتے تھے۔ گانا بجانا یکلخت بند ہوجاتا تھا۔ سارے شہر میں سیندھی، شراب اور بھنگ وغیرہ تمام نشہ آور چیزوں کی خرید و فروخت یکقلم موقوف ہوجاتی تھی۔ شاہی باورچی خانے میں گوشت کا استعمال چھوڑ دیا جاتا تھا۔ عام طور پر رعایا بھی ان دنوں گوشت نہیں کھاتی تھی قصاب اپنی دکانیں برخاست کردیتے تھے۔ خاص و عام سب پان کھانا چھوڑ دیتے تھے کیونکہ بعض لوگ اس کے نہایت عادی ہوتے تھے اس لیے ان کی خاطر ایک خشک مرکب نکالا گیا جو نان پیزہ یا سکہ مکہ کہلاتا تھا۔ اکثر مجالس عزا میں اس کو تقسیم کرتے تھے آج بھی حیدرآباد میں اس کا رواج ہے۔ ان دنوں میں حجام بال ترشنا چھوڑ دیتے تھے۔ شاہی جامدارخانے سے مقربین و ملازمین شاہی کو کالے، نیلے رنگ کے کپڑے اور سیاہ اور سبز رنگ کے عصا تقسیم کیے جاتے تھے۔ امرا و وزرا کو بھی ان کے حسب مراتب بیش قیمت ماتمی لباس سرکار کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ محل شاہی (دولت خانہ عالی)

اور دارالسلطنت میں دو بہت بڑے عاشور خانے تھے۔ محرم میں بہت ہی اہتمام کے ساتھ ان کی آرائش ہوتی تھی۔ ان کے وسیع دالانوں اور صحنوں میں بیش قیمت فرش بچھایا جاتا تھا۔ چھت پر نیلے رنگ کے مخمل یا اطلس کی چاندنی لگائی جاتی تھی ان دونوں عاشور خانوں میں چودہ معصومین علیہم السلام کے نام سے سونے چاندی کے چودہ چودہ خوبصورت علم استادہ کئے جاتے تھے۔ ان پر فولادی سر طوق ہوتے تھے۔ ان علموں کو زربفت کے پارچے جن پر آیات قرآنی اور ادعیہ ماثورہ منقش ہوتی تھیں، باندھے جاتے تھے۔ دولت خانہ عالی کے عاشور خانے میں ایک دیوار پر طاقچوں کی دس قطاریں ایک دوسرے کے متوازی بنی ہوئی تھیں۔ پہلی تاریخ سے روزانہ ایک ایک قطار کے طاقچوں میں چراغ روشن کئے جاتے تھے۔

دسویں کی شب کو پورے دس قطار طاقچے روشن ہو جاتے تھے۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے چراغ دان بھی تھے جو درختوں کی شکل کے بنے ہوئے تھے۔ جن میں سے ہر ایک میں اکیس بیس چراغ روشن ہوتے تھے۔ دالانوں میں آدمی کے قد سے بھی بڑی شمعیں جلائی جاتی تھیں حوضوں کے اطراف بھی روشنی کی جاتی تھی۔ صبح اور شام مجالس عزا منعقد ہوتی تھیں۔ خوش آواز ذاکر دل سوز انداز میں واقعات شہادت بیان کرتے تھے۔ سوزخوان مرثیے اور نوحے سناتے تھے۔

عصر کے وقت بادشاہ عبداللہ قطب شاہ ماتمی لباس پہنے گھوڑے پر سوار ہو کر آہستہ آہستہ اور کبھی سیاہ مخمل کے سنگھاسن بیٹھ کر جو خاص اسی غرض کے لئے بنایا گیا تھا۔ قصر داد محل سے برآمد ہوتے تھے۔ تمام امرا وزرا، مقربین و ملازمین ہمراہ رکاب رہتے تھے۔ ان کے لباس بھی سیاہ ہوتے تھے۔ بادشاہ کی سواری ایوان الادہ یعنی عاشور خانہ شاہی میں داخل ہوتی تھی۔ راستہ میں دونوں طرف سواری کے ساتھ ساتھ خوش الحان سوزخوان مرثیے سناتے جاتے تھے۔ جب سواری عاشور خانے کے دروازہ پر پہنچ جاتی تو بادشاہ سواری سے اتر پڑتے عاشور خانے کے اندر داخل ہوتے تھے اور اپنے ہاتھ سے علموں کو سہرے باندھتے اور پھول چڑھاتے تھے۔ پھر مغرب تک وہیں ٹھہر کر اپنے ہاتھ سے طاقچوں کے چراغ روشن کرتے اور ذاکروں کے بیان اور مرثیے سنتے جس کے بعد خطیب شاہی بادشاہ کے روبرو کھڑے ہو کر نہایت فصاحت و بلاغت سے شہدائے کربلا کے ارواح طیبہ پر فاتحہ پڑھتا اور بادشاہ کی درازی عمر و اقبال کے لئے دعا کرتا۔ بادشاہ اس توفیق ایزدی پر سجدۂ شکر بجا لا کر محل کو واپس ہوتے اور امرا اور وزرا وغیرہ عاشور خانے میں ٹھہر جاتے جہاں مجلس عزا شروع ہوتی۔ مجلس کے ختم ہونے کے بعد دسترخوان بچھایا جاتا اور نہایت پرتکلف کھانے (بے گوشت کے) کھلائے جاتے۔ مصری اور گلاب کا شربت پلایا جاتا اور نان ریزہ کے طبق تقسیم کئے جاتے۔ کھانے کے بعد پھر عزاداری شروع ہوتی جس کا سلسلہ آدھی رات تک جاری رہتا تھا۔ دولت خانہ عالی کے باہر بھی جو بڑا عاشور خانہ تھا اور جو کوتوال شہر کی نگرانی میں تھا۔ وہاں بھی اسی طرح کی روشنی ہوتی، مجالس عزا ہوتیں، عزاداروں کی ضیافت کی جاتی تھی۔ ان دو عاشور خانوں کے علاوہ بادشاہ کے اعزہ اور امرا کے متعدد عاشور خانے تھے خصوصاً حیات آباد، کلثوم پورہ، بالاپور، خیرت آباد اور لنگر فیض اثر کے عاشور خانے اپنے علموں اور مجالس عزا کے لئے بہت مشہور تھے۔ ان کے علاوہ مختلف کارخانہ جات جیسے فیل خانہ، طویلہ شاہی وغیرہ کے ملازمین بھی محرم میں قسم قسم کے تازیے اور تابوت بناتے تھے۔

چھٹی محرم کی رات سے روزآنہ عاشورخانے کے علم اور یہ تازیے داد محل کے وسیع میدان میں لائے جاتے تھے جہاں ہر طرح کی روشنی ہوتی تھی علموں کے سامنے محبانِ اہل بیت اور عقیدت مند افراد چھوٹی چھوٹی مشعلیں ہاتھ میں لئے ہوئے دو رویہ چلتے تھے جن کے درمیان مرثیہ خوانوں اور ذاکروں کی جماعتیں ہوتی تھیں جب یہ لوگ اس طرح داد محل کی دیواروں کے بالکل نیچے پہنچ جاتے تو علموں کے گرد تمام ماتمی جمع ہو کر بہت زور و شور سے نوحہ و بکا کرتے۔ بادشاہ سلامت بھی محل سے برآمد ہوتے اور گریہ و بکا کو دیکھ کر اور ذاکروں کی زبان سے مصائب کربلا سن کر خود بھی آبدیدہ ہوتے۔ پھر تمام عزاداروں کے لئے محل شاہی سے "نان ریزہ کے طبق" ارسال کرتے۔ کوتوالِ شہر بادشاہ کی سلامتی کی دعا کرتا اور علم واپس ہوتے۔ عاشورے تک روزآنہ اسی طرح علم لائے جاتے تھے اور ماتم ہوتا تھا۔ ساتویں کی رات کو ان علموں کے علاوہ قصبہ حیات آباد کے علم اور سرطوق بھی لائے جاتے تھے جن کے ساتھ بڑا مجمع ہوتا تھا۔

ساتویں کی صبح کو بادشاہ تدی محل میں تشریف لاتے اور شہ نشین میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایران و ہندوستان کے سفیر مقامی وزراء اور امراء اور جملہ طبقات کے ملازمین سب سیاہ لباس پہنے ہوئے اپنے مقام پر کھڑے ہو جاتے تھے دولت خانہ عالی، لنگر فیض اثر، حیات آباد اور دوسرے مقامات کے علم اس خاص دروازے سے جو دروازہ بارہ امام کے نام سے موسوم تھا محل کے اندر داخل ہوتے۔ جس کے ساتھ ہندو مسلمان عوام کا انبوہ کثیر ہوتا تھا۔ تمام علم یکے بعد دیگرے بادشاہ کے سامنے لائے جاتے۔ ذاکرین مصائب اہل بیت بیان کرتے اور عزادار نالہ و شیون بلند کرتے۔ ہر علم کو ریشمی پارچہ باندھا جاتا اور مجاوروں کو اشرفیوں کے توڑے دئے جاتے۔ ساتویں کی شام کو بادشاہ چراغوں کو روشن کرنے اور پھول چڑھانے کے بعد خود بھی مجلس عزا میں شریک ہوتے تھے۔ اسی طرح نویں کی مجلس میں بھی شرکت کرتے اور اپنے ہاتھ سے امراء سفراء کو کافوری شمعیں تقسیم کرتے اور خود بھی مشعل لیے ہوئے عاشورخانے کے باہر آتے۔ علم عاشورخانے سے نکل کر میدان کی طرف روانہ ہوتے بادشاہ خود بھی کوئی پانسو قدم علموں کے ساتھ پیدل چلتے اور پھر محل کے ایک بلند حصے میں کھڑے ہو جاتے یہاں اس روز دو بجے تک عزاداری اور شور و شیون کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

یوم عاشورہ کی صبح کو سب لوگ سیاہ پوش و برہنہ پا دولت خانہ عالی کے عاشورخانے میں جمع ہوتے۔ بادشاہ سلامت بھی اسی طرح برہنہ پا چلتے ہوئے اس مسجد میں آتے جو عاشورخانے کے متصل تھی۔ مسجد میں مجلس عزا منعقد ہوتی اور مصائب اہل بیت بیان کئے جاتے فاتحہ خوانی کے بعد جب مجلس برخاست ہوتی تو بادشاہ مجلس سے نکل کر دولت خانہ عالی میں داخل ہوتے اور نماز و زیارت حضرت سید الشہدا علیہ السلام میں مشغول ہو جاتے اس کے بعد خاص و عام کو کھانا کھلایا جاتا تھا اور سادات کے دو سو تیرہ و بیس لڑکے بادشاہ کے حضور میں پیش کئے جاتے تھے جن کو جامہ دلاتے نفیس لباس اور روپیوں کی تھیلیاں دی جاتی تھیں۔

دارالسلطنت کے علاوہ ریاست کے تمام شہروں، قصبوں اور بندرگاہوں میں بھی علم ستادہ کئے جاتے تھے اور مجالس عزا منعقد کی جاتی تھیں۔ ان کے تمام مصارف سرکار سے ادا کئے جاتے تھے۔ مراسم عزاداری میں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی برابر کے شریک تھے۔ ہندو، مرد، عورتیں اور بچے کیا امیر و کیا غریب ایام عاشورہ میں غسل کر کے اچھے کپڑے پہنتے مکانات کی صفائی و آہک پاشی کرتے اور پھر نہایت خلوص و عقیدت کے ساتھ شربت کی ٹھلیاں اپنے سروں پر لے کر عاشورخانہ جاتے اور نیاز ادا کرتے۔

علموں کو پھول چڑھاتے، نذرانے دیتے اور حصول مراد کے لئے منتیں مانگتے جو بچے ایام عاشورہ میں پیدا ہوتے تھے خاص و عام اُن کے نام حضرت سید الشہداء کے نام پر "حسین" رکھتے تھے۔

یہ قطب شاہی عہد کے مراسم عزاداری کا ایک سرسری خاکہ ہے آج بھی بہت سی اس میں اُسی طریقے پر حیدرآباد میں ادا ہوتی ہیں جس طرح تین ساڑھے تین سو برس پہلے ہوتی تھیں۔

سید محمد

سلام بر شہدائے عالی مقام علیہم السلام

اے سلامی رن کو جب اکبرؑ چلے — ڈالتے سایہ ملک سر پر چلے
لشکرِ اعدا میں بھاگڑ پڑ گئی — کھینچ کر شمشیر جب صفدر چلے
محوِ حیرت یاں ہوئے جن و بشر — واں ملائک بھی تو غش غش کر چلے
جسمِ اطہر چُور زخموں سے ہوا — بزدلوں کے تیر چھُپ چھُپ کر چلے
تین دن کی پیاس یوں خوں سے بجھے — حلق پر مظلوم کے خنجر چلے
دشمنوں نے خون میں نہلا دیا — پیشِ حق، کیا سرخرو ہو کر چلے
صبرِ اہلِ بیتؑ کے جوہر کھلے — اُف نہ کی آرے بھی جو سر پر چلے
حشر میں ہوں گے، قسیمِ آب جو — تشنہ ابنِ ساقیؑ کوثر چلے
خون برسائے نہ کیونکر آسماں — ہائے پیاسے سبطِ پیغمبر چلے
ظلم کی شبیر پر تھی انتہا — اِس ستم کے تیر کب کس پر چلے
راہِ حق میں کر دئے، قرباں پسر — رسمِ ابراہیم زندہ کر چلے
لب پہ شکوہ ہی نہ تھا، شبیر کے — یوں چلے اصغرؑ، اُدھر اکبرؑ چلے
ظلم کی چادر جو اوڑھے تھے شقی — سر برہنہ آلِ پیغمبرؐ چلے

خوں رلاتا ہے غمِ آلِ نبیؐ
دل پہ نوشابہ نہ کیوں نشتر چلے

نوشابہ خاتون

علی عادل شاہ شاہی کے مرثیے

بیجاپور کے آٹھویں تاجدار سلطان علی عادل شاہ ثانی کی شاعری سے ہم واقف ہیں، سلطان کا تخلص شاہی تھا، اس کے ہندوستانی کلیات[1] پر ہمارے دو تفصیلی مضمون[2] شایع ہو چکے ہیں۔

سلطان کے کلیات میں کوئی مرثیہ نہیں ہے، یہاں ہم سلطان کے دو مرثیے پیش کرتے ہیں۔

گزشتہ محرم میں رسالہ "سب رس" میں قدیم اور جدید شعرا کے جو مرثیے پیش ہوئے تھے، ان میں قدیم مرثیے زیادہ تر "دکنی میں اردو" سے لیے گئے تھے، لیکن سلطان علی عادل شاہ کا مرثیہ ان میں نہیں تھا، اس لیے ان کا تعارف مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سلطان علی عادل شاہ کی ولادت ۱۰۴۷ھ میں ہوئی، ۱۰۶۷ھ میں تخت و تاج کا مالک بنا، اور ۱۰۸۳ھ میں انتقال ہوا، بیجاپور میں مدفون ہے۔

شاہی کا مذہب امامیہ تھا، اس کو اہل بیت رسالت سے انتہائی خلوص تھا، اس نے منت مانی تھی کہ اگر جنگ میں کامیابی ہوگی تو علم بٹھا کر مرثیہ خوانی کا آغاز کرے گا۔ جنگ کی کامیابی کے بعد "حسینی محل" کی تعمیر خاص اسی غرض کے لیے ہوئی تھی، یہاں محرم میں علم استادہ ہوتے تھے، اس کے عہد کے ملک الشعرا، نصرتی نے اپنے ایک قصیدہ میں جو "عاشورہ کے بیان میں" کے عنوان سے لکھا گیا ہے، تفصیل کے ساتھ بیجاپور کے محرم کا تذکرہ کیا ہے۔

نصرتی نے بیان کیا ہے کہ علی عادل شاہ ثانی نے اہل بیت کی توفیق حاصل کر کے ہر سال عرس کرتا ہے اس نے حسینی محل کی تعمیر اس کی تزئین اور آرایش کی تفصیل کے ساتھ علموں کی سواری، راستوں کی آرایش، آتشبازی، لوگوں کا سوانگ بدلنا، پہلوانوں کے کرتب دکھانا وغیرہ امور کی پوری صراحت کی ہے۔

سلطان کے زمانہ میں بیجاپور میں گھر گھر شاعری کا چرچا تھا، عام شاعروں کے علاوہ بعض ایسے شعرا بھی تھے جو صرف مرثیہ گوئی کرتے تھے، ان میں مرزا کا نام سب سے زیادہ درخشاں نظر آتا ہے، مرزا وہ شخص ہے جس نے اپنی تمام عمر مرثیہ گوئی میں صرف کر دی اور سوا مرثیہ کے اور کسی صنف میں شعر گوئی نہیں کی، حتی کہ جب بادشاہ نے اپنے قصیدہ کے لئے اصرار کیا تو ایک مرثیہ میں اپنے تخلص کے بجائے بادشاہ کا نام لکھ دیا چنانچہ مولف "بساتین السلاطین" کہتا ہے "روزے علی عادل شاہ مرزا را بحضور طلبیدہ مدارات و عنایات بہ وفور و تکلف نمود، کہ زبان را بمدح بادشاہ آشنا سازد، مرزا گفت زبانے را کہ در حمد و نعت و منقبت وقف کردہ ام در حکم من نماندہ بادشاہ مکرر تکلف نمود، ناچار یک دو مرثیہ بر زبان سلطان گفتہ بجائے اسم خویش تخلص علی عادل شاہ کہ شاہی بود بہ قسمے داخل نمود، ... و سخن داد ...

---

[1] رسالہ معارف بابتہ مئی ۱۹۳۳ء اور رسالہ شہاب بابتہ بہمن و اسفندار ۱۳۴۲ف۔ مقالات ہاشمی میں اول الذکر مضمون شامل ہے

[2] دکنی مرثیوں پر ہمارے متعدد مضامین رسائل "کتبہ"، "ادبی دنیا" اور "شہاب" میں شایع ہوئے ہیں، ان میں بعد کو کچھ ... مرثیے پیش کیے ... اس کے بعد "دکن میں اردو" کے تیسرے ایڈیشن میں چند مرثیے شامل کر دیے گئے تھے۔ یہ مقالات ہاشمی حصہ اول میں ہمارے مطبوعہ اکثر مضامین شامل ہیں

مرزا کی شہادت بھی ایک مرثیہ لکھتے وقت ہوتی ہے، مطبوعہ (بساتین السلاطین ص۲۲۲)، مرزا کے مرثیوں کے نمونے "مقالات ہاشمی" میں شامل ہیں۔

سلطان علی عادل شاہ کے دو مرثیے ہمارے بزرگ مرحوم مولوی صفی الدین کے کتب خانہ کی بیاض میں موجود ہیں، ایک مرثیہ تیرہ شعر کا ہے، اور دوسرا پانچ شعر کا ہے، ایک میں شاہی تخلص ہے اور دوسرے میں علی عادل تخلص آیا ہے، نہیں معلوم یہ مرثیے خود سلطان کی فکر کے نتائج ہیں یا مرزا کے کہے ہوئے چونکہ ہمارے پاس اس کی تحقیق کے لئے کوئی ذریعہ نہیں ہے اس لئے ہم ان کے متعلق کچھ صراحت نہیں کر سکتے۔

ذیل میں دونوں مرثیے درج کئے جاتے ہیں، امید ہے کہ دلچسپی سے دیکھے جائیں گے۔

شہ کے غم سوں دل ہے نالاں ہائے ہائے — جگ برستے خون ابھالاں ہائے ہائے
جگ کے سہ (؟) ور دل کے لہو سوں بھر چلے — پھور کر پلکہاں کے بالا ل ہائے ہائے
یک شگفتہ گل نہ اس غم سوں رہیا — ہر خزاں میں بونہالا ل ہائے ہائے
دم تری (؟) دل میں دک سوں لہو جمیا — تو پھٹے کہن میں لعلا ل ہائے ہائے
اس شدیاں کوں کھول انکھیاں دیکھو تو — ہے بروسہ کے اودھاں ہائے ہائے
کربلا کی سب زمین رنگیں ہوئی — لہو بھری دلدل کے نالاں ہائے ہائے
ین شفق جگ پوچھ کر سنتے ملک — لہو بھری سوا ور ومالاں ہائے ہائے
گر خوشی ہور خرمی کے کر پرے — آہ کے چھتے میں نالا ل ہائے ہائے
اس دک سوں بھر کے امتی سب تن منی — نت جلیں انکھیاں بلالاں ہائے ہائے
اس دک سوں حوراں پیتاں ہات کوں — توڑ کر زلفاں کے بالاں ہائے ہائے

نت کریں عادل علی یک دل تھے
شہ کا اتم ماہ وسالاں ہائے ہائے

دیگر

جب تے دھریا امام حسن کربلا منے — تب تے ہوا ہے غم کوں رہن کربلا منے
افسوس صد ہزار کہ سرور حسینؑ کا — ہوکر رہیا ہے سرخ بدن کربلا منے
جس روز سے او سور چلیا جگ کوں کر وداع — اس روز تھے ہے سوز رین کربلا منے
ہولالہ زار سر پو سارے شہید کے — دستے ہیں لہو سوں لال چمن کربلا منے

نبہ کا دیپک لگا کو جو شاہی نے دھوند کر
پایا ہے پی بہا یو رتن کربلا منے

نصیر الدین ہاشمی

ﮧ چونکہ کسی اور جگہ سے اسی کی صحت ناممکن تھی اس لئے کانہ نقل کیا گیا ہے۔

بضاعتِ رسالت میں عقیدتمندانہ عرض

تنگ ہے انکارِ دنیا سے مری جانِ حزیں
رحم کرنا حال پر یا بنت ختم المرسلیں

التجا جس وقت تک میری نہ ہوگی یہ قبول
آپ کے در پر رگڑتا ہی رہوں گا میں جبیں

جانتا ہوں مانتا ہوں میری قسمت ہے بُری
آپ گر چاہیں تو کیا قسمت بدل سکتی نہیں

سارا عالم جانتا ہے ہوں غلامِ پنجتن
ہے حیا کی بات جو میں ہاتھ پھیلاؤں کہیں

مرتبے بفضل خدا سے دونوں بھی اچھے ملے
زوجۂ شیرِ خدا اور بنتِ ختم المرسلیں

یہ وہ مخدومہ ہے جس کے در کے ہیں منجبہ سا
فخر کرتے ہیں ملائک اور جبریل امیں

کربلا میں ہم رہیں جنت کی کیا پروا ہمیں
مسکن و مدفن کو تیرے ہو میسر وہ زمیں

میر امیر علیخاں آمیر

رباعیات

(۱)

غمِ شبیر میں جو اشک بہا دیتا ہے
درِ جنت اسے اللہ بہا دیتا ہے
مدحِ شبیر میں اک بیت اگر کوئی کہے
باغِ فردوس میں اک بیت خدا دیتا ہے

(۲)

راضی برضائے حق حسینِ جانباز
تھا طالب و مطلوب میں اک راز و نیاز
سر سجدۂ حق میں اور گلو پر خنجر
تھی آخری وہ حسینؑ بیکس کی نماز

(۳)

ترس آلِ محمدؐ پہ نہ آیا صد حیف
تاراج کیا گلشنِ زہرا صد حیف
بے اذن نہ آتے تھے ملک جس گھر میں
اعدا نے اُسی گھر کو جلایا صد حیف

میر کاظم علی برق موسوی صاحب

دکن کے مرثیہ نگار شعراء

یہہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اردو میں مرثیہ نگاری کی ابتداء دکن سے ہوئی۔ اگرچہ کہ اس امر کا صحیح پتہ نہ لگ سکا کہ دکھنی مرثیے پہلے کہاں لکھے گئے۔ کیونکہ بیجاپور اور گولکنڈہ دونوں سلطنتوں کے بانی شیعہ مذہب کے پیرو تھے اور ان حکومتوں میں ابتداء ہی سے مجالس عزا کا دستور پڑ گیا تھا جہاں مرثیہ خوانی بھی ہوتی تھی۔ بیجاپور میں علی عادل شاہ ثانی اور گولکنڈہ میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں خاص طور سے اس طرف توجہ کی گئی اور دکن میں مرثیہ گوئی کا عام رواج ہوگیا۔ بعض شعرا نے مرثیہ کے سوا اور کسی صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ اور اکثر شعرا نے کوئی نہ کوئی مرثیہ ضرور لکھا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ دکن میں شیعہ سلطنتوں کے زوال کے ساتھ مرثیہ نگاری کو بھی زوال نہیں آیا بلکہ اس کا سلسلہ باقی تھا۔ لیکن بعد میں اسی صنف کو جو ترقی ایک فن کی حیثیت سے لکھنؤ میں حاصل ہوئی وہ دکن میں نہ ہو سکی تھی۔

دکھنی مرثیوں کی سب سے پہلی خصوصیت ان کا مرثیہ پن ہے۔ ان کا اصل مقصد حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کا غم تازہ کرنا تھا۔ اس لئے صرف اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ رنج و غم کے مضامین اس طرح بیان کئے جائیں کہ واقعات آنکھوں کے سامنے مجسم ہو جائیں اور سننے والے کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں۔ اس بارہ میں دکن کے مرثیے شمالی ہند کے مرثیوں سے مختلف ہیں۔ انیس و دبیر نے مرثیوں میں کردار نگاری۔ مکالمے اور مناظر قدرت وغیرہ کو شامل کر کے اس فن کو نہایت وسعت دی۔ تاہم بھی دکھنی مرثیے ادبیت سے خالی نہیں ہیں۔ اور ان میں واقعہ نگاری کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ اگرچہ مضامین میں شمالی ہند کی گوناگونی نہیں پھر بھی علی اصغر کی شہادت اور امام قاسم اور بی بی سکینہ کی شادی اور جدائی کو تقریباً ہر مرثیہ نگار نے نئے طرز پر باندھا ہے۔ دکن کے مرثیے تاریخی حیثیت سے دہلی اور لکھنؤ کے مرثیوں کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہیں کیونکہ ان سے مرثیہ نگاروں کے نام اور اس زمانے کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اکثر شعرا کے متعلق ہم کو کچھ بھی معلومات نہ حاصل ہوتیں۔

دکھنی مرثیے بالعموم مربع بندوں کی شکل میں لکھے گئے ہیں۔ ہر مرثیے کے پہلے بند کے چار مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں لیکن ہر بند کا چوتھا مصرعہ اسی ردیف و قافیے میں لکھا جاتا ہے جو ابتدائی بند کا ہوتا ہے۔ چند مرثیے مخمس کی شکل میں بھی ہیں۔ سلام درود و فاتحہ کے لئے عموماً غزل کی طرز اختیار کی گئی ہے۔ بعض مرثیہ نگاروں نے مرثیے بھی غزل کی طرز میں لکھے ہیں۔

اب ہم ہر عہد کے مشہور مرثیہ گویوں کے مختصر حالات اور ان کے کلام کا نمونہ پیش کریں گے جس سے ان شعرا کے کمال کے علاوہ زبان کی تدریجی ترقی کا بھی بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

قطب شاہی مرثیہ نگار

وجہی۔ اگرچہ اس بات کا پتہ نہ لگ سکا کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں میں سے پہلے کس جگہ مرثیہ نگاری کی ابتدا ہوئی۔ لیکن اس وقت تک جو قدیم ترین مرثیہ دستیاب ہوا ہے وہ گولکنڈہ کے شاعر وجہی کا ہے۔ وجہی کئی حیثیتوں سے اس عہد کا سب سے بڑا شاعر کہلانے کا مستحق ہے اور یہی وہ شخص ہے جس کی نثر و نظم دونوں کے نمونے موجود ہیں۔ وجہی کی شاعری کا زمانہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔

اور عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں بھی وہ زندہ تھا۔ وجہی اپنی مثنوی قطب مشتری اور نثر سب رس کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ اس کی کئی غزلیں اور رباعیاں بھی ملتی ہیں لیکن مرثیہ صرف ایک ہی دستیاب ہوا ہے۔ یہ مرثیہ حسب ذیل ہے ؎

حسین کا غم کرو عزیزاں | انجو نین سوں جھڑو عزیزاں
بنا جو اول ہوا ہے غم کا | عرش گگن ہور دھرت ہلایا
قضا میں جوں جوں لکھیا الہی | گریا حسین پر او ہیں سمایا
یو کیا بلا تھے یو کیا جفا تھا | مگر قضا تھے سو حق دکھایا

محمد قلی قطب شاہ

یہ گولکنڈہ کا ہمتم بالشان بادشاہ اور بہت بڑا شاعر تھا۔ اس نے ۹۸۸ھ سے ۱۰۲۰ھ تک حکومت کی۔ اس کا اسلوب بیان نہایت سادہ ہے اور اس کے کلام میں دکنی کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ کی آمیزش ہے اس نے فارسی کے برخلاف ہندی اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس نے مختلف اصناف سخن میں شاعری کی ہے۔ اس کے کلام میں مثنویاں۔ قصیدے مرثیے۔ غزل ترجیع بند اور رباعیات شامل ہیں۔ اس کے عہد میں مرثیہ نگاری کی طرف کافی توجہ کی گئی۔ کلام کا نمونہ درج ذیل ہے

آج شہ چھپیں چلیا شرق نگر تھے شتاب | ڈھال فلک کی اچا وہ شہ عالی جناب
باندھ خنجر کرن کی زرین فرنگ ہاتھ لے | صبح کے وقت آ بیا پیچ دو پیالی شہاب

نوحہ۔ دو جگ اماں دکھ تھے سب تیو کرتے زاری وائے وائے | تن ہوان کی لکڑیاں جال کر کرتے ہیں خواری وائے وائے
پنکھی سنے ہیں سب پراں دو دو بھرائے سمدراں | بچھڑے ہیں سب اپنے گھراں دیکھ تو زاری وائے وائے

عبداللہ قطب شاہ۔ ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ

سلطان محمد قطب شاہ کا فرزند اور جانشین عبداللہ قطب شاہ بھی شاعر تھا اس کا تخلص عبداللہ تھا۔ اس نے سیاسی مشکلات کے باوجود ادبی ذوق کو ترک نہ کیا۔ اس کے عہد میں اردو کو بہت ترقی ہوئی اور دکنی ایک مستند زبان بن گئی۔ مرثیہ نگاری میں بھی کافی ترقی ہوئی سلطان کے کلام میں لفظی شان و شوکت اور سلاست خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مرثیہ کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں ؎

علی ہور فاطمہ کرتے ہیں دونوں آج زاری ہی | حسن تا ہو حسین کا دو کھوں آیا فگ پو خواری بھی
حسین جب چلے لڑنے سراں کئیں پر گئے پڑنے | شہیداں ہلاک پرنے لگیا یو دکھ بھاری بھی
شہربانو کہے اگر کرنے سنا رکے سرور | منجے غربت منے بعالم نجا چھوڑ باری بھی

غواصی۔ یہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا اور محمد قلی کے عہد میں مشہور ہوا۔ سلطان عبداللہ کے عہد میں اس کو شاہی تقرب حاصل ہوا۔ وجہی کی طرح یہ بھی ایک اعلیٰ شاعر تھا۔ اس کی دو مثنویاں زیادہ مشہور ہیں۔ ایک سیف الملوک و بدیع الجمال اور دوسری طوطی نامہ اس کے انتقال کی تاریخ یقینی طور پر معلوم نہیں۔ لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کے زمانے ہی میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کے

کلام میں ہندی الفاظ زیادہ پائے جاتے ہیں۔ کلام سادہ اور تصنع سے پاک ہے۔ اس کا طرز بیان دلکش ہے اور اس کی قادر الکلامی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے چند غزلیات اور مرثیے بھی دستیاب ہوئے ہیں ؎

دستا نہیں کروں کیا وہ جان کربلا کا　　پھرتا ہوں زار ہوں میں حیران کربلا کا
اسمان تے خدایا جبریل اوذکو آیا　　روزا اوپرتے لایا فرمان کربلا کا
دکھ سہ ملک لئے ہیں ماتم زدے ہوئے ہیں　　رو رو دیا گیے ہیں اسمان کربلا کا

لطیف۔ غلام علی خاں لطیف عبداللہ قطب شاہ کے عہد کا شاعر ہے۔ امامیہ مذہب کا پیرو تھا۔ وہ محض تفنن طبع کی خاطر شاعری کرتا تھا۔ بڑا پرگو شاعر تھا۔ ایک سال کی مدت میں پانچ ہزار پانچسو اشعار کی مثنوی لکھ دی۔ اسے اپنی شاعری کے علاوہ اپنی شرافت اور امارت پر بھی فخر تھا۔ وہ اپنی مثنوی ظفرنامہ کی وجہ سے مشہور ہے۔ مرثیے بھی کہا کرتا تھا۔

لے اہل دل اشک سوں انکھیاں کوں تر کرو　　نکلیا ہے پھر یو ماہ محرم نظر کرو
یو آہ و فغاں سن کر عباس علی　　چلے مسکراتے نیر نین ممبلے
کہتے تب حسینا کہ اے میرے بھائی　　کہ بیکلی تمیں کرتے ہم تے جدائی

افضل۔ افضل کے متعلق بہت سے اختلافات ہیں کیونکہ اس نام کا ایک شاعر شمالی ہند میں بھی گذرا ہے۔ دکن کے افضل کے متعلق صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ اس دور کے آخری زمانے سے تعلق رکھتا ہے اور گولکنڈہ کے ختم ہوکر سلطنت مغلیہ میں شامل ہوجانے کے بعد بھی یہ حیدرآباد میں موجود تھا۔ میراں شاہ معروف کا مرید اور ان سے خلافت حاصل تھی۔ اس کی تصانیف میں ایک مثنوی محی الدین نامہ کا پتہ چلتا ہے۔ مرثیے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ اس کے کلام میں فارسیت غالب ہے ؎

حسین کا دلبر و دلدادہ قاسم　　حسین کا مونس و غم خوار قاسم
کشیدہ تیغ و غم لپیا تھا قاسم　　جہاں سوں دیدۂ خونبار قاسم
گیا از بدعت کفار قاسم

شاہی۔ شاہ قلی خاں نام۔ شاہی تخلص گولکنڈہ کا نامور مرثیہ گو تھا۔ وہ امامیہ مذہب کا پیرو تھا۔ اور سختی کے ساتھ مذہب کا پابند تھا۔ پہلے وہ گولکنڈہ کی فوج میں شامل تھا۔ لیکن بعد میں اسے دربار میں جگہ ملی۔ تانا شاہ نے اس سے مرثیہ لکھنے کی فرمائش کی۔ اس کے مرثیوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں کافی شہرت حاصل کرلی۔ چنانچہ اورنگ زیب کے سپاہیوں نے ان کو زبانی یاد کرلیا اور اس طرح وہ شمالی ہند میں پہنچ گئے۔ اس کا ایک مرثیہ لاجواب ہے جس میں اس نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے جب کہ حضرت امام حسین کی شہادت کے بعد آپ کا خاندان قید ہوکر دمشق کو جاتا ہے۔ اس واقعہ کا طرز بیان انیس کے مماثل ہے۔ زبان بھی اعلیٰ اور شاعرانہ ہے۔ نمونۂ کلام ذیل میں درج ہے۔

ہائے غریب یتیم نمائی عابد تیری زاری ہے　　باپ کا مرنا دکھ بھرنا تس پر یو بیماری ہے
کہا بہشت سے پیام لیا یا عابد تیری دادی کا　　کٹھن گھڑی ہو پوتے مہرے تجھ پہ نمک خواری ہے

کاظم ۔ کاظم کے متعلق صرف اس قدر معلوم ہے کہ وہ گولکنڈہ کا شاعر تھا۔ وہ صرف مرثیہ نگار ہی تھا۔ اس کے مرثیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مرثیہ پن اور ادبیت دونوں پائے جاتے ہیں۔ مرثیہ کا نمونہ حسب ذیل ہے ؎

رکھنا امام دیں کے تیں جنگل منے بی آب و نان ۔۔۔ طفلاں کوں ان کے بے گنا ظلم ہیں ۔لانا کہاں روا

جن کو بٹھاتے تھے نبی دوش مبارک پر مدام ۔۔۔ نیزہ پران کے سر کے تیں رکھ کر پھرانا کب روا

مرزا۔ ابوالقاسم مرزا تانا شاہ کے دربار کا مشہور مرثیہ گو تھا جب تانا شاہ کو قید کرلیا گیا تو اس کو اس قدر رنج ہوا کہ اس نے فقیری اختیار کرلی اور بقیہ زندگی گوشہ نشینی میں گذاردی۔ اس کے کئی مرثیے دستیاب ہوئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا مشکل زمینوں میں مرثیے لکھا کرتا تھا۔ اس کا کلام سوز و گداز کے باعث اعلیٰ درجہ کا قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ زبان کے لحاظ سے صاف نہیں لیکن پراثر ضرور ہے۔ علی اصغر کی شہادت کے متعلق کہتا ہے ؎

کیوں دکھ درد اصغر کا وہ نور چشم سرور کا ۔۔۔ شہ غازی کے جو مہ کا کرو زاری مسلماناں

عزیزاں دل ہوا پرخون یوسف اصغر کے غم کوں ۔۔۔ کہ معصوم شہادت سوں کرو زاری مسلماناں

عادل شاہی مرثیہ نگار

نوری۔ اس شاعر کے بارے میں بہت سے اختلافات ہیں کیونکہ اس تخلص کے دو شاعر گذرے ہیں ایک بیجاپور میں اور ایک گولکنڈہ میں۔ بہرحال خیال کیا جاتا ہے کہ مرثیہ نگار نوری بیجاپور سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

کوئی ظلم اس میں تو کرتا نہ تھا ۔۔۔ ولے سب تعصب سے [illegible]

نہ کچھ خوف کھایا نہ جھوکا ذرا ۔۔۔ دھرم مرشئے سے پہل [illegible]

ہاشمی۔ سید میراں نام اور ہاشمی تخلص علی عادل شاہ کا درباری شاعر تھا یہ مادر زاد اندھا تھا اس نے ایک مثنوی جو یوسف زلیخا سے موسوم ہے سنہ ۱۰۹۹ھ میں مرتب کی غزلوں کا دیوان بھی مرتب کیا۔ اس کا کلام زبان کی صفائی کے لحاظ سے قابل تعریف ہے ؎

دلبند مصطفیٰ کا تابوت لے چلے ہیں ۔۔۔ فرزند مرتضیٰ کا تابوت لے چلے ہیں

سلطان دو جہاں کا تابوت لے چلے ہیں ۔۔۔ مظلوم کربلا کا تابوت لے چلے ہیں

مرزا۔ علی عادل شاہ کے عہد کا سب سے بڑا مرثیہ گو تھا اس نے مرثیے کے علاوہ اور کسی صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ مرثیہ گوئی کا ایسا شوق تھا کہ انتقال کے وقت بھی ایک مرثیے کا عنوان لکھ رہا تھا اس کو بادشاہ کا تقرب حاصل تھا پھر بھی اس نے کبھی بادشاہ کی مدح نہ کی۔ ایک وقت بادشاہ نے خود خواہش کی تو ایک مرثیے میں اپنے نام کی بجائے بادشاہ کا نام لکھ دیا۔

مرزا مرثیہ گوئی کو مذہبی فرض خیال کرتا تھا اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کو خواب میں بھی اس کی تلقین ہوتی تھی۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز مرزا مرثیہ لکھ رہا تھا۔ ایک مصرعہ موزوں ہوا تھا کہ ؎

دامان جیا کال انار ان کر لہو سینہ طبق میانے

دوسرے مصرعہ کے لئے مضمون نہیں مل رہا تھا۔ اسی سوچ میں تھا کہ اس پر مدہوشی طاری ہوئی۔ دیکھا کہ آنحضرت صلعم تشریف لائے ہیں اور فرماتے ہیں ؎

نبی رو بنے محشر کوں یو تحفہ لے کے جاتا ہے

مرزا نے یہی کہہ کر مرثیہ پورا کیا۔ اس کی شہادت یوم عاشورہ ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرثیہ لکھ رہا تھا کہ کسی نے خنجر سے ہلاک کر دیا۔ اس کے انتقال کا سنہ ٹھیک طور پر معلوم نہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۰۸۰ھ سے پیشتر اس کا انتقال ہوا۔ مرزا کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

شریعت اساسے پہ اپنا ستم	حقیقت ثناسے پہ اپنا ستم
نبی کے نواسے پہ اپنا ستم	سب امت کے آسے پہ اپنا ستم

قطب شاہیوں اور عادل شاہیوں کے بعد ۱۰۹۸ھ میں پورا دکن مغلیہ سلطنت میں شامل ہو گیا۔ دکن پر مغلوں کی حکومت ۱۱۳۵ھ تک رہی۔ اس ۳۷ سال کے عرصہ میں اردو کے کئی شعرا مشہور ہوئے۔ جن کا کلام آج تک موجود ہے۔ اب گولکنڈہ اور بیجاپور کی بجائے اورنگ آباد پایۂ تخت قرار پایا اور تمام شعرا اور باکمال اشخاص کا مرکز بن گیا۔ اس دور میں بھی کئی مرثیہ نگار گذرے جن میں سے مشہور حسب ذیل ہیں۔

دور مغلیہ کے مرثیہ نگار

ولی اورنگ آبادی:۔ ان کا نام ولی محمد تھا۔ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے اور تحصیل علم کے لئے گجرات گئے اور ایک عرصہ تک وہاں اقامت اختیار کرلی۔ مولانا عبدالحق صاحب کی تحقیقات کے بموجب سنہ ۱۱۱۹ھ میں انتقال کیا۔ ولی کے دیوانوں میں ان کا کوئی مرثیہ درج نہیں ہے لیکن ایڈنبرا کی بیاض میں شامل ہیں۔ ولی کے مرثیے غزل کی طرز میں لکھے گئے ہیں ؎

غوغا ہوا ہے جہاں میں شہ کے وصال کا	سینے منے پڑا ہے بھالا اس ملال کا
محتاج ہیں جہاں کے محباں تمام مل	دیدار چاہتے ہیں مبارک جمال کا
بوجھی ولی فدا کر اس شاہ کربلا پر	اس لایق ثنا پر بولو سلام یاراں

ذوقی:۔ ان کا نام سید شاہ حسین ذوقی تھا۔ اور ان کے مرشد شاہ خاں محمد نے ان کو بحر العرفان کا خطاب عطا کیا تھا۔ اچھے شاعر تھے اور اپنی شاعری پر فخر بھی کرتے تھے۔ ان کی مثنوی وصال العاشقین بہت شہرت رکھتی ہے۔ ان کی غزلیں اور مرثیے بھی مشہور ہیں۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے ؎

تب ہزاروں درد و غم سوں شہر بانو نے کہا	مجھ کوں کس کوں سونپ کر جاتے ہوئے سرتن
تم بنا اے جانِ جاناں کیوں کر کروں میں زندگی	تم بناں کس کوں کہوں میں یہ اپس کا دکھ کٹھن

اشرف:۔ سید اشرف اس دور کے اچھے شعرا میں سے تھے۔ شیعہ مذہب کے پیرو تھے۔ عمر غربت میں بسر ہوئی۔ ایک مثنوی

جنگ نامہ حیدر یادگار چھوڑی جس کا سنہ تصنیف ۱۱۲۵ھ ہے۔ ان کے مرثیوں میں ادبیت پائی جاتی ہے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھیں فطرت نگاری کا خوب ملکہ تھا۔ مرثیہ کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

بانو کہیں اصغر نہیں اب میں جھلاؤں کس کے تئیں ۔۔۔ سوتا ہوا ہے پالنا اب میں سلاؤں کس کے تئیں
نہلا کے میں کپڑے پنا اس کو بناتی گل نمن ۔۔۔ وہ پھول سوکھ نیر بن اب میں بناؤں کس کے تئیں

ولی ویلوری:- سید محمد فیض نام اور ولی تخلص تھا۔ ویلور جو مدراس کے علاقہ میں ہے۔ اس کا وطن تھا۔ دکن میں سات گدہ کے نواب حراست خاں کا درباری تھا۔ اس کے بعد سوہوٹ کے قلعہ میں ایک عہدہ پر مامور کیا گیا۔ ارکاٹ میں انتقال ہوا۔ بہت مذہبی آدمی تھا۔ اس کی دو مثنویوں کا پتہ چلا ہے۔ مثنوی رتن پدم اور دعائے فاطمہ۔ روضتہ الشہدا بھی مثنوی کی طرز میں ہے لیکن اس کو مرثیہ کہہ سکتے ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے ؎

سو حملہ کر ٹک چودھر سوں کفار ۔۔۔ لگے کرنے بدن پر شاہ کے وار
لگے تب شہ کوں زخماں تن پیارے ۔۔۔ او چلنے کوں لگے لہو کے فوارے
دکھیے نیں ہاتھ میں ہلنے کوں قوت ۔۔۔ نہ کچھ پیرن میں رہی چلنے کوں قوت

یتیم احمد:- یتیم احمد نام اور یہی تخلص بھی تھا۔ اور برہان پور کا باشندہ تھا۔ شاید مرثیوں کے سوا کسی اور صنف میں شاعری نہیں کی۔ سات مرثیے دستیاب ہوئے ہیں جن میں سے دو حضرت امام حسین کی شان میں قصیدے ہیں۔ ان مرثیوں کی زبان ہمعصروں کے مقابلے میں صاف اور سلیس نہیں ہے۔ مرثیوں کا نمونہ ذیل میں درج ہے۔

حیف گھائل حسین تن تیرا ۔۔۔ جسم پر خوں ہے پیرہن تیرا
تو کہاں ہور کدھر ہے تن تیرا ۔۔۔ کیوں بسیرا ہوا ہے رن تیرا
نہیں ملتا بوند کسی کنے پانی
سخت طفلاں کے سر پو حیرانی

ندیم:- سید شاہ ندیم اللہ حسینی نام ندیم تخلص بیجاپور کے باشندے تھے۔ عالمگیر کی فتح کے بعد مشہور ہوئے۔ مرثیوں کے سوا اور کوئی کلام دستیاب نہیں ہوا۔ نمونہ حسب ذیل ہے۔

ہے ہے اصغر ابن حسین سوتا تیرا پالنا ۔۔۔ رو رو بانو کرتے ہیں بین سوتا تیرا پالنا
تجھ بن بانو ہے بے حال ہوئیں بکھرے سر کے بال ۔۔۔ کہتے ہے ہے میرا لال سوتا تیرا پالنا

مغلیہ دور کے مرثیے ادبیت اور سوز و گداز کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔ اور زبان کی تدریجی ترقی کے لحاظ سے اس دور کا کلام کافی صاف ہے۔ اس عہد میں چونکہ ولی ویلوری کی روضتہ الشہدا مثنوی کی شکل میں لکھی گئی تھی اس کے بعد کے اکثر مرثیہ نگاروں نے اس وقت کی مروجہ شکل کو اظہار واقعات کے لئے محدود دیکھ کر مثنوی ہی کی شکل میں لکھنا پسند کیا۔ چنانچہ

اس کے بعد وہ مجالس وغیرہ اسی قسم کی مثنویاں لکھی گئیں۔

سنہ ۱۱۲۶ھ تک مغلیہ سلطنت کو زوال آچکا تھا۔ چنانچہ اس سنہ میں آصفجاہ اول نے سلطنت آصفیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس دور میں اردو کو بڑی ترقی نصیب ہوئی اور نظم و نثر کی کئی کتابیں لکھی گئیں اور شعراء کے تذکرے مرتب کئے گئے۔ اس دور میں بھی کئی مرثیہ گو شعراء گذرے ہیں۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

دور آصفیہ کے مرثیہ نگار

رضی:۔ حافظ رضی الدین اس دور کا بڑا مرثیہ نگار ہے۔ اس کے مرثیوں کی دکن میں بڑی شہرت تھی اور ان کی تضمین کی جاتی تھی۔ اس کے مرثیوں میں ادبیت نہیں پائی جاتی۔ بلکہ وہ اپنے سوز و گداز اور مرثیہ پن کی وجہ سے مقبول عام تھے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے ؎

آل نبی کے غم سوں بےخود ہوں یوں پکارا — دل میرود ز دستم صاحب دلاں خدارا
دل میں چھپا رکھا تھا حضرت حسین کا غم — دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا
ظلم و شتِ کربلا میں دیکھ بے حد و شمار — امتی محشر تلک روتے ہیں دلبر سوں زار زار

قادر:۔ ان کا سنہ پیدائش اور وفات دونوں معلوم نہیں ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سنہ ۱۱۴۹ھ میں وہ زندہ تھا اور سنہ ۱۱۶۹ھ سے قبل فوت ہوچکا تھا۔ میر عبدالقادر نام تھا اور ایک مشہور مرثیہ گو تھے۔ ان کے مرثیوں سے ان کی علمی قابلیت کا ثبوت ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علم نجوم اور ہندسہ میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے مرثیے تسلسل سادگی اور جذبات انسان کے ترجمانی کے لحاظ سے قابل تعریف ہیں ؎

ہوا شہرت محرم میں جو غم ہے شاہ عالی کا — کہ ہے فرزند پیارا وہ دونوں عالم کے والی کا
قیامت کا نپنا قادر تنزلزل جب کرے ظاہر — مجھے تفوہی تب آخر ہے حسین سرور سے والی کا

روحی:۔ روحی کے متعلق صرف اس قدر معلوم ہے کہ حیدرآباد کے پیرزادے تھے۔ ہاشم علی برہان پوری کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں یہ انتقال کر چکے تھے۔ ان کے مرثیے غزل کی طرز پر لکھے گئے ہیں اور ادبی حیثیت سے قابل قدر ہیں۔

آج غمناک شہ ہر انجمن کے گل — بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل
یوں نہ لالے شفق کے دستے ہیں — لہو میں ڈوبے ہیں سب گلن کے گل

امامی:۔ اس کے متعلق کچھ بھی علم نہیں۔ اس کے تخلص سے اس کے شیعہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ہر مرثیہ کے ختم پر وہ اپنا یہ عقیدہ پیش کرتا ہے کہ حضرت امام حسین کا مداح ہونے کی وجہ سے اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ وہ معمولی مرثیہ گو نہیں تھا۔ اس کا اسلوب بیان نہایت دلکش ہے اور اس کے مرثیے ڈرامائی اثر رکھتے ہیں۔ بحریں نہایت دلچسپ استعمال کی ہیں۔ مرثیوں کا نمونہ حسب ذیل ہے ؎

محشر میں جب محمد شاہ زمن اٹھیں گے — سب انبیائے مرسل پر غم حزن اٹھیں گے
حیدر علی لہو سوں آلودہ تن اٹھیں گے — لیتے لہو کے بلکاں ہے ہے حسن اٹھیں گے

ہاشم علی:۔ ہاشم علی اس دور کا مشہور مرثیہ نگار ہے۔ سنہ ۱۱۶۹ھ تک اس کے بقید حیات رہنے کا پتہ ہے۔ شیعہ مذہب کا پیرو تھا اور مرزا بیجاپوری کی طرح سوائے مرثیے کے اور کسی صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ اور اس کے عقیدہ کے مطابق اس کے مرثیے سننے کے لیے آنحضرت خواب میں تشریف لایا کرتے تھے۔ اس کے مرثیوں کا مجموعہ دیوان حسینی کے نام سے موسوم ہے جس میں ردیف وار مرثیے ہیں۔ ہاشم علی کے مرثیے مکالمے کی طرز کے ہیں جس کی وجہ سے دلچسپ بھی ہیں۔ کلام کی شستگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کس قدر ترقی کر چکی تھی۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے۔

آج پر خوں کفن ترا اصغر — آج سو کھا دہن ترا اصغر

لال ہے گلبدن ترا اصغر — حیف ہو بالین ترا اصغر

جلوہ میں اٹھ کے رن کو چلا تب کہی دلہن — دامن پکڑ کے لاج سوں انجھو ال بھر نین

مت چھوڑ کر سدھارو تم اس حال میں ہمن — تم بن رہے گا ہائے پہ سونا ہوں میرا

نظر۔ سید محمد علی نام اور نظر تخلص۔ اورنگ آباد کے مشہور شاعر تھے درویش منش آدمی تھے۔ ہر آٹھویں روز مشاعرہ کرتے۔ دوپہر تک طالب علموں کو درس دیا کرتے پھر شعر و سخن کا چرچا رہتا۔ ان کا کلام حسب ذیل ہے۔

اصغر کوں شہ نے گود میں لے کر لگے جو نیر — ملعون نے جواب میں مارا ستم کا تیر

بیداد کیا کیا تری تقصیر بو صغیر — سیانا نہیں زبان نہیں دست و پا نہیں

درگاہ:۔ درگاہ قلی خاں المتخلص بہ درگاہ۔ موتمن الدولہ سالار جنگ بہادر خطاب تھا۔ خاندان قلی خاں کے فرزند تھے۔ خاندان نواب سالار جنگ کے آپ ہی مورث اعلیٰ ہیں۔ آصفجاہ اول نے آپ کی سرپرستی فرمائی جس وقت آپ کی عمر چار سال کی تھی جاگیر اور منصب عطا فرمایا۔ بیس سال کی عمر سے آپ آصفجاہ اول کے ہم رکاب رہنے لگے۔ نواب ناصر جنگ اور نواب صلابت جنگ مرحوم کے زمانے میں آپ کے مدارج میں اور ترقی ہوئی اور خطاب سے سرفراز کئے گئے۔ ایک زمانے تک صوبہ خجستہ بنیاد کے صوبہ دار رہے۔ سنہ ۱۱۹۰ھ میں خدمت سے علیحدہ ہو کر اپنی جاگیر میں گوشہ نشین ہو گئے سنہ ۱۱۹۱ھ میں آپ کا انتقال ہوا اور اورنگ آباد میں باپ کے مقبرہ میں دفن کئے گئے۔ فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ زیادہ تر مرثیے کہا کرتے تھے ؎

ہوئی صبح شہادت اب بجاؤ طبل رحلت کا — اٹھو اے اس جنازے وال پڑھو کلمہ شہادت کا

مدینہ میں لیجا جلدی کرو اب دفن میت کا — محمد سے کہو آیا جگر نور جنت کا

مائل:۔ ڈاکٹر احمد حسین المتخلص بہ مائل حیدرآباد کا مشہور شاعر تھا شمالی ہند کے مشہور شعرا جیسے سودا وغیرہ کے جواب میں ان کی غزلیں قابل ملاحظہ ہیں۔ وصفی کے شاگرد تھے نظم میں کئی کتابیں شائع کی ہیں۔ مائل کے کلام سے ان کے استاد فن ہونے کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ بلند خیالی صفائی زبان رنگینی مضمون و سلاست وغیرہ کے لحاظ سے قابل تحسین ہے سنہ ۱۳۳۳ھ میں انتقال ہوا حیدرآباد میں مدفون ہیں کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے ؎

قربان جرأت پسر ابن مرتضیٰ — زخمی کیا تھا جس نے اسی پر جھپٹ پڑا

تلوار کی زبان سے سر کر دیا جدا — حیدر نے دی صدا کہ مرے شیر مرحبا

آنے لگا جو غش تو پکارا حسین کو
بابا سنبھالو آکے اب اس نورِ عین کو

مسرور:- میر محمد علی نام مسرور تخلص۔ حیدرآباد کے رہنے والے اور یہاں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناجی کے شاگرد ہیں۔ مرثیہ گوئی میں کمال حاصل کیا ہے۔ اپنے رنگ میں فی الوقت اپنا مقابل نہیں رکھتے۔

تیغ زن آکے جو نزدیک ستم ڈھاتے ہیں — پیچ دستار کے رنگین نظر آتے ہیں
رخ سے سہرے کی کئی لڑیوں کو سرکاتے ہیں — دل سے کہتے ہیں ہم ارمان بھرے جاتے ہیں

بیاہ کا ہونا بھی پیغام اجل کا ٹھیرا
رنگ مہندی کا ہمیں خون تمنا ٹھیرا

تلوار۔
خم کا وہ حسن کہ رہ جاتا ہے کٹ کٹ کے ہلال — جوہر ایسے ہیں کہ جن سے چمن خلد نہال
گھاٹ وہ گھٹ گئی جس سے پئے رشتِ خیال — باڑھ وہ جس سے بڑھی آرزوئے اہلِ کمال

دیدۂ اہلِ نظر میں یہ جگہ پاتی ہے
حلقۂ موئے میاں کٹتے ہی بن جاتی ہے

آصفیہ دور کے مرثیوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن میں کافی ترقی ہوئی۔ اور مرثیوں کو زیادہ پر اثر بنانے کے لئے کربلا کے واقعات کو ہندوستانی رنگ میں پیش کیا گیا۔ اور حضرت علی اور امام قاسم کے واقعات کو نئے نئے طریقوں سے باندھا گیا۔ کلام کو سادہ اور عام فہم بنانے کی بھی کوشش کی گئی اور بہت سے پرانے الفاظ متروک کر دیئے گئے۔

سنہ ۱۲۲۱ھ کے بعد سے ایک اہم تغیر یہ ہوا کہ دکھنی زبان کی بجائے دہلی اور لکھنؤ کی زبان نظم و نثر میں استعمال ہونے لگی۔ استادانِ دہلی و لکھنؤ کے یہاں جمع ہو جانے کے باعث عام طور سے اسلوب بیان میں فرق ہو گیا۔ زبان میں صفائی کے ساتھ ساتھ تکلف زیادہ ہو گیا تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا جانے لگا۔ اس دور میں لوگ نثر کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئے۔ دکن میں اردو ادب کے پہلے زینے کا آغاز مثنویوں سے ہوا پھر غزل گوئی کا دور شروع ہوا۔ اس کے بعد دکھنی شعرا غزل سے پھر مثنوی و نظم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ غزل گوئی بھی متروک نہیں ہوئی لیکن یہ امر ضرور واقع ہوا کہ زبان اور اسلوب میں نمایاں اور بین فرق ہو گیا۔ اسی زمانے میں نیچرل شاعری اور قومی نظموں کی بنیاد رکھی گئی۔

آصفی دور کے ابتدائی حصہ میں زیادہ مرثیہ نگاروں کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگرچہ اردو کو ترقی ہوتی رہی اور بہت سے نامور شاعر پیدا ہوئے لیکن ایسے شعرا جنھوں نے صرف مرثیہ ہی کی صنف میں طبع آزمائی کی بہت کم ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ولی اورنگ آبادی کے اثر سے شعرا کی تمام تر توجہ غزل کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی قصیدہ گوئی کا رواج بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ دکھنی مرثیہ گوئی کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا کہ یہ فن دکن میں کافی ترقی کر چکا تھا جس وقت شمالی ہند میں اس کی طرف توجہ کی گئی۔ اور اکثر لوگوں کا یہ خیال کہ مرثیہ گوئی کا سلسلہ دکن میں بالکل ٹوٹ گیا تھا اور میر ضمیر وغیرہ کو نئے سرے سے اس کو ایجاد کرنا پڑا بالکل غلط ہے۔ یہ کہنا البتہ صحیح ہے کہ انیس و دبیر نے مرثیہ گوئی کو معراج کمال کو پہنچا دیا اور آج تک کوئی دوسرا مرثیہ نگار ان کے مقابل کا پیدا نہ ہوا۔

افسر النساء بیگم
بی اے (آخری)

نواب رفعت یار جنگ مرحوم

دکن کی ایک علم دوست اور صاحبِ ذوق ہستی

ملک و مالک کے حقیقی بہی خواہوں اور روشن خیال اربابِ فکر سے حیدرآباد کبھی محروم نہیں رہا۔ سرزمین دکن کی تاریخ وطن کے قابل فخر فرزندوں کے کارناموں سے معمور ہے کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب کہ اس ملک میں مخلص کام کرنے والے پیدا نہ ہوئے ہوں انہی مایہ ناز فرزندانِ ملک کی فہرست میں نواب رفعت یار جنگ بہادر کے خاندان کو ہمیشہ خاص اہمیت اور نیک نامی حاصل رہے گی یہ خاندان ایک ایسے وقت میں ملک و مالک کی خدمت گزاری کے لئے کمربستہ ہوا جب کہ اہل حیدرآباد پر عام طور پر جمود طاری تھا اور نواب مختار الملک اس ریاست کی فلاح و بہبود کی خاطر باکمالوں کی تلاش میں سرگرم تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حیدرآباد میں عالم و فاضل دیانت دار اور واقف کار اصحاب کا فقدان ہو گیا ہے۔ اس مایوس کن ماحول میں نواب مختار الملک کو دو گوہر نایاب دستیاب ہوئے جن کی مردم شناس نظروں نے تاڑ لیا کہ ان دو بھائیوں یعنی نواب رفعت یار جنگ اول اور نواب عماد جنگ اول میں وہ تمام صلاحیتیں اور اعلیٰ خصوصیات موجود ہیں جن کی تلاش میں انھیں ریاست سے باہر افراد کے لئے چھان بین کرنی پڑ رہی تھی۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ وہ اپنے اس انتخاب میں خاص طور پر کامیاب ہوئے۔ اس لئے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا نواب مختار الملک نے پیچیدہ سے پیچیدہ اور اہم سے اہم کام ان کے سپرد کر کے آزما لیا کہ حیدرآباد کے یہ دونوں سپوت ہر لحاظ سے ان قابل افراد پر سبقت لیجاتے ہیں جو بیرون ریاست سے بلائے گئے تھے۔

خاندان نواب رفعت یار جنگ کا خاندان دکن میں اپنے ذوقِ علم و فضل دیانت داری اور ملک و مالک کی بہی خواہی میں شروع ہی سے ممتاز تھا ان کے آباء و اجداد سلطنت بیجاپور میں اور اس کے زوال کے بعد اورنگ آباد، میسور اور حیدرآباد میں رشد و ہدایت اور اعلیٰ معیارِ اخلاق کی وجہ سے ہمیشہ عزت کی نگاہوں سے دیکھے گئے ہیں ان کے اجداد میں قاضی حمید الدین ناگوری بہت مشہور و معروف تھے۔ اسی طرح ان کا ننھیالی سلسلہ بھی ایک اور بلند پایہ بزرگ شہاب الدین سہروردی تک پہنچتا ہے اس سلسلہ کے متعدد اصحاب نے مختلف طریقوں سے سلطنت کی خدمت کی بعض دیوان اور صدر بھی رہے۔ ان میں نامور علماء اولیاء اور مشائخین عظام بھی پیدا ہوئے جنھوں نے دکن کے باشندوں میں نہایت خوبی سے دینداری کا جذبہ پیدا کیا۔ مسلم اور غیر مسلم سب ان سے ارادت رکھتے تھے شہنشاہ اورنگ زیب سے بھی اس خاندان کو توسل اور وابستگی رہی ہے حاجی عبداللطیف خان اور عبدالکریم خان جاگیرداروں کو تقرب حاصل تھا مگر زمانہ مابعد میں حالات متغیر اور طریقہ معاشرت مختلف رہے۔ بعضوں نے فوجی یا دوسری نوکریاں اختیار کریں اور بعض نے درس و تدریس اور وعظ و تبلیغ کا طریقہ جاری رکھا۔ اس خاندان کے ایک فرد حضرت شاہ عالم قادری کے نواسے مولوی غلام محمد کو میسور کے فرمانروا حیدر علی اور ٹیپو سلطان بڑی وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اور نواب نظام علی خان بہادر نے بھی ان کو حیدرآباد طلب فرما کر خدمت بخشی گری خطاب، جاگیر، دیگر لوازماتِ امیرانہ سے سرفراز فرمایا۔ وہ بالآخر گلبرگہ میں جمعیت رسالہ کے ساتھ مقیم رہے اور وہیں ۱۲۲۶ھ میں انتقال کیا۔

اس خاندان کے ایک بزرگ حافظ محمد عبدالعزیز مولوی مدنی عالم اکمل اور فاضل اجل تھے جن کی ذات بابرکات اور فیضان صحبت سے بکثرت طالبان علوم مستفید ہوتے رہے۔ محمد مدنی جاگیردار خلف محمد عبداللطیف خان نے کمال عقیدت مندی سے اپنی دختر کو آپ کے عقد ازدواج میں دیا اس سلسلہ میں عبدالحکیم پیدا ہوئے اور ان کے فرزند مولوی شیخ محمد عبدالرحمن حافظ، قاری اور جید عالم تھے۔ تین مرتبہ حج اور آخر دفعہ اکثر مقامات مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے تمام عمر تعلیم و درس اور وعظ و نصیحت میں بسر کی شاگردوں کا دائرہ بہت وسیع تھا اسی کو آپ بہترین مشغلہ زندگی سمجھتے تھے۔ نواب عماد الملک بہادر نے کئی مرتبہ [illegible]

بلحاظ قدردانی اونی عہدہ قبول کرنے سے انکار فرمایا آپ نے ہر وقت توکل اور استغنیٰ کی زندگی اور آزادانہ درس و تدریس کو ملازمت کی پابندیوں پر ترجیح دی آپ کی اس
آزادروی اور بیباکی سے نواب صاحب بہت متاثر ہوئے انگریز عہدہ داران فوج بھی اکثر آپ کی پابندی وضع و خودداری کی تعریف کیا کرتے تھے ۔
ماہ ذیقعدہ ۱۲۹۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا ۔

آپ کے دو فرزند شیخ احمد حسین رفعت یار جنگ اول اور شیخ محمد صدیق عماد جنگ اول اور ایک صاحبزادی زوجہ حافظ محمد عبد اللہ رکن عدالت العالیہ
تھیں جن کے دو فرزند منصور نواز جنگ حاکم الدولہ اور سعد جنگ تھے ۔ نواب رفعت یار جنگ ثانی کے تذکرہ سے قبل ضروری ہے کہ ان کے والد مولوی
شیخ احمد حسین رفعت یار جنگ اول کے مختصر سے حالات بھی پیش کر دئے جائیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آپ کی تربیت کس ماحول میں ہوئی تھی ۔

مولوی شیخ احمد حسین خان بہادر نواب رفعت یار جنگ اول ۱۲۵۱ھ میں تولد ہوئے اپنے والد ماجد مولوی حافظ حاجی محمد عبد الرحمن صاحب
اور عم بزرگوار مولوی محمد حسین صاحب نقشبندی متخلص ساماں کے پاس ابتدائی تعلیم ہوئی بعدازاں دارالعلوم بلدہ میں شریک ہوئے اور امتیازی طور
لیتے ہوئے چند سال میں فارغ التحصیل ہو گئے مشہور علماء وقت مثلاً مولوی محمد زمان خان شہید وغیرہ کی صحبت سے بھی مستفید ہوئے نہایت ذہین اور ذکی الطبع
تھے دستار فضیلت باندھے زیادہ زمانہ نہیں ہوا تھا کہ مولانا محمد عبد الحلیم فرنگی محلی سے ایک مسئلہ پر آپ سے اختلاف ہوا نوجوان مولوی کی یہ جرأت
مولانا کو شاق گذری معاملہ وزیر اعظم تک پہنچا تو اس مدبر نے چینی خانہ میں علماء وقت کی ایک مجلس مقرر کی وہاں سب کے روبرو مولانا عبد الحلیم اور مولوی
شیخ احمد حسین کا مباحثہ ہوا علماء حاضرین نے بالاتفاق مولوی آخر الذکر کے سر کامیابی کا سہرا باندھا جس سے نواب مختار الملک نہایت خوش ہوئے ۔ آپ کی
خداداد طبیعت و ذہانت کی وجہ سے طالب علمی کے زمانے سے ہی نواب صاحب کی نظر شفقت و عنایت رہی اس معرکہ پر بذریعہ عنایت نامہ اظہار مسرت
کیا اور حوصلہ افزائی فرمائی ۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ نوجوان مولوی درست دماغ کا شخص ہے بہت بڑا آدمی ہونے والا ہے مجھ سے جہاں تک ہو سکے اس کی
مددگاروں گا اسی زمانے میں درس و تدریس میں مشغول ہوئے آپ کی عمدہ طرز تعلیم حسن اخلاق روشن دماغی کے ہر طرف چرچے تھے حتیٰ کہ علاوہ انگریزی
کے عہدہ دار نواب مختار الملک کے ذریعہ سے آپ سے استفادہ کی تمنا کرتے مگر بوجہ عدیم الفرصتی بعض وقت آپ معذرت کرتے ۔ سب کو آپ سے
تلمذ کا شوق تھا ۔ دلچسپ پیرایہ میں درس دیتے تھے طالب علم کو بار ہوتا نہ اس کو مدت دراز کتابوں میں صرف کرنی پڑتی مکرم الدولہ آپ کے خاص شاگرد
مشہور ہیں کہ بے شمار لوگ نہ صرف آپ کی تعلیم سے فیض یاب ہوئے بلکہ اکثر سرکاری ملازمت میں بھی لگا دئے گئے اور ملک کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں
چند اشخاص اس دستگیری کی یادگار نہ پائے جاتے اور منکسر گزار نہ ہوتے ۔ عربی فارسی کی تحریر تقریر و لہجہ میں آپ اہل زبان کے ہم پلہ تھے اور ملکی زبانوں
سے بھی واقف تھے ۔ آپ صرف عالم ہی نہ تھے بلکہ سواری ، شکار ، نشانہ اندازی اور پیراکی میں مشتاق ، کسرت ، کشتی ، بنوٹ وغیرہ سے واقف
ہتیار اور ان کے استعمال میں ماہر تھے آپ کی ان قابلیتوں کے علاوہ نیک بختی کے لگاؤ سے آپ کو اپنے ہم عصروں میں امتیاز و تفوق حاصل تھا ۔ اپنے
عم بزرگوار حضرت ساماں کی صحبت کی وجہ سے اوائل میں آپ کو شاعری کا بھی شوق رہا ۔ کوکب تخلص کرتے تھے اور چنانچہ ایک مختصر دیوان بھی مرتب
ہو چکا تھا مگر عام تعلیمی دلچسپی اور اصلاح تمدن و سیاست کے خیالات نے اس مذاق پر تفوق حاصل کیا ۔ پچھلے دور میں حیدرآباد کی تعلیمی ترقی میں جس قدر
دلچسپی سے کوشش کی اور حصہ لیا شاید ہی یہ عزت اس زمانے میں کسی اور کو نصیب ہوئی ہو ۔ بقول سید حسین بلگرامی (نواب عماد الملک مرحوم) حیدرآباد
میں آپ پہلے شخص تھے جن کو یہاں کی تعلیم کی ناقص حالت کا احساس اور اہل ملک کی بے خبری و بیکسی کا درد پیدا ہوا اور اس خرابی کے دور کرنے کی

کوشش شروع کی"۔

ابتداءً دفتر پیشی میں مدار المہام کے تمام قلمی تجاویز کے (جو مختلف محکموں کی گذارشات پر صادر ہوتیں) دیکھنے سمجھنے اور بہت جلد کام سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ ماہ صفر ۱۲۸۰ھ میں سرکاری ملازمت میں شریک ہوئے ۱۲۸۱ھ میں محکمہ مال میں کام کیا جو اس زمانے میں ریاست کا اعلیٰ اور اہم ترین محکمہ تسلیم کیا جاتا تھا اور سب اس کے ماتحت تھے۔ خاص اور اہم کاغذات سربمہر لفافہ جات جو نواب کرم الدولہ بہادر کی دستخط کے لئے پیش کرنے ہوتے سب آپ کی تحویل و حفاظت میں رہتے۔ مزید براں نواب صاحب کے پاس رہ کر متفرق کام بھی پیش کیا جاتا۔ نواب کرم الدولہ مجلس مال اور مدار المہام کے درمیان بحیثیت نائب مقرر ہوئے تو تقریباً چار سال تک (یعنی ۱۲۹۲ھ تا ۱۲۹۵ھ) تمام کاغذات آپ ہی کے توسط سے پیش ہوتے تھے اور ان کے ساتھ رہ کر مجلس سے آئے ہوئے کاغذات آپ ان کو بتا سمجھا کر تجویز کراتے۔ جب نواب کرم الدولہ صدر المہام مال ہوئے اس وقت بھی آپ مددگاری کا کام انجام دیتے رہے۔ اس طرح آپ کو مختلف صیغوں کے کام کی قابل لحاظ واقفیت حاصل اور کافی تجربہ ہو گیا تھا۔ ۱۲۹۲ھ میں اطراف بلدہ کے حالات کی اصلاح کی غرض سے تعلقداری کی خدمت دو سال نہایت محنت و مستعدی سے انجام دی۔ اس کارگزاری پر خوشنودی ظاہر فرماتے ہوئے مدار المہام بہادر نے دوسرے عہدہ داروں کو تقلید کی ہدایت فرمائی۔

۱۸۷۵ء کے مشہور قحط میں ضلع رائچور پر (جہاں شدید ترین قحط کا انتظام درپیش تھا) تبدیل ہو کر فوراً جائزہ لینا پڑا۔ اس نازک موقع پر آپ نے اس عمدگی سے انتظام کیا کہ مصیبت زدوں کے ساتھ پوری ہمدردی کی گئی۔ عمارتیں اور پل اور سڑک وغیرہ تیار کرائے گئے۔ آپ کا انتظام عموماً بنظر تحسین دیکھا گیا اور برٹش گورنمنٹ نے بھی تعریف کی۔ کچھ عرصہ بعد نواب مختار الملک نے آپ کو بلدے میں بلالیا اور یہاں بطور اسپیشل افسر بعض اہم اور پیچیدہ کام آپ کے تفویض ہوئے۔ زمانہ سابق میں سرکار کے مقابل بڑے بڑے ساہوکاروں کے دعوے اور مطالبے تھے۔ بڑے جاگیرداروں اور عربوں سے تصفیے پیش ہوتے تھے۔ ایسے مقدمات کی تحقیقات اور ان کے تصفیہ و انتظام کے متعلق مشورہ دینے کا کام آپ کے سپرد کیا جاتا تھا اور آپ کی صائب رائے کی مدار المہام بہت قدر فرماتے تھے۔ ان کو آپ پر پورا اعتماد تھا اور دیگر عہدہ داروں وغیرہ کی نظروں میں آپ کی بڑی وقعت تھی۔ عرصہ دراز تک آپ معتمد و رکن "مجلس قرضہ بابت داد و یادگرنت سرکار عالی" بھی رہے۔ ۱۸۹۱ء میں جب کہ نواب کرم الدولہ لندن جا رہے تھے تو نواب مختار الملک نے یہ ارشاد فرماتے ہوئے کہ "اس وقت میرا جانا تو محال ہے کسی اور پر مجھے بھروسہ نہیں۔ آپ کا ساتھ جانا گویا میرا ساتھ جانا ہے" سینہ سے لگا کر نہایت اعتماد و قدر دانی آپ کو ان کے ساتھ ولایت روانہ کیا۔ ہمراہی میں آپ نے ہر جگہ پر انتظام احتیاط و عمدگی سے کیا۔ اس سلسلے میں لندن، فرانس، اٹلی وغیرہ مختلف ممالک کی سیاحت کا موقع ملا۔ آپ کی کارگزاری سے نہ صرف نواب کرم الدولہ مطمئن ہوئے بلکہ نواب مختار الملک بھی خوش ہوئے۔ اس سفر میں آپ نے ہر مقام کی گورنمنٹ اور وہاں کے حالات و انتظامات کا بغور معائنہ و مطالعہ کیا اور تعلیم کے متعلق مفید معلومات حاصل کئے۔ اگرچہ سوائے انگریزی کے یورپ کی کسی زبان سے واقف نہ تھے لیکن لندن میں آپ نے فرنچ زبان میں بول چال کی حد تک خود استعداد حاصل کرلی۔ ہر جگہ کے معززین پر اپنے اخلاق، وضعداری اور جامع قابلیت سے عمدہ اثر قائم کیا۔

لندن سے واپس آنے کے بعد کچھ عرصہ کے لئے رکن مجلس دریافت [illegible] سب و مستعدی سے [illegible] کا تصفیہ کیا۔ بعد صدر مجلس ہونے علاوہ انفصالی کام کے اصلاح کی جانب بھی توجہ کی اس کے بعد تحقیقات مطالبات اراضی و نقدی [illegible] تصفیہ [illegible]

وروسیع اختیارات کے ساتھ کمشنری انعامات کے اعلیٰ عہدہ پر مقرر ہوئے۔ یہاں غیر معمولی توجہ اور محنت سے سررشتہ کی تنظیم ہر قسم کی اصلاح و باقاعدگی پیدا کرنے اور کثرت فیصلہ جات سے بہترین ریکارڈ قائم کیا۔ بہ قول شمس العلماء عزیز جنگ مرحوم جنھوں نے قوانین مال و عملیات پر مفید کتب تالیف کی ہیں "اس عہدہ کی نازک ذمہ داریوں کو جس نیک نامی و استقلال کے ساتھ انجام دیا حیدرآباد کی تاریخ میں آپ کی جوہر طبیعت کی ایک اعلیٰ یادگار ہے" چندے آپ کمشنر کروڑگیری بھی رہے۔ بعد ازاں صوبہ داری اورنگ آباد کے لئے آپ کا انتخاب ہوا مگر وہاں جانے کی نوبت نہیں آئی۔ اسی اثنا میں صوبہ داری سمت جنوبی پر متمکن ہوئے اصلاحات کی جانب توجہ بدستور مائل رہی۔ آپ کا زمانہ خاص شان و وقار کا گزرا نواب سر وقار الامراء نے آپ ہی کی عہد صوبہ داری میں اس صوبہ کا دورہ فرمایا۔ تمام حالات و انتظامات سے خوش ہوئے اور ہر موقعہ پر آپ کے ساتھ تعظیم و توقیر کا برتاؤ کیا بالآخر ورنگل سمت مشرقی پر آپ کا تبادلہ ہوا یہاں سرکار اور رعایا ہر دو کی بہبودی کے کام کئے۔ رعایا کی تکلیف رفع کرنے ان کو زیادہ نفع بخش کاموں میں مصروف کرنے کی ہر ممکنہ طریقہ سے کوشش کرتے رہے زمینات کی بہترین نگہداشت اور مختلف مفید اجناس او نیشکر کی کاشت، ریشم اور لاک وغیرہ پیدا کر کے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دلائی گئی۔ بوقت دورہ دفعتاً اتفاقاً کو نمائندگی کے ان کے عوض سال بھر کی زراعتی و صنوعاتی ترقیات کی نمائش منعقد کرنے کی ہدایت کرتے تھے شمس العلماء عزیز جنگ لکھتے ہیں کہ " رعایائے مالگزاری آپ کی پرستش کرتے تھے آپ کا ہر ایک کام اصول کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہوتا۔ آپ کی دلسوزی او حقیقی ہمدردی کا اندازہ دل ہی کر سکتا ہے" آپ کے رفاہ عام کے کاموں میں حسب ذیل اداروں کا قیام ہمیشہ آپ کے نام کو زندہ رکھے گا۔ (۱) مدرسہ اسلامیہ نظامیہ (۲) مدرسہ اعزہ (۳) سول سروس کلاس۔ آپ نے یورپ کی تعلیم کے لئے طلباء کو تیار کرنے اور وظیفہ دیکر روانہ کرنے کی بھی تحریک کی ابتدا دو۔ زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے پر زور دیا اور اس بارے میں ایک زبردست تحریک کی تھی جو آج جامعہ عثمانیہ کی شکل میں تکمیل کو پہنچی آپ نے ابتدا دو ہڈل کے مدارس اور اضلاع میں سہ ماہی مدارس رعایا کی تعلیم و تربیت کے لئے قائم کرائے۔ آپ نے روز جمعہ بعد ظہر ۹ صفر ۱۳۱۵ھ کو انتقال کیا۔ شمس العلماء عزیز جنگ ولاؔ نے قطعہ تاریخ وفات لکھا تھا۔

جب چلے ملک بقا کو دولت ایماں کے ساتھ   قصر جنت میں ہوئے ممتاز رفعت یار جنگ

عرش کی فکر ولاؔ نے سال رحلت فی البدیہہ   چل دئے دنیا سے باعزاز رفعت یار جنگ

نواب رفعت یار جنگ اول کے فرزند اکبر صاحب تذکرہ مولوی شیخ ضیاء الحق فصیح الدین احمد نواب رفعت یار جنگ ثانی تھے۔ آپ کے حالات ایک علیحدہ کتاب کا موضوع بن سکتے ہیں لیکن اس موقع پر اختصار کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں۔ جو زیادہ تر مرحوم کے خود نوشتہ سوانح کا اقتباس ہیں۔

ابتدائی زندگی

بتاریخ ۲۵ ذالحجہ ۱۲۸۵ھ م ۸ اپریل ۱۸۶۹ء م ۲۹ فروردی بہشت ۱۲۷۸ف ضلع تولد ہوئے اسی زمانہ سے ریاست کے منصبداروں میں شمار ہوا۔ تسمیہ خوانی تک منشی حیدر شریف اور منشی رحیم الدین آتالیق رہے اور حسب ہدایت والد ماجد زبانی تعلیم و تربیت ہوتی رہی۔ چار سال کی عمر سے تعلیم آغاز ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اردو فارسی عربی دینیات مکان پر مولوی محمد واصل و مولوی محمد کامل وغیرہ سے اور کچھ انگریزی ریونڈ فرینڈس سے پڑھنے کے بعد مدرسہ اعزہ کے قیام پر سالار جنگ کی بارہ دری میں مسٹر رامس وغیرہ کے زیر تعلیم رہے فارسی تقریر و تحریر میں کافی مہارت ہوئی۔ بعد ازاں سینٹ جارج گرامر اسکول میں مسٹر ہیوم کی نگرانی میں انگریزی اور لیٹن زبان کی تعلیم جاری رہی۔ یہاں سے ۱۸۸۱ء میں مدرسۃ العلوم علی گڈھ میں بانی مدرسہ آنریبل سر سید احمد خان کی خاص توجہ اور مولوی مشتاق حسین کی ذاتی نگرانی میں

بہ زمانۂ صدارت مسٹر سیڈنز و مسٹر نسبیٹ بابو بخشا و لعل اور ابو الحسن اور مسٹر اشوتوش بینا چارجی اساتذہ سے انگریزی ریاضی تاریخ جغرافیہ مولوی محمد عباس حسین سے دینیات اور مولوی محمد عبد الجبار خان صاحب سے عربی ادب کی تعلیم پائی۔ علی گڑھ سے حیدرآباد واپس آنے کے بعد دوبارہ مدرسہ اعزہ میں مسٹر جارج شیٹ بی اے اور مولوی حافظ محمد ابراہیم کے زیر نگرانی انگریزی و عربی کی تعلیم ہوتی رہی۔

شیخ عبد اللہ عرب مکی صاحب عربی بول چال سکھانے مقرر تھے بعدہٗ مولوی عبد الجبار خان صاحب صدر مدرس علوم مشرقیہ سے عربی علم ادب وغیرہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ اصلاح خیالات و ترقی کے لئے "مجلس اتفاق" قایم کی ایک کتب خانہ اور کرکٹ کلب کی بھی بنا ڈالی اور بحیثیت معتمد کامیابی کے ساتھ چلایا۔ ینگ مینز امپروومنٹ سوسائٹی رزیڈنسی کے ممبر رہے اعلیٰحضرت میر محبوب علی خان کے با اختیار حکومت کی زیر سایہ سوسائٹی کے جانب سے تہنیت پیش کرنے جو وفد حاضر ہوا تھا اس میں شریک تھے۔

۱۸۸۳ء میں امتحان میٹرک کی تکمیل کے بعد وزیر اعظم سالار جنگ کے تحت مدرسہ عالیہ نظام کالج کی اس خاص جماعت میں شریک رہے جو انگلستان جانے کے لئے زیر نگرانی مسٹر ہاڈسن ایم اے او مسٹر ینین تعلیم پا رہی تھی یہاں مولوی حمید علی صاحب سے قرآن مجید تفسیر وغیرہ میں تلمذ رہا۔

اگرچہ اس کے قبل مغلائی طریقہ کی سواری او اس کے متعلقہ جنگی کرتب کی مشق کی تھی اور کسرت کشتی بنوٹ وغیرہ بھی سیکھا تھا لیکن اس زمانہ میں نظام مونٹیڈ والنٹیر کا رسالہ قایم ہونے پر اس میں شریک رہ کر باقاعدہ فوجی تعلیم پائی تلوار بندوق وغیرہ کی بطور خاص شوق کی سواری آپ کا زیادہ شوق اور کرکٹ وہاکی کی عادت رہی۔

یورپ کا سفر ۱۸۸۵ء کے آخر میں یورپ جا کر سرکار عالی کے ایجنٹ مسٹر جوزف اک کے مشورہ سے لندن کے یونیورسٹی کالج میں کچھ دنوں شریک رہے ڈاکٹر مارلی سے انگریزی او ڈاکٹر ہل سے ریاضی پروفیسر لالا ان سے فرنچ زبان او حبیب ایمانی سے عربی میں استعداد حاصل کی مسٹر گریفن خاص توجہ سے تاریخ پڑھاتے اور بہت مہربانی سے پیش آتے تھے۔

والد ماجد کی ہدایت پر کیمبرج یونیورسٹی کے خصوصیات کی وجہ پہلے سینٹ پیٹرز کالج میں شریک ہوئے وہاں اساتذہ کی عنایت رہی کالج بورڈ میں بھی شریک کئے گئے اس زمانہ میں طلباء ہند کی انجمن قایم ہوئی او وقتاً فوقتاً مجالس ہوتے رہے۔

بعد ازاں ٹرینٹی ہال کالج میں منتقل ہو کر سلسلہ تعلیم جاری رکھا یہاں شبو و معروف مقنن ہنری مین ماسٹر تھے یونڈ ہاپکنز ٹیوٹر دونوں مہربان تھے خصوصاً اول الذکر اخلاص سے پیش آتے ہر تقریب میں شریک رہا کرتے اس زمانہ میں انگریزی میگزین بک شاپ ادب تاریخ وغیرہ میں تلمذ رہا ڈاکٹر کیتھو فاکیرٹ رہا یہ حضرات اپنی عنایت سے استعداد وغیرہ کی تعریف کرتے او شفقت و وقعت کا برتاؤ رکھتے تھے یونیورسٹی کی تعلیم کا سلسلہ ختم کر کے کمر لندن پہنچ کر قانون کی طرف توجہ کی ہنری کا تعلق مڈل ٹمپل سے رہا مشہور معلم قانون ٹرشیر وڈ کے تعلیم امتحانات متعلقہ سے فارغ ہو کر مسٹر آمنڈ ہاؤنڈ سکالر بیرسٹر کے چیمبرز میں معلومات قانونی میں اضافہ کر کے تصدیق حاصل کی۔

حین قیام لندن پڈنگٹن میں پارلیمنٹ کے نمونہ پر ایک پارلیمنٹ قایم ہوئی تھی جس کی غایت یہ تھی کہ لوگوں کو پارلیمنٹری طریقہ سے واقف کرا کے آئندہ کے لئے ان کو اس خدمت کا اہل بنایا جائے۔ صاحب تذکرہ کو بھی ایک کونسلر کے ممبر کی حیثیت سے شرکت او کچھ عرصہ تک اس نقلی پارلیمنٹ کی قایمی لندن میں آنحضرت صلعم کے میلاد مبارک کی تقریب سال بہ سال نہایت سلیقگی سے منانے او مختلف اقوام کے لوگوں کو مدعو کرنے کا طریقہ جاری کیا

کوئن وکٹوریہ کے تقاریب جوبلی میں شرکت پرنس آف ویلز (بعد ازاں ایڈورڈ ہفتم) سے بعض مواقع پر ملاقات اور نیز بطور سرکاری سنٹ جیمز پیالیس
کے دربار میں شرکت کی عزت حاصل رہی۔

سنہ ۱۸۹۱ء میں انٹرنیشنل کانگرس آف اورینٹلسٹس کی شرکت بطور معتمد شعبہ عربی و اسلام کی گئی اور منجانب مجلس انتظامی بنظر کارگزاری صداقت خوشنودی مرحمت ہوئی
اس موقع پر اس کانگرس میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ آئندہ زبان عربی کی تعلیم کی طرف خاص توجہ ہونی چاہیئے کیونکہ یہ نہ صرف ایک مکمل اور زندہ زبان ہے بلکہ
اس سے عبرانی وغیرہ کے سمجھنے اور انجیل وغیرہ کتب مقدس کے صحیح مفہوم کو پہنچنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ان ایام میں مختلف ملکوں کے مشہور و معروف علماء
فضلاء وغیرہ سے ملاقات ہوئی اور مختلف اقوام کے افراد کی طبیعتوں سے واقف ہونے اور ان کی خصوصیات کے امتیاز کا موقع ملا۔ زمانہ مابعد میں
اس کانگریس کی طرف سے بطور ڈیلیگیٹ بحیثیت مہمان شاہ پرتگال دار السلطنت لزبن جانے کا تہیہ ہوا تھا مگر دفعتاً وہاں ہیضہ پھوٹ پڑنے سے جانا نہ ہوسکا
اور دیرینہ آرزو سفر ہسپانیہ و پرتگال وغیرہ کی پوری نہ ہو سکی۔ البتہ مالٹا اور جبرالٹر دیکھ لیا گیا۔ بعض اوقات ہندوستانیوں اور بعض مشہور انگریزوں
میں صلح کرانے کی خدمت انجام دینی پڑی۔ ڈاکٹر لائٹنر بانی یونیورسٹی پنجاب جو اس زمانہ میں ووکنگ اور لندن میں رہتے تھے۔ عزت کا برتاؤ کرتے تھے
اور ان کے عمدہ خیالات ان کی ایک تحریر سے جو مسٹر پلوڈن رزیڈنٹ حیدرآباد کو لکھی گئی تھی ظاہر ہوتے ہیں۔ انڈیا آفس کے عہدہ داروں نیز اکثر اعلیٰ مرتبہ
کے اشخاص سے تعارف رہا جس میں سے بعض ہندوستان کے گورنر اور وائسرائے ہوئے۔ نارتھ بروک کلب اور انٹرنیشنل کلب سے ممبری کا تعلق رہا۔

لندن کے صرف بالائی نمائشی مہذب حالات سے نہیں بلکہ اندرونی مفصل حالات سے بھی واقفیت اور صحیح رائے قائم کرنے کا موقع ملا اور
نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ہر چمکنے والی شے سونا نہیں ہے۔ مصنوعی تہذیب اور نمائشی شائستگی سے اصلی راحت، الفت، تسکین قلب و روح حاصل نہیں ہوتی۔ تمام
ظاہری اسباب تہذیب حالت مطمئنہ پیدا کرنے سے قاصر و ناکام بلکہ حارج رہے۔ یہ رائے دن بدن مضبوط ہوتی گئی کہ جب تک اسلام کی سچی تعلیم
نہ پھیلے باوصف اس قدر ترقی کے اصلی اصلاح نہ ہوگی۔ آئندہ اینگلو سیکسن قوم اسلام قبول کرکے اپنے آزادی کا سلسلہ دنیا میں قائم رکھ سکے گی۔ اور
وہی لوگ جو صدیوں سے اسلام کے مخالف رہے اس کو بدنام اور اس کے پیروؤں کو برباد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ آئندہ اس کے حلقہ بگوش
ہوکر اس کی ترقی اور زیادہ شہرت کے باعث ہو رہیں گے گو یہ بات ابھی ان کے خیال میں نہیں آتی لیکن وہ وقت جلد اور ضرور آنے والا ہے۔
مسٹر عبداللہ کوئلیم کے مساعی بیکار نہ جائیں گے ان کے تقاریر اور تحریرات سے نہ صرف انگریز بلکہ انگریزی داں لوگوں میں جستجو کی تحریک
پیدا ہو چکی ہے۔ اور جوں جوں اصلی حالات سے وقوف ہوگا دائرۂ اسلام بھی وسیع ہوتا جائے گا۔ نیک نیت مسلمان جس گھر میں رہیں جس سوسائٹی میں
شریک ہوں اپنے پاک اخلاق عمدہ خیالات اور صحیح مذہبی معلومات سے وہاں کے لوگوں پر گہرا اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے۔ عام وعظ کے علاوہ
خانگی محفلوں میں اصلاح خیالات کی سعی ہونی چاہیئے جو ضرور نتیجہ بخش ثابت ہوگی۔ مسجد ووکنگ تیار ہوئی اور ہنوز کچھ کام باقی ہی تھا کہ عیدین کے موقع پر
ہندوستانی طلباء کو آمادہ کرکے وہاں جاکر خطبہ پڑھنے نماز ادا کرنے کا طریقہ ڈالا گیا۔ اس روز وہاں اسلامی طریقہ سے بکرے ذبح کئے جاتے اور
پخت و پز کا اہتمام مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہتا اور بعد سب ایک جگہ بیٹھ کر کھاتے دوسرے دوست احباب بھی اس تقریب میں شریک کئے جاتے۔
اس طرح خوشی سے دن بسر کرکے شام کو لندن واپس ہو جاتے۔ چنانچہ سنہ ۹۱ء کے ایک عید کے موقع کی تصویر پیش نظر ہے۔ ہمیشہ ہر ایک سے
اخلاق و تہذیب اور نرمی سے پیش آنے کی عادت رہی۔ اپنے اعتقادات کا دوسرے پر دباؤ ڈالنے سے احتراز اور اس نازک مسئلہ میں احتیاط رہی

مگر جب کوئی بطور خود پوچھتا تو حتی الامکان اس کی تشفی کیجاتی۔ اس اصول پر کاربند رہنے سے لوگ زیادہ مائل و معتقد ہوتے رہے۔

مختلف مذاہب کی چھان بین اور تاریخی حالات کی مطابقت سے اصل اور نقل کا فرق معلوم ہو چکا تھا اور کثرت مطالعہ سے معلومات میں وسعت اسلام کی سیدھی سادی تعلیم کی زیادہ وقعت اور دوسرے اعتقاد رکھنے والوں سے ایک نوع کی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔

مسٹر عبداللہ کوئیلم اور ان کے خاندان سے خلوص و محبت کے روابط رہے۔ حتی الامکان ان کی کوششوں میں شرکت اور ان کو صلاح و مشورہ سے مدد دیجاتی رہی۔ ان کی تبلیغ کا اثر زیادہ دور تک پھیلانے کی غرض سے ذاتی مصارف سے ایسے طریقے اختیار کئے گئے کہ بہت جلد نہ صرف انگلستان بلکہ باہر دور دراز مقامات کے لوگ مسٹر کوئیلم کے کام کی طرف متوجہ ہونے لگے لندن میں جب کسی انگریز کو اسلام کے متعلق واقفیت حاصل کرنا ہوتی تو مسٹر کوئیلم اس کام کو نواب صاحب کے حوالے کر دیتے۔ اس شخص سے مل کر اس کے سوالات کا خاطر خواہ جواب اور اس کے شکوک کو رفع کیا جاتا۔

آنحضرت رسول عربی صلعم کے سچے حالات اور حقیقی تعلیم سے واقف کرادیا جاتا جس کا اثر اچھا ہوتا۔ ان اشخاص میں زیادہ قابل ذکر مسٹر کلف ہیں جن کا مکان لندن سے کچھ فاصلہ پر براک لی میں تھا وہ مشاق سول مکینکل انجینیر تھے۔ غور و فکر کے عادی تھے۔ کچھ عرصہ سے عیسائی مذہب سے بدظن چرچ کی تعلیم اور پادریوں کے عمل سے متنفر ہو رہے تھے دیگر مذاہب کا مطالعہ کر کے مذہب اسلام کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس معاملہ میں مسٹر کوئیلم سے استمداد کی مگر دوری اور عدیم الفرصت ہونے کی وجہ سے انھوں نے صاحب موصوف کو ہدایت کی کہ لندن میں نواب صاحب سے ملیں اور اس کی اطلاع ان کو بھی دی گئی جس پر انھوں نے مسٹر کلف کی بستی میں جا کر ان سے ملاقات کی۔

اس طرح ایک دوسرے کے پاس آمد و رفت ہوتی رہی گفتگو و مطالعہ کا سلسلہ جاری رہا جب وہ ہر طرح مطمئن ہو گئے تو اسلام قبول کیا۔ ان کا نام ان کی طبعی خداترسی مذہبی جوش اور ہمدردی کے لحاظ کرتے ہوئے عبیداللہ رکھا گیا۔ جو بعد سید لیور پول کے [illegible] میں درج ہوا۔ اس کے بعد ان کے قلمی مضامین اور نظمیں انگریزی اور دیگر اخبارات میں شایع ہوتے رہے۔ ایک طویل قصہ جس میں انھوں نے تبدیل مذہب کا سبب اور مذاہب عیسوی و اسلامی کی تعلیم و اختلاف اور آخر الذکر کے وجوہ ترجیح بیان کئے تھے مدراس کے اخبار محمڈن میں چھپا اور موصوف کے مذہبی جوش و حمیت کی شہرت رہی۔

مسٹر کلف نہایت ذہین اور دماغ والے شخص تھے جنھوں نے متعدد او مختلف کلیں ایجاد کی تھیں اور میکزم گن کا نقشہ ابتداً ان ہی کے ہاتھ کا بنایا ہوا تھا۔

نواب صاحب مرحوم سے ان کو خاص اعتقاد و محبت رہی اور اس کے اظہار میں بطور شکریہ انھوں نے ایک کوئک فائرنگ گن جو آسانی سے ایک منٹ میں متعدد بار چلائی جاسکتی تھی کا نقشہ پیش کیا جس کو شکریہ کے ساتھ واپس کر کے صلاح دی گئی کہ ہر ایک کل پرزہ اور اس کو صحیح مقام پر جانے کی صراحت کے ساتھ مکمل نقشہ مع پوری کیفیت کے تیار کر دیں تو سلطان المعظم غازی عبدالحمید خان ثانی کی بارگاہ میں پہنچایا جائیگا صاحب موصوف نے اس کی تکمیل کی جانب توجہ کی تھی مگر افسوس ہے کہ دفعتاً حملہ قلب سے وہ عمیل ہو گئے اور نواب صاحب کو یاد کیا جس کی اطلاع ذریعہ تار لندن میں دی گئی۔ وہ اتوار کا دن تھا۔ ریل کم چلتی ہے۔ کسی قدر دیر میں ریل ملی مقام براک لی پہنچنے پر حالت نازک پائی گئی

جب ان سے پکار کر کہا گیا کہ شاہ احمد آئے ہیں فوراً ان کی آنکھیں کھلیں اور دیکھ کر احمد کہا چہرہ پر مسرت ظاہر ہوئی اطمینان کی کیفیت طاری ہوئی اور اللہ کے نام کے ساتھ روح پرواز کر گئی۔

ان کے اقربا عیسائی تھے۔ ان کے بھائی جو دوسرے شہر میں تھے فوراً چلے آئے ان کا رجحان عیسوی طریقہ پر ان کے آخری کام کرنے کا پایا گیا مگر خدا کے فضل و کرم سے نواب صاحب کا اثر غالب رہا۔ بیوہ اور جوان بیٹے نے مرحوم کی تجہیز و تکفین اسلامی طریقہ پر کرنے میں مزاحمت نہیں کی بعض ہندوستانیوں کو جو لندن میں اس وقت موجود تھے فراہم کیا گیا اور ترکی سفارت کے امام کو طلب کر کے نماز جنازہ ادا کر کے کافن ریل سے لیورپول بھیجا گیا۔ جہاں مسٹر عبداللہ کوئیلیم اور دیگر مسلمانوں نے اس کو لیجا کر اس حصہ قبرستان میں جو مسلمانوں کے لئے رکھا گیا تھا۔ دفن کر دیا اور عبداللہ کوئیلیم نے موقعہ کے لحاظ سے کیونکہ وہاں عیسائی لوگ بھی جمع ہوئے تھے مسلمانوں کے اعتقاد اور اس رسم کے متعلق موزوں و موثر تقریر سنائی مسٹر کنکلف کی وفات پر مختلف ممالک سے لوگوں نے رنج و ہمدردی کا اظہار کیا۔

جب نواب صاحب وطن واپس ہو رہے تھے جتنے مسلمان لیورپول کے تھے وداعی جلسہ کیا جس میں ترکی کونسل جنرل ہز آنر اسد بے اور شیخ الاسلام عبداللہ کوئیلیم۔ مولوی برکت اللہ وغیرہ نے اسلام کی راہ میں ان کی ہمدردانہ کوششوں کا ذکر خیر کر کے بہ اظہار خلوص و محبت خدا حافظ کہا۔ نواب صاحب کو کیمبرج لندن لیورپول جہاں کہیں قیام ہوا وہاں ہر دلعزیزی نصیب ہوئی بالآخر جہاں زیادہ رہنے کا اتفاق ہوا اور اخلاق و عادات وغیرہ کے متعلق ایک خاندان کے لوگوں کا جو خیال رہا اس کا اندازہ اس کی صدر خاتون مسماۃ مسز ناتھ کرافٹ معمرہ ۹۱ سالہ کی نظموں سے (جو سابق میں ایک سوانیہ کالج کی پرنسپل تھیں) جن میں ایک سالگرہ کے موقعہ پر دوسرے بوقت روانگی از لندن پیش کی گئی تھیں بخوبی ہوتا ہے

ملازمت

نواب صاحب مرحوم سنہ ۱۹۰۲ء میں ریاست کی سروس میں شامل ہوئے۔ پہلے سات برس تک دوم تعلقدار اور پانچ اضلاع پر اول تعلقدار و مجسٹریٹ ضلع رہ کر متعدد اصلاحات و انتظامات کر کے ناپسندیدہ عناصر کا جو رعایا اور حکومت کی تکلیف اور بے وقعتی کا باعث تھے قلع قمع کر کے سرکاری اقتدار اور رعب قائم کیا حکمت عملی سے سرکار کی ہر دل عزیزی میں اضافہ اور رعایا کی تسکین و تشفی کا باعث ہوئے جس سے دونوں آپ کی کارگزاری سے خوش اور مداح رہے۔ جہاں گئے ایک محسن و مصلح کی حیثیت سے خیر مقدم ہوا۔ آپ کے ہمدردانہ اور منصفانہ برتاؤ سے رعایا اس قدر متاثر و ممنون ہوئی کہ آپ کو "دھرم اوتار" اور "نجات دہندہ" پکارتی۔ لارڈ کرزن نے (جن سے لندن کی شناسائی تھی) جو ضلع ورنگل میں شکار کی غرض سے تشریف لائے تھے آپ سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات فرمائی۔ تعلقداری ضلع بیدر کے زمانہ میں اعلیٰحضرت بندگان عالی (بزمانہ ولیعہدی) نے سیر و سیاحت اور ازدیاد معلومات ملکی کی غرض سے اس تاریخی مقام پر رونق افروز ہو کر ہر ایک کام اور انتظام کو ملاحظہ فرما کر اظہار مسرت فرمایا تھا۔

سنہ ۱۹۱۵ء میں صوبہ داری ورنگل پر کچھ روز بڑی محنت و جانفشانی سے کام کیا۔ پھر بحیثیت صوبہ دار اورنگ آباد میں سنہ ۱۹۱۸ء سے کچھ عرصہ تک رعایا کی فلاح و بہبود کے کاموں میں مصروف رہے اسی اثنا میں لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے ہند اور لارڈ لائیڈ گورنر بمبئی کی تشریف آوری کے موقع پر ملاقات کا موقع ملا۔ دونوں آپ کے انتظام او خوش سلیقگی کا اثر لیتے گئے۔ آخر زمانہ میں سررشتہ علیات کی اصلاح کی غرض سے دار السلطنت میں بلائے گئے۔ تجربہ اور غور کے بعد ایک نہایت اہم اور مفید دستور العمل مرتب کیا۔ آپ کا پرخلوص اور ہمدردانہ نظم و نسق سب کے لئے باعث تشفی تھا۔ آپ تعلیم اور بالخصوص ملکی صنعتوں کی حفاظت اور ترقی کے پرجوش حامی رہے۔ بیدر میں مدرسہ صنعت و حرفت جاری کر کے مشہور بیدری صنعت کو مٹنے سے بچا لیا۔ افزائش نسل

استیاں و مویشی کی طرف خاص توجہ کی۔ نظام آباد میں کاغذ سازی کا کام جاری کیا اعلیٰ قسم کے کاغذ تیار ہونے لگے جن کی تعریف حیدرآباد و میسور کی نمائشوں میں ہوئی۔ زمانۂ اول تعلقداری میں حسب فرمان خسروی امیر پائیگاہ نواب معین الدولہ بہادر کار ہائے مال و عدالت کا عملی تجربہ حاصل کرنے کے لئے کچھ عرصہ تک وہاں تشریف فرما رہے۔ مالیگاؤں کی جاترا کو از سر نو جاری کیا اور ایک کلب اور کئی کتب خانے اور مطالعہ گھر قایم کئے۔ صنعتوں کی نمائش کا انتظام کیا۔ غرض اہل ملک کی ترقی کے کاموں میں آپ کو بے حد شوق و انہماک رہا۔ اعلیٰ حضرت غفران مکان ہمیشہ آپ کو قابل اعتماد اور وفادار سمجھتے رہے ۱۳۲۳ھ میں اپنی جوبلی کے عظیم الشان دربار میں خطاب آبائی سے سرفراز فرمایا۔ سر ٹریور چلاوڈن اور ان کے بعد کے چند رزیڈنٹ صاحبان آپ کے متعلق عمدہ رائے رکھتے تھے۔ سر الگزینڈر پنہیے اور اس زمانہ کے یوروپین عہدہ دار آپ کو حیدرآباد کے چند بہترین اشخاص میں شمار کرتے تھے۔ اعلیٰ حضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہٗ کے الطاف شاہانہ ہمیشہ یکساں طور پر آپ پر مبذول رہے۔ مرحوم ریاست کے ان چند با وقعت حکام میں سے تھے جن کے وجود کو ہر شخص مغتنم سمجھتا ہے جس مقام پر رہے فتنہ و فساد کا دروازہ بند کر دیا اور اگر کہیں اس کی کوشش ہوئی تو فوراً حکمت عملی سے اس کا سد باب کر دیا ہمیشہ گرد و پیش کے حالات سے باخبر رہے اور شر و فساد کی بیخ کنی کو بعد کے تدارک سے بہتر تدبیر سمجھتے تھے۔ میلاد شریف کے جلسے نہایت اہتمام اور تکلف سے ہوا کرتے تھے منتخب واعظین کے ذریعے مسلمانوں کو آنحضرت صلعم کی زندگی کے سچے واقعات بتائے جاتے اور نیک کام کرنے کی ترغیب دی جاتی۔ عیدین میں جو ہر شخص کی عطر اور پان سے تواضع کرتے اس خلوص اور مساوات اسلامی کا لوگوں کے دلوں پر گہرا اثر پڑتا اہل ہنود سے بھی ان کے تہواروں پر جب وہ ملنے آتے تو اسی خلوص اور کشادہ پیشانی سے ملاقات کرتے اور ان کی بھی عطر پان سے تواضع کرتے۔ آپ کبھی کسی پارٹی میں شریک نہیں ہوئے سازش کے انسداد کے ہمیشہ درپے رہتے تھے نادار طلبہ، بیواؤں اور یتیموں کی اس طرح امداد کرتے کہ کسی کو خبر نہ ہوتی۔ مطالعہ کا بے حد ذوق تھا۔ اردو، انگریزی زبانوں کے کئی رسالے اور اخبار آپ کے مطالعہ سے گذرتے۔ خادمین و معلمان قوم کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے وضعداری، خوش اخلاقی، فیاضی اور علم کی قدردانی آپ کے خاص اوصاف تھے پہلی دفعہ جس شخص سے جس طرح ملتے ہمیشہ اس طریقہ کو قایم رکھتے جو بھی آپ سے ایک دفعہ ملاقات کرتا وہ آپ کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا ظاہری اوصاف کے علاوہ تقدس اور پاک باطنی آپ کے چہرہ سے نمایاں ہوتی تھی۔

نواب صاحب مرحوم فطرتاً مصلح قوم اور پاکباز و پارسا پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ساری زندگی زہد و اتقا اور اصلاح و ہدایت میں بسر ہوئی۔ ملازمت کے زمانہ میں بھی ان کے یہی اوصاف نمایاں رہے اکثر اضلاع اور بالخصوص بیدر میں نواب صاحب مرحوم نے ایک ایسے قبیح فعل کی اصلاح کی طرف توجہ مبذول فرمائی کہ ان سے پہلے کسی عہدہ دار کو اس کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ پیشہ ور عورتیں لڑکیوں کو اس غرض سے ناچ کی تعلیم دیتی تھیں کہ آئندہ ان سے ناجائز فائدہ حاصل کریں۔ نواب صاحب مرحوم نے پہلے اس بات کی تحقیق فرمائی کہ آیا یہ لڑکیاں ان پیشہ ور عورتوں سے کوئی قرابت رکھتی ہیں یا زمانہ قحط میں یا اور کسی ذریعہ سے حاصل کی گئی ہیں۔ کافی معلومات اور تحقیقات کے بعد ان عورتوں کو قانوناً مجبور کیا گیا کہ ان لڑکیوں کی پرورش شریفانہ طریقہ سے کریں اور جب وہ بالغ ہو جائیں تو ان کی شادی کسی شریف قوم سے کر دی جائے۔ جب ان لڑکیوں کی شادی ہو گئی تو نواب صاحب مرحوم نے ان کو چند کار آمد اشیاء، لباس اور کچھ رقم بھی عطا کی تاکہ وہ اپنی زندگی کا آغاز شریفانہ طریقہ پر کریں۔ پاکبازی اور پارسائی کے علاوہ آپ کے دل میں ملک و قوم کا بھی خاص درد تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے زبردست حامی تھے۔ زمانہ ملازمت میں

ہندو مسلم رعایا کو ایک نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ آخر وقت تک جب کبھی اضلاع کے وہ ہندو یا مسلمان لوگ رجن کو آپ سے تعلق رہا تھا حیدرآباد آتے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہونا اپنا اولین فرض سمجھتے۔ اضلاع میں جہاں کہیں قدیم ہندو یا مسلمان آثار نظر سے گذرتے آپ ان کی حفاظت اور احترام کے طرف وہاں کے رہنے والوں کو خاص طور پر توجہ کرتے۔ اس کے علاوہ آپ نے ریاست کے آثار قدیمہ کی حفاظت اور نگرانی کے لئے گورنمنٹ کو فوراً توجہ دلائی اور یہ مشورہ دیا کہ برٹش انڈیا کے کسی ماہر فن کی خدمات اس کام کے لئے مستعار لی جائیں۔ چنانچہ ابتدا میں گولکنڈہ کی ہزار ستون کی دیول کی صفائی کے لئے مسٹر واکر صدرالمہام فینانس سے ایک معتد بہ رقم منظور کروالی۔ اور ریاست میں آثار قدیمہ کے تحفظ کا کام آپ ہی کی سفارش اور توجہ سے شروع ہوا اور ان آثار کو مٹنے سے بچا لیا۔

مرحوم کی شادی ۱۳۱۵ھ میں بڑے سلیقہ سے ہوئی۔ اعلیٰحضرت غفران مکان نے اپنے دست مبارک سے سہرہ باندھ کر عزت افزائی فرمائی۔ آپ کی اہلیہ شمس العلماء مولانا ظہور حسن فرنگی محلی جاگیردار سرکار عالی کی دختر اور نواب نصیر جنگ آصف جاہی کی ہمشیرہ ہیں آپ کی نسبی اولاد سے اس وقت تین فرزند (غازی الدین احمد مددگار مہتمم برقی، ناصرالدین احمد تحصیلدار، اور سراج الدین احمد زیر تعلیم) اور چار دختر بقید حیات ہیں۔ آپ کے بڑے داماد نواب میر باسط علی خاں سشن جج صوبہ ورنگل ہیں۔ دوسرے داماد مولوی ظہور حسن صاحب انصاری (فرزند نواب نصیر جنگ آصف جاہی) تھے جو ملک کے ایک قابل فخر نوجوان تھے۔ اور اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ تشریف لیجا رہے تھے کہ اجمیر شریف میں یکایک انتقال فرمایا۔ سب رس کے حصۂ اطفال کے ایڈیٹر معین الدین احمد انصاری انہی کے فرزند ارجمند ہیں۔ تیسرے داماد ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ ہیں جن کے نام اور کام سے علمی دنیا بخوبی واقف ہے۔ چوتھے داماد مولوی افضل الدین حسن صاحب ہیں جو نواب صاحب مرحوم کے حقیقی ہمشیر زادہ ہیں۔

خواجہ حمید الدین شاہد

قطعۂ تاریخ

جس سے سنتا ہوں وہ کہتا ہے بصد رنج و الم
ہو گئے ہم سے جدا نواب رفعت یار جنگ
اُن کے اوصافِ حمیدہ سے ہے واقف کُل جہاں
تھے بڑے ہی باخدا نواب رفعت یار جنگ
جنتی تھے جنتی، جنت میں داخل ہو گئے
کہدو عارفؔ پارسا نواب رفعت یار جنگ
۱۳۵۷ھ

میر لطف علی عارف ابوالعلائی قاضی پرگنہ متنورہ

نلگنڈہ اور اُس کے قرب و جوار میں

(ایک روزنامچہ سے)

ادارہ سب رس ایسے مضامین شکریہ کے ساتھ شائع کرے گا، جن میں ممالک محروسہ سرکار عالی کے اضلاع اور دیہات کے متعلق دلچسپ معلومات درج ہوں، اور جن میں قدیم عمارتوں، مندروں، مسجدوں کے حالات اور درگاہوں اور قبروں کے کتبوں کی نقلیں بھی شامل ہوں۔

نلگنڈہ کی آبادی

سلطنت آصفیہ کے اضلاع تلنگانہ میں ایک ضلع نلگنڈہ ہے جو دارالسلطنت کے مشرق میں واقع ہے۔ اس ضلع کا مستقر اسی نام کے ایک چھوٹے سے شہر میں ہے جو سطح سمندر سے تقریباً ایک ہزار فیٹ بلندی پر ہے اس شہر کی پرانی آبادی کے دو طرف پہاڑ ہیں جس کی وجہہ گرمی شدت کی ہوتی ہے ان دو پہاڑوں میں سے ایک پر امام ضامن کا چلہ اور دوسرے پر حضرت لطیف صاحب کا مزار ہے۔ پرانی آبادی کے سلسلہ میں گران پہاڑوں سے ذرا ہٹ کر جدید وضع کے بنگلے اور باغ ہیں۔ یہیں اکثر دفاتر سرکاری ہیں، پولیس کے کوارٹرس ہیں، احاطہ پولیس میں ایک خوبصورت مسجد ہے۔

نلگنڈہ کا قطب مینار

نلگنڈہ کی قدیم آبادی کے ایک گوشہ میں پتھر کا ایک ستون کھڑا ہے۔ نئے اصحاب جو نلگنڈہ جاتے ہیں وہ اس ستون کو بھی دیکھتے ہیں گویا وہ یہاں کا قطب مینار ہے یہ ستون جس کی بلندی اکتالیس فیٹ ہے، ایک ہی پتھر میں تراشا گیا ہے، زمین میں جو حصہ گڑا ہے وہ اس کے سوا ہے بہت ممکن ہے کہ کسی دیول کے سامنے یہہ چراغ کا کھم (دیپک) ہو گر اب تو نہ یہاں کوئی دیول ہے نہ دیول کے کوئی آثار۔

لنگ کی کرامت

نلگنڈہ سے قریب ہی موضع پانگل کی آبادی ہے یہاں تیل کے ظروف بہت اچھے بنتے ہیں اس آبادی سے متصل ہی ایک دیول ہے جو گو شکستہ ہوگئی ہے لیکن سنگ تراشی کے اچھے اچھے نمونے اب تک موجود ہیں یہاں سے کچھ ہٹ کر ایک اور قدیم دیول ہے جس کی نسبت اہل ہنود کا اعتقاد ہے کہ اس دیول کے لنگ پر کسی کا سایہ نہیں پڑتا اور یہ ایک کرامت ہے۔ جناب بہاؤالدین خاں صاحب تحصیلدار اور عزیزی احمد حسین صاحب خزانہ دار ضلع کی معیت میں اس دیول کا معائنہ میں نے کوئی نو بجے دن کے کیا جب کہ دھوپ خوب پھیل رہی تھی اور ایک ستون نما سایہ لنگ پر دیکھا اس کی وجہ یہ تھی یا میرے نزدیک یوں کی چھانوں لنگ پر نہ پڑ سکتی تھی، یہہ ستون نما سایہ اُن چار کھمبوں میں سے ایک کا تھا جو دیول کے حجرہ کے باہر دالان میں لگے ہیں یہ آفتاب کے رخ اس حساب سے کھڑے کئے گئے ہیں کہ ایک نہ ایک کھم کا سایہ ہر گھڑی لنگ پر پڑتا ہے اس لئے جب کوئی دوسرا یہاں آتا ہے تو ستون کے آڑ میں ہونے سے اس کی چھانوں پیدا ہی نہیں ہوتی۔ غرض یہہ ایک صنعت ہے جس کو ضعیف الاعتقاد کرامت سمجھنے لگے۔ ایسی مختلف قسم کی صنعتیں میں نے متعدد جگہ دیکھی ہیں ملا بند ل (ضلع کریم نگر) کے قلعہ کی مسجد کے مینار ہلانے سے لرزتے ہیں دگلور (ضلع نانڈیڑ) میں شاہ ضیاءالدین صاحب کے گنبد کے پیوتر سے پر چند خبو میں ام مشہور ہے کہ ان کی تعویذوں کو جو سنگ سیاہ کے ہیں ٹھوکو تو ہر ایک تعویذ سے موسیقی کا ایک بول سا، رے، گا، ما نکلتا ہے ان تعویذوں کو مار کر میں نے بھی دیکھا آواز بھی آئی ممکن ہے کہ فن موسیقی کا واقف اصول سے ٹھوکے تو صحیح بول بھی نکلیں اسی طرح بیجاپور کے گول گنبد (محمد عادل شاہ کے مقبرہ) میں یہہ

صنعت یہ ہے کہ اس کی دیوار سے منہ لگا کر بات کرو تو آواز دوسری طرف اس طرح پہونچتی ہے جیسے ٹیلیفون غرض یہ سب جس طرح صنعت تعمیر ہے بالکل کے دیول میں بھی ایک صنعت رکھی ہے ۔ اس زمانہ میں ان چیزوں کا مذاق تھا تو ایسے کاریگر بھی تھے اب نہ اس کا شوق رہا نہ قدرداں رہے، نہ کوئی ایسے فن داں ہیں ۔

دیلور کنڈہ نلگنڈہ سے دیلور کنڈہ گیا یہاں کی آبادی بھی ایک پہاڑ کے دامن میں ہے جس پر ایک ویران قلعہ ہے، قلعہ کے شمال مغربی اور جنوب مغربی گوشوں میں دور دور تک سیکڑوں قبوریں بہت سی تو ٹوٹ پھوٹ گئیں کچھ جو درست ہیں ان کے بالعموم سنگ سیاہ کے تعویذ ایک ہی وضع قطع کے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سیکڑوں شہداء یہاں مدفون ہیں کچھ مجذوب اور اولیاء اللہ ہیں ان میں سے بعضوں کے قصے زبان زد عام ہیں ۔

از رفتگاں بہ زیر زمیں استخواں نماند	جز قصہ وفسانہ ونام ونشاں نماند

شہر خموشاں ایک درگاہ حضرت حاجی درویش محمد صاحب قدس سرہ کی دیلور کنڈہ کی آبادی سے مشرق کی طرف نلگنڈہ جانے والی سڑک کے کنارے ایک بلند ٹیلہ پر ہے درگاہ سے دور تک بڑا اچھا منظر ہے مزار سے متصل جانب مغرب ایک بڑا سا پتھر دوسرے پتھروں پر اس طرح آپڑا ہے کہ ایک مسقف حجرہ بن گیا مشہور ہے کہ حضرت حاجی صاحب مرحوم اسی حجرہ میں رہتے تھے ایک مرتبہ یہ پتھر گرنے لگا تو حضرت نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے تھاما، چنانچہ حضرت کے دست مبارک کے نشان پتھر پر پڑ گئے جو اب تک نمایاں ہیں، اسی حجرہ میں لکڑی کے چند شکستہ تختے پڑے ہیں کہتے ہیں کہ یہ اس تخت کی لکڑی ہے جس پر حضرت بیٹھا کرتے تھے، ان بزرگ کی تاریخ وفات ۷ ار جمادی الثانی ۹۹۹ھ کندہ ہے ۔

ایک دوسری درگاہ حضرت سلیمان شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی اسی سڑک پر تحصیل کچہری کے مقابل پختہ دیوار سے محصور ہے جس کے چاروں گوشوں پر چار چھوٹی چھوٹی سرائیں، وسط میں ایک مسجد پائین مزار ایک مستطیل حوض اور اطراف چبوترے ہیں درگاہ سے متصل بہ جانب غرب ایک اُجڑے ہوئے باغ کے آثار بھی پائے گئے ۔ درگاہ کے دروازہ پر کتبہ لگا ہے ۔

چو از ملک ناسوت فرسود رحلت	سلیمان شہ ملک مجد و کرامت
بہ گفت ارشد از بہر تاریخ سالش	سلیمان عالی نسب شد بہ جنت
	۱۱۷۳

امیر بیگ خاں عالی کرم شجاعت جنگ	بنا نمود چو ایوان کرمست مہتاں
بگفت ارشد ممتاز بہر تاریخش	مکان تعزیہ شاہ ملک کون ومکاں

ایک اور مزار مسافر بنگلہ دیلور کنڈہ کے مقابل ہے ۔ بالین قبر سنگ سیاہ پر یہ عبارت لکھی ہے :-

"یا اللہ وفات مرحومی نادر العصری شرف الدین حسن بن درویش بیگ غرہ ماہ ذیقعدہ ۹۰۵ھ وقوع یافت"

اس سے کچھ ہٹ کر قلعہ کے نیچے ایک چبوترہ پر جو مٹی کی دیوار سے محصور ہے تین قبور ہیں ان میں سے ایک کی تعویذ پر تین طرف عبارت کندہ ہے یہ کچھ تو پڑھی گئی اور کچھ میری اور میرے دوست جناب ایجاد علی صاحب مددگار جنگلات کی متفقہ کوشش کے باجود

نہ پڑھی جا سکی جو پڑھا وہ یہہ ہے :۔

(مغرب رخ) الا ھو والملایکتہ واولوا العلم قایماً بالقسط ....

(مشرق رخ) الا ھو العزیز الحکیم ان الدین عند اللہ الاسلام وما توا الا باللہ ....

شمال کے رخ طغریٰ ہے جو بالکل نہ پڑھا گیا ۔ سر مزار سیاہ پتھر کی تختی ہے جس پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے :۔

"وفات مرحومی مسمی محمدؐ شیخ برہان قرشی فردوس مکان"۔

عبارت بالا میں لفظ محمدؐ کے بعد حرف "ے" اور "ہ" بھی ہے اگر شیخ برہان محمدی پڑھا جائے تو پھر بھی "ہ" رہ جاتا ہے اس عبارت کے نیچے ۔ "تاریخ وفاتش روز پنجشنبہ دوم ماہ ذی قعدہ ۹۹۵ھ" لکھا ہے ۔

دیورکنڈہ کی صنعت

یہاں ریشم اور سوتی پارچہ بنتا ہے، ماضی قریب میں یہاں کے رومال بہت مشہور تھے یہہ بنتے تو اب بھی ہیں مگر پہلے عام تھے اب فرمائش کرو تو بنا دیتے ہیں ۔ یہہ میری دیکھی ہوئی بات ہے کہ عورتیں نیلیا رومال شوق سے اوڑھتی تھیں، مرد اس سے شملہ باندھتے تھے اور بڑے دفاتر کے جمعدار، چپراسیاں پیش قبض یا جمبیہ لگا کر اسی سے کمر کستے تھے مگر آج مصنوعی ریشم جب اصل ریشم سے زیادہ چمک دمک کا اور سستا ملتا ہو تو ان دیسی سوتی کپڑوں کو کون پوچھتا ہے ۔ جولاہوں کی حالت خستہ وخراب ہے ۔

موید الدین حسن

غزل

نالۂ دل اثر انداز نہیں ہے تو نہ ہو
لب ہلا لیتا ہوں آواز نہیں ہے تو نہ ہو

شکر کرتا ہوں ابھی حسرت پرواز تو ہے
اب اگر طاقت پرواز نہیں ہے تو نہ ہو

حسن کی ذات سے نسبت ہے یہی کیا کم ہے
عشق خود باعث اعزاز نہیں ہے تو نہ ہو

رہنمائی دل پر شوق کرے گا میری
کوئی غربت میں جو دمساز نہیں ہے تو نہ ہو

ہم تو حال غم دل اپنا کہے جائیں گے
وہ اگر گوش برآواز نہیں ہے تو نہ ہو

حسن اور عشق میں جذبات وہی ہیں موجود
کوہکن سا کوئی جاں باز نہیں ہے تو نہ ہو

نظر اپنی ہے فقط تیرے کرم پر ساقی
در توبہ بھی اگر باز نہیں ہے تو نہ ہو

آنکھوں آنکھوں میں تو ہے سلسلۂ ناز و نیاز
گفتگو ہوتی ہے آواز نہیں ہے تو نہ ہو

دل تو اپنا نگہہ ناز کی جانب ہے حمید
دل کے جانب نگہ ناز نہیں ہے تو نہ ہو

حمید (لکھنوی)

اُردو رسالوں کے خاص نمبر

شعبہ تنقید کی طرف سے نواب مرزا سیف علی خاں صاحب نے گذشتہ مہینے میں اُردو کے جو خاص نمبر شائع ہوئے ہیں ان پر حسب ذیل تعارفی تبصرہ روانہ فرمایا ہے :-

"سب رس"

سالنامہ ادبی دنیا (لاہور)

بابت ۱۹۳۹ء حجم ۲۷۶ صفحات قیمت عہ پتہ مینجر صاحب رسالہ ادبی دنیا لاہور اور مکتبہ ابراہیمیہ بادرہ حیدرآباد

لاہور کے مشہور ماہنامہ "ادبی دنیا" نے اس سال بھی اپنی قدیم وضعداری کے ساتھ شاندار معمور سالنامہ نکالا ہے جو علم وادب کے جواہر پاروں سے آراستہ ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے۔ آرٹ پیپر کی کوئی تین درجن تصویریں ہیں جن میں کئی رنگین بھی ہیں اور اپنے اندر کافی کشش رکھتی ہیں۔ اس سالنامہ کے مضامین نثر میں مسٹر کرشن چندر، جناب فیاض محمود صاحب سردار راجندر سنگھ بیدی صاحب، جناب عاشق حسین صاحب بٹالوی، جناب وقار انبالوی، جناب شبیر حسن صاحب لکھنوی اور جناب اختر انصاری کے طبعزاد افسانے اور مسٹر جیندر بھوشن سنگھ آزاد، جناب میر محمد علی خاں صاحب شہاب، جناب سراج الدین احمد صاحب، جناب طاہر قریشی کے دوسری زبانوں کی کہانیوں کے ترجمے، اندر لال داس صاحب قمر، پروفیسر سعنت صاحب، راجہ فاروق علی خاں صاحب، صلاح الدین احمد صاحب کے ڈرامے، منشی پیارے لال صاحب شاکر، پروفیسر فیض احمد صاحب، پنڈت برج موہن دتاتریہ، سید بادشاہ حسن صاحب حیدرآبادی سید شہنشاہ حسین صاحب رضوی، سید نورالحسن صاحب، برلاس، مظفر احمد صاحب، جناب میراجی اور جناب بسنت سہائے صاحب کے تاریخی علمی وادبی مضامین قابل ذکر ہیں۔

حصہ نظم میں جناب اختر صہبائی، جناب ضیا فتح آبادی، جناب سید علی منظور، جناب آزاد انصاری، پنڈت اندر جیت شرما، جناب اختر شیرانی، جناب سیماب اکبرآبادی، جناب محشر، جناب فراق، جناب فانی بدایونی، جناب وجد حیدرآبادی، جناب امجد حیدرآبادی، جناب یگانہ لکھنوی، جناب ساغر نظامی، جناب نظیر لدھیانوی، جناب احسان بن دانش، جناب ماہر القادری اور جناب ظفر کی نظمیں اور غزلیں بہت دلچسپ اور رنگین ہیں۔

سالنامہ ادب لطیف (لاہور)

بابت ۱۹۳۹ء حجم ۲۸۰ صفحات قیمت عہ۔ پتہ مینجر صاحب رسالہ ادب لطیف لاہور اور مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد

لاہور کے ماہنامہ "ادب لطیف" کا یہ سالنامہ اس دفعہ نہایت خوبصورت شائع ہوا ہے۔ لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے۔ اس میں ہندوستان کے مشہور مضمون نگار، افسانہ نویس، ڈرامالسٹ اور شعرا کے اچھوتے مضامین، دلچسپ افسانے، نتیجہ خیز ڈرامے اور پرکیف نظمیں درج ہوئی ہیں۔ ان میں سے چند کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

پنڈت برج موہن کیفی دتاتریہ نے اپنے مضمون "خواجہ حالی مرحوم" میں مولانا حالی کی خصوصیات اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ مولوی امتیاز علی صاحب تاج نے طالب بنارسی کے مشہور ڈرامے "لیل ونہار" پر دلچسپ تبصرہ کیا ہے، مولانا ماہر القادری نے قدیم تمدن، بت پرستی اور بت تراشی کے متعلق چند مفید معلومات لکھی ہیں، جناب سید بادشاہ حسین صاحب حیدرآبادی نے ہندوستان کی حرفتی ناقابلیت کے اسباب، قومی خصوصیات، جغرافیائی ماحول، امراض وافلاس، جہالت وناتجربہ کاری، سیاسی غلامی اور تجارتی قابلیت کے تحت

واضح طور پر بیان کئے ہیں۔ جناب فضل حق صاحب قریشی دہلوی نے آغا حشر کے متعلق اپنے ذاتی تاثرات قلمبند کئے ہیں۔

افسانوں میں مسٹر کرشن چندر، محترمہ حجاب امتیاز علی، پروفیسر سید فیاض محمود، جناب پریم پجاری، جناب اعظم کریوی، محترمہ مسز عبدالقادر، منشی پریم چند آنجہانی، جناب صادق الخیری، جناب ایم اسلم، جناب سعادت حسن منٹو، جناب اختر انصاری کے دلکش افسانے قابل ذکر ہیں۔

مزاح نگاروں میں پروفیسر کنہیا لال، جناب شوکت تھانوی، علامہ ملا لطیف اور جناب ناکارہ حیدرآبادی نے طنز کے خوب پہلو نکالے ہیں اور خاطر خواہ داد ظرافت دی ہے۔

جناب بہزاد لکھنوی، حکیم احمد شجاع صاحب، جناب احمد ندیم قاسمی، جناب نریندر ناتھ صاحب نے چند دلچسپ ڈرامے لکھے ہیں۔

حصہ نظم میں اردو کے مشہور شعراء حضرت جوش ملیح آبادی، علامہ سیماب، جناب امین حزیں، حضرت احسان، جناب اثر صہبائی، جناب الطاف مشہدی، جناب فراق اور جناب آزاد انصاری کی نظمیں اور غزلیں بہت دلچسپ اور کیف آور ہیں

ہمایوں (لاہور) سالگرہ نمبر بابت ۱۹۳۹ء حجم ۱۴۰ صفحات قیمت ۱۲ر۔ پتہ۔ ۲۳ لارنس روڈ لاہور

لاہور کے قدیم اور مشہور ادبی ماہنامہ ہمایوں نے حسب معمول اپنا سالگرہ نمبر شائع کیا ہے۔ اس میں کئی بلند پایہ علمی، ادبی مضامین، افسانے ڈرامے اور نظمیں ہیں۔ اس نمبر کے شروع صفحات پر جناب بشیر احمد صاحب ایڈیٹر ہمایوں کا وہ مقالہ جو "یوم اردو" کے موقع پر انجمن اردو پنجاب کے جلسہ میں پڑھا گیا تھا درج ہوا ہے۔ آخری صفحات پر اسی طرح کا ایک اور مقالہ ہے جو جناب حامد علی خاں صاحب جائنٹ ایڈیٹر ہمایوں نے انجمن مذکور کے جلسہ میں پڑھا تھا لکھا گیا ہے۔ یہ دونوں مقالے اردو، ہندی کے جھگڑے پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہیں۔ جناب فلک پیما کا ڈراما "نقل اور اصل" اور جناب پروفیسر سید فیاض محمود صاحب کا ڈراما "قسمت کا فیصلہ" بہت دلچسپ اور نتیجہ خیز ہیں۔ مسٹر کرشن چندر جناب سید علی عباس صاحب، جناب عبدالحمید صاحب کے افسانے "بے رنگ و بو"، "منچی کی پریت" اور "پہاڑ کا انتقام" کافی دلکش اور سبق آموز ہے نظموں میں مزدور کا عزم، فن لطیف، غم، روح النساں، برساتی ندی، عودہتی، منظر کے نام، تقاضائے فطرت بہت دلچسپ، فطری اور دلآویز ہیں تصویروں میں مزدور کا عزم (رنگین)، نیا سال، زندگی، پانی کے قطرے، انعکاس نور، ایک دیہاتی منظر بہت خوبصورت اور نظر افروز ہیں

سالنامہ صبح امید (بمبئی) بابت ۱۹۳۹ء حجم ۱۰۰ صفحات قیمت ۸ر۔ پتہ۔ مینیجر صاحب رسالہ صبح امید بمبئی ۸۔

اس نمبر کے بعض مضامین اور نظمیں اعلیٰ درجے کے ادیب اور شعراء کے قلم کی منت کش ہیں حضرت اختر شیرانی، مولانا آزاد، مولانا عبدالماجد صاحب، مولانا ظفر علی خاں صاحب، علامہ سید سلیمان ندوی، علامہ سیماب اکبرآبادی، مولانا ماہر القادری جیسے بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں کے رشحات قلم سے اس نمبر کو زینت دی گئی ہے۔ ابتداء میں ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور اور ڈاکٹر بدل الرحمن صاحب کے پیامات بھی بصیرت افروز ہیں

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مخصوص رنگ میں خاص اس نمبر کے لئے ایک مقالہ "الاصلاح" تحریر فرمایا ہے۔ یہ فلسفیانہ مضمون اپنے اندر بہت ساری اصلاحی اور تعمیری خصوصیتیں رکھتا ہے۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا مختصر مضمون "ملک حسن" یورپ کے مقابلہ حسن پر ایک بصیرت افروز تبصرہ ہے۔ حضرت سید سلیمان صاحب ندوی نے "حج بیت اللہ" پر ایک پرمغز مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے مولانا ماہر القادری نے "جنت بغداد" میں بغداد کے انقلابات کی مختصر تاریخ دلچسپ پیرایہ میں بیان کی ہے۔ پروفیسر سید حبیب اشرف صاحب ندوی نے

"اردو کے مختلف نام" کے عنوان سے اُردو کی مختصر تاریخ لکھی ہے۔ مولانا احمد شبلی صاحب نے اپنے مزاحیہ مضمون "جھوٹ بھی ضرورت زندگی سے ہے" میں ثابت کیا ہے کہ جھوٹوں کے آگے سچا رو مرتا ہے۔

اس نمبر میں بعض قابل خواتین کے مضامین نظم و نثر بھی شامل ہیں۔ ان میں محترمہ زاہدہ خاتون صاحبہ لکھنوی اور زاہد النساء حبیبہ زاہدہ بسوانی کی غزلیں، محترمہ ا۔ ز۔ کے بانو مقسم رضویہ کی نظم "اشک آدم" اور محترمہ ن، ب صاحبہ دہلوی کا مختصر مضمون "میں نے مضمون لکھا" قابل ذکر ہیں۔

اس نمبر کے حصہ نظم میں مولانا سیماب اکبرآبادی کی نظم اتحاد قومیت، جناب صاحبزادہ میکش کی نظم "شاعر مشرق" جس کو موصوف نے اسماعیل کالج بمبئی کے جلسہ "یوم اقبال" میں پڑھی تھی۔ حضرت نیرنگ کی نظم "آہنگ عمل" مولانا ظفر علی خاں کی نظم "ہلال عید کو دیکھ کر" حضرت اختر شیرانی کی نظم "صبح عید" اور جناب آغا حشر کی نظم "گریۂ یعقوب" جناب سنجر عظیم آبادی اور جناب قطرس نقوی کی غزلیں دل افروز اور روح پرور ہیں۔

تصویروں میں دو بجلیاں، رقاصہ، حسن، نیکی و بدی، دولت کی سیڑھی دلکش اور جاذب نظر ہیں۔ اس سالنامہ کی کتابت کچھ اچھی نہیں ہے، بمبئی میں نہ اچھے کاتب ملتے ہیں، نہ لیتھو کی چھپائی پاکیزہ ہوتی ہے۔ اس لئے یہ نقص نظرانداز کرنے کے قابل ہے۔

سالنامہ ساقی (دہلی)

بابت ۱۹۳۹ء مرتبہ جناب شاہد احمد صاحب ۲۸۰ صفحات قیمت عہ پتہ۔ منیجر صاحب رسالہ ساقی کھاری باولی دہلی مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ سے بھی بہ قیمت عہ سکہ عثمانیہ دستیاب ہو سکتا ہے۔

ادارہ ساقی دہلی نے اس سال بھی اپنا سالنامہ نہایت شاندار پیمانہ پر نکالا ہے پہلے پچاس صفحات پر شکسپیر کے مشہور ڈرامے "کنگ لیر" کو مولانا عنایت اللہ صاحب دہلوی سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد نے اردو کے نہایت خوبصورت لباس میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے "ایران کی عشقیہ شاعری" پر ایک تنقیدی و تاریخی مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے جناب صادق الخیری صاحب کا "حسن و شباب" جناب ایم اسلم صاحب کی "سادھو کی پتری" جناب ل۔ احمد صاحب کا چینی افسانہ "داؤ" جناب سید وزیر حسن صاحب کی "رشیدہ" محترمہ حجاب امتیاز علی کی "مہمان داری" جناب فیضی صاحب رامپوری کی "رضیہ" جناب عظیم بیگ صاحب چغتائی کی "لال مہر" جناب سعادت حسن صاحب منٹو کا "پھاہا" جناب آوارہ کی "دوربیں" جناب اختر انصاری صاحب کا "میں نے ایسا کیوں کیا" محترمہ صالحہ عابد حسین کا "خاں بہادر" جناب ناکارہ حیدرآبادی کا "شاگرد" جناب اشرف صبوحی کی "اندھیری راتیں" یہ سب کے سب مختصر افسانے اور دلچسپ کہانیاں اپنے اندر رومان، عبرت، نصیحت، مزاح اور طنز کے مختلف پہلو رکھتی ہیں۔

جناب "بیابانی" کا "پاگل" جناب "ناصر" کا "ڈاکہ گھر" اور جناب الضار ناصری صاحب کا "بخت آور" یہ تینوں ڈرامے نتیجہ خیز اور دلچسپ ہیں۔

پروفیسر برلاس نے "جاپانی پہلوان" میں جاپان کے فن پہلوانی اور وہاں کے دنگلوں اور کشتیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اس مضمون کے ساتھ جاپانی پہلوانوں کی چند تصویریں بھی ہیں۔ جناب سید بادشاہ حسین صاحب حیدرآبادی نے "ڈرامہ میں مکالمہ کی اہمیت" کے عنوان سے مکالمہ نگاری اور کردار کی خصوصیات پر اچھا تبصرہ کیا ہے۔ جناب محمد مسلم صاحب نے "جنسی تعلیم" اور جنسی معلومات کی ضرورت پر دل نشیں پیرایہ میں نہایت دلچسپ اور نصیحت خیز مکالمہ لکھا ہے۔ جناب آغا محمد اشرف صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ایران کی

بچوں سے

فروری کے پرچے میں "بقرعید یا المنکرات" پر مضمون لکھنے کے لئے کہا گیا تھا مگر کم بچوں نے حصہ لیا۔ اب ہم تاریخ بڑھائے دیتے ہیں۔ ۱۵ مارچ تک مضامین ضرور لکھ بھیجیں۔ مضمونوں پر نمبر دیے جائیں گے اور نتیجہ اپریل کے پرچے میں شائع کیا جائے گا۔

ایک اور بات آپ سے یہ کہنا ہے کہ آپ اپنے پرچے کے متعلق رائے لکھ بھیجیں کہ آپ کو اپنے سب رس میں کس قسم کی کمی نظر آ رہی ہے اور سب رس کو کس طرح اس سے بہتر بنایا جائے۔ غرض کہ جو کچھ رائے لکھیں صاف واضح طریقے سے اور بالکل آزادی سے لکھیں اور ۱۵ مارچ تک ہمارے پاس بھیج دیں جن کی رائیں بہترین سمجھی جائیں گی وہ اپریل کے پرچے میں شائع کر دی جائیں گی۔ فروری کی پہیلیوں کے کسی نے بھی صحیح حل نہیں بھیجے۔ مندرجہ ذیل پانچ اصحاب میں سے پہلے چار نے ایک غلطی کی ہے اور آخری صاحب نے دو۔

۱۔ مسیح الدین خاں شفیق۔ ۲۔ میر محمود علی اکبر مشیر۔ ۳۔ خونہ پیر پاشاہ۔ ۴۔ خواجہ معین الدین۔ ۵۔ حبیب شمس۔

پہیلیوں کے صحیح حل یہ ہیں :۔

(۱) انسان یا آدمی (۲) گھڑی یا گھڑیال (۳) صندوق (۴) انار (۵) حقہ۔

اس وقت یہ انعامی سوالات دیئے جا رہے ہیں :۔ (۱) انھیں بھی ۱۵ مارچ تک حل کر کے دفتر میں بھیج دیں۔ (۲) ان سوالات کے جوابات وہی بھائی اور بہنیں روانہ کریں جو اس رسالہ کے خریدار ہیں۔ (۳) اگر ایک سے زیادہ اصحاب انعام کے مستحق ہوں تو قرعہ اندازی سے انعام کا تصفیہ کیا جائے گا۔ (۴) انعام میں ایک کتاب "اسکول کی زندگی" دی جائے گی۔ جو میر محمود علی صاحب کی عطیہ ہے۔

انعامی سوالات

معین الدین احمد انصاری

(۱) وہ کونسی چیز ہے جو جا کر نہیں آتی (۲) وہ کونسی چیز ہے جو آ کر نہیں جاتی (۳) وہ کونسی شئے ہے جس کے چار حرف ہیں۔ اسے اکثر بڑے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اگر اسے الٹ کر پڑھیں تو بارش کا موسم یاد آجاتا ہے۔ (۴) وہ کونسی شئے ہے جو خود تو بے جان ہے لیکن جانداروں کو گرفتار کرتی ہے۔ (۵) وہ کونسی شئے ہے جو خود تو اندھی ہے لیکن اندھے کو راستہ ڈھونڈنے میں مدد دیتی ہے؟

لطیفے

میر محمود علی اکبر مشیر

۱۔ ایک ملازم نے کوئی غلطی کی مالک نے غصہ میں آ کر کہا۔ تم گدھے کے بچے ہو نوکر نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا سرکار ماں باپ ہیں۔

۲۔ ایک مرتبہ ایک صاحب آم کھا رہے تھے اس اثنا میں ایک صاحب ان کی ملاقات کے لئے آئے آپ نے آم پیش کیا انھوں نے انکار کیا اتفاقاً ادھر سے ایک گدھا گذرا انھوں نے چھلکا پھینکا وہ سونگ کر چلا گیا۔ ملاقاتی نے کہا کہ دیکھیے جناب گدھے تک آم نہیں کھاتے جس پر آپ نے کہا۔ جی ہاں گدھے آم نہیں کھاتے۔

(۳) ایک صاحب کے گھر مہمان آئے تھے اتفاق سے ان کے کمپونڈ میں گدھے چر رہے تھے۔ مہمان نے دریافت کیا کیا آپ کے گھر میں گدھے رہتے ہیں۔ میزبان نے کہا نہیں جناب رہتے نہیں ہیں بلکہ آج آئے ہیں۔ سید غوث الدین احمد

اطلاعیں

۱۔ **بہترین تحفہ** ۔ سب رس بچے اور طلبہ اپنے بھائیوں، بہنوں، اور دوستوں کو گزشتہ سال کے سب رس کے بارہ پرچوں کی خوبصورت جلدیں تحفہ کے طور پر دے سکتے ہیں۔ ایسی جلدوں پر سب رس کے نام اور سنہ کے علاوہ تحفہ دینے والے کا نام اور جس کو کہ تحفہ دیا جارہا ہے ان کا نام بھی منقش کر دیا جاسکتا ہے۔ بارہ پرچوں کی ایسی نفیس مکمل جلد کی قیمت صرف ۱۲؍ ہوگی۔ اگر سب رس بچے منی آرڈر کے ساتھ اپنے عزیز یا دوست کا پتہ لکھ بھیجیں تو یہ جلد دو چار روز کے اندر ان کی طرف سے تحفہ بن کر ان کے دوست کے یہاں پہنچ جائے گی۔ صرف چند ہی جلدوں کی گنجائش ہے۔ علم دوست طلبہ اپنی فرمائشیں جلد روانہ کریں ورنہ موقع نہ رہے گا۔

۲۔ **سب رس کے متفرق پرچے** ۔ جن بچوں کے یہاں سب رس کے گذشتہ سال کے پورے پرچے محفوظ نہ ہوں اور وہ اپنا فائل مکمل کرنا چاہتے ہوں تو دفتر سے مراسلت کریں۔ اگر ممکن ہو تو دفتر سب رس رعایتی قیمت سے پرچے فراہم کرکے ان کے فائل کی تکمیل میں مدد دے گا۔

۳۔ **اکثر بچوں کی تحریک ہے کہ** بچوں کے سب رس کے صفحوں میں اضافہ کرکے اس کی قیمت میں اضافہ کیا جائے۔ اس بارے میں ادارہ نے کافی غور کے بعد یہ تصفیہ کیا ہے کہ :-

جن بچوں کو ۱۶ صفحوں سے زیادہ مضمون اور نظمیں وغیرہ پڑھنے کا شوق ہے وہ بڑے سب رس کے خریدار بن جائیں جس کا چندہ صرف چار روپے سالانہ علاوہ محصول ڈاک ہے۔ بڑے سب رس کے سب مضمون بھی مفید، دلچسپ اور معلومات آفریں ہوتے ہیں اور طلبہ ان کے مطالعہ سے پوری طرح فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔ اس بڑے پرچہ میں بچوں کا پرچہ بھی شامل رہتا ہے۔ اور تصویریں بھی چھپتی ہیں۔ جو بچے اس وقت چھوٹے پرچے کے خریدار ہیں وہ آئندہ سے بڑا پرچہ لینا چاہیں تو دفتر سے مراسلت کریں۔ ان کا چندہ بڑے پرچہ میں منسوب کرکے کچھ رعایت کے ساتھ بڑا سب رس جاری کیا جائے گا۔

مہتمم سب رس

معلومات

(۱) لندن کے عجائب گھر میں اوسطاً ہر روز سو کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

(۲) افریقہ کی بعض قومیں شیر کے گوشت کو غذا کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔

(۳) سیفٹی دیاسلائیاں ابتداءً ۱۸۵۵ء میں سویڈن میں ایجاد ہوئی تھیں۔

(۴) شاہ برطانیہ کا تاج ۴۰ آونس وزنی ہے۔ (۵) جاپان میں ہر سال تقریباً ۵۰۰ مرتبہ زلزلے آتے ہیں۔

(۶) سورج کی روشنی ۸ منٹ ۸ سکنڈ میں زمین تک پہونچتی ہے۔ (۷) ہندوستان کا رقبہ جزائر برطانیہ سے ۱۴ گنا زیادہ ہے۔

محمد غوث محی الدین (متعلم شیخ گلبرگہ)

امام حسین علیہ السلام

حسین نام تھا۔ آپ کے والد ماجد علیؓ مرتضیٰ اور والدہ ماجدہ سیدہ فاطمہ زہرہؓ رسول اللہ کی لختِ جگر تھیں۔ آپ ہجرت کے چوتھے سال ماہ شعبان المعظم شنبہ کے روز مدینہ منورہ میں تولد ہوئے۔ ولادت کی خبر سن کر رسولِ مقبول تشریف لائے۔ آپ نے صاحبزادے کے کانوں میں اذان دی۔ حضرت حسینؓ کی ہستی متعدد صفات کی حامل تھی۔ علم و عمل، زہد و تقویٰ، جود و سخا، شجاعت، اخلاق، صبر اور شکر آپ کی کتابِ زندگی کے نہایت جلی عنوان تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ سے غیر معمولی انس تھا چنانچہ آپ فرماتے ہیں (۱) اہلِ بیت میں مجھ کو حسنؓ و حسینؓ سب سے زیادہ محبوب تھا۔ (۲) خدایا میں ان کو محبوب رکھتا ہوں تو بھی اُن کو محبوب رکھ (۳) حسنؓ و حسینؓ جنت کے دو پھول ہیں (۴) حسنؓ و حسینؓ نوجوانانِ جنت کے سردار ہیں۔

ایک مرتبہ آنحضرتؐ نے امام حسنؓ اور حسینؓ کو اپنے دوش مبارک پر بٹھایا۔ حضرت یعلیٰ بن مرہ نے کہا۔ صاحبزادے تمہاری سواری کتنی اچھی ہے۔ آپ نے فرمایا سوار بھی کتنے اچھے ہیں۔

صحابہ کرام بھی آپ کی تعظیم کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ مال غنیمت تقسیم کر رہے تھے۔ آپ نے امام حسنؓ اور حسینؓ کو ایک ایک ہزار درہم دیئے اور جب اپنے بیٹے عبداللہ کی باری آئی تو ان کو پانسو درہم دیئے۔ انھوں نے کہا یا امیرالمومنین میں طاقتور ہوں۔ میں نے کئی معرکوں میں رسولؐ کا ساتھ دیا ہے اُس وقت تو یہ دونوں بالکل بچے تھے۔ اب ان کو ایک ایک ہزار درہم دیئے گئے ہیں اور مجھے صرف پانسو۔ حضرت عمرؓ کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا آپ نے فرمایا "جا تو بھی ان کے باپ جیسا باپ، ان کی ماں جیسی ماں، ان کے نانا جیسے نانا، اُن کی نانی جیسی نانی، اُن کے ماموں جیسے ماموں، ان کی خالہ جیسی خالہ اور اُن کے چچا جیسے چچا لا۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ ان کے باپ علی مرتضیٰؓ، ماں فاطمہ زہرہؓ، نانا محمد مصطفیٰؐ، نانی خدیجۃ الکبریٰ، ماموں ابراہیم، خالہ ام کلثوم اور رقیہ اور چچا جعفر طیارؓ تھے۔ عبداللہ ابن عمرؓ یہ سن کر خاموش رہ گئے۔

آپ نہایت متقی اور پرہیزگار واقع ہوئے تھے۔ نماز، روزہ اور حج آپ کے پُرمعنی مشغلے تھے۔ آپ نے ایک ہزار نوافل اور پچیس حج پاپیادہ ادا فرمائے ہیں۔ آپ کی جود و سخا کا یہ عالم تھا کہ کوئی سائل آپ کے گھر سے خالی نہیں جاتا تھا۔ ایک دفعہ آپ نے ایک فقیر کو دیکھا جو دس ہزار درہم کے لئے خدا سے دعا مانگ رہا تھا۔ آپ مکان تشریف لا کر دس ہزار درہم غلام کے ہاتھ روانہ فرما دیئے۔

آپ بہت سادہ طبیعت واقع ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ چند فقراء کھانا کھا رہے تھے انھوں نے آپ کو مدعو کیا آپ نے ان کی دعوت رد نہیں کی بلکہ اُن کے ساتھ شریک ہو گئے اور فرمایا کہ متکبر لوگوں کو خدا دوست نہیں رکھتا۔

آپ کی کتابِ زندگی کے اوراق کا مطالعہ کرنے سے یہ بات مشاہدہ میں آتی ہے کہ آپ کی ہستی تمام صفاتِ حسنہ کا مجسمہ تھی۔ اور اچھی صفات اور خوبیوں کے مجسمہ کا نام حسینؓ تھا۔ آپ نے حق کے لئے جان دی اور قیامت تک آپ کی شہادت کی یاد منائی جائے گی۔

محمد رفیع الدین فاروقی آرزو

حضرت امام حسین علیہ السلام کے حالات اور ان کی شہادت کے سانحہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنی ہوں تو دفتر سب رس سے محرم نامہ منگا لیجئے۔ بتیس زیادہ صفحات۔ ۵ تصاویر۔ مجلد قیمت ۲ عہ ۶ ہر مسلمان گھر میں سب رس کے محرم نامہ کی ایک جلد ضرور ہونی چاہیئے۔

عقل کی آنکھ

ایک بادشاہ اپنی تھوڑی سی فوج اور وزیر کے ساتھ شکار کو نکلے یعنی کا غلام بھی ہمراہ تھا۔ چلتے چلتے شہر سے دور جنگل میں نکل گئے۔ انھیں وہاں ایک ہرن دکھائی دیا۔ بادشاہ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ہرن کو زندہ گرفتار کرنا چاہئے۔ چنانچہ ہرن کے پیچھے گھوڑا دوڑایا جب ساتھیوں سے دور نکل گیا تو وہ ایک چوراہے پر پہنچا۔ وہاں ایک نابینا شاہ صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے شاہ صاحب سے پوچھا کہ شاہ صاحب کیا ادھر سے کوئی جانور گیا ہے۔ شاہ صاحب نے کہا کہ ہاں بادشاہ سلامت ابھی ابھی ادھر سے ایک ہرن پورب کی طرف گیا ہے یہ سنتے ہی بادشاہ اسی جانب کو چل دیا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد بادشاہ نے ہرن کو گرفتار کر لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد وزیر اور غلام بھی بادشاہ سے آملے۔ جب تمام ایک جگہ جمع ہوئے تو بادشاہ نے وزیر سے پوچھا کہ چوراہے پر جو نابینا شاہ صاحب بیٹھے ہیں انھیں یہ کیونکر معلوم ہوا کہ میں بادشاہ ہوں اور انھوں نے جانور کا نام بھی بتا دیا۔ وزیر نے کہا حضور میں خود حیران ہوں۔ میرے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ انھوں نے مجھے وزیر کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ غلام نے بھی دست بستہ ان باتوں کی تصدیق کی۔ اب تو بادشاہ کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ وزیر اور غلام کو ساتھ لے کر چوراہے پر پہنچا۔

بادشاہ :- شاہ صاحب آپ کی بعض باتوں نے مجھے حیران کر رکھا ہے۔ براہ کرم میرے سوالوں کا صحیح صحیح جواب دیجئے۔

شاہ صاحب :- حضور شوق سے فرمائیں۔ میں آپ کے سوال کے جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

بادشاہ :- آپ تو نابینا ہیں آپ کو کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی پھر یہ کیسے معلوم ہوا کہ ادھر سے جانے والا جانور ہرن ہی تھا؟۔

شاہ صاحب :- حضور عالی یہ ظاہر ہے کہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا مگر عقل سے انسان بہت کچھ معلوم کر سکتا ہے۔ ادھر سے جانے والا جانور چوکڑی بھر رہا تھا اور میں جانتا ہوں کہ ہرن دوڑتے وقت چوکڑی بھرتا ہے۔

بادشاہ :- شکریہ! مہربانی فرما کر اب یہ بھی بتا دیجئے کہ آپ نے کس طرح جانا کہ میں بادشاہ ہوں۔

شاہ صاحب :- یہ بھی میں نے صرف عقل کی رہنمائی سے معلوم کیا ہے۔ کیونکہ آپ نے مجھے شاہ صاحب پکارا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ مجھ غریب فقیر کو شاہ صاحب کہنے والا ضرور کوئی اعلیٰ ظرف انسان ہے ہو نہ ہو یہ کوئی بادشاہ ہے اس لئے میں نے آپ سے اسی طرح گفتگو کی جیسے بادشاہ سے کی جاتی ہے اور بعد میں آنے والے صاحب کو میں نے اس طرح وزیر جانا کہ انھوں نے مجھ سے جن الفاظ اور انداز میں گفتگو کی وہ پہلے والے سے ذرا کم معلوم ہوتی تھی اور بادشاہ کے بعد وزیر یا اسی درجے کے کسی شخص کو آنا چاہئے تھا اس لئے میں نے انھیں وزیر صاحب کہہ کر مخاطب کیا اور تیسرا شخص جو ادھر سے گذرا اس کا انداز پہلے دونوں سواروں سے بالکل جدا اور سخت تھا۔ اس نے دور ہی سے چیخ کر پوچھا کہ ارے اندھے کیا دو گھوڑے سوار گذرے ہیں؟ میں نے اسے بتا تو دیا۔ مگر یہ بھی معلوم کر لیا کہ ایسی سختی سے بات چیت کرنے والا اور تنگ ظرف سوائے غلام کے کوئی نہیں ہو سکتا۔ شاہ صاحب کی گفتگو کا بادشاہ اور اس کے ساتھیوں پر بہت اثر ہوا۔ اور غلام نہایت شرمندہ ہوا اور سب خوش خوش گھر کو لوٹے۔

جمیلہ حامد النساء بیگم

علم کے طالب کو کیا کیا چاہیئے

علم کے طالب کو کیا کیا چاہیئے
اور کیا اس کو ہونا چاہیئے

اِن مضامیں پر ہے کچھ میرا کلام
ایک اک مصرعہ کو دیکھا چاہیئے

شرطِ اوّل ہے یہ انساں کے لئے
آدمی کا ذہن اچھا چاہیئے

یہ تو قدرت کی عنایت ہے مگر
پھر بھی ہم کو غور کرنا چاہیئے

آدمی ہر حال میں ہے آدمی
ذمہ داری اپنی دیکھا چاہیئے

علمیت ہی کا ثمر ہے تربیت
اولاً اخلاق اعلیٰ چاہیئے

معرفت پر ہے بنا اخلاق کی
ذاتِ خالق کا عقیدہ چاہیئے

پڑھنے، لکھنے کا نہیں تعلیم نام
اس سے بے شک استفادہ چاہیئے

یہ خطابت اور کتابت ہی فقط
آپ کو انسان ہونا چاہیئے

علم کے طالب کا ہے یہ فرضِ عین
عقل کی باتوں پہ چلنا چاہیئے

کیجئے گا قدر اپنے وقت کی
اقتدارِ وقت اچھا چاہیئے

اپنے اپنے وقت پر ہر کام ہو
انتظامِ وقت اچھا چاہیئے

قوتِ بازو پہ کیجئے اعتماد
اپنی ہمت پر بھروسہ چاہیئے

آڑے وقتوں میں بنیں سینہ سپر
طالب علمو ایسا شیوا چاہیئے

بادشاہِ وقت و ملت والدین
ان کا اپنے دل میں رتبہ چاہیئے

اپنے چھوٹوں سے محبت کیجئے
اور بڑوں سے جھک کے ملنا چاہیئے

آپ کی رگ رگ میں ہو حبِ وطن
ملک کا آنکھوں میں نقشہ چاہیئے

دھجیاں ہو جائے گر علم لباس
سوزنِ محنت سے سینا چاہیئے

ہے مثالِ علم پانی کی طرح
پر حصول اس کا زیادہ چاہیئے

اپنا رستہ خود بنا لیتا ہے یہ
کس طرف سے اس کو بہنا چاہیئے

زندگی میں ہے سہارا علم کا
بحرِ ہستی میں سفینہ چاہیئے

کیجئے حاصل مسلسل علم کو
ایک اک موتی پرونا چاہیئے

حسین شریف درد

وقت کی قیمت

وقت ایک قیمتی شئے ہے۔ جب تک کوئی شخص بیمار نہ ہو تندرستی کی قدر نہیں جانتا اسی طرح جب کوئی شخص وقت کو بے وجہ فضول ضائع کر کے دیگر مصائب میں گرفتار ہو جاتا ہے تب وہ وقت کی قدر کو جانتا ہے کہ یہ کیسی قیمتی شئے ہے۔ بقول شخصے:۔
"انسان کچھ کھو کر سیکھتا ہے۔" مقولہ ہذا کے مطابق جب انسان وقت کو کھو کر کوئی ناقابل برداشت تکلیف محسوس کرتا ہے۔ تب کہیں وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر وقت کی قیمت کو محسوس کرتا ہے۔ اور افسوس کرتا ہے کہ:۔ "کاش میں اس قیمتی وقت کو ضائع نہ کرتا" یہ مقولہ ہر کس و ناکس کی زبان زد ہے کہ:۔ "کمیاب شئے گراں قیمت ہوتی ہے۔" لیکن وقت اس کے برعکس ہے یعنی خدائے معظم نے وقت کو بغیر کسی قیمت کے ہر امیر و غریب کو عطا کیا۔ لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو وقت کی قدر کرتے ہیں۔ اس لئے کسی شخص کو وقت کی کمی محسوس نہیں ہوتی کیونکہ وقت کی بہتات ہے

اگر تم وقت کی قدر کو جاننا چاہتے ہو تو کسی بے تاج بادشاہ سے پوچھو یا کسی سراغ رساں سے پوچھو۔ وہ یہی کہے گا کہ:۔
"وقت چار دانگ عالم میں شل ہوا کے ہرجائی ہے لیکن بہت کم اشخاص ایسے ہیں جو وقت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔"
ایک بادشاہ ہے جو وسیع سلطنت پر حکمران ہے۔ کچھ عرصہ بعد ایک دوسرا طاقتور شہنشاہ اس بادشاہ کی ریاست پر قبضہ کر لیتا ہے۔ اور وہ بادشاہ جان کے خوف سے چھپتا چھپاتا اپنی حدودِ سلطنت سے نکل جاتا ہے۔

اس وقت اس بدنصیب دل جلے اور بے تاج بادشاہ کے مغموم دل سے یہ پر درد صدا نکلتی ہے "کاش! میں اس وقت کی قدر و منزلت کرتا جب کہ میں کئی لاکھ رعایا کا آقا تھا جب کہ میں ایک وسیع خزانہ کا مالک تھا۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ میں نے اس عزیز ترین وقت کو عیش و عشرت اور غرور و نخوت سے بسر کیا۔ میرا وہ نازک بدن جو مخملوں کے نرم و نازک بچھونوں پر رہا کرتا تھا آج فرش زمین پر ہے۔ وہ سر جو غرور و نخوت سے بھرپور تھا آج سرنگوں ہے۔ میرا وہ پُر رعب چہرہ اور وہ پُر غضب نگاہیں جب کسی ادنیٰ شخص پر پڑجاتی تھیں تو وہ لرز جاتا تھا۔ اور آج میں وہ ہوں کہ اگر دشمن کا ایک ادنیٰ سپاہی آتشیں نگاہوں سے گھورے تو میں کانپ جاؤں۔ افسوس صد افسوس کسی نے سچ کہا ہے:۔ "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں" وہ وقت جب کہ میرے دم قدم سے محفلیں آباد رہتی تھیں اور میری رعایا مجھ کو سر آنکھوں پر بٹھاتی تھی۔ ہر امیر و غریب کے دل میری عزت سے بھرپور تھے اگر میں اب بھی کروڑہا روپے پانی کی طرح بہادوں تو "وہ وقت تو اب واپس نہیں آسکتا۔" اے وقت تو بہت قیمتی ہے۔ کسی شہنشاہ کا خزانہ تیری قیمت ادا نہیں کرسکتا۔ سچ ہے! تو قیمتی ہے ہیروں سے زیادہ، شہنشاہوں کے خزانوں سے زیادہ حتیٰ کہ اے وقت تیرے سامنے دنیا کی دولت ہیچ ہے۔ تیری اتنی بہتات کے باوجود کوئی شخص تجھ کو خرید نہیں سکتا اور نہ کوئی خرید سکے گا۔
کاش! اگر کوئی شخص وقت کی قیمت کو محسوس کر کے نہایت ہی عقلمندی سے صرف کرے تو وہ بہت کچھ عروج حاصل کرسکتا ہے۔
بادشاہ کے اس کلام سے ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی شئے وقت سے زیادہ قیمتی نہیں۔ حتیٰ کہ دنیا کے کسی شہنشاہ کا خزانہ وقت کی قیمت ادا نہیں کرسکتا۔

غلام مجتبیٰ قمر (بیدشریف)

لالچ کی سزا

نسیم ایک نیک لڑکا تھا۔ ایک دفعہ وہ ٹہلنے جا رہا تھا۔ راستے میں اسے ایک قیمتی بٹوا پڑا ملا۔ بٹوہ نہایت ہی عمدہ تھا اور اس میں ایک ریشمی ڈورا پڑا ہوا تھا نسیم نے جب بٹوہ کھولا تو معلوم ہوا کہ اس میں ایک سونے کی انگوٹھی ہے۔ وہ خوش نہ ہوا بلکہ یہ خیال کر کے رنجیدہ ہوا کہ کسی راستہ چلنے والے کا قیمتی بٹوہ گر گیا ہے۔ نسیم بٹوہ لے کر سیدھا قاضی جی کے پاس گیا اور ان کے ہاتھ میں دے کر کہنے لگا کہ یہ بٹوہ جس شخص کا ہو اسے دے دیجئے۔ اتنے میں بٹوہ کا مالک جمال اپنے بٹوہ کی تلاش کے لئے اتفاق سے ادھر کو آنکلا۔ اس نے بہت کچھ تلاش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ سوچا کہ قاضی صاحب سے جا کر اپنے نقصان کی اطلاع کرنی چاہیئے۔ جمال دوڑا ہوا قاضی صاحب کے پاس گیا۔ اس وقت قاضی اور نسیم میں یہ گفتگو ہو رہی تھی۔

قاضی:۔ تم نے یہ بٹوہ کس جگہ پایا؟

نسیم:۔ میں ٹہلنے جا رہا تھا تو مجھے راستہ میں یہ بٹوہ پڑا ملا۔ میں اسے آپ کے پاس لے آیا تاکہ جس کا ہو اسے مل جائے۔

جمال نے قاضی کو اپنی طرف متوجہ کیا اور کہا کہ یہ بٹوہ میرا ہے۔ میں اس کی تلاش میں عرصے سے پریشان ہوں۔ قاضی نے نسیم کی طرف اشارہ کیا اور جمال سے کہا کہ یہ شخص میرے پاس ایک بٹوہ لایا ہے۔ بتاؤ تمہارا بٹوہ کیسا ہے۔

جمال:۔ میرا بٹوہ بالکل نیا اور قیمتی تھا اور اس میں ایک ریشمی ڈورا پڑا تھا۔

قاضی:۔ اس کے اندر کیا تھا؟

جمال نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر میں کہدوں کہ میرے بٹوہ میں دو انگوٹھیاں تھیں۔ تو نسیم کو ایک انگوٹھی اپنے پاس سے دینی پڑیگی۔ یہ سوچ کر بولا جی جناب اس میں سونے کی دو انگوٹھیاں تھیں۔

قاضی۔ جناب آپ نے سب کچھ صحیح بتلایا لیکن آپ کے کہنے کے خلاف اس میں تو صرف ایک انگوٹھی ہے۔

جمال:۔ تو جناب نسیم ہی نے ایک انگوٹھی غائب کر لی ہوگی۔

قاضی نے کہا کہ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بھلا خیال تو کرو کہ اگر اس لڑکے کو چرانا ہی ہوتا تو وہ بٹوہ میرے پاس لاتا ہی کیوں۔ تمہارے بٹوہ میں دو انگوٹھیاں تھیں۔ اور اس میں صرف ایک انگوٹھی ہے اس لئے تم اس کے مالک ہرگز نہیں ہو سکتے۔

یہ کہہ کر قاضی نے بٹوہ نسیم کو دے دیا اور جمال کو چار و ناچار گھر واپس ہونا پڑا۔ دیکھو بھائیو اور بہنو لالچ بہت بری بلا ہے۔ جمال نے اپنے ہاتھ سے اپنا بٹوہ کھویا۔

اشرف ہادی علی (محبوبیہ گرلز اسکول)

دلچسپ معلومات

(۱) دنیا میں زیادہ بارش۔ آسام میں چراپونجی کے مقام پر سالانہ ۰۰ ۵ انچ ہوتی ہے۔ (۲) سب سے زیادہ آبادی جاپان کے پایۂ تخت شہر ٹوکیو میں ہے۔ (۳) ایل روسس نے ایک ریل بنائی ہے جس کا نام ٹرانس سائبیرین ریلوے ہے۔ حسین شریف قدرو

لطیفے:۔ جج (مجرم سے) آج تم بارہویں مرتبہ عدالت میں آئے ہو اس مرتبہ ہرگز ہرگز تمہارا قصور معاف نہ ہوگا۔
مجرم:۔ حضور میں تو تیرہویں مرتبہ ہی آیا ہوں اور آپ تو روزانہ آتے ہیں۔ مرزا محمد ارشد مختار بیگ مہدی

بچوں کی تعلیم و تربیت

(آخری قسط)

نفسیات کے ماہروں کا قول ہے کہ بچہ اپنی عمر کے پہلے پانچ سال میں جتنا علم حاصل کرتا ہے اپنی آئندہ زندگی کے کسی سال میں بھی اتنا حاصل نہیں کر سکتا۔ پیدائش سے سنِ شعور تک بچہ کی دماغی حالت میں بہت سی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں اوائل زندگی کے تاثرات ہی کسی بچہ کے مزاج اور مذاق کے بنانے میں بہت موثر ثابت ہوتے ہیں۔ عموماً عہدِ طفلی ہی میں بچہ کا مذاق، مزاج، عادات و اطوار بنتے اور نشوونما پاتے ہیں اس لئے ابتدائی زمانہ میں اگر ہم بچوں کو ان کی عادات کے موافق صحیح اصول پر تعلیم دیں تو حقیقی معنوں میں انہیں انسان بنا سکتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم و تربیت ہی ایسی چیز ہے جو بچہ کے افعال، عادات و اطوار اور چال چلن کو سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ پیدائش کے وقت بچہ بالکل بے علم ہوتا ہے، البتہ تھوڑی ذہانت ضرور رکھتا ہے۔ اس کی دماغی قوتیں حواسِ خمسہ کے ذریعہ بتدریج علم حاصل کرتی ہیں اسی طرح اس کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی قوتوں کی نشوونما ہوتی ہے اور اس کے علم میں اضافہ ہونا شروع ہوتا ہے۔

ہر قوم کی ترقی اور بہبودی کا دارومدار ان کے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت اور اصلاح پر منحصر ہے۔ آج کے بچے کل کے شہری ہوتے ہیں۔ زمانہ کی رفتار اس سرعت سے ترقی کر رہی ہے کہ دنیا دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ وہ زمانہ گیا جب کبوتر اڑائے جاتے تھے، پتنگ بازی کے جلسے بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے تھے، بلبل اور مرغ لڑائے جاتے تھے۔ آج کل کے کھلونوں نے بھی مہذب شکل اختیار کر لی ہے۔ ہر زمانہ کا ایک میکانی یا مشینی پہلو ہوتا ہے۔ پتنگوں سے زیادہ بچوں کی دلچسپی کا سامان طیاروں کی پرواز میں منتقل ہو گیا ہے۔ اپنے بچوں کو ہم اب ایسے کھیل سکھائیں اور ان کے لئے ایسی تفریح کے سامان مہیا کریں جن میں تعلیم کا پہلو نمایاں ہو۔ چھوٹے بچوں کی تعلیم اب اسی طرح ہو رہی ہے۔ بچے کھیلنے کودنے پڑھنے لکھنے لگ جاتے ہیں۔ تعلیم کا یہ طرز کمسن بچوں کے نازک دماغوں پر نہایت خوش گوار ہوتا ہے۔ ابتدائی تعلیم کے یہ ڈھنگ ہر ملک میں نہایت کامیاب ثابت ہو رہے ہیں۔

بچوں سے اکثر غلطیاں ہوا کرتی ہیں۔ ان کی ان غلطیوں اور فروگذاشتوں کا مواخذہ نہایت احتیاط سے کرنا چاہیے۔ ایسے موقعوں پر غم و غصہ کا اظہار والدین کے چہروں سے ہوا کرے تو بہتر ہے۔ بچہ سے اس کی غلطیوں کا ذکر بار بار نہ کرنا چاہیے ورنہ وہ بے حس اور ڈھیٹ ہو جائے گا۔ بچہ والدین کے حرکات و سکنات کا مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ جب وہ اپنی کسی غلطی پر والدین کا چہرہ بدلا ہوا یعنی غضب ناک پاتا ہے تو اس پر ضرور اثر ہوتا ہے اور وہ از خود نصیحت حاصل کرتا ہے۔

بچوں کو ان کی شرارتوں اور غلطیوں پر کچھ اور سزائیں بھی دی جا سکتی ہیں۔ مثلاً انہیں سینما نہ دکھانا، مٹھائی چاکلیٹ وغیرہ نہ دینا، ان کے شوق کی چیزیں انہیں نہ دلانا، ان کے کھلونوں میں سے کسی ایک کھلونے کو ضبط کر لینا۔ غرض کہ سزا ہر غلطی کی حیثیت کے موافق ہونی چاہیے۔ اگر کسی بچہ پر والدین کی ناراضی اور اس قسم کی سزاؤں کا کوئی اثر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ والدین کی محبت میں تربیت نہیں حاصل کر سکتا۔ ایسے بچہ کو کسی اچھے بورڈنگ ہاؤس میں بھیج دینا چاہیے تاکہ اجنبی ماحول میں والدین کی محبت یاد آنے اور وہ اپنی غلطیوں پر پشیمان ہو کر ان سے باز آنے کا عزم کر لے۔

نوخیز لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت اس طرح ہونی چاہیے کہ وہ گھر میں عزیزوں اور بزرگوں کے ساتھ ان کے احترام اور اپنے اعلیٰ کردار کو

ہمیشہ پیش نظر رکھیں تاکہ جب وہ شباب کی حدود میں داخل ہوں تو زندگی کے اُن مراحل میں جہاں اخلاق کی پابندیاں برائے نام ہوتی ہیں اور ہوس پرستی نیک و بد میں امتیاز نہیں کرنے دیتی، ان خطروں سے بخوبی واقف ہو جائیں جن کی وجہ ان کی جسمانی اور روحانی تندرستی غارت ہو جاتی ہے۔ ان کے آس پاس کی فضا نہایت معصوم اور پاک ہو، ان کے خیالات پاکیوں اور نیکیوں کی طرف مائل کئے جائیں، ان کے دل و دماغ کو زندگی کی گندگیوں سے باز رکھا جائے اور اچھی طرح ان کے ذہن نشین کر دیا جائے کہ پاکیزگی کیا ہے اور معصومیت کو خیرباد کہنا اپنے آپ کو اقسام کی مصیبتوں اور تباہکاریوں میں مبتلا کرنا ہے۔

عام طور پر خاموش اور متین بچہ قابلِ تعریف سمجھا جاتا ہے، بچوں میں کود پھاند اور دوڑ دھوپ ایک فطری چیز ہے جو ان کے اعضاء کو بڑھاتی، جسمانی قوت میں اضافہ کرتی اور ان کی صحت و تندرستی کو بحسن و خوبی قائم رکھتی ہے، ان کی فطری امنگ ان کو اچھلنے کودنے، شور و غل مچانے، دوڑنے بھاگنے پر آمادہ کرتی ہے مگر بعض ناداں والدین ان کو ان حرکتوں سے بیجا روکتے اور سزائیں دیتے ہیں، بچوں کو کھیلنے کودنے سے روکنا ان میں بڈھوں کی فطرت پیدا کرنا اور ان کو سست اور کاہل بنانا ہے، جس سے ان کی صحت پر نہایت خراب اثر پڑتا ہے اور وہ آئے دن بیمار اور سست نظر آتے ہیں۔ اُچھل کود سے بچوں کو منع کرنا ان کو مردہ دل بنا دینا ہے اور ان کی طبیعت بجھی جاتی رہتی ہے، یہ ضروری ہے کہ ان کو بیہودہ افعال اور غیر مہذب عادات سے ضرور منع کیا جائے۔

انسان کی زندگی میں رجحانات بھی پائے جاتے ہیں اور عقل اصل بھی، یہ دونوں اپنی اپنی جگہ قائم ہیں، معلم کا فرض ہے کہ بچہ کے رجحانات کا گہرا مطالعہ کرے اور اس کے رجحانات کو صحیح راستہ پر لگائے، بچہ کا آئندہ رجحان اس کے موجودہ رجحان سے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس لئے سخت ضروری ہے کہ اس کے رجحانات میں ابتداہی سے بتدریج ایسی راست روی پیدا کر سکے وہ آئندہ قوم کا ایک بہترین اور قابلِ فخر فرد بنے۔

جب کوئی لڑکا اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوتا ہے تو اس کے والدین کو بڑی مسرت ہوتی ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا لڑکا منزلِ مقصود کی طرف جا رہا ہے اور چند سال میں بی اے یا ایم اے ہو کر کسی بڑے عہدہ پر پہنچ جائے گا۔ اس جوشِ مسرت میں انہیں اس بات کا مطلق خیال نہیں آتا کہ کالج کی گراں قیمت تعلیم پر ان کا کتنا روپیہ صرف ہو رہا ہے۔ اتنا بھی ان کا لڑکا اپنی تعلیم ختم کرکے حاصل کر سکتا ہے یا نہیں! جن اعلیٰ علمی ڈگریوں کو لڑکے اپنی منزلِ مقصود سمجھتے ہیں وہ ان کو حاصل کرنے کے بعد ایک عمیق تنگ و تاریک غار پاتے ہیں! بس یہی ان کی منزلِ مقصود ہے!! جہاں پہنچ کر وہ ٹھٹھک کر رہ جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اب کیا کریں اور کس طرح اس غار میں اپنی منزل کا پتہ چلائیں!!!

ہمیں یہ سوچنا اور غور کرنا چاہیئے کہ اس قسم کی تعلیم پر ہم اپنا روپیہ اور ہمارے لڑکے اپنی صحت و تندرستی کب تک قربان کرتے رہیں گے؟ افسوس ہے کہ ہم نے "علم" اور ضروریات زندگی کو حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تعلیم کو ہی سمجھ رکھا ہے، حالانکہ یہ ناممکن ہے کہ صرف تعلیم سے انسان اپنی زندگی کی ضرورتیں بھی پوری کر سکے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ زندگی کی ضرورتیں حاصل کرنے کے لئے ہم تعلیم کو خیرباد کہہ کر صنعت و حرفت سیکھیں یا کسی پیشہ کو اختیار کریں، ہر شخص کے لئے ابتدائی تعلیم کی سخت ضرورت ہے اس کے بعد طالب علم کے شوق اور رجحان کا لحاظ کرکے اس کو

تعلیم دینی چاہیئے ورنہ ایک ایسے لڑکے کو جس کو تعلیم حاصل کرنے کا بہت کم شوق ہو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کر کے والدین کو اپنی اقتصادی حالت تباہ کرنی چاہیئے۔ یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ ہمارے اسکول اور کالج کے استادوں اور پروفیسروں کے انتخاب کا معیار ان کی اعلیٰ قابلیت ہو! نہ کہ کاغذی اسناد!!

تعلیم کے معنی چند کتابیں رٹا دینے کے نہیں ہیں، معلم کو چاہیئے کہ بچہ میں معمولی مسائل کے سمجھنے کی قابلیت پیدا کرے اور اپنی سمجھ سے کام لینے کی عادت ڈالے، کسی مسئلہ کے سمجھانے سے پہلے بچہ کو کوشش کرنے دینا چاہیئے، اگر باوجود کوشش کرنے کے وہ کسی مسئلہ کو سلجھا نہ سکے تو استاد کو اس وقت اس کی مدد کرنی چاہیئے۔ غرض کہ معلم کو صحیح طور پر اپنی قابلیت سے بچوں کو استفادہ کرنے دینا چاہیئے تاکہ ان کی ذہنی نشوونما میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، اس کا یہ بھی فرض ہے کہ بچوں میں بلند خیالی اور عالی ہمتی پیدا کرے، تحقیق و دریافت کی قابلیت کو پامال نہ ہونے دے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان میں دلیری اور خود اعتمادی کے جذبات کو بھی بیدار رکھے، بچوں کی تعلیم کا فرض ایک معلم کے لئے ایسا مقدس اور اہم ہے کہ اس پر قوم کا سارا آئندہ وقار منحصر ہے اور ملک کی ترقی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔

مرزا سیف علی خاں

باغبان

ندی کے کنارے ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ باغ کی سطح ذرا نیچی تھی، اور کبھی کبھی برسات میں ندی کا پانی باغ کے نشیبی حصوں میں پہنچ جاتا تھا۔ پاس ہی سے سڑک گزرتی تھی، جہاں سے باغ کا منظر قابل دید تھا۔ راہ گیر جاتے جاتے ضرور نظر بھر کے پھولوں کے تختے کو دیکھ لیتے اور بچے ندی کے پل پر بیٹھ کر پھولوں پر للچائی ہوئی نظریں ڈالتے۔

ندی آہستہ آہستہ بہتی، اور درختوں کا سایہ اس پر لرزتا ہوا معلوم ہوتا، ہوا چل کر ٹہنیوں کو ہلاتی، اور پھول رقص کرنے لگتے: انسان کا تھکا ہوا دماغ دن بھر کے کام کاج کے بعد فطرت کی ان دلکشیوں میں کسی قدر لطف پاتا ہے۔

اس باغ کا مالک جب دن بھر کی محنت کے بعد اس باغ میں آتا تو اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ ہوتی۔ لیکن ایک ہستی ایسی بھی تھی، جس کو اس باغ سے بے پایاں محبت تھی۔ وہ اس باغ کا مالی تھا۔ اس باغ کا مالی جس نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے ان پودوں کو پالا پوسا تھا۔ گرمیوں میں ان کو پانی دیا تھا، دن دن بھر ان پودوں کی تراش خراش کی تھی۔ اور ان کی زندگی اور ترقی کا خیال اس کا نصب العین بن گیا تھا۔ وہ اکیلا تھا، اس کا کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ شاید کوئی دور کا عزیز ہو مگر ایسا تو کوئی نہ تھا کہ جس کی کفالت اس کے ذمہ ہو۔

اس لئے یہ باغ اس کے لئے دنیا تھا اس کی ساری محبت ان پودوں میں محصور ہو گئی تھی۔ وہ ان کو پروان چڑھتے دیکھ کر خوش ہوتا، جیسے کوئی اپنے بچوں کو پروان چڑھتے دیکھ کر خوش ہو۔ تنخواہ اس کی تن پروری کے لئے کافی تھی۔ اور اسے لے دے کر اگر کوئی فکر تھی تو صرف باغ کی۔ وہ باغ کی خدمت اس لئے نہیں کرتا تھا کہ یہ اس کا فرض تھا۔ غالباً اس نے اپنے فرض کو کبھی محسوس نہیں کیا۔ وہ پودوں کو اپنے بچے سمجھتا۔ اور ان سے محبت کرتا۔ جیسے کوئی باپ اپنے بچے سے محبت کرے۔

جب ہوا پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو کو اڑا کر پریشان کرتی تو وہ مست ہو جاتا۔ اس کے دل میں محبت کا پاکیزہ ترین جذبہ تھا۔

اور یہ اسی محبت کا اثر تھا۔ کہ وہ ان پھولوں کی خوشبو میں ایک خاص فرحت اور لذت پاتا۔ وہ اکثر محبت بھری نظروں سے ندی کو تکا کرتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ندی اس کے باغ کے پاس سے بہتی تھی اور اس کے درختوں کو پانی دیتی تھی۔ اور اس طرح اس کی زندگی مسرت، کیف اور لطف سے لبریز تھی۔ یہ سب محبت کا اثر تھا۔ اور محبت جو ہر دل میں کم و بیش موجود رہتی ہے اس کے دل میں بھی تھی اور اُسے دنیا و مافیہا سے بے پرواہ بنا چکی تھی۔

اس کا مالک جب باغ میں آتا اور باغ کی تر و تازگی کو دیکھتا تو ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا "یہ سب مالی کی محبت کا اثر ہے ہر ہر پھول سے مالی کی محبت کی خوشبو آ رہی ہے" شاید وہ اپنی محبت کو یاد کرنے لگتا جو اس کے نوجوانی کے زمانے کی بہترین یادگار تھی۔

دن گذرتے گئے۔ مالی بڈھا ہوتا گیا اور درخت تناور ہوتے گئے۔ اس کے مالک نے باغیچہ دوسرے کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ باغبان اب بہت بڈھا ہو گیا تھا۔ درختوں کو اب بڈھے کی خدمات کی ضرورت نہ تھی۔ بڈھے کے ہاتھ پیر اب درختوں کی خدمت کر بھی نہ سکتے تھے۔ حالانکہ اس کی دلی محبت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی حالت ان پرندوں کی سی تھی جو درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھ کر اور پھولوں سے مخاطب ہو کر نغمہ سرائی کرتے۔ بڈھا مالی بہت فرط مسرت سے کوئی دیہاتی راگ گانے لگتا۔ ایک دن نئے آقا نے بڈھے مالی کو بلا کر کہا "یہ لو اپنی تنخواہ۔ اب تم بڈھے ہو گئے۔ باغ تم سنبھال نہیں سکتے۔ جاؤ اور گھر بیٹھ کر اللہ اللہ کرو۔ اب تم کام نہیں کر سکتے۔ اور یہ خدا کو یاد کرنے کا زمانہ ہے۔ اور یہ لو انعام۔"

بڈھے مالی نے ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور میری ایک تمنا پوری کر دیں کیے گا؟ مرنے کے بعد میری قبر پر اس باغ کا ایک پھول ڈال دیجئے گا" یہ کہہ کر کہنہ سال باغبان نے ایک سرد آہ بھری اور لاٹھی ٹیکتا ہوا باہر نکل گیا۔ (ماخوذ)

ہوائی جہاز کی ایجاد

محمود علی

ایک زمانے میں ہوا میں اڑنا انسان کے نزدیک ایک خواب و خیال تھا۔ بیحد جو جدوجہد کوششیں اس کے لئے ناکامیابی رہی۔ لیکن سنہ ۱۷۸۳ء میں کچھ کامیابی کی صورت نظر آئی۔

مانٹ گالفیر کے دو بھائیوں نے جو ملک فرانس کے رہنے والے تھے، غبارہ ایجاد کیا۔ پہلے ان دونوں نے ابر کو اڑتا ہوا دیکھ کر غور کیا تو اس نتیجہ پر پہونچ گئے کہ اگر ایک ربر کی تھیلی میں ابر کی طرح بھانپ بھر دی جائے تو وہ بھانپ اس ربر کی تھیلی کو ہوا میں اڑا لے جائے گی۔ انھوں نے لکڑی جمع کر کے آگ سلگائی اور اس آگ کے اوپر ایک ربر کی تھیلی جس کا قطر ایک سو پانچ فٹ تھا اس میں لکڑیوں کے دھوئیں کو جمع کیا اور اس کو جب ہوا میں چھوڑ دیا تو وہ تقریباً ڈیڑھ میل تک ہوا میں بلند ہو گیا اور دس منٹ کے بعد نیچے آ گیا۔ ان دونوں نے یہ خیال کیا کہ یہ غبارہ ہوا میں اس لئے اڑا کہ اس کے اندر جو دھواں تھا وہ بہت ہلکا تھا۔ اور تھوڑے دنوں کے بعد یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ گرم ہوا سرد ہوا سے ہلکی ہوتی ہے۔ وہ تھیلا ہوا میں اس وقت تک بلند رہا جب تک کہ اس کے اندر کا دھواں گرم رہا اور جونہی اس میں خنکی پیدا ہونے لگی۔ غبارہ وزنی ہو کر نیچے آ گیا۔ اس پہلے تجربے میں یہ غلطی ہوئی تھی کہ اس میں کوئی ایسا انتظام نہیں کیا گیا کہ اندر کے دھوئیں کو

گرم رکھا جا سکے۔ یہ ہوا پر قابو پانے کا پہلا تجربہ تھا۔

دوسری کوشش سنہ ۱۷۸۳ء میں دوسرے دو بھائیوں کی۔ جن کا نام رابرٹ تھا [illegible] انھوں نے ایک غبارے میں ہیڈروجن گیاس بھر دی۔ وہ غبارہ تین ہزار فٹ بلندی پر اڑا اور تقریباً پینتالیس منٹ تک ہوا میں رہا اور ایک کھیت میں جو پندرہ میل کے فاصلہ پر تھا گر گیا جہاں کے لوگ اس غبارہ کو دیکھ کر پریشان ہو گئے اور اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

اسی سال مانٹو گالفیر ہی کے دو اور بھائیوں نے ایک اور غبارہ بنایا۔ انھوں نے ایک پنجرا اس غبارہ میں نیچے کی طرف لٹکا دیا۔ اور اس میں ایک بکرا۔ ایک مرغ اور ایک بطخ کو بند کیا جو سب سے پہلے دنیا کے ہوائی مسافر تھے۔ ان تینوں جانوروں کو کوئی صدمہ یا نقصان نہیں پہونچا صرف مرغ کا پکھوڑا کچھ زخمی ہو گیا تھا جس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس غبارے کے اڑنے سے پہلے بکرے نے اس کو ایک لات مار دی تھی۔

پہلا انسان جس نے ہوا میں پرواز کی وہ روزیر تھا جو فرانس کا رہنے والا تھا [illegible] مرتبہ [illegible] اس نے یہ ثابت کر دیا کہ غبارہ میں رہ کر اندر کی ہوا کو ایک انسان آگ روشن کر کے گرم رکھ سکتا ہے۔ فرانس کی اس ہوائی جدوجہد کی خبریں تمام یورپ میں پھیل گئیں۔ جس کے بعد ہی مختلف مقامات پر غبارے ہوا میں اڑائے جانے لگے اور رفتہ رفتہ وہ بڑے [illegible] جانے لگے اور انسان میں بھی یہ جرأت پیدا ہو گئی کہ وہ ہوا میں اڑیں۔ سنہ ۱۸۳۶ء میں لندن کے چند مشہور معزز لوگ [illegible] ہوا میں اڑے اور یہ غبارہ اٹھارہ گھنٹے ہوا میں رہنے کے بعد زمین پر اترا اور اس دوران میں اس نے ۵۰۰ میل کا راستہ طے کر لیا تھا۔ ان غباروں میں صرف یہی خرابی تھی کہ وہ ہوا کے رخ پر ہی اڑتے تھے۔ اس خرابی کو رفتہ رفتہ دور کیا گیا۔ اس طرح کہ [illegible] غبارہ کے نیچے لٹکا دی گئی۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں دو جرمن سائنس داں سات میل اونچے ہوا میں اڑے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں کونٹ زپلین ایک جرمن نوجوان نے اس طرف توجہ کی اور اس نے ہوائی جہاز بنائے جس کے ڈھانچے بہت ہلکی دھات کے تھے۔ اس کے اندر مختلف خانے بنائے گئے جن میں ہوا بھری گئی۔ یہ ہوائی جہاز بہت بڑے تھے اور ان کو زپلین کا نام دیا گیا [illegible]

جنگ عظیم میں جرمنی نے زپلین کو کثرت سے استعمال کیا ہے۔ زپلین ہوائی جہاز [illegible] انھوں نے [illegible] پر بم برسائے۔ اور اس کے ذریعہ سے فرانس اور پیرس پر بم برسائے گئے [illegible] لوگوں نے [illegible] مشین ہوا میں اڑانے [illegible] کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے پتنگوں اور چڑیوں کو دیکھا کہ کس طرح ہوا میں اڑتے ہیں [illegible] خیال پیدا ہوا [illegible] کسی طرح ہوا میں اڑنا ممکن ہے چنانچہ انھوں نے پرندوں ہی کے وضع کے ہوائی جہاز تیار کئے۔ رائٹ نے سنہ ۱۹۰۳ء میں پہلی مرتبہ ہوا میں نئے قسم کا ہوائی جہاز اڑایا۔

سنہ ۱۹۰۹ء میں بلیرٹ نامی ایک فرانسیسی نے بحیرہ انگلستان کو عبور کیا اور اس کامیابی پر ایک ہزار پونڈ کا انعام حاصل کیا۔ دس ہزار پونڈ کا انعام ایسے شخص کو دیے جانے کا اعلان کیا گیا جو لندن سے مانچسٹر تک پرواز کرے۔ اس انعام کو پالہم نامی ایک صناع نے حاصل کیا۔ اسی زمانہ سے ہوائی جہاز کو رفتہ رفتہ ترقی حاصل ہوتی گئی۔ جنگ عظیم میں ان ہوائی جہازوں سے بڑی مدد لی گئی تھی۔ اور اب بھی ہوائی جہازوں کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ وسائل حمل و نقل میں اس سے بڑی مدد مل رہی ہے ہوائی جہاز کی وجہ سے دنیا کی طنابیں بہت کھنچ گئی ہیں۔ موجودہ خرابی جو سب باقی رہ گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کو اڑنے کے لیے کافی گنجائش کی ضرورت ہے۔ فرانس کے ایک شخص نے اس خرابی کو دور کر کے تجربہ بتا دیا ہے۔ آج کل جرمنی، روس، فرانس اور امریکہ میں ہوائی جہاز بنانے کے کارخانے نہایت سرعت سے ترقی کر رہے ہیں۔

مسعود بن سعید

ن ڈپہ آصفیہ (۱۵۳)

رجسٹر نمبر (M3950)

یعنی

ادارہ ادبیات اردو کے ماہ نامہ

سب رس

کا سالگرہ نمبر بابتہ جنوری ۱۹۳۹ء

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش — سکینہ بیگم

خواجہ حمید الدین شاہد — معین الدین احمد انصاری

مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر "ادارہ" نعمت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

رجز حیات

رگوں میں خوں ہے جوش زن ابھی جواں ہے زندگی
بلند و پست دہر میں اک امتحاں ہے زندگی

مثال بحر مضطرب رواں دواں ہے زندگی
صدائے روئے حریت کا کارواں ہے زندگی

تلاش دمبدم ہی سے تو زندگی میں جان ہے
یہ زندگی کا اوج ہے یہ زندگی کی شان ہے

ارادے سب رکھو اٹل کہ تم ابھی جوان ہو
رہو قدم زنِ عمل کہ تم ابھی جوان ہو

ہو دست آہنی میں بل کہ تم ابھی جوان ہو
بنے نہ سدِ رہ جبل کہ تم ابھی جوان ہو

تلاش دمبدم ہی سے تو زندگی میں جان ہے
یہ زندگی کا اوج ہے یہ زندگی کی شان ہے

ہو سرفروش وصف شکن وطن پرست و تیغ زن
وفا شعار و ذی ہمم فدائی شہ دکن

دل قوی میں رات دن ہو یہ لگی ہوئی لگن
ضرور اک نہ ایک دن کریں گے خدمت وطن

تلاش دمبدم ہی سے تو زندگی میں جان ہے
یہ زندگی کا اوج ہے یہ زندگی کی شان ہے

زمانہ کس ادا سے پھر سناتا ہے کھری کھری
یہ زندگی ہے جاوداں نہ سمجھو اس کو سرسری

رگوں میں برق زندگی ہے لوٹ کوٹ کر بھری
ابھر رہے ہو کیوں نہ کام پر تمھیں خیال برتری

تلاش دمبدم ہی سے تو زندگی میں جان ہے
یہ زندگی کا اوج ہے یہ زندگی کی شان ہے

اٹھو اشارے کرتے ہیں فلک سے تارے بار بار
اٹھو تمھارے واسطے ہے موج آب بے قرار

حیات نو کا لایا ہے پیام ابر نو بہار
دلوں کو گدگدتی ہے ادائے حسن سبزہ زار

تلاش دمبدم ہی سے تو زندگی میں جان ہے
یہ زندگی کا اوج ہے یہ زندگی کی شان ہے

محمد عبدالسلام ذکی

ادارۂ ادبیات اردو کی مشہور و معروف کتابیں

مرقع سخن (جلد اول) حیدرآباد
کے پچیس شعرائے عہد آصفیہ کا باتصویر تذکرہ
پچاس سے زیادہ تصاویر اور چار سو سے
زیادہ صفحات مجلد قیمت صہ

مرقع سخن (جلد دوم) حیدرآباد
کے پچاس دیگر شعرائے عہد آصفیہ کا
باتصویر تذکرہ پچاس تصاویر ۴۰۰
صفحات۔ مجلد قیمت صہ

سراج سخن
انتخاب کلام شاہ سراج اورنگ آبادی
مرتبہ پروفیسر عبدالقادر سروری
معہ سوانح شاہ سراج صفحے ۱۵۲ قیمت
۱۲ / ر

ایمان سخن
انتخاب کلام خسرو محمد خاں ایمان
مرتبہ مولوی سید محمد صاحب ام۔ اے
معہ سوانح ایمان صفحے ۱۲۰ قیمت
۱۲ / ر

فیض سخن
انتخاب کلام حافظ میر شمس الدین محمد فیض
مرتبہ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
معہ سوانح فیض صفحے ۱۴۴ قیمت ۱۲ / ر

بادۂ سخن
انتخاب کلام ڈاکٹر احمد حسین مائل
مرتبہ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
معہ سوانح و تصویر صفحے ۱۱۲ قیمت ۱۲ / ر

کیف سخن
انتخاب کلام سید رضی الدین حسن کیفی
مرتبہ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
معہ سوانح و تصویر صفحے ۲۲ قیمت ۱۲ / ر

متاع سخن
انتخاب کلام نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز
مرتبہ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
معہ سوانح و تصویر صفحے ۱۲۵ قیمت ۱۲ / ر

ورڈز ورتھ اور اسکی شاعری
مشہور انگریز شاعر کے حالات اور کلام پر
تبصرہ۔ از مولوی میر حسن صاحب ام۔ اے معہ تصویر
شاعر ۱۸۴ صفحات قیمت صرف عہ / ر

ٹیگور اور ان کی شاعری
ہندوستان کے مشہور شاعر رابندر ناتھ
ٹیگور کے حالات اور کلام پر تبصرہ
از مولوی مخدوم محی الدین صاحب ام۔ اے معہ تصویر
شاعر صفحات (۱۲۸) قیمت صہ / ر

یوسف ہندی قید فرنگ میں
مرزا غالب کی قید فرنگ کے حالات
مرتبہ۔ مولوی حسن بن شبیر صاحب
بی اے۔ ال ال بی صفحات (۸۰) قیمت

ہوش کے ناخن (ڈرامہ)
حیدرآباد کی سماجی زندگی کا خاکہ
مصنفہ مخدوم محی الدین و میر حسن صاحبان
صفحات (۹۶) قیمت عہ

نذر ولیؔ
ولیؔ اورنگ آبادی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر
تفصیلی مضامین کا مجموعہ از لطیف النساء بیگم
بی اے نجم النساء بیگم بی اے نعیم النساء بیگم بی اے
جہاں بانو بیگم بی اے صفحے ۲۴۵ قیمت عہ / ر

نقد سخن
کلام فانی پر نواب عزیز یار جنگ بہادر
عزیز کی تنقیدوں کا مجموعہ
قیمت عہ

گریہ و تبسم
صاحبزادہ میکش
کی نظموں
کا مجموعہ قیمت مجلد عہ

مشاہیر قندہار دکن
دکن کے مشہور قدیم قصبہ کی دلچسپ
باتصویر تاریخ
از اکبر صدیقی بی اے
قیمت عہ

من کی دنیا
نوجوان انشا پرداز رشید قریشی
کے
ولولہ انگیز افسانے مجلد قیمت عہ

مدراس میں اردو
مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی
کی
محققانہ تالیف صفحات ۲۰۰
مجلد قیمت عہ

نذر دکن (باتصویر)
دکن کے متعلق خواتین دکن کے نتائج قلم
معہ عکس تحریر و تصاویر۔
صفحات ۲۰۰ مجلد قیمت عہ

محرم نامہ
شہادت کربلا کے متعلق دلچسپ
معلومات باتصویر مجموعہ
صفحات ۱۱۲ مجلد قیمت عہ

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ پروفیسر ادبیاتِ اردو جامعہ عثمانیہ کی معرکۃ الآرا کتابیں

اردو کے اسالیبِ بیان

اردو نثر نگاری کی تاریخ انشاپردازوں کی نثر کے اسلوب اور ان کی خصوصیات پر تبصرہ جدید اردو نثر کے رجحانات اور مستقبل کے متعلق مشورے

طبع سوم ۱۷۹ صفحات قیمت ۴؎ عہ

اردو شہ پارے

آغازِ اردو سے ولی اورنگ آبادی تک کے اردو ادب (نظم و نثر) کا محققانہ تذکرہ معہ نمونۂ کلام۔ قدیم شعراء اور مصنفین کی اردو کی نایاب تصاویر بڑی تقطیع

۴۰۰ صفحات مجلد قیمت ۴؎ لعہ

روحِ تنقید

فن تنقید پر اردو ادب کی واحد مستند کتاب جو مختلف جامعات کے نصابِ تعلیمی میں شامل ہے۔ طبع سوم

صفحات ۲۹۰ قیمت ۲؎ عہ

تنقیدی مقالات

روحِ تنقید کا دوسرا حصہ اردو کے بہترین ادبی کارناموں پر بلند پایہ تنقیدیں طبع دوم

۲۹۶ صفحات مجلد قیمت ۲؎ ۸

عہدِ عثمانی میں اردو کی ترقی

گزشتہ ربع صدی میں اردو نے جو ترقیاں کی ہیں ان کا مفید اور مکمل تذکرہ جامعہ عثمانیہ کی مستند تاریخ حیدرآباد کے جملہ خدمت گزارانِ اردو کی خدمات پر تبصرہ۔ ۲۸۶ صفحات مجلد قیمت عہ

محمود غزنوی کی بزمِ ادب

غزنین کی فارسی شاعری اور وہاں کی ادبی و علمی چہل پہل کا مبسوط تذکرہ

صفحات ۱۱۰

قیمت عہ

ہندوستانی لسانیات

اردو زبان کا لسانی تجزیہ و تشریح اپنے فن میں اردو کی پہلی کتاب اردو ہندی جھگڑے کی تاریخ

قیمت عا

ہندوستانی صوتیات

(بزبانِ انگریزی)

اردو زبان کا صوتی تجزیہ و تشریح جدید ترین عملی صوتیاتی آلات اور گراموفون کے نتائج کے بہتر فوٹو قیمت ۴؎ عا

فنِ انشاپردازی

مضمون نگاری اور انشاپردازی کے راز اور فنِ تحریر میں کامیابی کے عملی طریقے انشاپردازی میں کامیابی حاصل کرنے کے وسائل صفحات ۱۱۶

قیمت عہ ۴؎

طلسمِ تقدیر

زوالِ گولکنڈہ کے وقت کا نیم تاریخی افسانہ

طبع سوم صفحات ۶۶

قیمت ۸

سیرِ گولکنڈہ

۱۶ افسانے۔ ۱۲ تصاویر۔ گولکنڈہ کی زندگی کے مختلف پہلو افسانوں کی شکل میں تعلقِ بنا ہوں کی مختصر تاریخ صفحات ۱۲۰ قیمت ۱۵

گولکنڈے کے ہیرے

۱۰ افسانے ۸ تصاویر

سیرِ گولکنڈہ کا دوسرا حصہ گولکنڈہ کے آخری دور کے متعلق نیم تاریخی افسانے

صفحات ۱۳۶ قیمت مجلد ۱۲

دفتر سب رس۔ رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہیں

حیدرآباد، اضلاع، اور برطانوی ہند سے دفتر سب رس کو ادارہ ادبیات اردو کی مطبوعات کے علاوہ عام اردو ادب اور خاص کر دکن کی مطبوعات فراہم کرنے کے لئے فرمائشیں وصول ہوتی ہیں لیکن ابھی دفتر نہیں چاہتا کہ ایک مکمل اردو بک ڈپو کے انتظامات کی ذمہ داری لے۔ تاہم اہل ذوق اصحاب کے اصرار پر حیدرآباد کے خاص خاص اور مشہور و معروف مصنفین و شعراء کی کتابیں دفتر سب رس میں فروخت کے لئے حاصل کی گئیں اور خواہشمند اصحاب کے یہاں روانہ کی جاتی ہیں۔ دوسرے اہل ذوق اصحاب کی اطلاع کے لئے بھی ذیل میں ان کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے جو سب رس کتاب گھر سے عام بازار کی قیمت پر حاصل کی جاسکتی ہیں۔

تصنیفات حضرت حکیم الشعراء سید احمد حسین امجد

کتاب	قیمت
رباعیات امجد حصہ اول	عمہ
رباعیات امجد حصہ دوم	عمہ
ریاض امجد حصہ اول	عہ
ریاض امجد حصہ دوم	عہ
خرقۂ امجد سی پیوند	عہ
نذر امجد	۶ر
حج امجد	عاں ۸ر
میاں بیوی کی کہانی	۸ر
حکایات امجد	عہ
جمال امجد	ے
گلستان امجد	ے

کلام استاد سخن نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

کتاب	قیمت
ارمغان عزیز	عاں
متاع سخن	۱۲ر

تصنیفات ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور

کتاب	قیمت
اردو کے اسالیب بیان	عمہ ۸ر
اردو شہ پارے	ے ۸ر
روح تنقید	عمہ ۱۲ر
تنقیدی مقالات	ے ۸ر
عہد عثمانی میں اردو کی ترقی	عمہ ۸ر
محمود غزنوی کی بزم ادب	عہ
ہندوستانی لسانیات	عاں
ہندوستانی صوتیات (انگریزی)	عاں ۸ر
فن انشاء پردازی	عہ ۸ر
طلسم تقدیر	۸ر
سیر گولکنڈہ	۱۵ر
گولکنڈے کے ہیرے	۱۱ر

تصنیفات و تالیفات پروفیسر عبد القادر صاحب سروری

کتاب	قیمت
دنیائے افسانہ	عمہ
کردار اور افسانہ	عمہ ۸ر
جدید اردو شاعری	عاں ۸ر
حیدرآباد کی تعلیمی ترقی	عہ
چینی اور جاپانی افسانے	۶ر
انگریزی افسانے	عمہ ۸ر

کلام سید محمد حسین صاحب آزاد

کتاب	قیمت
خیالات آزاد جلد اول	عمہ ۸ر
خیالات آزاد جلد دوم	عہ

تصنیفات و تالیفات مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی

کتاب	قیمت
یورپ میں دکنی مخطوطات	للعہ
دکن میں اردو	ے ۸ر
خواتین عہد عثمانی	عمہ ۸ر
حضرت امجد کی شاعری	۱۲ر
مکتوبات امجد	۱۲ر
رہبر سفر یورپ	۱۲ر
ذکر نبیؐ	۱۲ر

تصنیفات و تالیفات مولوی سید محمد صاحب ایم، اے

کتاب	قیمت
ارباب نثر اردو	عاں
گلشن گفتار	۱۲ر
مثنویات میر	عاں
ابتدائی فارسی	۱۲ر
یادگار دکنی	عاں

ان کے علاوہ ادارۂ ادبیات اردو کی جملہ کتابیں بھی سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہیں

ـب رس

نمبر

ادبیات اردو

نشان ڈپہ آصفیہ (۱۵۳)

رجسٹر نمبر (M3950)

مُرقّعِ دکن

یعنی

ادارۂ ادبیات اُردو کے ماہنامہ

سب رس

کا سالگرہ نمبر بابتہ جنوری ۱۹۳۹ء

زیر نگرانی

ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زورؔ

مجلس ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکشؔ

سکینہ بیگم

خواجہ حمید الدین شاہدؔ

معین الدین احمد انصاری

مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر "ادارہ" خیریت منزل پنجہ شاہ حیدرآباد سے شائع ہوا

تعداد صفحات ۲۰۰، تعداد تصاویر ۶، قیمت عالم

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہ ادارہ ادبیات اردو کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہ ہوں گے

(۳) اُردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کرکے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اُردو میں نقل کرکے اُردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی پی یا دی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے	چار روپے	دو روپے	چھ آنے
بیرون بلدہ	چار روپے آٹھ آنے	دو روپے بارہ آنے	سات آنے

بچوں کے سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے	ایک روپیہ	دس آنے	ڈیڑھ آنہ
بیرون بلدہ	ایک روپیہ آٹھ آنے	بارہ آنے	دو آنے

محرم نمبر ۱۲ ؍ اقبال نمبر عہ ؍ دکن نمبر ۱۱

سب رس کی خریداری اس میں اشتہارات کی طباعت اور ادارہ ادبیات اردو کی رکنیت یا اس کے مطبوعات کی خریداری کے سلسلے میں جو اصحاب صدر دفتر (رفعت منزل خیریت آباد) سے گفتگو یا مراسلت نہیں کرسکتے وہ حسب ذیل اصحاب سے گفتگو یا مراسلت کرسکتے ہیں۔

بلدہ (۱) مسٹر ایس اے کریم نمائندہ خصوصی بیلہ پورہ قریب مکان حکیم محمود صمدانی مرحوم (۲) مسٹر ایس پی اننتا۔ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ (۳) رحمان کا ٹمبا گھانسی بازار۔ **اضلاع** مسٹر محمد فخرالدین ازماں (روضۂ شیخ) گلبرگہ شریف ان کے علاوہ نور احمد صاحب عثمانیہ ادارہ کی طرف سے علمی و ادبی دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے یہاں ادارہ کی کتابیں اور رسالے لے کر آئیں گے۔ توقع ہے کہ علم دوست اصحاب ضرور ان کی مدد کریں گے۔

سب رس مرقع دکن نمبر جنوری ۳۹ء

فہرست تصاویر

اعلیٰحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

حضرت الاشان نواب اعظم جاہ بہادر شہزادۂ برار

کرنل نواب مکرم جاہ بہادر مقابل صفحہ (۴)

سلاطین آصفی

وزرائے آصفی

امرائے آصفی

دیگر تصاویر

تعداد صفحات ۲۱۶ - تعداد تصاویر ۷۸ - قیمت عللہ

سب رس مرقع دکن نمبر جنوری ۳۹ء

فہرست مضامین

ادارۂ ادبیات اردو کی چند

قابل دید کتابیں

نذر ولی۔ حضرت ولی اورنگ آبادی کی خدمت میں نذر عقیدت قیمت مجلد (عاں)

گریہ و تبسم۔ حیدرآباد کے نوجوان شاعر صاحبزادہ میکش کے کلام کا مجموعہ قیمت مجلد (عاں)

[illegible]۔ دو جلدیں۔ حیدرآباد کے پچھتر شعرا کا باتصویر تذکرہ فی جلد مجلد (عمہ)

من کی دنیا۔ نوجوان انشا پرداز رشید قریشی کے ولولہ انگیز افسانے (عہ)

ہز ہائینس والا شان نواب اعظم جاہ بہادر

ولی عہد سلطنت آصفیہ و شہزادہ برار

اپنے فرزند ارجمند شہزادہ کرنل نواب مکرم جاہ بہادر کے ساتھ

مدحِ خواجہ

معین الدینؒ ہیں قطب الدینؒ سے شاد — تو قطب الدینؒ فرید الدینؒ سے شاد

فرید الدینؒ نظام الدینؒ سے خوش — نظام الدینؒ نصیر الدینؒ سے خوش

نصیر الدینؒ مرے ممدوح سے شاد

مرے ممدوح کا تو نام رکھ یاد

مُطیع مصطفےٰ سیّد محمدؐ — مُطاعِ باصفا سیّد محمدؐ

دوئی کیسی؟ یہ ہے فردِ یگانہ — مری نظروں میں ہے قطبِ یگانہ

اُدھر جو ہے وہی ضو پاش اِدھر ہے

نمودِ خواجہ ہر سُو جلوہ گر ہے

سمجھ کا دور ہو جائے اگر پھیر — تو کلبرگہ کو بھی تو سمجھے اجمیر

غرض تنویرِ خواجہ دیدنی ہے — جدھر دیکھو اسی کی روشنی ہے

نگاہِ عارف ان جلووں کی جویا

مری نظریں بھی خوش ان سے ہیں گویا

دکھاتا ہے یہ سلطانِ طریقت — مجازی شان میں شانِ حقیقت

نزول اچھا عروج اچھا ہے اس کا — سلوک اس شان سے کامل ہے کس کا

جو یہ شہباز ہو مائل بہ پرواز

کھلے تشبیہ سے تنزیہ کا راز

عیاں خواجہ کی ہے بندہ نوازی — نہیں کس کو امیدِ سرفرازی

سلیمانِ دکن عثمان علی خاں خلد اللہ ملکہ — فروغِ مدعائے آصفستاں

مرے خواجہ کے رُخ سے سب کا ہے ضو

دکن افروز ہے خواجہ کا پرتو

علی منظور

۱؎ غریب نواز ۲؎ بختیار کاکی ۳؎ گنج شکر ۴؎ سلطان المشائخ ۵؎ چراغ دہلی ۶؎ بندہ نواز [illegible]

سید سراج الدین صاحب ام۔ اے۔ سید محمد اکبر وفا قانی صاحب بی۔ اے۔ ال ال بی۔ عبد القادر سروری صاحب ام۔ اے۔ ال ال بی اور سید محمد صاحب ام۔ اے۔ ہر طرح سے مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے نہ صرف خود کام کیا بلکہ دوسروں سے بھی اچھے تاریخی مضامین لکھوائے۔ مولوی غلام احمد خاں صاحب صوبہ دار اورنگ آباد کی علمی دلچسپی کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ انھوں نے نہ صرف اورنگ آباد پر مضمون لکھ بھیجا بلکہ وہاں کے مختلف مناظر اور تاریخی مقامات کی تصاویر بھی روانہ کیں۔ جن میں سے بعض اس مرقع میں یا بچوں کے دکن نمبر میں شامل ہیں اور بعض آئندہ نمبروں میں چھپیں گی۔

سب رس کے ناظرین یہ معلوم کرکے خوش ہوں گے کہ حیدرآباد کے مشہور آرٹسٹ مسٹر نیومن نے جس طرح اس شمارہ کے لئے عبدالرزاق لاری کی تصویر بنادی ہے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ بھی سب رس کو اپنے حسن کارانہ کمالات سے مستفید کرتے رہیں گے

سید محمد اکبر وفا قانی صاحب اور مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب نے بھی سب رس کے ہر شمارہ میں کسی نہ کسی مضمون کی تیاری اور اشاعت میں مدد دینے کا ذمہ لیا ہے۔ اگرچہ وقت کی تنگی کی وجہ سے لاری کی تصویر رنگوں میں چھاپی نہ جاسکی تاہم یہ تصویر اپنی تاریخی اہمیت اور ایک مشہور مصور حسن کار کا نتیجۂ قلم ہونے کی وجہ سے قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ عبدالرزاق لاری نے تنہا اس وقت مغل فوج کا مقابلہ کیا جب غداروں کے دروازہ کھول دینے کی وجہ سے مغل فوج قلعہ میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ لاری کو عین وقت پر اس کی اطلاع ہوئی اور وہ کھلے ہوئے دروازے کے سامنے مقابلہ کرتا رہا یہاں تک کہ زخموں میں چور ہوگیا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

اس سب رس میں ایک چیز کی کمی محسوس ہوئی ہوگی۔ سب مضامین اور نظمیں مردوں ہی کے ہیں۔ صنفِ نازک کو اس میں سوائے بچوں کے حصہ کے کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے۔ ایسا عمداً کیا گیا۔ کیونکہ ادارہ کے شعبہ نسواں نے تصفیہ کیا تھا کہ وہ اپنا نمبر علیحدہ شایع کرے گا۔ اس لئے جملہ مضامین معتمد شعبۂ نسواں اور سب رس کی مجلس ادارت کی رکن محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کے یہاں روانہ کر دیے گئے۔

انھوں نے ان سب مضامین کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کرلیا اور خواتین دکن کے دلچسپ اور مفید مضمونوں اور نظموں کا یہ مجموعہ اب نذر دکن کے نام سے شایع ہو رہا ہے۔ اور غالباً پندرہ جنوری تک قدردانوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔ نذر دکن اپنی قسم کی واحد اور قابل دید کتاب ہوگی۔ اور سب رس کے سالانہ خریداروں کو نصف قیمت پر دی جائے گی کیونکہ وہ دراصل سب رس ہی کا ایک حصہ ہے۔

نذر دکن کے علاوہ شعبۂ نسواں کی طرف سے قریب میں اور کتابیں بھی شایع ہوں گی۔ توقع ہے کہ یہ شعبہ ملک کی علم دوست خاتونوں کے تعاون کی وجہ سے خاطر خواہ کامیاب ہوگا۔

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس عاملہ نے حسب ذیل اصحاب کو اُن کی علمی و ادبی دلچسپیوں اور ادارہ کے کاموں میں خلوص کے ساتھ ہاتھ بٹانے کے پیش نظر ادارہ کا رفیق منتخب کیا ہے۔

محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ (داعی شعبۂ نسواں)، مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری ام۔ اے۔ بی ایس سی آنرز (داعی شعبۂ زبان) مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ام۔ اے۔ ایچ سی ایس (داعی شعبۂ تراجم) اور نواب کیقباد جنگ بہادر

توقع ہے کہ سب رس کا دوسرا سال نئے انتظامات اور خاص اہتمام کے باعث پہلے سال سے زیادہ کامیاب ثابت ہوگا۔

زورؔ
سید محی الدین قادری

اور ترقی کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے ہیں چنانچہ انجمن خواتین حیدرآباد کی سرگرم کوششیں اس کا بدیہی ثبوت ہیں۔ اسی طرح سے اعلیٰحضرت نے اپنے بھائی صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر کو جدید تعلیمی کمیٹی کا صدر اعلیٰ مقرر فرمایا ہے۔ جن کی صدارت میں بہت کچھ مفید کام کیا جا رہا ہے۔ غرض ۸۲ ہزار مربع میل سے زائد رقبہ ملک پر اعلیٰحضرت کے نام کا سکہ جاری ہے۔ اور تقریباً ڈیڑھ کروڑ رعایا قانون آصفی کے تحت عدل و انصاف سے مستفید ہو رہی ہے۔

صرف خاص مبارک، پائیگاہوں، جاگیرات، اور مستاجروں کے قطع نظر محض علاقہ دیوانی کی آمدنی اس وقت (۹) کروڑ روپے سالانہ سے زیادہ ہے جس کی وجہ سے خزانہ معمور ہے اور قوم سازی کے بہت سے کام ہو رہے ہیں۔ زراعت پیشہ طبقہ کی مشکلات کو بڑی حد تک دور کیا گیا ہے۔ صنعت و حرفت کی ترقی کی طرف بھی خاص توجہ کی گئی ہے۔ چنانچہ اس وقت بہت سی صنعتیں جاری ہیں اور بعض بڑے بڑے کارخانہ جات کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ اسی طرح تجارت کیا بلحاظ درآمد اور کیا بلحاظ برآمد ترقی پر ہے۔

اعلیٰحضرت بندگان عالی کی سرپرستی اور فیاضی کا یہ عالم ہے کہ ریاست کے باہر بھی جو باشندے یا جو ادارے مستحق ہیں ان کو یہاں سے مالی امداد دی جاتی ہے مختصر یہ کہ حیدرآباد قدیم اپنی روایات برقرار رہیں اور بعض امور میں حیدرآباد دوسری ریاستوں اور برطانوی ہند سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے جیسا کہ انتظامی اختیارات کی علحدگی کا مسئلہ ہے۔ اس پر اکتفا نہیں بلکہ اس وقت دستوری اصلاحات کے نفاذ اور مزید معاشی ترقیات کی تحریکات پر غور کیا جا رہا ہے۔

آخر پر اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ مبارک دور عثمانی کا سب سے اہم اور لافانی کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے جہاں سارے علوم و فنون کی تعلیم ملک کی عام فہم اور سرکاری زبان یعنی ہندوستانی (اردو) کے ذریعہ دی جاتی ہے۔

اس پچیس سال کے عرصہ میں جامعہ عثمانیہ نے جو ترقی کی ہے اور اس کو اندرون و بیرون ملک جو غیر معمولی کامیابی اور عام مقبولیت نصیب ہوئی ہے وہ تاریخ میں اپنی آپ نظیر ہے ؎

زندہ کردی چوں مسیحا علم و فن را در دکن
زندہ باش اے حضرت عثمان علی خاں زندہ باش

میر محمود علی

سب رس کے گذشتہ سال کے پرچے

سب رس کے گزشتہ پرچوں کی ابھی سے مانگ بڑھ گئی ہے۔ نومبر اور ڈسمبر کے پرچے اصلی قیمت میں خریدے جائیں گے۔ اگر کسی صاحب کے یہاں اچھی حالت میں ہوں اور وہ ان کو نکالنا چاہتے ہوں تو دفتر کو مطلع فرمائیں۔ دوسرے مہینوں کے پرچوں کو بھی حفاظت سے رکھیے۔ آئندہ طلب کیے جائیں گے۔

مہتمم

تمدنِ ہند میں دکن کا رتبہ

تاریخ ہند کی یہ عملی حقیقت ہے کہ دکن تہذیبِ ہند کا تنہا محافظ ہے۔ اس حقیقت کو ہم حال و مستقبل کے آئینہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ وہ تاریخ ہند جو انگریزی اقتدار کا ذریعہ بنی ہوئی ہے، ہمارے ماضی کی تقسیم فرقوں کی سرخیوں سے کرتی، اور اس تنگ نظری کی وجہ سے تاریخ کا تہذیبی پہلو اجاگر نہیں ہوتا۔ ایک وطن پرست تہذیبی تقسیم کے لحاظ سے ہندوستان کو ان عنوانات کے تحت مطالعہ کر سکتا ہے۔ ویدوں کا دور، مثنویوں کے ذریعے ہندوستان ماسبق کی تہذیب، گوتم بدھ کا ہند، ہند کا نشاۃ ثانیہ، اور آخر میں وہ تہذیب جو ویدانت اور توحید کے تخیل سے پیدا ہوئی۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس دوسری تقسیم کے تحت ہندوستانی تہذیب میں دکن کی اہمیت پر روشنی ڈالیں۔

آریائی قوم دنیا کی ان بڑی اقوام میں سے ہے جس نے ایک خاص رنگ اور نہج کی تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ انسان، کائنات اور ان سب کے خالق کے متعلق ان کے نظریوں نے دیومالے پیدا کئے، اور یہی دیومالے ایک ایک تمدن کی بنیاد بن گئے۔ مغرب میں یونان اور مشرق میں ہند۔ یہاں پر چونکہ آریائی تمدن سے اصل بحث نہیں ہے اس لئے مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ آریائی تہذیب نے چار ورن کی معاشرتی تنظیم کے ذریعے ایک مستقل تمدن پیدا کیا۔ دکن نے اس تمدن کے ابتدائی خط و خال کو خوب جذب کیا۔ افسانوی دور میں رامائن کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شہ کار مثنوی کا ایک نمایاں ہیرو ہنومان ہے۔ دکن کا یہ راجہ رام کو مدد دیتا ہے۔ صداقت کی تلوار [illegible] ہے اور مظلوم عورت یا آریہ ورت کی [illegible] کو دشمنوں سے چھڑا لاتا ہے اور اس کے صلہ میں آریا اس کو دیوتا بنا دیتے ہیں۔ لیکن اس واقعے سے یہ ثابت ہے کہ دکن نے اپنی جگہ میدانوں میں بسنے والے خود [illegible] اور دوسروں کو اپنے [illegible] آریاؤں کو اپنی انسانیت سے منوایا اور اپنی تمدن نوازی کو ثابت کیا۔ اس کے بعد دوسری بڑی مثنوی مہابھارت ہے۔ اس میں بھی دکن نمایاں ہے۔ پانڈوؤں کا دیس نکالا ہوتا ہے تو دکن میں پناہ ملتی ہے اور دوارکا کا روحانی دربار کا راجہ پانچ بھائیوں کو [illegible] پیش آتا ہے۔ یہ زمانے صحیح لیکن ان کا اثر دکن پر دیکھئے کہ یہاں کا ایک ایک مقام انہیں مثنویوں کی وجہ سے مقدس بن گیا۔ مندرجہ تیرتھ [illegible] ہوتے تھے۔ ان تعداد شکل میں پیدا ہوگئے۔ وہ مقام جہاں رام، سیتا اور لکشمن پہنچے مقدس بن گیا اور وندھیاچل سے لے کر [illegible] تک ویدک تہذیب کے مختلف اور مستقل ادارے پیدا ہوگئے۔ جنھوں نے آریاؤں کا مذہب، فلسفہ، علم، ادب، شاعری اور جملہ شعبہ ہائے فن کاری کو [illegible] اور [illegible] متبدل بنا دیا۔ اس طرح بیدر نل دمینتی کے لافانی عشق کی وجہ سے امر بن گیا۔

افسانوں سے نکل کر جب ہم تاریخ پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم سے دکن بیرونی حملوں سے محفوظ رہا اور اکثر اوقات یہی ہوا ہے کہ دکن نے شمالی ہند کے میدانوں پر بھی اپنا سیاسی اقتدار جما لیا

بدھ مذہب وہ پہلی روحانی تحریک ہے جس نے آریاؤں کی طبقہ واری تقسیم اور آریا و غیر آریہ کے عصبی فرق مدارج کو دور کر کے ہندوستان کو ایک قومیت میں لانے کی کوشش کی۔ لیکن دکن باوجود اشوک کی کامیابی کے اس ہمہ گیر تحریک کو [illegible] تہذیبی حد تک قبول [illegible] اپنی روایت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود بدھ حسن کاری کے خزانے کے ایلورا، اجنتا دکن میں ہونے کے وہ بدھ تمدن کے تحت آریائی تہذیب کو معدوم نہ ہونے دیا اور جب کبھی موقع ملا تو پھر دکن نے قدیم ہندو عصبیت اور طبقہ واری تمدن کو تمام ہندوستان پر مسلط کر دیا۔ شنکر اچاری کی تحریک حقیقت میں دکن کے بدھ مت پر روحانی فتح تھی۔ یہ دکن کا نشاۃ ثانیہ ہماری موجودہ بحث کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ ہندوستان کا یہ سطح مرتفع نہ صرف بلند ہے بلکہ تہذیب دکن کا سپہ دار بھی ہے۔

اس کے بعد وہ دور آتا ہے جب کہ ہندوستان قدیم اور ایشیا کا وہ تمدن جو عرب کی سرزمین سے نکل کر پورے تمدن عالم پر محیط ہوگیا۔ ہندوستان میں ضیا پاشیاں شروع کرتا ہے۔ اسلام ایک ایسا ہمہ گیر سیل رواں ہے جو جگہ، مقام اور حالات کے لحاظ سے بظاہر اپنی شکل کو تو بدلتا ہے، لیکن فطرت نہیں بدلتا۔ ہندوستان میں بھی اس نے یہاں کی تہذیب میں آکر ایک نیا روپ اختیار کیا اور ایک مستقل اور ہندوستانی تہذیب کی بنا ڈالی۔ دکن میں سب سے پہلے مسلمان جن کو تہذیبی اعمال کا موقع ملا وہ ترک ہیں۔ جو ہندوستان کی تاریخ میں غلام خاندان کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ترکان دکن نے اس سرزمین کی تہذیب میں ایک چیز کا اضافہ کیا۔ موسیقی، رنگ کاری، آذری یہاں پہلے ہی سے موجود تھی۔ لیکن پرشکوہ تعمیر کاری کا رواج ترکوں سے شروع ہوا اور دنیا کی سب سے بڑی گنبد بولی گنبد بیجاپور پر ختم ہوا۔ اس دور میں علاوہ اور چیزوں کے ہندوستانی قومیت کے لئے وہ انمول شئے پیدا ہوئی جس کو قومی زبان کہتے ہیں اور پر کثرت ترکی، فارسی اور عربی عام فہم الفاظ، محاورے اور لسانی اجزا مل کر ہندوستان کی قومی زبان بن گئی ہے جس کو ابتدا میں دکھنی پھر ریختہ، اور اس کے بعد اردو کا نام نصیب ہوا اور موجودہ دور تعصب میں ہندوستانی ہندی، ہندی ہندوستانی کی الجھن میں پھنس گیا۔

یہ مختصر سا خاکہ اس امر کے لئے کافی ہے کہ ایک سوچنے والا اور تجسس کرنے والا عالم اس کو ابتدائی خط و خال سمجھ کر آگے آئے اور ایک اور مبسوط کارنامہ پیش کرے جس سے دکن اور اہل دکن کو معلوم ہو کہ حقیقت میں ہندوستانی تمدن میں ان کا درجہ اور رتبہ کیا ہے اور ہندوستان کے مستقبل کے سنوارنے میں ان کی کیا ذمہ داری ہے۔

سید محمد اکبر وفاقانی

دکن قدیم اردو شاعروں کی نظر میں

ملا وجہی ملک الشعرائے عہد محمد قلی قطب شاہ مصنف قطب مشتری

(۱۰۱۸ھ) و سب رس (۱۰۴۵ھ)

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں — پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
(مقام) (موجود)

دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ — انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہے لگ

دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے — کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے
(اور)

دکھن ملک بھوتیچ خاصا اہے — تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے

طبعی شاعر عہد ابوالحسن قطب شاہ مصنف بہرام و گل اندام

(۱۰۸۱ھ)

جو کوئی یاد کرتا نیں اپنا وطن — او مردہ ہے بے پیرہن ہے اس کا کفن
(نہیں) (تن)

اگر کوئی غربت میں شاہی کرے — اگر مال ہور ملک لاکھاں دھرے

اِس کوں دکھتے طول کر اب جو اٹھیاں — دیوے خاک تن کا وطن کا نشاں

وطن سب کوں دنیا میں پیارا اہے — سفر ہے سو جوں باد بارا اہے

اجنتا

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں
جہاں گھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں

جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں
جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں

جہاں نغمے تبسم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

شراب و شعر کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں
بہارِ زندگی غلطاں ہے سبزے کی رداؤں میں

نوائے سرمدی آتی ہے جھرنوں کی صداؤں میں
بیاں ممکن نہیں وہ لطف آتا ہے دعاؤں میں

یہاں صدیوں سے رائج پرسکوں شیریں مقالی ہے
یہاں کا ذرہ ذرہ مظہرِ شانِ جمالی ہے

در و دیوار پر ہیں نقش حسن و عشق کی گھاتیں
پیامِ زندگی دیتی ہیں شرمیلی ملاقاتیں

جواں برسات کے دن جان لیوا چاندنی راتیں
فضا میں ہر قدم پہ گونجتی ہیں دلنشیں باتیں

یہاں پیری پہ ہو جاتا ہے دھوکہ نوجوانی کا
سبق دیتا ہے ہر چہرہ حیاتِ جاودانی کا

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقش لاثانی
تصدق جن کے ہر خط پر تحیہ منانہ مانی

مشکل ہے شباب و حسن میں تخئیلِ انسانی
تقدس کے سہارے ہی رہا ہے ذوقِ عریانی

گلستانِ اجنتا پہ جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

بہانہ مل گیا دستِ جنوں کو حسن کاری کا　　اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصلِ بہاری کا
چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بے قراری کا　　سکھایا گُر اسے جذبات کی آئینہ داری کا

دلِ کہسار میں محفوظ اپنی داستاں کر دی
جگر داروں نے بنیادِ جہانِ جاوداں رکھ دی

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے　　ترازو دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی ہے
اداؤں سے عیاں ہے لذتِ دردِ جگر دی ہے　　کھلیں گے راز اس ڈر سے دہن پر مہر کر دی ہے

یہ تصویریں بظاہر گو یونہی خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کے بھید کہتی ہیں

کرشمہ ہے یہ سب اہلِ جنوں کی سعیِ پیہم کا　　جنھیں احساس تک باقی نہ تھا کچھ شادی و غم کا
دلوں پر عکس کھنچ آیا تھا جن کے حسنِ عالم کا　　قلم کو نقش ازبر ہو گیا تھا اسمِ اعظم کا

چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کر دیں

جہاں چھوڑا خوشی سے عشق کے پیغام کی خاطر　　خوشامد اہلِ دنیا کی نہیں کی نام کی خاطر
نہ چھانی خاک در در کی کسی انعام کی خاطر　　جیے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر

زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

سکندر علی وجد

دکن کا قدیم جغرافیہ

دکن سنسکرت زبان میں دکشنیہ کہلاتا ہے یعنی جنوبی علاقہ یعنی وہ علاقہ جو دریائے نربدا کے جنوب میں واقع ہے سنسکرت اور بعض دوسری کتابوں میں اس علاقہ کا نام دکشنا پتا بھی ہے یعنی جنوبی علاقہ پراکرت زبان میں اس علاقہ کا نام دکھنا بادہا (DAKKINA BADHA) ہے یونانیوں نے اسے دکھینا بادس (DAKHINABADES) لکھا فاہیان نے اسے اپنے سفرنامہ میں سنسکرت کی تقلید میں ته فسن (TA THSIN) لکھا جو دکشنیہ کا مترادف ہے۔

قدیم ہند کے جغرافیہ نویس نربدا کے جنوبی حصے کو دکن کہتے ہیں مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے دوران میں دکن کے علاقہ کو صرف کرشنا تک قرار دیا اور حالیہ مورخین بھی دکن سے وہ علاقہ مراد لیتے ہیں جو دریائے نربدا اور کرشنا کے درمیان ہے بعض مورخین دکن کی سرحد کو بالاگھاٹ تک قرار دیتے ہیں اور بعض نے پورے شمالی حصہ کو بھی دکن میں شامل کیا ہے جغرافی نقطۂ نظر سے یہہ سرزمین سطح مرتفع دکن کہلاتی ہے کیونکہ یہہ سمندر کی سطح سے تین ہزار سے تین ہزار فٹ تک بلند ہے عام طور پر ریاست حیدرآباد کو دکن کہتے ہیں

دکن کی سرزمین پہاڑی ہونے کی وجہہ سے یہہ قیاس کیا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں کوہ آتش فشاں پھٹتے تھے انہی پہاڑیوں کے بعض حصے بنجر ہو گئے اور بارش کے عمل سے صدیوں کی ریتی اور قابل رہائش ہوئے یہہ علاقہ کوہستانی ہونے کی وجہہ سے یہاں کی آب و ہوا خشک ہے۔ اونچے پہاڑیوں کے نہ ہونے سے بارش کچھ زیادہ نہیں ہوتی اس ملک کو نربدا، تاپتی، گوداوری، کرشنا اور ان کے معاون سیراب کرتے ہیں۔ علاقہ دکن پہاڑی ہونے کے باعث بے حد نشیب و فراز ہے جس کی وجہہ سے دریا اور ندیاں سرعت سے بہتی ہیں۔ ان کا دارومدار صرف بارش پر ہے ان میں برسات میں بار بار طغیانیاں آتی ہیں اور گرما میں یہہ پایاب ہو جاتی ہیں انہی وجوہات کی بنا پر یہہ ندیاں کشتی رانی کے قابل نہیں

دکن کے شمال میں بندھیاچل اور ست پڑا پہاڑ ہیں اور اس کے مشرق و مغرب میں مشرقی و مغربی گھاٹ ہیں اور جنوب میں دریائے کرشنا ہے جو جنوبی ہند کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے شمال میں کوہ بندھیاچل دکن کی اس طرح حفاظت کرتا ہے جس طرح ہمالیہ ہندوستان کی۔ علاوہ ازیں اس پہاڑ کے باعث ہندوستان دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ غرض بندھیاچل دو مختلف تمدنوں دو مختلف آب و ہواؤں زمینوں اور اقوام کو ایک دوسرے سے علحدہ کرتا ہے۔ شمالی پہاڑوں اور دریاؤں کے دشوار گزار راستوں کے باعث دکن کا تمدن بڑی حد تک محفوظ رہا۔ یہاں کے قدیم باشندے دراوڑی اسی باعث خارجی اثرات سے محفوظ رہے۔ یہہ اقوام تقریباً اب تک اپنے قدیم اعتقادات، رسم و رواج، اور عادات و خصائل پر قائم ہیں اسی طرح استثنائے حائل ہونے سے انتہائی جنوبی ہند کے تمدن میں بہت زیادہ قدامت ہے اس لئے شمالی ہند کے بہت کم فاتحین نے اس طرف توجہہ کی۔

آریا وسط ایشیا سے افغانستان آئے اور پنجاب سے ہوتے ہوئے دوآب کے علاقے میں آباد ہوئے۔ دریائے سرسوتی اور تھانیسر کا درمیانی علاقہ ان کا مقدس مقام تھا یہیں ان کے عقائد اور مذہبی تصورات کا آغاز ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ بندھیاچل تک پھیل گئے لیکن دکن کے شمالی پہاڑوں نے ایک عرصہ تک ان کی روک تھام کی جب آریا جنوب میں داخل ہوئے تو پہلے برار کی وادیوں میں سکونت اختیار کی اس کے بعد اور آگے بڑھے۔ رامائن اور مہابھارت میں بھی اس دکھنی سرزمین کا تذکرہ ہے۔ راما سے عقیدت کے باعث شعرا نے اس علاقہ کو جنت نشان بنانے میں کسر اٹھا نہ رکھی۔ آریاؤں کی آمد کے وقت جنوب میں نظم معاشرت اور حکومتیں تھیں

دکن کی قدیم ترین وحشی قومیں گونڈ، بھیل، سنتال اور ٹوڈا ہیں۔ جو اب بھی جنگلوں اور پہاڑوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں اب بھی وہی اگلی بربریت ہے جب آریاؤں نے شمالی ہند میں اپنے قدم جمائے تو قدیم باشندوں یعنی دراوڑیوں کو سوائے جنوب کی طرف راہ فرار اختیار کرنے یا ان کے تابع ہو کر غلام بنے رہنے کے کوئی اور صورت نہ تھی اسی طرح جب دراوڑی جنوبی ہند میں داخل ہوئے تو انھوں نے بھی آریاؤں کی طرح یہاں کے قدیم باشندوں پر جبر و زیادتی کی ہوگی ایک عرصہ بعد آریاؤں نے جنوبی ہند کا رخ کیا جہاں انھیں قدیم حکومتوں سے سابقہ پڑا جن سے انھوں نے ربط و اتحاد قائم کیا۔

دکن کی قدیم تاریخ بالکل تاریک ہے۔ جس طرح ہندوستان قدیم کی کوئی ہم عصر تاریخی تصنیف نہیں اسی طرح قدیم دکن کی بھی لہٰذا دکن کے قدیم خاندانوں کا حال معلوم کرنا بہت مشکل ہے البتہ تاریخ سے متعلق چند پراگندہ اوراق ملتے ہیں جن کا مرتبہ افسانوی ہے اور کچھ مختصر حالات شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ ملتے ہیں ان کے علاوہ کتبات سے جو چٹانوں اور تانبے کے پتروں پر کندہ ہیں یہاں کی مذہبی اور معاشرتی تحریکات پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی سلسلہ میں ان تحریکات کی سرپرستی کرنے والے حکمرانوں کے واقعات بھی معلوم ہو جاتے ہیں قدیم سکوں سے حکمرانوں کے نام اور ان کے سنین ظاہر ہوتے ہیں جس مقام سے یہ سکے برآمد ہوتے ہیں ان سے حکمرانوں کے حدود سلطنت یا اثرات کا پتہ لگتا ہے۔ پرانوں سے بھی چند بڑے راجاؤں کا حال معلوم ہوتا ہے، سنسکرت ادب کی جن حکمرانوں نے سرپرستی کی ان کے بھی واقعات سنسکرت کی کتابوں میں چیدہ چیدہ ملتے ہیں۔ نیز بعض چینی کتابوں میں صرف مذہبی معاملات کی حد تک ان راجاؤں کے حالات لکھے ہوئے ہیں جنھوں نے جین مت کی حمایت کی لیکن ان میں کوئی ترتیب و تنظیم نہیں، پہلی صدی عیسوی میں بدھ مت جب چین میں مروج ہوا تو بہت سے چینی سیاح بدھ کے مقدس مقامات کی زیارت کرنے کے لئے ہندوستان آئے ان سیاحوں نے جنوب کی بھی سیر کی اور لنکا تک گئے ان کی تحریروں سے بھی دکن کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اشوک کے تیسری صدی ق م کے کتبوں میں دکن کی بعض حکومتوں کا تذکرہ ہے۔ بعض یونانی اور رومی مورخین کے بیانات سے پانچویں یا چھٹی صدی ق م تک کی حکومتوں کے واقعات ظاہر ہوتے ہیں۔ باوجود ان ماخذوں کے دکن کے چند ایسے علاقے رہ جاتے ہیں جن کی قدیم تاریخ کا پتہ لگانے کا کوئی ذریعہ نہیں

دکن میں مختلف اقوام آباد ہیں، جن کی مختلف زبانیں ہیں اور انہی زبانوں کے اعتبار سے یہاں کے علاقے موسوم ہیں۔

بیدر سے اوپر شمال مغربی علاقہ میں مرہٹی زبان بولی جاتی ہے۔ یہ علاقہ مہاراشٹر کہلاتا ہے، اس میں برار کا ایک حصہ، تلنگانہ اور کونکن کا علاقہ شامل ہے، تلنگانہ کا علاقہ مہاراشٹر کے مشرق میں ہے اس میں اندھرا اور کلنگ سلطنتیں تھیں یعنی دریائے گوداوری کے

جنوب میں آندھرا سلطنت اور شمال میں کلنگ، مسلمانوں کے دور میں تلنگانہ کا مرکز ورنگل تھا۔ کنڑی علاقہ بیدر سے ادھونی تک اور مغرب میں دریائے کرشنا کے منبع تک پھیلا ہوا ہے تلنگانے کے نیچے تامل علاقہ ہے جو راس کماری تک ہے۔

ان علاقوں پر مختلف زمانوں میں مختلف حکمرانوں نے حکومت کی، اشوک کے کتبات اور قدیم پرانوں کے دیکھنے سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ جنوب کے قدیم ترین حکمران پانڈیا، چولا اور چیرا ہیں ان کا تمدن ۲۵۰ ق م سے بھی پہلے کا ہے، یہاں ۲۵۰ ق م میں بدھ مت کی تعلیم وتلقین کے لئے اشوک نے مبلغین بھیجے جنھوں نے یہاں کے باشندوں کو بدھ مت کے فلسفہ کی تعلیم دی اس زمانہ میں دکن ڈنڈا کرانیا (DANDAKARANYA) یا ڈنڈکا (DANDAKA) یعنی صحرائے ڈنڈک کہلاتا تھا

آندھرا سلطنت

رامائن میں لکھا ہے کہ گوداوری اور کرشنا کے درمیان آندھرا خاندان حکومت کرتا تھا جس سے یونانی جغرافیہ نویس بھی واقف تھے، قدیم تاریخی ماخذوں کے دیکھنے سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ اندھراؤں کی حکومت تقریباً ۱۸۰ ق م سے شروع ہوئی۔ انھوں نے دھنیا کٹکا (DHANYAKATAKA) کو اپنا مرکز قرار دیا جو دریائے کرشنا پر تھا۔ ان کی سلطنت شمال میں بندھیاچل سے جنوب میں دریائے کرشنا تک، مشرق میں خلیج بنگال سے مغرب میں بحیرۂ عرب تک پھیلی ہوئی تھی۔ پروفیسر بھنڈارکر کا خیال ہے کہ اندھرا خاندان دکن پر ۷۳ ق م سے ۲۱۸ء تک برسر اقتدار رہا۔ مہاراشٹر اور تلنگانہ کا تمام علاقہ ان کے تابع تھا و نسنٹ اسمتھ کا خیال ہے کہ اندھرا کا پائے تخت سری کاکولم تھا جو دریائے کرشنا پر واقع تھا۔ شاید دھنیاکٹکا کا نام بدل کر سری کاکولم ہو لیا ہو یا بدل گیا ہو۔

اس زمانہ میں گجرات اور ممبئی کے علاقہ میں ستراپوں کی حکومت تھی۔ ستراپ کے معنی صوبہ دار کے ہیں۔ یہہ ایرانی لفظ ہے۔ اندھرا خاندان کے ایک حکمران بل بائے کرنے ۱۲۶ء میں ستراپوں کے علاقہ مہاراشٹر پر قبضہ کیا اسی زمانہ میں مالوہ میں ایک اور ستراپ خاندان حکمران تھا۔ اس خاندان کے ایک راجہ رودرادامن اول نے جس کا پائے تخت اجین تھا اندھرا خاندان کے راجہ سے مہاراشٹر کا علاقہ چھین لیا، جب تلنگانہ کے اندھرا خاندان میں جگن سری یا یجنا سری ۱۶۷ء میں برسر اقتدار ہوا (جس کا عہد حکومت ۲۰۲ء تک ہے) تو اس نے مالوہ کے ستراپوں سے جنگ کی اور ان کی سلطنتوں کے بعض صوبے اپنی سلطنت میں شامل کرلئے۔

دکن میں دو آندھرا سلطنتیں تھیں، ایک مشرق میں جس کا پائے تخت دھنیاکٹکا تھا اور دوسری مغرب میں جس کا مرکز پیتھان (PAITHAN) تھا جو اب پٹن کہلاتا ہے اور صوبہ اورنگ آباد کے ایک تعلقہ کا مستقر ہے، پٹن دریائے گوداوری کے شمالی کنارے پر ہے۔ یہہ پرتستان (PRATISTHAN) بھی کہلاتا ہے یہہ دکن کا قدیم ترین شہر ہے اشوک نے اپنے مبلغ یہاں بھی بھیجے تھے، بطلیموس (PTOLEMY) کے قول کے مطابق یہہ آندھرا بادشاہ پلومائی (PLUMAYE) دوم کا پائے تخت اور اہم تجارتی مرکز تھا۔ یہہ مشہور آندھرا راجہ سلماہانا (SALMAHANA) کی جائے پیدائش ہے اور اس کا پائے تخت بھی رہا۔ اب بھی یہاں بہت سے منادر اس کی قدیم عظمت کی یادگار ہیں۔ آندھرا خاندان کا کب اور کس طرح خاتمہ ہوا کچھ بھی پتہ نہیں چلتا۔

جب کہ آندھرا سلطنت عروج پر تھی شاندراشٹرکوٹ سلطنت اس کی باجگذار تھی جس کا علاقہ بندھیاچل کے شمال وجنوب میں تھا۔ اٹوم یا راشٹرکوٹ سلطنت نے شمال میں لیتا خود مختاری ان کے علاوہ ایک اور خاندان کدمب پانچویں صدی عیسوی میں مرہٹہ علاقہ میں برسر اقتدار تھا جن کا مرکز بانسی تھا اس سلطنت میں کنڑا اور میسور کا علاقہ شامل تھا۔

اسی پانچویں صدی عیسوی میں پلوا کو عروج حاصل ہوا اور اس نے آندھرا کے مشرقی پایۂ تخت اور علاقوں پر قبضہ کیا۔ آندھرا دور میں ملک کی تجارتی حالت بہت اچھی تھی۔ یہاں ایشیا، مصر، روم، یونان، چین اور دوسرے مشرقی مقامات سے سفراء آتے تھے تمام میں جنگ میں ہندوستانی ہاتھیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ آندھرا سلطنت کے بعض علاقوں میں رومی سکے بھی دستیاب ہوئے ہیں پروفیسر بھنڈارکر کے قول کے مطابق آندھرا کے خاتمہ کے بعد تین سو سال تک دکن کے حکمران خاندانوں کا حال معلوم نہ ہوسکا۔

چالوکیا

دکن کی سلطنتوں کے حالات وضاحت کے ساتھ چھٹی صدی عیسوی کے وسط سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں خاندان چالوکیا حکمران تھا۔ چالوکیا یا سولنکی کا تعلق چاپ قوم سے ہے جو گرجر کی ایک شاخ ہے، گرجر جو شمال مغربی ہندوستان میں زیادہ آباد ہیں ان کا تعلق ہون سے ہے۔ شمالی ہند کے پرہار اور راجپوت قبائل دراصل ان وحشی اقوام کی تبدیل شدہ شکل ہیں جو پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان میں داخل ہوئی تھیں ان میں سے ادنیٰ درجہ کے لوگ گرجر کہلاتے ہیں اور اعلیٰ درجہ کے راجپوت چالوکیا خاندان کا ابتدائی تعلق شمالی ہند کے راجپوتوں سے ہے جو کچھ عرصہ بعد دراوڑیوں میں خلط ملط ہوگئے۔ چالوکیا نقل مقام کرکے راجپوتانہ سے دکن آئے۔ اس خاندان کی بنیاد ایک سردار پلکیسن اول نے ڈالی۔ یعنی ۵۵۰ء میں واتاپی ضلع بیجاپور (موجودہ مقام بادامی) پر قابض ہوکر اس نے ایک چھوٹی سی سلطنت قائم کی اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے پلکیسن نے اشومیدھ کی رسم منائی تھی اس کے دونوں بیٹوں کیرتی ورمن اور منگلیس کے عہد میں سلطنت مشرق اور مغرب کی طرف پھیلی۔ کیرتی ورمن اول ۵۶۶ء میں تخت نشین ہوا یہ زبردست جنگجو تھا۔ ایک کتبہ میں لکھا ہے کہ اس نے جنوب کے تمام قبائل اور اقوام کو تابع کیا۔ مشہور بدھی راہب دھرماگپتا اسی کے عہد میں گزرا ہے جو مذہبی کتابوں کا چینی زبان میں ترجمہ کرتا تھا کیرتی ورمن وشنو کی پوجا کرتا تھا اس نے بادامی میں ایک غاری مندر تعمیر کروایا، منگلیس نے کونکن اور مغربی گھاٹ کا کچھ علاقہ بھی سلطنت میں شامل کیا۔

منگلیس کے بعد کیرتی ورمن کا بیٹا پلکیسن دوم تخت نشین ہوا۔ اس نے ونگی پر قبضہ کیا اور اپنے بھائی وشنو وردھن کو وہاں کا نائب السلطنت بنایا جس کا صدر مقام پشٹپور تھا جو اب ضلع گوداوری میں پتھاپورم کہلاتا ہے۔ ۶۱۵ء میں وشنو وردھن خود مختار ہوا اور خاندان چولا، پانڈیا اور کریل سے جنگ کی۔ پلکیسن دوم نے ۶۲۰ء میں ہرش کو پسپا کیا، ۶۲۵ء تا ۶۲۶ء میں اس نے ایک سفارت ایران کے شہنشاہ خسرو دوم کے پاس روانہ کی جس کا طبری نے تذکرہ کیا ہے اجنٹہ کے غار نمبر ۱ میں استرکاری کی ایک بڑی تصویر میں ایرانی سفیر ہندی راجہ کے آگے کھڑا ہوا ہے۔ اس تصویر سے ایرانی اور ہندی فنون لطیفہ کے اختلاط کی جھلک ظاہر ہوتی ہے۔

۶۴۱ء میں ہیون سانگ چینی سیاح پلکیسن دوم کے دربار میں حاضر ہوا، اس نے اجنٹہ کی تعریف کی ہے۔ اس وقت چالوکیا سلطنت کا

مرکز واتاپی نہ تھا بلکہ ناسک، مدرشس کے مقابلہ میں سہولت پیدا کرنے کے لئے پلکیسن نے ناسک کو موقتی پایۂ تخت قرار دیا تھا۔ اس نے کوکن کے موریا کو شکست دی۔ راشٹرکوٹ کی طاقت توڑ دی اور کدمب کا بھی خاتمہ کیا اور مشرقی شاحل سے بڑھ کر پتھاپورم کے قلعہ پر قبضہ کیا، کلنگ کے راجہ کو زیر کیا جس کا پایۂ تخت پوری تھا جو اب بھی جگناتھ کے مندر کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ اس نے چولا، پانڈیا اور کریل سلطنتوں پر بھی حملہ کیا۔

جنوبی ہند میں پلوا خاندان بہت طاقتور تھا، اگرچہ مسلسل کوشش کرکے چالوکیا راجاؤں نے ان کی قوت توڑ دی تھی پھر بھی ۶۴۲ء میں کانچی کے پلوا خاندان کے راجہ نرسمہا ورمن نے پلکیسن دوم کو شکست فاش دے دی اور بادامی کو اس بری طرح برباد کیا کہ تیرہ سال تک بادامی پر کسی نے حکومت نہ کی۔ جب ۶۵۵ء میں وکرما جیت اول (پلکیسن دوم کا بیٹا دور حکومت ۶۵۵ء تا ۶۸۰ء) تخت نشین ہوا تو اس نے پلوا سے اپنے باپ کا بدلہ لیا اور شہر کانچی پر قبضہ کیا اس نے چولا کو بھی شکست دی۔ وکرما جیت کے پوتے وجیا دتیا کے راشٹرکوٹ سے اچھے تعلقات تھے جن کی بنا پر راشٹرکوٹ کے اندر راجہ نے چالوکیا شہزادی سے شادی کی جس کے بطن سے دنتی درگا پیدا ہوا۔ جب کیرتی ورمن دوم برسر اقتدار ہوا تو اس کے دور میں دنتی درگا نے بادامی پر قبضہ کیا جس سے مغربی چالوکیا سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ اسی چالوکیا دور میں شاید پلوا کی مخالفت کے سلسلہ میں راجمندری کی بنیاد پڑی اور یہاں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا گیا کیونکہ جنوب والوں کے لئے کرشنا سے ہوتے ہوئے شمال کی طرف جانے کا راستہ یہیں سے گزرتا ہے۔

مغربی چالوکیا کا پایۂ تخت بادامی ضلع بیجاپور میں ہے۔ یہاں جینوں کا ۶۳۵ء کا ایک غار کا مندر ہے۔ اس کے علاوہ تین غار برہمنی اثر کے ہیں۔ ان میں سے ایک ۵۷۹ء کا ہے یہاں دو قلعے ہیں ایک باون بندی اور دوسرا رن منڈل چھٹی صدی عیسوی میں پلوا نے اس پر قبضہ کیا تھا۔ اس کے بعد چالوکیا اس پر قابض ہوئے ساتویں صدی عیسوی میں مشہور چینی جاتری ہوانسانگ یہاں آیا تھا اس نے لکھا ہے کہ اس کی راجہ (پلکیسن دوم) سے ملاقات ہوئی جو چھتری ذات کا ہے یہ راجہ وسیع الخیال اور رحمدل [illegible] ہے اس کے ماتحت وفاداری کے ساتھ اس کی خدمت بجالاتے ہیں اور راجہ نے ان سے خاص ہمدردی ہے۔

یہاں کی زمین زرخیز ہے۔ غلہ خوب اگتا ہے۔ موسم گرم ہے یہاں کے باشندوں کے خصائل سادہ اور دیانتدارانہ ہیں ان کے قد اونچے ہیں اور طبیعت کے غائب ہیں اگر ان کی توہین کی جائے تو بری طرح بگڑتے ہیں اور بدلہ لیتے ہیں جنگ میں ڈٹ کر اپنے دشمن کا خوب تعاقب کرتے ہیں لیکن جب کوئی اپنے آپ کو ان کے حوالہ کر دیتا ہے تو وہ اسے ایذا نہیں پہنچاتے جب کسی جنگ میں سردار ہار جاتا ہے تو اسے مارتے نہیں بلکہ اسے زنانی لباس پہناتے ہیں اور اسی طرح اسے زندگی کاٹنے پر مجبور کرتے ہیں [illegible] جو اکثر کشتی لڑتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ خوب پیتے اور لڑتے ہیں اگر وہ کسی کو ہلاک کر ڈالیں تو قانوناً [illegible] یہاں ہاتھیوں کو بھی خوب پلایا جاتا ہے اپنے پہلوانوں اور جنگی ہاتھیوں پر راجہ کو فخر ہے۔

واتاپی کے حکمرانوں کے دور میں بدھ مذہب آبادی کے ایک بڑے حصہ میں رائج تھا جس کا ہیونسانگ نے ذکر کیا ہے [illegible] یہاں بدھ مت کے بہت سے مندر اور خانقاہیں تھیں جہاں بدھ مت کو زوال ہوا [illegible] کیونکہ برہمنی مذہب کے [illegible]

چنانچہ خود راجہ پلکیسن اول نے اشومیدھ کی رسم منائی۔ برہمنی مت کی ترقی کے ساتھ ان کے منادر بھی چوطرف بننے لگے اور پران کے دیوتاؤں برہما، وشنو اور شیوا وغیرہ کی پوجا ہونے لگی، بادامی غاری مندر میں منگلیس کے عہد میں وشنو کی پوجا ہوتی تھی جو اس کا تعمیر کرایا ہوا تھا ان مختلف مذاہب کا سلطنت میں پایا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ چالوکیا راجہ تمام مذاہب کے ساتھ رواداری برتتے تھے۔
باوجود اس کے بدھ مت بتدریج برہمنی مذہب اور جین مت کے مقابلہ میں معدوم ہوگیا ہندو خاص طور پر قربانی کی طرف توجہ کرنے لگے۔
اس زمانہ میں بدھ اور جین مت والوں سے ہندوؤں نے غاروں میں مندر تراشنے کا فن سیکھا مرہٹوں کے علاقہ کے جنوبی حصے میں عام طور پر جین مذہب مقبول تھا، آٹھویں صدی عیسوی میں زرتشتی مذہب بھی ہندوستان میں رائج ہوا خراسان کے جلاوطن پارسی ۷۳۵ء میں پہلی دفعہ احاطہ بمبئی کے ضلع تھانہ میں بمقام سنجان آباد ہوئے پلکیسن دوم اور وکرما جیتا دوم نے جینوں کی مدد کی اور ان کے مناد تعمیر کروائے، ۶۷۸ء میں یہاں مشہور قواعد کا عالم (PUUYAPADA) تھا اوپر بیان ہوچکا ہے کہ سلطنت زیادہ وسیع ہو جانے سے انتظامات کی خاطر پلکیسن دوم نے ونگی پر اپنے بھائی وشنو وردھن کا تقرر کیا جس نے کچھ عرصہ بعد اپنی علٰحدہ حکومت قائم کرلی اور اس طرح دو چالوکیا خاندان ہوگئے مغربی چالوکیا کا مرکز بادامی تھا اور مشرقی کا ونگی۔ ونگی گوداوری اور کرشنا کے دہانوں کے قریب ہے۔ بدھ مت کا زبردست دشمن اور ذی اثر شخص شنکراچاریہ اور مشہور عالم (AKALANKA) اسی زمانہ کے ہیں آٹھویں صدی میں کلنک اور مشرقی دکن پر مشرقی چالوکیا اور دکن کے وسطی اور مغربی حصہ پر راشٹرکوٹ حکمران تھے۔ دسویں صدی کے اختتام پر راشٹرکوٹ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئے جس کے باعث مغربی چالوکیا کا دوسرا دور شروع ہوا جو مغربی چالوکیا خاندان کی رجعت کہلایا جاسکتا ہے۔ تیلا دوم نے ۹۷۳ء میں راشٹرکوٹ کے آخری راجہ کک دوم کو شکست دی اور نئے مغربی چالوکیا خاندان کی بناء ڈالی۔ اس نے راشٹرکوٹ شہزادی سے شادی کی اس کا عہد حکومت ۹۷۳ء سے ۹۹۶ء تک ہے، اس کے دور میں سلطنت بلاری اور میسور کے بعض بعض حصص تک پھیل گئی تھی۔

اسی زمانہ میں چولا حکمران راجا راجہ نے ونگی پر قبضہ کیا اور چالوکیا خاندان کے ایک لڑکے کو تخت نشین کرکے واپس ہوا اس راجہ نے جس کا نام دی مالا دیتا ہے راجا راجہ کی لڑکی سے شادی کی اس کی اولاد نے مشرقی چالوکیا اور چولا سلطنت پر حکومت کی بالآخر مشرقی چالوکیا حکومت کا ۱۰۷۰ء میں خاتمہ ہوگیا جس سے مغربی چالوکیا کا اقتدار بہت بڑھ گیا اور وہ تمام دکن پر حاوی ہوگئے۔ ۱۰۴۲ء میں مغربی چالوکیا خاندان میں سومیسورا اول تخت نشین ہوا تھا جس نے کلیانی کو دارالسلطنت قرار دیا جس کے باعث یہ چالوکیان کلیانی کہلاتے ہیں۔ کلیانی ممالک محروسہ سرکار عالی میں ہے۔ اس خاندان نے بھی قدیم چالوکیا کی طرح دو سو برس حکومت کی سمیسور اول نے چولا کے راجا راجہ کو شکست دی، دھارا (مالوہ کے علاقہ میں ہے) اور جنوبی کانچی پر حملہ کیا اور ان دونوں کو فتح کیا۔

۱۰۷۶ء میں وکرماجیت اول یا بکرمانک تخت نشین ہوا۔ اس نے کانچی فتح کیا اور دوارا سمدرا کے خاندان ہوسل سے سخت جنگ کی دوارا سمدرا کو دوارا وتی پور بھی کہتے تھے مسلمان مورخین نے اسے دوارا سمندر لکھا اس کے کھنڈر ضلع حسن میسور میں موجود ہیں اس نے اپنے نام سے ایک سنہ جاری کیا جو کبھی مقبول نہ ہوا، وکرماجیت نے وشنو کا ایک بڑا مندر تعمیر کروایا اور اس کے آگے ایک تالاب بنوایا اور اس کے قریب ایک شہر آباد کیا جو وکرما پورا کہلاتا تھا، اس کے عہد میں رعایا خوش حال تھی۔ کشمیری پنڈت

(BILHANA) کے قول کے مطابق ملک میں ہر طرف امن تھا۔ کہیں چوروں کا خوف نہ تھا جو اچھے انتظام کی دلیل ہے۔ علاوہ اس کے بادشاہ نیک منش، فیاض اور ہمدرد تھا اس نے علم کی خوب سرپرستی کی، یہہ کلیانی کا بڑا راجہ تھا جس کے عہد میں سلطنت انتہائی عروج کو پہونچی، اور بقول بلہانا کلیان ہر اعتبار سے عدیم المثال تھا، یہی مشہور قانون داں وجنانیسور کا وطن ہے جس کی تصنیف متاکشرا ہندو قانون کی سب سے زیادہ مستند کتاب ہے۔ کلیانی احاطہ بمبئی کے ضلع تھانہ میں ہے۔ (PRIPLUS) کے قول کے مطابق کلیانی کی اہمیت دوسری صدی عیسوی سے شروع ہوئی، یہہ شہر تجارت کے اعتبار سے مشہور تھا، بڑے بڑے تجار یہاں آتے تھے شائد یہہ شہر ۵۲ئلہ میں آباد ہوا یہاں پتیل اور شیشم کا کام اچھا ہوتا تھا اور کپڑے بھی اچھے بنتے تھے، چودھویں صدی میں مسلمان حکمرانوں نے اس کا نام اسلام آباد رکھا۔

وکرماجیت کے مرنے کے بعد چالوکیان کلیانی کو زوال شروع ہوا، راجہ تیل سوم کے عہد میں سپہ سالار افواج بجّل یا وجّالایا بجّالا نے بغاوت کی اور تمام سلطنت پر قابض ہوگیا ۱۱۶۲ء سے ۱۱۸۳ء تک بجل اور اس کے جانشینوں نے حکومت کی جس کے بعد خاندان چالوکیا کے ایک شہزادہ سمیسور چہارم نے بجل کے جانشینوں سے ملک کا بہت بڑا حصہ حاصل کیا لیکن یادوا خاندان دیوگری اور ہوسل خاندان دوارا سمدرا کے عروج کے باعث اس کا اقتدار جاتا رہا یعنی ۱۱۹۰ء میں کلیان سلطنت کا خاتمہ ہوا

بجل کے عہد میں ایک مذہبی انقلاب ہوا جس سے شیو کے مذہب نے دوبارہ زندگی پائی اور ایک نیا فرقہ قائم ہوا جس کا نام ویراسیوس یا لنگایت ہے جو اب تک موجود ہے۔ بجل مذہباً جین تھا، اس کے متعلق یہہ مشہور ہے کہ اس نے فرقہ لنگایت کے دو برہمن کارکنوں کو بلا وجہہ اندھا کیا تھا جس کے بدلہ سرپرست مذہب لنگایت بسوا (BASAVA) کے اشارہ ۱۱۶۷ء میں راجہ کو قتل کیا گیا اس مذہب کے ماننے والے عام طور پر کنڑی علاقوں میں آباد ہیں۔

وکرماجیت کے عہد میں تاجروں نے بدھ مذہب کے لئے خانقاہیں تعمیر کروائیں اور ان کے اخراجات کے لئے زمیں اور ... بھی فراہم کیں اس زمانہ میں جین مت کو تفوق حاصل نہ تھا، لنگایت فرقہ کے نکلنے کے بعد تو جین مت کا اثر اور بھی زائل ہوگیا، لنگایت مذہب زیادہ تر بجا ریں پھیلا جو پہلے جین مت کے طرفدار تھے۔ لنگایت لنگ کو حیات کا مبدا سمجھتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں یہہ بیدوں، تناسخ، بچپن کی شادی کے مخالف ہیں۔ یہہ بالکل حقیقت ہے کہ ان کے مذہب کا بانی بسوا برہمن تھا لیکن انھیں برہمنوں سے سخت نفرت ہے اس مذہب کے جاری ہونے سے نہ صرف بدھ مت جنوب سے ناپید ہوا بلکہ جین مت کو بھی زوال شروع ہوا

راشٹراکوٹ

۷۵۳ء تا ۹۷۳ء

راشٹراکوٹ یادونسل کے تھے راجہ (RATTA) کے ایک بیٹے کا نام راشٹراکوٹا تھا جس کے نام سے یہہ خاندان مشہور ہوا۔ آٹھویں صدی کے درمیان میں دنتی درگا نامی ایک سردار نے جو راشٹراکوٹ خاندان سے تعلق رکھتا تھا خاندان چالوکیا کے راجہ وکرماجیت دوم کے بیٹے کیرتی ورمن دوم کو شکست دی اور راشٹراکوٹ سلطنت قائم کی جب عوام اس کی طرف سے بدظن ہوئے تو اس کے چچا کرشنا اول نے

اسے تخت سے اتار دیا اور خود راجہ بنا۔ بعض کتبوں سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ دنتی درگاہ لاولد تھا شائد اس کے مرنے کے بعد کسی اور وارث تخت کو ہٹا کر کرشنا تخت نشین ہوا۔ دنتی درگا کو تخت سے علحدہ کرنا اس لئے ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت طاقتور حکمران تھا۔

کرشنا اول کے عہد میں ایلورا کا مشہور کیلاس کا مندر تعمیر ہوا۔ یہہ مندر ایک چٹان میں تراشا گیا ہے جو فن تعمیر کے اعتبار سے غیر معمولی ہے۔ اسی خاندان کے ایک حکمران گوبند سوم نے ۷۹۳ء تا ۸۱۵ء سلطنت کو شمال میں بندھیاچل اور مالوا اور جنوب میں کانچی تک وسعت دی اور اپنے بھائی اندراج کو جنوبی گجرات میں نائب السلطنت مقرر کیا۔ اس کے بعد امو گھورش تخت نشین ہوا۔

(۸۱۵ء تا ۸۷۷ء) اس نے زیادہ تر وینگی کے مشرقی چالوکیا راجاؤں سے جنگ کی۔ اس نے اپنا دارالسلطنت ناسک سے مانیا کھیت بدل دیا اسی شہر کو عرب مورخین نے مانکیر لکھا ہے، اب یہہ مالکھیڈ یا ملکھیڈ کے نام سے ریاست نظام میں ہے، یہہ اس زمانہ کا بہت مشہور اور بارونق شہر تھا، امو گھورش کے جانشین کرشنا دوم نے جینیوں کے تنگ وقت دگمبر کی بہت سرپرستی کی جن سین، گنبھدرا اور دوسرے علما دکی تو یہہ کے باعث اس فرقہ کو بہت تقویت حاصل ہوی جس کی بدولت بدھ مت کے اثرات دکن سے رفتہ رفتہ زائل ہوتے گئے اور بارھویں صدی تک یہہ مذہب دکن سے معدوم ہوگیا۔

اسی خاندان کا ایک راجہ اندر سوم نے قنوج پر کامیاب حملہ کیا اور ۹۴۹ء میں چول خاندان کے راجہ دت پر فوج کشی کی اس زمانہ میں ہندوؤں اور بدھ مت والوں میں زبردست رقابت تھی، راشٹر کوٹوں کے ابتدائی دور میں برہمن وید کی تعلیم کے مطابق خوب قربانی کرتے تھے، اس زمانہ میں جین مت کو بھی فروغ حاصل ہوا، راشٹرا کوٹوں کی علمی سرپرستی کے باعث ان کے دربار میں شعرا کا اجتماع ہوا

آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں یعنی ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کی فتح سے سندھ پر اسلامی سیاسی اثرات غالب آئے، راشٹراکوٹ خاندان کے ان عرب حملہ آوروں سے دوستانہ تعلقات تھے اور گرجروں سے مخالفت تھی، گرجروں نے عربوں سے اچھے تعلقات نہ رکھے جس کے باعث انھیں نقصان پہونچا، اس سے بچنے کے لئے راشٹراکوٹوں نے ان نو وارد حملہ آوروں سے اتحاد کرلیا تھا، جس کے باعث مسلمان سوداگر اور سیاح مغربی علاقوں میں بہ آسانی تجارت کرتے تھے اور بہت سے مغربی ساحل پر آباد ہوے، ان مسلمان تاجروں اور سیاحوں نے اپنے سیاحت نامے لکھے جن میں یہہ راشٹراکوٹ راجاؤں کو بل ہرا لکھتے ہیں جس کے معنی ہندوستان کا سب سے بڑا راجہ ہیں، انھیں بل ہرا اس لئے لکھتے ہیں کہ یہہ خود کو دلبھ کہتے تھے۔ اور یہہ لفظ رائے کے ساتھ مل کر بلہرا ہوگیا، چالوکیا راجہ بھی دلبھ اپنے نام کے ساتھ لکھتے تھے، شائد انہی سے یہہ طرز راشٹراکوٹوں نے اختیار کی، ولبھ رائے یا بلہا رائے مقامی استعمال سے بلہرائے ہوا اور عربوں نے اسے بلہرا لکھا۔

راشٹراکوٹ راجاؤں کی مسلمان سیاحوں نے بہت تعریف کی، ان کے عہد کا کیلاس کا مندر دنیا کے عجائبات میں ہے۔ ان راجاؤں نے سنسکرت ادب کی سرپرستی کی اور بہت سے مندر شاہی مصارف سے تعمیر کروائے۔

ان تمام سلطنتوں میں چالوکیا سلطنت زیادہ عرصہ تک باقی رہی یہہ ایسے زمانہ میں یعنی ۱۱۹۰ء میں ٹوٹی جب کہ تمام ہندوستان کی سیاسی حالت بدل رہی تھی کیونکہ اسی سنہ میں مسلمانوں نے شہاب الدین غوری کے تحت ہندوستان پر حملے کئے اور یہاں اپنی

نقوشِ اجنٹہ

اداۓ شوق — دعوتی ہوتی ہیں تصویریں — چمک رہی ہیں یہاں آرزو کی تقدیریں

پگھل رہے ہیں کہیں صاف ہو رہے ہیں کہیں — وہ سختی دل ناکام پتھروں میں نہیں

یہ حسن و شوق کی پوجا کے کارنامے ہیں — یہ رنگ و نور کے درد آشنا فسانے ہیں

دکن کی خاک میں ہے بدھ کی زندگی خاموش — دکن کی خاک میں اندر کے ہے پریم کا جوش

نقوش حسن کو خون جگر سے بھرتے ہیں — یہ پتھروں میں نہیں بزم دل میں سوتے ہیں

ہے دیوتاؤں کی تعبیر زندگی میں حسن — ہے پارساؤں کی تصویر زندگی میں حسن

چمک ہے روح کی رنگوں کی رعنائی میں — لچک ہے عشق کی پتھر کی سخت جانی میں

نظر نواز بنا اور جاں گداز بنا! — زمین شوق کا ہر ذرہ عشق باز بنا

زمیں پہ رفعت جاں خود نمائی کرتی ہے — وہ دیکھ بزم تصور خدائی کرتی ہے!

باقی

خواتین دکن نمبر

اس مرقع دکن کے ساتھ اس کا ایک **ضمیمۂ خواتین** علحدہ کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے جس میں دکن کی بیش انشاء پرداز خاتونوں کے نہایت دلچسپ اور مفید مضمون اور نظمیں شامل ہیں۔ یہ اصل میں اسی دکن نمبر کا حصہ ہے جو صنف لطیف کے رشحات قلم پر مشتمل ہے۔ اور ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسواں کی طرف سے اس کی سرگرم معتمد مخدومہ سکینہ بیگم صاحبہ کے پرخلوص مساعی کی وجہ سے نہایت خوبی، نفاست اور لطافت کے ساتھ مرتب اور شائع ہو رہا ہے۔ اس کی عام قیمت ۸ؔ رکھی گئی ہے لیکن صرف سب رس کے خریداروں کو ختم فروری تک نصف قیمت پر محض اس وجہ سے دیا جائے گا کہ یہ سب رس ہی کا ایک حصہ ہے۔ اس خواتین دکن نمبر کے بعض مضمون نگاروں کے نام یہ ہیں:-

رابعہ بیگم صاحبہ (زنانہ کالج)	فاطمہ بیگم صاحبہ اثر	تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ	قمر النساء بیگم صاحبہ
کبریٰ اقبال عبدالرؤف	زبیدہ ضیاء الدین انصاری	بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر	رابعہ بیگم صاحبہ (معلمہ محبوبیہ اسکول)
افسر النساء بیگم صاحبہ	ممتاز جہاں بیگم صاحبہ صوفی	صفیہ صدیق فریدہ بیگم صاحبہ	جہاں بانو بیگم صاحبہ بی، اے
لطیف النساء بیگم صاحبہ بی، اے	ذاکرہ بنت فضل اللہ احمد صاحب	تسنیم ربانی بی، اے	مسز صوفی ام، اے۔

دکن کی اسلامی فتوحات

"دورِ وسطیٰ میں دکن اور شمالی ہند کے تعلقات" ۱۲۹۴ء تا ۱۳۵۱ء

۱۲۰۶ء میں جب دہلی کی اسلامی سلطنت قائم ہوئی تو اس کے حدود زیادہ وسیع نہ تھے۔ بنگال، گجرات، مالوہ، قنوج، اجمیر اور دوآبہ کے کچھ حصے اس میں شامل تھے۔ ۱۲۹۴ء تک اس کو بنگال سے سندھ اور جنوب میں دریائے نربدا تک وسیع کیا گیا۔ جب دہلی کی حکومت خلجی خاندان کے ہاتھ آئی تو جلال الدین خلجی کے پیشِ نظر کسی قسم کا فتوحاتی یا تعمیری کام باقی نہ رہا۔ علاءالدین خلجی صوبہ دار کڑہ شاہی فوجوں کے ہمراہ مالوہ کے قریب بھیلسہ کی فتح میں مصروف تھا یہاں اس کو دکن کی مہاراشٹرا سلطنت کے حالات معلوم ہوئے جس کا مرکز دیوگڑھ تھا۔ یہ سلطنت کوہستان ست پڑا کے جنوب میں واقع تھی۔ چونکہ یہ منظر نامہ پہلا واقع ہوا تھا اور اس کے پیشِ نظر سلطنت دہلی پر قبضہ کرنے کا منصوبہ پہلے ہی سے تھا اس لئے اس نے بغیر سلطان کی اجازت کے آٹھ ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ دیوگڑھ کی طرف کوچ کیا۔

یوں تو جنوبی ہند کے ساحلوں پر مسلمان عرب تاجروں نے آباد ہو کر سلطنت کی بنیاد ڈال دی تھی لیکن فرشتہ اور تہامہ کی تحریروں کے بموجب ان تاجروں نے کوئی سیاسی حیثیت حاصل نہ کی۔ بلکہ وہ دوسرے شہروں کی طرح آباد ہوئے۔ ان عرب تاجروں کے ہمراہ بعض بزرگ فقیر اور درویش بھی آئے جن میں بابا ظاہر، خواجہ خضر اور شیخ عبداللہ خفیف بھی تھے۔ ان بزرگوں نے سماجی حیثیت سے نمایاں حصہ لیا جس سے مخلوط تہذیب و تمدن کا وجود ہوا۔ انسانی برادری اور وحدت کا پیام سرزمین دکن پر بالکل نئے اصول سے پیش کیا گیا جو آگے چل کر شمالی ہند پر بھی پھیلا۔ ہندو مسلم تمدن کا پیش خیمہ تھا۔

علاءالدین کے حملے کے وقت دکن میں تین خود مختار سلطنتیں تھیں۔ ۱۱۹۰ء میں جب چالوکیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا تو مہاراشٹرا، تلنگانہ اور کرناٹک صوبے خود مختار ہو گئے۔ مہاراشٹرا کا پایۂ تخت دیوگڑھ تھا جہاں یادو خاندان کا راجہ رام دیو حکمران تھا۔ تلنگانہ کے مرکز ورنگل پر کاکتیا خاندان کی ایک عورت رودرما دیوی اپنے پوتے کی کمسنی کی وجہ سے حکمران تھی۔ کرناٹک کے مرکز دوارسمدر پر ہوئسال خاندان کا راجہ بیر بلال حکمران تھا۔ یہ سلطنتیں بہت متمول تھیں کیونکہ ان کے حدود میں سونے، چاندی اور جواہرات کی کانیں تھیں اور اس کے علاوہ گھوڑے، ہاتھی کافی تعداد میں موجود تھے۔

علاءالدین خلجی کی روانگی سے قبل بعض صوفی اور فقیر منش بزرگ دکن کی طرف روانہ ہو چکے تھے جن میں سے بعض تو راستہ کی گھاٹیوں پر آباد ہو گئے اور بعض آگے بڑھتے چلے گئے۔ ان لوگوں سے علاءالدین کو راستہ معلوم کرنے میں بڑی مدد ملی۔ دولت کی ہوس اور اپنے منصوبوں کو کامیاب بنانے کی کوشش میں اس نے راستہ کی مشکلات کا مطلق خیال نہ کیا۔ اس کی فوج بالاگھاٹ سے ہوتی ہوئی ایلچپور پہنچی جو مہاراشٹرا سلطنت کی فوجی چھاؤنی تھی یہاں معمولی جھڑپ ہوئی اور ایلچپور پر قبضہ کر لیا گیا جو دکن کا باب مدخل ہے۔ یہاں اس نے ضروری معلومات حاصل کیں۔ اس کے بعد آگے بڑھ کر دیوگڑھ (دولت آباد) کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

راجہ رام دیو قلعہ بند ہو گیا۔ اس زمانہ میں اس کا بیٹا شنکر دیو کسی جاترا میں گیا ہوا تھا۔ راجہ نے اس اچانک حملے سے پریشان ہو کر صلح نامہ پیش کیا۔ اس صلح نامہ میں فرشتہ کے بیان کے بموجب علاءالدین کو چھ سو من سونا، سات من موتی، دو من جواہرات اور ہزار من چاندی اور اس کے علاوہ ریشمی تھان، گھوڑے، ہاتھی وغیرہ ہاتھ آئے۔ سالانہ خراج کا وعدہ لے کر یہ واپس ہو رہا تھا کہ شنکر دیو آ گیا اور اس نے علاءالدین کی فوج پر حملہ کر دیا۔ لیکن اس پر بھی علاءالدین کو کامیابی ہوئی اور اس نے نئے صلح نامہ کی رو سے دوگنا تاوان حاصل کیا۔ ایلچپور پر اس نے مستقل قبضہ رکھنا ضروری سمجھا کیونکہ اس کو آئندہ بھی دکن سے تعلقات قائم رکھنے تھے۔ یہ واپس ہو گیا لیکن بعض صوفی اور درویش ایلچپور اور اطراف و اکناف کی

پہاڑیوں پر آباد ہوگئے یہی سب سے پہلی دکن کی اسلامی آبادکاری کی ابتدا ہے۔ علاءالدین کا یہ حملہ محض اتفاقی اور اپنے سیاسی منصوبوں کی تکمیل کے سلسلہ میں دولت کے حصول کی خاطر ہوا۔ دکن پر براہ راست حکومت کرنے کا کوئی خیال علاءالدین کے دماغ میں نہ تھا۔ اس حملے کے بعد دکن کا راستہ شمالی ہند کی طاقتوں کے لئے کھل گیا اور ساتھ ہی ساتھ دکن کے سیاسی حالات پر بھی اس کا اثر پڑا

علاءالدین خلجی کو دکن میں وہی درجہ حاصل ہے جو محمود غزنوی کو تاریخ ہند میں۔ جس طرح محمود نے ہندوستان کی دولت سے اپنی سلطنت کو مستحکم اور مالامال کرلیا اسی طرح علاءالدین نے دکن کی دولت سے سلطنت دہلی کو حاصل کیا اور بادشاہ بننے کے بعد اسی دولت سے اپنے مخالفین کے منہ بند کردیے۔ اور وہ قوت حاصل کی جو آج بیسویں صدی میں آمروں کو حاصل ہے۔

دکن پر دوسرا حملہ سنہ ۱۳۰۷ء میں ہوا کیونکہ دیوگری کے راجہ نے خراج ادا کرنا روک دیا تھا۔ علاءالدین اس دوران میں سلطنت کے کاروبار اور فتوحات میں مصروف رہا اور دکن کی طرف سے کسی قدر غافل بھی ہوگیا جس سے فائدہ اٹھا کر رام دیو نے تین سال تک مسلسل خراج روک دیا۔ سلطنت دہلی کی جانب سے ملک کافور کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی گئی لیکن راجہ نے بغیر مقابلہ کئے اطاعت قبول کرلی اور دہلی جاکر ایک مدت تک شاہی مہمان رہا۔ دربار سے اس کو رائے رایاں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا اور سرخ چتر لگانے کی اجازت دی گئی۔ گجرات کا ضلع نیسری بھی اس کی عملداری میں دے دیا گیا۔ اس طرح دیوگری پر پورا سیاسی اقتدار حاصل ہوگیا۔

سنہ ۱۳۰۹ء میں تلنگانہ کے مرکز ورنگل پر حملہ کیا گیا۔ اس حملہ سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ سلطنت دہلی کے پیش نظر دکن پر حکومت کرنے کا ایک خاکہ موجود تھا۔ ملک کافور کی ماتحتی میں شاہی فوجیں ورنگل کی طرف روانہ ہوئیں۔ ضیاءالدین برنی نے لکھا ہے کہ علاءالدین نے ملک کافور کو یہ حکم دیا تھا کہ ورنگل پر قبضہ کرنے کے بجائے دولت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ شاہی فوجیں چندیری، چندہار، دیوگری سے ہوتی ہوئی ورنگل پہنچیں۔ راستہ میں دیوگری کے راجہ کی جانب سے شاہی فوج کیلئے ضروری انتظامات کردیے گئے تھے۔ ہنمکنڈہ پر قبضہ کرکے قلعہ کا محاصرہ کرلیا گیا۔ قلعہ بہت مضبوط اور مستحکم تھا۔ تھوڑے دنوں کے اندر ہی راجہ پرتاپ رودر دیو نے صلح کرلی اور سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اور نذرانہ و تاوان کے سلسلہ میں کثیر مقدار سونا، چاندی اور زر و جواہرات پیش کیا جو ایک ہزار اونٹوں پر لادا گیا۔ ہاتھی اور گھوڑوں کی ایک کثیر تعداد بھی ہاتھ آئی۔ پروفیسر کرشنا سوامی اینگار نے امیر خسرو اور برنی کے بیانات کا حوالہ دیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ورنگل کی پوری دولت ملک کافور کے ہاتھ آگئی تھی۔ اس طرح دکن کی دو متمول سلطنتوں پر سیاسی اقتدار قائم ہوگیا۔ اب صرف جنوب ہند میں دو اور سلطنتیں باقی رہ گئی تھیں۔ ایک دوارسمدر کی ہوسیلا سلطنت اور دوسری سلطنت پانڈیہ جو مالابار میں واقع تھی۔

ملک کافور نے ورنگل کی فتح کے وقت ہی جنوبی سلطنتوں کے حالات معلوم کرلئے تھے۔ دہلی پہونچنے کے بعد اس نے سلطان سے مالابار پر حملہ کی اجازت لے لی چنانچہ سنہ ۱۳۱۰ء میں ایک بڑی فوج کے ساتھ مالابار کی طرف روانہ ہوا۔ اس حملہ کو امیر خسرو نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے کیونکہ وہ خود اس میں ہمراہ تھے۔ دکن کی پہاڑیوں اور دشوار گذار راستوں کا حال بہت ہی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ راستہ میں رام دیو نے رسد کا انتظام کردیا تھا۔ اور کچھ فوجی ہاتھی بھی پیش کئے۔ نربدا، تاپتی کے علاوہ اس فوج کو تین اور دریا، گوداوری، سینا، بھیما عبور کرنے پڑے۔ بندری کے مقام پر ملک کافور ٹھیر گیا تاکہ مالابار سلطنت کے حالات معلوم کرے۔ اس وقت سلطنت کے لئے دو بھائیوں بیرپانڈیہ اور سندرپانڈیہ کے درمیان جنگ ہو رہی تھی جو حقیقی بھائی تھے۔ دوارسمدر کا راجہ بلال دیو اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاکر اپنی فوج کے ساتھ حملہ کے لئے گیا لیکن جوں ہی

بتاتا ہے اور بطوطہ اس کو مورد الزام نہیں سمجھتا۔ بہرحال واقعات کچھ بھی ہوں غیاث الدین تغلق نے اکثر لوگوں کو جو دہلی بھاگ آئے تھے سخت سزائیں دیں۔ اور ایک دوسری فوج الغ خاں ہی کی سرکردگی میں روانہ کی جس کے بعد قلعہ فتح ہوگیا اور راجہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر کے تلنگانہ کے علاقے کو بھی براہ راست دہلی کے تحت کر دیا گیا۔

سلطنت دہلی جو ۱۲۹۴ء میں صرف دریائے نربدا تک پھیلی ہوئی تھی ۱۳۳۲ء میں مالابار تک پھیل گئی۔ مسلمانوں کی اتنی وسیع سلطنت اس سے قبل یا اس کے بعد کبھی قائم نہ ہوئی۔ خاندیس کے علاقے میں پٹھانوں کی نوآبادی اسی زمانہ میں قایم ہوئی۔ ان حملوں سے مسلمانوں کے اکثر قبیلے اور خاندان شاہان دہلی سے جاگیریں حاصل کر کے دکن کے مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے تھے۔

سلطان محمد تغلق (الغ خاں) کے ابتدائی زمانہ میں اس کے بھانجے بہاءالدین گرشاسپ نے جو گلبرگہ کے قریب ساگر میں متعین تھا بغاوت کر دی۔ اس کی سرکوبی کے لئے خواجہ جہاں کی قیادت میں شاہی فوجیں روانہ کی گئیں۔ بہاءالدین نے شاہی فوجوں کی آمد سے مرعوب ہو کر دریائے کرشنا اور تنگبھدرا کی درمیانی سلطنت کمپلی میں پناہ لی۔ یہاں اس کا تعاقب کیا گیا۔ یہاں سے یہ دوار سمدرا چلا گیا اور وہاں بھی اس کا تعاقب کیا گیا۔ اس تعاقب میں ان دونوں سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا گیا اور ان کو براہ راست دہلی کے تحت کر دیا گیا۔ بہاءالدین یہاں گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ روپوش ہوگیا اور پھر اس کا پتہ نہ چلا۔

محمد تغلق کے پیش نظر سب سے زیادہ مشکل مسئلہ مرکزی قوت کا قیام تھا اس لئے کہ مرکز کو موثر بنائے بغیر اتنی وسیع سلطنت پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ اس نے اس مسئلہ کا حل یہ سوچا کہ دہلی کے بجائے دیوگری کو مرکز بنایا جائے تاکہ شمال، جنوب، مشرق اور مغرب چاروں طرف سے اس کا فاصلہ یکساں رہے۔ دہلی میں بیٹھ کر جنوب ہند کے علاقے مالابار وغیرہ پر تسلط قائم رکھنا بہت ہی مشکل تھا اور پھر ایسے زمانہ میں جب کہ ذرایع حمل و نقل میں بڑی دشواریاں تھیں۔ نظری اعتبار سے اس کا یہ حل بہت ہی مناسب اور بہتر تھا لیکن عملی اعتبار سے اس کا یہ منصوبہ بیکار ثابت ہوا۔ اس نے اپنے اقتدار سے دہلی کو اجاڑ کر دولت آباد کو بسا لیا لیکن بہت ہی تھوڑے عرصے میں پھر دہلی واپس ہونا پڑا۔ اس رد و بدل سے دولت آباد (دیوگری) میں مسلمانوں کی ایک کافی تعداد آباد ہوگئی اور امرائے صدہ کا ایک بڑا حصہ یہیں مقیم ہوگیا۔ جس کے بعد انھیں امراؤں نے دہلی سے بغاوت کر کے ایک علیحدہ اسلامی سلطنت دکن میں قائم کی جو بعد میں سلطنت بہمنی کے نام سے مشہور ہوئی۔ دکن کی یہ خود مختار سلطنت محمد تغلق کی زندگی ہی میں قائم ہوئی اور بعد میں تاریخ ہند اور تاریخ دکن کی سیاسیات میں ایک بڑے انقلاب کا باعث ثابت ہوئی۔

سید کرار علی

افغانی قندھار نہیں۔ دکن کا قندھار جسے قندھار شریف کہا جاتا ہے۔ کیونکہ محمد تغلق کے ساتھ دکن میں آئے ہوئے اولیا واللہ کی چودہ سو پالکیوں میں کا ایک کثیر حصہ قندھار شریف ہی کے حصہ میں آیا۔ یہہ دکن کا بلگرام ہے، یہاں سے اولیا، صوفیا، علما، شعرا، مورخین اور مشاہیر پیدا ہوئے جن کے حالات اور کارنامے " مشاہیر قندھار دکن " میں پڑھئے جس کو اکبر صدیقی صاحب بی، اے نے مرتب کر کے باتصویر شایع کیا اور اب ادارۂ ادبیات اُردو کو اس کا حق تصنیف دے دیا ہے۔ (مہتمم)

سلطان محمد شاہ بہمنی
۷۷۵ھ - ۷۸۰ھ

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی
۸۲۵ھ ، ۸۳۹ھ

محمد شاہ اول کا انتقال ۱۳۷۵ء میں ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مجاہد شاہ تخت نشین ہوا جو تین سال سے زیادہ بادشاہی کرنے نہ پایا کیونکہ اس کے چچا داؤد نے اس کا خاتمہ کرکے خود تخت پر قبضہ کرلیا۔ مجاہد شاہ کے ہمدردوں نے بہت جلد اس کا بھی خاتمہ کردیا اور علاء الدین حسن کے ایک پوتے کو جس کا نام محمد شاہ دوم ہے تخت نشین کیا گیا۔ محمد شاہ دوم کی تخت نشینی سے اس سلطنت کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس میں نہ صرف ملک کو خانہ جنگی سے نجات ملی بلکہ تمدنی ترقی کی نئی راہیں کھل گئیں۔ محمد شاہ بہت تعلیم یافتہ اور علم دوست آدمی تھا اس کی وجہ سے دکن میں سب سے پہلے علمی سرگرمیاں شروع ہوگئیں جو اس سے پہلے نہیں ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ محمد شاہ دوم سے پہلے جو زمانہ تھا وہ انتشار و ناہمواری اور تشکیل کا زمانہ تھا۔ اس میں علمی ترقی نہیں ہو سکتی تھی۔ جب تک استحکام سلطنت کے ساتھ ملک میں سیاسی اطمینان نہ پیدا ہو جائے اہل علم اطمینان کے ساتھ علمی کام نہیں کرسکتے۔ محمد شاہ دوم کے کامیاب نظم و نسق کی وجہ سے ایک طرف تو امن قائم ہوگیا اور دوسری طرف اس کی علم دوستی نے ملک میں علمی دلچسپیاں پیدا کردیں۔ لائق علما جمع کئے گئے مدرسے کھول دئے گئے۔ استادوں کے لئے خاطر خواہ تنخواہیں اور طلبہ کے لئے وظائف مقرر ہوگئے۔ ان علما میں سے جو اس زمانے میں دکن آئے تھے فضل اللہ انجو کا نام ہمیشہ یادرہے گا جو دنیائے اسلام کا بہت بڑا عالم تھا اسی شخصیت کی وجہ سے دکن میں علم کی دیا روشن ہوئی اور اس کی روشنی ایسی پھیلی کہ دکن علم کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

سلطنت بہمنی کا انتہائی عروج

جس طرح محمد شاہ اول کے انتقال کے بعد خانہ جنگی کی بدنما شکل پیدا ہوئی تھی اور چند روز تک تمدنی ترقی مسدود ہوگئی اسی طرح محمد شاہ دوم کے بعد بھی بہت سی سیاسی بدمزگیاں پیدا ہوگئیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز کے لئے سلطنت بہمنی کے وقار کو دھکا لگا۔ محمد شاہ کا انتقال ۱۳۹۷ء میں ہوا۔ اس کے جانشین غیاث الدین، اور شمس الدین جو چند مہینوں کے فصل سے اس کے بعد تخت نشین ہوئے اس گراں بار کے متحمل نہیں ہوسکے۔ ایک ترک غلام تغلچین نامی سلطنت پر بری طرح حاوی ہوگیا اور بادشاہ کٹ پتلی ہوگئے اس وقت ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو ملک کی صحیح رہنمائی کرسکیں۔ علاء الدین حسن کے دوسرے پوتے محمود خاں اور احمد خاں جو بہت لائق اور ذی علم تھے بہمنی سلطنت کے وقار کو بچانے کے لئے میدان میں آگئے اور سازش کرکے تغلچین کو ماردیا اور فیروز خاں تاج الدین فیروز شاہ کے لقب سے تخت فیروزہ پر بیٹھ گیا۔ جو اس خاندان بہمنیہ کا سب سے زیادہ جلیل القدر اور مایۂ ناز بادشاہ تھا۔ اس کے عہد حکومت میں دکن کی جس قدر ذہنی اور اخلاقی تربیت ہوئی اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے بہمنیوں کا تمام تر تمدن اسی عہد کی پیداوار ہے۔ فیروز شاہ فضل اللہ انجو کا شاگرد تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے استاد کے تمام سرمایۂ علم سے فائدہ اٹھایا تھا بلکہ اپنی رسا طبیعت اور غیر معمولی ذہن کی وجہ سے ایسی علمی شان پیدا کردی تھی کہ دنیا کے سلاطین میں اس کی مثال نہیں ملتی اس نے تمام ملک میں اشاعت علم کے تمام ذرائع استعمال کئے۔ دور دراز سے علما جمع کئے اور ان کی خاطر خواہ تواضع کی۔ علم کی مجلسیں منعقد کیں اور ان میں وہ خود بھی ایسا حصہ لیتا تھا کہ گویا وہ بادشاہ نہیں ہے اسی پر حصر نہیں ہے بلکہ فرصت کے اوقات میں وہ بلند پایہ طلبہ کو جمع کرکے ان کو انتہائی مضامین میں درس دیا کرتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ

فیروز شاہ کی ذی علم شخصیت کی وجہ سے دکن کے در و دیوار علم و فضل سے گونجنے لگے اور گلبرگہ علم کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

علمیت کے ساتھ فیروز شاہ میں سیاسی تدبر بھی کچھ کم نہیں تھا۔ ملک کی کامیاب سیاسی رہنمائی کی اور ہمسایہ سلطنتوں پر اس قدر رعب داب قائم کیا کہ سب سلطنت بہمنی کا لوہا مانتے تھے۔ نیز فیروز شاہ کے پاکیزہ ذوق کی وجہ سے دکن کے تمدن میں بڑی شگفتگی پیدا ہوگئی لباس وضع قطع نئے انداز میں ڈھل گئے لباس کی بعض اختراعیں جو فیروز شاہ نے بنائی تھیں وہ اب تک موجود ہیں اگر فیروز شاہ سے کوئی غلطی ہوئی تھی تو وہ صرف یہ تھی کہ اس نے اپنے بھائی احمد خاں کی جگہ اپنے بیٹے حسن خان کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا۔ احمد خاں عمر رسیدہ اور لایق آدمی تھا۔ اس نے خود فیروز شاہ کی تخت نشینی میں مدد دی تھی۔ اسی بنا پر اس زمانے کے مشہور بزرگ حضرت بندہ نوازؒ نے بھی احمد خاں کے لئے اپنا روحانی فیصلہ صادر کردیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا دونوں فریقوں میں ان بن ہوگئی اور احمد خاں کو تلوار کے زور سے تخت حاصل کرنا پڑا

سلطنت بہمنی کا آخری دور

احمد خاں جو اپنی روحانیت کی وجہ سے احمد شاہ ولی بہمنی کے نام سے موسوم ہے ۸۲۵ھ میں تخت نشین ہوا اس کی تخت نشینی سے سلطنت کے استحکام و توسیع میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ علم و فن کی سرگرمیاں اسی طرح قائم رہیں جس طرح فیروز شاہ کے عہد میں تھیں۔ لیکن اس کے عہد میں گلبرگہ کی جگہ بیدر کو پائے تخت بنا لیا گیا اس انتظام سے یہ فائدہ ہوا کہ پائے تخت کے لئے بیدر جیسی ایک بلند جگہ مل گئی لیکن گلبرگہ جو ایک زمانے میں علم و فن کا مرکز بن گیا تھا اس کی آب و تاب گھٹنے لگی اب دنیا کی توجہ بیدر کی طرف منعطف ہونے لگی۔ شیخ آذری جو اس زمانے کا مشہور عالم ہے اسی زمانے میں دکن آیا تھا اور دربار کی فیاضیوں سے فائدہ اٹھا کر ملک کی علمی خدمت کرتا تھا۔ اس کو دربار سے یہ کہا گیا تھا کہ بہمن نامہ کے نام سے سلطنت بہمنی کی تاریخ لکھے۔ چنانچہ اس نے اپنی آخری عمر تک اس کی تکمیل بھی کی تھی لیکن افسوس ہے کہ وہ نایاب ہے ان بند نامہ کی چیزوں کے قطع نظر جو بہت کچھ حوصلہ افزا معلوم ہوتی ہیں سلطنت کی تہ میں بہت سی چیزیں ایسی تھیں جو آگے چل کر اس سلطنت کے زوال کا باعث ہوگئیں یعنے اسی عہد سے طبقہ واری کشمکش کے بدنما آثار ظاہر ہونے لگے۔ علاءالدین حسن کے عہد سے جو لوگ یہاں آ کر اور ان کے خاندان دکن میں آباد ہوگئے تھے وہ اپنے آپ کو دکھنی کہتے تھے اور انھیں اس کا حق بھی تھا کیونکہ دکن کے حقیقی آباد کار اور سلطنت بہمنی کے بانی تھے۔ اور اس پر فخر بیجا ایک صحیح تھی لیکن اس کے بعد جو نو وارد ترکستان اور ایران سے یہاں آتے تھے وہ ان میں گھل مل نہیں سکے اور اہل دکن ان کو اپنا دشمن سمجھنے لگے طبقہ واری کشمکش۔ احمد شاہ کے بیٹے علاءالدین ثانی کے عہد میں جو ۸۳۸ھ میں تخت نشین ہوا بری طرح ظاہر ہوگئی یعنے دونوں فریقوں میں سخت خوں ریزیاں ہونے لگیں ایک ہنگامہ تو اس قدر زبردست ہوا کہ جس میں تمام باہر کے لوگ مارڈالے گئے۔ اگرچہ علاءالدین ثانی نے اپنے آہنی پنجہ سے اس آگ کو فرو کردیا لیکن اس کے جانشینوں کے عہد میں اس کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں اور بالآخر سلطنت بہمنی کو جلا کر خاک کردیا۔

علاء الدین ثانی کے بعد جس کا انتقال ۱۴۵۸ء میں ہوا تھا اس کا بیٹا ہمایوں اس کا جانشین ہوا لیکن یہ تین سال سے زیادہ حکومت نہیں کر سکا۔ اس کی بے وقت موت سے بہت نقصان ہوا۔ اس کے بیٹے چھوٹے تھے، ایک بیٹا نظام شاہ بہمنی کے نام سے تخت نشین کیا گیا تھا جو جلد مر گیا اور دوسرا بیٹا محمد شاہ لشکری کے نام تخت پر بٹھایا گیا چونکہ اس کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی اس لئے اس کی ماں نرگس بانو جو مدبرہ تھیں ملک کی سیاسی رہنمائی کرتی تھی لیکن وزارت کی بڑی خدمت پر محمود گاواں ثانی ایک نووارد برسر اقتدار ہوگیا۔ یہ اگرچہ علاء الدین ثانی کے عہد میں باہر سے آیا تھا اور تجارت کرتا تھا لیکن محمد شاہ لشکری کی کمسنی کے زمانے میں اس نے بہت ترقی کرلی۔ اور سلطنت کے تمام سیاہ و سفید اس کے سپرد ہوگئے۔ محمد شاہ کے سن رشد کے پہنچنے کے بعد بھی اس کے اقتدار میں کمی نہیں ہوئی محمود گاواں کے اقتدار سے بہت سے فائدے بھی ہوئے چنانچہ ملک میں علمی کام ہوئے اور دستور میں اضافے ہوئے لیکن اس کی تنگ نظری سے دکھنی فریق بیزار ہوگیا اور اس کو مارنے کے درپے ہوگیا چنانچہ ایک خاص موقع پر جب کہ بادشاہ اور محمود گاواں مشرقی اور شمالی تلنگانہ کی مہم میں مصروف تھے ایک سازش ہوگئی۔ بادشاہ کو محمود گاواں کی طرف سے بدظن کیا گیا۔ بادشاہ نے ناعاقبت اندیشی سے اس کو مارنے کا حکم صادر کردیا۔

محمود گاواں کا قتل جو ۱۴۸۱ء میں ہوا دکن کا بڑا واقعہ ہے اسی واقعہ کے بعد سے سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ کیونکہ جو لوگ اس کے قتل کے ذمہ دار تھے ان میں سیاسی رہنمائی کی صلاحیت نہ تھی۔ ملک حسن بحری جو نظام الملک کے خطاب سے سرفراز تھا اس فعل کا ذمہ دار تھا اگر اس میں محمود گاواں کی وزارت کے سنبھالنے کی صلاحیت ہوتی تو سلطنت اپنی جگہ قائم رہتی اور شیرازہ نہیں بکھرتا لیکن افسوس یہ ہے کہ نظام الملک اور اس کا فریق بالکل خود غرض تھا ان کی نا اہلیت اور خود غرضی کی وجہ سے ہر قدم پر ملک کو نقصان پہنچنے لگا جو لوگ محمود گاواں کے آوردہ تھے سب حکومت سے متنفر ہوگئے اور ہر جگہ انحراف کرنے لگے محمد شاہ لشکری کی زندگی تک جو ۱۴۸۲ء میں ہوا تھا حالات کسی قدر درپردہ تھے لیکن اس کے انتقال کے بعد جب اس کے کمسن بیٹے محمود شاہ بہمنی کو تخت نشین کیا گیا تو علانیہ خودسری ظاہر ہونے لگی۔ اکثر صوبہ دار باغی ہو گئے چنانچہ ۱۴۹۰ء میں احمد نگر اور بیجاپور اور برار کے صوبہ داروں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا چند سال بعد گولکنڈہ بھی خود مختار ہوگیا ۱۴۹۰ء کو سلطنت بہمنی کی آخری تاریخ سمجھنا چاہیئے بیدر میں جو سلطنت کا مرکز ہے قاسم برید ذی اختیار ہوگیا جو دراصل یہاں کا کوتوال تھا محمود شاہ اور اس کے تمام جانشین سب اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہوئے تھے ۱۵۱۸ء میں محمود شاہ کے مرنے کے بعد اس کے چار بیٹے احمد شاہ، علاء الدین ثالث، ولی اللہ کلیم اللہ یکے بعد دیگرے برائے نام تخت پر بٹھائے گئے تھے لیکن یہ سب بریدیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھے۔ بالآخر کلیم اللہ حق ناشناس بریدیوں کی دست درازیوں سے تنگ آکر ۱۵۲۷ء میں احمد نگر بھاگ گیا اور اس کے ساتھ تخت فیروزہ پر بیٹھنے والے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے۔

عبدالمجید صدیقی

کشن رائے کے عہد میں سلطنت وجیانگر کی جو عظمت تھی وہ سب کو معلوم ہے۔ اس کی فوجی طاقت بہت زیادہ تھی۔ ایسی طاقتور سلطنت کا مقابلہ کچھ آسان نہیں تھا۔ اس موقع کی نزاکت کے باوجود مجاہد نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ یہ بڑے گھمسان کا معرکہ تھا۔ گو اس حملے سے کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا تھا لیکن اس میں مجاہد شاہ نے جو کارنامے دکھائے تھے وہ ہمیشہ یاد رہیں گے۔ کوئی معرکہ ایسا نہ تھا جس میں اس نے حصہ نہ لیا ہو۔ وجیانگر کی چڑھائی، شرنگا کا حملہ، قلعہ ادھونی کا محاصرہ، اور رامیشورم تک کشن رائے کا تعاقب اس کے مشہور کارنامے ہیں جو بھلائے نہیں جا سکتے۔ ان چڑھائیوں میں ایک امتیازی بات یہ تھی کہ کہیں قتل عام نہیں کیا گیا۔ جو دشمن مقابلہ کرتا تھا اسی کو مارا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ مجاہد شاہ کے باپ محمد شاہ کی وصیت تھی جس کی پابندی کی گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر شجیع سپہ سالار کے اوصاف میں یہ چیز داخل ہے۔

اگر مجاہد شاہ کی زندگی مہلت دیتی تو شاید دنیا کے بڑے بادشاہوں میں اس کا شمار ہوتا۔ دریائے کرشنا کے کنارے جہاں اس کے دشمنوں نے اس کا خاتمہ کرنا چاہا تھا اس وقت بھی اس نے اپنی فطری شجاعت کے جوہر دکھائے۔ یہ کیمپ میں سو رہا تھا کہ دشمنوں نے اس پر وار کیا۔ داؤد خاں نے خنجر بھونکا تو اس کی آنتیں نکل آئیں تھیں۔ لیکن اس کے باوجود اس نے داؤد کو اس کے خنجر کے ساتھ پکڑ کر کھینچا اور قریب تھا کہ داؤد مر جاتا لیکن اس کے ایک ساتھی مسعود خاں نے اس کو مار دیا اور اس طرح دکن کا یہ ہونہار حکمراں موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

سلطان احمد شاہ ولی البہمنی

عبدالحفیظ صدیقی

احمد خاں بہمنی بن سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے دوسرے بیٹے تھے۔ ولادت ۷۷۴ھ م ۱۳۷۲ء میں بعہد سلطان محمد شاہ بن سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی ہوئی۔ باپ کے انتقال کے وقت یہ اور ان کے بھائی فیروز شاہ صغیر سن تھے۔ اور ان دونوں کی پرورش و پرداخت ان کے چچیرے بھائی محمد شاہ ثانی نے کی۔ ان دونوں کو تیر اندازی۔ چوگان بازی۔ سواری۔ پڑھنا۔ لکھنا غرض کہ ہر شاہی علم و فن کی اچھی تعلیم دی۔ اور شیراز کے مشہور و متبحر عالم میر فضل اللہ انجو کو ہر دو کی تعلیم و تربیت کے لئے مقرر کیا اور اپنی دونوں بیٹیاں ان دونوں بھائیوں کو بیاہ دیں۔

جب فیروز شاہ بادشاہ ہوا تو احمد خاں کو خانخاناں کا خطاب دیا اور امیر الامرا مقرر کیا۔ وہ نہایت شجاع اور خوبصورت جوان تھے چہرہ روشن اور پیشانی خندہ تھی۔ خلوص ارادت سے حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی۔ بصرف زر کثیر حضرت کے لئے ایک خانقاہ تعمیر کرائی اور ہمیشہ حاضر خدمت ہو کر اسرار معرفت کا سبق لیتے اور ہر محفل سماع میں شریک ہو کر نکات تصوف سے محظوظ اور توجہ حضرت سے بہرہ مند ہوتے تھے۔ چنانچہ حضرت نے ان کی نسبت بادشاہی کی پیشین گوئی کی تھی جس کی وجہ سے فیروز شاہ بہت رنجیدہ ہوا اور حضرت کو شہر گلبرگہ سے باہر جا کر رہنے کا حکم دیا۔ اور مصاحبین کے ورغلانے سے احمد خاں سے بھی بدظن ہوا اور اپنے دو غلاموں ہوشیار عین الملک و بیدار نظام الملک کی صلاح سے ان کو مدھا کرانے کا ارادہ کیا۔ جب ان کو اس کی اطلاع ملی تو اپنے فرزند علاء الدین کے ساتھ شہر سے بھاگ نکلے اور حضرت کے ارشاد و فیوض سے مطمئن ہو کر وہاں سے رخصت ہوئے۔

جب ان کے بھاگ جانے کی خبر فیروز شاہ کو ہوئی تو ایک فوج اپنے دو غلام ہوشیار اور بیدار کے ساتھ پکڑ لانے کے لئے روانہ کی۔ انھوں نے یہ اطلاع پا کر مختصر سی فوج تیار کر کے شاہی فوج کا مقابلہ کیا جس میں ان کو کامیابی حاصل ہوئی۔

فیروز شاہ ان کی فتح کی خبر سن کر قلعہ کا دروازہ کھلوا کر اپنے پاس بلوایا۔ وہ فیروز شاہ کے پاس گئے اور اس کے قدموں پر سر رکھ کر

جو حالت بیماری میں فریش تھا زار وقطار رونے لگے۔ فیروز شاہ نے مسرت کر خوشی کے لہجہ میں کہا کہ میں نے تم کو اپنے حین حیات بادشاہ دیکھا۔ تم شایان سلطنت ہو اور مستحقاق اس کا تم ہیں کو پہونچتا ہے۔ میں شفقت پدری سے حسن خاں کی ولیعہدی کی سعی کرتا رہا جب کار فرمایان قضا وقدر میرے بعد تاج سلطنت تمہارے لئے نامزد کر چکے ہیں تو دوسرے کے لئے کوشش بے فائدہ ہے۔ حسن خاں کو تمھارے سپرد کیا۔ اٹھو آج ہی سے مہمات سلطنت کو انجام دینا شروع کرو۔ غرض شوال پانچویں ۸۲۵ھ کو تاج بادشاہ بھائی کا زیب سر کر کے تخت فیروزہ پر جلوہ گر ہوئے اور اپنا نام "احمد شاہ بہمنی" رکھا۔

مہمات سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلے خلف حسن بصری کو وکیل السلطنت کر کے ہزار دو صدی کا منصب عطا کیا اور ملک التجار خطاب دیا۔ اور ہوشیار و بیدار غلاموں میں سے ایک کو خطاب امیر الامرائی اور دوسرے کو دولت آباد کی فوج کی سپہ سالاری کے منصب سے سرفراز فرمایا۔ اور فیروز شاہ کے بیٹے حسن خاں کو جو وارث تاج و تخت تھا اور جمیع ارکان دولت جس کے قتل یا قید کرنے کی صلاح دیتے تھے منصب پانصدی عطا کیا اور فیروز آباد جاگیر میں دیا اور وہاں اس کو آزادی سے رہنے اور سیر و شکار کرنے کی اجازت بھی عطا کی۔ یہ شہزادہ جب کی زندگی تک وہاں سیر و شکار میں مشغول رہ کر اپنی زندگی خوب مزے سے بسر کرتا رہا۔

راجہ دیجیا نگر نے سرکشی شروع کی اور خراج دینے سے انکار کیا۔ علاوہ اس کے گزشتہ جنگ میں مسلمانوں کا بہت سا خون بہا تھا اس کا بدلہ لینا بھی ضروری تھا۔ اس لئے چالیس ہزار سوار جرار ہمراہ رکاب لے کر دیجیا نگر کی طرف روانہ ہوئے۔ راجہ رائے ورنگل کی مدد سے مقابلہ میں آیا۔ دونوں فوجیں دریائے تنگبھدرا کے کنارے ایک دوسرے کے سامنے اتریں لیکن دونوں میں سے کوئی آگے بڑھ کر اول حملہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر بہمنی فوج کا ایک دستہ یکایک ایسی پھرتی سے دریا پار اترا کہ راجہ دیو رائے بھی حیران رہ گیا اور اس کی فوج فوراً منتشر ہو کر بھاگ نکلی۔

ایک دن احمد شاہ چند سواروں کے ساتھ شکار کو نکلے۔ ہندوؤں نے جو موقع کی تاک میں تھے پیچھا کیا اور چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے سلطان کے سب ساتھی کام آئے مگر سلطان تنہا میں کمک آ پہونچی اور دیجیا نگر کی تسخیر کا عزم ارادہ کیا۔ دیو رائے گھبرا گیا اور اس نے حیرانی میں کئی سال کے خراج کی بقایا رقم کو ہاتھیوں پر لاد کر فی الفور بارگاہ سلطانی میں داخل کر دیا اور عجز و نیاز سے صلح کی درخواست کی دونوں میں صلح ہوگئی بوقت واپسی تلنگانہ پر چڑھائی کی۔ رائے ورنگل نے بافوج لڑ کر آپ ہی مقابلہ کیا۔ آخر مارا گیا۔ ملک تلنگ کو اپنے تصرف و اقتدار میں لیا اور مظفر و منصور ہو کر واپس ہوئے۔

انہیں ایام میں سلطان بیدر کے ایک میدان سے گزرے جو نہایت پرفضا تھا۔ حکومت کے لئے ایک مرکزی مقام کی ضرورت تھی جہاں سے پورے دکن پر حکومت کی جا سکے۔ بیدر چونکہ دکن کے وسط میں نہایت بلندی پر واقع تھا اس لئے سلطان نے اس کو پسند فرما کر یہاں شہر کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام احمد آباد بیدر رکھا۔ اور رجب ۸۲۶ھ مطابق ۱۴۲۳ء میں کلبرگہ کے بجائے بیدر کو پایہ تخت قرار دیا یہاں قلعہ حصار اور محلات شاہی و باغات وغیرہ چار سال کے قلیل عرصہ میں تعمیر کرائے۔

بیدر میں سلطنت کرتے ہوئے چند سال گزرے تھے کہ ملک بارش سے قحط پڑ گیا اور بے شمار انسان و حیوان مرنے لگے۔ سلطان نے خزانہ کا منہ کھول دیا۔ اور غلہ کے شاہی ذخائر خرید کر مساکین میں تقسیم کئے جب ایک سال اس طرح گذرا اور دوسرے سال بھی بارش نہ ہوئی۔ سلطان نے علماء و مشائخ اور زہاد کو جمع کر کے نماز استسقا ادا کی لیکن جب یہ بھی بے سود ہوا تو سلطان

بنفس نفیس صحرا کی طرف تشریف لے گئے اور تنہا بلندی پر چڑھ کر چند دوگانے ادا کئے۔ دعا مقبول ہوئی اور اس قدر مینھ برسنے لگا کہ لوگ خوش ہوگئے اور اُسی دن سے سلطان "احمد شاہ" ولی کے لقب سے مشہور ہوگئے۔

سلطان کو قواعد لشکرکشی اور آئین فرمانروائی میں کافی مہارت تھی۔ وہ ہر کام میں بھائی کی پیروی کرتے سادات علماء اور مشائخ کی تعظیم و تکریم کرتے۔ فقیروں اور درویشوں سے بہت عقیدت رکھتے۔ صوم و صلوٰۃ کے اتنے پابند کہ کبھی تہجد اور اشراق تک قضا نہیں ہونے دی اور کل مہام سلطنت بذات خود انجام دیتے۔ غریب سے غریب رعایا کی فریاد سنتے اور انصاف فرماتے اور گاہے گاہے مثل ہارون رشید خلیفہ بغداد کے بھیس بدل کر رعایا کے حالات دریافت کرتے۔ کبھی مسجدوں اور مدرسوں میں جاکر وہاں کے حالات دیکھتے اور کبھی دفاتر میں جاکر ملک کے نظم و نسق کو ملاحظہ فرماکر اصلاحیں جاری فرماتے۔ غرض آپ نے اخلاق حسنہ سے خاص عام کو مطیع و فرمانبردار بنالیا تھا۔

جن دنوں میں سلطان جنگ میں مصروف تھے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ نے رحلت فرمائی۔ جس کا سلطان کو بہت صدمہ ہوا۔ ایک روز بھرے دربار میں اپنے صاحبزادوں کو طلب کیا اور سب کی طرف مخاطب ہوکر بولے۔ جب مالک اپنے بندہ کو اپنے پاس بلائے تو کیا کرنا چاہیئے۔ مجمع نے جواب دیا کہ اپنے مالک کا حکم بجالانا چاہیئے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ جناب ہی مجھے طلب فرماتے ہیں اور حضرت پیرو مرشد بندہ نواز گیسو دراز کی یاد ستارہی ہے۔ اب باغ عالم کی سیر سے دل کو سیر ہوگیا۔ یہ کہہ کر آپ نے ملک کے مختلف علاقوں پر فرزندوں کو حاکم مقرر فرمایا۔ چنانچہ ولایت رام نگر، مدہول، کلم، برار اور ولایت ماہلور کا شاہزادہ محمود خاں کو حاکم مقرر کیا۔ شاہزادہ داؤد خاں کو راکور اور تلنگانہ کا اور ولیعہد علاء الدین کو اپنی جگہ بادشاہی دی اور چھوٹے شہزادہ محمد خاں کو بڑے بھائی کا شریک شاہی کیا اور عدم مخالفت کے بارہ میں چاروں سے قسم لی اور ضروری وصیت اور سب کو اتفاق کی ہدایت کرکے دربار برخاست اور پھر یاد حق میں ایسے مشغول ہوئے کہ عین حالت عبادت میں ۲۹ ذیحجہ ۸۳۹ھ کو بوقت شب واصل بحق ہوئے۔ سلطان کا گنبد بیدر سے ایک کوس کے فاصلے پر موضع اشٹور کے میدان میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

محمد ظہیر الدین

پُرانا پُل

(حیدرآباد)

لرزتی نگاہوں کا فرمان ہے تو
دھڑکتے ہوئے دل کا احسان ہے تو
ثبات تمنا کی پہچان ہے تو
رُکا جس سے طوفاں وہ طوفان ہے تُو

(۲)

گلستانِ چلیم کی رنگیں کہانی
قطب شاہ کے دل کی کافر جوانی
غرور محبت کی زندہ نشانی
ضیائے چراغ شبستان ہے تُو

(۳)

"پڑی" "بھاگ نگری" کی بنیاد تجھ سے
ہوا دشتِ ویران آباد تجھ سے
بنا تجھ سے، ہاں حیدرآباد تجھ سے
مری داستانوں کا عنوان ہے تُو

(۴)

وہ دن جا چکے، وہ زمانہ نہیں ہے
وہ زلفیں نہیں ہیں وہ شانہ نہیں ہے
مگر یہ حقیقت، فسانہ نہیں ہے
کہ سچی محبت کا پیمان ہے تُو

میکشؔ

بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت

سلطنت بہمنیہ کے زوال کے بعد دکن میں جو پانچ اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں ان میں دو بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومتیں سیاسی و تمدنی حیثیت سے نہ صرف دوسری ریاستوں سے بہت زیادہ ممتاز تھیں نہ صرف حدود اراضی کی وسعت بلکہ فوجی قوت میں یہ دوسری دکنی ریاستوں سے بڑھی ہوئی تھیں بلکہ ہندوستان کی دوسری متعدد حکومتوں سے زیادہ پائدار اور برتر تھیں۔ ان کی عالیشان عمارتیں اور تہذیب و تمدن کے دوسرے آثار آج بھی ان کی عظمت اور اہمیت کو یاد دلاتے ہیں۔ بیجاپور کا بول گنبد، ابراہیم روضہ اور سیکڑوں خوش نما مسجدیں، گولکنڈے کا عظیم الشان قلعہ، بادشاہوں کے گنبد، حیدرآباد کا چارمینار اور مکہ مسجد ان دونوں خاندان کی وہ زبردست یادگاریں ہیں جو آج بھی سیاحوں کو اپنی طرف کشاں کشاں لے آتی ہیں۔ اگرچہ آخری دور میں ان ریاستوں میں بہت سی کمزوریاں پیدا ہوگئی تھیں اور یہ مغلوں کی باج گزار بھی بن گئی تھیں اورنگ زیب عالم گیر نے سلطنت مغلیہ کو کشمیر سے لے کر راس کماری تک وسیع کرنے کے جوش میں ان کا خاتمہ کر کے خود اپنی سلطنت کو ہمیشہ کے لئے کمزور اور زوال پذیر کر دیا۔

سب سے پہلے عادل شاہی ریاست ہی اس کی جوع الارض کا شکار بنی اور یوسف عادل شاہ نے ۸۹۵ھ میں جس ایوان حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی وہ دو سو سال قائم رہ کر منہدم ہو گیا۔ یوسف اصل میں ترکی شہزادہ اور سلطان مراد کا دوسرا بیٹا تھا شہزادگی کے زمانے میں باپ کے انتقال اور بھائی کی تخت نشینی کے بعد اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس لئے ماں نے بڑی دانش مندی اور چالاکی سے اس کو موت کے منہ سے چھڑا کر خواجہ عمادالدین گرجانی نامی تاجر کے ساتھ راتوں رات قسطنطنیہ سے باہر بھیج دیا سوداگر مذکور یوسف کو لے کر ایران پہنچا اور یہاں شہر ساوہ میں سکونت اختیار کی، یوسف کا ابتدائی زمانہ ایران میں ہی گزرا اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ جب جوان ہوا تو خواجہ عماد کے ساتھ بطریق تجارت و سیاحت ۸۶۴ھ میں ہندوستان میں داخل ہوا۔

ان دنوں ہندوستان میں بہمنیہ سلطنت اپنے پورے عروج پر تھی۔ سلطان محمد بہمنی کا دربار خود اس کی اولوالعزمی اور عالی حوصلگی اور اس کے وزیر خواجہ جہاں خواجہ محمود گاواں کے تدبر اور حسن انتظام کی وجہ سے مرجع خلائق بنا ہوا تھا۔ یوسف بھی ہندوستان آیا تو سیدھے خواجہ محمود گاواں کے ہاں باریاب ہوا، خواجہ جہاں نے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا جہاں اس کی قابلیت کے جوہر کی آزمائش کے بعد اس کو شاہی چیلوں یا مقربین خاص کے زمرے میں شریک کر لیا گیا۔ سلطان محمود بہمنی کے دربار میں یوسف نے اپنی علمی اور فوجی قابلیتوں کے متعدد ثبوت دئے اور ہر قسم کے انعامات اور اعزازات سے سرفراز ہوتا گیا۔ یوسف عادل خاں اور ملک الشرق کے خطابات بھی پائے اور کئی سیر حاصل پرگنے بھی جاگیر کے طور پر ملے۔ مختلف موقعوں پر میدان جنگ کی سرکردگی اور فوجوں کی سپہ سالاری کے فرائض انجام دینے کے علاوہ پہلے "بیجنیر" کا عامل اور بالآخر سلطنت کے بہت بڑے صوبہ بیجاپور کا طرف دار یعنی گورنر مقرر ہوا۔

سلطان محمود اور اس کے وزیر خواجہ جہاں دونوں کی موت سے سلطنت بہمنیہ روز بروز کمزور ہوتی گئی۔ بریدی امیر نے بادشاہ کو

سلاطین بیجاپور

یوسف عادل شاہ

اسمٰعیل عادل شاہ

اپنے ہاتھ میں کٹھ پتلی بناکر خود حکومت شروع کردی اور سلطنت بہمنیہ تباہی کے قریب ہوگئی تو یوسف نے احمد نظام الملک طرف دار احمدنگر کی تحریک سے دوسرے صوبہ داروں کی طرح اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اور ۸۹۵ھ یا ۸۹۶ھ یوسف عادل خاں کی بجائے عادل شاہ کا لقب اختیار کرکے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کیا۔

یوسف عادل شاہ

خودمختار ہوتے ہی یوسف عادل شاہ اپنی ریاست کے اندرونی و بیرونی استحکام میں ہمہ تن مصروف ہوگیا۔ قاسم برید نے تیم راج مہاراجہ بیجانگر اور بہادر گیلانی کو اس کے خلاف اکسایا۔ اولاً عادل شاہ کے دو تین زرخیز علاقوں پر دشمنوں کا قبضہ ہوگیا لیکن بالآخر اس نے کئی معرکوں میں دشمنوں کا مقابلہ کرکے ان سے نہ صرف اپنے علاقے واپس لے لیے بلکہ ایک مدت کے لئے اُن کو خاموش کردیا۔ بیرونی استحکام سے فراغت پاکر جب وہ اندرونی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا تو اس سلسلے میں بھی بڑی مشکلات کا سامنا ہوا وہ نہ صرف شیعہ عقائد کی طرف مائل ہوگیا تھا بلکہ اپنی ریاست پر شیعیت کو سرکاری مذہب کی طرح رائج کرنے پر مصر بھی تھا اس کے تمام امرا اور خاص و عام سب سنی تھے۔ بادشاہ کے اس ارادے اور رواج ہرٹ نے بڑی زبردست اندرونی فساد اور ایک بیرونی جنگی طوفان کی صورت اختیار کرلی ۹۰۰ھ میں کمزور بہمنی بادشاہ محمود شاہ اس کا منشیہ اور نائب السلطنت قاسم برید جو عملاً بیدر کا بادشاہ تھا، احمد نظام شاہ والی احمدنگر اور قلی قطب شاہ فرماں روائے گولکنڈہ چاروں متحد طور پر بیجاپور پر حملہ آور ہوئے اور یوسف عادل شاہ کو سوائے وہاں سے بھاگ جانے کے اور کوئی چارہ نہ رہا۔ وہ بھاگ کر خاندیس میں عماد الملک کے پاس پناہ گزیں ہوا۔ یہاں اس نے اپنے خیالات سے دست برداری کی قسم کھائی اور عماد الملک نے بیچ میں پڑ کر جملہ آوروں سے مصالحت کی اور اُن کے لشکر واپس کرائے۔ یوسف کی خوش قسمتی تھی کہ ریاست دوبارہ مل گئی اور ایک زبردست فتنہ ختم ہوگیا۔ اگرچہ یوسف نے شیعہ عقائد کی ترویج نہ کرنے کی قسم کھائی تھی لیکن وہ ارادے سے باز نہ آیا اور جب دوبارہ اپنے تخت پر مستقل ہولیا تو اس نے زیادہ اہتمام اور ہوشیاری کے ساتھ بالآخر شیعیت اختیار کی اور یہ ہوا اس کے خاندان اور ریاست کا سرکاری مذہب اثنا عشری بھی قرار دیا۔

یوسف نے کم و بیش بائیس سال حکومت کی اور (۵۷) سال کی عمر میں ۹۱۶ھ میں وفات پائی اور حسب وصیت اس کی جاگیر جو بہمنی بادشاہ کی عطا کی ہوئی تھی، قصبہ کوگی نصرت آباد میں حضرت شاہ چندا حسینی کے پائین دفن کیا گیا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے بیٹے اسماعیل کو اپنا جانشین کرانے سے تخت نشینی کے رسوم ادا کردیے تھے۔ اسماعیل کے علاوہ اس کی اولاد میں تین لڑکیاں، مریم سلطان، خدیجہ سلطان اور بی بی ستی تھیں۔ یہ سب اور اسماعیل اس کی بیوی پونجی خاتون کی اولاد تھیں جو ایک دکنی خاتون تھی۔ مریم سلطان برہان نظام شاہ کو، خدیجہ سلطان علاء الدین عماد الملک اور بی بی ستی احمد شاہ بہمنی سے بیاہی گئیں یوسف ملک گیری اور ملک داری کے علاوہ اعلیٰ علمی لیاقت سے بہرہ مند متصف تھا وہ فارسی کا اچھا شاعر اور خط نستعلیق کا عمدہ خوش نویس تھا۔ فن موسیقی کا بھی شائق اور طنبورا اور عود بجانے میں مہارت رکھتا تھا۔ اس کی علم دوستی کی

وجہ سے بہت سے لایق اور قابل افراد اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔ اس کو تعمیر عمارات کا کوئی زیادہ موقع نہیں ملا۔ بریں ہم اس کے عہد کی بعض عمارتیں ہیں مگر بہت شکستہ حالت میں۔ وہ عام طور پر عدل و انصاف میں کافی شہرت رکھتا تھا اور اپنی شجاعت کی طرح سخاوت میں دور دور مشہور تھا۔

اسماعیل عادل شاہ ۱۵۱۰ء - ۱۵۳۴ء

یوسف عادل شاہ نے اپنی زندگی سے مایوس ہو کر اپنے سامنے ہی اپنے اکلوتے بیٹے اسماعیل کو مسند نشین کر دیا تھا اور انصرام امور سلطنت کے لئے کمال خاں دکھنی کو وزیر اعظم کے علاوہ کمسن بادشاہ کا متولی (ایجنٹ) بھی قرار دے دیا تھا اس وقت اسماعیل کی عمر بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہیں تھی، کمال خاں جو اب جبر دی کے نام سے بھی موسوم ہے، پونجی خاتون کے مشورہ اور ہدایت سے ریاست کے کاروبار تن دہی اور ہوشیاری سے انجام دینے لگا، ہم سایہ ریاستوں کے ساتھ تعلقات میں جو کشیدگی چلی آ رہی تھی اس کو اپنے حسن تدبیر سے بہت جلد دور کر دیا اور کوآبنہ رکاوٹ کے پرتگالیوں سے جن کی سرکوبی یوسف عادل شاہ نے بھی کی تھی مصلحت وقت کے تحت صلح کرلی اور اطمینان کے ساتھ ریاست کی اندرونی اصلاحات کی طرف متوجہ ہوا لیکن چند سال فراغت اور اطمینان سے حکمرانی کرنے کے بعد اکثر متولیاں ریاست کی طرح اس کی نیت بدل گئی اور اس نے بادشاہ کی کم سنی اور خارجی سیاسی حالات کے مدنظر خود بادشاہ بن بیٹھنے کی ٹھان لی۔ اس کی حرکات سے پونجی خاتون اور دیگر شاہ پرست افراد بے خبر نہیں تھے مگر اس کے غیر معمولی اثر واقتدار اور چالاکیوں کے آگے ان کی ایک نہیں چلتی تھی۔ بادشاہ محل میں قیدی کی طرح تھا اور کمال خاں کے آدمی اس کی ذرا ذرا سی نقل و حرکت پر نظر رکھتے تھے۔

باوجود اس سخت انتظام کے پونجی خاتون نے ایک تدبیر ایسی نکالی کہ اس کانٹا ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔ پونجی خاتون نے اسماعیل نامی ایک غلام کے ذریعے بڑی ہوشیاری سے کمال خاں کا کام تمام کر دیا اور پھر اس کے بیٹے صفدر خاں کی لشکر کشی پر بڑی مردانہ ہمت سے اس کا مقابلہ کر کے بالآخر اس کو بھی ختم کیا اور اسماعیل کو خود سر متولی کے پنجے سے ہمیشہ کے لئے رہائی دلائی۔ اسماعیل نے خود مختار ہو کر دکھنیوں اور حبشیوں کو خدمات سے الگ کر کے مغلوں کو ان کی جگہ مامور کیا۔ خسرو آغا لاری کو جو اس کا طرف دار تھا اور کمال خاں کے مقابلہ پر بڑی ساتھ داری کی تھی اسد خاں لاری کے خطاب سے سرفراز کر کے کئی علاقے بھی بطور جاگیر عطا کئے اور مہمات سلطنت میں اس کو مشیر اور وزیر بنایا۔

اسماعیل کی زندگی کا بڑا حصہ جنگ میں گزرا۔ اس کے عہد میں متعدد جنگیں ہوئیں۔ سب سے پہلے قاسم برید سے جنگ چھڑی۔ قاسم برید نے برہان نظام شاہ، قلی قطب شاہ اور علاء الدین عماد الملک کی مدد سے بیجاپور پر چڑھائی کر دی، مگر اسماعیل نے ان چاروں سے مقابلہ کیا اور شکست دی۔ سب کی فوجیں تتر بتر ہو گئیں سلطان محمود شاہ بہمنی اور اس کا بیٹا احمد شاہ جو بریدی لشکر کے ہمراہ تھے، اسماعیل کے ہاتھ گرفتار ہو گئے۔ اسماعیل نے ان دونوں کو بہت احترام اور خاطر تواضع سے مہمان رکھا اور پھر اپنی بہن ستی بی بی کی شادی احمد شاہ سے بہت اہتمام کے ساتھ بمقام گلبرگہ انجام دے کر دونوں کو بیدر واپس کیا۔

اسماعیل کے عہد کی دوسری جنگ راجائے بیجانگر سے ہوئی، بیجانگر کے راجہ نے اپنی سرحد کے استحکام کے لئے رائچور اور مدگل کے قلعے اور ان کے آس پاس کے علاقے کو فتح کرنے کے لئے ایک بڑے جرار لشکر سے ۱۵۲۰ء میں بڑی معرکۃ الآرا جنگ کی۔ اسماعیل اور اس کے سپہ سالاروں نے بڑی مردانگی سے مقابلہ کیا مگر بدقسمتی سے شکست اٹھائی اس جنگ میں ناکامی سے اسماعیل کی طاقت اور شہرت کو بہت دھکا لگا اور وہ

عرصہ دراز تک بیجانگر والوں سے جنگ آزمانہ ہوا بہت دنوں کے بعد رائچور کو دوبارہ فتح کیا اس زمانے میں اس نے اپنی طاقت بڑھانے کے لئے دوسرے ہمسایہ بادشاہوں سے تعلقات مضبوط کرنے کی کوشش شروع کی۔ سنہ ۹۳۰ھ میں اسد خاں کی توجہ سے برہان نظام شاہ اور مریم سلطان ہمشیرہ اسماعیل کی شادی ہوگئی مگر یہ شادی بجائے تعلقات کو بہتر بنانے کے دشمنی وعداوت میں اضافے کا موجب بنی۔ شادی کے وقت طے ہوا تھا کہ قلعہ شولاپور جہیز میں دیا جائے گا مگر بعد کو اسماعیل نے انکار کیا۔ نظام شاہ نے بہ زور شمشیر فتح کرنے کی ٹھان لی او رمتعدد مرتبہ زبردست معرکہ آرائی ہوئی مگر ہر وقت نظام شاہ کو شکست ہوئی۔ آخر تک یہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن بنے رہے

اسد خاں نے اتحاد بڑھانے کے سلسلے میں اسماعیل کی دوسری بہن خدیجہ سلطان کی شادی علاء الدین عماد الملک بادشاہ برار سے طے کرادی اس کے کچھ دن بعد ہی قاسم برید نے جو اس عرصے میں کسی قدر طاقتور ہوگیا' اسماعیل سے جنگ کی طرح ڈالی اس کو قلی قطب شاہ اور والی بیجانگر کی تائید بھی حاصل تھی' اسماعیل اس کی دراز دستیوں سے تنگ آکر دس ہزار سپاہ کا لشکر لئے ہوے اس پر حملہ آور ہوا اور بری طرح اس کو شکست دے کر قلعہ بیدر پر قابض ہوگیا۔ قاسم برید قید ہوا اور بہت دنوں کے بعد اسماعیل کی مہربانی سے جو اپنے علاقے پر حکمران بنا کر وہ داس ہی سلوک کے اسماعیل کے ساتھ اس نے دشمنی اور وفاداری نہیں کی۔

اسماعیل نے ان جنگوں سے فراغت پاکر کچھ دن اصلاح ملک میں صرف کئے تھے کہ موت کا پیغام آپہنچا اور ۱۵۳۴ء (۹۴۱ھ) میں حوالی سکر میں اس کا انتقال ہوگیا اور اپنے باپ کے پہلو میں دفن کیا گیا' اسماعیل نے کل (۲۴) سال حکومت کی وہ بڑا بہادر اور فیاض واقع ہوا تھا' اس نے محض اپنی فیاضی سے قاسم برید کو جو بیدر جیسا زرخیز علاقہ دوبارہ بخش دیا' بدقسمتی سے اس کا تمام تر زمانہ جنگوں میں لڑا الملک کی اندرونی اصلاح کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا' اس کی اولاد میں چار لڑکے ملوخاں' علوخاں' ابراہیم خاں وعبداللہ خاں باقی تھے' عقیدتاً وہ شیعہ تھا اور اس کے عہد میں کمال خاں کے زوال کے بعد ترکوں اور ایرانیوں کا عروج رہا۔ اس کو شاعری اور موسیقی سے بھی بہت دلچسپی تھی اور تاریخوں میں اس کے اشعار جستہ جستہ منقول ہیں۔

ابراہیم عادل شاہ اول ۱۵۳۴ء-۱۵۵۷ء

اسماعیل کی وفات پر اس کے حسب وصیت اسد خاں غازی نے اس کے بڑے بیٹے ملوخاں کو تخت نشین لیا اور اس کی غلطی وبداطواری کے مدنظر خود کنارہ کش ہوکر اپنی جاگیر بلگام چلا گیا' چھ مہینے کے اندر ملوخاں نے اپنی نالائقی سے ساری رعایا پرایا لو اپنے سے متنفر کردیا آخر کار اس کی دادی پونجی خاتون کے ایما سے وہ تخت سے الگ کیا گیا اور ابراہیم خاں "ابراہیم عادل شاہ" کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

ابراہیم کی تخت نشینی کے ساتھ ہی اسد خاں کو پونجی خاتون کے حکم سے پھر کاروبار سیاست میں حصہ لینا پڑا' ابراہیم خود بھی بہت بہادر اور تیز فہم نوجوان تھا۔ وہ اسد خاں کے مشورے سے کاروبار کرنے لگا' ابھی ایک سال نہیں گزرا تھا کہ والی بیجانگر سے لڑائی ہوئی مقابلہ بہت سخت تھا مگر اسد خاں کی تجربہ کاری کام کر گئی' اس نے ادھونی کے مقام پر بیجانگر کے لشکر کو شکست فاش دے کر ابراہیم کا سکہ بٹھادیا بادشاہ نے خوش ہوکر اسد خاں کے مراتب میں اور بھی اضافہ کیا مگر کچھ دنوں کے بعد سازشیوں نے بادشاہ کو اس سے بدظن کردیا اور وہ کنارہ کش ہوکر پھر بلگام چلا گیا۔

بادشاہ اور سپہ سالار کی اس ناچاقی سے فائدہ اٹھاکر برہان نظام شاہ حملہ آور ہوا اور قلعہ شولاپور جس لے لئے وہ اسماعیل کے زمانے میں

تین مرتبہ ناکام کوشش کر چکا تھا، فتح کرلیا اور بیجاپور کی طرف پیش قدمی کرنے لگا۔ اسد خاں کی وفاداری اس کو کسی طرح روا نہیں رکھ سکتی تھی وہ پھر ابراہیم سے آملا اور عماد الملک والی برار کی امداد سے نہ صرف قلعہ شولاپور واپس لے لیا بلکہ برہان نظام شاہ کو بیڑ تک مار بھگایا۔

نوجوان ابراہیم سے شکست کھا کر برہان نے پہلے سے زیادہ تیاریاں کیں اور رام راج والی بیجانگر، جمشید قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ اور علی برید تینوں کو اپنے ساتھ ملا کر پھر ۹۴۶ھ؍۱۵۴۶ء میں چڑھائی کی۔ اس موقع پر اسد خاں کی حسن تدبیر سے رام راج ان سے الگ کردیا گیا اور شولاپور کا قلعہ جو اصل میں سارے جھگڑے کا باعث تھا، بغیر لڑائی کے نظام شاہ کے حوالے کردیا گیا اور اسد خاں نے ان دونوں کا تصفیہ کرنے کے بعد جمشید قلی قطب شاہ کا مقابلہ کیا اور اس کو بے طرح شکست دی۔ باوجود اس حکمت عملی اور حسن تدبیر کے لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ برہان نظام شاہ اور والی بیجانگر اور برہان کے جانشین حسین نظام شاہ نے ابراہیم سے کئی مرتبہ لڑائیاں کیں اور بہت کچھ خوں ریزی ہوئی مگر آخرکار ابراہیم ہی کامیاب رہا۔

ان لڑائیوں کے دوران میں اسد خاں سے وقتاً فوقتاً ابراہیم کو بڑی مدد ملتی رہی مگر اس کے مخالف ہمیشہ بادشاہ کو اس کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے بالآخر کچھ تو پیری کی وجہ سے اور کچھ بادشاہ کی ناراضی دیکھ کر اسد خاں بلگام میں گوشہ نشین ہوگیا۔ اسد خاں کے بعد احمدنگر کا سپہ سالار جو عین الملک کنعان سے منتفر ہو کر ابراہیم کا ملازم ہوگیا تھا، اس کے لشکر کی سپہ سالاری کرتا رہا مگر وہ بہت جلد باغی ہوگیا۔

ابراہیم اگرچہ بڑا بہادر سپاہی اور اہل سیف کا بہت قدردان تھا مگر اس کی سختی کی وجہ سے بہت سے لوگ ہمیشہ اس سے ڈرتے رہتے تھے اسی خوف نے دشمنی کی شکل اختیار کی اور سلسلہ یہاں تک بڑھا کہ اس کو معزول کرنے اور اس کے بھائی عبداللہ کو بادشاہ بنانے کی سازش ہونے لگی۔ سازش کا راز فاش ہوتے ہی عبداللہ بھاگ کر گوا میں پرتگالیوں کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔ اور چند روز کے لئے ان کی حمایت سے اپنی بادشاہی کا اعلان بھی کرایا مگر ابراہیم کی زبردست فوجی قوت اور اس کے لشکریوں کی وفاداری سے عبداللہ کو کبھی اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی، پرتگالی بھی اس قضیے میں پھنس کر نفع کی بجائے ہمیشہ فوجی نقصان برداشت کرتے رہے۔

ابراہیم اپنے باپ کی طرح علم دوست بھی تھا اور میدان جنگ میں اس کی شجاعت و بہادری ہمیشہ لایق ستائش رہی مگر تند خو اور سخت گیر بھی بہت زیادہ تھا۔ اپنی علالت کے زمانے میں جس کا سلسلہ تقریباً دو سال رہا۔ جلد صحت یاب نہ ہونے پر بگڑ کر کئی طبیبوں کو قتل کرڈالا اور بعض کو ملک بدر کردیا۔ وہ اپنی اولاد کے ساتھ بھی سختی کرنے سے باز نہیں رہتا تھا۔ اس کا دوسرا فرزند علی بڑے بھائی کے مقابلے میں جو ولی عہد تھا بہت تیز تھا اس نے کمسن شہزادے کو اپنے ولی عہد کے حق میں مضر سمجھ کر نہایت بے دردی سے کم عمری میں ہی قلعہ مرج میں قید کردیا تھا۔

ابراہیم نے کم و بیش (۲۴) سال خدمت کرکے ۱۵۵۷ء (۹۶۵ھ) میں وفات پائی اور اپنے باپ دادا کے پہلو میں بمقام نصرت آباد (گوگی) دفن کیا گیا اس کے کل چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ بڑا اسماعیل ولی عہد مگر بہت غبی اور کودن تھا۔ منجھلا علی بہت زیرک تھا اور وہی باپ کے بعد اس کا جانشین ہوا، دوسرے دو لڑکوں کے نام طہماسپ اور احمد تھے۔ لڑکیوں میں ایک تانی بی بی علی برید سے بیاہی گئی تھی اور دوسری جس کا نام ہدیہ سلطان بتایا جاتا ہے مرتضیٰ نظام شاہ بحری سے منسوب تھی۔

اگرچہ ابراہیم کا زمانہ زیادہ تر لڑائیوں میں گزرا لیکن اس نے اس پر بھی بہت سے کام اصلاح و ترقی ملک کے لئے ۹۳۳ھ میں ابراہیم پور کے نام ایک شہر آباد کیا اور وہاں ایک عالی شان مسجد بنائی۔ ۹۳۵ھ میں سولہا کھمی محل تعمیر کرایا۔ نیز غالب مسجد جس میں صرف روشنی کے لئے ۳۰۴ طاقچے تھے اور جامع مسجد جو درگاہ حضرت جعفر سقاف سے متصل ہے اسی کی بنائی ہوئی ہیں ان کے علاوہ اس کے عہد میں بیجاپور اور رائچور کے قلعوں کی فصیلوں کی درستی اور استحکام کا کام بھی انجام پایا۔

سلاطین بیجاپور

سلطان ابراہیم عادل شاہ اول
سنہ ۹۴۱ھ تا سنہ ۹۶۵ھ

سلطان علی عادل شاہ اول
(سوہر چاند سلطانہ)
سنہ ۹۶۵ھ تا سنہ ۹۸۸ھ

علی عادل شاہ اوّل

۱۵۵۷ - ۱۵۸۰ء

شہزادہ علی کو قلعہ مرج میں قید کر دیا گیا تھا مگر قید میں بھی اس کی تعلیم و تربیت بہت ہی اعلیٰ درجے کی ہوئی تھی اور وہ اپنے سب بھائیوں سے زیادہ لائق تھا۔ باپ کے عقائد کے خلاف وہ شیعہ عقائد کی طرف مائل تھا اور اس کے اتالیق، رفیق اور نگران بھی بہت ہوشیار اور ابراہیم کی موت کے منتظر تھے انھوں نے ابراہیم کے مرنے سے پہلے ہی اس کی بادشاہت کے منصوبے پورے کر لیے۔ ادھر ابراہیم فوت ہوا اور ادھر علی کی بادشاہی کا اعلان میں قلعہ مرج سے کر دیا گیا۔ چند ہی روز میں بیجاپور علی نے اپنے دوسرے بھائیوں کو جو باپ کے مرتے ہی قید ہو گئے تھے اندھا اور ناکارہ کر دیا اور بے کھٹکے بادشاہت کرنے لگا۔ اس کو چونکہ شیعہ عقائد میں سخت تر غلو تھا اس لئے اس نے اہل ایران کو کثرت سے بیجاپور میں جمع کیا اور شیعہ عقاید کی ترویج میں بہت شدت دکھائی لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی فیاضی اور داد و دہش اس قدر زیادہ تھی کہ مذہب کے معاملے میں اس کی سختی پر غالب آ گئی۔ اگرچہ سنی مسلمان اس کی حرکات اور خصوصاً تبرا پسندی سے سخت ناراض تھے لیکن اس کے احسان عام نے "مذہبی جرم" کو دبا دیا

اس کی تخت نشینی پر والی بیجانگر نے مبارک باد دی اور دوستی کی طرح ڈالی مگر اس کے برخلاف حسین نظام شاہ والی احمد نگر نے [illegible] خلافی کی اسی لئے بیجاپور اور بیجانگر کے تعلقات بہت بڑھ گئے۔ دونوں ملکوں کے فرماں رواؤں نے مل کر حسین نظام شاہ سے ۹۶۶ھ میں متصادم ہوئے اور اس کو بہت نقصان پہنچایا۔ پھر اگلے سال دونوں نے مل کر اس کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ اس دفعہ حسین نظام شاہ نے ابراہیم قطب شاہ کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا مگر علی عادل شاہ نے ابراہیم کو اس سے الگ کر دیا۔ اس دفعہ احمد نگر کی ریاست بری طرح تباہ ہو گئی اور تینوں نے مل کر حسین نظام شاہ کو بہت ستایا ان دونوں جنگوں میں والی بیجانگر اور اس کے لشکر نے بیجاپوریوں کی احسان مندی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عام طور پر بستی [illegible] مسلمانوں کی سخت دل آزاری ہوئی ان کی مسجدیں توڑ ہی نہیں ڈالیں بلکہ بت خانوں سے بدل دیں جس نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے [illegible] سے اختلافات دینی کے پردے میں چھپا لئے، دولت اور مال غنیمت کی کثرت نے والی بیجانگر کو بے حد خود سر بنا دیا تھا جس کی وجہ سے علی عادل شاہ اور دوسرے فرماں رواؤں کو سخت خطرہ لاحق ہو گیا۔ اس اتفاقی موقع سے فائدہ اٹھا کر بیجانگر نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور ایک ایک کر کے ان اسلامی ریاستوں کو ختم کرنے کی تدبیریں ہونے لگیں۔ اور ہر موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے بیجاپور، احمد نگر، گولکنڈہ کے بادشاہ بھی اپنی پچھلی عداوتیں بھول کر متحد ہو گئے اور ۹۷۲ھ میں سب نے مل کر تالی کوٹ کے میدان میں بیجانگر والوں سے فیصلہ کن مقابلہ کیا، جس میں اتحادیوں کو فتح [illegible] رہا بیجانگر کا شہر تاراج ہو گیا اور اس کی سلطنت کو بھی ایسا دھکا پہنچا کہ وہ پھر سنبھل نہ سکی۔

اگرچہ بیجانگر سے جنگ کرنے کیلئے اتحاد بڑے زور شور سے عمل میں آیا تھا اور حسین نظام شاہ کی بیٹی چاند بی بی کی شادی علی عادل شاہ سے اور علی عادل شاہ کی بہن کی شادی حسین نظام شاہ کے بیٹے مرتضیٰ نظام سے ہو چکی تھی لیکن باوجود ان سب باتوں کے ان ریاستوں میں پھر لڑائی جھگڑے شروع ہوئے اور علی عادل شاہ برابر آخر تک جنگوں میں گھرا رہا

علی عادل شاہ لاولد تھا اس لیے اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بھتیجے ابراہیم ابن طہماسپ کو ۹۸۷ھ میں اپنا ولی عہد قرار دے دیا تھا ابھی اس بات کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اگلے ہی سال یعنے ۹۸۸ھ م ۱۵۸۰ء میں علی عادل شاہ ایک خائن غلام کے ہاتھ قتل ہو گیا۔ اس کی مدت حکومت (۲۳) سال اور عمر (۴۰) سال تھی۔ اس کی وفات سے ریاست بیجاپور کو بہت نقصان پہنچا کیونکہ گو اس کا جانشین ابراہیم بعد کو بہت بڑا بادشاہ ثابت ہوا لیکن اس کی کمسنی کے زمانے میں متوسلیوں نے ریاست کو بہت کم زور کر دیا

علی عادل شاہ کو تعمیر عمارت کا بہت شوق تھا۔ اس کے عہد میں جو عمارتیں بنیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے خاص طور پر مشہور یہ ہیں۔ قلعہ شاہ درگ (نلدرگ) فصیل قصبہ شاہ پور، نہر کشور خانی، پریا محل، آنند محل، گگن محل، باغ دوازدہ امام، باغ فدک، مسجد جامع، چاند باؤلی، قلعہ دھارور، قلعہ بنکاپور وغیرہ۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی ۱۵۸۰ - ۱۶۲۷ء

جب علی عادل شاہ کے حسب وصیت ابراہیم ابن طہماسپ تخت نشین ہوا تو اس کی عمر صرف نو سال تھی۔ اس کی چچی چاند بی بی کے زیر ہدایت کامل خاں متولی اور مختار ریاست کی حیثیت سے کام کرنے لگا مگر بہت جلد وہ خود سر ہو گیا۔ اس کی جگہ چاند بی بی کے اشارے سے کشور خاں متولی بنا مگر وہ بھی چند ہی دنوں میں صد درجے خودسر اور دشمن ملک و مالک ثابت ہوا اس نے تو خود چاند بی بی کو بے حرمتی سے محل سے نکال کر قید کر دیا۔ اس کے مارے جانے پر اخلاص خاں نے متولی کا عہدہ پایا۔ پھر دلاور خاں مختار کل بنا اور اسی کے زمانۂ مختاری میں ابراہیم قطب شاہ کی بیٹی اور محمد قلی قطب شاہ کی بہن ملکہ جہاں سے جس کا عرف چاند سلطانہ ہو، ابراہیم عادل شاہ کی شادی ہوئی۔

ان متولیوں کے زمانۂ اقتدار میں آس پاس کے اکثر بادشاہوں نے بیجاپور پر متعدد حملے کئے اور اس کو نقصان پہنچایا اس کے علاوہ متعدد مرتبہ کئی خانہ جنگی اور امرا اور متولیان ریاست کے جھگڑوں سے بیجاپور کو باوجود خوش حالی کے بہت نقصان پہنچا، دلاور خاں کے زمانہ مختاری میں اسماعیل نے جو ابراہیم کا چھوٹا بھائی تھا ایک بڑی بغاوت کی اور سارے ملک میں ہل چل مچ گئی۔ دلاور خاں کی درپردہ شرارتوں کے باوجود ابراہیم کے اقبال سے اسماعیل کا قلع قمع ہو گیا مگر دلاور خاں بادشاہ کی نظروں میں بے طرح کھٹک گیا۔ اب بادشاہ نے جو سن بلوغ کو پہنچ چکا تھا اور ہر طرح کاروبار ریاست سنبھال سکتا تھا، دلاور خاں کو معزول کر کے ۱۰۰۰ھ عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور بہت کرو فر کے ساتھ بیجاپور میں داخل ہوا۔ اس نے چندے بیرونی جھگڑوں سے الگ رہ کر اندرون ملک کی اصلاح و تعمیر شروع کی ۱۰۰۰ھ میں ایک نئے شہر نورس پور کو آباد کیا اور رفتہ رفتہ دیگر بہت سی عمارتیں بنائیں۔ شعرا و علما سے اپنے دربار کو آراستہ کیا، فن موسیقی کے بڑے بڑے ماہرین کو جمع کیا کیونکہ اس کو اس فن سے طبعی لگاؤ اور اس میں ید طولی حاصل تھا۔ اس کی کتاب نورس آج تک مشہور ہے۔

اس کے خود مختار ہونے سے کچھ دنوں قبل ہی چاند بی بی اپنے میکے چلی گئی اپنی آبائی ریاست احمد نگر کو جو ابراہیم نظام شاہ کی جوان مرگی کی وجہ سے بے طرح خود غرض امرا کی تباہ کاریوں کا شکار بنی ہوئی تھی۔ سنبھالنے کی کوشش کی۔ مغلوں نے اس پر پے در پے حملے کر کے اس کے اکثر حصوں کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ شہنشاہ اکبر کی فتوحات کا سلسلہ اور آگے بڑھا۔ اس نے ابراہیم عادل شاہ سے بھی خراج طلب کیا اور ابراہیم نے اس کے مقابلے میں اپنے کو کمزور پا کر خراج منظور کر لیا۔ اس کے بعد مغلوں کا زور اور بھی بڑھ گیا۔ ابراہیم نے اکبر کے پیغام بھیجنے پر اپنی لڑکی سلطان بیگم کی شادی شہزادۂ دانیال سے کر دی۔ اکبر کے بعد جہانگیر اور اس کے بیٹے شہزادہ خرم نے دکن کے کئی علاقوں پر جو عادل شاہی نظام شاہی اور قطب شاہی ریاستوں کی ملک تھے اپنا قبضہ جما یا۔ ابراہیم نے بیدر پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا۔ ادھر ملک عنبر نے بیجاپور پر حملہ کیا اور ابراہیم کے آباد کئے ہوئے نورس پور کو ہمیشہ کے لئے تباہ و تاراج کر دیا اور خود بھی چند ہی روز میں فوت ہو گیا۔ ابراہیم کو اس کا بڑا رنج ہوا مگر ملک عنبر کے مر جانے کی وجہ سے وہ اس سے بدلہ نہ لے سکا۔

ابراہیم نے پورے (۴۷) سال حکومت کی اور ۱۶۲۷ء (۱۰۳۶ھ) میں انتقال کیا۔ اس نے متولیوں کا دور دلالت ختم ہونے کے بعد

سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی
(نورس)
۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ

سلطان محمد عادل شاہ
۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۷ھ

دو میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔

محمد عادل شاہ نے فصیلوں اور برجوں کی مرمت کے علاوہ ادکل بیگم تالاب وغیرہ کئی عمارات اور متعدد مسجدیں بنائیں جن میں سب سے زیادہ مشہور خود اس کا گنبد ہے محمد عادل شاہ نے ۱۶۵۶ء میں (۳۰) سال سے زیادہ عرصے تک حکومت کر کے وفات پائی اور اپنے گنبد میں جو گول گنبد یا بول گنبد کے نام سے مشہور ہے دفن ہوا یہ گنبد اس قدر بڑا ہے کہ ہندوستان بھر میں کوئی اور گنبد اس کے برابر نہیں۔ اس کی یہ خصوصیت مسلمہ اور مشہور ہے کہ ایک سرے پر کھڑے ہو کر خفیف سی خفیف آواز پیدا کی جائے تو دوسرے سرے پر برابر سنائی دیتی ہے اسی وجہ سے اس کو بول گنبد کہتے ہیں سیکڑوں سیاح اس گنبد کو دیکھنے کے لئے بیجاپور آتے ہیں۔ اس کے عہد میں علوم و فنون کی بہت ترقی ہوئی اور کئی بڑے بڑے شعرا و علما اس کے دربار میں ملازم تھے۔

علی عادل شاہ ثانی ۱۶۵۶ء۔ ۱۶۷۲ء

علی عادل شاہ ثانی اپنے نامور باپ کا اکلوتا بیٹا تھا خوش قسمتی سے محمد عادل شاہ کی حرم خاص حاجی بڑی صاحبہ نے جو محمد قطب شاہ کی بیٹی تھی، خاص اہتمام سے اس کی پرورش اور تربیت کی وہ علوم متداولہ اور فنون متعارفہ میں بہ طرح ماہر بنایا۔ وہ (۱۹) سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور اپنی والدہ کی ہدایت اور خان محمد خاں وزیر ملک اور دیگر معتبر ارکان ریاست کے مشورے سے کاروبار ریاست انجام دینے لگا۔

شاہجہاں نے جو اپنی سلطنت کے حدود وسیع سے وسیع تر کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا اس بہانے کہ ریاست بیجاپور سلطنت تیموریہ کی باج گزار ہے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کی اور یہ اعتراض اٹھایا کہ ہماری منظوری کے بغیر علی عادل شاہ کس طرح تخت نشین ہو سکتا ہے۔ اس نے یہاں تک لکھ دیا کہ علی عادل شاہ صلبی فرزند نہیں متبنیٰ ہے اور اس لئے وارث تخت و تاج نہیں گر علی عادل شاہ ثانی نے ان اعتراضات کے ترکی بہ ترکی جواب دئے جب مراسلت کا کوئی اثر نہیں ہوا تو اسی سال اورنگ زیب نے ایک بڑی فوج لے کر حملہ کیا اور بیدر اور کلیانی کے قلعے فتح کر کے اس کے بعد بیجاپور کا بھی محاصرہ کر لیا۔ ابھی علی عادل شاہ ثانی کو تخت نشین ہو کر ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اس طرح زبردست دشمن سے مقابلہ آن پڑا بیجاپور کے امرا آپس کی ناراضیوں کی وجہ سے خاطر خواہ متحد اور وفادار نہیں تھے۔ محاصرہ روز بروز شدید ہو رہا تھا کہ شاہجہاں کی علالت کی بنا پر خود اورنگ زیب محاصرہ اٹھا کر دہلی کو روانہ ہوا جس وقت مغلوں کا لشکر سرحد پار کر رہا تھا خان محمد وزیر مملکت سے جو سرحد پر مقابلے کے لئے متعین تھا ملاقی ہوا خان محمد نے اورنگ زیب کی عاجزانہ التجا اور اس چالبازانہ وعدے کی بنا پر کہ جب تک وہ وزیر مملکت ہے بیجاپور کی طرف مغل کبھی پیش قدمی نہیں کریں گے اورنگ زیب سے مزاحمت نہیں کی خان محمد کی یہ حرکت جس کی قباحت کا خود اس کو یقین تھا اس کی موت کا باعث ہوئی۔ اس کے قتل کے بعد ابراہیم خاں وزیر مملکت بنایا گیا۔ اور سپہ سالاری کی خدمت افضل خاں کے سپرد ہوئی۔

ابھی اس طرف سے سکون نہیں ہوا تھا کہ سیواجی نے جو محمد عادل شاہ کی علالت کے زمانے میں قلعہ جنیر پر قبضہ کر لیا تھا مزید پیش قدمی کی اور کوکن اور اس کے پاس کے علاقوں میں لوٹ مار مچا دی اور کئی قلعوں پر قبضہ کر لیا اس کی سرکوبی کے لئے افضل خاں کی سرکردگی میں ۱۶۵۹ء میں فوج روانہ کرنی پڑی مگر سیواجی نے افضل خاں کو دھوکا دے کر تنہائی میں قتل کر ڈالا اور پھر اس کی فوج کو پیچھے سے حملہ کر کے اچانک

سلطان سکندر عادل شاہ
۱۰۸۳ھ تا ۱۰۵۷

سلطان علی عادل شاہ ثانی
شاہی
۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ

زبردست شکست دی۔ افضل خاں کے بعد سدی جوہر کو جو اپنی باغیانہ سرکشی سے توبہ کرکے حاضر خدمت ہو گیا تھا، صلابت خاں کا خطاب دے ایک بڑے لشکر کے ساتھ روانہ کیا گیا مگر یہ سیواجی کی باتوں میں آگیا اور اس کے ساتھ سازش کرکے قلعہ پنالہ پر جو ایک نہایت مستحکم اور اہم قلعہ تھا قبضہ کرلیا اور علانیہ بغاوت شروع کردی۔ اب تو بادشاہ خود لشکر لے کر مقابلے کے لئے نکلا اور ایک معرکے میں پنالہ فتح کرلیا۔ سیواجی اور سدی جوہر دونوں فرار ہوگئے۔ چلتے ہوئے بادشاہ نے قلعہ منتو میں پھر جوہر کا مقابلہ کیا اور اس دفعہ بھی شکست دی۔ جوہر زخمی ہوا مگر وہاں سے کسی طرح بچ بچا کر قلعہ رنجور میں پناہ گزیں ہوا۔ بادشاہ نے اس قلعہ کو بھی فتح کرلیا۔ سدی جوہر بھاگتے اور شکست کھاتے ہوئے آخرکار سخت بیمار ہوکر مرگیا۔ بادشاہ تلنگانہ کے سرکش زمینداروں کو جو خراج ادا نہیں کررہے تھے گوشمالی کرکے مظفر و منصور بیجاپور واپس ہوا اور سیواجی نے مصلحت وقت دیکھ کر اس شرط پر ۱۶۶۲ء میں صلح کرلی کہ کوکن اور اس کے قریب کا علاقہ سیواجی کے قبضے میں رہے اور وہ اس سے آگے نہ بڑھے مگر موقع پاکر سیواجی نے پھر لوٹ مار شروع کردی اور شائستہ خاں مغل سردار سے مقابلہ کرکے اس کو قید کرلیا۔

اورنگ زیب نے یہ خبر سن کر علی عادل شاہ ثانی سے اس کی سرکوبی میں مدد مانگی اور بیجاپور سے خواصی خاں کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کیا گیا جس نے سیواجی کو سخت شکست دی مگر عین وقت پر سیواجی نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اورنگ زیب کے سپہ سالار جے سنگھ کو اپنا دوست بنالیا اور یہ وعدہ کرکے اپنے قبضے کے ۳۲ قلعوں کی کنجیاں جے سنگھ کے سپرد کردیں کہ میں آپ کی مدد کرکے عادل شاہی ریاست کا خاتمہ کردیتا ہوں اور اس طرح یہ سارا ملک اورنگ زیب کی حکومت میں آجائے گا۔ علی عادل شاہ ثانی کو اس کی اطلاع ملنے پر مجبوراً جے سنگھ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ دونوں میں مقابلے ہوئے اور ہر دفعہ جے سنگھ نے شکست کھائی آخرکار ۱۶۶۶ء میں دہلی کو واپس بھاگا۔ سیواجی بھی اورنگ زیب کے دربار میں پہنچا اور چند دن وہاں رہ کر پھر دکن آیا اور وہی لوٹ مار شروع کردی۔ کئی قلعے جو مغلوں کے قبضے میں آگئے تھے سیواجی نے چھین لیے اور اپنی جگہ مستقل ہوکر علی عادل شاہ ثانی کو ستانا شروع کیا۔ ادھر جے سنگھ وغیرہ کے ساتھ مسلسل جنگوں کی وجہ سے خزانہ خالی ہوگیا تھا اور سلطنت مغلیہ کا خراج ادا نہ ہونے سے مغلیہ لشکر بار بار چڑھائی کر بیٹھتا تھا اس لئے علی عادل شاہ ثانی نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ اورنگ زیب اور سیواجی دونوں سے مصالحت کرلی جائے۔

یہ صلح محض عارضی تھی اورنگ زیب اور سیواجی دونوں ریاست بیجاپور کو اپنے قبضہ و تصرف میں لانے کی آرزو دل میں لئے ہوئے تھے۔ ابھی اس صلح کو کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ یکایک علی عادل شاہ ثانی بدقسمتی سے فالج میں مبتلا ہوکر معذور و مجبور ہوگیا۔ حالات بگڑ رہے تھے، امراء آپس میں عداوت پھیلی ہوئی تھی۔ مصلحت وقت کے تحت اپنے کمسن بیٹے سکندر عادل شاہ کو تخت نشین کرکے دارالسلطنت کے کام خواصی خاں کے سپرد کئے اور خود پلنگ پر لیٹے لیٹے صلاح و مشورہ دینا مناسب سمجھا۔ مغلوں کی روک تھام کے لئے عبدالمحمد کو شاہ درگ (نل درگ) گلبرگہ اور سکر کے علاقے کا صوبہ دار بنایا اور عبدالکریم اور بہلول خاں کو مرج اور پنالہ کے قلعوں پر متعین کرکے سیواجی کی دراز دستیوں کا بندوبست کیا۔ اسی حالت میں وہ ۱۰۸۳ھ (م ۱۶۷۲ء) میں (۳۵) برس کی جوانی میں سولہ سال حکومت کرکے راہی ملک عدم ہوا۔ اس نے بیجاپور میں اپنی زندگی ہی میں اپنے لئے ایک بہت ہی عالی شان مقبرے کی تعمیر شروع کی تھی ابھی اس کی تعمیر مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اسی میں اس کو دفن کیا گیا یہیں اس کی بیوی اور کئی عزیز اور بھی دفن ہیں اور آج بھی یہ ناتمام مقبرہ اس کے عالی شان تعمیری حوصلوں کی ایک عبرت ناک تصویر پیش کررہا ہے۔

علی عادل شاہ ثانی بڑا بہادر اور شجیع تھا۔ اس نے کئی بڑے بڑے معرکے خود فتح کئے۔ اس کو شعر و شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ خود بھی شاعر تھا اس کے عہد میں اُردو زبان کو بہت ترقی ہوئی۔ وہ اردو شاعروں کا بڑا سرپرست تھا، ملا نصرتی جو علی نامہ اور دیگر مثنویوں کا مصنف ہے اسی کے دربار کا متوسل تھا اس کے عہد کی عمارات میں علاوہ ناتمام مقبرے کے حسینی محل، اور کئی مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ اس نے دو عظیم الشان محلات، علی محل اور عرش محل کے نام سے بنانے شروع کئے تھے مگر یہہ ناتمام رہ گئے یہہ عادل شاہی خاندان کا آخری با اقتدار بادشاہ تھا اس کے بعد اس کے کمسن بیٹے سکندر کو اورنگ زیب نے قید کرلیا اور بیجاپور کی ریاست کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا۔

سکندر عادل شاہ ۔ ۱۶۷۳ء ۔ ۱۶۸۶ء

علی عادل شاہ ثانی کے انتقال پر خواص خاں نے باضابطہ طور پر پانچ سال کے کمسن شہزادے کو سکندر عادل شاہ کے نام سے تخت پر بٹھایا اور خود بطور متولی کے کاروبار ریاست انجام دینے لگا۔ بادشاہ کی کمسنی امرا کی نا اتفاقی اور غداری سے فائدہ اٹھا کر ریاست کے دوازلی دشمن مغل اور مرہٹے من مانے لوٹ مار اور جنگ و جدل کرنے لگے۔ سیواجی نے غیر معمولی طاقت حاصل کرلی بنالہ فتح کرلیا، مغلوں کا لشکر بھی حملہ آور ہوا۔ خواص خاں مغلوں سے سازش کرلی اور سکندر کی بہن شہربانو بیگم کی شادی شہزادہ محمد اعظم سے نذر دے کر ایک بڑے پیشکش کے ساتھ اورنگ زیب سے صلح کرلی مگر یہہ صلح کبھی پائدار ثابت نہ ہوئی۔

خواص خاں، سدی مسعود خاں، بلول خاں، سید مخدوم، شرزہ خاں اپنی ناعاقبت اندیشی اور نمک حرامی سے کبھی اورنگ زیب سے مل جاتے اور کبھی مرہٹوں سے۔ اسی طرح صلح و جنگ میں اپنی قوتیں صرف کرتے رہے۔ اسی عرصے میں سیواجی فوت ہوگیا مگر اس کے بیٹے سنبھاجی اور دوسرے مرہٹہ سرداروں نے اپنی وہی روش جاری رکھی، وہ ادھر عادل شاہیوں کو تنگ کرتے اور ادھر مغلوں کو الگ دق کرتے۔ بالآخر اورنگ زیب نے بیجاپور کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا تہیہ کرکے اولاً ایک فرمان بھیجا جس میں متعدد سخت شرائط درج تھیں۔ سکندر عادل شاہ کے منشیوں نے اس کا جواب اس طرح مرتب کیا جس سے اورنگ زیب کی شرائط کی تکمیل نہیں ہوتی تھی۔ اورنگ زیب نے ایک بڑی فوج کے ساتھ ۱۰۹۶ھ (۱۶۸۶ء) میں بیجاپور پر چڑھائی کی اور شہر فتح کرکے سکندر کو قید کرلیا اور بیجاپور کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ بدقسمت سکندر پانچ سال کی عمر میں بادشاہ ہوا، چودہ سال حکومت کی اور چودہ سال اورنگ زیب کی قید میں رہ کر بالآخر ۱۱۱۱ھ میں وفات پائی۔

سید محمد

یادگار ولی

مرتبہ سید محمد ام۔ اے یہہ اُردو شاعری کے استاد اول ولی اورنگ آبادی کی زندگی، ماحول اور شعری کارناموں اور ولی سے پہلے اور ولی کے بعد اردو شاعری کے ارتقاء کا ایک بسیط تذکرہ ہے جو دو صد سالہ جشن یادگار ولی کے سلسلہ میں ترتیب دیا گیا ہے اس کے آخر میں ولی کا منتخب کلام اور اُردوئے قدیم (دکنی) کے ان مخطوطات کی تفصیلی فہرست بھی درج ہے جو حیدرآباد کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں متعدد قدیم بادشاہوں اور شاعروں کی تصاویر بھی اس کے ساتھ ہیں قیمت عہ

سب رس کتاب گھر سے طلب کیجئے

بیجاپور کے سپہ سالار

افضل خان

شرزہ خان

عادل شاہی امراء

افضل خاں

افضل خاں بیجاپور کے مشہور سپہ سالاروں میں تھا۔ اس کا نام عبداللہ خاں تھا۔ سلطان محمد عادل شاہ کے زمانے میں اس نے متعدد معرکوں میں حصہ لیا اور ملک کی بڑی شائستہ خدمات انجام دیں جس پر اس کو افضل خاں کا خطاب عطا کیا گیا۔ سلطان محمد عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا نوجوان فرزند علی عادل شاہ ثانی تخت نشین ہوا تو اس کے مراتب و اعزاز میں اور اضافہ کیا گیا اور یہ خان محمد خاں کے ساتھ ایک بڑے لشکر کا سپہ سالار بنا کر اورنگ زیب کے مقابلے کے لئے بھیجا گیا۔ اورنگ زیب اس عرصے میں بیدر اور کلیانی کے قلعے فتح کر چکا تھا۔ بیجاپور کا محاصرہ کر لیا مگر شاہ جہاں کی علالت کی خبر پاکر محاصرہ برخاست کرکے دہلی کا رخ کیا۔ جب وہ سرحد سے گزر رہا تھا تو خان محمد نے بطور خود اس کے لشکر کو چلے جانے کا موقع دیا اور اس طرح ایک بے نظیر موقع چھوڑ دیا۔ افضل خاں اس پر بہت ناراض ہوا۔ جب بادشاہ کو اس کی رپورٹ ملی تو خان محمد کو واپس طلب کیا مگر وہ رستے ہی میں اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔

خان محمد کے بعد افضل خاں ہی سب سے بڑا سپہ سالار تھا۔ بادشاہ نے اس کو سیواجی کے مقابلے میں روانہ کیا جس نے کوکن کے علاقے میں سخت طوفان مچا رکھا تھا۔ تلجاپور اور پنڈھارپور سے گزر کر افضل خاں پرتاب گڑھ پہنچا۔ سیواجی نے اس کی آمد کی خبر سن کر اپنی فطری چالاکی سے بجائے مقابلے کے صلح و اطاعت کیشی کی چال چلی۔ افضل خاں کے سفیر کرشناجی کے ساتھ اپنے سفیر گوپی ناتھ کو بھیج کر یہ قول و قرار کیا کہ افضل خاں سے تنہائی میں مل کر معذرت کرنا اور سر اطاعت خم کرنا چاہتا ہے۔ افضل خاں اس کے دھوکے میں آگیا اور جب تنہائی میں یہ دونوں ملے تو سیواجی نے ایک چھپے ہوئے ہتیار سے فوراً اس کا کام تمام کردیا۔ افضل خاں کے قتل ہوتے ہی سیواجی کی فوج کے حوصلے بڑھ گئے اور عادل شاہی فوج بے سر ہو گئی۔ سیواجی نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ افضل جوش شجاعت میں اس کی چال کو نہ سمجھا اور اپنی جان گنوائی سیواجی کے ایک ساتھی نے اس کا سر کاٹ لیا اور سیواجی کے پاس لے جاکر انعام پایا۔ علی عادل شاہ ثانی کو افضل خاں کی موت سے بڑا نقصان پہنچا اور مرہٹوں کی طاقت ہمیشہ کے لئے بڑھ گئی کیونکہ اس کے بعد علی عادل شاہ ثانی نے جن لوگوں کو سیواجی کے مقابلے کے لئے بھیجا وہ یا تو نمک حرام نکلے یا سیواجی نے ان کو اپنے مکر و فریب سے کام کر دیا۔ بالآخر خود بادشاہ کو اس سے مقابلہ کرکے شکست دینی پڑی مگر یہ شکست بھی سیواجی کو ختم نہ کر سکی۔

شرزہ خاں

شرزہ خاں علی عادل شاہ ثانی کے ان خاص سپہ سالاروں میں تھا جنھوں نے اورنگ زیب اعظم کے جرار لشکروں کے مقابلہ در دلیر سرداران مغلیہ سے بڑے معرکتہ الآرا مقابلے کئے اور ہمیشہ مظفر و منصور رہا۔ اس کا نام سید الیاس تھا اس نے شنگل بیڑھ اور بیجاپور کے قریب جے سنگھ اور اس کے مددگار سردار سرفراز خاں اور صلابت خاں کو بڑی بڑی شکستیں دیں اور آخر کار مغلوں کو پیچھے ہٹنے اور میدان جنگ چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی موت عجیب و غریب طریقے پر واقع ہوی۔ مغلوں کو شکست دے کر ابھی یہ واپس نہیں ہوا تھا۔ راستے ہی میں تھا اور مغلوں کے اکے دکے حملے ہو رہے تھے۔ اتفاقاً ایک دن ایک چھوٹی سی ٹکڑی نے اس کے کم سن لڑکے کو گھیر لیا۔ بیٹے کے پکارنے پر شرزہ خاں اکیلا لپکا اور آناً فاناً دشمن کو مار بھگایا۔ باپ بیٹے واپس ہو رہے تھے کہ یکا یک گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ شرزہ خاں زمین پر آرہا اور گرتے ہی فوت ہو گیا۔ جب لشکر میں اس کی مرگ مفاجات کی خبر پہنچی تو ایک کہرام مچ گیا۔ بادشاہ کو ناقابل بیان رنج ہوا۔ اس کے دونوں بیٹوں

سید مخدوم و سید حبیب کو ان کے باپ کی شایستہ خدمات کے صلے میں شہزادہ خاں خطابوں سے سرفراز کیا اور ملازم رکھ لیا۔

سید محمد

ہاشمی بیجاپوری

ہاشمی، علی عادل شاہ ثانی اور نصرتی کا ہم عصر تھا۔ شاہ ہاشم بیجاپوری کا مرید خاص تھا اسی مناسبت سے ہاشمی تخلص رکھا۔ شاہ ہاشم اور ملا ہاشمی دونوں کی تصویریں اس مضمون کے ساتھ شایع ہو رہی ہیں وہ مادرزاد اندھا تھا لیکن شاعری سے فطری لگاؤ رکھتا تھا۔ دکن میں ریختی زبان کی ایجاد کا سہرا ہاشمی کے سر ہے ایک دیوان ریختی کی غزلیات کا مرتب کیا اور ایک مثنوی یوسف زلیخا، احسن القصص کے نام سے ۱۰۹۹ھ میں لکھی۔ ہاشمی کی زندگی کے حالات کسی تذکرے میں نہیں ملتے البتہ اس کے کلام سے اندرونی شہادتیں کچھ ملتی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ برہان پور کا باشندہ تھا بیجاپور کے ایک رئیس ذوالفقار خاں کی شہرت سن کر وہاں آیا اور اپنے ممدوح سے قصائد کے بدلے بیش بہا انعام حاصل کئے۔ دو تین قصیدے ذوالفقار خاں کی مدح میں ہاشمی نے لکھے ہیں۔ ابھی ہاشمی کے متعلق کافی معلومات فراہم نہ ہو سکے۔ اس کا دیوان ریختی اور مثنوی یوسف زلیخا جو زیر طبع ہیں ان کے مقدمہ کی کمیل تک ہماری کوشش ہے کہ جس قدر ممکن ہو سکے اس کی زندگی کے متعلق معلومات فراہم کریں۔ علاوہ دیوان اور مثنوی کے ہاشمی بیجاپور کا اعلی پایہ مرثیہ نگار ہے اس کے کئی مرثیے دستیاب ہوے ہیں جن سے اس کی قادرالکلامی اور وسیع النظری کا ثبوت ملتا ہے۔ یہاں ہم دیوان اور مثنوی سے چند شعر نقل کرتے ہیں:۔

غزل ریختی

جھانکو نکو سو لچھن تج دل چھوڑ ہوئے گا　تجھ خیل میں تمنا چپ سب جگ میں شور ہوئے گا

تجھ کوں بھری سند کی عالم میں ہانک ہوی ہے　جھانکیگی تس اوپر تو شہرت بھی زور ہوئے گا

انکھیں تو ہور دستیاں دل میں تو بھید کچھ ہے　باتاں بھی ہور کچھ ہیں مقصد بھی ہور ہوئے گا

ہے حسن دہن تمہارا رکھنا جتن نہیں دہن　نیں تو یو دہن چیرانے کوی ساہو چور ہوئے گا　(دیوان ریختی)

عشق

اگر عشق نیں ہے تو چندر کوں نور　تو کیا واسطے نت یو تپتا ہے سور

اگر عشق نیں ہے تو دریا دین آب　پلاتا ہے بادل کوں کی بے حساب

اگر عشق نیں ہو تو کی دہر تری　نوی رت میں کرتی ہے کسوت ہری

اگر عشق نیں ہے تو کی یو بھنور　پھرے پاس لیتا ہر اک گل اوپر

اگر عشق نیں ہے تو کی یو فقیر　فقیر ہو کے غربت لئے اپنے سیر

مجازی عشق راست ہر ٹھور ہے
حقیقی و لے عشق کچھ ہور ہے　(یوسف زلیخا)

میر سعادت علی رضوی

ملا ہاشمی بیجاپوری

شاہ ہاشم علوی بیجاپوری

نظام شاہی خاندان

احمد نظام الملک ۸۹۵ھ تا ۹۱۴ھ

بہمنی سلطنت کا جب شیرازہ بکھر گیا تو سب سے پہلے احمد نظام الملک نے بغاوت کی۔ احمد نظام الملک دکن کے برہمن نژاد امیر حسن بحری کا لڑکا کہلاتا ہے جس کو بعد کے مورخ ایک عجیب و غریب حکایت کے ذریعے محمد شاہ بہمنی کا لڑکا تسلیم کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ بہمنی سلطنت کے شمال مغربی حصہ کا مالک بنا اور اپنا صدر مقام جنیر قرار دیا لیکن بعد میں ایک شہر آباد کرکے احمد نگر اس کا نام رکھا۔ اور اسی نام سے اس کی سلطنت موسوم ہوئی۔ احمد نظام الملک نے ۸۹۱ھ میں اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کیا اور ۲۲ سال پرشوکت حکومت کرنے کے بعد ۹۱۴ھ میں انتقال کیا۔

برہان نظام شاہ ۹۱۴ھ تا ۹۶۱ھ

باپ کے بعد تخت نشین ہوا۔ اور اسی سلطنت کی تمدنی ترقی کا باعث بنا اس دور میں نظام شاہی حکومت کی وسعت اور تنظیم کا کام ہوا اور اسی بادشاہ کی وجہ سے بہادر شاہ والی گجرات کا دیا ہوا لقب نظام شاہی اس خانوادہ کا لقب ہو گیا۔

سلطان حسین نظام شاہ اول ۹۶۱ھ تا ۹۷۲ھ

باپ کے مرنے کے بعد سریر آرائے حکومت ہوا۔ یہ بہت بڑا سپاہی اور مدبر تھا۔ اس کے زمانے میں سلاطین دکن میں اتحاد ہوا اور اسی کی سرگرمی اور کوشش سے تالی کوٹ میں رام راج کو شکست ہوئی اور نہایت شان اور جبروت کی حکومت کے بعد ۹۷۲ھ میں انتقال کیا۔

مرتضیٰ نظام شاہ۔ ۹۷۲ھ تا ۹۹۶ھ

یہ صغیر سنی میں بادشاہ ہوا۔ اور اپنی مدبر ماں خونزہ ہمایوں کے تحت حکومت کرتا رہا اور ۹۸۰ھ میں ماں کو قید کرکے برسر اقتدار آیا۔ یہ بادشاہ چاند بی بی کا بھائی تھا اس کے دور میں سلطنت کے ابتدائی آثار تنزل شروع ہو گئے تھے ۹۹۶ھ میں کثرت عیاشی کی وجہ سے دیوانہ ہو گیا اور اس کے بیٹے میراں حسین نے اس کو حمام میں بند کر دیا۔

میراں حسین نظام شاہ۔ ۹۹۷ھ

باپ کو قید کرکے تخت پر بیٹھا اور وزیر مرزا خاں کے ہاتھ مارا گیا۔ اس نے صرف نو مہینے حکومت کی۔

اسماعیل نظام شاہ۔ ۹۹۷ھ تا ۹۹۹ھ

یہ امرائے گردی کے ذریعے تخت پر آیا۔ اور اپنے باپ برہان نظام شاہ کے ہاتھوں تخت سے اتار دیا گیا۔

برہان نظام شاہ ثانی۔ ۹۹۹ھ تا ۱۰۰۳ھ

مغلوں کی طاقت کے ذریعے بیٹے کو معزول کرکے تخت حاصل کیا۔ اور ۱۰۰۳ھ میں عادل شاہیوں سے شکست کھا کر اسی صدمہ میں انتقال کیا۔ اور اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین بڑے بیٹے اسمٰعیل کے بجائے جو مہدوی تھا اپنے چھوٹے بیٹے کو جو اسماعیلیہ مذہب کا پیرو تھا مقرر کیا۔

ابراہیم نظام شاہ ۔ ۱۰۰۳ھ

باپ کے بعد برسرِ حکومت آیا اور ایک ہی سال میں عادل شاہیوں سے لڑتا ہوا ایک سپاہی کے ہاتھ مارا گیا ۔

احمد نظام شاہ

یہہ شخص ایک دعویدار سلطنت تھا اور محض امراء کی کوشش سے تخت نشین ہوا لیکن بعد میں چاند بی بی کے تدبر سے اس کو تخت سے ہٹایا گیا اور بہادر نظام شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا ۔

بہادر نظام شاہ ۱۰۰۴ھ تا ۱۰۰۹ھ

یہہ طوائف الملوکی کا دور تھا ۔ وزیر اعظم اخلاص خاں حبشی اور چاند بی بی کے ذریعہ برسر اقتدار آیا یہہ وہ دور تھا جس میں چاند بی بی نے مغلوں سے غیر معمولی معرکے کئے ۔

مرتضیٰ نظام شاہ دوم ۔ ۱۰۰۹ھ تا ۱۰۳۵ھ

بہادر نظام شاہ کے بعد طوائف الملوکی بچ گئی اور امراء نے مرتضیٰ نظام شاہ کو تخت پر بٹھایا اِس دور کو ملک عنبر کا دور کہا جا سکتا ہے، مغلوں کی بڑھتی ہوی قوت ملک عنبر کی زندگی تک نظام شاہی سلطنت پر چھا نہ سکی ۔ ملک عنبر کے بعد کوئی نظام شاہی حکومت کو بچانے والا نہ تھا

برہان نظام شاہ سوم ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۴۱ھ

برہان نظام شاہ نے باپ کے بعد سلطنت حاصل کی اور ۱۰۴۱ھ میں انتقال کیا یہہ دورِ تنزل تھا ۔

حسین نظام شاہ سوم

یہہ احمد نگر کا آخری تاجدار ہے ۔ اس کے زمانے میں مغلوں نے احمد نگر پر قبضہ کیا اور شاہ جہاں نے اس کو گوالیار میں قید کر دیا

مرتضیٰ نظام شاہ سوم ۱۰۴۲ھ تا ۱۰۴۵ھ

یہہ بادشاہ نظام شاہی سلطنت کے بعد شاہ جی مرہٹے کے ذریعے تین سال تک شاہ گڑھ پر حکومت کرتا رہا اور تین سال کے بعد اپنے خاندان کا خاتم بنا ۔

چاند بی بی

دکن کی نامور سلطانہ چاند بی بی حسین نظام شاہ اور خونزہ ہمایوں بیگم کی بیٹی تھی اور اس طرح باپ کی طرف سے نظام شاہی تدبر اور ماں کی طرف سے ترکی تہور اور بے جگری ورثے میں پائی تھی ۔ یہہ ملکہ ۹۵۰ھ میں احمد نگر میں پیدا ہوی آنکھ کھولتے ہی اس نے تلوار کی جھنکار سنی بہمنی سلطنت کے مختلف شہ پارے آپس میں دست و گریباں تھے اور اس نفاق سے فائدہ اٹھا کر رام راج کے تخت وجیا نگر کی شہنشاہیت مسلم راج اور مسلم سلطنتوں پر چھائی جا رہی تھی چودہ برس کی عمر میں چاند سلطانہ اس شطرنج کا مہرہ بنی اور علی عادل شاہ والی بیجاپور کے نکاح میں آکر دکنی مسلم اتحاد کا باعث بنی کوئی تعجب نہیں کہ تالی کوٹ کی لڑائی میں یہہ شاہی دلہن میدان کارزار میں ہو اور مسلمانوں کے ناموس کا مرکز بنی رہی ہو ۔ یہہ چاند سلطانہ کا پہلا دور ہے ۔

چاند سلطانہ کی زندگی کا دوسرا دور ۹۷۰ھ سے شروع ہوتا ہے ۔ جب کہ وہ دلہن بن کر بیجاپور کے بادشاہ کے دل میں حکمران تھی

حسن نظام الملک بحری
بانی سلطنت نظام شاہی

ـد ـد ـد ـا
محمد علی عادل شاہ اول

علی عادل شاہ خود بڑا بادشاہ تھا اس کی زندگی تک چاند بی بی کو صرف نظری تجربہ سیاست کا اور سلطنت کا حاصل ہوتا رہا یہاں تک کہ ۹۸۷ھ میں چاند سلطانہ کا شوہر علی عادل شاہ بیجاپور کا پانچواں زبردست فرماں روا بریدی غلام کے ہاتھوں شہید ہوا اب چاند سلطانہ بیجاپور میں وہی تدبر اور تنظیمی قوت کا اظہار کرنے لگی جو تاریخ انگلستان میں صرف ملکہ ایلزبتھ کو حاصل تھا۔ نیا بادشاہ ابراہیم عادل شاہ نو برس کا تھا اور سلطنت چو طرف سے اندرونی سازش اور بیرونی غنیموں سے گھری ہوئی تھی امرائے سلطنت کی باہمی رقابت اور تمت کے ذریعے اس مدبر خاتون نے ابراہیم عادل شاہ کو نہ صرف بچایا بلکہ اس کو تربیت کے ذریعے بیجاپور کا سب سے بڑا فرماں روا بننے کے قابل رکھا۔ اس طرح ۹۸۷ھ سے ۹۹۲ھ تک چاند بی بی بیجاپور کے لئے فرشتۂ رحمت رہی کوئی مورخ جو چاند بی بی کی حقیقی سوانح عمری لکھنے بیٹھے اس دور کو اس کا دور تدبر قرار دے گا۔

جس طرح چاند بی بی بیجاپور خود کی شادی کی وجہہ سے آئی تھی اسی طرح ابراہیم عادل شاہ کی بہن خدیجہ سلطانہ کے ساتھ چاند بی بی کے بھتیجے میراں حسین کو بیاہی گئی تھی پھر احمد نگر واپس ہوئی۔ اس کو پہلے سے بھی زیادہ زبردست سیاسی خدمات انجام دینے پڑے احمد نگر سلم اقتدار دکن کا سب سے اہم مرکز تھا۔ مغل اس کو کسی نہ کسی طرح اپنے علاقے میں شامل کرنے کی تاک میں لگے ہوئے تھے۔ اور یہ اہم جاننا خاک ...... کی تسخیر شاہان دکن کی تسخیر ہے۔ مرتضی نظام شاہ کے انتقال کے بعد جو طوائف الملوکی مچی میراں حسین نے بعد اسمعیل تخت پر بیٹھا حسین کو .... برہان نظام شاہ دوم نے مغلوں کے اثر سے بے دخل کر دیا۔ اور اس کے چند سال بعد ابراہیم نظام شاہ اور بہادر نظام شاہ یکے بعد دیگرے آئے۔ یہہ دور احمد نگر کے لئے زیست اور موت کا دور تھا اور چاند بی بی کی زندگی کا حقیقی کارنامہ اسی دور سے متعلق ہے جو کام بیجاپور میں اپنے شوہر اور اس کی اولاد کے لئے اس نے کیا وہی کام اپنے خاندان کے لئے اسے کرنا تھا بلکہ یہاں پر اس کے لئے اندرونی فتنے زیادہ تھے۔ اور مغلوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے سابقہ تھا۔ اس دور میں چاند بی بی نے بادشاہ گری کی بہادر نظام شاہ کے لئے وہ سب کچھ کیا جو بڑے سے بڑا مدبر اور سپہ سالار کر سکتا تھا۔ اندرونی فتنہ کو رفع کیا اور مغلوں کو تادم زیست اپنے آبا و اجداد کی سلطنت سے دور رکھا۔ اکبری لشکر نے مراد کی سرکردگی میں ۱۰۰۴ھ میں احمد نگر پر یلغار کی چاند بی بی نے اتنی بہادری سے ان کا مقابلہ کیا کہ مغلوں کو مجبوراً صلح کرنی پڑی۔ یہی وہ معرکہ تھا جس میں سرنگ کے ذریعے پچاس گز قلعہ کی دیوار اڑا دی گئی تھی۔ اور چاند بی بی نے مغلیہ دل بادل کو تلوار کی نوک سے اس وقت تک روک رکھا تھا جب تک دیوار از سر نو تیار نہ ہوگئی تاریخ حرب میں یہہ کارنامہ ہمیشہ صفحۂ اول میں رہے گا۔ اس کے بعد مغلوں نے دوسرا حملہ شہزادہ دانیال کی سرکردگی میں کیا۔ اور چار مہینے کے محاصرہ کے بعد چاند بی بی کی مردہ لاش اور دکن کا ایک ویران شہر اس کے ہاتھ آیا ۱۰۰۹ھ میں یہہ بہادر سلطانہ ناموس کی حفاظت کے لئے تیزاب کے کنویں میں مستور ہوگئی۔

ملک عنبر

ملک عنبر دکن کا مشہور سپہ سالار، مدبر اور بادشاہ گر حبشی ۹۵۵ھ میں پیدا ہوا ملک میں ابتدائی تربیت پائی اور دکن کے بازار
میں آکر فروخت ہو گیا احمد نگر میں چنگیز خاں کے غلام کی حیثیت سے تربیت حاصل کی اور آقا نے غلام کو اولاد کی طرح پالا آقا کی وفات کے بعد
۹۸۲ھ میں ملک عنبر گولکنڈہ میں لشکر شاہی کا ملازم ہوا پھر بیجاپور جا کر ابراہیم عادل شاہ کے ملازمان میں شریک ہو کر ایک ممتاز عہدہ پر فائز
اور ملک عنبر کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ اب اس نے عرب تو اتیو اور حبشیوں کی فوج جمع کرنا شروع کیا اور اس لئے شرفا نوازی اور بہادری کی
کی دھوم مچ گئی لیکن بیجاپور کے امراء کے حسد اور حوصلہ شکن رقابت سے بیزار ہو کر بیجاپور بھی ۱۰۰۶ھ میں چھوڑنا پڑا کچھ مدت ملک عنبر کی مدت
تنگدستی میں گزری لیکن اس حالت میں بھی فوج فراہم کرتا رہا اور احمد نگر میں ملازمت اختیار کر لی حسین نظام شاہ کی فوج میں اس کے ہزار
حبشی کے اضافہ نے مغلوں کے مقابلے میں ایک قوت پیدا کر دی تھی۔

ملک عنبر ایک ایسے دور میں سیف و دماغ کے جوہر دکھانے کے لئے دنیا میں آیا جب کہ دکن تباہ ہو رہا تھا بہمنی شہنشاہیت کے
ٹکڑے آپس میں دست و گریباں تھے اور مغلوں کا بڑھتا ہوا اقبال ان پر عقاب کی طرح چھا رہا تھا احمد نگر جو دکن کی کنجی تھا
جس پر مغلوں کی آنکھ لگی ہوئی تھی۔ ملک عنبر کی جوانی بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر کے عروج میں شروع ہوئی اور دکنی سلطنتوں کے زوال کے
ساتھ ساتھ ملک عنبر کی حوصلہ مندیوں نے عروج حاصل کیا اور کم از کم اپنی ذات کی وجہ سے تیس سال تک دکن کو اغیار کی غداری سے
بچائے رکھا اس طرح تمام عمر ایک مجاہد کی زندگی بسر کر کے ۱۴؍ شعبان ۱۰۳۵ھ کو بخار کی وجہ سے اسّی سال کی عمر میں انتقال کیا۔

ملک عنبر میانہ قد حبشی رنگ اور گٹھیلے جسم کا آدمی تھا مغلوں کا لباس اور رنگین دل رکھتا تھا۔ حلیم الطبع، منکسر المزاج وفاشعار
ایسا کہ آخری دم تک باوجود بے تاج کا بادشاہ ہونے کے مرتضیٰ نظام شاہ کو بادشاہ مانتا رہا۔ اس کے نام و نمود کی دھوم تھی اس کا دربار
علاوہ شعراء کے ادیب، علماء، فضلاء، اولیاء اور رشیوں کا مامن تھا۔ میدان جنگ میں شیر ژیاں اور میدان تدبر کا شاطر۔ ایک طرف
اہل سیف اور دوسری طرف مصلح، ریفارمر اور تعمیر کار تھا ملک عنبر کے احسانات میں سے سب سے بڑا احسان وہ ہے جو اس نے مرہٹہ
قوم پر کیا آج کل کے مرہٹہ مورخ تعصب کی وجہ سے اس کو تسلیم نہ کریں لیکن خاص عربی طرز جنگ اسی کے دم سے ایک طرز نو بن گئی
مرہٹوں کو بحیثیت قوم سپاہی بنانے کا کام ملک عنبر نے انجام دیا۔ اسی نے صدیوں کے غلام اور بے بس کسانوں کو نہ صرف مرد میدان بنایا
بلکہ صاحب تاج اور سلطنت کر دکھایا۔ یہ جب تک ملک عنبر کی سکھائی ہوئی راہ پر گامزن تھے اقبال ان کے ساتھ تھا جس روز
انھوں نے برگیری چھوڑ کر میدان سنبھالا تو ان کو پانی پت کی تیسری جنگ کا روز بد دیکھنا پڑا۔

ملک عنبر کا دوسرا کارنامہ مالی انتظام تھا اس مدبر سپاہی نے باوجود تمام عمر میدان جنگ میں بسر کرنے کے اپنی رعایا کی خوشحالی
کے لئے بہترین مالی انتظام کیا مالگزاری کی تنظیم زمینات کا بندوبست اور محاصل کے خوش ستانی نے رعایا کو مطمئن اور فارغ البال کر دیا تھا

اس نے انتظام سلطنت کے لئے ملکی زبان کو دفاتر کے لئے رائج کیا

بحیثیت تعمیر کار اس کی ہستی لافانی ہے۔ کھڑکی ایک غیر آباد اور پہاڑی قریہ کو اس نے بارونق اور متمدن شہر بنا دیا گو اس شہر کو
ایک مرتبہ جہانگیر کی فوجوں نے زمین کے برابر بنا دیا تھا تاہم ملک عنبر نے چند دنوں میں اس ویرانے کو گلزار میں تبدیل کر دیا

سید محمد اکبر وفا قانی

گولکنڈے کا نیا قلعہ

(قلعہ گولکنڈہ کے پہلو میں سلطان عبداللہ قطب شاہ
نے جو نیا قلعہ بنایا تھا اس کی ایک جھلک)

اب بھی رونق پا رہا ہوں تیرے ویرانے میں میں
سن رہا ہوں کچھ سکوتِ شب کے افسانے میں میں

موجزن ہے تشنگی حوضوں میں پانی کے لئے
ابر جن پر چھا رہا ہے دُرفشانی کے لئے

ہیں نقوشِ جستجو تیرے شکستہ بام و در
جن میں کھو جاتی ہے دل کی دھڑکنیں لے کر نظر

تیرے سائے میں ہے ابتک بھی جھلک تلوار کی
تیرے خود رو دشت میں فرحت سی ہے گلزار کی

تیرا ہر پربت ہے اپنی عظمتوں کا رازداں
تیری خاموشی کے دامن پر ہیں نغموں کے نشاں

نوحہ خواں ہے پرسکوں تالاب کی سرسبز دوب
شام کو جس کے کنارے مہر ہوتا ہے غروب

تو خموشی میں ہے کیفیت کہاں فریاد میں؟
یہ ہے مسجد وہ ہے خدا کا گھر خدا کی یاد میں

عکسِ ماضی دیکھتا ہوں میں تری تصویر میں
حسن کاری کا تخیل ہے تری تعمیر میں

پیکرِ مردہ میں تیرے زندگی کی آن ہے
اب بھی محلوں کے کھنڈر کی جاودانی شان ہے

تھی تری بیداری تقدیر سونے کے لئے
تو یوں ہی چھوڑا گیا برباد ہونے کے لئے

آج کر دوں گا نمایاں بے حسی کے داغ کو
اپنے دل کے خون سے سینچوں گا تیرے باغ کو

آج میں تعبیر مانگوں گا فسونِ خواب سے
تیرے حوضوں کو بھروں گا آنسوؤں کی آب سے

ڈوب جائینگی اثر میں آج آہِ آتشیں
ثبت کر دوں گا ترے سجدے میں نقشِ جبیں

تیرے کھنڈروں میں سکونِ زندگانی پاؤں گا
تیری خاموشی میں ماضی کے ترانے گاؤں گا

میکش

گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت

قطب شاہی خاندان کی حکومت سرزمین حیدرآباد پر تقریباً دو سو سال یعنی ۹۱۸ھ سے ۱۰۹۸ھ تک رہی اور اس عرصہ میں ان حکمرانوں نے یہاں تہذیب و تمدن، تموّل و ثروت، علم و فضل اور شعر و سخن کی ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس پر دکن کی تاریخ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ ان بادشاہوں نے شیعہ و سنی اور مسلمان و ہندو غرض ہر مذہب و ملت کے باشندوں میں ایک مشترک کلچر کے پیدا کرنے میں یہاں تک کامیابی حاصل کی تھی کہ دوسروں کے لئے اس ملک کے رہنے والوں کا باہمی اتحاد اور یگانگت باعثِ رشک تھی۔ اسی موانست و مفاہمت کی خاطر انھوں نے اردو کی سرپرستی کی اور اس زبان میں ایسی ایسی بلند پایہ کتابیں لکھیں اور لکھوائیں جن پر اردو ہمیشہ نازاں رہے گی۔

یوں تو قطب شاہی سلطنت کے بانی سلطان قلی کا تعلق اس سرزمین سے ۸۹۱ھ میں پیدا ہو چکا تھا جب وہ تلنگانہ کا صوبہ دار بنایا گیا تھا لیکن جب سنہ ۹۰۱ھ میں گولکنڈہ اور اس کے اطراف و اکناف کا علاقہ اس کو بطور جاگیر کے دیا گیا تو اس نے اس کا نام محمد نگر رکھا اور قدیم قلعہ کو مستحکم کر کے اس میں متعدد محلات تعمیر کئے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اپنے علاقہ کو وسیع کرنا شروع کیا۔ چنانچہ بیس بائیس سال کے عرصہ میں پانگل، ککمن پور، کویل کنڈہ اور بلگندل وغیرہ اس کے قبضہ میں آ گئے۔ سنہ ۹۲۴ھ میں اس نے قلعہ میں بالا حصار کے دامن میں مشہور مسجد صفا بنائی جس میں آخر کار سنہ ۹۵۰ھ میں اس کے فرزند یار قلی جمشید کے اشارے سے سلطان قلی قطب شاہ کو ننانوے (۹۹) سال کی عمر میں عصر کی نماز پڑھتے وقت شہید کیا گیا۔ اس نے دوسرے صوبہ داروں کی طرح بہمنی بادشاہ کے خلاف علم بغاوت نہیں بلند کیا بلکہ آخر تک ان کی مدد کرتا رہا اور جب بریدیوں نے بہمنیوں پر پوری طرح قبضہ کر لیا تو مجبوراً سلطان قلی کو بھی اپنی بادشاہت کا اعلان کرنا پڑا۔

سلطان قلی کو فنِ تعمیر کا خاص ذوق تھا۔ اس نے قدیم قلعہ (موجودہ بالا حصار) کے اطراف ایک عالیشان شہر بنایا۔ اور در اصل وہی اس طرز تعمیر کا بھی بانی ہے جو قطب شاہی کہلاتا ہے اور ایرانی، ہندو، اور پٹھان طرز ہائے تعمیر کے امتزاج سے بنا ہے۔ اس کی وفات کے وقت اس کی سلطنت شمال میں دریائے گوداوری، مشرق میں اڑیسہ اور ساحلِ سمندر اور جنوب میں دریائے کرشنا تک پھیل چکی تھی۔

۲ جمشید قلی قطب شاہ تخت نشین ہوتے ہی اپنی سلطنت کے استحکام و وسعت میں مصروف ہو گیا۔ اگرچہ اس کا سات سال کا مختصر سا عہد حکومت زیادہ تر جنگ و جدل، سخت گیریوں اور پریشانیوں میں گذر گیا۔ لیکن اس نے ناراین کھیڑ، احسن آباد اور میدک پر قبضہ کر کے قطب شاہی سلطنت میں اضافہ کیا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ لیکن اس کے عہد میں گولکنڈہ اردو شعر و سخن کا مرکز نہ بن سکا۔ اس کی وفات ۹۵۷ھ پر اس کے کمسن لڑکے سبحان قلی کو تخت نشین کیا گیا لیکن چند ماہ بعد ہی اس کا دوسرا بھائی ابراہیم قلی کوبل کنڈہ کے نایک واڑیوں کی مدد سے قلعہ گولکنڈہ میں داخل ہوا۔ اور اپنے بھائی کے مظالم کی تلافی کرنے میں مصروف ہو گیا۔

۳ سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ کی شخصیت کو دکن کی سیاست میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اسی کے زمانہ میں ۹۷۲ھ میں تالی کوٹہ کی مشہور لڑائی ہوئی جس میں وجیانگر کی عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی گولکنڈہ کو مال و دولت اور سیاسی حیثیت سے کافی اہمیت حاصل ہو گئی۔ بعد میں ابراہیم قطب شاہ نے راجمندری، قاسم کوٹہ اور کھم میٹھ وغیرہ کے علاقے بھی فتح کئے۔ اس نے ۹۸۸ھ میں انتقال کیا۔ اس کو بھی اپنے باپ کی طرح تعمیر کا شوق تھا۔ چنانچہ بالا حصار کی سیڑھیوں کی مسجد، موسیٰ ندی کا پہلا پل، حسین ساگر، بدویل کا تالاب، ابراہیم باغ، باغ گلشن اور قصبہ ابراہیم پٹن اس کی تعمیری یادگاریں ہیں۔ اس کے عہد میں گولکنڈہ اردو زبان کا مرکز بن گیا۔ اور فیروز، محمود، احمد اور وجہی جیسے بلند پایہ شعراء

اسی کی قدردانی اردو کی وجہ سے متعدد بیش بہا کتابیں اس زبان میں تصنیف کر سکے۔

۴ ابراہیم کے بعد اس کا تیسرا لڑکا سلطان محمد قلی تخت نشین ہوا جس نے ۹۹۹ھ میں اپنی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر بھاگ نگر کی بنا ڈالی۔ اور عالیشان محلات، حمام، مساجد، مدارس اور بازار وغیرہ تعمیر کیے۔ بھاگ نگر کے اطراف و اکناف بیس میل تک باغات بنائے گئے۔ نرکھوڑہ، ابراہیم پٹن، جونگیہ، اور پٹن چیرو اس شہر کے حدود پر واقع تھے۔ ستره برس کے بعد غالباً اپنی اکلوتی لڑکی شہزادی حیات بخشی بیگم کی شادی کے موقعہ پر بادشاہ نے اس پری (؟) بھاگ نگر کا نام حیدر آباد قرار دیا۔

محمد قلی قطب شاہ نے ۱۰۰۱ھ میں سکر اور سندیال وغیرہ فتح کیا۔ اس کے زمانہ میں گولکنڈہ بہ لحاظ عروج کمال پر پہنچ گیا۔ شاہ عباس صفوی کا سفیر اغزلو سلطان اسی عہد میں گولکنڈہ آیا تھا۔ علم و فضل اور شعر و سخن کے لحاظ سے بھی یہ دور دکن کا عہد زرین سمجھا جاتا ہے۔ اسی دور میں دکنی قطب شاہی سلطنت اور خاص کر گولکنڈہ اور حیدر آباد میں معراج کمال حاصل کیا اور اس سرزمین نے تمدن و معاشرت کے وہ تمام منازل طے کر لیے جو کسی ملک کو متمدن اور شائستہ ثابت کرتے ہیں۔ اسی زمانہ میں گولکنڈہ مختلف اقطاع عالم کے سیاحوں اور علما و فضلا کا مرجع و مامن بھی بن گیا تھا۔

سلطان محمد قلی نے جنگ و جدل سے زیادہ امن و امان اور ملک کی وسعت سے زیادہ اہل ملک کی خوش حالی اور رعایا کی تعلیمی ترقی پر زور دیا وہ خود بہت بڑا شاعر اور قدر دان سخن تھا۔ اس نے تین زبانوں فارسی اردو اور تلنگی میں اپنے دیوان مرتب کیے تھے۔ اس کا اردو کلام نہایت اعلیٰ پایہ ہے۔ اس کا دربار شاعروں سے معمور تھا۔

حیدر آباد کی اکثر عمارتیں اسی صاحب ذوق بادشاہ کی یادگار ہیں۔ ان میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں:-

چار مینار، چار کمان، چار سو کا حوض، دار الشفا، جامع مسجد، داد محل، ندی محل، نبات گھاٹ، باغ دلکشا، خداداد محل (جو جنت منزل تھا اور ہر منزل کا نام جدا تھا مثلاً الٰہی محل، محمدی محل، حیدری محل، حسینی محل، حسنی محل، جعفری محل اور موسوی محل)، باغ محمد شاہی، کوہ طور، جنان منزل، اور بادشاہی عاشور خانہ وغیرہ۔

۵ محمد قلی قطب شاہ کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد سلطان مرزا سلطان محمد قطب شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس کی شادی حیات بخشی بیگم بنت سلطان محمد قلی کے ساتھ ۱۰۱۶ھ میں نہایت تزک و احتشام سے ہوئی تھی۔ اس کا عہد حکومت بھی امن و امان اور خوش حالی میں گذرا۔ اس کے دور میں شہزادہ خرم نے جو بعد میں شاہجہاں کے لقب سے جہانگیر کا جانشین ہوا باپ سے بغاوت کرکے اور اس کی فوجوں سے ہزیمت پاکر قطب شاہی سلطنت میں پناہ لی تھی۔ سلطان محمد نے اس کے ساتھ ہمدردی کی اور ایسے وقت میں اس کی مالی امداد کی جب کہ وہ بالکل محتاج تھا اور اکثر رفیقوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

سلطان محمد قطب شاہ نے اپنے چچا کی قدر دانی شعر و سخن کو جاری رکھا۔ لیکن وہ شاعر ہونے کے علاوہ عالم و فاضل بھی تھا۔ اس نے شعر و سخن اور علم و فضل کے ساتھ زہد و تقویٰ اور اخلاق و آداب کا بھی خاص خیال رکھا۔ اسی کے عہد میں اس خاندان کی مشہور تاریخ سلطان محمد قطب شاہی لکھی گئی۔ اس کے دور میں بھی دکن کے حکمرانوں کے علاوہ جہانگیر اور شاہ عباس صفوی کے سفرا گولکنڈہ آئے تھے۔ اس کے عہد کے اردو شاعروں میں وجہی کے علاوہ غواصی اور ابن نشاطی کے نام خاص کر قابل ذکر ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ سلطان محمد کو بھی اپنے اجداد کی طرح فن تعمیر سے خاص شغف تھا۔ اس نے قلعہ محمد نگر گولکنڈہ کے مقابل میں حیدرآباد کے مشرقی جانب چھ میل کے فاصلہ پر ایک قلعہ سلطان نگر کی ۱۰۳۲ھ میں بناڈالی لیکن اس کا بہت جلد انتقال ہوگیا اور وہ قلعہ ناتمام رہا۔ اس کے علاوہ اسی سلطان نے "مسجد" "محل سلطان شاہی" اور "گوشہ محل" کی بھی بناڈالی تھی مگر اس کا کوئی کام اس کی زندگی میں تکمیل نہ پا سکا۔ اس کی جوانمرگی نے اس کو ہر طرح حرماں نصیب رکھا۔ اگر وہ چند اور سال زندہ رہ جاتا تو گولکنڈہ کی سلطنت اس قدر جلد زوال پذیر نہ ہونے پاتی۔

۶ سلطان محمد کے بعد اس کا اکلوتا لڑکا عبداللہ مرزا ۱۰۳۵ھ میں بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس بادشاہ کی یہ کم عمری اور ناتجربہ کاری قطب شاہی سلطنت کی کمزوری کا باعث ہوئی۔ سلطان عبداللہ کی کمزوریوں سے سب سے زیادہ محمد سعید میر جملہ نے فائدہ اٹھایا۔ آخرکار جب بادشاہ نے اس سرکش کا استیصال کرنا چاہا تو اس نے شہزادہ اورنگ زیب کے یہاں پناہ لی اور قطب شاہی سلطنت اور اس کے حکمران کی کمزوریوں سے غنیم کو واقف کردیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گولکنڈہ کی آزادی قائم نہ رہ سکی۔ اور اس کی عظمت و شوکت کا آفتاب غروب ہونے لگا۔

ان سیاسی پریشانیوں کے علاوہ سلطان عبداللہ کے عہد میں حیدرآباد کو ایک تباہ کن قحط اور پھر ایک زبردست طغیانی رود موسیٰ کی وجہ سے بھی سخت صدمے اٹھانے پڑے۔ لیکن ان سب صدموں سے بڑھ کر اہل حیدرآباد اس پریشانی اور ذلت سے متاثر ہوئے جو ۱۰۶۶ھ میں میر جملہ کی وجہ سے اورنگ زیب کے حملہ کی شکل میں نمودار ہوئی۔ اس وقت مغلوں نے لوٹ مار کے سلسلہ میں حیدرآباد کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور تمام شہر کو تباہ کرکے چھوڑا۔ غرض عبداللہ قطب شاہ کی زندگی پریشانیوں اور کشمکشوں میں گذر گئی۔ وہ آخر دم تک اولاد نرینہ کا متمنی رہا۔ اور اسی یاس و امید میں ایک پوری عمر بسر کی۔ گذاردی۔ پچاس سال کی طویل حکومت کے بعد سلطان عبداللہ نے ۱۰۸۳ھ میں انتقال کیا اور دراصل اس کے ساتھ ہی قطب شاہی حکمرانوں کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ وہ بھی اردو زبان کا ایک اچھا شاعر تھا اس کے عہد میں بھی علم و فضل اور شعرا و شاعری کی قدردانی جاری رہی فارسی کی مشہور فرہنگ برہان قاطع اور اردو کی مشہور کتابیں سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ، پھول بن، اور ماہ پیکر وغیرہ۔ اسی دور کی یادگار ہیں۔

۷ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے بعد اس کا چھوٹا داماد ابوالحسن تانا شاہ تخت نشین ہوا وہ چودہ برس تک قطب شاہوں کی اس امانت یعنی سلطنت گولکنڈہ کو دشمنوں سے بچاتا رہا۔ وہ نہایت دوراندیش اور قلندر منش حکمران تھا۔ اس نے قلیل عرصہ میں قطب شاہی سلطنت کے ان تمام کل پرزوں کو درست کرلیا جو سلطان عبداللہ کے پچاس سال کے طویل عہد حکومت میں بالکل کمزور اور منتشر ہوگئے تھے۔ اگر شہنشاہ اورنگ زیب جیسے طاقتور دشمن سے مقابلہ نہ ہوتا اور تمام ہندوستان کی فوجیں اس کے مقابلہ کے لئے جمع نہ ہوجاتیں تو وہ قطب شاہوں کی اس امانت کو اپنی اولاد تک نہایت مستحکم اور طاقتور حالت میں منتقل کرسکتا۔ اس کے عہد میں بھی حیدرآباد اردو شاعروں اور انشاپردازوں کا مرکز بنا رہا۔ طبعی اور غلام علی جیسے بلند مرتبہ شاعر اس وقت بھی موجود تھے۔ جنھوں نے وجہی و غواصی کے خدمات شعر و سخن کو بوجہِ احسن جاری رکھا۔

سلطان ابوالحسن قطب شاہ نے جس خوبی اور مردانگی سے مغلوں کا مقابلہ کیا اور اثنائے جنگ میں اس کا برتاؤ جیسا شریفانہ اور بہادرانہ رہا اس کے تذکرے خاص و عام کی زبان پر اب تک جاری ہیں اس نے قطب شاہی افواج کی اخلاقی حالت اس قدر درست کردی تھی کہ دشمن بھی اعتراف کرتے تھے۔ اگر اورنگ زیب کا تدبر اور میر جملہ کے جانشین غدار قطب شاہی امرا کا مکر و فریب کارگر نہ ہوتا تو شاید ہی گولکنڈہ فتح ہوسکتا۔

(ماخوذ از "سیر گولکنڈہ")

سید محی الدین قادری زور

سلطان قلی قطب شاہ (۹۲۴ھ تا ۹۵۰ھ)

سلطان قلی قطب شاہ سلطنت گولکنڈہ کا بانی ہے۔ وہ ترکستان کے ایک بہت بڑے اور مشہور حکمران قبیلے قراقونیلو کا رکن تھا ۹۰۰ھ مرتبہ دکن آیا تھا۔ اس کے دکن آنے کا سبب خاندان شاہیہ کی تباہی اور قبیلہ قراقونیلو کا ترکستان پر تسلط ہے۔ وہ اپنے چچا اللہ قلی کے ساتھ قیمتی تحفے وغیرہ لے کر ہندوستان آیا تھا۔

سلطان قلی ترکستان سے بیدر دکن آیا۔ یہ محمود شاہ بہمنی کا عہد حکومت تھا جبکہ بیدر تمام ممالک عجم کا مرجع بن گیا تھا۔ ان کے خاندانی حالات اور وجاہت کو دیکھ کر بہمنی دربار نے ان کی بہت آؤ بھگت کی۔ سلطان قلی اپنے چچا کے ساتھ جب پہلی مرتبہ دکن آیا تو دونوں کے لئے تاقیام وظیفہ قائم رکھا گیا تھا دوسری مرتبہ آیا تو بہت سی عنایتیں ہوئیں اور ان کو یہاں رہ جانے کے لئے مجبور کیا گیا۔ یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے سلطان قلی دربار دکن سے بہت متاثر ہوا تھا۔

چند دنوں کے بعد ترکستان کے حاکم امیر یعقوب کے مرنے کی خبر آئی اور یہ ہمدان کے شاہی خاندان کے لئے اچھا موقع تھا۔ اللہ قلی بیگ نے بادشاہ سے مراجعت کی اجازت چاہی۔ اللہ قلی کے اصرار پر اس کو تو اجازت مل گئی لیکن بادشاہ نے کہا کہ "اللہ قلی بیگ اگر بمراجعت مختاری، مگر سلطان قلی بیگ را بہ ہیچ وجہ رخصت انصراف نمی دہیم"۔ اس کے علاوہ خود سلطان قلی بھی واپس نہیں جانا چاہتا تھا اس لئے اللہ قلی کو مجبوراً تنہا لوٹنا پڑا۔ اور سلطان قلی دکن میں رہ گیا۔

سلطان قلی کی استقامت سے محمود شاہ بہت خوش تھا۔ اس کو اپنے مقرب درباریوں میں شریک کر لیا۔ اس کی ترقی کا بڑا سبب اس کی ذاتی قابلیت تھی۔ شکار کے مشہور واقعہ کے بعد اس کو ایک سو پچاس عربی و ترکی گھوڑے مع ساز و سامان مطلا ہونے اور خلعت عنایت کی گئی اور اس کے اخراجات کے لئے کوڑنگل اور اس کے مضافات دئے گئے اور خواص خان خطاب سے سرفراز ہوا۔ سلطان قلی علم حساب اچھا جانتا تھا اور خوش خط بھی تھا اسی لئے بادشاہ نے اس کو شاہی محلات کا محاسب بنایا۔ اس کی بڑی قابلیت کا اظہار تلنگانہ کے پرگنوں میں ہوا جہاں وہ اپنی خواہش سے ڈاکوؤں کی سرکوبی اور ادائی مالگزاری کے لئے رعایا کو پابند کرنے گیا تھا۔ چونکہ اس میں علمی اور فوجی دونوں قابلیتیں تھیں اس کو زمانہ میں صاحب السیف والقلم کہا جاتا تھا۔

اس کے بعد سلطان قلی کی قابلیت اس وقت ظاہر ہوئی جبکہ ۸۹۶ھ میں بیدر شہر کے باغی والوں سے انتقام لینے کے لئے قلعہ پر حملہ کر دیا تھا۔ خود بادشاہ کی جان سخت خطرے میں تھی قلعہ دار حسن علی سبزواری اور سید مرزا مشہدی کے ساتھ سلطان قلی بھی مع اپنے ترک سوار جوانوں کے موجود تھا۔ یہاں سلطان قلی کی سچی وفاشعاری اس کی غیر معمولی ترقی کا باعث ہوئی چنانچہ بادشاہ نے خوش ہو کر اس کو قطب الملک کا خطاب عطا کیا تھا۔

اس کے تین سال بعد ۸۹۹ھ میں مغربی ساحل کی بغاوت سلطان قلی کے لئے مزید ترقی کا باعث ہوئی۔ یعنی وہ تمام ممالک تلنگانہ کا صوبہ دار بن گیا۔ بہمنی امیر بہادر گیلانی کی سرکوبی میں اس نے بڑا حصہ لیا۔ جب بادشاہ مغربی ساحل کی مہم سے فارغ ہو کر بیدر آیا تو قطب الملک سلطان قلی کو تلنگانہ کا صوبہ دار بنا دیا۔ اور اس کی قدیم جاگیر میں گولکنڈہ اور کوڑنگل کا اضافہ کیا

دکن کے سیاسی انتشار نے بھی سلطان قلی کی مدد کی۔ اسی انتشار میں وہ ترقی کر کے گولکنڈہ کی خود مختار سلطنت قائم کر سکا۔ دکن میں ملکی اور غیر ملکی عناصر کی کشمکش اور حکومت کی کمزوریوں سے جب بہمنی سلطنت کا دسویں صدی ہجری کے اوائل میں خاتمہ ہوا اور اس کے حصے بخرے ہونے لگے تو بیجاپور، احمد نگر،

اور برار کے ساتھ گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت بھی قائم ہوگئی۔

۹۲۴ھ میں سلطان محمود کے انتقال کے بعد وہ خودمختار ہوا اور اس کے بعد اس نے گولکنڈہ کو پایۂ تخت بنایا قلعہ اور شہر کی تعمیر کی۔ فوجی نقطۂ نظر سے گولکنڈہ نہایت موزوں سمجھا گیا۔ اپنے مرکز کے استحکام کے بعد اس نے شرقی تلنگانہ کے مختلف صوبوں پر وار کرنے شروع کئے تقریباً ۲۰ سال کے دوران میں ساٹھ ستر قلعے اور حصار فتح کئے۔ اور سلطنت کو ونگل کی سرحد سے بندر گاہ مچھلی پٹم تک پہنچا دیا۔

۹۵۰ھ اواخر جمادی الاول میں اس کے بیٹے جمشید نے تخت سلطنت کی ہوس میں اسے قتل کروایا۔ اس نے تقریباً پچاس سال دکن میں حکومت کی۔ اگر اس کا ابتدائی زمانہ بھی شامل کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے تقریباً ساٹھ سال سیاست دکن کی رہنمائی کی۔ اسی مدت میں اس نے جنوبی ہند کے تمدن و سیاست میں ایک بڑا تغیر پیدا کیا تھا۔ یہاں کی منتشر اکائیوں کو ایک رشتہ میں منسلک کرکے اس ملک کی خاطر خواہ شیرازہ بندی کردی تھی اور باضابطہ نظم و نسق سے یہاں امن و امان قائم کردیا تھا۔

جمشید قطب شاہ

(۹۵۰ھ تا ۹۵۷ھ)

سلطان قلی قطب شاہ نے ۵۰ سالہ عہد حکومت کے بعد ننانوے (۹۹) سال کی عمر میں انتقال کیا تھا۔ وہ گولکنڈہ کی نوخیز سلطنت کو مستحکم حالت میں چھوڑ گیا تھا۔ اس کے ۶ بیٹے تھے۔ فرزند اکبر حیدر قلی جو جانشینی کے لئے نامزد ہو چکا تھا باپ کی زندگی [illegible] اس کے بعد سلطان قلی قطب شاہ نے اپنے دوسرے بیٹے قطب الدین کو ولیعہد بنایا لیکن اس کے مقابلہ میں اس کے دوسرے بھائی جمشید قلی، عبدالکریم اور دولت قلی بہت تیز طبیعت اور حوصلہ مند تھے۔ چھوٹا بیٹا ابراہیم قطب دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ لائق تھا۔ عبدالکریم باپ کی زندگی ہی میں بغاوت کی پاداش میں مارا گیا۔ اور جمشید اور دولت بھی نظر احتیاط قید رکھے گئے تھے، لیکن جمشید قلی جو گولکنڈہ ہی میں مقید تھا، اپنے لئے قید میں سے راستہ صاف کرنے لگا اور سازش کی اور ایک شخص میر محمود ہمدانی کے ذریعہ اپنے باپ کو قتل کروایا۔ باپ کے مرنے کے بعد جمشید قید سے باہر نکلا اور اپنے ہمدردوں کے زور سے سلطنت کے سیاہ و سفید اپنے ہاتھ کر لیے۔ قطب الدین ولیعہد سلطنت اندھا کردیا گیا۔

۹۵۰ھ میں جمشید قطب شاہ کی تخت نشینی عمل میں آئی اور ۹۵۷ھ تک سات سال اس نے حکومت کی۔ اگرچہ تخت نشینی کے بعد جمشید نے رعایا پروری کی کوشش کی اور انھیں مختلف انعامات سے سرفراز کیا لیکن راعی و رعایا میں کچھ خوشگوار تعلقات نہ پیدا ہو سکے۔ پہلے تو اس کے کرتوت ہی اس کی بدنامی کے لئے کافی تھے پھر تخت نشینی کے بعد جبکہ اس کی عمر [illegible] سال کی تھی، طبیعت کی ترشی اور تندمزاجی نے اس کے بہت سے مخالف پیدا کردئے۔ جمشید کا چھوٹا بھائی ابراہیم جو دیورکنڈہ سے بھاگ کر ملک برید کے پاس بیدر پہنچ گیا تھا برید کی امداد کے ساتھ گولکنڈہ کی دیواروں تک پہنچ گیا۔ اگرچہ یہ حملہ برہان نظام شاہ والئ احمد نگر کی تائید سے رفع ہوگیا تھا لیکن ملک برید اس حملہ کے بعد سے گولکنڈہ کی اندرونی سیاسی فضا اور جمشید کی کمزوریوں سے واقف ہوگیا۔ بیدر کی بریدشاہی سلطنت بہت مختصر تھی لیکن اس زمانہ میں برید دکن کی لومڑی کہلاتے تھے۔ وہ آپس کے جوڑ توڑ میں بہت مشاق تھے کبھی بیجاپور کا ساتھ دیا تو کبھی احمد نگر کا۔ ہر حیلہ و بہانہ سے ان سلطنتوں کو لڑادیا کرتے تھے تاکہ اس طرح سے ان کا فائدہ ہو جائے۔ چنانچہ جمشید کے زمانے میں ایسی لڑائیاں بہت کم ہوئی ہیں۔

برہان نظام شاہ نے جمشید قلی قطب شاہ سے زیادہ دوستی بڑھا لی۔ بیجاپور پر احمد نگر نے حملہ کیا تو عماد الملک اور جمشید دونوں احمد نگر کے ساتھ شریک تھے۔ لیکن ابراہیم عادل شاہ کی تائید پر برید کی فوجیں تھیں۔ کہتے ہیں کہ اس موقع پر جمشید ہی نے بڑا کام کیا۔ اس کے آگے بڑھنے سے ابراہیم اور برید میدان چھوڑ کر بھاگ گئے اور جمشید نے برید کا بیدر کی دیواروں تک تعاقب کیا۔

اس شکست کے بعد برید خاموش کیسے بیٹھ سکتا تھا۔ انتقام لینے کے لئے برید نے غالباً ۹۴۵ھ میں گولکنڈہ پر حملہ کر دیا لیکن جمشید نے بڑی ہوشیاری کی۔ تھوڑی سی فوج یہاں چھوڑ کر پیچھے سے بیدر پر حملہ کر بیٹھا۔ برید کی فوجیں لوٹ گئیں اور دونوں کا مقابلہ ہوا۔ یہاں بھی گولکنڈہ کی فتح ہوئی۔

برید کا جذبۂ انتقام اس کی شکستوں سے اور بڑھ رہا تھا۔ اب اس نے چوتھی مرتبہ ابراہیم عادل شاہ بیجاپور کے اتحاد سے جمشید پر حملہ کیا۔ کئی دن لڑائی ہوئی مگر اس میں بھی جمشید ہی کے سر فتح کا سہرا رہا۔

اس کے بعد جمشید نے ہمیشہ کے لئے برید کا خاتمہ چاہا۔ اس نے دکن کی تمام دوسری ریاستوں کو ہموار کر کے برید پر متفقہ حملہ کیا۔ بیجاپور بھی جو اب تک برید کا دوست تھا اس اتحاد میں شریک ہو گیا۔ چنانچہ جب برید ہار مان کر بیجاپور بھاگا تو بجائے امن دینے کے ابراہیم نے اسے گرفتار کر لیا لیکن دکن کی سلطنتوں میں کچھ ایسی رقابت تھی کہ بعد کو خود جمشید نے برید کو چھڑا لیا اور بیدر لیجا کر صحیح سلامت چھوڑ دیا۔

بیدر سے واپسی کے بعد جمشید نے دو تین سال آرام سے گزارے لیکن یہ کچھ زیادہ دن آرام نہ لے سکا وہ ایک سخت مرض میں مبتلا ہو گیا۔ فرشتہ اسے دق بتاتا ہے لیکن تاریخ قطب شاہی کے الفاظ میں یہ مرض سرطان تھا جس کے صدمہ سے بالآخر ۹۵۷ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے صرف سات سال حکومت کی۔ اس کو سلطان قلی قطب شاہ کے قریب دفن کیا گیا۔

انتہائی برائیوں کے گھٹا ٹوپ میں جو جمشید سے سرزد ہوئی تھیں اس کے اچھے اوصاف روشنی میں نہ آ سکے لیکن اس کی برائیوں کو قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اس میں بہت سے اوصاف ایسے بھی ملتے ہیں جو سراہنے کے قابل ہیں۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے جمشید قطب شاہ ہندوستان کے اچھے حکمرانوں میں سے تھا۔ دکن کی سیاست پر اس کی گہری نظر تھی۔ سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے وہ ہمیشہ کامیاب ہتھکنڈے اختیار کرتا تھا۔ چنانچہ برید کے شر و فساد سے دامن چھڑانے کے لئے احمد نگر اور بیجاپور سے اتحاد کیا تھا۔ اس کی فوجی نظم نہایت اچھی تھی۔ وہ خود بھی سپاہی تھا۔ فوج میں بذات خود حصہ لیتا تھا۔ اس کی دلیری اور جرأت کا یہی نتیجہ تھا کہ سوائے جنگ نالی کھیڑ کے جہاں عین الملک کے بیٹے کی غفلت سے کام خراب ہوا تھا گولکنڈہ کی فوج کو کبھی شکست نہیں ہوئی اور سلاطین دکن ہمیشہ اس کی امداد کے طالب ہوتے تھے۔ وہ شجاعت کے ساتھ خوش رائی کا جوہر بھی اپنے اندر رکھتا تھا۔

ان اوصاف کے ساتھ جمشید میں علمی قابلیت بھی تھی۔ وہ اچھا شاعر تھا بعض دفعہ اس نے فی البدیہہ شعر کہے تھے۔ اس نے فرصت کے موقعوں میں بہت سے قصیدے اور غزلیں بھی لکھی تھیں۔

عبدالحفیظ صدیقی

ابراہیم قلی قطب شاہ (۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ)

جمشید قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد تخت گولکنڈہ کے کئی دعویدار کھڑے ہو گئے۔ جمشید کا صغیر سن بیٹا سبحان قلی تخت پر بٹھا دیا گیا لیکن دو زبردست حریف اٹھ بیٹھے۔ دولت قلی نے بھونگیر میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اور ابراہیم قلی بیجا نگر سے حصول تخت کے لئے۔ دولت قلی کو کسی نہ کسی طرح مقید کر لیا گیا پر ابراہیم قلی کے سامنے کسی کی کچھ پیش نہ گئی اور ۹۵۷ھ میں تخت گولکنڈہ ابراہیم قلی قطب شاہ سے زینت پایا۔ ابراہیم قلی قطب شاہ بڑا مدبر اور دوربین بادشاہ تھا۔ اس نے مصطفےٰ خان کو اپنا وزیر مقرر کیا اور اپنی بہن اس سے منسوب کر دی۔

۹۶۰ھ میں حسین نظام شاہ اور ابراہیم قطب شاہ کے متحدہ لشکر نے گلبرگہ کا محاصرہ کر لیا لیکن رام راج والی بیجا نگر کی گفت و شنید نے محاصرہ اٹھانے پر مجبور کیا۔

۹۶۵ھ میں علی عادل، رام راج اور ابراہیم قطب شاہ تینوں نے احمد نگر پر حملہ کر دیا۔ قریب تھا کہ احمد نگر فتح ہو جائے لیکن چونکہ اس فتح سے علی عادل کی قوت بہت بڑھ جاتی تھی اور سلطنت گولکنڈہ کو اس سے خدشہ تھا۔ ابراہیم راتوں رات اپنا لشکر لے کر چلا آیا۔ حسین نظام شاہ نے اپنی بیٹی ابراہیم کے عقد میں دی۔ اور اپنے کھوئے ہوئے قلعے واپس لینے کے لئے ابراہیم کی مدد چاہی۔ ابراہیم نے اپنی فوج بھیج دی لیکن یہ مہم مستقل طور پر نہیں لڑی گئی۔ کچھ دن بعد فوج بغیر کسی نتیجہ کے واپس لوٹی۔ اس وقت گولکنڈہ بیرونی حملہ آوروں کی زد میں تھا۔ رام راج کی فوج اندر تک گھس آئی تھی اور بادشاہ کو گولکنڈہ، گھن پورہ، اور پانگل کے قلعے دے کر صلح کر لینا پڑا۔ بیرونی دشمن دفع ہو چکا تو اندرونی دشمنوں نے سر اٹھایا۔ ابراہیم قلی نے گولکنڈہ کے حصار کی مرمت کروائی اور شہر کو ہر طرح محفوظ کر لیا۔ اسی اثنا میں نائب وزیروں کا فساد ہوا لیکن بہت جلد فرو کر دیا گیا۔

رام راج کی قوت بہت بڑھ چکی تھی۔ اور وہ اسی زعم میں اپنی ہمسایہ سلطنتوں کو چھیڑ چھیڑ کر اپنی طاقت جتلا رہا تھا۔ مسلمان تو نہیں ایک دوسرے کی دشمن سہی لیکن وقت پر متحد ہونا بھی جانتی تھیں۔ ابراہیم قلی قطب شاہ، حسین نظام شاہ، علی عادل، اور علی برید نے رام راج پر حملہ کر دیا۔ اور مشہور فیصلہ کن جنگ تالی کوٹ ہوئی۔ راجہ کو شکست فاش ہوئی۔ اور ابراہیم کے کھوئے ہوئے قلعے پھر اسے واپس مل گئے۔

۹۷۱ھ میں ابراہیم نے رفعت خاں لاری کو راجمندری کی فتح کے لئے بھیجا۔ دو زبردست معرکوں کے بعد راجمندری پر قطب شاہی افواج قابض ہو گئیں۔

ابراہیم کا دور حکومت نہایت پرآشوب اور معرکہ آرائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ایک فتنہ کا سر دبایا گیا تو دوسرا سر اٹھا۔ بادشاہ کا لشکر کبھی اتحادیوں کو ان کی بد عہدی کی سزا دینے میں مصروف ہوتا تو کبھی چھوٹے موٹے راجاؤں کو ان کی سرکشی کی۔ شاہی اقبال ہمیشہ یاوری کرتا اور ہر جگہ بادشاہ کو فتح ہوتی۔ ابراہیم قلی قطب شاہ کا انتقال ۹۸۸ھ میں ہوا۔ کل تیس۳۰ سال نو۹ مہینے اس کی حکومت کا زمانہ ہے۔ اس کے زمانے میں گولکنڈہ میں کئی عمارتیں بنیں۔ لنگر دوازدہ امام، ریاض محل، باغ ابراہیم شاہی، حوض حسین ساگر، کنگورہ، کنگورہ بدر محل، کے علاوہ مساجد، مدارس بھی تعمیر پائے۔

رشید قریشی

ابراهیم قلی قطب شاہ
۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ

محمد قلی قطب شاہ
بانی حیدرآباد
۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ

قومی تعمیر کی بنیاد رکھی اور اس کو آگے بڑھانے کی پوری کوشش کی۔ دوسری طرف تمدنی ضروریات کے ذریعہ شاہانہ زندگی کا تمدنی پایہ بلند کیا۔ اس کے زمانے کے عظیم الشان تعمیری آثار اس حقیقت کی پوری نشان دہی کرتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ دکھنی زبان کا بڑا عالم تھا اور روایت ہے کہ اس نے دکھنی میں ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ وہ پہلا آدمی ہے جس نے حیدرآباد میں اردو میں شاعری کی۔ اس کی نظمیں اور غزلیں اس کے ادبی ذوق اور ارتقائے اردو کے بہترین نمونے ہیں۔ ان نظموں سے معلوم ہوتا ہے اس کو مقامی معاشرت اور روایات سے بھی گہری دلچسپی تھی۔

محمد قلی قطب شاہ کے تمدنی کارناموں کی ایک بڑی فہرست ہے۔ صرف شہر حیدرآباد اور اس کی تعمیر اس بادشاہ کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ حیدرآباد کی تعمیر کی صحیح تاریخ نہیں ملتی ہے۔ شہر کے بیچ میں ایک سڈول عمارت چار مینار کی تاسیس ۹۹۹ھ میں ہوئی تھی غالباً یہ ڈیڑھ دو سو سال میں تیار ہوئی اور "یا حافظ" سے اس کی تاریخ نکلتی ہے۔ شہر کی تعمیر کا بڑا مقصد ملک میں ایک اجتماعی زندگی پیدا کرنا تھا۔ بادشاہ نے شہر کی تعمیر کے ساتھ اس بات کا پورا لحاظ رکھا تھا کہ اس میں ایک متمدن زندگی کی تمام ضرورتیں مہیا ہوں۔ شہر و عمارت کی خوش اسلوبی اور عظمت کی وجہ سے گولکنڈہ کے مورخ کا یہ کہنا کہ "تمامی ہندوستان عدیلے ندارد" بڑی حقیقت پر مبنی ہے۔

عبدالحفیظ صدیقی

سلطان محمد قطب شاہ

(۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵ھ)

سلطان محمد قلی وصیت کر گیا تھا کہ اس کے بھتیجے سلطان محمد کو تخت پر بٹھایا جائے۔ اس لئے سلطان محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۸ سال تھی۔ سب سے پہلا کام جو اس نے لیا وہ راجہ وستر کی مہم کا تصفیہ کرنا تھا۔ راجہ وستر نے اطاعت قبول کر لی تو شاہی فوجیں بانیت لوٹ آئیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مغلوں کا تسلط دکن پر روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اور مصلحت وقت یہی تھی کہ سلطان محمد بھی مغلوں سے صلح کر لیتا۔ جب شاہجہان شہزادہ کی حیثیت سے دکن میں مارا مارا پھر رہا تھا سلطان محمد نے اس کی بڑی مہمان داری کی۔ سلطان محمد بہت مہمان نواز اور فراخ دل بادشاہ تھا۔ اس کے دربار میں دور دور کے سفیر حاضر رہتے اور بڑی بڑی تنخواہیں پاتے۔

سلطان محمد کا بڑا بیٹا عبداللہ ۱۰۲۳ھ میں پیدا ہوا۔ بادشاہ نے ۱۲ سال تک اس کی صورت نہ دیکھی۔ کیونکہ یہی منجموں اور رمالوں کی رائے تھی۔ بارہ سال گزرنے کے بعد بادشاہ نے اپنے بیٹے کی صورت دیکھی بھی تو کچھ نہ ہوا۔ دوسرے تیسرے روز سے بادشاہ کو بخار آنا شروع ہوا۔ طبیبوں کے باہمی اختلاف نے مرض کو اور بڑھا دیا اور ۱۰۳۵ھ میں ۳۲ سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا۔ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کی صحیح تاریخ ملنی بہت مشکل ہے۔ روایتوں اور قصے کہانیوں سے کچھ حال معلوم ہو سکا۔ اس کے جنگی کارنامے بھی معلوم نہ ہو سکے ہاں اتنا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے عادات و اطوار نہایت ستودہ اور زبان زد خاص و عام تھے۔ یہ صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔ کہتے ہیں کہ جس وقت بادشاہ کو مسجد کی بنیاد رکھنے ایسے آدمی کی تلاش ہوئی جس کی تہجد تک قضا نہ ہوئی ہو تو خود بادشاہ ہی ایسا شخص تھا۔ شعر کہنے کا بھی شوق تھا اور خوب کہتا تھا۔ حیدرآباد کی جامع مسجد (جو اب مکہ مسجد کہلاتی ہے) اسی کے عہد میں شروع ہوئی لیکن مسجد کے ختم ہونے سے پہلے ہی بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔

اپنا ایلچی روانہ کیا اور نہایت جرأت سے شہنشاہ کو لکھا کہ "ہم آپ سے سرتابی کرتے ہیں سنبھاجی کو بھی۔ اکنا نے یہاں بلکھیں گے آپ کن کن سے مقابلہ کرتے ہیں" اورنگ زیب کی نظر سے یہ تحریر گزری تو بہت غضب ناک ہوا اور شاہزادہ شاہ عالم بہادر شاہ کو فوج کثیر لے ساتھ گولکنڈہ کی طرف روانہ کیا۔ ابوالحسن کی فوج نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن جلد قطب نامی سپہ سالا مغلوں سے مل گئے اور فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ دوسرے دن پھر لڑائی ہوئی اس اثنا میں بادشاہ اپنے سپہ سالاروں سے اندیشہ مند ہوگیا اور خلیل اللہ خاں جو گولکنڈہ کا نہایت نامی سپہ سالار تھا ان سے ٹوٹ کر مغلوں سے جاملا۔ اب ابوالحسن نے قلعہ گولکنڈہ میں پناہ لی اور مغل سپاہیوں نے حیدرآباد میں وہ قیامت برپا کی کہ قتل نادری اس کے سامنے گرد تھا ابوالحسن کی درخواست پر جدال و قتال روک دیا گیا اور صلح کے شرائط طے ہونے لگے صلح کی شرط ایک یہ بھی تھی کہ مادنا و اکنا زندہ بھیج دیا جائے بادشاہ نے منظور نہ کیا۔ بہادر شاہ نے میر ہاشم کو صلح کے لئے بھیجا لیکن گولکنڈہ سے میں یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اصل میں میر ہاشم تانا شاہ کو گرفتار کرنے آرہا ہے چنانچہ عبدالرزاق لاری اور شیخ منہاج نے میر ہاشم پر حملہ کر دیا اور اسے قتل کر دیا۔ اورنگ زیب کو شہزادہ کی سستی اور ناتجربہ کاری کی خبر ہوئی تو بہت کبیدہ ہوا اور دوسری مہموں کو عقد نے لگا کر گولکنڈہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ابوالحسن نے صلح کی بہت کچھ کوشش کی لیکن اورنگ زیب نے گولکنڈہ کو محصور کر لیا۔ "تنگ آمد بجنگ آمد" ابوالحسن نے بھی سخت مقابلہ کیا لیکن عبداللہ خاں پنی کی غداری سے اورنگ زیب نے قلعہ فتح کرلیا عبدالرزاق لاری نے اس موقع پر جس شجاعت و نمک حلالی کا ثبوت دیا وہ تاریخ میں یادگار رہے۔

قلعہ میں مغل سردار گھسے تو سارے قلعہ میں ادھم مچ گیا ہر جا طرف آہ و شیون کی آوازیں تھیں۔ اس وقت خاصہ تیار تھا کھانا طلب کیا۔ ابوالحسن اپنے لواحقین کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا۔ کھانے سے فارغ ہوکر شہزادہ کے پاس گھوڑے پر سوار ہوکر آیا۔ [illegible] کی مالا اس کے گلے میں ڈال دی۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ ابوالحسن کی عمر کے ۱۴ سال طفلی میں۔ ۱۴ سال تحصیل علوم میں ۱۴ سال سید راجو قتال کی خدمت میں ۱۴ سال حکمرانی میں اور چودہ سال قلعہ دولت آباد میں گزرے۔ ابوالحسن کی تین بیٹیاں تھیں۔ اور ایک لڑکا خدا بندہ جس کو اورنگ زیب نے بندہ سلطان کا خطاب دیا تھا۔ اس بادشاہ کی زندگی نے جس فرضی افسانوی حیثیت حاصل کر لی ہے وہ تاریخی مطالعہ سے بے بنیاد ثابت ہوتی ہے۔ بادشاہ کی نزاکت عیش پرستی، اور سادہ لوحی کے جو قصے بیان کئے جاتے ہیں وہ اس کے تاریخی کیرکٹر کو بگاڑ نہیں سکتے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مستقل مزاج، مدبر اور متوکل بادشاہ تھا جس کی پیشانی عین گرفتاری کے وقت بھی شکن آلودہ نہ ہوئی۔

تاناشاہ کو ایک لڑکا اور تین لڑکیاں تھیں اورنگ زیب نے دوسری لڑکی کی شادی سکندر عادل شاہ سے اور تیسری کی اسد خاں وزیر کے فرزند سے کردی پہلی لڑکی نے یہ کہہ کر شادی سے انکار کردیا کہ وہ اپنے بزرگ باپ کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کردینی چاہتی ہے۔ تاناشاہ کے لڑکے خدا بندہ کو باپ کی وفات کے بعد اپنے دربار میں طلب کیا اور بندہ سلطان خطاب دیا، لیکن جب یہ شہزادہ دربار میں آتا تو اہل دربار جن میں دکنی امرا بھی تھے اس کی تعظیم کرتے جس کی وجہ سے اورنگ زیب کو شبہ ہوا اور پھر یہ لڑکا کبھی نظر نہ آیا۔

رشید قریشی

وداعِ شاہ

تاناشاہ کی روانگی کے وقت اہلِ گولکنڈہ کی زبان سے

با حالِ تباہ جا رہا ہے — کانوں کی بے راہ جا رہا ہے
کس یاس سے آہ جا رہا ہے — اب قلعہ سے شاہ جا رہا ہے

کس طرح غبار راہ دیکھیں
ٹوٹے ہوئے دل کی چاہ دیکھیں

مٹ جائیں گے خود ہی اے عدم ہم — آئیں گے نہ تیرے روبرو ہم
کرلیں گے تباہ رنگ و بو ہم — بیچیں گے نہ اپنی آبرو ہم

کس آس پہ اب رہیں جہاں میں
اڑتے ہوئے رنگ گلستاں میں

ہم کو تو ملا تھا تاجِ شاہی — کن آنکھوں سے دیکھیں یہ تباہی
آتا ہے ہمیں بھی رقصِ ماہی — پائیں گے نہ اپنے بے گناہی

واللہ تڑپ کے جان دیں گے
مر کر ہی تجھے مکان دیں گے

پامال ہوں آفتاب ہو کر؟ — گر جائیں شرابِ ناب ہو کر؟
چھپ جائیں نظر سے خواب ہو کر؟ — بے کیف رہیں شباب ہو کر؟

جب شاہ نہیں تو ہم نہیں یوں؟
غیروں سے حدیثِ غم کہیں یوں؟

بے آبروئی سے ڈر رہی ہیں — ٹھکرا کے جہاں کو مر رہی ہیں
نعشوں سے کنویں کو بھر رہی ہیں — کام آنے کا کام کر رہی ہیں

اموات پہ رقصِ بلبل ہے
اس جنس کا دل بھی مردِ دل ہے

میکش

مشاہیرِ گولکنڈہ

اس نام سے ایک کتاب آج کل زیرِ ترتیب ہے جس میں گولکنڈہ کے جملہ مشہور اصحاب (بادشاہوں سے لے کر غلاموں تک) کے تاریخی حالات نہایت دلچسپ پیرایہ میں قلمبند کئے جا رہے ہیں۔ اسی کتاب سے چند اصحاب کے حالات یہاں درج ہیں۔

(وزرائے گولکنڈہ) جملۃ الملک مرزا محمد امین

اصفہان کے رہنے والے حیدرآباد آکر دربار شاہی کی ملازمت اختیار کی۔ سلطان محمد قلی نے حضرت میر مومن استرآبادی کی سفارش پر ۱۰۱۱ھ میں خدمت میر جملگی سپرد کی اور جواہرات کا ایک الماس مرصع قلمدانِ وزارت عنایت کیا جس کی روشنی سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ دو لاکھ ہون سالانہ تنخواہ مقرر کی گئی جو حال کے نو لاکھ روپیوں کے برابر ہوتے ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ قطب شاہی وزیر اعظم کی تنخواہ عہد حاضرہ کے وزیر اعظم کی تنخواہ سے تقریباً دس گنا زیادہ تھی۔ محمد امین نے میر جملہ ہوتے ہی باغیوں اور سرکشوں کو زیر کیا اور سواری راؤ برہمن کو کار و بارِ سلطنت سے بے اثر کر دیا ۱۰۱۵ھ میں جب آگرہ اور دہلی کے مغل سوداگر حالت نشہ میں شاہی محل میں بغیر اجازت کے دیکھنے کے لئے داخل ہوئے اور بادشاہ نے علی آقا کوتوال کو حکم دیا کہ انھیں باہر نکال دیا جائے تو شہر کے اوباشوں کو موقع مل گیا اور انھوں نے ان سوداگروں کے مال و اسباب کو لوٹنا شروع کیا اس ہنگامۂ عظیم کو محمد امین نے بڑی ترکیب سے فرو کیا اس اثناء میں محمد امین کا اثر بہت بڑھ گیا تھا۔ اسی وجہ سے دکنی امراء نے بادشاہ سے ناخوش ہو کر اس کے بھائی خدا بندہ کو بغاوت کے لئے اکسایا لیکن اس بغاوت میں وہ ناکام ہوئے۔

۱۰۱۹ھ میں محمد امین نے بادشاہ کی ایک شاندار دعوت کی اور اپنے مکان کو رشکِ فردوس بنا کر پا انداز میں زربفت و اطلس اور مخمل و مشجر کے کپڑے بچھا دئے۔ جب بادشاہ تشریف لائے تو شاعروں نے قصیدے سنائے اور مطربوں نے نغمے۔ آخر میں محمد امین نے تیس[3] عربی گھوڑے بیس[2] ہاتھی اور بلور کا ایک مدور آئینہ جس کے اطراف قسم قسم کے جواہر نصب کئے ہوئے تھے ایک سونے کی زین جس پر جواہر کا کام کیا ہوا تھا، چودہ جلد خوش خط قرآن شریف اور دیگر قیمتی اشیاء بطور نذر پیش کئے اور طعام کے بعد نغمہ خوانوں اور ندیموں کو پچاس ہزار ہون انعام میں دئے۔ بادشاہ نے چلتے وقت اپنے کندھوں سے زردوزی چادر نکال کر محمد امین کو عنایت کی۔ ۱۰۲۰ھ میں پرتاپ راؤ کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے محمد امین کو روانہ کیا گیا مگر وہ ناکام رہے اسی سال محمد قلی نے وفات پائی ان کی وفات سے قبل ہی محمد امین نے شہر سے ملحق ایک عالی شان تالاب بنایا جو تالاب میر جملہ کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ اسی تالاب کے کنارے مشرق رویہ محمد امین کی ڈیوڑھی بھی تھی جو اپنی آرائش اور خوبی تعمیر کی وجہ سے مشہور تھی اور جس میں آخر زمانے تک بڑے بڑے سفراء اور معزز مہمان ٹھیرائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ محمد امین نے موسیٰ ندی کے کنارے ایک امین باغ بھی بنایا تھا جو اس عہد کا ایک نہایت پر فضا مقام تھا اس امین باغ میں آج کل سرکاری زچگی خانہ ہے۔

جب سلطان محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا تو مرزا محمد امین نے حج کو جانے کے لئے رخصت حاصل کی اور اپنی پوری دولت کے ساتھ گولکنڈے سے نکل کر بیجاپور کا رخ کیا۔ وہاں ان کی خاطر خواہ آؤ بھگت نہیں ہوئی تو وہ ایران چلے گئے اور گولکنڈہ سے لائے ہوئے ایک لاکھ روپے کے جواہر شاہ عباس کی خدمت میں پیش کئے۔ لیکن شاہ عباس میں بھی انھیں محمد قلی جیسی خوبیاں نظر نہ آئیں تو دوبارہ ہندوستان آکر ۱۰۲۷ھ میں جہانگیر کے دربار میں ملازمت اختیار کی اور پچاس ہزار روپے کے جواہر نذر کئے۔ وہاں بھی انھیں وہ عروج حاصل نہ ہو سکا جو گولکنڈہ میں نصیب ہوا تھا البتہ میر بخشی کے خطاب سے سرفراز ہوئے آخر کار ۱۰۴۶ھ میں شاہجہاں کے عہد میں لقوہ اور فالج سے انتقال کیا۔

عواصی ملک الشعرائے گولکنڈہ

مرزا محمد امین میر جملہ

حیدرآباد میں وفات پائی۔

خواجہ افضل سلطان محمد کے زمانہ میں نو سال خدمت سرخیلی پر اور سلطان عبداللہ کے زمانہ میں چھ سال سپہ سالاری، مہرداری اور وزارت کے عہدہ پر مامور رہے۔ دولت و ثروت میں اپنے امثال و اقران میں ممتاز تھے اسی لئے حدیقہ میں ان کو اعظم الامراء لکھا ہے۔ ان کے ملازمین میں ایک ہزار ترکی و عرب و عجمی سوار تھے یوسف بیگ کے سپرد کئے گئے۔ اور ان کی جاگیر تفصیلی نگار پر فصیح الدین محمد تفرشی کو سرفراز کی گئی۔

مرزا روزبہان اصفہانی

سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے عمائدین سلطنت سے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی وفات سے دو ماہ قبل ربیع الاول ۱۰۳۵ھ میں ان کو خواجہ افضل ترک کی معزولی کے بعد سرخیلی کے منصب ارجمند پر سرفراز کیا تھا۔ لیکن سلطان عبداللہ کی تخت نشینی کے بعد جب خانم آغا اور منصور خاں حبشی کا دربار پر اثر جم گیا تو مرزا روزبہان کو معزول کرکے جلیسان حضور کے زمرہ میں شریک کردیا گیا۔ لیکن جب منصور خاں بیرہ ملکہ کا انتقال ہوگیا اور علامہ ابن خاتون پیشوائے سلطنت اور مختار دربار ہوگئے تو انھوں نے میرزا روزبہان کے لئے کوشش شروع کی اور بادشاہ کے سامنے ان کی بڑی تعریف کی چنانچہ ۳ ربیع الاول ۱۰۴۱ھ کو مرزا روزبہان دوبارہ منصب سرخیلی پر مامور کئے گئے اور انھوں نے پوری قوت کے ساتھ فوج اور رعایا کے معاملات سرانجام کرنے شروع کئے۔ لیکن بادشاہ کو ان پر اعتبار نہ آیا اور وہ ہمیشہ ان کو شبہ کی نظر سے دیکھتے رہے۔ آخرکار بددیانتی کے الزام میں منصب سرخیلی سے ۱۸ صفر ۱۰۴۲ھ میں ہٹائے گئے اور فصیح الدین محمد کو سرخیل بنایا گیا۔

عین الملک منصور خاں حبشی

سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے اکابر سلطنت سے ہیں۔ حوالہ داری لشکر رکاب خانہ کے علاوہ وزارت عین الملکی پر مامور تھے۔ اور بادشاہ اور ان کی والدہ کے مزاج میں دخل و رسوخ حاصل تھا۔ چنانچہ جب بادشاہ مرض موت میں مبتلا ہوئے تو ان کے علاج کے بارے میں اطبائے ہند اور اطبائے عراق کے مابین اختلاف پیدا ہوگیا۔ بادشاہ کی والدہ کا خیال تھا کہ اطبائے ہند علاج کریں کیونکہ جو مزاج ہندوستان کی آب و ہوا میں پرورش پاتے ہیں ان کے لئے مناسب ہے کہ ہندوستانی طبیبوں کا علاج کرایا جائے۔

اگرچہ والدۂ بادشاہ کی اس رائے سے اکثر امرائے دربار کو اختلاف تھا لیکن منصور خاں کی تائید کی وجہ سے ہندوستانی اطباء نے علاج کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت منصور خاں کتنے صاحب اقتدار تھے۔

سلطان محمد کے انتقال کے بعد سلطان عبداللہ کو تخت نشین کرانے میں اور پایۂ تخت میں انتظام اور امن و امان قائم رکھنے میں منصور خاں نے بڑا حصہ لیا۔ اس وقت بادشاہ کی کم عمری کی وجہ سے سلطان محمد کی والدہ ہی کاروبار سلطنت میں دخیل تھیں اور انھوں نے زور دے کر منصور خاں کو میر جملہ بنایا۔ نظام الدین احمد مولف حدیقۃ السلاطین چونکہ علامہ ابن خاتون کے طرف داروں میں سے تھے اس لئے انھوں نے اپنی تاریخ میں منصور خاں کی خدمات کے اعتراف میں بخل سے کام لیا ہے اور جگہ جگہ ذم کا پہلو نمایاں کردیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ منصور خاں اور ملک یوسف وغیرہ اس وقت کے ان ملکی امرا اور جاں نثاران سلطنت سے تھے جن کو علامہ ابن خاتون اور دیگر اجنبی امرا اپنے راستے میں حائل سمجھتے تھے اور چونکہ سلطان عبداللہ کی طبیعت بہت کم زور واقع ہوئی تھی اس لئے انھوں نے با اقتدار امرائے عراق کے زیر اثر اپنے قدیم امرا اور خدمت گذاروں کو بہت جلد بے اثر کردیا۔

منصور خاں کی میر جملگی کا پہلا اثر یہ پڑا کہ مرزا روزبہان اصفہانی جن کو صرف دو ماہ قبل سلطان محمد نے خواجہ افضل ترک کو معزول کر کے سرخیل بنایا تھا اپنے عہدے سے معزول ہو گئے۔ منصور خاں نے برہمنوں کو بھی برسرکار کیا کیونکہ نظام الدین احمد مورخ کا بیان ہے کہ خود میر جملہ کو لکھنا نہیں آتا تھا۔ تاہم اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ منصور خاں سپاہیوں پر خوب نظر رکھتے تھے اور انھوں نے اس طبقہ کی حالت کو درست کر دیا اگرچہ غیر ملکیوں کے ساتھ ان کا سلوک اچھا نہ تھا۔

منصور خاں نے وزارت پناہ خواجہ افضل ترک کو پھر سے ایک لاکھ ہون تنخواہ کی جائداد پر سرفراز کر کے امرائے عظام کے طبقہ میں شامل کر دیا منصور خاں نے اس شان و شوکت سے میر جملگی کی خدمت انجام دی کہ دارالسلطنت میں ان کے غلاموں کا بھی رعب بیٹھا ہوا تھا اور بڑے بڑے عہدہ دار بھی ان سے ڈرتے تھے چنانچہ حدیقہ میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ۹ محرم ۱۰۳۷ھ کو دیوان کے ایک حبشی غلام نے میدان دربار میں شب چراغاں کا اہتمام کرتے وقت قاسم بیگ کوتوال کے ساتھ بے ادبی کی لیکن چونکہ میر جملہ کا آدمی تھا قاسم بیگ کچھ نہ کر سکے اور رنجیدہ ہو کر گھر بیٹھ رہے اور منصب کوتوالی سے استعفا دے دیا۔

نظام الدین احمد کا بیان ہے کہ جملۃ الملک منصور خاں قاسم بیگ کوتوال اور شاہ محمد نیز دونوں کو ہٹا کر ملا محمد تقی کو خدمت کوتوالی اور میر سید سوامی کو پیشوائی دلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اول الذکر کو مچھلی پٹن سے اور موخر الذکر کو دہلی سے بلا بھیجا تھا۔ اور دونوں حسب الطلب حیدرآباد پہنچ بھی گئے۔ اور منصور خاں نے کئی بار کوشش کی کہ بارگاہ شاہی میں پیش کر کے منصب کوتوالی دلائیں لیکن بادشاہ پر علامہ ابن خاتون کا اثر پڑنا شروع ہو چکا تھا وہ انجان ہوتے گئے اور آخر کار قاسم بیگ کی جگہ پر ملا محمد تقی کو مقرر کرنے کے بجائے زین بیگ نائب کوتوال کو خدمت کوتوالی پر ترقی دے دی۔ اب جو محمد تقی کو مایوسی ہوئی تو میر جملہ نے اپنی پیشی میں مقرر کر کے میر جملگی کا کام جو کوتوال کے کام سے ارفع ہے ان کے سپرد کر دیا اس طرح ۱۰۳۷ھ میں جبکہ امور دیوانی میں ملا تقی نائب میر جملہ ہو گئے اور ایک سال تک اس خدمت کو انجام دیا۔

آغاز محرم ۱۰۳۸ھ میں منصور خاں نے دو سال سات مہینے اور چند روز میر جملگی کی خدمت انجام دے کر ایکا ایک انتقال کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ منصور خاں کی وفات کے بعد چھ سال دس مہینے تک منصب میر جملگی پر کوئی بھی فائز نہ ہو سکا آخر کار ۹ شوال ۱۰۴۴ھ میں علامہ ابن خاتون نے منصور خاں کی جگہ لی۔ اس اثنا میں منصور خاں کی خدمات کو تین چار اشخاص میں تقسیم کر دیا گیا تھا یعنی ملا محمد تقی سرخیل، آدم خاں عین الملک اور پسر منصور خاں حوالہ دار فوج رکاب خانہ وغیرہ۔

شریف الملک ملا محمد تقی

سلطان محمد قطب شاہ کے دور میں بندر مچھلی پٹن کے حوالہ دار تھے۔ سلطان عبداللہ کے دور میں جب منصور خاں حبشی میر جملہ نے اقتدار تمام حاصل کیا تو ان کا خیال تھا کہ قاسم بیگ کوتوال کی جگہ ملا محمد تقی اس خدمت پر سرفراز ہوں چنانچہ ۱۰۳۲ھ میں ملا محمد کو لکھا کہ پایہ تخت چلے آئیں۔ ملا صاحب خوش ہوئے اور ایک ہاتھی پانچ ہزار ہون نقد اور دیگر تحف و ہدایا کے ساتھ محرم ۱۰۳۶ھ میں حیدرآباد آئے۔ منصور خاں ان کی آمد سے بہت خوش ہوئے اور چاہتے تھے کہ بادشاہ ان کو منصب کوتوالی پر سرفراز کریں چنانچہ تین مہینوں تک برابر دولت خانہ عالی میں ساتھ لیجاتے رہے اور ایک دفعہ تو زر نقد ہاتھی اور دیگر تحفے بادشاہ کی خدمت میں پیش بھی کر دئے مگر بادشاہ نے ملا تقی کو باریاب نہ کیا بادشاہ یہ چاہتے تھے کہ ملا تقی بجائے کوتوالی کے منصور خاں کے قائم مقام بن کر منصب سرخیلی انجام دیں اور اسی لئے وہ ٹال رہے تھے تا کہ کوتوالی کا مستقل انتظام ہوئے تو ملا محمد تقی کو

باریاب کرکے سرخیلی بنادوں آخرکار ۱۰ ربیع الاول ۱۰۳۶ھ کو بادشاہ نے حسن بیگ نائب کیتوال کو حیدرآباد کی کوتوالی کل پر سرفراز کردیا۔

اب منصورخاں بڑے پریشان ہوے لیکن انھوں نے ملا محمد تقی کو اپنے ہی ساتھ رکھ کر میرجملگی کے جملہ مہمات کو ان کے سپرد کردیا اس طرح ملا محمد تقی کوتوالی سے زیادہ اہم اور بڑے عہدہ کا کام انجام دینے لگے۔ انھوں نے ایک سال تک منصورخاں کے نائب کی طرح دیوانی کی خدمات اور میرجملگی کے جملہ امور انجام دئے بادشاہ بھی یہی چاہتے تھے۔

محرم ۱۰۳۸ھ میں منصورخاں نے یکایک انتقال کیا تو ان کی جگہ کے لئے بہت سے امرا نے کوشش کی اور نذرانے پیش کرنے شروع کئے لیکن ملا محمد تقی پہلے ہی سے امور دیوانی انجام دئے رہتے تھے، منصورخاں نے بھی کئی بار ان کے کام کی تعریف کی تھی اور بادشاہ پر ان کی کاردانی کا سکہ بیٹھا چکا تھا اس کے علاوہ اس دفعہ ملا نے دوسروں کے نذرانوں سے زیادہ پیش کش دیا اس لئے بادشاہ نے انہی کو پسند کیا اور ۲۳ صفر ۱۰۳۸ھ کو منصب جلیل القدر سرخیلی پر سرفراز کیا۔ اس موقع پر دوسرے شاعروں کی طرح ملا نظام الدین احمد مولف حدیقۃ نے بھی ایک قطعہ تاریخ ملا کی خدمت میں پیش کیا تھا جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

خسرو یوسف رخ جمشید جاہ   شاہ عبداللہ شاہ کامیاب

مولوی را بہر سرخیلی نمود   ازمیانِ جملہ اعیاں انتخاب

تربیت بنمود اورا ہمچو مہر   تاکہ شد یاقوت ساں باآب وتاب

عقل بہر منصبش تاریخ گفت   دائماً سرخیل بادا کامیاب

سرخیل ہونے کے بعد ملا تقی نے بادشاہ کے مزاج سے کافی واقفیت پیدا کرلی اور جملہ مہمات دیوانی اور کل معاملات سلطانی پر ایسا قبضہ کرلیا کہ دوسروں کو دخل دینے کا موقع نہ دیا، خاص کر برہمنوں کے لئے رعایا پر ظلم وستم کرنے کا موقع نہ رہا۔ اور محاصل کی رقمیں اچھی طرح داخل خزانہ ہونے لگیں۔ چنانچہ صرف نارائن راؤ مجموعہ دار سے ایک سو تیس ہزار ہون وصول کرکے داخل خزانہ کئے گئے اور جو چودہری اور صاحبانِ جائداد منافق مغرور اور ظالم ہوگئے تھے ان کو قتل کرکے ان کی جائداد اور ذخیروں پر شاہی قبضہ کرادیا۔

ان خدمات کے صلہ میں بادشاہ نے ملا کو شریف الملک کا خطاب عطا کیا اور وہ قلمدان مرصع جو مرزا محمد امین میرجملہ کے بعد سے کسی کو مرحمت نہیں کیا گیا تھا ملا شریف الملک کو عنایت کیا گیا۔ اس اثنا میں مغلوں کے حملہ دکن کی خبریں مشہور ہونے لگی تھیں اس لئے سلطان نے شریف الملک کو پچاس ہزار ہون کی جاگیر دی تاکہ ایک لشکر تیار رکھے اور فیل خانۂ خاص سے چند مست ہاتھی بھی عنایت کئے۔ اس طرح سرخیلی اور سرداری ایک ہی جگہ جمع ہوگئی۔ ملا نے بہت جلد دکنیوں، عربوں اور پٹھانوں کی ایک فوج تیار کرلی اور میدان دلکشائے دادمحل میں لاکر بادشاہ کو دکھادی۔ بادشاہ بہت خوش ہوے اور ملا کے مدارج میں اور بھی اضافہ کردیا۔ اس طرح شریف الملک کی عزت و وقعت اور اثر ورسوخ اور بھی بڑھ گیا۔

جب شریف الملک کی ذات میں دو عہدے یعنے سرداری اور سرخیلی جمع ہوگئے تو مہمات دیوانی اور ضبط ربط امور مملکت کے ساتھ ساتھ شہسواری اور سپہ گری کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی۔ چنانچہ وہ روزانہ شام کا وقت ندی محل کے برابر رودِ موسیٰ کے کنارے وسیع میدان میں کمان داری اور چوگان بازی میں گذارتے تھے۔ ایک وقت گھوڑے پر سے گرے اور چوٹ کھائی لیکن تکلیف میں کچھ کمی ہوئی تھی کہ آخر شعبان ۱۰۴۰ھ میں

گولکنڈے کے سپہ سالار

موسی خاں

دیانت خاں

علی باغ میں جشن رمضان میں شرکت کی اور غذا میں بے احتیاطی کی وجہ سے ہیضہ و اسہال کا مرض لاحق ہوگیا اور اسی حالت بیماری میں رمضان بھر صبح و شام بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اس حاضری میں اور مسلسل تعرض رہنے کی وجہ سے طبیعت اور بگڑتی گئی آخر کار رمضان کی عید کے دن جب بادشاہ نے دربار کیا اور ملا شریف الملک عصر تک برابر کھڑے ہو کر لشکر اور رعایا کے معروضے پیش کرتے رہے تو طبیعت بالکل بگڑ گئی اور اس روز کے بعد دربار کو آنا نصیب نہ ہوا، حکیم اسمٰعیل گیلانی اور دیگر ہندوستانی طبیبوں نے علاج کیا بادشاہ نے اپنے غلام حسن علی خاں کو پرسش احوال کے لئے بھیجا اور آخر میں اپنے خاص طبیبوں کو بھی علاج کرنے کے لئے حکم دیا لیکن پیمانۂ حیات پر ہو چکا تھا ملا محمد تقی شریف الملک نے ۱۹ شوال ۱۰۴۱ھ میں انتقال کیا

انھوں نے دو سال آٹھ ماہ بڑے کر و فر اور اعزاز و اقتدار کے ساتھ حکومت کی اور بادشاہ کی خیر خواہی اور آداب بجا لانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ان کے انتقال کا بادشاہ کو بھی صدمہ ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ملا شریف الملک کو اولاد نہ تھی کیونکہ بادشاہ نے ان کی بیوہ اعزا اور ہم شہریوں کے حال پر خاص نوازشیں کیں اور ان کو پورے سامان کے ساتھ عراق جانے کی اجازت دی

ابن خاتون

شیخ محمد نام، ابن خاتون عرف طوسی عاملی کے بیٹے اور شیخ بہائی کے بھانجے تھے سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے علما میں سے ہیں ان کے علم فضل کی وجہ سے بادشاہ نے ان کو منشی الملک اور دبیر سلطنت بنا کر بارگاہ سلطانی کے مقربان خاص میں شامل کر لیا تھا جب سلطان محمد قلی کی وفات کے بعد شاہ عباس صفوی کا سفیر حسین بیگ قبچاچی حیدرآباد آیا تو اس کی واپسی کے وقت بادشاہ نے ۱۰۲۴ھ میں علامہ شیخ محمد ابن خاتون کو پیش بہا تحفے دے کر اس کے ساتھ ایران کو روانہ کیا جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور وہ تقریباً دس سال مقیم رہے اور جب واپس آنے لگے تو شاہ ایران نے ان کے ساتھ قاسم بیگ سپہ سالار مازندران کو روانہ کیا وہ ۱۰۳۵ھ میں اس وقت حیدرآباد واپس ہوئے جب کہ سلطان محمد قطب شاہ کا انتقال ہو چکا تھا سلطان عبداللہ نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور اپنے پیشوا شاہ محمد ولد شاہ علی عرف شاہ میرزادہ پیشوائے سلطنت کا نائب مقرر کیا۔ اور پیشوا کی طرح ان کو بھی اپنی مجلس میں بیٹھنے کی اجازت دی چونکہ یہ خدمت منفک تھی اس لئے بادشاہ نے محمد رضا استرآبادی سے منصب دبیر سے کر دوبارہ ابن خاتون کو دبیر سلطنت بھی بنا دیا۔

ان دو خدمات جلیلہ کی وجہ سے ابن خاتون کی عزت و احترام میں بہت اضافہ ہوگیا اور انھوں نے دربار کے معاملوں میں دخل پا کر اپنے توسط سے بہت سے لوگوں کو نوجوان بادشاہ کے مراحم خسروانہ سے فائدہ پہونچایا اس بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر شاہ محمد پیشوا ان سے کھٹکنے لگے اور دربار میں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں ہونی شروع ہوئیں آخر کار جب ۱۰۴۳ھ میں شاہ جہاں کا ایلچی شیخ محی الدین حیدرآباد آیا تو بعض باتیں ایسی ہوئیں کہ بادشاہ شاہ محمد پیشوا سے بالکل ناراض ہوگئے اور ان کو معزول کرکے ۹ رمضان ۱۰۴۳ھ میں ابن خاتون کو پیشوائی کل سے سرفراز کیا اس خوشی میں ابن خاتون کے طرفدار علما، و فضلا، اور شعرا نے مبارکباد کے قصائد اور قطعے لکھے جن میں سے ایک قطعہ حدیقۃ السلاطین کے مصنف نے لکھا تھا جو درج ذیل ہے ؎

شہ یوسف رخ و جمشید حشمت	کہ حاتم می کند از وے گدائی
ز فرط مرحمت کردہ ممکن	محمدؐ را بصدر پیشوائی
بساماں شد مہام ملک و ملت	کہ بود ابترز آفات سمائی
متاع فضل و دانش بود کاسد	کنوں بگرفت در عہدش روائی
جہاں معمور گردیدہ بدانساں	کہ شد محو از خلائق بے نوائی
بالہام آمد ایں مصراع تاریخ	محمد یافت از حق پیشوائی

پیشوا ہونے کے بعد ہی علامہ ابن خاتون نے شیخ محی الدین ایلچی شاہ جہاں کو واپس کر دیا اور کچھ ایسی ترکیب کی کہ وہ شاہ جہاں کے پاس معتوب قرار پایا۔

ابن خاتون اگرچہ بہت صاحب ثروت تھے اور نواب علامہ کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے لیکن ساتھ ہی مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف بھی جاری تھی بے حد علم دوست تھے اور روز اُن کے مدرسہ میں بڑے بڑے علما و فضلا جمع ہوتے اور علوم معقول و منقول پر مباحثے اور مذاکرے کیا کرتے۔ ہر منگل کو جو قطب شاہی سلطنت میں چھٹی کا دن ہوتا ان کے یہاں شعرا جمع ہوا کرتے اور شعرائے متقدمین کے کلام کے مذاکرہ کے علاوہ طرحی غزلوں کا مشاعرہ بھی کرتے تھے۔

ابن خاتون خود بھی بہت بڑے مصنف تھے شرح ارشاد، ترجمہ کتاب اربعین، حاشیہ جامع عباسی ان کی تصانیف ہیں جامع عباسی کی تکمیل بھی انہی نے کی تھی۔ یہہ اپنے عہدہ کے لحاظ سے جملہ مذہبی امور کے بھی ذمہ دار تھے۔ چنانچہ جب سنہ ۱۰۴۰ھ میں حیدرآباد میں برا زبردست قحط ہوا تو شہر کے تمام علما و فضلا و اتقیا سہ روزہ روزہ رکھ جمعہ کی صبح میں پا برہنہ علامہ ابن خاتون کے یہاں پہونچے اور ان کے ساتھ نماز استسقاء کے لئے شہر سے باہر نکل کر موسیٰ ندی کے کنارے جمع ہوے اور بعد نماز دعا پڑھی۔ آخر میں ابن خاتون نے صدر مجلس میں بیٹھ کر اشرفیوں کی سفید اور لال تھلیاں بادشاہ کی طرف سے تمام مستحقوں میں تقسیم کیں اور ہاتھیوں اور اونٹوں پر جو پیسے بادشاہ نے خیرات کے لئے روانہ کئے تھے وہ بھی تقسیم کر دئے بعد میں بادشاہ کی افزونی عمر کی دعا کر کے شہر کو مراجعت کی۔

اس عزت و احترام کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ ابن خاتون کے مخالفین برابر کام کر رہے تھے چنانچہ جب بیجاپوری لوگ حیدرآباد آئے تھے تو ابن خاتون کا اثر کم ہو گیا اور ۱۳ر جمادی الاخر سنہ ۱۰۴۲ھ کو یہہ اپنی خدمت سے معزول کر دئے گئے اور میر محمد رضا استرآبادی پیشوا مقرر ہوئے اس زمانے میں ابن خاتون خانہ نشین ہو گئے لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد جب شہزادی کی پالکی بیجاپور روانہ ہوئی تو عبداللہ قطب شاہ پھر علامہ کی طرف متوجہ ہوئے اور جو کدورت پیدا ہوئی تھی دور ہو گئی چنانچہ اپنے ایک مقرب خاص کو طلائی پاندان دے کر علامہ کے یہاں روانہ کیا اور چند روز کے بعد خود ان کو طلب کر کے نوازش خاص کا اظہار کیا اور صدر الشریعت صدر جہاں کی جگہ ان کے بیٹھنے کے لئے معین کی اور سلطنت کے جملہ امور کے متعلق پہلے سے زیادہ مشورہ لینا شروع کیا۔ آخر کار ابن خاتون کو ۹ر شوال سنہ ۱۰۴۳ھ کو جملۃ الملکی کا خلعت حاصل ہوا۔

(باقی آئندہ)

سید محی الدین قادری زور

ابن نشاطی — شاعر گولکنڈہ

محمد سعید میر جملہ گولکنڈہ

گولکنڈے کے صوفیائے کرام

سید شاہ راجو

شاہ میر محمود

تاناشاہ کے ہندو دیوان

مادنا پنتلو اور اکنا پنتلو کے بارے میں مستند فارسی کتب میں کوئی مواد نہیں البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابوالحسن تاناشاہ کے وزرا تھے۔ کوئی فارسی تاریخ ایسی نہیں ہے جو ان کو بدکردار اور جہنمی نہ لکھتی ہو۔ تعجب کا مقام ہے کہ ان کی کسی کتاب میں بھی ان کی بدکرداری کا کہیں ذکر نہیں جس سے ان مورخوں کی رائے کی تائید ہوسکے۔ یورپی کمپنیوں کے مکاتیب سے ان کی زندگی پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ان کی رائے اس وجہ سے قطعی تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ یہ فریق متعلقہ تھی اور خود غرض بھی۔ مقامی روایات، قصے، کہانیاں ہی بس وہ ماخذ ہیں جن سے ہم کچھ مستفید ہوسکتے ہیں۔ ان واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان وزرا کی زندگی کا مختصر تذکرہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے اور حتی المقدور اس امر کی کوشش کی جائے گی کہ ان کی زندگی کا کوئی ایسا پہلو پیش نہ کیا جائے جو موجودہ مواد کی بنا پر مابہ النزاع بن سکے۔

دیوان مادنا

اکنا اور مادنا بنگل بھانو جی پنتلو کے فرزندان نیک بخت تھے۔ بھانو جی پنتلو ہنمکنڈہ کا عامل یا عہدہ دار تھا۔ اس نے اپنے چاروں بیٹوں کی عمدہ تعلیم و تربیت کا انتظام کیا تھا۔ اکنا اور مادنا تحصیل تعلیم کے بعد عبداللہ قطب شاہ کے درمیانی عہد سلطنت میں حیدرآباد آئے۔ مرزا سید احمد نے ان کو اپنے صیغۂ حساب میں ملازم رکھا تھا۔ اور حالات کی ناموافقت کے باوجود وہ اپنی ان تھک محنتوں کی وجہ سے درجہ بدرجہ ترقی کرتے گئے اور ۱۶۶۶ء کے بعد مادنا سید مظفر سپہ سالار عبداللہ قطب شاہ کا پیشکار مقرر ہوا۔ اس طرح جب اس کو قلمدان وزارت سپرد کیا گیا تو یہ اس کے وسیع تجربوں کی بنا پر تھا نہ کہ کسی اور ذریعہ کے تحت۔

(۱) ۱۶۷۲ء کے انقلاب میں مادنا نے سید مظفر سے کسی طرح کم حصہ نہ لیا تھا۔ سید مظفر اور موسیٰ خان علی الترتیب میر جملہ اور سرخیل مقرر ہوئے اور مادنا میر جملہ کا پیشکار مقرر ہوا۔ سید مظفر کی حرص اقتدار نے اسے ایک ایسی مصلحت اختیار کرنے کی ترغیب دی جس کے تحت بادشاہ حکومت کا برائے نام صدر رہ جاتا ہے۔ سید مظفر اہم معاملات میں بھی بادشاہ کا مشورہ نہیں لیتا تھا جس سے علانیہ مخالفت کی بو آتی تھی۔ ابوالحسن جیسے عاقل اور بردبار حکمران سے یہ حرکت کب برداشت ہوسکتی تھی۔ لیکن وہ کھلم کھلا اس کو بے دخل کر دینے پر بھی آمادہ نہ تھا اس لئے اس نے اکنا اور مادنا دونوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور ان کے ذریعہ سید مظفر کے متعلقین اور فوج کے عہدہ داروں کو ہموار بنا کر ۱۶۷۴ء میں بے خبری سے دربار میں سید مظفر کی نازیبا حرکتوں کا راز فاش کر دیا اور اس سے قلمدان وزارت لے کر مادنا کے سپرد کر دیا۔ اس طرح وہ اپنی قابلیت، وفاداری اور تجربے کی بنا پر عہدۂ وزارت عظمیٰ پر فائز ہوا۔ اور دربار شاہی سے سوریا پرکاش راؤ کا خطاب اور خلعت پایا۔ اکنا اپنے بھائی کا پیشکار رہا۔ اب ہم کو ان کی حکومت کے تین پہلوؤں سے واقف ہونا ہے۔ (۱) اندرونی مصلحت (۲) خارجی حکمت عملی (۳) فوجی تنظیم۔

اول الذکر کے بارے میں ان کے اصول حکومت کے متعلق کوئی تفصیلی معلومات اب تک فراہم نہ ہوسکیں تاہم موجودہ قلیل معلومات کی بدولت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے پیشرؤں کی حکومت کے برعکس ان کے طریقۂ کار سے ملک میں باضابطگی و امن قائم ہوسکا۔ تجارت، کان کنی، جہاز رانی اور زراعت میں بہت ترقی ہوئی البتہ گولکنڈہ کے کرناٹکی مقبوضات میں جو بعد میں حاصل کئے گئے تھے نظم و نسق قائم کرنے کا موقع نہیں رہا۔ قبل اس کے ہم کوئی قطعی رائے پیش کریں ہمارا اخلاقی فرض یہ ہوگا کہ ہم ملک کے ان حالات پر غور کریں جن کی وجہ سے ملک کو ناگفتہ بہ مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اورنگ زیب کی حکمت عملی کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ گولکنڈہ کو کس قدر

صدر دیوان گولکنڈہ

قریب بنایا جائے کہ حکومت کا نظام درہم برہم ہو جائے اور فوج منحرف ہو جائے۔ اس غرض سے انھوں نے آئے دن مطالبات میں اضافہ کرنا شروع کیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بادشاہ اپنے خانگی اور حرم کے جواہرات فروخت کر کے مطالبات پورے کرتے تھے۔ ملک و مالک کی تباہی سے مادنا کی حکومت کے بنیادی اصول کا ایک پہلو مسئلہ تخفیف میں ظاہر ہوا تو دوسرا عدیم المثال ضبط و تنظیم میں۔ گولکنڈہ کی تاریخ میں یہ دونوں بہت اہم اور نئی باتیں ہیں۔ تمام امراء عہدہ داروں کی تنخواہوں میں تخفیف کی گئی۔ اعلیٰ اور ادنیٰ تمام عہدہ دار اس قانون کی پابندی کرنے پر مجبور کئے گئے اور یہی وجہ ہوئی کہ تمام لوگ وزیر کے مخالف ہو گئے۔ مادنا کی غیر ہر دلعزیزی کا یہ ایک اہم اور بنیادی سبب ہے۔ اس واقعہ میں مادنا سے زیادہ وہ عہدہ دار قابل الزام ٹھیرتے ہیں جو اپنی تنخواہ کا ایک قلیل حصہ حکومت کو دینے کے لئے تیار نہیں تھے اور ایک واویلا مچا کر حکومت کو کمزور بنا دیا۔ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مادنا کی عزت عوام میں زیادہ تھی ۱۶۸۶ء تک وزیر اعظم نے تین مرتبہ پورے ملک کا دورہ کیا ہے۔

دوسرا پہلو خارجی مصلحت کا ہے۔ دکنی آزاد سلطنتیں ذاتی تحفظ کیلئے مغلوں کے مقابلہ میں ایک دوسرے کی مدد کرتی تھیں چنانچہ عبداللہ قطب شاہ نے مرزا راجہ جے سنگھ کے خلاف علی عادل شاہ ثانی کی مدد کے لئے نیک نام خاں کے تحت بارہ ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادوں کی ایک جرار فوج روانہ کی۔ مادنا و ابوالحسن نے اس مصلحت کو برقرار رکھا اور مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے لئے ایک قومی محاذ بنا لیا۔ یہ اس کا انتہائی مدبرانہ سیاست دانی ہے کہ اس نے سیواجی کے ہاتھوں کو دوستی اور اخوت کے رشتے سے باندھ دیا اور اس طرح سلطنت گولکنڈہ سیواجی کی تاخت و تاراجی سے بچی رہی۔ اس دور اندیشی کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ اس نے قلعہ جات ونگل کنڈہ پلی، کنڈہ ویر کو مستحکم کیا اور ہر ایک کی حفاظت کے لئے بارہ ہزار سپاہیوں کو متعین کر دیا۔ بیجاپور میں اپنے بھائی اکنا کو کیپٹن حاجب اس لئے مقرر کیا تھا کہ وہاں کی خارجی مصلحت کی رہبری کرے۔ مادنا نے ابوالحسن کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ قلعہ گولکنڈہ میں محصور نہ ہو جائے بلکہ کسی دوسرے قلعہ میں جائے اور بصورت ضرورت گولکنڈہ کو فوجی امداد روانہ کرے لیکن چونکہ شیخ منہاج کے مشورے کا زیادہ اثر تھا اس لئے اس مشورہ پر عمل نہیں کیا گیا۔ "مادنا اور اکنا منصب کے لالچ میں ابوالحسن کو اورنگ زیب کے ہاتھوں فروخت کرنا چاہتے تھے" یہ الزام تاریخ کے کسی طالب علم کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔ یہ دونوں بھائی اورنگ زیب اور ابوالحسن سے خوبی واقف تھے۔ فوجی تنظیم کے بارے میں بجائے اس کے کہ ہم اپنی رائے کا اظہار کریں مناسب ہوگا کہ واقعات کا اظہار کر دیا جائے جس سے ناظرین کو خود رائے قائم کرنے کا موقع مل سکے۔ ۱۶۵۶ء میں گولکنڈہ کی فوج، دکن کے مغل صوبہ دار کے لشکر کا مقابلہ ایک دن بھی نہ کر سکی اور قلعہ گولکنڈہ مغل گولہ باری کی تاب نہ لا سکا۔ لیکن ۱۶۸۵ء اور ۱۶۸۶ء میں شہنشاہیت کی ساری قوت ملکھیڑ کے میدان میں تین مہینے تک روکی گئی اور تمام تاریخیں گولکنڈہ کی فوج کی بہادری کے کارناموں سے بھری پڑی ہیں۔ اگر محمد ابراہیم باغی نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ مغلوں کو ملکھیڑ کے میدان میں ایسی شکست فاش ہوتی کہ مغل پھر ادھر کا رخ نہ کرتے۔ محاصرۂ گولکنڈہ سے ہر شخص واقف ہے۔ ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ناظرین اپنی ذاتی رائے قائم کر سکتے ہیں۔

مادنا پر ظالم اور متعصب ہونے کا جو الزام لگایا گیا ہے وہ شہنشاہی اغراض کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ گولکنڈہ پر حملہ کرنے کا ایک حیلہ ہے۔ علاوہ اس پر یہ واقعہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قتل مادنا سے قبل مسعود خاں اور شرزہ خاں کے بارے میں بیجاپور میں یہی مصلحت اختیار کی گئی تھی۔ مختصر یہ کہ ۱۶۸۶ء میں اعیان سلطنت نے سازش کی اور ان کو قتل کرا دیا۔ جمشید نامی ایک غلام نے چند اور دوسرے غلاموں کے ساتھ ان کے سر تن سے جدا کر دئے۔ شہزادہ شاہ عالم بہادر کے پاس روانہ کئے۔ حرم سے سروا اور جانی بی بی نے اس سازش میں زیادہ حصہ لیا ہے۔

شہزادہ نے ان کے سروں کو بہادر خان کے ذریعہ شولاپور میں اورنگ زیب کے پاس روانہ کیا جہاں وہ ہاتھی کے پیروں تلے روندے گئے۔

اکنا پیشکار

یہ مادنا کا بڑا بھائی تھا۔ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص غیر مہذب ' منہ پھٹ اور صاف گو تھا۔ مادنا کے وزیر اعظم بننے کے بعد یہ ان کا پیشکار مقرر ہوا۔ اور پھر قطب شاہی کرناٹک کا صوبہ دار بنا صوبہ داری کے عہدے سے سرلشکری پر ترقی پائی۔ عہد نامہ بیجاپور کے بعد وہاں کا حاجب مقرر ہوا ۱۶۸۶ء میں بیجاپور سے واپس ہوا اور ۱۶۸۶ء میں مادنا کے ساتھ قتل کردیا گیا۔

اس نے کرناٹک اور مشرقی ' کا دو مرتبہ دورہ کیا۔ بندرگاہوں کے انتظام میں نہایت بے مروتی سے کام لیا اور اس طرح گولکنڈہ کی آمدنی میں اضافہ کیا۔ فوج کی تنظیم میں اس کا بہت حصہ ہے اس کے دو بھانجوں رستم راؤ اور پودلی لنگنّا نے بادشاہ کی کئی اہم خدمات انجام دیں۔ خافی خاں رستم راؤ کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے کہ وہ صاحب السیف والقلم تھے پودلی لنگنّا نے انگریزوں کو سربلند ہونے نہ دیا اور بار بار زک دے کر گولکنڈہ میں انہیں برسر اقتدار ہونے سے روکتا رہا اس کے مدد و معاون اس کے دونوں ماموں تھے جو ہر طریقے سے اس کی اس کام میں مدد کرتے تھے۔ اکنا کے ایک خط میں انگریزوں کو بدین الفاظ تنبیہ کی گئی کہ وہ پودلی لنگنّا کے اقتدار کو تسلیم کریں۔ اس کے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈہ کی بحری تجارت بھی تھی۔ اور خود ان بھائیوں کے تجارتی جہاز تھے ہیاورٹ نامی ولندیزی رسالے میں ان کو مغرور اور شریر النفس بیان کیا گیا مگر اس کی تائید کسی اور تاریخ سے نہیں ہوتی۔ موجودہ معلومات کی بنا پر ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ان کی طبیعت میں روکھا پن زیادہ تھا۔

بہرکیف دونوں بھائیوں نے ملک و مالک کی بے لوث خدمت کی ہے لیکن ان کی محنت کا انہیں معاوضہ نہیں ملا۔ انہیں حکومت کو ایسی ناگفتہ بہ حالت میں چلانا پڑا جس میں کامیابی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تاہم چودہ سال تک جس قابلیت سے ان بھائیوں نے ملک کے اس ٹمٹماتے دیئے کو گل ہونے سے روکا ہے وہ قابل تحسین ہے بہت ممکن ہے کہ مارخ دان اس حقیقت کے اظہار کی طرف متوجہ ہوکر ان الزامات کو غلط ثابت کردیں گے۔ علاوہ زمانہ بتادے گا کہ ملک و مالک کے بہی خواہ کبھی نہ کبھی اپنی حقیقی قدر و منزلت حاصل کرکے رہیں گے۔

کے ' وی بھوپال راؤ

عبدالرزاق لاری گولکنڈہ کے دروازے پر

اک شیر ژیاں ہے کہ کھڑا جھوم رہا ہے
زخموں سے لہو گر کے قدم چوم رہا ہے

تلوار بھی اک ہاتھ میں بل کھائی ہوئی ہے
معلوم نہیں کس کی قضا آئی ہوئی ہے

دروازے میں اک جان ہے اور لاشوں کے انبار
اور سمتِ مقابل میں ہے تلواروں کی جھنکار

معلوم ہے اس کو کہ کوئی ساتھ نہ دے گا
بیٹا کو اٹھانے میں کوئی ہاتھ نہ دے گا

پر اک دلِ لاری ہے کہ جو جانِ وفا ہے
یہہ مطلعِ انوارِ وفا ' کانِ وفا ہے

اکبر وفاقانی

گولکنڈہ کا آخری سپہ سالار، عبدالرزاق لاری زخموں سے بے ہوش ہو کر گرنے سے پہلے

سلطنتِ ابد مدّت آصفجاہی

اور

سلاطینِ آصفی

سلطنت آصفیہ کا قیام تاریخ ہند کا ایک نہایت درخشاں باب ہے۔ اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد کوئی شخصیت نواب نظام الملک سے زیادہ نمایاں نہ تھی جو منتشر قوتوں کو یکجا کر کے مرکزیت پیدا کرنے اور ایک بڑی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ چنانچہ نواب نظام الملک نے اول تو سلطنت مغلیہ کے بقا، اس کی اصلاح اور استحکام کے لئے ممکنہ کوشش کی لیکن جب اس میں کامیابی کی صورت نظر نہ آئی تو انھوں نے حریفوں کو شکست دے کر سلطنت آصفیہ کی بنیاد ڈالی (سنہ ۱۷۲۴ء) نواب نظام الملک کے بعد جس شخصیت نے سینہ سپر ہو کر مشکلات کا مقابلہ کیا اور سلطنت کے لئے جو خطرات تھے ان کو دور کیا اور سلطنت آصفیہ کی صحیح معنوں میں تعمیر کی وہ بانیٔ سلطنت کے فرزند آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں بہادر تھے۔

قیام سلطنت آصفیہ سے بہت سے فوائد حاصل ہوئے۔ اول تو دکن کی بدنظمی اور بدامنی کا خاتمہ ہو کر امن و امان اور عدل و انصاف کا دور شروع ہوا۔ دوم یہ کہ ملک میں زراعت کی سرسبزی، صنعت و حرفت کی ترقی اور تجارت کی گرم بازاری ہونے لگی۔ بالخصوص شاہان آصفیہ کی شہرۂ آفاق رواداری اور لاثانی حب الوطنی روایتی فیاضی اور عدیم المثال رعایا پروری نے ملک کی خوشحالی میں چار چاند لگا دئے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہان آصفی کی حکومت اپنی ساری رعایا پر نہ صرف منصفانہ رہی۔ بلکہ ہمیشہ مشفقانہ اور پدرانہ رہی ہے۔ انھوں نے قیام امن اور عدل و انصاف تک ہی خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ آثار قدیمہ کی حفاظت اور علم و فن کی سرپرستی میں بڑا حصہ لیا۔ اور جدید قوم ساز سررشتوں کو قائم کر کے رعایا کی مادی، اخلاقی اور تعلیمی ترقی میں دن دونی اور رات چوگنی اضافہ کیا۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ وسط انیسویں صدی ہی سے یعنی سالار جنگ اول کی وزارت کے زمانہ سے ترقی و اصلاح کا دور شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس وقت مبارک عہد عثمانی میں جس تیز رفتاری کے ساتھ دکن میں ہر جہتی ترقی ہو رہی ہے۔ وہ تاریخ ہند میں عدیم المثال ہے۔ حیدرآباد جدید کی تعمیر کے سلسلے میں اعلیٰ حضرت بندگان عالی کا نام رہتی دنیا تک یادگار رہے گا کہ زراعت صنعت و حرفت تجارت تعلیم تعمیرات و حفظان صحت غرض ہر شعبۂ زندگی میں غیر معمولی چہل پہل ہے۔ نتیجہ یہ کہ اب دکن صرف مشرقی تمدن اور قدیم معاشرت ہی کا مرکز نہیں رہا ہے بلکہ اپنے عصری ترقیات کے اعتبار سے حیدرآباد مشرقی اور مغربی تہذیب کا گہوارہ اور قدیم و جدید تمدن کا سنگم بن گیا ہے۔ موجودہ ہمہ جہتی ترقی کی رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل نہیں کہ دور عثمانی میں حیدرآباد مستقبل اس کے بہمنیہ و قطب شاہیہ ماضی سے کہیں شان دار ہوتا جا رہا ہے۔

نواب نظام الملک آصفجاہ اول بانی سلطنت آصفیہ

(۱۶۷۱ء تا ۱۷۴۸ء)

نواب نظام الملک آصفجاہ اول کا خاندانی سلسلہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ تک اور آگے حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے۔ نواب نظام الملک کے دادا عابد خاں عہد شاہجہاں میں ہندوستان آئے تھے اورنگ زیب کے زمانے میں منصب پنج ہزاری۔ و صدارت کل کے عہدہ پر فائز تھے گولکنڈہ کے محاصرہ میں گولے کے زخم سے شہید ہوئے۔

اُن کے فرزند میر شہاب الدین خاں اورنگ زیب کے مشہور امراء میں سے تھے جن کو منصب ہفت ہزاری اور غازی الدین خاں فیروز جنگ کا خطاب عطا ہوا تھا۔ انھیں کے نامور فرزند نواب نظام الملک آصفجاہ اول تھے۔

اُن کا اصلی نام میر قمر الدین تھا اور ولادت ۱۶۷۱ء میں ہوئی تھی۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں "چین قلیچ خاں" کا خطاب اور منصب پنج ہزاری سے سرفراز ہوئے بعد ازاں بیجاپور کی صوبہ داری پر فائز ہوئے تھے۔ غرض اورنگ زیب کی اُن پر خاص عنایت تھی۔ حتیٰ کہ اورنگ زیب نے خاندانی حالات، وجاہت، بہادری، و تدبر کی بناء پر ان کو اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کام بخش کی لڑکی بیاہ دینی چاہی تھی لیکن مصلحت کی بناء پر نظام الملک نے اس کو پسند نہیں کیا۔

فرخ سیر کے زمانہ میں ان کو "نظام الملک بہادر فتح جنگ" کا خطاب ہفت ہزاری منصب اور دکن کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ چنانچہ ۱۷۱۳ء میں وہ بہ حیثیت صوبہ دار دکن اورنگ آباد آگئے تھے۔ لیکن اورنگ زیب کے نااہل جانشینوں کے زمانہ میں جب ملک کی حالت خراب ہوگئی اس وقت نظام الملک کو بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ وہ دکن سے مالوہ کی صوبہ داری پر بھیجے گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سارا ملک بادشاہ گر سیدوں (سید حسین علی اور سید عبداللہ دونوں بھائیوں) کے مظالم سے تنگ آگیا تھا۔ اس وقت سب کی نظریں نظام الملک کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اُس نازک موقع پر نواب نظام الملک نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ مخالفین سے سخت لڑائی ہوئی (جس میں سید دلاور علی خاں اور سید عالم علی خاں نائب صوبہ دار دکن مارے گئے) اس طرح نواب نظام الملک نے بزور شمشیر حیدرآباد اور برار وغیرہ کے علاقوں کو فتح کیا۔ غرض سیدوں کا خاتمہ کرکے نہ صرف محمد شاہ کو انھوں نے نجات دلائی بلکہ سارے ملک پر ایک بڑا احسان کیا۔ محمد شاہ نے اس کے صلہ میں آصفجاہ کا خطاب دے کر ان کو سلطنت دہلی کا وزیر مقرر کیا لیکن دربار کی حالت دیکھ کر انھوں نے اپنے بڑے فرزند غازی الدین خاں کو دہلی میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود حیدرآباد تشریف لائے۔

راستہ میں برار کے قریب ان کو مبارز الدین خاں سے لڑنا پڑا جس میں وہ مارا گیا۔ غرض یہ وہ زمانہ ہے کہ ملک میں فتنہ و فساد کا بازار گرم تھا۔ کوئی مرکزی طاقت موجود نہ تھی جو امن و امان قائم کرسکتی ہو۔ اول تو نواب نظام الملک نے سلطنت مغلیہ کو بچانے کی انتہائی کوشش کی لیکن جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو مجبوراً ۱۷۲۴ء میں سلطنت آصفیہ کی خود مختاری کی بنا رڈالی (یہی وجہ ہے کہ حسب فرمان خسروی ہر سال ۲۹ رجب کو اسی خود مختاری سلطنت آصفیہ کی یادگار میں عام تعطیل دی جاتی ہے)۔ لیکن اس کے باوجود سلطنت دہلی کی خیرخواہی اور وفاداری میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ چنانچہ ۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تو وہ فوراً

نواب میر قمر الدین خان فتح جنگ نظام الملک آصف جاہ اول

نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی

دہلی پہنچ گئے اور وہاں غیر معمولی جرات سے کام لے کر نادر کو لوٹ مار اور قتل عام سے روکا۔

دہلی سے دوبارہ دکن آ کر انھوں نے مرہٹوں کا سدباب کیا اور دریائے تاپتی سے لے کر جنوبی ہند اور کارنا‌ٹک سارے ممالک محروسہ میں امن و اماں قائم کیا۔ اس سے رعایا کو اطمینان نصیب ہوا۔ اس طرح سلطنت آصفیہ کے قیام سے ملک میں معاشی خوشحالی کا آغاز ہوا۔ نظام الملک بڑے رحمدل اور فیاض بادشاہ تھے۔ ان کو ہمیشہ اپنی رعایا کا بڑا خیال رہتا تھا۔ آخرکار ۱۷۴۸ء میں بمقام برہان پور انتقال کیا۔ چنانچہ دولت آباد میں ان کا مقبرہ موجود ہے۔

مختصر یہ کہ نواب نظام الملک نصف اوائل اٹھارویں صدی کے سب سے بڑے قائد، زبردست سپہ سالار اور بہترین مدبر کی حیثیت سے یاد کئے جائیں گے بلکہ موجودہ سلطنت آصفیہ کے بانی ہونے کی وجہ سے تاریخ میں ان کی شخصیت ہمیشہ نمایاں رہے گی

نواب میر نظام علی خان آصفجاہ ثانی

(۱۷۶۱ء تا ۱۸۰۳ء)

نواب نظام الملک کی وفات پر دکن میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا اسی سلسلہ میں انگریزی اور فرانسیسی کمپنیوں کو ریشہ دوانیوں کا خوب موقع ہاتھ آیا۔ ابتدا یہاں پر نظام الملک کے دوسرے فرزند ناصر جنگ نے دو سال تک حکومت کی ان کی شہادت پر نظام الملک کے نواسے مظفر جنگ چند روزہ حکومت کے بعد مارے گئے اس کے بعد امراء نے صلابت جنگ کو تخت نشین کیا جو اور بھائیوں کی بہ نسبت عمر میں بڑے تھے۔ لیکن ان کا زمانہ شروع سے آخر تک ایک کمزور زمانہ تھا۔ جب کہ مرہٹہ اور فرانسیسی دکن پر چھا گئے تھے اور ملک کے انتظامی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ اس لئے امراء کے مشورہ سے محض ملکی مفاد کے مدنظر صلابت جنگ کی علحدگی عمل میں آئی اور نواب آصفجاہ ثانی تخت نشین ہوئے

نواب میر نظام علی خاں بہادر نظام الملک کے چوتھے فرزند تھے اُن کی ولادت ۱۷۳۴ء میں ہوئی تھی بچپن ہی سے وہ بہادر اور فنون سپہ گری سے خوب واقف تھے۔ چونکہ اپنے بھائی صلابت جنگ کے زمانہ میں وہ وزیر رہ چکے تھے اس لئے ان کو سلطنت کے معاملات کا بہت وسیع تجربہ تھا بادشاہ ہوتے ہی انھوں نے کھوئے ہوئے علاقے مرہٹوں سے حاصل کئے اور فرانسیسی اثرات کو دکن سے دور کیا بعد ازاں نہایت دور اندیشی سے کام لے کر انگریزوں سے رابطہ اتحاد قائم کیا۔ اس زمانہ میں ٹیپو سلطان کی قوت بڑھ رہی تھی۔ اس لئے انگریزوں نے آصفجاہ ثانی اور مرہٹوں کو ملا کر "اتحاد ثلاثہ" قائم کیا اور میسور کے خلاف کامیابی حاصل کی اس کے کچھ عرصہ بعد جب مرہٹوں نے چوتھ کے مطالبہ کے سلسلہ میں حیدرآباد پر حملہ کیا تو انگریزی گورنر جنرل سرجان شور نے عدم مداخلت کا بہانہ کر کے مدد دینے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے سرکار نظام کو بمقام کھرڈلا ناکامی ہوئی اور سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

اس پر آصفجاہ ثانی نے انگریزی فوجوں کو برخاست کر کے ان کی جگہ موسیو ریموں کی ماتحتی میں فرانسیسی فوجیں ملازم رکھیں لیکن موسیو ریموں کی موت کے بعد جب انگریزی کمپنی کا مشہور و معروف گورنر جنرل ولزلی ہندوستان آیا تو اس نے نہایت حکمت عملی سے

آصفجاہ ثانی کو پھر اپنی طرف کر کے فرانسیسی فوجوں کو دکن سے برخاست کرا دیا۔

حیدرآباد کے عہد معاونت قبول کرنے کے بعد یہاں سے رقمی اور فوجی امداد حاصل کر کے ولزلی نے میسور کی ریاست پر حملہ کیا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت اور ریاست میسور کے خاتمہ کے بعد کچھ علاقے مثلاً کڑپہ، کرنول اور بلاری وغیرہ حیدرآباد کو برائے نام ملے تھے لیکن فوجی مصارف کے نام سے بہت جلد واپس لے لئے گئے۔

سنہ ۱۸۰۰ء میں آصفجاہ ثانی اور انگریزوں کے درمیان عام اعانت و حفاظت باہم دیگر کا مشہور عہدنامہ ہوا چنانچہ اُس وقت سے آج تک تاج برطانیہ اور ریاست حیدرآباد کے جو خوش گوار تعلقات قائم ہیں وہ اُسی زمانہ کی یادگار ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آصفجاہ ثانی نے انگریزوں سے مستقل تعلقات قائم کر کے سلطنت آصفیہ کے لئے فرانسیسیوں ٹیپو سلطان اور مرہٹوں کے جو زبردست خطرات تھے ان کو رفع کیا اور اندرون ملک سے فسادات کو دور کیا اور امن قائم کیا۔ اس طرح سنہ ۱۷۶۱ء سے سنہ ۱۸۰۳ء تک نہایت کامیابی کے ساتھ انھوں نے حکومت کی اور اپنی حکمت عملی اور دور اندیشی سے نہ صرف سلطنت کی ڈوبتی ناؤ کو بچالیا بلکہ اپنے عہد حکومت میں ممالک محروسہ کا رقبہ وسیع کر کے سلطنت آصفیہ کا وجود ہمیشہ کے لئے مستقل اور مستحکم کر دیا۔ ان وجوہات کی بنا پر اور خصوصاً اٹھارویں صدی کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب کہ ہندوستان میں ہر نقطۂ نظر سے ایک عام انحطاط کا دور چلا آ رہا تھا۔ ہمیں آصفجاہ ثانی کی شخصیت کیا بلحاظ بہادری اور کیا بلحاظ تدبر اپنے ہم عصروں میں سب سے ممتاز نظر آتی ہے۔ اور وہ بجا طور پر سلطنت آصفیہ کے حقیقی معمار سمجھے جا سکتے ہیں۔

نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث

(سنہ ۱۸۰۳ء تا سنہ ۱۸۲۹ء)

نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثانی کے بڑے بیٹے تھے اور ان کا نام میر اکبر علی خاں تھا۔ ان کے اوائل حکومت کا اہم ترین واقعہ مرہٹوں اور انگریزوں کی جنگ ہے۔ چونکہ نواب سکندر جاہ نے اس لڑائی میں ہر طرح سے انگریزوں کی امداد فرمائی تھی اس لئے کامیابی حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے دولت آباد وغیرہ کے علاقے نواب سکندر جاہ کو واپس کر دئے۔ لیکن اُسی زمانہ سے فوجی اور ملکی معاملات میں انگریزوں نے زیادہ دخل دینا شروع کیا۔ چنانچہ میر عالم کے انتقال پر مدار المہام کے تقرر کا مسئلہ پیش ہوا تو رزیڈنٹ وقت کپتان سڈنہم نے بہت کچھ مداخلت کی لیکن سکندر جاہ نے منیر الملک ہی کو اپنی مرضی سے وزیر منتخب کیا البتہ اتنا ضرور ہوا کہ سارے اختیارات پیشکار مہاراجہ چندو لعل کے ہاتھ میں آگئے، (جن کی تائید میں رزیڈنٹ تھا) چنانچہ اس کے بعد تقریباً تیس سال تک ریاست میں چندو لال ہی کا بڑا عمل دخل رہا۔ ریاست کے انتظامی اور فوجی معاملات میں رزیڈنٹ رسل کی پیش قدمی انگریزوں سے مہاراجہ چندو لال کی غیر معمولی ہمدردی اور پامر کمپنی سے سودی قرضہ کا لین دین یہ وہ چیزیں تھیں جس کی وجہ سے ریاست حیدرآباد کی مالی اور انتظامی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ چنانچہ دوسرے رزیڈنٹ مٹکاف نے جائزہ لیتے ہی صاف طور پر یہ کہہ دیا کہ نئی اعانتی فوجیں حیدرآباد کے خزانہ پر بہت بار ہیں اور پامر کمپنی کا جال ایک دوسری مصیبت ہے۔ اس لئے اس نے بعض مفید تجاویز پیش کئے۔ چنانچہ گورنر جنرل وقت مارکوئس آف ہسٹنگز نے پامر کمپنی کا قرضہ تو انگریزی حکومت

نواب میر اکبر علی خان سکندر جاہ آصف جاہ ثالث

نواب میر فرخندہ علی خان ناصر الدولہ آصف جاہ رابع

کی طرف سے ادا کرادیا لیکن شمالی سرکاروں کی جو پیشکش آصفجاہ ثانی کے زمانہ سے جاری تھی وہ اس سلسلہ میں ہمیشہ کے لیے بند کردی۔ اور فوجی بار حسب حال ریاست پر پڑتا رہا۔

مہاراجہ چندولال کے عمل دخل کو دیکھ کر نواب سکندر جاہ نے خود امور سلطنت میں زیادہ حصہ نہیں لیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کے معاملات میں انگریزوں کی مداخلت روز بروز زیادہ بڑھتی گئی۔

نواب سکندر جاہ ایک خدا ترس رحمدل اور نیک بادشاہ تھے۔ ان کو اپنی رعایا کے آرام و آسائش کا بڑا خیال تھا چنانچہ انھوں نے کئی تالاب سڑکیں وغیرہ تعمیر کرائیں۔ غرض رفاہ عام کے بہت سے کام انجام دیے۔ انگریزی اعانتی فوج کے لئے سکندرآباد کا شہر انھیں کی یادگار ہے

نواب ناصر الدولہ آصفجاہ رابع

(سنہ ۱۸۲۹ء تا سنہ ۱۸۵۷ء)

میر فرخندہ علی خاں نواب ناصر الدولہ سکندر جاہ کے صاحبزادے تھے۔ تخت نشین ہونے ہی انھوں نے ملکی انتظامات کو درست کرنے کی کوشش کی۔ ریذیڈنسی کے اثرات کو کم کیا اس سلسلہ میں مہاراجہ چندولال کے استعفا دینے کے بعد کچھ عرصہ تک بغیر کسی مدار المہام کے بذات خود وہ حکومت کے کام کرتے رہے۔ اور پھر کئی مدار المہاموں کو خود ہی مقرر کیا اور معطل علیحدہ کر دیا۔ انگریزوں کے قرضہ کی رقم بڑھتی جا رہی تھی چنانچہ جب ڈلہوزی گورنر جنرل ہو کر ہندوستان آیا تو اس نے سخت تقاضا کیا کہ قرضہ کے معاوضہ اور فوجی اخراجات کے لیے ملک کے بعض اضلاع انگریزوں کے حوالے کیے جائیں۔ اس زمانہ کا رزیڈنٹ جنرل فریزر نہایت منصف مزاج اور ریاست کا خیر خواہ تھا۔ اس طرح کی ناواجبی مداخلت کو پسند نہ کرتے ہوئے خود استعفا دے دیا۔

لیکن ڈلہوزی نے پھر دباؤ ڈالا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد کی اعانتی فوج کے اخراجات اور قرضہ کے سلسلہ میں نواب ناصر الدولہ پر نہایت دباؤ ڈالا گیا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی رو سے رائچور کا دوآبہ اور برار کا علاقہ عارضی طور پر انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا اس واقعہ کا صدمہ مدار المہام سراج الملک پر اتنا اثر ہوا کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ ان کے بھتیجے میر تراب علی خاں سالار جنگ اول مدار المہام مقرر ہوئے جنھوں نے نہ صرف تین بادشاہوں کے زمانہ میں مدار المہامی کی اہم ترین خدمت انجام دی بلکہ حیدرآباد کے بنانے میں شدید سے زیادہ حصہ لیا۔

نواب ناصر الدولہ کے زمانہ ہی سے انھوں نے سیاسی اصلاحات اور معاشی و تعلیمی ترقیات کا کام شروع کر دیا تھا جس کو بعد کے زمانوں [illegible] کے زمانہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ملک کے بعض حصے جو کہ چھوٹے چھوٹے [illegible] رہن تھے سالار جنگ نے ان علاقوں کو چھڑوا لیا اور دوسری اصلاحات کے کام بھی شروع کیے تھے کہ ادھر شمالی ہند میں غدر کی آگ بھڑک پڑی اور ادھر نواب ناصر الدولہ نے رحلت فرمائی۔

نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس

(۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء)

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی اہمیت غیر معمولی ہے کیوں کہ اُس سال شمالی ہند میں غدر ہونے کی وجہ سے دہلی اور میرٹھ سے لے کر وسطِ ہند تک ہر جگہ ہندوستانی فوج نے سرکشی کی تھی۔ غرض وہ وقت انگریزوں کے لئے نہایت درجہ نازک تھا۔ حیدرآباد کے لئے بھی وہ زمانہ کچھ کم اہمیت کا نہ تھا کیونکہ ناصر الدولہ کے انتقال کے بعد یہاں ان کے بڑے صاحبزادے نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ تخت نشین ہوئے تھے۔ انھوں نے نہ صرف ریاست حیدرآباد اور جنوبی ہند میں غدر کی آگ کو پھیلنے سے روکا بلکہ انگریزوں کی ہر طرح سے مدد فرمائی مختصر یہ کہ نواب افضل الدولہ اور ان کے وزیر سالار جنگ نے انگریزوں کی ڈوبتی ناؤ کو بچا لیا۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمہ کے بعد ہندوستان کی حکومت جب راست شاہانِ انگلستان کے ہاتھ آگئی تو نواب افضل الدولہ کی خدمات کے صلہ میں شورا پور اور رائچور کا دوآبہ حیدرآباد کو واپس مل گیا۔

نواب افضل الدولہ کے زمانے سے حیدرآباد جدید کی ابتداء ہوتی ہے۔ اب بھی ایسے سن رسیدہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے نواب افضل الدولہ اور ان کے خیرخواہ اور وفادار وزیر سالار جنگ اول کو اصلاح اور ترقیٔ ملک کے کاموں میں ہمہ تن مصروف دیکھا تھا چنانچہ ان کی زبانی اُس زمانے کے حالات سننے سے اس عہد کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

اسی طرح حیدرآباد میں بہت سی نشانیاں اور کئی عمارتیں ایسی موجود ہیں۔ جیسے افضل گنج۔ افضل گنج کا پل۔ مسجد افضل گنج یا چومحلہ پیالیس وغیرہ جو اسی عہد کی یادگار ہیں۔

نواب افضل الدولہ کا عہد حکومت صرف بارہ سال تک رہا لیکن سچ تو یہ ہے کہ حکومت آصفیہ کے موجودہ نظام حکومت اور انتظامات مملکت کی داغ بیل اُسی عہد میں ڈالی گئی۔ اول تو سارے ملک کی پیمائش کرا کے مالگزاری مقرر کی گئی دوسرے یہ کہ سارے ملک کو چار صوبوں، سترہ ضلعوں اور بہت سے تعلقوں میں تقسیم کر کے صوبہ دار۔ تعلقدار اور تحصیلدار مقرر کئے گئے۔ انتظامی اور مالی اصلاحات کے علاوہ سررشتہ عدالت اور پولیس کی تنظیم عمل میں آئی۔ نیا سکہ جاری ہوا۔ اِس طرح امن وامان اور عدل وانصاف کے سررشتوں کی تنظیم کے بعد قوم ساز سررشتوں کے قیام کی طرف توجہ کی گئی اور رعایا کے آرام وآسائش، علمی اور مادی ترقی کی خاطر سررشتہ جات تعلیم۔ طبابت اور تعمیرات وغیرہ کا قیام عمل میں آیا۔ خاص کر تعلیم کے معاملہ میں دورِ جدید کی تاریخ میں پہلا قدم نواب افضل الدولہ کے عہد میں اٹھایا گیا کہ ایک طرف تو ہر ضلع اور ہر تعلقہ میں مدارس قائم کئے گئے۔ اور دوسری طرف خاص شہر حیدرآباد میں دار العلوم اور مدرسہ عالیہ کا قیام عمل میں آیا۔ جہاں عام طور پر ذریعۂ تعلیم فارسی زبان تھی۔

ذاتی حالات کے اعتبار سے افضل الدولہ بہادر بڑے خدا ترس، بہت نیک، ملنسار اور سادہ مزاج بادشاہ تھے۔ رفاہِ عام کے کاموں میں غیر معمولی دلچسپی لینے کے علاوہ بڑے فیاض اور علم وفن کے بڑے قدر دان تھے۔ تاریخ میں اُن کا اور ان کے وفادار وزیر سالار جنگ اول کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اس رحمدل بادشاہ اور خیرخواہ وزیر نے ریاست حیدرآباد کی اصلاح اور ترقی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور اس طرح حیدرآباد جدید کی تعمیر کا کام آغاز کیا۔ جس کو بعد کے زمانہ میں ترقی ہوتی گئی۔

نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ آصف جاہ خامس

نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس

نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس (۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء)

تاریخ میں ایسی مثالیں شاذ ہی ہوں گی جب کہ ایک نہایت کمسن شہزادہ کو تخت نشین کیا گیا ہو۔ اور پھر بھی حکومت کامیابی سے چلی ہو چنانچہ یہ ایک اہم واقعہ ہے کہ ۱۸۶۹ء میں افضل الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے چہیتے فرزند نواب میر محبوب علی خاں کو تین سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا گیا اور ایک مجلس تولیت قائم ہوئی جس کے اراکین نواب سالار جنگ اول اور نواب شمس الامراء تھے۔ اور انہیں کے سپرد حکومت کے جملہ کاروبار تھے۔

نواب میر محبوب علی خاں کے سن بلوغ کو پہنچنے سے قبل کے چند واقعات نہایت اہم ہیں ایک تو یہ کہ سالار جنگ اول نے واپسی برار کا مسئلہ چھیڑ دیا اور اسی سلسلہ میں خود انگلستان گئے جہاں آپ کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۷۷ء میں اعلیٰ حضرت کو ساتھ لے کر سالار جنگ اول نے دہلی دربار میں شرکت کی۔ اور تیسرا اہم واقعہ خود سالار جنگ کے ۱۸۸۳ء میں انتقال کر جانے کا ہے۔ ایسے وفادار اور مدبر وزیر کسی ملک کی تاریخ میں شاید ہی گذرے ہوں جو اپنے ملک اور مالک کے لئے ہمہ تن وقف ہو گئے ہوں۔ چنانچہ سالار جنگ کو یہ شرف حاصل رہا کہ ناصر الدولہ۔ افضل الدولہ اور نواب میر محبوب علی خاں جیسے تین ہردلعزیز بادشاہوں کے زمانے میں تقریباً تیس سال تک انہوں نے نہایت تدبر اور وفاداری سے ملک اور مالک کے خدمات انجام دے۔ اور سچ تو یہ کہ حیدرآباد جدید کی ترقیوں کی داغ بیل ڈالنے میں بڑا حصہ لیا۔

سالار جنگ نہایت ہردلعزیز تھے ان کی وفات کا صدمہ یوں تو ساری رعایا کو ہوا لیکن سب سے زیادہ اعلیٰ حضرت کو ہوا کیونکہ اعلیٰ حضرت دل سے ان کی قدر کرتے تھے۔ سالار جنگ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سالار جنگ ثانی پھر سر آسمان جاہ سر وقار الامراء اور آخر کار مہاراجہ سرکشن پرشاد یکے بعد دیگرے مدارالمہام مقرر ہوئے۔

اعلیٰ حضرت مرحوم بڑی خوبیوں کے انسان اور بڑے ہردلعزیز بادشاہ تھے سرکار انگریزی سے ان کے زمانہ میں دوستانہ تعلقات میں اضافہ ہوا لارڈ رپن نے پہلی مرتبہ حیدرآباد آکر اس رسم کی ابتدا کی کہ گورنر جنرل کو ضرور حیدرآباد آنا چاہئے۔ چنانچہ اس کے بعد سے ہر وائسرائے اپنی واپسی سے قبل ضرور حیدرآباد آیا کرتے ہیں۔ تاریخ دکن میں مسئلہ برار ایک بھی کوئی دل خوش کن چیز نہ تھی۔ اس پر ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے حیدرآباد آکر برار کے دوامی پٹہ پر مجبوراً اعلیٰ حضرت دستخط لے لئے کہ برار ملکیت تو سرکار نظام کی ہو لیکن اس پر قبضہ ہمیشہ کے لئے سرکار انگریزی کا رہے۔ اور اس کے لئے سالانہ ۲۵ لاکھ کی پیشکش سرکار نظام کو دی جایا کرے۔ چنانچہ یہ رقم اب تک ہر سال وصول ہوتی ہے۔

اعلیٰ حضرت مرحوم کا زمانہ جدید ترقیات کے آغاز کا ہے۔ اس دور میں نہ صرف بہت سی عمارتیں تعمیر ہوئیں جیسے زنانی شفاخانہ، محبوبیہ ٹاؤن ہال وغیرہ بلکہ بہت سی سیاسی اصلاحیں عمل میں آئیں۔ مثلاً سکہ محبوبیہ جاری ہوا۔ کیبنٹ کونسل اور لیجسلیٹو کونسل کا قیام عمل میں آیا۔

۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی کی طغیانی حیدرآباد کے لئے ایک زبردست سانحہ تھا۔ اس وقت اعلیٰ حضرت نے جس طرح رعایا کی مدد فرمائی وہ عدیم المثال ہے۔

غرض اعلیٰ حضرت نہ صرف شاعر اور بڑے شاعر و عالم اور قدر دان علم و فن تھے بلکہ غیر معمولی خوبیوں کے چرچے نہ صرف ریاست حیدرآباد میں بلکہ دور دراز ملکوں تک پہنچے ہوئے تھے۔

۱۹۱۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ملک پر ان کے احسانات اس قدر ہیں کہ حیدرآباد اپنے محبوب بادشاہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

میر محمود علی

باغِ عام

اور مدح حضرت آصف سابع خلد اللہ

کیا حسین ہے صورتِ گلفام باغِ عام کی
آنکھ ہو اور شکلِ دل آرام باغِ عام کی

صبح اس گلزار کی آئینۂ رخسارِ حور
شانۂ گیسوئے لیلیٰ شام باغِ عام کی

دیگر

نرگسِ شہلا میں عشوے چشمِ آہوئے شام کے
سنبلِ پیچاں میں گھونگر زلفِ غنچہ فام کے

بارک اللہ حسن قدرِ پانی کے چشمے میں بہار
سب میں آئینے جمالِ روئے باغِ عام کے

دیگر

روئے گل پر کاکلِ سنبل ہی بل کھائی ہوئی
برگِ گل میں لعلِ لب کی ہی جھلک آئی ہوئی

وہ ہے باغِ عام پہ جوبن کہ انساں کیا جلیل
بنکے چشمِ شوق نرگس بھی تماشائی ہوئی

دیگر

آج باغِ عام سے ہی اور ہی شانِ دکن
ہر کلی اس بوستاں کی ہے گلستانِ دکن

پتی پتی نے لکھا ہے کلکِ قدرت سے جلیل
شاہِ عثماں آصفِ سابع سلیمانِ دکن

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

حیدر یار خان ظفر جنگ صمصام الدولہ صمصام الملک

درگاہ قلی خان سالار جنگ موتمن الدولہ خان دوران

وزرائے آصفی

شیر جنگ تولد ۱۱۱۳ھ وفات ۱۱۸۹ھ

خاندان سالار جنگ کے مورث اعلیٰ شیر الدولہ شیر الملک شیر جنگ حیدر یار خان ہیں جو حضرت اویس قرنی کی اولاد تھے۔ اویس قرنی تاریخ اسلام میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ آنحضرت کے زمانہ میں موجود تھے۔ حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کے ہمراہ جنگ صفین میں حاضر تھے اور اسی جنگ میں جام شہادت پیا۔ اویس قرنی کی اولاد سے اویس ثالث اپنے لڑکے محمد علی کے ہمراہ مدینہ منورہ سے دکن آئے اور بیجاپور پہونچے۔ یہاں اس زمانہ میں علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ) حکمران تھا۔ بادشاہ نے آپ کی بڑی عزت کی اور آپ کے فرزند محمد علی کی شادی ملا احمد نائطی کی دختر سے کردی گئی اور "صدر سلطانی" کا عہدہ بھی دیا گیا

علی عادل شاہ کے بعد شیخ محمد علی کے دونوں فرزند محمد باقر اور محمد حیدر دربار مغلیہ سے متعلق ہوگئے۔ عالمگیر اورنگ زیب نے دو ہزاری منصب سے سرفراز کیا محمد باقر کے فرزند محمد تقی بھی عالمگیری عہد میں منصب سہ صدی سے سرفراز ہو چکے تھے اور فرخ سیر کے زمانہ میں ان کو اورنگ آباد میں داروغہ خزینہ کی خدمت ملی۔

حضرت آصفجاہ اول نے ان کو قلعہ جات دکن کا داروغہ مقرر کیا۔ انھیں محمد تقی کے فرزند شمس الدین محمد حیدر یار خان شیر جنگ ہیں

شیر جنگ کی ولادت اورنگ آباد میں ۱۱۱۳ھ میں ہوئی حضرت آصفجاہ اول نے سب سے پہلے دو صدی منصب کے ساتھ فیل خانہ کا داروغہ مقرر کیا اس کے بعد آپ کو مختلف خدمات عطا ہوئیں جن کو آپ نے خوش اسلوبی سے انجام دیا آصفجاہ کا بڑا اعتماد آپ پر تھا۔ حیدر یار خان کا خطاب بھی آصفجاہ نے عطا کیا تھا۔

نواب ہدایت محی الدین خان مظفر جنگ کے مارے جانے پر نواب صلابت جنگ کی مسند نشینی شیر جنگ کی جرات کی وجہ سے ہوئی تھی کیونکہ بعض امرا کی خواہش تھی کہ نواب نظام علی خان (آصفجاہ ثانی) مسند نشین بنائے جائیں۔ چونکہ نواب صلابت جنگ بڑے بھائی تھے اس لئے شیر جنگ نے کہا کہ بڑے بھائی کے ہوتے چھوٹے کو مسند نشین کرنا خاندان آصفی کی روایات کے خلاف ہے۔ اور پیش قدمی کر کے نواب صلابت جنگ کو مسند نشینی کی نذر پیش کردی۔ آپ کے بعد دوسرے امرا نے بھی آپ کی پیروی کی

نواب صلابت جنگ کے زمانہ میں شیر جنگ نے دیوانی کے اہم فرائض بھی انجام دئے ۱۱۷۲ھ نواب آصفجاہ ثانی کے ابتدائی ایام میں چونکہ شیر جنگ سے موافقت نہیں تھی اس لئے انھوں نے پونہ میں اقامت کرلی تھی، بعد میں شیر جنگ مورد عنایت شاہی ہوئے۔ رکن الدولہ کے مشیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اس کے بعد انھوں نے مختلف اہم خدمات کو انجام دیا اور آخر زمانہ میں جبکہ ان کا سن بھی زیادہ ہوگیا تھا ان کو صوبہ اورنگ آباد کی نظامت کے عہدہ پر سرفراز کیا گیا اس خدمت کو بھی وہ پانچ سال تک انجام دیکر ۱۱۸۹ھ میں انتقال فرمایا۔ اورنگ آباد میں سپرد خاک کئے گئے۔

شیر جنگ، سخاوت، شجاعت میں مشہور تھے، علمی قابلیت بہت اچھی تھی۔ ان کو دو لڑکے تھے۔ بڑے محمد صفدر خان غیور جنگ، نوردگاہ قلی خان کے داماد تھے۔ اور دوسرے تقی یار خان ذوالفقار جنگ جنھوں نے عنفوان شباب میں انتقال کیا۔
اول الذکر کی اولاد سے نواب سالار جنگ بہادر ہیں، جو آپ کی چھٹی پشت کے دادا ہوتے ہیں۔

مہر مہ صی د ہ ، کں الد و ا

مہراب جنگ معین الدولہ مشیرالملک اعظم الامرا ارسطو جاہ

رکن الدولہ میر موسیٰ خان — وفات ۱۱۹۰ھ

میر محمد یار نام اور رکن الدولہ میر موسیٰ خان احتشام جنگ خطاب تھا۔ آپ کے اجداد بخارا کے رہنے والے تھے رکن الدولہ کے دادا ہندوستان آئے اور نواب غازی الدین خان فیروز جنگ کے فرزند میر قمر الدین خان آصف جاہ اول کی تعلیم دینے پر مامور کئے گئے ترکی خان ان کو خطاب ملا ان کے فرزند میر موسیٰ تھے، جو دیوکنڈہ کی وقائع نگاری پر مامور کئے گئے پھر مظفر جنگ کے یہاں ایک سال کے افسر مقرر ہوئے، ان کے بعد ان کے فرزند میر محمد یار کو باپ کی جگہ مامور کیا گیا۔ نواب مظفر جنگ کے مارے جانے پر صلابت جنگ نے محمد یار کو موسیٰ خان کے خطاب کے ساتھ ایک خاص فوج کی تانداری پر مقرر کیا۔ رفتہ رفتہ انھوں نے ترقی کی نام پیدا کیا اور جنگ گیری سایہ پر ترقی پائی چونکہ طالع یاور تھا حضرت آصف جاہ ثانی کی نظر عنایت مبذول ہو گئی و ۱۱۸۲ھ میں خطاب رکن الدولہ احتشام جنگ کے ساتھ منصب ہفت ہزاری و ہشت ہزار سوار کا اعزاز اور خدمت دیوانی سے سرفراز کئے گئے ان کے دیوانی کے کاروبار میں نواب تہور جنگ کو زیادہ دخل تھا وہ مشیر خاص کی حیثیت رکھتے تھے

۱۱۹۰ ہجری میں ایک سپاہی فضو نام نے آپ کو شہید کر دیا کوہ مولا کے دامن میں دفن کئے گئے

ان کی دیوانی کے اہم واقعات یہ ہیں :-

(۱) حیدر علی کو انگریزوں کے ساتھ جنگ میں آصفی فوج نے مدد دی، حیدر علی کو ناکامی ہوئی محمد علی والا جاہ نے نظام اور انگریزوں میں صلح کرا دی اس صلح کے لئے رکن الدولہ مدراس گئے۔

(۲) مرہٹوں سے دو دو جنگ ہوئی

(۳) موسیٰ ندی میں طغیانی آئی اور فصیل توڑ کر پانی اندر چلا آیا

رکن الدولہ کو اولاد نہ تھی۔ لیکن ان کے بھائی نواب شمس الامراء کی اولاد موجود ہے۔ ان کے سلسلے میں نواب تہور جنگ رکن الملک کی ایک قابل ذکر ہستی تھی جو اپنے کردار اور زہد و ورع کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔

ارسطوجاہ

تولد ۱۱۴۵ھ وفات ۱۲۱۹ھ

غلام سید نام اور معین الدولہ سہراب جنگ شبیہ الملک اعظم الامرا ارسطوجاہ فرزند ارجمند وکیل مطلق مختار دولت آصفیہ خطاب تھا۔ ۱۱۴۵ھ میں تولد ہوئے۔ نوشیروان عادل کی اولاد سے تھے۔ آپ کے باپ فرخ نژاد خاں کو حضرت آصفجاہ اول نے صوبہ دار برار مقرر کیا تھا۔ غلام سید خاں آصفجاہ ثانی کے رفیق اور مصاحب تھے۔ حیدر جنگ کے مارے جانے کے بعد معین الدولہ سہراب جنگ کے خطاب کے ساتھ محالات صوبہ برار اور تبنیاد کی دیوانی پر مامور کئے گئے۔ اس کے بعد پونہ اور ناگپور کی سفارت پر بھیجے گئے۔ چنانچہ سہراب جنگ نے اونپڈت پردھان اور رگھوجی بھونسلہ کے پاس جاکر اپنا مفوضہ کام نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا۔ اس کے بعد ایک عرصہ بعد شبیہ الملک اعظم الامرا کے خطاب کے ساتھ خدمت دیوانی سے سرفراز کئے گئے (۱۷۸۱ء مطابق ۱۱۸۹ھ)

آپ کی دیوانی کے اہم واقعات کی بڑی تفصیل ہے، جن کی صراحت کا یہ موقع نہیں ہے، مختصراً اس کا اظہار کیا جاتا ہے:-

(۱) سلطنت آصفیہ نے مرہٹوں کی تائید سے میسور پر چڑھائی کی، مگر عین وقت پر مرہٹوں نے ساتھ نہیں دیا۔ اس لئے تنہا آصفی فوج نے میسور پر حملہ کیا اور فتحیاب ہوئی۔

(۲) انگریزوں کے ساتھ شریک ہوکر سلطنت آصفیہ نے میسور کی تیسری لڑائی میں حصہ لیا۔

(۳) مرہٹوں کے ساتھ جنگ کھرلہ واقع ہوئی جس میں بعض وجوہ سے آصفی فوج ناکام رہی۔

(۴) اعظم الامرا پونہ میں نظر بند کئے گئے۔

(۵) پونہ میں اعظم الامرا نے سیاسی چال چلی، روسا مرہٹہ میں نفاق ڈالکر ان کو آپس میں جدا کر دیا، اور پھر اپنی سیاسی چال اور توڑ جوڑ سے ان کی صفائی بھی کرادی، اور صفائی کرانے کے بعد جنگ کھرلہ کے نقصانات کی تلافی میں ایک کروڑ نقد تین کروڑ کے دستاویزات معافی چوتھ کی سند ممالک دولت آباد وغیرہ واپس لیکر حیدرآباد واپس ہوئے۔

(۶) میسور کی چوتھی لڑائی میں انگریزوں کی مدد کی گئی اور فتحیاب ہوئے۔

(۷) آصفجاہ ثانی کا انتقال ہوا اور آصفجاہ ثالث مسند حکومت پر جلوہ گر ہوئے، اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ۱۲۱۹ھ میں ارسطوجاہ کا انتقال ہو گیا سرورنگر میں دفن ہوئے۔ ارسطوجاہ اپنے ملک اور مالک کے سچے خیرخواہ رہے، مرتے دم تک آپ نے ملک اور مالک کی خدمت نہایت دیانت داری سے انجام دی، وہ اپنے وقت کے بڑے سیاست داں تھے، انھوں نے بیسیوں موقعوں پر سیاسی دل و دماغ سے کام لیکر کامیابی حاصل کی۔ ارسطوجاہ مذہبی آدمی تھے۔ فرائض کی پابندی سختی کے ساتھ کرتے تھے، جود و سخا میں مشہور تھے۔ علما و فضلا کی صحبت سے بڑی دلچسپی تھی۔ شعر و سخن سے شغف تھا، ان کے دربار نے اُردو شاعری کی بھی بڑی خدمت کی۔

محمد ابوالقاسم محمود گاواں

علی زماں خاں غیور جنگ منیر الدولہ مدبر الملک امیر الامراء

میر عالم

تولد ۱۱۶۶ھ وفات ۱۲۲۳ھ

ابوالقاسم میر عالم کے والد سید رضی شوستر (ایران) کے شیخ الاسلام کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سید رضی شوستر ہی میں پیدا ہوئے مگر ۱۱۶۳ھ میں وہ اپنے بھائی کے ہمراہ ہندوستان آئے۔ شاہجہان آباد میں چند روز قیام کے بعد شجاع الدولہ ناظم بنگال کے پاس بنگال چلے گئے اور وہاں ان کے مخدوم مرشد قلی کی رفاقت میں رہنے لگے۔ اور مرشد قلی کے ساتھ حیدرآباد آئے۔ آصفجاہ کی ملازمت اختیار کی۔ دارالانشا میں ملازم ہو گئے۔

حضرت آصفجاہ نے ایک جاگیر بھی مرحمت فرمائی تھی۔ ۱۱۹۴ھ میں سید رضی کا حیدرآباد میں انتقال ہوا دائرہ میر مومن میں دفن ہوئے۔

سید رضی بڑے قابل فرد اور مجتہد کا درجہ رکھتے تھے۔ شاعری کا بھی شوق تھا اقدس تخلص کرتے تھے۔

میر ابوالقاسم المخاطب بہ میر عالم کی ولادت حیدرآباد میں ۱۱۶۶ھ م ۱۷۵۳ء ہوئی۔ عربی اور فارسی میں بڑی اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ فارسی میں مہارت بھی تھی۔ قلم برداشتہ عربی لکھا کرتے تھے۔ فارسی شاعری اور انشاپردازی کا خاص ذوق تھا۔ بہرحال میر عالم اپنے وقت کے ایک بلند پایہ ادیب و قابل فرد تھے۔

یہ امر خاص طور سے قابل تذکرہ ہے کہ میر عالم کی ابتدائی ملازمت ان کی شاعری کے طفیل ہوئی۔ اگرچہ ان کو باپ کی جاگیر مل چکی تھی مگر ملازمت کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ ایک مرتبہ جب ارسطوجاہ کی مدح میں قصیدہ پیش کیا تو ارسطوجاہ نے ان کی فصاحت و بلاغت سے متاثر ہو کر ان کو اپنا سکریٹری بنا لیا۔ اس وقت سے ان کی ترقی ہونے لگی۔

اس کے بعد وہ سرکار کے تعلقدار بنائے گئے۔ انہوں نے اپنے تعلقہ کا انتظام نہایت عمدگی سے کیا۔ رعایا اور مالک دونوں کی خوشنودی حاصل کی۔

معاہدہ تعلقداری کے بعد میر عالم کو وکالت کی خدمت دی گئی۔ جب کمپنی کی جانب سے ایک سفیر حیدرآباد آیا تو ارسطوجاہ نے اپنے اور اس انگریز سفیر کے درمیان ان کو وکالت پر مامور کیا۔ معاملات نہایت عمدگی سے طے پائے۔ اس کے بعد میر عالم کو سفارت کے لئے منتخب کیا گیا اور وہ حضرت آصفجاہ ثانی کی جانب سے گورنر جنرل کے پاس بھیجے گئے۔ ۱۲۰۱ھ میں میر عالم اس سفارت میں کامیاب ہو کر کلکتہ سے واپس آئے۔ اس کامیابی کے صلہ میں ان کو خطاب میر عالم کے ساتھ دیگر اعزازات سے بھی ممتاز کیا گیا۔ اب وہ پیشوا کے پاس پونہ روانہ کئے گئے اور اس کے بعد میسور کی چوتھی لڑائی میں حیدرآبادی فوج کی سپہ سالاری کے فرائض ان کے تفویض کئے گئے۔

ارسطوجاہ کے انتقال پر آصفجاہ ثالث نے میر عالم کو دیوانی کی خدمت عطا فرمائی ۱۲۱۹ھ۔

میر عالم نے اپنی دیوانی کے زمانے میں کئی اصلاحیں کیں چنانچہ قلمرو آصفی میں سب سے پہلے رسائل ڈاک کا انتظام کیا گیا حیدرآباد، کلکتہ، مدراس، بمبئی، پونہ اور مچھلی بندر تک ڈاک کا انتظام ہوا۔ اس کے راستے میں مسافر خانے، مسجدیں، سرائیں اور باؤلیاں کھدوائیں آج تک بھی اکثر سرائیں موجود ہیں۔

۱۲۲۰ھ میں ایک قحط ہوا میر عالم نے اس کا معقول انتظام فرمایا۔ بہرحال میر عالم ایک منتظم اور مدبر دیوان ثابت ہوئے۔

شوال ۱۲۲۳ھ میں میر عالم کا انتقال ہوا دائرہ میر مومن میں اپنے والد کے پہلو میں دفن کئے گئے۔

میر عالم کی بنائی ہوئی کئی چیزیں آج تک موجود ہیں مثلاً میر عالم کا تالاب، میر عالم کی منڈی، بارہ دری اور اس کا باغ وغیرہ۔ میر عالم صاحب تصنیف تھے فارسی نثر و نظم میں کئی کتابیں تھیں ان میں سے حدیقۃ العالم اور مثنوی من ماہ اور کاغذ کی چند مشہور ہیں۔

میر عالم بڑے سخی تھے۔ روزانہ ان کے باورچی خانہ سے دو سو مسکینوں کو کھانا ملتا تھا۔ وہ بڑے معاملہ فہم، دوربین، دوراندیش، صاحب عزم و احتیاط کرنے والے اور عاقبت بین تھے۔

شمس الامرا ثانی امیر کبیر

تولد ۱۱۹۵ھ   انتقال ۱۲۰۹ھ

نواب محمد فخر الدین خان تیغ جنگ ابو الفتح خان شمس الامرا اول کے فرزند ہیں حیدرآباد میں آپ کی ولادت ہوئی (۱۱۹۵ھ) باپ کے انتقال کے وقت بہت کم سن تھے، آپ کی کم عمری سے ہی آصفجاہ ثانی کے نوازشات مبذول ہوتی رہیں۔

موروثی خطابات تیغ جنگ شمس الدولہ، شمس الملک شمس الامرا (ثانی) کے ساتھ امیر کبیر (اول) کا جلیل القدر خطاب بھی ملا۔

امیر کبیر مختلف حیثیتوں سے خاندان پائگاہ کے چشم و چراغ ہیں، آپ کی ممتاز ہستی نہ صرف امرا پائیگاہ بلکہ تاریخ دکن میں بھی اہم حیثیت رکھتی ہے اور تاریخ دکن اپنے اس قابل فخر سپوت پر ہمیشہ فخر کرے گی۔

امرا پائگاہ میں آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں جو بادشاہ کی دامادی کے رشتہ میں منسلک کئے گئے، چنانچہ ۱۲۱۵ھ میں حضرت آصفجاہ ثانی نے اپنی صاحبزادی بشیر النسا بیگم کی شادی آپ سے فرما کر دامادی کے رشتہ سے ممتاز کیا۔ اور آج تک آپ کی اولاد کو یہ فخر حاصل ہو رہا ہے کہ وہ خاندان آصفی کی شہزادیوں کے ساتھ ازدواجی کا امتیاز حاصل کرتے ہیں۔

نواب شمس الامرا ــــ ھ میں منصب مدار المہامی پر فائز ہوئے گو چند ماہ نہایت کامیابی کے ساتھ کام کرنے کے بعد خدمت سے سبکدوش ہو گئے

امیر کبیر کی ذات علما، شعرا، اور مصنفین کے لئے ملجا و ماویٰ تھی آپ علم و فن کی ترویج کے لئے لوگوں کی ہمت افزائی کا پورا سامان کرتے تھے، ان کو فکر معاش سے مستغنی کرنے کے لئے مناصب اور ماہوار مقرر فرماتے تھے چنانچہ حضرت فیض، قیس، آفاق، شہرت وغیرہ کو ماہواریں ملا کرتی تھیں۔

ترقی تعلیم سے آپ کو بڑی دلچسپی تھی۔ اپنے صرفے سے کئی مدرسے قائم کئے تھے، یہاں کے مدرسین کو بیش قرار ماہوار اور طلبہ کو وظائف کے علاوہ کتابوں وغیرہ سے بھی مدد دی جاتی تھی

امیر کبیر کے سب سے بڑے اور قابل فخر کارنامے یہ ہیں کہ آپ نے مغربی علوم و فنون خصوصاً سائنس اور ریاضی وغیرہ کی کئی کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے شائع فرمائیں اور ان کی تعلیم کا انتظام فرمایا۔ اردو زبان میں مغربی علوم کے ترجمہ کرنے کی یہ سب سے پہلی کوشش تھی۔ دہلی کالج، علی گڈھ وغیرہ کی تحریکیں سب اس کے بعد کی ہیں۔ ارباب کمپنی نے کلکتہ میں نثر اردو میں قصہ کہانیاں وغیرہ کی کتابیں مرتب کرائیں تھیں، یہ کارنامہ ان دنوں تاریخ ادب اردو کا ایک ممتاز باب سمجھا جاتا ہے، لیکن امیر کبیر نے زبان اردو کی جو خدمت سائنس کے کتابوں کے ترجمہ کی کی ہے، وہ ان قصے کہانیوں کے کارناموں سے زیادہ درخشاں اور زیادہ سودمند ہے۔

امیر کبیر کو فن تعمیر سے بھی بڑی دلچسپی تھی آپ نے کئی عالی شان عمارتیں اور بازار وغیرہ تعمیر کرائے۔

محمد ابو الفخر نصر الدین خان امام جنگ ثالث خورشید الدولہ
خورشید الملک

مہاراجہ چندو لال

مہاراجہ چندولعل

تولد ۱۱۸۰ھ انتقال ۱۲۶۱ھ

مہاراجہ چندولعل بہادر، اکبری نورتن کے ایک رتن راجہ ٹوڈرمل کی اولاد سے تھے۔ آپ کے جد اعلیٰ رائے مول چند، راجہ ٹوڈرمل کی پانچویں پشت سے تھے۔ حضرت آصفجاہ اوّل کے زمانہ میں کروڑگیری کی تعلقداری پر مامور تھے۔ ان کے بعد ان کے فرزند رائے بھیم رام کو آصفجاہ ثانی نے اس خدمت سے سرفراز فرمایا۔ ان کے دو لڑکے تھے، رائے نانک رام اور رائے نارائن داس۔ نارائن داس کے فرزند رائے چندولال ہیں۔

بھیم رام کے مرنے پر نانک رام کو ان کی موروثی خدمت ملی اور ان کے بعد ان کے فرزند رائے لکھپت رائے اس جگہ مامور ہوئے مگر دو سال میں انھوں نے انتقال کیا۔

مہاراجہ چندولعل ۱۱۸۰ھ میں تولد ہوئے۔ رواج زمانہ کے موافق فارسی اور عربی کی تعلیم پائی اور خاص قابلیت پیدا کی۔ سن شعور کو پہنچ کر اپنے چچا نانک رام کے ماتحت سررشتہ کروڑگیری میں ایک خدمت پر مامور ہوئے اور پھر لکھپت رائے کے مرنے پر تعلقداری کروڑگیری ہوگئے۔ آصفجاہ ثانی نے مہاراجہ چندولعل کی قابلیت اور لیاقت سے واقف ہو کر ان کو قلعہ سدہوٹ وغیرہ کے انتظام پر روانہ کیا۔ راجہ بہادر کا خطاب بھی ملا۔ سابقہ خدمت بھی بدستور بحال رہی جس پر آپ کے غیاب میں آپ کے بھائی کارگزار رہے۔

میر عالم بہادر کی وزارت میں آپ کو خدمت پیشکاری پر سرفراز کیا گیا اور مہاراجہ کا خطاب عطا ہوا۔ منیر الملک کی دیوانی میں آپ پیشکاری کے ساتھ دیوانی کے کاموں میں دخیل رہے اور ان کے انتقال پر گرچہ آپ کو باضابطہ دیوانی کی خدمت نہیں ملی مگر چونکہ کوئی اور شخص دیوان نہیں تھا اس لئے آپ ہی دیوانی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ خطاب راجایان مہاراجہ سے ممتاز کئے گئے۔

مہاراجہ چندولعل نے اپنے زمانہ میں خوب ہی داد و دہش کی۔ سیکڑوں اصحاب کو جاگیر، انعام اور مناصب بحال کر دیا۔ ۱۲۴۹ھ میں مہاراجہ چندولعل خدمت پیشکاری سے مستعفی کئے گئے اور ۱۲۶۱ھ میں وفات پائی۔

آپ ایک علم دوست، ذی علم، فیاض، سخی امیر تھے۔ علما، فضلا، شعرا کی بڑی قدر کرتے تھے۔ شعر و سخن کے دلدادہ تھے۔ سخن فہم اور سخن سنج اس کے ساتھ ہی بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ کے فارسی اور اردو کلیات شائع ہو چکے ہیں۔ شاداںؔ آپ کا تخلص تھا۔

آپ کا کلام سنجیدہ، شگفتہ اور پسندیدہ، مضامین کا گنجینہ ہے۔ کلام کی شیرینی، انداز بیان کی جدت اور تخیل کی بلندی آپ کی قادر الکلامی کے شاہد ہیں۔ آپ کے کلام کا ذخیرہ معرفت و تصوف سے بھرا ہوا ہے۔

آپ کے دربار میں ہر وقت شعرا کا جمگھٹا رہا کرتا تھا۔ ان کی بڑی بڑی تنخواہیں مقرر تھیں۔

مہاراجہ کی سخاوت اور خیرات عام و خاص میں مشہور تھی۔ بلا لحاظ مذہب و ملت فقیروں، مسکینوں کو سال میں تمام تہواروں پر روپیہ پیسے کے علاوہ روز میوہ اور شیرینی پارچے، دوشالے وغیرہ بھی تقسیم ہوا کرتے تھے۔ بعض مرتبہ ایک ایک ہزار دوشالے روزانہ تقسیم ہوتے تھے۔

آپ کو تعمیرات سے بھی دلچسپی تھی۔ بارہ دری مشہور ہے جو باغ ارم سے موسوم تھی۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے کئی عمارتیں بنائی ہیں۔ بہرحال تاریخ دکن میں مہاراجہ چندولعل بھی اہم شخصیت کے مالک ہیں۔

منیر الملک ثانی

تولد ۱۱۹۴ھ وفات ۱۲۲۶ھ

علی زمان خان المخاطب غیور جنگ، منیر الدولہ، امیر الامرا، منیر الملک ثانی، غیور جنگ صفدر یار خان کے فرزند اور شیر جنگ منیر الملک کے پوتے تھے۔
صفدر یار خان غیور جنگ کے انتقال پر ان کے چاروں لڑکوں نے جائداد آپس میں تقسیم کر لی۔ حضرت آصفجاہ ثانی نے ان کو منیر الملک خطاب کے ساتھ پنج ہزاری منصب اور سہ ہزار سوار کا افراز عطا فرمایا اور بختیاری فوج کی خدمت سے سرفراز کئے گئے۔
منیر الملک، میر عالم کے داماد تھے، ان کی دو لڑکیاں یکے بعد دیگرے آپ سے بیاہی گئیں۔ میر عالم نے آپ کو خانہ داماد کی حیثیت سے اپنے ہی پاس رکھا تھا۔ ان کے انتقال کے چند ماہ بعد منیر الملک خدمت دیوانی سے سرفراز کئے گئے (۱۲۲۴ھ)۔

آپ کی دیوانی کے اہم واقعات حسب ذیل ہیں :-

(۱) پنڈاروں کا ہمیشہ کے لئے انسداد ہوگیا ان کی لوٹ مار سے قلمرو آصفی کو نجات ملی
(۲) سکھوں اور عربوں میں سخت فساد ہوا فتنہ فرو ہونے کے بعد سکھوں کو شہر بدر کیا گیا
(۳) مہتدزادہ مبارز الدولہ سے دو دفعہ ہنگامہ برپا کیا اور کرنول دیا قلعہ محمد نگر میں نظر بند کیا گیا
(۴) رود موسیٰ کو قیامت خیز طغیانی ہوئی۔
(۵) حضرت آصفجاہ ثالث نے انتقال فرمایا اور آصفجاہ رابع نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

۱۲۲۶ھ میں منیر الملک کا انتقال ہوا دائرہ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ آپ کو چار لڑکے تھے یہ اشجع الدولہ، شجاع الدولہ، سراج الملک اور اکرم الدولہ۔
منیر الملک بھی اپنے دادا کی طرح بڑے سخی تھے، محرم میں بڑی خیرات کیا کرتے تھے، سادات اور حجاج وغیرہ ہمیشہ آپ کے مہمان رہا کرتے۔ لذیذ کھانوں سے بھی آپ کو رغبت تھی، ہر وقت باورچی خانہ گرم رہا کرتا۔ فی باورچی دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ دیا کرتے تھے۔
تعمیر سے بھی آپ کو دلچسپی تھی چینی خانہ، آئینہ خانہ آپ ہی کی یادگار ہیں، اورنگ آباد میں بھی آپ نے ایک محل تعمیر کیا تھا

سراج الملک

تولد ۱۲۲۴ھ وفات ۱۲۶۹ھ

میر عالم علی خان المخاطب شیر جنگ سراج الدولہ سراج الملک، منیر الملک امیر الامرا کے تیسرے فرزند اور میر عالم کے نواسے تھے۔
سراج الملک دو مرتبہ دیوانی کی خدمت سے سرفراز کئے گئے پہلی مرتبہ ۱۲۵۹ھ میں اور دوسری مرتبہ ۱۲۶۲ھ میں۔ پہلی بار تو کچھ عرصہ کے بعد سبکدوش ہوگئے اور دوسری بار تقریباً سات سال تک یہ خدمت انجام دی اور برسر خدمت ہی آپ کا انتقال ہوا۔ دوسری مرتبہ دیوانی کے لئے رزیڈنٹ صاحب نے بڑی کوشش کی تھی۔ آپ کی دیوانی کے زمانہ میں حسب ذیل اہم واقعات ہوئے :-

(۱) عربوں اور روہیلوں میں فساد ہوگیا۔ (۲) مبارز الدولہ نے مولوی سلیم کے بہکانے سے ایک ہنگامہ کیا آخر مبارز الدولہ قلعہ محمد نگر میں نظر بند کر دئے گئے اور مولوی سلیم کو حبس دوام کی سزا ہوئی۔ (۳) راجہ چندو لعل کی داد و دہش کے باعث خزانہ عامرہ خالی ہوگیا تھا۔ انگریزی فوج کنٹنجنٹ کی ماہوار ادا ہو رہی تھی، کئی لاکھ روپیہ اس کی ماہوار کا فاضل ہوگیا تھا، اس لئے حسب مطالبہ لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ملک برار کو بطور امانی انگریزوں کے تفویض کرنا پڑا طے یہ ہوا تھا کہ بعد وضع اخراجات باقی رقم سرکار عالی کے خزانہ میں داخل کی جائیگی (۱۲۶۹ھ ۱۸۵۳ء)
اس معاہدہ کے کچھ عرصہ بعد نواب سراج الملک کا انتقال ہوگیا۔ آبائی مدفن دائرہ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ سراج الملک کم سخن، صاحب اخلاق و مروت، باریک بیں، دور رس، صاحب تدبیر امیر تھے۔ اہل کمال کے بڑے قدر داں تھے علما و فضلا سے بڑی محبت تھی۔

نواب سراج الملک بہادر وزیر اعظم دولت آصفیہ

میر تراب علی خان شجاع الدولہ نواب مختار الملک سالار جنگ بہادر اول
وزیر اعظم دولت آصفیہ

نواب محمد یوسف علی خاں صلابت جنگ بہادر

رائٹ آنریبل سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ

محمد اکبر المخاطب رائٹ آنریبل سر حیدر نواز جنگ بہادر کے والد نذر علی مرحوم کھمبات کے متوطن اور بمبئی کے نامی گرامی تاجر تھے۔ حیدری آپ کا خاندانی لقب ہے۔

سر اکبر کی ولادت نومبر ۱۸۶۹ء میں بمبئی میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنی والدہ اور نانی سے پائی۔ آپ کی نانی بمبئی کے مشہور جسٹس بدر الدین طیب جی کی حقیقی بہن تھیں۔ بمبئی کے سینٹ زیویرز کالج سے سترہ سال کی عمر میں آپ نے بی اے میں کامیابی حاصل کی اس سے آپ کے تعلیمی شوق، خداداد حافظہ اور غیر معمولی ذہن کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

تعلیم کے بعد سر اکبر گورنمنٹ آف انڈیا کی سلک ملازمت میں داخل ہوگئے اور مالیہ کے صیغہ حساب میں ایک افسر کی حیثیت سے مامور ہوئے (۱۸۸۸ء) اس کے بعد لاہور پھر کلکتہ میں کارگذار رہے اور وہاں سے الہ آباد کی جانب میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل کی جگہ پر ترقی ملی الہ آباد سے آپ کا تبادلہ بمبئی میں ہوا اور پھر بمبئی سے مدراس کی ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرلی پر مامور کئے گئے، اسی خدمت سے آپ حیدرآباد میں طلب کئے گئے۔

مدراس کی ملازمت کے زمانے میں آپ ہندوستان بھر کے سرکاری مطابع کی جانچ پڑتال پر مقرر کئے گئے تھے اس کام کو بھی آپ نے نہایت خوبی سے انجام دیا۔

۱۹۰۵ء (۱۳۱۷ف) میں سر اکبر حیدری کا تقرر صدر محاسبی سرکار عالی پر ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر ۳۶ سال کی تھی دو سال کے بعد معتمدی فینانس پر آپ کا تقرر ہوا اور پھر ۱۳۲۳ف (۱۹۱۱ء) میں معتمد عدالت و کوتوالی امور عامہ پر تبادلہ ہوگیا اس خدمت پر ایک طویل زمانے تک مامور رہے۔ کچھ عرصے تک اس خدمت کے ساتھ آپ نے صدر ناظم صنعت و حرفت کا کام بھی انجام دیا۔

۱۳۳۲ف (۱۹۲۰ء) میں سر اکبر سرکار عالی کی ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کرکے بمبئی میں اکاؤنٹنٹ جنرل کی خدمت پر مامور ہوگئے مگر اس کے چند ماہ بعد پھر جولائی ۱۹۲۱ء میں صدر المہام فینانس کی جگہ آپ کا تقرر ہوا اس طرح آپ دوبارہ سرکار عالی کی سلک ملازمت میں شامل ہوگئے۔

صدر المہامی فینانس کے بعد ۲۹ رجب ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۶ء) میں سر اکبر صدر اعظم کی جلیل القدر خدمت پر مامور کئے گئے اور تقریباً دو سال سے آپ اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔

جس زمانہ میں سر اکبر حیدرآباد آکر صدر محاسب ہوئے تھے، اس وقت صدر المہامی اور مدار المہامی (صدر اعظم) کے خدمات حیدرآباد کے مخصوص امراء اور جاگیرداروں کے لئے مختص تھے کسی اعلیٰ عہدہ دار کا خواہ وہ معتمد ہی کیوں نہ ہو ترقی پاکر صدر المہام یا صدر اعظم ہو جانا محال تھا اس لئے اس وقت یہ شائبہ نہیں تھا کہ ایک دن سر اکبر صدر اعظم کی جلیل القدر خدمت پر مامور ہو جائیں گے۔

لیکن ایک زمانہ وہ آیا کہ اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع کے تدبر اور دور بین نظر کے باعث قابل اور لائق اشخاص اپنی اعلیٰ قابلیت اور عمدہ لیاقت کے باعث صدر المہام اور صدر اعظمی پر ترقی پانے لگے۔ اس قسم کا سب سے پہلا اعزاز سر فریدون الملک کو ملا تھا

رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم

سرکار عالی کی ایک معمولی خدمت سے ترقی کرتے ہوئے سب سے اعلیٰ خدمت صدر اعظمی پر مامور کئے گئے تھے ۔ ان کو یہ اعزاز محض ان کی لیاقت، قابلیت، دیانت، و وفاداری کے طفیل ملا تھا ۔ سر فریدون الملک کے بعد سر اکبر وہ شخص ہیں جو سرکار عالی کی صدر محاسبی سے ترقی کرتے ہوئے صدر اعظمی پر سرفراز کئے گئے ہیں، سر اکبر کو بھی یہ خدمت انہی کی طرح بہ تمام قابلیت کے بل بوتے پر ملی ہے

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے سر اکبر ہندوستان کے کئی صوبوں سی پی، پنجاب، بنگال، یو پی، بمبئی اور مدراس میں مامور رہے ہر جگہ آپ نے سرکاری خدمات کو حسن و خوبی سے انجام دیا اور اپنے بعد وہاں اپنی خوش گوار یاد چھوڑی حیدرآباد میں بحیثیت معتمدی اور صدر المہامی مختلف سررشتہ جات آپ سے متعلق رہے ہر سررشتہ میں دلچسپی لے کر آپ نے اصلاح کی کوشش فرمائی جن کی تفصیل اس موقع پر طوالت کا موجب ہوگی ۔

لیکن خصوصیت سے بعض سررشتہ جات کا ذکر ضروری ہے کیونکہ اس کے اظہار کے بغیر آپ کے حالات مکمل نہیں ہو سکتے سررشتہ آثار قدیمہ کا قیام آپ کی توجہ کا رہین منت ہے ۔ سررشتہ طبابت کی اصلاح آپ کا ایک کارنامہ ہے ۔

سررشتہ تعلیمات کی جدید تنظیم اور جامعہ عثمانیہ کا افتتاح آپ کے نمایاں خدمات سے تعلق رکھتا ہے ۔ یوں تو حیدرآباد میں مختلف اوقات میں "جامعہ" کے قیام کا مسئلہ زیر بحث ہوا اور مختلف اصحاب نے اس کی طرف توجہ کی مگر عملی کام کسی نے نہیں لیا ۔ جامعہ عثمانیہ" کا سہرا آپ ہی کے سر ہے ۔ سررشتہ داری، سہ سالہ مالیاتی تنظیم کا قاعدہ، ریلوے کی خریدی، سررشتہ صنعت و حرفت میں اس کی ترقی کے لئے ایک گراں قدر رقم کا مختص کرنا، حیدرآباد سیول سروس کی تنظیم دوران کو اعلیٰ خدمت پر مامور کرنا یہ سب آپ کی کارگزاریوں میں شامل ہے یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ سر اکبر کو خوش نصیبی سے اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کا نصیب ہوا ۔ آپ کی تعلیم پروری، معارف نوازی اور رعایا پروری کے باعث منظوری سے ممتاز فرمایا ۔

صدر المہامی فینانس کے زمانہ میں سر اکبر نے حیدرآباد کے نمائندہ کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شرکت فرمائی ہے

نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر کو پبلک امور سے بھی دلچسپی رہی ہے ... انجمنوں وغیرہ کے زمانہ میں نہایت توجہ اور دلچسپی سے آپ نے کام کیا ہے ۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے صدر آپ ہی ہوئے تھے ۔ آپ کی توجہ سے کانفرنس نے بہت جلد ... حاصل کی تھی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مسلمانان جنوبی ہند کی تعلیمی کانفرنس کے آپ صدر رہ چکے ہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سینیٹ کے رکن ہیں بہر حال آپ کی سرکاری خدمات کی طرح پبلک خدمات کی تفصیل بھی طویل صفحات کی متقاضی ہے

سر اکبر کو مذہب سے بڑا شغف ہے وہ صوم و صلوٰۃ کے سختی سے پابند ہیں بزرگان دین کے قبور کی زیارت اور مشائخین و صوفیا کی ملاقات کا آپ کو بڑا اشتیاق رہا کرتا ہے ۔ آپ سادگی پسند ہیں ... اپنے اوقات مقررہ کی پابندی کرنے والے ... ہر وقت مصروف رہنے کے عادی ہیں ۔

سر اکبر بحیثیت ماہر فینانس، بحیثیت ماہر تعلیم، بحیثیت سیاسی مدبر، بحیثیت معاشی و اقتصادی ماہر اپنی آپ نظیر ہیں ۔

نصیر الدین ہاشمی

عہدِ آصفی کے امراء

اس کے قبل عہدِ آصفی کے مدارالمہاموں اور صدر اعظموں کے حالات اور تصاویر درج کی گئیں۔ اب عہدِ آصفی کے اُن خاص خاص امراء کے حالات اور تصویریں شامل کی جاتی ہیں جو اپنے کارناموں اور شہرت کی وجہ سے بہت مشہور تھے یا جو نائب حضور کے درجے تک پہنچے تھے۔

نواب درگاہ قلی خاں سالارجنگ

نواب ذوالقدر اصل نام تھا ۱۱۲۲ھ میں بمقام سنگمیر پیدا ہوئے۔ ان کے والد خان قلی خاں کی پرورش اور حضرت غفران مآب نواب آصف[جاہ] اول کی تربیت سے ان کی فطری قابلیت بہت جلد نمایاں ہوگئی سن رشد کو پہنچنے سے قبل ہی اکثر علوم و فنون میں مہارت حاصل کرلی منکسر المزاج[ی] کے ساتھ طبیعت میں شوخی اور ظرافت بھی تھی۔ فن موسیقی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ ۱۱۵۱ھ میں آصف جاہ بہادر کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا نادرشاہی [حملے] کے زمانہ میں اپنے مربی کی حفاظت میں غیر معمولی جاں بازی کا ثبوت دیا جس سے ان کی شجاعت کا ثبوت ملتا ہے دہلی سے واپس ہوکر اپنے سفر [کے] حالات کا ایک تفصیلی تذکرہ قلمبند کیا جو مرقع دہلی کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس میں بارہویں صدی کی دہلی کے معاشرتی، تمدنی [و] تاریخی، اور ادبی حالات نہایت تفصیل سے درج ہیں۔ شاعری سے فطری لگاؤ تھا اکثر فی البدیہہ اشعار کہتے تھے خود مشاعرے منعقد کر[تے] اور اپنی غزل آپ پڑھتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی افسوس ہے کہ بجز چند مرثیوں کے ان کا اردو و فارسی کلام دستیا[ب] نہ ہوسکا چیدہ چیدہ اشعار کہیں کہیں تذکروں میں ملتے ہیں

دکن کے اکثر عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز رہنے کے بعد تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں ۱۱۸۰ھ میں ان کا انتقال ہوا اور اپنے خاندانی مقبرہ واقع اورنگ آباد میں مدفون ہوئے۔ نمونۂ کلام حسب ذیل۔

قصیدہ

پڑی ہے آ کے گلے ناگہاں بلائے سفر — سفر نہیں ہے سفر از سقر سے ہے بدتر

غرض کہ سخت مصیبت میں ہیں وضیع و شریف — غنی فقیر سبھی احتیاج میں مضطر

اسی تردد افکار میں گئی تھی نیند — کہ ناگہ خواب میں دیکھا قریب وقت سحر

کھڑا ہے آ کے سرہانے پہ پیر نورانی — لطیف عنصر و خوش منظر و خجستہ سیر

کہہ کمال عنایت سے کیسے فکر تجھے — ہے تیرے کام کا حامی امام جن و بشر
شہنشہ سریر کرامت امیر کل امیر — ولی حضرت مولیٰ وصی پیغمبر
امام جن و ملک تاجدار ملک و ملک — کہا ہے لحمک لحمی جسے شہنشہ سرور
سوائے اس کے کہوں کون شیخ و مرداں ہے — خدا نے سیف دی اور دی رسول نے چتر
ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہوں سے — کمینہ بندۂ درگاہ صاحب قنبر
مراد بندۂ درگاہ زود دے کہ کرے — ابوتراب کی تربت کی خاک کحل بصر

مرثیہ

عالم میں پھر کے لایا پیغام غم محرم — سب انبیا اور مرسلین اولیا پہ ماتم
اہل حرم ستم میں دل چاک دیدہ پرنم — فریاد کر کے کہتے اے سرور دو عالم
اولاد پر تمہارے یہ کیا بلا ہے برہم — کوئی لہو میں نہلاتے کوئی خاک میں ہے پیہم
ظالم تو بر جور و جفا سے پیہم — سب مبتلا بلا میں فرصت نہیں ہے دم

ہیہات بیکساں را تقدیر چیست یا رب
در ورطۂ ملالت تدبیر چیست یا رب

یہ قصۂ مصیبت ہے سخت درد مانوں — کیا لکھوں اگر کہوں سب طاقت نہیں بیاں کی
موقوف کر اے دل غمناک داستاں کو — سب پر عیاں ہوا ہے حدیث ہندوستاں
تو شافع الہ عاصی مغضوب بندگاں کو — بخشیں تو شافع ہوں بہر وجہاں کو
دنیا میں آبرو دے چندے و نہ میہماں کو — محمود و قت اور عقبیٰ نشاں کو

فیض لطف درگاہ پیش است عاصی
از فضل تو تمنا دارد غریب عاصی

میر سعادت علی رضوی

تیغ جنگ شمس الامراء (وفات ۱۲۰۵ھ)

ابو الفتح خاں تیغ جنگ کے والد ابو الخیر خاں تھے، سلسلۂ نسب حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج سے ملتا ہے۔

ابو الخیر خان کو دربار مغلیہ (محمد شاہ) سے "خان بہادر" کا خطاب عطا ہوا تھا حضرت آصفجاہ اوّل کے ہمراہ رکاب دکن آئے۔ آصفجاہ نے دو ہزاری منصب پانچ سو سوار کا امراز عطا کیا اور کئی ہزار کی جاگیرات مرحمت فرمائی تھی۔

وہ مالک کے بڑے وفادار اور جاں نثار تھے۔ چنانچہ جب ناصر جنگ شہید نے باپ کے خلاف صف آرائی کی تو ابو الخیر خاں کو بھی بہ نیاط فدا بنانا چاہا۔ لیکن انھوں نے آصفجاہ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اسی وفاداری کے طفیل میں زمانۂ مابعد میں خود ناصر جنگ نے ان کو "شمشیر بہادر" اور صلابت جنگ نے امام جنگ کے خطاب سے عزت افزائی کی۔ برہان پور میں ابو الخیر خاں کا انتقال ۱۱۶۸ھ میں ہوا وہیں مدفون ہوئے۔

تیغ جنگ کی پیدائش برہان پور میں ہوئی، والد کے انتقال کے بعد اپنی جاگیر میں خانہ نشین تھے، نواب صلابت جنگ نے اپنے سفر برہانپور (۱۱۷۱ھ) کے وقت آپ کو دربار کے امیروں میں شامل فرمایا۔ اس کے بعد آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علیخاں نے خاص توجہ مبذول فرمائی اور آپ کے مراتب میں بیشی ہوتی گئی۔ تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء (اوّل) کے خطابات عطا ہوئے۔ کئی لاکھ کی جاگیر مرحمت ہوئی۔

نواب رکن الدولہ میر موسیٰ خان کے انتقال پر حضرت آصفجاہ نے آپ کو قلمدان دیوانی سے بھی سرفراز کرنا چاہا، مگر آپ نے میدان جنگ کے مقابلہ میدان سیاست کو پسند نہیں فرمایا۔

پائیگاہ کے آپ ہی بانی ہیں، حضرت آصفجاہ ثانی نے تین لاکھ کی جاگیر فوج کے لئے عطا فرمائی تھی، علاوہ جاگیرات کے نقد رقم بھی اس کے لئے مرحمت ہوتی تھی پائیگاہ کی یہ فوج شاہی محافظ (باڈی گارڈ) کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے سوار بہادر اور دلاور ہونے اور معقول تنخواہ پاتے تھے، تیغ جنگ کے چار رشتہ دار امجد الملک، سردار الملک، امام الملک اور اعظم الملک اس فوج کے اعلیٰ افسر تھے۔ تیغ جنگ کو اپنی فوج کے ساتھ بڑا شغف تھا۔

بحالت سفر پانگل کے مقام پر ۱۲۰۵ھ میں انتقال ہوا۔ لاش کو حیدرآباد لاکر درگاہ برہنہ شاہ میں دفن کیا گیا۔

شمس الامراء ثالث امیر کبیر (ثانی) (ولادت ۱۲۰۱ھ وفات ۱۲۹۴ھ)

امیر کبیر ثانی کا نام محمد رفیع الدین خان تھا۔ آپ فخر الدین خان امیر کبیر (اوّل) کے بڑے فرزند تھے جن کا ذکر وزرائے سلطنت کے سلسلہ میں گزر چکا ہے۔ شوال ۱۲۲۱ھ میں آپ کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی۔ نامور جنگ عمدۃ الدولہ عمدۃ الملک شمس الامراء ثالث (امیر کبیر ثانی) کے خطابات آپ کو سرفراز ہوئے تھے۔ نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کے انتقال پر اعلیٰحضرت غفران مکان کی صغر سنی کے باعث آپ نائب حضور کی حیثیت سے سلطنت آصفی کے کاروبار انجام دیتے رہے۔ اسی نائب حضوری کے زمانہ میں آپ کا انتقال ہوا (۱۲۹۴ھ) میں خاندانی مدفن درگاہ حضرت برہنہ شاہ میں دفن کئے گئے۔

آپ کو علوم و فنون خصوصاً ریاضی اور ہیئت سے بڑی دلچسپی تھی۔ ریاضی میں آپ نے چند کتابیں تالیف فرمائی ہیں۔

محمد فخر الدین خان بہادر جنگ عمدۃ الدولہ عمدۃ الملک
شمس الامراء امیر کبیر ثانی

ر شعد ا د ىں خا ں و د ر الا ا مد ا قمص الا مہ ا مد احمد

محی ا ادین دا ں تدم جدگ سر خو رشید جاہ

بارہ آصفی سے مختلف اوقات میں آپ کو حسب ذیل خطابات سے متعز کیا گیا۔ ابوالخیر خاں، تیغ جنگ، خورشید الدولہ، خورشید الملک، خورشید جاہ، شمس الامرا، امیر کبیر۔

شمس الامرا اور امیر کبیر کے خطابات آپ پر ختم ہو گئے، پھر کسی کو آج تک یہ خطاب نہیں ملا۔

سرکار انگریزی میں آپ کے بڑے اعزاز تھے۔ "سر" کا خطاب ملا تھا اور آپ کی زندگی میں جس قدر ویسرائے حیدرآباد آئے وہ آپ کے یہاں مدعو ہوتے تھے۔

سر خورشید جاہ کو اپنے باپ کی طرح میدان سیاست سے بڑی دلچسپی تھی۔ آپ اپنے زمانہ کے مدبر اور صاحب فراست تھے، کونسل آف اسٹیٹ کی کنیت پر اعلیٰحضرت غفران مکاں نے آپ کا تقرر فرمایا تھا۔

علم و فن سے دلچسپی تھی، تاریخ خورشید جاہی آپ ہی کی سرپرستی میں شائع ہوئی، اور شعر بھی بہ شوق کہتے تھے، حجاز ریلوے کی تعمیر کے لئے پچیس ہزار کا چندہ دیا تھا۔ سیر و سیاحت کا شوق تھا۔ شمالی ہند اور جنوبی ہند کے کئی شہر دیکھے تھے۔ اپنی فوج کو باقاعدہ مرتب کیا تھا۔ فوجی وردی اور عمدہ ہتھیار دئے جو پائیگاہ میں اس سے پہلے نہیں تھے، ۱۳۲۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ درگاہ برہنہ شاہ میں دفن کئے گئے۔ آپ کو دو صاحبزادے تولد ہوئے، امام جنگ اور ظفر جنگ۔ آخر الذکر شہزادی حسن النساء بیگم صاحبہ کے بطن سے تھے۔

مکرم الدولہ میر پرورش علیخاں حسام جنگ

میر پرورش علی خان المخاطب حسام جنگ مکرم الدولہ، آپ کے والد نواب قیصر الدولہ نواب سراج الملک کے داماد تھے اس طرح مکرم الدولہ نواب مختار الملک کے ہمشیرہ زادے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ مکرم الدولہ آپ کے داماد بھی تھے، نور النساء بیگم صاحبہ آپ سے بیاہی گئی تھیں۔

مکرم الدولہ کی تعلیم مدرسہ دارالعلوم میں ہوئی، اس مدرسے کے افتتاح کے ساتھ ہی آپ نے اس میں شرکت فرمائی تھی، عربی، فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔

نواب مختار الملک نے مجلس مالگذاری قائم کی (۱۲۸۶ھ) تو اس مجلس کا آپ کو میر مجلس بنایا گیا، اس کے بعد جب مجلس برخاست ہو کر صدر المہام مقرر ہوئے تو اس وقت آپ صدر المہام مالگذاری ہوئے۔

نواب مختار الملک کے سفر یورپ کے زمانہ میں آپ بشیر الدولہ کے ساتھ مل کر مدار المہامی کا کام بھی انجام دیتے رہے، آپ کی قابلیت مسلمہ تھی، اور عام و خاص میں آپ کی لیاقت کا شہرہ تھا۔

شادی کے ایک سال بعد (۱۲۹۶ھ) میں آپ خلل دماغ کی وجہ سے خانہ نشین ہو گئے، ۱۳۲۳ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ دائرہ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ آپ کو کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

نصیر الدین ہاشمی

سُورما

گولکنڈہ کا ایک افسانہ

گولکنڈہ کی زمین ہیروں کی سرزمین ہے۔ یہ کبھی آندھرا دیس کی راج نگری تھی جس کی شاہانہ سج دھج سے اپنے پرائے سب کی آنکھیں چکاچوندھ ہو جاتی تھیں۔ آج بھی وہاں اُن دنوں کی یاد دلانے والے ایک آئینہ خانے کے کچھ آثار رہ گئے ہیں جنھیں دیکھتے ہوئے ایک دفعہ مجھے محسوس ہوا کہ ان آئینوں میں گزرے زمانہ کی پرچھائیاں اُبھر رہی ہیں۔ جیسے من میں پیاروں کی یاد آئے!

دیکھا کہ کہیں سلطان قلی قطب شاہ ہے۔ بشرے سے پرعلم کا نور۔ ترکستانی وجاہت۔ لوگ اس بادشاہ کے شیدائی ہیں۔ "بڑے ملک" کے نام سے پکارتے ہیں۔ تلنگانہ کا داتا سمجھتے ہیں۔ کہیں ابراہیم قطب شاہ ہے جو آرٹ اور تمدن کی داغ بیل ڈال رہا ہے۔ اسکے پیچھے پیچھے محمد قلی قطب شاہ چلا آتا ہے۔ جو فلاح و ترقی کی بیل منڈھے چڑھا رہا ہے۔ اتنے میں سلطان محمد قطب شاہ نظر آیا۔ پاکیزگی حیات کا گوہر آبدار۔ ساتھ ایک ملکہ ہے۔ حیات بخشی بیگم ـــ دکن کی ہیروئن!

یہیں ایک آئینہ میں یہ بھی دیکھا کہ تاناشاہ کا عہد حکومت ہے۔ مغل فوجیں قلعہ کا محاصرہ کئے ہیں۔ آٹھ مہینے ہو چکے۔ مگر قلعہ والے اپنی خودداری نہیں کھوتے۔ جان پر کھیلے بیٹھے ہیں۔ مگر سچ یہ ہے، جہاں اچھے ہیں وہاں بُرے بھی ہیں۔ ان جاں نثاروں میں دو چار گندم نما جو فروش بھی ہیں۔ جنہوں نے دشمنوں سے ساز باز کیا۔ چاہتے ہیں کہ وطن کو بیچ کے تن کو پالیں۔ من کو مار ڈالیں۔ مگر غداری نہیں چھپا کرتی۔ ہوتے ہوتے اس کی خبر دکن کے جانباز۔ عبدالرزاق لاری کو بھی ہوئی۔ وہ بھلا اس نمک حرامی کو کیسے برداشت کرتا۔ اسی وقت ان بدسگالوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ اور حکم دیا کہ ان کے لاشے بے گور و کفن پھینک دو۔ تاکہ غداروں کی موت سے عبرت زندہ ہو!

یہ جیسے دن کا قصہ ہے۔ رات ہوئی۔ جو بڑی تاریک تھی۔ اس وقت سپاہی کچھ پہرے پر ہیں کچھ۔ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں کہ دس بجے۔ گیارہ بجے۔ بارہ بج گئے۔ سپاہی کو سپاہیوں کی سی باتیں سوجھتی ہیں۔ باتوں باتوں میں ایک نے کہا، "چلو" بدخواہوں کے لاشے دیکھیں؟ کہتے ہیں: رات کے بارہ بجے فرشتے انہیں آتشیں گرز مارتے ہیں!

دوسرا:- جانا ہے تو ایک ایک جاؤ۔ اور دیکھ آؤ۔ سب کا مل کے جانا ٹھیک نہیں۔ تم جانتے ہو؟ یہ وقت سردارالملک کے بھیس بدل کے نکلنے کا ہے۔ نہو کہ وہ ہمیں یوں جاتا دیکھ لے۔ اور کچھ اور سمجھے۔

تیسرا:- ٹھیک ہے۔ ویسے بھی مرد ہو۔ تو مرد بنو۔ ڈر کو کچل ڈالو۔

چوتھا:- جی، یہ لن ترانی۔ رہنے دو۔ رات کے اس اندھیرے میں اکیلا کوئی نہیں جا سکتا۔

تیسرا:- کیا؟؟

دوسرا:- دیکھو بھئی، ہم یہ وہ نہیں جانتے۔ کچھ شرط بدو۔ اور یاروں کو ستاؤ نہیں۔ پچاس نہیں۔ دس ہی روپے دلواؤ۔ ہم جاتے ہیں۔

چوتھا :- اچھا ہوگی مگر ہماری بھی ایک شرط ہے۔ وہ سامنے مہندی کی باڑھ ہے اس کی پتیاں توڑ لو۔ وہاں جا کے نہیں پیسو۔ اور ہر ایک مردے کی ہتھیلی پہ مہندی لگا آؤ۔ تب بات ہے۔ دوسرے جھانکتے آنے کی سند نہیں۔ پھر ہم جائے دیکھ لیں گے۔

دوسرا :- منظور !

دوسرے دن ہوتے ہی نہیں۔ ادھر لاری نہیں دل کی میا چھپ فوج کی موجودات لینے نکلا۔ یہاں بیچ تو بد خواہوں کا ذکر نہ خیال ہوا کہ کہیں غداری کی، یا عام تو نہیں ہوگی۔ اس لئے شک کیا۔ اور ایک درخت کی آڑ سے سارا ماجرا سن لیا تو اطمینان ہوا۔

جب سورما نے شرط مان لی تھی اوس نے تو ہوا کی پیش قبض جا پایا۔ اور بیٹھا تیار چپ اس گھنی جھاڑی میں پہنچا۔ جہاں لاشے تھے۔ وہاں اندھیرے کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ بے شمار جھینگر بول رہے تھے۔ کبھی بیدڑ بولتے تو یہ سمجھتا کہ کوئی اس کی دلیری پر واہ واہ کر رہے ہیں۔ نرکس بولتا تو خیال ہوتا کہ کوئی اس کی کامیابی پر ہنس رہا ہے۔ اور شیر ڈکارتا تو سوچتا کہ کہیں ڈرپوک سمجھ کے سردار لاری تو نہیں گھرک رہا!

غیر وہاں اس پہلے پتیاں رگڑیں مہندی تیار کی پھر لاشوں کے پاس تک ایک مردے کی ہتھیلی پہ لگائی۔ دوسرے کے لگا رہا تھا کہ تیسرے لاشے نے حرکت کی۔ سورما نے غور سے دیکھا۔ اور خاموش ہو گیا۔ دوسری دفعہ لاشہ نے حرکت کی تو سورما نے بگڑ کے کہا: ٹھیر جا! تیسری دفعہ لاشے نے ہاتھ پھیلا دیا۔ سورما کو یہ بے خبری بری معلوم ہوئی جھٹ پیش قبض نکالی۔ وہ لاشے کے ہاتھ کو زمین پر رکھ کے اسکی ہتھیلی میں پیش قبض اتار دیا۔ اس کے بعد مہندی بھی لگا دی۔ اور پیش قبض کا لگ جانا ہوا۔ سورما کی بے جگری کا یہ وہ کارنامہ تھا جسے اسوقت آسمان کی لاکھوں آنکھیں دیکھ رہی تھیں!

وہاں سے چلا تو کچھ دور پر رستہ میں ایک شخص چادر اوڑھے نظر آیا۔ جیسے سورما نے ٹوکا۔ ساتھ ہی تلوار کا وار بھی کیا۔ مگر اجنبی نے پینترا کاٹ کے وار خالی دیا۔ اور جلدی سے سورما کو گلے لگاتے ہوئے اوس کا نام لیکر پکارا۔

سورما نے آواز پہچان کر کہا: ہائیں؟!

اجنبی :- ہاں!

سورما :- میں صرف مہندی

اجنبی :- تم سرخرو ہوئے!

سورما :- کیسے؟

اجنبی :- میں وہیں تھا۔ تمہارے پہنچتے پہنچتے رستہ کاٹ کے وہاں آن پہنچا۔ ایک لاشے کو ہٹا کے اسکی جگہ لیٹ گیا کہ دیکھوں تم میں کتنا حوصلہ ہے؟!

یہ کہہ کر اجنبی نے چادر سے ہاتھ نکال کے دکھایا۔ خون بہہ رہا تھا۔ اسی ہاتھ میں سورما نے پیش قبض اتار دیا تھا۔ یہ جانباز لاری کا ہاتھ تھا۔ جو مرتے مرتے بھی کہہ گیا کہ:- "تا جان دارم نثار ابو الحسن خواہم نمود"!!

سید وزیر حسن (عثمانیہ)

اورنگ آباد

(ہندوستان میں مغلوں کی حکومت کے آخری تاجدار شہنشاہ اورنگزیب کی سب سے عظیم الشان سلطنت کا صدر مقام)

کچھ بلبلوں کو یاد ہے کچھ قمریوں کو حفظ
عالم میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ جس شہر کی سرگزشت میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں وہ سوا دو سو سال پہلے اتنا بڑا شہر تھا جیسا اب لکھنؤ ہے۔ اس کی آبادی پندرہ لاکھ بیان کی جاتی تھی۔

اورنگ آباد کی بنیاد اور اس کے عروج و زوال کی داستان کو آپ کے سامنے بیان کرنا دراصل ہندوستان کی اس دور کی تاریخ دہرانا ہے۔ میں آپ کو اتنی دور نہیں لے جاؤں گا لیکن مختصراً چند دور آفریں واقعات کا ذکر کروں گا۔

دلی خلجیوں کے زیر تسلط تھی۔ جلال الدین سریر آرا تھا۔ اس کے بھتیجے کے سر پر بادشاہت کا سودا سمایا لیکن خوب جانتا تھا کہ روپیہ کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ اس زمانے میں سلطنت دیوگری (دولت آباد) کی دولت ضرب المثل ہو گئی تھی۔ علاء الدین نے اپنے چچا کی رضامندی حاصل کئے بغیر سپاہیوں کا ایک مختصر سا دستہ لیا اور جنوب کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں کے راجہ کو ڈرا دھمکا کے مطیع کیا اور بہت کچھ مال غنیمت حاصل کیا۔

خلجیوں نے اپنے انتقال سے قبل دیوگری کو فتح کر لیا تھا اور اس کا نام دولت آباد رکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں کے راجہ رام دیو کی زندہ کھال اتاری گئی۔ اس میں گھاس بھری گئی اور اس کو قلعے کے دروازے پر نصب کیا گیا۔

واقعات بدلے۔ خلجیوں کی جگہ تغلق بادشاہ برسر اقتدار ہوئے۔ شاہ دیوانہ محمد تغلق کی خواہش تھی کہ اپنی حکومت کا صدر مقام دلی سے دولت آباد منتقل کیا جائے۔ رعایا کو چالیس روز میں دولت آباد پہنچنے کا حکم دیا۔ قافلہ اس غرض سے روانہ ہوا۔ دولت آباد سلطنت کا صدر مقام تو نہ بن سکا۔ البتہ دلی کے لوگوں نے جنوب کے امرا کو اپنے آقا کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیا اور سلاطین بہمنی بادشاہوں کے ہاتھوں ایک خود مختار حکومت کی بنیاد پڑی۔

جنوب میں وجے نگر کی طاقتور سلطنت بھی تھی۔ بہمنی بادشاہ اس سلطنت کے ساتھ برابر جنگ آزمائی کرتے رہے۔ بہمنی سلطنت کا انتزاع عمل میں آیا اور پانچ مختلف ریاستیں قائم ہوئیں یعنی بیجا پور، بیدر، برار، گولکنڈہ اور احمد نگر۔

ادھر بہمنی سلطنت پانچ حصوں پر تقسیم ہوئی۔ تو ادھر وجے نگر کی سلطنت میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا جس سے فائدہ اٹھا کر ان نو خیز ریاستوں نے باہمی اتحاد کیا۔ پانچویں یعنی برار شریک نہ تھی۔ چاروں نے مل کر ۱۵۶۵ء میں تالی کوٹہ کی جنگ کی جس نے وجے نگر کی عظیم الشان سلطنت کو ہندوستان کی سیاسیات کے صفحے سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔

شکست خوردہ سلطنت کی تقسیم کے بارے میں نزاع پیدا ہوئی۔ ان کی آپس کی حاسدانہ کارستانیوں نے اکبر اعظم کو جو اس وقت دلی میں فرمانروائی کر رہا تھا، بیدار اس کی دیرینہ آرزو بھی کہ مرہٹوں کے جنوبی علاقے کو زیر نگیں کیا جائے۔ خاندیس کے صدر مقام برہان پور دکن کے دروازے

برہان پور پر اس نے ۱۵۹۶ء میں قبضہ جما لیا۔ اس کے بعد سلطنت احمدنگر پر اس کے جغرافی محل وقوع پر نظر کر کے حملہ ہوا۔ چاند بی بی نے پرزور اور دلیرانہ مدافعت کی۔ وہ جی روان تھی لیکن اپنے ایک امیر کے ہاتھوں قتل ہو گئی اور میڈوز ٹیلر کے مشہور رومان کی ہیروئن بنی۔

چاند سلطانہ ہمارے ضلع کے بعض دیہات میں اب تک عزت و احترام سے یاد کی جاتی ہے۔ ایک اہم واقعہ کی یادگار جیکل تھانے میں اب تک موجود ہے جو شہر اورنگ آباد سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس موضع میں ہر سال اس شریف ملکہ کے اعزاز میں دسہرے کے موقع پر سب سے پہلے ایک جھنڈا بلند کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسری رسمیں ادا ہوتی ہیں۔ اس کو دلفریب حسن و جمال کی دیوی کہتے ہیں کرامات اس سے منسوب کی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ جالنہ سے احمدنگر جا رہی تھی تو اثنائے راہ میں جیکل تھانے سے متصل خیمہ زن ہوئی۔ علی الصبح وہ وہاں سے یکایک غائب ہو گئی اور احمدنگر میں پائی گئی۔ اس موضع کے قریب کی جگہ جو اس کی فرودگاہ تھی اب تک "سنگار باڑی" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ نام بھی اس کی دلفریبیوں کی طرف ایک نازک اشارہ ہے۔

چاند بی بی کے قتل کے بعد اکبر نے اپنا اقتدار احمدنگر میں نافذ کر دیا لیکن مدبر اور سخت کوش وزیر ملک عنبر نے شکست نصیب خاندان کو مرتضیٰ کی بادشاہی کا اعلان کر کے از سر نو زندہ کیا اور خود وزیر اور نائب بنا۔

مرتضیٰ کی تاج پوشی کی رسم ملک عنبر نے پرینڈہ (ضلع عثمان آباد) میں ادا کی لیکن وہ دولت آباد واپس آیا اور تقریباً ۱۶۱۰ء میں شہر اورنگ آباد کی بنیاد ڈالی۔ دس سال کے عرصے میں یہ نیا پایہ تخت ایک آباد اور بارونق شہر بن گیا۔ گزیٹر کے بیان کے مطابق اس شہر کی آبادی ملک عنبر کے عروج کے زمانہ میں دو لاکھ کے قریب تھی۔

میں ان اسباب کا ٹھیک کھوج نہ لگا سکا اور نہ کسی تاریخ یا وقائع سے اس پر روشنی پڑتی ہے کہ ملک عنبر نے یہ جگہ کیوں انتخاب کی۔ حالانکہ یہ جگہ دولت آباد کے مقابلے میں کچھ محفوظ نہ تھی۔ دولت آباد اس کے قبضہ میں تھا۔ وہ گزار ہو رہا تھا۔ اور خود بڑا فوجی صدر مقام تھا۔ موجودہ اورنگ آباد شہر بہت ہی ناہموار جگہ پر آباد ہے اور اس کا بہت بڑا حصہ نشیب میں ہے۔

قرین قیاس یہ ہے کہ ملک عنبر چاہتا تھا کہ وہ بیجاپور کی شان اور وجیانگر کے ویران شہر کی قدیم عظمت کے مقابلہ کا ایک شہر آباد کرے۔ گو وجیانگر ہندوستان کے نقشے سے محو ہو چکا تھا لیکن لوگوں کے دلوں میں اس کی یاد تازہ تھی۔

وافر مقدار میں آب رسانی کیلئے اس جگہ کا جغرافی محل وقوع بہت موزوں تھا۔ اس کے شمال میں لاکن واڑا کا پہاڑی سلسلہ ہے اور جنوب میں ستارا کی پہاڑیاں۔ دونوں کے درمیان دس میل کی وادی ہے جس میں ایک دھارا بہتی ہے جسکو کھام ندی کہتے ہیں۔ یہ جگہ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے اس جدت آمیز طریقہ آب رسانی کے لئے بہت موزوں ثابت ہوئی جس نے اپنے بانی کے نام کو زندہ و دائم کر دیا۔

میں ملک عنبر کے گوناگون کارناموں سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میں صرف اس کے ان کارناموں کا مختصراً ذکر کروں گا جو اس نے اس شہر میں انجام دیئے ہیں۔ اس نے نوکھنڈا محل تعمیر کرایا جو اس وقت ویران ہے۔ اس میں پانچ زنانہ عمارتیں، ایک دیوان عام، ایک دیوان خاص اور ایک مسجد تھی۔ اور اس کے ساتھ کئی باغ، حوض اور حمام بھی تھے۔

جامع مسجد اس کی زندگی میں کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے پچاس کثیر الاضلاع ستون ہیں۔

چیتا خانہ ۔ یہ ایک شاندار عمارت تھی جو ویران ہو چکی تھی ۔ یہ عمارت اس نے شہر کے پنڈتوں اور عالموں کے جلسوں کے لئے تعمیر کرائی تھی لیکن اس کے بعد اس مقدس عمارت کو روز بد دیکھنا نصیب ہوا ۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں اس کو مسافرخانہ بنا دیا گیا تھا ۔ اور بعد کو اس میں شاہی شکاری چیتے بھریاں رکھی گئی تھیں کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ وہ مجلس کے طور پر استعمال ہوتا تھا ۔ یہیں شہر کی صفائی کا دفتر چند سال رہا ۔ اب اس کی ترمیم ہو چکی ہے اور پھر ٹاؤن ہال کے کام میں استعمال ہو رہا ہے   شہر کی موجودہ سڑک ایک بڑے سنگین دروازے سے گزرتی ہے جو بھڑکل کہلاتا ہے جس کے معنی قدیم دکھنی زبان میں دروازے کے ہیں ۔

اس کے کارناموں میں سب سے زیادہ نمایاں کام جس کی بدولت اس کا نام زبان زد خاص و عام ہے اس کا طریقہ آب رسانی ہے جس کو اس نے شہر میں جاری کیا تھا شہر سے پانچ میل کے فاصلہ پر ایک ندی سے ایک نہر آتی ہے جس میں ٹنکیوں کا سلسلہ چلا گیا ہے ان سب ٹنکیوں کے پختہ کھلے دریچے ہیں ۔ قوت جاذبہ کے آسان طریقے سے یہ نہر آج تک شہر کی ضروریات کو پورا کر رہی ہے اس کی تکمیل دس سال کے عرصہ ۱۶۱۶ء - ۱۶۲۶ء میں ہوئی ۔

ملک عنبر نسلاً حبشی تھا ۔ اس کی پرورش ایک غلام کی حیثیت سے دربار بیجاپور میں ہوئی تھی بعد کو یہ احمد نگر کے نظام شاہی بادشاہ کی ملازمت میں داخل ہو گیا تھا ۔ وہ دکن کی تاریخ میں اسی طرح مشہور رہے جس طرح کہ شمالی ہند کی تاریخ میں ٹوڈرمل ہے ۔

وہ بہت وسیع المشرب تھا ۔ اس نے اپنے دوستوں کے انتخاب میں کبھی کوئی امتیاز روا نہیں رکھا ۔ اس کے رفیقوں میں شیواجی کا باپ شاہ جی بھی تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک عیسائی گرجا بھی تعمیر کرایا تھا ۔ اسی سال کی طویل و پختہ عمر میں وہ فوت ہوا ۔ اس کا بیٹا فتح خان اس کا جانشین ہوا اس نے وقت کی موزونی کے لحاظ سے کوئی ترقی نہیں کی اور اس کو بھی نہ سنبھال سکا جو کچھ کہ اس کے باپ نے حاصل کیا تھا ۱۶۳۳ء میں فتح نگر مغلوں کے قبضے میں آ گیا ۔

اورنگ زیب نے صوبہ دار دکن کی حیثیت سے اس شہر کو اپنا مستقر بنایا اور ۱۶۳۵ء میں اورنگ آباد کے نام سے موسوم کیا چار سال بعد وہ تخت دہلی پر اس وقت متمکن ہوا جب کہ ٹھیک دو سو سال بعد ایک دوسرا انقلاب ہندوستان میں رونما ہونے والا تھا ۔

عہد مغلیہ کی عمارتوں میں سب سے زیادہ اہم مقبرہ ہے جس کو اعظم شاہ نے اپنی ماں کی یادگار میں تعمیر کرایا ۔ ۱۶۵۰ - ۱۶۵۷ء اس کے لئے جے پور سے سنگ مرمر آیا تھا ۔ اورنگ بیاح کا بیان ہے ۔

"ایک مرتبہ سورت سے گولکنڈہ جاتے ہوئے راستے میں تین سو بیل گاڑیاں جو سنگ مرمر سے لدی ہوئی تھیں ۔ چھوٹی سی چھوٹی گاڑی کے کھینچنے کے لئے بھی بارہ بیل درکار تھے ۔"

معمار کا نام عطاء اللہ تھا ۔ ساڑھے چھ لاکھ روپیہ کی لاگت آئی ۔ یہ عمارت مشہور تاج محل کے جواب میں تعمیر ہوئی تھی جو قریب اسی زمانہ میں تکمیل کو پہنچا تھا لیکن مقبرہ سے اس قدر جلد ویرانی و خرابی کے آثار رونما ہونے لگے کہ باوجود بہت خوبصورت ہونے کے بھی وہ اپنے مد مقابل سے بدرجہا کم تر ہے ۔

یہ مقبرہ ۵۰۰ × ۳۰۰ گز کے احاطے میں ایستادہ ہے ۔ درگاہ مرتفع مربع چبوترہ کے ۱۲ ۔ ۱۲ فٹ اونچے چبوترہ پر ہے ۔ یہ بھی ان

چار میناروں کی بلندی بھی ہے جو چبوترے کے چاروں زاویوں پر واقع ہیں۔ قبر مربع ہے اور ایک بلند نکیلی محراب رکھتی ہے۔ اوپر چار مینار ہیں۔ ان چاروں میناروں سے متوازی چھوٹے چھوٹے گنبد کونوں پر ہیں۔ مرمریں جالی کے دریچے آگرہ کے دریچوں کی طرح نازک ہیں۔ آخر میں جو تنہا سفید ادقی مسالے کا ہاتھ پھیرا گیا ہے۔

۱۶۸۲ء میں شہر پر دھاوا کرنے کے لئے مرہٹے ستارا کی پہاڑیوں کے قرب وجوار میں جمع ہونے لیکن مغلوں کے ایک عظیم الشان لشکر کی آمد سن کر فرار ہو گئے۔ اس کے بعد کے سنین میں شہنشاہ عالمگیر کے حکم سے شہر پناہ تعمیر ہوئی جس کے ہر رخ پر ایک دروازہ تھا۔ شمالی رخ پر دہلی دروازہ تھا۔ اس زمانہ میں جنوب کے تمام اہم شہروں میں اس نام کا اور اسی رخ پر ایک دروازہ تھا حتیٰ کہ پونہ میں پیشوا کے محل کے دروازہ کا نام بھی دہلی دروازہ تھا۔

۱۶۹۲ء میں اورنگ زیب نے قلعہ ارک تعمیر کرایا۔ ارک کے معنی ترکی زبان میں قلعے کے ہیں۔ ارک میں اب مسجد قابل دید ہے۔ ہندوستان میں خوشنما ترین مناظر میں پن چکی ہے جس پر دکن اور اورنگ آباد کو فخر ہو سکتا ہے۔ یہاں شہنشاہ اورنگ زیب کے مرشد بابا شاہ مسافر آسودہ ہیں۔ مسٹر گلیڈسٹن سالمن اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

"میں اس کو ان دلفریب باغوں میں شمار کرتا ہوں جو میں نے مشرق میں دیکھے ہیں۔ متقابلتاً چھوٹی سی جگہ میں وہ اپنے مکمل خاکے کی پوری دلکشی رکھتا ہے۔ اس سے ملحق چند نہایت دلچسپ تاریخی اور مقدس عمارتیں بھی ہیں۔ اس کے حوض اپنی ترتیب کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔ حوض کے قریب جو شاندار ہال ہے وہ میرے دیکھے ہوئے ہندوستانی باغوں میں بے نظیر ہے۔ وہ پھول پتیوں سے ڈھکی ہوئی چھوٹی سی نشست گاہ جو مسجد کی طرف سب سے چھوٹے حوض کے قریب واقع ہے ایک حسن کار کے نقطۂ نظر سے مکمل ہے۔"

روضہ باغ۔ اس میں اورنگ زیب کے ایک استاد اسمٰعیل خان آسودہ ہیں۔ آج کل کوتوالی بنگلہ بنا ہوا ہے۔

اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء میں ہوئی اس کے لڑکوں میں جنگ چھڑ گئی ۱۷۱۳ء میں نظام الملک حیدرآباد کے موجودہ حکمران خاندان کے بانی دکن کے صوبہ دار مقرر ہوئے ۱۷۲۳ء میں وہ آصف جاہ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ دہلی کی سازشوں سے وہ اس قدر بیزار ہو گئے تھے کہ انھوں نے دہلی سے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور ۱۷۲۷ء میں اپنا پایہ تخت حیدرآباد منتقل کر دیا۔

وہ خاص اور قابل ذکر عمارتیں جو عالمگیر کی وفات کے بعد اور آصف جاہ کے زیر نگرانی تعمیر ہوئیں حسب ذیل ہیں۔

مسجد شاہ گنج جو ۱۷۲۰ء میں تعمیر ہوئی۔

بارہ دری عیوض خاں۔ عیوض خان آصف جاہ کی غیر حاضری میں نیابت کی خدمت انجام دیتے تھے۔ یہ بارہ دری انھوں نے تعمیر کرائی۔ اس سے متصل دمڑی محل تعمیر ہوا۔ یہ عمارتیں مزدوروں کی اجرت سے دمڑی دمڑی بچا کر بنائی گئی تھیں۔ بارہ دری میں آج کل صوبہ داری اور اوّل تعلقداری کے دفاتر ہیں۔

یہ شہر اپنے عروج کے زمانے میں تین میل شمال میں کھام ندی تک اور مشرق میں جہنہ بل جنگل جانے تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی آبادی عام طور پر دو لاکھ سمجھی جاتی تھی لیکن اس وقت جب کہ شہنشاہ اس کا دربار، خاندان اور دیوان الشکراوس کے عہدہ دار اور راجگان مع اپنے متعلقین کے یہاں قیام پذیر تھے تو کہا جاتا ہے کہ اس کی آبادی دس لاکھ کے قریب تھی۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ مغلوں کی وسیع و عریض سلطنت کی آمدنی اورنگ آباد پر خرچ ہوتی تھی لیکن آج یہ اپنی عظمت رفتہ کی ایک مٹی ہوئی یادگار ہے۔

جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے اس شہر پر تین شاندار دور گزرے ہیں۔ آصف جاہ نے اپنا زیادہ وقت شہر میں بسر نہیں کیا بلکہ وہ زیادہ تر دہلی میں رہتے۔ عہد عالمگیری میں یہ شہر خاص طور پر فوجی اور سیاسی مرکز بنا رہا۔ اس کی حقیقی عظمت و شان [illegible] اس کے بانی ملک عنبر کے عہد میں گزرا ہے۔ اس وقت وہ علوم و فنون کا مرکز تھا۔ مختلف طبقوں کے لوگ بہ امن و اطمینان ایک دوسرے کے دوش بدوش رہتے تھے۔ اس نے شہر کا جامع مسجد تعمیر کیا، مسجد بنائی، [illegible] محل تعمیر کرایا، [illegible] بنوایا۔ جو صرف [illegible] روایات کو برقرار رکھنے کے لئے کیا گیا۔

شہر اورنگ آباد اپنے اندر رواداری، مساوات، امن اور آزادی کی بہت خوشگوار روایات رکھتا ہے۔ میں مضمون کے اختتام پر اس عظیم الشان شہر کے کھنڈروں کی طرف ایک پیغام سنانے کی جرأت کرتا ہوں۔ وہ پیغام کیا ہے۔ ذات پات اور مذہب کے امتیازات کو مٹانا، شہر کی بہبودی کی خاطر اور اس کی روایات کے شایان شان ترقی کرنے کی طرف بڑھنے کیلئے ایک دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھانا ہے۔

تمام مذہب کی ایک ہی تعلیم ہے۔ وہ محبت کی ہی تعلیم ہے کہ اس دنیا میں بنی آدم کے ساتھ محبت کی جائے۔ میں حافظ کی ایک معنی خیز رباعی پر اس شہر کے بانی ملک عنبر کے احساسات کے لحاظ سے اپنا مضمون ختم کرتا ہوں۔

در صومعہ و مدرسہ و دیر و کنشت — ترسندہ ز دوزخ است و جویان بہشت
آن کس کہ ز اسرار خدا با خبر است — زین تخم در اندرون دل ہیچ نکشت

غلام احمد خاں

([illegible])

"اس میں تاریخ اور افسانے اور واقعات اور تخیل کو اس خوبی سے سمویا ہے کہ قطب شاہی دور کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ بڑی بڑی تاریخوں سے وہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں جو اس چھوٹی سی کتاب میں ہیں اور وہ دلچسپی ہے جو ناول میں ہے۔ اس وقت کی معاشرت کا رنگ بھی اس میں نظر آتا ہے۔ [illegible] بعض بادشاہوں، شہزادوں، شہزادیوں کی تصویریں بھی دی ہیں جس سے کتاب کی دلکشی بڑھ گئی ہے۔" یہ گولکنڈہ کے متعلق مولانا عبدالحق صاحب کی رائے ہے جو انجمن ترقی اردو [illegible] ہے۔ یہ کتاب صرف ۱۵ روپے میں سب رس کتاب گھر یا کتب فروش سے مل سکتی ہے۔

خواتینِ دکن کی اُردو خدمات

منذرجہ بالا عنوان پر ہماری ایک کتاب زیرِ ترتیب ہے، بڑا حصہ مکمل ہو گیا ہے، اس کے ابتدائی اوراق "سب رس" کے ناظرین اور ناظرات کے ضیافتِ طبع کے لئے پیش ہیں۔ امید ہے کہ موجبِ دلچسپی ہونگے

ہاشمی

دکن میں اُردو زبان کی ترویج ساتویں صدی ہجری (بارہویں صدی عیسوی) میں ہو چکی تھی، اس کے بعد وہ بہت جلد بول چال کے درجہ سے گزر کر تحریری صورت میں بھی آگئی، پھر اس نے ترقی کے مدارج مسلسل طے کئے، تا آنکہ آج جامعہ عثمانیہ کے ذریعہ اس کا معراج ہو رہا ہے۔

دکن میں اُردو کی ابتدائی اور اسکی ترقی کا مفصل تذکرہ "دکن میں اردو" کی تیسری اشاعت اور مدراس میں اردو میں قلمبند کر دیا گیا ہے، اگرچہ "دکن میں اردو" کے چند صفحات پر خواتین کا تذکرہ بھی آیا ہے، لیکن اردو کی ترقی میں خواتینِ دکن نے جو حصہ لیا ہے، اس کا کوئی مفصل تذکرہ ابھی قلمبند نہیں ہوا ہے، اس مختصر سی کتاب کا مقصد یہ ہے کہ بعض ان خواتینِ دکن کے کارناموں کی وضاحت کیجائے، جنہوں نے "ہندوستانی" کی ترقی میں حصہ لیا ہے۔

"ہندوستانی" کی ترقی کے لئے دکنی خواتین نے جو خدمت گزاری کی ہے، اسکی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں:۔

(۱) مولفین اور شعرائے اردو کی سرپرستی وغیرہ

(۲) شعر گوئی (۳) نثر نگاری و انشا پردازی (۴) خطابت (۵) صحافت اور انجمنوں کے ذریعہ اردو کی خدمت گزاری۔

ان ہی عنوانوں کے تحت صفحاتِ آیندہ میں خواتینِ دکن کی خدمات کا تذکرہ کیا جائیگا۔

مولفین اور شعرائے اردو کی سرپرستی وغیرہ

خواتین کا مولفین اور شعرا کی سرپرستی کرنا، اور ان کے خدمات کا صلہ دیکر قدر دانی، ہمت افزائی کرنا، درحقیقت زبان کی خدمت گزاری میں داخل ہے، دنیا میں ہر جگہ ایسا ہوتا ہے، اور علما، شعرا فکرِ معاش سے مستغنی ہو کر علمی خدمت میں منہمک اور مصروف ہو جاتے ہیں۔

خواتینِ دکن نے بھی اردو مصنفین اور شعرا کی قدر دانی کی ہے، اور اپنی سرپرستی سے نظم اور نثر میں کتابیں مرتب کرائی ہیں، اس خصوص میں ہم سب سے پہلے عادل شاہی ملکہ خدیجہ سلطان شہر بانو کا نام پیش کرتے ہیں، جو سلطان قلی قطب شاہ کی پوتی، سلطان محمد کی برادر زادی، سلطان عبداللہ کی بہن تھی، اور سلطان محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۷ھ) سے بیاہی گئی تھی اس کے دربار میں کئی نامور شعرا کو بار حاصل تھا، ان میں ملک خوشنود اور رستمی جیسے استادان سر آمد بھی شامل تھے، ملکہ کی سرپرستی سے ملک خوشنود نے کئی مثنویاں لکھیں، جن میں ہشت بہشت اور یوسف زلیخا قابلِ تذکرہ ہیں، رستمی نے دکنی رزمیہ مثنوی کاشنہ کا خاور نامہ

محشر میں تو محشر کرنے والی ہے فاطمہ　　　پھر جو بات کو چلا دیں گے فاطمہ
کر فضل ہو تو اس کو چھڑا دیں گے فاطمہ　　　مظلوم فاطمہ کے حسین علی

گئے دنیا میں کیسا ہے مولوی محی الدین مرحوم

افسوس ہے کہ یہ چودھویں صدی ہو چکی ہے بجز کسی شاعر خاتون کا تعارف کرانے سے لکھا۔ وسعت محدود ہے۔ ممکن ہے کبھی آپ اضافہ کر سکے۔
اس سے قبل چودھویں صدی کے شعراء نسواں کا تذکرہ دیا جاتا ہے جو ان کے تذکرہ ان کی تقسیم کی گئی ہے۔ دور محبوبی دور عثمانی کے
تحت ان کو منتقل کیا گیا ہے فقط

نصیر الدین ہاشمی

اورنگ زیب اور تانا شاہ

"اچھا تو نماز ہو رہی ہے!"

تانا شاہ نے کہا اور ساتھ ہی اس کا چہرہ غصے سے تمتما گیا۔

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ مغل ہمارے شاہانہ بازوؤں کی اتنی تحقیر کریں گے! قلعہ کے اس قدر قریب اور ہمارے تیر و تفنگ کی زد میں کھڑے ہو کر نماز جماعت ادا کرنا مصلحت اور دور اندیشی سے یقیناً بعید ہے! کیا اورنگ زیب جیسا دور اندیش اور ہوشیار بادشاہ بھی غلطی کر سکتا ہے! نہیں ہرگز نہیں یا کیا وہ بھی یہ سمجھتا ہے کوئی ہمارا ایسا نشانہ باز ہے؟"

اورنگ زیب کئی مہینوں سے گولکنڈہ کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ مغل فوجیں چاروں طرف سے ایک عجیب سمندر کی پر جوش موجوں کی طرح قلعہ کی فصیلوں سے آ کر ٹکراتی ہیں اور ہر مرتبہ دکنی سپاہی پہاڑوں کی چٹانیں بن کر انہیں پیچھے ہٹا دیتے ہیں۔ اس وقت آفتاب کی تمازت میں کمی ہو گئی ہے اور نیمہ لشکر اپنی پوری قوت کے ساتھ حملوں پر حملے کئے جا رہا ہے۔ ان صفوں کے ذرا پیچھے دو تین ہموار قطاریں نظر آتی ہیں کیونکہ اورنگ زیب اور اس کے کئی ایک مصاحب بھی نماز کیلئے صف بستہ کھڑے ہیں۔ چند لمحے گذرنے نہیں پاتے ہیں کہ امام یکایک تڑپ کر آگے کی طرف گر پڑتا ہے۔

"خوب! شاباش!! امام رکھ لیا۔ دیکھنا صف میں سے ایک دوسرا شخص امامت کیلئے آگے بڑھ رہا ہے۔　　ہاں پھر وار نہیں۔ کسی امام نے بچنے　　اس کو کہنے ہیں انتقام تحقیر!!"

شاہی حکم بجلی بن کر دوسرے امام پر گرتا ہے اور وہ بھی دکنی گلندا ز کا نشانہ ہو جاتا ہے

دو تین پیش اماموں کے یکے بعد دیگرے اس طرح نذر اجل ہو جانے کے بعد امامت کیلئے صف میں سے آگے بڑھنا کسی معمولی دل و دماغ والے کا کام نہیں! اس سرے سے اس سرے تک پس و پیش کا ایک عجیب عالم چھا جاتا ہے۔ لیکن ابھی چند لمحے بھی گذرنے نہیں پاتے ہیں کہ خود اورنگ زیب امامت کے لئے بڑھتا نظر آتا ہے، اور اب گولکنڈہ کا شاہی نشانہ باز بندوق خالی کرنے ہی کو ہے کہ تانا شاہ دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

"ظالم! کیا ایک بادشاہ کو بھی نشانہ بنائے گا؟ دکھائی نہیں دیتا کہ خود اورنگ زیب اس وقت امام ہے!!"

سید محی الدین قادری زور

ہندوستان کے اکثر صوبوں اور ریاستوں میں زراعت کا حال بالکل ہی مختلف ہے۔ اگر دوسرے ممالک میں دیہی آبادی کی قلت ہے تو ہمارے یہاں دیہی آبادی کی کثرت ہی نے زراعت کی حالت کو خراب کر رکھا ہے۔ اگر ان کے یہاں دیہی آبادی کم ہے تو ہمارے یہاں شہری آبادی کی کمی ہے۔ دراصل ہندوستان کلکتہ، بمبئی، دہلی، حیدرآباد جیسے عظیم الشان شہروں، ان کی سڑکوں، عمارتوں، خوشنما وضع دار بنگلوں، چوڑی سمنٹ دار سڑکوں، جگمگاتی ہوئی دوکانوں کا نام نہیں ہے۔ ہندوستان نام ہے کثیر آبادی کا جو کچے جھونپڑوں یا گھاس کے ٹوٹے ہوئے مکانوں میں رہتی ہے۔ محنت و مشقت سے جھکے چہرے زرد ہیں۔ گال پچکے ہوئے، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں، بدن پر چیتھڑے ہیں۔ جن کی اکثر غذائیں ایسی ہیں جن میں غذائیت کا جز نہیں۔ جن کے بدن کا اکثر حصہ برہنہ و بے لباس ہیں۔ جن کا ماحول ملیریا، انفلوئنزا، ہیضہ، چیچک، طاعون، دق، سل اور اسی طرح کے دیگر متعدی امراض کے جراثیم سے پر ہے۔ جو دنیا کے لئے غذا مہیا کرتا ہے مگر اپنی غذا کے لئے دوسروں کا محتاج ہے۔ جو ہمارے شہروں اور گھروں کی رونق کا باعث ہے مگر خود اس کے گھر اجڑے ہوئے اور بے چراغ ہیں۔ وہ محنت کرتا ہے تو اس کی محنت کے پھل دوسرے کھاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ زراعت کی ان خرابیوں کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا ہر جگہ زراعت میں وہی خرابیاں ہیں جو ہمارے یہاں ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملکی حالات نے مجموعی حیثیت سے زراعت کی حالت کو خراب کر رکھا ہے۔ اور قدرت، سماج، کاشتکار اور حکومت ہر ایک اپنی جگہ پر اس کی تباہی کا ذمہ دار ہے۔

قدرتی اسباب میں سیلاب، خشک سالی، بارش کی غیر مساوی تقسیم، موسموں کی غیر یقینی حالت، کہر، اولا، پالا اور ٹڈی دل شامل ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ان میں سے بعض اسباب کو دور کیا جا سکتا ہے گویا انسان اگر قدرت کے قابو سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا تو کم از کم اس کا تابع اور فرمانبردار بھی نہیں جیسا کہ آج نظر آ رہا ہے۔

مجموعی حیثیت سے سماج پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس نے زراعت کو معزز پیشہ نہ سمجھا۔ دیہاتوں کے متعلق اچھی رائے قائم نہ کی۔ تعلیم یافتہ قوم اور رہنمایان وطن کا فرض تھا کہ وہ اس طرف توجہ کرتے مگر انہوں نے کثیر آبادی کو چھوڑ کر شہری آبادی کو جو کہ ہمارے ملک میں قلت سے ہے اپنی اصلاح کا مرکز بنایا۔ انہوں نے کارخانے کے مزدوروں کیلئے جنکی تعداد ۲۰ سے ۴۰ لاکھ کے درمیان ہے قوانین بنانے اور ان کیلئے سہولتیں بہم پہنچانے کی جانب اپنی توجہ مبذول کی اور ۳۵ کروڑ آبادی سے تغافل برتا۔ اس خصوص میں سب سے زیادہ مورد الزام وہ تعلیم یافتہ اور صاحب حیثیت افراد ہیں جنہوں نے دیہات میں جنم لینے اور پرورش پانے کے بعد دیہات سے لاپروائی اختیار کی۔ یہ اپنی واقفیت اور قدیم اقتدار کی بنا پر بہت کچھ کر سکتے تھے، مگر انہوں نے بھی اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے کیلئے شہروں کو ہی انتخاب کیا۔ ایسی صورت میں یہ کہنا چاہیے کہ ان میں صداقت اور خلوص کا مادہ نہ تھا بلکہ وہ شہرت اور تشہیر کے خواہاں تھے۔ وہ خدمت خلق کرنا نہیں جانتے تھے بلکہ دنیا پر اپنی قابلیت و عظمت کا سکہ بٹھانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ دور افتادہ گاؤں میں یہ ذرائع کہاں، ان کے لئے تو بڑے بڑے شہر ہی موزوں ہیں جہاں جذبہ شہرت کو تسکین دینے کیلئے مختلف قسم کے ذرائع موجود ہیں۔ ذات پات کے طریق کی ذمہ داری بھی سماج ہی کے سر ہے، اس نے کسی کو ادنیٰ اور کسی کو اعلیٰ بنایا۔ سماج نے مذہب کی آڑ لیکر چھوت چھات کی بنا ڈالی، اور ان کو وہ اہمیت دی کہ گویا ان ہی کی ادائی مذہب ہے۔

کی قسمیں دریافت ہو چکی ہیں۔ تحقیقاتی نتائج جانچنے اور نئے آلات یا نئے طریقوں سے زمین کی پیداوار بڑھانے کے لئے مزرعے قائم کئے گئے۔ تاکہ عملی اور معاشی حیثیت سے نتائج کا امتحان ہو سکے۔ کامیاب تجربوں کو کاشتکاروں کے سامنے پیش کرنے نئے تشہیر کی ضرورت پیش آئی تاکہ کاشتکار جن کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا ہے اس سے فائدہ اٹھاسکیں۔ اسوقت محکمۂ زراعت کے تحت دس مزرعے ہیں جہاں یہ کام ہو رہے ہیں۔ فصلوں کی بیماریوں کا علاج، مویشیوں کی بیماریوں اور ان کی نمو و پرداخت کی جانب بھی توجہ ہو رہی ہے۔ مرغیوں کے سلسلہ میں بھی کافی تجربات ہو چکے ہیں۔ دیہی تنظیم کے سلسلے میں ممالک محروسہ میں دیہی تنظیم کا ایک مرکزی بورڈ قائم ہے جس میں باب حکومت کے چار اراکین مالگذاری و صنعت و حرفت کے معتمدین، زائد معتمد مالگزاری، چاروں صوبہ دار، محکمہ ہائے تعلیمات، صحت عامہ و طبابت، زراعت، صنعت و حرفت، معلومات عامہ کے ناظم، امداد باہمی کے رجسٹرار، مارکیٹنگ آفیسر اور سنٹرل کو آپریٹیو یونین کے نمائندے شامل ہیں۔ مرکزی بورڈ ایک عام خاکہ تیار کرتی ہے اور اسکو عملی جامہ پہنانے کے لئے اضلاع اور تعلقوں میں مقامی بورڈ قائم ہیں۔ جن میں سرکاری اراکین بھی شامل ہوتے ہیں۔ غرض دیہی تنظیم کا سب سے اہم مرکز نے، زراعت کی ترقی و اصلاح، مویشیوں کی اصلاح، اور معاشرتی اصلاح نظام عمل کے اہم جز ہیں۔ زراعت کی ترقی میں دوسرا قدم جو اٹھایا گیا وہ مختلف قوانین کا سلسلہ تھا۔ ۱۹۱۳ء کے قانون امداد باہمی جسکی رو سے زرعی اور غیر زرعی انجمن قائم ہوئیں، تعلقہ داری اور مرکزی بنک اور صدر جمعیت اتحاد کا قیام عمل میں آیا۔ اسکا ذکر کیا جاچکا ہے۔ ۱۹۲۳ء سے موازنہ میں امداد باہمی اور تحفظ قحط کی مدات داخل ہوئیں اور تقریباً ۲۰، ۲۲ لاکھ سالانہ کی رقم قرضوں یا امدادی اور تعمیری کاموں کیلئے مخصوص کی جانے لگی۔ ۱۹۳۱ء میں قانون زرعی بازارات کا نفاذ ہوا۔ اسکا مقصد باضابطہ منڈیوں کا قیام تھا تاکہ کاشتکاروں کو غیر منظم منڈیوں کے نقصانات سے محفوظ رکھا جائے۔ باضابطہ منڈیوں میں نیلام یا خیراتی نام سے پیداوار وصول کرنے کی ممانعت کی گئی۔ صحیح اوزان کو رائج کیا گیا۔ تولنے والوں کے لئے اجازت نامہ ضروری قرار پایا۔ خریداروں کو کاروبار کی جملہ کارروائی درج کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اس قانون کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ برطانوی ہند کے قانون کی طرح صرف روئی کیلئے مخصوص نہیں ہے بلکہ اسکا اطلاق تمام زرعی پیداوار پر ہوتا ہے۔

زراعت کی پستی کا ایک بڑا سبب قرضداری ہے۔ کاشتکار مفلس ہے اور اسکو اپنے روزمرہ کی ضروریات مویشی، آلات، تخم خریدنے یا کلیانی اور کٹائی کی اجرت ادا کرنے کیلئے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ رقم وہ ساہوکار سے لیتا ہے۔ ساہوکار نہ صرف گراں شرح سود اور سود مرکب وصول کرتا ہے بلکہ دوسری مختلف ترکیبوں سے بھی کاشتکار کو لوٹنے کی فکر کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کاشتکار کو قرضہ کا بار ابھرنے نہیں دیتا۔ مسٹر ایس ایم بہروچہ جنہوں نے ممالک محروسہ میں زرعی قرضداری کی تحقیقات کی تھی ممالک محروسہ کے زرعی قرضہ کا اندازہ ۶۴½ کروڑ سے کچھ زائد بتایا ہے۔ آپ نے ۱۲۱ مواضعات کی تحقیقات کے بعد زرعی آبادی کے قرضہ کا اوسط ۳۰ روپیہ فی کس بتایا ہے۔ مجھے حال میں ایک موضع کی تحقیق کے سلسلہ میں معلوم ہوا کہ اسکے زرعی قرضہ کی تعداد ایک لاکھ ۴۵ ہزار ہے جبکہ اسکی آبادی ۲۵۶۲ ہے۔ ۵۰ روپیہ فی کس کل آبادی پر اور ۸۰ روپیہ فی کس زرعی آبادی پر قرضہ کا اوسط آتا ہے۔ مسٹر بہروچہ نے بتایا ہے کہ دس لاکھ ایکڑ مزروعہ زمین میں سے ۳ لاکھ ایکڑ مکفول ہو چکی ہے اور ایک لاکھ ۶۰ ہزار ایکڑ کاشتکاروں کی ملکیت سے نکل کر قرض خواہوں کے قبضہ میں جا چکی ہے۔ تصویر کا یہی ایک بھیانک اور تاریک رخ تھا جس نے ان مختلف خرابیوں کے انسداد کیلئے حکومت کو فوری اقدام پر مجبور کیا اور

معالجت قرضہ، قرض دہندگان اور انتقال اراضی کے قوانین دستور العمل نافذ ہوئے۔ گرچہ ان میں بعض خامیاں ہیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان سے کاشتکاروں کو بڑا فائدہ پہونچنے کی امید ہے۔ یہ تو ڈوبتے ہوئے کیلئے سہارا ہے اور جو ڈوبنے سے بچ گئے ہیں ان کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہیں۔

دیہی تنظیم کا کام جو ریاستوں یا صوبہ داری حکومتوں کے یہاں بہت ہی شاندار نظر آتا ہے فی الحقیقت اس قدر شاندار نہیں ہے۔ ہندوستان جہاں تقریباً ۷ لاکھ گاؤں ہوں وہاں چند سو دیہی مرکزوں کی وہی مثال ہے جیسے سمندر میں چند قطرے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آخر یہ کام کس طرح ہو؟ کیا موجودہ طریقہ کو جاری رکھا جائے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ڈیڑھ دو سو برس بعد ہم وہاں پہونچیں گے جہاں دنیا آج ہے گویا دنیا سے دو صدی پیچھے رہنا ہماری قسمت میں لکھا ہے۔ کسی حکومت سے یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ ہر گاؤں کو دیہی تنظیم کا مرکز بنا دے اور دس پانچ سال میں ملک کی حالت بدل دے۔ اس طرح یہ سب اہم مسئلہ کی چھوڑ نہ ہوئی بلکہ ٹالا جاسکتا ہے اور نہ اسکا لازمی یقین۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسا پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے جسکا کوئی حل ہی موجود نہ ہو۔ حل موجود ہے مگر اس میں مشکلات ہیں اور ان پر غالب آنا ہمارا کام ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مسئلہ حکومت، سماج، مصلحین معاشرت، محبان وطن اور سب سے زیادہ اور سب سے اہم تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اشتراک سے طے ہوسکتا ہے۔

یہ سمجھنا کہ اصلاح دیہات کیلئے کثیر رقم کی ضرورت ہے ایک گمراہ کن خیال ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر نئے کام کیلئے روپیہ کی سخت ضرورت ہوتی ہے اسی طرح دیہات سدھار کیلئے بھی کچھ روپیہ کی ضرورت ہے۔ مگر روپیہ سے زیادہ ایسی چیزوں کی ضرورت ہے جنکو روپیہ مہیا نہیں کرسکتا۔ ان چیزوں کو خلوص، ہمدردی، ایثار، قربانی اور احساس کہا جاتا ہے۔ ہمارے سامنے ایسے کامیاب ادارے موجود ہیں جن کے پاس ابتداً میں سرمایہ بہت قلیل تھا مگر کام کرنے والوں میں مذکورہ بالا خصوصیات موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جس سرعت، تیزی اور استقلال سے کام کیا کسی کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ دیہات سدھار کے سلسلے میں متعدد کام ایسے ہیں جن میں روپیہ کی قطعی ضرورت نہیں اور متعدد کام ایسے ہیں جن میں روپیہ کی بچت ہوتی ہے۔

ہم اپنے کسان کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میں بھلائی اور برائی سمجھنے کی تمیز نہیں یا وہ نفع و نقصان میں امتیاز نہیں کرسکتا بلکہ اس کے باوجود وہ برائی کیطرف کھنچا نظر آتا ہے اس کی وجہ قسمت پرستی ہے۔ اس میں آگے بڑھنے کا شوق اور راہ جاننے کی امنگ مفقود ہوچکی ہے۔ اس قنوطیت کا اصلی سبب وہ حالات ہیں جو برسوں سے اس کو اپنا شکار بنائے ہیں۔ انیسویں صدی کے ابتدائی حصہ میں ہمارے ملک میں امن و امان نہ تھا۔ حملہ آور، رہزن اور پنڈاروں کی ٹولیوں سے اسکے کھیتوں کو روندتے تھے۔ کبھی فصلیں کاٹ لیتے یا ان کو جلا دیتے تھے جب ملک میں امن و امان قائم ہوا تو حملہ آوروں کا خوف کم ہوگیا مگر سیلاب، خشک سالی، اولا، پالا اور ٹڈی دل سے اس کی فصلوں کو نقصان پہونچتا رہا۔ مختلف بیماریاں اسکو اپنا لقمہ بناتی رہیں۔ رفتہ رفتہ اس کو یقین ہوگیا کہ ارضی و سماوی مصیبتیں انسان کی بدکرداریوں کا نتیجہ ہیں۔ اس نے قدرت کو غیر منصف تصور کرلیا۔ مگر یہ سوال اس کے ذہن میں پیدا ہوتا تھا کہ قدرت خصوصیت سے اس پر ظالم کیوں ہے۔ اس بات کا کھوج نہ لگانے کی وجہ سے اس کے ذہن میں یہ احساس قوی تر ہوگیا کہ اپنی بھلائی اور برائی کا کوئی کام وہ خود نہیں کرسکتا۔ اس کی قسمت کو بگاڑنے یا بنانے والی ایک ایسی ہستی ہے جس پر اس کا قابو نہیں۔ اس لئے اس نے اپنے تمام کام اسی کے حوالے کر دئے نتیجہ

قسمت پرست یا قناعت پسند اور بالفاظ دیگر دوسست، کاہل اور نکما ہو گیا۔

آج سے چند سال پہلے اس میں سے اکثر چیزوں کو برداشت کیا جا سکتا تھا، مگر اب سائنس، فن انجنیری، فن زراعت، اور علم طب کی ترقی نے انسان کا قابو قدرت پر بڑھا دیا ہے۔ گویا قسمت پرستی کا دور ختم ہو گیا اگر وہ ہنوز قسمت پرست ہے، اس میں یہ احساس پیدا ہو گا کہ ماضی ختم ہو چکا ہے اور جو انکا مستقبل سامنے ہے وہ ماضی کا دلدادہ ہے اور حال و مستقبل کے فکر سے بے نیاز ہے۔ ماضی خواہ کتنا ہی شاندار کیوں نہ ہو اس کو یاد کرنا بیکار ہے، گزرا ہوا زمانہ واپس نہیں آتا۔ آنے والے زمانہ کی فکر کرنا اور اسکو خوشگوار بنانا سب سے اہم فریضہ ہے۔

دیہی زندگی جمود و سکون کا نام ہے، وہاں بے حسی، غفلت اور ناواقفیت کے دیوتاؤں کا راج ہے، ان کے دل مردہ اور پژمردہ ہیں، ضرورت ہے کہ ان کے جمود و سکون کو توڑا جائے، بے حسی اور غفلت کے پردوں کو چاک کیا جائے، مردہ دلوں میں اور پژمردہ امیدوں میں شوق اور امنگ پیدا کی جائے، ان کو بیدار کر کے متحرک اور جاندار بنا دیا جائے، ان کے رگ و ریشہ میں برقی رو دوڑا دی جائے ان کو خود اعتمادی کا سبق پڑھایا جائے، یہ کام ملک کے نوجوان ہی انجام دے سکتے ہیں۔ یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ ان کی یہ صلاحیتیں مٹ چکی ہیں۔ کانگریس نے برسر اقتدار آنے سے پہلے چھوٹے چھوٹے دیہات میں زندگی کی روح پیدا کی تھی، اور خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر دیا تھا۔ وہ اس قوت کو حکومت سے ٹکرانا چاہتی تھی جس میں اس کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی، مگر جس طرح سادہ لوح کسان بھٹک گئے، اور جب کانگریس نے عہدے قبول کر لئے تو وہ اس نئی حکومت سے ٹکرانے لگے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسانوں میں آگے بڑھنے، اور ترقی کرنے کے جراثیم ضرور موجود ہیں، اب اس کا انحصار کام لینے والوں پر ہے کہ وہ ان کا رخ کس طرف پھیرتے ہیں۔

میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان یا ممالک محروسہ سرکار عالی جیسے زرعی خطوں کے دیہات کی اصلاح حکومت کے بس کی بات نہیں ہے، حکومت بزور قانون اصلاح نہیں کر سکتی، اصلاح کا احساس خود پس ماندہ لوگوں میں پیدا ہونا چاہئے۔ جبری اصلاح کا ہمیشہ یہ خاصہ رہا ہے کہ جب جبر اٹھا لیا گیا اصلاح ختم ہو گئی، ضرورت ہے کہ ملک کے سنجیدہ، مخلص اور ٹھوس کام کرنے والے تعلیم یافتہ نوجوان دیہات میں مستقل سکونت اختیار کریں اور اپنا ایک نصب العین بنا کر اس کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔ کام کرنے والوں کو اپنے آپکو حاکم یا مخدوم نہ سمجھنا چاہئے بلکہ وہ کاشتکاروں کے دوست، مشیر کار اور خادم بننے کی کوشش کریں، مخدوم بننا آسان ہے اور خادم بننا مشکل۔ ان کو اسکا بھی خیال رکھنا ہو گا کہ گاؤں ہماری تہذیب کا قدیم ترین مرکز ہے، کسی قدیم شئے کو مٹا کر اس کی جگہ اسی مسالہ سے نئی عمارت تعمیر کرنا آسان نہیں، ان کو ابتدا میں مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا ہو گا ان کو قدم قدم پر ناکامیوں کا منہ دیکھنا ہو گا، ان کو دلی اذیت اور روحانی تکلیف بھی ہو گی کہ جو چیزیں جن کی بھلائی کے لئے پیش کیا رہی ہیں وہی اس کو ٹھکرا رہے ہیں، مگر ان کو نا امید نہ ہونا چاہئے اور غم و غصہ سے الگ رہ کر خلوص سے کام کرتے رہنا چاہئے۔ خلوص اور قربانیوں کا درخت پھل ضرور لائیگا اور بار آور ہونے میں جتنا زیادہ عرصہ لگے گا اتنے ہی اسکے پھل عمدہ اور شیریں ہوں گے۔

محمد احمد سبزواری

یعنی یہ چمڑے کی بنی ہوئی ہونے سے ہندو لوگ مذہبی نقطۂ نظر سے اس کا پانی پینا جائز نہیں سمجھتے۔ اس وجہ سے اس کی طلب کم ہوئی۔ لیکن یہ یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ پہلے بھی ہندو مسلمان یہ دو فرقے تھے پہلے یہ صنعت انہیں معاشرتی حالات میں عروج پر تھی۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زوال کی محض یہی ایک وجہ نہیں ہے۔ بلکہ بڑی وجہ یہ ہے کہ آج کل جدید قسم کے گاگلٹ ملتے ہیں جو بڑے چھوٹے ہونے میں اس وجہ سے ایک سے دوسری جگہ لے جانے میں آسانی ہوتی ہے اور وہ سستے بھی ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی طلب بڑھی اور چھاگلیں پیچھے رہ گئیں۔ اس کے باوجود بھی صنعت باقی رہتی اگر عہدہ داران مقامی اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاتے بالخصوص پولیس کے ملازمین سے ان لوگوں کو اس بارے میں خوب نقصان پہنچا۔ پہلے ہی ان کی صنعت کمزور اور کچھ مقامی بازاروں میں بکتی تھیں لیکن اس حالت میں ان ملازمین نے ہر سال موسم گرما میں کئی چھاگلیں مفت لینی شروع کیں۔ اس وجہ سے انہیں نقصان ہوا اور انھوں نے اس میں اپنی خیریت دیکھی کہ اس پیشہ ہی کو چھوڑ دیا جائے۔

انہیں وجوہات کی بنا پر وہ لوگ زراعت میں منتقل ہو گئے اور ملک کی ایک صنعت مٹ گئی۔ اب اس کو ترقی دی جاسکتی ہے لیکن وہ بہت گراں بار ثابت ہوگی۔ اگر ان لوگوں کو حکومت بغیر سود کے قرضہ دے یا انہیں مزدوروں کی حیثیت سے چھاگلیں بنانے کے لئے نوکر رکھے، اور اس کی نکاسی اپنے ذمہ لے تو یہ صنعت پھر زندہ ہوسکتی ہے۔ اب چونکہ اس صنعت کی زیادہ طلب نہیں ہے اور اس میں کام کرنا نفع بخش نہیں ہے اس لئے اس پیشہ میں زیادہ لوگ نہیں ہیں لیکن اگر اس میں فائدہ کی امید ہو تو اب بھی کم از کم ۳۰۔۴۰ لوگ اس پیشہ میں شریک ہوں گے اس کی نکاسی شہروں کے بجائے بڑے بڑے دیہاتوں میں ہوگی۔ اس صنعت کی تحقیق سے مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اب اس میں تازہ روح پھونکنا مشکل ہے لیکن پھر یہ خیال آیا کہ اس صنعت کے زوال کے اسباب پر نظر ڈالنے سے اور اس کی طرف آپ لوگوں کی توجہ مبذول کرنے سے ممکن ہے ملک کی دوسری صنعتیں جو اسی راہ پر لگی ہیں فنا ہونے سے بچ جائیں کیونکہ اب بھی میں بعض سرکاری ملازمین کو دیکھتا ہوں کہ وہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو اپنی ہی ذاتی ملک سمجھتے ہیں۔ او کسی چپراسی یا عہدہ دار کو صناعوں کے مکان پر بھیج کر ایک دو چیزیں بے تکلفی سے منگوا لیتے ہیں۔ یہ بات ایک شخص کے لئے ایک وقت کیلئے معمولی ہے لیکن بعض اوقات یہ معمولی بات مہلک ثابت ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے لوگ بیروزگار ہو جاتے ہیں۔

اب ہم بیڑ کی دوسری صنعت پر غور کریں گے۔ اس صنعت کا نام گپتی کی صنعت ہے۔ اس کو وجود میں آئے ہوئے کوئی پچاس سال ہوتے ہیں۔ آپ میں سے اگر کسی نے بیڑ کی بنی ہوئی گپتی دیکھی ہوگی تو اس پر ضرور آپ نے جان محمد کا نام انگریزی میں یا اردو میں لکھا ہوا پڑھا ہوگا۔ یہ شخص شروع میں تلواریں بناتا تھا لیکن نہ معلوم اسے کیا سمجھائی دیا کہ اس نے تلوار بنانا چھوڑ کر گپتیاں بنانی شروع کیں۔ اب یہ شخص زندہ نہیں ہے اس کا بیٹا شیخ احمد نام موجود ہے جس کی عمر اب (۶۰) سال کی ہے اور جس کا ایک بیٹا اور دو نواسے ہیں جو اس کے ہاں یہی کام کرتے ہیں عموماً ان کے ہاں تین چار نوکر رکھے جاتے ہیں۔ اور ضرورت کے لحاظ سے ان نوکروں میں اضافہ بھی کیا جاتا ہے۔ اس طرح اس صنعت میں کوئی (۸) اشخاص ہمیشہ لگے ہوتے ہیں۔

گپتی بنانے کے لئے بیر اور ساگوان کی لکڑی استعمال کی جاتی ہے۔ اس میں سے بیر کی لکڑی تو بیڑ ہی میں ملتی ہے لیکن ساگوان کی لکڑی احمد نگر او بمبئی سے منگاتے ہیں یا وہاں بھی کسی دوکان سے خریدتے ہیں۔ گپتی کے لئے فولاد کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی بمبئی

سے منگایا جاتا ہے۔ گپتیاں اس قدر بہترین بنائی جاتی ہیں کہ اس کی جلد شناخت نہیں ہوتی کہ آیا یہ لکڑی ہے یا تلوار۔ جھنبے بھی بنائے جاتے ہیں۔ لکھنے کے قلم میں فولاد کا بیتہ بٹھایا جاتا ہے گویا لکھنے کا قلم ہی گپتی ہے۔ اس طرح یہ چاقو بھی بناتے ہیں۔ گپتیوں پر بارہ سنگھے، چاندی، لکڑی اور جرمن سلور کے دستے بنائے جاتے ہیں۔ ان دستوں پر مختلف نقش و نگار اور تصاویر کھینچی جاتی ہیں۔ اور خریدار کا نام بھی خواہش کرنے پر کھودا جاتا ہے۔ گپتی کی اصیل تلواری اور فولادی اس طرح دو قسمیں ہیں۔ اصیل تلواری درجۂ اول ۲۵ روپیوں میں اور درجہ دوم ۲۰ روپیوں میں بکتی ہیں۔ فولادی گپتی درجۂ اول (۱۵) روپیہ میں اور درجہ دوم (۱۲) روپیہ میں فروخت ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ معمولی گپتیاں ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، روپیوں میں خوبی کے لحاظ سے بیچی جاتی ہیں۔ ایک شخص ایک گپتی دو دن میں مکمل تیار کر سکتا ہے۔

ان لوگوں کو مختلف نمائشوں میں تمغے ملے ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد میں جو نمائشیں ہوئیں ان میں ان کو تمغے ملے ہیں۔ نواب نعمت یار جنگ بہادر صوبہ دار اورنگ آباد اور بعض تعلقداروں نے بھی تمغے دیئے ہیں۔ اور اصل میں پہلے ایسے ہی عہدہ داران افزائی کر کے صنعتوں کو باقی رکھتے تھے۔

ان لوگوں کا پیشہ محض گپتی سازی ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اپنی صنعت کی تشہیر نہیں کرتے۔ جو لوگ بیڑ کے رہنے والے ہیں یا جو ملازمین بیڑ سے تبادلہ ہو کر دوسرے اضلاع میں جاتے ہیں ان کے ذریعہ سے اس صنعت کی تشہیر ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی طرح یہ صنعت کسی قدر مشہور ہوئی اور اب ان کے پاس اورنگ آباد، ناندیڑ، پربھنی، ونلگل، نظام آباد، گلبرگہ سے گپتیوں کے لئے آرڈر آتے ہیں۔ موجودہ کساد بازاری کا اثر ان پر بھی پڑا ہے۔ پانچ سات سال پہلے ان کی خالص آمدنی ۱۵۰ ، ۲۰۰ روپیہ تھی لیکن اب ۱۰۰ ، ۱۲۵ روپیہ ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ پانچ سات سال پہلے ان کے دو نواسے کام نہیں کرتے تھے۔ ان لڑکوں کو مڈل تک تعلیم دی گئی ہے۔ انھوں نے برٹش انڈیا میں اس صنعت کی تجارت کرنے کی اجازت حاصل کی تھی لیکن بعد انہیں منع کیا گیا۔ آجکل فیشن کے لحاظ سے لوگ لکڑی ہاتھ میں پکڑاتے نہیں اس وجہ سے گپتی کی خرید بھی کم ہوتی ہے۔

اگر حکومت ان صناعوں میں سے ایک کو صنعت و حرفت کے مدرسہ میں ملازم رکھے تو کئی لوگ اس فن سے واقف ہو جائینگے تنخواہ ۱۰۰ روپیہ ماہانہ کی تنخواہ پر آنے کے لئے راضی ہے۔ یہ مطالبہ میرے خیال میں ضرورت سے زیادہ ہے۔ میں نے اس سے اپنا شبہ ظاہر کیا تو اس نے جواب دیا کہ لوگ ملتے بھی نہیں ہیں۔ اگر حکومت رکھے تو ہمیں کو رکھے ان کے پاس سرمایہ نہ ہونے سے یہ ترقی نہیں کر سکتے اگر انہیں سرمایہ بہم پہنچایا جائے تو یہ مشین کا بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک مشکل یہ پیش آتی ہے کہ مذہبی خیالات کے لحاظ سے یہ لوگ بغیر سود کے قرضہ چاہتے ہیں۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لئے حکومت یہ کر سکتی ہے کہ محکمۂ پولیس میں کرچ اور بایونٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر محکمۂ پولیس کرچ اور بایونٹ انہیں کے پاس سے خرید ے اور انہیں کچھ امداد دے یا پہلے کچھ قیمت ادا کرے تو ان کو سرمایہ ملیگا اور مشین استعمال کر سکیں گے۔ اب وہ اپنے ہاتھ سے روغن تیار کرتے ہیں۔ اگر گپتیاں کثیر مقدار میں بنائی جائیں اور انکی کھپت بھی ہو تو یہاں روغن کی صنعت بھی ترقی کر سکتی ہے۔ اس صنعت کی عمر ابھی چھوٹی ہے۔ اس لحاظ سے ابھی اس میں ترقی کی گنجایش ہے۔ اس کے لئے انہیں اصل مہیا کرنا چاہئے اور صنعت کی تشہیر، نکاسی کا بندوبست کرنا

چاہئے۔ آج کل تشہیر نہ ہونے پر بھی ان کو ۱۵۰ ۔ ۲۰۰ روپیہ ماہانہ ملتے ہیں اگر ان کا اشتہار کیا جائے تو ہم کساد بازاری کے زمانہ میں بھی زیادہ آمدنی ہوگی اور ساتھ ہی ملک کی ایک صنعت ترقی کرے گی جس میں ابھی بہت سے مزدوروں کی کھپت ہو سکتی ہے۔ ایک شہری

ایک غمگین صبح

اپنے عالی حوصلہ شاہوں کے گُن گاتی ہوئی
اٹھ رہی ہے سطح سے یہ موج لہراتی ہوئی

ہر ادا میں شان ہے "شاہوں کے استقبال" کی
ساحلِ ماضی سے ٹکراتی ہیں موجیں حال کی

بس گئی دنیا اجڑتی تھی ابھی اجڑی نہ تھی
بات یوں آس کی بنی جیسے کبھی بگڑی نہ تھی

اس کے سینے میں تمنا کی تپش باقی رہی
مادی رونق میں روحانی کشش باقی رہی

اس کی موجوں کو نظر سے چومتا تھا آسماں
اب بھی خاموشی سناتی ہے وہ خونیں داستاں

قافلہ گذرا تھا جب اس پر سے تاناشاہ[1] کا
اس نے گذرا نا تھا تحفہ نالۂ جانکاہ کا

بے کسی میں اپنے شہ کی دے دیا جو بھی تھا پاس
اس کے پانی نے بجھائی تھی خدا بندے کی پیاس

داغِ دل بن کر قطب شاہوں کے ہیں نقشِ قدم
سوکھنے پاتا نہیں اس کا کبھی دامانِ نم

سیر کرنے والے ان رنگینیوں میں کھو نہ جا
حال کے جلووں میں یوں ماضی سے غافل ہو نہ جا

قہقہوں کی گونج میں پوشیدہ آہوں کو نہ بھول
ذرّہ ذرّہ کہہ رہا ہے قطب شاہوں کو نہ بھول

رو رہا ہے آسماں یہ شبنم افشانی نہیں
اشک کا سیلِ رواں ہے دیکھ یہ پانی نہیں

میکش

[1] تاناشاہ کا اکلوتا فرزند

دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا

اردو مثنوی، دوسرے اصناف کی طرح اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے۔ اس کی مقبولیت، اس کی خصوصیات اور اس کے لوازم مختلف زمانوں میں کچھ نہ کچھ بدلتے رہے ہیں۔ اس کا پورا سرمایہ کم و بیش سو سال کی پیداوار پر حاوی ہے۔

مثنوی کو دوسرے اصناف کے مقابلہ میں میسر دیکھنے کی بعض وقت ضرورت اور خواہش اس وجہ سے داعی ہوتی ہے کہ یہ صنف چند معین خیالات کے اظہار کا آلہ رہی ہے چنانچہ اس کی اصطلاحی آسانیوں کی وجہ سے ابتدا میں صوفیائے کرام نے اس کو ذریعہ بنایا تھا۔ بعد میں جب یہ زیادہ ادبی بن گئی تو قصے کے ساتھ اس کا پیوند لگا۔ اس کے بعد ایک زمانہ اس پر ایسا بھی آیا کہ یہ کسی قدر کم طویل قصوں یا مرقع کی نظموں کی صورت میں فروغ پاتی رہی۔ موجودہ زمانہ میں یہ صنف ظاہری شکل و صورت اور معنوی ہر اعتبار سے بہت کچھ بدل گئی ہے۔

اس طرح اردو مثنوی کی پوری ڈھائی صدی کو ہم چند منازل میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ مثلاً (۱) ابتدائی عہد کے مثنوی پارے جو زیادہ تر صوفیائے کرام کے تشبیہات پر مشتمل ہیں۔ یہ موجودہ مسلمہ الفاظ میں بھی ہوئی ایسی بھاشا کے نمونے ہیں جن میں عربی اور فارسی کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ ان کی تحریریں عموماً بہت کم ہیں اور یہ منتشر پارے ساتویں صدی ہجری کے نصف آخر سے لے کر دسویں صدی ہجری کے زمانہ پر حاوی ہیں۔ (۲) دوسرا دور ابتدائی مکمل اور طویل مثنویوں کا ہے۔ اس میں پنجاب، گجرات اور بیجاپور کے ابتدائی دور کے چند کارنامے شامل ہیں۔ اور یہ تقریباً سب کے سب ارشاد و ہدایت اور تصوف و عرفان کے حامل ہیں۔ ان میں قابل ذکر گجرات کے حضرت خوب محمد چشتی کی مثنوی "خوب ترنگ" اور بیجاپور کے ایک نہایت مقدس بزرگ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق اور ان کے خاندان کے ملفوظات ہیں جو نظم اور نثر دونوں پر مشتمل ہیں۔ اسی دور میں اردو مثنوی کا حقیقی ڈول ڈالا گیا۔ اور اس کے آخری زمانے کا تعلق دکن اور خاص طور پر بیجاپور سے ہے۔

دکن میں مثنوی کا ارتقا ڈھائی سو سال سے زیادہ مدت پر حاوی ہے۔ حضرت شاہ میراں جی کی وفات ۹۰۲ھ میں ہوئی آپ کے زمانہ سے لیکر ۱۱۶۰ھ یعنی حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی کی مثنوی "بوستان خیال" کی تحریر تک مثنوی کو مسلسل اور خاطر خواہ ترقی ہوتی رہی۔

اس ڈھائی سو سال کے طویل عرصہ کی پیداوار کو ہم کم سے کم تین عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا عنوان عہد زرین کی مثنویاں۔ دوسرا عنوان عہد مغلیہ کی مثنویاں اور تیسرا عنوان آصفجاہی عہد کی دکنی مثنویاں ہو سکتی ہیں۔ اس طرح پہلا عنوان اردو مثنوی کے ارتقا کا گویا تیسرا باب ہوگا اور دوسرا اور تیسرا عنوان بہ ترتیب چوتھا اور پانچواں باب۔

حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کی ولادت مکہ معظمہ میں ہوئی تھی۔ آپ اوائل عمر میں ہندوستان تشریف لائے اور بیجاپور کو اپنا مستقر بنایا۔ آپ کے علم و فضل، تقدس اور سیرت کے اثرات نے ارادت مندوں کا ایک بڑا گروہ آپ کے اطراف جمع کر دیا تھا۔ چونکہ ان میں سے اکثر عربی زبان سے ناواقف اور فارسی سے بھی کچھ زیادہ مانوس نہیں تھے اس لئے آپ نے خود ان کی زبان سیکھی اور اسی میں ارشاد و ہدایت فرمائی۔ یہ ملفوظات آپ کے مریدین اور معتقدین نے عوام کے فائدے کی خاطر لکھ لئے۔ اس وقت اسی طرح

کے کئی مخطوطے دستیاب ہوتے ہیں، جو اسی قدیمی زمانہ کے لکھے ہوئے ہیں، اور نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہیں۔

نظموں میں آپ کی مثنویاں "خوش نامہ" اور "خوش نغز" کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں شامل ہیں۔ ان کے اقتباسات، موجودہ زمانے کی اکثر ایسی کتابوں میں شائع ہو چکے ہیں، جو اس دور سے متعلق ہیں۔

حضرت شاہ میراں جی کے فرزند، حضرت شاہ برہان الدین جانم بھی بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ آپ کے ملفوظات میں "سکھ سہیلا" "منفعت الایمان" اور "ارشاد نامہ" وغیرہ اب منظر عام پر آچکے ہیں۔ اسی طرح حضرت شاہ برہان الدین جانم کے فرزند حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ کے ملفوظات میں بھی کئی نظمیں اور کسی قدر طویل مثنویاں شامل ہیں۔ ان میں "رموز السالکین" "نظم وجودیہ" "نظم قربیہ" "محب نامہ" قابل ذکر ہیں۔ اس خاندان کے ارشادات تمام تر مذہبی اور صوفیانہ خیالات پر مشتمل ہیں۔

اسی طرح کے اور بھی نظم و نثر کے رسالے موجود ہیں، جو صوفیائے کرام کے ملفوظات پر مشتمل ہیں۔ یہ رسالے زیادہ تر بیجاپور کے ابتدائی چار حکمرانوں کے عہد سے متعلق ہیں۔

دکن کی ادبی تاریخ بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ) اور گولکنڈے کے محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کے عہد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان دونوں سلاطین کی سرپرستی میں، ادبی ذوق کی ترقی شروع ہوئی اور بلند پایہ شعرا نشو و نما پانے لگے۔ ان میں محمد قلی کے درباری شاعر، وجہی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جس کی مثنوی "قطب مشتری" (۱۰۱۸ھ) عمدہ شاعری کا کارنامہ ہے۔ وجہی کے بعد اس فن کو سب سے زیادہ ترقی، عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے عہد کے مشہور ملک الشعرا شاعر غواصی نے دی۔ غواصی کی دو مثنویاں "سیف الملوک و بدیع الجمال" (۱۰۳۵ھ) اور "طوطی نامہ" (۱۰۴۹ھ) قدیم اردو کے ترقی یافتہ اور بسیط شعری کارنامے ہیں۔ اس نے اردو مثنوی کو جس معیار تک پہنچا دیا تھا، وہ بعد کے شعرا کے لئے نمونہ بن گیا۔

مقیمی جو اسی عہد کا شاعر ہے اور بیجاپور کے ابتدائی ادبی مثنوی نگاروں میں سے ہے، اپنے آپ کو غواصی کا خوشہ چین بتلاتا ہے۔ اس کی مثنوی "چندر بدن و مہیار" جو ۱۰۴۰ھ سے قبل لکھی گئی ہے، ادبی اعتبار سے زیادہ اہمیت تو نہیں رکھتی، لیکن اس کا قصہ عرب کے، لیلیٰ مجنوں کے قصے کی طرح بے حد مشہور رہے۔

مقیمی کے زمانے سے مثنوی لکھنے کا طریقہ بیجاپور میں عام ہو گیا۔ اب مذہبی مثنویوں کے بجائے ادبی مثنویاں لکھی جانے لگیں۔ چنانچہ امین جو مقیمی ہی کا معاصر اور ہم وطن تھا، اس کے اثر سے فارسی کے ایک قصے کا ترجمہ "بہرام و حسن بانو" کے نام سے کیا۔ لیکن اس کی تکمیل وہ نہ کر سکا۔ اور بعد کے ایک بیجاپوری شاعر دولت نے ۱۰۵۰ھ میں اس کی تکمیل کی۔

مقیمی تک زیادہ تر اردو مثنویوں کا مواد یا تو طبع زاد ہوتا تھا یا برج بھاشا سے ماخوذ صرف محمد قلی کے زمانے کے ایک شاعر، احمد نے فارسی سے استفادہ کر کے "لیلیٰ مجنوں" لکھی تھی۔ لیکن "بہرام و حسن بانو" کے بعد سے جو مثنویاں اردو میں لکھی جانے لگیں ان میں زیادہ تر فارسی مثنویوں سے استفادہ کیا گیا۔ چنانچہ اس زمانے میں محمد عادل شاہ کے دربار کے ایک شاعر صنعتی نے ۱۰۵۵ھ میں حضرت تمیم انصاری صحابی رسول کی مہمات کے ایک قصے "قصۂ بے نظیر" کا ترجمہ کیا۔ اور اس کے دوسرے سال اسی کے ہم وطن شاعر، ملک خوشنود نے "ہشت بہشت" کو

اردو نظم کا جامہ پہنایا۔ ۱۰۵۹ھ میں بیجاپور ہی کے ایک اور شاعر کمال خاں رستمی نے ابن حسام کے مشہور فارسی رزمیہ "خاور نامہ" کو نظم کیا۔ یہ اردو کی پہلی قابل ذکر رزمیہ مثنوی ہے۔ نہ صرف اس لحاظ سے، بلکہ بیان اور زور قلم کے اعتبار سے بھی یہ کارنامہ قابل قدر ہے۔

"خاور نامہ" کے بعد جو مثنوی لکھی گئی وہ گولکنڈے کے شاعر جنیدی کی "ماہ پیکر" (۱۰۶۱ھ) ہے لیکن اس کا مخطوطہ اب نایاب ہے۔ اس کا ذکر مختلف حوالوں کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس کے دو سال بعد گولکنڈے کا ایک اور شاہکار لکھا گیا یعنی ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" ہے جو اس میں شک نہیں کہ ایک فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے لیکن آزاد ہے چنانچہ اس میں جگہ جگہ ماحول اور عہد کے اثرات نمایاں ہیں۔ غواصی کے بعد یہ دوسرا بڑا اور اسی کی ٹکر کا شاعر تھا جس نے مثنوی کے معیار کو، اسلوب اور تکمیل کی حد تک بلند کیا۔ بعد کے شاعروں نے غواصی کی طرح اس کے کارنامے کو نمونہ بنایا چنانچہ ہنر فرزند عشرتی کی مثنوی "نیہہ درپن" (۱۰۴۳ھ) میں اس کے ثبوت ملتے ہیں۔

بیجاپور میں علی عادل شاہ ثانی کے عہد تک اردو شاعری کا ذوق خاطر خواہ ترقی کر چکا تھا چنانچہ خود اس نے بڑے ملک الشعرا نصرتی جیسے زبردست سخن پردازوں کی پرورش کی۔ نصرتی بیجاپور کے لازوال شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی دو مثنویوں میں ایک "گلشن عشق" ہے جو ۱۰۶۸ھ میں لکھی گئی۔ ہندوستان کے مشہور قصے "منوہر مدمالتی" کی عشقیہ داستان ہے۔ اس کی دوسری مثنوی "علی نامہ" رزمیہ اور تاریخی مثنوی ہے جس میں علی عادل شاہ اور دشمنوں کی جنگوں کے حالات نہایت تفصیل سے پیش کئے گئے ہیں۔ لفظیات کے اعتبار سے "علی نامہ" کی وسعت لوازم وغیرہ جہاں تک کارنامہ پہنچ سکتے ہیں نصرتی کے اسلوب میں ادبیت اور لطف بھی موجود ہے۔ وہ جنگوں کے نقشے نہایت عمدگی سے اور حقیقی پیش کر سکتا تھا۔ "علی نامہ" کی تکمیل ۱۰۷۶ھ میں ہوئی۔

اس عہد کی آخری مثنویوں کے ذکر سے پہلے گولکنڈے کی ایک مثنوی "بہرام و گل اندام" کا تذکرہ ضروری ہے جو ۱۰۸۱ھ میں لکھی گئی۔ یہ بہت زیادہ اہم کارنامہ نہیں ہے۔ تاہم غواصی اور ابن نشاطی کے دبستان کی تمام خوبیوں اور خصوصیات کا حامل ہے۔

دوسری مثنوی "ظفر نامہ نظام شاہ" ایک رزمیہ ہے جو تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں رام راجہ سے دکن کی دوسری سلطنتوں کی جو جنگ ہوئی تھی، اس کا شاعرانہ حال درج ہے۔ اس کا مصنف حسن شوقی ایک بلند پایہ شاعر تھا جس کا پہلے نظام شاہی دربار (احمد نگر) سے توسل رہا۔ پھر وہ بیجاپور آیا۔ آخر میں محمد قطب شاہ کے زمانے میں گولکنڈہ آگیا تھا۔ اس کی ایک اور مثنوی "میزبانی نامہ" بھی ہے۔

نصرتی کے بعد، سوائے ہاشمی کے بیجاپور میں ایسے بلند پایہ شاعر کم پیدا ہوئے، جن کے کارنامے دیرپا دلچسپی کے حامل ہوں۔ صرف شاہ ملک کا ذکر اس کی ضخیم مذہبی مثنوی "شریعت نامہ" کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ یہ مثنوی ۱۰۸۸ھ میں لکھی گئی تھی۔ ہاشمی، وسیع دلچسپیوں کا انسان تھا، عادل شاہی سلطنت کے زوال کی وجہ سے زمانہ بھی بدل چکا تھا اس لئے اس نے اپنی شاعری میں عام راستے سے تجاوز کیا اور اس دور میں دکن کی آخری مثنویاں زیادہ تر گولکنڈے میں لکھی گئیں۔ چنانچہ امین، غلام علی، فائز اور لطیف، جن کی تصنیفات ۱۰۹۰ھ سے لے کر ۱۱۱۰ھ کے زمانہ پر حاوی ہیں، اسی گولکنڈے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

امین، حضرت عمر کے فرزند ابو شحمہ کے متعلق ایک فرضی قصے کا مصنف ہے، جو ۱۱۰۹ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس کے ایک سال بعد

غلام علی نے "پدماوت" کے حصے کو منظوم کیا۔ اس کا ماخذ فارسی سے زیادہ ہندی قصہ تھا۔ فائز "رضوان شاہ و روح افزا" (سنہ ۱۰۹۵ھ) کا مصنف ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لطیف نے ایک رزمیہ مثنوی لکھی ہے جو "ظفر نامہ" کے نام سے موسوم ہے اس میں "خاور نامہ" کا زور بیان اور "علی نامہ" کا لطف موجود نہیں ہے ۔

سنہ ۱۱۱۰ھ کے قریب دو ڈھائی سال کے اندر اندر بیجاپور اور گولکنڈے کے ادبی اور علمی مرکزوں کا خاتمہ ہوگیا ۔ وہ علما اور خاص طور پر اردو زبان کے شاعر، جو عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین کی سرپرستی میں اپنے ذوق کی تکمیل میں منہمک تھے منتشر ہونے لگے ۔ کیونکہ ان سلاطین کے جانشین یعنے مغلیہ امرا کو اردو شاعری کا چسکا ابھی نہیں لگا تھا ۔ شہنشاہی احساس کے ساتھ فطرتاً وہ شہنشاہی دربار کی ادبی روایات اپنے ساتھ لائے تھے ۔ تاہم اردو شاعروں کے قدم اکھڑ گئے تو اس سرزمین میں فارسی شعرا کے قدم بھی نہ جم سکے ۔ اور شعرا ہی نے دکن کے اگلے ادبی ذوق کو جاری رکھا ۔ لیکن یہ خود منتشر ہوگئے، ان کی شعری پیداوار کی یکسانیت منتشر ہوگئی ۔

چنانچہ دکن میں مغلوں کے تسلط کے بعد، جو کارنامے ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ بڑی حد تک ان کے پیدا کرنے والوں کی ذہنی حالت کا عکس پیش کرتے ہیں ۔ اس زمانے کی شعری پیداوار کو ہم اس طرح تقسیم کر سکتے ہیں ۔ (۱) مرثیے (۲) مذہبی نظمیں (۳) متصوفانہ نظمیں، (۴) نیم مذہبی نظمیں ۔

دکن کے شعرا نے مرثیہ کے لئے متنوع شعری صنفوں کا استعمال کیا ہے ۔ لیکن اس طرز کا زیادہ کلام قافیہ کی ترتیب میں قصیدے کی شکل رکھتا ہے، اس لئے یہ ہمارے دائرہ سے باہر ہے ۔ دوسری قسم کی نظموں میں، ولی ویلوری کی "روضۃ الشہدا" (ضیعفی کی "ہدایت ہندی" ذوقی کی "وصال العاشقین"، جیسی طویل مذہبی نظمیں شامل ہیں ۔ اس دور میں تیسری قسم کی نظمیں بہت زیادہ مقبول ہوئیں ۔ ان میں سب سے پہلے قاضی محمود بحری کی "من لگن" کا ذکر ضروری ہے ۔ بحری اصل میں بیجاپور کے رہنے والے تھے ۔ بیجاپور کی تباہی کے بعد بہ حال تباہ گولکنڈہ پہنچے ۔ دو سال بعد، گولکنڈے کی سلطنت کا سایہ بھی سر سے جاتا رہا ۔ "من لگن" تصوف کی قدیم نظموں میں خاص اہمیت رکھتی ہے یہ اور وجدی کی "پنچھی باچھا" جو منطق الطیر" کا ترجمہ ہے، بہت پڑھی جاتی تھیں ۔ ان کے علاوہ عشرتی کی متصوفانہ نظمیں "چیت لگن" اور "دیپک پتنگ" بھی کافی مقبول تھیں ۔

نیم مذہبی نظموں میں محمد علی عاجز کے قصے قابل ذکر ہیں ۔ ان میں فقہ عقائد وغیرہ کے مسائل کو قصے کے پیرایہ میں بیان کیا جاتا تھا ۔ ان قصوں کو بھی اپنے زمانہ میں کافی مقبولیت حاصل رہی ۔

دکن میں مثنوی کی ترقی کا آخری زمانہ آصفجاہی سلطنت کے قیام کا ابتدائی دور ہے ۔ یہ ایک عبوری زمانہ ہے، جس میں قدیم خیالات اور قدیم روایات کی کچھ توڑ شکست و ریخت ہوئی، اور کچھ نئی تعمیر شروع ہوئی ۔ زبان اور اظہار خیال کے سانچوں کے لحاظ سے، اس دور سے بڑا انقلاب رونما ہونے لگا ۔

اس دور کا سب سے بڑا شاعر، ولی ہے ۔ جس نے اپنی شاعری میں نئے ماحول اور بدلے ہوئے مذاق کو سب سے زیادہ جگہ دی اس کے بعد، شعرا کو ان کے نقش قدم پر چلنا آسان ہوگیا ۔ مثنوی کی حد تک ولی کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں ۔ انھوں نے صرف دو تین

چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں۔ ان میں سے دو بزرگوں کی تعریف میں ہیں۔ مگر ایک مثنوی جو تین سو تیس شعر کی ہے، نہایت اہم ہے۔ اس مثنوی کا عنوان "مثنوی در تعریف سورت" ہے۔ یہ اگلی تمام مثنویوں کے مقابلہ میں جداگانہ نوعیت رکھتی ہے۔ اس وقت تک اردو میں مثنوی مرقع نگاری کے لئے استعمال نہیں ہوئی تھی۔ ابتدائی چھوٹی چھوٹی مثنویاں متصوفانہ تھیں بعد میں وجہی کے زمانہ سے اس میں قصے لکھے گئے۔ کچھ رزمیہ مثنویاں بھی لکھی گئیں۔ عربی شعرا اس نوع کے خیالات کے لئے قصیدہ کا استعمال کرتے تھے فارسی شعرا نے بھی انہیں کی پیروی کی۔

ولی کے اثر سے جب دہلی میں اردو شاعری کو فروغ ہوا تو ابتدائی زمانہ کے شعرا جیسے شاہ حاتم اور آبرو نے ولی کی اس مثنوی کی پیروی کی۔ میر تقی میر کے سامنے یہ نمونے تھے۔ اس لئے ان کی وہ مثنویاں، جو فارسی کی تقلید میں نہیں لکھی گئی ہیں، اسی طرز کی ہیں فارسی کی قصہ دار مثنویوں کے نمونے پر میر نے جو مثنویاں لکھیں وہ ابتدائی نوعیت کی ہیں۔

ولی کے بعد دکن میں دونوں طرح کی مثنویاں رائج رہیں۔ ولی کے جانشین حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی نے ایک طویل مثنوی "بوستان خیال" کے ساتھ ساتھ کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی لکھیں، جو متصوفانہ خیالات سے مملو ہیں۔ سراج کی طویل اور قصہ دار مثنوی "بوستان خیال" اس دبستان کی دکنی مثنویوں کا سب سے بہتر کارنامہ ہے۔ اور اردو کی تمام مثنویوں میں اس کا درجہ "سحر البیان" کے بعد ہے۔ انداز بیان، صداقت جذبات، تکمیل اور شعری خوبیوں کی بدولت "بوستان خیال" ہر زمانہ میں قدر کی نظر سے دیکھی جائیگی۔

"بوستان خیال" کے بعد، دکن میں مثنوی نگاری کے ذوق پر تنزل طاری ہونے لگا تاہم اس آخری دور میں بھی دو تین مثنویاں ایسی لکھی گئیں جن کی ادبی اہمیت کبھی کم نہیں ہو سکتی۔ ان میں سب سے پہلے قابل ذکر، لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی کی "تصویر جاناں" ہے۔ جو قصے کی ندرت اصلیت اور ادبی معیار کی بلندی کے باعث اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ دوسری "لعل و گوہر" ہے۔ جس کے مصنف عارف الدین خاں عاجز اورنگ آباد کے شعرا میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ مثنوی قدیم طرز کے دوسرے قصوں سے کچھ زیادہ امتیاز نہیں رکھتی۔ لیکن عاجز کا انداز بیان صاف ستھرا اور موجودہ روزمرہ سے بہت قریب ہے چونکہ اس زمانے میں اورنگ آباد کو سیاسی مرکزیت حاصل تھی اس لئے یہاں اچھے اچھے شعرا جمع ہوگئے تھے۔ اور دکن کے دارالخلافہ کے حیدرآباد میں منتقل ہونے تک اورنگ آباد ہی کو ادبی مرکزیت حاصل رہی۔ چنانچہ کئی سخن پرداز ناف ہند سے آکر یہیں فروکش ہوگئے تھے۔ ان میں شاہ غلام قادر [illegible] خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ برہان پور سے آکر یہاں فروکش ہوئے تھے۔ یہ اچھے شاعر تھے اور ان کے اطراف شاگردوں کا ایک خاصہ مجمع تھا۔ یہ شفیق کے ہم عصر اور دوست تھے۔ شفیق نے [illegible] "چمنستان شعرا" میں ان کی ایک مثنوی "[illegible]" کے منتخبات دئے ہیں۔ یہ مثنوی خاصی ضخیم بتلائی جاتی ہے لیکن اب تک اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مثنوی اچھی ہوگی۔

اس مضمون کے ختم کرنے سے پہلے ایک اور [illegible] کا ذکر ضروری ہے جو اپنے زمانے کے استاد شمار کئے جاتے تھے۔ یہ میر محمد ایمان شاگرد حضرت شاہ تجلی ہیں۔ ایمان کا نشو و نما نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کے آخر عہد میں ہوا۔ یہ پرگو شاعر تھے انہوں نے

کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی لکھی ہیں، جو پڑھنے اور لطف اندوز ہونے کے قابل ہیں۔

یہ آخری سخن سنج درحقیقت قدیم دبستان کے آخری شاعر تھے۔ اس کے بعد نئے عہد کے نئے تخیلات اور نئے روزمرہ کے اثرات نے قدیم دبستان کو متاثر کرنا شروع کیا۔ اور قدیم تخیلات پر بڑی شکست و ریخت طاری ہوئی۔ اس دوران میں، دکن کی اردو شاعری پر پژمردگی سی چھائی رہی۔ یہاں تک موجودہ عہد سے پہلے، جب یہ شکست و ریخت مکمل ہو گئی، تعمیرِ جدید اردو شاعروں میں ایک نئی روح پھونک دی گئی۔

عبدالقادر سروری

گوداوری گھاٹ کی ایک حسین صبح

شب تاریک چلی زلفوں کو سلجھاتی ہوئی — صبح کے خوف سے ڈرتی ہوئی گھبراتی ہوئی

چور کی طرح دبے پاؤں چلی بادِ صبا — ہر قبائے گلِ نوخیز کو مسکاتی ہوئی

آئی گردوں سے دھندلکے میں عروسِ شبنم — موتیوں کو در و دیوار پہ بکھراتی ہوئی

جل بجھی شمع ہوئی رات کی محفل خاموش — بزمِ تاروں کی چلی آنکھوں کو جھپکاتی ہوئی

اڑ چلی نکہتِ گل چھوڑ کے دامن گل کا — بادِ سرشار چلی جھومتی اتراتی ہوئی

جلوہ گر صبح کی دیوی ہوئی رفتہ رفتہ — شب کا آنچل رخِ پرنور سے سرکاتی ہوئی

دور تاریکی ہوئی گھاٹ کی تقدیر کھلی — ٹکڑیاں آئیں حسینوں کی ستم ڈھاتی ہوئی

نقرئی شانوں پہ بکھرائے ہوئے بال کوئی — قلزمِ حسن کی ہر لہر میں لہراتی ہوئی

ذرے ذرے کو تبسم سے بناتی رنگیں — بجلیاں چشمِ فسوں ساز سے برساتی ہوئی

کوئی انگڑائیاں لیتی ہوئی بدمستی میں — ساغرِ عشق سے مے حسن کی چھلکاتی ہوئی

اپنی گستاخ اداؤں سے الجھتی ہر دم — خود بہکتی ہوئی دنیا کو بھی بہکاتی ہوئی

کرنے اشنان کوئی کھول کے جوڑا آئی — کوئی ساحل پہ کھڑی رہ گئی شرماتی ہوئی

بھیگے کپڑوں میں جو عریاں ہوئے جسمِ سیمیں — بجلیاں بھرنے لگیں ابر میں گھبراتی ہوئی

کوئی کھولے ہوئے بالوں کو چلی ندی میں — نکلی پانی سے کوئی زلفوں کو سلجھاتی ہوئی

چلی ہر ایک نہا دھو کے خراماں آخر — موتی ان بھیگے ہوئے بالوں سے برساتی ہوئی

ہو گیا جلد ہی روپوش یہ رنگیں منظر — آنکھوں آنکھوں میں نظر رہ گئی للچاتی ہوئی

علی احمد

اورنگ آباد کا سنہری محل

سنہری محل دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا جو بحمداللہ پورا ہوا ۔ یہ عمارت اورنگ آباد کی قدیم عمارت سے ہے جو مقبرۂ رابعہ دورانی سے تقریباً ۳ فرلانگ کے فاصلے پر جانب غرب پہاڑی کے دامن میں واقع ہے ۔ اس عمارت کا محل وقوع نہایت ہی بلند اور مرتفع ہے اس کے اطراف کھلے میدان اور مشرق وشمال کی جانب پر فضا پہاڑی ہے مقبرہ اس عمارت کے بالکل مقابل میں ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہ عمارت آباد تھی اس کی دیواروں پر سونے کا ملمع کیا ہوا تھا یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے ۔ فی زمانہ گو عمارت صحیح وسالم ہے لیکن دیواروں کے ملمع کا کہیں پتہ نہیں ہاں نقش ونگار کے کہیں کہیں نشان پائے جاتے ہیں ۔ یہ محل دو منزلہ ہے نیچے کے حصہ کی تفصیل یہ ہے ۔ بیچ میں ایک ہال اس کے دونوں جانب دو دو کمرے ان کمروں کے بازو ایک ایک وسیع ہال ۔ اوپر کی منزل نہایت شاندار ہے ۔ بیچ میں ایک بہت بڑا ہال اس کے آگے پیش جس میں نہایت کشادہ خوشنما کنگرہ دار کمانیں نکلی ہوئیں پیش کے مقابل میں وسیع صحن بڑے ہال کے ہر دو جانب دو دو کمرے اور ہر ایک کمرے کے بازو کھلا ہوا صحن اور صحن کے کنارے پر حد کی دیوار سے لگا ہوا ایک ایک پختہ مسقف بیت الخلا ۔ بالاخانہ کے عقبی حصہ میں بھی کشادہ صحن واقع ہے بالاخانے کے اوپر چاندنی ہے جس کے اطراف دیوار کھچی ہوئی ہے ۔ چاندنی پر چڑھنے کے بعد تمام شہر ہتھیلی میں نظر آتا ہے اور نظر ریلوے اسٹیشن سے پرے جنوبی پہاڑی سلسلے تک بلا روک ٹوک کام کرتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارت کوسوں تک گرد وپیش کے وسیع رقبہ پر حکومت کر رہی ہے اس عمارت کے اطراف پختہ دیوار بنی ہوئی ہے جس میں کمانیں نکلی ہوئی ہیں اور دیوار کے اندر عمارت کے عقب وپیش نہایت وسیع مسطح وہموار صحن ہے علامات وآثار سے پایا جاتا ہے کہ اس صحن میں چمن بندی کی گئی ہوگی کیونکہ اس وسیع چبوترے پر جس پر عمارت قائم کی گئی ہے ۔ ایک حوض بنا ہوا ہے جس میں سے پانی ایک چھوٹی سی نہر میں جاتا تھا اور یہ نہر میں سے پشت ماہی آبشار پر سے ڈھلکتا ہوا صحن کی روشوں میں پہونچتا تھا حوض اور نہر میں اب خاک اڑ رہی ہے اور چبوترے پر لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی ہے عمارت کے نیچے کا حصہ آج کل نہایت خراب حالت میں ہے اس کی اکثر کمانیں پتھروں سے چن دی گئی ہیں جس کی وجہ اندرونی حصہ کسی قدر تاریک ہے فرش پر کوڑے کرکٹ کی کوئی حد نہیں اس کے علاوہ جابجا مویشیوں کے گوبر کے ڈھیر پڑے ہوئے ہیں غالباً عدم نگرانی کی وجہ سے مویشی اندر داخل ہو جاتے ہیں بالاخانہ اب بھی ایسا ہے کہ وہاں کوئی بیٹھ جائے تو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا لیکن افسوس متعدی مالیخولیا کی علامات سے سفید دیواریں سیاہ ہو گئی ہیں ۔ آہ ! بالاخانہ کچھ نہ پوچھئے کیا چیز ہے شاید ہی ایسا ہوا دار مقام کہیں ہو اطراف کا کشادہ منظر کوسوں تک نظر کے روبرو بازو میں پہاڑی کا سلسلہ گوناگوں دلفریبیوں سے معمور اپنے حسن کی آب وتاب کے ساتھ بے نقاب نظر آتی ہے انواع واقسام کے مناظر کے اجتماع سے ایک عجیب وغریب منظر پیدا ہو گیا ہے غرضکہ منظر کی لطافتیں حد بیان سے باہر ہیں صرف وہی لوگ بخوبی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں جو بذاتہ اس کا لطف اٹھا چکے ہوں ۔ اس عمارت کے استحکام کی یہ حالت ہے کہ اس کی گچ سیسہ کے اور اینٹ فولاد کے مماثل ہے یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے بادوباراں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر رہی ہے ۔

اس عمارت کی ویرانی کو دیکھ کر اور بانیانِ عمارت کی عظمت گزشتہ کا خیال کر کے دل پر کچھ ایسا عالم طاری ہو گیا کہ یہ چند اشعار

بے اختیار قلم سے نکل پڑے۔

(۱)

ہے بہت خوشنما سنہری محل　　دلکشا پر فضا سنہری محل
مرتفع اور بلند ہے یہ قصر　　روبروئے نظر ہے سارا شہر
ہے محل وقوع فرحت زا　　گرد حلقہ ہے اک پہاڑی کا
وادیٔ کوہ قاف میں گویا　　یہ سنہری محل ہے پریوں کا

(۲)

خوبصورت وہ وہ دامن کہسار　　اور اس میں وہ سایہ دار اشجار
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائے جاں پرور　　چاروں جانب کھلا ہوا منظر
ہر طرف اس کی حکم رانی ہے　　جو جگہ ہے یہاں سہانی ہے

(۳)

ہے مقابل میں مقبرہ[1] ایسا　　تعزیہ اک دھرا ہوا گویا
دیکھ کر مقبرے کی زیبائی　　ایک تشبیہ خوب یاد آئی
کیا ہی دلکش ہے خوش قرینہ ہے　　سبز زاروں میں اک نگینہ ہے
قصر زریں تیرا کیا کہنا　　عہد رفتہ کا ہے تو افسانا
قصر کیا ہے سرائے عبرت ہے　　دیکھو جس سمت جوشش حسرت ہے
اب ہے ویران تھا کبھی آباد　　شان رفتہ ہے شوکت برباد
تازیانہ پئے تخیل ہے　　نقش بربادیٔ تجمل ہے

(۵)

ہوگئی ہے یہ تیری حالت زار　　جا بجا سے جگر ہے تیرا فگار
اب کہاں وہ طلائی رنگ ترا　　اب نہ وہ آب و تاب ہے نہ ضیا
تھیں کبھی جو نگار دیواریں　　ہوگئیں دل فگار دیواریں
فرش جو مثل آئینہ تھا صاف　　جا بجا اس میں پڑ گئے ہیں شگاف

---

[1] مقبرۂ رابعہ دورانی

کس مپرسی کی تیری حالت ہے — تیرا ویرانہ جائے عبرت ہے
حوض ہیں خشک صحن میں تیرے — خاک اڑتی ہے تھے جہاں چشمے
روشیں ہیں وہ اب کہاں باقی — ہیں کہیں کچھ ابھی نشاں باقی

(۶)

کہہ رہے ہیں ترے در و دیوار — تھا کبھی تو بھی غیرتِ گلزار
کیا ہی ذی شان ہوں گے تیرے مکیں — صاحبِ اقتدار ذی تمکیں
پیش خدمت تھے جن کے جاہ و حشم — نصرتیں چومتی تھیں جن کے قدم
اب کہاں ہیں وہ مالکِ دولت — کیا ہوئی ان کی حشمت و ثروت
قصر جن کے تھے مثلِ قصرِ جناں — گھونسلے زاغ و بوم کے ہیں وہاں
گردشِ دہر نے کیا پامال — وہ رہے اور نہ ان کا مال و منال
نہ رہا ان کا کر و فر باقی — یادگار ان کے ہیں کھنڈر باقی

(۷)

اے محل اے وہ یادگارِ کہن — اے وہ تصویرِ انقلابِ زمن
جو تجھے دیکھنے کو آتا ہے — نقشِ عبرت وہ لے کے جاتا ہے

سید اللہ بخش توحید

مدارس میں اردو زبان اور ادب کی ترقی و اشاعت کا مسئلہ ہندوستان میں ہمہ گیر توجہ حاصل کر رہا ہے۔ کانگریس نے ہندوستانی کو وہاں کی سرکاری زبان بنانے کا تہیہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں ہندی کے رواج کے لئے بڑی کوشش کی جا رہی ہے ایسی صورت میں اردو کے بہی خواہوں کو اردو کی بھی فکر دامنگیر ہوگئی ہے اور ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح مدراس میں اردو زبان کی حالت اور اردو ادب کے نشو و نما کے بارے میں عام معلومات حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے ادارہ ادبیات اردو نے مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی سے یہ مبسوط کتاب لکھوائی ہے۔
اس میں گزشتہ ڈھائی صدیوں سے مدراس میں اردو کا جو کام کیا گیا ہے اس کا تفصیلی ذکر درج کیا ہے۔ قیمت عـہ

سب رس کتاب گھر یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہے۔

قاضی جی کی کارگزاری

۱۳۹۸ء میں دیول رائے والئ بیجانگر فیروز شاہ بہمنی پر حملہ کرنے کی غرض سے ایک ٹڈی دل لشکر لے کر طوفان کی طرح اٹھا تاکہ مدگل اور رائچور وغیرہ کے قلعوں کو مسمار کرتا ہوا پائے تخت تک پہنچے اور تختۂ سلطنت کو الٹ کر شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔

دیول رائے شمالی سرحد کی طرف سے بڑھتا ہوا دریائے کرشنا کے ساحل پر پہنچا اور وہیں ڈیرے ڈال دیئے فوراً راؤٹیاں اور خیمے نصب کر دیئے گئے دوکانیں لگا دی گئیں اور یا لوگ جنگل میں منگل منانے لگے۔ کیمپ تقریباً بارہ تیرہ میل تک پھیلا ہوا تھا جس میں تیس ہزار سوار اور نوے ہزار پیادوں کا لشکر جرار بحر ناپیدا کنار کی طرح موجیں مار رہا تھا، ہر پیشہ کے لوگ اس میں موجود تھے، خرید و فروخت ہو رہی تھی، بازاروں میں چہل پہل تھی، شراب خانے کھلے ہوئے تھے، دور پر دور چل رہے تھے، ارباب نشاط طوائفیں اور کسبیاں نغمہ سرائی میں مصروف تھیں اور رقص و سرود سے محفلوں کو گرما رہی تھیں۔

ادھر سلطان کو خبر پہنچی تو وہ فوراً بارہ ہزار سر فروش اور جاں نثار سپاہیوں کا لشکر اپنے ساتھ لے کر آندھی کی طرح اٹھا اور گلبرگہ سے کوچ کر کے کرشنا کے دوسرے ساحل پر جا پہنچا۔ برسات کا زمانہ تھا، سیلاب کے طوفان نے دریا کا پاٹ اس قدر چوڑا کر دیا تھا کہ پار اترنا مشکل نظر آیا۔ اس لئے حسب ایماء شاہی وہیں سراپردہ نصب کر دیا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد سلطان نے اپنے ارکان دولت اور سپہ سالاروں کو مشورہ کرنے کی غرض سے طلب کیا، دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ہر شخص نے اپنی اپنی سمجھ کے موافق تدبیریں بتائیں لیکن سلطان کو تشفی نہیں ہوئی اور کوئی تصفیہ نہ ہو سکا۔ بہرحال نشستند و گفتند و برخاستند کے بعد سلطان کو بہت زیادہ فکر دامنگیر ہو گئی۔

ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، اندھیری رات میں سنسان جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا، گھوڑے سے لے کر سوار تک سانس نہیں لے رہا تھا لیکن سلطان بدستور اسی غور و فکر میں غرق تھا کہ دریا کس طرح عبور کیا جائے اور غنیم کی فوج پر کس پہلو سے حملہ کیا جائے۔

یکایک نظر اٹھائی تو دیکھا کہ سامنے کوئی بزرگ کھڑے ہوئے ہیں، چمکدار روشن آنکھیں، نورانی چہرہ، لانبی ستواں ناک، لمبی ڈاڑھی، دراز قد جسم پر سفید براق کپڑے۔ ادھر سلطان نے ذرا غور سے دیکھا، ادھر وہ بزرگ بھی سلام کرتے ہوئے آگے بڑھے تو معلوم ہوا کہ قاضی سراج[1] ہیں۔ سلطان نے تعجب سے پوچھا کہ اس وقت تم کدھر؟ دست بستہ عرض کی کہ پیر و مرشد، اس وقت لوگ خاموشی کے ساتھ جنگ کی تیاری میں مصروف ہیں مگر حضور کے چہرہ سے غور و فکر کے آثار نمایاں ہیں۔ اب حضور زیادہ تردد نہ فرمائیں، اس بہی خواہ دولت کو ایک تدبیر سوجھی ہے، اگر جان کی امان پاؤں تو حرف مدعا زبان پر لاؤں اور ایک تدبیر بتاؤں۔ سلطان فیروز عام طور پر علماء، فضلاء اور اپنے ارکان دولت سے نہایت بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ باتیں کرتا تھا، قاضی جی کی گفتگو سن کر مسکرایا اور کہا کہ قاضی صاحب! اللہ اللہ کرو، بھلا تم کو جنگ سے کیا واسطہ، کیوں خواہ مخواہ اس جھگڑے میں پڑتے ہو، تم تو اپنے خیمہ میں بیٹھے ہوئے اللہ اللہ کرو اور فتح فیروزی کی دعائیں مانگتے رہو۔

---

[1] قاضی سراج بادشاہی امیروں میں سے ایک نامی عہدہ دار اور امیران صدہ کا ایک نامی فرد تھا (فرشتہ)

قاضی جی بھلا کہاں چوکنے والے تھے، دست بستہ عرض کی کہ خداوند نعمت، فتح و فیروزی کی دعا تو ہر وقت زبان پر رہے گی خواہ میں خیمہ میں ہوں یا میدان جنگ میں مگر عرض یہ ہے کہ قاضی سمجھ کر میرا نام بہادروں کی صف سے خارج نہ فرمائیے باپ دادا سے فن سپہ گری ورثہ میں چلا آ رہا ہے اس لئے میں اہل قلم سے ہی نہیں ہوں بلکہ اہل سیف بھی ہوں۔

سلطان نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو اپنی تدبیر بھی کہہ ڈالو۔ قاضی جی نے کہا کہ حضور تدبیر یہ ہے کہ میں نے دریا پار اترنے کے لئے چند چمڑے کے ٹوکرے اور لکڑی کی کشتیاں تیار کر لی ہیں۔ اس وقت غنیم کی فوج غافل ہے اگر حکم ہو تو تھوڑی سی فوج لے کر جاؤں اور شب خون ماروں۔

سلطان نے کہا کہ قاضی صاحب آپ نے ٹوکروں اور کشتیوں کی تدبیر تو بہت ہی اچھی نکالی مگر شب خون مارنے کی تدبیر مجھے پسند نہیں فی الحال اس لئے کہ میں فتح کو حیلہ سے حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ پھر غنیم کی فوج ایک لاکھ تیس ہزار ہے اور ہماری صرف بارہ ہزار اگر یہاں سے آپ چار سو پانچ سو آدمی لے کر بھی گئے تو کیا فائدہ ہوگا، غنیم کی فوج تو اس پار دور تک پھیلی پڑی ہے شب خون کسی طرح پر انہیں تباہ نہیں کر سکتا۔

قاضی جی کی طبیعت ان معاملات میں بلا کی رسا واقع ہوئی تھی۔ فرمایا مثل مشہور ہے کہ الحرب خدعۃ۔ بس ہم بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ چار پانچ سو آدمی تو ان لوگوں کے لئے کافی سے زیادہ ہیں۔ خدا بہوت نہ بنائے تو یہی لوگ ان کو خرگوشوں کی طرح بھگا دیں یا بھگا بھگا کر مار نہ دیں گے۔ ہاں اگر کسی مصلحت کی بنا پر پیر و مرشد اس کے خلاف ہیں تو آپ اجازت مرحمت فرمائی جائے کہ میں اپنے ساتھ چیدہ چیدہ سے کچھ آدمی لے کر دریا کو عبور کر جاؤں اور خفیہ طور پر غنیم کے لشکر میں پہنچ جاؤں اور اس کے یا اس کے بیٹے کا کام تمام کر دوں۔ اس عرصہ میں ہماری فوج بھی ٹوکروں اور کشتیوں سے دریا کے اس پار اتر آئے۔ جب شور بلند ہو تو فوراً ہمارے لشکری دشمن پر گریں اور اس کے پرخچے اڑا دیں۔

بادشاہ قاضی جی کی یہ تدبیر سن کر مسکرایا اور خاموش ہو گیا مگر قاضی جی پارے کی طرح بے قرار تھے۔ بادشاہ کے سکوت کو "السکوت کالرضا" سمجھے فوراً سلطان سے رخصت ہو کر کیمپ پہنچے اور پانچ سو جوان مرد اپنے ساتھ لئے جو آٹھوں گانٹھ کمیت تھے۔ اور فقیروں کا بھیس کر کے چل کھڑے ہوئے۔ صبح ہوتے ہوتے غنیم کے کیمپ میں جا پہنچے۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر ٹامک ٹوئیے مارتے رہے۔ جب کہیں دال گلتی نظر نہ آئی تو ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر آپس میں کھچڑی پکانی شروع کر دی۔ قاضی جی نے ذرا مراقبہ کیا تو ہزاروں عیاریاں اور چالاکیاں ہاتھ باندھے ہوئے سامنے حاضر ہو گئیں پھر کیا تھا۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے، ہاتھ پھیلا اور ساتھیوں کو بشارت دی کہ ایک ترکیب سوجھی ہے اب انشاء اللہ فتح ہی فتح ہے۔ ساتھیوں نے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ تو فرمایا کہ راجہ کی فوج کے ساتھ ارباب نشاط، طوائفیں اور کسبیوں کے طائفے بھی موجود ہیں۔ بس ہمیں وہیں چلنا چاہئے وہیں میں سوا ایک امید ہے کہ وہاں پہنچ کر ضرور کامیابی کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ ساتھیوں نے پھر پوچھا کہ آخر وہاں جا کر کیا کیجئے گا؟ تو قاضی جی نے فرمایا کہ تمہیں کیا معلوم کہ فقیر جھولی میں کیا ڈالتا ہے اور کیا دکھاتا ہے۔ بس تم لوگ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ اور جو کچھ میں کہوں اس پر بے چون و چرا عمل کئے جاؤ۔ القصہ سب نے مل کر کسبیوں اور طوائفوں کے کیمپ کی طرف دھاوا بول دیا۔ قاضی صاحب، شاہ صاحب کا بھیس بدلے خضر راہ بنے ہوئے آگے آگے تھے اور ان کے چیلے اور مرید اپنے مرشد کے پیچھے قدم بقدم چل رہے تھے۔ اول خرابات میں پہنچے اور وہیں دھونی رما دی، دو چار روز کے بعد یہ درویشوں کی ٹولی کسبیوں کے کیمپ میں پہنچی اور ان کا نہایت تفصیل کے ساتھ بھید لینا شروع کر دیا۔ ایک مقام پر دیکھا کہ ایک طوائف، نہایت طرح دار، حسین، مہ جبین، نوکیلی چھبیلی، کنگھی چوٹی سے درست، قیمتی زیور

سے آراستہ و پیراستہ شمع محفل بنی بیٹھی ہے۔

اس وقت قاضی جی کو سات خون معاف تھے، اسے دیکھتے ہی رال ٹپک پڑی، کانوں تک باچھیں کھل گئیں، دل سینہ میں بانسوں اچھلنے لگا، ڈورے ڈالنے کے لئے پروانہ وار آگے بڑھے اور اس کے سامنے بیٹھ کر وہ وہ باتیں بنائیں کہ رنڈی نام سا ہیں کا۔

اس موقع پر قاضی جی نے اپنے آپ کو پر لے نمبر کا عاشق مزاج، دل پھینک اور رنگیلا ثابت کرنے کی کوشش کی۔ سو جان سے قربان ہو رہے تھے، جو کچھ روپیہ پیسہ اپنے ساتھ لائے تھے بے دریغ اس پر سے نثار کر ڈالا شروع کر دیا، وہ وہ باتیں بنائیں، وہ وہ روغن قاز ملا کہ طوائف بھی ان پر ریجھ گئی اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ مجھ پر لٹو ہے۔ رات بھر خوش مذاقی اور ظرافت کی آتشبازی چھوٹتی رہی۔ تمام رنڈیاں اور ڈوم ڈھاڑی قاضی جی سے پیٹے ہوئے تھے اور قاضی جی اپنی مضحکہ خیز حرکتوں اور پر لطف باتوں سے اس محفل کو خوب گرما رہے تھے۔ اس وقت بقول انشاء اللہ خاں، قاضی جی کی یہ کیفیت تھی کہ۔

شب محفل ہولی میں جو وارد ہوا زاہد ۔ رندوں نے لپیٹ کر
ڈاڑھی کو دیا اس کی لگا بدر قلوٹا ۔ اور بجنے لگی گت
تب منبچے کہنے لگے ٹک پر لو نا ہو ۔ بلکہ ناک پہ انگلی
اور آئے جی آنے سے برا مانے سو بھڑوا ۔ بے موسم عزت

دو چار روز اسی طرح گزرے، اتفاقاً ایک روز رات کے وقت قاضی جی کی معشوقہ راج کنور کے دربار میں مجرے کے لئے طلب کی گئی اور وہ جانے کیلئے تیاری کرنے لگی، قاضی جی کو جیسے ہی یہ پتہ لگا، بس مچل گئے، فوراً آنکھوں میں آنسو بھر لئے اور لگے تسوے بہانے پھر یہ ہی نہیں بے تاب ہو کر پروانہ وار اس کے گرد پھرنے لگے اور قدموں پر گر کر عرض کرنے لگے کہ جدائی کی گھڑیاں مجھ سے نہیں کٹ سکیں گی خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو یا تو تم وہاں نہ جاؤ یا مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ طوائف نے کہا کہ قاضی جی کیا عقل ماری گئی ہے، اپنے ہوش کے ناخن لو۔ ہم تو راجہ کے نوکر ٹھیرے، پھر بڑی بات یہ کہ خود کنور جی نے طلب فرما کر ہماری عزت افزائی فرمائی ہے ایسی صورت میں، بھلا میں حکم عدولی کیسے کر سکتی اور اپنے ساتھ راج سبھا میں تمہیں کیسے لے جا سکتی ہوں۔ اس لئے کہ وہاں تو صرف وہی شخص جا سکتا ہے جو گانے بجانے اور ناچ رنگ میں مشتاق ہو۔

قاضی جی نے جواب دیا کہ اے جان جہاں! کیا تم نے اوروں کی طرح مجھ کو بھی نرا کاٹھ کا الو سمجھ لیا ہے، رام کی دیا سے میں بھی گانے بجانے سے اچھی طرح واقف ہوں، اس کے علاوہ وہ وہ کمالات جانتا ہوں کہ راجہ صاحب بھی دیکھ لیں تو بھوچکا ہو کر رہ جائیں۔ طوائف نے خیال کیا ڈون کی لے رہا ہے، مسکرائی، اور اپنا ستار ان کی طرف کھسکا کر کہا کہ لیجئے ذرا اس کو تو چھیڑیئے۔ قاضی جی نے فوراً ستار ہاتھ میں لے، پردوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا، پھر جوڑا اور باج کے تاروں کو ٹٹولا اور طربوں کے سُر ملا کر وہ استادی سے بجایا، وہ وہ گت سازی اور مینڈ کاری کے کمالات دکھلائے کہ طوائفیں اور کسبیاں تو رہیں ایک طرف ان کے سازندے بھی سن کر دنگ رہ گئے۔ اب تو ان کی معشوقہ کا ماتھا ٹھنکا، سوچی کہ اس کا ساتھ رکھنا تو باعث فخر و عزت ہے، ناچ گانے سے بھی خوب واقف ہے، باتیں بھی خوب بناتا ہے

بہت ممکن ہے کہ اس کے طفیل سے ہم بھی وہاں پہنچ سکیں۔ فوراً سب کو طائفہ میں شریک کر لیا اور انہیں اپنے ساتھ لئے راج کنور کے دربار میں جا پہنچی۔

محفل کیا کچھ بھری ہوئی تھی، دیو رائے کا بیٹا اور اس کے احباب آپس میں ہنس بول رہے تھے، شراب کا دور چل رہا تھا۔ اس طائفہ کے پہنچتے ہی گانا شروع ہو گیا، طبلہ پر تھاپ پڑی، سارنگی ریں ریں کی، مجیرے بجنے لگے۔ طائفہ کی سریلی آواز اور گھنگرو کی چھم چھم سے محفل کا رنگ ہی بدل گیا، دیر تک محفل رقص و سرود گرم رہی۔ گانا ختم ہوا تو نقالوں کی باری آئی۔ قاضی جی فوراً ایک ساتھی کو لے کر اکھاڑے میں کود پڑے۔ یہ دونوں زنانہ لباس پہنے، سرمہ، مسّی اور زیور سے سہاگن بنے، ناز و غمزے کرتے، مٹکتے، ٹھمکتے، تالیاں بجاتے اور کمر مٹکاتے ہوئے بس مضحکہ خیز انداز میں راج کنور کے سامنے آئے کہ اہل محفل ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ پھر ان بہروپئے نقالوں نے، تمسخر، طرب سازی، اور گت بازی میں وہ وہ کمالات بتائے کہ راج کنور اور پوری محفل اش اش کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد قاضی جی نے اپنی غیر معمولی طاقت، پھرتی اور دلفریب نرت کے ساتھ رقص شروع کر دیا۔ لے میں ڈوبا ہوا ساز، سُروں میں ڈوبی ہوئی آواز، اور قدیم راگ راگنی کے سوز و گداز نے محفل پر جادو سا کر دیا۔ یہ شخص بت بنا ہوا ان کو ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں دونوں نے کمر سے خنجر کھینچ بھاؤ بتانے شروع کر دئے اور نہایت سبک روی کے ساتھ وہ وہ جوڑ توڑ دکھائے اور وہ وہ ہاتھ اور پینترے نکالے کہ پوری محفل وجد کرنے لگی۔

آخر کار پالے کاٹتے اور پینترے بدلتے ہوئے دونوں کے دونوں راج کنور کی طرف آہستہ آہستہ بڑھے یہاں تک کہ اس کے سینے و شکم میں دونوں نے بیک وقت ایسے کاری خنجر بھونکے کہ وہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ اس کے ساتھی اور تماشائی نشہ میں چور اور مست و مخمور تھے۔ جو لڑکھڑاتے ہوئے باہر بھاگے انہیں قاضی جی کے ان ساتھیوں نے سنبھالا جو باہر کھڑے ہوئے تال دے رہے تھے جو بھاگ نہ سکے وہ وہیں کے ہو کے رہ گئے۔

اب قاضی جی اور ان کے ساتھیوں نے کیمپ کے چراغ گل کرنے شروع کر دئے۔ پھر کیا تھا چراغ گل پگڑی غائب۔ لشکری حیران و پریشان اصل واقعہ سے بے خبر سمجھے کہ سلطان کے لشکر نے شب خون مارا ہے۔ شراب کا نشہ، کچی نیند اور رات کی تاریکی میں ایک دوسرے پر پل پڑے۔ ہر طرف صدائے دار و گیر بلند ہو گئی۔ ادھر قاضی جی نے اپنے ساتھیوں کو اطلاع دینے کی غرض سے سلطان کی طرف روانہ کر دیا اور خود کسی گوشۂ عافیت میں چھپ کر بیٹھ گئے۔

دیو رائے نے یہ کیفیت دیکھی تو ہوش پراں ہو گئے۔ بڑی مشکل سے اپنے لڑکے کی لاش لے کر بیچ لڑائی سے بھاگ کر روانہ ہو گیا۔ دوسرے روز جب شفق کا شعلہ ابھرا اور شب کی فوج کو شکست دے کر شعاع کا نیزہ ہاتھ میں لئے نکلا، فیروز شاہ سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق، جسم پر زرہ بکتر اور چار آئینے، سر پر خود فولادی، کمر میں شمشیر اصفہانی، پشت پر سپر، کندھے پر کمان، کمند ابریشمی شکار بند میں آویزاں، عربی گھوڑے پر سوار اپنی فوج ظفر موج کو لئے ہوئے آ پہنچا۔ نقارے پر چوٹ پڑی کہ دل سینوں میں دہل گئے۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر کے نعروں سے دشت و ہامون گونج اٹھا۔ بہادروں نے بڑھ کر حملہ کیا، پھر کیا تھا، تلواروں سے

تلواریں اور نیزوں سے نیزے اژدہوں کی طرح زبانیں نکالے ہوئے ایک دوسرے سے گتھ گئے۔ تیروں کی دھواں دھار بارش سے آسمان پر ایک ابر سا چھا گیا، جس میں برچھیوں کی سنانیں اور بھالوں کی انیاں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر بجلیاں گرا رہی تھیں۔ بڑے گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ستم کا رن پڑا۔ جدھر دیکھو کشتوں کے پشتے لگے تھے، خون کا سیلاب بہہ رہا تھا، کوئی سسک رہا تھا، کوئی ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور کوئی رقص بسمل کر رہا تھا۔ غرض یہ کہ قاضی جی کے ناچ نے سب کو گلی کا ناچ نچا دیا تھا۔

بارہ ہزار بہادروں نے وہ جی توڑ کر حملہ کیا کہ ایک دھاوے میں پینسٹھ ہزار سے زیادہ کا کھیت کر دیا جو باقی رہے ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور ایسے اکھڑے کہ پھر نہ جمے۔ یار لوگ عجیب عجیب طرح بھاگ رہے تھے، کوئی بے تحاشا بھاگا، کوئی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا، کوئی ٹوک دُم بھاگا اور کوئی دم دبائے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ پیادوں کو ہوش نہ تھا کہ ہاتھ میں تلوار ہے یا میان کا ٹکڑا، سوار کو خبر نہ تھی کہ وہ گھوڑے پر سیدھا سوار ہے یا الٹا۔ فتحیابوں نے کئی کوس تک ان کا پیچھا کیا بلکہ ان کے گھر تک پہنچا کر واپس آئے۔ راستہ میں زخمیوں کی کمریں اور مردوں کی ہمیانیاں کھول کھول کر اپنے کمر کیسے خوب ٹھوک ٹھوک کر بھرے اور اس قدر زر و جواہر مال و دولت ہاتھ آیا کہ جس کا حد و حساب نہیں۔

گھوڑوں کی ٹاپوں سے میدان جنگ میں جو غبار اٹھا، قسمت نے ہاتھ بڑھا کر نیزے کی انی سے اس پر فیروز شاہ کا نام لکھ دیا۔

الغرض راجہ کو ایسی شکست فاش ہوئی کہ اس کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔ سلطان فیروز شاہ اپنے لشکر کے ساتھ کامیابی کے جھنڈے اڑاتا ہوا اور فتح و فیروزی کے نقارے بجاتا ہوا اپنے دار السلطنت واپس ہوا۔ اس خدمت کے صلہ میں قاضی سراج خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوئے اور گروہ امرا میں داخل ہو کر چین کی بنسی بجاتے رہے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

باغِ دکن

یہیں بہار کا پہلے پہل بنا ہے چمن — عجیب خطۂ دلکش ہے خاکِ پاکِ دکن
نگاہِ شوق کو کیا کیا سماں دکھاتا ہے — انوکھی شان زمانہ کو یہ بتاتا ہے
نمونۂ کرم و لطفِ کردگار ہے یہ — یہ باغِ علم ہے گہوارۂ بہار ہے یہ
گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمیں شاداب — لطیف و سرد ہوا پاک صاف چشمۂ آب
کمی نہیں ہے کسی شئے کی اس گلستاں میں — عجب بہار ہے کچھ اس کے سرو و ریحاں میں
طلسمِ حسن کا خاکِ دکن ہے گلدستہ — بہم کھڑے ہیں شجر اور کوہ صف بستہ
مسافر آکے جو اس جا قیام کرتے ہیں — مناظر اس کے انہیں جلد رام کرتے ہیں
بلندیوں سے جو ہو مائلِ نشیب نظر — فریب دیتا ہے تالاب کا حسین منظر
وہ دیکھو دور سے پانی ہے یوں نظر آتا — سفید سانپ چلا جائے جیسے بل کھاتا

اقبال الدین احمد
سابق اڈیٹر کامریڈ و ادبی دنیا

دکن کے نسوانی ادارے

عہدِ عثمانی میں جہاں ملک اور ابنائے ملک کی ہر جہتی فلاح و بہبود کی خاطر بیکراں اصلاحیں عمل میں آئی ہیں وہاں طبقۂ نسواں کی تعلیم و تربیت اور اصلاحِ حال کے لئے بھی ہمارے سید امجد سلطان العلوم کی علم پرور حکومت نے اپنی امکانی کوششیں کی ہیں اور مسلسل کیے جا رہی ہے۔

تعلیم نسواں کے سلسلہ میں جو تجاویز عمل میں آئی ہیں اور جو اقدامات کئے گئے ہیں ان کی اہمیت اور وقعت دوسری تجاویز سے کہیں زیادہ ہے! تعلیم نسواں کی اہمیت مردوں کی تعلیم سے بہت زیادہ ہے، اسی پر قوم کے ارتقا کا دار و مدار ہے، ہماری آیندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت ان کی اخلاقی اصلاح اور ان کی بہتری کے لئے عورت کا صحیح تعلیم و تربیت یافتہ ہونا ازبس ضروری ہے، عورت نہ صرف مرد کا بلکہ ساری قوم کا "نصف بہتر" ہے، اس کو جاہل اور تعلیم و تربیت سے محروم رکھ کر ہم کبھی شاہراہِ ترقی پر گامزن نہیں ہو سکتے۔

عہدِ عثمانی میں تعلیم نسواں نے ترقی کے جو مدارج طے کیے ہیں اور خواتین دکن نے اصلاحِ معاشرت و تمدن کی جو کوششیں کی ہیں ان کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۳۲۰ف میں جبکہ موجودہ فرمانروائے دکن نے زمامِ سلطنت اپنے دستِ مبارک میں لی صرف (۹۱) مدارس نسواں ممالک محروسہ سرکار عالی میں قائم تھے جن میں (۶۳۴۶) لڑکیاں زیرِ تعلیم تھیں۔ ۱۳۴۲ف کے اعداد و شمار سے تعلیم نسواں کی ترقی کی رفتار اس طرح واضح ہوتی ہے کہ نسوانی درسگاہوں کی تعداد (۷۲۰) ہو گئی جن میں ساٹھ ہزار لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں۔ ان مدارس میں ۶۹۲ تحتانیہ ہیں جن میں (۴۶۱۰۶) طالبات شریک ہیں۔ مدارس وسطانیہ ۲۰ ہیں جن کی طالبات کی تعداد ۲۴۰۰ ہے۔ مدارس فوقانیہ نو ہیں ان میں ۲۹۲۳ لڑکیاں ہیں۔ تعلیم نسواں پر سالانہ جو رقم صرف ہوتی ہے اس کا ایک معمولی سا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف ۱۳۴۲ف میں ہماری علم دوست اور فیاض حکومت نے کوئی ساڑھے نو لاکھ روپے اس طبقہ کی تعلیم پر صرف کئے ہیں۔

ذیل میں چند سرکاری، امدادی و خانگی نسوانی مدارس اور خواتین کے اصلاحی و معاشرتی اداروں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ہم یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ عہدِ عثمانی میں تعلیم و تمدن نسواں نے ترقی کی منزلیں کس حسن و خوبی سے طے کی ہیں اور خواتین دکن میں تحصیل علم اور اصلاحِ معاشرت کے جذبات کس حد تک کارفرما ہیں۔

نامپلی زنانہ اسکول

مدرسۂ فوقانیہ نسواں نامپلی کا قیام ۱۳۰۸ف میں عمل میں آیا، اس وقت اسکول میں صرف سولہ لڑکیاں شریک تھیں۔ عرصہ تک ترقی تقریباً ناپید تھی مگر سلطان العلوم کے تختِ دکن پر متمکن ہوتے ہی ایک عظیم تغیر رونما ہوا، طالبات کی تعداد بتدریج بڑھنا شروع ہوئی چنانچہ اس وقت اس میں ۱۱۶۶ لڑکیاں ہیں۔ تعلیم کے علاوہ لڑکیوں کو امورِ خانہ داری، دستکاری، سلائی، اور پکوان کی بھی باضابطہ صحیح اصول پر عملی تعلیم دی جاتی ہے۔

کلیۂ اناث

تعلیم نسواں کا معیار بلند کرنے اور طبقۂ نسواں کو اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور کرنے کیلئے ۱۳۳۳ف میں کلیۂ اناث کا قیام عمل میں آیا، اس کالج کے ابتدائی اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم پانیوالی طالبات کی تعداد

نصف درجن سے زیادہ نہیں تھی، اسٹاف صرف ایک پرنسپل اور ایک پروفیسر پر مشتمل تھا اور اب کوئی ایک درجن خاتون پروفیسر سامنہ ستر لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے زینے طے کرا رہی ہیں۔

وظایف تعلیمی

کلیۂ اناث کی کامیاب طالبات کو ان کی مخصوص اور امتیازی کامیابیوں کے مدنظر ہماری علم پرور حکومت سے ممالک غیر میں تکمیل تعلیم کے لئے وظائف عطا کئے جاتے ہیں اور اکثر خواتین باہر جاکر امتیازی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ خدمات پر اسی کالج میں مامور ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس وقت ایسی کئی خواتین کالج کی خدمات پروفیسری کو انجام دے رہی ہیں۔

محبوبیہ زنانہ اسکول

یہ اسکول ۱۳۱۶ف سے قائم ہے، اس میں سینیر کیمبرج تک تعلیم دی جاتی ہے، یہاں زیادہ تر امراء اور معزز طبقہ کی لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں یہاں کی اکثر طالبات سینیر کیمبرج کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے کلیۂ اناث میں داخل ہوتی ہیں، اسمیں طالبات کی تعداد ۱۳۴۶ف کے آخر میں (۲۰۹) تھی۔ اس اسکول میں کمسن لڑکے بھی داخل ہو سکتے ہیں، علاوہ تعلیم کے دستکاری، مصوری، موسیقی، خانہ داری، سلائی اور پکوان کی بھی عملی تعلیم دیجاتی ہے، سادہ معاشرت کا عادی بنانے، لباس میں سادگی پیدا کرنے اور لڑکیوں کو کفایت شعار بنانے کے لئے اس اسکول کی ورکنگ اور تجربہ کار پرنسپل طالبات کو سادہ لباس استعمال کرنے اور زیورات کو ترک کرنے کی ترغیب و ہدایت دیتی رہتی ہیں، اسکول کی عمارت میں چند سال پہلے کافی توسیع کی گئی ہے۔ اس اسکول میں بھی ہر قسم کے میدانی کھیل ڈرل اور جمناسٹک کا بھی انتظام ہے۔

مدارس تعلیم المعلمات

یہ مدارس خصوصاً معلمات کو طرز تعلیم سے واقف کرانے کے لئے قائم کئے گئے ہیں ان میں علاوہ (۱۰۴) طالبات کے (۹۰) معلمات بھی مصروف طرز تعلیم و تدریس ہیں، ان کو طرز تعلیم کے جدید طریقوں سے واقف کرایا جاتا ہے۔

ماڈل پرائمری اسکول

یہ اسکول ۱۳۴۴ف میں قائم کیا گیا ہے اس میں مخلوط اسٹاف چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کو تعلیم کے لئے تیار کرتا ہے یہاں باغبانی بھی سکھائی جاتی ہے۔

گرل گائیڈ

کوئی آٹھ سال سے "گرل گائیڈ" کی تحریک جاری ہے، اس تحریک کے بنیادی اصول انسانوں اور جانوروں کے ساتھ ہمدردی ایک دوسرے کی تائید، زخمیوں کی دوا و امداد، تیمارداری اور خود اعتمادی ہیں۔ اس تحریک میں کلیۂ اناث، مدرسہ نسواں نامپلی، محبوبیہ زنانہ اسکول اور تعلیم نسواں کے بعض دوسرے ادارے بھی شریک ہیں کھیل، مضامین سیر و تفریح کے مواقع اور معاشرتی پارٹیاں لڑکیوں کے لئے ترقی دلچسپیوں کا باعث ہوئے ہیں۔

انجمن ترقی تعلیم و تمدن نسواں

تعلیم نسواں کی ترقی اور اعلیٰ تعلیم کی نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ خواتین دکن کی معاشرت، تمدن اور ذہنیت میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ اعلیٰ تعلیم اور صحیح تربیت یافتہ خواتین علم کی خوبیوں سے واقف ہونے کے بعد اپنی ان بہنوں کو جنہیں حصول تعلیم کے ذرایع میسر نہیں علم کی برکات سے واقف کرانے اور روشن خیال بنانے کی کوشش کر رہی ہیں اسی خیال کے تحت یہ انجمن ۱۹۳۷ء میں قائم کی گئی ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ سماجی اور معاشرتی اصلاحات کا تبلیغی کام بھی یہ انجمن بہ احسن وجوہ انجام دے رہی ہے۔ اس انجمن کی صدر محترمہ بیگم صاحبہ نواب ولی الدولہ اور نائب صدر مشہور پارسی خاتون مسز رستم جی فریدوں جی ہیں، ان دونوں روشن خیال اور ملک و قوم کا درد رکھنے والی معزز خواتین کی سرپرستی میں یہ انجمن خوب پروان چڑھ رہی ہے، اشاعت تعلیم، اصلاح معاشرت و رسم و رواج کے مختلف اصول اور طریقے اس انجمن کے پیش نظر ہیں، یہ انجمن متعدد

زنانہ مدارس کی امداد اور نگرانی کرتی ہے، غریب اور شوقین لڑکیوں کو وظائف تعلیمی بھی اس انجمن سے دئے جاتے ہیں۔ اس انجمن کے تحت پانچ مدارس قائم ہیں، ان میں تقریباً چار سو بچوں کو مفت ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔

دار الاقامہ اس انجمن کی سرپرستی میں ایک دار الاقامہ شہر کے وسط میں قائم کیا گیا ہے، اس میں باہر سے آئی ہوئی خواتین بلحاظ مذہب و ملت قیام کر سکتی ہیں، یہ اقامت خانہ خاص طور پر ان غریب خواتین کی ضرورت کو پورا کرتا ہے جو دایہ گری اور تیمارداری کی عملی تعلیم شفاخانوں میں حاصل کرتی ہیں اور ختم تعلیم پر مختلف دواخانوں اور ہسپتالوں میں ملازم ہوتی ہیں۔

دار المباحثہ اس انجمن کے زیر سایہ ایک دار المباحثہ بھی قائم ہے۔ اس میں تعلیم یافتہ خواتین تقریری مقابلے کرتی ہیں اس قسم کے تقریری مقابلوں سے خواتین میں علمی ذوق پیدا کرنے کے علاوہ تقریر کرنے کی قابلیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس سال دار المباحثہ کی جانب سے ایک پرجوش مناظرہ ہوا جس میں باتفاق آرا یہ طے ہوا کہ ہندوستان میں بچوں کی پرورش کا موجودہ طریقہ ناقابل اطمینان ہے۔

ذیلی کمیٹیاں اس انجمن کی کئی ذیلی کمیٹیاں ہیں جو خواتین کے حقوق کی حفاظت، کمسنی کی ازدواج، نکاح، حفاظت عورتوں اور بچوں کی جسمانی اور اخلاقی بہتری کے لئے مناسب تدابیر عمل میں لاتی ہیں۔ تقریروں کے ذریعہ اس انجمن کی اراکین اپنی بہنوں کو ان کے حقوق اور فرائض سے آگاہ کرتی ہیں اور ان کو اپنی صحت تندرستی کی جانب بطور خاص متوجہ کرتی ہیں۔ ایک کمیٹی عورتوں کی قانونی شادیوں پر غور کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہے۔ امسال اس کمیٹی کا ایک عام جلسہ ہوا جس میں کئی اداروں کی مسلم خواتین شریک ہوئیں۔ اس جلسہ میں وہ "ازدواج نامہ" پیش کیا گیا جسکو مسز حامد علی خاں نائب صدر آل ہند خواتین کی کانفرنس نے مرتب کیا ہے یہ نکاح نامہ ایک اقرار نامہ کی شکل میں ہے جس میں مسلم خواتین کو تحت قانون شرع طلاق کا حق دیا گیا ہے۔ بحالت مجموعی شریک جلسہ خواتین نے باتفاق آرا اس نکاح نامہ کو منظور کیا۔

اس انجمن کو کل ہند خواتین کی کانفرنس کی مستقل کمیٹی نے حیدرآباد کی خواتین کی نمایندہ انجمن تسلیم کر لیا ہے۔ اس انجمن سے اس کے نمایندے سالانہ کل ہند کانفرنس کے جلسوں میں بھیجے جاتے ہیں اور کانفرنس کی مستقل کمیٹی میں اس انجمن کی ایک رکن حیدرآباد کے نمایندے کی حیثیت سے شریک رہتی ہے۔

دی گرلز اسکول کوآپریٹیو بلڈنگ سوسائٹی لمیٹڈ مسز رستم جی کی صدارت میں چند ذمہ داروں کی ایک سوسائٹی زنانہ مدارس کی عمارتوں کی تعمیر کے لئے ۱۹۳۵ء میں قائم کی گئی ہے۔ اس سوسائٹی کا مقصد عمدہ اور ہوادار غریب لڑکیوں کے مدارس کیلئے مختلف مقامات پر تعمیر کرنا ہے چنانچہ ایک ایسی ہی عمارت خیریت آباد میں تعمیر کی گئی ہے اس میں ایک اسکول قائم ہے۔

زنانہ کلب گزشتہ چند سال کے اندر حیدرآباد اور سکندرآباد میں خواتین کے کئی کلب قائم ہو گئے ہیں ان کے لئے نہایت کشادہ اور شاندار عمارتیں تیار کی گئی ہیں۔ پردہ کے عمدہ انتظام کے ساتھ کلب کی اراکین مختلف قسم کے کھیل و تفریحات سے مستفید ہوتی ہیں کھیل اور تفریح کے علاوہ تقاریر کے ذریعہ دماغی اور اخلاقی ترقی بھی ہوتی ہے۔

لیڈیز اسوسی ایشن کلب اس کلب کی بنا کسی زمانہ میں مسز [illegible] جنگ مرحومہ نے ڈالی تھی۔ اس وقت یہ کلب نہایت اعلیٰ پیمانہ پر قائم ہے، اس کی صدر لیڈی حیدری ہیں، جن کی نگرانی میں اس کی شاندار اور خوبصورت عمارت تیار ہوئی۔ اس کلب کے اراکین کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ ہے۔ اس کلب کی جانب سے ہر سال دو طلائی میڈل ان طالبات کو عطا کئے جاتے ہیں جو انگریزی اور اردو کے مضامین میں نمایاں کامیابیاں حاصل کرتی ہیں۔ غریب لڑکیوں کو تعلیمی وظائف بھی دئے جاتے ہیں۔ اس کلب کی اراکین مختلف تفریحات اور میدانی کھیلوں کے علاوہ تقریری مقابلوں میں بھی شریک ہوتی ہیں۔

لیڈیز ریکریشن کلب گزشتہ چند سال سے یہ کلب قائم ہے، اس کی صدر رانی شام راج راجونت بہادر ہیں۔ اس کے اراکین کی تعداد تقریباً دو سو ہے میدانی

کھیلوں اور دوسری تفریحات کے علاوہ اس میں ایک تیرنے کا تالاب بھی ہے۔ اس میں خواتین تیراکی کا شوق بھی پورا کرتی ہیں۔

متذکرہ صدر اداروں کے علاوہ خواتین کی اور کئی انجمنیں بھی ہیں مثلاً انجمن خواتین دکن، انجمن خواتین اسلام، [illegible] خواتین کی انجمن، گجراتی خواتین کی انجمن، عیسائی خواتین کی انجمن، بہبودی اطفال کے متعدد مراکز وغیرہ۔

انجمن خواتین دکن | خواتین کی انجمنوں میں اس انجمن کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ یہ انجمن ۱۳۴۳ھ ہجری میں مسز صغرا ہمایون مرزا کی صدارت میں قائم ہوئی۔ اس انجمن کی سرپرست رانی شام راج راجونت بہادر ہیں۔ اس انجمن کے مقاصد یہ ہیں۔ مذہب و ملت کی قید و تفریق [illegible]۔ نادار غریب لڑکیوں کی شادی میں امداد دینا، بیوہ عورتوں اور نادار لڑکیوں کو دستکاری سکھانا، معذور عورتوں کو ماہانہ امداد و وظائف کی شکل میں دینا، گھریلو صنعت و حرفت کو ترقی دینا، فضول رسم و رواج کو ترک کرانا ہے۔
اس انجمن کی کامیابیاں زیادہ تر محترمہ صغرا ہمایون مرزا کی عالی ہمتی و ایثار کی مرہون منت ہیں۔ اس انجمن نے اب تک مختلف کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ تقریباً بیس معذور و بیوہ و نادار عورتوں کو ماہانہ امداد دی جاتی ہے۔ اس انجمن کی زیر نگرانی زنانہ صنعت و حرفت کا ایک مدرسہ قائم ہونیوالا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہوگا جس میں ادبی تعلیم کے ساتھ دستکاری، امور خانہ داری اور مختلف فنون کی عملی تعلیم کا خاص انتظام کیا جائے گا۔ محترمہ صدر انجمن نے بڑی فیاضی سے اپنی جائداد کا بڑا حصہ اس ادارہ کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اس انجمن کی سرپرستی میں ہر سال دستکاری کی نمائش کی جاتی ہے۔ اس نمائش میں تعلیم نسواں کے مختلف ادارے حصہ لیتے ہیں۔ اس انجمن کی نگرانی میں اس وقت تین زنانہ اسکول قائم ہیں۔ غرض اس انجمن کی کارگزاریاں دیکھنے کے بعد مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں بھی ایسی حساس خواتین موجود ہیں جو اپنی صنف کی تن من دھن سے خدمت کر رہی ہیں۔

بستان طالبات | یہ ادارہ کوئی دس سال سے قائم ہے۔ اس میں یتیم بے سہارا لڑکیوں کے قیام و طعام کا انتظام کیا جاتا ہے اور ان کو تعلیم و تربیت کے ساتھ امور خانہ داری، سوزن کاری اور پکوان وغیرہ کی عملی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس وقت اس میں کوئی چالیس یتیم لڑکیاں زیر پرورش ہیں۔ اس ادارہ کی مہتمم محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ بانو نظامی ہیں۔ علاوہ یتیم لڑکیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے پردہ کرنے والی مفلس بیوہ عورتوں کی امداد بھی کی جاتی ہے۔ سلائی کا کام ان کے لئے فراہم کیا جاتا ہے اور اجرت پر ان سے کام لیا جاتا ہے اور ان کو کشیدہ کاری اور سلائی کی تعلیم بھی مفت دی جاتی ہے۔

چند خانگی ادارے | چند خانگی مدارس بعض حساس اور ہمدرد ملک و قوم خواتین کی سرپرستی اور نگرانی میں قائم ہیں۔ بیگم سید رحمت اللہ صاحب پروفیسر [illegible] کالج نے ایک خانگی اسکول اپنے مکان پر ملازمین کی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے قائم کیا ہے جس میں سلائی کی تعلیم خود دیتی ہیں۔ مسز امیر حسن صاحب نے ایک ایسا ادارہ اپنی قیام گاہ جوبلی ہل پر قائم کیا ہے جس میں صرف بیچارہ عورتوں کو سلائی اور کشیدہ کاری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مسز نندی نے اپنے مکان پر ایک مختصر سا اسکول ادنیٰ نوکروں کی اولاد کے لئے قائم کیا ہے جسکو وہ خود تعلیم دیتی ہیں۔

متذکرہ صدر اعداد و شمار سے واضح ہوگا کہ خواتین دکن میں بیداری کے احساسات کس حد تک پیدا ہو گئے ہیں اور اس طبقہ نے ہمارے آقائے ولی نعمت کے عہد میمنت مہد میں اپنی بہبودی، فلاح و بہبود کے لئے کیسے کیسے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ تعلیمی، ذہنی و معاشرتی ترقی کے زینے کس حسن و خوبی سے طے کئے جا رہے ہیں۔ ترقی کی اس رفتار کو دیکھ کر دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ طبقہ مستقبل قریب میں ذیلی مدارج طے کر کے بہت جلد بام ترقی پر پہنچ جائیگا۔ تعلیم نسواں کی یہ رفتار پیش خیمہ ہے اس طبقہ کے درخشاں مستقبل کا۔ وہ دن دور نہیں کہ ہماری ملکی بہنیں دوسرے ممالک متمدنہ کی خواتین کی طرح زیور علم سے آراستہ اور صحیح تربیت یافتہ ہو کر علم و عمل کی روشنی سے جہالت کی تاریکی کو ملک سے دور کر دیں گی۔

مرزا سیف علیخاں

سب میں
دنیا کا سب سے بڑا ہیرا ہے، کیونکہ اس کا وزن (۵۳۹) قیراط ہے۔

"الماس نظام" کے ابتدائی تاریخی واقعات کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہ ہیرا نواب میر فرخندہ علی خاں بہادر آصفجاہ رابع کے عہد حکومت میں دستیاب ہوا تھا۔ صاحب گلزار آصفیہ نے (جو اس دور کے معتبر ترین مورخ سمجھے جاتے ہیں، اور جنھیں ایک عرصہ تک دربار شاہی کے تقرب کا بھی اختصاص حاصل رہا) اس کے حالات کی تحقیق میں، جو غالباً ان کے چشم دید ہیں، یہ بیان کیا ہے کہ قصبۂ جٹ پول میں ایک بقال رہتا تھا، معلوم نہیں کہ یہ الماس اسے کہاں سے ہاتھ لگا، مگر اس نے اس کی حفاظت بگائے کے سینگ میں چھپاکر اپنے ہی گھر میں، زمین میں دفن کرکر رکھی تھی، اور اس کے ساتھ اس کی فردکیفیت بھی اسی سینگ میں لکھ چھوڑی۔ چند دنوں بعد وہ مرگیا، اور اس کا حال کسی کو نہ بتاگیا، چنانچہ یہ ہیرا اسی طرح دو سو برس تک زمین ہی میں پوشیدہ رہا، اور اس دو صدی کے امتداد نے اس کے مکان کو کہنہ و افتادہ کرکے ویران کردیا، اور صرف کھنڈر ہی باقی رہا تھا۔ اتفاق سے کسی نے اس زمین کو خرید کر اس پر مکان بنانا شروع کیا، کھنڈر کی صفائی وغیرہ اور پایہ کھودنے کی وجہ سے پرانے مکان کی مٹی دوسری طرف منتقل ہوتی رہی، یہاں تک کہ اس زمین کا وہ دفن شدہ سینگ بھی جس میں کہ یہ چھپا تھا سارے خس وخاشاک کے ساتھ پھینک دیا گیا اس لئے کہ ایسی حقیر چیز کی کیا اہمیت ہوسکتی تھی اور اس کے راز اور بھید سے کون واقف تھا۔

اس کے بہت دنوں بعد ۱۲۰۰ھ میں اسی قصبہ کا ایک کمہار برتن بنانے کے لئے مٹی کی خاطر اس مقام پر پہنچا اور یہاں اس نے خاک میں دبی ہوئی ایک سینگ پائی صرف اس خیال سے کہ زمین کھودنے اور مٹی حاصل کرنے میں اس سے سہولت ہوگی اٹھالی، جب اسنے صاف کرنے لگا تو اس سینگ میں اس کو ایک خوبصورت مگر بے رونق پتھر نظر پڑا چونکہ وہ ایک گنوار تھا، اس لئے اس نے اس "سنگِ رنگین" کو کوئی اہمیت نہ دی۔ مٹی ساتھ لادلی اور اس پتھر کو بھی اپنے بچوں کے کھیلنے کے لئے رکھ لیا۔
چنانچہ گھر پہنچ کر اس نے اس پتھر کو اپنی لڑکی کے حوالہ کیا اور لڑکی اس کی رنگینی و دلآویزی کو دیکھ کر ہیرا لئے خوش خوش باہر نکلی، پنے ساتھ کھیلنے والے بچوں کو جمع کیا اور ان بچوں نے دوڑ دوڑ کر میٹھے پھل (شرینیوں) کے بیج اکٹھے کئے۔ خود بیٹھی ترازو کے ایک پلڑے میں یہ رنگین پتھر رکھے بیجوں کو اس کا ہم سنگ کرتی، اور سارے بچوں میں انھیں تقسیم کرتی جاتی تھی۔
ان ہی دنوں سے چند روز پہلے لڑکی کی ماں نے اپنے گاؤں کے ایک سنار سے اس لڑکی کے لئے کسی زیور کے تیار کرنے کی فرمایش کی تھی، اتفاق سے وہ اسی دن چاندی لینے کے لئے اس کے گھر آیا، تو لڑکی کو گھر کے پہلو میں چند بچوں کے ساتھ بیٹھے

ہے "الماس پٹن" نامی ایک اور ہیرا ہے، یہ ایک علاقہ کا نام ہے، جہاں کا حاکم راجہ پٹن کہلاتا ہے، چونکہ یہ الماس اسی کے قبضہ میں ہے، اسی لئے اس نام سے مشہور ہوا۔ یہ ہیرا ابھی ناتراشیدہ بیضوی شکل کا ہے، جس کا وزن (۱۶۶) قیراط سی ½ ماشہ ہے، جوہریوں نے اس کی قیمت دو کروڑ سے زیادہ قرار دی ہے، تو اس لحاظ سے غور فرمایئے کہ "الماس نظام" کس قیمت کا ہوگا، جو اس سے (۳۷۳) قیراط زیادہ وزنی ہے۔ "کوہ نور" جیسا مشہور ترین ہیرا تو غالباً بارھویں نمبر پر شمار ہوتا ہے، جس کا وزن ½ ۱۰۶ قیراط اور قیمت چودہ لاکھ ہے، صرف اس کو اس کی تاریخی حیثیت سے اتنی بڑی شہرت نصیب ہوئی۔ ورنہ اس کا قیمت و وزن کے لحاظ سے کوئی درجہ نہیں۔

اس بے نظیر پتھر سے کھیلتے ہوئے پایا، اور اس نے اپنی واقفیت کی بنا پر اس پتھر کی حقیقت سمجھ لی کہ یہ ایک بے بدل آب دار ہیرا ہے۔ دوسرے دن جب کہ کمہار کے گھر کوئی نہ تھا، سنار موقع پاکر اپنے ساتھ مٹھائی لے آیا، اور نہایت عاجزی کے ساتھ لڑکی کو سمجھا منا کر مٹھائی دی اور اس سے وہ پتھر مانگنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کچھ ضدی تھی۔ اس کی اس طلب پر برہم ہوگئی، اور غصہ میں فوراً بھاگ کر گھر دوڑی چلی آئی، اور کمرے میں جاکر ہیرے کو طاق پر رکھ دیا۔ جب ماں آئی تو سارا قصہ بیان کیا کہ فلاں سنار نے مجھے مٹھائی دی، اور اس پتھر کو بڑی عاجزی سے مانگنے لگا، لیکن میں نے اُسے نہ دیا۔ ماں نے یہ خیال کیا کہ وہ شاید چاندی تولنے کے لیے اس کو مانگ رہا تھا، اس لئے اس نے اس پتھر کو ایک پوشیدہ مقام پر چھپا دیا۔ جب دوبارہ سنار آیا اور اس نے لڑکی سے وہ پتھر مانگا تو ماں کو معلوم ہوگیا، اس نے سنار سے کہا معلوم نہیں کہ اس دیوانی بچی نے اُسے کہاں کھو دیا۔ سنار یہ سن کر بے قرار ہوگیا، اور کہنے لگا کہ "افسوس تو نے یہ کیا کیا! ارے وہ تو ہیرا تھا!! اگر تو مجھے دے دیتی تو میں تجھے تیرے منہ مانگے پیسے دیتا"۔ جب لڑکی کا باپ آیا تو ماں نے یہ سارا قصہ اُسے کہہ سنایا، اس پتھر کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد کہ یہ ہیرا ہے شاید کمہار زرگر سے ملا، اور ان دونوں میں بعد تصفیہ یہ طے پایا کہ وہ اس معاملہ کو انتہائی پوشیدہ رکھیں گے، اور آپس میں نصف نصف تقسیم کرلیں گے، چنانچہ بہ ہزار دقت ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اُسے توڑا، اور ہیرے کا وہ حصہ، جس کو سنار نے اپنے لیے پسند کیا تھا، اس کے دو تین [۳] ٹکڑے ہوگئے، اور وہ حصہ جو کمہار کے لیے مختص تھا محفوظ رہا، اور یہی ٹکڑا وزن میں پختہ چھ تولے پانچ ماشے نکلا۔[1] صاحب گلزار آصفیہ لکھتے ہیں کہ یہ اپنی تمام و کمال حالت میں گیارہ تولے تھا

سنار اپنے حصے کے ٹکڑوں کو لے آیا، اور دوسرے سناروں کے ہاتھ ایک ایک کرکے فروخت کردیا۔ اس خرید فروخت کی شہرت ہونے لگی، اور ہوتے ہوتے وہاں کے زمیندار تک بھی پہنچی، فوراً اس نے اس سنار کو گرفتار کرالیا، اور اس پر سختیاں کرکے اِس ہیرے کی تحقیقات کی، واقعات کے معلوم ہونے پر اُن سب سناروں اور اُس کمہار کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان دنوں، اس علاقہ کی تعلقداری پر بچھا راؤ نامی ایک شخص مامور تھا، اُس نے اِس الماس کی ساری حقیقت مدار المہام وقت مہاراجہ چندو لال بہادر کو لکھ بھیجی۔ مہاراجہ نے محمد قمر الدین جمعدار مندوزی کو جو تعلقدار نلگنڈہ تھے، بچھا راؤ کے ہمراہ اُس زمیندار کے پاس بھیج کر اُسے طلب کیا، زمیندار نے، نوبت و نقارہ اور دس ہزار کی جاگیر اپنے اور اپنی اولاد کے لئے بطور "آل تمغہ" سرفراز ہونے کی شرط پر اِس ہیرے کو مہاراجہ بہادر کے حوالہ کردیا۔ راجہ صاحب نے حضور کی نظر اشرف میں گذرانا، اور اُسے حسب وعدہ اعلیٰ حضرت سے عرض کرکے جاگیر سے سرفراز کرایا۔ جوہریوں نے اس "نادر العصر رقم" کو دیکھ کر اور پرکھ کر، بالاتفاق عرض کی کہ یہ الماس عجائبات روزگار سے ایک لاقیمت چیز ہے، اور کسی ملک میں ہم نے ایسا نادر روزگار، اس قدر بڑا ہیرا دیکھا اور نہ سُنا۔ اور ایسے جوہر نایاب کی قیمت لگانے سے ہم عاجز ہیں۔

ہند اور ولایت، ایران کے حکاکوں کو اِس الماس کی تختیاں تراشنے کے لئے حکم ہوا تو ان لوگوں نے اس کی مزدوری پانچ لاکھ روپئے طلب کی، اور کہا کہ ہم اِس الماس سے سات عمدہ باریک اور شفاف تختیاں تراش کر گزرانیں گے، کہ جس کے آگے "دریائے نور" اور "کوہ نور" بے رونق و بے آب نظر آنے لگیں گے۔ غالباً حضور نے اجرت کی زیادتی کی وجہ سے منظور نہیں فرمایا، یہ جس حالت میں دست یاب ہوا تھا، اُسی طرح جواہر خانہ میں محفوظ کرلیا گیا۔[1]

---

[1] گلزار آصفیہ صفحہ ۶۰۰ مؤلفہ حکیم غلام حسین خاں مطبوعہ مطبع محمدی ۱۳۰۸ھ

"تاریخ ریاست حیدرآباد دکن" کے مولف نجم الغنی خاں رام پوری نے اپنی کتاب کے صفحہ انیس[1] پر اس ہیرے کے تراشنے کی اجرت پچاس ہزار لکھی ہے، جو درست معلوم نہیں ہوتی۔[2]

"آئینہ جواہر" کا مولف کہتا ہے کہ اس ہیرے کا شمار دنیا کے بڑے بڑے ہیروں میں ہے، اور نظام حیدرآباد کے پاس رہنے کی وجہ سے "الماس نظام" سے مشہور ہوا ہے۔ اس کا وزن (۳۴۰) قیراط یعنی (۱۲۷ ۳/۴)[3] ماشہ ہے۔ یکان کلور سے برآمد ہوا تھا، اور ۱۸۳۵ء میں ایک شخص کے پاس بطور کھلونے کے تھا۔ ایک اور روایت یہ نقل کی ہے کہ کسی سوار نے اسے ایک مٹی کے برتن میں پایا تھا۔ جو بعد کو ایک ہندو زرگر کے ہاتھ لگا اور اس نے اس کی آزمائش کے لئے کہ یہ ٹوٹ سکتا ہے یا نہیں اس پر ضرب لگائی جس کی وجہ سے اس کے تین ٹکڑے ہو گئے۔[4] اس کی شکل ایک چینی عورت کے پاؤں کی طرح ہے جس کا انگوٹھا[5] نہ ہو۔

کنگ صاحب (Mr King) نے بھی اس کی شکل و شباہت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ناتراشیدہ الماس بادامی شکل کا ہے۔ اس کے تاریخی حالات لکھنے میں انھوں نے بھی سخت غلطی کی ہے، اور ہمارے نزدیک ان کے ایسے مشہور ماہر و نقاد کے بیانات بھی قابل اعتبار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "کسی حادثہ سے ہندوستان کے غدر میں اس سے ایک ٹکڑا علیحدہ ہو گیا، اور اس کا وزن (۳۴۰) قیراط ہے۔" بعضوں نے یہ شک ظاہر کیا ہے کہ کنگ صاحب نے اس کی کوئی صراحت نہیں کی کہ آیا یہ وزن اس الماس کے ٹوٹنے سے قبل کا ہے یا بعد کا؟ ایک اور انگریز ڈیولے فیٹ (Dieula Fait) کا بیان ہے کہ اس کا وزن اس کے ٹوٹنے سے پیشتر (۳۴۰) قیراط سے کم نہ تھا۔ مبصرین کے نزدیک صاحب گلزار آصفیہ کے سے معتبر مورخ کے آگے ان لوگوں کے گمانوں اور مختلف بیانوں کی کوئی وقعت نہیں، اس لئے کہ انھوں نے وزن کی تصریح صاف طور پر کر دی ہے۔ باربٹ نامی ایک ماہر نے اس فرضی وزن کی بنا پر اس کی قیمت (۵) لاکھ فرنک لکھی ہے جو بیس لاکھ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

"آئینہ جواہر" کا مولف امرناتھ کہتا ہے کہ اس ناتراشیدہ الماس کی قیمت ٹھیک ٹھیک نہیں کہی جا سکتی۔ کیونکہ کاٹنے کی وجہ سے ناتراشیدہ الماس اکثر وزن میں کم ہو جایا کرتے ہیں، لیکن غیر تراشیدہ حالت میں اس الماس نظام کی شکل چنداں بے ڈھب بھی نہیں۔ البتہ کٹوانے میں نصف سے زیادہ کے نقصان کا احتمال نہ ہوگا۔ تا حال یہ الماس نظام حیدرآباد کے جانشینوں کے پاس خیال کیا جاتا ہے۔[6]

---

1. تاریخ ریاست حیدرآباد دکن مطبوعہ نول کشور پریس ۱۹۳۰ء۔

2. صاحب گلزار آصفیہ نے جو وزن چھ تولے پانچ ماشہ لکھا ہے، اس کے کل (۷۷) ماشے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ وزن غلط اور ناقابل تسلیم ہے، اور مؤلف موصوف کا ہی بیان بہت زیادہ قابل اعتبار ہے۔ ۱۲

4. آئینہ جواہر کے مؤلف نے غالباً یہ قصہ انگریزی کتابوں سے لیا ہے، اور انگریز محققین نے بلا تحقیق جس طرح روایت در روایت نقل در نقل اپنی کتابوں میں قلم بند کر دیا گویا قصہ ان لوگوں نے غلط لکھا ہے، مگر گلزار آصفیہ کے ہی واقعہ کی الٹ پھیر ہے، اور ان غلط قصوں ہی سے صاحب گلزار آصفیہ کی تحقیقات اور سچائی کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہے۔ کمہار کے بجائے مٹی کے برتن کا ذکر کیا گیا ہے، شاید مؤلف ظرف کہہ کر مظروف کا قاعدہ تو مراد نہیں لے رہے ہیں۔ سوار کا اس ہیرے کو پانا بالکل غلط ہے۔ البتہ ایک ہندو زرگر، اور اس کے تین ٹکڑے ہونا یہ صحیح ہے۔

5. آئینہ جواہر مصنفہ پنڈت امرناتھ، حاشیہ صفحہ ۱۶۴ مطبوعہ خادم التعلیم پریس لاہور سنہ ۱۹۱۳ء

6. آئینہ جواہر صفحہ ۱۶۴

رہبر فاروقی

تاش کا منڈپ باندھا جاتا ہے۔ منڈپ باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو شل ہے بیل منڈوے چڑھے تو گویا منڈپ تو منڈوہ ہے اور بیل آل اولاد کی جو آگے چڑھے گی۔ غریبوں میں تو اب تک لکڑیوں کو نگہ کر سبز سبز پتوں سے منڈپ باندھا جاتا ہے۔ مگر امیروں اور صاحب استطاعت لوگوں نے منڈوے سے منڈپ اس طرح بنا لیا ہے۔ اسی منڈپ کے نیچے ایک لال رنگ کی پاؤں گھڑی یعنی پا انداز بچھاتے ہیں تاکہ سمدھنیں منڈپ کے نیچے اور اس پاؤں گھڑی پر سے چلتی ہوئیں دالان میں داخل ہو سکیں۔ منڈپ کے نیچے دلہن کی کوئی ایک ان بیاہی رشتہ دار لڑکی چاندی کی کٹوری میں صندل لے کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اور جب سمدھنیں آنا شروع ہوتی ہیں تو ہر سمدھن کو "صندل ہاتھ" دیا جاتا ہے۔ صندل ہاتھ دینے کا طریقہ یہ ہے کہ صندل کی کٹوری میں چار انگلیاں ڈبو کر ہر سمدھن سے اس طرح ہاتھ ملایا جائے کہ اس کے ہاتھ میں ہی صندل لگ جائے کہ یہ نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ انہی آنے والی سمدھنوں میں اگر کوئی سمدھن "امید" سے ہوں تو وہ منڈپ کے نیچے نہیں آ سکتیں اور نہ ان کا گود بھرا جاتا ہے وجہ یہ ہے کہ قدرتاً تو وان کا گود بھر جانے والا ہے۔ اب اگر گود بھرا جائے گا تو وہم یہ ہے کہ بچہ ضایع ہو جائے گا۔ اور گود خالی ہو جائے گا۔ اسی طرح چونکہ منڈپ میں بھی گود ڈالا جاتا ہے اس لئے یہ اس کے نیچے بھی نہیں جا سکتی منڈپ میں گود اس لئے ڈالتے ہیں کہ منڈپ ایک ایسا منڈوہ ہے جس پر آل اولاد کی بیل چڑھتی ہے۔ گود میں پان شریک ہوتے ہیں اور پان کی بیل ہوتی ہے اس لئے ابتدا ہی سے گویا منڈپ میں گود ڈال کر بیل چڑھا دی جاتی ہے۔ تاکہ آئندہ آل اولاد کی بیل ہمیشہ ہری بھری اور چڑھتی ہی رہے

منڈپ کے قریب ہی ایک طرف میراثنیوں کا طائفہ بیٹھا ہوا گاتا رہتا ہے ان لوگوں کے گانے بہت و تفنیہ ہوتے ہیں۔ ہر موقعہ اور رسم کے لحاظ سے یہ لوگ مخصوص گانے گاتے جاتے ہیں۔ ان کے گانے اپنے وقت پر درج ہوں گے۔ چنانچہ جس وقت سمدھنیں آتی ہیں تو میراثنیں یہ مخصوص گانا گاتی ہیں۔

ساجن آئی رے اللہ پیر منائی رے

میری ساجن آئی رے

جب سمدھنیں دالان میں گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتی ہیں تو انھیں "مصری چنائی" جاتی ہے۔ دو ماما ئیں سمدھنوں کے سر پر ایک تاش کا رومال اٹھا ہوا دوپٹہ پکڑ لیتی ہیں اور دلہن کی ایک سہاگن رشتہ دار بیوی چاندی کی طشتری میں مصری کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں جن پر چاندی سونے کا ورق لگا ہوا ہوتا ہے لاتی ہیں اور ہر سمدھن کے آگے باری باری سے پیش کرتی ہیں۔ ہر سمدھن ایسے موقعہ پر شرم اور جھینپ کا اظہار ضرور کرتی ہے اب خواہ یہ نظر آتا ہو یا رسماً بہرحال رسم کی پابندی غیں ضرور کرنی پڑتی ہے۔ وہ لڑکیاں جو ناکتخدا ہیں مصری لینا تو کجا آنکھ تک اُدھر نہیں اٹھاتیں۔ گر مصری لانے والی بیوی جبر و قہر اور زور و زبردستی کے ساتھ ان کے منہ میں مصری ٹھونس ہی دیتی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ فقرے بھی کستی جاتی ہیں جس سے وہ بیچاری تو مارے شرم کے عرق عرق ہوتی جاتی ہے اور ادھر خوب فرمائشی قہقہے اڑتے ہیں۔ مصری چنائی جاتے وقت میراثنیاں گاتی ہیں

سمدھن میری مصری کھاوے

اس کے بعد گانا شروع ہوتا ہے۔ ٹھمری۔ دادرا غزل وغیرہ جب میراثنیں گا چکتی ہیں تو دلہن کو لائی کی جلدی شروع کی جاتی ہے۔ ادھر تو جلدی ہوتی ہے اور اُدھر دلہن کو سنوارا جاتا ہے۔ دلہن بیچاری کا شروع شادی سے اخیر شادی تک

پنے اوپر کوئی اختیار نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ اپنی آنکھوں کو بند رکھے باقی جملہ کام اوپر والے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔

دلہن کو کسی ایک قسم کا قیمتی جوڑا کپڑوں کا پہنایا جاتا ہے اور وہ زیور بھی جو دلہن کو جہیز میں دیا جانے والا ہے۔ پہنا دیتے ہیں آنکھوں پہ "آرائش" لگاتے ہیں۔ چنی باریک کٹے ہوئے مقیش سے افشاں چنا جاتا ہے۔ سرمہ لگایا جاتا ہے۔ اور ایک لمبا سا گھونگھٹ کھینچ کر کوئی ماما۔ انا۔ ددا یا چھوکری دلہن کو گود میں اٹھا کر باہر اس زردوزی مسند پر لا بٹھاتی ہے جو دالان میں منڈپ کے نیچے اسی رسم کے لئے بچھائی جاتی ہے۔ ایک مخصوص گیت ہوتا ہے جو ایسے وقت میں میراثنیاں نہایت جوش میں گاتی رہتی ہیں۔ اس وقت کا سماں قابل دید اور اس وقت لوگوں کے جذبات دیکھنے کی چیز ہیں سب سمدھنیں خاموش دلہن کے کمرے کی طرف نگاہیں لگائے سراپا انتظار اور مجسم اشتیاق بنی بیٹھی ہوتی ہیں۔ جیسے ہی دلہن نظر آتی ہے۔ میراثنیوں کا جوش اور بڑھ جاتا ہے۔ سمدھنوں کے چہرے پھول کی طرح کھل جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ تبسم۔ ہنسی سے بدل جاتا ہے۔

آئی بنو آئی - ہریالی بنو آئی

اماں کی پیاری بنو آئی باوا کی پیاری بنو آئی

آئی بنو آئی

یہ گیت سمدھنوں میں ایک عجیب جوش وخروش پیدا کر دیتا ہے باہر نوبت نوازی شروع ہو جاتی ہے اور اب رسم شروع ہوتی ہے رسم دولہا کی سہاگن پھوپی یا بہن کو کرنا پڑتا ہے۔ دولہا کی والدہ ان سے نہایت عجز وانکسار اور منت کے ساتھ کہتی ہیں آپ بزرگ ہیں۔ اگر آپ کے ہاتھ سے یہ "کاج" ہو جائے تو میری خوش نصیبی ہے۔ خدا آپ کی چھاؤں (سایہ) دلہن پر بھی ڈالے اور وہ دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ اگر دولہا کے رشتہ داروں میں سے کوئی بزرگ نہ ہوا اور خود دولہا کی ماں سہاگن ہوں تو رسم کرنے بیٹھتی ہیں۔ رسم کرنے کے لیے سہاگن کا ہونا ضروری ہے۔

کشتیاں اور چنگیر جو دولہا کے گھر سے آتے ہیں وہ مسند کے قریب رکھ دئے جاتے ہیں۔ رسم کرنے والی بیوی پہلے اپنے گلے کو صندل لگاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ خود سہاگن ہیں اور پھر وہ سہاگن جن کا سہاگ بہت قدیم ہے مطلب یہ کہ ان کی طرح دلہن کا بھی سہاگ تا دیر قائم رہے۔ اپنے گلے کو صندل لگا لینے کے بعد دلہن کے گلے۔ سینہ اور پیٹھ پر صندل لگا کر سات۔ نو یا گیارہ سہاگنوں کو بھی بہ ترتیب متذکرہ صندل لگایا جاتا ہے۔ اگر دلہن کی بہن ہو تو پھر دلہن کو صندل لگانے کے بعد علاوہ سہاگنوں کے ان بیاہی لڑکیوں کو بھی صندل لگایا جاتا ہے تاکہ اس کی شادی بھی جلدی ہو جائے۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ رسم ہوتے وقت اگر کوئی چھینک دے تو رسم تھوڑی دیر کے لئے روک دیا جاتا ہے۔ حالانکہ چھینکنے کے بعد مسلمان الحمد اللہ کہہ کر شکر ادا کرتے ہیں۔ تاہم اس کو کسی کام کی ابتدا میں منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح باہر نکلتے وقت کوئی چھینک دے یا کبلی سامنے آجائے یا ٹھوکر لگ جائے تو تھوڑی دیر کے لئے باہر جانا موقوف ہو جاتا ہے کیونکہ یہ ناکامیابی کی علامت ہے بجائے اس کے اگر کوئی مہتر یا کوئی شخص "دہی" لے کر سامنے آجائے تو کامیابی یقینی سمجھی جاتی ہے۔

صندل لگاتے وقت میراثنیں گاتی ہیں۔

صندل لگاؤ ہریالی بنو کو۔ راج دلاری بنو کو

صندل لگا چکنے کے بعد گود بھرے جاتے ہیں۔ پہلے رسم کرنے والی بیوی اپنا گود بھرتی ہیں۔ اس کے بعد دلہن کا گود چاندی کی سپیاری اور چاندی کے لڈو سے حسب مقدور روپیہ رکھ کر بھرا جاتا ہے۔ دلہن کے قریب دلہن کی ایک رشتہ دار سہاگن بیٹھتی ہیں۔ شرم کی وجہ سے دلہن جھکی ہوئی بیٹھتی ہے۔ اس لئے یہ بیوی دلہن کا سر بھی تھامے ہوئے رہتی ہیں اور موقعہ بموقعہ دلہن کو امداد بھی دیتی جاتی ہیں چنانچہ جس وقت دلہن کا گود بھرا جاتا ہے تو یہ بیوی ایک ریشمی رومال دلہن کے گود میں بچھا کر گود حاصل کر لیتی ہیں۔ دلہن کا گود بھرنے کے بعد منڈپ میں بھی ایک گود ڈالا جاتا ہے اور پھر سات تو۔ یا گیارہ سہاگنوں کے گود بھرے جاتے ہیں۔ گود بھرتے وقت میراثنیاں یہ مخصوص گیت گاتی ہیں۔

یہ بائی کا گود بھراؤ۔ پیا کے کارن۔ راج دلاری کے گود بھراؤ
سب مل کر گود بھراؤ۔ سہاگنوں کا گود بھراؤ پیا کے کارن
گود بھراؤ گنگا کو۔ موتیوں کے چوک پراؤ پیا کے کارن

گود بھرائی ہو چکنے کے بعد دلہن کا منہ میٹھا کیا جاتا ہے۔ رسم کرنے والی بیوی مصری دلہن کے منہ کے پاس لیجاتی ہیں اور وہ بیوی جو دلہن کے قریب بغرض امداد بیٹھتی ہیں ہاتھ بڑھا کر مصری لے لیتی ہیں۔ اس کے بعد "چوبا" کھلایا جاتا ہے۔ مصری کھلاتے وقت کا مخصوص گیت یہ ہے۔

مصری کھاوے بنو میری۔ یہ سہاگن کے ہاتھ سے کھاوے
یہ بچہ والی کھلاوے۔ بنو میری مصری کھاوے

چوبا کھلاتے وقت بجائے مصری کے چوبا کھاوے گاتے ہیں بقیہ گانا یہی ہوتا ہے۔ چوبا کھلانے کے بعد دلہن کو پان کھلایا جاتا ہے۔ پان پر سونے چاندی کے ورق لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس وقت کا مخصوص گیت یہ ہے۔

بندڑی کو پان کھلاؤ ری البیلی سہاگن

پان کھلا کر پھولوں کا گہنا اور ہار پہنائے جاتے ہیں۔ اس وقت یہ مخصوص گیت گایا جاتا ہے۔

ہار وری ماں یہ لال بنو کے گلے
اماں پیاری کے گلے۔ باوا پیاری کے گلے
جائی۔ جوئی اور بیلا چنبیلی۔ اچھے گلابوں کے ہار
یہ چاند بنو کے گلے۔ ہار وری ماں یہ لال بنو کے گلے

یہ جملہ رسوم گویا تمہید تھے اصل پاؤں ناپنے کی رسم کے۔ کیونکہ جب تک یہ سارے رسوم نہ ہوں کوئی رسم ہی نہیں کہلاتا۔ بہر حال یہ سب مراحل طے ہو جانے کے بعد وہ موتیوں کے لڑ جو ساتھ لائی گئی ہے۔ رسم کرنے والی بیوی نکالتی ہیں اور ادھر سے دلہن کے پاس بیٹھی ہوئی دلہن کی رشتہ دار سہاگن دلہن کا سیدھا پاؤں آگے بڑھا دیتی ہیں اور اس "لڑ" سے پاؤں ناپ لیا جاتا ہے۔ یہ لڑ جس سے پاؤں ناپا گیا ہے جلوہ کے روز دلہن کی نتھ میں ڈالی جاتی ہے۔

اس کے بعد "رونمائی" ہوتی ہے اور جو روپیہ، اشرفیاں یا زیور لایا گیا ہے وہ اس طرح دلہن کو "سلامی" میں

یہ جاتا ہے کہ دلہن کے قریب بیٹھی ہوئی بی بی دلہن کے دونوں ہاتھ آگے پھیلا دیتی ہیں اور رسم کرنے والی بیوی "سلامی" دلہن کے ہاتھوں میں ڈال دیتی ہیں اور ساتھ ہی دلہن کے سر سے جھٹ پٹ بلائیں لے لیتی ہیں اس کے بعد "وارن پھیرن" شروع ہوتا ہے۔ ایک میراثن دلہن کے قریب آکر کھڑی ہو جاتی ہے تاکہ "وارن پھیرن" کے روپے حاصل کرے کیونکہ یہ حق میراثن ہی کا ہوتا ہے اس طرح اسے بھی سو سوا سو روپے مل جاتے ہیں۔ بہرحال ایک ایک سمدھن آتی جاتی ہیں دلہن کا منہ دیکھتی ہیں اور حسب مقدور روپیہ وار کر میراثن کو دیتی جاتی ہیں۔ بقیہ میراثنیاں یہ مبارک بادی گاتی رہتی ہیں جس کے بعد یہ رسم ہو جاتا ہے اور دلہن کمرہ میں پہونچائی جاتی ہے۔

تمھیں یہ شادی جسم جسم مبارک ہو مبارک ہو
مچی ہے دھوم شادی کی مبارک خانہ آبادی
وہ شہزادہ یہ شہزادی مبارک ہو مبارک ہو

تقی عابدی

کوہ نور

(گولکنڈہ کا مشہور ہیرا جو اب بہت دنوں سے انگلستان کے تاج کی زینت ہے)

بحر ظلمات میں ڈوبا ہوا تارا تھا کوئی — راکھ کے ڈھیر میں خوابیدہ شرارہ تھا کوئی
پردۂ خاک سے سورج کی کرن نکلی ہے — جلوہ بردوش نمائے دکن نکلی ہے
کسی معشوق جواں سال کا نگیں لب ہے — زرپرستوں کے لئے شمع سر محفل ہے
سنگ کی شکل میں اک نور نظر آتا ہے — پرتو جلوہ گہ طور نظر آتا ہے
شعلۂ حسن ہے یہ جلوۂ نیرنگ ہے یہ — رونق تاج ہے یہ زینت اورنگ ہے یہ
جو بھی دیکھے کہتا ہے کہ لاقیمت ہے — جس کی قسمت میں یہ آجائے وہ خوش قسمت ہے

ذرہ کہتا ہے کہ "یہ کیا ہے تماشا یارب؟
مہر تابندہ سے بڑھ کر ہے یہ ذرہ یارب؟
کس سے لوں نور کہ اب میری نظر ششدر ہے
چرخ پر مہر ہے اور ارض پہ یہ پتھر ہے
ایک ہے دور بہت ایک ہے آنکھوں سے قریب
کس کو سجدہ کرے حیران ہے یہ تیرا غریب"

میکش

سمستان جٹپول

ہماری سلطنت آصفیہ کے زیر اقتدار بہ عنایت الٰہی ایسے متعدد علاقے ہیں جو اپنی وسعت اور آمدنی کے اعتبار سے ہندوستان کے ان اسٹیٹوں سے بڑھے ہوئے ہیں جن کے حکمران ہز ہائینس کے خطاب سے ممتاز اور توپوں کی سلامی کا اعزاز رکھتے ہیں بلکہ ان میں سے بعض تو یورپ کی چھوٹی چھوٹی خود مختار سلطنتوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ایسے تمام علاقوں کے والی (نواب یا راجہ) کی جانشینی و ولیعہدی کی تہنیت، وراثت، عطائے اختیارات عدالتی و کوتوالی، اعلیٰ عہدہ داران اسٹیٹ کا تقرر و تنزل کلیتۃً حکومت عالیہ آصفیہ نظامیہ کی منظوری کا تابع ہے۔ ان ہی علاقوں میں سے ایک سمستان جٹ پول ہے جس کا رقبہ ۵۰، ۵۴۵ مربع میل، اوسط آمدنی سالانہ [illegible] اور جس کی مردم شماری ۵۰۰،۹ ہے۔

جٹ پول کا صحیح تلفظ جٹ پرول ہے۔ جٹایو ایک پرندہ کا نام ہے اور پرول کے معنی شہر کے ہیں۔ وجہ تسمیہ اس کی یہ کہی جب راون، رام چندر جی کی باعصمت بیوی کو ان کے بن باس کے زمانہ میں اڑائے جا رہا تھا تو یہ پرندہ اس مقام پر راون کا سد راہ ہوا۔ راون کو جو نشہ حکومت میں سرشار تھا جٹایو کی یہ مزاحمت غضب آلود کر دی اور اس نے اس پرندکو مار ڈالا یا کم از کم یہ کہ اس کو زخمی کر دیا اور اس کا بازو اسی مقام پر گر گیا جس کی یادگار میں جٹیشور نام کی ایک دیول تعمیر کی گئی جو ابتک موجود ہے اور یہیں ایک شہر جٹ پرول نام کا بسا جو اب ایک معمولی سا قریہ رہ گیا ہے۔ بعد میں یہ علاقہ بھی اسی نام سے موسوم ہو گیا۔

سنسکرت میں سنوستھان راجہ کے رہنے کی جگہ کو کہتے ہیں کثرت استعمال سے واؤ اور ھ حذف ہو گئے اور نون میم سے بدل کر سمستان ہو گیا اور اس سے مراد ایسا علاقہ عطیہ شاہی قرار پایا جس میں ملک کا ایک حصہ ایک رقم معینہ کے ٹھیراؤ سے کسی کو عطا کیا گیا ہو اس رقم معینہ کو اعزازاً پیشکش کہتے ہیں۔ اس طرح ان دونوں الفاظ کی ترکیب سے یہ علاقہ سمستان جٹ پول کہلاتا ہے۔ مگر سمستان کا مستقر اب جٹ پول نہیں بلکہ کولاپور ہے جو حیدرآباد سے ۱۲۰ میل جانب جنوب ضلع محبوب نگر میں ہے حیدرآباد سے براہ جڑچرلہ و کتہ کوٹہ یا پرال تک ۱۱۰ میل کی سیدھی سڑک تعمیرات [illegible] کی ہے۔ اس کے بعد ۲۰ میل کا راستہ علاقہ سمستان جٹ پول کا ہے جو دریائے کرشنا کے متوازی کولاپور تک بنایا گیا ہے۔

یہاں کے راجہ ریچرلہ گوترم سے سربھی خاندان کے اراکین ہیں جو جنوبی ہند کا ایک بڑا معزز اور قدیم خاندان ہے۔ اس خاندان کے دیگر اراکین علاقہ مدراس میں بوبلی، وینکٹ گری، پیٹھا پور، میلارم کے راجہ ہیں آخری ذاتی سمستان جٹ پول راجہ وینکٹ لچھما راؤ یہاں کے تائیسویں راجہ تھے ان کا اصلی نام کرشنا چندریا ہے راجہ وینکٹ جگنا تھ راؤ نے انہیں ۱۸۰۸ف میں متبنیٰ کیا اور وینکٹ لچھما راؤ نام رکھا بعد میں اعلیٰ حضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہ نے نظام نواز ونت کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

مستقر سمستان کولاپور جس کی مردم شماری ۲۱۵۸ ہے دریائے کرشنا کے شمال میں ۶ میل پر ایک وسیع میدان

اس کی تعمیر ۱۳۱۷ف میں ہوئی۔ ڈاکٹر خانہ کی پختہ عمارت جس کی بنا سر اکبر حیدری (نواب حیدر نواز جنگ) ناظم و معتمد مال حکومت سرکار عالی نے ۹ اردی بہشت ۱۳۱۵ف کو رکھی اور جس کا افتتاح ۲ شہریور ۱۳۴۰ف کو مواجہ و رت مقامی کے لئے ایک مکمل عمارت ہے اس کا افتتاح ناظم صاحب طبابت سرکار عالی نے دیا تھا۔ اس عمارت میں زنانہ اور مردانہ مریضوں کے لئے علحدہ علحدہ وارڈ ہیں۔ ادویات اور آلات جراحی کا کافی ذخیرہ ہے سند یافتہ ڈاکٹر مامور ہیں اور خوبی کی یہ بات ہے کہ دواؤں کا موازنہ جو عوام کے لئے ہے محل کی ضروریات سے متاثر نہیں ہونے پاتا بلکہ ڈیوڑھی کے ادویہ کا خرچ محل ہی کے موازنہ سے پورا ہوتا ہے۔

راجہ صاحب کے محل کے شمالی و مشرقی گوشہ پر دو ہاتھیوں کا تھان پر شکوہ شاندار صدر دروازہ پر سالہ کے باڈی گارڈ سپاہی کا ہاتھ میں برچھا لئے پہرہ دینا۔ اس دروازے کے مقابل ہی خوبصورت برجی میں برنجی گھڑیال دروازہ کے منزل بالا پر نوبت و نقارہ مشرقی امرا کے شان کا ایک پر رعب و پر جلال منظر ہے اس صدر دروازہ سے داخل ہونے پر سیدھے طرف ایک مختصر سے چمن کے وسط میں سری راجہ وینکٹ لچھما راؤ نظام نواز ونت بہادر کا پتلا (اسٹیچو) ہے جس کے پائین کتبہ لگا ہے جس سے واضح ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء اور تاریخ وفات ۵ اپریل ۱۹۲۸ء م ۱۱ خورداد ۱۳۳۷ف ہے۔ حکومت سرکار عالی کی منظوری کے بعد یہ ۶ مارچ ۱۸۸۷ء (مطابق ۲ فروردی ۱۲۹۶ف) کو اس علاقہ کے راجہ ہوئے۔

جو حالات سنے گئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آنجہانی راجہ بڑے شکاری تھے۔ ۳۹ شیر دو بونچے اور ۲۹ ریچھ مارے ہیں۔ شکار اور شکاریوں کی تاریخ میں یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ ۱۶ ستمبر ۱۹۲۲ء کو راجہ صاحب نے سوا گھنٹہ کے اندر ۵ شیر مارے۔ ان میں جہاں سپاہیانہ جوہر نظر آتے ہیں۔ وہیں انتظامی قابلیت بھی عیاں ہوتی ہے۔ اسٹیٹ کی موجودہ ترقیاں انہی کے عہد سے شروع ہوئی ہیں اب انہی کی رانی صاحبہ سربھی وینکٹ رتنما جو ویل واڑہ تعلقہ سرسلہ ضلع کریم نگر کے دیسائی کی صاحبزادی ہیں اسٹیٹ کے کاموں کی نگران ہیں اور باوجودیکہ گوشہ کی سخت پابند ہیں حتیٰ کہ ان کے اعلیٰ عہدہ دار بھی انھیں بے پردہ نہیں دیکھ سکے پھر بھی اسٹیٹ کا انتظام خوبی سے کر لیتی ہیں۔

کیا میں اس موقع پر کہہ سکتا ہوں کہ گوشہ اور پردہ کو جو تجدد پسند ترقی و انتظام دنیوی میں ہارج سمجھتے ہیں وہ اس متاع جائداد پردہ نشین ہندو رانی کے عمل کو دیکھیں۔ میں نے محترمہ بیگم صاحبہ سربلند جنگ کا ایک مضمون کسی اخبار میں چند دن قبل پڑھا تھا جس میں موصوفہ نے بعض بڑے گھرانوں کی بیگمات کے نام گنائے تھے کہ وہ باوجود پردے میں رہنے کے کامیابی کے ساتھ اپنے وسیع علاقہ کا انتظام کرتی ہیں ان مثالوں میں رانی سربھی وینکٹ رتنما صاحبہ کے نام کا اضافہ کر لینا چاہیئے۔

ہم راجہ صاحب کے محل کا ذکر کر رہے تھے جس کے صدر دروازے سے داخل ہونے کے بعد آنجہانی راجہ صاحب کے اسٹیچو (پتلے) کے سلسلے میں ان کے اور ان کی رانی صاحبہ کے کچھ حالات لکھ دیئے اس محل کو جو چندر محل سے موسوم ہے ۱۸۷۱ء میں راجہ وینکٹ جگناتھ راؤ نے بنوایا۔ یہ ایک قدیم وضع کی عمارت بڑے بڑے فیل پایوں پر ہے اس کی دیواریں کسی قلعہ کی فصیل معلوم ہوتی ہیں اسی محل پر راجہ وینکٹ لچھما راؤ نے ایک اور منزل ۱۲۹۹ف میں بڑھائی اور ۱۳۲۵ف میں اسی کے عقب وجیا محل کے نام سے زنانی حصہ تعمیر کرایا۔

بہت بڑے کمپونڈ میں بلند و بالا عمارات کا تسلسل بیسیوں دریچے اور دروازے متعدد برآمدے اور شاہ نشین سے

مکین کی شوکت و حشمت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس احاطہ میں آنے کے بعد یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ ہم تین ہزار کی مردم شماری والے قصبہ میں ہیں بلکہ گمان ہوتا ہے کہ دفعتہً حیدرآباد جیسے بلدۃ الامرا میں کسی بڑے امیر کی ڈیوڑھی میں پہنچ گئے۔ چندر محل کے شان دار ڈرائینگ روم میں جس کے فرش، فرنیچر اور دیواروں پر راجہ نظام نواز ونت آنجہانی کے شکار کئے ہوئے جنگلی جانوروں کی کھالیں مختلف طرح پر بچھی یا لٹکی ہوئی تھیں ہم نے دو تصویروں کو بڑی دیر تک دیکھا۔ ان میں سے ایک تو راجہ وینکٹ جگناتھ راؤ آنجہانی کی تھی جو بڑا سا پگڑ باندھے، انگرکھا پہنے، کندھے پر پرتلہ لٹکائے تلوار ہاتھ میں تھامے پرانی وضع بنے کھڑے ہیں دوسری انہی کے ہم نام انہی کے نوجوان پوتے کی جو سوٹ بوٹ میں ملبوس یوروپین وضع قطع بنائے مسکرا رہے ہیں۔ یہ دونوں تصویریں تبدیل لباس تبدیل مذاق تبدیل وضع کی مشرقی تاریخ آنکھوں کے سامنے پیش کرتی ہیں۔

یہاں کی عمارتوں میں بہم رسانی قوت برقی کا مکان یا پاور ہوس بھی قابل ذکر ہے۔ اس مکان میں جو بالکل [illegible] بقدر ضرورت اور سستے داموں میں بنایا گیا ہے۔ دو مشین لگے ہیں ایک ۶۰ گھوڑوں کی طاقت کا دوسرا اس کا نصف اس کے ذریعہ محل میں روشنی اور پنکھے دن رات اور عوام کے لیے سر مغرب سے تا ۹ بجے شب تک چلتے ہیں۔ آٹے کی دو چکیاں اور تیل کے دو گھانے کام کرتے ہیں۔ تیل کے گھانوں کو روزآنہ پانچ روپے پر ٹھیکہ دے رکھا ہے۔ چاول پھوڑنے کا مشین بھی لگایا ہے مگر یہ مشین ابھی چالو نہیں کیا گیا۔ آب رسانی کے لیے پانی یہیں کی برقی قوت سے کھینچا جاتا ہے۔ جو مشین باولی پر لگا ہے وہ ۴۴ ہزار گیالن روزآنہ کھینچ سکتا ہے مگر موسم گرما میں یہاں صرف ۱۰ ہزار گیالن تک پانی خرچ ہوتا ہے چونکہ پانی مقررہ اوقات پر کھولا جاتا ہے اس لئے باولیوں کا استعمال بھی جاری ہے۔

آخری راجہ وینکٹ لچھما راؤ نظام نواز ونت بہادر متوفی کو صلبی دو لڑکیاں ہیں چونکہ اولاد نرینہ نہ تھی اس لئے وینکٹ جگناتھ راؤ کو متبنی کیا ہے یہ سنہ ۱۳۲۶ف میں پیدا ہوئے ہیں اور سنہ ۱۳۳۹ف کو ان کی شادی اندرا دیوی سے ہوئی۔ جو نظام نواز ونت بہادر کی چھوٹی صاحبزادی سرسوتی دیوی کی دختر ہیں یہ نوجوان پسر بھی اپنے سپاہی منش متبنی پدر کی طرح شکار اور مردانہ کھیلوں کے شائق ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس چھوٹی سی عمر میں ۱۰ شیر انھوں نے شکار کئے ہیں۔

متوفی راجہ صاحب کی بڑی صاحبزادی ر[illegible] راجہ صاحب تیپرول کو سنہ ۱۳۱۰ف میں بیاہی گئی ہیں اور دوسری جن کا نام سرسوتی دیوی ہے وینکٹ کرشنا راؤ زمیندار پرنا پور کو دی گئی تھیں افسوس کہ عالم جوانی میں بیوہ ہو گئیں ان کے شوہر پرواز کے بڑے شوقین تھے چنانچہ کولا پور سے مدراس کو پرواز کرتے ہوئے ۲۷ اگست سنہ ۱۹۳۰ء کو طیارہ کے ٹوٹنے سے گر کے مر گئے۔ کولاپور گسٹ ہوس کے متصل ایک سنگی ستون ان کی بیوہ رانی کی طرف سے لگایا گیا ہے جس کی عبارت ان دونوں میاں بیوی کی محبت کی خاموش داستان ہے۔

اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے میں اپنی اس آرزو کا اظہار کرتا ہوں جو رہ رہ کر میرے دل میں پیدا ہوتی ہے کہ کاش ہمارے ملک کے سارے جاگیرات خصوصاً بڑے بڑے علاقوں کا انتظام ایسا ہی ہوتا ہم یہ نہیں کہتے کہ سمستان جٹ پول میں ساری ترقیاں ہو چکی ہیں نہیں۔ بلکہ جس حد تک بھی یہاں ترقی ہو گئی ہے وہ بہ نسبت موجودہ بعض دوسرے جاگیری علاقوں کے قابل تقلید ہے۔

ابو ظفر مؤید الدین حسن فاروقی

میر محمود صاحبؒ کی پہاڑی پر

میر محمود صاحب کی پہاڑی ہمارے وطن میں ایک مشہور مقام ہے۔ میر عالم کے تالاب کے کنارے ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے اور اس پر ایک بزرگ کی درگاہ بنی ہوئی ہے۔ درگاہ کے اس طرف گھنا جنگل ہے جہاں ہماری پردہ نشین خواتین نہایت خوشی سے اپنے بال بچوں کے ساتھ تفریح مناتی ہیں جس طرح عام دستور ہے ہم لوگ کسی بزرگ کی ذات سے اتنا فائدہ نہیں اٹھاتے جتنا ان کی درگاہ سے اٹھاتے ہیں یہی حال اس درگاہ کا بھی ہے، لوگ اس پُرسکون اور خاموش مقام میں دنیاوی فکروں کو ایک بزرگ کے فیضِ صحبت سے روحانی چین میں مبدل کرنے کم آتے ہیں اور زیادہ تر اس لئے تکلیف فرماتے ہیں کہ تالاب کا لطف حاصل کیا جائے اور مناظر کی دلچسپیوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

ایک مرتبہ ہم اس مقام پر پہنچ گئے موٹر سیکل پر سوار تھے خیال ہوا چلو آج اس مقام کی سیر کریں جس کی شہرت مدتوں سے سنتے آئے ہیں سرمائی تعطیلات تھیں، ٹھنڈا ٹھنڈا موسم نرم نرم دھوپ، نیلا نیلا آسمان فوراً موٹر سیکل تیز کی اور درگاہ کی طرف چلے۔ لوگ کہتے ہیں سیدھا راستہ چلنا چاہئے مگر بعض وقت راستہ گم کرنے اور اٹکل پچّو چلے جانے میں غیر معمولی لطف آتا ہے، خصوصاً اس وقت جب کہ فطرت اور اس کے اسرار کے سوا کوئی رہنما نہ ہو ہماری نظر پہاڑی کی طرف تھی مگر راستہ بالکل اس کی مخالف سمت نظر آرہا تھا پیدل ہوتے تو دور نکل جانے کا خوف ہوتا مگر جب "پیٹ بھری" موٹر سیکل ہو (آپ پیٹ بھری کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے) تو اور ہمت بڑھتی ہے۔ ہم دیکھتے رہے پہاڑی کی طرف اور چلتے رہے دوسری طرف راستہ پیچیدہ تھا ایک شاعر کو جو معشوق کی زلفوں کے پیچ و خم دیکھ چکا ہو بھلا راستے کی پیچیدگی کیا ستا سکتی؟ ہم سبز درختوں کی چھاؤں چھاؤں چلتے ہی رہے۔ بڑی دیر کے بعد منزلِ مقصود آئی پہاڑ کے دامن میں پہنچے، موٹر سیکل گرم ہو چلی تھی، ہم نے کچھ اس خیال سے کہ پہاڑ پر جا کر آنے تک کہیں یہ غائب نہ ہو جائے اور کچھ اس لئے کہ گھنے سائے میں اس کی گرمی دور ہو گی اسے شاداب جھاڑیوں کے اندر کھڑا کر دیا اور اوپر کی طرف چلے۔ جنگل، ساگوان کے درخت، پرندوں کے چہچہے، ٹھنڈی ہوائیں اور دس بجے کی نرم دھوپ بڑا روپ دکھا رہی تھی، ہم نے خیال کیا کہ سب سے پہلے بزرگ کے مزار پر فاتحہ پڑھ لینی چاہئے۔ معاف کیجئے ہم ذرا مذہبی قسم کے آدمی ہیں فوراً جیب میں ہاتھ پہنچ گیا کہ دیکھیں پھولوں اور خیرات کے لئے کھلے پیسے ہیں بھی یا نہیں بارے ایک اٹھنّی نکلی ورنہ ہر موٹر سوار کی جیب سے پیسوں سے زیادہ روپیوں کی جھنکار آتی ہے، راستہ بائیں طرف کو مڑتا تھا ہم اپنی وطنی خاکساری کے ساتھ سر جھکائے زمین جھانکتے چلے جا رہے تھے۔ یکایک اوپر جو نظر پڑی تو دیکھتے کیا ہیں کہ دو فرلانگ تک اونچا راستہ ہے سیڑھیوں کی قطار ہے اور اوپر بزرگ کا مزار نظر آرہا ہے۔ فوراً دل پر اثر ہوا۔ ہم نے خیال کیا کہ سچ ہے روح کی بلندی یہ حال قائم رہتی ہے ہم نے سیڑھیاں چڑھنی شروع کیں اوپر پہنچنے تک بُرا حال ہو گیا سب سے زیادہ تکلیف ہمارے پیٹ کو پہنچی کیونکہ ہمارا پیٹ کسی قدر گول ہے! درگاہ کے چبوترے پر پہنچنے کے بعد ایک قدیم روایت یاد آگئی۔ یہاں کے متعلق مشہور ہے کہ کسی بزرگ کی بددعا سے اس درگاہ کے تین گوشے آباد ہیں اور ایک ویران۔ ہم نے بڑے شوق سے اس کی توثیق کرنی چاہی گوشوں کی آبادی کا حال سنئے دو چار بکریاں، آٹھ دس کبوتر، تھوڑی سی عدمِ صفائی اور ایک حافظ صاحب! ویرانی کی طرف عمارت شکستہ اور کچھ نہیں۔ بہرحال ہم نے درگاہ کا ایک معتقدانہ طواف کیا اور درمیانی گنبد کے نیچے مزار کی ایک جانب بیٹھ گئے۔ تکان اور مراقبے میں ایک روحانی تعلق معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس وقت

شاید یہ لطف جنت ہی میں حاصل ہو یا نہ ہو۔ ایک درخت کے نیچے ہم نے دیکھا کہ پگڈنڈی پر دھوپ کی طرف ایک بڑا سیاہ بچھو چلا جا رہا ہے ہماری نظر اس پر اس وقت پڑی جب کہ ہم اس پر پاؤں رکھنے ہی والے تھے۔ ہم دور اچھل پڑے اور بچھو کو بہت غور سے دیکھنا شروع کیا بچھو کالا تھا جسم پر بڑے بڑے بال تھے اور ڈنکوں کی طرف دو بڑے سیاہ پنجے۔ اس کی جسامت بڑی تیتلی کے برابر ہوگی۔ تماشہ دیکھئے جوں ہی ہماری نظر اس پر پڑی بچھو اس طرح تلملا اٹھا جیسے اسے کسی تیز اور گرم سیخ سے پڑکا دیا گیا ہے۔ وہ سکڑنے لگا اور ایک دو منٹ میں سکڑ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ ہم نے دس منٹ تک اس کے چلنے کا انتظار کیا مگر وہ مردہ پڑا ہوا تھا۔ ہم نے ایک بڑی لکڑی سے اس کو الٹا کر دیکھا کہ وہ مر چکا تھا۔ ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم اس بچھو کو ایک بڑے پتے پر اٹھا کر گھر لے آئے، دو منٹوں میں وہ پانی پانی ہو گیا۔ اب ہم کو میر محمد صاحب کی پہاڑی کے دو تحفے اکثر یاد آتے ہیں۔ ایک تو اب تک قلمدان سے زیادہ دل میں ہے اور دوسرا حافظے کی دنیا میں۔ ہماری سمجھ میں نہ آسکا کہ اس پہاڑی پر ہم کو یہ تحفے کیوں ملے۔

محمد عبدالقیوم خاں باقی

نیا پل اور شام

شام کی سندر فضا میں دور کی تنویر ہے
خواب دوشیزہ کی میرے سامنے تصویر ہے

ہر طرف طوفانِ نغمہ ہر طرف طغیانِ نور
حضرتِ انساں کی سرگرمی میں گم شورِ طیور

نور کی سرگرمیوں میں غرق ایوانِ بلند
شام کی دیوی نے بڑھ کر پھینک دی اپنی کمند

گنبدوں پر نور کی پرچھائیاں ہیں پر بہار
اور فضا پر چھا گیا ہے نور و ظلمت کا غبار

اک طرف تعمیرِ عدل و اک طرف دارالشفا
دور پر اک مدرسہ ہے نیند میں کھویا ہوا

سامنے دارالکتب کی دل نشیں تعمیر ہے
جس کی خشت و گل میں عقل و ہوش کی تخمیر ہے

رودِ موسیٰ پر نیا پل دہر کی تصویر ہے
جس کی دو رنگی میں دونوں دور کی تعمیر ہے

ایسے خوش منظر میں میری ذات ہے کھوئی ہوئی
جاگتی ہے آنکھ اور تقدیر ہے سوئی ہوئی

سید محمد اکبر وفاقانی

عدالت العالیہ۔ عثمانیہ دواخانہ۔ کلیہ طب۔ کتب خانہ آصفیہ۔

نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۴)

۵۷۱/۲

رجسٹر نمبر (M3950)

مُرقعِ دکن

یعنی

ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے ماہ نامہ

سب رس

کا سالگرہ نمبر بابتہ جنوری ۱۹۳۹ء

زیرِ نگرانی

ڈاکٹر سیّد محی الدّین قادری زورؔ

مجلسِ ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکشؔ — سکینہ بیگم

خواجہ حمید الدین شاہدؔ — معین الدین احمد انصاری

مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر "ادارہ" رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

تعداد صفحات ۲۱۶، تعداد تصاویر ۸، قیمت عا

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہ ادارہ ادبیات اردو کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہ ہوں گے

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کر کے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوا کرے گا

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع بندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیئے

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی پی یا دوئی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے	چار روپے	دو روپے	چھ آنے
شہر میں شہر سے باہر بذریعہ	چار روپے آٹھ آنے	دو روپے بارہ آنے	سات آنے

بچوں کے سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے	ایک روپیہ	دس آنے	ڈیڑھ آنہ
شہر میں شہر سے باہر بذریعہ	ایک روپیہ آٹھ آنے	بارہ آنے	دو آنے

محرم نمبر ۱۲/ اقبال نمبر عہ ۸/ دکن نمبر عا/

سب رس کی خریداری اس میں اشتہارات کی طباعت اور ادارہ ادبیات اردو کی رکنیت یا اس کے مطبوعات کی خریداری کے سلسلے میں جو اصحاب صدر دفتر (رفعت منزل خیریت آباد) سے گفتگو یا مراسلت نہیں کر سکتے وہ حسب ذیل اصحاب سے گفتگو یا مراسلت کر سکتے ہیں۔

بلدہ (۱) مسٹر ایس اے کریم نمائندہ خصوصی چیلہ پورہ قریب مکان حکیم محمود صمدانی مرحوم (۲) مسٹر ایس پی اننتا۔ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ (۳) رحمان کاٹیج گھانسی بازار۔ **اضلاع** مسٹر محمد فخرالدین ارماں (روضہ شیخ) گلبرگہ شریف

ان کے علاوہ نوراللہ صاحب عثمانیہ ادارہ کی طرف سے علمی و ادبی دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے یہاں ادارہ کی کتابیں اور رسالے لے کر آئیں گے۔ توقع ہے کہ علم دوست اصحاب ضرور ان کی مدد کریں گے۔

سب رس مرقع دکن نمبر جنوری سنہ ۳۹ء

فہرست تصاویر

سلاطین آصفی

وزرائے آصفی

امرائے آصفی

دیگر تصاویر

تعداد صفحات ۲۱۶ - تعداد تصاویر ۷۸ - قیمت عہ/

سب رس مرقع دکن نمبر جنوری ۴۹ء

فہرست مضامین

ادارۂ ادبیات اردو کی چند

قابل دید کتابیں

ہز ہائینس والاشان نواب اعظم جاہ بہادر
ولیعہد سلطنت آصفیہ شہزادۂ برار
اپنے فرزند ارجمند شہزادہ نواب مکرم جاہ بہادر کے ساتھ

مدحِ خواجہ

معین الدینؒ ہیں قطب الدینؒ سے شاد — تو قطب الدینؒ فرید الدینؒ سے شاد

فرید الدینؒ نظام الدینؒ سے خوش — نظام الدینؒ نصیر الدینؒ سے خوش

نصیر الدینؒ مرے ممدوح سے شاد

مرے ممدوح کا تو نام رکھ یاد

مطیعِ مصطفیٰ سید محمدؐ — مطاعِ باصفا سید محمد

دوئی کیسی؟ یہ ہر فردِ یگانہ — مری نظروں میں ہے قطبِ یگانہ

اُدھر جو ہے وہی ضوپاش ادھر ہے

نمودِ خواجہ ہر سو جلوہ گر ہے

سمجھ کا دور ہو جائے اگر پھیر — تو گلبرگہ کو بھی تو سمجھے اجمیر

غرض تنویرِ خواجہ دیدنی ہے — جدھر دیکھو اسی کی روشنی ہے

نگاہِ عارف ان جلووں کی جویا

مری نظریں بھی خوش ان سے ہیں گویا

دکھاتا ہے یہ سلطانِ طریقت — مجازی شان میں شانِ حقیقت

نزولِ اجتہاد و حق چھپا ہے اس کا — سلوک اس شان سے کامل ہے اس کا

جو یہ شہباز ہو مائل بہ پرواز

کھلے تشبیہ سے تنزیہ کا راز

عیاں خواجہ کی ہے بندہ نوازی — نہیں کس کو امیدِ سرفرازی

سلیمانِ دکن عثمان علی خاںؒ — فروغِ دودمانِ آصفستاں

مہ خواجہ کے رخ سے سب کا ہے ضو

دکن افروز ہے خواجہ کا پرتو

علی منظور

[illegible]

اداریہ

سب رس کا دوسرا سال نہیں بلکہ اہتمام کے ساتھ شروع ہو رہا ہے۔ اس کا عملی ثبوت یہ سالگرہ نمبر ہے جو دکن کے ماضی و حال کے متعلق دلچسپ و اہم تاریخی معلومات کے لیے وقف کر دیا گیا ہے۔ ورنہ ادارہ پہلے سے نسبتاً تیار ہوا ہے۔ قدیم تاریخی قلمی تصویروں کے فوٹو لینے اور پھر ان کے اتنی بلاکس کی تیاری اور ان کی چھپائی کے لیے جو وقت اور رقم صرف ہوئی ہوگی صرف اسی کا اندازہ کرنے سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ ادارہ نے اس شاندار تاریخی نمبر کی خاطر کتنا اہتمام کیا ہے اور سب رس کی زندگی اور ترقی کے لیے کس حد تک ہر قسم کا صرفہ و محنت کرنے کے لیے تیار ہے۔

اسی اہتمام اور خوش سلیقگی کی کوششوں میں آسانی کا پہلو پیدا کرنے کے سلسلہ میں ادارہ ادبیات اردو نے نئے سال سے سب رس کی ایک مجلس ادارت بھی قائم کر دی ہے۔ جو اپنے ہر دو ماہ نشست میں ذوق اور بہتر قسم کی دلچسپیوں سے مالا مال کرنے کی طرف خاص طور پر متوجہ رہے گی۔

مجلس ادارت کے قیام کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ سب رس علمی و ادبی حیثیت سے بڑھتا جائے اور اس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ایسی مفید اور ضروری معلومات بھی درج ہوا کریں جن کا جاننا ہر تعلیم یافتہ کے لیے ضروری ہے۔ اس بارے میں ادارہ ادبیات اردو کے مختلف شعبے سب رس کا ہاتھ بٹائیں گے۔ مثلاً شعبہ زبان اردو زبان کے ضروری اور اہم مسائل پیش کرتا رہے گا۔ شعبہ تنقید کی طرف سے اردو کتابوں پر سنجیدہ اور مفید تنقیدیں شایع ہوتی رہیں گی۔ اور تمام ہندوستان کی جدید مطبوعات کی فہرست بھی وقتاً فوقتاً دی جائے گی تاکہ معلوم ہوتا رہے کہ اردو میں کون کونسی کتابیں شایع ہو رہی ہیں۔ شعبہ تاریخ دکن ایسی مفید اور دلچسپ معلومات فراہم کرتا رہے گا جو ملک کی ترقی اور عروج تک پہنچنے میں ملک کی رہبری کریں گی۔ شعبہ نسوان ہر ماہ نسوانی فلاح و بہبود سے متعلق مضامین کی فراہمی کے علاوہ اس امر کی کوشش کرتا رہے گا کہ سب رس میں نسوانی دلچسپیوں کے کافی سامان مہیا ہوتے رہیں۔

ساتھ ہی ادارہ کے تمام شعبوں کے ماہوار جلسوں کی روئدادیں بھی سب رس میں شایع ہوا کریں گی تاکہ ہر مضمون سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب مستفید ہو سکیں۔ چنانچہ ان تمام شعبوں کی تفصیل اور ان کے جلسوں کی روئدادوں کے اہم حصے اس مہینے بھی شایع کئے جا رہے ہیں۔

یہ باتیں صرف اس لئے بیان کی گئیں کہ سب رس کے قدر دانوں کو اندازہ ہو جائے کہ سب رس کی ترقی اور اس کے مستقبل کو درخشاں بنانے کے لئے ادارہ کیا کام کر رہا ہے۔

دکن نمبر کے بارے میں زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ خود اس کا مطالعہ اس کی سفارش کرے گا۔ اتنا لکھنا ضرور ہے کہ محض اعلیحضرت ظل سبحانی سلطان العلوم آصفجاہ سابع کی علم نوازیوں اور میر عثمانی فیاضیوں کے باعث آج ہم اس قابل ہو سکے کہ دکن کی قدیم تاریخ کو اس طرح باتصویر پیش کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مرقع دکن اعلیحضرت کے نام نامی اور حالات زندگی سے شروع کیا جا رہا ہے۔ اور اس کا سرورق حضرت ظل سبحانی سلطان العلوم ہی کی تصویر سے مزین ہے۔ اس سلسلہ میں نواب سالار جنگ بہادر کی علم دوستی اور فیاضی کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ جس کی وجہ سے یہ مرقع دکن صحیح معنوں میں ایک مرقع بن سکا۔ اس کی اکثر تصویریں نواب صاحب ہی کے خزائن فنون لطیفہ سے حاصل کی گئی ہیں۔ اور نواب صاحب نے بکمال مہربانی ان کو سب رس میں شایع کرنے کی اجازت عطا فرمائی ہے۔

سب رس کے قلمی معاونین کا شکریہ بھی لازمی ہے کہ انھوں نے قلیل عرصے میں نہایت مستند دلچسپ و مکمل مضامین تیار کر دئے۔ خاص کر دکن نمبر کی تیاری کے لئے جو مجلس ادارت منتخب کی گئی تھی اس کے ارکان (عبدالمجید صاحب صدیقی ام اے ال ال بی۔ میر محمود علی صاحب ام اے

سید سراج الدین صاحب ایم اے، سید محمد اکبر وفا قانی صاحب بی اے ال ال بی، عبدالقادر سروری صاحب ایم اے ال ال بی اور سید محمد صاحب ایم اے، ہر طرح سے مستحق مبارک باد ہیں کہ انھوں نے نہ صرف خود کام کیا بلکہ دوسروں سے بھی اچھے اچھے مضامین لکھوائے۔ مولوی غلام احمد خاں صاحب صوبہ دار اورنگ آباد کی علمی دلچسپی کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ انھوں نے نہ صرف اورنگ آباد پر مضمون لکھ بھیجا بلکہ وہاں کے مختلف مناظر اور تاریخی مقامات کی تصاویر بھی روانہ کیں۔ جن میں سے بعض اس مرقع میں یا بچوں کے دکن نمبر میں شامل ہیں اور بعض آئندہ نمبروں میں چھپیں گی۔

سب رس کے ناظرین یہ معلوم کرکے خوش ہوں گے کہ حیدرآباد کے مشہور آرٹسٹ مسٹر نیوم صاحب نے اس شمارہ کے لئے عبدالرزاق لاری کی تصویر بنا دی ہے اور وعدہ کیا ہے کہ آئندہ بھی سب رس کو اپنے حسن کارانہ کمالات سے مستفید کرتے رہیں گے

سید محمد اکبر وفا قانی صاحب اور مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب نے بھی سب رس کے اس شمارہ میں کسی نہ کسی مضمون کی تیاری اور اشاعت میں مدد دینے کا ذمہ لیا ہے۔ اگرچہ وقت کی تنگی کی وجہ سے لاری کی تصویر رنگوں میں چھاپی نہ جا سکی۔ تاہم یہ تصویر اپنی تاریخی اہمیت اور ایک مشہور حسن کار کا نتیجہ قلم ہونے کی وجہ سے قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ عبدالرزاق لاری نے تنہا اس وقت مغلوں کا مقابلہ کیا جب غداروں کے دروازہ کھول دینے کی وجہ سے مغل فوج قلعہ میں داخل ہو چکی تھی۔ لاری کو عین وقت پر اس کی اطلاع ہوئی اور وہ کھلے ہوئے دروازے کے سامنے مقابلہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ زخموں میں چور ہو گیا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا

اس سب رس میں ایک چیز کی کمی محسوس ہوتی ہوگی۔ سب مضامین اور نظمیں مردوں ہی کے ہیں صنف نازک کو اس میں سوائے بچوں کے حصہ کے کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے۔ ایسا قصداً کیا گیا کیونکہ ادارہ کے شعبہ نسواں نے تصفیہ کیا تھا کہ وہ اپنا نمبر علحدہ شایع کرے گا۔ اس لیے جملہ مضامین متعلقہ شعبہ نسواں اور سب رس کی مجلس ادارت کی کنوینر سکینہ بیگم صاحبہ کے پاس روانہ کر دیے گئے۔

انھوں نے ان سب مضامین کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کرلیا اور خواتین دکن کے دلچسپ اور مفید مضمونوں اور نظموں کا یہ مجموعہ اب نذر دکن کے نام سے شایع ہو رہا ہے۔ ان شاءاللہ وسط جنوری تک قدردانوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔ نذر دکن اپنی قسم کی واحد اور نادر کتاب ہوگی۔ اور سب رس کے سالانہ خریداروں کو نصف قیمت پر دی جائے گی کیونکہ وہ دراصل سب رس ہی کا ایک حصہ ہے

نذر دکن کے علاوہ شعبہ نسواں کی طرف سے قریب میں اور کتابیں بھی شایع ہوں گی۔ توقع ہے کہ یہ شعبہ ملک کی علم دوست خاتونوں کے تعاون کی وجہ سے خاطر خواہ کامیاب ہوگا۔

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس عاملہ نے حسب ذیل اصحاب کو ان کی علمی و ادبی دلچسپیوں اور ادارہ کے کاموں میں خلوص کے ساتھ ہاتھ بٹانے کے پیش نظر ادارہ کا رفیق منتخب کیا ہے۔

محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ (داعی شعبہ نسواں)، مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری ایم اے بی ایس سی آنرز (داعی شعبہ زبان) مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے ایچ سی ایس (داعی شعبہ تراجم) اور نواب کنفیاد جنگ بہادر

توقع ہے کہ سب رس کا دوسرا سال نئے انتظامات اور خاص اہتمام کے باعث پہلے سال سے زیادہ کامیاب ثابت ہوگا۔

سید محی الدین قادری زور

اعلیحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخان بہادر آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ

حضرت ظل سبحانی کے حالات زندگی اور عہد حکومت مبارک سے متعلق اس وقت تک متعدد کتابیں اور مضامین شایع ہو چکے ہیں ہر سال ملک اور بیرون ملک میں رسائل و اخبارات کے سالنامے اور سالگرہ اقدس کی مبارکباد کے خاص نمبر شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ان سب میں حضرت بندگان عالی کی عظیم الشان شخصیت آپ کے بے مثال تدبر و سیاست ذاتی علم و فضل شعر و سخن کی دلچسپیوں اور مذہبی و اخلاقی محاسن وغیرہ کے ہر پہلو سے متعلق تفصیلی مضامین شایع ہوتے رہتے ہیں اگر ان سب کو یکجا کر دیا جائے تو اعلیحضرت سلطان العلوم کی قابل تقلید ہستی کے متعلق کئی جلدوں کی سوانح حیات مرتب ہو جائے۔

دودمان آصفی میں اعلیحضرت سلطان العلوم آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہ کی ذات بابرکات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور علم و عمل و شعر و سخن کی سرپرستیوں میں حضرت جہاں پناہی نے خاص توجہ فرمائی ہے یہی وجہ ہے کہ اعلیحضرت تعالیٰ کے تذکرہ کو اس موضوع و فن کے لیے سر عنوان قرار دے کر تاریخی سلسلے درج کرنے کی جگہ ابتدا میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اعلیحضرت سلطان العلوم خلد اللہ کی حیات کا محض علمی و ادبی پہلو بھی ایسا وسیع ہے کہ اس پر لکھنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر کئی جلدوں کی مبسوط کتاب لکھی جا سکتی ہے اگر موقع ملے تو خود ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے اس موضوع پر نہایت اجمال کے ساتھ پانچ ابواب میں ایک نذر عقیدت پیش کی جائے گی۔ اس سوانح شاہانہ کا پہلا باب حیات سلطانی اور دوسرے چار ابواب ۲۔ اردو شاعری ۳۔ اردو نثر ۴۔ فارسی شاعری اور ۵۔ ہندی شاعری پر مشتمل ہوں گے۔

ادارہ

خسرو دکن مشرق کے سب سے زیادہ ہر دلعزیز تاجدار ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ آپ کے لئے بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام تھا اس لئے آپ کو مشرقی اور مغربی علوم میں اعلیٰ مہارت حاصل ہے۔ فارسی اور اردو زبان کے اعلیٰ شاعر ہونے کے علاوہ اپنی خداداد ذہانت و علمی قابلیت اور علوم و فنون کی سرپرستی کی بنا پر بجا طور پر سلطان العلوم کہلاتے ہیں۔

اپنے والد نواب میر محبوب علی خاں کے انتقال پر آپ ۱۹۱۱ء میں ۲۶ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے جس کو آج تقریباً ۴۰ سال کا عرصہ ہوتا ہے اس عرصہ میں حیدرآباد کی ہر جہتی ترقی حیرت انگیز ہے جو کام کہ سلطنت آصفیہ کے قیام کے زمانے سے اس زمانہ تک یعنی دو سو سال کے عرصہ میں نہیں ہوا تھا وہ اس وقت ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور بندگان عالی نے اپنی غیر معمولی روشن خیالی۔ رواداری بے انتہا سادہ زندگی، اعلیٰ اخلاق اور خداداد قابلیت سے حیدرآباد کی قومی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی ہے جس کی وجہ سے سارے ملک میں عام بیداری پیدا ہوگئی ہے اور سلطنت آصفیہ میں ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوگیا ہے۔

رعایا کے نہ صرف جان و مال کی حفاظت اور ملکی ترقی کا خیال آپ کے پیش نظر رہتا ہے بلکہ تعلیمی اور اخلاقی زندگی کی اصلاح اور رعایا کے آرام و آسایش کی فکر ہمیشہ آپ کے دامنگیر رہتی ہے۔ چنانچہ طلبہ مدارس اور بالخصوص نوجوانوں کو ابھی حال میں جو نصائح آپ نے فرمائے ہیں وہ آب زر سے

اور ترقی کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے ہیں چنانچہ انجمن خواتین حیدرآباد کی سرگرم کوششیں اس کا بدیہی ثبوت ہیں۔ اسی طرح سے اعلیٰحضرت نے اپنے بھائی صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر کو جدید تعلیمی کمیٹی کا صدر اعلیٰ مقرر فرمایا ہے۔ جن کی صدارت میں بہت کچھ مفید کام کیا جا رہا ہے۔

غرض ۸۲ ہزار مربع میل سے زائد رقبہ ملک پر اعلیٰ حضرت کے نام کا سکہ جاری ہے۔ اور تقریباً ڈیڑھ کروڑ رعایا قانون آصفی کے تحت عدل و انصاف سے مستفید ہو رہی ہے۔

صرف خاص مبارک، پائیگاہوں، جاگیرات، اور سمستانوں کے قطع نظر محض علاقہ دیوانی کی آمدنی اس وقت (۹) کروڑ روپے سالانہ سے زائد ہے جس کی وجہ سے خزانہ معمور ہے اور قوم سازی کے بہت سے کام ہو رہے ہیں زراعت پیشہ طبقہ کی مشکلات کو بڑی حد تک دور کیا گیا ہے۔ صنعت و حرفت کی ترقی کی طرف بھی خاص توجہ کی گئی ہے۔ چنانچہ اس وقت بہت سی صنعتیں جاری ہیں اور بعض بڑے بڑے کارخانہ جات کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ اسی طرح تجارت کیا بلحاظ درآمد و کیا بلحاظ برآمد ترقی پر ہے۔

اعلیٰحضرت بندگان عالی کی سرپرستی و فیاضی کا یہ عالم ہے کہ ریاست کے باہر بھی جو باشندے یا جو ادارے مستحق ہیں ان کو یہاں سے مالی امداد دی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ حیدرآباد قدیم آئینی روایات برقرار رہیں اور بعض امور میں حیدرآباد جدید دوسری ریاستوں اور برطانوی ہند سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے جیسا کہ انتظامی اختیارات کی علیحدگی کا مسئلہ ہے۔ اس پر اکتفا نہیں بلکہ اس وقت دستوری اصلاحات کے نفاذ اور مزید معاشی ترقیات کی تحریکات پر غور کیا جا رہا ہے۔

آخر پر اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ مبارک دور عثمانی کا سب سے اہم اور لافانی کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے جہاں سارے علوم و فنون کی تعلیم ملک کی عام فہم اور سرکاری زبان یعنی ہندوستانی (اردو) کے ذریعہ دی جاتی ہے۔

اس بیس سال کے عرصہ میں جامعہ عثمانیہ نے جو ترقی کی ہے اور اس کو اندرون و بیرون ملک جو غیر معمولی کامیابی اور عام مقبولیت نصیب ہوئی ہے وہ تاریخ میں اپنی آپ نظیر ہے ؎

زندہ کردی چوں مسیحا علم و فن را در دکن
زندہ باش اے حضرتِ عثمان علی خاں زندہ باش

میر محمود علی

سب رس کے گذشتہ سال کے پرچے

سب رس کے گزشتہ پرچوں کی ابھی سے مانگ بڑھ گئی ہے۔ نومبر اور ڈسمبر کے پرچے اصلی قیمت میں خریدے جائیں گے۔ اگر کسی صاحب کے یہاں اچھی حالت میں ہوں اور وہ ان کو نکالنا چاہتے ہوں تو دفتر کو مطلع فرمائیں۔ دوسرے مہینوں کے پرچوں کو بھی حفاظت سے رکھیے۔ آئندہ طلب کیے جائیں گے۔

مہتمم

تمدنِ ہند میں دکن کا رتبہ

تاریخ ہند کی یہ کھلی حقیقت ہے کہ دکن تہذیب ہند کا [illegible] نقطہ ہے۔ اس حقیقت کو ہم حال و مستقبل کے آئینہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ وہ تاریخ ہند جو انگریزی اقتدار کا ذریعہ بنی ہوئی ہے ہمارے ماضی کی تقسیم فرقوں کی سرخیوں سے کرتی ہے۔ اس تنگ نظری کی وجہ سے تاریخ کا تہذیبی پہلو اجاگر نہیں ہوتا۔ ایک وطن پرست تہذیبی تقسیم کے لحاظ سے ہندوستان کو ان عنوانات کے تحت مطالعہ کر سکتا ہے۔ ویدوں کا دور، مثنویوں کے ذریعے ہندوستان ماسبق کی تہذیب، گوتم بدھ کا ہند، ہند کا نشاۃ ثانیہ اور آخر میں وہ تہذیب جو ویدانت اور توحید کے تخیل سے پیدا ہوئی۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس دوسری تقسیم کے تحت ہندوستانی تہذیب میں دکن کی اہمیت پر روشنی ڈالیں۔

آریائی قوم دنیا کی ان بڑی اقوام میں سے ہے جس نے ایک خاص رنگ اور ڈھنگ کی تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ انسان، کائنات اور ان سب کے خالق کے متعلق ان کے نظریوں نے دیومالے پیدا کئے اور یہی دیومالے ایک ایک تمدن کی بنیاد بن گئے۔ مغرب میں یونان اور مشرق میں ہند۔ یہاں پر چونکہ [illegible] دیومالائی [illegible] اصل بحث نہیں ہے اس لئے مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ آریائی تہذیب نے چاروں کی معاشرتی تنظیم کے ذریعے ایک مستقل تمدن پیدا کیا۔ [illegible] اس تمدن کے ابتدائی خط و خال کو خود [illegible] جذب کیا۔ افسانوی دور میں رامائن کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شاہکار مثنوی کا ایک نمایاں [illegible] ہے۔ [illegible] [illegible] رام کو مدد دی۔ صداقت کی طرف [illegible] ہے اور مظلوم عورت یا آریہ عورت کی [illegible] کو دشمنوں سے چھڑا لایا ہے اور اس کے صلہ میں [illegible] دیوتا بنا دیتے ہیں۔ لیکن اس واقعے سے یہ ثابت ہے کہ دکن نے اپنی جگہ میدانوں میں بسنے والے خود [illegible] اور دوسروں کو اپنی [illegible] سے زیادہ اپنی انسانیت سے منوایا اور اپنی تمدن نوازی کو ثابت کیا۔ اس کے بعد دوسری بڑی مثنوی مہابھارت ہے۔ اس میں بھی دکن نمایاں ہے۔ پانڈوؤں کو دیس نکالا ہوتا ہے تو دکن میں پناہ ملتی ہے اور دوارکا کا روحانی اور بانکا [illegible] پانچ پنچھا یوں کو [illegible] کرتا ہے۔ [illegible] افسانے صحیح یقین ان کا اثر دکن پر دیکھئے کہ یہاں کا ہر ایک ایک مقام انہیں مثنویوں کی وجہ سے مقدس بن گیا۔ [illegible] [illegible] ہوتے تھے۔ [illegible] شکل میں پیدا ہوگئے۔ ہر وہ مقام جہاں رام، سیتا اور کرشن پہنچے مقدس بن گیا اور وہ [illegible] سے لے کر [illegible] تہذیب کے مقامات اور مستقل ادارے پیدا ہوگئے۔ جنہوں نے آریائی [illegible] کا مذہب، فلسفہ، علم، ادب، شاعری [illegible] [illegible] وغیرہ متبدل بنا دیا۔ اس طرح حیدرنل [illegible] کے لافانی عشق کی وجہ سے امر بن گیا۔

افسانوں سے نکل کر جب ہم تاریخ پر آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم سے دکن [illegible] [illegible] اکثر اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ دکن نے شمالی ہند کے میدانوں پر بھی اپنا سیاسی اقتدار جمایا۔

بدھ مذہب وہ پہلی روحانی تحریک ہے جس نے [illegible] کی طبقہ واری تقسیم اور آریا اور غیر آریا کے تعصبی فرق [illegible] کو دور کر کے ہندوستان کو ایک قومیت میں لانے کی کوشش کی۔ لیکن دکن باوجود اشوک کی کامیابی کے اس ہمہ گیر تحریک کو [illegible] تہذیبی [illegible] [illegible] اور [illegible] روایت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود بدھ کی حسن کاری کے خزانے کے [illegible] اجنتا دکن میں ہونے کے [illegible] بدھ تمدن کے تحت آریائی تہذیب کو معدوم نہ ہونے دیا اور جب کبھی موقع ملا [illegible] دکن نے قدیم ہندو عصبیت اور طبقہ واری تمدن کو تمام ہندوستان پر [illegible] کر دیا۔ [illegible] شنکراچاری کی تحریک حقیقت میں دکن کے بدھ مت پر روحانی فتح تھی۔ یہ دکن کا نشاۃ ثانیہ ہماری موجودہ بحث کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ ہندوستان کا یہ سطح مرتفع نہ صرف بلند ہے بلکہ تہذیب دکن کا سپہ دار بھی ہے۔

اس کے بعد وہ دور آتا ہے جب کہ ہندوستان قدیم اور ایشیا کا وہ تمدن جو جنوب کی سرزمین سے نکل کر پورے تمدن عالم پر چھا گیا تھا، نیچا ہوگیا۔ ہندوستان میں ضیا پاشیاں شروع کرتا ہے۔ اسلام ایک ایسا ہمہ گیر سیل رواں ہے جو جگہ، مقام اور حالات کے لحاظ سے بظاہر اپنی شکل کو تو بدلتا ہے، لیکن فطرت نہیں بدلتا۔ ہندوستان میں بھی اس نے یہاں کی تہذیب میں آکر ایک نیا روپ اختیار کیا اور ایک مستقل اور ہندوستانی تہذیب کی بنا ڈالی۔ دکن میں سب سے پہلے مسلمان جن کو تہذیبی عمال کا موقع ملا وہ ترک ہیں۔ جو ہندوستان کی تاریخ میں غلام خاندان کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ترکان دکن نے اس سرزمین کی تہذیب میں ایک چیز کا اضافہ کیا۔ موسیقی، رنگ کاری، آذری یہاں پہلے ہی سے موجود تھی۔ لیکن پرشکوہ تعمیر کاری کا رواج ترکوں سے شروع ہوا اور دنیا کی سب سے بڑی گنبد بولی گنبد بیجاپور پر ختم ہوا۔ اس دور میں علاوہ اور چیزوں کے ہندوستانی قومیت کے لئے وہ انمول شئے پیدا ہوئی جس کو قومی زبان کہتے ہیں اور پراکرت، ترکی، فارسی اور عربی عام فہم الفاظ، محاورے اور لسانی اجزا مل کر ہندوستان کی قومی زبان بن گئی ہے جس کو ابتدا میں دکھنی پھر ریختہ، اور اس کے بعد اردو کا نام نصیب ہوا اور موجودہ دور تعصب میں ہندوستانی، ہندی، ہندی ہندوستانی کی الجھن میں پھنس گیا۔

یہ مختصر سا خاکہ اس امر کے لئے کافی ہے کہ ایک سوچنے والا اور تجسس کرنے والا عالم اس کو ابتدائی خط و خال سمجھ کر آگے بڑھے اور ایک مبسوط کارنامہ پیش کرے جس سے دکن اور اہل دکن کو معلوم ہو کہ حقیقت میں ہندوستانی تمدن میں ان کا درجہ اور رتبہ کیا ہے اور ہندوستان کے مستقبل کے سنوارنے میں ان کی کیا ذمہ داری ہے۔

سید محمد اکبر وفاقانی

دکن قدیم اردو شاعروں کی نظر میں

ملا وجہی ملک الشعرائے عہد محمد قلی قطب شاہ مصنف قطب مشتری

(سنہ ۱۰۱۸ھ) و سب رس (سنہ ۱۰۴۵ھ)

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں ۔۔۔ پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں

دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ ۔۔۔ انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہے لگ

دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے ۔۔۔ کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے

دکھن ملک بھوتیچ خاصہ اہے ۔۔۔ تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے

[بہت ہی]

طبعی شاعر عہد ابوالحسن قطب شاہ مصنف بہرام و گل اندام

(سنہ ۱۰۸۱ھ)

جو کوئی یاد کرتا نیں اپنا وطن ۔۔۔ او مردہ ہے ہے پیرن ہے اس کا کفن

اگر کوئی غربت میں شاہی کرے ۔۔۔ اگر مال ہور ملک لاکھاں دھرے

اسے کوں دکھیے لعل کر بھر انکھیاں ۔۔۔ دیوے خاک تن کا وطن کا نشاں

[نور چشم]

وطن سب کوں دنیا میں پیارا اہے ۔۔۔ سفر ہے سو جوں بادبارا اہے

اجنتا

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں
جہاں گھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں ہنستا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں
جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں

جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

شرابِ شعر کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں
بہارِ زندگی غلطاں ہے سبزے کی رداؤں میں
نوائے سرمدی آتی ہے جھرنوں کی صداؤں میں
بیاں ممکن نہیں وہ لطف آتا ہے دعاؤں میں

یہاں صدیوں سے رائج پُرسکوں شیریں مقالی ہے
یہاں کا ذرہ ذرہ مظہرِ شانِ جمالی ہے

در و دیوار پر ہیں نقشِ حسن و عشق کی گھاتیں
پیامِ زندگی دیتی ہیں شرمیلی ملاقاتیں
جواں برسات، ان جان لیوا چاندنی راتیں
فضا میں ہر قدم پر گونجتی ہیں دلنشیں باتیں

یہاں پیری پہ ہو جاتا ہے دھوکہ نوجوانی کا
سبق دیتا ہے ہر چہرہ حیاتِ جاودانی کا

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقش لاثانی
تصدق جن کے ہر خط پر تحیہ شانِ مانی
مشکّل ہے شباب و حسن میں تخئیلِ انسانی
تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی

گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

بہانہ مل گیا دستِ جنوں کو حسن کاری کا
اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصلِ بہاری کا
چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بے قراری کا
سکھایا گُر اسے جذبات کی آئینہ داری کا

دلِ کہسار میں محفوظ اپنی داستاں کر دی
جگرداروں نے بنیادِ جہانِ جاوداں کر دی

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے
ترازو دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی ہے
اداؤں سے عیاں ہے لذتِ دردِ جگر دی ہے
کھلیں گے راز اس ڈر سے دہن پر مہر کر دی ہے

یہ تصویریں بظاہر گو یونہی خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کے بھید کہتی ہیں

کرشمہ ہے یہ سب اہلِ جنوں کی سعیِ پیہم کا
جنھیں احساس تک باقی نہ تھا کچھ شادی و غم کا
دلوں پر عکس کھنچ آیا تھا جن کے حسنِ عالم کا
قلم کو نقش از بر ہو گیا تھا اسمِ اعظم کا

چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کر دیں

جہاں چھوڑا خوشی سے عشق کے پیغام کی خاطر
خوشا اہلِ دنیا کی ہنسی کی نام کی خاطر
نہ چھانی خاک در در کی کسی انعام کی خاطر
جیے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر

زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے، نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

سکندر علی وجد

دکن کا قدیم جغرافیہ

دکن سنسکرت زبان میں دکشینا کہلاتا ہے یعنی جنوبی علاقہ یعنی وہ علاقہ جو دریائے نربدا کے جنوب میں واقع ہے۔ سنسکرت اور بعض دوسری کتابوں میں اِس علاقہ کا نام دکشینا پتا بھی ہے یعنی جنوبی علاقہ۔ پراکرت زبان میں اس علاقہ کا نام دکھینا بادہا (DAKKINA BADHA) ہے۔ یونانیوں نے اسے دکھینا باڈس (DAKHINABADES) لکھا۔ فاہیان نے اسے اپنے سفرنامہ میں سنسکرت کی تقلید میں TA THSIN لکھا جو دکشینا کا مترادف ہے۔

قدیم ہندو جغرافیہ نویس نربدا کے جنوبی حصے کو دکن کہتے ہیں مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے دوران میں دکن کے علاقہ کو صرف کرشنا ہی تک قرار دیا اور حالیہ مورخین بھی دکن سے وہ علاقہ مراد لیتے ہیں جو دریائے نربدا اور کرشنا کے درمیان ہے بعض مورخین دکن کی سرحد کو بالاگھاٹ تک قرار دیتے ہیں اور بعض نے میسور کے شمالی حصہ کو بھی دکن میں شامل کیا ہے۔ جغرافی نقطۂ نظر سے یہہ سرزمین سطح مرتفع دکن کہلاتی ہے کیونکہ یہہ سمندر کی سطح سے تین ہزار سے پانچ ہزار فیٹ تک بلند ہے۔ عام طور پر ریاست حیدرآباد کو دکن کہتے ہیں

دکن کی سرزمین پہاڑی ہونے کی وجہہ سے یہہ قیاس کیا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں کوہ آتش فشاں بکثرت تھے۔ انہی پہاڑیوں کے بعض حصے تیز ہواؤں اور بارش کے عمل سے صدیوں بعد زرخیز اور قابل رہائش ہوئے۔ یہہ علاقہ کوہستانی ہونے کی وجہہ سے یہاں کی آب و ہوا خشک ہے۔ اونچے پہاڑیوں کے نہ ہونے سے بارش کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ اس ملک کو نربدا، تاپتی، گوداوری، کرشنا اور ان کے معاون سیراب کرتے ہیں۔ علاقہ دکن پہاڑی ہونے کے باعث بے حد نشیب و فراز ہے جس کی وجہہ سے دریا اور ندیاں سرعت سے بہتی ہیں۔ ان کا دارومدار کلیتہً بارش پر ہے ان میں برسات میں بار بار طغیانیاں آتی ہیں اور گرما میں یہہ پایاب ہو جاتی ہیں۔ انہی وجوہات کی بناء پر یہہ ندیاں کشتی رانی کے قابل نہیں۔

دکن کے شمال میں بندھیاچل اور ست پڑا پہاڑ ہیں اور اس کے مشرق و مغرب میں مشرقی و مغربی گھاٹ ہیں اور جنوب میں دریائے کرشنا ہے جو جنوبی ہند کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ شمال میں کوہ بندھیاچل دکن کی اس طرح حفاظت کرتا ہے جس طرح ہمالیہ ہندوستان کی۔ علاوہ ازیں اس پہاڑ کے باعث ہندوستان دو حصوں میں منقسم ہوگیا۔ غرض بندھیاچل دو مختلف تمدنوں دو مختلف آب و ہواؤں، زمینوں اور اقوام کو ایک دوسرے سے علٰحدہ کرتا ہے۔ شمالی پہاڑوں اور دریاؤں کے دشوار گزار راستوں کے باعث دکن کا تمدن بڑی حد تک محفوظ رہا۔ یہاں کے قدیم باشندے دراوڑی اسی باعث خارجی اثرات سے محفوظ رہے۔ یہہ اقوام تقریباً اب تک اپنے قدیم اعتقادات، رسم و رواج، اور عادات و خصائل پر قائم ہیں اسی طرح کرشنا کے حائل ہونے سے انتہائی جنوبی ہند کے تمدن میں بہت زیادہ قدامت ہے اس لئے کہ شمالی ہند کے بہت کم فاتحین نے اس طرف توجہ کی۔

آریا وسط ایشیا سے افغانستان آنے اور پنجاب سے ہوتے ہوے دوآب کے علاقے میں آباد ہوئے۔ دریائے سرسوتی اور تھانیسر کا درمیانی علاقہ ان کا مقدس مقام تھا یہیں ان کے عقائد اور مذہبی تصورات کا آغاز ہوا۔ رفتہ رفتہ یہہ بندھیاچل تک پھیل گئے لیکن دکن کے شمالی پہاڑوں نے ایک عرصہ تک ان کی روک تھام کی جب آریا جنوب میں داخل ہوے تو پہلے برار کی وادیوں میں سکونت اختیار کی اس کے بعد اور آگے بڑھے۔ رامائن اور مہابھارت میں بھی اس دکھنی سرزمین کا تذکرہ ہے۔ راما سے عقیدت کے باعث شعرا نے اِس علاقہ کو جنت نشان بتانے میں کسر اٹھا نہ رکھی۔ آریاؤں کی آمد کے وقت جنوب میں منظم معاشرت اور حکومتیں تھیں۔

دکن کی قدیم ترین وحشی قومیں گونڈ، بھیل، سنتال اور ٹوڈا ہیں۔ جو اب بھی جنگلوں اور پہاڑوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں اب بھی وہی اگلی بربریت ہے جب آریاؤں نے شمالی ہند میں اپنے قدم جمائے تو قدیم باشندوں یعنی دراوڑیوں کو سوائے جنوب کی طرف راہِ فرار اختیار کرنے یا ان کے تابع ہو کر غلام بنے رہنے کے کوئی اور صورت نہ تھی۔ اسی طرح جب دراوڑ (؟) جنوبی ہند میں داخل ہوئے تو انھوں نے بھی آریاؤں کی طرح یہاں کے قدیم باشندوں پر جبر و زیادتی کی ہوگی۔ ایک عرصہ بعد آریاؤں نے جنوبی ہند کا رخ کیا جہاں انھیں قدیم حکومتوں سے سابقہ پڑا جن سے انھوں نے ربط و اتحاد قائم کیا۔

دکن کی قدیم تاریخ بالکل تاریک ہے۔ جس طرح ہندوستان قدیم کی کوئی ہم عصر تاریخی تصنیف نہیں اسی طرح قدیم دکن کی بھی لہٰذا دکن کے قدیم خاندانوں کا حال معلوم کرنا بہت مشکل ہے البتہ تاریخ سے متعلق چند پراگندہ اوراق ملتے ہیں جن کا مرتبہ افسانوی ہے اور کچھ مختصر حالات شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ کتبات سے جو چٹانوں اور تانبے کے پتروں پر کندہ ہیں یہاں کی مذہبی اور معاشرتی تحریکات پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی سلسلہ میں ان تحریکات کی سرپرستی کرنے والے حکمرانوں کے واقعات بھی معلوم ہوجاتے ہیں قدیم سکوں سے حکمرانوں کے نام اور ان کے سنین ظاہر ہوتے ہیں جس مقام سے یہہ سکے برآمد ہوتے ہیں ان سے حکمرانوں کے حدود سلطنت یا اثرات کا پتہ لگتا ہے۔ پرانوں سے بھی چند بڑے راجاؤں کا حال معلوم ہوتا ہے، سنسکرت ادب کی جن حکمرانوں نے سرپرستی کی ان کے بھی واقعات سنسکرت کی کتابوں میں چیدہ چیدہ ملتے ہیں۔ نیز بعض چینی کتابوں میں صرف مذہبی معاملات کی حد تک ان راجاؤں کے حالات لکھے ہوے ہیں جنھوں نے جین مت کی حمایت کی لیکن ان میں کوئی ترتیب و تنظیم نہیں، پہلی صدی عیسوی میں بدھ مت جب چین میں مروج ہوا تو بہت سے چینی سیاح بدھ کے مقدس مقامات کی زیارت کرنے کے لئے ہندوستان آئے ان سیاحوں نے جنوب کی بھی سیر کی اور لنکا تک گئے ان کی تحریروں سے بھی دکن کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اشوک کے تیسری صدی ق م کے کتبوں میں دکن کی بعض حکومتوں کا تذکرہ ہے۔ بعض یونانی اور رومی مورخین کے بیانات سے پانچویں یا چھٹی صدی ق م تک کی حکومتوں کے واقعات ظاہر ہوتے ہیں۔ باوجود ان ماخذوں کے دکن کے چند ایسے علاقے رہ جاتے ہیں جن کی قدیم تاریخ کا پتہ لگانے کا کوئی ذریعہ نہیں

دکن میں مختلف اقوام آباد ہیں جن کی مختلف زبانیں ہیں اور انہی زبانوں کے اعتبار سے یہاں کے علاقے موسوم ہیں۔ بیدر سے اوپر شمال مغربی علاقہ میں مرہٹی زبان بولی جاتی ہے۔ یہہ علاقہ مہاراشٹر کہلاتا ہے، اس میں برار کا ایک حصہ، تلنگانہ اور کونکن کا علاقہ شامل ہے، تلنگانہ کا علاقہ مہاراشٹر کے مشرق میں ہے اس میں اندھرا اور کلنگ سلطنتیں تھیں یعنی دریائے گوداوری کے

جنوب میں آندھرا سلطنت اور شمال میں کلنگ، مسلمانوں کے دور میں تلنگانہ کا مرکز ورنگل تھا، کنڑی علاقہ بیدر سے ادھونی تک اور مغرب میں دریائے کرشنا کے منبع تک پھیلا ہوا ہے تلنگانے کے نیچے تامل علاقہ ہے جو راس کماری تک ہے۔

ان علاقوں پر مختلف زمانوں میں مختلف حکمرانوں نے حکومت کی، اشوک کے کتبات اور قدیم پرانوں کے دیکھنے سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ جنوب کے قدیم ترین حکمران پانڈیا، چولا اور چیرا ہیں ان کا تمدن ۲۵۰ ق م سے بھی پہلے کا ہے، یہاں ۲۵۰ ق م میں بدھ مت کی تعلیم و تلقین کے لئے اشوک نے مبلغین بھیجے جنھوں نے یہاں کے باشندوں کو بدھ مت کے فلسفہ کی تعلیم دی اس زمانہ میں دکن ڈنڈا ارانیا (DANDAKARANYA) یا ڈنڈکا (DANDAKA) یعنی صحرائے ڈنڈک کہلاتا تھا۔

آندھرا سلطنت

رامائن میں لکھا ہے کہ گوداوری اور کرشنا کے درمیان اندھرا خاندان حکومت کرتا تھا جس سے یونانی جغرافیہ نویس بھی واقف تھے، قدیم تاریخی ماخذوں کے دیکھنے سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ اندھراؤں کی حکومت تقریباً ۱۸۰ ق م سے شروع ہوئی۔ انھوں نے دھنیا کٹکا (DHANYAKATAKA) کو اپنا مرکز قرار دیا جو دریائے کرشنا پر تھا۔ ان کی سلطنت شمال میں بندھیاچل سے جنوب میں دریائے کرشنا تک، مشرق میں خلیج بنگال سے مغرب میں بحیرۂ عرب تک پھیلی ہوئی تھی۔ پروفیسر بھنڈارکر کا خیال ہے کہ اندھرا خاندان دکن پر ۲۳۰ ق م سے ۲۱۵ء تک برسر اقتدار رہا۔ مہاراشٹر اور تلنگانہ کا تمام علاقہ ان کے تابع تھا۔ وسنٹ اسمتھ کا خیال ہے کہ اندھرا کا پائے تخت سری کاکولم تھا جو دریائے کرشنا پر واقع تھا۔ شائد دھنیا کٹکا کا نام بدل کر سری کاکولم ہوگیا ہو یا بدل گیا ہو۔

اس زمانہ میں گجرات اور بمبئی کے علاقہ میں ستراپوں کی حکومت تھی۔ ستراپ کے معنی صوبہ دار کے ہیں۔ یہہ ایرانی لفظ ہے۔ اندھرا خاندان کے ایک حکمران بل بائے کرنے ۱۲۶ء میں ستراپوں کے علاقہ مہاراشٹر پر قبضہ کیا اسی زمانہ میں مالوہ میں ایک اور ستراپ خاندان حکمران تھا۔ اس خاندان کے ایک راجہ رودرادامن اول نے جس کا پائے تخت اجین تھا اندھرا خاندان کے راجہ سے مہاراشٹر کا علاقہ چھین لیا، جب تلنگانہ کے اندھرا خاندان میں جگن سری یا یجنا سری ۱۷۲ء میں برسر اقتدار رہا (جس کا عہد حکومت ۲۰۲ء تک ہے) تو اس نے مالوہ کے ستراپوں سے جنگ کی اور ان کی سلطنتوں کے بعض صوبے اپنی سلطنت میں شامل کر لئے۔

دکن میں دو آندھرا سلطنتیں تھیں، ایک مشرق میں جس کا پائے تخت دھنیا کٹکا تھا اور دوسری مغرب میں جس کا مرکز پیتھان (PAiTHAN) تھا جو اب پٹن کہلاتا ہے اور صوبہ اورنگ آباد کے ایک تعلقہ کا مستقر ہے، پٹن دریائے گوداوری کے شمالی کنارے پر ہے۔ یہہ پرتستان (PRATiSTHAN) بھی کہلاتا ہے یہہ دکن کا قدیم ترین شہر ہے اشوک نے اپنے مبلغ یہاں بھی بھیجے تھے، بطلیموس (PTOLEMY) کے قول کے مطابق یہہ آندھرا بادشاہ پلومائی (PLUMAYE) دوم کا پائے تخت اور اہم تجارتی مرکز تھا۔ یہہ مشہور آندھرا راجہ سلماہانا (SALMAHANA) کی جائے پیدائش ہے اور اس کا پائے تخت بھی رہا۔ اب بھی یہاں بہت سے منادر اس کی قدیم عظمت کی یادگار ہیں۔ آندھرا خاندان کا کب اور کس طرح خاتمہ ہوا کچھ بھی پتہ نہیں چلتا۔

جب کہ آندھرا سلطنت عروج پر تھی شاند راشٹرا کوٹ سلطنت اس کی باجگزار تھی جس کا علاقہ بندھیاچل کے شمال وجنوب میں تھا' اٹ قوم یا راشٹرا کوٹ سلطنت کے شمال میں گپتا حکومت تھی ان کے علاوہ ایک اور خاندان کدمب پانچویں صدی عیسوی میں مرہٹہ علاقہ میں برسراقتدار تھا جن کا مرکز ہالسی تھا اس سلطنت میں کنڑا اور میسور کا علاقہ شامل تھا۔

اسی پانچویں صدی عیسوی میں پلوا کو عروج حاصل ہوا اور اس نے آندھرا کے مشرقی پائے تخت اور علاقوں پر قبضہ کیا۔ آندھرا دور میں ملک کی تجارتی حالت بہت اچھی تھی۔ یہاں ایشیا' مصر' روم' یونان' چین اور دوسرے مشرقی مقامات سے سفراء آتے تھے شام میں جنگ میں ہندوستانی ہاتھیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ آندھرا سلطنت کے بعض علاقوں میں رومی سکے بھی دستیاب ہوے ہیں پروفیسر بھنڈارکر کے قول کے مطابق آندھرا کے خاتمہ کے بعد تین سو سال تک دکن کے حکمران خاندانوں کا حال معلوم نہ ہوسکا۔

چالوکیا

دکن کی سلطنتوں کے حالات وضاحت کے ساتھ چھٹی صدی عیسوی کے وسط سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں خاندان چالوکیا حکمران تھا۔ چالوکیا یا سولنکی کا تعلق چاپ قوم سے ہے جو گرجر کی ایک شاخ ہے' گرجر جو شمال مغربی ہندوستان میں زیادہ آباد ہیں ان کا تعلق ہون سے ہے۔ شمالی ہند کے پرہار اور راجپوت قبائل دراصل ان وحشی اقوام کی تبدیل شدہ شکل ہیں جو پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان میں داخل ہوی تھیں ان میں سے ادنیٰ درجہ کے لوگ گرجر کہلاتے ہیں اور اعلیٰ درجہ کے راجپوت چالوکیا خاندان کا ابتدائی تعلق شمالی ہند کے راجپوتوں سے ہے جو کچھ عرصہ بعد دراوڑیوں میں غلط ملط ہو گئے۔ چالوکیا نقل مقام کر کے راجپوتانہ سے دکن آئے۔ اس خاندان کی بنیاد ایک سردار پلکیسن اول نے ڈالی۔ یعنی ۵۵۰ء میں واتاپی ضلع بیجاپور (موجودہ مقام بادامی) پر قابض ہو کر اس نے ایک چھوٹی سی سلطنت قائم کی اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے پلکیسن نے اشومیدھ کی رسم منائی تھی اس کے دونوں بیٹوں کیرتی وامن اور منگلیس کے عہد میں سلطنت مشرق اور مغرب کی طرف پھیلی۔ کیرتی ورمن اول ۵۶۶ء میں تخت نشین ہوا۔ یہہ زبردست جنگجو تھا۔ ایک کتبہ میں لکھا ہے کہ اس نے جنوب کے تمام قبائل اور اقوام کو تابع کیا۔ مشہور بدھی راہب دھرماگپتا اسی کے عہد میں گزرا ہے جو مذہبی کتابوں کا چینی زبان میں ترجمہ کرتا تھا۔ کیرتی ورمن وشنو کی پوجا کرتا تھا۔ اس نے بادامی میں ایک غاری مندر تعمیر کروایا' منگلیس نے کونکن اور مغربی گھاٹ کا کچھ علاقہ بھی سلطنت میں شامل کیا۔

منگلیس کے بعد کیرتی ورمن کا بیٹا پلکیسن دوم تخت نشین ہوا۔ اس نے ونگی پر قبضہ کیا اور اپنے بھائی وشنو وردھن کو وہاں کا نائب السلطنت بنایا جس کا صدر مقام پشٹپور تھا جو اب ضلع گوداوری میں پتھاپورم کہلاتا ہے۔ ۶۱۵ء میں وشنو وردھن خود مختار ہوا اور خاندان چولا' پانڈیا اور کریل سے جنگ کی۔ پلکیسن دوم نے ۶۲۰ء میں ہرش کو پسپا کیا' ۶۲۵ء تا ۶۲۶ء میں اس نے ایک سفارت ایران کے شہنشاہ خسرو دوم کے پاس روانہ کی جس کا طبری نے تذکرہ کیا ہے اجنٹہ کے غار نمبر ۱ میں استرکاری کی ایک بڑی تصویر میں ایرانی سفیر ہندی راجہ کے آگے کھڑا ہوا ہے۔ اس تصویر سے ایرانی اور ہندی فنون لطیفہ کے اختلاط کی جھلک ظاہر ہوتی ہے۔

۶۴۱ء میں ہیون سانگ چینی سیاح پلکیسن دوم کے دربار میں حاضر ہوا' اس نے اجنٹہ کی تعریف کی ہے۔ اس وقت چالوکیا سلطنت کا

مرکز واتاپی نہ تھا بلکہ ناسک، ہرشس کے مقابلہ میں سہولت پیدا کرنے کے لئے پلکیسن نے ناسک کو موقتی پائے تخت قرار دیا تھا۔ اس نے کوکن کے موریا کو شکست دی۔ راشٹر کوٹ کی طاقت توڑ دی اور کدمب کا بھی خاتمہ کیا اور مشرقی شامل سے بڑھ کر پتھاپورم کے قلعہ پر قبضہ کیا، کلنگ کے راجہ کو زیر کیا جس کا پائے تخت پوری تھا جو اب بھی جگناتھ کے مندر کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ اس نے چولا، پانڈیا اور کریل سلطنتوں پر بھی حملہ کیا۔

جنوبی ہند میں پلوا خاندان بہت طاقتور تھا، اگرچہ مسلسل کوشش کرکے چالوکیا راجاؤں نے ان کی قوت توڑ دی تھی پھر بھی ۶۴۲ء میں کانچی کے پلوا خاندان کے راجہ نرسمہا ورمن نے پلکیسن دوم کو شکست فاش دے دی اور بادامی کو اس بری طرح برباد کیا کہ تیرہ سال تک بادامی پر کسی نے حکومت نہ کی۔ جب ۶۵۵ء میں وکرما جیت اول (پلکیسن دوم کا بیٹا دور حکومت ۶۵۵ء تا ۶۸۰ء) تخت نشین ہوا تو اس نے پلوا سے اپنے باپ کا بدلہ لیا اور شہر کانچی پر قبضہ کیا اس نے چولا کو بھی شکست دی۔ وکرما جیت کے پوتے، جیا دیتا کے راشٹر کوٹ سے اچھے تعلقات تھے جن کی بنا پر راشٹر کوٹ کے اندرا راجا نے چالوکیا شہزادی سے شادی کی جس کے بطن سے دنتی درگا پیدا ہوا جب کیرتی ورمن دوم برسر اقتدار ہوا تو اس کے دور میں دنتی درگا نے بادامی پر قبضہ کیا جس سے مغربی چالوکیا سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ اسی چالوکیا دور میں شاید پلوا کی مخالفت کے سلسلہ میں راجمندری کی بنیاد پڑی اور یہاں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا گیا کیونکہ جنوب والوں کے لئے کرشنا سے ہوتے ہوئے شمال کی طرف جانے کا راستہ یہیں سے گزرتا ہے۔

مغربی چالوکیا کا پائے تخت بادامی ضلع بیجاپور میں ہے۔ یہاں جینوں کا ۶۳۴ء کا ایک غار نما مندر ہے۔ اس کے علاوہ تین غار برہمنی انڑ کے ہیں۔ ان میں سے ایک ۵۷۹ء کا ہے یہاں دو قلعے ہیں ایک باون بندی اور دوسرا رن منڈل، چھٹی صدی عیسوی میں پلوا نے اس پر قبضہ کیا تھا۔ اس کے بعد چالوکیا اس پر قابض ہوئے ساتویں صدی عیسوی میں مشہور چینی جاتری ہونسانگ یہاں آیا تھا اس نے لکھا ہے کہ اس کی راجہ (پلکیسن دوم) سے ملاقات ہوئی چھتری ذات کا ہے یہ راجہ وسیع النظر اور بلند حوصلہ ہے اس کے ماتحت وفاداری کے ساتھ اس کی خدمت بجالاتے ہیں اور راجہ کو ان سے خاص ہمدردی ہے۔

یہاں کی زمین زرخیز ہے۔ غلہ خوب اگتا ہے۔ موسم گرم ہے یہاں کے باشندوں کے خصائل سادہ اور دیانتدارانہ ہیں ان کے قد اونچے ہیں اور طبیعت کے غائے ہیں اگر ان کی توہین کی جائے تو بری طرح بگڑتے ہیں اور بدلہ لیتے ہیں۔ جنگ میں ڈٹ کر لڑتے اور غنیم کا خوب تعاقب کرتے ہیں لیکن جب کوئی اپنے آپ کو ان کے حوالہ کردیتا ہے تو وہ اسے ایذا نہیں پہونچاتے۔ جب کسی جنگ میں سردار ہارجاتا ہے تو اسے مارتے نہیں بلکہ اسے زنانی لباس پہناتے ہیں اور اسی طرح اسے زندگی کاٹنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ملک میں بے شمار پہلوان ہیں جو اکثر کشتی لڑتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ خوب پیتے اور لڑتے ہیں۔ اگر وہ کسی کو سڑک پر ماردیں تو قانوناً انھیں گرفتار نہیں کیا جاتا۔ یہاں ہاتھیوں کو بھی خوب پلایا جاتا ہے اپنے پہلوانوں اور جنگی ہاتھیوں پر راجہ کو فخر ہے۔

واتاپی کے حکمرانوں کے دور میں بدھ مذہب آبادی کے ایک بڑے حصے میں رائج تھا جس کا ہیون سانگ نے ذکر کیا ہے۔ اس وقت یہاں بدھ مت کے بہت سے منادر اور خانقاہیں تھیں، لیکن بدھ مت کو زوال ہو رہا تھا۔ کیونکہ برہمنی مذہب کے اثرات بڑھ رہے تھے

چنانچہ خود راجہ پلکیسن اول نے اشومیدھ کی رسم منائی، برہمنی مت کی ترقی کے ساتھ ان کے منادر بھی چو طرف بننے لگے اور پران کے دیوتاؤں برہما، وشنو اور شیوا وغیرہ کی پوجا ہونے لگی، بادامی غاری مندر میں منگلیس کے عہد میں وشنو کی پوجا ہوتی تھی جو اس کا تعمیر کرایا ہوا تھا ان مختلف مذاہب کا سلطنت میں پایا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ چالوکیا راجہ تمام مذاہب کے ساتھ رواداری برتتے تھے۔ باوجود اس کے بدھ مت بتدریج برہمنی مذہب اور جین مت کے مقابلہ میں معدوم ہوگیا۔ ہندو خاص طور پر قربانی کی طرف توجہ کرنے لگے۔ اس زمانہ میں بدھ اور جین مت والوں سے ہندوؤں نے غاروں میں مندر تراشنے کا فن سیکھا مرہٹوں کے علاقہ کے جنوبی حصے میں عام طور پر جین مذہب مقبول تھا، آٹھویں صدی عیسوی میں زرتشتی مذہب بھی ہندوستان میں رائج ہوا۔ خراسان کے جلاوطن پارسی ۷۳۵ء میں پہلی دفعہ احاطہ بمبئی کے ضلع تھانہ میں بمقام سنجان آباد ہوئے، پلکیسن دوم اور وکرماجیتا دوم نے جینیوں کی مدد کی اور ان کے منادر تعمیر کروائے، ۶۷۵ء میں یہاں مشہور قواعد کا عالم (PUUYAPADA) تھا اوپر بیان ہوچکا ہے کہ سلطنت زیادہ وسیع ہو جانے سے انتظامات کی خاطر پلکیسن دوم نے ونگی پر اپنے بھائی وشنو وردھن کا تقرر کیا جس نے کچھ عرصہ بعد اپنی علیحدہ حکومت قائم کرلی اور اس طرح دو چالوکیا خاندان ہوگئے مغربی چالوکیا کا مرکز بادامی تھا اور مشرقی کا ونگی۔ ونگی گوداوری اور کرشنا کے دہانوں کے قریب ہے۔ بدھ مت کا زبردست دشمن اور ذی اثر شخص شنکراچاریہ اور مشہور عالم (AKALANKA) اسی زمانہ کے ہیں آٹھویں صدی میں کلنگ، اور مشرقی دکن پر مشرقی چالوکیا اور دکن کے وسطی اور مغربی حصہ پر راشترکوٹ حکمران تھے۔ دسویں صدی کے اختتام پر راشترکوٹ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئے جس کے باعث مغربی چالوکیا کا دوسرا دور شروع ہوا جو مغربی چالوکیا خاندان کی رجعت کہلایا جاسکتا ہے۔ تیلا دوم نے ۹۷۳ء میں راشترکوٹ کے آخری راجہ کک دوم کو شکست دی اور نئے مغربی چالوکیا خاندان کی بناء ڈالی، اس نے راشترکوٹ شہزادی سے شادی کی اس کا عہد حکومت ۹۷۳ء سے ۹۹۶ء تک ہے، اس کے دور میں سلطنت بلاری اور میسور کے بعض بعض حصص تک پھیل گئی تھی۔

اسی زمانہ میں چولا حکمران راجا راجہ نے ونگی پر قبضہ کیا اور چالوکیا خاندان کے ایک لڑکے کو تخت نشیں کرکے واپس ہوا اس راجہ نے جس کا نام وی مالا دیتا ہے راجا راجہ کی لڑکی سے شادی کی اس کی اولاد نے مشرقی چالوکیا اور چولا سلطنت پر حکومت کی بالآخر مشرقی چالوکیا حکومت کا ۱۰۷۰ء میں خاتمہ ہوگیا جس سے مغربی چالوکیا کا اقتدار بہت بڑھ گیا اور وہ تمام دکن پر حاوی ہوگئے۔ ۱۰۴۲ء میں مغربی چالوکیا خاندان میں سومیسورا اول تخت نشین ہوا تھا جس نے کلیانی کو دارالسلطنت قرار دیا جس کے باعث یہ چالوکیاں کلیانی کہلاتے ہیں۔ کلیانی ممالک محروسہ سرکار عالی میں ہے۔ اس خاندان نے بھی قدیم چالوکیا کی طرح دو سو برس حکومت کی سمیسورا اول نے چولا کے راجا راجہ کو شکست دی، دھارا (مالوہ کے علاقہ میں ہے) اور جنوبی کانچی پر حملہ کیا اور ان دونوں کو فتح کیا۔

۱۰۷۶ء میں وکرماجیت اول یا بکرمانک تخت نشین ہوا۔ اس نے کانچی فتح کیا اور دوارا سمدرا کے خاندان ہوسل سے سخت جنگ کی دوارا سمدرا کو دوارا وتی پور بھی کہتے تھے مسلمان مورخین نے اسے دوارا سمندر لکھا اس کے کھنڈر ضلع حسن میسور میں موجود ہیں اس نے اپنے نام سے ایک سنہ جاری کیا جو کبھی مقبول نہ ہوا، وکرماجیت نے وشنو کا ایک بڑا مندر تعمیر کروایا اور اس کے آگے ایک تالاب بنوایا اور اس کے قریب ایک شہر آباد کیا جو وکرما پورا کہلاتا تھا، اس کے عہد میں رعایا خوش حال تھی کشمیری پنڈت

(BILHANA) کے قول کے مطابق ملک میں ہر طرف امن تھا۔ کہیں چوروں کا خوف نہ تھا جو اچھے انتظام کی دلیل ہے۔ علاوہ اس کے بادشاہ نیک منش، فیاض اور ہمدرد تھا اس نے علم کی خوب سرپرستی کی، یہہ کلیانی کا بڑا راجہ تھا جس کے عہد میں سلطنت انتہائی عروج کو پہونچی، اور بقول بلہانا "کلیان ہر اعتبار سے عدیم المثال تھا" یہی مشہور قانون داں وجنانیسور کا وطن ہے جس کی تصنیف متاکشرا ہندو قانون کی سب سے زیادہ مستند کتاب ہے۔ کلیانی احاطہ بمبئی کے ضلع تھانہ میں ہے۔ (PRIPLUS) کے قول کے مطابق کلیانی کی اہمیت دوسری صدی عیسوی سے شروع ہوئی، یہہ شہر تجارت کے اعتبار سے مشہور تھا، بڑے بڑے تجار یہاں آتے تھے شائد یہہ شہر سنہ ۱۰۵۳ء میں آباد ہوا یہاں پیتل اور شیشم کا کام اچھا ہوتا تھا اور کپڑے بھی اچھے بنتے تھے، چودھویں صدی میں مسلمان حکمرانوں نے اس کا نام اسلام آباد رکھا۔

وکرماجیت کے مرنے کے بعد چالوکیان کلیانی کو زوال شروع ہوا، راجہ تیل سوم کے عہد میں سپہ سالار افواج بجّل یا وجّالا یا بجّالا نے بغاوت کی اور تمام سلطنت پر قابض ہو گیا سنہ ۱۱۶۲ء سے سنہ ۱۱۸۳ء تک بجل اور اس کے جانشینوں نے حکومت کی جس کے بعد خاندان چالوکیا کے ایک شہزادہ سومیسور چہارم نے بجل کے جانشینوں سے ملک کا بہت بڑا حصہ حاصل کیا لیکن یادوا خاندان دیوگری اور ہوسل خاندان دوارا سمدرا کے عروج کے باعث اس کا اقتدار جاتا رہا یعنی سنہ ۱۱۹۰ء میں کلیان سلطنت کا خاتمہ ہوا۔

بجل کے عہد میں ایک مذہبی انقلاب ہوا جس سے شیو کے مذہب نے دوبارہ زندگی پائی اور ایک نیا فرقہ قائم ہوا جس کا نام ویراسیوس یا لنگایت ہے جو اب تک موجود ہے۔ بجل مذہباً جین تھا، اس کے متعلق یہہ مشہور ہے کہ اس نے فرقہ لنگایت کے دو برہمن گاروں کو بلا وجہہ اندھا کما تھا جس کے بدلہ سرپرست مذہب لنگایت بسوا (BASAVA) کے اشارہ سنہ ۱۱۶۷ء میں راجہ کو قتل کیا گیا اس مذہب کے ماننے والے عام طور پر کنٹری علاقوں میں آباد ہیں۔

وکرماجیت کے عہد میں تاجروں نے بدھ مذہب کے لئے خانقاہیں تعمیر کروائیں اور ان کے اخراجات کے لئے رقمیں اور زمینیں فراہم کیں اس زمانہ میں جین مت کو تفوق حاصل نہ تھا، لنگایت فرقہ کے نکلنے کے بعد تو جین مت کا اثر اور بھی زائل ہو گیا، لنگایت مذہب زیادہ تر بجائیں پھیلا جو پہلے جین مت کے طرفدار تھے۔ لنگایت لنگ کو حیات کا مبدا سمجھتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ یہہ ویدوں، تناسخ بچپن کی شادی کے مخالف ہیں۔ یہہ بالکل حقیقت ہے کہ ان کے مذہب کا بانی بسوا برہمن تھا لیکن انھیں برہمنوں سے سخت نفرت ہے اس مذہب کے جاری ہونے سے نہ صرف بدھ مت جنوب سے ناپید ہوا بلکہ جین مت کو بھی زوال شروع ہوا۔

راشتراکوٹ

سنہ ۷۵۳ء تا سنہ ۹۷۳ء

راشتراکوٹ یادو نسل کے تھے راجہ (RATTA) کے ایک بیٹے کا نام راشتراکوٹا تھا جس کے نام سے یہہ خاندان مشہور ہوا۔ آٹھویں صدی کے درمیان میں دنتی درگا نامی ایک سردار نے جو راشتراکوٹ خاندان سے تعلق رکھتا تھا خاندان چالوکیا کے راجہ وکرماجیت دوم کے بیٹے کیرتی ورمن دوم کو شکست دی اور راشتراکوٹ سلطنت قائم کی۔ جب عوام اس کی طرف سے بدظن ہوئے تو اس کے چچا کرشنا اول نے

اسے تخت سے اتار دیا اور خود راجہ بنا' بعض کتبوں سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ دنتی درگاہ لاولد تھا شائد اس کے مرنے کے بعد کسی اور وارث تخت کو ہٹا کر کرشنا تخت نشین ہوا' دنتی درگا کو تخت سے علحدہ کرنا اس لئے ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت طاقتور حکمران تھا۔
کرشنا اول کے عہد میں ایلورا کا مشہور کیلاس کا مندر تعمیر ہوا۔ یہہ مندر ایک چٹان میں ترا شا گیا ہے جو فن تعمیر کے اعتبار سے غیر معمولی ہے۔ اسی خاندان کے ایک حکمران گوبند سوم نے ۷۹۳ء تا ۸۱۵ء سلطنت کو شمال میں بندھیاچل اور مالوا اور جنوب میں کانچی تک وسعت دی اور اپنے بھائی اندراج کو جنوبی گجرات میں نائب السلطنت مقرر کیا' اس کے بعد اموگھورش تخت نشین ہوا۔ (۸۱۵ء تا ۸۷۷ء) اس نے زیادہ تر ونگی کے مشرقی چالوکیا راجاؤں سے جنگ کی۔ اس نے اپنا دارالسلطنت ناسک سے مانیاکھیت بدل دیا اسی شہر کو عرب مورخین نے مانکیر لکھا ہے' اب یہہ مالکھیڈ یا ملکھیڑ کے نام سے ریاست نظام میں ہے' یہہ اس زمانہ کا بہت مشہور اور بارونق شہر تھا' اموگھورش کے جانشین کرشنا دوم نے جینیوں کے ننگے فرقے دگمبر کی بہت سر پرستی کی جن سین' گنبھدرا اور دوسرے علماء کی توجہہ کے باعث اس فرقہ کو بہت تقویت حاصل ہوی جس کی بدولت بدھ مت کے اثرات دکن سے رفتہ رفتہ زائل ہوتے گئے' اور بارھویں صدی تک یہہ مذہب دکن سے معدوم ہوگیا۔
اسی خاندان کا ایک راجہ اندر سوم نے قنوج پر کامیاب حملہ کیا' اور ۹۴۹ء میں چول خاندان کے راجہ دت پر فوج کشی کی اس زمانہ میں ہندوؤں اور بدھ مت والوں میں زبردست رقابت تھی' راشٹر کوٹوں کے ابتدائی دور میں برہمن وید کی تعلیم کے مطابق خوب قربانی کرتے تھے' اس زمانہ میں جین مت کو بھی فروغ حاصل ہوا' راشٹراکوٹوں کی علمی سر پرستی کے باعث ان کے دربار میں شعرا کا اجتماع ہوا آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں یعنی ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کی فتح سے سندھ پر اسلامی سیاسی اثرات غالب آئے' راشٹراکوٹ خاندان کے ان عرب حملہ آوروں سے دوستانہ تعلقات تھے اور گرجروں سے مخالفت تھی' گرجروں نے عربوں سے اچھے تعلقات نہ رکھے جس کے باعث انھیں نقصان پہونچا' اس سے بچنے کے لئے راشٹراکوٹوں نے ان نووارد حملہ آوروں سے اتحاد کرلیا تھا' جس کے باعث مسلمان سوداگر اور سیاح مغربی علاقوں میں بہ آسانی تجارت کرتے تھے اور بہت سے مغربی ساحل پر آباد ہوے' ان مسلمان تاجروں اور سیاحوں نے اپنے سیاحت نامے لکھے جن میں یہہ راشٹراکوٹ راجاؤں کو بل ہرا لکھتے ہیں جس کے معنی ہندوستان کا سب سے بڑا راجہ ہیں' انھیں بل ہرا اس لئے لکھتے ہیں کہ یہہ خود کو دلبھ کہتے تھے۔ اور یہہ لفظ رائے کے ساتھ مل کر بلہرا ہوگیا' چالوکیا راجہ بھی ولبھ اپنے نام کے ساتھ لکھتے تھے' شائد انہی سے یہہ طرز راشٹراکوٹوں نے اختیار کی' ولبھ رائے یا بلہا رائے مقامی استعمال سے بلہرائے ہوا اور عربوں نے اسے بلہرا لکھا۔
راشٹراکوٹ راجاؤں کی مسلمان سیاحوں نے بہت تعریف کی' ان کے عہد کا کیلاس کا مندر دنیا کے عجائبات میں ہے۔ ان راجاؤں نے سنسکرت ادب کی سرپرستی کی اور بہت سے مندر شاہی مصارف سے تعمیر کروائے۔
ان تمام سلطنتوں میں چالوکیا سلطنت زیادہ عرصہ تک باقی رہی یہہ ایسے زمانہ میں یعنی ۱۱۹۰ء میں ٹوٹی جب کہ تمام ہندوستان کی سیاسی حالت بدل رہی تھی کیونکہ اسی سنہ میں مسلمانوں نے شہاب الدین غوری کے تحت ہندوستان پر حملے کئے اور یہاں اپنی

حکومت قائم کی جو صدیوں تک برقرار رہی، جغرافی اعتبار سے چالوکیا جیسی وسیع سلطنت میں مختلف زبانوں کے علاقے تھے جو فطرتاً زبانوں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے علحدہ ہوکر اپنی علحدہ حکومتوں کے علم بردار ہوگئے، مرہٹواڑی کے علاقہ میں یادو سلطنت قائم ہوئی جس کا پائے تخت دیوگیر موجودہ دولت آباد تھا آندھرا یعنی تلنگانہ میں کیتیا سلطنت جس کا مرکز ورنگل تھا، تیسرے کنڑی علاقہ میں ہوسلیا خاندان برسر اقتدار تھا جس کا پائے تخت دوارا سمدرا تھا۔

کلیتیا خاندان ۱۱۰۰ء کے بعد نمایاں ہوا اس کے طاقتور راجہ پرتاپا رودرا اور گنپتی تھے، اس خاندان نے مسلمانوں کے حملے تک اچھی طرح حکومت کی، یادوا خاندان کے راجہ خود کو سری کرشنا کی نسل سے سمجھتے تھے۔ یہ لوگ جنوب میں ہوسلیا حکومت سے برسرپیکار تھے اور شمال میں گجرات تک اپنی سلطنت کو وسعت دی، ان کا بڑا حکمران سنگھانا (۱۲۱۰ء تا ۱۲۴۷ء) تھا، اس خاندان نے سنسکرت کی سرپرستی کی علاء الدین خلجی (۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء) نے اپنے آخری دور حکومت میں نہ صرف دکن بلکہ تمام جنوبی ہند کو مستقل طور پر حکومت دہلی کے تابع کیا، لیکن اس کے انتقال کے بعد مرکزی حکومت کی کمزوریوں سے جنوب کے حکمرانوں نے فائدہ اٹھایا، جب محمد تغلق (۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء) برسر اقتدار ہوا تو اس نے ۱۳۲۶ء میں دیوگڑھی کا نام دولت آباد قرار دے کر اسے اپنا پائے تخت بنایا لیکن فوراً ہی بعض اسباب کی بنا پر اپنے ارادہ سے باز آیا مگر جنوب کو اپنے قابو سے نکلنے نہ دیا اور ورنگل پر فوج کشی کرکے اس کا نام سلطان پور رکھا محمد تغلق کے آخری عہد میں گجرات اور دکن کے امرا نے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی، چنانچہ موقع پاکر انھوں نے ۱۳۴۶ء میں حسن گنگو بہمنی کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا جس نے دکن میں ایک طاقتور حکومت قائم کی جو بہمنی سلطنت کہلاتی ہے جس کا دارالسلطنت گلبرگہ تھا۔

دکن کی قدیم تاریخ کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شمالی ہند اور دکن اکثر ایک دوسرے کے مرہونِ منت رہے چنانچہ آندھرا سلطنت جو موریا کی ہم عصر تھی، اس کے ایک فرد نے اشوک کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد مگدھ پر حکومت کی اور یہ مگدھ کا آندھرا خاندان کہلاتا ہے حملوں کے سلسلہ میں بھی دکن کے حکمرانوں کو بعض دفعہ تفوق حاصل رہا یعنی پلی کیسن دوم نے ہرش کو شکست دی اور اندر سوم نے قنوج پر کامیاب حملہ کیا، قدیم دکن کی تہذیب و تمدن اور سیاسی حالات کا پتہ لگانا اس لئے مشکل ہے کہ اس خطہ میں سنہ عیسوی سے بھی صدیوں پہلے سے حکومتیں قائم تھیں جن کی کوئی مفصل سند نہیں ملتی نیز یہ سرزمین مختلف اقوام کی آماجگاہ ہے کیونکہ یہ خطہ شمالی و جنوبی ہند کے درمیان واقع ہے۔ علاوہ ازیں اپنی قدرتی خوبیوں کے باعث بھی یہ ہمیشہ سے دلکش اور جاذب نظر رہا۔

سید سراج الدین

نقوشِ اجنٹہ

نگاہِ عشق نے دھوئی ہوئی ہیں تصویریں — چمک رہی ہیں یہاں آرزو کی تقدیریں

پگھل گئے ہیں کہیں صاف ہوگئے ہیں کہیں — وہ سختیٔ دلِ ناکام، پتھروں میں نہیں

یہ حسن و عشق کی پوجا کے کارنامے ہیں — یہ رنگ و نور کے دردآشنا فسانے ہیں

دکن کی خاک میں ہے بدھ کی زندگی خاموش — دکن کی خاک میں اندر کے ہے پریم کا جوش

نقوش حسن کو خونِ جگر سے دھوتے ہیں — یہ پتھروں میں نہیں، بزمِ دل میں سوتے ہیں

ہے دیوتاؤں کی تعبیرِ زندگی میں حسن — ہے پارساؤں کی تصویرِ زندگی میں حسن

چمک ہے روح کی، رنگوں کی راجدھانی میں — لچک ہے عشق کی، پتھر کی سخت جانی میں

نظر نواز بنا، اور جانگداز بنا! — زمینِ شوق کا ہر ذرہ عشق باز بنا

زمیں پہ رفعتِ جاں خودنمائی کرتی ہے — وہ دیکھ بزمِ تصور، خدائی کرتی ہے!

باقی

خواتین دکن نمبر

اس مرقعِ دکن کے ساتھ اس کا ایک **ضمیمۂ خواتین** علحدہ کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے جس میں دکن کی بہترین انشاء پرداز خاتونوں نے نہایت دلچسپ اور مفید مضمون اور نظمیں شامل ہیں، یہ اصل میں اسی دکن نمبر کا حصہ ہے جو صنفِ لطیف کے رشحاتِ قلم پر مشتمل ہے۔ اور ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبۂ نسواں کی طرف سے اس کی سرگرم معتمد محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کے پُرخلوص مساعی کی وجہ سے نہایت خوبی، نفاست اور لطافت کے ساتھ مرتب اور شائع ہو رہا ہے۔ اس کی عام قیمت عہ رکھی گئی ہے۔ لیکن صرف سب رس کے خریداروں کو ختم فروری تک نصف قیمت پر محض اس وجہ سے دیا جائے گا کہ یہ سب رس ہی کا ایک حصہ ہے۔ اس خواتین دکن نمبر کے بعض مضمون نگاروں کے نام یہ ہیں:-

رالعہ بیگم صاحبہ (زنانہ کالج) — فاطمہ بیگم صاحبہ اداؔ — تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ — قمر النساء بیگم صاحبہ

کبریٰ اقبال عبدالرؤف — زبیدہ ضیاء الدین انصاری — بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیرؔ — رالعہ بیگم صاحبہ (معلمہ محبوبیہ اسکول)

افسر النساء بیگم صاحبہ — ممتاز جہاں بیگم صاحبہ صوفی — صفیہ صدیق فریدہ بیگم صاحبہ — جہاں بانو بیگم صاحبہ بی، اے

لطیف النساء بیگم صاحبہ بی، اے — ذاکرہ بنت فضل اللہ احمد صاحب — تسنیم ربانی بی، اے — مسز صوفی ام، اے۔

دکن کی اسلامی فتوحات

"دورِ وسطیٰ میں دکن اور شمالی ہند کے تعلقات" (۱۲۹۴ء تا ۱۳۵۱ء)

۱۲۰۶ء میں جب دہلی کی اسلامی سلطنت قائم ہوئی تو اس کے حدود زیادہ وسیع نہ تھے۔ بنگال، گجرات، مالوہ، قنوج، اجمیر اور دوآبہ کے کچھ حصے اس میں شامل تھے۔ سنہ ۱۲۹۴ء تک اس کو بنگال سے سندھ اور جنوب میں دریائے نربدا تک وسیع کیا گیا۔ جب دہلی کی حکومت خلجی خاندان کے ہاتھ آئی تو جلال الدین خلجی کے پیشِ نظر کسی قسم کا فتوحاتی یا تعمیری کام باقی نہ رہا۔ علاء الدین خلجی صوبہ دار کڑہ شاہی فوجوں کے ہمراہ مالوہ کے قریب بھیلسہ کی فتح میں مصروف تھا یہاں اس کو دکن کی مہاراشٹرا سلطنت کے حالات معلوم ہوئے جس کا مرکز دیوگڑھی تھا۔ یہ سلطنت کوہِ ست پڑا کے جنوب میں واقع تھی۔ چونکہ یہ خطہ نامنچلا واقع ہوا تھا اور اس کے پیشِ نظر سلطنتِ دہلی پر قبضہ کرنے کا منصوبہ پہلے ہی سے تھا اس لئے اس نے بغیر سلطان کی اجازت کے آٹھ ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ دیوگڑھی کا رُخ کیا۔

یوں تو جنوبی ہند کے ساحلوں پر مسلمان عرب تاجروں نے آباد ہو کر اسلامی آبادکاری کی بنیاد ڈال دی تھی لیکن فرشتہ اور شہریار کی تحریروں کے بموجب ان تاجروں نے کوئی سیاسی حیثیت حاصل نہ کی۔ بلکہ وہ دوسرے فرقوں کی طرح آباد ہوئے۔ ان عرب تاجروں کے ہمراہ بعض بزرگ، فقیر اور درویش بھی آئے جن میں بابا ظاہر، خواجہ خضر اور شیخ عبداللہ ضعیف بھی تھے۔ ان بزرگوں نے سماجی اتحاد میں نمایاں حصہ لیا جس سے مخلوط تہذیب و تمدن کا وجود ہوا۔ انسانی برادری اور وحدت کا پیام سرزمین دکن پر بالکل نئے اصول سے پیش کیا گیا جو آگے چل کر شمالی ہند پر بھی پھیلا اور ہندلمانی تشکیل کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

علاء الدین کے حملے کے وقت دکن میں تین خود مختار سلطنتیں تھیں۔ سنہ ۱۱۹۰ء میں جب چالوکیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا تو مہاراشٹرا، تلنگانہ اور کرناٹک صوبے خود مختار ہو گئے۔ مہاراشٹرا کا پایۂ تخت دیوگڑھی تھا جہاں یادو خاندان کا راجہ رام دیو حکمراں تھا۔ تلنگانہ کے مرکز ورنگل پر کاکتیا خاندان کی ایک عورت رودرما دیوی اپنے پوتے کی کمسنی کی وجہ سے حکمران تھی۔ کرناٹک کے مرکز دوارسمدر پر ہویسال خاندان کا راجہ بیر بلال حکمران تھا۔ یہ سلطنتیں بہت متمول تھیں کیونکہ ان کے حدود میں سونے، چاندی اور جواہرات کی کانیں تھیں اور اس کے علاوہ گھوڑے، ہاتھی کافی تعداد میں موجود تھے۔

علاء الدین خلجی کی روانگی سے قبل بعض صوفی اور فقیر منش بزرگ دکن کی طرف روانہ ہو چکے تھے جن میں سے بعض تو راستہ کی گھاٹیوں پر آباد ہو گئے اور بعض آگے بڑھتے چلے گئے۔ ان لوگوں سے علاء الدین کو راستہ معلوم کرنے میں بڑی مدد ملی۔ دولت کی ہوس اور اپنے منصوبوں کو کامیاب بنانے کی کوشش میں اس نے راستہ کی مشکلات کا مطلق خیال نہ کیا۔ اس کی فوج بالاگھاٹ سے ہوتی ہوئی ایلچپور پہونچی جو مہاراشٹرا سلطنت کی فوجی چھاؤنی تھی یہاں معمولی جھڑپ ہوئی اور ایلچپور پر قبضہ کر لیا گیا جو دکن کا باب الداخلہ ہے۔ یہاں اس نے ضروری معلومات حاصل کیں۔ اس کے بعد آگے بڑھ کر دیوگڑھی (دولت آباد) کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

راجہ رام دیو قلعہ بند ہو گیا۔ اس زمانہ میں اس کا بیٹا شنکر دیو کسی جاترا میں گیا ہوا تھا۔ راجہ نے اس اچانک حملے سے پریشان ہو کر صلح نامہ پیش کیا۔ اس صلح نامہ میں فرشتہ کے بیان کے بموجب علاء الدین کو چھ سو من سونا، سات من موتی، دو من جواہرات اور ہزار من چاندی اور اس کے علاوہ ریشمی تھان، گھوڑے، ہاتھی وغیرہ ہاتھ آئے۔ سالانہ خراج کا وعدہ لے کر یہ واپس ہو رہا تھا کہ شنکر دیو آ گیا اور اس نے علاء الدین کی فوج پر حملہ کر دیا۔ لیکن اس پر بھی علاء الدین کو کامیابی ہوئی اور اس نے نئے صلح نامہ کی رو سے دوگنا تاوان حاصل کیا۔ ایلچپور پر اس نے مستقل قبضہ رکھنا ضروری سمجھا کیونکہ اس کو آئندہ بھی دکن سے تعلقات قائم رکھنے تھے۔ یہ واپس ہو گیا لیکن بعض صوفی اور درویش ایلچپور اور اطراف و اکناف کی

پہاڑیوں پر آباد ہوگئے۔ یہی سب سے پہلی دکن کی اسلامی آبادکاری کی ابتدا ہے۔ علاء الدین کا یہ حملہ محض اتفاقی اور اپنے سیاسی منصوبوں کی تکمیل کے سلسلہ میں دولت کے حصول کی خاطر ہوا۔ دکن پر براہ راست حکومت کرنے کا کوئی خیال علاء الدین کے دماغ میں نہ تھا۔ اس حملے کے بعد دکن کا راستہ شمالی طاقتوں کے لئے کھل گیا اور ساتھ ہی ساتھ دکن کے سیاسی حالات پر بھی اس کا اثر پڑا۔

علاء الدین خلجی کو دکن میں وہی درجہ حاصل ہے جو محمود غزنوی کو تاریخ ہند میں۔ جس طرح محمود نے ہندوستان کی دولت سے اپنی سلطنت کو مستحکم اور مالامال کرلیا اسی طرح علاء الدین نے دکن کی دولت سے سلطنت دہلی کو حاصل کیا اور بادشاہ بننے کے بعد اسی دولت سے اپنے مخالفین کے منہ بند کردئیے اور وہ قوت حاصل کی جو آج بیسویں صدی میں امروں کو حاصل ہے۔

دکن پر دوسرا حملہ سنہ ۱۳۰۶ء میں ہوا کیونکہ دیوگڑی کے راجہ نے خراج ادا کرنا روک دیا تھا۔ علاء الدین اس دوران میں سلطنت کے کاروبار اور فتوحات میں مصروف رہا اور دکن کی طرف سے کسی قدر غافل بھی ہوگیا جس سے فائدہ اٹھاکر رام دیو نے تین سال تک مسلسل خراج ادا نہ کیا۔ سلطنت دہلی کی جانب سے ملک کافور کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی گئی لیکن راجہ نے بغیر مقابلہ کئے اطاعت قبول کرلی اور دہلی جاکر ایک ماہ تک شاہی مہمان رہا۔ دربار سے اس کو رائے رایاں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا اور سرخ چتر لگانے کی اجازت دی گئی۔ گجرات کا ضلع نیسری بھی اس کی عملداری میں دے دیا گیا۔ اس طرح دیوگڑی پر پورا سیاسی اقتدار حاصل ہوگیا۔

سنہ ۱۳۰۹ء میں تلنگانہ کے مرکز ورنگل پر حملہ کیا گیا۔ اس حملہ سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ سلطنت دہلی کے پیش نظر دکن پر حملہ کرنے کا ایک خاکہ موجود تھا۔ ملک کافور کی ماتحتی میں شاہی فوجیں ورنگل کی طرف روانہ ہوئیں۔ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ علاء الدین نے ملک کافور کو یہ حکم دیا تھا کہ ورنگل پر قبضہ کرنے کے بجائے دولت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ شاہی فوجیں ایلچپور، قندہار، دیوگڑی سے ہوتی ہوئی ورنگل پہونچیں۔ راستہ میں دیوگری کے راجہ کی جانب سے شاہی فوج کیلئے ضروری انتظامات کردئیے گئے تھے۔ ہنمکنڈہ پر قبضہ کرکے قلعہ کا محاصرہ کرلیا گیا۔ قلعہ بہت مضبوط اور مستحکم تھا۔ تھوڑے دنوں کے اندر ہی راجہ رودر دیو نے صلح کرلی اور سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا اور نذرانہ و تاوان کے سلسلہ میں کثیر مقدار سونا، چاندی اور زر و جواہرات پیش کیا جو ایک ہزار اونٹوں پر لادا گیا۔ ہاتھی اور گھوڑوں کی ایک کثیر تعداد بھی ہاتھ آئی۔ پروفیسر کرشنا سوامی اینگار نے امیر خسرو اور برنی کے بیانات کا حوالہ دیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ورنگل کی پوری دولت ملک کافور کے ہاتھ آگئی تھی۔ اس طرح دکن کی دو متمول سلطنتوں پر سیاسی اقتدار قائم ہوگیا۔ اب صرف جنوب ہند میں دو اور سلطنتیں باقی رہ گئی تھیں۔ ایک دوارسمدر کی ہوسیلا سلطنت اور دوسری سلطنت پانڈیہ جو مالابار میں واقع تھی۔

ملک کافور نے ورنگل کی فتح کے وقت ہی جنوبی سلطنتوں کے حالات معلوم کرلئے تھے۔ دہلی پہونچنے کے بعد اس نے سلطان سے مالابار پر حملہ کی اجازت لے لی چنانچہ سنہ ۱۳۱۰ء میں ایک بڑی فوج کے ساتھ مالابار کی طرف روانہ ہوا۔ اس حملہ کو امیر خسرو نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے کیونکہ وہ خود اس میں ہمراہ تھے۔ دکن کی پہاڑیوں اور دشوار گذار راستوں کا حال بہت ہی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ راستہ میں رام دیو نے رسد کا انتظام کردیا تھا۔ اور کچھ فوجی ہاتھی بھی پیش کئے۔ نربدا، تاپتی کے علاوہ اس فوج کو تین اور دریا، گوداوری، سینی اور بھیما عبور کرنے پڑے۔ پاندری کے مقام پر ملک کافور ٹھیر گیا تاکہ مالابار سلطنت کے حالات معلوم کرے۔ اس وقت سلطنت کے لئے دو دعویداروں ویرا پانڈیہ اور سندرا پانڈیہ کے درمیان جنگ ہورہی تھی جو حقیقی بھائی تھے۔ دوارسمدر کا راجہ بلال دیو اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاکر اپنی فوج کے ساتھ حملہ کے لئے آگیا لیکن جوں ہی

اس کو مسلمانوں کے آمد کی اطلاع ہوئی وہ واپس ہوگیا۔ ملک کافور نے اس کا تعاقب کیا اور اُس کو دوارسمدر (دوار وتی پور) میں محصور کر لیا۔ جو سلطنت کرناٹک کا مرکز تھا۔ بلال دیو نے صلح نامہ پیش کیا جس پر ملک کافور نے سالانہ خراج کی پابندی عاید کی اور تاوان جنگ جو ایک کثیر مقدار میں ہاتھ آیا مع ویر آبلال سوم کے دہلی روانہ کردیا تاکہ علاء الدین کے روبرو اپنی اطاعت کا اقرار کرے۔

ناآبار سے سندر پانڈیہ نے بھاگ کر دہلی کا رخ کیا اور علاء الدین کے پاس پہونچا اور سلطنت پر ویر پانڈیہ قابض ہوگیا۔ مسلمانوں کی آمد پر راجہ نے پایۂ تخت کو چھوڑ کر ایک جزیرہ میں پناہ لی۔ ملک کافور نے بغیر کسی جھگڑے کے کثیر مال و دولت پر قبضہ کر لیا۔ وآصف اور خسرو کے بیان کے بموجب اس نے ۳۲۰ ہاتھی ۲۰ ہزار گھوڑے ۵۰۰،۲ پونڈ سونا اور جواہرات کے کئی صندوق حاصل کئے۔ اس دولت سے اس کے خیالات پلٹ گئے اور ایک خود مختار سلطنت کے قیام کا منصوبہ اس کے دماغ میں آیا لیکن حالات سے مجبور ہوکر اپنے منصوبہ کو کامیاب نہ بنا سکا۔ اس فتح سے اس کی ہمت بڑھ گئی اور یہ آگے بڑھتا ہوا۔ رامیشورم تک چلا گیا جہاں اس نے یادگار کے طور پر ایک مسجد بھی تعمیر کروائی۔ یہاں اس نے مسلمانوں کو بھی دیکھا جن کا طرز معاشرت، نسلی تمیاز اور زبان وہاں کے ماحول اور جغرافی حالات کی وجہ سے بہت کچھ بدل گئی تھی۔ ۱۳۱۱ء میں یہ شمالی ہند کی سب سے پہلی اور انتہائی پیش قدمی تھی۔ اورنگ زیب صرف دریائے کاویری تک بڑھ سکا۔ اس طرح تاریخ ہند کا یہ دور جنوب ہند کی فتح اور سیاسی اقتدار کو حاصل کرنے میں سب سے نمایاں رہا۔

علاء الدین خلجی کے بعد اس کا دوسرا بیٹا مبارک خلجی جب ۱۳۱۶ء میں تخت نشین ہوا تو دیوگڑی میں بغاوت ہوگئی۔ وہاں ہرپال دیو نے شنکر کو ہٹا کر تخت پر قبضہ کر لیا تھا۔ مبارک خلجی نے ہمت سے کام لے کر دیوگڑی پر حملہ کردیا۔ اس نے پہلے خسرو کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ بھیجا اور اس کے بعد خود گیا۔ ہرپال دیو کو شکست ہوئی اور دیوگڑی پر براہ راست قبضہ کر لیا گیا۔ اس طرح مہاراشٹرا سلطنت براہ راست شمالی ہند کے زیر حکومت آگئی۔ گلبرگہ اور ساگر پر فوجی عہدہ دار مقرر کردیے گئے اور دیوگڑی پر ایک ترکی النسل صوبہ دار مقرر کیا گیا جس کا نام یک لاکی تھا۔ ان انتظامات کے بعد مبارک خلجی نے خسرو کو ورنگل کی تسخیر کے لئے روانہ کیا۔ . . . ورنگل کے راجہ نے اطاعت قبول کرلی اور کثیر مال و دولت نذرانہ کے طور پر پیش کیا جس کی تفصیل ابن بطوطہ نے لکھی ہے یعنی ایک سو ہاتھی ۱۲ ہزار گھوڑے ۶۰ صندوق جواہرات ۲۵۰ پونڈ سونا۔ ورنگل کی سلطنت کے پانچ اضلاع بھی دیوگڑی میں شامل کردیے گئے۔

خسرو اس فتح کے بعد جنوبی ہند کی طرف روانہ ہوگیا۔ ضیاء الدین برنی نے خسرو کی اس جنوبی مہم کو بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ جن جن شہروں سے یہ فوج گزرتی تھی وہاں کے راجہ شہر چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ اس نے ان خالی شہروں سے بہت بڑی دولت حاصل کی۔ دولت کی فراوانی نے اسے باغی بنادیا اور یہیں سے اس نے سلطنت دہلی پر قدم جمانے کے منصوبے شروع کردئے۔ دکن کی دولت نے ہر جنرل کو شاہی کے خواب دکھائے اور انھوں نے اسی قوت کے نشے میں سلطنت دہلی پر قبضہ بھی حاصل کیا۔

خلجی دور کے بعد تغلق دور میں غیاث الدین تغلق نے جب شاہی خزانہ خالی پایا تو اپنے بیٹے الغ خان کو ورنگل پر حملے کے لئے روانہ کیا۔ اس لئے کہ یہاں کے راجہ نے دہلی کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھا کر خراج دینا بند کردیا تھا۔ یہ حملہ ۱۳۲۳ء میں ہوا جب شاہی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا تو فوج میں یہ غلط خبر مشہور ہوگئی کہ غیاث الدین تغلق کا انتقال ہوگیا ہے جس کی وجہ سے محاصرہ پر برا اثر پڑا۔ راجہ کی فوج نے محاصرین کو سخت شکست دی۔ الغ خاں نے دیوگڑی میں پناہ لی۔ ضیاء الدین برنی اور ابن بطوطہ کے بیانات میں کچھ اختلاف ہوگیا ہے کیونکہ برنی اس غلطی کا ذمہ دار الغ خاں کو

بتاتا ہے اور بطوطہ اس کو مورد الزام نہیں سمجھتا۔ بہرحال واقعات کچھ بھی ہوں غیاث الدین تغلق نے اکثر لوگوں کو جو دہلی بھاگ آئے تھے سخت سزائیں دیں۔ اور ایک دوسری فوج الغ خاں ہی کی سرکردگی میں روانہ کی جس کے بعد قلعہ فتح ہوگیا اور راجہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرکے تلنگانہ کے علاقے کو بھی براہ راست دہلی کے تحت کردیا گیا۔

سلطنت دہلی جو ۱۲۹۴ء میں صرف دریائے نربدا تک پھیلی ہوئی تھی ۱۳۳۰ء میں مالابار تک پھیل گئی۔ مسلمانوں کی اتنی وسیع سلطنت اس سے قبل یا اس کے بعد کبھی قائم نہ ہوئی۔ خاندیس کے علاقے میں پٹھانوں کی نوآبادی اسی زمانہ میں قایم ہوئی۔ ان حملوں سے مسلمانوں کے اکثر قبیلے اور خاندان شاہان دہلی سے جاگیریں حاصل کرکے دکن کے مختلف علاقوں میں آباد ہوگئے تھے۔

سلطان محمد تغلق (الغ خاں) کے ابتدائی زمانہ میں اس کے بھتیجے بہاءالدین گرشاسپ نے جو گلبرگہ کے قریب ساگر میں متعین تھا بغاوت کردی۔ اس کی سرکوبی کے لئے خواجہ جہاں کی قیادت میں شاہی فوجیں روانہ کی گئیں۔ بہاءالدین نے شاہی فوجوں کی آمد سے مرعوب ہوکر دریائے کرشنا اور تنگبھدرا کی درمیانی سلطنت کمپلی میں پناہ لی۔ یہاں اس کا تعاقب کیا گیا۔ یہاں سے یہ دوار سمدرا چلا گیا اور وہاں بھی اس کا تعاقب کیا گیا۔ اس تعاقب میں ان دونوں سلطنتوں کا خاتمہ کردیا گیا اور ان کو براہ راست دہلی کے تحت کردیا گیا۔ بہاءالدین یہاں گرفتار ہوا اور قتل کردیا گیا لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ روپوش ہوگیا اور پھر اس کا پتہ نہ چلا۔

محمد تغلق کے پیش نظر سب سے زیادہ مشکل مسئلہ مرکزی قوت کا قیام تھا اس لئے کہ مرکز کو موثر بنائے بغیر اتنی وسیع سلطنت پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ اس نے اس مسئلہ کا حل یہ سوچا کہ دہلی کے بجائے دیوگری کو مرکز بنایا جائے تاکہ شمال، جنوب، شرق اور مغرب چاروں طرف سے اس کا فاصلہ یکساں رہے۔ دہلی میں بیٹھ کر جنوب ہند کے علاقے مالابار وغیرہ پر تسلط قائم رکھنا بہت ہی مشکل تھا اور پھر ایسے زمانہ میں جب کہ ذرایع حمل و نقل میں بڑی دشواریاں تھیں۔ نظری اعتبار سے اس کا یہ حل بہت ہی مناسب اور بہتر تھا لیکن عملی اعتبار سے اس کا یہ منصوبہ بیکار ثابت ہوا۔ اس نے اپنے اتنے ارے دہلی کو اجاڑ کر دولت آباد کو بسا لیا لیکن بہت ہی تھوڑے عرصے میں پھر دہلی واپس ہونا پڑا۔ اس ردوبدل سے دولت آباد (دیوگری) میں مسلمانوں کی ایک کافی تعداد آباد ہوگئی اور امرائے صدہ کا ایک بڑا حصہ یہیں مقیم ہوگیا۔ جس کے بعد انھیں امراؤں نے دہلی سے بغاوت کرکے ایک علیحدہ اسلامی سلطنت دکن میں قائم کی جو بعد میں سلطنت بہمنی کے نام سے مشہور ہوئی۔ دکن کی یہ خودمختار سلطنت محمد تغلق کی زندگی ہی میں قائم ہوئی اور بعد میں تاریخ ہند اور تاریخ دکن کی سیاسیات میں ایک بڑے انقلاب کا باعث ثابت ہوئی۔

سید کرار علی

افغانی قندھار نہیں۔ دکن کا قندھار جسے قندھار شریف کہا جاتا ہے۔ کیونکہ محمد تغلق کے ساتھ دکن میں آئے ہوئے اولیاء اللہ کی چودہ سو پالکیوں میں کا ایک کثیر حصہ قندھار شریف ہی کے حصہ میں آیا۔ یہ دکن کا بلگرام ہے، یہاں سے اولیاء، صوفیا، علماء، شعرا، مورخین اور مشاہیر پیدا ہوئے جن کے حالات اور کارنامے " مشاہیر قندھار دکن " میں پڑھئے جس کو اکبر صدیقی صاحب بی اے نے مرتب کرکے باتصویر شایع کیا اور اب ادارۂ ادبیات اردو کو اس کا حق تصنیف دے دیا ہے۔ (مہتمم)

سلطان مجاہد شاہ بہمنی
۷۷۵ھ تا ۷۹۰ھ

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی
۸۲۵ھ تا ۸۳۹ھ

دکن پر بہمنی خاندان کی حکومت

سلطنت بہمنی کی مبارک تاسیس جو ۱۳۴۷ء میں عمل میں آئی وسط چودھویں صدی کا عظیم الشان واقعہ تھا۔ اس سلطنت کی حقیقی عظمت اس کے جلیل القدر سلاطین کی علمی وعملی شخصیت اور ان کے غیر معمولی سیاسی اور تمدنی کارناموں میں مضمر ہے۔ ان علم پروروں نے دکن کو ایک بلند پایہ سیاست اور پاکیزہ تمدن کے زیور سے اس قدر سنوارا کہ دنیا اس کو پہچاننے لگی اور اب بھی اس کی یاد تازہ ہے۔ دکن کی اصلی عظمت اسی خاندان کی وجہ سے ہے اس وقت دکن کو جس تمدن پر ناز ہے وہ سب شاہان بہمنیہ کا سرمایہ ہے۔ انہیں سلاطین نے دکن کے طول وعرض میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی اور اس کو پھیلایا۔ بہمنیوں کا کرشمہ تھا کہ انھوں نے بہت جلد دکن کو اپنا گھر بنالیا۔ اس ملک کی جغرافی خصوصیات اپنے میں جذب کرلیں اور اپنی حکومت انہیں خصوصیات کے مطابق بنائی۔ یہ سلطنت اس وقت قائم ہوئی تھی جب کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کمزور ہونے کی وجہ سے سیاست منتشر ہو رہی تھی۔ اس کے ذمہ دار کچھ تو اس زمانے کے سیاسی حالات تھے جو خلجی خاندان کے خاتمہ کے بعد ہندوستان میں رونما ہوئے بعض خاندان میں ہندوستان جیسے وسیع ملک کی رہنمائی کی اہلیت نہ تھی مرکز کی کمزوری سے ہر صوبے میں جداگانہ عملداری قائم ہوگئی۔ دکن کی انفرادیت جس طرح پہلے زمانے میں قائم تھی پھر کھڑی ہوگئی اور امرائے صدہ کی بدولت جو دکن کے تاریخ ساز ہیں سلطنت بہمنی کی داغ بیل پڑ گئی

سلطنت بہمنی کا پہلا دور

سلطنت بہمنی کی تقریباً ڈیڑھ سو سال کی تاریخ ہے اس کا ابتدائی زمانہ جب کہ اس سلطنت کے بانی علاء الدین حسن اور اس کے بیٹے محمد شاہ اول نے حکومت کی بہت اہم تھا اس دور میں سلطنت کی بنیاد رکھی گئی اور دکن کے طول وعرض اور اس کی قومی اور جغرافی خصوصیات کا صحیح مطالعہ کرکے ایک نہایت عمدہ نظام حکومت قائم کیا گیا یہ سلاطین بہمنیہ کا سیاسی کرشمہ سمجھنا چاہئے کہ انھوں نے ابتدا ہی سے دکن کو اپنا گھر بنالیا تھا اس جدید ماحول میں اپنے آپ کو اس قدر مانوس کرلیا کہ قدیم اہل دکن ان کو اپنا بادشاہ تسلیم کرنے لگے۔ نظام حکومت اس طرح مرتب کیا گیا جو سب کے لئے خوش گوار تھا ہندو بھی حکومت میں شریک کیا گیا جس کو تاریخ ہند کا پہلا واقعہ سمجھنا چاہئے، مرکزی حکومت مضبوط بنائی گئی اور سلطنت مقامی حلقوں میں تقسیم کرکے صوبہ داری اور ضلع داری کی علاقہ بندیاں قائم کی گئیں، اگرچہ اس انتظام کا سہرا ان بادشاہوں کے سر ہے جو اس سلطنت کے بانی اور معمار تھے لیکن اس میں اسی سلطنت کے پہلے وزیر اعظم سیف الدین غوری کا بھی ہاتھ تھا۔ محمد شاہ کو اس بات کا احساس تھا کہ اس نے شاہی دربار کے آداب کے لئے خاص اہتمام کیا تھا دربار کو مختلف طریقوں سے سجایا گیا امراء و روسا کے کھڑے رہنے کی جگہ مقرر کی گئی اور بادشاہ کے بیٹھنے کے لئے تخت فیروزہ کے نام سے ایک تخت بنایا گیا جس کی بہت شہرت تھی اور ہندوستان کی تاریخ میں اب تک ایسا تخت نہیں بنا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں اسی تخت کی شہرت سے متاثر تھا اور تخت طاؤس کو بہمنی تخت کا نقش ثانی سمجھنا چاہئے تخت محمد شاہ کے دربار کا ایک اہتمام بھی بہمنیوں کی خاص اختراع ہے۔ اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔

محمد شاہ اول کا انتقال سنہ ۱۳۷۵ء میں ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مجاہد شاہ تخت نشین ہوا جو تین سال سے زیادہ بادشاہی کرنے نہ پایا کیونکہ اس کے چچا داؤد نے اس کا خاتمہ کرکے خود تخت پر قبضہ کرلیا مجاہد شاہ کے ہمدردوں نے بہت جلد اس کا بھی خاتمہ کردیا اور علاء الدین حسن کے ایک پوتے کو جس کا نام محمد شاہ دوم ہے تخت نشین کیا گیا۔ محمد شاہ دوم کی تخت نشینی سے اس سلطنت کا دور دورہ شروع ہوتا ہے۔ اس میں نہ صرف ملک کو خانہ جنگی سے نجات ملی بلکہ تمدنی ترقی کی نئی راہیں کھل گئیں محمد شاہ بہت تعلیم یافتہ اور علم دوست آدمی تھا اس کی وجہ سے دکن میں سب سے پہلے علمی سرگرمیاں شروع ہوگئیں جو اس سے پہلے نہیں ہوئی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ محمد شاہ دوم سے پہلے جو زمانہ گذرا تھا وہ تاسیس اور تشکیل کا زمانہ تھا۔ اس میں علمی ترقی نہیں ہوسکتی تھی۔ جب تک استحکام سلطنت کے ساتھ ملک میں سیاسی اطمینان نہ پیدا ہوجائے اہل علم اطمینان کے ساتھ علمی کام نہیں کرسکتے۔ محمد شاہ دوم کے کامیاب نظم و نسق کی وجہ سے ایک طرف تو امن قائم ہوگیا اور دوسری طرف اس کی علم دوستی نے ملک میں علمی دلچسپیاں پیدا کردیں۔ لائق علما جمع کئے گئے مدرسے کھول دئے گئے۔ استادوں کے لئے خاطر خواہ تنخواہیں اور طلبہ کے لئے وظائف مقرر ہوگئے ان علما میں سے جو اس زمانے میں دکن آتے تھے فضل اللہ انجو کا نام ہمیشہ یادر ہے گا جو دنیائے اسلام کا بہت بڑا عالم تھا اسی شخصیت کی وجہ سے دکن میں علم کی دیا روشن ہوئی اور اس کی روشنی ایسی پھیلی کہ دکن علم کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

سلطنت بہمنی کا انتہائی عروج

جس طرح محمد شاہ اول کے انتقال کے بعد خانہ جنگی کی بدنما شکل پیدا ہوئی تھی اور چند روز تک تمدنی ترقی مسدود ہوگئی اسی طرح محمد شاہ دوم کے بعد بھی بہت سی سیاسی بدمزگیاں پیدا ہوگئیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز کے لئے سلطنت بہمنی کے وقار کو دھکا لگا محمد شاہ کا انتقال سنہ ۱۲۹۷ء میں ہوا۔ اس کے جانشین غیاث الدین اور شمس الدین جو چند مہینوں کے فصل سے اس کے بعد تخت نشین ہوئے اس گراں بار کے متحمل نہیں ہوسکے۔ ایک ترک غلام تغلچین نامی سلطنت پر بری طرح حاوی ہوگیا اور بادشاہ کٹھ پتلی ہوگئے اس وقت ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو ملک کی صحیح رہنمائی کرسکیں۔ علاء الدین حسن کے دوسرے پوتے محمود خاں اور احمد خاں جو بہت لائق اور ذی علم تھے بہمنی سلطنت کے وقار کو بچانے کے لئے میدان میں آگئے اور سازش کرکے تغلچین کو ماردیا اور فیروز خاں تاج الدین فیروز شاہ کے لقب سے تخت فیروزہ پر بیٹھ گیا۔ جو اس خاندان بہمنیہ کا سب سے زیادہ جلیل القدر اور مایۂ ناز بادشاہ تھا۔ اس کے عہد حکومت میں دکن کی جس قدر ذہنی اور اخلاقی تربیت ہوئی اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے بہمنیوں کا تمام تر تمدن اسی عہد کی پیداوار ہے۔ فیروز شاہ فضل اللہ انجو کا شاگرد تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے استاد کے تمام سرمایۂ علم سے فائدہ اٹھایا تھا بلکہ اپنی رسا طبیعت اور غیر معمولی ذہن کی وجہ سے ایسی علمی شان پیدا کردی تھی کہ دنیا کے سلاطین میں اس کی مثال نہیں ملتی اس نے تمام ملک میں اشاعت علم کے تمام ذرائع استعمال کئے۔ دور دراز سے علما جمع کئے اور ان کی خاطر خواہ تواضع کی۔ علم کی مجلسیں منعقد کیں اور ان میں وہ خود بھی ایسا حصہ لیتا تھا کہ گویا وہ بادشاہ نہیں ہے اسی پر حصر نہیں ہے بلکہ فرصت کے اوقات میں وہ بلند پایہ طلبہ کو جمع کرکے ان کو انتہائی مضامین میں درس دیا کرتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ

فیروز شاہ کی ذی علم شخصیت کی وجہہ سے دکن کے در و دیوار علم و فضل سے گونجنے لگے اور گلبرگہ علم کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

علمیت کے ساتھ فیروز شاہ میں سیاسی تدبر بھی کچھ کم نہیں تھا۔ ملک کی کامیاب سیاسی رہنمائی کی اور ہمسایہ سلطنتوں پر اس قدر رعب داب قائم کیا کہ سب سلطنت بہمنی کا لوہا مانتے تھے۔ نیز فیروز شاہ کے پاکیزہ ذوق کی وجہ سے دکن کے تمدن میں بڑی شگفتگی پیدا ہوگئی لباس وضع قطع نئے انداز میں ڈھل گئے لباس کی بعض اختراعیں جو فیروز شاہ نے بنائی تھیں وہ اب تک موجود ہیں اگر فیروز شاہ سے کوئی غلطی ہوئی تھی تو وہ صرف یہہ ہی کہ اس نے اپنے بھائی احمد خاں کی جگہ اپنے بیٹے حسن خان کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا۔ احمد خاں عمر رسیدہ اور لائق آدمی تھا۔ اس نے خود فیروز شاہ کی تخت نشینی میں مدد دی تھی۔ اسی بناء پر اس زمانے کے مشہور بزرگ حضرت بندہ نوازؒ نے بھی احمد خاں کے لئے اپنا روحانی فیصلہ صادر کردیا تھا اس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ دونوں فریقوں میں ان بن ہوگئی اور احمد خاں کو تلوار کے زور سے تخت حاصل کرنا پڑا

سلطنت بہمنی کا آخری دور

احمد خاں جو اپنی روحانیت کی وجہہ سے احمد شاہ ولی بہمنی کے نام سے موسوم ہے ۸۲۴ھ میں تخت نشین ہوا اس کی تخت نشینی سے سلطنت کے استحکام و توسیع میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ علم و فن کی سرگرمیاں اسی طرح قائم ہیں جس طرح فیروز شاہ کے عہد میں تھیں۔ لیکن اس کے عہد میں گلبرگہ کی جگہ بیدر کو پائے تخت بنایا گیا اس انتظام سے یہہ فائدہ ہوا کہ پائے تخت کے لئے بیدر جیسی ایک بلند جگہ مل گئی لیکن گلبرگہ جو ایک زمانے میں علم و فن کا مرکز بن گیا تھا اس کی آب و تاب گھٹ گئی۔ اب دنیا کی توجہہ بیدر کی طرف منعطف ہونے لگی۔ شیخ آذری جو اس زمانے کا مشہور عالم ہے اسی زمانے میں دکن آیا تھا اور دربار کی فیاضیوں سے فائدہ اٹھا کر ملک کی علمی خدمت کرتا تھا۔ اس کو دربار سے یہہ کہا گیا تھا کہ بہمن نامہ کے نام سے سلطنت بہمنی کی تاریخ لکھے۔ چنانچہ اس نے اپنی آخری عمر تک اس کی تکمیل بھی کی تھی لیکن افسوس ہے کہ وہ ناپید ہے ان چند ظاہری چیزوں کے قطع نظر جو بہت کچھ حوصلہ افزا معلوم ہوتی ہیں سلطنت کی تہہ میں بہت سی چیزیں ایسی بھی تھیں جو آگے چل کر اسی سلطنت کے زوال کا باعث ہوگئیں یعنے اسی عہد سے طبقہ واری کشمکش کے بنما آثار ظاہر ہونے لگے۔ علاء الدین حسن کے عہد سے جو امرائے صدہ اور ان کے خاندان دکن میں آباد ہوگئے تھے وہ اپنے آپ کو دکھنی کہتے تھے اور انھیں اس کا حق بھی تھا کیونکہ دکن کے حقیقی آباد کار اور سلطنت بہمنی کے بانی تھے۔ اور اس پر تقریباً ایک صدی گذر گئی اس کے بعد جو نو وارد ترکستان اور ایران سے یہاں آتے تھے وہ ان میں گھل مل نہیں سکے اور اہل دکن ان کو اپنا دشمن سمجھنے لگے طبقہ واری کشمکش۔ احمد شاہ کے بیٹے علاء الدین ثانی کے عہد میں جو ۸۳۸ھ میں تخت نشین ہوا بری طرح ظاہر ہوگئی یعنے دونوں فرقوں میں سخت خوں ریزیاں ہونے لگیں ایک ہنگامہ تو اس قدر زبردست ہوا کہ جس میں تمام باہر کے لوگ مار دئے گئے۔ اگرچہ علاء الدین ثانی نے اپنے آہنی پنجہ سے اس آگ کو فرو کردیا لیکن اس کے جانشینوں کے عہد میں اس کی چینگاریاں پھر بھڑک اٹھیں اور بالآخر سلطنت بہمنی کو جلا کر خاک کردیا۔

علاء الدین ثانی کے بعد جس کا انتقال ۱۴۵۸ء میں ہوا تھا اس کا بیٹا ہمایوں اس کا جانشین ہوا لیکن یہ تین سال سے زیادہ حکومت نہیں کر سکا۔ اس کی بے وقت موت سے بہت نقصان ہوا۔ اس کے بیٹے چھوٹے تھے، ایک بیٹا نظام شاہ بہمنی کے نام سے تخت نشین کیا گیا تھا جلد مر گیا اور دوسرا بیٹا محمد شاہ لشکری کے نام تخت پر بٹھایا گیا چونکہ اس کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی اس لئے اس کی ماں نرگس بانو مخدومہ جہاں ملک کی سیاسی رہنمائی کرتی تھی لیکن وزارت کی بڑی خدمت پر محمود گاواں ثانی ایک نووارد برسر اقتدار ہوگیا۔ یہ اگرچہ علاء الدین ثانی کے عہد میں باہر سے آیا تھا اور تجارت کرتا تھا لیکن محمد شاہ لشکری کی کمسنی کے زمانے میں اس نے بہت ترقی کر لی۔ اور سلطنت کے تمام سیاہ و سفید اس کے سپرد ہوگئے۔ محمد شاہ کے سن رشد کے پہنچنے کے بعد بھی اس کے اقتدار میں کمی نہیں ہوی محمود گاواں کے اقتدار سے بہت سے فائدے بھی ہوئے چنانچہ ملک میں علمی کام ہوے اور دستور میں اضافے ہوے لیکن اس کی تنگ نظری سے دکھنی فریق بیزار ہوگیا اور اس کو مارنے کے درپے ہوگیا۔ چنانچہ ایک خاص موقع پر جب کہ بادشاہ اور محمود گاواں مشرقی اور شمالی تلنگھانے کی مہم میں مصروف تھے ایک سازش ہوگئی۔ بادشاہ کو محمود گاواں کی طرف سے بدظن کیا گیا۔ بادشاہ نے ناعاقبت اندیشی سے اس کو مارنے کا حکم صادر کر دیا۔

محمود گاواں کا قتل جو ۱۴۸۱ء میں ہوا دکن کا بڑا واقعہ ہے اسی واقعہ کے بعد سے سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ کیونکہ جو لوگ اس کے قتل کے ذمہ دار تھے ان میں سیاسی رہنمائی کی صلاحیت نہ تھی۔ ملک حسن بحری جو نظام الملک کے خطاب سے سرفراز تھا اس فعل کا ذمہ دار تھا اگر اس میں محمود گاواں کی وزارت کے سنبھالنے کی صلاحیت ہوتی تو سلطنت اپنی جگہ قائم رہتی اور شیرازہ نہیں بکھرتا لیکن افسوس یہ ہے کہ نظام الملک اور اس کا فریق بالکل خود غرض تھا۔ ان کی نااہلیت اور خود غرضی کی وجہ سے ہر قدم پر ملک کو نقصان پہنچنے لگا جو لوگ محمود گاواں کے آوردہ تھے سب حکومت سے متنفر ہوگئے اور ہر جگہ انحراف کرنے لگے محمد شاہ لشکری کی زندگی تک جو ۱۴۸۲ء میں ہوا تھا حالات کسی قدر روبراہ تھے لیکن اس کے انتقال کے بعد جب اس کے کمسن بیٹے محمود شاہ بہمنی کو تخت نشین کیا گیا تو علانیہ خود سری ظاہر ہونے لگی۔ اکثر صوبہ دار باغی ہو گئے چنانچہ ۱۴۹۰ء میں احمد نگر اور بیجاپور اور برار کے صوبہ داروں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا چند سال بعد گولکنڈہ بھی خود مختار ہوگیا۔ ۱۴۹۰ء کو سلطنت بہمنی کی آخری تاریخ سمجھنا چاہئے۔ بیدر میں جو سلطنت کا مرکز ہے قاسم برید ذی اختیار ہوگیا جو در اصل شہر کا کوتوال تھا محمود شاہ اور اس کے تمام جانشین سب اس کے ہاتھ میں کٹ پتلی ہوگئے تھے ۱۵۱۸ء میں محمود شاہ کے مرنے کے بعد اس کے چار بیٹے احمد شاہ، علاء الدین ثالث، ولی اللہ کلیم اللہ یکے بعد دیگرے برائے نام تخت پر بٹھائے گئے تھے لیکن یہ سب بریدیوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی تھے۔ بالآخر کلیم اللہ حق ناشناس بریدیوں کی دست درازیوں سے تنگ آکر ۱۵۲۷ء میں احمد نگر بھاگ گیا اور اس کے ساتھ تخت فیروزہ پر بیٹھنے والے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے۔

عبدالمجید صدیقی

نذر ولی

مجاہد شاہ بہمنی

مجاہد شاہ سلطنت بہمنی کا تیسرا تاجدار ہے۔ اس کی جگہ ایسی صف میں ہے جہاں بالعموم کسی کی نظر نہیں پڑتی لیکن اپنے درجہ پر بھی وہ مطالعہ کے قابل ہے۔ اگرچہ اس کی مختصر زندگی کچھ زیادہ جاذب نظر نہیں مگر اس کے بعض پہلو نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ سبق آموز ہیں۔

مجاہد شاہ محمد شاہ کا بیٹا اور علاء الدین حسن گنگو کا پوتا تھا۔ یہ ۱۳۷۵ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۳۷۸ء میں قتل کر دیا گیا۔ اس طرح اس نے صرف تین سال حکومت کی۔ اس کا قاتل خود اس کا چچا داؤد شاہ تھا جب مجاہد شاہ نے وجیانگر پر حملہ کیا اور وہاں کے راجہ کشن رائے کو بری طرح شکست دی تو واپسی میں وہ دریائے کرشنا کے کنارے آرام کے لئے ٹھیرا اس کے دشمنوں نے موقع پا کر اسے یہاں قتل کر دیا۔

مجاہد شاہ ایک بیدار مغز حکمران اور ایک نہایت اچھا سپاہی تھا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی سلطنت کے چاروں طرف نظر ڈالی اور ان اسباب کو بغور دیکھا جہاں سے حملے ہوتے تھے۔ اگرچہ سلطنت بہمنی کو خاندیش، مالوہ اور گجرات کی شمالی سلطنتوں سے بھی خطرہ تھا لیکن جنوبی سلطنت وجیانگر ہمیشہ پریشانی کا باعث رہتی تھی۔ علاء الدین اور محمد شاہ کے عہد میں اس سلطنت سے لڑائیاں ہو چکی تھیں اور کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ مجاہد شاہ کی نظر سب سے پہلے اسی ہمسایہ سلطنت پر پڑی۔ اس نے بین سلطنتی سمجھوتہ کرنا چاہا اور وجیانگر کو لکھا کہ آئندہ نزاع کا سدباب اس طرح ہو سکتا ہے کہ تمہارے اور ہمارے درمیان حدود کا تعین ہو جائے چنانچہ مجاہد شاہ نے اپنی طرف سے یہ تجویز کی تھی کہ دریائے تنگبھدرا حد فاصل ہو۔ لیکن کشن رائے اس تجویز پر راضی نہیں ہوا۔ وہ رائچور اور مدگل کا دوآبہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اسی لئے اس نے تنگبھدرا کی بجائے دریائے کرشنا کو حد فاصل بنانا چاہا۔ لیکن مجاہد شاہ اس کو کیسے مان لیتا۔ چنانچہ اپنی تجویز کو منوانے کے لئے اس نے حملہ کر ہی دیا۔

مجاہد شاہ کے غیر معمولی قوائے جسمانی اور اس کے ساتھ اس کی شجاعت اور جوانمردی اس کی زندگی کے روشن پہلو ہیں۔ سلطنت بہمنی کا عام دستور تھا کہ وہ اپنے شاہزادوں کو خاطر خواہ تعلیم و تربیت دیتے اور درس و تدریس کے لئے لائق اساتذہ فراہم کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ تمام سلاطین بہمنی اچھے تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ بعض تو اونچی قابلیت رکھتے تھے۔ نیز ان کو جسمانی اور فوجی تربیت دی جاتی تھی اور وہ اچھے سپاہی ہوتے تھے۔ چنانچہ تمام معرکوں میں سلاطین بہمنی بذات خود حصہ لیتے تھے۔ اسی ماحول میں مجاہد شاہ کی بھی اٹھان ہوئی تھی۔ چونکہ اس کے قویٰ بھی کافی اچھے تھے اس لیے اس پر تعلیم و تربیت کا غیر معمولی اثر ہوا تھا۔ فرشتہ کے قول کے مطابق وہ شمشیر، نیزہ اور خنجر کے سوا بات نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ مجاہد شاہ کے اس شوق شمشیر آزمائی کے متعلق بہمن نامہ کے اشعار یہ ہیں۔

ز گہوارہ چوں پائے بیروں نہاد   بہ تیر و کمان دست و بازو کشاد
بسے تند گردن گرفتش پیل زور   کہ نشنید گفتے کسے وقت شور
چناں بر سر کنگرہ می دوید   کہ انگشت حیرت فلک می گزید

مجاہد شاہ سلطنت بہمنی کا بہت بڑا سپہ سالار تھا۔ اس کی سپہ سالاری کے حقیقی جوہر اس وقت ظاہر ہوئے جب کہ سلطنت وجیانگر سے اس کی ان بن ہو گئی تھی۔ وہ ۱۹ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا اور حملہ وجیانگر کے وقت اس کی عمر مشکل سے ۲۲ سال ہوگی۔ اس نو خیز عمر میں اس کا دلیرانہ معرکہ اس کی زندگی کا اعجوبہ تھا۔ کشن رائے کے مقابلہ سے پہلے گنگا وتی کے آگے اس نے جو خونخوار شیر کا تیرے شکار کیا تھا وہ مدتوں سے عرصہ تک زبان زد خاص و عام رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں تنہائی پرست کا وجیہ نگر پر تنا رعب پڑا تھا کہ کشن رائے مدتوں کا موج ہمبر کر کھی تھی۔

کشن رائے کے عہد میں سلطنت وجیانگر کی جو عظمت تھی وہ سب کو معلوم ہے۔ اس کی فوجی طاقت بہت زیادہ تھی۔ ایسی طاقتور سلطنت کا مقابلہ کچھ آسان نہیں تھا۔ اس موقع کی نزاکت کے باوجود مجاہد نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ یہ بڑے گھمسان کا معرکہ تھا۔ گو اس حملہ سے کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا تھا لیکن اس میں مجاہد شاہ نے جو کارنامے دکھائے تھے وہ ہمیشہ یاد رہیں گے۔ کوئی معرکہ ایسا نہ تھا جس میں اس نے حصہ نہ لیا ہو۔ وجیانگر کی چڑھائی، شرنگ کا حملہ، قلعہ ادھونی کا محاصرہ، اور رامیشورم تک کشن رائے کا تعاقب اس کے مشہور کارنامے ہیں جو بھلائے نہیں جا سکتے۔ ان چڑھائیوں میں ایک امتیازی بات یہ تھی کہ کہیں قتل عام نہیں کیا گیا۔ جو دشمن مقابلہ کرتا تھا اسی کو مارا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ مجاہد شاہ کے باپ محمد شاہ کی وصیت تھی جس کی پابندی کی گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر شجیع سپہ سالار کے اوصاف میں یہ چیز داخل ہے۔

اگر مجاہد شاہ کی زندگی مہلت دیتی تو شاید دنیا کے بڑے بادشاہوں میں اس کا شمار ہوتا۔ دریائے کرشنا کے کنارے جہاں اس کے دشمنوں نے اس کا خاتمہ کرنا چاہا تھا۔ اس وقت بھی اس نے اپنی فطری شجاعت کے جوہر دکھائے۔ یہ کیمپ میں سو رہا تھا کہ دشمنوں نے اس پر وار کیا۔ داؤد خاں نے خنجر بھونکا تو اس کی آنتیں نکل آئیں تھیں لیکن اس کے باوجود اس نے داؤد کو اس کے خنجر کے ساتھ پکڑ کر کھینچا اور قریب تھا کہ داؤد مر جاتا لیکن اس کے ایک ساتھی مسعود خاں نے اس کو مار دیا اور اس طرح دکن کا یہ ہونہار حکمراں موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

سلطان احمد شاہ ولی البہمنی

عبد الحفیظ صدیقی

احمد خاں بہمنی بن سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے دوسرے بیٹے تھے۔ ولادت ۷۷۴ھ م ۱۳۷۲ء میں بعہد سلطان محمد شاہ بن سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی ہوئی۔ باپ کے انتقال کے وقت یہ اور ان کے بھائی فیروز شاہ صغیر سن تھے۔ اور ان دونوں کی پرورش و پرداخت ان کے چچیرے بھائی محمد شاہ ثانی نے کی۔ ان دونوں کو تیر اندازی۔ چوگان بازی۔ سواری۔ پڑھنا۔ لکھنا غرض کہ ہر شاہی علم و فن کی اچھی تعلیم دی۔ اور شیراز کے مشہور اور متبحر عالم میر فضل اللہ انجو کو ہر دو کی تعلیم و تربیت کے لئے مقرر کیا اور اپنی دونوں بیٹیاں ان دونوں بھائیوں کو بیاہ دیں۔

جب فیروز شاہ بادشاہ ہوا تو احمد خاں کو خانخاناں کا خطاب دیا اور امیر الامرا مقرر کیا۔ وہ نہایت شجاع اور خوبصورت جوان تھے چہرہ روشن اور پیشانی خندہ تھی۔ خلوص ارادت سے حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو درازؒ سے بیعت کی۔ بصرف زرکثیر حضرت کے لئے ایک خانقاہ تعمیر کرائی اور ہمیشہ حاضر خدمت ہو کر اسرار معرفت کا سبق لیتے اور ہر محفل سماع میں شریک ہو کر نکات تصوف سے محظوظ اور توجہ حضرت سے بہرہ مند ہوتے تھے۔ چنانچہ حضرت نے ان کی نسبت بادشاہی کی پیشین گوئی کی تھی جس کی وجہ سے فیروز شاہ بہت رنجیدہ ہوا اور حضرت کو شہر گلبرگہ سے باہر جا کر رہنے کا حکم دیا۔ اور مصاحبین کے ورغلانے سے احمد خاں سے بھی بدظن ہوا اور اپنے دو غلاموں ہوشیار عین الملک و بیدار نظام الملک کی صلاح سے ان کو اندھا کرانے کا ارادہ کیا۔ جب ان کو اس کی اطلاع ملی تو اپنے فرزند علاء الدین کے ساتھ شہر سے بھاگ نکلے اور حضرت کے ارشاد و فیوض سے مطمئن ہو کر وہاں سے رخصت ہوئے۔

جب ان کے بھاگ جانے کی خبر فیروز شاہ کو ہوئی تو ایک فوج اپنے دو غلام ہوشیار اور بیدار کے ساتھ پکڑ لانے کے لئے روانہ کی۔ انھوں نے بھی اطلاع پا کر مختصر سی فوج تیار کر کے شاہی فوج کا مقابلہ کیا جس میں ان کو کامیابی حاصل ہوئی۔

فیروز شاہ ان کی فتح کی خبر سن کر قلعہ کا دروازہ کھلوا کر اپنے پاس بلوایا۔ وہ فیروز شاہ کے پاس گئے اور اس کے قدموں پر سر رکھ کر

جو حالت بیماری میں فرش تھا زار و قطار رونے لگے۔ فیروز شاہ نے سر اٹھا کر خوشی کے لہجہ میں کہا کہ میں نے تم کو اپنے جیتے جی بادشاہ دیکھا۔ تم شایانِ سلطنت ہو اور استحقاق اس کا تمہیں کو پہونچتا ہے۔ میں شفقت پدری سے حسن خاں کی ولیعہدی کی سعی کرتا رہا۔ جب کارفرمایانِ قضا و قدر میرے بعد تاج سلطنت تمہارے لئے نامزد کر چکے ہیں تو دوسرے کے لئے کوشش بے فائدہ ہے۔ حسن خاں کو تمہارے سپرد کیا۔ اٹھو آج ہی سے مہمات سلطنت کو انجام دینا شروع کرو۔ غرض شوال پانچویں ۸۲۵ھ کو تاج بادشاہی بھائی کا زیب سر کرکے تخت فیروزہ پر جلوہ گر ہوئے اور اپنا نام "احمد شاہ بہمنی" رکھا۔

مہمات سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلے خلف حسن بصری کو وکیل السلطنت کرکے ہزار دو صدی کا منصب عطا کیا اور ملک التجار خطاب دیا۔ اور ہوشیار و بیدار غلاموں میں سے ایک کو خطاب امیر الامرائی اور دوسرے کو دولت آباد کی فوج کی سپہ سالاری کے منصب سے سرفراز فرمایا۔ اور فیروز شاہ کے بیٹے حسن خاں کو جو وارث تاج و تخت تھا اور جمیع ارکان دولت جس کے قتل یا قید کرنے کی صلاح دیتے تھے منصب پانصدی عطا کیا اور فیروز آباد جاگیر میں دیا اور وہاں اس کو آزادی سے رہنے اور سیر و شکار کرنے کی اجازت بھی عطا کی۔ یہ شہزادہ جیتے جی کی زندگی تک وہاں سیر و شکار میں مشغول رہ کر اپنی زندگی خوب مزے سے بسر کرتا رہا۔

راجہ ویجیا نگر نے سرکشی شروع کی اور خراج دینے سے انکار کیا۔ علاوہ اس کے گزشتہ جنگ میں مسلمانوں کا بیدردی سے کشت و خون ہوا تھا اس کا بدلہ لینا بھی ضروری تھا۔ اس لئے چالیس ہزار سوار جرار ہمراہ رکاب لے کر ویجیا نگر کی طرف روانہ ہوئے۔ راجہ رائے ورنگل کی مدد سے مقابلہ میں آیا۔ دونوں فوجیں دریائے تنگبھدرا کے کنارے ایک دوسرے کے سامنے اتریں لیکن دونوں میں سے کوئی آگے بڑھ کر اول حملہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر بہمنی فوج کا ایک دستہ یکایک ایسی پھرتی سے دریا پار اترا کہ راجہ دیو رائے بھی حیران رہ گیا اور اس کی فوج فوراً منتشر ہو کر بھاگ نکلی۔

ایک دن احمد شاہ چند سواروں کے ساتھ شکار کو نکلے۔ ہندوؤں نے جو موقع کی تاک میں تھے پیچھا کیا اور چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے سلطان کے سب ساتھی کام آئے مگر اس اثناء میں کمک آ پہونچی اور ویجیا نگر کی تسخیر کا عزم ارادہ کیا۔ دیو رائے نے گھبرایا اور اس نے حیرانی میں کئی سال کے خراج کی بقایا رقم کو ہاتھیوں پر لاد کر فی الفور بارگاہ سلطانی میں داخل کر دیا۔ اور بہت ہی عجز و انکسار سے صلح کی درخواست کی۔ دونوں میں صلح ہو گئی۔ بوقت واپسی تلنگانہ پر چڑھائی کی۔ رائے ورنگل نے با فوج لشکر آپ کا مقابلہ کیا۔ آخر مارا گیا۔ ملک تلنگ کو اپنے تصرف و اقتدار میں لیا اور مظفر و منصور ہو کر واپس ہوئے۔

انہیں ایام میں سلطان بیدر کے ایک میدان سے گزرے جو نہایت پر فضا تھا۔ حکومت کے لئے ایک مرکزی مقام کی ضرورت تھی جہاں سے پورے دکن پر حکومت کی جا سکے۔ بیدر چونکہ دکن کے وسط میں نہایت بلندی پر واقع تھا اس لئے سلطان نے اس کو پسند فرما کر یہیں شہر کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام احمد آباد بیدر رکھا۔ اور رجب ۸۲۶ھ م ۱۴۲۳ء میں گلبرگہ کے بجائے بیدر کو پائے تخت قرار دیا یہاں قلعہ حصار اور محلات شاہی و باغات وغیرہ چار سال کے قلیل عرصہ میں تعمیر کرائے۔

بیدر میں سلطنت کرتے ہوئے چند سال گزرے تھے کہ امساک باراں سے سخت قحط پڑا نہریں اور باؤلیاں خشک ہو گئیں انسان و حیوان مرنے لگے۔ سلطان نے خزانہ کا منہ کھول دیا۔ اور غلہ کے شاہی ذخار غرباء اور مساکین میں لٹا دئے۔ جب ایک سال اس طرح گذرا اور دوسرے سال بھی بارش نہ ہوئی تو سلطان نے علماء و مشائخ و زہاد کو ساتھ لے کر نماز استسقا ادا کی لیکن جب یہ بھی بے سود ہوا تو سلطان

بہ نفس نفیس صحرا کی طرف تشریف لے گئے اور تنہا بلندی پر چڑھ کر چند دوگانے ادا کئے۔ دعا مقبول ہوئی اور اس قدر مینھ برسنے لگا کہ لوگ خوش ہوگئے اور اُسی دن سے سلطان احمد شاہ ' ولی کے لقب سے مشہور ہوگئے۔

سلطان کو قواعد لشکرکشی اور آئین فرمانروائی میں کافی مہارت تھی۔ وہ ہر کام میں بھائی کی پیروی کرتے سادات علمار اور مشائخ کی تعظیم و تکریم کرتے۔ فقیروں اور درویشوں سے بہت عقیدت رکھتے۔ صوم و صلوٰۃ کے اتنے پابند کہ کبھی تہجد اور اشراق تک قضا نہیں ہونے دی اور کل مہام سلطنت بذات خود انجام دیتے۔ غریب سے غریب رعایا کی فریاد سنتے اور انصاف فرماتے اور گاہے گاہے مثل ہارون رشید خلیفۂ بغداد کے بھیس بدل کر رعایا کے حالات دریافت کرتے۔ کبھی مسجدوں اور مدرسوں میں جاکر وہاں کے حالات دیکھتے اور کبھی دفاتر میں جاکر ملک کے نظم ونسق کو ملاحظہ فرماکر اصلاحیں جاری فرماتے۔ غرض آپ نے اخلاق حسنہ سے خاص عام کو مطیع و فرمانبردار بنالیا تھا۔

جن دنوں میں سلطان جنگ میں مصروف تھے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ نے رحلت فرمائی۔ جس کا سلطان کو بہت صدمہ ہوا۔ ایک روز بھرے دربار میں اپنے صاحبزادوں کو طلب کیا اور سب کی طرف مخاطب ہوکر بولے۔ جب مالک اپنے بندہ کو اپنے پاس بلائے تو کیا کرنا چاہیئے۔ مجمع نے جواب دیا کہ اپنے مالک کا حکم بجالانا چاہیئے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ جناب ہی مجھے طلب فرماتے ہیں اور حضرت پیرو مرشد بندہ نواز گیسو دراز کی یاد ستا رہی ہے۔ اب باغ عالم کی سیر سے دل کو سیر ہوگیا۔ یہ کہہ کر آپ نے ملک کے مختلف علاقوں پر فرزندوں کو حاکم مقرر فرمایا۔ چنانچہ ولایت رام نگر' مدھول' مکلم' برار اور ولایت' ماہور کا شاہزادہ محمود خاں کو حاکم مقرر کیا۔ شاہزادہ داؤد خاں کو راکور اور تلنگانہ کا اور ولیعہد علاء الدین کو اپنی جگہ بادشاہی دی اور چھوٹے شہزادہ محمد خاں کو بڑے بھائی کو شریک شاہی کیا اور عدم مخالفت کے بارہ میں چاروں سے قسم لی اور ضروری وصیت اور سب کو اتفاق کی ہدایت کرکے دربار برخاست اور پھر یاد حق میں ایسے مشغول ہوئے کہ عین حالت عبادت میں ۲۹ ذی الحجہ ۸۳۹ھ کو بوقت شب واصل بحق ہوئے۔ سلطان کا گنبد بیدر سے ایک کوس کے فاصلے پر موضع اشٹور کے میدان میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

محمد ظہیر الدین

پرانا پُل

(حیدر آباد)

لرزتی نگاہوں کا فرمان ہے تو
دھڑکتے ہوئے دل کا احساں ہے تو
ثباتِ تمنا کی پہچان ہے تو
رُکا جس سے طوفاں وہ طوفان ہے تو

(۲)

گلستانِ حلم کی رنگیں کہانی
قطب شاہ کے دل کی کافر جوانی
غرورِ محبت کی زندہ نشانی
ضیائے چراغِ شبستان ہے تو

(۳)

پڑی "بھاگ نگری" کی بنیاد تجھ سے
ہوا دشتِ ویران آباد تجھ سے
بنا تجھ سے، ہاں حیدر آباد تجھ سے
مری داستانوں کا عنوان ہے تو

(۴)

وہ دن جا چکے، وہ زمانہ نہیں ہے
وہ زلفیں نہیں ہیں وہ شانہ نہیں ہے
مگر یہ حقیقت، فسانہ نہیں ہے
کہ سچی محبت کا پیمان ہے تو

میکش

بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت

سلطنت بہمنیہ کے زوال کے بعد دکن میں جو پانچ اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں ان میں دو بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومتیں سیاسی، اور تمدنی حیثیت سے نہ صرف دوسری ریاستوں سے بہت زیادہ ممتاز تھیں، نہ صرف حدود ارضی کی وسعت بلکہ فوجی قوت میں یہ دوسری دکنی ریاستوں سے بڑھی ہوی تھیں بلکہ ہندوستان کی دوسری متعدد حکومتوں سے زیادہ پائدار اور برتر تھیں۔ ان کی عالیشان عمارتیں اور تہذیب و تمدن کے دوسرے آثار آج بھی ان کی عظمت اور اہمیت کو یاد دلاتے ہیں۔ بیجاپور کا بول گنبد، ابراہیم روضہ اور سیکڑوں خوش نما مسجدیں، گولکنڈے کا عظیم الشان قلعہ، بادشاہوں کے گنبد، حیدرآباد کا چار مینار اور مکہ مسجد ان دونوں خاندان کی وہ زبردست یادگاریں ہیں جو آج بھی سیاحوں کو اپنی طرف کشاں کشاں لے آتے ہیں۔ اگرچہ آخری دور میں ان ریاستوں میں بہت سی کمزوریاں پیدا ہوگئی تھیں اور یہ مغلوں کی باج گزار بھی بن گئی تھیں اورنگ زیب عالم گیر نے سلطنت مغلیہ کو کشمیر سے لے کر راس کماری تک وسیع کرنے کے جوش میں ان کا خاتمہ کر کے خود اپنی سلطنت کو ہمیشہ کے لئے کمزور اور زوال پذیر کر دیا۔

سب سے پہلے عادل شاہی ریاست ہی اس کی جوع الارض کا شکار بنی اور یوسف عادل شاہ نے ۸۹۵ھ میں جس ایوان حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی وہ دو سو سال قائم رہ کر منہدم ہو گیا۔ یوسف اصل میں ترکی شہزادہ اور سلطان مراد کا دوسرا بیٹا تھا شیر خوارگی کے زمانے میں باپ کے انتقال اور بھائی کی تخت نشینی کے بعد اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس لئے ماں نے بڑی دانش مندی اور چالاکی سے اس کو موت کے منہ سے چھڑا کر خواجہ عماد الدین گرجانی نامی تاجر کے ساتھ راتوں رات قسطنطنیہ سے باہر بھیج دیا سوداگر مذکور یوسف کو لے کر ایران پہنچا اور یہاں شہر ساوہ میں سکونت اختیار کی، یوسف کا ابتدائی زمانہ ایران میں ہی گزرا اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ جب جوان ہوا تو خواجہ عماد کے ساتھ بطریق تجارت و سیاحت ۸۶۴ھ میں ہندوستان میں داخل ہوا۔

ان دنوں ہندوستان میں بہمنیہ سلطنت اپنے پورے عروج پر تھی۔ سلطان محمد بہمنی کا دربار خود اس کی اولوالعزمی اور عالی حوصلگی اور اس کے وزیر خواجہ جہاں خواجہ محمود گاواں کے تدبر اور حسن انتظام کی وجہ سے مرجع خلائق بنا ہوا تھا۔ یوسف بھی ہندوستان آیا تو سیدھے خواجہ محمود گاواں کے ہاں باریاب ہوا، خواجہ جہاں نے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا جہاں اس کی قابلیت کے جوہر کی آزمائش کے بعد اس کو شاہی چیلوں یا مقربین خاص کے زمرے میں شریک کر لیا گیا۔ سلطان محمود بہمنی کے دربار میں یوسف نے اپنی علمی اور فوجی قابلیتوں کے متعدد ثبوت دئے اور ہر قسم کے انعامات اور اعزازات سے سرفراز ہوتا گیا۔ یوسف عادل خاں اور ملک الشوق کے خطابات بھی پائے اور کئی سیر حاصل پرگنے بھی جاگیر کے طور پر ملے۔ مختلف موقعوں پر میدان جنگ کی سرکردگی اور فوجوں کی سپہ سالاری کے فرائض انجام دینے کے علاوہ پہلے بنیر کا عامل اور بالآخر سلطنت کے بہت بڑے صوبہ بیجاپور کا طرف دار یعنے گورنر مقرر ہوا۔

سلطان محمود اور اس کے وزیر خواجہ جہاں دونوں کی موت سے سلطنت بہمنیہ روز بروز کمزور ہوتی گئی۔ بریدی امیر نے بادشاہ کو

سلاطین بیجاپور

یوسف عادل شاہ

اسمٰعیل عادل شاہ

تین مرتبہ ناکام کوشش کر چکا تھا، فتح کر لیا اور بیجاپور کی طرف پیش قدمی کرنے لگا۔ اسد خاں کی وفاداری اس کو کسی طرح روا نہیں رکھ سکتی تھی وہ پھر ابراہیم سے آملا اور عماد الملک والی برار کی امداد سے نہ صرف قلعہ شولاپور واپس لے لیا بلکہ برہان نظام شاہ کو بیڑ تک مار بھگایا۔

نوجوان ابراہیم سے شکست کھا کر برہان نے پہلے سے زیادہ تیاریاں کیں اور رام راج والی بیجانگر، جمشید قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ اور علی برید تینوں کو اپنے ساتھ ملا کر پھر ۱۵۴۶ء میں چڑھائی کی۔ اس موقع پر اسد خاں کی حسن تدبیر سے رام راج ان سے الگ کر دیا گیا اور شولاپور کا قلعہ جو اصل میں سارے جھگڑے کا باعث تھا، لغیر لڑائی کے نظام شاہ کے حوالے کر دیا گیا اور اسد خاں نے ان دونوں کا تصفیہ کرنے کے بعد جمشید قلی قطب شاہ کا مقابلہ کیا اور اس کو بے طرح شکست دی۔ باوجود اس حکمت عملی اور حسن تدبیر کے لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ برہان نظام شاہ اور والی بیجانگر اور برہان کے جانشین حسین نظام شاہ نے ابراہیم سے کئی مرتبہ لڑائیاں کیں اور بہت کچھ خوں ریزی ہوئی مگر آخر کار ابراہیم ہی کامیاب رہا۔

ان لڑائیوں کے دوران میں اسد خاں سے وقتاً فوقتاً ابراہیم کو بڑی مدد ملتی رہی مگر اس کے مخالف ہمیشہ بادشاہ کو اس کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے بالآخر کچھ تو پیری کی وجہ سے اور کچھ بادشاہ کی ناراضی دیکھ کر اسد خاں بلگام میں گوشہ نشین ہو گیا۔ اسد خاں کے بعد احمد نگر کا سپہ سالار جو عین الملک کے خطاب سے مفتخر ہو کر ابراہیم کا ملازم ہو گیا تھا، اس کے لشکر کی سپہ سالاری کرتا رہا مگر وہ بہت جلد باغی ہو گیا۔

ابراہیم اگرچہ بڑا بہادر سپاہی اور اہل سیف کا بہت قدردان تھا مگر اس کی سختی کی وجہ سے بہت سے لوگ ہمیشہ اس سے ڈرتے رہتے تھے اسی خوف نے دشمنی کی شکل اختیار کی اور سلسلہ یہاں تک بڑھا کہ اس کو معزول کرنے اور اس کے بھائی عبداللہ کو بادشاہ بنانے کی سازش ہونے لگی سازش کا راز فاش ہوتے ہی عبداللہ بھاگ کر گوا میں پرتگالیوں کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔ اور چند روز کے لئے ان کی حمایت سے اپنی بادشاہی کا اعلان بھی کرایا مگر ابراہیم کی زبردست فوجی قوت اور اس کے لشکریوں کی وفاداری سے عبداللہ کو کبھی اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی، پرتگالی بھی اس قضیے میں پھنس کر نفع کی بجائے ہمیشہ فوجی نقصان برداشت کرتے رہے۔

ابراہیم اپنے باپ کی طرح علم دوست بھی تھا اور میدان جنگ میں اس کی شجاعت و بہادری ہمیشہ لائق ستائش رہی مگر تند خو اور ہٹیلا بھی بہت زیادہ تھا۔ اپنی علالت کے زمانے میں جس کا سلسلہ تقریباً دو سال رہا۔ جلد صحت یاب نہ ہونے پر بگڑ کر کئی طبیبوں کو قتل کر ڈالا اور بعض کو ملک بدر کر دیا۔ وہ اپنی اولاد کے ساتھ بھی سختی کرنے سے باز نہیں رہتا تھا۔ اس کا دوسرا فرزند علی بڑے بھائی کے مقابلے میں جو ولی عہد تھا بہت تیز تھا اس نے کمسن شہزادے کو اپنے ولی عہد کے حق میں مضر سمجھ کر نہایت بے دردی سے کم عمری ہی میں قلعہ مرج میں قید کر دیا تھا۔

ابراہیم نے کم و بیش (۲۴) سال خدمت کر کے ۱۵۵۷ء (۹۶۵ھ) میں وفات پائی اور اپنے باپ دادا کے پہلو میں بمقام نصرت آباد (گوگی) دفن کیا گیا اس کے کل چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ بڑا اسماعیل ولی عہد مگر بہت غبی اور کودن تھا۔ منجھلا علی بہت زیرک تھا اور وہی باپ کے بعد اس کا جانشین ہوا، دوسرے دو لڑکوں کے نام طہماسپ اور احمد تھے۔ لڑکیوں میں ایک تانی بی بی علی برید سے بیاہی گئی تھی اور دوسری جس کا نام ہدیہ سلطان بتایا جاتا ہے مرتضیٰ نظام شاہ بحری سے منسوب تھی۔

اگرچہ ابراہیم کا زمانہ زیادہ تر لڑائیوں میں گزرا لیکن اس نے اس پر بھی بہت سے کام اصلاح و ترقی ملک کے لئے کئے ۹۳۳ھ میں ابراہیم پور نامی ایک شہر آباد کیا اور وہاں ایک عالی شان مسجد بنائی۔ ۹۳۵ھ میں سولہ کھمبی محل تعمیر کرایا۔ نیز غالب مسجد جس میں صرف روشنی کے لئے ۳۰۳ طاقچے تھے اور جامع مسجد جو درگاہ حضرت جعفر سقاف سے متصل ہے اسی کی بنائی ہوئی ہیں ان کے علاوہ اس کے عہد میں بیجاپور اور رائچور کے قلعوں کی فصیلوں کی درستی اور استحکام کا کام بھی انجام پایا۔

سلاطین بیجاپور

سلطان ابراھیم عادل شاہ اول
سنہ ۹۴۱ھ تا سنہ ۹۶۵ھ

سلطان علی عادل شاہ اول
(شوہر چاند سلطانہ)
سنہ ۹۶۵ھ تا سنہ ۹۸۸ھ

علی عادل شاہ اوّل
۱۵۵۷ء ۔ ۱۵۸۰ء

شہزادہ علی کو قلعہ مرچ میں قید کر دیا گیا تھا مگر قید میں بھی اس کی تعلیم و تربیت بہت ہی اعلیٰ درجے کی ہوئی تھی اور وہ اپنے سب بھائیوں سے زیادہ لائق تھا۔ باپ کے عقائد کے خلاف وہ شیعہ عقائد کی طرف مائل تھا اور اس کے اتالیق، رفیق اور نگران بھی بہت ہوشیار اور ابراہیم کی موت کے منتظر تھے انھوں نے ابراہیم کے مرنے سے پہلے ہی اس کی بادشاہت کے منصوبے پورے کر لیے۔ ادھر ابراہیم فوت ہوا اور ادھر علی کی بادشاہی کا اعلان وہیں قلعہ مرچ سے کر دیا گیا۔ چند ہی روز میں بیجاپور میں علی نے اپنے دوسرے بھائیوں کو جو باپ کے مرتے ہی قید ہو گئے تھے اندھا اور ناکارہ کر دیا اور بے کھٹکے بادشاہت کرنے لگا۔ اس کو چونکہ شیعہ عقائد میں سخت غلو تھا اس لئے اس نے اہل ایران کو کثرت سے بیجاپور میں جمع کیا اور شیعہ عقاید کی ترویج میں بہت شدت دکھائی لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی فیاضی اور داد و دہش اس قدر زیادہ تھی کہ مذہب کے معاملے میں اس کی سختی پر غالب آ گئی۔ اگرچہ سنی مسلمان اس کی حرکات اور خصوصاً تبرا پسندی سے سخت ناراض تھے لیکن اس کے احسان عام نے "مذہبی جنگ" کو روک دیا

اس کی تخت نشینی پر والی بیجانگر نے مبارکباد دی اور دوستی کی طرح ڈالی مگر اس کے برخلاف حسین نظام شاہ والی احمد نگر نے بہت کج خلقی دکھائی اسی لئے بیجاپور اور بیجانگر کے تعلقات بہت بڑھ گئے۔ دونوں ملکوں کے فرماں روا مل کر حسین نظام شاہ سے ۹۶۶ھ میں متصادم ہوئے اور اس کو بہت نقصان پہنچایا۔ پھر اگلے سال دونوں نے مل کر اس کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ اس دفعہ حسین نظام شاہ نے ابراہیم قطب شاہ کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا مگر علی عادل شاہ نے ابراہیم کو اس سے الگ کر دیا۔ اس دفعہ احمد نگر کی ریاست بری طرح تباہ ہو گئی اور تینوں نے مل کر حسین نظام شاہ کو بہت تنگ کیا ان دونوں جنگوں میں والی بیجانگر اور اس کے لشکر نے بیجاپوریوں کی احسان مندی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عام طور پر ایسی حرکات کیں جو مسلمانوں کی سخت دل آزاری ہوئی ان کی مسجدوں کو توڑا ہی نہیں ڈالیں بلکہ بت خانوں سے بدل دیں۔ نیز بیجاپور اور گولکنڈہ کے بہت سے علاقے دھمکی کے پردے میں چھین لئے۔ دولت اور مال غنیمت کی کثرت نے والی بیجانگر کو بے حد مغرور بنا دیا تھا جس کی وجہ سے علی عادل شاہ اور دوسرے فرماں رواؤں کو سخت خطرہ لاحق ہو گیا۔ اس اتفاقی موقع سے فائدہ اٹھا کر بیجانگر نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور ایک ایک کر کے ان اسلامی ریاستوں کو ختم کرنے کی تدبیریں ہونے لگیں۔ اور ہر موقع کی نزاکت کو سمجھ کر بیجاپور، احمد نگر، گولکنڈہ کے بادشاہ بھی اپنی پچھلی عداوتیں بھلا کر متحد ہو گئے اور ۹۷۲ھ میں سب نے مل کر تالی کوٹ کے میدان میں بیجانگر والوں سے فیصلہ کن مقابلہ کیا۔ میدان اتحادیوں کے ہاتھ رہا۔ بیجانگر کا شہر تاراج ہو گیا اور اس کی سلطنت کو بھی ایسا دھکا پہنچا کہ وہ پھر پنپ نہ سکی۔

اگرچہ بیجانگر سے جنگ کرنے کیلئے اتحاد بڑے زور شور سے عمل میں آیا تھا اور حسین نظام شاہ کی بیٹی چاند بی بی کی شادی علی عادل شاہ سے اور علی عادل شاہ کی بہن کی شادی حسین نظام شاہ کے بیٹے مرتضیٰ نظام شاہ سے ہو گئی تھی لیکن باوجود ان سب باتوں کے ان ریاستوں میں پھر لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے اور علی عادل شاہ برابر آخر تک جنگوں میں گھرا رہا۔

علی عادل شاہ لاولد تھا اس لئے اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بھتیجے ابراہیم ابن طہماسپ کو ۹۸۷ھ میں اپنا ولی عہد قرار دے دیا تھا ابھی اس بات کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اگلے ہی سال یعنی ۹۸۸ھ م ۱۵۸۰ء میں علی عادل شاہ ایک خائن غلام کے ہاتھ قتل ہو گیا۔ اس کی مدت حکومت (۲۳) سال اور عمر (۴۰) سال تھی۔ اس کی وفات سے ریاست بیجاپور کو بہت نقصان پہنچا کیونکہ گو اس کا جانشین ابراہیم بعد کو بہت بڑا بادشاہ ثابت ہوا لیکن اس کی کمسنی کے زمانے میں غنیموں نے ریاست کو بہت کمزور کر دیا

علی عادل شاہ کو تعمیر عمارت کا بہت شوق تھا۔ اس کے عہد میں جو عمارتیں بنیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے خاص طور پر مشہور یہ ہیں۔ قلعہ شاہ درگ (نلدرگ) فصیل قصبہ شاہ پور، نہر کشور خانی، پریا محل، آنند محل، گگن محل، باغ دوازدہ امام، باغ فدک، مسجد جامع چاند باؤلی، قلعہ دھارور، قلعہ بنکاپور وغیرہ۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی ۔ ۱۵۸۰ء ۔ ۱۶۲۷ء

جب علی عادل شاہ کے حسب وصیت ابراہیم ابن طہماسپ تخت نشین ہوا تو اس کی عمر صرف نو سال تھی۔ اس کی چچی چاند بی بی کے زیر ہدایت کامل خاں متولی اور مختار ریاست کی حیثیت سے کام کرنے لگا مگر بہت جلد وہ خود سر ہو گیا۔ اس کی جگہ چاند بی بی کے اشارے سے کشور خاں متولی بنا مگر وہ بھی چند ہی دنوں میں حد درجے خود سر اور دشمن ملک و مالک ثابت ہوا۔ اس نے تو خود چاند بی بی کو بے حرمتی سے محل سے نکال کر قید کر دیا۔ اس کے مارے جانے پر اخلاص خاں نے متولی کا عہدہ پایا۔ پھر دلاور خاں مختار کل بنا اور اسی کے زمانۂ مختاری میں ابراہیم قطب شاہ کی بیٹی اور محمد قلی قطب شاہ کی بہن ملکہ جہاں سے جس کا عرف چاند سلطانہ ہو، ابراہیم عادل شاہ کی شادی ہوئی۔

ان متولیوں کے زمانۂ اقتدار میں آس پاس کے اکثر بادشاہوں نے بیجاپور پر متعدد حملے کئے اور اس کو نقصان پہنچایا اس کے علاوہ متعدد مرتبہ کئی خانہ جنگی امرا اور متولیاں ریاست کے جھگڑوں سے بیجاپور کو باوجود خوش حالی کے بہت نقصان پہنچا۔ دلاور خاں کے زمانہ مختاری میں اسماعیل نے جو ابراہیم کا چھوٹا بھائی تھا ایک بڑی بغاوت کی اور سارے ملک میں ہل چل مچ گئی۔ دلاور خاں کی درپردہ شرارتوں کے باوجود ابراہیم کے اقبال سے اسماعیل کا قلع قمع ہو گیا مگر دلاور خاں بادشاہ کی نظروں میں بے طرح کھٹک گیا۔ اب بادشاہ نے جو سن بلوغ کو پہنچ چکا تھا اور ہر طرح کاروبار ریاست سنبھال سکتا تھا، دلاور خاں کو معزول کر کے ۱۰۰۰ھ عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور بہت کر و فر کے ساتھ بیجاپور میں داخل ہوا۔ اس نے چند بیرونی جھگڑوں سے الگ رہ کر اندرون ملک کی اصلاح و تعمیر شروع کی ۱۰۰۸ھ میں ایک نئے شہر نورس پور کو آباد کیا اور رفتہ رفتہ دیگر بہت سی عمارتیں بنائیں، شعرا و علما سے اپنے دربار کو آراستہ کیا، فن موسیقی کے بڑے بڑے ماہرین کو جمع کیا کیونکہ اس کو اس فن سے طبعی لگاؤ اور اس میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس کی کتاب نورس آج تک مشہور ہے۔

اس کے خود مختار ہونے سے کچھ دنوں قبل ہی چاند بی بی اپنے میکے چلی گئی اپنی آبائی ریاست احمد نگر کو جو ابراہیم نظام شاہ کی جوان مرگی کی وجہ سے بے طرح خود غرض امرا کی تباہ کاریوں کا شکار بنی ہوئی تھی، سنبھالنے کی کوشش کی۔ مغلوں نے اس پر پے در پے حملے کر کے اس کے اکثر حصوں کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ شہنشاہ اکبر کی فتوحات کا سلسلہ اور آگے بڑھا۔ اس نے ابراہیم عادل شاہ سے بھی خراج طلب کیا اور ابراہیم نے اس کے مقابلے میں اپنے کو کمزور پا کر خراج منظور کر لیا۔ اس کے بعد مغلوں کا زور اور بھی بڑھ گیا۔ ابراہیم نے اکبر کے پیغام بھیجنے پر اپنی لڑکی سلطان بیگم کی شادی شہزادۂ دانیال سے کر دی۔ اکبر کے بعد جہانگیر اور اس کے بیٹے شہزادہ خرم نے دکن کے کئی علاقوں پر جو عادل شاہی نظام شاہی اور قطب شاہی ریاستوں کی ملک تھے اپنا قبضہ جمایا۔ ابراہیم نے بیدر پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا۔ ادھر ملک عنبر نے بیجاپور پر حملہ کیا اور ابراہیم کے آباد کئے ہوئے نورس پور کو ہمیشہ کے لئے تباہ و تاراج کر دیا اور خود بھی چند ہی روز میں فوت ہو گیا۔ ابراہیم کو اس کا بڑا رنج ہوا مگر ملک عنبر کے مر جانے کی وجہ سے وہ اس سے بدلہ نہ لے سکا۔

ابراہیم نے پورے (۴۷) سال حکومت کی اور ۱۶۲۶ء (۱۰۳۶ھ) میں انتقال کیا۔ اس نے متولیوں کا دورِ ملالت ختم ہونے کے بعد

سلطان ابراهیم عادل شاہ ثانی
(نورس)
۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ

سلطان محمد عادل شاہ
۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۷ھ

تیس سال سے زیادہ مدت تک جو خودمختارانہ حکومت کی وہ زمانہ زیادہ تر پُرامن رہا اور اس عرصے میں اس نے ریاست کی اندرونی اصلاح کے
بہت سے کام کئے۔ اس کو تعمیر عمارات کا بہت شوق تھا، اس کے عہد میں کثرت سے عمارتیں بنی ہیں مثلاً آثار محل، آنند محل، مسجد ملکۂ جہاں،
نورس محل یا سنگت محل، نورس پور کی عمارات وغیرہ۔ ابراہیم روضہ اس کے عہد میں بہت سی اور بھی تمدنی ترقیاں ہوئیں اور نئی رسوم و تقاریب کا
اضافہ ہوا جیسے عید نورس وغیرہ۔ اس کا مقبرہ جو ابراہیم روضہ کے نام سے مشہور ہے تعمیری نقطۂ نظر سے ایک بہترین یادگار ہے اور اپنی گل کاریوں
اور نقش و نگار کے اعتبار سے دکن کا تاج محل سمجھا جاتا ہے۔

اس کے کل چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں جو مختلف محلات کے بطن سے تھے۔ بڑا بیٹا درویش بادشاہ محمد قلی قطب شاہ کی بہن ملکۂ جہاں
کے بطن سے تھا مگر ابراہیم اس کی ماں سے ناراض تھا علاوہ ازیں چھوٹا سلطان محمد اس کے مقابلے میں باپ کا منظور اور زیادہ لایق تھا
اس لئے اس کو اپنا جانشین کیا۔

محمد عادل شاہ ۱۶۲۷ء - ۱۶۵۶ء

جس وقت سلطان محمد اپنے مرحوم باپ کے حسب وصیت تخت نشین ہوا اس کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ مرزا محمد امین لاری، دولت خاں
آقا رضا اور دیانت الملک وغیرہ مختلف عہدوں پر مامور کئے گئے اور یہی نوجوان بادشاہ کے مشیر اور مددگار تھے اگرچہ بادشاہ کم عمر تھا لیکن اپنی
ذہانت طبعی سے فوراً ملک کی اصلاح میں مصروف ہو گیا۔ چند ہی دن کے بعد نظام شاہی خاندان سے فرماں روا نے پھر مخالفت کی ابھی زیادہ
مدت گزرنے بھی نہیں پائی تھی کہ صلح ہو گئی مگر یہ دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ دوبارہ نظام شاہی فوج حملہ آور ہوئی اور بری طرح شکست کھائی۔ اس واقعہ کے
بعد نظام شاہی ریاست روز بروز کمزور ہونے لگی امرا و صوبہ دار جو پہلے سے خود سر بن بیٹھے تھے خود مختار ہو گئے رہی سہی طاقت مغلوں کے
پے در پے حملوں نے توڑ دی۔ بہت سے علاقے محمد عادل شاہ کے قبضے میں آ گئے۔

شاہ جہاں نے جب یہ دیکھا کہ محمد عادل شاہ قوی ہوتا جاتا ہے تو اس نے نظام شاہی ریاست کے مفتوحہ علاقوں کی واپسی
کی پہلے سے چھیڑ چھاڑ شروع کی اور نہایت لطیف دو مراسلے بھیجے۔ محمد عادل شاہ نے ان کا نہایت پرزور جواب دیا۔ بعض علاقے امرائے
عادل شاہی کی ریشہ دوانیوں سے شاہ جہاں کو پیش قدمی کے اچھے موقعے مل گئے۔ بہت جلد احمد نگر و دولت آباد ختم ہو گئے محمد عادل شاہ نے
بیجاپور میں قلعہ بند ہو کر شہر کے اطراف میلوں تک وسیع میدان کو تباہ و برباد کر دیا تاکہ مغل فوج کو رسد نہ ملنے پائے اس کی یہ تدبیر
کامیاب رہی۔ مغلوں نے بیجاپور کا محاصرہ ترک کیا اور اس وقت تنگ آ کر مجبوراً صلح پر آمادہ ہو گئے۔ عادل شاہ نے بھی اس شرط پر صلح کر لی کہ
دریائے کرشنا کے اس طرف کا تمام علاقہ شاہ جہاں کے قبضے میں دے دیا جائے۔ اس طرف کا سارا علاقہ بدستور بیجاپور کی ریاست میں شامل رہے
نیز تاوان جنگ کے طور پر بیس لاکھ روپے شاہ جہاں کو ادا کئے جائیں۔

مغلوں سے پیچھا چھڑا کر محمد عادل شاہ نے کرناٹک کی طرف توجہ کی اور بڑی لڑائیاں کیں اور بہت سے علاقے فتح کر کے اپنی ریاست
کو وسیع اور مالامال کیا اور اپنی ساری توجہ رعایا کی فلاح و ملک کی اصلاح و ترقی کے کاموں میں صرف کی۔ اس دوران میں برابر شاہ جہاں
کی طرف سے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی مگر بہ مقتضائے وقت اس نے جنگ نہیں کیا بلکہ کمزور بادشاہ کے حسب منشا کام کرتا رہا۔ باوجود
اس کے محمد عادل شاہ کے زمانے میں بیجاپور کی ریاست کو کافی وسعت ہوئی اور رعایا کی خوش حالی تو ایسی تھی کہ اگلے کسی بادشاہ کے

دو میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔

محمد عادل شاہ نے فصیلوں اور برجوں کی مرمت کے علاوہ داد محل، بیگم تالاب وغیرہ کئی عمارات اور متعدد مسجدیں بنائیں جن میں سب سے زیادہ مشہور خود اس کا گنبد ہے محمد عادل شاہ نے ۱۶۵۶ء میں (۳۰) سال سے زیادہ عرصے تک حکومت کرکے وفات پائی اور اپنے گنبد میں جو گول گنبد یا بول گنبد کے نام سے مشہور ہے دفن ہوا۔ یہ گنبد اس قدر بڑا ہے کہ ہندوستان بھر میں کوئی اور گنبد اس کے برابر نہیں۔ اس کی یہ خصوصیت مسلمہ اور مشہور ہے کہ ایک سرے پر کھڑے ہوکر خفیف سی خفیف آواز پیدا کی جائے تو دوسرے سرے پر برابر سنائی دیتی ہے اسی وجہ سے اس کو بول گنبد کہتے ہیں۔ سیکڑوں سیاح اس گنبد کو دیکھنے کے لئے بیجاپور آتے ہیں اس کے عہد میں علوم و فنون کی بہت ترقی ہوئی اور کئی بڑے بڑے شعرا اور علما اس کے دربار میں ملازم تھے۔

علی عادل شاہ ثانی ۱۶۵۶ء - ۱۶۷۲ء

علی عادل شاہ ثانی اپنے نامور باپ کا اکلوتا بیٹا تھا خوش قسمتی سے محمد عادل شاہ کی حرم خاص حاجی بڑی صاحبہ نے جو محمد قطب شاہ کی بیٹی تھی، خاص اہتمام سے اس کی پرورش اور تربیت کی اور علوم متداولہ اور فنون متعارفہ میں ماہر بنایا۔ وہ (۱۹) سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور اپنی والدہ کی ہدایت اور خان محمد خاں وزیر ملک اور دیگر معتبر ارکان ریاست کے مشورے سے کاروبار ریاست انجام دینے لگا۔

شاہ جہاں نے جو اپنی سلطنت کے حدود وسیع سے وسیع تر کرنے کا تہیہ کئے ہوے تھا اس بہانے کہ ریاست بیجاپور سلطنت تیموریہ کی باج گزار ہے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کی اور یہ اعتراض اٹھایا کہ ہماری منظوری کے بغیر علی عادل شاہ کس طرح تخت نشین ہوسکتا ہے۔ اس نے یہاں تک لکھ دیا کہ علی عادل شاہ صلبی فرزند نہیں متبنیٰ ہے اور اس لئے وارث تخت و تاج نہیں گر علی عادل شاہ ثانی نے ان اعتراضات کے ترکی بہ ترکی جواب دئے جب مراسلت کا کوئی اثر نہیں ہوا تو اسی سال اورنگ زیب نے ایک بڑی فوج لے کر حملہ کیا اور بیدر اور کلیانی کے قلعے فتح کرکے اس کے بعد بیجاپور کا بھی محاصرہ کرلیا۔ ابھی علی عادل شاہ ثانی کو تخت نشین ہوکر ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اس طرح زبردست دشمن سے مقابلہ آن پڑا۔ بیجاپور کے امرا آپس کی ناراضیوں کی وجہ سے خاطر خواہ متحد اور وفادار نہیں تھے۔ محاصرہ روز بہ روز شدید ہو رہا تھا کہ شاہ جہاں کی علالت کی خبر پاکر خود اورنگ زیب محاصرہ اٹھا کر دہلی کو روانہ ہوا جس وقت مغلوں کا لشکر سرحد پار کررہا تھا خان محمد وزیر مملکت سے جو سرحد پر مقابلے کے لئے متعین تھا ملاقی ہوا، خان محمد نے اورنگ زیب کی عاجزانہ التجا اور اس چالبازانہ وعدے کی بنا پر کہ جب تک وہ وزیر مملکت ہے، بیجاپور کی طرف مغل کبھی پیش قدمی نہیں کریں گے، اورنگ زیب سے مزاحمت نہیں کی خان محمد کی یہ حرکت جس کی قباحت کا خود اس کو یقین تھا، اس کی موت کا باعث ہوی۔ اس کے قتل کے بعد ابراہیم خاں وزیر مملکت بنایا گیا۔ اور سپہ سالاری کی خدمت افضل خاں کے سپرد ہوئی۔

ابھی اس طرف سے سکون نہیں ہوا تھا کہ سیواجی نے جو محمد عادل شاہ کی علالت کے زمانے میں قلعہ جنیر پر قبضہ کرلیا تھا، مزید پیش قدمی کی اور کوکن اور اس کے پاس کے علاقوں میں لوٹ مار مچادی اور کئی قلعوں پر قبضہ کرلیا اس کی سرکوبی کے لئے افضل خاں کی سرکردگی میں ۱۶۵۹ء میں فوج روانہ کرنی پڑی مگر سیواجی نے افضل خاں کو دھوکا دے کر تنہائی میں قتل کرڈالا اور پھر اس کی فوج کو پیچھے سے حملہ کرکے اچانک

سلطان سکندر عادل شاہ
۱۰۸۳ھ تا ۱۰۵۷

سلطان علی عادل شاہ ثانی
(شاہی)
۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ

زبردست شکست دی (مغل نام کے بعد سدی) جوہر کو جو اپنی سابقہ سرکشی سے توبہ کرکے حامی ہو گیا تھا، صلابت خاں کا خطاب دے ایک بڑے لشکر کے ساتھ روانہ کیا گیا مگر یہ سیواجی کی باتوں میں آ گیا اور اس کے ساتھ سازش کر کے قلعہ پنالہ پر جو ایک نہایت مستحکم اور اہم قلعہ تھا قبضہ کر لیا اور علانیہ بغاوت شروع کر دی۔ اب تو بادشاہ خود لشکر لے کر مقابلے کے لئے نکلا اور ایک معرکے میں پنالہ فتح کر لیا۔ سیواجی اور سدی جوہر دونوں فرار ہو گئے۔ چلتے ہوئے بادشاہ نے قلعہ منتو میں پھر جوہر کا مقابلہ کیا اور اس دفعہ بھی شکست دی۔ جوہر زخمی ہوا مگر وہاں سے کسی طرح بچ بچا کر قلعہ رانچو میں پناہ گزیں ہوا۔ بادشاہ نے اس قلعہ کو بھی فتح کر لیا۔ سدی جوہر بھاگتے اور شکست کھاتے ہوئے آخر کار سخت بیمار ہو کر مر گیا۔ بادشاہ تلنگانے کے سرکش زمینداروں کو جو خراج ادا نہیں کر رہے تھے گوشمالی کر کے مظفر و منصور بیجاپور واپس ہوا اور سیواجی سے مصلحت وقت دیکھ کر سنہ ۱۶۶۲ء میں صلح کر لی کہ کوکن اور اس کے قریب کا علاقہ سیواجی کے قبضے میں رہے اور وہ اس سے آگے نہ بڑھے مگر موقع پا کر سیواجی نے پھر لوٹ مار شروع کر دی اور شائستہ خاں مغل سردار سے مقابلہ کر کے اس کو قید کر لیا۔

اورنگ زیب نے یہ خبر سن کر علی عادل شاہ ثانی سے اس کی سرکوبی میں مدد مانگی اور بیجاپور سے خواصی خاں کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کیا گیا جس نے سیواجی کو سخت شکست دی مگر عین وقت پر سیواجی نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اورنگ زیب کے سپہ سالار جے سنگھ کو اپنا دوست بنا لیا اور یہ وعدہ کر کے اپنے قبضے کے اکثر قلعوں کی کنجیاں جے سنگھ کو دے دیں کہ میں آپ کی مدد کر کے عادل شاہی ریاست کا خاتمہ کرا ڈالتا ہوں اور اس طرح یہ سارا ملک اورنگ زیب کی حکومت میں آ جائے گا۔ علی عادل شاہ ثانی کو اس کی اطلاع ملنے پر مجبوراً جے سنگھ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ دونوں میں مقابلے ہوئے اور ہر دفعہ جے سنگھ نے شکست کھائی آخر کار سنہ [illegible]ھ میں دہلی کو واپس بھاگا۔ سیواجی بھی اورنگ زیب کے دربار میں پہنچا اور چندے وہاں رہ کر پھر دکن آیا اور وہی لوٹ مار شروع کر دی۔ کئی قلعے جو مغلوں کے قبضے میں آ گئے تھے سیواجی نے چھین لیے اور اپنی جگہ مستحکم ہو کر علی عادل شاہ ثانی کو ستانا شروع کیا۔ ادھر جے سنگھ وغیرہ کے ساتھ مسلسل جنگوں کی وجہ سے خزانہ خالی ہو گیا تھا اور سلطنت مغلیہ کا خراج ادا نہ ہونے سے مغلیہ لشکر بار بار چڑھائی کر بیٹھتا تھا اس لئے علی عادل شاہ ثانی نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ اورنگ زیب اور سیواجی دونوں سے مصالحت کر لی جائے۔

یہ صلح محض عارضی تھی اورنگ زیب اور سیواجی دونوں ریاست بیجاپور کو اپنے قبضہ و تصرف میں لانے کی آرزو دل میں لئے ہوئے تھے۔ ابھی اس صلح کو کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ یکایک علی عادل شاہ ثانی بدقسمتی سے فالج میں مبتلا ہو کر معذور و مجبور ہو گیا۔ حالات بگڑ رہے تھے، امرا کے آپس میں عداوت پھیلی ہوئی تھی۔ مصلحت وقت کے تحت اپنے کم سن بیٹے سکندر عادل شاہ کو تخت نشین کر کے دارالسلطنت کے کام خواصی خاں کے سپرد کئے اور خود پلنگ پر لیٹے لیٹے صلاح و مشورہ دینا مناسب سمجھا۔ مغلوں کی روک تھام کے لئے عبدالمحمد کو شاہ درگ (نل درگ) گلبرگہ اور ساگر کے علاقے کا صوبہ دار بنایا اور عبدالکریم اور بہلول خاں و مرج اور پنالہ کے قلعوں پر متعین کر کے سیواجی کی دراز دستیوں کا بندوبست کیا۔ اسی حالت میں وہ سنہ ۱۰۸۳ھ (م ۱۶۷۲ء) میں (۳۵) برس کی جوانی میں سولہ سال حکومت کر کے راہی ملک عدم ہوا۔ اس نے بیجاپور میں اپنی زندگی ہی میں اپنے لئے ایک بہت ہی عالی شان مقبرے کی تعمیر شروع کی تھی ابھی اس کی تعمیر مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اسی میں اس کو دفن کیا گیا یہیں اس کی بیوی اور کئی عزیز اور بھی دفن ہیں اور آج بھی یہ ناتمام مقبرہ اس کے عالی شان تعمیری حوصلوں کی ایک عبرت ناک تصویر پیش کر رہا ہے۔

علی عادل شاہ ثانی بڑا بہادر اور شجیع تھا۔ اس نے کئی بڑے بڑے معرکے خود فتح کئے۔ اس کو شعر و شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ خود بھی شاعر تھا اس کے عہد میں اُردو زبان کو بہت ترقی ہوی۔ وہ اردو شاعروں کا بڑا سر پرست تھا۔ ملا نصرتی جو علی نامہ اور دیگر مثنویوں کا مصنف ہے اسی کے دربار کا متوسل تھا اس کے عہد کی عمارات میں علاوہ ناتمام مقبرے کے حسینی محل اور کئی مسجدیں تعمیر ہویں۔ اس نے دو عظیم الشان محلات، علی محل اور عائش محل کے نام سے بنانے شروع کئے تھے مگر یہہ ناتمام رہ گئے یہہ عادل شاہی خاندان کا آخری با اقتدار بادشاہ تھا اس کے بعد اس کے کمسن بیٹے سکندر کو اورنگ زیب نے قید کرلیا اور بیجاپور کی ریاست کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا۔

سکندر عادل شاہ ۔ ۱۶۷۳ء ۔ ۱۶۸۶ء

علی عادل شاہ ثانی کے انتقال پر خواص خاں نے باضابطہ طور پر پانچ سال کے کمسن شہزادے کو سکندر عادل شاہ کے نام سے تخت پر بٹھایا اور خود بطور متولی کے کاروبار ریاست انجام دینے لگا۔ بادشاہ کی کمسنی امرا کی نا اتفاقی اور غداری سے فائدہ اٹھا کر ریاست کے دوانی دشمن مغل اور مرہٹے من مانے لوٹ مار اور جنگ و جدل کرنے لگے۔ سیواجی نے غیر معمولی طاقت حاصل کرلی پنالہ فتح کرلیا۔ مغلوں نا تعفر علی حملہ آور ہوا۔ خواص خاں مغلوں سے سازش کرلی اور سکندر کی بہن شہر بانو بیگم کی شادی شہزادہ محمد اعظم سے قرار دے کر ایک بڑے پیشکش کے ساتھ اورنگ زیب سے صلح کرلی مگر یہہ صلح کبھی پائدار ثابت نہ ہوئی۔

خواص خاں، سدی مسعود خاں، بہلول خاں، سید مخدوم، شرزہ خاں اپنی ناعاقبت اندیشی اور نمک حرامی سے کبھی اورنگ زیب سے مل جاتے اور کبھی مرہٹوں سے۔ اسی طرح صلح و جنگ میں اپنی قوتیں صرف کرتے رہے۔ اسی عرصہ میں سیواجی فوت ہوگیا مگر اس کے بیٹے سنبھاجی اور دوسرے مرہٹہ سرداروں نے اپنی وہی روش جاری رکھی، وہ ادھر عادل شاہیوں کو تنگ کرتے اور ادھر مغلوں کو الگ دق کرتے۔ بالآخر اورنگ زیب نے بیجاپور کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا تہیہ کرکے اولاً ایک فرمان بھیجا جس میں متعدد سخت شرائط درج تھیں۔ سکندر عادل شاہ کے مشیروں نے اس کا جواب اس طرح مرتب کیا جس سے اورنگ زیب کی شرائط کی تکمیل نہیں ہوتی تھی۔ اورنگ زیب نے ایک بڑی فوج کے ساتھ ۱۰۹۷ھ (۱۶۸۶ء) میں بیجاپور پر چڑھائی کی اور شہر فتح کرکے سکندر کو قید کرلیا اور بیجاپور کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ بدقسمت سکندر پانچ سال کی عمر میں بادشاہ ہوا، چودہ سال حکومت کی اور چودہ سال اورنگ زیب کی قید میں رہ کر بالآخر ۱۱۱۱ھ میں وفات پائی۔

سید محمد

یادگار ولی

مرتبہ سید محمد ایم اے یہہ اُردو شاعری کے استاد اول ولی اورنگ آبادی کی زندگی ناحول اور شعری کارناموں اور ولی سے پہلے اور ولی کے بعد اردو شاعری کے ارتقاء کا ایک بسیط تذکرہ ہے جو دو صد سالہ جشن یادگار ولی کے سلسلہ میں ترتیب دیا گیا ہے اس کے آخر میں ولی کا منتخب کلام اور اُردوئے قدیم (دکنی) کے ان مخطوطات کی تفصیلی فہرست بھی درج ہے جو حیدرآباد کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں متعدد قدیم بادشاہوں اور شاعروں کی تصاویر بھی اس کے ساتھ ہیں قیمت عالی

سب رس کتاب گھر سے طلب کیجئے

بیجاپور کے سپہ سالار

افضل خاں

شرزہ خاں

عادل شاہی امراء

افضل خاں

افضل خاں بیجاپور کے مشہور سپہ سالاروں میں تھا۔ اس کا نام عبداللہ خاں تھا۔ سلطان محمد عادل شاہ کے زمانے میں اس نے متعدد معرکوں میں حصہ لیا اور ملک کی بڑی شائستہ خدمات انجام دیں جس پر اس کو افضل خاں کا خطاب عطا کیا گیا۔ سلطان محمد عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا نوجوان فرزند علی عادل شاہ ثانی تخت نشین ہوا تو اس کے مراتب و اعزاز میں اور اضافہ کیا گیا اور یہ خان محمد خاں کے ساتھ ایک بڑے لشکر کا سپہ سالار بنا کر اورنگ زیب کے مقابلے کے لئے بھیجا گیا۔ اورنگ زیب اس عرصے میں بیدر اور کلیانی کے قلعے فتح کر چکا تھا۔ بیجاپور کا محاصرہ کر لیا مگر شاہ جہاں کی علالت کی خبر پاکر محاصرہ برخاست کر کے دہلی کا رخ کیا۔ جب وہ سرحد سے گزر رہا تھا تو خان محمد نے بطور خود اس کے لشکر کو چلے جانے کا موقع دیا اور اس طرح ایک بے نظیر موقع چھوڑ دیا۔ افضل خاں اس پر بہت ناراض ہوا۔ جب بادشاہ کو اس کی رپورٹ ملی تو خان محمد کو واپس طلب کیا مگر وہ رستے ہی میں اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔

خان محمد کے بعد افضل خاں ہی سب سے بڑا سپہ سالار تھا۔ بادشاہ نے اس کو سیواجی کے مقابلے میں روانہ کیا جس نے کوکن کے علاقے میں سخت طوفان مچا رکھا تھا۔ تیجاپور اور بھنڈارپور سے گزر کر افضل خاں پرتاپ گڑھ پہنچا۔ سیواجی نے اس کی آمد کی خبر سن کر اپنی فطری چالاکی سے بجائے مقابلہ کے صلح و اطاعت کی پیشکش کی چال چلی۔ افضل خاں کے سفیر کرشناجی کے ساتھ اپنے سفیر گوپی ناتھ کو بھیج کر یہ قول و قرار کیا کہ افضل خاں سے تنہائی میں مل کر معذرت کرنا اور اطاعت ختم کرنا چاہتا ہے۔ افضل خاں اس کے دھوکے میں آگیا اور جب تنہائی میں یہ دونوں ملے تو سیواجی نے آستین میں چھپے ہوئے ہتھیار سے فوراً اس کا کام تمام کر دیا۔ افضل خاں کے قتل ہوتے ہی سیواجی کی فوج کے حوصلے بڑھ گئے اور عادل شاہی فوج بھاگ گئی۔ سیواجی نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ افضل جوش شجاعت میں اس کی چال کو نہ سمجھا اور اپنی جان گنوائی۔ سیواجی کے ایک ساتھی نے اس کا سر کاٹ لیا اور سیواجی کے پاس لے جاکر انعام پایا۔ علی عادل شاہ ثانی کو افضل خاں کی موت سے بڑا نقصان پہنچا اور مرہٹوں کی طاقت ہمیشہ کے لئے بڑھ گئی کیونکہ اس کے بعد علی عادل شاہ ثانی نے جن لوگوں کو سیواجی کے مقابلے کے لئے بھیجا وہ یا تو شکست کھا گئے یا سیواجی نے ان کا اپنے مکر و فریب سے کام کر دیا۔ بالآخر خود بادشاہ کو اس سے مقابلہ کر کے شکست دینی پڑی مگر یہ شکست بھی سیواجی کو ختم نہ کر سکی۔

شرزہ خاں

شرزہ خاں علی عادل شاہ ثانی کے ان خاص سپہ سالاروں میں تھا جنہوں نے اورنگ زیب اعظم کے بڑے لشکروں کے مقابلے میں سرداران مغلیہ سے بڑے معرکتہ الآرا مقابلے کئے اور ہمیشہ مظفر و منصور رہا۔ اس کا نام سید الیاس تھا۔ اس نے شکل بیڑہ اور بیجاپور کے قریب جے سنگھ اور اس کے مددگار سردار سرفراز خاں اور صلابت خاں کو بڑی بڑی شکستیں دیں اور آخرکار مغلوں کو پیچھے ہٹنے اور میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی موت عجیب و غریب طریقے پر واقع ہوئی۔ مغلوں کو شکست دے کر ابھی یہ واپس نہیں ہوا تھا۔ راستے میں تھا اور مغلوں کے اکے دکے حملے ہو رہے تھے۔ اتفاقاً ایک دن ایک چھوٹی سی ٹکڑی نے اس کے کم سن لڑکے کو گھیر لیا۔ بیٹے نے باپ کو پکارا۔ شرزہ خاں اکیلا لپکا اور آناً فاناً دشمن کو مار بھگایا۔ باپ بیٹے واپس ہو رہے تھے کہ یکایک گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ شرزہ خاں زمین پر آرہا اور گرتے ہی فوت ہوگیا۔ جب لشکر میں اس کی مرگ مفاجات کی خبر پہنچی تو ایک کہرام مچ گیا۔ بادشاہ کو ناقابل بیان رنج ہوا۔ اس نے دونوں بیٹوں

سید می وم وسید حبیب کو ان کے باپ کی شائستہ خدمات کے صلے میں شرزہ خاں خطابوں سے سرفراز کیا اور ملازم رکھ لیا۔

سید محمد

ہاشمی بیجاپوری

ہاشمی، علی عادل شاہ ثانی اور نصرتی کا ہم عصر تھا۔ شاہ ہاشم بیجاپوری کا مرید خاص تھا اسی مناسبت سے ہاشمی تخلص رکھا۔ شاہ ہاشم اور ملا ہاشمی دونوں کی تصویریں اس مضمون کے ساتھ شایع ہو رہی ہیں وہ مادرزاد اندھا تھا لیکن شاعری سے فطری لگاؤ رکھتا تھا۔ دکن میں ریختی زبان کی ایجاد کا سہرا ہاشمی کے سر ہے ایک دیوان ریختی کی غزلیات کا مرتب کیا، اور ایک مثنوی یوسف زلیخا "احسن القصص" کے نام سے ۱۰۹۹ء میں لکھی۔ ہاشمی کی زندگی کے حالات کسی تذکرے میں نہیں ملتے البتہ اس کے کلام سے اندرونی شہادتیں کچھ ملتی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ برہان پور کا باشندہ تھا بیجاپور کے ایک رئیس ذوالفقار خاں کی شہرت سن کر وہاں آیا اور اپنے ممدوح سے قصائد کے بدلے بیش گراں بہا انعام حاصل کئے۔ دو تین قصیدے ذوالفقار خاں کی مدح میں ہاشمی نے لکھے ہیں۔ ابھی ہاشمی کے متعلق کافی معلومات فراہم نہ ہوسکے۔ اس کا دیوان ریختی اور مثنوی یوسف زلیخا جو زیر طبع ہیں ان کے مقدمہ کی تکمیل اب ہماری کوشش ہے کہ جس قدر ممکن ہوسکے اس کی زندگی کے متعلق معلومات فراہم کریں۔ علاوہ دیوان اور مثنوی کے ہاشمی بیجاپور کا اعلیٰ پایہ مرثیہ نگار ہے اس کے کئی مرثیے دستیاب ہوے ہیں جن سے اس کی قادر الکلامی اور وسیع النظری کا ثبوت ملتا ہے۔ یہاں ہم دیوان اور مثنوی سے چند شعر نقل کرتے ہیں:۔

غزل ریختی

جھانکو نکو سو پچھن تج دل چھوٹ ہوئے گا ۔۔۔ تجھ خیل میں تمنا چپ سب جگ میں شور ہوئے گا

تجھ کن بھری سندر کی عالم میں ہانک ہوی ہے ۔۔۔ جھانکیگی تس اوپر تو شہرت بھی زور ہوئے گا

انکھیں تو ہور دستیاں دل میں تو بھید کچھ ہے ۔۔۔ باتاں جی ہور کچھ ہیں مقصد بھی ہور ہوئے گا

ہے حسن دہن تمہارا رکھنا جتن مہیں دہن ۔۔۔ نیں تو یو دہن جیرانے کوی ساہو چور ہوئے گا (دیوان ریختی)

عشق

اگر عشق نیں ہے تو چندر کوں نور ۔۔۔ تو کیا واسطے نت یو تپتا ہے سور

اگر عشق نیں ہے تو دریا میں آب ۔۔۔ پلاتا ہے بادل کوں کی بے حساب

اگر عشق نیں ہو تو کی دہر تری ۔۔۔ نوی رت میں کرتی ہے کسوت ہری

اگر عشق نیں ہے تو کی یو بھنور ۔۔۔ پھرے باس لیتا ہر اک گل اوپر

اگر عشق نیں ہے تو کی یو فقیر ۔۔۔ فقیر ہو کے غربت لئے اپنے سیر

مجازی عشق راست ہر ٹھور ہے

حقیقی و لے عشق کچھ ہور ہے (یوسف زلیخا)

میر سعادت علی رضوی

ہاشمی بیجاپوری

شاہ ہاشم علوی بیجاپوری

نظام شاہی خاندان

احمد نظام الملک ۸۹۵ھ تا ۹۱۴ھ

بہمنی سلطنت کا جب شیرازہ بکھر گیا تو سب سے پہلے احمد نظام الملک نے بغاوت کی۔ احمد نظام الملک دکن کے برہمن نژاد امیر حسن بحری کا لڑکا کہلاتا ہے جس کو بعد کے مورخ ایک عجیب وغریب حکایت کے ذریعے محمد شاہ بہمنی کا لڑکا تسلیم کرانے کی کوشش کرتے ہیں یہ بہمنی سلطنت کے شمال مغربی حصے کا مالک بنا اور اپنا صدر مقام جنیر قرار دیا لیکن بعد میں ایک شہر آباد کرکے احمد نگر اس کا نام رکھا۔ اور اسی نام سے اس کی سلطنت موسوم ہوئی۔ احمد نظام الملک نے ۸۹۱ھ میں اپنی آزادی اور خود مختار حکومت کا اعلان کیا اور ۲۲ سال پرشوکت حکومت کرنے کے بعد ۹۱۴ھ میں انتقال کیا۔

برہان نظام شاہ ۹۱۴ھ تا ۹۶۱ھ

باپ کے بعد تخت نشین ہوا۔ اور اپنی سلطنت کی تمدنی ترقی کا باعث بنا اس کے دور میں نظام شاہی حکومت کی وسعت اور تنظیم کا کام ہوا اور اسی بادشاہ کی وجہ سے بہادر شاہ والی گجرات کا دیا ہوا لقب نظام شاہی اس خانوادہ کا لقب ہو گیا۔

سلطان حسین نظام شاہ اول ۹۶۱ھ تا ۹۷۲ھ

باپ کے مرنے کے بعد سریر آرائے حکومت ہوا۔ یہ بہت بڑا سپاہی اور مدبر تھا اس کے زمانے میں سلاطین دکن میں اتحاد ہوا اور اسی کی سرکردگی اور کوشش سے تالی کوٹ میں رام راج کو شکست ہوئی اور نہایت شان اور جبروت کی حکومت کے بعد ۹۷۲ھ میں انتقال کیا۔

مرتضیٰ نظام شاہ۔ ۹۷۲ھ تا ۹۹۶ھ

یہ صغیر سنی میں بادشاہ ہوا۔ اور اپنی مدبر ماں خونزہ ہمایوں کے تحت حکومت کرتا رہا اور ۹۸۰ھ میں ماں کو قید کرکے برسر اقتدار آیا۔ یہ بادشاہ چاند بی بی کا بھائی تھا اس کے دور میں سلطنت کے ابتدائی آثار تنزل شروع ہو گئے تھے ۹۹۶ھ میں کثرت عیاشی کی وجہ سے دیوانہ ہو گیا اور اس کے بیٹے میراں حسین نے اس کو حمام میں بند کر دیا۔

میراں حسین نظام شاہ۔ ۹۹۶ھ

باپ کو قید کرکے تخت پر بیٹھا اور وزیر مرزا خاں کے ہاتھ مارا گیا۔ اس نے صرف نو مہینے حکومت کی۔

اسماعیل نظام شاہ۔ ۹۹۷ھ تا ۹۹۹ھ

یہ امرائے گردلی کے ذریعے تخت پر آیا اور اپنے باپ برہان نظام شاہ کے ہاتھوں تخت سے اتار دیا گیا۔

برہان نظام شاہ ثانی۔ ۹۹۹ھ تا ۱۰۰۳ھ

مغلوں کی طاقت کے ذریعے بیٹے کو معزول کرکے تخت حاصل کیا۔ اور ۱۰۰۳ھ میں عادل شاہیوں سے شکست کھا کر اسی صدمہ میں انتقال کیا۔ اور اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین بڑے بیٹے اسمٰعیل کے بجائے جو مہدوی تھا اپنے چھوٹے بیٹے کو جو اسماعیلیہ مذہب کا پیرو تھا مقرر کیا۔

ابراہیم نظام شاہ - ۱۰۰۳ھ

باپ کے بعد برسرِ حکومت آیا اور ایک ہی سال میں عادل شاہیوں سے لڑتا ہوا ایک سپاہی کے ہاتھ مارا گیا۔

احمد نظام شاہ

یہ شخص ایک دعوے دار سلطنت تھا اور بعض امراء کی کوشش سے تخت نشین ہوا لیکن بعد میں چاند بی بی کے تدبر سے اس کو تخت سے ہٹایا گیا اور بہادر نظام شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔

بہادر نظام شاہ ۱۰۰۴ھ تا ۱۰۰۹ھ

یہ طوائف الملوکی کا دور تھا۔ وزیر اعظم اخلاص خاں حبشی اور چاند بی بی کے ذریعہ برسرِ اقتدار آیا یہ وہ دور تھا جس میں چاند بی بی نے مغلوں سے غیر معمولی معرکے کئے۔

مرتضیٰ نظام شاہ دوم ۱۰۰۹ھ تا ۱۰۳۵ھ

بہادر نظام شاہ کے بعد طوائف الملوکی کی پنچ کئی اور امراء نے مرتضیٰ نظام شاہ کو تخت پر بٹھایا اس دور کو ملک عنبر کا دور کہا جا سکتا ہے، مغلوں کی بڑھتی ہوئی قوت ملک عنبر کی زندگی تک نظام شاہی سلطنت پر چھا نہ سکی۔ ملک عنبر کے بعد کوئی نظام شاہی حکومت کو بچانے والا نہ تھا

برہان نظام شاہ سوم ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۴۱ھ

برہان نظام شاہ نے باپ کے بعد سلطنت حاصل کی اور ۱۰۴۱ھ میں انتقال کیا یہ دورِ تنزل تھا۔

حسین نظام شاہ سوم

یہ احمد نگر کا آخری تاجدار ہے۔ اس کے زمانے میں مغلوں نے احمد نگر پر قبضہ کیا اور شاہ جہاں نے اس کو گوالیار میں قید کر دیا

مرتضیٰ نظام شاہ سوم ۱۰۴۲ھ تا ۱۰۴۵ھ

یہ بادشاہ نظام شاہی سلطنت کے بعد شاہ جی مرہٹے کے ذریعے تین سال تک شاہ گڑھ پر حکومت کرتا رہا اور تین سال کے بعد اپنے خاندان کا خاتم بنا۔

چاند بی بی

دکن کی نامور سلطانہ چاند بی بی حسین نظام شاہ اور خونزہ ہمایوں بیگم کی بیٹی تھی اور اس طرح باپ کی طرف سے نظام شاہی تدبر اور ماں کی طرف سے ترکی تہور اور دلیری ورثے میں پائی تھی۔ یہ ملکہ ۹۵۵ھ میں احمد نگر میں پیدا ہوئی آنکھ کھولتے ہی اس نے تلوار کی جھنکار سنی بہمنی سلطنت کے مختلف شہ پارے آپس میں دست و گریباں تھے اور اس نفاق سے فائدہ اٹھا کر رام راج کے تخت وجیانگر کی شہنشاہیت مسلم راج اور مسلم سلطنتوں پر چھائی جا رہی تھی چودہ برس کی عمر میں چاند سلطانہ اس شطرنج کا مہرہ بنی اور علی عادل شاہ والی بیجاپور کے نکاح میں آ کر دکنی مسلم اتحاد کا باعث بنی کوئی تعجب نہیں کہ تالی کوٹ کی لڑائی میں یہ شاہی دلہن میدانِ کارزار میں ہو اور مسلمانوں کے ناموس کا مرکز بنی رہی ہو۔ یہ چاند سلطانہ کا پہلا دور ہے۔

چاند سلطانہ کی زندگی کا دوسرا دور ۹۷۲ھ سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ وہ دلہن بن کر بیجاپور کے بادشاہ کے دل میں حکمران تھی

علی عادل شاہ خود بڑا بادشاہ تھا اس کی زندگی تک چاند بی بی کو صرف نظری تجربہ سیاست کا اور سلطنت کا حاصل ہوتا رہا یہاں تک کہ ۹۸۸ھ میں چاند سلطانہ کا شوہر علی عادل شاہ بیجاپور کا پانچواں زبردست فرماں روا بریدی غلام کے ہاتھوں شہید ہوا اب چاند سلطانہ بیجاپور میں وہی تدبر اور تنظیمی قوت کا اظہار کرنے لگی جو تاریخ انگلستان میں صرف ملکہ ایلزبتھ کو حاصل تھی، نیا بادشاہ ابراہیم عادل شاہ نو برس کا تھا اور سلطنت چو طرف سے اندرونی سازش اور بیرونی غنیموں سے گھری ہوئی تھی امرائے سلطنت کی باہمی رقابت اور قوت کے ذریعے اس مدبر خاتون نے ابراہیم عادل شاہ کو نہ صرف بچایا بلکہ اس کو تربیت کے ذریعے بیجاپور کا سب سے بڑا فرماں روا بننے کے قابل رکھا۔ اس طرح ۹۸۸ھ سے ۹۹۲ھ تک چاند بی بی بیجاپور کے لئے فرشتۂ رحمت رہی کوئی مورخ جو چاند بی بی کی حقیقی سوانح عمری لکھنے بیٹھے اس دور کو اس کا دور تدبر قرار دے گا۔

جس طرح چاند بی بی بیجاپور خود کی شادی کی وجہہ سے آئی تھی اسی طرح ابراہیم عادل شاہ کی بہن خدیجہ سلطانہ کے ساتھ چاند بی بی کے بھتیجے میراں حسین کو بیاہی گئی تھی پھر احمد نگر واپس لوٹی۔ اس کو پہلے سے بھی زیادہ زبردست سیاسی خدمات انجام دینے پڑے احمد نگر مسلم اقتدار دکن کا سب سے اہم مرکز تھا۔ مغل اس کو کسی نہ کسی طرح اپنے علاقے میں شامل کرنے کی تاک میں لگے ہوئے تھے۔ اور یہ سمجھ جاتے تھے کہ احمد نگر کی تسخیر شاہان دکن کی تسخیر ہے۔ مرتضیٰ نظام شاہ کے انتقال کے بعد جو طوائف الملوکی مچی میراں حسین کے بعد اسمٰعیل تخت پر بیٹھا جس کو [illegible] برہان نظام شاہ دوم نے مغلوں کے اثر سے بے دخل کر دیا۔ اور اس کے چند سال بعد ابراہیم نظام شاہ اور بہادر نظام شاہ یکے بعد دیگرے [illegible] یہ دور احمد نگر کے لئے زیست اور موت کا دور تھا اور چاند بی بی کی زندگی کا حقیقی کارنامہ اسی دور سے متعلق ہے جو کام بیجاپور میں اپنے شوہر اور اس کی اولاد کے لئے اس نے کیا وہی کام اپنے خاندان کے لئے اسے کرنا تھا لیکن یہاں پر اس کے لئے اندرونی فتنے زیادہ تھے۔ اور مغلوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے سابقہ تھا۔ اس دور میں چاند بی بی نے بادشاہ گری کی، بہادر نظام شاہ کے لئے وہ سب کچھ کیا جو بڑے سے بڑا مدبر اور سپہ سالار کر سکتا تھا۔ اندرونی فتنہ کو رفع کیا اور مغلوں کو تا دم زیست اپنے آبا و اجداد کی سلطنت سے دور رکھا۔ اکبری لشکر نے مراد کی سرکردگی میں ۱۰۰۳ھ میں احمد نگر پر یلغار کی چاند بی بی نے اتنی بہادری سے ان کا مقابلہ کیا کہ مغلوں کو مجبوراً صلح کر لینی پڑی۔ یہی وہ معرکہ تھا جس میں سرنگ کے ذریعے پچاس گز قلعہ کی دیوار اڑا دی گئی تھی۔ اور چاند بی بی نے مغلیہ دل بادل کو تلوار کی نوک سے اس وقت تک روک رکھا تھا جب تک دیوار از سر نو تیار نہ ہو گئی تاریخ حرب میں یہ کارنامہ ہمیشہ صفحۂ اول میں رہے گا۔ اس کے بعد مغلوں نے دوسرا حملہ شہزادہ دانیال کی سرکردگی میں کیا۔ اور چار مہینے کے محاصرہ کے بعد چاند بی بی کی مردہ لاش اور دکن کا ایک ویران شہر اس کے ہاتھ آیا ۱۰۰۹ھ میں یہ بہادر سلطانہ ناموس کی حفاظت کے لئے تیزاب کے کنوئیں میں مستور ہو گئی۔

ملک عنبر

ملک عنبر دکن کا مشہور سپہ سالار، مدبر اور بادشاہ گر حبشی ۹۵۵ھ میں پیدا ہوا اس نے ابتدائی تربیت پائی اور دکن کے بازار میں آکر فروخت ہو گیا احمد نگر میں چنگیز خاں کے غلام کی حیثیت سے تربیت حاصل کی اور آقا نے غلام کو اولاد کی طرح پالا آقا کی وفات کے بعد ۹۸۴ھ میں ملک عنبر گولکنڈہ میں لشکر شاہی کا ملازم ہوا پھر بیجاپور جاکر ابراہیم عادل شاہ کے ملازمان میں شریک ہو کر ایک ممتاز عہدہ پر فائز اور ملک عنبر کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ اب اس نے عرب نوایتوں اور حبشیوں کی فوج جمع کرنا شروع کیا اور اس کے شرفا نوازی اور بہادر پروری کی دھوم مچ گئی لیکن بیجاپور کے امراء کے حسد اور حوصلہ شکن فضا سے بیزار ہو کر بیجاپور بھی ۱۰۰۰ھ میں چھوڑنا پڑا کچھ مدت ملک عنبر کی عسرت تنگدستی میں گزری لیکن اس حالت میں بھی فوج فراہم کرتا رہا اور احمد نگر میں ملازمت اختیار کر لی حسین نظام شاہ کی فوج میں اس جیالے ہمت حبشی کے افسانہ نے مغلوں کے مقابلے میں ایک قوت پیدا کر دی تھی۔

ملک عنبر ایک ایسے دور میں سیف و دماغ کے جوہر دکھانے کے لئے دنیا میں آیا جب کہ دکن تباہ ہو رہا تھا بہمنی شہنشاہیت کے شہ پارے آپس میں دست و گریباں تھے اور مغلوں کا بڑھتا ہوا اقبال ان پر عقاب کی طرح چھا رہا تھا احمد نگر فتح دکن کی کنجی تھا جس پر مغلوں کی آنکھ لگی ہوئی تھی۔ ملک عنبر کی جوانی بیجاپور و گولکنڈہ اور احمد نگر کے عروج میں شروع ہوئی اور دکن کی سلطنتوں کے زوال کے ساتھ ساتھ ملک عنبر کی حوصلہ مندیوں نے عروج حاصل کیا اور کم از کم اپنی دانشمندی کی وجہ سے تیس سال تک دکن کو اغیار کی غداری سے بچائے رکھا اس طرح تمام عمر ایک مجاہد کی زندگی بسر کر کے ۱۴ شعبان ۱۰۳۵ھ کو بخار کی وجہ سے اسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔

ملک عنبر میانہ قد حبشی رنگ اور گٹھیلے جسم کا آدمی تھا مغلوں کا لباس اور دکنی دل رکھتا تھا۔ حلیم الطبع، منکسر المزاج وفا شعار ایسا کہ آخری دم تک باوجود بے تاج کا بادشاہ ہونے کے مرتضیٰ نظام شاہ کو بادشاہ مانتا رہا۔ اس کے نوال و نوازش کی دھوم تھی اس کا دربار علاوہ شعراء کے ادیب، علماء، فضلاء، اولیاء اور رشیوں کا مامن تھا۔ میدان جنگ میں شیر ژیاں اور میدان تدبر کا شاطر۔ ایک طرف اہل سیف اور دوسری طرف مصلح، ریفارمر اور تعمیر کار تھا ملک عنبر کے احسانات میں سے سب سے بڑا احسان وہ ہے جو اس نے مرہٹہ قوم پر کیا آج کل کے مرہٹہ مورخ تعصب کی وجہ سے اس کو تسلیم نہ کریں لیکن خاص عربی طرز جنگ اسی کے دم سے ایک طرز نو بن گئی مرہٹوں کو بحیثیت قوم سپاہی بنانے کا کام ملک عنبر نے انجام دیا۔ اسی نے صدیوں کے غلام اور بے بس کسانوں کو نہ صرف مرد میدان بنایا بلکہ صاحب تاج اور سلطنت کر دکھایا۔ یہ جب تک مرہٹے ملک عنبر کی بتائی ہوئی راہ پر گامزن تھے اقبال ان کے ساتھ تھا جس روز انھوں نے برگیری چھوڑ کر میدان سنبھالا تو ان کو پانی پت کی تیسری جنگ کا روز بد دیکھنا پڑا۔

ملک عنبر کا دوسرا کارنامہ مالی انتظام تھا اس مدبر سپاہی نے باوجود تمام عمر میدان جنگ میں بسر کرنے کے اپنی رعایا کی خوشحالی کے لئے بہترین مالی انتظام کیا مالگزاری کی تنظیم نو، پیمائش کا بندوبست اور محاصل کے خوش ستانی نے رعایا کو مطمئن اور فارغ البال کر دیا تھا اس نے انتظام سلطنت کے لئے ملکی زبان کو دفاتر کے لیے رائج کیا

بحیثیت تعمیر کار اس کی ہستی لافانی ہے کھڑکی ایک غیر آباد اور پہاڑی قریہ کو اس نے بارونق اور متمدن شہر بنا دیا گو اس شہر کو ایک مرتبہ جہانگیر کی فوجوں نے زمین کے برابر بنا دیا تھا تاہم ملک عنبر نے چند دنوں میں اس ویرانہ کو گلزار میں تبدیل کر دیا

سید محمد اکبر وفا قانی

ملک عنبر سپہ سالار احمد نگر

ملک عنبر کا مقبرہ

گولکنڈے کا نیا قلعہ

(قلعہ گولکنڈہ کے پہلو میں سلطان عبداللہ قطب شاہ نے جو نیا قلعہ بنایا تھا اس کی ایک جھلک)

اب بھی رونق پا رہا ہوں تیرے ویرانہ میں میں
سن رہا ہوں کچھ سکوتِ شب کے افسانہ میں میں

موجزن ہے تشنگی حوضوں میں پانی کیلئے
ابر جن پر چھا رہا ہے دُرفشانی کیلئے

ہیں نقوشِ جستجو تیرے شکستہ بام و در
جن میں کھو جاتی ہے دل کی دھڑکنیں لے کر نظر

تیرے سائے میں ہے اب تک بھی جھلک تلوار کی
تیرے خود رو دشت میں فرحت سی ہے گلزار کی

تیرا ہر پربت ہے اپنی عظمتوں کا رازداں
تیری خاموشی کے دامن پر ہیں نغموں کے نشاں

نوحہ خواں ہے پرسکوں تالاب کی سرسبز دوب
شام کو جس کے کنارے مہر ہوتا ہے غروب

یہ خموشی میں ہے کیفیت کہاں فریاد میں؟
یہ ہے مسجد وہ ہے خدا کا گھر خدا کی یاد میں

لمس ماضی دیکھتا ہوں میں تری تصویر میں
حسن کاری کا تخیل ہے تری تعمیر میں

پیکر مردہ میں تیرے زندگی کی آن ہے
اب بھی محلوں کے کھنڈر کی جاودانی شان ہے

تھی تری بیداری تقدیر سونے کیلئے
تو یوں ہی چھوڑا گیا برباد ہونے کیلئے

آج کر دوں گا نمایاں بے حسی کے داغ کو
اپنے دل کے خون سے سینچوں گا تیرے باغ کو

آج میں تعمیر مانگوں گا فسونِ خواب سے
تیرے حوضوں کو بھروں گا آنسوؤں کے آب سے

ڈوب جائیگی اثر میں آج آہِ آتشیں
ثبت کر دوں گا تری مسجد میں میں نقشِ جبیں

تیرے کھنڈروں میں سکونِ زندگانی پاؤں گا
تیری خاموشی میں ماضی کے ترانے گاؤں گا

میکش

گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت

قطب شاہی خاندان کی حکومت سرزمین حیدرآباد پر تقریباً دو سو سال یعنی ۹۱۸ھ سے ۱۰۹۸ھ تک رہی اور اس عرصہ میں ان حکمرانوں نے یہاں تہذیب و تمدن، تمول و ثروت، علم و فضل، اور شعر و سخن کی ایک ایسی فضا پیدا کردی جس پر دکن کی تاریخ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ ان بادشاہوں نے شیعہ و سنی اور مسلمان و ہندو غرض ہر مذہب و ملت کے باشندوں میں ایک مشترک کلچر کے پیدا کرنے میں یہاں تک کامیابی حاصل کی تھی کہ دوسروں کے لئے اس ملک کے رہنے والوں کا باہمی اتحاد اور یگانگت باعث رشک تھی اسی موانست و مفاہمت کی خاطر انھوں نے اردو کی سرپرستی کی اور اس زبان میں ایسی ایسی بلند پایہ کتابیں لکھیں اور لکھوائیں جن پر اردو ہمیشہ نازاں رہے گی۔

یوں تو قطب شاہی سلطنت کے بانی سلطان قلی کا تعلق اس سرزمین سے ۸۹۱ھ میں پیدا ہو چکا تھا جب وہ تلنگانہ کا صوبہ دار بنا دیا گیا تھا لیکن جب سنہ ۹۰۱ھ میں گولکنڈہ اور اس کے اطراف و اکناف کا علاقہ اس کو بطور جاگیر کے دیا گیا تو اس نے اس کا نام محمد نگر رکھا اور قدیم قلعہ کو مستحکم کر کے اس میں متعدد محلات تعمیر کئے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اپنے علاقہ کو وسیع کرنا شروع کیا۔ چنانچہ بیس بائیس سال کے عرصہ میں پانگل، کھمن پیٹھ، کویل کنڈہ، اور بلگندل وغیرہ اس کے قبضہ میں آگئے۔ سنہ ۹۲۴ھ میں اس نے قلعہ میں بالاحصار کے دامن میں مشہور مسجد صفا بنائی جس میں آخر کار سنہ ۹۵۰ھ میں ایک نوجوان ترک بیگ نے جمشید کے اشارے سے سلطان قلی قطب شاہ کو ننانوے سال کی عمر میں عصر کی نماز پڑھتے وقت شہید کیا گیا۔ اس نے دوسرے صوبہ داروں کی طرح بہمنی بادشاہ کے خلاف علم بغاوت نہیں بلند کیا بلکہ آخر تک ان کی مدد کرتا رہا اور جب بریدیوں نے بہمنیوں پر پوری طرح قبضہ کرلیا تو مجبوراً سلطان قلی کو بھی اپنی بادشاہت کا اعلان کرنا پڑا۔

سلطان قلی کو فن تعمیر کا خاص ذوق تھا۔ اس نے قدیم قلعہ (موجودہ بالاحصار) کے اطراف ایک عالیشان شہر بنایا۔ اور دراصل وہی اس طرز تعمیر کا بھی بانی ہے جو قطب شاہی کہلاتا ہے اور ایرانی، ہندو، اور پٹھان طرز ہائے تعمیر کے امتزاج سے بنا ہے اس کی وفات کے وقت اس کی سلطنت شمال میں دریائے گوداوری، مشرق میں اڑیسہ اور ساحل سمندر اور جنوب میں دریائے کرشنا تک پھیل چکی تھی۔

۲ جمشید قلی قطب شاہ تخت نشین ہوتے ہی اپنی سلطنت کے استحکام و وسعت میں مصروف ہو گیا۔ اگرچہ اس کا سات سال کا مختصر سا عہد حکومت زیادہ تر جنگ و جدل سخت گیریوں اور پریشانیوں میں گذر گیا۔ لیکن اس نے نارائن کھیڑ، احسن آباد اور میدک پر قبضہ کرکے قطب شاہی سلطنت میں اضافہ کیا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ لیکن اس کے عہد میں گولکنڈہ اردو شعر و سخن کا مرکز نہ بن سکا۔ اس کی وفات ۹۵۷ھ پر اس کے کمسن لڑکے سبحان قلی کو تخت نشین کیا گیا لیکن چند ماہ بعد ہی اس کا دوسرا بھائی ابراہیم قلی کوبل کنڈہ کے نایک واڑیوں کی مدد سے قلعہ گولکنڈہ میں داخل ہوا۔ اور اپنے بھائی کے مظالم کی تلافی کرنے میں مصروف ہو گیا۔

۳ سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ کی شخصیت کو دکن کی سیاست میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اسی کے زمانہ میں ۹۷۲ھ میں تالی کوٹہ کی مشہور لڑائی ہوئی جس میں وجیا نگر کی عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی گولکنڈہ کو مال و دولت اور سیاسی حیثیت سے کافی اہمیت حاصل ہو گئی۔ بعد میں ابراہیم قطب شاہ نے راجمندری، قاسم کوٹہ اور کھمم میٹھ وغیرہ کے علاقے بھی فتح کئے۔ اس نے ۹۸۸ھ میں انتقال کیا۔ اس کو بھی اپنے باپ کی طرح تعمیرات کا شوق تھا۔ چنانچہ بالاحصار کی سیڑھیوں کی مسجد، موسیٰ ندی کا پہلا پل، حسین ساگر بدویل کا تالاب، ابراہیم باغ، باغ گلشن، اور قصبہ ابراہیم پٹن اس کی تعمیری یادگار ہیں۔ اس کے عہد میں گولکنڈہ اردو زبان کا مرکز بن گیا۔ اور فیروز، محمود، احمد، اور وجہی جیسے بلند پایہ شعراء

اُسی کی قدردانی اردو کی وجہ سے متعدد بیش بہا کتابیں اس زبان میں تصنیف کر سکے ۔

۴ ابراہیم کے بعد اس کا تیسرا لڑکا سلطان محمد قلی تخت نشین ہوا جس نے ۹۹۱ھ میں اپنی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر بھاگ نگر کی بنا ڈالی ۔ اور عالیشان محلات، حمام، مساجد، مدارس اور بازار وغیرہ تعمیر کیے ۔ بھاگ نگر کے اطراف واکناف بیس میل تک باغات بنائے گئے ۔ نرکھوڑہ، ابراہیم پٹن، بھونگیر، اور پٹن چیرو اس شہر کے حدود پر واقع تھے ۔ سترہ برس کے بعد غالباً اپنی اکلوتی لڑکی شہزادی حیات بخشی بیگم کی شادی کے موقعہ پر بادشاہ نے اس پر فضا بستی بھاگ نگر کا نام حیدرآباد قرار دیا ۔

محمد قلی قطب شاہ نے ۱۰۰۲ھ میں سکھر، اور ندیال وغیرہ فتح کیا ۔ اس کے زمانہ میں گولکنڈہ ہر لحاظ سے معراج کمال کو پہنچ گیا ۔ شاہ عباس صفوی کا سفیر اغزلو سلطان اسی عہد میں گولکنڈہ آیا تھا ۔ علم وفضل اور شعر و سخن کے لحاظ سے بھی یہ دور دکن کا عہد زرین سمجھا جاتا ہے ۔ اسی دور میں دہنے قطب شاہی سلطنت اور خاص کر گولکنڈہ اور حیدرآباد میں معراج کمال حاصل کیا اور اس سرزمین نے تمدن و معاشرت کے وہ تمام منازل طے کر لیے جو کسی ملک کو متمدن اور شائستہ ثابت کرتے ہیں ۔ اسی زمانہ میں گولکنڈہ مختلف اقطاع عالم کے سیاحوں اور علما و فضلا کا مرجع و مامن بھی بن گیا تھا ۔

سلطان محمد قلی نے جنگ و جدل سے زیادہ امن و امان، اور ملک کی وسعت سے زیادہ اہل ملک کی خوش حالی اور رعایا کی تعلیمی ترقی پر زور دیا ۔ وہ خود بہت بڑا شاعر اور قدردان سخن تھا ۔ اس نے تین زبانوں فارسی اردو اور تلنگی میں اپنے دیوان مرتب کیے تھے ۔ اردو کلام نہایت اعلیٰ پایہ ہے ۔ اس کا دربار شاعروں سے معمور تھا ۔

حیدرآباد کی اکثر عمارتیں اسی صاحب ذوق بادشاہ کی یادگار ہیں ۔ ان میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں :-

چار مینار، چار کمان، چار سو کا حوض، دارالشفا، جامع مسجد، داد محل، ندی محل، نبات گھاٹ، باغ دلکشا، خداداد محل (جو ہفت منزلہ تھا اور ہر منزل کا نام جدا تھا مثلاً الہٰی محل، محمدی محل، حیدری محل، حسینی محل، حسنی محل، جعفری محل، اور موسوی محل) باغ محمد شاہی، کوہ طور، جنان منزل اور بادشاہی عاشور خانہ وغیرہ ۔

۵ محمد قلی قطب شاہ کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد سلطان مرزا سلطان محمد قطب شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا ۔ اس کی شادی مع بہت شان و شوکت سے سلطان محمد قلی کے ساتھ ۱۰۲۱ھ میں نہایت تزک و احتشام سے ہوئی تھی ۔ اس کا عہد حکومت بھی امن و امان اور خوش حالی میں گذرا ۔ اس کے دور میں شہزادہ خرم نے جو بعد میں شاہجہاں کے لقب سے جہانگیر کا جانشین ہوا باپ سے بغاوت کرکے اور اس کی فوجوں سے ہزیمت پاکر قطب شاہی سلطنت میں پناہ لی تھی ۔ سلطان محمد نے اس کے ساتھ ہمدردی کی اور ایسے وقت میں اس کی امداد کی جب کہ وہ بالکل محتاج تھا اور اکثر رفیقوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا ۔

سلطان محمد قطب شاہ نے اپنے چچا کی قدردانی شعر و سخن کو جاری رکھا ۔ لیکن وہ شاعر ہونے کے علاوہ عالم و فاضل بھی تھا ۔ اس نے شعر و سخن اور علم و فضل کے ساتھ زہد و تقویٰ اور اخلاق و آداب کا بھی خاص خیال رکھا ۔ اسی کے عہد میں اس خاندان کی مشہور تاریخ سلطان محمد قطب شاہی لکھی گئی ۔ اس کے دور میں بھی دکن کے حکمرانوں کے علاوہ جہانگیر اور شاہ عباس صفوی کے سفرا گولکنڈہ آئے تھے ۔ اس کے عہد کے اردو شاعروں میں وجہی کے علاوہ غواصی اور ابن نشاطی کے نام خاص کر قابل ذکر ہیں ۔

یہ عجیب بات ہے کہ سلطان محمد کو بھی اپنے اجداد کی طرح فن تعمیر سے خاص شغف تھا۔ اس نے قلعہ محمد نگر گولکنڈہ کے مقابل میں حیدرآباد کے مشرقی جانب چھ میل کے فاصلہ پر ایک قلعہ سلطان نگر کی سنہ ۱۰۳۲ھ میں بنا ڈالی لیکن اس کا بہت جلد انتقال ہو گیا اور وہ قلعہ ناتمام رہا۔ اس کے علاوہ اسی سلطان نے مکہ مسجد، محل سلطان شاہی، اور گوشہ محل کی بھی بنا ڈالی تھی مگر اس کا کوئی کام اس کی زندگی میں تکمیل نہ پا سکا۔ اس کی جوانمرگی نے اس کو ہر طرح حرماں نصیب رکھا۔ اگر وہ چند اور سال زندہ رہ جاتا تو گولکنڈہ کی سلطنت اس قدر جلد زوال پذیر نہ ہونے پاتی۔

٦ سلطان محمد کے بعد اس کا اکلوتا لڑکا عبداللہ مرزا سنہ ۱۰۳۵ھ میں بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور بادشاہ کی یہ کم عمری اور ناتجربہ کاری قطب شاہی سلطنت کی کمزوری کا باعث ہوئی۔ سلطان عبداللہ کی کمزوریوں سے سب سے زیادہ محمد سعید میر جملہ نے فائدہ اٹھایا۔ آخر کار جب بادشاہ نے اس سرکش کا استیصال کرنا چاہا تو اس نے شہزادہ اورنگ زیب کے یہاں پناہ ملی اور قطب شاہی سلطنت اور اس کے حکمران کی کمزوریوں سے غنیم کو واقف کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گولکنڈہ کی آزادی قائم نہ رہ سکی۔ اور اس کی عظمت و شوکت کا آفتاب غروب ہونے لگا۔

ان سیاسی پریشانیوں کے علاوہ سلطان عبداللہ کے عہد میں حیدرآباد کو ایک تباہ کن قحط اور پھر ایک زبردست طغیانی رودِ موسیٰ کی وجہ سے بھی سخت صدمے اٹھانے پڑے۔ لیکن ان سب صدموں سے بڑھکر اہل حیدرآباد اب پریشانی اور ذلت سے متاثر ہوئے جو سنہ ۱۰۶۶ھ میں میر جملہ کی وجہ سے اورنگ زیب کے حملہ کی شکل میں نمودار ہوئی۔ اس وقت مغلوں نے لوٹ مار کے سلسلہ میں حیدرآباد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور تمام شہر کو تباہ کر کے چھوڑا۔

غرض عبداللہ قطب شاہ کی زندگی پریشانیوں اور کشمکشوں میں گذر گئی۔ وہ آخر دم تک اولاد نرینہ کا متمنی رہا۔ اور اسی یاس و امید میں ایک پوری نصف صدی گذار دی۔ پچاس سال کی طویل حکومت کے بعد سلطان عبداللہ نے سنہ ۱۰۸۳ھ میں انتقال کیا اور در اصل اس کے ساتھ ہی قطب شاہی حکمرانوں کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ وہ بھی اردو زبان کا ایک اچھا شاعر تھا اس کے عہد میں بھی علم و فضل اور شعرا و شاعری کی قدردانی جاری رہی فارسی کی مشہور فرہنگ برہانِ قاطع اور اردو کی مشہور کتابیں سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ، پھول بن، اور ماہ پیکر وغیرہ۔ اسی دور کی یادگار ہیں۔

۷ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے بعد اس کا چھوٹا داماد ابوالحسن تانا شاہ تخت نشین ہوا وہ چودہ برس تک قطب شاہوں کی اس امانت یعنی سلطنتِ گولکنڈہ کو دشمنوں سے بچاتا رہا۔ وہ نہایت دور اندیش اور قلندر منش حکمران تھا۔ اس نے قلیل عرصہ میں قطب شاہی سلطنت کے ان تمام کل پرزوں کو درست کر لیا جو سلطان عبداللہ کے پچاس سال کے طویل عہد حکومت میں بالکل کمزور اور منتشر ہو گئے تھے۔ اگر شہنشاہ اورنگ زیب جیسے طاقتور دشمن سے مقابلہ نہ ہوتا اور تمام ہندوستان کی فوجیں اس کے مقابلہ کے لئے جمع نہ ہو جاتیں تو وہ قطب شاہوں کی اس امانت کو اپنی اولاد تک نہایت مستحکم اور طاقتور حالت میں منتقل کر سکتا۔ اس کے عہد میں بھی حیدرآباد اردو شاعروں اور انشا پردازوں کا مرکز بنا رہا۔ طبعی اور غلام علی جیسے بلند مرتبہ شاعر اس وقت بھی موجود تھے۔ جنھوں نے وجہی و غواصی کے خدمات شعر و سخن کو بوجہِ احسن جاری رکھا۔

سلطان ابوالحسن قطب شاہ نے جس خوبی اور مردانگی سے مغلوں کا مقابلہ کیا اور اثنائے جنگ میں اس کا برتاؤ جیسا شریفانہ اور بہادرانہ رہا اس کے تذکرے خاص و عام کی زبان پر اب تک جاری ہیں اس نے قطب شاہی افواج کی اخلاقی حالت اس قدر درست کر دی تھی کہ دشمن بھی اعتراف کرتے تھے۔ اگر اورنگ زیب کا تدبر اور میر جملہ کے جانشین غدار قطب شاہی امرا کا مکر و فریب کارگر نہ ہوتا تو شاید ہی گولکنڈہ فتح ہو سکتا۔

(ماخوذ از سیر گولکنڈہ)

سید محی الدین قادری زور

سلطان قلی قطب شاہ
بانی گولکنڈہ
۹۱۶ھ تا ۹۵۰ھ

جمشید قلی قطب شاہ
۹۵۰ھ تا ۹۵۷ھ

سلطان قلی قطب شاہ

(۹۲۴ھ تا ۹۵۰ھ)

سلطان قلی قطب شاہ سلطنت گولکنڈہ کا بانی ہے۔ وہ ترکستان کے ایک بہت بڑے اور مشہور حکمران قبیلے قراقوینلو کا رکن تھا۔ وہ دو مرتبہ دکن آیا تھا۔
اس کے دکن آنے کا سبب خاندان شاہی کی تباہی اور قبیلۂ آق قوینلو کا ترکستان پر تسلط ہے۔ وہ اپنے چچا اللہ قلی کے ساتھ قیمتی تحفے وغیرہ لے کر ہندوستان آیا تھا۔
سلطان قلی ترکستان سے سیدھا دکن آیا۔ یہ محمود شاہ بہمنی کا عہد حکومت تھا جبکہ بیدر تمام ممالک عجم کا مرجع بن گیا تھا۔ ان کے خاندانی حالات اور وجاہت کو دیکھ کر بہمنی دربار نے ان کی بہت آؤ بھگت کی۔ سلطان قلی اپنے چچا کے ساتھ جب پہلی مرتبہ دکن آیا تو دونوں کے لئے تا قیام وظیفہ قائم رکھا گیا تھا۔
دوسری مرتبہ آیا تو بہت سی صعوبتیں ہوئیں اور وطن کو لوٹ جانے کے لئے مجبور کیا گیا۔ یہی اسباب ہیں جنکی وجہ سے سلطان قلی دربار دکن سے بہت متاثر ہوا تھا۔
چند دنوں کے بعد ترکستان کے حاکم امیر یعقوب کے مرنے کی خبر آئی اور یہ ہمدان کے شاہی خاندان کے لئے اچھا موقع تھا۔ اللہ قلی بیگ نے بادشاہ سے مراجعت کی اجازت چاہی۔ اللہ قلی کے اصرار پر اس کو تو اجازت مل گئی لیکن بادشاہ نے کہا کہ "اللہ قلی بیگ اگر تو می روی مختاری مگر سلطان قلی بابے را بہ ہیچ وجہ رخصت انصراف نمی دہم"۔ اس کے علاوہ خود سلطان قلی بھی واپس نہیں جانا چاہتا تھا اس لئے اللہ قلی کو مجبوراً تنہا لوٹنا پڑا۔ اور سلطان قلی دکن میں رہ گیا۔

سلطان قلی کی استقامت سے محمود شاہ بہت خوش تھا۔ اس کو اپنے مقرب درباریوں میں شریک کر لیا۔ اس کی ترقی کا بڑا سبب اس کی ذاتی قابلیت تھی۔ شکار کے مشہور واقعہ کے بعد اس کو ایک سو پچاس عربی و ترکی گھوڑے مع ساز و سامان عطا ہوئے اور خلعت عنایت کی گئی اور اس کے اخراجات کے لئے کوڈنگل اور اس کے مضافات دئے گئے اور خواص خاں خطاب سے سرفراز ہوا۔ سلطان قلی علم حساب اچھا جانتا تھا اور خوش خط بھی تھا اسی لئے بادشاہ نے اس کو شاہی محلات کا محاسب بنایا۔ اس کی بڑی قابلیت کا اظہار تلنگانہ کے پرگنوں میں جو باغیاں و خود اپنی خواہش سے ڈاکوؤں کی سرکوبی اور ادائی مالگزاری کے لئے رعایا کو پابند کرنے گیا تھا۔ چونکہ اس میں علمی اور فوجی دونوں قابلیتیں تھیں، اس کو ہم عصروں میں صاحب السیف والقلم کہا جاتا تھا۔

اس کے بعد سلطان قلی کی قابلیت اس وقت ظاہر ہوئی جبکہ ۸۹۶ھ میں ملک بیدر نے باہر والوں سے انتقام لینے کے لئے قلعہ پر حملہ کر دیا تھا۔ خود بادشاہ کی جان سخت خطرے میں تھی۔ قلعہ دار حسن علی سبزواری اور سید مرزا مشہدی کے ساتھ سلطان قلی بھی مع دس ہزار سپاہ جوانوں کے موجود تھا۔ یہاں سلطان قلی کی سچی وفاشعاری اس کی غیر معمولی ترقی کا باعث ہوئی چنانچہ بادشاہ نے خوش ہو کر اس کو قطب الملک کا خطاب دیا تھا۔
اس کے تین سال بعد ۸۹۹ھ میں جنوبی ساحل کی بغاوت سلطان قلی کے لئے مزید ترقی کا باعث ہوئی۔ یعنی وہ تمام ممالک تلنگانہ کا صوبہ دار بن گیا۔ بہمنی امیر بہادر گیلانی کی سرکوبی میں اس نے بڑا حصہ لیا۔ جب بادشاہ جنوبی ساحل کی مہم سے فارغ ہو کر بیدر آیا تو قطب الملک سلطان قلی کو تلنگانہ کا صوبہ دار بنا دیا۔ اور اس کی قدیم جاگیر میں گولکنڈہ اور ورنگل کا اضافہ کیا۔
دکن کے سیاسی انتشار نے بھی سلطان قلی کی مدد کی۔ اسی انتشار میں وہ ترقی کرکے گولکنڈہ کی خودمختار سلطنت قائم کر سکا۔ دکن میں ملکی اور غیر ملکی امراء کی کشمکش اور حکومت کی کمزوریوں سے جب بہمنی سلطنت کا دسویں صدی ہجری کے اوائل میں خاتمہ ہوا اور اس کے حصے بخرے ہونے لگے تو بیجاپور، احمد نگر،

اور برار کے ساتھ گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت بھی قائم ہوگئی۔

۹۲۴ھ میں سلطان محمود کے انتقال کے بعد وہ خود مختار ہوا اور اس کے بعد اس نے گولکنڈہ کو پائے تخت بنایا قلعہ او شہر کی تعمیر کی۔ فوجی نقطۂ نظر سے گولکنڈہ نہایت موزوں سمجھا گیا۔ اپنے مرکز کے استحکام کے بعد اس نے مشرقی تلنگانہ کے مختلف صوبوں پر وار کرنے شروع کئے تقریباً ۲۰ سال کے دوران میں ساٹھ ستر قلعے اورحصار فتح کئے۔ اور سلطنت کو ونگل کی سرحد سے بندرگاہ مچھلی پٹم تک پہنچا دیا۔

۹۵۰ھ اواخر جمادی الاول میں اس کے بیٹے جمشید نے تخت سلطنت کی ہوس میں اسے قتل کروایا۔ اس نے تقریباً پچاس سال دکن میں حکومت کی۔ اگر اس کا ابتدائی زمانہ بھی شامل کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے تقریباً ساٹھ سال سیاست دکن کی رہنمائی کی۔ اسی مدت میں اس نے جنوبی ہند کے تمدن و سیاست میں ایک بڑا تغیر پیدا کیا تھا۔ یہاں کی منتشر آبادیوں کو ایک رشتہ میں منسلک کرکے اس ملک کی حاظ خواہ شیرازہ بندی کردی تھی اور باضابطہ نظم و نسق سے یہاں امن و امان قائم کر دیا تھا۔

جمشید قطب شاہ (۹۵۰ھ تا ۹۵۷ھ)

سلطان قلی قطب شاہ نے [illegible] عہد حکومت کے بعد ۹۹ سال کی عمر [illegible] انتقال کیا تھا۔ گولکنڈہ [illegible] سلطنت کو مستحکم حالت میں چھوڑ گیا تھا۔ اس کے ۶ بیٹے تھے۔ فرزند اکبر حیدر قلی جو جانشینی کے لئے نامزد ہو چکا تھا باپ کی زندگی میں [illegible]۔ اس کے بعد سلطان قلی قطب شاہ نے اپنے دوسرے بیٹے قطب الدین کو ولیعہد بنایا لیکن اس کے مقابلہ میں اس کے دوسرے بھائی جمشید قلی، عبدالکریم اور دولت قلی بہت تیز طبیعت اور حوصلہ مند تھے۔ چھوٹا بیٹا ابراہیم قطب دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ لائق تھا۔ عبدالکریم باپ کی زندگی ہی میں بغاوت کی پاداش میں مارا گیا۔ اور جمشید اور دولت بھی نظر احتیاط قید رکھے گئے تھے، لیکن جمشید قلی جو گولکنڈہ ہی میں مقید تھا اپنے لئے قید میں سے راستہ صاف کرنے لگا اور سازش کی اور ایک شخص میر محمود ہمدانی کے ذریعہ اپنے باپ کو قتل کروایا۔ باپ کے مرنے کے بعد جمشید قید سے باہر نکلا اور اپنے ہمدردوں کی مدد سے سلطنت کے سیاہ و سفید اپنے ہاتھ کرلیے۔ قطب الدین ولیعہد سلطنت اندھا کر دیا گیا۔

۹۵۰ھ میں جمشید قطب شاہ کی تخت نشینی عمل میں آئی اور ۹۵۷ھ تک سات سال اس نے حکومت کی۔ اگرچہ تخت نشینی کے بعد جمشید نے رعایا کو خوش کرنے کی کوشش کی اور انھیں مختلف انعامات سے سرفراز کیا لیکن راعی و رعایا میں کچھ خوشگوار تعلقات نہ پیدا ہو سکے۔ پہلے تو اس کے کرتوت ہی اس کی بدنامی کے لئے کافی تھے پھر تخت نشینی کے بعد جبکہ اس کی عمر ۰۰ سال کی تھی، طبیعت کی ترشی اور تند مزاجی نے اس کے بہت سے مخالف پیدا کر دئے۔ جمشید کا چھوٹا بھائی ابراہیم جو دیورکنڈہ سے بھاگ کر ملک برید کے پاس بیدر پہنچ گیا تھا برید کی امداد کے ساتھ گولکنڈہ کی دیواروں تک پہنچ گیا۔ اگرچہ یہ حملہ برہان نظام شاہ والی احمد نگر کی تائید سے رفع ہوگیا تھا لیکن ملک برید اس حملہ کے بعد سے گولکنڈہ کی اندرونی سیاسی فضا اور جمشید کی کمزوریوں سے واقف ہوگیا۔ بیدر کی بریدشاہی سلطنت بہت مختصر تھی لیکن اس زمانہ میں برید دکن کی لومڑی کہلاتے تھے۔ وہ آپس کے جوڑ توڑ میں بہت مشاق تھے کبھی بیجاپور کا ساتھ دیا تو کبھی احمد نگر کا۔ ہر حیلہ و بہانہ سے ان سلطنتوں کو لڑوایا کرتے تھے تاکہ اس طرح سے ان کا فائدہ ہو جائے۔ چنانچہ جمشید کے زمانے میں بھی لڑائیاں بہت کم ہوئی ہیں۔

برہان نظام شاہ نے جمشید قلی قطب شاہ سے زیادہ دوستی بڑھائی۔ شولاپور پر احمدنگر نے حملہ کیا تو عماد الملک اور جمشید دونوں احمدنگر کے ساتھ شریک تھے۔ لیکن ابراہیم عادل شاہ کی تائید پر برید کی فوجیں تھیں۔ کہتے ہیں کہ اس موقع پر جمشید ہی نے بڑا کام کیا۔ اس کے آگے بڑھنے سے ابراہیم اور برید میدان چھوڑ کر بھاگ گئے اور جمشید نے برید کا بیدر کی دیواروں تک تعاقب کیا۔

اس شکست کے بعد برید خاموش کیسے بیٹھ سکتا تھا۔ انتقام لینے کے لئے برید نے غالباً ۹۴۲ھ میں گولکنڈہ پر حملہ کر دیا۔ لیکن جمشید نے بڑی ہوشیاری کی۔ تھوڑی سی فوج [illegible] بھیج کر پیچھے سے برید پر حملہ کر بیٹھا۔ برید کی فوجیں لوٹ گئیں اور دونوں کا مقابلہ ہوا۔ یہاں بھی گولکنڈہ کی فتح ہوئی۔ برید کا جذبۂ انتقام اس کی شکستوں سے اور بڑھ رہا تھا۔ اب اس نے چوتھی مرتبہ ابراہیم عادل شاہ بیجاپور کی امداد سے جمشید پر حملہ کیا۔ کئی دن لڑائی ہوئی مگر اس مرتبہ بھی جمشید ہی کے سر فتح کا سہرا رہا۔

اس کے بعد جمشید نے ہمیشہ کے لئے برید کا خاتمہ چاہا۔ اس نے دکن کی تمام دوسری ریاستوں کو ہموار کر کے برید پر متفقہ حملہ کیا۔ بیجاپور بھی جو اب تک برید کا دوست تھا اس اتحاد میں شریک ہو گیا۔ چنانچہ جب برید ہار مان کر بیجاپور بھاگا تو بجائے امن دینے کے ابراہیم نے اسے گرفتار کر لیا۔ لیکن دکن کی سلطنتوں میں کچھ ایسی رقابت تھی کہ [illegible] لیجا کر صحیح سلامت چھوڑ دیا۔

بیدر سے واپسی کے بعد جمشید نے تین سال آرام سے گزارے۔ لیکن یہ کچھ زیادہ دن تک آرام نہ لے سکا۔ وہ بڑے سخت مرض میں مبتلا ہو گیا۔ فرشتہ اسے دق بتاتا ہے لیکن تاریخ قطب شاہی کے الفاظ میں یہ مرض سرطان تھا جس کے صدمہ سے بالآخر ۹۵۰ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے مدت سات سال حکومت کی۔ اس کو سلطان قلی قطب شاہ کے قریب دفن کیا گیا۔

انفرادی برائیوں کے لحاظ سے دیکھیں تو جو جمشید سے سرزد ہوئی تھیں اس لئے کوئی اوصاف روشنی میں نہ آ سکے۔ لیکن اس کی برائیوں کو قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اس میں بہت سے اوصاف ایسے بھی ملتے ہیں جو ماننے کے قابل ہیں۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے جمشید قطب شاہ ہندوستان کے اچھے حکمرانوں میں سے تھا۔ دکن کی سیاست پر اس کی وسیع نظر تھی۔ سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے وہ ہمیشہ کامیاب ہتھکنڈے اختیار کرتا تھا۔ چنانچہ برید [illegible] اتحاد بیجاپور سے توڑا گیا تھا۔ اس کی فوجی تنظیم نہایت اچھی تھی۔ وہ خود جری سپاہی تھا اور فوج میں بذات خود حصہ لیتا تھا۔ اس کی دلیری اور جرات ہی کا نتیجہ تھا کہ سوائے جنگ [illegible] کے جہاں عین الملک کے بیٹے کی غفلت سے کام خراب ہو گیا تھا گولکنڈہ کی فوج کو کبھی شکست نہیں ہوئی اور سلاطین دکن ہمیشہ اس کی امداد کے طالب ہوتے تھے۔ وہ شجاعت کے ساتھ خودداری کا جوہر بھی اپنے اندر رکھتا تھا۔ ان اوصاف کے ساتھ جمشید میں علمی قابلیت بھی تھی۔ وہ اچھا شاعر تھا بعض دفعہ اس نے فی البدیہہ شعر کہے تھے۔ اس نے فرصت کے زمانوں میں بہت سے قصیدے اور غزلیں بھی لکھی تھیں۔

عبدالحفیظ صدیقی

ابراہیم قلی قطب شاہ

سنہ ۹۵۷ھ تا سنہ ۹۸۸ھ

جمشید قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد تخت گولکنڈہ کے لئے جھگڑے ہو گئے۔ جمشید کا صغیر سن بیٹا سبحان قلی تخت پر بٹھا تو دیا گیا لیکن دو زبردست حریف اٹھ کھڑے ہوئے۔ دولت قلی نے کوہیر میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور ابراہیم قلی بیجانگر سے اس تخت کے لئے واپس ہوا۔ دولت قلی کو کسی نہ کسی طرح مقید کر لیا گیا پر ابراہیم قلی کے سامنے کسی کی پیش نہ گئی اور سنہ ۹۵۷ھ میں تخت گولکنڈہ ابراہیم قلی قطب شاہ سے زینت پایا۔ ابراہیم قلی قطب شاہ بڑا مدبر اور ذہین بادشاہ تھا۔ اس نے مصطفیٰ خان کو اپنا وزیر مقرر کیا اور اپنی بہن اس سے منسوب کر دی۔

سنہ ۹۶۰ھ میں حسین نظام شاہ اور ابراہیم قطب شاہ نے متحد ہو کر گلبرگہ کا محاصرہ کر لیا لیکن رام راج والی بیجانگر کی کمک نے محاصرہ اٹھانے پر مجبور کیا۔

سنہ ۹۶۶ھ میں علی عادل، رام راج اور ابراہیم قطب شاہ تینوں نے احمد نگر پر حملہ کر دیا۔ قریب تھا کہ احمد نگر فتح ہو جائے لیکن چونکہ اس فتح سے علی عادل کی قوت بہت بڑھ جاتی تھی اور سلطنت گولکنڈہ کو اس سے خدشہ تھا ابراہیم راتوں رات اپنا لشکر لے کر چلا آیا۔ حسین نظام شاہ نے اپنی بیٹی ابراہیم کے عقد میں دی اور اپنے کھوئے ہوئے قلعے واپس لینے کے لئے ابراہیم کی مدد چاہی۔ ابراہیم نے اپنی فوج بھیج دی لیکن یہ مہم معطل ہو کر رہ گئی۔ چند دن بعد فوج بغیر کسی نتیجہ کے واپس لوٹی۔ اس وقت گولکنڈہ پر بیرونی حملہ آوروں کی زد میں تھا۔ رام راج کی فوج اندر تک گھس آئی تھی اور بریدشاہ کو گولکنڈہ، گھن پورہ اور پانگل کے قلعے دے کر صلح کر لینا پڑا۔ بیرونی دشمن دفع ہوئے تو اندرونی دشمنوں نے سر اٹھایا۔ ابراہیم قلی نے کولاس کے حصار کی مرمت کروائی اور شہر کو ہر طرح محفوظ کر لیا۔ اسی اثنا میں نائب وزیروں کا فتنہ ہوا لیکن بہت جلد دور کر دیا گیا۔

رام راج کی قوت بہت بڑھ چلی تھی اور وہ اسی زعم میں اپنی ہمسایہ سلطنتوں کو چھیڑ چھیڑ کر اپنی طاقت جتلا رہا تھا۔ مسلمان قومیں ایک دوسرے کی دشمن سہی لیکن وقت پر متحد ہو جاتی ہیں۔ ابراہیم قلی قطب شاہ، حسین نظام شاہ، علی عادل اور علی برید نے رام راج پر حملہ کر دیا اور فیصلہ کن جنگ تالی کوٹ ہوئی۔ رام راج کو شکست فاش ہوئی اور ابراہیم کے کھوئے ہوئے قلعے پھر اسے واپس مل گئے۔

سنہ ۹۷۸ھ میں ابراہیم نے رفعت خان لاری کو راجمندری کی فتح کے لئے بھیجا۔ دو بڑے معرکوں کے بعد راجمندری پر قطب شاہی افواج قابض ہو گئیں۔

ابراہیم کا دور حکومت نہایت پرآشوب اور معرکہ آرائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ایک فتنہ کا سر دبایا گیا تو دوسرا اٹھا۔ بادشاہ کا لشکر کبھی افغانوں کو ان کی بدعہدی کی سزا دینے میں مصروف ہوتا تو کبھی چھوٹے موٹے راجاؤں کو ان کی سرکشی کی۔ شاہی اقبال ہمیشہ یاوری کرتا اور ہر جگہ بادشاہ کو فتح ہوتی۔ ابراہیم قلی قطب شاہ کا انتقال سنہ ۹۸۸ھ میں ہوا۔ کل تیس سال نو مہینے اس کی حکومت کا زمانہ ہے۔ اس کے زمانے میں گولکنڈہ میں کئی عمارتیں بنیں۔ لنگر دوازدہ امام، ریاض محل، باغ ابراہیم شاہی، حوض حسین ساگر، کنکورہ، بدویل کے علاوہ مساجد بھی اس عہد میں تعمیر پائے۔

رشید قریشی

قومی تعمیر کی بنیاد رکھی اور اس کو آگے بڑھانے کی پوری کوشش کی۔ دوسری طرف تمدنی خدمات کے ذریعہ گولکنڈہ کا تمدنی پایہ بلند کیا۔ اس کے زمانہ کے عظیم الشان تعمیری آثار اس حقیقت کی پوری نشاندہی کرتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ تلنگی زبان کا بڑا عالم تھا اور روایت ہے کہ اس نے تلنگی میں ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ وہ پہلا آدمی ہے جس نے حیدرآباد میں اردو میں شاعری کی۔ اس کی نظمیں اور غزلیں اس کے ادبی ذوق اور ارتقائے اردو کے بہترین نمونہ ہیں۔ ان نظموں سے معلوم ہوتا ہے اس کو مقامی معاشرت اور روایات سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔

محمد قلی قطب شاہ کے تمدنی کارناموں کی ایک بڑی فہرست ہے۔ صرف شہر حیدرآباد اور اس کی تعمیر اس بادشاہ کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے حیدرآباد کی تعمیر کی صحیح تاریخ نامعلوم ہے۔ شہر کے بیچ میں ایک شاندار عمارت چار مینار کی تاسیس ۹۹۹ھ میں ہوئی تھی غالباً یہ ڈیڑھ دو سو سال میں تیار ہوئی اور "یا حافظ" سے اس کی تاریخ نکلتی ہے۔ شہر کی تعمیر کا بڑا مقصد ملک میں ایک اجتماعی زندگی پیدا کرنا تھا۔ بادشاہ نے شہر کی تعمیر کے ساتھ اس بات کا پورا لحاظ رکھا تھا کہ اس میں ایک متمدن زندگی کی تمام ضرورتیں مہیا ہوں۔ شہر و عمارت کی خوش اسلوبی اور عظمت کی وجہ سے گولکنڈہ کے مورخ کا یہ کہنا کہ "در تمامی ہندوستان عدیلے ندارد" بڑی حقیقت پر مبنی ہے۔

سلطان محمد قطب شاہ

(۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵ھ)

عبدالحفیظ صدیقی

سلطان محمد قلی وصیت کر گیا تھا کہ اس کے بھتیجے سلطان محمد کو تخت پر بٹھایا جائے اس لئے سلطان محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۹ سال تھی سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ راجہ دستر کی مہم کا تصفیہ کرنا تھا۔ راجہ بستر نے اطاعت قبول کرلی تو شاہی فوجیں پایۂ تخت لوٹ آئیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مغلوں کا تسلط دکن پر روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اور مصلحت وقت یہی تھی کہ سلطان محمد بھی مغلوں سے صلح کرلیتا۔ اور جب شاہجہان معتوب شہزادہ کی حیثیت سے دکن میں مارا مارا پھر رہا تھا سلطان محمد نے اس کی بڑی مہمان داری کی۔ سلطان محمد بیحد مہمان نواز اور فراخ دل بادشاہ تھا۔ اس کے دربار میں دور دور کے سفیر حاضر رہتے اور بڑی بڑی تنخواہیں پاتے۔

سلطان محمد کا بڑا بیٹا عبداللہ مرزا ۱۰۲۳ھ میں پیدا ہوا۔ بادشاہ نے ۱۲ سال تک اس کی صورت نہ دیکھی۔ کیونکہ یہی منجموں اور رمالوں کی رائے تھی۔ بارہ سال گزرنے کے بعد بادشاہ نے اپنے بیٹے کی صورت دیکھی بھی تو کچھ نہ ہوا۔ دوسرے تیسرے روز سے بادشاہ کو بخار آنا شروع ہوا۔ طبیبوں کے باہمی اختلاف نے مرض کو اور بڑھا دیا۔ اور ۱۰۳۵ھ میں ۳۲ سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا۔ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کی صحیح تاریخ ملنی بہت مشکل ہے۔ روایتوں اور قصہ کہانیوں سے کچھ حال معلوم ہو سکا۔ اس کے جنگی کارنامے بھی معلوم نہ ہو سکے ہاں اتنا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے عادات و اطوار نہایت ستودہ اور زبان زد خاص و عام تھے۔ یہ صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔ کہتے ہیں کہ جس وقت بادشاہ کو مسجد کی بنیاد رکھنے ایسے آدمی کی تلاش ہوئی جس کی تہجد تک قضا نہ ہوئی ہو تو خود بادشاہ ہی ایسا شخص تھا۔ شعر کہنے کا بھی شوق تھا اور خوب کہتا تھا۔ حیدرآباد کی جامع مسجد (جو اب مکہ مسجد کہلاتی ہے) اسی کے عہد میں شروع ہوئی لیکن مسجد کے ختم ہونے سے پہلے ہی بادشاہ کا انتقال ہوگیا۔

اپنا ایلچی روانہ کیا اور نہایت جراءت سے شہنشاہ کو لکھا کہ "ہم آپ سے سرتابی کرتے ہیں۔ سنبھاجی کو بھی پناہ دی ہے اب دیکھیں گے آپ کن کن سے مقابلہ کرتے ہیں"۔ اورنگ زیب کی نظر سے یہ تحریر گزری تو بےحد غضبناک ہوا اور شاہزادہ شاہ عالم بہادر شاہ کو فوج کثیر کے ساتھ گولکنڈہ کی طرف روانہ کیا۔ ابوالحسن کی فوج نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن جلد قطب شاہی سپہ سالار مغلوں سے مل گئے اور فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ دوسرے دن پھر لڑائی ہوئی اسی اثنا میں بادشاہ اپنے سپہ سالاروں سے اندیشہ مند ہوگیا اور خلیل اللہ خاں جو گولکنڈہ کا نہایت نامی سپہ سالار تھا۔ ان سے ٹوٹ کر مغلوں سے جاملا۔ اب ابوالحسن نے قلعہ گولکنڈہ میں پناہ لی۔ اور مغل سپاہیوں نے حیدرآباد میں وہ قیامت برپا کی کہ قتل نادری اس کے سامنے کچھ نہ تھا ابوالحسن کی درخواست پر جدال و قتال روک دیا گیا اور صلح کے شرائط طے ہونے لگے۔ صلح کی شرط ایک یہ بھی تھی کہ مادنا و اکنا کو قید کرکے بھیج دیا جائے۔ بادشاہ نے منظور نہ کیا۔ بہادر شاہ نے میر ہاشم کو صلح کے لئے بھیجا لیکن گولکنڈے میں یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اصل میں میر ہاشم تانا شاہ کو گرفتار کرنے آیا ہے چنانچہ عبدالرزاق لاری اور شرزہ خاں نے میر ہاشم پر حملہ کردیا اور اسے قتل کردیا۔ اورنگ زیب کو شہزادہ کی سستی اور ناتجربہ کاری کی خبر ہوئی تو بہت رنجیدہ ہوا اور دوسری مہموں کو ٹھکانے لگاکر گولکنڈہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ابوالحسن نے صلح کی بہت کچھ کوشش کی لیکن اورنگ زیب نے گولکنڈہ کو محصور کرلیا "تنگ آمد بجنگ آمد"۔ ابوالحسن نے بھی سخت مقابلہ کیا۔ لیکن عبداللہ خاں پنی کی غداری سے اورنگ زیب نے قلعہ فتح کرلیا۔ عبدالرزاق لاری نے اس موقع پر جس شجاعت و نمک حلالی کا ثبوت دیا وہ تاریخ میں یادگار ہے۔

قلعہ میں مغل سردار گھسے تو سارے قلعہ میں ادھم مچ گئی ہر چہار طرف آہ و شیون کی آوازیں تھیں، اس وقت خاصہ تیار تھا سلطان ابوالحسن اپنے لواحقین کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا۔ کھانے سے فارغ ہوکر شہزادہ کے پاس گھوڑے پر سوار ہوکر آیا۔ اپنی موتیوں کی مالا اس کے گلے میں ڈال دی۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ ابوالحسن کی عمر کے ۱۴ سال طفلی میں۔ ۱۴ سال تحصیل علوم میں ۱۴ سال سید راجو حسینی کی خدمت میں ۱۴ سال حکمرانی میں اور چودہ سال قلعہ دولت آباد میں گزرے۔ ابوالحسن کی تین بیٹیاں تھیں۔ اور ایک لڑکا خدابندہ جس کو اورنگ زیب نے بندہ سلطان کا خطاب دیا تھا۔ اس بادشاہ کی زندگی نے جس قدر افسانوی حیثیت حاصل کرلی ہے وہ تاریخی مطالعہ سے بےبنیاد ثابت ہوتی ہے۔ بادشاہ کی نزاکت، عیش پرستی، اور سادہ لوحی کے جو قصے بیان کئے جاتے ہیں وہ اس کے تاریخی کیرکٹر کو بگاڑ نہیں سکتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مستقل مزاج، مدبر اور متوکل بادشاہ تھا جس کی پیشانی عین گرفتاری کے وقت بھی شکن آلودنہ ہوئی۔

تانا شاہ کو ایک لڑکا اور تین لڑکیاں تھیں، اورنگ زیب نے دوسری لڑکی کی شادی سکندر عادل شاہ سے اور تیسری کی اسد خاں وزیر کے فرزند سے کردی پہلی لڑکی نے یہ کہہ کر شادی سے انکار کردیا کہ وہ اپنے بزرگ باپ کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کردینی چاہتی ہے۔ تانا شاہ کے لڑکے خدابندہ کو باپ کی وفات کے بعد اپنے دربار میں طلب کیا اور بندہ سلطان خطاب دیا، لیکن جب یہ شہزادہ دربار میں آتا تو اہل دربار جن میں دکنی امرا بھی تھے اس کی تعظیم کرتے۔ جس کی وجہ اورنگ زیب کو شبہ ہوا اور پھر یہ لڑکا کبھی نظر نہ آیا۔

رشید قریشی

وداع شاہ

تانا شاہ کی روانگی کے وقت اہل گولکنڈہ کی زبان سے

باحال تباہ جا رہا ہے — کانوں کی بے راہ جا رہا ہے
کس یاس سے آہ جا رہا ہے — اب قلعہ سے شاہ جا رہا ہے

کس طرح غبارِ راہ دیکھیں
ٹوٹے ہوئے دل کی چاہ دیکھیں

مٹ جائیں گے خود ہی اے عدو ہم — آئیں گے نہ تیرے روبرو ہم
کر لیں گے تباہ رنگ و بو ہم — بیچیں گے نہ اپنی آبرو ہم

کس آس پہ اب رہیں جہاں میں
اُڑتے ہوئے رنگ گلستاں میں

ہم کو تو ملا تھا تاج شاہی — کن آنکھوں سے دیکھیں یہ تباہی
آتا ہے ہمیں بھی رقص ماہی — پائیں گے نہ ان سے بے گناہی

واللہ تڑپ کے جان دیں گے
مر کر ہی تجھے مکان دیں گے

پامال ہوں آفتاب ہو کر — گر جائیں شہابِ ثاقب ہو کر!
چھپ جائیں نظر سے خواب ہو کر — بے کیف ہیں شباب ہو کر!

جب شاہ نہیں تو ہم ہیں کیوں؟
غیروں سے حدیثِ غم کہیں کیوں!

بے آبروئی سے ڈر رہی ہیں — ٹھکرا کے جہاں کو مر رہی ہیں
نعشوں سے کنویں کو بھر رہی ہیں — کام آنے کا کام کر رہی ہیں

امواج پہ رقص آب و گل ہے
اس جنس کا دل بھی مردہ دل ہے

مشاہیرِ گولکنڈہ

اس نام سے ایک کتاب آج کل زیرِ ترتیب ہے جس میں گولکنڈہ کے جملہ مشہور اصحاب (بادشاہوں سے لے کر غلاموں تک) کے تاریخی حالات نہایت دلچسپ پیرایہ میں قلمبند کئے جا رہے ہیں۔ اسی کتاب سے چند اصحاب کے حالات یہاں درج ہیں۔

(وزرائے گولکنڈہ) جملۃ الملک مرزا محمد امین

اصفہان کے رہنے والے حیدرآباد آکر دربارِ شاہی کی ملازمت اختیار کی۔ سلطان محمد قلی نے حضرت میر مومن استرآبادی کی سفارش پر ۱۰۰۱ھ میں خدمتِ میر جملگی سپرد کی اور جواہرات کا ایک ایسا مرصع قلمدانِ وزارت عنایت کیا جس کی روشنی سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ دو لاکھ ہون سالانہ تنخواہ مقرر کی گئی جو حال کے نو لاکھ روپیوں کے برابر ہوتے ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ قطب شاہی وزیر اعظم کی تنخواہ عہدِ حاضرہ کے وزیر اعظم کی تنخواہ سے تقریباً دس گنا زیادہ تھی۔ محمد امین نے میر جملہ ہوتے ہی باغیوں اور سرکشوں کو زیر کیا اور سواری راؤ برہمن کو کار و بارِ سلطنت سے بے اثر کر دیا ۱۰۱۱ھ میں جب آگرہ اور دہلی کے مغل سوداگر حالتِ نشہ میں شاہی محل میں بغیر اجازت کے دیکھنے کے لئے داخل ہوئے اور بادشاہ نے علی آقا کوتوال کو حکم دیا کہ انھیں باہر نکال دیا جائے تو شہر کے اوباشوں کو موقع مل گیا اور انھوں نے ان سوداگروں کے مال و اسباب کو لوٹنا شروع کیا۔ اس ہنگامۂ عظیم کو محمد امین نے بڑی ترکیب سے فرو کیا اس اثناء میں محمد امین کا اثر بہت بڑھ گیا تھا جس کی وجہ سے دکنی امراء نے بادشاہ سے ناخوش ہو کر اس کے بھائی خدا بندہ کو بغاوت کے لئے اکسایا لیکن اس بغاوت میں وہ ناکام ہوئے۔

۱۰۱۹ھ میں محمد امین نے بادشاہ کی ایک شاندار دعوت کی اور اپنے مکان کو رشکِ فردوس بنا کر پا انداز میں زربفت و اطلس اور مخمل و مشجر کے کپڑے بچھا دئے۔ جب بادشاہ تشریف لائے تو شاعروں نے قصیدے سنائے اور مطربوں نے نغمے۔ آخر میں محمد امین نے تیس عربی گھوڑے بیس ہاتھی اور بلور کا ایک مدور آئینہ جس کے اطراف قسم قسم کے جواہر نصب کئے ہوئے تھے ایک سونے کی زین جس پر جواہر کا کام کیا ہوا تھا چودہ جلد خوش خط قرآن شریف اور دیگر قیمتی اشیاء بطور نذر پیش کئے اور طعام کے بعد قصہ خوانوں اور ندیموں کو پچاس ہزار ہون انعام میں دے بادشاہ نے چلتے وقت اپنے کندھوں سے زردوزی چادر نکال کر محمد امین کو عنایت کی

۱۰۲۰ھ میں پرتاپ راؤ کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے محمد امین کو روانہ کیا گیا مگر وہ ناکام رہے اسی سال محمد قلی نے وفات پائی۔ ان کی وفات سے قبل ہی محمد امین نے شہر سے ملحق ایک عالی شان تالاب بنایا جو تالاب میر جملہ کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ اسی تالاب کے کنارے مشرق رویہ محمد امین کی ڈیوڑھی بھی تھی جو اپنی آرائش اور خوبی تعمیر کی وجہ سے مشہور تھی اور جس میں آخر زمانے تک بڑے بڑے سفراء اور معزز مہمان ٹھیرائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ محمد امین نے موسیٰ ندی کے کنارے ایک امین باغ بھی بنایا تھا جو اس عہد کا ایک نہایت پر فضا مقام تھا اس امین باغ میں آج کل سرکاری زچگی خانہ ہے۔

جب سلطان محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا تو مرزا محمد امین نے حج کو جانے کے لئے رخصت حاصل کی اور اپنی پوری دولت کے ساتھ گولکنڈے سے نکل کر بیجاپور کا رخ کیا۔ وہاں ان کی خاطر خواہ آؤ بھگت نہیں ہوی تو وہ ایران چلے گئے اور گولکنڈہ سے لائے ہوئے ایک لاکھ روپے کے جواہر شاہ عباس کی خدمت میں پیش کئے۔ لیکن شاہ عباس میں بھی انھیں محمد قلی جیسی خوبیاں نظر نہ آئیں تو دوبارہ ہندوستان آکر ۱۰۲۷ھ میں جہانگیر کے دربار میں ملازمت اختیار کی اور پچاس ہزار روپے کے جواہر نذر کئے۔ وہاں بھی انھیں وہ عروج حاصل نہ ہو سکا جو گولکنڈہ میں نصیب ہوا تھا البتہ میر بخشی کے خطاب سے سرفراز ہوئے آخر کار ۱۰۴۶ھ میں شاہجہاں کے عہد میں لقوہ اور فالج سے انتقال کیا۔

غواصی ملک الشعرائے گولکنڈہ

مرزا محمد امین میر جملہ

خواجہ افضل ترک

سلطان محمد قطب شاہ نے ۱۰۲۰ھ میں منصب سرخیلی پر سرفراز کیا تھا اور چار لاکھ ہون کی مشروط خدمت جاگیر دی تھی لیکن آخر زمانہ میں ۱۰۳۰ھ میں بادشاہ نے ان کو معزول کر کے مرزا روزبہان کو سرخیل بنایا اور ان کی جاگیر میر محمد تقی طباطبا کو عنایت کر دی تھی

اس واقعہ کے دو ماہ بعد ہی جب سلطان عبداللہ تخت نشین ہوئے تو منصور خاں پیشوا نے مرزا روزبہان کو معزول کر دیا خواجہ افضل پھر دوبارہ اس جگہ پائے۔ اور بعد کو علامہ ابن خاتون کے ساتھ ان کی سازش کا شبہ پیدا کیا گیا اور ۱۰۳۷ھ میں شاہ محمد پیشوا کو معزول کر دیا لیکن علامہ ابن خاتون کی رمضان ۱۰۳۸ھ میں منصب پیشوائی پر سرفرازی کے بعد خواجہ افضل بھی زیادہ دن تک پائے تخت میں نہ رہ سکے چنانچہ مرتضیٰ نگر اور کھمم میٹ کے عامل میر ابو المعالی دیانت خاں کو جب وہاں کی رعایا نے مار دیا تو بادشاہ نے خواجہ افضل ترک کو وہاں کی حکومت تفویض کر کے اواخر ۱۰۳۹ھ میں دارالسلطنت سے روانہ کیا۔ خواجہ افضل پورے تزک و احتشام اور فوج کے ساتھ مرتضیٰ نگر کی طرف روانہ ہوئے اور راستہ میں جہاں کہیں چوروں اور اوباشوں کا پتہ چلا سب کو تہ تیغ کیا اور اس سمت کے چار سو عیار اور طرار چوروں کو ایک وقت گرفتار کر لیا اور راستوں پر جگہ جگہ ان کو سولی پر لٹکا دیا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور سرکشوں کی تنبیہ ہو سکے۔ غرض اس علاقہ کو خس و خاشاک سے پاک کر کے خواجہ نے زمانہ میں بھی خلایق کی حفاظت اور غلہ رسانی وغیرہ کا بڑا اچھا انتظام کیا

ابھی خواجہ افضل مرتضیٰ نگر کے صوبہ دار ہی تھے کہ ۱۰۴۱ھ میں باقر خاں صوبہ دار بنگالہ نے قطب شاہی علاقہ کھمم میٹ پر حملہ کر کے کچھ حصے اپنے قبضہ میں کر لئے۔ وہاں کے عاملوں اور فوجیوں نے بادشاہ سے مدد طلب کی۔ بادشاہ نے خواجہ افضل کے یہاں آدمی دوڑائے اور ان کو بسرعت تمام پائے تخت پہنچنے کا حکم دیا۔ چنانچہ خواجہ افضل اسی فرسنگ کے فاصلہ کو ایک ماہ یا نصف ماہ کے بجائے صرف تین دن میں طے کر کے بارگاہ بادشاہی میں پہنچے بادشاہ بہت خوش ہوئے اور رجب ۱۰۴۱ھ کو تشریف و خلعت خاص اور گھوڑے اور نقدی زر و انعام سے سرفراز کیا اور باقر خاں کے مقابلہ پر جانے کا حکم دیا شجاع الملک شیر محمد خاں و رحیم دکنی سرداروں، حوالداروں، اور ہزار سواران شمشیر زن کو ان کے ساتھ کیا۔ اور تمام کھمم میٹ کو اطلاع کرا دی کہ سب خواجہ افضل کی مدد کریں اور اس کے مطیع و منقاد رہیں اس کے علاوہ میاں تیمن خواجہ دار دروازہ شیر علی بادشاہی کو راجمندری روانہ کیا تاکہ خواجہ افضل کے لشکر کے لئے غذا پانی کا پہلے سے انتظام کر رکھے۔ چنانچہ خواجہ افضل ایک بڑی جمعیت لشکر کے ساتھ کھمم میٹ کی طرف روانہ ہوئے اور جیسے جیسے راجمندری کی طرف بڑھتے راستہ میں ہر جگہ خواجہ کی فوج میں اضافہ ہوتا جاتا تھا مرتضیٰ نگر میں خواجہ افضل کا جو لشکر تھا وہ بھی مدد کو آیا اور دریائے کرشنا کو عبور کر کے مصطفیٰ نگر کے پاس خواجہ کے شاہی لشکر سے مل گیا اس عظیم الشان لشکر کے ساتھ خواجہ افضل کھمم میٹ پہنچے تو معلوم ہوا کہ باقر خاں کو شاہجہاں نے واپسی کا حکم دیا ہے اور جتنے علاقوں پر قبضہ کیا گیا تھا ان کو چھوڑ کر باقر خاں کی فوجیں واپس ہو رہی ہیں اس طرح لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اور خواجہ افضل کو چند روز راجمندری میں قیام کرنے کا حکم دیا گیا۔

خواجہ افضل ابھی راجمندری میں تھے کہ مہری پنڈت سپہ سالار عادل شاہی نے ۱۰۴۲ھ میں قطب شاہی علاقہ پر حملہ کیا اور قلعہ کوڈاس کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت اگرچہ بادشاہ نے دوسرے امراء کو مقابلے کے لئے روانہ کر دیا تھا تاہم احتیاطاً خواجہ افضل کو پورے لشکر اور انتظام کے ساتھ راجمندری سے گولکنڈہ آنے کا حکم دیا۔

خواجہ افضل اس اثنا میں سخت بیمار ہو گئے تھے اور اسی حالت میں وہ حیدرآباد آئے لیکن جانبر نہ ہو سکے چنانچہ ۱۰ جمادی الآخر ۱۰۴۲ھ کو

حیدرآباد میں وفات پائی۔

خواجہ افضل سلطان محمد کے زمانہ میں نو سال خدمت سرخیلی پر اور سلطان عبداللہ کے زمانہ میں چھ سال سپہ سالاری، صوبہ داری اور وزارت کے عہدہ پر مامور رہے۔ اور تجمل و ثروت میں اپنے امثال و اقران میں ممتاز تھے اسی لئے حدیقہ میں ان کو اعظم الامرا لکھا ہے۔ ان کے ملازمین جن میں ایک ہزار ترکی و عرب و عجمی سوار تھے یوزچی بیگ کے سپرد کئے گئے۔ اور ان کی جاگیر مرتضیٰ نگر پر فصیح الدین محمد تفرشی کو سرفراز کی گئی۔

مرزا روزبہان اصفہانی

سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے عمائدین سلطنت سے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی وفات سے ۲ ماہ قبل ربیع الاول ۱۰۳۵ھ میں ان کو خواجہ افضل ترک کی معزولی کے بعد سرخیلی کے منصب ارجمند پر سرفراز کیا تھا۔ لیکن سلطان عبداللہ کی تخت نشینی کے بعد جب خانم آغا اور منصور خاں حبشی کا دربار پر اثر جم گیا تو مرزا روزبہان کو معزول کرکے مجلسیان حضور کے زمرہ میں شریک کردیا گیا۔ لیکن جب منصور خاں میر جملہ کا انتقال ہوگیا اور علامہ ابن خاتون پیشوائے سلطنت اور مختار دربار ہوگئے تو انھوں نے پھر مرزا روزبہان کے لئے کوشش شروع کی اور بادشاہ کے سامنے ان کی بڑی تعریف کی چنانچہ ۳ ربیع الاول ۱۰۴۱ھ کو مرزا روزبہان دوبارہ منصب سرخیلی پر مامور کئے گئے اور انھوں نے پوری قوت کے ساتھ فوج اور رعایا کے معاملات سرانجام کرنے شروع کئے۔ لیکن بادشاہ کو ان پر اعتبار نہ آیا اور وہ ہمیشہ ان کو شبہ کی نظر سے دیکھتے رہے۔ آخرکار بددیانتی کے الزام میں منصب سرخیلی سے ۱۸ صفر ۱۰۴۲ھ میں ہٹائے گئے اور فصیح الدین محمد کو سرخیل بنایا گیا۔

عین الملک منصور خاں حبشی

سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے اکابر سلطنت سے ہیں، حوالہ داری لشکر رکاب خانہ کے علاوہ وزارت عین الملکی پر مامور تھے۔ اور بادشاہ اور ان کی والدہ کے مزاج میں درخور حاصل تھا۔ چنانچہ جب بادشاہ مرض موت میں مبتلا ہوئے تو ان کے علاج کے بارے میں اطبائے ہند اور اطبائے عراق کے مابین اختلاف پیدا ہوگیا۔ بادشاہ کی والدہ کا خیال تھا کہ اطبائے ہند علاج کریں کیونکہ جو مزاج ہندوستان کی آب و ہوا میں پرورش پاتے ہیں ان کے لئے مناسب ہے کہ ہندوستانی طبیبوں کا علاج کرایا جائے۔

اگرچہ والدۂ بادشاہ کی اس رائے سے اکثر امرائے دربار کو اختلاف تھا لیکن منصور خاں کی تائید کی وجہ سے ہندوستانی اطباء نے علاج کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت منصور خاں کتنے صاحب اقتدار تھے۔

سلطان محمد کے انتقال کے بعد سلطان عبداللہ کو تخت نشین کرانے میں اور پائے تخت میں انتظام اور امن و امان قائم رکھنے میں منصور خاں نے بڑا حصہ لیا۔ اس وقت بادشاہ کی کم عمری کی وجہ سے سلطان محمد کی والدہ ہی کاروبار سلطنت میں دخیل تھیں اور انھوں نے زور دے کر منصور خاں کو میر جملہ بنایا۔ نظام الدین احمد مولف حدیقۃ السلاطین چونکہ علامہ ابن خاتون کے طرفداروں میں سے تھے اس لئے انھوں نے اپنی تاریخ میں منصور خاں کی خدمات کے اعتراف میں بخل سے کام لیا ہے اور جگہ جگہ ذم کا پہلو نمایاں کردیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ منصور خاں اور ملک یوسف وغیرہ اس وقت کے ان ملکی امرا اور جاں نثاران سلطنت سے تھے جن کو علامہ ابن خاتون اور دیگر اجنبی امرا اپنے راستے میں حائل سمجھتے تھے اور چونکہ سلطان عبداللہ کی طبیعت بہت کم زور واقع ہوئی تھی اس لئے انھوں نے با اقتدار امرائے عراق کے زیر اثر اپنے قدیم امرا اور خدمت گذاروں کو بہت جلد بے اثر کردیا۔

منصور خاں کی میر جملگی کا پہلا اثر یہ پڑا کہ مرزا روز بہان اصفہانی جن کو صرف دو ماہ قبل سلطان نے خواجہ افضل ترک کو معزول کر کے سرخیل بنایا تھا اپنے عہدے سے معزول ہو گئے منصور خاں نے برہمنوں کو بھی برسر کار کیا کہ نظام الدین احمد مورخ کا بیان ہے کہ خود میر جملہ کو لکھنا نہیں آتا تھا۔ تاہم اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ منصور خاں سپاہیوں پر خوب نظر رکھتے تھے اور انھوں نے اس طبقہ کی حالت کو درست کر دیا۔ اگرچہ غیر ملکیوں کے ساتھ ان کا سلوک اچھا نہ تھا۔

منصور خاں نے وزارت پناہ خواجہ افضل ترک کو پھر سے ایک لاکھ ہون تنخواہ کی جاگیر دے کر سرفراز کر کے امرائے عظام کے طبقہ میں شامل کر دیا منصور خاں نے اس شان و شوکت سے میر جملگی کی خدمت انجام دی کہ دارالسلطنت میں ان کے علاوہ ان کا بھی رعب بیٹھا ہوا تھا اور بڑے بڑے عہدہ دار بھی ان سے ڈرتے تھے چنانچہ حدیقہ میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ۹ محرم ۱۰۳۰ھ کو دیوان کے ایک حبشی غلام نے میدان دربار میں شب چراغاں کا اہتمام کرتے وقت قاسم بیگ کوتوال کے ساتھ بے ادبی کی لیکن چونکہ میر جملہ کا آدمی تھا قاسم بیگ کچھ نہ کر سکے اور رنجیدہ ہو کر گھر بیٹھ رہے اور منصب کوتوالی سے استعفا دے دیا۔

نظام الدین احمد کا بیان ہے کہ جملۃ الملک منصور خاں قاسم بیگ کوتوال اور شاہ محمد نیر دونوں کو ہٹا کر ملا محمد تقی کو خدمت کوتوالی اور میر سید سنوانی کو پیشوائی دلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اول الذکر کو مچھلی پٹن سے اور موخر الذکر کو دہلی سے طلب کیا اور محمد تقی نوبت الطلب حیدرآباد پہنچ بھی گئے اور منصور خاں سے کئی بار کوشش کی کہ بارگاہ شاہی میں پیش کر کے عہدہ کوتوالی دلا دیں لیکن بادشاہ پر علامہ ابن خاتون کا اثر پڑنا شروع ہو چکا تھا وہ انکار ہوتے گئے اور آخرکار قاسم بیگ کی جگہ پر ملا محمد تقی کو مقرر نہ کئے جانے پر قاسم بیگ نائب کوتوال کو خدمت کوتوالی پر ترقی دے دی۔ اب جو محمد تقی کو مایوسی ہوئی تو میر جملہ نے اپنی پیشی میں مقرر کر کے میر جملگی کا کام جو کوتوال کے کام سے انفع ہے ان کے سپرد کر دیا اس طرح ۱۰۳۰ھ میں جملہ امور دیوانی میں ملا تقی نائب میر جملہ ہو گئے اور ایک سال تک اس خدمت کو انجام دیا۔

آغاز محرم ۱۰۳۲ھ میں منصور خاں نے دو سال سات مہینے اور چند روز میر جملگی کی خدمت انجام دے کر انتقال کیا یہ عجیب بات ہے کہ منصور خاں کی وفات کے بعد چھ سال دس مہینے تک منصب میر جملگی پر کوئی بھی فائز نہ ہو سکا آخر کار شوال ۱۰۳۸ھ میں علامہ ابن خاتون نے منصور خاں کی جگہ لی۔ اس اثناء میں منصور خاں کی خدمات کو تین چار امراء میں تقسیم کر دیا گیا تھا یعنی ملا محمد تقی سرخیل، آدم خاں عین الملک اور پسر منصور خاں حوالہ دار فوج رکاب خانہ وغیرہ۔

شریف الملک ملا محمد تقی

سلطان محمد قطب شاہ کے دور میں بندر مچھلی پٹن کے حوالہ دار تھے سلطان عبداللہ کے دور میں جب منصور خاں حبشی میر جملہ نے اقتدار تمام حاصل کیا تو ان کا خیال تھا کہ قاسم بیگ کوتوال کی جگہ ملا محمد تقی اس خدمت پر سرفراز ہوں چنانچہ ۱۰۳۲ھ میں ملا محمد کو لکھا کہ پایہ تخت چلے آئیں ملا بہت خوش ہوئے اور ایک ہاتھی پانچ ہزار ہون نقد اور دیگر تحف و ہدایا کے ساتھ محرم ۱۰۳۳ھ میں حیدرآباد آئے منصور خاں ان کی آمد سے بہت خوش ہوئے اور چاہتے تھے کہ بادشاہ ان کو منصب کوتوالی پر سرفراز کریں چنانچہ تین مہینوں تک برابر دولت خانۂ عالی میں ساتھ لے جاتے رہے اور ایک دفعہ تو زر نقد ہاتھی اور دیگر تحفے بادشاہ کی خدمت میں پیش بھی کر دئے مگر بادشاہ نے ملا تقی کو باریاب نہ کیا بادشاہ یہ چاہتے تھے کہ ملا تقی بجائے کوتوالی کے منصور خاں کے قائم مقام ہوں کہ منصب سرخیلی ... اور ... لیکن وہ مائل نہ تھے تاکہ کوتوالی کا مستقل انتظام ہو لے تو ملا محمد تقی کو

بازیاب کرکے سرخیلی بنادوں آخر کار ۷ ربیع الاول ۱۰۳۶ھ کو بادشاہ نے حسن بیگ نائب کوتوال کو حیدرآباد کی کوتوالی کل پر سرفراز کردیا۔

اب منصور خاں بڑے پریشان ہوے لیکن انھوں نے ملا محمد تقی کو اپنے ہی ساتھ رکھ کر میر جملگی کے جملہ جہات کو ان کے سپرد کردیا اس طرح ملا محمد تقی کوتوالی سے زیادہ اہم اور بڑے عہدہ کا کام انجام دینے لگے۔ انھوں نے ایک سال تک منصور خاں کے نائب کی طرح دیوانی کی خدمات اور میر جملگی کے جملہ امور انجام دئے بادشاہ بھی یہی چاہتے تھے۔

محرم ۱۰۳۸ھ میں منصور خاں نے یکایک انتقال کیا تو ان کی جگہ کے لئے بہت سے امراء نے کوشش کی اور نذرانے پیش کرنے شروع کئے لیکن ملا محمد تقی پہلے ہی سے امور دیوانی انجام دئے رہے تھے، منصور خاں نے بھی کئی بار ان کے کام کی تعریف کی تھی اور بادشاہ پر ان کی کاردانی کا سکہ بٹھا چکا تھا اس کے علاوہ اس دفعہ ملا نے دوسروں کے نذرانوں سے زیادہ پیش کش دیا اس لئے بادشاہ نے انہی کو پسند کیا اور ۲۳ صفر ۱۰۳۸ھ کو منصب جلیل القدر سرخیلی پر سرفراز کیا۔ اس موقع پر دوسرے شاعروں کی طرح ملا نظام الدین احمد مولف حدیقۃ نے بھی ایک قطعۂ تاریخ ملا کی خدمت میں پیش کیا تھا جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

خسرو یوسف رخ جمشید جاہ	شاہ عبداللہ شاہ کامیاب
مولوی را بہر سرخیلی نمود	از میانِ جملہ اعیاں انتخاب
تربیت بنمود اورا ہمچو مہر	تاکہ شد یاقوت ساں باآب وتاب
عقل بہر منصبش تاریخ گفت	دائماً سرخیل بادا کامیاب

سرخیل ہونے کے بعد ملا تقی نے بادشاہ کے مزاج سے کافی واقفیت پیدا کرلی اور جملہ مہات دیوانی اور کل معاملات سلطانی پر ایسا قبضہ کرلیا کہ دوسروں کو دخل دینے کا موقع نہ دیا، خاص کر برہمنوں کے لئے رعایا پر ظلم وستم کرنے کا موقع نہ رہا۔ اور محاصل کی رقمیں اچھی طرح داخل خزانہ ہونے لگیں۔ چنانچہ صرف نارائن راؤ مجموعہ دار سے ایک سو تیس ہزار ہون وصول کرکے داخل خزانہ کئے گئے اور جو چودہری اور صاحبانِ جائداد منافق مغرور اور ظالم ہوگئے تھے ان کو قتل کرکے ان کی جائداد اور ذخیروں پر شاہی قبضہ کرادیا۔

ان خدمات کے صلہ میں بادشاہ نے ملا کو شریف الملک کا خطاب عطا کیا اور وہ قلمدان مرصع جو مرزا محمد امین میر جملہ کے بعد سے کسی کو مرحمت نہیں کیا گیا تھا ملا شریف الملک کو عنایت کیا گیا۔ اس اثنا میں مغلوں کے حملۂ دکن کی خبریں مشہور ہونے لگی تھیں اس لئے سلطان نے شریف الملک کو پچاس ہزار ہون کی جاگیر دی تاکہ ایک لشکر تیار رکھے اور فیل خانۂ خاص سے چند مست ہاتھی بھی عنایت کئے۔ اس طرح سرخیلی اور سرداری ایک ہی جگہ جمع ہوگئی۔ ملا نے بہت جلد دکنیوں، عربوں اور پٹھانوں کی ایک فوج تیار کرلی اور میدان دلکشائے داد محل میں لاکر بادشاہ کو دکھادی۔ بادشاہ بہت خوش ہوے اور ملا کے مدارج میں اور بھی اضافہ کردیا۔ اس طرح شریف الملک کی عزت و وقعت اور اثر و رسوخ اور بھی بڑھ گیا۔

جب شریف الملک کی ذات میں دو عہدے یعنے سرداری اور سرخیلی جمع ہوگئے تو مہات دیوانی اور ضبط و ربط امور مملکت کے ساتھ ساتھ شہسواری اور سپہ گری کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی۔ چنانچہ وہ روزانہ شام کا وقت ندی محل کے برابر رود موسی کے کنارے وسیع میدان میں کمان داری اور چوگان بازی میں گذارتے تھے۔ ایک وقت گھوڑے پر سے گرے اور چوٹ کھائی لیکن تکلیف میں کچھ کمی ہوتی تھی کہ آخر شعبان ۱۰۴۰ھ میں

ملا نظام الدین احمد
مورخ گولکنڈہ

علامہ شیخ محمد ابن خاتون
پیشوائے گولکنڈہ

گولکنڈے کے سپہ سالار

موسیٰ خاں

حیوان خاں

علی باغ میں جشن رمضان میں شرکت کی اور غذا میں بے ضبطی کی وجہ سے ہیضہ و اسہال کا مرض لاحق ہوگیا، اور اسی حالت بیماری میں رمضان بھر صبح و شام بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اس حاضری میں اور مسلسل صرف رہنے کی وجہ سے ضعف بڑھتی گئی آخر کار رمضان کی عید کے دن جب بادشاہ نے دربار کیا اور ملا شریف الملک عصر تک برابر کھڑے ہو کر لشکر اور رعایا کے معروضے پیش کرتے رہے تو طبیعت بالکل بگڑ گئی اور اس روز کے بعد دربار کو آنا نصیب نہ ہوا، حکیم اسمٰعیل گیلانی اور دیگر ہندوستانی طبیبوں نے علاج کیا بادشاہ نے اپنے غلام حسن علی خاں کو پرسش احوال کے لئے بھیجا اور آخر میں اپنے خاص طبیبوں کو بھی علاج کرنے کے لئے حکم دیا لیکن پیمانہ حیات پر ہو چکا تھا ملا محمد تقی شریف الملک نے ۱۹ شوال ۱۰۲۰ھ میں انتقال کیا

انھوں نے دو سال آٹھ ماہ بڑے کر و فر اور اثر و اقتدار کے ساتھ حکومت کی اور بادشاہ کی خیر خواہی اور آداب عبودیت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ان کے انتقال کا بادشاہ کو بھی صدمہ ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ملا شریف الملک کو اولاد نہ تھی۔ کیونکہ بادشاہ نے ان کی موجود اقربا اور ہمسایوں کے حال پر خاص نوازشیں کیں اور ان کو پورے سامان کے ساتھ عراق جانے کی اجازت دی۔

ابن خاتون

شیخ محمد نام، ابن خاتون طوسی عاملی کے بیٹے اور شیخ بہائی کے جانشین تھے سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے علما میں سے ہیں ان کے علم و فضل کی وجہ سے بادشاہ نے ان کو منشی الملک اور دبیر سلطنت بنا کر ماہ گروہ سلطانی کے مقربان خاص میں شامل کر لیا تھا جب سلطان محمد علی کی وفات کے بعد شاہ عباس صفوی کا سفیر حسین بیگ قبچاقی حیدرآباد آیا تو اس کی واپسی کے وقت بادشاہ نے ۱۰۲۴ھ میں علامہ شیخ محمد ابن خاتون کو پیش قیمت تحفے دے کر اس کے ساتھ ایران کو روانہ کیا جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور وہ تقریباً دس سال مقیم رہے اور جب واپس آنے لگے تو شاہ ایران نے ان کے ساتھ قاسم بیگ سپہ سالار مازندران کو روانہ کیا اور ۱۰۳۵ھ میں اس وقت حیدرآباد واپس ہوئے جب کہ سلطان محمد قطب شاہ کا انتقال ہو چکا تھا سلطان عبداللہ نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور اپنے پھوپھا شاہ محمد ولد شاہ علی جو شاہ میر زادہ پیشوائے سلطنت کا نائب مقرر کیا اور پیشوا کی طرح ان کو بھی اپنی مجلس میں بیٹھنے کی اجازت دی چونکہ یہ خدمت منزل تھی اس لئے بادشاہ نے محمد رضا استرآبادی سے منصب دبیری لے کر دوبارہ ابن خاتون کو دبیر سلطنت بھی بنا دیا۔

ان دو خدمات جلیلہ کی وجہ سے ابن خاتون کی عزت و احترام میں بہت اضافہ ہو گیا، انھوں نے دربار کے بڑا امور میں دخل پا کر اپنے توسط سے بہت سے لوگوں کو نوجوان بادشاہ کے مراحم خسروانہ سے فائدہ پہنچایا اس بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر شاہ محمد پیشوا ان سے کھٹکنے لگے اور دربار میں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں ہونی شروع ہوئیں آخر کار جب ۱۰۳۶ھ میں شاہ جہاں کا ایلچی شیخ محی الدین حیدرآباد آیا تو بعض باتیں ایسی ہوئیں کہ بادشاہ شاہ محمد پیشوا سے بالکل ناراض ہو گئے اور ان کو معزول کر کے ۹ رمضان ۱۰۳۶ھ میں ابن خاتون کو پیشوائی کل سے سرفراز کیا اس خوشی میں ابن خاتون کے طرفدار علما، و فضلا، اور شعرا، نے مبارک باد کے قصائد و قطعے لکھے جن میں سے ایک قطعہ حدیقۃ السلاطین کے مصنف نے لکھا تھا جو درج ذیل ہے ؎

شہ یوسف رخ و جمشید حشمت — کہ حاتم می کند از وے گدائی

ز فرط رحمت کردہ ممکن — محمد را بصدر پیشوائی

بساماں شد مہام ملک و ملت — کہ بود ابتر ز آفات سمائی

متاع فضل و دانش بود کاسد — کنوں بگرفت در عہدش روائی

جہاں معمور گردیدہ بد انساں — کہ شد محو از خلائق بے نوائی

بالہام آمد ایں مصراع تاریخ — محمد یافت از حق پیشوائی

پیشوا ہونے کے بعد ہی علامہ ابن خاتون نے شیخ محی الدین ایلچی شاہ جہاں کو واپس کر دیا اور کچھ ایسی ترکیب کی کہ وہ شاہ جہاں کے پاس معتوب قرار پایا۔

ابن خاتون اگرچہ بہت صاحب ثروت تھے اور نواب علامہ کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے لیکن ساتھ ہی مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف بھی جاری تھی بے حد علم دوست تھے اور روز ان کے مدرسہ میں بڑے بڑے علما و فضلا جمع ہوتے اور علوم معقول و منقول پر مباحثے اور مذاکرے کیا کرتے۔ منگل کو جو قطب شاہی سلطنت میں چھٹی کا دن ہوتا ان کے یہاں شعرا جمع ہوا کرتے اور شعرائے متقدمین کے کلام کے مذاکرہ کے علاوہ طرحی غزلوں کا مشاعرہ بھی کرتے تھے

ابن خاتون خود بھی بہت بڑے مصنف تھے شرح ارشاد، ترجمہ کتاب اربعین، حاشیہ جامع عباسی ان کی تصانیف ہیں جامع عباسی کی تکمیل بھی انہی نے کی تھی۔ یہ اپنے عہدہ کے لحاظ سے جملہ مذہبی امور کے بھی ذمہ دار تھے۔ چنانچہ جب ۱۰۴۰ھ میں حیدرآباد میں بڑا زبردست قحط ہوا تو شہر کے تمام علماء و فضلا و اتقیا سہ روزہ روزہ رکھ جمعہ کی صبح میں پا برہنہ علامہ ابن خاتون کے یہاں پہونچے اور ان کے ساتھ نماز استسقاء کے لئے شہر سے باہر نکل کر موسیٰ ندی کے کنارے جمع ہوئے اور بعد نماز دعا پڑھی۔ آخر میں ابن خاتون نے صدر مجلس میں بیٹھ کر اشرفیوں کی سفید اور لال تھلیاں بادشاہ کی طرف سے تمام مستحقوں میں تقسیم کیں اور ہاتھیوں اور اونٹوں پر جو پیسے بادشاہ نے خیرات کے لئے روانہ کئے تھے وہ بھی تقسیم کر دئے بعد میں بادشاہ کی افزونی عمر کی دعا کر کے شہر کو مراجعت کی۔

اس عزت و احترام کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ ابن خاتون کے مخالفین برابر کام کر رہے تھے چنانچہ جب بیجاپوری لوگ حیدرآباد آئے تھے تو ابن خاتون کا اثر کم ہو گیا اور ۱۳ جمادی الآخر ۱۰۴۲ھ کو یہ اپنی خدمت سے معزول کر دئے گئے اور میر محمد رضا استرآبادی پیشوا مقرر ہوئے اس زمانے میں ابن خاتون خانہ نشین ہو گئے لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد جب شہزادی کی پالکی بیجاپور روانہ ہوئی تو عبداللہ قطب شاہ پھر علامہ کی طرف متوجہ ہوئے اور جو کدورت پیدا ہوئی تھی دور ہو گئی چنانچہ اپنے ایک مقرب خاص کو طلائی پاندان دے کر علامہ کے یہاں روانہ کیا اور چند روز کے بعد خود ان کو طلب کر کے نوازش خاص کا اظہار کیا اور صدر الشریعت صدر جہاں کی جگہ ان کے بیٹھنے کے لئے معین کی اور سلطنت کے جملہ امور کے متعلق پہلے سے زیادہ مشورہ لینا شروع کیا۔ آخر کار ابن خاتون کو ۹ شوال ۱۰۴۳ھ کو جملۃ الملکی کا خلعت حاصل ہوا۔

(باقی آئندہ)

سید محی الدین قادری زور

ابن نشاطی — شاعر گولکنڈہ

محمد سعید میر جملہ گولکنڈہ

گولکنڈے کے صوفیائے کرام

سید شاہ راجو

شاہ میر محمود

ملک الشعراء غواصی

غواصی کی تاریخ ولادت و وفات بھی تحقیق طلب ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا اور محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں شاعری شروع کی۔ اس کی ابتدائی زندگی غربت میں بسر ہوئی سرکاری ملازمت اس کی گذر اوقات کا ذریعہ تھی عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی سے اس کے دن پھرے۔ شاہی دربار میں رسوخ حاصل ہوا اور رفتہ رفتہ ملک الشعرا کے درجہ تک پہنچا۔ امور سلطنت میں بھی غواصی کو دخل تھا چنانچہ ۱۰۴۵ھ میں شاہی سفیر کی حیثیت سے بیجاپور بھیجا گیا۔ اس کی آخری زندگی پھر ایک مرتبہ تاریکی میں نظر آتی ہے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ سلطان عبداللہ کے زمانے میں اس کا انتقال ہوا۔

غواصی ایک قادر الکلام شاعر تھا اس کی درباری حیثیت نے اس کی شاعری کو شہرت دی۔ یہاں تک کہ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں اس عہد کے شعرا میں سے صرف غواصی کا ذکر کیا ہے۔ سلطنت گولکنڈہ کا آخری ملک الشعراء غواصی ہے۔

اس وقت تک علاوہ چیدہ چیدہ غزلوں اور مرثیوں کے غواصی کی صرف دو مستقل تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔ مثنوی 'سیف الملوک و بدیع الجمال' اور 'طوطی نامہ'۔ دونوں اتفاق سے فارسی کے ترجمے ہیں۔ غواصی اپنے آپ کو فن شعر میں اس قدر کامل خیال کرتا ہے کہ دوسرے کسی شاعر کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس تعلی اور ہمہ دانی کا ثبوت کوئی ایسی پیداوار سے نہیں ملتا۔ البتہ ان ترجموں میں اس نے اپنی پوری قوت صرف کی ہے و[illegible] رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بڑی حد تک اپنی کوشش میں کامیاب اترا [illegible]س کی پرگوئی کا ثبوت یہ ہے کہ تقریباً سات سو جو دو ہزار سے زاید اشعار کی نظم ہے صرف ایک مہینے کی قلیل مدت میں ختم ہوئی ہے۔ ان مثنویوں کے وہ حصے جو غواصی کی اپنی پیداوار ہیں [illegible] شان لئے ہوئے ہیں جن میں غضب کی روانی پائی جاتی ہے۔

غواصی کی زبان میں ہندی عنصر غالب ہے۔ مبالغہ بہت کم اور کلام سادہ اور تصنع سے پاک ہے۔ اسلوب بلحاظ عنوان بدلتا جاتا ہے چنانچہ مکالمہ کے مقام پر سادگی اور سلاست اور مدح و منقبت میں بلند خیالی اور شاندار الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔

یہاں مثالاً غواصی کی دونوں مثنویوں سے چیدہ چیدہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

قلم کاف و نون سے جو نکلیا بہار ... سو پہلے بچن کوں کیا آشکار
بچن عرش کرسی پو تے دباے ہیں ... بچن آدمی کے بدل آئے ہیں
بچن تے سوالاں جواباں ہو دیں ... بچن تے حساباں کتاباں ہو دیں
بچن تے ہوی فام نیکی بدی ... بچن تے ہوے منتہی مبتدی
بچن تے چلے دین و دنیا تمام ... بچن کے ہیں محتاج سب خاص و عام
بچن غیب کے ہیں عجب جوہراں ... بچن کے سو ہیں جوہری شاعراں

میر سعادت علی رضوی

تانا شاہ کے ہندو دیوان

مادنا، پنیلو اور اکنا پنتو کے بارے میں مستند فارسی کتب میں کوئی مواد نہیں البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابوالحسن تانا شاہ کے وزراء تھے کوئی فارسی تاریخ ایسی نہیں ہے جو ان کو بدکردار اور جنسی بے راہ رو ثابت کرتی ہو۔ تعجب کا مقام ہے کہ ان پچھ کسی کتاب میں بھی ان کی بدکرداری کا کہیں ذکر نہیں جس سے ان موزخوں کی رائے کی تائید ہو سکے۔ یورپی کمپنیوں کے مکاتیب سے ان کی زندگی پر کچھ روشنی پڑتی ہے لیکن ان کی رائے اس وجہ سے قطعی تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ یہ فریق متعلقہ بھی ہیں اور خود غرض بھی۔ مقامی روایات، قصے کہانیاں ہی ہمارے وہ ماخذ ہیں جن سے ہم کچھ مستفید ہو سکتے ہیں۔ ان واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان وزراء کی زندگی کا مختصر تذکرہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے اور حتی المقدور اس امر کی کوشش کی جائے گی کہ ان کی زندگی کا کوئی ایسا پہلو پیش نہ کیا جائے جو موجودہ مواد کی بنا پر مابہ النزاع بن سکے۔

دیوان مادنا

اکنا اور مادنا پنگلی بھانو پنتولو کے فرزندان نیک بخت تھے۔ بھانوجی پنتولو ہنمکنڈہ کا عامل یا عہدہ دار تھا۔ اس نے اپنے چاروں بیٹوں کی عمدہ تعلیم و تربیت کا انتظام کیا تھا۔ اکنا اور مادنا ختم تعلیم کے بعد عبداللہ قطب شاہ کے درمیانی عہد سلطنت میں حیدرآباد آئے۔ مرزا سید احمد نے ان کو اپنے صیغہ حساب میں ملازم رکھا تھا اور حالات کی ناموافقت کے باوجود وہ اپنی ان تھک محنتوں کی وجہ سے درجہ بدرجہ ترقی کرتے گئے اور ۱۶۶۶ء کے بعد مادنا سید مظفر سپہ سالار عبداللہ قطب شاہ کا پیشکار مقرر ہوا۔ اس طرح جب اس کو قلمدان وزارت سپرد کیا گیا تو یہ اس کے وسیع تجربوں کی بنا پر تھا نہ کہ کسی اور ذریعے کے تحت۔

(۱) ۱۶۷۲ء کے انقلاب میں مادنا نے سید مظفر سے کسی طرح کم حصہ نہ لیا تھا۔ سید مظفر اور موسیٰ خاں علی الترتیب میر جملہ اور سرخیل مقرر ہوئے اور مادنا میر جملہ کا پیشکار مقرر ہوا۔ سید مظفر کی حرص اقتدار نے اسے ایک ایسی مصلحت اختیار کرنے کی ترغیب دی جس کے نتیجے میں بادشاہ حکومت کا برائے نام صدر رہ جاتا ہے۔ سید مظفر اہم معاملات میں بھی بادشاہ کا مشورہ نہیں لیتا تھا جس سے علانیہ مخالفت کی بو آتی تھی۔ ابوالحسن جیسے عاقل اور مدبر حکمران سے یہ حرکت کب برداشت ہو سکتی تھی لیکن وہ کھلم کھلا اس کو بے دخل کر دینے پر بھی آمادہ نہ تھا اس لیے اس نے اکنا اور مادنا دونوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور ان کے ذریعہ سید مظفر کے متعلقین اور فوج کے عہدہ داروں کو ہمنوا بنا کر ۱۶۷۴ء میں بھرے دربار میں سید مظفر کی نازیبا حرکتوں کا راز فاش کر دیا اور اس سے قلمدان وزارت لے کر مادنا کے سپرد کر دیا۔ اس طرح مادنا اپنی قابلیت، وفاداری اور تجربے کی بنا پر عہدۂ وزارت عظمیٰ پر فائز ہوا۔ اور دربار شاہی سے سوریا پرکاش راؤ کا خطاب اور خلعت پایا۔ اکنا اپنے بھائی کا پیشکار تھا۔ اب ہم کو ان کی حکومت کے تین پہلوؤں سے واقف ہونا ہے۔ (۱) اندرونی مصلحت (۲) خارجی حکمت عملی (۳) فوجی تنظیم۔

اول الذکر کے بارے میں ان کے اصول حکومت کے متعلق کوئی تفصیلی معلومات اب تک فراہم نہ ہو سکیں تاہم موجودہ قلیل معلومات کی بدولت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے پیشرؤوں کی حکومت سے زیادہ ان کے طریقۂ کار سے ملک میں باضابطگی اور امن قائم ہو سکا، تجارت، کان کنی، جہاز رانی اور زراعت میں بہت ترقی ہوئی البتہ گولکنڈہ کے کرناٹکی مقبوضات میں جو بعد میں حاصل کیے گئے تھے نظم و نسق قائم کرنے کا موقع نہیں ملا۔ قبل اس کے ہم کوئی قطعی رائے پیش کریں ہمارا اخلاقی فرض یہ ہوگا کہ ہم ملک کے ان حالات پر غور کریں جن کی وجہ سے ملک کو ناگفتہ بہ مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اورنگ زیب کی حکمت عملی کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ گولکنڈہ کو اس قدر

ملک دام خاں — وزیر گولکنڈہ

مادنا دیوان گولکنڈہ

امیر گولکنڈہ

فریب بنایا جائے کہ حکومت کا نظام درہم برہم ہو جائے اور فوج منحرف ہو جائے۔ اس غرض سے انھوں نے آئے دن مطالبات میں اضافہ کرنا شروع کیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بادشاہ اپنے خانگی اور حرم کے جواہرات فروخت کرکے مطالبات پورے کرتے تھے۔ ملک و مالک کی مصاحبت سے مادنا کی حکومت کے بنیادی اصول کا ایک پہلو مثلاً تخفیف میں ظاہر ہوا تو دوسرا عدیم المثال ضبط و نظم میں۔ گولکنڈہ کی تاریخ میں یہ دونوں بہت اہم اور نئی باتیں ہیں۔ تمام امراء، عہدہ داروں کی تنخواہوں میں تخفیف کی گئی۔ اعلیٰ اور ادنیٰ تمام عہدہ دار اس قانون کی پابندی کرنے پر مجبور کئے گئے اور یہی وجہ ہوئی کہ تمام لوگ وزیر کے مخالف ہو گئے۔ مادنا کی غیر ہر دلعزیزی کا یہ ایک اہم اور بنیادی سبب ہے۔ اس واقعہ میں مادنا سے زیادہ قدیم امراء قابل الزام ٹھیرتے ہیں جو اپنی تنخواہ کا ایک قلیل حصہ حکومت کو دینے کے لئے تیار نہیں تھے اور ایک واویلا مچا کر حکومت کو کمزور بنا دیا۔ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مادنا کی عزت عوام میں زیادہ تھی ۱۰۹۶ھ تک وزیر اعظم نے تین مرتبہ پورے ملک کا دورہ کیا ہے۔

دوسرا پہلو خارجی مصلحت کا ہے۔ دکنی آزاد سلطنتیں ذاتی تحفظ کیلئے مغلوں کے مقابلہ میں ایک دوسرے کی مدد کرتی تھیں چنانچہ عبداللہ قطب شاہ نے مرزا راجہ جے سنگھ کے خلاف علی عادل شاہ ثانی کی مدد کے لئے نیک نام خاں کے تحت بارہ ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادوں کی ایک بڑی فوج روانہ کی۔ مادنا اور ابوالحسن نے اس مصلحت کو برقرار رکھا اور مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے لئے ایک قومی محاذ بنا لیا۔ یہ اسی کا انتہائی تدبر اور سیاست دانی ہے کہ اس نے سیواجی کے ہاتھوں کو دوستی اور رشوت کی رسی سے باندھ دیا اور اس طرح سلطنت گولکنڈہ سیواجی کی تاخت و تاراجی سے بچی۔ اس دور اندیشی کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ اس نے قلعہ جات ورنگل، کنڈویر، گولکنڈہ وغیرہ کو مستحکم کیا اور ہر ایک کی حفاظت کے لئے بارہ ہزار سپاہیوں کو متعین کر دیا۔ بیجاپور میں اپنے بھائی اکنا کو حاجب اس لئے مقرر کیا تھا کہ وہاں کی خارجی مصلحت کی رہبری کرے۔ مادنا نے ابوالحسن کو مشورہ دیا تھا کہ وہ قلعہ گولکنڈہ میں محصور نہ ہو جائے بلکہ کسی دوسرے کے قلعہ میں جائے اور بصورت ضرورت گولکنڈہ کو فوجی امداد روانہ کرے لیکن چونکہ شیخ منہاج کے مشورے کا زیادہ اثر تھا اس لئے اس مشورہ پر عمل نہیں کیا گیا۔ "مادنا اور اکنا منصب کے لالچ میں ابوالحسن کو اورنگ زیب کے ہاتھوں فروخت کرنا چاہتے تھے" یہ الزام تاریخ کے کسی طالب علم کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ یہ دونوں بھائی اورنگ زیب اور ابوالحسن سے خوب واقف تھے۔ فوجی تنظیم کے بارے میں بجائے اس کے کہ ہم اپنی رائے کا اظہار کریں مناسب ہوگا کہ واقعات کا اظہار کر دیا جائے جس سے ناظرین کو خود رائے قائم کرنے کا موقع مل سکے۔ ۱۰۹۵ھ میں گولکنڈہ کی فوج دکن کے مغل صوبہ دار کے لشکر کا مقابلہ ایک دن بھی نہ کرسکی اور قلعہ گولکنڈہ مغل گولہ باری کی تاب نہ لا سکا۔ لیکن ۱۰۹۶ھ اور ۱۰۹۷ھ میں شہنشاہیت کی ساری قوت ملکھیڑ کے میدان میں تین مہینے تک روکی گئی۔ تمام تاریخیں گولکنڈہ کی فوج کی بہادری کے کارناموں سے بھری پڑی ہیں۔ اگر میرزا ابراہیم باغی نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ مغلوں کو ملکھیڑ کے میدان میں ایسی شکست فاش ہوتی کہ مغل پھر ادھر کا رخ نہ کرتے۔ محاصرۂ گولکنڈہ سے ہر شخص واقف ہے۔ ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ناظرین اپنی ذاتی رائے قائم کرسکتے ہیں۔

مادنا پر ظالم اور متعصب ہونے کا جو الزام لگایا گیا ہے وہ شہنشاہی اغراض کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ گولکنڈہ کی بربادی کا ایک حیلہ ہے۔ ان کے قتل کا واقعہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قتل سے پہلے مسعود خاں اور شرزہ خاں کے بارے میں بیجاپور میں مصلحت اختیار کی گئی تھی چنانچہ ۱۰۹۷ھ میں اعیان سلطنت نے سازش کی اور ان کو قتل کرا دیا۔ جمشید نامی ایک غلام کے چند اور دوسرے غلاموں کے ساتھ ان کے سر تن سے جدا کر کے شاہزادہ شاہ عالم بہادر کے پاس روانہ کئے۔ حرم سے سروما اور جانی بی بی نے اس سازش میں زیادہ حصہ لیا ہے۔

شہزادہ نے ان کے سروں کو بہادر خان کے ذریعہ شولاپور میں اورنگ زیب کے پاس روانہ کیا جہاں وہ ہاتھی کے پیروں تلے روندے گئے ۔

اکنا پنگار

یہ مادنا کا برادر اعیانی تھا ۔ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص غیر مہذب ، منہ پھٹ اور بدزبان تھا ۔ مادنا کے وزیر اعظم بننے کے بعد یہ ان کا پیشکار مقرر ہوا ۔ اور پھر قطب شاہی کرناٹک کا صوبہ دار بنا ۔ صوبہ داری کے عہدے سے سرلشکری پر ترقی پائی ۔ عہد نامہ بیجاپور کے بعد وہاں کا حاجب مقرر ہوا ۱۶۸۵ء میں بیجاپور سے واپس ہوا اور ۱۶۸۶ء میں مادنا کے ساتھ قتل کر دیا گیا ۔

اس نے کرناٹک اور مشرق کا دو مرتبہ دورہ کیا ۔ بندرگاہوں کے انتظام میں نہایت بے مروتی سے کام لیا اور اس طرح گولکنڈہ کی آمدنی میں اضافہ کیا ۔ فوج کی تنظیم میں اس کا بہت حصہ ہے اس کے دو بھانجوں رستم راؤ اور پودلی لنگنا نے بادشاہ کی کئی اہم خدمات انجام دیں ۔ خافی خاں رستم راؤ کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے کہ وہ صاحب السیف والقلم تھے پودلی لنگنا نے انگریزوں کو سربلند ہونے نہ دیا اور بار بار زک دے کر گولکنڈہ میں انہیں برسر اقتدار ہونے سے روکتا رہا اس کے مدد و معاون اس کے دونوں ماموں تھے جو ہر طریقے سے اس کی اس کام میں مدد کرتے تھے ۔ اکنا کے ایک خط میں انگریزوں کو ان الفاظ میں تنبیہ کی گئی کہ وہ پودلی لنگنا کے اقتدار کو تسلیم کریں ۔ اس کے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈہ کی بحری تجارت بھی تھی ۔ اور خود ان بھائیوں کے تجارتی جہاز تھے ہیاورٹ نامی ولندیزی رسالے میں ان کو مغرور اور شریر النفس بیان کیا گیا مگر اس کی تائید کسی اور تاریخ سے نہیں ہوتی ۔ موجودہ معلومات کی بنا پر ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ان کی طبیعت میں روکھا پن زیادہ تھا ۔

بہرکیف دونوں بھائیوں نے ملک و مالک کی بے لوث خدمت کی ہے لیکن ان کی محنت کا انہیں معاوضہ نہیں ملا ۔ انہیں حکومت کو ایسی نازک گھڑی میں چلانا پڑا جس میں کامیابی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ تاہم چودہ سال تک جس قابلیت سے ان بھائیوں نے ملک کے اس ٹمٹماتے دیے کو گل ہونے سے روکا ہے وہ قابل تحسین ہے بہت ممکن ہے کہ مورخ وان اس حقیقت کے اظہار کی طرف متوجہ ہو کر ان الزامات کو غلط ثابت کر دیں گے ۔ اور زمانہ بتا دے گا کہ ملک و مالک کے بہی خواہ کبھی نہ کبھی اپنی حقیقی قدر و منزلت حاصل کر کے رہیں گے ۔

کے ، وی بھوپال راؤ

عبدالرزاق لاری گولکنڈہ کے دروازے پر

اک شیر ژیاں ہے کہ کھڑا جھوم رہا ہے
زخموں سے لہو گر کے قدم چوم رہا ہے

تلوار بھی اک ہاتھ میں بل کھائی ہوئی ہے
معلوم نہیں کس کی قضا آئی ہوئی ہے

دروازے میں اک جان ہے اور لاشوں کے انبار
اور سمتِ مقابل میں ہے تلواروں کی جھنکار

معلوم ہے اس کو کہ کوئی ساتھ نہ دے گا
بیٹا کو اٹھانے میں کوئی ہاتھ نہ دے گا

پر اک دلِ لاری ہے کہ جو جانِ وفا ہے
یہ مطلعِ انوارِ وفا ، کانِ وفا ہے

اکبر وفاقانی

گولکنڈہ کا آخری سپہ سالار۔ عبدالرزاق لاری زخموں سے بے ہوش ہو کر گرنے سے پہلے

سلطنتِ ابد مدت آصفجاہی

اور

سلاطینِ آصفی

سلطنت آصفیہ کا قیام تاریخ ہند کا ایک نہایت درخشاں باب ہے۔ اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں اورنگ زیب کی وفات کے
[بعد کوئی] مرکزی شخصیت نواب نظام الملک سے زیادہ نمایاں نہ تھی جو منتشر قوتوں کو یکجا کر کے مرکزیت پیدا کرنے اور ایک بڑی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو سکتی تھی
چنانچہ نواب نظام الملک نے اول تو سلطنت مغلیہ کے بقا، اس کی اصلاح اور استحکام کے لئے ممکنہ کوشش کی لیکن جب اس میں کامیابی کی صورت
نظر نہ آئی تو انھوں نے حریفوں کو شکست دے کر سلطنتِ آصفیہ کی بنا ڈالی (۱۷۲۴ء) نواب نظام الملک کے بعد جس شخصیت نے سینہ سپر
ہو کر مشکلات کا مقابلہ کیا اور سلطنت کے لئے جو خطرات تھے ان کو دور کیا اور سلطنت آصفیہ کی صحیح معنوں میں تعمیر کی وہ بانیٔ سلطنت کے فرزند
آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں بہادر تھے۔

قیام سلطنت آصفیہ سے بہت سے فوائد حاصل ہوئے۔ اول تو دکن کی بدنظمی اور بدامنی کا خاتمہ ہو کر امن و امان اور عدل و انصاف کا
دور شروع ہوا۔ دوم یہ کہ ملک میں زراعت کی سرسبزی، صنعت و حرفت کی ترقی اور تجارت کی گرم بازاری ہونے لگی۔ بالخصوص شاہان
آصفیہ کی شہرۂ آفاق رواداری اور لاثانی حب الوطنی روایتی فیاضی اور عدیم المثال رعایا پروری نے ملک کی خوشحالی میں چار چاند لگا دئے
حقیقت یہ ہے کہ شاہان آصفی کی حکومت اپنی ساری رعایا پر نہ صرف منصفانہ رہی۔ بلکہ ہمیشہ مشفقانہ اور پدرانہ رہی ہے۔ انھوں نے قیام امن
و عدل و انصاف تک ہی خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ آثار قدیمہ کی حفاظت اور علم و فن کی سرپرستی میں بڑا حصہ لیا۔ اور جدید قوم ساز سررشتوں کو قائم کر کے رعایا
کی اخلاقی اور تعلیمی ترقی میں دن دونی اور رات چوگنی اضافہ کیا۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ وسط انیسویں صدی ہی سے یعنی سالار جنگ اول کی وزارت کے زمانہ سے ترقی اور اصلاح کا دور شروع ہو گیا تھا چنانچہ
اس وقت مبارک عہد عثمانی میں جس تیز رفتاری کے ساتھ دکن میں ہر جہتی ترقی ہو رہی ہے وہ تاریخ ہند میں عدیم المثال ہے۔ حیدرآباد جدید
کی تعمیر کے سلسلے میں اعلیٰ حضرت بندگان عالی کا نام رہتی دنیا تک یادگار رہے گا کہ زراعت، صنعت و حرفت، تجارت، تعلیم، تعمیرات اور حفظان صحت غرض
ہر شعبۂ زندگی میں غیر معمولی چہل پہل ہے۔ نتیجہ یہ کہ اب دکن صرف مشرقی تمدن اور قدیم معاشرت ہی کا مرکز نہیں ہے بلکہ اپنے عمدہ
ترقیات کے اعتبار سے حیدرآباد مشرقی اور مغربی تہذیب کا گہوارہ اور قدیم و جدید تمدن کا سنگم بن گیا ہے۔ موجودہ ہمہ جہتی ترقی کی رفتار کو
دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل نہیں کہ دور عثمانی میں حیدرآباد کا مستقبل اس کے بہمنی اور قطب شاہی ماضی سے کہیں شاندار
ہوتا جا رہا ہے۔

نواب نظام الملک آصفجاہ اول بانی سلطنت آصفیہ

(۱۷۲۴ء تا ۱۷۴۸ء)

نواب نظام الملک آصفجاہ اول کا خاندانی سلسلہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ تک اور آگے حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے۔ نواب نظام الملک کے دادا عابد خاں عہد شاہ جہاں میں ہندوستان آئے تھے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں منصب پنج ہزاری و صدارت کل کے عہدہ پر فائز تھے گولکنڈہ کے محاصرہ میں گولے کے زخم سے شہید ہوئے۔

اُن کے فرزند میر شہاب الدین خاں اورنگ زیب کے مشہور امرا میں سے تھے جن کو منصب ہفت ہزاری و غازی الدین خاں فیروز جنگ کا خطاب عطا ہوا تھا۔ انھیں کے نامور فرزند نواب نظام الملک آصفجاہ اول تھے۔

اُن کا اصلی نام میر قمر الدین تھا اور ولادت ۱۶۷۱ء میں ہوئی تھی۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں "چین قلیچ خاں" کا خطاب اور منصب پنج ہزاری سے سرفراز ہوئے بعد ازاں بیجاپور کی صوبہ داری پر فائز ہوئے تھے۔ غرض اورنگ زیب کی اُن پر خاص عنایت تھی حتیٰ کہ اورنگ زیب نے خاندانی حالات، وجاہت، بہادری و تدبر کی بنا پر ان کو اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کام بخش کی لڑکی بیاہ دینی چاہی تھی لیکن مصلحت کی بنا پر نظام الملک نے اس کو پسند نہیں کیا۔

فرخ سیر کے زمانہ میں ان کو "نظام الملک بہادر فتح جنگ" کا خطاب ہفت ہزاری منصب اور دکن کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ چنانچہ ۱۷۱۳ء میں وہ بحیثیت صوبہ دار دکن اورنگ آباد آگئے تھے۔ لیکن اورنگ زیب کے نااہل جانشینوں کے زمانہ میں جب ملک کی حالت خراب ہوتی گئی اس وقت نظام الملک کو بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ وہ دکن سے مالوہ کی صوبہ داری پر بھیجے گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سارا ملک بادشاہ گر سیدوں (سید حسین علی اور سید عبداللہ دونوں بھائیوں) کے مظالم سے تنگ آگیا تھا۔ اس وقت سب کی نظریں نظام الملک کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس نازک موقع پر نواب نظام الملک نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ مخالفین سے سخت لڑائی ہوئی (جس میں سید دلاور علی خاں اور سید عالم علی خاں نائب صوبہ دار دکن مارے گئے) اس طرح نواب نظام الملک نے بزور شمشیر خاندیس اور برار وغیرہ کے علاقوں کو فتح کیا۔ غرض سیدوں کا خاتمہ کرکے نہ صرف محمد شاہ کو انھوں نے نجات دلائی بلکہ سارے ملک پر ایک بڑا احسان کیا۔ محمد شاہ نے اس کے صلہ میں آصفجاہ کا خطاب دے کر ان کو سلطنت دہلی کا وزیر مقرر کیا لیکن دربار کی حالت دیکھ کر انھوں نے اپنے بڑے فرزند غازی الدین خاں کو دہلی میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود حیدرآباد تشریف لائے۔

راستہ میں برار کے قریب ان کو مبارز الدین خاں سے لڑنا پڑا جس میں وہ مارا گیا۔ غرض یہ وہ زمانہ ہے کہ ملک میں فتنہ و فساد کا بازار گرم تھا۔ کوئی مرکزی طاقت موجود نہ تھی جو امن و امان قائم کرسکتی ہو۔ اصل تو نواب نظام الملک نے سلطنت مغلیہ کو بچانے کی انتہائی کوشش کی لیکن جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو مجبوراً ۱۷۲۴ء میں سلطنت آصفیہ کی خودمختاری کی بنا رکھی (یہی وجہ ہے کہ حسب فرمان خسروی ہر سال ۲۹ رجب کو اسی خودمختاری سلطنت آصفیہ کی یادگار میں عام تعطیل دی جاتی ہے)۔ لیکن اس کے باوجود سلطنت دہلی کی خیرخواہی اور وفاداری میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ چنانچہ ۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تو وہ فوراً

نواب میر قمر الدین خان فتح جنگ نظام الملک آصف جاہ اول

نواب میر نظام علی خان آصف جاہ ثانی

دہلی پہنچ گئے اور وہاں غیر معمولی جرأت سے کام لے کر نادر کو لوٹ مار اور قتل عام سے روکا۔

دہلی سے دوبارہ دکن آکر انھوں نے مرہٹوں کا سد باب کیا اور دیدیتے تا پتی سے لے کر جنوبی ہند اور رکاٹ تک سارے ممالک محروسہ میں امن و امان قائم کیا۔ اس سے رعایا کو اطمینان نصیب ہوا۔ اس طرح سلطنت آصفیہ کے قیام سے ملک میں معاشی خوش حالی کا آغاز ہوا۔ نظام الملک بڑے رحم دل اور فیاض بادشاہ تھے۔ ان کو ہمیشہ اپنی رعایا کا بڑا خیال رہتا تھا۔ آخرکار ۱۷۴۸ء میں بمقام برہان پور انتقال کیا۔ چنانچہ دولت آباد میں ان کا مقبرہ موجود ہے۔

مختصر یہ کہ نواب نظام الملک نہ صرف اوائل اٹھارویں صدی کے سب سے بڑے قائد، زبردست سپہ سالار اور بہترین مدبر کی حیثیت سے یاد کیے جائیں گے بلکہ موجودہ سلطنت آصفیہ کے بانی ہونے کی وجہ سے تاریخ میں ان کی شخصیت ہمیشہ نمایاں رہے گی۔

نواب میر نظام علی خاں آصفجاہ ثانی

(۱۷۶۱ء تا ۱۸۰۳ء)

نواب نظام الملک کی وفات پر دکن میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ اسی سلسلہ میں انگریزی اور فرانسیسی کمپنیوں کو ریشہ دوانیوں کا خوب موقع ہاتھ آیا۔ اولاً یہاں پر نظام الملک کے دوسرے فرزند ناصر جنگ نے دو سال تک حکومت کی ان کی شہادت پر نظام الملک کے نواسے مظفر جنگ چند روزہ حکومت کے بعد مارے گئے اس کے بعد امراء نے صلابت جنگ کو تخت نشین کیا جو اور بھائیوں کی بہ نسبت عمر میں بڑے تھے۔ لیکن ان کا زمانہ شروع سے آخر تک ایک کمزور زمانہ تھا۔ جب کہ مرہٹہ اور فرانسیسی دکن پر چھا گئے تھے اور ملک کے انتظامی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ اس لیے امراء کے مشورہ سے بعض ملکی مفاد کے مدنظر صلابت جنگ کی علٰحدگی عمل میں آئی اور نواب آصفجاہ ثانی تخت نشین ہوئے

نواب میر نظام علی خاں بہادر نظام الملک کے چوتھے فرزند تھے اُن کی ولادت ۱۷۳۴ء میں ہوئی تھی بچپن ہی سے وہ بہادر و فنون سپہ گری سے خوب واقف تھے۔ چونکہ اپنے بھائی صلابت جنگ کے زمانہ میں وہ وزیر رہ چکے تھے اس لئے ان کو سلطنت کے معاملات کا بہت وسیع تجربہ تھا بادشاہ ہوتے ہی انھوں نے کھوئے ہوئے علاقے مرہٹوں سے حاصل کئے اور فرانسیسی اثرات کو دکن سے دور کیا بعد ازاں نہایت دور اندیشی سے کام لے کر انگریزوں سے رابطہ اتحاد قائم کیا۔ اس زمانہ میں ٹیپو سلطان کی قوت بڑھ رہی تھی۔ اس لئے انگریزوں نے آصفجاہ ثانی اور مرہٹوں کو ملا کر "اتحاد ثلاثہ" قائم کیا اور میسور کے خلاف کامیابی حاصل کی اس کے کچھ عرصہ بعد جب مرہٹوں نے چوتھ کے مطالبہ کے سلسلہ میں حیدرآباد پر حملہ کیا تو انگریزی گورنر جنرل سرجان شور نے عدم مداخلت کا بہانہ کر کے مدد دینے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے سرکار نظام کو بمقام کھرڈلا ناکامی ہوئی اور سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

اس پر آصفجاہ ثانی نے انگریزی فوجوں کو برخاست کر کے ان کی جگہ موسیو ریموں کی ماتحتی میں فرانسیسی فوجیں ملازم رکھیں لیکن موسیو ریموں کی موت کے بعد جب انگریزی کمپنی کا مشہور و معروف گورنر جنرل ولزلی ہندوستان آیا تو اس نے نہایت حکمت عملی سے

آصفجاہ ثانی کو پھر اپنی طرف کرکے فرانسیسی فوجوں کو دکن سے برخاست کرا دیا۔

حیدرآباد کے عہد معاونت قبول کرنے کے بعد یہاں سے رقمی اور فوجی امداد حاصل کرکے ولزلی نے میسور کی ریاست پر حملہ کیا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت اور ریاست میسور کے خاتمہ کے بعد کچھ علاقے مثلاً کڑپہ، کرنول اور بلاری وغیرہ حیدرآباد کو برائے نام ملے تھے لیکن فوجی مصارف کے نام سے بہت جلد واپس لے لئے گئے۔

سنہ ۱۸۰۰ء میں آصفجاہ ثانی اور انگریزوں کے درمیان عام اعانت وحفاظت باہم دیگر کا مشہور عہدنامہ ہوا چنانچہ اُس وقت سے آج تک تاج برطانیہ اور ریاست حیدرآباد کے جو خوش گوار تعلقات قائم ہیں وہ اُسی زمانہ کی یادگار ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آصفجاہ ثانی نے انگریزوں سے مستقل تعلقات قائم کرکے سلطنت آصفیہ کے لئے فرانسیسیوں، ٹیپو سلطان اور مرہٹوں کے جو زبردست خطرات تھے ان کو رفع کیا اور اندرون ملک سے فسادات کو دور کیا اور امن قائم کیا۔ اس طرح ۱۷۶۱ء سے ۱۸۰۳ء تک نہایت کامیابی کے ساتھ انھوں نے حکومت کی اور اپنی حکمت عملی اور دور اندیشی سے نہ صرف سلطنت کی ڈوبتی ناؤ کو بچالیا بلکہ اپنے عہد حکومت میں ممالک محروسہ کا رقبہ وسیع کرکے سلطنت آصفیہ کا وجود ہمیشہ کے لئے مستقل اور مستحکم کردیا۔ ان وجوہات کی بنا پر اور خصوصاً اٹھارویں صدی کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب کہ ہندوستان میں ہر نقطۂ نظر سے ایک عام انحطاط کا دور چلا آرہا تھا۔ ہمیں آصفجاہ ثانی کی شخصیت کیا بلحاظ بہادری اور کیا بلحاظ تدبر اپنے ہم عصروں میں سب سے ممتاز نظر آتی ہے۔ اور وہ بجا طور پر سلطنت آصفیہ کے حقیقی معمار سمجھے جا سکتے ہیں۔

نواب سکندرجاہ آصفجاہ ثالث

(سنہ ۱۸۰۳ء تا سنہ ۱۸۲۹ء)

نواب سکندرجاہ آصفجاہ ثانی کے بڑے بیٹے تھے اور ان کا نام میر اکبر علی خاں تھا۔ ان کے اوائل حکومت کا اہم ترین واقعہ مرہٹوں اور انگریزوں کی جنگ ہے۔ چونکہ نواب سکندرجاہ نے اس لڑائی میں ہر طرح سے انگریزوں کی امداد فرمائی تھی اس لئے کامیابی حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے دولت آباد وغیرہ کے علاقے نواب سکندرجاہ کو واپس کردئے۔ لیکن اُسی زمانہ سے فوجی اور ملکی معاملات میں انگریزوں نے زیادہ دخل دینا شروع کیا۔ چنانچہ میر عالم کے انتقال پر مدارالمہام کے تقرر کا مسئلہ پیش ہوا تو رزیڈنٹ وقت کپتان سڈنہم نے بہت کچھ مداخلت کی لیکن سکندرجاہ نے منیرالملک ہی کو اپنی مرضی سے وزیر منتخب کیا البتہ اتنا ضرور ہوا کہ سارے اختیارات پیشکار مہاراجہ چندولعل کے ہاتھوں میں آگئے، (جن کی تائید میں رزیڈنٹ تھا) چنانچہ اس کے بعد تقریباً تیس سال تک ریاست میں چندولال ہی کا بڑا عمل دخل رہا۔ ریاست کے انتظامی اور فوجی معاملات میں رزیڈنٹ رسل کی پیش قدمی، انگریزوں سے مہاراجہ چندولال کی غیر معمولی ہمدردی اور پامر کمپنی سے سودی قرضہ کا لین دین یہ وہ چیزیں تھیں جس کی وجہ سے ریاست حیدرآباد کی مالی اور انتظامی حالت بد سے بدتر ہوگئی۔ چنانچہ دوسرے رزیڈنٹ مٹکاف نے جائزہ لیتے ہی صاف طور پر یہ کہہ دیا کہ نئی اعانتی فوجیں حیدرآباد کے خزانہ پر بہت بار ہیں اور پامر کمپنی کا جال ایک دوسری مصیبت ہے۔ اس لئے اس نے بعض مفید تجاویز پیش کئے۔ چنانچہ گورنر جنرل وقت مارکوئس آف ہسٹنگز نے پامر کمپنی کا قرضہ تو انگریزی حکومت

نواب میر اکبر علی خاں سکندر جاہ آصف جاہ ثالث

نواب میر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ آصف جاہ رابع

کی طرف سے ادا کرا دیا لیکن شمالی سرکاروں کی جو پیشکش آصفجاہ ثانی کے زمانہ سے جاری تھی وہ اس سلسلہ میں ہمیشہ کے لیے بند کر دی۔ اور فوجی بار حسب حال ریاست پر پڑتا رہا۔

مہاراجہ چندو لال کے عمل دخل کو دیکھ کر نواب سکندر جاہ نے خود امور سلطنت میں زیادہ حصہ نہیں لیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کے معاملات میں انگریزوں کی مداخلت روز بروز زیادہ بڑھتی گئی۔

نواب سکندر جاہ ایک خدا ترس رحمدل اور نیک بادشاہ تھے۔ ان کو اپنی رعایا کے آرام و آسایش کا بڑا خیال تھا چنانچہ انھوں نے کئی تالاب سڑکیں وغیرہ تعمیر کرائیں۔ غرض رفاہ عام کے بہت سے کام انجام دیئے۔ انگریزی اعانتی فوج کے لئے سکندر آباد کا شہر انھیں کی یادگار ہے۔

نواب ناصر الدولہ آصفجاہ رابع

(سنہ ۱۸۲۹ء تا سنہ ۱۸۵۷ء)

میر فرخندہ علی خاں نواب ناصر الدولہ سکندر جاہ کے صاحبزادے تھے۔ تخت نشین ہوتے ہی انھوں نے ملکی انتظامات کو درست کرنے کی کوشش کی رزیڈنسی کے اثرات کو کم کیا اس سلسلہ میں مہاراجہ چندو لال کے استعفا دینے کے بعد کچھ عرصہ تک بغیر کسی مدار المہام کے بذات خود وہ حکومت کے کام انجام دیتے رہے۔ اور پھر کئی مدار المہاموں کو خود ہی مقرر کیا اور معطل و علحدہ کر دیا۔ انگریزوں کے قرضہ کی رقم بڑھتی جا رہی تھی چنانچہ جب ڈلہوزی گورنر جنرل ہو کر ہندوستان آیا تو اس نے سخت تقاضا کیا کہ قرضہ کے معاوضہ اور فوجی اخراجات کے لئے ملک کے بعض اضلاع انگریزوں کے حوالے کئے جائیں۔ اُس زمانہ کا رزیڈنٹ جنرل فریزر نہایت منصف مزاج اور ریاست کا خیر خواہ تھا۔ اس طرح کی ناواجبی مداخلت کو پسند نہ کر کے اس نے خود استعفا دے دیا۔

لیکن ڈلہوزی نے پھر دباؤ ڈالا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد کی اعانتی فوج کے اخراجات اور قرضہ کے سلسلہ میں نواب ناصر الدولہ پر انتہائی دباؤ ڈالا گیا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی رو سے رائچور کا دوآبہ اور برار کا علاقہ عارضی پٹہ پر انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا اس واقعہ کا حیدرآباد کے وزیر سراج الملک پر اتنا اثر ہوا کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ ان کے بھتیجے میر تراب علی خاں سالار جنگ اول مدار المہام مقرر ہوئے جنھوں نے نہ صرف تین بادشاہوں کے زمانہ میں مدار المہامی کی اہم ترین خدمت انجام دی بلکہ جدید حیدرآباد کے بنانے میں شاید سب سے زیادہ حصہ لیا۔

نواب ناصر الدولہ کے زمانہ ہی سے انھوں نے سیاسی اصلاحات اور معاشی و تعلیمی ترقیات کا کام شروع کر دیا تھا جس کو بعد کے دو زمانوں کے زمانہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ملک کے جتنے بڑے ہو کر چھوٹے چھوٹے اراضیات سرمایہ داروں کے زیر قبضہ رہن تھے سالار جنگ نے ان علاقوں کو چھڑوا لیا اور دوسری اصلاحات کے کام میں مصروف تھے کہ ادھر شمالی ہند میں غدر کی آگ بھڑک اٹھی اور ادھر نواب ناصر الدولہ نے رحلت فرمائی۔

نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس

(۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء)

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی اہمیت غیر معمولی ہے کیونکہ اس سال شمالی ہند میں غدر ہونے کی وجہ سے دہلی و میرٹھ سے لے کر وسط ہند تک ہر جگہ ہندوستانی فوج نے سرکشی کی تھی۔ غرض وہ وقت انگریزوں کے لئے نہایت نازک تھا۔ حیدرآباد کے لئے بھی وہ زمانہ کچھ کم اہمیت کا نہ تھا کیونکہ ناصر الدولہ کے انتقال کے بعد یہاں ان کے بڑے صاحبزادے نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ تخت نشین ہوئے تھے۔ انھوں نے نہ صرف ریاست حیدرآباد اور جنوبی ہند میں غدر کی آگ کو پھیلنے سے روکا بلکہ انگریزوں کی ہر طرح سے مدد کی۔ مختصر یہ کہ نواب افضل الدولہ اور ان کے وزیر سالار جنگ نے انگریزوں کی ڈوبتی ناؤ کو بچالیا۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمہ کے بعد ہندوستان کی حکومت جب راست شاہان انگلستان کے ہاتھ آگئی تو نواب افضل الدولہ کی خدمات کے صلہ میں شوراپور اور رائچور کا دوآبہ حیدرآباد کو واپس مل گیا۔

نواب افضل الدولہ کے زمانے سے حیدرآباد جدید کی ابتدا ہوتی ہے۔ اب بھی ایسے سن رسیدہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے نواب افضل الدولہ اور ان کے خیرخواہ اور وفادار وزیر سالار جنگ اول کو اصلاح اور ترقی ملک کے کاموں میں ہمہ تن مصروف دیکھا تھا چنانچہ ان کی زبانی اس زمانے کے حالات سننے سے اس عہد کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔

اسی طرح حیدرآباد میں بہت سی نشانیاں اور کئی عمارتیں ایسی موجود ہیں۔ جیسے افضل گنج۔ افضل گنج کا پل۔ مسجد افضل گنج یا چومحلہ پیالیس وغیرہ جو اسی عہد کی یادگار ہیں۔

نواب افضل الدولہ کا عہد حکومت صرف بارہ سال تک رہا لیکن سچ تو یہ ہے کہ حکومت آصفیہ کے موجودہ نظام حکومت اور انتظامات مملکت کی داغ بیل اسی عہد میں ڈالی گئی۔ اول تو سارے ملک کی پیمائش کرائی گئی۔ مالگزاری مقرر کی گئی دوسرے یہ کہ سارے ملک کو چار صوبوں، سترہ ضلعوں اور بہت سے تعلقوں میں تقسیم کرکے صوبہ دار۔ تعلقدار اور تحصیلدار مقرر کئے گئے۔ انتظامی اور مالی اصلاحات کے علاوہ سررشتہ عدالت اور پولیس کی تنظیم عمل میں آئی۔ نیا سکہ جاری ہوا۔ اس طرح امن و امان اور عدل و انصاف کے سررشتوں کی تنظیم کے بعد قوم ساز سررشتوں کے قیام کی طرف توجہ کی گئی اور رعایا کے آرام و آسائش علمی اور مادی ترقی کی خاطر سررشتہ جات تعلیم۔ طبابت اور تعمیرات وغیرہ کا قیام عمل میں آیا۔ خاص کر تعلیم کے معاملہ میں دور جدید کی تاریخ میں پہلا قدم نواب افضل الدولہ کے عہد میں اٹھایا گیا کہ ایک طرف تو ہر ضلع اور ہر تعلقہ میں مدارس قائم کئے گئے۔ اور دوسری طرف خاص شہر حیدرآباد میں دارالعلوم اور مدرسہ عالیہ کا قیام عمل میں آیا۔ جہاں عام طور پر ذریعہ تعلیم مذہبی زبان تھی۔

ذاتی حالات کے اعتبار سے افضل الدولہ بہادر بڑے خداترس، بہت نیک ملنسار اور سادہ مزاج بادشاہ تھے۔ رفاہ عام کے کاموں میں غیر معمولی دلچسپی لینے کے علاوہ بڑے فیاض اور علم و فن کے بڑے قدردان تھے تاریخ میں ان کا اور ان کے وفادار وزیر سالار جنگ اول کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا، کہ اس رحمدل بادشاہ اور خیرخواہ وزیر نے ریاست حیدرآباد کی اصلاح و ترقی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اور اس طرح حیدرآباد جدید کی تعمیر کا کام آغاز کیا۔ جس کو بعد کے زمانہ میں ترقی ہوتی گئی۔

باغِ عام

اور مدح حضرت آصف سابع خلد اللہ

کیا حسین ہے صورت گلفام باغ عام کی
آنکھ ہو اور شکل دل آرام باغ عام کی

صبح اس گلزار کی آئینہ رخسار حور
شانۂ گیسوئے لیلیٰ شام باغ عام کی

دیگر

نرگس شہلا میں عشوے چشم مے آشام کے
سنبل پیچاں میں گھونگر زلف عنبر فام کے

بارک اللہ جس قدر پانی کے چشمے ہیں یہاں
سب ہیں آئینے جمال روئے باغِ عام کے

دیگر

روئے گل پر کاکل سنبل ہے بل کھائی ہوئی
برگ گل میں لعل لب کی ہے جھلک آئی ہوئی

وہ ہے باغِ عام پر جوبن کہ انساں کیا جلیل
بنکے چشم شوق نرگس بھی تماشائی ہوئی

دیگر

آج باغِ عام سے ہی اور ہی شانِ دکن
ہر کلی اس بوستاں کی ہے گلستانِ دکن

پتی پتی نے لکھا ہے کلکِ قدرت سے جلیل
شاہِ عثماں آصفِ سابع سلیمانِ دکن

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

حیدر یار خاں منیر جنگ منیر الدولہ منیر الملک

ذرہ قلی خاں سالار جنگ موتمن الدولہ خاں دوراں

سہراب جنگ معین الدولہ مشیر الملک اعظم الامرا ارسطو جاہ

ارسطو جاہ

تولد ۱۱۶۵ھ   وفات ۱۲۱۹ھ

غلام سید نام او ر معین الدولہ سہراب جنگ مشیر الملک اعظم الامرا ارسطو جاہ فرزند ارجمند وکیل مطلق مختار دولت آصفیہ خطاب تھا ۱۱۶۵ھ میں تولد ہوئے۔ نوشیروان عادل کی اولاد سے تھے۔ آپ کے باپ فتح نواز خان کو حضرت آصفجاہ اول نے صوبہ دار برار مقرر کیا تھا۔ غلام سید خان آصفجاہ ثانی کے رفیق او مصاحب تھے۔ سید جنگ کے مارے جانے کے بعد معین الدولہ سہراب جنگ نظام کے ساتھ حالات صوبہ برار اور ترتیب و بنیاد کی دیوانی پر مامور کئے گئے۔

اس کے بعد پونہ او ناگپور کی سفارت پر بھیجے گئے۔ چنانچہ سہراب جنگ نے راؤ پنڈت پردھان اور رگھوجی بھونسلے کے پاس جاکر اپنا مفوضہ کام نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا۔ اس کے بعد ایک عرصہ بعد مشیر الملک اعظم الامرا کے خطاب کے ساتھ خدمت دیوانی سے سرفراز کئے گئے (۱۱۰۱ھ، ۱۱۸۹ھ)

آپ کی دیوانی کے اہم واقعات کی بڑی تفصیل ہے، جن کی صراحت کا یہ موقع نہیں ہے، مختصراً اس کا اظہار کیا جاتا ہے :-

(۱) سلطنت آصفیہ نے مرہٹوں کی تائید سے میسور پر چڑھائی کی مگر عین وقت پر مرہٹوں نے ساتھ نہیں دیا۔ الغرض تنہا آصفی فوج نے میسور پر حملہ کیا او فتحیاب ہوئی۔

(۲) انگریزوں کے ساتھ شریک ہوکر سلطنت آصفیہ نے میسور کی تیسری لڑائی میں حصہ لیا۔

(۳) مرہٹوں کے ساتھ جنگ کھرلہ واقع ہوئی جس میں بعض وجوہ سے آصفی فوج ناکام رہی۔

(۴) اعظم الامرا پونہ میں نظر بند کئے گئے۔

(۵) پونہ میں اعظم الامرا نے سیاسی چال چلی، روسا مرہٹہ میں نفاق ڈالکر ان کو آپس میں جدا کر دیا، اور پھر اپنی سیاسی چال اور توڑ جوڑ سے ان کی صفائی بھی کرادی، اور صفائی کرانے کے بعد جنگ کھرلہ کے نقصانات کی تلافی میں ایک کروڑ نقد تین کروڑ کے دستاویزات معافی چوتھ کی سند ممالک دولت آباد وغیرہ واپس لیکر حیدرآباد واپس ہوئے

(۶) میسور کی چوتھی لڑائی میں انگریزوں کی مدد کی گئی اور فتحیاب ہوئے۔

(۷) آصفجاہ ثانی کا انتقال ہوا اور آصفجاہ ثالث مسند حکومت پر جلوہ گر ہوئے، اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ۱۲۱۹ھ میں ارسطو جاہ کا انتقال ہو گیا سرور نگر میں دفن ہوئے۔ ارسطو جاہ اپنے ملک اور مالک کے سچے خیر خواہ رہے، مرتے دم تک آپ نے ملک اور مالک کی خدمت نہایت دیانت داری سے انجام دی۔ وہ اپنے وقت کے بڑے سیاست داں تھے، انھوں نے بیسیوں موقعوں پر سیاسی دل و دماغ سے کام لیکر کامیابی حاصل کی

ارسطو جاہ مذہبی آدمی تھے۔ فرائض کی پابندی سختی کے ساتھ کرتے تھے، جود و سخا میں مشہور تھے علما، و فضلا، کی صحبت سے بڑی دلچسپی تھی۔ شعر و سخن سے شغف تھا، ان کے دربار نے اُردو شاعری کی بھی بڑی خدمت کی۔

صدل ابو القاسم صدر ع ام

علی رضا خان غیور جنگ مدبر الدولہ صدر الملک امیر الامراء

میر عالم

تولد ۱۱۶۶ھ　　　وفات ۱۲۲۳ھ

ابوالقاسم میر عالم کے والد سید رضی شوستر ایران کے شیخ الاسلام کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سید رضی شوستر ہی میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۶۳ھ میں وہ اپنے بھائی کے ہمراہ ہندوستان آئے شاہجہان آباد میں چند روز قیام کے بعد شجاع الدولہ ناظم بنگال کے پاس بنگال چلے گئے اور وہاں ان کے داماد مرشد قلی کی رفاقت میں بسر کئے اور مرشد قلی کے ساتھ حیدرآباد آئے۔ آصف جاہ کی ملازمت اختیار کی۔ دارالانشاء میں مامور کئے گئے۔ حضرت آصف جاہ نے ایک جاگیر بھی مرحمت فرمائی تھی۔ ۱۱۹۴ھ میں سید رضی کا حیدرآباد میں انتقال ہوا دائرہ میر مومن میں دفن ہوئے۔

سید رضی بڑے قابل فرد اور مجتہد کا درجہ رکھتے تھے شاعری کا بھی شوق تھا قدسی تخلص کرتے تھے

میر ابوالقاسم المخاطب بہ میر عالم کی ولادت حیدرآباد میں ۱۱۶۶ھ م ۱۷۵۳ء ہوئی عربی اور فارسی میں بڑی اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ ریاضی میں مہارت تھی قلم برداشتہ عالی لکھا کرتے تھے فارسی شاعری اور انشاپردازی کا خاص ذوق تھا۔ بہرحال میر عالم اپنے وقت کے ایک بلند پایہ ادیب و عالم فن شناس تھے

میر عالم بہت قابل تذکرہ شخص تھے ان کی ابتدائی ملازمت شاعری کے طفیل ہوئی اگرچہ ان کو باپ کی جاگیر مل چکی تھی مگر ملازمت کا کوئی سلسلہ نہیں تھا ایک مرتبہ جب مسعود جنگ کی مدح میں قصیدہ پیش کیا تو مسعود جنگ ان کے کلام کی لطافت و بلاغت سے متاثر ہو کر پانچ سو روپیہ ماہوار مقرر کیا اس وقت سے ان کی ترقی شروع ہوئی

اس کے بعد وہ صدر تعلقہ بنائے گئے انھوں نے اپنے علاقہ کا انتظام نہایت عمدگی سے کیا رعایا اور مالک دونوں کی خوشنودی حاصل کی

صدر تعلقداری کے بعد میر عالم کو وکالت کی خدمت دی گئی۔ جب کمپنی کی جانب سے ایک نمائندہ حیدرآباد آیا تو معاملات اپنے اور انگریزوں کے درمیان ان کو وکالت پر مامور کیا معاملات نہایت عمدگی سے طے پا گئے اس کے بعد میر عالم کو سفارت کے لئے منتخب کیا گیا اور حضرت آصف جاہ ثانی کی جانب سے گورنر جنرل لارڈ کارنوالس کے پاس بھیجے گئے ۱۲۰۴ھ میں میر عالم اس سفارت میں کامیاب ہو کر کلکتہ سے واپس ہوئے۔ اس کامیابی کے صلہ میں ان کو خطاب میر عالم کے ساتھ دیگر اعزازات سے بھی ممتاز کیا گیا۔ اب وہ ٹیپو کے پاس پونہ روانہ کئے گئے اور اس کے بعد ٹیپو کی چوتھی لڑائی میں حیدرآبادی فوج کی سپہ سالاری کے فرائض ان کے تفویض کئے گئے

آصف جاہ کے انتقال پر آصف جاہ ثالث نے میر عالم کو دیوانی کی خدمت عطا فرمائی ۱۲۱۹ھ

میر عالم نے اپنی دیوانی کے زمانہ میں کئی اصلاحیں کیں چنانچہ قلمرو آصفی میں سب سے پہلے پختہ سڑکوں کا انتظام کیا گیا حیدرآباد کلکتہ اور مسولی پٹنم اور مچھلی بندر تک پختہ سڑک کا انتظام ہوا اس کے علاوہ راستے میں مسافر خانے، چوکیاں اور باولیاں کھدوائیں آج تک بھی اکثر سرائیں موجود ہیں۔

۱۲۲۰ھ میں ایک قحط ہوا میر عالم نے اس کا معقول انتظام فرمایا بہرحال میر عالم ایک منتظم اور مدبر دیوان ثابت ہوئے۔

شوال ۱۲۲۳ھ میں میر عالم کا انتقال ہوا دائرہ میر مومن میں اپنے والد کے پہلو میں دفن کئے گئے۔

میر عالم کی بنائی ہوئی کئی چیزیں آج تک موجود ہیں مثلاً میر عالم کا تالاب میر عالم کی منڈی ... اور اس کا باغ وغیرہ۔ میر عالم صاحب تصنیف تھے فارسی نثر و نظم میں کئی کتابیں ہیں ان میں سے حدیقۃ العالم اور مثنوی ... مشہور ہیں۔

میر عالم بڑے سخی تھے ... ایک بار ... وہ بڑے معاملہ فہم ... صاحب تدبیر حزم و احتیاط کرنے والے ... میں تھے

شمس الامراء ثانی امیر کبیر

ولادت ۱۱۹۵ھ — انتقال ۱۲۰۹ھ

نواب محمد فخر الدین خان، تیغ جنگ ابو الفتح خان شمس الامراء اول کے فرزند ہیں۔ حیدرآباد میں آپ کی ولادت ہوئی (۱۱۹۵ھ) باپ کے انتقال کے وقت بہت کم سن تھے، آپ کی کم عمری ہی سے آصفجاہ ثانی کی نوازشات مبذول ہوتی رہیں۔

موروثی خطابات تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء (ثانی) کے ساتھ امیر کبیر (اول) کا جلیل القدر خطاب بھی ملا۔

امیر کبیر مختلف حیثیتوں سے خاندان پائگاہ کے چشم و چراغ ہیں آپ کی ممتاز ہستی نہ صرف امراء پائیگاہ بلکہ تاریخ دکن میں بھی اہم حیثیت رکھتی ہے اور تاریخ دکن اپنے اس قابل فخر سپوت پر ہمیشہ فخر کرے گی۔

امراء پائگاہ میں آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں جو بادشاہ کی دامادی کے رشتہ میں منسلک کئے گئے چنانچہ ۱۲۱۵ھ میں حضرت آصفجاہ ثانی نے اپنی صاحبزادی بشیر النساء بیگم کی شادی آپ سے فرما کر دامادی کے رشتہ سے ممتاز کیا۔ اور آج تک آپ کی اولاد کو یہ فخر حاصل ہو رہا ہے کہ وہ خاندان آصفی کی شہزادیوں کے ساتھ ازدواج کا امتیاز حاصل کرتے ہیں

نواب شمس الامراء ۔۔۔ میں منصب مدار المہامی پر فائز ہوئے مگر چند ماہ نہایت کامیابی کے ساتھ کام کرنے کے بعد خدمت سے سبکدوش ہو گئے

امیر کبیر کی ذات علماء، شعراء اور مصنفین کے لئے ملجا و ماوی تھی۔ آپ علم و فن کی ترویج کے لئے لوگوں کی ہمت افزائی کا پورا سامان کرتے تھے، ان کو فکر معاش سے مستغنی کرنے کے لئے مناصب اور ماہوار مقرر فرماتے تھے چنانچہ حضرت فیض، قیس، آفاق، شہرت وغیرہ کو ماہواریں ملا کرتی تھیں۔

ترقی تعلیم سے آپ کو بڑی دلچسپی تھی۔ اپنے صرفے سے کئی مدرسے قائم کئے تھے، یہاں کے مدرسین کو بیش قرار ماہوار اور طلبہ کو وظائف کے علاوہ کتابوں وغیرہ سے بھی مدد دی جاتی تھی

امیر کبیر کے سب سے بڑے اور قابل فخر کارنامے یہ ہیں کہ آپ نے مغربی علوم و فنون خصوصاً سائنس اور ریاضی وغیرہ کی کئی کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے شائع فرمائیں اور ان کی تعلیم کا انتظام فرمایا۔ اردو زبان میں مغربی علوم کے ترجمہ کرنے کی یہ سب سے پہلی کوشش تھی۔ دہلی کالج، علی گڈھ وغیرہ کی تحریکیں سب اس کے بعد کی ہیں۔ ارباب کمپنی نے کلکتہ میں نثر اردو میں قصہ کہانیاں وغیرہ کی کتابیں مرتب کرائی تھیں۔ یہ کارنامہ ان دنوں تاریخ ادب اردو کا ایک ممتاز باب سمجھا جاتا ہے، لیکن امیر کبیر نے زبان اردو کی جو خدمت سائنس کی کتابوں کے ترجمہ کی کی ہے، وہ ان قصے کہانیوں کے کارناموں سے زیادہ درخشاں اور زیادہ سودمند ہے۔

امیر کبیر کو فن تعمیر سے بھی بڑی دلچسپی تھی آپ نے کئی عالی شان عمارتیں اور بازار وغیرہ تعمیر کرائے۔

محمد ابوالفخر فخرالدین خاں امام جنگ ثالث حو، عمدۃ الدولہ
حور عمدۃ الملک

مہاراجہ چندو لال

مہاراجہ چندو لعل

تولد ۱۱۸۰ھ انتقال ۱۲۶۱ھ

مہاراجہ چندو لعل بہادر، اکبری نورتن کے ایک رتن راجہ ٹوڈرمل کی اولاد سے تھے۔ آپ کے جد اعلیٰ رائے مول چند جو راجہ ٹوڈرمل کی پانچویں پشت سے تھے حضرت آصفجاہ اول کے زمانہ میں کروڑگیری کی عہدہ داری پر مامور تھے۔ ان کے بعد ان کے فرزند رائے بھیم رام کو آصفجاہ ثانی نے اس خدمت سے سرفراز فرمایا۔ ان کے دو لڑکے تھے۔ رائے نانک رام اور رائے نارائن داس۔ نارائن داس کے فرزند رائے چندو لال ہیں۔

بھیم رام کے مرنے پر نانک رام کو ان کی موروثی خدمت ملی اور ان کے بعد ان کے فرزند رائے گلپت رائے اس جگہ مامور ہوئے مگر دو سال میں انھوں نے انتقال کیا۔

مہاراجہ چندو لعل ۱۱۸۰ھ میں تولد ہوئے۔ رواج زمانہ کے موافق فارسی وغیرہ کی تعلیم پائی اور ذاتی قابلیت پیدا کی۔ ابتدا میں ہو کر اپنے چچا نانک رام کے ماتحت سررشتہ کروڑگیری میں ایک خدمت پر مامور ہوئے اور بعد رائے گلپت رائے کے مرنے پر تعلقداری کروڑگیری پر مامور ہوگئے۔ سیلو باد رئیے۔ چندو لعل کی قابلیت اور لیاقت سے واقف ہو کر ان کو قلعہ مدہوشہ وغیرہ کے انتظام پر روانہ کیا۔ راجہ بہادر کا خطاب بھی ملا۔ سابقہ خدمت بھی بدستور بحال رہی جس پر آپ کے غیاب میں آپ کے بھائی کام کرتے رہے۔

میر عالم بہادر کی وزارت میں آپ کو خدمت پیشکاری پر سرفراز کیا گیا اور مہاراجہ کا خطاب عطا ہوا۔ منیر الملک کی دیوانی میں آپ پیشکاری کے ساتھ دیوانی کے کاموں میں دخیل رہے۔ ان کے انتقال پر اگرچہ آپ کو باضابطہ دیوانی کی خدمت نہیں ملی تھی مگر چونکہ کوئی اور شخص دیوان نہیں تھا اس لئے آپ ہی دیوانی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ خطاب راجہ راجایان مہاراجہ سے ممتاز کئے گئے۔

مہاراجہ چندو لعل نے اپنے زمانہ میں خوب داد و دہش کی۔ سینکڑوں اصحاب کو جاگیرات، انعام اور مناصب بحال کر دیا۔ ۱۲۵۹ھ میں مہاراجہ چندو لعل خدمت پیشکاری سے مستعفی کئے گئے اور ۱۲۶۱ھ میں وفات پائی۔

آپ ایک علم دوست، ذی علم، فیاض، سخی امیر تھے۔ علما فضلا کی بڑی قدر کرتے تھے۔ شعر و سخن کے دلدادہ تھے۔ سخن فہم اور سخن سنج تھے۔ اس کے ساتھ ہی بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ کے فارسی اور اردو کلیات شائع ہو چکے ہیں۔ شاداں آپ کا تخلص تھا۔

آپ کا کلام سنجیدہ، شگفتہ اور پسندیدہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ کلام کی پختگی، انداز بیان کی جدت اور خیال کی بلندی آپ کی قادر الکلامی کے شاہد ہیں۔ آپ کے کلام کا بڑا حصہ معرفت و تصوف سے بھرا ہوا ہے۔

آپ کے دربار میں ہر وقت شعرا کا مجمع رہتا تھا۔ ان کی بڑی خاطریں ہوتی تھیں۔

مہاراجہ کی سخاوت اور خیرات عام و خاص میں مشہور تھی۔ بلا لحاظ مذہب و ملت فقیروں، مستحقین و سائلین تمام شہر کو روزینے روپیے کے علاوہ روز میوہ اور شیرینی بانٹتے۔ دوشالے وغیرہ بھی تقسیم ہوا کرتے تھے۔ بعض وقت ایک ایک ہزار دوشالے روزانہ تقسیم ہوتے تھے۔

آپ کو تعمیرات سے بھی دلچسپی تھی۔ بارہ دری مشہور ہے جو بانی کے نام سے موسوم تھی۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے کئی عمارتیں بنائی ہیں۔ بہر حال تاریخ دکن میں مہاراجہ چندو لعل بھی اہم شخصیت کے مالک ہیں۔

منیر الملک ثانی

تولد ۱۱۹۴ھ   وفات ۱۲۴۵ھ

علی زمان خان المخاطب غیور جنگ، منیر الدولہ، امیر الامرا، منیر الملک ثانی، غیور جنگ صفدر یار خان کے فرزند اور شیر جنگ منیر الملک کے پوتے تھے۔ صفدر یار خان غیور جنگ کے انتقال پر ان کے چاروں لڑکوں نے جائداد آپس میں تقسیم کر لی۔ حضرت آصفجاہ ثانی نے ان کو منیر الملک کے خطاب کے ساتھ پنج ہزاری منصب اور سہ ہزار سوار کا اعزاز عطا فرمایا اور بخشیگری فوج کی خدمت سے سرفراز کئے گئے۔

منیر الملک، میر عالم کے داماد تھے۔ ان کی دو لڑکیاں یکے بعد دیگرے آپ سے بیاہی گئیں۔ میر عالم نے آپ کو خانہ داماد کی حیثیت سے اپنے ہی پاس رکھا تھا۔ ان کے انتقال کے چند ماہ بعد منیر الملک خدمت دیوانی سے سرفراز کئے گئے (۱۲۲۴ھ)

آپ کی دیوانی کے اہم واقعات حسب ذیل ہیں :-

(۱) پنڈاروں کا ہمیشہ کے لئے انسداد ہو گیا ان کی لوٹ مار سے [illegible] (۲) مبارز الدولہ نے دو مرتبہ ہنگامہ برپا کیا، ان کو [illegible] قلعہ محمد نگر قلعہ و آصفی کو نجات ملی میں نظر بند کیا گیا

(۳) سکھوں اور عربوں میں سخت فساد ہوا بعد فرو ہونے کے بعد سکھوں کو شہر بدر کیا گیا (۴) رود موسیٰ کو قیامت خیز طغیانی ہوئی۔

(۵) حضرت آصفجاہ ثالث نے انتقال فرمایا اور آصفجاہ رابع نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

۱۲۴۵ھ میں منیر الملک کا انتقال ہوا دائرہ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ آپ کو چار لڑکے تھے: اشجع الدولہ، شجاع الدولہ، سراج الملک، اکرم الدولہ منیر الملک بھی اپنے دادا کی طرح بڑے سخی تھے۔ محرم میں بڑی خیرات کیا کرتے [illegible] ہمیشہ آپ کے مہمان رہا کرتے۔ لذیذ کھانوں سے بھی آپ کو رغبت تھی، ہر وقت باورچی خانہ گرم رہا کرتا۔ [illegible] تعمیر سے بھی آپ کو دلچسپی تھی چینی خانہ، آئینہ خانہ آپ ہی کی یادگار ہیں [illegible] آپ نے ایک محل تعمیر کیا تھا

سراج الملک

تولد ۱۲۲۴ھ   وفات ۱۲۶۹ھ

میر عالم علی خان المخاطب شیر جنگ سراج الدولہ سراج الملک، منیر الملک امیر الامرا کے تیسرے فرزند اور میر عالم کے نواسے تھے۔ سراج الملک دو مرتبہ دیوانی کی خدمت سے سرفراز کئے گئے پہلی مرتبہ ۱۲۵۹ھ میں اور دوسری مرتبہ ۱۲۶۲ھ میں۔ پہلی بار تو کچھ عرصہ کے بعد سبکدوش ہو گئے اور دوسری بار تقریباً سات سال تک یہ خدمت انجام دی اور اسی خدمت پر آپ کا انتقال ہوا۔ دوسری مرتبہ دیوانی کے لئے رزیڈنٹ صاحب نے بڑی کوشش کی تھی۔ آپ کی دیوانی کے زمانہ میں حسب ذیل اہم واقعات ہوئے :-

(۱) عربوں اور روہیلوں میں فساد ہو گیا۔ (۲) مبارز الدولہ نے مولوی سلیم کے بہکانے سے ایک ہنگامہ بپا کیا آخر مبارز الدولہ قلعہ محمد نگر میں نظر بند کر دئے گئے اور مولوی سلیم کو حبس دوام کی سزا ہوئی۔ (۳) راجہ چندو لعل کی داد و دہش کے باعث خزانہ عامرہ خالی ہو گیا تھا۔ انگریزی فوج کنٹنجنٹ کی تنخواہ ادا ہو رہی تھی، کئی لاکھ روپیہ اس کی ماہوار کا فاضل ہو گیا تھا، اس لئے حسب مطالبہ لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ملک برار کو بطور امانی انگریزوں کے تفویض کرنا پڑا۔ طے یہ ہوا تھا کہ بعد وضع اخراجات باقی رقم سرکار عالی کے خزانہ میں داخل کی جایا کرے گی (۱۸۵۳ء ۱۲۶۹ھ)

اس معاہدہ کے کچھ عرصہ بعد نواب سراج الملک کا انتقال ہو گیا۔ آبائی مدفن دائرہ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ سراج الملک سلیم سخن، صاحب اخلاق و مروت، باریک بیں، دور رس، صاحب تدبیر امیر تھے۔ اہل کمال کے بڑے قدر دان تھے۔ علما و فضلا سے بڑی محبت تھی

نواب سراج الملک بہادر وزیر اعظم دولت آصفیہ

میر تراب علی خان شجاع الدوله نواب مختار الملک سالار جنگ بهادر اول
وزیر اعظم دولت آصفیه

ہزایکسلنسی سر سالارجنگ مختارالملک جی سی ایس آئی۔ ایل ایل ڈی

میر تراب علی خاں المخاطب سالارجنگ شجاع الدولہ مختارالملک جی سی ایس آئی محمد علی خاں سالار جنگ شجاع الدولہ کے فرزند اور امیرالامراء منیرالملک کے پوتے تھے۔ میر عالم کی دختر آپ کی دادی تھیں۔ ان کو غلطی سے سالارجنگ اول لکھا جاتا ہے حالانکہ یہ اپنے خاندان میں چوتھے سالارجنگ تھے۔ کیونکہ ان کے والد شجاع الدولہ کو بھی سالارجنگ کا خطاب تھا اور شجاع الدولہ کو یہ خطاب ان کے والد منیرالملک کے خصوصی خدمات کی بناء پر ملا تھا۔ کیونکہ ان کے نانا درگاہ قلی خاں اور ماموں دونوں کا خطاب سالارجنگ تھا اور جو ان کے ماموں نے لاولد انتقال کیا اس لئے خصوصی معاش اور جاگیرات کے ساتھ خطاب سالارجنگ بھی اس خاندان میں منتقل ہوا۔

نواب مختارالملک کی ولادت ۱۲۴۴ھ میں ہوئی کم سنی میں باپ کے سایہ سے محروم ہوگئے۔ دادی اور چچا سراج الملک نے تعلیم و تربیت دی عربی فارسی کے ساتھ انگریزی سے بھی آپ بخوبی واقف تھے، فنون سپہ گری کی بھی آپ کو اچھی مشق تھی۔

سراج الملک نے صرف کتابی علم کا انتظام نہیں فرمایا تھا بلکہ کاروبار ریاست کے تجربہ کا بھی انتظام ہوا، چنانچہ ضلع [illegible] کی جگہ آپ تعلقدار بنائے گئے اور سراج الملک نے اپنی جاگیرات کا انتظام بھی آپ کے ذمہ فرمایا تھا ان وجوہ سے آپ کو عملی کام کرنے کا اچھا موقعہ ملتا تھا آپ نے جاگیرات اور سرکاری علاقہ کا نہایت عمدہ انتظام فرمایا تھا۔

سراج الملک کے انتقال پر ۱۲۶۹ھ میں حضرت آصفجاہ رابع نے دیوانی کے لئے آپ کو منتخب کیا اور قلمدان وزارت آپ کے سپرد ہوا اس وقت آپ چوبیس سالہ نوجوان تھے لوگوں کو تعجب ہوا تھا کہ نواب ناصرالدولہ نے اتنی کم عمری میں آپ کو وزیر بنادیا جس کے جواب میں حضور نے فرمایا کہ دارہیم [illegible] لیکن بڑے بڑوں سے زیادہ عمدہ کام کرسکتے ہیں۔

نواب مختارالملک کی دیوانی اہم واقعات، اصلاحات اور جدید تنظیم وغیرہ کے لحاظ سے تاریخ دکن میں اپنی آپ نظیر ہے اس مختصر یادداشت میں ان کا اظہار دشوار ہے لیکن بعض اہم واقعات کے اظہار کے بغیر یہ مختصر یادداشت بھی بے کار ہوجائے گی اس لئے [illegible] لکھا جاتا ہے۔

(۱) حضرت آصفجاہ رابع غفران منزل کا ۱۲۷۳ھ میں انتقال ہوا اور یہ زمانہ بڑا نازک تھا کیونکہ تمام ہندوستان میں غدر کی آگ پھیل چکی تھی اور حیدرآباد بھی اس سے متاثر ہو رہا تھا لیکن نواب مختارالملک نے اپنے ذاتی تدبر سے ریاست کو اس آگ سے محفوظ رکھا ورنہ آج دوسری صورت ہوتی۔ اس کے بعد ہم آپ ہی کی وزارت میں آصفجاہ خامس نے بھی ۱۲۸۵ھ میں عالم جاودانی کی راہ لی اعلیٰ حضرت غفران مکان میر محبوب علی خاں مسند حکومت پر بٹھائے گئے اور ریجنسی کے ذریعہ ریاست کا کام ہونے لگا۔ یہ وقت بھی بہت نازک تھا کیونکہ اکثر امراء اور عمائدین کے مخالف ہوگئے تھے لیکن نواب مختارالملک کی وجہ سے تبدیلی نہ ہونے پائی۔ (۲) آپ پہلے دیوان ہیں جو سرکاری کام سے یورپ تشریف لے گئے اور انگریزوں نے آپ کے شایان شان عزت کی۔ (۳) مالگذاری تعلیم عدالت، تعمیرات وغیرہ کی تنظیم ہوئی اور مختلف محکموں میں اصلاحات عمل میں آئیں جن کی مختصر روئداد حسب ذیل ہے:-

(الف) مالگذاری کا جدید انتظام ہوا، قدیم طریقہ ملک کو قول اور ٹھیکہ پر دینے کا موقوف کیا گیا اس کے بجائے سرکار نے خود محاصل سے وصول کرنے کا ذمہ اختیار کیا، تحصیلدار، تعلقدار، صوبہ دار مقرر ہوئے، ملک کو چار صوبوں میں تقسیم کیا گیا مجلس مالگذاری قائم ہوئی ان وجوہ سے ساہوکاروں اور دولت مند اصحاب کے ظلم و ستم سے رعایا محفوظ و مامون ہوگئی۔

(ب) عدالت کے لئے جدید محکمے، فوجداری، دیوانی، عدالت عالیہ کا قیام عمل میں آیا اور منظم طور پر عدالت کا کاروبار ہونے لگا۔ عدالتوں کے لئے شرع اسلام اور رسوم شائستہ کو قانون قرار دیا گیا اسی کے لحاظ سے فیصلے ہونے لگے۔

(ج) ملک کی تعلیم کی طرف پوری توجہ کی گئی اضلاع اور تعلقات میں مدرسے کھولے گئے حیدرآباد میں مدرسہ دارالعلوم، مدرسہ عالیہ وغیرہ کا افتتاح کیا گیا۔

(د) تعمیرات کے لئے جدید محکمہ قائم ہوا۔ نئے راستے بنائے گئے، قدیم عمارات کی ترمیم ہونے لگی۔

(و) قلمرو آصفی میں ریل اور تار جاری ہوئے (۱۰) فوج کی اصلاح ہوی باقاعدہ فوج کی بنیاد قائم ہوی۔

غرض کہ اصلاحات اور انتظامات کی ایک طویل فہرست ہے، بہ حال نواب مختار الملک نے ایک باقاعدہ اور منظم ریاست کی صورت میں سلطنت آصفیہ کو مبدل کر دیا۔

۱۳۰۱ھ میں نواب مختار الملک کا ہیضہ سے انتقال ہوا اور دائرۂ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ مختار الملک بہت خوش خلق حسن سیرت کے انسان تھے، ان کا حافظہ غضب کا تھا، معاملہ فہمی میں اپنی آپ نظیر تھے اور سیاست میں ان کا ثانی نہیں تھا۔ شخص کو دیکھ کر اس کی عادت اور خصلت سے بخوبی واقف ہو جاتے تھے۔ ان کی مردم شناسی مشہور تھی۔ سرکار کو [illegible] کا خطاب دیا تھا اور سترہ توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ انھیں دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔

راجہ نرسنگ بہادر

تولد ۱۲۴۴ھ　انتقال ۱۳۰۶ھ

راجہ نراین پرشاد نرسنگ بہادر، راجہ دھرم راج بالا پرشاد کے فرزند اور مہاراجہ چندو لال کے پوتے تھے، راجہ راجایان راجہ بہادر کے خطاب سے سرفراز تھے۔

۱۲۴۴ھ میں تولد ہوئے عربی، فارسی کے علاوہ انگریزی سے بھی واقف تھے۔ ۱۲۶۹ھ میں خدمت پیشکاری سے سرفراز ہوے سالار جنگ مختار الملک کے انتقال پر بہ شرکت عماد السلطنت بہادر دیوانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس زمانہ کا اہم واقعہ اعلیٰ حضرت غفران مکاں آصف جاہ سادس کا پورے اختیارات کے ساتھ مسند نشین ہونا ہے۔

راجہ نرسنگ بہادر ایک مدبر، فیاض، تجربہ کار، سیر چشم انسان تھے، آپ کو صرف ایک دختر تھیں جو راجہ ہری کشن بہادر سے بیاہی گئیں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر آپ کے نواسے اور جانشین ہیں۔ ۱۳۰۶ھ میں راجہ نرسنگ بہادر کا انتقال ہوا۔

میر لائق علی خاں سالار جنگ منیر الدولہ عماد السلطنت

عماد السلطنت

تولد ۱۲۸۰ھ وفات ۱۳۰۶ھ

میر لائق علی خان المخاطب سالار جنگ منیر الدولہ مختار الملک عماد السلطنت مختار الملک اول کے بڑے فرزند تھے ۱۲۸۰ھ میں حیدرآباد میں آپ کی ولادت ہوئی۔ قابل باپ کی نگرانی میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم میں آپ مرحوم اعلیٰحضرت غفران مکان کے ساتھ شریک اور ہم مکتب رہے اس کے بعد مدرسہ عالیہ میں شریک ہوئے۔ تکمیل تعلیم کے لئے انگلستان بھی روانہ کئے گئے تھے (۱۲۹۰ھ)

اعلیٰحضرت غفران مکان نے اختیارات کے ساتھ مسند نشین ہوتے ہی آپ کو قلمدان دیوانی مرحمت فرمایا (۱۳۰۱ھ) آپ کی دیوانی کے اہم واقعات حسب ذیل ہیں۔

(۱) اعلیٰحضرت نے کونسل آف اسٹیٹ قائم فرمائی اور اپنی صدارت سے اس کو ممتاز کیا (۲) [illegible] قائم ہوا (۳) مجلس وضع قوانین کا قیام ہوا۔ (۴) ویسرائے ہند کے حیدرآباد آنے کا سلسلہ قائم ہوا۔ (۵) سرکاری زبان اردو قرار دی گئی تمام سرکاری دفاتر میں اردو میں کاروبار ہونے لگا۔

۱۳۰۴ھ خدمت دیوانی سے آپ مستعفی ہوگئے علحدگی کے بعد دوبارہ آپ نے یورپ کی سیاحت فرمائی قسطنطنیہ میں سلطان عبدالحمید خان سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔

یورپ کے سفر سے واپسی کے بعد ۱۳۰۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ خاندانی مدفن دائرہ میر مومن میں سپرد خاک کئے گئے۔

عماد السلطنت نہایت قابل فرد تھے، ذہن اور حافظہ میں وہ اپنے باپ سے بھی سبقت لے گئے تھے، آپ کی ذہانت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ قسطنطنیہ میں ایک ہفتہ میں ترکی زبان میں اتنا ملکہ حاصل کرلیا کہ ایک موقع پر اسی زبان میں تقریر فرمائی آپ کے مضامین موقر رسالوں میں شائع ہوتے تھے، آپ کے ایک مضمون پر گلاڈسٹون نے تعریفی خط لکھا تھا

آپ کی خوش اخلاقی اور ملنساری کا سب کو اعتراف تھا۔ فنون سپہ گری سے بھی آپ کو دلچسپی تھی والنٹیر کور آپ ہی نے قائم فرمائی تھی اعلیٰحضرت غفران مکان کے ساتھ اکثر سیر و سیاحت میں ہم رکاب رہا کرتے تھے

امیر اکبر سر آسمان جاہ

تولد ۱۲۵۶ھ انتقال ۱۳۱۶ھ

محمد مظہر الدین خان آسمان جاہ کے والد محمد سلطان الدین خان سیف جنگ تھے ۱۲۵۶ھ میں تولد ہوئے آپ کی کمسنی ہی میں والد کا انتقال ہوگیا۔ اس لئے چچا محمد رفیع الدین خان امیر کبیر ثانی نے آپ کی پرورش فرمائی ان ہی کی نگرانی میں تعلیم ہوئی نواب ہمت یار جنگ بہادر کوتوال کے دادا آپ کے اُستاد تھے۔

مختلف اوقات میں آپ کو حسب ذیل خطابات عطا ہوئے۔

"رفعت جنگ بشیر الدولہ عمدۃ الملک امیر کبیر آسمان جاہ" سرکار عالی کی مختلف خدمات کو آپ نے بحسن و خوبی انجام دیا جن کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

۱۲۸۶ھ میں نواب مختار الملک نے سلطنت آصفیہ کی جدید تنظیم فرمائی تھی۔ چار صدر المہام مقرر کئے تھے ان میں سے ایک نواب بشیر الدولہ آسماں جاہ بھی تھے۔ عدالت کا سررشتہ آپ سے متعلق تھا۔ مولوی سید محمد مودودی صاحب معتمد تھے آسمان جاہ یہ خدمت بلا تنخواہ انجام دیتے تھے اس کے بعد جب نواب مختار الملک انگلستان تشریف لے گئے تو اپنے سررشتہ کا کام مدار المہام کی نیابت کرتے تھے اور مختار الملک کے انتقال پر ایجنسی کے رکن ہو گئے اس زمانہ میں آپ ہی نے وائسرائے کی خدمت میں مرحوم اعلیٰحضرت غفران مکان کو پورے اختیارات کے ساتھ مسند نشین کرنے کی تحریک کی۔

پرنس آف ویلز (اڈورڈ ہفتم) کے ہندوستان آنے پر بمبئی میں آسماں جاہ نے سلطنت آصفیہ کی جانب سے استقبال کے فرائض انجام دئے تھے اور اس کے بعد ۱۳۰۴ھ میں ملکہ وکٹوریہ کی پنجاہ سالہ جوبلی میں سرکار عالی کی جانب سے شرکت فرمائی تھی۔

اسی سنہ ۱۳۰۴ھ میں جبکہ آپ لندن میں تھے آپ کو قلمدان مدار المہام سے سرفراز کیا گیا خاندان پائگاہ میں آپ ہی سب سے پہلے شخص ہیں جن کو یہ خدمت عطا ہوئی تھی، آسماں جاہ کے زمانہ وزارت میں مختلف اصلاحیں ہوئیں سررشتہ عدالت اور کروڑگیری میں اصلاح ہوئی۔ موازنہ، مداخل مخارج میں تنظیم ہوئی۔ آبرسانی رسد بندی کے دفاتر قائم ہوئے۔

اس کے علاوہ بعض سیاسی مقدمات مثلاً چیلیب کا ہیرا کا مقدمہ سرداربنگ کا ریلوے و معدنیات کا مقدمہ مہدی حسن کی بیوی کا مقدمہ، سرور الملک کے رشوت کا مقدمہ وغیرہ بھی آپ کی وزارت کے اہم ترین واقعات ہیں جو حیدرآباد کے میدان سیاست میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۳۱۱ھ میں آسماں جاہ نے مدار المہامی سے علحدگی اختیار کی اور ۱۳۱۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ درگاہ برہنہ شاہ میں مدفون ہوئے۔

آسماں جاہ کو سیر و سیاحت سے دلچسپی تھی یورپ کے کئی ممالک دیکھے، مصر میں خدیو مصر سے ملاقات کی، ہندوستان کے شمالی و جنوب کے کئی شہر کا معائنہ کیا۔

انگلستان میں آپ کی بڑی عزت و وقعت ہوتی تھی، کئی دعوتیں ہوئیں تھیں زمانہ وزارت میں "سر" کا خطاب ملا تھا۔

آپ کو تعمیر عمارات کا بڑا شوق تھا، بشیر باغ، آسمان گڈھ، اکبر باغ سرور نگر کا باغ سب آپ کی یادگار ہیں، اس کے علاوہ اجمیر کا سماع خانہ، درگاہ حضرت شاہ خاموش، عمدہ ساگر، چوک کی گھڑیال آپ ہی کے تعمیر کئے ہوئے ہیں۔

آسمان جاہ نہایت وسیع اخلاق، شرم و حیا کے پتلے تھے، اپنے ملازمین کی بڑی قدر کرتے ان کے متوسلین کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے تھے۔

نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کی صاحبزادی سے آپ کی شادی ہوئی تھی، مگر ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

نواب معین الدین خان (امانت جنگ معین الدولہ بہادر) آپ کے اکلوتے فرزند ہیں۔ جو معین المہامی کی خدمت کئی سال تک انجام دے چکے ہیں اور شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا دیوان معینِ سخن آج کل زیرِ طبع ہے۔

محمد مظہر الدین خان رفعت جنگ بشیر الدولہ عمدۃ الملک
اعظم الامرا امیر الدین امیر آسمان جاہ

محمد فضل الدین خان سکندر جنگ اقبال الدولہ اقتدار الملک
سر وقار الامرا

اقبال الدولہ وقار الامرا

ولادت ۱۲۷۴ھ وفات ۱۳۱۹ھ

محمد فضل الدین خان المخاطب سکندر جنگ اقبال الدولہ اقتدار الملک وقار الامرا، کے والد محمد رشید الدین خان امیر کبیر ہیں۔ آپ خورشید جاہ کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۲۷۴ھ میں ولادت ہوئی اور ۱۳۱۹ھ میں عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔

ابتداءً اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم پائی۔ جوانی میں انگریزی تعلیم سے بھی استفادہ فرمایا

نواب آسمان جاہ کی وزارت کے زمانہ میں آپ نے صدر المہام مالگزاری کی خدمت انجام دی اور ان کے بعد مدار المہامی کی خدمت جلیلہ پر سرفراز ہوئے (۱۳۱۱ھ) سات سال سے زیادہ اس خدمت کو انجام دیکر ۱۳۱۹ھ میں مستعفی ہوئے۔ اور چند ماہ کے بعد انتقال فرمایا۔ خاندانی قبرستان درگاہ برہنہ شاہ میں سپرد خاک کئے گئے۔

نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کی دختر نیک اختر سے آپ کا بھی عقد ہوا۔ ان کے بطن سے آپ کے بڑے فرزند نواب جنگ سلطان الملک کی پیدائش ہوئی آپ کے دوسرے فرزند محمد ولی الدین خان المخاطب ولی الدولہ مرحوم تھے

وقار الامرا یورپ بھی تشریف لے گئے تھے اور آٹھ ماہ تک وہاں آپ کا قیام رہا۔ یورپ کے طریقہ تعلیم سے بڑے متاثر ہوئے اور اپنے دونوں لڑکوں کو وہاں تعلیم کے لئے روانہ فرمایا۔ ولی الدولہ مرحوم کئی سال تک رگبی کالج میں زیر تعلیم رہے

وقار الامرا داد و دہش میں بڑے مشہور تھے۔ نہ صرف اپنے ذاتی خزانہ سے بلکہ دیوانی کے زمانہ میں سرکاری خزانہ سے بھی آپ نے خوب سخاوت فرمائی۔

آپ کے زمانہ وزارت میں سررشتہ علوم و فنون کا قیام عمل میں آیا تھا۔ مولانا سید علی بلگرامی نے کئی کتابوں کا ترجمہ فرمایا اور پھر مولانا شبلی مرحوم اس سررشتہ کے ناظم قرار پائے تھے۔ مولانا نے کئی کتابیں اسی زمانہ میں تالیف فرمائیں

وقار الامرا نے بصرف کثیر فلک نما کی تعمیر فرمائی تھی۔ مگر اس کے بعد قرضہ کی وجہ سے ۲۲۱، لاکھ میں اس کو اعلیٰ حضرت کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

نواب وقار الامرا کے چھوٹے فرزند نواب ولی الدولہ بہادر نے کئی سال تک صدر اعظمی کی خدمت انجام دی۔ وہ اپنے اخلاق سادگی اور نیک طبع کی وجہ سے بہت ہر دل عزیز تھے چنانچہ دو سال قبل جب وہ حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے اور وہیں انتقال فرمایا تو اہل ملک کو ان کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔ ان کی بیگم صاحبہ کو علم و فضل اور اصلاح نسواں سے خاص شغف تھا۔ اور حیدرآباد کی کوئی مجلس نسواں ان کے مشوروں اور امداد سے محروم نہیں رہی

مہاراجہ یمین السلطنت بہادر

تولد ۱۲۷۹ھ

رائے کشن پرشاد الخاطب راجہ راجایان مہاراجہ راجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت بہادر۔ راجہ ہرکشن کے فرزند اور راجہ نریندر بہادر کے نواسے ہیں۔

حیدرآباد میں ۱۲۷۹ھ میں آپ کی ولادت ہوئی نانا کی نگرانی میں تعلیم و تربیت ہوئی، گھر کی تعلیم کے بعد مدرسہ عالیہ میں تعلیم پائی اُردو، فارسی، عربی، انگریزی وغیرہ میں کافی مہارت حاصل فرمائی۔

نانا کے انتقال پر ان کی جاگیرات آپ کے نام بحال کی گئیں اور ۱۳۱۰ھ میں خدمت پیشکاری و معین المہامی فوج سے سرفراز کئے گئے، سروقار الامراء کے مستعفی ہونے پر خدمت جلیلہ مدارالمہامی پر اولاً منسرم ۱۳۱۹ھ اور پھر مستقل کئے گئے (۱۳۲۰ھ) کامل دس سال کے بعد ۱۳۳۰ھ میں اس سے مستعفی ہوئے۔ دوبارہ ۱۳۴۲ھ میں صدارت عظمیٰ پر آپ کا تقرر ہوا۔ ذیحجہ ۱۳۵۵ھ میں بوجہ پیرانہ سالی آپ نے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

آپ کا زمانہ مدارالمہامی اور صدارت عظمیٰ اہم واقعات اور انتظامات سے مملو ہے جس کی مختصر صراحت بھی طویل صفحات کی متقاضی ہے۔

اعلیٰحضرت آصفجاہ سادس غفراں مکاں نے آپ ہی کی مدارالمہامی کے زمانہ میں فردوس بریں کی راہ لی اور اعلیٰحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ برار کے متعلق قطعی تصفیہ ہوا، بیسیوں جدید محکمے قائم ہوئے، بیسیوں قانون کی اصلاح اور تنظیم ہوئی، نئی اسکیمیں جاری ہوئیں محکمہ جات فینانس، تعمیرات، مالگزاری، عدالت، تعلیمات، فوج غرض ہر ہر سررشتہ میں اس قدر اصلاحیں ہوئیں کہ ان کا اظہار دشوار ہے۔

مہاراجہ بہادر کی ذات محاسن اور اخلاقی خوبیوں سے مملو ہے، آپ کی عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت، تلنگی، مرہٹی، اردو، ہندی زبانیں مسلّمہ ہے آپ اُردو، اور فارسی کے زبردست شاعر اور ادیب ہیں، داغ اور آصف سے تلمذ حاصل ہے نعت اور تصوف میں آپ کا کلام بہت دلچسپ اور دل آویز ہوتا ہے۔ شاد آپ کا تخلص ہے۔

مشرقی امراء کا آپ زندہ نمونہ ہیں، حسن واخلاق، سخاوت، مروّت، رواداری آپ کے خصوصی اور امتیازی جوہر ہیں۔ فقیر دوست، فقیر منش اور صوفی مشرب ہیں، آپ کے یہاں ہمیشہ فقرا، صوفیا، مشائخین، شعرا، اور اہل کمال کا مجمع رہا کرتا ہے۔ مشاعرے ہوا کرتے ہیں۔

مہاراجہ بہادر کو تصنیف وتالیف سے بھی شغف ہے کئی درجن کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں نظم و نثر پر آپ کو پورا عبور حاصل ہے، نہایت خوش خط ہیں، درگاہوں، مندروں، مسجدوں کی زیارت کا شوق ہے۔ ہندوستان کے مشہور زیارت گاہوں خواہ ہندوؤں سے متعلق ہوں یا مسلمانوں کی آپ نے دونوں کی زیارت کی ہے۔

علم دوستی، سخاوت، رواداری میں آپ اپنے جد اعلیٰ مہاراجہ چندو لعل کے مکمل نمونہ ہیں۔

گورنمنٹ انگریزی میں بھی آپ کو اعزاز حاصل ہے چنانچہ کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ اور "جی۔ سی۔ آئی۔ ای" کے خطابات آپ کو ملے ہیں۔

بہرحال مہاراجہ بہادر ایک نیک مزاج، خوش خلق اور مالک کے وفادار امیر ہیں۔

(ولادت ۱۳۰۶ھ)

نواب میر یوسف علی خاں سالارجنگ بہادر، عمادالسلطنت مختارالملک ثانی کے اکلوتے لختِ جگر ہیں، ۱۴ر شوال ۱۳۰۶ھ کو بمقام پونا آپ کی ولادت ہوئی، ایک ماہ کے اندر ہی سایۂ پدری سے محروم ہوگئے

آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور پھر مدرسۂ عالیہ میں شریک کئے گئے ۱۹۰۲ء میں آپ نے مڈل کا امتحان کامیاب کیا اور پھر میٹرک میں کامیاب ہوئے۔ آپ نے مدرسہ میں اپنے عمدہ اخلاق سے نہ صرف ہم کلاس طلبہ کو گرویدہ کرلیا بلکہ اساتذہ کو بھی اپنا مداح بنالیا مسٹر سیٹن سابق پرنسپل آپ کی طالب علمانہ خوبیوں کا ہمیشہ اعتراف کرتے رہے۔

اعلیٰ حضرت سلطان العلوم نے اپنی مسند نشینی کے پہلے ہی سال آپ کے اسٹیٹ کی کورٹ کی نگرانی کو برخاست کرکے آپ کی نگرانی میں دے دیا۔ بااختیار ہوکر آپ نے اپنے جاگیرات کا دورہ کیا۔ رعایا کی حالت بچشم خود معائنہ کرکے ان کی اصلاح اور صلاح و فلاح کے احکام دئے۔

اس کے چند ماہ بعد ۲۵ رجب ۱۳۳۰ھ میں آپ مدارالمہامی کی جلیل القدر خدمت سے سرفراز کئے گئے تقریباً تین سال آپ نے اس خدمت کو انجام دیا آپ کے زمانہ میں کئی جدید محکمے قائم ہوئے، آبپاشی، آب رسانی کو وسعت ہوئی، تعمیرات کی ترقی ہوئی، تعلیمات میں جدید اسکیم نافذ ہوئے جس کی تفصیل آخر میں درج ہے۔

محرم ۱۳۳۳ھ کو آپ نے خدمت مدارالمہامی سے سبکدوشی حاصل کی علم و فن، تعلیم، صنعت و زینت سے آپ کو بڑی دلچسپی ہے، اس کی تفصیلی صراحت کا یہاں موقع نہیں ہے۔ البتہ چند امور درج کئے جاتے ہیں:-

مدرسۂ دارالعلوم کی ساٹھ سالہ جوبلی کی آپ نے صدارت فرمائی اور حوصلہ افزا خطبہ سنایا، آپ ہی کے عہد وزارت میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔

مسلم یونیورسٹی کو ایک لاکھ کا گراں قدر چندہ عطا فرمایا اور سالانہ بارہ سو روپیہ بحال رکھے۔ انجمن ترقی اردو کو دس ہزار کا چندہ دیا اپنے اعزہ اور متوسلین کی تعلیم کی طرف خاص توجہ مبذول ہے، ہونہار طلبہ کو ہندوستان اور یورپ میں تعلیم پانے کے لئے وظائف سے امداد فرماتے ہیں۔

صنعت و حرفت کے فروغ کے لئے آپ نے دلچسپی لے کر کئی کمپنیوں کی خریداری قبول فرمائی ہے اور بیسیوں کمپنیاں خود آپ نے قائم کیں جو کامیابی سے چل رہی ہیں۔

آپ کا سب سے زیادہ قابل قدر کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے "ولی" کے دو صد سالہ جشن کی صدارت فرمائی اور دکھنی ادب کی سرپرستی کا اعلان کیا چنانچہ آپ کی توجہ اور گراں قدر عطیہ سے بیسیوں دکنی ادب کی قابل قدر کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہورہی ہیں۔ یہ آپ کا وہ کارنامہ ہے جس پر موجودہ اور آئندہ نسلیں فخر کریں گی نہ زمانہ مٹا سکے گا اور نہ حوادثات اس کو محو کرسکیں گے۔

ایک اور عظیم الشان اسکیم آپ کے زیر غور ہے وہ یہ ہے کہ آپ کا ارادہ ہے کہ ایک عالی شان محل تعمیر کیا جائے اور اس میں

آپ کے یہاں کے عجائبات اور نادر روزگار اشیاء اور نایاب کتابیں وغیرہ پبلک نے استفادہ کا موقع دیا جائے۔

یہہ اسکیم جس قدر مفید جس قدر ضروری اور کارآمد ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، خدا سے دعا ہے کہ آپ کے نیک ارادے کو جلد عملی صورت نصیب ہو جائے۔

نواب سالار جنگ بہادر کے عہد وزارت میں قانون و قواعد اوزان و پیمانہ جات جاری کئے گئے۔ مسابغ پر سند یافتہ ملاؤں کا جو ماہوار ایاب ہوں تقرر کرنے کا حکم دیا گیا عارضی دستور العمل تحت ممالک محروسہ سرکار عالی نافذ کیا گیا ہومسٹر ویکفیلڈ کمشنر تحت مقرر کئے گئے۔ اراضی نامہ جات جو بند وبست کی شنوائی کے وقت پیش ہوں ان کا قطعی تصفیہ تعلقداران ضلع کو کرنے کا حکم ہوا۔ سیول سروس کلاس قائم ہوئی اور قواعد داخلہ وانتخاب طلبہ بنائے گئے۔ قانون تادیب خانہ جات ممالک محروسہ سرکار عالی نافذ ہوئے۔ جدید جوڈیشیل کمیٹی کی تنظیم عمل میں لائی گئی۔ مائیننگ بورڈ کا قیام منظور فرمایا گیا انگریزی الفاظ کے سرکاری مراسلات میں استعمال کرنے کی ممانعت فرمائی گئی۔ ضابطہ جوڈیشیل کمیٹی ممالک محروسہ سرکار عالی نافذ کیا گیا قواعد پولیس ٹرننگ اسکول جاری کئے گئے حسب ذیل طلبہ کو وظیفہ تعلیمی یورپ و ایشیاء دیا گیا:۔

(۱) سمیع اللہ شاہ بی، ایس، سی ولد سید امجد اللہ سول انجینیرنگ۔ ۲۔ سید محمد یونس بی، اے ولد سید عطا حسین سول انجینیرنگ۔ ۳۔ حیدر علی خاں بی، ایم، ایس ولد حکیم داد ے علی طبابت۔ ۴۔ محمد الیاس برنی ایم، اے ولد محمد ابراہیم (زیر تصفیہ)

وظائف تعلیم ایشیا

۱۔ محمد سراج الدین احمد ولد ڈاکٹر معین الدین انجینیرنگ۔ ۲۔ ایم، اے۔ لماریلو ولد یم ل انڈیا طبابت۔ ۳۔ دی ایچ کوناپور ولد منمنت راؤ کوناپور طبابت محکمہ آثار قدیمہ ممالک محروسہ سرکار عالی قائم کیا گیا اور غلام یزدانی صاحب بی، اے کا س کی نظامت پر تقرر ہوا قانون انجمن ہائے امداد قرضہ نافذ ہوا۔ قواعد نگرانی اقوام جرائم پیشہ جاری کئے گئے اور قواعد امتحان زبان دانی عہدہ داران سررشتہ تعلیمات نافذ ہوئے۔

نواب صاحب نے گذشتہ نو سال کے عرصے میں تقریباً پچانوے ہزار روپے سے ہندوستان اور انگلستان میں تعلیم پانے والے طلبہ کی امداد فرمائی اور تقریباً اٹھارہ ہزار روپے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور مدرسہ آصفیہ کی ماہانہ امداد میں اور تقریباً بیس ہزار روپے اخبارات و رسائل کے چندوں میں عطا کئے ہیں۔ اس کے علاوہ موقتی طور پر علمی و ادبی انجمنوں اور اصحاب کو بھی خاطر خواہ رقمی امداد کرتے رہتے ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی

ایمان سخن

ادارۂ ادبیات اردو کے سلسلۂ انتخابات شعرائے دکن کی ایک دلچسپ کتاب جس میں مولوی سید محمد صاحب ایم، اے نے نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد کے ملک الشعراء کا کلام انتخاب کرکے اپنے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے قیمت ۱۲؍

نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ بہادر

محمد پرورش علی خاں مکرم الدولہ

سر سید علی امام مؤید الملک مرحوم

سر سید علی امام المخاطب مؤید الملک مرحوم آپ کے والد سید امداد امام مرحوم المتخلص بہ اثر پٹنہ کے رؤسا سے تھے آپ کا خاندان سادات بارہہ سے تعلق رکھتا ہے۔

سید علی امام کی پیدائش ۱۸۶۹ء میں مضافات پٹنہ میں ہوئی والد کی نگرانی میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی سید امداد امام بڑے خوش قسمت تھے کہ ان کے دونوں فرزند سید علی امام اور حسن امام ہندوستان کے افق پر آفتاب اور ماہتاب بن کر چمکے۔

سید علی امام گھر کی تعلیم کے بعد ضلع آرہ کے اسکول میں شریک ہوئے پھر پٹنہ میں کالج کی تعلیم پائی اس کے بعد انگلستان جا کر بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی ۱۸۹۰ء میں یورپ سے واپس آئے اور پٹنہ میں وکالت شروع کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں پٹنہ ہائی کورٹ کے وکلاء میں ممتاز شخصیت پیدا کر لی۔

آپ ہی وہ پہلے مسلمان ہیں جو وائسرائے ہند کی کونسل میں ممبر کی حیثیت سے مامور کئے گئے کئی سال تک آپ نے اس خدمت کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ ایک طرف گورنمنٹ آپ کے کام کی قدردان اور آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی تو دوسری طرف رعایا میں بھی ہر دل عزیز تھے اس قسم کی خوش نصیبی بہت کم اصحاب کو میسر آتی ہے۔

اس خدمت کے بعد پھر آپ نے وکالت شروع کی مگر بہت جلد پٹنہ ہائی کورٹ میں جج ہو گئے اور اس کے بعد صوبہ بہار کی کونسل میں مامور ہوئے اسی خدمت سے آپ حیدرآباد میں طلب کئے گئے ۱۳۳۷ھ (۱۹۱۹ء) اور صدارت عظمیٰ کی جلیل القدر خدمت آپ کے تفویض کی گئی۔ زمانہ ما بعد میں مؤید الملک کا خطاب بھی آپ کو دیا گیا۔ آپ کے صدارت عظمیٰ کے زمانہ میں یہاں کئی اصلاحیں ہوئیں اور جدید تنظیمات ہوئے جن میں سے بعض ذیل ہیں:-

(۱) باب حکومت کا قیام ہوا اور سررشتہ جات کی جدید تنظیم ہوئی (۲) دفتر ترقیات عامہ کا قیام ہوا غیر آباد مقامات کو آباد کرنے اور آبادی کو وسعت دینے کی بڑی اسکیم پیش نظر تھی۔ (۳) عدالت اور مال کے حکام کی علحدگی عمل میں آئی تعلقداران و تحصیلداروں سے عدالتی اختیارات علحدہ کر کے عدالت کے لئے جدید عہدہ دار مقرر کئے گئے (۴) دفاتر سرکار عالی میں تنخواہ کے متعلق جدید اسکیم نام اسکیل کا نفاذ عمل میں آیا (۵) معابدت پر نظر ثانی ہوئی اس کے علاوہ بھی جدید کئی اصلاحیں ہوئیں ان کی صراحت طوالت کا موجب ہے۔

حیدرآباد ہی کے زمانہ میں آپ جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنز) میں ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے نامزد کئے گئے ۱۳۴۱ھ میں سر مؤید الملک نے صدارت عظمیٰ سے کنارہ کشی اختیار کر لی مگر اس کے بعد بھی وہ مشیر کی حیثیت سے اپنے انتقال تک حیدرآباد تشریف لاتے رہے۔

سر علی امام نے بحیثیت ہندوستانی اور بحیثیت مسلمان ہندوستان میں بہت کچھ کام کئے ہیں وہ مسلم لیگ کے صدر نشین بھی ہوئے تھے ہندو اور مسلم دونوں میں وہ ہر دل عزیز تھے۔

سر علی امام بڑے خوددار، مدبر، سیاست داں تھے وہ حسن خلق اور حسن سیرت سے آراستہ تھے۔ ۱۹۳۲ء میں انتقال ہوا رانچی میں دفن کئے گئے۔

رائٹ آنریبل سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ

محمد اکبر المخاطب رائٹ آنریبل سر حیدر نواز جنگ بہادر کے والد نذر علی مرحوم کھمبات کے متوطن اور بمبئی کے نامی گرامی تاجر تھے حیدری آپ کا خاندانی لقب ہے۔

سر اکبر کی ولادت نومبر ۱۸۶۹ء میں بمبئی میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنی والدہ اور نانی سے پائی، آپ کی نانی بمبئی کے مشہور جسٹس بدرالدین طیب جی کی حقیقی بہن تھیں بمبئی کے سینٹ زیویئر کالج سے سترہ سال کی عمر میں آپ نے بی، اے میں کامیابی حاصل کی۔ اس سے آپ کے تعلیمی شوق، خداداد حافظہ اور غیر معمولی ذہن کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

تعلیم کے بعد سر اکبر گورنمنٹ آف انڈیا کی ملک ملازمت میں داخل ہو گئے اور اولاً ناگپور کے صیغہ حسابات میں ایک افسر کی حیثیت سے مامور ہوئے (۱۸۸۸ء) اس کے بعد لاہور پھر کلکتہ میں کارگذار رہے اور وہاں سے الہ آباد کی محاسبی میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل کی جگہ پر ترقی ملی الہ آباد سے آپ کا تبادلہ بمبئی میں ہوا اور پھر بمبئی سے مدراس کی ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرلی پر مامور کئے گئے۔ اسی خدمت سے آپ حیدرآباد میں طلب کئے گئے۔

مدراس کی ملازمت کے زمانے میں آپ ہندوستان و برما کے سرکاری مطابع کی جانچ پڑتال پر مقرر کئے گئے تھے اس کام کو بھی آپ نے نہایت خوبی سے انجام دیا

۱۹۰۵ء (۱۳۲۳ف) میں سر اکبر حیدری کا تقرر صدر محاسبی سرکار عالی پر ہوا اس وقت آپ کی عمر ۳۶ سال کی تھی دو سال کے بعد معتمدی فینانس پر آپ کا تقرر ہوا اور پھر ۱۳۲۳ف (۱۹۱۱ء) میں معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ پر تبادلہ ہو گیا اس خدمت پر ایک طویل زمانہ تک مامور رہے۔ کچھ عرصہ تک اس خدمت کے ساتھ آپ نے صدر ناظم صیغہ حرفت کا کام بھی انجام دیا۔

۱۳۳۲ف (۱۹۲۰ء) میں سر اکبر سرکار عالی کی ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کر کے بمبئی میں اکاؤنٹنٹ جنرل کی خدمت پر مامور ہو گئے مگر اس کے چند ماہ بعد پھر جولائی ۱۹۲۱ء میں صدر المہام فینانس کی جگہ آپ کا تقرر ہوا اس طرح آپ دوبارہ سرکار عالی کی سلک ملازمت میں شامل ہو گئے۔

صدر المہامی فینانس کے بعد ۱۳۵۵ف ۲۶ رجب (۱۹۳۶ء) میں سر اکبر صدر اعظم کی جلیل القدر خدمت پر مامور کئے گئے اور تقریباً ۲ دو سال سے آپ اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔

جس زمانہ میں سر اکبر حیدرآباد آ کر صدر محاسب ہوئے تھے، اس وقت صدر المہامی اور مدار المہامی (صدر اعظم) کے خدمات حیدرآباد کے مخصوص امراء اور جاگیرداروں کے لئے مختص تھے کسی اعلیٰ عہدہ دار کا خواہ وہ معتمد ہی کیوں نہ ہو ترقی پا کر صدر المہام یا صدر اعظم ہو جانا محال تھا اس لئے اس وقت یہ شائبہ نہیں تھا کہ ایک دن سر اکبر صدر اعظم کی جلیل القدر خدمت پر مامور ہو جائیں گے۔

لیکن ایک زمانہ وہ آیا کہ اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع کے تدبر اور دوربین نظر کے باعث قابل اور لائق اشخاص اپنی اعلیٰ قابلیت اور عمدہ لیاقت کے باعث صدر المہام اور صدر اعظمی پر ترقی پانے لگے۔ اس قسم کا سب سے پہلا اعزاز سر فریدون الملک کو ملا تھا

سر محمد علی امام مؤید الملک

رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم

سرکارعالی کی ایک معمولی خدمت سے ترقی کرتے ہوئے سب سے اعلیٰ خدمت صدر اعظمی پر مامور کئے گئے تھے۔ ان کو یہ اعزاز محض ان کی لیاقت، قابلیت، دیانت اور وفاداری کے طفیل ملا تھا۔ سر فریدون الملک کے بعد سراکبر وہ شخص ہیں جو سرکارعالی کی صدر محاسبی سے ترقی کرتے ہوئے صدر اعظمی پر سرفراز کئے گئے ہیں، سراکبر کو بھی یہ خدمت انہی کی طرح لیاقت قابلیت کے بل بوتے پر ملی ہے

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے سراکبر ہندوستان کے کئی صوبوں سی پی، پنجاب، بنگال، یوپی، بمبئی اور مدراس میں مامور رہے ہر جگہ آپ نے سرکاری خدمت کو حسن و خوبی سے انجام دیا اور اپنے بعد وہاں اپنی خوش گوار یاد چھوڑی حیدرآباد میں بحیثیت معتمدی اور صدر المہامی مختلف سررشتہ جات آپ سے متعلق رہے ہر سررشتہ میں دلچسپی لے کر آپ نے اصلاح کی کوشش فرمائی جن کی تفصیل اس موقع پر طوالت کا موجب ہوگی۔

لیکن خصوصیت سے بعض سررشتہ جات کا ذکر ضروری ہے کیونکہ اس کے اظہار کے بغیر آپ کے حالات مکمل نہیں ہوسکتے سررشتہ آثار قدیمہ کا قیام آپ کی توجہ کا رہین منت ہے۔ سررشتہ طبابت کی اصلاح آپ کا ایک کارنامہ ہے،

سررشتہ تعلیمات کی جدید تنظیم اور جامعہ عثمانیہ کا افتتاح آپ کے نمایاں خدمات سے تعلق رکھتا ہے یوں تو حیدرآباد میں مختلف اوقات میں "جامعہ" کے قیام کا مسئلہ زیر بحث ہوا اور مختلف اصحاب حل و عقد نے اس کی طرف توجہ کی مگر عملی کام کسی نے نہیں کیا بہرحال "جامعہ عثمانیہ" کا سہرا آپ ہی کے سر ہے سررشتہ داری سے سالانہ مالیاتی تنظیم کا قاعدہ ریلوے کی خریدی سررشتہ صنعت و حرفت میں اس کی ترقی کے لئے ایک گراں قدر رقم کا مخصوص کرنا حیدرآباد سیول سرویس کی مکرر تنظیم اور ان کو اعلیٰ خدمات پر مامور کرنا یہ سب واقعات آپ ہی کی کارگزاریوں میں شامل ہیں یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ سراکبر کو خوش قسمتی سے اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ جیسا حکمراں نصیب ہوا اور آپ کی اسکیم کو اپنی معارف نوازی اور رعایا پروری کے باعث منظوری سے ممتاز فرمایا

صدر اعظمی فینانس کے زمانہ میں سراکبر نے حیدرآباد سے نمائندہ کی حیثیت سے لیگ آف نیشنز کانفرنس میں شرکت فرمائی ہے۔

نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر کو پبلک امور سے بھی دلچسپی رہی ہے تعلیمی، مذہبی، طبی، اور انجمنوں کی ادا نیہ وغیرہ کے زمانہ میں نہایت توجہ اور دلچسپی سے آپ نے کام لیا ہے۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے صدر آپ ہی ہوئے تھے اور آپ کی توجہ سے کانفرنس نے بہت کچھ کامیابی حاصل کی تھی۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مسلمانان جنوبی ہند کی تعلیمی کانفرنس کے آپ صدر رہ چکے ہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سینٹ کے رکن ہیں بہرحال آپ کے سرکاری خدمات کی طرح پبلک خدمات کی تفصیل بھی طویل صفحات کی متقاضی ہے

سراکبر کو مذہب سے بڑا شغف ہے وہ صوم و صلوٰۃ کے سختی سے پابند ہیں بزرگان دین کے قبور کی زیارت اور مشائخین و صوفیاء کی ملاقات کا آپ کو بڑا اشتیاق رہا کرتا ہے۔ آپ سادگی پسند ہیں صرف کو ناپسند کرتے ہیں اور اوقات مقررہ کی پابندی کرنے والے سرکاری کام کرنے کے شائقین ہر وقت مصروف رہنے کے عادی ہیں۔

سراکبر بحیثیت لیڈر فینانس بحیثیت ماہر تعلیم بحیثیت سیاسی مدبر بحیثیت معاشی و اقتصادی ماہر اپنی آپ نظیر ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی

عہدِ آصفی کے امراء

اس کے قبل عہدِ آصفی کے مدارالمہاموں اور صدرِ اعظموں کے حالات اور تصاویر درج کی گئیں۔ اب عہدِ آصفی کے اُن خاص خاص امراء کے حالات اور تصویریں شامل کی جاتی ہیں جو اپنے کارناموں اور شہرت کی وجہہ سے بہت مشہور تھے یا جو نائب حضور کے درجے تک پہنچے تھے۔

نواب درگاہ قلی خاں سالار جنگ

نواب ذوالقدر اصل نام تھا ۱۱۲۲ھ میں بمقام سنگمنیر پیدا ہوئے۔ ان کے والد خاندان قلی خاں کی پرورش اور حضرت غفران مآب نواب آصفجاہ اوّل کی تربیت سے ان کی فطری قابلیت بہت جلد نمایاں ہوگئی۔ سن رشد کو پہنچنے سے قبل ہی اکثر علوم و فنون میں مہارت حاصل کرلی۔ منکسرالمزاجی کے ساتھ طبیعت میں شوخی اور ظرافت بھی تھی۔ فن موسیقی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ ۱۱۵۱ھ میں آصفجاہ بہادر کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا۔ نادرشاہی بلا کے زمانہ میں اپنے مربی کی حفاظت میں غیر معمولی جاں بازی کا ثبوت دیا جس سے ان کی شجاعت کا ثبوت ملتا ہے۔ دہلی سے واپس ہوکر اپنے سفر کے حالات کا ایک تفصیلی تذکرہ قلمبند کیا جو مرقع دہلی کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ جس میں بارھویں صدی کی دہلی کے معاشرتی، تمدنی، تاریخی اور ادبی حالات نہایت تفصیل سے درج ہیں۔ شاعری سے فطری لگاؤ تھا اکثر فی البدیہہ اشعار کہتے تھے خود مشاعرے منعقد کرتے اور اپنی غزل آپ پڑھتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی افسوس ہے کہ بجز چند مرثیوں کے ان کا اردو فارسی کلام دستیاب نہ ہوسکا چیدہ چیدہ اشعار کہیں کہیں تذکروں میں ملتے ہیں

دکن کے اکثر عہدہائے جلیلہ پر فائز رہنے کے بعد تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں ۱۱۸۰ھ میں ان کا انتقال ہوا اور اپنے خاندانی مقبرہ واقع اورنگ آباد میں مدفون ہوئے۔ نمونۂ کلام حسب ذیل۔

قصیدہ

پڑی ہے آکے گلے ناگہاں بلائے سفر ◦ سفر نہیں ہے سقر بل سقر سے ہے بدتر

غرض کہ سخت مصیبت میں ہیں وضیع و شریف ◦ غنی فقیر سبھی احتیاج میں مضطر

اسی تردد و افطار میں لگی تھی نیند ◦ کہ ناگہہ خواب میں دیکھا قریب وقت سحر

کھڑا ہے آکے سرہانے پہ پیر نورانی ◦ لطیف عنصر و خوش منظر و خجستہ سیر

(وفات ۱۲۰۵ھ)

ابوالفتح خاں تیغ جنگ کے والد ابوالخیر خاں تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج سے ملتا ہے۔

ابوالخیر خاں کو دربار مغلیہ (محمد شاہ بادشاہ) سے "خان بہادر" کا خطاب عطا ہوا تھا۔ حضرت آصفجاہ اول کے ہمراہ رکاب دکن آئے۔ آصفجاہ نے دو ہزاری منصب پانچ سو سوار کا اعزاز عطا کیا اور کئی ہزار کی جاگیرات مرحمت فرمائی تھی۔

وہ مالک کے بڑے وفادار اور جانثار تھے۔ چنانچہ جب ناصر جنگ شہید نے باپ کے خلاف صف آرائی کی تو ابوالخیر خاں کو بھی ہم خیال بنانا چاہا۔ لیکن انھوں نے آصفجاہ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اسی وفاداری کے طفیل میں زمانہ مابعد میں خود ناصر جنگ نے ان کو "شمشیر بہادر" اور صلابت جنگ نے امام جنگ کے خطابات سے عزت افزائی کی۔ برہان پور میں ابوالخیر خاں کا انتقال ۱۱۷۰ھ میں ہوا وہیں مدفون ہوئے۔

تیغ جنگ کی پیدائش برہان پور میں ہوئی۔ والد کے انتقال کے بعد اپنی جاگیر میں خانہ نشین تھے، نواب صلابت جنگ نے اپنے سفر بیجاپور (۱۱۷۱ھ) کے وقت آپ کو دربار کے امیروں میں شامل فرمایا۔ اس کے بعد آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علیخاں نے خاص توجہ مبذول فرمائی اور آپ کے مراتب میں بیشی ہوتی گئی۔ تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء (اول) کے خطابات عطا ہوئے۔ کئی لاکھ کی جاگیر مرحمت ہوئی۔

نواب رکن الدولہ موسیٰ خان کے انتقال پر حضرت آصفجاہ نے آپ کو قلمدان دیوانی سے بھی سرفراز کرنا چاہا مگر آپ نے میدان جنگ کے مقابلہ میدان سیاست کو پسند نہیں فرمایا۔

پائیگاہ کے آپ ہی بانی ہیں۔ حضرت آصفجاہ ثانی نے کئی لاکھ کی جاگیر فوج کے لئے عطا فرمائی تھی، علاوہ جاگیرات کے نقد رقم بھی اس کے لئے مرحمت ہوتی تھی۔ پائیگاہ کی یہ فوج شاہی محافظ (باڈی گارڈ) کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے سوار بہادر اور دلاور ہوتے اور معقول تنخواہ پاتے تھے۔ تیغ جنگ کے جانشین امجد الملک، سردار الملک، امام الملک اور اعظم الملک اس فوج کے اعلیٰ افسر تھے۔ تیغ جنگ کو اپنی فوج کے ساتھ بڑا شغف تھا۔

بحالت سفر پانگل کے مقام پر ۱۲۰۵ھ میں انتقال ہوا لاش کو حیدرآباد لاکر درگاہ برہنہ شاہ میں دفن کیا گیا۔

شمس الامراء ثالث امیر کبیر (ثانی)

(ولادت ۱۲۲۰ھ وفات ۱۲۹۴ھ)

امیر کبیر ثانی کا نام محمد رفیع الدین خاں تھا آپ فخر الدین خان امیر کبیر (اول) کے بڑے فرزند تھے جن کا ذکر وزرائے سلطنت کے سلسلہ میں گذر چکا ہے۔ شوال ۱۲۲۰ھ میں آپ کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی۔ ناموس جنگ عمدۃ الدولہ عمدۃ الملک شمس الامراء (ثالث) امیر کبیر (ثانی) کے خطابات آپ کو سرفراز ہوئے تھے۔ نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کے انتقال پر اعلیٰحضرت غفران مکان کی صغر سنی کے باعث آپ نائب ضور کی حیثیت سے سلطنت آصفی کے کاروبار انجام دیتے رہتے۔ اسی نائب مختاری کے زمانہ میں آپ کا انتقال ہوا (۱۲۹۴ھ) میں خاندانی مدفن درگاہ حضرت برہنہ شاہ میں دفن کئے گئے۔

آپ کو علوم و فنون خصوصاً ریاضی اور ہیئت سے بڑی دلچسپی تھی ریاضی میں آپ نے چند کتابیں تالیف فرمائی ہیں۔

محمد رفیع الدین خان بہادر جنگ عمدۃ الدولہ عمدۃ الملک
شمس الامراء امیر کبیر ثانی

دربار آصفی سے مختلف اوقات میں آپ کو حسب ذیل خطابات سے سرفراز کیا گیا۔ ابو الخیر خاں، تیغ جنگ، خورشید الدولہ، خورشید الملک، خورشید جاہ، شمس الامراء امیر کبیر۔

شمس الامراء اور امیر کبیر کے خطابات آپ پر ختم ہو گئے، پھر کسی کو آج تک یہ خطاب نہیں ملا۔

سرکار انگریزی میں آپ کے بڑے اعزاز تھے۔ "سر" کا خطاب ملا تھا اور آپ کی زندگی میں جس قدر وائسرائے ہند حیدرآباد آئے وہ آپ کے یہاں مدعو ہوتے تھے۔

سر خورشید جاہ کو اپنے باپ کی طرح میدان سیاست سے بڑی دلچسپی تھی۔ آپ اپنے زمانہ کے مدبر اور صاحب فراست تھے۔ کونسل آف اسٹیٹ کی نسبت پر اعلیحضرت غفران مکاں نے آپ کا تقرر فرمایا تھا

علم و فن سے دلچسپی تھی، تاریخ خو[illegible] [illegible] ت لکھتے تھے، بچاؤ مولے کی تعمیر کے لئے پچیس ہزار کا چندہ دیا تھا [illegible] سیاحت کا شوق [illegible] فوج کو باقاعدہ مرتب کیا تھا۔ فوجی وردی اور عمدہ ہتھیار دئے جو پائیگاہ میں اس سے پہلے نہیں تھے، ۱۳۱۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ درگاہ پہاڑی شاہ میں دفن کئے گئے۔ آپ کو دو صاحبزادے تولد ہوئے، امام جنگ اور ظفر جنگ۔ آخر الذکر شہزادی حسن النساء بیگم صاحبہ کے بطن سے تھے۔

مکرم الدولہ میر پرورش علیخاں حسام جنگ

میر پرورش علی خان المخاطب حسام جنگ مکرم الدولہ، آپ کے والد نواب قیصر الدولہ نواب سراج الملک کے داماد تھے اس طرح مکرم الدولہ نواب مختار الملک کے ہمشیرہ زادے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ مکرم الدولہ آپ کے داماد بھی تھے، نور النساء بیگم صاحبہ آپ سے بیاہی گئی تھیں۔

مکرم الدولہ کی تعلیم مدرسہ دار العلوم میں ہوئی، اس مدرسے کے افتتاح کے ساتھ ہی آپ نے ابتدائیہ کتب فرمائی تھی، عربی، فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی دست گاہ رکھتے تھے۔

نواب مختار الملک نے مجلس مالگذاری قائم کی (۱۲۸۶ھ) تو اس مجلس کا آپ کو میر مجلس بنایا گیا، اس کے بعد جب مجلس برخاست ہوکر صدر المہام مقرر ہوئے تو اس وقت آپ صدر المہام مالگذاری ہوئے۔

نواب مختار الملک کے سفر یورپ کے زمانہ میں آپ بشیر الدولہ کے ساتھ مل کر مدار المہامی کا کام بھی انجام دیتے رہے، آپ کی قابلیت مسلمہ تھی، اور عام و خاص میں آپ کی لیاقت کا شہرہ تھا۔

شادی کے ایک سال بعد (۱۲۹۶ھ) میں آپ خلل دماغ کی وجہ سے خانہ نشین ہوگئے، ۱۳۱۳ھ میں آپ کا انتقال ہوا، دائرہ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ آپ کو کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

نصیر الدین ہاشمی

سورما

گولکنڈہ کا ایک افسانہ

گولکنڈہ کی زمین ہیروں کی سرزمین ہے۔ یہ کبھی آندھرا دیس کی راج نگری تھی جس کی شاہانہ سج دھج سے اپنے پرائے سب کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتی تھیں۔ آج بھی وہاں ان دنوں کی یاد دلانے والے ایک آئینہ خانے کے کچھ آثار رہ گئے ہیں جنہیں دیکھتے ہوئے ایک دفعہ مجھے محسوس ہوا کہ ان آئینوں میں گزرے زمانہ کی پرچھائیاں ابھر رہی ہیں۔ جیسے من میں پیاروں کی یاد آئے!

دیکھا کہیں سلطان قلی قطب شاہ ہے۔ بشرہ سے پرعظمت کا نور۔ ترکستانی وجاہت۔ لوگ اس بادشاہ کے شیدائی ہیں۔ "بڑے ملک" کے نام سے پکارتے ہیں۔ ملتفانہ کو دانا سمجھتے ہیں۔ کہیں ابراہیم قطب شاہ ہے جو ارتقائے تمدن کی داغ بیل ڈال رہا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے محمد قلی قطب شاہ چلا آتا ہے۔ جو فلاح و ترقی کی بیل منڈھے چڑھا رہا ہے۔ اتنے میں سلطان محمد قطب شاہ نظر آیا۔ پاکیزگی حیات کا گوہر آبدار۔ ساتھ ایک ملکہ ہے۔ حیات بخشی بیگم۔ دکن کی ہیروئن!

یہیں ایک آئینہ میں یہ بھی دیکھا کہ تانا شاہ کا عہد حکومت ہے۔ مغل فوجیں قلعہ کا محاصرہ کئے ہیں۔ آٹھ مہینے ہو چکے۔ مگر قلعہ والے اپنی خودداری نہیں کھوتے۔ جان پر کھیلے بیٹھے ہیں۔ مگر ٹیپ یہ ہے، جہاں اچھے ہیں وہاں برے بھی ہیں۔ ان جاں نثاروں میں دو چار گندم نما جو فروش بھی ہیں۔ جنہوں نے دشمنوں سے ساز باز کیا۔ چاہتے ہیں کہ وطن کو بیچ کے تن کو پالیں، من کو مار ڈالیں۔ مگر غداری نہیں چھپا کرتی۔ ہوتے ہوتے اس کی خبر دکن کے جانباز۔ عبدالرزاق لاری کو بھی ہوئی۔ وہ بھلا اس نمک حرامی کو کیسے برداشت کرتا۔ اسی وقت ان بدسگالوں کو تہ تیغ کر دیا۔ اور حکم دیا کہ ان کے لاشے بے گور و کفن پھینک دو۔ تاکہ غداروں کی موت سے عبرت زندہ ہو!

یہ جیسے دن کا قصہ ہے۔ رات ہوئی۔ جو بڑی تاریک تھی۔ اس وقت سپاہی کچھ پہرے پر ہیں کچھ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں کہ دس بجے۔ گیارہ بجے۔ بارہ بج گئے۔ سپاہی کو سپاہیوں کی سی باتیں سوجھتی ہیں۔ باتوں باتوں میں ایک نے کہا: چلو، بدخواہوں کے لاشے دیکھیں؟ کہتے ہیں: رات کے بارہ بجے فرشتے انہیں آتشیں گرز مارتے ہیں!

دوسرا:۔ جانا ہے تو ایک ایک جاؤ۔ اور دیکھو سب کا مل کے جانا ٹھیک نہیں۔ تم جانتے ہو: یہ وقت سردارالملک کے بھیس بدل کے نکلنے کا ہے۔ نہ ہو کہ وہ ہمیں یوں جاتا دیکھ لے۔ اور کچھ اور سمجھے۔

تیسرا:۔ ٹھیک ہے۔ ویسے بھی مرد ہو تو مرد بنو۔ ڈر کو کچل ڈالو۔

چوتھا:۔ جی، یہ لن ترانی رہنے دو۔ رات کے اس اندھیرے میں اکیلا کوئی نہیں جا سکتا۔

تیسرا:۔ کیا؟؟

دوسرا:۔ دیکھو بھئی، ہم یہ وہ نہیں جانتے۔ کچھ شرط بدو۔ اور یہاں کون تنخواہیں پچاس نہیں۔ دس ہی روپے دلواؤ۔ ہم جاتے ہیں۔

چوتھا :- اچھا ہوگئی مگر ہماری بھی ایک شرط ہے۔ وہ سامنے مہندی کی باڑ ہے۔ اس کی پتیاں توڑ لو۔ وہاں جا کے نہیں پیسو۔ اور ہر ایک مُردے کی چھنگلی پر مہندی لگا آؤ۔ تب بات ہے۔ دور سے جھانک آنے کی سند نہیں۔ پھر ہم جا کے دیکھیں گے۔

دوسرا :- منظور!

”مصر یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ اُدھر لاری بھیس بدل کر چھپا چھپا فوج کی موجودات لینے نکلا۔ یہاں پہنچا تو بدخواہوں کا ذکر سنا خیال ہوا کہیں غداری کی وبا عام تو نہیں ہوگئی۔ اس لئے ٹھٹک گیا۔ اور ایک درخت کی آڑ سے سارا ماجرا سن لیا تو اطمینان ہوا۔

جس سورما نے شرط بدی تھی اوس نے تلوار حمائل کی پیش قبض سجایا۔ اور چلا چل چپ اس گھنیری پہاڑی میں پہنچا۔ جہاں لاشے تھے۔ وہاں اندھیرے کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ بے شمار جھینگر بول رہے تھے۔ کبھی بند ہو لیتے تو یہ سمجھتا کہ کوئی اس کی دلیری پر واہ واہ کر رہا ہے۔ تڑس بولتا تو خیال ہوتا کہ کوئی اس کی کامیابی پر ہنس رہا ہے۔ اور جھینگر ڈراتا تو سوچتا کہیں ڈرپوک سمجھ کے سردار لاری تو نہیں کھٹک رہا!

خیر وہاں پہلے پتیاں رگڑیں۔ مہندی تیار کی۔ پھر لاشوں کے پاس آ کے ایک مُردے کی چھنگلی میں لگائی۔ دوسرے کے لگا رہا تھا کہ تیسرے لاشے نے حرکت کی۔ سورما نے غور سے دیکھا۔ اور خاموش ہوگیا۔ دوسری دفعہ لاشہ نے حرکت کی تو سورما نے بگڑ کے کہا: ٹھیر جا! تیسری دفعہ لاشے نے ہاتھ پھیلا دیا۔ سورما کو یہ بے صبری بڑی معلوم ہوئی۔ جھٹ پیش قبض نکالا۔ اور لاشے کے ہاتھ کو زمین پر رکھ کے اسکی ہتھیلی میں پیش قبض اتار دیا۔ اس کے بعد مہندی بھی لگا دی۔ اور پیش قبض نکال کر چلتا ہوا۔ سورما کی بے جگری کا یہ وہ کارنامہ تھا جسے اسوقت آسمان کی لے گنتی آنکھیں دیکھ رہی تھیں!

وہاں سے پلٹا تو کچھ دور پر رستہ میں ایک شخص چادر اوڑھے نظر آیا۔ جیسے سورما نے ٹوکا۔ ساتھ ہی تلوار کا وار بھی کیا۔ مگر اجنبی نے پینترا کاٹ کے وار خالی دیا۔ اور جلدی سے سورما کو گلے لگاتے ہوئے اوس کا نام لیکر پکارا۔

سورما نے آواز پہچان کر کہا: ہائیں؟!

اجنبی :- ہاں!

سورما :- میں صرف مہندی

اجنبی :- تم سرخرو ہوئے!

سورما :- کیسے؟

اجنبی :- میں وہیں تھا۔ تمہارے پہنچتے پہنچتے رستہ کاٹ کے وہاں آن پہنچا۔ ایک لاشے کو ہٹا کے اسکی جگہ لیٹ گیا کہ پرکھوں تم میں کتنا حوصلہ ہے؟!

یہ کہہ کر اجنبی نے چادر سے ہاتھ نکال کے دکھایا۔ خون بہہ رہا تھا۔ اسی ہاتھ میں سورما نے پیش قبض اتار دیا تھا۔ یہ جانباز لاری کا ہاتھ تھا۔ جو مرتے مرتے بھی کہہ گیا کہ :- ”تا جان دارم نثار ابوالحسن خواہم نمود!!“ سید وزیر حسن (عثمانیہ)

مرد حضرب ا ، ، اول

سه ان کو ه مر

ـ مہ او ںگ آ ر ذ کی مسجد

اورنگ آباد

(سترھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے آخری کارفرما شہنشاہ و مشرق کی سب سے عظیم الشان سلطنت کا صدر مقام)

کچھ بلبلوں کو یاد ہے کچھ قمریوں کو حفظ
عالم میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ جس اجڑے دیار کی سرگزشت میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں وہ سوا دو سو سال پہلے اتنا بڑا شہر تھا جیسا اب کلکتہ ہے۔ اس کی آبادی پندرہ لاکھ بیان کی جاتی تھی۔

اورنگ آباد کی بنیاد اور اس کے عروج و زوال کی داستان کو آپ کے سامنے بیان کرنا اور اصل ہندوستان کی اس دور کی تاریخ کو دہرانا ہے۔ میں آپ کو اتنی دور نہیں لے جاؤنگا لیکن مختصراً چند دور آفریں واقعات کا ذکر کروں گا۔

دہلی خلجیوں کے زیر نگیں تھی۔ جلال الدین سریر آرا تھا۔ اس کے بھتیجے کے سر میں بادشاہت کا سودا سمایا لیکن خوب جانتا تھا کہ روپیے کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ اس زمانے میں سلطنت دیوگڑھی (دولت آباد) کی دولت ضرب المثل ہو گئی تھی۔ علاء الدین نے اپنے چچا کی رضامندی حاصل کئے بغیر سپاہیوں کا ایک مختصر سا دستہ لیا۔ اور جنوب کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں کے راجہ کو ڈرا دھمکا کے مطیع کیا اور بہت کچھ مال غنیمت حاصل کیا۔

خلجیوں نے اپنے انقطاع سے قبل دیوگڑھی کو فتح کر لیا تھا اور اس کا نام دولت آباد رکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں کے راجہ ہرپال کی زندہ کھال اتاری گئی۔ اس میں گھاس بھری گئی اور اس کو قلعے کے دروازہ پر نصب کیا گیا۔

واقعات بدلے۔ خلجیوں کی جگہ تغلق بادشاہ برسر اقتدار ہوئے۔ "شاندار دیوانہ" محمد شاہ تغلق کی خواہش تھی کہ یہی حکومت کا صدر مقام دہلی سے دولت آباد منتقل کیا جائے۔ رعایا کو چالیس روز میں دولت آباد پہنچنے کا حکم دیا۔ رعایا اس سفر پر روانہ ہوئی۔ دولت آباد سلطنت کا صدر مقام تو ہرگز نہ بن سکا بلکہ بادشاہان دہلی کے تلون نے جنوب کے امرا کو اپنے آقا کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیا اور آخر بہمنی بادشاہوں کے ہاتھوں ایک خودمختار حکومت کی بنیاد پڑی۔

جنوب میں وجیا نگر کی طاقتور سلطنت بھی تھی۔ بہمنی بادشاہ اس سلطنت کے ساتھ ناکام جنگ آزمائی کرتے رہے۔ بہمنی سلطنت کا انتزاع عمل میں آیا اور پانچ مختلف ریاستیں قائم ہوئیں۔ بیجاپور۔ بیدر۔ برار۔ گولکنڈہ اور احمد نگر۔

ادھر بہمنی سلطنت پانچ حصوں پر تقسیم ہو گئی۔ تو ادھر وجیا نگر کی سلطنت میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا جس سے فائدہ اٹھا کر ان نو بنیاد ریاستوں نے باہمی اتحاد کیا۔ پانچویں یعنی برار شریک نہ تھی۔ چاروں نے مل کر ۱۵۶۵ء میں تالی کوٹ کی جنگ کی جس نے وجیا نگر کی عظیم الشان سلطنت کو ہندوستان کی سیاسیات کے صفحے سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔

شکست خوردہ سلطنت کی تقسیم کے بارے میں نزاع پیدا ہوئی۔ ان کی آپس کی حاسدانہ کارستانیوں نے اکبر اعظم کو جو اس وقت دہلی میں فرمان روائی کر رہا تھا ابھارا۔ اس کی دیرینہ آرزو تھی کہ نربدا کے جنوبی علاقے کو زیر نگیں کیا جائے۔ خاندیس کے صدر مقام اور دکن کے صدر دروازے

برہان پور پر اس نے ۱۵۹۳ء میں قبضہ جمالیا۔ اس کے بعد سلطنت احمد نگر پر اس کے جغرافی محل وقوع پر نظر کر کے حملہ ہوا۔ چاند بی بی پر زور اور حیلہ انہ مدافعت کی روح رواں تھی لیکن اپنے ایک امیر کے ہاتھوں قتل ہو گئی اور میڈو ٹیلر کے مشہور رومان کی ہیروئن بنی۔

چاند سلطانہ ہمارے ضلع کے بعض دیہات میں اب تک عزت و احترام سے یاد کیجاتی ہے۔ ایک اہم واقعہ کی یادگار چیکل تھانے میں اب تک موجود ہے جو شہر اورنگ آباد سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس موضع میں ہر سال اس شریف ملکہ کے اعزاز میں دسہرے کے موقع پر سب سے پہلے ایک جھنڈا بلند کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسری رسمیں ادا ہوتی ہیں۔ اس کو دلفریب حسن و جمال کی دیوی کہتے ہیں کرامات اس سے منسوب کیجاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ جالنہ سے احمد نگر جا رہی تھی تو اثنائے راہ میں چیکل تھانہ سے متصل خیمہ زن ہوئی۔ علی الصبح وہ وہاں سے یکایک غائب ہو گئی اور احمد نگر میں پائی گئی۔ اس موضع کے قریب کی جگہ جو اس کی فرودگاہ تھی اب تک "سنگار باڑی" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ نام بھی اس کی دلفریبیوں کی طرف ایک نازک اشارہ ہے۔

چاند بی بی کے قتل کے بعد اکبر نے اپنا اقتدار احمد نگر میں نافذ کر دیا لیکن مدبر او سخت کوش وزیر ملک عنبر نے شکست نصیب خاندان کو مرتضیٰ کی بادشاہی کا اعلان کر کے از سر نو زندہ کیا اور خود وزیر اور نائب بنا۔

مرتضیٰ کی تاج پوشی کی رسم ملک عنبر نے پرینڈہ (ضلع عثمان آباد) میں ادا کی لیکن وہ دولت آباد واپس آیا اور تقریباً ۱۶۱۰ء میں شہر اورنگ آباد کی بنیاد ڈالی۔ دس سال کے عرصے میں یہ نیا پایہ تخت ایک آباد اور بارونق شہر بن گیا۔ گزیٹر کے بیان کے مطابق اس شہر کی آبادی ملک عنبر کے عروج کے زمانہ میں دو لاکھ کے قریب تھی۔

میں ان اسباب کا ٹھیک کھوج نہ لگا سکا اور نہ کسی تاریخ یا وقایع سے اس پر روشنی پڑتی ہے کہ ملک عنبر نے یہ جگہ کیوں انتخاب کی۔ حالانکہ یہ جگہ دولت آباد کے مقابلے میں کچھ محفوظ نہ تھی۔ دولت آباد اس کے قبضہ میں تھا۔ وہ گلزار ہو رہا تھا۔ اور خود بڑا فوجی صدر مقام تھا۔ موجودہ اورنگ آباد شہر بہت ہی ناہموار جگہ پر آباد ہے اور اس کا بہت بڑا حصہ نشیب میں ہے۔

قرین قیاس یہ ہے کہ ملک عنبر چاہتا تھا کہ وہ بیجاپور کی شان اور وجیانگر کے ویران شہر کی قدیم عظمت کے مقابلہ کا ایک شہر آباد کرے۔ گو وجیانگر ہندوستان کے نقشے سے محو ہو چکا تھا لیکن لوگوں کے دلوں میں اس کی یاد تازہ تھی۔

وافر مقدار میں آب رسانی کیلئے اس جگہ کا جغرافی محل وقوع بہت موزوں تھا اس کے شمال میں لاکن واڑا کا پہاڑی سلسلہ ہے اور جنوب میں ستارا کی پہاڑیاں۔ دونوں کے درمیان دس میل کی وادی ہے جس میں ایک دھار بہتی ہے جسکو کھام ندی کہتے ہیں۔ یہ جگہ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے اس جدت آمیز طریقہ آب رسانی کے لئے بہت موزوں ثابت ہوئی جس نے اپنے بانی کے نام کو زندہ دوام کر دیا۔

میں ملک عنبر کے گوناگون کارناموں سے بحث کرنا نہیں چاہتا میں صرف اس کے ان کارناموں کا مختصراً ذکر کروں گا جو اس نے اس شہر میں انجام دیئے ہیں۔ اس نے نوکھنڈہ محل تعمیر کرایا جو اس وقت ویران ہے اس میں پانچ زنانہ عمارتیں ایک دیوانِ عام۔ ایک دیوان خاص اور ایک مسجد تھی۔ اور اس کے ساتھ کئی باغ، حوض اور حمام بھی تھے۔

جامع مسجد اس کی زندگی میں کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے پچاس کثیر الاضلاع ستون ہیں۔

چیتا خانہ ۔ یہ ایک شاندار عمارت تھی جو ویران ہو چکی تھی ۔ یہ عمارت اس نے شہر کے پنڈتوں اور عالموں کے جلسوں کے لئے تعمیر کرائی تھی۔ لیکن اس کے بعد اس مقدس عمارت کو روز بد دیکھنا نصیب ہوا ۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں اس کو مسافر خانہ بنا دیا گیا تھا ۔ اور بعد کو اس میں شاہی شکاری چیتے بھی رکھی گئی تھیں کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ وہ محبس کے طور پر استعمال ہوتا تھا ۔ یہیں شہر کی صفائی کا دفتر چند سال رہا ۔ اب اس کی ترمیم ہو چکی ہے اور پھر یہ ٹاؤن ہال کے کام میں استعمال ہو رہا ہے ۔ شہر کی موجودہ سڑک ایک بڑے سنگین دروازے سے گزرتی ہے جو بھڑ کل کہلاتا ہے جس کے معنی قدیم دکھنی زبان میں دروازہ کے ہیں ۔

اس کے کارناموں میں سب سے زیادہ نمایاں کام جس کی بدولت اس کا نام زبان زد خاص و عام ہے اس کا طریقہ آب رسانی ہے جس کو اس نے شہر میں جاری کیا تھا ۔ شہر سے پانچ میل کے فاصلہ پر ایک ندی سے ایک نہر لائی گئی جس میں نلکیوں کا سلسلہ چلایا گیا ہے ۔ ان میں کچھ کے پختہ کھلے دریچے ہیں ۔ قوت جاذبہ کے آسان طریقے سے یہ نہر آج تک شہر کی ضروریات کو پورا کر رہی ہے اس کی تکمیل دس سال کے عرصہ (۱۶۱۶ ۔ ۱۶۲۶) میں ہوئی ۔

ملک عنبر نسلاً حبشی تھا ۔ اس کی پرورش ایک غلام کی حیثیت سے دربار بیجاپور میں ہوئی تھی ۔ بعد کو یہ احمد نگر کے نظام شاہی بادشاہ کی ملازمت میں داخل ہو گیا تھا ۔ وہ دکن کی تاریخ میں اسی طرح مشہور رہے جس طرح کہ شمالی ہند کی تاریخ میں ٹوڈرمل ہے ۔

وہ بہت وسیع المشرب تھا ۔ اس نے اپنے دوستوں کے انتخاب میں کبھی کوئی امتیاز روا نہیں رکھا ۔ اس کے رفیقوں میں شیواجی کا باپ شاہ جی بھی تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک عیسائی گرجا بھی تعمیر کرایا تھا ۔ اسی سال کی طویل و پختہ عمر میں وہ فوت ہوا ۔ اس کا بیٹا فتح خان اس کا جانشین ہوا اس نے وقت کی موزونی کے لحاظ سے کوئی ترقی نہیں کی اور اس کو بھی نہ سنبھال سکا جو کچھ کہ اس کے باپ نے حاصل کیا تھا ۱۶۳۳ء میں فتح نگر مغلوں کے قبضے میں آگیا ۔

اورنگ زیب نے صوبہ دار دکن کی حیثیت سے اس شہر کو اپنا مستقر بنایا اور ۱۶۵۳ء میں اورنگ آباد کے نام سے موسوم کیا ۔

چار سال بعد وہ تخت دہلی پر اس وقت متمکن ہوا جب کہ ٹھیک دو سو سال بعد ایک عظیم ترین انقلاب ہندوستان میں رونما ہونے والا تھا۔

عہد مغلیہ کی عمارتوں میں سب سے زیادہ اہم مقبرہ ہے جس کو اعظم شہزادہ نے اپنی ماں کی یادگار میں تعمیر کرایا ۔ (۱۶۵۰ ۔ ۱۶۵۷) ۔
اس کے لئے پورے سنگ مرمر آیا ۔ ٹاورنیر سیاح کا بیان ہے ۔

"ایک مرتبہ سورت سے گولکنڈہ جاتے ہوئے راستے میں تین سو بیل گاڑیاں ملیں جو سنگ مرمر سے لدی ہوئی تھیں ۔ چھوٹی سی چھوٹی گاڑی کے کھینچنے کے لئے بھی بارہ بیل درکار تھے ۔"

معمار کا نام عطاء اللہ تھا ۔ ساڑھے چھ لاکھ روپیے کی لاگت آئی ۔ یہ عمارت مشہور تاج محل کے جواب میں تعمیر ہوئی تھی جو تقریباً اسی زمانہ میں تکمیل کو پہنچا تھا لیکن مقبرہ سے اس قدر جلد ویرانی اور خرابی کے آثار رونما ہونے لگے کہ باوجود بہت خوبصورت ہونے کے بھی وہ اپنے مد مقابل سے ہر طور کم رتبہ ہے ۔

یہ مقبرہ ۵۰۰ × ۳۰۰ گز کے احاطے میں ایستادہ ہے ۔ درگاہ سرخ تراشیدہ پتھر کے (۲۰ ، ۱۰) مربع گز چبوترے پر ہے ۔ یہیں ان

چار میناروں کی بلندی بھی ہے جو چبوترے کے چاروں زاویوں پر واقع ہیں۔ قبر مربع ہے اور ایک بلند مجلی محراب رکھتی ہے۔ اوپر چار مینار ہیں۔ ان چاروں میناروں کے متوازی چھوٹے چھوٹے گنبد کونوں پر ہیں۔ مرمریں جالی کے در بیچے آگرہ کے دریچوں کی طرح نازک ہیں۔ آخر میں خوشنما سفید ابرقی مسالے کا ہاتھ پھیر گیا ہے۔

۱۶۵۳ء میں شہر پر دھاوا کرنے کے لئے مرہٹے ستارا کی پہاڑیوں کے قرب وجوار میں جمع ہوئے لیکن مغلوں کے ایک عظیم الشان لشکر کی آمد سن کر فرار ہو گئے۔ اس کے بعد کے سنین میں شہنشاہ عالمگیر کے حکم سے شہر پناہ تعمیر ہوئی جسکے ہر رخ پر ایک دروازہ تھا۔ شمالی رخ پر دہلی دروازہ تھا۔ اس زمانہ میں جنوب کے تمام مشہور شہروں میں اس نام کا اور اسی رخ پر ایک دروازہ تھا حتیٰ کہ پونہ میں پیشوا کے محل کے دروازہ کا نام بھی دہلی دروازہ تھا۔

۱۶۹۲ء میں اورنگ زیب نے قلعہ ارک تعمیر کرایا۔ ارک کے معنی ترکی زبان میں قلعے کے ہیں۔ ارک میں اب مسجد قابل دید ہے۔ ہندوستان میں خوشنما ترین مناظر میں پن چکی ہے جس پر دکن اور اورنگ آباد کو فخر ہو سکتا ہے۔ یہاں شہنشاہ اورنگ زیب کے مرشد بابا شاہ مسافر آسودہ ہیں مسٹر گلیڈسٹن سالمن اسکے متعلق لکھتے ہیں۔

"میں اس کو ان دلفریب باغوں میں شمار کرتا ہوں جو میں نے مشرق میں دیکھے ہیں۔ متقابلۃً چھوٹی سی جگہ میں وہ اپنے مکمل خاکے کی پوری دلکشی رکھتا ہے۔ اس سے ملحق چند نہایت دلچسپ تاریخی اور مقدس عمارتیں بھی ہیں۔ اس کے حوض اپنی ترتیب کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔ حوض کے قریب جو شاندار ہال ہے وہ میرے دیکھے ہوئے ہندوستانی باغوں میں بے نظیر ہے۔ وہ پھول پتیوں سے ڈھکی ہوئی چھوٹی سی نشست گاہ جو مسجد کی طرف سب سے چھوٹے حوض کے قریب واقع ہے ایک حسن کار کے نقطۂ نظر سے مکمل ہے۔"

روضہ باغ۔ اس میں اورنگ زیب کے ایک استاد اسمٰعیل خان آسودہ ہیں۔ آج کل کوتوالی بنگلہ بنا ہوا ہے۔

اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء میں ہوئی اس کے لڑکوں میں جنگ چھڑ گئی ۱۷۱۳ء میں نظام الملک حیدرآباد کے موجودہ حکمران خاندان کے بانی دکن کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ ۱۷۲۳ء میں وہ آصف جاہ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ دہلی کی سازشوں سے وہ اس قدر بیزار ہو گئے تھے کہ انھوں نے دہلی سے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور ۱۷۲۷ء میں اپنا پایہ تخت حیدرآباد منتقل کر دیا۔

وہ خاص اور قابل ذکر عمارتیں جو عالمگیر کی وفات کے بعد اور آصف جاہ کے زیر نگرانی تعمیر ہوئیں حسب ذیل ہیں۔

مسجد شاہ گنج جو ۱۷۲۰ء میں تعمیر ہوئی۔

بارہ دری عیوض خاں۔ عیوض خان آصف جاہ کی غیر حاضری میں نیابت کی خدمت انجام دیتے تھے۔ یہ بارہ دری انھوں نے تعمیر کرائی۔ اس سے متصل دمڑی محل تعمیر ہوا۔ یہ عمارتیں مزدوروں کی اجرت سے دمڑی دمڑی بچا کر بنائی گئی تھیں۔ بارہ دری میں آج کل صوبہ داری اور اوّل تعلقداری کے دفاتر ہیں۔

یہ شہر اپنے عروج کے زمانے میں تین میل شمال میں کھام ندی تک اور مشرق میں جھیل جھیل تھانے تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی آبادی عام طور پر ۵ لاکھ بھی جاتی تھی لیکن اس وقت جب کہ شہنشاہ اس کا دربار خاندان اور پورا لشکر اس کے عہدہ دار اور راجگان مع اپنے متعلقین کے یہاں قیام پذیر تھے تو کہا جاتا ہے کہ اس کی آبادی دس لاکھ کے قریب تھی۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ مغلوں کی وسیع و عریض سلطنت کی آمدنی اورنگ آباد پر خرچ ہوتی تھی لیکن آج یہ اپنی عظمت رفتہ کی ایک شکستہ سی یادگار ہے۔

جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے اس شہر پر تین شاندار دور گزرے ہیں۔ آصف جاہ نے اپنا زیادہ وقت شہنشاہ کی نگرانی میں صرف نہیں کیا بلکہ وہ زیادہ تر دہلی میں رہے۔ عہد عالمگیری میں یہ شہر خاص طور پر فوجی اور سیاسی مرکز بنا رہا۔ اس کی حقیقی عظمت و شان کا دور اس کے بانی ملک عنبر کے عہد میں گزرا ہے اس وقت وہ علوم و فنون کا مرکز تھا۔ مختلف طبقوں کے لوگ بہ امن و اطمینان ایک دوسرے کے دوش بدوش رہتے تھے۔ اس نے گرجا تعمیر کیا، مسجد بنائی۔ پنڈت محل تعمیر کرایا۔ ٹھاکر محل بنوایا۔ جو صاف ظاہر ہے کہ محض ہندوستانی روایات کو برقرار رکھنے کے لئے کیا گیا۔

شہر اورنگ آباد اپنے اندر رواداری، مساوات، امن اور آزادی کی بہت خوش گوار روایات رکھتا ہے۔ اس مضمون کے اختتام پر میں اس عظیم الشان شہر کے باشندوں کی طرف ایک پیغام سنانے کی جراءت کرتا ہوں۔ وہ پیغام کیا ہے۔ ذات پات اور مذہب کے امتیازات کو مٹانا۔ شہر کی بہبودی کی خاطر اور اس کی روایات کے شایان شان ترقی کرنے کی طرف بڑھنے کیلئے ایک دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھانا ہے۔

تمام مذاہب کی ایک ہی تعلیم ہے۔ دہریت کی بھی تعلیم ہے کہ اس دنیا میں بنی آدم کے ساتھ کچھ نیکی کی جائے۔ عمر خیام کی ایک معنی خیز رباعی پر اس شہر کے بانی ملک عنبر کے احساسات کے لحاظ سے میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

در صومعہ و مدرسہ و دیر و کنشت — ترسندہ دوزخ است و جویائے بہشت
آن کس کہ ز اسرار خدا با خبر است — زین تخم در اندرون دل ہیچ نکشت

غلام احمد خاں
(صوبہ دار)

"اس میں تاریخ اور افسانے اور واقعات اور تخیل کو اس خوبی سے سمویا ہے کہ قطب شاہی دور کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ بڑی بڑی تاریخوں سے وہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں جو اس چھوٹی سی کتاب میں ہیں اور نہ وہ کیفیت ہے جو اس میں ہے۔ اس وقت کی معاشرت کا رنگ بھی اس میں نظر آتا ہے اس زمانہ کے بعض بادشاہوں، شہزادوں، مشاہیر کی تصویریں بھی ہیں جس سے کتاب کی دلکشی بڑھ گئی ہے۔" یہ گولکنڈہ کے متعلق مولانا عبدالحق صاحب بابائے اردو معتمد انجمن ترقی اردو کی رائے ہے۔ یہ کتاب صرف ۵ روپے میں سب رس کتاب گھر یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہے۔

خواتینِ دکن کی اُردو خدمات

مندرجۂ بالا عنوان پر ہماری ایک کتاب زیرِ ترتیب ہے، بڑا حصہ مکمل ہوگیا ہے، اس کے ابتدائی اوراق "سب رس" کے ناظرین اور ناظرات کے ضیافتِ طبع کے لئے پیش ہیں۔ امید ہے کہ موجبِ دلچسپی ہونگے

ہاشمی

دکن میں اُردو زبان کی ترویج ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) میں ہوچکی تھی، اس کے بعد وہ بہت جلد بول چال کے درجہ سے گزر کر تحریری صورت میں بھی آگئی، پھر اس نے ترقی کے مدارج مسلسل طے کئے، تا آنکہ آج جامعۂ عثمانیہ کے ذریعہ اس کا معراج ہو رہا ہے۔

دکن میں اُردو کی ابتدائی اور اسکی ترقی کا مفصل تذکرہ "دکن میں اردو" کی تیسری اشاعت اور مدراس میں اردو میں قلمبند کردیا گیا ہے، اگرچہ دکن میں اردو "کے چند صفحات پر خواتین کا تذکرہ بھی آیا ہے، لیکن اردو کی ترقی میں خواتینِ دکن نے جو حصہ لیا ہے، اس کا کوئی مفصل تذکرہ ابھی قلمبند نہیں ہوا ہے، اس مختصر سی کتاب کا مقصد یہ ہے کہ بعض ان خواتینِ دکن کے کارناموں کی وضاحت کیجائے، جنہوں نے "ہندوستانی" کی ترقی میں حصہ لیا ہے۔

"ہندوستانی" کی ترقی کے لئے دکنی خواتین نے جو خدمت گزاری کی ہے، اسکی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں:۔

(۱) مولفین اور شعرائے اُردو کی سرپرستی وغیرہ

(۲) شعر گوئی (۳) نثر نگاری و انشاپردازی (۴) خطابت (۵) صحافت اور انجمنوں کے ذریعہ اُردو کی خدمت گزاری۔

ان ہی عنوانوں کے تحت صفحاتِ آیندہ میں خواتینِ دکن کی خدمات کا تذکرہ کیا جائیگا۔

مولفین و شعرائے اردو کی سرپرستی وغیرہ

خواتین کا مولفین اور شعرا کی سرپرستی کرنا، اور ان کے خدمات کا صلہ دیکر قدر دانی، ہمت افزائی کرنا، درحقیقت زبان کی خدمت گزاری میں داخل ہے، دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے، اور علما، شعرا فکرِ معاش سے مستغنی ہوکر علمی خدمت میں منہمک اور مصروف ہو جاتے ہیں۔

خواتینِ دکن نے بھی اردو مصنفین اور شعرا کی قدردانی کی ہے، اور اپنی سرپرستی سے نظم اور نثر میں کتابیں مرتب کرائی ہیں، اس خصوص میں ہم سب سے پہلے عادل شاہی ملکہ خدیجہ سلطان شہر بانو کا نام پیش کرتے ہیں، جو سلطان قلی قطب شاہ کی پوتی، سلطان محمد کی برادر زادی، سلطان عبداللہ کی بہن تھی، اور سلطان محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۹ھ) سے بیاہی گئی تھی اس کے دربار میں کئی نامور شعرا کو بار حاصل تھا، ان میں ملک خوشنود اور رستمی جیسے استادانِ سخن بھی شامل تھے، ملکہ کی سرپرستی سے ملک خوشنود نے کئی مثنویاں لکھیں، جن میں ہشت بہشت اور یوسف زلیخا قابلِ تذکرہ ہیں، رستمی نے دکنی رزمیہ مثنوی کا شہ کار خاور نامہ

قلبند کیا، اس کی وجہ سے ملکہ کا نام اس وقت تک باقی رہے گا جب تک کہ یہ مثنوی باقی ہے۔ سلطانہ شہر بانو کی علمی فیاضی کا تذکرہ "خیابان نسواں"[1] میں تفصیل سے کیا جاچکا ہے، اس لئے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں دوسرا نام ماہ لقا بائی چندا کا پیش ہو سکتا ہے، اس کی علمی قدر دانی شعرا مصنفین اور مورخین کے لئے بہت زیادہ باعث فخر کا باعث تھی۔ چندا کا مفصل تذکرہ آگے آتا ہے۔

نور النساء بیگم مرحومہ بنت نواب مختار الملک اول کا نام نامی اس سلسلہ میں لانا ضروری ہے جن کی تعلیمی دلچسپی اور نسوانی ہمدردی نے "تذکرۂ جمیل" ان کے اسم گرامی پر معنون ہوا ہے، اور ان کی سرپرستی میں اس کی اشاعت ہوئی ہے۔

موجودہ دور میں۔ اس ذیل میں شہزادی ہر ہائینس درشہوار دردانہ بیگم صاحبہ اور شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ کا اسم گرامی پیش کیا جا سکتا ہے جن کے اسماء گرامی پر کئی کتابیں معنون ہوئی ہیں، مثلاً ہر ہائینس کے اسم گرامی پر راقم کی کتاب "خواتین عہد عثمانی" اور جہاں بانو بیگم نقوی کی "پروازِ خیال" اور شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ کے اسم گرامی پر بسمل صاحب کی تصنیف "صنف نازک" اور راقم کی "خیابان نسواں" کو معنون ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔

اس عنوان میں صغرا بیگم ہمایوں مرزا کا نام بھی پیش ہو سکتا ہے، جو عموماً اپنی علمی ہمدردی اور خصوصاً اردو کی دلچسپی کے باعث اردو ادب اردو کے معاونین کے زمرہ میں شامل کی گئی ہیں۔

شعر گوئی اور نثر نگاری

اب ہم خواتین دکن کی شاعری اور نثر نگاری کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ مورخ اردو کے لئے یہ دشوار ہے کہ وہ ہر صدی کی خواتین کی ادبی خدمتوں کا تذکرہ کر سکے، اول تو اس لئے کہ پردہ کے باعث خواتین کے علمی کارنامے بھی پردۂ خفا میں رکھے گئے، اور آج بھی بعض گھرانوں میں اسی پر عمل ہے۔

دوسرے یہ کہ زمانۂ گذشتہ میں عام طور سے تعلیم نسواں کا رواج نہیں تھا اور تعلیمی سہولتیں حاصل نہیں تھیں، اس لئے خواتین نے کچھ کام بھی کیا تو وہ پوشیدہ رہا۔

گو یہ صحیح ہے کہ بعض خاندانوں میں عورتوں کی تعلیم کا رواج تھا، مگر ان میں بھی زیادہ تر ابتدائی اور معمولی مذہبی تعلیم کا رواج تھا، اعلیٰ فنی اور فارسی تعلیم حاصل کرنا سب کا کام نہیں تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہم کو گذشتہ صدیوں کے "اردو" خدمات کی تفصیل بیان کرنی دشوار ہے، جو کچھ صراحت اس موضوع کے تحت کی جا سکتی ہے وہ زیادہ تر چودھویں صدی ہجری سے متعلق ہوگی۔

چودھویں صدی ہجری کے قبل ہم جن شاعر خواتین کا تذکرہ کر سکتے ہیں وہ صرف چندا، شرف النساء اور فاطمہ ہیں۔

چندا۔ ماہ لقا بائی چندا، ایک باہر فن موسیقی اور شاہی طوائف تھی، مگر آج کل کے پیشہ ور طوائفین سے اس کی حالت

---

[1] مولف کی دوسری تالیف جو صمت بک ڈپو دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

جداگانہ تھی، اس کی علمی قابلیت اور شعرا و مصنفین کی قدر دانی کے باعث آج تک اس کا نام زندہ ہے۔

۱۱۸۱ھ میں تولد ہوئی اور ۱۲۳۶ھ میں اس کا انتقال ہوا، حیدرآباد میں کوہ مولا کے قریب مدفون ہے۔

وہ صاحب منصب و جاگیر تھی، اس لحاظ سے بلند پایہ اور اعلیٰ حیثیت رکھتی تھی، اس کے موسیقی کے جلسوں میں ارسطو جاہ، اور میر عالم (وزرا حیدرآباد) جیسی شخصیت کے اصحاب شریک ہوتے تھے، اور میر عالم نے تو ایک مثنوی اس کی مدح میں لکھی ہے، چندا کے پاس صرف پہرہ کے لئے پانچ سو سپاہی ملازم تھے، اس سے اس کی دولت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

چندا ایک باکمال ماہر موسیقی ہونے کے علاوہ وہ ایک نازک خیال اور بلند پرواز شاعرہ بھی تھی، اس کا دیوان ۱۲۱۳ھ میں ارسطو جاہ کے حکم سے مرتب ہوا ہے جس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، جو سر جان ملکم کو بطور تحفہ دیا گیا تھا۔

وہ شاعری کے ساتھ شعرا کی قدر دان بھی تھی، اس کے پاس ہمیشہ شعر و شاعری کی گرم بازاری رہا کرتی، شعرا کی ہمت افزائی بندھانا اور حوصلہ افزائی بھی اس کا معمول تھا۔

چندا کو موسیقی، شاعری کے ساتھ تاریخ سے بھی شغف تھا، اسکی سرپرستی سے ایک تاریخ "دل افروز" کے نام سے لکھی گئی ہے، جو دکن کی معتبر تاریخوں میں شمار ہو سکتی ہے۔

بہرحال چندا نے نہ صرف اپنی شاعری کے ذریعہ بلکہ شعرا و مصنفین کی سرپرستی کرکے بھی اردو زبان کی خدمت گزاری میں حصہ لیا ہے، چندا کو شیر محمد خان ایمان سے تلمذ تھا۔

موضع "اڈیکمٹ" اسی کی جاگیر میں تھا، جہاں آج جامعۂ عثمانیہ کی پرشوکت اور شاندار عمارت تیار ہو رہی ہے،

چندا کا دیوان کوئی ضخیم دیوان نہیں ہے، اسکے کلام میں پاکیزگی اور لطافت کے ساتھ شعریت اور موسیقی بھی ہے جسکی وجہ سے دل آویزی پیدا ہو گئی ہے، مبتذل جذبات اور عامیانہ خیالات سے بھی اسکی شاعری پاک ہے، اس سے بھی اس کے بہترین اخلاق کا پتہ چلتا ہے،

"حیات ماہ لقا بائی" کے نام سے اس کی ایک سوانح عمری بھی غلام صمدانی خاں گوہر نے شائع کی ہے، یورپ میں دکھنی مخطوطات "دکن میں اردو" اور "مرقع سخن" جلد اول میں اس کے حالات موجود ہیں،

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ جسطرح اس کی جاگیر "اڈیکمٹ" تعلیمی مرکز بن رہا ہے اسی طرح اسکی پروردہ لڑکی "حسن لقا بائی" کا باغ بھی زنانی مدرسہ[1] کے لئے منتخب ہوا ہے۔

چندا کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

قتل پر کس کے آج ہوتی ہے ۔ توسن حسن پر سوار شراب

کب تک رہوں حجاب میں محروم وصل سے ۔ جی میں ہے کیجے پیار سے بوس و کنار محبوب

---

[1] نام پی پائی اسکول۔

رخصت بوسہ دیا پان چھپا کر ظالم — یہی قسمت میں مگر تھا یہ حجاب یاقوت
ساقی دے مجھ کو جام مے ارغوان پھر — افسردہ دل میں آئے جو تھا ہی جان پھر
بنایا یا ملک صورت کو وہ نقاش کہ جن — کھنچے نقشہ نہ ایسا مانی و بہزاد سے ہرگز
مری نازک مزاجی کی خبر رکھتا نہیں ہرگز — وہ بیکس دل نہیں ممکن کسی کا ہو کبھی عاشق
عمر بھر دوں ہی رہے حسن کا چند جلوہ — آرزو رکھتے ہیں یہ چند گزارے ہم
وفا کے رقعہ سے اپنے کمال عاجز ہیں — جتاؤ انکی نہیں علوم پیشتر ہم کو
چشم کافر بھی ہے او غمزہ خونخوار بھی پھر — قتل کو کیسی سپاہی کے یہ تلوار بھی ہے
سو جان سے ہو گئی وہ تصدق سر مولا — چندا کی جو کوئین میں امداد کرو گے
کیا بے ضبط اس پردہ نشین کے عشق میں یاں تک — صدائے آہ ناممکن ہے دل سے تا گوش آئے

شرف النساء

شرف النساء کے متعلق ہم کو کوئی معلومات حاصل نہیں ہیں، ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ اسی زمانہ (تیرہویں صدی ہجری) کی شاعرہ تھی۔ اس کا ایک مرثیہ ہمیں دستیاب ہوا ہے جس کے بعض شعر ملاحظہ ہوں۔

بسیا چاند غم کا گگن میں حسین — پڑا زلزلہ سب زمن میں حسین
رسالت کے گگن کا منور چندر — چھپا کربلا کے بن میں حسین!
کیا گگن نے نیلی قبا تن ادپر — دیکھیا جب کیلا کفن میں حسین[1]

فاطمہ

فاطمہ بھی اسی زمانہ کی مرثیہ گو ہے، اس کا ایک مرثیہ ہمیں ملا ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے متعلق بھی کوئی تفصیلی صراحت نہیں کی جا سکتی۔ مرثیہ کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

کیوں کربلا میں آج حسین علی گئے — مظلوم کربلا حرم کو علی کے رتن گئے
خنجر جفا کا حلق پیاسے پہ [illegible] گئے — اطفال کو کر یتیم نبی کے جوان گئے
کن کے گلے پہ ظلم سوں خنجر پھرا و دریغ — حسرت سے ہاتھ مارتے خیر الانام گئے
نادے کو تیر تیغ کو کیا ظلم بے رحم — نعرہ دریغ سوں مار کر خیر النساء گئے
کھینچتے عرش رسول سوں گریاں ہو فاطمہ — پیاسا ہو آج جگ سوں شہ دین سیں گئے
قاسم سجن پہ ظلم ہوا کربلا منے — کرتے ہیں یاد تجھ کو دولہن کربلا منے
کیوں رن میں تجھ اکیلا وہاں کفن کربلا منے — افسوس آہ مار کو قاسم سجن گئے

---

[1] خیابان نسواں مولفہ راقم میں پورا مرثیہ نقل کیا گیا ہے۔

محشر میں فاطمہ کے نئے والی ہے فاطمہ　　پھر جادہ بات کو پاویں گے فاطمہ

کر فضل سوں اس کو چھڑا دیں گے فاطمہ　　مظلوم فاطمہ کے حسین علی　　گئے (از بیاض کتب خانہ مولوی عبدالحق)

افسوس ہے کہ تیرھویں صدی ہجری کے دیگر کسی شاعر خاتون کا تعارف کرانے سے ہم سردست معذور ہیں۔ ممکن ہے کبھی اس میں اضافہ ہوسکے۔

اس کے بعد چودھویں صدی کے شعرا و نثر نگار خواتین کا تذکرہ کیا جائیگا۔ سہولت کے مدنظر ان کی تقسیم کی گئی ہے، 'دور محبوبی'، 'دور عثمانی' کے تحت ان کو متعارف کیا گیا ہے فقط

نصیر الدین ہاشمی

اورنگ زیب اور تاناشاہ

"اچھا تو نماز ہو رہی ہے!"

تاناشاہ نے کہا اور ساتھ ہی اس کا چہرہ غصے سے تمتما گیا۔

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ مغل ہمارے نشانہ بازوں کی اتنی تحقیر کریں گے! قلعہ کے اس قدر قریب اور ہمارے تیر و تفنگ کی زد میں کھڑے ہو کر نماز جماعت کا ادا کرنا مصلحت اور دور اندیشی سے تو یقیناً بعید ہے! کیا اورنگ زیب جیسا دور اندیش اور ہوشیار بادشاہ بھی غلطی کر سکتا ہے! نہیں ہرگز نہیں یا یکہ تازی کے بھروسے دیکھنا ہے کوئی ہمارا اچھا نشانہ باز؟"

اورنگ زیب کئی مہینوں سے گولکنڈہ کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ مغل فوجیں چاروں طرف سے ایک مہیب سمندر کی پر جوش موجوں کی طرح قلعہ کی فصیلوں سے آکر ٹکراتی ہیں۔ اور ہر ہر دفعہ دکنی سپاہی پہاڑوں کی چٹانیں بنکر انہیں پیچھے ہٹا دیتے ہیں۔ اس وقت آفتاب کی تمازت میں خاصی کمی ہو گئی ہے اور غنیم استقلال اور پوری قوت کے ساتھ حملوں پر حملے کئے جا رہا ہے۔ ان صفوں کے ذرا پیچھے دو تین ہموار قطاریں نظر آتی ہیں کیونکہ اورنگ زیب اور اس کے کئی ایک مصاحب ابھی نماز کیلئے صف بستہ کھڑے ہیں۔ چند لمحے گذرنے نہیں پاتے ہیں کہ امام یکایک تڑپ کر آگے کی طرف گر پڑتا ہے۔

"خوب! شاباش!! امام رکھ لیا۔ دیکھنا صف میں سے ایک دوسرا شخص امامت کیلئے آگے بڑھ رہا ہے۔ ہاں چھوڑنا نہیں۔ کوئی امام نہ بچے۔ اس کو کہتے ہیں انتقام تحقیر!!"

شاہی حکم بجلی بن کر دوسرے امام پر گرتا ہے اور وہ بھی دکنی گولنداز کا نشانہ ہو جاتا ہے

دو تین پیش اماموں کے یکے بعد دیگرے اس طرح نذر اجل ہو جانے کے بعد امامت کیلئے صف میں سے آگے بڑھنا کسی معمولی دل و دماغ والے کا کام نہیں! اس سرے سے اس سرے تک پس و پیش کا ایک عجیب عالم چھا جاتا ہے لیکن ابھی چند لمحے بھی گذرنے نہیں پاتے ہیں کہ خود اورنگ زیب امامت کے لئے بڑھتا نظر آتا ہے اور اب گولکنڈہ کا شاہی نشانہ باز بندوق خالی کرنے ہی کو ہے کہ تاناشاہ لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

"ظالم! کیا ایک بادشاہ کو بھی نشانہ بنائے گا؟ دکھائی نہیں دیتا کہ خود اورنگ زیب اس وقت امام ہے!!"

سید محی الدین قادری زور

حیدرآباد اور دیہی تنظیم

ہر ملک اپنی آب و ہوا، موسمی خصوصیات، قدرتی حالات اور جغرافی ماحول کے مطابق اپنی آبادی کی گذر اوقات کے لئے آمدنی حاصل کرنے کے چند شعبوں کا انتخاب کر لیتا ہے۔ ان مختلف شعبوں میں زراعت سب سے اہم ہے کیونکہ اس میں نہ صرف پودے لگا کر زرعی پیداوار حاصل کرنا شامل ہے بلکہ فصلوں کو بیماریوں اور وباؤں سے بچانے کی تدبیریں، زرعی پیداوار کی نکاسی کا انتظام، مویشیوں کی خورد و پرداخت، اچھی نسلیں پیدا کرنا، زمین کے مختصر ٹکڑوں سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی کوشش بھی اسی کے دائرہ میں داخل ہے۔ اور دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ اسی شعبہ سے آمدنی حاصل کر رہا ہے۔

۱۷۶۰ء کے صنعتی انقلاب سے پہلے ہر ملک میں زراعت کی بڑی اہمیت تھی، مگر انقلاب کے بعد حالات بدل گئے۔ بھاپ پر انسانی اقتدار اور نئی نئی کلوں کی ایجاد نے پیدائش دولت کو آسان کر دیا۔ دولت کی کثیر تعداد قلیل وقت میں انسان کی معمولی کوشش سے پیدا ہونے لگی۔ اس نئے طریقہ نے کس طرح قدیم مذہبی رجحانات، انفرادی آزادی، خانگی زندگی، مکمل مسرت کو مٹایا، چھوٹے دستکاروں اور غریب صناعوں کا خاتمہ کیا! مفلس کو مفلس ترین اور دولت مند کو دولت مند ترین بنانے میں مدد دی، یا میکانی قوت جس کی ابتدا انسان کے ایک تابع غلام کی حیثیت سے ہوئی اس نے کس طرح انسان کو اپنا غلام بنا لیا ہمارے موضوع سے خارج از بحث ہیں، مگر انقلاب کا ایک اہم نتیجہ یہ ہوا کہ زراعت کو غیر اہم اور صنعت و حرفت کو اہم سمجھا جانے لگا، ہر ملک یہ سمجھنے لگا کہ ہمارا کام صنعتی اشیا پیدا کرنا ہے، اور زرعی پیداوار ہمارے لئے دوسرے مہیا کرتے ہیں۔ اگر صرف چند ممالک اس اصول کو اختیار کرتے تو کچھ بے جا نہ تھا بلکہ تجارت خارجہ کے نظریہ کے مطابق کہ ہر ملک وہی چیزیں پیدا کرے جس کے لئے وہ موزوں ترین ہو، اور آپس میں تبادلہ کر کے اپنی ضروریات پوری کر لے بہت اچھا تھا کیونکہ اس کی بدولت ہر قوم دوسری قوموں کے قدرتی عطیات اور کسبی کمالات سے پوری پوری طرح مستفید ہو سکتی تھی۔ اور عمومی حیثیت سے دنیا میں کثیر دولت پیدا ہو سکتی اور دنیا کی خوشحالی میں اضافہ ہو سکتا تھا، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا، بلکہ ہر ملک نے اس اصول کو اختیار کرنے کی کوشش کی، حالانکہ یہ ان ملکوں کا رجحان تھا جن کے یہاں قدرتی حالات، موسمی خصوصیات اور زمین کی ساخت کے اعتبار سے زراعت کے کچھ اچھے امکانات نہ تھے، مگر دنیا کے ہر ملک نے اس رجحان کو ایک کلیہ بنا لیا اور صنعتی دوڑ میں ایک عالمی مسابقت شروع ہو گئی۔

زرعی معاشیات میں جنگ عظیم سے پہلے جو ادب کی قلت نظر آتی ہے اس کی وجہ یہی عالمی رجحان تھا مگر جنگ عظیم کے تلخ تجربوں نے فاتحین اور مفتوحین پر اس امر کا انکشاف کر دیا کہ اگر جنگ طویل ہو جائے، ملک کا محاصرہ کر لیا جائے، وسائل آمد و رفت کو مسدود کر دیا جائے تو ملک میں زہریلے بموں، مشین گنوں، خطرناک توپوں، ہوائی جہازوں، غوطہ خور کشتیوں اور جنگی جہازوں کی کثرت کے باوجود لڑائی جاری رکھنے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں کیونکہ جنگ کا انحصار آلات حرب سے زیادہ اشیائے خوراک پر ہے اور جب ان ہی کی قلت ہو جائے تو نہ لڑنے والے لڑ سکتے ہیں نہ آلات حرب کام آ سکتے ہیں۔ چنانچہ جنگ کے بعد یہ اصول تسلیم کر لیا گیا تھا کہ قوم کی مدافعت اور ملک کی حفاظت کے لئے زراعت ایک ناگزیر شئے ہے، اب دنیا نے زراعت کی طرف توجہ شروع کی، زرعی پروگرام بنائے گئے، زراعت کو ترقی دینے، اور زرعی آبادی کو بڑھانے کی کوشش شروع ہوئی اور حکومتوں نے اس سلسلے میں بے دریغ روپیہ خرچ کرنا شروع کیا اور زراعت کی ہر طریقے سے مدد کی جانے لگی۔

ہندوستان، اسکے صوبے، اور ریاستوں میں زراعت کا حال بالکل ہی مختلف ہے۔ اگر دوسرے ممالک میں زرعی آبادی کی قلت ہے تو ہمارے یہاں زرعی آبادی کی کثرت ہی نے زراعت کی حالت کو خراب کر رکھا ہے۔ اگر ان کے یہاں دیہی آبادی کم ہے تو ہمارے یہاں شہری آبادی کی کمی ہے۔ در اصل ہندوستان کلکتہ، بمبئی، دہلی یا حیدرآباد جیسے عظیم الشان شہروں، ان کی سر بفلک عمارتوں، خوشنما اور وضع دار بنگلوں، چوڑی سمنٹ دار سڑکوں، جگمگاتی ہوئی دوکانوں کا نام نہیں ہے۔ ہندوستان نام ہے اس کثیر آبادی کا جو کچے جھونپڑوں یا گھاس کے ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں رہتی ہے۔ محنت مشقت سے جن کے چہرے زرد ہیں، گال پچکے ہوئے آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں، بدن پر چیتھڑے ہیں، جن کی اکثر غذائیں ایسی ہیں جن میں غذائیت کا جز نہیں، جن کے بدن کا اکثر حصہ برہنہ و بے لباس ہے، جس کا ماحول ملیریا، انفلوئنزا، ہیضہ، پیچش، طاعون دق، سل اور اسی طرح کے دیگر متعدی امراض کے جراثیم سے پر ہے۔ جو دنیا کے لئے غذا مہیا کرتا ہے مگر اپنی غذا کے لئے دوسروں کا محتاج ہے، جو ہمارے شہروں اور گھروں کی رونق کا باعث ہے مگر خود اس کے گھر اجڑے ہوئے اور بے چراغ ہیں، وہ محنت کرتا ہے تو اس کی محنت کے پھل دوسرے کھاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ زراعت کی ان خرابیوں کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا ہر جگہ زراعت میں وہی خرابیاں ہیں جو ہمارے یہاں ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملکی حالات نے مجموعی حیثیت سے زراعت کی حالت کو خراب کر رکھا ہے، اور قدرت، سماج، کاشتکار اور حکومت ہر ایک اپنی جگہ پر اس کی تباہی کا ذمہ دار ہے۔

قدرتی اسباب میں سیلاب، خشک سالی، بارش کی غیر مساوی تقسیم، موسموں کی غیر یقینی حالت، کہر، اولا، پالا، اور ٹڈی دل شامل ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ان میں سے بعض اسباب کو دور کیا جا سکتا ہے۔ گویا انسان اگر قدرت کے قابو سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا تو کم از کم اس کا اتنا مطیع اور فرمانبردار بھی نہیں ہو سکتا جتنا کہ وہ آج نظر آ رہا ہے۔

مجموعی حیثیت سے سماج پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس نے زراعت کو معزز پیشہ نہ سمجھا، دیہاتیوں کے متعلق اچھی رائے قائم نہ کی، مصلحین قوم اور محبان وطن کا فرض تھا کہ وہ اس طرف توجہ کرتے مگر انھوں نے کثیر آبادی کو چھوڑ کر شہری آبادی کو جس کی ہمارے ملک میں قلت ہے اپنی اصلاح کا مرکز بنایا۔ انھوں نے کارخانے کے مزدوروں کیلئے جن کی تعداد ۲۰ سے ۳۰ لاکھ کے درمیان ہے قوانین بنانے اور ان کیلئے سہولتیں بہم پہونچانے کی جانب اپنی توجہ مبذول کی اور ۲۰ کروڑ آبادی سے تغافل برتا۔ اس خصوص میں سب سے زیادہ مورد الزام وہ تعلیم یافتہ اور صاحب ثروت افراد ہیں جنھوں نے دیہات میں جنم لینے اور پرورش پانے کے بعد دیہات سے لاپروائی اختیار کی۔ یہ اپنی واقفیت اور قدیم اقتدار کی بنا پر بہت کچھ کر سکتے تھے، مگر انھوں نے بھی اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے کیلئے شہروں کو ہی انتخاب کیا۔ ایسی صورت میں یہ کہنا بے جا نہیں کہ ان میں صداقت اور خلوص کا نام نہ تھا بلکہ وہ شہرت اور تشہیر کے خواہاں تھے، وہ خدمت خلق کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ دنیا پر اپنی قابلیت اور عظمت کا سکہ بٹھانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ دور افتادہ گاؤں میں یہ ذرائع کہاں، ان کے لئے تو بڑے بڑے شہر ہی موزوں ہیں جہاں جذبۂ شہرت کو تسکین دینے کیلئے مختلف قسم کے ذرائع موجود ہیں۔ ذات پات کے طریق کی ذمہ داری بھی سماج ہی کے سر ہے، اس نے کسی کو ادنیٰ اور کسی کو اعلیٰ بنایا۔ سماج نے مذہب کی آڑ لیکر رسومات کی بنا ڈالی، اور ان کو وہ اہمیت دی کہ گویا ان ہی کی ادائی مذہب ہے۔

زرعی مذہب کی سب سے پیچیدہ کڑی خود کاشتکار ہے، کیونکہ زراعت کی بہتری اور بدتری کا انحصار اسی پر ہے۔ وہ دنیا کے حالات سے بے خبر، ان پڑھ، مفلس، قرضدار، فضول خرچ، قدامت پرست اور قسمت پرست ہے۔ کسان کے لئے منظم قابلیت کی بڑی ضرورت ہے اکثر و بیشتر کاشتکاروں کو پیداوار کی کمی سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا ان کی خراب تنظیم سے ہوتا ہے۔ وہ مفلس اور قرضدار ہے، مگر تقاریب، تہوار اور رسومات پر بے حد خرچ کرتا ہے۔ اس کے پاس آمدنی و خرچ کا کوئی حساب نہیں۔ اس کو نہیں معلوم کہ اس کو کیا آمدنی ہو رہی ہے اور اس کے اخراجات کیا ہیں۔ ناواقفیت کی بنا پر وہ اچھی قسم کی فصلیں پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا، کم ہمتی کی بنا پر عارضی نفع کی خاطر وہ اچھی فصلوں میں خراب فصلوں کی آمیزش کر دیتا ہے۔ قدرت پرستی اور قسمت پرستی اس کو نئے طریقوں کے اختیار کرنے سے روکتی ہے۔

حکومت جس کا کام رعایا کی فلاح و بہبود کے ہر ممکنہ ذریعہ اختیار کرنا ہے، اس نے بھی اس عالمی بحران کے تحت جس کا ذکر کیا جا چکا ہے اس طرف سے لاپروائی برتی، اور مقامی حالات کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ خود اہل ملک نے بھی حکومت کو اس جانب متوجہ کرنے کی کوشش نہ کی، اس وقت ہندوستان کے قائدین اس بات پر زور دیتے تھے کہ چونکہ ہندوستان کی قدیم صنعتوں کو ختم کر دیا گیا ہے اس لئے دوبارہ ان کو زندہ کیا جائے، انڈین نیشنل کانگریس جیسے قومی ادارے نے ۱۹۲۰ء میں صنعت و حرفت کی ترقی و احیا کے لئے ایک الگ شاخ قائم کی، مگر زراعت کی جانب ۱۹۳۲ء سے پہلے توجہ نہ کر سکی۔

جنگ میں حکومت برطانیہ کے تلخ تجربات سے حکومت ہند نے بھی فائدہ اٹھایا۔ اور ۱۹۱۹ء کی اصلاحات میں نیز زراعت کا عہدہ قائم ہوا، ۱۹۲۶ء میں زرعی کمیشن مقرر ہوا، جس کی رپورٹ پر غور کرنے کیلئے شملہ میں صوبوں کے وزرا اور نظمائے زراعت، اور امداد باہمی کے رجسٹراروں کی کانفرنس منعقد ہوئی، ۱۹۲۹ء میں شاہی زرعی تحقیقاتی کونسل مستقل اراکین کیساتھ وجود میں آئی۔

دیہی تنظیم یا دیہات سدھار بالکل حالیہ اصطلاح ہے، ملک میں ۱۹۳۵ء سے پہلے اسکی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا۔ جب کہ ایک جانب کانگریس نے دیہات سدھار کو اپنے نظام نامے میں شامل کیا تھا، دوسری جانب عالمی کساد بازاری نے زرعی پیداوار کی قیمتیں سطح سے بہت نیچے قرار دی تھیں، موازنوں میں خسارہ آ رہا تھا اور زرعی آبادی کو سخت معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ۱۹۳۵-۳۶ء کے موازنہ میں ایک کروڑ کی رقم مرکزی حکومت نے دیہات سدھار کیلئے منظور کی۔

ممالک محروسہ میں زراعت کے کم و بیش وہی حالات ہیں جو برطانوی ہند یا ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں ہیں۔ یہاں ۲۱۲۴۲ دیہات ہیں، آبادی کا ۱۱ فیصد شہروں میں اور ۸۹ فیصد دیہات میں رہتا ہے گو یہاں زراعت کے تحفظ کیلئے مختلف تدابیر پہلے بھی اختیار کی جاتی تھیں مثلاً قحط کے زمانہ میں کاشتکاروں کی امداد، یا خشک مہینوں میں مالگزاری میں معافیاں، یا زرعی آبادی کی بہبودی کیلئے ۱۹۱۱ء میں قانون امداد باہمی کا نفاذ وغیرہ، مگر اسی عالمی بحران کے تحت زراعت کی جانب کوئی خاص توجہ نہ تھی۔ مگر حالات کے بدلتے ہی یہاں بھی تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ گو زراعت کا محکمہ ۱۹۱۱ء سے قائم ہے مگر ابتدا میں اس کا خاص مقصد "نگرانی" روئی کو تباہی سے بچانا تھا۔ مگر ۱۹۲۹ء میں اس کا مقصد ملک کی عام زراعت کی ترقی قرار پایا۔ اس نے تحقیق، تجربے اور تشہیر سے اپنے مقصد کو پورا کرنا شروع کیا۔ تحقیق کا مقصد یہ تھا کہ معلوم ہو سکے کونسی فصلیں اچھی ہیں، یا ان کو کس طرح اچھا بنایا جا سکتا ہے، چنانچہ اس وقت تک متعدد مقامی اعلیٰ قسم

کی قسمیں دریافت ہو چکی ہیں۔ تحقیقاتی نتائج جانچنے اور نئے آلات یا نئے طریقوں سے زمین کی پیداوار بڑھانے کے لئے مزید تجربے قائم کئے گئے تاکہ عملی اور معاشی حیثیت سے نتائج کا امتحان ہو سکے۔ کامیاب تجربوں کو کاشتکاروں کے سامنے پیش کرنے کے لئے تشہیر کی ضرورت پیش آئی تاکہ کاشتکار جن کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا ہے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اسوقت محکمۂ زراعت کے تحت دس مزرعے ہیں جہاں یہ کام ہو رہے ہیں، فصلوں کی بیماریوں کا علاج، مویشیوں کی بیماریوں اور ان کی غور و پرداخت کی جانب بھی توجہ ہو رہی ہے۔ مرغیوں کے سلسلہ میں بھی کافی تجربات ہو چکے ہیں۔ دیہی تنظیم کے سلسلے میں ممالک محروسہ میں دیہی تنظیم کا ایک مرکزی بورڈ قائم ہے جس میں باب حکومت کے چار اراکین، مالگذاری اور صنعت و حرفت کے معتمدین، زائد معتمد مالگزاری، چاروں صوبیدار محکمہ ہائے تعلیمات، صحت عامہ وطبابت، زراعت، صنعت و حرفت، معلومات عامہ کے ناظماء امداد باہمی کے رجسٹرار، مارکٹنگ آفیسر اور سنٹرل کو اپریٹیو یونین کے نمایندے شامل ہیں۔ مرکزی بورڈ ایک عام خاکہ تیار کرتی ہے اور اسکو عملی جامہ پہنانے کے لئے اضلاع اور تعلقوں میں مقامی بورڈ قائم ہیں۔ جن میں سرکاری اراکین بھی شامل ہوتے ہیں۔ پھر دیہی تنظیم کا سب سے اہم مرکز ہے، زراعت کی ترقی و اصلاح، مویشیوں کی اصلاح، اور معاشری اصلاح نظام العمل کے اہم جز ہیں۔ زراعت کی ترقی میں دوسرا قدم جو اٹھایا گیا وہ مختلف قوانین کا سلسلہ تھا۔ ۱۹۱۳ء کے قانون امداد باہمی جسکی رو سے زرعی اور غیر زرعی انجمن قائم ہوئیں، تعلقہ داری اور مرکزی بنک، اور صدر جمعیت اتحاد کا قیام عمل میں آیا اسکا ذکر کیا جاچکا ہے۔ ۱۹۲۳ء سے موازنہ میں امداد قحط اور محفوظہ قحط کی مدات داخل ہوئیں اور تقریباً ۲۲٫۲۰ لاکھ سالانہ کی رقم قحطوں یا امدادی اور تعمیری کاموں کیلئے مخصوص کی جانے لگی ۱۹۳۱ء میں قانون زرعی بازارات کا نفاذ ہوا۔ اسکا مقصد باضابطہ منڈیوں کا قیام تھا تاکہ کاشتکاروں کو غیر منظم منڈیوں کے نقصانات سے محفوظ رکھا جائے، باضابطہ منڈیوں میں مذہبی یا خیراتی نام سے پیداوار وصول کرنے کی ممانعت کی گئی۔ صحیح اوزان کو رائج کیا گیا، تولنے والوں کے لئے اجازت نامہ ضروری قرار پایا، خریداروں کو کاروبار کی جملہ کارروائی درج کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اس قانون کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ برطانوی ہند کے قانون کی طرح صرف روئی کیلئے مخصوص نہیں ہے بلکہ اسکا اطلاق تمام زرعی پیداوار پر ہوتا ہے۔

زراعت کی پستی کا ایک بڑا سبب قرضداری ہے، کاشتکار مفلس ہے اور اسکو اپنے روزمرہ کی ضروریات، مویشی، آلات، تخم خریدنے یا کلپائی اور کٹائی کی اجرت ادا کرنے کیلئے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے، یہ رقم وہ ساہوکار سے لیتا ہے، ساہوکار نہ صرف گراں شرح سود اور سود مرکب وصول کرتا ہے بلکہ دوسری مختلف ترکیبوں سے بھی کاشتکار کو لوٹنے کی فکر کرتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کاشتکار کو قرضہ کا بار ابھرنے نہیں دیتا۔ مسٹر ایس ایم بھروچہ جنہوں نے ممالک محروسہ میں زرعی قرضداری کی تحقیقات کی تھی ممالک محروسہ کے زرعی قرضہ کا اندازہ ۶۴ ½ کروڑ سے کچھ زائد بتایا ہے۔ آپ نے ۳۲۱ مواضعات کی تحقیقات کے بعد زرعی آبادی کے قرضہ کا اوسط ۳۰ روپیہ فی کس بتایا ہے مجھے حال ہی میں ایک موضع کی تحقیق کے سلسلہ میں معلوم ہوا کہ اسکے زرعی قرضہ کی تعداد ایک لاکھ ۵۴ ہزار ہے جبکہ اسکی آبادی ۲۲۶۵ ہے۔ ۵۰ روپیہ فی کس کل آبادی پر اور ۷۰ روپیہ فی کس زرعی آبادی پر قرضہ کا اوسط آتا ہے۔ مسٹر بھروچہ نے بتایا ہے کہ دس لاکھ ایکڑ مزروعہ زمین میں سے ۳ لاکھ ایکڑ مکفول ہو چکی ہے اور ایک لاکھ ۶۰ ہزار ایکڑ کاشتکاروں کی ملکیت سے نکل کر قرض خواہوں کے قبضہ میں جاچکی ہے۔ تصویر کا یہی ایک بھیانک اور تاریک رخ تھا جس نے ان مختلف خرابیوں کے انسداد کیلئے حکومت کو فوری اقدام پر مجبور کیا اور

معالجت نزرعہ، قرض دہندگان، اور انتقال اراضی کے قوانین دستور العمل نافذ ہوئے، اگرچہ ان میں بعض خامیاں ہیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان سے کاشتکاروں کو بڑا فائدہ پہونچنے کی امید ہے، یہ ڈوبتے ہوؤں کیلئے سہارا، اور جو ڈوبے نہیں ہیں ان کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہیں۔

دیہی تنظیم کا کام جو ریاستوں یا صوبہ داری حکومتوں کے یہاں بہت ہی شاندار نظر آتا ہے فی الحقیقت اس قدر شاندار نہیں ہے۔ ہندوستان جہاں تقریباً ۷ لاکھ گاؤں ہوں وہاں چند سو دیہی مرکزوں کی وہی مثال ہے جیسے سمندر میں چند قطرے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آخر یہ کام کس طرح ہو، کیا مروجہ طریقہ کو جاری رکھا جائے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ڈیڑھ سو دو سو برس بعد ہم وہاں پہونچیں جہاں دنیا آج ہے گویا دنیا سے دو صدی پیچھے رہنا ہماری قسمت میں لکھا ہے۔ نہ کسی حکومت سے یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ ہر گاؤں کو دیہی تنظیم کا مرکز بنا دے، اور دس پانچ سال میں ملک کی حالت بدل دے، اس طرح سانپ کے منہ کی چھچھوندر ہو گئی جسکو نہ اگلا جا سکتا ہے اور نہ نگلا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسا پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے جسکا کوئی حل ہی موجود نہ ہو، حل موجود ہے مگر اس میں مشکلات ہیں، اور ان پر غالب آنا ہمارا کام ہے، میرا خیال ہے کہ یہ مسئلہ حکومت، سماج، مصلحین معاشرت، محبان وطن اور سب سے زیادہ اور سب سے اہم تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اشتراک سے طے ہو سکتا ہے۔

یہ سمجھنا کہ اصلاح دیہات کیلئے کثیر رقم کی ضرورت ہے ایک گمراہ کن خیال ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر نئے کام کیلئے روپیہ کی سخت ضرورت ہوتی ہے اسی طرح دیہات سدھار کیلئے بھی کچھ روپیہ کی ضرورت ہے، مگر روپیہ سے زیادہ ایسی چیزوں کی ضرورت ہے جنکو روپیہ مہیا نہیں کر سکتا، ان چیزوں کو خلوص، ہمدردی، ایثار، قربانی اور انسانیت کہا جاتا ہے ہمارے سامنے ایسے کامیاب ادارے موجود ہیں جن کے پاس ابتدا میں سرمایہ بہت قلیل تھا مگر کام کرنے والوں میں مندرجہ بالا خصوصیات موجود تھیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جس سرعت، تیزی اور استقلال سے کام کیا کسی نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں دیہات سدھار کے سلسلہ میں متعدد کام ایسے ہیں جن میں روپیہ کی قطعی ضرورت نہیں، اور متعدد کام ایسے ہیں جن میں روپیہ کی بچت ہوتی ہے۔

ہم اپنے کسان کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میں بھلائی اور برائی سمجھنے کی تمیز نہیں، یا وہ نفع و نقصان میں امتیاز نہیں کر سکتا، لیکن اس کے باوجود وہ برائی بکثرت کا شکار نظر آتا ہے اس کی وجہ قسمت پرستی ہے۔ اس میں آگے بڑھنے کا شوق اور اونچا ابھرنے کی امنگ مفقود ہو چکی ہے۔ اس قنوطیت کا اصلی سبب وہ حادثات ہیں جو برسوں سے اس کو اپنا شکار بنا رہے ہیں۔ انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں تک ملک میں امن و امان نہ تھا، حملہ آور آتے اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے اسکے کھیتوں کو روندتے، اسکی فصلیں کاٹ لیتے یا ان کو جلا دیتے تھے جب ملک میں امن و امان قائم ہوا تو حملہ آوروں کا خوف کم ہو گیا مگر سیلاب، خشک سالی، اولا، پالا، اور ٹڈی دل سے اس کی فصلوں کو نقصان پہونچتا رہا۔ مختلف بیماریاں اسکو اپنا لقمہ بناتی رہیں۔ رفتہ رفتہ اس کو یقین ہو گیا کہ ارضی و سماوی مصیبتیں انسان کی بداعمالیوں کا نتیجہ ہیں۔ اس نے قدرت کو غیر منصف تصور کر لیا۔ مگر یہ سوال اس کے ذہن میں پیدا نہ ہوتا تھا کہ قدرت خصوصیت سے اس پر ظالم کیوں ہے۔ اس بات کا کھوج نہ لگانے کی وجہ سے اس کے ذہن میں یہ احساس قوی تر ہو گیا کہ اپنی بھلائی اور برائی کا کوئی کام وہ خود نہیں کر سکتا۔ اس کی قسمت کو بگاڑنے یا بنانے والی ایک ایسی ہستی ہے جس پر اس کا قابو نہیں، اس لئے اس نے اپنے تمام کام اسی کے حوالہ کر دئے نتیجہ

قسمت پرست یا قناعت پسند اور بالفاظ دیگر پست ہمت، کاہل اور نکما ہو گیا۔

آج سے چند سال پہلے اس ہیں سے اکثر چیزوں کو برداشت کیا جا سکتا تھا، مگر اب سائنس، فن انجینیری، فن زراعت، اور علم طب کی ترقی نے انسان کا قابو قدرت پر بڑھا دیا ہے۔ گویا قسمت پرستی کا دور ختم ہو گیا مگر وہ بدستور قسمت پرست ہے، اس میں یہ احساس پیدا ہونا کہ ماضی ختم ہو چکا ہے اور خوشگوار مستقبل سامنے ہے وہ ماضی کا دلدادہ ہے، اور حال و مستقبل کی فکر سے بے نیاز ہے۔ ماضی خواہ کتنا ہی شاندار کیوں نہ ہو اس کو یاد کرنا بیکار ہے، گزرا ہوا زمانہ واپس نہیں آتا، آنے والے زمانہ کی فکر کرنا اور اسکو خوشگوار بنانا سب سے اہم فریضہ ہے۔

دیہی زندگی جمود و سکون کا نام ہے، وہاں بے حسی، غفلت اور ناواقفیت کے دیوتاؤں کا راج ہے، ان کے دل مردہ اور امیدیں پژمردہ ہیں، ضرورت ہے کہ ان کے جمود و سکون کو توڑا جائے، بے حسی اور غفلت کے پردوں کو چاک کیا جائے، مردہ دلوں میں اور پژمردہ امیدوں میں شوق اور امنگ پیدا کی جائے، ان کو بیدار کر کے متحرک اور جاندار بنا دیا جائے، ان کے رگ و ریشہ میں برقی رو دوڑا دی جائے ان کو خود اعتمادی کا سبق پڑھایا جائے، یہ کام ملک کے نوجوان ہی انجام دے سکتے ہیں۔ یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ ان کی یہ صلاحیتیں مٹ چکی ہیں۔ کانگریس نے برسر اقتدار آنے سے پہلے چھوٹے چھوٹے دیہات میں زندگی کی روح پیدا کی تھی، اور خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر دیا تھا۔ وہ اس قوت کو حکومت سے ٹکرانا چاہتی تھی جن میں اس کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی، مگر اس طرح سادہ لوح کسان بھٹک گئے، اور جب کانگریس نے عہدے قبول کرنے تو وہ اس نئی حکومت سے ٹکرانے لگے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسانوں میں آگے بڑھنے، اور ترقی کرنے کے جراثیم ضرور موجود ہیں اب اس کا انحصار کام لینے والوں پر ہے کہ وہ ان کا رخ کس طرف پھیرتے ہیں۔

میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان یا ممالک محروسہ سرکار عالی جیسے زرعی خطوں کے دیہات کی اصلاح حکومت کے بس کی بات نہیں ہے، حکومت بزور قانون اصلاح نہیں کر سکتی، اصلاح کا احساس خود پسماندہ لوگوں میں پیدا ہونا چاہئے۔ جبری اصلاح کا ہمیشہ یہ خاصہ رہا ہے کہ جب جبر اٹھا لیا گیا اصلاح ختم ہو گئی، ضرورت ہے کہ ملک کے سنجیدہ، مخلص اور ٹھوس کام کرنے والے تعلیم یافتہ نوجوان دیہات میں مستقل سکونت اختیار کریں اور اپنا ایک نصب العین بنا کر اس کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔ کام کرنے والوں کو اپنے آپکو حاکم یا مخدوم نہ سمجھنا چاہئے بلکہ وہ کاشتکاروں کے دوست، مشیر کار اور خادم بننے کی کوشش کریں، مخدوم بننا آسان ہے اور خادم بننا مشکل، ان کو اسکا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ گاؤں ہماری تہذیب کا قدیم ترین مرکز ہے، کسی قدیم شئے کو مٹا کر اس کی جگہ اسی مسالہ سے نئی عمارت تعمیر کرنا آسان نہیں، ان کو ابتداءً مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا ان کو قدم قدم پر ناکامیوں کا منہ دیکھنا ہوگا، ان کو دلی اذیت اور روحانی تکلیف بھی ہوگی کہ جو چیزیں جنکی بھلائی کے لئے پیش کی جا رہی ہیں وہی اس کو ٹھکرا رہے ہیں، مگر ان کو نا امید نہ ہونا چاہئے اور غم و غصہ سے الگ رہ کر خلوص سے کام کرتے رہنا چاہئے۔ خلوص اور قربانیوں کا درخت پھل ضرور لائیگا اور بار آور ہونے میں جتنا زیادہ عرصہ لگے گا اتنے ہی اسکے پھل عمدہ اور شیریں ہوں گے۔

محمد احمد سبزواری

بیڑ کی چھاگل اور گپتی کی صنعت

ہندوستان کی صنعتی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں قدیم زمانہ میں مختلف گھریلو صنعتیں تھیں صرف ان کا وجود ہی نہ تھا بلکہ یہ نہایت ترقی پر تھیں اور دیگر ممالک میں بھی وہ شہرت حاصل کر چکی تھیں لیکن صنعتی انقلاب کے بعد جب مشین کا بنا ہوا دکھاوا اور سستا مال یہاں کے بازار میں آنے لگا تو یہاں کی صنعتوں کو زوال ہوا۔ اس کے علاوہ چند معاشرتی اور سیاسی اثرات بھی تھے جن کی بدولت یہاں کی بہت سی دستی صنعتیں فنا ہوئیں اور کئی صناعوں نے زراعت کا پیشہ اختیار کیا۔

اس کی مثال ہماری ریاست حیدرآباد کے ضلع بیڑ کی چھاگل کی صنعت ہے۔ یہ صنعت آج سے کچھ کم دو سو سال قبل یہاں عروج پر تھی اس صنعت کے ذریعہ بہت سے لوگ روزی حاصل کرتے تھے، لیکن آج اس کی حالت بالکل ناگفتہ بہ ہے۔ اب خاص بیڑ میں اس صنعت کے واقف کار صرف دو افراد ہیں، ایک کا نام وٹھوبا اور دوسرے کا نام راما ہے۔ ان کا یہ پیشہ اب ضمنی ہے اور یہ لوگ زراعت میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ ان کے پاس ایک یا دو چھاگلیں تیار رہتی ہیں۔ وہ بھی اس خیال سے کہ یہاں کی یہ صنعت مشہور ہے اور ممکن ہے کہ کوئی خواہشمند خرید لے۔

ان صناعوں میں سے ایک کو اولاد ہے دوسرا لاولد ہے۔ ان کے چند رشتہ دار ہیں جو بیڑ کے نزدیک کے دیہات میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی بیڑ کے ہفتہ واری بازار میں معمولی قسم کی چھاگلیں لاتے ہیں۔

مگر خاص طور پر چھاگلیں بنوائی جائیں تو اعلیٰ قسم کی بنائی جاتی ہیں۔ خوبی کے لحاظ سے ان کی قیمتیں ۴ روپیہ سے ۵ روپیہ تک ہوتی ہیں۔ چمڑا نہایت ہی ملائم کیا جاتا ہے۔ پھر اس چمڑے کی چھاگل بنائی جاتی ہے۔ چھاگل پر مختلف قسم کے عجیب و غریب نقش اتارے جاتے ہیں۔ اور ان نقشوں میں رنگین کاغذات لگائے جاتے ہیں۔ چمڑا گائے اور بیل کا لیا جاتا ہے۔ ایک جانور کی کھال مقامی بازار میں ۵ روپیہ سے ۱۰ روپیہ تک ملتی ہے اور اس میں غالباً دو یا تین چھاگلیں تیار کی جاتی ہیں۔ عموماً ایک چھاگل کا پانی موسم گرما میں دو آدمیوں کو ایک دن کے لئے کافی ہوتا ہے۔ چھاگلوں کی زیادہ قیمت کی ایک وجہ ان کی قلت بھی ہونی چاہئے۔ کیونکہ ان لوگوں کو کبھی کبھی چھاگلیں بنانی پڑتی ہیں ظاہر ہے کہ ہمیں وہ ذرا زیادہ قیمت وصول کر لیتے ہوں۔ ایک چھاگل تیار کرنے کے لئے دو دن درکار ہوتے ہیں ان کے پاس ملازمین نہیں ہوتے بلکہ یہ اپنی بیوی بچوں کی مدد سے چھاگلیں تیار کرتے ہیں۔

ان کی عمرانی زندگی سے ہمیں یہاں بحث نہیں لیکن وہ بھی غور طلب ہے۔ ان کی رہائش اچھوت ہونے کی وجہ سے آبادی کے باہر ڈھور واڑہ نامی محلہ میں ہے۔ یہ محلہ ان کی ذات کے نام سے ہی مشہور ہے۔ ان کے مکان کے سامنے سے ایک کچی سڑک گزرتی ہے لیکن وہاں نالیوں یا موریوں کا انتظام نہیں ہے سڑک کے کنارے جو موریاں ہیں ان میں غلاظت ہمیشہ جمع رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہاں سے کوئی شہری ناک بھوں چڑھائے بغیر نہیں گزرتا۔ یہ پڑھنا جانتے ہیں نہ لکھنا۔ ان کا لباس اس قدر پھٹا ہوا ہوتا ہے کہ اس میں سے ان کا آدھا جسم دکھائی دیتا ہے۔
جب ہم صنعت کے زوال پر غور کرتے ہیں تو ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی طلب آبادی کے صرف ایک محدود حصہ سے ہے۔

یعنی یہ چمڑے کی بنی ہوئی ہونے سے ہندو لوگ مذہبی نقطۂ نظر سے انہیں کا پانی پینا جائز نہیں سمجھتے۔ اس وجہ سے اس کی طلب کم ہوئی۔ لیکن یہ بھی اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ پہلے بھی ہندو مسلمان یہ دو فرقے تھے پہلے یہ صنعت انہیں معاشرتی حالات میں مروج رہی تھی۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زوال کی محض یہی ایک وجہ نہیں ہے۔ بلکہ بڑی وجہ یہ ہے کہ آج کل جدید قسم کے گاگلٹ ملتے ہیں جو بڑے چھوٹے ہوتے ہیں اس سبب سے ایک سے دوسری جگہ لے جانے میں آسانی ہوتی ہے اور وہ سستے بھی ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی طلب بڑھی اور چھاگلیں پیچھے رہ گئیں۔ اس کے باوجود بھی صنعت باقی رہتی اگر عہدہ داران مقامی اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاتے بالخصوص پولیس کے ملازمین سے ان لوگوں کو اس بارے میں خوب نقصان پہنچا۔ پہلے ہی ان کی صنعت کمزور اور کچھ مقامی بازاروں میں بکتی تھیں لیکن اس حالت میں ان ملازمین نے ہر سال موسم گرما میں کئی چھاگلیں مفت لینی شروع کیں۔ اس وجہ سے انہیں نقصان ہوا اور انھوں نے اس میں اپنی خیریت دیکھی کہ اس پیشہ ہی کو چھوڑ دیا جائے۔

انہیں وجوہات کی بنا پر وہ لوگ زراعت میں منتقل ہوگئے اور ملک کی ایک صنعت مٹ گئی۔ اب اس کو ترقی دی جاسکتی ہے لیکن وہ بہت گراں بار ثابت ہوگی۔ اگر ان لوگوں کو حکومت بغیر سود کے قرضہ دے یا انہیں مزدوروں کی حیثیت سے چھاگلیں بنانے کے لئے نوکر رکھے اور اس کی نکاسی اپنے ذمہ لے تو یہ صنعت پھر زندہ ہوسکتی ہے۔ اب چونکہ اس صنعت کی زیادہ طلب نہیں ہے اور اس میں کام کرنا نفع بخش نہیں ہے اس لئے اس پیشہ میں زیادہ لوگ نہیں ہیں۔ لیکن اگر اس میں فائدہ کی امید ہو تو اب بھی کم از کم ۲۰۰ لوگ اس پیشہ میں شریک ہوں گے اس کی نکاسی شہروں کے بجائے بڑے بڑے دیہاتوں میں ہوگی۔ اس صنعت کی تحقیق سے مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اب اس میں تازہ روح پھونکنا مشکل ہے لیکن پھر یہ خیال آیا کہ اس صنعت کے زوال کے اسباب پر نظر ڈالنے سے اور اس کی طرف آپ لوگوں کی توجہ مبذول کرنے سے ممکن ہے ملک کی دوسری صنعتیں جو اسی راہ پر لگی ہیں فنا ہونے سے بچ جائیں کیونکہ اب بھی میں بعض سرکاری ملازمین کو دیکھتا ہوں کہ وہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو اپنی ہی ذاتی ملک سمجھتے ہیں۔ اور کسی چپراسی یا ذمہ دار کو صناعوں کے مکان پر بھیج کر ایک دو چیزیں بے تکلفی سے منگوا لیتے ہیں۔ یہ بات ایک شخص کے لئے ایک وقت کیلئے معمولی ہے لیکن بعض اوقات یہی معمولی بات مہلک ثابت ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے لوگ بیروزگار ہو جاتے ہیں۔

اب ہم بیڑ کی دوسری صنعت پر غور کریں گے۔ اس صنعت کا نام گپتی کی صنعت ہے۔ اس کو وجود میں آئے ہوئے کوئی پچاس سال ہوتے ہیں۔ آپ میں سے اگر کسی نے بیڑ کی بنی ہوئی گپتی دیکھی ہوگی تو اس پر ضرور آپ نے جان محمدؐ کا نام انگریزی میں یا اردو میں لکھا ہوا پڑھا ہوگا۔ یہ شخص شروع میں تلواریں بناتا تھا لیکن نہ معلوم اسے کیا سمجھائی دیا کہ اس نے تلوار بنانا چھوڑ کر گپتیاں بنانی شروع کیں۔ اب یہ شخص زندہ نہیں ہے اس کا بیٹا شیخ احمد نام موجود ہے جس کی عمر اب (۶۰) سال کی ہے اور جس کا ایک بیٹا اور دو نواسے ہیں جو اس کے ہاں یہی کام کرتے ہیں عموماً ان کے ہاں تین چار نوکر رکھے جاتے ہیں۔ اور ضرورت کے لحاظ سے ان نوکروں میں اضافہ بھی کیا جاتا ہے۔ اس طرح اس صنعت میں کوئی (۸) اشخاص ہمیشہ لگے ہوتے ہیں۔

گپتی بنانے کے لئے بیر اور ساگوان کی لکڑی استعمال کی جاتی ہے۔ اس میں سے بیر کی لکڑی تو بیڑ ہی میں ملتی ہے لیکن ساگوان کی لکڑی احمد نگر او بمبئی سے منگاتے ہیں یا وہاں بھی کسی دوکان سے خریدتے ہیں۔ گپتی کے لئے فولاد کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی بمبئی

سے سگایا جاتا ہے ۔ گپتیاں اس قدر بہترین بنائی جاتی ہیں کہ اس کی جلد شناخت نہیں ہوتی کہ آیا یہ لکڑی ہے یا تلوار ۔ جیسے بھی بنائے جاتے ہیں ۔ قلمنے کے قلم میں فولاد کا پتہ بٹھایا جاتا ہے گویا لکھنے کا قلم ہی گپتی ہے ۔ اس طرح یہ چاقو بھی بناتے ہیں ۔ گپتیوں پر بارہ سنگھے چاندی، لکڑی اور جرمن سلور کے دستے بنائے جاتے ہیں ۔ ان دستوں پر مختلف نقش و نگار اور تصاویر کھینچی جاتی ہیں ۔ اور خریدار کا نام بھی خواہش کرنے پر کھود دیا جاتا ہے ۔ گپتی کی اسٹیل تلواری اور فولادی اس طرح دو قسمیں ہیں ۔ اسٹیل تلواری درجۂ اول ۲۵ روپیوں میں اور درجۂ دوم ۲۰ روپیوں میں بکتی ہیں ۔ فولادی گپتی درجۂ اول (۱۵) روپیہ میں اور درجۂ دوم (۱۲) روپیہ میں فروخت ہوتی ہے ۔ ان کے علاوہ معمولی گپتیاں ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰ روپیوں میں خوبی کے لحاظ سے بیچی جاتی ہیں ایک شخص ایک گپتی دو دن میں مکمل تیار کر سکتا ہے ۔

ان لوگوں کو مختلف نمائشوں میں تمغے ملے ہیں ۔ چنانچہ حیدرآباد میں جو نمائشیں ہوئیں ان میں ان کو تمغے ملے ہیں ۔ نواب ضعت جنگ بہادر صوبہ دار اورنگ آباد اور بعض تعلقداروں نے بھی تمغے دیئے ہیں ۔ اور اصل میں پہلے ایسے ہی عہدہ داران افزائی کر کے صنعتوں کو باقی رکھتے تھے ۔ ان لوگوں کا پیشہ محض گپتی سازی ہے ۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اپنی صنعت کی تشہیر نہیں کرتے ۔ جو لوگ بیڑ کے رہنے والے ہیں یا جو ملازمین بیڑ سے تبادلہ ہو کر دوسرے اضلاع میں جاتے ہیں ان کے ذریعہ سے اس صنعت کی تشہیر ہوتی ہے ۔ چنانچہ اسی طرح یہ صنعت کسی قدر مشہور ہوئی اور اب ان کے پاس اورنگ آباد، ناندیڑ، پربھنی، ورنگل، نظام آباد، گلبرگہ سے گپتیوں کے لئے آرڈر آتے ہیں ۔ موجودہ کساد بازاری کا اثر ان پر بھی پڑا ہے ۔ پانچ سات سال پہلے ان کی خالص آمدنی ۱۵۰۰ روپیہ تھی لیکن اب ۱۰۰۰، ۱۲۵۰ روپیہ ہوتی ہے ۔ واضح رہے کہ پانچ سات سال پہلے ان کے دو نواسے کام نہیں کرتے تھے ان لڑکوں کو مڈل تک تعلیم دی گئی ہے ۔ انہوں نے برٹش انڈیا میں اس صنعت کی تجارت کرنے کی اجازت حاصل کی تھی لیکن پھر انہیں منع کیا گیا آج کل فیشن کے لحاظ سے لوگ لکڑی ہاتھ میں پکڑتے نہیں اس وجہ سے گپتی کی خرید بھی کم ہوتی ہے ۔

اگر حکومت ان صناعوں میں سے ایک کو صنعت و حرفت کے مدرسہ میں ملازم رکھے تو کئی لوگ اس فن سے واقف ہو جائیں گے شیخ ہم ۱۰۰ روپیہ ماہانہ کی تنخواہ پر آنے کے لئے راضی ہے ۔ یہ مطالبہ میرے خیال میں ضرورت سے زیادہ ہے میں نے اس سے اپنا شبہ ظاہر کیا تو اس نے جواب دیا کہ لوگ ملتے بھی نہیں ہیں ۔ اگر حکومت رکھے تو ہیں کو رکھے ان کے پاس سرمایہ نہ ہونے سے یہ ترقی نہیں کر سکتے اگر انہیں سرمایہ بہم پہنچایا جائے تو یہ مشین کا بھی استعمال کر سکتے ہیں ۔ لیکن یہاں ایک مشکل یہ پیش آتی ہے کہ مذہبی خیالات کے لحاظ سے یہ لوگ بغیر سود کے قرضہ چاہتے ہیں ۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لئے حکومت یہ کر سکتی ہے کہ محکمۂ پولیس میں کرچ اور بایونٹ کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اگر محکمۂ پولیس کرچ اور بایونٹ انہیں کے پاس سے خریدے اور انہیں کچھ امداد دے یا پہلے کچھ قیمت ادا کرے تو ان کو سرمایہ ملیگا اور مشین استعمال کر سکیں گے ۔ اب وہ اپنے ہاتھ سے روغن تیار کرتے ہیں ۔ اگر گپتیاں کثیر تعداد میں بنائی جائیں اور ان کی کھپت بھی ہو تو یہاں روغن کی صنعت بھی ترقی کر سکتی ہے ۔ اس صنعت کی عمر ابھی چھوٹی ہے ۔ اس لحاظ سے ابھی اس میں ترقی کی گنجایش ہے ۔ اس کے لئے انہیں اصل مہیا کرنا چاہئے اور صنعت کی تشہیر اور نکاسی کا بندوبست کرنا

چاہئے۔ آج کل تشہیر نہ ہونے پر بھی ان کو ۱۵۰ ، ۲۰۰ روپیہ ماہانہ ملتے ہیں اگر ان کا اشتہار کیا جائے تو اس کساد بازاری کے زمانہ میں بھی زیادہ آمدنی ہوگی اور ساتھ ہی ملک کی ایک صنعت ترقی کرے گی جس میں ابھی بہت سے مزدوروں کی کھپت ہو سکتی ہے۔ (ایک عثمانیہ)

حسین ساگر

(ایک غمگین صبح)

اپنے عالی حوصلہ شاہوں کے گن گاتی ہوئی
اٹھ رہی ہے سطح سے ہر موج لہراتی ہوئی

ہر ادا میں شان ہے "شاہوں کے استقبال" کی
حال ماضی سے ٹکراتی ہیں موجیں حال کی

بس گئی دنیا اجڑتی تھی ابھی اجڑی نہ تھی
بات یوں اس کی بنی جیسے کبھی بگڑی نہ تھی

اس کے سینے میں تمنا کی تپش باقی رہی
مادی رونق میں روحانی کشش باقی رہی

اس کی موجوں کو نظر سے چومتا تھا آسماں
اب بھی خاموشی سناتی ہے وہ خونیں داستاں

قافلہ گذرا تھا جب اس پر سے تاناشاہ کا
اس نے گذرانا تھا تحفہ نالۂ جاں کاہ کا

بے کسی میں اپنے شہہ کی دے دیا جو بھی تھا پاس
اس کے پانی نے بجھائی تھی خدابندے[1] کی پیاس

داغ دل بن کر قطب شاہوں کے ہیں نقشِ قدم
سوکھنے پاتا نہیں اس کا کبھی دامانِ نم

سیر کرنے والے ان رنگینیوں میں کھو نہ جا
حال کے جلووں میں یوں ماضی سے غافل ہو نہ جا

قہقہوں کی گونج میں پوشیدہ آہوں کو نہ بھول
ذرہ ذرہ کہہ رہا ہے قطب شاہوں کو نہ بھول

رو رہا ہے آسماں یہ شبنم افشانی نہیں
اشک کا سیلِ رواں ہے دیکھ یہ پانی نہیں

میکش

[1] تاناشاہ کا اکلوتا فرزند

دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا

اردو مثنوی، اور اصناف کی طرح اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے اس کی مقبولیت، اس کی خصوصیات اور اس کے لوازم مختلف زمانوں میں کچھ نہ کچھ بدلتی رہیں۔ اس کا پورا سرمایہ کم و بیش سو سال کی پیداوار پر حاوی ہے۔

مثنوی کو دوسرے اصناف کے مقابلہ میں ممیز دیکھنے کی بعض وقت ضرورت اور خواہش اس وجہ سے داعی ہوتی ہے کہ یہ صنف چند معین خیالات کے اظہار کا آلہ رہی ہے چنانچہ اس کی اصطلاحی آسانیوں کی وجہ سے ابتدا میں صوفیائے کرام نے اس کو ذریعہ بنایا تھا۔ بعد میں جب یہ زیادہ ادبی بن گئی تو قصے کے ساتھ اس کا پیوند لگا۔ اس کے بعد ایک زمانہ اس پر ایسا بھی آیا کہ یہ کسی قدر کم طویل قصوں یا مرقع کی نظموں کی صورت میں فروغ پاتی رہی۔ موجودہ زمانہ میں یہ صنف ظاہری شکل و صورت اور معنوی ہر اعتبار سے بہت کچھ بدل گئی ہے۔

اس طرح اردو مثنوی کی پوری ارتقائی رفتار کو ہم چند منازل میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ مثلاً (۱) ابتدائی عہد کے مثنوی پارے جو زیادہ تر صوفیائے کرام کے رشحات پر مشتمل ہیں۔ یہ موجودہ رسم الخط میں بھی ہوئی ایسی بھاشا کے نمونے ہیں جن میں عربی اور فارسی کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ ان کی بحریں عموماً برج کی ہیں اور یہ منتشر پارے ساتویں صدی ہجری کے نصف آخر سے لے کر دسویں صدی ہجری کے زمانہ پر حاوی ہیں۔ دوسرا دور ابتدائی مکمل اور طویل مثنویوں کا ہے اس میں پنجاب، گجرات اور بیجاپور کے ابتدائی دور کے چند کارنامے شامل ہیں۔ اور یہ تقریباً سب کے سب ارشاد و ہدایت اور تصوف و عرفان کے حامل ہیں ان میں قابل ذکر گجرات کے حضرت خوب محمد چشتی کی مثنوی "خوب ترنگ" اور بیجاپور کے ایک نہایت مقدس بزرگ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق اور ان کے خاندان کے ملفوظات ہیں جو نظم اور نثر دونوں پر مشتمل ہیں۔ اسی دور میں اردو مثنوی کا حقیقی ڈول ڈالا گیا۔ اور اس کے آخری زمانے کا تعلق دکن اور خاص طور پر بیجاپور سے ہے۔

دکن میں مثنوی کا ارتقا ڈھائی سو سال سے زیادہ مدت پر حاوی ہے۔ حضرت شاہ میراں جی کی وفات ۹۰۲ھ میں ہوئی آپ کے زمانہ سے لیکر ۱۱۶۰ھ یعنی حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی کی مثنوی "بوستان خیال" کی تحریر تک مثنوی کو مسلسل اور خاطر خواہ ترقی ہوتی رہی۔

اس ڈھائی سو سال کے طویل عرصہ کی پیداوار کو ہم کم سے کم تین عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا عنوان عہد زرین کی مثنویاں۔ دوسرا عنوان عہد مغلیہ کی مثنویاں اور تیسرا عنوان آصفجاہی عہد کی دکنی مثنویاں ہو سکتی ہے۔ اس طرح پہلا عنوان، اردو مثنوی کے ارتقا کا گویا تیسرا باب ہوگا۔ اور دوسرا اور تیسرا عنوان، بہ ترتیب چوتھا اور پانچواں باب۔

حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق، کی ولادت مکہ معظمہ میں ہوئی تھی۔ آپ اوائل عمر میں ہندوستان تشریف لائے اور بیجاپور کو اپنا مستقر بنایا۔ آپ کے علم و فضل، تقدس اور سیرت کے اثرات نے، ارادتمندوں کا ایک بڑا گروہ آپ کے اطراف جمع کر دیا تھا۔ چونکہ ان میں سے اکثر عربی زبان سے ناواقف اور فارسی سے بھی کچھ زیادہ مانوس نہیں تھے اس لئے، آپ نے خود ان کی زبان سیکھی اور اسی میں ارشاد و ہدایت فرمائی۔ یہ ملفوظات آپ کے مریدین اور معتقدین نے عوام کے فائدے کی خاطر لکھ لئے۔ اس وقت اسی طرح

کے کئی مخطوطے دستیاب ہوتے ہیں، جو اسی قریبی زمانے کے لکھے ہوئے ہیں، اور نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہیں۔

نظموں میں آپ کی مثنویاں "خوش نامہ" اور "خوش نغز" کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں شامل ہیں۔ ان کے اقتباسات موجودہ زمانے کی اکثر ایسی کتابوں میں شایع ہو چکے ہیں، جو اس دور سے متعلق ہیں۔

حضرت شاہ میراں جی کے فرزند، حضرت شاہ برہان الدین جانم بھی بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ آپ کے ملفوظات میں "سکھ سہیلا" "منفعت الایمان" اور "ارشاد نامہ" وغیرہ اب منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اسی طرح حضرت شاہ برہان الدین جانم کے فرزند حضرت شاہ امین الدین اعلےٰ کے ملفوظات میں بھی کئی نظمیں اور کسی قدر طویل مثنویاں شامل ہیں۔ ان میں "رموز السالکین" "نظم وجودیہ" "نظم قربیہ" "محب نامہ" قابل ذکر ہیں۔ اس خاندان کے ارشادات تمام تر مذہبی اور متصوفانہ خیالات پر مشتمل ہیں۔

اسی طرح کے اور بھی نظم و نثر کے رسالے موجود ہیں، جو صوفیائے کرام کے ملفوظات پر مشتمل ہیں۔ یہ رسالے زیادہ تر بیجاپور کے ابتدائی حکمرانوں کے عہد سے متعلق ہیں۔

دکن کی ادبی تاریخ بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ تا ۱۰۳۵ھ) اور گولکنڈے کے محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کے عہد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان دونوں سلاطین کی سرپرستی میں، ادبی ذوق کی ترقی شروع ہوئی اور بلند پایہ شعرا نشو و نما پانے لگے۔ ان میں محمد قلی کے درباری شاعر، وجہی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جس کی مثنوی "قطب مشتری" (۱۰۱۸ھ) عمدہ شاعری کا نمونہ ہے۔ وجہی کے بعد اس فن کو سب سے زیادہ ترقی، عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے عہد کے مشہور ملک الشعرا شاعر غواصی نے دی۔ غواصی کی دو مثنویاں "سیف الملوک و بدیع الجمال" (۱۰۳۵ھ) اور "طوطی نامہ" (۱۰۴۹ھ) قدیم اردو کے ترقی یافتہ اور بسیط شعری کارنامے ہیں۔ اس نے اردو مثنوی کو جس معیار تک پہنچا دیا تھا، وہ بعد کے شعرا کے لئے نمونہ بن گیا۔

مقیمی جو اسی عہد کا شاعر ہے اور بیجاپور کے ابتدائی ادبی مثنوی نگاروں میں سے ہے، اپنے آپ کو غواصی کا خوشہ چین بتلاتا ہے۔ اس کی مثنوی "چندر بدن و مہیار" جو ۱۰۵۰ھ سے قبل لکھی گئی ہے، ادبی اعتبار سے زیادہ اہمیت تو نہیں رکھتی، لیکن اس کا قصہ عرب کے، لیلےٰ مجنوں کے قصے کی طرح بے حد مشہور رہے۔

مقیمی کے زمانے سے مثنوی لکھنے کا طریقہ بیجاپور میں عام ہو گیا۔ اب مذہبی مثنویوں کے بجائے ادبی مثنویاں لکھی جانے لگیں۔ چنانچہ امین جو مقیمی کا معاصر اور ہم وطن تھا، اس نے نثر سے فارسی کے ایک قصے کا ترجمہ "بہرام و حسن بانو" کے نام سے کیا۔ لیکن اس کی تکمیل وہ نہ کر سکا۔ اور بعد کے ایک بیجاپوری شاعر دولت نے ۱۰۵۰ھ میں اس کی تکمیل کی۔

مقیمی تک زیادہ تر ان دو مثنویوں کا مواد یا تو طبعزاد ہوتا تھا یا برج بھاشا سے ماخوذ صرف محمد قلی کے زمانے کے ایک شاعر، احمد نے فارسی سے استفادہ کر کے "لیلیٰ مجنوں" لکھی تھی۔ لیکن "بہرام و حسن بانو" کے بعد سے جو مثنویاں اردو میں لکھی جانے لگیں ان میں زیادہ تر فارسی مثنویوں سے استفادہ کیا گیا۔ چنانچہ اس زمانے میں محمد عادل شاہ کے دربار کے ایک شاعر صنعتی نے ۱۰۵۵ھ میں حضرت تمیم انصاری صحابی رسول کی مہمات کے ایک قصے "قصۂ بے نظیر" کا ترجمہ کیا۔ اور اس کے دوسرے سال اسی کے ہم وطن شاعر، ملک خوشنود نے "ہشت بہشت"، کو

اردو نظم کا جامہ پہنایا۔ ۱۰۵۹ھ میں بیجاپور ہی کے ایک اور شاعر کمال خاں رستمی نے ابن حسام کے مشہور فارسی رزمیہ "خاور نامہ" کو نظم کیا۔ یہ اردو کی پہلی قابل ذکر رزمیہ مثنوی ہے۔ نہ صرف اس لحاظ سے، بلکہ بیان اور زورِ قلم کے اعتبار سے بھی یہ کارنامہ قابل قدر ہے۔

"خاور نامہ" کے بعد، جو مثنوی لکھی گئی وہ گولکنڈے کے شاعر جنیدی کی "ماہ پیکر" (۱۰۶۴ھ) ہے لیکن اس کا مخطوطہ اب نا پید ہے۔ اس کا ذکر مختلف حوالوں کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس کے دو سال بعد گولکنڈے کا ایک اور شاہکار لکھا گیا: ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" ہے جو اس میں شک نہیں کہ ایک فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے لیکن آزاد، چنانچہ اس میں جگہ جگہ ... غواصی کے بعد یہ دوسرا اور اسی پایہ کا شاعر تھا جس نے مثنوی کے معیار کو اسلوب اور تکمیل کی حد تک بلند کیا۔ بعد کے شاعروں نے غواصی کی طرح اس کے کارنامے کو نمونہ بنایا چنانچہ ہنر فرزند عشرتی کی مثنوی "نیہہ درپن" (۱۱۴۴ھ) میں اس کے ثبوت ملتے ہیں۔

بیجاپور میں علی عادل شاہ ثانی کے عہد تک اردو شاعری کا ذوق خاطر خواہ ترقی کر چکا تھا چنانچہ خود اس کے دربار نے ملک الشعراء نصرتی جیسے زبردست سخن پردازوں کی پرورش کی۔ نصرتی بیجاپور کے لازوال شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی دو مثنویوں میں ایک "گلشن عشق" جو ۱۰۶۸ھ میں لکھی گئی ہندوستان کے مشہور قصے "منوہر مدمالتی" کی عشقیہ داستان ہے۔ اس کی دوسری مثنوی "علی نامہ" رزمیہ اور تاریخی مثنوی ہے۔ اس میں علی عادل شاہ اور مغلوں کی جنگوں کے حالات نہایت تفصیل سے پیش کئے گئے ہیں۔ لفظیات کے اعتبار سے "علی نامہ" کی ... بہت کم کارنامے پہنچ سکتے ہیں نصرتی کے اسلوب میں ادبیت اور لطف بھی موجود ہے۔ وہ جنگوں کے نقشے نہایت ہمہ گیری سے اور حقیقی پیش کر سکتا تھا۔ "علی نامہ" ۱۰۷۶ھ میں ...

اس عہد کی آخری مثنویوں کے ذکر سے پہلے گولکنڈے کی ایک مثنوی "بہرام و گل اندام" کا ذکر ضروری ہے جو ۱۰۸۱ھ میں لکھی گئی۔ یہ بہت زیادہ اہم کارنامہ نہیں ہے تاہم غواصی اور ابن نشاطی کے دبستان کی تمام خوبیوں اور خصوصیات کا حامل ہے۔

دوسری مثنوی "ظفر نامہ نظام شاہ" ایک رزمیہ ہے جو تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں رام راجہ سے دکن کی دوسری سلطنتوں کی جو جنگ ہوئی تھی، اس کا شاعرانہ حال درج ہے۔ اس کا مصنف حسن شوقی بلند پایہ شاعر تھا جس کو پہلے نظام شاہی دربار (احمد نگر) سے توسل رہا۔ پھر وہ بیجاپور آیا آخر میں محمد قطب شاہ کے زمانے میں گولکنڈہ آگیا تھا۔ اس کی ایک اور مثنوی "میزبانی نامہ" بھی ہے۔

نصرتی کے بعد سوائے ہاشمی کے بیجاپور میں ایسے بلند پایہ شاعر کم پیدا ہوئے جن کے کارنامے دیرپا ہوں۔ ہاشمی کے ... صرف شاہ ملک کا ذکر اس کی ضخیم مذہبی مثنوی "شریعت نامہ" کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ یہ مثنوی ۱۰۸۸ھ میں لکھی گئی تھی۔ ہاشمی ... انسان تھا۔ عادل شاہی سلطنت کے زوال کی وجہ سے زمانہ بھی بدل چکا تھا اس لئے اس نے اپنی شاعری میں عام راستے سے تجاوز کیا اور اس دور میں دکن کی آخری مثنویاں زیادہ تر گولکنڈے میں لکھی گئیں۔ چنانچہ امین، غلام علی، فائز، لطیف، جن کی تصنیفات ۱۰۹۰ھ سے لے کر ۱۱۰۰ھ کے زمانہ پر حاوی ہیں، اسی گولکنڈے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

امین: حضرت عمر کے فرزند ابو شحمہ کے متعلق ایک فرضی قصے کا مصنف ہے، جو ۱۰۹۷ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس کے ایک سال بعد

غلام علی نے "پدماوت" کے حصے کو منظوم کیا۔ اس کا ماخذ فارسی سے زیادہ ہندی قصہ تھا۔ فائز "رضوان شاہ روح افزا" ۱۰۹۵ھ کا مصنف ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لطیف نے ایک رزمیہ مثنوی لکھی ہے جو "ظفرنامہ" کے نام سے موسوم ہے اس میں "خاورنامہ" کا زور بیان اور "علی نامہ" کا لطف موجود نہیں ہے۔

۱۱۰۰ھ کے قریب دو ڈھائی سال کے اندر اندر بیجاپور اور گولکنڈے کے ادبی اور علمی مرکزوں کا خاتمہ ہوگیا۔ وہ علما اور خاص طور پر اردو زبان کے شاعر، جو عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین کی سرپرستی میں اپنے ذوق کی تکمیل میں منہمک تھے منتشر ہونے لگے کیونکہ ان سلاطین کے جانشین یعنے مغلیہ امراکو اردو شاعری کا چسکا ابھی نہیں لگا تھا۔ شہنشاہی احساس کے ساتھ فطرتاً وہ شہنشاہی دربار کی ادبی روایات اپنے ساتھ لائے تھے۔ تاہم اردو شاعروں کے قدم اکھڑ گئے تو اس سرزمین میں فارسی شعرا کے قدم بھی نہ جم سکے۔ اور شعرا ہی نے دکن کے اگلے ادبی ذوق کو جاری رکھا۔ لیکن یہ خود منتشر ہو گئے، ان کی شعری پیداوار کی یکسانیت منتشر ہوگئی۔

چنانچہ دکن میں مغلوں کے تسلط کے بعد جو کارنامے ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ بڑی حد تک ان کے پیدا کرنے والوں کی ذہنی حالت کا عکس پیش کرتے ہیں۔ اس زمانے کی شعری پیداوار کو ہم اس طرح تقسیم کر سکتے ہیں۔ (۱) مرثیے (۲) مذہبی نظمیں (۳) متصوفانہ نظمیں، (۴) نیم مذہبی نظمیں۔

دکن کے شعرا نے مرثیہ کے لئے متنوع شعری صنفوں کا استعمال کیا ہے لیکن اس طرز کا زیادہ کلام قافیہ کی ترتیب میں قصیدے کی شکل رکھتا ہے، اس لئے یہ ہمارے دائرہ سے باہر ہے۔ دوسری قسم کی نظموں میں، ولی ویلوری کی "روضۃ الشہدا" (۱) ضعیفی کی "ہدایت ہندی" ذوقی کی "وصال العاشقین" جیسی طویل مذہبی نظمیں شامل ہیں۔ اس دور میں تیسری قسم کی نظمیں بہت زیادہ مقبول ہوئیں۔ ان میں سب سے پہلے قاضی محمد محمود بحری کی "من لگن" کا ذکر ضروری ہے۔ بحری اصل میں بیجاپور کے رہنے والے تھے۔ بیجاپور کی تباہی کے بعد بہ حال تباہ گولکنڈہ پہنچے۔ دو سال بعد، گولکنڈے کی سلطنت کا سایہ بھی سر سے جاتا رہا۔ "من لگن" تصوف کی قدیم نظموں میں خاص اہمیت رکھتی ہے یہ اور وجدی کی "پنچھی باچھا" جو منطق الطیر" کا ترجمہ ہے، بہت پڑھی جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ عشرتی کی متصوفانہ نظمیں "چیت لگن" اور "دیپک پتنگ" بھی کافی مقبول تھیں۔

نیم مذہبی نظموں میں محمد علی عاجز کے قصے قابل ذکر ہیں۔ ان میں فقہ عقائد وغیرہ کے مسائل کو قصے کے پیرایہ میں بیان کیا جاتا تھا۔ ان قصوں کو بھی اپنے زمانہ میں کافی مقبولیت حاصل رہی۔

دکن میں مثنوی کی ترقی کا آخری زمانہ آصفجاہی سلطنت کے قیام کا ابتدائی دور ہے۔ یہ ایک عبوری زمانہ ہے، جس میں قدیم خیالات اور قدیم روایات کی کچھ تو شکست و ریخت ہوئی، اور کچھ نئی تعمیر شروع ہوئی۔ زبان اور اظہار خیال کے سانچوں کے لحاظ سے، اس دور سے بڑا انقلاب رونما ہونے لگا۔

اس دور کا سب سے بڑا شاعر، ولی ہے۔ جس نے اپنی شاعری میں نئے ماحول اور بدلے ہوئے مذاق کو سب سے زیادہ جگہ دی اس کے بعد، شعرا کو ان کے نقش قدم پر چلنا آسان ہوگیا۔ مثنوی کی حد تک ولی کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ انھوں نے صرف دو تین

چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں۔ ان میں سے دو بزرگوں کی تعریف میں ہیں۔ مگر ایک مثنوی جو تین سو تیس شعر کی ہے' نہایت اہم ہے۔ اس مثنوی کا عنوان "مثنوی در تعریف سورت" ہے۔ یہ اگلی تمام مثنویوں کے مقابلہ میں جداگانہ نوعیت رکھتی ہے۔ اس وقت تک اردو میں مثنوی مرقع نگاری کے لئے استعمال نہیں ہوئی تھی۔ ابتدائی چھوٹی چھوٹی مثنویاں متصوفانہ تھیں بعد میں وجہی کے زمانہ سے اس میں قصے لکھے گئے۔ کچھ رزمیہ مثنویاں بھی لکھی گئیں۔ عربی شعرا اس نوع کے خیالات کے لئے قصیدہ کا استعمال کرتے تھے۔ فارسی شعرا نے بھی انہیں کی پیروی کی۔

ولی کے اثر سے' جب دلی میں اردو شاعری کو فروغ ہوا تو ابتدائی زمانہ کے شعرا' جیسے شاہ حاتم اور آبرو نے ولی کی اسی مثنوی کی پیروی کی۔ میر تقی میر کے سامنے یہ نمونے تھے۔ اس لئے ان کی وہ مثنویاں' جو فارسی کی تقلید میں نہیں لکھی گئی ہیں' اسی طرز کی ہیں۔ فارسی کی قصہ دار مثنویوں کے نمونے پر میر نے جو مثنویاں لکھیں وہ' ابتدائی نوعیت کی ہیں

ولی کے بعد دکن میں دونوں طرح کی مثنویاں رائج ہوگئیں۔ خود ان کے جانشین' حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی نے ایک طویل مثنوی' "بوستان خیال" کے ساتھ ساتھ کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی لکھیں' جو متصوفانہ خیالات سے مملو ہیں۔ سراج کی طویل اور قصہ دار مثنوی "بوستان خیال" اس دبستان کی دکنی مثنویوں کا سب سے بہتر کارنامہ ہے۔ اور اردو کی تمام مثنویوں میں اس کا درجہ "سحر البیان" کے بعد ہے۔ انداز بیان' صداقت جذبات' تکمیل اور شعری خوبیوں کی بدولت "بوستان خیال" ہر زمانہ میں قدر کی نظر سے دیکھی جائیگی

"بوستان خیال" کے بعد' دکن میں مثنوی نگاری کے ذوق پر تنزل طاری ہونے لگا تاہم اس آخری دور میں بھی دو تین مثنویاں ایسی لکھی گئیں' جن کی ادبی اہمیت کبھی کم نہیں ہوسکتی۔ ان میں سب سے پہلے قابل ذکر لالہ لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی کی تصویر جاناں ہے۔ جو قصے کی ندرت' اصلیت اور ادبی معیار کی بلندی کے باعث اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ دوسری "گل و گوہر" ہے۔ جس کے مصنف عارف الدین خاں عاجز اورنگ آباد کے شعرا میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ مثنوی قدیم طرز کے داستانی قصوں سے کچھ زیادہ امتیاز نہیں رکھتی' لیکن عاجز کا انداز بیان صاف ستھرا اور موجودہ روزمرہ سے بہت قریب ہے۔ چونکہ اس زمانے میں اورنگ آباد کو سیاسی مرکزیت حاصل تھی' اس لئے یہاں اچھے اچھے شاعر جمع ہوگئے تھے۔ اور دکن کے دار الخلافہ کے حیدرآباد میں منتقل ہوجانے تک اورنگ آباد ہی کو ادبی مرکزیت حاصل رہی۔ چنانچہ کئی سخن پرداز اکناف ہند سے آکر یہیں فروکش ہوگئے تھے۔ ان میں شاہ غلام قادر خانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ برہان پور سے آکر یہاں فروکش ہوئے تھے۔ یہ اچھے شاعر تھے اور ان کے اطراف شاگردوں کا ایک حلقہ جمع تھا۔ یہ شفیق کے ہم عصر اور دوست تھے۔ شفیق نے اپنے تذکرے "چمنستان شعرا" میں ان کی ایک مثنوی "شوق و منور" کے اقتباسات دئے ہیں۔ یہ مثنوی خاصی ضخیم بتلائی جاتی ہے۔ لیکن اب تک اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مثنوی اچھی ہوگی۔

اس مضمون کے ختم کرنے سے پہلے ایک اور سخن سنج کا ذکر ضروری ہے' جو اپنے زمانے کے استاد شمار کئے جاتے تھے۔ یہ سید محمد ایمان شاگرد حضرت شاہ تجلی ہیں۔ ایمان کا نشوونما نواب نظام علی خان آصفجاہ ثانی کے آخر عہد میں ہوا۔ یہ پرگو شاعر تھے۔ انھوں نے

کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی لکھی ہیں، جو پڑھنے اور لطف اندوز ہونے کے قابل ہیں ۔

یہ آخری سخن سنج، اصل قدیم دبستان کے آخری شاعر تھے ۔ اس کے بعد نئے عہد کے نئے تخیلات اور نئے روزمرہ کے اثرات نے قدیم دبستان کو متاثر کرنا شروع کیا ۔ اور قدیم تخیلات پر بڑی شکست و ریخت طاری ہوئی اس دوران میں، دکن کی اردو شاعری پر پژمردگی سی چھائی رہی یہاں تک موجودہ عہد سے پہلے، جب یہ شکست و ریخت مکمل ہو گئی، تعمیر جدید اردو شاعروں میں ایک نئی روح پھونک دی گئی ۔

عبدالقادر سروری

گوداوری گھاٹ کی ایک حسین صبح

شب تاریک چلی زلفوں کو سلجھاتی ہوئی — صبح کے خوف سے ڈرتی ہوئی گھبراتی ہوئی

چور کی طرح بے پاؤں چلی باد صبا — ہر قبائے گل نوخیز کو مسکاتی ہوئی

آئی گردوں سے زمیں بند لئے تھی عروس شبنم — موتیوں کو در و دیوار پہ بکھراتی ہوئی

جل بجھی شمع، ہوئی رات کی محفل خاموش — بزم تاروں کی چلی آنکھوں کو جھپکاتی ہوئی

اڑ چلی نکہت گل چھوڑ کے دامن گل کا — باد سرشار چلی جھومتی اتراتی ہوئی

جلوہ گر صبح کی دیوی ہوئی رفتہ رفتہ — شب کا آنچل رخ پر نور سے سرکاتی ہوئی

دور تاریکی ہوئی گھاٹ کی تقدیر کھلی — ٹکڑیاں آئیں حسینوں کی ستم ڈھاتی ہوئی

نقرئی شانوں پہ بکھرائے ہوئے بال کوئی — قلزم حسن کی ہر لہر میں لہراتی ہوئی

ذرے ذرے کو تبسم سے بناتی رنگیں — بجلیاں چشم فسوں ساز سے برساتی ہوئی

کوئی انگڑائیاں لیتی ہوئی بدمستی میں — ساغر عشق سے مے حسن کی چھلکاتی ہوئی

اپنی گستاخ اداؤں سے الجھتی ہر دم — خود بہکتی ہوئی دنیا کو بھی بہکاتی ہوئی

کرنے اشنان کوئی کھول کے جوڑا آئی — کوئی ساحل پہ کھڑی رہ گئی شرماتی ہوئی

بھیگے کپڑوں میں جو عریاں ہوئے جسم سیمیں — بجلیاں پھرنے لگیں ابر میں گھبراتی ہوئی

کوئی کھولے ہوئے بالوں کو چلی ندی میں — نکلی پانی سے کوئی زلفوں کو سلجھاتی ہوئی

چلی ہر ایک نہا دھو کے خراماں آخر — موتی ان بھیگے ہوئے بالوں سے برساتی ہوئی

ہو گیا جلد ہی روپوش یہ رنگیں منظر — آنکھوں آنکھوں میں نظر رہ گئی للچاتی ہوئی

علی احمد

اورنگ آباد کا سنہری محل

سنہری محل دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا جو بحمداللہ پورا ہوا۔ یہ عمارت اورنگ آباد کی قدیم عمارت سے ہے جو مقبرۂ رابعہ دورانی سے تقریباً ۴ فرلانگ کے فاصلے پر جانب غرب پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ اس عمارت کا محل وقوع نہایت ہی بلند اور مرتفع ہے اس کے اطراف کھلے میدان اور مشرق و شمال کی جانب پر فضا پہاڑی ہے مقبرہ اس عمارت کے بالکل مقابل میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہ عمارت آباد تھی اس کی دیواروں پر سونے کا ملمع کیا ہوا تھا یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ فی زمانہ گو عمارت صحیح و سالم ہے لیکن دیواروں کے ملمع کا کہیں پتہ نہیں ہاں نقش و نگار کے کہیں کہیں نشان پائے جاتے ہیں۔ یہ محل دو منزلہ ہے نیچے کے حصہ کی تفصیل یہ ہے۔ بیچ میں ایک ہال اس کے دونوں جانب دو دو کمرے ان کمروں کے بازو ایک ایک وسیع ہال۔ اوپر کی منزل نہایت شاندار ہے۔ بیچ میں ایک بہت بڑا ہال اس کے آگے پیش جس میں نہایت کندہ دار خوشنما کنگرہ دار کمانیں نکلی ہوئی ہیں پیش کے مقابل میں وسیع صحن بڑے ہال کے دو جانب دو دو کمرے اور ہر ایک کمرے کے بازو کھلا ہوا صحن اور صحن کے کنارے پر حد کی دیوار سے لگا ہوا ایک ایک پختہ سقف بیت الخلا۔ بالاخانہ کے عقبی حصہ میں بھی کشادہ صحن واقع ہے بالاخانے کے اوپر چاندنی ہے جس کے اطراف دیوار کھنچی ہوئی ہے چاندنی پر چڑھنے کے بعد تمام شہر ہتھیلی میں نظر آتا ہے اور نظر اٹلیو سے اسٹیشن سے پرے جنوبی پہاڑی سلسلے تک بلا روک ٹوک کام کرتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارت کوسوں تک گرد و پیش کے وسیع [illegible] پر حکومت کر رہی ہے اس عمارت کے اطراف پختہ دیوار بنی ہوئی ہے جس میں کمانیں نکلی ہوئی ہیں اور دیوار کے اندر عمارت کے عقب و پیش نہایت وسیع سطح ہموار صحن ہے علامات و آثار سے پایا جاتا ہے کہ اس صحن میں چمن بندی کی گئی ہوگی کیونکہ اس وسیع چبوترے پر جس پر عمارت قائم کی گئی ہے۔ ایک حوض بنا ہوا ہے جس میں سے پانی ایک چھوٹی سی نہر میں جاتا تھا اور یہ نہر ہی سے زینت و آبشار سے ڈھلکتا ہوا صحن کی روشوں میں پہنچتا تھا حوض اور نہر میں اب خاک اڑ رہی ہے اور چبوترے پر لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی ہے عمارت کے نیچے کا حصہ آج کل نہایت خراب حالت میں ہے اس کی اکثر کمانیں پتھروں سے چن دی گئی ہیں جس کی وجہ اندرونی حصہ کسی قدر تاریک ہے فرش پر کوڑے کرکٹ کی کوئی حد نہیں اس کے علاوہ جابجا مویشیوں کے گوبر کے ڈھیر پڑے ہوئے ہیں غالباً عدم نگرانی کی وجہ سے مویشی اندر داخل ہو جاتے ہیں بالاخانہ اب بھی اس لائق ہے کہ وہاں کوئی بیٹھ جائے تو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا لیکن افسوس متعدد [illegible] کی علامات سے سفید دیواریں سیاہ ہو گئی ہیں آہ! بالاخانہ کچھ نہ پوچھئے کیا چیز ہے شاید ہی ایسا ہوادار مقام کہیں ہو اطراف کا کاٹ دار نظارہ کوسوں تک نظر آتا ہے روبرو بالا میں پہاڑی کا سلسلہ گویا گوناگوں رنگینیوں سے معمور ہو کر اپنے حسن کی آب و تاب کے ساتھ بے نقاب نظر آتی ہے نواح و اطراف کے مناظر کے اجتماع سے ایک عجیب و غریب نظارہ پیدا ہو گیا ہے غرضکہ منظر کی لطافتیں حد بیان سے باہر ہیں صرف وہی لوگ بخوبی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں جو بذاتہ اس کا لطف اٹھا چکے ہوں اس عمارت کے استحکام کی یہ حالت ہے کہ اس کی گچ سیمنٹ اور اینٹ فولاد کے مانند ہے یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے بادوباراں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر رہی ہے۔

اس عمارت کی ویرانی کو دیکھ کر اور بانیان عمارت کی عظمت گزشتہ کا خیال کر کے دل پر کچھ ایسا عالم طاری ہو گیا کہ یہ چند اشعار

بے اختیار قلم سے نکل پڑے ۔

(۱)

ہے بہت خوشنما سنہری محل — دلکشا پر فضا سنہری محل
مرتفع اور بلند ہے یہ قصر — روبروئے نظر ہے سارا شہر
ہے محل وقوع فرحت زا — گرد حلقہ ہے اک پہاڑی کا
وادئی کوہ قاف میں گویا — یہ سنہری محل ہے پریوں کا

(۲)

خوبصورت وہ دامن کہسار — اور اس میں وہ سایہ دار اشجار
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائے جاں پرور — چاروں جانب کھلا ہوا منظر
ہر طرف اس کی حکمرانی ہے — جو جگہ ہے یہاں سہانی ہے

(۴)

ہے مقابل میں مقبرہ[1] ایسا — تعزیہ اک دھرا ہوا گویا
دیکھ کر مقبرے کی زیبائی — ایک تشبیہہ خوب یاد آئی
کیا ہی دلکش ہے خوش قرینہ ہی — سبزہ زاروں میں اک نگینہ ہے
قصر زریں تیرا کیا کہنا — عہد رفتہ کا ہے تو افسانا
قصر کیا ہے سرائے عبرت ہے — دیکھو جس سمت جوش حسرت ہی
اب ہے ویران تھا کبھی آباد — شان رفتہ ہے شوکت برباد
تازیانہ پئے تخیل ہے — نقش بربادئی تجمل ہے

(۵)

ہوگئی ہے یہ تیری حالت زار — جا بجا سے جگر ہے تیرا فگار
اب کہاں وہ طلائی رنگ ترا — اب نہ وہ آب و تاب ہے نہ ضیا
تھیں کبھی جو نگار دیواریں — ہوگئیں دل فگار دیواریں
فرش جو مثل آئینہ تھا صاف — جا بجا اس میں پڑ گئے ہیں شگاف

---

[1] مقبرۂ رابعہ دورانی

کس مپرسی کی تیری حالت ہے
تیرا ویرانہ جائے عبرت ہے
حوض ہیں خشک صحن میں تیرے
خاک اڑتی ہے تھے جہاں چشمے
روشیں ہیں وہ اب کہاں باقی
ہیں کہیں کچھ ابھی نشاں باقی

(۶)

کہہ رہے ہیں ترے در و دیوار
تھا کبھی تو بھی غیرت گلزار
کیا ہی ذی شان ہوں گے تیرے مکیں
صاحب اقتدار ذی تمکیں
پیش خدمت تھے جن کے جاہ و حشم
نصو میں جو منی تھیں جن کے قدم
اب کہاں ہیں وہ مالک دولت
کیا ہوی ان کی حشمت و ثروت
قصر جن کے تھے مثل قصر جناں
گھونسلے زاغ و بوم کے ہیں وہاں
گردش دہر نے کیا پامال
وہ رہے اور نہ ان کا مال و منال
نہ رہا ان کا کر و فر باقی
یادگار ان کے ہیں کھنڈر باقی

(۷)

اے محل اے وہ یادگار کہن
اے وہ تصویر انقلاب زمن
جو تجھے دیکھنے کو آتا ہے
نقش عبرت وہ لے کے جاتا ہے

سید اللہ بخش توحید

مدارس میں اُردو زبان اور ادب کی ترقی و اشاعت کا مسئلہ ہندوستان میں ہمہ گیر توجہ حاصل کر رہا ہے۔ کانگریس نے ہندوستانی کو وہاں کی سرکاری زبان بنانے کا تہیہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں ہندی کے رواج کے لئے بڑی کوشش کی جا رہی ہے ایسی صورت میں اُردو کے بہی خواہوں کو اُردو کی بھی فکر دامنگیر ہوگئی ہے اور ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح مدراس میں اردو زبان کی حالت اور اُردو ادب کے نشوونما کے بارے میں عام معلومات حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے ادارۂ ادبیات اُردو نے مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی سے یہ مبسوط کتاب لکھوائی ہے۔
اس میں گزشتہ دو ڈھائی صدیوں سے مدراس میں اُردو کا جو کام کیا گیا ہے اس کا تفصیلی ذکر درج کیا ہے۔ قیمت عمہ

سب رس کتاب گھر یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہے۔

قاضی جی کی کارگزاری

۷۹۵ھ میں دیول رائے والئ بیجانگر فیروز شاہ بہمنی پر حملہ کرنے کی غرض سے ایک ٹڈی لشکر لے کر طوفان کی طرح اٹھا تاکہ مدگل اور رائچور وغیرہ کے قلعوں کو مسمار کرتا ہوا پایۂ تخت تک پہنچے اور تختہ سلطنت کو الٹ کر شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔

دیول رائے شمالی سرحد کی طرف سے بڑھتا ہوا دریائے کرشنا کے کنارے پر پہنچا اور وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ فوراً راؤٹیاں اور خیمے نصب کر دئے گئے، دوکانیں لگا دی گئیں اور بیوپاری لوگ جنگل میں منگل منانے لگے۔ کیمپ تقریباً تین میل تک پھیلا ہوا تھا جس میں تیس ہزار سوار اور نوے ہزار پیادوں کا لشکر جرار بحر زاید کی طرح موجیں مار رہا تھا، ہر پیشہ کے لوگ اس میں موجود تھے، خرید و فروخت ہو رہی تھی، بازاروں میں چہل پہل تھی، شراب خانے کھلے ہوئے تھے، دور پر دور چل رہے تھے، ارباب نشاط طوائفیں اور کسبیاں نغمہ سرائی میں مصروف تھیں اور رقص و سرود سے محفلوں کو گرما رہی تھیں۔

ادھر سلطان کو خبر پہنچی تو وہ فوراً بارہ ہزار وفادار اور جان نثار سپاہیوں کا لشکر اپنے ساتھ لے کر آندھی کی طرح اٹھا اور گلبرگہ سے کوچ کر کے کرشنا کے دوسرے ساحل پر جا پہنچا۔ برسات کا زمانہ تھا، سیلاب کے طوفان نے دریا کا پاٹ اس قدر چوڑا کر دیا تھا کہ پار اترنا مشکل نظر آیا۔ اس لئے حسب ایما شاہی وہیں سراپردہ نصب کر دیا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد سلطان نے اپنے ارکان دولت اور سپہ سالاروں کو مشورہ کرنے کی غرض سے طلب کیا۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ہر شخص نے اپنی اپنی سمجھ کے موافق تدبیریں بتائیں لیکن سلطان کو تسلی نہیں ہوئی اور کوئی تصفیہ نہ ہو سکا۔ بہرحال جلسہ منعقدہ کی برخاست کے بعد سلطان کو بہت زیادہ فکر دامنگیر ہو گئی۔

ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، اندھیری رات میں سنسان جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا، گھوڑے سے لے کر سوار تک سانس نہیں لے رہا تھا، لیکن سلطان بدستور اسی غور و فکر میں غرق تھا کہ دریا کس طرح عبور کیا جائے اور غنیم کی فوج پر کس پہلو سے حملہ کیا جائے۔

یکایک نظر اٹھائی تو دیکھا کہ سامنے کوئی بزرگ کھڑے ہوئے ہیں، چمکدار روشن آنکھیں، نورانی چہرہ، لانبی ستواں ناک، لمبی ڈاڑھی، دراز قد جسم پر سفید براق کپڑے۔ ادھر سلطان نے ذرا غور سے دیکھا، ادھر وہ بزرگ بھی سلام کرتے ہوئے آگے بڑھے تو معلوم ہوا کہ قاضی سراج[1] ہیں۔ سلطان نے تعجب سے پوچھا کہ اس وقت تم کدھر؟ دست بستہ عرض کی کہ پیر و مرشد، اس وقت لوگ خاموشی کے ساتھ جنگ کی تیاری میں مصروف ہیں مگر حضور کے چہرہ سے غور و فکر کے آثار نمایاں ہیں۔ اب حضور زیادہ تردد نہ فرمائیں، اس بہی خواہ دولت کو ایک تدبیر سوجھی ہے، اگر جان کی امان پاؤں تو حرف مدعا زبان پر لاؤں اور ایک تدبیر بتاؤں۔ سلطان فیروز عام طور پر علما، فضلا اور ایسے ارکان دولت سے نہایت بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ باتیں کرتا تھا۔ قاضی جی کی گفتگو سن کر مسکرایا اور کہا کہ قاضی صاحب! اللہ اللہ کرو، بھلا تم کو جنگ سے کیا واسطہ، کیوں خواہ مخواہ اس جھگڑے میں پڑتے ہو، تم تو اپنے خیمہ میں بیٹھے ہوئے اللہ اللہ کرو اور فتح فیروزی کی دعائیں مانگتے رہو۔

---

[1] قاضی سراج بادشاہی امیروں میں سے ایک نامی عہدہ دار اور امیران صدہ کا ایک نامی فرد تھا (فرشتہ)

قاضی جی چالاکیاں چوکنے والے تھے۔ دست بستہ عرض کی کہ خداوند نعمت، فتح و فیروزی کی دعا تو ہر وقت زبان پر رہے گی خواہ میں حجرے میں رہوں یا میدان جنگ میں مگر عرض یہ ہے کہ قاضی سمجھ کر میرا نام بہادروں کی صف سے خارج نہ ہو جائے۔ باپ دادا سے فن سپہ گری ورثے میں چلا آ رہا ہے اس لئے میں اہل قلم سے تو نہیں ہوں بلکہ اہل سیف بھی ہوں۔

سلطان نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو اپنی تدبیر بھی کہہ ڈالو۔ قاضی جی نے کہا کہ حضور تدبیر یہ ہے کہ میں نے دریا پار جانے کے لئے سینکڑوں ٹوکرے اور لکڑی کی کشتیاں تیار کرا لی ہیں۔ اس وقت غنیم کی فوج غافل ہے اگر حکم ہو تو تھوڑی سی فوج لے کر جاؤں اور شب خون مار دوں۔

سلطان نے کہا کہ قاضی صاحب آپ نے ٹوکروں اور کشتیوں کی تدبیر تو بہت ہی اچھی بتائی مگر شب خون [illegible] نے کی تدبیر مجھے پسند نہیں آئی اس لئے کہ میں فتح کو حیلہ سے حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ پھر غنیم کی فوج ایک لاکھ [illegible] اور ہماری صرف [illegible] اگر یہاں سے آپ چار سو یا پانچ سو آدمی لے کر بھی گئے تو کیا فائدہ ہو گا۔ غنیم کی فوج تو [illegible]۔ وہاں تک پہنچنا بڑی بات ہے [illegible] نہیں۔

قاضی جی کی طبیعت ان معاملات میں بلا کی رسا واقع ہوئی تھی۔ فرمایا مثل مشہور ہے کہ الحرب خدعۃ۔ بس ہم بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ چار پانچ سو آدمی تو ان کے لئے کافی سے زیادہ ہیں [illegible] تو یہی لوگ ان کو خرگوشوں کی طرح بھگا دیں گے [illegible] کیا ہمیں گے۔ ہاں کمک کی مصلحت کی بنا پر [illegible] کے خلاف ہیں تو آپ اجازت مرحمت فرمانے میں [illegible] ساتھ [illegible] تھوڑے سے آدمی [illegible] اور خفیہ طور پر غنیم کے لشکر میں پہنچ جاؤں [illegible] پاس لے جا کر کام تمام کر دوں [illegible] تو بھی ٹوکروں اور کشتیوں سے [illegible] شور ہو تو فوراً ہمارے لشکری غنیم پر گر پڑیں اور اس کا پرچم [illegible]۔

بادشاہ قاضی جی کی یہ تدبیر سن کر مسکرایا اور خاموش ہو گیا مگر قاضی جی پارے کی طرح بے قرار تھے۔ بادشاہ کے سکوت کو "السکوت کالرضا" سمجھے فوراً سلطان سے رخصت ہو کر کیمپ پہنچے اور [illegible] اپنے ساتھ لئے جو ان کے ہم نشین تھے اور فقیروں کا بھیس کر کے چل کھڑے ہوئے۔ صبح ہوتے ہوتے غنیم کے کیمپ میں پہنچے۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر ٹہلتے رہے جب کہیں دل لگی نظر آئی تو ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر آپس میں کچھ [illegible] شروع کر دی۔ قاضی جی نے مراقبہ کیا [illegible] اور چالاکیاں ہاتھ باندھے ہوئے سامنے حاضر ہوئیں پھر کیا تھا فوراً داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور ساتھیوں کو بشارت دی کہ ایک ترکیب سوجھی ہے اب انشاء اللہ فتح ہی فتح ہے۔ ساتھیوں نے پوچھا کہ وہ کیا ہے تو فرمایا کہ [illegible] کی فوج کے ساتھ [illegible] طوائفیں اور کسبیوں کے طائفے بھی موجود ہیں۔ بس ہمیں وہاں چلنا چاہئے وہیں سے امید ہے کہ وہاں پہنچ کر ضرور کامیابی کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ ساتھیوں نے پھر پوچھا کہ آخر وہاں جا کر کیا کیجئے گا؟ تو قاضی جی نے فرمایا کہ تمہیں کیا معلوم کہ فقیر جھولی میں کیا ڈال کے اور کیا [illegible] بس فقیر کے پیچھے پیچھے [illegible] اور کچھ مت پوچھو کیوں کس لئے چون و چرا نہ کئے جاؤ۔ القصہ سب نے مل کر کسبیوں اور طوائفوں کے کیمپ کی طرف دھاوا بول دیا۔ قاضی صاحب شاہ صاحب کا بھیس بدلے خضر راہ بنے ہوئے آگے آگے تھے اور ان کے چیلے اور مرید اپنے مرشد کے پیچھے قدم بقدم چل [illegible] وہاں پہنچے اور وہیں دھونی [illegible] دو چار روز کے بعد یہ درویشوں کی ٹولی کسبیوں کے کیمپ میں بھی آنے جانے لگی اور ان کا نہایت [illegible] کے سلسلہ بیعت شروع کر دیا۔ ایک مقام پر دیکھا کہ ایک طوائف نہایت طرحدار، حسین، مہ جبین، نوکیلی چھبیلی، کنگھی چوٹی سے درست، [illegible]

سے آراستہ و پیراستہ، شمع محفل بنی بیٹھی ہے۔

اس وقت قاضی جی کو سات خون معاف تھے، اسے دیکھتے ہی رال ٹپک پڑی، کانوں تک باچھیں کھل گئیں، دل سینہ میں بالسوں اچھلنے لگا، ڈورے ڈالنے کے لئے پروانہ وار آگے بڑھے اور اس کے سامنے بیٹھ کر وہ وہ باتیں بنائیں کہ رہے نام سائیں کا۔

اس موقع پر قاضی جی نے اپنے آپ کو پرلے نمبر کا عاشق مزاج، دل پھینک اور رنگیلا ثابت کرنے کی کوشش کی۔ سو جان سے قربان ہو رہے تھے، جو کچھ روپیہ پیسہ اپنے ساتھ لائے تھے بے دریغ اس پر سے نثار کرنا شروع کر دیا، وہ وہ باتیں بنائیں، وہ وہ روغن قاز ملا کہ طوائف بھی ان پر ریجھ گئی اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ مجھ پر لٹو ہے۔ رات بھر خوش مذاقی اور ظرافت کی آتشبازی چھوٹتی رہی۔ تمام رنڈیاں اور ڈوم ڈھاڑی قاضی جی سے پیٹے ہوئے تھے اور قاضی جی اپنی مضحکہ خیز حرکتوں اور پر لطف باتوں سے اس محفل کو خوب گرما رہے تھے۔ اس وقت بقول انشاء اللہ خاں، قاضی جی کی یہ کیفیت تھی کہ۔

شب محفل ہولی میں جو وار و ہوا زاہد ۔ رندوں نے لپٹ کر
ڈاڑھی کو دیا اس کی رنگا بدر تلونا ۔ اور دینے لگی لت
تب منہ پچکے کہنے لگے ٹک پر لونا چو کھ ناک پہ انگلی
اور آئے جی آنے سے برا مانے سو بھڑوا ۔ ت ... ہم عشرت

دو چار روز اسی طرح گزرے، آخر ... ت ... تھی کہ معشوقہ اجے کنور کے دربار میں مجرے کے لئے طلب کی گئی اور وہ جانے کیلئے تیاری کرنے لگی، قاضی جی کو جیسے ہی یہ پتہ لگا، بس پھر کیا تھا، فوراً آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور لگے ٹسوے بہانے بھر یہ ہی نہیں بے تاب ہو کر پروانہ وار اس کے گرد پھرنے لگے اور قدموں پر گر کر عرض کرنے لگے کہ جدائی کی گھڑیاں مجھ سے نہیں کٹ سکیں گی، خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو، یا تو تم وہاں نہ جاؤ یا مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ طوائف نے کہا کہ قاضی جی کیا عقل ماری گئی ہے، اپنے ہوش کے ناخن لو۔ ہم تو راجہ کے نوکر ٹھیرے، پھر بڑی بات یہ کہ خود کنور جی نے طلب فرما کر ہماری عزت افزائی فرمائی ہے ایسی صورت میں بھلا میں حکم عدولی کیسے کر سکتی اور اپنے ساتھ راج سبھا میں تمہیں کیسے لے جا سکتی ہوں۔ اس لئے کہ وہاں تو صرف وہی شخص جا سکتا ہے جو گانے بجانے اور ناچ رنگ میں مشاق ہو۔

قاضی جی نے جواب دیا کہ اے جان جہاں! کیا تم نے اوروں کی طرح مجھ کو بھی نرا کاٹھ ملا سمجھ لیا ہے، رام کی دیا سے میں بھی گانے بجانے سے اچھی طرح واقف ہوں، اس کے علاوہ وہ وہ کمالات جانتا ہوں کہ راجہ صاحب بھی دیکھ لیں تو بھونچکا ہو کر رہ جائیں۔ طوائف نے خیال کیا ڈینگ کی لے رہا ہے، مسکرائی، اور اپنا ستار ان کی طرف کھسکا کر کہا کہ لیجئے ذرا اس کو تو چھیڑئیے۔ قاضی جی نے فوراً ستار ہاتھ میں لے پردوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا، پھر جوڑا اور باج کے تاروں کو ٹٹولا اور طربوں کے سُر ملا کر وہ استادی سے بجایا، وہ وہ گت سازی اور مینڈ کاری کے کمالات دکھلائے کہ طوائفیں اور کسبیاں تو رہیں ایک طرف ان کے سازندے بھی سن کر دنگ رہ گئے۔ اب تو ان کی معشوقہ کا ماتھا ٹھنکا، سوچی کہ اس کا ساتھ رکھنا تو باعث فخر و عزت ہے، ناچ گانے سے بھی خوب واقف ہے، باتیں بھی خوب بناتا ہے

بہت ممکن ہے کہ اس کے طفیل سے ہم پر بھی امن برسنے لگے۔" نوراب کو طائفہ میں شریک کر لیا اور انہیں اپنے ساتھ لئے راج کنور کے دربار میں جا پہنچی۔

محفل کیا کچھ بھری ہوئی تھی۔ دیول رانی کا سپوت اور اس کے احباب آپس میں چہلیں کر رہے تھے، شراب کا دور چل رہا تھا۔ اس طائفہ کے پہنچتے ہی گانا شروع ہو گیا۔ طبلہ پر تھاپ پڑی، سارنگی بجنے لگی، منجیرے بجنے لگے۔ طائفہ کی سریلی آواز اور گھنگروؤں کی چھم چھم سے محفل کا رنگ ہی بدل گیا۔ دیر تک محفل رقص و سرود گرم رہی۔ گانا ختم ہوا تو نقالوں کی باری آئی۔ قاضی جی فوراً ایک ساتھی پکڑ کر اکھاڑے میں کود پڑے۔ یہ دونوں زنانہ لباس پہنے سرمہ، مسّی اور زیور سے سدا سہاگن بنے، ناز و غمزے کرتے، مٹکتے، ٹھمکتے، تالیاں بجاتے اور کمر مٹکاتے ہوئے ایسے مضحکہ خیز انداز میں راج کنور کے سامنے آئے کہ اہل محفل ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ پھر ان بہروپیے نقالوں نے تمسخر، طرب سازی، اور گت بازی کے وہ وہ کمالات دکھلائے کہ راج کنور اور پوری محفل اش اش کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد قاضی جی نے اپنی غیر معمولی پھرت اور دلفریب حرکت کے ساتھ رقص شروع کر دیا۔ لے میں ڈوبا ہوا ساز، سروں میں ڈوبی ہوئی آواز اور وظیفہ راگ راگنی کے سوز و گداز نے محفل پر جادو سا کر دیا۔ ہر شخص بت بنا ہوا ان کو ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں دونوں نے کمر سے خنجر کھینچ، بھاؤ بتانے شروع کر دئے اور نہایت سبک روی کے ساتھ وہ وہ توڑ دکھائے، وہ وہ ہاتھ اور پینترے نکالے کہ پوری محفل وجد کرنے لگی۔

آخر کار یا تو لے کاٹتے اور پینترے بدلتے ہوئے دونوں کے دونوں راج کنور کی طرف آہستہ آہستہ بڑھے پھر لپک کر اس کے سینے و شکم میں دونوں نے بیک وقت ایسے کاری خنجر بھونکے کہ وہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ اور تماشائی نشہ میں چور اور مست و مخمور تھے۔ جو لڑکھڑاتے ہوئے باہر بھاگے انہیں قاضی جی کے ان ساتھیوں نے سنبھالا جو باہر کھڑے ہوئے تال دے رہے تھے جو بھاگ نہ سکے وہ وہیں کے ہو کے رہ گئے۔

اب قاضی جی اور ان کے ساتھیوں نے کیمپ کے چراغ گل کرنے شروع کر دئے۔ پھر کیا تھا چراغ گل پگڑی غائب، لشکری حیران و پریشان اصل واقعہ سے بے خبر سمجھے کہ سلطان کے لشکر نے شب خون مارا ہے۔ شراب کا نشہ، کچی نیند اور رات کی تاریکی میں ایک دوسرے پر پل پڑے۔ ہر طرف صدائے دار و گیر بلند ہو گئی۔ ادھر قاضی جی نے اپنے ساتھیوں کو اطلاع دینے کی غرض سے سلطان کی طرف روانہ کر دیا اور خود کسی گوشۂ عافیت میں سر چھپا کر بیٹھ گئے۔

دیو رانی نے یہ کیفیت دیکھی تو ہوش پراں ہو گئے۔ بس اندھیرے منہ اپنے لڑکے کی لاش لے کر بقیہ لشکر بلا سے بچا کر روانہ ہو گیا۔ دوسرے روز جب مشرق کا شہسوار اپنی فوج کو شکست دے کر شعاع کا نیزہ ہاتھ میں لئے نکلا، فوج شاہی سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق، جسم پر زرہ بکتر اور چار آئینے، سر پر خود فولادی، کمر میں شمشیر اصفہانی، پشت پر سپر، کندھے پر کمان، کمند بریشمی شکار بند میں آویزاں، عربی گھوڑوں پر سوار اپنی فوج ظفر موج کو لئے ہوئے آ پہنچا۔ نقارے پر چوٹ پڑی کہ دل سینوں میں دہل گئے۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر کے نعروں سے دشت و ہامون گونج اٹھے۔ بہادروں نے بڑھ کر حملہ کیا، پھر کیا تھا، تلواروں سے

تلواریں اور نیزوں سے نیزے اژدہوں کی طرح زبانیں نکالے ہوئے ایک دوسرے سے گتھ گئے۔ بندوقوں کی دھواں دھار بارش سے آسمان پر ایک ابر سا چھا گیا تھا جس میں برچھیوں کی سنانیں اور بھالوں کی انیاں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر بجلیاں گرا رہی تھیں۔ بڑے گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ گھمسان کا رن پڑا۔ جدھر دیکھو کشتوں کے پشتے لگے تھے۔ خون کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ کوئی سسک رہا تھا کوئی ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور کوئی رقص بسمل کر رہا تھا۔ غرض یہ کہ قاضی جی کے ناچ نے سب کو گلی کا ناچ نچا رکھا تھا۔

بارہ ہزار پیادوں نے وہ بھی تو ایسا حملہ کیا کہ ایک دھاوے میں نیستہ نابود سے زیادہ کا کھیت کر دیا جو باقی بچے ان کے پاؤں اکھڑے اور ایسے اکھڑے کہ پھر نہ جمے۔ یہ لوگ عجیب عجیب طرح بھاگ رہے تھے۔ کوئی بے تحاشا بھاگا۔ کوئی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ کوئی نوک دم بھاگا اور کوئی دم دبائے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ پیادوں کو ہوش نہ تھا کہ ہاتھ میں تلوار ہے یا میان۔ گھوڑا سوار کو خبر نہ تھی کہ گھوڑے پر سیدھا سوار ہے یا الٹا۔ فتحیابوں نے کئی کوس تک ان کا پیچھا کیا۔ گلبرگہ تک پہنچا کر واپس آئے۔ راستے میں زخمیوں کی کمریں اور مردوں کی ہمیانیاں کھول کھول کر اپنے کیسے خوب ٹھونس ٹھونس کر بھرے اور اس قدر نقد و جواہر مال و دولت ہاتھ آیا کہ جس کا حد و حساب نہیں۔

گلبرگہ والوں کی ناکامیوں سے میدان جنگ میں جو غبار اٹھا تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر تیرے کی انی سے اس فیروز شاہ کا نام لکھ دیا اور ضیاء الدین لودھی کی یہ کوشش ہوئی کہ اس کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔ سلطان فیروز شاہ اپنے لشکر کے ساتھ کامیابی کے ڈنکے بجاتا ہوا اور مال غنیمت لئے نقارے بجاتا ہوا پائے دار السلطنت واپس ہوا۔ اس خدمت کے صلہ میں قاضی سراج خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوئے اور گروہ امرا میں داخل ہو کر چین کی بنسی بجاتے رہے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

باغ دکن

یہیں بہار کا میلہ یہیں بنا ہے چمن
عجیب خطہ دلکش ہے خاک پاک دکن

نگاہ شوق کو کیا کیا سماں دکھاتا ہے
انوکھی شان زمانہ کو یہ بتاتا ہے

نمونہ کرم و لطف کردگار ہے یہ
یہ باغ علم ہے گہوارہ بہار ہے یہ

لگے ہیں درخت ہری بھری زمین شاداب
لطیف و سرد ہوا پاک صاف چشمۂ آب

کمی نہیں ہے کسی شئے کی اس گلستاں میں
عجب بہار ہے کچھ اس کے سرو و ریحاں میں

ملک ہم چمن کا خاک دکن ہے گلدستہ
ہم کھڑے ہیں شجر اور کوہ صف بستہ

مسافر آکے جو اس جا قیام کرتے ہیں
مناظر اس کے انہیں جلد رام کرتے ہیں

بلندیوں سے جو ہو مائل نشیب نظر
فریب دیتا ہے تالاب کا حسین منظر

وہ دیکھو دور سے پانی ہے یوں نظر آتا
سفید سانپ چلا جائے جیسے بل کھاتا

اقبال الدین احمد
سابق اڈیٹر کامریڈ و ادبی دنیا

دکن کے نسوانی ادارے

عہد عثمانی میں جہاں ملک اور ابنائے ملک کی ہمہ جہتی فلاح و بہبودی کی خاطر سیکڑوں اصلاحیں عمل میں آئی ہیں وہاں طبقۂ نسواں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح حال کے لئے بھی ہمارے بیدار مغز سلطان العلوم کی علم پرور حکومت نے اپنی امکانی کوششیں کی ہیں اور مسلسل کئے جا رہی ہے۔

تعلیم نسواں کے سلسلہ میں جو تجاویز عمل میں آئی ہیں اور جو اقدامات کئے گئے ہیں ان کی اہمیت اور وقعت دوسری تجاویز سے کہیں زیادہ ہے! تعلیم نسواں کی اہمیت مردوں کی تعلیم سے بہت زیادہ ہے، اسی پر قوم کے ارتقا کا دار و مدار ہے۔ ہماری آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت، ان کی اخلاقی اصلاح اور ان کی بہتری کے لئے عورت کا صحیح تعلیم و تربیت یافتہ ہونا از بس ضروری ہے، عورت نہ صرف مرد کا بلکہ ہماری قوم کا "نصف بہتر" ہے، اس کو جاہل اور تعلیم و تربیت سے محروم رکھ کر ہم کبھی شاہراہ ترقی پر گامزن نہیں ہو سکتے۔

عہد عثمانی میں تعلیم نسواں نے ترقی کے جو مدارج طے کئے ہیں اور خواتین دکن نے اصلاح معاشرت و تمدن کی جو کوششیں کی ہیں ان کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۳۲۱ف میں جبکہ موجودہ فرمانروائے دکن نے مہام سلطنت اپنے دست مبارک میں لی صرف (۹۱) مدارس نسواں ممالک محروسہ سرکار عالی میں قائم تھے جن میں ۶۳۴۶ لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں۔ سنہ ۱۳۳۲ف کے اعداد و شمار سے تعلیم نسواں کی ترقی کی رفتار اس طرح واضح ہوتی ہے کہ نسوانی درسگاہوں کی تعداد ۷۳۶ ہے، جن میں ساٹھ ہزار لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔ ان مدارس میں ۶۹۶ تحتانیہ ہیں جن میں (۶۲۱۰۶) طالبات تعلیم پاتی ہیں، مدارس وسطانیہ ۳۰ ہیں جن کی طالبات کی تعداد ۲۲۸ ہے۔ مدارس فوقانیہ نو ہیں ان میں ۳۹۳۳ لڑکیاں ہیں۔ تعلیم نسواں پر معتدبہ رقم جو ہر سال صرف ہو رہی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف ۱۳۴۴ف میں ہماری علم دوست اور فیاض حکومت نے ... روپے اس طبقہ کی تعلیم پر صرف کئے ہیں۔

ذیل میں چند سرکاری مدارس و خانگی اسکولوں اور خواتین کے اصلاحی و معاشرتی اداروں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ہم یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ عہد عثمانی میں تعلیم و تربیت نسواں نے ترقی کی منزلیں کس حسن و خوبی سے طے کی ہیں اور خواتین دکن میں تحصیل علم اور اصلاح معاشرت کے جذبات کس حد تک کارفرما ہیں۔

نامپلی زنانہ اسکول

موجودہ فوقانیہ نسواں نامپلی کا قیام ۱۳۱۸ھ میں عمل میں آیا، اس وقت اسکول میں صرف سولہ لڑکیاں شریک تھیں۔ مگر اس نے ترقی تدریجاً کی، پھر اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کے تخت نشین ہوتے ہی ایک عظیم تغیر رونما ہوا، طالبات کی تعداد تیزی سے بڑھنا شروع ہوئی چنانچہ اس وقت اس میں ۶۶۱ لڑکیاں زیر تعلیم ہیں۔ ان لڑکیوں کو امور خانہ داری، دستکاری، مصوری، سلائی اور بچوں کی پرورش کی بھی باضابطہ صحیح اصول پر عملی تعلیم دی جاتی ہے۔

کلیۂ اناث

تعلیم نسواں کا معیار بلند کرنے اور طبقۂ نسواں کو اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور کرنے کے لئے ۱۳۴۳ف میں کلیۂ اناث کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم پانے والی طالبات کی تعداد

نصف درجن سے زیادہ نہیں تھی، اسٹاف صرف ایک پرنسپل اور ایک پروفیسر پر مشتمل تھا اور اب کوئی ایک درجن خاتون پروفیسر ساٹھ ستر لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے زینے طے کرا رہی ہیں۔

وظائف تعلیمی

کلیۂ اناث کی کامیاب طالبات کو ان کی مخصوص اور امتیازی کامیابیوں کے مدنظر ہماری علم پرور حکومت سے ممالک غیر میں تکمیل تعلیم کے لئے وظائف عطا کئے جاتے ہیں اور اکثر خواتین باہر جاکر امتیازی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ خدمات پر اسی کالج میں مامور ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس وقت ایسی کئی خواتین کالج کی خدمات پروفیسری کو انجام دے رہی ہیں۔

محبوبیہ زنانہ اسکول

یہ اسکول ۱۳۱۶ف سے قائم ہے، اس میں سینیر کیمبرج تک تعلیم دی جاتی ہے، یہاں زیادہ تر امراء اور معزز طبقہ کی لڑکیاں شریک ہیں یہاں کی اکثر طالبات سینیر کیمبرج کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے کلیۂ اناث میں داخل ہوتی ہیں، اسمیں طالبات کی تعداد ۱۳۴۶ف کے آخر میں (۴۰۹) تھی، اس اسکول میں کمسن لڑکے بھی داخل ہوسکتے ہیں، علاوہ تعلیم کے دستکاری، مصوری، موسیقی، خانہ داری، سلائی اور پکوان کی بھی عملی تعلیم دیجاتی ہے، سادہ معاشرت کا عادی بنانے، لباس میں سادگی پیدا کرانے اور لڑکیوں کو کفایت شعار بنانے کے لئے اس اسکول کی دوراندیش اور تجربہ کار پرنسپل طالبات کو سادہ لباس استعمال کرنے اور زیورات کو ترک کرنیکی ترغیب و ہدایت دیتی رہتی ہیں، اسکول کی عمارت میں چند سال پہلے کافی توسیع کی گئی ہے۔ اس اسکول میں بھی ہر قسم کے میدانی کھیل ڈرل اور جمناسٹک کا اچھا انتظام ہے۔

مدارس تعلیم المعلمات

یہ مدارس خصوصاً معلمات کو طرز تعلیم سے واقف کرانے کے لئے قائم کئے گئے ہیں ان میں علاوہ (۱۰۴) طالبات کے (۱۰۹) معلمات بھی مروجہ طرز تعلیم و تدریس میں، ان کو طرز تعلیم کے جدید طریقوں سے واقف کرایا جاتا ہے۔

ماڈل پرائمری اسکول

یہ اسکول ۱۳۴۴ف میں قائم کیا گیا ہے اس میں مخلوط اسٹاف چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کو تعلیم کے لئے تیار کرتا ہے یہاں باغبانی بھی سکھائی جاتی ہے۔

گرل گائیڈ

کوئی آٹھ سال سے "گرل گائیڈ" کی تحریک جاری ہے، اس تحریک کے بنیادی اصول انسانوں اور جانوروں کے ساتھ ہمدردی ایک دوسرے کی تائید، زخمیوں کی فوری امداد تیمارداری اور خود اعتمادی ہیں۔ اس تحریک میں کلیۂ اناث، مدرسۂ نسواں نامپلی، محبوبیہ زنانہ اسکول اور تعلیم نسواں کے بعض دوسرے ادارے بھی شریک ہیں کھیل وضامین سیر و تفریح کے مواقع اور معاشرتی پارٹیاں لڑکیوں کے لئے بڑی دلچسپیوں کا باعث ہوئے ہیں

انجمن ترقی تعلیم و تمدن نسواں

تعلیم نسواں کی ترقی اور اعلیٰ تعلیم کی نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ خواتین دکن کی معاشرت، تمدن اور ذہنیت میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ اعلیٰ تعلیم اور صحیح تربیت یافتہ خواتین علم کی خوبیوں سے واقف ہونیکے بعد اپنی ان بہنوں کو جنہیں حصول تعلیم کے ذرایع میسر نہیں علم کی برکات سے واقف کرانے اور روشن خیال بنانیکی پوری کوشش کر رہی ہیں۔ اسی خیال کے تحت یہ انجمن ۱۹۲۶ء میں قائم کیگئی ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ حاجی اور معاشرتی اصلاحات کا تبلیغی کام بھی یہ انجمن بہ احسن وجوہ انجام دے رہی ہے۔ اس انجمن کی صدر محترمہ بیگم صاحبہ نواب ولی الدولہ اور نائب صدر مشہور پارسی خاتون مسز رستم جی فریدون جی ہیں، ان دونوں روشن خیال اور ملک و قوم کا درد رکھنے والی معزز خواتین کی سرپرستی میں یہ انجمن خوب پروان چڑھ رہی ہے، اشاعت تعلیم، اصلاح معاشرت و رسم و رواج کے مختلف اصول اور طریقے اس انجمن کے پیش نظر ہیں، یہ انجمن متعدد

زنانہ مدارس کی امداد اور نگرانی کرتی ہے، غریب اور شوقین لڑکیوں کو وظائف تعلیمی بھی اس انجمن سے دئے جاتے ہیں۔ اس انجمن کے تحت پانچ مدارس قائم ہیں، ان میں تقریباً چار سو بچوں کو مفت ابتدائی تعلیم دیجاتی ہے۔

دارالاقامہ اس انجمن کی سرپرستی میں ایک دارالاقامہ شہر کے وسط میں قائم کیا گیا ہے، اس میں باہر سے آنی ہوئی خواتین بلالحاظ مذہب و ملت قیام کرسکتی ہیں، یا قامت خانہ خاص طور پر ان غریب خواتین کی ضرورت کو پورا کرتا ہے جو دایہ گری اور تیمارداری کی عملی تعلیم شفاخانوں میں حاصل کرتی ہیں اور ختم تعلیم پر مختلف دواخانوں اور ہسپتالوں میں ملازم ہوتی ہیں

دارالمباحثہ اس انجمن کے زیر سایہ ایک دارالمباحثہ بھی قائم ہے۔ اس میں تعلیم یافتہ خواتین تقریری مقابلے کرتی ہیں۔ اس قسم کے تقریری مقابلوں سے خواتین میں علمی ذوق پیدا کرنیکے علاوہ تقریر کرنیکی قابلیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس سال دارالمباحثہ کی جانب سے ایک پرجوش مناظرہ اردو میں ہوا۔ اس جلسہ میں بلفظ آراء یہ طے ہوا کہ ہندوستان میں بچوں کی پرورش کا موجودہ طریقہ ناقابل اطمینان ہے۔

ذیلی کمیٹیاں اس انجمن کی کئی ذیلی کمیٹیاں ہیں جو خواتین کے حقوق کی حفاظت، کمسنی کے ازدواج کی مخالفت، عورتوں اور بچوں کی جسمانی اور اخلاقی بہتری کے لئے مناسب تجاویز عمل میں لاتی ہیں۔ تقریروں کے ذریعہ اس انجمن کی اراکین اپنی بہنوں کو ان کے حقوق اور فرائض سے آگاہ کرتی ہیں۔ ان کو اپنی صحت تندرستی کی جانب بطور خاص توجہ کرتی ہیں۔ ایک کمیٹی عورتوں کی قانونی دشواریوں پر غور کرنے کے لئے مقرر کیگئی ہے۔ اس سال ہر کمیٹی کا ایک عام جلسہ ہوا جس میں کئی اداروں کی مسلم خواتین شریک ہوئیں۔ اس جلسہ میں وہ "نکاح نامہ" پیش کیا گیا جسکو مسز جارعلی خان نائب صدر کل ہند خواتین کی کانفرنس نے مرتب کیا ہے۔ یہ نکاح نامہ ایک اقرارنامہ کی شکل میں ہے جس میں مسلم خواتین کو تحت قانون شرع طلاق کا حق دیا گیا ہے۔ بعد شرکاء جلسہ خواتین نے بلفظ آراء اس نکاح نامہ کو منظور کیا۔

اس انجمن کو کل ہند خواتین کی کانفرنس کی مستقل کمیٹی نے حیدرآباد کی خواتین کی نمایندہ انجمن تسلیم کرلیا ہے اس انجمن سے اس نمایندے سالانہ کل ہند کانفرنس کے جلسوں میں بھیجے جاتے ہیں اور کانفرنس کی مستقل کمیٹی میں اس انجمن کا ایک رکن حیدرآباد کے نمایندے کی حیثیت سے شریک رہتی ہے۔

دی گرلز اسکول کوآپریٹیو بلڈنگ سوسائٹی لمیٹڈ مسز رستم جی کی صدارت میں محدود ذمہ داریوں کی ایک سوسائٹی زنانہ مدارس کی عمارتوں کی تعمیر کے لئے ۱۹۳۵ء میں قائم کیگئی ہے۔ اس سوسائٹی کا مقصد یہ ہوا ہے کہ غریب لڑکیوں کے مدارس کیلئے مختلف مقامات پر تعمیر کرانا ہے چنانچہ ایک ایسی ہی عمارت خیریت آباد میں تعمیر کیگئی ہے جس میں ایک اسکول قائم ہے۔

زنانہ کلب گزشتہ چند سال کے اندر حیدرآباد اور سکندرآباد میں خواتین کے کئی کلب قائم ہوگئے ہیں۔ ان کے لئے نہایت کشادہ اور شاندار عمارتیں تیار کیگئی ہیں۔ پردہ کے حدود و انتظام کے ساتھ کلب کی اراکین مختلف قسم کے کھیل و تفریحات سے مستفید ہوتی ہیں کھیل اور تفریح کے علاوہ تقاریر کے ذریعہ دماغی اور اخلاقی ترقی بھی ہوتی ہے۔

لیڈیز اسوسی ایشن کلب اس کلب کی بنا کسی زمانہ میں مسز صغریٰ ہمایوں جنگ مرحومہ نے ڈالی تھی۔ اس وقت یہ کلب نہایت اعلیٰ پیمانہ پر قائم ہے۔ اس کی صدر لیڈی حیدری ہیں، جن کی نگرانی میں اس کی شاندار اور خوبصورت عمارت تیار ہوئی۔ اس کلب کے اراکین کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ ہے اس کلب کی جانب سے ہر سال طلائی میڈل ان طالبات کو عطا کئے جاتے ہیں جو انگریزی اور اردو کے مضامین میں امتیازی کامیابیاں حاصل کرتی ہیں۔ غریب لڑکیوں کو تعلیمی وظائف بھی دئے جاتے ہیں۔ اس کلب کی اراکین مختلف تفریحات اور میدانی کھیلوں کے علاوہ تقریری مقابلوں میں بھی شریک ہوتی ہیں۔

لیڈیز ریکریشن کلب گزشتہ چند سال سے یہ کلب قائم ہے، اس کی صدر رانی شنکر راج راجونت بہادر ہیں۔ اس کے اراکین کی تعداد تقریباً دو سو ہے میدانی

کھیلوں اور دوسری تفریحات کے علاوہ اس میں ایک تیرنے کا تالاب بھی ہے ۔ اس میں خواتین تیراکی کا شوق بھی پورا کرتی ہیں ۔

متذکرہ صدر اداروں کے علاوہ خواتین کی اور کئی انجمنیں بھی ہیں مثلاً انجمن خواتین دکن ، انجمن خواتین اسلام ، [illegible] خواتین کی انجمن ، گجراتی خواتین کی انجمن ، عیسائی خواتین کی انجمن ، بہبودیٔ اطفال کے متعدد مراکز وغیرہ ۔

انجمن خواتین دکن

خواتین کی انجمنوں میں اس انجمن کو ممتاز درجہ حاصل ہے ۔ یہ انجمن ۱۳۴۳ف ہجری میں مسز صغرا ہمایوں مرزا کی صدارت میں قائم ہوئی ۔ اس انجمن کی پیٹرن رانی شام راج راجونت بہادر ہیں ۔ اس انجمن کے مقاصد میں بہ تمیز مذہب و ملت کی غریب و شریف خواتین کی مدد کرنا ، غریب لڑکیوں کی شادی میں امداد دینا ، بیوہ عورتوں اور نادار لڑکیوں کو دستکاری سکھانا ، معذور عورتوں کو ماہانہ امداد و وظائف کی شکل میں دینا ، ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینا ، فضول رسم و رواج کو ترک کرانا ہے ۔

اس انجمن کی کامیابیاں زیادہ تر محترمہ صغرا ہمایوں مرزا کی عالی ہمتی و ایثار کی مرہون منت ہیں ۔ اس انجمن نے اب تک [illegible] نقد [illegible] بے یار و مددگار عورتوں کو ماہانہ امداد دی جاتی ہے ۔ اس انجمن کی زیر نگرانی زنانہ صنعت و حرفت کا ایک مدرسہ قائم ہوا ہے ۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہوگا جس میں ادبی تعلیم کے ساتھ دستکاری ، امور خانہ داری اور مختلف فنون کی عملی تعلیم کا خاص انتظام کیا جائے گا ۔ محترمہ صدر انجمن نے بڑی فیاضی سے اپنی جائیداد کا بڑا حصہ اس ادارہ کے لئے وقف کر دیا ہے ۔ ہر انجمن کی سرپرستی میں ہر سال دستکاری اور کھانوں کی نمائش کی جاتی ہے ۔ اس نمائش میں تعلیم نسواں کے مختلف ادارے حصہ لیتے ہیں ۔ اس انجمن کی نگرانی میں اس وقت تین زنانہ اسکول قائم ہیں ۔ غرضکہ اس انجمن کی کارگزاریاں دیکھنے کے بعد مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں بھی ایسی حساس خواتین موجود ہیں جو اپنی صنف کی تن من دھن سے خدمت کر رہی ہیں ۔

بستان طالبات

یہ ادارہ کوئی دس سال سے قائم ہے ۔ اس میں یتیم بے یار و مددگار لڑکیوں کے قیام و طعام کا انتظام کیا جاتا ہے اور ان کو تعلیم و تربیت کے ساتھ امور خانہ داری ، سوزن کاری اور کھانا وغیرہ پکانے کی عملی تعلیم بھی دی جاتی ہے ۔ اس وقت اس میں کوئی چالیس یتیم لڑکیاں زیر پرورش ہیں ۔ اس ادارہ کی معتمد محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ ۔ بانو نظامی ہیں ۔ علاوہ یتیم لڑکیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے پردہ کرنے والی مفلس بیوہ عورتوں کی امداد بھی کی جاتی ہے ۔ سلائی کا کام ان کے لئے فراہم کیا جاتا ہے اور اجرت دے کر ان سے کام لیا جاتا ہے اور ان کو کشیدہ کاری اور سلائی کی تعلیم بھی مفت دی جاتی ہے ۔

چند خانگی ادارے

چند خانگی مدارس بعض حساس اور ہمدرد ملک و قوم خواتین کی سرپرستی اور نگرانی میں قائم ہیں ۔ بیگم سید رحمت اللہ صاحب پروفیسر [illegible] کالج نے ایک خانگی اسکول اپنے مکان پر ملازمین کی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے قائم کیا ہے جس میں سلائی کی تعلیم وہ خود دیتی ہیں ۔ مسز ابراہیم حسن صاحب نے ایک ایسا ادارہ اپنی قیام گاہ جوبلی ہل پر قائم کیا ہے جس میں صرف بیچارہ عورتوں کو سلائی اور کشیدہ کاری کی تعلیم دی جاتی ہے ۔ مسز نندی نے اپنے مکان پر ایک مختصر سا اسکول ادنیٰ نوکروں کی اولاد کے لئے قائم کیا ہے جس کو وہ خود تعلیم دیتی ہیں ۔

متذکرہ صدر اعداد و شمار سے واضح ہوگا کہ خواتین دکن میں بیداری کے احساسات کس حد تک پیدا ہو گئے ہیں اور اس طبقہ نے ہمارے آقائے ولی نعمت کے عہد میمنت مہد میں اپنی ہر جہتی فلاح و بہبود کے لئے کیسے کارہائے نمایاں کئے ہیں ۔ تعلیمی ، ذہنی و معاشرتی ترقی کے زینے کس حسن و خوبی سے طے کئے جا رہے ہیں ۔ ترقی کی اس رفتار کو دیکھ کر دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ طبقہ مستقبل قریب میں زینے طے کر کے بہت جلد بام ترقی پر پہنچ جائیگا ۔ تعلیم نسواں کی یہ رفتار پیش خیمہ ہے اس طبقہ کے درخشاں مستقبل کا ۔ وہ دن دور نہیں کہ ہماری ملکی بہنیں دوسرے ممالک متمدنہ کی خواتین کی طرح زیور علم سے آراستہ اور صحیح تربیت یافتہ ہو کر علم و عمل کی روشنی سے جہالت کی تاریکی کو ملک سے دور کر دیں گی ۔

مرزا سیف علیخاں

دنیا کا سب سے بڑا ہیرا ہے، کیونکہ اس کا وزن (۳۹۵) قیراط[۱] ہے۔

"الماس نظام" کے ابتدائی تاریخی واقعات کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہ ہیرا نواب میر فرخندہ علی خاں بہادر آصفجاہ رابع کے عہد حکومت میں دستیاب ہوا تھا۔ صاحب گلزار آصفیہ نے (جو اس دور کے معتبر ترین مورخ سمجھے جاتے ہیں اور جنھیں ایک عرصہ تک دربار شاہی کے تقرب کا بھی اختصاص حاصل رہا) اس کے حالات کی تحقیق میں، جو غالباً ان کے چشم دید ہیں، یہ بیان کیا ہے کہ قصبۂ جٹ پول میں ایک بقال رہتا تھا، معلوم نہیں کہ یہ الماس اسے کہاں سے ہاتھ لگا، مگر اس نے اس کی حفاظت بکاسے کے سینگ میں چھپا کر اپنے ہی گھر میں، زمین میں دفن کر کے رکھی تھی، اور اس کے ساتھ اس کی فرد کیفیت بھی اسی سینگ میں لکھ چھوڑی۔ چند دنوں بعد وہ مر گیا اور اس کا حال کسی کو نہ بتا گیا، چنانچہ یہ ہیرا اسی طرح دو سو برس تک زمین ہی میں پوشیدہ رہا، اور اس دو صدی کے امتداد نے اس کے مکان کو کہنہ و افتادہ کر کے ویران کر دیا، اور صرف کھنڈر ہی باقی رہا تھا۔ اتفاق سے کسی نے اس زمین کو خرید کر اس پر مکان بنانا شروع کیا، کھنڈر کی صفائی وغیرہ اور پایہ کھودنے کی وجہ سے اس مکان کی مٹی دوسری طرف منتقل ہوتی رہی، یہاں تک کہ اس زمین کا وہ دفن شدہ سینگ بھی جس میں کہ ہیرا چھپا تھا سارے خس و خاشاک کے ساتھ پھینک دیا گیا اس لئے کہ ایسی حقیر چیز کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی اور اس کے راز اور بھید سے کون واقف تھا۔

اس کے بہت دنوں بعد [illegible] میں اسی قصبہ کا ایک کمہار برتن بنانے کے لئے مٹی کی خاطر اس مقام پر پہنچا اور یہاں اس نے خاک میں دبی ہوئی ایک سینگ پائی صرف اس خیال سے کہ زمین کھودنے اور مٹی حاصل کرنے میں اس سے سہولت ہوگی اٹھا لی، جب اسے صاف کرنے لگا تو اس سینگ میں اس کو ایک خوبصورت مگر بے رونق پتھر نظر پڑا چونکہ وہ ایک گنوار تھا اس لئے اس نے اس "سنگ رنگین" کو کوئی اہمیت نہ دی۔ مٹی ساتھ لا دی اور اس پتھر کو بھی اپنے بچوں کے کھیلنے کے لئے رکھ لیا۔ چنانچہ گھر پہنچ کر اس نے اس پتھر کو اپنی لڑکی کے حوالہ کیا اور لڑکی اس کی رنگینی و دل آویزی کو دیکھ کر ہیرا لئے خوش خوش باہر نکلی، اپنے ساتھ کھیلنے والے بچوں کو جمع کیا اور ان بچوں نے دوڑ دوڑ کر سیتا پھل (شریفوں) کے بیج اکٹھے کئے۔ خود بیٹھی ترازو کے ایک پلڑے میں یہ رنگین پتھر رکھے بیجوں کو اس کا ہم سنگ کرتی، اور سارے بچوں میں انھیں تقسیم کرتی جاتی تھی۔

ان ہی دنوں سے چند روز پہلے، لڑکی کی ماں نے اپنے گاؤں کے ایک سنار سے، اس لڑکی کے لئے کسی زیور کے تیار کرنے کی فرمائش کی تھی، اتفاق سے وہ اسی دن چاندی لینے کے لئے اس کے گھر آیا، تو لڑکی کو گھر کے پہلو میں چند بچوں کے ساتھ بیٹھے

---

[۱] "الماس ٹن" نامی ایک اور ہیرا ہے، یہ ایک علاقہ کا نام ہے، جہاں کا ملکم راجہ ٹن کہلاتا ہے، چونکہ یہ الماس اسی کے قبضہ میں ہے، اسی لئے اس نام سے مشہور ہوا۔ یہ ہیرا بھی ناتراشیدہ بیضوی شکل کا ہے، جس کا وزن (۲۷۷) قیراط یعنی ½ ۱۲ ماشہ ہے، جوہریوں نے اس کی قیمت دو کروڑ سے زیادہ قرار دی ہے، تو اس لحاظ سے غور فرمائیے کہ "الماس نظام" کس قیمت کا ہوگا جو اس سے (۱۷۱) قیراط زیادہ وزنی ہے۔ "کوہ نور" جیسا مشہور ترین ہیرا تو غالباً بارہویں نمبر پر شمار ہوتا ہے، جس کا وزن ۱/۱۶ ۱۰۶ قیراط اور قیمت چودہ لاکھ ہے، صرف اس کو اس کی تاریخی حیثیت سے اتنی بڑی شہرت نصیب ہوئی۔ ورنہ اس کا قیمت و وزن کے لحاظ سے کوئی درجہ نہیں۔

س بے نظیر پتھر سے کھیلتے ہوئے پایا' اور اس نے اپنی واقفیت کی بنا پر اس پتھر کی حقیقت سمجھ لی کہ یہ ایک بے بدل آب دار ہیرا ہے' دوسرے دن جب کہ کمہار کے گھر کوئی نہ تھا سنار موقع پاکر اپنے ساتھ مٹھائی لے آیا' اور نہایت عاجزی کے ساتھ لڑکی کو سمجھا منا کر مٹھائی دی اور اس سے وہ پتھر مانگنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کچھ ضدی تھی۔ اس کی اس طلب پر برہم ہوگئی' اور غصہ میں فوراً بھاگ کر گھر دوڑی چلی آئی' اور کمرے میں جاکر ہیرے کو طاق میں رکھ دیا۔ جب ماں آئی تو سارا قصہ بیان کیا کہ فلاں سنار نے مجھے مٹھائی دی' اور اس پتھر کو بڑی عاجزی سے مانگنے لگا' لیکن میں نے اُسے نہ دیا' ماں نے یہ خیال کیا کہ وہ شاید چاندی تولنے کے لیے اس کو مانگ رہا تھا اس لیے اس نے اس پتھر کو ایک پوشیدہ مقام پر چھپا دیا۔ جب دوبارہ سنار آیا اور اس نے لڑکی سے وہ پتھر مانگا' تو ماں کو معلوم ہوگیا' اس نے سنار سے کہا معلوم نہیں کہ اس دیوانی بچی نے اُسے کہاں کھو دیا۔ سنار یہ سن کر بے قرار ہوگیا' اور کہنے لگا کہ "افسوس تونے یہ کیا کیا: اری وہ تو ہیرا تھا!! اگر تو مجھے دے دیتی تو میں تجھے تیرے منہ مانگے پیسے دیتا۔ جب لڑکی کا باپ آیا تو ماں نے یہ سارا قصہ اُسے کہہ سنایا' اس پتھر کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد کہ یہ ہیرا ہے شاید کمہار زرگر سے ملا' اور ان دونوں میں بعد تصفیہ یہ طے پایا کہ وہ اس معاملہ کو انتہائی پوشیدہ رکھیں گے' اور آپس میں نصف نصف تقسیم کرلیں گے' چنانچہ بہ بازار وقت ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اُسے توڑا' اور ہیرے کا وہ حصہ' جس کو سنار نے اپنے لیے پسند کیا تھا' اس کے دو تین ٹکڑے ہوگئے اور وہ حصہ جو کمہار کے لیے مختص تھا محفوظ رہا' اور یہی ٹکڑا وزن میں پختہ چھ تولے پانچ ماشے تھا۔ صاحب گلزار آصفیہ لکھتے ہیں کہ یہ اپنی تمام و کمال حالت میں گیارہ تولے تھا[1]

سنار اپنے حصے کے ٹکڑوں کو لے آیا' اور دوسرے سناروں کے ہاتھ ایک ایک کرکے فروخت کردیا۔ اس خرید و فروخت کی شہرت ہونے لگی' اور ہوتے ہوتے وہاں کے زمیندار تک بھی پہنچی' فوراً اس نے اس سنار کو گرفتار کر لیا' اور اس پر سختیاں کرکے اس ہیرے کی تحقیقات کی' واقعات کے معلوم ہونے پر اُن سب سناروں اور اُس کمہار کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان دنوں' اس علاقہ کی تعلقداری پر بھا راؤ نامی ایک شخص مامور تھا' اُس نے اس الماس کی ساری حقیقت مدار المہام وقت مہاراجہ چندو لال بہادر کو لکھ بھیجی۔ مہاراجہ نے محمد قمر الدین جمعدار مندوزی کو جو تعلقدار نلگنڈہ تھے بھا راؤ کے ہمراہ اس زمیندار کے پاس بھیج کر اُسے طلب کیا' زمیندار نے' نوبت و نقارہ اور دس ہزار کی جاگیر اپنے اور اپنی اولاد کے لیے بطور آل تمغہ' سرفراز ہونے کی شرط پر اس ہیرے کو مہاراجہ بہادر کے حوالے کردیا۔ راجہ صاحب نے حضور کی نظر اشرف میں گذرانا' اور اُسے حسب وعدہ اعلیٰ حضرت سے عرض کرکے جاگیر سے سرفراز کرایا۔ جوہریوں نے اس "نادر العصر" تحفہ کو دیکھ کر اور پرکھ کر' بالاتفاق عرض کی کہ یہ الماس عجائبات روزگار سے ایک لاقیمت چیز ہے' کسی ملک میں ہم نے ایسا نادر روزگار' اس قدر بڑا ہیرا دیکھا اور نہ سنا۔ اور ایسے جوہر نایاب کی قیمت لگانے سے ہم عاجز ہیں

ہند اور ولایت' ایران کے حکاکوں کو اس الماس کی تختیاں تراشنے کے لیے حکم ہوا تو ان لوگوں نے اس کی مزدوری پانچ لاکھ روپئے طلب کی اور کہا کہ ہم اس الماس سے سات عمدہ باریک اور شفاف تختیاں تراش کر گزرانیں گے کہ جب کے آگے "دریائے نور" اور "کوہ نور" بے رونق و بے آب نظر آنے لگیں گے۔ غالباً حضور نے اجرت کی زیادتی کی وجہ سے منظور نہیں فرمایا' یہ جس حالت میں دست یاب ہوا تھا' اسی طرح جواہر خانہ میں محفوظ کرلیا گیا[1]

---

[1] گلزار آصفیہ صفحہ ۶۰۰ مؤلفہ حکیم غلام حسین خاں مطبوعہ مطبع محمدی ۱۳۰۸ھ

"تاریخ ریاست حیدرآباد دکن" کے مصنف نجم الغنی خاں رامپوری نے بھی تاریخ کے صفحہ ۱۹ پر اس ہیرے کے
تراشے کی بابت پچاس ہزار ہی بتائی ہے مگر وزن تاریخ میں درج نہیں ہوئی۔[1]

"آئینہ جواہر" کا مؤلف لکھتا ہے کہ اس ہیرے کا شمار دنیا کے بڑے بڑے ہیروں میں ہے اور نظام حیدرآباد کے پاس
رہنے کی وجہ سے الماس نظام سے مشہور ہوا ہے۔ اس کا وزن ۳۴۰ قیراط یعنی ایک سو ۳۴۰ ماشہ ہے۔[2] یہ کان گولکنڈہ سے برآمد
ہوا تھا اور ۱۸۳۵ء میں ایک شخص کے پاس بطور کھلونے کے تھا۔ یہ اور روایت یہ نقل کی ہے کہ کسی سوار نے اسے ایک مٹی کے
برتن میں پایا تھا۔ جو بعد کو ایک ہندو زرگر کے ہاتھ لگا اور اس نے اس کی آزمائش کے لئے کہ یہ ٹوٹ سکتا ہے یا نہیں اس پر ضرب
لگائی جس کی وجہ سے اس کے تین ٹکڑے ہو گئے۔ اس کی شکل ایک چینی عورت کے پاؤں کی طرح ہے جس کا انگوٹھا نہ ہو۔[3]

کنگ صاحب (Mr King) نے بھی اس کی شکل و شباہت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ناتراشیدہ الماس اسی شکل کا
ہے اس کے تاریخی حالات لکھنے میں انھوں نے بھی سخت غلطی کی ہے اور ہمارے نزدیک ان کے بیشتر اور ماہرین کے بیانات بھی قابل اعتبار
نہیں وہ کہتے ہیں کہ کسی حادثہ سے ہندوستان کے غدر میں اس سے ایک ٹکڑا علیحدہ ہو گیا اور اس کا وزن (۳۴۰) قیراط ہے۔ بعض نے
یہ شک ظاہر کیا ہے کہ کنگ صاحب نے اس کی کوئی صراحت نہیں کی کہ یہ وزن اس الماس کے ٹوٹنے سے قبل کا ہے یا بعد کا؟ ایک اور
انگریز ڈیولے فیٹ (Dieula Fait) کا بیان ہے کہ اس کا وزن اس کے ٹوٹنے سے پیشتر ۴۴۰ قیراط سے کم نہ تھا۔
مبصرین کے نزدیک صاحب گلزار آصفیہ کے سے معتبر مورخ کے آگے ان لوگوں کے گمانوں اور مختلف بیانوں کی کوئی وقعت نہیں اس لئے کہ
انھوں نے وزن کی تعیین صاف طور پر کردی ہے۔ ... ایک ماہر نے اس فرضی وزن کی بنا پر اس کی قیمت دو لاکھ ... لکھی ہے
جو بیس لاکھ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

"آئینہ جواہر" کا مؤلف امرناتھ لکھتا ہے کہ اس ناتراشیدہ الماس کی قیمت ٹھیک ٹھیک نہیں ہی جا سکتی۔ کیونکہ کاٹنے کی وجہ سے
ناتراشیدہ الماس اکثر وزن میں کم ہو جایا کرتے ہیں۔ لیکن ناتراشیدہ حالت میں اس الماس نظام کی شکل چنداں بے ڈھب بھی
نہیں۔ البتہ کٹوانے میں نصف سے زیادہ کے نقصان کا احتمال نہ ہوگا۔ حاصل یہ الماس نظام حیدرآباد کے جانشینوں کے پاس منتقل کیا جاتا ہے۔[4]

---

[1] تاریخ ریاست حیدرآباد دکن مطبوعہ نولکشور پریس سنہ ۱۹۳۰ء۔

[2] صاحب گلزار آصفیہ نے جو وزن چھ تولے پانچ ماشہ لکھا ہے اس کے (...) ماشے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ وزن غلط اور ناقابل تسلیم ہے اور مؤلف موصوف
ہی بیان بہت زیادہ قابل اعتبار ہے۔ ۱۲

[3] "آئینہ جواہر" کے مؤلف نے غالباً یہ قصہ انگریزی کتابوں سے لیا ہے ... نے بالکل اسی طرح روایت ... اپنی کتابوں میں قلمبند کر لیا گویا قصہ
ان لوگوں نے غلط لکھا ہے۔ مگر گلزار آصفیہ کے ہی واقعہ کی الٹ پھیر ہے اور ان غلط قصوں ہی سے صاحب گلزار آصفیہ کی تحقیقات اور سچائی کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے
جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہے۔ کمہار کے بجائے مٹی کے برتن کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاید مؤلف طرز بیان کا قاعدہ ... نہیں لے رہے ہیں۔ سوار کا اس ہیرے کو
پانا بالکل غلط ہے۔ البتہ ایک ہندو زرگر اور اس کے تین ٹکڑے ہونا صحیح ہے۔

[4] آئینہ جواہر مصنفہ پنڈت امرناتھ، حاشیہ صفحہ ۱۴ مطبوعہ ... پریس ... سنہ ۱۹۱۰ء

[5] ... صفحہ ۱۰

رہبر فاروقی

تاش کا منڈپ باندھا جاتا ہے۔ منڈپ باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو مثل ہے بیل منڈوے چڑھے تو گویا منڈپ تو منڈوہ ہے اور بیل آل اولاد کی جو آگے چڑھے گی۔ غریبوں میں تو اب تک لکڑیوں کو ٹکا کر سبز سبز پتوں سے منڈپ باندھا جاتا ہے۔ مگر امیروں اور صاحب استطاعت لوگوں نے منڈوے سے منڈپ اس طرح بنا لیا ہے۔ اسی منڈپ کے نیچے ایک لال رنگ کی پاؤں گھڑی یعنی پا انداز بچھاتے ہیں تاکہ سمدھنیں منڈپ کے نیچے اور اس پاؤں گوڑی پر سے چلتی ہوئیں دالان میں داخل ہو سکیں۔ منڈپ کے نیچے دلہن کی کوئی ایک ان بیاہی رشتہ دار لڑکی چاندی کی کٹوری میں صندل لے کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اور جب سمدھنیں آنا شروع ہوتی ہیں تو ہر سمدھن کو "صندل ہاتھ" دیا جاتا ہے۔ صندل ہاتھ دینے کا طریقہ یہ ہے کہ صندل کی کٹوری میں چار انگلیاں ڈبو کر ہر سمدھن سے اس طرح ہاتھ ملایا جائے کہ اس کے ہاتھ میں ہی صندل لگ جائے کہ یہ نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ انہی آنے والی سمدھنوں میں اگر کوئی سمدھن "امید" سے ہوں تو وہ منڈپ کے نیچے نہیں آ سکتیں اور نہ ان کا گود بھرا جاتا ہے وجہ یہ ہے کہ قدرتاً تو ان کا گود بھرا جانے والا ہے۔ اب اگر گود بھرا جائے گا تو وہم یہ ہے کہ بچہ ضائع ہو جائے گا۔ اور گود خالی ہو جائے گا۔ اسی طرح چونکہ منڈپ میں بھی گود ڈالا جاتا ہے اس لئے یہ اس کے نیچے بھی نہیں جا سکتی۔ منڈپ میں گود اس لئے ڈالتے ہیں کہ منڈپ ایک ایسا منڈوہ ہے جس پر آل اولاد کی بیل چڑھتی ہے۔ گود میں پان شریک ہوتے ہیں اور پان کی بیل ہوتی ہے اس لئے ابتدا ہی سے گویا منڈپ میں گود ڈال کر بیل چڑھا دی جاتی ہے۔ تاکہ آئندہ آل اولاد کی بیل ہمیشہ ہری بھری اور چڑھتی ہی رہے۔

منڈپ کے قریب ہی ایک طرف میراثنیوں کا طائفہ بیٹھا ہوا گاتا رہتا ہے۔ ان لوگوں کے گانے بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ ہر موقعہ اور رسم کے لحاظ سے یہ لوگ مخصوص گانے گاتے جاتے ہیں۔ ان کے گانے اپنے اپنے وقت پر درج ہوں گے۔ چنانچہ جس وقت سمدھنیں آتی ہیں تو میراثنیں یہ مخصوص گانا گاتی ہیں۔

ماجن آئی رے اللہ پیر منائی رے

ہیری سماجن آئی رے

جب سمدھنیں دالان میں گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتی ہیں تو انھیں "مصری چنائی" جاتی ہے۔ دو مامائیں سمدھنوں کے سر پر ایک تاش کا مسالا ٹکا ہوا دوپٹہ پکڑ لیتی ہیں اور دلہن کی ایک سہاگن رشتہ دار بیوی چاندی کی طشتری میں مصری کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں جن پر چاندی سونے کا ورق لگا ہوا ہوتا ہے لاتی ہیں اور ہر سمدھن کے آگے باری باری سے پیش کرتی ہیں۔ ہر سمدھن ایسے موقعہ پر شرم اور جھینپ کا اظہار ضرور کرتی ہے اب خواہ یہ نظر آتا ہو یا رسماً بہر حال رسم کی پابندی انھیں ضرور کرنی پڑتی ہے۔ نو لڑکیاں جو نا کتخدا ہیں مصری لینا تو کجا آنکھ تک ادھر نہیں اٹھاتیں۔ مگر مصری لانے والی بیوی جبر و قہر اور زور و زبردستی کے ساتھ ان کے منہ میں مصری ٹھونس ہی دیتی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ فقرے بھی کستی جاتی ہیں جس سے وہ بیچاری تو مارے شرم کے عرق عرق ہوتی جاتی ہے اور ادھر خوب فرمائشی قہقہے اڑتے ہیں۔ مصری چنائی جاتے وقت میراثنیاں گاتی ہیں

سمدھن میری مصری کھاوے

اس کے بعد گانا شروع ہوتا ہے۔ ٹھمری۔ دادرا غزل وغیرہ جب میراثنیں گا چکتی ہیں تو دلہن کو لانے کی جلدی شروع کی جاتی ہے۔ ادھر تو جلدی ہوتی ہے اور ادھر دلہن کو سنوارا جاتا ہے۔ دلہن بیچاری کا شروع شادی سے اخیر شادی تک

نے اوپر کوئی اختیار نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ اپنی آنکھوں کو بند رکھے باقی جملہ کام اوپر والے جو چاہتے ہیں کر دیتے ہیں۔

دلہن کو کسی ایک قسم کا قیمتی جوڑا کپڑوں کا پہنایا جاتا ہے اور وہ زیور بھی جو دلہن کو جہیز میں دیا جانے والا ہے۔ پہنا دیتے ہیں آنکھوں پر "آرائش" لگاتے ہیں۔ جنی باریک کٹے ہوئے منقیش سے افشاں چنا جاتا ہے سرمہ لگایا جاتا ہے۔ اور ایک لمبا سا گھونگٹ کھینچ کر کوئی ماما۔ انا۔ دوا یا چھوکری دلہن کو گود میں اٹھا کر باہر اس زردوزی مسند پر لا بٹھاتی ہے جو دالان میں منڈپ کے نیچے اسی رسم کے لئے بچھائی جاتی ہے۔ ایک مخصوص گیت ہوتا ہے جو ایسے وقت میں میراثنیاں نہایت جوش میں گاتی رہتی ہیں۔ اس وقت کا سماں قابل دید اور اس وقت لوگوں کے جذبات دیکھنے کی چیز ہیں سب سمدھنیں خاموش دلہن کے کمرے کی طرف نگاہیں لگائے سراپا انتظار اور مجسم اشتیاق بنی بیٹھی ہوتی ہیں۔ جیسے ہی دلہن نظر آتی ہے۔ میراثنیوں کا جوش اور بڑھ جاتا ہے۔ سمدھنوں کے چہرے پھول کی طرح کھل جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ تبسم۔ ہنسی سے بدل جاتا ہے۔

آئی بنو آئی - ہریالی بنو آئی
اماں کی پیاری بنو آئی باوا کی پیاری بنو آئی
آئی بنو آئی

کا گیت سمدھنوں میں ایک عجیب جوش و خروش پیدا کر دیتا ہے نوبت نوازی شروع ہو جاتی ہے اور اب رسم شروع ہوتا ہے رسم دولہا کی سہاگن پھوپی یا بہن کو کرنا پڑتا ہے۔ دولہا کی والدہ ان سے نہایت عجز و انکسار اور منت کے ساتھ کہتی ہیں آپ بزرگ ہیں۔ اگر آپ کے ہاتھ سے یہ نکاح ہو جائے تو میری خوش نصیبی ہے۔ خدا آپ کی چھاؤں (سایہ) دلہن پر بھی ڈالے اور وہ دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ اگر دولہا کے رشتہ داروں میں سے کوئی بزرگ نہ ہو اور خود دولہا کی ماں سہاگن ہوں تو رسم کرنے بیٹھتی ہیں۔ رسم کرنے کے لئے سہاگن کا ہونا ضروری ہے۔

کشتیاں اور چنگیر جو دولہا کے گھر سے آتے ہیں وہ مسند کے قریب رکھ دئے جاتے ہیں۔ رسم کرنے والی بیوی پہلے اپنے گلے کو صندل لگاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ خود سہاگن ہیں اور پھر وہ سہاگن جن کا سہاگ بہت قدیم ہے مطلب یہ کہ ان کی طرح دلہن کا بھی سہاگ تا دیر قائم رہے۔ اپنے گلے کو صندل لگا لینے کے بعد دلہن کے گلے۔ سینہ اور پیٹھ پر صندل لگا کر سات۔ نو یا گیارہ سہاگنوں کو بھی بہ ترتیب متذکرہ صندل لگایا جاتا ہے۔ اگر دلہن کمسن ہو تو پھر دلہن کو صندل لگانے کے بعد علاوہ سہاگنوں کے ان بیاہی لڑکیوں کو بھی صندل لگایا جاتا ہے تاکہ ان کی شادی بھی جلدی ہو جائے۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ رسم ہوتے وقت اگر کوئی چھینک دے تو رسم تھوڑی دیر کے لئے روک دیا جاتا ہے۔ حالانکہ چھینکنے کے بعد مسلمان الحمد للہ کلمہ شکر ادا کرتے ہیں۔ تاہم اس کو کسی کام کی ابتدا میں منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح باہر نکلتے وقت کوئی چھینک دے یا کوئی سامنے آ جائے یا ٹھوکر لگ جائے تو تھوڑی دیر کے لئے باہر جانا موقوف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ناکامیابی کی علامت ہے بجائے اس کے اگر کوئی مہتر یا کوئی شخص "دہی" لے کر سامنے آ جائے تو کامیابی یقینی سمجھی جاتی ہے۔

صندل لگاتے وقت میراثنیں گاتی ہیں۔

صندل لگاؤ ہریالی بنو کو۔ راج دلاری بنو کو

صندل لگا چکنے کے بعد گود بھرے جاتے ہیں۔ پہلے رسم کرنے والی بیوی اپنا گود بھر لیتی ہیں۔ اس کے بعد دلہن کا گود چاندی کی سپیاری اور چاندی کے لڈو سے حسب مقدور روپیہ رکھ کر بھرا جاتا ہے۔ دلہن کے قریب دلہن کی ایک رشتہ دار سہاگن بیٹھتی ہیں۔ شرم کی وجہ سے دلہن جھکی ہوئی بیٹھتی ہے۔ اس لئے یہ بیوی دلہن کا سر بھی تھامے ہوئے رہتی ہیں اور موقعہ بموقعہ دلہن کو امداد بھی دیتی جاتی ہیں۔ چنانچہ جس وقت دلہن کا گود بھرا جاتا ہے تو یہ بیوی ایک ریشمی رومال دلہن کے گود میں بچھا کر گود حاصل کر لیتی ہیں۔ دلہن کا گود بھرنے کے بعد منڈپ میں بھی ایک گود ڈالا جاتا ہے اور پھر سات تو۔ یا گیارہ سہاگنوں کے گود بھرے جاتے ہیں۔ گود بھرتے وقت میراثنیاں یہ مخصوص گیت گاتی ہیں۔

ہریالی کا گود بھراؤ ۔ پیا کے کارن۔ راج دلاری کے گود بھراؤ

سب مل کر گود بھراؤ ۔ سہاگنوں کا گود بھراؤ پیا کے کارن

گود بھراؤ مانگ لگاؤ ۔ موتیوں کے چوک پراؤ پیا کے کارن

گود بھرائی ہو چکنے کے بعد دلہن کا منہ میٹھا کیا جاتا ہے۔ رسم کرنے والی بیوی مصری دلہن کے منہ کے پاس لے جاتی ہیں اور وہ بیوی جو دلہن کے قریب بغرض امداد بیٹھتی ہیں ہاتھ بڑھا کر مصری لے لیتی ہیں۔ اس کے بعد "چوبا" کھلایا جاتا ہے۔ مصری کھلاتے وقت کا مخصوص گیت یہ ہے۔

مصری کھاوے بنو میری۔ یہ سہاگن کے ہاتھ سے کھاوے

یہ بچہ والی کھلاوے ۔ بنو میری مصری کھاوے

چوبا کھلاتے وقت بجائے مصری کے چوبا کھاوے گاتے ہیں۔ بقیہ گانا یہی ہوتا ہے۔ چوبا کھلانے کے بعد دلہن کو پان کھلایا جاتا ہے۔ پان پر سونے چاندی کے ورق لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس وقت کا مخصوص گیت یہ ہے۔

بنڈری کو پان کھلاؤ ری البیلی سہاگن

پان کھلا کر پھولوں کا گہنا اور ہار پہنائے جاتے ہیں۔ اس وقت یہ مخصوص گیت گایا جاتا ہے۔

ہار وری ماں یہ لال بنو کے گلے

اماں پیاری کے گلے ۔ باوا پیاری کے گلے

جائی۔ جوئی اور بیلا چنبیلی۔ اچھے گلابوں کے ہار

یہ چاند بنو کے گلے۔ ہار وری ماں یہ لال بنو کے گلے

یہ جملہ رسوم گویا تمہید تھے اصل پاؤں ناپنے کی رسم کے۔ کیونکہ جب تک یہ سارے رسوم نہ ہوں کوئی رسم ہی نہیں کہلاتا۔ بہرحال یہ سب مراحل طے ہو جانے کے بعد وہ موتیوں کے لڑ جو ساتھ لائی گئی ہے۔ رسم کرنے والی بیوی نکالتی ہیں اور ادھر سے دلہن کے پاس بیٹھی ہوئی دلہن کی رشتہ دار سہاگن دلہن کا سیدھا پاؤں آگے بڑھا دیتی ہیں اور اس "لڑ" سے پاؤں ناپ لیا جاتا ہے۔ یہ لڑ جس سے پاؤں ناپا گیا ہے جلوہ کے روز دلہن کی نتھ میں ڈالی جاتی ہے۔

اس کے بعد "رونمائی" ہوتی ہے اور جو روپیہ، اشرفیاں یا زیور لایا گیا ہے وہ اس طرح دلہن کو "سلامی" میں

دیا جاتا ہے کہ دلہن کے قریب بیٹھی ہوئی بی بی دلہن کے دونوں ہاتھ آگے پھیلا دیتی ہیں اور رسم کرنے والی بیوی "سلامی" دلہن کے ہاتھوں میں ڈال دیتی ہیں اور ساتھ ہی دلہن کے سر سے چٹ چٹ بلائیں لے رہی ہیں اس کے بعد "وارن پھیرن" شروع ہوتا ہے۔ ایک میراثن دلہن کے قریب آکر کھڑی ہو جاتی ہے تاکہ "وارن پھیرن" کے روپے حاصل کرے کیونکہ یہ حق میراثن ہی کا ہوتا ہے اس طرح اسے بھی سو سوا سو روپے مل جاتے ہیں۔ بہرحال ایک ایک سمدھن آتی جاتی ہیں دلہن کا منہ دیکھتی ہیں اور حسب مقدور روپیہ وار کر میراثن کو دیتی جاتی ہیں۔ بقیہ میراثنیاں یہ مبارک بادی گاتی رہتی ہیں جس کے بعد یہ رسم ہو جاتا ہے اور دلہن کمرہ میں پہونچائی جاتی ہے۔

تمھیں یہ شادیاں جم جم مبارک ہو مبارک ہو
مچی ہے دھوم شادی کی مبارک خانہ آبادی
وہ شہزادہ یہ شہزادی مبارک ہو مبارک ہو

تقی عابدی

کوہِ نور

(گولکنڈہ کا مشہور ہیرا جو اب شہنشاہ انگلستان کے تاج کی زینت ہے۔)

بحرِ ظلمات میں ڈوبا ہوا تارا تھا کوئی
راکھ کے ڈھیر میں خوابیدہ شرارا تھا کوئی

پردۂ خاک سے سورج کی کرن نکلی ہے
جلوہ بر دوش تمنائے دکن نکلی ہے

کسی معشوق جواں سال کا نمکیں لب
زر پرستوں کے لئے شمع سرِ محفل ہے

سنگ کی شکل میں اک نور نظر آتا ہے
پرتوِ جلوہ گہہ طور نظر آتا ہے

شعلۂ حسن ہے یہ جلوۂ نیرنگ ہے یہ
رونق تاج ہے یہ زینت اورنگ ہے یہ

جوہری دیکھ کے کہتا ہے کہ "لاقیمت ہے"
جس کی قسمت میں یہ آجائے وہ خوش قسمت ہے

ذرہ کہتا ہے کہ "یہ کیا ہے تماشا یارب؟
مہر تابندہ سے بڑھ کر ہے یہ ذرہ یارب؟
کس سے لوں نور کہ اب میری نظر ششدر ہے
چرخ پر مہر ہے اور فرش پہ یہ پتھر ہے
ایک ہے دور بہت ایک ہے آنکھوں سے قریب
کس کو سجدہ کرے حیران ہے یہ تیرا غریب"

میکش

سمستان جٹپول

ہماری سلطنت آصفیہ کے زیر اقتدار بہ عنایت الٰہی ایسے متعدد علاقے ہیں جو اپنی وسعت اور آمدنی کے اعتبار سے ہندوستان کے ان اسٹیٹوں سے بڑھے ہوئے ہیں جن کے حکمران ہز ہائینس کے خطابات ممتاز اور توپوں کی سلامی کا اعزاز رکھتے ہیں بلکہ ان میں کے بعض تو یورپ کی چھوٹی چھوٹی خود مختار سلطنتوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ایسے تمام علاقوں کے والی (نواب یا راجہ) کی جانشینی و علیحدگی، بابت وراثت، عطائے اختیارات عدالتی و کوتوالی، اعلیٰ عہدہ داران اسٹیٹ کا تقرر و تنزل کلیتہً حکومت عالیہ آصفیہ نظامیہ کی منظوری کا تابع ہے۔ انہی علاقوں میں سے ایک سمستان جٹ پول ہے جس کا رقبہ ۴۹۵٫۵۰ مربع میل (دو لاکھ ۔۔۔ ایکڑ) اور جس کی مردم شماری ۵۰٬۸۰۹ ہے۔

جٹ پول کا صحیح تلفظ جیٹ پیرول ہے۔ جٹایو ایک پرندہ کا نام ہے اور پرول کے معنی شہر کے ہیں۔ وجہ تسمیہ اس کی یہ ہے کہ جب راون، رام چندر جی کی باعصمت بیوی کو ان کے بن باس کے زمانہ میں اڑائے جا رہا تھا تو یہ پرندہ اس مقام پر راون کا سدراہ ہوا۔ راون کو چونکہ نشۂ حکومت میں سرشار تھا۔ جٹایو کی یہ مزاحمت غضب آلود کردی اور اس نے اس پرندکو مار ڈالا یا کم از کم یہ کہ اس کو زخمی کردیا اور اس کا بازو اسی مقام پر گر گیا جس کی یادگار میں جٹیشور نام کی ایک دیول تعمیر کی گئی جو آج تک موجود ہے اور یہاں ایک شہر جٹ پرول نام کا بسا جو اب ایک معمولی سا قریہ رہ گیا ہے۔ بعد میں یہ علاقہ بھی اسی نام سے موسوم ہوگیا۔

سنسکرت میں سنوستھان راجہ کے رہنے کی جگہ کو کہتے ہیں کثرت استعمال سے واؤ اور ھ حذف ہوگئے اور نون میم سے بدل کر سمستان ہوگیا اور اس سے مراد ایسا علاقہ عطیہ شاہی قرار پایا جس میں ملک کا ایک حصہ ایک رقم معینہ کے ٹھیرا ؤ سے کسی کو عطا کیا گیا ہو اس رقم معینہ کو اعزازاً پیش کش کہتے ہیں۔ اس طرح ان دونوں الفاظ کی ترکیبات سے اب یہ علاقہ سمستان جٹ پول کہلاتا ہے۔ مگر سمستان کا مستقر اب جٹ پول نہیں بلکہ کولاپور ہے جو حیدرآباد سے ۱۲۰ میل جانب جنوب ضلع محبوب نگر میں ہے حیدرآباد سے براہ جڑچرلہ و کتہ کوٹہ یا پرال تک ۱۰۰ میل کی سیدھی سڑک تعمیرات کی طرف سے ہے۔ اس کے بعد ۲۰ میل کا راستہ علاقہ سمستان جٹ پول کا ہے جو دریائے کرشنا کے متوازی کولاپور تک چلا گیا ہے۔

یہاں کے راجہ ریچرلہ گوترم سے سرجی خاندان کے اراکین ہیں جو جنوبی ہند کا ایک بڑا معزز اور قدیم خاندان ہے۔ اس خاندان کے دیگر اراکین علاقہ مدراس میں بوبلی، وینکٹ گری، پنتھاپور، میلارم کے راجہ ہیں آخری والی سمستان جٹ پول راجہ وینکٹ لچھما راؤ یہاں کے تائیویں راجہ تھے ان کا اصلی نام کرشنا چندریا ہے راجہ وینکٹ جگناتھ راؤ نے انھیں ۱۸۷۰ء میں متبنیٰ لیا اور وینکٹ لچھما راؤ نام رکھا بعد میں اعلیٰ حضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہٗ نے نظام نواز ونت کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

مستقر سمستان کولاپور جس کی مردم شماری ۲۱۵۸ ہے دریائے کرشنا کے شمال میں ۲ میل پر ایک وسیع میدان

یہ سطح سمندر سے ۱۴۵۹ فٹ مرتفع مقام پر آباد ہے اس کی جدید آبادی راجہ کے شاندار اور خوبصورت اسم باسمی چندر محل کے اطراف سلیقے سے بسائی گئی ہے اس چھوٹی سی مگر خوشنما آبادی میں صاف و شفاف پانی ایک باؤلی پر پمپ لگا کر نل کے ذریعہ پہونچایا جاتا ہے اور بجلی کی روشنی بھی ہوتی ہے سڑکیں اگرچہ مورم کی ہیں مگر صاف ہیں شہر سے عوام کے مکانات گو چھوٹے چھوٹے ہیں لیکن باہر سے خوش وضع معلوم ہوتے ہیں کہ اجازت تعمیر مکان دیتے ہوئے باہر کے ایلویشن کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

راجہ صاحب کے عالی شان چندر محل کے علاوہ یہاں ایک بڑا دو منزلہ گسٹ ہوس ہے ایک پختہ شفاخانہ ہے ڈاکٹر خانہ کی پختہ تعمیر ہے مدرسہ وسطانیہ ہے اسٹیٹ کے دفاتر کی عمدہ پکی عمارت ہے یہ سب جدید ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ وینکٹ لچھما راؤ المخاطب بہ ظام نواز ونت بہادر آنجہانی جو ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۲ء تک یہاں کے راجہ رہے پسند اور تزئین آبادی کے شائق تھے اور مولوی محمد علی صاحب اعلیٰ عہدہ دار اسٹیٹ کا تجربہ سلیقہ و تمیز جو انہوں نے سرکار عالی کی ملازمت میں عہدہ داران سرکار عالی سے حاصل کیا اسٹیٹ کے لیے بڑا مفید رہا صاحب موصوف ۱۹۲۱ء سے یہاں کارندہ ہیں اور تحصیلداری بندوبست کرتے ہوئے اسٹیٹ کی سب سے بڑی خدمت پر اس وقت مامور اور جس طرح والی اسٹیٹ کی نظروں میں باوقعت ہیں اسی طرح عوام میں ہر دل عزیز ہیں۔

سمستان کے ۴۶ مواضع اور ۲۸ مزرعے ہیں جو باستثناء ایک موضع چیلیال کے باقی سب ایک ہی سلسلہ میں واقع ہیں البتہ شمال میں سمستان ونپرتی اور گوپال پیٹھ یا زبردست خاں کی جاگیر کے ۲۰۴ مواضع اس علاقہ میں آگئے ہیں اس سمستان کے مغرب میں تعلقہ عالم پور ضلع رائچور اور علاقہ سمستان ونپرتی ہے اور ونپرتی ہی جیسا ہی علاقہ کا سمستان ہے مشرق میں دریائے کرشنا اور سرحد تعلقہ امرآباد ضلع محبوب نگر جنوب میں دریائے کرشنا اور شمال میں تعلقہ ناگر کرنول ضلع محبوب نگر ہے۔ سمستان کی سالانہ آمدنی پانچ لاکھ ہے جس کے منجملہ کوئی ۔۔۔ ہزار طبابت تعلیمات آبرسانی المکس سڑک کی ترمیم اور نگہداشت اور خیرات مبرات میں خرچ کیے جاتے ہیں۔ بمقابلہ آمدنی ان مدات میں زائد یا صرف ۶ فیصد مصارف یقیناً ناکافی ہیں ۔۔۔ بجٹ میں بھی تعلیمات کا حصہ کل موضع ۔۔۔ اور طبابت کا ۔۔۔ ہے جو بہت ہی کم ہے لیکن یہ اطمینان بخش ہے کہ اسٹیٹ بہرحال ترقی کے لئے کوشاں ہے چنانچہ حال میں ۔۔۔ کے صرفہ سے ڈاکٹر خانہ کی عمارت بنائی گئی ہے مدرسہ وسطانیہ کی تعمیر میں ۔۔۔ ہزار صرف کیے گئے تزئین آبادی کے مساعی بھی حال کی پیداوار ہے بجلی روشنی اور نل کے ذریعہ آبرسانی بھی یہاں جدید چیزیں ہیں۔

کولاپور کے مغرب میں آبادی سے کچھ ذرا سا ہٹا ہوا ایک وسیع ہموار میدان ہے یہ گویا یہاں کا وسیع میدان ہے جو پولو کرکٹ اور اسپورٹس کے کام آتا ہے۔ راجہ صاحب آنجہانی کے داماد اور فرزند کو ایسے مردانہ کھیلوں کا شوق رہا ہے۔ اس میدان کے کنارے ایک دو منزلہ بنگلہ ہے جو بالعموم گسٹ ہوس اور دسہرہ وغیرہ کے موقع پر پویلین کا کام دیتا ہے اس بنگلہ سے سامنے کا یہ وسیع میدان اور سرسبز جنگل اور پہاڑ پر لطف منظر ہے۔

۔۔۔ کے مشرق میں اسٹیٹ کا ایک باغ میوہ اور پھولوں سے لدا ہوا ہے جس کے بیچوں بیچ سندر محل اسم بامسمیٰ ۔۔۔

اس کی تعمیر ۱۳۱۷ف میں ہوئی۔ ڈاکٹر خانہ کی پختہ عمارت جس کی بنا مسز گرانٹن ابیہ صدر المہام و معتمد مال حکومت سرکار عالی نے ۹ اردی بہشت ۱۳۳۵ف کو رکھی اور جس کا افتتاح ۴ شہریور ۱۳۳۷ف کو ہوا ضرورت مقامی کے لئے ایک مکمل عمارت ہے اس کا نقشہ ناظم صاحب طبابت سرکار عالی نے دیا تھا۔ اس عمارت میں زنانہ اور مردانہ مریضوں کے لئے علحدہ علحدہ وارڈ ہیں۔ ادویات اور آلات جراحی کا کافی ذخیرہ ہے سند یافتہ ڈاکٹر مامور ہیں اور خوبی کی یہ بات ہے کہ دواؤں کا موازنہ جو عوام کے لئے ہے محل کی ضروریات سے متاثر نہیں ہونے پاتا بلکہ ڈیوڑھی کے ادویہ کا خرچ محل ہی کے موازنہ سے پورا ہوتا ہے۔

راجہ صاحب کے محل کے شمالی و مشرقی گوشہ پر دو ہاتھیوں کا تھان ہے جو بڑا شاندار ہے صدر دروازہ پر رسالہ کے باڈی سپاہی کا ہاتھ میں برچھا لئے پہرہ دینا۔ اس دروازے کے مقابل ہی خوبصورت برجی میں برنجی گھڑیال دروازہ کے منزل بالا پر نوبت و نقارہ مشرقی امرا کے شان کا ایک پر رعب و پر جلال منظر ہے اس صدر دروازہ سے داخل ہونے پر سیدھے طرف ایک مختصر سے چمن کے وسط میں سری راجہ وینکٹ لچھما راؤ نظام نواز ونت بہادر کا تپلا (اسٹیچو) ہے جس کے پائین کتبہ لگا ہے جس سے واضح ہے کہ ان کی تاریخ پیدایش ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء اور تاریخ وفات ۵ اپریل ۱۹۲۰ء م ۱۱۔ خورداد ۱۳۲۹ف ہے۔ حکومت سرکار عالی کی منظوری کے بعد یہ ۶ مارچ ۱۸۸۷ء (مطابق ۴ فروردی ۱۲۹۶ف) کو اس علاقہ کے راجہ ہوئے۔

جو حالات سنے گئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آنجہانی راجہ بڑے شکاری تھے۔ ۳۹ شیر دو بونچے اور ۲۹ ریچھ مارے ہیں۔ شکار اور شکاریوں کی تاریخ میں یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ ۶ ستمبر ۱۹۲۲ء کو راجہ صاحب نے سوا گھنٹہ کے اندر ۵ شیر مارے۔ ان میں جہاں سپاہیانہ جوہر نظر آتے ہیں۔ وہیں انتظامی قابلیت بھی عیاں ہوتی ہے۔ اسٹیٹ کی موجودہ ترقیاں انہی کے عہد سے شروع ہوئی ہیں اب انہی کی رانی صاحبہ سری وینکٹ رتنما جو ویل واڑہ تعلقہ سرسلہ ضلع کریم نگر کے دیسائی کی صاحبزادی ہیں اسٹیٹ کے کاموں کی نگران ہیں اور باوجودیکہ گوشہ کی سخت پابند ہیں حتیٰ کہ ان کے اعلیٰ عہدہ دار بھی انھیں بے پردہ نہیں دیکھ سکے پھر بھی اسٹیٹ کا انتظام خوبی سے کرتی ہیں۔

کیا میں اس موقع پر کہہ سکتا ہوں کہ گوشہ اور پردہ کو جو تجدد پسند ترقی و انتظام دنیوی میں ہارج سمجھتے ہیں وہ اس صاحب جائداد پردہ نشین ہندو رانی کے عمل کو دیکھیں۔ میں نے محترمہ بیگم صاحبہ سر بلند جنگ کا ایک مضمون کسی اخبار میں چند دن قبل پڑھا تھا جس میں موصوفہ نے بعض بڑے گھرانوں کی بیگمات کے نام گنائے تھے کہ وہ باوجود پردے میں رہنے کے کامیابی کے ساتھ اپنے وسیع علاقہ کا انتظام کرتی ہیں ان مثالوں میں رانی سر بھی وینکٹ رتنما صاحبہ کے نام کا اضافہ کر لینا چاہیے۔

ہم راجہ صاحب کے محل کا ذکر کر رہے تھے جس کے صدر دروازے سے داخل ہونے کے بعد آنجہانی راجہ صاحب کے اسٹیچو (پتلے) کے سلسلے میں ان کے اور ان کی رانی صاحبہ کے کچھ حالات لکھدیئے اس محل کو جو چندر محل سے موسوم ہے ۱۸۷۱ء میں راجہ وینکٹ جگناتھ راؤ نے بنوایا۔ یہ ایک قدیم وضع کی عمارت بڑے بڑے نیل پایوں پر ہے اس کی دیواریں کسی قلعہ کی فصیل معلوم ہوتی ہیں اسی محل پر راجہ وینکٹ لچھما راؤ نے ایک اور منزل ۱۲۹۹ف میں بڑھائی اور ۱۳۲۵ف میں اسی کے عقب دیپا محل کے نام سے زنانی حصہ تعمیر کرایا۔

بہت بڑے کمپونڈ میں بلند و بالا عمارات کا تسلسل بیسیوں دریچے اور دروازے متعدد برآمدے اور شاہ نشین سے

مکین کی شوکت و حشمت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس احاطہ میں آنے کے بعد یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ ہم تین ہزار کی مردم شماری والے قصبہ میں ہیں بلکہ گمان ہوتا ہے کہ دفعتہً حیدرآباد جیسے بلدۃ الامراء میں کسی بڑے امیر کی دیوڑھی میں پہونچ گئے۔ چندر محل کے شاندار ڈرائنگ روم میں جس کے فرش و فرنیچر اور دیواروں پر راجہ نظام نواز ونت آنجہانی کے شکار کئے ہوئے جنگلی جانوروں کی کھالیں مختلف طرح پر بچھی یا لٹکی ہوئی تھیں ہم نے دو تصویروں کو بڑی دیر تک دیکھا ان میں سے ایک تو راجہ وینکٹ جگناتھ راؤ آنجہانی کی تھی جو بڑا سا پگڑ باندھے، انگرکھا پہنے، کندھے پر تلوار لٹکائے تلوار ہاتھ میں تھامے پرانی وضع بنے کھڑے ہیں دوسری انہی کے ہم نام انہی کے نوجوان پوتے کی جو سوٹ بوٹ میں ملبوس یوروپین وضع قطع بنائے مسکرا رہے ہیں۔ یہ دونوں تصویریں تبدیل لباس، تبدیل مذاق، تبدیل وضع کی معاشرتی تاریخ آنکھوں کے سامنے پیش کرتی ہیں۔

یہاں کی عمارتوں میں جہاں برقی قوت برقی کا مکان (پاور ہوس) بھی قابل ذکر ہے۔ اس مکان میں جو بالکل نہایتی ملبایہ بقدر ضرورت ... سستے داموں میں بنایا گیا ہے۔ دو مشین لگے ہیں ایک (۲۰) گھوڑوں کی طاقت کا دوسرا اس کا نصف اس کے ذریعہ محل میں روشنی اور پنکھے دن رات اور عوام کے لئے سر مغرب سے ۹ بجے شب تک چلتے ہیں۔ آٹے کی دو چکیاں اور تیل کے دو گھانے کام کرتے ہیں۔ تیل کے گھانوں کو روزانہ پانچ روپے پر گتہ دے رکھا ہے۔ چاول چھوڑنے کا مشین بھی لگا ہے مگر یہ مشین ابھی چالو نہیں کیا گیا آب رسانی کے لئے پانی یہیں کی برقی قوت سے کھینچا جاتا ہے۔ جو مشین باؤلی پر لگا ہے وہ ۴۲ ہزار گیلن روزانہ کھینچ سکتا ہے مگر موسم گرما میں یہاں صرف ۱۰ ہزار گیلن تک پانی خرچ ہوتا ہے۔ چونکہ پانی مقررہ اوقات پر کھولا جاتا ہے۔ اس لئے باؤلیوں کا استعمال بھی جاری ہے۔

آخری راجہ وینکٹ لچھما راؤ نظام نواز ونت بہادر متوفی کو صلبی دو لڑکیاں ہیں چونکہ اولاد نرینہ نہ تھی۔ اس لئے وینکٹ جگناتھ راؤ کو متبنیٰ لیا ہے یہ ۱۳۲۶ف میں پیدا ہوئے ہیں اور ۱۳۳۹ف میں ان کی شادی اندرا دیوی سے ہوئی۔ جو نظام نواز ونت بہادر کی چھوٹی صاحبزادی سرسوتی دیوی کی دختر ہیں یہ نوجوان پسر بھی اپنے سپاہی منش متبنی پدر کی طرح شکار اور مردانہ کھیلوں کے شائق ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس چھوٹی سی عمر میں ۱۰ شیر انھوں نے شکار کئے ہیں۔

متوفی راجہ صاحب کی بڑی صاحبزادی راجیشرا راجہ صاحب تپروال کو ۱۳۱۳ف میں بیاہی گئی ہیں اور دوسری جن کا نام سرسوتی دیوی ہے وینکٹ کرشنا راؤ زمیندار پرناپور کو دی گئی جو افسوس کہ عالم جوانی میں بیوہ ہو گئیں ان کے شوہر پرواز کے بڑے شوقین تھے چنانچہ کولا پور سے مدراس کو پرواز کرتے ہوئے ۲۵ اگست ۱۹۳۵ء کو طیارہ کے ٹوٹنے سے گر کے مر گئے۔ کولا پور گسٹ ہوس سے متصل ایک سنگی ستون ان کی بیوہ رانی کی طرف سے لگایا گیا ہے جس کی عبارت ان دونوں میاں بیوی کی محبت کی خاموش داستان ہے۔

اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے میں اپنی اس آرزو کا اظہار کرتا ہوں جو رہ رہ کر میرے دل میں پیدا ہوتی ہے کہ کاش ہمارے ملک کے سارے جاگیرات خصوصاً بڑے بڑے علاقوں کا انتظام ایسا ہی ہوتا ہم یہ نہیں کہتے کہ گمنتان جٹ پول میں ساری ترقیاں ہو چکی ہیں نہیں۔ بلکہ جس حد تک بھی یہاں ترقی کی گئی ہے۔ وہ بات موجودہ بھی دوسرے جاگیری علاقوں کے لئے قابل تقلید ہے۔

ابوظفر موید الدین حسن فاروقی

میر محمود صاحبؒ کی پہاڑی پر

میر محمود صاحبؒ کی پہاڑی ہمارے وطن میں ایک مشہور مقام ہے۔ میر عالم کے تالاب کے کنارے ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے اور اس پر ایک بزرگ کی درگاہ بنی ہوئی ہے۔ درگاہ کے اس طرف گھنا جنگل ہے جہاں ہماری پردہ نشین خواتین نہایت خوشی سے بال بچوں کے ساتھ تفریح مناتی ہیں جس طرح عام دستور ہے ہم لوگ کسی بزرگ کی ذات سے اتنا فائدہ نہیں اٹھاتے جتنا ان کی درگاہ سے اٹھاتے ہیں یہی حال اس درگاہ کا بھی ہے، لوگ اس پرسکون اور خاموش مقام میں دنیاوی فکروں کو ایک بزرگ کے فیض صحبت سے روحانی چین میں بدل کر آتے ہیں اور زیادہ تر اس لئے تکلیف فرماتے ہیں کہ تالاب کا لطف حاصل کیا جائے اور مناظر کی دلچسپیوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

ایک مرتبہ ہم اس مقام پر پہنچ گئے۔ موٹر سیکل پر سوار تھے خیال ہوا چلو آج اس مقام کی سیر کریں جس کی تعریف کانوں سے سنتے آئے ہیں سرما کی تعطیلات تھیں، ٹھنڈا ٹھنڈا موسم نرم نرم دھوپ، نیلا نیلا آسمان فوراً موٹر سیکل تیز کی اور درگاہ کی طرف چلے لوگ کہتے ہیں سیدھا راستہ چلنا چاہئے مگر بعض وقت راستہ گم کرنے اور اٹکل پر چلے جانے میں غیر معمولی لطف آتا ہے۔ خصوصاً ایسے وقت جب کہ فطرت اور اس کے اسرار کے سوا کوئی رہنما نہ ہو ہماری نظر پہاڑی کی طرف تھی مگر راستہ بالکل اس کی مخالف سمت نظر آرہا تھا۔ پیدل ہوتے تو دور نکل جانے کا خوف ہوتا مگر جب "پیٹ بھری" موٹر سیکل ہو (آپ پیٹ بھری کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے) تو اور ہمت بڑھتی ہے۔ ہم دیکھتے رہے پہاڑی کی طرف اور چلتے رہے دوسری طرف راستہ پیچیدہ تھا ایک شاعر کو جو معشوق کی زلفوں کے پیچ و خم دیکھ چکا ہو بھلا راستے کی پیچیدگی کیا ستا سکتی ہے ہم سبز درختوں کی چھاؤں چھاؤں چلتے ہی رہے۔ بڑی دیر کے بعد منزل مقصود آئی پہاڑ کے دامن میں پہنچے موٹر سیکل گرم ہو چلی تھی ہم نے کچھ اس خیال سے کہ پہاڑ پر جا کر آئے تک کہیں پہیہ غائب نہ ہو جائے اور کچھ اس لئے کہ گھنے سائے میں اس کی گرمی دور ہو گی اسے شاداب جھاڑیوں کے اندر کھڑا کر دیا اور اوپر کی طرف چلے۔ جنگل، ساگوان کے درخت، پرند کے چہچہے، ٹھنڈی ہوائیں اور دس بجے کی نرم دھوپ بڑا روپ دکھا رہی تھی۔ ہم نے خیال کیا کہ سب سے پہلے بزرگ کے مزار پر فاتحہ پڑھ لینی چاہئے۔ معاف کیجئے ہم ذرا مذہبی قسم کے آدمی ہیں فوراً جیب میں ہاتھ پہنچ گیا کہ دیکھیں پھولوں اور خیرات کے لئے کھلے پیسے ہیں بھی یا نہیں بارے ایک اٹھنی نکلی ورنہ ہر موٹر سوار کی جیب سے پیسوں سے زیادہ روپیوں کی جھنکار آتی ہے۔ راستہ بائیں طرف کو مڑتا تھا ہم اپنی وطنی خاکساری کے ساتھ سر جھکائے زمین جھانکتے چلے جارہے تھے۔ یکایک اوپر جو نظر پڑی تو دیکھتے کیا ہیں کہ دو فرلانگ تک اونچا راستہ ہے سیڑھیوں کی قطار ہے اور اوپر بزرگ کا مزار نظر آرہا ہے۔ فوراً دل پر اثر ہوا۔ ہم نے خیال کیا کہ سچ ہے روح کی بلندی ہمیشہ قائم رہتی ہے ہم نے سیڑھیاں چڑھنی شروع کیں اوپر پہنچنے تک برا حال ہو گیا سب سے زیادہ تکلیف ہمارے پیٹ کو پہنچی کیونکہ ہمارا پیٹ کسی قدر گول ہے! درگاہ کے چبوترے پر پہنچنے کے بعد ایک قدیم روایت یاد آگئی۔ یہاں کے متعلق مشہور ہے کہ کسی بزرگ کی بد دعا سے اس درگاہ کے تین گوشے آباد ہیں اور ایک ویران۔ ہم نے بڑے شوق سے اس کی توثیق کرنی چاہی گوشوں کی آبادی کا حال سنئے دو چار بکریاں، آٹھ دس کبوتر، تھوڑی سی عدم صفائی اور ایک حافظ صاحب! ویرانی کی طرف عمارت شکستہ اور کچھ نہیں۔ بہر حال ہم نے درگاہ کا ایک معتقدانہ طواف کیا اور درمیانی گنبد کے نیچے مزار کی ایک جانب بیٹھ گئے۔ تکان اور مراقبے میں ایک روحانی تعلق معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس وقت

سی نہ کسی کیف میں ڈوب گئے اور آنکھیں بند کر لیں یقین مانئے ایسا معلوم ہوا ہم کسی اعلیٰ مقام میں پہنچ گئے ہیں سوائے رنگینیوں کے کچھ نظر نہ آتا تھا مگر توجہات کی زد دل پر پڑ رہی تھی ۔ ایسے وقت میں قرآن مجید بہت جلد یاد آتا ہے ہم نے قرآن خوانی اور درود پڑھنا شروع کیا جس وقت ہم پہنچے تھے تو ڈھائی بجے [illegible] منٹ ہوئے تھے جب آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ بارہ بج گئے ہیں ہم نے لیا خوب اصحاب کہف کی نیند کا ایک حصہ گویا ہم نے بھی دیکھ لیا ۔ آنکھ کھلتے ہی بھوک کی بہت کی تکلیف بھوک محسوس ہوئی اور بری طرح محسوس ہوئی درگاہ کے باہر نکلے ہی تھے کہ ایک بزرگ صورت فقیر نے ہمارے سامنے قدرتی باغ کی ایک ڈالی پیش کی جس میں کچھ سیتا پھل کچھ موز، عمدہ بیر، دو چار جام ایک سنگترہ بیچ میں پھولوں کا ایک گلدستہ ۔ ہم نے بزرگ کو حیرت سے دیکھا اور کہا حضرت آپ کون ہیں یہ کیا ہے ؟ کوئی معجزہ ہے یا ہمیں یہ [illegible] ہو رہا تھا ان سے [illegible] جیسے بھی [illegible] دی جا رہی ہے انھوں نے فرمایا " جی ہاں تحفہ ہے غریب کا لے لیجئے " ہم نے [illegible] لے لیا اور [illegible] جس وقت ہم چلے تو بزرگ نے ہماری طرف غور سے دیکھا ہم نے بھی انہیں غور سے دیکھا تھوڑی دور نکل جانے کے بعد خیال ہوا انھیں کچھ [illegible] دینے چاہییں ۔ ہم نے جب ٹٹولا تو اس میں نہ تھا [illegible] آپ ہی خیال کیجئے کیسی ندامت ہوئی ہوگی بھلا [illegible] ہم سوچ ہی رہے تھے کہ بزرگ نے کہا " میں آپ کی مشکل سمجھ لیا تکلیف نہ کیجئے اور آئیے میں آپ کو ایک چیز دکھاؤں "

اُن کے ساتھ چلتے ہوئے [illegible] ہمیں کچھ خوف ہونے لگا کیونکہ اس جنگل میں سوائے اُن کے اور ہمارے کوئی نہ تھا ہاں ایک عجیب دوساتھی تھا جو عجیب [illegible] طریقے سے ہماری رفاقت کر رہا تھا اور یہ کوا تھا [illegible] ہمارے ساتھ ساتھ ڈالی ڈالی اڑتا برابر کائیں کائیں کیا جا رہا تھا ۔ ایک آدھ میل چلنے کے بعد تالاب کا کنارہ آیا ۔ قدرت کا منظر عجیب لطف دے رہا تھا ہم پانی کے کنارے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے قریب ہی ایک جھونپڑی نظر آئی ہم اور وہ بزرگ دونوں خاموش تھے کہ یکایک فضا میں ایک دوشیزہ کی آواز بلند ہوئی " بابا جان کھانا تیار ہے " ہم نے چونک کے اُدھر دیکھا کہ انہیں جھونپڑی کے دروازے پر نظر پڑی ایک حسن اجالا بیٹھی تھی جیسے کہ ایک چاندنی سی کلائی اور ستارے جیسی ایک آنکھ ہم نے فوراً درود پڑھا اور کہا " جل جلالہ "

حسن کا جن لوگوں کو اعتراف سمجھتا ہے ہم نے اس وقت یہ محسوس کیا [illegible] نازنین کی [illegible] اور کیا ہی [illegible] جا پڑتے ہیں ۔ ہم نے دماغ پر زور ڈال کے سوچنا شروع کیا کہ کسی طرح [illegible] برق تجلی کی پوری زد میں آنا چاہئے ہم نے جیسے ہی بزرگ کی طرف دیکھ کے ایک سوال کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ انھوں نے فرمایا " میاں چلو کھانا کھالیں " ہم نے کہا بہتر ہے اور موصوف سے جھونپڑی میں پہنچ گئے ایک نازنین یا تھ سے سلام کیا ہم نے دعا تو نہیں سلام ہی کا جواب دیا اور بیٹھ گئے ۔ پھر ملی آواز پھر بلند ہوئی ۔ جناب ہم غریب ہیں کھانا پسند نہ آئے گا ۔ ہم نے کہا " جناب ۔ نہیں جناب ! آپ کیا کہتی ہیں اس وقت بھوک کی شدت ہے اور یہ کھانا من و سلویٰ معلوم ہو رہا ہے " کھانا کھانے تک وہ تو شکل نظر آنکھوں کے سامنے ہی رہا ۔ بندہ منت پذیر ہوں گے کہ خدا حافظ کہنا پڑا ہم بادلِ ناخواستہ باہر نکلے اتنے میں اُس نازنین نے مجھے آواز دی قریب بلوا کے ایک بلورجس پر دھاریاں تھیں میرے ہاتھ پر رکھا " ابا جان نے دیا ہے ۔ اسے اپنے قلمدان میں رکھا کیجئے " ہم نے اس تحفے کو آنکھوں پر لیا اور شکریہ کر کے چلے ہم تنہا تھے راستہ بڑی مشکل سے طے ہو رہا تھا ۔ روحانی دنیا میں محبت کی چاشنی !

شاید یہ لطف جنت ہی میں حاصل ہو یا نہ ہو۔ ایک درخت کے نیچے ہم نے دیکھا کہ پگڈنڈی پر دھوپ کی طرف ایک بڑا سیاہ بچھو چلا جا رہا ہے ہماری نظر اس پر اس وقت پڑی جب کہ ہم اس پر پاؤں رکھنے ہی والے تھے۔ ہم دور اچھل پڑے اور بچھو کو بہت غور سے دیکھنا شروع کیا پورا بچھو تھا جسم پر بڑے بڑے بال تھے اور ڈنکوں کی طرف دو بڑے سیاہ چھپے اس کی جسامت بڑی چھپکلی کے برابر ہوگی۔ تماشہ دیکھنے والوں ہی ہماری نظر اس پر پڑی بچھو اس طرح تلملا اٹھا جیسے اسے کسی تیز اور گرم سیخ سے چھیڑ دیا گیا ہے۔ وہ سکڑنے لگا اور ایک دو منٹ میں سکڑ کر گھونگا ہو گیا۔ ہم نے دس منٹ تک اس کے چلنے کا انتظار کیا مگر وہ مرا ہوا پڑا تھا۔ ہم نے ایک بڑی لکڑی سے لے کر دور سے اسے چھیڑا اگر وہ مر چکا تھا۔ ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم اس نسخے کو ایک بڑے پتے پر اٹھا کر گھر لے آئے، دو گھنٹوں میں وہ پانی پانی ہو گیا۔ اب ہم کو میر محمود صاحب کی پہاڑی کے دو نسخے اکثر یاد آتے ہیں۔ ایک تو اب تک قلمدان سے زیادہ دل میں ہے، اور دوسرا حافظے کی دنیا میں۔ ہماری سمجھ میں نہ آسکا کہ اس پہاڑی پر ہم کو یہ نسخے کیوں ملے۔

محمد عبدالقیوم خاں باقی

نیا پل اور شام

شام کی سندر فضا میں دور کی تنویر ہے
خوابِ دوشیزہ کی میرے سامنے تصویر ہے

ہر طرف طوفانِ نغمہ ہر طرف طغیانِ نور
حضرتِ انساں کی سرگرمی میں گم شورِ طیور

نور کی سرگرمیوں میں غرق ایوانِ بلند
شام کی دیوی نے بڑھ کر پھینک دی اپنی کمند

گنبدوں پر نور کی پرچھائیاں ہیں پر بہار
اور فضا پر چھا گیا ہے نور و ظلمت کا غبار

اک طرف تعمیرِ عدل[1] و اک طرف دار الشفا[2]
دور پر اک مدرسہ[3] ہے نیند میں کھویا ہوا

سامنے دار الکتب[4] کی دل نشیں تعمیر ہے
جس کی خشت و گل میں عقل و ہوش کی تخمیر ہے

رودِ موسیٰ پر نیا پل دہر کی تصویر ہے
جس کی دو رنگی میں دونوں دور کی تعمیر ہے

ایسے خوش منظر میں میری ذات ہی کھوئی ہوئی
جاگتی ہے آنکھ اور تقدیر ہے سوئی ہوئی

سید محمد اکبر وفا قانی

---

[1] عدالت العالیہ۔ [2] عثمانیہ دواخانہ۔ [3] کلیہ بلدہ۔ [4] کتب خانہ آصفیہ۔

سب رس

دکن نمبر

ادارۂ ادبیات اردو

نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۳)

رجسٹرنمبر (M3950)

مُرقّعِ دکن

یعنی

ادارہ ادبیات اُردو کے ماہنامہ

سب رس

کا سالگرہ نمبر بابتہ جنوری ۱۹۳۹ء

زیر نگرانی

ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زورؔ

مجلس ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکشؔ

سکینہ بیگم

خواجہ حمید الدین شاہدؔ

معین الدین احمد انصاری

مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر "ادارہ" زینت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

تعداد صفحات ۱۱۲ تعداد تصاویر ۸، قیمت عال

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہ ادارہ ادبیات اردو کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہ ہوں گے

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کر کے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی پی یا دی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششش ماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے	چار روپے	دو روپے	چھ آنے
شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ	چار روپے آٹھ آنے	دو روپے بارہ آنے	سات آنے

بچوں کے سب رس کی قیمت

	سالانہ	ششش ماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے	ایک روپیہ	دس آنے	ڈیڑھ آنہ
شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ	ایک روپیہ آٹھ آنے	بارہ آنے	دو آنے

محرم نمبر ۱۲ر اقبال نمبر عہ ۴ر دکن نمبر عہ ۱۱

سب رس کی خریداری اس میں اشتہارات کی طباعت اور ادارہ ادبیات اردو کی رکنیت یا اس کے مطبوعات کی خریداری کے سلسلے میں جو اصحاب صدر دفتر (رفعت منزل خیریت آباد) سے گفتگو یا مراسلت نہیں کر سکتے وہ حسب ذیل اصحاب سے گفتگو یا مراسلت کر سکتے ہیں۔

بلدہ (۱) مسٹر ایس اے کریم نمائندۂ خصوصی پتلی پورہ قریب مکان حکیم محمود ہمدانی مرحوم (۲) مسٹر ایس پی اننتا۔ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ (۳) رحمان کا بکڈپو گھانسی بازار۔ **اضلاع** مسٹر محمد فخر الدین ازماں (رونق شیخ) گاپہ کے تعریف ان کے علاوہ نور احمد صاحب عثمانیہ ادارہ کی طرف سے علمی و ادبی دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے یہاں ادارہ کی کتابیں اور رسالے لے کر آئیں گے۔ توقع ہے کہ علم دوست اصحاب ضرور ان کی مدد کریں گے۔

سب رس مرقع دکن نمبر جنوری سنہ ۳۹ء

فہرست تصاویر

اعلیحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

سلاطین آصفیہ

وزرائے آصفیہ

امرائے آصفی

دیگر تصاویر

تعداد صفحات ۲۱۶ - تعداد تصاویر ۷۸ - قیمت عالی

سب رس مرقع دکن نمبر جنوری ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

ادارۂ ادبیات اردو کی چند

قابل دید کتابیں

ہز ہائینس والاشان نواب اعظم جاہ بہادر
ولیعہد سلطنت آصفیہ و شہزادۂ برار
اپنے فرزند ارجمند شہزادہ کرنل نواب مکرم جاہ بہادر کے ساتھ

مدحِ خواجہؒ

معین الدینؒ ہیں قطب الدینؒ سے شاد | تو قطب الدینؒ فرید الدینؒ سے شاد
فرید الدینؒ نظام الدینؒ سے خوش | نظام الدینؒ نصیر الدینؒ سے خوش

نصیر الدینؒ مرے ممدوح سے شاد
مرے ممدوح کا تو نام رکھ یاد

مطیعِ مصطفیٰ سید محمدؒ | مطاعِ باصفا سید محمدؒ
دوئی کیسی؟ یہ ہر فرد یگانہ | مری نظروں میں ہے قطبِ یگانہ

ادھر جو ہے وہی ضو پاش ادھر ہے
نمودِ خواجہ ہر سو جلوہ گر ہے

سمجھ کا دور ہو جائے اگر پھیر | تو گلبرگہ کو بھی تو سمجھے اجمیر
غرض، تنویرِ خواجہؒ دیدنی ہے | جدھر دیکھو اسی کی روشنی ہے

نگاہِ عارف ان جلووں کی جویا
مری نظریں بھی خوش ان سے ہیں گویا

دکھاتا ہے یہ سلطانِ طریقت | مجازی شان میں شانِ حقیقت
نزول اچھا عروج اچھا ہے اس کا | سلوک اس شان سے کامل ہے کس کا

جو یہ شہبازؔ ہو مائل بہ پرواز
کھلے تشبیہ سے تنزیہ کا راز

عیاں خواجہ کی ہے بندہ نوازی | نہیں کس کو امیدِ سرفرازی
سلیمانِ دکن عثمان علی خاںؒ خلد اللہ | فروغِ مدعائے آصفستاں

مرے خواجہؒ کے رخ سے سب کا ہے ضو
دکن افروز ہے خواجہؒ کا پرتو

علی منظور

۱؎ غریب نوازؒ ۲؎ بختیار کاکیؒ ۳؎ گنج شکرؒ ۴؎ سلطان المشائخؒ ۵؎ چراغ دہلیؒ ۶؎ بندہ نوازؒ ۷؎ غریب نوازؒ اور بندہ نوازؒ [illegible] ۸؎ مصطفیٰ ہے بیٹا ۱۲۔ ۹؎ خواجہؒ کے القاب میں ایک لقب شہباز [illegible]

اداریہ

سب رس کا دوسرا سال جس اہتمام کے ساتھ شروع ہو رہا ہے۔ اس کا عملی ثبوت یہ سالگرہ نمبر ہے جو دکن کے ماضی و حال کے متعلق دلچسپ اور اہم تاریخی معلومات کے لئے وقف کر دیا گیا ہے اور ہزارہا روپیہ کے صرفہ سے تیار ہوا ہے۔ قدیم تاریخی قلمی تصویروں کے فوٹو لینے اور پھر ان کے انسی بلاکس کی تیاری اور ان کی چھپائی کے لئے جو وقت اور رقم صرف ہوئی ہوگی صرف اسی کا اندازہ کرنے سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ ادارہ نے اس شاندار تاریخی نمبر کی خاطر کتنا اہتمام کیا ہے اور سب رس کی زندگی اور ترقی کے لئے کس حد تک رقم کا صرفہ اور محنت کرنے کے لئے تیار ہے۔

اسی اہتمام اور غیر معمولی کوششوں میں آسانی کار پیدا کرنے کے سلسلہ میں ادارۂ ادبیات اردو نے نئے سال سے سب رس کی ایک مجلس ادارت بھی قائم کر دی ہے۔ جو اپنے ہر ماہنامے کو ہر ذوق اور ہر قسم کی دلچسپیوں سے مالا مال کرنے کی طرف خاص طور پر متوجہ رہے گی۔

مجلس ادارت کے قیام کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ سب رس کا علمی و ادبی معیار بڑھتا جائے اور اس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ایسی مفید اور ضروری معلومات بھی درج ہوا کریں جن کا جاننا ہر تعلیم یافتہ کے لئے ضروری ہے۔ اس بارے میں ادارۂ ادبیات اردو کے مختلف شعبے سب رس کا ہاتھ بٹائیں گے۔ مثلاً شعبۂ زبان اردو زبان کے ضروری اور اہم مسائل پیش کرتا رہے گا۔ شعبۂ تنقید کی طرف سے اردو کتابوں پر سنجیدہ اور ذمہ دارانہ تنقیدیں شایع ہوتی رہیں گی۔ اور تمام ہندوستان کی جدید مطبوعات کی اطلاع بھی وقت بوقت دی جائے گی تاکہ معلوم ہوتا رہے کہ اردو میں کون کونسی کتابیں شایع ہو رہی ہیں۔ شعبۂ تاریخ دکن ایسی مفید اور دلچسپ معلومات فراہم کرتا رہے گا جو ملک کی ترقی اور عزت کیلئے اہل ملک کی رہبری کریں گی۔ شعبۂ نسوان ہر ماہ نسوانی فلاح و بہبود سے متعلق مضامین کی فراہمی کے علاوہ اس امر کی کوشش کرتا رہے گا کہ سب رس میں نسوانی دلچسپیوں کے کافی سامان مہیا ہوتے رہیں۔

ساتھ ہی ادارہ کے تمام شعبوں کے ماہوار جلسوں کی روئدادیں بھی سب رس میں شایع ہوں گی تاکہ ہر مضمون سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب مستفید ہو سکیں۔ چنانچہ ان تمام شعبوں کی تفصیل اور ان کے جلسوں کی روئدادوں کے اہم حصے اس مہینے بھی شایع کئے جا رہے ہیں۔

یہ باتیں صرف اس لئے بیان کی گئیں کہ سب رس کے قدردانوں کو اندازہ ہو جائے کہ سب رس کی ترقی اور اس کے مستقبل کو درخشاں بنانے کے لئے ادارہ کیا کام کر رہا ہے۔

دکن نمبر کے بارے میں زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ خود اس کا مطالعہ اس کی سفارش کرے گا۔ اتنا لکھنا ضرور ہے کہ محض اعلیٰحضرت ظل سبحانی سلطان العلوم آصفجاہ سابع کی علم نوازیوں اور مسیحا نفسیوں کے باعث آج ہم اس قابل ہو سکے کہ دکن کی قدیم تاریخ کو اس طرح باتصویر پیش کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مرقع دکن اعلیٰحضرت کے نام نامی اور حالات زندگی سے شروع کیا جا رہا ہے۔ اور اس کا سرورق حضرت ظل سبحانی سلطان العلوم ہی کی تصویر سے مزین ہے۔ اس سلسلہ میں نواب سالار جنگ بہادر کی علم دوستی اور فیاضی کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ جس کی وجہ سے یہ مرقع دکن صحیح معنوں میں ایک مرقع بن سکا۔ اس کی اکثر تصویریں نواب صاحب ہی کے خزائن فنون لطیفہ سے حاصل کی گئی ہیں۔ اور نواب صاحب نے بکمال مہربانی ان کو سب رس میں شایع کرنے کی اجازت عطا فرمائی ہے۔

سب رس کے قلمی معاونین کا شکریہ بھی لازمی ہے کہ انھوں نے قلیل عرصہ میں نہایت مستند دلچسپ اور مکمل مضامین تیار کر دئے۔ خاص کر دکن نمبر کی تیاری کے لئے جو مجلس مشاورت مقرر کی گئی تھی اس کے ارکین (عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ال ال بی۔ میر محمود علی صاحب ایم اے

اعلیٰحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخان بہادر آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ

حضرتِ ظلِ سبحانی کے حالاتِ زندگی اور عہدِ حکومت کے متعلق اس وقت تک متعدد کتابیں اور مضامین شایع ہو چکے ہیں ہر سال ملک اور بیرون ملک میں رسائل و اخبارات کے سالنامے اور سالگرہ اقدس کی مبارکباد کے خاص نمبر شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ان سب میں حضرت بندگان عالی کی عظیم الشان شخصیت آپ کے بے مثال تدبر و سیاست ذاتی علم و فضل شعر و سخن کی دلچسپیوں اور ذہنی و اخلاقی محاسن وغیرہ کے ہر پہلو سے متعلق تفصیلی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں اگر ان سب کو ایک جگہ کردیا جائے تو اعلیٰحضرت سلطان العلوم کی قابل تقلید ہستی کے متعلق کئی جلدوں کی سوانح حیات مرتب ہو جائے۔

دودمانِ آصفی میں اعلیٰحضرت سلطان العلوم آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ کی ذاتِ والاصفات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اور علم و فضل و شعر و سخن کی سرپرستیوں میں حضرت جہاں پناہی نے خاص توجہ فرمائی ہے یہی وجہ ہے کہ اعلیٰحضرت خلد اللہ ملکہٗ کے تذکرہ کو اس مرقع دکن کے لئے زیب عنوان قرار دے کر تاریخی سلسلہ سے درج کرنے کی جگہ ابتداء میں پیش کیا جارہا ہے۔

اعلیٰحضرت سلطان العلوم خلد اللہ کی حیات کا محض علمی و ادبی پہلو بھی ایسا وسیع ہے کہ اس پر لکھنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر کئی جلدوں کی مبسوط کتاب لکھی جاسکتی ہے اگر موقع ملے تو خود ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے اس موضوع پر نہایت اجمال کے ساتھ پانچ ابواب میں ایک نذرِ عقیدت پیش کی جائیگی۔ اس سوانح شاہانہ کا پہلا باب حیاتِ سلطانی اور دوسرے چار ابواب ۲۔ اردو شاعری ۳۔ اردو نثر ۴۔ فارسی شاعری اور ۵۔ ہندی شاعری پر مشتمل ہوں گے۔

ادارہ

خسرو دکن مشرق کے سب سے زیادہ ہردلعزیز تاجدار ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ آپ کے لئے بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام تھا اس لئے آپ کو مشرقی اور مغربی علوم میں اعلیٰ مہارت حاصل ہے۔ فارسی اور اردو زبان کے اعلیٰ شاعر ہونے کے علاوہ اپنی خداداد ذہانت و علمی قابلیت اور علوم و فنون کی سرپرستی کی بناء پر بجا طور پر سلطان العلوم کہلاتے ہیں۔

اپنے والد نواب میر محبوب علی خاں کے انتقال پر آپ ۱۹۱۱ء میں ۲۵ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے جس کو آج تقریباً ۳۵ سال کا عرصہ ہوتا ہے اس عرصہ میں حیدرآباد کی ہر جہتی ترقی حیرت انگیز ہے جو کام کہ سلطنت آصفیہ کے قیام کے زمانے سے حالیہ زمانہ تک یعنی دو سو سال کے عرصہ میں نہیں ہوا تھا وہ اس وقت ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور بندگان عالی نے اپنی غیر معمولی روشن خیالی، رواداری بے انتہا سادہ زندگی، اعلیٰ اخلاق اور خداداد قابلیت سے حیدرآباد کی قومی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی ہے جس کی وجہ سے سارے ملک میں عام بیداری پیدا ہوگئی ہے اور سلطنتِ آصفیہ میں ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوگیا ہے۔

رعایا کے نہ صرف جان و مال کی حفاظت اور ملکی ترقی کا خیال آپ کے پیش نظر رہتا ہے بلکہ تعلیمی اور اخلاقی زندگی کی اصلاح اور رعایا کے آرام و آسایش کی فکر ہمیشہ آپ کے دامنگیر رہتی ہے۔ چنانچہ طبقۂ امراء اور بالخصوص نوجوانوں کو ابھی حال میں جو نصائح آپ نے فرمائے ہیں وہ آب زر سے

لکھے جانے کے قابل ہیں۔

اعلیٰحضرت کی تخت نشینی کے وقت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر مدارالمہام تھے۔ پھر نواب سالار جنگ بہادر سوم مدارالمہام ہوئے۔ بعد ازاں پانچ سال تک اعلیٰحضرت نے نہایت جانفشانی سے یہ فرائض خود انجام دئے۔ آخر پر ۱۹۱۹ء میں باب حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد سر علی امام، سر فریدون الملک نواب ولی الدولہ بہادر، اور پھر مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یکے بعد دیگرے صدر اعظم مقرر ہوئے۔

جنگ عظیم کے نازک موقع پر اعلیٰحضرت نے خاندانی روایات کے مطابق اپنی جملہ فوجوں اور تقریباً چھ کروڑ روپیوں سے سلطنت برطانیہ کی مدد فرمائی۔ اس امداد کے اعتراف میں حکومت برطانیہ نے "یہ روفادار، فیدفل الی" ہز اگزالٹیڈ ہائینس" کے خطاب سے مخاطب کیا۔

اعلیٰحضرت کی حب الوطنی اور رعایا پروری ضرب المثل ہے چنانچہ آپ نے بادشاہ ہوتے ہی قدیم محکموں کی از سر نو تنظیم فرمائی اور بہت سے نئے محکمے قائم کئے جیسے محکمہ آثار قدیمہ، محکمہ زراعت، محکمہ صنعت و حرفت، محکمہ آرائش بلدہ، محکمہ امداد باہمی، محکمہ بلدیہ، محکمہ لاسلکی وغیرہ۔ کئی ایک بڑے بڑے تالاب بنوائے جیسے عثمان ساگر، حمایت ساگر اور نظام ساگر وغیرہ۔ اسی طرح بے شمار عمارتیں تعمیر کیں جیسے عدالت العالیہ، دواخانہ عثمانیہ، سٹی کالج، معظم جاہی مارکٹ، کتب خانہ آصفیہ، جامعہ عثمانیہ کی عمارتیں، جوبلی ہال وغیرہ۔

ان خوبصورت عمارتوں کی کثرت، سمنٹ کی شاندار سڑکوں کی رونق اور ہر قسم کی عصری ترقیوں کی وجہ سے اس وقت حیدرآباد ہندوستان کا بہترین شہر بن گیا ہے، جہاں مشرقی اور مغربی دونوں قسم کے تمدنوں کے نمونے موجود ہیں۔ اسی طرح اضلاع اور شہر میں آمد و رفت کی بہت کچھ سہولت پیدا ہوگئی ہے۔ چنانچہ ریلوں اور سڑکوں کا ایک جال سارے ملک میں بچھا دیا گیا ہے۔ اس طرح دور عثمانی میں عمارتوں کی تعمیر اور رعایا کی خوش حالی اور ترقی کو دیکھ کر عہد شاہجہانی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔

اعلیٰحضرت کے پچیس سالہ کامیاب حکومت کا جشن (سلور جوبلی) منایا جاکر ابھی پورے دو سال کا عرصہ نہیں ہوا ہے کہ اس جشن سمیں کے بعد نواب سر احمد سعید خان چھتاری کو صدر اعظم مقرر فرمایا گیا ہے۔ سر اکبر حیدری نواز جنگ بہادر نے صدارت عظمیٰ سے قبل ملک میں اشاعت تعلیم، قیام جامعہ عثمانیہ اور مالیات کے استحکام اور دیگر اصلاحات کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے وفاق کے سلسلہ میں گفت و شنید جاری رہنے تک آپ نے ریاست کے مفاد کی بھی بہت کچھ حفاظت کی ہے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں حکومت برطانیہ اور اعلیٰحضرت کے درمیان یہ معاہدہ ہوا کہ "برار میں انگریزی جھنڈے کے ساتھ مخصوص نظام کا جھنڈا بھی بلند ہوگا۔ اور ولی عہد بہادر ہز ہائینس پرنس آف برار کا خطاب پائیں گے۔ اعلیٰحضرت ہز اگزالٹیڈ ہائینس نظام آف حیدرآباد و برار کا خطاب اختیار فرمائیں گے۔" اسی طرح علاقہ ریذیڈنسی کی واپسی بھی اعلیٰحضرت کے زمانے کی ایک بڑی یادگار ہے۔

اعلیٰحضرت کی تقلید میں خاندان شاہی کے دیگر اراکین بھی ترقی ملک کے لئے ہمہ تن مصروف ہیں چنانچہ ولیعہد سلطنت ہز ہائینس پرنس آف برار والا شان اعظم جاہ بہادر کی سپہ سالاری میں فوجوں کی بہت کچھ اصلاح اور ترقی عمل میں آئی ہے۔ شہزادہ والا شان نواب معظم جاہ بہادر کی صدر مجلسی میں محکمہ آرائش و بلدیہ حیدرآباد کے اشتراک عمل سے رعایا کی زندگی کو بہتر بنانے، بہبودی اطفال کے مرکز قائم کرنے، معظم جاہی مارکٹ کو ایک نمونے کی مارکٹ بنانے اور شہر کی عام رونق میں اضافہ کرنے میں سرگرم عمل ہے۔ ترکی شہزادیوں یعنی شہزادی ہز ہائینس درشہوار اور شہزادی نیلوفر کی رہنمائی کی وجہ سے حیدرآباد کے طبقۂ نسواں میں بہت کچھ بیداری، اصلاح

اور ترقی کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے ہیں چنانچہ انجمن خواتین حیدرآباد کی سرگرم کوششیں اس کا بدیہی ثبوت ہیں۔ اسی طرح سے اعلیٰحضرت نے اپنے بھائی صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر کو جدید تعلیمی کمیٹی کا صدر اعلیٰ مقرر فرمایا ہے۔ جن کی صدارت میں بہت کچھ مفید کام کیا جا رہا ہے۔ غرض ۸۲ ہزار مربع میل سے زاید رقبہ ملک پر اعلیٰحضرت کے نام کا سکہ جاری ہے۔ اور تقریباً ڈیڑھ کروڑ رعایا قانون آصفی کے تحت عدل و انصاف سے مستفید ہو رہی ہے۔

صرف خاص مبارک، پائیگاہوں، جاگیرات، درستانوں کے قطع نظر محض علاقہ دیوانی کی آمدنی اس وقت (۹) کروڑ روپے سالانہ سے زاید ہے جس کی وجہ سے خزانہ معمور ہے۔ اور قوم سازی کے بہت سے کام ہو رہے ہیں۔ زراعت پیشہ طبقہ کی مشکلات کو بڑی حد تک دور کیا گیا ہے۔ صنعت و حرفت کی ترقی کی طرف بھی خاص توجہ کی گئی ہے۔ چنانچہ اس وقت بہت سی صنعتیں جاری ہیں اور بعض بڑے بڑے کارخانہ جات کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ اسی طرح تجارت کیا بلحاظ درآمد اور کیا بلحاظ برآمد ترقی پر ہے۔

اعلیٰحضرت بندگان عالی کی سرپرستی اور فیاضی کا یہ عالم ہے کہ ریاست کے باہر بھی جو باشندے یا جو ادارے مستحق ہیں ان کو یہاں سے مالی امداد دی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ حیدرآباد قدیم کی روایات برقرار ہیں اور بعض امور میں حیدرآباد جدید دوسری ریاستوں اور برطانوی ہند سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے جیسا کہ انتظامی اختیارات کی علحدگی کا مسئلہ ہے۔ اس پر اکتفا نہیں بلکہ اس وقت دستوری اصلاحات کے نفاذ اور مزید معاشی ترقیات کی تحریکات پر غور کیا جا رہا ہے۔

آخر پر اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ مبارک دورِ عثمانی کا سب سے اہم اور لافانی کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے جہاں سارے علوم و فنون کی تعلیم ملک کی عام فہم اور سرکاری زبان یعنی ہندوستانی (اردو) کے ذریعہ دی جاتی ہے۔

اس بیس سال کے عرصہ میں جامعہ عثمانیہ نے جو ترقی کی ہے اور اس کو اندرون و بیرونِ ملک جو غیر معمولی کامیابی اور عام مقبولیت نصیب ہوئی ہے وہ تاریخ میں اپنی آپ نظیر ہے ؎

زندہ کردی چوں مسیحا علم و فن را در دکن
زندہ باش اے حضرتِ عثمان علی خاں زندہ باش

میر محمود علی

سب رس کے گذشتہ سال کے پرچے

سب رس کے گزشتہ پرچوں کی ابھی سے مانگ بڑھ گئی ہے۔ نومبر اور ڈسمبر کے پرچے اصلی قیمت میں خریدے جائیں گے۔ اگر کسی صاحب کے یہاں اچھی حالت میں ہوں اور وہ ان کو نکالنا چاہتے ہوں تو دفتر کو مطلع فرمائیں۔ دوسرے مہینوں کے پرچوں کو بھی حفاظت سے رکھیے۔ آئندہ طلب کئے جائیں گے۔

مہتمم

تمدنِ ہند میں دکن کا رتبہ

تاریخ ہند کی یہ کھلی حقیقت ہے کہ دکن تہذیب ہند کا ہمیشہ محافظ ہے۔ اس حقیقت کو ہم ماضی اور مستقبل کے آئینہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ وہ تاریخ ہند جو انگریزی اقتدار کا ذریعہ بنی ہوئی ہے، ہمارے ماضی کی تقسیم فرقوں کی منفعتوں سے کرتی ہے۔ اس تنگ نظری کی وجہ سے تاریخ کا تہذیبی پہلو اجاگر نہیں ہوتا۔ ایک وطن پرست تہذیبی تقسیم کے لحاظ سے ہندوستان کو ان عنوانات کے تحت مطالعہ کر سکتا ہے۔ ویدوں کا دور، مثنویوں کے ذریعے ہندوستان ماسبق کی تہذیب، گوتم بدھ کا ہند، ہند کا نشاۃ ثانیہ اور آخر میں وہ تہذیب جو ویدانت اور توحید کے تخیل سے پیدا ہوئی۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس دوسری تقسیم کے تحت ہندوستانی تہذیب میں دکن کی اہمیت پر روشنی ڈالیں۔

آریائی قوم دنیا کی ان بڑی اقوام میں سے ہے جس نے ایک خاص رنگ اور نہج کی تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ انسان کائنات اور ان سب کے خالق کے متعلق ان کے نظریوں نے دیوتا پیدا کئے اور یہی دیوتا ایک ایک تمدن کی بنیاد بن گئے۔ مغرب میں یونان اور مشرق میں ہند۔ یہاں پر چونکہ آریائی تمدن سے اصل بحث نہیں ہے اس لئے مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ آریائی تہذیب نے چاروں کی معاشرتی تنظیم کے ذریعے ایک مستقل تمدن پیدا کیا۔ دکن نے اس تمدن کے ابتدائی خط و خال کو خود میں جذب کیا۔ افسانوی دور میں رامائن کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شہ کار مثنوی کا ایک نمایاں ہیرو ہنومان ہے۔ دکن کا یہ راجہ رام کو مدد دیتا ہے۔ صداقت کی تلوار [illegible] ہے اور مظلوم عورت یا آریاورت کی ماں کو دشمنوں سے چھڑا لاتا ہے اور اس کے صلہ میں آریا اس کو دیوتا بنا دیتے ہیں۔ لیکن اس واقعے سے یہ ثابت ہے کہ دکن نے اپنی جگہ میدانوں میں بسنے والے خود دار متمدن اور دوسروں کو ہیچ سمجھنے والے آریاؤں سے اپنی انسانیت سے منوایا اور اپنی تمدن نوازی کو ثابت کیا۔ اس کے بعد دوسری بڑی مثنوی مہابھارت ہے۔ [illegible] نمایاں ہے۔ پانڈوؤں کا دیس نکالا ہوتا ہے تو دکن میں پناہ ملتی ہے اور دوارکا کا روحانی اور بانکا راجہ پانچ بھائیوں کو سوکا [illegible] یہ افسانے صحیح نہیں ان کا اثر دکن پر دیکھئے کہ یہاں کا ایک ایک مقام انہیں مثنویوں کی وجہ سے مقدس بن گیا۔ [illegible] لاتعداد شکل میں پیدا ہو گئے۔ ہر وہ مقام جہاں رام، سیتا اور کرشن پہنچے مقدس بن گیا اور وہ ہندیہل سے لے کر [illegible] مختلف اور مستقل ادارے پیدا ہو گئے۔ جنہوں نے آریاؤں کا مذہب فلسفہ، علم، ادب، شاعری اور جملہ شعبہ ہائے حسن کاری [illegible] مستقل بنا دیا۔ اس طرح حیدر محل، ورد مینتی کے لافانی عشق کی وجہ سے اہم بن گیا۔

افسانوں سے نکل کر جب ہم تاریخ پر آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم سے دکن بیرونی حملوں سے محفوظ رہا اور اکثر [illegible] یہی ہوا ہے کہ دکن نے شمالی ہند کے میدانوں پر بھی اپنا سیاسی اقتدار جما لیا۔

بدھ مذہب وہ پہلی روحانی تحریک ہے جس نے آریاؤں کی طبقہ واری تقسیم اور آریا اور غیر آریا کے تعصبی فرق مٹا کر [illegible] ہندوستان کو ایک قومیت میں لانے کی کوشش کی۔ لیکن دکن باوجود اشوک کی کامیابی کے اس ہمہ گیر تحریک کو [illegible] تہذیبی حد تک قبول کرتا [illegible] روایات کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود بدھی حسن کاری کے خزانے کے ایلورہ، اجنتا دکن میں ہونے کے وہ بدھ تمدن کے تحت آریائی تہذیب کو معدوم نہ ہونے دیا اور جب کبھی موقع ملا از سر نو دکن نے قدیم ہندو عصبیت اور طبقہ واری تمدن کو زندہ کر دیا۔ ہندوستان پر پہلے شنکر اچاریہ کی تحریک حقیقت میں دکن کے بدھ مت پر روحانی فتح تھی۔ یہ دکن کا نشاۃ ثانیہ ہمارے موجودہ بحث کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ ہندوستان کا یہ سطح مرتفع نہ صرف بلند ہے بلکہ تہذیب دکن کا سپہ دار بھی ہے۔

اس کے بعد وہ دور آتا ہے جب کہ ہندوستان قدیم اور ایشیا کا وہ تمدن جو عرب کی سرزمین سے نکل کر پورے تمدن عالم پر محیط ہو گیا۔ ہندوستان میں ضیا پاشیاں شروع کرتا ہے۔ اسلام ایک ایسا ہمہ گیر سیل رواں ہے جو جگہ، مقام اور حالات کے لحاظ سے بظاہر اپنی شکل کو تو بدلتا ہے، لیکن فطرت نہیں بدلتا۔ ہندوستان میں بھی اس نے یہاں کی تہذیب میں آکر ایک نیا روپ اختیار کیا اور ایک مستقل اور ہندوستانی تہذیب کی بنا ڈالی۔ دکن میں سب سے پہلے مسلمان جن کو تہذیبی اعمال کا موقع ملا وہ ترک ہیں جو برسوں کی تاریخ میں غلام خاندان کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ترکان دکن نے اس سرزمین کی تہذیب میں ایک چیز کا اضافہ کیا۔ موسیقی، رنگ کاری، آذری، یہاں پہلے ہی سے موجود تھی۔ لیکن پُرشکوہ تعمیر کاری کا رواج ترکوں سے شروع ہوا اور دنیا کی سب سے بڑی گنبد، بولی گنبد بیجاپور پر ختم ہوا۔ اس دور میں علاوہ اور چیزوں کے ہندوستانی قومیت کے لیے وہ انمول شئے پیدا ہوئی جس کو قومی زبان کہتے ہیں اور پراکرت، ترکی، فارسی اور عربی عام فہم الفاظ، محاورے اور لسانی اجزا مل کر ہندوستان کی قومی زبان بن گئی ہے جس کو ابتدا میں دکھنی، پھر ریختہ، اور اس کے بعد اردو کا نام نصیب ہوا۔ اور موجودہ دور تعصب میں ہندوستانی ہندی، ہندی ہندوستانی کی الجھن میں پھنس گیا۔

یہ مختصر سا خاکہ اس امر کے لیے کافی ہے کہ ایک سوچنے والا اور تجسس کرنے والا عالم اس کو ابتدائی خط و خال سمجھ کر آگے آئے اور ایک اور مبسوط کارنامہ پیش کرے جس سے دکن اور اہل دکن کو معلوم ہو کہ حقیقت میں ہندوستانی تمدن میں ان کا درجہ اور رتبہ کیا ہے اور ہندوستان کے مستقبل کے سنوارنے میں ان کی کیا ذمہ داری ہے۔

سید محمد اکبر وفاقانی

دکن قدیم اردو شاعروں کی نظر میں

ملا وجہی ملک الشعرائے عہد محمد قلی قطب شاہ مصنف قطب مشتری

(سنہ ۱۰۱۰ھ) و سب رس (سنہ ۱۰۴۵ھ)

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں (مقام) ... پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں (اجد)

دکھن ہے نگینہ، انگوٹھی ہے جگ ... انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہے لگ

دکھن ملک کمیں دھن عجب ساج ہے (تھا) ... کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے (اور)

دکھن ملک بہوتیچ خاصا اہے (بہت ہی) ... تلنگانہ اس کا خلاصا اہے

طبعی شاعر عہد ابوالحسن قطب شاہ مصنف بہرام و گل اندام

(سنہ ۱۰۸۱ھ)

جو کوئی یاد کرتا نئیں اپنا وطن (نہیں) ... او مردہ ہے بے پیرہن ہے اس کا کفن (پیرہن)

اگر کوئی غربت میں شاہی کرے ... اگر مال ہور ملک لاکھاں بھرے (اور)

اس کوں دیکھے کھول کر جو انکھیاں (آنکھیں) ... دیوے خاک تن کا وطن کا نشاں

وطن سب کوں دنیا میں پیارا اہے ... سفر ہے سو جوں بادبارا اہے

اجنتا

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں — جہاں گھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں

جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں — جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں

جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے

دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

شراب و شعر کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں — بہارِ زندگی غلطاں ہے سبزے کی اداؤں میں

نوائے سرمدی آتی ہے جھرنوں کی صداؤں میں — بیاں ممکن نہیں وہ لطف آتا ہے دعاؤں میں

یہاں صدیوں سے رائج پُرسکوں شیریں مقالی ہے

یہاں کا ذرہ ذرہ مظہرِ شانِ جمالی ہے

در و دیوار پر ہیں نقش حسن و عشق کی گھاتیں — پیامِ زندگی دیتی ہیں سر میلی ملاقاتیں

جواں برسات کے دن، جان لیوا چاندنی راتیں — فضا میں ہر قدم پر گونجتی ہیں دلنشیں باتیں

یہاں پیری پہ ہو جاتا ہے دھوکہ نوجوانی کا

سبق دیتا ہے ہر چہرہ حیاتِ جاودانی کا

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقشِ لاثانی — تصدق جن کے ہر خط پر تحیّر خانۂ مانی

مشکّل ہے شباب و حسن میں تخئیلِ انسانی — تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی

گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا

یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

بہانہ مل گیا دستِ جنوں کو حُسن کاری کا — اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصلِ بہاری کا

چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بے قراری کا — سکھایا گُر اسے جذبات کی آئینہ داری کا

دلِ کہسار میں محفوظ اپنی داستاں کر دی

جگرداروں نے بنیادِ جہانِ جاوداں رکھ دی

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جاں بھر دی ہے — ترازو دل میں ہو جاتی ہے وہ کاوِ نظر دی ہے

اداؤں سے عیاں ہے لذتِ دردِ جگر دی ہے — کھلیں گے راز اس ڈر سے دہن پر مہر کر دی ہے

یہ تصویریں بظاہر گو یونہی خاموش رہتی ہیں

مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کے بھید کہتی ہیں

کرشمہ ہے یہ سب اہلِ جنوں کی سعیٔ پیہم کا — جنھیں احساس تک باقی نہ تھا کچھ شادی و غم کا

دلوں پر عکس کھنچ آیا تھا جن کے حُسنِ عالم کا — قلم کو نقش ازبر ہو گیا تھا اسمِ اعظم کا

چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں

فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کر دیں

جہاں چھوڑا خوشی سے عشق کے پیغام کی خاطر — خوشامد اہلِ دنیا کی نہیں کی نام کی خاطر

نہ چھانی خاک در در کی کسی انعام کی خاطر — جیے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر

زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے

رہیں گے نقش ان کے، نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

سکندر علی وجد

دکن کا قدیم جغرافیہ

دکن سنسکرت زبان میں دکشینا کہلاتا ہے یعنی جنوبی علاقہ یعنی وہ علاقہ جو دریائے نربدا کے جنوب میں واقع ہے۔ سنسکرت اور بعض دوسری کتابوں میں اِس علاقہ کا نام دکشینا پتا بھی ہے یعنی جنوبی علاقہ۔ پراکرت زبان میں اس علاقہ کا نام دکھینا بادہا (DAKKINA BADHA) ہے یونانیوں نے اسے دکھینا باڈس (DAKHINABADES) لکھا۔ فاہیان نے اسے اپنے سفرنامہ میں سنسکرت کی تقلید میں صرف TA-THSIN لکھا جو دکشینا کا مترادف ہے۔

قدیم ہندو جغرافیہ نویس نربدا کے جنوبی حصے کو دکن کہتے ہیں مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے دوران میں دکن کے علاقہ کو صرف کرشنا ہی تک قرار دیا اور حالیہ مورخین بھی دکن سے وہ علاقہ مراد لیتے ہیں جو دریائے نربدا اور کرشنا کے درمیان ہے بعض مورخین دکن کی سرحد کو بالاگھاٹ تک قرار دیتے ہیں اور بعض نے میسور کے شمالی حصہ کو بھی دکن میں شامل کیا ہے۔ جغرافی نقطۂ نظر سے یہہ سرزمین سطح مرتفع دکن کہلاتی ہے کیونکہ یہہ سمندر کی سطح سے تین ہزار سے پانچ ہزار فیٹ تک بلند ہے۔ عام طور پر ریاست حیدرآباد کو دکن کہتے ہیں
دکن کی سرزمین پہاڑی ہونے کی وجہہ سے یہہ قیاس کیا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں کوہ آتش فشاں بکثرت تھے۔ انہی پہاڑیوں کے بعض حصے تیز ہواؤں اور بارش کے عمل سے صدیوں بعد زرخیز اور قابل رہائش ہوئے۔ یہہ علاقہ کوہستانی ہونے کی وجہہ سے یہاں کی آب وہوا خشک ہے۔ اونچے پہاڑیوں کے نہ ہونے سے بارش کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ اس ملک کو نربدا، تاپتی، گوداوری، کرشنا اور ان کے معاون سیراب کرتے ہیں۔ علاقہ دکن پہاڑی ہونے کے باعث بے حد نشیب و فراز ہے جس کی وجہہ سے دریا اور ندیاں سرعت سے بہتی ہیں۔ ان کا دارومدار کلیتہً بارش پر ہے ان میں برسات میں بار بار طغیانیاں آتی ہیں اور گرما میں یہہ پایاب ہو جاتی ہیں۔ انہی وجوہات کی بناء پر یہہ ندیاں کشتی رانی کے قابل نہیں۔

دکن کے شمال میں بندھیاچل اور ست پڑا پہاڑ ہیں اور اس کے مشرق و مغرب میں مشرقی و مغربی گھاٹ ہیں اور جنوب میں دریائے کرشنا ہے جو جنوبی ہند کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ شمال میں کوہ بندھیاچل دکن کی اس طرح حفاظت کرتا ہے جس طرح ہمالیہ ہندوستان کی۔ علاوہ ازیں اس پہاڑ کے باعث ہندوستان دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ غرض بندھیاچل دو مختلف تمدنوں دو مختلف آب وہواؤں، زمینوں اور اقوام کو ایک دوسرے سے علحدہ کرتا ہے۔ شمالی پہاڑوں اور دریاؤں کے دشوار گذار راستوں کے باعث دکن کا تمدن بڑی حد تک محفوظ رہا۔ یہاں کے قدیم باشندے دراوڑی اسی باعث خارجی اثرات سے محفوظ رہے۔ یہہ اقوام تقریباً اب تک اپنے قدیم اعتقادات، رسم ورواج، اور عادات وخصائل پر قائم ہیں اسی طرح کرشنا کے حائل ہونے سے انتہائی جنوبی ہند کے تمدن میں بہت زیادہ قدامت ہے اس لئے کہ شمالی ہند کے بہت کم فاتحین نے اس طرف توجہہ کی۔

آریا وسط ایشیا سے افغانستان آنے اور پنجاب سے ہوتے ہوئے دوآب کے علاقے میں آباد ہوئے۔ دریائے سرسوتی اور تھانیسر کا درمیانی علاقہ ان کا مقدس مقام تھا یہیں ان کے عقائد اور مذہبی تصورات کا آغاز ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ ہندھیاچل تک پھیل گئے لیکن دکن کے شمالی پہاڑوں نے ایک عرصہ تک ان کی روک تھام کی جب آریا جنوب میں داخل ہوئے تو پہلے برار کی وادیوں میں سکونت اختیار کی اس کے بعد اور آگے بڑھے۔ رامائن اور مہابھارت میں بھی اس دکھنی سرزمین کا تذکرہ ہے۔ رلما سے عقیدت کے باعث شعرائے اِس علاقہ کو جنت نشان بتانے میں کسر اٹھا نہ رکھی۔ آریاؤں کی آمد کے وقت جنوب میں منظم معاشرت اور حکومتیں تھیں۔

دکن کی قدیم ترین وحشی قومیں گونڈ، بھیل، سنتال اور ٹوڈا ہیں۔ جو اب بھی جنگلوں اور پہاڑوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں اب بھی وہی اگلی بربریت ہے جب آریاؤں نے شمالی ہند میں اپنے قدم جمائے تو قدیم باشندوں یعنی دراوڑیوں کو سوائے جنوب کی طرف راہِ فرار اختیار کرنے یا ان کے تابع ہو کر غلام بنے رہنے کے کوئی اور صورت نہ تھی۔ اسی طرح جب دراوڑی جنوبی ہند میں داخل ہوئے تو انھوں نے بھی آریاؤں کی طرح یہاں کے قدیم باشندوں پر جبر و زیادتی کی ہوگی۔ ایک عرصہ بعد آریاؤں نے جنوبی ہند کا رخ کیا جہاں انھیں قدیم حکومتوں سے سابقہ پڑا جن سے انھوں نے ربط و اتحاد قائم کیا۔

دکن کی قدیم تاریخ بالکل تاریک ہے۔ جس طرح ہندوستان قدیم کی کوئی ہم عصر تاریخی تصنیف نہیں اسی طرح قدیم دکن کی بھی لہٰذا دکن کے قدیم خاندانوں کا حال معلوم کرنا بہت مشکل ہے البتہ تاریخ سے متعلق چند پراگندہ اوراق ملتے ہیں جن کا مرتبہ افسانوی ہے اور کچھ مختصر حالات شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ کتبات سے جو چٹانوں اور تانبے کے پتروں پر کندہ ہیں یہاں کی مذہبی اور معاشرتی تحریکات پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی سلسلہ میں ان تحریکات کی سرپرستی کرنے والے حکمرانوں کے واقعات بھی معلوم ہوجاتے ہیں قدیم سکوں سے حکمرانوں کے نام اور ان کے سنین ظاہر ہوتے ہیں جس مقام سے یہ سکے برآمد ہوتے ہیں ان سے حکمرانوں کے حدود سلطنت یا اثرات کا پتہ لگتا ہے۔ پرانوں سے بھی چند بڑے راجاؤں کا حال معلوم ہوتا ہے، سنسکرت ادب کی جن حکمرانوں نے سرپرستی کی ان کے بھی واقعات سنسکرت کی کتابوں میں چیدہ چیدہ ملتے ہیں۔ نیز بعض چینی کتابوں میں صرف مذہبی معاملات کی حد تک ان راجاؤں کے حالات لکھے ہوئے ہیں جنھوں نے جین مت کی حمایت کی لیکن ان میں کوئی ترتیب و تنظیم نہیں، پہلی صدی عیسوی میں بدھ مت جب چین میں مروج ہوا تو بہت سے چینی سیاح بدھ کے مقدس مقامات کی زیارت کرنے کے لئے ہندوستان آئے ان سیاحوں نے جنوب کی بھی سیر کی اور لنکا تک گئے ان کی تحریروں سے بھی دکن کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اشوک کے تیسری صدی ق م کے کتبوں میں دکن کی بعض حکومتوں کا تذکرہ ہے۔ بعض یونانی اور رومی مورخین کے بیانات سے پانچویں یا چھٹی صدی ق م تک کی حکومتوں کے واقعات ظاہر ہوتے ہیں۔ باوجود ان ماخذوں کے دکن کے چند ایسے علاقے رہ جاتے ہیں جن کی قدیم تاریخ کا پتہ لگانے کا کوئی ذریعہ نہیں

دکن میں مختلف اقوام آباد ہیں جن کی مختلف زبانیں ہیں اور انہی زبانوں کے اعتبار سے یہاں کے علاقے موسوم ہیں۔ بیدر سے اوپر شمال مغربی علاقہ میں مرہٹی زبان بولی جاتی ہے۔ یہ علاقہ مہاراشٹر کہلاتا ہے، اس میں برار کا ایک حصہ، تلنگانہ اور کونکن کا علاقہ شامل ہے، تلنگانہ کا علاقہ مہاراشٹر کے مشرق میں ہے اس میں اندھرا اور کلنگ سلطنتیں تھیں یعنی ندیائے گوداوری کے

جنوب میں آندھرا سلطنت اور شمال میں کلنگ، مسلمانوں کے دور میں تلنگانہ کا مرکز ورنگل تھا، کنڑی علاقہ بیدر سے ادھونی تک اور مغرب میں دریائے کرشنا کے منبع تک پھیلا ہوا ہے تلنگانے کے نیچے تامل علاقہ ہے جو راس کماری تک ہے ۔

ان علاقوں پر مختلف زمانوں میں مختلف حکمرانوں نے حکومت کی، اشوک کے کتبات اور قدیم پرانوں کے دیکھنے سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ جنوب کے قدیم ترین حکمران پانڈیا، چولا اور چیرا ہیں ان کا تمدن ۲۵۰ ق م سے بھی پہلے کا ہے، یہاں ۲۵۰ ق م میں بدھ مت کی تعلیم و تلقین کے لئے اشوک نے مبلغین بھیجے جنھوں نے یہاں کے باشندوں کو بدھ مت کے فلسفہ کی تعلیم دی اس زمانہ میں دکن ڈنڈا کرانیا (DANDAKARANYA) یا ڈنڈکا (DANDAKA) یعنی صحرائے ڈنڈک کہلاتا تھا ۔

آندھرا سلطنت

رامائن میں لکھا ہے کہ گوداوری اور کرشنا کے درمیان اندھرا خاندان حکومت کرتا تھا جس سے یونانی جغرافیہ نویس بھی واقف تھے، قدیم تاریخی ماخذوں کے دیکھنے سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ اندھراؤں کی حکومت تقریباً ۱۸۰ ق م سے شروع ہوئی۔ انھوں نے دھنیا کٹکا (DHANYAKATÁKA) کو اپنا مرکز قرار دیا جو دریائے کرشنا پر تھا۔ ان کی سلطنت شمال میں بندھیاچل سے جنوب میں دریائے کرشنا تک، مشرق میں خلیج بنگال سے مغرب میں بحیرۂ عرب تک پھیلی ہوئی تھی ۔ پروفیسر بھنڈارکر کا خیال ہے کہ اندھرا خاندان دکن پر ۲۳۰ ق م سے ۲۱۸ء تک برسرِ اقتدار رہا مہاراشٹر اور تلنگانہ کا تمام علاقہ ان کے تابع تھا۔ وسنٹ اسمتھ کا خیال ہے کہ اندھرا کا پائے تخت سری کاکولم تھا جو دریائے کرشنا پر واقع تھا۔ شائد دھنیا کٹکا کا نام بدل کر سری کاکولم ہوگیا ہو یا بدل گیا ہو۔

اس زمانہ میں گجرات اور بمبئی کے علاقہ میں ستراپوں کی حکومت تھی ۔ ستراپ کے معنی صوبہ دار کے ہیں ۔ یہہ ایرانی لفظ ہے۔ اندھرا خاندان کے ایک حکمران بل بائے کرنے ۱۲۶ء میں ستراپوں کے علاقہ مہاراشٹر پر قبضہ کیا اسی زمانہ میں مالوہ میں ایک اور ستراپ خاندان حکمران تھا۔ اس خاندان کے ایک راجہ رودرادامن اول نے جس کا پائے تخت اجین تھا اندھرا خاندان کے راجہ سے مہاراشٹر کا علاقہ چھین لیا، جب تلنگانہ کے اندھرا خاندان میں یجن سری یا یجنا سری ۱۷۳ء میں برسرِ اقتدار ہوا (جس کا عہد حکومت ۲۰۲ء تک ہے) تو اس نے مالوہ کے ستراپوں سے جنگ کی اور ان کی سلطنتوں کے بعض صوبے اپنی سلطنت میں شامل کر لئے ۔

دکن میں دو آندھرا سلطنتیں تھیں، ایک مشرق میں جس کا پائے تخت دھنیا کٹکا تھا اور دوسری مغرب میں جس کا مرکز پیتھان (PAITHAN) تھا جو اب پیٹن کہلاتا ہے اور صوبہ اورنگ آباد کے ایک تعلقہ کا مستقر ہے، پیٹن دریائے گوداوری کے شمالی کنارے پر ہے۔ یہہ پرتستان (PRATISTHAN) بھی کہلاتا ہے یہہ دکن کا قدیم ترین شہر ہے اشوک نے اپنے مبلغ یہاں بھی بھیجے تھے، بطلیموس (PTOLEMY) کے قول کے مطابق یہہ آندھرا بادشاہ پلومائی (PLUMAYE) دوم کا پائے تخت اور اہم تجارتی مرکز تھا۔ یہہ مشہور آندھرا راجہ سلباہانا (SALMAHANA) کی جائے پیدائش ہے اور اس کا پائے تخت بھی رہا۔ اب بھی یہاں بہت سے منادر اس کی قدیم عظمت کی یادگار ہیں۔ آندھرا خاندان کا کب اور کس طرح خاتمہ ہوا کچھ بھی پتہ نہیں چلتا۔

جب کہ آندھرا سلطنت عروج پر تھی شانذ راشٹراکوٹ سلطنت اس کی باجگزار تھی جس کا علاقہ بندھیاچل کے شمال وجنوب میں تھا' اٹ توم یا راشٹراکوٹ سلطنت کے شمال میں گپتا حکومت تھی ان کے علاوہ ایک اور خاندان کدمب پانچویں صدی عیسوی میں مرہٹہ علاقہ میں برسراقتدار تھا جن کا مرکز ہالسی تھا اس سلطنت میں کنڑا اور میسور کا علاقہ شامل تھا۔

اسی پانچویں صدی عیسوی میں پلوا کو عروج حاصل ہوا اور اس نے آندھرا کے مشرقی پائے تخت اور علاقوں پر قبضہ کیا۔ آندھرا دور میں ملک کی تجارتی حالت بہت اچھی تھی۔ یہاں ایشیا' مصر' روم' یونان' چین اور دوسرے مشرقی مقامات سے سفراء آتے تھے شام میں جنگ میں ہندوستانی ہاتھیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ آندھرا سلطنت کے بعض علاقوں میں رومی سکے بھی دستیاب ہوئے ہیں پروفیسر بھنڈارکر کے قول کے مطابق آندھرا کے خاتمہ کے بعد تین سو سال تک دکن کے حکمران خاندانوں کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

چالوکیا

دکن کی سلطنتوں کے حالات وضاحت کے ساتھ چھٹی صدی عیسوی کے وسط سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں خاندان چالوکیا حکمران تھا۔ چالوکیا یا سولنکی کا تعلق چاپ قوم سے ہے جو گرجر کی ایک شاخ ہے' گرجر جو شمال مغربی ہندوستان میں زیادہ آباد ہیں ان کا تعلق ہون سے ہے۔ شمالی ہند کے پرہار اور راجپوت قبائل دراصل ان وحشی اقوام کی تبدیل شدہ شکل ہیں جو پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان میں داخل ہوئی تھیں ان میں سے ادنیٰ درجہ کے لوگ گرجر کہلاتے ہیں اور اعلیٰ درجہ کے راجپوت چالوکیا خاندان کا ابتدائی تعلق شمالی ہند کے راجپوتوں سے ہے جو کچھ عرصہ بعد دراوڑیوں میں خلط ملط ہو گئے۔ چالوکیا نقل مقام کر کے راجپوتانہ سے دکن آئے۔ اس خاندان کی بنیاد ایک سردار پلکیسن اول نے ڈالی۔ یعنی ۵۵۰ء میں واتاپی ضلع بیجاپور (موجودہ مقام بادامی) پر قابض ہو کر اس نے ایک چھوٹی سی سلطنت قائم کی اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے پلکیسن نے اشومیدھ کی رسم منائی تھی اس کے دونوں بیٹوں کیرتی وامن اور منگلیس کے عہد میں سلطنت مشرق اور مغرب کی طرف پھیلی۔ کیرتی ورمن اول ۵۶۶ء میں تخت نشین ہوا۔ یہہ زبردست جنگجو تھا۔ ایک کتبہ میں لکھا ہے کہ اس نے جنوب کے تمام قبائل اور اقوام کو تابع کیا۔ مشہور بدھی راہب دھرما گپتا اسی کے عہد میں گزرا ہے جو مذہبی کتابوں کا چینی زبان میں ترجمہ کرتا تھا۔ کیرتی ورمن وشنو کی پوجا کرتا تھا۔ اس نے بادامی میں ایک غاری مندر تعمیر کروایا' منگلیس نے کوکن اور مغربی گھاٹ کا کچھ علاقہ بھی سلطنت میں شامل کیا۔

منگلیس کے بعد کیرتی ورمن کا بیٹا پلکیسن دوم تخت نشین ہوا۔ اس نے وینگی پر قبضہ کیا اور اپنے بھائی وشنو وردھن کو وہاں کا نائب السلطنت بنایا جس کا صدر مقام پشٹپور تھا جو اب ضلع گوداوری میں پیتھاپورم کہلاتا ہے۔ ۶۱۵ء میں وشنو وردھن خود مختار ہوا اور خاندان چولا' پانڈیا اور کیرل سے جنگ کی پلکیسن دوم نے ۶۳۰ء میں ہرش کو پسپا کیا' ۶۲۵ء تا ۶۲۶ء میں اس نے ایک سفارت ایران کے شہنشاہ خسرو دوم کے پاس روانہ کی جس کا طبری نے تذکرہ کیا ہے اجنتہ کے غار نمبر ۱ میں استرکاری کی ایک بڑی تصویر میں ایرانی سفیر ہندی راجہ کے آگے کھڑا ہوا ہے۔ اس تصویر سے ایرانی اور ہندی فنون لطیفہ کے اختلاط کی جھلک ظاہر ہوتی ہے۔

۶۴۱ء میں ہیون سانگ چینی سیاح پلکیسن دوم کے دربار میں حاضر ہوا' اس نے اجنتہ کی تعریف کی ہے۔ اس وقت چالوکیا سلطنت کا

مرکز واتاپی نہ تھا بلکہ ناسک ، ہرشں کے مقابلہ میں سہولت پیدا کرنے کے لئے پلکیسن نے ناسک کو موقتی پائے تخت قرار دیا تھا۔ اس نے کونکن کے موریا کو شکست دی ۔ راشٹر کوٹ کی طاقت توڑ دی اور کدمب کا بھی خاتمہ کیا اور مشرقی شامل سے بڑھ کر پتھاپورم کے قلعہ پر قبضہ کیا، کلنگ کے راجہ کو زیر کیا جس کا پائے تخت پوری تھا جو اب بھی جگناتھ کے مندر کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ اس نے چولا، پانڈیا اور کریل سلطنتوں پر بھی حملہ کیا۔

جنوبی ہند میں پلوا خاندان بہت طاقتور تھا، اگرچہ مسلسل کوشش کر کے چالوکیا راجاؤں نے ان کی قوت توڑ دی تھی پھر بھی ۶۴۲ء میں کانچی کے پلوا خاندان کے راجہ نرسمہا ورمن نے پلکیسن دوم کو شکست فاش دے دی اور بادامی کو اس بری طرح برباد کیا کہ تیرہ سال تک بادامی پر کسی نے حکومت نہ کی۔ جب ۶۵۵ء میں وکرماجیت اول (پلکیسن دوم کا بیٹا دور حکومت ۶۵۵ء تا ۶۸۰ء) تخت نشین ہوا تو اس نے پلوا سے اپنے باپ کا بدلہ لیا اور شہر کانچی پر قبضہ کیا اس نے چولا کو بھی شکست دی ۔ وکرماجیت کے پوتے وجیادیتا کے راشٹر کوٹ سے اچھے تعلقات تھے جن کی بنا پر راشٹر کوٹ کے اندرا راجا نے چالوکیا شہزادی سے شادی کی جس کے بطن سے دنتی درگا پیدا ہوا جب کیرتی ورمن دوم برسر اقتدار ہوا تو اس کے دور میں دنتی درگا نے بادامی پر قبضہ کیا جس سے مغربی چالوکیا سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی چالوکیا دور میں شاید پلوا کی مخالفت کے سلسلہ میں راجمندری کی بنیاد پڑی اور یہاں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا گیا کیونکہ جنوب والوں کے لئے کرشنا سے ہوتے ہوئے شمال کی طرف جانے کا راستہ یہیں سے گزرتا ہے ۔

مغربی چالوکیا کا پائے تخت بادامی ضلع بیجاپور میں ہے۔ یہاں جینوں کا ۶۵۰ء کا ایک غاری مندر ہے ۔ اس کے علاوہ تین غار برہمنی اثر کے ہیں۔ ان میں سے ایک ۵۷۹ء کا ہے یہاں دو قلعے ہیں ایک باون بندی اور دوسرا رن منڈل، چھٹی صدی عیسوی میں پلوا نے اس پر قبضہ کیا تھا۔ اس کے بعد چالوکیا اس پر قابض ہوئے ساتویں صدی عیسوی میں مشہور چینی جاتری ہیونسانگ یہاں آیا تھا اس نے لکھا ہے کہ اس کی راجہ (پلکیسن دوم) سے ملاقات ہوئی چھتری ذات کا ہے یہ راجہ وسیع النظر اور بلند حوصلہ ہے اس کے ماتحت وفاداری کے ساتھ اس کی خدمت بجالاتے ہیں اور راجہ کو ان سے خاص ہمدردی ہے ۔

یہاں کی زمین زرخیز ہے۔ غلہ خوب اگتا ہے۔ موسم گرم ہے یہاں کے باشندوں کے خصائل سادہ اور دیانت دارانہ ہیں ان کے قد اونچے ہیں اور طبیعت کے غالب ہیں اگر ان کی توہین کی جائے تو بری طرح بگڑتے ہیں اور بدلہ لیتے ہیں۔ جنگ میں ڈٹ کر لڑتے اور غنیم کا خوب تعاقب کرتے ہیں لیکن جب کوئی اپنے آپ کو ان کے حوالہ کر دیتا ہے تو وہ اسے ایذا نہیں پہونچاتے۔ جب کسی جنگ میں سردار ہار جاتا ہے تو اسے مارتے نہیں بلکہ اسے زنانی لباس پہناتے ہیں اور اسی طرح اسے زندگی کاٹنے پر مجبور کرتے ہیں ملک میں بے شمار پہلوان ہیں جو اکثر کشتی لڑتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ خوب پیتے اور لڑتے ہیں۔ اگر وہ کسی کو سڑک پر مار دیں تو قانوناً انھیں گرفتار نہیں کیا جاتا۔ یہاں ہاتھیوں کو بھی خوب پلایا جاتا ہے ۔ اپنے پہلوانوں اور جنگی ہاتھیوں پر راجہ کو فخر ہے ۔

واتاپی کے حکمرانوں کے دور میں بدھ مذہب " بادی کے ایک بڑے حصے میں رائج تھا جس کا ہیون سانگ نے ذکر کیا ہے۔ اس وقت یہاں بدھ مت کے بہت سے مندر اور خانقاہیں تھیں، لیکن بدھ مت کو زوال ہو رہا تھا۔ کیونکہ برہمنی مذہب کے اثرات بڑھ رہے تھے

چنانچہ خود راجہ پلکیسن اول نے اشومیدھ کی رسم منائی، برہمنی مت کی ترقی کے ساتھ ان کے منادر بھی چوطرف بننے لگے اور پران کے دیوتاؤں برہما، وشنو اور شیوا وغیرہ کی پوجا ہونے لگی، بادامی غاری مندر میں منگلیس کے عہد میں وشنو کی پوجا ہوتی تھی جو اس کا تعمیر کرلیا ہوا تھا ان مختلف مذاہب کا سلطنت میں پایا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ چالوکیا راجہ تمام مذاہب کے ساتھ رواداری برتتے تھے۔

باوجود اس کے بدھ مت بتدریج برہمنی مذہب اور جین مت کے مقابلہ میں معدوم ہوگیا۔ ہندو خاص طور پر قربانی کی طرف توجہ کرنے لگے۔ اس زمانہ میں بدھ اور جین مت والوں سے ہندوؤں نے غاروں میں مندر تراشنے کا فن سیکھا۔ مرہٹوں کے علاقہ کے جنوبی حصے میں عام طور پر جین مذہب مقبول تھا، آٹھویں صدی عیسوی میں زرتشتی مذہب بھی ہندوستان میں رائج ہوا۔ خراسان کے جلاوطن پارسی ۷۳۵ء میں پہلی دفعہ احاطہ بمبئی کے ضلع تھانہ میں بمقام سنجان آباد ہوئے۔ پلکیسن دوم اور وکرما جیتا دوم نے جینوں کی مدد کی اور ان کے منادر تعمیر کروائے، ۶۷۵ء میں یہاں مشہور قواعد کا عالم (PUUYAPADA) تھا۔ جیسا بیان ہوچکا ہے کہ سلطنت زیادہ وسیع ہو جانے سے انتظامات کی خاطر پلکیسن دوم نے ونگی پر اپنے بھائی وشنو وردھن کا تقرر کیا جس نے کچھ عرصہ بعد اپنی علیٰحدہ حکومت قائم کرلی اور اس طرح دو چالوکیا خاندان ہوگئے مغربی چالوکیا کا مرکز بادامی تھا اور مشرقی کا ونگی۔ ونگی گوداوری اور کرشنا کے دہانوں کے قریب ہے۔ بدھ مت کا زبردست دشمن اور ذی اثر شخص شنکراچاریہ اور مشہور عالم (AKALANKA) اسی زمانہ کے ہیں آٹھویں صدی میں کلنگ اور مشرقی دکن پر مشرقی چالوکیا اور دکن کے وسطی اور مغربی حصہ پر راشٹرکوٹ حکمران تھے۔ دسویں صدی کے اختتام پر راشٹرکوٹ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئے جس کے باعث مغربی چالوکیا کا دوسرا دور شروع ہوا جو مغربی چالوکیا خاندان کی رجعت کہلایا جاسکتا ہے۔ تیلا دوم نے ۹۷۳ء میں راشٹرکوٹ کے آخری راجہ کک دوم کو شکست دی اور نئے مغربی چالوکیا خاندان کی بناء ڈالی، اس نے راشٹرکوٹ شہزادی سے شادی کی اس کا عہد حکومت ۹۷۳ء سے ۹۹۶ء تک ہے، اس کے دور میں سلطنت بلاری اور میسور کے بعض بعض حصص تک پھیل گئی تھی۔

اسی زمانہ میں چولا حکمران راجا راجہ نے ونگی پر قبضہ کیا اور چالوکیا خاندان کے ایک لڑکے کو تخت نشیں کرکے واپس ہوا اس راجہ نے جس کا نام وی مالا دیتا ہے راجا راجہ کی لڑکی سے شادی کی اس کی اولاد نے مشرقی چالوکیا اور چولا سلطنت پر حکومت کی بالآخر مشرقی چالوکیا حکومت کا ۱۰۷۰ء میں خاتمہ ہوگیا جس سے مغربی چالوکیا کا اقتدار بہت بڑھ گیا اور وہ تمام دکن پر حاوی ہوگئے۔ ۱۰۴۲ء میں مغربی چالوکیا خاندان میں سومیسورا اول تخت نشین ہوا تھا جس نے کلیانی کو دارالسلطنت قرار دیا جس کے باعث یہ چالوکیاں کلیانی کہلاتے ہیں۔ کلیانی ممالک محروسہ سرکار عالی میں ہے۔ اس خاندان نے بھی قدیم چالوکیا کی طرح دو سو برس حکومت کی سمیسورا اول نے چولا کے راجا راجہ کو شکست دی، دھارا (مالوہ کے علاقہ میں ہے) اور جنوبی کانچی پر حملہ کیا اور ان دونوں کو فتح کیا۔

۱۰۷۶ء میں وکرماجیت اول یا بکرمانک تخت نشین ہوا۔ اس نے کانچی فتح کیا اور دوارا سمدرا کے خاندان ہوسل سے سخت جنگ کی دوارا سمدرا کو دواراوتی پور بھی کہتے تھے مسلمان مورخین نے اسے دوارا سمندر لکھا اس کے کھنڈر ضلع حسن میسور میں موجود ہیں اس نے اپنے نام سے ایک سنہ جاری کیا جو کبھی مقبول نہ ہوا، وکرماجیت نے وشنو کا ایک بڑا مندر تعمیر کروالیا اور اس کے آگے ایک تالاب بنوایا اور اس کے قریب ایک شہر آباد کیا جو وکرما پورا کہلاتا تھا، اس کے عہد میں رعایا خوش حال تھی۔ کشمیری پنڈت

(BILHANA) کے قول کے مطابق ملک میں ہر طرف امن تھا۔ کہیں چوروں کا خوف نہ تھا جو اچھے انتظام کی دلیل ہے۔ علاوہ اس کے بادشاہ نیک منش، فیاض اور ہمدرد تھا اس نے علم کی خوب سرپرستی کی، یہہ کلیانی کا بڑا راجہ تھا جس کے عہد میں سلطنت انتہائی عروج کو پہونچی، اور بقول بلہانا کلیان ہر اعتبار سے عدیم المثال تھا، یہی مشہور قانون داں وجنانیسور کا وطن ہے جس کی تصنیف متاکشرا ہندو قانون کی سب سے زیادہ مستند کتاب ہے۔ کلیانی احاطہ بمبئی کے ضلع تھانہ میں ہے۔ (PRIPLUS) کے قول کے مطابق کلیانی کی اہمیت دوسری صدی عیسوی سے شروع ہوئی یہہ شہر تجارت کے اعتبار سے مشہور تھا، بڑے بڑے تجار یہاں آتے تھے شائد یہہ شہر ۵۳۳ء میں آباد ہوا یہاں پیتل اور شیشم کا کام اچھا ہوتا تھا اور کپڑے بھی اچھے بنتے تھے، چودھویں صدی میں مسلمان حکمرانوں نے اس کا نام اسلام آباد رکھا۔

وکراماجیت کے مرنے کے بعد چالوکیان کلیانی کو زوال شروع ہوا، راجہ تیل سوم کے عہد میں سپہ سالار افواج بجل یا وجالیا بجالا نے بغاوت کی اور تمام سلطنت پر قابض ہوگیا ۱۱۶۲ء سے ۱۱۸۳ء تک بجل اور اس کے جانشینوں نے حکومت کی جس کے بعد خاندان چالوکیا کے ایک شہزادہ سمیسور چہارم نے بجل کے جانشینوں سے ملک کا بہت بڑا حصہ حاصل کیا لیکن یادوا خاندانِ دیوگری اور ہوسل خاندان دوارا سمدرا کے عروج کے باعث اس کا اقتدار جاتا رہا یعنی ۱۱۹۰ء میں کلیان سلطنت کا خاتمہ ہوا۔

بجل کے عہد میں ایک مذہبی انقلاب ہوا جس سے شیو کے مذہب نے دوبارہ زندگی پائی اور ایک نیا فرقہ قائم ہوا جس کا نام ویراسیوس یا لنگایت ہے جو اب تک موجود ہے۔ بجل مذہباً جین تھا، اس کے متعلق یہہ مشہور ہے کہ اس نے فرقہ لنگایت کے دو پرہیز گاروں کو بلا وجہ اندھا کیا تھا جس کے بدلہ سرپرست مذہب لنگایت بسوا (BASAVA) کے اشارہ ۱۱۶۷ء میں راجہ کو قتل کیا گیا اس مذہب کے ماننے والے عام طور پر کنڑی علاقوں میں آباد ہیں۔

وکراماجیت کے عہد میں تاجروں نے بدھ مذہب کے لئے خانقاہیں تعمیر کروائیں اور ان کے اخراجات کے لئے رقمیں اور زمینیں فراہم کیں اس زمانہ میں جین مت کو تفوق حاصل نہ تھا، لنگایت فرقہ کے نکلنے کے بعد تو جین مت کا اثر اور بھی زائل ہوگیا، لنگایت مذہب زیادہ تر تجار میں پھیلا جو پہلے جین مت کے طرفدار تھے۔ لنگایت لنگ کو حیات کا مبدا سمجھتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ یہہ ویدوں، تناسخ بچپن کی شادی کے مخالف ہیں۔ یہہ بالکل حقیقت ہے کہ ان کے مذہب کا بانی بسوا برہمن تھا لیکن انھیں برہمنوں سے سخت نفرت ہے اس مذہب کے جاری ہونے سے نہ صرف بدھ مت جنوب سے ناپید ہوا بلکہ جین مت کو بھی زوال شروع ہوا۔

راشٹراکوٹ

۷۵۳ء تا ۹۷۳ء

راشٹراکوٹ یادو نسل کے تھے راجہ (RATTA) کے ایک بیٹے کا نام راشٹراکوٹا تھا جس کے نام سے یہہ خاندان مشہور ہوا۔ آٹھویں صدی کے درمیان میں دنتی دُرگا نامی ایک سردار نے جو راشٹراکوٹ خاندان سے تعلق رکھتا تھا خاندان چالوکیا کے راجہ کرماجیت دوم کے بیٹے کیرتی ورمن دوم کو شکست دی اور راشٹراکوٹ سلطنت قائم کی۔ جب عوام اس کی طرف سے بدظن ہوئے تو اس کے چچا کرشنا اول نے

اسے تخت سے اتار دیا اور خود راجہ بنا، بعض کتبوں سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ دنتی درگاہ لاولد تھا شائد اس کے مرنے کے بعد کسی اور وارث تخت کو ہٹا کر کرشنا تخت نشین ہوا، دنتی درگا کو تخت سے علحدہ کرنا اس لئے ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت طاقتور حکمران تھا۔

کرشنا اول کے عہد میں ایلورا کا مشہور کیلاس کا مندر تعمیر ہوا۔ یہہ مندر ایک چٹان میں ترا شا گیا ہے جو فن تعمیر کے اعتبار سے غیر معمولی ہے۔ اسی خاندان کے ایک حکمران گوبند سوم نے ۷۹۳ء تا ۸۱۵ء سلطنت کو شمال میں بندھیا چل اور مالوا اور جنوب میں کانچی تک وسعت دی اور اپنے بھائی اندراج کو جنوبی گجرات میں نائب السلطنت مقرر کیا، اس کے بعد اموگھورش تخت نشین ہوا۔ (۸۱۵ء تا ۸۷۷ء) اس نے زیادہ تر ونگی کے مشرقی چالوکیا راجاؤں سے جنگ کی۔ اس نے اپنا دارالسلطنت ناسک سے مانیا کھیت بدل دیا اسی شہر کو عرب مورخین نے مانلیہ لکھا ہے، اب یہہ مالکھیڑ یا ملکھیڑ کے نام سے ریاست نظام میں ہے، یہہ اس زمانہ کا بہت مشہور اور بارونق شہر تھا، اموگھورش کے جانشین کرشنا دوم نے جینیوں کے ننگے فرقے دگمبر کی بہت سرپرستی کی جن سین، گنبھدرا اور دوسرے علماء کی توجہہ کے باعث اس فرقہ کو بہت تقویت حاصل ہوئی جس کی بدولت بدھ مت کے اثرات دکن سے رفتہ رفتہ زائل ہوتے گئے، اور بارھویں صدی تک یہہ مذہب دکن سے معدوم ہوگیا۔

اسی خاندان کا ایک راجہ اندر سوم نے قنوج پر کامیاب حملہ کیا، اور ۹۴۹ء میں چول خاندان کے راجہ دت پر فوج کشی کی اس زمانہ میں ہندوؤں اور بدھ مت والوں میں زبردست رقابت تھی، راشٹر کوٹوں کے ابتدائی دور میں برہمن وید کی تعلیم کے مطابق خوب قربانی کرتے تھے، اس زمانہ میں جین مت کو بھی فروغ حاصل ہوا، راشٹراکوٹوں کی علمی سرپرستی کے باعث ان کے دربار میں شعرا کا اجتماع ہوا

آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں یعنی ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کی فتح سے سندھ پر اسلامی سیاسی اثرات غالب آئے، راشٹراکوٹ خاندان کے ان عرب حملہ آوروں سے دوستانہ تعلقات تھے اور گرجروں سے مخالفت تھی، گرجروں نے عربوں سے اچھے تعلقات نہ رکھے جس کے باعث انھیں نقصان پہونچا، اس سے بچنے کے لئے راشٹراکوٹوں نے ان نووارد حملہ آوروں سے اتحاد کرلیا تھا، جس کے باعث مسلمان سوداگر اور سیاح مغربی علاقوں میں بہ آسانی تجارت کرتے تھے اور بہت سے مغربی ساحل پر آباد ہوے، ان مسلمان تاجروں اور سیاحوں نے اپنے سیاحت نامے لکھے جن میں یہہ راشٹراکوٹ راجاؤں کو بل ہرا لکھتے ہیں جس کے معنی ہندوستان کا سب سے بڑا راجہ ہیں، انھیں بل ہرا اس لئے لکھتے ہیں کہ یہہ خود کو ولبھ کہتے تھے۔ اور یہہ لفظ رائے کے ساتھ مل کر بلہرا ہوگیا، چالوکیا راجہ بھی ولبھ اپنے نام کے ساتھ لکھتے تھے، شائد انہی سے یہہ طرز راشٹراکوٹوں نے اختیار کی، ولبھ رائے یا بلہا رائے مقامی استعمال سے بلہرائے ہوا اور عربوں نے اسے بلہرا لکھا۔

راشٹراکوٹ راجاؤں کی مسلمان سیاحوں نے بہت تعریف کی، ان کے عہد کا کیلاس کا مندر دنیا کے عجائبات میں ہے۔ ان راجاؤں نے سنسکرت ادب کی سرپرستی کی اور بہت سے مندر شاہی مصارف سے تعمیر کروائے۔

ان تمام سلطنتوں میں چالوکیا سلطنت زیادہ عرصہ تک باقی رہی یہہ ایسے زمانہ میں یعنی ۱۱۹۰ء میں ٹوٹی جب کہ تمام ہندوستان کی سیاسی حالت بدل رہی تھی کیونکہ اسی سنہ میں مسلمانوں نے شہاب الدین غوری کے تحت ہندوستان پر حملے کئے اور یہاں اپنی

حکومت قائم کی جو صدیوں تک برقرار رہی۔ جغرافی اعتبار سے چالوکیا جیسی وسیع سلطنت میں مختلف زبانوں کے علاقے تھے جو فطرتاً زبانوں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے علحدہ ہو کر اپنی علحدہ حکومتوں کے علم بردار ہو گئے۔ مرہٹواڑی کے علاقہ میں یادو اسلطنت قائم ہوئی جس کا پائے تخت دیوگیر موجودہ دولت آباد تھا۔ آندھرا یعنی تلنگانہ میں کاکتیا سلطنت جس کا مرکز ورنگل تھا۔ تیسرے کنڑی علاقہ میں ہوسلیا خاندان برسر اقتدار تھا جس کا پائے تخت دوارا سمدر تھا۔

کاکتیا خاندان سنہ ۱۱۰۰ء کے بعد نمایاں ہوا۔ اس کے طاقتور راجہ پرتاپ رودر اور گنپتی تھے۔ اس خاندان نے مسلمانوں کے مقابلہ تک اچھی طرح حکومت کی۔ یادو خاندان کے راجہ خود کو سری کرشنا کی نسل سے سمجھتے تھے۔ یہ لوگ جنوب میں ہوسلیا حکومت سے برسرپیکار رہے اور شمال میں گجرات تک اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ ان کا بڑا حکمران سنگھنا (سنہ ۱۲۱۰ء تا سنہ ۱۲۴۷ء) تھا۔ اس خاندان نے سنسکرت کی سرپرستی کی۔ علاء الدین خلجی (سنہ ۱۲۹۶ء تا سنہ ۱۳۱۶ء) نے اپنے آخری دور حکومت میں نہ صرف دکن بلکہ تمام جنوبی ہند کو مستقل طور پر حکومت دہلی کے تابع کیا۔ لیکن اس کے انتقال کے بعد مرکزی حکومت کی کمزوریوں سے جنوب کے حکمرانوں نے فائدہ اٹھایا۔ جب محمد تغلق (سنہ ۱۳۲۵ء تا سنہ ۱۳۵۱ء) برسر اقتدار ہوا تو اس نے سنہ ۱۳۲۶ء میں دیوگری کا نام دولت آباد قرار دے کر اسے اپنا پائے تخت بنایا لیکن فوراً ہی بعض اسباب کی بنا پر اپنے ارادہ سے باز آیا مگر جنوب کو اپنے قابو سے نکلنے نہ دیا اور ورنگل پر دست رسی کرکے اس کا نام سلطان پور رکھا۔ محمد تغلق کے آخری عہد میں گجرات اور دکن کے امرا نے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی چنانچہ موقع پا کر انھوں نے سنہ ۱۳۴۶ء میں حسن گنگو بہمنی کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا جس نے دکن میں ایک طاقتور حکومت قائم کی جو بہمنی سلطنت کہلاتی ہے جس کا دارالسلطنت گلبرگہ تھا۔

دکن کی قدیم تاریخ کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شمالی ہند اور دکن اکثر ایک دوسرے کے ممنون منت رہے چنانچہ آندھرا سلطنت جو موریا کی ہم عصر تھی، اس کے ایک فرد نے اشوک کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد مگدھ پر حکومت کی اور یہ کنوا کا آندھرا خاندان کہلاتا ہے۔ حملوں کے سلسلہ میں بھی دکن کے حکمرانوں کو بعض دفعہ تفوق حاصل ہوا یعنی پلکیشن دوم نے ہرش کو شکست دی اور اندر سوم نے قنوج پر کامیاب حملہ کیا۔ قدیم دکن کی تہذیب و تمدن اور سیاسی حالات کا پتہ لگانا اس لئے مشکل ہے کہ اس خطہ میں سنہ عیسوی سے بھی صدیوں پہلے سے حکومتیں قائم تھیں جن کی کوئی مفصل سند نہیں ملتی نیز یہ سرزمین مختلف اقوام کی آماجگاہ ہے کیونکہ یہ خطہ شمالی و جنوبی ہند کے درمیان واقع ہے۔ علاوہ ازیں اپنی قدرتی خوبیوں کے باعث بھی یہ ہمیشہ سے دلکش اور جاذب نظر رہا۔

سید سراج الدین

نقوشِ اجنٹہ

نگاہِ عشق سے دھوئی ہوئی ہیں تصویریں ‏ چمک رہی ہیں یہاں آرزو کی تقدیریں

پگھل گئے ہیں کہیں صاف ہو گئے ہیں کہیں ‏ وہ سختی دلِ ناکام پتھروں میں نہیں

یہ حسن و عشق کی پوجا کے کارنامے ہیں ‏ یہ رنگ و نور کے درد آشنا فسانے ہیں

دکن کی خاک میں ہے ابد کی زندگی کی خاموش ‏ دکن کی خاک میں اندر کے ہے پریم کا جوش

نقوشِ حسن کو خونِ جگر سے دھوتے ہیں ‏ یہ پتھروں میں نہیں بزمِ دل میں سوتے ہیں

ہے دیوتاؤں کی تعبیر زندگی میں حسن ‏ ہے پارساؤں کی تصویرِ زندگی میں حُسن

چمک ہے روح کی رنگوں کی راجدھانی میں ‏ چمک ہے عشق کی پتھر کی سخت جانی میں

نظر نواز بنا اور جانگداز بنا! ‏ زمینِ شوق کا ہر ذرہ عشق باز بنا

زمیں پہ رفعتِ جاں خود نمائی کرتی ہے ‏ وہ دیکھ بزمِ تصور خدائی کرتی ہے!

باقی

خواتین دکن نمبر

اس مرقع دکن کے ساتھ اس کا ایک **ضمیمۂ خواتین** علحدہ کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے جس میں دکن کی بیش انشا پرداز خاتونوں کے نہایت دلچسپ اور مفید مضمون اور نظمیں شامل ہیں، یہ اصل میں اسی دکن نمبر کا حصہ ہے جو صنف لطیف کے رشحات قلم پر مشتمل ہے۔ وہ ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسواں کی طرف سے اس کی سرگرم معتمد مخدومہ سکینہ بیگم صاحبہ کے پرخلوص مساعی کی وجہ سے نہایت خوبی، نفاست اور لطافت کے ساتھ مرتب اور شائع ہو رہا ہے۔ اس کی عام قیمت ۸ؔ رکھی گئی ہے لیکن صرف سب رس کے خریداروں کو ختم فروری تک نصف قیمت پر محض اس وجہ سے دیا جائے گا کہ یہ سب رس ہی کا ایک حصہ ہے۔ اس خواتین دکن نمبر کے بعض مضمون نگاروں کے نام یہ ہیں:-

رالعہ بیگم صاحبہ (زنانہ کالج)	فاطمہ بیگم صاحبہ ادا	تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ	قمر النساء بیگم صاحبہ
کبریٰ اقبال عبد الروف	زبیدہ ضیاء الدین انصاری	بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیرؔ	رالعہ بیگم صاحبہ (معلمہ محبوبیہ اسکول)
افسر النساء بیگم صاحبہ	ممتاز جہاں بیگم صاحبہ صوفی	صفیہ صدیق فریدہ بیگم صاحبہ	جہاں بانو بیگم صاحبہ بی، اے
لطیف النساء بیگم صاحبہ بی، اے	ذاکرہ بنت فضل اللہ احمد صاحب	تسنیم ربانی بی، اے	مسز صوفی ام، اے۔

دکن کی اسلامی فتوحات

"دورِ وسطیٰ میں دکن اور شمالی ہند کے تعلقات" سنہ ۱۲۹۴ء تا سنہ ۱۳۵۱ء

سنہ ۱۲۰۶ء میں جب دہلی کی اسلامی سلطنت قائم ہوئی تو اس کے حدود زیادہ وسیع نہ تھے۔ بنگال، گجرات، مالوہ، قنوج، اجمیر اور دوآبہ کے کچھ حصے اس میں شامل تھے سنہ ۱۲۹۴ء تک اس کو بنگال سے سندھ اور جنوب میں دریائے نربدا تک وسیع کیا گیا۔ جب دہلی کی حکومت خلجی خاندان کے ہاتھ آئی تو جلال الدین خلجی کے پیش نظر کسی قسم کا فتوحاتی یا تعمیری کام باقی نہ رہا۔ علاء الدین خلجی صوبہ دار کڑہ شاہی فوجوں کے ہمراہ اودھ کے قریب بھیلسہ کی فتح میں مصروف تھا یہاں اس کو دکن کی مہاراشٹرا سلطنت کے حالات معلوم ہوئے جس کا مرکز دیوگڑھ تھا یہ سلطنت کوہ ست پڑا کے جنوب میں واقع تھی۔ چونکہ یہ خطہ نامکمل واقع ہوا تھا اور اس کے پیش نظر سلطنت دہلی پر قبضہ کرنے کا منصوبہ پہلے ہی سے تھا اس لئے اس نے بغیر سلطان کی اجازت کے آٹھ ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ دیوگڑھ کی کوچ کیا۔

یوں تو جنوبی ہند کے ساحلوں پر مسلمان عرب تاجروں نے آباد ہوکر اسلامی آبادکاری کی بنیاد ڈال دی تھی لیکن فرشتہ اور شہریار کی تحریروں کے بموجب ان تاجروں نے کوئی سیاسی حیثیت حاصل نہ کی۔ بلکہ وہ دوسرے فرقوں کی طرح آباد ہوئے۔ ان عرب تاجروں کے ہمراہ بعض بزرگ فقیر اور درویش بھی آئے جن میں بابا ظاہر، خواجہ خضر اور شیخ عبداللہ حنیف بھی تھے۔ ان بزرگوں نے سماجی اتحاد میں نمایاں حصہ لیا جس سے مخلوط تہذیب و تمدن کا وجود ہوا۔ "انسانی برادری اور وحدت کا پیام سرزمین دکن پر بالکل نئے اصول سے پیش کیا گیا جو آگے چل کر شمالی ہند پر بھی پھیلا اور ہندوستانی تمدن کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

علاء الدین کے حملے کے وقت دکن میں تین خود مختار سلطنتیں تھیں۔ سنہ ۱۱۹۰ء میں جب چالوکیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا تو مہاراشٹرا، تلنگانہ اور کرناٹک صوبے خود مختار ہو گئے۔ مہاراشٹرا کا پایۂ تخت دیوگڑھ تھا جہاں یادو خاندان کا راجہ رام دیو حکمراں تھا "تلنگانہ" کے مرکز ورنگل پر کاکتیا خاندان کی ایک عورت رودرما دیوی اپنے پوتے کی کمسنی کی وجہ سے حکمران تھی۔ کرناٹک کے مرکز دوارسمدرا پر ہوئسل خاندان کا راجہ بیر بلال حکمران تھا۔ یہ سلطنتیں بہت متمول تھیں کیونکہ ان کے حدود میں سونے، چاندی اور جواہرات کی کانیں تھیں اور اس کے علاوہ گھوڑے ہاتھی کافی تعداد میں موجود تھے۔

علاء الدین خلجی کی روانگی سے قبل بعض صوفی اور فقیر منش بزرگ دکن کی طرف روانہ ہو چکے تھے جن میں سے بعض تو راستہ کی گھاٹیوں پر آباد ہو گئے اور بعض آگے بڑھتے چلے گئے۔ ان لوگوں سے علاء الدین کو راستہ معلوم کرنے میں بڑی مدد ملی۔ دولت کی ہوس اور اپنے منصوبوں کو کامیاب بنانے کی کوشش میں اس نے راستہ کی مشکلات کا مطلق خیال نہ کیا۔ اس کی فوج بالاگھاٹ سے ہوتی ہوئی ایلچپور پہونچی جو مہاراشٹرا سلطنت کی فوجی چھاؤنی تھی یہاں معمولی جھڑپ ہوئی اور ایلچپور پر قبضہ کر لیا گیا جو دکن کا باب الداخلہ ہے۔ یہاں اس نے ضروری معلومات حاصل کیں۔ اس کے بعد آگے بڑھ کر دیوگڑھ (دولت آباد) کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

راجہ رام دیو قلعہ بند ہو گیا۔ اس زمانہ میں اس کا بیٹا شنکر دیو کسی جاترا میں گیا ہوا تھا۔ راجہ نے اس اچانک حملے سے پریشان ہو کر صلح پیش کیا۔ اس صلح نامہ میں فرشتہ کے بیان کے بموجب علاء الدین کو چھ سو من سونا، سات من موتی، دو من جواہرات اور ہزار من چاندی اور اس کے علاوہ ریشمی تھان، گھوڑے، ہاتھی وغیرہ ہاتھ آئے۔ سالانہ خراج کا وعدہ لے کر یہ واپس ہو رہا تھا کہ شنکر دیو آگیا اور اس نے علاء الدین کی فوج پر حملہ کر دیا۔ لیکن اس پر بھی علاء الدین کو کامیابی ہوئی اور اس نے نئے صلح نامہ کی رو سے دوگنا تاوان حاصل کیا۔ ایلچپور پر اس نے مستقل قبضہ رکھنا ضروری سمجھا کیونکہ اس کو آئندہ بھی دکن سے تعلقات قائم رکھنے تھے۔ یہ واپس ہو گیا لیکن بعض صوفی اور درویش ایلچپور اور اطراف و اکناف کی

پہاڑیوں پر آباد ہوگئے۔ یہی سب سے پہلی دکن کی اسلامی آبادکاری کی ابتدا ہے۔ علاء الدین کا یہ حملہ محض اتفاقی اور اپنے سیاسی منصوبوں کی تکمیل کے سلسلہ میں دولت کے حصول کی خاطر ہوا۔ دکن پر براہ راست حکومت کرنے کا کوئی خیال علاء الدین کے دماغ میں نہ تھا۔ اس حملے کے بعد دکن کا راستہ شمالی ہند کی طاقتوں کے لئے کھل گیا اور ساتھ ہی ساتھ دکن کے سیاسی حالات پر بھی اس کا اثر پڑا۔

علاء الدین خلجی کو دکن میں وہی درجہ حاصل ہے جو محمود غزنوی کو تاریخ ہند میں۔ جس طرح محمود نے ہندوستان کی دولت سے اپنی سلطنت کو مستحکم اور مالا مال کرلیا اسی طرح علاء الدین نے دکن کی دولت سے سلطنت دہلی کو حاصل کیا اور بادشاہ بننے کے بعد اسی دولت سے اپنے مخالفین کے منہ بند کردیے۔ اور وہ قوت حاصل کی جو آج بیسویں صدی میں آمروں کو حاصل ہے۔

دکن پر دوسرا حملہ سنہ ۱۳۰۶ء میں ہوا کیونکہ دیوگری کے راجہ نے خراج ادا کرنا روک دیا تھا۔ علاء الدین اس دوران میں سلطنت کے کاروبار اور فتوحات میں مصروف تھا اور دکن کی طرف سے کسی قدر غافل بھی ہوگیا جس سے فائدہ اٹھاکر رام دیو نے تین سال تک مسلسل خراج ادا نہ کیا۔ سلطنت دہلی کی جانب سے ملک کافور کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی گئی لیکن راجہ نے بغیر مقابلہ کئے اطاعت قبول کرلی اور دہلی جاکر ایک ماہ تک شاہی مہمان رہا۔ دربار سے اس کو رائے رایاں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا اور سرخ چتر لگانے کی اجازت دی گئی۔ گجرات کا ضلع نیسری بھی اس کی عملداری میں دے دیا گیا۔ اس طرح دیوگری پر پورا سیاسی اقتدار حاصل ہوگیا۔

سنہ ۱۳۰۹ء میں تلنگانہ کے مرکز ورنگل پر حملہ کیا گیا۔ اس حملہ سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ سلطنت دہلی کے پیش نظر دکن پر حملہ کرنے کا ایک خاکہ موجود تھا۔ ملک کافور کی ماتحتی میں شاہی فوجیں ورنگل کی طرف روانہ ہوئیں۔ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ علاء الدین نے ملک کافور کو یہ حکم دیا تھا کہ ورنگل پر قبضہ کرنے کے بجائے دولت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ شاہی فوجیں ایلچپور، قندہار، دیوگری سے ہوتی ہوئی ورنگل پہونچیں۔ راستہ میں دیوگری کے راجہ کی جانب سے شاہی فوج کیلئے ضروری انتظامات کردیے گئے تھے۔ ہنمکنڈہ پر قبضہ کرکے قلعہ کا محاصرہ کرلیا گیا۔ قلعہ بہت مضبوط اور مستحکم تھا۔ تھوڑے دنوں کے اندر ہی راجہ رودر دیو نے صلح کرلی اور سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا اور نذرانہ و تاوان کے سلسلہ میں کثیر مقدار سونا، چاندی اور زر و جواہرات پیش کیا جو ایک ہزار اونٹوں پر لادا گیا۔ ہاتھی اور گھوڑوں کی ایک کثیر تعداد بھی ہاتھ آئی۔ پروفیسر کرشنا سوامی اینگار نے امیر خسرو اور برنی کے بیانات کا حوالہ دیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ورنگل کی پوری دولت ملک کافور کے ہاتھ آگئی تھی۔ اس طرح دکن کی دو متمول سلطنتوں پر سیاسی اقتدار قائم ہوگیا۔ اب صرف جنوب ہند میں دو اور سلطنتیں باقی رہ گئی تھیں۔ ایک دوار سمدرا کی ہویسلا سلطنت اور دوسری سلطنت پانڈیہ جو مالابار میں واقع تھی۔

ملک کافور نے ورنگل کی فتح کے وقت ہی جنوبی سلطنتوں کے حالات معلوم کرلیے تھے۔ دہلی پہونچنے کے بعد اس نے سلطان سے مالابار پر حملہ کی اجازت لے لی چنانچہ سنہ ۱۳۱۰ء میں ایک بڑی فوج کے ساتھ مالابار کی طرف روانہ ہوا۔ اس حملہ کو امیر خسرو نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے کیونکہ وہ خود اس میں ہمراہ تھے۔ دکن کی پہاڑیوں اور دشوار گذار راستوں کا حال بہت ہی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ راستہ میں رام دیو نے رسد کا انتظام کردیا تھا۔ اور کچھ فوجی ہاتھی بھی پیش کئے۔ نربدا، تاپتی کے علاوہ اس فوج کو تین اور دریا، گوداوری، سینی اور بھیما عبور کرنے پڑے۔ بندری کے مقام پر ملک کافور ٹھیر گیا تاکہ مالابار سلطنت کے حالات معلوم کرے۔ اس وقت سلطنت کے لئے دو دعویداروں بیر پانڈیہ اور سندرا پانڈیہ کے درمیان جنگ ہو رہی تھی جو حقیقی بھائی تھے۔ دوار سمدر کا راجہ بلال دیو اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاکر اپنی فوج کے ساتھ حملہ کے لئے آگیا لیکن جوں ہی

اس کو مسلمانوں کی آمد کی اطلاع ہوئی وہ واپس ہوگیا۔ ملک کافور نے اس کا تعاقب کیا اور اُسے دوار سمدر (دوار وتی پور) میں محصور کر لیا جو سلطنت کرناٹک کا مرکز تھا۔ بلال دیو نے صلح نامہ پیش کیا جس پر ملک کافور نے سالانہ خراج کی پابندی عاید کی اور تاوانِ جنگ جو ایک کثیر مقدار میں ہاتھ آیا مع ویر بلال سوم کے دہلی روانہ کر دیا تاکہ علاء الدین کے روبرو اپنی اطاعت کا اقرار کرے۔

مانا باہ سے سندر پانڈیہ نے بھاگ کر دہلی کا رخ کیا اور علاء الدین کے پاس پہونچا اور سلطنت پر ویر پانڈیہ قابض ہوگیا۔ مسلمانوں کی آمد پر راجہ نے پایہ تخت کو چھوڑ کر ایک جزیرہ میں پناہ لی۔ ملک کافور نے بغیر کسی جھگڑے کے کثیر مال و دولت پر قبضہ کر لیا۔ واصف اور خسرو کے بیان کے بموجب اس نے ۳۲۰ ہاتھی، ۲۰ ہزار گھوڑے، ۲۵۰۰ پونڈ سونا اور جواہرات کے کئی صندوق حاصل کئے۔ اس دولت سے اس کے خیالات پلٹ گئے اور ایک خود مختار سلطنت کے قیام کا منصوبہ اس کے دماغ میں آیا لیکن حالات سے مجبور ہو کر اپنے منصوبہ کو کامیاب نہ بنا سکا۔ اس شکست سے اس کی ہمت بڑھ گئی اور یہ آگے بڑھتا ہوا رامیشورم تک چلا گیا جہاں اس نے یادگار کے طور پر ایک مسجد بھی تعمیر کروائی۔ یہاں اس نے مسلمانوں کو بھی دیکھا جن کا طرز معاشرت، نسلی تمایز اور زبان وہاں کے ماحول اور جغرافی حالات کی وجہ سے بہت کچھ بدل گئی تھی۔ ۱۳۱۱ء میں یہ شمالی ہند کی سب سے پہلی اور انتہائی پیش قدمی تھی۔ اورنگ زیب صرف دریائے کاویری تک بڑھ سکا۔ اس طرح تاریخ ہند کا یہ دور جنوب ہند کی فتح اور سیاسی اقتدار کو حاصل کرنے میں سب سے نمایاں رہا۔

علاء الدین خلجی کے بعد اس کا دوسرا بیٹا مبارک خلجی جب ۱۳۱۶ء میں تخت نشین ہوا تو دیوگڑی میں بغاوت ہوگئی۔ وہاں ہرپال دیو نے نائب کو ہٹا کر تخت پر قبضہ کر لیا تھا۔ مبارک خلجی نے ہمت سے کام لے کر دیوگڑی پر حملہ کر دیا۔ اس نے پہلے خسرو کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ بھیجا اور اس کے بعد خود گیا۔ ہرپال دیو کو شکست ہوئی اور دیوگڑی پر براہ راست قبضہ کر لیا گیا۔ اس طرح یہاں راشٹرا سلطنت براہ راست شمالی ہند کے زیر حکومت آگئی گوگلہ اور ساگر پر فوجی عہدہ دار مقرر کر دیے گئے اور دیوگڑی پر ایک ترکی النسل صوبہ دار مقرر کیا گیا جس کا نام یک لکھی تھا۔ ان انتظامات کے بعد مبارک خلجی نے خسرو کو ورنگل کی تسخیر کے لئے روانہ کیا۔ . . . . ورنگل کے راجہ نے اطاعت قبول کر لی اور کثیر مال و دولت نذرانہ کے طور پر پیش کیا جس کی تفصیل ابن بطوطہ نے لکھی ہے یعنی ایک سو ہاتھی ۱۲ ہزار گھوڑے، ۶۰ صندوق جواہرات ۲۵۰ پونڈ سونا۔ ورنگل کی سلطنت کے پانچ اضلاع بھی دیوگڑی میں شامل کر دیے گئے۔

خسرو اس فتح کے بعد جنوبی ہند کی طرف روانہ ہوگیا۔ ضیاء الدین برنی نے خسرو کی اس جنوبی مہم کو بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ جن جن شہروں سے یہ فوج گزرتی تھی وہاں کے راجہ شہر چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ اس نے ان خالی شہروں سے بہت بڑی دولت حاصل کی۔ دولت کی فراوانی نے اسے باغی بنا دیا اور یہیں سے اس نے سلطنت دہلی پر قدم جمانے کے منصوبے شروع کر دئے۔ دکن کی دولت نے ہزاروں کو شاہی کے خواب دکھائے اور انھوں نے اسی قوت کے نشے میں سلطنت دہلی پر قبضہ بھی حاصل کیا۔

خلجی دور کے بعد تغلق دور میں غیاث الدین تغلق نے جب شاہی خزانہ خالی پایا تو اپنے بیٹے الغ خان کو ورنگل پر حملے کے لیے روانہ کیا۔ اس لیے یہاں کے راجہ نے دہلی کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھا کر خراج دینا بند کر دیا تھا۔ یہ حملہ ۱۳۲۲ء میں ہوا جب شاہی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا تو فوج میں یہ غلط خبر مشہور ہوگئی کہ غیاث الدین تغلق کا انتقال ہوگیا ہے جس کی وجہ سے محاصرہ پر برا اثر پڑا۔ راجہ کی فوج نے محاصرین کو سخت شکست دی۔ الغ خاں نے دیوگڑی میں پناہ لی۔ ضیاء الدین برنی اور ابن بطوطہ کے بیانات میں کچھ اختلاف ہوگیا ہے کیونکہ برنی اس غلطی کا ذمہ دار الغ خاں کو

بتاتا ہے اور بطوطہ اس کو مورد الزام نہیں سمجھتا۔ بہرحال واقعات کچھ بھی ہوں غیاث الدین تغلق نے اکثر لوگوں کو جو دہلی بھاگ آئے تھے سخت سزائیں دیں۔ اور ایک دوسری فوج الغ خاں ہی کی سرکردگی میں روانہ کی جس کے بعد قلعہ فتح ہوگیا اور راجہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر کے تلنگانہ کے علاقے کو بھی براہ راست دہلی کے تحت کر دیا گیا۔

سلطنت دہلی جو ۱۲۹۶ء میں صرف دریائے نربدا تک پھیلی ہوئی تھی ۱۳۲۰ء میں مالا بار تک پھیل گئی۔ مسلمانوں کی اتنی وسیع سلطنت اس سے قبل یا اس کے بعد کبھی قائم نہ ہوئی۔ خاندیس کے علاقے میں پٹھانوں کی نوآبادی اسی زمانہ میں قایم ہوئی۔ ان حملوں سے مسلمانوں کے اکثر قبیلے اور خاندان شاہان دہلی سے جاگیریں حاصل کر کے دکن کے مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے تھے۔

سلطان محمد تغلق (الغ خاں) کے ابتدائی زمانہ میں اس کے بھانجے بہاءالدین گرشاسپ نے جو گلبرگہ کے قریب ساگر میں متعین تھا بغاوت کر دی۔ اس کی سرکوبی کے لیے خواجہ جہاں کی قیادت میں شاہی فوجیں روانہ کی گئیں۔ بہاءالدین نے شاہی فوجوں کی آمد سے مرعوب ہوکر دریائے کرشنا اور تنگبھدرا کی درمیانی سلطنت کمپلی میں پناہ لی۔ یہاں اس کا تعاقب کیا گیا۔ یہاں سے یہ دوار سمدرا چلا گیا اور وہاں بھی اس کا تعاقب کیا گیا۔ اس تعاقب میں ان دونوں سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا گیا اور ان کو براہ راست دہلی کے تحت کر دیا گیا۔ بہاءالدین یہاں گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ روپوش ہوگیا اور پھر اس کا پتہ نہ چلا۔

محمد تغلق کے پیش نظر سب سے زیادہ مشکل مسئلہ مرکزی قوت کا قیام تھا اس لئے کہ مرکز کو موثر بنائے بغیر اتنی وسیع سلطنت پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ اس نے اس مسئلہ کا حل یہ سوچا کہ دہلی کے بجائے دیوگری کو مرکز بنایا جائے تاکہ شمال، جنوب، مشرق اور مغرب چاروں طرف سے اس کا فاصلہ یکساں رہے۔ دہلی میں بیٹھ کر جنوب ہند کے علاقے مالابار وغیرہ پر تسلط قائم رکھنا بہت ہی مشکل تھا اور پھر ایسے زمانہ میں جب کہ ذرایع حمل ونقل میں بڑی دشواریاں تھیں۔ نظری اعتبار سے اس کا یہ حل بہت ہی مناسب اور بہتر تھا لیکن عملی اعتبار سے اس کا یہ منصوبہ بیکار ثابت ہوا۔ اس نے اپنے اقتدار سے دہلی کو اجاڑ کر دولت آباد کو بسا لیا لیکن بہت ہی تھوڑے عرصے میں پھر دہلی واپس ہونا پڑا۔ اس رد و بدل سے دولت آباد (دیوگری) میں مسلمانوں کی ایک کافی تعداد آباد ہو گئی اور امرائے صدہ کا ایک بڑا حصہ یہیں مقیم ہوگیا۔ جس کے بعد انھیں امراؤں نے دہلی سے بغاوت کر کے ایک علیحدہ اسلامی سلطنت دکن میں قائم کی جو بعد میں سلطنت بہمنی کے نام سے مشہور ہوئی۔ دکن کی یہ خود مختار سلطنت محمد تغلق کی زندگی ہی میں قائم ہوئی اور بعد میں تاریخ ہند اور تاریخ دکن کی سیاسیات میں ایک بڑے انقلاب کا باعث ثابت ہوئی۔

سید کرار علی

افغانی قندھار نہیں۔ دکن کا قندھار جسے قندھار شریف کہا جاتا ہے۔ کیونکہ محمد تغلق کے ساتھ دکن میں آئے ہوئے اولیاء اللہ کی چودہ سو پالکیوں میں کا ایک کثیر حصہ قندھار شریف ہی کے حصہ میں آیا۔ یہ دکن کا بلگرام ہے، یہاں سے اولیاء، صوفیا، علماء، شعرا، مورخین اور مشاہیر پیدا ہوئے جن کے حالات اور کارنامے " مشاہیر قندھار دکن " میں پڑھیے جس کو اکبر صدیقی صاحب بی اے نے مرتب کر کے باتصویر شایع کیا اور اب ادارۂ ادبیات اردو کو اس کا حق تصنیف دے دیا ہے۔ (مہتمم)

سلطان محمد شاہ بہمنی
۷۷۵ھ - ۷۹۰ھ

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی
۸۲۵ھ تا ۸۳۹ھ

دکن پر بہمنی خاندان کی حکومت

سلطنت بہمنی کی مبارک تاسیس جو ۱۳۴۷ء میں عمل میں آئی وسط چودھویں صدی کا عظیم الشان واقعہ تھا۔ اس سلطنت کی حقیقی عظمت اس کے جلیل القدر سلاطین کی علمی و عملی شخصیت اور ان کے غیر معمولی سیاسی اور تمدنی کارناموں میں مضمر ہے۔ ان علم پروروں نے دکن کو ایک بلند پایہ سیاست اور پاکیزہ تمدن کے زیور سے اس قدر سنوارا کہ دنیا اس کو پہچاننے لگی اور اب بھی اس کی یاد تازہ ہے، دکن کی اصلی عظمت اسی خاندان کی وجہ سے ہے اس وقت دکن کو جس تمدن پر ناز ہے وہ سب شاہان بہمنیہ کا سرمایہ ہے انہیں سلاطین نے دکن کے طول و عرض میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی اور اس کو پھیلایا بہمنیوں کا کرشمہ تھا کہ انھوں نے بہت جلد دکن کو اپنا گھر بنالیا۔ اس ملک کی جغرافی خصوصیات اپنے میں جذب کرلیں اور اپنی حکومت انہیں خصوصیات کے مطابق بنائی یہ سلطنت اس وقت قائم ہوئی تھی جب کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کمزور ہونے کی وجہ سے سیاست منتشر ہو رہی تھی۔ اس کے ذمہ دار کچھ تو اس زمانے کے سیاسی حالات تھے جو خلجی خاندان کے خاتمے کے بعد ہندوستان میں رونما ہوئے بعض خاندان میں ہندوستان جیسے وسیع ملک کی رہنمائی کی اہلیت نہ تھی مرکز کی کمزوری سے ہر صوبے میں جداگانہ عمل داری قائم ہوگئی۔ دکن کی انفرادیت جس طرح پہلے زمانے میں قائم تھی پھر کھڑی ہوگئی اور امرائے صدہ کی بدولت جو دکن کے تاریخ ساز ہیں سلطنت بہمنی کی داغ بیل پڑ گئی

سلطنت بہمنی کا پہلا دور

سلطنت بہمنی کی تقریباً ڈیڑھ سو سال کی تاریخ ہے اس کا ابتدائی زمانہ جب کہ اس سلطنت کے بانی علاء الدین حسن اور اس کے بیٹے محمد شاہ اول نے حکومت کی عہد تاسیس تھا اس دور میں سلطنت کی بنیاد رکھی گئی اور دکن کے طول و عرض اور اس کی قومی اور جغرافی خصوصیات کا صحیح مطالعہ کرکے ایک نہایت موزوں نظام حکومت قائم کیا گیا یہ سلاطین بہمنیہ کا سیاسی کرشمہ سمجھنا چاہئے کہ انھوں نے ابتدا ہی سے دکن کو اپنا گھر بنالیا تھا۔ اس جدید ماحول میں اپنے آپ کو اس قدر مانوس کرلیا کہ قدیم اہل دکن ان کو اپنا بادشاہ تسلیم کرنے لگے۔ نظام حکومت اس طرح مرتب کیا گیا جو سب کے لئے خوش گوار تھا، ہندوؤں کو حکومت میں شریک کیا گیا جس کو تاریخ ہند کا پہلا واقعہ سمجھنا چاہئے، مرکزی حکومت کی بنیاد ڈالی گئی اور سلطنت مقامی معقول تقسیم کرکے صوبہ داری اور ضلع داری قلمرویں قائم کی گئیں، اگرچہ اس انتظام کا سہرا ان بادشاہوں کے سر ہے جو اس سلطنت کے بانی اور معمار تھے لیکن اس میں اسی سلطنت کے پہلے وزیر اعظم سیف الدین غوری کا بھی ہاتھ تھا۔ محمد شاہ کو اس بات کا احساس تھا کہ اس نے شاہی آداب کے لئے خاص اہتمام کیا تھا دربار کو مختلف طریقوں سے سجایا گیا، امراء و رؤسا کے کھڑے رہنے کی جگہ مقرر کی گئی اور بادشاہ کے بیٹھنے کے لئے تخت فیروزہ کے نام سے ایک تخت بنایا گیا جس کی بہت شہرت تھی اور ہندوستان کی تاریخ میں اب تک ایسا تخت نہیں بنا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں اسی تخت کی شہرت سے متاثر تھا اور تخت طاؤس کو بہمنی تخت کا نقش ثانی سمجھنا چاہئے نیز محمد شاہ کے دربار کا تزک و احتشام بھی بہمنیوں کی خاص اختراع ہے۔ اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔

محمد شاہ اول کا انتقال ۷۷۶ھ میں ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مجاہد شاہ تخت نشین ہوا جو تین سال سے زیادہ بادشاہی کرنے نہ پایا کیونکہ اس کے چچا داؤد نے اس کا خاتمہ کرکے خود تخت پر قبضہ کرلیا مجاہد شاہ کے ہمدردوں نے بہت جلد اس کا بھی خاتمہ کردیا اور علاء الدین حسن کے ایک پوتے کو جس کا نام محمد شاہ دوم ہے تخت نشین کیا گیا۔ محمد شاہ دوم کی تخت نشینی سے اس سلطنت کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے اس میں نہ صرف ملک کو خانہ جنگی سے نجات ملی بلکہ تمدنی ترقی کی نئی راہیں کھل گئیں محمد شاہ بہت تعلیم یافتہ اور علم دوست آدمی تھا اس کی وجہ سے دکن میں سب سے پہلے علمی سرگرمیاں شروع ہوگئیں جو اس سے پہلے نہیں ہوئی ہیں اور ظاہر ہے کہ محمد شاہ دوم سے پہلے جو زمانہ گذرا تھا وہ تاسیس اور تشکیل کا زمانہ تھا اس میں علمی ترقی نہیں ہوسکتی تھی۔ جب تک استحکام سلطنت کے ساتھ ملک میں سیاسی اطمینان نہ پیدا ہوجائے اہل علم اطمینان کے ساتھ علمی کام نہیں کرسکتے۔ محمد شاہ دوم کے کامیاب نظم و نسق کی وجہ سے ایک طرف تو امن قائم ہوگیا اور دوسرے طرف اس کی علم دوستی نے ملک میں علمی دلچسپیاں پیدا کردیں لائق علما جمع کئے گئے مدرسے کھول دئے گئے۔ استادوں کے لئے خاطر خواہ تنخواہیں اور طلبہ کے لئے وظائف مقرر ہوگئے ان علما میں سے جو اس زمانے میں دکن آئے تھے فضل اللہ انجو کا نام ہمیشہ یادر ہے گا جو دنیائے اسلام کا بہت بڑا عالم تھا اسی شخصیت کی وجہ سے دکن میں علم کی دیا روشن ہوئی اور اس کی روشنی ایسی پھیلی کہ دکن علم کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

سلطنت بہمنی کا انتہائی عروج

جس طرح محمد شاہ اول کے انتقال کے بعد خانہ جنگی کی بدنما شکل پیدا ہوئی تھی اور چند روز تک تمدنی ترقی مسدود ہوگئی اسی طرح محمد شاہ دوم کے بعد بھی بہت سی سیاسی بدمزگیاں پیدا ہوگئیں اور اس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ چند روز کے لئے سلطنت بہمنی کے وقار کو دھکا لگا محمد شاہ کا انتقال ۷۹۹ھ میں ہوا۔ اس کے جانشین غیاث الدین اور شمس الدین جو چند مہینوں کے فصل سے اس کے بعد تخت نشین ہوے اس گراں بار کے متحمل نہیں ہوسکے۔ ایک ترک غلام تغلچین نامی سلطنت پر بری طرح حاوی ہوگیا اور بادشاہ کٹ پتلی ہوگئے اس وقت ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو ملک کی صحیح رہنمائی کرسکیں۔ علاء الدین حسن کے دوسرے پوتے محمود خاں اور احمد خاں جو بہت لائق اور ذی علم تھے بہمنی سلطنت کے وقار کو بچانے کے لئے میدان میں آگئے اور سازش کرکے تغلچین کو ماردیا اور فیروز خاں تاج الدین فیروز شاہ کے لقب سے تخت فیروزہ پر بیٹھ گیا۔ جو اس خاندان بہمنیہ کا سب سے زیادہ جلیل القدر اور مایۂ ناز بادشاہ تھا۔ اس کے عہد حکومت میں دکن کی جس قدر ذہنی اور اخلاقی تربیت ہوئی اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے بہمنیوں کا تمام تر تمدن اسی عہد کی پیداوار ہے۔ فیروز شاہ فضل اللہ انجو کا شاگرد تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے استاد کے تمام سرمایۂ علم سے فائدہ اٹھایا تھا بلکہ اپنی رسا طبیعت اور غیر معمولی ذہن کی وجہہ سے ایسی علمی شان پیدا کردی تھی کہ دنیا کے سلاطین میں اس کی مثال نہیں ملتی اس نے تمام ملک میں اشاعت علم کے تمام ذرائع استعمال کئے۔ دور دراز سے علما جمع کئے اور ان کی خاطر خواہ تواضع کی۔ علم کی مجلسیں منعقد کیں اور ان میں وہ خود بھی ایسا حصہ لیتا تھا کہ گویا وہ بادشاہ نہیں ہے اسی پر حصر نہیں ہے بلکہ فرصت کے اوقات میں وہ بلند پایہ طلبہ کو جمع کرکے ان کو انتہائی مضامین میں درس دیا کرتا تھا۔ نتیجہ یہہ تھا کہ

فیروز شاہ کی ذی علم شخصیت کی وجہ سے دکن کے در و دیوار علم و فضل سے گونجنے لگے اور گلبرگہ علم کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

علمیت کے ساتھ فیروز شاہ میں سیاسی تدبر بھی کچھ کم نہیں تھا۔ ملک کی کامیاب سیاسی رہنمائی کی اور ہمسایہ سلطنتوں پر اس قدر رعب داب قائم کیا کہ سب سلطنت بہمنی کا لوہا مانتے تھے۔ نیز فیروز شاہ کے پاکیزہ ذوق کی وجہ سے دکن کے تمدن میں بڑی شگفتگی پیدا ہوگئی لباس وضع قطع نئے انداز میں ڈھل گئے لباس کی بعض اختراعیں جو فیروز شاہ نے بنائی تھیں وہ اب تک موجود ہیں اگر فیروز شاہ سے کوئی غلطی ہوئی تھی تو وہ صرف یہ ہی کہ اس نے اپنے بھائی احمد خاں کی جگہ اپنے بیٹے حسن خان کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا۔ احمد خاں عمر رسیدہ اور لائق آدمی تھا۔ اس نے خود فیروز شاہ کی تخت نشینی میں مدد دی تھی۔ اسی بنا پر اس زمانے کے مشہور بزرگ حضرت بندہ نوازؒ نے بھی احمد خاں کے لئے اپنا روحانی فیصلہ صادر کردیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں فریقوں میں ان بن ہوگئی اور احمد خاں کو تلوار کے زور سے تخت حاصل کرنا پڑا

سلطنت بہمنی کا آخری دور

احمد خاں جو اپنی روحانیت کی وجہ سے احمد شاہ ولی بہمنی کے نام سے موسوم ہے ۸۲۵ھ میں تخت نشین ہوا اس کی تخت نشینی سے سلطنت کے استحکام و توسیع میں کوئی اضافہ نہیں ہوا علم و فن کی سرگرمیاں اسی طرح قائم رہیں جس طرح فیروز شاہ کے عہد میں تھیں۔ لیکن اس کے عہد میں گلبرگہ کی جگہ بیدر کو پائے تخت بنا لیا گیا اس انتظام سے یہ فائدہ ہوا کہ پائے تخت کے لئے بیدر جیسی ایک بلند جگہ مل گئی لیکن گلبرگہ جو ایک زمانے میں علم و فن کا مرکز بن گیا تھا اس کی آب و تاب گھٹ گئی اب دنیا کی توجہ بیدر کی طرف منعطف ہونے لگی۔ شیخ آذری جو اس زمانے کا مشہور عالم ہے اسی زمانے میں دکن آیا تھا اور دربار کی فیاضیوں سے فائدہ اٹھا کر ملک کی علمی خدمت کرتا تھا۔ اس کو دربار سے یہ کہا گیا تھا کہ بہمن نامہ کے نام سے سلطنت بہمنی کی تاریخ لکھے۔ چنانچہ اس نے اپنی آخری عمر تک اس کی تکمیل بھی کی تھی لیکن افسوس ہے کہ وہ نایاب ہے ان بظاہر چھوٹی چیزوں کے قطع نظر جو بہت کچھ حوصلہ افزا معلوم ہوتی ہیں سلطنت کی تہ میں بہت سی چیزیں ایسی بھی تھیں جو آگے چل کر اسی سلطنت کے زوال کا باعث ہوگئیں یعنے اسی عہد سے طبقہ واری کشمکش کے بڑھتے آثار ظاہر ہونے لگے۔ علاء الدین حسن کے عہد سے جو امرائے صدہ اور ان کے خاندان دکن میں آباد ہوگئے تھے وہ اپنے آپ کو دکھنی کہتے تھے اور انھیں اس کا حق بھی تھا کیونکہ دکن کے حقیقی آبادکار اور سلطنت بہمنی کے بانی تھے۔ اور اس پر تقریباً ایک صدی گذر گئی اس کے بعد جو نو وارد ترکستان اور ایران سے یہاں آتے تھے وہ ان میں گھل مل نہیں سکے اور اہل دکن ان کو اپنا دشمن سمجھنے لگے طبقہ واری کشمکش۔ احمد شاہ کے بیٹے علاء الدین ثانی کے عہد میں جو ۸۳۸ھ میں تخت نشین ہوا بری طرح ظاہر ہوگئی یعنے دونوں فرقوں میں سخت خون ریزیاں ہونے لگیں ایک ہنگامہ تو اس قدر زبردست ہوا کہ جس میں تمام باہر کے لوگ مار دئے گئے۔ اگرچہ علاء الدین ثانی نے اپنے آہنی پنجہ سے اس آگ کو فرو کردیا لیکن اس کے جانشینوں کے عہد میں اس کی چنگاریاں پھر بھڑک اٹھیں اور بالآخر سلطنت بہمنی کو جلا کر خاک کردیا۔

علاء الدین ثانی کے بعد جس کا انتقال ۱۴۵۸ء میں ہوا تھا اس کا بیٹا ہمایوں اس کا جانشین ہوا لیکن یہہ تین سال سے زیادہ حکومت نہیں کر سکا۔ اس کی بے وقت موت سے بہت نقصان ہوا۔ اس کے بیٹے چھوٹے تھے، ایک بیٹا نظام شاہ بہمنی کے نام سے تخت نشین کیا گیا تھا وہ جلد مر گیا اور دوسرا بیٹا محمد شاہ لشکری کے نام تخت پر بٹھا یا گیا چونکہ اس کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی اس لئے اس کی ماں نرگس بانو مخدومہ جہاں ملک کی سیاسی رہنمائی کرتی تھی لیکن وزارت کی بڑی خدمت محمود گاواں ثانی ایک نووارد پر مرتقد ار ہو گیا۔ یہہ اگرچہ علاء الدین ثانی کے عہد میں باہر سے آیا تھا اور تجارت کرتا تھا لیکن محمد شاہ لشکری کی کمسنی کے زمانے میں اس نے بہت ترقی کرلی۔ اور سلطنت کے تمام سیاہ و سفید اس کے سپرد ہو گئے۔ محمد شاہ کے سن رشد کو پہنچنے کے بعد بھی اس کے اقتدار میں کمی نہیں ہوی محمود گاواں کے اقتدار سے بہت سے فائدے بھی ہوئے چنانچہ ملک میں علمی کام ہوے اور دستور میں اضافے ہوے لیکن اس کی تنگ نظری سے دکھنی ذاتیں بیزار ہو گیا اور اس کو مارنے کے درپے ہو گیا چنانچہ ایک خاص موقع پر جب کہ بادشاہ اور محمود گاواں مشرقی اور شمالی تلنگھانے کی مہم میں مصروف تھے ایک سازش ہو گئی۔ بادشاہ کو محمود گاواں کی طرف سے بدظن کیا گیا۔ بادشاہ نے ناعاقبت اندیشی سے اس کو مارنے کا حکم صادر کر دیا۔

محمود گاواں کا قتل جو ۱۴۸۱ء میں ہوا دکن کا بڑا واقعہ ہے اسی واقعہ کے بعد سے سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ کیونکہ جو لوگ اس کے قتل کے ذمہ دار تھے ان میں سیاسی رہنمائی کی صلاحیت نہ تھی۔ ملک حسن بحری جو نظام الملک کے خطاب سے سرفراز تھا اس فعل کا ذمہ دار تھا اگر اس میں محمود گاواں کی وزارت کے سنبھالنے کی صلاحیت ہوتی تو سلطنت اپنی جگہ قائم رہتی اور شیرازہ نہیں بکھرتا لیکن افسوس یہہ ہے کہ نظام الملک اور اس کا فریق بالکل خود غرض تھا۔ ان کی نا اہلیت اور خود غرضی کی وجہہ سے ہر قدم پر ملک کو نقصان پہنچنے لگا جو لوگ محمود گاواں کے آوردہ تھے سب حکومت سے متنفر ہو گئے اور ہر جگہ انحراف کرنے لگے محمد شاہ لشکری کی زندگی تک جو ۱۴۸۲ء میں ہوا تھا حالات کسی قدر رو براہ تھے لیکن اس کے انتقال کے بعد جب اس کے کمسن بیٹے محمود شاہ بہمنی کو تخت نشین کیا گیا تو علانیہ خود سری ظاہر ہونے لگی۔ اکثر صوبہ دار باغی ہو گئے چنانچہ ۱۴۹۰ء میں احمد نگر اور بیجاپور اور برار کے صوبہ داروں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا چند سال بعد گولکنڈہ بھی خود مختار ہو گیا۔ ۱۴۹۰ء کو سلطنت بہمنی کی آخری تاریخ سمجھنا چاہئے۔ بیدر میں جو سلطنت کا مرکز ہے قاسم برید ذی اختیار ہو گیا جو در اصل شہر کا کوتوال تھا محمود شاہ اور اس کے تمام جانشین سب اس کے ہاتھ میں کٹ پتلی ہو گئے تھے ۱۵۱۸ء میں محمود شاہ کے مرنے کے بعد اس کے چار بیٹے احمد شاہ، علاء الدین ثالث، ولی اللہ کلیم اللہ یکے بعد دیگرے برائے نام تخت پر بٹھائے گئے تھے لیکن یہہ سب بریدیوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی تھے۔ بالآخر کلیم اللہ حق ناشناس بریدیوں کی دست درازیوں سے تنگ آکر ۱۵۲۷ء میں احمد نگر بھاگ گیا اور اس کے ساتھ تخت فیروزہ پر بیٹھنے والے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

عبدالمجید صدیقی

تذکرہ ولی

مجاہد شاہ بہمنی

مجاہد شاہ سلطنت بہمنی کا تیسرا تاجدار ہے۔ اس کی جگہ ایسی صف میں ہے جہاں بالعموم کسی کی نظر نہیں پڑتی لیکن اپنے درجہ پر بھی وہ مطالعہ کے قابل ہے۔ اگرچہ اس کی مختصر زندگی کچھ زیادہ جاذب نظر نہیں مگر اس کے بعض پہلو نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ سبق آموز ہیں۔

مجاہد شاہ محمد شاہ کا بیٹا اور علاء الدین حسن گنگو کا پوتا تھا۔ یہ ۱۳۷۵ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۳۷۸ء میں قتل کر دیا گیا۔ اس طرح اس نے صرف تین سال حکومت کی۔ اس کا قاتل خود اس کا چچا داؤد شاہ تھا جب مجاہد شاہ نے وجیانگر پر حملہ کیا اور وہاں کے راجہ کشن رائے کو بری طرح شکست دی تو واپسی میں وہ دریائے کرشنا کے کنارے آرام کر رہا تھا کہ اس کے دشمنوں نے موقع پا کر اسے یہاں قتل کر دیا۔

مجاہد شاہ ایک جری اور نڈر حکمران اور ایک نہایت اچھا سپاہی تھا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی سلطنت کے چاروں طرف نظر ڈالی اور ان سب کو بغور دیکھا جہاں سے حملے ہوتے تھے۔ گرچہ سلطنت بہمنی کو خاندیس، مالوہ اور گجرات کی شمالی سلطنتوں سے بھی خطرہ تھا لیکن جنوبی سلطنت وجیانگر ہمیشہ پریشانی کا باعث رہتی تھی۔ علاء الدین اور محمد شاہ کے عہد میں اس سلطنت سے لڑائیاں ہو چکی تھیں اور کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ مجاہد شاہ کی نظر سب سے پہلے اسی ہمسایہ سلطنت پر پڑی۔ اس نے بین سلطنتی سمجھوتہ کرنا چاہا اور وجیانگر کو لکھا کہ آئندہ نزاع کا سدباب اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہمارے درمیان حدود کا تعین ہو جائے۔ چنانچہ مجاہد شاہ نے اپنی طرف سے یہ تجویز کی تھی کہ دریائے تنگبھدرا حد فاصل ہو۔ لیکن کشن رائے اس تجویز پر راضی نہیں ہوا۔ وہ رائچور اور مدگل کا دوآبہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اسی لئے اس نے تنگبھدرا کی بجائے دریائے کرشنا کو حد فاصل بنانا چاہا۔ لیکن مجاہد شاہ اس کو کیسے مان لیتا۔ چنانچہ اپنی تجویز کو منوانے کے لئے اس نے حملہ کر ہی دیا۔

مجاہد شاہ کے غیر معمولی توانائے جسمانی اور اس کے ساتھ اس کی شجاعت اور جوانمردی اس کی زندگی کے روشن پہلو ہیں۔ سلاطین بہمنی کا عام دستور تھا کہ وہ اپنے شاہزادوں کو خاطر خواہ تعلیم و تربیت دیتے اور درس و تدریس کے لئے لائق اساتذہ فراہم کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ تمام سلاطین بہمنی اچھے تعلیم یافتہ ہوتے تھے بعض تو ادبی قابلیت رکھتے تھے۔ نیز ان کو جسمانی اور فوجی تربیت دی جاتی تھی اور وہ اچھے سپاہی ہوتے تھے۔ چنانچہ تمام معرکوں میں سلاطین بہمنی بذات خود حصہ لیتے تھے۔ اسی ماحول میں مجاہد شاہ کی بھی اٹھان ہوئی تھی۔ چونکہ اس کے قویٰ بھی کافی اچھے تھے اس لیے اس پر تعلیم و تربیت کا غیر معمولی اثر ہوا تھا۔ فرشتہ کے قول کے مطابق وہ شمشیر، نیزہ اور خنجر کے سوا بات نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ مجاہد شاہ کے اس شوق شمشیر زنی کے متعلق بہمن نامہ کے اشعار یہ ہیں۔

ز گہوارہ چون پای بیرون نہاد	بہ تیر و کمان دست و بازو گشاد
ببستے تند گردن کشس پیل زور	کہ نشنید گفتے کسے وقت شور
چنان بر سر کنگرہ می دوید	کہ انگشت حیرت فلک می گزید

مجاہد شاہ سلطنت بہمنی کا بہت بڑا سپہ سالار تھا۔ اس کی سپہ سالاری کے حقیقی جوہر اس وقت نمایاں ہوئے جب کہ سلطنت وجیانگر سے اس کی ان بن ہو گئی تھی۔ وہ ۱۹ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا اور وجیانگر کے وقت اس کی عمر مشکل سے ۲۱ سال ہوگی۔ اس خونریز جنگ میں اس کا دلیرانہ معرکہ اس کی زندگی کا اعجوبہ تھا۔ کشن رائے کے مقابلے سے پہلے گنگاوتی کے آگے اس نے جو خونخوار شیر کا شکار کیا تھا وہ دکنیوں میں عرصہ تک زبان زد خاص و عام رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس انتہائی جرأت کا وجیانگر پر ایسا رعب پڑا تھا کہ کشن رائے دل ہی دل میں سہم کر رہ گیا تھی۔

کشن رائے کے عہد میں سلطنت وجیانگر کی جو عظمت تھی وہ سب کو معلوم ہے۔ اس کی فوجی طاقت بہت زیادہ تھی۔ ایسی طاقتور سلطنت کا مقابلہ کچھ آسان نہیں تھا۔ اس موقع کی نزاکت کے باوجود مجاہد نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ یہ بڑے گھمسان کا معرکہ تھا گو اس حملے سے کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا تھا لیکن اس میں مجاہد شاہ نے جو کارنامے دکھائے تھے وہ ہمیشہ یاد رہیں گے۔ کوئی معرکہ ایسا نہ تھا جس میں اس نے حصہ نہ لیا ہو۔ وجیانگر کی چڑھائی، شہر نگ کا حملہ، قلعہ ادھونی کا محاصرہ، اور رامیشورم تک کشن رائے کا تعاقب اس کے مشہور کارنامے ہیں جو بھلائے نہیں جا سکتے۔ ان چڑھائیوں میں ایک امتیازی بات یہ تھی کہ کہیں قتل عام نہیں کیا گیا۔ جو دشمن مقابلہ کرتا تھا اسی کو مارا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ مجاہد شاہ کے باپ محمد شاہ کی وصیت تھی جس کی پابندی کی گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شجیع سپہ سالار کی اوصاف میں یہ چیز داخل ہے۔

اگر مجاہد شاہ کی زندگی مہلت دیتی تو شاید دنیا کے بڑے بادشاہوں میں اس کا شمار ہوتا۔ دریائے کرشنا کے کنارے جہاں اس کے دشمنوں نے اس کا خاتمہ کرنا چاہا تھا اس وقت بھی اس نے اپنی فطری شجاعت کے جوہر دکھائے۔ یہ کیمپ میں سو رہا تھا کہ دشمنوں نے اس پر وار کیا۔ داؤد خاں نے خنجر بھونکا تو اس کی آنتیں نکل آئیں تھیں لیکن اس کے باوجود اس نے داؤد کو اس کے خنجر کے ساتھ پکڑ کر کھینچا اور قریب تھا کہ داؤد مر جاتا لیکن اس کے ایک ساتھی مسعود خاں نے اس کو مار دیا اور اس طرح دکن کا یہ ہونہار حکمراں موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

سلطان احمد شاہ ولی البہمنی

عبد الحفیظ صدیقی

احمد خاں بہمنی بن سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے دوسرے بیٹے تھے۔ ولادت ۷۷۴ھ م ۱۳۷۲ء میں بعہد سلطان محمد شاہ بن سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی ہوئی۔ باپ کے انتقال کے وقت یہ اور ان کے بھائی فیروز شاہ صغیر سن تھے۔ اور ان دونوں کی پرورش و پرداخت ان کے چچیرے بھائی محمد شاہ ثانی نے کی۔ ان دونوں کو تیر اندازی۔ چوگان بازی۔ سواری۔ پڑھنا۔ لکھنا غرض کہ ہر شاہی علم و فن کی اچھی تعلیم دی۔ اور شیراز کے مشہور اور متبحر عالم میر فضل اللہ انجو کو ہر دو کی تعلیم و تربیت کے لئے مقرر کیا اور اپنی دونوں بیٹیاں ان دونوں بھائیوں کو بیاہ دیں۔

جب فیروز شاہ بادشاہ ہوا تو احمد خاں کو خانخاناں کا خطاب دیا اور امیر الامرا مقرر کیا۔ وہ نہایت شجاع اور خوبصورت جوان تھے چہرہ روشن اور پیشانی خندہ تھی۔ خلوص ارادت سے حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو دراز سے بیعت کی۔ بصرف زر کثیر حضرت کے لئے ایک خانقاہ تعمیر کرائی اور ہمیشہ حاضر خدمت ہو کر اسرار معرفت کا سبق لیتے اور ہر محفل سماع میں شریک ہو کر نکات تصوف سے محظوظ اور توجہ حضرت سے بہرہ مند ہوتے تھے۔ چنانچہ حضرت نے ان کی نسبت بادشاہی کی پیشین گوئی کی تھی جس کی وجہ سے فیروز شاہ بہت رنجیدہ ہوا اور حضرت کو شہر گلبرگہ سے باہر جا کر رہنے کا حکم دیا۔ اور مصاحبین کے ورغلانے سے احمد خاں سے بھی بدظن ہوا اور اپنے دو غلاموں ہوشیار عین الملک و بیدار نظام الملک کی صلاح سے ان کو اندھا کرانے کا ارادہ کیا۔ جب ان کو اس کی اطلاع ملی تو اپنے فرزند علاء الدین کے ساتھ شہر سے بھاگ نکلے اور حضرت کے ارشاد و فیوض کے مطمئن ہو کر وہاں سے رخصت ہوئے۔

جب ان کے بھاگ جانے کی خبر فیروز شاہ کو ہوئی تو ایک فوج اپنے دو غلام ہوشیار اور بیدار کے ساتھ پکڑ لانے کے لئے روانہ کی۔ انھوں نے بھی اطلاع پا کر مختصر سی فوج تیار کر کے شاہی فوج کا مقابلہ کیا جس میں ان کو کامیابی حاصل ہوئی۔

فیروز شاہ ان کی فتح کی خبر سن کر قلعہ کا دروازہ کھلوا کر اپنے پاس بلوایا۔ وہ فیروز شاہ کے پاس گئے اور اس کے قدموں پر سر رکھ کر

جو حالت بیماری میں فرش پر تھا زار و قطار رونے لگے۔ فیروز شاہ نے سر اٹھا کر خوشی کے لہجہ میں کہا کہ میں نے تم کو اپنے عین حیات بادشاہ دیکھا تم شایان سلطنت ہو اور استحقاق اس کا تمہیں کو پہونچتا ہے۔ میں شفقت پدری سے حسن خاں کی ولیعہدی کی سعی کرتا رہا۔ جب کارفرمایان قضا و قدر میرے بعد تاج سلطنت تمہارے لئے نامزد کر چکے ہیں تو دوسرے کے لئے کوشش بے فائدہ ہے۔ حسن خاں کو تمہارے سپرد کیا۔ اٹھو آج ہی سے مہمات سلطنت کو انجام دینا شروع کرو۔ غرض شوال پانچویں ۸۲۵ھ کو تاج بادشاہ بھائی کا زیب سر کر کے تخت فیروزہ پر جلوہ گر ہوئے اور اپنا نام "احمد شاہ بہمنی" رکھا۔

مہمات سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلے خلف حسن بصری کو وکیل السلطنت کر کے ہزار دو صدی کا منصب عطا کیا اور ملک التجار خطاب دیا۔ اور ہوشیار و بیدار غلاموں میں سے ایک کو خطاب امیر الامرائی اور دوسرے کو دولت آباد کی فوج کی سپہ سالاری کے منصب سے سرفراز فرمایا۔ مرحوم فیروز شاہ کے بیٹے حسن خاں کو جو وارث تاج و تخت تھا اور جمیع ارکان دولت جس کے قتل یا قید کرنے کی صلاح دیتے تھے منصب پانصدی عطا کیا اور فیروز آباد جاگیر میں دیا اور وہاں اس کو آزادی سے رہنے اور سیر و شکار کرنے کی اجازت بھی عطا کی۔ یہ شہزادہ بچی کی زندگی تک وہاں سیر و شکار میں مشغول رہ کر اپنی زندگی خوب مزے سے بسر کرتا رہا۔

راجہ دیجیا نگر نے سرکشی شروع کی اور خراج دینے سے انکار کیا۔ علاوہ اس کے گزشتہ جنگ میں مسلمانوں کا بیدردی سے کشت و خون ہوا تھا اس کا بدلہ لینا بھی ضروری تھا۔ اس لئے پچاس ہزار سوار جرار ہمراہ رکاب لے کر دیجیا نگر کی طرف روانہ ہوئے۔ راجہ رائے ورنگل کی مدد سے مقابلہ میں آیا۔ دونوں فوجیں دریائے تنگبھدرا کے کنارے ایک دوسرے کے سامنے اتریں لیکن دونوں میں سے کوئی آگے بڑھ کر اول حملہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر بہمنی فوج کا ایک دستہ یکایک ایسی پھرتی سے دریا پار اترا کہ راجہ دیو رائے بھی حیران رہ گیا اور اس کی فوج فوراً منتشر ہو کر بھاگ نکلی۔

ایک دن احمد شاہ چند سواروں کے ساتھ شکار کو نکلے۔ ہندوؤں نے جو موقع کی تاک میں تھے پیچھا کیا اور چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے سلطان کے سب ساتھی کام آئے مگر اس اثنا میں کمک پہونچی اور دیجیا نگر کی تسخیر کا عزم ارادہ کیا۔ دیو رائے گھبرایا اور اس نے حیرانی میں کئی سال کے خراج کی بقایا رقم کو ہاتھیوں پر لاد کر فی الفور بارگاہ سلطانی میں داخل کر دیا۔ اور بہت ہی عجز و انکسار سے صلح کی درخواست کی۔ دونوں میں صلح ہوگئی۔ بوقت واپسی تلنگانہ پر چڑھائی کی۔ رائے ورنگل نے با فوج کثیر آپ کا مقابلہ کیا۔ آخر مارا گیا۔ ملک تلنگ کو اپنے تصرف و اقتدار میں لیا و مظفر و منصور ہو کر واپس ہوئے۔

انہیں ایام میں سلطان بیدر کے ایک میدان سے گزرے جو نہایت پر فضا تھا۔ حکومت کے لئے ایک مرکزی مقام کی ضرورت تھی جہاں سے پورے دکن پر حکومت کی جا سکے۔ بیدر چونکہ دکن کی سطح سے نہایت بلندی پر واقع تھا اس لئے سلطان نے اس کو پسند فرما کر یہیں شہر کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام احمد آباد بیدر رکھا۔ اور رجب ۸۲۶ھ م ۱۴۲۳ء میں گلبرگہ کے بجائے بیدر کو پائے تخت قرار دیا۔ یہاں قلعہ حصار اور محلات شاہی و باغات وغیرہ چار سال کے قلیل عرصہ میں تعمیر کرائے۔

بیدر میں سلطنت کرتے ہوئے چند سال گزرے تھے کہ امساک باراں سے سخت قحط پڑا۔ ندیاں اور باؤلیاں خشک ہوگئیں انسان و حیوان مرنے لگے۔ سلطان نے خزانہ کا منہ کھول دیا۔ اور غلہ کے شاہی ذخائر غربا و مساکین میں بانٹ دئے۔ جب ایک سال اس طرح گذرا اور دوسرے سال بھی بارش نہ ہوئی تو سلطان نے علما و مشائخ و زہاد کو ساتھ لے کر نماز استسقا ادا کی لیکن جب یہ بھی بے سود ہوا تو سلطان

بنفس نفیس صحرا کی طرف تشریف لے گئے اور تنہا بلندی پر چڑھ کر چند دوگانے ادا کئے۔ دعا مقبول ہوی اور اس قدر مینھ برسنے لگا کہ لوگ خوش ہوگئے اور اوسی دن سے سلطان احمد شاہ ولی کے لقب سے مشہور ہوگئے۔

سلطان کو قواعد لشکرکشی اور آئین فرمانروائی میں کافی مہارت تھی۔ وہ ہر کام میں بھائی کی پیروی کرتے سادات علماء اور مشائخ کی تعظیم و تکریم کرتے۔ فقیروں اور درویشوں سے بہت عقیدت رکھتے۔ صوم و صلوٰۃ کے اتنے پابند کہ کبھی تہجد اور اشراق تک قضا نہیں ہونے دی اور کل مہام سلطنت بذات خود انجام دیتے۔ غریب سے غریب رعایا کی فریاد سنتے اور انصاف فرماتے اور گاہے گاہے مثل ہارون رشید خلیفہ بغداد کے بھیس بدل کر رعایا کے حالات دریافت کرتے۔ کبھی مسجدوں اور مدرسوں میں جاکر وہاں کے حالات دیکھتے اور کبھی دفاتر میں جاکر ملک کے نظم و نسق کو ملاحظہ فرماکر اصلاحیں جاری فرماتے۔ غرض آپ نے اخلاق حسنہ سے خاص عام کو مطیع و فرمانبردار بنالیا تھا۔

جن دنوں میں سلطان جنگ میں مصروف تھے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ نے رحلت فرمائی۔ جس کا سلطان کو بہت صدمہ ہوا۔ ایک روز بھرے دربار میں اپنے صاحبزادوں کو طلب کیا اور سب کی طرف مخاطب ہوکر بولے۔ جب مالک اپنے بندہ کو اپنے پاس بلائے تو کیا کرنا چاہیئے۔ مجمع نے جواب دیا کہ اپنے مالک کا حکم بجالانا چاہیئے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا۔ جناب الٰہی مجھے طلب فرماتے ہیں اور حضرت پیرو مرشد بندہ نواز گیسو دراز کی یاد ستا رہی ہے۔ اب باغ عالم کی سیر سے دل کو سیر ہوگیا۔ یہ کہکر آپ نے ملک کے مختلف علاقوں پر فرزندوں کو حاکم مقرر فرمایا۔ چنانچہ ولایت رام نگر، مدھول، مکل، برار اور ولایت ماہور کا شاہزادہ محمود خاں کو حاکم مقرر کیا۔ شاہزادہ داؤد خاں کو رائچور اور تلنگانہ کا اور ولیعہد علاء الدین کو اپنی جگہ بادشاہی دی اور چھوٹے شہزادہ محمد خاں کو بڑے بھائی کا شریک شاہی کیا اور عدم مخالفت کے بارہ میں چاروں سے قسم لی اور ضروری وصیت اور سب کو اتفاق کی ہدایت کرکے دربار برخاست اور پھر یاد حق میں ایسے مشغول ہوئے کہ عین حالت عبادت میں ۲۹ رذیحجہ ۸۳۹ھ کو بوقت شب واصل بحق ہوئے۔ سلطان کا گنبد بیدر سے ایک کوس کے فاصلے پر موضع اشٹور کے میدان میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

محمد ظہیر الدین

پُرانا پُل

(حیدرآباد)

لرزتی نگاہوں کا فرمان ہے تو
دھڑکتے ہوئے دل کا احساں ہے تو
ثباتِ تمنا کی پہچان ہے تو
رُکا جس سے طوفاں وہ طوفان ہے تو

(۲)

گلستانِ حِلم کی رنگیں کہانی
قطب شاہ کے دل کی کافر جوانی
غرورِ محبت کی زندہ نشانی
ضیائے چراغِ شبستان ہے تو

(۳)

پڑی "بھاگ نگری" کی بنیاد تجھ سے
ہوا دشتِ ویران آباد تجھ سے
بنا تجھ سے، ہاں حیدرآباد تجھ سے
مری داستانوں کا عنوان ہے تو

(۴)

وہ دن جا چکے، وہ زمانہ نہیں ہے
وہ زلفیں نہیں ہیں وہ شانہ نہیں ہے
مگر یہ حقیقت، فسانہ نہیں ہے
کہ سچی محبت کا پیمان ہے تو

میکشؔ

بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت

سلطنت بہمنیہ کے زوال کے بعد دکن میں جو پانچ اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں ان میں دو بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومتیں سیاسی، تمدنی حیثیت سے نہ صرف دوسری ریاستوں سے بہت زیادہ ممتاز تھیں، نہ صرف حدود ارضی کی وسعت بلکہ فوجی قوت میں یہ دوسری دکنی ریاستوں سے بڑھی ہوئی تھیں بلکہ ہندوستان کی دوسری متعدد حکومتوں سے زیادہ پائدار اور برتر تھیں۔ ان کی عالیشان عمارتیں اور تہذیب و تمدن کے دوسرے آثار آج بھی ان کی عظمت اور اہمیت کو یاد دلاتے ہیں ۔
بیجاپور کا بول گنبد، ابراہیم روضہ اور سیکڑوں خوش نما مسجدیں، گولکنڈے کا عظیم الشان قلعہ، بادشاہوں کے گنبد، حیدرآباد کا چار مینار اور مکہ مسجد ان دونوں خاندان کی وہ زبردست یادگاریں ہیں جو آج بھی سیاحوں کو اپنی طرف کشاں کشاں لے آتے ہیں۔ اگرچہ آخری دور میں ان ریاستوں میں بہت سی کمزوریاں پیدا ہوگئی تھیں اور یہ مغلوں کی باج گزار بھی بن گئی تھیں اورنگ زیب عالمگیر نے سلطنت مغلیہ کو کشمیر سے لے کر راس کماری تک وسیع کرنے کے جوش میں ان کا خاتمہ کر کے خود اپنی سلطنت کو ہمیشہ کے لئے کمزور اور زوال پذیر کر دیا ۔

سب سے پہلے عادل شاہی ریاست ہی اس کی جوع الارض کا شکار بنی اور یوسف عادل شاہ نے ۸۹۵ھ میں جس ایوان حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی وہ دو سو سال قائم رہ کر منہدم ہو گیا۔ یوسف اصل میں ترکی شہزادہ اور سلطان مراد کا دوسرا بیٹا تھا شیر خوارگی کے زمانے میں باپ کے انتقال اور بھائی کی تخت نشینی کے بعد اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے اس لئے ماں نے بڑی دانش مندی اور چالاکی سے اس کو موت کے منہ سے چھڑا کر خواجہ عمادالدین گرجانی نامی تاجر کے ساتھ راتوں رات قسطنطنیہ سے باہر بھیج دیا سوداگر مذکور یوسف کو لے کر ایران پہنچا اور یہاں شہر ساوہ میں سکونت اختیار کی، یوسف کا ابتدائی زمانہ ایران میں ہی گزرا اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ جب جوان ہوا تو خواجہ عماد کے ساتھ بطریق تجارت و سیاحت ۸۶۴ھ میں ہندوستان میں داخل ہوا۔
ان دنوں ہندوستان میں بہمنیہ سلطنت اپنے پورے عروج پر تھی۔ سلطان محمد بہمنی کا دربار خود اس کی اولوالعزمی اور عالی حوصلگی اور اس کے وزیر خواجہ جہاں خواجہ محمود گاواں کے تدبر اور حسن انتظام کی وجہ سے مرجع خلائق بنا ہوا تھا۔ یوسف بھی ہندوستان آیا تو سیدھے خواجہ محمود گاواں کے ہاں باریاب ہوا، خواجہ جہاں نے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا جہاں اس کی قابلیت کے جوہر کی آزمائش کے بعد اس کو شاہی چیلوں یا مقربین خاص کے زمرے میں شریک کر لیا گیا۔ سلطان محمود بہمنی کے دربار میں یوسف نے اپنی علمی اور فوجی قابلیتوں کے متعدد ثبوت دئے اور ہر قسم کے انعامات اور اعزازات سے سرفراز ہوتا گیا۔ یوسف عادل خاں اور ملک الشرق کے خطابات بھی پائے اور کئی سیر حاصل پرگنے بھی جاگیر کے طور پر ملے۔ مختلف موقعوں پر میدان جنگ کی سرکردگی اور فوجوں کی سپہ سالاری کے فرائض انجام دینے کے علاوہ پہلے جنیر کا عامل اور بالآخر سلطنت کے بہت بڑے صوبہ بیجاپور کا طرف دار یعنی گورنر مقرر ہوا۔
سلطان محمود اور اس کے وزیر خواجہ جہاں دونوں کی موت سے سلطنت بہمنیہ روز بروز کمزور ہوتی گئی۔ بریدی امیر نے بادشاہ کو

سلاطین بیجاپور

یوسف عادل شاہ

اسمعیل عادل شاہ

اپنے ہاتھ میں کٹھ پتلی بناکر خود حکومت شروع کردی اور سلطنت بہمنیہ تباہی کے قریب ہوگئی تو یوسف نے احمد نظام الملک طرف دار احمد نگر کی تحریک سے دوسرے صوبہ داروں کی طرح اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور ۸۹۵ھ یا ۸۹۶ھ عادل خاں کی بجائے عادل شاہ کا لقب اختیار کرکے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کیا۔

یوسف عادل شاہ

خود مختار ہوتے ہی یوسف عادل شاہ اپنی ریاست کے اندرونی و بیرونی استحکام میں ہمہ تن مصروف ہوگیا۔ قاسم برید نے تیم راج مہاراجہ بیجانگر، دریا خاں اور بہادر گیلانی کو اس کے خلاف اکسایا۔ اولاً عادل شاہ کے دو تین زرخیز علاقوں پر دشمنوں کا قبضہ ہوگیا لیکن بالآخر اس نے کئی موقعوں میں دشمنوں کا مقابلہ کرکے ان سے نہ صرف اپنے علاقے واپس لے لیے بلکہ ایک مدت کے لئے اُن کو خاموش کردیا۔ بیرونی استحکام سے فراغت پاکر جب وہ اندرونی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا تو اس سلسلے میں بھی بڑی مشکلات کا سامنا ہوا وہ نہ صرف شیعہ عقائد کی طرف مائل ہوگیا تھا بلکہ اپنی ریاست پر شیعیت کو سرکاری مذہب کی طرح رائج کرنے پر مصر بھی تھا۔ اس کے تمام امرا اور خاص وعام سب سنی تھے۔ بادشاہ کے اس ارادے اور راج ہٹ نے بڑی زبردست اندرونی فساد اور ایک بیرونی جنگی طوفان کی صورت اختیار کرلی ۹۰۸ھ میں کمزور بہمنی بادشاہ محمود شاہ اس کا منتیہ اور نائب السلطنت قاسم برید جو عملاً بیدر کا بادشاہ تھا احمد نظام شاہ والی احمد نگر اور قلی قطب شاہ فرماں روائے گولکنڈہ چاروں متحد طور پر بیجاپور پر حملہ آور ہوئے اور یوسف عادل شاہ کو سوائے وہاں سے بھاگ جانے کے اور کوئی چارہ نہ رہا۔ وہ بھاگ کر خاندیس میں عماد الملک کے پاس پناہ گزیں ہوا۔ یہاں اس نے اپنے خیالات سے دست برداری کی قسم کھائی اور عماد الملک نے بیچ میں پڑکر چاروں حملہ آوروں سے معذرت کی اور اُن کے لشکر واپس کرائے۔ یوسف کی خوش قسمتی تھی کہ ریاست دوبارہ مل گئی اور ایک زبردست فتنہ ختم ہوگیا۔ اگرچہ یوسف نے شیعہ عقائد کی ترویج نہ کرنے کی قسم کھائی تھی لیکن وہ ارادے سے باز نہ آیا اور جب دوبارہ وہ اپنے تخت پر مستحکم ہوگیا تو اس نے زیادہ اہتمام اور ہوشیاری کے ساتھ بالآخر شیعیت اختیار کی اور بعد کو اس کے خاندان اور ریاست کا سرکاری مذہب اثنا عشری ہی قرار دیا۔

یوسف نے کم وبیش بائیس سال حکومت کی اور ۷۵ سال کی عمر میں ۹۱۶ھ میں وفات پائی اور حسب وصیت اس کی جاگیر جو بہمنی بادشاہ کی عطا کی ہوئی تھی، قصبہ گوگی (نصرت آباد) میں حضرت شاہ چندا حسینی کے پائیں دفن کیا گیا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے بیٹے اسماعیل کو اپنا جانشین کرکے مسند نشینی کے رسوم ادا کردئے تھے۔ اسماعیل کے علاوہ اس کی اولاد میں تین لڑکیاں، مریم سلطان، خدیجہ سلطان اور بی بی ستی تھیں۔ یہ سب اور اسماعیل اس کی بیوی پونجی خاتون کی اولاد تھیں جو ایک دکنی خاتون تھی۔ مریم سلطان برہان نظام شاہ کو، خدیجہ سلطان علاء الدین عماد الملک اور بی بی ستی احمد شاہ بہمنی سے بیاہی گئیں یوسف ملک گیری اور ملک داری کے علاوہ اعلیٰ علمی لیاقت سے بہرہ ور متصف تھا وہ فارسی کا اچھا شاعر اور خط نستعلیق کا عمدہ خوش نویس تھا۔ فن موسیقی کا بھی شایق اور طنبورا اور عود بجانے میں مہارت رکھتا تھا۔ اس کی علم دوستی کی

وجہ سے بہت سے لایق اور قابل افراد اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔ اس کو تعمیر عمارات کا کوئی زیادہ موقع نہیں ملا۔ بریں ہمہ اس کے عہد کی بعض عمارتیں ہیں مگر بہت شکستہ حالت میں۔ وہ عام طور پر عدل و انصاف میں کافی شہرت رکھتا تھا اور اپنی شجاعت کی طرح سخاوت میں دور دور مشہور تھا۔

اسمٰعیل عادل شاہ ۱۵۱۰ء - ۱۵۳۴ء

یوسف عادل شاہ نے اپنی زندگی سے مایوس ہو کر اپنے سامنے ہی اپنے اکلوتے بیٹے اسمٰعیل کو مسند نشین کر دیا تھا اور انصرام امور سلطنت کے لئے کمال خاں دکھنی کو وزیر اعظم کے علاوہ کمسن بادشاہ کا متولی (ریجنٹ) بھی قرار دے دیا تھا۔ اس وقت اسمٰعیل کی عمر بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ کمال خاں جو داراب جبردی کے نام سے بھی موسوم ہے، پونجی خاتون کے مشورہ اور ہدایت سے ریاست کے کاروبار تن دہی اور ہوشیاری سے انجام دیتے لگا۔ ہمسایہ ریاستوں کے ساتھ تعلقات میں جو کشیدگی چلی آ رہی تھی اس کو اپنے حسن تدبیر سے بہت جلد دور کر دیا اور گوا بندرگاہ کے پرتگالیوں سے جن کی سرکوبی یوسف عادل شاہ نے بھی کی تھی مصلحت وقت کے تحت صلح کر لی اور اطمینان کے ساتھ ریاست کی اندرونی اصلاحات کی طرف متوجہ ہوا لیکن چند سال فراغت اور اطمینان سے حکمرانی کرنے کے بعد اکثر متولیاں ریاست کی طرح اس کی نیت بدل گئی اور اس نے بادشاہ کی کم سنی اور خارجی سیاسی حالات کے مدنظر خود بادشاہ بن بیٹھنے کی ٹھان لی۔ اس کی حرکات سے پونجی خاتون اور دیگر شاہ پرست افراد بے خبر نہیں تھے مگر اس کے غیر معمولی اثر و اقتدار اور چالاکیوں کے آگے ان کی ایک نہیں چلتی تھی۔ بادشاہ محل میں قیدی کی طرح تھا اور کمال خاں کے آدمی اس کی ذرا ذرا سی نقل و حرکت پر لحظ رکھتے تھے۔

باوجود اس سخت انتظام کے پونجی خاتون نے ایک تدبیر ایسی نکالی کہ اس کا کانٹا ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔ پونجی خاتون نے اسمٰعیل نامی ایک غلام کے ذریعے بڑی ہوشیاری سے کمال خاں کا کام تمام کر دیا اور پھر اس کے بیٹے صفدر خاں کی لشکر کشی پر بڑی مردانہ ہمت سے اس کا مقابلہ کرکے بالآخر اس کو بھی ختم کیا اور اسمٰعیل کو خود سر متولی کے پنجے سے ہمیشہ کے لئے رہائی دلائی۔ اسمٰعیل نے خود مختار ہو کر دکھنیوں اور حبشیوں کو خدمات سے الگ کرکے مغلوں کو ان کی جگہ مامور کیا۔ خسرو آغا لاری کو جو اس کا طرف دار تھا اور کمال خاں کے مقابلے پر بڑی ساتھ داری کی تھی اسد خاں لاری کے خطاب سے سرفراز کرکے کئی علاقے بھی بطور جاگیر عطا کئے اور مہمات سلطنت میں اس کو مشیر اور وزیر بنایا۔

اسمٰعیل کی زندگی کا بڑا حصہ جنگ میں گزرا۔ اس کے عہد میں متعدد جنگیں ہوئیں۔ سب سے پہلے قاسم برید سے جنگ چھڑی۔ قاسم برید نے برہان نظام شاہ، قلی قطب شاہ اور علاء الدین عماد الملک کی مدد سے بیجاپور پر چڑھائی کر دی، مگر اسمٰعیل نے ان چاروں سے مقابلہ کیا اور شکست دی۔ سب کی فوجیں تتر بتر ہو گئیں سلطان محمود شاہ بہمنی اور اس کا بیٹا احمد شاہ جو بریدی لشکر کے ہمراہ تھے، اسمٰعیل کے ہاتھ گرفتار ہو گئے۔ اسمٰعیل نے ان دونوں کو بہت احترام اور خاطر تواضع سے مہمان رکھا اور پھر اپنی بہن ستی بی بی کی شادی احمد شاہ سے بہت اہتمام کے ساتھ بمقام کلبرگہ انجام دے کر دونوں کو بیدر واپس کیا۔

اسمٰعیل کے عہد کی دوسری جنگ راجائے بیجانگر سے ہوئی، بیجانگر کے راجہ نے اپنی سرحد کے استحکام کے لئے رائچور اور مدگل کے قلعے اور ان کے آس پاس کے علاقے کو فتح کرنے کے لئے ایک بڑے جرار لشکر سے ۱۵۲۰ء میں بڑی معرکۃ الآرا جنگ کی۔ اسمٰعیل اور اس کے سپہ سالاروں نے بڑی مردانگی سے مقابلہ کیا مگر بدقسمتی سے شکست اٹھائی۔ اس جنگ میں ناکامی سے اسمٰعیل کی طاقت اور شہرت کو بہت دھکا لگا اور وہ

عرصہ دراز تک بیجانگر والوں سے جنگ آزمانہ ہوا بہت دنوں کے بعد رائچور کو دوبارہ فتح کیا اس زمانے میں اس نے اپنی طاقت بڑھانے کے لئے دوسرے ہمسایہ بادشاہوں سے تعلقات مضبوط کرنے کی کوشش شروع کی۔ سنہ ۹۳۰ھ میں اسد خاں کی توجہ سے برہان نظام شاہ اور مریم سلطان ہمشیرہ اسماعیل کی شادی ہو گئی مگر یہ شادی بجائے تعلقات کو بہتر بنانے کے دشمنی و عداوت میں اضافے کا موجب بنی۔ شادی کے وقت طے ہوا تھا کہ قلعہ شولاپور جہیز میں دیا جائے گا مگر بعد کو اسماعیل نے انکار کیا۔ نظام شاہ نے بہ زور شمشیر فتح کرنے کی ٹھان لی اور تین مرتبہ زبردست معرکہ آرائی ہوئی مگر ہر وقت نظام شاہ کو شکست ہوئی۔ آخر تک یہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن بنے رہے

اسد خاں نے اتحاد بڑھانے کے سلسلہ میں اسماعیل کی دوسری بہن خدیجہ سلطان کی شادی علاء الدین عماد الملک بادشاہ برار سے طے کرا دی اس کے کچھ دن بعد ہی قاسم برید نے جو اس عرصے میں کسی قدر طاقتور ہو گیا، اسماعیل سے جنگ کی طرح ڈالی اس کو قلی قطب شاہ اور والی بیجانگر کی تائید بھی حاصل تھی، اسماعیل اس کی دراز دستیوں سے تنگ آ کر دس ہزار پیادہ کا لشکر لئے ہوئے اس پر حملہ آور ہوا اور بری طرح اس کو شکست دے کر قلعہ بیدر پر قابض ہو گیا۔ قاسم برید قید ہوا اور بہت دنوں کے بعد اسماعیل کی مہربانی سے پھر اپنے علاقے پر حکمران بنا کر۔ وجہ دا اس حسن سلوک کے اسماعیل کے ساتھ اس نے دوستی اور وفاداری نہیں کی۔

اسماعیل نے ان جنگوں سے فراغت پاکر کچھ دن اصلاح ملک میں صرف کئے تھے کہ موت کا پیغام آ پہنچا اور ۱۵۳۴ء (۹۴۱ھ) میں حوالی سگر میں اس کا انتقال ہو گیا اور اپنے باپ کے پہلو میں دفن کیا گیا، اسماعیل نے کل (۲۴) سال حکومت کی وہ بڑا بہادر اور فیاض واقع ہوا تھا، اس نے محض اپنی فیاضی سے قاسم برید کو پھر بیدر جیسا زرخیز علاقہ دوبارہ بخش دیا، بدقسمتی سے اس کا تمام تر زمانہ جنگوں میں گزرا ملک کی اندرونی اصلاح کی طرف کبھی خاطر خواہ توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس کی اولاد میں چار لڑکے ملو خاں، علو خاں، ابراہیم خاں اور عبداللہ خاں باقی تھے، عقیدتاً وہ شیعہ تھا اور اس کے عہد میں کمال خاں کے زوال کے بعد سے مغلوں اور ایرانیوں کا عروج رہا۔ اس کو شاعری اور موسیقی سے بھی بہت دلچسپی تھی اور تاریخوں میں اس کے اشعار جستہ جستہ منقول ہیں۔

ابراہیم عادل شاہ اول ۱۵۳۴ء — ۱۵۵۷ء

اسماعیل کی وفات پر اس کے حسب وصیت اسد خاں غازی نے اس کے بڑے بیٹے ملو خاں کو تخت نشین کیا اور اس کی فطری بد اطواری کے مد نظر خود کنارہ کش ہو کر اپنی جاگیر بلگام چلا گیا، چھ مہینے کے اندر ملو خاں نے اپنی نالائقی سے ساری رعایا بریا لوا پنے سے متنفر کر دیا آخر کار اس کی دادی پونجی خاتون کے ایما سے وہ تخت سے الگ کیا گیا اور ابراہیم خاں "ابراہیم عادل شاہ" کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

ابراہیم کی تخت نشینی کے ساتھ ہی اسد خاں کو پونجی خاتون کے حکم سے پھر کاروبار سیاست میں حصہ لینا پڑا ابراہیم خود بھی بہت بہادر اور تیز فہم نوجوان تھا۔ وہ اسد خاں کے مشورے سے کاروبار کرنے لگا، ابھی ایک سال نہیں گزرا تھا کہ والی بیجانگر سے لڑائی ہوئی۔ مقابلہ بہت سخت تھا مگر اسد خاں کی تجربہ کاری کام کر گئی۔ اس نے ادھونی کے مقام پر بیجانگر کے لشکر کو شکست فاش دے کر ابراہیم کا ساتھ دیا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اسد خاں کے مراتب میں اور بھی اضافہ کیا مگر کچھ دنوں کے بعد سازشیوں نے بادشاہ کو اس سے بدظن کر دیا اور وہ کنارہ کش ہو کر پھر بلگام چلا گیا۔

بادشاہ اور سپہ سالار کی اس ناچاقی سے فائدہ اٹھا کر برہان نظام شاہ حملہ آور ہوا اور قلعہ شولاپور جس کے لئے وہ اسماعیل کے زمانہ میں

تین مرتبہ ناکام کوشش کر چکا تھا، فتح کرلیا اور بیجاپور کی طرف پیش قدمی کرنے لگا۔ اسد خاں کی وفاداری اس کو کسی طرح روا نہیں رکھ سکتی تھی وہ پھر ابراہیم سے آملا اور عماد الملک والی برار کی امداد سے نہ صرف قلعہ شولاپور واپس لے لیا بلکہ برہان نظام شاہ کو بیڑ تک مار بھگایا۔

نوجوان ابراہیم سے شکست کھا کر برہان نے پہلے سے زیادہ تیاریاں کیں اور رام راج والی بیجانگر، جمشید قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ اور علی برید تینوں کو اپنے ساتھ ملا کر پھر ۱۵۴۲ء ۹۴۹ھ میں چڑھائی کی۔ اس موقع پر اسد خاں کی حسن تدبیر سے رام راج ان سے الگ کر دیا گیا اور شولاپور کا قلعہ جو اصل میں سارے جھگڑے کا باعث تھا، بغیر لڑائی کے نظام شاہ کے حوالے کر دیا گیا اور اسد خاں نے ان دونوں کا تصفیہ کرنے کے بعد جمشید قلی قطب شاہ کا مقابلہ کیا اور اس کو بے طرح شکست دی۔ باوجود اس حکمت عملی اور حسن تدبیر کے لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ برہان نظام شاہ اور والی بیجانگر اور برہان کے جانشین حسین نظام شاہ نے ابراہیم سے کئی مرتبہ لڑائیاں کیں اور بہت کچھ خون ریزی ہوئی مگر آخرکار ابراہیم ہی کامیاب رہا۔

ان لڑائیوں کے دوران میں اسد خاں سے وقتاً فوقتاً ابراہیم کو بڑی مدد ملتی رہی مگر اس کے مخالف ہمیشہ بادشاہ کو اس کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے بالآخر کچھ تو پیری کی وجہ سے اور کچھ بادشاہ کی ناراضی دیکھ کر اسد خاں بلگام میں گوشہ نشین ہو گیا۔ اسد خاں کے بعد احمد نگر کا سپہ سالار جو عین الملک کے خطاب سے مفتخر ہو کر ابراہیم کا ملازم ہو گیا تھا، اس کے لشکر کی سپہ سالاری کرتا رہا مگر وہ بہت جلد باغی ہو گیا۔

ابراہیم اگرچہ بڑا بہادر سپاہی اور اہل سیف کا بہت قدردان تھا مگر اس کی سختی کی وجہ سے بہت سے لوگ ہمیشہ اس سے ڈرتے رہتے تھے اسی خوف نے دشمنی کی شکل اختیار کی اور سلسلہ یہاں تک بڑھا کہ اس کو معزول کرنے اور اس کے بھائی عبداللہ کو بادشاہ بنانے کی سازش ہونے لگی۔ سازش کا راز فاش ہوتے ہی عبداللہ بھاگ کر گوا میں پرتگالیوں کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔ اور چند روز کے لئے ان کی حمایت سے اپنی بادشاہی کا اعلان بھی کرایا مگر ابراہیم کی زبردست فوجی قوت اور اس کے لشکریوں کی وفاداری سے عبداللہ کو کبھی اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی، پرتگالی بھی اس قضیے میں پھنس کر نفع کی بجائے ہمیشہ فوجی نقصان برداشت کرتے رہے۔

ابراہیم اپنے باپ کی طرح علم دوست بھی تھا اور میدان جنگ میں اس کی شجاعت و بہادری ہمیشہ لائق ستائش رہی مگر تند خو اور سخت گیر بھی بہت زیادہ تھا۔ اپنی علالت کے زمانے میں جس کا سلسلہ تقریباً دو سال رہا۔ جلد صحت یاب نہ ہونے پر بگڑ کر کئی طبیبوں کو قتل کر ڈالا اور بعض کو ملک بدر کر دیا۔ وہ اپنی اولاد کے ساتھ بھی سختی کرنے سے باز نہیں رہتا تھا۔ اس کا دوسرا فرزند علی بڑے بھائی کے مقابلے میں جو ولی عہد تھا بہت تیز تھا اس نے کمسن شہزادے کو اپنے ولی عہد کے حق میں مضر سمجھ کر نہایت بے دردی سے کم عمری میں ہی قلعہ مرچ میں قید کر دیا تھا۔

ابراہیم نے کم و بیش (۲۴) سال خدمت کر کے ۱۵۵۷ء (۹۶۵ھ) میں وفات پائی اور اپنے باپ دادا کے پہلو میں بمقام نصرت آباد (گوگی) دفن کیا گیا اس کے کل چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ بڑا اسمٰعیل ولی عہد مگر بہت غبی اور کودن تھا۔ منجھلا علی بہت زیرک تھا اور وہی باپ کے بعد اس کا جانشین ہوا، دوسرے دو لڑکوں کے نام طہماسپ اور احمد تھے۔ لڑکیوں میں ایک تانی بی بی علی برید سے بیاہی گئی تھی اور دوسری جس کا نام ہدیہ سلطان بتایا جاتا ہے مرتضیٰ نظام شاہ بحری سے منسوب تھی۔

اگرچہ ابراہیم کا زمانہ زیادہ تر لڑائیوں میں گزرا لیکن اس نے اس پر بھی بہت سے کام اصلاح و ترقی ملک کے لئے کئے ۹۳۳ھ میں ابراہیم پور نام کا ایک شہر آباد کیا اور وہاں ایک عالی شان مسجد بنائی۔ ۹۳۵ھ میں سولہ کھمبی محل تعمیر کرایا۔ نیز غالب مسجد جس میں صرف روشنی کے لئے ۴۴ طاقچے تھے اور جامع مسجد جو درگاہ حضرت جعفر سقاف سے متصل ہے اسی کی بنائی ہوئی ہیں ان کے علاوہ اس کے عہد میں بیجاپور اور رائچور کے قلعوں کی فصیلوں کی درستی اور استحکام کا کام بھی انجام پایا۔

سلاطین بیجاپور

سلطان ابراہیم عادل شاہ اول
سنہ ۹۴۱ھ تا سنہ ۹۶۵ھ

سلطان علی عادل شاہ اول
(شوہر چاند سلطانہ)
سنہ ۹۶۵ھ تا سنہ ۹۸۸ھ

علی عادل شاہ اوّل ۱۵۵۷ء - ۱۵۸۰ء

شہزادہ علی کو قلعہ مرج میں قید کردیا گیا تھا مگر قید میں بھی اس کی تعلیم و تربیت بہت ہی اعلیٰ درجے کی ہوئی تھی اور وہ اپنے سب بھائیوں سے زیادہ لایق تھا۔ باپ کے عقائد کے خلاف وہ شیعہ عقائد کی طرف مائل تھا اور اس کے اتالیق، رفیق اور نگران بھی بہت ہوشیار ہو ابراہیم کی موت کے منتظر تھے انھوں نے ابراہیم کے مرنے سے پہلے ہی اس کی بادشاہت کے منصوبے پورے کرلیے۔ ادھر ابراہیم فوت ہوا اور ادھر علی کی بادشاہی کا اعلان دیہی قلعہ مرج سے کردیا گیا چند ہی روز میں بیجاپور علی نے اپنے دوسرے بھائیوں کو جو باپ کے مرتے ہی قید ہوگئے تھے اندھا اور ناکارہ کردیا اور بے کھٹکے بادشاہت کرنے لگا۔ اس کو چونکہ شیعہ عقائد میں سخت تر غلو تھا اس لئے اس نے اہل ایران کو کثرت سے بیجاپور میں جمع کیا اور شیعہ عقاید کی ترویج میں بہت شدت دکھائی لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی فیاضی اور داد و دہش اس قدر زیادہ تھی کہ مذہب کے معاملے میں اس کی سختی پر غالب آگئی۔ اگرچہ سنی مسلمان اس کی حرکات اور خصوصاً تبرا پسندی سے سخت ناراض تھے لیکن اس کے احسان عام نے "مذہبی جنگ" کو روک دیا

اس کی تخت نشینی پر والی بیجانگر نے مبارک باد دی اور دوستی کی طرح ڈالی مگر اس کے برخلاف حسین نظام شاہ والی احمد نگر نے بہت کج خلقی دکھائی اسی لئے بیجاپور اور بیجانگر کے تعلقات بہت بڑھ گئے۔ دونوں ملکوں کے فرماں رواملکر حسین نظام شاہ سے ۹۶۷ھ میں متصادم ہوئے اور اس کو بہت نقصان پہنچایا۔ پھر اگلے سال دونوں نے مل کر اس کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ اس دفعہ حسین نظام شاہ نے ابراہیم قطب شاہ کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا مگر علی عادل شاہ نے ابراہیم کو اس سے الگ کردیا۔ اس دفعہ احمد نگر کی ریاست بری طرح تباہ ہوگئی اور تینوں نے مل کر حسین نظام شاہ کو بہت تنگ کیا ان دونوں جنگوں میں والی بیجانگر اور اس کے لشکر نے بیجاپوریوں کی احسان مندی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عام طور پر بستی والوں کی بے حرمتی کی مسلمانوں کی سخت دل آزاری ہوئی ان کی مسجدیں توڑ ہی نہیں ڈالیں بلکہ بت خانوں سے بدل دیں نیز بیجاپور اور گولکنڈے کے بہت سے علاقے دھوکے کے پردے میں چھین لئے، دولت اور مال غنیمت کی کثرت نے والی بیجانگر کو بے حد خود سر بنا دیا تھا جس کی وجہ سے علی عادل شاہ اور دوسرے فرماں رواؤں کو سخت خطرہ لاحق ہوگیا۔ اس اتفاقی موقع سے فائدہ اٹھا کر بیجانگر نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور ایک ایک کرکے ان اسلامی ریاستوں کو ختم کرنے کی تدبیریں ہونے لگیں۔ ادھر موقع کی نزاکت کو محسوس کرکے بیجاپور، احمد نگر، گولکنڈے کے بادشاہ بھی اپنی پچھلی عداوتیں بھلا کر متحد ہوگئے اور ۹۷۲ھ میں سب نے مل کر تالی کوٹ کے میدان میں بیجانگر والوں سے فیصلہ کن مقابلہ کیا، میدان اتحادیوں کے ہاتھ رہا، بیجانگر کا شہر تاراج ہوگیا اور اس کی سلطنت کو بھی ایسا دھکا پہنچا کہ وہ پھر پنپ نہ سکی۔

اگرچہ بیجانگر سے جنگ کرنے کیلئے اتحاد بڑے زور شور سے عمل میں آیا تھا اور حسین نظام شاہ کی بیٹی چاند بی بی کی شادی علی عادل شاہ سے اور علی عادل شاہ کی بہن کی شادی حسین نظام شاہ کے بیٹے مرتضیٰ نظام شاہ سے ہوگئی تھی لیکن باوجود ان سب باتوں کے ان ریاستوں میں پھر لڑائی جھگڑے شروع ہوئے اور علی عادل شاہ برابر آخر تک جنگوں میں گھرا رہا۔

علی عادل شاہ لاولد تھا اس لیے اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بھتیجے ابراہیم ابن طہماسپ کو ۹۸۷ھ میں اپنا ولی عہد قرار دے دیا تھا ابھی اس بات کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اگلے ہی سال یعنے ۹۸۸ھ م ۱۵۸۰ء میں علی عادل شاہ ایک خائن غلام کے ہاتھ قتل ہوگیا۔ اس کی مدت حکومت (۲۳) سال اور عمر (۴۷) سال تھی۔ اس کی وفات سے ریاست بیجاپور کو بہت نقصان پہنچا کیونکہ گو اس کا جانشین ابراہیم بعد کو بہت بڑا بادشاہ ثابت ہوا لیکن اس کی کمسنی کے زمانے میں متولیوں نے ریاست کو بہت کم زور کردیا۔

علی عادل شاہ کو تعمیر عمارت کا بہت شوق تھا۔ اس کے عہد میں جو عمارتیں بنیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے خاص طور پر مشہور یہ ہیں۔ قلعہ شاہ درگ (نلدرگ) فصیل قصبہ شاہ پور، نہر کشور خانی، پریا محل، آنند محل، گگن محل، باغ دوازدہ امام، باغ فدک، مسجد جامع چاند باؤلی، قلعہ دھارور، قلعہ بنکاپور وغیرہ۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی ۔ ۱۵۸۰ ۔ ۱۶۲۷ء

جب علی عادل شاہ کے حسب وصیت ابراہیم ابن طہماسپ تخت نشین ہوا تو اس کی عمر صرف نو سال تھی۔ اس کی چچی چاند بی بی کے زیر ہدایت کامل خاں متولی اور مختار ریاست کی حیثیت سے کام کرنے لگا مگر بہت جلد وہ خود سر ہو گیا۔ اس کی جگہ چاند بی بی کے اشارے سے کشور خاں متولی بنا مگر وہ بھی چند ہی دنوں میں حد درجے خود سر اور دشمن ملک و مالک ثابت ہوا۔ اس نے تو خود چاند بی بی کو بے حرمتی سے محل سے نکال کر قید کر دیا۔ اس کے مارے جانے پر اخلاص خاں نے متولی کا عہدہ پایا۔ پھر دلاور خاں مختار کل بنا اور اسی کے زمانہ مختاری میں ابراہیم قطب شاہ کی بیٹی اور محمد قلی قطب شاہ کی بہن ملکہ جہاں سے جس کا عرف چاند سلطانہ ہو، ابراہیم عادل شاہ کی شادی ہوئی۔

ان متولیوں کے زمانہ اقتدار میں آس پاس کے اکثر بادشاہوں نے بیجا پور پر متعدد حملے کئے اور اس کو نقصان پہنچایا اس کے علاوہ متعدد مرتبہ کئی خانہ جنگی اور امرا اور متولیاں ریاست کے جھگڑوں سے بیجا پور کو باوجود خوش حالی کے بہت نقصان پہنچا۔ دلاور خاں کے زمانہ مختاری میں اسماعیل نے جو ابراہیم کا چھوٹا بھائی تھا بیک ایک بڑی بغاوت کی اور سارے ملک میں ہل چل مچ گئی۔ دلاور خاں کی درپردہ شرارتوں کے باوجود ابراہیم کے اقبال سے اسماعیل کا قلع قمع ہو گیا مگر دلاور خاں بادشاہ کی نظروں میں بے طرح کھٹک گیا۔ اب بادشاہ نے جو سن بلوغ کو پہنچ چکا تھا اور ہر طرح کاروبار ریاست سنبھال سکتا تھا، دلاور خاں کو معزول کرکے ۱۰۰۱ھ عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور بہت کروفر کے ساتھ بیجا پور میں داخل ہوا۔ اس نے چندے بیرونی جھگڑوں سے الگ رہ کر اندرون ملک کی اصلاح و تعمیر شروع کی ۱۰۰۸ھ میں ایک نئے شہر نورس پور کو آباد کیا اور رفتہ رفتہ دیگر بہت سی عمارتیں بنائیں۔ شعرا و علما سے اپنے دربار کو آراستہ کیا، فن موسیقی کے بڑے بڑے ماہرین کو جمع کیا کیونکہ اس کو اس فن سے طبعی لگاؤ اور اس میں ید طولی حاصل تھا۔ اس کی کتاب نورس آج تک مشہور ہے۔

اس کے خود مختار ہونے سے کچھ دنوں قبل ہی چاند بی بی اپنے میکے چلی گئی اپنی آبائی ریاست احمد نگر کو جو ابراہیم نظام شاہ کی جوان مرگی کی وجہ سے بے طرح خود غرض امرا کی تباہ کاریوں کا شکار بنی ہوئی تھی۔ سنبھالنے کی کوشش کی۔ مغلوں نے اس پر پے در پے حملے کرکے اس کے اکثر حصوں کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ شہنشاہ اکبر کی فتوحات کا سلسلہ اور آگے بڑھا۔ اس نے ابراہیم عادل شاہ سے بھی خراج طلب کیا اور ابراہیم نے اس کے مقابلے میں اپنے کو کمزور پاکر خراج منظور کر لیا۔ اس کے بعد مغلوں کا زور اور بھی بڑھ گیا۔ ابراہیم نے اکبر کے پیغام بھیجنے پر اپنی لڑکی سلطان بیگم کی شادی شہزادۂ دانیال سے کر دی۔ اکبر کے بعد جہانگیر اور اس کے بیٹے شہزادہ خرم نے دکن کے کئی علاقوں پر جو عادل شاہی نظام شاہی اور قطب شاہی ریاستوں کی ملک تھے اپنا قبضہ جمایا۔ ابراہیم نے بیدر پر حملہ کرکے اس کو فتح کر لیا۔ ادھر ملک عنبر نے بیجا پور پر حملہ کیا اور ابراہیم کے آباد کئے ہوئے نورس پور کو ہمیشہ کے لئے تباہ و تاراج کر دیا اور خود بھی چند ہی روز میں فوت ہو گیا۔ ابراہیم کو اس کا بڑا رنج ہوا مگر ملک عنبر کے مرجانے کی وجہ سے وہ اس سے بدلہ نہ لے سکا۔

ابراہیم نے پورے (۴۷) سال حکومت کی اور ۱۶۲۷ء (۱۰۳۷ھ) میں انتقال کیا۔ اس نے متولیوں کا دور ختم ہونے کے بعد

سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی
نورس
۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ

سلطان محمد عادل شاہ
۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۷ھ

دو میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے ۔

محمد عادل شاہ نے فصیلوں اور برجوں کی مرمت کے علاوہ دادمحل، بیگم تالاب وغیرہ کئی عمارات اور متعدد مسجدیں بنائیں جن میں سب سے زیادہ مشہور خود اس کا گنبد ہے محمد عادل شاہ نے ۱۶۵۶ء میں (۳۰) سال سے زیادہ عرصے تک حکومت کرکے وفات پائی اور اپنے گنبد میں جو گول گنبد یا بول گنبد کے نام سے مشہور ہے، دفن ہوا، یہ گنبد اس قدر بڑا ہے کہ ہندوستان بھر میں کوئی اور گنبد اس کے برابر نہیں ۔ اس کی یہ خصوصیت مسلمہ اور مشہور ہے کہ ایک سرے پر کھڑے ہوکر خفیف سی خفیف آواز پیدا کی جائے تو دوسرے سرے پر برابر سنائی دیتی ہے اسی وجہہ سے اس کو بول گنبد کہتے ہیں سیکڑوں سیاح اس گنبد کو دیکھنے کے لئے بیجاپور آتے ہیں ۔ اس کے عہد میں علوم و فنون کی بہت ترقی ہوئی اور کئی بڑے بڑے شعرا اور علما اس کے دربار میں ملازم تھے ۔

علی عادل شاہ ثانی ۱۶۵۶ء – ۱۶۷۲ء

علی عادل شاہ ثانی اپنے نامور باپ کا اکلوتا بیٹا تھا خوش قسمتی سے محمد عادل شاہ کی حرم خاص حاجی بڑی صاحبہ نے جو محمد قطب شاہ کی بیٹی تھی، خاص اہتمام سے اس کی پرورش اور تربیت کی اور علوم متداولہ اور فنون متعارفہ میں بہ طرح ماہر بنایا ۔ وہ (۱۹) سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور اپنی والدہ کی ہدایت اور خان محمد خاں وزیر ملک اور دیگر معتبر ارکان ریاست کے مشورے سے کاروبار ریاست انجام دینے لگا ۔

شاہ جہاں نے جو اپنی سلطنت کے حدود وسیع سے وسیع تر کرنے کا تہیہ کئے ہوے تھا اس بہانے کہ ریاست بیجاپور سلطنت تیموریہ کی باج گزار ہے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کی اور یہ اعتراض اٹھایا کہ ہماری منظوری کے بغیر علی عادل شاہ کس طرح تخت نشین ہوسکتا ہے ۔ اس نے یہاں تک لکھ دیا کہ علی عادل شاہ صلبی فرزند نہیں متبنیٰ ہے اور اس لئے وارث تخت و تاج نہیں کر علی عادل شاہ ثانی نے ان اعتراضات کے ترکی بہ ترکی جواب دئے، جب مراسلت کا کوئی اثر نہیں ہوا تو اسی سال اورنگ زیب نے ایک بڑی فوج لے کر حملہ کیا اور بیدر اور کلیانی کے قلعے فتح کرکے اس کے بعد بیجاپور کا بھی محاصرہ کرلیا ۔ ابھی علی عادل شاہ ثانی کو تخت نشین ہوکر ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اس طرح زبردست دشمن سے مقابلہ آن پڑا ۔ بیجاپور کے امرا آپس کی ناراضیوں کی وجہہ سے خاطر خواہ متحد اور وفادار نہیں تھے ۔ محاصرہ روز بہ روز شدید ہو رہا تھا کہ شاہ جہاں کی علالت کی خبر پاکر خود اورنگ زیب محاصرہ اٹھاکر دہلی کو روانہ ہوا جس وقت مغلوں کا لشکر سرحد پار کررہا تھا خان محمد وزیر مملکت سے جو سرحد پر مقابلے کے لئے متعین تھا، ملاقی ہوا، خان محمد نے اورنگ زیب کی عاجزانہ التجا اور اس چالبازانہ وعدے کی بنا پر کہ جب تک وہ وزیر مملکت ہے بیجاپور کی طرف مغل کبھی پیش قدمی نہیں کریں گے، اورنگ زیب سے مزاحمت نہیں کی خان محمد کی یہ حرکت جس کی قباحت کا خود اس کو یقین تھا، اس کی موت کا باعث ہوی ۔ اس کے قتل کے بعد ابراہیم خاں وزیر مملکت بنایا گیا ۔ اور سپہ سالاری کی خدمت افضل خاں کے سپرد ہوئی ۔

ابھی اس طرف سے سکون نہیں ہوا تھا کہ سیواجی نے جو محمد عادل شاہ کی علالت کے زمانے میں قلعہ جنیر پر قبضہ کرلیا تھا، مزید پیش قدمی کی اور کوکن اور اس کے پاس کے علاقوں میں لوٹ مار مچادی اور کئی قلعوں پر قبضہ کرلیا اس کی سرکوبی کے لئے افضل خاں کی سرکردگی میں ۱۶۵۹ء میں فوج روانہ کرنی پڑی مگر سیواجی نے افضل خاں کو دھوکا دے کر تنہائی میں قتل کرڈالا اور پھر اس کی فوج کو پیچھے سے حملہ کرکے اچانک

سلطان سکندر عادل شاہ
۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۷

سلطان علی عادل شاہ ثانی
شاہی
۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ

زبردست شکست دی۔ افضل خاں کے بعد سدی جوہر جو اپنی سابقہ رنجش سے توبہ کر کے حاضر ہو چکا تھا صلابت خاں کا خطاب دے
ایک بڑے لشکر کے ساتھ روانہ کیا گیا مگر یہ سیواجی کی باتوں میں آ گیا اور اس کے ساتھ مل کر قلعہ پنالہ پر جو ایک نہایت مستحکم اور اہم قلعہ تھا
قبضہ کر لیا اور علانیہ بغاوت شروع کر دی۔ اب تو بادشاہ خود لشکر لے کر مقابلے کے لئے نکلا اور ایک معرکے میں پنالہ فتح کر لیا۔ سیواجی اور سدی جوہر
دونوں فرار ہو گئے۔ چلتے ہوئے بادشاہ نے قلعہ متو میں پھر جوہر کا مقابلہ کیا اور اس دفعہ بھی شکست دی۔ جوہر زخمی ہوا مگر وہاں سے کسی طرح
بچ کر قلعہ ریچور میں پناہ گزیں ہوا۔ بادشاہ نے اس قلعہ کو بھی فتح کر لیا۔ سدی جوہر بھاگتے اور شکست کھاتے ہوئے آخر کار سخت بیمار
ہو کر مر گیا۔ بادشاہ تلنگانہ کے سرکش زمینداروں کو جو خراج ادا نہیں کرتے تھے گوشمالی کر کے مظفر و منصور بیجاپور واپس ہوا اور
سیواجی سے مصلحت وقت دیکھ کر اس شرط پر ۱۶۶۲ء میں صلح کر لی کہ کوکن اور اس کے قریب کا علاقہ سیواجی کے قبضے میں رہے اور وہ اس
سے آگے نہ بڑھے مگر موقع پا کر سیواجی نے پھر لوٹ مار شروع کر دی اور شائستہ خاں مغل سردار سے مقابلہ کر کے اس کو نیچا دکھایا۔
اورنگ زیب نے یہ خبر سن کر علی عادل شاہ ثانی سے اس کی سرکوبی میں مدد مانگی اور بیجاپور سے خواص خاں کی سرکردگی میں
ایک لشکر روانہ کیا گیا جس نے سیواجی کو سخت شکست دی مگر عین وقت پر سیواجی نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اورنگ زیب کے سردار
جے سنگھ سے صلح کر لی اور اپنے قبضے کے اکثر قلعوں کی کنجیاں جے سنگھ کو دے دیں کہ میں آپ کی مدد کر کے
عادل شاہی ریاست کا خاتمہ کر دوں گا اور اس طرح یہ سارا ملک اورنگ زیب کی حکومت میں آ جائے گا۔ علی عادل شاہ ثانی کو اس
کی اطلاع ملی تو مجبوراً جے سنگھ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ دونوں میں مقابلے ہوئے اور ہر دفعہ جے سنگھ نے شکست کھائی آخر کار ۱۰۷۷ھ میں دہلی
کو واپس بھاگا۔ سیواجی بھی اورنگ زیب کے دربار میں پہنچا اور چند روز وہاں رہ کر پھر دکن آیا اور وہی لوٹ مار شروع کر دی۔ کئی قلعے جو
مغلوں کے قبضے میں آ گئے تھے سیواجی نے چھین لئے اور پھر جلد مستعد ہو کر علی عادل شاہ ثانی کو ستانا شروع کیا۔ ادھر جے سنگھ وغیرہ کے
مقابلوں اور ملک کی بربادی کی وجہ سے خزانہ خالی ہو گیا تھا اور سلطنت مغلیہ کا خراج ادا نہ ہونے سے مغلیہ لشکر بار بار چڑھائی کر بیٹھتا تھا
اس سے علی عادل شاہ ثانی نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ اورنگ زیب اور سیواجی دونوں سے مصالحت کر لی جائے۔
یہ صلح محض عارضی تھی اورنگ زیب اور سیواجی دونوں ریاست بیجاپور کو اپنے قبضہ و تصرف میں لانے کی آرزو دل میں لئے
ہوئے تھے۔ ابھی اس صلح کو کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ یکایک علی عادل شاہ ثانی بدقسمتی سے فالج میں مبتلا ہو کر معذور و مجبور
ہو گیا۔ حالات بگڑ رہے تھے، امرا کے آپس میں عداوت پھیلی ہوئی تھی۔ مصلحت وقت سے اس نے اپنے کمسن بیٹے سکندر عادل شاہ
کو تخت نشین کر کے دارالسلطنت کے کام خواص خاں کے سپرد کر دئے اور خود بیماری کی حالت میں لیٹے لیٹے صلاح و مشورہ دینا مناسب سمجھا۔
مغلوں کی روک تھام کے لئے عبدالمحمد کو شاہ درگ (نل درگ) گلبرگہ اور سارے علاقے کا صوبہ دار بنایا اور عبدالکریم اور بہلول خاں
کو مرچ اور پنالہ کے قلعوں پر متعین کر کے سیواجی کی دراز دستیوں کا بند و بست کیا۔ اسی حالت میں وہ ۱۰۸۳ھ (م ۱۶۷۲ء)
میں (۳۵) برس کی جوانی میں سولہ سال حکومت کر کے راہی ملک عدم ہوا۔ اس نے بیجاپور میں اپنی زندگی میں ہی اپنے لئے ایک بہت ہی
عالی شان مقبرے کی تعمیر شروع کی تھی ابھی اس کی تعمیر مکمل نہیں ہوئی تھی کہ اسی میں اس کو دفن کیا گیا یہیں اس کی بیوی اور
کئی عزیز اور بھی دفن ہیں اور آج بھی یہ نامکمل مقبرہ اس کے عالی شان تعمیری حوصلوں کی یادگار بن کر کھڑا ہے۔

علی عادل شاہ ثانی بڑا بہادر اور شجیع تھا۔ اس نے کئی بڑے بڑے معرکے خود فتح کئے۔ اس کو شعر و شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ خود بھی شاعر تھا اس کے عہد میں اردو زبان کو بہت ترقی ہوئی وہ اردو شاعروں کا بڑا سرپرست تھا۔ ملا نصرتی جو علی نامہ اور دیگر مثنویوں کا مصنف ہے اسی کے دربار کا متوسل تھا۔ اس کے شہر کی عمارات میں علاوہ نا تمام مقبرہ کے حسینی محل اور مکی مسجد بھی تعمیر ہوئیں۔ اس نے دو عظیم الشان محلات "علی محل" اور "عرش محل" کے نام سے بنانے شروع کئے تھے مگر یہ نا تمام رہ گئے یہ عادل شاہی خاندان کا آخری با اقتدار بادشاہ تھا اس کے بعد اس کے کمسن بیٹے سکندر کو اورنگ زیب نے قید کر لیا اور بیجاپور کی ریاست کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

سکندر عادل شاہ ۔ ۱۰۸۳ھ ۱۶۷۲ء ۔ ۱۰۹۷ھ ۱۶۸۶ء

علی عادل شاہ ثانی کے انتقال پر خواص خاں نے باضابطہ طور پر پانچ سال کے کمسن شہزادے کو سکندر عادل شاہ کے نام سے تخت پر بٹھایا اور خود بطور اتالیق کے ریاست کا انتظام دیکھنے لگا۔ بادشاہ کی کمسنی امرا کی نا اتفاقی اور غداری سے فائدہ اٹھا کر ریاست کے دو اہل دشمن مغل اور مرہٹے ملک میں لوٹ مار اور قتل کرنے لگے۔ سیواجی نے غیر معمولی طاقت حاصل کر لی بنگالہ فتح کر لیا۔ مغلوں کا لشکر بھی تیار تھا اور خواص خاں مغلوں سے سازش کی اور بادشاہ کی بہن شہر بانو بیگم کی شادی شہزادہ محمد اعظم سے قرار دے کر ایک بڑے پیشکش کے ساتھ اورنگ زیب سے صلح کر لی مگر یہ صلح بھی پائدار ثابت نہ ہوئی۔

خواص خاں سیدی مسعود خاں، بہلول خاں، سید مخدوم، شرزہ خاں اپنی ناعاقبت اندیشی اور نمک حرامی سے کبھی اورنگ زیب سے مل جاتے اور کبھی مرہٹوں سے۔ اسی طرح صلح و جنگ میں اپنی قوتیں صرف کرتے رہے۔ اسی دوران میں سیواجی فوت ہو گیا مگر اس کے بیٹے سنبھاجی اور دوسرے مرہٹہ سرداروں نے اپنی وہی روش جاری رکھی، وہ ادھر عادل شاہیوں کو تنگ کرتے اور ادھر مغلوں کو الگ دق کرتے۔ بالآخر اورنگ زیب نے بیجاپور کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا تہیہ کر کے اولاً ایک فرمان بھیجا جس میں متعدد سخت شرائط درج تھیں۔ سکندر عادل شاہ کے مشیروں نے اس کا جواب اس طرح مرتب کیا جس سے اورنگ زیب کی شرائط کی تکمیل نہیں ہوتی تھی اورنگ زیب نے ایک بڑی فوج کے ساتھ ۱۰۹۷ھ (۱۶۸۶ء) میں بیجاپور پر چڑھائی کی اور شہر فتح کر کے سکندر کو قید کر لیا اور بیجاپور کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بدقسمت سکندر پانچ سال کی عمر میں بادشاہ ہوا، چودہ سال حکومت کی اور چودہ سال اورنگ زیب کی قید میں رہ کر بالآخر ۱۱۱۱ھ میں وفات پائی۔

سید محمد

بیجاپور کے سپہ سالار

افضل خاں

شرزہ خاں

سید محمد ... صبیب کو ان کے باپ کی شاہانہ خدمات کے صلے میں شرنیہ خاں خطابوں سے سرفراز کیا اور ناظم مقرر کیا۔

سید محمد

ہاشمی بیجاپوری

ہاشمی، علی عادل شاہ ثانی اور نصرتی کا ہم عصر تھا۔ شاہ ہاشم بیجاپوری کا مرید خاص تھا اسی نسبت سے ہاشمی تخلص رکھا۔ شاہ ہاشم اور ملا ہاشمی دونوں کی تصویریں اس مضمون کے ساتھ شایع ہو رہی ہیں وہ مادرزاد اندھا تھا لیکن شاعری سے فطری لگاؤ رکھتا تھا۔ دکن میں ریختی زبان کی ایجاد کا سہرا ہاشمی کے سر ہے ایک دیوان ریختی کی غزلیات کا مرتب کیا اور ایک مثنوی یوسف زلیخا احسن القصص کے نام سے ۱۰۹۹ھ میں لکھی۔ ہاشمی کی زندگی کے حالات کسی تذکرے میں نہیں ملتے البتہ اس کے کلام سے اندرونی شہادتیں کچھ ملتی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ برہان پور کا باشندہ تھا۔ بیجاپور کے ایک رئیس ذوالفقار خاں کی شہرت سن کر وہاں آیا اور اپنے ممدوح سے قصائد کے بدلے میں گراں بہا انعام حاصل کئے۔ دو تین قصیدے ذوالفقار خاں کی مدح میں ہاشمی نے کہے ہیں۔ ابھی ہاشمی کے متعلق کافی معلومات فراہم نہ ہو سکے۔ اس کا دیوان ریختی اور مثنوی یوسف زلیخا جو زیر طبع ہیں ان کے مقدمہ کی تکمیل تک ہماری کوشش ہے کہ جس قدر ممکن ہو سکے اس کی زندگی کے متعلق معلومات فراہم کریں۔ علاوہ دیوان اور مثنوی کے ہاشمی بیجاپور کا اعلیٰ پایہ مرثیہ نگار ہے اس کے کئی مرثیے دستیاب ہوئے ہیں جن سے اس کی قادر الکلامی اور وسیع النظری کا ثبوت ملتا ہے۔ یہاں ہم دیوان اور مثنوی سے چند شعر نقل کرتے ہیں:

غزل ریختی

تھانکو نلو سو پیتم تج دل چھوڑ ہونے کا	تجھ خیل میں تمنا چپ اب جگ میں شور ہوئے گا
تجھ گن بھوی سندر کی عالم میں ہانک ہوئی ہے	جھانکیگی تس اوپر تو شہرت بھی زور ہوئے گا
انکھیں تو ہور دتیاں دل میں تو بھید کچھ ہے	باتاں بھی ہور کچھ ہیں مقصد بھی ہور ہوئے گا
ہے حسن دہن تمہارا رکھنا جتن تمہیں دہن	نیں تو یو دہن چیرانے کوئی ساہو چور ہوئے گا (دیوان ریختی)

عشق

اگر عشق نیں ہے تو چندر کوں نور	تو کیا واسطے نت یو تپتا ہے سور
اگر عشق نیں ہے تو دریا دیں آب	پلاتا ہے بادل کوں کی بے حساب
اگر عشق نیں ہو تو کی دھر تری	نوی رت میں کرتی ہے کپوت ہر ی
اگر عشق نیں ہے تو کی یو بھنور	پھرے پاس لینا ہر اک گل اوپر
اگر عشق نیں ہے تو کی یو فقیر	فقیر ہو کے غربت لئے اپسے سیر

مجازی عشق راست ہر ٹھور ہے
حقیقی و لے عشق کچھ ہور ہے (یوسف زلیخا)

میر سعادت علی رضوی

پدمنی بیدنوری

بدھسٹوی دوی

نظام شاہی خاندان

احمد نظام الملک ۸۹۵ھ تا ۹۱۴ھ

بہمنی سلطنت کا جب شیرازہ بکھر گیا تو سب سے پہلے احمد نظام الملک نے بغاوت کی۔ احمد نظام الملک دکن کے برہمن نژاد امیر ملک حسن بحری کا لڑکا تھا۔ جس کو اپنے عہد کے مورخ ایک عجیب و غریب حکایت کے ذریعہ محمد شاہ بہمنی کا لڑکا تسلیم کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب بہمنی سلطنت کے شمال مغربی حصہ کا مالک بنا تو اپنا صدر مقام جنیر قرار دیا لیکن بعد میں ایک شہر آباد کر کے احمد نگر اس کا نام رکھا اور اسی نام سے اس کی سلطنت موسوم ہوئی۔ احمد نظام الملک نے ۸۹۵ھ میں اپنی آزادی اور خود مختار حکومت کا اعلان کیا اور ۲۲ سال حکومت کرنے کے بعد ۹۱۴ھ میں انتقال کیا۔

برہان نظام شاہ ۹۱۴ھ تا ۹۶۱ھ

یہ ۴۷ سال حکمراں رہا اور اپنی سلطنت کی بے حد ترقی کا باعث بنا۔ اس کے دور میں نظام شاہی حکومت کی وسعت اور شان کا نام ہوا۔ اسی بادشاہ کی وجہ سے بہادر شاہ والی گجرات کا دیا ہوا لقب نظام شاہی اس خاندان کا لقب ہو گیا

سلطان حسین نظام شاہ اول ۹۶۱ھ تا ۹۷۲ھ

باپ کے مرنے کے بعد برسر اقتدار ہوا۔ یہ بہت بڑا سپاہی اور مدبر تھا۔ اس کے زمانے میں سلاطین دکن میں اتحاد ہوا اور اسی کی سرکردگی اور کوشش سے تالی کوٹ میں رام راج کو شکست ہوئی اور نہایت شان اور عزت کی حکومت کے بعد ۹۷۲ھ میں انتقال کیا۔

مرتضیٰ نظام شاہ ۔ ۹۷۲ھ تا ۹۹۶ھ

یہ صغیر سنی میں بادشاہ ہوا۔ اور اپنی ماں خونزہ ہمایوں کے تحت حکومت کرتا رہا اور ۹۷۷ھ میں ماں کو قید کر کے برسر اقتدار آیا۔ یہ بادشاہ چاند بی بی کا بھائی تھا اس کے دور میں سلطنت کے ابتدائی آثار زوال شروع ہونے لگے ۹۹۶ھ میں کثرت عیاشی کی وجہ سے دیوانہ ہو گیا اور اس کے بیٹے میراں حسین نے اس کو حمام میں بند کر دیا۔

میراں حسین نظام شاہ ۔ ۹۹۶ھ تا ۹۹۷ھ

باپ کو قید کر کے تخت پر بیٹھا اور وزیر مرزا خاں کے ہاتھ مارا گیا اس نے صرف دس مہینے حکومت کی۔

اسماعیل نظام شاہ ۔ ۹۹۷ھ تا ۹۹۹ھ

یہ امرائے گردی کے ذریعے تخت پر آیا اور اپنے باپ برہان نظام شاہ کے ہاتھوں تخت سے اتار دیا گیا

برہان نظام شاہ ثانی ۔ ۹۹۹ھ تا ۱۰۰۳ھ

مغلوں کی طاقت کے ذریعے بیٹے کو معزول کر کے تخت حاصل کیا اور ۱۰۰۳ھ میں عادل شاہیوں سے شکست کھا کر اسی صدمہ میں انتقال کیا۔ اور اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین بڑے بیٹے اسمعیل کے بجائے جو مہدوی تھا اپنے چھوٹے بیٹے کو جو اسماعیلیہ مذہب کا پیرو تھا مقرر کیا۔

ابراہیم نظام شاہ ۔ ۱۰۰۳ھ

باپ کے بعد برسرحکومت آیا اور ایک ہی سال میں عادل شاہیوں سے لڑتا ہوا ایک سپاہی کے ہاتھ مارا گیا ۔

احمد نظام شاہ

یہہ شخص ایک دعویدار سلطنت تھا اور بعض امراء کی کوشش سے تخت نشین ہوا لیکن بعد میں چاند بی بی کی تدبیر سے اس کو تخت سے ہٹا لیا اور بہادر نظام شاہ سریرآرائے سلطنت ہوا ۔

بہادر نظام شاہ ۱۰۰۴ھ تا ۱۰۰۹ھ

یہہ طوائف الملوکی کا دور تھا ۔ وزیراعظم اخلاص خاں حبشی اور چاند بی بی کے ذریعہ برسر اقتدار آیا یہہ وہ دور تھا جس میں چاند بی بی نے مغلوں سے غیرمعمولی معرکے کئے ۔

مرتضیٰ نظام شاہ دوم ۱۰۰۹ھ تا ۱۰۳۵ھ

بہادر نظام شاہ کے بعد طوائف الملوکی پھیلی اور امراء نے مرتضیٰ نظام شاہ کو تخت پر بٹھایا اس دور کو ملک عنبر کا دور کہا جا سکتا ہے مغلوں کی بڑھتی ہوئی قوت ملک عنبر کی زندگی تک نظام شاہی سلطنت پر چھا نہ سکی ۔ ملک عنبر کے بعد کوئی نظام شاہی حکومت کو بچانے والا نہ تھا

برہان نظام شاہ سوم ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۴۰ھ

برہان نظام شاہ نے باپ کے بعد سلطنت حاصل کی اور ۱۰۴۰ھ میں انتقال کیا یہہ دور تنزل تھا ۔

حسین نظام شاہ سوم

یہہ احمدنگر کا آخری تاجدار ہے ۔ اس کے زمانے میں مغلوں نے احمدنگر پر قبضہ کیا اور شاہجہاں نے اس کو گوالیار میں قید کر دیا

مرتضیٰ نظام شاہ سوم ۱۰۴۲ھ تا ۱۰۴۶ھ

یہہ بادشاہ نظام شاہی سلطنت کے بعد شاہ جی مرہٹے کے ذریعے تین سال تک شاہ گڑھ پر حکومت کرتا رہا اور تین سال کے بعد اپنے خاندان کا خاتم بنا ۔

چاند بی بی

دکن کی نامور سلطانہ چاند بی بی حسین نظام شاہ اور خونزہ ہمایوں بیگم کی بیٹی تھی اور اس طرح باپ کی طرف سے نظام شاہی اور ماں کی طرف سے ترکی تہور اور بے جگری ورثے میں پائی تھی ۔ یہہ ملکہ ۹۵۵ھ میں احمدنگر میں پیدا ہوئی آنکھ کھولتے ہی اس نے تلوار کی جھنکار سنی بہمنی سلطنت کے مختلف شہ پارے آپس میں دست و گریباں تھے اور اس نفاق سے فائدہ اٹھا کر رام راج کے تحت وجیانگر کی شہنشاہیت مسلم راج اور مسلم سلطنتوں پر چھائی جا رہی تھی چودہ برس کی عمر میں چاند سلطانہ اس شطرنج کا مہرہ بنی اور علی عادل شاہ والی بیجاپور کے نکاح میں آکر دکنی مسلم اتحاد کا باعث بنی کوئی تعجب نہیں کہ تالی کوٹ کی لڑائی میں یہہ شاہی دلہن میدان کارزار میں ہو اور مسلمانوں کے ناموس کا مرکز بنی رہی ہو ۔ یہہ چاند سلطانہ کا پہلا دور ہے ۔

چاند سلطانہ کی زندگی کا دوسرا دور ۹۷۱ھ سے شروع ہوتا ہے جب کہ وہ دلہن بن کر بیجاپور کے بادشاہ کے دل میں حکمران تھی

ملک عنبر سپہ سالار احمدنگر

ملک عنبر کا مقبرہ

گولکنڈے کا نیا قلعہ

(قلعہ گولکنڈہ کے پہلو میں سلطان عبداللہ قطب شاہ نے جو نیا قلعہ بنایا تھا اس کی ایک جھلک)

اب بھی رونق پا رہا ہوں تیرے ویرانے میں میں
سن رہا ہوں کچھ سکوتِ شب کے افسانے میں میں

موجزن ہے تشنگی حوضوں میں پانی کیلئے
ابر جن پر چھا رہا ہے درفشانی کیلئے

ہیں نقوشِ جستجو تیرے شکستہ بام و در
جن میں کھو جاتی ہے دل کی دھڑکنیں لے کر نظر

تیرے سائے میں ہے اب تک بھی جھلک تلوار کی
تیرے خود رو دشت میں فرحت سی ہے گلزار کی

تیرا ہر پربت ہے اپنی عظمتوں کا رازداں
تیری خاموشی کے دامن پر ہیں نغموں کے نشاں

نوحہ خواں ہے پُرسکوں تالاب کی سرسبز دوب
شام کو جس کے کنارے مہر ہوتا ہے غروب

جو خموشی میں ہے کیفیت کہاں فریاد میں؟
یہ ہے مسجد یہ ہے خدا کا گھر خدا کی یاد میں

عکسِ ماضی دیکھتا ہوں میں تری تصویر میں
حسن کاری کا تخیل ہے تری تعمیر میں

پیکرِ مردہ میں تیرے زندگی کی آن ہے
اب بھی محلوں کے کھنڈر کی جاودانی شان ہے

تھی تری بیداری تقدیر سونے کیلئے
تو یوں ہی چھوڑا گیا برباد ہونے کیلئے

آج کردوں گا نمایاں بے بسی کے داغ کو
اپنے دل کے خون سے سینچوں گا تیرے باغ کو

آج میں تعبیر مانگوں گا فسونِ خواب سے
تیرے حوضوں کو بھروں گا آنسوؤں کی آب سے

ڈوب جائیگی اثر میں آج آہِ آتشیں
ثبت کردوں گا تری مسجد میں میں نقشِ جبیں

تیرے کھنڈروں میں سکونِ زندگانی پاؤں گا
تیری خاموشی میں ماضی کے ترانے گاؤں گا

میکش

گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت

قطب شاہی خاندان کی حکومت سرزمین حیدرآباد پر تقریباً دو سو سال یعنی ۹۱۸ھ سے ۱۰۹۸ھ تک رہی اور اس عرصہ میں اُن حکمرانوں نے یہاں تہذیب و تمدن تمول و ثروت، علم و فضل اور شعر و سخن کی ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس پر دکن کی تاریخ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ ان بادشاہوں نے شیعہ و سنی اور مسلمان و ہندو غرض ہر مذہب و ملت کے باشندوں میں ایک مشترک کلچر کے پیدا کرنے میں یہاں تک کامیابی حاصل کی تھی کہ دوسروں کے لئے اس ملک کے رہنے والوں کا باہمی اتحاد اور یگانگت باعث رشک تھی اسی موانست و مفاہمت کی خاطر انھوں نے اردو کی سرپرستی کی اور اس زبان میں ایسی ایسی بلند پایہ کتابیں لکھیں اور لکھوائیں جن پر اردو ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔

یوں تو قطب شاہی سلطنت کے بانی سلطان قلی کا تعلق اس سرزمین سے ۸۹۱ھ میں پیدا ہو چکا تھا جب وہ تلنگانہ کا صوبہ دار بنایا گیا تھا لیکن جب ۹۰۱ھ میں گولکنڈہ اور اس کے اطراف و اکناف کا علاقہ اس کو بطور جاگیر کے دے دیا گیا تو اس نے اس کا نام محمد نگر رکھا اور قدیم قلعہ کو مستحکم کر کے اس میں متعدد محلات تعمیر کئے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اپنے علاقہ کو وسیع کرنا شروع کیا۔ چنانچہ بیس بائیس سال کے عرصہ میں پانگل، کھمن پیٹ، کوئیل کنڈہ، اور بلکنڈل وغیرہ اس کے قبضہ میں آ گئے۔ ۹۲۴ھ میں اس نے قلعہ میں بالا حصار کے دامن میں مشہور مسجد صفا بنائی جس میں آخر کار ۹۵۰ھ میں اس کے فرزند نابکار قلی جمشید کے اشارہ سے سلطان قلی قطب شاہ کو ننانوے سال کی عمر میں عصر کی نماز پڑھتے وقت شہید کیا گیا۔ اس نے دوسرے صوبہ داروں کی طرح بہمنی بادشاہ کے خلاف علم بغاوت نہیں بلند کیا بلکہ آخر تک ان کی مدد کرتا رہا اور جب بریدیوں نے بہمنیوں پر پوری طرح قبضہ کر لیا تو مجبوراً سلطان قلی کو بھی اپنی بادشاہت کا اعلان کرنا پڑا۔

سلطان قلی کو فنِ تعمیر کا خاص ذوق تھا۔ اس نے قدیم قلعہ (موجودہ بالا حصار) کے اطراف ایک عالیشان شہر بنایا۔ اور دراصل وہی اس طرز تعمیر کا بھی بانی ہے۔ جو قطب شاہی کہلاتا ہے اور ایرانی، ہندو، اور پٹھان طرز ہائے تعمیر کے امتزاج سے بنا ہے اس کی وفات کے وقت اس کی سلطنت شمال میں دریائے گوداوری، مشرق میں اڑیسہ اور ساحلِ سمندر اور جنوب میں دریائے کرشنا تک پھیل چکی تھی۔

۲ جمشید قلی قطب شاہ تخت نشین ہوتے ہی اپنی سلطنت کے استحکام و وسعت میں مصروف ہو گیا۔ اگرچہ اس کا سات سال کا مختصر سا عہد حکومت زیادہ تر جنگ و جدل سخت گیریوں اور پریشانیوں میں گزر گیا۔ لیکن اس نے نارائن کھیڑ، احسن آباد اور میدک پر قبضہ کر کے قطب شاہی سلطنت میں اضافہ کیا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ لیکن اس کے عہد میں گولکنڈہ اردو شعر و سخن کا مرکز نہ بن سکا۔ اس کی وفات ۹۵۷ھ پر اس کے کمسن لڑکے سبحان قلی کو تخت نشین کیا گیا لیکن چند ماہ بعد ہی اس کا دوسرا بھائی ابراہیم قلی کوئیل کنڈہ کے نایک واڑیوں کی مدد سے قلعہ گولکنڈہ میں داخل ہوا۔ اور اپنے بھائی کے مظالم کی تلافی کرنے میں مصروف ہو گیا۔

۳ سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ کی شخصیت کو دکن کی سیاست میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اسی کے زمانہ میں ۹۷۲ھ میں تالی کوٹہ کی مشہور لڑائی ہوئی جس میں وجیانگر کی عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی گولکنڈہ کو مال و دولت اور سیاسی حیثیت سے کافی اہمیت حاصل ہو گئی۔ بعد میں ابراہیم قطب شاہ نے راجمندری، قاسم کوٹہ اور کھم میٹھ وغیرہ کے علاقے بھی فتح کئے۔ اس نے ۹۸۸ھ میں انتقال کیا۔ اس کو بھی اپنے باپ کی طرح تعمیر کا شوق تھا۔ چنانچہ بالا حصار کی سیڑھیوں کی مسجد، موسیٰ ندی کا پہلا پل، حسین ساگر بدیل کا تالاب، ابراہیم باغ، باغ گلشن، اور قصبہ ابراہیم پٹن [illegible] کی تعمیر [illegible] میں۔ اس کے عہد میں گولکنڈہ اردو زبان کا مرکز بن گیا۔ اور فیروز، محمود، احمد، وجہی جیسے بلند پایہ شعراء

اُسی کی قدردانی اُردو کی وجہ سے متعدد بیش بہا کتابیں اس زبان میں تصنیف کر سکے۔

۴ ابراہیم کے بعد اس کا تیسرا لڑکا سلطان محمد قلی تخت نشین ہوا جس نے سنہ ۹۹۹ھ میں اپنی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر بھاگ نگر کی بنا ڈالی۔ اور عالیشان محلات، حمام، مساجد، مدارس اور بازار وغیرہ تعمیر کیے۔ بھاگ نگر کے اطراف و اکناف بیس میل تک باغات بنائے گئے۔ نرکھوڑہ، ابراہیم پٹن، جونگیر، اور پٹن چیرو اس شہر کے حدود پر واقع تھے۔ سترہ برس کے بعد غالباً اپنی اکلوتی لڑکی شہزادی حیات بخشی بیگم کی شادی کے موقع پر بادشاہ نے اس پرانی بستی بھاگ نگر کا نام حیدرآباد قرار دیا۔

محمد قلی قطب شاہ نے سنہ [illegible]ھ میں سگر اور مندیال وغیرہ فتح کیا۔ اس کے زمانہ میں گولکنڈہ ہر لحاظ سے معراج کمال کو پہنچ گیا۔ شاہ عباس صفوی کا سفیر اغرلو سلطان اسی عہد میں گولکنڈہ آیا تھا۔ علم و فضل اور شعر و سخن کے لحاظ سے بھی یہ دور دکن کا عہد زرین سمجھا جاتا ہے۔ اسی دور میں اردو نے قطب شاہی سلطنت اور خاص کر گولکنڈہ اور حیدرآباد میں معراج کمال حاصل کیا اور اس سرزمین نے تمدن و معاشرت کے وہ تمام منازل طے کر لیے جو کسی ملک کو متمدن اور شائستہ ثابت کرتے ہیں۔ اسی زمانہ میں گولکنڈہ مختلف اقطاع عالم کے سیاحوں اور علماء و فضلاء کا مرجع و مامن بھی بن گیا تھا۔

سلطان محمد قلی نے جنگ و جدل سے زیادہ امن و امان، اور ملک کی وسعت سے زیادہ اہل ملک کی خوش حالی اور رعایا کی تعلیمی ترقی پر زور دیا۔ وہ خود بہت بڑا شاعر اور قدر دان سخن تھا۔ اس نے تین زبانوں فارسی، اردو اور تلنگی میں اپنے دیوان مرتب کیے تھے۔ اس کا اردو کلام نہایت اعلیٰ پایہ کا ہے۔ اس کا دربار شاعروں سے معمور تھا۔

حیدرآباد کی اکثر عمارتیں اسی صاحب ذوق بادشاہ کی یادگار ہیں۔ ان میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں :-

چار مینار، چار کمان، چار سو کا حوض، دارالشفا، جامع مسجد، داد محل، ندی محل، نبات گھاٹ، باغ دلکشا، خداداد محل (جو ہفت منزلہ تھا اور ہر منزل کا نام جدا تھا مثلاً الٰہی محل، محمدی محل، حیدری محل، حسینی محل، حسنی محل، جعفری محل اور موسوی محل)، باغ محمد شاہی، کوہ طور، جنان منزل اور بادشاہی عاشور خانہ وغیرہ۔

۵ محمد قلی قطب شاہ کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد سلطان مرزا سلطان محمد قطب شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس کی شادی حیات بخشی بیگم بنت سلطان محمد قلی کے ساتھ سنہ ۱۰۱۶ھ میں نہایت تزک و احتشام سے ہوئی تھی۔ اس کا عہد حکومت بھی امن و امان اور خوش حالی میں گذرا۔ اسی زمانہ میں شہزادہ خرم نے جو بعد میں شاہجہاں کے لقب سے جہانگیر کا جانشین ہوا باپ سے بغاوت کر کے اور اس کی فوجوں سے شکست پا کر قطب شاہی سلطنت میں پناہ لی تھی۔ سلطان محمد نے اس کے ساتھ ہمدردی کی اور ایسے وقت میں اس کی مالی امداد کی جب کہ وہ بالکل محتاج تھا اور اکثر رفیقوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

سلطان محمد قطب شاہ نے اپنے چچا کی قدردانی شعر و سخن کو جاری رکھا۔ لیکن وہ شاعر ہونے کے علاوہ عالم و فاضل بھی تھا۔ اس نے شعر و سخن اور علم و فضل کے ساتھ زہد و تقویٰ اور اخلاق و آداب کا بھی خاص خیال رکھا۔ اسی کے عہد میں اس خاندان کی مشہور تاریخ سلطان محمد قطب شاہی لکھی گئی۔ اس کے دور میں بھی دکن کے حکمرانوں کے علاوہ جہانگیر اور شاہ عباس صفوی کے سفراء گولکنڈہ آئے تھے۔ اس کے عہد کے دو شاعروں میں وجہی کے علاوہ غواصی اور ابن نشاطی کے نام خاص کر قابل ذکر ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ سلطان محمد کو بھی اپنے اجداد کی طرح فن تعمیر سے خاص شغف تھا۔ اس نے قلعہ محمد نگر گولکنڈہ کے مقابل میں حیدرآباد کے مشرقی جانب چھ میل کے فاصلہ پر ایک قلعہ سلطان نگر کی سنہ ۱۰۳۳ھ میں بنا ڈالی لیکن اس کا بہت جلد انتقال ہو گیا اور وہ قلعہ ناتمام رہا۔ اس کے علاوہ اسی سلطان نے مکہ مسجد، محل سلطان شاہی، اور گوشہ محل کی بھی بنا ڈالی تھی مگر اس کا کوئی کام اس کی زندگی میں تکمیل نہ پا سکا۔ اس کی جوانمرگی نے اس کو ہر طرح سرماں نصیب رکھا۔ اگر وہ چند اور سال زندہ رہ جاتا تو گولکنڈہ کی سلطنت اس قدر جلد زوال پذیر نہ ہونے پاتی۔

۶ سلطان محمد کے بعد اس کا اکلوتا لڑکا عبداللہ مرزا سنہ ۱۰۳۵ھ میں بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس بادشاہ کی یہ کم عمری اور ناتجربہ کاری قطب شاہی سلطنت کی کمزوری کا باعث ہوئی۔ سلطان عبداللہ کی کمزوریوں سے سب سے زیادہ محمد سعید میر جملہ نے فائدہ اٹھایا۔ آخر کار جب بادشاہ نے اس سرکش کا استیصال کرنا چاہا تو اس نے شہزادہ اورنگ زیب کے یہاں پناہ لی اور قطب شاہی سلطنت اور اس کے حکمران کی کمزوریوں سے غنیم کو واقف کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گولکنڈہ کی آزادی قائم نہ رہ سکی۔ اور اس کی عظمت و شوکت کا آفتاب غروب ہونے لگا۔

ان سیاسی پریشانیوں کے علاوہ سلطان عبداللہ کے عہد میں حیدرآباد کو ایک تباہ کن قحط اور پھر ایک زبردست طغیانی رود موسیٰ کی وجہ سے بھی سخت صدمے اٹھانے پڑے۔ لیکن ان سب صدموں سے بڑھ کر اہل حیدرآباد اس پریشانی اور ذلت سے متاثر ہوئے جو سنہ ۱۰۶۶ھ میں میر جملہ کی وجہ سے اورنگ زیب کے حملہ کی شکل میں نمودار ہوئی۔ اس وقت مغلوں نے لوٹ مار کے سلسلہ میں حیدرآباد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور تمام شہر کو تباہ کر کے چھوڑا۔

غرض عبداللہ قطب شاہ کی زندگی پریشانیوں اور کشمکشوں میں گذر گئی۔ وہ آخر دم تک اولاد نرینہ کا متمنی رہا۔ اور اسی یاس و امید میں ایک پوری عمر صرف گذار دی۔ پچاس سال کی طویل حکومت کے بعد سلطان عبداللہ نے سنہ ۱۰۸۳ھ میں انتقال کیا اور دراصل اس کے ساتھ ہی قطب شاہی حکمرانوں کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ وہ بھی اردو زبان کا ایک اچھا شاعر تھا اس کے عہد میں بھی علم و فضل اور شعرا و شاعری کی قدردانی جاری رہی فارسی کی مشہور فرہنگ برہانِ قاطع اور اردو کی مشہور کتابیں سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ، پھول بن، اور ماہ پیکر وغیرہ۔ اسی دور کی یادگار ہیں۔

۷ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے بعد اس کا چھوٹا داماد ابوالحسن تانا شاہ تخت نشین ہوا وہ چودہ برس تک قطب شاہوں کی اس امانت یعنی سلطنتِ گولکنڈہ کو دشمنوں سے بچاتا رہا۔ وہ نہایت دور اندیش اور فلسفی منش حکمران تھا۔ اس نے قلیل عرصہ میں قطب شاہی سلطنت کے ان تمام کل پرزوں کو درست کر دیا جو سلطان عبداللہ کے پچاس سال کے طویل عہد حکومت میں بالکل کمزور اور منتشر ہو گئے تھے۔ اگر شہنشاہ اورنگ زیب جیسے طاقتور دشمن سے مقابلہ ہو۔ اور تمام ہندوستان کی فوجیں اس کے مقابلہ کے لئے جمع نہ ہو جاتیں تو وہ قطب شاہوں کی اس امانت کو اپنی اولاد تک نہایت مستحکم اور طاقتور حالت میں منتقل کر سکتا۔ اس کے عہد میں بھی حیدرآباد اردو شاعروں اور انشا پردازوں کا مرکز بنا رہا۔ طبعی اور غلام علی جیسے بلند مرتبہ شاعر اس وقت بھی موجود تھے۔ جنھوں نے وجہی و غواصی کے خدمات شعر و سخن کو بدستور جاری رکھا۔

سلطان ابوالحسن قطب شاہ نے جس خوبی اور مردانگی سے مغلوں کا مقابلہ کیا اور اثنائے جنگ میں اس کا برتاؤ جیسا شریفانہ اور بہادرانہ رہا اس کے تذکرے خاص و عام کی زبان پر اب تک جاری ہیں اس نے قطب شاہی افواج کی اخلاقی حالت اس قدر درست کر دی تھی کہ دشمن بھی اعتراف کرتے تھے۔ اگر اورنگ زیب کا تدبر اور میر جملہ کے جانشین غدار قطب شاہی امرا کا مکر و فریب کارگر نہ ہوتا تو شاید ہی گولکنڈہ فتح ہو سکتا۔

(ماخوذ از سیرِ گولکنڈہ)

سید محی الدین قادری زور

سلطان قلی قطب شاہ
والی گولکنڈہ
۹۱۸ھ تا ۹۵۰ھ

جمشید قلی قطب شاہ
۹۵۰ھ تا ۹۵۷ھ

(۹۲۴ھ تا ۹۵۰ھ)

سلطان قلی قطب شاہ سلطنت گولکنڈہ کا بانی ہے۔ وہ ترکستان کے ایک بہت بڑے اور مشہور حکمران قبیلے قراقونیلو کا رکن تھا۔ وہ ۹۰۰ھ میں دکن آیا تھا۔ اس کے دکن آنے کا سبب خاندان شاہیکی تباہی اور قبیلہ قراقونیلو کا ترکستان پر تسلط ہے۔ وہ اپنے چچا اللہ قلی کے ساتھ قیمتی تحفے وغیرہ لے کر ہندوستان آیا تھا۔

سلطان قلی ترکستان سے سیدھا دکن آیا۔ یہ محمود شاہ بہمنی کا عہد حکومت تھا جبکہ بیدر تمام ممالک عجم کا مرکز بن گیا تھا۔ ان کے خاندانی حالات اور وجاہت کو دیکھ کر بہمنی دربار نے ان کی بہت آؤ بھگت کی۔ سلطان قلی اپنے چچا کے ساتھ جب پہلی مرتبہ دکن آیا تو دونوں کے لئے تا قیام وظیفہ قائم رکھا گیا تھا دوسری مرتبہ آیا تو بہت سی عنایتیں ہوئیں اور ان کو ٹھہر جانے کے لئے مجبور کیا گیا۔ یہی اسباب ہیں جنکی وجہ سے سلطان قلی دربار دکن سے بہت متاثر ہوا تھا۔

چند دنوں کے بعد ترکستان کے حاکم امیر یعقوب کے مرنے کی خبر آئی اور یہ ہمدان کے شاہی خاندان کے لئے اچھا موقع تھا۔ اللہ قلی بیگ نے بادشاہ سے مراجعت کی اجازت چاہی۔ اللہ قلی کے اصرار پر اس کو تو اجازت مل گئی لیکن بادشاہ نے کہا کہ "اللہ قلی بیگ اگر تو می رودی مختاری، مگر سلطان قلی بیگ را بہ ہیچ وجہ رخصت انصراف نمی دہیم"۔ اس کے علاوہ خود سلطان قلی بھی واپس نہیں جانا چاہتا تھا اس لئے اللہ قلی کو مجبوراً تنہا لوٹنا پڑا۔ اور سلطان قلی دکن میں رہ گیا۔

سلطان قلی کی استقامت سے محمود شاہ بہت خوش تھا۔ اس کو اپنے مقرب درباریوں میں شریک کر لیا۔ اس کی ترقی کا بڑا سبب اس کی ذاتی قابلیت تھی۔ شکار کے مشہور واقعہ کے بعد اس کو ایک سو پچاس عربی و ترکی گھوڑے مع سازوسامان عطا ہوئے اور خلعت عنایت کی گئی اور اس کے اخراجات کے لئے کوڑنگل اور اس کے مضافات دئے گئے اور جواہر خانہ خطاب سے سرفراز ہوا۔ سلطان قلی علم حساب بھی جانتا تھا اور خوش خط بھی تھا اسی لئے بادشاہ نے اس کو شاہی محلات کا محاسب بنایا۔ اس کی بڑی قابلیت کا اظہار تلنگانہ کے ہنگاموں میں ہوا جہاں وہ خود اپنی خواہش سے ڈاکوؤں کی سرکوبی اور ادائی مالگزاری کے لئے رعایا کو پابند کرنے گیا تھا۔ چونکہ اس میں علمی اور فوجی دونوں قابلیتیں تھیں اس کو فرامین میں صاحب السیف والقلم کہا جاتا تھا۔

اس کے بعد سلطان قلی کی قابلیت اس وقت ظاہر ہوئی جبکہ ۸۹۶ھ میں امیر بیدر نے باغیوں سے انتقام لینے کے لئے قلعہ پر حملہ کر دیا تھا۔ خود بادشاہ کی جان سخت خطرے میں تھی قلعہ دار حسن علی سبزواری اور سید مرزائی مشہدی نے ساتھ سلطان قلی بھی مع دس ہزار سوار جوانوں کے موجود تھا۔ یہاں سلطان قلی کی بہادری و وفاشعاری اس کی غیر معمولی ترقی کا باعث ہوئی چنانچہ بادشاہ نے خوش ہو کر اس کو قطب الملک کا خطاب دیا تھا۔

اس کے تین سال بعد ۸۹۹ھ میں متوفی ساحل کی بغاوت سلطان قلی کے لئے مزید ترقی کا باعث ہوئی۔ یعنی وہ تمام ممالک تلنگانہ کا صوبہ دار بن گیا۔ بہمنی امیر عماد گیلانی کی سرکوبی میں اس نے بڑا حصہ لیا۔ جب بادشاہ خونی ماہی کی مہم سے فارغ ہو کر بیدر آیا تو قطب الملک سلطان قلی کو تلنگانہ کا صوبہ دار بنا دیا۔ اور اس کی قدیم جاگیر میں گولکنڈہ اور ورنگل کا اضافہ کیا

دکن کے سیاسی انتشار نے بھی سلطان قلی کی مدد کی۔ اسی انتشار میں وہ ترقی کر کے گولکنڈہ کی خود مختار سلطنت قائم کر سکا۔ دکن میں ملکی اور غیر ملکی عناصر کی کشمکش اور حکومت کی کمزوریوں سے جب بہمنی سلطنت کا دسویں صدی ہجری کے اوائل میں خاتمہ ہوا اور اس کے حصے بخرے ہونے لگے تو بیجاپور، احمد نگر،

اور برار کے ساتھ گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت بھی قائم ہوگئی ۔

سنہ ۹۲۴ھ میں سلطان محمود کے انتقال کے بعد وہ خودمختار ہوا اور اس کے بعد اس نے گولکنڈہ کو پایۂ تخت بنایا۔ قلعہ اور شہر کی تعمیر کی۔ فوجی نقطۂ نظر سے گولکنڈہ نہایت موزوں سمجھا گیا ۔ اپنے گھر کے انتظام کے بعد اس نے مشرقی تلنگانہ کے مختلف صوبوں پر وار کرنے شروع کئے تقریباً ۲۰ سال کے دوران میں ساٹھ ستر قلعے اور حصار فتح کئے ۔ اور سلطنت کو نیل کی سرحد سے بندر مچھلی پٹن تک پہنچا دیا ۔

سنہ ۹۵۰ھ اواخر جمادی الاول میں اس کے بیٹے جمشید نے ہوسِ سلطنت میں اسے قتل کروایا ۔ اس نے تقریباً پچاس سال دکن میں حکومت کی ۔ مگر اس کا ابتدائی زمانہ بھی شامل کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے تقریباً ساٹھ سال سیاستِ دکن کی رہنمائی کی ۔ اسی مدت میں اس نے جنوبی ہند کے تمدن و سیاست میں ایک بڑا تغیر پیدا کیا تھا ۔ یہاں کی منتشر اکائیوں کو ایک رشتہ میں منسلک کر کے اس ملک کی خاطر خواہ شیرازہ بندی کر دی تھی اور باضابطہ نظم و نسق سے یہاں امن و امان قائم کر دیا تھا ۔

جمشید قطب شاہ

(سنہ ۹۵۰ھ تا سنہ ۹۵۷ھ)

سلطان قلی قطب شاہ نے ۔ ۔ برس ... عہد حکومت کے بعد سنہ ۹۹ ... انتقال ... کی ... کے ہر متعلقات میں چھوڑ گیا تھا ۔ اس کے ۶ بیٹے تھے ۔ فرزند اکبر حیدر قلی جو جانشینی کے لئے نامزد ہو چکا تھا باپ کی زندگی میں انتقال کر گیا ۔ اس کے بعد سلطان قلی قطب شاہ نے اپنے دوسرے بیٹے قطب الدین کو ولیعہد بنایا لیکن اس کے مقابلہ میں اس کے دوسرے بھائی جمشید قلی ، عبدالکریم اور دولت قلی بہت تیز طبیعت اور حوصلہ مند تھے ۔ چھٹا بیٹا ابراہیم قطب دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ لائق تھا ۔ عبدالکریم باپ کی زندگی ہی میں بغاوت کی پاداش میں مارا گیا ۔ اور جمشید اور دولت بھی نظر احتیاطاً قید رکھے گئے تھے ، لیکن جمشید قلی جو گولکنڈہ ہی میں مقید تھا ، اپنے لئے قید ہی سے راستہ صاف کرنے لگا اور سازش کی اور ایک شخص میر محمود ہمدانی کے ذریعہ اپنے باپ کو قتل کروایا ۔ باپ کے مرنے کے بعد جمشید قید سے باہر نکلا اور اپنے ہمدردوں کے زور سے سلطنت کے سیاہ و سفید اپنے ہاتھ کر لیے ۔ قطب الدین ولیعہد سلطنت اندھا کر دیا گیا ۔

سنہ ۹۵۰ھ میں جمشید قطب شاہ کی تخت نشینی عمل میں آئی اور سنہ ۹۵۷ھ تک سات سال اس نے حکومت کی ۔ اگرچہ تخت نشینی کے بعد جمشید نے رعایا و برایا کو خوش کرنے کی کوشش کی اور انھیں مختلف انعامات سے سرفراز کیا لیکن راعی و رعایا میں کچھ خوشگوار تعلقات نہ پیدا ہو سکے ۔ پہلے تو اس کے کرتوت ہی اس کی بدنامی کے لئے کافی تھے پھر تخت نشینی کے بعد جبکہ اس کی عمر ۰ سال کی تھی طبیعت کی ترشی اور تند مزاجی نے اس کے بہت سے مخالف پیدا کر دئے ۔ جمشید کا چھوٹا بھائی ابراہیم جو دیورکنڈہ سے بھاگ کر ملک برید کے پاس بیدر پہنچ گیا تھا برید کی امداد کے ساتھ گولکنڈہ کی دیواروں تک پہنچ گیا ۔ اگرچہ یہ حملہ برہان نظام شاہ والی احمدنگر کی تائید سے رفع ہو گیا تھا لیکن ملک برید اس حملہ کے بعد سے گولکنڈہ کی اندرونی سیاسی فضا اور جمشید کی کمزوریوں سے واقف ہو گیا ۔ بیدر کی بریدشاہی سلطنت بہت مختصر تھی لیکن اس زمانہ میں برید دکن کی لومڑی کہلاتے تھے ۔ وہ آپس کے جوڑ توڑ میں بہت مشاق تھے کبھی بیجاپور کا ساتھ دیا تو کبھی احمدنگر کا ۔ ہر حیلہ و بہانہ سے ان سلطنتوں کو لڑوایا کرتے تھے تاکہ اس طرح سے ان کا فائدہ ہو جائے ۔ چنانچہ جمشید کے زمانے میں بھی لڑائیاں بہت کم ہوئی ہیں ۔

برہان نظام شاہ نے جمشید قلی قطب شاہ سے زیادہ دوستی بڑھائی تھی اور بیجاپور پر احمد نگر نے حملہ کیا تو عماد الملک اور جمشید دونوں احمد نگر کے ساتھ شریک تھے۔ لیکن ابراہیم عادل شاہ کی تائید پر برید کی فوجیں تھیں۔ کہتے ہیں کہ اس موقع پر جمشید نے بڑا کام کیا۔ اس کے آگے بڑھنے سے ابراہیم اور برید میدان چھوڑ کر بھاگے اور جمشید نے برید کا بیدر کی دیواروں تک تعاقب کیا

اس شکست کے بعد برید خاموش کیسے بیٹھ سکتا تھا۔ انتقام لینے کے لئے برید نے غالباً ۹۵۰ھ میں گولکنڈہ پر حملہ کر دیا لیکن جمشید نے بڑی ہوشیاری کی۔ تھوڑی سی فوج یہاں چھوڑ کر پہلے سے بیدر پر حملہ کر بیٹھا۔ برید کی فوجیں لوٹ گئیں اور دونوں کا مقابلہ ہوا۔ یہاں بھی گولکنڈہ کی فتح ہوئی۔

برید کا جذبۂ انتقام اس کی شکستوں سے اور بڑھ جاتا تھا۔ اب اس نے چوتھی مرتبہ ابراہیم عادل شاہ بیجاپور کی امداد سے جمشید پر حملہ کیا۔ کئی دن لڑائی ہوئی مگر اس میں بھی جمشید ہی کے سر فتح کا سہرا رہا۔

اس کے بعد جمشید نے ہمیشہ کے لئے برید کا خاتمہ چاہا۔ اس نے دکن کی تمام دوسری ریاستوں کو ہموار کر کے برید پر متفقہ حملہ کیا۔ بیجاپور بھی جو اب تک برید کا دوست تھا اس اتحاد میں شریک ہو گیا۔ چنانچہ جب برید بار مان کر بیجاپور بھاگا تو امن دینے کے بجائے ابراہیم نے اسے گرفتار کر لیا لیکن دکن کی سلطنتوں میں کچھ ایسی رقابت تھی کہ بعد کو جمشید نے برید کو چھڑا لیا اور سمجھا کر صحیح سلامت چھوڑ دیا۔

بیدر سے واپسی کے بعد جمشید نے دو تین سال آرام سے گزارے لیکن یہ کچھ زیادہ دن آرام نہ لے سکا وہ بڑے سخت مرض میں مبتلا ہو گیا۔ فرشتہ اسے دق بتاتا ہے لیکن تاریخ قطب شاہی الف نامہ میں یہ مرض سرطان تھا جس کے صدمہ سے ماہ آخر ۹۵۰ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے صرف سات سال حکومت کی۔ اس کو سلطان قلی قطب شاہ کے قریب دفن کیا گیا۔

انتہائی برائیوں کے گھٹا ٹوپ میں جو جمشید سے سرزد ہوئی تھیں اس کے کوئی اوصاف دکھائی نہیں دیتے لیکن اس کی برائیوں کو قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اس میں بہت سے اوصاف ایسے بھی ملتے ہیں جو اس کے نام آور ہیں۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے شاید ہی شاہان ہندوستان کے اچھے حکمرانوں میں سے تھا۔ دکن کی سیاست پر اس کی وسیع نظر تھی۔ سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے وہ ہمیشہ کامیاب ہتھکنڈے اختیار کرتا تھا۔ چنانچہ برید کے شر و فساد سے دامن چھڑانے کے لئے احمد نگر اور بیجاپور سے اتحاد کیا تھا۔ اس کی فوجی تنظیم نہایت اچھی تھی۔ وہ خود جری سپاہی تھا اور فوج میں بذات خود حصہ لیتا تھا۔ اس کی دلیری اور جرأت کا یہ نتیجہ تھا کہ سوائے جنگ [illegible] کے جہاں عین الملک کے بیٹے کی غفلت سے حالت خراب ہو گئی تھی گولکنڈہ کی فوج کو کبھی شکست نہیں ہوئی اور سلاطین دکن ہمیشہ اس کی امداد کے طالب ہوتے تھے۔ وہ شجاعت کے ساتھ خوش مزاجی کا جوہر بھی اپنے اندر رکھتا تھا۔

ان اوصاف کے ساتھ جمشید میں علمی قابلیت بھی تھی۔ وہ اچھا شاعر تھا بعض دفعہ اس نے فی البدیہہ اشعار کہے تھے۔ اس نے فرصت کے لمحوں میں بہت سے قصیدے اور غزلیں بھی لکھی تھیں۔

عبدالحفیظ صدیقی

جدید اردو شاعری

مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل بی کی معرکتہ الآرا تصنیف ہے جو عہد حاضر کی اردو شاعری پر ایک مستند اور اپنی آپ نظیر کتاب ہے اس موضوع پر اس سے بہتر کوئی کتاب اردو میں موجود نہیں ہے اکثر شعرائے اردو کی تصاویر بھی ہیں صفحات [illegible] قیمت [illegible]

سب رس کتاب گھر سے طلب کیجئے

ابراہیم قلی قطب شاہ

(۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ)

جمشید قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد تخت گولکنڈہ کے کئی دعویدار کھڑے ہو گئے۔ جمشید کا صغیر سن بیٹا سبحان قلی تخت پر بٹھا تو دیا گیا لیکن دو زبردست حریف اٹھ بیٹھے۔ دولت قلی نے کوہیر میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اور ابراہیم قلی بیجا نگر سے حصول تخت کے لئے۔ دولت قلی کو کسی نہ کسی طرح مقید کر لیا گیا پر ابراہیم قلی کے سامنے کسی کی کچھ پیش نہ گئی اور ۹۵۷ھ میں تخت گولکنڈہ ابراہیم قلی قطب شاہ سے زینت پایا۔ ابراہیم قلی قطب شاہ بڑا دور بین بادشاہ تھا۔ اس نے مصطفیٰ خان کو اپنا وزیر مقرر کیا اور اپنی بہن اس سے منسوب کر دی۔

۹۶۲ھ میں حسین نظام شاہ اور ابراہیم قطب شاہ کے متحدہ لشکر نے گلبرگہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن رام راج والی بیجانگر کی گفت و شنید نے محاصرہ اٹھانے پر مجبور کیا۔

۹۶۶ھ میں علی عادل، رام راج اور ابراہیم قطب شاہ تینوں نے احمد نگر پر حملہ کر دیا۔ قریب تھا کہ احمد نگر فتح ہو جائے لیکن چونکہ اس فتح سے علی عادل کی قوت بہت بڑھ جاتی تھی۔ اور سلطنت گولکنڈہ کو اس سے خدشہ تھا ابراہیم راتوں رات اپنا لشکر لے کر چلا آیا۔ حسین نظام شاہ نے اپنی بیٹی ابراہیم کے عقد میں دی۔ اور اپنے کھوئے ہوئے قلعے واپس لینے کے لئے ابراہیم کی مدد چاہی۔ ابراہیم نے اپنی فوج بھیج دی۔ لیکن یہ مہم مستقل طور پر نہیں لڑی گئی۔ کچھ ہی دن بعد فوج بغیر کسی نتیجہ کے واپس لوٹی۔ اس وقت گولکنڈہ بیرونی حملہ آوروں کی زد میں تھا۔ رام راج کی فوج اندر تک گھس آئی تھی اور بادشاہ کو گولکنڈہ، گھن پورہ، اور پانگل کے قلعے دے کر صلح کر لینا پڑا۔ بیرونی دشمن دفع ہو چکا تو اندرونی دشمنوں نے سر اٹھایا ابراہیم قلی نے گولکنڈہ کے حصار کی مرمت کروائی اور شہر کو ہر طرح محفوظ کر لیا۔ اسی اثنا میں نائب وزیروں کا فساد ہوا لیکن بہت جلد فرو کر دیا گیا۔

رام راج کی قوت بہت بڑھ چکی تھی۔ اور وہ اسی زعم میں اپنی ہمسایہ سلطنتوں کو چھیڑ چھیڑ کر اپنی طاقت جتلا رہا تھا۔ مسلمان قوتیں ایک دوسرے کی دشمن سہی لیکن وقت پر متحد ہو بھی جاتی تھیں۔ ابراہیم قلی قطب شاہ، حسین نظام شاہ، علی عادل، اور علی برید نے رام راج پر حملہ کر دیا۔ اور مشہور فیصلہ کن جنگ تالی کوٹ ہوئی۔ راجہ کو شکست فاش ہوئی۔ اور ابراہیم کے کھوئے ہوئے قلعے پھر اسے واپس مل گئے۔

۹۸۱ھ میں ابراہیم نے رفعت خان لاری کو راجمندری کی فتح کے لئے بھیجا۔ دو زبردست معرکوں کے بعد راجمندری پر قطب شاہی افواج قابض ہو گئیں۔

ابراہیم کا دور حکومت نہایت پر آشوب اور معرکہ آرائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ایک فتنہ کا سر دبایا گیا تو دوسرا اٹھا۔ بادشاہ کا لشکر کبھی اتحادیوں کو ان کی بد عہدی کی سزا دینے میں مصروف ہوتا تو کبھی چھوٹے موٹے راجاؤں کو ان کی سرکشی کی۔ شاہی اقبال ہمیشہ یاوری کرتا اور ہر جگہ بادشاہ کو فتح ہوتی۔ ابراہیم قلی قطب شاہ کا انتقال ۹۸۸ھ میں ہوا۔ کل تیس سال نو مہینے اس کی حکومت کا زمانہ ہے۔ اس کے زمانے میں گولکنڈہ میں کئی عمارتیں بنیں۔ لنگر دوازدہ امام، ریاض محل، باغ ابراہیم شاہی، حوض حسین ساگر، کنگور، کنگورہ بدویل، کے علاوہ مساجد، مدارس بھی تعمیر پائے۔

رشید قریشی

ابراہیم قلی قطب شاہ
۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ

محمد قلی قطب شاہ
بانی حیدرآباد
۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ

وداعِ شاہ

تانا شاہ کی روانگی کے وقت اہلِ گولکنڈہ کی زبان سے

باحال تباہ جا رہا ہے　　کانٹوں کی سی راہ جا رہا ہے
کس یاس سے آہ جا رہا ہے　　اب قلعہ سے شاہ جا رہا ہے

کس طرح غبار راہ دیکھیں
ٹوٹے ہوئے دل کی چاہ دیکھیں

مٹ جائیں گے خود ہی اے عدو ہم　　آئیں گے نہ تیرے روبرو ہم
رہیں گے تباہ رنگ و بو ہم　　بیچیں گے نہ اپنی آبرو ہم

کس آس پہ اب رہیں جہاں میں
اُجڑے ہوئے رنگ گلستاں میں

ہم کو تو ملا تھا تاجِ شاہی　　کن آنکھوں سے دیکھیں یہ تباہی
آتا ہے ہمیں بھی رقصِ ماہی　　پائیں گے نہ ہم سے بے پناہی

وقت آپ کے جان دیں گے
مر کر ہی تجھے مکان دیں گے

پامال ہوں آفتاب ہو کر　　مر جائیں شہ بے تاب ہو کر
چھپ جائیں نظر سے خواب ہو کر　　بے کیف ہیں شباب ہو کر

جب شاہ نہیں تو ہم ہیں کیا چیز
غیروں سے حدیثِ غم ہے ناچیز

بے آبروئی سے ڈر رہی ہیں　　ٹھکرا کے جہاں کو مر رہی ہیں
نقشوں سے کنویں کو بھر رہی ہیں　　نام آنے کا کام کر رہی ہیں

ہر داغ پہ نقش ہے وہ گل ہے
ہر جنس کا دل بھی مرد دل ہے

میکش

غواصی ملک الشعرائے گولکنڈہ

مرزا محمد امین میر جملہ

خواجہ افضل ترک

سلطان محمد قطب شاہ نے ۱۰۲۵ھ میں منصب سرخیلی پر سرفراز کیا تھا اور چار لاکھ ہون کی مشروط خدمت جاگیر دی تھی لیکن آخر زمانہ میں ۱۰۳۰ھ میں بادشاہ نے ان کو معزول کرکے مرزا روزبہان کو سرخیل بنایا اور ان کی جاگیر مرزا محمد تقی طباطبا کو عنایت کردی تھی۔

اس واقعہ کے دو ماہ بعد ہی جب سلطان عبداللہ تخت نشین ہوئے تو منصور خاں میر جملہ نے مرزا روزبہان کو معزول کردیا خواجہ افضل پھر اپنی جگہ پا گئے۔ اور اب کی بار علامہ ابن خاتون کے ساتھ مل کر انتظام شروع کیا کہ ۱۰۳۵ھ میں شاہ محمد پیشوا کو معزول کرا دیا لیکن علامہ ابن خاتون کی رمضان ۱۰۳۵ھ میں منصب پیشوائی پر سرفرازی کے بعد خواجہ افضل بھی زیادہ دن تک پائے تخت میں نہ رہ سکے۔ چنانچہ مرتضی نگر اور کھمم میٹ کے عامل میر ابو المعالی دیانت خاں کو جب وہاں کی رعایا نے مار دیا تو بادشاہ نے خواجہ افضل ترک کو وہاں کی حکومت تفویض کرکے آخر ۱۰۳۵ھ میں دارالسلطنت سے روانہ کیا۔ خواجہ افضل پورے تزک و احتشام اور فوج کے ساتھ مرتضی نگر کی طرف روانہ ہوئے اور راستہ میں جہاں کہیں چوروں اور اوباشوں کا پتہ چلا سب کو تہ تیغ کیا اور اس سمت کے چار سو عیار اور ہزار چوروں کو بیک وقت گرفتار کر لیا اور راستوں پر جگہ جگہ ان کو سولی پر لٹکا دیا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور سرکشوں کی تنبیہ ہو سکے۔ غرض اس علاقہ کو خس و خاشاک سے پاک کرتے ہوئے زمانہ میں بھی خلائق کی حفاظت اور غلہ رسانی وغیرہ کا بڑا اچھا انتظام کیا۔

ابھی خواجہ افضل مرتضی نگر کے صوبہ دار ہی تھے کہ ۱۰۴۱ھ میں باقر خاں صوبہ دار بنگالہ نے قطب شاہی علاقہ کسیمکوٹ پر حملہ کرکے کچھ حصے اپنے قبضہ میں کر لئے۔ وہاں کے عاملوں اور فوجوں نے بادشاہ سے مدد طلب کی۔ بادشاہ نے خواجہ افضل کے یہاں آدمی دوڑائے اور ان کو سرعت تمام پایہ تخت پہنچنے کا حکم دیا۔ چنانچہ خواجہ افضل اسی فرسخ کے فاصلہ کو ایک ... دن میں طے کرکے بارگاہ بادشاہی میں پہنچے بادشاہ بہت خوش ہوئے اور ۲ رجب ۱۰۴۱ھ کو تشریف و خلعت خاص اور ... انعام و اکرام سے سرفراز کیا اور باقر خاں کے مقابلہ پر جانے کا حکم دیا۔ شجاع الملک شیر محمد خاں اور چند دکنی سرداروں، حوالہ داروں اور ہزار سواران ... ان کے ساتھ کیا۔ اور تمام کسیمکوٹ کو اطلاع کرا دی کہ سب خواجہ افضل کی مدد کریں اور اس کے مطیع و منقاد رہیں اس کے علاوہ میاں حسینی حوالدار دروازہ شیر علی بادشاہی کو راجمندری روانہ کیا تاکہ خواجہ افضل کے لشکر کے لئے غذا پانی کا پہلے سے انتظام کر رکھے۔ چنانچہ خواجہ افضل ایک زبردست لشکر کے ساتھ کسیمکوٹ کی طرف روانہ ہوئے اور پہلے راجمندری پہنچے راستہ میں ہر جگہ خواجہ کی فوج میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ مرتضی نگر میں خواجہ افضل کا جو لشکر تھا وہ بھی مدد کو آیا اور دریائے کرشنا کو عبور کرکے مصطفی نگر کے پاس خواجہ کے شاہی لشکر سے مل گیا۔ اس عظیم الشان لشکر کے ساتھ خواجہ افضل کسیمکوٹ پہنچے تو معلوم ہوا کہ باقر خاں کو شاہ جہاں نے واپسی کا حکم دیا ہے اور جتنے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا ان کو چھوڑ کر باقر خاں کی فوجیں واپس ہو رہی ہیں اس طرح لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اور خواجہ افضل کو چند روز راجمندری میں قیام کرنے کا حکم دیا گیا۔

خواجہ افضل ابھی راجمندری میں تھے کہ مرہری پنڈت سپہ سالار عادل شاہی نے ۱۰۴۲ھ میں قطب شاہی علاقہ پر حملہ کیا اور قلعہ کولاس کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت اگرچہ بادشاہ نے دوسرے امراء کو مقابلے کے لئے روانہ کر دیا تھا تاہم اعظم الامرا خواجہ افضل کو پورے لشکر اور انتظام کے ساتھ راجمندری سے گولکنڈہ آنے کا حکم دیا۔

خواجہ افضل اسی اثنا میں سخت بیمار ہو گئے تھے اور اسی حالت میں وہ حیدرآباد آئے لیکن جانبر نہ ہو سکے چنانچہ ۱۰ جمادی الآخر ۱۰۴۲ھ کو

حیدرآباد میں وفات پائی۔

خواجہ افضل سلطان محمد کے زمانہ میں نو سال خدمت سرخیلی پر اور سلطان عبداللہ کے زمانہ میں چھ سال سپہ سالاری، صوبہ داری اور وزارت کے عہدہ پر مامور رہے اور تجمل و ثروت میں اپنے امثال و اقران میں ممتاز تھے اسی لئے حدیقہ میں ان کو اعظم الامرا لکھا ہے۔ ان کے ملازمین جن میں ایک ہزار ترکی و عرب و عجمی سوار تھے یوزچی بیگ کے سپرد کئے گئے۔ اور ان کی جاگیر مرتضیٰ نگر میر فصیح الدین محمد تفرشی کو سرفراز کی گئی۔

مرزا روزبھان اصفہانی

سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے عمائدین سلطنت سے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی وفات سے ۲ ماہ قبل ربیع الاول ۱۰۳۵ھ میں ان کو خواجہ افضل ترک کی معزولی کے بعد سرخیلی کے منصب ارجمند پر سرفراز کیا تھا لیکن سلطان عبداللہ کی تخت نشینی کے بعد جب خانم آغا اور منصور خاں حبشی کا دربار پر اثر جم گیا تو مرزا روزبھان کو معزول کرکے مجلسیان حضور کے زمرہ میں شریک کردیا گیا۔ لیکن جب منصور خاں میر جملہ کا انتقال ہوگیا اور علامہ ابن خاتون پیشوائے سلطنت اور مختار دربار ہوگئے تو انھوں نے میرزا روزبھان کے لئے کوشش شروع کی اور بادشاہ کے سامنے ان کی بڑی تعریف کی چنانچہ ۳ ربیع الاول ۱۰۴۱ھ کو میرزا روزبھان دوبارہ منصب سرخیلی پر مامور کئے گئے اور انھوں نے پوری قوت کے ساتھ فوج اور رعایا کے معاملات سرانجام کرنے شروع کئے۔ لیکن بادشاہ کو ان پر اعتبار نہ آیا اور وہ ہمیشہ ان کو شبہ کی نظر سے دیکھتے رہے۔ آخرکار بد دیانتی کے الزام میں منصب سرخیلی سے ۱۸ صفر ۱۰۴۲ھ میں ہٹائے گئے اور میر فصیح الدین محمد کو سرخیل بنایا گیا۔

عین الملک منصور خاں حبشی

سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے اکابر سلطنت سے ہیں، حوالہ داری لشکر رکاب خانہ کے علاوہ وزارت عین الملکی پر مامور تھے۔ اور بادشاہ اور ان کی والدہ کے مزاج میں درخور حاصل تھا۔ چنانچہ جب بادشاہ مرض موت میں مبتلا ہوئے تو ان کے علاج کے بارے میں اطبائے ہند اور اطبائے عراق کے مابین اختلاف پیدا ہوگیا۔ بادشاہ کی والدہ کا خیال تھا کہ اطبائے ہند علاج کریں کیونکہ جو مزاج ہندوستان کی آب و ہوا میں پرورش پاتے ہیں ان کے لئے مناسب ہے کہ ہندوستانی طبیبوں کا علاج کرایا جائے۔

اگرچہ والدۂ بادشاہ کی اس رائے سے اکثر امرائے دربار کو اختلاف تھا لیکن منصور خاں کی تائید کی وجہ سے ہندوستانی اطباء نے علاج کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت منصور خاں کتنے صاحب اقتدار تھے۔

سلطان محمد کے انتقال کے بعد سلطان عبداللہ کو تخت نشین کرانے میں اور پائے تخت میں انتظام اور امن و امان قائم رکھنے میں منصور خاں نے بڑا حصہ لیا۔ اس وقت بادشاہ کی کم عمری کی وجہ سے سلطان محمد کی والدہ ہی کاروبار سلطنت میں دخیل تھیں اور انھوں نے زور دے کر منصور خاں کو میر جملہ بنایا۔ نظام الدین احمد مولف حدیقۃ السلاطین چونکہ علامہ ابن خاتون کے طرف داروں میں سے تھے اس لئے انھوں نے اپنی تاریخ میں منصور خاں کی خدمات کے اعتراف میں بخل سے کام لیا ہے اور جگہ جگہ ذم کا پہلو نمایاں کردیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ منصور خاں اور ملک یوسف وغیرہ اس وقت کے ان ملکی امرا اور جاں نثاران سلطنت سے تھے جن کو علامہ ابن خاتون اور دیگر اجنبی امرا اپنے راستے میں حائل سمجھتے تھے اور چونکہ سلطان عبداللہ کی طبیعت بہت کم زور واقع ہوئی تھی اس لئے انھوں نے با اقتدار امرائے عراق کے زیر اثر اپنے قدیم امرا اور خدمت گذاروں کو بہت جلد بے اثر کردیا۔

منصور خاں کی میر جملگی کا پہلا اثر یہ پڑا کہ مرزا روزبہان اصفہانی جن کو صرف دو ماہ قبل سلطان محمد نے خواجہ افضل ترک کو معزول کر کے سرخیل بنایا تھا اپنے عہدے سے معزول ہوگئے منصور خاں نے برہمنوں کو بھی برسرکار کیا کیونکہ نظام الدین احمد مورخ کا بیان ہے کہ خود میر جملہ کو لکھنا نہیں آتا تھا۔ تاہم اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ منصور خاں سپاہیوں پر خوب نظر رکھتے تھے اور انھوں نے اس طبقہ کی حالت کو درست کردیا اگرچہ غیر ملکیوں کے ساتھ ان کا سلوک اچھا نہ تھا۔

منصور خاں نے وزارت پناہ خواجہ افضل ترک کو پھر سے ایک لاکھ ہون تنخواہ کی جائداد پر سرفراز کر کے امرائے عظام کے طبقہ میں شامل کر دیا منصور خاں نے اس شان و شوکت سے میر جملگی کی خدمت انجام دی کہ دارالسلطنت میں ان کے غلاموں کا بھی رعب بیٹھا ہوا تھا اور بڑے بڑے عہدہ دار بھی ان سے ڈرتے تھے چنانچہ حدیقہ میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ۹ محرم ۱۰۳۰ھ کو دیوان کے ایک حبشی غلام نے میدان دربار میں شب چراغاں کا اہتمام کرتے وقت قاسم بیگ کوتوال کے ساتھ بے ادبی کی لیکن چونکہ میر جملہ کا آدمی تھا قاسم بیگ کچھ نہ کر سکے اور رنجیدہ ہو کر گھر بیٹھ رہے اور منصب کوتوالی سے استعفا دے دیا۔

نظام الدین احمد کا بیان ہے کہ جملۃ الملک منصور خاں قاسم بیگ کوتوال اور شاہ محمد مینو دونوں کو ہٹا کر ملا محمد تقی کو خدمت کوتوالی اور میر سید خراسانی کو پیشوائی دلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اول الذکر کو مچھلی پٹن سے اور موخر الذکر کو دہلی سے بلا بھیجا تھا۔ اور محمد تقی نواب الطلب حیدرآباد پہنچ بھی گئے اور منصور خاں نے کئی بار کوشش کی کہ بارگاہ شاہی میں پیش کر کے منصب کوتوالی دلادیں لیکن بادشاہ پر علامہ ابن خاتون کا اثر پڑنا شروع ہوچکا تھا وہ انجان ہوتے گئے اور آخر کار قاسم بیگ کی جگہ پر ملا محمد تقی کو مقرر کرنے کے بجائے [illegible] بیگ نائب کوتوال کو خدمت کوتوالی پر ترقی دے دی۔ اب جو محمد تقی کو مایوسی ہوئی تو میر جملہ نے اپنی پیشی میں مقرر کر کے میر جملگی کا کام جو کوتوال کے کام سے ارفع ہے ان کے سپرد کردیا اس طرح ۱۰۳۰ھ میں جملہ امور دیوانی میں ملا تقی نائب میر جملہ ہوگئے اور ایک سال تک اس خدمت کو انجام دیا۔

آغاز محرم ۱۰۳۱ھ میں منصور خاں نے دو سال سات مہینے اور چند روز میر جملگی کی خدمت انجام دے کر یکایک انتقال کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ منصور خاں کی وفات کے بعد چھ سال دس مہینے تک منصب میر جملگی پر کوئی بھی فائز نہ ہو سکا آخر کار ۱۰ شوال ۱۰۳۷ھ میں علامہ ابن خاتون نے منصور خاں کی جگہ لی۔ اس اثنا میں منصور خاں کی خدمات کو تین چار امرا میں تقسیم کردیا گیا تھا یعنے ملا محمد تقی سرخیل، آدم خاں عین الملک اور پسر منصور خاں حوالہ دار فوج رکاب خانہ وغیرہ۔

شریف الملک ملا محمد تقی

سلطان محمد قطب شاہ کے دور میں بندر مچھلی پٹن کے حوالہ دار تھے۔ سلطان عبداللہ کے دور میں جب منصور خاں حبشی میر جملہ نے اقتدار تمام حاصل کیا تو ان کا خیال تھا کہ قاسم بیگ کوتوال کی جگہ ملا محمد تقی اس خدمت پر سرفراز ہوں چنانچہ ۱۰۳۲ھ میں ملا محمد کو لکھا کہ پایہ تخت چلے آئیں۔ ملا بہت خوش ہوئے اور ایک ہاتھی پانچ ہزار ہون نقد اور دیگر تحف و ہدایا کے ساتھ محرم ۱۰۳۳ھ میں حیدرآباد آئے۔ منصور خاں ان کی آمد سے بہت خوش ہوئے اور چاہتے تھے کہ بادشاہ ان کو منصب کوتوالی پر سرفراز کریں چنانچہ تین مہینوں تک برابر دولت خانۂ عالی میں ساتھ لیجاتے رہے اور ایک دفعہ تو زر نقد ہاتھی اور دیگر تحفے بادشاہ کی خدمت میں پیش بھی کردئے مگر بادشاہ نے ملا تقی کو باریاب نہ کیا بادشاہ یہ چاہتے تھے کہ ملا تقی بجائے کوتوالی کے منصور خاں کے قائم مقام بن کر منصب سرخیلی انجام دیں اور اسی لئے وہ ٹال رہے تھے تاکہ کوتوالی کا مستقل انتظام ہو لے تو ملا محمد تقی کو

باریاب کرکے سرخیل بنادیں۔ آخرکار ۶ ربیع الاول ۱۰۳۶ھ کو بادشاہ نے حسن بیگ نائب کوتوال کو حیدرآباد کی کوتوالی کل پر سرفراز کردیا۔

اب منصور خاں بڑے پریشان ہوئے لیکن انھوں نے ملا محمد تقی کو اپنے ہی ساتھ رکھ کر مہمات ملکی کے جملہ مہمات کو ان کے سپرد کردیا اس طرح ملا محمد تقی کوتوالی سے زیادہ اہم اور بڑے عہدہ کا کام انجام دینے لگے۔ انھوں نے ایک سال تک منصور خاں کے نائب کی طرح دیوانی کی خدمات اور مہمات ملکی کے جملہ امور انجام دئے۔ بادشاہ بھی یہی چاہتے تھے۔

محرم ۱۰۳۸ھ میں منصور خاں نے یکایک انتقال کیا تو ان کی جگہ کے لئے بہت سے امرا نے کوشش کی اور نذرانے پیش کرنے شروع کئے لیکن ملا محمد تقی پہلے ہی سے امور دیوانی انجام دئے رہے تھے۔ منصور خاں نے بھی کئی بار ان کے کام کی تعریف کی تھی اور بادشاہ پر ان کی کاردانی کا سکہ بیٹھا چکا تھا اس کے علاوہ اس دفعہ ملا نے دوسروں کے نذرانوں سے زیادہ پیش کش دیا اس لئے بادشاہ نے انہی کو پسند کیا اور ۲۳ صفر ۱۰۳۸ھ کو منصب جلیل القدر سرخیلی پر سرفراز کیا۔ اس موقع پر دوسرے شاعروں کی طرح ملا نظام الدین احمد مولف حدیقۃ نے بھی ایک قطعہ تاریخ ملا کی خدمت میں پیش کیا تھا جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

خسرو یوسف رخ جمشید جاہ شاہ عبداللہ شاہ کامیاب
مولوی را بہر سرخیلی نمود از میانِ جملہ اعیاں انتخاب
تربیت بنمود او را ہمچو مہر تا کہ شد یاقوت سال با آب و تاب
عقل بہر منصبش تاریخ گفت دائماً سرخیل بادا کامیاب

سرخیل ہونے کے بعد ملا تقی نے بادشاہ کے مزاج سے کافی واقفیت پیدا کرلی اور جملہ مہمات دیوانی اور کل معاملات سلطانی پر ایسا قبضہ کرلیا کہ دوسروں کو دخل دینے کا موقع نہ دیا، خاص کر برہمنوں کے لئے رعایا پر ظلم وستم کرنے کا موقع نہ رہا۔ اور محاصل کی رقمیں اچھی طرح داخل خزانہ ہونے لگیں۔ چنانچہ صرف نارائن راؤ مجموعہ دار سے ایک سو تیس ہزار ہون وصول کرکے داخل خزانہ کئے گئے اور جو چودہری اور صاحبان جائداد منافق مغرور اور ظالم ہوگئے تھے ان کو قتل کرکے ان کی جائداد اور ذخیروں پر شاہی قبضہ کرادیا۔

ان خدمات کے صلہ میں بادشاہ نے ملا کو شریف الملک کا خطاب عطا کیا اور وہ قلمدان مرصع جو مرزا محمد امین میر جملہ کے بعد سے کسی کو مرحمت نہیں کیا گیا تھا ملا شریف الملک کو عنایت کیا گیا۔ اس اثنا میں مغلوں کے حملہ دکن کی خبریں مشہور ہونے لگی تھیں اس لئے سلطان نے شریف الملک کو پچاس ہزار ہون کی جاگیر دی تاکہ ایک لشکر تیار رہے اور فیل خانۂ خاص سے چند مست ہاتھی بھی عنایت کئے۔ اس طرح سرخیلی اور سرداری ایک ہی جگہ جمع ہوگئی۔ ملا نے بہت جلد دکنیوں، عربوں اور پٹھانوں کی ایک فوج تیار کرلی اور میدان دلکشائے داد محل میں لاکر بادشاہ کو دکھادی۔ بادشاہ بہت خوش ہوئے اور ملا کے مدارج میں اور بھی اضافہ کردیا۔ اس طرح شریف الملک کی عزت و وقعت اور اثر ورسوخ اور بھی بڑھ گیا

جب شریف الملک کی ذات میں دو عہدے یعنی سرداری اور سرخیلی جمع ہوگئے تو مہمات دیوانی اور ضبط و ربط امور مملکت کے ساتھ ساتھ شہسواری اور سپہ گری کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی۔ چنانچہ وہ روزآنہ شام کا وقت ندی محل کے برابر رود موسیٰ کے کنارے وسیع میدان میں کمان داری اور چوگان بازی میں گذارتے تھے۔ ایک وقت گھوڑے پر سے گرے اور چوٹ کھائی لیکن تکلیف میں کچھ کمی ہونے نہ پائی تھی کہ آخر شعبان ۱۰۴۰ھ میں

گولکنڈے کے سپہ سالار

موسیٰ خاں

حسام خاں

محل باغ میں جشن رمضان میں شرکت کی اور غذا میں بے احتیاطی کی وجہ سے ہیضہ واسہال کا مرض لاحق ہوگیا اور اس حالت بیماری میں رمضان بھر صبح وشام بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اس حاضری میں اور مسلسل لڑنے کی وجہ سے طبیعت اور بگڑتی گئی آخر کار رمضان کی عید کے دن جب بادشاہ نے دربار کیا اور ملا شریف الملک عصر تک برابر کھڑے ہوکر لشکر اور رعایا کے معروضے پیش کرتے رہے تو طبیعت بالکل بگڑ گئی اور اس روز کے بعد دربار کو آنا نصیب نہ ہوا۔ حکیم اسمعیل گیلانی اور دیگر ہندوستانی طبیبوں نے علاج کیا بادشاہ نے اپنے غلام حسن علی خاں کو پرسش احوال کے لئے بھیجا اور آخر میں اپنے خاص طبیبوں کو بھی علاج کرنے کے لئے حکم دیا لیکن پیمانۂ حیات پر ہو چکا تھا ملا محمد تقی شریف الملک نے ۱۹ر شوال ۱۰۴۱ھ میں انتقال کیا۔

انھوں نے دو سال آٹھ ماہ بڑے کر و فر اور اعزاز و اقتدار کے ساتھ حکومت کی اور بادشاہ کی خیر خواہی اور آداب عبودیت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ان کے انتقال کا بادشاہ کو بھی صدمہ ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ملا شریف الملک کو اولاد نہ تھی کیونکہ بادشاہ نے ان کی بیوہ اور بہنوں کے حال پر خاص نوازشیں کیں اور ان کو پورے سامان کے ساتھ عراق جانے کی اجازت دی۔

ابن خاتون

شیخ محمد نام ابن خاتون طوسی عاملی کے بیٹے اور شیخ بہائی کے بھانجے تھے سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے علما میں سے ہیں ان کے علم و فضل کی وجہ سے بادشاہ نے ان کو منشی الملک اور دبیر سلطنت بناکر بارگاہ سلطانی کے مقربان خاص میں شامل کرلیا تھا۔ سلطان محمد علی کی وفات کے بعد شاہ عباس صفوی کا سفیر حسین بیگ قبچاقی حیدرآباد آیا تو اس کی واپسی کے وقت بادشاہ نے ۱۰۲۴ھ میں علامہ شیخ محمد ابن خاتون کو پیش قیمت تحفے دے کر اس کے ساتھ ایران کو روانہ کیا جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور وہ تقریباً دس سال قم رہے اور جب واپس آنے لگے تو شاہ ایران نے ان کے ساتھ قاسم بیگ سپہ سالار مازندران کو روانہ کیا اور ۱۰۳۵ھ میں اس وقت حیدرآباد واپس ہوئے جب کہ سلطان محمد قطب شاہ کا انتقال ہوچکا تھا۔ سلطان عبداللہ نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور اپنے پھوپھا شاہ محمد ولد شاہ علی وغیرہ شاہ زادہ پیشوا نے سلطنت کا نائب مقرر کیا۔ اور پیشوا کی طرح ان کو بھی اپنی مجلس میں بیٹھنے کی اجازت دی چونکہ یہ خدمت [illegible] تک تھی اس لئے بادشاہ نے محمد رضا استرآبادی سے منصب دبیر لے کر دوبارہ ابن خاتون کو دبیر سلطنت بھی بنادیا۔

ان دو خدمات جلیلہ کی وجہ سے ابن خاتون کی عزت و احترام میں بہت اضافہ ہوگیا اور انھوں نے دربار کے ہر امور میں دخل پاکر اپنے توسط سے بہت سے لوگوں کو نوجوان بادشاہ کے مراحم خسروانہ سے فائدہ پہنچایا اس بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر شاہ محمد پیشوا ان سے کھٹکنے لگے اور دربار میں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں ہونی شروع ہوئیں آخر کار رجب ۱۰۴۳ھ میں شاہ جہاں کا ایلچی شیخ محی الدین حیدرآباد آیا تو بعض باتیں ایسی ہوئیں کہ بادشاہ شاہ محمد پیشوا سے بالکل ناراض ہوگئے اور ان کو معزول کرکے ۹ رمضان ۱۰۴۳ھ میں ابن خاتون کو پیشوائی کی خدمت سے سرفراز کیا اس خوشی میں ابن خاتون کے طرفدار علما و فضلا اور شعرا نے مبارکباد کے قصائد اور قطعے لکھے جن میں سے ایک قطعہ حدیقۃ السلاطین کے مصنف نے لکھا تھا جو درج ذیل ہے ؎

شہ یوسف رخ و جمشید حشمت | کہ حاتم می کند از وے گدائی
ز فرط مرحمت کردہ تمکن | محمد را بصدر پیشوائی
بسالار شہ مہام ملک و ملت | کہ بود ابتر ز آفات سمائی
متاع فضل و دانش بود کاسد | کنوں بگرفت در عہدش روائی
جہاں معمور گردیدہ بدانساں | کہ شد محو از خلائق بے نوائی
بالہام آمد ایں مصراع تاریخ | محمد یافت از حق پیشوائی

پیشوا ہونے کے بعد ہی علامہ ابن خاتون نے شیخ محی الدین ایلچی شاہ جہاں کو واپس کر دیا اور کچھ ایسی ترکیب کی کہ وہ شاہ جہاں کے پاس معتوب قرار پایا۔

ابن خاتون اگرچہ بہت صاحب ثروت تھے اور نواب علامہ کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے لیکن ساتھ ہی مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف بھی جاری تھی بے حد علم دوست تھے اور روز ان کے مدرسہ میں بڑے بڑے علماء و فضلا جمع ہوتے اور علوم معقول و منقول پر مباحثے او مذاکرے کیا کرتے۔ منگل کو جو قطب شاہی سلطنت میں چھٹی کا دن ہوتا ان کے یہاں شعراء جمع ہوا کرتے اور شعرائے متقدمین کے کلام کے مذاکرہ کے علاوہ طرحی غزلوں کا مشاعرہ بھی کرتے تھے۔

ابن خاتون خود بھی بہت بڑے مصنف تھے شرح ارشاد، ترجمہ کتاب اربعین، حاشیہ جامع عباسی ان کی تصانیف ہیں جامع عباسی کی تکمیل بھی انہی نے کی تھی۔ یہ اپنے عہدہ کے لحاظ سے جملہ مذہبی امور کے بھی ذمہ دار تھے۔ چنانچہ جب ۱۰۴۰ھ میں حیدرآباد میں بڑا زبردست قحط ہوا تو شہر کے تمام علماء و فضلا و اتقیا سہ روزہ روزہ رکھ جمعہ کی صبح میں پا برہنہ علامہ ابن خاتون کے یہاں پہونچے اور ان کے ساتھ نماز استسقاء کے لئے شہر سے باہر نکل کر موسی ندی کے کنارے جمع ہوئے اور بعد نماز دعا پڑھی۔ آخر میں ابن خاتون نے صدر مجلس میں بیٹھ کر اشرفیوں کی سفید اور لال تھیلیاں بادشاہ کی طرف سے تمام مستحقوں میں تقسیم کیں اور ہاتھیوں اور اونٹوں پر جو پیسے بادشاہ نے خیرات کے لئے روانہ کئے تھے وہ بھی تقسیم کر دئے بعد میں بادشاہ کی افزونی عمر کی دعا کر کے شہر کو مراجعت کی۔

اس عزت و احترام کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ ابن خاتون کے مخالفین برابر کام کر رہے تھے چنانچہ جب بیجاپوری لوگ حیدرآباد آئے تھے تو ابن خاتون کا اثر کم ہو گیا اور ۱۳ر جمادی الآخر ۱۰۴۳ھ کو یہ اپنی خدمت سے معزول کر دئے گئے اور میر محمد رضا استرآبادی پیشوا مقرر ہوئے اس زمانے میں ابن خاتون خانہ نشین ہو گئے لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد جب شہزادی کی پالکی بیجاپور روانہ ہوئی تو عبداللہ قطب شاہ پھر علامہ کی طرف متوجہ ہوئے اور جو کدورت پیدا ہوئی تھی دور ہو گئی چنانچہ اپنے ایک مقرب خاص کو طلائی پاندان دے کر علامہ کے یہاں روانہ کیا اور چند روز کے بعد خود ان کو طلب کر کے نوازش خاص کا اظہار کیا اور صدر الشریعت صدر جہاں کی جگہ ان کے بیٹھنے کے لئے معین کی اور سلطنت کے جملہ امور کے متعلق پہلے سے زیادہ مشورہ لینا شروع کیا۔ آخر کار ابن خاتون کو ۹ر شوال ۱۰۴۳ھ کو جملۃ الملکی کا خلعت حاصل ہوا۔

(باقی آئندہ)

سید محی الدین قادری زور

نس — سعداشرگو ملکہ

محمد سعید سرحدہ گو ملکہ

گولکنڈے کے صوفیائے کرام

سید شاہ راجو

شاہ میر محمود

نئے دکن نمبر

ملک الشعرا غواصی

غواصی کی تاریخ ولادت و وفات ابھی تحقیق طلب ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا اور محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں شاعری شروع کی۔ اس کی ابتدائی زندگی غربت میں بسر ہوئی سرکاری ملازمت اس کی گذر اوقات کا ذریعہ تھی عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی سے اس کے دن پھرے۔ شاہی دربار میں رسوخ حاصل ہوا اور رفتہ رفتہ ملک الشعرا کے درجہ تک پہنچا۔ امور سلطنت میں بھی غواصی کو دخل تھا چنانچہ سنہ ۱۰۴۵ھ میں شاہی سفیر کی حیثیت سے بیجاپور بھیجا گیا۔ اس کی آخری زندگی پھر ایک مرتبہ تاریکی میں نظر آتی ہے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ سلطان عبداللہ کے زمانے میں اس کا انتقال ہوا۔

غواصی ایک قادر الکلام شاعر تھا اس کی درباری حیثیت نے اس کی شاعری کو شہرت دی۔ یہاں تک کہ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں اس عہد کے شعرا میں سے صرف غواصی کا ذکر کیا ہے۔ سلطنت گولکنڈہ کا آخری ملک الشعرا غواصی ہے۔

اس وقت تک علاوہ چیدہ چیدہ غزلوں اور مرثیوں کے غواصی کی صرف دو مستقل تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔ مثنوی سیف الملک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ۔ دونوں اتفاق سے فارسی کے ترجمے ہیں۔ غواصی اپنے آپ کو فن شعر میں اس قدر کامل خیال کرتا ہے کہ دوسرے کسی شاعر کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس تعلی اور ہمہ دانی کا ثبوت کوئی ایسی پیداوار سے نہیں ملتا۔ البتہ ان ترجموں میں اس نے اپنی پوری قوت صرف کی ہے اور ان پر اپنا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بڑی حد تک اپنی کوشش میں کامیاب اترا۔ اس کی پرگوئی کا ثبوت یہ ہے کہ مثنوی سیف الملوک جو دو ہزار سے زائد اشعار کی نظم ہے صرف ایک مہینے کی قلیل مدت میں ختم ہوتی ہے۔ ان مثنویوں کے وہ حصے جو غواصی کی اپنی پیداوار ہیں آورد کی شان لئے ہوئے ہیں جن میں غضب کی روانی پائی جاتی ہے۔

غواصی کی زبان میں ہندی عنصر غالب ہے۔ مبالغہ بہت کم اور کلام سادہ اور تصنع سے پاک ہے۔ اسلوب بہ لحاظ مضمون بدلا جاتا ہے چنانچہ مکالمہ کے مقام پر سادگی اور سلاست اور مدح و منقبت میں بلند خیالی اور شاندار الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔

یہاں مثالاً غواصی کی دونوں مثنویوں سے چیدہ چیدہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

قلم کاف و نوں سے جو کلیا بہار — سو چلے بچن کوں کیا آشکار
بچن عرش کرسی پو تے دہائے ہیں — بچن آدمی کے بدل آئے ہیں
بچن تے سوالاں جواباں ہووے ہیں — بچن تے حساباں کتاباں ہووے ہیں
بچن تے ہوی فام نیکی بدی — بچن تے ہوئے منتہی مبتدی
بچن تے چلے دین و دنیا تمام — بچن کے ہیں محتاج سب خاص و عام
بچن غیب کے ہیں عجب جوہراں — بچن کے سو ہیں جوہری شاعراں

میر سعادت علی رضوی

مادنا دیوان گولکنڈہ

اکنا عہدہ دار گولکنڈہ

نہ بنایا جائے کہ حکومت کا نظام درہم برہم ہو جائے اور فوج منحرف ہو جائے۔ اس غرض سے انھوں نے آئے دن مطالبات میں اضافہ کرنا شروع کیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بادشاہ اپنے خانگی اور حرم کے جواہرات فروخت کر کے مطالبات پورے کرتے تھے۔ ملک و مالک کی محتاجی سے مادنا کی حکومت کے بنیادی اصول کا ایک پہلو مثلاً تخفیف میں ظاہر ہوا تو دوسرا عدیم المثال ضبط و تنظیم میں۔ گولکنڈہ کی تاریخ میں یہ دونوں بہت اہم اور نئی باتیں ہیں۔ تمام امراء، عہدہ داروں کی تنخواہوں میں تخفیف کی گئی۔ اعلیٰ اور ادنیٰ تمام عہدہ دار اس قانون کی پابندی کرنے پر مجبور کئے گئے۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ تمام لوگ وزیر کے مخالف ہو گئے۔ مادنا کی غیر ہر دلعزیزی کا یہ ایک اہم اور بنیادی سبب ہے۔ اس واقعہ میں مادنا سے زیادہ قدیم امراء قابل الزام ٹھیرتے ہیں جو اپنی تنخواہ کا ایک قلیل حصہ حکومت کو دینے کے لئے تیار نہیں تھے اور ایک واویلا مچا کر حکومت کو کمزور بنا دیا۔ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مادنا کی عزت عوام میں زیادہ تھی۔ سلطنت کے وزیر اعظم نے تین مرتبہ پورے ملک کا دورہ کیا ہے۔

دوسرا پہلو خارجی سلطنت کا ہے۔ دکنی آزاد سلطنتیں ذاتی تحفظ کیلئے مغلوں کے مقابلہ میں ایک دوسرے کی مدد کرتی تھیں چنانچہ عبد اللہ قطب شاہ نے مرزا راجہ جے سنگھ کے خلاف علی عادل شاہ ثانی کی مدد کے لئے نیک نام خاں کے تحت بارہ ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادوں کی ایک عظیم فوج روانہ کی۔ مادنا اور ابوالحسن نے اس سلطنت کو برقرار رکھا اور مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے لئے ایک قومی محاذ بنا کر لیا۔ یہ اسی کا انتہائی تدبر اور سیاست دانی ہے کہ اس نے سیواجی کے ہاتھوں کو دوستی اور اخوت کے رشتے سے باندھ دیا اور اس طرح سلطنت گولکنڈہ سیواجی کی تاخت و تاراجی سے بچی رہی۔ اس دور اندیشی کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ اس نے قلعہ جات ونگل، کنڈاپلی اور کنڈا ویر کو مستحکم کیا کر ہر ایک کی حفاظت کے لئے بارہ ہزار سپاہیوں کو متعین کر دیا۔ بیجاپور میں اپنے بھائی اکنا کو بحیثیت حاجب اس لئے مقرر کیا تھا کہ وہاں کی خارجی سلطنت کی رہبری کرے۔ مادنا نے ابوالحسن کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ قلعہ گولکنڈہ میں محصور نہ ہو جائے بلکہ کسی دوسرے کے قلعہ میں جائے اور بصورت ضرورت گولکنڈہ کو فوجی امداد روانہ کرے لیکن چونکہ شیخ منہاج کے مشورے کا زیادہ اثر تھا اس نے اس مشورہ پر عمل نہیں کیا گیا "مادنا اور اکنا منصب کے لالچ میں ابوالحسن کو اورنگ زیب کے ہاتھوں فروخت کرنا چاہتے تھے"۔ یہ الزام تاریخ کے کسی طالب علم کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ یہ دونوں بھائی اورنگ زیب اور ابوالحسن سے بخوبی واقف تھے۔ فوجی تنظیم کے بارے میں بجائے اس کے کہ ہم اپنی رائے کا اظہار کریں مناسب ہوگا کہ واقعات کا اظہار کر دیا جائے جس سے ناظرین کو خود رائے قائم کرنے کا موقع مل سکے۔ ۱۶۵۶ء میں گولکنڈہ کی فوج دکن کے مغل صوبہ دار کے لشکر کا مقابلہ ایک دن بھی نہ کر سکی اور قلعہ گولکنڈہ مغل گولہ باری کی تاب نہ لا سکا۔ لیکن ۱۶۸۵ء اور ۱۶۸۶ء میں شہنشاہیت کی ساری قوت گولکنڈہ کے میدان میں تین مہینے تک روکی گئی اور تمام تاریخیں گولکنڈہ کی فوج کی بہادری کے کارناموں سے بھری پڑی ہیں۔ اگر محمد ابراہیم باغی نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ مغلوں کو گولکنڈہ کے میدان میں ایسی شکست فاش ہوتی کہ مغل پھر ادھر کا رخ نہ کرتے۔ محاصرۂ گولکنڈہ سے ہر شخص واقف ہے۔ ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ناظرین اپنی ذاتی رائے قائم کر سکتے ہیں۔

مادنا پر ظالم اور متعصب ہونے کا جو الزام لگایا گیا ہے وہ شہنشاہی اغراض کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ گولکنڈہ پر حملہ کرنے کا ایک حیلہ ہے: مادنا پر یہ واقعہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قتل تھا۔ بعد مسعود خاں اور شیر زماں خاں کے بارے میں بھی بیجاپور میں یہی سلطنت نتیجاً مکالمہ کی تھی مختصر یہ کہ ۱۶۸۶ء میں اعیان سلطنت نے سازش کی اور ان کو قتل کرا دیا۔ جمشید نامی ایک غلام نے چند اور دوسرے غلاموں کے ساتھ ان کے سر تن سے جدا کر کے شہزادہ شاہ عالم بہادر کے پاس لشکر کے حرم سے سر دیا اور جانی بی بی نے اس سازش میں زیادہ حصہ لیا ہے۔

شہزادہ نے ان کے سروں کو بہادر خان کے ذریعہ شولاپور میں اورنگ زیب کے پاس روانہ کیا جہاں وہ ہاتھی کے پیروں تلے روندے گئے۔

اکنا پیشکار

یہ مادنا کا بڑا بھائی تھا۔ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص غیر مہذب، منہ پھٹ اور صاف گو تھا۔ مادنا کے وزیر اعظم بننے کے بعد یہ ان کا پیشکار مقرر ہوا اور پھر قطب شاہی کرناٹک کا صوبہ دار بنا۔ صوبہ داری کے عہدے سے سرلشکری پر ترقی پائی۔ عہد نامہ بیجاپور کے بعد وہاں کا حاجب مقرر ہوا۔ ۱۶۸۵ء میں بیجاپور سے واپس ہوا اور ۱۶۸۶ء میں مادنا کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔

اس نے کرناٹک اور مشرق کا دو مرتبہ دورہ کیا۔ بندرگاہوں کے انتظام میں نہایت بے مروتی سے کام لیا اور اس طرح گولکنڈہ کی آمدنی میں اضافہ کیا۔ فوج کی تنظیم میں اس کا بہت حصہ ہے۔ اس کے دو بھانجوں رستم راؤ اور پودلی لنگنا نے بادشاہ کی کئی اہم خدمات انجام دیں۔ خافی خاں رستم راؤ کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے کہ وہ صاحب السیف والقلم تھے۔ پودلی لنگنا نے انگریزوں کو سربلند ہونے نہ دیا اور بار بار زک دے کر گولکنڈہ میں انھیں سر اٹھانے سے روکتا رہا۔ اس کے مدد و معاون اس کے دونوں ماموں تھے جو ہر طریقے سے اس کی اس کام میں مدد کرتے تھے۔ اکنا کے ایک خط میں انگریزوں کو ان الفاظ میں تنبیہ کی گئی کہ وہ پودلی لنگنا کے اقتدار کو تسلیم کریں۔ اس کے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈہ کی بحری تجارت بھی تھی۔ اور خود ان بھائیوں کے تجارتی جہاز تھے۔ ہیباورٹ نامی ولندیزی رسالے میں ان کو بدمزاج اور شریر النفس بیان کیا گیا مگر اس کی تائید کسی اور تاریخ سے نہیں ہوتی۔ موجودہ معلومات کی بنا پر ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ان کی طبیعت میں روکھا پن زیادہ تھا۔

بہرکیف دونوں بھائیوں نے ملک و مالک کی بے لوث خدمت کی ہے لیکن ان کی محنت کا انھیں معاوضہ نہیں ملا۔ انھیں حکومت کو ایسی گئی گذری حالت میں چلانا پڑا جس میں کامیابی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم چودہ سال تک جس قابلیت سے ان بھائیوں نے ملک کے اس ٹمٹاتے دیے کو گل ہونے سے روکا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ بہت ممکن ہے کہ مورخ وان اس حقیقت کے اظہار کی طرف متوجہ ہو کر ان الزامات کو غلط ثابت کر دیں گے۔ اور زمانہ بتا دے گا کہ ملک و مالک کے بہی خواہ کبھی نہ کبھی اپنی حقیقی قدر و منزلت حاصل کر کے رہیں گے۔

کے، وی بھوپال راؤ

عبدالرزاق لاری گولکنڈہ کے دروازے پر

اک شیر نیستاں ہے کہ کھڑا جھوم رہا ہے
زخموں سے لہو گر کے قدم چوم رہا ہے
تلوار بھی اک ہاتھ میں بل کھائی ہوئی ہے
معلوم نہیں کس کی قضا آئی ہوئی ہے
دروازے میں اک جان ہے اور لاشوں کے انبار
اور سمتِ مقابل میں ہے تلواروں کی جھنکار
معلوم ہے اس کو کہ کوئی ساتھ نہ دے گا
بیڑا کو اٹھانے میں کوئی ہاتھ نہ دے گا
پر اک دلِ لاری ہے کہ جو جانِ وفا ہے
یہ مطلعِ انوارِ وفا، کانِ وفا ہے

اکبر وفاقانی

گولکنڈہ کا آخری سپہ سالار عبدالرزاق لاری زخموں سے بے ہوش ہو کر گرنے سے پہلے

سلطنت ابد مدت آصفجاہی

اور

سلاطین آصفی

سلطنت آصفیہ کا قیام تاریخ ہند کا ایک نہایت درخشاں باب ہے۔ اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد کوئی شخصیت نواب نظام الملک سے زیادہ نمایاں نہ تھی جو منتشر قوتوں کو یکجا کر کے مرکزیت پیدا کرنے اور ایک سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ چنانچہ نواب نظام الملک نے اول تو سلطنت مغلیہ کے بقا، اس کی اصلاح اور استحکام کے لیے ممکنہ کوشش کی لیکن جب اس میں کامیابی کی صورت نظر نہ آئی تو انھوں نے حریفوں کو شکست دے کر سلطنت آصفیہ کی بنا ڈالی (۱۷۲۴ء)۔ نواب نظام الملک کے بعد جس شخصیت نے سینہ سپر ہو کر مشکلات کا مقابلہ کیا اور سلطنت کے لیے جو خطرات تھے ان کو دور کیا اور سلطنت آصفیہ کی صحیح معنوں میں تعمیر کی وہ بانیٔ سلطنت کے فرزند آصف جاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں بہادر تھے۔

قیام سلطنت آصفیہ سے بہت سے فوائد حاصل ہوئے۔ اول تو دکن کی بدنظمی اور بدامنی کا خاتمہ ہو کر امن و امان اور عدل و انصاف کا دور شروع ہوا۔ دوم یہ کہ ملک میں زراعت کی سرسبزی، صنعت و حرفت کی ترقی اور تجارت کی گرم بازاری ہونے لگی۔ بالخصوص شاہان آصفیہ کی شہرۂ آفاق رواداری، بے مثال حب الوطنی، روایتی فیاضی اور عدیم المثال رعایا پروری نے ملک کی خوشحالی میں چار چاند لگا دیے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہان آصفی کی حکومت اپنی ساری رعایا پر نہ صرف منصفانہ رہی، بلکہ ہمیشہ مشفقانہ اور پدرانہ رہی ہے۔ انھوں نے قیام امن اور عدل و انصاف تک ہی خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ آثار قدیمہ کی حفاظت اور علوم و فنون کی سرپرستی تک بڑھا دیا اور جدید تعمیری سررشتوں کو قائم کر کے رعایا کی مادی، اخلاقی اور تعلیمی ترقی میں دن دونی اور رات چوگنی اضافہ کیا۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ وسط انیسویں صدی ہی سے یعنی سالار جنگ اول کی وزارت کے زمانہ سے ترقی و اصلاح کا دور شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس وقت مبارک عہد عثمانی میں جس تیز رفتاری کے ساتھ دکن میں ہر جہتی ترقی ہو رہی ہے، وہ تاریخ ہند میں عدیم المثال ہے۔ حیدرآباد جدید تعمیر کے سلسلے میں اعلیٰ حضرت بندگان عالی کا نام رہتی دنیا تک یادگار رہے گا کہ زراعت، صنعت و حرفت، تجارت، تعلیم، تعمیرات اور حفظان صحت غرض ہر شعبۂ زندگی میں غیر معمولی چہل پہل ہے۔ نتیجہ یہ کہ اب دکن صرف مشرقی تمدن اور قدیم معاشرت ہی کا مرکز نہیں رہا ہے بلکہ اپنے عصری ترقیات کے اعتبار سے حیدرآباد مشرقی اور مغربی تہذیب کا گہوارہ اور قدیم و جدید تمدن کا سنگم بن گیا ہے۔ موجودہ ہر جہتی ترقی کی رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل نہیں کہ دور عثمانی میں حیدرآباد کا مستقبل اس کے بہمنیہ و قطب شاہیہ ماضی سے کہیں شاندار ہوتا جا رہا ہے۔

نواب نظام الملک آصفجاہ اوّل بانیٔ سلطنت آصفیہ

(۱۷۲۴ء تا ۱۷۴۸ء)

نواب نظام الملک آصفجاہ اول کا خاندانی سلسلہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ تک اور آگے حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے۔ نواب نظام الملک کے دادا عابد خاں عہد شاہ جہاں میں ہندوستان آئے تھے اورنگ زیب کے زمانے میں منصب پنج ہزاری ور صدارت کل کے عہدہ پر فائز تھے گولکنڈہ کے محاصرہ میں گولے کے زخم سے شہید ہوئے۔

اُن کے فرزند میر شہاب الدین خاں اورنگ زیب کے مشہور امرا میں سے تھے جن کو منصب ہفت ہزاری اور غازی الدین خاں فیروز جنگ کا خطاب عطا ہوا تھا۔ انھیں کے نامور فرزند نواب نظام الملک آصفجاہ اول تھے۔

اُن کا اصلی نام میر قمر الدین تھا اور ولادت ۱۶۷۱ء میں ہوئی تھی۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں "چین قلیچ خاں" کا خطاب اور منصب پنج ہزاری سے سرفراز ہوئے بعد ازاں بیجاپور کی صوبہ داری پر فائز ہوئے تھے۔ غرض اورنگ زیب کی اُن پر خاص عنایت تھی۔ حتیٰ کہ اورنگ زیب نے خاندانی حالات، وجاہت، بہادری ور تدبر کی بنا پر ان کو اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کام بخش کی لڑکی بیاہ دینی چاہی تھی لیکن مصلحت کی بنا پر نظام الملک نے اس کو پسند نہیں کیا۔

فرخ سیر کے زمانہ میں ان کو "نظام الملک بہادر فتح جنگ" کا خطاب ہفت ہزاری منصب اور دکن کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ چنانچہ ۱۷۱۳ء میں وہ بہ حیثیت صوبہ دار دکن اورنگ آباد آگئے تھے۔ لیکن اورنگ زیب کے نااہل جانشینوں کے زمانہ میں جب ملک کی حالت خراب ہوتی گئی اس وقت نظام الملک کو بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ وہ دکن سے مالوہ کی صوبہ داری پر بھیجے گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سارا ملک بادشاہ گر سیدوں (سید حسین علی اور سید عبداللہ دونوں بھائیوں) کے مظالم سے تنگ آگیا تھا۔ اس وقت سب کی نظریں نظام الملک کی طرف لگی ہوئی تھیں اس نازک موقع پر نواب نظام الملک نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ مخالفین سے سخت لڑائی ہوئی (جس میں سید دلاور علی خاں اور سید عالم علی خاں نائب صوبہ دار دکن مارے گئے) اس طرح نواب نظام الملک نے بزور شمشیر حیدرآباد اور برار وغیرہ کے علاقوں کو فتح کیا۔ غرض سیدوں کا خاتمہ کر کے نہ صرف محمد شاہ کو انھوں نے نجات دلائی بلکہ سارے ملک پر ایک بڑا احسان کیا۔ محمد شاہ نے اس کے صلہ میں آصفجاہ کا خطاب دے کر ان کو سلطنت دہلی کا وزیر مقرر کیا لیکن دربار کی حالت دیکھ کر انھوں نے اپنے بڑے فرزند غازی الدین خاں کو دہلی میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود حیدرآباد تشریف لائے۔

راستہ میں برار کے قریب ان کو مبارز الدین خاں سے لڑنا پڑا جس میں وہ مارا گیا۔ غرض یہ وہ زمانہ ہے کہ ملک میں فتنہ و فساد کا بازار گرم تھا۔ کوئی مرکزی طاقت موجود نہ تھی جو امن و امان قائم کر سکتی ہو۔ اول تو نواب نظام الملک نے سلطنت مغلیہ کو بچانے کی انتہائی کوشش کی لیکن جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو مجبوراً ۱۷۲۴ء میں سلطنت آصفیہ کی خود مختاری کی بنا ڈالی (یہی وجہ ہے کہ حسب فرمان خسروی ہر سال ۲۹ رجب کو اسی خود مختاری سلطنت آصفیہ کی یادگار میں عام تعطیل دی جاتی ہے) لیکن اس کے باوجود سلطنت دہلی کی خیر خواہی اور وفاداری میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ چنانچہ ۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تو وہ فوراً

نواب میر قمر الدین خاں فتح جنگ نظام الملک آصف جاہ اول

نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی

دہلی پہنچ گئے اور وہاں غیر معمولی جرأت سے کام لے کر نادر کو لوٹ مار اور قتل عام سے روکا۔

دہلی سے دوبارہ دکن آکر انھوں نے مرہٹوں کا سدباب کیا اور دریائے تاپتی سے لے کر جنوبی ہند اور ارکاٹ تک سارے ممالک محروسہ میں امن و امان قائم کیا۔ اس سے رعایا کو اطمینان نصیب ہوا۔ اس طرح سلطنت آصفیہ کے قیام سے ملک میں معاشی خوشحالی کا آغاز ہوا۔ نظام الملک بڑے رحمدل اور فیاض بادشاہ تھے۔ ان کو ہمیشہ اپنی رعایا کا بڑا خیال رہتا تھا۔ آخرکار ۱۷۴۸ء میں بمقام برہان پور انتقال کیا۔ چنانچہ دولت آباد میں ان کا مقبرہ موجود ہے۔

مختصر یہ کہ نواب نظام الملک نہ صرف اوائل اٹھارویں صدی کے سب سے بڑے قائد، زبردست سپہ سالار اور بہترین مدبر کی حیثیت سے یاد کئے جائیں گے بلکہ موجودہ سلطنت آصفیہ کے بانی ہونے کی وجہ سے تاریخ میں ان کی شخصیت ہمیشہ نمایاں رہے گی۔

نواب میر نظام علی خاں آصفجاہ ثانی

(۱۷۶۱ء تا ۱۸۰۳ء)

نواب نظام الملک کی وفات پر دکن میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ اسی سلسلہ میں انگریزی اور فرانسیسی کمپنیوں کو ریشہ دوانیوں کا خوب موقع ہاتھ آیا۔ اور آیا یہاں پر نظام الملک کے دوسرے فرزند ناصر جنگ نے دو سال تک حکومت کی ان کی شہادت پر نظام الملک کے نواسے مظفر جنگ چند روزہ حکومت کے بعد مارے گئے اس کے بعد امرا نے صلابت جنگ کو تخت نشین کیا جو اور بھائیوں کی بہ نسبت عمر میں بڑے تھے۔ لیکن ان کا زمانہ شروع سے آخر تک ایک کمزور زمانہ تھا۔ جب کہ مرہٹہ اور فرانسیسی دکن پر چھا گئے تھے اور ملک کے انتظامی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ اس لئے امرا کے مشورہ سے محض ملکی مفاد کے مدنظر صلابت جنگ کی علحدگی عمل میں آئی اور نواب آصفجاہ ثانی تخت نشین ہوئے۔

نواب میر نظام علی خاں بہادر نظام الملک کے چوتھے فرزند تھے ان کی ولادت ۱۷۳۴ء میں ہوئی تھی بچپن ہی سے وہ بہادر اور فنون سپہ گری سے خوب واقف تھے۔ چونکہ اپنے بھائی صلابت جنگ کے زمانہ میں وہ وزیر رہ چکے تھے اس لئے ان کو سلطنت کے معاملات کا بہت وسیع تجربہ تھا بادشاہ ہوتے ہی انھوں نے کھوئے ہوئے علاقے مرہٹوں سے حاصل کئے اور فرانسیسی اثرات کو دکن سے دور کیا بعد ازاں نہایت دور اندیشی سے کام لے کر انگریزوں سے رابطہ اتحاد قائم کیا۔ اس زمانہ میں ٹیپو سلطان کی قوت بڑھ رہی تھی۔ اس لئے انگریزوں نے آصفجاہ ثانی اور مرہٹوں کو ملا کر "اتحاد ثلاثہ" قائم کیا اور میسور کے خلاف کامیابی حاصل کی اس کے کچھ عرصہ بعد جب مرہٹوں نے چوتھ کے مطالبہ کے سلسلہ میں حیدرآباد پر حملہ کیا تو انگریزی گورنر جنرل سرجان شور نے عدم مداخلت کا بہانہ کر کے مدد دینے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے سرکار نظام کو بمقام کھرڈلا ناکامی ہوئی اور سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

اس پر آصفجاہ ثانی نے انگریزی فوجوں کو برخاست کر کے ان کی جگہ موسیو ریموں کی ماتحتی میں فرانسیسی فوجیں ملازم رکھیں لیکن موسیو ریموں کی موت کے بعد جب انگریزی کمپنی کا مشہور و معروف گورنر جنرل ولزلی ہندوستان آیا تو اس نے نہایت حکمت عملی سے

آصفجاہ ثانی کو پھر اپنی طرف کر کے فرانسیسی فوجوں کو دکن سے برخاست کرادیا۔

حیدرآباد کے عہد معاونت قبول کرنے کے بعد یہاں سے رقمی اور فوجی امداد حاصل کر کے ولزلی نے میسور کی ریاست پر حملہ کیا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت اور ریاست میسور کے خاتمہ کے بعد کچھ علاقے مثلاً کڑپہ، کرنول اور بلاری وغیرہ حیدرآباد کو برائے نام ملے تھے لیکن فوجی مصارف کے نام سے بہت جلد واپس لے لئے گئے۔

سنہ ۱۸۰۰ء میں آصفجاہ ثانی اور انگریزوں کے درمیان عام اعانت وحفاظت باہم دیگر کا مشہور عہدنامہ ہوا چنانچہ اُس وقت سے آج تک تاج برطانیہ اور ریاست حیدرآباد کے جو خوش گوار تعلقات قائم ہیں وہ اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آصفجاہ ثانی نے انگریزوں سے مستقل تعلقات قائم کر کے سلطنت آصفیہ کے لئے فرانسیسیوں ٹیپو سلطان اور مرہٹوں کے جو زبردست خطرات تھے ان کو رفع کیا اور اندرون ملک سے فسادات کو دور کیا اور امن قائم کیا۔ اس طرح سنہ ۱۷۶۱ء سے سنہ ۱۸۰۳ء تک نہایت کامیابی کے ساتھ انھوں نے حکومت کی اور اپنی حکمت عملی اور دوراندیشی سے نہ صرف سلطنت کی ڈوبتی ناؤ کو بچالیا بلکہ اپنے عہد حکومت میں ممالک محروسہ کا رقبہ وسیع کر کے سلطنت آصفیہ کا وجود ہمیشہ کے لئے مستقل اور مستحکم کردیا۔ ان وجوہات کی بنا پر اور خصوصاً اٹھارویں صدی کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب کہ ہندوستان میں ہر نقطۂ نظر سے ایک عام انحطاط کا دور چلا آرہا تھا۔ ہمیں آصفجاہ ثانی کی شخصیت کیا بلحاظ بہادری اور کیا بلحاظ تدبر اپنے ہم عصروں میں سب سے ممتاز نظر آتی ہے۔ اور وہ بجا طور پر سلطنت آصفیہ کے حقیقی معمار سمجھے جا سکتے ہیں۔

نواب سکندرجاہ آصفجاہ ثالث

(سنہ ۱۸۰۳ء تا سنہ ۱۸۲۹ء)

نواب سکندرجاہ آصفجاہ ثانی کے بڑے بیٹے تھے اور ان کا نام میر اکبر علی خاں تھا۔ ان کے اوائل حکومت کا اہم ترین واقعہ مرہٹوں اور انگریزوں کی جنگ ہے۔ چونکہ نواب سکندرجاہ نے اس لڑائی میں ہر طرح سے انگریزوں کی امداد فرمائی تھی اس لئے کامیابی حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے دولت آباد وغیرہ کے علاقے نواب سکندرجاہ کو واپس کردئے۔ لیکن اُسی زمانہ سے فوجی اور ملکی معاملات میں انگریزوں نے زیادہ دخل دینا شروع کیا۔ چنانچہ میر عالم کے انتقال پر مدارالمہام کے تقرر کا مسئلہ پیش ہوا تو رزیڈنٹ وقت کیپٹن سڈنہم نے بہت کچھ مداخلت کی لیکن سکندرجاہ نے منیر الملک ہی کو اپنی مرضی سے وزیر منتخب کیا البتہ اتنا ضرور ہوا کہ سارے اختیارات پیشکار مہاراجہ چندولعل کے ہاتھوں میں آگئے، اور جن کی تائید میں رزیڈنٹ تھا، چنانچہ اس کے بعد تقریباً تیس سال تک ریاست میں چندولال ہی کا بڑا عمل دخل رہا۔ ریاست کے انتظامی اور فوجی معاملات میں رزیڈنٹ رسل کی پیش قدمی انگریزوں سے مہاراجہ چندولال کی غیر معمولی ہمدردی اور پامر کمپنی سے سودی قرضہ کا لین دین یہ وہ چیزیں تھیں جس کی وجہ سے ریاست حیدرآباد کی مالی اور انتظامی حالت بد سے بدتر ہوگئی۔ چنانچہ دوسرے رزیڈنٹ مٹکاف نے جائزہ لیتے ہی صاف طور پر یہ کہہ دیا کہ نئی اعانتی فوجیں حیدرآباد کے خزانہ پر بہت بار ہیں اور پامر کمپنی کا جال ایک دوسری مصیبت ہے۔ اس لئے اس نے بعض مفید تجاویز پیش کئے۔ چنانچہ گورنر جنرل وقت مارکوئیس آف ہسٹنگز نے پامر کمپنی کا قرضہ تو انگریزی حکومت

نواب میر اکبر علی خاں سکندر جاہ آصف جاہ ثالث

نواب میر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ آصف جاہ رابع

کی طرف سے ادا کرا دیا لیکن شمالی سرکاروں کی جو پیشکش آصفجاہ ثانی کے زمانہ سے جاری تھی وہ اس سلسلہ میں ہمیشہ کے لئے بند کر دی۔ اور فوجی بار حسب حال ریاست پر پڑتا رہا۔

مہاراجہ چندو لال کے عمل دخل کو دیکھ کر نواب سکندر جاہ نے خود امور سلطنت میں زیادہ حصہ نہیں لیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کے معاملات میں انگریزوں کی مداخلت روز بروز بڑھتی گئی۔

نواب سکندر جاہ ایک خدا ترس رحمدل اور نیک بادشاہ تھے۔ ان کو اپنی رعایا کے آرام و آسائش کا بڑا خیال تھا چنانچہ انھوں نے کئی تالاب سڑکیں وغیرہ تعمیر کرائیں۔ غرض رفاہ عام کے بہت سے کام انجام دیئے۔ انگریزی اعانتی فوج کے لئے سکندرآباد کا شہر انھیں کا بسایا ہوا ہے۔

نواب ناصر الدولہ آصفجاہ رابع

(۱۸۲۹ء تا ۱۸۵۷ء)

میر فرخندہ علی خاں نواب ناصر الدولہ سکندر جاہ کے صاحبزادے تھے۔ تخت نشین ہوتے ہی انھوں نے ملکی انتظامات کو درست کرنے کی کوشش کی ریذیڈنسی کے اثرات کو کم کیا اس سلسلہ میں مہاراجہ چندو لال کے استعفا دینے کے بعد کچھ عرصہ تک بغیر کسی مدار المہام کے بذات خود وہ حکومت کے کام انجام دیتے رہے۔ اور پھر کئی مدار المہاموں کو خود ہی مقرر کیا اور معطل و علحدہ کر دیا۔ انگریزوں کے قرضہ کی رقم بڑھتی جا رہی تھی چنانچہ جب ڈلہوزی گورنر جنرل ہو کر ہندوستان آیا تو اس نے سخت تقاضا کیا کہ قرضہ کے معاوضہ اور فوجی اخراجات کے لئے ملک کے بعض اضلاع انگریزوں کے حوالے کئے جائیں۔ اُس زمانہ کا رزیڈنٹ جنرل فریزر نہایت منصف مزاج اور ریاست کا خیر خواہ تھا۔ اس طرح کی ناواجبی مداخلت کو پسند نہ کر کے اس نے خود استعفا دے دیا۔

لیکن ڈلہوزی نے پھر دباؤ ڈالا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد کی اعانتی فوج کے اخراجات اور قرضہ کے سلسلہ میں نواب ناصر الدولہ پر انتہائی دباؤ ڈالا گیا۔ چنانچہ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی رو سے رائچور کا دوآبہ اور برار کا علاقہ عارضی پٹہ پر انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا اس واقعہ کا حیدرآباد کے وزیر سراج الملک پر اتنا اثر ہوا کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ ان کے بھتیجے میر تراب علی خاں سالار جنگ اول مدار المہام مقرر ہوئے جنھوں نے نہ صرف تین بادشاہوں کے زمانہ میں مدار المہامی کی اہم ترین خدمت انجام دی بلکہ جدید حیدرآباد کے بنانے میں شاید سب سے زیادہ حصہ لیا

نواب ناصر الدولہ کے زمانہ ہی سے انھوں نے سیاسی اصلاحات اور معاشی و تعلیمی ترقیات کا کام شروع کر دیا تھا جس کو بعد کے فرمانرواؤں کے زمانہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ملک کے حصے بخرے ہو کر چھوٹے چھوٹے اراضیات سرمایہ داروں اور عرب جمعداروں کے پاس رہن تھے سالار جنگ نے ان علاقوں کو چھڑوا لیا۔ اور دوسری اصلاحات کے کام میں مصروف تھے کہ ادھر شمالی ہند میں غدر کی آگ بھڑک پڑی اور ادھر نواب ناصر الدولہ نے رحلت فرمائی۔

نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس

(۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء)

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی اہمیت غیر معمولی ہے کیوں کہ اس سال شمالی ہند میں غدر ہونے کی وجہ سے دلی اور میرٹھ سے لے کر وسط ہند تک ہر جگہ ہندوستانی فوج نے سرکشی کی تھی۔ غرض وہ وقت انگریزوں کے لئے نہایت درجہ نازک تھا۔ حیدرآباد کے لیے بھی وہ زمانہ کچھ کم اہمیت کا نہ تھا کیونکہ ناصرالدولہ کے انتقال کے بعد یہاں ان کے بڑے صاحبزادے نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ تخت نشین ہوئے تھے۔ انھوں نے نہ صرف ریاست حیدرآباد اور جنوبی ہند میں غدر کی آگ کو پھیلنے سے روکا بلکہ انگریزوں کی ہر طرح سے مدد فرمائی مختصر یہ کہ نواب افضل الدولہ اور ان کے وزیر سالار جنگ نے انگریزوں کی ڈوبتی ناؤ کو بچا لیا۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمہ کے بعد ہندوستان کی حکومت جب راست شاہان انگلستان کے ہاتھ آگئی تو نواب افضل الدولہ کی خدمات کے صلہ میں شوراپور اور رائچور کا دوآبہ حیدرآباد کو واپس مل گیا۔

نواب افضل الدولہ کے زمانے سے حیدرآباد جدید کی ابتدا ہوتی ہے۔ اب بھی ایسے سن رسیدہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے نواب افضل الدولہ اور ان کے خیرخواہ اور وفادار وزیر سالار جنگ اول کو اصلاح اور ترقی ملک کے کاموں میں ہمہ تن معروف دیکھا تھا چنانچہ ان کی زبانی اس زمانے کے حالات سننے سے اس عہد کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

اسی طرح حیدرآباد میں بہت سی نشانیاں اور کئی عمارتیں ایسی موجود ہیں۔ جیسے افضل گنج۔ افضل گنج کا پل۔ مسجد افضل گنج یا چوحلہ پیالیس وغیرہ جو اسی عہد کی یادگار ہیں۔

نواب افضل الدولہ کا عہد حکومت صرف بارہ سال تک رہا لیکن سچ تو یہ ہے کہ حکومت آصفیہ کے موجودہ نظام حکومت اور انتظامات مملکت کی داغ بیل اسی عہد میں ڈالی گئی۔ اول تو سارے ملک کی پیمائش کر کے مالگزاری مقرر کی گئی دوسرے یہ کہ سارے ملک کو چار صوبوں، سترہ ضلعوں اور بہت سے تعلقوں میں تقسیم کر کے صوبہ دار۔ تعلقدار اور تحصیلدار مقرر کئے گئے۔ انتظامی اور مالی اصلاحات کے علاوہ سررشتہ عدالت اور پولیس کی تنظیم عمل میں آئی۔ نیا سکہ جاری ہوا۔ اس طرح امن وامان اور عدل وانصاف کے سررشتوں کی تنظیم کے بعد قوم ساز سررشتوں کے قیام کی طرف توجہ کی گئی اور رعایا کے آرام وآسایش علمی اور مادی ترقی کی خاطر سررشتہ جات تعلیم۔ طبابت اور تعمیرات وغیرہ کا قیام عمل میں آیا۔ خاص کر تعلیم کے معاملہ میں دور جدید کی تاریخ میں پہلا قدم نواب افضل الدولہ کے عہد میں اٹھایا گیا کہ ایک طرف تو ہر ضلع اور ہر تعلقہ میں مدارس قائم کئے گئے۔ اور دوسری طرف خاص شہر حیدرآباد میں دارالعلوم اور مدرسہ عالیہ کا قیام عمل میں آیا۔ جہاں عام طور پر ذریعہ تعلیم فارسی زبان تھی۔

ذاتی حالات کے اعتبار سے افضل الدولہ بہادر بڑے خداترس، بہت نیک ملنسار اور سادہ مزاج بادشاہ تھے۔ رفاہ عام کے کاموں میں غیر معمولی دلچسپی لینے کے علاوہ بڑے فیاض اور علم وفن کے بڑے قدردان تھے۔ تاریخ میں ان کا اور ان کے وفادار وزیر سالار جنگ اول کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا، کہ اس رحمدل بادشاہ اور خیرخواہ وزیر نے ریاست حیدرآباد کی اصلاح اور ترقی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور اس طرح حیدرآباد جدید کی تعمیر کا کام آغاز کیا۔ جس کو بعد کے زمانہ میں ترقی ہوتی گئی۔

نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ آصف جاہ خامس

نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس

نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس (دور ۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء)

تاریخ میں ایسی مثالیں شاذ ہی ہوں گی جب کہ ایک نہایت کمسن شہزادہ کو تخت نشین کیا گیا ہو۔ اور پھر بھی حکومت کامیابی سے چلی ہو چنانچہ یہ ایک اہم واقعہ ہے کہ ۱۸۶۹ء میں افضل الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے فرزند نواب میر محبوب علی خاں کو تین سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا گیا اور ایک مجلس تولیت قائم ہوئی جس کے اراکین نواب سالار جنگ اول اور نواب شمس الامراء تھے۔ اور انہیں کے سپرد حکومت کے جملہ کاروبار تھے۔

نواب میر محبوب علی خاں کے سن بلوغ کو پہنچنے سے قبل کے چند واقعات نہایت اہم ہیں ایک تو یہ کہ سالار جنگ اول نے اپنی برار کا مسئلہ چھیڑ دیا اور اسی سلسلہ میں خود انگلستان گئے جہاں آپ کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۷۷ء میں اعلیٰ حضرت کو ساتھ لے کر سالار جنگ اول نے دہلی دربار میں شرکت کی اور تیسرا اہم واقعہ خود سالار جنگ کے ۱۸۸۳ء میں انتقال کر جانے کا ہے۔ ایسے وفادار اور مدبر وزیر کسی ملک کی تاریخ میں شاید ہی گذرے ہوں جو اپنے ملک اور مالک کے لئے ہمہ تن وقف ہو گئے ہوں۔ چنانچہ سالار جنگ کو یہ شرف حاصل رہا کہ ناصر الدولہ، افضل الدولہ اور نواب میر محبوب علی خاں جیسے تین ہر دلعزیز بادشاہوں کے زمانے میں تقریباً تیس سال تک انہوں نے نہایت تدبر و وفاداری سے ملک اور مالک کے خدمات انجام دے۔ اور سچ تو یہ کہ حیدرآباد جدید کی ترقیوں کی داغ بیل ڈالنے میں بڑا حصہ لیا۔

سالار جنگ نہایت ہر دلعزیز تھے ان کی وفات کا صدمہ یوں تو ساری رعایا کو ہوا لیکن سب سے زیادہ اعلیٰ حضرت کو ہوا کیونکہ اعلیٰ حضرت دل سے ان کی قدر کرتے تھے۔ سالار جنگ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سالار جنگ ثانی پھر سر آسمان جاہ، سر وقار الامراء اور آخر کار مہاراجہ سر کشن پرشاد یکے بعد دیگرے مدار المہام مقرر ہوئے۔

اعلیٰ حضرت مرحوم بڑی خوبیوں کے انسان اور بڑے ہر دلعزیز بادشاہ تھے سرکار انگریزی سے ان کے زمانہ میں دوستانہ تعلقات میں اضافہ ہوا لارڈ رپن نے پہلی مرتبہ حیدرآباد آکر اس رسم کی ابتدا کی کہ گورنر جنرل کو ضرور حیدرآباد آنا چاہئے۔ چنانچہ اس کے بعد سے ہر وائسرائے اپنی واپسی سے قبل ضرور حیدرآباد آیا کرتے ہیں تاریخ دکن میں مسئلہ برار یوں بھی کوئی دل خوش کن چیز نہ تھی۔ اس پر ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے حیدرآباد آکر برار کے دوامی پٹہ پر مجبوراً اعلیٰ حضرت سے دستخط لے لئے کہ برار مملکت تو سرکار نظام کی ہو لیکن اس پر قبضہ ہمیشہ کے لئے سرکار انگریزی کا رہے۔ اور اس کے لئے سالانہ ۲۵ لاکھ کی پیشکش سرکار نظام کو دی جایا کرے۔ چنانچہ یہ رقم اب تک ہر سال وصول ہوتی ہے۔

اعلیٰ حضرت مرحوم کا زمانہ جدید ترقیات کے آغاز کا ہے اس دور میں نہ صرف بہت سی عمارتیں تعمیر ہوئیں جیسے زنانی شفاخانہ محبوبیہ ٹاؤن ہال وغیرہ بلکہ بہت سی سیاسی اصلاحیں عمل میں آئیں۔ مثلاً سکۂ محبوبیہ جاری ہوا۔ کیبنٹ کونسل اور لیجسلیٹو کونسل کا قیام عمل میں آیا۔

۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی کی طغیانی حیدرآباد کے لئے ایک زبردست سانحہ تھا اس وقت اعلیٰ حضرت نے جس طرح رعایا کی مدد فرمائی ہے وہ عدیم المثال ہے۔

غرض اعلیٰ حضرت نہ صرف خود بڑے شاعر، عالم اور قدر دان علم و فن تھے بلکہ غیر معمولی خوبیوں کے چرچے نہ صرف ریاست حیدرآباد میں بلکہ دور دراز ملکوں تک پھیلے ہوئے تھے۔

۱۹۱۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ملک پر ان کے احسانات اس قدر ہیں کہ حیدرآباد اپنے محبوب بادشاہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

میر محمود علی

باغِ عام

اور مدح حضرت آصف سالع خلد اللہ

کیا حسین ہے صورتِ گلفام باغِ عام کی
آنکھ ہو اور شکلِ دل آرام باغ عام کی

صبح اِس گلزار کی آئینۂ رخسارِ حور
شانۂ گیسوئے لیلیٰ شام باغ عام کی

دیگر

نرگسِ شہلا میں عشوے چشمِ مے آشام کے
سنبلِ پیچاں میں گھونگر زلف عنبر فام کے

بارک اللہ جس قدر پانی کے چشمے ہیں یہاں
سب ہیں آئینے جمالِ روئے باغِ عام کے

دیگر

روئے گل پر کاکلِ سنبل ہے بل کھائی ہوئی
برگِ گل میں لعل لب کی ہے جھلک آئی ہوئی

وہ ہے باغِ عام پر جوبن کہ انسان کیا جلیلؔ
بن کے چشمِ شوق نرگس بھی تماشائی ہوئی

دیگر

آج باغِ عام سے ہی اور ہی شانِ دکن
ہر کلی اس بوستاں کی ہے گلستانِ دکن

پتی پتی نے لکھا ہے کلکِ قدرت سے جلیلؔ
شاہِ عثماں آصفِ سابع سلیمانِ دکن

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیلؔ

حیدر یار خاں مہر جنگ منیر الدولہ منیر الملک

درگاہ قلی خان سالار جنگ مؤتمن الدولہ خان دوران

وزرائے آصفی

شیر جنگ تولد ۱۱۱۳ھ وفات ۱۱۸۹ھ

خاندانِ سالار جنگ کے مورثِ اعلیٰ شیر الدولہ شیر الملک شیر جنگ سید یار خان ہیں جو حضرت اویس قرنی کی اولاد سے تھے۔ اویس قرنی تاریخِ اسلام میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ آنحضرت کے زمانہ میں موجود تھے حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کے ہمراہ جنگ صفین میں حاضر تھے اور اسی جگہ میں جامِ شہادت پیا۔ اویس قرنی کی اولاد سے اویس ثابت اپنے لڑکے محمد علی کے ہمراہ مدینہ منورہ سے دکن آئے اور بیجاپور پہنچے۔ یہاں اس زمانہ میں علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۶ھ تا ۱۰۸۳ھ) حکمران تھا بادشاہ نے آپ کی بڑی عزت کی اور آپ کے فرزند محمد علی کی شادی ملا احمد نائطی کی دختر سے کر دی گئی اور دربارِ سلطانی کا عہدہ بھی دیا گیا

علی عادل شاہ کے بعد شیخ محمد علی کے دونوں فرزند محمد باقر اور محمد سید بادشاہانِ مغلیہ سے متعلق ہو گئے، عالمگیر اورنگ زیب نے دو ہزاری منصب سے سرفراز کیا۔ محمد باقر کے فرزند محمد تقی بھی عالمگیری عہد میں منصب سہ صدی سے مفتخر ہو چکے تھے اور فرخ سیر کے زمانہ میں ان کو اورنگ آباد میں داروغہ خزینہ کی خدمت دی گئی۔

حضرت آصفجاہ اول نے ان کو قلعہ جات دکن کا داروغہ مقرر کیا انھیں محمد تقی کے فرزند شمس الدین محمد سید یار خان شیر جنگ ہیں

شیر جنگ کی ولادت اورنگ آباد میں ۱۱۱۳ھ میں ہوئی حضرت آصفجاہ اول نے سب سے پہلے دو صدی منصب کے ساتھ فیل خانہ کا داروغہ مقرر کیا اس کے بعد آپ کو مختلف خدمات عطا ہوئیں جن کو آپ نے خوش اسلوبی سے انجام دیا آصفجاہ کا بڑا اعتماد آپ پر تھا۔ حیدر یار خان کا خطاب بھی آصفجاہ نے عطا کیا تھا۔

نواب ہدایت محی الدین خان مظفر جنگ کے مارے جانے پر نواب صلابت جنگ کی تخت نشینی شیر جنگ کی جرأت کی وجہ سے ہوئی تھی کیونکہ بعض امرا کی خواہش تھی کہ نواب نظام علی خان (آصفجاہ ثانی) کو تخت نشین کیا جائے چونکہ نواب صلابت جنگ بڑے بھائی تھے اس لئے شیر جنگ نے کہا کہ بڑے بھائی کے ہوتے چھوٹے کو مسند نشین کرنا خاندان آصفی کی روایات کے خلاف ہے، اور پیش قدمی کر کے نواب صلابت جنگ کو مسند نشینی کی نذر پیش کردی۔ آپ کے بعد دوسرے امرا نے بھی آپ کی پیروی کی

نواب صلابت جنگ کے زمانہ میں شیر جنگ نے دیوانی کے اہم فرائض بھی انجام دئے (۱۱۷۲ھ) نواب آصفجاہ ثانی کے ابتدائی ایام میں چونکہ شیر جنگ سے موافقت نہیں تھی اس لئے انھوں نے پونہ میں اقامت کر لی تھی، بعد میں شیر جنگ مورد عنایت شاہی ہوئے۔ رکن الدولہ کے نائب کی حیثیت سے کام کرتے رہے اس کے بعد انھوں نے مختلف اہم خدمات کو انجام دیا اور آخر زمانہ میں جبکہ ان کا سن بھی زیادہ ہو گیا تھا ان کو صوبہ اورنگ آباد کی نظامت کے عہدہ پر سرفراز کیا گیا اس خدمت کو بھی وہ پانچ سال تک انجام دیکر ۱۱۸۹ھ میں انتقال فرمایا۔ اورنگ آباد میں سپرد خاک کئے گئے۔

شیر جنگ، سخاوت، شجاعت میں مشہور تھے، علمی قابلیت بہت اچھی تھی۔ ان کو دو لڑکے تھے۔ بڑے محمد صفدر خان غیور جنگ بودگاہ قلی خان کے داماد تھے۔ اور دوسرے تقی یار خان ذوالفقار جنگ جنھوں نے عنفوان شباب میں انتقال کیا۔ اول الذکر کی اولاد سے نواب سالار جنگ بہادر ہیں، جو آپ کی چھٹی پشت کے داد ا ہوتے ہیں۔

صرصوھی دٗ ۃ اکں الد وا

سہراب جنگ معین الدولہ مشیر الملک اعظم الامرا ارسطو جاہ

رکن الدولہ میر موسیٰ خان

وفات ۱۱۸۹ھ

میر محمد یار نام اور رکن الدولہ میر موسیٰ خان احتشام جنگ خطاب تھا آپ کے اجداد بخارا کے رہنے والے تھے
رکن الدولہ کے دادا ہندوستان آئے اور نواب غازی الدین خان فیروز جنگ کے فرزند میر قمرالدین خان
آصف جاہ اول کی تعلیم دینے پر مامور کئے گئے [illegible] بیگ خان ان کو خطاب ملا ان کے فرزند میر موسیٰ تھے ، جو
دیوکنڈہ کی وقائع نگاری پر مامور کئے گئے پھر مظفر جنگ کے یہاں ایک سال کے افسر مقرر ہوئے ،
ان کے بعد ان کے فرزند میر محمد یار کو باپ کی جگہ مامور کیا گیا نواب مظفر جنگ کے مارے جانے پر صلابت جنگ نے
محمد یار کو موسیٰ خان کے خطاب کے ساتھ ایک خاص فوج کی حاضری پر مقرر کیا ۔ رفتہ رفتہ انھوں نے ترقی کی
نام پیدا کیا اور جہانگیری سایہ پر ترقی پائی چونکہ طالع یاور تھا [illegible] آصف جاہ ثانی کی نظر عنایت مبذول ہوگئی
اور ۱۱۸۰ھ میں خطاب رکن الدولہ احتشام [illegible] ہفت ہزاری اور ہشت ہزار سوار کا اعزاز
ملا اور خدمت دیوانی [illegible] میں نواب تیغ جنگ کو زیادہ دخل تھا ۔
وہ مشیر خاص کی حیثیت رکھتے تھے

۱۱۸۹ ہجری میں ایک سپاہی فیض نام نے آپ کو شہید کر دیا کہ مولا علی کے دامن میں دفن کئے گئے
ان کی دیوانی کے اہم واقعات یہ ہیں :-

(۱) حیدر علی کو انگریزوں کے ساتھ [illegible] فوج [illegible] حیدر علی کو
ناکامی ہوئی محمد علی والاجاہ نے نظام اور انگریزوں میں صلح کرادی اس صلح کے لئے رکن الدولہ
مدراس گئے ۔

(۲) مرہٹوں سے دو دو جنگیں ہوئی

(۳) موسیٰ ندی میں طغیانی آئی اور فصیل توڑ کر پانی اندر آیا

رکن الدولہ کو اولاد نہ تھی لیکن ان کے بھائی [illegible] شمس الامراء کی اولاد موجود ہے ۔ ان کے سلسلے میں نواب [illegible]
رکن الملک کی ایک قابل ذکر ہستی تھی جو اپنے کردار اور زہد و ورع کی وجہ سے بہت مشہور تھے ۔

ارسطوجاہ

تولد ۱۱۴۵ھ　　وفات ۱۲۱۹ھ

غلام سید نام اور معین الدولہ سہراب جنگ شیر الملک اعظم الامرا ارسطوجاہ فرزند ارجمند وکیل مطلق مختار دولت آصفیہ بخطاب تمام ۱۱۴۵ھ میں تولد ہوئے، نوشیروان عادل کی اولاد سے تھے۔ آپ کے باپ فرخ نژاد خان کو حضرت آصفجاہ اول نے صوبہ دار برار مقرر کیا تھا۔ غلام سید خان آصفجاہ ثانی کے رفیق و مصاحب تھے، ہیبت جنگ کے مارے جانے کے بعد معین الدولہ سہراب جنگ کے خطاب کے ساتھ محالات صوبہ برار اور خجستہ بنیاد کی دیوانی پر مامور کئے گئے۔

اس کے بعد پونہ اور ناگپور کی سفارت پر بھیجے گئے چنانچہ سہراب جنگ نے راؤ پنڈت پردھان اور رگھوجی بھونسلہ کے پاس جا کر اپنا مفوضہ کام نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا۔ اس کے بعد ایک عرصہ بعد شیر الملک اعظم الامرا کے خطاب کے ساتھ خدمت دیوانی سے سرفراز کئے گئے (۱۷۸۱ء، ۱۱۹۵ھ)

آپ کی دیوانی کے اہم واقعات کی بڑی تفصیل ہے، جن کی صراحت کا یہ موقع نہیں ہے، مختصراً اس کا اظہار کیا جاتا ہے:-

(۱) سلطنت آصفیہ نے مرہٹوں کی تائید سے میسور پر چڑھائی کی مگر عین وقت پر مرہٹوں نے ساتھ نہیں دیا۔ الحمد للہ تنہا آصفی فوج نے میسور پر حملہ کیا اور فتحیاب ہوئی۔

(۲) انگریزوں کے ساتھ شریک ہو کر سلطنت آصفیہ نے میسور کی تیسری لڑائی میں حصہ لیا۔

(۳) مرہٹوں کے ساتھ جنگ کھرلہ واقع ہوئی، جس میں بعض وجوہ سے آصفی فوج ناکام رہی۔

(۴) اعظم الامرا پونہ میں نظر بند کئے گئے۔

(۵) پونہ میں اعظم الامرا نے سیاسی چال چلی، روسا مرہٹہ میں نفاق ڈالکر ان کو آپس میں جدا کر دیا، اور پھر اپنی سیاسی چال اور توڑ جوڑ سے ان کی صفائی بھی کرا دی، اور صفائی کرانے کے بعد جنگ کھرلہ کے نقصانات کی تلافی میں ایک کروڑ نقد تین کروڑ کے دستاویزات معافی چوتھ کی سند ممالک دولت آباد وغیرہ واپس لیکر حیدرآباد واپس ہوئے۔

(۶) میسور کی چوتھی لڑائی میں انگریزوں کی مدد کی گئی اور فتحیاب ہوئے۔

(۷) آصفجاہ ثانی کا انتقال ہوا اور آصفجاہ ثالث مسند حکومت پر جلوہ گر ہوئے، اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ۱۲۱۹ھ میں ارسطوجاہ کا انتقال ہو گیا سرور نگر میں دفن ہوئے۔ ارسطوجاہ اپنے ملک اور مالک کے سچے خیرخواہ رہے، مرتے دم تک آپ نے ملک اور مالک کی خدمت نہایت دیانت داری سے انجام دی، وہ اپنے وقت کے بڑے سیاست داں تھے، انھوں نے بیسیوں موقعوں پر سیاسی دل و دماغ سے کام لیکر کامیابی حاصل کی۔
ارسطوجاہ مذہبی آدمی تھے۔ فرائض کی پابندی سختی کے ساتھ کرتے تھے، جود و سخا میں مشہور تھے۔ علما و فضلا کی صحبت سے بڑی دلچسپی تھی۔ شعر و سخن سے شغف تھا، ان کے دربار نے اردو شاعری کی بھی بڑی خدمت کی۔

صدں ابو القاسم صد ءالم

علی زمان خان غیور جنگ منیر الدولہ منذر الملک امیر الامراء

میر عالم

تولد ۱۱۶۶ھ وفات ۱۲۲۳ھ

ابوالقاسم میر عالم کے والد سید رضی شوستری ایران کے شیخ الاسلام کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سید رضی شوستر ہی میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۶۳ھ میں وہ اپنے جلالی کے ہمراہ ہندوستان آئے۔ شاہجہان آباد میں چند روز قیام کے بعد شجاع الدولہ ناظم بنگال کے پاس بنگال چلے گئے اور وہاں ان کے داماد مرشد قلی کی رفاقت میں رہنے لگے اور مرشد قلی کے ساتھ حیدرآباد آئے۔ آصفجاہ کی ملازمت اختیار کی۔ دارالانشا میں مامور کئے گئے۔ حضرت آصفجاہ نے ایک جاگیر بھی مرحمت فرمائی تھی۔ ۱۱۹۴ھ میں سید رضی کا حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ دائرہ میر مومن میں دفن ہوئے۔
سید رضی بڑے قابل فرد اور مجتہد کا درجہ رکھتے تھے۔ شاعری کا بھی شوق تھا۔ اقدس تخلص کرتے تھے۔

میر ابوالقاسم المخاطب بہ میر عالم کی ولادت حیدرآباد میں ۱۱۶۶ھ م ۱۷۵۳ء ہوئی۔ عربی اور فارسی میں بڑی اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ ریاضی میں مہارت تھی۔ قلم برداشتہ عربی لکھا کرتے تھے۔ فارسی شاعری اور انشاپردازی کا خاص ذوق تھا۔ بہرحال میر عالم اپنے وقت کے ایک بلند پایہ ادیب اور قابل منتظم تھے۔
یہ امر خاص طور سے قابل تذکرہ ہے کہ میر عالم کی ابتدائی ملازمت اسی شاعری کے طفیل ہوئی۔ اگرچہ ان کو آپ کی جاگیر مل چکی تھی مگر ملازمت کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ ایک مرتبہ جب ارسطوجاہ کی مدح میں قصیدہ کہا تو ارسطوجاہ نے ان کے کلام کی لطافت و بلاغت سے متاثر ہو کر اپنا سکریٹری بنالیا۔ اس وقت سے ان کی ترقی ہونے لگی۔
اس کے بعد وہ صدر تعلقدار بنائے گئے۔ انھوں نے اپنے علاقہ کا انتظام نہایت عمدہ کیا۔ رعایا اور مالک دونوں کی خوشنودی حاصل کی۔
صدر تعلقداری کے بعد میر عالم کو وکالت کی خدمت دی گئی۔ جب کمپنی کی جانب سے ایک سفیر حیدرآباد آیا تو ارسطوجاہ نے اپنے اور اس انگریز سفیر کے درمیان ان کو وکالت پر مامور کیا۔ معاملات نہایت عمدگی سے طے پا گئے۔ اس کے بعد میر عالم کو سفارت کے لئے منتخب کیا گیا اور وہ حضرت آصفجاہ ثانی کی جانب سے گورنر جنرل کارنوالس کے پاس بھیجے گئے ۱۲۰۳ھ۔ میر عالم اس سفارت میں کامیاب ہو کر کلکتہ سے واپس آئے۔ اس کامیابی کے صلہ میں ان کو خطاب میر عالم کے ساتھ دیگر اعزازات سے بھی ممتاز کیا گیا۔ اب وہ پیشوا کے پاس پونہ روانہ کئے گئے۔ اور اس کے بعد میسور کی چوتھی لڑائی میں حیدرآبادی فوج کی سپہ سالاری کے فرائض ان کے تفویض کئے گئے۔

ارسطوجاہ کے انتقال پر آصفجاہ ثالث نے میر عالم کو دیوانی کی اہم خدمت عطا فرمائی (۱۲۱۹ھ)۔
میر عالم نے اپنی دیوانی کے زمانہ میں کئی اصلاحیں فرمائیں۔ چنانچہ قلمرو آصفی میں سب سے پہلے ٹپہ سانی (ڈاک) کا انتظام کیا گیا۔ حیدرآباد، کلکتہ، مدراس، بمبئی، پونہ اور مچھلی بندر تک ٹپہ کا انتظام ہوا۔ اس کے لئے راستے میں مسافر خانے، مسجدیں بنوائیں اور باؤلیاں کھدوائیں۔ آج تک بھی اکثر سرائیں موجود ہیں۔

۱۲۲۰ھ میں ایک قحط ہوا۔ میر عالم نے اس کا معقول انتظام فرمایا۔ بہرحال میر عالم ایک منتظم اور مدبر دیوان ثابت ہوئے۔
شوال ۱۲۲۳ھ میں میر عالم کا انتقال ہوا۔ دائرہ میر مومن میں اپنے والد کے پہلو میں دفن کئے گئے۔

میر عالم کی بنائی ہوئی کئی چیزیں آج تک موجود ہیں مثلاً میر عالم کا تالاب، میر عالم کی منڈی، بارہ دری اور اس کا باغ وغیرہ۔ میر عالم صاحب تصنیف تھے۔ فارسی نثر و نظم میں کئی کتابیں ہیں۔ ان میں سے حدیقۃ العالم اور مثنوی مدح ماہ لقا بائی چندا مشہور ہیں۔
میر عالم بڑے سخی تھے۔ ہر روز ان کے باورچی خانہ سے ۰۰ مساکین کو کھانا ملتا تھا۔ وہ بڑے معاملہ فہم، دور رس، دوربین، صاحب حزم و احتیاط کرنے والے اور عاقبت بین تھے۔

شمس الامرا ثانی امیر کبیر

تولد ۱۱۹۵ھ   انتقال ۱۲۰۹ھ

نواب محمد فخر الدین خان، تیغ جنگ ابو الفتح خان شمس الامراء اول کے فرزند ہیں۔ حیدرآباد میں آپ کی ولادت ہوئی (۱۱۹۵ھ) باپ کے انتقال کے وقت بہت کم سن تھے۔ آپ کی کم عمری سے ہی آصفجاہ ثانی کے نوازشات مبذول ہوتی رہیں۔

موروثی خطابات تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء (ثانی) کے ساتھ امیر کبیر (اول) کا جلیل القدر خطاب بھی ملا۔

امیر کبیر مختلف حیثیتوں سے خاندان پائگاہ کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کی ممتاز ہستی نہ صرف امرا پائیگاہ بلکہ تاریخ دکن میں بھی اہم حیثیت رکھتی ہے۔ اور تاریخ دکن اپنے اس قابل فخر سپوت پر ہمیشہ فخر کریگی۔

امراء پائگاہ میں آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں، جو بادشاہ کی دامادی کے رشتہ میں منسلک کئے گئے چنانچہ ۱۲۱۵ھ میں حضرت آصفجاہ ثانی نے اپنی صاحبزادی بشیر النسا بیگم کی شادی آپ سے فرماکر دامادی کے رشتہ سے ممتاز کیا۔ اور آج تک آپ کی اولاد کو یہ فخر حاصل ہو رہا ہے کہ وہ خاندان آصفی کی شہزادیوں کے ساتھ ازدواج کا امتیاز حاصل کرتے ہیں

نواب شمس الامراء [illegible] میں منصب مدار المہامی پر فائز ہوئے گیارہ ماہ نہایت کامیابی کے ساتھ کام کرنے کے بعد خدمت سے سبکدوش ہوئے

امیر کبیر کی ذات علما، شعرا اور مصنفین کے لئے ملجا و ماویٰ تھی آپ علم و فن کی ترویج کے لئے لوگوں کی ہمت افزائی کا پورا سامان کرتے تھے، ان کو فکر معاش سے مستغنی کرنے کے لئے مناصب اور ماہوار مقرر فرماتے تھے چنانچہ حضرت فیض، قیس، آفاق، شہرت وغیرہ کو ماہواریں ملا کرتی تھیں۔

ترقی تعلیم سے آپ کو بڑی دلچسپی تھی۔ اپنے صرفہ سے کئی مدرسے قائم کئے تھے، یہاں کے مدرسین کو بیش قرار ماہوار اور طلبہ کو وظائف کے علاوہ کتابوں وغیرہ سے بھی مدد دی جاتی تھی

امیر کبیر کے سب سے بڑے اور قابل فخر کارنامے یہ ہیں کہ آپ نے مغربی علوم و فنون خصوصاً سائنس اور ریاضی وغیرہ کی کئی کتابیں اردو میں ترجمہ کراکے شائع فرمائیں اور ان کی تعلیم کا انتظام فرمایا۔ اردو زبان میں مغربی علوم کے ترجمہ کرنے کی یہ سب سے پہلی کوشش تھی۔ دہلی کالج، علی گڈھ وغیرہ کی تحریکیں سب اس کے بعد کی ہیں۔ ارباب کمپنی نے کلکتہ میں نثر اردو میں قصہ کہانیاں وغیرہ کی کتابیں مرتب کرائی تھیں یہ کارنامہ ان دنوں تاریخ ادب اردو کا ایک ممتاز باب سمجھا جاتا ہے، لیکن امیر کبیر نے زبان اردو کی جو خدمت سائنس کے کتابوں کے ترجمہ کی کی ہے، وہ ان قصے کہانیوں کے کارناموں سے زیادہ درخشاں اور زیادہ سود مند ہے۔

امیر کبیر کو فن تعمیر سے بھی بڑی دلچسپی تھی آپ نے کئی عالی شان عمارتیں اور بازار وغیرہ تعمیر کرائے۔

محمد ابوالفخر فخرالدین خان امام جنگ ثالث خورشید الدولہ
خورشید الملک

مہاراجہ چندو لال

مہاراجہ چندو لعل

تولد ۱۱۸۰ھ انتقال ۱۲۶۱ھ

مہاراجہ چندو لعل بہادر، اکبری نورتن کے ایک رتن راجہ ٹوڈرمل کی اولاد سے تھے۔ آپ کے جد اعلیٰ رائے مول چند جو راجہ ٹوڈرمل کی پانچویں پشت سے تھے حضرت آصفجاہ اول کے زمانہ میں کروڑگیری کی تعلقداری پر مامور رہتے تھے۔ ان کے بعد ان کے فرزند رائے بھیم رام کو آصفجاہ ثانی نے اس خدمت سے سرفراز فرمایا۔ ان کے دو لڑکے تھے، رائے نانک رام اور رائے نارائن داس۔ نارائن داس کے فرزند رائے چندو لال ہیں۔

بھیم رام کے مرنے پر نانک رام کو ان کی موروثی خدمت ملی اور ان کے بعد ان کے فرزند رائے لکپت رائے اس جگہ مامور ہوئے مگر دو سال میں انھوں نے انتقال کیا۔

مہاراجہ چندو لعل ۱۱۸۰ھ میں تولد ہوئے۔ رواج زمانہ کے موافق فارسی اور عربی کی تعلیم پائی اور معاشی قابلیت پیدا کی۔ سن شعور کو پہونچ کر اپنے چچا نانک رام کے ماتحت سررشتہ کروڑگیری میں ایک خدمت پر مامور ہوئے اور پھر لکپت رائے کے مرنے پر تعلقدار کروڑگیری ہوگئے۔ ارسطوجاہ نے راجہ چندو لعل کی قابلیت اور لیاقت سے واقف ہوکر ان کو فیلخانہ، [illegible] وغیرہ کے انتظام پر مامور کیا۔ راجہ بہادر کا خطاب بھی ملا۔ سابقہ خدمت بھی بدستور بحال رہی جس پر آپ کے غیاب میں آپ کے بھائی کارگزار رہتے۔

میر عالم بہادر کی وزارت میں آپ کو خدمت پیشکاری پر سرفراز کیا گیا اور مہاراجہ کا خطاب عطا ہوا۔ منیر الملک کی دیوانی میں آپ پیشکاری کے ساتھ دیوانی کے کاموں میں دخیل رہتے اور ان کے انتقال پر اگرچہ آپ کو باضابطہ دیوانی کی خدمت نہیں ملی تھی مگر چونکہ کوئی اور شخص دیوان نہیں تھا اس لئے آپ ہی دیوانی کے فرائض بھی انجام دیتے رہتے۔ خطاب راجایان مہاراجہ سے ممتاز کیے گئے۔

مہاراجہ چندو لعل نے اپنے زمانہ میں خوب ہی داد و دہش کی۔ بیسیوں اشخاص کو جاگیریں، انعام اور مناصب بحال کر دیا۔
۱۲۵۹ھ میں مہاراجہ چندو لعل خدمت پیشکاری سے مستعفی کر دیے گئے اور ۱۲۶۱ھ میں وفات پائی۔

آپ ایک علم دوست، ذی علم، فیاض، سخی امیر تھے۔ علما فضلا کی بڑی قدر کرتے تھے۔ شعر و سخن کے دلدادہ تھے۔ سخن فہم اور سخن سنج تھے۔ اس کے ساتھ ہی بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ کے فارسی اور اردو کلیات شائع ہو چکے ہیں۔ شاداں آپ کا تخلص تھا۔

آپ کا کلام سنجیدہ، شگفتہ اور پسندیدہ مضامین کا گنجینہ ہے۔ کلام کی شیرینی، انداز بیان کی جدت اور تخیل کی بلندی آپ کی قادر الکلامی کے شاہد ہیں۔ آپ کے کلام کا بڑا حصہ معرفت و تصوف سے بھرا ہوا ہے۔

آپ کے دربار میں ہر وقت شعرا کا جمگھٹا رہا کرتا تھا۔ ان کی بڑی بڑی تنخواہیں مقرر تھیں۔

مہاراجہ کی سخاوت اور خیرات عام و خاص میں مشہور تھی۔ بلا لحاظ مذہب و ملت فقیروں، مساکین، گوسائیں، شاستری وغیرہ کو روزینے یومیہ کے علاوہ روز میوہ اور شیرینی، پارچے، دوشالے وغیرہ بھی تقسیم ہوا کرتے تھے۔ بعض مرتبہ ایک ایک ہزار دوشالے روزانہ تقسیم ہوتے تھے۔

آپ کو تعمیرات سے بھی دلچسپی تھی۔ بارہ دری مشہور ہے جو باغ رحمت موسوم تھی۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے کئی عمارتیں بنائی ہیں۔ بہرحال تاریخ دکن میں مہاراجہ چندو لعل بھی اہم شخصیت کے مالک ہیں۔

منیر الملک ثانی

تولد ۱۱۹۰ھ   وفات ۱۲۴۶ھ

علی زمان خان المخاطب غیور جنگ، منیر الدولہ، امیر الامرا، منیر الملک ثانی، غیور جنگ، صفدر یار خان کے فرزند اور شیر جنگ منیر الملک کے پوتے تھے۔ صفدر یار خان غیور جنگ کے انتقال پر ان کے چاروں لڑکوں نے جائداد آپس میں تقسیم کر لی۔ حضرت آصفجاہ ثانی نے ان کو منیر الملک کے خطاب کے ساتھ پنج ہزاری منصب اور سہ ہزار سوار کا اعزاز عطا فرمایا اور بخشیگری فوج کی خدمت سے سرفراز کئے گئے۔

منیر الملک، میر عالم کے داماد تھے، ان کی دو لڑکیاں یکے بعد دیگرے آپ سے بیاہی گئیں۔ میر عالم نے آپ کو خانہ داماد کی حیثیت سے اپنے ہی پاس رکھا تھا۔ ان کے انتقال کے چند ماہ بعد منیر الملک خدمت دیوانی سے سرفراز کئے گئے (۱۲۲۴ھ)

آپ کی دیوانی کے اہم واقعات حسب ذیل ہیں:-

(۱) پنڈاروں کا ہمیشہ کے لئے انسداد ہوگیا۔ ان کی لوٹ مار سے قلمرو آصفی کو نجات ملی۔

(۲) سکھوں اور عربوں میں سخت فساد ہوا فتنہ فرو ہونے کے بعد سکھوں کو شہر بدر کیا گیا۔

(۳) مرشد زادہ مبارز الدولہ نے دو مرتبہ ہنگامہ برپا کیا اور ان کو نادیا قلعہ محمد نگر میں نظر بند کیا گیا۔

(۴) رود موسی کو قیامت خیز طغیانی ہوئی۔

(۵) حضرت آصفجاہ ثالث نے انتقال فرمایا اور آصفجاہ رابع نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

۱۲۴۶ھ میں منیر الملک کا انتقال ہوا۔ دائرہ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ آپ کو چار لڑکے تھے یعنی شجیع الدولہ، شجاع الدولہ، سراج الملک، اکرم الدولہ۔

منیر الملک بھی اپنے دادا کی طرح بڑے سخی تھے، محرم میں بڑی خیرات کیا کرتے، سادات اور حاجی وغیرہ ہمیشہ آپ کے مہمان رہا کرتے۔ لذیذ کھانوں سے بھی آپ کو رغبت تھی، ہر وقت باورچی خانہ گرم رہا کرتا۔ فی باورچی دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ دیا کرتے تھے۔

تعمیر سے بھی آپ کو دلچسپی تھی چینی خانہ، آئینہ خانہ آپ ہی کی یادگار ہیں۔ اورنگ آباد میں بھی آپ نے ایک محل تعمیر کیا تھا۔

سراج الملک

تولد ۱۲۲۴ھ   وفات ۱۲۶۹ھ

میر عالم علی خان المخاطب شیر جنگ سراج الدولہ سراج الملک، منیر الملک امیر الامرا کے تیسرے فرزند اور میر عالم کے نواسے تھے۔ سراج الملک دو مرتبہ دیوانی کی خدمت سے سرفراز کئے گئے پہلی مرتبہ ۱۲۵۹ھ میں اور دوسری مرتبہ ۱۲۶۲ھ میں۔ پہلی بار تو کچھ عرصہ کے بعد سبکدوش ہوگئے اور دوسری بار تقریباً سات سال تک یہ خدمت انجام دی اور برسر خدمت ہی آپ کا انتقال ہوا۔ دوسری مرتبہ دیوانی کے لئے رزیڈنٹ صاحب نے بڑی کوشش کی تھی۔ آپ کی دیوانی کے زمانہ میں حسب ذیل اہم واقعات ہوئے:-

(۱) عربوں اور روہیلوں میں فساد ہوگیا۔ (۲) مبارز الدولہ نے مولوی سلیم کے بہکانے سے ایک ہنگامہ کیا۔ آخر مبارز الدولہ قلعہ محمد نگر میں نظر بند کر دیے گئے اور مولوی سلیم کو حبس دوام کی سزا ہوئی۔ (۳) راجہ چندو لعل کی داد و دہش کے باعث خزانہ عامرہ خالی ہوگیا تھا۔ انگریزی فوج کنٹیجنٹ کی ماہوار ادا ہو رہی تھی، کئی لاکھ روپیہ اس کی ماہوار کا فاضل ہوگیا تھا، اس لئے حسب مطالبہ لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ملک برار کو بطور امانی انگریزوں کے تفویض کرنا پڑا۔ طے یہ ہوا تھا کہ بعد وضع اخراجات باقی رقم سرکار عالی کے خزانہ میں داخل کی جائیگی (۱۸۵۳ء)

اس معاہدہ کے کچھ عرصہ بعد نواب سراج الملک کا انتقال ہوگیا (۱۲۶۹ھ)۔ آبائی مدفن دائرہ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ سراج الملک، کم سخن، صاحب اخلاق و مروت، باریک بیں، دور رس، صاحب تدبیر امیر تھے، اہل کمال کے بڑے قدردان تھے۔ علماء و فضلاء سے بڑی محبت تھی۔

نواب سراج الملک بہادر وزیر اعظم دولت آصفیہ

مرحوم نواب علی خان شجاع الدولہ نواب مختار الملک سالار جنگ بہادر اول
وزیر اعظم دولت آصفیہ

(ب) عدالت کے لئے جدید محکمے فوجداری، دیوانی، عدالت عالیہ کا قیام عمل میں آیا اور منظم طور پر عدالت کا کاروبار ہونے لگا۔ عدالتوں کے لئے شرع اسلام اور رسوم شائستہ کو قانون قرار دیا گیا اسی کے لحاظ سے فیصلے ہونے لگے۔

(ج) ملک کی تعلیم کی طرف پوری توجہ کی گئی اضلاع اور تعلقات میں مدرسے کھولے گئے حیدرآباد میں مدرسہ دارالعلوم، مدرسہ عالیہ وغیرہ کا افتتاح کیا گیا۔

(د) تعمیرات کے لئے جدید محکمہ قائم ہوا۔ نئے راستے بنائے گئے، قدیم عمارات کی مرمت ہونے لگی۔

(و) قلمرو آصفی میں ریل اور تار جاری ہوئے (۱۰) فوج کی اصلاح ہوئی باقاعدہ فوج کی بنیاد قائم ہوئی۔

غرض کہ اصلاحات اور انتظامات کی ایک طویل فہرست ہے، بہر حال نواب مختار الملک نے ایک باقاعدہ انتظام ریاست کی صورت میں سلطنت آصفیہ کو مبدل کردیا۔

۱۳۰۰ھ میں نواب مختار الملک کا ہیضہ سے انتقال ہوا اور دائرۂ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ مختار الملک بلند ہمت خوش خلق حسن سیرت کے انسان تھے، ان کا حافظہ غضب کا تھا، معاملہ فہمی میں اپنی آپ نظیر تھے تدبر و سیاست میں ان کا ثانی نہیں تھا، ہر شخص دیکھ کر اس کی عادت اور خصلت سے بخوبی واقف ہوجاتے تھے۔ ان کی مردم شناسی مشہور تھی۔ برٹش گورنمنٹ نے ان کو جی سی ایس آئی کا خطاب دیا تھا اور سترہ توپوں کی سلامی دی جاتی تھی ۔ انھیں دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔

راجہ نریندر بہادر

تولد ۱۲۴۴ھ انتقال ۱۳۰۶ھ

راجہ نراین پرشاد نریندر بہادر، راجہ دھراج بالا پرشاد کے فرزند اور مہاراجہ چندو لال کے پوتے تھے، راجہ راجایان راجہ بہادر کے خطاب سے سرفراز تھے۔

۱۲۴۴ھ میں تولد ہوئے عربی، فارسی کے علاوہ انگریزی سے بھی واقف تھے۔ ۱۲۶۹ھ میں خدمت پیشکاری سے سرفراز ہوئے سالار جنگ مختار الملک کے انتقال پر بہ شرکت عماد السلطنت بہادر دیوانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس زمانہ کا اہم واقعہ اعلیٰ حضرت غفران مکاں آصف جاہ سادس کا پورے اختیارات کے ساتھ مسند نشین ہونا ہے۔

راجہ نریندر بہادر ایک مدبر، فیاض، تجربہ کار، سیر چشم انسان تھے، آپ کو صرف ایک دختر تھیں جو راجہ ہری کشن بہادر سے بیاہی گئیں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر آپ کے نواسے اور جانشین ہیں۔ ۱۳۰۶ھ میں راجہ نریندر بہادر کا انتقال ہوا۔

میر لائق علی خاں سالار جنگ منیرالدولہ عماد السلطنت

۱۲۸۶ھ میں نواب مختار الملک نے سلطنت آصفیہ کی جدید تنظیم فرمائی تھی، چار صدر المہام مقرر کئے تھے۔ ان میں سے ایک نواب بشیر الدولہ آسمان جاہ بھی تھے، عدالت کا سررشتہ آپ سے متعلق تھا۔ مولوی سید محمود ودی صاحب معتمد تھے۔ آسمان جاہ یہ خدمت بلا تنخواہ انجام دیتے تھے۔

اس کے بعد جب نواب مختار الملک گلستان تشریف لے گئے تو آپ سررشتہ کا کام مدارالمہام کی نیابت کرتے رہے۔ اور مختار الملک کے انتقال پر ایجنسی کے رکن ہوگئے۔ اس زمانہ میں آپ ہی نے ویسرائے کی خدمت میں مرحوم اعلیحضرت غفران مکان کو مسند نشینی کے ساتھ اختیارات دئیے جانے کی تحریک کی تھی۔ پرنس آف ویلز (ایڈورڈ ہفتم) کے ہندوستان آنے پر آسمان جاہ نے سلطنت آصفیہ کی جانب سے استقبال کے فرائض انجام دئیے تھے اور اس کے بعد ۱۳۰۴ھ میں ملکہ وکٹوریہ کی پچاس سالہ جوبلی میں سرکار عالی کی جانب سے تہنیت فرمائی تھی۔

اسی سال ۱۳۰۴ھ میں جبکہ آپ لندن میں تھے آپ کو قلمدان مدارالمہامی سپرد کیا گیا۔ خاندان پائیگاہ میں آپ ہی سب سے پہلے شخص ہیں جن کو یہ خدمت عطا ہوئی تھی۔ آسمان جاہ کے زمانہ وزارت میں مختلف اصلاحیں ہوئیں۔ سررشتہ عدالت، اور کروڑگیری میں اصلاح ہوئی۔ موازنہ، مداخل و مخارج میں تنظیم ہوئی۔ آبرسانی، سررشتہ انجن کے دفاتر قائم ہوئے۔

اس کے علاوہ بعض سیاسی مقدمات مثلاً جیکب کا ہیرا کا مقدمہ، [illegible] ریلوے و معدنیات کا مقدمہ، مہدی حسن کی برطرفی کا مقدمہ، سرور الملک کے رشوت کا مقدمہ وغیرہ بھی آپ کی وزارت کے اہم ترین واقعات ہیں جو حیدرآباد کے میدان سیاست میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۳۱۱ھ میں آسمان جاہ نے مدارالمہامی سے علحدگی اختیار کی اور ۱۳۱۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ درگاہ برہنہ شاہ میں مدفون ہوئے۔ آسمان جاہ کو سیر و سیاحت سے دلچسپی تھی یورپ کے کئی ممالک دیکھے۔ مصر میں خدیو مصر سے ملاقات کی، ہندوستان کے شمالی و جنوب کے کئی شہر کا معائنہ کیا۔

انگلستان میں آپ کی بڑی عزت و وقعت ہوتی تھی، کئی دعوتیں ہوئیں تھیں۔ زمانہ وزارت میں "سر" کا خطاب ملا تھا۔

آپ کو تعمیر عمارات کا بڑا شوق تھا، بشیر باغ، آسمان گڈھ، اکبر باغ، سرور نگر کا باغ سب آپ کی یادگار ہیں، اس کے علاوہ اجمیر کا سماع خانہ، درگاہ حضرت شاہ خاموش، عمدہ ساگر، چوک کی گھڑیال آپ ہی کے تعمیر کئے ہوئے ہیں۔

آسمان جاہ نہایت وسیع اخلاق، شرم و حیا کے پتلے تھے، اپنے ملازمین کی بڑی قدر کرتے ان کے متوسلین کے ساتھ حسن سلوک کرتے تھے۔

نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کی صاحبزادی سے آپ کی شادی ہوئی تھی، مگر ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

نواب معین الدین خان ۱۱ امانت جنگ معین الدولہ بہادر، آپ کے اکلوتے فرزند ہیں۔ جو معین المہامی کی خدمت کئی سال تک انجام دے چکے ہیں اور شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا دیوان معین سخن آج کل زیر طبع ہے۔

محمد مظہر الدین خان رفعت جنگ بشیر الدولہ عمدۃ الملک
اعظم الامرا امیر الدہر سر آسمان جاہ

محمد فضل الدین خان سکندر جنگ اقبال الدولہ اقتدار الملک
سر وقار الامرا

اقبال الدولہ وقار الامرا

ولادت [illegible] وفات ۱۳۱۹ھ

محمد فضل الدین خان المخاطب سکندر جنگ اقبال الدولہ اقتدار الملک وقار الامرا کے والد محمد رشید الدین خان امیر کبیر ہیں آپ خورشید جاہ کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے ۱۲۷۴ھ میں ولادت ہوئی اور ۱۳۱۹ھ میں عالم جاودانی کو تشریف لے گئے

ابتداً اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم پائی، جوانی میں انگریزی تعلیم سے بھی استفادہ فرمایا

نواب آسمان جاہ کی وزارت کے زمانہ میں آپ نے صدر المہام مالگزاری کی خدمت انجام دی اور ان کے بعد مدار المہامی کی خدمت جلیلہ پر سرفراز ہوئے (۱۳۱۱ھ) سات سال سے زیادہ اس خدمت کو انجام دیکر ۱۳۱۹ھ میں مستعفی ہوئے اور چند ماہ کے بعد انتقال فرمایا۔ خاندانی قبرستان، درگاہ برہنہ شاہ میں سپرد خاک کئے گئے۔

نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کی دختر نیک اختر سے آپ کا بھی عقد ہوا، ان کے بطن سے آپ کے بڑے فرزند نامور جنگ سلطان الملک کی پیدائش ہوئی آپ کے دوسرے فرزند محمد ولی الدین خان المخاطب ولی الدولہ مرحوم تھے

وقار الامرا یورپ بھی تشریف لے گئے تھے اور آٹھ ماہ تک وہاں آپ کا قیام رہا یورپ کے طریقہ تعلیم سے بہت متاثر ہوئے اور اپنے دونوں لڑکوں کو وہاں تعلیم کے لئے روانہ فرمایا ولی الدولہ مرحوم کئی سال تک ایٹن کالج میں زیر تعلیم رہے

وقار الامرا داد و دہش میں بڑے مشہور تھے نہ صرف اپنے ذاتی خزانہ سے بلکہ دیوانی کے زمانہ میں سرکاری خزانہ سے بھی آپ نے خوب سخاوت فرمائی۔

آپ کے زمانہ وزارت میں سررشتہ علوم وفنون کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس سے بلند پایہ علمی کتابوں کا ترجمہ فرمایا اور پھر مولانا شبلی مرحوم اس سررشتہ کے ناظم قرار پائے تھے مولانا نے کئی کتابیں اسی زمانہ میں تالیف فرمائیں۔

وقار الامرا نے بصرف کثیر فلک نما کی تعمیر فرمائی تھی۔ مگر اس کے بعد قرضہ کی وجہ سے ۲۲ لاکھ میں اس کو اعلیٰ حضرت کے ہاتھ فروخت کردیا۔

نواب وقار الامرا کے چھوٹے فرزند نواب ولی الدولہ بہادر نے کئی سال تک صدر المہامی کی خدمت انجام دی وہ اپنے اخلاق، سادگی اور نیک طبع کی وجہ سے بہت ہر دل عزیز تھے چنانچہ دو سال قبل جب وہ حج بیت اللہ کے لئے گئے تھے وہیں انتقال فرمایا تو اہل ملک کو ان کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔ ان کی بیگم صاحبہ کو علم و فضل اور اصلاح نسواں سے خاص شغف ہے اور شاید ہی کوئی مجلس نسواں ان کے مشوروں اور امداد سے محروم رہتی ہے

مہاراجہ یمین السلطنت بہادر

تولد ۱۲۸۰ھ

رائے کشن پرشاد المخاطب راجہ راجایان مہاراجہ راجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت بہادر، راجہ ہرکشن کے فرزند اور راجہ نریندر بہادر کے نواسے ہیں۔

حیدرآباد میں ۱۲۸۰ھ میں آپ کی ولادت ہوئی نانا کی نگرانی میں تعلیم و تربیت ہوئی، گھر کی تعلیم کے بعد مدرسہ عالیہ میں تعلیم پائی۔ اردو، فارسی، عربی، انگریزی وغیرہ میں کافی مہارت حاصل فرمائی۔

نانا کے انتقال پر ان کی جاگیرات آپ کے نام بحال کی گئیں اور ۱۳۰۰ھ میں خدمت پیشکاری و معین المہامی فوج سے سرفراز کئے گئے، سروقارالامراء کے مستعفی ہونے پر خدمت جلیلہ مدارالمہامی پر اولاً منصرم ۱۳۱۹ھ اور پھر مستقل کئے گئے ۱۳۲۰ھ کامل دس سال کے بعد ۱۳۳۰ھ میں اس سے مستعفی ہوئے۔ دوبارہ ۱۳۴۲ھ میں صدارت عظمیٰ پر آپ کا تقرر ہوا۔ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ میں بوجہ پیرانہ سالی آپ نے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

آپ کا زمانہ مدارالمہامی اور صدارت عظمیٰ اہم واقعات اور انتظامات سے مملو ہے جس کی مختصر صراحت بھی طویل صفحات کی متقاضی ہے۔

اعلیٰحضرت آصفجاہ سادس غفران مکاں نے آپ ہی کی مدارالمہامی کے زمانہ میں فردوس بریں کی راہ لی اور اعلیٰحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی برار کے متعلق قطعی تصفیہ ہوا، بیسیوں جدید محکمے قائم ہوئے، بیسیوں دفاتر کی اصلاح و تنظیم ہوئی، نئی اسکیمیں جاری ہوئیں محکمہ جات فینانس، تعمیرات، مالگزاری، عدالت، تعلیمات، فوج غرض ہر ہر سر رشتہ میں اس قدر اصلاحیں ہوئیں کہ ان کا اظہار دشوار ہے۔

مہاراجہ بہادر کی ذات محاسن اور اخلاقی خوبیوں سے مملو ہے، آپ کی عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت، تلنگی، مرہٹی، اردو، ہندی پر قدرت مسلّمہ ہے آپ اردو، اور فارسی کے زبردست شاعر اور ادیب ہیں، داغ اور آصف سے تلمذ حاصل ہے نعت اور تصوف میں آپ کا کلام بجید دلچسپ اور دل آویز ہوتا ہے۔ شاد آپ کا تخلص ہے۔

مشرقی امراء کا آپ زندہ نمونہ ہیں، حسن واخلاق، سخاوت، مروّت، رواداری آپ کے خصوصی اور امتیازی جوہر ہیں، فقیر دوست، فقیر منش اور صوفی مشرب ہیں، آپ کے یہاں ہمیشہ فقرا، صوفیا، مشائخین، شعرا، اور اہل کمال کا مجمع رہا کرتا ہے۔ مشاعرے ہوا کرتے ہیں۔

مہاراجہ بہادر کو تصنیف وتالیف سے بھی شغف ہے کئی درجن کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں، نظم و نثر پر آپ کو پورا عبور حاصل ہے، نہایت خوش خط ہیں، درگاہوں، مندروں، مسجدوں کی زیارت کا شوق ہے۔ ہندوستان کے مشہور زیارت گاہوں خواہ ہندوؤں سے متعلق ہوں یا مسلمانوں کی آپ نے دونوں کی زیارت کی ہے۔

علم دوستی، سخاوت، رواداری میں آپ اپنے جد اعلیٰ مہاراجہ چندو لعل کے عکس نمونہ ہیں۔

گورنمنٹ انگریزی میں بھی آپ کو اعزاز حاصل ہے چنانچہ کے، سی، آئی، ای۔ اور جی، سی، آئی، ای کے خطابات آپ کو ملے ہیں بہرحال مہاراجہ بہادر ایک نیک مزاج، خوش خلاق اور مالک کے وفادار امیر ہیں۔

(ولادت ۱۳۰۶ھ)

نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ بہادر، عماد السلطنت مختار الملک ثانی کے اکلوتے لختِ جگر ہیں، ۴ ار شوال ۱۳۰۶ھ کو بمقام پونا آپ کی ولادت ہوئی، ایک ماہ کے اندر ہی سایۂ پدری سے محروم ہو گئے

آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور پھر مدرسہ عالیہ میں شریک کئے گئے ۱۹۰۲ء میں آپ نے مڈل کا امتحان کامیاب کیا اور پھر میٹرک میں کامیاب ہوئے آپ نے مدرسہ میں اپنے عمدہ اخلاق سے نہ صرف ہم کلاس طلبہ کو گرویدہ کر لیا بلکہ اساتذہ کو بھی اپنا مداح بنالیا مسٹر سیٹن سابق پرنسپل آپ کی طالب علمانہ خوبیوں کا ہمیشہ اعتراف کرتے رہے۔

اعلیٰ حضرت سلطان العلوم نے اپنی مسند نشینی کے پہلے ہی سال آپ کے اسٹیٹ کی کورٹ کی نگرانی کو برخاست کر کے آپ کی نگرانی میں دے دیا۔ بااختیار ہو کر آپ نے اپنے جاگیرات کا دورہ کیا۔ رعایا کی حالت بچشم خود معائنہ کر کے ان کی اصلاح اور صلاح و فلاح کے احکام دئے۔

اس کے چند ماہ بعد ۲۵ رجب ۱۳۳۱ھ میں آپ مدارالمہامی کی جلیل القدر خدمت سے سرفراز کئے گئے تقریباً تین سال آپ نے اس خدمت کو انجام دیا آپ کے زمانہ میں کئی جدید محکمے قائم ہوئے آبپاشی کی آب رسانی کو وسعت ہوئی تعمیرات کی ترقی ہوئی، تعلیمات میں جدید اسکیم نافذ ہوئے جس کی تفصیل آخر میں درج ہے۔

محرم ۱۳۳۲ھ کو آپ نے خدمت مدارالمہامی سے سبکدوشی حاصل کی علم و فن، تعلیم، صنعت و حرفت سے آپ کو بڑی دلچسپی ہے، اس کی تفصیلی صراحت کا یہاں موقع نہیں ہے۔ البتہ چند امور درج کئے جاتے ہیں:

مدرسہ دارالعلوم کی ساٹھ سالہ جوبلی کی آپ نے صدارت فرمائی اور حوصلہ افزا خطبہ سنایا۔ آپ ہی کے عہد وزارت میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔

مسلم یونیورسٹی کو ایک لاکھ کا گراں قدر چندہ عطا فرمایا۔ اور سالانہ بارہ سو روپے بحال کئے۔ انجمن ترقی اردو کو دس ہزار کا چندہ دیا اپنے اعزہ اور متوسلین کی تعلیم کی طرف خاص توجہ مبذول ہے، ہونہار طلبہ کو ہندوستان اور یورپ میں تعلیم پانے کے لئے وظائف سے امداد فرماتے ہیں۔

صنعت و حرفت کے فروغ کے لئے آپ نے دلچسپی لے کر نئی کمپنیوں کی بڑی امداد فرمائی ہے اور بعض کمپنیاں خود آپ نے قائم کیں جو کامیابی سے چل رہی ہیں۔

آپ کا سب سے زیادہ قابل قدر کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے "ولی" کے دو صد سالہ جشن کی صدارت فرمائی اور دکھنی ادب کی سرپرستی کا اعلان کیا چنانچہ آپ کی توجہ اور گراں قدر عطیہ سے بعض دکھنی ادب کی قابل قدر کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو رہی ہیں۔ یہ آپ کا وہ کارنامہ ہے جس پر موجودہ اور آئندہ نسلیں فخر کریں گی زمانہ مٹ سکے گا اور نہ حوادثات اس کو محو کر سکیں گے۔

ایک اور عظیم بالشان اسکیم آپ کے زیر غور ہے وہ یہ ہے کہ آپ کا ارادہ ہے کہ ایک عالی شان محل تعمیر کیا جائے اور اس میں

تب کہ یہاں کے عجائبات او نادر روزگار اشیاء اورنایاب کتابیں وغیرہ پبلک استفادہ کا موقع دیا جائے۔
یہ اسکیم جس قدر مفید جس قدر ضروری او کارآمد ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا' خدا سے دعا ہے کہ آپ کے نیک ارادے کو جلد عملی صورت نصیب ہو جائے۔

نواب سالار جنگ بہادر کے عہد وزارت میں قانون و قواعد اوزان و پیمانہ جات جاری کئے گئے۔ مسالخ پر سند یافتہ ملاؤں کا جو ماہوار یاب ہوں تقرر کرنے کا حکم دیا گیا عارضی دستور العمل تحط ممالک محروسہ سرکارعالی نافذ کیا گیا اور مسٹر ویکفیلڈ کمشنر تحط مقرر کئے گئے۔ اراضی نامہ جات جو بند وبست کی شنوائی کے وقت پیش ہوں ان کا قطعی تصفیہ تعلقداران ضلع کو کرنے کا حکم ہوا۔ سیول سروس کلاس قائم ہوئی اور قواعد داخلہ و انتخاب طلبہ بنائے گئے' قانون تادیب خانہ جات ممالک محروسہ سرکارعالی نافذ ہوئے۔ جدید جوڈیشل کمیٹی کی تنظیم عمل میں لائی گئی' انیبنگ بورڈ کا قیام منظور فرمایا گیا انگریزی الفاظ کے سرکاری مراسلات میں استعمال کرنے کی ممانعت فرمائی گئی ضابطہ جوڈیشل کمیٹی ممالک محروسہ سرکارعالی نافذ کیا گیا قواعد پولیس ٹریننگ اسکول جاری کئے گئے حسب ذیل طلبہ کو وظیفہ تعلیمی یورپ و ایشیاء دیا گیا :-
(۱) سمیع اللہ شاہ بی ایس' سی ولد سید احمد اللہ سول انجینیرنگ۔ ۲۔ سید محمد یونس بی' اے ولد سید عطا حسین سول انجینیرنگ۔ ۳۔ حیدر علی خاں ایل یم یس ولد حکیم دادے علی طبابت۔ ۴۔ محمد الیاس برنی ام' اے ولد محمد ابراہیم (زیر تصفیہ)

وظایف تعلیم ایشیا

۱۔ محمد سراج الدین احمد ولد ڈاکٹر معین الدین انجینیرنگ۔ ۲۔ ام' اے۔ لماریلو ولد یم ل اندیا طبابت۔ ۳۔ دی ایچ کوناپور ولد ہنمنت راؤ کوناپور طبابت محکمہ آثار قدیمہ ممالک محروسہ سرکارعالی قائم کیا گیا اور غلام یزدانی صاحب بی' اے اس کی نظامت پر تقرر ہوا قانون انجمن ہائے امداد قرضہ نافذ ہوا۔ قواعد نگرانی اقوام جرائم پیشہ جاری کئے گئے اور قواعد امتحان زبان دانی عہدہ داران سررشتہ تعلیمات نافذ ہوئے۔

نواب صاحب نے گذشتہ نو سال کے عرصے میں تقریباً پچانوے ہزار روپے سے ہندوستان اور انگلستان میں تعلیم پانے والے طلبہ کی امداد فرمائی اور تقریباً اٹھارہ ہزار روپے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور مدرسہ آصفیہ کی ماہانہ امداد میں اور تقریباً بیس ہزار روپے اخبارات و رسائل کے چندوں میں عطا کئے ہیں۔ اس کے علاوہ موقتی طور پر علمی و ادبی انجمنوں اور اصحاب کو بھی خاطر خواہ رقمی امداد کرتے رہتے ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی

ایمان سخن

ادارۂ ادبیات اردو کے سلسلۂ انتخابات شعرائے دکن کی ایک دلچسپ کتاب جس میں مولوی سید محمد صاحب ام' اے نے نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد کے ملک الشعراء کا کلام انتخاب کرکے اپنے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے قیمت ۱۲ار

نواب محمد یوسف علی خاں سالار جنگ بہادر

سید پرورش علی خاں مکرم الدولہ

سر سید علی امام صاحب مؤید الملک مرحوم آپ کے والد سید امداد امام مرحوم ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے آپ کا خاندان سادات بارہہ سے تعلق رکھتا ہے۔

سید علی امام کی پیدائش ۱۸۶۹ء میں مضافات پٹنہ میں ہوئی والد کی نگرانی میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ سید امداد امام بڑے خوش قسمت تھے کہ ان کے دونوں فرزند سید علی امام اور حسن امام ہندوستان کے نہایت کامیاب و نامور بیرسٹر ہوئے۔

سید علی امام گھر کی تعلیم کے بعد ضلع آرہ کے اسکول میں شریک ہوئے پھر پٹنہ میں کالج کی تعلیم پائی اس کے بعد انگلستان جا کر بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی ۱۸۹۰ء میں یورپ سے واپس آئے اور پٹنہ میں وکالت شروع کی تھوڑے ہی عرصہ میں پٹنہ ہائی کورٹ کے وکلاء میں ممتاز حیثیت پیدا کر لی۔

آپ ہی وہ پہلے مسلمان ہیں جو وائسرائے ہند کی کونسل میں ممبر کی حیثیت سے مامور کئے گئے، کئی سال تک آپ نے اس خدمت کو نہایت خوش سلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ ایک طرف گورنمنٹ آپ کے کام کی قدرداں اور آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی تو دوسری طرف رعایا میں بھی ہردل عزیز تھے اس قسم کی خوش نصیبی بہت کم اصحاب کو میسر آتی ہے۔

اس خدمت کے بعد پھر آپ نے وکالت شروع کی مگر بہت جلد پٹنہ ہائی کورٹ میں جج ہو گئے اور اس کے بعد صوبہ بہار کی کونسل میں مامور ہوئے اسی خدمت سے آپ حیدرآباد میں طلب کئے گئے ۱۳۳۸ھ (۱۹۱۹ء) اور صدارت عظمیٰ کی جلیل القدر خدمت آپ کے تفویض کی گئی۔ زمانہ ما بعد میں مؤید الملک کا خطاب بھی آپ کو دیا گیا۔ آپ کے صدارت عظمیٰ کے زمانہ میں یہاں کئی اصلاحیں ہوئیں اور جدید تنظیمات ہوئے جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:-
(۱) باب حکومت کا قیام ہوا اور سررشتہ جات کی جدید تنظیم ہوئی (۲) دفتر ترقیات عامہ کا قیام ہوا جس کا مقصد مقامات کو آباد کرنے اور آبادی کو وسعت دینے کی بڑی اسکیم پیش نظر تھی۔ (۳) عدالت اور مال کے حکام کی علٰحدگی عمل میں آئی تعلقہ داران و تحصیلداروں سے عدالتی اختیارات علٰحدہ ہو کر عدالت کے لئے جدید عہدہ دار مقرر کئے گئے (۴) دفاتر سرکار عالی میں تنخواہ کے متعلق جدید اسکیم یعنی اسکیل کا نفاذ عمل میں آیا (۵) معاہدات پر نظر ثانی ہوئی اس کے علاوہ بھی جدید کئی اصلاحیں ہوئیں ان کی صراحت طوالت کا موجب ہے۔

حیدرآباد ہی کے زمانہ میں آپ جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنز) میں ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے ۱۳۴۱ھ میں سر مؤید الملک نے صدارت عظمیٰ سے کنارہ کشی اختیار کرلی مگر اس کے بعد بھی وہ مشیر کی حیثیت سے اپنے انتقال تک حیدرآباد آتے رہے۔

سر علی امام نے بحیثیت ہندوستانی اور بحیثیت مسلمان ہندوستان میں بہت کچھ کام کئے ہیں، وہ مسلم لیگ کے صدر نشین بھی ہوئے تھے ہندو اور مسلم دونوں میں وہ ہردل عزیز تھے۔

سر علی امام بڑے خوددار، مدبر، سیاست داں تھے وہ حسن اخلاق اور حسن سیرت سے آراستہ تھے۔ ۱۹۳۲ء میں انتقال ہوا رانچی میں دفن کئے گئے۔

رائٹ آنریبل سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ

محمد اکبر المخاطب رائٹ آنریبل سر حیدر نواز جنگ بہادر کے والد نذر علی مرحوم کھمبات کے متوطن اور بمبئی کے نامی گرامی تاجر تھے۔ حیدری آپ کا خاندانی لقب ہے۔

سر اکبر کی ولادت نومبر ۱۸۶۹ء میں بمبئی میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنی والدہ اور نانی سے پائی، آپ کی نانی بمبئی کے مشہور جسٹس بدرالدین طیب جی کی حقیقی بہن تھیں۔ بمبئی کے سینٹ زیویر کالج سے سترہ سال کی عمر میں آپ نے بی، اے میں کامیابی حاصل کی۔ اس سے آپ کے تعلیمی شوق، خداداد حافظہ اور غیر معمولی ذہن کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

تعلیم کے بعد سر اکبر گورنمنٹ آف انڈیا کی سلک ملازمت میں داخل ہوگئے اولاً ناگپور کے صیغہ حساب میں ایک افسر کی حیثیت سے مامور تھے (۱۸۸۸ء) اس کے بعد لاہور پھر کلکتہ میں کارگذار رہے اور وہاں سے الہ آباد کی محاسبی میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل کی جگہ پر ترقی ملی الہ آباد سے آپ کا تبادلہ بمبئی میں ہوا، اور پھر بمبئی سے مدراس کی ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرلی پر مامور کئے گئے۔ اسی خدمت سے آپ حیدرآباد میں طلب کئے گئے۔

مدراس کی ملازمت کے زمانے میں آپ ہندوستان و برما کے سرکاری مطابع کی جانچ پڑتال پر مقرر کئے گئے تھے اس کام کو بھی آپ نے نہایت خوبی سے انجام دیا۔

۱۹۰۵ء (۱۳۱۶ف) میں سر اکبر حیدری کا تقرر صدر محاسبی سرکار عالی پر ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر ۴۶ سال کی تھی۔ دو سال کے بعد معتمدی فینانس پر آپ کا تقرر ہوا اور پھر ۱۳۲۳ف (۱۹۱۱ء) میں معتمد عدالت و کوتوالی امور عامہ پر تبادلہ ہوگیا۔ اس خدمت پر ایک طویل زمانے تک مامور رہے۔ کچھ عرصے تک اس خدمت کے ساتھ آپ نے صدر ناظم صنعت و حرفت کا کام بھی انجام دیا۔

۱۳۳۲ف (۱۹۲۰ء) میں سر اکبر سرکار عالی کی ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کرکے بمبئی میں اکاؤنٹنٹ جنرل کی خدمت پر مامور ہوگئے مگر اس کے چند ماہ بعد پھر جولائی ۱۹۲۱ء میں صدر المہام فینانس کی جگہ آپ کا تقرر ہوا اس طرح آپ دوبارہ سرکار عالی کی سلک ملازمت میں شامل ہوگئے۔

صدر المہامی فینانس کے بعد ۲۶ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۶ء) میں سر اکبر صدر اعظم کی جلیل القدر خدمت پر مامور کئے گئے اور تقریباً دو سال سے آپ اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔

جس زمانہ میں سر اکبر حیدرآباد آکر صدر محاسب ہوئے تھے، اس وقت صدر المہامی اور مدار المہامی (صدر اعظم) کے خدمات حیدرآباد کے مخصوص امراء اور جاگیرداروں کے لئے مختص تھے کسی اعلیٰ عہدہ دار کا خواہ وہ معتمد ہی کیوں نہ ہو ترقی پاکر صدر المہام یا صدر اعظم ہوجانا محال تھا اس لئے اس وقت یہ شائبہ نہیں تھا کہ ایک دن سر اکبر صدر اعظم کی جلیل القدر خدمت پر مامور ہو جائیں گے۔

لیکن ایک زمانہ وہ آیا کہ اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع کے تدبر اور دوربین نظر کے باعث قابل اور لائق اشخاص اپنی اعلیٰ قابلیت اور عمدہ لیاقت کے باعث صدر المہام اور صدر اعظمی پر ترقی پانے لگے۔ اس قسم کا سب سے پہلا اعزاز سر فریدون الملک کو حاصل

سر محمد علی امام مؤید الملک

رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم

عہدِ آصفی کے امراء

اس کے قبل عہد آصفی کے مدارالمہاموں اور صدر اعظموں کے حالات اور تصاویر درج کی گئیں۔ اب عہد آصفی کے اُن خاص خاص امراء کے حالات اور تصویریں شامل کی جاتی ہیں جو اپنے کارناموں اور شہرت کی وجہ سے بہت مشہور تھے یا جو نائب حضور سرکے درجہ تک پہنچے تھے۔

نواب درگاہ قلی خاں سالار جنگ

نواب ذوالقدر اصل نام تھا ۱۱۲۲ھ میں بمقام سنگمنیر پیدا ہوئے ان کے والد خواجہ قلی خاں کی پرورش اور حضرت غفران مآب نواب آصفجاہ اوّل کی تربیت سے ان کی فطری قابلیت بہت جلد نمایاں ہوگئی سن رشد کو پہنچنے سے قبل ہی اکثر علوم و فنون میں مہارت حاصل کر لی منکسر المزاجی کے ساتھ طبیعت میں شوخی اور ظرافت بھی تھی۔ فن موسیقی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے ۱۱۵۱ھ میں آصفجاہ بہادر کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا نادرشاہی حملہ کے زمانہ میں اپنے مربی کی حفاظت میں غیر معمولی جاں بازی کا ثبوت دیا جس سے ان کی شجاعت کا ثبوت ملتا ہے۔ دہلی سے واپس ہوکر اپنے سفر کے حالات کا ایک تفصیلی تذکرہ قلمبند کیا جو مرقع دہلی کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے جس میں بارہویں صدی کی دہلی کے معاشرتی، تمدنی، تاریخی اور ادبی حالات نہایت تفصیل سے درج ہیں۔ شاعری سے فطری لگاؤ تھا اکثر فی البدیہہ اشعار کہتے تھے خود مشاعرے منعقد کرتے اور اپنی غزل آپ پڑھتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی افسوس ہے کہ بجز چند مرثیوں کے ان کا اردو فارسی کلام دستیاب نہ ہوسکا چیدہ چیدہ اشعار کہیں کہیں تذکروں میں ملتے ہیں

دکن کے اکثر عہدہائے جلیلہ پر فائز رہنے کے بعد تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں ۱۱۸۰ھ میں ان کا انتقال ہوا اور اپنے خاندانی مقبرہ واقع اورنگ آباد میں مدفون ہوئے۔ نمونۂ کلام حسب ذیل۔

قصیدہ

پڑی ہے آکے گلے ناگہاں بلائے سفر
سفر نہیں ہے سفر بل سقر سے ہے بدتر

غرض کہ سخت مصیبت میں ہیں وضیع و شریف
غنی فقیر سبھی احتیاج میں مضطر

اسی تردد افطار میں لگی تھی غنود
کہ ناگہ خواب میں دیکھا قریب وقت سحر

کھڑا ہے آکے سرہانے پہ پیر نورانی
لطیف عنصر و خوش منظر و خجستہ سیر

(وفات ۱۲۰۵ھ)

ابوالفتح خاں تیغ جنگ کے والد ابوالخیر خاں تھے، سلسلۂ نسب حضرت شیخ فریدالدین شکر گنج سے ملتا ہے۔

ابوالخیر خاں کو دربار خلیفہ (محمد شاہ) سے "خان بہادر" کا خطاب عطا ہوا تھا۔ حضرت آصفجاہ اول کے ہمراہ رکاب دکن آئے۔ آصفجاہ نے دو ہزاری منصب پانچ سو سوار کا اعزاز عطا کیا اور کئی ہزار کی جاگیر ذات مرحمت فرمائی تھی۔

وہ مالک کے بڑے وفادار اور جانثار تھے، چنانچہ جب ناصر جنگ شہید نے باپ کے خلاف صف آرائی کی تو ابوالخیر خاں کو بھی اپنا طرفدار بنانا چاہا، لیکن انھوں نے آصفجاہ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اسی وفاداری کے طفیل میں زمانہ مابعد میں خود ناصر جنگ نے ان کو "شمشیر بہادر" اور صلابت جنگ نے امام جنگ کے خطاب سے عزت افزائی کی۔ برہان پور میں ابوالخیر خاں کا انتقال ۱۱۶۶ھ میں ہوا وہیں مدفون ہوئے۔

تیغ جنگ کی پیدائش برہان پور میں ہوئی، والد کے انتقال کے بعد اپنی جاگیر میں خانہ نشین تھے، نواب صلابت جنگ نے اپنے سفر برہانپور (۱۱۷۱ھ) کے وقت آپ کو بلا کے امیروں میں شامل فرمایا۔ اس کے بعد آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علیخاں نے خاص توجہ مبذول فرمائی اور آپ کے مراتب میں بیشی ہوتی گئی۔ تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء (اول) کے خطابات عطا ہوئے۔ کئی لاکھ کی جاگیر مرحمت ہوئی۔

نواب رکن الدولہ میر موسیٰ خان کے انتقال پر حضرت آصفجاہ نے آپ کو قلمدان دیوانی سے بھی سرفراز کرنا چاہا، مگر آپ نے میدان جنگ کے مقابلہ میدان سیاست کو پسند نہیں فرمایا

پائیگاہ کے آپ ہی بانی ہیں۔ حضرت آصفجاہ ثانی نے کئی لاکھ کی جاگیر فوج کے لئے عطا فرمائی تھی، علاوہ جاگیرات کے نقد رقم بھی اس کے لئے مرحمت ہوتی تھی۔ پائیگاہ کی یہ فوج شاہی محافظ (باڈی گارڈ) کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے سوار بہادر اور دلاور ہوتے اور معقول تنخواہ پاتے تھے۔

تیغ جنگ کے چار رشتہ دار ابدالملک، امیرالملک، امام الملک اور اعظم الملک اس فوج کے اعلیٰ افسر تھے۔ تیغ جنگ کو اپنی فوج کے ساتھ بڑا شغف تھا۔

بحالت سفر پانگل کے مقام پر ۱۲۰۵ھ میں انتقال ہوا۔ لاش کو حیدرآباد لاکر درگاہ برہنہ شاہ میں دفن کیا گیا۔

شمس الامراء (ثالث) امیر کبیر (ثانی) (ولادت ۱۲۲۰ھ وفات ۱۲۹۴ھ)

امیر کبیر ثانی کا نام محمد رفیع الدین خان تھا۔ آپ فخرالدین خان امیر کبیر (اول) کے بڑے فرزند تھے جن کا ذکر وزرائے سلطنت کے سلسلہ میں گزر چکا ہے۔

شوال ۱۲۲۰ھ میں آپ کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی۔ نامور جنگ عمدۃ الدولہ عمدۃ الملک شمس الامراء (ثالث) امیر کبیر (ثانی) کے خطابات آپ کو سرفراز ہوئے تھے۔

نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کے انتقال پر اعلیٰحضرت غفران مکان کی صغر سنی کے باعث آپ نائب حضور کی حیثیت سے سلطنت آصفی کے کاروبار انجام دیتے رہے۔ اسی نائب حضوری کے زمانہ میں آپ کا انتقال ہوا (۱۲۹۴ھ) میں خاندانی مدفن درگاہ حضرت برہنہ شاہ میں دفن کئے گئے۔

آپ کو علوم و فنون خصوصاً ریاضی اور ہیئت سے بڑی دلچسپی تھی۔ ریاضی میں آپ نے چند کتابیں تالیف فرمائی ہیں۔

ابوالفتح خاں تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء

محمد رفیع الدین خان فاروق جنگ عمدۃ الدولہ عمدۃ الملک
شمس الامراء امیر کبیر ثانی

رشید الدین خاں وقار الامرا شمس الامرا امیر کبیر

محی الدین خاں قدم جنگ سرخور تمدد جاہ

دربار آصفی سے مختلف اوقات میں آپ کو حسب ذیل خطابات سے متمیز کیا گیا ۔ ابوالخیر خان، تیغ جنگ، خورشید الدولہ، خورشید الملک، خورشید جاہ، شمس الامرا، امیر کبیر ۔

شمس الامرا اور امیر کبیر کے خطابات آپ پر ختم ہو گئے، پھر کسی کو آج تک یہ خطاب نہیں ملا ۔

سرکار انگریزی میں آپ کے بڑے اعزاز تھے ۔ "سر" کا خطاب ملا تھا اور آپ کی زندگی میں جس قدر وائسرائے ہند حیدرآباد آئے وہ آپ کے یہاں ضرور مدعو ہوتے تھے ۔

سر خورشید جاہ کو اپنے باپ کی طرح میدان سیاست سے بڑی دلچسپی تھی ۔ آپ اپنے زمانہ کے مدبر اور صاحب فراست تھے، کونسل آف اسٹیٹ کی رکنیت پر اعلیٰحضرت غفران مکاں نے آپ کا تقرر فرمایا تھا ۔

علم و فن سے دلچسپی تھی "تاریخ خورشید جاہی" آپ کی سرپرستی میں شائع ہوئی ۔ داد و دہش میں بھی شہرت رکھتے تھے، حجاز ریلوے کی تعمیر کے لئے پچیس ہزار کا چندہ دیا تھا ۔ سیر و سیاحت کا شوق تھا شمالی ہند اور جنوبی ہند کے کئی شہر دیکھے تھے ۔ اپنی فوج کو باقاعدہ مرتب کیا تھا ۔ فوجی وردی اور عمدہ ہتھیار دئے جو پائیگاہ میں اس سے پہلے نہیں تھے، ۱۳۲۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا ۔ درگاہ برہنہ شاہ میں دفن کئے گئے ۔ آپ کو دو صاحبزادے تولد ہوئے، امام جنگ اور ظفر جنگ ۔ آخر الذکر شہزادی حسن النسا بیگم صاحبہ کے بطن سے تھے ۔

مکرم الدولہ میر پرورش علیخاں حسام جنگ

میر پرورش علی خان المخاطب حسام جنگ مکرم الدولہ، آپ کے والد نواب قیصر الدولہ نواب سراج الملک کے داماد تھے اس طرح مکرم الدولہ نواب مختار الملک کے ہمشیرہ زادے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ مکرم الدولہ آپ کے داماد بھی تھے، نور النسا بیگم صاحبہ آپ سے بیاہی گئی تھیں ۔

مکرم الدولہ کی تعلیم مدرسہ دار العلوم میں ہوئی، اس مدرسہ کے افتتاح کے ساتھ ہی آپ نے اس میں شرکت فرمائی تھی، عربی، فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے ۔

نواب مختار الملک نے مجلس مالگذاری قائم کی (۱۲۸۶ھ) تو اس مجلس کا آپ کو میر مجلس بنایا گیا ۔ اس کے بعد جب مجلس برخاست ہو کر صدر المہام مقرر ہوئے تو اس وقت آپ صدر المہام مالگذاری ہوئے ۔

نواب مختار الملک کے سفر یورپ کے زمانہ میں آپ بشیر الدولہ کے ساتھ مل کر مدار المہامی کا کام بھی انجام دیتے رہے، آپ کی قابلیت مسلم تھی، اور عام و خاص میں آپ کی لیاقت کا شہرہ تھا ۔

شادی کے ایک سال بعد (۱۲۹۶ھ) میں آپ خلل دماغ کی وجہ سے خانہ نشین ہو گئے، ۱۳۲۳ھ میں آپ کا انتقال ہوا ۔ دائرۂ میر مومن میں دفن کئے گئے ۔ آپ کو کوئی اولاد نہیں ہوئی ۔

نصیر الدین ہاشمی

سورما

گولکنڈہ کا ایک افسانہ

گولکنڈہ کی زمین ہیروں کی سرزمین ہے۔ یہ بھی آندھرا دیس کی۔ جو کبھی تھی جس کی شاہانہ سج دھج سے اپنے پرائے سب کی آنکھیں چکاچوند ہو جاتی تھیں۔ آج بھی وہاں اُن دنوں کی یاد دلانے والے بہت سے آثار رہ گئے ہیں جنہیں دیکھتے ہوئے ایک دفعہ مجھے محسوس ہوا کہ ان آئینوں میں گزرے زمانہ کی پرچھائیاں اُبھر رہی ہیں جیسے من میں پیاروں کی یاد آئے!

دیکھا کہ کہیں سلطان قلی قطب شاہ ہے۔ بشرے پر علم کا نور۔ ترکستانی وجاہت۔ لوگ اس بادشاہ کے شیدائی ہیں۔ "بڑے ملک" کے نام سے پکارتے ہیں۔ تلنگانہ کا داتا سمجھتے ہیں۔ کہیں ابراہیم قطب شاہ ہے جو تلنگانے تمدن کی داغ بیل ڈال رہا ہے۔ اسکے پیچھے پیچھے محمد قلی قطب شاہ چلا آتا ہے۔ جو فلاح و ترقی کی بلندیوں پر چڑھ رہا ہے۔ اتنے میں سلطان محمد قطب شاہ نظر آیا۔ پاکیزگی حیات کا گہوارہ۔ ساتھ ایک ملکہ ہے۔ حیات بخشی بیگم دکن کی ہیروئن!

یہیں ایک آئینہ میں یہ بھی دیکھا کہ تانا شاہ کا عہد حکومت ہے۔ مغل فوجیں قلعہ کا محاصرہ کئے ہیں۔ آٹھ مہینے ہو چکے۔ مگر قلعہ والے اپنی خودداری نہیں کھوتے۔ جان پر کھیلے بیٹھے ہیں۔ مگر سچ ہے جہاں اچھے ہیں وہاں برے بھی ہیں۔ ان جاں نثاروں میں دو چار گندم نما جو فروش بھی ہیں۔ جنہوں نے دشمنوں سے ساز باز کیا۔ چاہتے ہیں کہ وطن کو بیچ کے تن کو پالیں من کو مار ڈالیں۔ مگر غداری نہیں چھپا کرتی ہوتے ہوتے اس کی خبر دکن کے جانباز عبدالرزاق لاری کو بھی ہوئی۔ وہ بھلا اس نمک حرامی کو کیسے برداشت کرتا۔ اسی وقت ان بدشگونوں کو تہ تیغ کردیا اور حکم دیا کہ ان کے لاشے برج کی کنگنی پہ لٹکا دو تاکہ غداروں کی موت سے عبرت زندہ ہو!

یہ جیسے دن کا قصہ ہے۔ رات ہوئی۔ جو بڑی تاریک تھی۔ اس وقت سپاہی پہرہ دے رہے ہیں۔ کچھ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں کہ دس بجے۔ گیارہ بجے۔ بارہ بج گئے۔ سپاہی کو سپاہیوں کی سی باتیں سوجھتی ہیں۔ باتوں باتوں میں ایک نے کہا: چلو بدخواہوں کے لاشے دیکھیں؟ کہتے ہیں: رات کے بارہ بجے فرشتے انہیں آتشیں گرز مارتے ہیں!

دوسرا:- جانا ہے تو ایک ایک جاؤ۔ اور دیکھ آؤ۔ سب کا اک کے جانا ٹھیک نہیں۔ تم جانتے ہو: یہ وقت سردارانِ کے بھیس بدل کے نکلنے کا ہے۔ ہو کہ وہ ہمیں یوں جاتا دیکھ لے۔ اور کچھ اور سمجھے۔

تیسرا:- ٹھیک ہے۔ ویسے بھی مرد ہو۔ تو مرد بنو۔ ڈر کو کچل ڈالو۔

چوتھا:- جی۔ یہ لن ترانی رہنے دو۔ رات کے اس اندھیرے میں اکیلا کوئی نہیں جا سکتا۔

تیسرا:- کیا؟؟

دوسرا:- دیکھو بھئی، ہم یہ دو نہیں جانتے۔ کچھ نہ کچھ ہو جائے۔ اور یہاں کوئی نہیں پہچانتا نہیں۔ دس ہی روپے دلواؤ۔ ہم جاتے ہیں۔

چوتھا : اچھا ، ہوگئی مگر ہماری بھی ایک شرط ہے ۔ وہ سامنے مہندی کی باڑ ہے ۔ اس کی پتیاں توڑ لو ۔ وہاں جا کے نہیں پیسو ۔ اور ہر ایک مردے کی چھنگلی پر مہندی لگا دو تب بات ہے ۔ دور سے جھانکنے کی سند نہیں ۔ پھر ہم جا کے دیکھیں گے ۔

دوسرا : منظور !

اُدھر یہ باتیں ہو رہی تھیں ۔ اُدھر لاری بھیس بدل کر چھپا چھپا فوج کی موجودات لینے نکلا ۔ یہاں پہنچا تو بدخواہوں کا ذکر سنا خیال ہوا کہ کہیں غداری کی وبا عام تو نہیں ہوگئی ۔ اس لئے ٹھٹک گیا ۔ اور ایک درخت کی آڑ سے سارا ماجرا سن لیا تو اطمینان ہوا ۔

جس سورما نے شرط مانی تھی اوس نے تلوار حمائل کی پیش قبض سجایا ۔ اور چلا ۔ چل پے چل اس گمبھیر جھاڑی میں پہنچا ۔ جہاں لاشے تھے ۔ وہاں اندھیرے کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا ۔ بے شمار جھینگر بول رہے تھے ۔ کبھی گیدڑ بولتے تو یہ سمجھتا کہ کوئی اس کی دلیری پر واہ واہ کر رہا ہے ۔ ترس بولتا تو خیال ہوتا کہ کوئی اس کی کامیابی پر ہنس رہا ہے ۔ اور شیر ڈکارتا تو سوچتا کہ کہیں ڈرپوک سمجھ کے سردار لاری تو نہیں گھرک رہا !

خیر وہاں پہلے پتیاں رگڑیں ۔ مہندی تیار کی ۔ پھر لاشوں کے پاس آکے ایک مردے کی چھنگلی پر لگائی ۔ دوسرے کے لگا رہا تھا کہ تیسرے لاشے نے حرکت کی ۔ سورما نے غور سے دیکھا ۔ اور خاموش ہوگیا ۔ دوسری دفعہ لاشہ نے حرکت کی تو سورما نے جھڑک کے کہا : ٹھیر جا ! تیسری دفعہ لاشے نے ہاتھ پھیلا دیا ۔ سورما کو یہ بے صبری بڑی معلوم ہوئی ۔ جھٹ پیش قبض نکالا ۔ اور لاشے کے ہاتھ کو زمین پر رکھ کے اسکی ہتھیلی میں پیش قبض اتار دیا ۔ اس کے بعد مہندی بھی لگا دی ۔ اور پیش قبض لگا کر چلتا ہوا ۔ سورما کی بے جگری کا یہ وہ کارنامہ تھا جسے اسوقت آسمان کی لے گنتی آنکھیں دیکھ رہی تھیں !

وہاں سے پلٹا تو کچھ دور پر رستہ میں ایک شخص چادر اوڑھے نظر آیا ۔ جیسے سورما نے ٹوکا ۔ ساتھ ہی تلوار کا وار بھی کیا ۔ مگر اجنبی نے پینترا کاٹ کے وار خالی دیا ۔ اور جلدی سے سورما کو گلے لگاتے ہوئے اوس کا نام لیکر پکارا ۔

سورما نے آواز پہچان کر کہا : ہائیں ؟ !

اجنبی :- ہاں :

سورما :- میں صرف مہندی

اجنبی :- تم سرخرو ہوئے !

سورما :- کیسے ؟

اجنبی :- میں وہیں تھا ۔ تمہارے پہنچتے پہنچتے رستہ کاٹ کے وہاں آن پہنچا ۔ ایک لاشے کو ہٹا کے اسکی جگہ لیٹ گیا کہ دیکھوں تم میں کتنا حوصلہ ہے ؟ !

یہ کہہ کر اجنبی نے چادر سے ہاتھ نکال کے دکھایا ۔ خون بہہ رہا تھا ۔ اسی ہاتھ میں سورما نے پیش قبض اتار دیا تھا ۔ یہ جانباز لاری کا ہاتھ تھا ۔ جو مرنے مرتے بھی کہہ گیا کہ :- "تا جان دارم نثار ابوالحسن نخواہم نمود !!"

سید وزیر حسن (عثمانیہ)

اورنگ آباد

(سترہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے آخری کار فرما شہنشاہ اور دکن کی سب سے عظیم الشان سلطنت کا صدر مقام)

کچھ بلبلوں کو یاد ہے کچھ قمریوں کو حفظ
عالم میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ جس بڑے دیار کی سرگزشت میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں وہ سوا دو سو سال پہلے اتنا بڑا شہر تھا جیسا اب کلکتہ ہے۔ اس کی آبادی پندرہ لاکھ بیان کی جاتی تھی۔

اورنگ آباد کی بنیاد اور اس کے عروج و زوال کی داستان کو آپ کے سامنے بیان کرنا دراصل ہندوستان کی اس دور کی تاریخ کو دہرانا ہے۔ میں آپ کو اتنی دور نہیں لے جاؤں گا لیکن مختصراً چند دو ایک واقعات کا ذکر کروں گا۔

دہلی خلجیوں کے زیر تسلط تھی۔ جلال الدین سریر آرا تھا۔ اس کے بھتیجے کے سر میں بادشاہت کا سودا سمایا لیکن خوب جانتا تھا کہ روپیہ کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ اس زمانے میں سلطنت دیوگڑھی (دولت آباد) کی دولت ضرب المثل ہو گئی تھی۔ علاء الدین نے اپنے چچا کی رضامندی حاصل کیے بغیر سپاہیوں کا ایک مختصر سا دستہ لیا اور جنوب کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں کے راجہ کو ہرا کر مطیع کیا اور بہت کچھ مال غنیمت حاصل کیا۔

خلجیوں نے اپنے انقطاع سے قبل دیوگڑھی کو فتح کر لیا تھا اور اس کا نام دولت آباد رکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں کے راجہ ہرپال کی زندہ کھال اتاری گئی۔ اس میں گھاس بھری گئی اور اس کو قلعے کے دروازے پر نصب کیا گیا۔

واقعات بدلے۔ خلجیوں کی جگہ تغلق بادشاہ برسر اقتدار ہوئے۔ شاندار دیوانہ محمد شاہ تغلق کی خواہش تھی کہ دارالحکومت کا صدر مقام دہلی سے دولت آباد منتقل کیا جائے۔ رعایا کو چالیس روز میں دولت آباد پہنچنے کا حکم دیا۔ رعایا اس سفر پر روانہ ہوئی۔ دولت آباد سلطنت کا صدر مقام تو ہرگز نہ بن سکا بلکہ بادشاہان دہلی کے تلون نے جنوب کے امراء کو اپنے آقا کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیا اور ظفر بہمنی بادشاہوں کے ہاتھوں ایک خود مختار حکومت کی بنیاد پڑی۔

جنوب میں وجیانگر کی طاقتور سلطنت بھی تھی۔ بہمنی بادشاہ اس سلطنت کے ساتھ برابر جنگ آزمائی کرتے رہے۔ بہمنی سلطنت کا انتشار عمل میں آیا اور پانچ مختلف ریاستیں قائم ہو گئیں۔ بیجاپور۔ بیدر۔ برار۔ گولکنڈہ اور احمد نگر۔

ادھر بہمنی سلطنت پانچ حصوں پر تقسیم ہو گئی۔ تو ادھر وجیانگر کی سلطنت میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا جس سے فائدہ اٹھا کر ان نو بنیاد ریاستوں نے باہمی اتحاد کیا پانچویں یعنی برار شریک نہ تھی۔ چاروں نے مل کر ۱۵۶۵ء میں تالی کوٹ کی جنگ لی جس نے وجیانگر کی عظیم الشان سلطنت کو ہندوستان کی سیاسیات کے صفحے سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔

شکست خوردہ سلطنت کی تقسیم کے بارے میں نزاع پیدا ہوئی۔ ان کی آپس کی حاسدانہ کارستانیوں نے اکبر اعظم کو جو اس وقت دہلی میں فرمان روائی کر رہا تھا ابھارا۔ اس کی دیرینہ آرزو تھی کہ نربدا کے جنوبی علاقے کو زیر نگیں کیا جائے۔ خاندیش کے صدر مقام اور دکن کے دروازے

برہان پور پر اس نے ۱۵۹۶ء میں قبضہ جمالیا۔ اس کے بعد سلطنت احمد نگر پر اس کے جغرافی محل وقوع پر نظر کر کے حملہ ہوا۔ چاند بی بی نے زور دار دلیرانہ مدافعت کی۔ وہ جواں مردی سے لڑی لیکن اپنے ایک امیر کے ہاتھوں قتل ہوگئی اور میڈوز ٹیلر کے مشہور رومان کی ہیروئن بنی۔

چاند سلطانہ ہمارے ضلع کے بعض دیہات میں اب تک عزت و احترام سے یاد کی جاتی ہے۔ ایک اہم واقعہ کی یادگار چیکل ٹھانے میں اب تک موجود ہے جو شہر اورنگ آباد سے چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس موضع میں ہر سال اس شریف ملکہ کے اعزاز میں دسہرے کے موقع پر سب سے پہلے ایک جھنڈا بلند کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسری رسمیں ادا ہوتی ہیں۔ اس کو دلفریب حسن و جمال کی دیوی کہتے ہیں کرامات اس سے منسوب کی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ جالنہ سے احمد نگر جا رہی تھی تو اثنائے راہ میں چیکل ٹھانے سے متصل خیمہ زن ہوئی۔ علی الصبح وہ وہاں سے یکایک غائب ہوگئی اور احمد نگر میں پائی گئی۔ اس موضع کے قریب کی جگہ جو اس کی فرودگاہ تھی اب تک "سنگار باڑی" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ نام بھی اس کی دلفریبیوں کی طرف ایک نازک اشارہ ہے۔

چاند بی بی کے قتل کے بعد اکبر نے اپنا اقتدار احمد نگر میں نافذ کر دیا لیکن مدبر اور سخت کوش وزیر ملک عنبر نے شکست نصیب خاندان کو مرتضیٰ کی بادشاہی کا اعلان کر کے از سر نو زندہ کیا اور خود وزیر اور نائب بنا۔

مرتضیٰ کی تاج پوشی کی رسم ملک عنبر نے پرینڈہ (ضلع عثمان آباد) میں ادا کی لیکن وہ دولت آباد واپس آیا اور تقریباً ۱۶۱۰ء میں شہر اورنگ آباد کی بنیاد ڈالی۔ دس سال کے عرصے میں یہ نیا پایہ تخت ایک آباد اور بارونق شہر بن گیا۔ گزیٹر کے بیان کے مطابق اس شہر کی آبادی ملک عنبر کے عروج کے زمانہ میں دو لاکھ کے قریب تھی۔

میں ان اسباب کا ٹھیک کھوج نہ لگا سکا اور نہ کسی تاریخ یا وقائع سے اس پر روشنی پڑتی ہے کہ ملک عنبر نے یہ جگہ کیوں انتخاب کی۔ حالانکہ یہ جگہ دولت آباد کے مقابلے میں کچھ محفوظ نہ تھی۔ دولت آباد اس کے قبضہ میں تھا۔ وہ دلگزار ہو رہا تھا۔ اور خود بڑا فوجی صدر مقام تھا۔ موجودہ اورنگ آباد شہر بہت ہی ناہموار جگہ پر آباد ہے اور اس کا بہت بڑا حصہ نشیب میں ہے۔

قرین قیاس یہ ہے کہ ملک عنبر چاہتا تھا کہ وہ بیجاپور کی شان اور وجیانگر کے ویران شہر کی قدیم عظمت کے مقابلہ کا ایک شہر آباد کرے۔ گو وجیانگر ہندوستان کے نقشے سے محو ہو چکا تھا لیکن لوگوں کے دلوں میں اس کی یاد تازہ تھی۔

وافر مقدار میں آب رسانی کیلئے اس جگہ کا جغرافی محل وقوع بہت موزوں تھا اس کے شمال میں لاکن واڑا کا پہاڑی سلسلہ ہے اور جنوب میں ستارا کی پہاڑیاں۔ دونوں کے درمیان دس میل کی وادی ہے جس میں ایک دھارا بہتی ہے جسکو کھام ندی کہتے ہیں۔ یہ جگہ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے اس جدت آمیز طریقہ آب رسانی کے لئے بہت موزوں ثابت ہوئی جس نے اپنے بانی کے نام کو زندہ دائم کر دیا۔

میں ملک عنبر کے گوناگون کارناموں سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میں صرف اس کے ان کارناموں کا مختصراً ذکر کروں گا جو اس نے اس شہر میں انجام دیئے ہیں۔ اس نے نوکھنڈہ محل تعمیر کرایا جو اس وقت ویران ہے اس میں پانچ زنانہ عمارتیں ایک دیوان عام۔ ایک دیوان خاص اور ایک مسجد تھی۔ اور اس کے ساتھ کئی باغ، حوض اور حمام بھی تھے۔

جامع مسجد اس کی زندگی میں مکمل ہوگئی تھی۔ اس کے پچاس کثیر الاضلاع ستون ہیں۔

چار میناروں کی بلندی بھی ہے جو چبوترے کے چاروں زاویوں پر واقع ہیں۔ قبر مربع ہے اور ایک بلند نجیلی محراب رکھتی ہے۔ اوپر چار مینار ہیں۔ ان چاروں میناروں کے متوازی چھوٹے چھوٹے گنبد کونوں پر ہیں۔ مرمریں جالی کے دریچے آگرہ کے دریچوں کی طرح نازک ہیں۔ آخر میں خوشنما سفید ابرقی مسالے کا ہاتھ پھیر گیا ہے۔

۱۶۸۲ء میں شہر پر دھاوا کرنے کے لئے مرہٹے ستارا کی پہاڑیوں کے قرب و جوار میں جمع ہوئے لیکن مغلوں کے ایک عظیم الشان لشکر کی آمد سن کر فرار ہو گئے۔ اس کے بعد کے سنین میں شہنشاہ عالمگیر کے حکم سے شہر پناہ تعمیر ہوئی جس کے ہر رخ پر ایک دروازہ تھا۔ شمالی رخ پر دہلی دروازہ تھا۔ اس زمانہ میں جنوب کے تمام مشہور شہروں میں اس نام کا اور اسی رخ پر ایک دروازہ تھا حتیٰ کہ پونہ میں پیشوا کے محل کے دروازہ کا نام بھی دہلی دروازہ تھا۔

۱۶۹۲ء میں اورنگ زیب نے قلعہ ارک تعمیر کرایا۔ ارک کے معنی ترکی زبان میں قلعے کے ہیں۔ ارک میں اب مسجد قابل دید ہے۔ ہندوستان میں خوشنما ترین مناظر میں پن چکی ہے جس پر دکن اور اورنگ آباد کو فخر ہو سکتا ہے۔ یہاں شہنشاہ اورنگ زیب کے مرشد بابا شاہ مسافر آسودہ ہیں مسٹر گلیڈسٹن سالمن اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

"میں اس کو ان دلفریب باغوں میں شمار کرتا ہوں جو میں نے مشرق میں دیکھے ہیں۔ متقابلۃً چھوٹی سی جگہ میں وہ اپنے مکمل خاکے کی پوری دلکشی رکھتا ہے۔ اس سے ملحق چند نہایت دلچسپ تاریخی اور مقدس عمارتیں بھی ہیں۔ اس کے حوض اپنی ترتیب کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔ حوض کے قریب جو شاندار ہال ہے وہ میرے دیکھے ہوئے ہندوستانی باغوں میں بے نظیر ہے۔ وہ پھول پتیوں سے ڈھکی ہوئی چھوٹی سی نشست گاہ جو مسجد کی طرف سب سے چھوٹے حوض کے قریب واقع ہے ایک حسن کار کے نقطۂ نظر سے مکمل ہے۔"

روضہ باغ۔ اس میں اورنگ زیب کے ایک استاد اسمٰعیل خان آسودہ ہیں۔ آج کل کوتوالی بنگلہ بنا ہوا ہے۔

اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء میں ہوئی اس کے لڑکوں میں جنگ چھڑ گئی ۱۷۱۳ء میں نظام الملک حیدرآباد کے موجودہ حکمران خاندان کے بانی دکن کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ ۱۷۲۳ء میں وہ آصف جاہ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ دہلی کی سازشوں سے وہ اس قدر بیزار ہو گئے تھے کہ انھوں نے دہلی سے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور ۱۷۶۳ء میں اپنا پایہ تخت حیدرآباد منتقل کر دیا۔

وہ خاص اور قابل ذکر عمارتیں جو عالمگیر کی وفات کے بعد اور آصف جاہ کے زیر نگرانی تعمیر ہوئیں حسب ذیل ہیں۔

مسجد شاہ گنج جو ۱۷۲۰ء میں تعمیر ہوئی۔

بارہ دری عیوض خاں۔ عیوض خان آصف جاہ کی غیر حاضری میں نیابت کی خدمت انجام دیتے تھے۔ یہ بارہ دری انھوں نے تعمیر کرائی۔ اس سے متصل دمڑی محل تعمیر ہوا۔ یہ عمارتیں مزدوروں کی اجرت سے دمڑی دمڑی بچا کر بنائی گئی تھیں۔ بارہ دری میں آج کل صوبہ داری اور اوّل تعلقداری کے دفاتر ہیں۔

یہ شہر اپنے عروج کے زمانے میں تین میل شمال میں کھام ندی تک اور مشرق میں چھ میل جنگل تھانے تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی آبادی عام طور پر ۵ لاکھ سمجھی جاتی تھی لیکن اس وقت جب کہ شہنشاہ اس کا دربار زمانۂ دکن اور دیو الکراہ اس کے عہدہ دار اور راجگان مع اپنے متعلقین کے یہاں قیام پذیر تھے تو کہا جاتا ہے کہ اس کی آبادی دس لاکھ کے قریب تھی۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ مغلوں کی وسیع و عریض سلطنت کی آمدنی اورنگ آباد پر صرف ہوتی تھی لیکن آج یہ اپنی عظمتِ رفتہ کی ایک مٹی ہوئی یادگار ہے۔

جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے اس شہر پر تین شاندار دور گزرے ہیں۔ آصف جاہ نے اپنا زیادہ وقت صوبہ داری میں صرف نہیں کیا بلکہ وہ زیادہ تر دہلی میں رہے۔ عہد عالمگیر میں یہ شہر خاص طور پر فوجی اور سیاسی مرکز بنا رہا۔ اس کی حقیقی عظمت و شان کا دور اس کے بانی ملک عنبر کے عہد میں گزرا ہے اس وقت وہ علوم و فنون کا مرکز تھا۔ مختلف طبقوں کے لوگ یہاں امن و اطمینان سے ایک دوسرے کے دوش بدوش رہتے تھے۔ اس نے گرجا تعمیر کیا، مسجد بنائی، پنڈت محل تعمیر کرایا، گوردوارہ بنوایا اور صاف ظاہر ہے کہ [illegible] روایات کو برقرار رکھنے کے لئے کیا گیا۔

شہر اورنگ آباد اپنے اندر رواداری مساوات امن اور آزادی کی بہت خوشگوار روایات رکھتا ہے۔ اس مضمون کے اختتام پر میں اس عظیم الشان شہر کے کھنڈروں کی طرف سے ایک پیغام سنانے کی جرأت کرتا ہوں۔ وہ پیغام کیا ہے۔ ذات پات اور مذہب کے امتیازات کو مٹانا۔ شہر کی بہبودی کی خاطر اور اس کی روایات کے شایانِ شان ترقی کرنے کی طرف بڑھنے کیلئے ایک دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھانا ہے۔

تمام مذہب کی ایک ہی تعلیم ہے۔ ہر مذہب کی یہی تعلیم ہے کہ اس دنیا میں بنی آدم کے ساتھ کچھ نیکی کی جائے۔ عمر خیام کی ایک معنی خیز رباعی پر اس شہر کے بانی ملک عنبر کے احساسات کے لحاظ سے میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

در صومعہ و مدرسہ و دیر و کنشت — ترسندۂ دوزخ است و جویائے بہشت
آں کس کہ ز اسرارِ خدا باخبر است — زیں تخم در اندرونِ دل ہیچ نہ کشت

غلام احمد خاں
(صوبہ دار)

"اس میں تاریخ اور افسانے اور واقعات اور تخیل کو اس خوبی سے سمویا ہے کہ قطب شاہی دور کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ بڑی بڑی تاریخوں سے وہ معلومات حاصل نہیں ہو سکتیں جو اس چھوٹی سی کتاب میں ہیں اور نہ وہ کیفیت ہے جو اس میں ہے۔ اس وقت کی معاشرت کا رنگ بھی اس میں نظر آتا ہے اس زمانے کے بعض بادشاہوں، شہزادوں، مشاہیر کی تصویریں بھی ہیں جس سے کتاب کی دلکشی بڑھ گئی ہے۔" یہ گولکنڈہ کے متعلق مولانا عبدالحق صاحب بابائے اردو انجمن ترقی اردو کی رائے ہے۔ یہ کتاب صرف [illegible] میں سب رس کتاب گھر یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہے۔

خواتینِ دکن کی اردو خدمات

مندرجہ بالا عنوان پر ہماری ایک کتاب زیرِ ترتیب ہے، بڑا حصہ مکمل ہوگیا ہے، اس لئے ابتدائی اوراق "سب رس" کے ناظرین اور ناظرات کے ضیافتِ طبع کے لئے پیش ہیں، امید ہے کہ موجبِ دلچسپی ہونگے۔

ہاشمی

دکن میں اُردو زبان کی ترویج ساتویں صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) میں ہوچکی تھی، اس کے بعد وہ بہت جلد بول چال کے درجہ سے گزر کر تحریری صورت میں بھی آگئی، پھر اس نے ترقی کے مدارج مسلسل طے کئے۔ تاآنکہ آج جامعۂ عثمانیہ کے ذریعہ اس کا معراج ہو رہا ہے۔

دکن میں اردو کی ابتدائی اور اسکی ترقی کا مفصل تذکرہ "دکن میں اردو" کی تیسری اشاعت اور "مدراس میں اردو" میں قلمبند کردیا گیا ہے، اگرچہ "دکن میں اردو" کے چند صفحات پر خواتین کا تذکرہ بھی آیا ہے، لیکن اردو کی ترقی میں خواتینِ دکن نے جو حصہ لیا ہے، اس کا کوئی مفصل تذکرہ ابھی قلمبند نہیں ہوا ہے، اس مختصر سی کتاب کا مقصد یہ ہے کہ بعض ان خواتینِ دکن کے کارناموں کی وضاحت یکجا، جنھوں نے "ہندوستانی" کی ترقی میں حصہ لیا ہے۔

"ہندوستانی" کی ترقی کے لئے دکنی خواتین نے جو خدمت گزاری کی ہے، اسکی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں:-

(۱) مولفین اور شعرائے اردو کی سرپرستی وغیرہ

(۲) شعرگوئی (۳) نثرنگاری و انشاپردازی (۴) خطابت (۵) صحافت اور انجمنوں کے ذریعہ اردو کی خدمت گزاری۔

ان ہی عنوانوں کے تحت صفحاتِ آیندہ میں خواتینِ دکن کی خدمات کا تذکرہ کیا جائیگا۔

مولفین اور شعرائے اردو کی سرپرستی وغیرہ

خواتین کا مولفین اور شعرا کی سرپرستی کرنا، اور ان کے خدمات کا صلہ دیکر قدردانی و ہمت افزائی کرنا، درحقیقت زبان کی خدمت گزاری میں داخل ہے، دنیا میں ہر جگہ ایسا ہوتا ہے، اور علما، شعرا فکرِ معاش سے مستغنی ہوکر علمی خدمت میں منہمک اور مصروف ہوجاتے ہیں۔

خواتینِ دکن نے بھی اردو مصنفین اور شعرا کی قدردانی کی ہے، اور اپنی سرپرستی سے نظم اور نثر میں کتابیں مرتب کرائی ہیں، اس خصوص میں ہم سب سے پہلے عادل شاہی ملکہ خدیجہ سلطان شہربانو کا نام پیش کرتے ہیں، جو سلطان قلی قطب شاہ کی پوتی، سلطان محمد کی برادرزادی، سلطان عبداللہ کی بہن تھی، اور سلطان محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۹ھ) سے بیاہی گئی تھی۔ اس کے دربار میں کئی نامور شعرا کو بار حاصل تھا، ان میں ملک خوشنود اور رستمی جیسے استادان سرآمد بھی شامل تھے، ملکہ کی سرپرستی سے ملک خوشنود نے کئی مثنویاں لکھیں، جن میں ہشت بہشت اور یوسف زلیخا قابلِ تذکرہ ہیں، رستمی کے دکنی رزمیہ مثنوی کا شتہ کا خاوندنامہ

قلمبند کیا۔ اس کی وجہ سے کلام اس وقت تک باقی رہیگا جب تک کہ یہ مثنوی باقی ہے۔ سالار نسہ بانو کی علمی فیاضی کا تذکرہ خیابان سوانح میں تفصیل سے کیا جاچکا ہے۔ اس لئے یہاں مختصر کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں دوسرا نام ماہ لقا بائی چندا کا پیش ہو سکتا ہے' اس کی علمی قدردانی شعرا مصنفین اور مورخین کے لئے بہت بڑی مسرت افزائی کا باعث تھی' چندا کا مفصل تذکرہ آگے آتا ہے۔

نور النساء بیگم مرحومہ بنت نواب مختار الملک اول کا نام نامی اس سلسلہ میں لانا ضروری ہے جن کی تعلیمی دلچسپی اور نسوانی ہمدردی کے باعث تذکرۂ جمیل ان کے اسم گرامی پر معنون ہوا ہے' اور ان کی سرپرستی میں اس کی اشاعت ہوئی ہے۔

موجودہ دور میں۔ اس ذیل میں شہزادی ہر ہائینس درشہوار دردانہ بیگم صاحبہ اور شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ کا اسم گرامی پیش کیا جاسکتا ہے جن کے اسمائے گرامی پر کئی کتابیں معنون ہوئی ہیں' مثلاً ہر ہائینس کے اسم گرامی پر راقم کی کتاب "خواتین عہد عثمانی" اور جہاں بانو بیگم نقوی کی پرواز خیال' اور شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ کے اسم گرامی پر بسمل صاحب کی تصنیف "صنف نازک" اور راقم کی خیابان نسواں کو معنون ہونے کا امتیاز حاصل ہے'

اس عنوان میں صغرا بیگم ہمایون مرزا کا نام بھی پیش ہو سکتا ہے' جو عموماً اپنی علمی ہمدردی اور عمدہ صلاحیتوں کی بدولت ہمیشہ سے [illegible] اردو کے معاونین کے زمرہ میں شامل کیجاتی ہیں۔

شعرگوئی اور نثر نگاری

اب ہم خواتین دکن کی شاعری اور نثر نگاری کی تفصیل بیان کرنے میں [illegible] صدی کے خواتین کی ادبی خدمتوں کا تذکرہ کرسکے۔ اول تو اس لئے کہ پردہ کے باعث خواتین کے علمی کارنامے بھی پردۂ خفا میں رکھے گئے' اور آج بھی بعض گھرانوں میں اسی پر عمل ہے'

دوسرے یہ کہ زمانہ گزشتہ میں عام طور سے تعلیم نسواں کا رواج نہیں تھا۔ اور تعلیمی سہولتیں حاصل نہیں تھیں' اس لئے خواتین نے کچھ کام بھی کیا تو وہ پوشیدہ رہا۔

گو یہ صحیح ہے کہ بعض خاندانوں میں عورتوں کی تعلیم کا رواج تھا' مگر ان میں بھی زیادہ تر ابتدائی اور معمولی مذہبی تعلیم ہوتی تھی' عربی اور فارسی تعلیم حاصل کرنا سب کا کام نہیں تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہم کو گزشتہ صدیوں کے "اردو" خدمات کی تفصیل بیان کرنی دشوار ہے' جو کچھ صراحت اس موضوع کے تحت کی جاسکتی ہے وہ زیادہ تر چودھویں صدی ہجری سے متعلق ہوگی۔

چودھویں صدی ہجری کے قبل ہم جن شاعر خواتین کا تذکرہ کرسکتے ہیں وہ صرف چندا' شرف النساء' اور فاطمہ ہیں۔

چندا۔

مہ لقا بائی چندا' ایک ماہر فن موسیقی اور شاہی طوائف تھی' مگر آج کل کے پیشہ ور طوائفین سے اس کی ذات [illegible]

۱؎ مولف کی دوسری تالیف جو حسنات بک ڈپو دہلی سے شایع ہوئی ہے۔

جداگانہ تھی۔ اس کی علمی قابلیت اور شعرا و مصنفین کی قدردانی کے باعث آج تک اس کا نام زندہ ہے۔

۱۱۸۱ھ میں تولد ہوئی اور ۱۲۳۶ھ میں اس کا انتقال ہوا، حیدرآباد میں کوہ مولا کے قریب مدفون ہے۔

وہ صاحب منصب و جاگیر تھی، اس لحاظ سے بلند پایہ اور اعلیٰ حیثیت رکھتی تھی، اس کے موسیقی کے جلسوں میں ارسطو جاہ و میر عالم اور اُمرائے حیدرآباد آصفی سلطنت کے اصحاب شریک ہوتے تھے، اور میر عالم نے تو ایک مثنوی اس کی مدح میں لکھی ہے، چندا کے پاس صرف پہرہ کے لئے پانچ سو پیادے ملازم تھے، اس سے اس کی دولت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ ایک باکمال ماہر موسیقی ہونے کے علاوہ وہ ایک نازک خیال اور بلند پرواز شاعرہ بھی تھی، اس کا دیوان ۱۲۱۳ھ میں ارسطو جاہ کے حکم سے مرتب ہوا ہے جس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، جو سرجان ملکم کو بطور تحفہ دیا گیا تھا۔

وہ شاعری کے ساتھ شعرا کی قدردان بھی تھی، اس کے پاس ہمیشہ شعر و شاعری کی گرم بازاری رہا کرتی، شعرا کی ہمت افزائی بندھانا اور صلہ افزائی بھی اس کا معمول تھا

چندا کو موسیقی، شاعری کے ساتھ تاریخ سے بھی شغف تھا، اسکی سرپرستی سے ایک تاریخ "دل افروز" کے نام سے لکھی گئی ہے، جو دکن کی معتبر تاریخوں میں شمار ہوسکتی ہے۔

بہرحال چندا نے نہ صرف اپنی شاعری کے ذریعہ بلکہ شعرا و مصنفین کی سرپرستی کرکے بھی اردو زبان کی خدمت گزاری میں حصہ لیا ہے چندا کو شیر محمد خان ایمان سے تلمذ تھا۔

موضع "اڈیکمیٹ" اسی کی جاگیر میں تھا، جہاں آج جامعۂ عثمانیہ کی پرشوکت اور شاندار عمارت تیار ہو رہی ہے،

چندا کا دیوان کوئی ضخیم دیوان نہیں ہے، اسکے کلام میں پاکیزگی اور لطافت کے ساتھ شعریت اور موسیقی بھی ہے جسکی وجہ سے دل آویزی پیدا ہوگئی ہے، مبتذل جذبات اور عامیانہ خیالات سے بھی اسکی شاعری پاک ہے، اس سے بھی اس کے بہترین اخلاق کا پتہ چلتا ہے،

"حیات ماہ لقا بائی" کے نام سے اس کی ایک سوانح عمری بھی غلام صمدانی خاں گوہر نے شائع کی ہے، یورپ میں دکنی مخطوطات" "دکن میں اردو" اور "مرقع سخن" جلد اول میں اس کے حالات موجود ہیں،

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح اس کی جاگیر "اڈیکمیٹ" تعلیمی مرکز بن رہا ہے اسی طرح اسکی پروردہ لڑکی "حسن لقا بائی" کا باغ بھی زنانی مدرسہ[1] کے لئے منتخب ہوا ہے۔

چندا کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

قتل پر کس کے آج ہوتی ہے — توسن حسن پر سوار شتاب

کب تک رہوں حجاب میں محروم وصل سے — جی میں ہے کیجے پیار سے بوس و کنار خوب

---

[1] نام پلی ہائی اسکول۔

محشر میں تو ظلم نہ لٹنے والی ہے فاطمہ — پھر جادہ بات کو چلاویں گے فاطمہ

کر فضل ہو ان اس کو چھڑاویں گے فاطمہ — مظلوم فاطمہ کے حسین علی گئے (از بیاض کتب خانہ مولوی صفی الدین مرحوم)

افسوس ہے کہ تیرھویں صدی ہجری کے دیگر کسی شاعر خاتون کا تعارف کرانے سے ہم بوجہ عدم دستیاب معذور ہیں۔ ممکن ہے کبھی اس میں اضافہ ہو سکے۔

اس کے بعد چودھویں صدی کے شعراء زیادہ تر ان خواتین کا تذکرہ کیا جائیگا جو ہو... کے تذکرہ ان کی تقسیم کی گئی ہے، دور محبوبی، دور عثمانی کے تحت ان کو متعارف کیا گیا ہے فقط

نصیر الدین ہاشمی

اورنگ زیب اور تاناشاہ

"اچھا تو نماز ہو رہی ہے!"

تاناشاہ نے کہا اور ساتھ ہی اس کا چہرہ غصے سے تمتما گیا۔

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ مغل ہمارے نشانہ بازوں کی اتنی تحقیر کریں گے! قلعہ کے اس قدر قریب اور ہمارے تیر و تفنگ کی زد میں کھڑے ہو کر نماز جماعت ادا کرنا مصلحت اور دور اندیشی سے تو یقیناً بعید ہے!! کیا اورنگ زیب جیسا دور اندیش اور ہوشیار بادشاہ بھی غلطی کر سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں یا یہ کہ یہی مجھے دیکھنا ہے کوئی ہمارا اچھا نشانہ باز؟"

اورنگ زیب کئی مہینوں سے گولکنڈہ کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ مغل فوجیں چاروں طرف سے ایک مہیب سمندر کی پرجوش موجوں کی طرح قلعہ کی فصیلوں سے آ کر ٹکراتی ہیں اور ہر دفعہ دکنی سپاہی پہاڑوں کی چٹانیں بن کر انہیں پیچھے ہٹا دیتے ہیں۔ اس وقت آفتاب کی تمازت میں خاصی کمی ہو گئی ہے اور خفیف خنکی پیدا ہو رہی ہے۔ ساتھ حملوں پر حملے کئے جا رہا ہے۔ ان صفوں کے ذرا پیچھے دو تین ہموار قطاریں نظر آتی ہیں کیونکہ اورنگ زیب اور اس کے کئی ایک مصاحب بھی نماز کیلئے صف بستہ کھڑے ہیں۔ چند لمحے گزرنے نہیں پاتے ہیں کہ امام یکایک تڑپ کر آگے کی طرف گر پڑتا ہے۔

"خوب! شاباش!! امام رکھ لیا۔ دیکھنا صف میں سے ایک دوسرا شخص امامت کیلئے آگے بڑھ رہا ہے ہاں پھر مارنا ہیں۔ کوئی امام نہ بچے

اس کو کہتے ہیں انتقام تحقیر!!"

شاہی حکم کی تعمیل کر دوسرا امام بھی گرتا ہے اور وہ بھی دکنی گولنداز کا نشانہ ہو جاتا ہے

دو تین پیش اماموں کے یکے بعد دیگرے اس طرح نذر اجل ہو جانے کے بعد امامت کیلئے صف میں سے آگے بڑھنا کسی معمولی دل و دماغ والے کا کام نہیں! اس سرے سے اس سرے تک پس و پیش کا ایک عجیب عالم چھا جاتا ہے لیکن ابھی چند لمحے بھی گذرنے نہیں پاتے ہیں کہ خود اورنگ زیب امامت کے لئے بڑھتا نظر آتا ہے، اور اب گولکنڈہ کا شاہی نشانہ باز بندوق خالی کرنے ہی کو ہے کہ تاناشاہ لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

"ظالم! کیا ایک بادشاہ کو بھی نشانہ بنائے گا؟ دکھائی نہیں دیتا کہ خود اورنگ زیب اس وقت امام ہے!!"

سید محی الدین قادری زور

ہندوستان اسکے صوبے اور ریاستوں میں زراعت کا حال بالکل ہی مختلف ہے۔ اگر دوسرے ممالک میں دیہی آبادی کی قلت ہے تو ہمارے یہاں دیہی آبادی کی کثرت ہی نے زراعت کی حالت کو خراب کر رکھا ہے۔ اگر ان کے یہاں دیہی آبادی کم ہے تو ہمارے یہاں شہری آبادی کی کمی ہے۔ دراصل ہندوستان کلکتہ، بمبئی، دہلی یا حیدرآباد جیسے عظیم الشان شہروں، ان کی سربفلک عمارتوں خوشنما اور وضع دار بنگلوں، چوڑی سمنٹ دار سڑکوں جگمگاتی ہوئی دوکانوں کا نام نہیں ہے۔ ہندوستان نام ہے اس کثیر آبادی کا جو کچے جھونپڑوں یا گھاس کے ٹوٹے ہوئے مکانوں میں رہتی ہے۔ محنت مشقت سے جسکے چہرے زرد ہیں۔ گال پچکے ہوئے آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں، بدن پر جھریاں ہیں، جسکی اکثر غذائیں ایسی ہیں جن میں غذائیت کا جز نہیں، جسکے بدن کا اکثر حصہ برہنہ و بے لباس ہیں، جسکا ماحول ملیریا، انفلوئنزا، ہیضہ، چیچک، طاعون، دق، سل اور اسی طرح کے دیگر متعدی امراض کے جراثیم سے پر ہے۔ جو دنیا کے لئے غذا مہیا کرتا ہے مگر اپنی غذا کے لئے دوسروں کا محتاج ہے، جو ہمارے شہروں اور گھروں کی رونق کا باعث ہے مگر خود اس کے گھر اجڑے ہوئے اور بے چراغ ہیں، وہ محنت کرتا ہے تو اس کی محنت کے پھل دوسرے کھاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ زراعت کی ان خرابیوں کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا ہر جگہ زراعت میں وہی خرابیاں ہیں جو ہمارے یہاں ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملکی حالات نے مجموعی حیثیت سے زراعت کی حالت کو خراب کر رکھا ہے، اور قدرت، سماج، کاشتکار اور حکومت ہر ایک اپنی جگہ پر اس کی تباہی کا ذمہ دار ہے۔

قدرتی اسباب میں سیلاب، خشک سالی، بارش کی غیر مساوی تقسیم، موسموں کی غیر یقینی حالت، کہر، اولا، پالا اور ٹڈی دل شامل ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ان میں سے بعض اسباب کو دور کیا جا سکتا ہے گویا انسان اگر قدرت کے قابو سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا تو کم از کم اسکا اتنا مطیع اور فرمانبردار بھی نہیں رہ سکتا جتنا کہ وہ آج نظر آ رہا ہے۔

مجموعی حیثیت سے سماج پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس نے زراعت کو معزز پیشہ نہ سمجھا، دیہاتیوں کے متعلق اچھی رائے قائم نہ کی۔ مصلحین قوم اور محبان وطن کا فرض تھا کہ وہ اس طرف توجہ کرتے مگر انہوں نے کثیر آبادی کو چھوڑ کر شہری آبادی کو جو کہ ہمارے ملک میں تین سے اپنی اصلاح کا مرکز بنایا۔ انھوں نے کارخانے کے مزدوروں کیلئے جنکی تعداد ۲۰ سے ۳۰ لاکھ کے درمیان ہے قوانین بنانے اور ان کیلئے سہولتیں بہم پہونچانے کی جانب اپنی توجہ مبذول کی اور ۲۶ کروڑ آبادی سے تغافل برتا۔ اس خصوص میں سب سے زیادہ موردِ الزام وہ تعلیم یافتہ اور صاحب اثر افراد ہیں جنھوں نے دیہات میں جنم لینے اور پرورش پانے کے بعد دیہات سے لاپروائی اختیار کی۔ یہ اپنی واقفیت اور قدیم اقتدار کی بنا پر بہت کچھ کر سکتے تھے، مگر انھوں نے بھی اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے کیلئے شہروں کو ہی انتخاب کیا ایسی صورت میں یہ کہنا بے جا نہیں کہ ان میں صداقت اور خلوص کا مادہ نہ تھا بلکہ وہ شہرت اور تشہیر کے خواہاں تھے وہ خدمت خلق کرنا نہیں جانتے تھے بلکہ دنیا پر اپنی قابلیت و عظمت کا سکہ بٹھانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ دور افتادہ گاؤں میں یہ ذرائع کہاں، ان کے لئے تو بڑے بڑے شہری مرکزوں میں جہاں جذبۂ شہرت کو تسکین دینے کیلئے مختلف قسم کے ذرائع موجود ہیں۔ ذات پات کے طریق کی ذمہ داری بھی سماج ہی کے سر ہے، اس نے کسی کو ادنیٰ اور کسی کو اعلیٰ بنایا سماج نے مذہب کی آڑ لیکر رسومات کی بنا ڈالی، اور ان کو وہ اہمیت دی کہ گویا ان ہی کی ادائی مذہب ہے۔

کی قسمیں دریافت ہوچکی ہیں۔ تحقیقاتی نتائج جانچے اور نئے آلات یا نئے طریقوں سے زمین کی پیداوار بڑھانے کے لئے مزرعے قائم کئے گئے تاکہ عملی اور معاشی حیثیت سے نتائج کا امتحان ہوسکے۔ کامیاب تجربوں کو کاشتکاروں کے سامنے پیش کرنے کے لئے تشہیر کی ضرورت پیش آئی تاکہ کاشتکار جن کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا ہے اس سے فائدہ اٹھاسکیں۔ اسوقت محکمۂ زراعت کے تحت دس مزرعے ہیں جہاں یہ کام ہورہے ہیں۔ فصلوں کی بیماریوں کا علاج، مویشیوں کی بیماریوں اور ان کی نگہداشت و پرداخت کی جانب بھی توجہ ہورہی ہے۔ مرغیوں کے سلسلہ میں بھی کافی تجربات ہوچکے ہیں۔ دیہی تنظیم کے سلسلے میں ممالک محروسہ میں دیہی تنظیم کا ایک مرکزی بورڈ قائم ہے جس میں باب حکومت کے چار اراکین، مالگذاری اور صنعت و حرفت کے معتمدین، نائب معتمد مالگزاری، چاروں صوبیدار، محکمۂ ہائے تعلیمات، صحت عامہ و طبابت، زراعت، صنعت و حرفت، معلومات عامہ کے ناظم، امداد باہمی کے رجسٹرار، مارکٹنگ آفیسر اور سنٹرل کو اپریٹیو یونین کے نمائندے شامل ہیں۔ مرکزی بورڈ ایک عام خاکہ تیار کرتی ہے اور اسکو عملی جامہ پہنانے کے لئے اضلاع و تعلقوں میں مقامی بورڈ قائم ہیں۔ جن میں سرکاری اراکین بھی شامل ہوتے ہیں۔ غرض دیہی تنظیم کا سب سے اہم مرکز، زراعت کی ترقی و اصلاح، مویشیوں کی اصلاح، اور معاشرتی اصلاح نظام العمل کے اہم جز ہیں۔ زراعت کی ترقی میں دوسرا قدم جو اٹھایا گیا وہ مختلف قوانین کا سلسلہ تھا۔ ۱۹۱۱ء کے قانون امداد باہمی جسکی رو سے زرعی اور غیر زرعی انجمن قائم ہوئیں، تعلقہ داری اور مرکزی بنک، اور صدر جمعیت اتحاد کا قیام عمل میں آیا اسکا ذکر کیا جاچکا ہے۔ ۱۹۲۳ء سے موازنہ میں امداد قحط اور محفوظہ قحط کی مدات داخل ہوئیں اور تقریباً ۲۰، ۲۲ لاکھ سالانہ کی رقم قحطوں یا امدادی اور تعمیری کاموں کیلئے مخصوص کی جانے لگی۔ ۱۹۳۱ء میں قانون زرعی بازارات کا نفاذ ہوا۔ اسکا مقصد باضابطہ منڈیوں کا قیام تھا تاکہ کاشتکاروں کو غیر منظم منڈیوں کے نقصانات سے محفوظ رکھا جائے۔ باضابطہ منڈیوں میں مذہبی یا خیراتی نام سے پیداوار وصول کرنے کی ممانعت کی گئی۔ صحیح اوزان کو رائج کیا گیا، تولنے والوں کے لئے اجازت نامہ ضروری قرار پایا، خریداروں کو کاروبار کی جملہ کارروائی درج کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اس قانون کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ برطانوی ہند کے قانون کی طرح صرف روئی کیلئے مخصوص نہیں ہے بلکہ اسکا اطلاق تمام زرعی پیداوار پر ہوتا ہے۔

زراعت کی پستی کا ایک بڑا سبب قرضداری ہے، کاشتکار مفلس ہے اور اسکو اپنے روزمرہ کی ضروریات مویشی، آلات، تخم خریدنے یا کلیجانی اور کٹائی کی اجرت ادا کرنے کیلئے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے، یہ رقم وہ ساہوکار سے لیتا ہے، ساہوکار نہ صرف گراں شرح سود اور سود مرکب وصول کرتا ہے بلکہ دوسری مختلف ترکیبوں سے بھی کاشتکار کو لوٹنے کی فکر کرتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کاشتکار کو قرضہ کا بار ابھرنے نہیں دیتا۔ مسٹر ایس ایم بھروچہ جنہوں نے ممالک محروسہ میں زرعی قرضداری کی تحقیقات کی تھی ممالک محروسہ کے زرعی قرضہ کا اندازہ ۶۴ ½ کروڑ سے کچھ زائد بتایا ہے۔ آپ نے ۳۲۱ مواضعات کی تحقیقات کے بعد زرعی آبادی کے قرضہ کا اوسط ۳۰ روپیہ فی کس بتایا ہے مجھے حال میں ایک موضع کی تحقیق کے سلسلہ میں معلوم ہوا کہ اسکے زرعی قرضہ کی تعداد ایک لاکھ ۵۴ ہزار ہے جبکہ اسکی آبادی ۲۶۵۲ ہے۔ ۵۰ روپیہ فی کس کل آبادی پر اور ۷۱ روپیہ فی کس زرعی آبادی پر قرضہ کا اوسط آتا ہے۔ مسٹر بھروچہ نے بتایا ہے کہ دس لاکھ ایکڑ مزروعہ زمین میں سے ۳ لاکھ ایکڑ مکفول ہوچکی ہے اور ایک لاکھ ۶۰ ہزار ایکڑ کاشتکاروں کی ملکیت سے نکل کر قرض خواہوں کے قبضہ میں جاچکی ہے۔ تصویر کا یہی ایک بھیانک اور تاریک رخ تھا جس نے ان مختلف خرابیوں کے انسداد کیلئے حکومت کو فوری اقدام پر مجبور کیا اور

معالجت قرضہ، قرض دہندگان اور انتقال اراضی کے قوانین دستور العمل نافذ ہوئے۔ اگرچہ ان میں بعض خامیاں ہیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان سے کاشتکاروں کو بڑا فائدہ پہونچنے کی امید ہے۔ یہ ڈوبتے ہوؤں کیلئے سہارا، اور جو ڈوبے نہیں ہیں ان کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہیں۔

دیہی تنظیم کا کام جو ریاستوں یا صوبہ واری حکومتوں کے یہاں بہت ہی شاندار نظر آتا ہے فی الحقیقت اس قدر شاندار نہیں ہے۔ ہندوستان جہاں تقریباً ۷ لاکھ گاؤں ہوں وہاں چند سو دیہی مرکزوں کی وہی مثال ہے جیسے سمندر میں چند قطرے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آخر یہ کام کس طرح ہو، کیا موجودہ طریقہ کو جاری رکھا جائے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ڈیڑھ دو سو برس بعد ہم وہاں پہونچیں گے جہاں دنیا آج ہے گویا دنیا سے دو صدی پیچھے رہنا ہماری قسمت میں لکھا ہے۔ کسی حکومت سے یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ ہر گاؤں کو دیہی تنظیم کا مرکز بنادے، اور دس یا پانچ سال میں ملک کی حالت بدل دے۔ اس صورت میں یہ سانپ کے منہ کی چھچھوندر ہوگئی جسکو نہ نگلا جاسکتا ہے اور نہ اگلا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسا پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے جس کا کوئی حل ہی موجود نہ ہو۔ حل موجود ہے گو اس میں مشکلات ہیں، اور ان پر غالب آنا ہمارا کام ہے، میرا خیال ہے کہ یہ مسئلہ حکومت، سماج، مصلحین معاشرت، محبان وطن اور سب سے زیادہ اور سب سے اہم تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اشتراک سے طے ہوسکتا ہے۔

یہ سمجھنا کہ اصلاح دیہات کیلئے کثیر رقم کی ضرورت ہے ایک گمراہ کن خیال ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر نئے کام کیلئے روپیہ کی سخت ضرورت ہوتی ہے اسی طرح دیہات سدھار کیلئے بھی کچھ روپیہ کی ضرورت ہے مگر روپیہ سے زیادہ ایسی چیزوں کی ضرورت ہے جو حکومت مہیا نہیں کرسکتی، ان چیزوں کو خلوص، ہمدردی، ایثار، قربانی اور انسانیت کہا جاتا ہے۔ ہمارے سامنے ایسے کامیاب ادارے موجود ہیں جن کے پاس ابتدا میں سرمایہ بہت قلیل تھا مگر کام کرنے والوں میں مذکورہ بالا صفات موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جس سرعت، تیزی اور استقلال سے کام کیا کسی کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ دیہات سدھار کے سلسلہ میں متعدد کام ایسے ہیں جن میں روپیہ کی قطعی ضرورت نہیں، اور متعدد کام ایسے ہیں جن میں روپیہ کی بچت ہوتی ہے۔

ہم اپنے کسان کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میں بھلائی اور برائی سمجھنے کی تمیز نہیں یا وہ نفع و نقصان میں امتیاز نہیں کرسکتا لیکن اس کے باوجود وہ پرانی لکیر کا فقیر نظر آتا ہے اس کی وجہ قسمت پرستی ہے۔ اس میں آگے بڑھنے کا شوق اور راہ پانے کی امنگ مفقود ہوچکی ہے۔ اس قنوطیت کا اصلی سبب وہ حادثات ہیں جو برسوں سے اس کو اپنا شکار بنائے ہیں۔ انیسویں صدی کے ابتدائی حصہ تک اس ملک میں امن و امان نہ تھا، حملہ آور آتے اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے اسکے کھیتوں کو روندتے، اس کی فصلیں کاٹ لیتے یا ان کو جلا دیتے تھے۔ جب ملک میں امن و امان قائم ہوا تو حملہ آوروں کا خوف کم ہوگیا مگر سیلاب، خشک سالی، اولا، پالا، اور ٹڈی دل سے اس کی فصلوں کو نقصان پہونچتا رہا۔ مختلف بیماریاں اسکو اپنا لقمہ بناتی رہیں۔ رفتہ رفتہ اس کو یقین ہوگیا کہ ارضی و سماوی مصیبتیں انسان کی کوتاہیوں کا نتیجہ ہیں۔ اس نے قدرت کو غیر منصف تصور کرلیا۔ مگر یہ سوال اس کے ذہن میں پیدا نہ ہوتا تھا کہ قدرت خصوصیت سے اس پر ظالم کیوں ہے اس بات کا کھوج نہ لگانے کی وجہ سے اس کے ذہن میں یہ احساس قوی تر ہوگیا کہ اپنی بھلائی اور برائی کا کوئی نام و دخل نہیں رکھتا، اس کی قسمت کو بگاڑنے یا بنانے والی ایک ایسی ہستی ہے جس پر اس کا قابو نہیں۔ اس لئے اس نے اپنے تمام کام اسی کے حوالہ کرنے شروع

قسمت پرست یا قناعت پسند اور بالفاظ دیگر وہ سست، کاہل اور نکما ہو گیا۔

آج سے چند سال پہلے اس میں سے اکثر چیزوں کو برداشت کیا جا سکتا تھا، مگر اب سائنس، فن انجینیری، فن زراعت، اور علم طب کی ترقی نے انسان کا قابو قدرت پر بڑھا دیا ہے۔ گویا قسمت پرستی کا دور ختم ہو گیا مگر وہ بدستور قسمت پرست ہے۔ ان میں یہ احساس پیدا نہو سکا کہ ماضی ختم ہو چکا ہے اور خوشگوار مستقبل سامنے ہے۔ وہ ماضی کا دلدادہ ہے اور حال و مستقبل کی فکر سے بے نیاز ہے۔ ماضی خواہ کتنا ہی شاندار کیوں نہو اس سلسلہ کو یاد کرنا بیکار ہے، گزرا ہوا زمانہ واپس نہیں آتا، آنے والے زمانہ کی فکر کرنا اور اسکو خوشگوار بنانا سب سے اہم فریضہ ہے۔

دیہی زندگی جمود و سکون کا نام ہے، وہاں بے حسی، غفلت اور ناواقفیت کے دیوتاؤں کا راج ہے، ان کے دل مردہ اور سینے پژمردہ ہیں، ضرورت ہے کہ ان کے جمود و سکون کو توڑا جائے، بے حسی اور غفلت کے پردوں کو چاک کیا جائے، مردہ دلوں میں اور پژمردہ امیدوں میں شوق اور امنگ پیدا کی جائے، ان کو بیدار کر کے متحرک اور جاندار بنا دیا جائے، ان کے رگ و ریشہ میں برقی رو دوڑا دی جائے ان کو خود اعتمادی کا سبق پڑھایا جائے، یہ کام ملک کے نوجوان ہی انجام دے سکتے ہیں۔ یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ ان کی یہ صلاحیتیں مٹ چکی ہیں۔ کانگریس نے برسر اقتدار آنے سے پہلے چھوٹے چھوٹے دیہات میں زندگی کی روح پیدا کی تھی، اور خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر دیا تھا۔ وہ اس قوت کو حکومت سے ٹکرانا چاہتی تھی جس میں اس کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی، مگر جس طرح سادہ لوح کسان بھٹک گئے، اور جب کانگریس نے عہدے قبول کر لئے تو وہ اسی نئی حکومت سے ٹکرانے لگے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسانوں میں آگے بڑھنے، اور ترقی کرنے کے جراثیم ضرور موجود ہیں، اب اس کا انحصار کام لینے والوں پر ہے کہ وہ ان کا رخ کس طرف پھیرتے ہیں۔

میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان یا ممالک محروسہ سرکار عالی جیسے زرعی خطوں کے دیہات کی اصلاح حکومت کے بس کی بات نہیں ہے، حکومت بزور قانون اصلاح نہیں کر سکتی، اصلاح کا احساس خود پس ماندہ لوگوں میں پیدا ہونا چاہئے۔ جبری اصلاح کا ہمیشہ یہ خاصہ رہا ہے کہ جب جبر اٹھایا گیا اصلاح ختم ہو گئی، ضرورت ہے کہ ملک کے سنجیدہ، مخلص اور ٹھوس کام کرنے والے تعلیم یافتہ نوجوان دیہات میں مستقل سکونت اختیار کریں اور اپنا ایک نصب العین بنا کر اس کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔ کام کرنے والوں کو اپنے آپکو حاکم یا مخدوم نہ سمجھنا چاہئے بلکہ وہ کاشتکاروں کے دوست، مشیر کار اور خادم بننے کی کوشش کریں، مخدوم بننا آسان ہے اور خادم بننا مشکل، ان کو اسکا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ گاؤں ہماری تہذیب کا قدیم ترین مرکز ہے، کسی قدیم شئے کو مٹا کر اس کی جگہ اسی مسالہ سے نئی عمارت تعمیر کرنا آسان نہیں، ان کو ابتدا میں مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا ان کو قدم قدم پر ناکامیوں کا منہ دیکھنا ہوگا، ان کو دلی اذیت اور روحانی تکلیف بھی ہوگی کہ جو چیزیں جنکی بھلائی کے لئے پیش کیا، ہیں وہی اس کو ٹھکرا رہے ہیں، مگر ان کو ناامید نہونا چاہئے اور رنج و غصہ سے الگ رہ کر خلوص سے کام کرتے رہنا چاہئے۔ خلوص اور قربانیوں کا درخت پھل ضرور لائیگا اور بار آور ہونے میں جتنا زیادہ عرصہ لگے گا اتنے ہی اسکے پھل عمدہ اور شیریں ہوں گے۔

محمد احمد سبزواری

یعنی یہ چمڑے کی بنی ہوئی ہونے سے ہندو لوگ مذہبی نقطۂ نظر سے انہیں کا پانی پینا جائز نہیں سمجھتے۔ اس وجہ سے اس کی طلب کم ہوئی۔ لیکن یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ پہلے بھی ہندو مسلمان یہ دو فرقے تھے۔ پہلے یہ صنعت انہیں معاشی حالات میں عروج پر تھی۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زوال کی محض یہی ایک وجہ نہیں ہے بلکہ بڑی وجہ یہ ہے کہ آج کل جدید قسم کے گاگلٹ ملتے ہیں جو بڑے چھوٹے ہوتے ہیں اس وجہ سے ایک سے دوسری جگہ لے جانے میں آسانی ہوتی ہے اور وہ سستے بھی ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی طلب بڑھی اور چھاگلیں پیچھے رہ گئیں۔ اس کے باوجود بھی صنعت باقی رہتی اگر عہدہ داران مقامی اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاتے بالخصوص پولیس کے ملازمین سے ان لوگوں کو اس بارے میں خوب نقصان پہنچا۔ پہلے ہی ان کی صنعت کمزور اور کچھ مقامی بازاروں میں بکتی تھیں لیکن اس حالت میں ان ملازمین نے ہر سال موسم گرما میں کئی چھاگلیں مفت لینی شروع کیں۔ اس وجہ سے انہیں نقصان ہوا اور انھوں نے اس میں اپنی خیریت دیکھی کہ اس پیشہ ہی کو چھوڑ دیا جائے۔

انہیں وجوہات کی بنا پر وہ لوگ زراعت میں منتقل ہوگئے اور ملک کی ایک صنعت مٹ گئی۔ اب اس کو زندہ کیا جاسکتی ہے لیکن وہ بہت گراں بار ثابت ہوگی۔ اگر ان لوگوں کو حکومت بغیر سود کے قرضہ دے یا انہیں مزدوروں کی حیثیت سے چھاگلیں بنانے کے لئے نوکر رکھے اور اس کی نکاسی اپنے ذمہ لے تو یہ صنعت پھر زندہ ہوسکتی ہے۔ اب چونکہ اس صنعت کی زیادہ طلب نہیں ہے اور اس میں کام کرنا نفع بخش نہیں ہے اس لئے اس پیشہ میں زیادہ لوگ نہیں ہیں لیکن اگر اس میں فائدہ کی امید ہو تو اب بھی کم از کم ۳۰۰ لوگ اس پیشہ میں شریک ہوں گے اس کی نکاسی شہروں کے بجائے بڑے بڑے دیہاتوں میں ہوگی۔ اس صنعت کی تحقیق سے مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اب اس میں تازہ روح پھونکنا مشکل ہے لیکن مجھے یہ خیال آیا کہ اس صنعت کے زوال کے اسباب پر نظر ڈالنے سے اور اس کی طرف آپ لوگوں کی توجہ مبذول کرنے سے ممکن ہے ملک کی دوسری صنعتیں جو اسی راہ پر لگی ہیں فنا ہونے سے بچ جائیں کیونکہ اب بھی میں بعض سرکاری ملازمین کو دیکھتا ہوں کہ وہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو اپنی ہی ذاتی ملک سمجھتے ہیں اور کبھی بیگاری یا نمبردار کو صناعوں کے مکان پر بھیج کر ایک دو چیزیں بے تکلفی سے منگوا لیتے ہیں۔ یہ بات ایک شخص کے لئے ایک وقت کیلئے معمولی ہے لیکن بعض اوقات یہی معمولی بات مہلک ثابت ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے لوگ بیروزگار ہو جاتے ہیں۔

اب ہم بیڑ کی دوسری صنعت پر غور کریں گے۔ اس صنعت کا نام گپتی کی صنعت ہے۔ اس کو وجود میں آئے ہوئے کوئی پچاس سال ہوتے ہیں۔ آپ میں سے اگر کسی نے بیڑ کی بنی ہوئی گپتی دیکھی ہوگی تو اس پر ضرور آپ نے جان محمد کا نام انگریزی میں یا اردو میں لکھا ہوا پڑھا ہوگا۔ یہ شخص شروع میں تلواریں بناتا تھا لیکن نہ معلوم اسے کیا سجھائی دیا کہ اس نے تلوار بنانا چھوڑ کر گپتیاں بنانی شروع کیں۔ اب یہ شخص زندہ نہیں ہے اس کا بیٹا شیخ احمد نام موجود ہے جس کی عمر اب (۶۰) سال کی ہے اور جس کا ایک بیٹا اور دو نواسے ہیں جو اس کے ہاں یہی کام کرتے ہیں عموماً ان کے ہاں تین چار نوکر رکھے جاتے ہیں۔ اور ضرورت کے لحاظ سے ان نوکروں میں اضافہ بھی کیا جاتا ہے۔ اس طرح اس صنعت میں کوئی (۵) اشخاص ہمیشہ لگے ہوتے ہیں۔

گپتی بنانے کے لئے بیر اور ساگوان کی لکڑی استعمال کی جاتی ہے۔ اس میں سے بیر کی لکڑی تو بیڑ ہی میں ملتی ہے لیکن ساگوان کی لکڑی احمد نگر اور بمبئی سے منگاتے ہیں یا وہاں بھی کسی دوکان سے خریدتے ہیں۔ گپتی کے لئے فولاد کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی بمبئی

سے منگایا جاتا ہے۔ گپتیاں اس قدر بہترین بنائی جاتی ہیں کہ اس کی جلد شناخت نہیں ہوتی کہ آیا یہ لکڑی ہے یا تلوار۔ چھڑیاں بھی بنائے جاتے ہیں۔ لکھنے کے قلم میں فولاد کا بنا بٹھایا جاتا ہے گویا لکھنے کا قلم ہی گپتی ہے اس طرح یہ چاقو بھی بناتے ہیں۔ گپتیوں پر بارہ سنگھے، چاندی، لکڑی اور جرمن سلور کے دستے بنائے جاتے ہیں۔ ان دستوں پر مختلف نقش و نگار اور تصاویر کھینچی جاتی ہیں۔ اور خریدار کا نام بھی خواہش کرنے پر کھودا جاتا ہے۔ گپتی کی اصیل تلواری اور فولادی اس طرح دو قسمیں ہیں۔ اصیل تلواری درجۂ اول ۲۵ روپیوں میں اور درجۂ دوم ۲۰ روپیوں میں بکتی ہیں۔ فولادی گپتی درجۂ اول (۱۵) روپیہ میں اور درجۂ دوم (۱۲) روپیہ میں فروخت ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ معمولی گپتیاں ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰ روپیوں میں خوبی کے لحاظ سے بیچی جاتی ہیں ایک شخص ایک گپتی دو دن میں مکمل تیار کر سکتا ہے۔

ان لوگوں کو مختلف نمائشوں میں تمغے ملے ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد میں جو نمائش ہوئیں ان میں ان کو تمغے ملے ہیں۔ راجہ صاحب بابر جنگ بہادر صوبہ دار اورنگ آباد اور بعض تعلقداروں نے بھی تمغے دیئے ہیں اور اصل میں پہلے ایسے ہی عہدہ دار ہمت افزائی کر کے صنعتوں کو باقی رکھتے تھے۔

ان لوگوں کا پیشہ محض گپتی سازی ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اپنی صنعت کی تشہیر نہیں کرتے۔ جو لوگ یہاں کے رہنے والے ہیں یا جو ملازمین یہاں سے تبادلہ ہو کر دوسرے اضلاع میں جاتے ہیں ان کے ذریعہ سے اس صنعت کی تشہیر ہوتی ہے چنانچہ اسی طرح یہ صنعت کسی قدر مشہور ہوئی اور اب ان کے پاس اورنگ آباد، ناندیڑ، پربھنی، ورنگل، نظام آباد، گلبرگہ سے گپتیوں کے لئے آرڈر آتے ہیں۔ موجودہ کساد بازاری کا اثر ان پر بھی پڑا ہے۔ پانچ سات سال پہلے ان کی خالص آمدنی ۵۰ یا ۱۰۰ روپیہ تھی لیکن اب ۱۰ یا ۱۵ روپیہ ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ پانچ سات سال پہلے ان کے دو نواسے کام نہیں کرتے تھے ان لڑکوں کو مڈل تک تعلیم دی گئی ہے۔ انہوں نے برٹش انڈیا میں اس صنعت کی تجارت کرنے کی اجازت حاصل کی تھی لیکن پھر انہیں منع کیا گیا آجکل فیشن کے لحاظ سے لوگ لکڑی ہاتھ میں پکڑتے نہیں اس وجہ سے گپتی کی خرید بھی کم ہوتی ہے۔

اگر حکومت ان صناعوں میں سے ایک کو صنعت و حرفت کے مدرسہ میں ملازم رکھے تو کئی لوگ اس فن سے واقف ہو جائیں گے شیخ احمد [illegible] ۱۰۰ روپیہ ماہانہ کی تنخواہ پر آنے کے لئے راضی ہے۔ یہ مطالبہ میرے خیال میں ضرورت سے زیادہ ہے میں نے اس سے اپنا شبہ ظاہر کیا تو اس نے جواب دیا کہ لوگ ملتے بھی نہیں ہیں۔ اگر حکومت رکھے تو ہمیں کو رکھے ان کے پاس سرمایہ نہ ہونے سے یہ ترقی نہیں کر سکتے اگر انہیں سرمایہ بہم پہنچایا جائے تو یہ مشین کا بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک مشکل یہ پیش آتی ہے کہ مذہبی خیالات کے لحاظ سے یہ لوگ بغیر سود کے قرضہ چاہتے ہیں۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لئے حکومت یہ کر سکتی ہے کہ محکمۂ پولیس میں گپتی [illegible] کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر محکمۂ پولیس گپتی اور بایونٹ انہیں کے پاس سے خریدے اور انہیں کچھ رعایت دے یا پہلے کچھ قیمت ادا کرے تو ان کو سرمایہ ملے گا اور مشین استعمال کر سکیں گے۔ اب وہ اپنے ہاتھ سے روغن تیار کرتے ہیں۔ اگر گپتیاں کثیر مقدار میں بنائی جائیں اور ان کی کھپت بھی ہو تو یہاں روغن کی صنعت بھی ترقی کر سکتی ہے۔ اس صنعت کی عمر ابھی چھوٹی ہے۔ اس لحاظ سے ابھی اس میں ترقی کی گنجایش ہے۔ اس کے لئے انہیں اصل مہیا کرنا چاہئے اور صنعت کی تشہیر اور نکاسی کا بندوبست کرنا

چاہئے۔ آج کل تشہیر نہ ہونے پر بھی ان کو ۱۵۰ ۔ ۲۰۰ روپیہ ماہانہ ملتے ہیں اگر ان کا اشتہار کیا جائے تو اس کساد بازاری کے زمانہ میں بھی زیادہ آمدنی ہوگی اور ساتھ ہی ملک کی ایک صنعت ترقی کرے گی جس میں ابھی بہت سے مزدوروں کی کھپت ہو سکتی ہے۔

ایک خوشنیہ

ایک غمگین صبح

اپنے عالی حوصلہ شاہوں کے گن گاتی ہوئی　　اٹھ رہی ہے سطح سے ہر موج لہراتی ہوئی
ہر ادا میں شان ہے "شاہوں کے استقبال" کی　　ساحل ماضی سے ٹکراتی ہیں موجیں حال کی
بس گئی دنیا "اجڑتی تھی ابھی اجڑی نہ تھی　　بات یوں اس کی بنی جیسے کبھی بگڑی نہ تھی
اس کے سینے میں تمنا کی تپش باقی رہی　　مادی رونق میں روحانی کشش باقی رہی
اس کی موجوں کو نظر سے چومتا تھا آسماں　　اب بھی خاموشی سناتی ہے وہ خونیں داستاں
قافلہ گذرا تھا جب اس پر سے تاناشاہ[1] کا　　اس نے گذرانا تھا تحفہ نالۂ جاں کاہ کا
بے کسی میں اپنے شہہ کی دے دیا جو بھی تھا پاس　　اس کے پانی نے بجھائی تھی خداآیندے کی پیاس

داغ دل بن کر قطب شاہوں کے ہیں نقش قدم
سوکھنے پاتا نہیں اس کا کبھی دامان نم

سیر کرنے والے ان رنگینیوں میں کھو نہ جا　　حال کے جلووں میں یوں ماضی سے غافل ہو نہ جا
قہقہوں کی گونج میں پوشیدہ آہوں کو نہ بھول　　ذرہ ذرہ کہہ رہا ہے قطب شاہوں کو نہ بھول

رو رہا ہے آسماں یہ شبنم افشانی نہیں
اشک کا سیل رواں ہے دیکھ یہ پانی نہیں

میکش

[1] تاناشاہ کا اکلوتا فرزند

کے کئی مخطوطے دستیاب ہوتے ہیں، جو اسی قدیم زمانے کے لکھے ہوئے ہیں، اور نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہیں۔

نظموں میں آپ کی مثنویاں "خوش نامہ" اور "خوش نغز" کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں شامل ہیں۔ ان کے اقتباسات موجودہ زمانے کی اکثر ایسی کتابوں میں شائع ہو چکے ہیں، جو اس دور سے متعلق ہیں۔

حضرت شاہ میراں جی کے فرزند، حضرت شاہ برہان الدین جانم بھی بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ آپ کے ملفوظات میں "سکھ سہیلا" "منفعت الایمان" اور "ارشاد نامہ" وغیرہ اب منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اسی طرح حضرت شاہ برہان الدین جانم کے فرزند حضرت شاہ امین الدین اعلےٰ کے ملفوظات میں بھی کئی نظمیں اور کسی قدر طویل مثنویاں شامل ہیں۔ ان میں "رموز السالکین" "نظم وجود" "نظم قربیہ" "محب نامہ" قابل ذکر ہیں۔ اس خاندان کے ارشادات تمام تر مذہبی اور صوفیانہ خیالات پر مشتمل ہیں۔

اسی طرح کے اور بھی نظم و نثر کے رسالے موجود ہیں، جو صوفیائے کرام کے ملفوظات پر مشتمل ہیں۔ یہ رسالے زیادہ تر بیجاپور کے ابتدائی چار حکمرانوں کے عہد سے متعلق ہیں۔

دکن کی ادبی تاریخ میں بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ) اور گولکنڈے کے محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کے عہد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان دونوں سلاطین کی سرپرستی میں، ادبی ذوق کی ترقی شروع ہوئی اور بلند پایہ شعرا نشو و نما پانے لگے۔ ان میں محمد قلی کے درباری شاعر، وجہی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جس کی مثنوی "قطب مشتری" (۱۰۱۸ھ) عمدہ شاعری کا نمونہ ہے۔ وجہی کے بعد اس فن کو سب سے زیادہ ترقی، عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے عہد کے مشہور ملک الشعرا شاعر غواصی نے دی۔ غواصی کی دو مثنویاں "سیف الملوک و بدیع الجمال" (۱۰۳۵ھ) اور "طوطی نامہ" (۱۰۴۹ھ) قدیم اردو کے ترقی یافتہ اور بسیط شعری کارنامے ہیں۔ اس نے اردو مثنوی کو جس معیار تک پہنچا دیا تھا، وہ بعد کے شعرا کے لئے نمونہ بن گیا۔

مقیمی جو اسی عہد کا شاعر ہے اور بیجاپور کے ابتدائی ادبی مثنوی نگاروں میں سے ہے، اپنے آپ کو غواصی کا خوشہ چین بتلاتا ہے۔ اس کی مثنوی "چندر بدن و مہیار" جو ۱۰۵۰ھ سے قبل لکھی گئی ہے، ادبی اعتبار سے زیادہ اہمیت تو نہیں رکھتی، لیکن اس کا قصہ عرب کے "لیلےٰ مجنوں" کے قصے کی طرح بے حد مشہور رہے۔

مقیمی کے زمانے سے مثنوی لکھنے کا طریقہ بیجاپور میں عام ہو گیا۔ اب مذہبی مثنویوں کے بجائے ادبی مثنویاں لکھی جانے لگیں۔ چنانچہ امین جو مقیمی ہی کا معاصر اور ہم وطن تھا، اس کے اثر سے فارسی کے ایک قصے کا ترجمہ "بہرام و حسن بانو" کے نام سے کیا۔ لیکن اس کی تکمیل وہ نہ کر سکا۔ اور بعد کے ایک بیجاپوری شاعر دولت نے ۱۰۵۰ھ میں اس کی تکمیل کی۔

مقیمی تک زیادہ تر اردو مثنویوں کا مواد یا تو طبعزاد ہوتا تھا یا برج بھاشا سے ماخوذ صرف محمد قلی کے زمانے کے ایک شاعر، احمد نے فارسی سے استفادہ کر کے "لیلیٰ مجنوں" لکھی تھی۔ لیکن "بہرام و حسن بانو" کے بعد سے جو مثنویاں اردو میں لکھی جانے لگیں ان میں زیادہ تر فارسی مثنویوں سے استفادہ کیا گیا۔ چنانچہ اس زمانے میں محمد عادل شاہ کے دربار کے ایک شاعر صنعتی نے ۱۰۵۵ھ میں حضرت تمیم انصاری صحابی رسول کی مہمات کے ایک قصے "قصۂ بے نظیر" کا ترجمہ کیا۔ اور اس کے دوسرے سال اسی کے ہم وطن شاعر، ملک خوشنود نے "ہشت بہشت" کو

اردو نظم کا جامہ پہنایا۔ ۱۰۵۰ھ میں بیجاپور ہی کے ایک اور شاعر کمال خان رستمی نے ابن حسام کے مشہور رزمیہ "خاور نامہ" کو نظم کیا۔ یہ اردو کی پہلی قابل ذکر رزمیہ مثنوی ہے۔ نہ صرف اس لحاظ سے، بلکہ بیان اور زور قلم کے اعتبار سے بھی یہ کارنامہ قابل قدر ہے۔

"خاور نامہ" کے بعد جو مثنوی لکھی گئی وہ گولکنڈے کے شاعر جنیدی کی "ماہ پیکر" (۱۰۶۲ھ) ہے لیکن اس کا مخطوطہ نایاب ہے۔ اس کا ذکر مختلف حوالوں کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس کے دو سال بعد گولکنڈے کا ایک اور شاعر [illegible] ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" ہے جو اس میں شک نہیں کہ ایک فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے لیکن آزاد خیالی کی اس میں جگہ جگہ، حال او رعہد کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ غواصی کے بعد یہ دوسرا بڑا اور اسی پایہ کا شاعر تھا جس نے مثنوی کے معیار کو، اسلوب اور تخیل کی حد تک بلند کیا۔ بعد کے شاعروں نے غواصی کی طرح اس کے کارنامے کو نمونہ بنایا۔ چنانچہ ہنر فرزند مشرقی، کی مثنوی "ہنر درپن" (۱۰۹۷ھ) میں اس کے ثبوت ملتے ہیں۔

بیجاپور میں علی عادل شاہ ثانی کے عہد تک اردو شاعری کا ذوق خاطر خواہ ترقی کر چکا تھا چنانچہ خود اس کے دربار نے ملک الشعرا نصرتی جیسے زبردست سخن پردازوں کی پرورش کی۔ نصرتی بیجاپور کے لازوال شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی دو مثنویوں میں ایک "گلشن عشق" جو ۱۰۶۸ھ میں لکھی، ہندوستان کے مشہور قصے "منوہر مدمالتی" کی عشقیہ داستان ہے۔ اس کی دوسری مثنوی "علی نامہ" رزمیہ اور تاریخی مثنوی ہے اس میں علی عادل شاہ اور دشمنوں کی جنگوں کے حالات نہایت تفصیل سے پیش کئے گئے ہیں۔ لفظیات کے اعتبار سے "علی نامہ" کی وسعت کو اردو بہت کم کارنامے پہنچ سکتے ہیں نصرتی کے اسلوب میں ادبیت اور لطف بھی موجود ہے۔ وہ جنگوں کے نقشے نہایت عمدگی سے اور حقیقی پیش کر سکتا تھا۔ "علی نامہ" کی تکمیل ۱۰۷۶ھ میں ہوئی

اس عہد کی آخری مثنویوں کے ذکر سے پہلے گولکنڈے کی ایک مثنوی "بہرام و گل اندام" کا ذکر ضروری ہے جو ۱۰۹۰ھ میں لکھی گئی۔ یہ بہت زیادہ اہم کارنامہ نہیں ہے تاہم غواصی اور ابن نشاطی کے دبستان کی تمام خوبیوں اور خصوصیات کا حامل ہے

دوسری مثنوی "ظفر نامہ نظام شاہ" ایک رزمیہ ہے جو تاریخی اہمیت رکھتا ہے اس میں رام راجہ سے دکن کی دو مسلمانوں کی سلطنتوں کی جو جنگ ہوئی تھی، اس کا شاعرانہ حال درج ہے۔ اس کا مصنف حسن شوقی، بلند پایہ شاعر تھا جس کو پہلے، نظام شاہی دربار (احمد نگر) سے توسل رہا۔ پھر وہ بیجاپور آیا۔ آخر میں محمد قطب شاہ کے زمانے میں گولکنڈہ آگیا تھا۔ اس کی ایک اور مثنوی "میزبانی نامہ" بھی ہے۔

نصرتی کے بعد سوائے ہاشمی کے بیجاپور میں ایسے بلند پایہ شاعر کم پیدا ہوئے جن کے کارنامے یہ بانیسی کے حامل ہوں صرف شاہ ملک کا ذکر اس کی ضخیم مذہبی مثنوی "شریعت نامہ" کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ یہ مثنوی ۱۰۸۹ھ میں لکھی گئی تھی۔ ہاشمی وقت پسند انسان تھا، عادل شاہی سلطنت کے زوال کی وجہ سے زمانہ بھی بدل چکا تھا اس لئے اس نے اپنی شاعری میں عام راستے سے تجاوز کیا اور اس دور میں دکن کی آخری مثنویاں زیادہ تر گولکنڈے میں لکھی گئیں۔ چنانچہ امین، غلام علی، فائز اور طیف، جن کی تصنیفات ۱۰۹۰ھ سے لے کر ۱۱۱۱ھ کے زمانہ پر حاوی ہیں، اسی گولکنڈے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

امین، حضرت عمر کے فرزند ابو شحمہ کے متعلق ایک فرضی قصے کا مصنف ہے، جو ۱۰۹۸ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس کے ایک سال بعد

غلام علی نے "پدماوت" کے حصے کو منظوم کیا۔ اس کا ماخذ فارسی سے زیادہ ہندی قصہ تھا۔ فائز "رضوان شاہ روح افزا" (۱۰۹۵ء) کا مصنف ہے۔ ... لطیف نے ایک رزمیہ مثنوی لکھی ہے جو "ظفر نامہ" کے نام سے موسوم ہے اس میں "خاور نامہ" کا زور بیان اور "علی نامہ" کا لطف موجود نہیں ہے۔

۱۱۰۰ھ کے قریب دو ڈھائی سال کے اندر اندر بیجاپور اور گولکنڈے کے ادبی اور علمی مرکزوں کا خاتمہ ہوگیا۔ وہ علما اور خاص طور پر اردو زبان کے شاعر، جو عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین کی سرپرستی میں اپنے ذوق کی تکمیل بے تشک تھے منتشر ہونے لگے۔ کیونکہ ان سلاطین کے جانشین یعنی مغلیہ امراء کا رو شاعری کا چسکا ابھی نہیں لگا تھا۔ شہنشاہی احساس کے ساتھ فطرتاً وہ شہنشاہی دربار کی ادبی روایات اپنے ساتھ لانے تھے۔ نامور اردو شاعروں کے قدم اکھڑے تو اس سرزمین میں فارسی شعرا کے قدم بھی نہ جم سکے۔ اور شعرا ہی نے دکن کے اگلے ادبی ذوق کو جاری رکھا۔ لیکن یہ خود منتشر ہوگئے، ان کی شعری پیداوار کی یکجائیت منتشر ہوگئی۔

چنانچہ دکن میں مغلوں کے تسلط کے بعد، جو کارنامے ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ بڑی حد تک ان کے پیدا کرنے والوں کی ذہنی حالت کا عکس پیش کرتے ہیں۔ اس زمانے کی شعری پیداوار کو ہم اس طرح تقسیم کرسکتے ہیں۔ (۱) مرثیے (۲) مذہبی نظمیں (۳) متصوفانہ نظمیں (۴) نیم مذہبی نظمیں۔

دکن کے شعرا نے مرثیہ کے لئے متنوع شعری صنفوں کا استعمال کیا ہے۔ لیکن اس طرز کا زیادہ کلام قافیہ کی ترتیب میں قصیدے کی شکل رکھتا ہے، اس لئے یہ ہمارے دائرے سے باہر ہے۔ دوسری قسم کی نظموں میں، ولی ویلوری کی "روضۃ الشہدا" (۱) ضعیفی کی "ہدایت ہندی" ذوقی کی "وصال العاشقین" جیسی طویل مذہبی نظمیں شامل ہیں۔ اس دور میں تیسری قسم کی نظمیں بہت زیادہ مقبول ہوئیں۔ ان میں سب سے پہلے قاضی محمود بحری کی "من لگن" کا ذکر ضروری ہے۔ بحری اصل میں بیجاپور کے رہنے والے تھے۔ بیجاپور کی تباہی کے بعد بہ حال تباہ گولکنڈہ پہنچے۔ دو سال بعد گولکنڈے کی سلطنت کا سایہ بھی سر سے جاتا رہا۔ "من لگن" تصوف کی قدیم نظموں میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ اور وجدی کی "پنچھی باچھا" جو "منطق الطیر" کا ترجمہ ہے، بہت پڑھی جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ عشرتی کی متصوفانہ نظمیں "چت لگن" اور "دیپک پتنگ" بھی کافی مقبول تھیں۔

نیم مذہبی نظموں میں محمد علی عاجز کے قصے قابل ذکر ہیں۔ ان میں فقہ عقائد وغیرہ کے مسائل کو قصے کے پیرایہ میں بیان کیا جاتا تھا۔ ان قصوں کو بھی اپنے زمانہ میں کافی مقبولیت حاصل رہی۔

دکن میں مثنوی کی ترقی کا آخری زمانہ آصفجاہی سلطنت کے قیام کا ابتدائی دور ہے۔ یہ ایک عبوری زمانہ ہے، جس میں قدیم خیالات اور قدیم روایات کی کچھ زیادہ شکست و ریخت ہوئی، اور کچھ نئی تعمیر شروع ہوئی۔ زبان اور اظہار خیال کے سانچوں کے لحاظ سے، اس دور سے بڑا انقلاب رونما ہونے لگا۔

اس دور کا سب سے بڑا شاعر ولی ہے۔ جس نے اپنی شاعری میں نئے ماحول اور بدلے ہوئے مذاق کو سب سے زیادہ جگہ دی اس کے بعد، شعرا کو ان کے نقش قدم پر چلنا آسان ہوگیا۔ مثنوی کی حد تک ولی کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ انھوں نے صرف دو تین

کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی لکھی ہیں، جو پڑھنے اور لطف اندوز ہونے کے قابل ہیں۔

یہ آخری سخن سنج، اہل قدیم دبستان کے آخری شاعر تھے۔ اس کے بعد نئے عہد کے نئے تخیلات اور نئے روزمرہ کے اثرات نے قدیم دبستان کو تباہ کرنا شروع کیا۔ اور قدیم تخیلات پر بڑی شکست و ریخت طاری ہوئی اس دوران میں، دکن کی اردو شاعری پر پژمردگی سی چھائی رہی۔ یہاں تک موجودہ عہد سے پہلے، جب یہ شکست و ریخت مکمل ہو گئی، تعمیر جدید اردو شاعروں میں ایک نئی روح پھونک دی گئی۔

عبدالقادر سروری

گوداوری گھاٹ کی ایک حسین صبح

شب تاریک چلی زلفوں کو سلجھاتی ہوئی ... صبح کے خوف سے ڈرتی ہوئی گھبراتی ہوئی
چور کی طرح دبے پاؤں چلی باد صبا ... ہر قبائے گل نوخیز کو مسکاتی ہوئی
آئی گردوں سے زمیں تک عروس شبنم ... موتیوں کو در و دیوار پہ بکھراتی ہوئی
جل بجھی شمع، ہوئی رات کی محفل خاموش ... بزم تاروں کی چلی آنکھوں کو جھپکاتی ہوئی
اڑ چلی نکہت گل چھوڑ کے دامن گل کا ... باد سرشار چلی جھومتی اتراتی ہوئی
جلوہ گر صبح کی دیوی ہوئی رفتہ رفتہ ... شب کا آنچل رخ پرنور سے سرکاتی ہوئی
دور تاریکی ہوئی گھاٹ کی تقدیر کھلی ... ٹکڑیاں آئیں حسینوں کی ستم ڈھاتی ہوئی
نقرئی شانوں پہ بکھرائے ہوئے بال کوئی ... قلزم حسن کی ہر لہر میں لہراتی ہوئی
ذرے ذرے کو تبسم سے بناتی رنگیں ... بجلیاں چشم فسوں ساز سے برساتی ہوئی
کوئی انگڑائیاں لیتی ہوئی بدمستی میں ... ساغر عشق سے مے حسن کی چھلکاتی ہوئی
اپنی گستاخ اداؤں سے الجھتی ہر دم ... خود بہکتی ہوئی دنیا کو بھی بہکاتی ہوئی
کرنے اشنان کوئی کھول کے جوڑا آئی ... کوئی ساحل پہ کھڑی رہ گئی شرماتی ہوئی
بھیگے کپڑوں میں جو عریاں ہوئے جسم حسین ... بجلیاں چھپنے لگیں ابر میں گھبراتی ہوئی
کوئی کھولے ہوئے بالوں کو چلی ندی میں ... نکلی پانی سے کوئی زلفوں کو سلجھاتی ہوئی
چلی ہر ایک نہا دھو کے خراماں آخر ... موتی اُن بھیگے ہوئے بالوں سے برساتی ہوئی
ہو گیا جلد ہی روپوش یہ رنگیں منظر ... آنکھوں آنکھوں میں نظر رنگیں لٹاتی ہوئی

علی احمد

اورنگ آباد کا سنہری محل

سنہری محل دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا جو بحمد اللہ پورا ہوا۔ یہ عمارت اورنگ آباد کی قدیم عمارت ہے جو مقبرۂ رابعہ دورانی سے تقریباً ۲ فرلانگ کے فاصلے پر جانب غرب پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ اس عمارت کا محل وقوع نہایت ہی بلند اور مرتفع ہے اس کے اطراف کھلے میدان اور مشرق و شمال کی جانب پر فضا پہاڑی ہے مقبرہ اس عمارت کے بالکل مقابل میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہ عمارت آباد تھی اس کی دیواروں پر سونے کا ملمع کیا ہوا تھا یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ فی زمانہ گو عمارت صحیح و سالم ہے لیکن دیواروں کے ملمع کا کہیں پتہ نہیں ہاں نقش و نگار کے کہیں کہیں نشان پائے جاتے ہیں۔ یہ محل دو منزلہ ہے نیچے کے حصہ کی تفصیل یہ ہے۔ بیچ میں ایک ہال اس کے دونوں جانب دو دو کمرے ان کمروں کے بازو ایک ایک وسیع ہال۔ اوپر کی منزل نہایت شاندار ہے۔ بیچ میں ایک بہت بڑا ہال اس کے آگے پیش جس میں نہایت کشادہ اور خوشنما کنگرہ دار کمانیں نکلی ہوئیں پیش کے مقابل میں وسیع صحن بڑے ہال کے ہر دو جانب دو دو کمرے اور ہر ایک کمرے کے بازو کھلا ہوا صحن اور صحن کے کنارے پر حد کی دیوار سے لگا ہوا ایک ایک پختہ مسقف بیت الخلا۔ بالاخانہ کے عقبی حصہ میں بھی کشادہ صحن واقع ہے بالاخانے کے اوپر چاندنی ہے جس کے اطراف دیوار کھنچی ہوئی ہے۔ چاندنی پر چڑھنے کے بعد تمام شہر ہتھیلی میں نظر آتا ہے اور نظر ریلوے اسٹیشن سے پرے جنوبی پہاڑی سلسلے تک بلا روک ٹوک کام کرتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارت کوسوں تک گرد و پیش کے وسیع رقبہ پر حکومت کر رہی ہے اس عمارت کے اطراف پختہ دیوار بنی ہوئی ہے جس میں کمانیں نکلی ہوئی ہیں اور دیوار کے اندر عمارت کے عقب و پیش نہایت وسیع سطح و ہموار صحن ہے علامات و آثار سے پایا جاتا ہے کہ اس صحن میں چمن بندی کی گئی ہوگی کیونکہ اس وسیع چبوترے پر جس پر عمارت قائم کی گئی ہے۔ ایک حوض بنا ہوا ہے جس میں سے پانی ایک چھوٹی سی نہر میں جاتا تھا اور پھر نہر میں سے پشت بہ پشت آبشار پر سے ڈھلکتا ہوا صحن کی روشوں میں پہنچتا تھا حوض اور نہر میں اب خاک اڑ رہی ہے اور چبوترے پر لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی ہے عمارت کے نیچے کا حصہ آج کل نہایت خراب حالت میں ہے اس کی اکثر کمانیں پتھروں سے چن دی گئی ہیں جس کی وجہ اندرونی حصہ کسی قدر تاریک ہے فرش پر کوڑے کرکٹ کی کوئی حد نہیں اس کے علاوہ جا بجا مویشیوں کے گوبر کے ڈھیر پڑے ہوئے ہیں غالباً عدم نگرانی کی وجہ سے مویشی اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ بالاخانہ اب بھی ایسا ہے کہ وہاں کوئی بیٹھ جائے تو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا لیکن افسوس متعدی مالیخولیا کی علامات سے سفید دیواریں سیاہ ہو گئی ہیں آہ! بالاخانہ کچھ نہ پوچھیے کیا چیز ہے شاید ہی ایسا ہوادار مقام کہیں ہو اطراف کا کشادہ منظر کوسوں تک نظر آتا ہے۔ روبرو دور میں پہاڑی کا سلسلہ گوناگوں دلفریبیوں سے معمور اپنے حسن کی آب و تاب کیساتھ بے نقاب نظر آتی ہے انواع و اقسام مناظر کے اجتماع سے ایک عجیب و غریب خطہ پیدا ہو گیا ہے غرضکہ منظر کی لطافتیں حد بیان سے باہر ہیں صرف وہی لوگ بخوبی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں جو بذاتہ اس کا لطف اٹھا چکے ہوں۔ اس عمارت کے استحکام کی یہ حالت ہے کہ اس کی گچ سیسہ کی اور اینٹ فولاد کے مماثل ہے یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے بادوباراں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر رہی ہے۔

اس عمارت کی ویرانی کو دیکھ کر اور بانیان عمارت کی عظمت گزشتہ کا خیال کر کے دل پر کچھ ایسا عالم طاری ہو گیا کہ یہ چند اشعار

بے اختیار قلم سے نکل پڑے ۔

(۱)

ہے بہت خوشنما سنہری محل　　دلکشا پر فضا سنہری محل

مرتفع اور بلند ہے یہ قصر　　روبروئے نظر ہے سارا شہر

ہے محل وقوع فرحت زا　　گرد حلقہ ہے اک پہاڑی کا

وادیٔ کوہ قاف میں گویا　　یہ سنہری محل ہے پریوں کا

(۲)

خوبصورت وہ دامن کہسار　　اور اس میں وہ سایہ دار اشجار

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائے جاں پرور　　چاروں جانب کھلا ہوا منظر

ہر طرف اس کی حکمرانی ہے　　جو جگہ ہے یہاں سہانی ہے

(۳)

ہے مقابل میں مقبرہ[1] ایسا　　تعزیہ اک دھرا ہوا گویا

دیکھ کر مقبرے کی زیبائی　　ایک تشبیہہ خوب یاد آئی

کیا ہی دلکش ہے خوش قرینہ ہے　　سبزہ زاروں میں اک نگینہ ہے

قصر زریں ترا کیا کہنا　　عہد رفتہ کا ہے تو افسانا

قصر کیا ہے سرائے عبرت ہے　　دیکھو جس سمت جوش حسرت ہے

اب ہے ویران تھا کبھی آباد　　شان رفتہ ہے شوکت برباد

تازیانہ پئے تخیل ہے　　نقش بربادیٔ تجمل ہے

(۵)

ہوگئی ہے یہ تیری حالت زار　　جا بجا سے جگر ہے تیرا فگار

اب کہاں وہ طلائی رنگ ترا　　اب نہ وہ آب و تاب ہے نہ ضیا

تھیں کبھی جو نگار دیواریں　　ہوگئیں دل فگار دیواریں

فرش جو مثل آئینہ تھا صاف　　جا بجا اس میں پڑ گئے ہیں شگاف

---

[1] مقبرۂ رابعہ دورانی

کس مپرسی کی تیری حالت ہے — تیرا ویرانہ جائے عبرت ہے
حوض ہیں خشک صحن میں تیرے — خاک اڑتی ہے تھے جہاں چشمے
روشیں ہیں وہ اب کہاں باقی — ہیں کہیں کچھ ابھی نشاں باقی

(۶)

کہہ رہے ہیں ترے در و دیوار — تھا کبھی تو بھی غیرت گلزار
کیا ہی ذی شان ہوں گے تیرے مکیں — صاحب اقتدار ذی تمکیں
پیش خدمت تھے جن کے جاہ و حشم — نصرتیں جو متی تھیں جن کے قدم
اب کہاں ہیں وہ مالک دولت — کیا ہوئی ان کی حشمت و ثروت!
قصر جن کے تھے مثل قصر جناں — گھونسلے زاغ و بوم کے ہیں وہاں
گردش دہر نے کیا پامال! — وہ رہے اور نہ ان کا مال و منال
نہ رہا ان کا کر و فر باقی — یادگار ان کے ہیں کھنڈر باقی

(۷)

اے محل اے وہ یادگار کہن — اے وہ تصویر انقلاب زمن
جو تجھے دیکھنے کو آتا ہے — نقش عبرت وہ لے کے جاتا ہے

سید اللہ بخش توحید

مدراس میں اردو زبان اور ادب کی ترقی و اشاعت کا مسئلہ ہندوستان میں ہمہ گیر توجہ حاصل کر رہا ہے۔ کانگریس نے ہندوستانی کو وہاں کی سرکاری زبان بنانے کا تہیہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں ہندی کے رواج کے لئے بڑی کوشش کی جا رہی ہے ایسی صورت میں اردو کے بہی خواہوں کو اردو کی بھی فکر دامنگیر ہو گئی ہے اور ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح مدراس میں اردو زبان کی حالت اور اردو ادب کے نشو و نما کے بارے میں عام معلومات حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے ادارۂ ادبیات اردو نے مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی سے یہ مبسوط کتاب لکھوائی ہے۔
اس میں گزشتہ ڈھائی صدیوں سے مدراس میں اردو کا جو کام کیا گیا ہے اس کا تفصیلی ذکر درج کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

سب رس کتاب گھر یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہے۔

قاضی جی کی کارگزاری

۱۳۹۵ء میں دیول رائے والئی بیجانگر فیروز شاہ بہمنی پر حملہ کرنے کی غرض سے ایک ٹڈی دل لشکر لے کر طوفان کی طرح اٹھا تاکہ مدگل اور رائچور وغیرہ کے قلعوں کو مسمار کرتا ہوا پائے تخت تک پہنچے اور تخت سلطنت کو الٹ کر شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔

دیول رائے شمالی سرحد کی طرف سے بڑھتا ہوا دریائے کرشنا کے ساحل پر پہنچا اور وہیں ڈیرے ڈال دئیے فوراً راؤٹیاں اور خیمے نصب کر دئیے گئے۔ وہ کائیں گائیں گائیں اور بیار لوگ جنگل میں منگل منانے لگے۔ کیمپ تقریباً بارہ تیرہ میل تک پھیلا ہوا تھا جس میں تیس ہزار سوار اور نوے ہزار پیادوں کا لشکر جرار بحر ناپیدا کنار کی طرح موجیں مار رہا تھا۔ ہر پیشہ کے لوگ اس میں موجود تھے، خرید و فروخت ہو رہی تھی، بازاروں میں چہل پہل تھی، شراب خانے کھلے ہوئے تھے، دور پر دور چل رہے تھے، ارباب نشاط طوائفین اور کسبیاں نغمہ سرائی میں مصروف تھیں اور رقص و سرود سے محفل کو گرما رہی تھیں۔

ادھر سلطان کو خبر پہنچی تو وہ فوراً بارہ ہزار سرفروش اور جان نثار سپاہیوں کا لشکر اپنے ساتھ لے کر آندھی کی طرح اٹھا اور گلبرگہ سے کوچ کر کے کرشنا کے دوسرے ساحل پر جا پہنچا۔ برسات کا زمانہ تھا، سیلاب کے طوفان نے دریا کا پاٹ اس قدر چوڑا کر دیا تھا کہ پار اترنا مشکل نظر آیا۔ اس لئے حسب ایماء شاہی وہیں سراپردہ نصب کر دیا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد سلطان نے اپنے ارکان دولت اور سپہ سالاروں کو مشورہ کرنے کی غرض سے طلب کیا، دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ہر شخص نے اپنی اپنی سمجھ کے موافق تدبیریں بتائیں لیکن سلطان کو تشفی نہیں ہوئی اور کوئی تصفیہ نہ ہو سکا۔ بہرحال نشستند و گفتند و برخاستند کے بعد سلطان کو بہت زیادہ فکر دامنگیر ہو گئی۔

ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، اندھیری رات میں سنسان جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا، گھوڑے سے لے کر سوار تک سانس نہیں لے رہا تھا، لیکن سلطان بدستور اسی غور و فکر میں غرق تھا کہ دریا کس طرح عبور کیا جائے اور غنیم کی فوج پر کس پہلو سے حملہ کیا جائے۔

یکایک نظر اٹھائی تو دیکھا کہ سامنے کوئی بزرگ کھڑے ہوئے ہیں، چمکدار روشن آنکھیں، نورانی چہرہ، لانبی ستواں ناک، لمبی ڈاڑھی، دراز قد جسم پر سفید براق کپڑے، ادھر سلطان نے ذرا غور سے دیکھا، ادھر وہ بزرگ بھی سلام کرتے ہوئے آگے بڑھے تو معلوم ہوا کہ قاضی سراج[1] ہیں۔ سلطان نے تعجب سے پوچھا کہ اس وقت تم کدھر؟ دست بستہ عرض کی کہ پیر و مرشد، اس وقت لوگ خاموشی کے ساتھ جنگ کی تیاری میں مصروف ہیں مگر حضور کے چہرہ سے غور و فکر کے آثار نمایاں ہیں۔ اب حضور زیادہ تردد نہ فرمائیں، اس بہی خواہ دولت کو ایک تدبیر سوجھی ہے، اگر جان کی امان پاؤں تو حرف مدعا زبان پر لاؤں اور ایک تدبیر بتاؤں۔ سلطان فیروز عام طور پر علما، فضلا اور اپنے ارکان دولت سے نہایت بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ باتیں کرتا تھا، قاضی جی کی گفتگو سن کر مسکرایا اور کہا کہ قاضی صاحب! اللہ اللہ کرو، بھلا تم کو جنگ سے کیا واسطہ، کیوں خواہ مخواہ اس جھگڑے میں پڑتے ہو، تم تو اپنے خیمہ میں بیٹھے ہوئے اللہ اللہ کرو اور فتح فیروزی کی دعائیں مانگتے رہو۔

---

[1] قاضی سراج بادشاہی امیروں میں سے ایک نامی عہدہ دار اور امیران صدہ کا ایک نامی فرد تھا (فرشتہ)

قاضی جی مقابلہ کہاں چوکنے والے تھے، دست بستہ عرض کی کہ خداوند نعمت، فتح و فیروزی کی دعا تو ہر وقت زبان پر رہے گی خواہ میں حجرہ میں
رہوں یا میدان جنگ میں مگر عرض یہ ہے کہ قاضی سمجھ کر میرا نام بہادروں کی صف سے خارج نہ فرمائیے۔ باپ دادا سے فن سپہ گری و تیغ
چلا آ رہا ہے اس لئے میں اہل قلم سے ہی نہیں ہوں بلکہ اہل سیف بھی ہوں۔

سلطان نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو اپنی تدبیر بھی کہہ ڈالو۔ قاضی جی نے کہا کہ حضور تدبیر یہ ہے کہ میں نے دریا پار کرنے کے لئے چند چمڑے
کے ٹوکرے اور لکڑی کی کشتیاں تیار کر لی ہیں۔ اس وقت غنیم کی فوج غافل ہے اگر حکم ہو تو تھوڑی سی فوج لے کر جاؤں اور شب خون ماروں۔
سلطان نے کہا کہ قاضی صاحب آپ نے ٹوکروں اور کشتیوں کی تدبیر تو بہت ہی اچھی بتائی مگر شب خون مارنے کی تدبیر مجھے پسند نہیں
آئی اس لئے کہ میں فتح کو حیلہ سے حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ پھر غنیم کی فوج ایک لاکھ سے زیادہ ہے اور ہماری صرف بارہ ہزار۔ اگر یہاں
سے آپ چار سو پانچ سو آدمی لے کر بھی گئے تو کیا فائدہ ہوگا۔ غنیم کی فوج تو دس کوس تک پھیلی پڑی ہے۔ شب خون کسی طرح پورا نہیں پڑیگا
قاضی جی کی طبیعت ان معاملات میں بلا کی رسا واقع ہوئی تھی۔ فرمایا مثل مشہور ہے کہ الحرب خدعۃ۔ ہم کو بھی اس سے فائدہ
اٹھانا چاہئے۔ چار پانچ سو آدمی تو ان کے لئے کافی سے زیادہ ہیں، خدا نے چاہا تو یہی لوگ ان کو خرگوشوں کی طرح جھاڑیوں میں چھپتا پھرا
دیں گے۔ ہاں اگر کسی مصلحت کی بنا پر پیر و مرشد اس کے خلاف ہیں تو اتنی اجازت مرحمت فرمائی جائے کہ میں اپنے ساتھ صرف دو سو آدمی
لے کر دریا کو عبور کر جاؤں اور خفیہ طور پر غنیم کے لشکر میں پہنچ جاؤں تاکہ اس کے پیچھے کا کام تمام کر دوں۔ آپ اس عرصہ میں سامنے کی جانب [illegible] اور
کشتیوں سے دریا کے اس پار اترنے پر ... جب شور بلند ہو تو فوراً ہمارے لشکر حملہ کریں اور اس کے خیمے اڑا دیں۔

بادشاہ قاضی جی کی یہ تدبیر سن کر مسکرایا اور خاموش ہو گیا مگر قاضی جی بادشاہ کی طبیعت پہچانتے تھے، [illegible] السکوت کالرضا
سمجھے فوراً سلطان سے رخصت ہو کر کیمپ پہنچے اور سات سو جوان اپنے ساتھ لئے جو ان کے ماتحت تھے، اور فقیروں کا بھیس بدل کر چل کھڑے
ہوئے۔ صبح ہوتے ہوتے غنیم کے کیمپ میں پہنچے۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر ٹہلتے رہے، جب کہیں اہل حق نظر آئی تو ایک
درخت کے نیچے بیٹھ کر آپس میں کھچڑی پکانی شروع کر دی۔ قاضی جی نے [illegible] چاروں طرف ہاتھ [illegible]
[illegible] ہو گئیں پھر کیا تھا، ایک آواز تھی [illegible] ساتھیوں کو [illegible] ایک ترکیب سوجھی ہے اب انشاء اللہ فتح ہی فتح ہے۔ ساتھیوں
نے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ تو فرمایا کہ راجہ کی فوج کے ساتھ [illegible] طوائفیں اور کسبیوں کے طائفے بھی موجود ہیں۔ بس تم [illegible]
بھیس میں [illegible] امید ہے کہ وہاں پہنچ کر ضرور کامیابی کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ ساتھیوں نے پھر پوچھا کہ آخر بات کیا ہے؟
تو قاضی جی نے فرمایا کہ تمہیں کیا معلوم کہ فقیر جھولی میں کیا ڈالتا ہے اور کیا نکالتا ہے۔ بس تم لوگ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ اور جو کچھ میں
کہوں اس پر بے چون و چرا عمل کئے جاؤ۔ القصہ سب نے مل کر کسبیوں اور طوائفوں کے کیمپ کی طرف دھاوا بول دیا۔ قاضی صاحب
شاہ صاحب کا بھیس بدلے خضر راہ بنے ہوئے آگے آگے تھے اور ان کے چیلے اور مرید اپنے مرشد کے پیچھے قدم بقدم چل رہے تھے۔
یہاں پہنچے اور وہیں دھونی رما دی۔ دو چار روز کے بعد درویشوں کی ٹولی کسبیوں کے کیمپ میں پہنچی اور ان کا نہایت تفصیل کے ساتھ
لینا شروع کر دیا۔ ایک مقام پر دیکھا کہ ایک طوائف، نہایت طرح دار، حسین، مہ جبین، نوکیلی چھبیلی، کنگھی چوٹی سے درست

سے آراستہ و پیراستہ شمع محفل بنی بیٹھی ہے۔

اس وقت قاضی جی کو سات خون معاف تھے، اسے دیکھتے ہی تاب و تاب جاتی رہی، قانون کی جیبیں کھل گئیں، دل سینہ میں بانسوں اچھلنے لگا، ڈورے ڈالنے کے لئے پروانہ وار آگے بڑھے اور [illegible] کا۔

اس موقع پر قاضی جی نے اپنے آپ کو [illegible] اور [illegible] کی کوشش کی۔ سو جان سے قربان ہو رہے تھے، جو کچھ روپیہ پیسہ اپنے ساتھ لائے تھے بے دریغ اس پر نثار کر ڈالا شروع کر دیا، وہ وہ باتیں بنائیں، وہ وہ رنگ ڈھنگ آغاز کہ طوائف بھی ان پر ریجھ گئی اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ مجھ پر لٹو ہے۔ رات بھر خوش مذاقی اور ظرافت کی آتشبازی چھوٹتی رہی۔ تمام رنڈیاں اور ڈوم ڈھاڑی قاضی جی سے پٹے ہوئے تھے اور قاضی جی اپنی مضحکہ خیز حرکتوں اور پرلطف باتوں سے اس محفل کو خوب گرما رہے تھے۔ اس وقت بقول انشاء اللہ خاں قاضی جی کی کیفیت تھی کہ۔

شب محفل ہولی میں جو وارد ہوا زاہد۔ رندوں نے لپٹ کر
ڈاڑھی کو دیا اس کی لگا بند رقطونا۔ اور بجنے لگی گت
تب منہ سے کہنے لگے تک پر طونا جو کہ ناک پہ انگلی
اور آنے جی آنے سے برا مانے سو بھڑوا۔ ہے موسم عشرت

دو چار روز اسی طرح گزرے، اتفاقاً ایک روز رات کے وقت قاضی جی کی معشوقہ راج کنور کے دربار میں مجرے کے لئے طلب کی گئی اور وہ جانے کیلئے تیاری کرنے لگی، قاضی جی کو جیسے ہی یہ پتہ لگا بس مچل گئے، فوراً آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور لگے اس سے کہنے پھر یہ ہی نہیں بے تاب ہو کر پروانہ وار اس کے گرد پھرنے لگے اور قدموں پر گر کر عرض کرنے لگے کہ جدائی کی گھڑیاں مجھ سے نہیں کٹ سکیں گی، خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو یا تو تم وہاں نہ جاؤ یا مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ طوائف نے کہا کہ قاضی جی کیا عقل ماری گئی ہے، اپنے ہوش کے ناخن لو۔ ہم تو راجہ کے نوکر ٹھہرے، پھر بڑی بات یہ کہ خود کنور جی نے طلب فرما کر ہماری عزت افزائی فرمائی ہے ایسی صورت میں بھلا میں حکم عدولی کیسے کر سکتی اور اپنے ساتھ راج سبھا میں تمہیں کیسے لے جا سکتی ہوں۔ اس لئے کہ وہاں تو صرف وہی شخص جا سکتا ہے جو گانے بجانے اور ناچ رنگ میں مشاق ہو۔

قاضی جی نے جواب دیا کہ اے جانِ جہاں! کیا تم نے اوروں کی طرح مجھ کو بھی نرا کٹھ ملا سمجھ لیا ہے، رام کی دیا سے میں بھی گانے بجانے سے اچھی طرح واقف ہوں، اس کے علاوہ وہ وہ کمالات جانتا ہوں کہ راجہ صاحب بھی دیکھ لیں تو بھونچکا ہو کر رہ جائیں۔ طوائف نے خیال کیا ڈون کی لے رہا ہے، مسکرائی، اور اپنا ستار ان کی طرف کھسکا کر کہا کہ لیجئے ذرا اس کو تو چھیڑئیے۔ قاضی جی نے فوراً ستار ہاتھ میں لے، پردوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا، پھر جوڑ اور باج کے تاروں کو ٹٹولا اور مضرابوں کے سُر ملا کر وہ استادی سے بجایا، وہ وہ گت سازی اور مینڈ کاری کے کمالات دکھلانے کہ طوائفیں اور کسبیاں تو رہیں ایک طرف ان کے سازندے بھی اس کو سن کر دنگ رہ گئے۔ اب تو ان کی معشوقہ کا ماتھا ٹھنکا، سوچی کہ اس کا ساتھ رکھنا تو باعث فخر و عزت ہے، ناچ گانے سے بھی خوب واقف ہے، باتیں بھی خوب بناتا ہے

بہت ممکن ہے کہ اس کے طفیل سے ہم بھی بچ جائیں۔ یہ سن کر ہنسنے لگے۔ فوراً سب کو قافلہ میں شریک کر لیا اور انہیں اپنے ساتھ لئے راج کنور کے دربار میں جا پہنچے۔

محفل کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ دیول رانی کا بیٹا اور اس کے احباب اس میں حصہ لے رہے تھے۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ اس طائفہ کے پہنچتے ہی گانا شروع ہو گیا۔ طبلہ پر تھاپ پڑی، سارنگی تی تی کی، مجیرے بجنے لگے۔ طائفہ کی سریلی آواز اور گھنگھروؤں کی چھم چھم سے محفل کا رنگ ہی بدل گیا۔ دیر تک محفل رقص و سرود گرم رہی۔ گانا ختم ہوا تو نقالوں کی باری آئی۔ قاضی جی فوراً ایک ساتھی کو لے کر اکھاڑے میں کود پڑے۔ یہ دونوں زنانہ لباس پہنے، سر پر اوڑھنی اور زیور سے سہاگن بنے، ناز و غمزے کرتے، مٹکتے، ٹھمکتے، تالیاں بجاتے اور کمر مٹکاتے ہوئے بس مضحکہ خیز انداز میں راج کنور کے سامنے آئے کہ اہل محفل ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ پھر ان بہروپیے نقالوں نے تمسخر، ضرب ماری اور کرتب بازی میں وہ وہ کمالات دکھائے کہ راج کنور اور پوری محفل عش عش کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد قاضی جی نے اپنی غیر معمولی چابکدستی اور دلفریب حرکت کے ساتھ رقص شروع کر دیا۔ لے میں ڈوبا ہوا ساز، سروں میں ڈوبی ہوئی آواز اور رقت آمیز راگ راگنی کے سر و گداز نے محفل پر جادو سا کر دیا۔ ہر شخص بت بنا ہوا ان کو ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں دونوں نے کمر سے خنجر کھینچ، بھاؤ بتانا شروع کر دیئے اور نہایت تیز روی کے ساتھ وہ وہ جوڑ توڑ دکھائے اور وہ وہ ہاتھ اور پینترے نکالے کہ پوری محفل وجد کرنے لگی۔

آخر کار پانوے کاٹتے اور پینترے بدلتے ہوئے دونوں کے دونوں راج کنور کی طرف آہستہ آہستہ بڑھے، پھر لپک کر اس کے سینے و شکم میں دونوں نے بیک وقت ایسے کاری خنجر بھونکے کہ وہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ اس کے ساتھی اور تماشائی نشہ میں چور اور مست و مخمور تھے۔ جو لڑکھڑاتے ہوئے باہر بھاگے انہیں قاضی جی کے ان ساتھیوں نے سنبھالا جو باہر کھڑے ہوئے تاک رہے تھے۔ جو بھاگ نہ سکے وہ وہیں کے ہو کے رہ گئے۔

اب قاضی جی اور ان کے ساتھیوں نے کیمپ کے چراغ گل کرنے شروع کر دیئے۔ پھر کیا تھا چراغ گل پگڑی غائب۔ لشکری حیران و پریشان، اصل واقعہ سے بے خبر، سمجھے کہ سلطان کے لشکر نے شب خون مارا ہے۔ شراب کا نشہ، کچی نیند اور رات کی تاریکی میں ایک دوسرے پر پل پڑے۔ ہر طرف صدائے دار و گیر بلند ہو گئی۔ ادھر قاضی جی نے اپنے ساتھیوں کو اطلاع دینے کی غرض سے سلطان کی طرف روانہ کر دیا اور خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھے۔

دیو رائے نے یہ کیفیت دیکھی تو ہوش پران ہو گئے۔ رات اندھیرے منہ لپیٹے دریا کے پار کی کوشش لے کر بغیر لڑے بھڑے بھاگ کر روانہ ہو گیا۔ دوسرے روز جب سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو سلطان کی فوج کو شکست دینے کو شجاع کا نیزہ ہاتھوں میں لئے، فولاد سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق، جسم پر زرہ بکتر اور چار آئینے، سر پر خود، فولادی کمر میں شمشیر اصفہانی، پشت پر سپر، کندھے پر کمان، کندھا بریشمی تسکار بند میں آویزاں، عربی گھوڑے پر سوار اپنی فوج ظفر موج کو لئے ہوئے آ پہنچا۔ نقارے پر چوٹ پڑی کہ دل سینوں میں دہل گئے۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر کے نعروں سے دشت و ہامون گونج اٹھا۔ بہادروں نے بڑھ کر حملہ کیا، پھر کیا تھا، تلواروں

تلواریں اور نیزوں سے بیٹے اژدہوں کی طرح زبانیں نکالے ہوئے ایک دوسرے سے گتھ گئے۔ تیروں کی دھواں دھار بارش سے آسمان پر ایک ابر سا چھا گیا، جس میں برچھیوں کی سنانیں اور بھالوں کی انیاں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر بجلیاں گرا رہی تھیں۔ بڑے گھمسان کی لڑائی ہوئی، بسنتم کارن پڑا۔ جدھر دیکھو کشتوں کے پشتے لگے تھے، خون کا سیلاب بہہ رہا تھا، کوئی سسک رہا تھا، کوئی ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور کوئی رقص بسمل کر رہا تھا۔ غرض یہ کہ قاضی جی کے ناچ نے سب کو گنگنی کا ناچ نچا دیا تھا۔

بارہ ہزار بہادروں نے دو جی توڑ کر حملہ کیا کہ ایک دھاوے میں غنیم کے ہزار سے زیادہ کا کھیت کر دیا جو باقی رہے ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور ایسے اکھڑے کہ پھر نہ جمے۔ یار لوگ عجیب عجیب طرح بھاگ رہے تھے، کوئی بے تحاشا بھاگا، کوئی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا، کوئی نوک دم بھاگا اور کوئی دم دبائے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ پیادوں کو ہوش نہ تھا کہ ہاتھ میں تلوار ہے یا میان، سوار کو خبر نہ تھی کہ وہ گھوڑے پر سیدھا سوار ہے یا الٹا۔ فتحیابوں نے کئی کوس تک ان کا پیچھا کیا بلکہ ان کے گھر تک پہنچا کر واپس آئے۔ راستہ میں زخمیوں کی کمریں اور مردوں کی ہمیانیاں کھول کھول کر اپنے کیسے خوب ٹھونک ٹھونک کر بھرے اور اس قدر زر جواہر مال و دولت ہاتھ آیا کہ جس کا حد و حساب نہیں۔

گھوڑوں کی ٹاپوں سے میدان جنگ میں جو غبار اٹھا، قضا نے ہاتھ بڑھا کر نیزے کی انی سے اس پر فیروز شاہ کا نام لکھ دیا۔

الغرض راجہ کو ایسی شکست فاش ہوئی کہ اس کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔ سلطان فیروز شاہ اپنے لشکر کے ساتھ کامیابی کے جھنڈے اڑاتا ہوا اور فتح و فیروزی کے نقارے بجاتا ہوا دارالسلطنت واپس ہوا۔ اس خدمت کے صلہ میں قاضی سراج خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوئے اور گروہ امرا میں داخل ہو کر چین کی بنسی بجاتے رہے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

باغِ دکن

یہیں بہار کا پہلے پہل بنا ہے چمن — عجیب خطۂ دلکش ہے خاکِ پاکِ دکن
نگاہِ شوق کو کیا کیا سماں دکھاتا ہے — انوکھی شان زمانہ کو یہ بتاتا ہے
نمونۂ کرم و لطف کردگار ہے یہ — یہ باغِ علم ہے گہوارۂ بہار ہے یہ
گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمیں شاداب — لطیف و سرد ہوا پاک و صاف چشمۂ آب
کمی نہیں ہے کسی شئے کی اس گلستاں میں — عجب بہار ہے کچھ اس کے سرو و ریحاں میں
طلسمِ حسن کا خاکِ دکن ہے گلدستہ — بہم کھڑے ہیں شجر اور کوہ صف بستہ
مسافر آ کے جو اس جا قیام کرتے ہیں — مناظر اس کے انہیں جلد رام کرتے ہیں
بلندیوں سے جو ہو مائل نشیب نظر — فریب دیتا ہے تالاب کا حسین منظر
وہ دیکھو دور سے پانی ہے یوں نظر آتا — سفید سانپ چلا جائے جیسے بل کھاتا

اقبال الدین احمد
سابق اڈیٹر کامریڈ و ادبی دنیا

دکن کے نسوانی ادارے

عہد عثمانی میں جہاں ملک اور ابنائے ملک کی ہر جہتی فلاح و بہبود کی خاطر بیکراں مساعی عمل میں آ رہی ہیں وہاں طبقۂ نسواں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح حال کے لئے بھی ہمارے بیدار مغز سلطان العلوم کی علم پرور حکومت نے اپنی امکانی کوششیں کی ہیں اور مسلسل کئے جا رہی ہے۔

تعلیم نسواں کے سلسلہ میں جو تجاویز عمل میں آ رہی ہیں اور جو اقدامات کئے گئے ہیں انکی اہمیت اور وقعت دوسری تجاویز سے کہیں زیادہ ہے!

تعلیم نسواں کی اہمیت مردوں کی تعلیم سے بہت زیادہ ہے۔ اسی پر قوم کے ارتقا کا دار و مدار ہے۔ ہماری آنیوالی نسلوں کی تعلیم و تربیت انکی اخلاقی اصلاح اور ان کی بہتری کے لئے عورت کا صحیح تعلیم و تربیت یافتہ ہونا از بس ضروری ہے۔ عورت نصف مرد کا بلکہ ہماری قوم کا "نصف بہتر" ہے۔ اس کو جاہل اور تعلیم و تربیت سے محروم رکھکر ہم کبھی شاہراہ ترقی پر گامزن نہیں ہوسکتے۔

عہد عثمانی میں تعلیم نسواں نے ترقی کے جو مدارج طے کئے ہیں اور خواتین دکن نے اصلاح معاشرت و تمدن کی جو کوششیں کی ہیں ان کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے۔

سنہ ۱۳۲۰ ف میں جبکہ موجودہ فرمانروائے دکن نے زمام سلطنت اپنے دست مبارک میں لی صرف (۹۱) مدارس نسواں ممالک محروسہ سرکار عالی میں قائم تھے جن میں (۴۲۴۶) لڑکیاں زیر تعلیم تھیں۔ سنہ ۱۳۴۳ ف کے اعداد و شمار سے تعلیم نسواں کی ترقی کی رفتار اس طرح واضح ہوتی ہے کہ نسوانی درس گاہوں کی تعداد (۳۶ ۔) ہو گئی جن میں ساڑھے چوبیس ہزار لڑکیاں تعلیم پا رہی تھیں۔ ان مدارس میں ۶۹۶ تحتانیہ ہیں جن میں (۲۱۸۶۴) طالبات شریک ہیں۔ مدارس وسطانیہ سو ہیں جنکی طالبات کی تعداد ۲۲۰۰ ہے۔ مدارس فوقانیہ نو ہیں ان میں ۲۶۳۳ لڑکیاں ہیں۔ تعلیم نسواں پر صرف ہونے والی رقم جو ہر سال صرف ہو رہی ہے اس کا ایک معمولی سا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف ۱۳۴۳ ف میں ہماری علم دوست اور فیاض حکومت نے کوئی ساڑھے نو لاکھ روپے اس طبقہ کی تعلیم پر صرف کئے ہیں۔

ذیل میں چند سرکاری، امدادی و خانگی نسوانی مدارس اور خواتین کے اصلاحی و معاشرتی اداروں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ہم یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ عہد عثمانی میں تعلیم و تمدن نسواں نے ترقی کی منزلیں کس حسن و خوبی سے طے کی ہیں اور خواتین دکن میں تحصیل علم اور اصلاح معاشرت کے جذبات کس حد تک کارفرما ہیں۔

نامپلی زنانہ اسکول

مدرسہ فوقانیہ نسواں نامپلی کا قیام سنہ ۱۳۰۸ھ میں عمل میں آیا۔ اس وقت اسکول میں صرف سولہ لڑکیاں شریک تھیں۔ مدرسہ کی ترقی تقریباً ناپید تھی مگر سلطان العلوم کے تحت دکن پر متمکن ہوتے ہی ایک عظیم تغیر رونما ہوا۔ طالبات کی تعداد بتدریج بڑھنا شروع ہوئی چنانچہ اس وقت اس میں ۱۱۶ لڑکیاں ہیں تعلیم کے علاوہ لڑکیوں کو امور خانہ داری، دستکاری، معاشرتی سلائی، اور پکوان کی بھی باضابطہ صحیح اصول پر عملی تعلیم دی جاتی ہے۔

کلیۂ اناث

تعلیم نسواں کا معیار بلند کرنے اور طبقۂ نسواں کو اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور کرنے کیلئے ۱۳۴۳ ف میں کلیۂ اناث کا قیام عمل میں آیا۔ اس کالج کے ابتدائی اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم پانیوالی طالبات کی تعداد

نصف درجن سے زیادہ نہیں تھی۔ اسٹاف صرف ایک پرنسپل اور ایک پروفیسر پر مشتمل تھا اور اب کوئی ایک درجن خاتون پروفیسر ساٹھ ستر لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے زینے طے کرا رہی ہیں۔

وظائف تعلیمی

کلیۂ اناث کی کامیاب طالبات کو ان کی مخصوص اور امتیازی کامیابیوں کے مدنظر ہماری علم پرور حکومت سے ممالک غیر میں تکمیل تعلیم کے لئے وظائف عطا کئے جاتے ہیں اور اکثر خواتین باہر جاکر امتیازی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ خدمات پر اسی کالج میں مامور ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس وقت ایسی کئی خواتین کالج کی خدمات پروفیسری کو انجام دے رہی ہیں۔

محبوبیہ زنانہ اسکول

یہ اسکول ۱۳۱۵ف سے قائم ہے۔ اس میں سینئر کیمبرج تک تعلیم دیجاتی ہے۔ یہاں زیادہ تر امراء اور معزز طبقہ کی لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔ یہاں کی اکثر طالبات سینئر کیمبرج کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے کلیۂ اناث میں داخل ہوتی ہیں۔ اسمیں طالبات کی تعداد ۱۳۴۶ف کے آخر میں (۴۰۹) تھی۔ اس اسکول میں کمسن لڑکے بھی داخل ہوسکتے ہیں۔ علاوہ تعلیم کے دستکاری، مصوری، موسیقی، خانہ داری، سلائی اور پکوان کی بھی عملی تعلیم دیجاتی ہے۔ سادہ معاشرت کا عادی بنانے، لباس میں سادگی پیدا کرانے اور لڑکیوں کو کفایت شعار بنانے کے لئے اس اسکول کی دوراندیش اور تجربہ کار پرنسپل طالبات کو سادہ لباس استعمال کرنے اور زیورات کو ترک کرنے کی ترغیب و ہدایت دیتی رہتی ہیں۔ اسکول کی عمارت میں چند سال پہلے کافی توسیع کی گئی ہے۔ اس اسکول میں بھی ہر قسم کے میدانی کھیل، ڈرل اور جمناسٹک کا بھی انتظام ہے۔

مدارس تعلیم المعلمات

یہ اسکول خاص معلمات کو طرز تعلیم سے واقف کرانے کے لئے قائم کئے گئے ہیں۔ ان میں علاوہ (۱۰۴) طالبات کے (۹۰) معلمات بھی مصروف طرز تعلیم و تدریس ہیں۔ ان کو طرز تعلیم کے جدید طریقوں سے واقف کرایا جاتا ہے۔

ماڈل پرائمری اسکول

یہ اسکول ۱۳۴۵ف میں قائم کیا گیا ہے۔ اس میں مخلوط اسٹاف چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کو تعلیم کے لئے تیار کرتا ہے۔ یہاں باغبانی بھی سکھائی جاتی ہے۔

گرل گائیڈ

کوئی آٹھ سال سے "گرل گائیڈ" کی تحریک جاری ہے۔ اس تحریک کے بنیادی اصول انسانوں اور جانوروں کے ساتھ ہمدردی، ایک دوسرے کی تائید، مجبوروں کی فوری امداد، ذمہ داری اور خود اعتمادی ہیں۔ اس تحریک میں کلیۂ اناث، مدرسہ نسوان نامپلی، محبوبیہ زنانہ اسکول اور تعلیم نسوان کے بعض دوسرے ادارے بھی شریک ہیں۔ کھلی فضا میں سیر و تفریح کے مواقع اور معاشرتی پارٹیاں لڑکیوں کے لئے ترقی و دلچسپیوں کا باعث ہوئے ہیں۔

انجمن ترقی تعلیم و تمدن نسواں

تعلیم نسواں کی ترقی اور اعلیٰ تعلیم کی نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ خواتین دکن کی معاشرت، تمدن اور ذہنیت میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ اعلیٰ تعلیم اور صحیح تربیت پائی ہوئی خواتین علم کی خوبیوں سے واقف ہونے کے بعد اپنی ان بہنوں کو جنہیں حصول تعلیم کے ذرائع میسر نہیں علم کی برکات سے واقف کرانے اور روشن خیال بنانے کی پوری کوشش کر رہی ہیں۔ اسی خیال کے تحت یہ انجمن ۱۹۲۷ء میں قائم کی گئی ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ سماجی اور معاشرتی اصلاحات کا تبلیغی کام بھی یہ انجمن بحسن وجوہ انجام دے رہی ہے۔ اس انجمن کی صدر محترمہ بیگم صاحبہ نواب ولی الدولہ اور نائب صدر مشہور پارسی خاتون مسز رستم جی فریدون جی ہیں۔ ان دونوں روشن خیال اور ملک و قوم کا درد رکھنے والی معزز خواتین کی سرپرستی میں یہ انجمن خوب پروان چڑھ رہی ہے۔ اشاعت تعلیم، اصلاح معاشرت و رسم و رواج کے مختلف اصول اور طریقے اس انجمن کے پیش نظر ہیں۔ یہ انجمن متعدد

زنانہ مدارس کی امداد اور نگرانی کرتی ہے۔ غریب اور شوقین لڑکیوں کو وظائف تعلیمی بھی اس انجمن سے دئے جاتے ہیں۔ اس انجمن کے تحت پانچ مدارس قائم ہیں۔ ان میں تقریباً چار سو بچوں کو مفت ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔

دارالاقامہ | اس انجمن کی سرپرستی میں ایک دارالاقامہ شہر [illegible] میں قائم کیا گیا ہے [illegible] بلحاظ مذہب و ملت قیام کر سکتی ہیں، یہ اقامت خانہ خاص طور پر ان غریب خواتین کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے [illegible] تعلیم [illegible] حاصل کرتی ہیں اور ختم تعلیم پر مختلف مدرسوں اور ہسپتالوں میں ملازم ہوتی ہیں۔

دارالمباحثہ | اس انجمن کے زیر سایہ ایک دارالمباحثہ بھی قائم ہے۔ اس میں تعلیم یافتہ خواتین تقریری مقابلے کرتی ہیں اس قسم کے تقریری مقابلوں سے خواتین میں علمی ذوق پیدا کرنے کے علاوہ تقریر کرنے کی قابلیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس سال دارالمباحثہ کی جانب سے ایک دلچسپ مناظرہ [illegible] ہوا اس جلسہ میں متفقہ آراء سے یہ طے ہوا کہ ہندوستان میں بچوں کی پرورش کا موجودہ طریقہ ناقابل اطمینان ہے۔

ذیلی کمیٹیاں | اس انجمن کی کئی ذیلی کمیٹیاں ہیں جو خواتین کے حقوق کی حفاظت [illegible] اور ان کی جسمانی اور اخلاقی بہتری کے لئے مناسب تجاویز عمل میں لاتی ہیں۔ تقریروں کے ذریعہ اس انجمن کی اراکین اپنی بہنوں کو ان کے حقوق اور فرائض سے [illegible] کرتی ہیں [illegible] ان کو اپنی صحت درست رکھنے کی جانب بطور خاص متوجہ کرتی ہیں۔ ایک کمیٹی عورتوں کی قانونی و شادیوں پر غور کرنے کے لئے [illegible] اس کمیٹی کا ایک عام جلسہ ہوا جس میں کئی اداروں کی مسلم خواتین شریک ہوئیں۔ اس جلسہ میں وہ "نکاح نامہ" پیش کیا گیا جو [illegible] علی خان [illegible] خواتین کی کانفرنس نے مرتب کیا ہے یہ نکاح نامہ ایک اقرار نامہ کی شکل میں ہے جس میں مسلم خواتین کو تحت قانون شرع طلاق کا حق دیا گیا ہے۔ [illegible] جلسہ خواتین نے متفقہ آراء اس نکاح نامہ کو منظور کیا۔

اس انجمن کو کل ہند خواتین کی کانفرنس کی مستقل کمیٹی نے حیدرآباد کی خواتین کی نمایندہ انجمن تسلیم کر لیا ہے اس انجمن سے [illegible] نمایندے سالانہ کل ہند کانفرنس کے جلسوں میں بھیجے جاتے ہیں اور کانفرنس کی مستقل کمیٹی میں اس انجمن کا ایک رکن حیدرآباد کے نمایندے کی حیثیت سے شریک رہتی ہے۔

دی گرلز اسکول کوآپریٹیو بلڈنگ سوسائٹی لمیٹڈ | مسز [illegible] کی صدارت میں چند ذمہ داروں کی ایک سوسائٹی زنانہ مدارس کی عمارتوں کی تعمیر کے لئے [illegible] میں قائم کی گئی ہے۔ اس سوسائٹی کا مقصد یہ ہوا کہ عمارتیں غریب لڑکیوں کے مدارس کے لئے مختلف مقامات پر تعمیر کرنا ہے چنانچہ ایک ایسی ہی عمارت خیریت آباد میں تعمیر کی گئی ہے جس میں ایک اسکول قائم ہے۔

زنانہ کلب | گزشتہ چند سال کے اندر حیدرآباد اور سکندرآباد میں خواتین کے کئی کلب قائم ہو گئے ہیں۔ ان کے لئے نہایت کشادہ اور شاندار عمارتیں تیار کی گئی ہیں۔ پردہ کے عمدہ انتظام کے ساتھ کلب کی اراکین مختلف قسم کے کھیل و تفریحات سے مستفید ہو رہی ہیں کھیل اور تفریح کے علاوہ تقاریر کے ذریعہ دماغی اور اخلاقی ترقی بھی ہو رہی ہے۔

لیڈیز اسوسی ایشن کلب | اس کلب کی بنا کسی زمانہ میں مسز [illegible] جنگ مرحوم نے ڈالی تھی۔ اس وقت یہ کلب نہایت اعلیٰ پیمانہ پر قائم ہے، اس کی صدر لیڈی حیدری ہیں، جن کی نگرانی میں اس کی شاندار اور خوبصورت عمارت تیار ہوئی۔ اس کلب کے اراکین کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ ہے اس کلب کی جانب سے ہر سال وظائف و طلائی میڈل ان طالبات کو عطا کئے جاتے ہیں جو انگریزی اور اردو کے مضامین میں نمایاں کامیابی حاصل کرتی ہیں۔ غریب لڑکیوں کو تعلیمی وظائف بھی دئے جاتے ہیں۔ اس کلب کی اراکین مختلف تفریحات اور میدانی کھیلوں کے علاوہ تقریری مقابلوں میں بھی شریک ہوتی ہیں۔

لیڈیز ریکریشن کلب | گزشتہ چند سال سے یہ کلب قائم ہے، اس کی صدر [illegible] راجونت بہادر ہیں۔ اس کے اراکین کی تعداد تقریباً دو سو ہے میدانی

کلبوں اور دوسری تفریحگاہوں کے علاوہ اس میں ایک تیرنے کا تالاب بھی ہے جس میں خواتین تیراکی کا شوق بھی پورا کرتی ہیں

متذکرہ صدر اداروں کے علاوہ خواتین کی اور کئی انجمنیں بھی ہیں مثلاً انجمن خواتین دکن، انجمن خواتین اسلام، مدرسہ خواتین کی انجمن، گجراتی خواتین کی انجمن، عیسائی خواتین کی انجمن، بہبودی اطفال کے متعدد مراکز وغیرہ ۔

انجمن خواتین دکن | خواتین کی انجمنوں میں اس انجمن کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ یہ انجمن ۱۳۳۶ھ ہجری میں مسنر صغرا ہمایوں مرزا کی صدارت میں قائم ہوئی۔ اس انجمن کی سرپرست رانی شام راج راجونت بہادر ہیں۔ اس انجمن کے مقاصد میں ہر مذہب و ملت کی غریب و شریف خواتین کی مدد کرنا، غریب لڑکیوں کی شادی میں امداد دینا، بیوہ عورتوں اور نادار لڑکیوں کو دستکاری سکھانا، معذور عورتوں کو ماہانہ امداد وظائف کی شکل میں دینا، ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینا، فضول رسم و رواج کو ترک کرانا ہے ۔

اس انجمن کی کامیابیاں زیادہ تر محترمہ صغرا ہمایوں مرزا کی عالی ہمتی و ایثار کی مرہون منت ہیں۔ اس انجمن نے اب تک کئی کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ تقریباً بیس معذور و بے یار و مددگار عورتوں کو ماہانہ امداد دی جاتی ہے۔ اس انجمن کی زیر نگرانی تازہ صنعت و حرفت کا ایک مدرسہ قائم ہوا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہوگا جس میں ابتدائی تعلیم کے ساتھ دستکاری، امور خانہ داری اور مختلف فنون کی عملی تعلیم کا خاص انتظام کیا جائے گا۔ محترمہ صدر انجمن نے بڑی فیاضی سے اپنی جائیداد کا بڑا حصہ اس ادارہ کے لئے وقف کر دیا ہے۔ انجمن کی سرپرستی میں ہر سال دستکاری اور پکوان کی نمائش کی جاتی ہے۔ اس نمائش میں تعلیم نسواں کے مختلف ادارے حصہ لیتے ہیں۔ اس انجمن کی نگرانی میں اس وقت تین زنانہ اسکول قائم ہیں۔ غرضکہ اس انجمن کی کارگزاریاں دیکھنے کے بعد مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں بھی ایسی حساس خواتین موجود ہیں جو اپنی صنف کی تن من دھن سے خدمت کر رہی ہیں ۔

بستان طالبات | یہ ادارہ کوئی دس سال سے قائم ہے۔ اس میں یتیم بے یار و مددگار لڑکیوں کے قیام و طعام کا انتظام کیا جاتا ہے اور ان کو تعلیم و تربیت کے ساتھ امور خانہ داری، سوزن کاری اور پکوان وغیرہ کی عملی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس وقت اس میں کوئی چالیس یتیم لڑکیاں زیر پرورش ہیں۔ اس ادارہ کی معتمد محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ بانو نظامی ہیں۔ علاوہ یتیم لڑکیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے پردہ کرنے والی مفلس بیوہ عورتوں کی امداد بھی کی جاتی ہے۔ سلائی کا کام ان کے لئے فراہم کیا جاتا ہے اور اجرت پر ان سے کام لیا جاتا ہے اور ان کو کشیدہ کاری اور سلائی کی تعلیم بھی مفت دی جاتی ہے ۔

چند خانگی ادارے | چند خانگی مدارس بعض حساس اور ہمدرد ملک و قوم خواتین کی سرپرستی اور نگرانی میں قائم ہیں۔ بیگم سید رحمت اللہ صاحب پروفیسر نظام کالج نے ایک خانگی اسکول اپنے مکان پر ملازمین کی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے قائم کیا ہے جس میں سلائی کی تعلیم وہ خود دیتی ہیں۔ مسز امیر حسن صاحب نے ایک ایسا ادارہ اپنی قیام گاہ جوبلی ہل پر قائم کیا ہے جس میں صرف بیچارہ عورتوں کو سلائی اور کشیدہ کاری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مسز نندی نے اپنے مکان پر ایک مختصر سا اسکول اپنے نوکروں کی اولاد کے لئے قائم کیا ہے جنکو وہ خود تعلیم دیتی ہیں ۔

متذکرہ صدر اعداد و شمار سے واضح ہوگا کہ خواتین دکن میں بیداری کے احساسات کس حد تک پیدا ہو گئے ہیں اور اس طبقہ نے ہمارے آقائے ولی نعمت کے عہد میمنت مہد میں اپنی ہر جہتی فلاح و بہبود کے لئے کیسے کیسے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ تعلیمی، ذہنی و معاشرتی ترقی کے زینے کس حسن و خوبی سے طے کئے جا رہے ہیں۔ ترقی کی اس رفتار کو دیکھ کر دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ طبقہ مستقبل قریب میں ذیل کے مدارج طے کر کے بہت جلد بام ترقی پر پہنچ جائیگا۔ تعلیم نسواں کی یہ رفتار پیش خیمہ ہے اس طبقہ کے درخشاں مستقبل کا۔ وہ دن دور نہیں کہ ہماری ملکی بہنیں دوسرے ممالک متمدنہ کی خواتین کی طرح زیور علم سے آراستہ اور صحیح تربیت یافتہ ہو کر علم کی روشنی سے جہالت کی تاریکی کو ملک سے دور کر دیں گی ۔

مرزا یوسف علیخاں

دنیا کا سب سے بڑا ہیرا ہے، کیونکہ اس کا وزن (۵۳۹) قیراط[۲] ہے۔

"الماس نظام" کے ابتدائی تاریخی واقعات کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہ ہیرا نواب میر فرخندہ علی خاں بہادر آصفجاہ رابع کے عہد حکومت میں، دستیاب ہوا تھا۔ صاحب گلزار آصفیہ نے (جو اس دور کے معتبر ترین مورخ سمجھے جاتے ہیں، اور جنھیں ایک عرصہ تک دربار شاہی کے تقرب کا بھی اختصاص حاصل رہا) اس کے حالات کی تحقیق میں، جو غالباً اُن کے چشم دید ہیں، یہ بیان کیا ہے کہ قصبہ جٹ پول میں ایک بقال رہتا تھا، معلوم نہیں کہ یہ الماس اُسے کہاں سے ہاتھ لگا، مگر اس نے اس کی حفاظت بگاڑے کے سنگ میں چھپا کر اپنے ہی گھر میں، زمین میں دفن کر کر رکھی تھی، اور اس کے ساتھ اُس کی فرد کیفیت بھی اُسی سنگ میں لکھ چھوڑی۔ چند دنوں بعد وہ مر گیا، اور اس کا حال کسی کو نہ بتا گیا، چنانچہ یہ ہیرا اسی طرح دو سو برس تک زمین ہی میں پوشیدہ رہا، اور اس دو صدی کے امتداد نے اس کے مکان کو کہنہ و افتادہ کر کے ویران کر دیا، اور محض کھنڈر ہی باقی رہا تھا۔ اتفاق سے کسی نے اس زمین کو خرید کر، اس پر مکان بنانا شروع کیا، کھنڈر کی صفائی وغیرہ اور پایہ کھودنے کی وجہ سے اس مکان کی مٹی دوسری طرف منتقل ہوتی رہی، یہاں تک کہ اس زمین کا وہ دفن شدہ سنگ بھی جس میں کہ ہیرا چھپا تھا سارے خس و خاشاک کے ساتھ پھینک دیا گیا اس لئے کہ ایسی حقیر چیز کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی اور اس کے راز اور بھید سے کون واقف تھا

اس کے بہت دنوں بعد ۱۲۴۳ھ میں اسی قصبہ کا ایک کمہار برتن بنانے کے لئے مٹی کی خاطر اس مقام پر پہنچا اور یہاں اس نے خاک میں دبی ہوئی ایک سنگ پائی صرف اس خیال سے کہ زمین کھودنے اور مٹی حاصل کرنے میں اس سے سہولت ہوگی اٹھا لی، جب اسے صاف کرنے لگا تو اس سنگ میں اس کو ایک خوبصورت مگر بے رونق پتھر نظر پڑا چونکہ وہ ایک گنوار تھا، اس لئے اس نے اس "سنگ رنگین" کو کوئی اہمیت نہ دی۔ مٹی ساتھ لادی اور اس پتھر کو بھی اپنے بچوں کے کھیلنے کے لئے رکھ لیا۔ چنانچہ گھر پہنچ کر اس نے اس پتھر کو اپنی لڑکی کے حوالہ کیا اور لڑکی اس کی رنگینی و دل آویزی کو دیکھ کر ہیرا لئے خوش خوش باہر نکلی، اپنے ساتھ کھیلنے والے بچوں کو جمع کیا اور ان بچوں نے دوڑ دوڑ کر سیتاپھل (شریفوں) کے بیج اکٹھے کئے۔ خود بیٹھی ترازو کے ایک پلڑے میں یہ رنگین پتھر رکھے بیجوں کو اس کا ہم سنگ کرتی، اور سارے بچوں میں انھیں تقسیم کرتی جاتی تھی۔

ان ہی دنوں سے چند روز پہلے، لڑکی کی ماں نے اپنے گاؤں کے ایک سنار سے، اس لڑکی کے لئے کسی زیور کے تیار کرنے کی فرمایش کی تھی، اتفاق سے وہ اسی دن چاندی لینے کے لئے اس کے گھر آیا، تو لڑکی کو گھر کے پہلو میں چند بچوں کے ساتھ بیٹھے

---

[۲] "الماس پٹن" نامی ایک اور ہیرا ہے، پٹن ایک علاقہ کا نام ہے، جہاں کا حاکم راجہ پٹن کہلاتا ہے، چونکہ یہ الماس اسی کے قبضہ میں ہے، اسی لئے اس نام سے مشہور ہوا۔ یہ ہیرا ابھی ناتراشیدہ بیضوی شکل کا ہے، جس کا وزن (۱۰۲) قیراط یعنی ۲۱½ ماشہ ہے، جوہریوں نے اس کی قیمت دو کروڑ سے زیادہ قرار دی ہے، تو اس لحاظ سے غور فرمائیے کہ "الماس نظام" کس قیمت کا ہوگا، جو اس سے (۱۰۲) قیراط زیادہ وزنی ہے "کوہ نور" جیسا مشہور ترین ہیرا تو غالباً بارہویں نمبر پر شمار ہوتا ہے، جس کا وزن ۱۰۶½ قیراط اور قیمت چودہ لاکھ ہے، صرف اس کو اس کی تاریخی حیثیت سے اتنی بڑی شہرت نصیب ہوئی۔ ورنہ اس کا قیمت و وزن کے لحاظ سے کوئی درجہ نہیں۔

اس بے نظیر پتھر سے کھیلتے ہوئے پایا، اور اس نے اپنی واقفیت کی بنا پر اس پتھر کی حقیقت سمجھ لی کہ یہ ایک بے بدل آب دار ہیرا ہے، دوسرے دن جب کہ کمہار کے گھر کوئی نہ تھا، سنار موقع پاکر اپنے ساتھ مٹھائی لے آیا، اور نہایت عاجزی کے ساتھ لڑکی کو سمجھا منا کر مٹھائی دی اور اس سے وہ پتھر مانگنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کچھ ضدی تھی۔ اس کی اس طلب پر برہم ہوگئی، اور غصہ میں فوراً بھاگ کر گھر دوڑی چلی آئی، اور کمرے میں جاکر ہیرے کو طاق پر رکھ دیا۔ جب ماں آئی تو سارا قصہ بیان کیا کہ فلاں سنار نے مجھے مٹھائی دی، اور اس پتھر کو بڑی عاجزی سے مانگنے لگا، لیکن میں نے اسے نہ دیا، ماں نے یہ خیال کیا کہ وہ شاید چاندی تولنے کے لیے اس کو مانگ رہا تھا اس لیے اس نے اس پتھر کو ایک پوشیدہ مقام پر چھپا دیا۔ جب دوبارہ سنار آیا اور اس نے لڑکی سے وہ پتھر مانگا تو ماں کو معلوم ہوگیا، اس نے سنار سے کہا معلوم نہیں کہ اس دیوانی بچی نے اسے کہاں کھو دیا۔ سنار یہ سن کر بے قرار ہوگیا، اور کہنے لگا کہ "افسوس تو نے یہ کیا کیا؛ اری وہ تو ہیرا تھا!! اگر تو مجھے دے دیتی تو میں تجھے تیرے منہ مانگے پیسے دیتا۔" جب لڑکی کا باپ آیا تو ماں نے یہ سارا قصہ اسے کہہ سنایا، اس پتھر کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد کہ یہ ہیرا ہے شاید کمہار زرگر سے ملا، اور ان دونوں میں بعد تصفیہ یہ طے پایا کہ وہ اس معاملہ کو انتہائی پوشیدہ رکھیں گے، اور آپس میں نصف نصف تقسیم کرلیں گے۔ چنانچہ بہ ہزار دقت ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اسے توڑا اور ہیرے کا وہ حصہ جس کو سنار نے اپنے پسند کیا تھا، اس کے دو تین ٹکڑے ہوگئے اور وہ حصہ جو کمہار کے لیے مختص تھا محفوظ رہا اور یہی ٹکڑا وزن میں پختہ چھ تولے پانچ ماشے تھا۔[1] صاحب گلزار آصفیہ لکھتے ہیں کہ یہ اپنی تمام و کمال حالت میں گیارہ تولے تھا

سنار اپنے حصے کے ٹکڑوں کو لے آیا، اور دوسرے سناروں کے ہاتھ ایک ایک کرکے فروخت کردیا۔ اس خرید فروخت کی شہرت ہونے لگی، اور ہوتے ہوتے وہاں کے زمیندار تک بھی پہنچی، تو اس نے اس سنار کو گرفتار کرا لیا، اور اس پر سختیاں کرکے اس ہیرے کی تحقیقات کی، واقعات کے معلوم ہونے پر ان سب سناروں اور اس کمہار کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان دنوں، اس علاقہ کی تعلقداری پر چھیا راؤ نامی ایک شخص مامور تھا۔ اس نے اس الماس کی ساری حقیقت مدار المہام وقت مہاراجہ چندولال بہادر کو لکھ بھیجی۔ مہاراجہ نے محمد قمرالدین بعدار مندوزی کو جو تعلقدار [illegible] تھے، چھیا راؤ کے ہمراہ اس زمیندار کے پاس بھیج کر اسے طلب کیا۔ زمیندار نے، نوبت و نقارہ، اور [illegible] کے لیے بطور آل تمغہ سرفراز ہونے کی شرط پر اس ہیرے کو مہاراجہ بہادر کے حوالے کر دیا۔ مہاراجہ صاحب نے حضور [illegible] میں گذرانا، اور اسے حسب وعدہ اعلیٰ حضرت سے عرض کرکے جاگیر سے سرفراز کیا۔ جوہریوں نے اس نادر العصر قسم کو دیکھ اور پرکھ کر، بالاتفاق عرض کی کہ یہ الماس عجائبات روزگار سے ایک لاقیمت چیز ہے۔ کسی ملک میں ہم نے ایسا نادر روزگار، اس قدر بڑا ہیرا دیکھا اور نہ سنا۔ اور ایسے جوہر نایاب کی قیمت لگانے سے ہم عاجز ہیں

ہند اور ولایت، ایران کے حکاکوں کو اس الماس کی تختیاں تراشنے کے لیے حکم ہوا تو ان لوگوں نے اس کی مزدوری پانچ لاکھ روپئے طلب کی اور کہا کہ ہم اس الماس سے سات عمدہ باریک اور شفاف تختیاں تراش کر گزرانیں گے کہ جن کے آگے "دریائے نور" اور "کوہ نور" بے رونق و بے آب نظر آنے لگیں گے۔ غالباً حضور نے اجرت کی زیادتی کی وجہ سے منظور نہیں فرمایا۔ یہ جس حالت میں دست یاب ہوا تھا، اسی طرح جواہرخانہ میں محفوظ کرلیا گیا۔[1]

---

[1] گلزار آصفیہ صفحہ ۶۰۰ مؤلفہ حکیم غلام حسین خاں مطبوعہ مطبع محمدی ۱۳۰[illegible]

"تاریخ ریاست حیدر آباد دکن" کے مولف نجم الغنی خاں رام پوری نے اپنی کتاب کے صفحہ انیس[1] پر اس ہیرے کے تراشنے کی اجرت پچاس ہزار لکھی ہے۔ جو درست معلوم نہیں ہوتی۔[2]

"آئینہ جواہر" کا مولف کہتا ہے کہ اس ہیرے کا شمار دنیا کے بڑے بڑے ہیروں میں ہے۔ اور نظام حیدر آباد کے پاس رہنے کی وجہ سے "الماس نظام" سے مشہور ہوا ہے۔ اس کا وزن (۲۴۰) قیراط یعنی ۴۴ ماشہ[3] ہے۔ یہ کان گولکنڈہ سے برآمد ہوا تھا۔ اور ۱۸۳۵ء میں ایک شخص کے پاس بطور کھلونے کے تھا۔ ایک اور روایت یہ نقل کی ہے کہ کسی سوار نے اسے ایک مٹی کے برتن میں پایا تھا۔ جو بعد کو ایک ہندو زرگر کے ہاتھ لگا اور اس نے اس کی آزمایش کے لئے کہ یہ ٹوٹ سکتا ہے یا نہیں اس پر ضرب لگائی جس کی وجہ سے اس کے تین ٹکڑے ہو گئے۔[4] اس کی شکل ایک چینی عورت کے پاؤں کی طرح ہے جس کا انگوٹھا نہ ہو۔[5]

کنگ صاحب (Mr King) نے بھی اس کی شکل و شباہت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ناتراشیدہ الماس ہے۔ اسی شکل کا اس کے تاریخی حالات لکھنے میں انھوں نے بھی سخت غلطی کی ہے۔ اور ہمارے نزدیک ان کے ایسے مشہور ماہر و نقاد کے بیانات بھی قابل اعتبار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "کسی حادثہ سے ہندوستان کے غدر میں اس سے ایک ٹکڑا علیحدہ ہو گیا۔ اور اس کا وزن (۲۴۰) قیراط ہے۔" بعضوں نے شک ظاہر کیا ہے کہ کنگ صاحب نے اس امر کی کوئی صراحت نہیں کی کہ آیا یہ وزن اس الماس کے ٹوٹنے سے قبل کا ہے یا بعد کا؟ ایک اور انگریز ڈیولے فیٹ (Dieula Fait) کا بیان ہے کہ اس کا وزن اس کے ٹوٹنے سے پیشتر (۲۴۰) قیراط سے کم نہ تھا۔ مبصرین کے نزدیک صاحب گلزار آصفیہ کے سے معتبر مورخ کے آگے ان لوگوں کے گمانوں اور مختلف بیانوں کی کوئی وقعت نہیں۔ اس لئے کہ انھوں نے وزن کی تصریح صاف طور پر کر دی ہے۔ بارٹ نامی ایک ماہر نے اس فرضی وزن کی بنا پر اس کی قیمت (۵) لاکھ ڈنیک لکھی ہے جو بیس لاکھ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

"آئینہ جواہر" کا مولف امرناتھ کہتا ہے کہ اس ناتراشیدہ الماس کی قیمت ٹھیک ٹھیک نہیں کہی جا سکتی۔ کیونکہ کاٹنے کی وجہ سے ناتراشیدہ الماس اکثر وزن میں کم ہو جایا کرتے ہیں۔ لیکن نیم تراشیدہ حالت میں اس الماس نظام کی شکل چنداں بے ڈھب بھی نہیں۔ البتہ کٹوانے میں نصف سے زیادہ کے نقصان کا احتمال نہ ہوگا۔ تا حال یہ الماس نظام حیدر آباد کے جانشینوں کے پاس خیال کیا جاتا ہے۔[6]

---

[1] تاریخ ریاست حیدر آباد دکن مطبوعہ نول کشور پریس ۱۹۳۰ء۔

[2] صاحب گلزار آصفیہ نے جو وزن چھ تولے پانچ ماشہ لکھا ہے اس کے کل (...) ماشے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ وزن غلط اور ناقابل تسلیم ہے اور مولف موصوف کا ہی بیان بہت زیادہ قابل اعتبار ہے۔ ۱۲

[3] آئینہ جواہر کے مولف نے غالباً یہ قصہ انگریزی کتابوں سے لیا ہے اور انگریز محققین نے بلا تحقیق جس طرح روایت در روایت سنا تھا۔ اسے اپنی کتابوں میں قلم بند کر لیا گویا حقیقۃً ان لوگوں نے غلط لکھا ہے۔ مگر گلزار آصفیہ کے ہی واقعہ کی الٹ پھیر ہے۔ اور ان غلط قصوں ہی سے صاحب گلزار آصفیہ کی تحقیقات اور سچائی کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہے۔ کمہار کے بجائے مٹی کے برتن کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاید مولف ظرف کہہ کر مظروف کا قاعدہ تو مراد نہیں لے رہے ہیں۔ سوار کا اس ہیرے کو پانا بالکل غلط ہے۔ البتہ ایک ہندو زرگر اور اس کے تین ٹکڑے ہو جانا یہ صحیح ہے۔

[4] آئینہ جواہر مصنفہ پنڈت امرناتھ، حاشیہ صفحہ ۱۶۴ مطبوعہ خادم التعلیم پریس لاہور ۱۹۱۳ء

[5] آئینہ جواہر ص ۱۶۴

رہبر فاروقی

تاش کا منڈپ باندھا جاتا ہے۔ منڈپ باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو شگل ہے یعنی منڈوے چڑھے تو گویا منڈپ تو منڈوہ ہے اور بیل آل اولاد کی جو آگے چڑھے گی۔ بعض بعضوں میں تو اب تک لکڑیوں کو رنگ کر سبز سبز پتوں سے منڈپ باندھا جاتا ہے۔ مگر امیروں اور صاحب استطاعت لوگوں نے منڈوے سے منڈپ اس طرح بنا لیا ہے۔ اسی منڈپ کے نیچے ایک لال رنگ کی "پاؤں گھڑی" یعنی پا انداز بچھاتے ہیں تاکہ سمدھنیں منڈپ کے نیچے اور اس پاؤں گھڑی پر سے چلتی ہوئیں دالان میں داخل ہو سکیں۔ منڈپ کے نیچے دلہن کی کوئی ایک ان بیاہی رشتہ دار لڑکی چاندی کی کٹوری میں صندل لے کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اور جب سمدھنیں آنا شروع ہوتی ہیں تو ہر سمدھن کو "صندل ہاتھ" دیا جاتا ہے۔ صندل ہاتھ دینے کا طریقہ یہ ہے کہ صندل کی کٹوری میں چار انگلیاں ڈبو کر ہر سمدھن سے اس طرح ہاتھ ملایا جائے کہ اس کے ہاتھ میں ہی صندل لگ جائے کہ یہ نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ انہی آنے والی سمدھنوں میں اگر کوئی سمدھن "امید" سے ہوں تو وہ منڈپ کے نیچے نہیں آسکتیں اور نہ ان کا گود بھرا جاتا ہے وجہ یہ ہے کہ قدرتاً نو دان کا گود بھر جانے والا ہے۔ اب اگر گود بھرا جائے گا تو وہم یہ ہے کہ بچہ ضائع ہو جائے گا۔ اور گود خالی ہو جائے گا۔ اسی طرح چونکہ منڈپ میں بھی گود ڈالا جاتا ہے اس لئے یہ اس کے نیچے بھی نہیں جا سکتی منڈپ میں گود اس لئے ڈالتے ہیں کہ منڈپ ایک ایسا منڈوہ ہے جس پر آل اولاد کی بیل چڑھتی ہے۔ گود میں پان شریک ہوتے ہیں اور پان کی بیل ہوتی ہے اس لئے ابتداء ہی سے گویا منڈپ میں گود ڈال کر بیل چڑھا دی جاتی ہے۔ تاکہ آئندہ آل اولاد کی بیل ہمیشہ ہری بھری اور چڑھتی ہی رہے

منڈپ کے قریب ہی ایک طرف میراثنیوں کا طائفہ بیٹھا ہوا گاتا رہتا ہے۔ ان لوگوں کے گانے بہت و تفنیہ ہوتے ہیں۔ ہر موقعہ اور رسم کے لحاظ سے یہ لوگ مخصوص گانے گاتے جانتے ہیں۔ ان کے گانے اپنے اپنے وقت پر درج ہوں گے۔ چنانچہ جس وقت سمدھنیں آتی ہیں تو میراثنیں یہ مخصوص گانا گاتی ہیں۔

ساجن آئی رے اللہ پیر منائی رے

میری ساجن آئی رے

جب سمدھنیں دالان میں گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتی ہیں تو انھیں "مصری چنائی" جاتی ہے۔ دو مامائیں سمدھنوں کے سر پر ایک تاش کا مسالا ٹکا ہوا دوپٹہ پکڑ لیتی ہیں اور دلہن کی ایک سہاگن رشتہ دار بیوی چاندی کی طشتری میں مصری کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں جن پر چاندی سونے کا ورق لگا ہوا ہوتا ہے لاتی ہیں اور ہر سمدھن کے آگے باری باری سے پیش کرتی ہیں ہر سمدھن ایسے موقعہ پر شرم اور جھینپ کا اظہار ضرور کرتی ہے خواہ یہ فطرتاً ہو یا رسماً بہرحال رسم کی پابندی انھیں ضرور کرنی پڑتی ہے۔ وہ لڑکیاں جو ناکتخدا ہیں مصری لینا تو کجا آنکھ تک اُدھر نہیں اٹھاتیں۔ مگر مصری لانے والی بیوی جبر و قہر اور زور و زبردستی کے ساتھ ان کے منہ میں مصری ٹھونس ہی دیتی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ فقرے بھی کستی جاتی ہیں جس سے وہ بیچاری تو مارے شرم کے عرق عرق ہوتی جاتی ہے اور اِدھر خوب فرمائشی قہقہے اڑتے ہیں۔ مصری چنائی جاتے وقت میراثنیاں گاتی ہیں

سمدھن میری مصری کھاوے

اس کے بعد گانا شروع ہوتا ہے۔ ٹھمری۔ دادرا غزل وغیرہ جب میراثنیں گا چکتی ہیں تو دلہن کو لاڈ کی جلدی شروع کی جاتی ہے۔ اِدھر تو جلدی ہوتی ہے اور اُدھر دلہن کو سنوارا جاتا ہے۔ دلہن بیچاری کا شروع شادی سے اخیر شادی تک

پنے اوپر کوئی اختیار نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ اپنی آنکھوں کو بند رکھے باقی جملہ کام اوپر والے جو چاہتے ہیں کر لیتے ہیں۔
دلہن کو کسی ایک قسم کا قیمتی جوڑا کپڑوں کا پہنایا جاتا ہے اور وہ زیور بھی جو دلہن کو جہیز میں دیا جانے والا ہے۔ پہنا دیتے ہیں آنکھوں پہ "آرائش" لگاتے ہیں۔ یعنی باریک کٹے ہوئے منقش سے افشاں چنا جاتا ہے۔ سرمہ لگایا جاتا ہے۔ اور ایک لمبا سا گھونگھٹ کھینچ کر کوئی ماما، انا، دوا یا چھوکری دلہن کو گود میں اٹھا کر باہر اس زردوزی مسند پر لا بٹھاتی ہے جو دالان میں منڈپ کے نیچے اسی رسم کے لئے بچھائی جاتی ہے۔ ایک مخصوص گیت ہوتا ہے جو ایسے وقت میں میراثنیاں نہایت جوش میں گاتی رہتی ہیں۔ اس وقت کا سماں قابل دید اور اس وقت لوگوں کے جذبات دیکھنے کی چیز۔ میں سب سمدھنیں خاموش دلہن کے کمرے کی طرف نگاہیں لگائے سراپا انتظار اور مجسم اشتیاق بنی بیٹھی ہوتی ہیں۔ جیسے ہی دلہن نظر آتی ہے۔ میراثنیوں کا جوش اور بڑھ جاتا ہے۔ سمدھنوں کے چہرے پھول کی طرح کھل جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ تبسم، ہنسی سے بدل جاتا ہے۔

آئی بنو آئی ۔ ہریالی بنو آئی
اماں کی پیاری بنو آئی باوا کی پیاری بنو آئی
آئی بنو آئی

کا گیت سمدھنوں میں ایک عجیب جوش و خروش پیدا کر دیتا ہے۔ باہر نوبت نوازی شروع ہوجاتی ہے اور اب رسم شروع ہوتی ہے۔ رسم دولہا کی سہاگن پھوپی یا چچی کو کرنا پڑتا ہے۔ دولہا کی والدہ ان سے نہایت عجز و انکسار اور منت کے ساتھ کہتی ہیں آپ بزرگ ہیں۔ اگر آپ کے ہاتھ سے یہ "کاج" ہوجائے تو میری خوش نصیبی ہے۔ خدا آپ کی چھاؤں (سایہ) دلہن پر بھی ڈالے اور دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ اگر دولہا کے رشتہ داروں میں سے کوئی بزرگ نہ ہو اور خود دولہا کی ماں سہاگن ہوں تو رسم کرنے بیٹھتی ہیں۔ رسم کرنے کے لئے سہاگن کا ہونا ضروری ہے۔
کشتیاں اور چنگیر جو دولہا کے گھر سے آتے ہیں وہ مسند کے قریب رکھ دئے جاتے ہیں۔ رسم کرنے والی بیوی پہلے اپنے گلے کو صندل لگاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ خود سہاگن ہیں اور پھر وہ سہاگن جن کا سہاگ بہت قدیم ہے مطلب یہ کہ ان کی طرح دلہن کا بھی سہاگ تادیر قائم رہے۔ اپنے گلے کو صندل لگا لینے کے بعد دلہن کے گلے۔ سینہ اور پیٹھ پر صندل لگا کر سات۔ نو یا گیارہ سہاگنوں کو بھی بہ ترتیب متذکرہ صندل لگایا جاتا ہے۔ اگر دلہن کی بہن ہو تو پھر دلہن کو صندل لگانے کے بعد علاوہ سہاگنوں کے اُن بیاہی لڑکیوں کو بھی صندل لگایا جاتا ہے تاکہ ان کی شادی بھی جلدی ہوجائے۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ رسم ہوتے وقت اگر کوئی چھینک دے تو رسم تھوڑی دیر کے لئے روک دیا جاتا ہے۔ حالانکہ چھینکنے کے بعد مسلمان الحمد للہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ تاہم اس کو کسی کام کی ابتدا میں منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح باہر نکلتے وقت کوئی چھینک دے یا کوئی سامنے آجائے یا ٹھوکر لگ جائے تو تھوڑی دیر کے لئے باہر جانا موقوف ہوجاتا ہے۔ کیونکہ یہ ناکامیابی کی علامت ہے بجائے اس کے اگر کوئی مہتر یا کوئی شخص "دہی" لے کر سامنے آجائے تو کامیابی یقینی سمجھی جاتی ہے۔
صندل لگاتے وقت میراثنیں گاتی ہیں۔

صندل لگاؤ ہریالی بنو کو۔ راج دلاری بنو کو

منسل لگا چکنے کے بعد گود بھرے جاتے ہیں۔ پیار کے ساتھ رسم کرنے والی بیوی اپنا گود بھر لیتی ہیں۔ اس کے بعد دلہن کا گود چاندی کی سپیاری اور چاندی کے لڈو سے حسب مقدور روپیہ رکھ کر بھرا جاتا ہے۔ دلہن کے قریب دلہن کی ایک رشتہ دار سہاگن بیٹھتی ہیں۔ شرم کی وجہ سے دلہن جھکی ہوئی بیٹھتی ہے۔ اس لیے یہ بیوی دلہن کا سر بھی تھامے ہوئے رہتی ہیں اور موقعہ بموقعہ دلہن کو امداد بھی دیتی جاتی ہیں۔ چنانچہ جس وقت دلہن کا گود بھرا جاتا ہے تو یہ بیوی ایک ریشمی رومال دلہن کے گود میں بچھا کر گود حاصل کر لیتی ہیں۔ دلہن کا گود بھرنے کے بعد منڈپ میں بھی ایک گود ڈالا جاتا ہے اور پھر سات تا نو۔ یا گیارہ سہاگنوں کے گود بھرے جاتے ہیں۔ گود بھرتے وقت میراثنیں یہ مخصوص گیت گاتی ہیں۔

یہ بالی کا گود بھراؤ۔ پیا کے کارن۔ راج دلاری کے گود بھراؤ

سب مل کر گود بھراؤ۔ سہاگنوں کا گود بھراؤ پیا کے کارن

گود بھراؤ مانگ لیکو۔ موتیوں کے چوک پراؤ پیا کے کارن

گود بھرائی ہو چکنے کے بعد دلہن کا منہ میٹھا کیا جاتا ہے۔ رسم کرنے والی بیوی مصری دلہن کے منہ کے پاس لے جاتی ہیں اور وہ بیوی جو دلہن کے قریب بغرض امداد بیٹھی ہیں ہاتھ بڑھا کر مصری لے لیتی ہیں۔ اس کے بعد "چوبا" کھلایا جاتا ہے۔ مصری کھلاتے وقت کا مخصوص گیت یہ ہے۔

مصری کھلاوے بنو میری۔ یہ سہاگن کے ہاتھ سے کھاوے

یہ بچپہ والی کھلاوے۔ بنو میری مصری کھاوے

چوبا کھلاتے وقت بجائے مصری کے چوبا کھاوے گاتے ہیں بقیہ گانا وہی ہوتا ہے۔ چوبا کھلانے کے بعد دلہن کو پان کھلایا جاتا ہے۔ پان پر سونے چاندی کے ورق لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس وقت کا مخصوص گیت یہ ہے۔

بنڈڑی کو پان کھلاؤ ری البیلی سہاگن

پان کھلا کر پھولوں کا گہنا اور ہار پہنائے جاتے ہیں۔ اس وقت یہ مخصوص گیت گایا جاتا ہے۔

ہار و ری ماں یہ لال بنو کے گلے

اماں پیاری کے گلے۔ باوا پیاری کے گلے

جائی۔ جوئی اور بیلا چنبیلی۔ اچھے گلابوں کے ہار

یہ چاند بنو کے گلے۔ ہار وری ماں یہ لال بنو کے گلے

یہ جملہ رسوم گویا تمہید تھے اصل پاؤں ناپنے کی رسم کے۔ کیونکہ جب تک یہ سارے رسوم نہ ہوں کوئی رسم ہی نہیں کہلاتا بہرحال یہ سب مراحل طے ہو جانے کے بعد وہ موتیوں کے لڑ جو ساتھ لائی گئی ہے۔ رسم کرنے والی بیوی نکالتی ہیں اور ادھر سے دلہن کے پاس بیٹھی ہوئی دلہن کی رشتہ دار سہاگن دلہن کا سیدھا پاؤں آگے بڑھا دیتی ہیں اور اس "لڑ" سے پاؤں ناپ لیا جاتا ہے۔ یہ لڑ جس سے پاؤں ناپا گیا ہے جلوہ کے روز دلہن کی نتھ میں ڈالی جاتی ہے۔

اس کے بعد "رونمائی" ہوتی ہے اور جو روپیہ، اشرفیاں یا زیور لایا گیا ہے وہ اس طرح دلہن کو "سلامی" میں

دیا جاتا ہے کہ دلہن کے قریب بیٹھی ہوئی بی بی دلہن کے دونوں ہاتھ آگے پھیلا دیتی ہیں، اور رسم کرنے والی بیوی "سلامی" دلہن کے ہاتھوں میں ڈال دیتی ہیں اور ساتھ ہی دلہن کے سر سے جھٹ پٹ بلائیں لے لیتی ہیں اس کے بعد "وارن پھیرن" شروع ہوتا ہے۔ ایک میراثن دلہن کے قریب آکر کھڑی ہو جاتی ہے "تاکہ" وارن پھیرن" کے روپے حاصل کرے کیونکہ یہ حق میراثن ہی کا ہوتا ہے اس طرح اسے بھی سو سوا سو روپے مل جاتے ہیں۔ بہرحال ایک ایک سمدھن آتی جاتی ہیں دلہن کا منہ دیکھتی ہیں اور حسب مقدور روپیہ وار کر میراثن کو دیتی جاتی ہیں۔ بقیہ میراثنیاں یہ مبارک بادی گاتی رہتی ہیں جس کے بعد یہ رسم ہو جاتا ہے اور دلہن کمرہ میں پہونچائی جاتی ہے۔

تمھیں یہ شادیاں جم جم مبارک ہو مبارک ہو
مچی ہے دھوم شادی کی مبارک خانہ آبادی
وہ شہزادہ یہ شہزادی مبارک ہو مبارک ہو

تقی عابدی

کوہِ نور

(گولکنڈہ کا مشہور ہیرا جو اب شہنشاہ انگلستان کے تاج میں ہے)

بحرِ ظلمات میں ڈوبا ہوا تارا تھا کوئی — راکھ کے ڈھیر میں خوابیدہ شرارا تھا کوئی
پردۂ خاک سے سورج کی کرن نکلی ہے — جلوہ بردوش تمنائے دلہن نکلی ہے
کسی معشوق جواں سال کا شیریں لب ہے — زر پرستوں کے لیے شمعِ سرِ محفل ہے
سنگ کی شکل میں اک نور نظر آتا ہے — پرتوِ جلوۂ کہ طور نظر آتا ہے
شعلۂ حسن ہے یہ جلوۂ نیرنگ ہے یہ — رونقِ تاج ہے یہ زینتِ اورنگ ہے یہ
جوہری دیکھ کے کہتا ہے کہ "لاقیمت ہے" — جس کی قسمت میں یہ آجائے وہ خوش قسمت ہے

ذرہ کہتا ہے کہ "یہ کیا ہے تماشا یارب؟
مہرِ تابندہ سے بڑھ کر ہے یہ ذرہ یارب؟
کس سے لوں نور کہ اب میری نظر ششدر ہے
یہ تیغ پر مہر ہے اور رخ پہ یہ پتھر ہے
ایک ہے دور بہت ایک ہے آنکھوں کے قریب
کس کو سجدہ کرے حیران ہے یہ تیرا غریب"

میکش

سمستان جٹپول

ہماری سلطنت آصفیہ کے زیر اقتدار بہ عنایت الٰہی ایسے متعدد علاقے ہیں جو اپنی وسعت اور آمدنی کے اعتبار سے ہندوستان کے ان اسٹیٹوں سے بڑھے ہوئے ہیں جن کے حکمران ہز ہائینس کے خطاب سے ممتاز اور توپوں کی سلامی کا اعزاز رکھتے ہیں بلکہ ان میں کے بعض تو یورپ کی چھوٹی چھوٹی خود مختار سلطنتوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ایسے تمام علاقوں کے والی (نواب یا راجہ) کی جانشینی و علیحدگی تبنیت، وراثت، عطائے اختیارات عدالتی و کوتوالی، اعلیٰ عہدہ داران اسٹیٹ کا تقرر و تنزل کلیتہً حکومت عالیہ آصفیہ نظامیہ کی منظوری کا تابع ہے۔ ان ہی علاقوں میں سے ایک سمستان جٹپول ہے جس کا رقبہ ۵.۰۱۵۴۵ مربع میل (اوسط آمدنی ... لاکھ) اور جس کی مردم شماری ۹،۸۰۵.۰ ہے۔

جٹپول کا صحیح تلفظ جٹ پرول ہے۔ جٹایو ایک پرندہ کا نام ہے اور پرول کے معنی شہر کے ہیں۔ وجہ تسمیہ اس کی یہ کہ جب راون، رام چندرجی کی عصمت بیوی کو ان کے بن باس کے زمانہ میں اڑائے جارہا تھا تو یہ پرندہ اس مقام پر راون کا سدِراہ ہوا۔ راون کو جو نشۂ حکومت میں سرشار تھا جٹایو کی یہ مزاحمت غضب آلود کردی اور اس نے اس پرندکو مار ڈالا یا کم از کم یہ کہ اس کو زخمی کردیا اور اس کا بازو اسی مقام پر گر گیا جس کی یادگار میں جٹیشور نام کی ایک دیول تعمیر کی گئی جو ابتک موجود ہے اور یہیں ایک شہر جٹ پرول نام کا تھا جو اب ایک معمولی سا قریہ رہ گیا ہے۔ بعد میں یہ علاقہ بھی اسی نام سے موسوم ہوگیا۔

سنسکرت میں سنوستھان راجہ کے رہنے کی جگہ کو کہتے ہیں کثرت استعمال سے واؤ اور ھ حذف ہوگئے اور نون میم سے بدل کر سمستان ہوگیا اور اس سے مراد ایسا علاقہ عطیہ شاہی قرار پایا جس میں ملک کا ایک حصہ ایک رقم معینہ کے معاوضے کسی کو عطا کیا گیا ہو اس رقم معینہ کو اعزازاً پیش کش کہتے ہیں۔ اس طرح ان دونوں الفاظ کی ترکیب سے اب یہ علاقہ سمستان جٹ پول کہلاتا ہے۔ مگر سمستان کا مستقر اب جٹ پول نہیں بلکہ کولاپور ہے جو حیدرآباد سے ۱۳۰ میل جانب جنوب ضلع محبوب نگر میں ہے حیدرآباد سے براہ جڑچرلہ وکتہ کوٹہ، یاپرال تک ۱۱۰ میل کی سیدھی سڑک تعمیرات کیا گئی ہے۔ اس کے بعد ۲۰ میل کا راستہ علاقہ سمستان جٹ پول کا ہے جو دریائے کرشنا کے متوازی کولاپور تک چلا گیا ہے۔

یہاں کے راجہ ریچرلہ گوترم سے سربھی خاندان کے اراکین ہیں جو جنوبی ہند کا ایک بڑا معزز اور قدیم خاندان ہے۔ اس خاندان کے دیگر اراکین علاقہ مدراس میں بوبلی، وینکٹ گری، پنتھاپور، میلارم کے راجہ ہیں آخری والی سمستان جٹ پول راجہ وینکٹ لچھما راؤ یہاں کے تائیسویں راجہ تھے ان کا اصلی نام کرشنا چندریا ہے راجہ وینکٹ جگنا تھ راؤ نے انھیں ۱۸۰۸ء میں متبنی کیا اور وینکٹ لچھما راؤ نام رکھا بعد میں اعلیٰ حضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہٗ نے نظام نواز ونت کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

مستقر سمستان کولاپور جس کی مردم شماری ۲۱۵۸ ہے دریائے کرشنا کے شمال میں ۶ میل پر ایک وسیع میدان

اس کی تعمیر ۱۳۱۷ف میں ہوئی۔ ڈاکٹر خانہ کی پختہ عمارت جس کی بنا مسز گرفن (اہلیہ مسٹر گرفن ناظم و معتمد مال حکومت سرکار عالی) نے ۹ اردی بہشت ۱۳۳۵ف کو رکھی اور جس کا افتتاح ۴ شہریور ۱۳۴۰ف کو ہوا ضرورت مقامی کے لئے ایک مکمل عمارت ہے اس کا نقشہ ناظم صاحب طبابت سرکار عالی نے دیا تھا۔ اس عمارت میں زنانہ اور مردانہ مریضوں کے لئے علحدہ علحدہ وارڈ ہیں۔ ادویات اور آلات جراحی کا کافی ذخیرہ ہے سند یافتہ ڈاکٹر مامور ہیں اور خوبی کی یہ بات ہے کہ دواؤں کا موازنہ جو عوام کے لئے ہے محل کی ضروریات سے متاثر نہیں ہونے پاتا بلکہ ڈیوڑھی کے ادویہ کا خرچ محل ہی کے موازنہ سے پورا ہوتا ہے۔

راجہ صاحب کے محل کے شمالی و مشرقی گوشہ پر دو ہاتھیوں کا تھان پر جھومنا شاندار صدر دروازہ پر رسالہ کے بارہ سپاہی کا ہاتھ میں برچھا لئے پہرہ دینا۔ اس دروازے کے مقابل ہی خوبصورت برجی میں برجی گھڑیال دروازہ کے منزل بالا پر نوبت و نقارہ مشرقی امرا کے شان کا ایک پر رعب و پر جلال منظر ہے اس صدر دروازہ سے داخل ہونے پر سیدھے طرف ایک مختصر سے چمن کے وسط میں سری راجہ وینکٹ لچھما راؤ نظام نواز ونت بہادر کا پتلا (اسٹیچو) ہے جس کے پائین کتبہ لگا ہے جس سے واضح ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء اور تاریخ وفات ۵ اپریل ۱۹۲۵ء م ۱۱ خورداد ۱۳۳۴ف ہے۔ حکومت سرکار عالی کی منظوری کے بعد یہ ۶ مارچ ۱۸۸۷ء (مطابق ۲ فروردی ۱۲۹۶ف) کو اس علاقہ کے راجہ ہوئے۔

جو حالات سنے گئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آنجہانی راجہ بڑے شکاری تھے۔ ۲۹ شیر دو بونچے اور ۲۹ ریچھ مارے ہیں۔ شکار اور شکاریوں کی تاریخ میں یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ ۱۶ ستمبر ۱۹۲۲ء کو راجہ صاحب نے سوا گھنٹہ کے اندر ۵ شیر مارے۔ ان میں جہاں سپاہیانہ جوہر نظر آتے ہیں۔ وہیں انتظامی قابلیت بھی عیاں ہوتی ہے۔ اسٹیٹ کی موجودہ ترقیاں انہی کے عہد سے شروع ہوئی ہیں اب انہی کی رانی صاحبہ رانی وینکٹ رتنما جو ویل واڑہ تعلقہ سرسلہ ضلع کریم نگر کے دیسائی کی صاحبزادی ہیں اسٹیٹ کے کاموں کی نگران ہیں اور باوجودیکہ گوشہ کی سخت پابند ہیں حتی کہ ان کے اعلیٰ عہدہ دار بھی انھیں بے پردہ نہیں دیکھ سکے پھر بھی اسٹیٹ کا انتظام خوبی سے کرلیتی ہیں۔

کیا میں اس موقع پر کہہ سکتا ہوں کہ گوشہ اور پردہ کو جو تجدد پسند ترقی و انتظام دنیوی میں ہارج سمجھتے ہیں وہ اس عنابر جائداد پردہ نشین ہندو رانی کے عمل کو دیکھیں۔ میں نے محترمہ بیگم صاحبہ سر بلند جنگ کا ایک مضمون کسی اخبار میں چند دن قبل پڑھا تھا جس میں موصوفہ نے بعض بڑے گھرانوں کی بیگمات کے نام گنائے تھے کہ وہ باوجود پردے میں رہنے کے کامیابی کے ساتھ اپنے وسیع علاقہ کا انتظام کرتی ہیں ان مثالوں میں رانی سر بھی وینکٹ رتنما صاحبہ کے نام کا اضافہ کرلینا چاہیئے۔

ہم راجہ صاحب کے محل کا ذکر کر رہے تھے جس کے صدر دروازے سے داخل ہونے کے بعد آنجہانی راجہ صاحب کے اسٹیچو (پتلے) کے سلسلے میں ان کے اور ان کی رانی صاحبہ کے کچھ حالات لکھدیئے اس محل کو جو چندر محل سے موسوم ہے ۱۸۷۱ء میں راجہ وینکٹ جگناتھ راؤ نے بنوایا۔ یہ ایک قدیم وضع کی عمارت بڑے بڑے فیل پایوں پر ہے اس کی دیواریں کسی قلعہ کی فصیل معلوم ہوتی ہیں اسی محل پر راجہ وینکٹ لچھما راؤ نے ایک اور منزل ۱۲۹۹ف میں بڑھائی اور ۱۳۲۵ف میں اسی کے عقب وجیا محل کے نام سے زنانی حصہ تعمیر کرایا۔

بہت بڑے کمپونڈ میں بلند و بالا عمارات کا تسلسل بیسیوں دریچے اور دروازے متعدد برآمدے اور شاہ نشین سے

مکین کی شوکت و حشمت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس احاطہ میں آنے کے بعد یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ ہم تین ہزار کی مردم شماری والے قصبہ میں ہیں بلکہ گمان ہوتا ہے کہ دفعتہً حیدرآباد جیسے بلدۃ الامراء میں کسی بڑے امیر کی ڈیوڑھی میں پہونچ گئے۔ چندر محل کے شاندار ڈرائنگ روم میں جس کے فرش و فرنیچر اور دیواروں پر راجہ نظام نواز ونت آنجہانی کے شکار کیے ہوئے جنگلی جانوروں کی کھالیں مختلف طرح پر بچھی یا لٹکی ہوئی تھیں ہم نے دو تصویروں کو بڑی دیر تک دیکھا ان میں سے ایک تو راجہ وینکٹ جگنا تھ راؤ آنجہانی کی تھی جو بڑا سا پگڑا باندھے، انگرکھا پہنے، کندھے پر نال لٹکائے تلوار ہاتھ میں تھامے پرانی وضع کے کھڑے ہیں دوسری [illegible] انہی کے نوجوان پوتے کی جو سوٹ بوٹ میں ملبوس یوروپین وضع قطع بنائے مسکرا رہے ہیں۔ یہ دونوں تصویریں تبدیل لباس تبدیل مذاق تبدیل وضع کی مشرقی تاریخ آنکھوں کے سامنے پیش کر رہی ہیں۔

یہاں کی عمارتوں میں بہم رسانی قوت برقی کا مکان (پاور ہوس) بھی قابل ذکر ہے۔ اس مکان میں جو بالکل نو بنی بنوا بقدر ضرورت اور سستے داموں میں بنایا گیا ہے۔ دو مشین لگے ہیں ایک ۲۰ گھوڑوں کی طاقت کا دوسرا اس کا نصف اس کے ذریعہ محل میں روشنی اور پنکھے دن رات اور عوام کے لیے سر شام سے تا ۹ بجے شب تک چلتے ہیں۔ تیل کی دو مشینیں اور تیل کے دو گھانے کام کرتے ہیں۔ تیل کے گھانوں کو روزآنہ بیس روپے برآمد رکھی ہے۔ چاول چھوڑنے کا مشین بھی لگا ہے مگر یہ مشین ابھی چالو نہیں کیا گیا۔ آب رسانی کے لیے پانی یہیں کی برقی قوت سے کھینچا جاتا ہے۔ جو مشین باولی پر لگا ہے وہ ۴۴ ہزار گیالن روزآنہ کھینچ سکتا ہے مگر موسم گرما میں یہاں صرف ۱۰ ہزار گیالن تک پانی خرچ ہوتا ہے کیونکہ پانی مقررہ اوقات پر کھولا جاتا ہے۔ اس لئے باؤلیوں کا استعمال بھی جاری ہے۔

آخری راجہ وینکٹ لچھما راؤ نظام نواز ونت بہادر متوفی کو صلبی دو لڑکیاں ہیں چونکہ اولاد نرینہ نہ تھی اس لیے وینکٹ جگنا تھ راؤ کو متبنیٰ بنایا ہے یہ سنہ ۱۳۲۶ف میں پیدا ہوئے ہیں تیرہ سنہ ۱۳۳۹ف کو ان کی شادی [illegible] ہوئی جو نظام نواز ونت بہادر کی چھوٹی صاحبزادی سرسوتی دیوی کی دختر ہیں یہ نوجوان راجہ بھی اپنے سپاہی منش متبنی باپ کی طرح شکار اور مردانہ کھیلوں کے شائق ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس چھوٹی سی عمر میں ۱۰ شیر انھوں نے شکار کیے ہیں۔

متوفی راجہ صاحب کی بڑی صاحبزادی راج شری راجہ صاحب تیہ وال کو سنہ ۱۳۱۱ف میں بیاہی گئی ہیں اور دوسری جن کا نام سرسوتی دیوی ہے وینکٹ کرشنا راؤ زمیندار پرنا پور گودا کی بیوی ہیں افسوس کہ عالم جوانی میں بیوہ ہوگئیں ان کے شوہر پرواز کے بڑے شوقین تھے چنانچہ کولاپور سے مدراس کو پرواز کرتے ہوئے ۲۰ اگست سنہ ۱۹۳۲ء کو طیارہ کے ٹوٹنے سے گر کے مر گئے۔ نواب جد گسٹ ہوس کے متصل ایک سنگی ستون ان کی بیوہ رانی کی طرف سے لگایا گیا ہے جس کی عبارت ان دونوں میاں بیوی کی محبت کی خاموش داستان ہے۔

اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے میں اپنی اس آرزو کا اظہار کرتا ہوں جو اس دورہ سے دل میں پیدا ہوتی ہے کہ کاش ہمارے ملک کے سارے جاگیرات خصوصاً بڑے بڑے علاقوں کا انتظام ایسا ہی ہوتا ہم یہ نہیں کہتے کہ ممستان جٹ پول میں ساری ترقیاں ہو چکی ہیں نہیں۔ بلکہ جس حد تک بھی یہاں ترقی کی گئی ہے وہ بہت کچھ دوسرے جاگیری علاقوں کے لیے قابل تقلید ہے۔

ابوظفر مؤید الدین حسن فاروقی

ایک سیر میر محمود صاحب کی پہاڑی پر

میر محمود صاحب کی پہاڑی ہمارے وطن میں ایک مشہور مقام ہے۔ میر عالم کے تالاب کے کنارے ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے اور اس پر ایک بزرگ کی درگاہ بنی ہوئی ہے۔ درگاہ کے اس طرف گھنا جنگل ہے جہاں ہماری پردہ نشین خواتین نہایت خوشی سے اپنے بال بچوں کے ساتھ تفریح مناتی ہیں جس طرح عام دستور ہے ہم لوگ کسی بزرگ کی ذات سے اتنا فائدہ نہیں اٹھاتے جتنا ان کی درگاہ سے اٹھاتے ہیں۔ یہی حال اس درگاہ کا بھی ہے، لوگ اس پرسکون اور خاموش مقام میں دنیاوی فکروں کو ایک بزرگ کے فیض صحبت سے روحانی چین میں مبدل کرنے کم آتے ہیں اور زیادہ تر اس لئے تکلیف فرماتے ہیں کہ تالاب کا لطف حاصل کیا جائے اور مناظر کی دلچسپیوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

ایک مرتبہ ہم اس مقام پر پہنچ گئے۔ موٹر سیکل پر سوار تھے خیال ہوا چلو آج اس مقام کی سیر کرلیں جس کی شہرت مدتوں سے سنتے آئے ہیں سہانی تعطیلات تھیں، ٹھنڈا ٹھنڈا موسم، نرم نرم دھوپ، نیلا نیلا آسمان فوراً موٹر سیکل تیز کی اور درگاہ کی طرف چلے۔ لوگ کہتے ہیں سیدھا راستہ چلنا چاہئے مگر بعض وقت راستہ گم کرنے اور اٹکل پر چلے جانے میں غیر معمولی لطف آتا ہے۔ خصوصاً ایسے وقت جب کہ فطرت اور اس کے اسرار کے سوا کوئی رہنما نہ ہو ہماری نظر پہاڑی کی طرف تھی مگر راستہ بالکل اس کی مخالف سمت نظر آرہا تھا پیدل ہوتے تو دور نکل جانے کا خوف ہوتا مگر جب "ہیٹ بھری" موٹر سیکل ہو (آپ ہیٹ بھری کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے) تو اور ہمت بڑھتی ہے۔ ہم دیکھتے رہے پہاڑی کی طرف اور چلتے رہے دوسری طرف راستہ پیچیدہ تھا ایک شاعر کو جو معشوق کی زلفوں کے پیچ وخم دیکھ چکا ہو بھلا راستے کی پیچیدگی کیا ستا سکتی؟ ہم سبز درختوں کی چھاؤں چھاؤں چلتے ہی رہے۔ بڑی دیر کے بعد منزل مقصود آئی پہاڑ کے دامن میں پہنچے، موٹر سیکل گرم ہو چلی تھی، ہم نے کچھ اس خیال سے کہ پہاڑ پر جاکر آنے تک کہیں یہ غائب نہ ہو جائے اور کچھ اس لئے کہ گھنے سائے میں اس کی گرمی دور ہوگی اسے شاداب جھاڑیوں کے اندر کھڑا کردیا اور اوپر کی طرف چلے۔ جنگل، ساگوان کے درخت، پرند کے چہچہے، ٹھنڈی ہوائیں اور دس بجے کی نرم دھوپ بڑا روپ دکھا رہی تھی، ہم نے خیال کیا کہ سب سے پہلے بزرگ کے مزار پر فاتحہ پڑھ لینی چاہئے۔ معاف کیجئے ہم ذرا مذہبی قسم کے آدمی ہیں فوراً جیب میں ہاتھ پہنچ گیا کہ دیکھیں پھولوں اور خیرات کے لئے کھلے پیسے ہیں بھی یا نہیں بارے ایک اکنی نکلی ورنہ ہر موٹر سوار کی جیب سے پیسوں سے زیادہ روپیوں کی جھنکار آتی ہے راستہ بائیں طرف کو مڑتا تھا ہم اپنی وطنی خاکساری کے ساتھ سر جھکائے زمین جھانکتے چلے جارہے تھے۔ یکایک اوپر جو نظر پڑی تو دیکھتے کیا ہیں کہ دو فرلانگ تک اونچا راستہ ہے سیڑھیوں کی قطار ہے اور اوپر بزرگ کا مزار نظر آرہا ہے۔ فوراً دل پر اثر ہوا۔ ہم نے خیال کیا کہ سچ ہے روح کی بلندی ہر حال قائم رہتی ہے ہم نے سیڑھیاں چڑھنی شروع کیں اوپر پہنچنے تک برا حال ہوگیا سب سے زیادہ تکلیف ہمارے پیٹ کو پہنچی کیونکہ ہمارا پیٹ کسی قدر گول ہے! درگاہ کے چبوترے پر پہنچنے کے بعد ایک قدیم روایت یاد آگئی۔ یہاں کے متعلق مشہور ہے کہ کسی بزرگ کی بددعا سے اس درگاہ کے تین گوشے آباد ہیں اور ایک ویران۔ ہم نے بڑے شوق سے اس کی توثیق کرنی چاہی گوشوں کی آبادی کا حال سنئے دو چار بکریاں، آٹھ دس کبوتر، تھوڑی سی عدم صفائی اور ایک حافظ صاحب! ویرانی کی طرف عمارت شکستہ اور کچھ نہیں۔ بہرحال ہم نے درگاہ کا ایک معتقدانہ طواف کیا اور درمیانی گنبد کے نیچے مزار کی ایک جانب بیٹھ گئے۔ تکان اور مراقبے میں ایک روحانی تعلق معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس وقت

شاید یہ لطف جنت ہی میں حاصل ہو یا نہ ہو۔ ایک درخت کے نیچے ہم نے دیکھا کہ بلند دھوپ کی طرف ایک بڑا سیاہ بچھو چلا جا رہا ہے ہماری نظر اس پر اس وقت پڑی جب کہ ہم اس پر پاؤں رکھنے ہی والے تھے۔ ہم دور اچھل پڑے اور بچھو کو بہت غور سے دیکھنا شروع کیا بڑی پھوٹا جسم پر بڑے بڑے بال تھے اور ڈنکوں کی طرف دو بڑے سیاہ پنجے۔ اس کی جسامت بڑی تیلی کے برابر ہو گی۔ تماشا دیکھتے ہوئے ہی ہماری نظر اس پر پڑی۔ بچھو اس طرح حملہ کرتا تھا جب اسے کسی تیز اور گرم چیز سے زک دیا جاتا ہے۔ وہ سر اٹھا کر لٹکا اور ایک دو منٹ میں بیکار ہو کر ٹھنڈا ہو گیا۔ ہم نے چند منٹ اس کے چلنے کا انتظار کیا مگر وہ مردہ پڑا ہوا تھا۔ ہم نے ایک بڑی لکڑی لے کر دور سے اسے چھیڑا۔ مگر وہ مر چکا تھا! ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم اس بچھو کو ایک بڑے پتے پر اٹھا کر لوٹ آئے، دو لمحوں میں وہ پانی پانی ہو گیا۔ اب ہم کو میر محمود صاحب کی پہاڑی کے دو حصے اکثر یاد آتے ہیں۔ ایک تو اب تک قلمدان سے زیادہ دل میں ہے، اور دوسرا حافظے کی دنیا میں۔ ہماری سمجھ میں نہ آسکا کہ اس پہاڑی پر ہم کو یہ حصے کیوں ملے۔

محمد عبدالقیوم خاں باقی

نیا پل اور شام

شام کی سندر فضا میں دور کی تنویر ہے
خواب دوشیزہ کی میرے سامنے تصویر ہے

ہر طرف طوفانِ نغمہ ہر طرف طغیانِ نور
حضرتِ انساں کی سرگرمی میں گم شورِ طیور

نور کی سرگرمیوں میں غرق ایوانِ بلند
شام کی دیوی نے بڑھ کر پھینک دی اپنی کمند

گنبدوں پر نور کی پرچھائیاں ہیں پر بہار
اور فضا پر چھا گیا ہے نور و ظلمت کا غبار

اک طرف تعمیرِ عدل[1] و اک طرف دار الشفا[2]
دور پر اک مدرسہ[3] ہے نیند میں کھویا ہوا

سامنے دار الکتب[4] کی دل نشیں تعمیر ہے
جس کی خشت و گل میں عقل و ہوش کی تخمیر ہے

رودِ موسیٰ پر نیا پل دہر کی تصویر ہے
جس کی دو رنگی میں دونوں دور کی تعمیر ہے

ایسے خوش منظر میں میری ذات ہی کھوئی ہوئی
جاگتی ہے آنکھ اور تقدیر ہے سوئی ہوئی

سید محمد اکبر وفا قانی

---

[1] عدالت العالیہ۔ [2] عثمانیہ دواخانہ۔ [3] کلیۂ طب۔ [4] کتب خانہ آصفیہ۔

سب رس

اعلیحضرت سلطان العلوم فرمانروائے دکن و برار خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ

دکن نمبر

ادارۂ ادبیات اردو

مُرقعِ دکن

یعنی
ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے ماہ نامہ

سب رس

کا سالگرہ نمبر بابتہ جنوری ۱۹۳۹ء

زیرِ نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلسِ ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش — سکینہ بیگم

خواجہ حمید الدین شاہد — معین الدین احمد انصاری

مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر "ادارہ" رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا
تعداد صفحات ۲۱۶ تعداد تصاویر ۲۰، قیمت عالم

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہ ادارہ ادبیات اردو کا [illegible] علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں [illegible] زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہ ہوں گے

(۳) اُردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کرکے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہ کار مضامین کو اُردو میں منتقل کرکے اُردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی پی یا وی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

	سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے	چار روپے	دو روپے	چھ آنے
شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ	چار روپے آٹھ آنے	دو روپے بارہ آنے	سات آنے

بچوں کے سب رس کی قیمت

	سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے	ایک روپیہ	دس آنے	ڈیڑھ آنہ
شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ	ایک روپیہ آٹھ آنے	بارہ آنے	دو آنے

محرم نمبر ۱۲/ اقبال نمبر عہ۱۴/ دکن نمبر عاں

سب رس کی خریداری اس میں اشتہارات کی طباعت اور ادارہ ادبیات اردو کی رکنیت یا اس کے مطبوعات کی خریداری کے سلسلے میں جو اصحاب صدر دفتر (رفعت منزل خیریت آباد) سے گفتگو یا مراسلت نہیں کرسکتے وہ حسب ذیل اصحاب سے گفتگو یا مراسلت کرسکتے ہیں۔

بلدہ (۱) مسٹر ایس اے کریم نمائندۂ خصوصی چیلہ پورہ قریب مکان حکیم محمود صمدانی مرحوم (۲) مسٹر ایس بی انعنا۔ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ (۳) رحمان کاشیج گھانسی بازار۔ **اضلاع** مسٹر محمد فخرالدین ارمان (روضۂ شیخ) گلبرگہ شریف

ان کے علاوہ نور احمد صاحب عثمانیہ ادارہ کی طرف سے علمی و ادبی دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے یہاں ادارہ کی کتابیں اور رسالے لے کر آئیں گے۔ توقع ہے کہ علم دوست اصحاب ضرور ان کی مدد کریں گے۔

سب رس مرقع دکن نمبر جنوری ۱۹۳۹ء

فہرست تصاویر

اعلیٰحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

سلاطین آصفی

وزرائے آصفی

امرائے آصفی

دیگر تصاویر

تعداد صفحات ۲۱۶ - تعداد تصاویر ۷۸ - قیمت [illegible]

سب رس مرقع دکن نمبر جنوری ۳۹ء

فہرست مضامین

ادارۂ ادبیات اردو کی چند

قابل دید کتابیں

نذر ولی۔ حضرت ولی اورنگ آبادی کی خدمت میں نذر عقیدت قیمت مجلد ۱عہ

گریہ و تبسم۔ حیدرآباد کے نوجوان شاعر صاحبزادہ میکش کے کلام کا مجموعہ قیمت مجلد ۱عہ

ورتع سخن۔ دو جلدیں۔ حیدرآباد کے پچھتر شعرا کا باتصویر تذکرہ فی جلد مجلد ۱عہ

من کی دنیا۔ نوجوان انشا پرداز رشید قریشی کے ولولہ انگیز افسانے (عہ

ہز ہائینس والاشان نواب اعظم جاہ بہادر
ولیعہد سلطنت آصفیہ وشہزادۂ برار
اپنے فرزند ارجمند شہزادہ کرنل نواب مکرم جاہ بہادر کے ساتھ

مدحِ خواجہ

معین الدینؒ ہیں قطب الدینؒ سے شاد — تو قطب الدینؒ فرید الدینؒ سے شاد

فرید الدینؒ نظام الدینؒ سے خوش — نظام الدینؒ نصیر الدینؒ سے خوش

نصیر الدینؒ مرے ممدوح سے شاد

مرے ممدوح کا تو نام رکھ یاد

مطیعِ مصطفےٰ سید محمدؒ — مطاعِ باصفا سید محمد

دوئی کیسی؟ یہ ہے فردِ یگانہ — مری نظروں میں ہے قطبِ یگانہ

اُدھر جو ہے وہی ضو پاش اِدھر ہے

نمودِ خواجہ ہر سو جلوہ گر ہے

سمجھ کا دُور ہو جائے اگر پھیر — تو گلبرگہ کو بھی تو سمجھے اجمیر

غرض، تنویرِ خواجہ دیدنی ہے — جدھر دیکھو اسی کی روشنی ہے

نگاہِ عارف ان جلووں کی جویا

مری نظریں بھی خوش ان سے ہیں گویا

دکھاتا ہے یہ سلطانِ طریقت — مجازی شان میں شانِ حقیقت

نزول اچھا عروج اچھا ہے اس کا — سلوک اس شان سے کامل ہے کس کا

جو یہ شہبازؒ ہو مائل بہ پرواز

کھلے تشبیہ سے تنزیہ کا راز

عیاں خواجہ کی ہے بندہ نوازی — نہیں کس کو امیدِ سرفرازی

سلیمانِ دکن عثمان علی خاںؒ — فروغِ مدعائے آصفستاں

مرے خواجہؒ کے رخ سے سب کا ہے ضو

دکن افروز ہے خواجہ کا پرتو

علی منظور

۱؎ غریب نواز ۲؎ بختیار کاکی ۳؎ گنج شکر ۴؎ سلطان المشائخ ۵؎ چراغ دہلی ۶؎ بندہ نواز۔ غریب نواز و بندہ نواز کے درمیان چھ واسطے ہیں ۷؎ خواجہ [illegible]

اداریہ

سب رس کا دوسرا سال جس اہتمام کے ساتھ شروع ہو رہا ہے۔ اس کا عملی ثبوت یہ سالگرہ نمبر ہے جو دکن کے ماضی و حال کے متعلق دلچسپ اور اہم تاریخی معلومات کے لئے وقف کر دیا گیا ہے اور ہزار ہا روپیہ کے صرفہ سے تیار ہوا ہے۔ قدیم تاریخی قلمی تصویروں کے فوٹو لینے اور پھر ان کے اتنی بلاکس کی تیاری اور اُن کی چھپائی کے لئے جو وقت اور رقم صرف ہوئی ہوگی صرف اسی کا اندازہ کرنے سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ ادارہ نے اس شاندار تاریخی نمبر کی خاطر کتنا اہتمام کیا ہے اور سب رس کی زندگی اور ترقی کے لئے کس حد تک رقم کا صرفہ اور محنت کرنے کے لئے تیار ہے۔

اسی اہتمام اور غیر معمولی کوششوں میں آسانی کا رپیدا کرنے کے سلسلہ میں ادارۂ ادبیات اردو نے نئے سال سے سب رس کی ایک مجلس ادارت بھی قائم کر دی ہے۔ جو اپنے ہر ماہ نامہ کو پر ذوق اور ہر قسم کی دلچسپیوں سے مالا مال کرنے کی طرف خاص طور پر متوجہ رہے گی۔

مجلس ادارت کے قیام کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ سب رس کا علمی و ادبی معیار بڑھتا جائے اور اس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ایسی مفید اور ضروری معلومات بھی درج ہوا کریں جن کا جاننا ہر تعلیم یافتہ کے لئے ضروری ہے۔ اس بارے میں ادارۂ ادبیات اردو کے مختلف شعبے سب رس کا ہاتھ بٹائیں گے۔ مثلاً شعبہ زبان اردو زبان کے ضروری اور اہم مسائل پیش کرتا رہے گا۔ شعبۂ تنقید کی طرف سے اردو کتابوں پر سنجیدہ اور نو وار تنقیدیں شائع ہوتی رہیں گی۔ اور تمام ہندوستان کی جدید مطبوعات کی اطلاع بھی وقت بوقت دی جائے گی تاکہ معلوم ہوتا رہے کہ اردو میں کون کونسی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ شعبۂ تاریخ دکن ایسی مفید اور دلچسپ معلومات فراہم کرتا رہے گا جو ملک کی ترقی اور عروج کیلئے اہل ملک کی رہبری کریں گی۔ شعبۂ نسوان ہر ماہ نسوانی فلاح و بہبود سے متعلق مضامین کی فراہمی کے علاوہ اس امر کی کوشش کرتا رہے گا کہ سب رس میں نسوانی دلچسپیوں کے کافی سامان مہیا ہوتے رہیں۔

ساتھ ہی ادارہ کے تمام شعبوں کے ماہوار جلسوں کی روئدادیں بھی سب رس میں شائع ہوں گی تاکہ ہر مضمون سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب مستفید ہو سکیں۔ چنانچہ ان تمام شعبوں کی تفصیل اور ان کے جلسوں کی روئدادوں کے اہم حصے اس مہینے بھی شائع کئے جا رہے ہیں۔

یہ باتیں صرف اس لئے بیان کی گئیں کہ سب رس کے قدر دانوں کو اندازہ ہو جائے کہ سب رس کی ترقی اور اس کے مستقبل کو درخشاں بنانے کے لئے ادارہ کیا کام کر رہا ہے۔

دکن نمبر کے بارے میں زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ خود اس کا مطالعہ اس کی سفارش کرے گا۔ اتنا لکھنا ضرور ہے کہ محض اعلیٰحضرت ظل سبحانی سلطان العلوم آصفجاہ سابع کی علم نوازیوں اور مسیحا نفسیوں کے باعث آج ہم اس قابل ہو سکے کہ دکن کی قدیم تاریخ کو اس طرح باتصویر پیش کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مرقع دکن اعلیٰحضرت کے نام نامی اور حالاتِ زندگی سے شروع کیا جا رہا ہے۔ اور اس کا سرورق حضرت ظل سبحانی سلطان العلوم ہی کی تصویر سے مزین ہے۔ اس سلسلہ میں نواب سالار جنگ بہادر کی علم دوستی اور فیاضی کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ جس کی وجہ سے یہ مرقع دکن صحیح معنوں میں ایک مرقع بن سکا۔ اس کی اکثر تصویریں نواب صاحب ہی کے خزائن فنونِ لطیفہ سے حاصل کی گئی ہیں۔ اور نواب صاحب نے بکمال مہربانی ان کو سب رس میں شائع کرنے کی اجازت عطا فرمائی ہے۔

سب رس کے قلمی معاونین کا شکریہ بھی لازمی ہے کہ انھوں نے قلیل عرصے میں نہایت مستند دلچسپ اور مکمل مضامین تیار کر دئے۔ خاص کر دکن نمبر کی تیاری کے لئے جو مجلس مشاورت مقرر کی گئی تھی اس کے اراکین (عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی۔ میر محمود علی صاحب ایم اے

سید سراج الدین صاحب ایم اے، سید محمد اکبر وفا قانی صاحب بی اے ال ال بی، عبدالقادر سروری صاحب ایم اے ال ال بی اور سید محمد صاحب ایم اے ہر طرح سے مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے نہ صرف خود کام کیا بلکہ دوسروں سے بھی اچھے اچھے مضامین لکھوائے۔ مولوی غلام احمد خاں صاحب صوبہ دار اورنگ آباد کی علمی دلچسپی کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ انھوں نے نہ صرف اورنگ آباد پر مضمون لکھا بلکہ وہاں کے مختلف مناظر و تاریخی عمارات کی تصاویر بھی روانہ کیں۔ جن میں سے بعض اس مرقع میں یا بچوں کے دکن نمبر میں شامل ہیں اور بعض آئندہ نمبروں میں چھپیں گی۔

سب رس کے ناظرین یہ معلوم کرکے خوش ہوں گے کہ حیدرآباد کے مشہور آرٹسٹ مسٹر قیوم نے جس طرح اس شمارہ کے لئے عبدالرزاق لاری کی تصویر بنا دی ہے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ بھی سب رس کو اپنے حسن کمالات سے مستفید کرتے رہیں گے۔

سید محمد اکبر وفا قانی صاحب اور مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب نے بھی سب رس کے اس شمارہ میں کسی نہ کسی مضمون کی تیاری اور اشاعت کی مدد دینے کا ذمہ لیا ہے۔ اگرچہ وقت کی تنگی کی وجہ سے لاری کی تصویر رنگوں میں چھاپی نہ جا سکی، تاہم یہ تصویر اپنی ادبی اہمیت اور ایک شہرہ حسن کار کا نتیجۂ قلم ہونے کی وجہ سے قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ عبدالرزاق لاری نے تنہا اس وقت مغل فوج کا مقابلہ کیا جب غداروں کے دروازہ کھول دینے کی وجہ سے مغل فوج قلعہ میں داخل ہو جانا چاہتی تھی۔ لاری کو عین وقت پر اس کی اطلاع ہوئی اور وہ نکلے ہوئے دروازے کے سامنے مقابلہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ زخموں میں چور ہو گیا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

اس سب رس میں ایک چیز کی کمی محسوس ضرور ہی ہو گی۔ سب مضامین ان بعض مردوں ہی کے ہیں صنف نازک کو اس میں سوائے بچوں کے حصہ کے کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے۔ ایسا عمداً کیا گیا، کیونکہ ادارہ کے شعبۂ نسواں نے تصفیہ کیا تھا کہ وہ ایک نمبر علیحدہ شائع کرے گی۔ اس لئے جملہ مضامین معتمد شعبۂ نسواں اور سب رس کی مجلس ادارت کی رکن محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کے پاس روانہ کر دیے گئے۔

انھوں نے ان سب مضامین کو ایک قدرے کی شکل میں مرتب کرلیا اور خواتین دکن کے دلچسپ و مفید قصوں اور نظموں کا مجموعہ اب نذر دکن کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ اور غالباً چند روز بعد جنوری کے ختم تک قدردانوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔ نذر دکن ایک اہم علمی و ادبی دلچسپ کتاب ہوگی۔ اور سب رس کے سالانہ خریداروں کو نصف قیمت پر دی جائے گی کیونکہ وہ دراصل سب رس ہی کا ایک حصہ ہے۔

نذر دکن کے علاوہ شعبۂ نسواں کی طرف سے قریب میں اور کتابیں بھی شائع ہوں گی۔ توقع ہے کہ یہ شعبہ ملک کی علم دوست خاتونوں کی مدد کی وجہ سے خاطر خواہ کامیاب ہوگا۔

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس عاملہ نے حسب ذیل اصحاب کو ان کی علمی و ادبی دلچسپیوں اور ادارہ کے کاموں میں خلوص کے ساتھ ہاتھ بٹانے کے پیش نظر ادارہ کا رفیق منتخب کیا ہے۔

محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ (داعی شعبۂ نسواں)، مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری ایم اے، بی ایس سی آنرز (داعی شعبۂ زبان) مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے، اچ سی ایس (داعی شعبۂ تراجم) اور نواب کیقباد جنگ بہادر

توقع ہے کہ سب رس کا دوسرا سال نئے انتظامات اور خاص اہتمام کے باعث پہلے سال سے زیادہ کامیاب ثابت ہوگا۔

زور
سید محی الدین قادری

اعلیحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخان بہادر آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ

حضرت ظل سبحانی کے حالات زندگی اور عہد میمنت مہد کے متعلق اس وقت تک متعدد کتابیں اور مضامین شایع ہو چکے ہیں ہر سال ملک اور بیرون ملک میں رسائل و اخبارات کے سالنامے اور سالگرہ اقدس کی مبارک باد کے خاص نمبر شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ان سب میں حضرت بندگان عالی کی عظیم الشان شخصیت' آپ کے بے مثال تدبر و سیاست' ذاتی علم و فضل شعر و سخن کی دلچسپیوں اور مذہبی و اخلاقی محاسن وغیرہ کے ہر پہلو سے متعلق تفصیلی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں اگر ان سب کو ایک جگہ کردیا جائے تو اعلیحضرت سلطان العلوم کی قابل تقلید ہستی کے متعلق کئی جلدوں کی سوانح حیات مرتب ہو جائے۔

دودمان آصفی میں اعلیحضرت سلطان العلوم آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ کی ذات والاصفات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور علم و فضل و شعر و سخن کی سرپرستیوں میں حضرت جہاں پناہی نے خاص توجہ فرمائی ہے یہی وجہ ہے کہ اعلیحضرت خلد اللہ کے تذکرہ کو اس مرقع دکن کے لئے زیب عنوان قرار دے کر تاریخی سلسلہ سے درج کرنے کی جگہ ابتداء میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اعلیحضرت سلطان العلوم خلد اللہ کی حیات کا محض علمی و ادبی پہلو بھی ایسا وسیع ہے کہ اس پر لکھنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر کئی جلدوں کی مبسوط کتاب لکھی جا سکتی ہے اگر موقع ملے تو خود ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے اس موضوع پر نہایت اجمال کے ساتھ پانچ ابواب میں ایک نذر عقیدت پیش کی جائے گی۔ اس سوانح شاہانہ کا پہلا باب حیات سلطانی اور دوسرے چار ابواب ۲۔ اردو شاعری۔ ۳۔ اردو نثر۔ ۴۔ فارسی شاعری اور ۵۔ ہندی شاعری پر مشتمل ہوں گے۔

ادارہ

خسرو دکن مشرق کے سب سے زیادہ ہر دلعزیز تاجدار ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ آپ کے لئے بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام تھا اس لئے آپ کو مشرقی اور مغربی علوم میں اعلیٰ مہارت حاصل ہے۔ فارسی اور اردو زبان کے اعلیٰ شاعر ہونے کے علاوہ اپنی خداداد ذہانت و اعلیٰ قابلیت اور علوم و فنون کی سرپرستی کی بناء پر بجا طور پر سلطان العلوم کہلاتے ہیں۔

اپنے والد نواب میر محبوب علی خاں کے انتقال پر آپ ۱۹۱۱ء میں ۲۵ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے جس کو آج تقریباً ۳۴ سال کا عرصہ ہوتا ہے اس عرصہ میں حیدرآباد کی ہر جہتی ترقی حیرت انگیز ہے جو کام کہ سلطنت آصفیہ کے قیام کے زمانے سے حالیہ زمانہ تک یعنی دو سو سال کے عرصہ میں نہیں ہوا تھا وہ اس وقت ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور بندگان عالی نے اپنی غیر معمولی روشن خیالی۔ رواداری بے انتہا سادہ زندگی' اعلیٰ اخلاق اور خداداد قابلیت سے حیدرآباد کی قومی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی ہے جس کی وجہ سے سارے ملک میں عام بیداری پیدا ہو گئی ہے اور سلطنت آصفیہ میں ترقی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے۔

رعایا کے نہ صرف جان و مال کی حفاظت اور ملکی ترقی کا خیال آپ کے پیش نظر رہتا ہے بلکہ تعلیمی اور اخلاقی زندگی کی اصلاح اور رعایا کے آرام و آسایش کی فکر ہمیشہ آپ کے دامنگیر رہتی ہے۔ چنانچہ طبقۂ امراء اور بالخصوص نوجوانوں کو ابھی حال میں جو نصائح آپ نے فرمائے ہیں وہ آب زر سے

لکھے جانے کے قابل ہیں۔

اعلیٰحضرت کی تخت نشینی کے وقت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر مدار المہام تھے۔ پھر نواب سالار جنگ بہادر (سوم) مدار المہام ہوئے۔ بعد ازاں پانچ سال تک اعلیٰحضرت نے نہایت جانفشانی سے یہ فرائض خود انجام دئے۔ آخر ۱۹۱۹ء میں باب حکومت کا قیام عمل میں آیا اس کے بعد سر علی امام، سر فریدوں الملک نواب ولی الدولہ بہادر، اور پھر مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یکے بعد دیگرے صدر اعظم مقرر ہوئے۔

جنگ عظیم کے نازک موقع پر اعلیٰحضرت نے خاندانی روایات کے مطابق اپنی جملہ فوجیں اور تقریباً چھ کروڑ روپیوں سے سلطنت برطانیہ کی مدد فرمائی۔ اس امداد کے اعتراف میں حکومت برطانیہ نے "یار وفادار" اور "ہز اگزالٹیڈ ہائینس" کے خطاب سے مخاطب کیا۔

اعلیٰحضرت کی حب الوطنی اور رعایا پروری ضرب المثل ہے چنانچہ آپ نے بادشاہ ہوتے ہی قدیم محکموں کی از سر نو تنظیم فرمائی اور بہت سے نئے نئے محکمے قائم کئے، جیسے محکمہ آثار قدیمہ، محکمہ زراعت، محکمہ صنعت و حرفت، محکمہ آرائش بلدہ، محکمہ امداد باہمی، محکمہ بلدیہ، محکمہ لاسلکی وغیرہ۔ کئی ایک بڑے بڑے تالاب بنوائے جیسے عثمان ساگر، حمایت ساگر، نظام ساگر وغیرہ اسی طرح بے شمار عمارتیں تعمیر کیں۔ جیسے عدالت العالیہ، دواخانہ عثمانیہ، سٹی کالج، معظم جاہی مارکٹ، کتب خانہ آصفیہ، جامعہ عثمانیہ کی عمارتیں، جوبلی ہال وغیرہ۔

غرض خوبصورت عمارتوں کی کثرت، سمنٹ کی کشادہ سڑکوں کی رونق اور ہر قسم کی عصری ترقیوں کی وجہ سے اس وقت حیدرآباد ہندوستان کا بہترین شہر بن گیا ہے، جہاں مشرقی اور مغربی دونوں قسم کے تمدنوں کے نمونے موجود ہیں۔ اسی طرح اضلاع اور شہر میں آمدورفت کی بہت کچھ سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ ریلوں اور سڑکوں کا ایک جال سارے ملک میں بچھا دیا گیا ہے اس طرح دور عثمانی میں عمارتوں کی تعمیر اور رعایا کی خوش حالی اور ترقی کو دیکھ کر عہد شاہجہانی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

اعلیٰحضرت کے پچیس سالہ کامیاب حکومت کا جشن (سلور جوبلی) منایا جا کر ابھی پورے دو سال کا عرصہ نہیں ہوا ہے کہ اس جشن ہی کے بعد رائٹ آنریبل سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر کو صدر اعظم مقرر فرمایا گیا ہے۔ سر اکبر نے صدارت عظمیٰ سے قبل ملک میں اشاعت تعلیم، قیام جامعہ عثمانیہ، ریاست کے مالیہ کے استحکام اور دیگر اصلاحات کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے وفاق کے سلسلہ میں کئی دفعہ انگلستان جا جا کر آپ نے ریاست کے مفاد کی بھی بہت کچھ حفاظت کی ہے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں حکومت برطانیہ اور اعلیٰحضرت کے درمیان یہ معاہدہ ہوا کہ "برار میں انگریزی جھنڈے کے ساتھ مقبوضہ نظام کا جھنڈا بھی بلند ہوگا۔ اور ولی عہد بہادر ہز ہائینس پرنس آف برار کا خطاب اور اعلیٰحضرت ہز اگزالٹیڈ ہائینس نظام آف حیدرآباد و برار کا خطاب اختیار فرمائیں گے"۔ اسی طرح علاقہ رزیڈنسی کی واپسی بھی اعلیٰحضرت کے زمانے کی ایک بڑی یادگار ہے۔

اعلیٰحضرت کی تقلید میں خاندان شاہی کے دیگر اراکین بھی ترقی ملک کے لئے ہمہ تن مصروف ہیں چنانچہ ولیعہد سلطنت ہز ہائینس پرنس آف برار والا شان اعظم جاہ بہادر کی سپہ سالاری میں فوجوں کی بہت کچھ اصلاح اور ترقی عمل میں آئی ہے۔ شہزادہ والا شان نواب معظم جاہ بہادر کی صدارت مجلس میں محکمہ آرائش بلدیہ حیدرآباد کے اشتراک عمل سے، غربا کی زندگی کو بہتر بنانے، بہبودی اطفال کے مرکز قائم کرنے، معظم جاہی مارکٹ کو ایک نمونے کی مارکٹ بنانے اور شہر کی عام رونق میں اضافہ کرنے میں سرگرم عمل ہے۔ ترکی شہزادیوں یعنی شہزادی ہز ہائینس درشہوار اور شہزادی نیلوفر کی رہنمائی کی وجہ سے حیدرآباد کے طبقۂ نسواں میں بہت کچھ بیداری، اصلاح

اور ترقی کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے ہیں چنانچہ انجمن خواتین حیدر آباد کی سرگرم کوششیں اس کا بدیہی ثبوت ہیں۔ اسی طرح سے اعلیٰحضرت نے اپنے بھائی صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر کو جدید تعلیمی کمیٹی کا صدر اعلیٰ مقرر فرمایا ہے۔ جن کی صدارت میں بہت کچھ مفید کام کیا جا رہا ہے غرض ۸۲ ہزار مربع میل سے زاید رقبہ ملک پر اعلیٰ حضرت کے نام کا سکہ جاری ہے۔ اور تقریباً ڈیڑھ کروڑ رعایا قانون آصفی کے تحت عدل و انصاف سے مستفید ہو رہی ہے۔

صرف خاص مبارک، پائیگاہوں، جاگیرات، اور سمستانوں کے قطع نظر محض علاقہ دیوانی کی آمدنی اس وقت (۹) کروڑ روپے سالانہ سے زاید ہے۔ جس کی وجہ سے خزانہ معمور ہے۔ اور قوم سازی کے بہت سے کام ہو رہے ہیں۔ زراعت پیشہ طبقہ کی مشکلات کو بڑی حد تک دور کیا گیا ہے۔ صنعت و حرفت کی ترقی کی طرف بھی خاص توجہ کی گئی ہے۔ چنانچہ اس وقت بہت سی صنعتیں جاری ہیں اور بعض بڑے بڑے کارخانہ جات کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ اسی طرح تجارت کیا بلحاظ درآمد اور کیا بلحاظ برآمد ترقی پر ہے۔

اعلیٰحضرت بندگان عالی کی سرپرستی اور فیاضی کا یہ عالم ہے کہ ریاست کے باہر بھی جو باشندے یا جو ادارے مستحق ہیں ان کو یہاں سے مالی امداد دی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ حیدر آباد قدیم کی روایات برقرار ہیں اور بعض امور میں حیدر آباد جدید دوسری ریاستوں اور برطانوی ہند سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے جیسا کہ انتظامی اختیارات کی علحدگی کا مسئلہ ہے۔ اس پر اکتفا نہیں بلکہ اس وقت دستوری اصلاحات کے نفاذ اور مزید معاشی ترقیات کی تحریکات پر غور کیا جا رہا ہے۔

آخر پر اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ مبارک دور عثمانی کا سب سے اہم اور لافانی کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے جہاں سارے علوم و فنون کی تعلیم ملک کی عام فہم اور سرکاری زبان یعنی ہندوستانی (اردو) کے ذریعہ دی جاتی ہے۔
اس بیس سال کے عرصہ میں جامعہ عثمانیہ نے جو ترقی کی ہے اور اس کو اندرون و بیرون ملک جو غیر معمولی کامیابی اور عام مقبولیت نصیب ہوئی ہے وہ تاریخ میں اپنی آپ نظیر ہے ؎

زندہ کردی چوں مسیحا علم و فن را در دکن
زندہ باش اے حضرتِ عثمان علی خاں زندہ باش

میر محمود علی

سب رس کے گذشتہ سال کے پرچے

سب رس کے گزشتہ پرچوں کی ابھی سے مانگ بڑھ گئی ہے۔ نومبر اور ڈسمبر کے پرچے اصلی قیمت میں خریدے جائیں گے۔ اگر کسی صاحب کے یہاں اچھی حالت میں ہوں اور وہ ان کو نکالنا چاہتے ہوں تو دفتر کو مطلع فرمائیں۔ دوسرے مہینوں کے پرچوں کو بھی حفاظت سے رکھیے۔ آئندہ طلب کیے جائیں گے۔

مہتمم

تمدنِ ہند میں دکن کا رتبہ

تاریخ ہند کی یہ کھلی حقیقت ہے کہ دکن تہذیب ہند کا ہمیشہ محافظ رہا ہے۔ اس حقیقت کو ہم حال اور مستقبل کے آئینہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ وہ تاریخ ہند جو انگریزی اقتدار کا ذریعہ بنی ہوئی ہے، ہمارے ماضی کی تقسیم فرقوں کی سرخیوں سے کرتی اور اس تنگ نظری کی وجہ سے تاریخ کا تہذیبی پہلو اجاگر نہیں ہوتا۔ ایک وطن پرست تہذیبی تقسیم کے لحاظ سے ہندوستان کو ان عنوانات کے تحت مطالعہ کر سکتا ہے۔ ویدوں کا دور، مثنویوں کے ذریعے ہندوستان ماسبق کی تہذیب، گوتم بدھ کا ہند، ہند کا نشاۃ ثانیہ اور آخر میں وہ تہذیب جو ویدانت اور توحید کے تخیل سے پیدا ہوئی۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس دوسری تقسیم کے تحت ہندوستانی تہذیب میں دکن کی اہمیت پر روشنی ڈالیں۔

آریائی قوم دنیا کی ان بڑی اقوام میں سے ہے جس نے ایک خاص رنگ اور نہج کی تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ انسان کائنات اور ان سب کے خالق کے متعلق ان کے نظریوں نے دیومالے پیدا کئے اور یہی دیومالے ایک ایک تمدن کی بنیاد بن گئے۔ مغرب میں یونان اور مشرق میں ہند۔ یہاں پر چونکہ آریائی تمدن سے اصل بحث نہیں ہے اس لئے مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ آریائی تہذیب نے چاروں کی معاشرتی تنظیم کے ذریعے ایک مستقل تمدن پیدا کیا۔ دکن نے اس تمدن کے ابتدائی خط و خال کو خود میں جذب کیا۔ افسانوی دور میں رامائن کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شہ کار مثنوی کا ایک نمایاں ہیرو ہنومان جب دکن کا یہ راجہ رام کو مدد دیتا ہے، صداقت کی تلوار سے ہے اور مظلوم عورت یا آریہ دت کی ماں کو دشمنوں سے چھڑا لاتا ہے اور اس کے صلہ میں آریا اس کو دیوتا بنا دیتے ہیں۔ لیکن اس واقعے سے یہ ثابت ہے کہ دکن نے اپنی جگہ میدانوں میں بسنے والے خود دار متمدن اور دوسروں کو نیچ سمجھنے والے آریاؤں کو اپنی انسانیت سے منوایا اور اپنی تمدن نوازی کو ثابت کیا۔ اس کے بعد دوسری بڑی مثنوی مہابھارت ہے۔ اس میں بھی دکن نمایاں ہے۔ پانڈوؤں کو دیس نکالا ہوتا ہے تو دکن میں پناہ ملتی ہے اور دوارکا کا روحانی اور بانکا راجہ پانچ بھائیوں کو سوکا ذبوں پر فتح مند کرتا ہے۔ یہ افسانے صحیح نہیں لیکن ان کا اثر دکن پر دیکھئے کہ یہاں کا ایک ایک مقام انہیں مثنویوں کی وجہ سے مقدس بن گیا۔ مندر جو قدیم تمدنوں کے مرکز ہوتے تھے لاتعداد شکل میں پیدا ہوگئے۔ ہر وہ مقام جہاں رام، سیتا اور لکشمن پہنچے مقدس بن گیا اور وندھیاچل سے لے کر ... مختلف اور مستقل ادارے پیدا ہوگئے۔ جنہوں نے آریاؤں کا مذہب، فلسفہ، علم، ادب، شاعری اور جملہ شعبہ ہائے فن کاری کو ... متبدل بنا دیا۔ اس طرح بیدر نل اور دمینتی کے لافانی عشق کی وجہ سے اہم بن گیا۔

افسانوں سے نکل کر جب ہم تاریخ پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہی سے دکن بیرونی عدا سے محفوظ رہا اور اکثر اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ دکن نے شمالی ہند کے میدانوں پر بھی اپنا سیاسی اقتدار جما لیا۔

بدھ مذہب وہ پہلی روحانی تحریک ہے جس نے آریاؤں کی طبقہ واری تقسیم اور آریا و غیر آریا کے عصبی فرق مٹا کر ہندوستان کو ایک قومیت میں لانے کی کوشش کی۔ لیکن دکن باوجود اشوک کی کامیابی کے اس ہمہ گیر تحریک کو تہذیبی حد تک قبول کیا اور قدیم روایات کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود بدھی حسن کاری کے خزانے کے ایلورہ، اجنٹا دکن میں ہونے کے، بدھ تمدن کے تحت آریائی تہذیب کو معدوم نہ ہونے دیا اور جب کبھی موقع ملا، از سر نو دکن نے قدیم ہندو عصبیت اور طبقہ واری تمدن کو تمام ہندوستان پر مسلط کر دیا۔ شنکر اچاری کی تحریک حقیقت میں دکن کے بدھ مت پر روحانی فتح تھی۔ یہ دکن کا نشاۃ ثانیہ تھا۔ اور موجودہ بحث کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ ہندوستان کا یہ سطح مرتفع نہ صرف بلند ہے بلکہ تہذیب دکن کا سپہ دار بھی ہے۔

اس کے بعد وہ دور آتا ہے جب کہ ہندوستان قدیم اور ایشیا کا وہ تمدن جو عرب کی سرزمین سے نکل کر پورے تمدن عالم پر محیط ہوگیا۔ ہندوستان میں ضیا پاشیاں شروع کرتا ہے۔ اسلام ایک ایسا ہمہ گیر سیل رواں ہے جو جگہ مقام اور حالات کے لحاظ سے بظاہر اپنی شکل کو تو بدلتا ہے، لیکن فطرت نہیں بدلتا۔ ہندوستان میں بھی اس نے یہاں کی تہذیب میں آکر ایک نیا روپ اختیار کیا اور ایک مستقل اور ہندوستانی تہذیب کی بنا ڈالی۔ دکن میں سب سے پہلے مسلمان جن کو تہذیبی اعمال کا موقع ملا وہ ترک ہیں جو مدرسوں کی تاریخ میں غلام خاندان کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ترکان دکن نے اس سرزمین کی تہذیب میں ایک چیز کا اضافہ کیا۔ موسیقی، رنگ کاری، آذری، یہاں پہلے ہی سے موجود تھی۔ لیکن پرشکوہ تعمیر کاری کا رواج ترکوں سے شروع ہوا اور دنیا کی سب سے بڑی گنبد بولی گنبد بیجاپور پر ختم ہوا۔ اس دور میں علاوہ اور چیزوں کے ہندوستانی قومیت کے لئے وہ انمول شئے پیدا ہوئی جس کو قومی زبان کہتے ہیں اور پراکرت، ترکی، فارسی اور عربی عام فہم الفاظ، محاورے اور لسانی اجزا مل کر ہندوستان کی قومی زبان بن گئی ہے جس کو ابتدا میں دکھنی پھر ریختہ، اور اس کے بعد اردو کا نام نصیب ہوا۔ اور موجودہ دور تعصب میں ہندوستانی ہندی، ہندی ہندوستانی کی الجھن میں پھنس گیا۔

یہ مختصر سا خاکہ اس امر کے لئے کافی ہے کہ ایک سوچنے والا اور تجسس کرنے والا عالم اس کو ابتدائی خط و خال سمجھ کر آگے آئے اور ایک اور مبسوط کارنامہ پیش کرے جس سے دکن اور اہل دکن کو معلوم ہو کہ حقیقت میں ہندوستانی تمدن میں ان کا درجہ اور رتبہ کیا ہے اور ہندوستان کے مستقبل کے سنوارنے میں ان کی کیا ذمہ داری ہے۔

سید محمد اکبر وفاقانی

دکن قدیم اردو شاعروں کی نظر میں

ملا وجہی ملک الشعرائے عہد محمد قلی قطب شاہ مصنف قطب مشتری

(۱۰۱۸ھ) و سب رس (۱۰۴۵ھ)

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں (مقام) — پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں (وجود)

دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ — انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہے لگ

دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے (سجتی) — کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے (اور)

دکھن ملک بھوت خاصا ہے (بہت ہی) — تلنگانہ اس کا خلاصا ہے

طبعی شاعر عہد ابوالحسن قطب شاہ مصنف بہرام و گل اندام

(۱۰۸۱ھ)

جو کوئی یاد کرتا نیں اپنا وطن (نہیں) — او مردہ ہے بے پیرن ہے اس کا کفن (پیرہن)

اگر کوئی غربت میں شاہی کرے — اگر مال ہور ملک لاکھاں دھرے (اور)

اسے کوں دیکھے کھول کر جو انکھیاں (تو مجھ کو، آنکھیں) — دیوے خاک تن کا وطن کا نشاں

وطن سب کوں دنیا میں پیارا اہے — سفر ہے سو جوں بادبارا اہے

اجنتا

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں جہاں کھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں

جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

شرابِ شعر کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں بہارِ زندگی غلطاں ہے سبزے کی اداؤں میں
نوائے سرمدی آتی ہے جھرنوں کی صداؤں میں بیاں ممکن نہیں وہ لطف آتا ہے دعاؤں میں

یہاں صدیوں سے رائج پُرسکوں شیریں مقالی ہے
یہاں کا ذرہ ذرہ مظہرِ شانِ جمالی ہے

در و دیوار پر ہیں نقش حسن و عشق کی گھاتیں پیامِ زندگی دیتی ہیں شرمیلی ملاقاتیں
جواں برسات کے دن، جان لیوا چاندنی راتیں فضا میں ہر قدم پر گونجتی ہیں دلنشیں باتیں

یہاں پیری پہ ہو جاتا ہے دھوکہ نوجوانی کا
سبق دیتا ہے ہر چہرہ حیاتِ جاودانی کا

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقشِ لاثانی تصدق جن کے ہر خط پر تجلیٔ خانہ مانی
مشکل ہے شباب و حسن میں تخئیل انسانی تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی

گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

بہانہ مل گیا دستِ جنوں کو حُسن کاری کا — اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصلِ بہاری کا
چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بے قراری کا — سکھایا گُر اسے جذبات کی آئینہ داری کا

دلِ کہسار میں محفوظ اپنی داستاں رکھ دی
جگر داروں نے بنیادِ جہانِ جاوداں رکھ دی

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے — ترازو دل میں ہو جاتی ہے وہ کاوشِ نظر دی ہے
اداؤں سے عیاں ہے لذتِ دردِ جگر دی ہے — کھلیں گے راز اس ڈر سے دہن پر مہر کر دی ہے

یہ تصویریں بظاہر گو یونہی خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کے بھید کہتی ہیں

کرشمہ ہے یہ سب اہلِ جنوں کی سعیِ پیہم کا — جنھیں احساس تک باقی نہ تھا کچھ شادی و غم کا
دلوں پر عکس کھنچ آیا تھا جن کے حُسنِ عالم کا — قلم کو نقش از بر ہو گیا تھا اسمِ اعظم کا

چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کر دیں

جہاں چھوڑا خوشی سے عشق کے پیغام کی خاطر — خوشامد اہلِ دنیا کی نہیں کی نام کی خاطر
نہ چھانی خاک در در کی کسی انعام کی خاطر — جیئے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر

زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے، نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

سکندر علی وجد

دکن کی قدیم تاریخ

دکن کا قدیم جغرافیہ

دکن سنسکرت زبان میں دکشینا کہلاتا ہے یعنی جنوبی علاقہ یعنی وہ علاقہ جو دریائے نربدا کے جنوب میں واقع ہے۔ سنسکرت اور بعض دوسری کتابوں میں اِس علاقہ کا نام دکشینا پتا بھی ہے یعنی جنوبی علاقہ۔ پراکرت زبان میں اس علاقہ کا نام : کھینا بادہا (DAKKINA BADHA) ہے۔ یونانیوں نے اسے دکھینا باڈس (DAKHINABADES) لکھا۔ فاہیان نے اسے اپنے سفرنامہ میں سنسکرت کی تقلید میں صرف TA - THSIN لکھا جو دکشینا کا مترادف ہے۔

قدیم ہند وجغرافیہ نویس نربدا کے جنوبی حصے کو دکن کہتے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے دوران میں دکن کے علاقہ کو صرف کرشنا ہی تک قرار دیا اور حالیہ مورخین بھی دکن سے وہ علاقہ مراد لیتے ہیں جو دریائے نربدا اور کرشنا کے درمیان ہے۔ بعض مورخین دکن کی سرحد کو بالا گھاٹ تک قرار دیتے ہیں اور بعض نے میسور کے شمالی حصہ کو بھی دکن میں شامل کیا ہے۔ جغرافی نقطۂ نظر سے یہہ سرزمین سطح مرتفع دکن کہلاتی ہے کیونکہ یہہ سمندر کی سطح سے تین ہزار سے پانچ ہزار فیٹ تک بلند ہے۔ عام طور پر ریاست حیدرآباد کو دکن کہتے ہیں۔

دکن کی سرزمین پہاڑی ہونے کی وجہہ سے یہہ قیاس کیا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں کوہ آتش فشاں بکثرت تھے۔ انہی پہاڑیوں کے بعض حصے تیز ہواؤں اور بارش کے عمل سے صدیوں بعد زرخیز اور قابل رہائش ہوئے۔ یہہ علاقہ کوہستانی ہونے کی وجہہ سے یہاں کی آب وہوا خشک ہے۔ اونچے پہاڑیوں کے نہ ہونے سے بارش کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ اس ملک کو نربدا' تاپتی' گوداوری' کرشنا اور ان کے معاون سیراب کرتے ہیں۔ علاقہ دکن پہاڑی ہونے کے باعث بے حد نشیب و فراز ہے جس کی وجہ سے دریا اور ندیاں سرعت سے بہتی ہیں۔ ان کا دارومدار کلیتہً بارش پر ہے جن میں برسات میں بار بار طغیانیاں آتی ہیں اور گرما میں یہہ پایاب ہو جاتی ہیں۔ انہی وجوہات کی بناء پر یہہ ندیاں کشتی رانی کے قابل نہیں۔

دکن کے شمال میں بندھیاچل اور ست پڑا پہاڑ ہیں اور اس کے مشرق و مغرب میں مشرقی و مغربی گھاٹ ہیں اور جنوب میں دریائے کرشنا ہے جو جنوبی ہند کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ شمال میں کوہ بندھیاچل دکن کی اس طرح حفاظت کرتا ہے جس طرح ہمالیہ ہندوستان کی۔ علاوہ ازیں اس پہاڑ کے باعث ہندوستان دو حصوں میں منقسم ہوگیا۔ غرض بندھیاچل دو مختلف تمدنوں دو مختلف آب وہواؤں' زمینوں اور اقوام کو ایک دوسرے سے علٰحدہ کرتا ہے۔ شمالی پہاڑوں اور دریاؤں کے دشوار گزار راستوں کے باعث دکن کا تمدن بڑی حد تک محفوظ رہا۔ یہاں کے قدیم باشندے دراوڑی انہی باعث خارجی اثرات سے محفوظ رہے۔ یہہ اقوام تقریباً اب تک اپنے قدیم اعتقادات' رسم ورواج' اور عادات وخصائل پر قائم ہیں اسی طرح کرشنا کے حائل ہونے سے انتہائی جنوبی ہند کے تمدن میں بہت زیادہ قدامت ہے اس لئے کہ شمالی ہند کے بہت کم فاتحین نے اس طرف توجہ کی۔

آریا وسط ایشیا سے افغانستان آئے اور پنجاب سے ہوتے ہوئے دوآب کے علاقے میں آباد ہوئے۔ دریائے سرسوتی اور تھانیسر کا درمیانی علاقہ ان کا مقدس مقام تھا یہیں ان کے عقائد اور مذہبی تصورات کا آغاز ہوا۔ رفتہ رفتہ یہہ بندھیاچل تک پھیل گئے لیکن دکن کے شمالی پہاڑوں نے ایک عرصہ تک ان کی روک تھام کی جب آریا جنوب میں داخل ہوئے تو پہلے برار کی وادیوں میں سکونت اختیار کی اس کے بعد اور آگے بڑھے۔ رامائن اور مہابھارت میں بھی اس دکھنی سرزمین کا تذکرہ ہے۔ راما سے عقیدت کے باعث شعرا نے اس علاقہ کو جنت نشان بتانے میں کسر اٹھا نہ رکھی۔ آریاؤں کی آمد کے وقت جنوب میں منظم معاشرت اور حکومتیں تھیں

دکن کی قدیم ترین وحشی قومیں گونڈ، بھیل، سنتال اور ٹوڈا ہیں۔ جو اب بھی جنگلوں اور پہاڑوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں اب بھی وہی اگلی بربریت ہے جب آریاؤں نے شمالی ہند میں اپنے قدم جمائے تو قدیم باشندوں یعنی دراوڑیوں کو سوائے جنوب کی طرف راہِ فرار اختیار کرنے یا ان کے تابع ہو کر غلام بنے رہنے کے کوئی اور صورت نہ تھی۔ اسی طرح جب دراوڑی جنوبی ہند میں داخل ہوئے تو انھوں نے بھی آریاؤں کی طرح یہاں کے قدیم باشندوں پر جبر و زیادتی کی ہوگی۔ ایک عرصہ بعد آریاؤں نے جنوبی ہند کا رخ کیا جہاں انھیں قدیم حکومتوں سے سابقہ پڑا جن سے انھوں نے ربط و اتحاد قائم کیا۔

دکن کی قدیم تاریخ بالکل تاریک ہے۔ جس طرح ہندوستان قدیم کی کوئی ہم عصر تاریخی تصنیف نہیں اسی طرح قدیم دکن کی بھی لہٰذا دکن کے قدیم خاندانوں کا حال معلوم کرنا بہت مشکل ہے البتہ تاریخ سے متعلق چند پراگندہ اوراق ملتے ہیں جن کا مرتبہ افسانوی ہے، اور کچھ مختصر حالات شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ کتبات سے جو چٹانوں اور تانبے کے پتروں پر کندہ ہیں یہاں کی مذہبی اور معاشری تحریکات پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی سلسلہ میں ان تحریکات کی سرپرستی کرنے والے حکمرانوں کے واقعات بھی معلوم ہوجاتے ہیں قدیم سکوں سے حکمرانوں کے نام اور ان کے سِنین ظاہر ہوتے ہیں جس مقام سے یہہ سکے برآمد ہوتے ہیں ان سے حکمرانوں کے حدود سلطنت یا اثرات کا پتہ لگتا ہے۔ پرانوں سے بھی چند بڑے راجاؤں کا حال معلوم ہوتا ہے، سنسکرت ادب کی جن حکمرانوں نے سرپرستی کی ان کے بھی واقعات سنسکرت کی کتابوں میں چیدہ چیدہ ملتے ہیں۔ نیز بعض چینی کتابوں میں طرف مذہبی معاملات کی حد تک ان راجاؤں کے حالات لکھے ہوئے ہیں جنھوں نے جین مت کی حمایت کی لیکن ان میں کوئی ترتیب و تنظیم نہیں، پہلی صدی عیسوی میں بدھ مت جب چین میں مروج ہوا تو بہت سے چینی سیاح بدھ کے مقدس مقامات کی زیارت کرنے کے لئے ہندوستان آئے ان سیاحوں نے جنوب کی بھی سیر کی اور لنکا تک گئے ان کی تحریروں سے بھی دکن کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اشوک کے تیسری صدی ق م کے کتبوں میں دکن کی بعض حکومتوں کا تذکرہ ہے۔ بعض یونانی اور رومی مورخین کے بیانات سے پانچویں یا چھٹی صدی ق م تک کی حکومتوں کے واقعات ظاہر ہوتے ہیں۔ باوجود ان ماخذوں کے دکن کے چند ایسے علاقے رہ جاتے ہیں جن کی قدیم تاریخ کا پتہ لگانے کا کوئی ذریعہ نہیں

دکن میں مختلف اقوام آباد ہیں، جن کی مختلف زبانیں ہیں اور انہی زبانوں کے اعتبار سے یہاں کے علاقے موسوم ہیں۔ بیدر سے اوپر شمال مغربی علاقہ میں مرہٹی زبان بولی جاتی ہے۔ یہہ علاقہ مہاراشٹر کہلاتا ہے، اس میں برار کا ایک حصہ، بگلانہ اور کوکن کا علاقہ شامل ہے، تلنگانہ کا علاقہ مہاراشٹر کے مشرق میں ہے اس میں اندھرا اور کلنگ سلطنتیں تھیں یعنی دریائے گوداوری کے

جنوب میں آندھرا سلطنت اور شمال میں کلنگ، مسلمانوں کے دور میں تلنگانہ کا مرکز ورنگل تھا، کنڑی علاقہ بیدر سے ادھونی تک اور مغرب میں دریائے کرشنا کے منبع تک پھیلا ہوا ہے تلنگانے کے نیچے تامل علاقہ ہے جو راس کماری تک ہے۔

ان علاقوں پر مختلف زمانوں میں مختلف حکمرانوں نے حکومت کی، اشوک کے کتبات اور قدیم پرانوں کے دیکھنے سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ جنوب کے قدیم ترین حکمران پانڈیا، چولا اور چیرا ہیں ان کا تمدن ۲۵۰ق م سے بھی پہلے کا ہے، یہاں ۲۵۰ ق م میں بدھ مت کی تعلیم و تلقین کے لئے اشوک نے مبلغین بھیجے جنھوں نے یہاں کے باشندوں کو بدھ مت کے فلسفہ کی تعلیم دی اس زمانہ میں دکن ڈنڈا کرانیا (DANDAKARANYA) یا ڈنڈکا (DANDAKA) یعنی صحرائے ڈنڈا کہلاتا تھا۔

آندھرا سلطنت

رامائن میں لکھا ہے کہ گوداوری اور کرشنا کے درمیان اندھرا خاندان حکومت کرتا تھا جس سے یونانی جغرافیہ نویس بھی واقف تھے، قدیم تاریخی ماخذوں کے دیکھنے سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ اندھراؤں کی حکومت تقریباً ۱۸۰ ق م سے شروع ہوئی۔ انھوں نے دھنیا کٹکا (DHANYAKATAKA) کو اپنا مرکز قرار دیا جو دریائے کرشنا پر تھا۔ ان کی سلطنت شمال میں بندھیاچل سے جنوب میں دریائے کرشنا تک، مشرق میں خلیج بنگال سے مغرب میں بحیرۂ عرب تک پھیلی ہوئی تھی۔ پروفیسر بھنڈارکر کا خیال ہے کہ اندھرا خاندان دکن پر ۷۳ ق م سے ۲۱۸ء تک برسراقتدار رہا۔ مہاراشٹر اور تلنگانہ کا تمام علاقہ ان کے تابع تھا۔ ونسنٹ اسمتھ کا خیال ہے کہ اندھرا کا پائے تخت سری کاکولم تھا جو دریائے کرشنا پر واقع تھا۔ شائد دھنیا کٹکا کا نام بدل کر سری کاکولم ہو گیا ہو یا بدل گیا ہو۔

اس زمانہ میں گجرات اور بمبئی کے علاقہ میں ستراپوں کی حکومت تھی۔ ستراپ کے معنی صوبہ دار کے ہیں۔ یہہ ایرانی لفظ ہے۔ اندھرا خاندان کے ایک حکمران بل بائے کرنے ۱۲۶ء میں ستراپوں کے علاقہ مہاراشٹر پر قبضہ کیا اسی زمانہ میں مالوہ میں ایک اور ستراپ خاندان حکمران تھا۔ اس خاندان کے ایک راجہ ردرادامن اول نے جس کا پائے تخت اجین تھا اندھرا خاندان کے راجہ سے مہاراشٹر کا علاقہ چھین لیا، جب تلنگانہ کے اندھرا خاندان میں جگن سری یا یجنا سری ۱۷۳ء میں برسراقتدار ہوا (جس کا عہد حکومت ۲۰۲ء تک ہے) تو اس نے مالوہ کے ستراپوں سے جنگ کی اور ان کی سلطنتوں کے بعض صوبے اپنی سلطنت میں شامل کر لئے۔

دکن میں دو آندھرا سلطنتیں تھیں، ایک مشرق میں جس کا پائے تخت دھنیا کٹکا تھا اور دوسری مغرب میں جس کا مرکز پیتھان (PAITHAN) تھا جو اب پٹن کہلاتا ہے اور صوبہ اورنگ آباد کے ایک تعلقہ کا مستقر ہے، پٹن دریائے گوداوری کے شمالی کنارے پر ہے۔ یہہ پرتستان (PRATISTHAN) بھی کہلاتا ہے یہہ دکن کا قدیم ترین شہر ہے اشوک نے اپنے مبلغ یہاں بھی بھیجے تھے، بطلیموس (PTOLEMY) کے قول کے مطابق یہہ آندھرا بادشاہ پلومائی (PLUMAYE) دوم کا پائے تخت اور اہم تجارتی مرکز تھا۔ یہہ مشہور آندھرا راجہ سلواہانا (SALMAHANA) کی جائے پیدائش ہے اور اس کا پائے تخت بھی رہا۔ اب بھی یہاں بہت سے منادر اس کی قدیم عظمت کی یادگار ہیں۔ آندھرا خاندان کا کب اور کس طرح خاتمہ ہوا کچھ بھی پتہ نہیں چلتا۔

جب کہ آندھرا سلطنت عروج پر تھی شاید راشٹراکوٹ سلطنت اس کی باجگزار تھی جس کا علاقہ بندھیاچل کے شمال و جنوب میں تھا۔ اٹ قوم یا راشٹراکوٹ سلطنت کے شمال میں گپتا حکومت تھی ان کے علاوہ ایک اور خاندان کدمب پانچویں صدی عیسوی میں مرہٹہ علاقہ میں برسر اقتدار تھا جن کا مرکز ہالسی تھا اس سلطنت میں کنڑا اور میسور کا علاقہ شامل تھا۔

اسی پانچویں صدی عیسوی میں پلوا کو عروج حاصل ہوا اور اس نے آندھرا کے مشرقی پایہ تخت اور علاقوں پر قبضہ کیا۔ آندھرا دور میں ملک کی تجارتی حالت بہت اچھی تھی۔ یہاں ایشیا، مصر، روم، یونان، چین اور دوسرے مشرقی مقامات سے سفراء آتے تھے شام میں جنگ میں ہندوستانی ہاتھیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ آندھرا سلطنت کے بعض علاقوں میں رومی سکے بھی دستیاب ہوئے ہیں پروفیسر بھنڈارکر کے قول کے مطابق آندھرا کے خاتمہ کے بعد تین سو سال تک دکن کے حکمران خاندانوں کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

چالوکیا

دکن کی سلطنتوں کے حالات وضاحت کے ساتھ چھٹی صدی عیسوی کے وسط سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں خاندان چالوکیا حکمران تھا۔ چالوکیا یا سولنکی کا تعلق چاپ قوم سے ہے جو گرجر کی ایک شاخ ہے، گرجر جو شمال مغربی ہندوستان میں زیادہ آباد ہیں ان کا تعلق ہون سے ہے۔ شمالی ہند کے پرہار اور راجپوت قبائل دراصل ان وحشی اقوام کی تبدیل شدہ شکل ہیں جو پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان میں داخل ہوئی تھیں ان میں سے ادنیٰ درجہ کے لوگ گرجر کہلاتے ہیں اور اعلیٰ درجہ کے راجپوت چالوکیا خاندان کا ابتدائی تعلق شمالی ہند کے راجپوتوں سے ہے جو کچھ عرصہ بعد دراوڑیوں میں خلط ملط ہو گئے۔ چالوکیا نقل مقام کرکے راجپوتانہ سے دکن آئے۔ اس خاندان کی بنیاد ایک سردار پلکیسن اول نے ڈالی۔ یعنی ۵۵۰ء میں واتاپی ضلع بیجاپور (موجودہ مقام بادامی) پر قابض ہو کر اس نے ایک چھوٹی سی سلطنت قائم کی اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے پلکیسن نے اشومیدھ کی رسم منائی تھی اس کے دونوں بیٹوں کیرتی وامن اور منگلیس کے عہد میں سلطنت مشرق اور مغرب کی طرف پھیلی۔ کیرتی ورمن اول ۵۶۶ء میں تخت نشین ہوا۔ یہ زبردست جنگجو تھا۔ ایک کتبہ میں لکھا ہے کہ اس نے جنوب کے تمام قبائل اور اقوام کو تابع کیا۔ مشہور بدھی راہب دھرم گپتا اسی کے عہد میں گزرا ہے جو مذہبی کتابوں کا چینی زبان میں ترجمہ کرتا تھا۔ کیرتی ورمن وشنو کی پوجا کرتا تھا۔ اس نے بادامی میں ایک غاری مندر تعمیر کروایا، منگلیس نے کوکن اور مغربی گھاٹ کا کچھ علاقہ بھی سلطنت میں شامل کیا۔

منگلیس کے بعد کیرتی ورمن کا بیٹا پلکیسن دوم تخت نشین ہوا۔ اس نے ونگی پر قبضہ کیا اور اپنے بھائی وشنو وردھن کو وہاں کا نائب السلطنت بنایا جس کا صدر مقام پشٹپور تھا جو اب ضلع گوداوری میں پتھاپورم کہلاتا ہے۔ ۶۱۵ء میں وشنو وردھن خود مختار ہوا اور خاندان چولا، پانڈیا اور کریل سے جنگ کی پلکیسن دوم نے ۶۲۰ء میں ہرش کو پسپا کیا، ۶۲۵ء تا ۶۲۶ء میں اس نے ایک سفارت ایران کے شہنشاہ خسرو دوم کے پاس روانہ کی جس کا طبری نے تذکرہ کیا ہے اجنٹہ کے غار نمبر ۱ میں استرکاری کی ایک بڑی تصویر میں ایرانی سفیر ہندی راجہ کے آگے کھڑا ہوا ہے۔ اس تصویر سے ایرانی اور ہندی فنون لطیفہ کے اختلاط کی جھلک ظاہر ہوتی ہے۔

۶۴۱ء میں ہیون سانگ چینی سیاح پلکیسن دوم کے دربار میں حاضر ہوا، اس نے اجنٹہ کی تعریف کی ہے۔ اس وقت چالوکیا سلطنت کا

مرکز واتاپی نہ تھا بلکہ ناسک، ہرشس کے مقابلہ میں سہولت پیدا کرنے کے لئے پلکیسن نے ناسک کو موقتی پایۂ تخت قرار دیا تھا۔ اس نے کوکن کے موریا کو شکست دی۔ راشٹرکوٹ کی طاقت توڑ دی اور کدمب کا بھی خاتمہ کیا اور مشرقی شامل سے بڑھ کر پتھا پورم کے قلعہ پر قبضہ کیا، کلنگ کے راجہ کو زیر کیا جس کا پایۂ تخت پوری تھا جو اب بھی جگناتھ کے مندر کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ اس نے چولا، پانڈیا اور کریل سلطنتوں پر بھی حملہ کیا۔

جنوبی ہند میں پلوا خاندان بہت طاقتور تھا، اگرچہ مسلسل کوشش کرکے چالوکیا راجاؤں نے ان کی قوت توڑ دی تھی پھر بھی ۶۴۲ء میں کانچی کے پلوا خاندان کے راجہ نرسمہا ورمن نے پلکیسن دوم کو شکست فاش دے دی اور بادامی کو اس بری طرح برباد کیا کہ تیرہ سال تک بادامی پر کسی نے حکومت نہ کی۔ جب ۶۵۵ء میں وکرما جیت اول (پلکیسن دوم کا بیٹا دور حکومت ۶۵۵ء تا ۶۸۰ء) تخت نشین ہوا تو اس نے پلوا سے اپنے باپ کا بدلہ لیا اور شہر کانچی پر قبضہ کیا اس نے چولا کو بھی شکست دی۔ وکرما جیت کے پوتے وجیا دیتا کے راشٹرکوٹ سے اچھے تعلقات تھے جن کی بنا پر راشٹرکوٹ کے اندرا راجا نے چالوکیا شہزادی سے شادی کی جس کے بطن سے دنتی درگا پیدا ہوا جب کیرتی ورمن دوم برسر اقتدار ہوا تو اس کے دور میں دنتی درگا نے بادامی پر قبضہ کیا جس سے مغربی چالوکیا سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ اسی چالوکیا دور میں شاید پلوا کی مخالفت کے سلسلہ میں راجمندری کی بنیاد پڑی اور یہاں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا گیا کیونکہ جنوب والوں کے لئے کرشنا سے ہوتے ہوئے شمال کی طرف جانے کا راستہ یہیں سے گزرتا ہے۔

مغربی چالوکیا کا پایۂ تخت بادامی ضلع بیجاپور میں ہے۔ یہاں جینوں کا ۶۵۰ء کا ایک غاری مندر ہے۔ اس کے علاوہ تین غار برہمنی اثر کے ہیں۔ ان میں سے ایک ۵۷۹ء کا ہے یہاں دو قلعے ہیں ایک باون بندی اور دوسرا رن منڈل، چھٹی صدی عیسوی میں پلوا نے اس پر قبضہ کیا تھا۔ اس کے بعد چالوکیا اس پر قابض ہوئے ساتویں صدی عیسوی میں مشہور چینی جاتری ہونسانگ یہاں آیا تھا اس نے لکھا ہے کہ اس کی راجہ (پلکیسن دوم) سے ملاقات ہوی چھتری ذات کا ہے یہہ راجہ وسیع النظر اور بلند حوصلہ ہے اس کے ماتحت وفاداری کے ساتھ اس کی خدمت بجالاتے ہیں اور راجہ کو ان سے خاص ہمدردی ہے۔

یہاں کی زمین زرخیز ہے۔ غلہ خوب اگتا ہے۔ موسم گرم ہے یہاں کے باشندوں کے خصائل سادہ اور دیانت دارانہ ہیں ان کے قد اونچے ہیں اور طبیعت کے غاٹے ہیں اگر ان کی توہین کی جائے تو بری طرح بگڑتے ہیں اور بدلہ لیتے ہیں۔ جنگ میں ڈٹ کر لڑتے اور غنیم کا خوب تعاقب کرتے ہیں لیکن جب کوی اپنے آپ کو ان کے حوالہ کردیتا ہے تو وہ اسے ایذا نہیں پہونچاتے۔ جب کسی جنگ میں سردار ہارجاتا ہے تو اسے مارتے نہیں بلکہ اسے زنانی لباس پہناتے ہیں اور اسی طرح اسے زندگی کاٹنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ملک میں بے شمار پہلوان ہیں جو اکثر کشتی لڑتے رہتے ہیں۔ یہہ لوگ خوب پیتے اور لڑتے ہیں۔ اگر وہ کسی کو سڑک پر ماردیں تو قانوناً انھیں گرفتار نہیں کیا جاتا۔ یہاں ہاتھیوں کو بھی خوب پلایا جاتا ہے۔ اپنے پہلوانوں اور جنگی ہاتھیوں پر راجہ کو فخر ہے۔

واتاپی کے حکمرانوں کے دور میں بدھ مذہب آبادی کے ایک بڑے حصے میں رائج تھا جس کا ہیون سانگ نے ذکر کیا ہے۔ اس وقت یہاں بدھ مت کے بہت سے مناد اور خانقاہیں تھیں، لیکن بدھ مت کو زوال ہو رہا تھا۔ کیونکہ برہمنی مذہب کے اثرات بڑھ رہے تھے

چنانچہ خود راجہ پلکیسن اول نے اشومیدھ کی رسم منائی، برہمنی مت کی ترقی کے ساتھ ان کے مناد بھی چوطرف بننے لگے اور پران کے دیوتاؤں برہما، وشنو اور شیوا وغیرہ کی پوجا ہونے لگی، بادامی غاری مندر میں منگلیس کے عہد میں وشنو کی پوجا ہوتی تھی جو اس کا تعمیر کرایا ہوا تھا۔ ان مختلف مذاہب کا سلطنت میں پایا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ چالوکیا راجہ تمام مذاہب کے ساتھ رواداری برتتے تھے۔
باوجود اس کے بدھ مت بتدریج برہمنی مذہب اور جین مت کے مقابلہ میں معدوم ہوگیا ہندو خاص طور پر قربانی کی طرف توجہ کرنے لگے۔
اس زمانہ میں بدھ اور جین مت والوں سے ہندؤں نے غاروں میں مندر تراشنے کا فن سیکھا مرہٹوں کے علاقہ کے جنوبی حصے میں عام طور پر جین مذہب مقبول تھا، آٹھویں صدی عیسوی میں زرتشتی مذہب بھی ہندوستان میں رائج ہوا۔ خراسان کے جلاوطن پارسی ۷۳۵ء میں پہلی دفعہ احاطہ بمبئی کے ضلع تھانہ میں بمقام سنجان آباد ہوئے، پلکیسن دوم اور وکرما جیتا دوم نے جینوں کی مدد کی اور ان کے مناد تعمیر کروائے، ۶۷۸ء میں یہاں مشہور قواعد کا عالم (PUJYAPADA) تھا اوپر بیان ہوچکا ہے کہ سلطنت زیادہ وسیع ہوجانے سے انتظامات کی خاطر پلکیسن دوم نے ونگی پر اپنے بھائی وشنو وردھن کا تقرر کیا جس نے کچھ عرصہ بعد اپنی علٰحدہ حکومت قائم کرلی اور اس طرح دو چالوکیا خاندان ہوگئے مغربی چالوکیا کا مرکز بادامی تھا اور مشرقی کا ونگی۔ ونگی گوداوری اور کرشنا کے دہانوں کے قریب ہے۔ بدھ مت کا زبردست دشمن اور ذی اثر شخص شنکر اچاریہ اور مشہور عالم (AKALANKA) اسی زمانہ کے ہیں آٹھویں صدی میں کلنگ اور مشرقی دکن پر مشرقی چالوکیا اور دکن کے وسطی اور مغربی حصہ پر راشٹر کوٹ حکمران تھے۔ دسویں صدی کے اختتام پر راشٹر کوٹ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئے جس کے باعث مغربی چالوکیا کا دوسرا دور شروع ہوا جو مغربی چالوکیا خاندان کی رجعت کہلایا جاسکتا ہے۔ تیلا دوم نے ۹۷۳ء میں راشٹر کوٹ کے آخری راجہ ککّ دوم کو شکست دی اور نئے مغربی چالوکیا خاندان کی بناء ڈالی، اس نے راشٹر کوٹ شہزادی سے شادی کی اس کا عہد حکومت ۹۷۳ء سے ۹۹۶ء تک ہے، اس کے دور میں سلطنت بلاری اور میسور کے بعض بعض حصص تک پھیل گئی تھی۔

اسی زمانہ میں چولا حکمران راجا راجہ نے ونگی پر قبضہ کیا اور چالوکیا خاندان کے ایک لڑکے کو تخت نشیں کرکے واپس ہوا اس راجہ نے جس کا نام وی مالا دیتا ہے راجا راجہ کی لڑکی سے شادی کی اس کی اولاد نے مشرقی چالوکیا اور چولا سلطنت پر حکومت کی بالآخر مشرقی چالوکیا حکومت کا ۱۰۷۰ء میں خاتمہ ہوگیا جس سے مغربی چالوکیا کا اقتدار بہت بڑھ گیا اور وہ تمام دکن پر حاوی ہوگئے۔ ۱۰۴۲ء میں مغربی چالوکیا خاندان میں سومیسورا اول تخت نشین ہوا تھا جس نے کلیانی کو دارالسلطنت قرار دیا جس کے باعث یہ چالوکیان کلیانی کہلاتے ہیں۔ کلیانی ممالک محروسہ سرکار عالی میں ہے۔ اس خاندان نے بھی قدیم چالوکیا کی طرح دو سو برس حکومت کی سومیسور اول نے چولا کے راجا راجہ کو شکست دی، دھارا (مالوہ کے علاقہ میں ہے) اور جنوبی کانچی پر حملہ کیا اور ان دونوں کو فتح کیا۔
۱۰۷۶ء میں وکرماجیت اول یا بکرمانک تخت نشین ہوا۔ اس نے کانچی فتح کیا اور دوارا سمدرا کے خاندان ہوسل سے سخت جنگ کی دوارا سمدرا کو دواراوتی پور بھی کہتے تھے مسلمان مورخین نے اسے دوارا سمندر لکھا اس کے کھنڈر ضلع حسن میسور میں موجود ہیں اس نے اپنے نام سے ایک سنہ جاری کیا جو کبھی مقبول نہ ہوا، وکرماجیت نے وشنو کا ایک بڑا مندر تعمیر کروایا اور اس کے آگے ایک تالاب بنوایا اور اس کے قریب ایک شہر آباد کیا جو وکرما پورا کہلاتا تھا، اس کے عہد میں رعایا خوش حال تھی۔ کشمیری پنڈت

(BILHANA) کے قول کے مطابق ملک میں ہر طرف امن تھا۔ کہیں چوروں کا خوف نہ تھا جو اچھے انتظام کی دلیل ہے۔ علاوہ اس کے بادشاہ نیک منش، فیاض اور ہمدرد تھا اس نے علم کی خوب سرپرستی کی، یہہ کلیانی کا بڑا راجہ تھا جس کے عہد میں سلطنت انتہائی عروج کو پہونچی؛ اور بقول بلہانا، کلیان ہر اعتبار سے عدیم المثال تھا، یہی مشہور قانون داں وجنانیسور کا وطن ہے جس کی تصنیف متاکشرا ہندو قانون کی سب سے زیادہ مستند کتاب ہے۔ کلیانی احاطہ بمبئی کے ضلع تھانہ میں ہے۔ (PRIPLUS) کے قول کے مطابق کلیانی کی اہمیت دوسری صدی عیسوی سے شروع ہوئی، یہہ شہر تجارت کے اعتبار سے مشہور تھا، بڑے بڑے تجار یہاں آتے تھے شائد یہہ شہر ۲۵۰ء میں آباد ہوا یہاں پیتل اور شیشم کا کام اچھا ہوتا تھا اور کپڑے بھی اچھے بنتے تھے، چودھویں صدی میں مسلمان حکمرانوں نے اس کا نام اسلام آباد رکھا۔

وکرماجیت کے مرنے کے بعد چالوکیاں کلیانی کو زوال شروع ہوا، راجہ تیل سوم کے عہد میں سپہ سالار افواج بجل یا وجالایا بجالا نے بغاوت کی اور تمام سلطنت پر قابض ہوگیا ۱۱۶۲ء سے ۱۱۸۳ء تک بجل اور اس کے جانشینوں نے حکومت کی جس کے بعد خاندان چالوکیا کے ایک شہزادہ سیمیسور چہارم نے بجل کے جانشینوں سے ملک کا بہت بڑا حصہ حاصل کیا لیکن یادوا خاندان دیوگری اور ہوسل خاندان دوارا سمدرا کے عروج کے باعث اس کا اقتدار جاتا رہا یعنی ۱۱۹۰ء میں کلیان سلطنت کا خاتمہ ہوا۔

بجل کے عہد میں ایک مذہبی انقلاب ہوا جس سے شیو کے مذہب نے دوبارہ زندگی پائی اور ایک نیا فرقہ قائم ہوا جس کا نام ویراسیوک یا لنگایت ہے جو اب تک موجود ہے۔ بجل مذہباً جین تھا، اس کے متعلق یہہ مشہور ہے کہ اس نے فرقہ لنگایت کے دو برہمن گاروں کو اندھا کیا تھا جس کے بدلہ سرپرست مذہب لنگایت بسوا (BASAVA) کے اشارہ ۱۱۶۷ء میں راجہ کو قتل کیا گیا اس مذہب کے ماننے والے عام طور پر کنڑی علاقوں میں آباد ہیں۔

وکرماجیت کے عہد میں تاجروں نے بدھ مذہب کے لئے خانقاہیں تعمیر کروائیں اور ان کے اخراجات کے لئے رقمیں اور زمینیں فراہم کیں۔ اس زمانہ میں جین مت کو تفوق حاصل نہ تھا، لنگایت فرقہ کے نکلنے کے بعد تو جین مت کا اثر اور بھی زائل ہوگیا، لنگایت مذہب زیادہ تر تجار میں پھیلا جو پہلے جین مت کے طرفدار تھے۔ لنگایت لنگ کو حیات کا مبدا سمجھتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ یہہ ویدوں، تناسخ بچپن کی شادی کے مخالف ہیں۔ یہہ بالکل حقیقت ہے کہ ان کے مذہب کا بانی بسوا برہمن تھا لیکن انھیں برہمنوں سے سخت نفرت ہے اس مذہب کے جاری ہونے سے نہ صرف بدھ مت جنوب سے ناپید ہوا بلکہ جین مت کو بھی زوال شروع ہوا۔

راشٹراکوٹ

۷۵۳ء تا ۹۷۳ء

راشٹراکوٹ یادو نسل کے تھے راجہ (RATTA) کے ایک بیٹے کا نام راشٹراکوٹا تھا جس کے نام سے یہہ خاندان مشہور ہوا آٹھویں صدی کے درمیان میں دنتی درگا نامی ایک سردار نے جو راشٹراکوٹ خاندان سے تعلق رکھتا تھا خاندان چالوکیا کے راجہ کرماجیت دوم کے بیٹے کیرتی ورمن دوم کو شکست دی اور راشٹراکوٹ سلطنت قائم کی۔ جب عوام اس کی طرف سے بدظن ہوئے تو اس کے چچا کرشنا اول نے

اسے تخت سے اتار دیا اور خود راجہ بنا' بعض کتبوں سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ دنتی درگاہ لاولد تھا شائد اس کے مرنے کے بعد کسی اور وارث تخت کو ہٹا کر کرشنا تخت نشین ہوا' دنتی درگا کو تخت سے علٰحدہ کرنا اس لئے ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت طاقتور حکمران تھا۔

کرشنا اول کے عہد میں ایلورا کا مشہور کیلاس کا مندر تعمیر ہوا۔ یہہ مندر ایک چٹان میں تراشا گیا ہے جو فن تعمیر کے اعتبار سے غیر معمولی ہے۔ اسی خاندان کے ایک حکمران گوبند سوم نے ۷۹۳ء تا ۸۱۵ء سلطنت کو شمال میں بندھیاچل اور مالوا اور جنوب میں کانچی تک وسعت دی اور اپنے بھائی اندراج کو جنوبی گجرات میں نائب السلطنت مقرر کیا' اس کے بعد اموگھورش تخت نشین ہوا۔ (۸۱۵ء تا ۸۷۷ء) اس نے زیادہ تر ونگی کے مشرقی چالوکیا راجاؤں سے جنگ کی۔ اس نے اپنا دارالسلطنت ناسک سے مانیا کھیت بدل دیا اسی شہر کو عرب مورخین نے مانکیر لکھا ہے' اب یہہ مالکھیڈ یا ملکھیڑ کے نام سے ریاست نظام میں ہے' یہہ اس زمانہ کا بہت مشہور اور بارونق شہر تھا' اموگھورش کے جانشین کرشنا دوم نے جینیوں کے ننگے فرقے دگمبر کی بہت سرپرستی کی جن سین' گنبھدرا اور دوسرے علما کی توجہہ کے باعث اس فرقہ کو بہت تقویت حاصل ہوی جس کی بدولت بدھ مت کے اثرات دکن سے رفتہ رفتہ زائل ہوتے گئے' اور بارھویں صدی تک یہہ مذہب دکن سے معدوم ہوگیا۔

اسی خاندان کا ایک راجہ اندر سوم نے قنوج پر کامیاب حملہ کیا' اور ۹۴۹ء میں چول خاندان کے راجہ دت پر فوج کشی کی اس زمانہ میں ہندوؤں اور بدھ مت والوں میں زبردست رقابت تھی' راشٹرکوٹوں کے ابتدائی دور میں برہمن ویدکی تعلیم کے مطابق خوب قربانی کرتے تھے' اس زمانہ میں جین مت کو بھی فروغ حاصل ہوا' راشٹراکوٹوں کی علمی سرپرستی کے باعث ان کے دربار میں شعرا کا اجتماع ہوا

آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں یعنی ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کی فتح سے سندھ پر اسلامی سیاسی اثرات غالب آئے' راشٹراکوٹ خاندان کے ان عرب حملہ آوروں سے دوستانہ تعلقات تھے اور گرجروں سے مخالفت تھی' گرجروں نے عربوں سے اچھے تعلقات نہ رکھے جس کے باعث انھیں نقصان پہونچا' اس سے بچنے کے لئے راشٹراکوٹوں نے ان نووارد حملہ آوروں سے اتحاد کرلیا تھا' جس کے باعث مسلمان سوداگر اور سیاح مغربی علاقوں میں بہ آسانی تجارت کرتے تھے اور بہت سے مغربی ساحل پر آباد ہوے' ان مسلمان تاجروں اور سیاحوں نے اپنے سیاحت نامے لکھے جن میں یہہ راشٹراکوٹ راجاؤں کو بَل ہَرا لکھتے ہیں جس کے معنی ہندوستان کا سب سے بڑا راجہ ہیں' انھیں بل ہرا اس لئے لکھتے ہیں کہ یہہ خود کو ولبھ کہتے تھے۔ اور یہہ لفظ رائے کے ساتھ مل کر بلرا ہوگیا' چالوکیا راجہ بھی ولبھ اپنے نام کے ساتھ لکھتے تھے' شائد انہی سے یہہ طرز راشٹراکوٹوں نے اختیار کی' ولبھ رائے یا بلبارائے مقامی استعمال سے بلرائے ہوا اور عربوں نے اسے بلہرا لکھا۔

راشٹراکوٹ راجاؤں کی مسلمان سیاحوں نے بہت تعریف کی' ان کے عہد کا کیلاس کا مندر دنیا کے عجائبات میں ہے۔ ان راجاؤں نے سنسکرت ادب کی سرپرستی کی اور بہت سے مندر شاہی مصارف سے تعمیر کروائے۔

ان تمام سلطنتوں میں چالوکیا سلطنت زیادہ عرصہ تک باقی رہی یہہ ایسے زمانہ میں یعنی ۱۱۹۰ء میں ٹوٹی جب کہ تمام ہندوستان کی سیاسی حالت بدل رہی تھی کیونکہ اسی سنہ میں مسلمانوں نے شہاب الدین غوری کے تحت ہندوستان پر حملے کئے اور یہاں اپنی

حکومت قائم کی جو صدیوں تک برقرار رہی، جغرافی اعتبار سے چالوکیا جیسی وسیع سلطنت میں مختلف زبانوں کے علاقے تھے جو فطرتاً زبانوں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے علحدہ ہوکر اپنی علحدہ حکومتوں کے علم بردار ہوگئے، مرہٹواڑی کے علاقہ میں یادوا سلطنت قائم ہوئی جس کا پائے تخت دیوگیر موجودہ دولت آباد تھا آندھرا یعنی تلنگانہ میں کیتیا سلطنت جس کا مرکز ورنگل تھا، تیسرے کنڑی علاقہ میں ہوسلیا خاندان برسراقتدار تھا جس کا پائے تخت دوارا سمدرا تھا۔

کیتیا خاندان سنہ ۱۱ء کے بعد نمایاں ہوا اس کے طاقتور راجہ پرتاپا ردرا اور گنپتی تھے، اس خاندان نے مسلمانوں کے حملہ تک اچھی طرح حکومت کی، یادوا خاندان کے راجہ خود کو سری کرشنا کی نسل سے سمجھتے تھے۔ یہ لوگ جنوب میں ہوسلیا حکومت سے برسرپیکار تھے اور شمال میں گجرات تک اپنی سلطنت کو وسعت دی، ان کا بڑا حکمران سنگھانا (سنہ ۱۲۱۰ء تا سنہ ۱۲۴۷ء) تھا، اس خاندان نے سنسکرت کی سرپرستی کی علاء الدین خلجی (سنہ ۱۲۹۶ء تا سنہ ۱۳۱۶ء) نے اپنے آخری دورِ حکومت میں نہ صرف دکن بلکہ تمام جنوبی ہند کو مستقل طور پر حکومت دہلی کے تابع کیا، لیکن اس کے انتقال کے بعد مرکزی حکومت کی کمزوریوں سے جنوب کے حکمرانوں نے فائدہ اٹھایا، جب محمد تغلق (سنہ ۱۳۲۵ء تا سنہ ۱۳۵۱ء) برسراقتدار ہوا تو اس نے سنہ ۱۳۲۶ء میں دیوگڑھی کا نام دولت آباد قرار دے کر اسے اپنا پائے تخت بنایا لیکن فوراً ہی بعض اسباب کی بنا پر اپنے ارادہ سے باز آیا مگر جنوب کو اپنے قابو سے نکلنے نہ دیا اور ورنگل پر فوج کشی کرکے اس کا نام سلطان پور رکھا محمد تغلق کے آخری عہد میں گجرات اور دکن کے امرا نے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی چنانچہ موقع پاکر انھوں نے سنہ ۱۳۴۶ء میں حسن گنگو بہمنی کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا جس نے دکن میں ایک طاقتور حکومت قائم کی جو بہمنی سلطنت کہلاتی ہے جس کا دارالسلطنت گلبرگہ تھا۔

دکن کی قدیم تاریخ کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شمالی ہند اور دکن اکثر ایک دوسرے کے مرہونِ منت رہے چنانچہ آندھرا سلطنت جو موریا کی ہم عصر تھی، اس کے ایک فرد نے اشوک کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد مگدھ پر حکومت کی اور یہ مگدھ کا آندھرا خاندان کہلاتا ہے حملوں کے سلسلہ میں بھی دکن کے حکمرانوں کو بعض دفعہ تفوق حاصل رہا یعنی پلی کیسن دوم نے ہرش کو شکست دی اور اندر سوم نے قنوج پر کامیاب حملہ کیا، قدیم دکن کی تہذیب و تمدن اور سیاسی حالات کا پتہ لگانا اس لئے مشکل ہے کہ اس خطہ میں سنہ عیسوی سے بھی صدیوں پہلے سے حکومتیں قائم تھیں جن کی کوئی مفصل سند نہیں ملتی نیز یہ سرزمین مختلف اقوام کی آماجگاہ ہے کیونکہ یہ خطہ شمالی و جنوبی ہند کے درمیان واقع ہے۔ علاوہ ازیں اپنی قدرتی خوبیوں کے باعث بھی یہ ہمیشہ سے دلکش اور جاذب نظر رہا۔

سید سراج الدین

نقوشِ اجنٹہ

نگاہ عشق سے دھوئی ہوئی ہیں تصویریں ۔۔۔ چمک رہی ہیں یہاں آرزو کی تقدیریں

پگھل گئے ہیں کہیں صاف ہوگئے ہیں کہیں ۔۔۔ وہ سختیٔ دلِ ناکام پتھروں میں نہیں

یہہ حسن وعشق کی پوجا کے کارنامے ہیں ۔۔۔ یہہ رنگ ونور کے درد آشنا فسانے ہیں

دکن کی خاک میں ہے بدھ کی زندگی خاموش ۔۔۔ دکن کی خاک میں اندر کے ہے پریم کا جوش

نقوشِ حسن کو خونِ جگر سے دھوتے ہیں ۔۔۔ یہہ پتھروں میں نہیں بزمِ دل میں سوتے ہیں

ہے دیوتاؤں کی تعبیرِ زندگی میں حُسن ۔۔۔ ہے پارساؤں کی تصویرِ زندگی میں حُسن

چمک ہے روح کی، رنگوں کی راجدھانی میں ۔۔۔ لچک ہے عشق کی، پتھر کی سخت جانی میں

نظر نواز بنا، اور جانگداز بنا ! ۔۔۔ زمینِ شوق کا ہر ذرہ عشق باز بنا

زمیں پہ رفعتِ جاں خود نمائی کرتی ہے ۔۔۔ وہ دیکھ بزمِ تصور، خدائی کرتی ہے!

باقیؔ

خواتین دکن نمبر

اِس مرقع دکن کے ساتھ اس کا ایک **ضمیمۂ خواتین** علحدہ کتابی صورت میں شائع ہورہا ہے جس میں دکن کی بیش انشاء پرداز خاتونوں کے نہایت دلچسپ اور مفید مضمون اور نظمیں شامل ہیں، یہہ اصل میں اسی دکن نمبر کا حصہ ہے جو صنفِ لطیف کے رشحاتِ قلم پر مشتمل ہے۔ اور ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبۂ نسوان کی طرف سے اس کی سرگرم معتمد محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کے پرخلوص مساعی کی وجہ سے نہایت خوبی، نفاست اور لطافت کے ساتھ مرتب اور شائع ہورہا ہے۔ اس کی عام قیمت ۸؍ رکھی گئی ہے۔ لیکن صرف سب رس کے خریداروں کو ختم فروری تک نصف قیمت پر محض اس وجہ سے دیا جائے گا کہ یہہ سب رس ہی کا ایک حصہ ہے۔ اس خواتین دکن نمبر کے بعض مضمون نگاروں کے نام یہہ ہیں:-

- رالعہ بیگم صاحبہ (زنانہ کالج)
- فاطمہ بیگم صاحبہ اداؔ
- تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ
- قمر النساء بیگم صاحبہ
- کبریٰ اقبال عبدالروف
- زبیدہ ضیاء الدین انصاری
- بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیرؔ
- رالعہ بیگم صاحبہ (معلمہ محبوبیہ اسکول)
- افسر النساء بیگم صاحبہ
- ممتاز جہاں بیگم صاحبہ صوفی
- صفیہ صدیق فریدہ بیگم صاحبہ
- جہاں بانو بیگم صاحبہ بی۔اے
- لطیف النساء بیگم صاحبہ بی۔اے
- ذاکرہ بنت فضل اللہ احمد صاحب
- تسنیم ربانی بی۔اے
- مسز صوفی ام۔اے۔

دکن کی اسلامی فتوحات

"دورِ وسطیٰ میں دکن اور شمالی ہند کے تعلقات" (۱۲۹۴ء تا ۱۳۵۱ء)

سنہ ۱۲۰۶ء میں جب دہلی کی اسلامی سلطنت قائم ہوئی تو اس کے حدود زیادہ وسیع نہ تھے۔ بنگال، گجرات، مالوہ، قنوج، اجمیر اور دوآبے کے کچھ حصے اس میں شامل تھے۔ سنہ ۱۲۹۰ء تک اس کو بنگال سے سندھ اور جنوب میں دریائے نربدا تک وسیع کیا گیا۔ جب دہلی کی حکومت خلجی خاندان کے ہاتھ آئی تو جلال الدین خلجی کے پیشِ نظر کسی قسم کا فتوحاتی یا تعمیری کام باقی نہ رہا۔ علاء الدین خلجی صوبہ دار کڑہ شاہی فوجوں کے ہمراہ مالوہ کے قریب بھیلسہ کی فتح میں مصروف تھا یہاں اس کو دکن کی مہاراشٹرا سلطنت کے حالات معلوم ہوئے جس کا مرکز دیوگری تھا۔ یہ سلطنت کوہ ست پڑا کے جنوب میں واقع تھی۔ چونکہ یہ خطہ تامچلا واقع ہوا تھا اور اس کے پیشِ نظر سلطنت دہلی پر قبضہ کرنے کا منصوبہ پہلے ہی سے تھا اس لئے اس نے بغیر سلطان کی اجازت کے آٹھ ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ دیوگری کا رُخ کیا۔

یوں تو جنوبی ہند کے ساحلوں پر مسلمان عرب تاجروں نے آباد ہو کر اسلامی آبادکاری کی بنیاد ڈال دی تھی لیکن فرشتہ اور شہریار کی تحریروں کے بموجب ان تاجروں نے کوئی سیاسی حیثیت حاصل نہ کی۔ بلکہ وہ دوسرے فرقوں کی طرح آباد ہوئے۔ ان عرب تاجروں کے ہمراہ بعض بزرگ، فقیر اور درویش بھی آئے جن میں بابا ظاہر، خواجہ خضر اور شیخ عبداللہ خفیف بھی تھے۔ ان بزرگوں نے سماجی اتحاد میں نمایاں حصہ لیا جس سے مخلوط تہذیب و تمدن کا وجود ہوا۔ انسانی برادری اور وحدت کا پیام سرزمین دکن پر بالکل نئے اصول سے پیش کیا گیا جو آگے چل کر شمالی ہند پر بھی پھیلا اور ہندوستانی تمدن کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

علاء الدین کے حملے کے وقت دکن میں تین خودمختار سلطنتیں تھیں۔ سنہ ۱۱۹۰ء میں جب چالوکیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا تو مہاراشٹرا، تلنگانہ اور کرناٹک کے صوبے خودمختار ہو گئے۔ مہاراشٹرا کا پایۂ تخت دیوگری تھا جہاں یادو خاندان کا راجہ رام دیو حکمراں تھا۔ تلنگانہ کے مرکز ورنگل پر کاکتیا خاندان کی ایک عورت رودرما دیوی اپنے پوتے کی کمسنی کی وجہ سے حکمراں تھی۔ کرناٹک کے مرکز دوارا وتی پور پر بلال خاندان کا راجہ بیر بلال حکمران تھا۔ یہ سلطنتیں بہت متمول تھیں کیونکہ ان کے حدود میں سونے، چاندی اور جواہرات کی کانیں تھیں اور اس کے علاوہ گھوڑے ہاتھی کافی تعداد میں موجود تھے۔

علاء الدین خلجی کی روانگی سے قبل بعض صوفی اور فقیر منش بزرگ دکن کی طرف روانہ ہو چکے تھے جن میں سے بعض تو راستہ کی گھاٹیوں پر آباد ہو گئے اور بعض آگے بڑھتے چلے گئے۔ ان لوگوں سے علاء الدین کو راستہ معلوم کرنے میں بڑی مدد ملی۔ دولت کی ہوس اور اپنے منصوبوں کو کامیاب بنانے کی کوشش میں اس نے راستہ کی مشکلات کا مطلق خیال نہ کیا۔ اس کی فوج بالاگھاٹ سے ہوتی ہوئی ایلچپور پہونچی جو مہاراشٹرا سلطنت کی فوجی چھاؤنی تھی یہاں معمولی جھڑپ ہوئی اور ایلچپور پر قبضہ کر لیا گیا جو دکن کا باب الداخلہ ہے۔ یہاں اس نے ضروری معلومات حاصل کیں۔ اس کے بعد آگے بڑھ کر دیوگری (دولت آباد) کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

راجہ رام دیو قلعہ بند ہو گیا۔ اس زمانہ میں اس کا بیٹا شنکر دیو کسی جاترا میں گیا ہوا تھا۔ راجہ نے اس اچانک حملے سے پریشان ہو کر صلح نامہ پیش کیا۔ اس صلح نامہ میں فرشتہ کے بیان کے بموجب علاء الدین کو چھ سو من سونا، سات من موتی، دو من جواہرات اور ہزار من چاندی اور اس کے علاوہ ریشمی تھان، گھوڑے، ہاتھی وغیرہ ہاتھ آئے۔ سالانہ خراج کا وعدہ لے کر یہ واپس ہو رہا تھا کہ شنکر دیو آ گیا اور اس نے علاء الدین کی فوج پر حملہ کر دیا۔ لیکن اس پر بھی علاء الدین کو کامیابی ہوئی اور اس نے پہلے صلح نامہ کی رُو سے دوگنا تاوان حاصل کیا۔ ایلچپور پر اس نے مستقل قبضہ رکھنا ضروری سمجھا کیونکہ اس کو آئندہ بھی دکن سے تعلقات قائم رکھنے تھے۔ یہ واپس ہو گیا لیکن بعض صوفی اور فقیر منش ایلچپور [illegible]

پہاڑیوں پر آباد ہو گئے۔ یہی سب سے پہلی دکن کی اسلامی آبادکاری کی ابتدا ہے۔ علاء الدین کا یہ حملہ محض اتفاقی اور اپنے سیاسی منصوبوں کی تکمیل کے سلسلہ میں دولت کے حصول کی خاطر ہوا۔ دکن پر براہ راست حکومت کرنے کا کوئی خیال علاء الدین کے دماغ میں نہ تھا۔ اس حملے کے بعد دکن کا راستہ شمالی ہند کی طاقتوں کے لئے کھل گیا اور ساتھ ہی ساتھ دکن کے سیاسی حالات پر بھی اس کا اثر پڑا۔

علاء الدین خلجی کو دکن میں وہی درجہ حاصل ہے جو محمود غزنوی کو تاریخ ہند میں۔ جس طرح محمود نے ہندوستان کی دولت سے اپنی سلطنت کو مستحکم اور مالا مال کر لیا اسی طرح علاء الدین نے دکن کی دولت سے سلطنت دہلی کو حاصل کیا اور بادشاہ بننے کے بعد اسی دولت سے اپنے مخالفین کے منہ بند کر دیئے۔ اور وہ قوت حاصل کی جو آج بیسویں صدی میں آمروں کو حاصل ہے۔

دکن پر دوسرا حملہ سنہ ۱۳۰۶ء میں ہوا کیونکہ دیوگڑی کے راجہ نے خراج ادا کرنا روک دیا تھا۔ علاء الدین اس دوران میں سلطنت کے کاروبار اور فتوحات میں مصروف رہا اور دکن کی طرف سے کسی قدر غافل بھی ہو گیا جس سے فائدہ اٹھا کر رام دیو نے تین سال تک مسلسل خراج ادا نہ کیا۔ سلطنت دہلی کی جانب سے ملک کافور کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی گئی لیکن راجہ نے بغیر مقابلہ کے اطاعت قبول کرلی اور دہلی جا کر ایک ماہ تک شاہی مہمان رہا۔ دربار سے اس کو رائے رایاں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا اور سرخ چتر لگانے کی اجازت دی گئی۔ گجرات کا ضلع نیسری بھی اس کی عملداری میں دے دیا گیا۔ اس طرح دیوگڑی پر پورا سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا۔

سنہ ۱۳۰۹ء میں تلنگانہ کے مرکز ورنگل پر حملہ کیا گیا۔ اس حملہ سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ سلطنت دہلی کے پیش نظر دکن پر حملہ کرنے کا ایک خاکہ موجود تھا۔ ملک کافور کی ماتحتی میں شاہی فوجیں ورنگل کی طرف روانہ ہوئیں۔ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ علاء الدین نے ملک کافور کو یہ حکم دیا تھا کہ ورنگل پر قبضہ کرنے کے بجائے دولت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ شاہی فوجیں الچپور، قندھار، دیوگڑی سے ہوتی ہوئی ورنگل پہونچیں۔ راستہ میں دیوگری کے راجہ کی جانب سے شاہی فوج کیلئے ضروری انتظامات کر دیئے گئے تھے۔ ہنمکنڈہ پر قبضہ کرکے قلعہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ قلعہ بہت مضبوط اور مستحکم تھا۔ تھوڑے دنوں کے اندر ہی راجہ رودر دیو نے صلح کرلی اور سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا اور نذرانہ وتاوان کے سلسلہ میں کثیر مقدار سونا، چاندی اور زر و جواہرات پیش کیا جو ایک ہزار اونٹوں پر لادا گیا۔ ہاتھی اور گھوڑوں کی ایک کثیر تعداد بھی ہاتھ آئی۔ پروفیسر کرشنا سوامی اینگار نے امیر خسرو اور برنی کے بیانات کا حوالہ دیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ورنگل کی پوری دولت ملک کافور کے ہاتھ آگئی تھی۔ اس طرح دکن کی دو متمول سلطنتوں پر سیاسی اقتدار قائم ہو گیا۔ اب صرف جنوب ہند میں دو اور سلطنتیں باقی رہ گئی تھیں۔ ایک دوار سمدر کی ہوسیلا سلطنت اور دوسری سلطنت پانڈیہ جو مالابار میں واقع تھی۔

ملک کافور نے ورنگل کی فتح کے وقت ہی جنوبی سلطنتوں کے حالات معلوم کر لئے تھے۔ دہلی پہونچنے کے بعد اس نے سلطان سے مالابار پر حملہ کی اجازت لے لی چنانچہ سنہ ۱۳۱۱ء میں ایک بڑی فوج کے ساتھ مالابار کی طرف روانہ ہوا۔ اس حملہ کو امیر خسرو نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے کیونکہ وہ خود اس میں ہمراہ تھے۔ دکن کی پہاڑیوں اور دشوار گذار راستوں کا حال بہت ہی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ راستہ میں رام دیو نے رسد کا انتظام کر دیا تھا۔ اور کچھ فوجی ہاتھی بھی پیش کئے۔ نربدا، تاپتی کے علاوہ اس فوج کو تین اور دریا، گوداوری، سینی اور بھیما عبور کرنے پڑے۔ باندری کے مقام پر ملک کافور ٹھیر گیا تاکہ مالابار سلطنت کے حالات معلوم کرے۔ اس وقت سلطنت کے لئے دو دعویداروں بیر پانڈیہ اور سندرا پانڈیہ کے درمیان جنگ ہو رہی تھی جو حقیقی بھائی تھے۔ دوار سمدر کا راجہ بلال دیو اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر اپنی فوج کے ساتھ حملہ کے لئے آ گیا لیکن جوں ہی

اس کو مسلمانوں کے آمد کی اطلاع ہوئی وہ واپس ہوگیا۔ ملک کافور نے اس کا تعاقب کیا اور اُس کو دوارسمدر (دوار وتی پور) میں محصور کر لیا جو سلطنت کرناٹک کا مرکز تھا۔ بلال دیو نے صلح نامہ پیش کیا جس پر ملک کافور نے سالانہ خراج کی پابندی عاید کی اور تاوان جنگ جو ایک کثیر مقدار میں ہاتھ آیا مع دیرآ بلال سوم کے دہلی روانہ کر دیا تاکہ علاء الدین کے روبرو اپنی اطاعت کا اقرار کرے۔

مالابار سے سندر پانڈیہ نے بھاگ کر دہلی کا رخ کیا اور علاء الدین کے پاس پہونچا اور سلطنت پر تیر پانڈیہ قابض ہوگیا۔ مسلمانوں کی آمد پر راجہ نے پایۂ تخت کو چھوڑ کر ایک جزیرہ میں پناہ لی۔ ملک کافور نے بغیر کسی جھگڑے کے کثیر مال و دولت پر قبضہ کر لیا۔ واصف اور خسرو کے بیان کے بموجب اس نے ۳۲۰ ہاتھی ۲۰ ہزار گھوڑے ۲۰۵۰۰ پونڈ سونا اور جواہرات کے کئی صندوق حاصل کئے۔ اس دولت سے اس کے خیالات پلٹ گئے اور ایک خود مختار سلطنت کے قیام کا منصوبہ اس کے دماغ میں آیا لیکن حالات سے مجبور ہو کر اپنے منصوبہ کو کامیاب نہ بنا سکا۔ اس شکستے سے اس کی ہمت بڑھ گئی اور یہ آگے بڑھتا ہوا۔ رامیشورم تک چلا گیا جہاں اس نے یادگار کے طور پر ایک مسجد بھی تعمیر کروائی۔ یہاں اس نے مسلمانوں کو بھی دیکھا جن کا طرز معاشرت نسلی تمیاز اور زبان وہاں کے ماحول اور جغرافی حالات کی وجہ سے بہت کچھ بدل گئی تھی۔ ۱۳۱۱ء میں یہ شمالی ہند کی سب سے پہلی اور انتہائی پیش قدمی تھی۔ اورنگ زیب صرف دریائے کاویری تک بڑھ سکا۔ اس طرح تاریخ ہند کا یہ دور جنوب ہند کی فتح اور سیاسی اقتدار کو حاصل کرنے میں سب سے نمایاں رہا۔

علاء الدین خلجی کے بعد اس کا دوسرا بیٹا مبارک خلجی جب ۱۳۱۶ء میں تخت نشین ہوا تو دیوگڑی میں بغاوت ہوگئی۔ وہاں ہرپال دیو نے شنکر دیو کو ہٹا کر تخت پر قبضہ کر لیا تھا۔ مبارک خلجی نے ہمت سے کام لے کر دیوگڑی پر حملہ کر دیا۔ اس نے پہلے خسرو کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ بھیجا اور اس کے بعد خود گیا۔ ہرپال دیو کو شکست ہوئی۔ دیوگڑی پر براہ راست قبضہ کر لیا گیا۔ اس طرح مہاراشٹرا سلطنت براہ راست شمالی ہند کے زیر حکومت آگئی۔ گلبرگہ اور ساگر پر فوجی عہدہ دار مقرر کر دیئے گئے اور دیوگڑی پر ایک ترکی النسل صوبہ دار مقرر کیا گیا جس کا نام ییک لاکی تھا۔ ان انتظامات کے بعد مبارک خلجی نے خسرو کو ورنگل کی تسخیر کے لئے روانہ کیا۔ . . . ورنگل کے راجہ نے اطاعت قبول کر لی اور کثیر مال و دولت نذرانہ کے طور پر پیش کیا جس کی تفصیل ابن بطوطہ نے لکھی ہے یعنی ایک سو ہاتھی ۱۲ ہزار گھوڑے ۶۰ صندوق جواہرات ۲۵۰ پونڈ سونا۔ ورنگل کی سلطنت کے پانچ اضلاع بھی دیوگڑی میں شامل کر دیئے گئے۔

خسرو اس فتح کے بعد جنوبی ہند کی طرف روانہ ہوگیا۔ ضیاء الدین برنی نے خسرو کی اس جنوبی مہم کو بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ جن جن شہروں سے یہ فوج گزرتی تھی وہاں کے راجہ شہر چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ اس نے ان خالی شہروں سے بہت بڑی دولت حاصل کی۔ دولت کی فراوانی نے اسے باغی بنا دیا اور یہیں سے اس نے سلطنت دہلی پر قدم جمانے کے منصوبے شروع کر دئے۔ دکن کی دولت نے ہر بار اس کو شاہی کے خواب دکھائے اور انھوں نے اسی قوت کے نشے میں سلطنت دہلی پر قبضہ بھی حاصل کیا۔

خلجی دور کے بعد تغلق دور میں غیاث الدین تغلق نے جب شاہی خزانہ خالی پایا تو اپنے بیٹے الغ خان کو ورنگل پر حملے کے لیے روانہ کیا۔ کیونکہ یہاں کے راجہ نے دہلی کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھا کر خراج دینا بند کر دیا تھا۔ یہ حملہ ۱۳۲۳ء میں ہوا جب شاہی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا تو فوج میں یہ غلط خبر مشہور ہوگئی کہ غیاث الدین تغلق کا انتقال ہوگیا ہے جس کی وجہ سے محاصرہ پر برا اثر پڑا۔ راجہ کی فوج نے محاصرین کو سخت شکست دی۔ الغ خاں نے دیوگڑی میں پناہ لی۔ ضیاء الدین برنی اور ابن بطوطہ کے بیانات میں کچھ اختلاف ہوگیا ہے کیونکہ برنی اس غلطی کا ذمہ دار الغ خاں کو

بتاتا ہے اور بطوطہ اس کو مورد الزام نہیں سمجھتا۔ بہرحال واقعات کچھ بھی ہوں غیاث الدین تغلق نے اکثر لوگوں کو جو دہلی بھاگ آئے تھے سخت سزائیں دیں۔ اور ایک دوسری فوج الغ خاں ہی کی سرکردگی میں روانہ کی جس کے بعد قلعہ فتح ہوگیا اور راجہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر کے تلنگانہ کے علاقے کو بھی براہ راست دہلی کے تحت کر دیا گیا۔

سلطنت دہلی جو ۱۲۹۴ء میں صرف دریائے نربدا تک پھیلی ہوئی تھی ۱۳۳۰ء میں مالابار تک پھیل گئی۔ مسلمانوں کی اتنی وسیع سلطنت اس سے قبل یا اس کے بعد کبھی قائم نہ ہوئی۔ خاندیس کے علاقے میں پٹھانوں کی نوآبادی اسی زمانہ میں قایم ہوئی۔ ان حملوں سے مسلمانوں کے اکثر قبیلے اور خاندان شاہان دہلی سے جاگیریں حاصل کر کے دکن کے مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے تھے۔

سلطان محمد تغلق (الغ خاں) کے ابتدائی زمانہ میں اس کے بھانجے بہاء الدین گرشاسپ نے جو گلبرگہ کے قریب ساگر میں متعین تھا بغاوت کردی۔ اس کی سرکوبی کے لئے خواجہ جہاں کی قیادت میں شاہی فوجیں روانہ کی گئیں۔ بہاء الدین نے شاہی فوجوں کی آمد سے مرعوب ہو کر دریائے کرشنا اور تنگبھدرا کی درمیانی سلطنت کمپلی میں پناہ لی۔ یہاں اس کا تعاقب کیا گیا۔ یہاں سے یہ دوار سمدرا چلا گیا اور وہاں بھی اس کا تعاقب کیا گیا۔ اس تعاقب میں ان دونوں سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا گیا اور ان کو براہ راست دہلی کے تحت کر دیا گیا۔ بہاء الدین یہاں گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ روپوش ہوگیا اور پھر اس کا پتہ نہ چلا۔

محمد تغلق کے پیش نظر سب سے زیادہ مشکل مسئلہ مرکزی قوت کا قیام تھا اس لئے کہ مرکز کو موثر بنائے بغیر اتنی وسیع سلطنت پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ اس نے اس مسئلہ کا حل یہ سوچا کہ دہلی کے بجائے دیوگری کو مرکز بنایا جائے تاکہ شمال، جنوب، مشرق اور مغرب چاروں طرف سے اس کا فاصلہ یکساں رہے۔ دہلی میں بیٹھ کر جنوب ہند کے علاقے مالابار وغیرہ پر تسلط قائم رکھنا بہت ہی مشکل تھا اور پھر ایسے زمانہ میں جب کہ ذرائع حمل ونقل میں بڑی دشواریاں تھیں۔ نظری اعتبار سے اس کا یہ حل بہت ہی مناسب اور بہتر تھا لیکن عملی اعتبار سے اس کا یہ منصوبہ بیکار ثابت ہوا۔ اس نے اپنے اقتدار سے دہلی کو اجاڑ کر دولت آباد کو بسالیا لیکن بہت ہی تھوڑے عرصے میں پھر دہلی واپس ہونا پڑا۔ اس ردوبدل سے دولت آباد (دیوگری) میں مسلمانوں کی ایک کافی تعداد آباد ہوگئی اور امرائے صدہ کا ایک بڑا حصہ یہیں مقیم ہوگیا۔ جس کے بعد انھیں امراؤں نے دہلی سے بغاوت کر کے ایک علیحدہ اسلامی سلطنت دکن میں قائم کی جو بعد میں سلطنت بہمنی کے نام سے مشہور ہوئی۔ دکن کی یہ خود مختار سلطنت محمد تغلق کی زندگی ہی میں قائم ہوئی اور بعد میں تاریخ ہند اور تاریخ دکن کی سیاسیات میں ایک بڑے انقلاب کا باعث ثابت ہوئی۔

سید کرار علی

افغانی قندہار نہیں۔ دکن کا قندہار جسے قندہار شریف کہا جاتا ہے۔ کیونکہ محمد تغلق کے ساتھ دکن میں آئے ہوئے اولیاء اللہ کی چودہ سو پالکیوں میں کا ایک کثیر حصہ قندہار شریف ہی کے حصہ میں آیا۔ یہ دکن کا بلگرام ہے، یہاں سے اولیاء، صوفیا، علماء، شعرا، مورخین اور مشاہیر پیدا ہوئے جن کے حالات اور کارنامے " مشاہیر قندہار دکن " میں پڑھئے جس کو اکبر صدیقی صاحب بی اے نے مرتب کر کے باتصویر شایع کیا اور اب ادارۂ ادبیات اردو کو اس کا حق تصنیف دے دیا ہے۔ (مہتمم)

سلطان محمد شاہ بہمنی
۷۷۵ھ تا ۷۸۰ھ

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی
۸۲۵ھ تا ۸۳۹ھ

دکن پر بہمنی خاندان کی حکومت

سلطنت بہمنی کی مبارک تاسیس جو ۱۳۴۷ء میں عمل میں آئی وسط چودھویں صدی کا عظیم الشان واقعہ تھا۔ اس سلطنت کی حقیقی عظمت اس کے جلیل القدر سلاطین کی علمی و عملی شخصیت اور ان کے غیر معمولی سیاسی اور تمدنی کارناموں میں مضمر ہے۔ ان علم برداروں نے دکن کو ایک بلند پایہ سیاست اور پاکیزہ تمدن کے زیور سے اس قدر سنوارا کہ دنیا اس کو پہچاننے لگی اور اب بھی اس کی یاد تازہ ہے، دکن کی اصلی عظمت اسی خاندان کی وجہ سے ہے اس وقت دکن کو جس تمدن پر ناز ہے وہ سب شاہان بہمنیہ کا سرمایہ ہے۔ انہیں سلاطین نے دکن کے طول و عرض میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی اور اس کو پھیلایا۔ بہمنیوں کا کرشمہ تھا کہ انھوں نے بہت جلد دکن کو اپنا گھر بنالیا۔ اس ملک کی جغرافی خصوصیات اپنے میں جذب کرلیں اور اپنی حکومت انہیں خصوصیات کے مطابق بنائی۔ یہ سلطنت اس وقت قائم ہوئی تھی جب کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کمزور ہونے کی وجہ سے سیاست منتشر ہو رہی تھی۔ اس کے ذمہ دار کچھ تو اس زمانے کے سیاسی حالات تھے جو خلجی خاندان کے خاتمہ کے بعد ہندوستان میں رونما ہوئے بعض خاندان میں ہندوستان جیسے وسیع ملک کی رہنمائی کی اہلیت نہ تھی مرکز کی کمزوری سے ہر صوبے میں جداگانہ عملداری قائم ہوگئی دکن کی انفرادیت جس طرح پچھلے زمانے میں قائم تھی پھر کھڑی ہوگئی اور امرائے صدہ کی بدولت جو دکن کے تاریخ ساز ہیں سلطنت بہمنی کی داغ بیل پڑگئی

سلطنت بہمنی کا پہلا دور

سلطنت بہمنی کی تقریباً ڈیڑھ سو سال کی تاریخ ہے اس کا ابتدائی زمانہ جب کہ اس سلطنت کے بانی علاء الدین حسن اور اس کے بیٹے محمد شاہ اول نے حکومت کی عہد تاسیس تھا اس دور میں سلطنت کی بنیاد رکھی گئی اور دکن کے طول و عرض اور اس کی قومی و جغرافی خصوصیات کا صحیح مطالعہ کرکے ایک نہایت مستحکم نظام حکومت قائم کیا گیا یہ سلاطین بہمنیہ کا سیاسی کرشمہ سمجھنا چاہئے کہ انھوں نے ابتدا ہی سے دکن کو اپنا گھر بنالیا تھا۔ اس جدید ماحول میں اپنے آپ کو اس قدر مانوس کرلیا کہ قدیم اہل دکن ان کو اپنا بادشاہ تسلیم کرنے لگے۔ نظام حکومت اس طرح مرتب کیا گیا جو سب کے لئے خوش گوار تھا۔ ہندوؤں کو حکومت میں نمایاں کیا گیا جس کو تاریخ ہند کا پہلا واقعہ سمجھنا چاہئے، مرکزی حکومت کی بنیاد رکھی گئی اور سلطنت مقامی ضرورتوں کے تحت صوبہ داری اور ضلع داری علاقے قائم کی گئیں، اگرچہ اس انتظام کا سہرا ان بادشاہوں کے سر ہے جو اس سلطنت کے بانی اور معمار تھے لیکن اس میں اسی سلطنت کے پہلے وزیر اعظم سیف الدین غوری کا بھی ہاتھ تھا۔ محمد شاہ کو اس بات کا احساس تھا کہ اس نے شاہی آداب کے لئے خاص اہتمام کیا تھا دربار کو مختلف طریقوں سے سجایا گیا امراء کے بیٹھنے کی جگہ مقرر کی اور بادشاہ کے بیٹھنے کے لئے فیروزہ کے نام سے ایک تخت بنایا گیا جس کی بہت شہرت تھی ہندوستان کی تاریخ میں شاید ایسا تخت نہیں بنا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں اسی تخت کی شہرت سے متاثر تھا۔ تخت دکن، بہمنی تخت کی نقش ثانی سمجھنا چاہئے محمد شاہ کے دربار کا نظام بھی بہمنیوں کی خاص اختراع ہے۔ اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔

محمد شاہ اول کا انتقال ۷۷۶ھ ۱۳۷۵ء میں ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مجاہد شاہ تخت نشین ہوا جو تین سال سے زیادہ بادشاہی کرنے نہ پایا، کیونکہ اس کے چچا داؤد نے اس کا خاتمہ کرکے خود تخت پر قبضہ کرلیا مجاہد شاہ کے ہمدردوں نے بہت جلد اس کا بھی خاتمہ کردیا اور علاء الدین حسن کے ایک پوتے کو جس کا نام محمد شاہ دوم ہے تخت نشین کیا گیا، محمد شاہ دوم کی تخت نشینی سے اس سلطنت کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، اس میں نہ صرف ملک کو خانہ جنگی سے نجات ملی بلکہ تمدنی ترقی کی نئی راہیں کھل گئیں محمد شاہ بہت تعلیم یافتہ اور علم دوست آدمی تھا اس کی وجہہ سے دکن میں سب سے پہلے علمی سرگرمیاں شروع ہوگئیں جو اس سے پہلے نہیں ہوئی ہیں اور ظاہر ہے کہ محمد شاہ دوم سے پہلے جو زمانہ گذرا تھا وہ تاسیس اور تشکیل کا زمانہ تھا۔ اس میں علمی ترقی نہیں ہوسکتی تھی۔ جب تک استحکام سلطنت کے ساتھ ملک میں سیاسی اطمینان نہ پیدا ہو جائے اہل علم اطمینان کے ساتھ علمی کام نہیں کرسکتے۔ محمد شاہ دوم کے کامیاب نظم و نسق کی وجہہ سے ایک طرف تو امن قائم ہوگیا اور دوسرے طرف اس کی علم دوستی نے ملک میں علمی دلچسپیاں پیدا کردیں لائق علما جمع کئے گئے مدرسے کھول دئے گئے۔ استادوں کے لئے خاطر خواہ تنخواہیں اور طلبہ کے لئے وظائف مقرر ہوگئے ان علما میں سے جو اس زمانے میں دکن آتے تھے فضل اللہ انجو کا نام ہمیشہ یادر ہے گا جو دنیائے اسلام کا بہت بڑا عالم تھا اسی شخصیت کی وجہہ سے دکن میں علم کی دیا روشن ہوئی اور اس کی روشنی ایسی پھیلی کہ دکن علم کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

سلطنت بہمنی کا انتہائی عروج

جس طرح محمد شاہ اول کے انتقال کے بعد خانہ جنگی کی بدنما شکل پیدا ہوئی تھی اور چند روز تک تمدنی ترقی مسدود ہوگئی اسی طرح محمد شاہ دوم کے بعد بھی بہت سی سیاسی بدمزگیاں پیدا ہوگئیں اور اس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ چند روز کے لئے سلطنت بہمنی کے وقار کو دھکا لگا محمد شاہ کا انتقال ۱۳۹۷ء میں ہوا۔ اس کے جانشیں غیاث الدین اور شمس الدین جو چند مہینوں کے فصل سے اس کے بعد تخت نشین ہوے اس گراں بار کے متحمل نہیں ہوسکے۔ ایک ترک غلام تغلچین نامی سلطنت پر بری طرح حاوی ہوگیا اور بادشاہ کٹ پتلی ہوگئے اس وقت ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو ملک کی صحیح رہنمائی کرسکیں۔ علاء الدین حسن کے دوسرے پوتے محمود خاں اور احمد خاں جو بہت لایق اور ذی علم تھے بہمنی سلطنت کے وقار کو بچانے کے لئے میدان میں آگئے اور سازش کرکے تغلچین کو ماردیا اور فیروز خاں تاج الدین فیروز شاہ کے لقب سے تخت فیروزہ پر بیٹھ گیا۔ جو اس خاندان بہمنیہ کا سب سے زیادہ جلیل القدر اور مایۂ ناز بادشاہ تھا۔ اس کے عہد حکومت میں دکن کی جس قدر ذہنی اور اخلاقی تربیت ہوئی اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے بہمنیوں کا تمام تر تمدن اسی عہد کی پیداوار ہے۔ فیروز شاہ فضل اللہ انجو کا شاگرد تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے استاد کے تمام سرمایۂ علم سے فائدہ اٹھایا تھا بلکہ اپنی رسا طبیعت اور غیر معمولی ذہن کی وجہہ سے ایسی علمی شان پیدا کردی تھی کہ دنیا کے سلاطین میں اس کی مثال نہیں ملتی اس نے تمام ملک میں اشاعت علم کے تمام ذرائع استعمال کئے۔ دور دراز سے علما جمع کئے اور ان کی خاطر خواہ تواضع کی۔ علم کی مجلسیں منعقد کیں اور ان میں وہ خود بھی ایسا حصہ لیتا تھا کہ گویا وہ بادشاہ نہیں ہے اسی پر حصر نہیں ہے بلکہ فرصت کے اوقات میں وہ بلند پایہ طلبہ کو جمع کرکے ان کو انتہائی مضامین میں درس دیا کرتا تھا۔ نتیجہ یہہ تھا کہ

فیروز شاہ کی ذی علم شخصیت کی وجہہ سے دکن کے در و دیوار علم و فضل سے گونجنے لگے اور گلبرگہ علم کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

علمیت کے ساتھ فیروز شاہ میں سیاسی تدبر بھی کچھ کم نہیں تھا۔ ملک کی کامیاب سیاسی رہنمائی کی اور ہمسایہ سلطنتوں پر اس قدر رعب داب قائم کیا کہ سب سلطنت بہمنی کا لوہا مانتے تھے۔ نیز فیروز شاہ کے پاکیزہ ذوق کی وجہ سے دکن کے تمدن میں بڑی شگفتگی پیدا ہوگئی لباس وضع قطع نئے انداز میں ڈھل گئے لباس کی بعض اختراعیں جو فیروز شاہ نے بنائی تھیں وہ اب تک موجود ہیں اگر فیروز شاہ سے کوئی غلطی ہوئی تھی تو وہ صرف یہہ تھی کہ اس نے اپنے بھائی احمد خاں کی جگہ اپنے بیٹے حسن خان کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا۔ احمد خاں عمر رسیدہ اور لایق آدمی تھا۔ اس نے خود فیروز شاہ کی تخت نشینی میں مدد دی تھی۔ اسی بناء پر اس زمانے کے مشہور بزرگ حضرت بندہ نوازؒ نے بھی احمد خاں کے لئے اپنا روحانی فیصلہ صادر کردیا تھا اس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ دونوں فریقوں میں ان بن ہوگئی اور احمد خاں کو تلوار کے زور سے تخت حاصل کرنا پڑا

سلطنت بہمنی کا آخری دور

احمد خاں جو اپنی روحانیت کی وجہہ سے احمد شاہ ولی بہمنی کے نام سے موسوم ہے ۱۴۲۲ء میں تخت نشین ہوا اس کی تخت نشینی سے سلطنت کے استحکام و توسیع میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ علم و فن کی سرگرمیاں اسی طرح قائم رہیں جس طرح فیروز شاہ کے عہد میں تھیں۔ لیکن اس کے عہد میں گلبرگہ کی جگہ بیدر کو پائے تخت بنا لیا اس انتظام سے یہہ فائدہ ہوا کہ پائے تخت کے لئے بیدر جیسی ایک بلند جگہ مل گئی لیکن گلبرگہ جو ایک زمانے میں علم و فن کا مرکز بن گیا تھا اس کی آب و تاب گھٹ گئی اب دنیا کی توجہہ بیدر کی طرف منعطف ہونے لگی۔ شیخ آذری جو اس زمانے کا مشہور عالم ہے اسی زمانے میں دکن آیا تھا اور دربار کی فیاضیوں سے فائدہ اٹھا کر ملک کی علمی خدمت کرتا تھا۔ اس کو دربار سے یہہ کہا گیا تھا کہ بہمن نامہ کے نام سے سلطنت بہمنی کی تاریخ لکھے۔ چنانچہ اس نے اپنی آخری عمر تک اس کی تکمیل بھی کی تھی لیکن افسوس ہے کہ وہ نایاب ہے۔ ان چند ظاہری چیزوں کے قطع نظر جو بہت کچھ حوصلہ افزا معلوم ہوتی ہیں سلطنت کی تہہ میں بہت سی خرابیاں ایسی بھی تھیں جو آگے چل کر اسی سلطنت کے زوال کا باعث ہوگئیں یعنے اسی عہد سے طبقہ واری کشمکش کے بد نما آثار ظاہر ہونے لگے۔ علاء الدین حسن کے عہد سے جو امرائے صدہ اور ان کے خاندان دکن میں آباد ہوگئے تھے وہ اپنے آپ کو دکھنی کہتے تھے اور انھیں اس کا حق بھی تھا کیونکہ دکن کے حقیقی آباد کار اور سلطنت بہمنی کے بانی تھے۔ اور اس پر تقریباً ایک صدی گذر چکی۔ اس کے بعد جو نو وارد ترکستان اور ایران سے یہاں آئے تھے وہ ان میں گھل مل نہیں سکے اور اہل دکن ان کو اپنا دشمن سمجھنے لگے جذبہ واری کشمکش احمد شاہ کے بیٹے علاء الدین ثانی کے عہد میں جو ۱۳۳۴ء میں تخت نشین ہوا بری طرح ظاہر ہوگئی یعنے دونوں فرقوں میں سخت خون ریزیاں ہونے لگیں ایک ہنگامہ تو اس قدر زبردست ہوا کہ جس میں تمام باہر کے لوگ مارے گئے۔ اگرچہ علاء الدین ثانی نے اپنے آہنی پنجہ سے اس آگ کو فرو کردیا لیکن اس کے جانشینوں کے عہد میں اس کی چنگاریاں پھر بھڑک اٹھیں اور بالآخر سلطنت بہمنی کو جلا کر خاک کر دیا۔

علاء الدین ثانی کے بعد جس کا انتقال ۱۴۵۸ء میں ہوا تھا اس کا بیٹا ہمایوں اس کا جانشین ہوا لیکن یہ تین سال سے زیادہ حکومت نہیں کر سکا ۔ اس کی بے وقت موت سے بہت نقصان ہوا۔ اس کے بیٹے چھوٹے تھے، ایک بیٹا نظام شاہ بہمنی کے نام سے تخت نشین کیا گیا تھا وہ جلد مر گیا اور دوسرا بیٹا محمد شاہ لشکری کے نام تخت پر بٹھایا گیا چونکہ اس کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی اس لئے اس کی ماں نرگس بانو محترمہ جہاں ملک کی سیاسی رہنمائی کرتی تھی لیکن وزارت کی بڑی خدمت پر محمود گاواں ثانی ایک نووارد برسر اقتدار ہو گیا۔ یہ اگرچہ علاء الدین ثانی کے عہد میں باہر سے آیا تھا اور تجارت کرتا تھا لیکن محمد شاہ لشکری کی کمسنی کے زمانے میں اس نے بہت ترقی کر لی اور سلطنت کے تمام سیاہ و سفید اس کے سپرد ہو گئے ۔ محمد شاہ کے سن رشد کے پہنچنے کے بعد بھی اس کے اقتدار میں کمی نہیں ہوئی محمود گاواں کے اقتدار سے بہت سے فائدے بھی ہوئے چنانچہ ملک میں علمی کام ہوئے اور دستور میں اضافے ہوئے لیکن اس کی تنگ نظری سے دکھنی فریق بیزار ہو گیا اور اس کو مارنے کے درپے ہو گیا چنانچہ ایک خاص موقع پر جب کہ بادشاہ اور محمود گاواں مشرقی اور شمالی [illegible] کی مہم میں مصروف تھے ایک سازش ہو گئی ۔ بادشاہ کو محمود گاواں کی طرف سے بدظن کیا گیا ۔ بادشاہ نے ناعاقبت اندیشی سے اس کو مارنے کا حکم صادر کر دیا۔

محمود گاواں کا قتل جو ۱۴۸۱ء میں ہوا دکن کا بڑا واقعہ ہے اسی واقعہ کے بعد سے سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا ۔ کیونکہ جو لوگ اس کے قتل کے ذمہ دار تھے ان میں سیاسی رہنمائی کی صلاحیت نہ تھی ۔ ملک حسن بحری جو نظام الملک کے خطاب سے سرفراز تھا اس فعل کا ذمہ دار تھا اگر اس میں محمود گاواں کی وزارت کے سنبھالنے کی صلاحیت ہوتی تو سلطنت اپنی جگہ قائم رہتی اور شیرازہ نہیں بکھرتا لیکن افسوس یہ ہے کہ نظام الملک اور اس کا فریق بالکل خود غرض تھا۔ ان کی نااہلیت اور خود غرضی کی وجہ سے ہر قدم پر ملک کو نقصان پہنچنے لگا جو لوگ محمود گاواں کے آوردہ تھے سب حکومت سے متنفر ہو گئے اور ہر جگہ انحراف کرنے لگے محمد شاہ لشکری کی زندگی تک جو ۱۴۸۲ء میں ہوا تھا حالات کسی قدر رو براہ تھے لیکن اس کے انتقال کے بعد جب اس کے کمسن بیٹے محمود شاہ بہمنی کو تخت نشین کیا گیا تو علانیہ خودسری ظاہر ہونے لگی ۔ اکثر صوبہ دار باغی ہو گئے چنانچہ ۱۴۹۰ء میں احمد نگر اور بیجاپور اور برار کے صوبہ داروں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا چند سال بعد گولکنڈہ بھی خود مختار ہو گیا ۔ ۱۴۹۰ء کو سلطنت بہمنی کی آخری تاریخ سمجھنا چاہئے ۔ بیدر میں جو سلطنت کا مرکز ہے قاسم برید ذی اختیار ہو گیا جو دراصل شہر کا کوتوال تھا ۔ محمود شاہ اور اس کے تمام جانشین سب اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو گئے تھے ۱۵۱۸ء میں محمود شاہ کے مرنے کے بعد اس کے چار بیٹے احمد شاہ، علاء الدین ثالث، ولی اللہ، کلیم اللہ یکے بعد دیگرے برائے نام تخت پر بٹھائے گئے تھے لیکن یہ سب بریدیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھے ۔ بالآخر کلیم اللہ حق ناشناس بریدیوں کی دست درازیوں سے تنگ آکر ۱۵۲۷ء میں احمد نگر بھاگ گیا اور اس کے ساتھ تخت فیروزہ پر بیٹھنے والے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے ۔

عبدالمجید صدیقی

مجاہد شاہ بہمنی

مجاہد شاہ سلطنت بہمنی کا تیسرا تاجدار ہے۔ اس کی جگہ ایسی صف میں ہے جہاں بالعموم کسی کی نظر نہیں پڑتی لیکن اپنے درجہ میں بھی وہ مطالعہ کے قابل ہے۔ اگرچہ اس کی مختصر زندگی کچھ زیادہ جاذب نظر نہیں مگر اس کے بعض پہلو نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ سبق آموز ہیں۔

مجاہد شاہ محمد شاہ کا بیٹا اور علاء الدین حسن گنگو کا پوتا تھا۔ یہ ۱۳۷۵ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۳۷۸ء میں قتل کر دیا گیا۔ اس طرح اس نے صرف تین سال حکومت کی۔ اس کا قاتل خود اس کا چچا داؤد شاہ تھا۔ جب مجاہد شاہ نے وجیانگر پر حملہ کیا اور وہاں کے راجہ کشن رائے کو بری طرح شکست دی تو واپسی میں وہ دریائے کرشنا کے کنارے آرام کے لئے ٹھیرا اس کے دشمنوں نے موقع پاکر اسے یہاں قتل کر دیا۔

مجاہد شاہ ایک بیدار مغز حکمراں اور ایک نہایت اچھا سپاہی تھا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی سلطنت کے چاروں طرف نظر ڈالی اور ان سمتوں کو بغور دیکھا جہاں سے حملے ہوتے تھے۔ اگرچہ سلطنت بہمنی کو خاندیس، مالوہ اور گجرات کی شمالی سلطنتوں سے بھی خطرہ تھا لیکن جنوبی سلطنت وجیانگر ہمیشہ پریشانی کا باعث رہتی تھی۔ علاء الدین اور محمد شاہ کے عہد میں اس سلطنت سے لڑائیاں ہو چکی تھیں اور کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ مجاہد شاہ کی نظر سب سے پہلے اسی ہمسایہ سلطنت پر پڑی۔ اس نے بین سلطنتی سمجھوتہ کرنا چاہا اور وجیانگر کو لکھا کہ آئندہ نزاع کا سد باب اس طرح ہو سکتا ہے کہ تمہارے اور ہمارے درمیان حدود کا تعین ہو جائے۔ چنانچہ مجاہد شاہ نے اپنی طرف سے یہ تجویز کی تھی کہ دریائے تنگبھدرا حد فاصل ہو۔ لیکن کشن رائے اس تجویز پر راضی نہیں ہوا۔ وہ رائچور اور مدگل کا دوآبہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اسی لئے اس نے تنگبھدرا کی بجائے دریائے کرشنا کو حد فاصل بنانا چاہا۔ لیکن مجاہد شاہ اس کو کیسے مان لیتا۔ چنانچہ اپنی تجویز کو منوانے کے لئے اس نے حملہ کر ہی دیا۔

مجاہد شاہ کے غیر معمولی قوائے جسمانی اور اس کے ساتھ اس کی شجاعت اور جوانمردی اس کی زندگی کے روشن پہلو ہیں۔ سلطنت بہمنی کا عام دستور تھا کہ وہ اپنے شاہزادوں کو خاطر خواہ تعلیم و تربیت دیتے اور درس و تدریس کے لئے لائق اساتذہ فراہم کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ تمام سلاطین بہمنی اچھے تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ بعض تو اونچی قابلیت رکھتے تھے۔ نیز ان کو جسمانی اور فوجی تربیت دی جاتی تھی اور وہ اچھے سپاہی ہوتے تھے۔ چنانچہ تمام معرکوں میں سلاطین بہمنی بذات خود حصہ لیتے تھے۔ اسی ماحول میں مجاہد شاہ کی بھی اٹھان ہوئی تھی۔ چونکہ اس کے قویٰ بھی کافی اچھے تھے اس لئے اس پر تعلیم و تربیت کا غیر معمولی اثر ہوا تھا۔ فرشتہ کے قول کے مطابق وہ شمشیر، نیزہ، اور خنجر کے سوا بات نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ مجاہد شاہ کے اس شوق شمشیر زنی کے متعلق بہمن نامہ کے اشعار یہ ہیں۔

ز گہوارہ چوں پائے بیروں نہاد — بہ تیر و کمان دست و بازو گشاد

ببستے تند گردن کشے پیل زور — کہ نشنید گفتے کسے وقت شور

چناں بر سر کنگرہ می دوید — کہ انگشت حیرت بدنداں گزید

مجاہد شاہ سلطنت بہمنی کا بہت بڑا سپہ سالار تھا۔ اس کی سپہ سالاری کے حقیقی جوہر اس وقت نمایاں ہوئے جب کہ سلطنت وجیانگر سے اس کی ان بن ہو گئی تھی۔ وہ ۱۹ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا اور جو وجیانگر کے وقت اس کی عمر مشکل سے ۲۱ سال ہوئی۔ اس نو خیز عمر میں اس کا دلیرانہ معرکہ اس کی زندگی کا عجوبہ تھا۔ کشن رائے کے مقابلے سے پہلے بنکاپور کے آگے اس نے جو خونخوار شیر کا نشانہ لگایا تھا، وہ صدیوں تک زبان زد خاص و عام رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس اتفاقی جرأت کا وجیانگر پر ایسا رعب پڑا تھا کہ کشن رائے دہشت کی وجہ سے سہم کر رہ گئی تھی۔

کشن رائے کے عہد میں سلطنت بیجانگر کی جو عظمت تھی وہ سب کو معلوم ہے۔ اس کی فوجی طاقت بہت زیادہ تھی۔ ایسی طاقتور سلطنت کا مقابلہ کچھ آسان نہیں تھا۔ اس موقع کی نزاکت کے باوجود مجاہد نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ یہ بڑے گھمسان کا معرکہ تھا۔ گو اس حملہ سے کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا تھا لیکن اس میں مجاہد شاہ نے جو کارنامے دکھائے تھے وہ ہمیشہ یاد رہیں گے۔ کوئی معرکہ ایسا نہ تھا جس میں اس نے حصہ نہ لیا ہو۔ ویجیانگر کی چڑھائی، شرنگ کا تلہ، قلعہ ادھونی کا محاصرہ، اور رامیشورم تک کشن رائے کا تعاقب اس کے مشہور کارنامے ہیں جو بھلائے نہیں جا سکتے۔ ان چڑھائیوں میں ایک امتیازی بات یہ تھی کہ کہیں قتل عام نہیں کیا گیا۔ جو دشمن مقابلہ کرتا تھا اسی کو مارا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ مجاہد شاہ کے باپ محمد شاہ کی وصیت تھی جس کی پابندی کی گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر شجیع سپہ سالار کے اوصاف میں یہ چیز داخل ہے۔

اگر مجاہد شاہ کی زندگی مہلت دیتی تو شاید دنیا کے بڑے بادشاہوں میں اس کا شمار ہوتا۔ دریائے کرشنا کے کنارے جہاں اس کے دشمنوں نے اس کا خاتمہ کرنا چاہا تھا اس وقت بھی اس نے اپنی فطری شجاعت کے جوہر دکھائے۔ یہ کیمپ میں سو رہا تھا کہ دشمنوں نے اس پر وار کیا۔ داؤد خاں نے خنجر بھونکا تو اس کی آنتیں نکل آئیں تھیں۔ لیکن اس کے باوجود اس نے داؤد کو اس کے خنجر کے ساتھ پکڑ کر کھینچا اور قریب تھا کہ داؤد مر جاتا لیکن اس کے ایک ساتھی مسعود خاں نے اس کو مار دیا اور اس طرح دکن کا یہ ہونہار حکمراں موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

سلطان احمد شاہ ولی البہمنی

عبد الحفیظ صدیقی

احمد خاں بہمنی بن سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے دوسرے بیٹے تھے۔ ولادت ۷۷۴ھ م ۱۳۷۲ء میں بعہد سلطان محمد شاہ بن سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی ہوئی۔ باپ کے انتقال کے وقت یہ اور ان کے بھائی فیروز شاہ صغیر سن تھے۔ اور ان دونوں کی پرورش و پرداخت ان کے چچیرے بھائی محمد شاہ ثانی نے کی۔ ان دونوں کو تیر اندازی۔ چوگان بازی۔ سواری۔ پڑھنا۔ لکھنا غرض کہ ہر شاہی علم و فن کی اچھی تعلیم دی۔ اور شیراز کے مشہور اور متبحر عالم میر فضل اللہ انجو کو ہر دو کی تعلیم و تربیت کے لئے مقرر کیا اور اپنی دونوں بیٹیاں ان دونوں بھائیوں کو بیاہ دیں۔

جب فیروز شاہ بادشاہ ہوا تو احمد خاں کو خانخاناں کا خطاب دیا اور امیر الامرا مقرر کیا۔ وہ نہایت شجاع اور خوبصورت جوان تھے چہرہ روشن اور پیشانی خندہ تھی۔ خلوص ارادت سے حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو دراز سے بیعت کی۔ بصرف زر کثیر حضرت کے لئے ایک خانقاہ تعمیر کرائی اور ہمیشہ حاضر خدمت ہو کر اسرار معرفت کا سبق لیتے اور ہر محفل سماع میں شریک ہو کر نکات تصوف سے محظوظ اور توجہ حضرت سے بہرہ مند ہوتے تھے۔ چنانچہ حضرت نے ان کی نسبت بادشاہی کی پیشین گوئی کی تھی جس کی وجہ سے فیروز شاہ بہت رنجیدہ ہوا اور حضرت کو شہر گلبرگہ سے باہر جا کر رہنے کا حکم دیا۔ اور مصاحبین کے ورغلانے سے احمد خاں سے بھی بدظن ہوا اور اپنے دو غلاموں ہوشیار عین الملک و بیدار نظام الملک کی صلاح سے ان کو اندھا کرانے کا ارادہ کیا۔ جب ان کو اس کی اطلاع ملی تو اپنے فرزند علاء الدین کے ساتھ شہر سے بھاگ نکلے اور حضرت کے ارشاد و پیشین گوئی سے مطمئن ہو کر وہاں سے رخصت ہوئے۔

جب ان کے بھاگ جانے کی خبر فیروز شاہ کو ہوئی تو ایک فوج اپنے دو غلام ہوشیار اور بیدار کے ساتھ پکڑ لانے کے لئے روانہ کی۔ انھوں نے بھی اطلاع پا کر مختصر سی فوج تیار کر کے شاہی فوج کا مقابلہ کیا جس میں ان کو کامیابی حاصل ہوئی۔

فیروز شاہ ان کی فتح کی خبر سن کر قلعہ کا دروازہ کھلوا کر اپنے پاس بلوایا۔ وہ فیروز شاہ کے پاس گئے اور اس کے قدموں پر سر رکھ کر

جو حالت بیماری میں فریش تھا زار و قطار رونے لگے۔ فیروز شاہ نے سر اٹھا کر خوشی کے لہجہ میں کہا کہ میں نے تم کو اپنے عین حیات بادشاہ دیکھا۔ تم شایان سلطنت ہو اور استحقاق اس کا تمہیں کو پہونچتا ہے۔ میں شفقت پدری سے حسن خاں کی ولیعہدی کی سعی کرتا رہا۔ جب کار فرمایان قضا و قدر نے ساعد تاج سلطنت تمہارے لئے نامزد کر چکے ہیں تو دوسرے کے لئے کوشش بے فائدہ ہے۔ حسن خاں کو تمہارے سپرد کیا۔ اٹھو آج ہی سے مہمات سلطنت کو انجام دینا شروع کرو۔ غرض شوال پانچویں ۸۲۵ھ کو تاج بادشاہی کا زیب سر کرکے تخت فیروزہ پر جلوہ گر ہوئے اور اپنا نام "احمد شاہ بہمنی" رکھا۔

مہمات سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلے خلف حسن بصری کو وکیل امور سلطنت کرکے ہزار دو صدی کا منصب عطا کیا اور ملک التجار خطاب دیا۔ اور ہوشیار و بیدار غلاموں میں سے ایک کو خطاب امیر الامرائی اور دوسرے کو دولت آباد کی فوج کی سپہ سالاری کے منصب سے سرفراز فرمایا۔ اور فیروز شاہ کے بیٹے حسن خاں کو جو وارث تاج و تخت تھا اور جمیع ارکان دولت جس کے قتل یا قید کرنے کی صلاح دیتے تھے منصب پانصدی عطا کیا اور فیروز آباد جاگیر میں دیا اور وہاں اس کو آزادی سے رہنے اور سیر و شکار کرنے کی اجازت بھی عطا کی۔ یہ شہزادہ بھی زندگی تک وہاں سیر و شکار میں مشغول رہ کر اپنی زندگی خوب مزے سے بسر کرتا رہا۔

راجہ دیجیا نگر نے سرکشی شروع کی اور خراج دینے سے انکار کیا۔ علاوہ اس کے گزشتہ جنگ میں مسلمانوں کا بیدردی سے کشت و خون ہوا تھا اس کا بدلہ لینا بھی ضروری تھا۔ اس لئے پچاس ہزار سوار جرار ہمراہ رکاب لے کر دیجیا نگر کی طرف روانہ ہوئے۔ راجہ رائے ورنگل کی مدد سے مقابلہ میں آیا۔ دونوں فوجیں دریائے تنگبھدرا کے کنارے ایک دوسرے کے سامنے اتریں لیکن دونوں میں سے کوئی آگے بڑھ کر اول حملہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر بہمنی فوج کا ایک دستہ یکایک ایسی پھرتی سے دریا پار اترا کہ راجہ دیو رائے بھی حیران رہ گیا اور اس کی فوج فوراً منتشر ہو کر بھاگ نکلی۔

ایک دن احمد شاہ چند سواروں کے ساتھ شکار کو نکلے۔ ہندوؤں نے جو موقع کی تاک میں تھے چھاپا کیا اور چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے سلطان کے سب ساتھی کام آئے مگر سلطان بچ نکلے اور کمک پہونچی اور دیجیا نگر کی تسخیر کا مصمم ارادہ کیا۔ دیو رائے نے گھبرایا اور اس نے حیرانی میں کئی سال کے خراج کی بقایا رقم کو ہاتھیوں پر لاد کر فی الفور بارگاہ سلطانی میں داخل کر دیا۔ اور بہت ہی عجز و انکسار سے صلح کی درخواست کی۔ دونوں میں صلح ہو گئی۔ بوقت واپسی تلنگانہ پر چڑھائی کی۔ رائے ورنگل نے با فوج کثیر آپ کا مقابلہ کیا۔ آخر مارا گیا۔ ملک تلنگ کو اپنے تصرف و اقتدار میں لیا اور مظفر و منصور ہو کر واپس ہوئے۔

انہیں ایام میں سلطان بیدر کے ایک میدان سے گزرے جو نہایت پرفضا تھا۔ حکومت کے لئے ایک مرکزی مقام کی ضرورت تھی جہاں سے پورے دکن پر حکومت کی جا سکے۔ بیدر چونکہ دکن کے وسط میں نہایت بلندی پر واقع تھا سلطان نے اس کو پسند فرما کر یہیں شہر کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام احمد آباد بیدر رکھا۔ اور رجب ۸۲۵ھ م ۱۴۲۳ء میں گلبرگہ کے بجائے بیدر کو پایۂ تخت قرار دیا جہاں قلعہ حصار اور محلات شاہی و باغات وغیرہ چار سال کے قلیل عرصہ میں تعمیر کرائے۔

بیدر میں سلطنت کرتے ہوئے چند سال گزرے تھے کہ امساک باراں سے سخت قحط پڑا نہریں اور باؤلیاں خشک ہو گئیں انسان و حیوان مرنے لگے۔ سلطان نے خزانہ کا منہ کھول دیا اور غلہ کے شاہی ذخائر غربا اور مساکین میں بانٹ دئے۔ جب ایک سال اس طرح گذرا اور دوسرے سال بھی بارش نہ ہوئی تو سلطان نے علما و مشائخ و زہاد کو ساتھ لے کر نماز استسقا ادا کی لیکن جب یہ بھی بے سود ہوا تو سلطان

بنفس نفیس صحرا کی طرف تشریف لے گئے اور تنہا بلندی پر چڑھ کر چند دوگانے ادا کئے۔ دعا مقبول ہوئی اور اس قدر مینھ برسنے لگا کہ لوگ خوش ہوگئے اور اُسی دن سے سلطان "احمد شاہ" ولی کے لقب سے مشہور ہوگئے۔

سلطان کو قواعد لشکر کشی اور آئین فرمانروائی میں کافی مہارت تھی۔ وہ ہر کام میں بھائی کی پیروی کرتے سادات علماء اور مشائخ کی تعظیم و تکریم کرتے۔ فقیروں اور درویشوں سے بہت عقیدت رکھتے۔ صوم و صلوٰۃ کے اتنے پابند کہ کبھی تہجد اور اشراق تک قضا نہیں ہونے دی اور کل مہام سلطنت بذات خود انجام دیتے۔ غریب سے غریب رعایا کی فریاد سنتے اور انصاف فرماتے اور گاہے گاہے مثل ہارون رشید خلیفۂ بغداد کے بھیس بدل کر رعایا کے حالات دریافت کرتے۔ کبھی مسجدوں اور مدرسوں میں جاکر وہاں کے حالات دیکھتے اور کبھی دفاتر میں جاکر ملک کے نظم و نسق کو ملاحظہ فرماکر اصلاحیں جاری فرماتے۔ غرض آپ نے اخلاق حسنہ سے خاص و عام کو مطیع و فرمانبردار بنالیا تھا۔

جن دنوں میں سلطان جنگ میں مصروف تھے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ نے رحلت فرمائی۔ جس کا سلطان کو بہت صدمہ ہوا۔ ایک روز بھرے دربار میں اپنے صاحبزادوں کو طلب کیا اور سب کی طرف مخاطب ہوکر بولے۔ جب مالک اپنے بندہ کو اپنے پاس بلائے تو کیا کرنا چاہیئے۔ مجمع نے جواب دیا کہ اپنے مالک کا حکم بجالانا چاہیئے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ جناب الٰہی مجھے طلب فرماتے ہیں اور حضرت پیرو مرشد بندہ نواز گیسو دراز کی یاد ستا رہی ہے۔ اب باغ عالم کی سیر سے دل کو سیر ہوگیا۔ یہ کہہ کر آپ نے ملک کے مختلف علاقوں پر فرزندوں کو حاکم مقرر فرمایا۔ چنانچہ ولایت رام نگر، مدھول بکلم، برار اور ولایت ماہلور کا شاہزادہ محمود خاں کو حاکم مقرر کیا۔ شاہزادہ داؤد خاں کو رائچور اور تلنگانہ کا اور ولیعہد علاء الدین کو اپنی جگہ بادشاہی دی اور چھوٹے شہزادہ محمد خاں کو بڑے بھائی کا شریک شاہی کیا اور عدم مخالفت کے بارہ میں چاروں سے قسم لی اور ضروری وصیت اور سب کو اتفاق کی ہدایت کرکے دربار برخاست اور پھر یاد حق میں ایسے مشغول ہوئے کہ عین حالت عبادت میں ۲۹ ذیحجہ ۸۳۹ھ کو بوقت شب واصل بحق ہوئے۔ سلطان کا گنبد بیدر سے ایک کوس کے فاصلے پر موضع اشٹور کے میدان میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

محمد ظہیر الدین

پُرانا پُل

(حیدرآباد)

لرزتی نگاہوں کا فرمان ہے تو
دھڑکتے ہوئے دل کا احسان ہے تو
ثباتِ تمنا کی پہچان ہے تو
رُکا جس سے طوفاں وہ طوفان ہے تو

(۲)

گلستانِ چچلم کی رنگیں کہانی
قطب شاہ کے دل کی کافر جوانی
غرورِ محبت کی زندہ نشانی
ضیائے چراغِ شبستان ہے تو

(۳)

پڑی "بھاگ نگری" کی بنیاد تجھ سے
ہوا دشتِ ویران آباد تجھ سے
بنا تجھ سے، ہاں حیدرآباد تجھ سے
مری داستانوں کا عنوان ہے تو

(۴)

وہ دن جا چکے، وہ زمانہ نہیں ہے
وہ زلفیں نہیں ہیں وہ شانہ نہیں ہے
مگر یہ حقیقت، فسانہ نہیں ہے
کہ سچی محبت کا پیمان ہے تو

میکش

بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت

سلطنت بہمنیہ کے زوال کے بعد دکن میں جو پانچ اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں ان میں دو بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومتیں سیاسی اور تمدنی حیثیت سے نہ صرف دوسری ریاستوں سے بہت زیادہ ممتاز تھیں، نہ صرف حدود اراضی کی وسعت بلکہ فوجی قوت میں یہ دوسری دکنی ریاستوں سے بڑھی ہوئی تھیں بلکہ ہندوستان کی دوسری متعدد حکومتوں سے زیادہ پائدار اور برتر تھیں۔ ان کی عالیشان عمارتیں اور تہذیب و تمدن کے دوسرے آثار آج بھی ان کی عظمت اور اہمیت کو یاد دلاتے ہیں۔ بیجاپور کا گول گنبد، ابراہیم روضہ اور سیکڑوں خوش نما مسجدیں، گولکنڈے کا عظیم الشان قلعہ، بادشاہوں کے گنبد، حیدرآباد کا چارمینار اور مکہ مسجد ان دونوں خاندان کی وہ زبردست یادگاریں ہیں جو آج بھی سیاحوں کو اپنی طرف کشاں کشاں لے آتے ہیں۔ اگرچہ آخری دور میں ان ریاستوں میں بہت سی کمزوریاں پیدا ہوگئی تھیں اور یہ مغلوں کی باج گزار بھی بن گئی تھیں اورنگ زیب عالم گیر نے سلطنت مغلیہ کو کشمیر سے لے کر راس کماری تک وسیع کرنے کے جوش میں ان کا خاتمہ کرکے خود اپنی سلطنت کو ہمیشہ کے لئے کمزور اور زوال پذیر کردیا۔

سب سے پہلے عادل شاہی ریاست ہی اس کی جوع الارض کا شکار بنی اور یوسف عادل شاہ نے ۸۹۵ھ میں جس ایوان حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی وہ دو سو سال قائم رہ کر منہدم ہوگیا۔ یوسف اصل میں ترکی شہزادہ اور سلطان مراد کا دوسرا بیٹا تھا شیرخوارگی کے زمانے میں باپ کے انتقال اور بھائی کی تخت نشینی کے بعد اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس لئے ماں نے بڑی دانش مندی اور چالاکی سے اس کو موت کے منہ سے چھڑا کر خواجہ عمادالدین گرجانی نامی تاجر کے ساتھ راتوں رات قسطنطنیہ سے باہر بھیج دیا سوداگر مذکور یوسف کو لے کر ایران پہنچا اور یہاں شہر ساوہ میں سکونت اختیار کی، یوسف کا ابتدائی زمانہ ایران میں ہی گزرا اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ جب جوان ہوا تو خواجہ عماد کے ساتھ بطریق تجارت و سیاحت ۸۶۴ھ میں ہندوستان میں داخل ہوا۔

ان دنوں ہندوستان میں بہمنیہ سلطنت اپنے پورے عروج پر تھی۔ سلطان محمد بہمنی کا دربار خود اس کی اولوالعزمی اور عالی حوصلگی اور اس کے وزیر خواجہ جہاں خواجہ محمود گاواں کے تدبر اور حسن انتظام کی وجہ سے مرجع خلایق بنا ہوا تھا۔ یوسف بھی ہندوستان آیا تو سیدھے خواجہ محمود گاواں کے ہاں باریاب ہوا، خواجہ جہاں نے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا جہاں اس کی قابلیت کے جوہر کی آزمائش کے بعد اس کو شاہی چیلوں یا مقربین خاص کے زمرے میں شریک کرلیا گیا۔ سلطان محمود بہمنی کے دربار میں یوسف نے اپنی علمی اور فوجی قابلیتوں کے متعدد ثبوت دئے اور ہر قسم کے انعامات اور اعزازات سے سرفراز ہوتا گیا۔ یوسف عادل خاں اور ملک الشوق کے خطابات بھی پائے اور کئی سیر حاصل پرگنے بھی جاگیر کے طور پر ملے۔ مختلف موقعوں پر میدان جنگ کی سرکردگی اور فوجوں کی سپہ سالاری کے فرائض انجام دینے کے علاوہ پہلے بیدر کا عامل اور بالآخر سلطنت کے بہت بڑے صوبہ بیجاپور کا طرف دار یعنے گورنر مقرر ہوا۔

سلطان محمود اور اس کے وزیر خواجہ جہاں دونوں کی موت سے سلطنت بہمنیہ روز بروز کمزور ہوتی گئی۔ بریدی امیر نے بادشاہ کو

سلاطین بیجاپور

یوسف عادل شاہ

اسمٰعیل عادل شاہ

اپنے ہاتھ میں کٹھ پتلی بناکر خود حکومت شروع کردی اور سلطنت بہمنیہ تباہی کے قریب ہوگئی تو یوسف نے احمد نظام الملک طرف دار احمدنگر کی تحریک سے دوسرے صوبہ داروں کی طرح اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اور ۸۹۵ھ یا ۸۹۶ھ عادل خاں کی بجائے عادل شاہ کا لقب اختیار کرکے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کیا۔

یوسف عادل شاہ

خودمختار ہوتے ہی یوسف عادل شاہ اپنی ریاست کے اندرونی و بیرونی استحکام میں ہمہ تن مصروف ہوگیا۔ قاسم برید نے تیم راج مہاراجہ بیجانگر اور بہادر گیلانی کو اس کے خلاف اکسایا۔ اولاً عادل شاہ کے دو تین زرخیز علاقوں پر دشمنوں کا قبضہ ہوگیا لیکن بالآخر اس نے کئی معرکوں میں دشمنوں کا مقابلہ کرکے ان سے نہ صرف اپنے علاقے واپس لے لیے بلکہ ایک مدت کے لئے ان کو خاموش کردیا۔

بیرونی استحکام سے فراغت پاکر جب وہ اندرونی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا تو اس سلسلے میں بھی بڑی مشکلات کا سامنا ہوا وہ نہ صرف شیعہ عقائد کی طرف مائل ہوگیا تھا بلکہ اپنی ریاست پر شیعیت کو سرکاری مذہب کی طرح رائج کرنے پر مصر بھی تھا حالانکہ تمام امرا اور خاص و عام سب سنی تھے۔ بادشاہ کے اس ارادے اور رواج ہٹ نے بڑی زبردست اندرونی فساد اور ایک بیرونی جنگی طوفان کی صورت اختیار کرلی ۹۰۸ھ میں مع بہمنی بادشاہ محمود شاہ اس کا منیہ اور نائب السلطنت قاسم برید جو عملاً بیدر کا بادشاہ تھا احمد نظام شاہ والی احمدنگر اور قلی قطب شاہ فرماں روائے گولکنڈہ یہ چاروں متحدہ طور پر بیجاپور پر حملہ آور ہوئے اور یوسف عادل شاہ کو سوائے وہاں سے بھاگ جانے کے اور کوئی چارہ نہ رہا۔ وہ بھاگ کر خاندیس میں عماد الملک کے پاس پناہ گزیں ہوا۔ یہاں اس نے اپنے خیالات سے دست برداری کی قسم کھائی اور عماد الملک نے بیچ میں پڑ کر حملہ آوروں سے معذرت کی اور ان کے لشکر واپس کرائے۔ یوسف کی خوش قسمتی تھی کہ ریاست دوبارہ مل گئی اور ایک زبردست فتنہ ختم ہوگیا۔ اگرچہ یوسف نے شیعہ عقائد کی ترویج نہ کرنے کی قسم کھائی تھی لیکن وہ ارادے سے باز نہ آیا اور جب دوبارہ اپنی سلطنت پر مستحکم ہوگیا تو اس نے زیادہ اہتمام اور ہوشیاری کے ساتھ بالآخر شیعیت اختیار کی اور بعد کو اس کے خاندان اور ریاست کا سرکاری مذہب اثنا عشری ہی قرار دیا۔

یوسف نے کم و بیش بائیس سال حکومت کی اور ۷۵ سال کی عمر میں ۹۱۶ھ میں وفات پائی اور حسب وصیت اس کی جاگیر جو بہمنی بادشاہ کی عطا کی ہوئی تھی، قصبہ کوگی متصل بادامی میں حضرت شاہ چندا حسینی کے پائیں دفن کیا گیا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے بیٹے اسماعیل کو اپنا جانشین کرکے مسند نشینی کے رسوم ادا کردئے تھے۔ اسماعیل کے علاوہ اس کی اولاد میں تین لڑکیاں، مریم سلطان، خدیجہ سلطان اور بی بی ستی تھیں۔ یہ سب اور اسماعیل اس کی بیوی پونجی خاتون کی اولاد تھیں جو ایک دکنی خاتون تھی۔ مریم سلطان برہان نظام شاہ کو، خدیجہ سلطان علاء الدین عماد الملک اور بی بی ستی احمد شاہ بہمنی سے بیاہی گئیں۔ یوسف ملک گیری اور ملک داری کے علاوہ اعلیٰ علمی لیاقت سے بہرہ ور متصف تھا وہ فارسی کا اچھا شاعر اور خط نستعلیق کا عمدہ خوش نویس تھا۔ فن موسیقی کا بھی شایق اور طنبورا اور عود بجانے میں مہارت رکھتا تھا۔ اس کی علم دوستی کی

وجہ سے بہت سے لایق اور قابل افراد اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔ اس کو تعمیر عمارات کا کوئی زیادہ موقع نہیں ملا۔ بریں ہم اس کے عہد کی بعض عمارتیں ہیں مگر بہت شکستہ حالت میں۔ وہ عام طور پر عدل و انصاف میں کافی شہرت رکھتا تھا اور اپنی شجاعت کی طرح سخاوت میں دور دور مشہور تھا۔

اسمٰعیل عادل شاہ ۱۵۱۰ء - ۱۵۳۴ء

یوسف عادل شاہ نے اپنی زندگی سے مایوس ہو کر اپنے سامنے ہی اپنے اکلوتے بیٹے اسمٰعیل کو مسند نشین کر دیا تھا اور انصرام امور سلطنت کے لئے کمال خاں دکھنی کو وزیر اعظم کے علاوہ کمسن بادشاہ کا متولی (ریجنٹ) بھی قرار دے دیا تھا۔ اس وقت اسمٰعیل کی عمر بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ کمال خاں جو اراب جرودی کے نام سے بھی موسوم ہے، پونجی خاتون کے مشورہ اور ہدایت سے ریاست کے کاروبار تن دہی اور ہوشیاری سے انجام دیتے لگا۔ ہم سایہ ریاستوں کے ساتھ تعلقات میں جو کشیدگی چلی آرہی تھی اس کو اپنے حسن تدبیر سے بہت جلد دور کر دیا اور گو ابندرگاہ کے پرتگالیوں سے جن کی سرکوبی یوسف عادل شاہ نے بھی کی تھی مصلحت وقت کے تحت صلح کر لی اور اطمینان کے ساتھ ریاست کی اندرونی اصلاحات کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن چند سال فراغت اور اطمینان سے حکمرانی کرنے کے بعد اکثر متولیاں ریاست کی طرح اس کی نیت بدل گئی اور اس نے بادشاہ کی کم سنی اور خارجی سیاسی حالات کے مدنظر خود بادشاہ بن بیٹھنے کی ٹھان لی۔ اس کی حرکات سے پونجی خاتون اور دیگر شاہ پرست افراد بے خبر نہیں تھے مگر اس کے غیر معمولی اثر و اقتدار اور رجالائیوں کے آگے ان کی ایک نہیں چلتی تھی۔ بادشاہ محل میں قیدی کی طرح تھا اور کمال خاں کے آدمی اس کی ذرا ذرا سی نقل و حرکت پر نظر رکھتے تھے۔

باوجود اس سخت انتظام کے پونجی خاتون نے ایک تدبیر ایسی نکالی کہ اس کا کانٹا ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔ پونجی خاتون نے اسمٰعیل نامی ایک غلام کے ذریعے بڑی ہوشیاری سے کمال خاں کا کام تمام کر دیا اور پھر اس کے بیٹے صفدر خاں کی لشکر کشی پر بڑی مردانہ ہمت سے اس کا مقابلہ کر کے بالآخر اس کو بھی ختم کیا اور اسمٰعیل کو خود سر متولی کے پنجے سے ہمیشہ کے لئے رہائی دلائی۔ اسمٰعیل نے خود مختار ہو کر دکھنیوں اور حبشیوں کو خدمات سے الگ کر کے مغلوں کو ان کی جگہ مامور کیا۔ خسرو آغا لاری کو جو اس کا طرف دار تھا اور کمال خاں کے مقابلے پر بڑی ساتھ داری کی تھی اسد خاں لاری کے خطاب سے سرفراز کر کے کئی علاقے بھی بطور جاگیر عطا کئے اور مہمات سلطنت میں اس کو مشیر اور وزیر بنایا۔

اسمٰعیل کی زندگی کا بڑا حصہ جنگ میں گزرا۔ اس کے عہد میں متعدد جنگیں ہوئیں۔ سب سے پہلے قاسم برید سے جنگ چھڑی۔ قاسم برید نے برہان نظام شاہ، قلی قطب شاہ اور علاء الدین عماد الملک کی مدد سے بیجاپور پر چڑھائی کر دی۔ مگر اسمٰعیل نے ان چاروں سے مقابلہ کیا اور شکست دی۔ سب کی فوجیں تتر بتر ہو گئیں سلطان محمود شاہ بہمنی اور اس کا بیٹا احمد شاہ جو بریدی لشکر کے ہمراہ تھے، اسمٰعیل کے ہاتھ گرفتار ہو گئے۔ اسمٰعیل نے ان دونوں کو بہت احترام اور خاطر تواضع سے مہمان رکھا اور پھر اپنی بہن ستی بی بی کی شادی احمد شاہ سے بہت اہتمام کے ساتھ بمقام گلبرگہ انجام دے کر دونوں کو بیدر واپس کیا۔

اسمٰعیل کے عہد کی دوسری جنگ راجائے بیجانگر سے ہوئی۔ بیجانگر کے راجہ نے اپنی سرحد کے استحکام کے لئے رائچور اور مدگل کے قلعے اور ان کے آس پاس کے علاقے کو فتح کرنے کے لئے ایک بڑے جرار لشکر سے ۱۵۲۰ء میں بڑی معرکۃ الآرا جنگ کی۔ اسمٰعیل اور اس کے سپہ سالاروں نے بڑی مردانگی سے مقابلہ کیا مگر بدقسمتی سے شکست اٹھائی۔ اس جنگ میں ناکامی سے اسمٰعیل کی طاقت اور شہرت کو بہت دھکا لگا اور وہ

عرصہ دراز تک بیجانگر والوں سے جنگ آزمانہ ہوا بہت دنوں کے بعد رائچور کو دوبارہ فتح کیا اس زمانہ میں اس نے اپنی طاقت بڑھانے کے لئے دوسرے ہمسایہ بادشاہوں سے تعلقات مضبوط کرنے کی کوشش شروع کی۔ ۱۹۳۰ھ میں اسد خاں کی توجہ سے برہان نظام شاہ اور مریم سلطان ہمشیرہ اسماعیل کی شادی ہوگئی مگر یہ شادی بجائے تعلقات کو بہتر بنانے کے دشمنی وعداوت میں اضافے کا موجب بنی۔ شادی کے وقت طے ہوا تھا کہ قلعہ شولاپور جہیز میں دیا جائے گا مگر بعد کو اسماعیل نے انکار کیا۔ نظام شاہ نے بہ زور شمشیر فتح کرنے کی ٹھان لی اور مین متنہ زبردست معرکہ آرائی ہوی مگر ہر وقت نظام شاہ کو شکست ہوی۔ آخر تک یہہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن بنے رہے۔

اسد خاں نے اتحاد بڑھانے کے سلسلہ میں اسماعیل کی دوسری بہن خدیجہ سلطان کی شادی علاء الدین عماد الملک بادشاہ برار سے طے کرادی اس کے کچھ دن بعد ہی قاسم برید نے جو اس عرصے میں کسی قدر طاقتور ہوگیا، اسماعیل سے جنگ کی طرح ڈالی اس کو قلی قطب شاہ اور والی بیجانگر کی تائید بھی حاصل تھی، اسماعیل اس کی دراز دستیوں سے تنگ آکر دس ہزار سپاہ کا لشکر لئے ہوئے اس پر حملہ آور ہوا اور بری طرح اس کو شکست دے کر قلعہ بیدر پر قابض ہوگیا۔ قاسم برید قید ہوا اور بہت دنوں کے بعد اسماعیل کی مہربانی سے پھر اپنے علاقے پر حکمران بنا مگر باوجود اس نیک سلوک کے اسماعیل کے ساتھ اس نے دوستی اور وفاداری نہیں کی۔

اسماعیل نے ان جنگوں سے فراغت پاکر یہ دن اصلاح ملک میں صرف کئے تھے کہ موت کا پیغام آپہنچا اور ۱۵۳۴ء (۹۴۱ھ) میں حوالی سگر میں اس کا انتقال ہوگیا اور اپنے باپ کے پہلو میں دفن کیا گیا، اسماعیل نے کل (۲۴) سال حکومت کی وہ بڑا بہادر اور فیاض واقع ہوا تھا، اس نے محض اپنی فیاضی سے قاسم برید کو پھر بیدر جیسا زرخیز علاقہ دوبارہ بخش دیا، بدقسمتی سے اس کا تمام تر زمانہ جنگوں میں گزرا ملک کی اندرونی اصلاح کی طرف کبھی خاطر خواہ توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا، اس کی اولاد میں چار لڑکے ملو خاں، علو خاں، ابراہیم خاں و عبداللہ خاں باقی تھے، عقیدتاً وہ شیعہ تھا اور اس کے عہد میں کمال خاں کے زوال کے بعد سے مغلوں اور ایرانیوں کا عروج رہا۔ اس کو شاعری اور موسیقی سے بھی بہت دلچسپی تھی اور تاریخوں میں اس کے اشعار جستہ جستہ منقول ہیں۔

ابراہیم عادل شاہ اول ۱۵۳۴ء--۱۵۵۰ء

اسماعیل کی وفات پر اس کے حسب وصیت اسد خاں غازی نے اس کے بڑے بیٹے ملو خاں کو تخت نشین کیا اور اس کی فطری بدکاری کے مدنظر خود کنارہ کش ہوکر اپنی جاگیر بلگام چلا گیا، چھ مہینے کے اندر ملو خاں نے اپنی نالائقی سے ساری رعایا بلکہ اراکین سلطنت سے متنفر کر دیا آخر کار اس کی دادی پونجی خاتون کے ایما سے وہ تخت سے الگ کیا گیا اور ابراہیم خاں "ابراہیم عادل شاہ" کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

ابراہیم کی تخت نشینی کے ساتھ ہی اسد خاں کو پونجی خاتون کے حکم سے پھر کاروبار سیاست میں حصہ لینا پڑا ابراہیم خود بھی بہت بہادر اور تیز فہم نوجوان تھا۔ وہ اسد خاں کے مشورے سے کاروبار کرنے لگا، ابھی ایک سال نہیں گزرا تھا کہ والی بیجانگر سے لڑائی ہوئی مقابلہ بہت سخت تھا مگر اسد خاں کی تجربہ کاری کام کر گئی اس نے ادھونی کے مقام پر پہنچا کر دشمن کو شکست فاش دے کر ابراہیم کا ساتھ دیا، بادشاہ نے خوش ہوکر اسد خاں کے مراتب میں اور بھی اضافہ کیا مگر کچھ دنوں کے بعد سازشیوں نے بادشاہ کو اس سے بدظن کر دیا اور وہ کنارہ کش ہوکر پھر بلگام چلا گیا۔

بادشاہ اور سپہ سالار کی اس ناچاقی سے فائدہ اٹھا کر برہان نظام شاہ حملہ آور ہوا اور قلعہ شولاپور جس کے لئے وہ اسماعیل کے زمانہ میں

تین مرتبہ ناکام کوشش کرچکا تھا، فتح کرلیا اور بیجاپور کی طرف پیش قدمی کرنے لگا۔ اسد خاں کی وفاداری اس کو کسی طرح روا نہیں رکھ سکتی تھی وہ پھر ابراہیم سے آملا اور عماد الملک والی برار کی امداد سے نہ صرف قلعہ شولاپور واپس لے لیا بلکہ برہان نظام شاہ کو بیدر تک مار بھگایا۔

نوجوان ابراہیم سے شکست کھا کر برہان نے پہلے سے زیادہ تیاریاں کیں اور رام راج والی بیجانگر، جمشید قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ اور علی برید تینوں کو اپنے ساتھ ملا کر پھر ۱۵۴۶ء میں چڑھائی کی۔ اس موقع پر اسد خاں کی حسن تدبیر سے رام راج ان سے الگ کردیا گیا اور شولاپور کا قلعہ جو اصل میں سارے جھگڑے کا باعث تھا، بغیر لڑائی کے نظام شاہ کے حوالے کردیا گیا اور اسد خاں نے ان دونوں کا تصفیہ کرنے کے بعد جمشید قلی قطب شاہ کا مقابلہ کیا اور اس کو بے طرح شکست دی۔ باوجود اس حکمت عملی اور حسن تدبیر کے لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ برہان نظام شاہ اور والی بیجانگر اور برہان کے جانشین حسین نظام شاہ نے ابراہیم سے کئی مرتبہ لڑائیاں کیں اور بہت کچھ خوں ریزی ہوئی مگر آخرکار ابراہیم ہی کامیاب رہا۔ ان لڑائیوں کے دوران میں اسد خاں سے وقتاً فوقتاً ابراہیم کو بڑی مدد ملتی رہی مگر اس کے مخالف ہمیشہ بادشاہ کو اس کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے بالآخر کچھ تو بیماری کی وجہ سے اور کچھ بادشاہ کی ناراضی دیکھ کر اسد خاں بلگام میں گوشہ نشین ہوگیا۔ اسد خاں کے بعد احمد نگر کا سپہ سالار جو عین الملک کے خطاب سے مفتخر ہو کر ابراہیم کا ملازم ہوگیا تھا، اس کے لشکر کی سپہ سالاری کرتا رہا مگر وہ بہت جلد باغی ہوگیا۔

ابراہیم اگرچہ بڑا بہادر سپاہی اور اہل سیف کا بہت قدردان تھا مگر اس کی سختی کی وجہ سے بہت سے لوگ ہمیشہ اس سے ڈرتے رہتے تھے اسی خوف نے دشمنی کی شکل اختیار کی اور سلسلہ یہاں تک بڑھا کہ اس کو معزول کرنے اور اس کے بھائی عبداللہ کو بادشاہ بنانے کی سازش ہونے لگی۔ سازش کا راز فاش ہوتے ہی عبداللہ بھاگ کر گوا میں پرتگالیوں کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔ اور چند روز کے لئے ان کی حمایت سے اپنی بادشاہی کا اعلان بھی کرایا مگر ابراہیم کی زبردست فوجی قوت اور اس کے لشکریوں کی وفاداری سے عبداللہ کو کبھی اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی، پرتگالی بھی اس قضیے میں پھنس کر نفع کی بجائے ہمیشہ فوجی نقصان برداشت کرتے رہے۔

ابراہیم اپنے باپ کی طرح علم دوست بھی تھا اور میدان جنگ میں اس کی شجاعت و بہادری ہمیشہ لائق ستائش رہی مگر تند خو اور سخت گیر بھی بہت زیادہ تھا۔ اپنی علالت کے زمانے میں جس کا سلسلہ تقریباً دو سال رہا۔ جلد صحت یاب نہ ہونے پر بگڑ کر کئی طبیبوں کو قتل کر ڈالا اور بعض کو ملک بدر کردیا۔ وہ اپنی اولاد کے ساتھ بھی سختی کرنے سے باز نہیں رہتا تھا۔ اس کا دوسرا فرزند علی بڑے بھائی کے مقابلے میں جو ولی عہد تھا بہت تیز تھا اس نے کمسن شہزادے کو اپنے ولی عہد کے حق میں مضر سمجھ کر نہایت بے دردی سے کم عمری میں ہی قلعہ مرج میں قید کردیا تھا۔

ابراہیم نے کم و بیش (۲۴) سال خدمت کرکے ۱۵۵۷ء (۹۶۵ھ) میں وفات پائی اور اپنے باپ دادا کے پہلو میں بمقام نصرت آباد (اگوگی) دفن کیا گیا اس کے کل چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ بڑا اسماعیل ولی عہد مگر بہت غبی اور کودن تھا۔ منجھلا علی بہت زیرک تھا اور وہی باپ کے بعد اس کا جانشین ہوا، دوسرے دو لڑکوں کے نام طہماسپ اور احمد تھے۔ لڑکیوں میں ایک تانی بی بی علی برید سے بیاہی گئی تھی اور دوسری جس کا نام ہدیہ سلطان بتایا جاتا ہے مرتضی نظام شاہ بحری سے منسوب تھی۔

اگرچہ ابراہیم کا زمانہ زیادہ تر لڑائیوں میں گزرا لیکن اس نے اس پر بھی بہت سے کام اصلاح و ترقی ملک کے لئے کئے ۹۳۳ھ میں ابراہیم پور کے نام سے ایک شہر آباد کیا اور وہاں ایک عالی شان مسجد بنائی ۹۳۵ھ میں سولہا کھمی محل تعمیر کرایا۔ نیز غالب مسجد جس میں صرف روشنی کے لئے ۳۰۳ طاقچے تھے اور جامع مسجد جو درگاہ حضرت جعفر سقاف سے متصل ہے اسی کی بنائی ہوئی ہیں ان کے علاوہ اس کے عہد میں بیجاپور اور رائچور کے قلعوں کی فصیلوں کی درستی اور استحکام کا کام بھی انجام پایا۔

سلاطین بیجاپور

سلطان ابراهیم عادل شاہ اول
سنہ ۹۴۱ ھ تا سنہ ۹۶۵ ھ

سلطان علی عادل شاہ اول
(شوہر چاند سلطانہ)
سنہ ۹۶۵ ھ تا سنہ ۹۱۱ ھ

علی عادل شاہ اوّل ۱۵۵۷ء - ۱۵۸۰ء

شہزادہ علی کو قلعہ مرج میں قید کر دیا گیا تھا مگر قید میں بھی اس کی تعلیم و تربیت بہت ہی اعلیٰ درجے کی ہوئی تھی اور وہ اپنے سب بھائیوں سے زیادہ لائق تھا۔ باپ کے عقائد کے خلاف وہ شیعہ عقائد کی طرف مائل تھا اور اس کے اتالیق، رفیق اور نگران بھی بہت ہوشیار اور ابراہیم کی موت کے منتظر تھے انھوں نے ابراہیم کے مرنے سے پہلے ہی اس کی بادشاہت کے منصوبے پورے کر لیے۔ ادھر ابراہیم فوت ہوا اور ادھر علی کی بادشاہی کا اعلان یہیں قلعہ مرج سے کر دیا گیا۔ چند ہی روز میں بیجاپور [illegible] علی نے اپنے دوسرے بھائیوں کو جو باپ کے مرتے ہی قید ہو گئے تھے اندھا اور ناکارہ کر دیا اور بے کھٹکے بادشاہت کرنے لگا۔ اس کو چونکہ شیعہ عقائد میں سخت تر غلو تھا اس لیے اس نے اہل ایران کو کثرت سے بیجاپور میں جمع کیا اور شیعہ عقائد کی ترویج میں بہت شدت دکھائی لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی فیاضی اور داد و دہش اس قدر زیادہ تھی کہ مذہب کے معاملے میں اس کی سختی پر غالب آ گئی۔ اگرچہ سنی مسلمان اس کی حرکات اور خصوصاً تبرا بازی سے سخت ناراض تھے لیکن اس کے احسان عام نے "مذہبی جنگ" کو روک دیا

اس کی تخت نشینی پر والی بیجانگر نے مبارک باد دی اور دوستی کی طرح ڈالی مگر اس کے برخلاف حسین نظام شاہ والی احمد نگر نے بہت کج خلقی دکھائی اسی لیے بیجاپور اور بیجانگر کے تعلقات بہت بڑھ گئے۔ دونوں ملکوں کے فرماں روا مل کر حسین نظام شاہ سے ۹۶۷ھ میں متصادم ہوئے اور اس کو بہت نقصان پہنچایا۔ پھر اگلے سال دونوں نے مل کر اس کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ اس دفعہ حسین نظام شاہ نے ابراہیم قطب شاہ کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا مگر علی عادل شاہ نے ابراہیم کو اس سے الگ کر دیا۔ اس دفعہ احمد نگر کی ریاست بری طرح تباہ ہو گئی اور تینوں نے مل کر حسین نظام شاہ کو بہت تنگ کیا ان دونوں جنگوں میں والی بیجانگر اور اس کے لشکر نے بیجاپوریوں کی احسان مندی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عام طور پر بھی [illegible] مسلمانوں کی سخت دل آزاری ہوئی ان کی مسجدیں توڑ ہی نہیں ڈالیں بلکہ بت خانوں سے بدل دیں [illegible] بیجاپور اور گولکنڈہ کے [illegible] علاقے [illegible] کے پردے میں چھین لیے، دولت اور مال غنیمت کی کثرت نے والی بیجانگر کو بے حد خود سر بنا دیا تھا جس کی وجہ سے علی عادل شاہ اور دوسرے فرماں رواؤں کو سخت خطرہ لاحق ہو گیا۔ اس اتفاقی موقع سے فائدہ اٹھا کر بیجانگر نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور ایک ایک کر کے ان اسلامی ریاستوں کو ختم کرنے کی تدبیریں ہونے لگیں۔ ادھر موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ کے بادشاہ بھی اپنی پچھلی عداوتیں بھلا کر متحد ہو گئے اور ۹۷۲ھ میں سب نے مل کر تالی کوٹ کے میدان میں بیجانگر والوں سے فیصلہ کن مقابلہ کیا۔ میدان اتحادیوں کے ہاتھ رہا۔ بیجانگر تباہ تاراج ہو گیا اور اس کی سلطنت کو بھی ایسا دھکا پہنچا کہ وہ پھر پنپ نہ سکی۔

اگرچہ بیجانگر سے جنگ کرنے کے لیے اتحاد بڑے زور شور سے عمل میں آیا تھا اور حسین نظام شاہ کی بیٹی چاند بی بی کی شادی علی عادل شاہ سے اور علی عادل شاہ کی بہن کی شادی حسین نظام شاہ کے بیٹے مرتضیٰ نظام شاہ سے ہو چکی تھی لیکن باوجود ان سب باتوں کے ان ریاستوں میں پھر لڑائی جھگڑے شروع ہوئے اور علی عادل شاہ برابر آخر تک جنگوں میں گھرا رہا۔

علی عادل شاہ لاولد تھا اس لیے اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بھتیجے ابراہیم ابن طہماسپ کو [illegible] میں اپنا ولی عہد قرار دے دیا تھا ابھی اس بات کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اگلے ہی سال یعنی ۹۸۸ھ م ۱۵۸۰ء میں علی عادل شاہ ایک خائن غلام کے ہاتھ قتل ہو گیا۔ اس کی مدت حکومت (۲۳) سال اور عمر (۴۸) سال تھی۔ اس کی وفات سے ریاست بیجاپور کو بہت نقصان پہنچا کیونکہ گو اس کا جانشین ابراہیم بعد کو بہت بڑا بادشاہ ثابت ہوا لیکن اس کی کمسنی کے زمانے میں متولیوں نے ریاست کو بہت کمزور کر دیا

علی عادل شاہ کو تعمیر عمارت کا بہت شوق تھا۔ اس کے عہد میں جو عمارتیں بنیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے خاص طور پر مشہور یہ ہیں۔ قلعہ شاہ درگ (نلدرگ) فصیل قصبہ شاہ پور، نہر کشور خانی، پریا محل، انند محل، گگن محل، باغ دوازدہ امام، باغ فدک، مسجد جامع، چاند باؤلی، قلعہ دھارور، قلعہ بنکا پور وغیرہ۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی ۱۵۸۰ - ۱۶۲۷ء

جب علی عادل شاہ کے حسب وصیت ابراہیم ابن طہماسپ تخت نشین ہوا تو اس کی عمر صرف نو سال تھی۔ اس کی چچی چاند بی بی کے زیر ہدایت کامل خاں متولی اور مختار ریاست کی حیثیت سے کام کرنے لگا مگر بہت جلد وہ خود سر ہو گیا۔ اس کی جگہ چاند بی بی کے اشارے سے کشور خاں متولی گردہ بھی چند ہی دنوں میں حد درجے خود سر اور دشمن ملک و مالک ثابت ہوا۔ اس نے تو خود چاند بی بی کو بے حرمتی سے محل سے نکال کر قید کر دیا۔ اس کے مارے جانے پر اخلاص خاں نے متولی کا عہدہ پایا۔ پھر دلاور خاں مختار کل بنا اور اسی کے زمانۂ مختاری میں ابراہیم قطب شاہ کی بیٹی اور محمد قلی قطب شاہ کی بہن ملکہ جہاں سے جس کا عرف چاند سلطانہ ہو، ابراہیم عادل شاہ کی شادی ہوئی۔

ان متولیوں کے زمانۂ اقتدار میں آ[illegible] اس کے الٹہ بادشاہوں نے بیجاپور پر متعدد حملے کئے اور اس کو نقصان پہنچایا اس کے علاوہ متعدد مرتبہ کئی خانہ جنگی اور امرا اور متولیان ریاست [illegible] جھگڑوں سے بیجاپور کو باوجود خوش حالی کے بہت نقصان پہنچا، دلاور خاں کے زمانہ مختاری میں اسماعیل نے جو ابراہیم کا چھوٹا بھائی تھا [illegible] بغاوت کی اور سارے ملک میں ہل چل مچ گئی۔ دلاور خاں کی درپردہ شرارتوں کے باوجود ابراہیم کے اقبال سے اسماعیل کا قلع قمع ہو گیا مگر دلاور خاں بادشاہ کی نظروں میں بے طرح کھٹک گیا۔ اب بادشاہ نے جو سن بلوغ کو پہنچ چکا تھا اور ہر طرح کاروبار ریاست سنبھال سکتا تھا، دلاور خاں کو معزول کر کے ۱۰۰۱ھ عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور بہت کروفر کے ساتھ بیجاپور میں داخل ہوا۔ اس نے چند سے بیرونی جھگڑوں سے الگ رہ کر اندرون ملک کی اصلاح و تعمیر شروع کی ۱۰۰۸ھ میں ایک نئے شہر نورس پور کو آباد کیا اور رفتہ رفتہ دیگر بہت سی عمارتیں بنائیں، شعرا و علما سے اپنے دربار کو آراستہ کیا، فن موسیقی کے بڑے بڑے ماہرین کو جمع کیا کیونکہ اس کو اس فن سے طبعی لگاؤ اور اس میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ اس کی کتاب نورس آج تک مشہور ہے۔

اس کے خود مختار ہونے سے کچھ دنوں قبل ہی چاند بی بی اپنے میکے چلی گئی اپنی آبائی ریاست احمد نگر کو جو ابراہیم نظام شاہ کی جوان مرگی کی وجہ سے بے طرح خود غرض امرا کی تباہ کاریوں کا شکار بنی ہوئی تھی، سنبھالنے کی کوشش کی۔ مغلوں نے اس پر پے در پے حملے کر کے اس کے اکثر حصوں کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ شہنشاہ اکبر کی فتوحات کا سلسلہ اور آگے بڑھا۔ اس نے ابراہیم عادل شاہ سے بھی خراج طلب کیا اور ابراہیم نے اس کے مقابلے میں اپنے کو کمزور پا کر خراج منظور کر لیا۔ اس کے بعد مغلوں کا زور اور بھی بڑھ گیا۔ ابراہیم نے اکبر کے پیغام بھیجنے پر اپنی لڑکی سلطان بیگم کی شادی شہزادۂ دانیال سے کر دی۔ اکبر کے بعد جہانگیر اور اس کے بیٹے شہزادہ خرم نے دکن کے کئی علاقوں پر جو عادل شاہی نظام شاہی اور قطب شاہی ریاستوں کی ملک تھے اپنا قبضہ جمایا۔ ابراہیم نے بیدر پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا۔ ادھر ملک عنبر نے بیجاپور پر حملہ کیا اور ابراہیم کے آباد کئے ہوئے نورس پور کو ہمیشہ کے لئے تباہ و تاراج کر دیا اور خود بھی چند ہی روز میں فوت ہو گیا۔ ابراہیم کو اس کا بڑا رنج ہوا مگر ملک عنبر کے مر جانے کی وجہ سے وہ اس سے بدلہ نہ لے سکا۔

ابراہیم نے پورے (۴۷) سال حکومت کی اور ۱۶۲۷ء (۱۰۳۷ھ) میں انتقال کیا۔ اس نے متولیوں کا دور ختم ہونے کے بعد

سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی
(نورس)
۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ

سلطان محمد عادل شاہ
۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۷ھ

تیس سال سے زاید مدت تک جو خود مختارانہ حکومت کی وہ زمانہ زیادہ تر پرامن رہا اور اس عرصے میں اس نے ریاست کی اندرونی اصلاح کے بہت سے کام کئے۔ اس کو تعمیر عمارت کا بہت شوق تھا۔ اس کے عہد میں کثرت سے عمارتیں بنی ہیں مثلاً آثار محل، انند محل، مسجد ملکہ جہاں، نورس محل یا سنگت محل، نورس پور کی عمارات وغیرہ ابراہیم روضہ اس کے عہد میں بہت سی اور بھی تمدنی ترقیاں ہوئیں اور نئی رسوم و تقاریب کا اضافہ ہوا جیسے عید نورس وغیرہ۔ اس کا مقبرہ جو ابراہیم روضہ کے نام سے مشہور تعمیری نقطۂ نظر سے ایک بہترین یادگار ہے اور اپنی گل کاریوں اور نقش و نگار کے اعتبار سے دکن کا تاج محل سمجھا جاتا ہے۔

اس کے کل چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں جو مختلف محلات کے بطن سے تھے۔ بڑا بیٹا درویش بادشاہ محمد قلی قطب شاہ کی بہن ملکۂ جہاں کے بطن سے تھا مگر ابراہیم اس کی ماں سے ناراض تھا علاوہ ازیں چھوٹا سلطان محمد اس کے مقابلے میں باپ کا منظور اور زیادہ لایق تھا اس لئے اس کو اپنا جانشین کیا۔

محمد عادل شاہ ۱۰۳۶ء – ۱۰۶۵ء

جس وقت سلطان محمد اپنے مرحوم باپ کے حسب وصیت تخت نشین ہوا اس کی عمر پندرہ سال کی تھی مرزا محمد امین لاری، دولت خاں آقا رضا اور دیانت الملک اور مختلف عہدوں پر مامور کئے گئے اور یہی نوجوان بادشاہ کے مشیر اور رفقا تھے اگرچہ بادشاہ کم عمر تھا لیکن اپنی فراست طبعی سے فوراً فوج کی اصلاح میں مصروف ہو لیا چند ہی دن کے بعد نظام شاہی خاندان کے فرماں روا نے چڑھائی کی ابھی زیادہ معرکہ آرائی نہیں ہوئی تھی کہ صلح ہو گئی لیکن یہ دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ دوبارہ نظام شاہی فوج حملہ آور ہوئی اور بری طرح شکست کھائی اس واقعہ کے بعد نظام شاہی ریاست روز بروز کمزور ہونے لگی اور صوبہ دار جو پہلے سے خود سر بنے بیٹھے تھے بہت کچھ خود مختار ہو گئے ہیں ہی طاقت مغلوں کے پے در پے حملوں نے توڑ دی۔ بہت سے علاقے محمد عادل شاہ کے قبضے میں آ گئے۔

شاہ جہاں نے جب یہ دیکھا کہ محمد عادل شاہ قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے تو اس نے نظام شاہی ریاست کے مفتوحہ علاقوں کی واپسی کی پہلے سے چھیڑ چھاڑ شروع کی اور نہایت تکلیف دہ خطوط لکھے، محمد عادل شاہ نے ان کا نرمی سے نرمی جواب دیا۔ بعض نمک حرام امرائے عادل شاہی کی ریشہ دوانیوں سے شاہ جہاں کو پیش قدمی کے اچھے موقعے مل گئے وہ جلد ہی دولت آباد تک آپہنچا۔ محمد عادل شاہ نے بیجاپور میں قلعہ بند ہو کر شہر کے اطراف میلوں تک وسیع میدان کو بے آب و گیاہ بنا دیا تاکہ مغل فوج محاصرہ نہ کر سکے چنانچہ اس کی یہ تدبیر کامیاب رہی۔ مغلوں نے بیجاپور کا محاصرہ تو کیا مگر اس پر فتح نہ کر سکے اور آخر صلح پر آمادہ ہو گئے۔ عادل شاہ نے بھی اس شرط پر صلح کر لی کہ رود کرشنا کے اس طرف کا تمام علاقہ شاہ جہاں کے قبضے میں دے دیا جائے اور اس طرف کا سارا علاقہ بدستور بیجاپور کی ریاست میں شامل رہے نیز تاوان جنگ کے طور پر بیس لاکھ روپے شاہ جہاں کو ادا کئے جائیں۔

مغلوں سے پیچھا چھڑوا کر محمد عادل شاہ نے کرناٹک کے سرکش حاکموں سے کئی لڑائیاں کیں اور بہت سے علاقے فتح کر کے اپنی ریاست کو وسیع اور مالا مال کیا اور اپنی ساری توجہ رعایا کی فلاح اور ملک کی اصلاح و ترقی کے کاموں میں صرف کی۔ اس دوران میں برابر شاہ جہاں کی طرف سے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی مگر بہ مقتضائے وقت اس نے جنگ نہیں کیا بلکہ گویا حلقہ بگوش مغل بادشاہ کے حسب مرضی کام کرتا رہا۔ باوجود اس کے محمد عادل شاہ کے زمانے میں بیجاپور کی ریاست کو کافی وسعت ہوئی اور رعایا کی خوش حالی تو ایسی تھی کہ اگلے کسی بادشاہ کے

رہ میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔

محمد عادل شاہ نے فصیلوں اور برجوں کی مرمت کے علاوہ داد محل، بیگم تالاب وغیرہ کئی عمارات اور متعدد مسجدیں بنائیں جن میں سب سے زیادہ مشہور خود اس کا گنبد ہے محمد عادل شاہ نے ۱۰۶۵ھ میں (۳۰) سال سے زیادہ عرصے تک حکومت کر کے وفات پائی اور اپنے گنبد میں جو گول گنبد یا بول گنبد کے نام سے مشہور ہے دفن ہوا، یہ گنبد اس قدر بڑا ہے کہ ہندوستان بھر میں کوئی اور گنبد اس کے برابر نہیں۔ اس کی یہ خصوصیت مسلمہ اور مشہور ہے کہ ایک سرے پر کھڑے ہو کر خفیف سی خفیف آواز پیدا کی جائے تو دوسرے سرے پر برابر سنائی دیتی ہے اسی وجہ سے اس کو بول گنبد کہتے ہیں سیکڑوں سیاح اس گنبد کو دیکھنے کے لئے بیجاپور آتے ہیں۔ اس کے عہد میں علوم و فنون کی بہت ترقی ہوئی اور کئی بڑے بڑے شعرا، علما اس کے دربار میں ملازم تھے۔

علی عادل شاہ ثانی ۱۰۶۵ھ۔ ۱۶۵۶ء

علی عادل شاہ ثانی اپنے نامور باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ خوش قسمتی سے محمد عادل شاہ کی حرم خاص حاجی بڑی صاحبہ نے جو محمد قطب شاہ کی بیٹی تھی، خاص اہتمام سے اس کی پرورش اور تربیت کی۔ وہ علوم متداولہ اور فنون متعارفہ میں ہر طرح ماہر بنایا۔ وہ (۱۹) سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور اپنی والدہ کی ہدایت اور خان محمد خاں وزیر ملک اور دیگر معتبر ارکان ریاست کے مشورے سے کاروبار ریاست انجام دینے لگا۔

شاہ جہاں نے جو اپنی سلطنت کے حدود وسیع سے وسیع تر کرنے کا تہیہ کئے ہوے تھا اس بہانے کہ ریاست بیجاپور سلطنت تیموریہ کی باج گزار ہے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کی اور یہ اعتراض اٹھایا کہ ہماری منظوری کے بغیر علی عادل شاہ کس طرح تخت نشین ہوسکتا ہے۔ اس نے یہاں تک لکھ دیا کہ علی عادل شاہ صلبی فرزند نہیں متبنیٰ ہے اور اس لئے وارث تخت و تاج نہیں گر علی عادل شاہ ثانی نے ان اعتراضات کے ترکی بہ ترکی جواب دئے۔ جب مراسلت کا کوئی اثر نہیں ہوا تو اسی سال اورنگ زیب نے ایک بڑی فوج لے کر حملہ کیا اور بیدر اور کلیانی کے قلعے فتح کر کے اس کے بعد بیجاپور کا بھی محاصرہ کرلیا۔ ابھی علی عادل شاہ ثانی کو تخت نشین ہو کر ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اس طرح زبردست دشمن سے مقابلہ آن پڑا۔ بیجاپور کے امرا آپس کی ناراضیوں کی وجہ سے خاطر خواہ متحد اور وفادار نہیں تھے۔ محاصرہ روز بروز شدید ہو رہا تھا کہ شاہ جہاں کی علالت کی خبر پاکر خود اورنگ زیب محاصرہ اٹھا کر دہلی کو روانہ ہوا جس وقت مغلوں کا لشکر سرحد پار کر رہا تھا خان محمد وزیر مملکت سے جو سرحد پر مقابلے کے لئے متعین تھا ملاقی ہوا، خان محمد نے اورنگ زیب کی عاجزانہ التجا اور اس چالبازانہ وعدے کی بنا پر کہ جب تک وہ وزیر مملکت ہے بیجاپور کی طرف مغل کبھی پیش قدمی نہیں کریں گے، اورنگ زیب سے مزاحمت نہیں کی خان محمد کی یہ حرکت جس کی قباحت کا خود اس کو یقین تھا، اس کی موت کا باعث ہوی۔ اس کے قتل کے بعد ابراہیم خاں وزیر مملکت بنایا گیا۔ اور سپہ سالاری کی خدمت افضل خاں کے سپرد ہوئی۔

ابھی اس طرف سے سکون نہیں ہوا تھا کہ سیواجی نے جو محمد عادل شاہ کی علالت کے زمانے میں قلعہ جنیر پر قبضہ کرلیا تھا، مزید پیش قدمی کی اور کوکن اور اس کے پاس کے علاقوں میں لوٹ مار مچادی اور کئی قلعوں پر قبضہ کرلیا اس کی سرکوبی کے لئے افضل خاں کی سرکردگی میں ۱۰۶۹ء میں فوج روانہ کرنی پڑی مگر سیواجی نے افضل خاں کو دھوکا دے کر تنہائی میں قتل کر ڈالا اور پھر اس کی فوج کو پیچھے سے حملہ کر کے اچانک

سلطان سکندر عادل شاہ
۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۷

سلطان علی عادل شاہ ثانی
شاہی
۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ

زبردست شکست دی۔ افضل خاں کے بعد سدی جوہر کو جو اپنی سابقہ سرکشی سے توبہ کرکے حلقہ مطیع ہوگیا تھا صلابت خاں کا خطاب دے ایک بڑے لشکر کے ساتھ روانہ کیا گیا مگر یہ سیواجی کی باتوں میں آگیا اور اس کے ساتھ سازش کرکے قلعہ پنالہ جو ایک نہایت مستحکم اور مضبوط قلعہ تھا قبضہ کرلیا اور علانیہ بغاوت شروع کردی۔ اب خود بادشاہ خود لشکر لے کر مقابلے کے لئے نکلا اور ایک معرکے میں پنالہ فتح کرلیا۔ سیواجی اور سدی جوہر دونوں فرار ہوگئے۔ چلتے ہوئے بادشاہ نے قلعہ منتو میں سدی جوہر کا مقابلہ کیا اور اس دفعہ بھی شکست دی۔ جوہر زخمی ہوا مگر وہاں سے کسی طرح بچ بھاگ کر قلعہ رنجور میں پناہ گزیں ہوا۔ بادشاہ نے اس قلعہ کو بھی فتح کرلیا۔ سدی جوہر بھاگتے اور شکست کھاتے ہوئے آخرکار سخت بیمار ہو کر مر گیا۔ بادشاہ نے [illegible] کے سرکش زمینداروں کو جو خراج ادا نہیں کرتے تھے گوشمالی کرکے مظفر و منصور بیجاپور واپس ہوا اور سیواجی سے مصلحت وقت دیکھ کر اس نے ۱۰۷۳ھ میں صلح کرلی کہ کوکن اور اس کے قریب کا علاقہ سیواجی کے قبضے میں رہے اور وہ اس سے آگے نہ بڑھے مگر موقع پا کر سیواجی نے پھر لوٹ مار شروع کردی اور شائستہ خاں مغل سردار سے مقابلہ کرکے اس کو قید کرلیا۔

اورنگ زیب کو جب یہ معلوم ہوا کہ علی عادل شاہ ثانی سے اس کی سرکوبی میں مدد مانگی اور بیجاپور سے خواصی خاں کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کیا گیا جس نے سیواجی کو سخت شکست دی مگر عین وقت پر سیواجی نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اورنگ زیب کے سپہ سالار جے سنگھ کو اپنا دوست بنالیا اور یہ وعدہ کرکے بیجاپور کے اکثر قلعوں کی نشاندہی جے سنگھ کو دے دی کہ میں آپ کی مدد کرکے عادل شاہی ریاست کا خاتمہ کرڈالتا ہوں اور اس طرح یہ سارا ملک اورنگ زیب کی حکومت میں آجائے گا۔ علی عادل شاہ ثانی کو اس کی اطلاع ملتے ہی مجبوراً جے سنگھ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ دونوں میں مقابلے ہوئے اور ہر دفعہ جے سنگھ نے شکست کھائی آخرکار ۱۰۷۶ھ میں دہلی کو واپس بھاگ گیا۔ سیواجی بھی اورنگ زیب کے دربار میں پہنچا اور چند دن وہاں رہ کر دکن آیا اور پھر لوٹ مار شروع کردی۔ کئی قلعے جو مغلوں کے قبضے میں آگئے تھے سیواجی نے چھین لیے اور اپنی جگہ مستحکم ہو کر علی عادل شاہ ثانی کو ستانا شروع کیا۔ ادھر جے سنگھ وغیرہ کے ساتھ مسلسل جنگوں کی وجہ سے خزانہ خالی ہوگیا تھا اور سلطنت مغلیہ کا خراج ادا نہ ہونے سے مغلیہ لشکر بار بار چڑھائی کر بیٹھتا تھا اس لئے علی عادل شاہ ثانی نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ اورنگ زیب اور سیواجی دونوں سے مصالحت کرلی جائے۔

یہ صلح محض عارضی تھی اورنگ زیب اور سیواجی دونوں ریاست بیجاپور کو اپنے قبضہ تصرف میں لانے کی آرزو دل میں لئے ہوئے تھے۔ ابھی اس صلح کو کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ یکایک علی عادل شاہ ثانی بدقسمتی سے فالج میں مبتلا ہو کر معذور و مجبور ہوگیا۔ حالات بگڑ رہے تھے۔ امرا کے آپس میں عداوت پھیلی ہوئی تھی۔ مصلحت وقت کے تحت اپنے کمسن بیٹے سکندر عادل شاہ کو تخت نشین کرکے اور سلطنت کے کام خواصی خاں کے سپرد کئے اور خود پلنگ پر لیٹے لیٹے صلاح و مشورہ دینا مناسب سمجھا ملک کی روک تھام کے لئے عبدالمحمد شاہ درگ (نلدرگ، گلبرگہ [illegible] کے علاقے کا صوبہ دار بنایا اور عبدالکریم اور بہلول خاں کو مرج [illegible] کے قلعوں پر متعین کرکے سیواجی کی دراز دستیوں کا بندوبست کیا۔ اسی حالت میں وہ ۱۰۸۳ھ (م ۱۶۷۲ء) میں ۳۴ برس کی جوانی میں سولہ سال حکومت کرکے اس جہان سے عدم ہوا۔ اس نے [illegible] اپنے لئے ایک بہت بڑا عالیشان مقبرے کی تعمیر شروع کی تھی ابھی اس کی تعمیر مکمل نہیں ہوئی تھی۔ اسی میں اس کو دفن کیا گیا ہے۔ اس کی بیوی اور کئی عزیز و اقارب بھی دفن ہیں۔ [illegible] یہ ناتمام مقبرہ اس کے عالی شان تعمیری حوصلوں کی ایک عبرتناک تصویر پیش کر رہا ہے

علی عادل شاہ ثانی بڑا بہادر اور شجیع تھا۔ اس نے کئی بڑے بڑے معرکے خود فتح کئے۔ اس کو شعر و شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ خود بھی شاعر تھا اس کے عہد میں اُردو زبان کو بہت ترقی ہوئی۔ وہ اردو شاعروں کا بڑا سرپرست تھا۔ ملا نصرتی جو علی نامہ اور دیگر مثنویوں کا مصنف ہے اسی کے دربار کا متوسل تھا اس کے عہد کی عمارات میں علاوہ نا تمام مقبرے کے حسینی محل اور کئی مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ اس نے دو عظیم الشان محلات علی محل اور عاشق محل کے نام سے بنانے شروع کئے تھے مگر یہ نا تمام رہ گئے یہ عادل شاہی خاندان کا آخری با اقتدار بادشاہ تھا اس کے بعد اس کے کمسن بیٹے سکندر کو اورنگ زیب نے قید کرلیا اور بیجاپور کی ریاست کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

سکندر عادل شاہ ۔ ۱۶۷۳ء ۔ ۱۶۸۶ء

علی عادل شاہ ثانی کے انتقال پر خواص خاں نے باضابطہ طور پر پانچ سال کے کمسن شہزادے کو سکندر عادل شاہ کے نام سے تخت پر بٹھایا اور خود بطور متولی کے کاروبار ریاست انجام دینے لگا۔ بادشاہ کی کمسنی امرا کی نا چاقی اور غداری سے فائدہ اٹھا کر ریاست کے دونوں دشمن مغل اور مرہٹے من مانے لوٹ مار اور جنگ و جدل کرنے لگے۔ سیواجی نے غیر معمولی طاقت حاصل کرلی۔ بنالہ فتح کرلیا۔ مغلوں نے شہر پر بھی حملہ آور ہوا۔ خواص خاں نے مغلوں سے سازش کرلی اور سکندر کی بہن شہر بانو بیگم کی شادی شہزادہ محمد اعظم سے کر دے کر ایک بڑے پیشکش کے ساتھ اورنگ زیب سے صلح کرلی مگر یہ صلح کبھی پائدار ثابت نہ ہوئی۔

خواص خاں، سدی مسعود خاں، بہلول خاں، سید مخدوم، شرزہ خاں اپنی ناعاقبت اندیشی اور نمک حرامی سے کبھی اورنگ زیب سے مل جاتے اور کبھی مرہٹوں سے۔ اسی طرح صلح و جنگ میں اپنی قوتیں صرف کرتے رہے۔ اسی عرصہ میں سیواجی فوت ہوگیا مگر اس کے بیٹے سنبھاجی اور دوسرے مرہٹہ سرداروں نے اپنی وہی روش جاری رکھی، وہ ادھر عادل شاہیوں کو تنگ کرتے اور ادھر مغلوں کو تنگ کرتے بالآخر اورنگ زیب نے بیجاپور کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا تہیہ کرکے اولاً ایک فرمان بھیجا جس میں متعدد سخت شرائط درج تھیں۔ سکندر عادل شاہ کے مشیروں نے اس کا جواب اس طرح مرتب کیا جس سے اورنگ زیب کی شرائط کی تکمیل نہیں ہوتی تھی۔ اورنگ زیب نے ایک بڑی فوج کے ساتھ ۱۰۹۷ھ (۱۶۸۶ء) میں بیجاپور پر چڑھائی کی اور شہر فتح کرکے سکندر کو قید کرلیا اور بیجاپور کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ بدقسمت سکندر پانچ سال کی عمر میں بادشاہ ہوا، چودہ سال حکومت کی اور چودہ سال اورنگ زیب کی قید میں رہ کر بالآخر ۱۱۰۰ھ میں وفات پائی۔

سید محمد

بیجاپور کے سپہ سالار

افضل خاں

شرزہ خاں

عادل شاہی امراء

افضل خاں

افضل خاں بیجاپور کے مشہور سپہ سالاروں میں تھا۔ اس کا نام عبداللہ خاں تھا۔ سلطان محمد عادل شاہ کے زمانے میں اس نے متعدد معرکوں میں حصہ لیا اور ملک کی بڑی شائستہ خدمات انجام دیں جس پر اس کو افضل خاں کا خطاب عطا کیا گیا۔ سلطان محمد عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا نوجوان فرزند علی عادل شاہ ثانی تخت نشین ہوا تو اس کے مراتب و اعزاز میں اور اضافہ کیا گیا اور یہ خان محمد خاں کے ساتھ ایک بڑے لشکر کا سپہ سالار بنا کر اورنگ زیب کے مقابلے کے لئے بھیجا گیا۔ اورنگ زیب اس عرصے میں بیدر اور کلیانی کے قلعے فتح کر چکا تھا۔ بیجاپور کا محاصرہ کیا لیکن شاہجہاں کی علالت کی خبر پاکر محاصرہ برخاست کرکے دہلی کا رخ کیا۔ جب وہ سرحد سے گزر رہا تھا تو خان محمد نے بطور خود اس کو بچ نکلنے کا موقع دیا اور اس طرح ایک بے نظیر موقع چھوڑ دیا۔ افضل خاں اس پر بہت ناراض ہوا۔ جب بادشاہ کو اس کی رپورٹ ملی تو خان محمد کو واپس طلب کیا اور وہ راستے ہی میں اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا۔

خان محمد کے بعد افضل خاں ہی سب سے بڑا سپہ سالار تھا۔ بادشاہ نے اس کو سیواجی کے مقابلے میں روانہ کیا جس نے کوکن کے علاقے میں ایک طوفان مچا رکھا تھا۔ تلجاپور اور پنڈھرپور سے گزر کر افضل خاں پرتاب گڑھ پہنچا۔ سیواجی نے اس کی آمد کی خبر سن کر اپنی فطری چالبازی سے دشمن کے مقابلے کے بجائے صلح و اطاعت کی چال چلی۔ افضل خاں کے سفیر کرشناجی کے ساتھ اپنے سفیر گوپی ناتھ کو بھیج کر یہ قول و قرار لیا کہ افضل خاں سے تنہائی میں مل کر معذرت کرنا اور سر اطاعت خم کرنا چاہتا ہے۔ افضل خاں اس کے دھوکے میں آگیا اور جب تنہائی میں یہ دونوں ملے تو سیواجی نے بغل گیر ہوتے ہوئے بگھنکھا سے فوراً اس کا کام تمام کر دیا۔ افضل خاں کے قتل ہوتے ہی سیواجی کی فوج کے حوصلے بڑھ گئے اور عادل شاہی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ سیواجی نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ افضل جوش شجاعت میں اس کی چال کو نہ سمجھا اور اپنی جان گنوائی۔ سیواجی کے ایک ساتھی نے اس کا سر کاٹ لیا اور سیواجی کے پاس لے جا کر انعام پایا۔ علی عادل شاہ ثانی کو افضل خاں کی موت سے بڑا نقصان پہنچا اور مرہٹوں کی طاقت ہمیشہ کے لئے بڑھ گئی کیونکہ اس کے بعد علی عادل شاہ ثانی نے جن لوگوں کو سیواجی کے مقابلے کے لئے بھیجا وہ یا تو ناکام ہو کر لوٹے یا سیواجی نے ان کو اپنے مکر و فریب سے ناکام کر دیا۔ بالآخر خود بادشاہ کو اس سے مقابلہ کرکے شکست دینی پڑی مگر یہ شکست بھی سیواجی کو ختم نہ کر سکی۔

شرزہ خاں

شرزہ خاں علی عادل شاہ ثانی کے اُن نامور سپہ سالاروں میں تھا جنھوں نے اورنگ زیب اعظم کے بڑے لشکروں کے مقابلے کئے اور ہمیشہ مظفر و منصور رہا۔ اس کا نام سید الیاس تھا اس نے شکل ترتیب دے کر اس کے مددگار سرفراز خاں اور صلابت خاں کو بڑی بڑی شکستیں دیں اور آخر کار مغلوں کو پیچھے ہٹنے اور میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی موت عجیب و غریب طریقے پر واقع ہوئی۔ مغلوں کو شکست دے کر ابھی یہ واپس نہیں ہوا تھا مغلوں کے اِکّے دکّے حملے ہو رہے تھے۔ اتفاقاً ایک دن ایک چھوٹی سی ٹکڑی نے اس کے کم سن بیٹے پر حملہ کیا۔ شرزہ خاں اکیلا لپکا اور آناً فاناً دشمن کو مار بھگایا۔ باپ بیٹے واپس ہو رہے تھے کہ یکایک گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ شرزہ خاں زمین پر آرہا اور فوت ہوگیا۔ جب لشکر میں اس کی مرگ مفاجات کی خبر پہنچی تو ایک کہرام مچ گیا۔ بادشاہ کو ناقابل بیان رنج ہوا۔ اس نے دونوں بیٹوں

سید محمود و سید حبیب کو ان کے باپ کی شایستہ خدمات کے صلے میں عزت خاں خطابوں سے سرفراز کیا اور ملازم رکھ لیا۔

سید محمد

ہاشمی بیجاپوری

ہاشمی، علی عادل شاہ ثانی اور نصرتی کا ہم عصر تھا۔ شاہ ہاشم بیجاپوری کا مرید خاص تھا اسی مناسبت سے ہاشمی تخلص رکھا۔ شاہ ہاشم اور ملا ہاشمی دونوں کی تصویریں اس مضمون کے ساتھ شایع ہو رہی ہیں وہ مادرزاد اندھا تھا لیکن شاعری سے فطری لگاؤ رکھتا تھا۔ دکن میں ریختی زبان کی ایجاد کا سہرا ہاشمی کے سر ہے ایک دیوان ریختی کی غزلیات کا مرتب کیا اور ایک مثنوی یوسف زلیخا احسن القصص کے نام سے ۱۰۹۹ھ میں لکھی۔ ہاشمی کی زندگی کے حالات کسی تذکرے میں نہیں ملتے البتہ اس کے کلام سے اندرونی شہادتیں کچھ ملتی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ برہان پور گیا [illegible] بیجاپور کے ایک امیر ذوالفقار خاں کی شہرت سن کر وہاں گیا اور اپنے ممدوح سے قصائد کے بدلے میں گراں بہا انعام حاصل کئے۔ دو ذہن قصیدے ذوالفقار خاں کی مدح میں ہاشمی نے کہے ہیں۔ ابھی ہاشمی کے متعلق کافی معلومات فراہم نہ ہو سکے۔ اس کا دیوان ریختی اور مثنوی یوسف زلیخا جو زیر طبع ہیں ان کے مقدمہ کی تکمیل کے لئے ہماری کوشش ہے کہ جس قدر ممکن ہو سکے اس کی زندگی کے متعلق معلومات فراہم کریں۔ علاوہ دیوان اور مثنوی کے ہاشمی بیجاپوری اعلیٰ پایہ مرثیہ نگار ہے اس کے کئی مرثیے دستیاب ہوئے ہیں جن سے اس کی قادر الکلامی اور وسیع النظری کا ثبوت ملتا ہے۔ یہاں ہم دیوان اور مثنوی سے چند شعر نقل کرتے ہیں:-

غزل ریختی

جھانکو نکو سو پچھن تج دل چھوٹ ہوے کا — تجھ خیل میں تمنا چپ سب جگ میں شور ہونے کا
جھ گن بھری سندر کی عالم میں بانٹ ہوی ہے — جھانکیکی تس اوپر تو شہرت بھی زور ہونے گا
انکھیاں تو ہور دستیاں دل میں تو بھید کچھ ہے — باتاں بھی ہور کچھ ہیں مقصد بھی ہور ہونے کا
ہے حسن دہن تمہارا رکھنا جتن نہیں دہن — نیں تو یو دہن تیرا نے کوئی سا ہو چور ہونے گا (دیوان ریختی)

عشق

اگر عشق نیں ہے تو چندر کوں نور — تو کیا واسطے نت یو تپتا ہے سور
اگر عشق نیں ہے تو دریا مین آب — پلاتا ہے بادلوں کی بے حساب
اگر عشق نیں ہو تو کی دھرتری — نوی رت میں کرتی ہے کسوت ہری
اگر عشق نیں ہے تو کی یو بہنور — پھرے باس لیتا ہر اک گل اوپر
اگر عشق نیں ہے تو کی یو فقیر — فقیر ہو کے غربت لئے اپنے سیر

مجازی عشق راست ہر ٹھور ہے
حقیقی ولے عشق کچھ ہور ہے (یوسف زلیخا)

میر سعادت علی رضوی

نظام شاہی خاندان

احمد نظام الملک ۸۹۵ھ تا ۹۱۴ھ

بہمنی سلطنت کا جب شیرازہ بکھر رہا تو سب سے پہلے احمد نظام الملک نے بغاوت کی۔ احمد نظام الملک دکن کے برہمن نژاد امیر حسن بحری کا لڑکا کہلاتا ہے جس کو دکن کے مورخ ایک عجیب و غریب کہانی کے ذریعے محمد شاہ بہمنی کا لڑکا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بہمنی سلطنت کے شمال مغربی حصہ کا مالک بنا اور اپنا صدر مقام جنیر قرار دیا لیکن احمد نگر آباد کر کے احمد نگر اس کا نام رکھا۔ اور اسی نام سے اس کی سلطنت موسوم ہوئی۔ احمد نظام الملک نے ۸۹۵ھ میں اپنی آزادی و خود مختاری کا اعلان کیا اور ۲۴ سال شوکت سے حکومت کرنے کے بعد ۹۱۴ھ میں انتقال کیا۔

برہان نظام شاہ ۹۱۴ھ تا ۹۶۱ھ

باپ کے بعد تخت نشین ہوا۔ اور اپنی سلطنت کی تمدنی ترقی کا باعث بنا۔ اس کے دور میں نظام شاہی حکومت کی وسعت اور تنظیم کا کام ہوا اور اسی بادشاہ کی وجہ سے بہادر شاہ والی گجرات کا دیا ہوا لقب نظام شاہی اس خانوادہ کا لقب ہو گیا۔

سلطان حسین نظام شاہ اول ۹۶۱ھ تا ۹۷۲ھ

باپ کے مرنے کے بعد برسر اقتدار آنے حکومت ہوا۔ یہ بہت بڑا سپاہی اور مدبر تھا اس کے زمانے میں سلاطین دکن میں اتحاد ہوا اور اسی کی سرگرمی اور کوشش سے تالی کوٹ میں رام راج کو شکست ہوئی اور نہایت شان اور جبروت کی حکومت کے بعد ۹۷۲ھ میں انتقال کیا۔

مرتضیٰ نظام شاہ ۹۷۲ھ تا ۹۹۶ھ

یہ صغیر سنی میں بادشاہ ہوا اور اپنی ماں برہان کی سرپرستی کے تحت حکومت کرتا رہا اور ۹۷۵ھ میں ماں کو قید کر کے برسر اقتدار آیا۔ یہ بادشاہ چاند بی بی کا بھائی تھا اس کے دور میں سلطنت کے ابتدائی آثار تنزل شروع ہو گئے تھے ۹۹۶ھ میں کثرت عیاشی کی وجہ سے دیوانہ ہو گیا اور اس کے بیٹے میران حسین نے اس کو حمام میں بند کر دیا۔

میران حسین نظام شاہ ۹۹۶ھ

باپ کو قید کر کے تخت پر بیٹھا اور وزیر مرزا خاں کے ہاتھ مارا گیا۔ اس نے صرف نو مہینے حکومت کی۔

اسماعیل نظام شاہ ۹۹۷ھ تا ۹۹۹ھ

یہ امرائے گروہی کے ذریعے تخت پر آیا اور اپنے باپ برہان نظام شاہ کے ہاتھوں تخت سے اتار دیا گیا۔

برہان نظام شاہ ثانی ۹۹۹ھ تا ۱۰۰۳ھ

مغلوں کی طاقت کے ذریعے بیٹے کو معزول کر کے تخت حاصل کیا۔ اور ۱۰۰۳ھ میں عادل شاہیوں سے شکست کھا کر اسی صدمہ میں انتقال کیا۔ اور اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین بڑے بیٹے اسمٰعیل کے بجائے جو عہد وہی تھا اپنے چھوٹے بیٹے کو جو اسماعیلیہ مذہب کا پیرو تھا مقرر کیا۔

ابراہیم نظام شاہ ـ ۱۰۰۳ھ

باپ کے بعد برسر حکومت آیا اور ایک ہی سال میں عادل شاہیوں سے لڑتا ہوا ایک سپاہی کے ہاتھ مارا گیا۔

احمد نظام شاہ

یہ شخص ایک دعویدار سلطنت تھا اور بعض امراء کی کوشش سے تخت نشین ہوا لیکن بعد میں چاند بی بی کے تدبر سے اس کو تخت سے ہٹایا گیا اور بہادر نظام شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔

بہادر نظام شاہ ۱۰۰۴ھ تا ۱۰۰۹ھ

یہ طوائف الملوکی کا دور تھا۔ وزیر اعظم اخلاص خاں حبشی اور چاند بی بی کے ذریعہ برسر اقتدار آیا یہ وہ دور تھا جس میں چاند بی بی نے مغلوں سے غیر معمولی معرکے کئے۔

مرتضیٰ نظام شاہ دوم ۱۰۰۹ھ تا ۱۰۳۵ھ

بہادر نظام شاہ کے بعد طوائف الملوکی کی بیخ کنی اور امراء نے مرتضیٰ نظام شاہ کو تخت پر بٹھایا اس دور کو ملک عنبر کا دور کہا جا سکتا ہے مغلوں کی بڑھتی ہوئی قوت ملک عنبر کی زندگی تک نظام شاہی سلطنت پر چھا نہ سکی۔ ملک عنبر کے بعد کوئی نظام شاہی حکومت کو بچانے والا نہ تھا

برہان نظام شاہ سوم ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۴۰ھ

برہان نظام شاہ نے باپ کے بعد سلطنت حاصل کی اور ۱۰۴۰ھ میں انتقال کیا یہ دورِ تنزل تھا۔

حسین نظام شاہ سوم

یہ احمد نگر کا آخری تاجدار ہے۔ اس کے زمانے میں مغلوں نے احمد نگر پر قبضہ کیا اور شاہ جہاں نے اس کو گوالیار میں قید کر دیا

مرتضیٰ نظام شاہ سوم ۱۰۴۲ھ تا ۱۰۴۵ھ

یہ بادشاہ نظام شاہی سلطنت کے بعد شاہ جی مرہٹے کے ذریعے تین سال تک شاہ گڑھ پر حکومت کرتا رہا اور تین سال کے بعد اپنے خاندان کا خاتم بنا۔

چاند بی بی

دکن کی نامور سلطانہ چاند بی بی حسین نظام شاہ اور خونزہ ہمایوں بیگم کی بیٹی تھی اور اس طرح باپ کی طرف سے نظام شاہی تدبر اور ماں کی طرف سے ترکی تہور اور بے جگری ورثے میں پائی تھی۔ یہ ملکہ ۹۵۵ھ میں احمد نگر میں پیدا ہوئی آنکھ کھولتے ہی اس نے تلوار کی جھنکار سنی بہمنی سلطنت کے مختلف شہ پارے آپس میں دست و گریباں تھے اور اس نفاق سے فائدہ اٹھا کر رام راج کے تخت وجیانگر کی شہنشاہیت مسلم راج اور مسلم سلطنتوں پر چھائی جا رہی تھی چودہ برس کی عمر میں چاند سلطانہ اس شطرنج کا مہرہ بنی اور علی عادل شاہ والی بیجاپور کے نکاح میں آکر دکنی مسلم اتحاد کا باعث بنی کوئی تعجب نہیں کہ تالی کوٹ کی لڑائی میں یہ شاہی دلہن میدان کارزار میں ہو اور مسلمانوں کے ناموس کا مرکز بنی رہی ہو۔ یہ چاند سلطانہ کا پہلا دور ہے۔

چاند سلطانہ کی زندگی کا دوسرا دور ۹۷۱ھ سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ وہ دلہن بن کر بیجاپور کے بادشاہ کے دل میں حکمران تھی

حسن نظام الملک بحری
بانی سلطنت نظام شاہیہ

چاند سلطانہ
منکوحہ علی عادل شاہ اول

علی عادل شاہ خود بڑا بادشاہ تھا اس کی زندگی تک چاند بی بی کو صرف نظری تجربہ سیاست کا اور سلطنت کا حاصل ہوتا رہا یہاں تک کہ ۹۸۸ھ میں چاند سلطانہ کا شوہر علی عادل شاہ بیجاپور کا پانچواں زبردست فرماں روا بریدی غلام کے ہاتھوں شہید ہوا اب چاند سلطانہ بیجاپور میں وہی تدبر اور تنظیمی قوت کا اظہار کرنے لگی جو تاریخ انگلستان میں صرف ملکہ ایلزبتھ کو حاصل تھا۔ نیا بادشاہ ابراہیم عادل شاہ نو برس کا تھا اور سلطنت چو طرف سے اندرونی سازش اور بیرونی غنیموں سے گھری ہوئی تھی امرائے سلطنت کی باہمی رقابت اور تمت کے ذریعے اس مدبر خاتون نے ابراہیم عادل شاہ کو نہ صرف بچایا بلکہ اس کو تربیت کے ذریعے بیجاپور کا سب سے بڑا فرماں روا بننے کے قابل رکھا۔ اس طرح ۹۸۷ھ سے ۹۹۲ھ تک چاند بی بی بیجاپور کے لئے فرشتۂ رحمت رہی کوئی مورخ جو چاند بی بی کی حقیقی سوانح عمری لکھنے بیٹھے اس دور کو اس کا دور تدبر قرار دے گا۔

جس طرح چاند بی بی بیجاپور خود کی شادی کی وجہ سے آئی تھی اسی طرح ابراہیم عادل شاہ کی بہن خدیجہ سلطانہ کے ساتھ چاند بی بی کے بھتیجے میراں حسین کو بیاہی گئی تھی پھر احمد نگر واپس لوٹی۔ اس کو پہلے سے بھی زیادہ زبردست سیاسی خدمات انجام دینے تھے احمد نگر مسلم اقتدار دکن کا سب سے اہم مرکز تھا۔ مغل اس کو کسی نہ کسی طرح اپنے علاقے میں شامل کرنے کی تاک میں لگے ہوئے تھے اور [illegible] کی مسخر شاہانہ دیدنی نسخہ ہے۔ مرتضیٰ نظام شاہ کے انتقال کے بعد جو طوائف الملوکی مچی میراں حسین کے بعد اسمٰعیل تخت پر بیٹھا جس کو اس کے باپ برہان نظام شاہ دوم نے مغلوں کے اثر سے بے دخل کر دیا۔ اور اس کے چند سال بعد ابراہیم نظام شاہ اور پھر بہادر نظام شاہ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ یہ دور احمد نگر کے لئے زیست اور موت کا دور تھا اور چاند بی بی کی زندگی کا حقیقی کارنامہ اسی دور سے متعلق ہے جو کام بیجاپور میں اپنے شوہر اور ان کی اولاد کے لئے اس نے کیا وہی کام اپنے خاندان کے لئے اسے کرنا تھا لیکن یہاں پر اس کے لئے اندرونی فتنے زیادہ تھے۔ اور مغلوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے سابقہ تھا۔ اس دور میں چاند بی بی نے بادشاہ گری کی بہادر نظام شاہ کے لئے وہ سب کچھ کیا جو بڑے سے بڑا مدبر اور سپہ سالار کر سکتا تھا۔ اندرونی فتنہ کو رفع کیا اور مغلوں کو تادم زیست اپنے آبا و اجداد کی سلطنت سے دور رکھا۔ اکبری لشکر نے مراد کی سرکردگی میں ۱۰۰۴ھ میں احمد نگر پر یلغار کی چاند بی بی نے اتنی بہادری سے ان کا مقابلہ کیا کہ مغلوں کو مجبوراً صلح کرنی پڑی۔ یہی وہ معرکہ تھا جس میں سرنگ کے ذریعے پچاس گز قلعہ کی دیوار اڑا دی گئی تھی۔ اور چاند بی بی نے مغلیہ دل بادل کو تلوار کی نوک سے اس وقت تک روک رکھا تھا جب تک دیوار از سر نو تیار نہ ہو گئی تاریخ حرب میں یہ کارنامہ ہمیشہ صف اول میں رہے گا۔ اس کے بعد مغلوں نے دوسرا حملہ شہزادہ دانیال کی سرکردگی میں کیا۔ اور چار مہینے کے محاصرہ کے بعد چاند بی بی کی مردہ لاش اور دکن کا ایک ویران شہر اس کے ہاتھ آیا ۱۰۰۸ھ میں یہ بہادر سلطانہ ناموس کی حفاظت کے لئے تیغ آب کے کنوئیں میں مستور ہو گئی۔

ملک عنبر

ملک عنبر دکن کا مشہور سپہ سالار، مدبر اور بادشاہ گر حبشی ۹۵۵ھ میں پیدا ہوا۔ اس نے ابتدائی تربیت پائی اور دکن کے بازار میں آکر فروخت ہو گیا۔ احمد نگر میں چنگیز خاں کے غلام کی حیثیت سے تربیت حاصل کی اور آقا نے غلام کو اولاد کی طرح پالا۔ آقا کی وفات کے بعد ۹۸۳ھ میں ملک عنبر گولکنڈہ میں شاہی کا ملازم ہوا پھر بیجاپور چلا گیا۔ ابراہیم عادل شاہ کے ملازمان میں شریک ہو کر ایک ممتاز عہدہ پر فائز اور ملک عنبر کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ اب اس نے عرب [illegible] اور حبشیوں کی فوج جمع کرنا شروع کیا اور اس کی شرفا نوازی اور بہادری کی دھوم مچ گئی لیکن بیجاپور کے امرا کے حسد اور حوصلہ شکن فضا سے بیزار ہو کر بیجاپور بھی [illegible] میں چھوڑنا پڑا۔ کچھ مدت ملک عنبر کی عمر تنگدستی میں گزری لیکن اس حالت میں بھی فوج فراہم کرتا رہا اور احمد نگر میں ملازمت اختیار کر لی۔ حسین نظام شاہ کی فوج میں اس جوان حبشی کے افسانہ نے مغلوں کے مقابلے میں ایک قوت پیدا کر دی تھی۔

ملک عنبر ایک ایسے دور میں سیف و دماغ کے جوہر دکھانے کے لئے دنیا میں آیا جب کہ دکن تباہ ہو رہا تھا۔ بہمنی شہنشاہیت کے شہ پارے آپس میں دست و گریباں تھے اور مغلوں کا بڑھتا ہوا اقبال ان پر عقاب کی طرح چھا رہا تھا۔ احمد نگر فتح دکن کی کنجی تھا جس پر مغلوں کی آنکھ لگی ہوئی تھی۔ ملک عنبر کی جوانی بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر کے عروج میں شروع ہوئی اور دکن کی سلطنتوں کے زوال کے ساتھ ساتھ ملک عنبر کی حوصلہ مندیوں نے عروج حاصل کیا اور کم از کم اپنی دانشمندی کی وجہ سے تیس سال تک دکن کو اغیار کی غداری سے بچائے رکھا۔ اس طرح تمام عمر ایک مجاہد کی زندگی بسر کر کے ۱۴ شعبان ۱۰۳۵ھ کو بخار کی وجہ سے اسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔

ملک عنبر میانہ قد حبشی رنگ اور گٹھیلے جسم کا آدمی تھا۔ مغلوں کا لباس اور دکنی دل رکھتا تھا۔ حلیم الطبع، منکسر المزاج وفا [illegible] ایسا کہ آخری دم تک باوجود بے تاج کا بادشاہ ہونے کے مرتضیٰ نظام شاہ کو بادشاہ بناتا رہا۔ اس کے [illegible] کی دھوم تھی۔ اس کا دربار علاوہ شعراء کے ادیب، علماء و فضلاء، اولیاء اور رشیوں کا مامن تھا۔ میدان جنگ میں شیر دل اور میدان تدبیر کا [illegible]۔ ایک طرف اہل سیف اور دوسری طرف مصلح، ریفارمر اور تعمیر کار تھا۔ ملک عنبر کے احسانات میں سب سے بڑا احسان وہ ہے جو اس نے مرہٹہ قوم پر کیا۔ آج کل کے مرہٹہ مورخ تعصب کی وجہ سے اس کو تسلیم نہ کریں لیکن خاص عربی طرز جنگ اسی نے [illegible] مرہٹوں کو بحیثیت قوم سپاہی بنانے کا کام ملک عنبر نے انجام دیا۔ اسی نے صدیوں کے غلام اور [illegible] انسانوں کو نہ صرف مرد میدان بلکہ صاحب تاج اور سلطنت کر دکھایا۔ یہ جب تک مرہٹے ملک عنبر کی بتائی ہوئی راہ پر گامزن تھے اقبال ان کے ساتھ تھا جس روز انہوں نے برگیری چھوڑ کر میدان سنبھالا تو ان کو پانی پت کی تیسری جنگ کا روز بد دیکھنا پڑا۔

ملک عنبر کا دوسرا کارنامہ مالی انتظام تھا۔ اس مدبر سپاہی نے باوجود تمام عمر میدان جنگ میں بسر کرنے کے اپنی رعایا کی خوشحالی کے لئے بہترین مالی انتظام کیا۔ مالگزاری کی تنظیم، زمینات کا بندوبست اور محاصل کے [illegible] نے رعایا کو مطمئن اور فارغ البال کر دیا۔ اس نے انتظام سلطنت کے [illegible] زبان کو دفاتر کے لئے رائج کیا۔

بحیثیت تعمیر کار اس کی شہرت لافانی ہے۔ کھڑکی ایک غیر آباد اور پہاڑی قریہ کو اس نے بارونق اور متمدن شہر بنا دیا گو اس شہر کو ایک مرتبہ جہانگیر کی فوجوں نے زمین کے برابر کر دیا تھا تاہم ملک عنبر نے چند دنوں میں اس ویرانہ کو گلزار میں تبدیل کر دیا۔

سید محمد اکبر وفا قانی

ملک عنبر سپہ سالار احمد نگر

مک شہر ذ ہقر ا

گولکنڈے کا نیا قلعہ

(قلعہ گولکنڈہ کے پہلو میں سلطان عبداللہ قطب شاہ نے جو نیا قلعہ بنایا تھا اس کی ایک جھلک)

اب بھی رونق پا رہا ہوں تیرے ویرانے میں میں / سن رہا ہوں کچھ سکوتِ شب کے افسانے میں میں

موجزن ہے تشنگی، حوضوں میں پانی کیلئے / ابر جن پر چھا رہا ہے، دُرفشانی کیلئے

ہیں نقوشِ جستجو، تیرے شکستہ بام و در / جن میں کھو جاتی ہے دل کی دھڑکنیں لے کر نظر

تیرے سائے میں ہے ابتک بھی جھلک تلوار کی / تیرے خودرو دشت میں فرحت سی ہے گلزار کی

تیرا ہر پربت ہے، اپنی عظمتوں کا رازداں / تیری خاموشی کے دامن پر ہیں نغموں کے نشاں

نوحہ خواں ہے پُرسکوں تالاب کی سرسبز دُوب / شام کو جس کے کنارے مہر ہوتا ہے غروب

جو خموشی میں ہے کیفیت کہاں فریاد میں؟ / یہ مسجد ہے خدا کا گھر خدا کی یاد میں

عکسِ ماضی دیکھتا ہوں میں تری تصویر میں / حسن کاری کا تخیل ہے تری تعمیر میں

پیکرِ مردہ میں تیرے زندگی کی آن ہے / اب بھی محلوں کے کھنڈر کی جاودانی شان ہے

تھی تری بیداری تقدیر سونے کیلئے
تو یوں ہی چھوڑا گیا برباد ہونے کیلئے

آج کردوں گا نمایاں بے حسی کے داغ کو / اپنے دل کے خون سے سینچوں گا تیرے باغ کو

آج میں تعبیر مانگوں گا فسونِ خواب سے / تیرے حوضوں کو بھروں گا آنسوؤں کی آب سے

ڈوب جائیگی اثر میں آج آہِ آتشیں / ثبت کردوں گا تری مسجد میں نقشِ جبیں

تیرے کھنڈروں میں سکونِ زندگانی پاؤں گا
تیری خاموشی میں ماضی کے ترانے گاؤں گا

میکش

گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت

قطب شاہی خاندان کی حکومت سرزمین حیدرآباد پر تقریباً دو سو سال یعنی ۹۱۸ھ سے ۱۰۹۸ھ تک رہی۔ اور اس عرصہ میں اُن حکمرانوں نے یہاں تہذیب و تمدن، تمول و ثروت، علم و فضل، اور شعر و سخن کی ایک ایسی فضا پیدا کردی جس پر دکن کی تاریخ بجا طور پر فخر کرسکتی ہے۔ ان بادشاہوں نے شیعہ، سنی اور مسلمان و ہندو غرض ہر مذہب و ملت کے باشندوں میں ایک مشترک کلچر کے پیدا کرنے میں یہاں تک کامیابی حاصل کی تھی کہ دوسروں کے لئے اُس ملک کے رہنے والوں کا باہمی اتحاد اور یگانگت باعث رشک تھی۔ اسی مفاہمت کی خاطر انھوں نے اردو کی سرپرستی کی اور اس زبان میں ایسی ایسی بلند پایہ کتابیں لکھیں اور لکھوائیں جن پر اردو ہمیشہ نازاں رہے گی۔

یوں تو قطب شاہی سلطنت کے بانی سلطان قلی کا تعلق اس سرزمین سے ۸۹۱ھ میں پیدا ہو چکا تھا جب وہ تلنگانہ کا صوبہ دار بنا یا گیا تھا لیکن جب ۹۰۱ھ میں گولکنڈہ اور اس کے اطراف و اکناف کا علاقہ اس کو بطور جاگیر کے دیا گیا تو اس نے اس کا نام محمد نگر رکھا اور قدیم قلعہ کو مستحکم کرکے اس میں متعدد محلات تعمیر کئے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اپنے علاقہ کو وسیع کرنا شروع کیا۔ چنانچہ بیس بائیس سال کے عرصہ میں پانگل، گلمن پورہ، کوئیل کنڈہ اور نلگنڈہ وغیرہ اس کے قبضہ میں آگئے۔ ۹۲۴ھ میں اس نے قلعہ میں بالا حصار کے دامن میں مشہور مسجد صفا بنائی جس میں آخر کار ۹۵۰ھ میں اپنے فرزند یار قلی جمشید کے اشارے سے سلطان قلی قطب شاہ کو ننانوے سال کی عمر میں عصر کی نماز پڑھتے وقت شہید کیا گیا۔ اس نے دوسرے صوبہ داروں کی طرح بہمنی بادشاہ کے خلاف علم بغاوت نہیں بلند کیا بلکہ آخر تک ان کی مدد کرتا رہا اور جب بریدیوں نے بہمنیوں پر پوری طرح قبضہ کرلیا تو مجبوراً سلطان قلی کو بھی اپنی بادشاہت کا اعلان کرنا پڑا۔

سلطان قلی کو فن تعمیر کا خاص ذوق تھا۔ اس نے قدیم قلعہ (موجودہ بالا حصار) کے اطراف ایک عالیشان شہر بنایا۔ وہ دراصل وہی اس طرز تعمیر کا بھی بانی ہے جو قطب شاہی کہلاتا ہے اور ایرانی، ہندو، اور پٹھان طرزہائے تعمیر کے امتزاج سے بنا ہے اس کی وفات کے وقت اس کی سلطنت شمال میں دریائے گوداوری، مشرق میں اڑیسہ اور ساحل سمندر اور جنوب میں دریائے کرشنا تک پھیل چکی تھی۔

۲ جمشید قلی قطب شاہ تخت نشین ہوتے ہی اپنی سلطنت کے استحکام و وسعت میں مصروف ہو گیا۔ اگرچہ اس کا سات سال کا مختصر سا عہد حکومت زیادہ تر جنگ و جدل سخت گیریوں اور پریشانیوں میں گذر گیا۔ لیکن اس نے ایلگندل، کوہیر، احسن آباد، اور میدک پر قبضہ کرکے قطب شاہی سلطنت میں اضافہ کیا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ لیکن اس کے عہد میں گولکنڈہ اردو شعر و سخن کا مرکز نہ بن سکا۔ اس کی وفات ۹۵۷ھ پر اس کے کمسن لڑکے سبحان قلی کو تخت نشین کیا گیا لیکن چند ماہ بعد ہی اس کا دوسرا بھائی ابراہیم قلی کوئیل کنڈہ کے نائیک واڑیوں کی مدد سے قلعہ گولکنڈہ میں داخل ہوا۔ اور اپنے بھائی کے مظالم کی تلافی کرنے میں مصروف ہو گیا۔

۳ سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ کی شخصیت کو دکن کی سیاست میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اسی کے زمانہ میں ۹۷۲ھ میں تالی کوٹہ کی مشہور لڑائی ہوئی جس میں وجیانگر کی عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی گولکنڈہ کو مال و دولت اور سیاسی حیثیت سے کافی اہمیت حاصل ہو گئی۔ بعد میں ابراہیم قطب شاہ نے راجمندری، قاسم کوٹہ اور کھم میٹھ وغیرہ کے علاقے بھی فتح کئے۔ اس نے ۹۸۸ھ میں انتقال کیا۔ اس کو بھی اپنے باپ کی طرح تعمیر کا شوق تھا۔ چنانچہ بالا حصار کی سیڑھیوں کی مسجد، موسیٰ ندی کا پہلا پل، حسین ساگر بدیل کا تالاب، ابراہیم باغ، باغ گلشن، اور قصبہ ابراہیم پٹن اس کی تعمیری یادگار ہیں۔ اس کے عہد میں گولکنڈہ اردو زبان کا مرکز بن گیا۔ اور فیروز، محمود، احمد اور وجہی جیسے بلند پایہ شعراء

یہ عجیب بات ہے کہ سلطان محمد کو بھی اپنے اجداد کی طرح فن تعمیر سے خاص شغف تھا۔ اس نے قلعہ محمد نگر گولکنڈہ کے مقابل میں حیدرآباد کے مشرقی جانب چھ میل کے فاصلہ پر ایک قلعہ سلطان نگر کی سنہ ۱۰۳۳ھ میں بنا ڈالی لیکن اس کا بہت جلد انتقال ہو گیا اور وہ قلعہ ناتمام رہا۔ اس کے علاوہ اسی سلطان نے مکہ مسجد، محل سلطان شاہی، اور گوشہ محل کی بھی بنا ڈالی تھی مگر اس کا کوئی کام اس کی زندگی میں تکمیل نہ پا سکا۔ اس کی جوانمرگی نے اس کو ہر طرح حرماں نصیب رکھا۔ اگر وہ چند اور سال زندہ رہ جاتا تو گولکنڈہ کی سلطنت اس قدر جلد زوال پذیر نہ ہونے پاتی۔

۶ سلطان محمد کے بعد اس کا اکلوتا بیٹا عبداللہ ماہ زرا سنہ ۱۰۳۵ھ میں بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ بادشاہ کی یہ کم عمری اور ناتجربہ کاری قطب شاہی سلطنت کی کمزوری کا باعث ہوئی۔ سلطان عبداللہ کی کمزوریوں سے سب سے زیادہ محمد سعید میر جملہ نے فائدہ اٹھایا۔ آخر کار جب بادشاہ نے اس سرکش کا استیصال کرنا چاہا تو اس نے شہزادہ اورنگ زیب کے یہاں پناہ لی اور قطب شاہی سلطنت اور اس کے حکمران کی کمزوریوں سے غنیم کو واقف کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گولکنڈہ کی آزادی قائم نہ رہ سکی۔ اور اس کی عظمت و شوکت کا آفتاب غروب ہونے لگا۔

ان سیاسی پریشانیوں کے علاوہ سلطان عبداللہ کے عہد میں حیدرآباد کو ایک نیم وحشی آفت یعنی ایک زبردست طغیانی و دو موسیٰ کی وجہ سے بھی زحمت اٹھانے پڑے۔ لیکن ان سب صدموں سے بڑھ کر اہل حیدرآباد اس پریشانی و زحمت سے متاثر ہوئے جو سنہ ۱۰۶۶ھ میں میر جملہ کی وجہ سے اورنگ زیب کے حملہ کی شکل میں نمودار ہوئی۔ اس وقت مغلوں نے لوٹ مار کے سلسلہ میں حیدرآباد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور تمام شہر کو تباہ کر کے چھوڑا۔

غرض عبداللہ قطب شاہ کی زندگی پریشانیوں اور کشمکشوں میں گذری۔ وہ آخر دم تک اولاد نرینہ کا متمنی رہا۔ اور اسی یاس و امید میں ایک پوری نصف صدی گذار دی۔ پچاس سال کی طویل حکومت کے بعد سلطان عبداللہ نے سنہ ۱۰۸۳ھ میں انتقال کیا اور درحقیقت اس کے ساتھ ہی قطب شاہی حکمرانوں کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ وہ بھی اردو زبان کا ایک اچھا شاعر تھا۔ اس کے عہد میں بھی علم و فضل اور شعرا و شاعری کی قدر دانی جاری رہی۔ فارسی کی مشہور فرہنگ برہانِ قاطع اور اردو کی مشہور کتابیں سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ، پھول بن، ماہ پیکر وغیرہ اسی دور کی یادگار ہیں۔

۷ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے بعد اس کا چھوٹا داماد ابوالحسن تانا شاہ تخت نشین ہوا۔ وہ چودہ برس تک قطب شاہوں کی اس امانت یعنی سلطنت گولکنڈہ کو دشمنوں سے بچاتا رہا۔ وہ نہایت دور اندیش اور قابل و منتظم حکمران تھا۔ اس نے قلیل عرصہ میں قطب شاہی سلطنت کے ان تمام کل پرزوں کو درست کر لیا جو سلطان عبداللہ کے پچاس سال کے طویل عہد حکومت میں بالکل کمزور اور منتشر ہو گئے تھے۔ اگر شہنشاہ اورنگ زیب جیسے طاقتور دشمن سے مقابلہ نہ ہوتا اور تمام ہندوستان کی فوجیں اس کے مقابلہ کے لئے جمع نہ ہو جاتیں تو وہ قطب شاہوں کی اس امانت کو اپنی اولاد تک نہایت مستحکم اور طاقتور حالت میں منتقل کر سکتا۔ اس کے عہد میں بھی حیدرآباد اردو شاعروں اور انشا پردازوں کا مرکز بنا رہا۔ غواصی اور غلام علی جیسے بلند مرتبہ شاعر اس وقت بھی موجود تھے۔ جنہوں نے اپنی وفاداری کے خدمات شعر و سخن وبوجوہ احسن انجام دی تھیں۔

سلطان ابوالحسن قطب شاہ نے جس خوبی اور مردانگی سے مغلوں کا مقابلہ کیا اور جنگ میں اس کا برتاؤ جیسا شریفانہ اور بہادرانہ رہا اس کے تذکرے خاص و عام کی زبان پر اب تک جاری ہیں۔ اس نے قطب شاہی افواج کی اخلاقی حالت اس قدر درست کر دی تھی کہ دشمن بھی اعتراف کرتے تھے۔ اگر اورنگ زیب کا تدبر اور میر جملہ کے جانشین غدار قطب شاہی امرا کا مکر و فریب کارگر نہ ہوتا تو شاید ہی گولکنڈہ فتح ہو سکتا۔

(ماخوذ از سیر گولکنڈہ)

سید محی الدین قادری زور

اور برار کے ساتھ گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت بھی قائم ہو گئی۔

سنہ ۹۲۴ھ میں سلطان محمود کے انتقال کے بعد وہ خودمختار ہوا اور اس کے بعد اس نے گولکنڈہ کو پایۂ تخت بنایا قلعہ اور شہر کی تعمیر کی۔ فوجی نقطۂ نظر سے گولکنڈہ نہایت موزوں سمجھا گیا۔ اپنے مرکز کے استحکام کے بعد اس نے مشرقی تلنگانہ کے مختلف صوبوں پر دھاوا کرنے شروع کئے تقریباً ۲۰ سال کے دوران میں ساٹھ ستر قلعے اور حصار فتح کئے اور سلطنت کو ونڈل کی سرحد سے بندرگاہ مچھلی پٹم تک پہنچا دیا۔

سنہ ۹۵۰ھ ماہ جمادی الاول میں اس کے بیٹے جمشید نے تخت سلطنت کی ہوس میں اسے قتل کروا دیا۔ اس نے تقریباً پچاس سال دکن میں حکومت کی۔ اگر اس کا ابتدائی زمانہ بھی شامل کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے تقریباً ساٹھ سال سیاست دکن کی رہنمائی کی۔ اسی مدت میں اس نے جنوبی ہند کے تمدن و سیاست میں ایک بڑا تغیر پیدا کیا تھا۔ یہاں کی منتشر اکائیوں کو ایک رشتہ میں منسلک کر کے اس ملک کی حفاظت خواہ شیرازہ بندی کر دی تھی اور باضابطہ نظم و نسق سے یہاں امن و امان قائم کر دیا تھا۔

جمشید قطب شاہ (سنہ ۹۵۰ھ تا سنہ ۹۵۷ھ)

سلطان قلی قطب شاہ نے ۵۰ سالہ عہد حکومت کے بعد ۹۹ سال کی عمر میں انتقال کیا تھا وہ گولکنڈہ کی نوخیز سلطنت کو مستحکم حالت میں چھوڑ گیا تھا۔ اس کے ۶ بیٹے تھے۔ فرزند اکبر حیدر قلی جو جانشینی کے لئے نامزد ہو چکا تھا باپ کی زندگی میں انتقال کر گیا۔ اس کے بعد سلطان قلی قطب شاہ نے اپنے دوسرے بیٹے قطب الدین کو ولیعہد بنایا لیکن اس کے مقابلہ میں اس کے دوسرے بھائی جمشید قلی، عبدالکریم اور دولت قلی بہت تیز طبیعت اور حوصلہ مند تھے۔ چھٹا بیٹا ابراہیم قطب دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ لائق تھا۔ عبدالکریم باپ کی زندگی ہی میں بغاوت کی پاداش میں مارا گیا۔ اور جمشید اور دولت بھی بنظر احتیاط قید رکھے گئے تھے، لیکن جمشید قلی جو گولکنڈہ ہی میں مقید تھا، اپنے لئے قید میں سے راستہ صاف کرنے لگا اپنی سازش کی اور ایک شخص میر محمود ہمدانی کے ذریعہ اپنے باپ کو قتل کروا دیا۔ باپ کے مرنے کے بعد جمشید قید سے باہر نکلا اور اپنے ہمدردوں کے زور سے سلطنت کے سیاہ و سفید اپنے ہاتھ کر لیے۔ قطب الدین ولیعہد سلطنت اندھا کر دیا گیا۔

سنہ ۹۵۰ھ میں جمشید قطب شاہ کی تخت نشینی عمل میں آئی اور سنہ ۹۵۷ھ تک سات سال اس نے حکومت کی۔ اگرچہ تخت نشینی کے بعد جمشید نے رعایا اور امرا کو خوش کرنے کی کوشش کی اور انھیں مختلف انعامات سے سرفراز کیا لیکن امرا و رعایا میں کچھ خوشگوار تعلقات نہ پیدا ہو سکے پہلے تو اس کے کرتوت ہی اس کی بدنامی کے لئے کافی تھے پھر تخت نشینی کے بعد جبکہ اس کی عمر ۰۰ سال کی تھی، طبیعت کی ترشی اور تند مزاجی نے اس کے بہت سے مخالف پیدا کر دیے۔ جمشید کا چھوٹا بھائی ابراہیم جو دیورکنڈہ سے بھاگ کر ملک برید کے پاس بیدر پہنچ گیا تھا برید کی امداد کے ساتھ گولکنڈہ کی دیواروں تک پہنچ گیا۔ اگرچہ یہ حملہ برہان نظام شاہ والی احمد نگر کی تائید سے رفع ہو گیا تھا لیکن ملک برید اس حملہ کے بعد سے گولکنڈہ کی اندرونی سیاسی فضا، اور جمشید کی کمزوریوں سے واقف ہو گیا۔ بیدر کی بریدشاہی سلطنت بہت مختصر تھی لیکن اس زمانہ میں برید دکن کی لومڑی کہلاتے تھے۔ وہ آپس کے جوڑ توڑ میں بہت مشاق تھے کبھی بیجاپور کا ساتھ دیا تو کبھی احمد نگر کا۔ ہر حیلہ و بہانہ سے ان سلطنتوں کو لڑوا دیا کرتے تھے تاکہ اس طرح سے ان کا فائدہ ہو جائے۔ چنانچہ جمشید کے زمانے میں ایسی لڑائیاں بہت کم ہوئی ہیں۔

برہان نظام شاہ نے جمشید قلی قطب شاہ سے زیادہ دوستی بڑھائی شولاپور پر احمدنگر نے حملہ کیا تو عماد الملک اور جمشید دونوں احمدنگر کے ساتھ شریک تھے۔ لیکن ابراہیم عادل شاہ کی تائید پر برید کی فوجیں تھیں۔ لکھتے ہیں کہ اس موقع پر جمشید ہی نے بڑا کام کیا۔ اس کے آگے بڑھنے سے ابراہیم اور برید میدان چھوڑ کر بھاگے اور جمشید نے برید کا بیدر کی دیواروں تک تعاقب کیا۔

اس شکست کے بعد برید خاموش کیسے بیٹھ سکتا تھا۔ انتقام لینے کے لئے برید نے غالباً ۹۴۳ھ میں گولکنڈہ پر حملہ کر دیا لیکن جمشید نے بڑی ہوشیاری کی۔ تھوڑی سی فوج یہاں چھوڑ کر چلپے سے بیدر پر حملہ کر بیٹھا۔ برید کی فوجیں لوٹ گئیں اور دونوں کا مقابلہ ہوا۔ یہاں بھی گولکنڈہ کی فتح ہوئی۔ برید کا جذبۂ انتقام اس کی شکستوں سے اور بھڑک اٹھا تھا۔ اب اس نے چوتھی مرتبہ ابراہیم عادل شاہ بیجاپور کے اتحاد سے جمشید پر حملہ کیا۔ کئی دن لڑائی ہوئی مگر اس میں بھی جمشید ہی کے سر فتح کا سہرا رہا۔

اس کے بعد جمشید نے ہمیشہ کے لئے برید کا خاتمہ چاہا۔ اس نے دکن کی تمام دوسری ریاستوں کو ہموار کر کے برید پر متفقہ حملہ کیا۔ بیجاپور بھی جو اب تک برید کا دوست تھا اس اتحاد میں شریک ہو گیا۔ چنانچہ جب برید ہار مان کر بیجاپور بھاگا تو بجائے امن دینے کے ابراہیم نے اسے گرفتار کر لیا۔ لیکن دکن کی سلطنتوں میں کچھ ایسی رقابت تھی کہ بعد کو خود جمشید نے برید کو چھڑا لیا اور بیدر لیجا کر صحیح سلامت چھوڑ دیا۔

بیدر سے واپسی کے بعد جمشید کے دو تین سال آرام میں گزرے لیکن یہ کچھ زیادہ دن تک آرام نہ لے سکا۔ وہ بڑے سخت مرض میں مبتلا ہو گیا۔ فرشتہ اسے دق بتاتا ہے لیکن تاریخ قطب شاہی کے الفاظ میں یہ مرض سرطان تھا جس کے صدمہ سے بالآخر ۹۵۰ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے صرف سات سال حکومت کی۔ اس کو سلطان قلی قطب شاہ کے قریب دفن کیا گیا۔

انتہائی برائیوں کے کشمکش تو یہ ہیں جو جمشید سے سرزد ہوئی تھیں اس کے کوئی اوصاف روشنی میں نہ آسکے۔ لیکن اس کی برائیوں کو قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اس میں بہت سے اوصاف ایسے بھی ملتے ہیں جو سراہنے کے قابل ہیں۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے جمشید قطب شاہ ہندوستان کے اچھے حکمرانوں میں سے تھا۔ دکن کی سیاست پر اس کی وسیع نظر تھی۔ سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے وہ ہمیشہ ناکامیاب جنگ سے اجتناب کرتا تھا۔ چنانچہ بڑے شر و فساد سے امن چھڑانے کے لئے احمدنگر اور بیجاپور سے اتحاد کیا تھا۔ اس کی فوجی تنظیم نہایت اچھی تھی۔ وہ خود جری سپاہی تھا اور فوج میں بذات خود حصہ لیتا تھا۔ اس کی دلیری اور جرأت کا ہی نتیجہ تھا کہ سوائے جنگ نا ان کمیا کے جہاں عین الملک کے بیٹے کی غفلت سے علم خراب ہوا تھا گولکنڈہ کی فوج کو کبھی شکست نہیں ہوئی اور سلاطین دکن ہمیشہ اس کی امداد کے طالب ہوتے تھے۔ وہ شجاعت کے ساتھ ہوشیاری کا جوہر بھی اپنے اندر رکھتا تھا۔

ان اوصاف کے ساتھ جمشید میں علمی قابلیت بھی تھی۔ وہ اچھا شاعر تھا بعض دفعہ اس نے فی البدیہ اشعار کہے تھے۔ اس نے فرصت کے اوقات میں بہت سے قصیدے اور غزلیں بھی لکھی تھیں۔

عبدالحفیظ صدیقی

ابراہیم قلی قطب شاہ

۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ

جمشید قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد تخت گولکنڈہ کے کئی دعویدار کھڑے ہو گئے۔ جمشید کا صغیر سن بیٹا سبحان قلی تخت پر بٹھا دیا گیا لیکن زبردست حریف اٹھ بیٹھے۔ دولت قلی نے کوئیر میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اور ابراہیم قلی بیجانگر سے حصول تخت کے لئے روانہ ہوا۔ دولت قلی کو کسی نہ کسی طرح مقید کر لیا گیا پر ابراہیم قلی کے سامنے کسی کی کچھ پیش نہ گئی اور ۹۵۷ھ میں تخت گولکنڈہ ابراہیم قلی قطب شاہ سے زینت پایا۔ ابراہیم قلی قطب شاہ بڑا مدبر اور دوربین بادشاہ تھا۔ اس نے مصطفےٰ خان کو اپنا وزیر مقرر کیا اور اپنی بہن اس سے منسوب کر دی۔

۹۶۲ھ میں حسین نظام شاہ اور ابراہیم قطب شاہ کے متحدہ لشکر نے گلبرگہ کا محاصرہ کر لیا لیکن رام راج والیٔ بیجانگر کی گفت و شنید نے محاصرہ اٹھانے پر مجبور کیا۔

۹۶۵ھ میں علی عادل، رام راج اور ابراہیم قطب شاہ تینوں نے احمد نگر پر حملہ کر دیا۔ قریب تھا کہ احمد نگر فتح ہو جائے لیکن چونکہ اس فتح سے علی عادل کی قوت بہت بڑھ جاتی تھی۔ اور سلطنت گولکنڈہ کو اس سے خدشہ تھا۔ ابراہیم راتوں رات اپنا لشکر لے کر چلا آیا۔ حسین نظام شاہ نے اپنی بیٹی ابراہیم کے عقد میں دی۔ اور اپنے کھوئے ہوئے قلعے واپس لینے کے لئے ابراہیم کی مدد چاہی۔ ابراہیم نے اپنی فوج بھیج دی لیکن یہ مہم مستقل طور پر نہیں لڑی گئی۔ کچھ ہی دن بعد فوج بغیر کسی نتیجہ کے واپس لوٹی۔ اس وقت گولکنڈہ بیرونی حملہ آوروں کی زد میں تھا۔ رام راج کی فوج اندر تک گھس آئی تھی اور بادشاہ کو کوئلکنڈہ، گھن پورہ، اور پانگل کے قلعے دے کر صلح کر لینا پڑا بیرونی دشمن دفع ہو چکا تو اندرونی دشمنوں نے سر اٹھایا ابراہیم قلی نے گولکنڈہ کے حصار کی مرمت کروائی اور شہر کو ہر طرح محفوظ کر لیا۔ اسی اثنا میں نائب وزیروں کا فساد ہوا لیکن بہت جلد دور کر دیا گیا

رام راج کی قوت بہت بڑھ چکی تھی۔ اور وہ اسی زعم میں اپنی ہمسایہ سلطنتوں کو چھیڑ چھیڑ کر اپنی طاقت جتلا رہا تھا مسلمان تو ویسے ایک دوسرے کے دشمن سہی لیکن وقت پر متحد ہو جانا بھی جانتے ہیں۔ ابراہیم قلی قطب شاہ حسین نظام شاہ، علی عادل، اور علی برید نے رام راج پر حملہ کر دیا۔ اور مشہور فیصلہ کن جنگ تالی کوٹ ہوئی۔ راجہ کو شکست فاش ہوئی۔ اور ابراہیم کے کھوئے ہوئے قلعے پھر اسے واپس مل گئے۔

۹۷۴ھ میں ابراہیم نے رفعت خاں لاری کو راجمندری کی فتح کے لئے بھیجا۔ دو زبردست معرکوں کے بعد راجمندری پر قطب شاہی افواج قابض ہو گئیں۔

ابراہیم کا دور حکومت نہایت پر آشوب اور معرکہ آرائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ایک فتنہ کا سر دبایا گیا تو دوسرا اٹھا۔ بادشاہ کا لشکر کبھی اتحادیوں کو ان کی بد عہدی کی سزا دینے میں مصروف ہوتا تو کبھی چھوٹے موٹے راجاؤں کو ان کی سرکشی کی۔ شاہی اقبال ہمیشہ یاوری کرتا اور ہر جگہ بادشاہ کو فتح ہوتی۔ ابراہیم قلی قطب شاہ کا انتقال ۹۸۸ھ میں ہوا۔ کل تیس سال نو ۹ مہینے اس کی حکومت کا زمانہ ہے۔ اس کے زمانے میں گولکنڈہ میں کئی عمارتیں بنیں۔ لنگر دوازدہ امام، ریاض محل، باغ ابراہیم شاہی حوض حسین ساگر، کنکور، کنکورہ بدویل، کے علاوہ مساجد، مدارس بھی تعمیر پائے۔

رشید قریشی

ابراهیم قلی قطب شاہ
۹۵۷ھ تا ۹۹۱ھ

محمد قلی قطب شاہ
[illegible]
۹۹۱ھ تا ۱۰۲۰ھ

ابراہیم قلی قطب شاہ
۹۵۷ھ تا ۹۸۹ھ

محمد قلی قطب شاہ
بانی حیدرآباد
۹۸۹ھ تا ۱۰۲۰ھ

قومی تہذیب کی بنیاد ڈالی اور اس کو آگے بڑھانے کی پوری کوشش کی۔ دوسری طرف تمدنی صفات کی بدولت گولکنڈہ کا تمدنی پایہ بلند کیا۔ اس زمانے کے عظیم الشان تعمیری آثار اس حقیقت کی پوری نشان دہی کرتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ تلنگی زبان کا بڑا عالم تھا اور روایت ہے کہ اس نے تلنگی میں ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ وہ پہلا آدمی ہے جس نے صحیح معنوں میں اردو میں شاعری کی۔ اس کی نظمیں اور غزلیں اس کے ادبی ذوق اور انتقادی دماغ کے بہترین نمونے ہیں۔ ان نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مقامی معاشرت اور روایات سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔

محمد قلی قطب شاہ کے تمدنی کارناموں کی ایک بڑی یادگار شہر حیدرآباد ہے۔ صرف شہر حیدرآباد اور اس کی تعمیر ہی بادشاہ کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ حیدرآباد کی تعمیر کی صحیح تاریخ نہیں ملتی ہے۔ شہر کے نقشے میں ایک شہر والا ... کی تاریخ ۹۹۹ھ میں ہوئی تھی غالباً یہ شہر دو سو سال میں تیار ہوئی اور "یا حافظ" سے اس کی تاریخ نکلتی ہے۔ شہر کی تعمیر کا اہم مقصد ملک میں اعلیٰ اجتماعی زندگی پیدا کرنا تھا۔ بادشاہ نے شہر کی تعمیر کے ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھا تھا کہ اس میں ایک متمدن زندگی کی تمام ضروریات مہیا ہوں۔ شہر و عمارت کی خوش اسلوبی و عظمت کی وجہ سے گولکنڈہ کے مورخ کا یہ کہنا کہ "تمامی ہندوستان میں اس کا ثانی نہیں" حقیقت پر مبنی ہے۔

سلطان محمد قطب شاہ

(سنہ ۱۰۲۰ تا سنہ ۱۰۳۵)

عبدالحفیظ صدیقی

سلطان محمد قلی وصیت کر گیا تھا کہ اس کے بھتیجے سلطان محمد کو تخت پر بٹھایا جائے۔ اس لئے سلطان محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۱ سال تھی۔ سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ راجہ دستور کی مہم کا تصفیہ کرنا تھا۔ راجہ نے آخر اطاعت قبول کر لی اور شاہی فوجیں واپس لوٹ آئیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مغلوں کا اثر دکن پر روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اور مصلحت وقت یہی تھی کہ سلطان محمد بھی مغلوں سے صلح کر لیتا۔ جب شاہجہاں مغل شہزادہ کی حیثیت سے دکن میں مارا مارا پھر رہا تھا سلطان محمد نے اس کی امداد بھی کی۔ سلطان محمد جہانگیر اور ... دونوں شاہ تھا۔ آپس کے دربار میں دونوں کے سفیر حاضر رہتے اور بڑی بڑی تنخواہیں پاتے۔

سلطان محمد کا پہلا بیٹا عبداللہ محرم ۱۰۲۳ھ میں پیدا ہوا۔ بادشاہ نے ۱۲ سال تک اس کی صورت نہ دیکھی کیونکہ نجومیوں اور رمالوں کی یہی رائے تھی۔ بارہ سال گزرنے کے بعد بادشاہ نے اپنے بیٹے کی صورت دیکھی بھی تو نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے تیسرے روز سے بادشاہ کو بخار شروع ہوا۔ طبیبوں کے باہمی اختلاف نے مرض کو اور بڑھا دیا۔ اور ۱۰۳۵ھ میں ۳۴ سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا۔ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کی صحیح تاریخ ملنی بہت مشکل ہے۔ روایتوں اور قصے کہانیوں سے کچھ حال معلوم ہو سکا۔ اس کے جنگی کارنامے بھی معلوم نہ ہو سکے ہاں اتنا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے عادات و اطوار نہایت ستودہ اور زبان زد خاص و عام تھے۔ یہ صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔ کہتے ہیں کہ جس وقت بادشاہ کو مسجد کی بنیاد رکھنے ایسے آدمی کی تلاش ہوئی جس کی تہجد تک قضا نہ ہوئی ہو تو خود بادشاہ ہی ایسا شخص تھا۔ شعر کہنے کا بھی شوق تھا اور خوب کہتا تھا۔ حیدرآباد کی جامع مسجد (جو اب مکہ مسجد کہلاتی ہے) اسی کے عہد میں شروع ہوئی لیکن عمارت ختم ہونے سے پہلے ہی بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔

سلطان محمد قطب شاہ
۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵ھ

سلطان عبداللہ قطب شاہ
۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ

ایلچی روانہ کیا اور نہایت جرأت سے شہنشاہ کو لکھا کہ "ہم آپ سے سرتابی کرتے ہیں سنبھاجی کو بھی۔ اک نہ اک دن دیکھیں گے آپ کن کن سے مقابلہ کرتے ہیں"۔ اورنگ زیب کی نظر سے یہ تحریر گزری تو بید غضب ناک ہوا اور شاہزادہ شاہ عالم بہادر شاہ کو فوج کثیر کے ساتھ گولکنڈہ کی طرف روانہ کیا۔ ابوالحسن کی فوج نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن جلد قطب شاہی سپہ سالار مغلوں سے مل گئے اور فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ دوسرے دن پھر لڑائی ہوئی اس اثنا میں بادشاہ اپنے سپہ سالاروں سے نا امید ہو گیا اور خلیل اللہ خاں جو گولکنڈہ کا نہایت نامی سپہ سالار تھا ان سے ٹوٹ کر مغلوں سے جا ملا۔ اب ابوالحسن نے قلعہ گولکنڈہ میں پناہ لی۔ اور مغل سپاہیوں نے حیدرآباد میں وہ قیامت برپا کی کہ قتل عام ہی اس کے سامنے کچھ نہ تھا۔ ابوالحسن کی درخواست پر جدال و قتال روک دیا گیا اور صلح کے شرائط طے ہونے لگے صلح کی شرط ایک یہ بھی تھی کہ مادنا اور اکنا زندہ بھیج دیا جائے بادشاہ نے منظور نہ کیا۔ بہادر شاہ نے میر ہاشم کو صلح کے لئے بھیجا لیکن گولکنڈے میں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اصل میں میر ہاشم تانا شاہ کو گرفتار کرنے آیا ہے چنانچہ عبدالرزاق لاری اور شرزہ خاں نے میر ہاشم پر حملہ کر دیا اور اسے قتل کر دیا۔ اورنگ زیب کو شہزادہ کی سستی اور ناتجربہ کاری کی خبر ہوئی تو بہت برہم ہوا اور دوسری مہموں کو معطل کر کے گولکنڈہ کی طرف متوجہ ہوا ابوالحسن نے صلح کی بہت کچھ کوشش کی لیکن اورنگ زیب نے گولکنڈہ کو محصور کر لیا "تا آمد جنگ آمد" ابوالحسن نے بھی ہمت سے مقابلہ کیا لیکن عبداللہ خاں پنی کی غداری سے اورنگ زیب نے قلعہ فتح کر لیا عبدالرزاق لاری نے اس موقع پر جس شجاعت و نمک حلالی کا ثبوت دیا وہ تاریخ میں یادگار ہے۔

قلعہ میں مغل سردار گھسے تو سارے قلعہ میں ادھم مچ گئی ہر چہار طرف آہ و شیون کی آوازیں تھیں۔ اس وقت خاصہ تیار تھا سلطان ابوالحسن اپنے لواحقین کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا۔ طعام سے فارغ ہو کر شہزادہ کے پاس گھوڑے پر سوار ہو کر آیا اپنی موتیوں کی مالا اس کے گلے میں ڈال دی مورخوں کا کہنا ہے کہ ابوالحسن کی عمر کے ۱۴ سال طفلی میں۔ ۱۴ سال تحصیل علوم میں ۱۴ سال سید راجو حسینی کی خدمت میں ۱۴ سال حکمرانی میں اور چودہ سال قلعہ دولت آباد میں گزرے۔ ابوالحسن کی تین بیٹیاں تھیں۔ اور ایک لڑکا خدابندہ جس کو اورنگ زیب نے بندہ سلطان کا خطاب دیا تھا۔ اس بادشاہ کی زندگی نے جس قدر افسانوی حیثیت حاصل کر لی ہے وہ تاریخی مطالعہ سے بے بنیاد ثابت ہوتی ہے۔ بادشاہ کی نزاکت عیش پرستی اور سادہ لوحی کے جو قصے بیان کئے جاتے ہیں وہ اس کے تاریخی کیرکٹر کو بگاڑ نہیں سکتے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مستقل مزاج، مدبر اور متوکل بادشاہ تھا جس کی پیشانی عین گرفتاری کے وقت بھی شکن آلود نہ ہوئی۔

تانا شاہ کو ایک لڑکا اور تین لڑکیاں تھیں، اورنگ زیب نے دوسری لڑکی کی شادی سکندر عادل شاہ سے اور تیسری کی اسد خاں وزیر کے فرزند سے کر دی پہلی لڑکی نے یہ کہہ کر شادی سے انکار کر دیا کہ وہ اپنے بزرگ باپ کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کر دینی چاہتی ہے۔ تانا شاہ کے لڑکے خدابندہ کو باپ کی وفات کے بعد اپنے دربار میں طلب کیا اور بندہ سلطان خطاب دیا، لیکن جب یہ شہزادہ دربار میں آتا تو اہل دربار بن میں دکنی امرا بھی تھے اس کی تعظیم کرتے۔ جس کی وجہ سے اورنگ زیب کو شبہ ہوا اور پھر یہ لڑکا کبھی نظر نہ آیا۔

رشید قریشی

سلطان ابوالحسن قطب شاہ

دور

۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۸ھ

وداع شاہ

تاناشاہ کی روانگی کے وقت اس گولکنڈہ کی زبان سے

باحال تباہ جا رہا ہے — کانوں کی بے راہ جا رہا ہے
کس یاس سے آہ جا رہا ہے — اب قلعہ سے شاہ جا رہا ہے

کس طرح غبار راہ دیکھیں
ٹوٹے ہوئے دل کی چاہ دیکھیں

مٹ جائیں گے خود ہی اے عدو ہم — آئیں گے نہ تیرے روبرو ہم
کرلیں گے تباہ رنگ و بو ہم — بیچیں گے نہ اپنی آبرو ہم

کس آس پہ اب رہیں جہاں میں
اڑتے ہوئے رنگ گلستاں میں

ہم کو تو ملا تھا تاج شاہی — کن آنکھوں سے دیکھیں یہ تباہی
آتا ہے ہمیں بھی قفس ماہی — پائیں گے نہ اپنے بے گناہی

واللہ نہ بیچ کے جان دیں گے
مرکر ہی تجھے مکان دیں گے

پامال ہوں آفتاب ہوکر! — مرجائیں شراب ناب ہوکر!
چھپ جائیں نظر سے خواب ہوکر! — بے کیف رہیں شباب ہوکر!

جب شاہ نہیں تو ہم نہیں ہیں!
غیروں سے حدیث غم کہیں کیوں!

بے آبروئی سے ڈر رہی ہیں — ٹھکرا کے جہاں کو مر رہی ہیں
نعشوں سے کنویں کو بھر رہی ہیں — نام آنے کا کام کر رہی ہیں

امواج پہ رقص بے دگل ہے
اس جنس کا دل بھی مردانہ ہے

میکش

مشاہیر گولکنڈہ

اس نام سے ایک کتاب آج کل زیر ترتیب ہے جس میں گولکنڈہ کے جملہ مشہور اصحاب (بادشاہوں سے لے کر غلاموں تک) کے تاریخی حالات نہایت دلچسپ پیرایہ میں قلمبند کئے جا رہے ہیں۔ اسی کتاب سے چند اصحاب کے حالات یہاں درج ہیں ۔

(وزرائے گولکنڈہ) جملۃ الملک مرزا محمد امین

اصفہان کے رہنے والے حیدرآباد آکر دربار شاہی کی ملازمت اختیار کی۔ سلطان محمد قلی نے حضرت میر مومن استرآبادی کی سفارش پر ۱۰۱۱ھ میں خدمت میر جملگی سپرد کی، اور جواہرات کا ایک الیسا مرصع قلمدان وزارت عنایت کیا جس کی روشنی سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں دولاکھ ہُنوں سالانہ تنخواہ مقرر کی گئی جو عمال کے نو لاکھ روپیوں کے برابر ہوتے ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ قطب شاہی وزیر اعظم کی تنخواہ عہد حاضرہ کے وزیر اعظم کی تنخواہ سے تقریباً دس گنا زیادہ تھی۔ محمد امین نے میر جملہ ہوتے ہی باغیوں اور سرکشوں کو زیر کیا اور سواری راؤ برہمن کو کاروبار سلطنت سے بے اثر کر دیا ۱۰۱۸ھ میں جب آگرہ و دہلی کے مغل سوداگر حالت نشہ میں شاہی محل میں بغیر اجازت کے دیکھنے کے لئے داخل ہوئے اور بادشاہ نے علی آقا کوتوال کو حکم دیا کہ انھیں باہر نکال دیا جائے تو شہر کے اوباشوں کو موقع مل گیا، اور انھوں نے ان سوداگروں کے مال و اسباب کو لوٹنا شروع کیا اس ہنگامہ عظیم کو محمد امین نے بڑی ترکیب سے فرو کیا اس اثناء میں محمد امین کا اثر بہت بڑھ گیا تھا۔ اسی وجہ سے دکنی امراء نے بادشاہ سے ناخوش ہوکر اس کے بھائی خدابندہ کو بغاوت کے لئے اکسایا لیکن اس بغاوت میں وہ ناکام ہوئے ۔

۱۰۱۹ھ میں محمد امین نے بادشاہ کی ایک شاندار دعوت کی اور اپنے مکان کو رشک فردوس بنا کر پا انداز میں زربفت و اطلس اور مخمل و مشجر کے کپڑے بچھا دئے۔ جب بادشاہ تشریف لائے تو شاعروں نے قصیدے سنائے اور مطربوں نے نغمے۔ آخر میں محمد امین نے تیس عربی گھوڑے، بیس ہاتھی اور بلور کا ایک مدور آئینہ جس کے اطراف قسم قسم کے جواہر نصب کئے ہوئے تھے، ایک سونے کی زین جس پر جواہر کا کام کیا ہوا تھا، چودہ جلد خوش خط قرآن شریف، اور دیگر قیمتی اشیاء بطور نذر پیش کئے اور طعام کے بعد قصہ خوانوں اور ندیموں کو پچاس ہزار ہُون انعام میں دئے بادشاہ نے چلتے وقت اپنے کندھوں سے زردوزی چادر نکال کر محمد امین کو عنایت کی۔

۱۰۲۰ھ میں پرتاب راؤ کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے محمد امین کو روانہ کیا گیا مگر وہ ناکام رہے اسی سال محمد قلی نے وفات پائی۔ ان کی وفات سے قبل ہی محمد امین نے شہر سے ملحق ایک عالیشان تالاب بنایا جو تالاب میر جملہ کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ اسی تالاب کے کنارے مشرق رویہ محمد امین کی ڈیوڑھی بھی تھی جو اپنی آرائش اور خوبی تعمیر کی وجہ سے مشہور تھی اور جس میں آخر زمانے تک بڑے بڑے سفراء اور معزز مہمان ٹھہرائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ محمد امین نے موسیٰ ندی کے کنارے ایک امین باغ بھی بنایا تھا جو اس عہد کا ایک نہایت پرفضا مقام تھا اس امین باغ میں آج کل سرکاری زچگی خانہ ہے ۔

جب سلطان محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا تو مرزا محمد امین نے حج کو جانے کے لئے رخصت حاصل کی اور اپنی پوری دولت کے ساتھ گولکنڈے سے نکل کر بیجاپور کا رخ کیا۔ وہاں ان کی خاطر خواہ آؤ بھگت نہیں ہوئی تو وہ ایران چلے گئے اور گولکنڈہ سے لائے ہوئے ایک لاکھ روپے کے جواہر شاہ عباس کی خدمت میں پیش کئے۔ لیکن شاہ عباس میں بھی انھیں محمد قلی جیسی خوبیاں نظر نہ آئیں تو دوبارہ ہندوستان آکر ۱۰۲۴ھ میں جہانگیر کے دربار میں ملازمت اختیار کی اور پچاس ہزار روپے کے جواہر نذر کئے۔ وہاں بھی انھیں وہ عروج حاصل نہ ہو سکا جو گولکنڈہ میں نصیب ہوا تھا البتہ میر بخشی کے خطاب سے سرفراز ہوئے آخرکار ۱۰۴۶ھ میں شاہجہاں کے عہد میں لقوہ اور فالج سے انتقال کیا۔

غواصی ملک الشعرائے گولکنڈہ

مرزا محمد امین میر جملہ

حیدرآباد میں وفات پائی۔

خواجہ افضل سلطان محمد کے زمانہ میں نو سال خدمت سرخیلی پر اور سلطان عبداللہ کے زمانہ میں چھ سال سپہ سالاری، صوبہ داری اور وزارت کے عہدہ پر مامور رہے۔ اور تجمل و ثروت میں اپنے امثال و اقران میں ممتاز تھے اسی لئے حدیقہ میں ان کو اعظم الامرا لکھا ہے۔ ان کے ملازمین جن میں ایک ہزار ترکی و عرب و عجمی سوار تھے یوچی بیگ کے سپرد کئے گئے۔ اور ان کی جاگیر مرتضی نگر میر فصیح الدین محمد تفرشی کو سرفراز کی گئی۔

مرزا روزبھان اصفہانی

سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے عمائدین سلطنت سے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی وفات سے ۲ ماہ قبل ربیع الاول ۱۰۳۵ھ میں ان کو خواجہ افضل ترک کی معزولی کے بعد سرخیلی کے منصب ارجمند پر سرفراز کیا تھا لیکن سلطان عبداللہ کی تخت نشینی کے بعد جب خانم آغا اور منصور خاں حبشی کا دربار پر اثر جم گیا تو مرزا روزبھان کو معزول کرکے مجلسیان حضور کے زمرہ میں شریک کردیا گیا۔ لیکن جب منصور خاں میر جملہ کا انتقال ہوگیا اور علامہ ابن خاتون پیشوائے سلطنت اور مختار دربار ہوگئے تو انھوں نے پھر مرزا روزبھان کے لئے کوشش شروع کی اور بادشاہ کے سامنے ان کی بڑی تعریف کی چنانچہ ۳ ربیع الاول ۱۰۴۱ھ کو مرزا روزبھان دوبارہ منصب سرخیلی پر مامور کئے گئے اور انھوں نے پوری قوت کے ساتھ فوج اور رعایا کے معاملات سرانجام کرنے شروع کئے۔ لیکن بادشاہ کو ان پر اعتبار نہ آیا اور وہ ہمیشہ ان کو شبہ کی نظر سے دیکھتے رہے۔ آخر کار بددیانتی کے الزام میں منصب سرخیلی سے ۱۸ صفر ۱۰۴۲ھ میں ہٹائے گئے اور فصیح الدین محمد کو سرخیل بنایا گیا۔

عین الملک منصور خاں حبشی

سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے اکابر سلطنت سے ہیں حوالہ داری لشکر رکاب خانہ کے علاوہ وزارت عین الملکی پر مامور تھے۔ اور بادشاہ اور ان کی والدہ کے مزاج میں درخور رسوخ حاصل تھا۔ چنانچہ جب بادشاہ مرض موت میں مبتلا ہوئے تو ان کے علاج کے بارے میں اطبائے ہند اور اطبائے عراق کے مابین اختلاف پیدا ہوگیا۔ بادشاہ کی والدہ کا خیال تھا کہ اطبائے ہند علاج کریں کیونکہ جو مزاج ہندوستان کی آب و ہوا میں پرورش پاتے ہیں ان کے لئے مناسب ہے کہ ہندوستانی طبیبوں کا علاج کرایا جائے۔

اگرچہ والدۂ بادشاہ کی اس رائے سے اکثر امرائے دربار کو اختلاف تھا لیکن منصور خاں کی تائید کی وجہ سے ہندوستانی اطباء نے علاج کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت منصور خاں کتنے صاحب اقتدار تھے۔

سلطان محمد کے انتقال کے بعد سلطان عبداللہ کو تخت نشین کرانے میں اور پائے تخت میں انتظام اور امن و امان قائم رکھنے میں منصور خاں نے بڑا حصہ لیا۔ اس وقت بادشاہ کی کم عمری کی وجہ سے سلطان محمد کی والدہ ہی کاروبار سلطنت میں دخیل تھیں اور انھوں نے زور دے کر منصور خاں کو میر جملہ بنایا۔ نظام الدین احمد مولف حدیقۃ السلاطین چونکہ علامہ ابن خاتون کے طرف داروں میں سے تھے اس لئے انھوں نے اپنی تاریخ میں منصور خاں کی خدمات کے اعتراف میں بخل سے کام لیا ہے اور جگہ جگہ ذم کا پہلو نمایاں کردیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ منصور خاں اور ملک یوسف وغیرہ اس وقت کے ان ملکی امرا اور جاں نثاران سلطنت سے تھے جن کو علامہ ابن خاتون اور دیگر اجنبی امرا اپنے راستے میں حائل سمجھتے تھے اور چونکہ سلطان عبداللہ کی طبیعت بہت کم زور واقع ہوئی تھی اس لئے انھوں نے با اقتدار امرائے عراق کے زیر اثر اپنے قدیم امرا اور خدمت گذاروں کو بہت جلد بے اثر کردیا۔

منصور خاں کی میرجملگی کا پہلا اثر یہ پڑا کہ مرزا روزبہان اصفہانی جن کو صرف دو ماہ قبل سلطان محمد نے خواجہ افضل ترک کو معزول کر کے سرخیل بنایا تھا اپنے عہدے سے معزول ہوگئے منصور خاں نے برہمنوں کو بھی برسرکار کیا کیونکہ نظام الدین احمد مورخ کا بیان ہے کہ خود میرجملہ کو لکھنا نہیں آتا تھا۔ تاہم اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ منصور خاں سپاہیوں پر خوب نظر رکھتے تھے اور انھوں نے اس طبقہ کی حالت کو درست کر دیا۔ اگرچہ غیر ملکیوں کے ساتھ ان کا سلوک اچھا نہ تھا۔

منصور خاں نے وزارت پناہ خواجہ افضل ترک کو پھر سے ایک لاکھ ہون تنخواہ کی جائداد پر سرفراز کر کے امرائے عظام کے طبقہ میں شامل کر دیا منصور خاں نے اس شان و شوکت سے میرجملگی کی خدمت انجام دی کہ دارالسلطنت میں ان کے غلاموں کا بھی رعب بیٹھا ہوا تھا اور بڑے بڑے عہدہ دار بھی ان سے ڈرتے تھے چنانچہ حدیقہ میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ۹ محرم ۱۰۳۰ھ کو دیوان کے ایک حبشی غلام نے میدان دادمحل میں شب چراغاں کا اہتمام کرتے وقت قاسم بیگ کوتوال کے ساتھ بے ادبی کی لیکن چونکہ میرجملہ کا آدمی تھا قاسم بیگ کچھ نہ کر سکے اور رنجیدہ ہو کر گھر بیٹھ رہے اور منصب کوتوالی سے استعفا دے دیا۔

نظام الدین احمد کا بیان ہے کہ حجلۃ الملک منصور خاں قاسم بیگ کوتوال اور شاہ محمد تیو دونوں کو ہٹا کر ملا محمد تقی کو خدمت کوتوالی اور میر سید سوامی کو پیشوائی دلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اول الذکر کو مچھلی پٹن سے اور موخر الذکر کو دہلی سے بلا بھیجا تھا۔ اور محمد تقی تو حسب الطلب حیدرآباد پہنچ بھی گئے اور منصور خاں نے کئی بار کوشش کی کہ بارگاہ شاہی میں پیش کر کے منصب کوتوالی دلاویں لیکن بادشاہ پر علامہ ابن خاتون کا اثر پڑنا شروع ہو چکا تھا وہ اس میں حائل ہونے گئے اور آخر کار قاسم بیگ کی جگہ پر ملا محمد تقی کو مقرر کرنے کے بجائے قاسم بیگ نائب کوتوال کو خدمت کوتوالی پر ترقی دے دی اب جو محمد تقی کو مایوسی ہوئی تو میر جملہ نے اپنی جگہ میں مقرر کر کے میر جملگی کا کام جو کوتوال کے کام سے ارفع ہے ان کے سپرد کر دیا اس طرح ۱۰۳۰ھ میں ملا امور دیوانی میں ملا تقی نائب میر جملہ ہوگئے اور ایک سال تک اس خدمت کو انجام دیا۔

آغاز محرم ۱۰۳۱ھ میں منصور خاں نے دو سال سات مہینے اور چند روز میرجملگی کی خدمت انجام دے کر یکا یک انتقال کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ منصور خاں کی وفات کے بعد چھ سال دس مہینے تک منصب میرجملگی پر کوئی بھی فائز نہ ہو سکا آخر کار ۹ شوال ۱۰۳۷ھ میں علامہ ابن خاتون نے منصور خاں کی جگہ لی۔ اس اثنا میں منصور خاں کی خدمات کو تین چار امیوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جیسے ملا محمد تقی سرخیل، آدم خاں عین الملک اور پسر منصور خاں حوالہ دار فوج رکاب خانہ وغیرہ۔

شریف الملک ملا محمد تقی

سلطان محمد قطب شاہ کے دور میں بندر مچھلی پٹن کے حوالہ دار تھے سلطان عبداللہ کے دور میں جب منصور خاں حبشی میر جملہ نے اقتدار تمام حاصل کیا تو ان کا خیال تھا کہ قاسم بیگ کوتوال کی جگہ ملا محمد تقی اس خدمت پر سرفراز ہوں چنانچہ ۱۰۳۲ھ میں ملا محمد کو لکھا کہ پایہ تخت چلے آئیں۔ ملا بہت خوش ہوئے اور ایک ہاتھی پانچ ہزار ہون نقد اور دیگر تحف و ہدایا کے ساتھ محرم ۱۰۳۳ھ میں حیدرآباد آئے۔ منصور خاں ان کی آمد سے بہت خوش ہوئے اور چاہتے تھے کہ بادشاہ ان کو منصب کوتوالی پر سرفراز کریں چنانچہ تین مہینوں تک برابر دولت خانۂ عالی میں ساتھ لے جاتے رہے اور ایک دفعہ تو زر نقد ہاتھی اور دیگر تحفے بادشاہ کی خدمت میں پیش بھی کر دئے مگر بادشاہ نے ملا تقی کو باریاب نہ کیا بادشاہ یہ چاہتے تھے کہ ملا تقی بجائے کوتوالی کے منصور خاں کے قائم مقام بن کر منصب سرخیلی انجام دیں اور اسی لئے وہ ٹال رہے تھے تاکہ کوتوالی کا مستقل انتظام ہو لے تو ملا محمد تقی کو

باریاب کرکے سرخیل بنادوں آخرکار ۷ ربیع الاول ۱۰۳۶ھ کو بادشاہ نے حسن بیگ نائب کیتوال کو حیدرآباد کی کوتوالی کل پر سرفراز کردیا۔
اب منصور خاں بڑے پریشان ہوئے لیکن انھوں نے ملا محمد تقی کو اپنے ہی ساتھ رکھ کر میر جملگی کے جملہ مہات کو ان کے سپرد کردیا اس طرح ملا محمد تقی کو توالی سے زیادہ اہم اور بڑے عہدہ کا کام انجام دینے لگے۔ انھوں نے ایک سال تک منصور خاں کے نائب کی طرح دیوانی کی خدمات اور میر جملگی کے جملہ امور انجام دے۔ بادشاہ بھی یہی چاہتے تھے۔

محرم ۱۰۳۸ھ میں منصور خاں نے یکایک انتقال کیا تو ان کی جگہ کے لئے بہت سے امراء نے کوشش کی اور نذرانے پیش کرنے شروع کئے لیکن ملا محمد تقی پہلے ہی سے امور دیوانی انجام دئے رہے تھے، منصور خاں نے بھی کئی بار ان کے کام کی تعریف کی تھی اور بادشاہ پر ان کی کاردانی کا سکہ بیٹھا چکا تھا اس کے علاوہ اس دفعہ ملا نے دوسروں کے نذرانوں سے زیادہ پیش کش دیا اس لئے بادشاہ نے انہی کو پسند کیا اور ۲۳ صفر ۱۰۳۸ھ کو منصب جلیل القدر سرخیلی پر سرفراز کیا۔ اس موقع پر دوسرے شاعروں کی طرح ملا نظام الدین احمد مولف حدیقۃ نے بھی ایک قطعہ تاریخ ملا کی خدمت میں پیش کیا تھا جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

خسرو یوسف رخ جمشید جاہ	شاہ عبداللہ شاہ کامیاب
مولوی را بہر سرخیلی نمود	از میان جملہ اعیان انتخاب
تربیت بنمود اورا ہمچو مہر	تاکہ شد یاقوت ساں باآب وتاب
عقل بہر منصبش تاریخ گفت	دائما سرخیل بادا کامیاب

سرخیل ہونے کے بعد ملا تقی نے بادشاہ کے مزاج سے کافی واقفیت پیدا کرلی اور جملہ مہات دیوانی اور کل معاملات سلطانی پر ایسا قبضہ کرلیا کہ دوسروں کو دخل دینے کا موقع نہ دیا، خاص کر برہمنوں کے لئے رعایا پر ظلم وستم کرنے کا موقع نہ رہا۔ اور محاصل کی رقمیں اچھی طرح داخل خزانہ ہونے لگیں۔ چنانچہ صرف نارائن راؤ مجموعہ دار سے ایک سو تیس ہزار ہون وصول کرکے داخل خزانہ کئے گئے اور جو چودہری اور صاحبان جائداد منافق مغرور اور ظالم ہوگئے تھے ان کو قتل کرکے ان کی جائداد اور ذخیروں پر شاہی قبضہ کرادیا۔

ان خدمات کے صلہ میں بادشاہ نے ملا کو شریف الملک کا خطاب عطا کیا اور وہ قلمدان مرصع جو مرزا محمد امین میر جملہ کے بعد سے کسی کو مرحمت نہیں کیا گیا تھا ملا شریف الملک کو عنایت کیا گیا۔ اس اثنا میں مغلوں کے حملہ دکن کی خبریں مشہور ہونے لگی تھیں اس لئے سلطان نے شریف الملک کو پچاس ہزار ہون کی جاگیر دی تاکہ ایک لشکر تیار رکھے اور فیل خانۂ خاص سے چند مست ہاتھی بھی عنایت کئے۔ اس طرح سرخیلی اور سرداری ایک ہی جگہ جمع ہوگئی۔ ملا نے بہت جلد دکنیوں، عربوں اور پٹھانوں کی ایک فوج تیار کرلی اور میدان دلکشائے داد محل میں لاکر بادشاہ کو دکھادی۔ بادشاہ بہت خوش ہوئے اور ملا کے مدارج میں اور بھی اضافہ کردیا۔ اس طرح شریف الملک کی عزت و وقعت اور اثر و رسوخ اور بھی بڑھ گیا۔

جب شریف الملک کی ذات میں دو عہدے یعنے سرداری اور سرخیلی جمع ہوگئے تو مہات دیوانی اور ضبط ربط امور مملکت کے ساتھ ساتھ شہسواری اور سپہ گری کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی۔ چنانچہ وہ روزانہ شام کا وقت ندی محل کے برابر رود موسیٰ کے کنارے وسیع میدان میں کمان داری اور چوگان بازی میں گذارتے تھے۔ ایک وقت گھوڑے پر سے گرے اور چوٹ کھائی لیکن تکلیف میں کچھ کمی ہوئی تھی کہ آخر شعبان ۱۰۳۸ھ میں

ملا نظام الدین احمد
مورخ گولکنڈہ

علامہ شیخ محمد ابن خاتون
پیشوائے گولکنڈہ

گولکنڈے کے سپہ سالار

موسی خاں

خیرات خاں

علی باغ میں جشن رمضان میں شرکت کی اور غذا میں بے احتیاطی کی وجہ سے ہیضہ و اسہال کا مرض لاحق ہوگیا اور اس حالت بیماری میں رمضان بھر صبح و شام بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اس حاضری میں اور مسلسل تکلیف رہنے کی وجہ سے طبیعت اور بگڑتی گئی آخر کار رمضان کی عید کے دن جب بادشاہ نے دربار کیا اور ملا شریف الملک عصر تک برابر کھڑے ہو کر لشکر اور رعایا کے معروضے پیش کرتے رہے تو طبیعت بالکل بگڑ گئی اور اس روز کے بعد دربار کو آنا نصیب نہ ہوا۔ حکیم اسمٰعیل گیلانی اور دیگر ہندوستانی طبیبوں نے علاج کیا بادشاہ نے اپنے غلام حسن علی خاں کو پرسش احوال کے لئے بھیجا اور آخر میں اپنے خاص طبیبوں کو بھی علاج کرنے کے لئے حکم دیا لیکن پیمانہ حیات پر ہو چکا تھا ملا محمد تقی شریف الملک نے ۱۹ شوال ۱۰۴۱ھ میں انتقال کیا۔

انھوں نے دو سال آٹھ ماہ بڑے کر و فکر اور اثر و اقتدار کے ساتھ حکومت کی اور بادشاہ کی خیر خواہی اور آداب بجا لانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ان کے انتقال کا بادشاہ کو بھی صدمہ ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ملا شریف الملک کو اولاد نہ تھی کیونکہ بادشاہ نے ان کی موجودہ اقربا اور ہم شہریوں کے حال پر خاص نوازشیں کیں اور ان کو پورے سامان کے ساتھ عراق جانے کی اجازت دی۔

ابن خاتون

شیخ محمد نام، ابن خاتون طوسی عاملی کے بیٹے اور شیخ بہائی کے بھانجے تھے سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے علما میں سے ہیں ان کے علم و فضل کی وجہ سے بادشاہ نے ان کو منشی الملک اور دبیر سلطنت مقرر کیا اور سلطانی کے مقربان خاص میں شامل کر لیا تھا جب سلطان محمد علی کی وفات کے بعد شاہ عباس صفوی کا سفیر حسین بیگ قبچاقی حیدرآباد آیا تو اس کی واپسی کے وقت بادشاہ نے ۱۰۲۴ھ میں علامہ شیخ محمد ابن خاتون کو پیش قیمت تحفے دے کر اس کے ساتھ ایران کو روانہ کیا جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور وہ تقریباً دس سال مقیم رہے اور جب واپس آنے لگے تو شاہ ایران نے ان کے ساتھ قاسم بیگ سپہ سالار مازندران کو روانہ کیا اور ۱۰۳۵ھ میں اس وقت حیدرآباد واپس ہوئے جب کہ سلطان محمد قطب شاہ کا انتقال ہو چکا تھا سلطان عبداللہ نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور اپنے بھوپا شاہ محمد ولد شاہ علی صاحب شاہ پیرزادہ پیشوائے سلطنت کا نائب مقرر کیا۔ اور پیشوا کی طرح ان کو بھی اپنی مجلس میں بیٹھنے کی اجازت دی چونکہ یہ خدمت منزلت تھی اس لئے بادشاہ نے محمد رضا استرآبادی سے منصب دبیری لے کر دوبارہ ابن خاتون کو دبیر سلطنت بھی بنا دیا

ان دو خدمات جلیلہ کی وجہ سے ابن خاتون کی عزت و احترام میں بہت اضافہ ہو گیا۔ انھوں نے دربار کے بڑا امور میں دخل پا کر اپنے توسط سے بہت سے لوگوں کو نوجوان بادشاہ کے مراحم خسروانہ سے فائدہ پہونچایا اس بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر شاہ محمد پیشوا ان سے کھٹکنے لگے اور دربار میں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں ہونی شروع ہوئیں آخر کار رجب ۱۰۳۶ھ میں شاہ جہاں کا ایلچی شیخ محی الدین حیدرآباد آیا تو بعض باتیں ایسی ہوئیں کہ بادشاہ شاہ محمد پیشوا سے بالکل ناراض ہو گئے اور ان کو معزول کر کے ۹ رمضان ۱۰۳۶ھ میں ابن خاتون کو پیشوائی کل سے سرفراز کیا اس خوشی میں ابن خاتون کے طرف دار علماء و فضلاء اور شعراء نے مبارک باد کے قصائد و قطعے لکھے جن میں سے ایک قطعہ حدیقۃ السلاطین کے مصنف نے لکھا تھا جو درج ذیل ہے ؎

شہ یوسف رخ و جمشید حشمت — کہ حاتم می کند از وے گدائی

ز فرط مرحمت کردہ تمکّن — محمدؐ را بعصدر پیشوائی

بساماں شد مہام ملک وملت — کہ بود ابتر ز آفاتِ سمائی

متاع فضل و دانش بود کاسد — کنوں بگرفت در عہدش روائی

جہاں معمور گردیدہ بہ انساں — کہ شد محو از خلائق بے نوائی

بالہام آمد ایں مصراع تاریخ — محمد یافت از حق پیشوائی

پیشوا ہونے کے بعد ہی علامہ ابن خاتون نے شیخ محی الدین ایلچی شاہ جہاں کو واپس کردیا اور کچھ ایسی ترکیب کی کہ وہ شاہ جہاں کے پاس معتوب قرار پایا۔

ابن خاتون اگرچہ بہت صاحب ثروت تھے اور نواب علامہ کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے لیکن ساتھ ہی مطالعہ کتب اور تصنیف وتالیف بھی جاری تھی بے حد علم دوست تھے اور روز اُن کے مدرسہ میں بڑے بڑے علما و فضلا جمع ہوتے اور علوم معقول ومنقول پر مباحثے اور مذاکرے کیا کرتے۔ منگل کو جو قطب شاہی سلطنت میں چھٹی کا دن ہوتا ان کے یہاں شعرا جمع ہوا کرتے اور شعرائے متقدمین کے کلام کے مذاکرہ کے علاوہ طرحی غزلوں کا مشاعرہ بھی کرتے تھے۔

ابن خاتون خود بھی بہت بڑے مصنف تھے شرح ارشاد، ترجمہ کتاب اربعین، حاشیہ جامع عباسی ان کی تصانیف ہیں جامع عباسی کی تکمیل بھی انہی نے کی تھی۔ یہ اپنے عہدہ کے لحاظ سے جملہ مذہبی امور کے بھی ذمہ دار تھے۔ چنانچہ جب ۱۰۴۰ھ میں حیدرآباد میں بڑا زبردست قحط ہوا تو شہر کے تمام علماء وفضلا واتقیاء روزہ رکھ جمعہ کی صبح میں پا برہنہ علامہ ابن خاتون کے یہاں پہونچے اور ان کے ساتھ نماز استسقاء کے لئے شہر سے باہر نکل کر موسیٰ ندی کے کنارے جمع ہوے اور بعد نماز دعا پڑھی۔ آخر میں ابن خاتون نے صدر مجلس میں بیٹھ کر اشرفیوں کی سفید اور لال تھیلیاں بادشاہ کی طرف سے تمام مستحقوں میں تقسیم کیں اور ہاتھیوں اور اونٹوں پر جو پیسے بادشاہ نے خیرات کے لئے روانہ کئے تھے وہ بھی تقسیم کردئے بعد میں بادشاہ کی افزونی عمر کی دعا کر کے شہر کو مراجعت کی۔

اس عزت واحترام کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ ابن خاتون کے مخالفین برابر کام کر رہے تھے چنانچہ جب بیجاپوری لوگ حیدرآباد آئے تھے تو ابن خاتون کا اثر کم ہوگیا اور ۱۳ جمادی الآخر ۱۰۴۳ھ کو یہ اپنی خدمت سے معزول کردئے گئے اور میر محمد رضا استرآبادی پیشوا مقرر ہوئے اس زمانے میں ابن خاتون خانہ نشین ہوگئے لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد جب شہزادی کی پالکی بیجاپور روانہ ہوئی تو عبداللہ قطب شاہ پھر علامہ کی طرف متوجہ ہوئے اور جو کدورت پیدا ہوئی تھی دور ہوگئی چنانچہ اپنے ایک مقرب خاص کو طلائی پاندان دے کر علامہ کے یہاں روانہ کیا اور چند روز کے بعد خود ان کو طلب کر کے نوازش خاص کا اظہار کیا اور صدر الشریعت صدر جہاں کی جگہ ان کے بیٹھنے کے لئے معین کی اور سلطنت کے جملہ امور کے متعلق پہلے سے زیادہ مشورہ لینا شروع کیا۔ آخر کار ابن خاتون کو ۹ شوال ۱۰۴۳ھ کو جملۃ الملکی کا خلعت حاصل ہوا۔

(باقی آئندہ) — سید محی الدین قادری زور

محمد سعید میر جملہ، گولکنڈہ

ابن نشاطی — شاعر گولکنڈہ

گولکنڈے کے صوفیائے کرام

سید شاہ راجو

شاہ میر محمود

ملک الشعراء غواصی

غواصی کی تاریخ ولادت و وفات ابھی تحقیق طلب ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا اور محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں شاعری شروع کی۔ اس کی ابتدائی زندگی غربت میں بسر ہوئی سرکاری ملازمت اس کی گذر اوقات کا ذریعہ تھی عبد اللہ قطب شاہ کی تخت نشینی سے اس کے دن پھرے۔ شاہی دربار میں رسوخ حاصل ہوا اور رفتہ رفتہ ملک الشعرا کے درجہ تک پہنچا۔ امور سلطنت میں بھی غواصی کو دخل تھا چنانچہ سنہ ۱۰۴۵ھ میں شاہی سفیر کی حیثیت سے بیجاپور بھیجا گیا۔ اس کی آخری زندگی پھر ایک مرتبہ تاریکی میں نظر آتی ہے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ سلطان عبد اللہ کے زمانے میں اس کا انتقال ہوا۔

غواصی ایک قادر الکلام شاعر تھا اس کی درباری حیثیت نے اس کی شاعری کو شہرت دی۔ یہاں تک کہ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں اس عہد کے شعراء میں سے صرف غواصی کا ذکر کیا ہے۔ سلطنت گولکنڈہ کا آخری ملک الشعراء غواصی ہے۔

اس وقت تک علاوہ چیدہ چیدہ غزلوں اور مرثیوں کے غواصی کی صرف دو مستقل تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔ مثنوی "سیف الملوک و بدیع الجمال" اور "طوطی نامہ"۔ دونوں اتفاق سے فارسی کے ترجمے ہیں۔ غواصی اپنے آپ کو فن شعر میں اس قدر کامل خیال کرتا ہے کہ دوسرے کسی شاعر کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس تعلی اور ہمہ دانی کا ثبوت کوئی ایسی پیداوار سے نہیں ملتا۔ البتہ ان ترجموں میں اس نے اپنی پوری قوت صرف کی ہے اور طبعزاد رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بڑی حد تک اپنی کوشش میں کامیاب اترا اس کی پرگوئی کا ثبوت یہ ہے کہ مثنوی سیف الملوک جو دو ہزار سے زاید اشعار کی نظم ہے صرف ایک مہینے کی قلیل مدت میں ختم ہوتی ہے۔ ان مثنویوں کے وہ حصے جو غواصی کی اپنی پیداوار ہیں آمد کی شان لئے ہوئے ہیں جن میں غضب کی روانی پائی جاتی ہے۔

غواصی کی زبان میں ہندی عنصر غالب ہے۔ مبالغہ بہت کم اور کلام سادہ اور تصنع سے پاک ہے۔ اسلوب بہ لحاظ عنوان بدلتا ہے چنانچہ مکالمہ کے مقام پر سادگی اور سلاست اور مدح و منقبت میں بلند خیالی اور شان دار الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔

یہاں مثالاً غواصی کی دونوں مثنویوں سے چیدہ چیدہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

قلم کاف و نوں سے جو نکلیا بہار ۔ سو پہلے بچن کوں کیا آشکار
بچن عرش کرسی پو تے دہانے ہیں ۔ بچن آدمی کے بدل آئے ہیں
بچن تے سوالاں جواباں ہو دیں ۔ بچن تے حساباں کتاباں ہو دیں
بچن تے ہوی فام نیکی بدی ۔ بچن تے ہوئے منتہی مبتدی
بچن تے چلے دین و دنیا تمام ۔ بچن کے ہیں محتاج سب خاص و عام
بچن غیب کے ہیں عجب جوہراں ۔ بچن کے سو ہیں جوہری شاعراں

میر سعادت علی رضوی

تاناشاہ کے ہندو دیوان

مادنا پنتلو اور اکنا پنتلو کے بارے میں مستند فارسی کتب میں کوئی مواد نہیں البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابوالحسن تاناشاہ کے وزرا تھے۔ کوئی فارسی تاریخ ایسی نہیں ہے جو ان کو بدکردار اور جہنمی نہ کہتی ہو۔ تعجب کا مقام ہے کہ ان تحریری کسی کتاب میں بھی ان کی بدکرداری کا کہیں ذکر نہیں جس سے ان مورخوں کی رائے کی تائید ہو سکے۔ یورپی کمپنیوں کے مکاتیب سے ان کی زندگی پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ان کی رائے اس وجہ سے قطعی تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ یہ فریق متعلقہ بھی ہیں اور خود غرض بھی۔ مقامی روایات، قصے، کہانیاں ہی بارے وہ ماخذ ہیں جن سے ہم کچھ مستفید ہو سکتے ہیں۔ ان واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان وزرا کی زندگی کا مختصر تذکرہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے اور حتی المقدور اس امر کی کوشش کی جائے گی کہ ان کی زندگی کا کوئی ایسا پہلو پیش نہ کیا جائے جو موجودہ مواد کی بنا پر مابہ النزاع بن سکے۔

دیوان مادنّا

اکنّا اور مادنّا بنگلی بھانوجی پنتلو کے فرزندان نیک بخت تھے۔ بھانوجی پنتلو ہنمکنڈہ کا عامل باعہدہ دار تھا۔ اس نے اپنے چاروں بیٹوں کی عمدہ تعلیم و تربیت کا انتظام کیا تھا۔ اکنا اور مادنا ختم تعلیم کے بعد عبداللہ قطب شاہ کے درمیانی عہد سلطنت میں حیدرآباد آئے۔ مرزا سید احمد نے ان کو اپنے جمعیت خاص میں ملازم رکھا تھا اور ماحول کی ناموافقت کے باوجود وہ اپنی ان تھک محنتوں کی وجہ سے درجہ بدرجہ ترقی کرتے گئے اور ۱۶۶۶ء کے بعد مادنا سید مظفر سپہ سالار عبداللہ قطب شاہ کا پیشکار مقرر ہوا۔ اس طرح جب اس کو قلمدان وزارت سپرد کیا گیا تو یہ اس کے وسیع تجربوں کی بنا پر تھا نہ کہ کسی اور ذریعہ کے تحت۔

(۱) ۱۶۷۲ء کے انقلاب میں مادنا نے سید مظفر سے کسی طرح کم حصہ نہ لیا تھا۔ سید مظفر اور موسیٰ خان علی الترتیب میر جملہ اور سرخیل مقرر ہوئے اور مادنا میر جملہ کا پیشکار مقرر رہا۔ سید مظفر کی حرص اقتدار نے اسے ایک ایسی حکمت عملی اختیار کرنے کی ترغیب دی جس کے نتیجہ سے بادشاہ حکومت کا برائے نام صدر رہ جاتا ہے۔ سید مظفر اہم معاملات میں بھی بادشاہ کا مشورہ نہیں لیتا تھا جس سے علانیہ مخالفت کی بو آتی تھی۔ ابوالحسن جیسے عاقل اور مدبر حکمران سے یہ حرکت کب برداشت ہو سکتی تھی لیکن وہ کھلم کھلا اس کو بے دخل کر دینے پر بھی آمادہ نہ تھا۔ اس لئے اس نے اکنا اور مادنا دونوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور ان کے ذریعہ سید مظفر کے متعلقین اور فوج کے عہدہ داروں کو ہمنوا بنا کر ۱۶۷۴ء میں بھرے دربار میں سید مظفر کی نازیبا حرکتوں کا راز فاش کر دیا اور اس سے قلمدان وزارت لے کر مادنا کے سپرد کر دیا۔ اس طرح مادنا اپنی قابلیت وفاداری اور تجربے کی بنا پر عہدۂ وزارت عظمیٰ پر فائز ہوا۔ اور دربار شاہی سے سوریا پرکاس راؤ کا خطاب اور خلعت پایا۔ اکنا اپنے بھائی کا پیشکار بنا۔ اب ہم کو ان کی حکومت کے تین پہلوؤں سے واقف ہونا ہے۔ (۱) اندرونی مصلحت (۲) خارجی حکمت عملی (۳) فوجی تنظیم۔

اول الذکر کے بارے میں ان کے اصول حکومت کے متعلق کوئی تفصیلی معلومات اب تک فراہم نہ ہو سکیں تاہم موجودہ قلیل معلومات کی بدولت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے پیشروؤں کی حکومت سے زیادہ ان کے طریقہ کار سے ملک میں باضابطگی و امن قائم ہو سکا۔ تجارت، کان کنی، جہاز رانی اور زراعت میں بہت ترقی ہوئی البتہ گولکنڈہ کے کرناٹکی مقبوضات میں جو بعد میں حاصل کئے گئے تھے نظم و نسق قائم کرنے کا موقع نہیں ملا۔ قبل اس کے ہم کوئی قطعی رائے پیش کریں ہمارا اخلاقی فرض یہ ہوگا کہ ہم ملک کے ان حالات پر غور کریں جن کی وجہ سے ملک کو ناگفتہ بہ مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اورنگ زیب کی حکمت عملی کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ گولکنڈہ کو اس قدر

سکدام خان — وزیر گولکنڈہ

سید مظفر — وزیر گولکنڈہ

مادنا دیوان گولکنڈہ

اکنا پنڈت گولکنڈہ

نہ بنایا جائے کہ حکومت کا نظام درہم برہم ہو جائے اور فوج منحرف ہو جائے۔ اس غرض سے مغلوں نے آئے دن مطالبات میں اضافہ کرنا شروع کیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بادشاہ اپنے خانگی اور حرم کے جواہرات فروخت کر کے مطالبات پورے کرتے تھے۔ ملک و مالک کی تباہی سے مادنا کی حکومت کے بنیادی اصول کا ایک پہلو مثلاً تخفیف میں ظاہر ہوا تو دوسرا عدیم المثال ضبط و نظم میں۔ گولکنڈہ کی تاریخ میں یہ دونوں بہت اہم اور نئی باتیں ہیں۔ تمام امراء عہدہ داروں کی تنخواہوں میں تخفیف کی گئی۔ ملکی اور مالی تمام عہدہ دار اس قانون کی پابندی کرنے پر مجبور کئے گئے۔ اور یہی وجہ ہوئی کہ تمام لوگ وزیر کے مخالف ہو گئے۔ مادنا کی غیر ہر دلعزیزی کا یہ ایک اہم اور بنیادی سبب ہے۔ اس واقعہ میں مادنا سے زیادہ قطب شاہ قابل الزام ٹھیرتے ہیں جو اپنی تنخواہ کا ایک قلیل حصہ حکومت کو دینے کے لئے تیار نہیں تھے اور ایک واویلا مچا کر حکومت کو کمزور بنا دیا۔ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مادنا کی عزت عوام میں زیادہ تھی ۱۶۸۶ء تک وزیر اعظم نے تین مرتبہ پورے ملک کا دورہ کیا ہے۔

دوسرا پہلو خارجی مصلحت کا ہے۔ دکنی آزاد سلطنتیں ذاتی تحفظ کے لئے مغلوں کے مقابلہ میں ایک دوسرے کی مدد کرتی تھیں۔ چنانچہ عبداللہ قطب شاہ نے مرزا راجہ جے سنگھ کے خلاف علی عادل شاہ ثانی کی مدد کے لئے نیک نام خاں کے تحت بارہ ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادوں کی ایک جرار فوج روانہ کی۔ مادنا اور ابوالحسن نے اس مصلحت کو برقرار رکھا۔ مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے لئے ایک قوی محاذ بنا کر لیا۔ یہی کا انتہائی تدبر اور سیاست دانی ہے کہ اس نے سیواجی کے ہاتھوں کو دوستی اور اخوت کی رسی سے باندھ دیا اور اس طرح سلطنت گولکنڈہ سیواجی کی تاخت و تاراجی سے بچی رہی۔ اس دور اندیشی کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ اس نے قلعہ جات ونگل، کنڈ وید، کنڈہ ویر کو مستحکم کر کے ہر ایک کی حفاظت کے لئے بارہ ہزار سپاہیوں کو متعین کر دیا۔ بیجاپور میں اپنے بھائی اکنا کو بحیثیت حاجب اس لئے مقرر کیا تھا کہ وہاں کی خارجی مصلحت کی رہبری کرے۔ مادنا نے ابوالحسن کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ قلعہ گولکنڈہ میں محصور نہ ہو جائے بلکہ کسی دور دراز کے قلعہ میں جائے اور بصورت ضرورت گولکنڈہ کو فوجی امداد روانہ کرے لیکن چونکہ شیخ منہاج کے مشورے کا زیادہ اثر تھا اس لئے اس مشورہ پر عمل نہیں کیا گیا
"مادنا اور اکنا منصب کے لالچ میں ابوالحسن کو اورنگ زیب کے ہاتھوں فروخت کرنا چاہتے تھے" یہ الزام تاریخ کے کسی طالب علم کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ یہ دونوں بھائی اورنگ زیب اور ابوالحسن سے خوب واقف تھے توقع تعظیم رکھنا ہے بجائے اس کے کہ ہم اپنی رائے کا اظہار کریں تمام سربستہ واقعات کا اظہار کر دیا جائے جس سے ناظرین کو خود رائے قائم کرنے کا موقع حاصل ہو۔ ۱۶۵۶ء میں گولکنڈہ کی فوج دکن کے مغل صوبہ دار کے لشکر کا مقابلہ ایک دن بھی نہ کر سکی اور قلعہ گولکنڈہ مغل گولہ باری کی تاب نہ لا سکا۔ لیکن ۱۶۶۶ء اور ۱۶۸۵ء میں شہنشاہیت کی ساری قوت ملکھیڑ کے میدان میں تین مہینے معطل کی گئی اور تمام تاریخیں گولکنڈہ کی فوج کی بہادری کے کارناموں سے بھری پڑی ہیں۔ اگر محمد ابراہیم باغی نہ ہو جاتا تو ممکن تھا کہ مغلوں کو ملکھیڑ کے میدان میں ایسی شکست فاش ہوتی کہ مغل پھر ادھر کا رخ نہ کرتے۔ محاصرہ گولکنڈہ سے ہر شخص واقف ہے ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ناظرین ذاتی رائے قائم کر سکتے ہیں۔

مادنا پر ظالم اور متعصب ہونے کا جو الزام لگایا گیا ہے وہ شہنشاہی اغراض کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ گولکنڈہ پر حملہ کرنے کا ایک حیلہ ہے: ہولناک پیرہ واقعہ جو سازش کی طرح عیاں ہے کہ قتل۔ بہرے مسعود خاں اور شرزہ خاں کے بارے میں بیجاپور میں مصلحت اختیار کی گئی تھی مختصر یہ کہ ۱۶۸۶ء میں عیان سلطنت نے سازش کی اور ان کو قتل کرا دیا۔ جمشید نامی ایک غلام کے چند اور دوسرے غلاموں کے ساتھ ان کے سر تن سے جدا کر دئے اور شہزادہ شاہ عالم بہادر کے پاس روانہ کئے حرم سے سرتروما اور جانی بی بی نے اس سازش میں زیادہ حصہ لیا ہے

شہزادہ نے ان کے سروں کو بہادر خاں کے ذریعہ شولاپور میں اورنگ زیب کے پاس روانہ کیا جہاں وہ ہاتھی کے پیروں تلے روندے گئے۔

اکنا پیشکار

یہ مادنا کا بڑا بھائی تھا۔ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص غیر مہذب، متعصب اور صاف گو تھا۔ مادنا کے وزیر اعظم بننے کے بعد یہ ان کا پیشکار مقرر ہوا۔ اور پھر قطب شاہی کرناٹک کا صوبہ دار بنا۔ صوبہ داری کے عہدے سے سرلشکری پر ترقی پائی۔ عہد نامہ بیجاپور کے بعد وہاں کا حاجب مقرر ہوا ۱۶۸۴ء میں بیجاپور سے واپس ہوا اور ۱۶۸۶ء میں مادنا کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔

اس نے کرناٹک اور مشرق کا دو مرتبہ دورہ کیا۔ بندرگاہوں کے انتظام میں نہایت بے مروتی سے کام لیا اور اس طرح گولکنڈہ کی آمدنی میں اضافہ کیا فوج کی تنظیم میں اس کا بہت حصہ ہے اس کے دو بھانجوں رستم راؤ اور پودلی لنگنا نے بادشاہ کی کئی اہم خدمات انجام دیں۔ خافی خاں رستم راؤ کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے کہ وہ صاحب السیف والقلم تھے پودلی لنگنا نے انگریزوں کو سربلند ہونے نہ دیا اور بار بار زک دے کر گولکنڈہ میں انہیں برسر اقتدار ہونے سے روکتا رہا اس کے مدد و معاون اس کے دونوں ماموں تھے جو ہر طریقے سے اس کی اس کام میں مدد کرتے تھے۔ اکنا کے ایک خط میں انگریزوں کو ان الفاظ میں تنبیہ کی گئی کہ وہ پودلی لنگنا کے اقتدار کو تسلیم کریں۔ اس کے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈہ کی بحری تجارت بھی تھی۔ اور خود ان بھانجوں کے تجارتی جہاز تھے ہیاورٹ نامی ولندیزی رسالے میں ان کو مغرور اور تند مزاج شخص بیان کیا گیا مگر اس کی تائید کسی اور تاریخ سے نہیں ہوتی۔ موجودہ معلومات کی بنا پر ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ان کی طبیعت میں روکھا پن زیادہ تھا۔

بہرکیف دونوں بھائیوں نے ملک و مالک کی بے لوث خدمت کی ہے لیکن ان کی محنت کا انہیں معاوضہ نہیں ملا۔ انہیں حکومت کو ایسی ناگفتہ بہ حالت میں چلانا پڑا جس میں کامیابی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم چودہ سال تک جس قابلیت سے ان بھائیوں نے ملک کے اس ٹمٹماتے دیئے کو گل ہونے سے روکا ہے وہ قابل تحسین ہے بہت ممکن ہے کہ مورخ اس حقیقت کے اظہار کی طرف متوجہ ہو کر ان الزامات کو غلط ثابت کر دیں گے۔ اور زمانہ بتادے گا کہ ملک و مالک کے بہی خواہ کبھی نہ کبھی اپنی حقیقی قدر و منزلت حاصل کر کے رہیں گے۔

کے، وی بھوپال راؤ

عبدالرزاق لاری گولکنڈہ کے دروازے پر

اک شیر ژیاں ہے کہ کھڑا جھوم رہا ہے
زخموں سے لہو گر کے قدم چوم رہا ہے

تلوار بھی اک ہاتھ میں بل کھائی ہوئی ہے
معلوم نہیں کس کی قضا آئی ہوئی ہے

دروازے میں اک جان ہے اور لاشوں کے انبار
اور سمتِ مقابل میں ہے تلواروں کی جھنکار

معلوم ہے اس کو کہ کوئی ساتھ نہ دے گا
بیٹا کو اٹھانے میں کوئی ہاتھ نہ دے گا

پر اک دلِ لاری ہے کہ جو جانِ وفا ہے
یہ مطلعِ انوار وفا' کانِ وفا ہے

اکبر وفاقانی

گولکنڈہ کا آخری سپہ سالار، عبدالرزاق لاری زخموں سے بے ہوش ہو کر گرنے سے پہلے

سلطنت ابد مدت آصفجاہی

اور

سلاطینِ آصفی

سلطنت آصفیہ کا قیام تاریخ ہند کا ایک نہایت درخشاں باب ہے۔ اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد کوئی شخصیت نواب نظام الملک سے زیادہ نمایاں نہ تھی جو منتشر قوتوں کو یکجا کرکے مرکزیت پیدا کرنے یا بڑی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوسکتی تھی۔ چنانچہ نواب نظام الملک نے اول تو سلطنت مغلیہ کے بقا، اس کی اصلاح اور استحکام کے لیے ممکنہ کوشش کی لیکن جب اس میں کامیابی کی صورت نظر نہ آئی تو انھوں نے حریفوں کو شکست دے کر سلطنت آصفیہ کی بنیاد ڈالی (۱۷۲۴ء)۔ نواب نظام الملک کے بعد جس شخصیت نے سینہ سپر ہوکر مشکلات کا مقابلہ کیا اور سلطنت کے لیے جو خطرات تھے ان کو دور کیا اور سلطنت آصفیہ کی صحیح معنوں میں تعمیر کی وہ بانی سلطنت کے فرزند آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں بہادر تھے۔

قیام سلطنت آصفیہ سے بہت سے فوائد حاصل ہوئے۔ اول تو دکن کی بدنظمی، اور بدامنی کا خاتمہ ہوکر امن و امان اور عدل و انصاف کا دور شروع ہوا۔ دوم یہ کہ ملک میں زراعت کی سرسبزی، صنعت و حرفت کی ترقی اور تجارت کی گرم بازاری ہونے لگی۔ بالخصوص شاہان آصفیہ کی شہرۂ آفاق رواداری اور لاثانی حب الوطنی روایتی فیاضی اور عدیم المثال رعایا پروری نے ملک کی خوشحالی میں چار چاند لگادئے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہان آصفی کی حکومت اپنی ساری رعایا پر نہ صرف منصفانہ رہی۔ بلکہ ہمیشہ مشفقانہ اور پدرانہ رہی ہے۔ انھوں نے قیام امن اور عدل و انصاف تک ہی خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ آثار قدیمہ کی حفاظت اور علوم و فنون کی سرپرستی میں بڑا حصہ لیا۔ اور جدید قسم کے سررشتوں کو قائم کرکے رعایا کی مادی، اخلاقی اور تعلیمی ترقی میں دن دونی اور رات چوگنی اضافہ کیا۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ دوسرا انیسویں صدی کے وسط سے یعنی سالار جنگ اول کی وزارت کے زمانہ سے ترقی اور اصلاح کا دور شروع ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس وقت مبارک عہد عثمانی میں جس تیز رفتاری کے ساتھ دکن میں ہر جہتی ترقی ہورہی ہے۔ وہ تاریخ ہند میں عدیم المثال ہے۔ حیدرآباد جیسی تعمیر کے سلسلے میں اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی کا نام رہتی دنیا تک یادگار رہے گا کہ زراعت صنعت و حرفت، تجارت، تعلیم، تعمیرات اور حفظان صحت غرض ہر شعبۂ زندگی میں غیر معمولی چہل پہل ہے۔ نتیجہ یہ کہ اب دکن صرف مشرقی تمدن اور قدیم معاشرت ہی کا مرکز نہیں رہا ہے بلکہ اپنے عصری ترقیات کے اعتبار سے حیدرآباد مشرقی اور مغربی تہذیب کا گہوارہ اور قدیم و جدید تمدن کا سنگم بن گیا ہے موجودہ ہمہ جہتی ترقی کی رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل نہیں کہ دور عثمانی میں حیدرآباد کا مستقبل اس کے بہمنیہ اور قطب شاہیہ ماضی سے کہیں شاندار ہوتا جارہا ہے۔

نواب نظام الملک آصفجاہ اول بانی سلطنت آصفیہ

(۱۷۲۴ء تا ۱۷۴۸ء)

نواب نظام الملک آصفجاہ اول کا خاندانی سلسلہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ تک اور آگے حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے۔ نواب نظام الملک کے دادا عابد خاں عہد شاہ جہاں میں ہندوستان آئے تھے اورنگ زیب کے زمانے میں منصب پنج ہزاری اور صدارت کل کے عہدہ پر فائز تھے گولکنڈہ کے محاصرہ میں گولے کے زخم سے شہید ہوئے۔

اُن کے فرزند میر شہاب الدین خاں اورنگ زیب کے مشہور امرا میں سے تھے جن کو منصب ہفت ہزاری اور غازی الدین خاں فیروز جنگ کا خطاب عطا ہوا تھا۔ انھیں کے نامور فرزند نواب نظام الملک آصفجاہ اول تھے۔

اُن کا اصلی نام میر قمر الدین تھا اور ولادت ۱۶۷۱ء میں ہوئی تھی۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں "چین قلیچ خاں" کا خطاب اور منصب پنج ہزاری سے سرفراز ہوئے بعد ازاں بیجاپور کی صوبہ داری پر فائز ہوئے تھے۔ غرض اورنگ زیب کی اُن پر خاص عنایت تھی۔ حتیٰ کہ اورنگ زیب نے خاندانی حالات، وجاہت، بہادری اور تدبر کی بنا پر ان کو اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کام بخش کی لڑکی بیاہ دینی چاہی تھی لیکن مصلحت کی بنا پر نظام الملک نے اس کو پسند نہیں کیا۔

فرخ سیر کے زمانہ میں ان کو "نظام الملک بہادر فتح جنگ" کا خطاب ہفت ہزاری منصب اور دکن کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ چنانچہ ۱۷۱۳ء میں وہ بہ حیثیت صوبہ دار دکن اورنگ آباد آ گئے تھے۔ لیکن اورنگ زیب کے نا اہل جانشینوں کے زمانہ میں جب ملک کی حالت خراب ہوتی گئی اس وقت نظام الملک کو بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ وہ دکن سے مالوہ کی صوبہ داری پر بھیجے گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سارا ملک بادشاہ گر سیدوں (سید حسین علی اور سید عبداللہ دونوں بھائیوں) کے مظالم سے تنگ آ گیا تھا۔ اس وقت سب کی نظریں نظام الملک کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اُس نازک موقع پر نواب نظام الملک نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ مخالفین سے سخت لڑائی ہوئی (جس میں سید دلاور علی خاں اور سید عالم علی خاں نائب صوبہ دار دکن مارے گئے) اس طرح نواب نظام الملک نے بزور شمشیر حیدرآباد اور برار وغیرہ کے علاقوں کو فتح کیا۔ غرض سیدوں کا خاتمہ کر کے نہ صرف محمد شاہ کو انھوں نے نجات دلائی بلکہ سارے ملک پر ایک بڑا احسان کیا۔ محمد شاہ نے اس کے صلہ میں آصفجاہ کا خطاب دے کر ان کو سلطنت دہلی کا وزیر مقرر کیا لیکن دربار کی حالت دیکھ کر انھوں نے اپنے بڑے فرزند غازی الدین خاں کو دہلی میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود حیدرآباد تشریف لائے۔

راستہ میں برار کے قریب ان کو مبارز الدین خاں سے لڑنا پڑا جس میں وہ مارا گیا۔ غرض یہ وہ زمانہ ہے کہ ملک میں فتنہ و فساد کا بازار گرم تھا۔ کوئی مرکزی طاقت موجود نہ تھی جو امن و امان قائم کر سکتی ہو۔ اول تو نواب نظام الملک نے سلطنت مغلیہ کو بچانے کی انتہائی کوشش کی لیکن جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو مجبوراً ۱۷۲۴ء میں سلطنت آصفیہ کی خود مختاری کی بنا رڈالی (یہی وجہ ہے کہ حسب فرمان خسروی ہر سال ۲۹ رجب کو اسی خود مختاری سلطنت آصفیہ کی یادگار میں عام تعطیل دی جاتی ہے) لیکن اس کے باوجود سلطنت دہلی کی خیر خواہی اور وفاداری میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ چنانچہ ۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تو وہ فوراً

نواب میر قمرالدین خاں فتح جنگ نظام الملک آصف جاہ اول

نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی

دہلی پہنچ گئے اور وہاں غیر معمولی جرأت سے کام لے کر نادر کو لوٹ مار اور قتل عام سے روکا۔

دہلی سے دوبارہ دکن آکر انھوں نے مرہٹوں کا سدباب کیا، نربدیا سے تاپتی سے لے کر جنوبی ہند اور کارناٹک تک سارے ممالک محروسہ میں امن و اماں قائم کیا۔ اس سے رعایا کو اطمینان نصیب ہوا۔ اس طرح سلطنت آصفیہ کے قیام سے ملک میں معاشی خوشحالی کا آغاز ہوا۔ نظام الملک بڑے رحمدل اور فیاض بادشاہ تھے۔ ان کو ہمیشہ اپنی رعایا کا بڑا خیال رہتا تھا۔ آخرکار ۱۷۴۸ء میں بمقام برہان پور انتقال کیا۔ چنانچہ دولت آباد میں ان کا مقبرہ موجود ہے۔

مختصر یہ کہ نواب نظام الملک نہ صرف اوائل اٹھارویں صدی کے سب سے بڑے قائد، زبردست سپہ سالار اور بہترین مدبر کی حیثیت سے یاد کئے جائیں گے بلکہ موجودہ سلطنت آصفیہ کے بانی ہونے کی وجہ سے تاریخ میں ان کی شخصیت ہمیشہ نمایاں رہے گی

نواب میر نظام علی خاں آصفجاہ ثانی

(۱۷۶۱ء تا ۱۸۰۳ء)

نواب نظام الملک کی وفات پر دکن میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا اسی سلسلہ میں انگریزی اور فرانسیسی کمپنیوں کو ریشہ دوانیوں کا خوب موقع ہاتھ آیا۔ اولاً یہاں پر نظام الملک کے دوسرے فرزند ناصر جنگ نے دو سال تک حکومت کی ان کی شہادت پر نظام الملک کے نواسے مظفر جنگ چند روزہ حکومت کے بعد مارے گئے اس کے بعد امراء نے صلابت جنگ کو تخت نشین کیا جو اور بھائیوں کی بہ نسبت عمر میں بڑے تھے۔ لیکن ان کا زمانہ شروع سے آخر تک ایک کمزور زمانہ تھا۔ جب کہ مرہٹہ اور فرانسیسی دکن پر چھا گئے تھے اور ملک کے انتظامی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ اس لئے امرا کے مشورہ سے محض ملکی مفاد کے مدنظر صلابت جنگ کی علٰحدگی عمل میں آئی اور نواب آصفجاہ ثانی تخت نشین ہوئے

نواب میر نظام علی خاں بہادر نظام الملک کے چوتھے فرزند تھے ان کی ولادت ۱۷۳۴ء میں ہوئی تھی بچپن ہی سے وہ بہادر اور فنون سپہ گری سے خوب واقف تھے۔ چونکہ اپنے بھائی صلابت جنگ کے زمانہ میں وہ وزیر رہ چکے تھے اس لئے ان کو سلطنت کے معاملات کا بہت وسیع تجربہ تھا بادشاہ ہوتے ہی انھوں نے کھوئے ہوئے علاقے مرہٹوں سے حاصل کئے اور فرانسیسی اثرات کو دکن سے دور کیا بعد ازاں نہایت دور اندیشی سے کام لے کر انگریزوں سے رابطہ اتحاد قائم کیا۔ اس زمانہ میں ٹیپو سلطان کی قوت بڑھ رہی تھی۔ اس لئے انگریزوں نے آصفجاہ ثانی اور مرہٹوں کو ملا کر "اتحاد ثلاثہ" قائم کیا اور میسور کے خلاف کامیابی حاصل کی اس کے کچھ عرصہ بعد جب مرہٹوں نے چوتھ کے مطالبہ کے سلسلہ میں حیدرآباد پر حملہ کیا تو انگریزی گورنر جنرل سر جان شور نے عدم مداخلت کا بہانہ کرکے مدد دینے سے انکار کردیا جس کی وجہ سے سرکار نظام کو بمقام کھرڈلا ناکامی ہوئی اور سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

اس پر آصفجاہ ثانی نے انگریزی فوجوں کو برخاست کرکے ان کی جگہ موسیو ریموں کی ماتحتی میں فرانسیسی فوجیں ملازم رکھیں لیکن موسیو ریموں کی موت کے بعد جب انگریزی کمپنی کا مشہور و معروف گورنر جنرل ولزلی ہندوستان آیا تو اس نے نہایت حکمت عملی سے

آصفجاہ ثانی کو پھر اپنی طرف کر کے فرانسیسی فوجوں کو دکن سے برخاست کرا دیا۔

حیدرآباد کے عہد معاونت قبول کرنے کے بعد یہاں سے رقمی اور فوجی امداد حاصل کر کے ولزلی نے میسور کی ریاست پر حملہ کیا۔
ٹیپو سلطان کی شہادت اور ریاست میسور کے خاتمہ کے بعد کچھ علاقے مثلاً کڑپہ، کرنول اور بلاری وغیرہ حیدرآباد کو برائے نام ملے تھے لیکن فوجی مصارف کے نام سے بہت جلد واپس لے لئے گئے۔

سنہ ۱۸۰۰ء میں آصفجاہ ثانی اور انگریزوں کے درمیان عام اعانت وحفاظت باہم دیگر کا مشہور عہدنامہ ہوا چنانچہ اُس وقت سے آج تک تاج برطانیہ اور ریاست حیدرآباد کے جو خوش گوار تعلقات قائم ہیں وہ اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آصفجاہ ثانی نے انگریزوں سے مستقل تعلقات قائم کر کے سلطنت آصفیہ کے لئے فرانسیسیوں، ٹیپو سلطان اور مرہٹوں کے جو زبردست خطرات تھے ان کو رفع کیا اور اندرون ملک سے فسادات کو دور کیا اور امن قائم کیا۔ اس طرح سنہ ۱۷۶۱ء سے سنہ ۱۸۰۳ء تک نہایت کامیابی کے ساتھ انھوں نے حکومت کی اور اپنی حکمت عملی اور دور اندیشی سے نہ صرف سلطنت کی ڈوبتی ناؤ کو بچا لیا بلکہ اپنے عہد حکومت میں ممالک محروسہ کا رقبہ وسیع کر کے سلطنت آصفیہ کا وجود ہمیشہ کے لئے مستقل اور مستحکم کر دیا۔ ان وجوہات کی بنا پر اور خصوصاً اٹھارویں صدی کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب کہ ہندوستان میں ہر نقطۂ نظر سے ایک عام انحطاط کا دور چلا آرہا تھا۔ ہمیں آصفجاہ ثانی کی شخصیت کیا بلحاظ بہادری اور کیا بلحاظ تدبر اپنے ہم عصروں میں سب سے ممتاز نظر آتی ہے۔ اور وہ بجا طور پر سلطنت آصفیہ کے حقیقی معمار سمجھے جا سکتے ہیں۔

نواب سکندرجاہ آصفجاہ ثالث

(سنہ ۱۸۰۳ء تا سنہ ۱۸۲۹ء)

نواب سکندرجاہ آصفجاہ ثانی کے بڑے بیٹے تھے اور ان کا نام میر اکبر علی خاں تھا۔ ان کے اوائل حکومت کا اہم ترین واقعہ مرہٹوں اور انگریزوں کی جنگ ہے۔ چونکہ نواب سکندرجاہ نے اس لڑائی میں ہر طرح سے انگریزوں کی امداد فرمائی تھی اس لئے کامیابی حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے دولت آباد وغیرہ کے علاقے نواب سکندرجاہ کو واپس کر دئے۔ لیکن اُسی زمانہ سے فوجی اور ملکی معاملات میں انگریزوں نے زیادہ دخل دینا شروع کیا۔ چنانچہ میر عالم کے انتقال پر مدار المہام کے تقرر کا مسئلہ پیش ہوا تو رزیڈنٹ وقت کپتان سڈنہم نے بہت کچھ مداخلت کی لیکن سکندرجاہ نے منیر الملک ہی کو اپنی مرضی سے وزیر منتخب کیا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ سارے اختیارات پیشکار مہاراجہ چندو لعل کے ہاتھ میں آگئے، (جن کی تائید میں رزیڈنٹ تھا) چنانچہ اس کے بعد تقریباً تیس سال تک ریاست میں چندو لال ہی کا بڑا عمل دخل رہا۔ ریاست کے انتظامی اور فوجی معاملات میں رزیڈنٹ رسل کی پیش قدمی انگریزوں سے مہاراجہ چندو لال کی غیر معمولی ہمدردی اور پامر کمپنی سے سودی قرضہ کا لین دین یہ وہ چیزیں تھیں جس کی وجہ سے ریاست حیدرآباد کی مالی اور انتظامی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ چنانچہ دوسرے رزیڈنٹ مٹکاف نے جایزہ لیتے ہی صاف طور پر یہ کہہ دیا کہ نئی اعانتی فوجیں حیدرآباد کے خزانہ پر بہت بار ہیں اور پامر کمپنی کا جال ایک معنوی مصیبت ہے۔ اس لئے اس نے بعض مفید تجاویز پیش کئے۔ چنانچہ گورنر جنرل وقت مارکوئس آف ہسٹنگز نے پامر کمپنی کا قرضہ تو انگریزی حکومت

نواب میر اکبر علی خاں سکندر جاہ آصف جاہ ثالث

نواب میر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ آصف جاہ رابع

کی طرف سے ادا کرادیا لیکن شمالی سرکاروں کی جو پیشکش آصفجاہ ثانی کے زمانہ سے جاری تھی وہ اس سلسلہ میں ہمیشہ کے لئے بند کردی۔ اور فوجی بار حسب حال ریاست پر پڑتا رہا۔

مہاراجہ چندو لال کے عمل دخل کو دیکھ کر نواب سکندر جاہ نے خود امور سلطنت میں زیادہ حصہ نہیں لیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کے معاملات میں انگریزوں کی مداخلت روز بروز بڑھتی گئی۔

نواب سکندر جاہ ایک خدا ترس رحمدل اور نیک بادشاہ تھے۔ ان کو اپنی رعایا کے آرام و آسایش کا بڑا خیال تھا چنانچہ انھوں نے کئی تالاب سڑکیں وغیرہ تعمیر کرائیں۔ غرض رفاہ عام کے بہت سے کام انجام دیئے۔ انگریزی اعانتی فوج کے لئے سکندرآباد کا شہر انھیں کی یادگار ہے۔

نواب ناصر الدولہ آصفجاہ رابع

(۱۸۲۹ء تا ۱۸۵۷ء)

میر فرخندہ علی خاں نواب ناصر الدولہ سکندر جاہ کے صاحبزادے تھے۔ تخت نشین ہوتے ہی انھوں نے ملکی انتظامات کو درست کرنے کی کوشش کی، رزیڈنسی کے اثرات کو کم کیا اس سلسلہ میں مہاراجہ چندو لال کے استعفا دینے کے بعد کچھ عرصہ تک بغیر کسی مدارالمہام کے بذات خود وہ حکومت کے کام انجام دیتے رہے۔ اور پھر کئی مدارالمہاموں کو خود ہی مقرر کیا اور معطل و علحدہ کردیا۔ انگریزوں کے قرضہ کی رقم بڑھتی جارہی تھی چنانچہ جب ڈلہوزی گورنر جنرل ہوکر ہندوستان آیا تو اس نے سخت تقاضا کیا کہ قرضہ کے معاوضہ اور فوجی اخراجات کے لیے ملک کے بعض اضلاع انگریزوں کے حوالے کے جائیں۔ اس زمانہ کا رزیڈنٹ جنرل فریزر نہایت منصف مزاج اور ریاست کا خیر خواہ تھا۔ اس طرح کی ناواجبی مداخلت کو پسند نہ کرتا اس لئے خود استعفا دے دیا۔

لیکن ڈلہوزی نے پھر دباؤ ڈالا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد کی اعانتی فوج کے اخراجات اور قرضہ کے سلسلہ میں نواب ناصر الدولہ پر انتہائی دباؤ ڈالا گیا۔ چنانچہ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی رو سے رائچور کا دوآبہ اور برار کا علاوہ عارضی پٹہ پر انگریزوں کے حوالے کردیا گیا اس واقعہ کا حیدرآباد کے وزیر سراج الملک پر اتنا اثر ہوا کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر ان کا انتقال ہوگیا اور ان کی جگہ ان کے بھتیجے میر تراب علی خاں سالار جنگ اول مدارالمہام مقرر ہوئے جنھوں نے نہ صرف تین بادشاہوں کے زمانہ میں مدارالمہامی کی اہم ترین خدمت انجام دی بلکہ جدید حیدرآباد کے بنانے میں شاید سب سے زیادہ حصہ لیا۔

نواب ناصر الدولہ کے زمانہ ہی سے انھوں نے سیاسی اصلاحات اور معاشی و تعلیمی ترقیات کا کام شروع کردیا تھا جس کو بعد کے زمانہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ملک کے نصف بٹے ہوئے ٹکڑے ٹکڑے اراضیات سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے پاس رہن تھے سالار جنگ نے ان علاقوں کو چھڑوالیا اور دوسری اصلاحات کے کام میں مصروف تھے کہ شمالی ہند میں غدر کی آگ بھڑک پڑی اور ادھر نواب ناصر الدولہ نے رحلت فرمائی۔

نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس

(۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء)

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی اہمیت غیر معمولی ہے کیوں کہ اُس سال شمالی ہند میں غدر ہونے کی وجہ سے دہلی اور میرٹھ سے لے کر وسطِ ہند تک ہر جگہ ہندوستانی فوج نے سرکشی کی تھی۔ غرض وہ وقت انگریزوں کے لئے نہایت درجہ نازک تھا۔ حیدرآباد کے لئے بھی وہ زمانہ کچھ کم اہمیت کا نہ تھا کیونکہ ناصر الدولہ کے انتقال کے بعد یہاں ان کے بڑے صاحبزادے نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ تخت نشین ہوئے تھے۔ انھوں نے نہ صرف ریاست حیدرآباد اور جنوبی ہند میں غدر کی آگ کو پھیلنے سے روکا بلکہ انگریزوں کی ہر طرح سے مدد فرمائی مختصر یہ کہ نواب افضل الدولہ اور ان کے وزیر سالار جنگ نے انگریزوں کی ڈوبتی ناؤ کو بچا لیا۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمہ کے بعد ہندوستان کی حکومت جب راست شاہانِ انگلستان کے ہاتھ آگئی تو نواب افضل الدولہ کی خدمات کے صلہ میں شوراپور اور رائچور کا دوآبہ حیدرآباد کو واپس مل گیا۔

نواب افضل الدولہ کے زمانے سے حیدرآباد جدید کی ابتداء ہوتی ہے۔ اب بھی ایسے سن رسیدہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے نواب افضل الدولہ اور ان کے خیرخواہ اور وفادار وزیر سالار جنگ اول کو اصلاح اور ترقیٔ ملک کے کاموں میں ہمہ تن مصروف دیکھا تھا چنانچہ ان کی زبانی اُس زمانے کے حالات سننے سے اس عہد کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔

اسی طرح حیدرآباد میں بہت سی نشانیاں اور کئی عمارتیں ایسی موجود ہیں۔ جیسے افضل گنج۔ افضل گنج کا پل۔ مسجد افضل گنج یا چوملہ پیالیس وغیرہ جو اسی عہد کی یادگار ہیں۔

نواب افضل الدولہ کا عہدِ حکومت صرف بارہ سال تک رہا لیکن سچ تو یہ ہے کہ حکومت آصفیہ کے موجودہ نظام حکومت اور انتظامات مملکت کی داغ بیل اسی عہد میں ڈالی گئی۔ اول تو سارے ملک کی پیمائش کراکے مالگزاری مقرر کی گئی دوسرے یہ کہ سارے ملک کو چار صوبوں، سترہ ضلعوں اور بہت سے تعلقوں میں تقسیم کرکے صوبہ دار۔ تعلقدار اور تحصیلدار مقرر کئے گئے۔ انتظامی اور مالی اصلاحات کے علاوہ سررشتہ عدالت اور پولیس کی تنظیم عمل میں آئی۔ نیا سکہ جاری ہوا۔ اس طرح امن وامان اور عدل وانصاف کے سررشتوں کی تنظیم کے بعد قوم ساز سررشتوں کے قیام کی طرف توجہ کی گئی اور رعایا کے آرام وآسایش علمی اور مادی ترقی کی خاطر سررشتہ جات تعلیم۔ طبابت اور تعمیرات وغیرہ کا قیام عمل میں آیا۔ خاص کر تعلیم کے معاملہ میں دورِ جدید کی تاریخ میں پہلا قدم نواب افضل الدولہ کے عہد میں اٹھایا گیا کہ ایک طرف تو ہر ضلع اور ہر تعلقہ میں مدارس قائم کئے گئے۔ اور دوسری طرف خاص شہر حیدرآباد میں دارالعلوم اور مدرسہ عالیہ کا قیام عمل میں آیا۔ جہاں عام طور پر ذریعۂ تعلیم فارسی زبان تھی۔

ذاتی حالات کے اعتبار سے افضل الدولہ بہادر بڑے خداترس، بہت نیک ملنسار اور سادہ مزاج بادشاہ تھے۔ رفاہِ عام کے کاموں میں غیر معمولی دلچسپی لینے کے علاوہ بڑے فیاض اور علم وفن کے بڑے قدردان تھے۔ تاریخ میں اُن کا اور ان کے وفادار وزیر سالار جنگ اول کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا، کہ اس رحمدل بادشاہ اور خیرخواہ وزیر نے ریاست حیدرآباد کی اصلاح اور ترقی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور اس طرح حیدرآباد جدید کی تعمیر کا کام آغاز کیا۔ جس کو بعد کے زمانہ میں ترقی ہوتی گئی۔

نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ آصف جاہ خامس

نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس

نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس

۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء

تاریخ میں ایسی مثالیں شاذ ہی ہوں گی جب کہ ایک نہایت کمسن شہزادہ کو تخت نشین کیا گیا ہو۔ اور پھر بھی حکومت کامیابی سے چلی ہو۔ چنانچہ یہ ایک اہم واقعہ ہے کہ ۱۸۶۹ء میں افضل الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے فرزند نواب میر محبوب علی خاں کو تین سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا گیا اور ایک مجلس تولیت قائم ہوئی جس کے اراکین نواب سالار جنگ اول اور نواب شمس الامراء تھے۔ انہیں کے سپرد حکومت کے جملہ کاروبار تھے۔

نواب میر محبوب علی خاں کے سن بلوغ کو پہنچنے سے قبل کے چند واقعات نہایت اہم ہیں ایک تو یہ کہ سالار جنگ اول نے واپسی برار کا مسئلہ چھیڑ دیا اور اسی سلسلہ میں خود انگلستان گئے جہاں آپ کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۷۷ء میں اعلیٰ حضرت کو ساتھ لے کر سالار جنگ اول نے دہلی دربار میں شرکت کی اور تیسرا اہم واقعہ خود سالار جنگ کے ۱۸۸۳ء میں انتقال کر جانے کا ہے۔ ایسے وفادار اور مدبر وزیر کسی ملک کی تاریخ میں شاذ ہی گذرے ہوں جو اپنے ملک اور مالک کے لئے ممد و معاون ثابت ہوئے ہوں چنانچہ سالار جنگ کو یہ شرف حاصل رہا کہ ناصر الدولہ افضل الدولہ اور نواب میر محبوب علی خاں جیسے تین ہر دلعزیز بادشاہوں کے زمانے میں تقریباً تیس سال تک انہوں نے نہایت تدبر و وفاداری سے ملک اور مالک کی خدمات انجام دی ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ حیدرآباد جدید کی ترقیوں کی داغ بیل ڈالنے میں بڑا حصہ لیا۔

سالار جنگ نہایت ہر دلعزیز تھے ان کی وفات کا صدمہ یوں تو ساری رعایا کو ہوا لیکن سب سے زیادہ اعلیٰ حضرت کو ہوا کیونکہ اعلیٰ حضرت دل سے ان کی قدر کرتے تھے۔ سالار جنگ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سالار جنگ ثانی پھر سر آسمان جاہ سر وقار الامراء اور آخر کار مہاراجہ سر کشن پرشاد یکے بعد دیگرے مدار المہام مقرر ہوئے۔

اعلیٰ حضرت مرحوم بڑی خوبیوں کے انسان اور بڑے ہر دلعزیز بادشاہ تھے سرکار انگریزی سے ان کے زمانہ میں دوستانہ تعلقات میں اضافہ ہوا لارڈ رپن نے پہلی مرتبہ حیدرآباد آکر اس رسم کی ابتدا کی کہ گورنر جنرل کو ضرور حیدرآباد آنا چاہئے۔ چنانچہ اس کے بعد سے ہر وائسرائے اپنی واپسی سے قبل ضرور حیدرآباد آجایا کرتے ہیں۔ تاریخ دکن میں مسئلہ برار جیسی بھی کوئی دل خوش کن چیز نہ تھی اس پر ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے حیدرآباد آکر برار کے دوامی پٹہ پر مجبوراً اعلیٰ حضرت کے دستخط لے لئے کہ برار مملکت تو سرکار نظام کی ہو لیکن اس پر قبضہ ہمیشہ کے لئے سرکار انگریزی کا رہے۔ اور اس کے لئے سالانہ ۲۵ لاکھ کی پیشکش سرکار نظام کو دی جایا کرے۔ چنانچہ یہ رقم اب تک ہر سال وصول ہوتی ہے۔

اعلیٰ حضرت مرحوم کا زمانہ جدید ترقیات کے آغاز کا ہے اس دور میں نہ صرف بہت سی عمارتیں تعمیر ہوئیں جیسے زنانی شفاخانہ محبوبیہ ٹاؤن ہال وغیرہ بلکہ بہت سی سیاسی اصلاحیں عمل میں آئیں۔ مثلاً سکہ محبوبیہ جاری ہوا۔ کیبنٹ کونسل اور لیجسلیٹو کونسل کا قیام عمل میں آیا۔

۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی کی طغیانی حیدرآباد کے لئے ایک زبردست سانحہ تھا اس وقت اعلیٰ حضرت نے جس طرح رعایا کی مدد فرمائی وہ عدیم المثال ہے۔

غرض اعلیٰ حضرت نہ صرف خود بڑے شاعر عالم اور قدر دان علم و فن تھے بلکہ غیر معمولی خوبیوں کے چرچے نہ صرف ریاست حیدرآباد میں بلکہ دور دراز ملکوں تک پہنچے ہوئے تھے۔

۱۹۱۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ملک پر ان کے احسانات اس قدر ہیں کہ حیدرآباد اپنے محبوب بادشاہ کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

میر محمود علی

باغِ عام

اور مدح حضرت آصف سابع خلد اللہ

کیا حسین ہے صورتِ گلفام باغ عام کی
آنکھ ہو اور شکلِ دل آرام باغ عام کی

صبح اس گلزار کی آئینۂ رخسار حور
شانۂ گیسوئے لیلیٰ شام باغ عام کی

دیگر

نرگس شہلا میں عشوے چشم مے آشام کے
سنبل پیچاں میں گھونگر زلف عنبر فام کے

بارک اللہ حسن قدرت پانی کے چشمے ہیں یہاں
سب ہیں آئینے جمال روئے باغِ عام کے

دیگر

روئے گل پر کاکلِ سنبل ہے بل کھائی ہوئی
برگِ گل میں لعلِ لب کی ہے جھلک آئی ہوئی

وہ ہے باغ عام پر جوبن کہ انساں کیا جلیل
بن گئی چشم شوق نرگس بھی تماشائی ہوئی

دیگر

آج باغ عام سے ہی اور ہی شانِ دکن
ہر کلی اس بوستاں کی ہے گلستانِ دکن

پتی پتی نے لکھا ہے کلکِ قدرت سے جلیل
شاہِ عثماں آصف سابع سلیمانِ دکن

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

حیدر یار خاں شیر جنگ صدر الدولہ صدر الملک

درگاہ قلی خاں سالار جنگ مؤتمن الدولہ خان دوراں

چار مینار

عظمت شاہان ماضی کی نرالی یادگار
اے وطن کی سرزمین حسن کے آئینہ دار

تجھ میں ذوق و شوق کی تابندگی پاتا ہوں میں
تجھ میں بیتے جشنوں کی زندگی پاتا ہوں میں

شہر کے سینے میں روشن ہے ترا نقش وفا
تیرے میناروں میں ہیں رنگینیاں جلوہ نما

چار سو جلتا ہے تیرے عشق دائم کا چراغ
دیکھ کر تجھ کو فلک کی سمت جاتا ہے دماغ

بادۂ سرمستی الفت کا تو اک جام ہے
اتحاد یکدگر کا تجھ میں اک پیغام ہے

ثبت ہیں سکوں کے دل پر تیری تصویریں ہنوز
ظلمتوں میں بھی ہیں روشن تیری تقدیریں ہنوز

تو جہان حسن کے نایاب شہ کاروں میں ہے
عشق کی برق تجلی تیرے فن پاروں میں ہے

رات کی اٹھتی ہے جب دم تیرے چہرے سے نقاب
جب پلٹتا ہے مکاں کی سرزمیں پر آفتاب

سربلندی کی فضا پر ناز فرماتا ہوا
تو نظر آتا ہے اک تارا چمکتا ہوا

باقی

وزرائے آصفی

شیر جنگ
تولد سنہ ۱۱۱۳ھ وفات سنہ ۱۱۹۰ھ

خاندان سالار جنگ کے مورث اعلیٰ منیر الدولہ منیر الملک شیر جنگ حیدر یار خان ہیں جو حضرت اویس قرنی کی اولاد سے تھے، اویس قرنی تاریخ اسلام میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ آنحضرت کے زمانہ میں موجود تھے۔ حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کے ہمراہ جنگ صفین میں حاضر تھے اور اسی جنگ میں جام شہادت پیا۔ اویس قرنی کی اولاد سے اویس ثالث اپنے لڑکے محمد علی کے ہمراہ مدینہ منورہ سے دکن آئے۔ اور بیجاپور پہونچے یہاں اس زمانہ میں علی عادل شاہ ثانی (سنہ ۱۰۶۶ء تا سنہ ۱۰۸۳ء) حکمراں تھا بادشاہ نے آپ کی بڑی عزت کی اور آپ کے فرزند محمد علی کی شادی ملا احمد نائطی کی دختر سے کر دی گئی اور "رتبہ سلطانی" کا عہدہ بھی دیا گیا

علی عادل شاہ کے بعد شیخ محمد علی کے دونوں فرزند محمد باقر اور محمد حمید، بامغلیہ سے متعلق ہوگئے۔ عالمگیر اورنگ زیب نے دو ہزاری منصب سے سرفراز کیا محمد باقر کے فرزند محمد تقی بھی عالمگیری عہد میں منصب سہ صدی سے ممتاز ہو چکے تھے اور فرخ سیر کے زمانہ میں ان کو اورنگ آباد میں "داروغہ خزینہ" کی خدمت ملی۔

حضرت آصفجاہ اول نے ان کو قلعہ جات دکن کا داروغہ مقرر کیا۔ انہیں محمد تقی کے فرزند شمس الدین محمد حیدر یار خان شیر جنگ ہیں۔

شیر جنگ کی ولادت اورنگ آباد میں سنہ ۱۱۱۳ھ میں ہوئی حضرت آصفجاہ اول نے سب سے پہلے دو صدی منصب کے ساتھ فیل خانہ کا داروغہ مقرر کیا۔ اس کے بعد آپ کو مختلف خدمات عطا ہوئیں جن کو آپ نے خوش اسلوبی سے انجام دیا آصفجاہ کا بڑا اعتماد آپ پر تھا۔ حیدر یار خان کا خطاب بھی آصفجاہ نے عطا کیا تھا۔

نواب ہدایت محی الدین خان مظفر جنگ کے مارے جانے پر نواب صلابت جنگ کی مسند نشینی شیر جنگ کی جرأت کی وجہ سے ہوئی تھی کیونکہ بعض امرا کی خواہش تھی کہ نواب نظام علی خان (آصفجاہ ثانی) کو مسند نشین کیا جائے، چونکہ نواب صلابت جنگ بڑے بھائی تھے اس لیے شیر جنگ نے کہا کہ بڑے بھائی کے ہوتے چھوٹے کو مسند نشین کرنا خاندان آصفی کی روایات کے خلاف ہے۔ اور پیش قدمی کر کے نواب صلابت جنگ کو مسند نشینی کی نذر پیش کر دی۔ آپ کے بعد دوسرے امرا نے بھی آپ کی پیروی کی

نواب صلابت جنگ کے زمانہ میں شیر جنگ دیوانی کے اہم فرائض بھی انجام دئے (۱۱۷۲ھ) نواب آصفجاہ ثانی کے ابتدائی ایام میں چونکہ شیر جنگ سے موافقت نہیں تھی اس لئے انھوں نے پونہ میں اقامت کر لی تھی، بعد میں شیر جنگ مورد عنایت شاہی ہوئے۔ رکن الدولہ کے مشیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے مختلف اہم خدمات کو انجام دیا اور آخر زمانہ میں جبکہ ان کا سن بھی زیادہ ہو گیا تھا ان کو صوبہ اورنگ آباد کی نظامت کے عہدہ پر سرفراز کیا گیا۔ اس خدمت کو بھی وہ پانچ سال تک انجام دیکر ۱۱۸۹ھ میں انتقال فرمایا۔ اورنگ آباد میں سپرد خاک کئے گئے۔

شیر جنگ، سخاوت، شجاعت میں مشہور تھے، علمی قابلیت بہت اچھی تھی۔ ان کو دو لڑکے تھے۔ بڑے محمد صفدر خان غیور جنگ جو درگاہ قلی خان کے داماد تھے۔ اور دوسرے تقی یار خان ذوالفقار جنگ جنھوں نے عنفوان شباب میں انتقال کیا۔

اول الذکر کی اولاد سے نواب سالار جنگ بہادر ہیں، جو آپ کی چھٹی پشت کے دادا ہوتے ہیں۔

میر موسی خاں رکن الدولہ

سہراب جنگ معین الدولہ مشیر الملک اعظم الامرا ارسطو جاہ

اَرسطوجاہ

تولد ۱۱۴۵ھ — وفات ۱۲۱۹ھ

غلام سید نام اور معین الدولہ سہراب جنگ مشیر الملک اعظم الامرا ارسطوجاہ فرزند ارجمند وکیل مطلق مختار دولت آصفیہ خطاب تھا۔ ۱۱۴۵ھ میں تولد ہوئے۔ نوشیروان عادل کی اولاد سے تھے۔ آپ کے باپ فتح شہزاد خان کو حضرت آصفجاہ اول نے صوبہ دار برار مقرر کیا تھا۔ غلام سید خان آصفجاہ ثانی کے رفیق و مصاحب تھے۔ حید جنگ کے مارے جانے کے بعد معین الدولہ سہراب جنگ کے خطاب کے ساتھ محالات صوبہ برار و قلعہ بنیاد کی دیوانی پر مامور کئے گئے۔
اس کے بعد پونہ اور ناگپور کی سفارت پر بھیجے گئے۔ چنانچہ سہراب جنگ نے پونہ سے پنڈت پردھان اور رگھوجی بھونسلے کے پاس جا کر اپنا مفوضہ کام نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا۔ اس کے بعد ایک عرصہ بعد مشیر الملک اعظم الامرا کے خطاب کے ساتھ خدمت دیوانی سے سرفراز کئے گئے (۱۷۹۱ء ۱۲۰۵ھ)

آپ کی دیوانی کے اہم واقعات کی بڑی تفصیل ہے، جن کی صراحت کا یہ موقع نہیں ہے، مختصراً اس کا اظہار کیا جاتا ہے:-

(۱) سلطنت آصفیہ نے مرہٹوں کی تائید سے میسور پر چڑھائی کی مگر عین وقت پر مرہٹوں نے ساتھ نہیں دیا۔ اس لئے تنہا آصفی فوج نے میسور پر حملہ کیا اور فتحیاب ہوئی۔

(۲) انگریزوں کے ساتھ شریک ہو کر سلطنت آصفیہ نے میسور کی تیسری لڑائی میں حصہ لیا۔

(۳) مرہٹوں کے ساتھ جنگ کھرڈا واقع ہوئی جس میں بعض وجوہ سے آصفی فوج ناکام رہی۔

(۴) اعظم الامرا پونہ میں نظر بند کئے گئے۔

(۵) پونہ میں اعظم الامرا نے سیاسی چال چلی، روسا مرہٹہ میں نفاق ڈالکر ان کو آپس میں جدا کر دیا، اور پھر اپنی سیاسی چال اور توڑ جوڑ سے ان کی صفائی بھی کرا دی، اور صفائی کرانے کے بعد جنگ کھرڈلہ کے نقصانات کی تلافی میں ایک کروڑ نقد تین کروڑ کے دستاویزات معافی چوتھ کی سند ممالک دولت آباد وغیرہ واپس لیکر حیدرآباد واپس ہوئے

(۶) میسور کی چوتھی لڑائی میں انگریزوں کی مدد کی گئی اور فتحیاب ہوئے

(۷) آصفجاہ ثانی کا انتقال ہوا اور آصفجاہ ثالث مسند حکومت پر جلوہ گر ہوئے۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ۱۲۱۹ھ میں ارسطوجاہ کا انتقال ہو گیا سرور نگر میں دفن ہوئے۔ ارسطوجاہ اپنے ملک اور مالک کے سچے خیر خواہ رہے، مرتے دم تک آپ نے ملک اور مالک کی خدمت نہایت دیانت داری سے انجام دی، وہ اپنے وقت کے بڑے سیاست داں تھے، انھوں نے بیسیوں موقعوں پر سیاسی دل و دماغ سے کام لیکر کامیابی حاصل کی۔
ارسطوجاہ مذہبی آدمی تھے۔ فرائض کی پابندی سختی کے ساتھ کرتے تھے، جود و سخا میں مشہور تھے علما، و فضلا، کی صحبت سے بڑی دلچسپی تھی۔ شعر و سخن سے شغف تھا، ان کے دربار نے اُردو شاعری کی بھی بڑی خدمت کی۔

علی زماں خاں غیور جنگ مدبر الدولہ صدر الملک امیر الامراء

میر عالم

تولد ۱۱۶۶ھ وفات ۱۲۲۳ھ

ابوالقاسم میر عالم کے والد سید رضی شوشتری ایران کے شیخ الاسلام کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سید رضی شوشتر ہی میں پیدا ہوئے مگر ۱۱۶۳ھ میں وہ اپنے بھائی کے ہمراہ ہندوستان آئے شاہجہان آباد میں چند روز قیام کے بعد شجاع الدولہ ناظم بنگال کے پاس بنگال چلے گئے اور وہاں ان کے داماد مرشد قلی کی رفاقت میں بسر کئے اور مرشد قلی کے ساتھ حیدرآباد آئے۔ آصفجاہ کی ملازمت اختیار کی۔ دارالانشاء میں مامور کئے گئے۔ حضرت آصفجاہ نے ایک جاگیر بھی مرحمت فرمائی تھی۔ ۱۱۹۴ھ میں سید رضی کا حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ دائرہ میر مومن میں دفن ہوئے۔

سید رضی بڑے قابل فرد اور مجتہد کا درجہ رکھتے تھے۔ شاعری کا بھی شوق تھا۔ اقدس تخلص کرتے تھے۔

میر ابوالقاسم المخاطب بہ میر عالم کی ولادت حیدرآباد میں ۲۶ … ۱۱۶۶ھ میں ہوئی۔ عربی اور فارسی میں بڑی اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ ریاضی میں مہارت تھی۔ قلم برداشتہ عربی لکھا کرتے تھے۔ فارسی شاعری اور انشاپردازی کا خاص ذوق تھا۔ بہرحال میر عالم اپنے وقت کے ایک بلند پایہ ادیب و عالم فاضل تھے۔

یہ امر خاص طور سے قابل تذکرہ ہے کہ میر عالم کی ابتدائی ملازمت ان کی شاعری کے طفیل ہوئی۔ اگرچہ ان کو باپ کی جاگیر مل چکی تھی مگر ملازمت کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ ایک مرتبہ جب ارسطو جاہ کی مدح میں قصیدہ لکھا تو ارسطو جاہ نے ان کے کلام کی فصاحت و بلاغت سے متاثر ہو کر اپنا پیشکار بنا لیا۔ اس وقت سے ان کی ترقی ہوتی گئی۔ اس کے بعد وہ تعلقدار بنائے گئے۔ انھوں نے اپنے علاقہ کا انتظام نہایت عمدگی سے کیا اور رعایا اور مالک دونوں کی خوشنودی حاصل کی۔

تعلقداری کے بعد میر عالم کو وکالت کی خدمت دی گئی۔ سرکار کمپنی کی جانب سے ایک نمائندہ آیا تو ارسطو جاہ نے اپنی اور انگریزوں کے درمیان ان کو وکالت پر مامور کیا۔ معاملات نہایت عمدگی سے طے پائے۔ اس کے بعد میر عالم کو سفارت کے لئے منتخب کیا گیا اور حضرت آصفجاہ ثانی کی جانب سے گورنر جنرل لارڈ کارنوالس کے پاس بھیجے گئے۔ ۱۲۰۲ھ میں میر عالم اس سفارت میں کامیاب ہو کر کلکتہ سے واپس آئے۔ اس کامیابی کے صلہ میں ان کو خطاب میر عالم کے ساتھ دیگر اعزازات سے بھی ممتاز کیا گیا۔ اب وہ ٹیپو سلطان کے پاس بھی روانہ کئے گئے اور اس کے بعد میسور کی چوتھی لڑائی میں حیدرآبادی فوج کی سپہ سالاری کے فرائض ان کے تفویض کئے گئے۔

ارسطو جاہ کے انتقال پر آصفجاہ ثالث نے میر عالم کو دیوانی کی خدمت عطا فرمائی ۱۲۱۹ھ

میر عالم نے اپنی دیوانی کے زمانہ میں کئی اصلاحیں کیں۔ انھیں نے پائیگاہ آصفی میں سب سے پہلے … ڈاک کا انتظام کیا گیا۔ حیدرآباد، کلکتہ، مدراس، بمبئی، پونا اور مچھلی بندر تک ڈاک کا انتظام ہوا۔ راستے میں مسافرخانے، چاہ، سرائیں اور باؤلیاں بنوائیں … تک بھی … موجود ہیں۔

۱۲۲۰ھ میں ایک قحط ہوا۔ میر عالم نے اس کا معقول انتظام فرمایا۔ بہرحال میر عالم ایک منتظم اور مدبر دیوان ثابت ہوئے۔

شوال ۱۲۲۳ھ میں میر عالم کا انتقال ہوا۔ دائرہ میر مومن میں اپنے والد کے پہلو میں دفن کئے گئے۔

میر عالم کی بنائی ہوئی کئی چیزیں آج تک موجود ہیں مثلاً میر عالم کا تالاب، میر عالم کی منڈی، بارہ دری اور اس کا باغ وغیرہ۔ میر عالم صاحب تصنیف تھے۔ فارسی نثر و نظم میں کئی کتابیں ہیں ان میں سے حدیقۃ العالم اور مثنوی … اور … بہت مشہور ہیں۔

میر عالم بڑے سخی تھے۔ … ان کے دسترخوان سے … سو آدمیوں کو کھانا ملتا تھا۔ وہ بڑے معاملہ فہم … دور میں … بزم و … کرنے والے … میں تھے۔

شمس الامرا ثانی امیر کبیر

تولد ۱۱۹۵ھ انتقال ۱۲۰۹ھ

نواب محمد فخر الدین خان تیغ جنگ ابو الفتح خان شمس الامرا اول کے فرزند ہیں۔ حیدرآباد میں آپ کی ولادت ہوئی (۱۱۹۵ھ) باپ کے انتقال کے وقت بہت کم سن تھے۔ آپ کی کم عمری سے ہی آصفجاہ ثانی کی نوازشات مبذول ہوتی رہیں۔

موروثی خطابات تیغ جنگ شمس الدولہ، شمس الملک شمس الامرا ثانی کے ساتھ امیر کبیر اول کا جلیل القدر خطاب بھی ملا۔

امیر کبیر مختلف حیثیتوں سے خاندان پائیگاہ کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کی ممتاز ہستی نہ صرف امرا پائیگاہ بلکہ تاریخ دکن میں بھی اہم حیثیت رکھتی ہے اور تاریخ دکن اپنے اس قابل فخر سپوت پر ہمیشہ فخر کرے گی۔

امرا پائیگاہ میں آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں جو بادشاہ کی دامادی کے رشتہ میں منسلک کئے گئے۔ چنانچہ ۱۲۱۵ھ میں حضرت آصفجاہ ثانی نے اپنی صاحبزادی بشیر النسا بیگم کی شادی آپ سے فرما کر دامادی کے رشتہ سے ممتاز کیا اور آج تک آپ کی اولاد کو یہ فخر حاصل ہو رہا ہے کہ وہ خاندان آصفی کی شہزادیوں کے ساتھ ازدواج کا امتیاز حاصل کرتے ہیں۔

نواب شمس الامرا ۔۔۔ میں منصب مدار المہامی پر فائز ہوئے گو چند ماہ نہایت کامیابی کے ساتھ کام کرنے کے بعد خدمت سے سبکدوش ہوگئے۔

امیر کبیر کی ذات علما، شعرا اور مصنفین کے لئے ملجا و ماویٰ تھی۔ آپ علم و فن کی ترویج کے لئے لوگوں کی ہمت افزائی کا پورا سامان کرتے تھے، ان کو فکر معاش سے مستغنی کرنے کے لئے مناصب اور ماہوار مقرر فرماتے تھے چنانچہ حضرت فیض، قیس، آفاق، شہرت وغیرہ کو ماہوار ملا کرتی تھیں۔

ترقی تعلیم سے آپ کو بڑی دلچسپی تھی۔ اپنے صرفے سے کئی مدرسے قائم کئے تھے۔ یہاں کے مدرسین کو بیش قرار ماہوار اور طلبہ کو وظائف کے علاوہ کتابوں وغیرہ سے بھی مدد دی جاتی تھی۔

امیر کبیر کے سب سے بڑے اور قابل فخر کارنامے یہ ہیں کہ آپ نے مغربی علوم و فنون خصوصاً سائنس اور ریاضی وغیرہ کی کئی کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے شائع فرمائیں اور ان کی تعلیم کا انتظام فرمایا۔ اردو زبان میں مغربی علوم کے ترجمہ کرنے کی یہ سب سے پہلی کوشش تھی۔ دہلی کالج، علی گڈھ وغیرہ کی تحریکیں سب اس کے بعد کی ہیں۔ ارباب کمپنی نے کلکتہ میں اردو میں قصہ کہانیاں وغیرہ کی کتابیں مرتب کرائیں تھیں، یہ کارنامہ ان دنوں تاریخ ادب اردو کا ایک ممتاز باب سمجھا جاتا ہے، لیکن امیر کبیر نے زبان اردو کی جو خدمت سائنس کے کتابوں کے ترجمہ کی کی ہے، وہ ان قصے کہانیوں کے کارناموں سے زیادہ درخشاں اور زیادہ سود مند ہے۔

امیر کبیر کو فن تعمیر سے بھی بڑی دلچسپی تھی آپ نے کئی عالی شان عمارتیں اور بازار وغیرہ تعمیر کرائے۔

محمد ابو الفخر فخر الدین خان امام جنگ نواب خورشید الدولہ
خورشید الملک

مہاراجہ چندو لال

منیر الملک ثانی

تولد ۱۱۹۴ھ وفات ۱۲۴۸ھ

علی زمان خان المخاطب غیور جنگ، منیر الدولہ، امیر الامرا۔ منیر الملک ثانی، غیور جنگ، صفدر یار خان کے فرزند اور شیر جنگ منیر الملک کے پوتے تھے۔ صفدر یار خان غیور جنگ کے انتقال پر ان کے چاروں لڑکوں نے جائداد آپس میں تقسیم کر لی۔ حضرت آصفجاہ ثانی نے ان کو منیر الملک کے خطاب کے ساتھ پنج ہزاری منصب اور سہ ہزار سوار کا اعزاز عطا فرمایا۔ اور بخشیگیری فوج کی خدمت سے سرفراز کئے گئے۔

منیر الملک، میر عالم کے داماد تھے۔ ان کی دو لڑکیاں یکے بعد دیگرے آپ سے بیاہی گئیں۔ میر عالم نے آپ کو خانہ داماد کی حیثیت سے اپنے ہی پاس رکھا تھا۔ ان کے انتقال کے چند ماہ بعد منیر الملک خدمت دیوانی سے سرفراز کئے گئے (۱۲۲۴ھ)

آپ کی دیوانی کے اہم واقعات حسب ذیل ہیں:-

(۱) پنڈاروں کا ہمیشہ کے لئے انسداد ہو گیا۔ ان کی لوٹ مار سے قلمرو آصفی کو نجات ملی۔

(۲) سکھوں اور عربوں میں سخت فساد ہوا۔ فتنہ فرو ہونے کے بعد سکھوں کو شہر بدر کر دیا گیا۔

(۳) شہزادہ مبارز الدولہ نے ہنگامہ برپا کیا اور ان کو تا حیات قلعہ محمد نگر میں نظر بند کیا گیا۔

(۴) رود موسیٰ کو قیامت خیز طغیانی ہوئی۔

(۵) حضرت آصفجاہ ثالث نے انتقال فرمایا اور آصفجاہ رابع نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

۱۲۴۸ھ میں منیر الملک کا انتقال ہوا۔ دائرہ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ آپ کو چار لڑکے تھے۔ اشجع الدولہ، شجاع الدولہ، سراج الملک، اکرم الدولہ۔ منیر الملک بھی اپنے دادا کی طرح بڑے سخی تھے۔ محرم میں بڑی خیرات کیا کرتے تھے۔ سادات اور حجاج وغیرہ ہمیشہ آپ کے مہمان رہا کرتے۔ لذیذ کھانوں سے بھی آپ کو رغبت تھی۔ ہر وقت باورچی خانہ گرم رہا کرتا۔ فی باورچی دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ دیا کرتے تھے۔

تعمیر سے بھی آپ کو دلچسپی تھی۔ چینی محل، آئینہ خانہ آپ ہی کی یادگار ہیں۔ اورنگ آباد میں بھی آپ نے ایک محل تعمیر کیا تھا۔

سراج الملک

تولد ۱۲۲۴ھ وفات ۱۲۶۹ھ

میر عالم علی خان المخاطب شیر جنگ، سراج الدولہ، سراج الملک، منیر الملک امیر الامرا کے بڑے فرزند اور میر عالم کے نواسے تھے۔

سراج الملک دو مرتبہ دیوانی کی خدمت سے سرفراز کئے گئے۔ پہلی مرتبہ ۱۲۵۹ھ میں اور دوسری مرتبہ ۱۲۶۳ھ میں۔ پہلی بار تو کچھ عرصہ کے بعد سبکدوش ہو گئے اور دوسری بار تقریباً سات سال تک یہ خدمت انجام دی اور برسر خدمت ہی آپ کا انتقال ہوا۔ دوسری مرتبہ دیوانی کے لئے رزیڈنٹ صاحب نے بڑی کوشش کی تھی۔ آپ کی دیوانی کے زمانہ میں حسب ذیل اہم واقعات ہوئے:-

(۱) عربوں اور روہیلوں میں فساد ہو گیا۔ (۲) مبارز الدولہ نے مولوی سلیم کے بہکانے سے ایک ہنگامہ کیا۔ آخر مبارز الدولہ قلعہ محمد نگر میں نظر بند کر دیے گئے اور مولوی سلیم کو حبس دوام کی سزا ہوئی۔ (۳) راجہ چندو لعل کی داد و دہش کے باعث خزانہ عامرہ خالی ہو گیا تھا۔ انگریزی فوج کنٹنجنٹ کی تنخواہ ادا نہ ہو رہی تھی، کئی لاکھ روپیہ اس کی ماہوار کا فاضل ہو گیا تھا، اس لئے حسب مطالبہ لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ملک برار کو بطور امانی انگریزوں کے تفویض کرنا پڑا۔ طے یہ ہوا تھا کہ بعد وضع اخراجات باقی رقم سرکار عالی کے خزانہ میں داخل کی جائیگی (۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۳ء)

اس معاہدہ کے کچھ عرصہ بعد نواب سراج الملک کا انتقال ہو گیا۔ آبائی مدفن دائرہ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ سراج الملک بذلہ سنج، صاحب اخلاق و مروت، باریک بیں، دوررس، صاحب تدبیر امیر تھے، اہل کمال کے بڑے قدر دان تھے۔ علماء و فضلاء سے بڑی محبت تھی۔

دواب صوا ج املک بہ د ، ر ، عمد د و صا اعتقد

میر تراب علی خاں شجاع الدولہ نواب مختار الملک سالار جنگ بہادر اول
وزیر اعظم دولت آصفیہ

(ب) عدالت کے لئے جدید محکمے، فوجداری، دیوانی، عدالت عالیہ کا قیام عمل میں آیا اور منظم طور پر عدالت کا کاروبار ہونے لگا۔ عدالتوں کے لئے شرع اسلام اور دھرم شاستر کو قانون قرار دیا گیا اسی کے لحاظ سے فیصلے ہونے لگے۔

(ج) ملک کی تعلیم کی طرف پوری توجہ کی گئی اضلاع اور تعلقات میں مدرسے کھولے گئے حیدرآباد میں مدرسۂ دارالعلوم، مدرسۂ عالیہ وغیرہ کا افتتاح کیا گیا۔

(د) تعمیرات کے لئے جدید محکمہ قائم ہوا۔ نئے راستے بنائے گئے، قدیم عمارات کی ترمیم ہونے لگی۔

(و) قلمرو آصفی میں ریل اور تار جاری ہوئے (۱۰) فوج کی اصلاح ہوی باقاعدہ فوج کی بنیاد قائم ہوی۔

غرض کہ اصلاحات اور انتظامات کی ایک طویل فہرست ہے، بہرحال نواب مختار الملک نے ایک باقاعدہ اور منظم ریاست کی صورت میں سلطنت آصفیہ کو مبدل کردیا۔

۱۳۰۱ھ میں نواب مختار الملک کا ہیضہ سے انتقال ہوا، اور دائرۂ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ مختار الملک نیک مزاج، خوش خلق حسن سیرت کے انسان تھے، ان کا حافظہ غضب کا تھا، معاملہ فہمی میں اپنی آپ نظیر تھے تدبر و سیاست میں ان کا ثانی نہیں تھا۔ [illegible] شخص کو دیکھ کر اس کی عادت اور خصلت سے بخوبی واقف ہو جاتے تھے۔ ان کی مردم شناسی مشہور تھی۔ برٹش گورنمنٹ نے ان کو [illegible] کا خطاب دیا تھا اور سترہ توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ انھیں دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔

راجہ نریندر بہادر

تولد ۱۲۴۴ھ انتقال ۱۳۰۶ھ

راجہ نراین پرشاد نریندر بہادر، راجہ دھراج بالا پرشاد کے فرزند اور مہاراجہ چندو لال کے پوتے تھے، راجہ راجایان راجہ بہادر کے خطاب سے سرفراز تھے۔

۱۲۴۴ھ میں تولد ہوئے عربی، فارسی کے علاوہ انگریزی سے بھی واقف تھے۔ ۱۲۶۹ھ میں خدمت پیشکاری سے سرفراز ہوے سالار جنگ مختار الملک کے انتقال پر بہ شرکت عماد السلطنت بہادر دیوانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس زمانہ کا اہم واقعہ اعلیٰ حضرت غفران مکاں آصف جاہ سادس کا پورے اختیارات کے ساتھ مسند نشین ہونا ہے۔

راجہ نریندر بہادر ایک مدبر، فیاض، تجربہ کار، سیر چشم انسان تھے، آپ کو صرف ایک دختر تھیں جو راجہ ہری کشن بہادر سے بیاہی گئیں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر آپ کے نواسے اور جانشین ہیں۔ ۱۳۰۶ھ میں راجہ نریندر بہادر کا انتقال ہوا۔

میر لائق علی خان سالار جنگ معتمد الدولہ عماد السلطنت

۱۲۸۶ھ میں نواب مختار الملک نے سلطنت آصفیہ کی جدید تنظیم فرمائی تھی، چار صدر المہام مقرر کئے تھے، ان میں سے ایک نواب بشیر الدولہ آسمان جاہ بھی تھے، عدالت کا سررشتہ آپ سے متعلق تھا۔ مولوی سید محمد مودودی صاحب معتمد تھے۔ آسمان جاہ یہ خدمت بلا تنخواہ انجام دیتے رہے۔
اس کے بعد جب نواب مختار الملک انگلستان تشریف لے گئے تو اپنے سررشتہ کا کام مدار المہام کی حیثیت سے کرتے رہے، اور مختار الملک کے انتقال کے بعد ریجنسی کونسل کے رکن ہوگئے اس زمانہ میں آپ ہی نے وسیرائے کی خدمت میں مرحوم اعلیٰحضرت غفران مکان کو چھ تیاری کے ساتھ مسند نشین کرنے کی تحریک فرمائی۔
پرنس آف ویلز (اڈورڈ ہفتم) کے ہندوستان آنے پر بمبئی میں آسمان جاہ نے سلطنت آصفیہ کی جانب سے استقبال کے فرائض انجام دیئے اور اس کے بعد ۱۳۰۴ھ میں ملکہ وکٹوریہ کی پنجاہ سالہ جوبلی میں سرکار عالی کی جانب سے شرکت فرمائی تھی۔
اسی ۱۳۰۴ھ میں جبکہ آپ لندن میں تھے آپ کو قلمدان مدار المہام سے سرفراز کیا گیا۔ خاندان پائگاہ میں آپ ہی سب سے پہلے شخص ہیں جن کو یہ خدمت عطا ہوئی تھی، آسمان جاہ کے زمانہ وزارت میں مختلف اصلاحیں ہوئیں سررشتہ عدالت، اور کروڑگیری میں اصلاح ہوئی۔ موازنہ، مداخل مخارج میں تنظیم ہوئی آبرسانی رجسٹریشن کے دفاتر قائم ہوئے۔
اس کے علاوہ بعض سیاسی مقدمات مثلاً حبیب کا ہیرا کا مقدمہ، سرونیک کا ریلوے و معدنیات کا مقدمہ مہدی حسن کی میم کا مقدمہ۔ سرور الملک کے رشوت کا مقدمہ وغیرہ بھی آپ کی وزارت کے اہم ترین واقعات ہیں جو حیدر آباد کے میدان سیاست میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔
۱۳۱۱ھ میں آسمان جاہ نے مدار المہامی سے علٰحدگی اختیار کی اور ۱۳۱۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ درگاہ برہنہ شاہ میں مدفون ہوئے۔
آسمان جاہ کو سیر و سیاحت سے دلچسپی تھی یورپ کے کئی ممالک دیکھے، مصر میں خدیو مصر سے ملاقات کی۔ ہندوستان کے شمالی و جنوب کے کئی شہر کا معائنہ کیا۔
انگلستان میں آپ کی بڑی عزت و وقعت ہوتی تھی، کئی دعوتیں ہوئیں تھیں زمانہ وزارت میں "سر" کا خطاب ملا تھا۔
آپ کو تعمیر عمارات کا بڑا شوق تھا، بشیر باغ، آسمان گڈھ، اکبر باغ، سرور نگر کا باغ سب آپ کی یادگار ہیں، اس کے علاوہ اجمیر کا سماع خانہ، درگاہ حضرت شاہ خاموش، عمدہ ساگر، چوک کی گھڑیال، آپ ہی کے تعمیر کئے ہوئے ہیں۔
آسمان جاہ نہایت وسیع اخلاق، شرم و حیا کے پتلے تھے، اپنے ملازمین کی بڑی قدر کرتے ان کے متوسلین کے ساتھ حسن سلوک کرتے تھے۔
نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کی صاحبزادی سے آپ کی شادی ہوئی تھی، مگر ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔
نواب معین الدین خان (امانت جنگ معین الدولہ بہادر) آپ کے اکلوتے فرزند ہیں۔ جو معین المہامی کی خدمت کئی سال تک انجام دے چکے ہیں اور شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا دیوان معدن سخن آج کل زیر طبع ہے۔

محمد مظہر الدین خان رفیع جنگ بشیر الدولہ عمدۃ الملک
اعظم الامرا امیر کبیر آسمان جاہ بہادر

محمد فضل الدین خان سکندر جنگ اقبال الدولہ اقتدار الملک
سر وقار الامراء

اقبال الدولہ وقار الامرا

تولد ۱۲۷۲ھ وفات ۱۳۱۹ھ

محمد فضل الدین خاں المخاطب سکندر جنگ اقبال الدولہ اقتدار الملک وقار الامرا کے والد محمد رشید الدین خاں امیر کبیر میں آپ نواب شمس الامرا کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۲۷۲ھ میں ولادت ہوئی اور ۱۳۱۹ھ میں عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔

ابتدا اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم پائی، جوانی میں انگریزی تعلیم سے بھی استفادہ فرمایا۔

نواب آسماں جاہ کی وزارت کے زمانہ میں آپ نے صدر المہام مالگزاری کی خدمت انجام دی۔ ان کے بعد مدار المہامی کی خدمت جلیلہ پر سرفراز ہوئے (۱۳۱۱ھ) سات سال سے زیادہ اس خدمت کو انجام دے کر ۱۳۱۹ھ میں مستعفی ہوئے اور چند ماہ بعد انتقال فرمایا۔ خاندانی قبرستان درگاہ برہنہ شاہ میں سپرد خاک کئے گئے۔

نواب فضل الدولہ آصفجاہ خامس کی دختر نیک اختر سے آپ کا بھی عقد ہوا۔ ان کے بطن سے آپ کے فرزند نامور خنجر جنگ سلطان الملک کی پیدائش ہوئی آپ کے دوسرے فرزند محمد ولی الدین خاں المخاطب ولی الدولہ مرحوم تھے۔

وقار الامرا یورپ بھی تشریف لے گئے تھے اور آٹھ ماہ تک وہاں آپ کا قیام رہا۔ یورپ کے طریقہ تعلیم سے بہت متاثر ہوئے اور اپنے دونوں لڑکوں کو وہاں تعلیم کے لئے روانہ فرمایا۔ ولی الدولہ مرحوم کئی سال تک ریٹن کالج میں زیر تعلیم رہے۔

وقار الامرا داد و دہش میں بڑے مشہور تھے، نہ صرف اپنے ذاتی خزانہ سے بلکہ دیوانی کے زمانہ میں سرکاری خزانہ سے بھی آپ نے خوب سخاوت فرمائی۔

آپ کے زمانہ وزارت میں سررشتہ علوم و فنون کا قیام عمل میں آیا تھا۔ مولانا سید علی بلگرامی نے کئی کتابوں کا ترجمہ فرمایا اور پھر مولانا شبلی مرحوم اس سررشتہ کے ناظم تعلیمات ریاست تھے۔ مولانا نے کئی کتابیں اسی زمانہ میں تالیف فرمائیں۔

وقار الامرا نے بصرف کثیر فلک نما کی تعمیر فرمائی تھی۔ مگر اس کے بعد قرضہ کی وجہ سے ۲۲ لاکھ میں اس کو اعلیٰ حضرت کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

نواب وقار الامرا کے چھوٹے فرزند نواب ولی الدولہ بہادر نے کئی سال تک صدر اعظمی کی خدمت انجام دی۔ وہ اپنے اخلاق سادہ اور نیک طبع کی وجہ سے بہت ہر دل عزیز تھے چنانچہ دو سال قبل جب وہ حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے اور وہیں انتقال فرمایا تو اہل ملک کو ان کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔ ان کی بیگم صاحبہ کو علم و فضل اور اصلاح نسواں سے خاص شغف ہے اور حیدرآباد کی کوئی مجلس نسواں ان کے مشوروں اور امداد سے محروم نہیں رہتی

مہاراجہ یمین السلطنت بہادر

تولد ۱۲۸۰ھ

رائے کشن پرشاد المخاطب راجہ راجایان مہاراجہ راجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت بہادر۔ راجہ ہرکشن کے فرزند اور راجہ نریندر بہادر کے نواسے ہیں۔

حیدرآباد میں ۱۲۷۹ھ میں آپ کی ولادت ہوئی نانا کی نگرانی میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ گھر کی تعلیم کے بعد مدرسہ عالیہ میں تعلیم پائی۔ اُردو، فارسی، عربی، انگریزی وغیرہ میں کافی مہارت حاصل فرمائی۔

نانا کے انتقال پر ان کی جاگیرات آپ کے نام بحال کی گئیں اور ۱۳۱۰ھ میں خدمت پیشکاری و معین المہامی فوج سے سرفراز کئے گئے، سرو قار الامراء کے مستعفی ہونے پر خدمت جلیلہ مدار المہامی پر اولاً منسرم ۱۳۱۹ھ اور پھر مستقل کئے گئے ۱۳۲۰ھ کامل دس سال کے بعد ۱۳۳۰ھ میں اس سے مستعفی ہوئے۔ دوبارہ ۱۳۴۲ھ میں صدارت عظمیٰ پر آپ کا تقرر ہوا۔ ذیحجہ ۱۳۵۵ھ میں بوجہ پیرانہ سالی آپ نے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

آپ کا زمانہ مدار المہامی اور صدارت عظمیٰ اہم واقعات اور انتظامات سے مملو ہے جس کی مختصر صراحت بھی طویل صفحات کی متقاضی ہے۔

اعلیٰحضرت آصفجاہ سادس غفران مکان نے آپ ہی کی مدار المہامی کے زمانہ میں فردوس بریں کی راہ لی اور اعلیٰحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ برار کے متعلق قطعی تصفیہ ہوا، بیسیوں جدید محکمے قائم ہوئے، بیسیوں دفاتر کی اصلاح و تنظیم ہوئی، نئی اسکیمیں جاری ہوئیں۔ محکمہ جات فینانس، تعمیرات، مالگزاری، عدالت، تعلیمات، فوج غرض ہر ہر سررشتہ میں اس قدر اصلاحیں ہوئیں کہ ان کا اظہار دشوار ہے۔

مہاراجہ بہادر کی ذات محاسن اور اخلاقی خوبیوں سے مملو ہے۔ آپ کی عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت، تلنگی، مرہٹی، اردو، ہندی لیاقت مسلمہ ہے آپ اُردو، اور فارسی کے زبردست شاعر اور ادیب ہیں، داغ اور آصف سے تلمذ حاصل ہے نعت اور تصوف میں آپ کا کلام نہایت دلچسپ اور دل آویز ہوتا ہے۔ شاد آپ کا تخلص ہے۔

مشرقی امراء کا آپ زندہ نمونہ ہیں، حسن واخلاق، سخاوت، مروّت، رواداری آپ کے خصوصی اور امتیازی جوہر ہیں، فقیر دوست، فقیر منش اور صوفی مشرب ہیں، آپ کے یہاں ہمیشہ فقرا، صوفیا، مشائخین، شعرا، و اہل کمال کا مجمع رہا کرتا ہے۔ مشاعرے ہوا کرتے ہیں۔

مہاراجہ بہادر کو تصنیف و تالیف سے بھی شغف ہے کئی درجن کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں، نظم و نثر پر آپ کو پورا عبور حاصل ہے، نہایت خوش خط ہیں، درگاہوں، مندروں، مسجدوں کی زیارت کا شوق ہے۔ ہندوستان کے مشہور زیارت گاہوں خواہ ہندوؤں سے متعلق ہوں یا مسلمانوں کی آپ نے دونوں کی زیارت کی ہے۔

علم دوستی، سخاوت، رواداری میں آپ اپنے جد اعلیٰ مہاراجہ چندو لعل کے مکمل نمونہ ہیں۔

گورنمنٹ انگریزی میں بھی آپ کو اعزاز حاصل ہے چنانچہ "کے، سی، آئی، ای۔ اور جی، سی، آئی، ای" کے خطابات آپ کو ملے ہیں۔ بہرحال مہاراجہ بہادر ایک نیک مزاج، خوش خلق اور مالک کے وفادار امیر ہیں۔

(ولادت ۱۳۰۶ھ)

نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ بہادر، عمادالسلطنت مختارالملک ثانی کے اکلوتے لخت جگر ہیں۔ ۱۴ر شوال ۱۳۰۶ھ کو بمقام پونا آپ کی ولادت ہوئی۔ ایک ماہ کے اندر ہی سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور پھر مدرسہ عالیہ میں شریک کئے گئے۔ ۱۹۰۲ء میں آپ نے مڈل کا امتحان کامیاب کیا اور پھر میٹرک میں کامیاب ہوئے۔ آپ نے مدرسہ میں اپنے حسن اخلاق سے نہ صرف ہم کلاس طلبہ کو گرویدہ کر لیا بلکہ اساتذہ کو بھی اپنا مداح بنا دیا۔ مسٹر سیڈن سابق پرنسپل آپ کی طالب علمانہ خوبیوں کا ہمیشہ اعتراف کرتے رہے۔

اعلیٰ حضرت سلطان العلوم نے اپنی مسند نشینی کے پہلے ہی سال آپ کے اسٹیٹ کی کورٹ کی نگرانی کو برخاست کر کے آپ کی نگرانی میں دے دیا۔ بااختیار ہو کر آپ نے اپنے جاگیرات کا دورہ کیا رعایا کی حالت بچشم خود معائنہ کر کے ان کی اصلاح اور صلاح و فلاح کے احکام دئے۔

اس لئے نومبر ۱۹۱۲ء مطابق ۲۰ رجب ۱۳۳۰ھ میں آپ مدارالمہامی کی جلیل القدر خدمت سے سرفراز کئے گئے تقریباً تین سال آپ نے اس خدمت کو انجام دیا آپ کے زمانہ میں کئی جدید محکمے قائم ہوئے آبپاشی، آبرسانی کو وسعت ہوئی تعمیرات کی ترقی ہوئی، تعلیمات میں جدید اسکیم نافذ ہوئے جس کی تفصیل آخر میں درج ہے۔

محرم ۱۳۳۳ھ کو آپ نے خدمت مدارالمہامی سے سبکدوشی حاصل کی علم و فن، تعلیم، صنعت و حرفت سے آپ کو بڑی دلچسپی ہے اس کی تفصیلی صراحت کا یہاں موقع نہیں ہے۔ البتہ چند امور درج کئے جاتے ہیں:۔

مدرسہ دارالعلوم کی ساٹھ سالہ جوبلی کی آپ نے صدارت فرمائی اور حوصلہ افزا خطبہ سنایا۔ آپ ہی کے عہد وزارت میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔

مسلم یونیورسٹی کو ایک لاکھ کا گراں قدر چندہ عطا فرمایا۔ اور سالانہ بارہ سو روپئے بحال رکھے۔ انجمن ترقی اردو کو دس ہزار کا چندہ دیا۔ غرباء اور متوسلین کی تعلیم کی طرف خاص توجہ مبذول ہے۔ ہونہار طلبہ کو ہندوستان اور یورپ میں تعلیم پانے کے لئے وظائف سے امداد فرماتے ہیں۔

صنعت و حرفت کے فروغ کے لئے آپ نے دلچسپی لے کر کئی کمپنیوں کی ڈائرکٹری قبول فرمائی ہے اور بعض کمپنیاں خود آپ نے قائم کیں جو کامیابی سے چل رہی ہیں۔

آپ کا سب سے زیادہ قابل قدر کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے "ولی" کے دو صد سالہ جشن کی صدارت فرمائی اور دکھنی ادب کی سرپرستی کا اعلان کیا چنانچہ آپ کی توجہ اور گراں قدر عطیہ سے بیسیوں دکھنی ادب کی قابل قدر کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو رہی ہیں۔ یہ آپ کا وہ کارنامہ ہے جس پر موجودہ اور آئندہ نسلیں فخر کریں گی زمانہ مٹا سکے گا اور نہ حوادثات اس کو محو کر سکیں گے۔

ایک اور عظیم بالشان اسکیم آپ کے زیر غور ہے وہ یہ ہے کہ آپ کا ارادہ ہے کہ ایک عالی شان محل تعمیر کیا جائے اور اس میں

آپ کے یہاں کے عجائبات اور نادر روزگار اشیاء اور نایاب کتابیں وغیرہ پبلک استفادہ کا موقع دیا جائے۔

یہہ اسکیم جس قدر مفید جس قدر ضروری اور کار آمد ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا' خدا سے دعا ہے کہ آپ کے نیک ارادے کو جلد عملی صورت نصیب ہو جائے۔

نواب سالار جنگ بہادر کے عہد وزارت میں قانون، قواعد اوزان و پیمانہ جات جاری کئے گئے۔ مسالح پر سند یافتہ ملاؤں کا جو ماہوار باب ہوں آمد کرنے کا حکم دیا گیا عارضی دستور العمل تحفظ ممالک محروسہ سرکار عالی نافذ کیا گیا اور مسٹر ویکفیلڈ کمشنر قحط مقرر کئے گئے۔ اراضی نامہ جات جو بنا وابستہ کی شنوائی کے وقت پیش ہوں ان کا قطعی تصفیہ تعلقداران ضلع کو کرنے کا حکم ہوا سیول سرویس کلاس قائم ہوی اور قواعد داخلہ و انتخاب طلبہ بنائے گئے، قانون تادیب خانہ جات ممالک محروسہ سرکار عالی نافذ ہوئے۔ جدید جوڈیشل کمیٹی کی تنظیم عمل میں لائی گئی، ٹائپنگ بورڈ کا قیام منظور فرمایا گیا انگریزی الفاظ کے سرکاری مراسلات میں استعمال کرنے کی ممانعت فرمائی گئی ضابطہ جوڈیشل کمیٹی ممالک محروسہ سرکار عالی نافذ کیا گیا قواعد پولیس ٹریننگ اسکول جاری کئے گئے حسب ذیل طلبہ کو وظیفہ تعلیمی یورپ والیشاء دیا گیا:۔

(۱) سمیع اللہ شاہ بی ایس سی ولد سید احمد اللہ سول انجینیرنگ۔ ۲۔ سید محمد یونس بی اے ولد سید عطا حسین سول انجینیرنگ۔ ۳۔ حیدر علی خاں بل یم یس ولد حلیم دادے علی طبابت۔ ۴۔ محمد الیاس برنی ام اے ولد محمد ابراہیم (زیر تصفیہ)

وظایف تعلیم ایشیا

۱۔ محمد سراج الدین احمد ولد ڈاکٹر معین الدین انجینیرنگ ۲۔ ام اے۔ لمار یلو ولد یم ل اندیا طبابت۔ ۳۔ دی ایچ کوناپور ولد ہنمنت راؤ کوناپور طبابت محکمہ آثار قدیمہ ممالک محروسہ سرکار عالی قائم کیا گیا اور غلام یزدانی صاحب بی اے کا س کی نظامت پر تقرر ہوا قانون انجمن ہائی امداد قرضہ نافذ ہوا۔ قواعد نگرانی اقوام جرائم پیشہ جاری کئے گئے اور قواعد امتحان زبان دانی عہدہ داران سررشتہ تعلیمات نافذ ہوئے۔

نواب صاحب نے گذشتہ نو سال کے عرصے میں تقریباً پچانوے ہزار روپے سے ہندوستان اور انگلستان میں تعلیم پانے والے طلبہ کی امداد فرمائی اور تقریباً اٹھارہ ہزار روپے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور مدرسہ آصفیہ کی ماہانہ امداد میں اور تقریباً بیس ہزار روپے اخبارات و رسائل کے چندوں میں عطا کئے ہیں۔ اس کے علاوہ موقتی طور پر علمی و ادبی انجمنوں اور اصحاب کو بھی خاطر خواہ رقمی امداد کرتے رہتے ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی

ایمان سخن

ادارۂ ادبیات اردو کے سلسلۂ انتخابات شعرائے دکن کی ایک دلچسپ کتاب جس میں مولوی سید محمد صاحب ام اے نے نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد کے ملک الشعراء کا کلام انتخاب کر کے اپنے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے قیمت ۱۲ر

نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ بہادر

سید پرورش علی خان معظم الدولہ

سر سید علی امام مونڈالملک مرحوم

سر سید علی امام المخاطب بہ مونڈالملک مرحوم آپ کے والد سید امداد امام مرحوم [illegible] پٹنہ کے رؤسا سے تھے آپ کا خاندان سادات بارہہ سے تعلق رکھتا ہے۔

سید علی امام کی پیدائش ۱۸۶۹ء میں مضافات پٹنہ میں ہوئی والد کی نگرانی میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ سید امداد امام مرحوم خوش قسمت تھے کہ ان کے دونوں فرزند سید علی امام اور حسن امام ہندوستان کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے

سید علی امام میٹرک کی تعلیم کے بعد ضلع کے اسکول میں شریک ہوئے بعد ازاں پٹنہ میں کالج کی تعلیم پائی اس کے بعد انگلستان جا کر بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی ۱۸۹۰ء میں یورپ سے واپس آئے اور پٹنہ میں وکالت شروع کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں پٹنہ ہائی کورٹ کے وکلاء میں ممتاز خصوصیت پیدا کرلی۔

آپ ہی وہ پہلے مسلمان ہیں جو وائسرائے ہند کی کونسل میں ممبر کی حیثیت سے مامور کئے گئے کئی سال تک آپ نے اس خدمت کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ ایک طرف گورنمنٹ آپ کے کام کی قدردان اور آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی تو دوسری طرف رعایا میں بھی ہر دل عزیز تھے اس قسم کی خوش نصیبی بہت کم صاحب کو میسر آتی ہے۔

اس خدمت کے بعد پھر آپ نے وکالت شروع کی مگر بہت جلد پٹنہ ہائی کورٹ میں جج ہو گئے اور اس کے بعد بہار کی کونسل میں ممبر ہوئے اسی خدمت سے آپ حیدرآباد میں طلب کئے گئے ۱۳۳۸ھ (۱۹۱۹ء) اور صدارت عظمیٰ کی جلیل القدر خدمت آپ کے تفویض کی گئی۔ اسی زمانہ میں مونڈالملک کا خطاب بھی آپ کو دیا گیا۔ آپ کے صدارت عظمیٰ کے زمانہ میں یہاں کئی اصلاحیں ہوئیں اور جدید تنظیمات ہوئیں جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:۔ (۱) باب حکومت کا قیام ہوا اور سررشتہ جات کی جدید تنظیم ہوئی (۲) دفتر ترقیات عامہ کا قیام ہوا جس سے آباد مقامات کو آباد کرنے اور آبادی کو وسعت دینے کی بڑی اسکیم پیش نظر تھی۔ (۳) عدالت اور مال کے حکام کی علیحدگی عمل میں آئی تعلقدار اور تحصیلداروں سے عدالتی اختیارات علحدہ کر کے عدالت کے لئے جدید عہدہ دار مقرر کئے گئے (۴) دفاتر سرکار عالی میں تنخواہ کے متعلق جدید تنظیم نام اسکیل کا نفاذ عمل میں آیا (۵) معاہدات پر نظر ثانی ہوئی اس کے علاوہ بھی جدید کئی اصلاحیں ہوئیں ان کی صراحت طوالت کا موجب ہے۔

حیدرآباد ہی کے زمانہ میں آپ جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنز) میں ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک کئے گئے ۱۳۴۱ھ میں سر مونڈالملک نے صدارت عظمیٰ سے کنارہ کشی اختیار کرلی مگر اس کے بعد بھی وہ مشیر کی حیثیت سے اپنے انتقال تک حیدرآباد آتے تھے۔

سر علی امام نے بحیثیت ہندوستانی اور بحیثیت مسلمان ہندوستان میں بہت کچھ کام کئے ہیں وہ مسلم لیگ کے صدر نشین بھی ہوتے تھے ہندو اور مسلم دونوں میں وہ ہر دل عزیز تھے۔

سر علی امام بڑے خوددار، مدبر، سیاست داں تھے وہ حسنِ اخلاق اور حسن سیرت سے آراستہ تھے۔ ۱۹۳۲ء میں انتقال ہوا رانچی میں دفن کئے گئے۔

رائٹ آنریبل سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ

محمد اکبر المخاطب رائٹ آنریبل سر حیدر نواز جنگ بہادر کے والد نذر علی مرحوم کھمبات کے متوطن اور بمبئی کے نامی گرامی تاجر تھے حیدری آپ کا خاندانی لقب ہے۔

سر اکبر کی ولادت نومبر ۱۸۶۹ء میں بمبئی میں ہوئی' ابتدائی تعلیم اپنی والدہ اور نانی سے پائی' آپ کی نانی بمبئی کے مشہور جسٹس بدرالدین طیب جی کی حقیقی بہن تھیں۔ بمبئی کے سینٹ زیویر کالج سے سترہ سال کی عمر میں آپ نے بی اے میں کامیابی حاصل کی اس سے آپ کے تعلیمی شوق' خداداد حافظہ اور غیر معمولی ذہن کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

تعلیم کے بعد سر اکبر گورنمنٹ آف انڈیا کی سلک ملازمت میں داخل ہوئے اولاً ناگپور کے صیغہ حساب میں ایک افسر کی حیثیت سے مامور ہوئے (۱۸۸۸ء) اس کے بعد لاہور پھر کلکتہ میں کارگذار رہے' اور وہاں سے الہ آباد کی محاسبی میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل کی جگہ پر ترقی ملی الہ آباد سے آپ کا تبادلہ بمبئی میں ہوا' اور پھر بمبئی سے مدراس کی ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرلی پر مامور کئے گئے' اسی خدمت سے آپ حیدرآباد میں طلب کئے گئے۔

مدراس کی ملازمت کے زمانے میں آپ ہندوستان و برما کے سرکاری مطابع کی جانچ پڑتال پر مقرر کئے گئے تھے اس کام کو بھی آپ نے نہایت خوبی سے انجام دیا۔

۱۹۰۵ء (۱۳۱۵ف) میں سر اکبر حیدری کا تقرر صدر محاسبی سرکار عالی پر ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر ۳۶ سال کی تھی دو سال کے بعد معتمدی فینانس پر آپ کا تقرر ہوا اور پھر ۱۳۲۰ف (۱۹۱۱ء) میں معتمد عدالت و کوتوالی امور عامہ پر تبادلہ ہوگیا۔ اس خدمت پر ایک طویل زمانے تک مامور رہے۔ کچھ عرصے تک اس خدمت کے ساتھ آپ نے صدر ناظم صنعت و حرفت کا کام بھی انجام دیا۔

۱۳۳۲ف (۱۹۲۰ء) میں سر اکبر سرکار عالی کی ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کر کے بمبئی میں اکاؤنٹنٹ جنرل کی خدمت پر مامور ہوگئے مگر اس کے چند ماہ بعد پھر جولائی ۱۹۲۱ء میں صدر المہام فینانس کی جگہ آپ کا تقرر ہوا اس طرح آپ دوبارہ سرکار عالی کی سلک ملازمت میں شامل ہوگئے۔

صدر المہامی فینانس کے بعد ۱۳۵۵ف (۱۹۳۶ء) میں سر اکبر صدر اعظم کی جلیل القدر خدمت پر مامور کئے گئے اور تقریباً دو سال سے آپ اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔

جس زمانہ میں سر اکبر حیدرآباد آکر صدر محاسب ہوئے تھے' اس وقت صدر المہامی اور مدار المہامی (صدر اعظم) کے خدمات حیدرآباد کے مخصوص امراء اور جاگیرداروں کے لئے مختص تھے کسی اعلیٰ عہدہ دار کا خواہ وہ معتمد ہی کیوں نہ ہو ترقی پا کر صدر المہام یا صدر اعظم ہو جانا محال تھا اس لئے اس وقت یہ شائبہ نہیں تھا کہ ایک دن سر اکبر صدر اعظم کی جلیل القدر خدمت پر مامور ہو جائیں گے۔

لیکن ایک زمانہ وہ آیا کہ اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع کے تدبر اور دور بین نظر کے باعث قابل اور لائق اشخاص اپنی اعلیٰ قابلیت اور عمدہ لیاقت کے باعث صدر المہام اور صدر اعظمی پر ترقی پانے لگے۔ اس قسم کا سب سے پہلا اعزاز سر فرید ون الملک کو ملا تھا

مہ صدد علی امام جی ثبد الملک

رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری صدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم

سرکار عالی کی ایک معمولی خدمت سے ترقی کرتے ہوئے سب سے اعلیٰ خدمت صدر اعظمی پر مامور کئے گئے تھے۔ ان کو یہ اعزاز محض ان کی لیاقت، قابلیت، دیانت اور وفاداری کے طفیل ملا تھا۔ سر فریدون الملک کے بعد سر اکبر وہ شخص ہیں جو سرکار عالی کی صدر محاسبی سے ترقی کرتے ہوئے صدر اعظمی پر سرفراز کئے گئے ہیں، سر اکبر کو بھی یہ خدمت انہی کی طرح لیاقت قابلیت کے بل بوتے پر ملی ہے

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے سر اکبر ہندوستان کے کئی صوبوں سی پی، پنجاب، بنگال، یوپی، بمبئی اور مدراس میں مامور رہے ہر جگہ آپ نے سرکاری خدمات کو حسن و خوبی سے انجام دیا اور اپنے بعد وہاں اپنی خوش گوار یاد چھوڑی۔ حیدرآباد میں بحیثیت معتمدی اور صدارالمہامی مختلف سررشتہ جات آپ سے متعلق رہے، ہر سررشتہ میں دلچسپی لے کر آپ نے اصلاح کی کوشش فرمائی جن کی تفصیل اس موقع پر طوالت کا موجب ہوگی۔

لیکن خصوصیت سے بعض سررشتہ جات کا ذکر ضروری ہے کیونکہ اس کے اظہار کے بغیر آپ کے حالات مکمل نہیں ہوسکتے سررشتہ آثار قدیمہ کا قیام آپ کی توجہ کا رہین منت ہے۔ سررشتہ طبابت کی اصلاح آپ کا ایک کارنامہ ہے۔

سررشتہ تعلیمات کی جدید تنظیم اور جامعہ عثمانیہ کا افتتاح آپ کے نمایاں خدمات سے تعلق رکھتا ہے۔ یوں تو حیدرآباد میں مختلف اوقات میں "جامعہ" کے قیام کا مسئلہ زیر بحث ہوا اور مختلف اصحاب حل و عقد نے اس کی طرف توجہ کی لیکن عملی کام کسی نے نہیں کیا۔ بہ حال "جامعہ عثمانیہ" کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ سررشتہ داری سہ سالہ مالیاتی تنظیم کا قاعدہ ریلوے کی خریدی، سررشتہ صنعت و حرفت نیز اس کی ترقی کے لئے ایک گراں قدر رقم کا مختص کرنا حیدرآباد سیول سروس کی تنظیم اور ان کو اعلیٰ خدمات پر مامور کرنا یہ سب [illegible] کی کارگزاریوں میں شامل ہے یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ سر اکبر کو خوش نصیبی سے اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ جیسا حکمراں نصیب ہوا اور آپ کی اسکیموں کو اپنی معارف نوازی اور رعایا پروری کے باعث منظوری سے ممتاز فرمایا۔

صدر المہامی فینانس کے زمانہ میں سر اکبر نے حیدرآباد کے نمائندہ کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شرکت فرمائی ہے۔

نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر کو پبلک امور سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ طغیانی رود موسیٰ، طاعون، انفلوئنزا وغیرہ کے زمانہ میں نہایت توجہ اور دلچسپی سے آپ نے کام کیا ہے۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے صدر آپ ہی ہوئے تھے اور آپ کی توجہ سے کانفرنس نے بہت کچھ کامیابی حاصل کی تھی۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مسلمانان جنوبی ہند کی تعلیمی کانفرنس کے آپ صدر رہے ہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سینیٹ کے رکن ہیں بہر حال آپ کے سرکاری خدمات کی طرح پبلک خدمات کی تفصیل بھی ایک مضمون کی متقاضی ہے۔

سر اکبر کو مذہب سے بڑا شغف ہے وہ صوم و صلوٰۃ کے سختی سے پابند ہیں بزرگان دین کے قبور کی زیارت اور مشائخین و صوفیا کی ملاقات کا آپ کو بڑا اشتیاق رہا کرتا ہے۔ آپ سادگی پسند ہیں، اسراف کو ناپسند کرنے والے، اوقات مقررہ کی پابندی کرنے والے، سرکاری کام کرنے کے شوقین، ہر وقت مصروف رہنے کے عادی ہیں۔

سر اکبر بحیثیت ایک ماہر فینانس، بحیثیت ماہر تعلیم، بحیثیت سیاسی مدبر، بحیثیت معاشی و اقتصادی ماہر اپنی آپ نظیر ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی

عہدِ آصفی کے امراء

اس کے قبل عہدِ آصفی کے مدارالمہاموں اور صدرِ اعظموں کے حالات اور تصاویر درج کی گئیں۔ اب عہدِ آصفی کے ان خاص خاص امراء کے حالات اور تصویریں شامل کی جاتی ہیں جو اپنے کارناموں اور شہرت کی وجہ سے بہت مشہور تھے یا جو نائب حضور کے درجے تک پہنچے تھے۔

نواب درگاہ قلی خاں سالار جنگ

نواب ذوالقدر اصل نام تھا سنہ ۱۱۲۲ھ میں بمقام سنگمنیر پیدا ہوئے۔ ان کے والد خاندان قلی خاں کی پرورش اور حضرت مغفرت مآب نواب آصف جاہ اول کی تربیت سے ان کی فطری قابلیت بہت جلد نمایاں ہوگئی۔ سن رشد کو پہنچنے سے قبل ہی اکثر علوم و فنون میں مہارت حاصل کرلی منکسر المزاجی کے ساتھ طبیعت میں شوخی اور ظرافت بھی تھی۔ فن موسیقی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ ۱۱۵۱ھ میں آصف جاہ بہادر کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا اور نادر شاہی حملہ کے زمانہ میں اپنے مربی کی حفاظت میں غیر معمولی جاں بازی کا ثبوت دیا جس سے ان کی شجاعت کا ثبوت ملتا ہے دہلی سے واپس ہوکر اپنے سفر کے حالات کا ایک تفصیلی تذکرہ قلمبند کیا جو مرقع دہلی کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس میں بارھویں صدی کی دہلی کے معاشرتی، تمدنی، تاریخی اور ادبی حالات نہایت تفصیل سے درج ہیں۔ شاعری سے فطری لگاؤ تھا اکثر فی البدیہہ اشعار کہتے تھے خود مشاعرے منعقد کرتے اور اپنی غزل آپ پڑھتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی افسوس ہے کہ بجز چند مرثیوں کے ان کا اردو و فارسی کلام دستیاب نہ ہوسکا چیدہ چیدہ اشعار کہیں کہیں تذکروں میں ملتے ہیں۔

دکن کے اکثر عہدہائے جلیلہ پر فائز رہنے کے بعد تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں ۱۱۸۱ھ میں ان کا انتقال ہوا اور اپنے خاندانی مقبرہ واقع اورنگ آباد میں مدفون ہوئے۔ نمونۂ کلام حسب ذیل۔

قصیدہ

پڑی ہے آ کے گلے ناگہاں بلائے سفر — سفر نہیں ہے سفر ہاں سقر سے ہے بدتر
غرض کہ سخت مصیبت میں ہیں وضیع و شریف — غنی فقیر سبھی احتیاج میں مضطر
اسی تردد افکار میں لگی تھی غنود — کہ ناگہ خواب میں دیکھا قریبِ وقتِ سحر
کھڑا ہے آ کے سرہانے یہ پیر نورانی — لطیف عنصر و خوش منظر و خجستہ سیر

کیا کمال عنایت سے کیا ہے فکر تجھے — ہے تیرے کام کا حامی امام جن و بشر
شہہ سریر کرامت امیر کل امیر — ولی حضرت مولی وصی پیغمبر
امام جن و ملک تاجدار ملک و ملکوت — کیا ہے لحمک لحمی جسے شہہ سرور
سوائے اس کے کہوں کون شان وو دادار ہے — خدا نے سیف دی او دی رسول نے چتر
ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہوں سے — کمینہ بندۂ درگاہ صاحب قنبر
مراد بندۂ درگہ وو دے کہ کرے — ابوتراب کی تربت کی خاک کحل بصر

مرثیہ

عالم میں پھر کے آیا پیغام غم محرم — سب انبیا اتب ہیں نگین اولیا پہ ماتم
اہل حرم ستم میں وان چاک اید دیدم — فریاد کر کے کہتے ہیں اے سرور دو عالم
اولاد پر تمہارے یہ کیا بلا ہے مبہم — کوئی لہو میں تملاتے کوئی خاک میں ہیں ہمدم
در دو الم تو اتنا جور و جفا ہے پیہم — سب مبتلا بلا میں فرصت نہیں ہے یکدم
بیہمت بیکساں را تقصیر چیست یارب
در ورطۂ بلا الت تدبیر چیست یارب

یہ قصۂ مصیبت ہے سخت درد جاں کوں — کیا کہوں اگر کہوں اب طاقت نہیں بیاں کوں
موقوف کر اے دل غمناک داستاں کوں — سب پر عیاں ہوا ہے حاجت نہیں بیاں کوں
توں سامع الدعا ہے مقصود بندگاں کوں — تجھ پر عیاں تو ہوا ن سید دو جہاں کوں
دنیا میں آبرو دے جنت روضۂ مہماں کوں — محمود وقت لرہن طلب تناں کوں
فیض طواف درگاہ شاہ عیب عاصی
از فضل تو تمنا دارد غریب عاصی

میر سعادت علی رضوی

تیغ جنگ شمس الامراء (وفات سنہ ۱۲۰۵ھ)

ابو الفتح خاں تیغ جنگ کے والد ابو الخیر خاں تھے، سلسلۂ نسب حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج سے ملتا ہے۔

ابو الخیر خاں کو دربار مغلیہ (محمد شاہ) سے "خان بہادر" کا خطاب عطا ہوا تھا۔ حضرت آصفجاہ اول کے ہمراہ رکاب دکن آئے۔ آصفجاہ نے دو ہزاری منصب پانچ سو سوار کا اعزاز عطا کیا اور کئی ہزار کی جاگیر ذات مرحمت فرمائی تھی۔

وہ مالک کے بڑے وفادار اور جاں نثار تھے۔ چنانچہ جب ناصر جنگ شہید نے باپ کے خلاف صف آرائی کی تو ابو الخیر خاں کو بھی اپنا طرفدار بنانا چاہا۔ لیکن انھوں نے آصفجاہ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اسی وفاداری کے طفیل میں زمانہ مابعد میں خود ناصر جنگ نے ان کو "شمشیر بہادر" اور صلابت جنگ نے امام جنگ کے خطاب سے عزت افزائی کی۔ برہان پور میں ابو الخیر خاں کا انتقال سنہ ۱۱۶۶ھ میں ہوا وہیں مدفون ہوئے۔

تیغ جنگ کی پیدائش برہان پور میں ہوئی۔ والد کے انتقال کے بعد اپنی جاگیر میں خانہ نشین تھے، نواب صلابت جنگ نے اپنے سفر برہانپور (سنہ ۱۱۶۱ھ) کے وقت آپ کو دربار کے امیروں میں شامل فرمایا۔ اس کے بعد آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علیخاں نے خاص توجہ مبذول فرمائی اور آپ کے مراتب میں بیشی ہوتی گئی۔ تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامرا (اول) کے خطابات عطا ہوئے۔ کئی لاکھ کی جاگیر مرحمت ہوئی۔

نواب رکن الدولہ میر موسیٰ خان کے انتقال پر حضرت آصفجاہ نے آپ کو قلمدان دیوانی سے بھی سرفراز کرنا چاہا، مگر آپ نے میدان جنگ کے مقابلہ میدان سیاست کو پسند نہیں فرمایا۔

پائیگاہ کے آپ ہی بانی ہیں، حضرت آصفجاہ ثانی نے کئی لاکھ کی جاگیر فوج کے لئے عطا فرمائی تھی، علاوہ جاگیرات کے نقد رقم بھی اس کے لئے مرحمت ہوتی تھی۔ پائیگاہ کی یہ فوج شاہی محافظ (باڈی گارڈ) کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے سوار بہادر اور دلاور ہونے اور معقول تنخواہ پاتے تھے، تیغ جنگ کے چار رشتہ دار امجد الملک، سردار الملک، امام الملک اور اعظم الملک اس فوج کے اعلیٰ افسر تھے۔ تیغ جنگ کو اپنی فوج کے ساتھ بڑا شغف تھا۔

بحالت سفر پانگل کے مقام پر سنہ ۱۲۰۵ھ میں انتقال ہوا۔ لاش کو حیدرآباد لاکر درگاہ برہنہ شاہ میں دفن کیا گیا۔

شمس الامراء ثالث امیر کبیر (ثانی) (ولادت سنہ ۱۲۲۰ھ وفات سنہ ۱۲۹۴ھ)

امیر کبیر ثانی کا نام محمد رفیع الدین خان تھا۔ آپ فخر الدین خان امیر کبیر (اول) کے بڑے فرزند تھے جن کا ذکر وزرائے سلطنت کے سلسلہ میں گزر چکا ہے۔ شوال سنہ ۱۲۲۰ھ میں آپ کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی۔ ناموس جنگ عمدۃ الدولہ عمدۃ الملک شمس الامراء ثالث، امیر کبیر (ثانی) کے خطابات آپ کو سرفراز ہوئے تھے۔

نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کے انتقال پر اعلیٰحضرت غفران مکان کی صغر سنی کے باعث آپ نائب حضور کی حیثیت سے سلطنت آصفی کے کاروبار انجام دیتے رہے۔ اسی نائب حضوری کے زمانہ میں آپ کا انتقال ہوا (سنہ ۱۲۹۴ھ) میں خاندانی مدفن درگاہ حضرت برہنہ شاہ میں دفن کئے گئے۔

آپ کو علوم و فنون خصوصاً ریاضی اور ہیئت سے بڑی دلچسپی تھی۔ ریاضی میں آپ نے چند کتابیں تالیف فرمائی ہیں۔

محمد رفیع الدین خاں بہادر، جنگ عمدۃ الدولہ عمدۃ الملک
شمس الامراء امیر کبیر ثانی

رشید الدین خاں وقار الامرا شمس الامرا امیر کبیر

محی الدین خاں تیغ جنگ سر خورشید جاہ

فن تعمیر کا بھی شوق تھا۔ آپ کی بنوائی ہوئی کئی عمارتیں موجود ہیں۔ داد و دہش میں مشہور تھے آپ کی سخاوت اور فیاضی کا شہرہ دور دور تک پہنچا تھا۔ چنانچہ زمانہ شباب میں (سنہ ۱۲۴۲ھ) آپ ایک مرتبہ بیمار ہو گئے تھے یونانی حکما کے علاج سے فائدہ نہیں ہوا انگریزی علاج شروع کیا گیا جو اس زمانہ میں ایک عجوبہ سے کم نہیں تھا۔ ڈاکٹر آپ کے لئے تبدیل آب ہوا ضروری قرار دیا کلکتہ لے گئے۔ وہاں جہاز کے ذریعہ سمندر میں تفریح ہونے لگی اور خدا کے فضل سے آپ کو صحت کلی حاصل ہوگئی۔ ایک سال تک یہاں قیام رہا کلکتہ میں آپ نے اس قدر داد و دہش فرمائی اور ولایتی سامان اس کثرت سے خرید فرمایا کہ یورپ میں بھی آپ کا نام سخاوت اور قدر دانی کے لحاظ سے مشہور ہو گیا تھا آپ کو کوئی اولاد نہیں تھی

محمد رشید الدین خان شمس الامرا (رابع) امیر کبیر (ثالث)

(ولادت سنہ ۱۲۳۰ھ وفات سنہ ۱۲۹۹ھ)

محمد رشید الدین خاں، امیر کبیر فخر الدین خاں کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ بمقام حیدرآباد سنہ ۱۲۳۰ھ میں ولادت ہوئی اور سنہ ۱۲۹۹ھ میں انتقال ہوا پہلے آپ کو ابو الخیر خان بہادر جنگ، اقتدار الدولہ اقتدار الملک وقار الامرا کا خطاب عطا ہوا تھا اس کے بعد جب امیر کبیر ثانی رفیع الدین خان کا انتقال ہوا تو آپ کو خاندانی خطاب شمس الدولہ شمس الملک شمس الامرا امیر کبیر کے موروثی خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ نواب ناصر جنگ بہادر کے لئے نواب تہنیت جاہ ثالث سکندر جاہ بہادر کی صاحبزادی سے آپ کا عقد ہوا تھا جن کے بطن سے آپ کو دو صاحبزادے خورشید جاہ اور وقار الامرا تولد ہوئے۔

محمد رشید الدین خاں اپنے وقت کے صاحب تدبیر و سیاست تھے۔ اس زمانہ میں آپ کو سیاسی خدمات اور بڑے بڑے مناصب لئے مد جس طرح عبور حاصل تھا وہ اپنی آپ نظیر تھا۔ داد و دہش میں مشہور تھے اپنے بڑے بھائی کی طرح ان کو بھی سخاوت اور حیات سے دلچسپی تھی علوم و فنون کے قدردان تھے، علما، فضلا اور شعرا کی ہمت افزائی کرتے اور کافی صلہ دے کر ان کی قدر دانی فرماتے تھے

تاریخ سے خاص شغف تھا اسی شوق کے باعث تاریخ "رشید الدین خانی" آپ کی سرپرستی میں مرتب و شائع ہوئی

محمد محی الدین خان خورشید جاہ شمس الامرا (خامس) امیر کبیر (رابع)

(ولادت سنہ ۱۲۵۵ھ وفات سنہ ۱۳۲۰ھ)

محمد رشید الدین خان کے بڑے فرزند تھے سنہ ۱۲۵۵ھ میں ولادت ہوئی۔ آپ کی والدہ محترمہ حضرت شمس النسا صاحبہ، حضرت ناصر الدولہ کی صاحبزادی تھیں آپ کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام ہوا تھا۔ عربی، فارسی، ریاضی وغیرہ کی تعلیم کے لئے علما و علحدہ نواب صاحب نے مقرر کئے تھے سپہ گری کا بھی اہتمام تھا۔ بہ حال دادا کی نگرانی میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی دادا کی خاص توجہ باقی اس طرف رکھی ہوئی تھی

سنہ ۱۲۷۲ھ میں آپ کی شادی نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کی صاحبزادی حضرت جہاں النسا بیگم صاحبہ سے ہوئی اس زمانہ میں امیر کبیر اول آپ کے دادا بقید حیات تھے، بڑی دھوم سے یہ شادی ہوئی۔ دو ہفتہ تک شادی کے جشن ہوتے۔ تب دن میں ہر روز ضیافت ہوتی تھی حیدرآباد کی تاریخ میں یہ شادی اپنے دھوم دھام کے روز شان و شوکت کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر تھی۔

...بارہ آصفی سے مختلف اوقات میں آپ کو حسب ذیل خطابات سے متعز کیا گیا۔ ابوالخیر خاں، تیغ جنگ، خورشید الدولہ، خورشید الملک، خورشید جاہ، شمس الامراء، امیر کبیر۔

شمس الامراء اور امیر کبیر کے خطابات آپ پر ختم ہوگئے، پھر کسی کو آج تک یہ خطاب نہیں ملا۔

سرکار انگریزی میں آپ کے بڑے اعزاز تھے۔ "سر" کا خطاب ملا تھا اور آپ کی زندگی میں جس قدر ویسرائے ہند حیدرآباد آئے وہ آپ کے یہاں ضرور مدعو ہوتے تھے۔

سر خورشید جاہ کو اپنے باپ کی طرح میدان سیاست سے بڑی دلچسپی تھی۔ آپ اپنے زمانہ کے مدبر اور صاحب فراست تھے۔ کونسل آف اسٹیٹ کی کنیت پر اعلیٰحضرت غفران مکاں نے آپ کا تقرر فرمایا تھا۔

علم و فن سے دلچسپی تھی، تاریخ خورشید جاہی آپ کی سرپرستی میں شائع ہوئی۔ داد و دہش میں بھی شہرت رکھتے تھے۔ حجاز ریلوے کی تعمیر کے لئے پچیس ہزار کا چندہ دیا تھا۔ سیر و سیاحت کا شوق تھا۔ شمالی ہند اور جنوبی ہند کے کئی شہر دیکھے تھے۔ اپنی فوج کو باقاعدہ مرتب کیا تھا۔ فوجی وردی اور عمدہ ہتھیار دئے جو پائیگاہ میں اس سے پہلے نہیں تھے۔ ۱۳۲۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ درگاہ برہنہ شاہ میں دفن کئے گئے۔ آپ کو دو صاحبزادے تولد ہوئے، امام جنگ اور ظفر جنگ۔ آخرالذکر شہزادی حسن النساء بیگم صاحبہ کے بطن سے تھے۔

مکرم الدولہ میر پرورش علیخاں حسام جنگ

میر پرورش علی خان المخاطب حسام جنگ مکرم الدولہ، آپ کے والد نواب قمر الدولہ نواب سراج الملک کے داماد تھے اس طرح مکرم الدولہ نواب مختار الملک کے ہمشیرہ زادے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ مکرم الدولہ آپ کے داماد بھی تھے، نور النساء بیگم صاحبہ آپ سے بیاہی گئی تھیں۔

مکرم الدولہ کی تعلیم مدرسہ دارالعلوم میں ہوئی، اس مدرسہ کے افتتاح کے ساتھ ہی آپ نے اس میں شرکت فرمائی تھی، عربی، فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔

نواب مختار الملک نے مجلس مالگذاری قائم کی (۱۲۸۶ھ) تو اس مجلس کا آپ کو میر مجلس بنایا گیا، اس کے بعد جب مجلس برخاست ہو کر صدر المہام مقرر ہونے تو اس وقت آپ صدر المہام مالگذاری ہوئے۔

نواب مختار الملک کے سفر یورپ کے زمانہ میں آپ بشیر الدولہ کے ساتھ مل کر مدار المہامی کا کام بھی انجام دیتے رہے، آپ کی قابلیت مسلم تھی، اور عام و خاص میں آپ کی لیاقت کا شہرہ تھا۔

شادی کے ایک سال بعد (۱۲۹۶ھ) میں آپ خلل دماغ کی وجہ سے خانہ نشین ہوگئے، ۱۳۲۳ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ دائرہ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ آپ کو کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

نصیر الدین ہاشمی

جداگانہ تھی، اس کی علمی قابلیت اور شعرا و مصنفین کی قدردانی کے باعث آج تک اس کا نام زندہ ہے ۔

۱۱۸۱ھ میں تولد ہوئی اور ۱۲۳۶ھ میں اس کا انتقال ہوا، حیدرآباد میں کوہ مولا کے قریب مدفون ہے ۔

وہ صاحب منصب و جاگیر تھی، اس لحاظ سے بلند پایہ اور اعلیٰ حیثیت رکھتی تھی، اس کے موسیقی کے جلسوں میں ارسطو جاہ، اور میر عالم او وزرا حیدرآباد جیسی شخصیت کے اصحاب شریک ہوتے تھے، اور میر عالم نے تو ایک مثنوی اس کی مدح میں لکھی ہے، چندا کے پاس صرف پہرہ کے لئے پانچ سو سپاہی ملازم تھے، اس سے اس کی دولت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

چندا ایک باکمال ماہر موسیقی ہونے کے علاوہ وہ ایک نازک خیال اور بلند پرواز شاعرہ بھی تھی، اس کا دیوان ۱۲۱۳ھ میں ارسطو جاہ کے حکم سے مرتب ہوا ہے جس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، جو سر جان ملکم کو بطور تحفہ دیا گیا تھا ۔

وہ شاعری کے ساتھ شعرا کی قدردان بھی تھی، اس کے پاس ہمیشہ شعر و شاعری کی گرم بازاری رہا کرتی، شعرا کی ہمت افزائی بڑھانا اور حوصلہ افزائی بھی اس کا معمول تھا

چندا کو موسیقی، شاعری کے ساتھ تاریخ سے بھی شغف تھا، اسکی سرپرستی سے ایک تاریخ "دل افروز" کے نام سے لکھی گئی ہے، جو دکن کی معتبر تاریخوں میں شمار ہو سکتی ہے ۔

بہر حال چندا نے نہ صرف اپنی شاعری کے ذریعہ بلکہ شعرا و مصنفین کی سرپرستی کر کے بھی اردو زبان کی خدمت گزاری میں حصہ لیا ہے چندا کو شیر محمد خان ایمان سے تلمذ تھا ۔

موضع "اڈیکمٹ" اسی کی جاگیر میں تھا، جہاں آج جامعہ عثمانیہ کی پرشوکت اور شاندار عمارت تیار ہو رہی ہے،

چندا کا دیوان کوئی ضخیم دیوان نہیں ہے، اسکے کلام میں پاکیزگی اور لطافت کے ساتھ شعریت اور موسیقیت بھی ہے جسکی وجہ سے دلآویزی پیدا ہو گئی ہے، مبتذل جذبات اور عامیانہ خیالات سے بھی اسکی شاعری پاک ہے، اس سے بھی اس کے بہترین اخلاق کا پتہ چلتا ہے،

" حیات ماہ لقا بائی " کے نام سے اس کی ایک سوانح عمری بھی غلام صمدانی خاں گوہر نے شائع کی ہے، یورپ میں دکھنی مخطوطات" دکن میں اردو" اور " مرقع سخن" جلد اول میں اس کے حالات موجود ہیں،

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ جسطرح اس کی جاگیر "اڈیکمیٹ" تعلیمی مرکز بن رہا ہے اسی طرح اسکی پروردہ لڑکی "حسن لقا بائی کا باغ بھی زنانی مدرسہ کے لئے[1] منتخب ہوا ہے ۔

چندا کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

قتل پر کس کے آج ہوتی ہے ۔　　　　توسن حسن پر سوار شراب

کب تک رہوں حجاب میں محروم وصل سے　　　　جی میں ہے کیجے پیارے بوس و کنار خوب

---

[1] نامپلی ہائی اسکول ۔

محشر میں فاطمہ کہنے والی ہے فاطمہ ‏ ‏ ‏ پھر جادہ بات کو چلاویں گے فاطمہ
کر فضل سوں اس کو چھڑاویں گے فاطمہ ‏ ‏ ‏ مظلوم فاطمہ کے حسین علی گئے (از بیاض کتب خانہ مولوی عبدالرحمن)

افسوس ہے کہ تیرھویں صدی ہجری کے دیگر کسی شاعر خاتون کا تعارف کرانے سے ہم قاصر ہیں۔ وقت معدود ہیں۔ ممکن ہے کبھی اس میں اضافہ ہو سکے۔
اس کے بعد چودھویں صدی کے شعراء اور نثر نگار خواتین کا تذکرہ کیا جائیگا سہولت کے مد نظر ان کی تقسیم کی گئی ہے۔ دور محبوبی، دور عثمانی کے وقت ان کو متعارف کیا گیا ہے فقط

نصیر الدین ہاشمی

اورنگ زیب اور تاناشاہ

"اچھا تو نماز ہو رہی ہے!"

تاناشاہ نے کہا اور ساتھ ہی اس کا چہرہ غصے سے تمتا گیا۔

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ مغل ہمارے نشانہ بازوں کی اتنی تحقیر کریں گے! قلعہ کے اس قدر قریب اور ہمارے تیر و تفنگ کی زد میں کھڑے ہو کر نماز جماعت ادا کرنا مصلحت اور دور اندیشی سے یقیناً بعید ہے! کیا اورنگ زیب جیسا دور اندیش اور ہوشیار بادشاہ بھی غلطی کر سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں یا یہ تحقیر کی تحقیر ہے دیکھنا ہے کوئی ہمارا اچھا نشانہ باز؟"

اورنگ زیب کئی مہینوں سے گولکنڈہ کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ مغل فوجیں چاروں طرف سے ایک عجیب سمندر کی پرجوش موجوں کی طرح قلعہ کی فصیلوں سے آ آ کر ٹکراتی ہیں۔ اور ہر مرتبہ دکنی سپاہی پہاڑوں کی چٹانیں بنکر انہیں پیچھے ہٹا دیتے ہیں۔ اس وقت آفتاب کی تمازت میں خاصی کمی ہو گئی ہے اور مغلیہ لشکر اپنی پوری قوت کے ساتھ حملوں پر حملے کئے جا رہا ہے۔ ان صفوں کے ذرا پیچھے دو تین ہموار قطاریں نظر آتی ہیں کیونکہ اورنگ زیب اور اس کے کئی ایک مصاحب ابھی نماز کیلئے صف بستہ کھڑے ہیں۔ چند لمحے گذرنے نہیں پاتے ہیں کہ امام لیکایک تڑپ کر آگے کی طرف گر پڑتا ہے۔

"خوب! شاباش!! امام رکھ لیا۔ دیکھنا صف میں سے ایک دوسرا شخص امامت کیلئے آگے بڑھ رہا ہے...... ہاں چھوڑنا نہیں۔ کوئی امام نہ بچے...... اس کو کہتے ہیں انتقام تحقیر!!"

شاہی حکم بجلی بن کر دوسرے امام پر گرتا ہے اور وہ بھی دکنی گلندار کا نشانہ ہو جاتا ہے۔

دو تین پیش اماموں کے یکے بعد دیگرے اس طرح نذر اجل ہو جانے کے بعد امامت کیلئے صف میں سے آگے بڑھنا کسی معمولی دل و دماغ والے کا کام نہیں! اس سرے سے اس سرے تک پس و پیش کا ایک عجیب عالم چھا جاتا ہے۔ لیکن ابھی چند لمحے بھی گذرنے نہیں پاتے ہیں کہ خود اورنگ زیب امامت کے لئے بڑھتا نظر آتا ہے اور اب گولکنڈہ کا شاہی نشانہ باز بندوق خالی کرنے ہی کو ہے کہ تاناشاہ لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

"ظالم! کیا ایک بادشاہ کو بھی نشانہ بنائے گا؟ دکھائی نہیں دیتا کہ خود اورنگ زیب اس وقت امام ہے!!"

سید محی الدین قادری زور

حیدرآباد اور دیہی تنظیم

ہر ملک اپنی آب و ہوا، موسمی خصوصیات، قدرتی حالات اور جغرافی ماحول کے مطابق اپنی آبادی کی گذر اوقات کے لئے آمدنی حاصل کرنے کے چند شعبوں کا انتخاب کر لیتا ہے۔ ان مختلف شعبوں میں زراعت سب سے اہم ہے کیونکہ اس میں نہ صرف پودے لگا کر زرعی پیداوار ہی حاصل کرنا شامل ہے بلکہ فصلوں کو بیماریوں اور وباؤں سے بچانے کی تدبیریں، زرعی پیداوار کی نکاسی کا انتظام، مویشیوں کی عمدہ پرداخت، اچھی نسلیں پیدا کرنا، زمین کے مختصر ٹکڑوں سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی کوشش بھی اسی کے دائرہ میں داخل ہے۔ اور دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ اسی شعبہ سے آمدنی حاصل کر رہا ہے۔

۱۷۶۰ء کے صنعتی انقلاب سے پہلے ہر ملک میں زراعت کی بڑی اہمیت تھی، مگر انقلاب کے بعد حالات بدل گئے۔ بھاپ پر انسانی اقتدار اور نئی نئی کلوں کی ایجاد نے پیدائش دولت کو آسان کر دیا۔ دولت کی کثیر تعداد قلیل وقت میں انسان کی معمولی کوشش سے پیدا ہونے لگی۔ اس نئے طریقہ نے کس طرح قدیم مذہبی رجحانات، انفرادی آزادی، خانگی زندگی، گھریلو صنعت کو مٹایا جس نے دستکاروں اور غریب صناعوں کا خاتمہ کیا! مفلس کو مفلس ترین اور دولت مند کو دولت مند ترین بنانے میں مدد دی، یا میکانی قوت جس کی ابتدا انسان کے ایک تابع غلام کی حیثیت سے ہوئی اس نے کس طرح انسان کو اپنا غلام بنا لیا ہمارے موضوع سے خارج از بحث ہیں۔ مگر انقلاب کا ایک اہم نتیجہ یہ ہوا کہ زراعت کو غیر اہم اور صنعت و حرفت کو اہم سمجھا جانے لگا۔ ہر ملک یہ سمجھنے لگا کہ ہمارا کام صنعتی اشیا پیدا کرنا ہے اور زرعی پیداوار ہمارے لئے دوسرے مہیا کرتے ہیں۔ اگر صرف چند ممالک اس اصول کو اختیار کرتے تو کچھ بے جا نہ تھا بلکہ تجارت خارجہ کے نظریہ کے مطابق کہ ہر ملک وہی چیزیں پیدا کرے جس کے لئے وہ موزوں ترین ہو، اور آپس میں تبادلہ کر کے اپنی ضروریات پوری کر لے بہت اچھا تھا کیونکہ اس کی بدولت ہر قوم دوسری قوموں کے قدرتی عطیات اور کسبی کمالات سے پوری پوری طرح مستفید ہو سکتی تھی اور مجموعی حیثیت سے دنیا میں کثیر دولت پیدا ہو سکتی اور دنیا کی خوشحالی میں اضافہ ہو سکتا تھا، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا، بلکہ ہر ملک نے اس اصول کو اختیار کرنے کی کوشش کی، حالانکہ یہ ان ملکوں کا رجحان تھا جن کے یہاں قدرتی حالات، موسمی خصوصیات اور زمین کی ساخت کے اعتبار سے زراعت کے کچھ اچھے امکانات نہ تھے، مگر دنیا کے ہر ملک نے اس رجحان کو ایک کلیہ بنا لیا اور صنعتی دوڑ میں ایک عالمی مسابقت شروع ہو گئی۔

زرعی معاشیات میں جنگ عظیم سے پہلے جو ادب کی قلت نظر آتی ہے اس کی وجہ یہی عالمی رجحان تھا مگر جنگ عظیم کے تلخ تجربوں نے فاتحین اور مفتوحین پر اس امر کا انکشاف کر دیا کہ اگر جنگ طویل ہو جائے، ملک کا محاصرہ کر لیا جائے، وسائل آمد و رفت کو مسدود کر دیا جائے تو ملک میں زہریلے بموں، مشین گنوں، خطرناک توپوں، ہوائی جہازوں، غوطہ زن کشتیوں اور جنگی جہازوں کی کثرت کے باوجود لڑائی جاری رکھنے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں کیونکہ جنگ کا انحصار آلات حرب سے زیادہ اشیائے خوراک پر ہے اور جب ان ہی کی قلت ہو جائے تو نہ لڑنے والے لڑ سکتے ہیں نہ آلات حرب کام آ سکتے ہیں۔ چنانچہ جنگ کے بعد یہ اصول تسلیم کر لیا گیا کہ قوم کی مدافعت اور ملک کی حفاظت کے لئے زراعت ایک ناگزیر شئے ہے، اب دنیا نے زراعت کی طرف توجہ شروع کی، زرعی پروگرام بنائے گئے، زراعت کو ترقی دینے اور زرعی آبادی کو بڑھانے کی کوشش شروع ہوئی اور حکومتوں نے اس سلسلے میں بے دریغ روپیہ خرچ کرنا شروع کیا اور زراعت کی ہر طریقے سے مدد کی جانے لگی۔

ہندوستان، اسکے صوبے، اور ریاستوں میں زراعت کا حال بالکل ہی مختلف ہے، اگر دوسرے ممالک میں ریعی آبادی کی قلت ہے تو ہمارے یہاں زرعی آبادی کی کثرت ہی نے زراعت کی حالت کو خراب کر رکھا ہے، اگر ان کے یہاں دیہی آبادی کم ہے تو ہمارے یہاں شہری آبادی کی کمی ہے۔ دراصل ہندوستان کلکتہ، بمبئی، دہلی یا حیدرآباد جیسے عظیم الشان شہروں، ان کی سربفلک عمارتوں خوشنما اور وضع دار بنگلوں، چوڑی سمنٹ دار سڑکوں، جگمگاتی ہوئی دوکانوں کا نام نہیں ہے۔ ہندوستان نام ہے اس کثیر آبادی کا جو کچے جھونپڑوں یا پھوس کے ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں رہتی ہے۔ محنت مشقت سے جنکے چہرے زرد ہیں، گال پچکے ہوئے آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں، بدن پر جھریاں ہیں، جنکی اکثر غذائیں ایسی ہیں جن میں غذائیت کا جز نہیں، جنکے بدن کا اکثر حصہ برہنہ و بے لباس ہیں۔ جنکا ماحول ملیریا، انفلوئنزا، ہیضہ، چیچک، طاعون، دق، سل اور اسی طرح کے دیگر متعدی امراض کے جراثیم سے پُر ہے۔ جو دنیا کے لئے غذا مہیا کرتا ہے مگر اپنی غذا کے لئے دوسروں کا محتاج ہے، جو ہمارے شہروں اور گھروں کی رونق کا باعث ہے مگر خود اس کے گھر اجڑے ہوئے اور بے چراغ ہیں، وہ محنت کرتا ہے تو اس کی محنت کے پھل دوسرے کھاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ زراعت کی ان خرابیوں کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا ہر جگہ زراعت میں وہی خرابیاں ہیں جو ہمارے یہاں ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملکی حالات نے مجموعی حیثیت سے زراعت کی حالت کو خراب کر رکھا ہے، اور قدرت، سماج، کاشتکار اور حکومت ہر ایک اپنی جگہ پر اس کی تباہی کا ذمہ دار ہے۔

قدرتی اسباب میں سیلاب، خشک سالی، بارش کی غیر مساوی تقسیم، موسموں کی غیر یقینی حالت، کہر، اولا، پالا اور ٹڈی دل شامل ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ان میں سے بعض اسباب کو دور کیا جا سکتا ہے۔ گویا انسان اگر قدرت کے قابو سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا تو کم از کم اسکا اتنا مطیع اور فرمانبردار بھی نہیں ہو سکتا جتنا کہ وہ آج نظر آ رہا ہے۔

مجموعی حیثیت سے سماج پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس نے زراعت کو معزز پیشہ نہ سمجھا، دیہاتیوں کے متعلق اچھی رائے قائم نہ کی، مصلحین قوم اور محبان وطن کا فرض تھا کہ وہ اس طرف توجہ کرتے مگر انہوں نے کثیر آبادی کو چھوڑ کر شہری آبادی کو جسکی ہمارے ملک میں قلت ہے اپنی اصلاح کا مرکز بنایا۔ انھوں نے کارخانے کے مزدوروں کیلئے جنکی تعداد ۲۰ سے ۳۰ لاکھ کے درمیان ہے قوانین بنانے اور ان کیلئے سہولتیں بہم پہونچانے کی جانب اپنی توجہ مبذول کی اور ۲۸ کروڑ آبادی سے تغافل برتا۔ اس خصوص میں سب سے زیادہ مورد الزام وہ تعلیم یافتہ اور صاحب حیثیت افراد ہیں جنہوں نے دیہات میں جنم لینے اور پرورش پانے کے بعد دیہات سے لاپروائی اختیار کی۔ یہ اپنی واقفیت اور قدیم اقتدار کی بنا پر بہت کچھ کر سکتے تھے، مگر انھوں نے بھی اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے کیلئے شہروں کو ہی انتخاب کیا ایسی صورت میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان میں صداقت اور خلوص کا نام نہ تھا بلکہ وہ شہرت اور تشہیر کے خواہاں تھے وہ خدمت خلق کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ دنیا پر اپنی قابلیت اور عظمت کا سکہ بٹھانا چاہتے تھے، ظاہر ہے کہ دور افتادہ گاؤں میں یہ ذرائع کہاں، ان کے لئے تو بڑے بڑے شہری موزوں ہیں جہاں جذبۂ شہرت کو تسکین دینے کیلئے مختلف قسم کے ذرائع موجود ہیں۔ ذات پات کے طریق کی ذمہ داری بھی سماج ہی کے سر ہے، اس نے کسی کو ادنیٰ اور کسی کو اعلیٰ بنایا سماج نے مذہب کی آڑ لیکر چھوت چھات کی بنا ڈالی، اور ان کو وہ اہمیت دی کہ گویا ان ہی کی ادائی مذہب ہے۔

زرعی مذہب کی سب سے پوشیدہ کڑی خود کاشتکار ہے کیونکہ زراعت کی بہتری اور بدتری کا انحصار اسی پر ہے۔ وہ دنیا کے حالات سے بے خبر، ان پڑھ، مفلس، قرض دار، فضول خرچ، قدامت پرست اور قسمت پرست ہے۔ کسان کے لئے منظم تربیت کی بڑی ضرورت ہے۔ اکثر و بیشتر کاشتکاروں کو پیداوار کی کمی سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا ان کی خراب تنظیم سے ہوتا ہے۔ وہ مفلس اور قرضدار ہے، مگر تقاریب، تہواروں اور رسومات پر خوب خرچ کرتا ہے۔ اس کے پاس آمدنی و خرچ کا کوئی حساب نہیں۔ اس کو نہیں معلوم کہ اس کو کیا آمدنی ہو رہی ہے اور اس کے اخراجات کیا ہیں۔ ناواقفیت کی بنا پر وہ اچھی قسم کی فصلیں پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ کم سمجھی کی بنا پر عارضی نفع کی خاطر وہ اچھی فصلوں میں خراب فصلوں کی آمیزش کر دیتا ہے۔ قدرت پرستی اور قسمت پرستی اس کو نئے طریقوں کے اختیار کرنے سے روکتی ہے۔

حکومت جس کا کام رعایا کی فلاح و بہبود کے ہر ممکنہ ذریعہ اختیار کرنا ہے، اس نے بھی اس عالمی رجحان کے تحت جس کا ذکر کیا جا چکا ہے اس طرف سے لاپروائی برتی، اور مقامی حالات کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ خود اہل ملک نے بھی حکومت کو اس جانب متوجہ کرنے کی کوشش نہ کی۔ اس وقت ہندوستان کے قائدین اس بات پر زور دیتے تھے کہ چونکہ ہندوستان کی قدیم صنعتوں کو ختم کر دیا گیا ہے اس لئے دوبارہ ان کو زندہ کیا جائے۔ انڈین نیشنل کانگریس جیسے قومی ادارے نے ۱۹۰۶ء میں صنعت و حرفت کی ترقی و احیا کے لئے ایک الگ شعبہ قائم کی۔ مگر زراعت کی جانب ۱۹۳۶ء سے پہلے توجہ نہ کر سکی۔

جنگ میں حکومت برطانیہ کے تلخ تجربات سے حکومت ہند نے بھی فائدہ اٹھایا۔ اور ۱۹۱۹ء کی اصلاحات میں وزیر زراعت کا عہدہ قائم ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں زرعی کمیشن مقرر ہوا جس کی رپورٹ پر غور کرنے کیلئے ۱۹۲۸ء میں صوبوں کے وزراء اور ناظمان زراعت اور امداد باہمی کے رجسٹراروں کی کانفرنس منعقد ہوئی، ۱۹۲۹ء میں شاہی زرعی تحقیقاتی کونسل مستقل ارکین کے ساتھ وجود میں آئی۔

دیہی تنظیم یا دیہات سدھار بالکل حالیہ اصطلاح ہے، ملک میں ۱۹۳۰ء سے پہلے اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کہ ایک جانب کانگریس نے دیہات سدھار کو اپنے نظام نامے میں شامل کیا تھا، دوسری جانب عالمی کساد بازاری نے عام پیداوار کی قیمتیں سطح سے بہت نیچے قرار دی تھیں، موازنوں میں خسارہ آ رہا تھا اور زرعی آبادی کو سخت معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ۱۹۳۴-۳۵ء کے موازنہ میں ایک کروڑ کی رقم مرکزی حکومت نے دیہات سدھار کیلئے منظور کی۔

ممالک محروسہ میں زراعت کے کم و بیش وہی حالات ہیں جو برطانوی ہند یا ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں ہیں۔ یہاں ۲۱۲۲۲ دیہات ہیں۔ آبادی کا ۱۰ فیصد شہروں میں اور ۹۰ فیصد دیہات میں رہتا ہے۔ گو یہاں زراعت کے تحفظ کیلئے مختلف تدابیر پہلے بھی اختیار کی جاتی تھیں مثلاً قحط کے زمانہ میں کاشتکاروں کی امداد، یا خشک سالی میں مالگزاری میں معافیاں، یا زرعی آبادی کی بہبودی کیلئے ۱۹۱۱ء میں قانون امداد باہمی کا نفاذ وغیرہ، مگر اسی عالمی رجحان کے تحت زراعت کی جانب کوئی خاص توجہ نہ تھی۔ مگر حالات کے بدلتے ہی یہاں بھی تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ گو زراعت کا محکمہ ۱۹۱۳ء سے قائم ہے مگر ابتدا میں اس کا خاص مقصد "نگرانی" روئی کو تباہی سے بچانا تھا۔ مگر ۱۹۲۹ء میں اس کا مقصد ملک کی عام زراعت کی ترقی قرار پایا۔ اس نے تحقیق، تجربے اور تشہیر سے اپنے مقصد کو پورا کرنا شروع کیا۔ تحقیق کا مقصد یہ تھا کہ معلوم ہو سکے کہ کونسی فصلیں اچھی ہیں یا ان کو کس طرح اچھا بنایا جا سکتا ہے، چنانچہ اس وقت تک متعدد مقامی اعلیٰ قسم

کی قسمیں دریافت ہو چکی ہیں۔ تحقیقاتی نتائج جانچنے اور نئے آلات یا نئے طریقوں سے زمین کی پیداوار بڑھانے کے لئے مزرعے قائم کئے گئے تاکہ عملی اور معاشی حیثیت سے نتائج کا امتحان ہو سکے۔ کامیاب تجربوں کو کاشتکاروں کے سامنے پیش کرنے کے لئے تشہیر کی ضرورت پیش آئی تاکہ کاشتکار جن کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا ہے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اسوقت محکمۂ زراعت کے تحت دس مزرعے ہیں جہاں یہ کام ہو رہے ہیں، فصلوں کی بیماریوں کا علاج، مویشیوں کی بیماریوں، اور ان کی غور و پرداخت کی جانب بھی توجہ ہو رہی ہے۔ مرغیوں کے سلسلہ میں بھی کافی تجربات ہو چکے ہیں۔ دیہی تنظیم کے سلسلے میں ممالک محروسہ میں دیہی تنظیم کا ایک مرکزی بورڈ قائم ہے، جن میں باب حکومت کے چار اراکین، مالگذاری اور صنعت و حرفت کے معتمدین، زائد معتمد مالگزاری، چاروں صوبہ دار، محکمہ ہائے تعلیمات، صحت عامہ و طبابت، زراعت، صنعت و حرفت، معلومات عامہ کے ناظم، امداد باہمی کے رجسٹرار، مارکٹنگ آفیسر اور سنٹرل کو آپریٹیو یونین کے نمائندے شامل ہیں۔ مرکزی بورڈ ایک عام خاکہ تیار کرتی ہے اور اسکو عملی جامہ پہنانے کے لئے اضلاع اور تعلقوں میں مقامی بورڈ قائم ہیں۔ جن میں سرکاری اراکین بھی شامل ہوتے ہیں۔ غرض دیہی تنظیم کا سب سے اہم مرکز ہے، زراعت کی ترقی و اصلاح، مویشیوں کی اصلاح، اور معاشرتی اصلاح نظام العمل کے اہم جزو ہیں۔ زراعت کی ترقی میں دوسرا قدم جو اٹھایا گیا وہ مختلف قوانین کا سلسلہ تھا۔ ۱۹۱۳ء کے قانون امداد باہمی جسکی رو سے زرعی اور غیر زرعی انجمن قائم ہوئیں، تعلقہ داری اور مرکزی بنک، اور صدر جمعیت اتحاد کا قیام عمل میں آیا اس کا ذکر کیا جا چکا ہے ۱۹۲۳ء سے موازنہ میں امداد قحط اور محفوظہ قحط کی مدات داخل ہوئیں اور تقریباً ۲۰، ۲۲ لاکھ سالانہ کی رقم قحطوں یا امدادی اور تعمیری کاموں کیلئے مخصوص کی جانے لگی ۱۹۳۱ء میں قانون زرعی بازارات کا نفاذ ہوا۔ اسکا مقصد باضابطہ منڈیوں کا قیام تھا تاکہ کاشتکاروں کو غیر منظم منڈیوں کے نقصانات سے محفوظ رکھا جائے۔ باضابطہ منڈیوں میں مذہبی یا خیراتی نام سے پیداوار وصول کرنے کی ممانعت کی گئی۔ صحیح اوزان کو رائج کیا گیا، تولنے والوں کے لئے اجازت نامہ ضروری قرار پایا، خریداروں کو کاروبار کی جملہ کارروائی درج کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اس قانون کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ برطانوی ہند کے قانون کی طرح صرف روئی کیلئے مخصوص نہیں ہے بلکہ اسکا اطلاق تمام زرعی پیداوار پر ہوتا ہے۔

زراعت کی پستی کا ایک بڑا سبب قرضداری ہے، کاشتکار مفلس ہے اور اسکو اپنے روزمرہ کی ضروریات مویشی، آلات، تخم خریدنے یا کھیائی اور کٹائی کی اجرت ادا کرنے کیلئے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے، یہ رقم وہ ساہوکار سے لیتا ہے، ساہوکار نہ صرف گراں شرح سود اور سود مرکب وصول کرتا ہے بلکہ دوسری مختلف ترکیبوں سے بھی کاشتکار کو لوٹنے کی فکر کرتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کاشتکار کو قرضہ کا بار ابھرنے نہیں دیتا۔ مسٹر ایس ایم بھروچہ جنہوں نے ممالک محروسہ میں زرعی قرضداری کی تحقیقات کی تھی ممالک محروسہ کے زرعی قرضہ کا اندازہ ۶۴½ کروڑ سے کچھ زائد بتایا ہے۔ آپ نے ۱۲۲ مواضعات کی تحقیقات کے بعد زرعی آبادی کے قرضہ کا اوسط ۳۰ روپیہ فی کس بتایا ہے مجھے حال میں ایک موضع کی تحقیق کے سلسلہ میں معلوم ہوا کہ اسکے زرعی قرضہ کی تعداد ایک لاکھ ۲۵ ہزار ہے جبکہ اسکی آبادی ۲۵۶ ہے۔ ۵۰۰ روپیہ فی کس کل آبادی پر اور ۱۰۰۰ روپیہ فی کس زرعی آبادی پر قرضہ کا اوسط آتا ہے۔ مسٹر بھروچہ نے بتایا ہے کہ دس لاکھ ایکڑ مزروعہ زمین میں سے ۳ لاکھ ایکڑ مکفول ہو چکی ہے اور ایک لاکھ ۶۰ ہزار ایکڑ کاشتکاروں کی ملکیت سے نکل کر قرض خواہوں کے قبضہ میں جا چکی ہے۔ تصویر کا یہی ایک بھیانک اور تاریک رخ تھا جس نے ان مختلف خرابیوں کے انسداد کیلئے حکومت کو فوری اقدام پر مجبور کیا اور

مفاہمت قرضہ، قرض دہندگان، اور انتقال اراضی کے زرین دستور العمل نافذ ہوئے، اگرچہ ان میں بعض خامیاں ہیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان سے کاشتکاروں کو بڑا فائدہ پہونچنے کی امید ہے، یہ ڈوبتے ہوؤں کیلئے سہارا، اور جو ڈوبے نہیں ہیں ان کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہیں۔

دیہی تنظیم کا کام جو ریاستوں یا صوبہ واری حکومتوں کے یہاں بہت ہی شاندار نظر آتا ہے فی الحقیقت اس قدر شاندار نہیں ہے۔ ہندوستان جہاں تقریباً ۷ لاکھ گاؤں ہوں وہاں چند سو دیہی مرکزوں کی وہی مثال ہے جیسے سمندر میں چند قطرے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آخر یہ کام کس طرح ہو، کیا مروجہ طریقہ کو جاری رکھا جائے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ڈیڑھ سو دو سو برس بعد ہم وہاں پہونچیں گے جہاں دنیا آج ہے گویا دنیا سے دو صدی پیچھے رہنا ہماری قسمت میں لکھا ہے۔ نہ کسی حکومت سے یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ ہر گاؤں کو دیہی تنظیم کا مرکز بنادے، اور دس پانچ سال میں ملک کی حالت بدل دے، اس طرح یہ سانپ کے منہ کی چھچھوندر ہوگی جسکو نہ نگلا جاسکتا ہے اور نہ اگلا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسا پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے جسکا کوئی حل ہی موجود نہو، حل موجود ہے مگر اس میں مشکلات ہیں، اور ان پر غالب آنا ہمارا کام ہے، میرا خیال ہے کہ یہ مسئلہ حکومت، سماج، مصلحین معاشرت، محبان وطن اور سب سے زیادہ اور سب سے اہم تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اشتراک سے طے ہوسکتا ہے۔

یہ سمجھنا کہ اصلاح دیہات کیلئے کثیر رقم کی ضرورت ہے ایک گمراہ کن خیال ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر نئے کام کیلئے روپیہ کی سخت ضرورت ہوتی ہے اسی طرح دیہات سدھار کیلئے بھی کچھ روپیہ کی ضرورت ہے، مگر روپیہ سے زیادہ ایسی چیزوں کی ضرورت ہے جسکو نقد مہیا نہیں کرسکتا، ان چیزوں کو خلوص، ہمدردی، ایثار، قربانی اور انسانیت کہا جاتا ہے ہمارے سامنے ایسے کامیاب ادارے موجود ہیں جن کے پاس ابتدا میں سرمایہ بہت قلیل تھا مگر کام کرنے والوں میں مندرجہ بالا خصوصیات موجود تھیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جس سرعت، تیزی اور استحکام سے کام کیا کسی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ دیہات سدھار کے سلسلہ میں متعدد کام ایسے ہیں جن میں روپیہ کی قطعی ضرورت نہیں، اور متعدد کام ایسے ہیں جن میں روپیہ کی بچت ہوتی ہے۔

ہم اپنے کسان کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میں بھلائی اور برائی سمجھنے کی تمیز نہیں، یا وہ نفع و نقصان میں امتیاز نہیں کرسکتا لیکن اس کے باوجود وہ پرانی لکیر کا فقیر نظر آتا ہے اس کی وجہ قسمت پرستی ہے۔ اس میں آگے بڑھنے کا شوق اور اونچا ابھرنے کی امنگ مفقود ہوچکی ہے۔ اس قنوطیت کا اصلی سبب وہ حادثات ہیں جو برسوں سے اس کو اپنا شکار بنا رہے ہیں۔ انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں تک ملک میں امن و امان نہ تھا، حملہ آور آتے اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے اسکے کھیتوں کو روندتے، اسکی فصلیں کاٹ لیتے یا ان کو جلا دیتے تھے، جب ملک میں امن و امان قائم ہوا تو حملہ آوروں کا خوف کم ہوگیا مگر سیلاب، خشک سالی، اولا، پالا، اور ٹڈی دل سے اس کی فصلوں کا نقصان پہونچتا رہا۔ مختلف بیماریاں اسکو اپنا لقمہ بناتی رہیں۔ رفتہ رفتہ اس کو یہ یقین ہوگیا کہ ارضی و سماوی مصیبتیں انسان کی کوتاہیوں کا نتیجہ ہیں۔ اس نے قدرت کو غیر منصف تصور کرلیا۔ مگر یہ سوال اس کے ذہن میں پیدا نہ ہوتا تھا کہ قدرت خصوصیت سے اس پر ظالم کیوں ہے۔ اس بات کا کھوج نہ لگانے کی وجہ سے اس کے ذہن میں یہ احساس قوی تر ہوگیا کہ اپنی بھلائی اور یا برائی کا کوئی کام وہ خود نہیں کرسکتا، اس کی قسمت کو بگاڑنے یا بنانے والی ایک ایسی ہستی ہے جس پر اس کا قابو نہیں۔ اس لئے اس نے اپنے تمام کام اسی کے حوالہ کردئے نتیجہ

قسمت پرست یا قناعت پسند اور بالفاظ دیگر سست، کاہل اور نکما ہو گیا۔

آج سے چند سال پہلے اس میں سے اکثر چیزوں کو برداشت کیا جا سکتا تھا، مگر اب سائنس، فن انجینیری، فن زراعت، اور علم طب کی ترقی نے انسان کا قابو قدرت پر بڑھا دیا ہے۔ گویا قسمت پرستی کا دور ختم ہو گیا مگر وہ بدستور قسمت پرست ہے، اس میں یہ احساس پیدا نہ ہو سکا کہ ماضی ختم ہو چکا ہے اور خوشگوار مستقبل سامنے ہے وہ ماضی کا دلدادہ ہے اور حال و مستقبل کی فکر سے بے نیاز ہے۔ ماضی خواہ کتنا ہی شاندار کیوں نہ ہو اس کو یاد کرنا بیکار ہے، گزرا ہوا زمانہ واپس نہیں آتا۔ آنے والے زمانہ کی فکر کرنا اور اسکو خوشگوار بنانا سب سے اہم فریضہ ہے۔

دیہی زندگی جمود و سکون کا نام ہے، وہاں بے حسی، غفلت اور ناواقفیت کے دیوتاؤں کا راج ہے، ان کے دل مردہ اور امیدیں پژمردہ ہیں، ضرورت ہے کہ ان کے جمود و سکون کو توڑا جائے، بے حسی اور غفلت کے پردوں کو چاک کیا جائے، مردہ دلوں میں اور پژمردہ امیدوں میں شوق اور امنگ پیدا کی جائے، ان کو بیدار کر کے متحرک اور جاندار بنا دیا جائے، ان کے رگ و ریشہ میں برقی رو دوڑا دی جائے ان کو خود اعتمادی کا سبق پڑھایا جائے، یہ کام ملک کے نوجوان ہی انجام دے سکتے ہیں۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ ان کی یہ صلاحیتیں مٹ چکی ہیں۔ کانگریس نے برسر اقتدار آنے سے پہلے چھوٹے چھوٹے دیہات میں زندگی کی روح پیدا کی تھی، اور خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر دیا تھا۔ وہ اس قوت کو حکومت سے ٹکرانا چاہتی تھی جن میں اس کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی، مگر اس طرح سادہ لوح کسان بھٹک گئے، اور جب کانگریس نے عہدے قبول کر لئے تو وہ اس نئی حکومت سے ٹکرانے لگے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسانوں میں آگے بڑھنے، اور ترقی کرنے کے جراثیم ضرور موجود ہیں اب اس کا انحصار کام لینے والوں پر ہے کہ وہ ان کا رخ کس طرف پھیرتے ہیں۔

میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان یا ممالک محروسہ سرکار عالی جیسے زرعی خطوں کے دیہات کی اصلاح حکومت کے بس کی بات نہیں ہے، حکومت بزور قانون اصلاح نہیں کر سکتی، اصلاح کا احساس خود پس ماندہ لوگوں میں پیدا ہونا چاہیے۔ جبری اصلاح کا ہمیشہ یہ خاصہ رہا ہے کہ جب جبر اٹھا لیا گیا اصلاح ختم ہو گئی، ضرورت ہے کہ ملک کے سنجیدہ، مخلص اور ٹھوس کام کرنے والے تعلیم یافتہ نوجوان دیہات میں مستقل سکونت اختیار کریں اور اپنا ایک نصب العین بنا کر اس کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔ کام کرنے والوں کو اپنے آپکو حاکم یا مخدوم نہ سمجھنا چاہیے بلکہ وہ کاشتکاروں کے دوست، مشیر کار اور خادم بننے کی کوشش کریں، مخدوم بننا آسان ہے اور خادم بننا مشکل۔ ان کو اسکا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ گاؤں ہماری تہذیب کا قدیم ترین مرکز ہے، کسی قدیم شئے کو مٹا کر اس کی جگہ اسی مسالہ سے نئی عمارت تعمیر کرنا آسان نہیں، ان کو ابتدا میں مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا ان کو قدم قدم پر ناکامیوں کا منہ دیکھنا ہوگا، ان کو دلی اذیت اور روحانی تکلیف بھی ہوگی کہ جو چیزیں جنکی بھلائی کے لئے پیش کیا رہی ہیں وہی اس کو ٹھکرا رہے ہیں، مگر ان کو ناامید نہ ہونا چاہیے اور غم و غصہ سے الگ رہ کر خلوص سے کام کرتے رہنا چاہیے۔ خلوص اور قربانیوں کا درخت پھل ضرور لائیگا اور بارآور ہونے میں جتنا زیادہ عرصہ لگے گا اتنے ہی اسکے پھل عمدہ اور شیریں ہوں گے۔

محمد احمد سبزواری

بیڑ کی چھاگل اور گُپتی کی صنعت

ہندوستان کی صنعتی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں قدیم زمانہ میں مختلف گھریلو صنعتیں تھیں صرف ان کا وجود ہی نہ تھا بلکہ یہ نہایت ترقی پر تھیں اور دیگر ممالک میں بھی وہ شہرت حاصل کر چکی تھیں لیکن صنعتی انقلاب کے بعد جب مشین کا بنا ہوا دکھاوا اور سستا مال یہاں کے بازار میں آنے لگا تو یہاں کی صنعتوں کو زوال ہوا۔ اس کے علاوہ چند معاشرتی اور سیاسی اثرات بھی تھے جن کی بدولت یہاں کی بہت سی دستی صنعتیں فنا ہوئیں اور کئی صناعوں نے زراعت کا پیشہ اختیار کیا۔

اس کی مثال ہماری ریاست حیدرآباد کے ضلع بیڑ کی چھاگل کی صنعت ہے۔ یہ صنعت آج سے کچھ کم ۱۰۰ سو سال قبل یہاں عروج پر تھی اس صنعت کے ذریعہ بہت سے لوگ روزی حاصل کرتے تھے لیکن آج اس کی حالت بالکل ناگفتہ بہ ہے۔ اب خاص بیڑ میں اس صنعت کے واقف کار صرف دو افراد ہیں، ایک کا نام ونٹھوبا اور دوسرے کا نام راما ہے۔ ان کا یہ پیشہ اب ضمنی ہے اور یہ لوگ زراعت میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ ان کے پاس ایک یا دو چھاگلیں تیار رہتی ہیں۔ وہ بھی اس خیال سے کہ یہاں کی یہ صنعت مشہور ہے اور ممکن ہے کہ کوئی خواہشمند خرید سکے۔

ان صناعوں میں سے ایک کو اولاد ہے دوسرا لاولد ہے۔ ان کے چند رشتہ دار ہیں جو بیڑ کے نزدیک کے دیہات میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی بیڑ کے ہفتہ واری بازار میں معمولی قسم کی چھاگلیں لاتے ہیں۔

اگر خاص طور پر چھاگلیں بنوائی جائیں تو اعلٰے قسم کی بنائی جاتی ہیں۔ خوبی کے لحاظ سے ان کی قیمتیں ۴ روپیہ سے ۱۵ روپیہ تک ہوتی ہیں۔ چمڑا نہایت ہی ملایم کمایا جاتا ہے۔ پھر اس چمڑے کی چھاگل بنائی جاتی ہے۔ چھاگل پر مختلف قسم کے عجیب و غریب نقش اتارے جاتے ہیں۔ اور ان نقشوں میں رنگین کاغذات لگائے جاتے ہیں۔ چمڑا اکثر اوزیل کا لیا جاتا ہے۔ ایک جانور کی کھال مقامی بازار میں ۵ روپیہ سے ۱۰ روپیہ تک ملتی ہے اور اس میں غالباً دو یا تین چھاگلیں تیار کی جاتی ہیں۔ عموماً ایک چھاگل کا پانی موسم گرما میں دو آدمیوں کو ایک دن کے لئے کافی ہوتا ہے۔ چھاگلوں کی زیادہ قیمت کی ایک وجہ ان کی قلت بھی ہونی چاہئے۔ کیونکہ ان لوگوں کو کبھی کبھی چھاگلیں بنانی پڑتی ہیں ظاہر ہے کہ ہمیں وہ ذرا زیادہ قیمت وصول کر لیتے ہوں۔ ایک چھاگل تیار کرنے کے لئے دو دن درکار ہوتے ہیں ان کے پاس ملازمین نہیں ہوتے بلکہ یہ اپنی بیوی بچوں کی مدد سے چھاگلیں تیار کرتے ہیں۔

ان کی عمرانی زندگی سے ہمیں یہاں بحث نہیں لیکن وہ بھی غور طلب ہے۔ ان کی رہایش اچھوت ہونے کی وجہ سے آبادی کے باہر ڈھور واڑہ نامی محلہ میں ہے۔ یہ محلہ ان کی ذات کے نام سے ہی مشہور ہے۔ ان کے مکاں کے سامنے سے ایک پکی سڑک گزرتی ہے لیکن وہاں نالیوں یا موریوں کا انتظام نہیں ہے سڑک کے کنارے جو موریاں ہیں ان میں غلاظت ہمیشہ جمع رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہاں سے کوئی شہری ناک بھوں چڑھائے بغیر نہیں گزرتا۔ یہ پڑھنا جانتے ہیں نہ لکھنا۔ ان کا لباس اسقدر پھٹا ہوا ہوتا ہے کہ ہمیں ان کا آدھا جسم دکھائی دیتا ہے۔ جب ہم صنعت کے زوال پر غور کرتے ہیں تو ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی طلب آبادی کے صرف ایک محدود حصہ سے ہے۔

یعنی یہ چمڑے کی بنی ہوئی ہونے سے ہندو لوگ مذہبی نقطۂ نظر سے انہیں کا پانی پینا جائز نہیں سمجھتے۔ اس وجہ سے اس کی طلب کم ہوئی۔ لیکن یہ یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ پہلے بھی ہندو مسلمان یہ دو فرقے تھے۔ پہلے یہ صنعت انہیں معاشرتی حالات میں عروج پر تھی۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زوال کی محض یہی ایک وجہ نہیں ہے۔ بلکہ بڑی وجہ یہ ہے کہ آج کل جدید قسم کے گاگلٹ ملتے ہیں جو بڑے چھوٹے ہوتے ہیں اس وجہ سے ایک سے دوسری جگہ لے جانے میں آسانی ہوتی ہے اور وہ سستے بھی ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی طلب بڑھی اور چھاگلیں پیچھے رہ گئیں۔ اس کے باوجود بھی صنعت باقی رہتی اگر عہدہ داران مقامی اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاتے بالخصوص پولیس کے ملازمین سے ان لوگوں کو اس بارے میں خوب نقصان پہنچا۔ پہلے ہی ان کی صنعت کمزور اور کچھ مقامی بازاروں میں کمی تھیں لیکن اس حالت میں ان ملازمین نے ہر سال موسم گرما میں کئی چھاگلیں مفت لینی شروع کیں۔ اس وجہ سے انہیں نقصان ہوا اور انھوں نے اس میں اپنی خیر یت دیکھی کہ اس پیشہ ہی کو چھوڑ دیا جائے۔

انہیں وجوہات کی بنا پر وہ لوگ زراعت میں منتقل ہوگئے اور ملک کی ایک صنعت مٹ گئی۔ اب اس کو ترقی دیجاسکتی ہے لیکن وہ بہت گراں بار ثابت ہوگی۔ اگر ان لوگوں کو حکومت بغیر سود کے قرضہ دے یا انہیں مزدوروں کی حیثیت سے چھاگلیں بنانے کے لئے نوکر رکھے اور اس کی نکاسی اپنے ذمہ لے تو یہ صنعت پھر زندہ ہو سکتی ہے۔ اب چونکہ اس صنعت کی زیادہ طلب نہیں ہے اور اس میں کام کرنا نفع بخش نہیں ہے اس لئے اس پیشہ میں زیادہ لوگ نہیں ہیں۔ لیکن اگر اس میں فائدہ کی امید ہو تو اب بھی کم از کم ۲۰، ۳۰ لوگ اس پیشہ میں شریک ہوں گے اس کی نکاسی شہروں کے بجائے بڑے بڑے دیہاتوں میں ہوگی۔ اس صنعت کی تحقیق سے مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اب اس میں تازہ روح پھونکنا مشکل ہے لیکن پھر یہ خیال آیا کہ اس صنعت کے زوال کے اسباب پر نظر ڈالنے سے اور اس کی طرف آپ لوگوں کی توجہ مبذول کرنے سے ممکن ہے ملک کی دوسری صنعتیں جو اسی راہ پر لگی ہیں فنا ہونے سے بچ جائیں کیونکہ اب بھی میں بعض سرکاری ملازمین کو دیکھتا ہوں کہ وہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو اپنی ہی ذاتی ملک سمجھتے ہیں۔ اور کسی چپراسی یا ذمہ دار کو صناعوں کے مکان پر بھیج کر ایک دو چیزیں بے تکلفی سے منگوا لیتے ہیں۔ یہ بات ایک شخص کے لئے ایک وقت کیلئے معمولی ہے لیکن بعض اوقات یہی معمولی بات مہلک ثابت ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے لوگ بیروزگار ہو جاتے ہیں۔

اب ہم بیڑ کی دوسری صنعت پر غور کریں گے۔ اس صنعت کا نام گپتی کی صنعت ہے۔ اس کو وجود میں آئے ہوئے کوئی پچاس سال ہوتے ہیں۔ آپ میں سے اگر کسی نے بیڑ کی بنی ہوئی گپتی دیکھی ہو گی تو اس پر ضرور آپ نے جان محمد کا نام انگریزی میں یا اردو میں لکھا ہوا دیکھا ہوگا۔ یہ شخص شروع میں تلواریں بناتا تھا لیکن نہ معلوم اسے کیا سمجھائی دیا کہ اس نے تلوار بنانا چھوڑ کر گپتیاں بنانی شروع کیں۔ اب یہ شخص زندہ نہیں ہے اس کا بیٹا شیخ احمد نام موجود ہے جس کی عمر اب (۶۰) سال کی ہے اور جس کا ایک بیٹا اور دو نواسے ہیں جو اس کے ہاں یہی کام کرتے ہیں عموماً ان کے ہاں تین چار نوکر رکھے جاتے ہیں۔ اور ضرورت کے لحاظ سے ان نوکروں میں اضافہ بھی کیا جاتا ہے۔ اس طرح اس صنعت میں کوئی (۸) اشخاص ہمیشہ لگے ہوتے ہیں۔

گپتی بنانے کے لئے بیر اور ساگوان کی لکڑی استعمال کی جاتی ہے۔ اس میں سے بیر کی لکڑی تو بیڑ ہی میں ملتی ہے لیکن ساگوان کی لکڑی احمد نگر اور بمبئی سے منگاتے ہیں یا وہاں بھی کسی دوکان سے خریدتے ہیں۔ گپتی کے لئے فولاد کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی بمبئی

سے منگایا جاتا ہے۔ گپتیاں اس قدر بہترین بنائی جاتی ہیں کہ اس کی جلد شناخت نہیں ہوتی کہ آیا یہ لکڑی ہے یا تلوار۔ چھتے بھی بنائے جاتے ہیں۔ لکھنے کے قلم میں فولاد کا پتہ بٹھایا جاتا ہے گویا لکھنے کا قلم ہی گپتی ہے۔ اس طرح یہ چاقو بھی بناتے ہیں۔ گپتیوں پر بارہ سنگھے، چاندی، لکڑی اور جرمن سلور کے دستے بنائے جاتے ہیں۔ ان دستوں پر مختلف نقش و نگار اور تصاویر کھینچی جاتی ہیں۔ اور خریدار کا نام بھی خواہش کرنے پر کھودا جاتا ہے۔ گپتی کی اصل تلواری اور فولادی اس طرح دو قسمیں ہیں۔ اصل تلواری درجۂ اول ۲۵ روپیوں میں اور درجۂ دوم ۲۰ روپیوں میں بکتی ہیں۔ فولادی گپتی درجۂ اول (۱۵) روپیہ میں اور درجۂ دوم (۱۲) روپیہ میں فروخت ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ معمولی گپتیاں ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰ روپیوں میں خوبی کے لحاظ سے بیچی جاتی ہیں۔ ایک شخص ایک گپتی دو دن میں مکمل تیار کرسکتا ہے۔

ان لوگوں کو مختلف نمائشوں میں تمغے ملے ہیں چنانچہ حیدرآباد میں جو نمائش ہوئی ان میں ان کو تمغے ملے ہیں۔ نواب معین یار جنگ بہادر صوبہ دار اورنگ آباد اور بعض تعلقداروں نے بھی تمغے دیئے ہیں۔ اور اصل میں پہلے ایسے ہی عہدہ دار ہمت افزائی کرکے صنعتوں کو باقی رکھتے تھے۔ ان لوگوں کا پیشہ محض گپتی سازی ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اپنی صنعت کی تشہیر نہیں کرتے۔ جو لوگ بیڑ کے رہنے والے ہیں یا جو ملازمین بیڑ سے تبادلہ ہوکر دوسرے اضلاع میں جاتے ہیں ان کے ذریعہ سے اس صنعت کی تشہیر ہوتی ہے چنانچہ اسی طرح یہ صنعت کسی قدر مشہور ہوئی اور اب ان کے پاس اورنگ آباد، ناندیڑ، پربھنی، ورنگل، نظام آباد، گلبرگہ سے گپتیوں کے لئے آرڈر آتے ہیں۔ موجودہ کساد بازاری کا اثر ان پر بھی پڑا ہے۔ پانچ سات سال پہلے ان کی خالص آمدنی ۱۵۰، ۲۰۰ روپیہ تھی لیکن اب ۱۰۰، ۱۲۵ روپیہ ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ پانچ سات سال پہلے ان کے دو نواسے کام نہیں کرتے تھے۔ ان لڑکوں کو مڈل تک تعلیم دی گئی ہے۔ انہوں نے برٹش انڈیا میں اس صنعت کی تجارت کرنے کی اجازت حاصل کی تھی لیکن پھر انہیں منع کیا گیا۔ آجکل فیشن کے لحاظ سے لوگ لکڑی ہاتھ میں پکڑتے نہیں اس وجہ سے گپتی کی خرید بھی کم ہوتی ہے۔

اگر حکومت ان صناعوں میں سے ایک کو صنعت و حرفت کے مدرسہ میں ملازم رکھے تو کئی لوگ اس فن سے واقف ہو جائینگے شیخ احمد اب ۱۰۰ روپیہ ماہانہ کی تنخواہ پر آنے کے لئے راضی ہے۔ یہ مطالبہ میرے خیال میں ضرورت سے زیادہ ہے میں نے اس سے اپنا شبہ ظاہر کیا تو اس نے جواب دیا کہ لوگ ملتے بھی نہیں ہیں۔ اگر حکومت رکھے تو ہمیں کو رکھے ان کے پاس سرمایہ نہ ہونے سے یہ ترقی نہیں کرسکتے اگر انہیں سرمایہ بہم پہنچایا جائے تو یہ مشین کا بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک مشکل یہ پیش آتی ہے کہ مذہبی خیالات کے لحاظ سے یہ لوگ بغیر سود کے قرضہ چاہتے ہیں۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لئے حکومت یہ کرسکتی ہے کہ محکمۂ پولیس میں کرچ اور بایونٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر محکمۂ پولیس کرچ اور بایونٹ انہیں کے پاس سے خریدے اور انہیں کچھ رعایات دے یا پہلے کچھ قیمت ادا کرے تو ان کو سرمایہ ملیگا اور مشین استعمال کرسکیں گے۔ اب وہ اپنے ہاتھ سے روغن تیار کرتے ہیں۔ اگر گپتیاں کثیر مقدار میں بنائی جائیں اور ان کی کھپت بھی ہو تو یہاں روغن کی صنعت بھی ترقی کرسکتی ہے۔ اس صنعت کی عمر ابھی چھوٹی ہے۔ اس لحاظ سے ابھی اس میں ترقی کی گنجائش ہے۔ اس کے لئے انہیں اصل مہیا کرنا چاہئے اور صنعت کی تشہیر اور نکاسی کا بندوبست کرنا

چاہئے۔ آج کل تشہیر نہ ہونے پر بھی ان کو ۱۵۰ ، ۲۰۰ روپیہ ماہانہ ملتے ہیں اگر ان کا اشتہار کیا جائے تو اس کساد بازاری کے زمانہ میں بھی زیادہ آمدنی ہوگی اور ساتھ ہی ملک کی ایک صنعت ترقی کرے گی جس میں ابھی بہت سے مزدوروں کی کھپت ہوسکتی ہے۔

ایک ۔ ثروتیہ

ایک غمگین صبح

اپنے عالی حوصلہ شاہوں کے گن گاتی ہوئی
اٹھ رہی ہے سطح سے ہر موج لہراتی ہوئی

ہر ادا میں شان ہے "شاہوں کے استقبال" کی
ساحلِ ماضی سے ٹکراتی ہیں موجیں حال کی

بس گئی دنیا "اجڑتی تھی ابھی اجڑی نہ تھی"
بات یوں اس کی بنی جیسے کبھی بگڑی نہ تھی

اس کے سینے میں تمنا کی تپش باقی رہی
مادی رونق میں روحانی کشش باقی رہی

اس کی موجوں کو نظر سے چومتا تھا آسماں
اب بھی خاموشی سناتی ہے وہ خونیں داستاں

قافلہ گذرا تھا جب اس پر سے تاناشاہ کا
اس نے گذرانا تھا تحفہ نالۂ جانکاہ کا

بے کسی میں اپنے شہ کی دے دیا جو بھی تھا پاس
اس کے پانی نے بجھائی تھی خدابندے[1] کی پیاس

داغِ دل بن کر قطب شاہوں کے ہیں نقشِ قدم
سوکھنے پاتا نہیں اس کا کبھی دامانِ نم

سیر کرنے والے ان رنگینیوں میں کھو نہ جا
حال کے جلووں میں یوں ماضی سے غافل ہو نہ جا

قہقہوں کی گونج میں پوشیدہ آہوں کو نہ بھول
ذرہ ذرہ کہہ رہا ہے قطب شاہوں کو نہ بھول

رو رہا ہے آسماں یہ شبنم افشانی نہیں
اشک کا سیلِ رواں ہے دیکھ یہ پانی نہیں

میکش

[1] تاناشاہ کا اکلوتا فرزند

دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا

اردو مثنوی، اور اصناف کی طرح اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے اس کی مقبولیت، اس کی خصوصیات اور اس کے لوازم مختلف زمانوں میں کچھ نہ کچھ بدلتی رہیں۔ اس کا پورا سرمایہ کم و بیش سو سال کی پیداوار پر حاوی ہے۔

مثنوی کو دوسرے اصناف کے مقابلہ میں میسر دیکھنے کی بعض وقت ضرورت اور خواہش اس وجہ سے داعی ہوتی ہے کہ یہ صنف چند معین خیالات کے اظہار کا آلہ رہی ہے چنانچہ اس کی اصطلاحی آسانیوں کی وجہ سے ابتدا میں صوفیائے کرام نے اس کو ذریعہ بنایا تھا۔ بعد میں جب یہ زبان ادبی بن گئی تو قصے کے ساتھ اس کا پیوند لگا۔ اس کے بعد ایک زمانہ اس پر ایسا بھی آیا کہ یہ کسی قدر کم طویل قصوں یا مدح کی نظموں کی صورت میں فروغ پاتی رہی۔ موجودہ زمانہ میں یہ صنف ظاہری شکل و صورت اور معنوی ہر اعتبار سے بہت کچھ بدل گئی ہے۔

اس طرح اردو مثنوی کی پوری ارتقائی رفتار کو ہم چند منازل میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ مثلاً (۱) ابتدائی عہد کے مثنوی پارے جو زیادہ تر صوفیائے کرام کے رشحات پر مشتمل ہیں۔ یہ موجودہ رسم الخط میں لکھی ہوئی ایسی بھاشا کے نمونے ہیں جن میں عربی اور فارسی کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ ان کی بحریں عموماً برج کی ہیں اور یہ تقریباً ساتویں صدی ہجری کے نصف آخر سے لے کر دسویں صدی ہجری کے زمانہ پر حاوی ہیں۔ دوسرا دور ابتدائی مکمل اور طویل مثنویوں کا ہے اس میں پنجاب، گجرات اور بیجاپور کے ابتدائی دور کے چند کارنامے شامل ہیں۔ اور یہ تقریباً سب کے سب ارشاد و ہدایت اور تصوف و عرفان کے حامل ہیں۔ ان میں قابل ذکر گجرات کے حضرت خوب محمد چشتی کی مثنوی "خوب ترنگ" اور بیجاپور کے ایک نہایت مقدس بزرگ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق اور ان کے خاندان کے ملفوظات ہیں جو نظم اور نثر دونوں پر مشتمل ہیں۔ اسی دور میں اردو مثنوی کا حقیقی ڈول ڈالا گیا۔ اور اس کے آخری زمانے کا تعلق دکن اور خاص طور پر بیجاپور سے ہے۔

دکن میں مثنوی کا آغاز ڈھائی سو سال سے زیادہ مدت پر حاوی ہے۔ حضرت شاہ میراں جی کی وفات ۹۰۲ھ میں ہوئی آپ کے زمانے سے لیکر ۱۱۶۰ھ یعنی حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی کی مثنوی "بوستان خیال" کی تحریر تک، مثنوی کو مسلسل اور خاطر خواہ ترقی ہوتی رہی۔

اس ڈھائی سو سال کے طویل عرصہ کی پیداوار کو ہم سہ گانہ تین عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا عنوان عہد بہمنی کی مثنویاں۔ دوسرا عنوان عہد عادل شاہیہ و قطب شاہیہ کی مثنویاں اور تیسرا عنوان آصفجاہی عہد کی دکنی مثنویاں ہو سکتی ہیں۔ اس طرح پہلا عنوان اردو مثنوی کے ارتقا کا گویا تیسرا باب ہوگا۔ اور دوسرا اور تیسرا عنوان بہ ترتیب چوتھا اور پانچواں باب۔

حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کی ولادت مکہ معظمہ میں ہوئی تھی۔ آپ اوائل عمر میں ہندوستان تشریف لائے اور بیجاپور کو اپنا مستقر بنایا۔ آپ کے علم و فضل، تقدس اور سیرت کے اثرات نے ارادت مندوں کا ایک بڑا گروہ آپ کے اطراف جمع کر دیا تھا۔ چونکہ ان میں سے اکثر عربی زبان سے ناواقف اور فارسی سے بھی کچھ زیادہ مانوس نہیں تھے اس لئے آپ نے خود ان کی زبان سیکھی اور اسی میں ارشاد و ہدایت فرمائی۔ یہ ملفوظات آپ کے مریدین اور معتقدین نے عوام کے فائدے کی خاطر لکھ لئے۔ اس وقت اسی طرح

کے کئی مخطوطے دستیاب ہوتے ہیں، جو اسی قریبی زمانے کے لکھے ہوئے ہیں، اور نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہیں۔

نظموں میں آپ کی مثنویاں "خوش نامہ" اور "خوش نغز" کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں شامل ہیں۔ ان کے اقتباسات موجودہ زمانے کی اکثر ایسی کتابوں میں شایع ہو چکے ہیں، جو اس دور سے متعلق ہیں۔

حضرت شاہ میراں جی کے فرزند، حضرت شاہ برہان الدین جانم بھی بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ آپ کے ملفوظات میں "سکھ سہیلا" "منفعت الایمان" اور "ارشاد نامہ" وغیرہ اب منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اسی طرح حضرت شاہ برہان الدین جانم کے فرزند حضرت شاہ امین الدین اعلےٰ کے ملفوظات میں بھی کئی نظمیں اور کسی قدر طویل مثنویاں شامل ہیں۔ ان میں "رموز السالکین" "نظم وجودیہ" "نظم قربیہ" "محب نامہ" قابل ذکر ہیں۔ اس خاندان کے ارشادات تمامتر مذہبی اور متصوفانہ خیالات پر مشتمل ہیں۔

اسی طرح کے اور بھی نظم و نثر کے رسالے موجود ہیں، جو صوفیائے کرام کے ملفوظات پر مشتمل ہیں۔ یہ رسالے زیادہ تر بیجاپور کے ابتدائی چار حکمرانوں کے عہد سے متعلق ہیں۔

دکن کی ادبی تاریخ بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ) اور گولکنڈے کے محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کے عہد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان دونوں سلاطین کی سرپرستی میں، ادبی ذوق کی ترقی شروع ہوئی اور بلند پایہ شعرا نشو و نما پانے لگے۔ ان میں محمد قلی کے درباری شاعر، وجہی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جس کی مثنوی "قطب مشتری" (۱۰۱۸ھ) عمدہ شاعری کا نامہ ہے۔ وجہی کے بعد اس فن کو سب سے زیادہ ترقی، عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے عہد کے مشہور ملک الشعرا شاعر غواصی نے دی۔ غواصی کی دو مثنویاں "سیف الملوک و بدیع الجمال" (۱۰۳۵ھ) اور "طوطی نامہ" (۱۰۴۹ھ) قدیم اردو کے ترقی یافتہ اور بلند شعری کارنامے ہیں۔ اس نے اردو مثنوی کو جس معیار تک پہنچا دیا تھا، وہ بعد کے شعرا کے لئے نمونہ بن گیا۔

مقیمی جو اسی عہد کا شاعر ہے اور بیجاپور کے ابتدائی ادبی مثنوی نگاروں میں سے ہے، اپنے آپ کو غواصی کا خوشہ چین بتلاتا ہے۔ اس کی مثنوی "چندر بدن و مہیار" جو ۱۰۵۰ھ سے قبل لکھی گئی ہے، ادبی اعتبار سے زیادہ اہمیت تو نہیں رکھتی، لیکن اس کا قصہ عرب کے' لیلےٰ مجنوں کے قصے کی طرح بے حد مشہور رہے۔

مقیمی کے زمانے سے مثنوی لکھنے کا طریقہ بیجاپور میں عام ہو گیا۔ اب مذہبی مثنویوں کے بجائے ادبی مثنویاں لکھی جانے لگیں۔ چنانچہ امین جو مقیمی ہی کا معاصر اور ہم وطن تھا، اس کے اثر سے فارسی کے ایک قصے کا ترجمہ "بہرام و حسن بانو" کے نام سے کیا۔ لیکن اس کی تکمیل وہ نہ کر سکا۔ اور بعد کے ایک بیجاپوری شاعر دولت نے ۱۰۵۰ھ میں اس کی تکمیل کی۔

مقیمی تک زیادہ تر اردو مثنویوں کا مواد یا تو طبعزاد ہوتا تھا یا برج بھاشا سے ماخوذ صرف محمد قلی کے زمانے کے ایک شاعر، احمد نے فارسی سے استفادہ کر کے "لیلیٰ مجنوں" لکھی تھی۔ لیکن "بہرام و حسن بانو" کے بعد سے جو مثنویاں اردو میں لکھی جانے لگیں ان میں زیادہ تر فارسی مثنویوں سے استفادہ کیا گیا۔ چنانچہ اس زمانے میں محمد عادل شاہ کے دربار کے ایک شاعر صنعتی نے ۱۰۵۵ھ میں حضرت تمیم انصاری صحابی رسول کی حیات کے ایک قصے "قصۂ بے نظیر" کا ترجمہ کیا۔ اور اس کے دوسرے سال اسی کے ہم وطن شاعر، ملک خوشنود نے "ہشت بہشت" کو

اردو نظم کا جامہ پہنایا۔ ۱۰۵۹ھ میں بیجاپور ہی کے ایک اور شاعر کمال خاں رستمی نے ابن حسام کے مشہور فارسی رزمیہ "خاور نامہ" کو نظم کیا۔ یہ اردو کی پہلی قابلِ ذکر رزمیہ مثنوی ہے۔ نہ صرف اس لحاظ سے، بلکہ بیان اور زورِ قلم کے اعتبار سے بھی یہ کارنامہ قابلِ قدر ہے۔

"خاور نامہ" کے بعد، جو مثنوی لکھی گئی وہ گولکنڈے کے شاعر جنیدی کی "ماہ پیکر" (۱۰۶۴ھ) ہے لیکن اس کا مخطوطہ نایاب ہے۔ اس کا ذکر مختلف حوالوں کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس کے دو سال بعد گولکنڈے کا ایک اور شاعر کا لکھا ہوا یہ ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" ہے جو اس میں شک نہیں کہ ایک فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے لیکن آزاد چنانچہ اس میں جگہ جگہ ماحول اور عہد کے اثرات نمایاں ہیں۔ غواصی کے بعد یہ دوسرا بڑا اور اسی ٹکر کا شاعر تھا جس نے مثنوی کے معیار کو، اسلوب اور تخیل کی حد تک بلند کیا۔ بعد کے شاعروں نے غواصی کی طرح اس کے کارنامے کو نمونہ بنایا چنانچہ ہنر فرزند مشرقی، کی مثنوی "نیہہ درپن" (۱۱۴۴ھ) میں اس کے ثبوت ملتے ہیں۔

بیجاپور میں علی عادل شاہ ثانی کے عہد تک اردو شاعری کا ذوق خاطر خواہ ترقی کر چکا تھا چنانچہ خود اس کے دربار نے ملک الشعرا نصرتی جیسے زبردست سخن پردازوں کی پرورش کی۔ نصرتی بیجاپور کے لازوال شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی دو مثنویوں میں ایک "گلشن عشق" جو ۱۰۶۸ھ میں لکھی گئی ہندوستان کے مشہور قصے "منوہر و مدمالتی" کی عشقیہ داستان ہے۔ اس کی دوسری مثنوی "علی نامہ" رزمیہ اور تاریخی مثنوی ہے جس میں علی عادل شاہ دوم کی جنگوں کے حالات نہایت تفصیل سے پیش کئے گئے ہیں۔ لفظیات کے اعتبار سے "علی نامہ" کی وسعت کو اردو کے بہت کم کارنامے پہنچ سکتے ہیں۔ نصرتی کے اسلوب میں ادبیت اور لطف بھی موجود ہے۔ وہ جنگوں کے نقشے نہایت عمدگی سے اور حقیقی پیش کر سکتا تھا۔ "علی نامہ" کی تکمیل ۱۰۷۶ھ میں ہوئی۔

اس عہد کی آخری مثنویوں کے ذکر سے پہلے گولکنڈے کی ایک مثنوی "بہرام و گل اندام" کا ذکر ضروری ہے جو ۱۰۸۱ھ میں لکھی گئی۔ یہ بہت زیادہ اہم کارنامہ نہیں ہے۔ تاہم غواصی اور ابن نشاطی کے دبستان کی تمام خوبیوں اور خصوصیات کا حامل ہے

دوسری مثنوی "ظفر نامہ نظام شاہ" ایک رزمیہ ہے جو تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں رام راج سے دکن کی دوسری سلطنتوں کی جو جنگ ہوئی تھی، اس کا شاعرانہ حال درج ہے۔ اس کا مصنف حسن شوقی، بلند پایہ شاعر تھا جس کو پہلے، نظام شاہی دربار (احمد نگر) سے توسل رہا۔ پھر وہ بیجاپور آیا۔ آخر میں محمد قطب شاہ کے زمانے میں گولکنڈہ آگیا تھا۔ اس کی ایک اور مثنوی "میزبانی نامہ" بھی ہے۔

نصرتی کے بعد، سوائے ہاشمی کے بیجاپور میں ایسے بلند پایہ شاعر کم پیدا ہوئے جن کے کارنامے دیرپا اہمیت کے حامل ہوں۔ صرف شاہ ملک کا ذکر اس کی ضخیم مذہبی مثنوی "شریعت نامہ" کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ یہ مثنوی ۱۰۸۸ھ میں لکھی گئی تھی۔ ہاشمی، وسیع پیمانہ کا انسان تھا، عادل شاہی سلطنت کے زوال کی وجہ سے زمانہ بھی بدل چکا تھا اس لئے اس نے اپنی شاعری میں، عام راستے سے تجاوز کیا اور اس دور میں دکن کی آخری مثنویاں زیادہ تر گولکنڈے میں لکھی گئیں۔ چنانچہ امین، غلام علی، فائز اور لطیف، جن کی تصنیفات ۱۰۹۰ھ سے ۱۱۰۰ھ کے زمانہ پر حاوی ہیں، اسی گولکنڈے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

امین، حضرت عمر کے فرزند ابوشحمہ کے متعلق ایک فرضی قصے کا مصنف ہے، جو ۱۰۹۸ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس کے ایک سال بعد

غلام علی نے "پدماوت" کے حصے کو منظوم کیا۔ اس کا ماخذ فارسی سے زیادہ ہندی قصہ تھا۔ فائز "رضوان شاہ روح افزا" (۱۰۹۴ھ) کا مصنف ہے .... لطیف نے ایک رزمیہ مثنوی لکھی ہے جو "ظفر نامہ" کے نام سے موسوم ہے اس میں "خاور نامہ" کا زور بیان اور "علی نامہ" کا لطف موجود نہیں ہے۔

۱۱۰۰ھ کے قریب دو ڈھائی سال کے اندر اندر بیجاپور اور گولکنڈے کے ادبی اور علمی مرکزوں کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ علما اور خاص طور پر اردو زبان کے شاعر جو عادل شاہی او قطب شاہی سلاطین کی سرپرستی میں اپنے ذوق کی تکمیل میں منہمک تھے منتشر ہونے لگے۔ کیونکہ ان سلاطین کے جانشین یعنی مغلیہ امرا کو اردو شاعری کا چسکا ابھی نہیں لگا تھا۔ شہنشاہی احساس کے ساتھ فطرتاً وہ شہنشاہی دربار کی ادبی روایات اپنے ساتھ لائے تھے۔ تاہم اردو شاعروں کے قدم اکھڑے تو اس سرزمین میں فارسی شعرا کے قدم بھی نہ جم سکے۔ اور شعرا ہی نے دکن کے اگلے ادبی ذوق کو جاری رکھا۔ لیکن یہ خود منتشر ہو گئے، ان کی شعری پیداوار کی یکسانیت منتشر ہو گئی۔

چنانچہ دکن میں مغلوں کے تسلط کے بعد، جو کارنامے ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ بڑی حد تک ان کے پیدا کرنے والوں کی ذہنی حالت کا عکس پیش کرتے ہیں۔ اس زمانے کی شعری پیداوار کو ہم اس طرح تقسیم کر سکتے ہیں۔ (۱) مرثیے (۲) مذہبی نظمیں (۳) متصوفانہ نظمیں، (۴) نیم مذہبی نظمیں۔

دکن کے شعرا نے مرثیہ کے لئے متنوع شعری صنفوں کا استعمال کیا ہے۔ لیکن اس طرز کا زیادہ کلام قافیہ کی ترتیب میں قصیدے کی شکل رکھتا ہے، اس لئے یہ ہمارے دائرہ سے باہر ہے۔ دوسری قسم کی نظموں میں، ولی ویلوری کی "روضۃ الشہدا" ( ) ضعیفی کی "ہدایت ہندی" ذوقی کی "وصال العاشقین" جیسی طویل مذہبی نظمیں شامل ہیں۔ اس دور میں تیسری قسم کی نظمیں بہت زیادہ مقبول ہوئیں۔ ان میں سب سے پہلے قاضی محمد محمود بحری کی "من لگن" کا ذکر ضروری ہے۔ بحری اصل میں بیجاپور کے رہنے والے تھے۔ بیجاپور کی تباہی کے بعد یہ حال تباہ گولکنڈہ پہنچے۔ دو سال بعد، گولکنڈے کی سلطنت کا سایہ بھی سر سے جاتا رہا۔ "من لگن" تصوف کی قدیم نظموں میں خاص اہمیت رکھتی ہے یہ اور وجدی کی "پنچھی باچھا" جو منطق الطیر کا ترجمہ ہے بہت پڑھی جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ عشرتی کی متصوفانہ نظمیں "چیت لگن" اور "دیپک پتنگ" بھی کافی مقبول تھیں۔

نیم مذہبی نظموں میں محمد علی عاجز کے قصے قابل ذکر ہیں۔ ان میں فقہ عقائد وغیرہ کے مسائل کو قصے کے پیرایہ میں بیان کیا جاتا تھا۔ ان قصوں کو بھی اپنے زمانہ میں کافی مقبولیت حاصل رہی۔

دکن میں مثنوی کی ترقی کا آخری زمانہ آصفجاہی سلطنت کے قیام کا ابتدائی دور ہے۔ یہ ایک عبوری زمانہ ہے، جس میں قدیم خیالات اور قدیم روایات کی کچھ تو شکست و ریخت ہوئی، اور کچھ نئی تعمیر شروع ہوئی۔ زبان اور اظہار خیال کے سانچوں کے لحاظ سے، اس دور سے بڑا انقلاب رونما ہونے لگا۔

اس دور کا سب سے بڑا شاعر، ولی ہے۔ جس نے اپنی شاعری میں نئے ماحول اور بدلے ہوئے مذاق کو سب سے زیادہ جگہ دی اس کے بعد، شعرا کو ان کے نقش قدم پر چلنا آسان ہو گیا۔ مثنوی کی حد تک ولی کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ انھوں نے صرف دو تین

چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں۔ ان میں سے دو بزرگوں کی تعریف میں ہیں۔ مگر ایک مثنوی جو تین سو تیس شعر کی ہے، نہایت اہم ہے۔ اس مثنوی کا عنوان "مثنوی در تعریف سورت" ہے۔ یہ اگلی تمام مثنویوں کے مقابلہ میں جداگانہ نوعیت رکھتی ہے۔ اس وقت تک اردو میں مثنوی مرقع نگاری کے لئے استعمال نہیں ہوئی تھی۔ ابتدائی چھوٹی چھوٹی مثنویاں متصوفانہ تھیں بعد میں وجہی کے زمانہ سے اس میں قصے لکھے گئے۔ کچھ رزمیہ مثنویاں بھی لکھی گئیں۔ عربی شعرا اس نوع کے خیالات کے لئے "قصیدہ" کا استعمال کرتے تھے فارسی شعرا نے بھی انہیں کی پیروی کی۔

ولی کے اثر سے، جب دہلی میں اردو شاعری کو فروغ ہوا تو ابتدائی زمانہ کے شعرا جیسے شاہ حاتم اور آبرو نے ولی کی اسی مثنوی کی پیروی کی۔ میر تقی میر کے سامنے یہ نمونے تھے۔ اس لئے ان کی وہ مثنویاں، جو فارسی کی تقلید میں نہیں لکھی گئی ہیں، اسی طرز کی ہیں فارسی کی قصہ دار مثنویوں کے نمونے پر میر نے جو مثنویاں لکھیں وہ، ابتدائی نوعیت کی ہیں۔

ولی کے بعد دکن میں دونوں طرح کی مثنویاں رائج ہو گئیں۔ خود ان کے جانشین، حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی نے ایک طویل مثنوی "بوستان خیال" کے ساتھ ساتھ کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی لکھیں، جو متصوفانہ خیالات سے مملو ہیں سراج کی طویل اور قصہ دار مثنوی، "بوستان خیال" اس دبستان کی دکنی مثنویوں کا سب سے بہتر کارنامہ ہے، اور اردو کی تمام مثنویوں میں اس کا درجہ "سحر البیان" کے بعد ہے۔ انداز بیان، صداقت جذبات، تکمیل اور شعری خوبیوں کی بدولت "بوستان خیال" ہر زمانہ میں قدر کی نظر سے دیکھی جائیگی۔

"بوستان خیال" کے بعد، دکن میں مثنوی نگاری کے ذوق پر تنزل طاری ہونے لگا تاہم اس آخری دور میں بھی دو تین مثنویاں ایسی لکھی گئیں، جن کی ادبی اہمیت کبھی کم نہیں ہو سکتی۔ ان میں سب سے پہلے قابل ذکر "دلہ جعیمی" [?] ابن شفیق اورنگ آبادی کی تصویر جاناں ہے۔ جو قصے کی ندرت اصلیت اور ادبی معیار کی بلندی کے باعث اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ دوسری "لعل و گوہر" ہے۔ جس کے مصنف عارف الدین خاں عاجز اورنگ آباد کے شعرا میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ مثنوی قدیم طرز کے فوق فطری قصوں سے کچھ زیادہ امتیاز نہیں رکھتی، لیکن عاجز کا انداز بیان صاف ستھرا اور موجودہ روزمرہ سے بہت قریب ہے۔ چونکہ اس زمانے میں اورنگ آباد کو سیاسی مرکزیت حاصل تھی، اس لئے، یہاں اچھے اچھے شاعر جمع ہو گئے تھے۔ اور دکن کے دار الخلافہ کے حیدر آباد میں منتقل ہو جانے تک اورنگ آباد ہی کو ادبی مرکزیت حاصل رہی۔ چنانچہ کئی سخن پرداز کنارِ ف هند سے آکر یہیں فروکش ہو گئے تھے۔ ان میں شاہ غلام قادر سامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ برہان پور سے آکر یہاں فروکش ہوئے تھے۔ یہ اچھے شاعر تھے اور ان کے اطراف شاگردوں کا ایک خاصہ مجمع تھا۔ یہ شفیق کے ہم عصر اور دوست تھے۔ شفیق نے اپنے تذکرے "چمنستان شعرا" میں ان کی ایک مثنوی "تماشاء صنو برِ" کے اقتباسات دئے ہیں۔ یہ مثنوی خاصی ضخیم بتلائی جاتی ہے۔ لیکن اب تک اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مثنوی اچھی ہوگی۔

اس مضمون کے ختم کرنے سے پہلے ایک اور سخن سنج کا ذکر ضروری ہے، جو اپنے زمانے کے استاد شمار کئے جاتے تھے یہ میر محمد ایمان، شاگرد حضرت شاہ تجلی ہیں۔ ایمان کا نشو و نما نواب نظام علی خان آصفجاہ ثانی کے آخر عہد میں ہوا یہ پرگو شاعر تھے۔ انہوں نے

کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی لکھی ہیں، جو پڑھنے اور لطف اندوز ہونے کے قابل ہیں۔

یہ آخری سخن سنج دراصل قدیم دبستان کے آخری شاعر تھے۔ اس کے بعد نئے عہد کے نئے تخیلات اور نئے روزمرہ کے اثرات نے قدیم دبستان کو متاثر کرنا شروع کیا۔ اور قدیم تخیلات پر بڑی شکست و ریخت طاری ہوئی اس دوران میں، دکن کی اردو شاعری پر پژمردگی سی چھائی رہی۔ یہاں تک موجودہ عہد سے پہلے، جب یہ شکست و ریخت مکمل ہو گی، تیسر جدید اردو شاعروں میں ایک نئی روح پھونک دی گی۔

عبدالقادر سروری

گوداوری گھاٹ کی ایک حسین صبح

شب تاریک چلی زلفوں کو سلجھاتی ہوئی ‏— صبح کے خوف سے ڈرتی ہوئی گھبراتی ہوئی

چور کی طرح دبے پاؤں چلی باد صبا ‏— ہر قبائے گل نوخیز کو مسکاتی ہوئی

آئی گردوں سے زمیں پر لئے تیغ عروس شبنم ‏— موتیوں کو در و دیوار پہ بکھراتی ہوئی

جل بجھی شمع ہوئی رات کی محفل خاموش ‏— بزم تاروں کی چلی آنکھوں کو جھپکاتی ہوئی

اڑ چلی نکہت گل چھوڑ کے دامن گل کا ‏— باد سرشار چلی جھومتی اتراتی ہوئی

جلوہ گر صبح کی دیوی ہوئی رفتہ رفتہ ‏— شب کا یہ گل رخ پر نور سے سرکاتی ہوئی

دور تاریکی ہوئی گھاٹ کی تقدیر کھلی ‏— ٹکڑیاں آئیں حسینوں کی ستم ڈھاتی ہوئی

نقرئی شانوں پہ بکھرائے ہوئے بال کوئی ‏— قلزم حسن کی ہر لہر میں لہراتی ہوئی

ذرے ذرے کو تبسم سے بناتی رنگیں ‏— بجلیاں چشم فسوں ساز سے برساتی ہوئی

کوئی انگڑائیاں لیتی ہوئی بدمستی میں ‏— ساغر عشق سے مے حسن کی چھلکاتی ہوئی

اپنی گستاخ اداؤں سے الجھتی ہر دم ‏— خود بہکتی ہوئی دنیا کو بھی بہکاتی ہوئی

کرنے اشنان کوئی کھول کے جوڑا آئی ‏— کوئی ساحل پہ کھڑی رہ گئی شرماتی ہوئی

بھیگے کپڑوں میں جو عریاں ہوئے جسم سیمیں ‏— بجلیاں بھرنے لگیں ابر میں گھبراتی ہوئی

کوئی کھولے ہوئے بالوں کو چلی ندی میں ‏— نکلی پانی سے کوئی زلفوں کو سلجھاتی ہوئی

چلی ہر ایک نہا دھو کے خراماں آخر ‏— موتی ان بھیگے ہوئے بالوں سے برساتی ہوئی

ہو گیا جلد ہی روپوش یہ رنگیں منظر ‏— آنکھوں آنکھوں میں نظر رہ گئی للچاتی ہوئی

علی احمد

اورنگ آباد کا سنہری محل

سنہری محل دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا جو بحمداللہ پورا ہوا۔ یہ عمارت اورنگ آباد کی قدیم عمارت ہے جو مقبرۂ رابعہ دورانی سے تقریباً ۲ فرلانگ کے فاصلے پر جانب غرب پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ اس عمارت کا محل وقوع نہایت ہی بلند اور مرتفع ہے اس کے اطراف کھلے میدان اور مشرق و شمال کی جانب پُرفضا پہاڑی ہے مقبرہ اس عمارت کے بالکل مقابل میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہ عمارت آباد تھی اس کی دیواروں پر سونے کا ملمع کیا ہوا تھا یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ فی زمانہ اگرچہ عمارت صحیح و سالم ہے لیکن دیواروں کے ملمع کا کہیں پتہ نہیں ہاں نقش و نگار کے کہیں کہیں نشان پائے جاتے ہیں۔ یہ محل دو منزلہ ہے نیچے کے حصہ کی تفصیل یہ ہے۔ بیچ میں ایک ہال اس کے دونوں جانب دو دو کمرے ان کمروں کے بازو ایک ایک وسیع ہال۔ اوپر کی منزل نہایت شاندار ہے۔ بیچ میں ایک بہت بڑا ہال اس کے آگے پیش جس میں نہایت کشادہ اور خوشنما کنگرہ دار کمانیں نکلی ہوئی ہیں پیش کے مقابل میں وسیع صحن بڑے ہال کے ہر دو جانب دو دو کمرے اور ہر ایک کمرے کے بازو کھلا ہوا صحن اور صحن کے کنارے پر حد کی دیوار سے لگا ہوا ایک ایک پختہ مسقف بیت الخلا۔ بالاخانہ کے عقبی حصہ میں بھی کشادہ صحن واقع ہے بالاخانے کے اوپر چاندنی ہے جس کے اطراف دیوار کھچی ہوئی ہے۔ چاندنی پر چڑھنے کے بعد تمام شہر ہتھیلی میں نظر آتا ہے اور نظر ریلوے اسٹیشن سے پرے جنوبی پہاڑی سلسلے تک بلا روک ٹوک کام کرتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارت کوسوں تک گرد و پیش کے وسیع رقبہ پر حکومت کر رہی ہے اس عمارت کے اطراف پختہ دیوار بنی ہوئی ہے جس میں کنگنیں نکلی ہوئی ہیں اور دیوار کے اندر عمارت کے عقب و پیش نہایت وسیع سطح و ہموار صحن ہے علامات و آثار سے پایا جاتا ہے کہ اس صحن میں چمن بندی کی گئی ہوگی کیونکہ اس وسیع چبوترے پر جس پر عمارت قائم کی گئی ہے۔ ایک حوض بنا ہوا ہے جس میں سے پانی ایک چھوٹی سی نہر میں جاتا تھا اور پھر نہر میں سے پست ماہی آبشار پر سے ڈھلکتا ہوا صحن کی روشوں میں پہنچتا تھا حوض اور نہر میں اب خاک اڑ رہی ہے اور چبوترے پر لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی ہے عمارت کے نیچے کا حصہ آج کل نہایت خراب حالت میں ہے اس کی اکثر کمانیں پتھروں سے چن دی گئی ہیں جس کی وجہ اندرونی حصہ کسی قدر تاریک ہے فرش پر کوڑے کرکٹ کی کوئی حد نہیں اس کے علاوہ جابجا مویشیوں کے گوبر کے ڈھیر پڑے ہوئے ہیں غالباً عدم نگرانی کی وجہ سے مویشی اندر داخل ہو جاتے ہیں بالاخانہ اب بھی ایسا ہے کہ وہاں کوئی بیٹھ جائے تو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا لیکن افسوس متعدی ملیریا کی علامات سے سفید دیواریں سیاہ ہو گئی ہیں۔ آہ! بالاخانہ کچھ نہ پوچھیے کیا چیز ہے شاید ہی ایسا ہوا دار مقام کہیں ہو اطراف کا کشادہ منظر کوسوں تک نظر کے روبرو ہے۔ روبرو میں پہاڑی کا سلسلہ گوناگوں دلفریبیوں سے معمور ہو کر اپنے حسن کی آب و تاب کے ساتھ بے نقاب نظر آتی ہے انواع و اقسام کے مناظر کے اجتماع سے ایک عجیب و غریب منظر پیدا ہو گیا ہے غرضکہ منظر کی لطافتیں حد بیان سے باہر ہیں صرف وہی لوگ بخوبی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں جو بذاتہ اس کا لطف اٹھا چکے ہوں۔ اس عمارت کے استحکام کی یہ حالت ہے کہ اس کی گچ سیسہ کے اور اینٹ فولاد کے مماثل ہے یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے بادوباراں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر رہی ہے۔

اس عمارت کی ویرانی کو دیکھ کر اور بانیان عمارت کی عظمت گزشتہ کا خیال کر کے دل پر کچھ ایسا عالم طاری ہو گیا کہ یہ چند اشعار

بے اختیار قلم سے نکل پڑے۔

(۱)

ہے بہت خوشنما سنہری محل دلکشا پر فضا سنہری محل
مرتفع اور بلند ہے یہ قصر روبروئے نظر ہے سارا شہر
ہے محل وقوع فرحت زا گرد حلقہ ہے اک پہاڑی کا
وادیٔ کوہ قاف میں گویا یہ سنہری محل ہے پریوں کا

(۲)

خوبصورت وہ دامن کہسار اور اس میں وہ سایہ دار اشجار
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائے جاں پرور چاروں جانب کھلا ہوا منظر
ہر طرف اس کی حکم رانی ہے جو جگہ ہے یہاں سہانی ہے

(۳)

ہے مقابل میں مقبرہ[1] ایسا نغز یہ اک دھرا ہوا گویا
دیکھ کر مقبرے کی زیبائی ایک تشبیہہ خوب یاد آئی
کیا ہی دلکش ہے خوش قرینہ ہے سبزہ زاروں میں اک نگینہ ہے
قصر زریں تیرا کیا کہنا عہد رفتہ کا ہے تو افسانا
قصر کیا ہے سرائے عبرت ہے دیکھو جس سمت جوش حسرت ہے
اب ہے ویران تھا کبھی آباد شان رفتہ ہے شوکت برباد
تازیانہ پئے تخیل ہے نقش بربادیٔ محل ہے

(۵)

ہوگئی ہے یہ تیری حالت زار جا بجا سے جگر ہے تیرا فگار
اب کہاں وہ طلائی رنگ ترا اب نہ وہ آب و تاب ہے نہ ضیا
تھیں کبھی جو نگار دیواریں ہوگئیں دل فگار دیواریں
فرش جو مثل آئینہ تھا صاف جا بجا اس میں پڑ گئے ہیں شگاف

---

[1] مقبرۂ رابعہ دورانی

کس میرسی کی تیری حالت ہے　　تیرا ویرانہ جائے عبرت ہے
حوض ہیں خشک صحن میں تیرے　　خاک اڑتی ہے تھے جہاں چشمے
رہ گئیں ہیں وہ اب کہاں باقی　　ہیں کہیں کچھ ابھی نشاں باقی

(۶)

کہہ رہے ہیں ترے در و دیوار　　تھا کبھی تو بھی غیرت گلزار
کیا ہی ذی شان ہوں گے تیرے مکیں　　صاحب اقتدار ذی تمکیں
پیش خدمت تھے جن کے جاہ و حشم　　نصرتیں چومتی تھیں جن کے قدم
اب کہاں ہیں وہ مالکِ دولت!　　کیا ہوئی ان کی حشمت و ثروت!
قصر جن کے تھے مثلِ قصرِ جناں　　گھونسلے زاغ و بوم کے ہیں وہاں
گردشِ دہر نے کیا پامال!　　وہ رہے اور نہ ان کا مال و منال
نہ رہا ان کا کر و فر باقی　　یادگار ان کے ہیں کھنڈر باقی

(۷)

اے محل اے وہ یادگار کہن　　اے وہ تصویر انقلاب زمن
جو تجھے دیکھنے کو آتا ہے　　نقش عبرت وہ لے کے جاتا ہے

سید اللہ بخش توحید

مدراس میں اُردو زبان اور ادب کی ترقی و اشاعت کا مسئلہ ہندوستان میں ہمہ گیر توجہ حاصل کر رہا ہے۔ کانگریس نے ہندوستانی کو وہاں کی سرکاری زبان بنانے کا تہیہ کیا ہے اور اس سلسلے میں ہندی کے رواج کے لئے بڑی کوشش کی جا رہی ہے ایسی صورت میں اُردو کے بہی خواہوں کو اُردو کی بھی فکر دامنگیر ہوگئی ہے اور ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح مدراس میں اردو زبان کی حالت اور اُردو ادب کے نشو و نما کے بارے میں عام معلومات حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے ادارۂ ادبیات اُردو نے مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی سے یہ مبسوط کتاب لکھوائی ہے۔
اس میں گزشتہ ڈھائی صدیوں سے مدراس میں اُردو کا جو کام کیا گیا ہے اس کا تفصیلی ذکر درج کیا ہے۔ قیمت ۱۲ عہ

سب رس کتاب گھر یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہے۔

۱۳۹۹ء میں دیول رائے والیٔ بیجانگر فیروز شاہ بہمنی پر حملہ کرنے کی غرض سے ایک ٹڈی لشکر لے کر طوفان کی طرح اٹھا تاکہ مدگل اور رائچور وغیرہ کے قلعوں کو مسمار کرتا ہوا پائے تخت تک پہنچے اور تختۂ سلطنت کو الٹ کر شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادے۔

دیول رائے شمالی سرحد کی طرف سے بڑھتا ہوا دریائے کرشنا کے ساحل پر پہنچا اور وہیں ڈیرے ڈال دیئے فوراً راؤٹیاں اور خیمے نصب کر دئے گئے، دکانیں لگادی گئیں اور یار لوگ جنگل میں منگل منانے لگے۔ کیمپ تقریباً بارہ تیرہ میل تک پھیلا ہوا تھا، جس میں تیس ہزار سوار اور نوے ہزار پیادوں کا لشکر جرار بحر ناپید اکنار کی طرح موجیں مار رہا تھا، ہر پیشہ کے لوگ اس میں موجود تھے، خرید و فروخت ہو رہی تھی، بازاروں میں چہل پہل تھی، شراب خانے کھلے ہوئے تھے، دور پر دور چل رہے تھے، ارباب نشاط طوائفیں اور کسبیاں نغمہ سرائی میں مصروف تھیں اور رقص و سرود سے محفلوں کو گرما رہی تھیں۔

ادھر سلطان کو خبر پہنچی تو وہ فوراً بارہ ہزار سرفروش اور جان نثار سپاہیوں کا لشکر اپنے ساتھ لے کر آندھی کی طرح اٹھا اور گلبرگہ سے کوچ کر کے کرشنا کے دوسرے ساحل پر جا پہنچا۔ برسات کا زمانہ تھا، سیلاب کے طوفان نے دریا کا پاٹ اس قدر چوڑا کر دیا تھا کہ پار اترنا مشکل نظر آیا۔ اس لئے حسب ایما شاہی وہیں سراپردہ نصب کر دیا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد سلطان نے اپنے ارکان دولت اور سپہ سالاروں کو مشورہ کرنے کی غرض سے طلب کیا، دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ہر شخص نے اپنی اپنی سمجھ کے موافق تدبیریں بتائیں لیکن سلطان کو تشفی نہیں ہوئی اور کوئی تصفیہ نہ ہو سکا۔ بہر حال نشستند و گفتند و برخاستند کے بعد سلطان کو بہت زیادہ فکر دامنگیر ہو گئی۔

ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، اندھیری رات میں سنسان جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا اور گھوڑے سے لے کر سوار تک سانس نہیں لے رہا تھا، لیکن سلطان بدستور اسی غور و فکر میں غرق تھا کہ دریا کس طرح عبور کیا جائے اور غنیم کی فوج پر کس پہلو سے حملہ کیا جائے ......

یکایک نظر اٹھائی تو دیکھا کہ سامنے کوئی بزرگ کھڑے ہوئے ہیں، چمکدار روشن آنکھیں، نورانی چہرہ، لانبی ستواں ناک، لمبی ڈاڑھی، دراز قد جسم پر سفید براق کپڑے، ادھر سلطان نے ذرا غور سے دیکھا، ادھر وہ بزرگ بھی سلام کرتے ہوئے آگے بڑھے تو معلوم ہوا کہ قاضی سراج[1] ہیں۔ سلطان نے تعجب سے پوچھا کہ اس وقت تم کدھر؟ دست بستہ عرض کی کہ پیر و مرشد، اس وقت لوگ خاموشی کے ساتھ جنگ کی تیاری میں مصروف ہیں مگر حضور کے چہرہ سے غور و فکر کے آثار نمایاں ہیں۔ اب حضور زیادہ تردد نہ فرمائیں، اس بہی خواہ دولت کو ایک تدبیر سوجھی ہے، اگر جان کی امان پاؤں تو حرف مدعا زبان پر لاؤں اور ایک تدبیر بتاؤں۔ سلطان فیروز عام طور پر علما، فضلا اور اپنے ارکان دولت سے نہایت بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ باتیں کرتا تھا، قاضی جی کی گفتگو سن کر مسکرایا اور کہا کہ قاضی صاحب! اللہ اللہ کرو، بھلا تم کو جنگ سے کیا واسطہ، کیوں خوامخواہ اس جھگڑے میں پڑتے ہو، تم تو اپنے خیمہ میں بیٹھے ہوئے اللہ اللہ کرو اور فتح فیروزی کی دعائیں مانگتے رہو۔

---

[1] قاضی سراج بادشاہی امیروں میں سے ایک نامی عہدہ دار اور امیران صدہ کا ایک نامی فرد تھا (فرشتہ)

قاضی جی بھلا کہاں چوکنے والے تھے، دست بستہ عرض کی کہ خداوند نعمت، فتح و فیروزی کی دعا تو ہر وقت زبان پر رہے گی خواہ میں حجرہ میں رہوں یا میدان جنگ میں مگر عرض یہ ہے کہ قاضی سمجھ کر میرا نام بہادروں کی صف سے خارج نہ فرمایئے باپ دادا سے فن سپہ گری ورثہ میں چلا آرہا ہے اس لئے میں اہل قلم سے ہی نہیں ہوں بلکہ اہل سیف بھی ہوں۔

سلطان نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو اپنی تدبیر بھی کہہ ڈالو۔ قاضی جی نے کہا کہ حضور تدبیر یہ ہے کہ میں نے دریا پار کرنے کے لئے چند چمڑے کے ٹوکرے اور لکڑی کی کشتیاں تیار کرلی ہیں۔ اس وقت غنیم کی فوج غافل ہے اگر حکم ہو تو تھوڑی سی فوج لے کر جاؤں اور شب خون ماروں۔

سلطان نے کہا کہ قاضی صاحب آپ نے ٹوکروں اور کشتیوں کی تدبیر تو بہت ہی اچھی بتائی مگر شب خون مارنے کی تدبیر مجھے پسند نہیں آئی اس لئے کہ میں فتح کو حیلہ سے حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ پھر غنیم کی فوج ایک لاکھ ہے اور ہماری صرف دس ہزار۔ اگر یہاں سے آپ چار سو پانچ سو آدمی لے کر بھی گئے تو کیا فائدہ؟ غنیم کی فوج تو دس بارہ میل تک پھیلی پڑی ہے۔ شب خون کسی طرح پورا نہیں پڑیگا۔

قاضی جی کی طبیعت ان معاملات میں بلا کی رسا واقع ہوئی تھی۔ فرمایا مثل مشہور ہے کہ الحرب خدعۃ۔ بس ہم بھی اسی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ چار پانچ سو آدمی تو ان کے لئے کافی سے زیادہ ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو یہ لوگ ان کو خرگوشوں کی طرح بھگا دیں گے بھگا بھگا کر مار ڈالیں گے۔ ہاں اگر کسی مصلحت کی بنا پر پیر و مرشد اس کے خلاف ہیں تو اتنی اجازت مرحمت فرمائی جائے کہ میں اپنے ساتھ چند بھروسے کے آدمی لے کر دریا کو عبور کروں اور خفیہ طور پر غنیم کے لشکر میں پہنچ جاؤں اور راجہ یا اس کے بیٹے کا کام تمام کردوں۔ اس عرصہ میں ہماری فوج بھی ٹوکروں اور کشتیوں سے دریا کے اس پار اتر آئے۔ جب شور غل ہو تو فوراً ہمارے لشکری دشمن پر گریں اور اس کے پرخچے اڑا دیں۔

بادشاہ قاضی جی کی یہ تدبیر سن کر مسکرایا اور خاموش ہو گیا مگر قاضی جی پارے کی طرح بے قرار تھے۔ بادشاہ کے سکوت کو "السکوت کالرضا" سمجھے اور سلطان سے رخصت ہو کر کیمپ پہنچے اور سات جوان مرد اپنے ساتھ لئے۔ جو آٹھوں ان کا دم بھرتے تھے۔ اور فقیروں کا بھیس کر کے چل کھڑے ہوئے۔ صبح ہوتے ہوتے غنیم کے کیمپ میں جا پہنچے۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے، جب کہیں دال گلتی نظر نہ آئی تو ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اس میں کھچڑی پکانی شروع کردی۔ قاضی جی نے ذرا مراقبہ کیا۔ ہزاروں چالبازیاں اور چالاکیاں ہاتھ باندھے ہوئے سامنے حاضر ہو گئیں پھر کیا تھا، فوراً ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور ساتھیوں کو بشارت دی کہ ایک ترکیب سوجھی ہے اب انشاءاللہ فتح ہی فتح ہے۔ ساتھیوں نے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ تو فرمایا کہ راجہ کی فوج کے ساتھ ارباب نشاط طوائفین اور کسبیوں کے طائفے بھی موجود ہیں۔ بس ہمیں وہیں چلنا چاہئے روپیہ میں سولہ آنہ امید ہے کہ وہاں پہنچ کر ضرور کامیابی کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ ساتھیوں نے پھر پوچھا کہ آخر وہاں جا کر کیا کیجئے گا؟ تو قاضی جی نے فرمایا کہ تمہیں کیا معلوم کہ فقیر جھولی میں کیا ڈالتا ہے اور کیا نکالتا ہے۔ بس تم لوگ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ اور جو کچھ میں کہوں اس پر بے چون و چرا عمل کئے جاؤ۔ القصہ سب نے مل کر کسبیوں اور طوائفوں کے کیمپ کی طرف دھاوا بول دیا۔ قاضی صاحب شاہ صاحب کا بھیس بدلے خضر راہ بنے ہوئے آگے آگے تھے اور ان کے چیلے اور مرید اپنے مرشد کے پیچھے قدم بقدم چل رہے تھے۔ اول خرابات میں پہنچے اور وہیں دھونی رما دی۔ دو چار روز کے بعد یہ درویشوں کی ٹولی کسبیوں کے کیمپ میں پہنچی اور ان کا نہایت تفصیل کے ساتھ جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ایک مقام پر دیکھا کہ ایک طوائف، نہایت طرحدار حسین، مہ جبین، نوکیلی چھبیلی، کنگھی چوٹی سے درست

سے آراستہ و پیراستہ شمعِ محفل بنی بیٹھی ہے۔

اس وقت قاضی جی کو سات خون معاف تھے، اسے دیکھتے ہی رال ٹپک پڑی، کانوں تک باچھیں کھل گئیں، دل سینہ میں بانسوں اچھلنے لگا، ڈورے ڈالنے کے لئے پروانہ وار آگے بڑھے اور اس کے سامنے بیٹھ کر وہ وہ باتیں بنائیں کہ رہے نام سائیں کا۔

اس موقع پر قاضی جی نے اپنے آپ کو پرلے نمبر کا عاشق مزاج، دل پھینک اور رنگیلا ثابت کرنے کی کوشش کی۔ سو جان سے قربان ہو رہے تھے، جو کچھ روپیہ پیسہ اپنے ساتھ لائے تھے بے دریغ اس پر سے نثار کرنا شروع کر دیا، وہ وہ باتیں بنائیں، وہ وہ رنگ جمائے کہ طوائف بھی ان پر ریجھ گئی اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ مجھ پر لٹو ہے۔ رات بھر خوش مذاقی اور ظرافت کی آتشبازی چھوٹتی رہی۔ تمام رنڈیاں اور ڈوم ڈھاڑی قاضی جی سے چپٹے ہوئے تھے اور قاضی جی اپنی مضحکہ خیز حرکتوں اور پرلطف باتوں سے اس محفل کو خوب گرما رہے تھے۔ اس وقت بقول انشاء اللہ خاں، قاضی جی کی یہ کیفیت تھی کہ۔

شب محفل ہولی میں جو وار و ہوا زاہد ۔ رنڈیوں نے لپٹ کر
داڑھی کو دیا اس کی کتا بند قلوتا ۔ اور بجنے لگی گت
تب منہ پہ کہنے لگے نمک پر ہو نا ہو ۔ بلکہ ناک پہ انگلی
اور آئے جی آنے سے برا مانے سو بھڑوا ۔ ہے موسم عشرت

دو چار روز اسی طرح گزرے، اتفاقاً ایک روز رات کے وقت قاضی جی کی معشوقہ راج کنور کے دربار میں مجرے کے لئے طلب کی گئی اور وہ جانے کیلئے تیاری کرنے لگی، قاضی جی کو جیسے ہی یہ پتہ لگا، بس مچل گئے، فوراً آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور لگے سسکنے، پھر یہ ہی نہیں بے تاب ہو کر پروانہ وار اس کے گرد پھرنے لگے اور قدموں پر گر کر عرض کرنے لگے کہ جدائی کی گھڑیاں مجھ سے نہیں کٹ سکیں گی، خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو یا تو تم وہاں نہ جاؤ یا مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ طوائف نے کہا کہ قاضی جی کیا عقل ماری گئی ہے، اپنے ہوش کے ناخن لو۔ ہم تو راجہ کے نوکر ٹھیرے، پھر بڑی بات یہ کہ خود کنور جی نے طلب فرما کر ہماری عزت افزائی فرمائی ہے ایسی صورت میں، بھلا میں حکم عدولی کیسے کر سکتی اور اپنے ساتھ راج سبھا میں تمہیں کیسے لے جا سکتی ہوں۔ اس لئے کہ وہاں تو صرف وہی شخص جا سکتا ہے جو گانے بجانے اور ناچ رنگ میں مشاق ہو۔

قاضی جی نے جواب دیا کہ اے جانِ جہاں! کیا تم نے اوروں کی طرح مجھ کو بھی نرا کاٹھ کا الو سمجھ لیا ہے، رام کی دیا سے میں بھی گانے بجانے سے اچھی طرح واقف ہوں، اس کے علاوہ وہ وہ کمالات جانتا ہوں کہ راجہ صاحب بھی دیکھ لیں تو بھونچکا ہو کر رہ جائیں۔ طوائف نے خیال کیا وہ ان کی لے رہا ہے، مسکرائی، اور اپنا ستار ان کی طرف کھسکا کر کہا کہ لیجئے ذرا اس کو تو چھیڑئیے۔ قاضی جی نے فوراً ستار ہاتھ میں لے، پردوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا، پھر جوڑ اور باج کے تاروں کو ٹٹولا اور طربوں کے سُر ملا کر وہ استادی سے بجایا، وہ وہ گت سازی اور مینڈ کاری کے کمالات دکھلائے کہ طوائفیں اور کسبیاں تو رہیں ایک طرف ان کے سازندے بھی سن کر دنگ رہ گئے۔ اب تو ان کی معشوقہ کا ماتھا ٹھنکا، سوچی کہ اس کا ساتھ رکھنا تو باعثِ فخر و عزت ہے، ناچ گانے سے بھی خوب واقف ہے، باتیں بھی خوب بناتا ہے

بہت ممکن ہے کہ اس کے طفیل سے ہم پر بھی دھن برسنے لگے۔ فوراً سب کو طائفہ میں شریک کر لیا اور انہیں اپنے ساتھ لئے راج کنور کے دربار میں جا پہنچے۔

محفل کیا کیا کچھ بھری ہوئی تھی، دیول رانی کا سہاگ اور اس کے احباب آپس میں ہنس بول رہے تھے، شراب کا دور چل رہا تھا۔ اس طائفہ کے پہنچتے ہی گانا شروع ہو گیا، طبلہ پر تھاپ پڑی، سارنگی رینے لگی، منجیرے بجنے لگے۔ طائفہ کی سریلی آواز اور گھنگرو کی چھم چھم سے محفل کا رنگ ہی بدل گیا۔ دیر تک محفل رقص و سرود گرم رہی۔ گانا ختم ہوا تو نقالوں کی باری آئی۔ قاضی جی فوراً ایک ساتھی کو لے کر اکھاڑے میں کود دے۔ یہ دونوں زنانہ لباس پہنے، سرمہ، مسّی اور زیور سے سدا سہاگن بنے، ناز و غمزے کرتے، مٹکتے ٹھمکتے، تھالیاں بجاتے اور کمر مٹکاتے ہوئے اس مضحکہ خیز انداز میں راج کنور کے سامنے آئے کہ اہل محفل ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ پھر ان بہروپیے نقالوں نے تمسخر، طرب سازی، اور گت بازی میں وہ وہ کمالات بتائے کہ راج کنور اور پوری محفل اش اش کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد قاضی جی نے اپنی غیر معمولی چلت پھرت اور دلفریب نرت کے ساتھ رقص شروع کر دیا۔ لے میں ڈوبا ہوا ساز، سُروں میں ڈوبی ہوئی آواز اور وقتیہ راگ راگنی کے سوز و گداز نے محفل پر جادو سا کر دیا، ہر شخص بت بنا ہوا ان کو ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہا تھا، اسی اثنا میں دونوں نے کمر سے خنجر کھینچ، بھاؤ بتانے شروع کر دئے اور نہایت سبک روی کے ساتھ وہ وہ جوڑ توڑ دکھائے اور وہ وہ ہاتھ اور پینترے نکالے کہ بھری محفل وجد کرنے لگی۔

آخر کار پاؤں کاٹتے اور پینترے بدلتے ہوئے دونوں کے دونوں راج کنور کی طرف آہستہ آہستہ بڑھے، پھر لپک کر اس کے سینے و شکم میں دونوں نے بیک وقت ایسے کاری خنجر بھونکے کہ وہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ اور تماشائی نشہ میں چور اور مست و مخمور تھے۔ جو لڑکھڑاتے ہوئے باہر بھاگے انہیں قاضی جی کے ان ساتھیوں نے سنبھالا جو باہر کھڑے ہوئے تال دے رہے تھے جو بھاگ نہ سکے وہ وہیں کے ہو کے رہ گئے۔

اب قاضی جی اور ان کے ساتھیوں نے کیمپ کے چراغ گل کرنے شروع کر دیئے۔ پھر کیا تھا چراغ گل پگڑی غائب، لشکری حیران و پریشان، اصل واقعہ سے بے خبر سمجھے کہ سلطان کے لشکر نے شب خون مارا ہے۔ شراب کا نشہ، کچی نیند اور رات کی تاریکی میں ایک دوسرے پر پل پڑے، ہر طرف صدائے دار و گیر بلند ہو گئی۔ ادھر قاضی جی نے اپنے ساتھیوں کو اطلاع دینے کی غرض سے سلطان کی طرف روانہ کر دیا اور خود کسی گوشۂ عافیت میں سر چھپا کر بیٹھ گئے۔

دیورانے نے یہ کیفیت دیکھی تو ہوش پرّاں ہو گئے، بس اندھیرے منہ اپنے لڑکے کی لاش لے کر فیر لائے اور بڑے بیجا نگر روانہ ہو گیا۔ دوسرے روز جب مشرق کا شہسوار ستاروں کی فوج کو شکست دے کر شعاع کا نیزہ ہاتھ میں لئے نکلا، فیروز شاہ سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق، جسم پر زرہ بکتر اور چار آئینے، سر پر خود فولادی، کمر میں شمشیر اصفہانی، پشت پر سپر، کندھے پر کمان، کمند ابریشمی شکار بند میں آویزاں، عربی گھوڑے پر سوار اپنی فوج ظفر موج کو لئے ہوئے آ پہنچا۔ نقارے پر چوٹ پڑی کہ دل سینوں میں دہل گئے۔ "اللہ اکبر، اللہ اکبر" کے نعروں سے دشت و دامن گونج اٹھا۔ بہادروں نے بڑھ کر حملہ کیا، پھر کیا تھا، تلواروں سے

تلواریں اور نیزوں سے نیزے اژدہوں کی طرح زبانیں نکالے ہوئے ایک دوسرے سے گتھ گئے۔ تیروں کی دھواں دھار بارش سے آسمان پر ایک ابر سا چھا گیا۔ جس میں برچھیوں کی سنانیں اور بھالوں کی انیاں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر بجلیاں گرا رہی تھیں۔ بڑے گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ ستم کا رن پڑا۔ جدھر دیکھو کشتوں کے پشتے لگے تھے۔ خون کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ کوئی سسک رہا تھا۔ کوئی ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور کوئی رقص بسمل کر رہا تھا۔ غرض یہ کہ قاضی جی کے ناچ نے سب کو گلی کا ناچ نچا دیا تھا۔

بارہ ہزار بہادروں نے وہ جی توڑ کر حملہ کیا کہ ایک دھاوے میں غنیم کے ہزار سے زیادہ کا کھیت کر دیا جو باقی رہے ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور ایسے اکھڑے کہ پھر نہ جمے۔ یار لوگ عجیب عجیب طرح بھاگ رہے تھے۔ کوئی بے تحاشا بھاگا۔ کوئی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ کوئی ٹوک دم بھاگا اور کوئی دم دبائے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ پیادوں کو ہوش نہ تھا کہ ہاتھ میں تلوار ہے یا میان۔ گھڑ سوار کو خبر نہ تھی کہ وہ گھوڑے پر سیدھا سوار ہے یا الٹا۔ فتحیابوں نے کئی کوس تک ان کا پیچھا کیا۔ بلکہ ان کے گھر تک پہنچا کر واپس آئے۔ راستے میں زخمیوں کی کمریں اور مردوں کی ہمیانیاں ٹٹول ٹٹول کر اپنے کمر کیسے خوب ٹھوک ٹھوک کر بھرے اور اس قدر زر، جواہر، مال و دولت ہاتھ آیا کہ جس کا حد و حساب نہیں۔

گھوڑوں کی ٹاپوں سے میدان جنگ میں جو غبار اڑا، قضا نے ہاتھ بڑھا کر نیزے کی انی سے اس پر فیروز شاہ کا نام لکھ دیا۔

الغرض راجہ کو ایسی شکست فاش ہوئی کہ اس کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔ سلطان فیروز شاہ اپنے لشکر کے ساتھ کامیابی کے جھنڈے اڑاتا ہوا اور فتح و فیروزی کے نقارے بجاتا ہوا اپنے دار السلطنت واپس ہوا۔ اس خدمت کے صلہ میں قاضی سراج خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوئے اور [illegible] امرا میں داخل ہو کر چین کی بنسی بجاتے رہے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

باغِ دکن

یہیں بہار کا پہلے پہل بنا ہے چمن
نگاہِ شوق کو کیا کیا سماں دکھاتا ہے
نمونۂ کرم و لطف کردگار ہے یہ
گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمیں شاداب
کمی نہیں ہے کسی شئے کی اس گلستاں میں
طلسم حسن کا خاکِ دکن ہے گلدستہ
مسافر آکے جو اس جا قیام کرتے ہیں
بلندیوں سے جو ہو مائل نشیب نظر
وہ دیکھو دور سے پانی ہے یوں نظر آتا

عجیب خطۂ دلکش ہے خاکِ پاکِ دکن
انوکھی شان زمانہ کو یہ بتاتا ہے
یہ باغ علم ہے گہوارۂ بہار ہے یہ
لطیف و سرد ہوا پاک صاف چشمۂ آب
عجب بہار ہے کچھ اس کے سرو و ریحاں میں
ہم کھڑے ہیں شجر اور کوہ صف بستہ
مناظر اس کے انہیں جلد رام کرتے ہیں
فریب دیتا ہے تالاب کا حسین منظر
سفید سانپ چلا جائے جیسے بل کھاتا

اقبال الدین احمد
سابق اڈیٹر کامریڈ و ادبی دنیا

دکن کے نسوانی ادارے

عہد عثمانی میں جہاں ملک اور ابنائے ملک کی ہر جہتی فلاح و بہبود کی خاطر سیکڑوں اصلاحیں عمل میں آئی ہیں وہاں طبقۂ نسواں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح حال کے لئے بھی ہمارے بیدار مغز سلطان العلوم کی علم پرور حکومت نے اپنی امکانی کوششیں کی ہیں اور مسلسل کئے جا رہی ہے۔

تعلیم نسواں کے سلسلہ میں جو تجاویز عمل میں آئی ہیں اور جو اقدامات کئے گئے ہیں ان کی اہمیت اور وقعت دوسری تجاویز سے کہیں زیادہ ہے! تعلیم نسواں کی اہمیت مردوں کی تعلیم سے بہت زیادہ ہے، اسی پر قوم کے ارتقا کا دار و مدار ہے، ہماری آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت ان کی اخلاقی اصلاح اور ان کی بہتری کے لئے عورت کا صحیح تعلیم و تربیت یافتہ ہونا از بس ضروری ہے، عورت نہ صرف مرد کا بلکہ ساری قوم کا "نصف بہتر" ہے، اس کو جاہل اور تعلیم و تربیت سے محروم رکھ کر ہم کبھی شاہراہ ترقی پر گامزن نہیں ہو سکتے۔

عہد عثمانی میں تعلیم [illegible] میں، و خواتین دکن نے اصلاح معاشرت و تمدن کی جو کوششیں کی ہیں ان کا اجمالاً تذکرہ کیا جاتا ہے۔

١٣٢٠ف میں جبکہ موجودہ فرمانروائے دکن نے زمام سلطنت اپنے دست مبارک میں لی صرف (٩١) مدارس نسواں ممالک محروسہ سرکار عالی میں قائم تھے جن میں (٤٦٣٤) لڑکیاں زیر تعلیم تھیں ١٣٤٢ف کے اعداد و شمار سے تعلیم نسواں کی ترقی کی رفتار اس طرح واضح ہوتی ہے کہ نسوانی درسگاہوں کی تعداد (٦٢٠) ہو گئی جن میں ساڑھے چوبیس ہزار لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں، ان مدارس میں ٥٩٦ تحتانیہ ہیں جن میں (٢١٠٤٣) طالبات شریک ہیں، مدارس وسطانیہ سولہ ہیں جن کی طالبات کی تعداد ٢٢٠٠ ہے۔ مدارس فوقانیہ نو ہیں ان میں ٣٦٢٣ لڑکیاں ہیں۔ تعلیم نسواں پر معتدبہ رقم جو سالانہ صرف ہو رہی ہے اس کا ایک معمولی سا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف ١٣٤٢ف میں ہماری علم دوست اور فیاض حکومت نے کوئی ساڑھے نو لاکھ روپے اس طبقہ کی تعلیم پر صرف کئے ہیں۔

ذیل میں چند سرکاری، امدادی و خانگی نسوانی مدارس اور خواتین کے اصلاحی و معاشرتی اداروں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ہم یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ عہد عثمانی میں تعلیم و تمدن نسواں نے ترقی کی منزلیں کس حسن و خوبی سے طے کی ہیں اور خواتین دکن میں تحصیل علم اور اصلاح معاشرت کے جذبات کس حد تک کارفرما ہیں۔

نامپلی زنانہ اسکول

مدرسہ فوقانیہ نسواں نامپلی کا قیام ١٣٠٠ف میں عمل میں آیا، اس وقت اسکول میں صرف سولہ لڑکیاں شریک تھیں، رفتار ترقی تقریباً ناپید تھی مگر سلطان العلوم کے تخت نشین ہوتے ہی ایک عظیم تغیر رونما ہوا، طالبات کی تعداد بتدریج بڑھنا شروع ہوئی چنانچہ اس وقت اس میں ١١٠٠ لڑکیاں زیر تعلیم ہیں علاوہ لڑکیوں کو امور خانہ داری، دستکاری، معاشرتی سلائی، اور بچوں کی بھی باضابطہ صحیح اصول پر عملی تعلیم دی جاتی ہے۔

کلیہ اناث

تعلیم نسواں کا معیار بلند کرنے اور طبقۂ نسواں کو اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور کرنے کے لئے ١٣٣٣ف میں کلیہ اناث کا قیام عمل میں آیا اس کالج کے ابتدائی اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم پانے والی طالبات کی تعداد

نصف درجن سے زیادہ نہیں تھی، اسٹاف صرف ایک پرنسپل اور ایک پروفیسر پر مشتمل تھا اور اب کوئی ایک درجن خاتون پروفیسر ساتھ ستر لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے زینے طے کرا رہی ہیں۔

وظایف تعلیمی

کلیۂ اناث کی کامیاب طالبات کو ان کی مخصوص اور امتیازی کامیابیوں کے مدنظر ہماری علم پرور حکومت سے ممالک غیر میں تکمیل تعلیم کے لئے وظائف عطا کئے جاتے ہیں اور اکثر خواتین باہر جاکر امتیازی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ خدمات پر اسی کالج میں مامور ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس وقت ایسی کئی خواتین کالج کی خدمات پروفیسری کو انجام دے رہی ہیں۔

محبوبیہ زنانہ اسکول

یہ اسکول ۱۳۱۶ف سے قائم ہے، اس میں سینیر کیمبرج تک تعلیم دیجاتی ہے، یہاں زیادہ تر امراء او معزز طبقہ کی لڑکیاں شریک ہیں یہاں کی اکثر طالبات سینیر کیمبرج کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے کلیۂ اناث میں داخل ہوتی ہیں، اسمیں طالبات کی تعداد ۱۳۴۶ف کے آخر میں (۴۰۹) تھی، اس اسکول میں کمسن لڑکے بھی داخل ہوسکتے ہیں، علاوہ تعلیم کے دستکاری، مصوری، موسیقی، خانہ داری، سلائی اور پکوان کی بھی عملی تعلیم دیجاتی ہے، سادہ معاشرت کا عادی بنانے، کفایت شعار بنانے کے لئے اس اسکول کی دوراندیش اور تجربہ کار پرنسپل طالبات کو سادہ لباس استعمال کرنے اور زیوارات کو ترک کرنیکی ترغیب و ہدایت دیتی رہتی ہیں، اسکول کی عمارت میں چند سال پہلے کافی توسیع کی گئی ہے۔ اس اسکول میں بھی ہر قسم کے میدانی کھیل ڈرل اور جمناسٹک کا بھی انتظام ہے۔

مدارس تعلیم المعلمات

یہ مدارس خصوصیاً معلمات کو طرز تعلیم سے واقف کرانے کے لئے قائم کئے گئے ہیں ان میں علاوہ (۱۰۴) طالبات کے (۹۰) معلمات بھی مصروف طرز تعلیم و تدریس ہیں، ان کو طرز تعلیم کے جدید طریقوں سے واقف کرایا جاتا ہے۔

ماڈل پرائمری اسکول

یہ اسکول ۱۳۳۴ف میں قائم کیا گیا ہے، اس میں مخلوط اشاف چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کو تعلیم کے لئے تیار کرتا ہے یہاں باغبانی بھی سکھائی جاتی ہے۔

گرل گائیڈ

کوئی آٹھ سال سے "گرل گائیڈ" کی تحریک جاری ہے، اس تحریک کے بنیادی اصول انسانوں اور جانوروں کے ساتھ ہمدردی ایک دوسرے کی تائید، زخمیوں کی فوری امداد، تیمار داری اور جوہ اتحادی ہیں۔ اس تحریک میں کلیۂ اناث، مدرسہ نسواں نامپلی، محبوبیہ زنانہ اسکول اور تعلیم نسواں کے بعض دوسرے ادارے بھی شریک ہیں، کھلی فضا میں سیر و تفریح کے مواقع اور معاشرتی پارٹیاں لڑکیوں کے سئے نرالی دلچسپیوں کا باعث ہوئے ہیں۔

انجمن ترقی تعلیم و تمدن نسواں

تعلیم نسواں کی ترقی اور اعلیٰ تعلیم کی نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ خواتین دکن کی معاشرت، تمدن اور ذہنیت میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ اعلیٰ تعلیم اور صحیح تربیت پائی ہوئی خواتین علم کی خوبیوں سے واقف ہونیکے بعد اپنی ان بہنوں کو جنہیں حصول تعلیم کے ذرایع میسر نہیں علم کی برکتوں سے واقف کرانے اور روشن خیال بنانیکی پوری کوشش کر رہی ہیں۔ اسی خیال کے تحت یہ انجمن ۱۹۲۶ء میں قائم کیگئی ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ سماجی اور معاشرتی اصلاحات کا تبلیغی کام بھی یہ انجمن بہ احسن وجوہ انجام دے رہی ہے۔ اس انجمن کی صدر محترمہ بیگم صاحبہ نواب ولی الدولہ اور نائب صدر مشہور پارسی خاتون مسز رستم جی فریدون جی ہیں، ان دونوں روشن خیال اور ملک و قوم کا درد رکھنے والی معزز خواتین کی سرپرستی میں یہ انجمن خوب پروان چڑھ رہی ہے، اشاعت تعلیم، اصلاح معاشرت و رسم و رواج کے مختلف اصول اور طریقے اس انجمن کے پیش نظر ہیں، یہ انجمن متعدد

زنانہ مدارس کی امداد اور نگرانی کرتی ہے، غریب اور شوقین لڑکیوں کو وظائف تعلیمی بھی اس انجمن سے دئے جاتے ہیں۔ اس انجمن کے تحت پانچ مدارس قائم ہیں، ان میں تقریباً چار سو بچوں کو مفت ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔

دارالاقامہ اس انجمن کی سرپرستی میں ایک دارالاقامہ شہر کے وسط میں قائم کیا گیا ہے، جس میں باہر سے آئی ہوئی خواتین بلالحاظ مذہب و ملت قیام کر سکتی ہیں، یہ اقامت خانہ خاص طور پر ان غریب خواتین کی ضرورت کو پورا کرتا ہے جو دایہ گری اور تیمارداری کی عملی تعلیم شفاخانوں میں حاصل کرتی ہیں اور ختم تعلیم پر مختلف دواخانوں اور ہسپتالوں میں ملازم ہوتی ہیں۔

دارالمباحثہ اس انجمن کے زیر سایہ ایک دارالمباحثہ بھی قائم ہے۔ اس میں تعلیم یافتہ خواتین تقریری مقابلے کرتی ہیں۔ اس قسم کے تقریری مقابلوں سے خواتین میں علمی ذوق پیدا کرنے کے علاوہ تقریر کرنے کی قابلیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس سال دارالمباحثہ کی جانب سے ایک پرجوش مناظرہ اردو میں ہوا۔ اس جلسے میں بلحاظ کثرت آراء یہ طے ہوا کہ ہندوستان میں بچوں کی پرورش کا موجودہ طریقہ ناقابل اطمینان ہے۔

ذیلی کمیٹیاں اس انجمن کی کئی ذیلی کمیٹیاں ہیں جو خواتین کے حقوق کی حفاظت، کمسنی کے ازدواج کی مخالفت، عورتوں اور بچوں کی جسمانی اور اخلاقی بہتری کے لئے مناسب تجاویز عمل میں لاتی ہیں۔ تقریروں کے ذریعہ اس انجمن کی اراکین اپنی بہنوں کو ان کے حقوق اور فرائض سے آگاہ کرتی ہیں اور ان کو اپنی صحت و تندرستی کی جانب بطور خاص متوجہ کرتی ہیں۔ ایک کمیٹی عورتوں کی قانونی دشواریوں پر غور کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہے۔ اس سال ہر کمیٹی کا ایک عام جلسہ ہوا جس میں کئی سو مسلم خواتین شریک ہوئیں۔ اس جلسہ میں وہ "نکاح نامہ" پیش کیا گیا جس کو مسز جاہ علی خان نائب صدر کل ہند خواتین کی کانفرنس نے مرتب کیا ہے۔ یہ نکاح نامہ ایک اقرار نامہ کی شکل میں ہے جس میں مسلم خواتین کو تحت قانون شرع طلاق کا حق دیا گیا ہے۔ بجز شریک جلسہ خواتین نے بلحاظ کثرت آراء اس نکاح نامہ کو منظور کیا۔

اس انجمن کو کل ہند خواتین کی کانفرنس کی مستقل کمیٹی نے حیدرآباد کی خواتین کی نمائندہ انجمن تسلیم کر لیا ہے۔ اس انجمن سے پانچ نمائندے سالانہ کل ہند کانفرنس کے جلسوں میں بھیجے جاتے ہیں اور کانفرنس کی مستقل کمیٹی میں اس انجمن کی ایک رکن حیدرآباد کے نمائندے کی حیثیت سے شریک رہتی ہے۔

دی گرلز اسکول کوآپریٹو بلڈنگ سوسائٹی لمیٹڈ مسز سنم جی کی صدارت میں محدود ذمہ داریوں کی ایک سوسائٹی زنانہ مدارس کی عمارتوں کی تعمیر کے لئے [illegible]ف میں قائم کی گئی ہے۔ اس سوسائٹی کا مقصد یہ ہے کہ غریب لڑکیوں کے مدارس کے لئے مختلف مقامات پر تعمیر کرائے، چنانچہ ایک ایسی ہی عمارت [illegible] میں تعمیر کی گئی ہے جس میں ایک اسکول قائم ہے۔

زنانہ کلب گزشتہ چند سال کے اندر حیدرآباد اور سکندرآباد میں خواتین کے کئی کلب قائم ہو گئے ہیں۔ ان کے لئے نہایت کشادہ اور شاندار عمارتیں بنائی گئی ہیں۔ پردہ کے معقول انتظام کے ساتھ کلب کی اراکین مختلف قسم کے کھیل و تفریحات سے مستفید ہوتی ہیں، کھیل اور تفریح کے علاوہ تقاریر کے ذریعہ دماغی اور اخلاقی ترقی بھی ہوتی ہے۔

لیڈیز اسوسی ایشن کلب اس کلب کی بنا کسی زمانہ میں مسز خدیو جنگ مرحومہ نے ڈالی تھی۔ اس وقت یہ کلب نہایت اعلیٰ پیمانہ پر قائم ہے، اس کی صدر لیڈی حیدری ہیں، جن کی نگرانی میں اس کی شاندار اور خوبصورت عمارت بنائی گئی۔ اس کلب کے اراکین کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ ہے۔ اس کلب کی جانب سے ہر سال دو طلائی میڈل ان طالبات کو عطا کئے جاتے ہیں جو انگریزی اور اردو کے مضامین میں امتیازی کامیابیاں حاصل کرتی ہیں۔ غریب لڑکیوں کو تعلیمی وظائف بھی دئے جاتے ہیں۔ اس کلب کی اراکین مختلف تفریحات اور میدانی کھیلوں کے علاوہ تقریری مقابلوں میں بھی شریک ہوتی ہیں۔

لیڈیز ریکریشن کلب گزشتہ چند سال سے یہ کلب قائم ہے، اس کی صدر رانی شام راج راجونت بہادر ہیں۔ اس کے اراکین کی تعداد تقریباً دو سو ہے۔ میدانی

کھیلوں اور دوسری تفریحات کے علاوہ اس میں ایک تیرنے کا تالاب بھی ہے جس میں خواتین تیراکی کا شوق بھی پورا کرتی ہیں۔

متذکرہ صدر اداروں کے علاوہ خواتین کی اور کئی انجمنیں بھی ہیں مثلاً انجمن خواتین دکن، انجمن خواتین اسلام، انجمن خواتین کی انجمن، گجراتی خواتین کی انجمن، عیسائی خواتین کی انجمن، بہبودی اطفال کے متعدد مراکز وغیرہ۔

انجمن خواتین دکن خواتین کی انجمنوں میں اس انجمن کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ یہ انجمن ۱۳۴۳ ہجری میں مسز صغرا ہمایون مرزا کی صدارت میں قائم ہوئی۔ اس انجمن کی سرپرست رانی شام راج راجونت بہادر ہیں۔ اس انجمن کے مقاصد میں ہر مذہب و ملت کی غریب و شریف خواتین کی مدد کرنا، غریب لڑکیوں کی شادی میں امداد دینا، بیوہ عورتوں اور نادار لڑکیوں کو دستکاری سکھانا، معذور عورتوں کو ماہانہ امداد و وظائف کی شکل میں دینا، ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینا، فضول رسم و رواج کو ترک کرانا ہے۔

اس انجمن کی کامیابیاں زیادہ تر محترمہ صغرا ہمایون مرزا کی عالی ہمتی و ایثار کی رہین منت ہیں ... انجمن ... کار ... ہیں۔ تقریباً بیس معذور و بیوہ اور نادار عورتوں کو ماہانہ امداد دی جاتی ہے۔ اس انجمن کی زیر نگرانی زنانہ صنعت و حرفت کا ... یہ اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہوگا جس میں ادبی تعلیم کے ساتھ دستکاری، امور خانہ داری اور مختلف فنون کی عملی تعلیم کا خاص انتظام کیا جاتا ہے ... انجمن نے بڑی فیاضی سے اپنی جائیداد کا بڑا حصہ اس ادارہ کے لئے وقف کر دیا ہے۔ ہر سال انجمن کی سرپرستی میں ہر سال دستکاری اور کپوان کی نمایش کی جاتی ہے۔ اس نمایش میں تعلیم نسواں کے مختلف ادارے حصہ لیتے ہیں۔ اس انجمن کی نگرانی میں اس وقت تین زنانہ اسکول قائم ہیں۔ غرضکہ اس انجمن کی کارگزاریاں دیکھنے کے بعد مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے یہاں بھی ایسی حساس خواتین موجود ہیں جو اپنی صنف کی تن من دھن سے خدمت کر رہی ہیں۔

بستان طالبات یہ ادارہ کوئی دس سال سے قائم ہے۔ اس میں یتیم بے یار و مددگار لڑکیوں کے قیام و طعام کا انتظام کیا جاتا ہے اور ان کو تعلیم و تربیت کے ساتھ امور خانہ داری، سوزن کاری اور کپوان وغیرہ کی عملی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس وقت ... ہیں ... اس ادارہ کی معتمد محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ بانو نظامی ہیں۔ علاوہ یتیم لڑکیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے پردہ کرنے والی مفلس بیوہ عورتوں کی امداد بھی کی جاتی ہے۔ سلائی کا کام ان کے لئے فراہم کیا جاتا ہے اور اجرت پر ان سے کام لیا جاتا ہے اور ان کو کشیدہ کاری اور سلائی کی تعلیم بھی مفت دی جاتی ہے۔

چند خانگی ادارے چند خانگی مدارس بعض حساس اور ہمدرد ملک و قوم خواتین کی سرپرستی اور نگرانی میں قائم ہیں۔ بیگم سید رحمت اللہ صاحب پروفیسر جاگیردار کالج نے ایک خانگی اسکول اپنے مکان پر ملازمین کی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے قائم کیا ہے جس میں سلائی کی تعلیم وہ خود دیتی ہیں۔ مسز امیر حسن صاحب نے ایک ایسا ادارہ اپنی قیام گاہ جوبلی ہل پر قائم کیا ہے جس میں صرف بیچارہ عورتوں کو سلائی اور کشیدہ کاری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مسز نندی نے اپنے مکان پر ایک مختصر سا اسکول ادنیٰ نوکروں کی اولاد کے لئے قائم کیا ہے جن کو وہ خود تعلیم دیتی ہیں۔

متذکرہ صدر اعداد و شمار سے واضح ہوگا کہ خواتین دکن میں بیداری کے احساسات کس حد تک پیدا ہو گئے ہیں اور اس طبقہ نے ہمارے آقائے ولی نعمت کے عہد میمنت مہد میں اپنی ہر جہتی فلاح و بہبود کے لئے کیسے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ تعلیمی، ذہنی و معاشرتی ترقی کے زینے کس حسن و خوبی سے طے کئے جا رہے ہیں۔ ترقی کی اس رفتار کو دیکھ کر دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ طبقہ مستقبل قریب میں ذیلی ... طے کر کے بہت جلد بام ترقی پر پہنچ جائیگا۔ تعلیم نسواں کی یہ رفتار پیش خیمہ ہے اس طبقہ کے درخشاں مستقبل کا۔ وہ دن دور نہیں کہ ہماری ملکی بہنیں دوسرے ممالک متمدنہ کی خواتین کی طرح زیور علم سے آراستہ اور صحیح تربیت یافتہ ہو کر علم کی روشنی سے جہالت کی تاریکی کو ملک سے دور کر دیں گی۔

مرزا سیف علیخاں

دنیا کا سب سے بڑا ہیرا

میں نے اپنے ملک کے ایک مجوزے مو ضوع پر یہ کتاب اس لیے لکھی ہے کہ گزشتہ آفاق و گراں قدر موضوع ہے کہ جو کبھی کسی دور میں دکن کی دولت مندی میں بے پناہ اضافہ کر چکا تھا اور فی زمانہ ایک پارینہ افسانوی داستان کے درجہ تک پہنچ چکا ہے زندہ کرنے اور پھر گذشتہ ثروت و دولت کا پتہ لگانے کے لیے وطن کی مادی و دولت میں اضافہ کرنے والے متجسین کے آگے "دکن کے ہیرے اور ان کی کانوں" کے عنوان سے تقریباً ایک کتاب مرتب کی ہے، جو شاید سعی بے حاصل سمجھی جائے یا سعی مشکور۔ نشاء اللہ عنقریب میں اس سے آئندہ کے نذر ہوگی۔ وہ کیسی ہوگی دیکھی ہوگی۔ اس کو ندرہ قارئین کرام ہی پرکھیں گے۔

محترم حضرت نور (مدظلہ) کے ارشاد پر اس کتاب سے اور کیا ہیرے کا حال آپ کے سامنے ہے۔ خود اس کے مفصل حالات اور مزید تحقیقی معلومات[1] کتاب میں شامل ہوں گے۔ صرف اس وقت جو کچھ موجود ہیں وہ ہی سب درج کر دیئے ہیں۔

اسی موضوع سے متعلق اس سے پہلے ایک اور ہیرے کا حال "کوہ نور ہیرے کی خونچکاں داستان" کے نام سے ۱۹۴۲ء کے سالنامہ نیرنگ خیال میں نکل چکا ہے۔ ۱۲

یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ دنیا کے معلومہ ہیروں میں صرف "الماس برگنزا"[1] ہی ایک ایسا ہیرا ہے جو سب سے زیادہ وزن رکھتا ہے، مگر نقادوں نے استدلال، شواہد اور تحقیقات کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ اس کا وزن اتنا زیادہ ہے کہ انہیں اس کی اصلیت پر شک و شبہ ہونے لگتا ہے، قطع نظر اس کے اور امور کے لحاظ سے وہ اس کو حقیقی الماس تصور نہیں کرتے۔

حال ہی میں شہنشاہ جارج ششم کی تاج پوشی کے موقع پر "ٹائمز آف انڈیا" کے نامہ نگار نے بادشاہ کے تاج کے متعلق جو تفصیلات لکھی تھیں، اس میں اس نے ان کے دوسرے تاج کی نسبت یہ لکھا ہے کہ اور جواہر کے سوا اس تاج میں وہ ہیرا بھی منسلک ہے جسے "آفریقہ کا ستارۂ ثانی" کہا جاتا ہے اور جس کا وزن (۳۰۹) کیرٹ ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس وقت صرف یہی ایک ہیرا دنیا کا سب سے بڑا ہیرا تصور ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جدید ترین اطلاع تک یہ جب یہ ماننا پڑے گا کہ بلحاظ وزن و اصلیت "الماس نظام" ہی

---

[1] یہ الماس چند جلاوطن مجرموں کو ۱۷۹۱ء میں دریائے ابیٹ سے ہاتھ لگا تھا جو راؤ بیلا سے شمال کی جانب واقع ہے۔ یہ ہیرا پرنس ریجنٹ (Prince Regent) جو بعد میں ڈان جواؤ ششم Don Jou VI کے نام سے مشہور ہوا اور حاکم پرتگال تھا، اس کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ یہ اب تک جو ہر خانہ پرتگال میں موجود ہے۔ غیر تراشیدہ حالت میں اس کا وزن ۱۶۸۰ قیراط یعنی ۱۰ اونس ہے اور بظاہر ایک بط کے بیضہ کی مقدار کا نظر آتا ہے۔ اگر یہ خالص ہو تو ماہرین کے حساب سے اس کی قیمت (۵۰) کروڑ ہوتی ہے، اور لکھا ہے کہ سرکار پرتگال اس کو خالص الماس سمجھنے کے لئے روگردانی کرتی ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا ہیرا ہے، کیونکہ اس کا وزن (۳۹٥) قیراط[۱] ہے۔

"الماس نظام" کے ابتدائی تاریخی واقعات کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہ ہیرا نواب میر فرخندہ علی خاں بہادر آصفجاہ رابع کے عہد حکومت میں، دستیاب ہوا تھا۔ صاحب گلزار آصفیہ نے (جو اس دور کے معتبر ترین مورخ سمجھے جاتے ہیں، اور جنھیں ایک عرصہ تک دربار شاہی کے تقرب کا بھی اختصاص حاصل رہا) اس کے حالات کی تحقیق میں، جو غالباً ان کے چشم دید ہیں، یہ بیان کیا ہے کہ قصبۂ جٹ پول میں ایک بقال رہتا تھا، معلوم نہیں کہ یہ الماس اُسے کہاں سے ہاتھ لگا، مگر اُس نے اس کی حفاظت بکرے کے سینگ میں چھپا کر اپنے ہی گھر میں، زمین میں دفن کر کے رکھی تھی، اور اس کے ساتھ اُس کی فرد کیفیت بھی اُسی سینگ میں لکھ چھوڑی۔ چند دنوں بعد وہ مر گیا، اور اس کا حال کسی کو نہ بتا گیا، چنانچہ یہ ہیرا اسی طرح دو سو برس تک زمین ہی میں پوشیدہ رہا، اور اس دو صدی کے امتداد نے اُس کے مکان کو کہنہ و افتادہ کر کے ویران کر دیا، اور صرف کھنڈر ہی باقی رہا تھا۔ اتفاق سے کسی نے اس زمین کو خرید کر، اس پر مکان بنانا شروع کیا، کھنڈر کی صفائی وغیرہ اور پایہ کھودنے کی وجہ سے اس مکان کی مٹی دوسری طرف منتقل ہوتی رہی، یہاں تک کہ اس زمین کا وہ دفن شدہ سینگ بھی جس میں کہ ہیرا چھپا تھا سارے خس و خاشاک کے ساتھ پھینک دیا گیا اس لئے کہ ایسی حقیر چیز کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی اور اس کے راز اور بھید سے کون واقف تھا۔

اس کے بہت دنوں بعد سنہ [illegible]ھ میں اسی قصبہ کا ایک کمہار برتن بنانے کے لئے مٹی کی خاطر اس مقام پر پہنچا اور یہاں اس نے خاک میں دبی ہوئی ایک سینگ پائی، صرف اس خیال سے کہ زمین کھودنے اور مٹی حاصل کرنے میں اس سے سہولت ہوگی اٹھالی، جب اُس نے صاف کرنے لگا تو اس سینگ میں اس کو ایک خوبصورت مگر بے رونق پتھر نظر پڑا، چونکہ وہ ایک گنوار تھا، اس لئے اس نے اس "سنگِ رنگین" کو کوئی اہمیت نہ دی۔ مٹی ساتھ لا رہی اور اس پتھر کو بھی اپنے بچوں کے کھیلنے کے لئے رکھ لیا۔ چنانچہ گھر پہنچ کر اس نے اس پتھر کو اپنی لڑکی کے حوالہ کیا اور لڑکی اس کی رنگینی و دل آویزی کو دیکھ کر، ہیرا لئے خوش خوش باہر نکلی، اپنے ساتھ کھیلنے والے بچوں کو جمع کیا اور ان بچوں نے دوڑ دوڑ کر سیتاپھل (شریفوں) کے بیج اکٹھے کئے۔ خود بیٹھی ترازو کے ایک پلڑے میں یہ رنگین پتھر رکھے بیجوں کو اس کا ہم سنگ کرتی، اور سارے بچوں میں انھیں تقسیم کرتی جاتی تھی۔

ان ہی دنوں سے چند روز پہلے، لڑکی کی ماں نے اپنے گاؤں کے ایک سنار سے، اس لڑکی کے لئے کسی زیور کے تیار کرنے کی فرمائش کی تھی، اتفاق سے وہ اسی دن، چاندی لینے کے لئے اس کے گھر آیا، تو لڑکی کو گھر کے پہلو میں چند بچوں کے ساتھ بیٹھے

---

[۱] "الماس ٹن" نامی ایک اور ہیرا ہے، یہ ایک علاقہ کا نام ہے، جہاں کا حاکم راجہ ٹن کہلاتا ہے، چونکہ یہ الماس اُسی کے قبضہ میں ہے، اسی لئے اس نام سے مشہور ہوا۔ یہ ہیرا ابھی ناتراشیدہ بیضوی شکل کا ہے، جس کا وزن (۲۶۲) قیراط یعنی ½ ۲ ماشہ ہے، جوہریوں نے اس کی قیمت دو کروڑ سے زیادہ قرار دی ہے، تو اس لحاظ سے غور فرمائیے کہ "الماس نظام" کس قیمت کا ہوگا، جو اس سے (۱۲۱) قیراط زیادہ وزنی ہے "کوہ نور" جیسا مشہور ترین ہیرا تو غالباً بارہویں نمبر پر شمار ہوتا ہے، جس کا وزن ½ ۱۰۶ قیراط اور قیمت چودہ لاکھ ہے، صرف اس کو اس کی تاریخی حیثیت سے اتنی بڑی شہرت نصیب ہوئی۔ ورنہ اس کا قیمت و وزن کے لحاظ سے کوئی درجہ نہیں۔

اس بے نظیر پتھر سے کھیلتے ہوئے پایا۔ اور اس نے اپنی واقفیت کی بنا پر اس پتھر کی حقیقت سمجھ لی کہ یہ ایک بے بدل آب دار ہیرا ہے۔ دوسرے دن جب کہ کمہار کے گھر کوئی نہ تھا، سنار موقع پاکر اپنے ساتھ مٹھائی لے آیا۔ اور نہایت عاجزی کے ساتھ لڑکی کو سمجھا بُجھا کر مٹھائی دی اور اس سے وہ پتھر مانگنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کچھ ضدی تھی۔ اس کی اس طلب پر برہم ہوگئی اور غصہ میں فوراً بھاگ کر گھر دوڑی چلی آئی۔ اور کمرے میں جاکر ہیرے کو طاق میں رکھ دیا۔ جب ماں آئی تو سارا قصہ بیان کیا کہ فلاں سنار نے مجھے مٹھائی دی۔ اور اس پتھر کو بڑی عاجزی سے مانگنے لگا، لیکن میں نے اُسے نہ دیا۔ ماں نے یہ خیال کیا کہ وہ شاید چاندی تولنے کے لیے اس کو تنگ رہا تھا۔ اس لئے اس نے اس پتھر کو ایک پوشیدہ مقام پر چھپا دیا۔ جب دوبارہ سنار آیا اور اس نے لڑکی سے وہ پتھر مانگا تو ماں کو معلوم ہوگیا۔ اس نے سنار سے کہا معلوم نہیں کہ اس دیوانی بچی نے اُسے کہاں کھو دیا۔ سنار یہ سن کر بے قرار ہوگیا اور کہنے لگا کہ "افسوس تو نے یہ کیا کیا؟ ارے وہ تو ہیرا تھا!! اگر تو مجھے دے دیتی تو میں تجھے تیرے منہ مانگے پیسے دیتا۔" جب لڑکی کا باپ آیا تو ماں نے یہ سارا قصہ اُسے کہہ سنایا۔ اس پتھر کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد کہ یہ ہیرا ہے شاید کمہار زرگر سے ملا۔ اور ان دونوں میں بعد تصفیہ یہ طے پایا کہ وہ اس معاملہ کو انتہائی پوشیدہ رکھیں گے۔ اور آپس میں نصف نصف تقسیم کریں گے۔ چنانچہ بہ ہزار دقت ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اُسے توڑا اور ہیرے کا وہ حصہ، جس کو سنار نے اپنے لئے پسند کیا تھا، اس کے دو تین ٹکڑے ہوگئے۔ اور وہ حصہ جو کمہار کے لئے مختص تھا محفوظ رہا۔ اور یہی ٹکڑا وزن میں پختہ چھ تولے پانچ ماشے تھا۔[1] صاحب گلزار آصفیہ لکھتے ہیں کہ یہ اپنی تمام و کمال حالت میں گیارہ تولے تھا۔

سنار اپنے حصے کے ٹکڑوں کو لے آیا۔ اور دوسرے سناروں کے ہاتھ ایک ایک کرکے فروخت کر دیا۔ اس خرید و فروخت کی شہرت ہونے لگی۔ اور ہوتے ہوتے وہاں کے زمیندار تک بھی پہنچی۔ فوراً اس نے اس سنار کو گرفتار کرالیا اور اس پر سختیاں کرکے اس ہیرے کی تحقیقات کی۔ واقعات کے معلوم ہونے پر اُن سب سناروں اور اُس کمہار کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان دنوں اس علاقہ کی تعلقداری پر بھارراؤ نامی ایک شخص مامور تھا۔ اُس نے اس الماس کی ساری حقیقت مدارالمہام وقت مہاراجہ چندولال بہادر کو لکھ بھیجی۔ مہاراجہ نے محمد قمرالدین جمعدار مندوزی کو جو تعلق ارنگ‌اندہ تھے بھارراؤ کے ہمراہ اس زمیندار کے پاس بھیج کر اُسے طلب کیا۔ زمیندار نے نوبت و نقارہ اور دس ہزار کی جاگیر اپنے اور اپنی اولاد کے لئے بطور "آل تمغہ" سرفراز ہونے کی شرط پر اس ہیرے کو مہاراجہ بہادر کے حوالہ کردیا۔ راجہ صاحب نے حضور کی نظر اشرف میں گذرانا۔ اور اُسے حسب وعدہ اعلیٰ حضرت سے عرض کرکے جاگیر سے سرفراز کرایا۔ جوہریوں نے اس "نادرالعصر" تحفہ کو دیکھ کر اور پرکھ کر، بالاتفاق عرض کی کہ یہ الماس عجائبات روزگار سے ایک لاقیمت چیز ہے۔ اور کسی ملک میں ہم نے ایسا نادر روزگار، اس قدر بڑا ہیرا دیکھا اور نہ سنا۔ اور ایسے جوہر نایاب کی قیمت لگانے سے ہم عاجز ہیں۔

ہند اور ولایت، ایران کے حکاکوں کو اس الماس کی تختیاں تراشنے کے لئے حکم ہوا تو ان لوگوں نے اس کی مزدوری پانچ لاکھ روپئے طلب کی۔ اور کہا کہ ہم اس الماس سے سات عمدہ باریک اور شفاف تختیاں تراش کر گزرانیں گے کہ جس کے آگے "دریائے نور" اور "کوہ نور" بے رونق و بے آب نظر آنے لگیں گے۔ غالباً حضور نے اجرت کی زیادتی کی وجہ سے منظور نہیں فرمایا۔ یہ جس حالت میں دست یاب ہوا تھا، اسی طرح جواہرخانہ میں محفوظ کرلیا گیا۔

[1] گلزار آصفیہ صفحہ ۶۰۰ مصنفہ حکیم غلام حسین خاں مطبوعہ مطبع محمدی سنہ ۱۳۰۸ھ

"تاریخ ریاست حیدر آباد دکن" کے مولف نجم الغنی خاں رام پوری نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۹ پر اس ہیرے کے تراشنے کی اجرت پچاس ہزار لکھی ہے جو درست معلوم نہیں ہوتی۔[1]

"آئینہ جواہر" کا مولف کہتا ہے کہ اس ہیرے کا شمار دنیا کے بڑے بڑے ہیروں میں ہے اور نظام حیدر آباد کے پاس رہنے کی وجہ سے "الماس نظام" سے مشہور ہوا ہے۔ اس کا وزن ۳۴۰ قیراط یعنی (۲۴۸) ماشہ ہے[2]۔ یہ کان کلور سے برآمد ہوا تھا اور ۱۸۳۵ء میں ایک شخص کے پاس بطور کھلونے کے تھا۔ ایک اور روایت یہ نقل کی ہے کہ کسی سوار نے اسے ایک مٹی کے برتن میں پایا تھا۔ جو بعد کو ایک ہندو زرگر کے ہاتھ لگا اور اس نے اس کی آزمائش کے لئے کہ یہ ٹوٹ سکتا ہے یا نہیں اس پر ضرب لگائی جس کی وجہ سے اس کے تین ٹکڑے ہو گئے[3]۔ اس کی شکل ایک چینی عورت کے پاؤں کی طرح ہے جس کا انگوٹھا نہ ہو[4]۔

کنگ صاحب (Mr King) نے بھی اس کی شکل و شباہت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ناتراشیدہ الماس بادامی شکل کا ہے اس کے تاریخی حالات لکھنے میں انہوں نے بھی سخت غلطی کی ہے اور ہمارے نزدیک ان کے ایسے مشہور ماہر و نقاد کے بیانات بھی قابل اعتبار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "کسی حادثہ سے ہندوستان کے غدر میں اس سے ایک ٹکڑا علیحدہ ہو گیا اور اس کا وزن (۲۸۰) قیراط ہے۔" بعضوں نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ کنگ صاحب نے اس کی کوئی صراحت نہیں کی کہ آیا یہ وزن اس الماس کے ٹوٹنے سے قبل کا ہے یا بعد کا؟ ایک اور انگریز ڈیولے فیٹ (Dieula Fait) کا بیان ہے کہ اس کا وزن اس کے ٹوٹنے سے پیشتر (۴۴۰) قیراط سے کم نہ تھا۔ مبصرین کے نزدیک صاحب گلزار آصفیہ کے سے معتبر مورخ کے آگے ان لوگوں کے گمانوں اور مختلف بیانوں کی کوئی وقعت نہیں، اس لئے کہ انہوں نے وزن کی تصریح صاف طور پر کر دی ہے۔ باربٹ نامی ایک ماہر نے اس فرضی وزن کی بنا پر اس کی قیمت [illegible] لکھی ہے جو بیس لاکھ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

"آئینہ جواہر" کا مولف امرناتھ کہتا ہے کہ اس ناتراشیدہ الماس کی قیمت ٹھیک ٹھیک نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ کاٹنے کی وجہ سے ناتراشیدہ الماس اکثر وزن میں کم ہو جایا کرتے ہیں، لیکن غیر تراشیدہ حالت میں اس الماس نظام کی شکل چنداں بے ڈھب بھی نہیں۔ البتہ کٹوانے میں نصف سے زیادہ کے نقصان کا احتمال نہ ہوگا۔ تا حال یہ الماس نظام حیدر آباد کے جانشینوں کے پاس خیال کیا جاتا ہے[5]۔

---

[1] تاریخ ریاست حیدر آباد دکن مطبوعہ نول کشور پریس ۱۹۳۰ء۔

[2] صاحب گلزار آصفیہ نے جو وزن چھ تولے پانچ ماشہ لکھا ہے اس کے کل (۷۷) ماشے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ وزن غلط اور ناقابل تسلیم ہے اور مولف موصوف کا ہی بیان بہت زیادہ قابل اعتبار ہے۔ ۱۲

[3] آئینہ جواہر کے مولف نے غالباً یہ قصہ انگریزی کتابوں سے لیا ہے اور انگریز مصنفین نے بلا تحقیق جس طرح روایت سنی تھی اسے اپنی کتابوں میں قلم بند کر لیا گو یہ قصہ ان لوگوں نے غلط لکھا ہے، مگر گلزار آصفیہ کے ہی واقعہ کی الٹ پھیر ہے، اور ان غلط قصوں ہی سے صاحب گلزار آصفیہ کی تحقیقات اور سچائی کا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہے۔ کمہار کے بجائے مٹی کے برتن کا ذکر کیا گیا ہے، شاید مولف ظرف کہہ کر مظروف کا قاعدہ تو مراد نہیں لے رہے ہیں۔ سوار کا اس ہیرے کو پانا بالکل غلط ہے۔ البتہ ایک ہندو زرگر اور اس کے تین ٹکڑے ہونا یہ صحیح ہے۔

[4] آئینہ جواہر مصنفہ پنڈت امرناتھ، حاشیہ صفحہ ۱۶۴ مطبوعہ خادم التعلیم پریس لاہور ۱۹۱۲ء

[5] آئینہ جواہر ص ۱۶۴

رہبر فاروقی

پاؤں میز

یعنی پاؤں ناپنے کی رسم

"یہ مضمون تقی عابدی صاحب کی اس دلچسپ کتاب کا ایک ٹکڑا ہے جو حیدر آباد کی شادیوں پر لکھی جا رہی ہے۔"

سانچے موتی کی ایک لڑ چاندی کی تھالی میں رکھ کر تھالی رسم کی کشتی میں رکھ دی جاتی ہے۔ دوسری کشتی میں بنارسی دوپٹہ جس پر مسالا ٹکا ہوا ہوتا ہے۔ رکھا جاتا ہے۔ تیسری کشتی میں مالیدہ، کھوپرہ کا چورا، مصری ڈلیاں، دلے سونف، ڈلی سپاری، مالیدہ کے لڈو طشتریوں میں جما کر۔ ایک چاندی کی کٹوری میں سامندل۔ چاندی کے ڈبے۔ لئے پان جس کو لال ناڑا باندھا جاتا ہے۔ چاندی کے لڈو چاندی کی سپاری وغیرہ کو کشتی میں جما کر رکھا جاتا ہے۔ جملہ سامان رسم کو چاندی کا ورق لگا کر تھالیوں پر زردوزی تھالی پوش اڑھا کر کشتیوں کو لال بستنی میں باندھ کر زردوزی کشتی پوش اڑھا دئے جاتے ہیں۔ ایک پڑیا آدھا پاؤ مصری خوانوں میں رکھ کر بستنی میں باندھ کر ان پر مخملی خوان پوش اوڑھا دئے جاتے ہیں۔ چاندی کی چنگیر میں پھولوں کا گہنا رکھ کر خاص طور پر مشاطہ کے ہاتھ چنگیر دیا جاتا ہے یہ خدمت سوائے مشاطہ کے دوسرا کوئی انجام نہیں دے سکتا ورنہ مشاطہ لڑائی جھگڑے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ رسم لیتے وقت مشاطہ کو لال چادر اوڑھنا ضروری ہے۔ اگر چادر سفید ہو تو اس پر لال لال چھینٹے دے دئے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سہاگ کے کام میں سفید چادر ممنوع ہے۔ حیدر آباد میں بیوہ عورتیں سفید کپڑے استعمال کرتی ہیں۔ رنگین کپڑے، مسی، پھول، چوڑیاں وغیرہ استعمال کرنا "ترکِ لذت" کے منافی ہے۔ اور پھر یہ چیزیں بیوہ اور سہاگن کی علامت امتیازی قرار دی گئی ہیں چنانچہ بیوہ عورتیں جانے کانچ کی چوڑیاں یا جوڑے کے سونے یا چاندی کی چوڑیاں پہنتی ہیں جنہیں چوڑ کہا جاتا ہے۔ جملہ سامان ایک زردوزی شامیانے کے نیچے جسے "ڈنڈا پیشگی" کہتے ہیں۔ اس ترتیب سے ہوتا ہے کہ آگے آگے مشاطہ پھولوں کی چنگیر لئے ہوئے اور پیچھے دو دو مل کر پر جملہ رسم کی کشتیاں۔

دکن میں شامیانہ صرف میت کے وقت استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ میت کے وقت اس کو شامیانے کا نام دیا گیا ہے۔ اس لئے اس کو ڈنڈہ پیشگی کہتے ہیں حالانکہ یہ دونوں کوئی علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔ اسی طرح حلوا، کھویا اور روغن زردہ جو میٹھا پکایا جاتا ہے عام طور پر اس کو میٹھا یا حلوہ کہتے ہیں۔ مگر کسی کے وہم یا چہلم میں اسی میٹھے کا نام "بھٹ بکا" رکھا جاتا ہے۔

بہرحال جملہ سامان رسم بہ ترتیب متذکرہ جب شامیانہ یا ڈنڈہ پیشگی کے نیچے ہوتا ہے تو مختلف باجہ نواز تاشہ نفیری روشن چوکی ڈھول بینڈ وغیرہ کے ساتھ جو آگے آگے بجتا رہتا ہے۔ دلہن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ یہ شام دولہن کے گھر والے سہاگن عورتیں یعنی سمدھنیں رسم کرنے آتی ہیں۔ دولہا کی ماں کے ساتھ چاندی کی تھالی میں سو سو روپیہ اشرفیاں یا کسی قسم کا زیور ہوتا ہے جو بطور "چڑھاوے" کے دلہن کو دیا جاتا ہے۔ اور سمدھنیں اپنے ساتھ ایک میراثنیوں کا طائفہ بھی ضرور لاتی ہیں۔ میراثنیں بوجہ ان کے مخصوص گانوں کی وجہ سے شادی اور رسم کا جزو لاینفک ہے۔

۲

ادھر دلہن کے گھر کو فرش فروش سے آراستہ کیا جاتا ہے دالان میں گاؤ تکیے لگائے جاتے ہیں۔ بیچ دالان میں ایک

تاش کا منڈپ باندھا جاتا ہے۔ منڈپ باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو مثل ہے بیل منڈوے چڑھے تو گویا منڈپ تو منڈوہ ہے اور بیل آل اولاد کی جو آگے چڑھے گی۔ غریبوں میں تو اب تک لکڑیوں کو بنگر کر سبز سبز پتوں سے منڈپ باندھا جاتا ہے۔ مگر امیروں اور صاحب استطاعت لوگوں نے منڈوے سے منڈپ اس طرح بنا لیا ہے۔ اسی منڈپ کے نیچے ایک لال رنگ کی پاؤں گھڑی یعنی پا انداز بچھاتے ہیں تاکہ سمدھنیں منڈپ کے نیچے اور اس پاؤں گھڑی پر سے چلتی ہوئیں دالان میں داخل ہوسکیں۔ منڈپ کے نیچے دلہن کی کوئی ایک ان بیاہی رشتہ دار لڑکی چاندی کی کٹوری میں صندل لے کر کھڑی ہوجاتی ہیں۔ اور جب سمدھنیں آنا شروع ہوتی ہیں تو ہر سمدھن کو "صندل ہاتھ" دیا جاتا ہے۔ صندل ہاتھ دینے کا طریقہ یہ ہے کہ صندل کی کٹوری میں چار انگلیاں ڈبو کر ہر سمدھن سے اس طرح ہاتھ ملایا جائے کہ اس کے ہاتھ میں ہی صندل لگ جائے کہ یہ نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ نئی آنے والی سمدھنوں میں اگر کوئی سمدھن "امید" سے ہوں تو وہ منڈپ کے نیچے نہیں آسکتیں اور نہ ان کا گود بھرا جاتا ہے وجہ یہ ہے کہ قدرتاً نو دان کا گود بھر جانے والا ہے۔ اب اگر گود بھرا جائے گا تو وہم یہ ہے کہ بچہ ضائع ہو جائے گا۔ اور گود خالی ہوجائے گا۔ اسی طرح چونکہ منڈپ میں بھی گود ڈالا جاتا ہے اس لئے یہ اس کے نیچے بھی نہیں جا سکتی۔ منڈپ میں گود اس لئے ڈالتے ہیں کہ منڈپ ایک ایسا منڈوہ ہے جس پر آل اولاد کی بیل چڑھتی ہے۔ گود میں پان شریک ہوتے ہیں۔ وہ پان کی بیل ہوتی ہے اس لئے ابتدا ہی سے گویا منڈپ میں گود ڈال کر بیل چڑھا دی جاتی ہے۔ تاکہ آئندہ آل اولاد کی بیل ہمیشہ ہری بھری اور چڑھتی رہے۔

منڈپ کے قریب ہی ایک طرف میراثنیوں کا طائفہ بیٹھا ہوا گاتا رہتا ہے۔ ان لوگوں کے گانے بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ ہر موقعہ اور رسم کے لحاظ سے یہ لوگ مخصوص گانے گاتے جاتے ہیں۔ ان کے گانے اپنے وقت پر درج ہوں گے۔ چنانچہ جس وقت سمدھنیں آتی ہیں تو میراثنیں یہ مخصوص گانا گاتی ہیں۔

ساجن آئی رے اللہ پیر منائی رے

میری ساجن آئی رے

جب سمدھنیں دالان میں گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتی ہیں تو انھیں "مصری چنائی" جاتی ہے۔ ڈومنیاں سمدھنوں کے سر پر ایک تاش کا مسالا ٹکا ہوا دوپٹہ پکڑ لیتی ہیں اور دلہن کی ایک سہاگن رشتہ دار بیوی چاندی کی طشتری میں مصری کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں جن پر چاندی سونے کا ورق لگا ہوا ہوتا ہے لاتی ہیں اور ہر سمدھن کے آگے باری باری سے پیش کرتی ہیں۔ ہر سمدھن ایسے موقعہ پر شرم و جھینپ کا اظہار ضرور کرتی ہے اب خواہ یہ فطرتاً ہو یا رسماً بہرحال رسم کی پابندی انھیں ضرور کرنی پڑتی ہے۔ نہ لڑکیاں جو ناکتخدا ہیں مصری لینا تو کجا آنکھ تک اوپر نہیں اٹھاتیں۔ مگر مصری لانے والی بیوی جبر و قہر اور زور و زبردستی کے ساتھ ان کے منہ میں مصری ٹھونس ہی دیتی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ فقرے بھی کستی جاتی ہیں جس سے وہ بیچاری تو مارے شرم کے عرق عرق ہوتی جاتی ہے اور ادھر خوب فرمائشی قہقہے اڑتے ہیں۔ مصری چنائی جاتے وقت میراثنیاں گاتی ہیں

سمدھن بیری مصری کھا دے

اس کے بعد گانا شروع ہوتا ہے۔ ٹھمری۔ دادرا غزل وغیرہ جب میراثنیں گا چکتی ہیں تو دلہن کو لاڈ کی جلدی شروع کی جاتی ہے۔ ادھر تو جلدی ہوتی ہے اور ادھر دلہن کو سنوارا جاتا ہے۔ دلہن بیچاری کا شروع شادی سے اخیر شادی تک

نے اوپر کوئی اختیار نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ اپنی آنکھوں کو بند رکھے باقی جملہ کام اوپر والے جو چاہتے ہیں کر لیتے ہیں۔

دلہن کو کسی ایک قسم کا قیمتی جوڑا کپڑوں کا پہنایا جاتا ہے اور وہ زیور بھی جو دلہن کو جہیز میں دیا جانے والا ہے۔ پہنا دیتے ہیں آنکھوں پر "آرائش" لگاتے ہیں۔ چنی باریک کٹے ہوئے مقیش سے نشان بنایا جاتا ہے سرمہ لگایا جاتا ہے۔ اور ایک لمبا سا گھونگھٹ کھینچ کر کوئی ماما، انا، ددا یا چھوکری دلہن کو گود میں اٹھا کر باہر اس زردوزی مسند پر لا بٹھاتی ہے جو دالان میں منڈپ کے نیچے اسی رسم کے لئے بچھائی جاتی ہے۔ ایک مخصوص گیت ہوتا ہے جو ایسے وقت میں میراثنیاں نہایت جوش میں گاتی رہتی ہیں۔ اس وقت کا سماں قابل دید اور اس وقت لوگوں کے جذبات دیکھنے کی چیز ہیں سب سمدھنیں خاموش دلہن کے کمرے کی طرف نگاہیں لگائے سراپا انتظار اور مجسم اشتیاق بنی بیٹھی ہوتی ہیں۔ جیسے ہی دلہن نظر آتی ہے۔ میراثنیوں کا جوش اور بڑھ جاتا ہے۔ سمدھنوں کے چہرے پھول کی طرح کھل جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ تبسم، ہنسی سے بدل جاتا ہے۔

آئی بنو آئی ۔ ہریالی بنو آئی
اماں کی پیاری بنو آئی باوا کی پیاری بنو آئی
آئی بنو آئی

یہ گیت سمدھنوں میں ایک عجیب جوش و خروش پیدا کر دیتا ہے۔ پھر نوبت و نفیری شروع ہو جاتی ہے اور اب رسم شروع ہوتی ہے۔ رسم دولہا کی سہاگن پھوپی یا بہن کو کرنا پڑتا ہے۔ دولہا کی والدہ ان سے نہایت عجز و انکسار اور منت کے ساتھ کہتی ہیں آپ بزرگ ہیں۔ اگر آپ کے ہاتھ سے یہ نکاح ہو جائے تو میری خوش نصیبی ہے۔ خدا آپ کی چھاؤں سایہ دلہن پر بھی ڈالے اور دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ اگر دولہا کے رشتہ داروں میں سے کوئی بزرگ نہ ہو اور خود دولہا کی ماں سہاگن ہوں تو رسم کرنے بیٹھتی ہیں۔ رسم کرنے کے لئے سہاگن کا ہونا ضروری ہے۔

کشتیاں اور چنگیر جو دولہا کے گھر سے آتے ہیں وہ مسند کے قریب رکھ دئے جاتے ہیں۔ رسم کرنے والی بیوی پہلے اپنے گلے کو صندل لگاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ خود سہاگن ہیں اور پھر وہ سہاگن جن کا سہاگ بہت قدیم ہے مطلب یہ کہ ان کی طرح دلہن کا بھی سہاگ تا دیر قائم رہے۔ اپنے گلے کو صندل لگا لینے کے بعد دلہن کے گلے۔ سینہ اور پیٹھ پر صندل لگا کر سات۔ نو یا گیارہ سہاگنوں کو بھی بہ ترتیب متذکرہ صندل لگایا جاتا ہے۔ اگر دلہن کی بہن ہو تو پھر دلہن کو صندل لگانے کے بعد علاوہ سہاگنوں کے ان بیاہی لڑکیوں کو بھی صندل لگایا جاتا ہے تاکہ ان کی شادی بھی جلدی ہو جائے۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ رسم ہوتے وقت اگر کوئی چھینک دے تو رسم تھوڑی دیر کے لئے روک دیا جاتا ہے۔ حالانکہ چھینکنے کے بعد مسلمان الحمد اللہ کلمۂ شکر ادا کرتے ہیں۔ تاہم اس کو کسی کام کی ابتدا میں منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح باہر نکلتے وقت کوئی چھینک دے یا کوئی سامنے آجائے یا ٹھوکر لگ جائے تو تھوڑی دیر کے لئے باہر جانا موقوف ہو جاتا ہے کیونکہ یہ ناکامیابی کی علامت ہے بجائے اس کے اگر کوئی مہتر یا کوئی شخص "دہی" لے کر سامنے آجائے تو کامیابی یقینی سمجھی جاتی ہے۔

صندل لگاتے وقت میراثنیں گاتی ہیں۔

صندل لگاؤ ہریالی بنو کو ۔ راج دلاری بنو کو

سب رسم صندل لگا چکنے کے بعد گود بھرے جاتے ہیں۔ پہلے رسم کرنے والی بیوی اپنا گود بھر لیتی ہیں۔ اس کے بعد دلہن کا گود چاندی کی سپیاری اور چاندی کے لڈو سے سب مقدور روپیہ رکھ کر بھرا جاتا ہے۔ دلہن کے قریب دلہن کی ایک رشتہ دار سہاگن بیٹھتی ہیں۔ شرم کی وجہ سے دلہن جھکی ہوئی بیٹھتی ہے۔ اس لئے یہ بیوی دلہن کا سر بھی تھامے ہوئے رہتی ہیں اور موقعہ بموقعہ دلہن کو امداد بھی دیتی جاتی ہیں چنانچہ جس وقت دلہن کا گود بھرا جاتا ہے تو یہ بیوی ایک ریشمی رومال دلہن کے گود میں بچھا کر گود حاصل کر لیتی ہیں۔ دلہن کا گود بھرنے کے بعد منڈپ میں بھی ایک گود ڈالا جاتا ہے اور پھر سات نو یا گیارہ سہاگنوں کے گود بھرے جاتے ہیں۔ گود بھرتے وقت میراثنیاں یہ مخصوص گیت گاتی ہیں۔

ہریالی کا گود بھراؤ۔ پیا کے کارن۔ راج دلاری کے گود بھراؤ
سب مل کر گود بھراؤ۔ سہاگنوں کا گود بھراؤ پیا کے کارن
گود بھراؤ مانگ لگاؤ۔ موتیوں کے چوک پراؤ پیا کے کارن

گود بھرائی ہو چکنے کے بعد دلہن کا منہ میٹھا کیا جاتا ہے۔ رسم کرنے والی بیوی مصری دلہن کے منہ کے پاس لے جاتی ہیں اور وہ بیوی جو دلہن کے قریب بغرض امداد بیٹھتی ہیں ہاتھ بڑھا کر مصری لے لیتی ہیں۔ اس کے بعد "چوبا" کھلایا جاتا ہے۔ مصری کھلاتے وقت کا مخصوص گیت یہ ہے۔

مصری کھاوے بنو میری۔ یہ سہاگن کے ہاتھ سے کھاوے
یہ بچہ والی کھلاوے۔ بنو میری مصری کھاوت

چوبا کھلاتے وقت بجائے مصری کے چوبا کہہ دے گاتے ہیں بقیہ گانا یہی ہوتا ہے۔ چوبا کھلانے کے بعد دلہن کو پان کھلایا جاتا ہے۔ پان پر سونے چاندی کے ورق لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس وقت کا مخصوص گیت یہ ہے۔

بنڈڑی کو پان کھلاؤ ری البیلی سہاگن

پان کھلا کر پھولوں کا گہنا اور ہار پہنائے جاتے ہیں۔ اس وقت یہ مخصوص گیت گایا جاتا ہے۔

ہار وری ماں یہ لال بنو کے گلے
اماں پیاری کے گلے۔ باوا پیاری کے گلے
جائی۔ جوئی اور بیلا چنبیلی۔ اچھے گلابوں کے ہار
یہ چاند بنو کے گلے۔ ہار وری ماں یہ لال بنو کے گلے

یہ جملہ رسوم گویا تمہید تھے اصل پاؤں ناپنے کی رسم کے کیونکہ جب تک یہ سارے رسوم نہ ہوں کوئی رسم ہی نہیں کہلاتا۔ بہرحال یہ سب مراحل طے ہو جانے کے بعد وہ موتیوں کے لڑ جو ساتھ لائی گئی ہے۔ رسم کرنے والی بیوی نکالتی ہیں اور ادھر سے دلہن کے پاس بیٹھی ہوئی دلہن کی رشتہ دار سہاگن دلہن کا سیدھا پاؤں آگے بڑھا دیتی ہیں اور اس "لڑ" سے پاؤں ناپ لیا جاتا ہے۔ یہ لڑ جس سے پاؤں ناپا گیا ہے جلوہ کے روز دلہن کی نتھ میں ڈالی جاتی ہے۔

اس کے بعد "رونمائی" ہوتی ہے اور جو روپیہ، اشرفیاں یا زیور لایا گیا ہے وہ اس طرح دلہن کو "سلامی" میں

دیا جاتا ہے کہ دلہن کے قریب بیٹھی ہوئی بی بی دلہن کے دونوں ہاتھ آگے پھیلا دیتی ہیں اور رسم کرنے والی بیوی "سلامی" دلہن کے ہاتھوں میں ڈال دیتی ہیں اور ساتھ ہی دلہن کے منہ سے چپٹ چپٹ بلائیں لیتی ہیں اس کے بعد "وارن پھیرن" شروع ہوتی ہے۔ ایک میراثن دلہن کے قریب آکر کھڑی ہو جاتی ہے تاکہ "وارن پھیرن" کے روپے حاصل کرے کیونکہ یہ حق میراثن ہی کا ہوتا ہے اس طرح اسے بھی سو سوا سو روپے مل جاتے ہیں۔ بہ حال ایک ایک سمدھن آتی جاتی ہیں دلہن کا منہ دیکھتی ہیں اور حسب مقدور روپیہ وار کر میراثن کو دیتی جاتی ہیں۔ بقیہ میراثنیاں یہ مبارک بادی گاتی رہتی ہیں جس کے بعد یہ رسم ہو جاتا ہے اور دلہن کمرہ میں پہونچائی جاتی ہے۔

تمھیں یہ شادیاں جم جم مبارک ہو مبارک ہو
مجھی ہے دھوم شادی کی مبارک خانہ آبادی
وہ شہزادہ یہ شہزادی مبارک ہو مبارک ہو

تقی عابدی

کوہ نور

(گولکنڈہ کا مشہور ہیرا جو اب شہنشاہ انگلستان کے تاج کی زینت ہے)

بحرِ ظلمات میں ڈوبا ہوا تھا اب تک کوئی
راکھ کے ڈھیر میں خوابیدہ تھا اب تک کوئی

پردۂ خاک سے سورج کی کرن نکلی ہے
جلوہ پرور وشِ نمائے وطن نکلی ہے

کسی معشوق جواں سال کا نگین لب ہے
زر پرستوں کے لئے شمع سر محفل ہے

سنگ کی شکل میں اک نور نظر آتا ہے
پرتو جلوۂ بے طور نظر آتا ہے

شعلۂ حسن ہے یہ جلوۂ نیرنگ ہے یہ
رونق تاج ہے یہ زینت اورنگ ہے یہ

جوہری دیکھ کے کہتا ہے کہ "لاقیمت ہے
جس کی قسمت میں یہ آجائے وہ خوش قسمت ہے"

ذرہ کہتا ہے کہ "یہ کیا ہے تماشا یارب؟
مہر تابندہ سے بڑھ کر ہے یہ ذرہ یارب!
کس سے یوں نور کا اب میری نظر تشنہ ہو
جو چرخ پر مہر ہے اور فرش پہ یہ پتھر ہے
ایک ہے ذرہ بہت ایک ہے آنکھوں سے قریب
کس کو سجدہ کرے حیران ہے یہ ذرہ غریب"

میکش

سمستان جٹپول

ہماری سلطنت آصفیہ کے زیر اقتدار بعنایت الہی ایسے متعدد علاقے ہیں جو اپنی وسعت اور آمدنی کے اعتبار سے ہندوستان کے ان اسٹیٹوں سے بڑھے ہوئے ہیں جن کے حکمران ہز ہائینس کے خطاب سے ممتاز اور توپوں کی سلامی کا اعزاز رکھتے ہیں بلکہ ان میں کے بعض تو یورپ کی چھوٹی چھوٹی خود مختار سلطنتوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ایسے تمام علاقو کے والی (نواب یا راجہ) کی جانشینی و علیحدگی، وراثت، عطائے اختیارات عدالتی و کوتوالی، اعلیٰ عہدہ داران اسٹیٹ کا تقرر و تنزل کلیتہً حکومت عالیہ آصفیہ نظامیہ کی منظوری کا تابع ہے۔ ان ہی علاقوں میں سے ایک سمستان جٹ پول ہے جس کا رقبہ ۵۰۵۰۴ مربع میل (لوسے ۲۳۳ ایکڑ) اور جس کی مردم شماری ۵۰۸۰۹ ہے

جٹ پول کا صحیح تلفظ جٹ پرول ہے۔ جٹایو ایک پرندہ کا نام ہے اور پرول کے معنی شہر کے ہیں۔ وجہ تسمیہ اس کی یہ کہ جب راون، رام چندرجی کی باعصمت بیوی کو ان کے بن باس کے زمانہ میں اڑائے جارہا تھا تو یہ پرندہ اس مقام پر راون کا سدراہ ہوا۔ راون کو جو نشہ حکومت میں سرشار تھا۔ جٹایو کی یہ مزاحمت غضب آلود کردی اور اس نے اس پرندکو مارڈالا یا کم ازکم یہ کہ اس کو زخمی کردیا اور اس کا بازو اسی مقام پر گر گیا جس کی یادگار میں جٹیشور نام کی ایک دیول تعمیر کی گئی جو اب تک موجود ہے اور یہیں ایک شہر جٹ پرول نام کا بسا جو اب ایک معمولی سا قریہ رہ گیا ہے۔ بعد میں یہ علاقہ بھی اسی نام سے موسوم ہوگیا۔

سنسکرت میں سنوستھان راجہ کے رہنے کی جگہ کو کہتے ہیں کثرت استعمال سے واؤ اور ھ حذف ہوگئے اور نون میم سے بدل کر سمستان ہوگیا اور اس سے مراد ایسا علاقہ عطیہ شاہی قرار پایا جس میں ملک کا ایک حصہ ایک رقم معینہ کے ٹھیراؤ سے کسی کو عطا کیا گیا ہو اس رقم معینہ کو اعزازاً پیش کش کہتے ہیں۔ اس طرح ان دونوں الفاظ کی ترکیب سے اب یہ علاقہ سمستان جٹ پول کہلاتا ہے۔ مگر سمستان کا مستقر اب جٹ پول نہیں بلکہ کولاپور ہے جو حیدرآباد سے (۱۴۰) میل جانب جنوب ضلع محبوب نگر میں ہے حیدرآباد سے براہ جڑچرلہ و کتہ کوٹہ یا پرال تک ۱۱۰ میل کی سیدھی سڑک تعمیرات کی رعا کی ہے۔ اس کے بعد ۲۰ میل کا راستہ علاقہ سمستان جٹ پول کا ہے جو دریائے کرشنا کے متوازی کولاپور تک چلا گیا ہے۔

یہاں کے راجہ ریچرلہ گوترم سے سربھی خاندان کے ارکین ہیں جو جنوبی ہند کا ایک بڑا معزز اور قدیم خاندان ہے۔ اس خاندان کے دیگر اراکین علاقہ مدراس میں بوبلی، وینکٹ گری، پنتھاپور، میلارم کے راجہ ہیں آخری والی سمستان جٹ پول راجہ وینکٹ لچھماراؤ یہاں کے تائیسویں راجہ تھے ان کا اصلی نام کرشنا چندریا ہے راجہ وینکٹ جگناتھ راؤ نے انھیں ۱۸۸۵ء میں متبنی لیا اور وینکٹ لچھماراؤ نام رکھا بعد میں اعلیٰ حضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہ نے نظام نواز ونت کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

مستقر سمستان کولاپور جس کی مردم شماری ۲۱۵۸ ہے دریائے کرشنا کے شمال میں ۲ میل پر ایک وسیع میدان

میں سطح سمندر سے ۹۵۴۱ فٹ مرتفع مقام پر آباد ہے اس کی جدید آبادی راجہ کے شاندار اور خوبصورت اسم باسمی چندر محل
کے اطراف سلیقے سے بسائی گئی ہے اس چھوٹی سی مگر خوشنما آبادی میں صاف و شفاف پانی ایک باؤلی پر پمپ لگا کر نل کے ذریعہ
پہونچایا جاتا ہے اور بجلی کی روشنی بھی ہوتی ہے سڑکیں اگرچہ مورمی ہیں مگر صاف ہیں شہر سے عوام کے مکانات گو چھوٹے
چھوٹے ہیں لیکن راجہ سے خوش وضع معلوم ہوتے ہیں کہ اجازت تعمیر مکان دیتے ہوئے باہر کے ایلیویشن کا خاص خیال رکھا
جاتا ہے۔

راجہ صاحب کے عالی شان چندر محل کے علاوہ یہاں ایک بڑا دو منزلہ گسٹ ہوس ہے ایک پختہ مسافر خانہ ہے ڈاکٹر خانہ
کی پختہ تعمیر ہے مدرسہ وسطانیہ ہے اسٹیٹ کے دفاتر کی عمدہ پکی عمارت ہے یہ سب جدید ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ
وینکٹ لچھما راؤ المخاطب بہ نظام نواز ونت بہادر آنجہانی جو ۱۲۹۶ف سے ۱۳۲۰ف تک یہاں کے راجہ رہے پسند اور تزئین
آبادی کے شایق تھے اور مولوی محمد علی صاحب اعلیٰ عہدہ دار اسٹیٹ کا تجربہ سلیقہ و تمیز جو انھوں نے سرکار عالی کی ملازمت میں
عہدہ داران سرکار عالی سے حاصل کیا اسٹیٹ کے لیے بڑا مفید رہا صاحب موصوف ۱۳۰۱ف سے یہاں کارفرما ہیں اور تحصیلداری بندوبست
کرتے ہوئے اسٹیٹ کی سب سے بڑی خدمت پر اس وقت مامور اور جس طرح والی اسٹیٹ کی نظروں میں باوقعت رہے اسی طرح
عوام میں ہر دل عزیز ہیں۔

اس سمستان کے ۶۸ مواضع اور ۲۰ قریے ہیں جو باستثناء ایک موضع چٹیال کے باقی سب ایک ہی سلسلہ میں
واقع ہیں البتہ شمال میں سمستان ونپرتی اور گوپال پیٹھ یا زبردست خاں کی جاگیر کے ۲۴ مواضع اس علاقہ میں آگئے ہیں۔
اس سمستان کے مغرب میں تعلقہ عالم پور ضلع رائچور اور علاقہ سمستان ونپرتی ہے (ونپرتی بھی ہمارے ہی علاقہ کا سمستان ہے)
مشرق میں دریائے کرشنا اور سرحد تعلقہ امرآباد ضلع محبوب نگر جنوب میں دریائے کرشنا اور شمال میں تعلقہ ناگر کرنول ضلع محبوب نگر
ہے۔ سمستان کی سالانہ آمدنی پانچ لاکھ ہے جس کے منجملہ کوئی [illegible] --- ہزار طبابت، تعلیمات، آبرسانی، الکٹرک، سڑک کی
ترمیم و نگہداشت اور خیرات مبرات میں خرچ کیے جاتے ہیں۔ بمقابلہ آمدنی ان مدات میں (تقریباً) صرف ۶ فیصد مصارف یقیناً
ناکافی ہیں [illegible] ہزار میں بھی تعلیمات کا حصہ کل [illegible] اور طبابت کا [illegible] ہے جو بہت ہی کم ہے لیکن یہ
اطمینان بخش ہے کہ اسٹیٹ بہرحال ترقی کے لئے کوشاں ہے چنانچہ حال میں [illegible] کے صرف سے ڈاکٹر خانہ کی عمارت بنائی گئی ہے
مدرسہ وسطانیہ کی تعمیر میں [illegible] ہزار صرف کئے گئے تزئین آبادی کی سعی بھی حال کی پیداوار ہے بجلی کی روشنی
اور نل کے ذریعہ آب رسانی بھی یہاں جدید چیزیں ہیں۔

کولاپور کے مغرب میں آبادی سے کچھ ذرا سا ہٹا ہوا ایک وسیع ہموار میدان ہے یہ گویا یہاں کا وسیع میدان ہے
جو پولو، کرکٹ اور اسپورٹس کے کام آتا ہے۔ راجہ صاحب آنجہانی کے داماد اور فرزند کو ایسے مردانہ کھیلوں کا شوق رہا ہے۔
اس میدان کے کنارے ایک دو منزلہ بنگلہ ہے جو بالعموم گسٹ ہوس اور دسہرہ وغیرہ کے موقع پر پویلین کا کام دیتا ہے
اس بنگلہ سے سامنے کا یہ وسیع میدان اور سرسبز جنگل اور پہاڑ پر لطف منظر ہے۔
[illegible] کے شرق میں اسٹیٹ کا ایک باغ میوہ اور پھولوں سے لدا ہوا ہے جس کے بیچوں بیچ سندر محل اسم بامسمیٰ [illegible]

اس کی تعمیر ۱۳۱۶ف میں ہوئی۔ ڈاکٹرخانہ کی پختہ عمارت جس کی بنا مسز کرنفش اہلیہ مسٹر ناظم معتمد ال حکومت سرکار عالی نے ۹ اردی بہشت ۱۳۲۵ف کو رکھی اور جس کا افتتاح ۲۸ شہریور ۱۳۴۲ف کو ہوا ضرورت مقامی کے لئے ایک مکمل عمارت ہے اس کا نقشہ ناظم صاحب طبابت سرکار عالی نے دیا تھا۔ اس عمارت میں زنانہ اور مردانہ مریضوں کے لیے علحدہ علحدہ وارڈ ہیں۔ ادویات اور آلات جراحی کا کافی ذخیرہ ہے سند یافتہ ڈاکٹر مامور ہیں اور خوبی کی یہ بات ہے کہ دواؤں کا موازنہ جو عوام کے لئے ہے محل کی ضروریات سے متاثر نہیں ہونے پاتا بلکہ ڈیوڑھی کے ادویہ کا خرچ محل ہی کے موازنہ سے پورا ہوتا ہے۔

راجہ صاحب کے محل کے شمالی و مشرقی گوشہ پر دو ہاتھیوں کا تھان پر شکوہ شاندار صدر دروازہ پر رسالہ کے بارگیر سپاہی کا ہاتھ میں برچھا لئے پہرہ دینا۔ اس دروازے کے مقابل ہی خوبصورت برجی میں برنجی گھڑیال دروازہ کے منزل بالا پر نوبت و نقارہ مشرقی امراء کے شان کا ایک پر رعب و پر جلال منظر ہے اس صدر دروازہ سے داخل ہونے پر سیدھے طرف ایک مختصر سے چمن کے وسط میں سری راجہ وینکٹ لچھما راؤ نظام نواز ونت بہادر کا پتلا (اسٹیچو) ہے جس کے پائین کتبہ لگا ہے جس سے واضح ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش ۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء اور تاریخ وفات ۵ اپریل ۱۹۲۰ء م ۱۱ خورداد ۱۳۳۰ف ہے۔ حکومت سرکار عالی کی منظوری کے بعد یہ ۶ مارچ ۱۸۸۷ء (مطابق ۳ فروردی ۱۲۹۶ف) کو اس علاقہ کے راجہ ہوئے۔

جو حالات سنے گئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آنجہانی راجہ بڑے شکاری تھے۔ ۳۹ شیر ۵۸ پوینچے اور ۲۹ ریچھ مارے ہیں۔ شکار اور شکاریوں کی تاریخ میں یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ ۶ ستمبر ۱۹۲۲ء کو راجہ صاحب نے سوا گھنٹہ کے اندر ۵ شیر مارے۔ ان میں جہاں سپاہیانہ جوہر نظر آتے ہیں۔ وہیں انتظامی قابلیت بھی عیاں ہوتی ہے۔ اسٹیٹ کی موجودہ ترقیاں انہی کے عہد سے شروع ہوئی ہیں اب انہی کی رانی صاحبہ سربھی وینکٹ رتنما بو ویل واڑہ تعلقہ سرسلہ ضلع کریم نگر کے دیسائی کی صاحبزادی ہیں اسٹیٹ کے کاموں کی نگران ہیں اور باوجودیکہ گوشہ کی سخت پابند ہیں حتیٰ کہ ان کے اعلیٰ عہدہ دار بھی انھیں بے پردہ نہیں دیکھ سکے پھر بھی اسٹیٹ کا انتظام خوبی سے کرلیتی ہیں۔

کیا میں اس موقع پر کہہ سکتا ہوں کہ گوشہ اور پردہ کو جو تجدد پسند ترقی و انتظام دنیوی میں حارج سمجھتے ہیں وہ اس مثال پردہ نشین ہندو رانی کے عمل کو دیکھیں۔ میں نے محترمہ بیگم صاحبہ سربلند جنگ کا ایک مضمون کسی اخبار میں چند دن قبل پڑھا تھا جس میں موصوفہ نے بعض بڑے گھرانوں کی بیگمات کے نام گنائے تھے کہ وہ باوجود پردے میں رہنے کے کامیابی کے ساتھ اپنے وسیع علاقہ کا انتظام کرتی ہیں ان مثالوں میں رانی سربھی وینکٹ رتنما صاحبہ کے نام کا اضافہ کرلینا چاہیئے۔

ہم راجہ صاحب کے محل کا ذکر کر رہے تھے جس کے صدر دروازے سے داخل ہونے کے بعد آنجہانی راجہ صاحب کے اسٹیچو (پتلے) کے سلسلے میں ان کے اور ان کی رانی صاحبہ کے کچھ حالات لکھدیئے اس محل کو جو چندر محل سے موسوم ہے ۱۸۷۱ء میں راجہ وینکٹ جگناتھ راؤ نے بنوایا۔ یہ ایک قدیم وضع کی عمارت بڑے بڑے فیل پایوں پر ہے اس کی دیواریں کسی قلعہ کی فصیل معلوم ہوتی ہیں اسی محل پر راجہ وینکٹ لچھما راؤ نے ایک اور منزل ۱۲۹۹ف میں بڑھائی اور ۱۳۲۵ف میں اسی کے عقب دھیا محل کے نام سے زنانی حصہ تعمیر کرایا۔

بہت بڑے کمپونڈ میں بلند و بالا عمارات کا تسلسل جیسیوں دریچے اور دروازے متعدد برآمدے اور شاہ نشین سے

مکین کی شوکت و حشمت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس احاطہ میں آنے کے بعد یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ ہم تین ہزار کی مردم شماری والے قصبہ میں ہیں بلکہ گمان ہوتا ہے کہ دفعتہً حیدرآباد جیسے بلدۃ الامراء میں کسی بڑے امیر کی ڈیوڑھی میں پہنچ گئے۔ چندر محل کے شان دار ڈرائنگ روم میں جس کے فرش و فرنیچر اور دیوار پر راجہ نظام نواز ونت آنجہانی کے شکار کئے ہوئے جنگلی جانوروں کی کھالیں مختلف طرح پر بچھی یا ٹنگی ہوئی تھیں ہم نے دو تصویروں کو بڑی دیر تک دیکھا۔ ان میں سے ایک تو راجہ وینکٹ جگناتھ راؤ آنجہانی کی تھی جو بڑا سا پگڑ باندھے، انگرکھا پہنے، کندھے پر پرتلہ لٹکائے تلوار ہاتھ میں تھامے ریچی بنے کھڑے ہیں دوسری انہی کے ہم نام انہی کے نوجوان پوتے کی جو سوٹ بوٹ میں ملبوس یوروپین وضع قطع بنائے مسکرا رہے ہیں۔ یہ دونوں تصویریں تبدیل لباس، تبدیل مذاق، تبدیل وضع کی معنی خیز تاریخ آنکھوں کے سامنے پیش کرتی ہیں۔

یہاں کی عمارتوں میں جہاں سانی قوت برقی کا مکان پاور ہاؤس بھی قابل ذکر ہے۔ اس مکان میں جو بالکل تجارتی اصول پر بقدر ضرورت اور سستے داموں میں بنایا گیا ہے۔ دو مشین لگے ہیں ایک ۲۰ گھوڑوں کی طاقت کا دوسرا اس کا نصف اس کے ذریعہ محل میں روشنی اور پنکھے دن رات اور عوام کے لیے سر مغرب سے ۹ بجے شب تک چلتے ہیں۔ آٹے کی دو چکیاں اور تیل کے دو گھانے کام کرتے ہیں۔ تیل کے گھانوں کو روزانہ پانچ روپے پر کرایہ دے رکھا ہے۔ چاول چھڑنے کا مشین بھی لگایا ہے مگر یہ مشین ابھی چالو نہیں کیا گیا۔ آب رسانی کے لیے پانی یہیں کی برقی قوت سے کھینچا جاتا ہے۔ جو مشین باؤلی پر لگا ہے وہ ۴۴ ہزار گیالن روزانہ کھینچ سکتا ہے مگر موسم گرما میں یہاں صرف ۱۰ ہزار گیالن تک پانی خرچ ہوتا ہے کیونکہ پانی مقررہ اوقات پر کھولا جاتا ہے۔ اس لئے باؤلیوں کا استعمال بھی جاری ہے۔

آخری راجہ وینکٹ جگناتھ راؤ نظام نواز ونت بہادر متوفی کو صلبی دو لڑکیاں ہیں چونکہ اولاد نرینہ نہ تھی۔ اس لئے وینکٹ جگناتھ راؤ کو متبنّیٰ بنایا ہے یہ سنہ ۱۳۲۶ف میں پیدا ہوئے ہیں۔ سنہ ۱۳۳۹ف کو ان کی شادی اندرا دیوی سے ہوئی۔ جو نظام نواز ونت بہادر کی چھوٹی صاحبزادی سرسوتی دیوی کی دختر ہیں یہ نوجوان پسر بھی اپنے سپاہی منش متبنّی پدر کی طرح شکار اور مردانہ کھیلوں کے شائق ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس چھوٹی سی عمر میں ۱۰ شیر انھوں نے شکار کئے ہیں۔

متوفی راجہ صاحب کی بڑی صاحبزادی رتنیشرا راجہ صاحب تنہ وال کو سنہ ۱۳۱۰ف میں بیاہی گئی ہیں اور دوسری جن کا نام سرسوتی دیوی ہے وینکٹ کرشنا راؤ زمیندار پرناپور کو دی گئی جو افسوس کہ عالم جوانی میں بیوہ ہو گئیں ان کے شوہر پرواز کے بڑے شوقین تھے چنانچہ کولاپور سے مدراس کو پرواز کرتے ہوئے ۲۵ اگست سنہ ۱۹۳۰ء کو طیارہ کے ٹوٹنے سے گر کے مر گئے۔ کولاپور کے گسٹ ہوس کے متصل ایک سنگی ستون ان کی بیوہ رانی کی طرف سے لگایا گیا ہے جس کی عبارت ان دونوں میاں بیوی کی محبت کی خاموش داستان ہے۔

اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے میں اپنی اس آرزو کا اظہار کرتا ہوں جو رہ رہ کر میرے دل میں پیدا ہوتی ہے کہ کاش ہمارے ملک کے سارے جاگیرات خصوصاً بڑے بڑے علاقوں کا انتظام ایسا ہی ہوتا ہم یہ نہیں کہتے کہ سمستان جٹ پول میں ساری ترقیاں ہو چکی ہیں نہیں۔ بلکہ جس حد تک بھی یہاں ترقی ہو گئی ہے۔ وہ بہ حیثیت موجودہ بھی دوسرے جاگیری علاقوں کے لیے قابل تقلید ہے۔

ابوظفر مؤید الدین حسن فاروقی

ایک سیر میر محمود صاحبؒ کی پہاڑی پر

میر محمود صاحبؒ کی پہاڑی ہمارے وطن میں ایک مشہور مقام ہے۔ میر عالم کے تالاب کے کنارے ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے اور اس پر اس بزرگ کی درگاہ بنی ہوئی ہے۔ درگاہ کے اس طرف گھنا جنگل ہے جہاں ہماری پردہ نشین خواتین نہایت خوشی سے اپنے بال بچوں کے ساتھ تفریح مناتی ہیں جس طرح عام دستور ہے ہم لوگ کسی بزرگ کی ذات سے اتنا فائدہ نہیں اٹھاتے جتنا ان کی درگاہ سے اٹھاتے ہیں۔ یہی حال اس درگاہ کا بھی ہے، لوگ اس پُرسکون اور خاموش مقام میں دنیائی فکروں کو ایک بزرگ کے فیض صحبت سے روحانی چین میں مبدل کرنے کم آتے ہیں اور زیادہ تر اس لئے تکلیف فرماتے ہیں کہ تالاب کا لطف حاصل کیا جائے اور مناظر کی دلچسپیوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

ایک مرتبہ ہم اس مقام پر پہنچ گئے۔ موٹر سیکل پر سوار تھے، خیال ہوا چلو آج اس مقام کی سیر کر لیں جس کی شہرت مدتوں سے سنتے آئے ہیں سرما کی تعطیلات تھیں، ٹھنڈا ٹھنڈا موسم نرم نرم دھوپ، نیلا نیلا آسمان فوراً موٹر سیکل تیز کی اور درگاہ کی طرف چلے۔ لوگ کہتے ہیں سیدھا راستہ چلنا چاہئے مگر بعض وقت راستہ گم کرنے اور اٹکل پر چلے جانے میں غیر معمولی لطف آتا ہے، خصوصاً ایسے وقت جب کہ فطرت اور اس کے اسرار کے سوا کوئی رہنما نہ ہو ہماری نظر پہاڑی کی طرف تھی مگر راستہ بالکل اس کی مخالف سمت نظر آرہا تھا پیدل ہوتے تو دور نکل جانے کا خوف ہوتا مگر جب "پیٹ بھری" موٹر سیکل ہو (آپ پیٹ بھری کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے) تو اور ہمت بڑھتی ہے۔ ہم دیکھتے رہے پہاڑی کی طرف اور چلتے رہے دوسری طرف راستہ پیچیدہ تھا ایک شاعر کو جو معشوق کی زلفوں کے پیچ و خم دیکھ چکا ہو بھلا راستے کی پیچیدگی کیا ستا سکتی؟ ہم سبز درختوں کی چھاؤں چھاؤں چلتے ہی رہے۔ بڑی دیر کے بعد منزل مقصود آئی پہاڑ کے دامن میں پہنچے، موٹر سیکل گرم ہو چکی تھی، ہم نے کچھ اس خیال سے کہ پہاڑ پر جا کر آئے تک کہیں یہ غائب نہ ہو جائے اور کچھ اس لئے کہ گھنے سائے میں اس کی گرمی دور ہوگی اسے شاداب جھاڑیوں کے اندر کھڑا کر دیا اور اوپر کی طرف چلے۔ جنگل، ساگوان کے درخت، پرندے کے چہچہے، ٹھنڈی ہوائیں اور دس بجے کی نرم دھوپ بڑا روپ دکھا رہی تھی، ہم نے خیال کیا کہ سب سے پہلے بزرگ کے مزار پر فاتحہ پڑھ لینی چاہئے۔ معاف کیجئے ہم ذرا مذہبی قسم کے آدمی ہیں فوراً جیب میں ہاتھ پہنچ گیا کہ دیکھیں پھولوں اور خیرات کے لئے کھلے پیسے ہیں بھی یا نہیں بارے ایک اٹھنی نکلی ورنہ ہر موٹر سوار کی جیب سے پیسوں سے زیادہ روپیوں کی جھنکار آتی ہے، راستہ بائیں طرف کو مڑتا تھا ہم اپنی وطنی خاکساری کے ساتھ سر جھکائے زمین جھانکتے چلے جا رہے تھے۔ یکایک اوپر جو نظر پڑی تو دیکھتے کیا ہیں کہ دو فرلانگ تک اونچا راستہ ہے سیڑھیوں کی قطار ہے اور اوپر بزرگ کا مزار نظر آرہا ہے۔ فوراً دل پر اثر ہوا۔ ہم نے خیال کیا کہ سچ ہے روح کی بلندی ہمیشہ قائم رہتی ہے ہم نے سیڑھیاں چڑھنی شروع کیں اوپر پہنچنے تک برا حال ہو گیا سب سے زیادہ تکلیف ہمارے پیٹ کو پہنچی کیونکہ ہمارا پیٹ کسی قدر گول ہے! درگاہ کے چبوترے پر پہنچنے کے بعد ایک قدیم روایت یاد آگئی۔ یہاں کے متعلق مشہور ہے کہ کسی بزرگ کی بددعا سے اس درگاہ کے تین گوشے آباد ہیں اور ایک ویران۔ ہم نے بڑے شوق سے اس کی توثیق کرنی چاہی گوشوں کی آبادی کا حال سنئے دو چار بکریاں، آٹھ دس کبوتر، تھوڑی سی عدم صفائی اور ایک حافظ صاحب! ویرانی کی طرف عمارت شکستہ اور کچھ نہیں۔ بہر حال ہم نے درگاہ کا ایک معتقدانہ طواف کیا اور درمیانی گنبد کے نیچے مزار کی ایک جانب بیٹھ گئے۔ تکان اور مراقبے میں ایک روحانی تعلق معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس وقت

کسی نہ کسی کیف میں ڈوب گئے اور آنکھیں بند کرلیں یقین مانئے ایسا معلوم ہوا ہم کسی اعلیٰ مقام میں پہنچ گئے ہیں سوائے رنگینیوں کے کچھ نظر نہ آرہا تھا، مگر تموجات کی زد دل پر پڑ رہی تھی ۔ ایسے وقت میں قرآن مجید بہت جلد یاد آتا ہے ہم نے قرآن خوانی اور درود پڑھنا شروع کیا جس وقت ہم پہنچے تھے تو دس بج کر بیس منٹ ہوئے تھے جب آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ بارہ بج گئے ہیں ہم نے لمبا خواب اصحاب کہف کی نیند کا ایک جھونکا ہم نے بھی دیکھ لیا۔ آنکھ کھلتے ہی پھر وہی پیٹ کی تکلیف بھوک محسوس ہوئی اور بری طرح محسوس ہوئی ۔ درگاہ کے باہر نکلے نہ تھے کہ ایک بزرگ صورت فقیر نے ہمارے سامنے قدرتی باغ کی ایک ڈالی پیش کی کچھ سیتاپھل کچھ موز، عمدہ بیر، دو چار جام، ایک سنگترہ بیچ میں پھولوں کا ایک گلدستہ ہم نے بزرگ کو حیرت سے دیکھا اور کہا حضرت آپ کون ہیں یہ کیا ہے ؟ کوئی تحفہ تو نہیں ہمیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے ذریعے غیبی امداد دی جا رہی ہے ۔ انھوں نے فرمایا " جی ہاں تحفہ غریب کا لے لیجئے " ہم نے یہ تحفہ فوراً پیٹ میں اتار لیا اور آگے بڑھے جس وقت ہم چلے تو بزرگ نے ہماری طرف غور سے دیکھا ہم نے بھی انھیں غور سے دیکھا تھوڑی دور نکل جانے کے بعد خیال ہوا کہ انھیں کچھ پیسے دیدینے چاہیں۔ ہم نے جیب ٹٹولا تو اس میں نہ چوانی نہ دوانی نہ پیسہ سب روپے آپ ہی خیال کیجئے کتنی ندامت ہوئی ہوگی بھلا غریب کو ایک روپیہ کیسے دے دیا جائے ؟ ہم سوچ ہی رہے تھے کہ بزرگ نے کہا " میں آپ کی مشکل سمجھ گیا تکلیف نہ کیجئے ادھر آیئے میں آپ کو ایک چیز دکھاؤں "

اُن کے ساتھ چلتے ہوئے سوچ جاتے ہمیں کچھ خوف ہونے لگا کیونکہ اس جنگل میں سوائے اُن کے اور ہمارے کوئی نہ تھا ہاں ایک تکلیف دہ ساتھی تھا جو عجیب و غریب طریقے سے ہماری رفاقت کر رہا تھا اور یہ کوا تھا کم بخت ہمارے ساتھ ساتھ ڈالی ڈالی اڑتا اور برابر کائیں کائیں کیا جا رہا تھا۔ ایک آدھ میل چلنے کے بعد تالاب کا کنارہ آیا ۔ قدرت کا نہایت عجیب منظر دے رہا تھا ہم پانی کے کنارے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے قریب ہی ایک جھونپڑی نظر آئی ہم اور وہ بزرگ دونوں خاموش تھے کہ یکایک فضا میں ایک دوشیزہ آواز بلند ہوئی " ابا جان کھانا تیار ہے " ہم نے چونک کے ادھر دیکھا کچھ نہیں جھونپڑی کے دروازے پر نظر پڑی ۔ ایک رنگین اجالا ایک چمکتی پیشانی ایک چاندی سی کلائی اور تارے جیسی ایک آنکھ ہم نے فوراً دوپٹہ اوڑھ لیا " جل جلالہ "

یہ حسن کا حسن کو بڑا مقدس سمجھتا ہے ہم نے اس وقت محسوس کیا کہ ان نازنین کی حسن کو پاکیزگی تقدس کچھ دور جا پڑا ہے ۔ ہم نے دماغ پر زور ڈال کے سوچنا شروع کیا کہ کسی طرح اس برق تجلی کی دید میں آنا چاہئے ہم نے کچھ مایوس کے کچھ بزرگ کی طرف دیکھ کے ایک سوال کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ انھوں نے فرمایا " میاں چلو کھانا کھالیں " ہم نے کہا ماشاء اللہ اور موصوف سے پہلے کٹیا میں پہنچ گئے ۔ ایک نازنین ہاتھ نے سلام کیا ہم نے دیکھا تو نہیں ۔ سلام ہی کا جواب دیا اور بیٹھ گئے ۔ پھر وہی آواز پھر بلند ہوئی ۔ جناب ہم غریب ہیں کھانا پسند نہ آئے گا ۔ ہم نے کہا " جناب ۔ نہیں جناب ۔ آپ کیا کہتی ہیں اس وقت بھوک کی شدت ہے اور یہ کھانا من و سلویٰ معلوم ہو رہا ہے " کھانا کھاتے کھاتے وہ تو بہ شکل نظر آ ۔ آنکھوں کے سامنے ہی رہا پندرہ منٹ گذرے ہوں گے کہ خدا حافظ کہنا پڑا ہم با دل ناخواستہ باہر نکلے ۔ اتنے میں اُس نازنین نے پیچھے آواز دی قریب بلوا کے ایک بلور جس پر دھاریاں تھیں میرے ہاتھ پر رکھا " ابا جان نے دیا ہے اسے پیٹ قلم ان میں رکھ لیجئے " ہم نے اس تحفے کو سر آنکھوں پر لیا اور شکریہ کر کے چلے ہم تنہا تھے راستہ بڑی مشکل سے طے ہو رہا تھا ۔ یہ عاقبی دنیا میں محبت کی چاشنی !

شاید یہہ لطف جنت ہی میں حاصل ہو یا نہ ہو۔ ایک درخت کے نیچے ہم نے دیکھا کہ پگڈنڈی پر دھوپ کی طرف ایک بڑا سیاہ بچھو چلا جا رہا ہے ہماری نظر اس پر اس وقت پڑی جب کہ ہم اس پر پاؤں رکھنے ہی والے تھے۔ ہم دور اچھل پڑے اور بچھو کو بہت غور سے دیکھنا شروع کیا پیلی بچھو تھا جسم پر بڑے بڑے بال تھے اور ڈنکوں کی طرف دو بڑے سیاہ پنجے۔ اس کی ضخامت بڑی تیتلی کے برابر ہوگی۔ تماشہ دیکھئے جوں ہی ہماری نظر اس پر پڑی بچھو اس طرح تلملا اٹھا جیسے اسے کسی تیز اور گرم سیخ سے چرکا دیا گیا ہے۔ وہ سکڑنے لگا اور ایک دو منٹ میں سکڑ کر ٹھنڈا ہوگیا۔ ہم نے دس منٹ تک اس کے چلنے کا انتظار کیا مگر وہ مردہ پڑا ہوا تھا۔ ہم نے ایک بڑی لکڑی لے کر دور سے اسے چھیڑا مگر وہ مر چکا تھا۔ ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم اس تحفے کو ایک بڑے پتے پر اٹھا کر گھر لے آئے، دو گھنٹوں میں وہ پانی پانی ہوگیا۔ اب ہم کو میر محمود صاحب کی پہاڑی کے دو تحفے اکثر یاد آتے ہیں۔ ایک تو اب تک قلمدان سے زیادہ دل میں ہے، اور دوسرا حافظے کی دنیا میں۔ ہماری سمجھ میں نہ آسکا کہ اس پہاڑی پر ہم کو یہہ تحفے کیوں ملے۔

محمد عبدالقیوم خاں باقی

نیا پل اور شام

شام کی سندر فضا میں دور کی تنویر ہے
خوابِ دوشیزہ کی میرے سامنے تصویر ہے

ہر طرف طوفانِ نغمہ ہر طرف طغیانِ نور
حضرتِ انساں کی سرگرمی میں گم شورِ طیور

نور کی سرگرمیوں میں غرق ایوانِ بلند
شام کی دیوی نے بڑھ کر پھینک دی اپنی کمند

گنبدوں پر نور کی پرچھائیاں ہیں پربہار
اور فضا پر چھا گیا ہے نور و ظلمت کا غبار

اک طرف تعمیرِ عدل[1] و اک طرف دارالشفا[2]
دور پر اک مدرسہ[3] ہے نیند میں کھویا ہوا

سامنے دارالکتب[4] کی دل نشیں تعمیر ہے
جس کی خشت و گل میں عقل و ہوش کی تخمیر ہے

رودِ موسیٰ پر نیا پل دہر کی تصویر ہے
جس کی دو رنگی میں دونوں دور کی تعمیر ہے

ایسے خوش منظر میں میری ذات ہی کھوئی ہوئی
جاگتی ہے آنکھ اور تقدیر ہے سوئی ہوئی

سید محمد اکبر وفا قانی

---

[1] عدالت العالیہ ۔ [2] عثمانیہ دواخانہ ۔ [3] کلیہ بلدہ ۔ [4] کتب خانہ آصفیہ ۔

The Hyderabad Printing Works,

سب رس

اعلیٰحضرت سلطان العلوم فرماں روائے دکن و برار خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

دکن نمبر

ادارۂ ادبیات اردو

نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۳)   رجسٹر نمبر (M3950)

مرقع دکن

یعنی
ادارۂ ادبیات اردو کے ماہ نامہ

سب رس

کا سالگرہ نمبر بابتہ جنوری ۱۹۳۹ء

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش   سکینہ بیگم
خواجہ حمید الدین شاہد   معین الدین احمد انصاری

مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر "ادارہ" رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا
تعداد صفحات ۲۱۲ تعداد تصاویر ۸۰ قیمت عالی

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) یہ ادارہ ادبیات اردو کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہ ہوں گے

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کرکے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہ کار مضامین کو اردو میں منتقل کرکے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ دوچر یا وی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

	سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے	چار روپے	دو روپے	چھ آنے
شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ	چار روپے آٹھ آنے	دو روپے بارہ آنے	سات آنے

بچوں کے سب رس کی قیمت

	سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
بلدہ حیدرآباد کے لئے	ایک روپیہ	دس آنے	ڈیڑھ آنہ
شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ	ایک روپیہ آٹھ آنے	بارہ آنے	دو آنے

محرم نمبر ۱۲؍ اقبال نمبر عہ ۸؍ دکن نمبر عہ ۱۱

سب رس کی خریداری اس میں اشتہارات کی طباعت اور ادارہ ادبیات اردو کی رکنیت یا اس کے مطبوعات کی خریداری کے سلسلے میں جو اصحاب صدر دفتر (رفعت منزل خیریت آباد) سے گفتگو یا مراسلت نہیں کرسکتے وہ حسب ذیل اصحاب سے گفتگو یا مراسلت کرسکتے ہیں۔

بلدہ (۱) مسٹر ایس اے کریم نمائندہ خصوصی چیلہ پورہ قریب مکان حکیم محمود صمدانی مرحوم (۲) مسٹر ایس پی اننتا۔ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ (۳) رحمان کا ٹیج گھانسی بازار۔ **اضلاع** مسٹر محمد فخرالدین ارماںؔ (روضۂ شیخ) گلبرگہ شریف

ان کے علاوہ نور احمد صاحب عثمانیہ ادارہ کی طرف سے علمی و ادبی دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے یہاں ادارہ کی کتابیں اور رسالے لے کر آئیں گے۔ توقع ہے کہ علم دوست اصحاب ضرور ان کی مدد کریں گے۔

سب رس مرقع دکن نمبر جنوری سنہ ۳۹ء

فہرست تصاویر

تعداد صفحات ۲۱۶ - تعداد تصاویر ۷۸ - قیمت عالی

سب رس مرقع دکن نمبر جنوری ۱۹۳۹ء

فہرست مضامین

ادارہ ادبیات اردو کی چند

قابلِ دید کتابیں

نذرِ ولیؔ۔ حضرت ولیؔ اورنگ آبادی کی خدمت میں نذرِ عقیدت قیمت مجلد (عہ)

گریہ و تبسم۔ حیدرآباد کے نوجوان شاعر صاحبزادہ میکش کے کلام کا مجموعہ قیمت مجلد (عہ)

بزمِ سخن۔ دو جلدیں۔ حیدرآباد کے پچھتّر شعراء کا باتصویر تذکرہ فی جلد مجلد (عہ)

من کی دنیا۔ نوجوان انشا پرداز رشید قریشی کے ولولہ انگیز افسانے (عہ)

ہز ہائینس والاشان نواب اعظم جاہ بہادر
ولیعہد سلطنت آصفیہ و شہزادۂ برار
اپنے فرزند ارجمند شہزادہ کرنل نواب مکرم جاہ بہادر کے ساتھ

مدح خواجہ

معین الدینؒ ہیں قطب الدینؒ سے شاد — تو قطب الدینؒ، فرید الدینؒ سے شاد
فرید الدینؒ، نظام الدینؒ سے خوش — نظام الدینؒ، نصیر الدینؒ سے خوش

نصیر الدینؒ مرے ممدوح سے شاد
مرے ممدوح کا تو نام رکھ یاد

مطیعِ مصطفےٰؐ سید محمدؒ — مطاعِ باصفا سید محمدؒ
دوئی کیسی؟ یہ ہر فردِ یگانہ — مری نظروں میں ہے قطبِ یگانہ

اُدھر جو ہے وہی ضو پاش اِدھر ہے
نمودِ خواجہ ہر سو جلوہ گر ہے

سمجھ کا دُور ہو جائے اگر پھیر — تو گلبرگہ کو بھی تو سمجھے اجمیر
غرض، تنویرِ خواجہ دیدنی ہے — جدھر دیکھو اسی کی روشنی ہے

نگاہِ عارف ان جلووں کی جُویا
مری نظریں بھی خوش ان سے ہیں گویا

دکھاتا ہے یہ سلطانِ طریقت — مجازی شان میں شانِ حقیقت
نزول اچھا عروج اچھا ہے اس کا — سلوک اس شان سے کامل ہے کس کا

جو یہ شہبازؒ ہو مائل بہ پرواز
کھلے تشبیہ سے تنزیہ کا راز

عیاں خواجہ کی ہے بندہ نوازی — نہیں کس کو اُمیدِ سرفرازی
سلیمانِ دکن عثمان علی خاںؒ خلد اللہ ملکہ — فروغِ مدعائے آصفیاں

مرے خواجہ کے رُخ سے سب کا ہے ضو
دکن افروز ہے خواجہ کا پرتو

علی منظور

---

۱ غریب نواز ۲ بختیار کاکی ۳ گنج شکر ۴ سلطان المشائخ ۵ چراغ دہلی ۶ بندہ نواز، غریب نواز اور بندہ نواز میں صرف چار واسطے ہیں ۱۲۔ ۷ خواجہ کے القاب میں ایک لقب شاہباز طریقت بھی

اداریہ

سب رس کا دوسرا سال جس اہتمام کے ساتھ شروع ہو رہا ہے۔ اس کا عملی ثبوت یہ سالگرہ نمبر ہے جو دکن کے ماضی وحال کے متعلق دلچسپ اور اہم تاریخی معلومات کے لیئے وقف کر دیا گیا ہے اور ہزار ہا روپیہ کے صرفہ سے تیار ہوا ہے۔ قدیم تاریخی قلمی تصویروں کے فوٹو لینے اور پھر ان کے اتنی بلاکس کی تیاری اور اُن کی چھپائی کے لیئے جو وقت اور رقم صرف ہوی ہوگی صرف اسی کا اندازہ کرنے سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ ادارہ نے اس شاندار تاریخی نمبر کی خاطر کتنا اہتمام کیا ہے اور سب رس کی زندگی اور ترقی کے لیئے کس حد تک رقم کا صرفہ اور محنت کرنے کے لیئے تیار ہے۔

اسی اہتمام اور غیر معمولی کوششوں میں آسانی کا پیدا کرنے کے سلسلہ میں ادارۂ ادبیات اردو نے نئے سال سے سب رس کی ایک مجلس ادارت بھی قائم کر دی ہے۔ جو اپنے ہر ماہ نامہ کو ہر ذوق اور ہر قسم کی دلچسپیوں سے مالا مال کرنے کی طرف خاص طور پر متوجہ رہے گی۔

مجلس ادارت کے قیام کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ سب رس کا علمی و ادبی معیار بڑھتا جائے اور اس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ایسی مفید اور ضروری معلومات بھی درج ہوا کریں جن کا جاننا ہر تعلیم یافتہ کے لیئے ضروری ہے۔ اس بارے میں ادارۂ ادبیات اردو کے مختلف شعبے سب رس کا ہاتھ بٹائیں گے۔ مثلاً شعبہ زبان اردو زبان کے ضروری اور اہم مسائل پیش کرتا رہے گا۔ شعبہ تنقید کی طرف سے اردو کتابوں پر سنجیدہ اور نمود تنقیدیں شایع ہوتی رہیں گی۔ اور تمام ہندوستان کی جدید مطبوعات کی اطلاع بھی وقت بوقت دی جائے گی تاکہ معلوم ہوتا رہے کہ اردو میں کون کونسی کتابیں شایع ہو رہی ہیں۔ شعبہ تاریخ دکن ایسی مفید اور دلچسپ معلومات فراہم کرتا رہے گا جو ملک کی ترقی اور عروج کیلئے اہل ملک کی رہبری کریں گی۔ شعبۂ نسوان ہر ماہ نسوانی فلاح و بہبود سے متعلق مضامین کی فراہمی کے علاوہ اس امر کی کوشش کرتا رہے گا کہ سب رس میں نسوانی دلچسپیوں کے کافی سامان مہیا ہوتے رہیں۔

ساتھ ہی ادارہ کے تمام شعبوں کے ماہوار جلسوں کی روئدادیں بھی سب رس میں شایع ہوں گی تاکہ ہر مضمون سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب مستفید ہو سکیں۔ چنانچہ ان تمام شعبوں کی تفصیل اور ان کے جلسوں کی روئدادوں کے اہم حصے اس مہینے بھی شایع کئے جا رہے ہیں۔

یہ باتیں صرف اس لیئے بیان کی گئیں کہ سب رس کے قدر دانوں کو اندازہ ہو جائے کہ سب رس کی ترقی اور اس کے مستقبل کو درخشاں بنانے کے لئے ادارہ کیا کام کر رہا ہے۔

دکن نمبر کے بارے میں زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ خود اس کا مطالعہ اس کی سفارش کرے گا۔ اتنا لکھنا ضرور ہے کہ محض اعلیٰحضرت ظل سبحانی سلطان العلوم آصفجاہ سابع کی علم نوازیوں اور مسیحا نفسیوں کے باعث آج ہم اس قابل ہو سکے کہ دکن کی قدیم تاریخ کو اس طرح باتصویر پیش کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مرقع دکن اعلیٰحضرت کے نام نامی اور حالاتِ زندگی سے شروع کیا جا رہا ہے۔ اور اس کا سرِورق حضرت ظل سبحانی سلطان العلوم ہی کی تصویر سے مزیّن ہے۔ اس سلسلہ میں نواب سالار جنگ بہادر کی علم دوستی اور فیاضی کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ جس کی وجہ سے یہ مرقع دکن صحیح معنوں میں ایک مرقع بن سکا۔ اس کی اکثر تصویریں نواب صاحب ہی کے خزائنِ فنونِ لطیفہ سے حاصل کی گئی ہیں۔ اور نواب صاحب نے بکمال مہربانی ان کو سب رس میں شایع کرنے کی اجازت عطا فرمائی ہے۔

سب رس کے قلمی معاونین کا شکریہ بھی لازمی ہے کہ انھوں نے قلیل عرصے میں نہایت مستند، دلچسپ اور مکمل مضامین تیار کر دئے۔ خاص کر دکن نمبر کی تیاری کے لیئے جو مجلس مشاورت مقرر کی گئی تھی اس کے اراکین (عبد المجید صاحب صدیقی ام اے ال ال بی۔ میر محمود علی صاحب ام اے

سید سراج الدین صاحب ایم اے۔ سید محمد اکبر وفا قانی صاحب بی اے ال ال بی۔ عبد القادر سروری صاحب ایم اے ال ال بی اور سید محمد صاحب ایم اے) ہر طرح سے مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے نہ صرف خود کام کیا بلکہ دوسروں سے بھی اچھے تاریخی مضامین لکھوائے۔ مولوی غلام احمد خاں صاحب صوبہ دار اورنگ آباد کی علمی دلچسپی کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ انھوں نے نہ صرف اورنگ آباد پر مضمون لکھ بھیجا بلکہ وہاں کے مختلف مناظر و آثار تاریخی عمارات کی تصاویر بھی روانہ کیں۔ جن میں سے بعض اس مرقع میں یا بچوں کے دکن نمبر میں شامل ہیں اور بعض آئندہ نمبروں میں چھپیں گی۔

سب رس کے ناظرین یہ معلوم کرکے خوش ہوں گے کہ حیدرآباد کے مشہور آرٹسٹ مسٹر نیوم نے جس طرح اس شمارہ کے لئے عبد الرزاق لاری کی تصویر بنا دی ہے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ بھی سب رس کو اپنے حسن کارانہ کمالات سے مستفید کرتے رہیں گے

سید محمد اکبر وفا قانی صاحب اور مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب نے بھی سب رس کے ہر شمارہ میں کسی نہ کسی عمدہ مضمون کی تیاری اور اشاعت میں مدد دینے کا ذمہ لیا ہے۔ گو کہ وقت کی تنگی کی وجہ سے لاری کی تصویر رنگوں میں چھاپی نہ جاسکی تاہم یہ تصویر اپنی تاریخی اہمیت اور ایک مشہور حسن کار کا نتیجۂ قلم ہونے کی وجہ سے قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ عبد الرزاق لاری نے تنہا اس وقت مغل فوج کا مقابلہ کیا جب غداروں کے دروازہ کھول دینے کی وجہ سے مغل فوج قلعہ میں داخل ہونا چاہتی تھی۔ لاری کو عین وقت پر اس کی اطلاع ہوئی اور وہ کھلے ہوئے دروازے کے سامنے مقابلہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ زخموں میں چور ہوگیا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

اس سب رس میں ایک چیز کی کمی محسوس ہو رہی ہوگی۔ سب مضامین اور نظمیں مردوں ہی کے ہیں۔ صنف نازک کو اس میں سوائے بچوں کے حصہ کے کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے۔ ایسا عمداً کیا گیا۔ کیونکہ ادارہ کے شعبۂ نسواں نے تصفیہ کیا تھا کہ وہ اپنا نمبر علحدہ شائع کرے گا۔ اس لئے جملہ مضامین معتمد شعبۂ نسواں اور سب رس کی مجلس ادارت کی رکن محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کے یہاں روانہ کر دئے گئے۔

انھوں نے ان سب مضامین کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کرلیا اور خواتین دکن کے دلچسپ و مفید مضمونوں اور نظموں کا یہ مجموعہ اب نذر دکن کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ اور غالباً آئندہ جنوری تک قدر دانوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔ نذر دکن اپنی قسم کی واحد اور قابل دید کتاب ہوگی۔ اور سب رس کے سالانہ خریداروں کو نصف قیمت پر دی جائے گی کیونکہ وہ دراصل سب رس ہی کا ایک حصہ ہے۔

نذر دکن کے علاوہ شعبۂ نسواں کی طرف سے قریب میں اور کتابیں بھی شائع ہوں گی۔ توقع ہے کہ یہ شعبہ ملک کی علم دوست خاتونوں کے تعاون کی وجہ سے خاطر خواہ کامیاب ہوگا۔

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس عاملہ نے حسب ذیل اصحاب کو اُن کی علمی و ادبی دلچسپیوں اور ادارہ کے کاموں میں خلوص کے ساتھ ہاتھ بٹانے کے پیش نظر ادارہ کا رفیق منتخب کیا ہے۔

محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ (داعی شعبۂ نسواں)۔ مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری ایم اے، بی ایس سی آنرز (داعی شعبۂ زبان) مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے، ایچ سی ایس (داعی شعبۂ تراجم) اور نواب کیقباد جنگ بہادر

توقع ہے کہ سب رس کا دوسرا سال نئے انتظامات اور خاص اہتمام کے باعث پہلے سال سے زیادہ کامیاب ثابت ہوگا۔

سید محی الدین قادری زورؔ

اعلیٰحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخاں بہادر آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ

حضرت ظلِ سبحانی کے حالاتِ زندگی اور عہدِ میمنت مہد کے متعلق اس وقت تک متعدد کتابیں اور مضامین شایع ہو چکے ہیں ہر سال ملک اور بیرونِ ملک میں رسائل و اخبارات کے سالنامے اور سالگرہ اقدس کی مبارکباد کے خاص نمبر شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ان سب میں حضرت بندگانعالی کی عظیم الشان شخصیت آپکے بے مثال تدبر و سیاست، ذاتی علم و فضل شعر و سخن کی دلچسپیوں اور ذہنی و اخلاقی محاسن وغیرہ کے ہر پہلو سے متعلق تفصیلی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں اگر ان سب کو ایکجگہ کردیا جائے تو اعلیٰحضرتِ سلطان العلوم کی قابلِ تقلید ہستی کے متعلق کئی جلدوں کی سوانح حیات مرتب ہو جائے۔

دودمانِ آصفی میں اعلیٰحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ کی ذاتِ والاصفات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور علم و فضل و شعر و سخن کی سرپرستیوں میں حضرت جہاں پناہی نے خاص توجہ فرمائی ہے یہی وجہ ہے کہ اعلیٰحضرت خلد اللہ کے تذکرہ کو اس مرقع دکن کے لیئے زیب عنوان قرار دے کر تاریخی سلسلہ سے درج کرنے کی جگہ ابتدا میں پیش کیا جارہا ہے۔

اعلیٰحضرت سلطان العلوم خلد اللہ کی حیات کا محض علمی و ادبی پہلو بھی ایسا وسیع ہے کہ اس پر لکھنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر کئی جلدوں کی مبسوط کتاب لکھی جاسکتی ہے اگر موقع ملے تو خود ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے اس موضوع پر نہایت اجمال کے ساتھ پانچ ابواب میں ایک نذر عقیدت پیش کی جائیگی۔ اس سوانح شاہانہ کا پہلا باب حیاتِ سلطانی اور دوسرے چار ابواب ۲۔ اردو شاعری۔ ۳۔ اردو نثر۔ ۴۔ فارسی شاعری اور ۵۔ ہندی شاعری پر مشتمل ہوں گے۔

ادارہ

خسروِ دکن مشرق کے سب سے زیادہ ہر دلعزیز تاجدار ہیں۔ آپکی ولادت ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ آپ کے لیئے بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام تھا اس لئے آپ کو مشرقی اور مغربی علوم میں اعلیٰ مہارت حاصل ہے۔ فارسی اور اردو زبان کے اعلیٰ شاعر ہونے کے علاوہ اپنی خداداد ذہانت و علمی قابلیت اور علوم و فنون کی سرپرستی کی بناء پر بجا طور پر سلطان العلوم کہلاتے ہیں۔

اپنے والد نواب میر محبوب علی خاں کے انتقال پر آپ ۱۹۱۱ء میں ۲۵ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے جس کو آج تقریباً ۳۸ سال کا عرصہ ہوتا ہے اس عرصہ میں حیدرآباد کی ہر جہتی ترقی حیرت انگیز ہے جو کام کہ سلطنت آصفیہ کے قیام کے زمانے سے حالیہ زمانہ تک یعنی دو سو سال کے عرصہ میں نہیں ہوا تھا وہ اس وقت ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور بندگانعالی نے اپنی غیر معمولی روشن خیالی۔ رواداری بے انتہا سادہ زندگی، اعلیٰ اخلاق اور خداداد قابلیت سے حیدرآباد کی قومی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی ہے جس کی وجہ سے سارے ملک میں عام بیداری پیدا ہوگئی ہے اور سلطنتِ آصفیہ میں ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوگیا ہے۔

رعایا کے نہ صرف جان و مال کی حفاظت اور ملکی ترقی کا خیال آپکے پیش نظر رہتا ہے بلکہ تعلیمی اور اخلاقی زندگی کی اصلاح اور رعایا کے آرام و آسایش کی فکر ہمیشہ آپ کے دامنگیر رہتی ہے۔ چنانچہ طبقۂ امراء اور بالخصوص نوجوانوں کو اسی حال میں جو نصائح آپ نے فرمائے ہیں وہ آب زر سے

لکھے جانے کے قابل ہیں۔

اعلیٰحضرت کی تخت نشینی کے وقت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر مدارالمہام تھے۔ پھر نواب سالار جنگ بہادر سوم، مدارالمہام ہوئے۔ بعد ازاں پانچ سال تک اعلیٰحضرت نے نہایت جانفشانی سے یہ فرائض خود انجام دئے۔ آخر پر ۱۹۱۹ء میں باب حکومت کا قیام عمل میں آیا اس کے بعد سر علی امام سر فرید الملک نواب ولی الدولہ بہادر، اور پھر مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یکے بعد دیگرے صدر اعظم مقرر ہوئے۔

جنگ عظیم کے نازک موقع پر اعلیٰحضرت نے خاندانی روایات کے مطابق اپنی جملہ فوجوں اور تقریباً چھ کروڑ روپیوں سے سلطنت برطانیہ کی مدد فرمائی۔ اس امداد کے اعتراف میں حکومت برطانیہ نے "یار وفادار اور ہز اگزالٹیڈ ہائینس" کے خطاب سے مخاطب کیا۔

اعلیٰحضرت کی حب الوطنی اور رعایا پروری ضرب المثل ہے چنانچہ آپ نے بادشاہ ہوتے ہی قدیم محکموں کی از سر نو تنظیم فرمائی اور بہت سے نئے محکمے قائم کئے۔ جیسے محکمہ آثار قدیمہ محکمہ زراعت۔ محکمہ صنعت و حرفت۔ محکمہ آرائش بلدہ، محکمہ امداد باہمی، محکمہ بلدیہ و محکمہ لاسلکی وغیرہ۔ کئی ایک بڑے بڑے تالاب بنوائے جیسے عثمان ساگر، حمایت ساگر اور نظام ساگر وغیرہ اسی طرح بے شمار عمارتیں تعمیر کیں۔ جیسے عدالت العالیہ۔ دواخانہ عثمانیہ۔ سٹی کالج معظم جاہی مارکٹ۔ کتب خانہ آصفیہ۔ جامعہ عثمانیہ کی عمارتیں۔ جوبلی ہال وغیرہ۔

غرض خوبصورت عمارتوں کی کثرت، سمنٹ کی کشادہ سڑکوں کی رونق اور ہر قسم کی عصری ترقیوں کی وجہ سے اس وقت حیدرآباد ہندوستان کا بہترین شہر بن گیا ہے، جہاں مشرقی اور مغربی دونوں قسم کے تمدنوں کے نمونے موجود ہیں۔ اسی طرح اضلاع اور شہر میں آمد و رفت کی بہت کچھ سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ ریلوں اور سڑکوں کا ایک جال سارے ملک میں بچھا دیا گیا ہے اس طرح دور عثمانی میں عمارتوں کی تعمیر اور رعایا کی خوش حالی اور ترقی کو دیکھ کر عہد شاہجہانی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

اعلیٰحضرت نے پچیس ۲۵ سالہ کامیاب حکومت کا جشن سلور جوبلی، منایا جا کر ابھی پورے دو سال کا عرصہ نہیں ہوا ہے کہ اس جشن سیمیں کے بعد رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نواز جنگ بہادر کو صدر اعظم مقرر فرمایا گیا ہے۔ سر اکبر نے صدارت عظمیٰ سے قبل ملک میں اشاعت تعلیم، قیام جامعہ عثمانیہ اور ریاست کے مالیہ کے استحکام اور دیگر اصلاحات کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے وفاق کے سلسلہ میں کئی دفعہ انگلستان جا جا کر آپ نے ریاست کے مفاد کی بھی بہت کچھ حفاظت کی ہے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں حکومت برطانیہ اور اعلیٰحضرت کے درمیان یہ معاہدہ ہوا کہ برار میں انگریزی جھنڈے کے ساتھ حضور نظام کا جھنڈا بھی بلند ہوگا۔ اور ولی عہد بہادر ہز ہائینس پرنس آف برار کا خطاب اور اعلیٰحضرت ہز اگزالٹیڈ ہائینس نظام آف حیدرآباد و برار کا خطاب اختیار فرمائیں گے! اسی طرح علاقہ رزیڈنسی کی واپسی بھی اعلیٰحضرت کے زمانے کی ایک بڑی یادگار ہے۔

اعلیٰحضرت کی تقلید میں خاندان شاہی کے دیگر اراکین بھی ترقی ملک کے لئے ہمہ تن مصروف ہیں چنانچہ ولیعہد سلطنت ہز ہائینس پرنس آف برار والاشان اعظم جاہ بہادر کی سپہ سالاری میں فوجوں کی بہت کچھ اصلاح و ترقی عمل میں آئی ہے۔ شہزادہ والاشان نواب معظم جاہ بہادر کی میر مجلسی میں محکمہ آرائش و بلدیہ حیدرآباد کے اشتراک عمل سے، غربا کی زندگی کو بہتر بنانے، بہبودیٔ اطفال کے مرکز قائم کرنے، معظم جاہی مارکٹ کو ایک نمونے کی مارکٹ بنانے اور شہر کی عام رونق میں اضافہ کرنے میں سرگرم عمل ہے۔ ترکی شہزادیوں یعنی شہزادی ہر ہائینس در شہوار اور شہزادی نیلوفر کی رہنمائی کی وجہ سے حیدرآباد کے طبقۂ نسوان میں بہت کچھ بیداری، اصلاح

اور ترقی کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے ہیں چنانچہ انجمن خواتین حیدرآباد کی سرگرم کوششیں اس کا بدیہی ثبوت ہیں۔ اسی طرح سے اعلیٰحضرت نے اپنے بھائی صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر کو جدید تعلیمی کمیٹی کا صدر اعلیٰ مقرر فرمایا ہے۔ جن کی صدارت میں بہت کچھ مفید کام کیا جا رہا ہے۔ غرض ۸۲۶۹۸ ہزار مربع میل سے زاید رقبۂ ملک پر اعلیٰ حضرت کے نام کا سکہ جاری ہے۔ اور تقریباً ڈیڑھ کروڑ رعایا قانون آصفی کے تحت عدل و انصاف سے مستفید ہو رہی ہے۔

صرف خاص مبارک، پائیگاہوں، جاگیرات، اور سمستانوں کے قطع نظر محض علاقۂ دیوانی کی آمدنی اس وقت (۹) کروڑ روپے سالانہ سے زاید ہے۔ جس کی وجہ سے خزانہ معمور ہے۔ اور قوم سازی کے بہت سے کام ہو رہے ہیں۔ زراعت پیشہ طبقہ کی مشکلات کو بڑی حد تک دور کیا گیا ہے۔ صنعت و حرفت کی ترقی کی طرف بھی خاص توجہ کی گئی ہے۔ چنانچہ اس وقت بہت سی صنعتیں جاری ہیں اور بعض بڑے بڑے کارخانہ جات کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے۔ اسی طرح تجارت کیا بلحاظ درآمد اور کیا بلحاظ برآمد ترقی پر ہے۔

اعلیٰحضرت بندگان عالی کی سرپرستی اور فیاضی کا یہ عالم ہے کہ ریاست کے باہر بھی جو باشندے یا جو ادارے مستحق ہیں ان کو یہاں سے مالی امداد دی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ حیدرآباد قدیم کی روایات برقرار ہیں اور بعض امور میں حیدرآباد جدید دوسری ریاستوں اور برطانوی ہند سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے جیسا کہ انتظامی اختیارات کی علحدگی کا مسئلہ ہے۔ اس پر اکتفا نہیں بلکہ اس وقت دستوری اصلاحات کے نفاذ اور مزید معاشی ترقیات کی تحریکات پر غور کیا جا رہا ہے۔

آخر پر اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ مبارک دورِ عثمانی کا سب سے اہم اور لافانی کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے جہاں سارے علوم و فنون کی تعلیم ملک کی عام فہم اور سرکاری زبان یعنی ہندوستانی (اردو) کے ذریعہ دی جاتی ہے۔
اس بیس سال کے عرصہ میں جامعہ عثمانیہ نے جو ترقی کی ہے اور اس کو اندرون و بیرونِ ملک جو غیر معمولی کامیابی اور عام مقبولیت نصیب ہوئی ہے وہ تاریخ میں اپنی آپ نظیر ہے ؎

زندہ کردی چوں مسیحا علم و فن را در دکن
زندہ باش اے حضرتِ عثمان علی خاں زندہ باش

میر محمود علی

سب رس کے گذشتہ سال کے پرچے

سب رس کے گزشتہ پرچوں کی ابھی سے مانگ بڑھ گئی ہے۔ نومبر اور ڈسمبر کے پرچے اصلی قیمت میں خریدے جائیں گے۔ اگر کسی صاحب کے یہاں اچھی حالت میں ہوں اور وہ ان کو نکالنا چاہتے ہوں تو دفتر کو مطلع فرمائیں۔ دوسرے مہینوں کے پرچوں کو بھی حفاظت سے رکھیے۔ آئندہ طلب کیے جائیں گے۔

مہتمم

تمدنِ ہند میں دکن کا رتبہ

تاریخ ہند کی یہ کھلی حقیقت ہے کہ دکن تہذیب ہند کا تنہا محافظ ہے۔ اس حقیقت کو ہم حال، و مستقبل کے آئینہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ وہ تاریخ ہند جو انگریزی اقتدار کا فدیہ بنی ہوئی ہے، ہمارے ماضی کی تقسیم فرقوں کی مذہبیوں سے کرتی، اور اس تنگ نظری کی وجہ سے تاریخ کا تہذیبی پہلو اجاگر نہیں ہوتا۔ ایک وطن پرست تہذیبی تقسیم کے لحاظ سے ہندوستان کو ان عنوانات کے تحت مطالعہ کر سکتا ہے۔ ویدوں کا دور، مثنویوں کے ذریعے ہندوستان ماسبق کی تہذیب، گوتم بدھ کا ہند، ہند کی نشاۃ ثانیہ اور آخر میں وہ تہذیب جو ویدانت اور توحید کے تخیل سے پیدا ہوئی ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس دوسری تقسیم کے تحت ہندوستانی تہذیب میں دکن کی اہمیت پر روشنی ڈالیں۔

آریائی قوم دنیا کی ان بڑی اقوام میں سے ہے جس نے ایک خاص رنگ اور نہج کی تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ انسان کائنات اور ان سب کے خالق کے متعلق ان کے نظریوں نے دیومالے پیدا کئے، اور یہی دیومالے ایک ایک تمدن کی بنیاد بن گئے۔ مغرب میں یونان اور مشرق میں ہند۔ یہاں پر چونکہ آریائی تمدن سے اصل بحث نہیں ہے اس لئے مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ آریائی تہذیب نے چاروں کی معاشرتی تنظیم کے ذریعے ایک مستقل تمدن پیدا کیا۔ دکن نے اس تمدن کے ابتدائی خط و خال کو خود میں جذب کیا۔ افسانوی دور میں رامائن کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شہ کار مثنوی کا ایک نمایاں ہیرو ہنومان ہے۔ دکن کا یہ راجہ رام کو مدد دیتا ہے۔ صداقت کی تلوار [illegible] ہے اور مظلوم عورت یا آریاورت کی ماں کو دشمنوں سے چھڑاتا ہے اور اس کے صلہ میں آریا اس کو دیوتا بنا دیتے ہیں۔ لیکن اس واقعے سے یہ ثابت ہے کہ دکن نے اپنی جگہ میدانوں میں بسنے والے خود دار متمرد اور دوسروں کو ہیچ سمجھنے والے آریاؤں کو اپنی انسانیت سے منوایا اور اپنی تمدن نوازی کو ثابت کیا۔ اس کے بعد دوسری بڑی مثنوی مہابھارت ہے۔ اس میں بھی دکن نمایاں ہے۔ پانڈوؤں کو دیس نکالا ہوتا ہے تو دکن میں پناہ ملتی ہے اور دوارکا کا روحانی اور بانکا راجہ پانچ بھائیوں کو سو کوروؤں پر فتح مند کرتا ہے۔ یہ فسانے صحیح نہیں لیکن ان کا اثر دکن پر دیکھئے کہ یہاں کا ایک ایک مقام انہیں مثنویوں کی وجہ سے مقدس بن گیا۔ مندر جو قدیم تمدنوں کے مرکز ہوتے تھے۔ لاتعداد شکل میں پیدا ہو گئے۔ ہر وہ مقام جہاں رام، سیتا اور کرشن پہنچے مقدس بن گیا اور وندھیاچل سے لے کر رامیشورم تک قدیم تہذیب کے مختلف اور مستقل ادارے پیدا ہو گئے۔ جنھوں نے آریاؤں کا مذہب فلسفہ، علم، ادب، شاعری اور جملہ شعبہ ہائے حسن کاری کو محفوظ اور غیر متبدل بنا دیا۔ اس طرح بیدر، نل اور دمینتی کے لافانی عشق کی وجہ سے اہم بن گیا۔

افسانوں سے نکل کر جب ہم تاریخ پر آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہی سے دکن بیرونی حملوں سے محفوظ رہا اور اکثر اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ دکن نے شمالی ہند کے میدانوں پر بھی اپنا سیاسی اقتدار جما لیا۔

بدھ مذہب وہ پہلی روحانی تحریک ہے جس نے آریاؤں کی طبقہ داری تقسیم اور آریا و غیر آریا کے تعصبی فرق مٹا کر [illegible] ایک قومیت میں لانے کی کوشش کی۔ لیکن دکن باوجود اشوک کی کامیابی کے اس ہمہ گیر تحریک کو تہذیبی حد تک قبول کیا اور اپنی قدیم روایات کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود بدھی حسن کاری کے خزانے کے ایلورہ، اجنتا دکن میں ہونے کے وہ بدھ تمدن کے تحت آریائی تہذیب کو معدوم نہ ہونے دیا اور جب کبھی موقع ملا۔ از سر نو دکن نے قدیم ہندو مذہبیت اور طبقہ داری تمدن کو تمام ہندوستان پر مسلط کر دیا۔ شنکر اچاری کی تحریک حقیقت میں دکن کے بدھ مت پر روحانی فتح تھی۔ یہ دکن کا نشاۃ ثانیہ ہماری موجودہ بحث کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ ہندوستان کا یہ سطح مرتفع نہ صرف بلند ہے بلکہ تہذیب دکن کا سپہ دار بھی ہے۔

اس کے بعد وہ دور آتا ہے جب کہ ہندوستان قدیم اور ایشیا کا وہ تمدن جو عرب کی سرزمین سے نکل کر پورے تمدن عالم پر محیط ہوگیا۔ ہندوستان میں ضیا پاشیاں شروع کرتا ہے۔ اسلام ایک ایسا ہمہ گیر سیل رواں ہے جو جگہ مقام اور حالات کے لحاظ سے بظاہر اپنی شکل کو تو بدلتا ہے، لیکن فطرت نہیں بدلتا۔ ہندوستان میں بھی اس نے یہاں کی تہذیب میں آکر ایک نیا روپ اختیار کیا اور ایک مستقل اور ہندوستانی تہذیب کی بنا ڈالی۔ دکن میں سب سے پہلے مسلمان جن کو تہذیبی اعمال کا موقع ملا وہ ترک ہیں۔ جو مدرسوں کی تاریخ میں غلام خاندان کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ترکان دکن نے اس سرزمین کی تہذیب میں ایک چیز کا اضافہ کیا ہے۔ موسیقی، رنگ کاری، آذری، یہاں پہلے ہی سے موجود تھی۔ لیکن پرشکوہ تعمیر کاری کا رواج ترکوں سے شروع ہوا اور دنیا کی سب سے بڑی گنبد، بولی گنبد بیجاپور پر ختم ہوا۔ اس دور میں علاوہ اور چیزوں کے ہندوستانی قومیت کے لیے وہ انمول شئے پیدا ہوئی جس کو قومی زبان کہتے ہیں اور پراکرت، ترکی، فارسی اور عربی عام فہم الفاظ، محاورے اور لسانی اجزا مل کر ہندوستان کی قومی زبان بن گئی ہے جس کو ابتدا میں دکھنی، پھر ریختہ، اور اس کے بعد اردو کا نام نصیب ہوا۔ اور موجودہ دور تعصب میں ہندوستانی ہندی، ہندی ہندوستانی کی الجھن میں پھنس گیا۔

یہ مختصر سا خاکہ اس امر کے لیے کافی ہے کہ ایک سوچنے والا اور تجسس کرنے والا عالم اس کو ابتدائی خط و خال سمجھ کر آگے آنے اور ایک اور مبسوط کارنامہ پیش کرے جس سے دکن اور اہل دکن کو معلوم ہو کہ حقیقت میں ہندوستانی تمدن میں ان کا درجہ اور رتبہ کیا ہے اور ہندوستان کے مستقبل کے سنوارنے میں ان کی کیا ذمہ داری ہے۔

سید محمد اکبر وفاقانی

دکن قدیم اردو شاعروں کی نظر میں

ملا وجہی ملک الشعرائے عہد محمد قلی قطب شاہ مصنف قطب مشتری

(۱۰۱۸ھ) و سب رس (۱۰۴۵ھ)

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں (مقام) — پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں (وجود)

دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ — انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہے لگ

دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے (سبھی) — کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے (اور)

دکھن ملک بہوتیچ خاصا اہے (بہت ہی) — تلنگانہ اس کا خلاصا اہے

طبعی شاعر عہد ابوالحسن قطب شاہ مصنف بہرام و گل اندام

(۱۰۸۱ھ)

جو کوئی یاد کرتا نہیں اپنا وطن (نہیں) — او مردہ ہے ہے پیرہن اس کا کفن (پیرہن)

اگر کوئی غربت میں شاہی کرے — اگر مال ہور ملک لاکھاں دھرے (اور)

ایس کوں دکھے کھول کر انکھیاں (منھ کو، آنکھیں) — دیوے خاک تن کا وطن کا نشاں

وطن سب کوں دنیا میں پیارا اہے — سفر ہے سو جوں بادبارا اہے

اجنتا

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں
جہاں گھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں

جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں
جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و نظر برسوں

جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

شراب و شعر کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں
بہارِ زندگی غلطاں ہے سبزے کی اداؤں میں

نوائے سرمدی آتی ہے جھرنوں کی صداؤں میں
بیاں ممکن نہیں وہ لطف آتا ہے دعاؤں میں

یہاں صدیوں سے رائج پُرسکوں شیریں مقالی ہے
یہاں کا ذرہ ذرہ مظہرِ شانِ جمالی ہے

در و دیوار پر ہیں نقشِ حسن و عشق کی گھاتیں
پیامِ زندگی دیتی ہیں سب شرمیلی ملاقاتیں

جواں برسات کے دن، جان لیوا چاندنی راتیں
فضا میں ہر قدم پر گونجتی ہیں دلنشیں باتیں

یہاں پیری پہ ہو جاتا ہے دھوکہ نوجوانی کا
سبق دیتا ہے ہر چہرہ حیاتِ جاودانی کا

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقش لاثانی
تصدق جن کے ہر خط پر تجلیٔ شانِ مانی

مشکل ہے شباب و حسن میں تخئیلِ انسانی
تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی

گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

بہانہ مل گیا دستِ جنوں کو حُسن کاری کا — اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصلِ بہاری کا
چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بے قراری کا — سکھایا گُر اسے جذبات کی آئینہ داری کا

دلِ کہسار میں محفوظ اپنی داستاں کر دی
جگرداروں نے بنیادِ جہانِ جاوداں کر دی

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے — ترازو دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی ہے
اداؤں سے عیاں ہے لذتِ دردِ جگر دی ہے — کھلیں گے راز اس ڈر سے دہن پر مہر کر دی ہے

یہ تصویریں بظاہر گو یونہی خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کے بھید کہتی ہیں

کرشمہ ہے یہ سب اہلِ جنوں کی سعیِ پیہم کا — جنھیں احساس تک باقی نہ تھا کچھ شادی و غم کا
دلوں پر عکس کھنچ آیا تھا جن کے حُسنِ عالم کا — قلم کو نقش ازبر ہو گیا تھا اسمِ اعظم کا

چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کر دیں

جہاں چھوڑا خوشی سے عشق کے پیغام کی خاطر — خوشا اہلِ دنیا کی ہنسی کی نام کی خاطر
نہ چھانی خاک در در کی کسی انعام کی خاطر — جیے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر

زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے، نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

سکندر علی وجد

دکن کا قدیم جغرافیہ

دکن سنسکرت زبان میں دکشینا کہلاتا ہے یعنی جنوبی علاقہ یعنی وہ علاقہ جو دریائے نربدا کے جنوب میں واقع ہے۔ سنسکرت اور بعض دوسری کتابوں میں اِس علاقہ کا نام دکشینا پتا بھی ہے یعنی جنوبی علاقہ۔ پراکرت زبان میں اس علاقہ کا نام دکھینا بادھا (DAKKINA BADHA) ہے۔ یونانیوں نے اسے دکھینا باڈس (DAKHINABADES) لکھا۔ فاہیان نے اسے اپنے سفرنامہ میں سنسکرت کی تقلید میں صرف TA - THSIN لکھا جو دکشینا کا مترادف ہے۔

قدیم ہندو جغرافیہ نویس نربدا کے جنوبی حصے کو دکن کہتے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنی فتوحات کے دوران میں دکن کے علاقہ کو صرف کرشنا ہی تک قرار دیا اور حالیہ مورخین بھی دکن سے وہ علاقہ مراد لیتے ہیں جو دریائے نربدا اور کرشنا کے درمیان ہے بعض مورخین دکن کی سرحد کو بالاگھاٹ تک قرار دیتے ہیں اور بعض نے میسور کے شمالی حصہ کو بھی دکن میں شامل کیا ہے۔ جغرافی نقطۂ نظر سے یہہ سرزمین سطح مرتفع دکن کہلاتی ہے کیونکہ یہہ سمندر کی سطح سے تین ہزار سے پانچ ہزار فیٹ تک بلند ہے۔ عام طور پر ریاست حیدرآباد کو دکن کہتے ہیں

دکن کی سرزمین پہاڑی ہونے کی وجہہ سے یہہ قیاس کیا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں کوہ آتش فشاں بکثرت تھے۔ انہی پہاڑیوں کے بعض حصے تیز ہواؤں اور بارش کے عمل سے صدیوں بعد زرخیز اور قابل رہائش ہوئے۔ یہہ علاقہ کوہستانی ہونے کی وجہہ سے یہاں کی آب و ہوا خشک ہے۔ اونچے پہاڑیوں کے نہ ہونے سے بارش کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ اس ملک کو نربدا، تاپتی، گوداوری، کرشنا اور ان کے معاون سیراب کرتے ہیں۔ علاقہ دکن پہاڑی ہونے کے باعث بے حد نشیب و فراز ہے جس کی وجہہ سے دریا اور ندیاں سرعت سے بہتی ہیں۔ ان کا دارومدار کلیتہً بارش پر ہے ان میں برسات میں بار بار طغیانیاں آتی ہیں اور گرما میں یہہ پایاب ہو جاتی ہیں۔ انہی وجوہات کی بناء پر یہہ ندیاں کشتی رانی کے قابل نہیں۔

دکن کے شمال میں بندھیاچل اور ست پڑا پہاڑ ہیں اور اس کے مشرق و مغرب میں مشرقی و مغربی گھاٹ ہیں اور جنوب میں دریائے کرشنا ہے جو جنوبی ہند کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ شمال میں کوہ بندھیاچل دکن کی اس طرح حفاظت کرتا ہے جس طرح ہمالیہ ہندوستان کی۔ علاوہ ازیں اس پہاڑ کے باعث ہندوستان دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ غرض بندھیاچل دو مختلف تمدنوں دو مختلف آب و ہواؤں، زمینوں اور اقوام کو ایک دوسرے سے علحدہ کرتا ہے۔ شمالی پہاڑوں اور دریاؤں کے دشوار گزار راستوں کے باعث دکن کا تمدن بڑی حد تک محفوظ رہا۔ یہاں کے قدیم باشندے دراوڑی اسی باعث خارجی اثرات سے محفوظ رہے۔ یہہ اقوام تقریباً اب تک اپنے قدیم اعتقادات، رسم و رواج، اور عادات و خصائل پر قائم ہیں اسی طرح کرشنا کے حائل ہونے سے انتہائی جنوبی ہند کے تمدن میں بہت زیادہ قدامت ہے اس لئے کہ شمالی ہند کے بہت کم فاتحین نے اس طرف توجہہ کی۔

آریا وسط ایشیا سے افغانستان آئے اور پنجاب سے ہوتے ہوئے دوآب کے علاقے میں آباد ہوئے۔ دریائے سرسوتی اور تھانیسر کا درمیانی علاقہ ان کا مقدس مقام تھا یہیں ان کے عقائد اور مذہبی تصورات کا آغاز ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ بند ھیاچل تک پھیل گئے لیکن دکن کے شمالی پہاڑوں نے ایک عرصہ تک ان کی روک تھام کی جب آریا جنوب میں داخل ہوئے تو پہلے برار کی وادیوں میں سکونت اختیار کی اس کے بعد اور آگے بڑھے۔ رامائن اور مہابھارت میں بھی اس دکھنی سرزمین کا تذکرہ ہے۔ رما سے عقیدت کے باعث شعرائے اِس علاقہ کو جنت نشان بتانے میں کسر اٹھا نہ رکھی۔ آریاؤں کی آمد کے وقت جنوب میں منظم معاشرت اور حکومتیں تھیں۔

دکن کی قدیم ترین وحشی قومیں گونڈ، بھیل، سنتال اور ٹوڈا ہیں۔ جو اب بھی جنگلوں اور پہاڑوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں اب بھی وہی اگلی بربریت ہے جب آریاؤں نے شمالی ہند میں اپنے قدم جمائے تو قدیم باشندوں یعنی دراوڑیوں کو سوائے جنوب کی طرف راہِ فرار اختیار کرنے یا ان کے تابع ہو کر غلام بنے رہنے کے کوئی اور صورت نہ تھی۔ اسی طرح جب دراوڑی جنوبی ہند میں داخل ہوئے تو انھوں نے بھی آریاؤں کی طرح یہاں کے قدیم باشندوں پر جبر و زیادتی کی ہوگی۔ ایک عرصہ بعد آریاؤں نے جنوبی ہند کا رخ کیا جہاں انھیں قدیم حکومتوں سے سابقہ پڑا جن سے انھوں نے ربط و اتحاد قائم کیا۔

دکن کی قدیم تاریخ بالکل تاریک ہے۔ جس طرح ہندوستان قدیم کی کوئی ہم عصر تاریخی تصنیف نہیں اسی طرح قدیم دکن کی بھی لہٰذا دکن کے قدیم خاندانوں کا حال معلوم کرنا بہت مشکل ہے البتہ تاریخ سے متعلق چند پراگندہ اوراق ملتے ہیں جن کا مرتبہ افسانوی ہے اور کچھ مختصر حالات شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ کتبات سے جو چٹانوں اور تانبے کے پتروں پر کندہ ہیں یہاں کی مذہبی اور معاشرتی تحریکات پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی سلسلہ میں ان تحریکات کی سرپرستی کرنے والے حکمرانوں کے واقعات بھی معلوم ہوجاتے ہیں قدیم سکوں سے حکمرانوں کے نام اور ان کے سنین ظاہر ہوتے ہیں جس مقام سے یہ سکے برآمد ہوتے ہیں ان سے حکمرانوں کے حدود سلطنت یا اثرات کا پتہ لگتا ہے۔ پرانوں سے بھی چند بڑے راجاؤں کا حال معلوم ہوتا ہے، سنسکرت ادب کی جن حکمرانوں نے سرپرستی کی ان کے بھی واقعات سنسکرت کی کتابوں میں چیدہ چیدہ ملتے ہیں۔ نیز بعض چینی کتابوں میں صرف مذہبی معاملات کی حد تک ان راجاؤں کے حالات لکھے ہوئے ہیں جنھوں نے جین مت کی حمایت کی لیکن ان میں کوئی ترتیب و تنظیم نہیں، پہلی صدی عیسوی میں بدھ مت جب چین میں مروج ہوا تو بہت سے چینی سیاح بدھ کے مقدس مقامات کی زیارت کرنے کے لئے ہندوستان آئے ان سیاحوں نے جنوب کی بھی سیر کی اور لنکا تک گئے ان کی تحریروں سے بھی دکن کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اشوک کے تیسری صدی ق م کے کتبوں میں دکن کی بعض حکومتوں کا تذکرہ ہے۔ بعض یونانی اور رومی مورخین کے بیانات سے پانچویں یا چھٹی صدی ق م تک کی حکومتوں کے واقعات ظاہر ہوتے ہیں۔ باوجود ان ماخذوں کے دکن کے چند ایسے علاقے رہ جاتے ہیں جن کی قدیم تاریخ کا پتہ لگانے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

دکن میں مختلف اقوام آباد ہیں، جن کی مختلف زبانیں ہیں اور انہی زبانوں کے اعتبار سے یہاں کے علاقے موسوم ہیں۔

بیدر سے اوپر شمال مغربی علاقہ میں مرہٹی زبان بولی جاتی ہے۔ یہ علاقہ مہاراشٹر کہلاتا ہے، اس میں برار کا ایک حصہ، تلگانہ اور کوکن کا علاقہ شامل ہے، تلنگانہ کا علاقہ مہاراشٹر کے مشرق میں ہے اس میں اندھرا اور کلنگ سلطنتیں تھیں یعنی دریائے گوداوری

جنوب میں آندھرا سلطنت اور شمال میں کلنگ، مسلمانوں کے دور میں تلنگانہ کا مرکز ورنگل تھا، کنڑی علاقہ بیدر سے ادھونی تک اور مغرب میں دریائے کرشنا کے منبع تک پھیلا ہوا ہے تلنگانے کے نیچے تامل علاقہ ہے جو راس کماری تک ہے۔

ان علاقوں پر مختلف زمانوں میں مختلف حکمرانوں نے حکومت کی، اشوک کے کتبات اور قدیم پرانوں کے دیکھنے سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ جنوب کے قدیم ترین حکمران پانڈیا، چولا اور چیرا ہیں ان کا تمدن ۲۵۰ ق م سے بھی پہلے کا ہے، یہاں ۲۵۰ ق م میں بدھ مت کی تعلیم و تلقین کے لئے اشوک نے مبلغین بھیجے جنھوں نے یہاں کے باشندوں کو بدھ مت کے فلسفہ کی تعلیم دی اس زمانہ میں دکن ڈنڈاکرانیا (DANDAKARANYA) یا ڈنڈکا (DANDAKA) یعنی صحرائے ڈنڈک کہلاتا تھا۔

آندھرا سلطنت

رامائن میں لکھا ہے کہ گوداوری اور کرشنا کے درمیان اندھرا خاندان حکومت کرتا تھا جس سے یونانی جغرافیہ نویس بھی واقف تھے، قدیم تاریخی ماخذوں کے دیکھنے سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ اندھراؤں کی حکومت تقریباً ۱۸۰ ق م سے شروع ہوئی۔ انھوں نے دھنیا کٹکا (DHANYAKATAKA) کو اپنا مرکز قرار دیا جو دریائے کرشنا پر تھا۔ ان کی سلطنت شمال میں بندھیاچل سے جنوب میں دریائے کرشنا تک، مشرق میں خلیج بنگال سے مغرب میں بحیرۂ عرب تک پھیلی ہوئی تھی۔ پروفیسر بھنڈارکر کا خیال ہے کہ اندھرا خاندان دکن پر ۲۳۰ ق م سے ۲۱۸ء تک برسراقتدار رہا۔ مہاراشٹرا اور تلنگانہ کا تمام علاقہ ان کے تابع تھا۔ وسنٹ اسمتھ کا خیال ہے کہ اندھرا کا پائے تخت سری کاکولم تھا جو دریائے کرشنا پر واقع تھا۔ شائد دھنیا کٹکا کا نام بدل کر سری کاکولم ہوگیا ہو یا بدل گیا ہو۔

اس زمانہ میں گجرات اور بمبئی کے علاقہ میں ستراپوں کی حکومت تھی۔ ستراپ کے معنی صوبہ دار کے ہیں۔ یہہ ایرانی لفظ ہے۔ اندھرا خاندان کے ایک حکمران بل بائے کرنے ۱۲۶ء میں ستراپوں کے علاقہ مہاراشٹر پر قبضہ کیا اسی زمانہ میں مالوہ میں ایک اور ستراپ خاندان حکمران تھا۔ اس خاندان کے ایک راجہ رودرادامن اول نے جس کا پائے تخت اجین تھا اندھرا خاندان کے راجہ سے مہاراشٹر کا علاقہ چھین لیا، جب تلنگانہ کے اندھرا خاندان میں یجن سری یا یجنا سری ۱۷۳ء میں برسراقتدار ہوا (جس کا عہد حکومت ۲۰۲ء تک ہے) تو اس نے مالوہ کے ستراپوں سے جنگ کی اور ان کی سلطنتوں کے بعض صوبے اپنی سلطنت میں شامل کرلئے۔

دکن میں دو آندھرا سلطنتیں تھیں، ایک مشرق میں جس کا پائے تخت دھنیا کٹکا تھا اور دوسری مغرب میں جس کا مرکز پیتھان (PAiTHAN) تھا جو اب پٹن کہلاتا ہے اور صوبہ اورنگ آباد کے ایک تعلقہ کا مستقر ہے، پٹن دریائے گوداوری کے شمالی کنارے پر ہے۔ یہہ پرتستان (PRATiSTHAN) بھی کہلاتا ہے یہہ دکن کا قدیم ترین شہر ہے اشوک نے اپنے مبلغ یہاں بھی بھیجے تھے، بطلیموس (PTOLEMY) کے قول کے مطابق یہہ آندھرا بادشاہ پلومائی (PLUMAYE) دوم کا پائے تخت اور اہم تجارتی مرکز تھا۔ یہہ مشہور آندھرا راجہ سلماہانا (SALMAHANA) کی جائے پیدائش ہے اور اس کا پائے تخت بھی رہا۔ اب بھی یہاں بہت سے منادر اس کی قدیم عظمت کی یادگار ہیں۔ آندھرا خاندان کا کب اور کس طرح خاتمہ ہوا کچھ بھی پتہ نہیں چلتا۔

جب کہ آندھرا سلطنت عروج پر تھی شائد راشٹرا کوٹ سلطنت اس کی باجگزار تھی جس کا علاقہ بندھیاچل کے شمال وجنوب میں تھا' اٹ قوم یا راشٹرا کوٹ سلطنت کے شمال میں گپتا حکومت تھی ان کے علاوہ ایک اور خاندان کدمب پانچویں صدی عیسوی میں مرہٹہ علاقہ میں برسر اقتدار تھا جن کا مرکز ہاسی تھا اس سلطنت میں کنڑا اور میسور کا علاقہ شامل تھا۔

اسی پانچویں صدی عیسوی میں پلوا کو عروج حاصل ہوا اور اس نے آندھرا کے مشرقی پائے تخت اور علاقوں پر قبضہ کیا۔ آندھرا دور میں ملک کی تجارتی حالت بہت اچھی تھی۔ یہاں ایشیا' مصر' روم' یونان' چین اور دوسرے مشرقی مقامات سے سفراء آتے تھے شام میں جنگ میں ہندوستانی ہاتھیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ آندھرا سلطنت کے بعض علاقوں میں رومی سکے بھی دستیاب ہوئے ہیں پروفیسر بھنڈارکر کے قول کے مطابق آندھرا کے خاتمہ کے بعد تین سو سال تک دکن کے حکمران خاندانوں کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

چالوکیا

دکن کی سلطنتوں کے حالات وضاحت کے ساتھ چھٹی صدی عیسوی کے وسط سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس زمانہ میں خاندان چالوکیا حکمران تھا۔ چالوکیا یا سولنکی کا تعلق چاپ قوم سے ہے جو گرجر کی ایک شاخ ہے' گرجر جو شمال مغربی ہندوستان میں زیادہ آباد ہیں ان کا تعلق ہون سے ہے۔ شمالی ہند کے پرہار اور راجپوت قبائل دراصل ان وحشی اقوام کی تبدیل شدہ شکل ہیں جو پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان میں داخل ہوئی تھیں ان میں سے ادنیٰ درجہ کے لوگ گرجر کہلاتے ہیں اور اعلیٰ درجہ کے راجپوت چالوکیا خاندان کا ابتدائی تعلق شمالی ہند کے راجپوتوں سے ہے جو کچھ عرصہ بعد دراوڑیوں میں خلط ملط ہو گئے۔ چالوکیا نقل مقام کر کے راجپوتانہ سے دکن آئے۔ اس خاندان کی بنیاد ایک سردار پلکیسن اول نے ڈالی۔ یعنی ۵۵۰ء میں واتاپی ضلع بیجاپور (موجودہ مقام بادامی) پر قابض ہو کر اس نے ایک چھوٹی سی سلطنت قائم کی اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے پلکیسن نے اشومیدھ کی رسم منائی تھی اس کے دونوں بیٹوں کیرتی وامن اور منگلیس کے عہد میں سلطنت مشرق اور مغرب کی طرف پھیلی۔ کیرتی ورمن اول ۵۶۶ء میں تخت نشین ہوا۔ یہہ زبردست جنگجو تھا۔ ایک کتبہ میں لکھا ہے کہ اس نے جنوب کے تمام قبائل اور اقوام کو تابع کیا۔ مشہور بدھی راہب دھرماگپتا اسی کے عہد میں گزرا ہے جو مذہبی کتابوں کا چینی زبان میں ترجمہ کرتا تھا۔ کیرتی ورمن وشنو کی پوجا کرتا تھا۔ اس نے بادامی میں ایک غاری مندر تعمیر کروایا' منگلیس نے کونکن اور مغربی گھاٹ کا کچھ علاقہ بھی سلطنت میں شامل کیا۔

منگلیس کے بعد کیرتی ورمن کا بیٹا پلکیسن دوم تخت نشین ہوا۔ اس نے ونگی پر قبضہ کیا اور اپنے بھائی وشنو وردھن کو وہاں کا نائب السلطنت بنایا جس کا صدر مقام پشٹپور تھا جو اب ضلع گوداوری میں پتھاپورم کہلاتا ہے۔ ۶۱۵ء میں وشنو وردھن خود مختار ہوا اور خاندان چولا' پانڈیا اور کریل سے جنگ کی پلکیسن دوم نے ۶۲۰ء میں ہرش کو پسپا کیا' ۶۲۵ء تا ۶۲۶ء میں اس نے ایک سفارت ایران کے شہنشاہ خسرو دوم کے پاس روانہ کی جس کا طبری نے تذکرہ کیا ہے اجنٹہ کے غار نمبر ۱ میں استرکاری کی ایک بڑی تصویر میں ایرانی سفیر ہندی راجہ کے آگے کھڑا ہوا ہے۔ اس تصویر سے ایرانی اور ہندی فنون لطیفہ کے اختلاط کی جھلک ظاہر ہوتی ہے۔

۶۴۱ء میں ہیون سانگ چینی سیاح پلکیسن دوم کے دربار میں حاضر ہوا' اس نے اجنٹہ کی تعریف کی ہے۔ اس وقت چالوکیا سلطنت کا

مرکز واتاپی نہ تھا بلکہ ناسک، ہرشش کے مقابلہ میں سہولت پیدا کرنے کے لئے پلکیسن نے ناسک کو موقتی پائے تخت قرار دیا تھا۔ اس نے کونکن کے موریا کو شکست دی۔ راشٹرکوٹ کی طاقت توڑ دی اور کدمب کا بھی خاتمہ کیا اور مشرقی شامل سے بڑھ کر پتھاپورم کے قلعہ پر قبضہ کیا، کلنگ کے راجہ کو زیر کیا جس کا پائے تخت پوری تھا جو اب بھی جگناتھ کے مندر کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ اس نے چولا، پانڈیا اور کریل سلطنتوں پر بھی حملہ کیا۔

جنوبی ہند میں پلوا خاندان بہت طاقتور تھا، اگرچہ مسلسل کوشش کرکے چالوکیا راجاؤں نے ان کی قوت توڑ دی تھی پھر بھی ۶۴۲ء میں کانچی کے پلوا خاندان کے راجہ نرسمہا ورمن نے پلکیسن دوم کو شکست فاش دے دی اور بادامی کو اس بری طرح برباد کیا کہ تیرہ سال تک بادامی پر کسی نے حکومت نہ کی۔ جب ۶۵۵ء میں وکرماجیت اول (پلکیسن دوم کا بیٹا دور حکومت ۶۵۵ء تا ۶۸۰ء) تخت نشین ہوا تو اس نے پلوا سے اپنے باپ کا بدلہ لیا اور شہر کانچی پر قبضہ کیا اس نے چولا کو بھی شکست دی۔ وکرماجیت کے پوتے وجیا دیتا کے راشٹرکوٹ سے اچھے تعلقات تھے جن کی بنا پر راشٹرکوٹ کے اندرا راجا نے چالوکیا شہزادی سے شادی کی جس کے بطن سے دنتی درگا پیدا ہوا جب کیرتی ورمن دوم برسر اقتدار ہوا تو اس کے دور میں دنتی درگا نے بادامی پر قبضہ کیا جس سے مغربی چالوکیا سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ اسی چالوکیا دور میں شاید پلوا کی مخالفت کے سلسلہ میں راجمندری کی بنیاد پڑی اور یہاں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا گیا کیونکہ جنوب والوں کے لئے کرشنا سے ہوتے ہوئے شمال کی طرف جانے کا راستہ یہیں سے گزرتا ہے۔

مغربی چالوکیا کا پائے تخت بادامی ضلع بیجاپور میں ہے۔ یہاں جینوں کا ۶۵۰ء کا ایک غاری مندر ہے۔ اس کے علاوہ تین غار برہمنی اثر کے ہیں۔ ان میں سے ایک ۵۷۹ء کا ہے یہاں دو قلعے ہیں ایک باون بندی اور دوسرا رن منڈل، چھٹی صدی عیسوی میں پلوا نے اس پر قبضہ کیا تھا۔ اس کے بعد چالوکیا اس پر قابض ہوئے ساتویں صدی عیسوی میں مشہور چینی جاتری ہیونسانگ یہاں آیا تھا اس نے لکھا ہے کہ اس کی راجہ (پلکیسن دوم) سے ملاقات ہوئی چھتری ذات کا ہے یہ راجہ وسیع النظر اور بلند حوصلہ ہے اس کے ماتحت وفاداری کے ساتھ اس کی خدمت بجالاتے ہیں اور راجہ کو ان سے خاص ہمدردی ہے۔

یہاں کی زمین زرخیز ہے۔ غلہ خوب اگتا ہے۔ موسم گرم ہے یہاں کے باشندوں کے خصائل سادہ اور دیانت دارانہ ہیں ان کے قد اونچے ہیں اور طبیعت کے غاٹے ہیں اگر ان کی توہین کی جائے تو بری طرح بگڑتے ہیں اور بدلہ لیتے ہیں۔ جنگ میں ڈٹ کر لڑتے اور غنیم کا خوب تعاقب کرتے ہیں لیکن جب کوئی اپنے آپ کو ان کے حوالہ کر دیتا ہے تو وہ اسے ایذا نہیں پہونچاتے۔ جب کسی جنگ میں سردار ہار جاتا ہے تو اسے مارتے نہیں بلکہ اسے زنانی لباس پہناتے ہیں اور اسی طرح اسے زندگی کاٹنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ملک میں بے شمار پہلوان ہیں جو اکثر کشتی لڑتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ خوب پیتے اور لڑتے ہیں۔ اگر وہ کسی کو سڑک پر مار دیں تو قانوناً انھیں گرفتار نہیں کیا جاتا۔ یہاں ہاتھیوں کو بھی خوب پلایا جاتا ہے اپنے پہلوانوں اور جنگی ہاتھیوں پر راجہ کو فخر ہے۔

واتاپی کے حکمرانوں کے دور میں بدھ مذہب آبادی کے ایک بڑے حصے میں رائج تھا جس کا ہیون سانگ نے ذکر کیا ہے۔ اس وقت یہاں بدھ مت کے بہت سے مناد اور خانقاہیں تھیں، لیکن بدھ مت کو زوال ہو رہا تھا۔ کیونکہ برہمنی مذہب کے اثرات بڑھ رہے تھے

چنانچہ خود راجہ پلکیسن اول نے اشومیدھ کی رسم منائی، برہمنی مت کی ترقی کے ساتھ ان کے منادر بھی چوطرف بننے لگے اور پران کے دیوتاؤں برہما، وشنو اور شیوا وغیرہ کی پوجا ہونے لگی، بادامی غاری مندر میں منگلیس کے عہد میں وشنو کی پوجا ہوتی تھی جو اس کا تعمیر کرایا ہوا تھا ان مختلف مذاہب کا سلطنت میں پایا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ چالوکیا راجہ تمام مذاہب کے ساتھ رواداری برتتے تھے۔
باوجود اس کے بدھ مت بتدریج برہمنی مذہب اور جین مت کے مقابلہ میں معدوم ہوگیا۔ ہندو خاص طور پر قربانی کی طرف توجہہ کرنے لگے۔ اس زمانہ میں بدھ اور جین مت والوں سے ہندوؤں نے غاروں میں مندر تراشنے کا فن سیکھا۔ مرہٹوں کے علاقہ کے جنوبی حصے میں عام طور پر جین مذہب مقبول تھا، آٹھویں صدی عیسوی میں زرتشتی مذہب بھی ہندوستان میں رائج ہوا۔ خراسان کے جلاوطن پارسی ۷۳۵ء میں پہلی دفعہ احاطہ بمبئی کے ضلع تھانہ میں بمقام سنجان آباد ہوئے' پلکیسن دوم اور وکرماجیتا دوم نے جینوں کی مدد کی اور ان کے منادر تعمیر کروائے، ۶۷۸ء میں یہاں مشہور قواعد کا عالم (PUUYAPADA) تھا، جو بیان ہو چکا ہے کہ سلطنت زیادہ وسیع ہو جانے سے انتظامات کی خاطر پلکیسن دوم نے وینگی پر اپنے بھائی وشنو وردھن کا تقرر کیا جس نے کچھ عرصہ بعد اپنی علٰحدہ حکومت قائم کرلی اور اس طرح دو چالوکیا خاندان ہوگئے مغربی چالوکیا کا مرکز بادامی تھا اور مشرقی کا وینگی۔ وینگی گوداوری اور کرشنا کے دہانوں کے قریب ہے۔ بدھ مت کا زبردست دشمن اور ذی اثر شخص شنکر اچاریہ اور مشہور عالم (AKALANKA) اسی زمانہ کے ہیں آٹھویں صدی میں کلنگ اور مشرقی دکن پر مشرقی چالوکیا اور دکن کے وسطی اور مغربی حصہ پر راشٹرکوٹ حکمران تھے۔ دسویں صدی کے اختتام پر راشٹرکوٹ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئے جس کے باعث مغربی چالوکیا کا دوسرا دور شروع ہوا جو مغربی چالوکیا خاندان کی رجعت کہلایا جاسکتا ہے۔ تیلا دوم نے ۹۷۳ء میں راشٹرکوٹ کے آخری راجہ کک دوم کو شکست دی اور نئے مغربی چالوکیا خاندان کی بناء ڈالی، اس نے راشٹرکوٹ شہزادی سے شادی کی اس کا عہد حکومت ۹۷۳ء سے ۹۹۶ء تک ہے، اس کے دور میں سلطنت بلاری اور میسور کے بعض بعض حصص تک پھیل گئی تھی۔

اسی زمانہ میں چولا حکمران راجا راجہ نے وینگی پر قبضہ کیا اور چالوکیا خاندان کے ایک لڑکے کو تخت نشین کرکے واپس ہوا اس راجہ نے جس کا نام دی مالا دیتا ہے راجا راجہ کی لڑکی سے شادی کی اس کی اولاد نے مشرقی چالوکیا اور چولا سلطنت پر حکومت کی بالآخر مشرقی چالوکیا حکومت کا ۱۰۷۰ء میں خاتمہ ہوگیا جس سے مغربی چالوکیا کا اقتدار بہت بڑھ گیا اور وہ تمام دکن پر حاوی ہوگئے۔ ۱۰۴۲ء میں مغربی چالوکیا خاندان میں سومیسورا اول تخت نشین ہوا تھا جس نے کلیانی کو دارالسلطنت قرار دیا جس کے باعث یہ چالوکیاں کلیانی کہلاتے ہیں۔ کلیانی ممالک محروسہ سرکار عالی میں ہے۔ اس خاندان نے بھی قدیم چالوکیا کی طرح دو سو برس حکومت کی سمیسورا اول نے چولا کے راجا راجہ کو شکست دی' دھارا (مالوہ کے علاقہ میں ہے) اور جنوبی کانچی پر حملہ کیا اور ان دونوں کو فتح کیا۔

۱۰۷۶ء میں وکرماجیت اول یا بکرمانک تخت نشین ہوا۔ اس نے کانچی فتح کیا اور دوار ہسمدرا کے خاندان ہوسل سے سخت جنگ کی دوارا سمدرا کو دواراوتی پور بھی کہتے تھے مسلمان مورخین نے اسے دوارا سمندر لکھا اس کے کھنڈر ضلع حسن میسور میں موجود ہیں اس نے اپنے نام سے ایک سنہ جاری کیا جو کبھی مقبول نہ ہوا' وکرماجیت نے وشنو کا ایک بڑا مندر تعمیر کروایا اور اس کے آگے ایک تالاب بنوایا اور اس کے قریب ایک شہر آباد کیا جو وکرماپورا کہلاتا تھا' اس کے عہد میں رعایا خوش حال تھی۔ کشمیری پنڈت

(BILHANA) کے قول کے مطابق ملک میں چو طرف امن تھا۔ کہیں چوروں کا خوف نہ تھا جو اچھے انتظام کی دلیل ہے۔ علاوہ اس کے بادشاہ نیک منش، فیاض اور ہمدرد تھا اس نے علم کی خوب سرپرستی کی، یہہ کلیانی کا بڑا راجہ تھا جس کے عہد میں سلطنت انتہائی عروج کو پہونچی، اور بقول بلہانا، کلیان ہر اعتبار سے عدیم المثال تھا، یہی مشہور قانون داں وجنانیسور کا وطن ہے جس کی تصنیف متاکشرا ہندو قانون کی سب سے زیادہ مستند کتاب ہے۔ کلیانی احاطہ بمبئی کے ضلع تھانہ میں ہے۔ (PRIPLUS) کے قول کے مطابق کلیانی کی اہمیت دوسری صدی عیسوی سے شروع ہوئی، یہہ شہر تجارت کے اعتبار سے مشہور تھا، بڑے بڑے تجار یہاں آتے تھے شائد یہہ شہر ۵۳ء میں آباد ہوا یہاں پیتل اور شیشم کا کام اچھا ہوتا تھا اور کپڑے بھی اچھے بنتے تھے، چودھویں صدی میں مسلمان حکمرانوں نے اس کا نام اسلام آباد رکھا۔

وکرماجیت کے مرنے کے بعد چالوکیان کلیانی کو زوال شروع ہوا، راجہ تیل سوم کے عہد میں سپہ سالار افواج بجّل یا وجّالا یا بجّالا نے بغاوت کی اور تمام سلطنت پر قابض ہوگیا ۱۱۶۲ء سے ۱۱۸۳ء تک بجل اور اس کے جانشینوں نے حکومت کی جس کے بعد خاندان چالوکیا کے ایک شہزادہ سمیسور چہارم نے بجل کے جانشینوں سے ملک کا بہت بڑا حصہ حاصل کیا لیکن یادوا خاندان دیوگری اور ہوسل خاندان دوارا سمدرا کے عروج کے باعث اس کا اقتدار جاتا رہا یعنی ۱۱۹۰ء میں کلیان سلطنت کا خاتمہ ہوا۔

بجل کے عہد میں ایک مذہبی انقلاب ہوا جس سے شیو کے مذہب نے دوبارہ زندگی پائی اور ایک نیا فرقہ قائم ہوا جس کا نام ویراسیوس یا لنگایت ہے جو اب تک موجود ہے۔ بجل مذہباً جین تھا، اس کے متعلق یہہ مشہور ہے کہ اس نے فرقہ لنگایت کے دو پرہیزگاروں کو بلا وجہ اندھا کیا تھا جس کے بدلہ سرپرست مذہب لنگایت بسوا (BASAVA) کے اشارہ ۱۱۶۷ء میں راجہ کو قتل کیا گیا اس مذہب کے ماننے والے عام طور پر کنڑی علاقوں میں آباد ہیں۔

وکرماجیت کے عہد میں تاجروں نے بدھ مذہب کے لئے خانقاہیں تعمیر کروائیں اور ان کے اخراجات کے لئے رقمیں اور زمینیں فراہم کیں اس زمانہ میں جین مت کو تفوق حاصل نہ تھا، لنگایت فرقہ کے نکلنے کے بعد تو جین مت کا اثر اور بھی زائل ہوگیا، لنگایت مذہب زیادہ تر تجار میں پھیلا جو پہلے جین مت کے طرفدار تھے۔ لنگایت لنگ کو حیات کا مبداء سمجھتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ یہہ ویدوں، تناسخ بچپن کی شادی کے مخالف ہیں۔ یہہ بالکل حقیقت ہے کہ ان کے مذہب کا بانی بسوا برہمن تھا لیکن انھیں برہمنوں سے سخت نفرت ہے اس مذہب کے جاری ہونے سے نہ صرف بدھ مت جنوب سے ناپید ہوا بلکہ جین مت کو بھی زوال شروع ہوا۔

راشٹراکوٹ

۷۵۳ء تا ۹۷۳ء

راشٹراکوٹ یا دونسل کے نعمے راجہ (RATTA) کے ایک بیٹے کا نام راشٹراکوٹا تھا جس کے نام سے یہہ خاندان مشہور ہوا۔ آٹھویں صدی کے درمیان میں دنتی درگا نامی ایک سردار نے جو راشٹراکوٹ خاندان سے تعلق رکھتا تھا خاندان چالوکیا کے راجہ وکرماجیت دوم کے بیٹے کیرتی ورمن دوم کو شکست دی اور راشٹراکوٹ سلطنت قائم کی۔ جب عوام اس کی طرف سے بدظن ہوئے تو اس کے چچا کرشنا اول نے

اسے تخت سے اتار دیا اور خود راجہ بنا، بعض کتبوں سے یہہ معلوم ہوتا ہے کہ دنتی درگاہ لاولد تھا شائد اس کے مرنے کے بعد کسی اور وارث تخت کو ہٹا کر کرشنا تخت نشین ہوا، دنتی درگا کو تخت سے علحدہ کرنا اس لئے ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت طاقتور حکمران تھا۔

کرشنا اول کے عہد میں ایلورا کا مشہور کیلاس کا مندر تعمیر ہوا۔ یہہ مندر ایک چٹان میں ترا شا گیا ہے جو فن تعمیر کے اعتبار سے غیر معمولی ہے۔ اسی خاندان کے ایک حکمران گوبند سوم نے ۷۹۳ء تا ۸۱۵ء سلطنت کو شمال میں بندھیا چل اور مالوا اور جنوب میں کانچی تک وسعت دی اور اپنے بھائی اندراج کو جنوبی گجرات میں نائب السلطنت مقرر کیا، اس کے بعد اموگھورش تخت نشین ہوا۔ (۸۱۵ء تا ۸۷۷ء) اس نے زیادہ تر ونگی کے مشرقی چالوکیا راجاؤں سے جنگ کی۔ اس نے اپنا دارالسلطنت ناسک سے مانیا کھیت بدل دیا اسی شہر کو عرب مورخین نے مانکیر لکھا ہے، اب یہہ مالکھیڈ یا ملکھیڈ کے نام سے ریاست نظام میں ہے، یہہ اس زمانہ کا بہت مشہور اور بارونق شہر تھا، اموگھورش کے جانشین کرشنا دوم نے جینیوں کے ننگے فرقے دگمبر کی بہت سرپرستی کی۔ جن سین، گنبھدرا اور دوسرے علما کی توجہ کے باعث اس فرقہ کو بہت تقویت حاصل ہوی جس کی بدولت بدھ مت کے اثرات دکن سے رفتہ رفتہ زائل ہوتے گئے، اور بارھویں صدی تک یہہ مذہب دکن سے معدوم ہوگیا۔

اسی خاندان کا ایک راجہ اندر سوم نے قنوج پر کامیاب حملہ کیا، اور ۹۴۹ء میں چول خاندان کے راجہ دت پر فوج کشی کی اس زمانہ میں ہندوؤں اور بدھ مت والوں میں زبردست رقابت تھی، راشٹر کوٹوں کے ابتدائی دور میں برہمن وید کی تعلیم کے مطابق خوب قربانی کرتے تھے، اس زمانہ میں جین مت کو بھی فروغ حاصل ہوا، راشٹراکوٹوں کی علمی سرپرستی کے باعث ان کے دربار میں شعرا کا اجتماع ہوا

آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں یعنی ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کی فتح سے سندھ پر اسلامی سیاسی اثرات غالب آئے، راشٹراکوٹ خاندان کے ان عرب حملہ آوروں سے دوستانہ تعلقات تھے اور گرجروں سے مخالفت تھی، گرجروں نے عربوں سے اچھے تعلقات نہ رکھے جس کے باعث انھیں نقصان پہونچا، اس سے بچنے کے لئے راشٹراکوٹوں نے ان نووارد حملہ آوروں سے اتحاد کرلیا تھا، جس کے باعث مسلمان سوداگر اور سیاح مغربی علاقوں میں بہ آسانی تجارت کرتے تھے اور بہت سے مغربی ساحل پر آباد ہوے، ان مسلمان تاجروں اور سیاحوں نے اپنے سیاحت نامے لکھے جن میں یہہ راشٹراکوٹ راجاؤں کو بَل ہَرا لکھتے ہیں جس کے معنی ہندوستان کا سب سے بڑا راجہ ہیں، انھیں بل ہرا اِس لئے لکھتے ہیں کہ یہہ خود کو ولبھ کہتے تھے۔ اور یہہ لفظ رائے کے ساتھ مل کر بلہرا ہوگیا، چالوکیا راجہ بھی ولبھ اپنے نام کے ساتھ لکھتے تھے، شائد انہی سے یہہ طرز راشٹراکوٹوں نے اختیار کی، ولبھ رائے یا بلہا رائے مقامی استعمال سے بلہرائے ہوا اور عربوں نے اسے بلہرا لکھا۔

راشٹراکوٹ راجاؤں کی مسلمان سیاحوں نے بہت تعریف کی، ان کے عہد کا کیلاس کا مندر دنیا کے عجائبات میں ہے۔ ان راجاؤں نے سنسکرت ادب کی سرپرستی کی اور بہت سے مندر شاہی مصارف سے تعمیر کروائے۔

ان تمام سلطنتوں میں چالوکیا سلطنت زیادہ عرصہ تک باقی رہی یہہ ایسے زمانہ میں یعنی ۱۱۹۰ء میں ٹوٹی جب کہ تمام ہندوستان کی سیاسی حالت بدل رہی تھی کیونکہ اسی سنہ میں مسلمانوں نے شہاب الدین غوری کے تحت ہندوستان پر حملے کئے اور یہاں اپنی

حکومت قائم کی جو صدیوں تک برقرار رہی، جغرافی اعتبار سے چالوکیا جیسی وسیع سلطنت میں مختلف زبانوں کے علاقے تھے جو فطرتاً زبانوں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے علحدہ ہوکر اپنی علحدہ حکومتوں کے علم بردار ہوگئے، مرہٹواڑی کے علاقہ میں یادوا سلطنت قائم ہوئی جس کا پائے تخت دیوگیر موجودہ دولت آباد تھا آندھرا یعنی تلنگانہ میں گیتیا سلطنت جس کا مرکز ورنگل تھا، تیسرے کنڑی علاقہ میں ہوسلیا خاندان برسر اقتدار تھا جس کا پائے تخت دوارا سمدرا تھا۔

گیتیا خاندان ۱۱۰۰ء کے بعد نمایاں ہوا اس کے طاقتور راجہ پرتاپا ردرا اور گنپتی تھے، اس خاندان نے مسلمانوں کے حملہ تک اچھی طرح حکومت کی، یادوا خاندان کے راجہ خود کو سری کرشنا کی نسل سے سمجھتے تھے۔ یہ لوگ جنوب میں ہوسلیا حکومت سے برسرپیکار تھے اور شمال میں گجرات تک اپنی سلطنت کو وسعت دی، ان کا بڑا حکمران سنگھانا (۱۲۱۰ء تا ۱۲۴۷ء) تھا، اس خاندان نے سنسکرت کی سرپرستی کی علاء الدین خلجی (۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء) نے اپنے آخری دورِ حکومت میں نہ صرف دکن بلکہ تمام جنوبی ہند کو مستقل طور پر حکومت دہلی کے تابع کیا، لیکن اس کے انتقال کے بعد مرکزی حکومت کی کمزوریوں سے جنوب کے حکمرانوں نے فائدہ اٹھایا، جب محمد تغلق (۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء) برسر اقتدار ہوا تو اس نے ۱۳۲۶ء میں دیوگڑھی کا نام دولت آباد قرار دے کر اسے اپنا پائے تخت بنایا لیکن فوراً ہی بعض اسباب کی بنا پر اپنے ارادہ سے باز آیا مگر جنوب کو اپنے قابو سے نکلنے نہ دیا اور ورنگل پر فوج کشی کرکے اس کا نام سلطان پور رکھا محمدؐ تغلق کے آخری عہد میں گجرات اور دکن کے امرا نے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی، چنانچہ موقع پاکر انھوں نے ۱۳۴۶ء میں حسن گنگو بہمنی کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا جس نے دکن میں ایک طاقتور حکومت قائم کی جو بہمنی سلطنت کہلاتی ہے جس کا دارالسلطنت گلبرگہ تھا۔

دکن کی قدیم تاریخ کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شمالی ہند اور دکن اکثر ایک دوسرے کے مرہونِ منت رہے چنانچہ آندھرا سلطنت جو موریا کی ہم عصر تھی، اس کے ایک فرد نے اشوک کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد مگدھ پر حکومت کی اور یہ مگدھ کا آندھرا خاندان کہلاتا ہے حملوں کے سلسلہ میں بھی دکن کے حکمرانوں کو بعض دفعہ تفوق حاصل رہا یعنی پلی کیسن دوم نے ہرش کو شکست دی اور اندر سوم نے قنوج پر کامیاب حملہ کیا، قدیم دکن کی تہذیب و تمدن اور سیاسی حالات کا پتہ لگانا اس لئے مشکل ہے کہ اس خطہ میں سنہ عیسوی سے بھی صدیوں پہلے سے حکومتیں قائم تھیں جن کی کوئی مفصل سند نہیں ملتی نیز یہ سرزمین مختلف اقوام کی آماجگاہ ہے کیونکہ یہ خطہ شمالی و جنوبی ہند کے درمیان واقع ہے۔ علاوہ ازیں اپنی قدرتی خوبیوں کے باعث بھی یہ ہمیشہ سے دلکش اور جاذب نظر رہا۔

سید سراج الدین

اِس **مرقع دکن** کی طرح ادارۂ ادبیات اُردو نے دکن کے مشہور ریختہ شاعروں کے حالات اور کلام کے نمونے مرقع سخن میں شائع کئے ہیں جو دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اِس **مرقع سخن** میں دکن کے شاعروں اور ان کے مربیوں کی سو سے زیادہ تصویریں اور آٹھ سو کے قریب صفحات ہیں دونوں جلدیں مجلد ہیں اور نہایت نفیس گردپوش میں لپٹی ہوئی کاغذ اور کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ ہے۔ دکن میں اِس شان کی کتابیں کم شائع ہوئی ہیں ہر جلد کی قیمت صرف صہ روپے ہے۔ پہلی جلد کے تو صرف چند ہی نسخے باقی رہ گئے ہیں، جو اصحاب اس **مرقع دکن** کو پسند کریں گے **مرقع سخن** کو دیکھ کر اس سے زیادہ خوش ہوں گے۔

دفتر سب رس۔ رفعت منزل خیریت آباد سے طلب فرمائیں۔

نقوشِ اجنٹہ

نگاہ عشق سے دعوئی ہوی ہیں تصویریں ‏ ‏ چمک رہی ہیں یہاں آرزو کی تقدیریں
پگھل گئے ہیں کہیں صاف ہوگئے ہیں کہیں ‏ ‏ وہ سختیٔ دلِ ناکام، پتھروں میں نہیں
یہہ حسن وعشق کی پوجا کے کارنامے ہیں ‏ ‏ یہہ رنگ ونور کے دردآشنا فسانے ہیں
دکن کی خاک میں ہے بدھ کی زندگی خاموش ‏ ‏ دکن کی خاک میں اندر کے ہے پریم کا جوش
نقوشِ حسن کو خونِ جگر سے دھوتے ہیں ‏ ‏ یہہ پتھروں میں نہیں، بزمِ دل میں سوتے ہیں
ہے دیوتاؤں کی تعبیرِ زندگی میں حُسن ‏ ‏ ہے پارساؤں کی تصویرِ زندگی میں حُسن
چمک ہے روح کی، رنگوں کی راجدھانی میں ‏ ‏ لچک ہے عشق کی، پتھر کی سخت جانی میں
نظر نواز بنا، اور جانگداز بنا ! ‏ ‏ زمینِ شوق کا ہر ذرہ عشق باز بنا
زمیں پہ رفعتِ جاں، خودنمائی کرتی ہے ‏ ‏ وہ دیکھ بزمِ تصور، خدائی کرتی ہے!

باقیؔ

خواتین دکن نمبر

اِس مرقع دکن کے ساتھ اس کا ایک **ضمیمۂ خواتین** علحدہ کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے جس میں دکن کی بیش انشاء پرداز خاتونوں کے نہایت دلچسپ اور مفید مضمون اور نظمیں شامل ہیں، یہہ اصل میں اسی دکن نمبر کا حصہ ہے جو صنف لطیف کے رشحات قلم پر مشتمل ہے ۔ اور ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبۂ نسوان کی طرف سے اس کی سرگرم معتمد محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ کے پُرخلوص مساعی کی وجہہ سے نہایت خوبی، نفاست اور لطافت کے ساتھ مرتب اور شائع ہو رہا ہے ۔ اس کی عام قیمت عہ رکھی گئی ہے. لیکن صرف سب رس کے خریداروں کو ختم فروری تک نصف قیمت پر محض اس وجہہ سے دیا جائیگا کہ یہہ سب رس ہی کا ایک حصہ ہے ۔ اس خواتین دکن نمبر کے بعض مضمون نگاروں کے نام یہہ ہیں :-

رالعہ بیگم صاحبہ (زنانہ کالج)	فاطمہ بیگم صاحبہ اداؔ	تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ	قمرالنساء بیگم صاحبہ
کبریٰ اقبال عبدالروف	زبیدہ ضیاء الدین انصاری	بشیرالنساء بیگم صاحبہ بشیرؔ	رالعہ بیگم صاحبہ (معلمہ محبوبیہ اسکول)
افسرالنساء بیگم صاحبہ	ممتاز جہاں بیگم صاحبہ صوفی	صفیہ صدیق فریدہ بیگم صاحبہ	جہاں بانو بیگم صاحبہ بی، اے
لطیف النساء بیگم صاحبہ بی، اے	ذاکرہ بنت فضل اللہ احمد صاحب	تسنیم ربانی بی، اے	مسز صوفی ام، اے ۔

دکن کی اسلامی فتوحات

"دورِ وسطیٰ میں دکن اور شمالی ہند کے تعلقات" (سنہ ۱۲۹۴ء تا سنہ ۱۳۵۱ء)

سنہ ۱۲۰۶ء میں جب دہلی کی اسلامی سلطنت قائم ہوئی تو اس کے حدود زیادہ وسیع نہ تھے۔ بنگال، گجرات، مالوہ، قنوج، اجمیر اور دوآبہ کے کچھ حصے اس میں شامل تھے۔ سنہ ۱۲۹۴ء تک اس کو بنگال سے سندھ اور جنوب میں دریائے نربدا تک وسیع کیا گیا۔ جب دہلی کی حکومت خلجی خاندان کے ہاتھ آئی تو جلال الدین خلجی کے پیش نظر کسی قسم کا فتوحاتی یا تعمیری کام باقی نہ رہا۔ علاء الدین خلجی صوبہ دار کڑہ شاہی فوجوں کے ہمراہ مالوہ کے قریب بھیلسہ کی فتح میں مصروف تھا یہاں اس کو دکن کی مہاراشٹرا سلطنت کے حالات معلوم ہوئے جس کا مرکز دیوگڑھی تھا۔ یہ سلطنت کوہ ست پڑا کے جنوب میں واقع تھی۔ چونکہ یہ علاقہ نامعلوم واقع ہوا تھا اور اس کے پیش نظر سلطنت دہلی پر قبضہ کرنے کا منصوبہ پہلے ہی سے تھا اس لئے اس نے بغیر سلطان کی اجازت کے آٹھ ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ دیوگڑھی کا رُخ کیا۔

یوں تو جنوبی ہند کے ساحلوں پر مسلمان عرب تاجروں نے آباد ہو کر اسلامی آبادکاری کی بنیاد ڈال دی تھی لیکن فرشتہ اور شہریار کی تحریروں کے بموجب ان تاجروں نے کوئی سیاسی حیثیت حاصل نہ کی۔ بلکہ وہ دوسرے فرقوں کی طرح آباد ہوئے۔ ان عرب تاجروں کے ہمراہ بعض بزرگ، فقیر اور درویش بھی آئے جن میں باباطاہر، خواجہ خضر اور شیخ عبداللہ خفیف بھی تھے۔ ان بزرگوں نے سماجی اتحاد میں نمایاں حصہ لیا جس سے مخلوط تہذیب و تمدن کا وجود ہوا۔ انسانی برادری اور وحدت کا پیام سرزمین دکن پر بالکل نئے اصول سے پیش کیا گیا جو آگے چل کر شمالی ہند پر بھی پھیلا اور ہندلسانی تشکیل کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

علاء الدین کے حملے کے وقت دکن میں تین خودمختار سلطنتیں تھیں۔ سنہ ۱۱۹۰ء میں جب چالوکیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا تو مہاراشٹرا، تلنگانہ اور کرناٹک کے صوبے خودمختار ہو گئے۔ مہاراشٹرا کا پایۂ تخت دیوگڑھی تھا جہاں یادو خاندان کا راجہ رام دیو حکمراں تھا۔ تلنگانہ کے مرکز ورنگل پر کاکتیا خاندان کی ایک عورت رودرما دیوی اپنے پوتے کی کمسنی کی وجہ سے حکمراں تھی۔ کرناٹک کے مرکز دوارا وتی پور پر ہوئسال خاندان کا راجہ بیر بلال حکمران تھا۔ یہ سلطنتیں بہت متمول تھیں کیونکہ ان کے حدود میں سونے، چاندی اور جواہرات کی کانیں تھیں اور اس کے علاوہ گھوڑے ہاتھی کافی تعداد میں موجود تھے۔

علاء الدین خلجی کی روانگی سے قبل بعض صوفی اور فقیر منش بزرگ دکن کی طرف روانہ ہو چکے تھے جن میں سے بعض تو راستہ کی گھاٹیوں پر آباد ہو گئے اور بعض آگے بڑھتے چلے گئے۔ ان لوگوں سے علاء الدین کو راستہ معلوم کرنے میں بڑی مدد ملی۔ دولت کی ہوس اور اپنے منصوبوں کو کامیاب بنانے کی کوشش میں اس نے راستہ کی مشکلات کا مطلق خیال نہ کیا۔ اس کی فوج بالاگھاٹ سے ہوتی ہوئی ایلچپور پہونچی جو مہاراشٹرا سلطنت کی فوجی چھاؤنی تھی یہاں معمولی جھڑپ ہوئی اور ایلچپور پر قبضہ کر لیا گیا جو دکن کا باب الداخلہ ہے۔ یہاں اس نے ٹھیر کر معلومات حاصل کیں۔ اس کے بعد آگے بڑھ کر دیوگڑھی (دولت آباد) کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

راجہ رام دیو قلعہ بند ہو گیا۔ اس زمانہ میں اس کا بیٹا شنکر دیو کسی جاترا میں گیا ہوا تھا۔ راجہ نے اس اچانک حملے سے پریشان ہو کر صلح نامہ پیش کیا۔ اس صلح نامہ میں فرشتہ کے بیان کے بموجب علاء الدین کو چھ سو من سونا، سات من موتی، دو من جواہرات اور ہزار من چاندی اور اس کے علاوہ ریشمی تھان، گھوڑے، ہاتھی وغیرہ ہاتھ آئے۔ سالانہ خراج کا وعدہ لے کر یہ واپس ہو رہا تھا کہ شنکر دیو آگیا اور اس نے علاء الدین کی فوج پر حملہ کر دیا۔ لیکن اس پر بھی علاء الدین کو کامیابی ہوئی اور اس نے نئے صلح نامہ کی رُو سے دوگنا تاوان حاصل کیا۔ ایلچپور پر اس نے مستقل قبضہ رکھنا ضروری سمجھا کیونکہ اس کو آئندہ بھی دکن سے تعلقات قائم رکھنے تھے۔ یہ واپس ہو گیا لیکن بعض صوفی اور درویش ایلچپور اور اطراف واکناف کی

پہاڑیوں پر آباد ہوگئے۔ یہی سب سے پہلی دکن کی اسلامی آبادکاری کی ابتدا ہے۔ علاءالدین کا یہ حملہ محض اتفاقی اور اپنے سیاسی منصوبوں کی تکمیل کے سلسلہ میں دولت کے حصول کی خاطر ہوا۔ دکن پر براہ راست حکومت کرنے کا کوئی خیال علاءالدین کے دماغ میں نہ تھا۔ اس حملے کے بعد دکن کا راستہ شمالی ہند کی طاقتوں کے لئے کھل گیا اور ساتھ ہی ساتھ دکن کے سیاسی حالات پر بھی اس کا اثر پڑا۔

علاءالدین خلجی کو دکن میں وہی درجہ حاصل ہے جو محمود غزنوی کو تاریخ ہند میں۔ جس طرح محمود نے ہندوستان کی دولت سے اپنی سلطنت کو مستحکم اور مالا مال کرلیا اسی طرح علاءالدین نے دکن کی دولت سے سلطنت دہلی کو حاصل کیا اور بادشاہ بننے کے بعد اسی دولت سے اپنے مخالفین کے منہ بند کردیے۔ اور وہ قوت حاصل کی جو آج بیسویں صدی میں آمرون کو حاصل ہے۔

دکن پر دوسرا حملہ ۱۳۰۶ء میں ہوا کیونکہ دیوگڑی کے راجہ نے خراج ادا کرنا روک دیا تھا۔ علاءالدین اس دوران میں سلطنت کے کاروبار اور فتوحات میں مصروف رہا اور دکن کی طرف سے کسی قدر غافل بھی ہوگیا جس سے فائدہ اٹھاکر رام دیو نے تین سال تک مسلسل خراج ادا نہ کیا۔ سلطنت دہلی کی جانب سے ملک کافور کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی گئی لیکن راجہ نے بغیر مقابلہ کئے اطاعت قبول کرلی اور دہلی جاکر ایک ماہ تک شاہی مہمان رہا۔ دربار سے اس کو رائے رایاں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا اور سرخ چتر لگانے کی اجازت دی گئی۔ گجرات کا ضلع نیسری بھی اس کی عملداری میں دے دیا گیا۔ اس طرح دیوگڑی پر پورا سیاسی اقتدار حاصل ہوگیا۔

۱۳۰۹ء میں تلنگانہ کے مرکز ورنگل پر حملہ کیا گیا۔ اس حملہ سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ سلطنت دہلی کے پیش نظر دکن پر حملہ کرنے کا ایک خاکہ موجود تھا۔ ملک کافور کی ماتحتی میں شاہی فوجیں ورنگل کی طرف روانہ ہوئیں۔ ضیاءالدین برنی نے لکھا ہے کہ علاءالدین نے ملک کافور کو یہ حکم دیا تھا کہ ورنگل پر قبضہ کرنے کے بجائے دولت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ شاہی فوجیں الچپور، قندھار، دیوگڑی سے ہوتی ہوی ورنگل پہونچیں۔ راستہ میں دیوگری کے راجہ کی جانب سے شاہی فوج کیلئے ضروری انتظامات کردیے گئے تھے۔ ہنمکنڈہ پر قبضہ کرکے قلعہ کا محاصرہ کرلیا گیا۔ قلعہ بہت مضبوط اور مستحکم تھا۔ تھوڑے دنوں کے اندر ہی راجہ رُدر دیو نے صلح کرلی اور سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا اور نذرانہ و تاوان کے سلسلہ میں کثیر مقدار سونا، چاندی اور زر و جواہرات پیش کیا جو ایک ہزار اونٹوں پر لادا گیا۔ ہاتھی اور گھوڑوں کی ایک کثیر تعداد بھی ہاتھ آئی۔ پروفیسر کرشنا سوامی اینگار نے امیر خسرو اور برنی کے بیانات کا حوالہ دیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ورنگل کی پوری دولت ملک کافور کے ہاتھ آگئی تھی۔ اس طرح دکن کی دو متمول سلطنتوں پر سیاسی اقتدار قائم ہوگیا۔ اب صرف جنوب ہند میں دو اور سلطنتیں باقی رہ گئی تھیں۔ ایک دوارسمدرا کی ہوسیلا سلطنت اور دوسری سلطنت پانڈیہ جو مالابار میں واقع تھی۔

ملک کافور نے ورنگل کی فتح کے وقت ہی جنوبی سلطنتوں کے حالات معلوم کرلیے تھے۔ دہلی پہونچنے کے بعد اس نے سلطان سے مالابار پر حملہ کی اجازت لے لی چنانچہ ۱۳۱۰ء میں ایک بڑی فوج کے ساتھ مالابار کی طرف روانہ ہوا۔ اس حملہ کو امیر خسرو نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے کیونکہ وہ خود اس میں ہمراہ تھے۔ دکن کی پہاڑیوں اور دشوارگذار راستوں کا حال بہت ہی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ راستہ میں رام دیو نے رسد کا انتظام کردیا تھا۔ اور کچھ فوجی ہاتھی بھی پیش کئے۔ نربدا، تاپتی کے علاوہ اس فوج کو تین اور دریا، گوداوری، سینی اور بھیما عبور کرنے پڑے۔ باندری کے مقام پر ملک کافور ٹھیر گیا تاکہ مالابار سلطنت کے حالات معلوم کرے۔ اس وقت سلطنت کے لئے دو دعویداروں بیر پانڈیہ اور سندرپانڈیہ کے درمیان جنگ ہورہی تھی جو حقیقی بھائی تھے۔ دوارسمدر کا راجہ بلال دیو اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھاکر اپنی فوج کے ساتھ حملہ کے لئے آگیا لیکن جوں ہی

اس کو مسلمانوں کے آمد کی اطلاع ہوئی وہ واپس ہوگیا۔ ملک کافور نے اس کا تعاقب کیا اور اُس کو دوارسمدر (دوارا وتی پور) میں محصور کرلیا۔ جو سلطنت کرناٹک کا مرکز تھا۔ بلال دیو نے صلح نامہ پیش کیا جس پر ملک کافور نے سالانہ خراج کی پابندی عاید کی اور تاوان جنگ جو ایک کثیر مقدار میں ہاتھ آیا مع ویرا بلال سوم کے دہلی روانہ کردیا تاکہ علاء الدین کے روبرو اپنی اطاعت کا اقرار کرے۔

مالابار سے سندر پانڈیہ نے بھاگ کر دہلی کا رخ کیا اور علاء الدین کے پاس پہونچا اور سلطنت پر ویر پانڈیہ قابض ہوگیا۔ مسلمانوں کی آمد پر راجہ نے پایۂ تخت کو چھوڑ کر ایک جزیرہ میں پناہ لی۔ ملک کافور نے بغیر کسی جھگڑے کے کثیر مال و دولت پر قبضہ کرلیا۔ وآصف اور خسروؔ کے بیان کے بموجب اس نے ۳۲۰ ہاتھی ۲۰ ہزار گھوڑے ۵۰ ۲ پونڈ سونا اور جواہرات کے کئی صندوق حاصل کئے۔ اس دولت سے اس کے خیالات پلٹ گئے اور ایک خودمختار سلطنت کے قیام کا منصوبہ اس کے دماغ میں آیا لیکن حالات سے مجبور ہوکر اپنے منصوبہ کو کامیاب نہ بنا سکا۔ اس نتیجے سے اس کی ہمت بڑھ گئی اور یہ آگے بڑھتا ہوا۔ رامیشورم تک چلا گیا جہاں اس نے یادگار کے طور پر ایک مسجد بھی تعمیر کروائی۔ یہاں اس نے مسلمانوں کو بھی دیکھا جن کا طرز معاشرت، نسلی امتیاز اور زبان وہاں کے ماحول اور جغرافی حالات کی وجہ سے بہت کچھ بدل گئی تھی۔ ۱۳۱۱ء میں یہ شمالی ہند کی سب سے پہلی اور انتہائی پیش قدمی تھی۔ اورنگ زیب صرف دریائے کاویری تک بڑھ سکا۔ اس طرح تاریخ ہند کا یہ دور جنوب ہند کی فتح اور سیاسی اقتدار کو حاصل کرنے میں سب سے نمایاں رہا۔

علاء الدین خلجی کے بعد اس کا دوسرا بیٹا مبارک خلجی جب ۱۳۱۶ء میں تخت نشین ہوا تو دیوگری میں بغاوت ہوگئی۔ وہاں ہرپال دیو نے شنکر دیو کو ہٹاکر تخت پر قبضہ کرلیا تھا۔ مبارک خلجی نے ہمت سے کام لے کر دیوگری پر حملہ کردیا۔ اس نے پہلے خسرو کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ بھیجا اور اس کے بعد خود گیا۔ ہرپال دیو کو شکست ہوئی اور دیوگری پر براہ راست قبضہ کرلیا گیا۔ اس طرح مہاراشٹرا سلطنت براہ راست شمالی ہند کے زیر حکومت آگئی۔ گلبرگہ اور ساگر پر فوجی عہدہ دار مقرر کردیے گئے اور دیوگری پر ایک ترکی النسل صوبہ دار مقرر کیا گیا جس کا نام یک لاکی تھا۔ ان انتظامات کے بعد مبارک خلجی نے خسروؔ کو ورنگل کی تسخیر کے لئے روانہ کیا۔ . . . . ورنگل کے راجہ نے اطاعت قبول کرلی اور کثیر مال و دولت نذرانہ کے طور پر پیش کیا جس کی تفصیل ابن بطوطہ نے لکھی ہے یعنی ایک سو ہاتھی ۱۲ ہزار گھوڑے ۶۰ صندوق جواہرات ۲۵۰ پونڈ سونا۔ ورنگل کی سلطنت کے پانچ اضلاع بھی دیوگری میں شامل کردیے گئے۔

خسروؔ اس فتح کے بعد جنوبی ہند کی طرف روانہ ہوگیا۔ ضیاء الدین برنی نے خسرو کی اس جنوبی مہم کو بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ جن جن شہروں سے یہ فوج گزرتی تھی وہاں کے راجہ شہر چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ اس نے ان خالی شہروں سے بہت بڑی دولت حاصل کی۔ دولت کی فراوانی نے اسے باغی بنادیا اور یہیں سے اس نے سلطنت دہلی پر قدم جمانے کے منصوبے شروع کردئے۔ دکن کی دولت نے ہر جنرل کو شاہی کے خواب دکھائے اور انھوں نے اسی قوت کے نشے میں سلطنت دہلی پر قبضہ بھی حاصل کیا۔

خلجی دور کے بعد تغلق دور میں غیاث الدین تغلق نے جب شاہی خزانہ خالی پایا تو اپنے بیٹے الغ خان کو ورنگل پر حملے کے لئے روانہ کیا۔ اس لئے یہاں کے راجہ نے دہلی کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھاکر خراج دینا بند کردیا تھا۔ یہ حملہ ۱۳۲۲ء میں ہوا جب شاہی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کرلیا تو فوج میں یہ غلط خبر مشہور ہوگئی کہ غیاث الدین تغلق کا انتقال ہوگیا ہے جس کی وجہ سے محاصرہ پر برا اثر پڑا۔ راجہ کی فوج نے محاصرین کو سخت شکست دی۔ الغ خاں نے دیوگری میں پناہ لی۔ ضیاء الدین برنی اور ابن بطوطہ کے بیانات میں کچھ اختلاف ہوگیا ہے کیونکہ برنی اس غلطی کا ذمہ دار الغ خان کو

بتاتا ہے اور بطوطہ اس کو موردالزام نہیں سمجھتا۔ بہرحال واقعات کچھ بھی ہوں غیاث الدین تغلق نے اکثر لوگوں کو جو دہلی بھاگ آئے تھے سخت سزائیں دیں۔ اور ایک دوسری فوج الغ خاں ہی کی سرکردگی میں روانہ کی جس کے بعد قلعہ فتح ہوگیا اور راجہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرکے تلنگانہ کے علاقے کو بھی براہ راست دہلی کے تحت کردیا گیا۔

سلطنت دہلی جو ۱۲۹۴ء میں صرف دریائے نربدا تک پھیلی ہوئی تھی ۱۳۳۰ء میں مالا بار تک پھیل گئی۔ مسلمانوں کی اتنی وسیع سلطنت اس سے قبل یا اس کے بعد کبھی قائم نہ ہوئی۔ خاندیس کے علاقے میں پٹھانوں کی نوآبادی اسی زمانہ میں قایم ہوئی۔ ان حملوں سے مسلمانوں کے اکثر قبیلے اور خاندان شاہان دہلی سے جاگیریں حاصل کرکے دکن کے مختلف علاقوں میں آباد ہوگئے تھے۔

سلطان محمد تغلق (الغ خاں) کے ابتدائی زمانہ میں اس کے بھانجے بہاءالدین گرشاسپ نے جو گلبرگہ کے قریب ساگر میں متعین تھا بغاوت کردی۔ اس کی سرکوبی کے لئے خواجہ جہاں کی قیادت میں شاہی فوجیں روانہ کی گئیں۔ بہاءالدین نے شاہی فوجوں کی آمد سے مرعوب ہوکر دریائے کرشنا اور تنگبھدرا کی درمیانی سلطنت کمپلی میں پناہ لی۔ یہاں اس کا تعاقب کیا گیا۔ یہاں سے یہ دوار سمدرا چلا گیا اور وہاں بھی اس کا تعاقب کیا گیا۔ اس تعاقب میں ان دونوں سلطنتوں کا خاتمہ کردیا گیا اوران کو براہ راست دہلی کے تحت کردیا گیا۔ بہاءالدین یہاں گرفتار ہوا اور قتل کردیا گیا لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ روپوش ہوگیا اور پھر اس کا پتہ نہ چلا۔

محمد تغلق کے پیش نظر سب سے زیادہ مشکل مسلہ مرکزی قوت کا قیام تھا اس لئے کہ مرکز کو موثر بنائے بغیر اتنی وسیع سلطنت پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ اس نے اس مسئلہ کا حل یہ سوچا کہ دہلی کے بجائے دیوگری کو مرکز بنایا جائے تاکہ شمال، جنوب، مشرق اور مغرب چاروں طرف سے اس کا فاصلہ یکساں رہے۔ دہلی میں بیٹھ کر جنوب ہند کے علاقے مالا بار وغیرہ پر تسلط قائم رکھنا بہت ہی مشکل تھا اور پھر ایسے زمانہ میں جب کہ ذرایع حمل ونقل میں بڑی دشواریاں تھیں۔ نظری اعتبار سے اس کا یہ حل بہت ہی مناسب اور بہتر تھا لیکن عملی اعتبار سے اس کا یہ منصوبہ بیکار ثابت ہوا۔ اس نے اپنے اقتدار سے دہلی کو اجاڑ کر دولت آباد کو بسالیا لیکن بہت ہی تھوڑے عرصے میں پھر دہلی واپس ہونا پڑا۔ اس ردوبدل سے دولت آباد (دیوگری) میں مسلمانوں کی ایک کافی تعداد آباد ہوگئی اور امرائے صدہ کا ایک بڑا حصہ یہیں مقیم ہوگیا۔ جس کے بعد انھیں امراؤں نے دہلی سے بغاوت کرکے ایک علیحدہ اسلامی سلطنت دکن میں قائم کی جو بعد میں سلطنت بہمنی کے نام سے مشہور ہوئی۔ دکن کی یہ خود مختار سلطنت محمد تغلق کی زندگی ہی میں قائم ہوئی اور بعد میں تاریخ ہند اور تاریخ دکن کی سیاسیات میں ایک بڑے انقلاب کا باعث ثابت ہوئی۔

سید کرار علی

افغانی قندھار نہیں۔ دکن کا قندھار جسے قندھار شریف کہا جاتا ہے۔ کیونکہ محمد تغلق کے ساتھ دکن میں آئے ہوئے اولیاء اللہ کی چودہ سو پالکیوں میں کا ایک کثیر حصہ قندھار شریف ہی کے حصہ میں آیا۔ یہہ دکن کا بلگرام ہے، یہاں سے اولیاء، صوفیا، علماء، شعرا، مورخین اور مشاہیر پیدا ہوئے جن کے حالات اور کارنامے "مشاہیر قندھار دکن" میں پڑھئے جس کو اکبر صدیقی صاحب بی، اے نے مرتب کرکے باتصویر شایع کیا اور اب ادارۂ ادبیات اُردو کو اس کا حق تصنیف دے دیا ہے۔ (مہتمم)

سلطان مجاہد شاہ بہمنی
۷۷۵ھ تا ۷۸۰ھ

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی
۸۲۵ھ تا ۸۳۸ھ

دکن پر بہمنی خاندان کی حکومت

سلطنت بہمنی کی مبارک تاسیس جو ۱۳۴۷ء میں عمل میں آئی وسط چودھویں صدی کا عظیم الشان واقعہ تھا۔ اس سلطنت کی حقیقی عظمت اس کے جلیل القدر سلاطین کی علمی و عملی شخصیت اور ان کے غیر معمولی سیاسی اور تمدنی کارناموں میں مضمر ہے۔ ان علم پرور اولیا نے دکن کو ایک بلند پایہ سیاست اور پاکیزہ تمدن کے زیور سے اس قدر سنوارا کہ دنیا اس کو پہچاننے لگی اور اب بھی اس کی یاد تازہ ہے۔ دکن کی اصلی عظمت اسی خاندان کی وجہ سے ہے اس وقت دکن کو جس تمدن پر ناز ہے وہ سب شاہان بہمنیہ کا سرمایہ ہے انہیں سلاطین نے دکن کے طول و عرض میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی اور اس کو پھیلایا۔ بہمنیوں کا کرشمہ تھا کہ انھوں نے بہت جلد دکن کو اپنا گھر بنالیا۔ اس ملک کی جغرافی خصوصیات اپنے میں جذب کرلیں اور اپنی حکومت انہیں خصوصیات کے مطابق بنائی۔ یہ سلطنت اس وقت قائم ہوئی تھی جب کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کمزور ہونے کی وجہ سے سیاست منتشر ہو رہی تھی۔ اس کے ذمہ دار کچھ تو اس زمانے کے سیاسی حالات تھے جو خلجی خاندان کے خاتمہ کے بعد ہندوستان میں رونما ہوئے بعض خاندان میں ہندوستان جیسے وسیع ملک کی رہنمائی کی اہلیت نہ تھی مرکز کی کمزوری سے ہر صوبے میں جداگانہ عمل داری قائم ہوگئی۔ دکن کی انفرادیت جس طرح پہلے زمانے میں قائم تھی پھر کھڑی ہوگئی اور امرائے صدہ کی بدولت جو دکن کے تاریخ ساز ہیں سلطنت بہمنی کی داغ بیل پڑ گئی

سلطنت بہمنی کا پہلا دور

سلطنت بہمنی کی تقریباً ڈیڑھ سو سال کی تاریخ ہے اس کا ابتدائی زمانہ جب کہ اس سلطنت کے بانی علاء الدین حسن اور اس کے بیٹے محمد شاہ اول نے حکومت کی عہد تاسیس تھا اس دور میں سلطنت کی بنیاد رکھی گئی اور دکن کے طول و عرض اور اس کی قومی اور جغرافی خصوصیات کا صحیح مطالعہ کرکے ایک نہایت منظم نظام حکومت قائم کیا گیا۔ یہ سلاطین بہمنیہ کا سیاسی کرشمہ سمجھنا چاہئے کہ انھوں نے ابتدا ہی سے دکن کو اپنا گھر بنالیا تھا۔ اس جدید ماحول میں اپنے آپ کو اس قدر مانوس کرلیا کہ قدیم اہل دکن ان کو اپنا بادشاہ تسلیم کرنے لگے۔ نظام حکومت اس طرح مرتب کیا گیا جو سب کے لئے خوش گوار تھا۔ ہندوؤں کو حکومت میں شریک کیا گیا جس کو تاریخ ہند کا پہلا واقعہ سمجھنا چاہئے، مرکزی حکومت قائم کی گئی اور سلطنت مقامی علاقوں میں تقسیم کرکے صوبہ داری اور ضلع داری علاقے قائم کی گئیں، اگرچہ اس انتظام کا سہرا ان بادشاہوں کے سر ہے جو اس سلطنت کے بانی اور معمار تھے لیکن اس میں اسی سلطنت کے پہلے وزیر اعظم سیف الدین غوری کا بھی ہاتھ تھا۔ محمد شاہ کو اس بات کا احساس تھا۔ اس نے شاہی آداب کے لئے خاص اہتمام کیا تھا دربار کو مختلف طریقوں سے سجایا گیا، امراء رؤسا کے کھڑے رہنے کی جگہ مقرر کی گئی اور بادشاہ کے بیٹھنے کے لئے تخت فیروزہ کے نام سے ایک تخت بنایا گیا جس کی بہت شہرت تھی اور ہندوستان کی تاریخ میں اب تک ایسا تخت نہیں بنا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں اسی تخت کی شہرت سے متاثر تھا اور تخت طاؤس کو بہمنی تخت کا نقش ثانی سمجھنا چاہئے نیز محمد شاہ کے دربار کا تزک و احتشام بھی بہمنیوں کی خاص اختراع ہے۔ اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔

محمد شاہ اول کا انتقال ۷۷۶ھ میں ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مجاہد شاہ تخت نشین ہوا جو تین سال سے زیادہ بادشاہی کرنے نہ پایا، کیونکہ اس کے چچا داؤد نے اس کا خاتمہ کرکے خود تخت پر قبضہ کرلیا مجاہد شاہ کے ہمدردوں نے بہت جلد اس کا بھی خاتمہ کردیا اور علاءالدین حسن کے ایک پوتے کو جس کا نام محمد شاہ دوم ہے تخت نشین کیا گیا، محمد شاہ دوم کی تخت نشینی سے اس سلطنت کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، اس میں نہ صرف ملک کو خانہ جنگی سے نجات ملی بلکہ تمدنی ترقی کی نئی راہیں کھل گئیں محمد شاہ بہت تعلیم یافتہ اور علم دوست آدمی تھا اس کی وجہہ سے دکن میں سب سے پہلے علمی سرگرمیاں شروع ہوگئیں جو اس سے پہلے نہیں ہوئی ہیں اور ظاہر ہے کہ محمد شاہ دوم سے پہلے جو زمانہ گذرا تھا وہ تاسیس اور تشکیل کا زمانہ تھا۔ اس میں علمی ترقی نہیں ہوسکتی تھی۔ جب تک استحکام سلطنت کے ساتھ ملک میں سیاسی اطمینان نہ پیدا ہوجائے اہل علم اطمینان کے ساتھ علمی کام نہیں کرسکتے۔ محمد شاہ دوم کے کامیاب نظم و نسق کی وجہہ سے ایک طرف تو امن قائم ہوگیا اور دوسرے طرف اس کی علم دوستی نے ملک میں علمی دلچسپیاں پیدا کردیں۔ لایق علما جمع کئے گئے مدرسے کھول دئے گئے۔ استادوں کے لئے خاطر خواہ تنخواہیں اور طلبہ کے لئے وظائف مقرر ہوگئے ان علما میں سے جو اس زمانے میں دکن آئے تھے فضل اللہ انجو کا نام ہمیشہ یادر ہے گا جو دنیائے اسلام کا بہت بڑا عالم تھا اسی شخصیت کی وجہہ سے دکن میں علم کی دیا روشن ہوئی اور اس کی روشنی ایسی پھیلی کہ دکن علم کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

سلطنت بہمنی کا انتہائی عروج

جس طرح محمد شاہ اول کے انتقال کے بعد خانہ جنگی کی بدنما شکل پیدا ہوئی تھی اور چند روز تک تمدنی ترقی مسدود ہوگئی اسی طرح محمد شاہ دوم کے بعد بھی بہت سی سیاسی بدنظمیاں پیدا ہوگئیں اور اس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ چند روز کے لئے سلطنت بہمنی کے وقار کو دھکا لگا محمد شاہ کا انتقال ۷۹۹ھ میں ہوا۔ اس کے جانشین غیاث الدین اور شمس الدین جو چند مہینوں کے فصل سے اس کے بعد تخت نشین ہوئے اس گراں بار کے متحمل نہیں ہوسکے۔ ایک ترک غلام تغلچین نامی سلطنت پر بری طرح حاوی ہوگیا اور بادشاہ کٹ پتلی ہوگئے اس وقت ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو ملک کی صحیح رہنمائی کرسکیں۔ علاءالدین حسن کے دوسرے پوتے محمود خاں اور احمد خاں جو بہت لایق اور ذی علم تھے بہمنی سلطنت کے وقار کو بچانے کے لئے میدان میں آگئے اور سازش کرکے تغلچین کو ماردیا اور فیروز خاں تاج الدین فیروز شاہ کے لقب سے تخت فیروزہ پر بیٹھ گیا۔ جو اس خاندان بہمنیہ کا سب سے زیادہ جلیل القدر اور مایۂ ناز بادشاہ تھا۔ اس کے عہد حکومت میں دکن کی جس قدر ذہنی اور اخلاقی تربیت ہوئی اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے بہمنیوں کا تمام تر تمدن اسی عہد کی پیداوار ہے۔ فیروز شاہ فضل اللہ انجو کا شاگرد تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے استاد کے تمام سرمایۂ علم سے فائدہ اٹھایا تھا بلکہ اپنی رسا طبیعت اور غیر معمولی ذہن کی وجہہ سے ایسی علمی شان پیدا کردی تھی کہ دنیا کے سلاطین میں اس کی مثال نہیں ملتی اس نے تمام ملک میں اشاعت علم کے تمام ذرائع استعمال کئے۔ دور دراز سے علما جمع کئے اور ان کی خاطر خواہ تواضع کی۔ علم کی مجلسیں منعقد کیں اور ان میں وہ خود بھی ایسا حصہ لیتا تھا کہ گویا وہ بادشاہ نہیں ہے اسی پر حصر نہیں ہے بلکہ فرصت کے اوقات میں وہ بلند پایہ طلبہ کو جمع کرکے ان کو انتہائی مضامین میں درس دیا کرتا تھا۔ نتیجہ یہہ تھا کہ

فیروز شاہ کی ذی علم شخصیت کی وجہہ سے دکن کے در و دیوار علم وفضل سے گونجنے لگے اور گلبرگہ علم کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

علمیت کے ساتھ فیروز شاہ میں سیاسی تدبر بھی کچھ کم نہیں تھا۔ملک کی کامیاب سیاسی رہنمائی کی اور ہمسایہ سلطنتوں پر اس قدر رعب داب قائم کیا کہ سب سلطنت بہمنی کا لوہا مانتے تھے۔نیز فیروز شاہ کے پاکیزہ ذوق کی وجہ سے دکن کے تمدن میں بڑی شگفتگی پیدا ہوگئی لباس وضع قطع نئے انداز میں ڈھل گئے لباس کی بعض اختراعیں جو فیروز شاہ نے بنائی تھیں وہ اب تک موجود ہیں اگر فیروز شاہ سے کوئی غلطی ہوی تھی تو وہ صرف یہہ ہی کہ اس نے اپنے بھائی احمد خاں کی جگہ اپنے بیٹے حسن خان کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا۔احمد خاں عمر رسیدہ اور لائق آدمی تھا۔ اس نے خود فیروز شاہ کی تخت نشینی میں مدد دی تھی۔اسی بناء پر اس زمانے کے مشہور بزرگ حضرت بندہ نوازؒ نے بھی احمد خاں کے لئے اپنا روحانی فیصلہ صادر کردیا تھا اس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ دونوں فریقوں میں ان بن ہوگئی اور احمد خاں کو تلوار کے زور سے تخت حاصل کرنا پڑا

سلطنت بہمنی کا آخری دور

احمد خاں جو اپنی روحانیت کی وجہہ سے احمد شاہ ولی بہمنی کے نام سے موسوم ہے ۸۲۲ھ میں تخت نشین ہوا اس کی تخت نشینی سے سلطنت کے استحکام و توسیع میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔علم وفن کی سرگرمیاں اسی طرح قائم رہیں جس طرح فیروز شاہ کے عہد میں تھیں۔لیکن اس کے عہد میں گلبرگہ کی جگہ بیدر کو پائے تخت بنایا گیا اس انتظام سے یہہ فائدہ ہوا کہ پائے تخت کے لئے بیدر جیسی ایک بلند جگہ مل گئی لیکن گلبرگہ جو ایک زمانے میں علم وفن کا مرکز بن گیا تھا اس کی آب وتاب گھٹ گئی۔اب دنیا کی توجہہ بیدر کی طرف منعطف ہونے لگی۔شیخ آذری جو اس زمانے کا مشہور عالم ہے اسی زمانے میں دکن آیا تھا اور دربار کی فیاضیوں سے فائدہ اٹھا کر ملک کی علمی خدمت کرتا تھا۔ اس کو دربار سے یہہ کہا گیا تھا کہ بہمن نامہ کے نام سے سلطنت بہمنی کی تاریخ لکھے۔چنانچہ اس نے اپنی آخری عمر تک اس کی تکمیل بھی کی تھی لیکن افسوس ہے کہ وہ ناپید ہے۔ان چند ظاہری چیزوں کے قطع نظر جو بہت کچھ حوصلہ افزا معلوم ہوتی ہیں سلطنت کی تہہ میں بہت سی چیزیں ایسی بھی تھیں جو آگے چل کر اسی سلطنت کے زوال کا باعث ہوگئیں یعنے اسی عہد سے طبقہ داری کشمکش کے بدنما آثار ظاہر ہونے لگے۔علاء الدین حسن کے عہد سے جو امراء وغیرہ اور ان کے خاندان دکن میں آباد ہوگئے تھے وہ اپنے آپ کو دکھنی کہتے تھے اور انھیں اس کا حق بھی تھا کیونکہ دکن کے حقیقی آباد کار اور سلطنت بہمنی کے بانی تھے۔اور اس پر تقریباً ایک صدی گذر گئی اس کے بعد جو نو وارد ترکستان اور ایران سے یہاں آتے تھے وہ ان میں گھل مل نہیں سکے اور اہل دکن ان کو اپنا دشمن سمجھنے لگے طبقہ واری کشمکش۔احمد شاہ کے بیٹے علاء الدین ثانی کے عہد میں جو ۸۳۸ھ میں تخت نشین ہوا بری طرح ظاہر ہوگئی یعنے دونوں فرقوں میں سخت خوں ریزیاں ہونے لگیں ایک ہنگامہ تو اس قدر زبردست ہوا کہ جس میں تمام باہر کے لوگ مار دئے گئے۔اگرچہ علاء الدین ثانی نے اپنے آہنی پنجہ سے اس آگ کو فرو کردیا لیکن اس کے جانشینوں کے عہد میں اس کی چنگاریاں پھر بھڑک اٹھیں اور بالآخر سلطنت بہمنی کو جلا کر خاک کردیا۔

علاء الدین ثانی کے بعد جس کا انتقال ۱۴۵۸ء میں ہوا تھا اس کا بیٹا ہمایوں اس کا جانشین ہوا لیکن یہ تین سال سے زیادہ حکومت نہیں کر سکا۔ اس کی بے وقت موت سے بہت نقصان ہوا۔ اس کے بیٹے چھوٹے تھے، ایک بیٹا نظام شاہ بہمنی کے نام سے تخت نشین کیا گیا تھا وہ جلد مر گیا اور دوسرا بیٹا محمد شاہ لشکری کے نام تخت پر بٹھایا گیا چونکہ اس کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی اس لئے اس کی ماں نرگس بانو مخدومہ جہاں ملک کی سیاسی رہنمائی کرتی تھی لیکن وزارت کی بڑی خدمت یہ محمود گاواں ثانی ایک نووارد برسر اقتدار ہو گیا۔ یہ اگرچہ علاء الدین ثانی کے عہد میں باہر سے آیا تھا اور تجارت کرتا تھا لیکن محمد شاہ لشکری کی کمسنی کے زمانے میں اس نے بہت ترقی کر لی۔ اور سلطنت کے تمام سیاہ و سفید اس کے سپرد ہو گئے۔ محمد شاہ کے سن رشد کے پہنچنے کے بعد بھی اس کے اقتدار میں کمی نہیں ہوئی محمود گاواں کے اقتدار سے بہت سے فائدے بھی ہوئے چنانچہ ملک میں علمی کام ہوئے اور دستور میں اضافے ہوئے لیکن اس کی تنگ نظری سے دکھنی فریق بیزار ہو گیا اور اس کو مارنے کے درپے ہو گیا۔ چنانچہ ایک خاص موقع پر جب کہ بادشاہ اور محمود گاواں مشرقی اور شمالی سرحدوں کے مٹانے کی مہم میں مصروف تھے ایک سازش ہو گئی۔ بادشاہ کو محمود گاواں کی طرف سے بدظن کیا گیا۔ بادشاہ نے ناعاقبت اندیشی سے اس کو مارنے کا حکم صادر کر دیا۔

محمود گاواں کا قتل جو ۱۴۸۱ء میں ہوا دکن کا بڑا واقعہ ہے اسی واقعہ کے بعد سے سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ کیونکہ جو لوگ اس کے قتل کے ذمہ دار تھے ان میں سیاسی رہنمائی کی صلاحیت نہ تھی۔ ملک حسن بحری جو نظام الملک کے خطاب سے سرفراز تھا اس فعل کا ذمہ دار تھا اگر اس میں محمود گاواں کی وزارت کے سنبھالنے کی صلاحیت ہوتی تو سلطنت اپنی جگہ قائم رہتی اور شیرازہ نہیں بکھرتا لیکن افسوس یہ ہے کہ نظام الملک اور اس کا فریق بالکل خود غرض تھا۔ ان کی نااہلیت اور خود غرضی کی وجہ سے ہر قدم پر ملک کو نقصان پہنچنے لگا جو لوگ محمود گاواں کے آوردہ تھے سب حکومت سے متنفر ہو گئے اور ہر جگہ انحراف کرنے لگے محمد شاہ لشکری کی زندگی تک جو ۱۴۸۲ء میں ہوا تھا حالات کسی قدر روبراہ تھے لیکن اس کے انتقال کے بعد جب اس کے کمسن بیٹے محمود شاہ بہمنی کو تخت نشین کیا گیا تو علانیہ خودسری ظاہر ہونے لگی۔ اکثر صوبہ دار باغی ہو گئے چنانچہ ۱۴۹۰ء میں احمد نگر اور بیجاپور اور برار کے صوبہ داروں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا چند سال بعد گولکنڈہ بھی خود مختار ہو گیا۔ ۱۴۹۰ء کو سلطنت بہمنی کی آخری تاریخ سمجھنا چاہئے۔ بیدر میں جو سلطنت کا مرکز ہے قاسم برید ذی اختیار ہو گیا جو دراصل شہر کا کوتوال تھا۔ محمود شاہ اور اس کے تمام جانشین سب اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو گئے تھے ۱۵۱۸ء میں محمود شاہ کے مرنے کے بعد اس کے چار بیٹے احمد شاہ، علاء الدین ثالث، ولی اللہ، کلیم اللہ یکے بعد دیگرے برائے نام تخت پر بٹھائے گئے تھے لیکن یہ سب بریدیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھے۔ بالآخر کلیم اللہ حق ناشناس بریدیوں کی دست درازیوں سے تنگ آ کر ۱۵۲۷ء میں احمد نگر بھاگ گیا اور اس کے ساتھ تخت فیروزہ پر بیٹھنے والے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

عبدالمجید صدیقی

نذر ولی

دکن کی تیار خواتین انشاء پرداز کے دلچسپ مضامین جو بابائے ریختہ حضرت ولی اور نائی آدمی کے حالات زندگی اور خصوصیات کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب اور جدید ترین نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں صفحات ۲۵۶ قیمت مجلد عہ/ ۸ (سب رس کتاب گھر)

مُجاہد شاہ بہمنی

مجاہد شاہ سلطنت بہمنی کا تیسرا تاجدار ہے۔ اس کی جگہ ایسی صف میں ہے جہاں بالعموم کسی کی نظر نہیں پڑتی لیکن اپنے درجہ میں بھی وہ مطالعہ کے قابل ہے۔ اگرچہ اس کی مختصر زندگی کچھ زیادہ جاذب نظر نہیں مگر اس کے بعض پہلو نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ سبق آموز ہیں۔

مجاہد شاہ محمد شاہ کا بیٹا اور علاء الدین حسن گنگو کا پوتا تھا۔ یہ ۱۳۷۵ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۳۷۸ء میں قتل کر دیا گیا۔ اس طرح اس نے صرف تین سال حکومت کی۔ اس کا قاتل خود اس کا چچا داؤد شاہ تھا۔ جب مجاہد شاہ نے وجیانگر پر حملہ کیا اور وہاں کے راجہ کرشن رائے کو بری طرح شکست دی تو واپسی میں وہ دریائے کرشنا کے کنارے آرام کے لئے ٹھیرا اس کے دشمنوں نے موقع پا کر اسے یہاں قتل کر دیا۔

مجاہد شاہ ایک بیدار مغز حکمران اور ایک نہایت اچھا سپاہی تھا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی سلطنت کے چاروں طرف نظر ڈالی اور ان مقامات کو بغور دیکھا جہاں سے حملے ہوتے تھے۔ اگرچہ سلطنت بہمنی کو خاندیس، مالوہ اور گجرات کی شمالی سلطنتوں سے بھی خطرہ تھا لیکن جنوبی سلطنت وجیانگر ہمیشہ پریشانی کا باعث رہی تھی۔ علاء الدین اور محمد شاہ کے عہد میں اس سلطنت سے لڑائیاں ہو چکی تھیں اور کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ مجاہد شاہ کی نظر سب سے پہلے اسی ہمسایہ سلطنت پر پڑی۔ اس نے بین سلطنتی سمجھوتہ کرنا چاہا اور وجیانگر کو لکھا کہ آئندہ نزاع کا سدباب اس طرح ہو سکتا ہے کہ تمہارے اور ہمارے درمیان حدود کا تعین ہو جائے۔ چنانچہ مجاہد شاہ نے اپنی طرف سے یہ تجویز کی تھی کہ دریائے تنگبھدرا حد فاصل ہو۔ لیکن کرشن رائے اس تجویز پر راضی نہیں ہوا۔ وہ رائچور اور مدگل کا دوآبہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اسی لئے اس نے تنگبھدرا کی بجائے دریائے کرشنا کو حد فاصل بنانا چاہا۔ لیکن مجاہد شاہ اس کو کیسے مان لیتا۔ چنانچہ اپنی تجویز کو منوانے کے لئے اس نے حملہ کر ہی دیا۔

مجاہد شاہ کے غیر معمولی توانائے جسمانی اور اس کے ساتھ اس کی شجاعت اور جوانمردی اس کی زندگی کے روشن پہلو ہیں۔ سلاطین بہمنی کا عام دستور تھا کہ وہ اپنے شاہزادوں کو خاطر خواہ تعلیم و تربیت دیتے اور درس و تدریس کے لئے لائق اساتذہ فراہم کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ تمام سلاطین بہمنی اچھے تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ بعض تو اونچی قابلیت رکھتے تھے۔ نیز ان کو جسمانی اور فوجی تربیت دی جاتی تھی اور وہ اچھے سپاہی ہوتے تھے۔ چنانچہ تمام معرکوں میں سلاطین بہمنی بذات خود حصہ لیتے تھے۔ اسی ماحول میں مجاہد شاہ کی بھی اٹھان ہوئی تھی۔ چونکہ اس کے قوی بھی کافی اچھے تھے اس لئے اس پر تعلیم و تربیت کا غیر معمولی اثر ہوا تھا۔ فرشتہ کے قول کے مطابق وہ شمشیر، نیزہ اور خنجر کے سوا بات نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ مجاہد شاہ کے اس شوق شمشیر زنی سے متعلق بہمن نامہ کے اشعار یہ ہیں۔

ز گہوارہ چوں پائے بیروں نہاد / بہ تیر و کمان دست و بازو کشاد
ببستے تند گردن کش پیل زور / کہ نشنید گفت کسے وقت شور
چناں بر سر کنگرہ می دوید / کہ انگشت حیرت بدنداں گزید

مجاہد شاہ سلطنت بہمنی کا بہت بڑا سپہ سالار تھا۔ اس کی سپہ سالاری کے حقیقی جوہر اس وقت نمایاں ہوئے جب کہ سلطنت وجیانگر سے اس کی ان بن ہو گئی تھی۔ وہ ۱۹ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا اور جو وجیانگر کے وقت اس کی عمر مشکل سے ۲۲ سال ہوگی۔ اس جنگ میں اس کا دلیرانہ معرکہ اس کی زندگی کا عجیب تجربہ تھا۔ کرشن رائے کے مقابلہ سے پہلے گنگاوتی کے آگے ایک جو خونخوار شیر کا شکار کیا تھا وہ قصہ ایک عرصہ تک زبان زد خاص و عام رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس انتہائی جرأت کا وجیانگر پر بڑا رعب پڑا تھا کرشن رائے دہشت کی وجہ سے گھبرا گیا تھا۔

کشن رائے کے عہد میں سلطنت ویجیا نگر کی جو عظمت تھی وہ سب کو معلوم ہے۔ اس کی فوجی طاقت بہت زیادہ تھی۔ ایسی طاقتور سلطنت کا مقابلہ کچھ آسان نہیں تھا۔ اس موقع کی نزاکت کے باوجود مجاہد نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ یہ بڑے گھمسان کا معرکہ تھا۔ گو اس حملہ سے کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا تھا لیکن اس میں مجاہد شاہ نے جو کارنامے دکھائے تھے وہ ہمیشہ یاد رہیں گے۔ کوئی معرکہ ایسا نہ تھا جس میں اس نے حصہ نہ لیا ہو۔ ویجیا نگر کی چڑھائی، شہر رنگا کا حملہ، قلعہ ادھونی کا محاصرہ، اور رامیشورم تک کشن رائے کا تعاقب اس کے مشہور کارنامے ہیں جو بھلائے نہیں جا سکتے۔ ان چڑھائیوں میں ایک امتیازی بات یہ تھی کہ کہیں قتل عام نہیں کیا گیا۔ جو دشمن مقابلہ کرتا تھا اسی کو مارا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ مجاہد شاہ کے باپ محمد شاہ کی وصیت تھی جس کی پابندی کی گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر شجیع سپہ سالار کے اوصاف میں یہ چیز داخل ہے۔

اگر مجاہد شاہ کی زندگی مہلت دیتی تو شاید دنیا کے بڑے بادشاہوں میں اس کا شمار ہوتا۔ دریائے کرشنا کے کنارے جہاں اس کے دشمنوں نے اس کا خاتمہ کرنا چاہا تھا۔ اس وقت بھی اس نے اپنی فطری شجاعت کے جوہر دکھائے۔ یہ کیمپ میں سو رہا تھا کہ دشمنوں نے اس پر وار کیا۔ داؤد خاں نے خنجر بھونکا تو اس کی آنتیں نکل آئیں تھیں۔ لیکن اس کے باوجود اس نے داؤد کو اس کے خنجر کے ساتھ پکڑ کر کھینچا اور قریب تھا کہ داؤد مر جاتا لیکن اس کے ایک ساتھی مسعود خاں نے اس کو مار دیا اور اس طرح دکن کا یہ ہونہار حکمراں موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

سلطان احمد شاہ ولی بہمنی

عبدالحفیظ صدیقی

احمد خاں بہمنی بن سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے دوسرے بیٹے تھے۔ ولادت ۸۰۰ھ م ۱۳۹۷ء میں بعہد سلطان محمد شاہ بن سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی ہوئی۔ باپ کے انتقال کے وقت یہ اور ان کے بھائی فیروز شاہ صغیر سن تھے۔ اور ان دونوں کی پرورش و پرداخت ان کے چچیرے بھائی محمد شاہ ثانی نے کی۔ ان دونوں کو تیر اندازی۔ چوگان بازی۔ سواری۔ پڑھنا۔ لکھنا غرض کہ ہر شاہی علم و فن کی اچھی تعلیم دی۔ اور شیراز کے مشہور اور متبحر عالم میر فضل اللہ انجو کو ہر دو کی تعلیم و تربیت کے لئے مقرر کیا اور اپنی دونوں بیٹیاں ان دونوں بھائیوں کو بیاہ دیں۔

جب فیروز شاہ بادشاہ ہوا تو احمد خاں کو خانخاناں کا خطاب دیا اور امیر الامرا مقرر کیا۔ وہ نہایت شجاع اور خوبصورت جوان تھے چہرہ روشن اور پیشانی خندہ تھی۔ خلوص ارادت سے حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو دراز سے بیعت کی۔ بطرف زرکتیہ حضرت کے لئے ایک خانقاہ تعمیر کرائی اور ہمیشہ حاضر خدمت ہو کر اسرار معرفت کا سبق لیتے اور ہر محفل سماع میں شریک ہو کر نکات تصوف سے محظوظ اور توجہ حضرت سے بہرہ مند ہوتے تھے۔ چنانچہ حضرت نے ان کی نسبت بادشاہی کی پیشین گوئی کی تھی جس کی وجہ سے فیروز شاہ بہت رنجیدہ ہوا اور حضرت کو شہر گلبرگہ سے باہر جا کر رہنے کا حکم دیا۔ اور مصاحبین کے ورغلانے سے احمد خاں سے بھی بدظن ہوا اور اپنے دو غلاموں ہوشیار عین الملک و بیدار نظام الملک کی صلاح سے ان کو اندھا کرانے کا ارادہ کیا۔ جب ان کو اس کی اطلاع ملی تو اپنے فرزند علاء الدین کے ساتھ شہر سے بھاگ نکلے اور حضرت کے ارشاد سے مطمئن ہو کر وہاں سے رخصت ہوئے۔

جب ان کے بھاگ جانے کی خبر فیروز شاہ کو ہوئی تو ایک فوج اپنے دو غلام ہوشیار اور بیدار کے ساتھ پکڑ لانے کے لئے روانہ کی۔ انھوں نے بھی اطلاع پا کر مختصر سی فوج تیار کر کے شاہی فوج کا مقابلہ کیا جس میں ان کو کامیابی حاصل ہوئی۔

فیروز شاہ ان کی فتح کی خبر سن کر قلعہ کا دروازہ کھلوا کر اپنے پاس بلوایا۔ وہ فیروز شاہ کے پاس گئے اور اس کے قدموں پر سر رکھ کر

جو حالت بیماری میں فرش تھا زار و قطار رونے لگے۔ فیروز شاہ نے سر اٹھا کر خوشی کے لہجہ میں کہا کہ میں نے تم کو اپنے عین حیات بادشاہ دیکھا تم شایان سلطنت ہو اور استحقاق اس کا تمہیں کو پہونچتا ہے۔ میں شفقت پدری سے حسن خاں کی ولیعہدی کی سعی کرتا رہا۔ جب کار فرمایان قضا و قدر میرے بعد تاج سلطنت تمہارے لئے نامزد کر چکے ہیں تو دوسرے کے لئے کوشش بے فائدہ ہے۔ حسن خاں کو تمہارے سپرد کیا۔ اٹھو آج ہی سے مہمات سلطنت کو انجام دینا شروع کرو۔ غرض شوال پانچویں ۸۲۵ھ کو تاج بادشاہی کا زیب سر کر کے تخت فیروزہ پر جلوہ گر ہوئے اور اپنا نام "احمد شاہ بہمنی" رکھا۔

مہمات سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلے خلف حسن بصری کو وکیل امور سلطنت کر کے ہزار و صدی کا منصب عطا کیا اور ملک التجار خطاب دیا۔ اور ہوشیار و بیدار غلاموں میں سے ایک کو خطاب امیرالامرائی اور دوسرے کو دولت آباد کی فوج کی سپہ سالاری کے منصب سے سرفراز فرمایا۔ اور فیروز شاہ کے بیٹے حسن خاں کو جو وارث تاج و تخت تھا اور جمیع ارکان دولت جس کے قتل یا قید کرنے کی صلاح دیتے تھے منصب پانصدی عطا کیا اور فیروز آباد جاگیر میں دیا اور وہاں اس کو آزادی سے رہنے اور سیر و شکار کرنے کی اجازت بھی عطا کی۔ یہ شہزادہ بچی کی زندگی تک وہاں سیر و شکار میں مشغول رہ کر اپنی زندگی خوب مزے سے بسر کرتا رہا۔

راجہ دیجیانگر نے سرکشی شروع کی اور خراج دینے سے انکار کیا۔ علاوہ اس کے گزشتہ جنگ میں مسلمانوں کا بیدردی سے کشت و خون ہوا تھا اس کا بدلہ لینا بھی ضروری تھا۔ اس لئے پچاس ہزار سوار جرار ہمراہ رکاب لے کر دیجیانگر کی طرف روانہ ہوئے۔ راجہ رائے ورنگل کی مدد سے مقابلہ میں آیا۔ دونوں فوجیں دریائے تنگبھدرا کے کنارے ایک دوسرے کے سامنے اُتریں لیکن دونوں میں سے کوئی آگے بڑھ کر اول حملہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر بہمنی فوج کا ایک دستہ یکایک ایسی پھرتی سے دریا پار اترا کہ راجہ دیو رائے بھی حیران رہ گیا اور اس کی فوج فوراً منتشر ہو کر بھاگ نکلی۔

ایک دن احمد شاہ چند سواروں کے ساتھ شکار کو نکلے۔ ہندوؤں نے جو موقع کی تاک میں تھے پیچھا کیا اور چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے سلطان کے سب ساتھی کام آنے کو تھے کہ اس اثنا میں کمک آ پہونچی اور دیجیانگر کی تسخیر کا مصمم ارادہ کیا۔ دیو رائے نے گھبرایا اور اس نے حیرانی میں کئی سال کے خراج کی بقایا رقم کو ہاتھیوں پر لادکر فی الفور بارگاہ سلطانی میں داخل کر دیا۔ اور بہت ہی عجز و انکسار سے صلح کی درخواست کی۔ دونوں میں صلح ہوگئی۔ بوقت واپسی تلنگانہ پر چڑھائی کی۔ رائے ورنگل نے فوج کثیر آپ کا مقابلہ کیا۔ آخر مارا گیا۔ ملک تلنگ کو اپنے تصرف و اقتدار میں لیا اور مظفر و منصور ہو کر واپس ہوئے۔

انہیں ایام میں سلطان بیدر کے ایک میدان سے گزرے جو نہایت پر فضا تھا۔ حکومت کے لئے ایک مرکزی مقام کی ضرورت تھی جہاں سے پورے دکن پر حکومت کی جا سکے۔ بیدر چونکہ دکن کے وسط میں نہایت بلندی پر واقع تھا اس لئے سلطان نے اس کو پسند فرما کر یہیں شہر کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام احمد آباد بیدر رکھا۔ اور رجب ۸۳۲ھ م ۱۴۲۳ء میں گلبرگہ کے بجائے بیدر کو پایۂ تخت قرار دیا۔ یہاں قلعہ حصار اور محلات شاہی و باغات وغیرہ چار سال کے قلیل عرصہ میں تعمیر کرائے۔

بیدر میں سلطنت کرتے ہوئے چند سال گزرے تھے کہ امساک باراں سے سخت قحط پڑا نہریں اور باولیاں خشک ہوگئیں انسان و حیوان مرنے لگے۔ سلطان نے خزانہ کا منہ کھول دیا۔ اور غلہ کے شاہی ذخائر غربا اور مساکین میں لٹا دئے۔ جب ایک سال اس طرح گذرا اور دوسرے سال بھی بارش نہ ہوئی تو سلطان نے علماء، مشائخ اور زہاد کو ساتھ لے کر نماز استسقا ادا کی لیکن جب یہ بھی بے سود ہوا تو سلطان

بنفس نفیس صحرا کی طرف تشریف لے گئے اور تنہا بلندی پر چڑھ کر چند دوگانے ادا کئے ۔ دعا مقبول ہوئی اور اس قدر مینھ برسنے لگا کہ لوگ خوش ہوگئے اور اُسی دن سے سلطان احمد شاہ ’ ولی کے لقب سے مشہور ہوگئے ۔

سلطان کو قواعد لشکرکشی اور آئین فرمانروائی میں کافی مہارت تھی ۔ وہ ہر کام میں بھائی کی پیروی کرتے سادات علماء اور مشائخ کی تعظیم و تکریم کرتے ۔ فقیروں اور درویشوں سے بہت عقیدت رکھتے ۔ صوم و صلوٰۃ کے اتنے پابند کہ کبھی تہجد اور اشراق تک قضا نہیں ہونے دی اور کل مہام سلطنت بذات خود انجام دیتے ۔ غریب سے غریب رعایا کی فریاد سنتے اور انصاف فرماتے اور گاہے گاہے مثل ہارون رشید خلیفہ بغداد کے بھیس بدل کر رعایا کے حالات دریافت کرتے ۔ کبھی مسجدوں اور مدرسوں میں جاکر وہاں کے حالات دیکھتے اور کبھی دفاتر میں جاکر ملک کے نظم و نسق کو ملاحظہ فرماکر اصلاحیں جاری فرماتے ۔ غرض آپ نے اخلاق حسنہ سے خاص عام کو مطیع و فرمانبردار بنالیا تھا ۔

جن دنوں میں سلطان جنگ میں مصروف تھے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے رحلت فرمائی ۔ جس کا سلطان کو بہت صدمہ ہوا ۔ ایک روز بھرے دربار میں اپنے صاحبزادوں کو طلب کیا اور سب کی طرف مخاطب ہوکر بولے ۔ جب مالک اپنے بندہ کو اپنے پاس بلائے تو کیا کرنا چاہیئے ۔ مجمع نے جواب دیا کہ اپنے مالک کا حکم بجالانا چاہیئے ۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ جناب الٰہی مجھے طلب فرماتے ہیں اور حضرت پیر و مرشد بندہ نواز گیسو دراز کی یاد ستا رہی ہے ۔ اب باغ عالم کی سیر سے دل کو سیر ہوگیا ۔ یہ کہہ کر آپ نے ملک کے مختلف علاقوں پر فرزندوں کو حاکم مقرر فرمایا ۔ چنانچہ ولایت رام نگر ’ مدہول ’ کلم ’ برار اور ولایت ’ ماہور کا شاہزادہ محمود خاں کو حاکم مقرر کیا ۔ شاہزادہ داؤد خاں کو رائچور اور تلنگانہ کا اور ولیعہد علاء الدین کو اپنی جگہ بادشاہی دی اور چھوٹے شہزادہ محمد خاں کو بڑے بھائی کا شریک شاہی کیا اور عدم مخالفت کے بارہ میں چاروں سے قسم لی اور ضروری وصیت اور سب کو اتفاق کی ہدایت کرکے دربار برخاست اور پھر یاد حق میں ایسے مشغول ہوئے کہ عین حالت عبادت میں ۲۹ ذیحجہ ۸۳۹ھ کو بوقت شب واصل بحق ہوئے ۔ سلطان کا گنبد بیدر سے ایک کوس کے فاصلے پر موضع اشٹور کے میدان میں زیارت گاہ خاص و عام ہے ۔

محمد ظہیر الدین

پُرانا پُل

(حیدرآباد)

لرزتی نگاہوں کا فرمان ہے تو
دھڑکتے ہوئے دل کا احساں ہے تو
ثباتِ تمنا کی پہچان ہے تو
رُکا جس سے طوفاں وہ طوفان ہے تُو

(۲)

گلستانِ چلیم کی رنگیں کہانی
قطب شاہ کے دل کی کافر جوانی
غرورِ محبت کی زندہ نشانی
ضیائے چراغ شبستان ہے تُو

(۳)

پڑی "بھاگ نگری" کی بنیاد تجھ سے
ہوا دشتِ ویران آباد تجھ سے
بنا تجھ سے، ہاں حیدرآباد تجھ سے
مری داستانوں کا عنوان ہے تُو

(۴)

وہ دن جا چکے، وہ زمانہ نہیں ہے
وہ زلفیں نہیں ہیں وہ شانہ نہیں ہے
مگر یہ حقیقت، فسانہ نہیں ہے
کہ سچی محبت کا پیمان ہے تُو

میکشؔ

بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت

سلطنت بہمنیہ کے زوال کے بعد دکن میں جو پانچ اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں ان میں دو بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومتیں سیاسی اور تمدنی حیثیت سے نہ صرف دوسری ریاستوں سے بہت زیادہ ممتاز تھیں، نہ صرف حدود ارضی کی وسعت بلکہ فوجی قوت میں یہ دوسری دکنی ریاستوں سے بڑھی ہوئی تھیں بلکہ ہندوستان کی دوسری متعدد حکومتوں سے زیادہ پائدار اور برتر تھیں۔ ان کی عالیشان عمارتیں اور تہذیب و تمدن کے دوسرے آثار آج بھی ان کی عظمت اور اہمیت کو یاد دلاتے ہیں۔ بیجاپور کا گول گنبد، ابراہیم روضہ اور سیکڑوں خوش نما مسجدیں، گولکنڈے کا عظیم الشان قلعہ، بادشاہوں کے گنبد، حیدرآباد کا چارمینار اور مکہ مسجد ان دونوں خاندان کی وہ زبردست یادگاریں ہیں جو آج بھی سیاحوں کو اپنی طرف کشاں کشاں لے آتے ہیں۔ اگرچہ آخری دور میں ان ریاستوں میں بہت سی کمزوریاں پیدا ہو گئی تھیں اور یہ مغلوں کی باج گزار بھی بن گئی تھیں اورنگ زیب عالم گیر نے سلطنت مغلیہ کو کشمیر سے لے کر راس کماری تک وسیع کرنے کے جوش میں ان کا خاتمہ کر کے خود اپنی سلطنت کو ہمیشہ کے لئے کمزور اور زوال پذیر کر دیا۔

سب سے پہلے عادل شاہی ریاست ہی اس کی جوع الارض کا شکار بنی اور یوسف عادل شاہ نے ۸۹۵ھ میں جس ایوانِ حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی وہ دو سو سال قائم رہ کر منہدم ہو گیا۔ یوسف اصل میں ترکی شہزادہ اور سلطان مراد کا دوسرا بیٹا تھا شیر خوارگی کے زمانے میں باپ کے انتقال اور بھائی کی تخت نشینی کے بعد اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس لئے ماں نے بڑی دانش مندی اور چالاکی سے اس کو موت کے منہ سے چھڑا کر خواجہ عماد الدین گرجانی نامی تاجر کے ساتھ راتوں رات قسطنطنیہ سے باہر بھیج دیا سوداگر مذکور یوسف کو لے کر ایران پہنچا اور یہاں شہر ساوہ میں سکونت اختیار کی، یوسف کا ابتدائی زمانہ ایران میں ہی گزرا اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ جب جوان ہوا تو خواجہ عماد کے ساتھ بطریقِ تجارت و سیاحت ۸۶۴ھ میں ہندوستان میں داخل ہوا۔

ان دنوں ہندوستان میں بہمنیہ سلطنت اپنے پورے عروج پر تھی۔ سلطان محمد بہمنی کا دربار خود اس کی اولوالعزمی اور عالی حوصلگی اور اس کے وزیر خواجہ جہاں خواجہ محمود گاواں کے تدبر اور حسن انتظام کی وجہ سے مرجع خلائق بنا ہوا تھا۔ یوسف بھی ہندوستان آیا تو سیدھے خواجہ محمود گاواں کے ہاں باریاب ہوا، خواجہ جہاں نے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا جہاں اس کی قابلیت کے جوہر کی آزمائش کے بعد اس کو شاہی چیلوں یا مقربین خاص کے زمرے میں شریک کر لیا گیا۔ سلطان محمود بہمنی کے دربار میں یوسف نے اپنی علمی اور فوجی قابلیتوں کے متعدد ثبوت دیئے اور ہر قسم کے انعامات اور اعزازات سے سرفراز ہوتا گیا۔ یوسف عادل خاں اور ملک الشرق کے خطابات بھی پائے اور کئی سیر حاصل پرگنے بھی جاگیر کے طور پر ملے۔ مختلف موقعوں پر میدان جنگ کی سرکردگی اور فوجوں کی سپہ سالاری کے فرائض انجام دینے کے علاوہ پہلے عنبر کا عامل اور بالآخر سلطنت کے بہت بڑے صوبہ بیجاپور کا طرف دار یعنے گورنر مقرر ہوا۔

سلطان محمود اور اس کے وزیر خواجہ جہاں دونوں کی موت سے سلطنت بہمنیہ روز بروز کمزور ہوتی گئی۔ بریدی امیر نے بادشاہ کو

سلاطین بیجاپور

یوسف عادل شاہ

اسمعیل عادل شاہ

اپنے ہاتھ میں کٹھ پتلی بناکر خود حکومت شروع کردی اور سلطنت بہمنیہ تباہی کے قریب ہوگئی تو یوسف نے احمد نظام الملک طرفدار احمد نگر کی تحریک سے دوسرے صوبہ داروں کی طرح یہ خود مختاری کا اعلان کیا اور ۸۹۵ھ یا ۸۹۶ھ عادل خاں کی بجائے عادل شاہ کا لقب اختیار کرکے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کیا۔

یوسف عادل شاہ

خود مختار ہوتے ہی یوسف عادل شاہ اپنی ریاست کے اندرونی و بیرونی استحکام میں ہمہ تن مصروف ہوگیا۔ قاسم برید نے نیم راج مہاراجہ بیجانگر اور بہادر گیلانی کو اس کے خلاف اکسایا۔ اولاً عادل شاہ کے دو تین زرخیز علاقوں پر دشمنوں کا قبضہ ہوگیا لیکن بالآخر اس نے کئی موقوں میں دشمنوں کا مقابلہ کرکے ان سے نہ صرف اپنے علاقے واپس لے لیے بلکہ ایک مدت کے لئے اُن کو خاموش کردیا۔ بیرونی استحکام سے فراغت پاکر جب وہ اندرونی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا تو اس سلسلے میں بھی بڑی مشکلات کا سامنا ہوا وہ نہ صرف شیعہ عقائد کی طرف مائل ہوگیا تھا بلکہ اپنی ریاست پر شیعیت کو سرکاری مذہب کی طرح رائج کرنے پر مُصر بھی تھا۔ اس کے تمام امرا، خاص و عام سب سنّی تھے۔ بادشاہ کے اس ارادے اور راج ہٹ نے بڑی زبردست اندرونی فساد اور ایک بیرونی جنگی طوفان کی صورت اختیار کرلی ۹۰۹ھ میں کمزور بہمنی بادشاہ محمود شاہ اس کا منتیہ اور نائب السلطنت قاسم برید جو عملاً بیدر کا بادشاہ تھا، احمد نظام شاہ والی احمد نگر اور قلی قطب شاہ فرماں روائے گولکنڈہ چاروں متحد طور پر بیجاپور پر حملہ آور ہوئے اور یوسف عادل شاہ کو سوائے وہاں سے بھاگ جانے کے اور کوئی چارہ نہ رہا۔ وہ بھاگ کر خاندیس میں عماد الملک کے پاس پناہ گزین ہوا۔ یہاں اس نے اپنے خیالات سے دست برداری کی قسم کھائی اور عماد الملک نے بیچ میں پڑ کر چاروں حملہ آوروں سے معذرت کی اور اُن کے لشکر واپس کرائے۔ یوسف کی خوش قسمتی تھی کہ ریاست دوبارہ مل گئی اور ایک زبردست فتنہ ختم ہوگیا۔ اگرچہ یوسف نے شیعہ عقائد کی ترویج نہ کرنے کی قسم کھائی تھی لیکن وہ ارادے سے باز نہ آیا اور جب دوبارہ اپنے تخت پر مستحکم ہوگیا تو اس نے زیادہ اہتمام اور ہوشیاری کے ساتھ بالآخر شیعیت اختیار کی اور بعد کو اس کے خاندان اور ریاست کا سرکاری مذہب اثنا عشری ہی قرار دیا۔

یوسف نے کم و بیش بائیس سال حکومت کی اور (۷۵) سال کی عمر میں ۹۱۶ھ میں وفات پائی اور حسب وصیت اس کی جاگیر جو بہمنی بادشاہ کی عطا کی ہوئی تھی، قصبہ کوگی (نصرت آباد) میں حضرت شاہ چندا حسینی کے پائیں دفن کیا گیا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے بیٹے اسماعیل کو اپنا جانشین کرکے مسند نشینی کے رسوم ادا کردیے تھے۔ اسماعیل کے علاوہ اس کی اولاد میں تین لڑکیاں، مریم سلطانہ، خدیجہ سلطان اور بی بی ستی تھیں۔ یہ سب اور اسماعیل اس کی بیوی پونجی خاتون کی اولاد تھیں جو ایک دکنی خاتون تھی۔ مریم سلطان برہان نظام شاہ کو، خدیجہ سلطان علاء الدین عماد الملک اور بی بی ستی احمد شاہ بہمنی سے بیاہی گئیں۔ یوسف ملک گیری اور ملک داری کے علاوہ اعلیٰ علمی لیاقت سے بہرہ ور متصف تھا وہ فارسی کا اچھا شاعر اور خط نستعلیق کا عمدہ خوش نویس تھا۔ فن موسیقی کا بھی شایق اور طنبورا اور عود بجانے میں مہارت رکھتا تھا۔ اس کی علم دوستی کی

وجہ سے بہت سے لایق اور قابل افراد اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے ۔ اس کو تعمیر عمارات کا کوئی زیادہ موقع نہیں ملا۔ بریں ہم اس کے عہد کی بعض عمارتیں ہیں مگر بہت شکستہ حالت میں ۔ وہ عام طور پر عدل و انصاف میں کافی شہرت رکھتا تھا اور اپنی شجاعت کی طرح سخاوت میں دور دور مشہور تھا ۔

اسماعیل عادل شاہ ۱۵۱۰ء - ۱۵۳۴ء

یوسف عادل شاہ نے اپنی زندگی سے مایوس ہو کر اپنے سامنے ہی اپنے اکلوتے بیٹے اسماعیل کو مسند نشین کر دیا تھا اور انصرام امور سلطنت کے لئے کمال خاں دکھنی کو وزیر اعظم کے علاوہ کمسن بادشاہ کا متولی (ایجنٹ) بھی قرار دے دیا تھا اس وقت اسماعیل کی عمر بارہ ، تیرہ سال سے زیادہ نہیں تھی ۔ کمال خاں جو داراب جردی کے نام سے بھی موسوم ہے ، پونجی خاتون کے مشورہ اور ہدایت سے ریاست کے کاروبار تن دہی اور ہوشیاری سے انجام دیتا رہا ۔ ہمسایہ ریاستوں کے ساتھ تعلقات میں جو کشیدگی چلی آ رہی تھی اس کو اپنے حسن تدبیر سے بہت جلد دور کر دیا اور گوا بندرگاہ کے پرتگالیوں سے جن کی سرکوبی یوسف عادل شاہ نے بھی کی تھی مصلحت وقت کے تحت صلح کر لی اور اطمینان کے ساتھ ریاست کی اندرونی اصلاحات کی طرف متوجہ ہوا لیکن چند سال فراغت اور اطمینان سے حکمرانی کرنے کے بعد اکثر متولیان ریاست کی طرح اس کی نیت بدل گئی اور اس نے بادشاہ کی کم سنی اور خارجی سیاسی حالات کے مدنظر خود بادشاہ بن بیٹھنے کی ٹھان لی ۔ اس کی حرکات سے پونجی خاتون اور دیگر شاہ پرست افراد بے خبر نہیں تھے مگر اس کے غیر معمولی اثر و اقتدار اور چالاکیوں کے آگے ان کی ایک نہیں چلتی تھی ۔ بادشاہ محل میں قیدی کی طرح تھا اور کمال خاں کے آدمی اس کی ذرا ذرا سی نقل و حرکت پر نظر رکھتے تھے ۔

باوجود اس سخت انتظام کے پونجی خاتون نے ایک تدبیر ایسی نکالی کہ اس کا کانٹا ہمیشہ کے لئے نکل گیا ۔ پونجی خاتون نے اسماعیل نامی ایک غلام کے ذریعے بڑی ہوشیاری سے کمال خاں کا کام تمام کر دیا اور پھر اس کے بیٹے صفدر خاں کی لشکر کشی پر بڑی مردانہ ہمت سے اس کا مقابلہ کر کے بالآخر اس کو بھی ختم کیا اور اسماعیل کو خود سر متولی کے پنجے سے ہمیشہ کے لئے رہائی دلائی ۔ اسماعیل نے خود مختار ہو کر دکھنیوں اور حبشیوں کو خدمات سے الگ کر کے مغلوں کو ان کی جگہ مامور کیا ۔ خسرو آغا لاری کو جو اس کا طرف دار تھا اور کمال خاں کے مقابلے پر بڑی ساتھ داری کی تھی اسد خاں لاری کے خطاب سے سرفراز کر کے کئی علاقے بھی بطور جاگیر عطا کئے اور مہمات سلطنت میں اس کو مشیر اور وزیر بنایا ۔

اسماعیل کی زندگی کا بڑا حصہ جنگ میں گزرا ۔ اس کے عہد میں متعدد جنگیں ہوئیں ۔ سب سے پہلے قاسم برید سے جنگ چھڑی ۔ قاسم برید نے برہان نظام شاہ ، قلی قطب شاہ اور علاء الدین عماد الملک کی مدد سے بیجاپور پر چڑھائی کر دی ، مگر اسماعیل نے ان چاروں سے مقابلہ کیا اور شکست دی ۔ سب کی فوجیں تتر بتر ہو گئیں سلطان محمود شاہ بہمنی اور اس کا بیٹا احمد شاہ جو بریدی لشکر کے ہمراہ تھے ، اسماعیل کے ہاتھ گرفتار ہو گئے ۔ اسماعیل نے ان دونوں کو بہت احترام اور خاطر تواضع سے مہمان رکھا اور پھر اپنی بہن ستی بی بی کی شادی احمد شاہ سے بہت اہتمام کے ساتھ بمقام گلبرگہ انجام دے کر دونوں کو بیدر واپس کیا ۔

اسماعیل کے عہد کی دوسری جنگ راجائے بیجانگر سے ہوئی ، بیجانگر کے راجہ نے اپنی سرحد کے استحکام کے لئے رائچور اور مدگل کے قلعے اور ان کے آس پاس کے علاقے کو فتح کرنے کے لئے ایک بڑے جرار لشکر سے ۱۵۲۰ء میں بڑی معرکتہ الآرا جنگ کی ۔ اسماعیل اور اس کے سپہ سالاروں نے بڑی مردانگی سے مقابلہ کیا مگر بدقسمتی سے شکست اٹھائی ۔ اس جنگ میں ناکامی سے اسماعیل کی طاقت اور شہرت کو بہت دھکا لگا اور وہ

عرصہ دراز تک بیجانگر والوں سے جنگ آزمانہ ہوا بہت دنوں کے بعد رائچور کو دوبارہ فتح کیا اس زمانے میں اس نے اپنی طاقت بڑھانے کے لئے دوسرے ہمسایہ بادشاہوں سے تعلقات مضبوط کرنے کی کوشش شروع کی ۔ سنہ ۹۳۰ھ میں اسدخاں کی توجہ سے برہان نظام شاہ اور مریم سلطان ہمشیرہ اسماعیل کی شادی ہوگئی مگر یہ شادی بجائے تعلقات کو بہتر بنانے کے دشمنی و عداوت میں اضافے کا موجب بنی ۔ شادی کے وقت طے ہوا تھا کہ قلعہ شولاپور جہیز میں دیا جائے گا مگر بعد کو اسماعیل نے انکار کیا ۔ نظام شاہ نے بہ زور شمشیر فتح کرنے کی ٹھان لی اور مین ۔ تبہ زبردست معرکہ آرائی ہوئی مگر برموقت نظام شاہ کو شکست ہوئی ۔ آخر تک یہہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن بنے رہے ۔

اسدخاں نے اتحاد بڑھنے کے سلسلہ میں اسماعیل کی دوسری بہن خدیجہ سلطان کی شادی علاءالدین عمادالملک بادشاہ برار سے طے کرادی اس کے کچھ دن بعد ہی قاسم برید نے جو اس عرصے میں کسی قدر طاقتور ہوگیا ' اسماعیل سے جنگ کی طرح ڈالی اس کو قلی قطب شاہ اور والی بیجانگر کی تائید بھی حاصل تھی ' اسماعیل اس کی دراز دستیوں سے تنگ آکر دس ہزار سپاہ کا لشکر لئے ہوئے اس پر حملہ آور ہوا اور بری طرح اس کو شکست دے کر قلعہ بیدر پر قابض ہوگیا ۔ قاسم برید قید ہوا اور بہت دنوں کے بعد اسماعیل کی مہربانی سے پھر اپنے علاقے پر حکمران بنا کر ۔ جو داس ن سلوک کے اسماعیل کے ساتھ اس نے دوستی او وفاداری نہیں کی ۔

اسماعیل نے ان جنگوں سے فراغت پا کر کچھ دن اصلاح ملک میں صرف کئے تھے کہ موت کا پیغام آپہنچا اور ۱۵۳۴ء (سنہ ۹۴۱ھ) میں حوالی سگر میں اس کا انتقال ہوگیا اور اپنے باپ کے پہلو میں دفن کیا گیا ' اسماعیل نے کل (۲۴) سال حکومت کی وہ بڑا بہادر اور فیاض واقع ہوا تھا ' اس نے محض اپنی فیاضی سے قاسم برید کو پھر بیدر جیسا زرخیز علاقہ دوبارہ بخش دیا ' بدقسمتی سے اس کا تمام تر زمانہ جنگوں میں گزرا ملک کی اندرونی اصلاح کی طرف کبھی خاطرخواہ توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا ' اس کی اولاد میں چار لڑکے ملوخاں ' علوخاں ' ابراہیم خاں و عبداللہ خاں باقی تھے ' عقیدتاً وہ شیعہ تھا اور اس کے عہد میں کمال خاں کے زوال کے بعد سے مغلوں اور ایرانیوں کا عروج رہا ۔ اس کو شاعری اور موسیقی سے بھی بہت دلچسپی تھی اور تاریخوں میں اس کے اشعار جستہ جستہ منقول ہیں ۔

ابراہیم عادل شاہ اول ۱۵۳۴ء — ۱۵۵۰ء

اسماعیل کی وفات پر اس کے حسب وصیت اسدخاں غازی نے اس کے بڑے بیٹے ملوخاں کو تخت نشین کیا اور اس کی نظر بندی ، الوا ہی نے مدنظر خود کنارہ کش ہوکر اپنی جاگیر بلگام چلا گیا ' چھ مہینے کے اندر ملوخاں نے اپنی نالائقی سے ساری رعایا برایا کو اپنے سے متنفر کردیا آخرکار اس کی دادی پونجی خاتون کے ایما سے وہ تخت سے الگ کیا گیا اور ابراہیم خاں " ابراہیم عادل شاہ " کے لقب سے تخت نشین ہوا

ابراہیم کی تخت نشینی کے ساتھ ہی اسدخاں کو پونجی خاتون کے حکم سے پھر کاروبار سیاست میں حصہ لینا پڑا ابراہیم خود بھی بہت بہادر اور تیز فہم نوجوان تھا ۔ وہ اسدخاں کے مشورے سے کاروبار کرنے لگا ' ابھی ایک سال نہیں گزرا تھا کہ والی بیجانگر سے لڑائی ہوئی مقابلہ بہت سخت تھا مگر اسدخاں کی تجربہ کاری کام کرگئی ' اس نے ادھونی کے مقام پر بیجانگر کے لشکر کو شکست فاش دے کر ابراہیم کا سکہ بٹھا دیا بادشاہ نے خوش ہوکر اسدخاں کے مراتب میں اور بھی اضافہ کیا مگر کچھ دنوں کے بعد سازشیوں نے بادشاہ کو اس سے بدظن کردیا اور وہ کنارہ کش ہوکر پھر بلگام چلا گیا ۔

بادشاہ اور سپہ سالار کی اس ناچاقی سے فائدہ اٹھا کر برہان نظام شاہ حملہ آور ہوا اور قلعہ شولاپور جس کے لئے وہ اسماعیل کے زمانے میں

تین مرتبہ ناکام کوشش کر چکا تھا، فتح کرلیا اور بیجاپور کی طرف پیش قدمی کرنے لگا۔ اسد خاں کی وفاداری اس کو کسی طرح روا نہیں رکھ سکتی تھی وہ پھر ابراہیم سے آملا اور عماد الملک والی برار کی امداد سے نہ صرف قلعہ شولاپور واپس لے لیا بلکہ برہان نظام شاہ کو بیڑ تک مار بھگایا۔

نوجوان ابراہیم سے شکست کھا کر برہان نے پہلے سے زیادہ تیاریاں کیں اور رام راج والی بیجانگر، جمشید قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ اور علی برید تینوں کو اپنے ساتھ ملا کر پھر ۱۵۴۶ء میں چڑھائی کی۔ اس موقع پر اسد خاں کی حسن تدبیر سے رام راج ان سے الگ کردیا گیا اور شولاپور کا قلعہ جو اصل میں سارے جھگڑے کا باعث تھا، بغیر لڑائی کے نظام شاہ کے حوالے کردیا گیا اور اسد خاں نے ان دونوں کا تصفیہ کرنے کے بعد جمشید قلی قطب شاہ کا مقابلہ کیا اور اس کو بے طرح شکست دی۔ باوجود اس حکمت عملی اور حسن تدبیر کے لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ برہان نظام شاہ اور والی بیجانگر اور برہان کے جانشین حسین نظام شاہ نے ابراہیم سے کئی مرتبہ لڑائیاں کیں اور بہت کچھ خوں ریزی ہوئی مگر آخر کار ابراہیم ہی کامیاب رہا۔

ان لڑائیوں کے دوران میں اسد خاں سے وقتاً فوقتاً ابراہیم کو بڑی مدد ملتی رہی مگر اس کے مخالف ہمیشہ بادشاہ کو اس کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے بالآخر کچھ تو پیری کی وجہ سے اور کچھ بادشاہ کی ناراضی دیکھ کر اسد خاں بلگام میں گوشہ نشین ہوگیا۔ اسد خاں کے بعد احمد نگر کا سپہ سالار جو عین الملک کے خطاب سے مفتخر ہو کر ابراہیم کا ملازم ہوگیا تھا، اس کے لشکر کی سپہ سالاری کرتا رہا مگر وہ بہت جلد باغی ہوگیا۔

ابراہیم اگرچہ بڑا بہادر سپاہی اور اہل سیف کا بہت قدردان تھا مگر اس کی سختی کی وجہ سے بہت سے لوگ ہمیشہ اس سے ڈرتے رہتے تھے اسی خوف نے دشمنی کی شکل اختیار کی اور سلسلہ یہاں تک بڑھا کہ اس کو معزول کرنے اور اس کے بھائی عبداللہ کو بادشاہ بنانے کی سازش ہونے لگی۔ سازش کا راز فاش ہوتے ہی عبداللہ بھاگ کر گوا میں پرتگالیوں کے ہاں پناہ گزین ہوا۔ اور چند روز کے لئے ان کی حمایت سے اپنی بادشاہی کا اعلان بھی کرایا مگر ابراہیم کی زبردست فوجی قوت اور اس کے لشکریوں کی وفاداری سے عبداللہ کو کبھی اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی، پرتگالی بھی اس قضیے میں پھنس کر نفع کی بجائے ہمیشہ فوجی نقصان برداشت کرتے رہے۔

ابراہیم اپنے باپ کی طرح علم دوست بھی تھا اور میدان جنگ میں اس کی شجاعت و بہادری ہمیشہ لائق ستائش رہی مگر تند خو اور سخت گیر بھی بہت زیادہ تھا۔ اپنی علالت کے زمانے میں جس کا سلسلہ تقریباً دو سال رہا، جلد صحت یاب نہ ہونے پر بگڑ کر کئی طبیبوں کو قتل کر ڈالا اور بعض کو ملک بدر کردیا وہ اپنی اولاد کے ساتھ بھی سختی کرنے سے باز نہیں رہتا تھا۔ اس کا دوسرا فرزند علی بڑے بھائی کے مقابلے میں جو ولی عہد تھا بہت نیک تھا اس نے کمسن شہزادے کو اپنے ولی عہد کے حق میں مضر سمجھ کر نہایت بے دردی سے کم عمری میں ہی قلعہ مرج میں قید کردیا تھا۔

ابراہیم نے کم و بیش (۲۴) سال حکومت کرکے ۱۵۵۷ء (۹۶۵ھ) میں وفات پائی اور اپنے باپ دادا کے پہلو میں بمقام نصرت آباد (گوگی) دفن کیا گیا اس کے کل چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ بڑا اسماعیل ولی عہد مگر بہت غبی اور کودن تھا۔ منجھلا علی بہت زیرک تھا اور وہی باپ کے بعد اس کا جانشین ہوا، دوسرے دو لڑکوں کے نام طہماسپ اور احمد تھے۔ لڑکیوں میں ایک تانی بی بی علی برید سے بیاہی گئی تھی اور دوسری جس کا نام ہادیہ سلطان بتایا جاتا ہے مرتضیٰ نظام شاہ بحری سے منسوب تھی۔

اگرچہ ابراہیم کا زمانہ زیادہ تر لڑائیوں میں گزرا لیکن اس نے اس پر بھی بہت سے کام اصلاح و ترقی ملک کے لئے ۹۳۳ھ میں ابراہیم پور کے نام ایک شہر آباد کیا اور وہاں ایک عالی شان مسجد بنائی۔ ۹۳۵ھ میں سولہ کھمبی محل تعمیر کرایا۔ نیز غالب مسجد جس میں صرف روشنی کے لئے ۳۰۳ طاقچے تھے اور جامع مسجد جو درگاہ حضرت جعفر سقاف سے متصل ہے اسی کی بنائی ہوئی ہیں ان کے علاوہ اس کے عہد میں بیجاپور اور رائچور کے قلعوں کی فصیلوں کی درستی اور استحکام کا کام بھی انجام پایا۔

سلاطین بیجاپور

سلطان ابراہیم عادل شاہ اول
سنہ ۹۴۱ھ تا سنہ ۹۶۵ھ

سلطان علی عادل شاہ اول
(شوہر چاند سلطانہ)
سنہ ۹۶۵ھ تا سنہ ۹۸۸ھ

علی عادل شاہ اوّل

۱۵۵۷ء - ۱۵۸۰ء

شہزادہ علی کو قلعہ مرج میں قید کر دیا گیا تھا مگر قید میں بھی اس کی تعلیم و تربیت بہت ہی اعلیٰ درجہ کی ہوئی تھی اور وہ اپنے سب بھائیوں سے زیادہ لائق تھا۔ باپ کے عقائد کے خلاف وہ شیعہ عقائد کی طرف مائل تھا اور اس کے اتالیق، رفیق اور نگران بھی بہت ہوشیار لوگ تھے ابراہیم کی موت کے منتظر تھے انھوں نے ابراہیم کے مرنے سے پہلے ہی اس کی بادشاہت کے منصوبے پورے کر لیے۔ ادھر ابراہیم فوت ہوا اور ادھر علی کی بادشاہی کا اعلان دیں قلعہ مرج سے کر دیا گیا۔ چند ہی روز میں بیجاپور علی نے اپنے دوسرے بھائیوں کو جو باپ کے مرتے ہی قید ہو گئے تھے اندھا اور ناکارہ کر دیا اور بے کھٹکے بادشاہت کرنے لگا۔ اس کو چونکہ شیعہ عقائد میں سخت تر غلو تھا اس لئے اس نے اہل ایران کو کثرت سے بیجاپور میں جمع کیا اور شیعہ عقاید کی ترویج میں بہت شدت دکھائی لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی فیاضی اور داد و دہش اس قدر زیادہ تھی کہ مذہب کے معاملے میں اس کی سختی پر غالب آ گئی اگرچہ سنی مسلمان اس کی حرکات اور خصوصاً تبرا پسندی سے سخت ناراض تھے لیکن اس کے احسان عام نے "مذہبی جنگ" کو روک دیا

اس کی تخت نشینی پر والی بیجانگر نے مبارک باد دی اور دوستی کی طرح ڈالی مگر اس کے برخلاف حسین نظام شاہ والی احمد نگر نے بد اخلاقی دکھائی اسی لئے بیجاپور اور بیجانگر کے تعلقات بہت بڑھ گئے۔ دونوں ملکوں کے فرماں رواؤں نے حسین نظام شاہ سے ۹۶۷ھ میں مقابلہ ہوا اور اس کو بہت نقصان پہنچایا۔ پھر اگلے سال دونوں نے مل کر اس کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ اس دفعہ حسین نظام شاہ نے ابراہیم قطب شاہ کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا مگر علی عادل شاہ نے ابراہیم کو اس سے الگ کر دیا۔ اس دفعہ احمد نگر کی ریاست بری طرح تباہ ہو گئی اور تینوں نے مل کر حسین نظام شاہ کو بہت ستایا ان دونوں جنگوں میں والی بیجانگر اور اس کے لشکر نے بیجاپوریوں کی احسان مندی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عام طور پر ایسی حرکات کیں جن سے مسلمانوں کی سخت دل آزاری ہوئی ان کی مسجدیں توڑ ہی نہیں ڈالیں بلکہ بت خانوں سے بدل دیں نیز بیجاپور اور گولکنڈہ کے بہت سے علاقے دوستی کے پردے میں چھین لئے، دولت اور مال غنیمت کی کثرت نے والی بیجانگر کو بے حد خود سر بنا دیا تھا جس کی وجہ سے علی عادل شاہ اور دوسرے فرماں رواؤں کو سخت خطرہ لاحق ہو گیا۔ اس اتفاقی موقع سے فائدہ اٹھا کر بیجاپور نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور ایک ایک کر کے ان اسلامی ریاستوں کو ختم کرنے کی تدبیریں ہونے لگیں۔ اور ہر موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے بیجاپور، احمد نگر، گولکنڈہ کے بادشاہ بھی اپنی پچھلی عداوتیں بھلا کر متحد ہو گئے اور ۹۷۲ھ میں سب نے مل کر تالی کوٹ کے میدان میں بیجانگر والوں سے فیصلہ کن مقابلہ کیا، میدان اتحاد کے ہاتھ رہا، بیجانگر کا شہر تاراج ہو گیا اور اس کی سلطنت کو بھی ایسا دھکا پہنچا کہ وہ پھر پنپ نہ سکی۔

اگرچہ بیجانگر سے جنگ کرنے کیلئے اتحاد بڑے زور شور سے عمل میں آیا تھا اور حسین نظام شاہ کی بیٹی چاند بی بی کی شادی علی عادل شاہ سے اور علی عادل شاہ کی بہن کی شادی حسین نظام شاہ کے بیٹے مرتضیٰ نظام شاہ سے ہوئی تھی لیکن باوجود ان سب باتوں کے ان ریاستوں میں پھر لڑائی جھگڑے شروع ہوئے اور علی عادل شاہ برابر آخر تک جنگوں میں گھرا رہا

علی عادل شاہ لاولد تھا اس لئے اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بھتیجے ابراہیم ابن طہماسپ کو ۹۶۰ھ میں اپنا ولی عہد قرار دے دیا تھا ابھی اس بات کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اگلے ہی سال یعنی ۹۸۸ھ م ۱۵۸۰ء میں علی عادل شاہ ایک خائن غلام کے ہاتھ قتل ہو گیا۔ اس کی مدت حکومت (۲۳) سال اور عمر (۴۷) سال تھی۔ اس کی وفات سے ریاست بیجاپور کو بہت نقصان پہنچا کیونکہ گو اس کا جانشین ابراہیم بعد کو بہت بڑا بادشاہ ثابت ہوا لیکن اس کی کمسنی کے زمانے میں منتظموں نے ریاست کو بہت کمزور کر دیا۔

علی عادل شاہ کو تعمیر عمارت کا بہت شوق تھا۔ اس کے عہد میں جو عمارتیں بنیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں سے خاص طور پر مشہور یہ ہیں۔ قلعہ شاہ درگ (نلدرگ) فصیل قصبہ شاہ پور، نہر کشور خانی، پریا محل، آنند محل، گگن محل، باغ دوازدہ امام، باغ فدک، مسجد جامع چاند باؤلی، قلعہ دھارور، قلعہ بنکاپور وغیرہ۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی ۔ ۱۵۸۰ ۔ ۱۶۲۷ء

جب علی عادل شاہ کے حسب وصیت ابراہیم ابن طہماسپ تخت نشین ہوا تو اس کی عمر صرف نو سال تھی۔ اس کی چچی چاند بی بی کے زیر ہدایت کامل خاں متولی اور مختار ریاست کی حیثیت سے کام کرنے لگا مگر بہت جلد وہ خود سر ہو گیا۔ اس کی جگہ چاند بی بی کے اشارے سے کشور خاں متولی بنا گر وہ بھی چند ہی دنوں میں حد درجے خود سر اور دشمن ملک و مالک ثابت ہوا۔ اس نے تو خود چاند بی بی کو بے حرمتی سے محل سے نکال کر قید کر دیا۔ اس کے مارے جانے پر اخلاص خاں نے متولی کا عہدہ پایا۔ پھر دلاور خاں مختار کل بنا اور اسی کے زمانہ مختاری میں ابراہیم قطب شاہ کی بیٹی اور محمد قلی قطب شاہ کی بہن ملکہ جہاں سے جس کا عرف چاند سلطانہ ہو، ابراہیم عادل شاہ کی شادی ہوئی۔

ان متولیوں کے زمانۂ اقتدار میں آس پاس کے اکثر بادشاہوں نے بیجاپور پر متعدد حملے کئے اور اس کو نقصان پہنچایا اس کے علاوہ متعدد مرتبہ کئی خانہ جنگی اور امرا اور متولیاں ریاست کے جھگڑوں سے بیجاپور کو باوجود خوش حالی کے بہت نقصان پہنچا، دلاور خاں کے زمانہ مختاری میں اسماعیل نے جو ابراہیم کا چھوٹا بھائی تھا ایک بڑی بغاوت کی اور سارے ملک میں ہل چل مچ گئی۔ دلاور خاں کی درپردہ شرارتوں کے باوجود ابراہیم کے اقبال سے اسماعیل کا قلع قمع ہو گیا مگر دلاور خاں بادشاہ کی نظروں میں بے طرح کھٹک گیا۔ اب بادشاہ نے جو سن بلوغ کو پہنچ چکا تھا اور ہر طرح کاروبار ریاست سنبھال سکتا تھا، دلاور خاں کو معزول کر کے ۱۰۰۰ھ عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور بہت کروفر کے ساتھ بیجاپور میں داخل ہوا۔ اس نے چند سے بیرونی جھگڑوں سے الگ رہ کر اندرون ملک کی اصلاح و تعمیر شروع کی ۱۰۰۸ھ میں ایک نئے شہر نورس پور کو آباد کیا اور رفتہ رفتہ دیگر بہت سی عمارتیں بنائیں۔ شعرا و علما سے اپنے دربار کو آراستہ کیا، فن موسیقی کے بڑے بڑے ماہرین کو جمع کیا کیونکہ اس کو اس فن سے طبعی لگاؤ اور اس میں ید طولی حاصل تھا۔ اس کی کتاب نورس آج تک مشہور ہے۔

اس کے خود مختار ہونے سے کچھ دنوں قبل ہی چاند بی بی اپنے میکے چلی گئی اپنی آبائی ریاست احمد نگر کو جو ابراہیم نظام شاہ کی جوان مرگی کی وجہہ سے بے طرح خود غرض امرا کی تباہ کاریوں کا شکار بنی ہوئی تھی۔ سنبھالنے کی کوشش کی۔ مغلوں نے اس پر پے در پے حملے کر کے اس کے اکثر حصوں کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ شہنشاہ اکبر کی فتوحات کا سلسلہ اور آگے بڑھا۔ اس نے ابراہیم عادل شاہ سے بھی خراج طلب کیا اور ابراہیم نے اس کے مقابلے میں اپنے کو کمزور پا کر خراج منظور کر لیا۔ اس کے بعد مغلوں کا زور اور بھی بڑھ گیا۔ ابراہیم نے اکبر کے پیغام بھیجنے پر اپنی لڑکی سلطان بیگم کی شادی شہزادۂ دانیال سے کر دی۔ اکبر کے بعد جہانگیر اور اس کے بیٹے شہزادہ خرم نے دکن کے کئی علاقوں پر جو عادل شاہی نظام شاہی اور قطب شاہی ریاستوں کی ملک تھے اپنا قبضہ جمایا۔ ابراہیم نے بیدر پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا۔ ادھر ملک عنبر نے بیجاپور پر حملہ کیا اور ابراہیم کے آباد کئے ہوئے نورس پور کو ہمیشہ کے لئے تباہ و تاراج کر دیا اور خود بھی چند ہی روز میں فوت ہو گیا۔ ابراہیم کو اس کا بڑا رنج ہوا مگر ملک عنبر کے مر جانے کی وجہہ سے وہ اس سے بدلہ نہ لے سکا۔

ابراہیم نے پورے (۴۷) سال حکومت کی اور ۱۶۲۷ء (۱۰۳۷ھ) میں انتقال کیا۔ اس نے متولیوں کا دور ملازمت ختم ہونے کے بعد

سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی
(نورس)
۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ

سلطان محمد عادل شاہ
۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۷ھ

تیس سال تک زاید مدت تک جو خود مختارانہ حکومت کی وہ زمانہ زیادہ تر پُرامن رہا اور اس عرصے میں اس نے ریاست کی اندرونی اصلاح کے بہت سے کام کئے۔ اس کو تعمیر عمارات کا بہت شوق تھا۔ اس کے عہد میں کثرت سے عمارتیں بنی ہیں مثلاً آثار محل، آنند محل، مسجد ملکۂ جہاں، نورس محل یا سنگت محل، نورس پور کی عمارات وغیرہ ابراہیم روضہ اس کے عہد میں بہت سی اور بھی تمدنی ترقیاں ہوئیں اور نئی رسوم و تقاریب کا اضافہ ہوا جیسے عید نورس وغیرہ، اس کا مقبرہ جو ابراہیم روضہ کے نام سے مشہور تعمیری نقطۂ نظر سے ایک بہترین یادگار ہے اور اپنی گل کاریوں اور نقش و نگار کے اعتبار سے دکن کا تاج محل سمجھا جاتا ہے۔

اس کے کل چھ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں جو مختلف محلات کے بطن سے تھے۔ بڑا بیٹا درویش بادشاہ محمد قلی قطب شاہ کی بہن ملکۂ جہاں کے بطن سے تھا مگر ابراہیم اس کی ماں سے ناراض تھا علاوہ ازیں چھوٹا سلطان محمد اس کے مقابلے میں باپ کا منظور اور زیادہ لایق تھا اس لئے اس کو اپنا جانشین کیا۔

محمد عادل شاہ ۱۶۲۷ء - ۱۶۵۷ء

جس وقت سلطان محمد اپنے مرحوم باپ کے حسب وصیت تخت نشین ہوا اس کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ مرزا محمد امین لاری، دولت خاں، آقا رضا اور دیانت الملک وغیرہ مختلف عہدوں پر مامور کئے گئے اور یہی نوجوان بادشاہ کے مشیر اور مددگار تھے اگرچہ بادشاہ کم عمر تھا لیکن اپنی ذہانت طبعی سے فوراً فوج کی اصلاح میں مصروف ہو گیا۔ چند ہی دن کے بعد نظام شاہی خاندان کے فرماں روا نے چڑھائی کی ابھی زیادہ معرکہ آرائی نہیں ہوئی تھی کہ صلح ہو گئی مگر یہ دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ دوبارہ نظام شاہی فوج حملہ آور ہوئی اور بری طرح شکست کھائی۔ اس واقعہ کے بعد نظام شاہی ریاست روز بروز کمزور ہونے لگی امرا اور صوبہ دار جو پہلے سے خود سر بن بیٹھے تھے بہت کچھ خود مختار ہو گئے رہی سہی طاقت مغلوں کے پے در پے حملوں نے توڑ دی بہت سے علاقے محمد عادل شاہ کے قبضے میں آ گئے۔

شاہ جہاں نے جب یہ دیکھا کہ محمد عادل شاہ قوی سے قوی تر ہوتا جا رہا ہے تو اس نے نظام شاہی ریاست کے مفتوحہ علاقوں کی واپسی کی پہلے سے چھیڑ چھاڑ شروع کی اور نہایت تکلیف دہ مراسلے بھیجے۔ محمد عادل شاہ نے ان کا نرمی سے جواب دیا۔ بعض نمک حرام امرائے عادل شاہی کی ریشہ دوانیوں سے شاہ جہاں کو پیش قدمی کے اچھے موقعے مل گئے وہ جلد ہی دولت آباد تک آ پہنچا۔ محمد عادل شاہ نے بیجا پور میں قلعہ بند ہو کر شہر کے اطراف میلوں تک وسیع میدانوں کو بے آب و گیاہ بنا دیا تاکہ مغل فوج محاصرہ نہ کر سکے۔ چنانچہ اس کی یہ تدبیر کامیاب رہی۔ مغلوں نے بیجا پور کا محاصرہ تو کیا مگر اس کو فتح نہ کر سکے اور مجبوراً صلح پر آمادہ ہو گئے۔ عادل شاہ نے بھی اس شرط پر صلح کر لی کہ رود کرشنا کے اس طرف کا تمام علاقہ شاہ جہاں کے قبضے میں دے دیا جائے اور اس طرف کا سارا علاقہ بدستور بیجا پور کی ریاست میں شامل رہے نیز تاوان جنگ کے طور پر بیس لاکھ روپے شاہ جہاں کو ادا کئے جائیں۔

مغلوں سے پیچھا چھوٹا کر محمد عادل شاہ نے کرناٹک کے سرکش حاکموں سے کئی لڑائیاں کیں اور بہت سے علاقے فتح کر کے اپنی ریاست کو وسیع اور مالا مال کیا اور اپنی ساری توجہ رعایا کی فلاح اور ملک کی اصلاح و ترقی کے کاموں میں صرف کی۔ اس دوران میں برابر شاہ جہاں کی طرف سے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی مگر بہ مقتضائے وقت اس نے جنگ نہیں کیا بلکہ حتی الامکان مغل بادشاہ کے حسب مرضی کام کرتا رہا۔ باوجود اس کے محمد عادل شاہ کے زمانے میں بیجا پور کی ریاست کو کافی وسعت ہوئی اور رعایا کی خوش حالی تو ایسی تھی کہ اگلے کسی بادشاہ کے

دور میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔

محمد عادل شاہ نے فصیلوں اور برجوں کی مرمت کے علاوہ دادمحل، بیگم تالاب وغیرہ کئی عمارات اور متعدد مسجدیں بنائیں جن میں سب سے زیادہ مشہور خود اس کا گنبد ہے محمد عادل شاہ نے ۱۶۵۶ء میں ۱۴۰ سال سے زیادہ عرصے تک حکومت کرکے وفات پائی اور اپنے گنبد میں جو گول گنبد یا بول گنبد کے نام سے مشہور ہے، دفن ہوا۔ یہ گنبد اس قدر بڑا ہے کہ ہندوستان بھر میں کوئی اور گنبد اس کے برابر نہیں۔ اس کی یہ خصوصیت مسلمہ اور مشہور ہے کہ ایک سرے پر کھڑے ہوکر خفیف سی خفیف آواز پیدا کی جائے تو دوسرے سرے پر برابر سنائی دیتی ہے اسی وجہ سے اس کو بول گنبد کہتے ہیں۔ سیکڑوں سیاح اس گنبد کو دیکھنے کے لئے بیجاپور آتے ہیں۔ اس کے عہد میں علوم و فنون کو بہت ترقی ہوئی اور کئی بڑے بڑے شعرا، علما اس کے دربار میں ملازم تھے۔

علی عادل شاہ ثانی ۱۶۵۶ء - ۱۶۷۲ء

علی عادل شاہ ثانی اپنے نامور باپ کا اکلوتا بیٹا تھا خوش قسمتی سے محمد عادل شاہ کی حرم خاص حاجی بڑی صاحبہ نے جو محمد قطب شاہ کی بیٹی تھی، خاص اہتمام سے اس کی پرورش اور تربیت کی اور علوم متداولہ اور فنون متعارفہ میں ماہر بنایا۔ (۱۹) سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور اپنی والدہ کی ہدایت اور خان محمد خاں وزیر ملک اور دیگر معتبر ارکان ریاست کے مشورے سے کاروبار ریاست انجام دینے لگا۔

شاہ جہاں نے جو اپنی سلطنت کے حدود کی توسیع سے ہیچ نہ کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا اس بہانے کہ ریاست بیجاپور سلطنت تیموریہ کی باج گزار ہے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کی اور یہ اعتراض اٹھایا کہ ہماری منظوری کے بغیر علی عادل شاہ کس طرح تخت نشین ہوسکتا ہے۔ اس نے یہاں تک لکھ دیا کہ علی عادل شاہ صلبی فرزند نہیں متبنی ہے اور اس لئے وارث تخت و تاج نہیں مگر علی عادل شاہ ثانی نے ان اعتراضات کے ترکی بہ ترکی جواب دئے جب مراسلت کا کوئی اثر نہیں ہوا تو اسی سال اورنگ زیب نے ایک بڑی فوج لے کر حملہ کیا اور بیدر اور کلیانی کے قلعے فتح کرکے اس کے بعد بیجاپور کا بھی محاصرہ کرلیا۔ ابھی علی عادل شاہ ثانی کو تخت نشین ہوکر ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اس طرح زبردست دشمن سے مقابلہ آن پڑا بیجاپور کے امرا آپس کی ناراضیوں کی وجہہ سے خاطر خواہ متحد اور وفادار نہیں تھے۔ محاصرہ روز بہ روز شدید ہو رہا تھا کہ شاہ جہاں کی علالت کی خبر پاکر خود اورنگ زیب محاصرہ اٹھاکر دہلی کو روانہ ہوا جس وقت مغلوں کا لشکر سرحد پار کر رہا تھا خان محمد وزیر مملکت سے جو سرحد پر مقابلے کے لئے متعین تھا، ملاقی ہوا، خان محمد نے اورنگ زیب کی عاجزانہ التجا اور اس چالبازانہ وعدے کی بنا پر کہ جب تک وہ وزیر مملکت ہے بیجاپور کی طرف مغل کبھی پیش قدمی نہیں کریں گے، اورنگ زیب سے مزاحمت نہیں کی خان محمد کی یہ حرکت جس کی قباحت کا خود اس کو یقین تھا، اس کی موت کا باعث ہوئی۔ اس کے قتل کے بعد ابراہیم خاں وزیر مملکت بنایا گیا۔ اور سپہ سالاری کی خدمت افضل خاں کے سپرد ہوئی۔

ابھی اس طرف سے سکون نہیں ہوا تھا کہ سیواجی نے جو محمد عادل شاہ کی علالت کے زمانے میں قلعہ جنیر پر قبضہ کرلیا تھا، مزید پیش قدمی کی اور کوکن اور اس کے پاس کے علاقوں میں لوٹ مار مچادی اور کئی قلعوں پر قبضہ کرلیا اس کی سرکوبی کے لئے افضل خاں کی سرکردگی میں ۱۶۵۹ء میں فوج روانہ کرنی پڑی مگر سیواجی نے افضل خاں کو دھوکا دے کر تنہائی میں قتل کرڈالا اور پھر اس کی فوج کو پیچھے سے حملہ کرکے اچانک

سلطان سکندر عادل شاہ
۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۷

سلطان علی عادل شاہ ثانی
(شاہی)
۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ

زبردست شکست دی۔ افضل خاں کے بعد سدی جوہر جو اپنی سابقہ سرکشی سے توبہ کرکے حاضر ہوچکا تھا صلابت خاں کا خطاب دے ایک بڑے لشکر کے ساتھ روانہ کیا گیا مگر یہ سیوا جی کی باتوں میں آگیا اور اس کے ساتھ سازش کرکے قلعہ پنالہ پر جو ایک نہایت مستحکم اور اہم قلعہ تھا قبضہ کرلیا۔ اور علانیہ بغاوت شروع کردی۔ اب تو بادشاہ خود لشکر لے کر مقابلے کے لئے نکلا اور ایک معرکے میں پنالہ فتح کرلیا۔ سیوا جی اور سدی جوہر دونوں فرار ہوگئے چلتے ہوئے بادشاہ نے قلعہ منتو میں سدی جوہر کا مقابلہ کیا اور اس دفعہ بھی شکست دی۔ جوہر زخمی ہوا مگر وہاں سے کسی طرح بچ بچاکر قلعہ رانچو میں پناہ گزیں ہوا۔ بادشاہ نے اس قلعہ کو بھی فتح کرلیا۔ سدی جوہر بھاگتے اور شکست کھاتے ہوئے آخرکار سخت بیمار ہوکر مرگیا۔ بادشاہ تلنگانے کے سرکش زمینداروں کو جو خراج ادا نہیں کر رہے تھے گوشمالی کرکے مظفر و منصور بیجاپور واپس ہوا اور سیوا جی سے مصلحت وقت دیکھ کر اس شرط پر ۱۶۶۲ء میں صلح کرلی کہ کوکن اور اس کے قریب کا علاقہ سیوا جی کے قبضے میں رہے اور وہ اس سے آگے نہ بڑھے مگر موقع پاکر سیوا جی نے لوٹ مار شروع کردی اور شائستہ خاں مغل سردار سے مقابلہ کرکے اس کو قید کرلیا۔

اورنگ زیب نے یہ خبر سن کر علی عادل شاہ ثانی سے اس کی سرکوبی میں مدد مانگی اور بیجاپور سے خواصی خاں کی سرکردگی میں ایک لشکر روانہ کیا گیا جس نے سیوا جی کو سخت شکست دی مگر عین وقت پر سیوا جی نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اورنگ زیب کے سالار جے سنگھ کو اپنا دوست بنا لیا اور یہ وعدہ کرکے اپنے قبضے کے اکثر قلعوں کی کنجیاں جے سنگھ کو دے دیں کہ میں آپ کی مدد کرکے عادل شاہی ریاست کا خاتمہ کرڈالتا ہوں اور اس طرح یہ سارا علاقہ اورنگ زیب کی حکومت میں آجائے گا۔ علی عادل شاہ ثانی کو اس کی اطلاع ملتے پر مجبوراً جے سنگھ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ دونوں میں مقابلے ہوئے اور ہر دفعہ جے سنگھ نے شکست کھائی آخرکار ۱۶۶۶ء میں دہلی کو واپس چلا گیا۔ سیوا جی بھی اورنگ زیب کے دربار میں پہنچا اور چند روز وہاں رہ کر پھر دکن آیا اور وہی لوٹ مار شروع کردی۔ کئی قلعے جو مغلوں کے قبضے میں آگئے تھے سیوا جی نے چھین لیے اور اپنی جگہ مستحکم ہوکر علی عادل شاہ ثانی کو ستانا شروع کیا۔ ادھر جے سنگھ وغیرہ کے متواتر حملوں اور پامالیوں کی وجہ سے خزانہ خالی ہوگیا تھا اور سلطنت مغلیہ کا خراج ادا نہ ہونے سے مغلیہ لشکر بار بار چڑھائی کر بیٹھتا تھا اس لئے علی عادل شاہ ثانی نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ اورنگ زیب اور سیوا جی دونوں سے مصالحت کرلی جائے۔

یہ صلح محض عارضی تھی اورنگ زیب اور سیوا جی دونوں ریاست بیجاپور کو اپنے قبضہ و تصرف میں لانے کی آرزو دل میں لئے ہوئے تھے۔ ابھی اس صلح کو کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ یکایک علی عادل شاہ ثانی بدقسمتی سے فالج میں مبتلا ہوکر معذور و مجبور ہوگیا۔ حالات نازک ہورہے تھے، امرا کے آپس میں عداوت پھیلی ہوئی تھی۔ مصلحت وقت کے تحت اپنے کمسن بیٹے سکندر عادل شاہ کو تخت نشین کرکے دارالسلطنت کے کام خواصی خاں کے سپرد کردئیے اور خود پلنگ پر لیٹے لیٹے صلاح و مشورہ دینا مناسب سمجھا۔ مغلوں کی روک تھام کے لئے عبدالمحمد کو شاہ درگ، نل درگ، گلبرگہ اور ساگر کے علاقے کا صوبہ دار بنایا اور عبدالکریم اور بہلول خاں کو مرج اور پنالہ کے قلعوں پر متعین کرکے سیوا جی کی دراز دستیوں کا بندوبست کیا۔ اسی حالت میں ۱۰۸۳ھ م ۱۶۷۲ء میں ۳۵ برس کی جوانی میں سولہ سال حکومت کرکے راہی ملک عدم ہوا۔ اس نے بیجاپور میں اپنی زندگی میں ہی اپنے لئے ایک بہت ہی عالی شان مقبرے کی تعمیر شروع کی تھی ابھی اس کی تعمیر مکمل نہیں ہوئی تھی کہ اسی میں اس کو دفن کیا گیا یہیں اس کی بیوی اور کئی عزیز بھی دفن ہیں اور آج بھی یہ ناتمام مقبرہ اس کے عالی شان تعمیری حوصلوں کی ایک عبرت ناک تصویر پیش کررہا ہے۔

علی عادل شاہ ثانی بڑا بہادر اور شجیع تھا۔ اس نے کئی بڑے بڑے معرکے خود فتح کئے۔ اس کو شعر و شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ خود بھی شاعر تھا اس کے عہد میں اردو زبان کو بہت ترقی ہوی۔ وہ اردو شاعروں کا بڑا سرپرست تھا۔ ملا نصرتی جو علی نامہ اور دیگر مثنویوں کا مصنف ہے اسی کے دربار کا متوسل تھا اس کے عہد کی عمارات میں علاوہ نا تمام مقبرے کے حسینی محل اور کئی مسجدیں تعمیر ہویں۔ اس نے دو عظیم الشان محلات، علی محل اور عرش محل کے نام سے بنانے شروع کئے تھے مگر یہ نا تمام رہ گئے۔ یہ عادل شاہی خاندان کا آخری با اقتدار بادشاہ تھا اس کے بعد اس کے کمسن بیٹے سکندر کو اورنگ زیب نے قید کرلیا اور بیجاپور کی ریاست کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

سکندر عادل شاہ۔ ۱۶۷۳ء۔ ۱۶۸۶ء

علی عادل شاہ ثانی کے انتقال پر خواص خاں نے باضابطہ طور پر پانچ سال کے کمسن شہزادے کو سکندر عادل شاہ کے نام سے تخت پر بٹھایا اور خود بطور متولی کے کاروبار ریاست انجام دینے لگا۔ بادشاہ کی کمسنی امرا کی نا اتفاقی اور غداریوں سے فائدہ اٹھا کر ریاست کے دو دشمن مغل اور مرہٹے من مانے لوٹ مار اور جنگ و جدل کرنے لگے۔ سیواجی نے غیر معمولی طاقت حاصل کرلی، پنالہ فتح کر لیا، مغلوں کا لشکر بھی حملہ آور ہوا۔ خواص خاں نے مغلوں سے سازش کرلی اور سکندر کی بہن شہر بانو بیگم کی شادی شہزادہ محمد اعظم سے قرار دے کر ایک بڑے پیشکش کے ساتھ اورنگ زیب سے صلح کرلی مگر یہ صلح کبھی پائدار ثابت نہ ہوئی۔

خواص خاں، سدی مسعود خاں، بلول خاں، سید مخدوم، شرزہ خاں اپنی نا عاقبت اندیشی اور نمک حرامی سے کبھی اورنگ زیب سے مل جاتے اور کبھی مرہٹوں سے۔ اسی طرح صلح و جنگ میں اپنی قوتیں صرف کرتے رہے۔ اسی عرصے میں سیواجی فوت ہوگیا مگر اس کے بیٹے سنبھاجی اور دوسرے مرہٹہ سرداروں نے اپنی وہی روش جاری رکھی، وہ ادھر عادل شاہیوں کو تنگ کرتے اور ادھر مغلوں کو الگ دق کرتے۔ بالآخر اورنگ زیب نے بیجاپور کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا تہیہ کرکے اولاً ایک فرمان بھیجا جس میں متعدد سخت شرائط درج تھیں۔ سکندر عادل شاہ کے مشیروں نے اس کا جواب اس طرح مرتب کیا جس سے اورنگ زیب کی شرائط کی تکمیل نہیں ہوتی تھی اورنگ زیب نے ایک بڑی فوج کے ساتھ ۱۰۹۷ھ (۱۶۸۶ء) میں بیجاپور پر چڑھائی کی اور شہر فتح کرکے سکندر کو قید کرلیا اور بیجاپور کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ بدقسمت سکندر پانچ سال کی عمر میں بادشاہ ہوا، چودہ سال حکومت کی اور چودہ سال اورنگ زیب کی قید میں رہ کر بالآخر ۱۱۱۱ھ میں وفات پائی۔

سید محمد

یادگار ولی

مرتبہ سید محمد ایم۔اے یہ اردو شاعری کے استاد اول ولی اورنگ آبادی کی زندگی، ماحول اور شعری کارناموں اور ولی سے پہلے اور ولی کے بعد اردو شاعری کے ارتقاء کا ایک بسیط تذکرہ ہے جو دو صد سالہ جشن یادگار ولی کے سلسلہ میں ترتیب دیا گیا ہے اس کے آخر میں ولی کے منتخب کلام اور اردوئے قدیم (دکنی) کے ان مخطوطات کی تفصیلی فہرست بھی درج ہے جو حیدرآباد کے مختلف کتب خانوں اور ... میں ... قدیم بادشاہوں اور شاعروں کی تصاویر بھی اس کے ساتھ ہیں قیمت عما

سب رس کتاب گھر سے طلب کیجئے

بیجاپور کے سپہ سالار

افضل خاں

شرزہ خاں

عادل شاہی امراء

افضل خاں

افضل خاں بیجاپور کے مشہور سپہ سالاروں میں تھا۔ اس کا نام عبداللہ خاں تھا۔ سلطان محمد عادل شاہ کے زمانے میں اس نے متعدد معرکوں میں حصہ لیا اور ملک کی بڑی شائستہ خدمات انجام دیں جس پر اس کو افضل خاں کا خطاب عطا کیا گیا۔ سلطان محمد عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا نوجوان فرزند علی عادل شاہ ثانی تخت نشین ہوا تو اس کے مراتب ۱۶۵۷ء میں اور اضافہ کیا گیا اور یہ خان محمد خاں کے ساتھ ایک بڑے لشکر کا سپہ سالار بنا کر اورنگ زیب کے مقابلے کے لئے بھیجا گیا۔ اورنگ زیب اس عرصے میں بیدر اور کلیانی کے قلعے فتح کر چکا تھا۔ بیجاپور کا محاصرہ کر لیا مگر شاہجہاں کی علالت کی خبر پاکر محاصرہ برخاست کرکے دہلی کا رخ لیا۔ جب وہ سرحد سے گزر رہا تھا تو خان محمد نے ایطور خود اس کے لشکر کو چلے جانے کا موقع دیا اور اس طرح ایک بے نظیر موقع چھوڑ دیا۔ افضل خاں اس پر بہت ناراض ہوا۔ جب بادشاہ کو اس کی رپورٹ ملی تو خان محمد کو واپس طلب کیا مگر وہ راستے ہی میں اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔

خان محمد کے بعد افضل خاں ہی سب سے بڑا سپہ سالار تھا۔ بادشاہ نے اس کو سیواجی کے مقابلے میں روانہ کیا جس نے کوکن کے علاقے میں سخت طوفان مچا رکھا تھا۔ تعلاپور اور پنڈارپور سے گزر کر افضل خاں پرتاب گڑھ پہنچا۔ سیواجی نے اس کی آمد کی خبر سن کر اپنی فطری چالاکی سے اس کے مقابلے کے صلح و اطاعت کیشی کی چال چلی۔ افضل خاں کے سفیر کرشناجی کے ساتھ اپنے سفیر گوپی ناتھ کو بھیج کر کے قول و قرار لیا کہ افضل خاں سے تنہائی میں مل کر معذرت کرنا اور سر اطاعت خم کرنا چاہتا ہے۔ افضل خاں اس کے دھوکے میں آگیا اور جب تنہائی میں یہ دونوں ملے تو سیواجی نے ایک چھپے ہوئے ہتیار سے فوراً اس کا کام تمام کر دیا۔ افضل خاں کے قتل ہوتے ہی سیواجی کی فوج کے حوصلے بڑھ گئے اور عادل شاہی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ سیواجی نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ افضل جوش شجاعت میں اس کی چال کو سمجھا اور اپنی جان گنوائی۔ سیواجی کے ایک ساتھی نے اس کا سر کاٹ لیا اور سیواجی کے پاس لے جاکر انعام پایا۔ علی عادل شاہ ثانی کو افضل خاں کی موت سے بڑا نقصان پہنچا اور مرہٹوں کی طاقت ہمیشہ کے لئے بڑھ گئی کیونکہ اس کے بعد علی عادل شاہ ثانی نے جن لوگوں کو سیواجی کے مقابلے کے لئے بھیجا وہ یا تو مارے گئے یا سیواجی نے ان کو اپنے مکر و فریب سے ناکام کر دیا۔ بالآخر خود بادشاہ کو اس سے مقابلہ کرکے شکست دینی پڑی مگر یہ شکست بھی سیواجی پر اثر نہ کرسکی۔

شرزہ خاں

شرزہ خاں علی عادل شاہ ثانی کے اُن خاص سپہ سالاروں میں تھا جنھوں نے اورنگ زیب اعظم کے زمانے میں بڑے نامور اور دلیر سرداران مغلیہ سے بڑے معرکتہ الآرا مقابلے کئے اور ہمیشہ مظفر و منصور رہا۔ اس کا نام سید الیاس تھا۔ اس نے شکل بیدر اور بیجاپور کے قریب جے سنگھ اور اس کے مددگار سردار سرفراز خاں اور صلابت خاں کو بڑی بڑی شکستیں دیں اور آخر کار مغلوں کو پیچھے ہٹنے اور ان کو بلند کوٹ چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی موت عجیب و غریب طریقے پر واقع ہوئی۔ مغلوں کو شکست دے کر ابھی یہ واپس نہیں ہوا تھا جنگل میں تھا اور مغلوں کے اِکے دُکے حملے ہو رہے تھے۔ اتفاقاً ایک دن ایک تیموری سپاہی نے اس کے کم سن لڑکے کو بھیج دیا۔ بیٹے نے باپ سے کہا کہ پدر بزرگوار، شرزہ خاں اکیلا لپکا اور آناً فاناً دشمن کو مار بھگایا۔ باپ بیٹے واپس ہو رہے تھے کہ یکایک گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ شرزہ خاں زمین پر آرہا اور وہیں فوت ہو گیا۔ جب لشکر میں اس کی مرگ مفاجات کی خبر پہنچی تو ایک کہرام مچ گیا۔ بادشاہ کو ناقابل بیان رنج ہوا اس نے دونوں بیٹوں

سید مخدوم و سید حبیب کو ان کے باپ کی شایستہ خدمات کے صلہ میں شہزادہ خان ٹ بول سے سرفراز کیا اور ملازم رکھ لیا۔

سید محمد

ہاشمی بیجاپوری

ہاشمی، علی عادل شاہ ثانی اور نصرتی کا ہم عصر تھا۔ شاہ ہاشم بیجاپوری کا مرید خاص تھا۔ پیر کی نسبت سے ہاشمی تخلص رکھا۔ شاہ ہاشم اور ملا ہاشمی دونوں کی تصویریں اس مضمون کے ساتھ شایع ہو رہی ہیں وہ مادرزاد اندھا تھا لیکن شاعری سے فطری لگاؤ رکھتا تھا۔ دکن میں ریختی زبان کی ایجاد کا سہرا ہاشمی کے سر ہے ایک دیوان ریختی کی غزلیات کا مرتب کیا اور ایک مثنوی یوسف زلیخا "احسن القصص" کے نام سے ۱۰۹۹ھ میں لکھی۔ ہاشمی کی زندگی کے حالات کسی تذکرے میں نہیں ملتے البتہ اس کے کلام سے اندرونی شہادتیں کچھ ملتی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ برہان پور کا باشندہ تھا بیجاپور کے ایک رئیس ذوالفقار خاں کی شہرت سن کر وہاں آیا اور اپنے ممدوح سے قصائد کے بدلے میں گراں بہا انعام حاصل کئے۔ دو تین قصیدے ذوالفقار خاں کی مدح میں ہاشمی نے کہے ہیں۔ ابھی ہاشمی کے متعلق کافی معلومات فراہم نہ ہو سکے۔ اس کا دیوان ریختی اور مثنوی یوسف زلیخا جو زیر طبع ہیں ان کے مقدمہ کی تکمیل تک ہماری کوشش ہے کہ جس قدر ممکن ہو سکے اس کی زندگی کے متعلق معلومات فراہم کریں۔ علاوہ دیوان اور مثنوی کے ہاشمی بیجاپور کا اعلیٰ پایہ مرثیہ نگار ہے اس کے لئی مرثئے دستیاب ہوئے ہیں جن سے اس کی قادر الکلامی اور وسیع النظری کا ثبوت ملتا ہے۔ یہاں ہم دیوان اور مثنوی سے چند شعر نقل کرتے ہیں:-

غزل ریختی

جھانکو نکو سو لچھن تج دل چھوڑ ہوئے گا ۔۔۔ تجھ خیل میں تمنا چپ سب جگ میں شور ہوئے گا
تجھ گن بھوی سندر کی عالم میں ہانک ہوی ہے ۔۔۔ جھانکیگی تس اوپر تو شہرت بھی زور ہوئے گا
انکھیں تو ہور دستیاں دل میں تو بھید کچھ ہے ۔۔۔ باتاں بھی ہور کچھ ہیں مقصد بھی ہور ہوئے گا
ہے حسن دہن تمہارا رکھنا جتن تمہیں دہن ۔۔۔ نیں تو یو دہن چیر انے کوی سا ہو چور ہوئے گا (دیوان ریختی)

عشق

اگر عشق نیں ہے تو چندر کوں نور ۔۔۔ تو کیا واسطے نت یو تپتا ہے سور
اگر عشق نیں ہے تو دریا دین آب ۔۔۔ پلاتا ہے بادل کوں کی بے حساب
اگر عشق نیں ہو تو کی دہر تری ۔۔۔ نوی رت میں کرتی ہے کہوت ہری
اگر عشق نیں ہے تو کی یو بھنور ۔۔۔ پھرے باس لینا ہر اک گل اوپر
اگر عشق نیں ہے تو کی یو فقیر ۔۔۔ فقیر ہو کے غربت لئے اپے سیر

مجازی عشق راست ہر ٹھور ہے
حقیقی وے عشق کچھ ہور ہے (یوسف زلیخا)

میر سعادت علی رضوی

نظام شاہی خاندان

احمد نظام الملک ۸۹۱ھ تا ۹۱۴ھ

بہمنی سلطنت کا جب شیرازہ بکھر گیا تو سب سے پہلے احمد نظام الملک نے بغاوت کی۔ احمد نظام الملک دکن کے برہمن نژاد امیر حسن بحری کا لڑکا کہلاتا ہے جس کو بعد کے مورخ ایک عجیب و غریب حکایت کے ذریعہ محمد شاہ بہمنی کا لڑکا تسلیم کرانے کی کوشش کرتے ہیں یہ بہمنی سلطنت کے شمال مغربی حصہ کا مالک بنا اور اپنا صدر مقام جنیر قرار دیا لیکن بعد میں ایک شہر آباد کر کے احمد نگر اس کا نام رکھا۔ اور اسی نام سے اس کی سلطنت موسوم ہوئی۔ احمد نظام الملک نے ۸۹۱ھ میں اپنی آزاد اور خود مختار حکومت کا اعلان کیا اور ۲۲ سال پرسکون حکومت کرنے کے بعد ۹۱۴ھ میں انتقال کیا۔

برہان نظام شاہ ۹۱۴ھ تا ۹۶۱ھ

باپ کے بعد تخت نشین ہوا اور اپنی سلطنت کی نمایاں ترقی کا باعث بنا اس کے دور میں نظام شاہی حکومت کی وسعت اور تنظیم کا کام ہوا اور اسی بادشاہ کی وجہہ سے بہادر شاہ والی گجرات کا دیا ہوا لقب نظام شاہی اس خانوادہ کا لقب ہو گیا

سلطان حسین نظام شاہ شاہ اول ۹۶۱ھ تا ۹۷۲ھ

باپ کے مرنے کے بعد سریر آرائے سلطنت ہوا۔ یہ بہت بڑا سپاہی اور مدبر تھا۔ اس کے زمانے میں سلاطین دکن میں اتحاد ہوا اور اسی کی سرگرمی اور کوشش سے تالی کوٹ میں رام راج کو شکست ہوئی اور نہایت شان اور جدت کی حکومت کے بعد ۹۷۲ھ میں انتقال کیا۔

مرتضیٰ نظام شاہ ۔ ۹۷۲ھ تا ۹۹۶ھ

یہ صغیر سنی میں بادشاہ ہوا۔ اور اپنی ماں خونزہ ہمایوں کے تحت حکومت کرتا رہا اور ۹۸۰ھ میں ماں کو قید کر کے برسر اقتدار آیا۔ یہ بادشاہ چاند بی بی کا بھائی تھا اس کے دور میں سلطنت کے ابتدائی آثار تنزل شروع ہوئے تھے ۹۹۶ھ میں کثرت عیاشی کی وجہہ سے دیوانہ ہو گیا اور اس کے بیٹے میراں حسین نے اس کو حمام میں بند کر دیا۔

میراں حسین نظام شاہ ۔ ۹۹۷ھ

باپ کو قید کر کے تخت پر بیٹھا اور وزیر مرزا خاں کے ہاتھ مارا گیا۔ اس نے صرف نو مہینے حکومت کی۔

اسماعیل نظام شاہ ۔ ۹۹۷ھ تا ۹۹۹ھ

یہ امرائے گردی کے ذریعے تخت پر آیا اور اپنے باپ برہان نظام شاہ کے ہاتھوں تخت سے اتار دیا گیا۔

برہان نظام شاہ ثانی ۔ ۹۹۹ھ تا ۱۰۰۳ھ

مغلوں کی طاقت کے ذریعے بیٹے کو معزول کر کے تخت حاصل کیا۔ اور ۱۰۰۳ھ میں عادل شاہیوں سے شکست کھا کر اسی صدمہ میں انتقال کیا۔ اور اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین بڑے بیٹے اسمعیل کے بجائے جو مہدوی تھا اپنے چھوٹے بیٹے کو جو اسماعیلیہ مذہب کا پیرو تھا مقرر کیا۔

ابراہیم نظام شاہ ۱۰۰۳ھ

باپ کے بعد برسرحکومت آیا اور ایک ہی سال میں عادل شاہیوں سے لڑتا ہوا ایک سپاہی کے ہاتھ مارا گیا ۔

احمد نظام شاہ

یہہ شخص ایک دعوےدار سلطنت تھا اور بعض امراء کی کوشش سے تخت نشین ہوا لیکن بعد میں چاند بی بی کے تدبر سے اس کو تخت سے ہٹایا گیا اور بہادر نظام شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا ۔

بہادر نظام شاہ ۱۰۰۴ھ تا ۱۰۰۹ھ

یہہ طوائف الملوکی کا دور تھا ۔ وزیر اعظم اخلاص خاں حبشی اور چاند بی بی کے ذریعہ برسر اقتدار آیا یہہ وہ دور تھا جس میں چاند بی بی نے مغلوں سے غیر معمولی معرکے کئے ۔

مرتضیٰ نظام شاہ دوم ۱۰۰۹ھ تا ۱۰۳۵ھ

بہادر نظام شاہ کے بعد طوائف الملوکی کی پیچ ہی اور امراء نے مرتضیٰ نظام شاہ کو تخت پر بٹھایا اس دور کو ملک عنبر کا دور کہا جا سکتا ہے مغلوں کی بڑھتی ہوئی قوت ملک عنبر کی زندگی تک نظام شاہی سلطنت پر چھا نہ سکی ۔ ملک عنبر کے بعد کوئی نظام شاہی حکومت کو بچانے والا نہ تھا ۔

برہان نظام شاہ سوم ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۴۰ھ

برہان نظام شاہ نے باپ کے بعد سلطنت حاصل کی اور ۱۰۴۰ھ میں انتقال کیا یہہ دور تنزل تھا ۔

حسین نظام شاہ سوم

یہہ احمد نگر کا آخری تاجدار ہے ۔ اس کے زمانے میں مغلوں نے احمد نگر پر قبضہ کیا اور شاہ جہاں نے اس کو گوالیار میں قید کر دیا ۔

مرتضیٰ نظام شاہ سوم ۱۰۴۲ھ تا ۱۰۴۵ھ

یہہ بادشاہ نظام شاہی سلطنت کے بعد شاہ جی مرہٹے کے ذریعے تین سال تک شاہ گڑھ پر حکومت کرتا رہا اور تین سال کے بعد اپنے خاندان کا خاتم بنا ۔

چاند بی بی

دکن کی نامور سلطانہ چاند بی بی حسین نظام شاہ اور خونزہ ہمایوں بیگم کی بیٹی تھی اور اس طرح باپ کی طرف سے نظام شاہی تدبر اور ماں کی طرف سے ترکی تہور اور بے جگری ورثے میں پائی تھی ۔ یہہ ملکہ ۹۵۵ھ میں احمد نگر میں پیدا ہوئی آنکھ کھولتے ہی اس نے تلوار کی جھنکار سنی بہمنی سلطنت کے مختلف شہ پارے آپس میں دست و گریباں تھے اور اس نفاق سے فائدہ اٹھا کر رام راج کے تخت وجیانگر کی شہنشاہیت مسلم راج اور مسلم سلطنتوں پر چھائی جا رہی تھی چودہ برس کی عمر میں چاند سلطانہ اس شطرنج کا مہرہ بنی اور علی عادل شاہ والی بیجاپور کے نکاح میں آ کر دکنی مسلم اتحاد کا باعث بنی کوئی تعجب نہیں کہ تالی کوٹ کی لڑائی میں یہہ شاہی دلہن میدان کارزار میں ہو اور مسلمانوں کے ناموس کا مرکز بنی رہی ہو ۔ یہہ چاند سلطانہ کا پہلا دور ہے ۔

چاند سلطانہ کی زندگی کا دوسرا دور ۹۸۸ھ سے شروع ہوتا ہے جب کہ وہ دلہن بن کر بیجاپور کے بادشاہ کے دل میں حکمران تھی

علی عادل شاہ خود بڑا بادشاہ تھا اس کی زندگی تک چاند بی بی کو صرف نظری تجربہ سیاست کا اور سلطنت کا حاصل ہوتا رہا یہاں تک کہ ۹۸۸ھ میں چاند سلطانہ کا شوہر علی عادل شاہ بیجاپور کا پانچواں زبردست فرماں روا بریدی غلام کے ہاتھوں شہید ہوا اب چاند سلطانہ بیجاپور میں وہی تدبر اور تنظیمی قوت کا اظہار کرنے لگی جو تاریخ انگلستان میں صرف ملکہ ایلزبتھ کو حاصل تھا، نیا بادشاہ ابراہیم عادل شاہ نو برس کا تھا اور سلطنت چوطرف سے اندرونی سازش اور بیرونی غنیموں سے گھری ہوی تھی امرائے سلطنت کی باہمی رقابت اور قوت کے ذریعے اس مدبر خاتون نے ابراہیم عادل شاہ کو نہ صرف بچایا بلکہ اس کو تربیت کے ذریعے بیجاپور کا سب سے بڑا فرماں روا بننے کے قابل رکھا۔ اس طرح ۹۷۱ھ سے ۹۹۲ھ تک چاند بی بی بیجاپور کے لئے فرشتۂ رحمت رہی کوئی مورخ جو چاند بی بی کی حقیقی سوانح عمری لکھنے بیٹھے اس دور کو اس کا دور تدبر قرار دے گا۔

جس طرح چاند بی بی بیجاپور خود کی شادی کی وجہہ سے آئی تھی اسی طرح ابراہیم عادل شاہ کی بہن خدیجہ سلطانہ کے ساتھ چاند بی بی کے بھتیجے میراں حسین کو بیاہی گئی تھی پھر احمد نگر واپس ہوئی۔ اس کو پہلے سے بھی زیادہ زبردست سیاسی خدمات انجام دینے پڑے احمد نگر مسلم اقتدار دکن کا سب سے اہم مرکز تھا۔ مغل اس کو کسی نہ کسی طرح اپنے علاقے میں شامل کرنے کی تاک میں لگے ہوے تھے۔ اور یہ عصر جاسا خانہ جنگی کی تسخیر شاہان دکن کی تسخیر ہے۔ مرتضی نظام شاہ کے انتقال کے بعد طوائف الملوکی مچی میراں حسین کے بعد اسمعیل تخت پر بیٹھا جس کو اس کے باپ برہان نظام شاہ دوم نے مغلوں کے اثر سے بے دخل کر دیا۔ اور اس کے چند سال بعد ابراہیم نظام شاہ اور بہادر نظام شاہ یکے بعد دیگرے آئے۔ یہہ دور احمد نگر کے لئے زیست اور موت کا دور تھا اور چاند بی بی کی زندگی کا حقیقی کارنامہ اسی دور سے متعلق ہے جو کام بیجاپور میں اپنے شوہر اور اس کی اولاد کے لئے اس نے بیادہی کام اپنے خاندان کے لئے اسے کرنا تھا لیکن یہاں پر اس کے لئے اندرونی فتنے زیادہ تھے اور مغلوں کی بڑھتی ہوی طاقت سے سابقہ تھا۔ اس دور میں چاند بی بی نے بادشاہ گری کی، بہادر نظام شاہ کے لئے وہ سب کچھ کیا جو بڑے سے بڑا مدبر اور سپہ سالار کر سکتا تھا۔ اندرونی فتنہ کو رفع کیا اور مغلوں کو تا دم زیست اپنے ابا و اجداد کی سلطنت سے دور رکھا۔ اکبری لشکر نے مراد کی سرکردگی میں ۱۰۰۳ھ میں احمد نگر پر یلغار کی چاند بی بی نے اتنی بہادری سے ان کا مقابلہ کیا کہ مغلوں کو مجبوراً صلح کر لینی پڑی۔ یہی وہ معرکہ تھا جس میں سرنگ کے ذریعے پچاس گز قلعہ کی دیوار اڑا دی گئی تھی۔ اور چاند بی بی نے مغلیہ دل بادل کو تلوار کی نوک سے اس وقت تک روک رکھا تھا جب تک دیوار از سر نو تیار نہ ہوگئی تاریخ حرب میں یہہ کارنامہ ہمیشہ صفحۂ اول میں رہے گا۔ اس کے بعد مغلوں نے دوسرا حملہ شہزادہ دانیال کی سرکردگی میں کیا۔ اور چار مہینے کے محاصرہ کے بعد چاند بی بی کی مردہ لاش اور دکن کا ایک ویران شہر اس کے ہاتھ آیا ۱۰۰۹ھ میں یہہ بہادر سلطانہ ناموس کی حفاظت کے لئے تیزاب کے کنویں میں مستور ہوگئی۔

ملک عنبر

ملک عنبر دکن کا مشہور سپہ سالار، مدبر اور بادشاہ گر حبشی ۹۵۵ھ میں پیدا ہوا اگرچہ میں ابتدائی تربیت پائی اور دکن کے بازار میں آکر فروخت ہو گیا۔ احمد نگر میں چنگیز خاں کے غلام کی حیثیت سے تربیت حاصل کی اور آقا نے غلام کو اولاد کی طرح پالا۔ آقا کی وفات کے بعد ۹۸۲ھ میں ملک عنبر گولکنڈہ میں لشکر شاہی کا ملازم ہوا پھر بیجاپور جا کر ابراہیم عادل شاہ کے ملازمان میں شریک ہو کر ایک ممتاز عہدہ پر فائز اور ملک عنبر کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ اب اس نے عرب، اتھیوپیا اور حبشیوں کی فوج جمع کرنا شروع کیا اور اس کے شرفا نوازی اور بہادری کی دھوم مچ گئی لیکن بیجاپور کے امرا کے حسد اور حوصلہ شکن فضا سے بیزار ہو کر بیجاپور بھی ۱۰۰۱ھ میں چھوڑنا پڑا۔ کچھ مدت ملک عنبر کی عسرت، تنگدستی میں گزری لیکن اس حالت میں بھی فوج فراہم کرتا رہا اور احمد نگر میں ملازمت اختیار کر لی۔ حسین نظام شاہ کی فوج میں آ کر جوان ہمت حبشی کے اضافہ نے مغلوں کے مقابلے میں ایک قوت پیدا کر دی تھی۔

ملک عنبر ایک ایسے دور میں سیف و دماغ کے جوہر دکھانے کے لئے دنیا میں آیا جب کہ دکن تباہ ہو رہا تھا۔ بہمنی شہنشاہیت کے شکستہ پارے آپس میں دست و گریباں تھے اور مغلوں کا بڑھتا ہوا اقبال ان پر عقاب کی طرح جھپٹ رہا تھا۔ احمد نگر فتح دکن کی کنجی تھا جس پر مغلوں کی آنکھ لگی ہوئی تھی۔ ملک عنبر کی جوانی بیجاپور و گولکنڈہ اور احمد نگر کے عروج میں شروع ہوئی اور دکن کی سلطنتوں کے زوال کے ساتھ ساتھ ملک عنبر کی حوصلہ مندیوں نے عروج حاصل کیا اور کم از کم اپنی استقامت کی وجہ سے بیس سال تک دکن کو اغیار کی غلامی سے بچائے رکھا۔ اس طرح تمام عمر ایک سپاہی کی زندگی بسر کر کے ۱۴ شعبان ۱۰۳۵ھ کو بخار کی وجہ سے اسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔

ملک عنبر میانہ قد حبشی رنگ اور گٹھیلے جسم کا آدمی تھا۔ مغلوں کا باس اور دکنی دل رکھتا تھا۔ حلیم الطبع، منکسر المزاج و وفاشعار ایسا کہ آخری دم تک باوجود بے تاج کا بادشاہ ہونے کے مرتضیٰ نظام شاہ کو بادشاہ مانتا رہا۔ اس کے بذل و نوال کی دھوم تھی۔ اس کا دربار علاوہ شعراء کے ادیب، علماء و فضلاء، اولیاء اور رشیوں کا مامن تھا۔ میدان جنگ میں تیغ زباں اور میدان تدبر کا شاطر۔ ایک طرف اہل سیف اور دوسری طرف مصلح، ریفارمر اور تعمیر کار تھا۔ ملک عنبر کے احسانات میں سے سب سے بڑا احسان وہ ہے جو اس نے مرہٹہ قوم پر کیا۔ آج کل کے مرہٹہ مورخ تعصب کی وجہ سے اس کو تسلیم نہ کریں لیکن خاص دکنی طرز جنگ اسی کے دم سے ایک طرز نو بن گئی۔ مرہٹوں کو بحیثیت قوم سپاہی بنانے کا کام ملک عنبر نے انجام دیا۔ اسی نے صدیوں کے غلام اور بے بس کسانوں کو نہ صرف مرد میدان بنایا بلکہ صاحب تاج اور سلطنت کر دکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک مرہٹے ملک عنبر کی سجھائی ہوئی راہ پر گامزن تھے اقبال ان کے ساتھ تھا۔ جس روز انھوں نے سرگنگیری چھوڑ کر میدان سنبھالا تو ان کو پانی پت کی تیسری جنگ کا روز بد دیکھنا پڑا۔

ملک عنبر کا دوسرا کارنامہ مالی انتظام تھا۔ اس مدبر سپاہی نے باوجود تمام عمر میدان جنگ میں بسر کرنے کے اپنی رعایا کی خوشحالی کے لئے بہترین مالی انتظام کیا۔ مالگزاری کی تنظیم، زمینات کا بندوبست اور محاصل کی خوش ستانی نے رعایا کو مطمئن اور فارغ البال کر دیا تھا۔ اس نے انتظام سلطنت کے لئے ملکی زبان کو دفاتر کے لئے رائج کیا۔

بحیثیت تعمیر کار اس کی ہستی لافانی ہے۔ کھڑکی ایک غیر آباد اور پہاڑی قریہ کو اس نے بارونق اور متمدن شہر بنا دیا گو اس شہر کو ایک مرتبہ جہانگیر کی فوجوں نے زمین کے برابر بنا دیا تھا تاہم ملک عنبر نے چند دنوں میں اس ویرانہ کو گلزار میں تبدیل کر دیا۔

سید محمد اکبر وفاقانی

گولکنڈے کا نیا قلعہ

(قلعہ گولکنڈہ کے پہلو میں سلطان عبداللہ قطب شاہ
نے جو نیا قلعہ بنایا تھا اس کی ایک جھلک)

اب بھی رونق پا رہا ہوں تیرے ویرانے میں میں
سن رہا ہوں کچھ سکوتِ شب کے افسانہ میں میں

موجزن ہے تشنگی حوضوں میں پانی کیلئے
ابر جن پر چھا رہا ہے درفشانی کیلئے

ہیں نقوشِ جستجو تیرے شکستہ بام و در
جن میں کھو جاتی ہے دل کی دھڑکنیں لے کر نظر

تیرے سائے میں ہے ابتک بھی جھلک تاج کی
تیرے کھنڈر و دشت میں فرحت سی ہے گلزار کی

تیرا ہر پربت ہے اپنی عظمتوں کا رازداں
تیری خاموشی کے دامن پر ہیں نغموں کے نشاں

نوحہ خواں ہے پرسکوں تالاب کی ہر بوند ڈوب
شام کو جس کے کنارے مہر ہوتا ہے غروب

پُرخموشی میں ہے کیفیت کہاں فریاد میں
یہ مسجد وہ ہے خدا کا گھر خدا کی یاد میں

عکسِ ماضی دیکھتا ہوں میں تری تصویر میں
حسن کاری کا تخیل ہے تری تعمیر میں

پیکرِ مردہ میں تیرے زندگی کی آن ہے
اب بھی محلوں کے کھنڈر کی یادگاری شان ہے

تھی تری جب ساری تقدیر سونے کیلئے
تو یوں ہی چھوڑا گیا برباد ہونے کیلئے

آج کر دوں گا نمایاں بے حسی کے داغ کو
اپنے دل کے خون سے سینچوں گا تیرے باغ کو

آج میں تعبیر مانگوں گا فسونِ خواب سے
تیرے حوضوں کو بھروں گا آنسوؤں کی آب سے

ڈوب جائیگی اثر میں آج آہِ آتشیں
ثبت کر دوں گا تری محراب میں نقشِ جبیں

تیرے کھنڈروں میں سکونِ زندگانی پاؤں گا
تیری خاموشی میں ماضی کے ترانے گاؤں گا

میکش

گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت

قطب شاہی خاندان کی حکومت سرزمین حیدر آباد پر تقریباً دو سو سال یعنی ۹۰۱ھ سے ۱۰۹۸ھ تک رہی اور اس عرصہ میں ان حکمرانوں نے یہاں تہذیب و تمدن، تمول و ثروت، علم و فضل اور شعر و سخن کی ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس پر دکن کی تاریخ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ ان بادشاہوں نے شیعہ و سنی اور مسلمان و ہندو غرض ہر مذہب و ملت کے باشندوں میں ایک مشترک کلچر کے پیدا کرنے میں یہاں تک کامیابی حاصل کی تھی کہ دوسروں کے لئے اس ملک کے رہنے والوں کا باہمی اتحاد اور یگانگت باعث رشک تھی اسی موانست و مفاہمت کی خاطر انھوں نے اردو کی سرپرستی کی اور اس زبان میں ایسی ایسی بلند پایہ کتابیں لکھیں اور لکھوائیں جن پر اردو ہمیشہ نازاں رہے گی۔

یوں تو قطب شاہی سلطنت کے بانی سلطان قلی کا تعلق اس سرزمین سے ۸۹۹ھ میں پیدا ہو چکا تھا جب وہ تلنگانہ کا صوبہ دار بنا دیا گیا تھا لیکن جب ۹۰۱ھ میں گولکنڈہ اور اس کے اطراف و اکناف کا علاقہ اس کو بطور جاگیر کے دیا گیا تو اس نے اس کا نام محمد نگر رکھا اور قدیم قلعہ کو مستحکم کر کے اس میں متعدد محلات تعمیر کئے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اپنے علاقہ کو وسیع کرنا شروع کیا۔ چنانچہ بیس بائیس سال کے عرصہ میں پانگل، کمن پوڑ، کوویل کنڈہ، اور بلکنڈل وغیرہ اس کے قبضہ میں آگئے۔ ۹۲۳ھ میں اس نے قلعہ میں بالا حصار کے دامن میں مشہور مسجد صفا بنائی جس میں آخر کار ۹۵۰ھ میں اس کے فرزند یار قلی جمشید کے اشارے سے سلطان قلی قطب شاہ کو ننانوے سال کی عمر میں عصر کی نماز پڑھتے وقت شہید کیا گیا۔ اس نے دوسرے صوبہ داروں کی طرح بہمنی بادشاہ کے خلاف علم بغاوت نہیں بلند کیا بلکہ آخر تک ان کی مدد کرتا رہا اور جب بریدیوں نے بہمنیوں پر پوری طرح قبضہ کر لیا تو مجبوراً سلطان قلی کو بھی اپنی بادشاہت کا اعلان کرنا پڑا۔

سلطان قلی کو فن تعمیر کا خاص ذوق تھا۔ اس نے قدیم قلعہ (موجودہ بالا حصار) کے اطراف ایک عالیشان شہر بنایا۔ اور دراصل وہی اس طرز تعمیر کا بھی بانی ہے جو قطب شاہی کہلاتا ہے اور ایرانی، ہندو، اور پٹھان طرز ہائے تعمیر کے امتزاج سے بنا ہے اس کی وفات کے وقت اس کی سلطنت شمال میں دریائے گوداوری، مشرق میں اڑیسہ اور ساحل سمندر اور جنوب میں دریائے کرشنا تک پھیل چکی تھی۔

۲ جمشید قلی قطب شاہ تخت نشین ہوتے ہی اپنی سلطنت کے استحکام و وسعت میں مصروف ہو گیا۔ اگرچہ اس کا سات سال کا مختصر سا عہد حکومت زیادہ تر جنگ و جدل سخت گیریوں اور پریشانیوں میں گذر گیا۔ لیکن اس نے نارائن کھیڑ، احسن آباد اور میدک پر قبضہ کر کے قطب شاہی سلطنت میں اضافہ کیا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ لیکن اس کے عہد میں گولکنڈہ اردو شعر و سخن کا مرکز نہ بن سکا۔ اس کی وفات ۹۵۷ھ پر اس کے کمسن لڑکے سبحان قلی کو تخت نشین کیا گیا لیکن چند ماہ بعد ہی اس کا دوسرا بھائی ابراہیم قلی کوویل کنڈہ کے نایک واڑیوں کی مدد سے قلعہ گولکنڈہ میں داخل ہوا۔ اور اپنے بھائی کے مظالم کی تلافی کرنے میں مصروف ہو گیا۔

۳ سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ کی شخصیت کو دکن کی سیاست میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اسی کے زمانہ میں ۹۷۲ھ میں تالی کوٹہ کی مشہور لڑائی ہوئی جس میں وجیانگر کی عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی گولکنڈہ کو مال و دولت اور سیاسی حیثیت سے کافی اہمیت حاصل ہو گئی۔ بعد میں ابراہیم قطب شاہ نے راجمندری، قائم کوڑ اور کھم میٹھ وغیرہ کے علاقے بھی فتح کئے۔ اس نے ۹۸۸ھ میں انتقال کیا۔ اس کو بھی اپنے باپ کی طرح تعمیر کا شوق تھا۔ چنانچہ بالا حصار کی سیڑھیوں کی مسجد، موسیٰ ندی کا پہلا پل، حسین ساگر، بدویل کا تالاب، ابراہیم باغ، باغ گلشن، اور قصبہ ابراہیم پٹن اس کی تعمیری یادگاریں ہیں۔ اس کے عہد میں گولکنڈہ اردو زبان کا مرکز بن گیا۔ اور فیروز، محمود، احمد، اور وجہی جیسے بلند پایہ شعراء

اُسی کی قدردانی اردو کی وجہ سے متعدد بیش بہا کتابیں اس زبان میں تصنیف کر سکے۔

۴ ابراہیم کے بعد اس کا تیسرا لڑکا سلطان محمد قلی تخت نشین ہوا جس نے ۹۹۱ھ میں اپنی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر بھاگ نگر کی بنا ڈالی۔ اور عالیشان محلات، حمام، مساجد، مدارس اور بازار وغیرہ تعمیر کیے۔ بھاگ نگر کے اطراف واکناف بیس میل تک باغات بنائے گئے۔ نرکھوڑہ، ابراہیم پٹن، بھونگیر، اور پٹن چیرو اس شہر کے حدود پر واقع تھے۔ سترہ برس کے بعد غالباً اپنی اکلوتی لڑکی شہزادی حیات بخشی بیگم کی شادی کے موقعہ پر بادشاہ نے اس پرفضا بستی بھاگ نگر کا نام حیدرآباد قرار دیا۔

محمد قلی قطب شاہ نے ۱۰۰۰ھ میں سکر گ اور نندیال وغیرہ فتح کیا۔ اس کے زمانہ میں گولکنڈہ ہر لحاظ سے معراج کمال کو پہنچ گیا۔ شاہ عباس صفوی کا سفیر اغزلو سلطان اسی عہد میں گولکنڈہ آیا تھا۔ علم و فضل اور شعر و سخن کے لحاظ سے بھی یہ دور دکن کا عہد زرین سمجھا جاتا ہے۔ اسی دور میں ...... قطب شاہی سلطنت اور خاص کر گولکنڈہ اور حیدرآباد میں معراج کمال حاصل کیا اور اس سرزمین نے تمدن و معاشرت کے وہ تمام منازل طے کر لیے جو کسی ملک کو متمدن اور شائستہ ثابت کرتے ہیں۔ اسی زمانہ میں گولکنڈہ مختلف اقطاع عالم کے سیاحوں اور علما و فضلا کا مرکز ...... بن گیا تھا۔

سلطان محمد قلی نے جنگ و جدل سے زیادہ امن و امان اور ملک کی وسعت سے زیادہ اہل ملک کی خوشحالی ...... وہ خود بہت بڑا شاعر اور قدردان سخن تھا۔ اس نے تین زبانوں فارسی، اردو اور تلنگی میں اپنے دیوان مرتب کیے ...... اس کا کلام نہایت اعلیٰ پایہ ہے۔ اس کا دربار شاعروں سے معمور تھا۔

حیدرآباد کی اکثر عمارتیں اسی صاحب ذوق بادشاہ کی یادگار ہیں۔ ان میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں:-

چار مینار، چار کمان، چار سو کا حوض، دارالشفا، جامع مسجد، داد محل، ندی محل، نبات گھاٹ، باغ دلکشا، خداداد محل، جو ہشت منزلہ تھا اور ہر منزل کا نام جدا تھا مثلاً الٰہی محل، محمدی محل، حیدری محل، حسینی محل، حسنی محل، جعفری محل اور موسوی محل، باغ محمد شاہی، کوہ طور، جنان منزل اور بادشاہی عاشور خانہ وغیرہ۔

۵ محمد قلی قطب شاہ کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد سلطان مرزا سلطان محمد قطب شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس کی شادی حیات بخشی بیگم بنت سلطان محمد قلی کے ساتھ ۱۰۱۶ھ میں نہایت تزک و احتشام سے ہوئی تھی۔ اس کا عہد حکومت بھی امن و امان اور خوش حالی میں گذرا۔ اس کے دور میں شہزادہ خرم نے جو بعد میں شاہجہاں کے لقب سے جہانگیر کا جانشین ہوا باپ سے بغاوت کر کے اور اس کی فوجوں سے بزیمت پا کر قطب شاہی سلطنت میں پناہ لی تھی۔ سلطان محمد نے اس کے ساتھ ہمدردی کی اور ایسے وقت میں اس کی مالی امداد کی جب کہ وہ بالکل محتاج تھا اور اکثر رفیقوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

سلطان محمد قطب شاہ نے اپنے چچا کی قدردانی شعر و سخن کو جاری رکھا۔ لیکن وہ شاہ ہونے کے علاوہ عالم و فاضل بھی تھا۔ اس نے شعر و سخن و علم و فضل کے ساتھ زہد و تقویٰ اور اخلاق و آداب کا بھی خاص خیال رکھا۔ اسی کے عہد میں اس خاندان کی مشہور تاریخ سلطان محمد قطب شاہی لکھی گئی۔ اس کے دور میں بھی دکن کے حکمرانوں کے علاوہ جہانگیر اور شاہ عباس صفوی کے سفرا گولکنڈہ آئے تھے۔ اس کے عہد کے دو شاعروں میں وجہی کے علاوہ غواصی اور ابن نشاطی کے نام خاص کر قابل ذکر ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ سلطان محمد کو بھی اپنے اجداد کی طرح فن تعمیر سے خاص شغف تھا۔ اس نے قلعہ محمد نگر گولکنڈہ کے مقابل میں حیدرآباد کے مشرقی جانب چھ میل کے فاصلہ پر ایک قلعہ سلطان نگر کی ۱۰۳۲ھ میں بنا ڈالی لیکن اس کا بہت جلد انتقال ہو گیا اور وہ قلعہ نا تمام رہا۔ اس کے علاوہ اسی سلطان نے کئی مسجد محلہ سلطان شاہی اور گوشہ محل کی بھی بنا ڈالی تھی مگر ان کا کوئی کام اس کی زندگی میں تکمیل نہ پا سکا۔ اس کی جوانمرگی نے اس کو ہر طرح حرماں نصیب رکھا۔ اگر وہ چند اور سال زندہ رہ جاتا تو گولکنڈہ کی سلطنت اس قدر جلد زوال پذیر نہ ہونے پاتی۔

۶ سلطان محمد کے بعد اس کا اکلوتا لڑکا عبداللہ ۱۰۳۵ھ میں بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس بادشاہ کی یہ کم عمری اور ناتجربہ کاری قطب شاہی سلطنت کی کمزوری کا باعث ہوئی۔ سلطان عبداللہ کی کمزوریوں سے سب سے زیادہ محمد سعید میر جملہ نے فائدہ اٹھایا۔ آخرکار جب بادشاہ نے اس سرکش کا استیصال کرنا چاہا تو اس نے شہزادہ اورنگ زیب کے یہاں پناہ لی اور قطب شاہی سلطنت اور اس کے حکمران کی کمزوریوں سے غنیم کو واقف کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گولکنڈہ کی آزادی قائم نہ رہ سکی۔ اور اس کی عظمت و شوکت کا آفتاب غروب ہونے لگا۔

ان سیاسی پریشانیوں کے علاوہ سلطان عبداللہ کے عہد میں حیدرآباد کو ایک بار کئی دفعہ ایک زبردست طغیانی رود موسی کی وجہ سے بھی سخت صدمے اٹھانے پڑے۔ لیکن ان سب صدموں سے بڑھکر اہل حیدرآباد جس پریشانی اور ذلت سے متاثر ہوئے جو ۱۰۶۶ھ میں میر جملہ کی وجہ سے اورنگ زیب کے حملہ کی شکل میں نمودار ہوئی۔ اس وقت مغلوں نے لوٹ مار کے سلسلہ میں حیدرآباد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور تمام شہر کو تباہ کرکے چھوڑا۔

غرض عبداللہ قطب شاہ کی زندگی پریشانیوں اور کشمکشوں میں گذر گئی۔ وہ آخر دم تک اولاد نرینہ کا متمنی رہا۔ اور اسی یاس و امید میں ایک پوری عمر گذار دی۔ پچاس سال کی طویل حکومت کے بعد سلطان عبداللہ نے ۱۰۸۳ھ میں انتقال کیا اور در اصل اس کے ساتھ ہی قطب شاہی حکمرانی کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ وہ بھی اردو زبان کا ایک اچھا شاعر تھا اس کے عہد میں بھی علم و فضل اور شعرا و شاعری کی قدردانی جاری رہی فارسی کی مشہور فرہنگ برہان قاطع اور اردو کی مشہور کتابیں سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ، پھول بن، اور ماہ پیکر وغیرہ۔ اسی دور کی یادگار ہیں۔

۷ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے بعد اس کا چھوٹا داماد ابوالحسن تانا شاہ تخت نشین ہوا وہ چودہ برس تک قطب شاہیوں کی اس امانت یعنی سلطنت گولکنڈہ کو دشمنوں سے بچاتا رہا۔ وہ نہایت دور اندیش اور دانشمند حکمران تھا۔ اس نے قلیل عرصہ میں قطب شاہی سلطنت کے ان تمام کل پرزوں کو درست کر دیا جو سلطان عبداللہ کے پچاس سال کے طویل عہد حکومت میں بالکل منتشر ہو گئے تھے۔ اگر شہنشاہ اورنگ زیب جیسے طاقتور دشمن سے مقابلہ نہ پڑتا اور تمام ہندوستان کی فوجیں اس کے مقابلہ کے لئے جمع نہ ہو جاتیں تو وہ قطب شاہیوں کی اس امانت کو اپنی اولاد تک نہایت مستحکم اور طاقتور حالت میں منتقل کر سکتا۔ اس کے عہد میں بھی حیدرآباد اردو شاعروں اور انشاپردازوں کا مرکز بنا رہا۔ طبعی اور غلام علی جیسے بلند مرتبہ شاعر اس وقت بھی موجود تھے جنھوں نے اپنی دلنوازی کے خدمات شعر و سخن کو بوجوہ احسن جاری رکھا۔

سلطان ابوالحسن تانا شاہ نے جس خوبی اور مردانگی سے مغلوں کا مقابلہ کیا اور اثنائے جنگ میں اس کا برتاؤ جیسا شریفانہ اور بہادرانہ رہا اس کے تذکرے خاص و عام کی زبان پر اب تک جاری ہیں اس نے قطب شاہی افواج کی اخلاقی حالت کس قدر درست کر دی تھی کہ دشمن بھی اعتراف کرتے تھے۔ اگر اورنگ زیب کا تدبر اور میر جملہ کے جانشین غدار قطب شاہی امرا کا مکر و فریب کارگر نہ ہوتا تو شاید ہی گولکنڈہ فتح ہو سکتا۔

(ماخوذ از اسیر گولکنڈہ)

سید محی الدین قادری زور

سلطان قلی قطب شاہ

[illegible]

٩١٨ ـ ٩٥٠ھ

جمشید قطب شاہ

٩٥٠ ـ ٩٥٧ھ

سلطان قلی قطب شاہ

(۹۲۴ھ تا ۹۵۰ھ)

سلطان قلی قطب شاہ سلطنت گولکنڈہ کا بانی ہے۔ وہ ترکستان کے ایک بہت بڑے اور مشہور حکمران قبیلے قراقوینلو کا رکن تھا۔ وہ دو مرتبہ دکن آیا تھا۔ اس کے دکن آنے کا سبب خاندان شاہی کی تباہی اور قبیلہ قراقوینلو کا ترکستان پر زوال ہے۔ وہ اپنے چچا اللہ قلی کے ساتھ قیمتی گھوڑے وغیرہ لے کر ہندوستان آیا تھا۔

سلطان قلی ترکستان سے سیدھا دکن آیا۔ یہ محمود شاہ بہمنی کا عہد حکومت تھا جبکہ بیدر تمام ممالک عجم کا مرکز اور مرجع بن گیا تھا۔ ان کے خاندانی حالات اور وجاہت کو دیکھ کر بہمنی دربار نے ان کی بہت آؤ بھگت کی۔ سلطان قلی اپنے چچا کے ساتھ جب پہلی مرتبہ دکن آیا تو دونوں کے لئے تا قیام وظیفہ قائم رکھا گیا تھا۔ دوسری مرتبہ آیا تو بہت سی عنایتیں ہوئیں اور ان کو ٹھہر جانے کے لئے مجبور کیا گیا۔ یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے سلطان قلی دربار دکن سے بہت متاثر ہوا تھا۔

چند دنوں کے بعد ترکستان کے حاکم امیر یعقوب کے مرنے کی خبر آئی اور یہ ہمدان کے شاہی خاندان کے لئے اچھا موقع تھا۔ اللہ قلی بیگ نے بادشاہ سے مراجعت کی اجازت چاہی۔ اللہ قلی کے اصرار پر اس کو تو اجازت مل گئی لیکن بادشاہ نے کہا کہ "اللہ قلی بیگ اگر توبی رہی مختاری، مگر سلطان قلی بیگ را بہ ہیچ وجہ رخصت انصراف نمی دہیم"۔ اس کے علاوہ خود سلطان قلی بھی واپس نہیں جانا چاہتا تھا اس لئے اللہ قلی کو تنہا لوٹنا پڑا۔ اور سلطان قلی دکن میں رہ گیا۔

سلطان قلی کی استقامت سے محمود شاہ بہت خوش تھا۔ اس کو پہلے منصب دربانوں میں شامل کر لیا۔ اس کی ترقی کا بڑا سبب اس کی ذاتی قابلیت تھی۔ شکار کے مشہور واقعہ کے بعد اس کو ایک سو پچاس عربی و ترکی گھوڑے مع ساز و سامان مرحمت ہوئے اور خلعت عنایت کی گئی اور اس کے اخراجات کے لئے کوڑنگل اور اس کے نواحات دئے گئے اور جواہر خاں خطاب سے سرفراز ہوا۔ سلطان قلی علم حساب اچھا جانتا تھا اور خوش خط بھی تھا اسی لئے بادشاہ نے اس کو شاہی محلات کا محاسب بنایا۔ اس کی بڑی قابلیت یہ ظاہر ہوئی کہ تلنگانہ کے پرگنوں میں جو ہنگامہ تھا خود اپنی خواہش سے ڈاکوؤں کی سرکوبی اور ادائی مالگزاری کے لئے رعایا کو پابند کرنے گیا تھا۔ چونکہ اس میں علمی اور فوجی دونوں قابلیتیں تھیں اس کو زمانہ میں صاحب السیف والقلم کہا جاتا تھا۔

اس کے بعد سلطان قلی کی قابلیت اس وقت ظاہر ہوئی جبکہ ۸۹۶ھ میں اہل بیدر نے باہر والوں سے انتقام لینے کے لئے قلعہ پر حملہ کر دیا تھا۔ خود بادشاہ کی جان سخت خطرے میں تھی۔ قلعہ دار حسن علی سبزواری اور سید مرزا مشہدی کے ساتھ سلطان قلی بھی مع دس بارہ سو جوانوں کے موجود تھا۔ یہاں سلطان قلی کی بہادری و جانبازی اس کی غیر معمولی ترقی کا باعث ہوئی چنانچہ بادشاہ نے خوش ہو کر اس کو قطب الملک کا خطاب دیا تھا۔

اس کے تین سال بعد ۸۹۹ھ میں مغربی ساحل کی بغاوت سلطان قلی کے لئے مزید ترقی کا باعث ہوئی جس سے وہ تمام ممالک تلنگانہ کا صوبہ دار بن گیا۔ بہمنی امیر بہادر گیلانی کی سرکوبی میں اس نے بڑا حصہ لیا۔ جب بادشاہ مغربی ساحل کی مہم سے فارغ ہو کر بیدر آیا تو قطب الملک سلطان قلی کو تلنگانہ کا صوبہ دار بنا دیا۔ اور اس کی قدیم جاگیر میں گولکنڈہ اور ورنگل کا اضافہ کیا

دکن کے سیاسی انتشار نے بھی سلطان قلی کی مدد کی۔ اسی انتشار میں وہ ترقی کرکے گولکنڈہ کی خود مختار سلطنت قائم کر سکا۔ دکن میں ملکی اور غیر ملکی عناصر کی کشمکش اور حکومت کی کمزوریوں سے جب بہمنی سلطنت کا دسویں صدی ہجری کے اوائل میں خاتمہ ہوا اور اس کے حصے بخرے ہونے لگے تو بیجاپور، احمد نگر،

اور برار کے ساتھ گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت بھی قائم ہوگئی ۔

۹۲۴ھ میں سلطان محمود کے انتقال کے بعد وہ خود مختار ہوا اور اس کے بعد اس نے گولکنڈہ کو پائے تخت بنایا ۔ قلعہ اور شہر کی تعمیر کی ۔ فوجی نقطۂ نظر سے گولکنڈہ نہایت موزوں سمجھا گیا ۔ اپنے گھر کے استحکام کے بعد اس نے شمالی تلنگانہ کے مختلف صوبوں پر وار کرنے شروع کئے ۔ تقریباً ۲۰ سال کے دوران میں ساٹھ ستر قلعے اور حصار فتح کئے ۔ اور سلطنت کو اڑیسہ کی سرحد سے بندر گاہ مچھلی پٹم تک پہنچا دیا ۔

۹۵۰ھ اواخر جمادی الاول میں اس کے بیٹے جمشید نے تخت سلطنت کی ہوس میں اسے قتل کروایا ۔ اس نے تقریباً پچاس سال دکن میں حکومت کی ۔ اگر اس کا ابتدائی زمانہ بھی شامل کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے تقریباً ساٹھ سال سیاست دکن کی رہنمائی کی ۔ اسی مدت میں اس نے جنوبی ہند کے تمدن و سیاست میں ایک بڑا تغیر پیدا کیا تھا ۔ یہاں کی منتشر آبادیوں کو ایک رشتہ میں منسلک کر کے اس ملک کی خاطر خواہ شیرازہ بندی کر دی تھی اور باضابطہ نظم و نسق سے یہاں امن و امان قائم کر دیا تھا ۔

جمشید قطب شاہ (۹۵۰ھ تا ۹۵۷ھ)

سلطان قلی قطب شاہ نے ۵۰ سالہ عہد حکومت کے بعد ۹۹ سال کی عمر میں انتقال کیا تھا ۔ وہ گولکنڈہ کی نوخیز سلطنت کو مستحکم حالت میں چھوڑ گیا تھا ۔ اس کے ۶ بیٹے تھے ۔ فرزند اکبر حیدر قلی جو جانشینی کے لئے نامزد ہو چکا تھا باپ کی زندگی میں انتقال کر گیا ۔ اس کے بعد سلطان قلی قطب شاہ نے اپنے دوسرے بیٹے قطب الدین کو ولیعہد بنایا لیکن اس کے مقابلہ میں اس کے دوسرے بھائی جمشید قلی ، عبد الکریم اور دولت قلی بہت تیز طبیعت اور حوصلہ مند تھے ۔ چھوٹا بیٹا ابراہیم قطب دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ لائق تھا ۔ عبد الکریم باپ کی زندگی ہی میں بغاوت کی پاداش میں مارا گیا ۔ اور جمشید اور دولت بھی نظر احتیاطاً قید رکھے گئے تھے ، لیکن جمشید قلی جو گولکنڈہ ہی میں مقید تھا ، اپنے لئے قید میں سے راستہ صاف کرنے لگا اس نے سازش کی اور ایک شخص میر محمود ہمدانی کے ذریعہ اپنے باپ کو قتل کروایا ۔ باپ کے مرنے کے بعد جمشید قید سے باہر نکلا اور اپنے ہمدردوں کے زور سے سلطنت کے سیاہ و سفید اپنے ہاتھ کر لیے ۔ قطب الدین ولیعہد سلطنت اندھا کر دیا گیا ۔

۹۵۰ھ میں جمشید قطب شاہ کی تخت نشینی عمل میں آئی اور ۹۵۷ھ تک سات سال اس نے حکومت کی ۔ اگرچہ تخت نشینی کے بعد جمشید نے رعایا کو خوش کرنے کی کوشش کی اور انہیں مختلف انعامات سے سرفراز کیا لیکن راعی و رعایا میں کچھ خوشگوار تعلقات نہ پیدا ہو سکے ۔ پہلے تو اس کے کرتوت ہی اس کی بدنامی کے لئے کافی تھے پھر تخت نشینی کے بعد جبکہ اس کی عمر ۰۰ سال کی تھی ، طبیعت کی ترشی اور تند مزاجی نے اس کے بہت سے مخالف پیدا کر دئے ۔ جمشید کا چھوٹا بھائی ابراہیم جو دیورکنڈہ سے بھاگ کر ملک برید کے پاس بیدر پہنچ گیا تھا برید کی امداد کے ساتھ گولکنڈہ کی دیواروں تک پہنچ گیا ۔ اگرچہ یہ حملہ برہان نظام شاہ والیٔ احمد نگر کی تائید سے رفع ہوگیا تھا لیکن ملک برید اس حملہ کے بعد سے گولکنڈہ کی امداد بیاسی فضا اور جمشید کی کمزوریوں سے واقف ہوگیا ۔ بیدر کی بریدشاہی سلطنت بہت مختصر تھی لیکن اس زمانہ میں برید دکن کی لومڑی کہلاتے تھے ۔ وہ آپس کے جوڑ توڑ میں بہت مشاق تھے کبھی بیجاپور کا ساتھ دیا تو کبھی احمد نگر کا ۔ ہر حیلہ و بہانہ سے ان سلطنتوں کو لڑوا دیا کرتے تھے تاکہ اس طرح سے ان کا فائدہ ہو جائے ۔ چنانچہ جمشید کے زمانے میں بھی لڑائیاں بہت کم ہوئی ہیں ۔

برہان نظام شاہ نے جمشید قلی قطب شاہ سے زیادہ دوستی بڑھائی شولاپور پر احمد نگر نے حملہ کیا تو عماد الملک اور جمشید دونوں احمد نگر کے ساتھ شریک تھے۔ لیکن ابراہیم عادل شاہ کی تائید پر برید کی فوجیں تھیں۔ کہتے ہیں کہ اس موقع پر جمشید ہی نے بڑا کام کیا۔ اس کے آگے بڑھنے سے ابراہیم اور برید میدان چھوڑ کر بھاگے اور جمشید نے برید کا بیدر کی دیواروں تک تعاقب کیا۔

اس شکست کے بعد برید خاموش کیسے بیٹھ سکتا تھا۔ انتقام لینے کے لئے برید نے غالباً ۹۵۱ھ میں گولکنڈہ پر حملہ کردیا۔ لیکن جمشید نے بڑی ہوشیاری کی۔ تھوڑی سی فوج یہاں چھوڑ کر چپکے سے بیدر پر حملہ کر بیٹھا۔ برید کی فوجیں لوٹ گئیں اور دونوں کا مقابلہ ہوا۔ یہاں بھی گولکنڈہ کی فتح ہوئی۔

برید کا جذبہ انتقام اس کی شکستوں سے اور بڑھ رہا تھا۔ اب اس نے چوتھی مرتبہ ابراہیم عادل شاہ بیجاپور کے اتحاد سے جمشید پر حملہ کیا۔ کئی دن لڑائی ہوئی مگر اس میں بھی جمشید ہی کے سر فتح کا سہرا رہا۔

اس کے بعد جمشید نے ہمیشہ کے لئے برید کا خاتمہ چاہا۔ اس نے دکن کی تمام دوسری ریاستوں کو ہموار کرکے برید پر متفقہ حملہ کیا۔ بیجاپور بھی جو اب تک برید کا دوست تھا اس اتحاد میں شریک ہوگیا۔ چنانچہ جب برید ہار مان کر بیجاپور بھاگا تو بجائے امن دینے کے ابراہیم نے اسے گرفتار کرلیا۔ لیکن دکن کی سلطنتوں میں کچھ ایسی رقابت تھی کہ اب کی بار جمشید نے برید کو چھڑا لیا اور بیدر لے جاکر صحیح سلامت چھوڑ دیا۔

بیدر سے واپسی کے بعد جمشید نے دو تین سال آرام میں گزارے۔ لیکن یہ کچھ زیادہ دن تک آرام نہ لے سکا۔ وہ بڑے سخت مرض میں مبتلا ہوگیا۔ فرشتہ اسے دق بتاتا ہے لیکن مصنف تاریخ قطب شاہی کے الفاظ میں یہ مرض سرطان تھا جس کے صدمہ سے بالآخر ۹۵۷ھ میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس نے صرف سات سال حکومت کی۔ اس کو سلطان قلی قطب شاہ کے قریب دفن کیا گیا۔

انتہائی برائیوں کے گھٹا ٹوپ میں جو جمشید سے سرزد ہوئی تھیں اس کے کوئی اوصاف روشنی میں نہ آسکے۔ لیکن اس کی برائیوں کو قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو اس میں بہت سے اوصاف ایسے بھی ملتے ہیں جو سراہنے کے قابل ہیں۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے جمشید قطب شاہ ہندوستان کے اچھے حکمرانوں میں سے تھا۔ دکن کی سیاست پر اس کی وسیع نظر تھی۔ سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے وہ ہمیشہ کامیاب ہتھکنڈے اختیار کرتا تھا۔ چنانچہ برید کے شر و فساد سے دامن چھڑانے کے لئے احمد نگر اور بیجاپور سے اتحاد کیا تھا۔ اس کی فوجی تنظیم نہایت اچھی تھی۔ وہ خود جری سپاہی تھا اور فوج میں بذات خود حصہ لیتا تھا۔ اس کی دلیری اور جرات ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ سوائے جنگ ناراین کھیڑ کے جہاں عین الملک کے بیٹے کی غفلت سے کام خراب ہوا تھا گولکنڈہ کی فوج کو کبھی شکست نہیں ہوئی۔ اور سلاطین دکن ہمیشہ اس کی امداد کے طالب ہوتے تھے۔ وہ شجاعت کے ساتھ خوش مزاجی کا جوہر بھی اپنے اندر رکھتا تھا۔ ان اوصاف کے ساتھ جمشید میں علمی قابلیت بھی تھی۔ وہ اچھا شاعر تھا۔ بعض دفعہ اس نے فی البدیہہ شعر کہے تھے۔ اس نے فرصت کے زمانوں میں بہت سے قصیدے اور غزلیں بھی لکھی تھیں۔

عبدالحفیظ صدیقی

ابراہیم قلی قطب شاہ

(۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ)

جمشید قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد تخت گولکنڈہ کے کئی دعویدار کھڑے ہو گئے۔ جمشید کا کمسن بیٹا سبحان قلی تخت پر بٹھا دیا گیا لیکن دو زبردست حریف اٹھ بیٹھے۔ دولت قلی نے گولکنڈہ میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اور ابراہیم قلی بیجا نگر سے حصول تخت کے لئے روانہ ہوا۔ دولت قلی کو کسی نہ کسی طرح مقید کر لیا گیا پر ابراہیم قلی کے سامنے کسی کی پیش نہ گئی اور ۹۵۷ھ میں تخت گولکنڈہ ابراہیم قلی قطب شاہ سے زینت پایا۔ ابراہیم قلی قطب شاہ بڑا مدبر اور دوربین بادشاہ تھا۔ اس نے مصطفٰے خان کو اپنا وزیر مقرر کیا اور اپنی بہن اس سے منسوب کر دی۔

۹۶۰ھ میں حسین نظام شاہ اور ابراہیم قطب شاہ کے متحدہ لشکر نے گلبرگہ کا محاصرہ کر لیا لیکن رام راج والی بیجا نگر کی کمک و تنبیہ نے محاصرہ اٹھانے پر مجبور کیا۔

۹۶۶ھ میں علی عادل، رام راج اور ابراہیم قطب شاہ تینوں نے احمد نگر پر حملہ کر دیا۔ قریب تھا کہ احمد نگر فتح ہو جائے لیکن چونکہ اس فتح سے علی عادل کی قوت بہت بڑھ جاتی تھی۔ اور سلطنت گولکنڈہ کو اس سے خدشہ تھا۔ ابراہیم راتوں رات اپنا لشکر لے کر چلا آیا۔ حسین نظام شاہ نے اپنی بیٹی ابراہیم کے عقد میں دی۔ اور اپنے کھوئے ہوئے قلعے واپس لینے کے لئے ابراہیم کی مدد چاہی۔ ابراہیم نے اپنی فوج بھیج دی۔ لیکن یہ مہم مستقل طور پر نہیں لڑی گئی۔ کچھ ہی دن بعد فوج بغیر کسی نتیجہ کے واپس لوٹی۔ اس وقت گولکنڈہ بیرونی حملہ آوروں کی زد میں تھا۔ رام راج کی فوج اندر تک گھس آئی تھی اور بادشاہ کو گولکنڈہ، گھن پورہ، اور پانگل کے قلعے دے کر صلح کر لینا پڑا۔ بیرونی دشمن دفع ہو چکا تو اندرونی دشمنوں نے سر اٹھایا۔ ابراہیم قلی نے گولکنڈہ کے حصار کی مرمت کروائی اور شہر کو ہر طرح محفوظ کر لیا۔ اسی اثنا میں نائب وزیروں کا فساد ہوا لیکن بہت جلد فرو کر دیا گیا۔

رام راج کی قوت بہت بڑھ چلی تھی اور وہ اسی زعم میں اپنی ہمسایہ سلطنتوں کو چھیڑ چھیڑ کر اپنی طاقت جتلا رہا تھا۔ مسلمان تو نہیں ایک دوسرے کی دشمن سہی لیکن وقت پر متحد ہونا بھی جانتی تھیں۔ ابراہیم قلی قطب شاہ، حسین نظام شاہ، علی عادل، اور علی برید نے رام راج پر حملہ کر دیا۔ اور مشہور فیصلہ کن جنگ تالی کوٹ ہوئی۔ راجہ کو شکست فاش ہوئی۔ اور ابراہیم کے کھوئے ہوئے قلعے پھر اسے واپس مل گئے۔

۹۷۹ھ میں ابراہیم نے رفعت خان لاری کو راجمندری کی فتح کے لئے بھیجا۔ دو زبردست معرکوں کے بعد راجمندری پر قطب شاہی افواج قابض ہو گئیں۔

ابراہیم کا دور حکومت نہایت پر آشوب اور معرکہ آرائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ایک فتنہ کا سر دبایا گیا تو دوسرا اٹھا۔ بادشاہ کا لشکر کبھی اتحادیوں کو ان کی بدعہدی کی سزا دینے میں مصروف ہوتا تو کبھی چھوٹے موٹے راجاؤں کو ان کی سرکشی کی۔ شاہی اقبال ہمیشہ یاوری کرتا اور ہر جگہ بادشاہ کو فتح ہوتی۔
ابراہیم قلی قطب شاہ کا انتقال ۹۸۸ھ میں ہوا۔ کل تیس سال نو مہینے اس کی حکومت کا زمانہ ہے۔ اس کے زمانے میں گولکنڈہ میں کئی عمارتیں بنیں۔ لنگر، دوازدہ امام، ریاض محل، باغ ابراہیم شاہی، حوض حسین ساگر، کنکورہ بدویل، کے علاوہ مساجد، مدارس بھی تعمیر پائے۔

رشید قریشی

ابراہیم قلی قطب شاہ
۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ

محمد قلی قطب شاہ
بانی حیدر آباد
۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ

قومی تعمیر کی بنیاد رکھی اور اس کو آگے بڑھانے کی پوری کوشش کی۔ دوسری طرف تمدنی صفات نے ترقی پائی۔ قائم کیا۔ اس کے زمانے کے مختلف نشان تعمیری آثار اس حقیقت کی پوری نشان دہی کرتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ تلنگی زبان کا بڑا عالم تھا، اور روایت ہے کہ اس نے تلنگی میں ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ وہ پہلا آدمی ہے جس نے حیدرآباد میں اردو میں شاعری کی۔ اس کی نظمیں اور غزلیں اس کے ادبی ذوق اور ارتقائے اردو کے بہترین نمونے ہیں۔ ان نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مقامی معاشرت اور روایات سے بھی گہری دلچسپی تھی۔

محمد قلی قطب شاہ کے تمدنی کارناموں کی ایک بڑی فہرست ہے۔ صرف شہر حیدرآباد اور اس کی تعمیر اس بادشاہ کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ حیدرآباد کی تعمیر کی صحیح تاریخ نامعلوم ہے۔ شہر کے بیچ میں ایک سڈول عمارت چار مینار کی تاسیس ۹۹۹ھ میں ہوئی تھی غالباً یہ ڈیڑھ دو سال میں تیار ہوئی اور "یا حافظ" سے اس کی تاریخ نکلتی ہے۔ شہر کی تعمیر کا بڑا مقصد ملک میں ایک اجتماعی زندگی پیدا کرنا تھا۔ بادشاہ نے شہر کی تعمیر کے ساتھ اس بات کا پورا لحاظ رکھا تھا کہ اس میں ایک متمدن زندگی کی تمام ضرورتیں مہیا ہوں۔ شہر و عمارت کی خوش اسلوبی و عظمت کی وجہ سے گولکنڈہ کے مورخ کا یہ کہنا کہ "در تمامی ہندوستان عدیلے ندارد" بڑی حقیقت پر مبنی ہے۔

سلطان محمد قطب شاہ

(سنہ ۱۰۲۰ھ تا سنہ ۱۰۳۵ھ)

عبدالحفیظ صدیقی

سلطان محمد قلی وصیت کر گیا تھا کہ اس کے بھتیجے سلطان محمد کو تخت پر بٹھایا جائے۔ اس لئے سلطان محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۹ سال تھی۔ سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ راجہ دستہ کی مہم کا تصفیہ کرنا تھا۔ راجہ دستہ نے ۱۰۲۱ھ اطاعت قبول کر لی تو شاہی فوجیں پایۂ تخت کو لوٹ آئیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مغلوں کا تسلط دکن پر روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اور مصلحت وقت یہی تھی کہ سلطان محمد بھی مغلوں سے صلح کر لیتا۔ جب شاہجہان مفرور شہزادہ کی حیثیت سے دکن میں مارا مارا پھر رہا تھا سلطان محمد نے اس کی بڑی مہمان داری کی۔ سلطان محمد بڑا مہمان نواز اور فراخ دل بادشاہ تھا۔ اس کے دربار میں دور دور کے سفیر حاضر رہتے اور بڑی بڑی تنخواہیں پاتے۔

سلطان محمد کا بڑا بیٹا عبداللہ مرزا ۱۰۲۳ھ میں پیدا ہوا۔ بادشاہ نے ۱۲ سال تک اس کی صورت نہ دیکھی۔ کیونکہ یہی منجموں اور رمالوں کی رائے تھی۔ بارہ سال گزرنے کے بعد بادشاہ نے اپنے بیٹے کی صورت دیکھی بھی تو کچھ نہ ہوا۔ دوسرے تیسرے روز سے بادشاہ کو بخار شروع ہوا۔ طبیبوں کے باہمی اختلاف نے مرض کو اور بڑھا دیا اور ۱۰۳۵ھ میں ۳۲ سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا۔ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کی تاریخ ملنی بہت مشکل ہے۔ داستانوں اور قصے کہانیوں سے کچھ حال معلوم ہو سکا۔ اس کے جنگی کارنامے بھی معلوم نہ ہو سکے ہاں اتنا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے عادات و اطوار نہایت خوب اور زبان زد خاص و عام تھے۔ یہ صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔ کہتے ہیں کہ جس وقت بادشاہ کو مسجد کی بنیاد رکھنے ایسے آدمی کی تلاش ہوئی جس کی تہجد تک قضا نہ ہوئی ہو تو خود بادشاہ ہی ایسا شخص تھا۔ شعر کہنے کا بھی شوق تھا اور خوب کہتا تھا۔ حیدرآباد کی جامع مسجد (جو اب مکہ مسجد کہلاتی ہے) اسی کے عہد میں شروع ہوئی لیکن مسجد کے ختم ہونے سے پہلے ہی بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔

سلطان محمد قطب شاہ
۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵

سلطان عبداللہ قطب شاہ
۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ

اپنا ایلچی روانہ کیا اور نہایت جرأت سے شہنشاہ کو لکھا کہ "ہم آپ سے مدارات کرتے ہیں سنبھاجی کو بھی اکساتے ہیں دیکھیں گے آپ کن کن سے مقابلہ کرتے ہیں"۔ اورنگ زیب کی نظر سے یہ تحریر گزری تو بہت غضبناک ہوا اور شاہزادہ شاہ عالم بہادر شاہ کو فوج کثیر کے ساتھ گولکنڈہ کی طرف روانہ کیا۔ ابوالحسن کی فوج نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن جب قطب شاہی سپہ سالار مغلوں سے مل گئے تو فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ دوسرے دن پھر لڑائی ہوئی اس اثنا میں بادشاہ اپنے سپہ سالاروں سے بدظن ہو گیا۔ خلیل اللہ خاں جو گولکنڈہ کا نہایت نامی سپہ سالار تھا۔ ان سے ٹوٹ کر مغلوں سے جا ملا۔ اب ابوالحسن نے قلعہ گولکنڈہ میں پناہ لی۔ ادھر مغل سپاہیوں نے حیدرآباد میں وہ قیامت برپا کی کہ قتل نادری اس کے سامنے گرد تھا۔ ابوالحسن کی درخواست پر جدال و قتال روک دیا گیا اور صلح کے شرائط طے ہونے لگے۔ صلح کی شرط ایک یہ بھی تھی کہ مادنا و اکنا کو قید کرکے بھیج دیا جائے۔ بادشاہ نے منظور کیا۔ بہادر شاہ نے میر ہاشم کو صلح کے لئے بھیجا لیکن گولکنڈہ میں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اصل میں میر ہاشم تانا شاہ کو گرفتار کرنے آیا ہے۔ نیز عبدالرزاق لاری اور شرزہ خاں نے میر ہاشم پر حملہ کر دیا اور اسے قتل کر دیا۔ اورنگ زیب کو شہزادہ کی سستی اور تاخیر کی جب خبر ہوئی تو بہت کبیدہ ہوا اور دوسری مہموں کو ٹھکانے لگا کر گولکنڈہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ابوالحسن نے صلح کی بہت کچھ کوشش کی مگر اورنگ زیب نے گولکنڈہ کو محصور کر لیا۔ تنگ آمد بجنگ آمد ابوالحسن نے بھی سخت مقابلہ کیا لیکن عبداللہ خاں پنی کی غداری سے اورنگ زیب نے قلعہ فتح کر لیا۔ عبدالرزاق لاری نے اس موقع پر جس شجاعت و نمک حلالی کا ثبوت دیا وہ تاریخ میں یادگار ہے۔

قلعہ میں مغل سردار گھسے تو سارے قلعہ میں ادھم مچ گئی۔ ہر جانب آہ و نالوں کی آوازیں تھیں۔ اس وقت کھانا تیار تھا۔ سلطان ابوالحسن اپنے لواحقین کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر شہزادہ کے پاس گھوڑے پر سوار ہو کر آیا۔ قیمتی موتیوں کی مالا اس کے گلے میں ڈال دی۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ ابوالحسن کی عمر کے ۱۴ سال طفلی میں ۱۴ سال تحصیل علم میں ۱۴ سال سید راجو حسینی کی خدمت میں ۱۴ سال حکمرانی میں اور چودہ ۱۴ سال قلعہ دولت آباد میں گزرے۔ ابوالحسن کی تین بیٹیاں تھیں۔ اور ایک لڑکا خدابندہ جس کو اورنگ زیب نے بندہ سلطان کا خطاب دیا تھا۔ اس بادشاہ کی زندگی نے جس قدر افسانوی حیثیت حاصل کر لی ہے وہ تاریخی مطالعہ سے لغو ثابت ہوتی ہے۔ بادشاہ کی نزاکت، عیش پرستی، اور سادہ لوحی کے جو قصے بیان کئے جاتے ہیں وہ اس کے تاریخی کیرکٹر کو بگاڑ نہیں سکتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مستقل مزاج، دلیر اور متوکل بادشاہ تھا جس کی پیشانی عین گرفتاری کے وقت بھی شکن آلودہ نہ ہوئی۔

تانا شاہ کو ایک لڑکا اور تین لڑکیاں تھیں، اورنگ زیب نے دوسری لڑکی کی شادی سکندر عادل شاہ سے اور تیسری کی اسد خاں وزیر کے فرزند سے کر دی۔ پہلی لڑکی نے یہ کہہ کر شادی سے انکار کر دیا کہ وہ اپنے بزرگ باپ کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کر دینی چاہتی ہے۔ تانا شاہ کے لڑکے خدابندہ کو باپ کی وفات کے بعد اپنے دربار میں طلب کیا اور بندہ سلطان خطاب دیا، لیکن جب یہ شہزادہ دربار میں آتا تو اہل دربار جن میں دکنی امرا بھی تھے اس کی تعظیم کرتے۔ جس کی وجہ اورنگ زیب کو شبہ ہوا اور پھر یہ لڑکا کبھی نظر نہ آیا۔

رشید قریشی

سلطان ابوالحسن قطب شاہ
(تانا شاہ)
۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۸ھ

وداعِ شاہ

تانا شاہ کی روانگی کے وقت اہلِ گولکنڈہ کی زبان سے

باحال تباہ جا رہا ہے کانٹوں کی بے راہ جا رہا ہے
کس یاس سے آہ جا رہا ہے اب قلعہ سے شاہ جا رہا ہے

کس طرح غبارِ راہ دیکھیں
ٹوٹے ہوئے دل کی چاہ دیکھیں

مٹ جائیں گے خود ہی اے صدوہم آئیں گے نہ تیرے روبرو ہم
کرلیں گے تباہ رنگ و بُو ہم بیچیں گے نہ اپنی آبرو ہم

کس آس پہ اب رہیں جہاں میں
اُڑتے ہوئے رنگِ گلستاں میں

ہم تو نہ طلائے تاج شاہی کن آنکھوں سے دیکھیں یہ تباہی
آتا ہے ہمیں بھی رقصِ ماہی پائیں گے نہ اسنے بے گناہی

واللہ تڑپ کے جان دیں گے
مرکر ہی تجھے مکان دیں گے

پامال ہوں آفتاب ہوکر گرجائیں شراب ناب ہوکر
چھپ جائیں نظر سے خواب ہوکر بے کیف رہیں شباب ہوکر

جب شاہ نہیں تو ہم رہیں کیوں
غیروں سے حدیثِ غم کہیں کیوں

بے آبروئی سے ڈر رہی ہیں تھک کے جہاں کو مر رہی ہیں
نعشوں سے کنوئیں کو بھر رہی ہیں کام آنے کا کام کر رہی ہیں

ہواج پہ رقص آب و گل ہے
ہر جنس کا دل بھی مردہ دل ہے

مشاہیرِ گولکنڈہ

اس نام سے ایک کتاب آج کل زیر ترتیب ہے جس میں گولکنڈہ کے جملہ مشہور اصحاب (بادشاہوں سے کر غلاموں تک) کے تاریخی حالات نہایت دلچسپ پیرایہ میں قلمبند کئے جا رہے ہیں۔ اسی کتاب سے چند اصحاب کے حالات یہاں درج ہیں۔

(وزرائے گولکنڈہ) جملۃ الملک مرزا محمد امین

اصفہان کے رہنے والے حیدرآباد آکر دربار شاہی کی ملازمت اختیار کی۔ سلطان محمد قلی نے حضرت میر مومن استرآبادی کی سفارش پر ۱۰۱۱ھ میں خدمت میر جملگی سپرد کی اور جواہرات کا ایک ایسا مرصع قلمدانِ وزارت عنایت کیا جس کی روشنی سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ دو ۲ لاکھ ہون سالانہ تنخواہ مقرر کی گئی جو حال کے نو لاکھ روپیوں کے برابر ہوتے ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ قطب شاہی وزیر اعظم کی تنخواہ عہد حاضرہ کے وزیر اعظم کی تنخواہ سے تقریباً دس گنا زیادہ تھی۔ محمد امین نے میر جملہ ہوتے ہی باغیوں اور سرکشوں کو زیر کیا اور سواری راؤ برہمن کو کاروبارِ سلطنت سے بے اثر کر دیا ۱۰۱۲ھ میں جب آگرہ اور دہلی کے مغل سوداگر حالت نشہ میں شاہی محل میں بغیر اجازت کے دیکھنے کے لئے داخل ہوئے اور بادشاہ نے علی آقا کوتوال کو حکم دیا کہ انھیں باہر نکال دیا جائے تو شہر کے اوباشوں کو موقع مل گیا اور انھوں نے ان سوداگروں کے مال و اسباب کو لوٹنا شروع کیا اس ہنگامۂ عظیم کو محمد امین نے بڑی ترکیب سے فرو کیا اس اثنا میں محمد امین کا اثر بہت بڑھ گیا تھا جس کی وجہ سے دکنی امرا نے بادشاہ سے ناخوش ہو کر اس کے بھائی خدا بندہ کو بغاوت کے لئے اکسایا لیکن اس بغاوت میں وہ ناکام ہوئے۔

۱۰۱۹ھ میں محمد امین نے بادشاہ کی ایک شاندار دعوت کی اور اپنے مکان کو رشکِ فردوس بنا کر پا انداز میں زربفت و اطلس اور مخمل و مشجر کے کپڑے بچھا دئے۔ جب بادشاہ تشریف لائے تو شاعروں نے قصیدے سنائے اور مطربوں نے نغمے۔ آخر میں محمد امین نے تیس ۳۰ عربی گھوڑے بیس ۲۰ ہاتھی اور ہیرے کا ایک مدور آئینہ جس کے اطراف قسم قسم کے جواہر نصب کئے ہوئے تھے ایک سونے کی زین جس پر جواہر کا کام کیا ہوا تھا، چودہ جلد خوش خط قرآن شریف اور دیگر قیمتی اشیاء بطور نذر پیش کئے اور طعام کے بعد قصہ خوانوں اور ندیموں کو پچاس ہزار ہون انعام میں دے بادشاہ نے چلتے وقت اپنے کندھوں سے زردوزی چادر نکال کر محمد امین کو عنایت کی۔

۱۰۲۰ھ میں پرتاب راؤ کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے محمد امین کو روانہ کیا گیا مگر وہ ناکام رہے اسی سال محمد قلی نے وفات پائی۔ ان کی وفات سے قبل ہی محمد امین نے شہر سے ملحق ایک عالی شان تالاب بنایا جو تالاب میر جملہ کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ اسی تالاب کے کنارے مشرق رویہ محمد امین کی ڈیوڑھی بھی تھی جو اپنی آرائش اور خوبی تعمیر کی وجہ سے مشہور تھی اور جس میں آخر زمانے تک بڑے بڑے سفرا اور معزز مہمان ٹھیرائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ محمد امین نے موسیٰ ندی کے کنارے ایک امین باغ بھی بنایا تھا جو اس عہد کا ایک نہایت پر فضا مقام تھا اس امین باغ میں آج کل سرکاری زچگی خانہ ہے۔

جب سلطان محمد قطب شاہ تخت نشین ہوا تو مرزا محمد امین نے حج کو جانے کے لئے رخصت حاصل کی اور اپنی پوری دولت کے ساتھ گولکنڈے سے نکل کر بیجاپور کا رخ کیا۔ وہاں ان کی خاطر خواہ آؤ بھگت نہیں ہوی تو وہ ایران چلے گئے اور گولکنڈہ سے لائے ہوئے ایک لاکھ روپے کے جواہر شاہ عباس کی خدمت میں پیش کئے۔ لیکن شاہ عباس میں بھی انھیں محمد قلی جیسی خوبیاں نظر نہ آئیں تو دوبارہ ہندوستان آکر ۱۰۲۶ھ میں جہانگیر کے دربار میں ملازمت اختیار کی اور پچاس ہزار روپے کے جواہر نذر کئے۔ وہاں بھی انھیں وہ عروج حاصل نہ ہو سکا جو گولکنڈہ میں نصیب ہوا تھا البتہ میر بخشی کے خطاب سے سرفراز ہوئے آخرکار ۱۰۴۶ھ میں شاہجہاں کے عہد میں لقوہ اور فالج سے انتقال کیا۔

غواصی ملک الشعرائے گولکنڈہ

مرزا محمد امین میر جملہ

حیدرآباد میں وفات پائی۔

خواجہ افضل سلطان محمد کے زمانہ میں دو سال خدمت سرخیلی پر اور سلطان عبداللہ کے زمانہ میں چھ سال سپہ سالاری، صوبہ داری و وزارت کے عہدہ پر مامور رہے۔ دربار و ثروت میں اپنے امثال و اقران میں ممتاز تھے اسی لئے حدیقہ میں ان کو اعظم الامرا لکھا ہے۔ ان کے ملازمین جن میں ایک ہزار ترکی و عرب و عجمی سوار تھے ہوتی بیگ کے سپرد کئے گئے۔ اور ان کی جاگیر منقضی ہو کر پیر فصیح ابن خواجہ نظر شفی کو سرفراز کی گئی۔

مرزا روزبہان اصفہانی

سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے عمائدین سلطنت سے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی وفات سے دو ماہ قبل ربیع الاول ۱۰۳۵ھ میں ان کو خواجہ افضل ترک کی معزولی کے بعد سرخیلی کے منصب ارجمند پر سرفراز کیا تھا۔ لیکن سلطان عبداللہ کی تخت نشینی کے بعد جب خانم آغا اور منصور خاں حبشی کا دربار پر اثر جم گیا تو مرزا روزبہان کو معزول کر کے جلیسان حضور کے زمرہ میں شریک کر دیا گیا۔ لیکن جب منصور خاں میر جملہ کا انتقال ہوگیا اور علامہ ابن خاتون پیشوائے سلطنت اور مختار دربار ہو گئے تو انھوں نے مرزا روزبہان کے لئے کوشش شروع کی اور بادشاہ کے سامنے ان کی بڑی تعریف کی چنانچہ ۳ ربیع الاول ۱۰۴۱ھ کو مرزا روزبہان دوبارہ منصب سرخیلی پر مامور کئے گئے اور انھوں نے پوری قوت کے ساتھ فوج اور رعایا کے معاملات سرانجام کرنے شروع کئے۔ لیکن بادشاہ کو ان پر اعتبار نہ آیا اور وہ ہمیشہ ان کو شبہ کی نظر سے دیکھتے رہے۔ آخرکار بددیانتی کے الزام میں منصب سرخیلی سے ۱۸ صفر ۱۰۴۲ھ میں ہٹائے گئے اور شیخ الدین محمد کو سرخیل بنایا گیا۔

عین الملک منصور خاں حبشی

سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے اکابر سلطنت سے ہیں حوالہ داری لشکر رکاب خاصہ کے علاوہ وزارت عین الملکی پر مامور تھے۔ اور بادشاہ اور ان کی والدہ کے مزاج میں دخور حاصل تھا۔ چنانچہ جب بادشاہ مرض موت میں مبتلا ہوئے تو ان کے علاج کے بارے میں اطبائے ہند اور اطبائے عراق کے مابین اختلاف پیدا ہوگیا۔ بادشاہ کی والدہ کا خیال تھا کہ اطبائے ہند علاج کریں کیونکہ جو مزاج ہندوستان کی آب و ہوا میں پرورش پاتے ہیں ان کے لئے مناسب ہے کہ ہندوستانی طبیبوں کا علاج کرایا جائے۔

اگرچہ والدۂ بادشاہ کی اس رائے سے اکثر امرائے دربار کو اختلاف تھا لیکن منصور خاں کی تائید کی وجہ سے ہندوستانی اطبا نے علاج کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت منصور خاں کتنے صاحب اقتدار تھے۔

سلطان محمد کے انتقال کے بعد سلطان عبداللہ کو تخت نشین کرانے میں اور پایۂ تخت میں انتظام اور امن و امان قائم رکھنے میں منصور خاں نے بڑا حصہ لیا۔ اس وقت بادشاہ کی کم عمری کی وجہ سے سلطان محمد کی والدہ ہی کاروبار سلطنت میں دخیل تھیں اور انھوں نے زور دے کر منصور خاں کو میر جملہ بنایا۔ نظام الدین احمد مولف حدیقۃ السلاطین چونکہ علامہ ابن خاتون کے طرفداروں میں سے تھے اس لئے انھوں نے اپنی تاریخ میں منصور خاں کی خدمات کے اعتراف میں بخل سے کام لیا ہے اور جگہ جگہ ذم کا پہلو نمایاں کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ منصور خاں اور ملک یوسف وغیرہ اس وقت کے ان ملکی امرا اور جانثاران سلطنت سے تھے جن کو علامہ ابن خاتون اور دیگر اجنبی امرا اپنے راستے میں حائل سمجھتے تھے اور چونکہ سلطان عبداللہ کی طبیعت بہت کم زور واقع ہوئی تھی اس لئے انھوں نے با اقتدار امرائے عراق کے زیر اثر اپنے قدیم امرا اور خدمت گذاروں کو بہت جلد بے اثر کر دیا۔

منصور خاں کی میر جملگی کا پہلا اثر یہ پڑا کہ مرزا روزبہان اصفہانی جن کو صرف دو ماہ قبل سلطان نے خواجہ افضل ترک کو معزول کر کے سرخیل بنایا تھا اپنے عہدے سے معزول ہو گئے منصور خاں نے برہمنوں کو بھی برسر کار کیا کیونکہ نظام الدین احمد مورخ کا بیان ہے کہ خود میر جملہ کو لکھنا نہیں آتا تھا۔ تاہم اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ منصور خاں سپاہیوں پر خوب نظر رکھتے تھے اور انھوں نے اس طبقہ کی حالت کو درست کر دیا اگرچہ غیر ملکیوں کے ساتھ ان کا سلوک اچھا نہ تھا۔

منصور خاں نے وزارت پناہ خواجہ افضل ترک کو پھر سے ایک لاکھ ہون تنخواہ کی جاگیر پر سرفراز کر کے امرائے عظام کے طبقہ میں شامل کر دیا منصور خاں نے اس شان و شوکت سے میر جملگی کی خدمت انجام دی کہ دارالسلطنت میں ان کے غلاموں کا بھی رعب بیٹھا ہوا تھا اور بڑے بڑے عہدہ دار بھی ان سے ڈرتے تھے چنانچہ حدیقہ میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ۹ محرم ۱۰۳۰ھ کو دیوان کے ایک حبشی غلام نے میدان دربار میں شب چراغاں کا اہتمام کرتے وقت قاسم بیگ کوتوال کے ساتھ بے ادبی کی لیکن چونکہ میر جملہ کا آدمی تھا قاسم بیگ کچھ نہ کر سکے اور رنجیدہ ہو کر گھر بیٹھ رہے اور منصب کوتوالی سے استعفا دے دیا۔

نظام الدین احمد کا بیان ہے کہ جملۃ الملک منصور خاں قاسم بیگ کوتوال اور شاہ محمد منشی دونوں کو ہٹا کر ملا محمد تقی کو خدمت کوتوالی اور میر سید مومن کو منشیگری دلانا چاہتے تھے چنانچہ اول الذکر کو مچھلی پٹن سے اور موخر الذکر کو دہلی سے طلب کیا تھا۔ اور محمد تقی تو حسب الطلب حیدرآباد پہنچ بھی گئے۔ منصور خاں نے کئی بار کوشش کی کہ بارگاہ شاہی میں پیش کر کے منصب کوتوالی دلاویں لیکن بادشاہ پر علماء اس خاتون کا اثر پڑنا شروع ہو چکا تھا وہ انجان ہوتے گئے اور آخر کار قاسم بیگ کی جگہ پر ملا محمد تقی کو مامور کرنے کے بجائے [illegible] بیگ نامی کوتوال کو خدمت کوتوالی پر ترقی دے دی۔ اب جو محمد تقی کو مایوسی ہوئی تو میر جملہ نے اپنی پیشی میں مقرر کر کے میر جملگی کا کام جو کوتوال کے کام سے ارفع ہے ان کے سپرد کر دیا اس طرح ۱۰۳۰ھ میں مہام امور دیوانی میں ملا تقی نائب میر جملہ ہو گئے اور ایک سال تک اس خدمت کو انجام دیا

آغاز محرم ۱۰۳۲ھ میں منصور خاں نے دو سال سات مہینے اور چند روز میر جملگی کی خدمت انجام دے کر ایک انتقال کیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ منصور خاں کی وفات کے بعد چھ سال دس مہینے تک منصب میر جملگی پر کوئی بھی فائز نہ ہو سکا آخر کار ۹ شوال ۱۰۳۸ھ میں علامہ ابن خاتون نے منصور خاں کی جگہ لی۔ اس اثنا میں منصور خاں کی خدمات کو تین چار امرا میں تقسیم کر دیا گیا تھا یعنے ملا محمد تقی سرخیل، آدم خاں عین الملک اور پسر منصور خاں حوالہ دار فوج رکاب خانہ وغیرہ۔

شریف الملک ملا محمد تقی

سلطان محمد قطب شاہ کے دور میں بندر مچھلی پٹن کے حوالدار تھے سلطان عبداللہ کے دور میں جب منصور خاں حبشی میر جملہ نے اقتدار تمام حاصل کیا تو ان کا خیال تھا کہ قاسم بیگ کوتوال کی جگہ ملا محمد تقی اس خدمت پر سرفراز ہوں چنانچہ ۱۰۳۲ھ میں ملا محمد کو لکھا کہ پایہ تخت چلے آئیں۔ ملا بہت خوش ہوئے اور ایک ہاتھی پانچ ہزار ہون نقد اور دیگر تحف و ہدایا کے ساتھ محرم ۱۰۳۳ھ میں حیدرآباد آئے۔ منصور خاں ان کی آمد سے بہت خوش ہوئے اور چاہتے تھے کہ بادشاہ ان کو منصب کوتوالی پر سرفراز کریں چنانچہ تین مہینوں تک برابر دولت خانۂ عالی میں ساتھ لے جاتے رہے اور ایک دفعہ تو زر نقد ہاتھی اور دیگر تحفے بادشاہ کی خدمت میں پیش بھی کر دئے مگر بادشاہ نے ملا تقی کو باریاب نہ کیا بادشاہ یہ چاہتے تھے کہ ملا تقی بجائے کوتوالی کے منصور خاں کے قائم مقام بن کر منصب سرخیلی انجام دیں اور اسی لئے وہ ٹال رہے تھے تاکہ کوتوالی کا مستقل انتظام ہو لے تو ملا محمد تقی کو

باریاب کرکے سرخیل بنادوں آخرکار ۷ ربیع الاول ۱۰۳۰ھ کو بادشاہ نے حسن بیگ نائب کوتوال کو حیدرآباد کی کوتوالی کل پر سرفراز کردیا۔
اب منصورخاں بڑے پریشان ہوے لیکن انھوں نے ملا محمد تقی کو اپنے ہی ساتھ رکھ کر میر جملگی کے جملہ جہات کو ان کے سپرد کردیا اس طرح ملا محمد تقی کو توالی سے زیادہ اہم اور بڑے عہدہ کا کام انجام دینے لگے۔ انھوں نے ایک سال تک منصورخاں کے نائب کی طرح دیوانی کی خدمات اور میر جملگی کے جملہ امور انجام دے بادشاہ بھی یہی چاہتے تھے۔
محرم ۱۰۳۱ھ میں منصورخاں نے یکایک انتقال کیا تو ان کی جگہ کے لئے بہت سے امراء نے کوشش کی اور نذرانے پیش کرنے شروع کئے لیکن ملا محمد تقی پہلے ہی سے امور دیوانی انجام دئے رہے تھے، منصورخاں نے بھی کئی بار ان کے کام کی تعریف کی تھی اور بادشاہ پر ان کی کاردانی کا سکہ بٹھا چکا تھا اس کے علاوہ اس دفعہ ملا نے دوسروں کے نذرانوں سے زیادہ پیش کش دیا اس لئے بادشاہ نے انھی کو پسند کیا اور ۲۳ صفر ۱۰۳۱ھ کو منصب جلیل القدر سرخیلی پر سرفراز کیا۔ اس موقع پر دوسرے شاعروں کی طرح ملا نظام الدین احمد مولف حدیقہ نے بھی ایک قطعہ تاریخ ملا کی خدمت میں پیش کیا تھا جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

خسرو یوسف رخ جمشید جاہ	شاہ عبداللہ شاہ کامیاب
مولوی را بہر سرخیلی نمود	از میان جملہ اعیاں انتخاب
تربیت فرمود اورا ہمچو مہر	تاکہ شد یاقوت سان باآب وتاب
عقل بہر منصبش تاریخ گفت	دائماً سرخیل بادا کامیاب

سرخیل ہونے کے بعد ملا تقی نے بادشاہ کے مزاج سے کافی واقفیت پیدا کرلی اور جملہ مہمات دیوانی اور کل معاملات سلطانی پر ایسا قبضہ کرلیا کہ دوسروں کو دخل دینے کا موقع نہ دیا، خاص کر برہمنوں کے لئے رعایا پر ظلم وستم کرنے کا موقع نہ رہا۔ اور محاصل کی رقمیں اچھی طرح داخل خزانہ ہونے لگیں۔ چنانچہ صرف ناماٹن راؤ مجموعہ دار سے ایک سو تیس ہزار ہون وصول کرکے داخل خزانہ کئے گئے اور جو چودہ ہی اور صاحبان جائداد منافق مغرور اور ظالم ہوگئے تھے ان کو قتل کرکے ان کی جائداد اور ذخیروں پر شاہی قبضہ کرادیا۔
ان خدمات کے صلہ میں بادشاہ نے ملا کو شریف الملک کا خطاب عطا کیا اور وہ قلمدان مرصع جو مرزا محمد امین میر جملہ کے بعد سے کسی کو مرحمت نہیں کیا گیا تھا ملا شریف الملک کو عنایت کیا گیا۔ اس اثنا میں مغلوں کے حملہ دکن کی خبریں مشہور ہونے لگی تھیں اس لئے سلطان نے شریف الملک کو پچاس ہزار ہُنوں کی جاگیر دی تاکہ ایک لشکر تیار رکھے اور فیل خانۂ خاص سے چند مست ہاتھی بھی عنایت کئے۔ اس طرح سرخیلی اور سرداری ایک ہی جگہ جمع ہوگئی۔ ملا نے بہت جلد دکنیوں، عربوں اور پٹھانوں کی ایک فوج تیار کرلی اور میدان دلکشائے داد محل میں لاکر بادشاہ کو دکھادی۔ بادشاہ بہت خوش ہوے اور ملا کے مدارج میں اور بھی اضافہ کردیا۔ اس طرح شریف الملک کی عزت و وقعت اور اثر ورسوخ اور بھی بڑھ گیا۔
جب شریف الملک کی ذات میں دو عہدے یعنے سرداری اور سرخیلی جمع ہوگئے تو مہات دیوانی اور ضبط ربط امور مملکت کے ساتھ ساتھ شہسواری اور سپہ گری کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی۔ چنانچہ دو روز آنہ شام کا وقت ندی محل کے برابر رود موسیٰ کے کنارے وسیع میدان میں کمانداری اور چوگان بازی میں گذارتے تھے۔ ایک وقت گھوڑے پر سے گرے اور چوٹ کھائی لیکن تکلیف میں کچھ کمی ہوئی تھی کہ آخر شعبان ۱۰۳۱ھ میں

ملا نظام الدین احمد
مورخ گولکنڈہ

خواجہ مسیح محمد ابن داؤد
نیسواے گولکنڈہ

نوابوں کے سپہ سالار

موسیٰ خاں

حمدان خاں

علی باغ میں جشن رمضان میں شرکت کی اور غذا میں بے احتیاطی کی وجہ سے ہیضہ و اسہال کا مرض لاحق ہوگیا، اور اس حالت بیماری میں رمضان بھر صبح و شام بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اس حاضری میں اور مسلسل کھڑے رہنے کی وجہ سے طبیعت اور بگڑتی گئی آخر کار رمضان کی عید کے دن جب بادشاہ نے دربار کیا اور ملا شریف الملک عرصہ تک برابر کھڑے ہو کر لشکر اور رعایا کے معروضے پیش کرتے رہے تو طبیعت بالکل بگڑ گئی اور اس روز کے بعد دربار کو آنا نصیب نہ ہوا۔ حکیم اسمٰعیل گیلانی اور دیگر ہندوستانی طبیبوں نے علاج کیا بادشاہ نے اپنے علام حسن علی خاں کو پرسش احوال کے لئے بھیجا اور آخر میں اپنے خاص طبیبوں کو بھی علاج کرنے کے لئے حکم دیا مگر پیمانۂ حیات پر ہوچکا تھا ملا محمد تقی شریف الملک نے ۱۹ شوال ۱۰۴۱ھ میں انتقال کیا

انھوں نے دو سال آٹھ ماہ بڑے کر و فر اور اثر و اقتدار کے ساتھ حکومت کی اور بادشاہ کی خیر خواہی اور آداب عبودیت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ان کے انتقال کا بادشاہ کو بھی صدمہ ہوا معلوم ہوتا ہے کہ ملا شریف الملک کو اولاد نہ تھی۔ کیونکہ بادشاہ نے ان کی بیوہ اور ہمشیروں کے حال پر خاص نوازشیں کیں اور ان کو پورے سامان کے ساتھ عراق جانے کی اجازت دی

ابن خاتون

شیخ محمد نام ابن خاتون طوسی عاملی کے بیٹے اور شیخ بہائی کے بھانجے تھے سلطان محمد قطب شاہ کے عہد کے علما میں سے ہیں ان کے علم و فضل کی وجہ سے بادشاہ نے ان کو منشی الملک اور دبیر سلطنت بنا کر بارگاہ سلطانی کے مقربان خاص میں شامل کر لیا تھا جب سلطان محمد علی کی وفات کے بعد شاہ عباس صفوی کا سفیر حسین بیگ قبچاچی حیدرآباد آیا تو اس کی واپسی کے وقت بادشاہ نے سنہ ۱۰۲۴ھ میں علامہ شیخ محمد ابن خاتون کو بیش قیمت تحفے دے کر اس کے ساتھ ایران کو روانہ کیا جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور وہ تقریباً دس سال مقیم رہے اور پھر جب واپس آنے لگے تو شاہ ایران نے ان کے ساتھ قاسم بیگ سپہ سالار مازندران کو روانہ کیا اور سنہ ۱۰۳۵ھ میں اس وقت حیدرآباد واپس ہوئے جب کہ سلطان محمد قطب شاہ کا انتقال ہوچکا تھا سلطان عبداللہ نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور اپنے پھوپا شاہ محمد ولد شاہ علی عرب شاہ شہزادہ پیشوائے سلطنت کا نائب مقرر کیا۔ اور پیشوا کی طرح ان کو بھی اپنی مجلس میں بیٹھنے کی اجازت دی چونکہ یہ خدمت مشترک تھی اس لئے بادشاہ نے محمد رضا استرآبادی سے منصب دبیری لے کر دوبارہ ابن خاتون کو دبیر سلطنت بھی بنا دیا۔

ان دو خدمات جلیلہ کی وجہ سے ابن خاتون کی عزت و احترام میں بہت اضافہ ہوگیا اور انھوں نے دربار کے بڑے امور میں دخل پا کر اپنے توسط سے بہت سے لوگوں کو نوجوان بادشاہ کے مراحم خسروانہ سے فائدہ پہونچایا اس بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر شاہ محمد پیشوا ان سے کھٹکنے لگے اور دربار میں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں ہونی شروع ہوئیں آخر کار رجب سنہ ۱۰۳۴ھ میں شاہ جہاں کا ایلچی شیخ محی الدین حیدرآباد آیا تو بعض باتیں ایسی ہوئیں کہ بادشاہ شاہ محمد پیشوا سے بالکل ناراض ہوگئے اور ان کو معزول کر کے ۹ رمضان سنہ ۱۰۳۵ھ میں ابن خاتون کو پیشوائی کل سے سرفراز کیا اس خوشی میں ابن خاتون کے طرفدار علما، فضلا اور شعرا نے مبارک باد کے قصائد و قطعے لکھے جن میں سے ایک قطعہ حدیقۃ السلاطین کے مصنف نے لکھا تھا جو درج ذیل ہے ؎

شہ یوسف رخ و جمشید حشمت | کہ حاتم می کند از وے گدائی
ز فرط حمت کردہ ممکن | محمد را بصدر پیشوائی
بسامان شد مہام ملک وملت | کہ بود ابتر ز آفات سمائی
متاع فضل و دانش بود کاسد | کنوں بگرفت در عہدش روائی
جہاں معمور گردیدہ بد انساں | کہ شد محو از خلائق بے نوائی
بالہام آمد ایں مصراع تاریخ | محمد یافت از حق پیشوائی

پیشوا ہونے کے بعد ہی علامہ ابن خاتون نے شیخ محی الدین ایلچی شاہ جہاں کو واپس کردیا اور کچھ ایسی ترکیب کی کہ وہ شاہ جہاں کے پاس معتوب قرار پایا۔

ابن خاتون اگرچہ بہت صاحب ثروت تھے اور نواب علامہ کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے لیکن ساتھ ہی مطالعہ کتب، تصنیف و تالیف بھی جاری تھی بے حد علم دوست تھے اور روز اُن کے مدرسہ میں بڑے بڑے علماء و فضلا جمع ہوتے اور علوم معقول و منقول پر مباحثے اور مذاکرے کیا کرتے۔ منگل کو جو قطب شاہی سلطنت میں چھٹی کا دن ہوتا ان کے یہاں شعرا جمع ہوا کرتے اور شعرائے متقدمین کے کلام پر مذاکرہ کے علاوہ طرحی غزلوں کا مشاعرہ بھی کرتے تھے۔

ابن خاتون خود بھی بہت بڑے مصنف تھے شرح ارشاد، ترجمہ کتاب العین، حاشیہ جامع عباسی ان کی تصانیف ہیں جامع عباسی کی تکمیل بھی انہی نے کی تھی۔ یہ اپنے عہدہ کے لحاظ سے جملہ مذہبی امور کے بھی ذمہ دار تھے۔ چنانچہ جب ۱۰۴۰ھ میں حیدرآباد میں بڑا زبردست قحط ہوا تو شہر کے تمام علماء و فضلاء و اتقیا سہ روزہ روزہ رکھ جمعہ کی صبح میں پا برہنہ علامہ ابن خاتون کے یہاں پہونچے اور ان کے ساتھ نماز استسقاء کے لئے شہر سے باہر نکل کر موسیٰ ندی کے کنارے جمع ہوئے اور بعد نماز دعا پڑھی۔ آخر میں ابن خاتون نے صدر مجلس میں بیٹھ کر اشرفیوں کی سفید اور لال تھلیاں بادشاہ کی طرف سے تمام مستحقوں میں تقسیم کیں اور ہاتھیوں اور اونٹوں پر جو پیسے بادشاہ نے خیرات کے لئے روانہ کئے تھے وہ بھی تقسیم کردئے بعد میں بادشاہ کی افزونی عمر کی دعا کرکے شہر کو مراجعت کی۔

اس عزت و احترام کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ ابن خاتون کے مخالفین برابر کام کررہے تھے چنانچہ جب بیجاپوری لوگ حیدرآباد آئے تھے تو ابن خاتون کا اثر کم ہوگیا اور ۱۳ رجمادی الآخر ۱۰۴۲ھ کو یہ اپنی خدمت سے معزول کردئے گئے اور میر محمد رضا استرآبادی پیشوا مقرر ہوئے اس زمانے میں ابن خاتون خانہ نشین ہوگئے لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد جب شہزادی کی پالکی بیجاپور روانہ ہوئی تو عبداللہ قطب شاہ پھر علامہ کی طرف متوجہ ہوئے اور جو کدورت پیدا ہوئی تھی دور ہوگئی چنانچہ اپنے ایک مقرب خاص کو طلائی پاندان دے کر علامہ کے یہاں روانہ کیا اور چند روز کے بعد خود ان کو طلب کرکے نوازش خاص کا اظہار کیا اور صدر الشریعت صدر جہاں کی جگہ ان کے بیٹھنے کے لئے معین کی اور سلطنت کے جملہ امور کے متعلق پہلے سے زیادہ مشورہ لینا شروع کیا۔ آخر کار ابن خاتون کو ۹ رشوال ۱۰۴۳ھ کو جملۃ الملکی کا خلعت حاصل ہوا۔

(باقی آئندہ) سید محی الدین قادری زور

گولکنڈے کے صوفیائے کرام

سید شاہ راجو

شاہ میر محمود

تاناشاہ کے ہندو دیوان

مادنا پنتلو اور اکنا پنتلو کے بارے میں مستند فارسی کتب میں کوئی مواد نہیں البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابوالحسن تاناشاہ کے وزراء تھے کوئی فارسی تاریخ ایسی نہیں ہے جو ان کو بدکردار اور جاہل نہ لکھتی ہو۔ تعجب کا مقام ہے کہ ان پانچ کسی کتاب میں بھی ان کی بدکرداری کا کہیں ذکر نہیں جس سے ان مورخوں کی رائے کی تائید ہو سکے۔ یورپی کمپنیوں کے مکاتیب سے ان کی زندگی پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ان کی رائے اس وجہ سے قطعی تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ یہ فریق متعلقہ بھی ہیں اور خود غرض بھی۔ مقامی روایات، قصے، کہانیاں ہی ہمارے وہ ماخذ ہیں جن سے ہم کچھ مستفید ہو سکتے ہیں۔ ان واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان وزراء کی زندگی کا مختصر تذکرہ بہ نیت اطمینان لیا جاتا ہے اور حتی المقدور اس امر کی کوشش کی جائے گی کہ ان کی زندگی کا کوئی ایسا پہلو پیش نہ کیا جائے جو موجودہ مواد کی بنا پر ناقابل انتزاع بن سکے۔

دیوان مادنا

اکنا اور مادنا بھنگی بھانو جی پنتلو کے فرزندان نیک بخت تھے۔ بھانو جی پنتلو ہنمکنڈہ کا عامل یا عہدہ دار تھا اس نے اپنے چاروں بیٹوں کی عمدہ تعلیم و تربیت کا انتظام کیا تھا۔ اکنا اور مادنا ختم تعلیم کے بعد عبداللہ قطب شاہ کے درمیانی عہد سلطنت میں حیدرآباد آئے۔ مرزا سید احمد نے ان کو اپنے صیغۂ حساب میں ملازم رکھا۔ فضا اور ماحول کی ناموافقت کے باوجود وہ اپنی ان تھک محنتوں کی وجہ سے درجہ بدرجہ ترقی کرتے گئے اور ۱۶۶۶ء کے بعد مادنا سید مظفر سپہ سالار عبداللہ قطب شاہ کا پیشکار مقرر ہوا۔ اس طرح جب اس کو قلمدان وزارت سپرد کیا گیا تو یہ اس کے وسیع تجربوں کی بنا پر تھا نہ کسی اور ذریعہ کے تحت۔

(۱) ۱۶۷۲ء کے انقلاب میں مادنا نے سید مظفر سے کسی طرح کم حصہ نہ لیا تھا۔ سید مظفر اور موسیٰ خان علی الترتیب میر جملہ اور سر خیل مقرر ہوئے اور مادنا میر جملہ کا پیشکار مقرر ہوا۔ سید مظفر کی حرص اقتدار نے اسے ایک ایسی مصلحت اختیار کرنے کی ترغیب دی جس کے نتیجے سے بادشاہ حکومت کا برائے نام صدر رہ جاتا ہے۔ سید مظفر اہم معاملات میں بھی بادشاہ کا مشورہ نہیں لیتا تھا جس سے علانیہ مخالفت کی بو آتی تھی۔ ابوالحسن جیسے عاقل اور مدبر حکمران سے یہ حرکت کب برداشت ہو سکتی تھی لیکن وہ کھلم کھلا اس کو بے دخل کر دینے پر بھی آمادہ نہ تھا اس لئے اس نے اکنا اور مادنا دونوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور ان کے ذریعہ سید مظفر کے متعلقین اور فوج کے عہدہ داروں کو ہموار بنا کر ۱۶۷۴ء میں بھرے دربار میں سید مظفر کی نازیبا حرکتوں کا راز فاش کر دیا اور اس سے قلمدان وزارت لے کر مادنا کے سپرد کر دیا۔ اس طرح مادنا اپنی قابلیت وفاداری اور تجربے کی بنا پر عہدۂ وزارت عظمیٰ پر فائز ہوا۔ اور دربار شاہی سے سوریا پرکاش راؤ کا خطاب اور خلعت پایا۔ اکنا اپنے بھائی کا پیشکار بنا۔ اب ہم کو ان کی حکومت کے تین پہلوؤں سے واقف ہونا ہے۔ (۱) اندرونی مصلحت (۲) خارجی حکمت عملی (۳) فوجی تنظیم۔

اول الذکر کے بارے میں ان کے اصول حکومت کے متعلق کوئی تفصیلی معلومات اب تک فراہم نہ ہو سکیں تاہم موجودہ قلیل معلومات کی بدولت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے پیشروؤں کی حکومت بہ زیادہ ان کے طریقۂ کار سے ملک میں باضابطگی و امن قائم ہو سکا۔ تجارت، کان کنی، جہازرانی اور زراعت میں بہت ترقی ہوئی البتہ گولکنڈہ کے کرناٹکی مقبوضات میں جو بعد میں حاصل کئے گئے تھے نظم و نسق قائم کرنے کا موقع نہیں ملا۔ قبل اس کے ہم کوئی قطعی رائے پیش کریں ہمارا اخلاقی فرض یہ ہو گا کہ ہم ملک کے ان حالات پر غور کریں جن کی وجہ سے ملک کو ناگفتہ بہ مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اورنگ زیب کی حکمت عملی کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ گولکنڈہ کو کس قدر

نیک نام خان — وزیر گولکنڈہ

سید مظفر — وزیر گولکنڈہ

صدر دیوان گولکنڈہ

زیب بنایا جائے کہ حکومت کا نظام درہم برہم ہو جائے اور فوج منحرف ہو جائے۔ اسی غرض سے مغلوں نے آئے دن مطالبات میں اضافہ کرنا شروع کیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بادشاہ اپنے خانگی اور حرم کے جواہرات فروخت کر کے مطالبات پورے کرتے تھے۔ ملک و مالک کی تباہی سے مادنا کی حکومت کے بنیادی اصول کا ایک پہلو مسئلۂ تخفیف میں ظاہر ہوا تو دوسرا عدیم المثال ضبط و تنظیم میں۔ گولکنڈہ کی تاریخ میں یہ دونوں بہت اہم اور نئی باتیں ہیں۔ تمام امراء، عہدہ داروں کی تنخواہوں میں تخفیف کی گئی۔ اعلیٰ اور ادنیٰ تمام عہدہ دار اس قانون کی پابندی کرنے پر مجبور کئے گئے اور یہی وجہ ہوئی کہ تمام لوگ وزیر کے مخالف ہو گئے۔ مادنا کی غیر ہردلعزیزی کا یہ ایک اہم اور بنیادی سبب ہے۔ اس واقعہ میں مادنا سے زیادہ قصور امرا کا ہے الزام یہ ہے کہ وہ اپنی تنخواہ کا ایک قلیل حصہ حکومت کو دینے کے لئے تیار نہیں تھے اور ایک واویلا مچا کر حکومت کو کمزور بنا دیا۔ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مادنا کی عزت عوام میں زیادہ تھی ۱۶۸۶ء تک وزیر اعظم نے تین مرتبہ پورے ملک کا دورہ کیا ہے۔

دوسرا پہلو خارجی مصلحت کا ہے۔ دکنی آزاد سلطنتیں ذاتی تحفظ کیلئے مغلوں کے مقابلہ میں ایک دوسرے کی مدد کرتی تھیں چنانچہ عبداللہ قطب شاہ نے مرزا راجہ جے سنگھ کے خلاف علی عادل شاہ ثانی کی مدد کے لئے نیک نام خاں کے تحت بارہ ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادوں کی ایک جرار فوج روانہ کی۔ مادنا اور ابوالحسن نے اس مصلحت کو برقرار رکھا اور مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے لئے ایک قومی محاذ بنا لیا۔ یہ اسی کا انتہائی تدبر اور ریاست دانی ہے کہ اس نے سیواجی کے ہاتھوں کو دوستی اور اخوت کے رشتے سے باندھ دیا اور اس طرح سلطنت گولکنڈہ سیواجی کی تاخت و تاراج سے بچی رہی۔ اس دور اندیشی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس نے قلعہ جات ترنگل کنڈہ ویلی، دیلکنڈہ وغیرہ کو مستحکم کروا کر ہر ایک کی حفاظت کے لئے بارہ ہزار سپاہیوں کو متعین کر دیا۔ بیجاپور میں اپنے بھائی اکنا کو بحیثیت حاجب اس لئے مقرر کیا تھا کہ وہاں کی خارجی مصلحت کی رہبری کرے۔ مادنا نے ابوالحسن کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ قلعہ گولکنڈہ میں محصور نہ ہو جائے بلکہ کسی دوسرے کے قلعہ میں جائے اور بصورت ضرورت گولکنڈہ کو فوجی امداد روانہ کرے لیکن چونکہ شیخ منہاج کے مشورے کا زیادہ اثر تھا اس لئے اس مشورہ پر عمل نہیں کیا گیا۔ "مادنا اور اکنا منصب کے لالچ میں ابوالحسن کو اورنگ زیب کے ہاتھوں فروخت کرنا چاہتے تھے"۔ یہ الزام تاریخ کے کسی طالب علم کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔ یہ دونوں بھائی اورنگ زیب اور ابوالحسن سے خوب واقف تھے۔ فوجی تنظیم کے بارے میں جاننے کیلئے کہ ہم اپنی رائے کا اظہار کریں مناسب ہوگا کہ واقعات کا اظہار کر دیا جائے جس سے ناظرین کو خود رائے قائم کرنے کا موقع مل سکے۔ ۱۶۵۶ء میں گولکنڈہ کی فوج اگرچہ مغل صوبہ دار کے لشکر کا مقابلہ بیگون بھی نہ کر سکی اور قلعہ گولکنڈہ مغل گولہ باری کی تاب نہ لا سکا۔ لیکن ۱۶۸۶ء اور ۱۶۸۷ء میں شہنشاہیت کی ساری قوت قلعہ کے سامنے میدان میں تین مہینے تک روکی گئی اور تمام تاریخیں گولکنڈہ کی فوج کی بہادری کے کارناموں سے بھری پڑی ہیں۔ اگر محمد ابراہیم باغی نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ مغلوں کو گولکنڈہ کے میدان میں ایسی شکست فاش ہوتی کہ مغل پھر ادھر کا رخ نہ کرتے۔ محاصرۂ گولکنڈہ سے ہر شخص واقف ہے ان تمام واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ناظرین اپنی ذاتی رائے قائم کر سکتے ہیں۔

مادنا پر ظالم اور متعصب ہونے کا جو الزام لگایا گیا ہے وہ شہنشاہی افواج کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ گولکنڈہ پر حملہ کرنے کا ایک حیلہ تھا۔ ناظرین پر یہ واقعہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قتل تدبیر سے مسعود خاں اور شرزہ خاں کے بارے میں بھی بیجاپور میں یہی مصلحت اختیار کی گئی تھی جو نتیجہ یہ کہ ۱۶۸۶ء میں تین اعیان سلطنت نے سازش کی اور ان کو قتل کرا دیا۔ جمشید نامی ایک غلام کے چند اور دوسرے غلاموں کے ساتھ ان کے سر تن سے جدا کر کے شہزادہ شاہ عالم بہادر کے پاس روانہ کئے۔ حرم سے سرو ماں اور جانی بی بی نے اس سازش میں زیادہ حصہ لیا ہے

شہزادہ نے ان کے سروں کو بہادر خان کے ذریعہ شولاپور میں اورنگ زیب کے پاس روانہ کیا جہاں وہ ہاتھی کے پیروں تلے روندے گئے ۔

اکنا پیشکار

یہ مادنا کا بڑا بھائی تھا ۔ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص غیر مہذب، بدتمیز اور صاف گو تھا ۔ مادنا کے وزیر اعظم بننے کے بعد یہ ان کا پیشکار مقرر ہوا ۔ اور پھر قطب شاہی کرناٹک کا صوبہ دار بنا ۔ صوبہ داری کے عہدے سے سرلشکری پر ترقی پائی ۔ عہد نامہ بیجاپور کے بعد وہاں کا حاجب مقرر ہوا ۱۰۹۶ھ میں بیجاپور سے واپس ہوا اور ۱۰۹۷ھ میں مادنا کے ساتھ قتل کر دیا گیا ۔

اس نے کرناٹک اور مشرق کا دورہ کیا اور بندرگاہوں کے انتظام میں نہایت لیاقت سے کام لیا اور اس طرح گولکنڈہ کی آمدنی میں اضافہ کیا ۔ فوج کی تنظیم بھی اس کا بہت [illegible] ہے ۔ اس کے دو بھانجوں رستم راؤ اور پودلی لنگنا نے بادشاہ کی کئی اہم خدمات انجام دیں ۔ خافی خاں رستم راؤ کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے کہ وہ صاحب السیف والقلم ہے ۔ پودلی لنگنا نے انگریزوں کو بہ حیثیت [illegible] بار بار زک دے کر گولکنڈہ میں رسوخ پیدا ہونے سے روکتا رہا ۔ اس لئے یہ دونوں معاون اس کے دونوں ہاتھ تھے جو ہر طریقے سے اس کی اس کام میں مدد کرتے تھے ۔ اکنا کے ایک خط میں انگریزوں کو ان الفاظ میں تنبیہ کی گئی کہ وہ پودلی لنگنا کے اقتدار کو تسلیم کریں ۔ اس کے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈہ والی بحری تجارت بھی تھی ۔ اور جو ان بھائیوں کے تجارتی جہاز تھے [illegible] ولندیزی رسالے میں ان کو [illegible] بیان کیا گیا مگر اس کی تائید کسی اور تاریخ سے نہیں ہوتی ۔ موجودہ معلومات کی بنا پر ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ان کی طبیعت میں اکھڑپن زیادہ تھا ۔

یہ کہنا ہے دونوں بھائیوں نے ملک و مالک کی بے لوث خدمت کی ہے لیکن ان کی محنت کا انہیں معاوضہ نہیں ملا ۔ انہیں حکومت کو ایسی نازک حالت میں چلانا پڑا جس میں کامیابی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ تاہم چودہ سال تک جس قابلیت سے ان بھائیوں نے ملک کے اس ٹمٹماتے دیئے کو گل ہونے سے روکا ہے وہ قابل تحسین ہے ۔ بہت ممکن ہے کہ تاریخ دان اس حقیقت کے اظہار کی طرف متوجہ ہو کر ان الزامات کو غلط ثابت کر دیں گے ۔ اور زمانہ بتادے گا کہ ملک و مالک کے بہی خواہ کبھی نہ کبھی اپنی حقیقی قدر و منزلت حاصل کر کے رہیں گے ۔

کے، وی بھوپال راؤ

عبدالرزاق لاری گولکنڈہ کے دروازے پر

اک شیر ژیاں ہے کہ کھڑا جھوم رہا ہے — زخموں سے لہو گر کے قدم چوم رہا ہے
تلوار بھی اک ہاتھ میں بل کھائی ہوئی ہے — معلوم نہیں کس کی قضا آئی ہوئی ہے
دروازے میں اک جان ہے اور لاشوں کے انبار — اور سمت مقابل میں ہے تلواروں کی جھنکار
معلوم ہے اس کو کہ کوئی ساتھ نہ دے گا — بیتا کو اٹھانے میں کوئی ہاتھ نہ دے گا
پر اک دل لاری ہے کہ جو جان وفا ہے — یہ مطلع انوار وفا، کان وفا ہے

اکبر وفاقانی

گولکنڈہ کا آخری سپہ سالار عبدالرزاق لاری زخموں سے بے ہوش ہو کر گرنے سے پہلے

سلطنتِ ابد مدّت آصفجاہی

اور

سلاطینِ آصفی

سلطنت آصفیہ کا قیام تاریخ ہند کا ایک نہایت درخشاں باب ہے۔ اٹھارہویں صدی کے ہندوستان میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد کوئی شخصیت نواب نظام الملک سے زیادہ نمایاں نہ تھی جو منتشر قوتوں کو یکجا کرکے مرکزیت پیدا کرنے یا بڑی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو سکتی تھی چنانچہ نواب نظام الملک نے اول تو سلطنت مغلیہ کے بقاء اس کی اصلاح اور استحکام کے لیے ممکنہ کوشش کی لیکن جب اس میں کامیابی کی صورت نظر نہ آئی تو انھوں نے حریفوں کو شکست دے کر سلطنت آصفیہ کی بنیاد ڈالی (۱۷۲۴ء) نواب نظام الملک کے بعد جس شخصیت نے سینہ سپر ہو کر مشکلات کا مقابلہ کیا اور سلطنت کے لیے جو خطرات تھے ان کو دور کیا اور سلطنت آصفیہ کی صحیح معنوں میں تعمیر کی وہ بانی سلطنت کے فرزند آصف جاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں بہادر تھے۔

قیام سلطنت آصفیہ سے بہت سے فوائد حاصل ہوئے اول تو دکن کی بدنظمی اور بدامنی کا خاتمہ ہو کر امن و امان اور عدل و انصاف کا دور شروع ہوا۔ دوم یہ کہ ملک میں زراعت کی سرسبزی، صنعت و حرفت کی ترقی اور تجارت کی گرم بازاری ہونے لگی۔ بالخصوص شاہان آصفیہ کی شہرۂ آفاق رواداری اور انسانی حب الوطنی روایتی فیاضی اور عدیم المثال رعایا پروری نے ملک کی خوشحالی میں چار چاند لگا دئے حقیقت یہ ہے کہ شاہان آصفی کی حکومت اپنی ساری رعایا پر نہ صرف منصفانہ رہی بلکہ ہمیشہ مشفقانہ اور پدرانہ رہی ہے۔ انھوں نے قیام امن اور عدل و انصاف تک ہی خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ آثار قدیمہ کی حفاظت اور علم و فن کی سرپرستی میں بڑا حصہ لیا۔ اور جدید قوم ساز سررشتوں کو قائم کرکے رعایا کی مادی اخلاقی اور تعلیمی ترقی میں دن دونی اور رات چوگنی امداد کی۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ وسط انیسویں صدی ہی سے یعنی سالار جنگ اول کی وزارت کے زمانہ سے ترقی اور اصلاح کا دور شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس وقت مبارک عہد عثمانی میں جس تیز رفتاری کے ساتھ دکن میں ہمہ جہتی ترقی ہو رہی ہے وہ تاریخ ہند میں عدیم المثال ہے۔ حیدرآباد جدید کی تعمیر کے سلسلے میں اعلیٰ حضرت بندگان عالی کا نام ہمیشہ دنیا میں یادگار رہے گا کہ زراعت صنعت و حرفت تجارت تعلیم تعمیرات حفظان صحت غرض ہر شعبۂ زندگی میں غیر معمولی چہل پہل ہے۔ نتیجہ یہ کہ اب دکن صرف مشرقی تمدن و قدیم معاشرت ہی کا مرکز نہیں رہا ہے بلکہ اپنے عصری ترقیات کے اعتبار سے حیدرآباد مشرقی اور مغربی تہذیب کا گہوارہ اور قدیم و جدید تمدن کا سنگم بن گیا ہے۔ موجودہ ہمہ جہتی ترقی کی رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل نہیں کہ دور عثمانی میں حیدرآباد مستقبل اس کے بہمنیہ و قطب شاہیہ ماضی سے کہیں شاندار ہوتا جا رہا ہے۔

نواب نظام الملک آصفجاہ اول بانی سلطنت آصفیہ

(۱۷۲۴ء تا ۱۷۴۸ء)

نواب نظام الملک آصفجاہ اول کا خاندانی سلسلہ شیخ شہاب الدین سہروردی تک اور آگے حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے۔ نواب نظام الملک کے دادا عابد خاں عہد شاہ جہاں میں ہندوستان آئے تھے اورنگ زیب کے زمانے میں منصب پنج ہزاری در صدارت کل کے عہدہ پر فائز تھے گولکنڈہ کے محاصرہ میں گولے کے زخم سے شہید ہوئے۔

اُن کے فرزند میر شہاب الدین خاں اورنگ زیب کے مشہور امراء میں سے تھے جن کو منصب ہفت ہزاری اور غازی الدین خاں فیروز جنگ کا خطاب عطا ہوا تھا۔ انھیں کے نامور فرزند نواب نظام الملک آصفجاہ اول تھے۔

اُن کا اصلی نام میر قمر الدین تھا اور ولادت ۱۶۷۱ء میں ہوئی تھی۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں "چین قلیج خاں" کا خطاب اور منصب پنج ہزاری سے سرفراز ہوئے بعد ازاں بیجاپور کی صوبہ داری پر فائز ہوئے تھے۔ غرض اورنگ زیب کی اُن پر خاص عنایت تھی۔ حتیٰ کہ اورنگ زیب نے خاندانی حالات، وجاہت، بہادری اور تدبر کی بناء پر ان کو اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کام بخش کی لڑکی بیاہ دینی چاہی تھی لیکن مصلحت کی بناء پر نظام الملک نے اس کو پسند نہیں کیا۔

فرخ سیر کے زمانہ میں ان کو "نظام الملک بہادر فتح جنگ" کا خطاب ہفت ہزاری منصب اور دکن کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ چنانچہ ۱۷۱۳ء میں وہ بہ حیثیت صوبہ دار دکن اورنگ آباد آگئے تھے۔ لیکن اورنگ زیب کے نااہل جانشینوں کے زمانہ میں جب ملک کی حالت خراب ہوتی گئی اس وقت نظام الملک کو بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ وہ دکن سے مالوہ کی صوبہ داری پر بھیجے گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سارا ملک بادشاہ گر سیدوں (سید حسین علی اور سید عبداللہ دونوں بھائیوں) کے مظالم سے تنگ آگیا تھا۔ اس وقت سب کی نظریں نظام الملک کی طرف لگی ہوئی تھیں اس نازک موقع پر نواب نظام الملک نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ مخالفین سے سخت لڑائی ہوئی (جس میں سید دلاور علی خاں اور سید عالم علی خاں نائب صوبہ دار دکن مارے گئے) اس طرح نواب نظام الملک نے برہانپور، خاندیش، اور برار وغیرہ کے علاقوں کو فتح کیا۔ غرض سیدوں کا خاتمہ کرکے نہ صرف محمد شاہ کو انھوں نے نجات دلائی بلکہ سارے ملک پر ایک بڑا احسان کیا۔ محمد شاہ نے اس کے صلہ میں آصفجاہ کا خطاب دے کر ان کو سلطنت دہلی کا وزیر مقرر کیا لیکن دربار کی حالت دیکھ کر انھوں نے اپنے بڑے فرزند غازی الدین خاں کو دہلی میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود حیدرآباد تشریف لائے۔

راستہ میں برار کے قریب ان کو مبارز الدین خاں سے لڑنا پڑا جس میں وہ مارا گیا۔ غرض یہ وہ زمانہ ہے کہ ملک میں فتنہ و فساد کا بازار گرم تھا۔ کوئی مرکزی طاقت موجود نہ تھی جو امن و امان قائم کرسکتی ہو۔ اصل تو نواب نظام الملک نے سلطنت مغلیہ کو بچانے کی انتہائی کوشش کی لیکن جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو مجبوراً ۱۷۲۴ء میں سلطنت آصفیہ کی خودمختاری کی بنا رڈالی (یہی وجہ ہے کہ حسب فرمان خسروی ہر سال ۲۹ رجب کو اسی خودمختاری سلطنت آصفیہ کی یادگار میں عام تعطیل دی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود سلطنت دہلی کی خیرخواہی اور وفاداری میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ چنانچہ ۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تو وہ فوراً

دہلی پہنچ گئے اور وہاں غیر معمولی جرأت سے کام لے کر نادر کو لوٹ مار اور قتل عام سے روکا۔

دہلی سے دوبارہ دکن آکر انھوں نے مرہٹوں کا سدباب کیا اور دریائے تاپتی سے لے کر جنوبی ہند اور ارکاٹ تک سارے ممالک محروسہ میں امن و اماں قائم کیا۔ اس سے رعایا کو اطمینان نصیب ہوا۔ اس طرح سلطنت آصفیہ کے قیام سے ملک میں معاشی خوشحالی کا آغاز ہوا۔ نظام الملک بڑے رحمدل اور فیاض بادشاہ تھے۔ ان کو ہمیشہ اپنی رعایا کا بڑا خیال رہتا تھا۔ آخرکار سنہ ۱۱۶۱ھ میں مقام برہان پور انتقال کیا۔ چنانچہ دولت آباد میں ان کا مقبرہ موجود ہے۔

مختصر یہ کہ نواب نظام الملک نہ صرف اٹھارویں صدی کے سب سے بڑے قائد، زبردست سپہ سالار اور بہترین مدبر کی حیثیت سے یاد کیے جائیں گے بلکہ موجودہ سلطنت آصفیہ کے بانی ہونے کی وجہ سے تاریخ میں ان کی شخصیت ہمیشہ نمایاں رہے گی۔

نواب میر نظام علی خاں آصفجاہ ثانی

(سنہ ۱۷۶۱ء تا سنہ ۱۸۰۳ء)

نواب نظام الملک کی وفات پر دکن میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ اسی سلسلہ میں انگریزی اور فرانسیسی کمپنیوں کو ریشہ دوانیوں کا خوب موقع ہاتھ آیا۔ اور یہاں پر نظام الملک کے دوسرے فرزند ناصر جنگ نے دو سال تک حکومت کی ان کی شہادت پر نظام الملک کے نواسے مظفر جنگ چند روزہ حکومت کے بعد مارے گئے اس کے بعد امراء نے صلابت جنگ کو تخت نشین کیا جو اور بھائیوں کی بہ نسبت عمر میں بڑے تھے۔ لیکن ان کا زمانہ شروع سے آخر تک ایک کمزور زمانہ تھا جب کہ مرہٹہ اور فرانسیسی دکن پر چھا گئے تھے اور ملک کے انتظامی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے اس لیے امراء کے مشورہ سے محض ملکی مفاد کے مدنظر صلابت جنگ کی علحدگی عمل میں آئی اور نواب آصفجاہ ثانی تخت نشین ہوئے

نواب میر نظام علی خاں بہادر نظام الملک کے چوتھے فرزند تھے ان کی ولادت سنہ ۱۱۴۳ھ میں ہوئی تھی بچپن ہی سے وہ بہادر اور فنون سپہ گری سے خوب واقف تھے۔ چونکہ اپنے بھائی صلابت جنگ کے زمانہ میں وہ وزیر رہ چکے تھے اس لیے ان کو سلطنت کے معاملات کا بہت وسیع تجربہ تھا بادشاہ ہوتے ہی انھوں نے کھوئے ہوئے علاقے مرہٹوں سے حاصل کیے اور فرانسیسی اثرات کو دکن سے دور کیا بعد ازاں نہایت دوراندیشی سے کام لے کر انگریزوں سے رابطہ اتحاد قائم کیا اس زمانہ میں ٹیپو سلطان کی قوت بڑھ رہی تھی۔ اس لیے انگریزوں نے آصفجاہ ثانی اور مرہٹوں کو ملاکر اتحاد ثلاثہ قائم کیا اور میسور کے خلاف کامیابی حاصل کی اس کے کچھ عرصہ بعد جب مرہٹوں نے چوتھ کے مطالبہ کے سلسلہ میں حیدرآباد پر حملہ کیا تو انگریزی گورنر جنرل سرجان شور نے عدم مداخلت کا بہانہ کرکے مدد دینے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے سرکار نظام کو بمقام کھرڈلا ناکامی ہوئی اور سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

اس پر آصفجاہ ثانی نے انگریزی فوجوں کو برخاست کرکے ان کی جگہ موسیو ریموں کی ماتحتی میں فرانسیسی فوجیں ملازم رکھیں لیکن موسیو ریموں کی موت کے بعد جب انگریزی کمپنی کا مشہور و معروف گورنر جنرل ولزلی ہندوستان آیا تو اس نے نہایت حکمت عملی سے

آصفجاہ ثانی کو ہموار اپنی طرف کر کے فرانسیسی فوجوں کو دکن سے برطرف کرادیا۔

حیدرآباد کے عہد معاونت قبول کرنے کے بعد یہاں سے رقمی اور فوجی امداد حاصل کر کے ولزلی نے میسور کی ریاست پر حملہ کیا۔

ٹیپو سلطان کی شہادت اور ریاست میسور کے خاتمہ کے بعد کچھ علاقے مثلاً گزپہ، کرنول اور بلاری وغیرہ حیدرآباد کو برائے نام ملے تھے لیکن فوجی مصارف کے نام سے بہت جلد واپس لے لئے گئے۔

سنہ ۱۸۰۰ء میں آصفجاہ ثانی اور انگریزوں کے درمیان عام اعانت و حفاظت باہم دیگر کا مشہور عہدنامہ ہوا چنانچہ اُس وقت سے آج تک تاج برطانیہ اور ریاست حیدرآباد کے جو خوشگوار تعلقات قائم ہیں وہ اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آصفجاہ ثانی نے انگریزوں سے مستقل تعلقات قائم کر کے سلطنت آصفیہ کے لئے فرانسیسیوں، ٹیپو سلطان اور مرہٹوں کے جو زبردست خطرات تھے ان کو رفع کیا اور اندرون ملک سے فسادات کو دور کیا اور امن قائم کیا۔ اس طرح سنہ ۱۷۶۱ء سے ۱۸۰۳ء تک نہایت کامیابی کے ساتھ انھوں نے حکومت کی اور اپنی حکمت عملی اور دوراندیشی سے نہ صرف سلطنت کی ڈوبتی ناؤ کو بچالیا بلکہ اپنے عہد حکومت میں ممالک محروسہ کا رقبہ وسیع کر کے سلطنت آصفیہ کا وجود ہمیشہ کے لئے مستقل اور مستحکم کردیا۔ ان وجوہات کی بناء پر، خصوصاً اٹھارویں صدی کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب کہ ہندوستان میں ہر نقطہ نظر سے ایک عام انحطاط کا دور چلا آرہا تھا۔ ہمیں آصفجاہ ثانی کی شخصیت کیا بلحاظ بہادری اور کیا بلحاظ تدبر اپنے ہم عصروں میں سب سے ممتاز نظر آتی ہے۔ اور وہ بجا طور پر سلطنت آصفیہ کے حقیقی معمار سمجھے جاسکتے ہیں۔

نواب سکندرجاہ آصفجاہ ثالث

(سنہ ۱۸۰۳ء تا سنہ ۱۸۲۹ء)

نواب سکندرجاہ آصفجاہ ثانی کے بڑے بیٹے تھے اور ان کا نام میر اکبر علی خاں تھا۔ ان کے اوائل حکومت کا اہم ترین واقعہ مرہٹوں اور انگریزوں کی جنگ ہے۔ چونکہ نواب سکندرجاہ نے اس لڑائی میں ہر طرح سے انگریزوں کی امداد فرمائی تھی اس لئے کامیابی حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے دولت آباد وغیرہ کے علاقے نواب سکندرجاہ کو واپس کر دیے۔ لیکن اسی زمانہ سے فوجی اور ملکی معاملات میں انگریزوں نے زیادہ دخل دینا شروع کیا۔ چنانچہ میر عالم کے انتقال پر مدارالمہام کے تقرر کا سوال پیش ہوا تو رزیڈنٹ وقت کیپٹن سڈنیہم نے بہت کچھ مداخلت کی لیکن سکندرجاہ نے منیرالملک ہی کو اپنی مرضی سے وزیر منتخب کیا البتہ اتنا ضرور ہوا کہ سارے اختیارات پیشکار مہاراجہ چندولعل کے ہاتھوں میں آگئے، (جن کی تائید میں رزیڈنٹ تھا) چنانچہ اس کے بعد تقریباً تیس سال تک ریاست میں چندولال ہی کا بڑا عمل دخل رہا۔ ریاست کے انتظامی اور فوجی معاملات میں رزیڈنٹ رسل کی پیش قدمی، انگریزوں سے مہاراجہ چندولال کی غیر معمولی ہمدردی اور پامر کمپنی سے سودی قرضہ کا لین دین یہ وہ چیزیں تھیں جس کی وجہ سے ریاست حیدرآباد کی مالی اور انتظامی حالت بد سے بدتر ہوگئی۔ چنانچہ دوسرے رزیڈنٹ مٹکاف نے جایزہ لیتے ہی صاف طور پر یہ کہہ دیا کہ نئی اعانتی فوجیں حیدرآباد کے خزانہ پر بہت بار ہیں اور پامر کمپنی کا جال ایک دوسری مصیبت ہے۔ اس لئے اس نے بعض مفید تجاویز پیش کئے۔ چنانچہ گورنر جنرل وقت مارکوئس آف ہسٹنگز نے پامر کمپنی کا قرضہ تو انگریزی حکومت

کی طرف سے ادا کرا دیا لیکن شمالی سرکار کی جو پیشکش آصفجاہ ثانی کے زمانہ سے جاری تھی وہ اس سلسلہ میں ہمیشہ کے لیے بند کردی۔ اور فوجی بار حسبِ حال ریاست پر پڑتا رہا۔

مہاراجہ چندو لال کے عمل دخل کو دیکھ کر نواب سکندرجاہ نے خود امورِ سلطنت میں زیادہ حصہ نہیں لیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کے معاملات میں انگریزوں کی مداخلت روز بروز زیادہ بڑھتی گئی۔

نواب سکندرجاہ ایک خدا ترس، رحم دل اور نیک بادشاہ تھے۔ ان کو اپنی رعایا کے آرام و آسائش کا بڑا خیال تھا چنانچہ انھوں نے کئی تالاب سڑکیں وغیرہ تعمیر کرائیں۔ غرض رفاہ عام کے بہت سے کام انجام دیے۔ انگریزی اعانتی فوج کے لئے سکندرآباد کا شہر انھیں کی یادگار ہے۔

نواب ناصرالدولہ آصفجاہ رابع

(۱۸۲۹ء تا ۱۸۵۷ء)

میر فرخندہ علی خاں نواب ناصرالدولہ سکندرجاہ کے صاحبزادے تھے۔ تخت نشین ہوتے ہی انھوں نے ملکی انتظامات کو درست کرنے کی کوشش کی۔ ریذیڈنسی کے اثرات کو کم کیا۔ اس سلسلہ میں مہاراجہ چندو لال کے استعفا دینے کے بعد کچھ مدت تک بغیر کسی مدارالمہام کے بذاتِ خود وہ حکومت کے کام انجام دیتے رہے اور پھر کئی مدارالمہاموں کو خود ہی مقرر کیا اور معطل و علحدہ کردیا۔ انگریزوں کے قرضہ کی رقم بڑھتی جارہی تھی چنانچہ جب ڈلہوزی گورنر جنرل ہوکر ہندوستان آیا تو اس نے سخت تقاضا کیا کہ قرضہ کے معاوضہ اور فوجی اخراجات کے لیے ملک کے بعض اضلاع انگریزوں کے حوالے کیے جائیں۔ اس زمانہ کا رزیڈنٹ جنرل فریزر نہایت منصف مزاج اور ریاست کا خیر خواہ تھا۔ اس طرح کی ناواجبی مداخلت کو پسند نہ کرکے اس نے خود استعفا دے دیا۔

لیکن ڈلہوزی نے پھر دباؤ ڈالا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد کی اعانتی فوج کے اخراجات اور قرضہ کے سلسلہ میں نواب ناصرالدولہ پر انتہائی دباؤ ڈالا گیا۔ چنانچہ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی رو سے رائچور کا دوآبہ اور برار کا علاقہ عارضی پٹہ پر انگریزوں کے حوالے کردیا گیا اس واقعہ کا حیدرآباد کے وزیر سراج الملک پر اتنا اثر ہوا کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر ان کا انتقال ہوگیا اور ان کی جگہ ان کے بھتیجے میر تراب علی خاں سالار جنگ اول مدارالمہام مقرر ہوئے جنھوں نے نہ صرف تین بادشاہوں کے زمانہ میں مدارالمہامی کی اہم ترین خدمت انجام دی بلکہ جدید حیدرآباد کے بنانے میں شاید سب سے زیادہ حصہ لیا۔

نواب ناصرالدولہ کے زمانہ ہی سے انھوں نے سیاسی اصلاحات اور معاشی و تمدنی ترقیات کا کام شروع کردیا تھا جس کو بعد کے زمانہ کے زمانہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ملک کے حصے بخرے ہوکر چھوٹے چھوٹے اراضیات معہ جاگیرداروں و عرب جمعداروں کے پاس رہن تھے سالار جنگ نے ان علاقوں کو چھڑا لیا اور دوسری اصلاحات کے کام ابتدا ہی میں تھے کہ دفعتہً شمالی ہند میں غدر کی آگ پھوٹ پڑی اور ادھر نواب ناصرالدولہ نے رحلت فرمائی۔

نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس

(۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء)

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی اہمیت غیر معمولی ہے کیوں کہ اُس سال شمالی ہند میں غدر ہونے کی وجہ سے دہلی اور میرٹھ سے لے کر وسطِ ہند تک ہر جگہ ہندوستانی فوج نے سرکشی کی تھی۔ غرض وہ وقت انگریزوں کے لئے نہایت درجہ نازک تھا۔ حیدرآباد کے لیے بھی وہ زمانہ کچھ کم اہمیت کا نہ تھا کیونکہ ناصر الدولہ کے انتقال کے بعد یہاں ان کے بڑے صاحبزادے نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ تخت نشین ہوئے تھے۔ انھوں نے نہ صرف ریاست حیدرآباد اور جنوبی ہند میں غدر کی آگ کو پھیلنے سے روکا بلکہ انگریزوں کی ہر طرح سے مدد فرمائی مختصر یہ کہ نواب افضل الدولہ اور ان کے وزیر سالار جنگ نے انگریزوں کی ڈوبتی ناؤ کو بچالیا۔ چنانچہ ۱۸۵۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خاتمہ کے بعد ہندوستان کی حکومت جب راست شاہانِ انگلستان کے ہاتھ آگئی تو نواب افضل الدولہ کی خدمات کے صلہ میں شوراپور اور رائچور کا دوآبہ حیدرآباد کو واپس مل گیا۔

نواب افضل الدولہ کے زمانے سے حیدرآباد جدید کی ابتداء ہوتی ہے۔ اب بھی ایسے سن رسیدہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے نواب افضل الدولہ بہادر اور ان کے خیرخواہ اور وفادار وزیر سالار جنگ اول کو اصلاح اور ترقی ملک کے کاموں میں ہمہ تن معروف دیکھا تھا چنانچہ ان کی زبانی اُس زمانے کے حالات سننے سے اس عہد کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔

اسی طرح حیدرآباد میں بہت سی نشانیاں اور کئی عمارتیں ایسی موجود ہیں۔ جیسے افضل گنج۔ افضل گنج کا پل۔ مسجد افضل گنج یا چومحلہ پیالیس وغیرہ جو اسی عہد کی یادگار ہیں۔

نواب افضل الدولہ کا عہد حکومت صرف بارہ سال تک رہا لیکن سچ تو یہ ہے کہ حکومت آصفیہ کے موجودہ نظام حکومت اور انتظامات مملکت کی داغ بیل اسی عہد میں ڈالی گئی۔ اول تو سارے ملک کی پیمائش کراکے مالگزاری مقرر کی گئی دوسرے یہ کہ سارے ملک کو چار صوبوں، سترہ ضلعوں اور بہت سے تعلقوں میں تقسیم کرکے صوبہ دار۔ تعلقدار اور تحصیلدار مقرر کیے گئے۔ انتظامی اور مالی اصلاحات کے علاوہ سررشتہ عدالت اور پولیس کی تنظیم عمل میں آئی۔ نیا سکہ جاری ہوا۔ اس طرح امن وامان اور عدل وانصاف کے سررشتوں کی تنظیم کے بعد قوم ساز سررشتوں کے قیام کی طرف توجہ کی گئی اور رعایا کے آرام وآسایش علمی اور مادی ترقی کی خاطر سررشتہ جات تعلیم۔ طبابت اور تعمیرات وغیرہ کا قیام عمل میں آیا۔ خاص کر تعلیم کے معاملہ میں دورِ جدید کی تاریخ میں پہلا قدم نواب افضل الدولہ کے عہد میں اٹھایا گیا کہ ایک طرف تو ہر ضلع اور ہر تعلقہ میں مدارس قائم کیے گئے۔ اور دوسری طرف خاص شہر حیدرآباد میں دار العلوم اور مدرسہ عالیہ کا قیام عمل میں آیا۔ جہاں عام طور پر ذریعہ تعلیم فارسی زبان تھی۔

ذاتی حالات کے اعتبار سے افضل الدولہ بہادر بڑے خداترس، بہت نیک ملنسار اور سادہ مزاج بادشاہ تھے۔ رفاہِ عام کے کاموں میں غیر معمولی دلچسپی لینے کے علاوہ بڑے فیاض اور علم وفن کے بڑے قدر دان تھے تاریخ میں آن کا اور ان کے وفادار وزیر سالار جنگ اول کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا، کہ اس رحمدل بادشاہ اور خیرخواہ وزیر نے ریاست حیدرآباد کی اصلاح اور ترقی میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی اور اس طرح حیدرآباد جدید کی تعمیر کا کام آغاز کیا۔ جس کو بعد کے زمانہ میں ترقی ہوتی گئی۔

نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس (۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء)

تاریخ میں ایسی مثالیں شاذ ہی ہوں گی جب کہ ایک نہایت کمسن شہزادہ کو تخت نشین کیا گیا ہو۔ اور پھر بھی حکومت کامیابی سے چلی ہو چنانچہ یہ ایک اہم واقعہ ہے کہ ۱۸۶۹ء میں افضل الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے چہیتے فرزند نواب میر محبوب علی خاں کو تین سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا گیا اور ایک مجلس تولیت قائم ہوئی جس کے اراکین نواب سالار جنگ اول اور نواب شمس الامراء تھے۔ اور انہیں کے سپرد حکومت کے جملہ کاروبار تھے۔

نواب میر محبوب علی خاں کے سن بلوغ کو پہنچنے سے قبل کے چند واقعات نہایت اہم ہیں ایک تو یہ کہ سالار جنگ اول نے برار کا مسئلہ چھیڑ دیا اور اسی مسئلہ میں خود انگلستان گئے جہاں آپ کی بہت آؤ بھگت ہوئی۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۷۷ء میں اعلیٰ حضرت کے ساتھ سالار جنگ اول نے دہلی دربار میں شرکت کی اور تیسرا اہم واقعہ خود سالار جنگ کے ۱۸۸۳ء میں انتقال کر جانے کا ہے۔ ایسے وفادار اور مدبر وزیر کسی ملک کی تاریخ میں شاید ہی گذرے ہوں جو اپنے ملک اور مالک کے لئے ہمہ تن وقف ہو گئے ہوں۔ چنانچہ سالار جنگ کو یہ شرف حاصل رہا کہ ناصر الدولہ افضل الدولہ اور نواب میر محبوب علی خاں جیسے تین ہر دلعزیز بادشاہوں کے زمانے میں تقریباً تیس سال تک انھوں نے نہایت تدبر اور وفاداری سے ملک اور مالک کے خدمات انجام دیں۔ اور سچ تو یہ کہ حیدرآباد جدید کی ترقیوں کی داغ بیل ڈالنے میں بڑا حصہ لیا۔

سالار جنگ نہایت ہر دلعزیز تھے ان کی وفات کا صدمہ یوں تو ساری رعایا کو ہوا لیکن سب سے زیادہ اعلیٰ حضرت کو ہوا کیونکہ اعلیٰ حضرت دل سے ان کی قدر کرتے تھے۔ سالار جنگ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سالار جنگ ثانی پھر سر آسمان جاہ سر وقار الامراء اور آخر کار مہاراجہ سر کشن پرشاد یکے بعد دیگرے مدار المہام مقرر ہوئے۔

اعلیٰ حضرت مرحوم بڑی خوبیوں کے انسان اور بڑے ہردلعزیز بادشاہ تھے سرکار انگریزی سے ان کے زمانہ میں دوستانہ تعلقات میں اضافہ ہوا لارڈ رپن نے پہلی مرتبہ حیدرآباد آکر اس رسم کی ابتداء کی کہ گورنر جنرل کو ضرور حیدرآباد آنا چاہئے۔ چنانچہ اس کے بعد سے ہر وائسرائے اپنی واپسی سے قبل ضرور حیدرآباد آجایا کرتے ہیں۔ تاریخ دکن میں مسئلہ برار ہمیشہ ہی کوئی دل خوش کن چیز نہ تھی اس لئے ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن سے حیدرآباد میں برار کے دوامی پٹہ پر اعلیٰ حضرت نے دستخط لے لئے کہ برار مملکت تو سرکار نظام کی ہو لیکن اس پر قبضہ ہمیشہ کے لئے سرکار انگریزی کا رہے۔ اور اس کے لئے سالانہ ۲۵ لاکھ کی پیشکش سرکار نظام کو دی جایا کرے۔ چنانچہ یہ رقم اب تک ہر سال وصول ہوتی ہے۔

اعلیٰ حضرت مرحوم کا زمانہ جدید ترقیات کے آغاز کا ہے اس دور میں نہ صرف بہت سی عمارتیں تعمیر ہوئیں جیسے زنانی شفاخانہ محبوبیہ ٹاؤن ہال وغیرہ بلکہ بہت سی سیاسی اصلاحیں عمل میں آئیں مثلاً سکہ محبوبیہ جاری ہوا۔ کیبنٹ کونسل اور لیجسلیٹو کونسل کا قیام عمل میں آیا۔

۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی کی طغیانی حیدرآباد کے لئے ایک زبردست سانحہ تھا اس وقت اعلیٰ حضرت نے جس طرح رعایا کی مدد فرمائی وہ عدیم المثال ہے۔

غرض اعلیٰ حضرت نہ صرف خود بڑے شاعر عالم اور قدردان علم و فن تھے بلکہ غیر معمولی خوبیوں کے چرچے نہ صرف ریاست حیدرآباد میں بلکہ دور دور ملکوں تک پہنچے ہوئے تھے۔

۱۹۱۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ملک پر ان کے احسانات اس قدر ہیں کہ حیدرآباد اپنے محبوب بادشاہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

میر محمود علی

باغِ عام

اور مدح حضرت آصف سابع خلد اللہ

کیا حسین ہے صورتِ گلفام باغِ عام کی
آنکھ ہو اور شکلِ دل آرام باغِ عام کی

صبح اس گلزار کی آئینۂ رخسارِ حور
شانۂ گیسوئے لیلیٰ شام باغِ عام کی

دیگر

نرگسِ شہلا میں عشوے چشمِ مے آشام کے
سنبلِ پیچاں میں گھونگر زلفِ عنبر فام کے

بارک اللہ جس قدر پانی کے چشمے ہیں یہاں
سب ہیں آئینے جمالِ روئے باغِ عام کے

دیگر

روئے گل پر کاکلِ سنبل ہے بل کھائی ہوئی
برگِ گل میں لعلِ لب کی ہے جھلک آئی ہوئی

وہ ہے باغِ عام پر جوبن کہ انسان کیا جلیل
بن کے چشمِ شوق نرگس بھی تماشائی ہوئی

دیگر

آج باغِ عام سے ہے اور ہی شانِ دکن
ہر کلی اس بوستاں کی ہے گلستانِ دکن

پتی پتی نے لکھا ہے کلکِ قدرت سے جلیل
شاہِ عثماں آصفِ سابع سلیمانِ دکن

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

حیدر یار خاں ظہیر جنگ صدر الدولہ ظہیر الملک

درگاہ قلی خاں سالار جنگ مؤتمن الدولہ خان دوراں

چار مینار

عظمتِ شاہانِ ماضی کی نرالی یادگار ... اے وطن کی سرزمینِ حسن کے آئینہ دار

تجھ میں ذوق و شوق کی تابندگی پاتا ہوں میں ... تجھ میں اپنے حوصلوں کی زندگی پاتا ہوں میں

شہر کے سینے میں روشن ہے ترا نقشِ وفا ... تیرے میناروں میں دل کی نعمتیں جلوہ نما

چار سو جلتا ہے تیرے عشقِ دوام کا چراغ ... دیکھ کر تجھ کو فلک کی سمت جاتا ہے دماغ

بادۂ سرمستیٔ الفت کا تو اک جام ہے ... اتحادِ میکدہ کا تجھ میں اک پیغام ہے

ثبت ہیں سکوں کے دل پر تیری تصویریں ہنوز ... ظلمتوں میں بھی ہیں روشن تیری تقدیریں ہنوز

تو جہانِ حسن کے نایاب شہ کاروں میں ہے ... عشق کی برقِ تجلی تیری دیواروں میں ہے

رات کی اٹھتی ہے جس دم تیرے چہرے سے نقاب ... جب چمکتا ہے دکن کی سرزمیں پر آفتاب

سربلندی کی فضا پر ناز فرماتا ہوا

تو نظر آتا ہے اک تلوار چمکاتا ہوا

باقی

وزرائے آصفی

شیر جنگ — تولد ۱۱۱۳ھ — وفات ۱۱۹۰ھ

خاندان سالار جنگ کے مورث اعلیٰ امیر الدولہ امیر الملک شیر جنگ حیدر یار خان ہیں جو حضرت اویس قرنی کی اولاد سے تھے، اویس قرنی تاریخ اسلام میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ آنحضرت کے زمانہ میں موجود تھے حضرت علی مرتضیٰ علیہ السّلام کے ہمراہ جنگ صفین میں حاضر تھے اور اسی جنگ میں جام شہادت پیا، اویس قرنی کی اولاد سے اویس ثالث اپنے لڑکے محمد علی کے ہمراہ مدینہ منورہ سے دکن آئے۔ اور بیجاپور پہونچے۔ یہاں اس زمانہ میں علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ) حکمران تھا بادشاہ نے آپ کی بڑی عزت کی اور آپ کے فرزند محمد علی کی شادی ملّا احمد نائطی کی دختر سے کردی گئی اور "دبیر سلطانی" کا عہدہ بھی دیا گیا۔

علی عادل شاہ کے بعد شیخ محمد علی کے دونوں فرزند محمد باقر اور محمد حیدر دربار مغلیہ سے متعلق ہوگئے، عالمگیر اورنگ زیب نے دو ہزاری منصب سے سرفراز کیا محمد باقر کے فرزند محمد تقی بھی عالمگیری عہد میں منصب سہ صدی سے مفتخر ہو چکے تھے اور فرخ سیر کے زمانہ میں ان کو اورنگ آباد میں "داروغہ خزینہ" کی خدمت ملی۔ حضرت آصفجاہ اول نے ان کو قلعہ جات دکن کا داروغہ مقرر کیا۔ انھیں محمد تقی کے فرزند شمس الدین محمد حیدر یار خان شیر جنگ ہیں۔

شیر جنگ کی ولادت اورنگ آباد میں ۱۱۱۳ھ میں ہوئی حضرت آصفجاہ اول نے سب سے پہلے دو صدی منصب کے ساتھ فیل خانہ کا داروغہ مقرر کیا۔ اس کے بعد آپ کو مختلف خدمات عطا ہوئیں جن کو آپ نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ آصفجاہ کا بڑا اعتماد آپ پر تھا، حیدر یار خان کا خطاب بھی آصفجاہ نے عطا کیا تھا۔

نواب ہدایت محی الدین خان مظفر جنگ کے مارے جانے پر نواب صلابت جنگ کی مسند نشینی شیر جنگ کی جرأت کی وجہ سے ہوئی تھی کیونکہ بعض امرا کی خواہش تھی کہ نواب نظام علی خان (آصفجاہ ثانی) کو مسند نشین بنایا جائے۔ چونکہ نواب صلابت جنگ بڑے بھائی تھے اس لئے شیر جنگ نے کہا کہ بڑے بھائی کے ہوتے چھوٹے کو مسند نشین کرنا خاندان آصفی کی روایات کے خلاف ہے، اور پیش قدمی کر کے نواب صلابت جنگ کو مسند نشینی کی نذر پیش کردی۔ آپ کے بعد دوسرے امرا نے بھی آپ کی پیروی کی۔

نواب صلابت جنگ کے زمانہ میں شیر جنگ نے دیوانی کے اہم فرائض بھی انجام دئے۔ (۱۱۷۲ھ) نواب آصفجاہ ثانی کے ابتدائی ایام میں چونکہ شیر جنگ سے موافقت نہیں تھی اس لئے انھوں نے پونہ میں اقامت کرلی تھی، بعد میں شیر جنگ مورد عنایت شاہی ہوئے۔ رکن الدولہ کے مشیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے مختلف اہم خدمات کو انجام دیا اور آخر زمانہ میں جبکہ ان کا سن بھی زیادہ ہوگیا تھا ان کو صوبہ اورنگ آباد کی نظامت کے عہدہ پر سرفراز کیا گیا۔ اس خدمت کو بھی وہ پانچ سال تک انجام دیکر ۱۱۸۹ھ میں انتقال فرمایا۔ اورنگ آباد میں سپرد خاک کئے گئے۔

شیر جنگ، سخاوت، شجاعت میں مشہور تھے، علمی قابلیت بہت اچھی تھی۔ ان کو دو لڑکے تھے۔ بڑے محمد صفدر خان غیور جنگ بزرگاہ قلی خان کے داماد تھے۔ اور دوسرے تقی یار خان ذوالفقار جنگ جنھوں نے عنفوان شباب میں انتقال کیا۔ اول الذکر کی اولاد سے نواب سالار جنگ بہادر ہیں، جو آپ کی چھٹی پشت کے داوا ہوتے ہیں۔

میر موسیٰ خاں رکن الدولہ

صہراب جنگ معین الدولہ مشیر الملک اعظم الامرا رسطو جاہ

رکن الدولہ میر موسیٰ خان وفات ۱۱۸۹ھ

میر محمد یار نام اور رکن الدولہ میر موسیٰ خان احتشام جنگ خطاب تھا۔ آپ کے اجداد بخارا کے رہنے والے تھے رکن الدولہ کے دادا ہندوستان آئے اور نواب غازی الدین خان فیروز جنگ کے فرزند میر قمر الدین خان آصف جاہ اول کی تعلیم دینے پر مامور کئے گئے ترکی خان ان کو خطاب ملا۔ ان کے فرزند میر موسیٰ تھے، جو دیو کنڈہ کی وقائع نگاری پر مامور کئے گئے۔ پھر مظفر جنگ کے یہاں ایک رسالہ کے افسر مقرر ہوئے، ان کے بعد ان کے فرزند میر محمد یار کو باپ کی جگہ مامور کیا گیا۔ نواب مظفر جنگ کے مارے جانے پر صلابت جنگ نے محمد یار کو موسیٰ خان کے خطاب کے ساتھ ایک خاص فوج کی کمانڈری پر مقرر کیا۔ رفتہ رفتہ انھوں نے ترقی کی نام پیدا کیا اور جہانگیری سایہ پر ترقی پائی۔ چونکہ طالع یاور تھا حضرت آصف جاہ ثانی کی نظر عنایت مبذول ہوگئی او ۱۱۸۰ھ میں خطاب رکن الدولہ احتشام جنگ کے ساتھ منصب ہفت ہزاری اور تین ہزار سوار کا اعزاز ملا اور خدمت دیوانی سے سرفراز کئے گئے ان کے دیونی کے کاروبار میں نواب شیر جنگ کو زیادہ دخل تھا، وہ مشیر خاص کی حیثیت رکھتے تھے

۱۱۸۹ہجری میں ایک سپاہی نیموا نام نے آپ کو شہید کیا کوہ مولاک دامن میں دفن کئے گئے

ان کی دیوانی کے اہم واقعات یہ ہیں :۔

(۱) حیدر علی کو انگریزوں کے ساتھ جنگ کرنے میں آصفی فوج نے مدد دی، مگر حیدر علی کو ناکامی ہوئی محمد علی والا جاہ نے نظام اور انگریزوں میں صلح کرادی۔ اس صلح کے لئے رکن الدولہ مدراس گئے۔

(۲) مرہٹوں سے دومرتبہ جنگ ہوئی

(۳) موسیٰ ندی میں طغیانی آئی اور فصیل توڑ کر پانی اندر چلا آیا۔

رکن الدولہ کو اولاد نہ تھی۔ لیکن ان کے بھائی نواب شمس الامراء کی اولاد موجود ہے۔ ان کے سلسلے میں نواب مؤتمن رکن الملک کی ایک قابل ذکر ہستی تھی جو اپنے کردار امرزبدہ و ارع لی مجمع سے بہت مشہور ہے۔

ارسطوجاہ

تولد ۱۱۵۵ھ   وفات ۱۲۱۹ھ

غلام سید نام اور معین الدولہ سہراب جنگ شیر الملک اعظم الامرا ارسطو جاہ فرزند ارجمند وکیل مطلق مختار دولت آصفیہ خطاب تھا۔ ۱۱۵۵ھ میں تولد ہوئے۔ نوشیروان عادل کی اولاد سے تھے۔ آپ کے باپ فرخ نژاد خان کو حضرت آصفجاہ اول نے صوبہ دار برار مقرر کیا تھا۔ غلام سید خان آصفجاہ ثانی کے رفیق و مصاحب تھے۔ حید جنگ کے مارے جانے کے بعد معین الدولہ سہراب جنگ کے خطاب کے ساتھ محالات صوبہ برار اور خجستہ بنیاد کی دیوانی پر مامور کئے گئے۔

اس کے بعد پونہ اور ناگپور کی سفارت پر بھیجے گئے۔ چنانچہ سہراب جنگ نے راو پنڈت پردھان اور رگھوجی بھونسلہ کے پاس جاکر اپنا مفوضہ کام نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا۔ اس کے بعد ایک عرصہ بعد شیر الملک اعظم الامرا کے خطاب کے ساتھ خدمت دیوانی سے سرفراز کئے گئے (۱۷۸۱ء ہ ۱۱۸۹ھ)

آپ کی دیوانی کے اہم واقعات کی بڑی تفصیل ہے، جن کی صراحت کا یہ موقع نہیں ہے، مختصراً اس کا اظہار کیا جاتا ہے:-

(۱) سلطنت آصفیہ نے مرہٹوں کی تائید سے میسور پر چڑھائی کی، مگر عین وقت پر مرہٹوں نے ساتھ نہیں دیا۔ اس لئے تنہا آصفی فوج نے میسور پر حملہ کیا اور فتحیاب ہوئی۔

(۲) انگریزوں کے ساتھ شریک ہوکر سلطنت آصفیہ نے میسور کی تیسری لڑائی میں حصہ لیا۔

(۳) مرہٹوں کے ساتھ جنگ کھڑلہ واقع ہوئی، جس میں بعض وجوہ سے آصفی فوج ناکام رہی۔

(۴) اعظم الامرا پونہ میں نظر بند کئے گئے۔

(۵) پونہ میں اعظم الامرا نے سیاسی چال چلی، روسا مرہٹہ میں نفاق ڈالکر ان کو آپس میں جدا کر دیا، اور پھر اپنی سیاسی چال اور توسط سے ان کی صفائی بھی کرادی، اور صفائی کرانے کے بعد جنگ کھڑلہ کے نقصانات کی تلافی میں ایک کروڑ نقد تین کروڑ کے دستاویزات معافی چوتھ کی سند ممالک دولت آباد وغیرہ واپس لیکر حیدرآباد واپس ہوئے۔

(۶) میسور کی چوتھی لڑائی میں انگریزوں کی مدد کی گئی اور فتحیاب ہوئے۔

(۷) آصفجاہ ثانی کا انتقال ہوا اور آصفجاہ ثالث مسند حکومت پر جلوہ گر ہوئے، اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ۱۲۱۹ھ میں ارسطو جاہ کا انتقال ہو گیا سرور نگر میں دفن ہوئے۔ ارسطو جاہ اپنے ملک اور مالک کے سچے خیر خواہ رہے، مرتے دم تک آپ نے ملک اور مالک کی خدمت نہایت دیانت داری سے انجام دی، وہ اپنے وقت کے بڑے سیاست داں تھے، انھوں نے بیسیوں موقعوں پر سیاسی تدبر و دماغ سے کام لیکر کامیابی حاصل کی۔

ارسطو جاہ مذہبی آدمی تھے۔ فرائض کی پابندی سختی کے ساتھ کرتے تھے۔ جود و سخا میں مشہور تھے۔ علما و فضلا کی صحبت سے بڑی دلچسپی تھی۔ شعر و سخن سے شغف تھا، ان کے دربار نے اردو شاعری کی بھی بڑی خدمت کی۔

سید ابو القاسم صدرِ عالم

علی زمان خان غیور جنگ مدبر الدولہ منذر الملک امیر الامراء

میر عالم

تولد ۱۱۶۶ھ   وفات ۱۲۲۳ھ

ابوالقاسم میر عالم کے والد سید رضی تستر (ایران) کے شیخ الاسلام کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سید رضی شوستر ہی میں پیدا ہوئے مگر ۱۱۶۳ھ میں وہ اپنے بھائی کے ہمراہ ہندوستان آئے۔ شاہ جہان آباد میں چند روز قیام کے بعد شجاع الدولہ ناظم بنگال کے پاس بنگال چلے گئے اور وہاں ان کے داماد مرشد قلی کی رفاقت میں رہنے لگے۔ اور مرشد قلی کے ساتھ حیدرآباد آئے۔ آصفجاہ کی ملازمت اختیار کی۔ دارالانشاء میں ملازم رکھے گئے حضرت آصفجاہ نے ایک جاگیر بھی مرحمت فرمائی تھی ۱۱۹۴ھ میں سید رضی کا حیدرآباد میں انتقال ہوا دائرہ میر مومن میں دفن ہوئے۔

سید رضی بڑے قابل فرد اور مجتہد کا درجہ رکھتے تھے شاعری کا بھی شوق تھا اقدس تخلص کرتے تھے۔

میر ابوالقاسم المخاطب بہ میر عالم کی ولادت حیدرآباد میں ۱۱۶۶ھ م ۱۷۵۳ء ہوئی عربی اور فارسی میں بڑی اچھی قابلیت رکھتے تھے، ریاضی میں مہارت تھی قلم برداشتہ عربی لکھا کرتے تھے فارسی شاعری اور انشاء پردازی کا خاص ذوق تھا۔ ہر حال میر عالم اپنے وقت کے ایک بلند پایہ ادیب و قابل قدر شاعر تھے اور خاص طور سے قابل تذکرہ بات یہ ہے کہ میر عالم کی ابتدائی ملازمت اسی شاعری کے طفیل ہوئی اگرچہ ان کو باپ کی جاگیر مل چکی تھی مگر ملازمت کا کوئی سلسلہ نہیں تھا ایک مرتبہ جب ارسطو جاہ کی مدح میں قصیدہ کہا تو ارسطو جاہ نے ان کے کلام کی فصاحت و بلاغت سے متاثر ہو کر اپنا سکریٹری بنا لیا۔ اس وقت سے ان کی ترقی ہونے لگی اس کے بعد وہ صدر تعلقدار بنائے گئے انھوں نے اپنے علاقہ کا انتظام نہایت عمدہ کیا رعایا اور مالک دونوں کی خوشنودی حاصل کی صدر تعلقداری کے بعد میر عالم کو وکالت کی خدمت دی گئی۔ جب کمپنی کی جانب سے ایک سفیر حیدرآباد آیا تو ارسطو جاہ نے اپنے اور اس انگریز سفیر کے درمیان ان کو وکالت پر مامور کیا معاملات نہایت عمدگی سے طے پاگئے۔ اس کے بعد میر عالم کو سفارت کے لئے منتخب کیا گیا اور وہ حضرت آصفجاہ ثانی کی جانب سے گورنر جنرل کارنوالس کے پاس بھیجے گئے ۱۲۰۲ھ میں میر عالم اس سفارت میں کامیاب ہو کر کلکتہ سے واپس آئے۔ اس کامیابی کے صلہ میں ان کو خطاب میر عالم کے ساتھ دیگر اعزازات سے بھی ممتاز کیا گیا۔ اب وہ پیشوا کے پاس پونہ روانہ کیے گئے۔ اور اس کے بعد میسور کی جو تھی لڑائی میں حیدرآبادی فوج کی سپہ سالاری کے فرائض ان کے تفویض کیے گئے

ارسطو جاہ کے انتقال پر آصفجاہ ثالث نے میر عالم کو دیوانی کی اہم خدمت عطا فرمائی (۱۲۱۹ھ)

میر عالم نے اپنی دیوانی کے زمانہ میں کئی اصلاحیں فرمائیں چنانچہ قلمرو آصفی میں سب سے پہلے مرسلہ رسانی، ڈاک کا انتظام کیا گیا حیدرآباد سے کلکتہ، مدراس، بمبئی، پونہ اور مچھلی بندر تک مرسلہ کا انتظام ہوا۔ اس کے لئے راستے میں مسافر خانے، مسجدیں بنوائیں اور باولیاں کھدوائیں آج تک بھی اکثر سرائیں موجود ہیں۔

۱۲۲۰ھ میں ایک قحط ہوا میر عالم نے اس کا معقول انتظام فرمایا۔ بہرحال میر عالم ایک منتظم اور مدبر دیوان ثابت ہوئے۔

شوال ۱۲۲۳ھ میں میر عالم کا انتقال ہوا۔ دائرہ میر مومن میں اپنے والد کے پہلو میں دفن کئے گئے۔

میر عالم کی بنائی ہوئی کئی چیزیں آج تک موجود ہیں مثلاً میر عالم کا تالاب، میر عالم کی منڈی، بارہ دری اور اس کا باغ وغیرہ۔ میر عالم صاحب تصنیف تھے فارسی نثر و نظم میں کئی کتابیں ہیں ان میں سے حدیقۃ العالم اور مثنوی مدح ماہ لقا بائی چندا مشہور ہیں۔

میر عالم بڑے سخی تھے۔ روزانہ ان کے باورچی خانہ سے ۰۰ سو مساکین کو کھانا ملتا تھا وہ بڑے معاملہ فہم، دوربین دوبین، صاحب تدبیر، حزم و احتیاط کرنے والے اور عاقبت بین تھے۔

شمس الامرا ثانی امیر کبیر

تولد ۱۱۹۵ھ   انتقال ۱۲۰۹ھ

نواب محمد فخر الدین خان، تیغ جنگ ابو الفتح خان شمس الامرا اول کے فرزند ہیں۔ حیدرآباد میں آپ کی ولادت ہوئی (۱۱۹۵ھ)
باپ کے انتقال کے وقت بہت کم سن تھے، آپ کی کم عمری سے ہی آصفجاہ ثانی کے نوازشات مبذول ہوتی رہیں۔

موروثی خطابات تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامرا ثانی، کے ساتھ امیر کبیر (اول) کا جلیل القدر خطاب بھی ملا۔

امیر کبیر مختلف حیثیتوں سے خاندان پائگاہ کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کی ممتاز ہستی نہ صرف امرا پائیگاہ بلکہ تاریخ دکن میں
بھی اہم حیثیت رکھتی ہے۔ اور تاریخ دکن اپنے اس قابل فخر سپوت پر ہمیشہ فخر کرے گی۔

امرا پائگاہ میں آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں جو بادشاہ کی دامادی کے رشتہ میں منسلک کئے گئے۔ چنانچہ ۱۲۱۵ھ میں حضرت
آصفجاہ ثانی نے اپنی صاحبزادی بشیر النساء بیگم کی شادی آپ سے فرما کر دامادی کے رشتہ سے ممتاز کیا۔ اور آج تک آپ کی اولاد کو
یہ فخر حاصل ہو رہا ہے کہ وہ خاندان آصفی کی شہزادیوں کے ساتھ ازدواجی کا امتیاز حاصل کرتے ہیں۔

نواب شمس الامرا ۔۔ھ میں منصب مدار المہامی پر فائز ہوئے مگر چھ ماہ نہایت کامیابی کے ساتھ کام کرنے کے بعد خدمت سے سبکدوش ہوئے

امیر کبیر کی ذات علما، شعرا اور مصنفین کے لئے ملجا و ماویٰ تھی۔ آپ علم و فن کی ترویج کے لئے لوگوں کی ہمت افزائی کا پورا
سامان کرتے تھے، ان کو فکر معاش سے مستغنی کرنے کے لئے مناسب ماہوار مقرر فرماتے تھے چنانچہ حضرت فیض، قیس، آفاق،
شہرت وغیرہ کو ماہواریں ملا کرتی تھیں۔

ترقی تعلیم سے آپ کو بڑی دلچسپی تھی۔ اپنے صرفے سے کئی مدرسے قائم کئے تھے، یہاں کے مدرسین کو بیش قرار ماہوار اور
طلبہ کو وظائف کے علاوہ کتابوں وغیرہ سے بھی مدد دی جاتی تھی۔

امیر کبیر کے سب سے بڑے اور قابل فخر کارنامے یہ ہیں کہ آپ نے مغربی علوم وفنون خصوصاً سائنس اور ریاضی وغیرہ کی
کئی کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے شائع فرمائیں اور ان کی تعلیم کا انتظام فرمایا۔ اردو زبان میں مغربی علوم کے ترجمہ کرنے کی یہ سب سے
پہلی کوشش تھی۔ دہلی کالج، علی گڈھ وغیرہ کی تحریکیں سب اس کے بعد کی ہیں۔ ارباب کمپنی نے کلکتہ میں نثر اردو میں قصہ کہانیاں وغیرہ
کی کتابیں مرتب کرائی تھیں۔ یہ کارنامہ ان دنوں تاریخ ادب اردو کا ایک ممتاز باب سمجھا جاتا ہے، لیکن امیر کبیر نے زبان اردو
کی جو خدمت سائنس کے کتابوں کے ترجمہ کی ہے، وہ ان قصے کہانیوں کے کارناموں سے زیادہ درخشاں اور زیادہ سودمند ہے۔

امیر کبیر کو فن تعمیر سے بھی بڑی دلچسپی تھی آپ نے کئی عالی شان عمارتیں اور بازار وغیرہ تعمیر کرائے۔

محمد ابوالفخر فخرالدین خاں امام جنگ ثالث خورشید الدولہ
خورشید الملک

مہاراجہ چندو لال

مہاراجہ چندو لعل

تولد ۱۱۷۵ھ انتقال ۱۲۶۱ھ

مہاراجہ چندو لعل بہادر، اکبری نورتن کے ایک رتن راجہ ٹوڈرمل کی اولاد سے تھے۔ آپ کے جد اعلیٰ رائے مول چند جو راجہ ٹوڈرمل کی پانچویں پشت سے تھے حضرت آصفجاہ اول کے زمانہ میں کروڑگیری کی تعلقداری پر مامور تھے، ان کے بعد ان کے فرزند رائے بھیم رام کو آصفجاہ ثانی نے اس خدمت سے سرفراز فرمایا۔ ان کے دو لڑکے تھے، رائے نانک رام اور رائے نارائن داس سکے فرزند رائے چندو لال ہیں۔

بھیم رام کے مرنے پر نانک رام کو ان کی موروثی خدمت ملی اور اُن کے بعد ان کے فرزند رائے لکپت رائے اس جگہ مامور ہوئے مگر دو سال میں انھوں نے انتقال کیا۔

مہاراجہ چندو لعل ۱۱۷۵ھ میں تولد ہوئے، رواج زمانہ کے موافق فارسی اور عربی کی تعلیم پائی او کافی قابلیت پیدا کی۔ سن شعور کو پہونچکر اپنے چچا نانک رام کے ماتحت سررشتہ کروڑگیری میں ایک خدمت پر مامور ہوئے اور پھر رائے لکپت رائے کے مرنے پر تعلقدار کروڑگیری ہوگئے۔ ارسطو جاہ نے راجہ چندو لعل کی قابلیت اور لیاقت سے واقف ہوکر ان کو قلعہ سدہوٹ وغیرہ کے انتظام پر روانہ کیا۔ راجہ بہادر کا خطاب عطا ہوا۔ سابقہ خدمت بھی بدستور بحال رہی جس پر آپ کے غیاب میں آپ کے بھائی کارگزار رہتے۔

میر عالم بہادر کی وزارت میں آپ کو خدمت پیشکاری پر سرفراز پایا گیا۔ مہاراجہ کا خطاب عطا ہوا۔ منیر الملک کی دیوانی میں آپ پیشکاری کے ساتھ دیوانی کے کاموں میں دخیل رہے اور ان کے انتقال پر اگرچہ آپ کو باضابطہ دیوانی کی خدمت نہیں ملی تھی مگر چونکہ کوئی اور شخص دیوان نہیں تھا اس لئے آپ ہی دیوانی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ خطاب راجایان مہاراجہ سے ممتاز کئے گئے۔

مہاراجہ چندو لعل نے اپنے زمانہ میں خوب ہی داد و دہش کی سیکڑوں اصحاب کو جاگیرات، انعام اور مناصب بحال کر دیا ۱۲۵۹ھ میں مہاراجہ چندو لعل خدمت پیشکاری سے مستعفی کئے گئے اور ۱۲۶۱ھ میں وفات پائی۔

آپ ایک علم دوست، ذی علم، فیاض سخی، امیر تھے علما فضلا سے بڑی دلچسپی تھی، شعر و سخن کے دلدادہ تھے سخن فہم اور سخن سنج تھے اس کے ساتھ ہی بلند پایہ شاعر تھے، آپ کے فارسی اور اُردو کلیات شائع ہو چکے ہیں۔ شاداں آپ کا تخلص تھا۔

آپ کا کلام سنجیدہ شگفتہ اور پسندیدہ مضامین کا گنجینہ ہے۔ کلام کی نگینی، انداز بیان کی جدت اور تخیل کی بلندی آپ کی قادر الکلامی کے شاہد ہیں۔ آپ کے کلام کا بڑا حصہ معرفت و تصوف سے بھرا ہوا ہے

آپ کے دربار میں ہر وقت شعرا کا جمگھٹا رہا کرتا تھا۔ ان کی بڑی بڑی تنخواہیں مقرر تھیں۔

مہاراجہ کی سخاوت اور خیرات عام و خاص میں مشہور تھی بلا لحاظ مذہب و ملت فقیروں، مشائخین، گوسائیں، شاستری وغیرہ کو روپئے پیسے کے علاوہ روز میوہ، اور شیرینی پارچے، دوشالے وغیرہ بھی تقسیم ہوا کرتے تھے۔ بعض مرتبہ ایک ایک ہزار دوشالے روزانہ تقسیم ہوتے تھے۔

آپ کو تعمیرات سے بھی دلچسپی تھی۔ بارہ دری مشہور ہے جو باغ ارم سے موسوم تھی۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے کئی عمارتیں بنائی ہیں۔ بہرحال تاریخ دکن میں مہاراجہ چندو لعل بھی اہم شخصیت کے مالک ہیں۔

منیر الملک ثانی

تولد ۱۱۸۴ھ　　وفات ۱۲۴۵ھ

علی زمان خان المخاطب غیور جنگ، منیر الدولہ، امیر الامرا، منیر الملک ثانی، غیور جنگ، صفدر یار خان کے فرزند اور شیر جنگ منیر الملک کے پوتے تھے۔ صفدر یار خان غیور جنگ کے انتقال پر ان کے چاروں لڑکوں نے جائداد آپس میں تقسیم کر لی حضرت آصفجاہ ثانی نے ان کو منیر الملک کے خطاب کے ساتھ پنج ہزاری منصب اور سہ ہزار سوار کا اعزاز عطا فرمایا اور بخشیگری فوج کی خدمت سے سرفراز کئے گئے۔

منیر الملک، میر عالم کے داماد تھے، ان کی دو لڑکیاں یکے بعد دیگرے آپ سے بیاہی گئیں۔ میر عالم نے آپ کو خانہ داماد کی حیثیت سے اپنے ہی پاس رکھا تھا۔ ان کے انتقال کے چند ماہ بعد منیر الملک خدمت دیوانی سے سرفراز کئے گئے (۱۲۲۴ھ)

آپ کی دیوانی کے اہم واقعات حسب ذیل ہیں:-

(۱) پنڈاروں کا ہمیشہ کے لئے انسداد ہو گیا۔ ان کی لوٹ مار سے قلمرو آصفی کو نجات ملی۔

(۲) سکھوں و عربوں میں سخت فساد ہوا فتنہ فرو ہونے کے بعد سکھوں کو شہر بدر کیا گیا۔

(۳) مرشد زادہ مبارز الدولہ نے دو مرتبہ ہنگامہ برپا کیا اور ان کو ہتا دیا قلعہ محمد نگر میں نظر بند کیا گیا۔

(۴) رود موسیٰ کو قیامت خیز طغیانی ہوئی۔

(۵) حضرت آصفجاہ ثالث نے انتقال فرمایا اور آصفجاہ رابع نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

۱۲۴۵ھ میں منیر الملک کا انتقال ہوا۔ دائرہ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ آپ کو چار لڑکے تھے بہ اشجع الدولہ، شجاع الدولہ، سراج الملک، اکرم الدولہ۔ منیر الملک بھی اپنے دادا کی طرح بڑے سخی تھے، محرم میں بڑی خیرات کیا کرتے، سادات او تجار وغیرہ ہمیشہ آپ کے مہمان رہا کرتے، لذیذ کھانوں سے بھی آپ کو رغبت تھی، ہر وقت باورچی خانہ گرم رہا کرتا۔ فی باورچی دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ دیا کرتے تھے۔

تعمیر سے بھی آپ کو دلچسپی تھی چینی خانہ، آئینہ خانہ آپ ہی کی یادگار ہیں، اورنگ آباد میں بھی آپ نے ایک محل تعمیر کیا تھا۔

سراج الملک

تولد ۱۲۲۴ھ　　وفات ۱۲۶۹ھ

میر عالم علی خان المخاطب شیر جنگ سراج الدولہ سراج الملک، منیر الملک امیر الامراء کے تیسرے فرزند اور میر عالم کے نواسے تھے۔

سراج الملک دو مرتبہ دیوانی کی خدمت سے سرفراز کئے گئے پہلی مرتبہ ۱۲۵۹ھ میں اور دوسری مرتبہ ۱۲۶۲ھ میں۔ پہلی بار تو کچھ عرصہ کے بعد سبکدوش ہو گئے اور دوسری بار تقریباً سات سال تک یہ خدمت انجام دی اور برسر خدمت ہی آپ کا انتقال ہوا۔ دوسری مرتبہ دیوانی کے لئے رزیڈنٹ صاحب نے بڑی کوشش کی تھی۔ آپ کی دیوانی کے زمانہ میں حسب ذیل اہم واقعات ہوئے:-

(۱) عربوں اور روہیلوں میں فساد ہو گیا۔ (۲) مبارز الدولہ نے مولوی سلیم کے بہکانے سے ایک ہنگامہ کیا آخر مبارز الدولہ قلعہ محمد نگر میں نظر بند کر دیے گئے اور مولوی سلیم کو حبس دوام کی سزا ہوئی۔ (۳) راجہ چندو لعل کی داد و دہش کے باعث خزانہ عامرہ خالی ہو گیا تھا۔ انگریزی فوج کنٹنجنٹ کی ماہوار ادا نہ ہو رہی تھی، کئی لاکھ روپیہ اس کی ماہوار کا فاضل ہو گیا تھا، اس لئے حسب مطالبہ لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ملک برار کو بطور امانی انگریزوں کے تفویض کرنا پڑا طے یہ ہوا تھا کہ بعد وضع اخراجات باقی رقم سرکار عالی کے خزانہ میں داخل کی جائیگی (۱۸۵۳ء ۱۲۶۹ھ)

اس معاہدہ کے کچھ عرصہ بعد نواب سراج الملک کا انتقال ہو گیا۔ آبائی مدفن دائرہ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ سراج الملک کریم سخن، صاحب اخلاق و مروت، باریک بیں، دور رس، صاحب تدبیر امیر تھے، اہل کمال کے بڑے قدرداں تھے۔ علما، وفضلا سے بڑی محبت تھی۔

نواب سراج الملک بہادر وزیر اعظم دولت آصفیہ

میر تراب علی خان شجاع الدولہ نواب مختار الملک سالار جنگ بہادر اول
وزیر اعظم دولت آصفیہ

ہز اکسلنسی سر سالار جنگ مختار الملک جی سی اس آئی۔ ال ال ڈی

میر تراب علی خاں المخاطب سالار جنگ شجاع الدولہ مختار الملک جی سی اس آئی۔ محمد علی خاں سالار جنگ شجاع الدولہ کے فرزند اور امیر الامرا منیر الملک کے پوترے تھے۔ میر عالم کی دختر آپ کی دادی تھیں۔ ان کو غلطی سے سالار جنگ اول کہا جاتا ہے حالانکہ یہ اپنے خاندان میں چوتھے سالار جنگ تھے۔ کیونکہ ان کے والد شجاع الدولہ کو بھی سالار جنگ کا خطاب تھا۔ اور شجاع الدولہ کو یہ خطاب ان کے والد منیر الملک کے ننھیالی خطابات میں سے ملا تھا۔ کیونکہ ان کے نانا درگاہ قلی خاں اور ماموں دونوں کا خطاب سالار جنگ تھا اور چونکہ ان کے ماموں نے لا ولد انتقال کیا اس لئے ننھیالی معاش اور جاگیرات کے ساتھ خطاب سالار جنگ بھی اس خاندان میں منتقل ہو گیا۔

نواب مختار الملک کی ولادت ۱۲۴۴ھ میں ہوئی کم سنی میں باپ کے سایہ سے محروم ہو گئے۔ دادی اور چچا سراج الملک نے تعلیم و تربیت دی عربی، فارسی کے ساتھ انگریزی سے بھی آپ بخوبی واقف تھے، فنون سپہ گری کی بھی آپ کو تعلیم دی گئی تھی۔

سراج الملک نے صرف کتابی علم کا انتظام نہیں فرمایا تھا بلکہ کاروبار ریاست کے تجربہ کا بھی انتظام ہوا، مثلاً ڈنبیس کی جگہ آپ تعلقدار بنائے گئے اور سراج الملک نے اپنی جاگیرات کا انتظام بھی آپ کے ذمہ فرمایا تھا۔ ان وجوہ سے آپ کو عملی کام کرنے کا اچھا موقعہ ہاتھ آیا۔ آپ نے جاگیرات اور سرکاری علاقہ کا نہایت عمدہ انتظام فرمایا تھا۔

سراج الملک کے انتقال پر ۱۲۶۹ھ میں حضرت آصفجاہ رابع نے دیوانی کے لئے آپ کو منتخب کیا، اور قلمدان وزارت آپ کے سپرد ہوا، اس وقت آپ چوبیس سالہ نوجوان تھے لوگوں کو تعجب ہوا تھا کہ نواب ناصر الدولہ نے اتنی کم عمری میں آپ کو وزیر بنا دیا جس کے جواب میں حضور نے فرمایا کہ وہ اگرچہ کم عمر ہیں لیکن بڑے بڑوں سے زیادہ عمدہ کام کر سکتے ہیں۔

نواب مختار الملک کی دیوانی اہم واقعات، اصلاحات اور جدید تنظیم وغیرہ کے لحاظ سے تاریخ دکن میں اپنی آپ نظیر ہے۔ اس مختصر یادداشت میں ان کا اظہار دشوار ہے لیکن بعض اہم واقعات کے اظہار کے بغیر یہ مختصر یادداشت بھی بے کار ہو جائے گی اس لئے اجمالاً لکھا جاتا ہے۔

(۱) حضرت آصفجاہ رابع غفران منزل کا ۱۲۷۳ھ میں انتقال ہوا اور یہ زمانہ بڑا نازک تھا کیونکہ تمام ہندوستان میں غدر کی آگ پھیل چکی تھی اور حیدرآباد بھی اس سے متاثر ہو رہا تھا لیکن نواب مختار الملک نے اپنے ذاتی تدبر سے ریاست کو اس آگ سے محفوظ رکھا ورنہ آج دوسری صورت ہوتی۔ اس کے بعد پھر آپ ہی کی وزارت میں آصفجاہ خامس نے بھی ۱۲۸۵ھ میں عالم جاودانی کی راہ لی، اعلیٰ حضرت غفران مکاں میر محبوب علی خاں مسند حکومت پر بٹھائے گئے اور ریجنسی کے ذریعہ ریاست کا کام ہونے لگا۔ یہ وقت بھی بہت نازک تھا کیونکہ اکثر امرا کم عمر رئیس کے مخالف ہو گئے تھے لیکن نواب مختار الملک کی وجہ سے تبدیلی نہ ہونے پائی۔ (۲) آپ پہلے دیوان ہیں جو سرکاری کام سے یورپ تشریف لے گئے اور انگریزوں نے آپ کے شایان شان عزت کی۔ (۳) مالگزاری تعلیم عدالت، تعمیرات وغیرہ کی تنظیم ہوئی اور مختلف محکموں میں اصلاحات عمل میں آئیں جن کی مختصر روئداد حسب ذیل ہے:۔

(الف) مالگزاری کا جدید انتظام ہوا، قدیم طریقہ ملک کو قول اور ٹھیکہ پر دینے کا موقوف کیا گیا اس کے بجائے سرکار نے خود محاصل کے وصول کرنے کا قاعدہ اخذ کیا، تحصیلدار، تعلقدار، صوبہ دار مقرر ہوئے، ملک کو چار صوبوں میں تقسیم کیا گیا مجلس مالگزاری قائم ہوئی ان وجوہ سے ساہوکاروں اور دولت مند اصحاب کے ظلم و ستم سے رعایا محفوظ و مامون ہو گئی۔

(ب) عدالت کے لئے جدید محکمے، فوجداری، دیوانی، عدالت عالیہ کا قیام عمل میں آیا اور منظم طور پر عدالت کا کاروبار ہونے لگا۔ عدالتوں کے لئے شرع اسلام اور دھرم شاستر کو قانون قرار دیا گیا اسی کے لحاظ سے فیصلے ہونے لگے۔

(ج) ملک کی تعلیم کی طرف پوری توجہ کی گئی اضلاع اور تعلقات میں مدرسے کھولے گئے حیدرآباد میں مدرسۂ دارالعلوم، مدرسۂ عالیہ وغیرہ کا افتتاح کیا گیا۔

(د) تعمیرات کے لئے جدید محکمہ قائم ہوا۔ نئے راستے بنائے گئے، قدیم عمارات کی ترمیم ہونے لگی۔

(و) قلمرو آصفی میں ریل اور تار جاری ہوئے (۱۰) فوج کی اصلاح ہوی باقاعدہ فوج کی بنیاد قائم ہوی۔

غرض کہ اصلاحات اور انتظامات کی ایک طویل فہرست ہے، بہرحال نواب مختارالملک نے ایک باقاعدہ اور منظم ریاست کی صورت میں سلطنت آصفیہ کو مبدل کر دیا۔

۱۳۰۰ھ میں نواب مختارالملک کا ہیضہ سے انتقال ہوا، اور دائرۂ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ مختارالملک نیک مزاج، خوش خلق حسن سیرت کے انسان تھے، ان کا حافظہ غضب کا تھا، معاملہ فہمی میں اپنی آپ نظیر تھے تدبر و سیاست میں ان کا ثانی نہیں تھا۔ وہ ہر شخص کو دیکھ کر اس کی عادت اور خصلت سے بخوبی واقف ہو جاتے تھے۔ ان کی مردم شناسی مشہور تھی۔ برٹش گورنمنٹ نے ان کو ہز ایکسلنسی کا خطاب دیا تھا اور سترہ توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ انھیں دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔

راجہ نرپندر بہادر

تولد ۱۲۴۴ھ انتقال ۱۳۰۶ھ

راجہ نراین پرشاد نرپندر بہادر، راجہ دہراج بالا پرشاد کے فرزند اور مہاراجہ چندولال کے پوتے تھے، راجہ راجایان راجہ بہادر کے خطاب سے سرفراز تھے۔

۱۲۴۴ھ میں تولد ہوئے عربی، فارسی کے علاوہ انگریزی سے بھی واقف تھے۔ ۱۲۶۹ھ میں خدمت پیشکاری سے سرفراز ہوے سالار جنگ مختارالملک کے انتقال پر بہ شرکت عمادالسلطنت بہادر دیوانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس زمانہ کا اہم واقعہ اعلیٰ حضرت غفران مکاں آصف جاہ سادس کا پورے اختیارات کے ساتھ مسند نشین ہونا ہے۔

راجہ نرپندر بہادر ایک مدبر، فیاض، تجربہ کار، سیرچشم انسان تھے، آپ کو صرف ایک دختر تھیں جو راجہ ہری کشن بہادر سے بیاہی گئیں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر آپ کے نواسے اور جانشین ہیں۔ ۱۳۰۶ھ میں راجہ نرپندر بہادر کا انتقال ہوا۔

میر لائق علی خاں سالار جنگ مدبر الدولہ عماد السلطنت

عمادُ السلطنت

تولد سنہ ۱۲۸۰ھ وفات سنہ ۱۳۰٦ھ

میر لائق علی خان المخاطب سالار جنگ منیر الدولہ مختار الملک عماد السلطنت مختار الملک اول کے بڑے فرزند تھے سنہ ۱۲۷۰ھ میں حیدرآباد میں آپ کی ولادت ہوئی، قابل باپ کی نگرانی میں تعلیم و تربیت ہوئی، ابتدائی تعلیم میں آپ مرحوم اعلیحضرت غفران مکان کے ساتھ شریک اور ہم مکتب رہے اس کے بعد مدرسہ عالیہ میں شریک ہوئے، تکمیل تعلیم کے لئے انگلستان بھی روانہ کئے گئے تھے (سنہ ۱۲۹۰ھ)

اعلیحضرت غفران مکان نے اختیارات کے ساتھ مسند نشین ہوتے ہی آپ کو قلمدان دیوانی مرحمت فرمایا (سنہ ۱۳۰۱ھ) آپ کی دیوانی کے اہم واقعات حسب ذیل ہیں ۔

(۱) اعلیحضرت نے کونسل آف اسٹیٹ قائم فرمائی اور اپنی صدارت سے اس کو ممتاز کیا ۔ (۲) دفتر فینانس قائم ہوا ۔ (۳) مجلس وضع قوانین کا قیام ہوا ۔ (۴) ویسرایان ہند کے حیدرآباد آنے کا سلسلہ قائم ہوا ۔ (۵) سرکاری زبان اردو قرار دی گئی تمام سرکاری دفاتر میں اردو میں کاروبار ہونے لگا ۔

سنہ ۱۳۰۴ھ خدمت دیوانی سے آپ مستعفی ہوگئے ۔علحدگی کے بعد دوبارہ آپ نے یورپ کی سیاحت فرمائی قسطنطنیہ میں سلطان عبدالحمید خان سے ملاقات کا شرف حاصل کیا ۔

یورپ کے سفر سے واپسی کے بعد سنہ ۱۳۰٦ھ میں آپ کا انتقال ہوا ۔ خاندانی مدفن دائرہ میر مومن میں سپرد خاک کئے گئے ۔

عماد السلطنت نہایت قابل فرد تھے ، ذہن اور حافظہ میں وہ اپنے باپ سے بھی سبقت لے گئے تھے ، آپ کی ذہانت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ قسطنطنیہ میں ایک ہفتہ میں ترکی زبان میں اتنا ملکہ حاصل کرلیا کہ ڈنر کے موقع پر اسی زبان میں تقریر فرمائی ۔ آپ کے مضامین موقر رسالوں میں شائع ہوتے تھے ، آپ کے ایک مضمون پر گلاڈسٹون نے تعریفی خط لکھا تھا ۔

آپ کی خوش اخلاقی اور ملنساری کا سب کو اعتراف تھا ۔ فنون سپہ گری سے بھی آپ کو دلچسپی تھی ۔ دائرہ کو آپ ہی نے قائم فرمائی تھی اعلیحضرت غفران مکان کے ساتھ اکثر سیر و سیاحت میں ہم رکاب رہا کرتے تھے ۔

امیر اکبر سر آسماں جاہ

تولد سنہ ۱۲۵٦ھ انتقال سنہ ۳۱٦ھ

محمد مظہر الدین خان آسمان جاہ کے والد محمد سلطان الدین خان سیف جنگ تھے سنہ ۱۲۵٦ھ میں تولد ہوئے آپ کی صغیر سنی میں والد کا انتقال ہوگیا ۔ اس لئے چچا محمد رفیع الدین خان امیر کبیر ثانی نے آپ کی پرورش فرمائی اور ان کی نگرانی میں تعلیم ہوئی نواب ہمت یار جنگ بہادر نوتوال کے دادا آپ کے استاد تھے ۔

مختلف اوقات میں آپ کو حسب ذیل خطابات عطا ہوئے ۔

"رفعت جنگ بشیر الدولہ عمدۃ الملک امیر کبیر آسمان جاہ" سرکار عالی کی مختلف خدمات آپ نے بحسن و خوبی انجام دیں جن کی تفصیل درج کی جاتی ہے ۔

۱۲۸۶ھ میں نواب مختار الملک نے سلطنت آصفیہ کی جدید تنظیم فرمائی تھی، چار صدر المہام مقرر کئے تھے، ان میں سے ایک نواب بشیر الدولہ آسماں جاہ بھی تھے، عدالت کا سررشتہ آپ سے متعلق تھا۔ مولوی سید محمد مودودی صاحب معتمد تھے۔ آسمان جاہ یہ خدمت بلا تنخواہ انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد جب نواب مختار الملک انگلستان تشریف لے گئے تو اپنے سررشتہ کا کام مدار المہام کی نیابت سے کرتے رہے، اور مختار الملک کے انتقال کے بعد ریجنسی کے رکن ہوگئے اس زمانہ میں آپ ہی نے ویسرائے کی خدمت میں مرحوم اعلیٰحضرت غفران مکان کو پورے اختیارات کے ساتھ مسند نشین کرنے کی تحریک فرمائی پرنس آف ویلز (اڈورڈ ہفتم) کے ہندوستان آنے پر بمبئی میں آسماں جاہ نے سلطنت آصفیہ کی جانب سے استقبال کے فرائض انجام دئے تھے اور اس کے بعد ۱۳۰۴ھ میں ملکہ وکٹوریہ کی پنجاہ سالہ جوبلی میں سرکار عالی کی جانب سے شرکت فرمائی تھی۔

اسی ۱۳۰۴ھ میں جبکہ آپ لندن میں تھے آپ کو قلمدان مدار المہام سے سرفراز کیا گیا۔ خاندان پائگاہ میں آپ ہی سب سے پہلے شخص ہیں جن کو یہ خدمت عطا ہوئی تھی، آسماں جاہ کے زمانہ وزارت میں مختلف اصلاحیں ہوئیں سررشتہ عدالت اور کروڑگیری میں اصلاح ہوئی۔ موازنہ، مداخل مخارج میں تنظیم ہوئی، آبرسانی پبلک ورکس کے دفاتر قائم ہوئے۔

اس کے علاوہ بعض سیاسی مقدمات مثلاً بیکیپ کا ہیرا کا مقدمہ، سردار جنگ کا ریلوے و معدنیات کا مقدمہ، مہدی حسن کی میم کا مقدمہ، سرور الملک کے رشوت کا مقدمہ وغیرہ بھی آپ کی وزارت کے اہم ترین واقعات ہیں جو حیدرآباد کے میدان سیاست میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۳۱۱ھ میں آسماں جاہ نے مدار المہامی سے علیحدگی اختیار کی اور ۱۳۱۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ درگاہ برہنہ شاہ میں مدفون ہوئے آسماں جاہ کو سیر و سیاحت سے دلچسپی تھی یورپ کے کئی ممالک دیکھے، مصر میں خدیو مصر سے ملاقات کی، ہندوستان کے شمالی و جنوب کے کئی شہر کا معائنہ کیا۔

انگلستان میں آپ کی بڑی عزت و وقعت ہوتی تھی، کئی دعوتیں ہوئیں تھیں۔ زمانہ وزارت میں "سر" کا خطاب ملا تھا۔ آپ کو تعمیر عمارات کا بڑا شوق تھا، بشیر باغ، آسمان گڈھ، اکبر باغ، سرور نگر کا باغ سب آپ کی یادگار ہیں، اس کے علاوہ اجمیر کا سماع خانہ، درگاہ حضرت شاہ خاموش، عمدہ ساگر، چوک کی گھڑیال آپ ہی کے تعمیر کئے ہوئے ہیں۔

آسمان جاہ نہایت وسیع اخلاق، شرم و حیا کے پتلے تھے، اپنے ملازمین کی بڑی قدر کرتے ان کے متوسلین کے ساتھ حسن سلوک کرتے تھے۔

نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کی صاحبزادی سے آپ کی شادی ہوئی تھی، مگر ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

نواب معین الدین خان (اعانت جنگ معین الدولہ بہادر) آپ کے اکلوتے فرزند ہیں۔ جو معین المہامی کی خدمت کئی سال تک انجام دے چکے ہیں اور شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا دیوان معین سخن آج کل زیر طبع ہے۔

محمد مظہر الدین خان رفعت جنگ بشیر الدولہ عمدۃ الملک
اعظم الامرا امیر کبیر سر آسمان جاہ

محمد فضل الدین خان سکندر جنگ اقبال الدولہ اقتدار الملک
سر وقار الامرا

اقبال الدّولہ وقار الامرا

تولد ۱۲۰۲ھ وفات ۱۳۱۹ھ

محمد فضل الدین خان المخاطب سکندر جنگ اقبال الدولہ اقتدار الملک وقار الامرا، کے والد محمد رشید الدین خان امیر کبیر ہیں۔ آپ شمس الامرا رشید جاہ کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۲۷۴ھ میں ولادت ہوئی اور ۱۳۱۹ھ میں عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔

ابتداً اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم پائی، جوانی میں انگریزی تعلیم سے بھی استفادہ فرمایا۔

نواب آسمان جاہ کی وزارت کے زمانہ میں آپ نے صدر المہام مالگزاری کی خدمت انجام دی اور ان کے بعد مدار المہامی کی خدمت جلیلہ پر سرفراز ہوئے (۱۳۱۱ھ) سات سال سے زیادہ اس خدمت کو انجام دیکر ۱۳۱۹ھ میں مستعفی ہوئے اور چند ماہ کے بعد انتقال فرمایا۔ خاندانی قبرستان درگاہ برہنہ شاہ میں سپرد خاک کئے گئے۔

نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کی دختر نیک اختر سے آپ کا بھی عقد ہوا، ان کے بطن سے آپ کے بڑے فرزند ناموجنگ سلطان الملک کی پیدائش ہوئی آپ کے دوسرے فرزند محمد ولی الدین خان المخاطب ولی الدولہ مرحوم تھے۔

وقار الامرا یورپ بھی تشریف لے گئے تھے اور آٹھ ماہ تک وہاں آپ کا قیام رہا۔ یورپ کے طریقہ تعلیم سے بڑے متاثر ہوئے اور اپنے دونوں لڑکوں کو وہاں تعلیم کے لئے روانہ فرمایا۔ ولی الدولہ مرحوم کئی سال تک ریڈین کالج میں زیر تعلیم رہے۔

وقار الامرا داد و دہش میں بڑے مشہور تھے، نہ صرف اپنے ذاتی خزانہ سے بلکہ دیوانی کے زمانہ میں سرکاری خزانہ سے بھی آپ نے خوب سخاوت فرمائی۔

آپ کے زمانہ وزارت میں سررشتہ علوم وفنون کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اولاً سید علی بلگرامی نے کئی کتابوں کا ترجمہ فرمایا اور پھر مولانا شبلی مرحوم اس سررشتہ کے ناظم العلوم قرار پائے تھے۔ مولانا نے کئی کتابیں اسی زمانہ میں تالیف فرمائیں۔

وقار الامرا نے بصرف کثیر فلک نما کی تعمیر فرمائی تھی۔ مگر اس کے بعد قرضہ کی وجہ سے ۲۲ لاکھ میں اس کو اعلی حضرت کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

نواب وقار الامرا کے چھوٹے فرزند نواب ولی الدولہ بہادر نے کئی سال تک صدر اعظمی کی خدمت انجام دی۔ وہ اپنے اخلاق سادگی اور نیک طبع کی وجہ سے بہت ہر دل عزیز تھے چنانچہ دو سال قبل جب وہ حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے اور وہیں انتقال فرمایا تو اہل ملک کو ان کی وفات کا بہت صدمہ ہوا۔ ان کی بیگم صاحبہ کو علم وفضل اور اصلاح نسواں سے خاص شغف ہے اور حیدرآباد کی کوئی مجلس نسواں ان کے مشوروں اور امداد سے محروم نہیں رہتی

مہاراجہ یمین السلطنت بہادر

تولد ۱۲۷۹ھ

رائے کشن پرشاد المخاطب راجہ راجایان مہاراجہ راجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت بہادر، راجہ ہرکشن کے فرزند اور راجہ نریندر بہادر کے نواسے ہیں۔

حیدرآباد میں ۱۲۷۹ھ میں آپ کی ولادت ہوئی نانا کی نگرانی میں تعلیم اور تربیت ہوئی، گھر کی تعلیم کے بعد مدرسہ عالیہ میں تعلیم پائی۔ اردو، فارسی، عربی، انگریزی وغیرہ میں کافی مہارت حاصل فرمائی۔

نانا کے انتقال پر ان کی جاگیرات آپ کے نام بحال کی گئیں اور ۱۳۱۰ھ میں خدمت پیشکاری و معین المہامی فوج سے سرفراز کئے گئے۔ سروقار الامرا کے مستعفی ہونے پر خدمت جلیلہ مدارالمہامی پر اولاً منسرم ۱۳۱۹ھ اور پھر مستقل کئے گئے (۱۳۲۰ھ) کامل دس سال کے بعد ۱۳۳۰ھ میں اس سے مستعفی ہوئے۔ دوبارہ ۱۳۴۲ھ میں صدارت عظمیٰ پر آپ کا تقرر ہوا۔ ذیحجہ ۱۳۵۵ھ میں بوجہ پیرانہ سالی آپ نے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

آپ کا زمانہ مدارالمہامی اور صدارت عظمیٰ اہم واقعات اور انتظامات سے مملو ہے جس کی مختصر صراحت بھی طویل صفحات کی متقاضی ہے۔

اعلیٰحضرت آصفجاہ سادس غفراں مکان نے آپ ہی کی مدارالمہامی کے زمانہ میں فردوس بریں کی راہ لی اور اعلیٰحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ برار کے متعلق قطعی تصفیہ ہوا، بیسیوں جدید محکمے قائم ہوئے، بیسیوں دفاتر کی اصلاح اور تنظیم ہوئی، نئی اسکیمیں جاری ہوئیں محکمہ جات فینانس، تعمیرات، مالگزاری، عدالت، تعلیمات، فوج غرض ہر ہر سررشتہ میں اس قدر اصلاحیں ہوئیں کہ ان کا اظہار دشوار ہے۔

مہاراجہ بہادر کی ذات محاسن اور اخلاقی خوبیوں سے مملو ہے، آپ کی عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت، تلنگی، مرہٹی، اردو، ہندی لیاقت مسلّمہ ہے آپ اردو، اور فارسی کے زبردست شاعر اور ادیب ہیں، داغ اور آصف سے تلمذ حاصل ہے نعت اور تصوف میں آپ کا کلام بید دلچسپ اور دل آویز ہوتا ہے۔ شاد آپ کا تخلص ہے۔

مشرقی امرا کا آپ زندہ نمونہ ہیں، حسن واخلاق، سخاوت، مروّت، رواداری آپ کے خصوصی اور امتیازی جوہر ہیں، فقیر دوست، فقیر منش اور صوفی مشرب ہیں، آپ کے یہاں ہمیشہ فقرا، صوفیا، مشائخین، شعرا، اور اہل کمال کا مجمع رہا کرتا ہے۔ مشاعرے ہوا کرتے ہیں۔

مہاراجہ بہادر کو تصنیف و تالیف سے بھی شغف ہے کئی درجن کتابیں ب تک شائع ہوچکی ہیں نظم و نثر پر آپ کو پورا عبور حاصل ہے، نہایت خوش خط ہیں، درگاہوں، مندروں، مسجدوں کی زیارت کا شوق ہے۔ ہندوستان کے مشہور زیارت گاہوں خواہ ہندوؤں سے متعلق ہوں یا مسلمانوں کی آپ نے دونوں کی زیارت کی ہے۔

علم دوستی، سخاوت، رواداری میں آپ اپنے جد اعلیٰ مہاراجہ چندولعل کے مکمل نمونہ ہیں۔

گورنمنٹ انگریزی میں بھی آپ کو اعزاز حاصل ہے چنانچہ "کے، سی، آئی۔ ای۔ اور جی، سی، آئی، ای" کے خطابات آپ کو ملے ہوئے ہیں بہرحال مہاراجہ بہادر ایک نیک مزاج، خوش اخلاق اور مالک کے وفادار امیر ہیں۔

(ولادت ۱۳۰۶ھ)

نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ بہادر، عماد السلطنت مختار الملک ثانی کے اکلوتے لختِ جگر ہیں، ۱۴ رشوال ۱۳۰۶ھ کو بمقام پونا آپ کی ولادت ہوئی، ایک ماہ کے اندر ہی سایۂ پدری سے محروم ہوگئے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور پھر مدرسہ عالیہ میں شریک کئے گئے ۱۹۰۲ء میں آپ نے مڈل کا امتحان کامیاب کیا اور پھر میٹرک میں کامیاب ہوئے۔ آپ نے مدرسہ میں اپنے عمدہ اخلاق سے نہ صرف ہم کلاس طلبہ کو گرویدہ کرلیا بلکہ اساتذہ کو بھی اپنا مداح بنالیا مسٹر سیڈن سابق پرنسپل آپ کی طالب علمانہ خوبیوں کا ہمیشہ اعتراف کرتے رہے۔

اعلیٰ حضرت سلطان العلوم نے اپنی مسند نشینی کے پہلے ہی سال آپ کے اسٹیٹ کی کورٹ کی نگرانی کو برخاست کرکے آپ کی نگرانی میں دے دیا۔ بااختیار ہوکر آپ نے اپنے جاگیرات کا دورہ کیا۔ رعایا کی حالت بچشم خود معائنہ کرکے ان کی اصلاح اور صلاح و فلاح کے احکام دئے۔

اس کے چند ماہ بعد جب ۱۳۳۱ھ میں آپ مدار المہامی کی جلیل القدر خدمت سے سرفراز کئے گئے تقریباً تین سال آپ نے اس خدمت کو انجام دیا آپ کے زمانہ میں کئی جدید محکمے قائم ہوئے، آبپاشی، آب رسانی کو وسعت ہوئی، تعمیرات کی ترقی ہوئی، تعلیمات میں جدید اسکیم نافذ ہوئے جس کی تفصیل آخر میں درج ہے۔

محرم ۱۳۳۳ھ کو آپ نے خدمت مدار المہامی سے سبکدوشی حاصل کی علم، فن، تعلیم، صنعت و حرفت سے آپ کو بڑی دلچسپی ہے اس کی تفصیلی صراحت کا یہاں موقع نہیں ہے۔ البتہ چند امور درج کئے جاتے ہیں:-

مدرسۂ دار العلوم کی ساٹھ سالہ جوبلی کی آپ نے صدارت فرمائی اور حوصلہ افزا خطبہ سنایا، آپ ہی کے عہد وزارت میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔

مسلم یونیورسٹی کو ایک لاکھ کا گراں قدر چندہ عطا فرمایا۔ اور سالانہ بارہ سو روپئے بحال رکھے۔ انجمن ترقی اردو کو دس ہزار کا چندہ دیا بیوہ اعزہ اور متوسلین کی تعلیم کی طرف خاص توجہ مبذول ہے۔ ہونہار طلبہ کو ہندوستان اور یورپ میں تعلیم پانے کے لئے وظائف سے مدد فرماتے ہیں۔

صنعت و حرفت کے فروغ کے لئے آپ نے دلچسپی لے کر کئی کمپنیوں کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے اور بیسیوں کمپنیاں خود آپ نے قائم کیں جو کامیابی سے چل رہی ہیں۔

آپ کا سب سے زیادہ قابل قدر کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے "ولی" کے دو صد سالہ جشن کی صدارت فرمائی اور دکھنی ادب کی سرپرستی کا اعلان کیا چنانچہ آپ کی توجہ اور گراں قدر عطیہ سے بیسیوں دکھنی ادب کی قابل قدر کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو رہی ہیں۔ یہ آپ کا وہ کارنامہ ہے جس پر موجودہ اور آئندہ نسلیں فخر کریں گی نہ زمانہ مٹا سکے گا اور نہ حوادثات اس کو محو کرسکیں گے۔

ایک اور مہتم بالشان اسکیم آپ کے زیر غور ہے وہ یہ ہے کہ آپ کا ارادہ ہے کہ ایک عالی شان محل تعمیر کیا جائے اور اس میں

آپ کے یہاں کے عجائبات اور نادر روزگار اشیاء اور نایاب کتابیں وغیرہ وپبلک استفادہ کا موقع دیا جائے۔

یہہ اسکیم جس قدر مفید جس قدر ضروری اور کارآمد ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا' خدا سے دعا ہے کہ آپ کے نیک ارادے کو جلد عملی صورت نصیب ہو جائے۔

نواب سالار جنگ بہادر کے عہد وزارت میں قانون وقواعد اوزان وپیمانہ جات جاری کئے گئے۔ مسالغ پر سند یافتہ ملاؤں کا جو ماہوار ریاب ہوں تقرر کرنے کا حکم دیا گیا عارضی دستور العمل تحط ممالک محروسہ سرکار عالی نافذ کیا گیا اور مسٹر ویکفیلڈ کمشنر تحط مقرر کئے گئے۔ اراضی نامہ جات جو بند وبست کی شنوائی کے وقت پیش ہوں ان کا قطعی تصفیہ تعلقداران ضلع کو کرنے کا حکم ہوا سیول سروس کلاس قائم ہوی اور قواعد داخلہ وانتخاب طلبہ بنائے گئے' قانون تادیب خانہ جات ممالک محروسہ سرکار عالی نافذ ہوئے۔ جدید جوڈیشل کمیٹی کی تنظیم عمل میں لائی گئی' مائننگ بورڈ کا قیام منظور فرمایا گیا انگریزی الفاظ کے سرکاری مراسلات میں استعمال کرنے کی ممانعت فرمائی گی ضابطہ جوڈیشل کمیٹی ممالک محروسہ سرکار عالی نافذ کیا گیا قواعد پولیس ٹرننگ اسکول جاری کئے گئے حسب ذیل طلبہ کو وظیفہ تعلیمی یورپ والیشاء دیا گیا:۔

(۱) سمیع اللہ شاد بی' ایس' سی ولد سید امجد اللہ سول انجینرنگ۔ ۲۔ سید محمد یونس بی' اے ولد سید عطا حسین سول انجینرنگ۔ ۳۔ حیدر علی خاں بل یم یس ولد حکیم داد علی طبابت۔ ۴۔ محمد الیاس برنی ام' اے ولد محمد ابراہیم (زیر تصفیہ)

وظایف تعلیم ایشیا

۱۔ محمد سراج الدین احمد ولد ڈاکٹر معین الدین انجینیرنگ۔ ۲۔ ام' اے۔ لمار بلو ولد یم ل اندیا طبابت۔ ۳۔ دی اچ کوناپور ولد ہنمنت راؤ کوناپور طبابت محکمہ آثار قدیمہ ممالک محروسہ سرکار عالی قائم کیا گیا اور غلام یزدانی صاحب بی' اے کا س کی نظامت پر تقرر ہوا قانون انجمن ہائی امداد قرضہ نافذ ہوا۔ قواعد نگرانی اقوام جرائم پیشہ جاری کئے گئے اور قواعد امتحان زبان دانی عہدہ داران سررشتہ تعلیمات نافذ ہوئے۔

نواب صاحب نے گذشتہ نو سال کے عرصے میں تقریباً پچانوے ہزار روپے سے ہندوستان اور انگلستان میں تعلیم پانے والے طلبہ کی امداد فرمائی اور تقریباً اٹھارہ ہزار روپے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور مدرسہ آصفیہ کی ماہانہ امداد میں اور تقریباً بیس ہزار روپے اخبارات و رسائل کے چندوں میں عطا کئے ہیں۔ اس کے علاوہ موقتی طور پر علمی وادبی انجمنوں اور اصحاب کو بھی خاطر خواہ رقمی امداد کرتے رہتے ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی

ایمان سخن

ادارۂ ادبیات اردو کے سلسلۂ انتخابات شعرائے دکن کی ایک دلچسپ کتاب جس میں مولوی سید محمد صاحب ام' اے نے نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد کے ملک الشعراء' کا کلام انتخاب کرکے اپنے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شایع کیا ہے قیمت ۱۲/

نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ بہادر

سید پرورش علی خاں مقدم الدولہ

سر سیّد علی امام موئد الملک مرحوم

سر سید علی امام صاحب موئد الملک مرحوم آپ کے والد سید امداد امام مرحوم المتخلص بہ اثر پٹنہ کے رؤسا سے تھے آپ کا خاندان سادات بارہہ سے تعلق رکھتا ہے۔

سید علی امام کی پیدائش ۱۸۶۹ء میں مضافات پٹنہ میں ہوئی والد کی نگرانی میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ سید امداد امام بڑے خوش قسمت تھے کہ ان کے دونوں فرزند سید علی امام اور حسن امام ہندوستان کے افق پر آفتاب اور ماہتاب بن کر چمکے

سید علی امام گھر کی تعلیم کے بعد ضلع آرہ کے اسکول میں شریک ہوئے پھر پٹنہ میں کالج کی تعلیم پائی اس کے بعد انگلستان جا کر بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی ۱۸۹۰ء میں یورپ سے واپس آئے اور پٹنہ میں وکالت شروع کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں پٹنہ ہائی کورٹ کے وکلاء میں ممتاز خصوصیت پیدا کر لی۔

آپ ہی وہ پہلے مسلمان ہیں جو وائسرائے ہند کی کونسل میں ممبر کی حیثیت سے مامور کئے گئے کئی سال تک آپ نے اس خدمت کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ ایک طرف گورنمنٹ آپ کے کام کی قدردان اور آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی تو دوسری طرف رعایا میں بھی ہر دل عزیز تھے اس قسم کی خوش نصیبی بہت کم اصحاب کو میسر آتی ہے۔

اس خدمت کے بعد پھر آپ نے وکالت شروع کی، مگر بہت جلد پٹنہ ہائی کورٹ میں جج ہو گئے اور اس کے بعد صوبہ بہار کی کونسل میں مامور ہوئے اسی خدمت سے آپ حیدرآباد میں طلب کئے گئے ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۹ء) اور صدارت عظمیٰ کی جلیل القدر خدمت آپ کے تفویض کی گئی۔ زمانہ ما بعد میں موئد الملک کا خطاب بھی آپ کو دیا گیا۔ آپ کے صدارت عظمیٰ کے زمانہ میں یہاں کئی اصلاحیں ہوئیں اور جدید تنظیمات ہوئیں جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:-

(۱) باب حکومت کا قیام ہوا اور سررشتہ جات کی جدید تنظیم ہوئی (۲) دفتر ترقیات عامہ کا قیام ہوا جو آباد مقامات کو آباد کرنے اور آبادی کو وسعت دینے کی بڑی اسکیم پیش نظر تھی۔ (۳) عدالت اور مال کے حکام کی علحدگی عمل میں آئی تعلقدار اور تحصیلدار اس سے عدالتی اختیارات علحدہ کر کے عدالت کے لئے جدید عہدہ دار مقرر کئے گئے (۴) دفاتر سرکار عالی میں تنخواہ کے متعلق جدید اسکیم نام اسکیل کا نفاذ عمل میں آیا (۵) معاملات پر نظر ثانی ہوئی اس کے علاوہ بھی جدید کئی اصلاحیں ہوئیں ان کی صراحت طوالت کا موجب ہے۔

حیدرآباد ہی کے زمانہ میں آپ جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنز) میں ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کے لئے ۱۳۳۱ف میں سر موئد الملک نے صدارت عظمیٰ سے کنارہ کشی اختیار کر لی مگر اس کے بعد بھی وہ مشیر کی حیثیت سے اپنے انتقال تک حیدرآباد آتے رہے۔

سر علی امام نے بحیثیت ہندوستانی اور بحیثیت مسلمان ہندوستان میں بہت کچھ کام کئے ہیں وہ مسلم لیگ کے صدر نشین بھی ہوئے تھے ہندو اور مسلم دونوں میں وہ ہر دل عزیز تھے۔

سر علی امام بڑے خوددار، مدبر، سیاست داں تھے وہ حسن اخلاق اور حسن سیرت سے آراستہ تھے۔ ۱۹۳۲ء میں انتقال ہوا رانچی میں دفن کئے گئے۔

رائٹ آنریبل سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ

محمد اکبر المخاطب رائٹ آنریبل سر حیدر نواز جنگ بہادر کے والد نذر علی مرحوم کھمبات کے متوطن اور بمبئی کے نامی گرامی تاجر تھے' حیدری آپ کا خاندانی لقب ہے۔

سر اکبر کی ولادت نومبر ۱۸۶۹ء میں بمبئی میں ہوئی' ابتدائی تعلیم اپنی والدہ اور نانی سے پائی' آپ کی نانی بمبئی کے مشہور جسٹس بدر الدین طیب جی کی حقیقی بہن تھیں۔ بمبئی کے سینٹ زیویر کالج سے سترہ سال کی عمر میں آپ نے بی' اے میں کامیابی حاصل کی۔ اس سے آپ کے تعلیمی شوق' خداداد حافظہ' اور غیر معمولی ذہن کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

تعلیم کے بعد سر اکبر گورنمنٹ آف انڈیا کی سلک ملازمت میں داخل ہوگئے اولاً ناگپور کے صیغہ حساب میں ایک افسر کی حیثیت سے مامور ہوئے (۱۸۸۸ء) اس کے بعد لاہور پھر کلکتہ میں کارگذار رہے اور وہاں سے الہ آباد کی محاسبی میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل کی جگہ پر ترقی ملی الہ آباد سے آپ کا تبادلہ بمبئی میں ہوا' اور پھر بمبئی سے مدراس کی ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرلی پر مامور ہوئے' اسی خدمت سے آپ حیدرآباد میں طلب کئے گئے۔

مدراس کی ملازمت کے زمانے میں آپ ہندوستان و برما کے سرکاری مطابع کی جانچ پڑتال پر مقرر کئے گئے تھے اس کام کو بھی آپ نے نہایت خوبی سے انجام دیا۔

۱۹۰۵ء (۱۳۱۶ف) میں سر اکبر حیدری کا تقرر صدر محاسبی سرکار عالی پر ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر ۳۶ سال کی تھی۔ دو سال کے بعد معتمدی فینانس پر آپ کا تقرر ہوا اور پھر ۱۳۲۳ف (۱۹۱۱ء) میں معتمد عدالت و کوتوالی امور عامہ پر تبادلہ ہوگیا۔ اس خدمت پر ایک طویل زمانے تک مامور رہے۔ کچھ عرصے تک اس خدمت کے ساتھ آپ نے صدر ناظم صنعت و حرفت کا کام بھی انجام دیا۔

۱۳۳۲ف (۱۹۲۰ء) میں سر اکبر سرکار عالی کی ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کر کے بمبئی میں اکاؤنٹنٹ جنرل کی خدمت پر مامور ہوگئے مگر اس کے چند ماہ بعد پھر جولائی ۱۹۲۱ء میں صدر المہام فینانس کی جگہ آپ کا تقرر ہوا اس طرح آپ دوبارہ سرکار عالی کی سلک ملازمت میں شامل ہوگئے۔

صدر المہامی فینانس کے بعد ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۶ء) میں سر اکبر صدر اعظم کی جلیل القدر خدمت پر مامور کئے گئے اور تقریباً ۲ دو سال سے آپ اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔

جس زمانہ میں سر اکبر حیدرآباد آکر صدر محاسب ہوئے تھے' اس وقت صدر المہامی اور مدار المہامی (صدر اعظم) کے خدمات حیدرآباد کے مخصوص امراء اور جاگیرداروں کے لئے مختص تھے کسی اعلیٰ عہدہ دار کا خواہ وہ معتمد ہی کیوں نہ ہو ترقی پاکر صدر المہام یا صدر اعظم ہوجانا محال تھا اس لئے اس وقت یہ شائبہ نہیں تھا کہ ایک دن سر اکبر صدر اعظم کی جلیل القدر خدمت پر مامور ہو جائیں گے۔

لیکن ایک زمانہ وہ آیا کہ اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع کے تدبر اور دوربین نظر کے باعث قابل اور لائق اشخاص اپنی اعلیٰ قابلیت اور عمدہ لیاقت کے باعث صدر المہام اور صدر اعظمی پر ترقی پانے لگے۔ اس قسم کا سب سے پہلا اعزاز سر فریدون الملک کو ملا تھا

سر محمد علی امام مؤید الملک

رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم

سرکار عالی کی ایک معمولی خدمت سے ترقی کرتے ہوئے سب سے اعلیٰ خدمت صدر اعظمی پر مامور کئے گئے تھے۔ ان کو یہ اعزاز محض ان کی لیاقت، قابلیت، دیانت اور وفاداری کے طفیل ملا تھا۔ سر فریدون الملک کے بعد سر اکبر وہ شخص ہیں جو سرکار عالی کی صدر محاسبی سے ترقی کرتے ہوئے صدر اعظمی پر سرفراز کئے گئے ہیں، سر اکبر کو بھی یہ خدمت انہی کی طرح لیاقت قابلیت کے بل بوتے پر ملی ہے

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے سر اکبر ہندوستان کے کئی صوبوں سی پی، پنجاب، بنگال، یو پی، بمبئی اور مدراس میں مامور رہے ہر جگہ آپ نے سرکاری خدمات کو حسن و خوبی سے انجام دیا اور اپنے بعد وہاں اپنی خوش گوار یاد چھوڑی۔ حیدرآباد میں بحیثیت معتمدی اور صدر المہامی مختلف سررشتہ جات آپ سے متعلق رہے، ہر سررشتہ میں دلچسپی لے کر آپ نے اصلاح کی کوشش فرمائی۔ جن کی تفصیل اس موقع پر طوالت کا موجب ہوگی۔

لیکن خصوصیت سے بعض سررشتہ جات کا ذکر ضروری ہے کیونکہ اس کے اظہار کے بغیر آپ کے حالات مکمل نہیں ہو سکتے سررشتہ آثار قدیمہ کا قیام آپ کی توجہ کا رہین منت ہے۔ سررشتہ طبابت کی اصلاح آپ کا ایک کارنامہ ہے،

سررشتہ تعلیمات کی جدید تنظیم اور جامعہ عثمانیہ کا افتتاح آپ کے نمایاں خدمات سے تعلق رکھتا ہے یوں تو حیدرآباد میں مختلف اوقات میں "جامعہ" کے قیام کا مسئلہ زیر بحث ہوا اور مختلف اصحاب حل و عقد نے اس کی طرف توجہ کی مگر عملی کام کسی نے نہیں کیا۔ بہر حال "جامعہ عثمانیہ" کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔ سررشتہ داری سہ سالہ مالیاتی تنظیم کا قاعدہ ریلوے کی خریدی سررشتہ صنعت و حرفت میں اس کی ترقی کے لئے ایک گراں قدر رقم کا محفوظ کرنا حیدرآباد سیول سروس کی مکرر تنظیم اور ان کو اعلیٰ خدمات پر مامور کرنا یہ سب رائٹ آنریبل سر اکبر کی کارگزاریوں میں شامل ہے یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ سر اکبر کو خوش قسمتی سے اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ جیسا حکمراں نصیب ہوا اور آپ کی ہر اسکیم کو اپنی معارف نوازی اور رعایا پروری کے باعث منظوری سے ممتاز فرمایا۔

صدر المہامی فینانس کے زمانہ میں سر اکبر نے حیدرآباد کے نمائندہ کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شرکت فرمائی ہے

نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر کو پبلک امور سے بھی دلچسپی رہی ہے طغیانی رود موسیٰ، طاعون، انفلوئنزا وغیرہ کے زمانہ میں نہایت توجہ اور دلچسپی سے آپ نے کام کیا ہے۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے صدر آپ ہی ہوئے تھے اور آپ کی توجہ سے کانفرنس نے بہت کچھ کامیابی حاصل کی تھی۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مسلمانان جنوبی ہند کی تعلیمی کانفرنس کے آپ صدر رہ چکے ہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سینیٹ کے رکن ہیں بہر حال آپ کے سرکاری خدمات کی طرح پبلک خدمات کی تفصیل بھی طویل صفحات کی متقاضی ہے۔

سر اکبر کو مذہب سے بڑا شغف ہے وہ صوم و صلوٰۃ کے سختی سے پابند ہیں بزرگان دین کے قبور کی زیارت اور مشائخین و صوفیا کی ملاقات کا آپ کو بڑا اشتیاق رہا کرتا ہے آپ سادگی پسند، بیجا اسراف کو ناپسند کرنے والے اوقات مقررہ کی پابندی کرنے والے، سرکاری کام کرنے کے شوقین، ہر وقت مصروف رہنے کے عادی ہیں۔

سر اکبر بحیثیت ایک ماہر فینانس، بحیثیت ماہر تعلیم، بحیثیت سیاسی مدبر، بحیثیت معاشی و اقتصادی ماہر اپنی آپ نظیر ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی

عہدِ آصفی کے امراء

اس کے قبل عہد آصفی کے مدارالمہاموں اور صدر اعظموں کے حالات اور تصاویر درج کی گئیں۔ اب عہد آصفی کے ان خاص خاص امراء کے حالات اور تصویریں شامل کی جاتی ہیں جو اپنے کارناموں اور شہرت کی وجہ سے بہت مشہور تھے یا جو نائب صوبہ کے درجے تک پہنچے تھے۔

نواب درگاہ قلی خاں سالار جنگ

نواب ذوالقدر اصل نام تھا ۱۱۲۲ھ میں بمقام سنگمیر پیدا ہوئے ان کے والد [illegible] قلی خاں کی پرورش اور حضرت غفران مآب نواب آصف جاہ اول کی تربیت سے ان کی فطری قابلیت بہت جلد نمایاں ہو گئی سن رشد کو پہنچنے سے قبل ہی اکثر علوم و فنون میں مہارت حاصل کر لی منکسر المزاجی کے ساتھ طبیعت میں شوخی اور ظرافت بھی تھی۔ فن موسیقی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے ۱۱۵۱ھ میں آصف جاہ بہادر کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا نادر شاہی حملے کے زمانہ میں اپنے مربی کی حفاظت میں غیر معمولی جاں بازی کا ثبوت دیا جس سے ان کی شجاعت کا ثبوت ملتا ہے دہلی سے واپس ہو کر اپنے سفر کے حالات کا ایک تفصیلی تذکرہ قلمبند کیا جو مرقع دہلی کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس میں بارھویں صدی کی دہلی کے معاشرتی، تمدنی، تاریخی، اور ادبی حالات نہایت تفصیل سے درج ہیں۔ شاعری سے فطری لگاؤ تھا اکثر فی البدیہہ اشعار کہتے تھے خود مشاعرے منعقد کرتے اور اپنی غزل آپ پڑھتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی افسوس ہے کہ بجز چند مرثیوں کے ان کا اردو و فارسی کلام دستیاب نہ ہو سکا چیدہ چیدہ اشعار کہیں کہیں تذکروں میں ملتے ہیں

دکن کے اکثر عہدہائے جلیلہ پر فائز رہنے کے بعد تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں ۱۱۸۰ھ میں ان کا انتقال ہوا اور اپنے خاندانی مقبرہ واقع اورنگ آباد میں مدفون ہوئے۔ نمونۂ کلام حسب ذیل۔

قصیدہ

پڑی ہے آکے گلے ناگہاں بلائے سفر
غرض کہ سخت مصیبت میں ہیں وضیع و شریف
اسی تردد افطار میں لگی تھی نیند
کھڑا ہے آکے سرہانے پہ پیر نورانی

سفر نہیں ہے سفر بل سقر سے ہے بدتر
غنی فقیر سبھی احتیاج میں مضطر
کہ ناگہہ خواب میں دیکھا قریب وقت سحر
لطیف عنصر و خوش منظر و خجستہ سیر

کہاں کمال عنایت سے کیجیے فکر تجھے　　ہے تیرے کام کا حامی امام جن و بشر
شہہ سریر کرامت امیر کل امیر　　ولی حضرت مولیٰ وصی پیغمبر
امام جن و ملک تاجدار ملک و ملک　　کہا ہے لحمک لحمی جسے شہہ سرور
سوائے اس کے کہوں کون ثنا وہ ذات ہے　　خدا نے سیف دی اور دی رسول نے جوہر
ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہوں سے　　کمینہ بندہ درگاہ صاحب قنبر
مراد بندہ درگہ و زود ہے کہ کرے　　ابوتراب کی تربت کی خاک کحل بصر

مرثیہ

عالم میں پھر کے لایا پیغام غم محرم　　سب انبیا ہیں غمگیں اور اولیا پہ ماتم
اہل حرم ستم میں دل چاک ہیں و پرغم　　فریاد کر کے کہتے اے سرور دو عالم
اولاد پر اپنے تیرا ہے یہ کیا ہے ستم　　کوئی لحد میں تنہا ہے کوئی خاک میں ہے بے دم
درد و الم تو اتنا جور و جفا سے پیہم　　سب مبتلا بلا میں فرصت نہیں ہے یکدم
بہ بہانہ بیکساں را نقصہ چیست یارب
در روطۂ ملالت تدبیر چیست یارب

یہ قصۂ مصیبت ہے سخت درد جاں کوں　　کیا لکھوں اگر کہوں اب طاقت نہیں بیاں کوں
موقوف کر ارے دل غمناک داستاں کوں　　سب پر عیاں ہوا ہے حاجت نہیں بیاں کوں
توں سامع الدعا ہے مقصود بندگاں کوں　　تجھ پاس مانگتا ہوں نابید وہ جہاں کوں
دنیا میں آبرو دے جنت دو رضویاں کوں　　عقبیٰ میں قربت کر ہم کلب آستاں کوں
فیض توسل درگاہ بخش عیب عاصی
از فضل تو تمنا دارد غریب عاصی

میر سعادت علی رضوی

(وفات ۱۲۰۵ھ)

ابو الفتح خاں تیغ جنگ کے والد ابو الخیر خاں تھے، سلسلۂ نسب حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج سے ملتا ہے۔

ابو الخیر خان کو دربار مغلیہ (محمد شاہ) سے "خان بہادر" کا خطاب عطا ہوا تھا۔ حضرت آصفجاہ اول کے ہمراہ رکاب دکن آئے۔ آصفجاہ نے دو ہزار منصب پانچ سو سوار کا اعزاز عطا کیا اور کئی ہزار کی جاگیر ذات مرحمت فرمائی تھی۔

وہ مالک کے بڑے وفادار اور جانثار تھے، چنانچہ جب ناصر جنگ شہید نے باپ کے خلاف صف آرائی کی تو ابو الخیر خاں کو بھی پناطرفدار بنانا چاہا۔ لیکن انھوں نے آصفجاہ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اسی وفاداری کے طفیل میں زمانہ مابعد میں خود ناصر جنگ نے ان کو "شمشیر بہادر" اور صلابت جنگ نے امام جنگ کے خطاب سے عزت افزائی کی۔ برہان پور میں ابو الخیر خاں کا انتقال ۱۱۶۶ھ میں ہوا وہیں مدفون ہوئے۔

تیغ جنگ کی پیدائش برہان پور میں ہوئی، والد کے انتقال کے بعد اپنی جاگیر میں خانہ نشین تھے، نواب صلابت جنگ نے اپنے سفر برہانپور (۱۱۶۸ھ) کے وقت آپ کو دربار کے امیروں میں شامل فرمایا۔ اس کے بعد آصفجاہ ثانی نواب میر نظام علیخاں نے خاص توجہ مبذول فرمائی اور آپ کے مراتب میں بیشی ہوتی گئی۔ تیغ جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء (اول) کے خطابات عطا ہوئے۔ کئی لاکھ کی جاگیر مرحمت ہوئی۔

نواب رکن الدولہ میر موسیٰ خان کے انتقال پر حضرت آصفجاہ نے آپ کو قلمدان دیوانی سے بھی سرفراز کرنا چاہا، مگر آپ نے میدان جنگ کے مقابلہ میدان سیاست کو پسند نہیں فرمایا۔

پائیگاہ کے آپ ہی بانی ہیں، حضرت آصفجاہ ثانی نے کئی لاکھ کی جاگیر فوج کے لئے عطا فرمائی تھی، علاوہ جاگیرات کے نقد رقم بھی اس کے لئے مرحمت ہوتی تھی۔ پائیگاہ کی یہ فوج شاہی محافظ (باڈی گارڈ) کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے سوار بہادر اور دلاور ہونے اور معقول تنخواہ پاتے تھے، تیغ جنگ کے چار رشتہ دار امجد الملک، سردار الملک، امام الملک اور اعظم الملک اس فوج کے اعلیٰ افسر تھے۔ تیغ جنگ کو اپنی فوج کے ساتھ بڑا شغف تھا۔

بحالت سفر پانگل کے مقام پر ۱۲۰۵ھ میں انتقال ہوا۔ لاش کو حیدرآباد لاکر درگاہ برہنہ شاہ میں دفن کیا گیا۔

شمس الامراء (ثالث) امیر کبیر (ثانی) (ولادت ۱۲۲۰ھ وفات ۱۲۹۴ھ)

امیر کبیر ثانی کا نام محمد رفیع الدین خان تھا۔ آپ فخر الدین خان امیر کبیر (اول) کے بڑے فرزند تھے جن کا ذکر وزرائے سلطنت کے سلسلہ میں گزر چکا ہے۔
شوال ۱۲۲۰ھ میں آپ کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی۔ نامور جنگ عمدۃ الدولہ عمدۃ الملک شمس الامراء (ثالث) امیر کبیر (ثانی) کے خطابات آپ کو سرفراز ہوئے تھے۔
نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس کے انتقال پر اعلیحضرت غفران مکان کی صغر سنی کے باعث آپ نائب حضور کی حیثیت سے سلطنت آصفی کے کاروبار انجام دیتے رہے۔ اسی نائب حضوری کے زمانہ میں آپ کا انتقال ہوا (۱۲۹۴ھ) میں خاندانی مدفن درگاہ حضرت برہنہ شاہ میں دفن کئے گئے۔
آپ کو علوم و فنون خصوصاً ریاضی اور ہیئت سے بڑی دلچسپی تھی۔ ریاضی میں آپ نے چند کتابیں تالیف فرمائی ہیں۔

ابوالفتح خان تہور جنگ شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء

محمد رفیع الدین خاں بہادر جنگ عمدۃ الدولہ عمدۃ الملک
شمس الامراء امیر کبیر ثانی

رشید الدین خاں وقار الامرا شمس الامرا امیر کبیر

محی الدین خاں قدم جنگ سر خورشید جاہ

فن تعمیر کا بھی شوق تھا۔ آپ کی بنوائی ہوئی کئی عمارتیں موجود ہیں۔ داد و دہش میں مشہور تھے۔ آپ کی سخاوت اور فیاضی کا شہرہ دور دور تک پہنچا تھا۔ چنانچہ زمانہ شباب میں (سنہ ۱۲۴۶ھ) آپ ایک مرتبہ بیمار ہو گئے تھے۔ یونانی حکماء کے علاج سے فائدہ نہیں ہوا۔ انگریزی علاج شروع کیا گیا جو اس زمانہ میں ایک عجوبہ سے کم نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے آپ کے لئے تبدیل آب و ہوا ضروری قرار دیا۔ کلکتہ لے گئے۔ وہاں جہاز کے ذریعہ سمندر میں تفریح ہونے لگی اور خدا کے فضل سے آپ کو صحت کلی حاصل ہو گئی۔ ایک سال تک یہاں قیام رہا۔ کلکتہ میں آپ نے اس قدر داد و دہش فرمائی اور ولایتی سامان اس کثرت سے خرید فرمایا کہ یورپ میں بھی آپ کا نام سخاوت اور قدردانی کے لحاظ سے مشہور ہو گیا تھا۔ آپ کو کوئی اولاد نہیں تھی

محمد رشید الدین خان شمس الامراء (رابع) امیر کبیر (ثالث)

(ولادت ۱۲۳۳ھ وفات ۱۲۹۹ھ)

محمد رشید الدین خان، امیر کبیر فخر الدین خان کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ بمقام حیدرآباد ۱۲۳۳ھ میں ولادت ہوئی اور ۱۲۹۹ھ میں انتقال ہوا۔ پہلے آپ کو ابو الخیر خان بہادر جنگ اقتدار الدولہ اقتدار الملک وقار الامراء کا خطاب عطا ہوا تھا۔ اس کے بعد جب امیر کبیر ثانی رفیع الدین خان کا انتقال ہوا تو آپ کو خاندانی خطاب شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء امیر کبیر کے موروثی خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ [illegible] نواب آصف جاہ ثالث سکندر جاہ بہادر کی صاحبزادی سے آپ کا عقد ہوا تھا۔ جن کے بطن سے آپ کو دو صاحبزادے خورشید جاہ و وقار الامراء تولد ہوئے۔

محمد رشید الدین خان اپنے وقت کے صاحب تدبیر و سیاست تھے۔ اس زمانہ میں آپ کو سیاسی خدمات اور پولیٹیکل معاملات کے انصرام پر جس طرح عبور حاصل تھا وہ اپنی آپ نظیر تھا۔ داد و دہش میں مشہور تھے۔ اپنے بڑے بھائی کی طرح ان کو بھی شعر و ادبیات سے دلچسپی تھی۔ علوم و فنون کے قدردان تھے۔ علماء، فضلاء اور شعراء کی ہمت افزائی کرتے اور کافی صلہ دے کر ان کی قدردانی فرماتے تھے۔

تاریخ سے خاص شغف تھا اسی شوق کے باعث تاریخ "رشید الدین خانی" آپ کی سرپرستی میں مرتب اور شائع ہوئی

محمد محی الدین خان خورشید جاہ شمس الامراء (خامس) امیر کبیر (رابع)

(ولادت ۱۲۵۸ھ وفات ۱۳۲۰ھ)

محمد رشید الدین خان کے بڑے فرزند تھے۔ ۱۲۵۸ھ میں ولادت ہوئی۔ آپ کی والدہ محترمہ حضرت عصمت النساء صاحبہ آصف جاہ ثالث کی صاحبزادی تھیں۔ آپ کی تعلیم و تربیت کا خاص انتظام ہوا تھا۔ عربی، فارسی، ریاضی وغیرہ کی تعلیم کے لئے علماء و فضلاء و قابل اساتذہ مامور کئے گئے تھے۔ [illegible] سپہ گری کا بھی اہتمام تھا۔ بہر حال دادا کی نگرانی میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ دادا کی خاص توجہ [illegible]

۱۲۷۰ھ میں آپ کی شادی نواب افضل الدولہ آصف جاہ خامس کی صاحبزادی حضرت حسن النساء بیگم صاحبہ سے ہوئی [illegible] تھیں۔ بڑی دھوم دھام سے یہ شادی ہوئی۔ دو ہفتہ تک شادی کے جشن ہوتے رہے۔ [illegible] برات ہوئی تھی [illegible] تاریخ میں یہ شادی اپنے دھوم دھام کروفر، شان و شوکت کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر تھی۔

بار ہ آصفی سے مختلف اوقات میں آپ کو حسب ذیل خطابات سے متمتع کیا گیا۔ ابوالخیر خاں، تیغ جنگ، خورشید الدولہ، خورشید الملک خورشید جاہ، شمس الامرا، امیر کبیر۔

شمس الامرا اور امیر کبیر کے خطابات آپ پر ختم ہوگئے، پھر کسی کو آج تک یہ خطاب نہیں ملا۔

سرکار انگریزی میں آپ کے بڑے اعزاز تھے۔ "سر" کا خطاب ملا تھا اور آپ کی زندگی میں جس قدر ویسرائے ہند حیدرآباد آئے وہ آپ کے یہاں ضرور مدعو ہوتے تھے۔

سر خورشید جاہ کو اپنے باپ کی طرح میدان سیاست سے بڑی دلچسپی تھی۔ آپ اپنے زمانہ کے مدبر اور صاحب فراست تھے، کونسل آف اسٹیٹ کی کنیت پر اعلیحضرت غفران مکاں نے آپ کا تقرر فرمایا تھا۔

علم و فن سے دلچسپی تھی، تاریخ خورشید جاہی آپ کی سرپرستی میں شائع ہوئی۔ داد و دہش میں بھی شہرت رکھتے تھے، حجاز ریلوے کی تعمیر کے لئے بیس ہزار کا چندہ دیا تھا۔ سیر و سیاحت کا شوق تھا شمالی ہند اور جنوبی ہند کے کئی شہر دیکھے تھے۔ اپنی فوج کو باقاعدہ مرتب کیا تھا۔ فوجی وردی اور عمدہ ہتیار دئے جو پائیگاہ میں اس سے پہلے نہیں تھے، سنہ ۱۳۲۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ درگاہ برہنہ شاہ میں دفن کئے گئے۔ آپ کو دو صاحبزادے تولد ہوئے، امام جنگ اور ظفر جنگ۔ آخر الذکر شہزادی حسن النسا بیگم صاحبہ کے بطن سے تھے۔

مکرم الدولہ میر پرورش علیخاں حسام جنگ

میر پرورش علی خان المخاطب حسام جنگ مکرم الدولہ، آپ کے والد نواب قبعۃ الدولہ، نواب سراج الملک کے داماد تھے اس طرح مکرم الدولہ نواب مختار الملک کے ہمشیرہ زادے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ مکرم الدولہ آپ کے داماد بھی تھے، نور النسا بیگم صاحبہ آپ سے بیاہی گئی تھیں۔

مکرم الدولہ کی تعلیم مدرسہ دار العلوم میں ہوئی، اس مدرسہ کے افتتاح کے ساتھ ہی آپ نے اس میں شرکت فرمائی تھی، عربی، فارسی کے علاوہ انگریزی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔

نواب مختار الملک نے مجلس مالگذاری قائم کی (سنہ ۱۲۵۶ھ) تو اس مجلس کا آپ کو میر مجلس بنایا گیا، اس کے بعد جب مجلس برخاست ہو کر صدر المہام مقرر ہوئے تو اس وقت آپ صدر المہام مالگذاری ہوئے۔

نواب مختار الملک کے سفر یورپ کے زمانہ میں آپ بشیر الدولہ کے ساتھ مل کر مدار المہامی کا کام بھی انجام دیتے رہے، آپ کی قابلیت مسلمہ تھی، اور عام و خاص میں آپ کی لیاقت کا شہرہ تھا۔

شادی کے ایک سال بعد (سنہ ۱۲۹۶ھ) میں آپ خلل دماغ کی وجہ سے خانہ نشین ہوگئے، سنہ ۱۳۲۳ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ دائرۂ میر مومن میں دفن کئے گئے۔ آپ کو کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

نصیر الدین ہاشمی

سورما

گولکنڈہ کا ایک افسانہ

گولکنڈہ کی زمین ہیروں کی سرزمین ہے۔ یہ کبھی آندھرا دیس کی راجدھانی تھی، جس کی شاہانہ سج دھج سے اپنے پرائے سب کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتی تھیں۔ آج بھی وہاں اُن دنوں کی یاد دلانے والے ایک آئینہ خانے کے کچھ آثار رہ گئے ہیں جنہیں دیکھتے ہوئے ایک دفعہ مجھے محسوس ہوا کہ ان آئینوں میں گزرے زمانہ کی پرچھائیاں اُبھر آتی ہیں جیسے من میں پیاروں کی یاد آئے!

دیکھا کہ کہیں سلطان قلی قطب شاہ ہے۔ بشرے پر علم کا نور۔ حرکت میں وجاہت۔ لوگ اس بادشاہ کو تلنگانی میں "بڑے ملک" کے نام سے پکارتے ہیں۔ تلنگانہ کا داتا سمجھتے ہیں! کہیں ابراہیم قطب شاہ ہے جو ابتدائے تمدن کی داغ بیل ڈال رہا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے محمد قلی قطب شاہ چلا آتا ہے۔ جو فلاح و ترقی کی راہ میں قدم سے قدم بڑھا رہا ہے۔ اتنے میں سلطان محمد قطب شاہ نظر آیا۔ پاکیزگی حیات کا گوہر آبدار۔ ساتھ ایک ملکہ ہے۔ حیات بخشی بیگم۔ دکن کی ہیروئن!

یہیں ایک آئینہ میں یہ بھی دیکھا کہ تاناشاہ کا عہد حکومت ہے۔ مغلوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا ہے۔ آٹھ مہینے ہو چکے ہیں، مگر قلعہ والے اپنی خودداری نہیں کھوتے۔ جان پر کھیلے بیٹھے ہیں۔ مگر سچ یہ ہے، جہاں اچھے ہیں وہاں بُرے بھی ہیں۔ ان جاں نثاروں میں دو چار گندم نما جو فروش بھی ہیں۔ جنہوں نے دشمنوں سے ساز باز کیا۔ چاہتے ہیں کہ وطن کو بیچ کے تن کو پالیں، من کو مار ڈالیں۔ مگر غداری نہیں چھپا کرتی۔ ہوتے ہوتے اس کی خبر دکن کے جانباز۔ عبدالرزاق لاری کو بھی ہوئی۔ وہ بھلا اس نمک حرامی کو کیسے برداشت کرتا۔ اسی وقت ان بدسگالوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ اور حکم دیا کہ ان کے لاشے پرے کو گھن پھینک دو، تاکہ غداروں کی موت سے عبرت زندہ ہو!

یہ جیسے دن کا قصہ ہے۔ رات ہوئی۔ جو بڑی تاریک تھی۔ اس وقت پاسی کچھ پہرے پر ہیں۔ کچھ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں کہ دس بجے۔ گیارہ بجے۔ بارہ بج گئے۔ سپاہی کو سپاہیوں کی سی باتیں جچتی ہیں۔ باتوں باتوں میں ایک نے کہا، "چلو، بدخواہوں کے لاشے دیکھیں؟ کہتے ہیں: رات کے بارہ بجے فرشتے آتے ہیں، تفتیش کر کے مارتے ہیں!

دوسرا:- جانا ہے تو ایک ایک جاؤ۔ اور دیکھو آج سب کام کے جانباز ہیں۔ تم جانتے ہو یہ وقت مردہ لاشوں کے بعض بد اعمال کے اٹھنے کا ہے۔ ہو کہ وہ تمہیں یوں جاتا دیکھے۔ اور کچھ او سمجھے۔

تیسرا:- ٹھیک ہے۔ ویسے بھی مرد ہو۔ تو مرد بنو۔ ڈر کو پھینک ڈالو۔

چوتھا:- جی، یہ لن ترانی رہنے دو۔ رات کے اس اندھیرے میں اکیلا کوئی نہیں جا سکتا۔

تیسرا:- کیا؟؟

دوسرا:- دیکھو بھئی، ہم یہ وہ نہیں جانتے۔ کچھ شرط بدو۔ اور یاروں کو سو نہیں پچاس نہیں۔ دس ہی روپے دلواؤ۔ ہم جاتے ہیں۔

چوتھا: - اچھا، ہو گئی گر ہماری بھی ایک شرط ہے۔ وہ سامنے مہندی کی باڑھ ہے۔ اس کی پتیاں توڑ لو۔ وہاں جاکے
نہیں پیسو۔ اور ہر ایک مردے کی چھنگلی پر مہندی لگا آؤ۔ تب بات ہے۔ دور سے جھانک آنے کی سند نہیں۔
پھر ہم جاکے دیکھیں گے۔

دوسرا: - منظور!

"دھر یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ اُدھر لاری بھیس بدل کر چھپا چھپا فوج کی موجودات لینے نکلا۔ یہاں پہنچا تو بد خوابوں کا ذکر سنا خیال
ہوا کہ کہیں غداری کی وبا عام تو نہیں ہوگئی۔ اس لئے ٹھٹک گیا۔ اور ایک درخت کی آڑ سے سارا ماجرا سن لیا تو اطمینان ہوا۔

جس سورما نے شرط بدی تھی اُس نے تلوار حمائل کی۔ پیش قبض سنبھالا۔ اور چلا۔ چل پہ چل۔ اس گھمبیر جھاڑی میں پہنچا۔ جہاں لاشے
تھے۔ وہاں اندھیرے کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا۔ بے شمار جھینگر بول رہے تھے۔ کبھی گیدڑ بولتے تو یہ سمجھتا کہ کوئی اس کی
دلیری پر واہ واہ کر رہا ہے۔ تڑاس بولتا تو خیال ہوتا کہ کوئی اس کی کامیابی پر ہنس رہا ہے۔ اور شہپر ڈکارتا تو سوچتا کہ کہیں ڈرپوک سمجھ
کے سردار لاری تو نہیں گھرک رہا!

خیر وہاں پہلے پتیاں رگڑیں۔ مہندی تیار کی۔ پھر لاشوں کے پاس آکے ایک مردے کی چھنگلی میں لگائی۔ دوسرے کے لگا رہا
تھا کہ تیسرے لاشے نے حرکت کی۔ سورما نے غور سے دیکھا۔ اور خاموش ہوگیا۔ دوسری دفعہ لاشہ نے حرکت کی تو سورما نے بگڑ کے کہا:
ٹھہر جا! تیسری دفعہ لاشے نے ہاتھ پھیلا دیا۔ سورما کو یہ بے صبری بری معلوم ہوئی۔ جھٹ پیش قبض نکالا۔ اور لاشے کے ہاتھ کو زمین
پر رکھ کے اس کی ہتھیلی میں پیش قبض اتار دیا۔ اس کے بعد مہندی بھی لگا دی۔ اور پیش قبض لگا کر چلتا ہوا۔ سورما کی بے جگری کا یہ وہ کارنامہ
تھا جسے اس وقت آسمان کی لاکھوں آنکھیں دیکھ رہی تھیں!

وہاں سے پلٹا تو کچھ دور پر رستہ میں ایک شخص چادر اوڑھے نظر آیا۔ جسے سورما نے ٹوکا۔ ساتھ ہی تلوار کا وار بھی کیا۔ مگر اجنبی نے
پینترا کاٹ کے وار خالی دیا۔ اور جلدی سے سورما کو گلے لگاتے ہوئے اس کا نام لیکر پکارا۔

سورما نے آواز پہچان کر کہا: ہائیں؟!

اجنبی: - ہاں:

سورما: - میں صرف مہندی

اجنبی: تم سرخرو ہوئے!

سورما: - کیسے؟

اجنبی: - میں وہیں تھا۔ تمہارے پہنچتے پہنچتے رستہ کاٹ کے وہاں آن پہنچا۔ ایک لاشے کو ہٹا کے اس کی جگہ لیٹ گیا۔ کہ دیکھوں
تم میں کتنا حوصلہ ہے؟!

یہ کہہ کر اجنبی نے چادر سے ہاتھ نکال کے دکھایا۔ خون بہہ رہا تھا۔ اسی ہاتھ میں سورما نے پیش قبض اتار دیا تھا۔ یہ جانباز لاری کا
ہاتھ تھا۔ جو مرتے مرتے بھی کہہ گیا کہ: "تا جان دارم نثار ابوالحسن خواہم نمود"!! **سید زبیر حسن** (عثمانیہ)

برہان پور پر اس نے ۱۵۹۳ء میں قبضہ جمالیا۔ اس کے بعد سلطنت احمد نگر پر اس کے جغرافی محل وقوع پر نظر کر کے حملہ ہوا۔ چاند بی بی پر زور اور مدبرانہ مدافعت کی روح رواں تھی لیکن اپنے ایک امیر کے ہاتھوں قتل ہو گئی اور میڈو ٹیلر کے مشہور رومان کی ہیروئن بنی۔

چاند سلطانہ ہمارے ضلع کے بعض دیہات میں اب تک عزت و احترام سے یاد کیجاتی ہے۔ ایک اہم واقعہ کی یادگار چیکل تھانے میں اب تک موجود ہے جو شہر اورنگ آباد سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے اس موضع میں ہر سال اس شریف ملکہ کے اعزاز میں دسہرے کے موقع پر سب سے پہلے ایک جھنڈا بلند کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسری رسمیں ادا ہوتی ہیں۔ اس کو دلفریب حسن و جمال کی دیوی کہتے ہیں کرامات اس سے منسوب کیجاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ جالنہ سے احمد نگر جا رہی تھی تو اثنائے راہ میں چیکل تھانہ سے متصل خیمہ زن ہوئی۔ علی الصبح وہ وہاں سے یکایک غائب ہو گئی اور احمد نگر میں پائی گئی۔ اس موضع کے قریب کی جگہ جو اس کی فرودگاہ تھی اب تک "سنگار باڑی" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ نام بھی اس کی دلفریبیوں کی طرف ایک نازک اشارہ ہے۔

چاند بی بی کے قتل کے بعد اکبر نے اپنا اقتدار احمد نگر میں نافذ کر دیا لیکن مدبر او سخت کوش وزیر ملک عنبر نے شکست نصیب خاندان کو مرتضیٰ کی بادشاہی کا اعلان کر کے از سر نو زندہ کیا اور خود وزیر اور نائب بنا۔

مرتضیٰ کی تاج پوشی کی رسم ملک عنبر نے پرینڈہ (ضلع عثمان آباد) میں ادا کی لیکن وہ دولت آباد واپس آیا اور تقریباً ۱۶۱۰ء میں شہر اورنگ آباد کی بنیاد ڈالی۔ دس سال کے عرصے میں یہ نیا پایہ تحت ایک آباد اور بارونق شہر بن گیا۔ گزیٹر کے بیان کے مطابق اس شہر کی آبادی ملک عنبر کے عروج کے زمانہ میں دو لاکھ کے قریب تھی۔

میں ان اسباب کا ٹھیک کھوج نہ لگا سکا اور نہ کسی تاریخ یا وقائع سے اس پر روشنی پڑتی ہے کہ ملک عنبر نے یہ جگہ کیوں انتخاب کی۔ حالانکہ یہ جگہ دولت آباد کے مقابلے میں کچھ محفوظ نہ تھی۔ دولت آباد اس کے قبضہ میں تھا۔ وہ گلزار ہو رہا تھا۔ اور خود بڑا فوجی صدر مقام تھا۔ موجودہ اورنگ آباد شہر بہت ہی ناہموار جگہ پر آباد ہے اور اس کا بہت بڑا حصہ نشیب میں ہے۔

قرین قیاس یہ ہے کہ ملک عنبر چاہتا تھا کہ وہ بیجاپور کی شان اور وجیانگر کے ویران شہر کی قدیم عظمت کے مقابلہ کا ایک شہر آباد کرے۔ گو وجیانگر ہندوستان کے نقشے سے محو ہو چکا تھا لیکن لوگوں کے دلوں میں اس کی یاد تازہ تھی۔

وافر مقدار میں آب رسانی کیلئے اس جگہ کا جغرافی محل وقوع بہت موزوں تھا اس کے شمال میں لاکن واڑا کا پہاڑی سلسلہ ہے اور جنوب میں ستارا کی پہاڑیاں۔ دونوں کے درمیان دس میل کی وادی ہے جس میں ایک دھارا بہتی ہے جسکو کھام ندی کہتے ہیں۔

یہ جگہ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے اس جدت آمیز طریقہ آب رسانی کے لئے بہت موزوں ثابت ہوئی جس نے اپنے بانی کے نام کو زندۂ دوام کر دیا۔

میں ملک عنبر کے گوناگون کارناموں سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میں صرف اس کے ان کارناموں کا مختصراً ذکر کروں گا جو اس نے اس شہر میں انجام دیئے ہیں۔ اس نے نوکھنڈہ محل تعمیر کرایا جو اس وقت ویران ہے اس میں پانچ زنانہ عمارتیں ایک دیوانِ عام۔ ایک دیوانِ خاص اور ایک مسجد تھی۔ اور اس کے ساتھ کئی باغ، حوض اور حمام بھی تھے۔

جامع مسجد اس کی زندگی میں کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے بجائے کتبہ الاضلاع ستون ہیں۔

چیتا خانہ۔ یہ ایک شاندار عمارت تھی جو ویران ہو چکی تھی۔ یہ عمارت اس نے شہر کے پنڈتوں اور عالموں کے جلسوں کے لئے تعمیر کرائی تھی۔ لیکن اس کے بعد اس مقدس عمارت کو روز بد دیکھنا نصیب ہوا۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں اس کو مسافر خانہ بنا دیا گیا تھا۔ اور بعد کو اس میں شاہی شکاری چیتے بھریاں رکھی گئی تھیں کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ وہ محبس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اسی میں شہر کی صفائی کا دفتر چند سال رہا۔ اب اس کی ترمیم ہو چکی ہے اور یہ ٹاؤن ہال کے کام میں استعمال ہو رہا ہے شہر کی موجودہ سڑک ایک بڑے سنگین دروازے سے گزرتی ہے جو بھڑکل کہلاتا ہے۔ جسکے معنی قدیم دکھنی زبان میں دروازہ کے ہیں۔

اس کے کارناموں میں سب سے زیادہ نمایاں کام جسکی بدولت اس کا نام زبان زد خاص و عام ہے اس کا طریقہ آب رسانی ہے جس کو اس نے شہر میں جاری کیا تھا۔ شہر سے پانچ میل کے فاصلہ پر ایک ندی سے ایک نہر لائی گئی جس میں نلکیوں کا سلسلہ چلایا گیا ہے۔ ان میں کچھ کے پختہ کھلے دریچے ہیں۔ قوت جاذبہ کے آسان طریقے سے یہ نہر آج تک شہر کی ضروریات کو پورا کر رہی ہے اس کی تکمیل دس سال کے عرصہ (۱۶۱۶ - ۱۶۲۶) میں ہوئی۔

ملک عنبر نسلاً حبشی تھا۔ اس کی پرورش ایک غلام کی حیثیت سے دربار بیجاپور میں ہوئی تھی بعد کو یہ احمد نگر کے نظام شاہی بادشاہ کی ملازمت میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ دکن کی تاریخ میں اسی طرح مشہور رہے جس طرح کہ شمالی ہند کی تاریخ میں ٹوڈرمل ہے۔

وہ بہت وسیع المشرب تھا۔ اس نے اپنے دوستوں کے انتخاب میں کبھی کوئی امتیاز روا نہیں رکھا۔ اس کے رفیقوں میں شیواجی کا باپ شاہ جی بھی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک عیسائی گرجا بھی تعمیر کرایا تھا۔ اسی سال کی طویل و پختہ عمر میں وہ فوت ہوا اس کا بیٹا فتح خان اس کا جانشین ہوا اس نے وقت کی موزونی کے لحاظ سے کوئی ترقی نہیں کی اور اس کو بھی نہ سنبھال سکا جو کچھ کہ اس کے باپ نے حاصل کیا تھا ۱۶۳۳ء میں فتح نگر مغلوں کے قبضے میں آگیا۔

اورنگ زیب نے صوبہ دار دکن کی حیثیت سے اس شہر کو اپنا مستقر بنایا اور ۱۶۵۳ء میں اورنگ آباد کے نام سے موسوم کیا۔

چار سال بعد وہ تخت دہلی پر اس وقت متمکن ہوا جب کہ ٹھیک دو سو سال بعد ایک عظیم الشان انقلاب ہندوستان میں رونما ہونے والا تھا۔

عہد مغلیہ کی عمارتوں میں سب سے زیادہ اہم مقبرہ ہے جسکو اعظم شہزادہ نے اپنی ماں کی یادگار میں تعمیر کرایا۔ (۱۶۵۰ - ۱۶۵۷)

اس کے لئے جو پورے سنگ مرمر آیا۔ ٹاورنیئر سیاح کا بیان ہے۔

"ایک مرتبہ سورت سے گولکنڈہ جاتے ہوئے راستے میں تین سو بیلوں پر سنگ مرمر لدی ہوئی تھیں۔ چھوٹی سی چھوٹی گاڑی کے کھینچنے کے لئے بھی بارہ بیل درکار تھے۔"

معمار کا نام عطاء اللہ تھا۔ ساڑھے چھ لاکھ روپے کی لاگت آئی۔ یہ عمارت مشہور تاج محل کے جواب میں تعمیر ہوئی تھی جو تقریباً اسی زمانہ میں تکمیل کو پہنچا تھا لیکن مقبرہ سے اس قدر جلد ویرانی اور خرابی کے آثار رونما ہونے لگے کہ باوجود بہت خوبصورت ہونے کے بھی وہ اپنے مدمقابل سے ہر طور کم رتبہ ہے۔

یہ مقبرہ ۵۰۰ × ۳۰۰ گز کے احاطے میں ایستادہ ہے۔ درگاہ بہت نزاکت دہ منظر کے (۲۰) مربع گز چبوترے پر ہے۔ یہی ان

چار میناروں کی بلندی بھی ہے جو چبوترے کے چاروں زاویوں پر واقع ہیں۔ قبر میں ہے اور ایک بلند محرابی محراب رکھتی ہے۔ اوپر چار مینار ہیں۔ ان چاروں میناروں کے متوازی چھوٹے چھوٹے گنبد کونوں پر ہیں۔ مرمریں جالی کے دریچے آگرہ کے دریچوں کی طرح نازک ہیں۔ آخر میں خوشنما سفید ابرقی مسالے کا ہاتھ پھیر اگیا ہے۔

سنہ ۱۶۸۲ء میں شہر پر دھاوا کرنے کے لئے مرہٹے ستارا کی پہاڑیوں کے قرب وجوار میں جمع ہوئے لیکن مغلوں کے ایک عظیم الشان لشکر کی آمد سن کر فرار ہو گئے۔ اس کے بعد کے سنین میں شہنشاہ عالمگیر کے حکم سے شہر پناہ تعمیر ہوئی جسکے ہر رخ پر ایک دروازہ تھا۔ شمالی رخ پر دہلی دروازہ تھا۔ اس زمانہ میں جنوب کے تمام مشہور شہروں میں اس نام کا اور اسی رخ پر ایک دروازہ تھا حتیٰ کہ پونہ میں پیشوا کے محل کے دروازہ کا نام بھی دہلی دروازہ تھا۔

سنہ ۱۶۹۲ء میں اورنگ زیب نے قلعہ ارک تعمیر کرایا۔ ارک کے معنی ترکی زبان میں قلعے کے ہیں۔ ارک میں اب مسجد قابل دید ہے۔ ہندوستان میں خوشنما ترین مناظر میں پن چکی ہے جسپر دکن اور اورنگ آباد کو فخر ہو سکتا ہے۔ یہاں شہنشاہ اورنگ زیب کے مرشد بابا شاہ مسافر آسودہ ہیں مسٹر گلیڈسٹن سالمن اسکے متعلق کہتے ہیں۔

"میں اس کو ان دلفریب باغوں میں شمار کرتا ہوں جو میں نے مشرق میں دیکھے ہیں۔ متقابلۃً چھوٹی سی جگہ میں وہ اپنے مکمل خاکے کی پوری دلکشی رکھتا ہے۔ اس سے ملحق چند نہایت دلچسپ، تاریخی اور مقدس عمارتیں بھی ہیں۔ اس کے حوض اپنی ترتیب کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔ حوض کے قریب جو شاندار ہال ہے وہ میرے دیکھے ہوئے ہندوستانی باغوں میں بے نظیر ہے۔ وہ پھول پتیوں سے ڈھکی ہوئی چھوٹی سی نشست گاہ جو مسجد کی طرف سب سے چھوٹے حوض کے قریب واقع ہے ایک حسن کار کے نقطۂ نظر سے مکمل ہے۔"

روضہ باغ۔ اس میں اورنگ زیب کے ایک استاد اسمٰعیل خان آسودہ ہیں۔ آج کل کوفوالی بنگلہ بنا ہوا ہے۔

اورنگ زیب کی وفات سنہ ۱۷۰۷ء میں ہوئی اس کے لڑکوں میں جنگ چھڑ گئی سنہ ۱۷۱۳ء میں نظام الملک حیدرآباد کے موجودہ حکمران خاندان کے بانی دکن کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۷۲۳ء میں وہ آصف جاہ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ دہلی کی سازشوں سے وہ اس قدر بیزار ہو گئے تھے کہ انھوں نے دہلی سے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور سنہ ۱۷۲۴ء میں اپنا پایہ تخت حیدرآباد منتقل کر دیا۔

وہ خاص اور قابل ذکر عمارتیں جو عالمگیر کی وفات کے بعد اور آصف جاہ کے زیر نگرانی تعمیر ہوئیں حسب ذیل ہیں۔

مسجد شاہ گنج جو سنہ ۱۷۲۰ء میں تعمیر ہوئی۔

بارہ دری عیوض خاں۔ عیوض خان آصف جاہ کی غیر حاضری میں نیابت کی خدمت انجام دیتے تھے۔ یہ بارہ دری انھوں نے تعمیر کرائی۔ اس سے متصل دمڑی محل تعمیر ہوا۔ یہ عمارتیں مزدوروں کی اجرت سے دمڑی دمڑی بچا کر بنائی گئی تھیں۔ بارہ دری میں آج کل صوبہ داری اور اوّل تعلقداری کے دفاتر ہیں۔

یہ شہر اپنے عروج کے زمانے میں تین میل شمال میں کھام ندی تک اور مشرق میں پانچ میل جیکل تھانے تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی آبادی جو دس بارہ لاکھ بھی جاتی تھی لیکن اس وقت جب کہ شہنشاہ اس کا دربار خاندان اور پورا لشکر اور اس کے عہدہ دار اور راجگان مع اپنے متوسلین کے یہاں قیام پذیر تھے تو کہا جاتا ہے کہ اس کی آبادی دس لاکھ کے قریب تھی۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ مغلوں کی وسیع و عریض سلطنت کی آمدنی اورنگ آباد پر خرچ ہوتی تھی لیکن آج یہ اپنی عظمت رفتہ کی ایک مٹی ہوئی یادگار ہے۔

جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے اس شہر پر تین شاندار دور گزرے ہیں۔ آصف جاہ نے اپنا زیادہ وقت [illegible] صرف نہیں کیا بلکہ وہ زیادہ تر دہلی میں رہے۔ عہد عالمگیر میں یہ شہر خاص طور پر فوجی اور سیاسی مرکز بنا رہا۔ اس کی حقیقی عظمت و شان کا دور اس کے بانی ملک عنبر کے عہد میں گزرا ہے اس وقت وہ علوم و فنون کا مرکز تھا مختلف طبقوں کے لوگ بہ امن و اطمینان ایک دوسرے کے دوش بدوش رہتے تھے۔ اس نے گرجا تعمیر کیا، مسجد بنائی۔ پنڈت کا مندر تعمیر کرایا [illegible] بنوایا [illegible] روایات کو برقرار رکھنے کے لئے کیا گیا۔

شہر اورنگ آباد اپنے اندر رواداری، مساوات، امن اور آزادی کی بہت خوش گوار روایات رکھتا ہے۔ اس مضمون کے اختتام پر میں اس عظیم الشان شہر کے باشندوں کی طرف ایک پیغام سنانے کی جرأت کرتا ہوں۔ وہ پیغام کیا ہے۔ ذات پات اور مذہب کے امتیازات کو مٹانا، شہر کی بہبودی کی خاطر ملک عنبر کی روایات کے شایان شان ترقی کرنے کی طرف بڑھنے کیلئے ایک دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھانا ہے۔

تمام مذہب کی ایک ہی تعلیم ہے۔ دہریت کی بھی تعلیم ہے کہ اس دنیا میں بنی آدم کے ساتھ کچھ نیکی کی جائے۔ عمر خیام کی ایک معنی خیز رباعی پر اس شہر کے بانی ملک عنبر کے احساسات کے لحاظ سے میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

در صومعہ و مدرسہ و دیر و کنشت — ترسندۂ دوزخ است و جویائے بہشت
آں کس کہ ز اسرار خدا باخبر است — زین تخم در اندرون دل ہیچ نہ کشت

غلام احمد خاں
(صوبہ دار)

"اس میں تاریخ اور افسانے اور واقعات اور تخیل کو اس خوبی سے سمویا ہے کہ قطب شاہی دور کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ بڑی بڑی تاریخوں سے وہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں جو اس چھوٹی سی کتاب میں ہیں اور نہ وہ کیفیت ہے جو اس میں ہے۔ اس وقت کی معاشرت کا رنگ بھی اس میں نظر آتا ہے اس زمانہ کے بعض بادشاہوں، شعراء اور مشاہیر کی تصویریں بھی ہیں جس سے کتاب کی دلکشی بڑھ گئی ہے۔" سیر گولکنڈہ کے متعلق مولانا عبدالحق صاحب بی۔ اے معتمد انجمن ترقی اردو کی رائے ہے۔ یہ کتاب صرف دو روپے میں سب رس کتاب گھر یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہے۔

خواتینِ دکن کی اردو خدمات

مندرجہ بالا عنوان پر ہماری ایک کتاب زیرِ ترتیب ہے، بڑا حصہ مکمل ہوگیا ہے، اس کے ابتدائی اوراق، "سب رس" کے ناظرین اور ناظرات کے ضیافتِ طبع کے لئے پیش ہیں۔ امید ہے کہ موجبِ دلچسپی ہونگے

ہاشمی

دکن میں اُردو زبان کی ترویج ساتویں صدی ہجری (بارہویں صدی عیسوی) میں ہوچکی تھی، اس کے بعد وہ بہت جلد بول چال کے درجہ سے گزر کر تحریری صورت میں بھی آگئی، پھر اس نے ترقی کے مدارج مسلسل طے کئے، تا آنکہ آج جامعۂ عثمانیہ کے ذریعہ اس کا معراج ہو رہا ہے۔

دکن میں اُردو کی ابتدائی اور اس کی ترقی کا مفصل تذکرہ "دکن میں اردو" کی تیسری اشاعت اور مدراس میں اردو میں قلمبند کردیا گیا ہے، اگرچہ دکن میں اردو کے چند صفحات پر خواتین کا تذکرہ بھی آیا ہے، لیکن اردو کی ترقی میں خواتینِ دکن نے جو حصہ لیا ہے، اس کا کوئی مفصل تذکرہ ابھی قلمبند نہیں ہوا ہے، اس مختصر سی کتاب کا مقصد یہ ہے کہ بعض ان خواتینِ دکن کے کارناموں کی وضاحت کیجائے، جنہوں نے "ہندوستانی" کی ترقی میں حصہ لیا ہے۔

"ہندوستانی" کی ترقی کے لئے دکنی خواتین نے جو خدمت گزاری کی ہے، اسکی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں:-

(۱) مولفین اور شعرائے اُردو کی سرپرستی وغیرہ

(۲) شعرگوئی (۳) نثر نگاری و انشاپردازی (۴) خطابت (۵) صحافت اور انجمنوں کے ذریعہ اُردو کی خدمت گزاری۔

ان ہی عنوانوں کے تحت صفحاتِ آیندہ میں خواتینِ دکن کی خدمات کا تذکرہ کیا جائیگا۔

مولفین و شعرائے اردو کی سرپرستی وغیرہ

خواتین کا مولفین اور شعرا کی سرپرستی کرنا، اور ان کے خدمات کا صلہ دیکر قدر دانی و ہمت افزائی کرنا، درحقیقت زبان کی خدمت گزاری میں داخل ہے، دنیا میں ہر جگہ ایسا ہوتا ہے، اور علما، شعرا فکرِ معاش سے مستغنی ہوکر علمی خدمت میں منہمک اور مصروف ہو جاتے ہیں۔

خواتینِ دکن نے بھی اردو مصنفین اور شعرا کی قدردانی کی ہے، اور اپنی سرپرستی سے نظم اور نثر میں کتابیں مرتب کرائی ہیں، اس خصوص میں ہم سب سے پہلے عادل شاہی ملکہ خدیجہ سلطان شہربانو کا نام پیش کرتے ہیں، جو سلطان قلی قطب شاہ کی پوتی، سلطان محمد کی برادرزادی، سلطان عبداللہ کی بہن تھی، اور سلطان محمد عادل شاہ (۱۰۳۰ھ تا ۱۰۶۱ھ) سے بیاہی گئی تھی اس کے دربار میں کئی نامور شعرا کو بار حاصل تھا، ان میں ملک خوشنود اور رستمی جیسے استادانِ سخن بھی شامل تھے، ملکہ کی سرپرستی سے ملک خوشنود نے کئی مثنویاں لکھیں، جن میں ہشت بہشت اور یوسف زلیخا قابلِ تذکرہ ہیں، رستمی نے دکنی رزمیہ مثنوی کا شئہ کا خاور نامہ

قلمبند کیا، اس کی وجہ سے ملکہ کا نام اس وقت تک باقی رہیگا جب تک کہ یہ مثنوی باقی ہے۔ سلطانہ شہر بانو کی علمی فیاضی کا تذکرہ خیابان نسواں [1] میں تفصیل سے کیا جا چکا ہے اس لئے یہیں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں دوسرا نام ماہ لقا بائی چندا کا پیش ہوسکتا ہے، اس کی علمی قدردانی شعرا مصنفین اور مورخین کے لئے بہت بڑی ہمت افزائی کا باعث تھی۔ چندا کا مفصل تذکرہ آگے آتا ہے۔

نورالنساء بیگم مرحومہ بنت نواب مختار الملک اول کا نام نامی اس سلسلہ میں لا نا ضروری ہے جن کی تعلیمی دلچسپی اور نسوانی ہمدردی کے باعث تذکرۂ جمیل ان کے اسم گرامی پر معنون ہوا ہے اور ان کی سرپرستی میں اس کی اشاعت ہوئی ہے۔

موجودہ دور میں۔ اس ذیل میں شہزادی ہر ہائنس درشہوار دردانہ بیگم صاحبہ اور شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ کا اسم گرامی پیش کیا جاسکتا ہے جن کے اسماء گرامی پر کئی کتابیں معنون ہوئی ہیں۔ مثلاً ہر ہائنس کے اسم گرامی پر راقم کی کتاب "خواتین عہد عثمانی" اور جہاں بانو بیگم نقوی کی پرواز خیال، اور شہزادی نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ کے اسم گرامی پر بسمل صاحب کی تصنیف صنف نازک اور راقم کی خیابان نسواں کو معنون ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔

اس عنوان میں صغرا بیگم ہمایوں مرزا کا نام بھی پیش ہوسکتا ہے، جو عموماً اپنی علمی ہمدردی اور خصوصاً اردو کی دلچسپی کے باعث اردو کے معاونین کے زمرہ میں شامل کیگئی ہیں۔

شعرگوئی اور نثرنگاری

اب ہم خواتین دکن کی شاعری اور نثر نگاری کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ مورخ اردو کیلئے یہ دشوار ہے کہ وہ ہر صدی کے خواتین کی ادبی خدمتوں کا تذکرہ کرسکے۔ اول تو اس لئے کہ پردہ کے باعث خواتین کے علمی جو ہر بھی پردۂ خفا میں رکھے گئے، اور آج بھی بعض گھرانوں میں اسی پر عمل ہے۔

دوسرے یہ کہ زمانۂ گزشتہ میں عام طور سے تعلیم نسواں کا رواج نہیں تھا۔ اور تعلیمی سہولتیں حاصل نہیں تھیں۔ اس لئے خواتین نے کچھ کام بھی کیا تو وہ پوشیدہ رہا۔

گو یہ صحیح ہے کہ بعض خاندانوں میں عورتوں کی تعلیم کا رواج تھا، مگر ان میں بھی زیادہ تر ابتدائی اور معمولی مذہبی تعلیم کا رواج تھا، اعلیٰ عربی اور فارسی تعلیم حاصل کرنا سب کا کام نہیں تھا۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہم کو گزشتہ صدیوں کی "اردو" خدمات کی تفصیل بیان کرنی دشوار ہے، جو کچھ صراحت اس موضوع کے تحت کی جاسکتی ہے وہ زیادہ تر چودھویں صدی ہجری سے متعلق ہوگی۔

چودھویں صدی ہجری کے قبل ہم جن شاعر خواتین کا تذکرہ کرسکتے ہیں وہ صرف چندا، شرف النساء اور فاطمہ ہیں۔

چندا۔

مہ لقا بائی چندا، ایک ماہر فن موسیقی اور شاہی طوائف تھی۔ گو آج کل کے چیشہ ور طوائفین سے اس کی حالت

---

[1] مولف کی دوسری تالیف جو عصمت بک ڈپو دہلی سے شایع ہوئی ہے۔

جداگانہ تھی، اس کی علمی قابلیت اور شعرا اور مصنفین کی قدردانی کے باعث آج تک اس کا نام زندہ ہے۔

سنہ ۱۱۸۰ھ میں تولد ہوئی اور سنہ ۱۲۳۰ھ میں اس کا انتقال ہوا، حیدرآباد میں کوہ مولا کے قریب مدفون ہے۔

وہ صاحب منصب و جاگیر تھی، اس لحاظ سے بلند پایہ اور اعلیٰ حیثیت رکھتی تھی، اس کے موسیقی کے جلسوں میں ارسطو جاہ، اور میر عالم (وزرا حیدرآباد) جیسی شخصیت کے اصحاب شریک ہوتے تھے، اور میر عالم نے تو ایک مثنوی اس کی مدح میں لکھی ہے، چندا کے پاس صرف پہرہ کے لئے پانچ سو سپاہی ملازم تھے، اس سے اس کی دولت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

چندا ایک باکمال ماہر موسیقی ہونے کے علاوہ وہ ایک نازک خیال اور بلند پرواز شاعرہ بھی تھی، اس کا دیوان سنہ ۱۲۱۳ھ میں ارسطو جاہ کے حکم سے مرتب ہوا ہے جس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، جو سرجان ملکم کو بطور تحفہ دیا گیا تھا۔

وہ شاعری کے ساتھ شعرا کی قدردان بھی تھی، اس کے پاس ہمیشہ شعر و شاعری کی گرم بازاری رہا کرتی، شعرا کی ہمت افزائی بندھانا اور حوصلہ افزائی بھی اس کا معمول تھا۔

چندا کو موسیقی، شاعری کے ساتھ تاریخ سے بھی شغف تھا، اسکی سرپرستی سے ایک تاریخ "دل افروز" کے نام سے لکھی گئی ہے، جو دکن کی معتبر تاریخوں میں شمار ہو سکتی ہے۔

بہرحال چندا نے نہ صرف اپنی شاعری کے ذریعہ بلکہ شعرا اور مصنفین کی سرپرستی کر کے بھی اردو زبان کی خدمت گزاری میں حصہ لیا ہے چندا کو شیر محمد خان ایمان سے تلمذ تھا۔

موضع "اڈیکمٹ" اسی کی جاگیر میں تھا، جہاں آج جامعۂ عثمانیہ کی پرشوکت اور شاندار عمارت تیار ہو رہی ہے،

چندا کا دیوان کوئی ضخیم دیوان نہیں ہے، اسکے کلام میں پاکیزگی اور لطافت کے ساتھ شعریت اور موسیقی بھی ہے جسکی وجہ سے دلآویزی پیدا ہو گئی ہے، مبتذل جذبات اور عامیانہ خیالات سے بھی اسکی شاعری پاک ہے، اس سے بھی اس کے بہترین اخلاق کا پتہ چلتا ہے،

"حیات ماہ لقا بائی" کے نام سے اس کی ایک سوانح عمری بھی غلام صمدانی خاں گوہر نے شایع کی ہے، یورپ میں دکھنی مخطوطات" "دکن میں اردو" اور "مرقع سخن" جلد اول میں اس کے حالات موجود ہیں،

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ جسطرح اس کی جاگیر "اڈیکمٹ" تعلیمی مرکز بن رہا ہے اسی طرح اسکی پروردہ لڑکی "حسن لقا بائی" کا باغ بھی زنانی مدرسہ[1] کے لئے منتخب ہوا ہے۔

چندا کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

قتل پر کس کے آج ہوتی ہے　　توسن حسن پہ سوار شراب

کب تک رہوں حجاب میں محروم وصل سے　　جی میں ہے کیجے پیار سے بوس و کنار محبوب

---

[1] نامپلی ہائی اسکول۔

رخصت بوسہ دیا پان چھپا کر ظالم   نہیں قسمت میں مگر تھا یہ حجاب یاقوت

ساقی دے مجھ کو جام مے ارغوان بھر   افسردہ دل ہیں آئے جو شاہی جان بھر

بنایا یار کی صورت کو وہ نقاش تقدیر   کھنچے نقشہ نہ ایسا مانی و بہزاد سے ہرگز

مری نازک مزاجی کی خبر رکھتا نہیں ہرگز   وہ سنگیں دل ہیں ممکن کسی کا ہو کبھی عاشق

عمر بھر یوں ہی رہے حسن کا چند جلوہ   آرزو رکھتے ہیں یہ چند گرار سے ہم

وفا کے ہاتھ سے اپنے کمال عاجز ہیں   جفا تو انکی نہیں معلوم پیشتر ہم کو

چشم کا فر بھی ہے اور غمزہ خونخوار بھی ہے   تن کو بس سیاہی کے یہ تو ابھی ہے

سو جان سے ہوئی وہ تصدق مرے مولا   چندا کی جو کوئین ہیں امداد کرو گے

کیا ہے ضبط اس پردہ نشیں کے عشق میں یعنی   صدائے آہ ناممکن ہے دل سے تا گوش آئے

شرف النساء — شرف النساء کے متعلق ہمیں کوئی معلومات حاصل نہیں ہیں، ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ اسی زمانہ (تیرھویں صدی ہجری) کی شاعرہ تھی۔ اس کا ایک مرثیہ ہمیں دستیاب ہوا ہے جس کے بعض شعر ملاحظہ ہوں۔

دسیا چاند غم کا گگن بیچ حسین   پڑیا زلزلہ سب زمین میں حسین

رسالت کے گلشن کا منہ رچند   چھپا کر گئے ہے رن میں حسین

کیا گلشن نے نیلی قبا تن اوپر   دیکھیا جب بکیلا چمن میں حسین[1]

فاطمہ — فاطمہ بھی اسی زمانہ کی مرثیہ گو ہے۔ اس کا ایک مرثیہ ہمیں ملا ہے افسوس ہے کہ اس کے متعلق بھی کوئی تفصیلی صراحت نہیں کی جاسکتی۔ مرثیہ کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

کیوں کربلا میں آج حسین علی گئے   مظلوم کربلا حرم کو علی کے زن گئے

خنجر جفا کا حلق پیاسے پہ گئے   اطفال کو کر یتیم نبی کے جوان گئے

کن کے گلے پہ ظالم سوں خنجر پھرا دیئے   حسرت سے ہاتھ مارتے خیر الانام گئے

نادے کو بیر کو کیا ظلم بے رحم   نعرا و راغ سوں مار کر خیر النسا گئے

کھینچتے عرش رسول سوں گریبان فاطمہ   پیاسا ہو آج جنگ سوں شہ دیں ہیں گئے

قاسم حسن پہ ظلم ہوا کربلا منے   گرنے میں یاد جھ کو دولن کربلا منے

کیوں رن میں خنجر اشقیا وان تن کربلا منے   افسوس آہ مار کو قاسم بن گئے

---

[1] خیابان نسواں مولفہ راقم میں پورا مرثیہ نقل کیا گیا ہے۔

محشر میں فاطمہ کہنے والی ہے فاطمہ | پھر جام ہات کو پلادیں گے فاطمہ
کر فضل سون اس کو چھڑاویں گے فاطمہ | مظلوم فاطمہ کے حسین علی گئے

(از بیاض کتب خانہ مولوی صفی الدین مرحوم)

افسوس ہے کہ تیرہویں صدی ہجری کے دیگر کسی شاعر خاتون کا تعارف کرانے سے ہم، دست معذور ہیں۔ ممکن ہے کبھی اس میں اضافہ ہوسکے۔ اس کے بعد چودھویں صدی کے شعراء نثر نگار خواتین کا تذکرہ کیا جائیگا سہولت کے مد نظر ان کی تقسیم کی گئی ہے، دور محبوبی، دور عثمانی کے تحت ان کو متعارف کیا گیا ہے فقط

نصیر الدین ہاشمی

اورنگ زیب اور تاناشاہ

"اچھا تو نماز ہو رہی ہے!"

تاناشاہ نے کہا اور ساتھ ہی اس کا چہرہ غصے سے تمتما گیا۔

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ مغل ہمارے نشانہ بازوں کی اتنی تحقیر کریں گے! قلعہ کے اس قدر قریب اور ہمارے تیر و تفنگ کی زد میں کھڑے ہو کر نماز جماعت ادا کرنا مصلحت اور دور اندیشی سے یقیناً بعید ہے! کیا اورنگ زیب جیسا دور اندیش اور ہوشیار بادشاہ بھی غلطی کرسکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں یا یہ کہ تحقیر ہے دیکھنا ہے کون ہمارا اچھا نشانہ باز؟"

اورنگ زیب کئی مہینوں سے گولکنڈہ کا محاصرہ کئے ہوئے ہے مغل فوجیں چاروں طرف سے ایک مہیب سمندر کی پر جوش موجوں کی طرح قلعہ کی فصیلوں سے آ کر ٹکراتی ہیں۔ اور ہر دفعہ دکنی سپاہی پہاڑوں کی چٹانیں بن کر انہیں پیچھے ہٹا دیتے ہیں۔ اس وقت آفتاب کی تمازت میں خاصی کمی ہوگئی ہے اور مغلیہ لشکر اپنی پوری قوت کے ساتھ حملوں پر حملے کئے جا رہا ہے۔ ان صفوں کے ذرا پیچھے دو تین ہموار قطاریں نظر آتی ہیں کیونکہ اورنگ زیب اور اس کے کئی ایک مصاحب ابھی ابھی نماز کیلئے صف بستہ کھڑے ہیں۔ چند لمحے گذرنے نہیں پاتے ہیں کہ امام یکایک تڑپ کر آگے کی طرف گر پڑتا ہے۔

"خوب! شاباش!! امام رکھ لیا۔ دیکھنا صف میں سے ایک اور شخص امامت کیلئے آگے بڑھ رہا ہے۔ ہاں چھوڑنا نہیں۔ کوئی امام نہ بچے۔ اس کو کہتے ہیں انتقام تحقیر!!"

شاہی حکم بجلی بن کر دوسرے امام پر گرتا ہے اور وہ بھی دکنی گلنداز کا نشانہ ہو جاتا ہے

دو تین پیش اماموں کے یکے بعد دیگرے اس طرح نذر اجل ہو جانے کے بعد امامت کیلئے صف میں سے آگے بڑھنا کسی معمولی دل و دماغ والے کا کام نہیں! اس سرے سے اس سرے تک پس و پیش کا ایک عجیب عالم چھا جاتا ہے۔ لیکن ابھی چند لمحے بھی گذرنے نہیں پاتے ہیں کہ خود اورنگ زیب امامت کے لئے بڑھتا نظر آتا ہے اور اب گولکنڈہ کا شاہی نشانہ باز بندوق خالی کرنے ہی کو ہے کہ تاناشاہ دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

"ظالم! کیا ایک بادشاہ کو بھی نشانہ بنائے گا؟ دکھائی نہیں دیتا کہ خود اورنگ زیب اس وقت امام ہے!!"

سید محی الدین قادری زور

حیدرآباد اور دیہی تنظیم

ہر ملک اپنی آب و ہوا، موسمی خصوصیات، قدرتی حالات اور جغرافی ماحول کے مطابق اپنی آبادی کی گذر اوقات کے لئے آمدنی حاصل کرنے کے چند شعبوں کا انتخاب کر لیتا ہے۔ ان مختلف شعبوں میں زراعت سب سے اہم ہے کیونکہ اس میں نہ صرف پودے لگا کر زرعی پیداوار حاصل کرنا شامل ہے بلکہ فصلوں کو بیماریوں اور وباؤں سے بچانے کی تدبیریں، زرعی پیداوار کی نکاسی کا انتظام، مویشیوں کی غور و پرداخت، اچھی نسلیں پیدا کرنا، زمین کے مختصر ٹکڑوں سے زائد پیداوار حاصل کرنے کی کوشش بھی اسی کے دائرہ میں داخل ہے۔ اور دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ اسی شعبہ سے آمدنی حاصل کر رہا ہے۔

۱۷۶۵ء کے صنعتی انقلاب سے پہلے ہر ملک میں زراعت کی بڑی اہمیت تھی، مگر انقلاب کے بعد حالات بدل گئے۔ بھاپ پر انسانی اقتدار اور فنی کلوں کی ایجاد نے پیدائش دولت کو آسان کر دیا۔ دولت کی کثیر تعداد قلیل وقت میں انسان کی معمولی کوشش سے پیدا ہونے لگی۔ اس نئے طریقہ نے کس طرح قدیم مذہبی رجحانات، انفرادی آزادی، خانگی زندگی، گھریلو صنعت کو مٹایا، چھوٹے دستکاروں اور غریب صناعوں کا خاتمہ کیا گیا؟ مفلس کو مفلس ترین اور دولت مند کو دولت مند ترین بنانے میں مدد دی، یا مکانی قوت جس کی ابتدا انسان کے ایک تابع غلام کی حیثیت سے ہوئی اس نے کس طرح انسان کو اپنا غلام بنا لیا ہمارے موضوع سے خارج از بحث ہیں، مگر انقلاب کا ایک اہم نتیجہ یہ ہوا کہ زراعت کو غیر اہم اور صنعت و حرفت کو اہم سمجھا جانے لگا، ہر ملک یہ سمجھنے لگا کہ ہمارا کام صنعتی اشیا پیدا کرنا ہے، اور زرعی پیداوار ہمارے لئے دوسرے مہیا کرتے ہیں۔ اگر صرف چند ممالک اس اصول کو اختیار کرتے تو کچھ بے جا نہ تھا بلکہ تجارت خارجہ کے نظریہ کے مطابق کہ ہر ملک وہی چیزیں پیدا کرے جس کے لئے وہ موزون ترین ہو، اور آپس میں مبادلہ کر کے اپنی ضروریات پوری کر لے بہت اچھا تھا کیونکہ اس کی بدولت ہر قوم دوسری قوموں کے قدرتی عطیات اور کسبی کمالات سے پوری پوری طرح مستفید ہو سکتی تھی۔ اور مجموعی حیثیت سے دنیا میں کثیر دولت پیدا ہو سکتی اور دنیا کی خوشحالی میں اضافہ ہو سکتا تھا، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا، بلکہ ہر ملک نے اس اصول کو اختیار کرنے کی کوشش کی حالانکہ یہ ان ملکوں کا رجحان تھا جن کے یہاں قدرتی حالات، موسمی خصوصیات اور زمین کی ساخت کے اعتبار سے زراعت کے کچھ اچھے امکانات نہ تھے مگر ہوا یہ کہ ہر ملک نے اس رجحان کو ایک کلیہ بنا لیا اور صنعتی دوڑ میں ایک عالمی مسابقت شروع ہو گئی۔

زرعی معاشیات میں جنگ عظیم سے پہلے جو ادب کی قلت نظر آتی ہے اس کی وجہ یہی عالمی رجحان تھا کہ جنگ عظیم کے تلخ تجربوں نے فاتحین اور مفتوحین پر اس امر کا انکشاف کر دیا کہ اگر جنگ طویل ہو جائے، ملک کا محاصرہ کر لیا جائے، سامان رسد و رفت کو مسدود کر دیا جائے تو ملک میں زہریلے بموں، مشین گنوں، خطرناک توپوں، ہوائی جہازوں، غوطہ خور کشتیوں اور جنگی جہازوں کی کثرت کے باوجود لڑائی جاری رکھنے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں کیونکہ جنگ کا انحصار آلات حرب سے زیادہ اشیائے خوراک پر ہے اور جب ان ہی کی قلت ہو جائے تو نہ لڑنے والے لڑ سکتے ہیں نہ آلات حرب کام آ سکتے ہیں۔ چنانچہ جنگ کے بعد یہ اصول تسلیم کر لیا گیا تھا کہ قوم کی مدافعت اور ملک کی حفاظت کے لئے زراعت ایک ناگزیر شئے ہے، اب دنیا نے زراعت کی طرف توجہ شروع کی، زرعی پروگرام بنائے گئے، زراعت کو ترقی دینے اور زرعی آبادی کو بڑھانے کی کوشش شروع ہوئی اور حکومتوں نے اس سلسلے میں بے دریغ روپیہ خرچ کرنا شروع کیا اور زراعت کی ہر طرح سے مدد کی جانے لگی۔

ہندوستان اسکے صوبے اور ریاستوں میں زراعت کا حال بالکل ہی مختلف ہے، اگر دوسرے ممالک میں زرعی آبادی کی قلت ہے تو ہمارے یہاں زرعی آبادی کی کثرت ہی نے زراعت کی حالت کو خراب کر رکھا ہے، اگر آج یہاں دیہی آبادی کم ہے تو ہمارے یہاں شہری آبادی کی کمی ہے۔ دراصل ہندوستان کلکتہ، بمبئی، دہلی یا حیدرآباد جیسے عظیم الشان شہروں، ان کی سربفلک عمارتوں خوشنما اور وضع دار بنگلوں چوڑی سمنٹ دار سڑکوں، جگمگاتی ہوئی دوکانوں کا نام نہیں ہے۔ ہندوستان نام ہے اس کثیر آبادی کا جو کچے جھونپڑوں یا پھوس کے ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں رہتی ہے۔ محنت مشقت سے جسکے چہرے زرد ہیں، گال پچکے ہوئے آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں، بدن پر جھریاں ہیں، جسکی اکثر غذائیں ایسی ہیں جن میں غذائیت کا جز نہیں، جسکے بدن کا اکثر حصہ شرمندہ لباس نہیں، جسکا ماحول ملیریا، انفلوئنزا، ہیضہ، پلیگ، طاعون، دق، سل اور اسی طرح کے دیگر متعدی امراض کے جراثیم سے پر ہے۔ جو دنیا کے لئے غذا مہیا کرتا ہے مگر اپنی غذا کے لئے دوسروں کا محتاج ہے، جو ہمارے شہروں اور گھروں کی رونق کا باعث ہے مگر خود اس کے گھر اجڑے ہوئے اور بے چراغ ہیں، وہ محنت کرتا ہے تو اس کی محنت کے پھل دوسرے کھاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ زراعت کی ان خرابیوں کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا ہر جگہ زراعت میں وہی خرابیاں ہیں جو ہمارے یہاں ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملکی حالات نے مجموعی حیثیت سے زراعت کی حالت کو خراب کر رکھا ہے، اور قدرت، سماج، کاشتکار اور حکومت ہر ایک اپنی جگہ پر اس کی تباہی کا ذمہ دار ہے۔

قدرتی اسباب میں سیلاب، خشک سالی، بارش کی غیر مساوی تقسیم، موسموں کی غیر یقینی حالت، کہر، اولا، پالا اور ٹڈی دل شامل ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ان میں سے بعض اسباب کو دور کیا جا سکتا ہے۔ گویا انسان اگر قدرت کے قابو سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا تو کم از کم اسکا اتنا مطیع اور فرمانبردار بھی نہیں دکھتا جتنا کہ وہ آج نظر آ رہا ہے۔

مجموعی حیثیت سے سماج پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس نے زراعت کو معزز پیشہ نہ سمجھا، دیہاتیوں کے متعلق اچھی رائے قائم نہ کی، مصلحین قوم اور محبان وطن کا فرض تھا کہ وہ اس طرف توجہ کرتے مگر انہوں نے دیہی آبادی کو چھوڑ کر شہری آبادی کو جسکی ہمارے ملک میں قلت ہے اپنی اصلاح کا مرکز بنایا۔ انھوں نے کارخانے کے مزدوروں کیلئے جنکی تعداد ۲۰ سے ۳۰ لاکھ کے درمیان ہے قوانین بنانے اور ان کیلئے سہولتیں بہم پہونچانے کی جانب اپنی توجہ مبذول کی اور ۲۵ کروڑ آبادی سے تغافل برتا۔ اس خصوص میں سب سے زیادہ مورد الزام وہ تعلیم یافتہ اور صاحب حیثیت افراد ہیں جنہوں نے دیہات میں جنم لینے اور پرورش پانے کے بعد دیہات سے لاپروائی اختیار کی۔ یہ اپنی واقفیت اور قدیم اقتدار کی بنا پر بہت کچھ کر سکتے تھے، مگر انھوں نے بھی اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے کیلئے شہروں کو ہی انتخاب کیا۔ ایسی صورت میں یہ کہنا بیجا نہیں کہ ان میں صداقت اور خلوص کا نام نہ تھا بلکہ وہ شہرت اور تشہیر کے خواہاں تھے وہ خدمت خلق کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ دنیا پر اپنی قابلیت و عظمت کا سکہ بٹھانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ دور افتادہ گاؤں میں یہ ذرائع کہاں، ان کے لئے تو بڑے بڑے شہری مرکزوں میں جہاں جذبۂ شہرت کو تسکین دینے کیلئے مختلف قسم کے ذرائع موجود ہیں۔ ذات پات کے طریق کی ذمہ داری بھی سماج ہی کے سر ہے، اس نے کسی کو ادنیٰ اور کسی کو اعلیٰ بنایا۔ سماج نے مذہب کی آڑ لیکر چھوت چھات کی بنا ڈالی، اور ان کو وہ اہمیت دی کہ گویا ان ہی کی ادائی مذہب ہے۔

زرعی مذہب کی سب سے پوشیدہ کڑی خود کاشتکار ہے کیونکہ زراعت کی بہتری اور بدتری کا انحصار اسی پر ہے۔ وہ دنیا کے حالات سے بے خبر، ان پڑھ، مفلس، قرض دار، فضول خرچ، قدامت پرست اور قسمت پرست ہے۔ کسان کے لئے منظم قابلیت کی بڑی ضرورت ہے، اکثر و بیشتر کاشتکاروں کو پیداوار کی کمی سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا ان کی خراب تنظیم سے ہوتا ہے۔ وہ مفلس و قرضدار ہے، اگر تقاریب، تہواروں اور رسومات پر خوب خرچ کرتا ہے۔ اس کے پاس آمدنی و خرچ کا کوئی حساب نہیں، اس کو نہیں معلوم کہ اس کو کیا آمدنی ہو رہی ہے اور اس کے اخراجات کیا ہیں۔ ناواقفیت کی بنا پر وہ اچھی قسم کی فصلیں پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا، کم سمجھی کی بنا پر عارضی نفع کی خاطر وہ اچھی فصلوں میں خراب فصلوں کی آمیزش کر دیتا ہے۔ قدامت پرستی اور قسمت پرستی اس کو نئے طریقوں کے اختیار کرنے سے روکتی ہے۔

حکومت جس کا کام رعایا کی فلاح و بہبود کے ہر ممکنہ ذرائع اختیار کرنا ہے، اس نے بھی اس عالمی بحران کے تحت جس کا ذکر کیا جا چکا ہے اس طرف سے لاپروائی برتی، اور مقامی حالات کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ خود اہل ملک نے بھی حکومت کو اس جانب متوجہ کرنے کی کوشش نہ کی۔ اس وقت ہندوستان کے قائدین اس بات پر زور دیتے تھے کہ چونکہ ہندوستان کی قدیم صنعتوں کو ختم کر دیا گیا ہے اس لئے دوبارہ ان کو زندہ کیا جائے۔ انڈین نیشنل کانگریس جیسے قومی ادارے نے ۱۹۰۵ء میں صنعت و حرفت کی ترقی و احیا کے لئے ایک الگ شاخ قائم کی، مگر زراعت کی جانب ۱۹۳۲ء سے پہلے توجہ نہ کر سکی۔

جنگ میں حکومت برطانیہ کے تلخ تجربات سے حکومت ہند نے بھی فائدہ اٹھایا۔ اور ۱۹۱۹ء کی اصلاحات میں وزیر زراعت کا عہدہ قائم ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں زرعی کمیشن مقرر ہوا، جس کی رپورٹ پر غور کرنے کیلئے شملہ میں صوبوں کے وزرا اور نظمائے زراعت، اور امداد باہمی کے رجسٹراروں کی کانفرنس منعقد ہوئی، ۱۹۲۹ء میں شاہی زرعی تحقیقاتی کونسل مستقل اراکین کے ساتھ وجود میں آئی۔

دیہی تنظیم یا دیہات سدھار بالکل حالیہ اصطلاح ہے، ملک میں ۱۹۳۱ء سے پہلے اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا۔ جب کہ ایک جانب کانگریس نے دیہات سدھار کو اپنے نظام نامے میں شامل کیا تھا، دوسری جانب عالمی کساد بازاری نے زرعی پیداواروں کی قیمتیں سطح سے بہت نیچے قرار دی تھیں، موازنوں میں خسارہ آ رہا تھا اور زرعی آبادی کو سخت معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ۱۹۳۳-۳۴ء کے موازنہ میں ایک کروڑ کی رقم مرکزی حکومت نے دیہات سدھار کیلئے منظور کی۔

ممالک محروسہ میں زراعت کے کم و بیش وہی حالات ہیں جو برطانوی ہند یا ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں ہیں۔ یہاں ۲۱۲۲۲ دیہات ہیں۔ آبادی کا ۱۱ فیصد شہروں میں اور ۸۹ فیصد دیہات میں رہتا ہے گو یہاں زراعت کے نشو و نما کیلئے مختلف تدابیر پہلے بھی اختیار کی جاتی تھیں مثلاً قحط کے زمانہ میں کاشتکاروں کی امداد، یا خشک مہینوں پر مالگزاری میں معافیاں، یا زرعی آبادی کی بہبودی کیلئے ۱۹۱۱ء میں قانون امداد باہمی کا نفاذ وغیرہ، مگر اسی عالمی بحران کے تحت زراعت کی جانب کوئی خاص توجہ نہ تھی۔ مگر حالات کے بدلتے ہی یہاں بھی تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ گو زراعت کا محکمہ ۱۹۱۲ء سے قائم ہے مگر ابتدا میں اس کا خاص مقصد "نگرانی" روئی کو تباہی سے بچانا تھا۔ مگر ۱۹۲۹ء میں اس کا مقصد ملک کی عام زراعت کی ترقی قرار پایا۔ اس نے تحقیق، تجربے اور تشہیر سے اپنے مقصد کو پورا کرنا شروع کیا۔ تحقیق کا مقصد یہ تھا کہ معلوم ہو سکے کہ کونسی فصلیں اچھی ہیں یا ان کو کس طرح اچھا بنایا جا سکتا ہے، چنانچہ اس وقت تک متعدد مقامی اعلیٰ قسم

کی قسمیں دریافت ہو چکی ہیں۔ تحقیقاتی نتائج جانچے اور نئے آلات یا نئے طریقوں سے زمین کی پیداوار بڑھانے کے لئے مزرعے قائم کئے گئے تاکہ عملی اور معاشی حیثیت سے نتائج کا امتحان ہو سکے۔ کامیاب تجربوں کو کاشتکاروں کے سامنے پیش کرنے کے لئے تشہیر کی ضرورت پیش آئی تاکہ کاشتکار جن کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا ہے اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اسوقت محکمۂ زراعت کے تحت دس مزرعے ہیں، جہاں یہ کام ہو رہے ہیں، فصلوں کی بیماریوں کا علاج، مویشیوں کی بیماریوں، اور ان کی غور و پرداخت کی جانب بھی توجہ ہو رہی ہے۔ مرغیوں کے سلسلہ میں بھی کافی تجربات ہو چکے ہیں۔ دیہی تنظیم کے سلسلے میں ممالک محروسہ میں دیہی تنظیم کا ایک مرکزی بورڈ قائم ہے، جس میں باب حکومت کے چار اراکین، مالگذاری، اور صنعت و حرفت کے معتمدین، زائد معتمد مالگزاری، چاروں صوبہ دار، محکمہ ہائے تعلیمات، صحت عامہ و طبابت، زراعت، صنعت و حرفت، معلومات عامہ کے نظماء، امداد باہمی کے رجسٹرار، مارکیٹنگ آفیسر اور سنٹرل کوآپریٹیو یونین کے نمائندے شامل ہیں۔ مرکزی بورڈ ایک عام خاکہ تیار کرتی ہے اور اسکو عملی جامہ پہنانے کے لئے اضلاع اور تعلقوں میں مقامی بورڈ قائم ہیں۔ جن میں سرکاری اراکین بھی شامل ہوتے ہیں۔ ٹیچر و دیہی تنظیم کا سب سے اہم مرکز ہے، زراعت کی ترقی و اصلاح، مویشیوں کی اصلاح، اور معاشرتی اصلاح نظام العمل کے اہم جزو ہیں۔ زراعت کی ترقی میں دوسرا قدم جو اٹھایا گیا وہ مختلف قوانین کا سلسلہ تھا۔ ۱۹۱۳ء کے قانون امداد باہمی جسکی رو سے زرعی اور غیر زرعی انجمن قائم ہوئیں، تعلقہ داری اور مرکزی بنک، اور صدر جمعیت اتحاد کا قیام عمل میں آیا اس کا ذکر کیا جا چکا ہے ۱۹۲۳ء سے موازنہ میں امداد قحط اور محفوظہ قحط کی مدات داخل ہوئیں اور تقریباً ۲۰، ۲۲ لاکھ سالانہ کی رقم قحطوں یا امدادی اور تعمیری کاموں کیلئے مخصوص کی جانے لگی ۱۹۳۱ء میں قانون زرعی بازارات کا نفاذ ہوا۔ اسکا مقصد باضابطہ منڈیوں کا قیام تھا تاکہ کاشتکاروں کو غیر منظم منڈیوں کے نقصانات سے محفوظ رکھا جائے۔ باضابطہ منڈیوں میں نذر یا خیراتی نام سے پیداوار وصول کرنے کی ممانعت کی گئی۔ صحیح اوزان کو رائج کیا گیا، تولنے والوں کے لئے اجازت نامہ ضروری قرار پایا، خریداروں کو کاروبار کی جملہ کارروائی درج کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اس قانون کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ برطانوی ہند کے قانون کی طرح صرف روئی کیلئے مخصوص نہیں ہے بلکہ اسکا اطلاق تمام زرعی پیداوار پر ہوتا ہے۔

زراعت کی پستی کا ایک بڑا سبب قرضداری ہے، کاشتکار مفلس ہے اور اسکو اپنے روزمرہ کی ضروریات مویشی، آلات، تخم خریدنے یا کلیائی اور کٹائی کی اجرت ادا کرنے کیلئے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے، یہ رقم وہ ساہوکار سے لیتا ہے، ساہوکار نہ صرف گراں شرح سود اور سود مرکب وصول کرتا ہے بلکہ دوسری مختلف ترکیبوں سے بھی کاشتکار کو لوٹنے کی فکر کرتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کاشتکار کو قرضہ کا بار ابھرنے نہیں دیتا۔ مسٹر ایس ایم بھروچہ جنہوں نے ممالک محروسہ میں زرعی قرضداری کی تحقیقات کی تھی ممالک محروسہ کے زرعی قرضہ کا اندازہ ۶۴½ کروڑ سے کچھ زائد بتایا ہے۔ آپ نے ۳۲۱ مواضعات کی تحقیقات کے بعد زرعی آبادی کے قرضہ کا اوسط ۳۰ روپیہ فی کس بتایا ہے مجھے حال میں ایک موضع کی تحقیق کے سلسلہ میں معلوم ہوا کہ اسکے زرعی قرضہ کی تعداد ایک لاکھ ۳۵ ہزار ہے جبکہ اسکی آبادی ۲۶۵۲ ہے۔ ۵۰ روپیہ فی کس کل آبادی پر اور ۷۰ روپیہ فی کس زرعی آبادی پر قرضہ کا اوسط آتا ہے۔ مسٹر بھروچہ نے بتایا ہے کہ دس لاکھ ایکڑ مزروعہ زمین میں سے ۳ لاکھ ایکڑ مکفول ہو چکی ہے اور ایک لاکھ ۶۰ ہزار ایکڑ کاشتکاروں کی ملکیت سے نکل کر قرض خواہوں کے قبضہ میں جا چکی ہے۔ تصویر کا یہی ایک بھیانک اور تاریک رخ تھا جس نے ان مختلف خرابیوں کے انسداد کیلئے حکومت کو فوری اقدام پر مجبور کیا اور

معالحت قرضہ، قرض دہندگان، اور انتقال اراضی کے قوانین دستور العمل نافذ ہوئے، اگرچہ ان میں بعض خامیاں ہیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان سے کاشتکاروں کو بڑا فائدہ پہونچنے کی امید ہے، یہ ڈوبتے ہوں کیلئے سہارا، اور جو ڈوبے نہیں ہیں ان کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہیں۔

دیہی تنظیم کا کام جو ریاستوں یا صوبہ داری حکومتوں کے یہاں بہت ہی شاندار نظر آتا ہے فی الحقیقت اس قدر شاندار نہیں ہے۔ ہندوستان جہاں تقریباً، لاکھ گاؤں ہوں وہاں چند سو دیہی مرکزوں کی وہی مثال ہے جیسے سمندر میں چند قطرے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آخر یہ کام کس طرح ہو، کیا مروجہ طریقہ کو جاری رکھا جائے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ڈیڑھ دو سو برس بعد ہم وہاں پہونچیں گے جہاں دنیا آج ہے، گویا دنیا سے دو صدی پیچھے رہنا ہماری قسمت میں لکھا ہے۔ نہ کسی حکومت سے یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ ہر گاؤں کو دیہی تنظیم کا مرکز بنادے، اور دس پانچ سال میں ملک کی حالت بدل دے، اس طرح یہ سانپ کے منہ کی چھچھوندر ہوگی جسکو نہ نکالا جاسکتا ہے اور نہ اگلا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسا پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے جسکا کوئی حل ہی موجود نہ ہو، حل موجود ہے مگر اس میں مشکلات ہیں، اور ان پر غالب آنا ہمارا کام ہے، میرا خیال ہے کہ یہ مسئلہ حکومت، سماج، مصلحین معاشرت، محبان وطن اور سب سے زیادہ اور سب سے اہم تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اشتراک سے طے ہوسکتا ہے۔

یہ سمجھنا کہ اصلاح دیہات کیلئے کثیر رقم کی ضرورت ہے ایک گمراہ کن خیال ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر نئے کام کیلئے روپیہ کی سخت ضرورت ہوتی ہے اسی طرح دیہات سدھار کیلئے بھی کچھ روپیہ کی ضرورت ہے، مگر روپیہ سے زیادہ وہ ایسی چیزوں کی ضرورت ہے جنکو حکومت مہیا نہیں کرسکتی، ان چیزوں کو خلوص، ہمدردی، ایثار، قربانی اور انسانیت کہا جاتا ہے ہمارے سامنے ایسے کامیاب ادارے موجود ہیں جن کے پاس ابتدا میں سرمایہ بہت قلیل تھا مگر کام کرنے والوں میں مندرجہ بالا خصوصیات موجود تھیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جس سرعت، تیزی اور استقلال سے کام کیا کسی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ دیہات سدھار کے سلسلہ میں متعدد کام ایسے ہیں جن میں روپیہ کی قطعی ضرورت نہیں، اور متعدد کام ایسے ہیں جن میں روپیہ کی بچت ہوتی ہے۔

ہم اپنے کسان کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میں بھلائی اور برائی سمجھنے کی تمیز نہیں، یا وہ نفع و نقصان میں امتیاز نہیں کرسکتا، لیکن اس کے باوجود وہ پرانی لکیر کا فقیر نظر آتا ہے اس کی وجہ قسمت پرستی ہے۔ اس میں آگے بڑھنے کا شوق اور ابھرنے کی امنگ مفقود ہوچکی ہے۔ اس قنوطیت کا اصلی سبب وہ حادثات ہیں جو برسوں سے اس کو اپنا شکار بنا رہے ہیں۔ انیسویں صدی کے ابتدائی عشرہ تک ملک میں امن و امان نہ تھا، حملہ آور آتے اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے اسکے کھیتوں کو روندتے، اسکی فصلیں کاٹ لیتے یا ان کو جلا دیتے تھے، جب ملک میں امن و امان قائم ہوا تو حملہ آوروں کا خوف کم ہوگیا مگر سیلاب، خشک سالی، اولا، پالا، اور ٹڈی دل سے اس کی فصلوں کو نقصان پہونچتا رہا۔ مختلف بیماریاں اسکو اپنا لقمہ بناتی رہیں۔ رفتہ رفتہ اس کو یقین ہوگیا کہ ارضی و سماوی مصیبتیں انسان کی بدکاریوں کا نتیجہ ہیں۔ اس نے قدرت کو غیر منصف تصور کرلیا۔ مگر یہ سوال اس کے ذہن میں پیدا ہوتا تھا کہ قدرت خصوصیت سے اس پر ظالم کیوں ہے۔ اس بات کا کھوج نہ لگانے کی وجہ سے اس کے ذہن میں یہ احساس قوی تر ہوگیا کہ اپنی بھلائی اور برائی کا کوئی کام وہ خود نہیں کرسکتا، اس کی قسمت کو بگاڑنے یا بنانے والی ایک ایسی ہستی ہے جس پر اس کا قابو نہیں، اس لئے اس نے اپنے تمام کام اسی کے حوالہ کردئے نتیجہ

ت پرست یا قناعت پسند اور بالفاظ دیگر سست، کاہل اور نکما ہو گیا۔

آج سے چند سال پہلے اس میں سے اکثر چیزوں کو برداشت کیا جا سکتا تھا، مگر اب سائنس، فن انجینیری، فن زراعت، اور علم طب
ترقی نے انسان کا قابو قدرت پر بڑھا دیا ہے۔ گویا قسمت پرستی کا دور ختم ہو گیا مگر وہ بدستور قسمت پرست ہے، اس میں یہ احساس پیدا نہ ہو سکا کہ
ی ختم ہو چکا ہے اور خوشگوار مستقبل سامنے ہے وہ ماضی کا دلدادہ ہے اور حال و مستقبل کی فکر سے بے نیاز ہے۔ ماضی خواہ کتنا ہی شاندار کیوں
ہ اس کو یاد کرنا بیکار ہے، گزرا ہوا زمانہ واپس نہیں آتا، آنے والے زمانہ کی فکر کرنا اور اسکو خوشگوار بنانا سب سے اہم فریضہ ہے۔

دیہی زندگی جمود و سکون کا نام ہے، وہاں بے حسی، غفلت اور ناواقفیت کے دیوتاؤں کا راج ہے، ان کے دل مردہ اور سینے
پژمردہ ہیں، ضرورت ہے کہ ان کے جمود و سکون کو توڑا جائے، بے حسی اور غفلت کے پردوں کو چاک کیا جائے، مردہ دلوں میں اور پژمردہ
سینوں میں شوق اور امنگ پیدا کی جائے، ان کو بیدار کر کے متحرک اور جاندار بنا دیا جائے، ان کے رگ و ریشہ میں برقی رو دوڑا دی جائے
ان کو خود اعتمادی کا سبق پڑھایا جائے، یہ کام ملک کے نوجوان ہی انجام دے سکتے ہیں۔ یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ ان کی یہ صلاحیتیں مٹ چکی ہیں۔
کانگریس نے برسر اقتدار آنے سے پہلے چھوٹے چھوٹے دیہات میں زندگی کی روح پیدا کی تھی، اور خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر دیا تھا۔ وہ اس
قوت کو حکومت سے ٹکرانا چاہتی تھی جن میں اس کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی، مگر اس طرح سادہ لوح کسان بھٹک گئے، اور جب کانگریس
نے عہدے قبول کر لئے تو وہ اسی نئی حکومت سے ٹکرانے لگے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسانوں میں آگے بڑھنے، اور ترقی کرنے کے
جراثیم ضرور موجود ہیں اب اس کا انحصار کام لینے والوں پر ہے کہ وہ ان کا رخ کس طرف پھیرتے ہیں۔

میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان یا ممالک محروسہ سرکار عالی جیسے زرعی خطوں کے دیہات کی اصلاح حکومت کے بس کی بات نہیں ہے،
حکومت بزور قانون اصلاح نہیں کر سکتی، اصلاح کا احساس خود پسماندہ لوگوں میں پیدا ہونا چاہئے۔ جبری اصلاح کا ہمیشہ یہ خاصہ رہا ہے
کہ جب جبر اٹھایا گیا اصلاح ختم ہو گئی، ضرورت ہے کہ ملک کے سنجیدہ، مخلص اور ٹھوس کام کرنے والے تعلیم یافتہ نوجوان دیہات میں مستقل
سکونت اختیار کریں اور اپنا ایک نصب العین بنا کر اس کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔ کام کرنے والوں کو اپنے آپکو حاکم یا مخدوم
نہ سمجھنا چاہئے بلکہ وہ کاشتکاروں کے دوست، مشیر کار اور خادم بننے کی کوشش کریں، مخدوم بننا آسان ہے اور خادم بننا مشکل۔ ان کو
اسکا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ گاؤں ہماری تہذیب کا قدیم ترین مرکز ہے، کسی قدیم شئے کو مٹا کر اس کی جگہ اسی مسالہ سے نئی عمارت تعمیر کرنا
آسان نہیں، ان کو ابتدا میں مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا ان کو قدم قدم پر ناکامیوں کا منہ دیکھنا ہوگا، ان کو دلی اذیت اور
روحانی تکلیف بھی ہوگی کہ جو چیزیں جن کی بھلائی کے لئے پیش کی جا رہی ہیں وہی اس کو ٹھکرا رہے ہیں، مگر ان کو ناامید نہ ہونا چاہئے اور غم و غصہ
سے الگ رہ کر خلوص سے کام کرتے رہنا چاہئے۔ خلوص اور قربانیوں کا درخت یہ پھل ضرور لائیگا اور بار آور ہونے میں جتنا زیادہ عرصہ
لگے گا اتنے ہی اسکے پھل عمدہ اور شیریں ہوں گے۔

محمد احمد سبزواری

بیڑ کی چھاگل اور گپتی کی صنعت

ہندوستان کی صنعتی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں قدیم زمانہ میں مختلف گھریلو صنعتیں نہیں صرف ان کا وجود ہی نہ تھا بلکہ یہ نہایت ترقی پر تھیں اور دیگر ممالک میں بھی وہ شہرت حاصل کر چکی تھیں لیکن صنعتی انقلاب کے بعد جب مشین کا بنا ہوا دکھاوا اور سستا مال یہاں کے بازار میں آنے لگا تو یہاں کی صنعتوں کو زوال ہوا۔ اس کے علاوہ چند معاشرتی اور سیاسی اثرات بھی تھے جن کی بدولت یہاں کی بہت سی دستی صنعتیں فنا ہوئیں اور کئی صناعوں نے زراعت کا پیشہ اختیار کیا۔

اس کی مثال ہماری ریاست حیدرآباد کے ضلع بیڑ کی چھاگل کی صنعت ہے۔ یہ صنعت آج سے کچھ کم دو سو سال قبل یہاں عروج پر تھی۔ اس صنعت کے ذریعہ بہت سے لوگ روزی حاصل کرتے تھے لیکن آج اس کی حالت بالکل ناگفتہ بہ ہے۔ اب خاص بیڑ میں اس صنعت کے واقف کار صرف دو افراد ہیں، ایک کا نام ٹھوبا اور دوسرے کا نام راما ہے۔ ان کا یہ پیشہ اب ضمنی ہے اور یہ لوگ زراعت میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ ان کے پاس ایک یا دو چھاگلیں تیار رہتی ہیں۔ وہ بھی اس خیال سے کہ یہاں کی یہ صنعت مشہور ہے اور ممکن ہے کہ کوئی خواہشمند خریدے۔

ان صناعوں میں سے ایک کو اولاد ہے دوسرا لاولد ہے۔ ان کے چند رشتہ دار ہیں جو بیڑ کے نزدیک کے دیہات میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی بیڑ کے ہفتہ واری بازار میں معمولی قسم کی چھاگلیں لاتے ہیں۔

الخاص طور پر چھاگلیں بنوائی جائیں تو اعلیٰ قسم کی بنائی جاتی ہیں۔ خوبی کے لحاظ سے ان کی قیمتیں ۴ روپیہ سے ۱۵ روپیہ تک ہوتی ہیں۔ چمڑا نہایت ہی ملائم کیا جاتا ہے۔ پھر اس چمڑے کی چھاگل بنائی جاتی ہے۔ چھاگل پر مختلف قسم کے عجیب و غریب نقش ابھارے جاتے ہیں۔ اور ان نقشوں میں رنگین کاغذات لگائے جاتے ہیں۔ چمڑا گائے اور بیل کا لیا جاتا ہے۔ ایک جانور کی کھال مقامی بازار میں ۵ روپیہ سے ۱۰ روپیہ تک ملتی ہے اور اسمیں غالباً دو یا تین چھاگلیں تیار کی جاتی ہیں۔ عموماً ایک چھاگل کا پانی موسم گرما میں دو آدمیوں کو ایک دن کے لئے کافی ہوتا ہے۔ چھاگلوں کی زیادہ قیمت کی ایک وجہ ان کی قلت بھی ہونی چاہئے۔ کیونکہ ان لوگوں کو کبھی کبھی چھاگلیں بنانی پڑتی ہیں ظاہر ہے کہ انہیں وہ ذرا زیادہ قیمت وصول کر لیتے ہوں۔ ایک چھاگل تیار کرنے کے لئے دو دن درکار ہوتے ہیں ان کے پاس ملازمین نہیں ہوتے بلکہ یہ اپنی بیوی بچوں کی مدد سے چھاگلیں تیار کرتے ہیں۔

ان کی عمرانی زندگی سے ہمیں یہاں بحث نہیں لیکن وہ بھی غور طلب ہے۔ ان کی رہائش اچھوت ہونے کی وجہ سے آبادی کے ڈھور واڑہ نامی محلہ میں ہے۔ یہ محلہ ان کی ذات کے نام سے ہی مشہور ہے۔ ان کے مکان کے سامنے سے ایک گلی بھی گزرتی ہے لیکن وہاں نالیوں یا موریوں کا انتظام نہیں ہے سڑک کے کنارے جو موریاں ہیں ان میں غلاظت ہمیشہ جمع رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہاں سے کوئی شہری ناک بھوں چڑھائے نہیں گزرتا۔ یہ پڑھنا جانتے ہیں نہ لکھنا۔ ان کا لباس اتنا پھٹا ہوا ہوتا ہے کہ انہیں سے ان کا آدھا جسم دکھائی دیتا ہے۔

جب ہم صنعت کے زوال پر غور کرتے ہیں تو ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی طلب آبادی کے صرف ایک محدود حصہ سے ہے۔

یعنی یہ چمڑے کی بنی ہوئی ہونے سے ہندو لوگ مذہبی نقطۂ نظر سے اس کا پانی پینا جائز نہیں سمجھتے ۔ اس وجہ سے اس کی طلب کم ہوئی ۔ لیکن اس پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ پہلے بھی ہندو مسلمان یہ دو فرقے تھے پہلے یہ صنعت انہیں معاشرتی حالات میں عروج پر تھی ۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زوال کی محض یہی ایک وجہ نہیں ہے بلکہ بڑی وجہ [illegible] ج کل جدید قسم کے گاگلٹ ملتے ہیں جو بڑے چھوٹے ہوتے ہیں اس وجہ سے ایک سے دوسری جگہ لے جانے میں آسانی ہوتی ہے اور وہ سستے بھی ہوتے ہیں ۔ اس وجہ سے ان کی طلب بڑھی اور چھاگلیں پیچھے رہ گئیں ۔ اس کے باوجود بھی صنعت باقی رہتی اگر عہدہ داران مقامی اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاتے بالخصوص پولیس کے ملازمین سے ان لوگوں کو اس بارے میں خوب نقصان پہنچا ۔ پہلے ہی ان کی صنعت کمزور اور کچھ مقامی بازاروں میں بکتی تھیں لیکن اس حالت میں ان ملازمین نے ہر سال موسم گرما میں کئی چھاگلیں مفت لینی شروع کیں ۔ اس وجہ سے انہیں نقصان ہوا اور انھوں نے اس میں اپنی خیر بہت دیکھی کہ اس پیشہ ہی کو چھوڑ دیا جائے ۔

انہیں وجوہات کی بنا پر وہ لوگ زراعت میں منتقل ہوگئے اور ملک کی ایک صنعت مٹ گئی ۔ اب اس کو ترقی دی جاسکتی ہے لیکن وہ بہت گراں بار ثابت ہوگی ۔ اگر ان لوگوں کو حکومت بغیر سود کے قرضہ دے یا انہیں مزدوروں کی حیثیت سے چھاگلیں بنانے کے لئے نوکر رکھے اور اس کی نکاسی اپنے ذمہ لے تو یہ صنعت پھر زندہ ہوسکتی ہے ۔ اب چونکہ اس صنعت کی زیادہ طلب نہیں ہے اور اس میں کام کرنا نفع بخش نہیں ہے اس لئے اس پیشہ میں زیادہ لوگ نہیں ہیں ۔ لیکن اگر اس میں فائدہ کی امید ہو تو اب بھی کم از کم ۳۰ ، ۴۰ لوگ اس پیشہ میں شریک ہوں گے اس کی نکاسی شہروں کے بجائے بڑے بڑے دیہاتوں میں ہوگی ۔ اس صنعت کی تحقیق سے مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اب اس میں تازہ روح پھونکنا مشکل ہے لیکن پھر یہ خیال آیا کہ اس صنعت کے زوال کے اسباب پر نظر ڈالنے سے اور اس کی طرف آپ لوگوں کی توجہ مبذول کرنے سے ممکن ہے ملک کی دوسری صنعتیں جو اسی راہ پر لگی ہیں فنا ہونے سے بچ جائیں کیونکہ اب بھی میں بعض سرکاری ملازمین کو دیکھتا ہوں کہ وہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو اپنی ہی ذاتی ملک سمجھتے ہیں ۔ اور کسی چپراسی یا ذمہ دار کو صناعوں کے مکان پر بھیج کر ایک دو چیزیں بے تکلفی سے منگوا لیتے ہیں ۔ یہ بات ایک شخص کے لئے ایک وقت کیلئے معمولی ہے لیکن بعض اوقات یہی معمولی بات مہلک ثابت ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے لوگ بیروزگار ہو جاتے ہیں ۔

اب ہم بیڑ کی دوسری صنعت پر غور کریںگے ۔ اس صنعت کا نام گپتی کی صنعت ہے ۔ اس کو وجود میں آئے ہوئے کوئی پچاس سال ہوتے ہیں ۔ آپ میں سے اگر کسی نے بیڑ کی بنی ہوئی گپتی دیکھی ہوگی تو اس پر ضرور آپ نے جان محمدؐ کا نام انگریزی میں یا اردو میں لکھا ہوا پڑھا ہوگا ۔ یہ شخص شروع میں تلواریں بناتا تھا لیکن نہ معلوم اسے کیا سمجھائی دیا کہ اس نے تلوار بنانا چھوڑ کر گپتیاں بنانی شروع کیں ۔ اب یہ شخص زندہ نہیں ہے اس کا بیٹا شیخ احمد نام موجود ہے جس کی عمر اب (۶۰) سال کی ہے اور جس کا ایک بیٹا اور دو نواسے ہیں جو اس کے ہاں یہی کام کرتے ہیں عموماً ان کے ہاں تین چار نوکر رکھے جاتے ہیں ۔ اور ضرورت کے لحاظ سے ان نوکروں میں اضافہ بھی کیا جاتا ہے ۔ اس طرح اس صنعت میں کوئی (۸) اشخاص ہمیشہ لگے ہوتے ہیں ۔

گپتی بنانے کے لئے بیر اور ساگوان کی لکڑی استعمال کی جاتی ہے ۔ اس میں سے بیر کی لکڑی تو بیڑ ہی میں ملتی ہے لیکن ساگوان کی لکڑی احمدنگر اور بمبئی سے منگاتے ہیں یا وہاں بھی کسی دوکان سے خریدتے ہیں ۔ گپتی کے لئے فولاد کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی بمبئی

سے منگایا جاتا ہے۔ گپتیاں اس قدر بہترین بنائی جاتی ہیں کہ اس کی جلد شناخت نہیں ہوتی کہ آیا یہ لکڑی ہے یا تلوار۔ جیسے بھی بنائے جاتے ہیں۔ لکھنے کے قلم میں فولاد کا پتہ بٹھایا جاتا ہے گویا لکھنے کا قلم ہی گپتی ہے۔ اس طرح یہ چاقو بھی بناتے ہیں۔ گپتیوں پر بارہ سنگھے، چاندی، لکڑی اور جرمن سلور کے دستے بنائے جاتے ہیں۔ ان دستوں پر مختلف نقش و نگار اور تصاویر کھینچی جاتی ہیں۔ اور خریدار کا نام بھی خواہش کرنے پر کھود جاتا ہے۔ گپتی کی اصل تلواری اور فولادی اس طرح دو قسمیں ہیں۔ اصل تلواری درجۂ اول ۲۵ روپیوں میں اور درجۂ دوم ۲۰ روپیوں میں بکتی ہیں۔ فولادی گپتی درجۂ اول (۱۵) روپیہ میں اور درجۂ دوم (۱۲) روپیہ میں فروخت ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ معمولی گپتیاں ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰ روپیوں میں خوبی کے لحاظ سے بیچی جاتی ہیں۔ ایک شخص ایک گپتی دو دن میں مکمل تیار کر سکتا ہے۔

ان لوگوں کو مختلف نمائشوں میں تمغے ملے ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد میں جو نمائشیں ہوئیں ان میں ان کو تمغے ملے ہیں۔ نواب نعمت یار جنگ بہادر صوبہ دار اورنگ آباد اور بعض تعلقداروں نے بھی تمغے دیئے ہیں۔ اور اصل میں پہلے ایسے ہی عہدہ دار ہمت افزائی کر کے صنعتوں کو باقی رکھتے تھے۔ ان لوگوں کا پیشہ محض گپتی سازی ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اپنی صنعت کی تشہیر نہیں کرتے۔ جو لوگ بیڑ کے رہنے والے ہیں یا جو ملازمین بیڑ سے تبادلہ ہو کر دوسرے اضلاع میں جاتے ہیں ان کے ذریعہ سے اس صنعت کی تشہیر ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی طرح یہ صنعت کسی قدر مشہور ہوئی اور اب ان کے پاس اورنگ آباد، ناندیڑ، پربھنی، ورنگل، نظام آباد، گلبرگہ سے گپتیوں کے لئے آرڈر آتے ہیں۔ موجودہ کساد بازاری کا اثر ان پر بھی پڑا ہے۔ پانچ سات سال پہلے ان کی خالص آمدنی ۱۵۰ تا ۲۰۰ روپیہ تھی لیکن اب ۱۰۰ تا ۱۲۵ روپیہ ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ پانچ سات سال پہلے ان کے لڑکے دوسرا کام نہیں کرتے تھے۔ ان لڑکوں کو مڈل تک تعلیم دی گئی ہے۔ انہوں نے برٹش انڈیا میں اس صنعت کی تجارت کرنے کی اجازت حاصل کی تھی لیکن پھر انہیں منع کیا گیا آجکل فیشن کے لحاظ سے لوگ لکڑی ہاتھ میں پکڑتے نہیں اس وجہ سے گپتی کی خرید بھی کم ہوئی ہے۔

اگر حکومت ان صناعوں میں سے ایک کو صنعت و حرفت کے مدرسہ میں ملازم رکھے تو کئی لوگ اس فن سے واقف ہو جائینگے شیخ احمد ۱۰۰ روپیہ ماہانہ کی تنخواہ پر آنے کے لئے راضی ہے۔ یہ مطالبہ میرے خیال میں ضرورت سے زیادہ ہے۔ میں نے اس سے اپنا شبہ ظاہر کیا تو اس نے جواب دیا کہ لوگ ملتے بھی نہیں ہیں۔ اگر حکومت رکھے تو ہمیں کو رکھے ان کے پاس سرمایہ نہ ہونے سے یہ ترقی نہیں کر سکتے اگر انہیں سرمایہ بہم پہنچایا جائے تو یہ مشین کا بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک مشکل یہ پیش آتی ہے کہ مذہبی خیالات کے لحاظ سے یہ لوگ بغیر سود کے قرضہ چاہتے ہیں۔ اس مشکل کو دور کرنے کے لئے حکومت یہ کر سکتی ہے کہ محکمۂ پولیس میں کرچ اور بایونٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر محکمۂ پولیس کرچ اور بایونٹ انہیں کے پاس سے خریدے اور انہیں کچھ رقم پہلے دے یا پہلے کچھ قیمت ادا کرے تو ان کو سرمایہ ملیگا اور مشین استعمال کر سکیں گے۔ اب وہ اپنے ہاتھ سے روغن تیار کرتے ہیں۔ اگر گپتیاں کثیر مقدار میں بنائی جائیں اور ان کی کھپت بھی ہو تو یہاں روغن کی صنعت بھی ترقی کر سکتی ہے۔ اس صنعت کی عمر ابھی چھوٹی ہے۔ اس لحاظ سے ابھی اس میں ترقی کی گنجائش ہے۔ اس کے لئے انہیں اصل مہیا کرنا چاہئے اور صنعت کی تشہیر اور نکاسی کا بندوبست کرنا

چاہیے۔ آج کل تشہیر نہ ہونے پر بھی ان کو ۱۵۰۰۰ روپیہ ماہانہ ملتے ہیں اگر ان کا اشتہار کیا جائے تو اس کساد بازاری کے زمانہ میں بھی زیادہ آمدنی ہوگی اور ساتھ ہی ملک کی ایک صنعت ترقی کرے گی جس میں ابھی بہت سے مزدوروں کی کھپت ہوسکتی ہے۔ ایک شرمیہ

ایک غمگین صبح

اپنے عالی حوصلہ شاہوں کے گن گاتی ہوئی	اُبھر رہی ہے سطح پر ہر موج لہراتی ہوئی
ہر ادا میں شان ہے "شاہوں کے استقبال" کی	ساحل ماضی سے ٹکراتی ہیں موجیں حال کی
بس گئی دنیا اجڑتی تھی ابھی اجڑی نہ تھی	بات یوں اس کی تھی جیسے ابھی بنتی نہ تھی
اس کے سینے میں تمنا کی تپش باقی رہی	مادی رونق میں روحانی کشش باقی رہی
اس کی موجوں کو نظر سے چومتا تھا آسماں	اب بھی خاموشی سناتی ہے وہ خونیں داستاں
قافلہ گذرا تھا جب اس پر سے تاناشاہ[1] کا	اس نے گذرانا تھا تحفہ نالۂ جانکاہ کا
بے کسی میں اپنے شہہ کی دے دیا جو بھی تھا پاس	اس کے پانی نے بجھائی تھی خدا کے بندے کی پیاس

داغ دل بن کر قطب شاہوں کے ہیں نقش قدم
سوکھنے پاتا نہیں اس کا کبھی دامانِ نم

سیر کرنے والے ان رنگینیوں میں کھو نہ جا	حال کے جلووں میں یوں ماضی سے غافل ہو نہ جا
قہقہوں کی گونج میں پوشیدہ آہوں کو نہ بھول	ذرہ ذرہ کہہ رہا ہے قطب شاہوں کو نہ بھول

رو رہا ہے آسماں یہ شبنم افشانی نہیں
اشک کا سیلِ رواں ہے دیکھ یہ پانی نہیں

میکش

[1] تاناشاہ کا اکلوتا فرزند

دکن میں اُردو مثنوی کا ارتقا

اردو مثنوی اور اصناف کی طرح اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے اس کی مقبولیت اس کی خصوصیات اور اس کے لوازم مختلف زمانوں میں کچھ نہ کچھ بدلتی رہیں۔ اس کا یہ ارتقا کم و بیش چھ سو سال کی مدت پر حاوی ہے۔

مثنوی کو دوسرے اصناف کے مقابلہ میں میسر دیکھیے کی بعض وقت ضرورت اور خواہش اس وجہ سے داعی ہوتی ہے کہ یہ صنف چند مسلسل خیالات کے اظہار کو آسان بناتی ہے چنانچہ اس کی اصلاحی آسانیوں کی وجہ سے ابتدا میں صوفیائے کرام نے اس کو ذریعہ بنایا تھا۔ بعد میں جب یہ زمانہ دراز تک قصے لے کر مثنوی کا پیوند لگا۔ اس کے بعد ایک زمانہ اس پر ایسا بھی آیا کہ یہ کسی قدر کم طویل قصوں یا مرقع کی نظموں کی صورت میں فروغ پاتی رہی موجودہ زمانہ میں یہ صنف طویل نظموں کی صورت اور معنوی اعتبار سے بہت کچھ بدل گئی ہے۔

اس طرح اردو مثنوی کی پوری ارتقائی رفتار کو ہم چند منزلوں میں تقسیم کر سکتے ہیں مثلاً (۱) ابتدائی عہد کے مثنوی پارے جو زیادہ تر صوفیائے کرام کے تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ یہ موجودہ قسم الفاظ میں ہوئی ایسی بھاشا کے نمونے ہیں جن میں عربی اور فارسی کے الفاظ بھی موجود ہیں ان کی بحریں عموماً ہندی ہیں اور یہ ابتدائی ساتویں صدی ہجری کے نصف آخر سے لے کر دسویں صدی ہجری کے زمانہ پر حاوی ہیں۔ دوسرے ابتدائی نظم اور طویل مثنوی پارے جو بہمنی عہد گولکنڈہ اور بیجاپور کے ابتدائی دور کے چند زمانہ شامل ہیں اور یہ تقریباً سب سے پہلے ارشاد و ہدایت اور تصوف وغیرہ کے مضامین بیان کرتی ہیں گجرات کے حضرت خوب محمد چشتی کی مثنوی "خوب ترنگ" اور بیجاپور کے حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق اور ان کے خاندان کے ملفوظات ہیں جو نظم اور نثر دونوں پر مشتمل ہیں۔ اس ہی دور میں اردو مثنوی کا حقیقی ڈول ڈالا گیا۔ اس کے آخری زمانے کا تعلق دکن اور خاص طور پر بیجاپور سے ہے۔

دکن میں مثنوی کا ارتقا ڈھائی سو سال سے زیادہ مدت پر حاوی ہے۔ حضرت شاہ میراں جی کی وفات ۹۰۲ھ میں ہوئی آپ کے زمانہ سے لے کر ۱۱۶۰ھ یعنی حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی کی مثنوی "بوستان خیال" کی تحریر تک مثنوی کو مسلسل اور خاطر خواہ ترقی ہوتی رہی۔

اس ڈھائی سو سال کے طویل عرصہ کی مدت کو ہم تین عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا عنوان عہد زرین کی مثنویاں۔ دوسرا عنوان عہد مغلیہ کی مثنویاں اور تیسرا عنوان آصف جاہی عہد کی دکنی مثنویاں ہو سکتی ہیں۔ اس طرح پہلا عنوان اردو مثنوی کے ارتقا کا گویا تیسرا باب ہوگا۔ اور دوسرا اور تیسرا عنوان بالترتیب چوتھا اور پانچواں باب۔

حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کی ولادت مکہ معظمہ میں ہوئی تھی۔ آپ اوائل عمر میں ہندوستان تشریف لائے اور بیجاپور کو اپنا مستقر بنایا۔ آپ کے علم و فضل تقدس اور سیرت کے اثرات نے ارادت مندوں کا ایک بڑا گروہ آپ کے اطراف جمع کر دیا تھا۔ چونکہ ان میں سے اکثر عربی زبان سے ناواقف اور فارسی سے بھی کچھ زیادہ مانوس نہیں تھے اس لئے آپ نے خود ان کی زبان سیکھی اور اسی میں ارشاد و ہدایت فرمائی۔ یہ ملفوظات آپ کے مریدین اور معتقدین نے عوام کے فائدے کی خاطر لکھ لئے۔ اس وقت اسی طرح

کے کئی مخطوطے دستیاب ہوتے ہیں، جو اسی قریبی زمانے کے لکھے ہوئے ہیں، اور نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہیں۔

نظموں میں آپ کی مثنویاں "خوش نامہ" اور "خوش نغز" کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں شامل ہیں۔ ان کے اقتباسات، موجودہ زمانے کی اکثر ایسی کتابوں میں شایع ہو چکے ہیں، جو اس دور سے متعلق ہیں۔

حضرت شاہ میراں جی کے فرزند، حضرت شاہ برہان الدین جانم بھی بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ آپ کے ملفوظات میں "سکھ سہیلا" "منفعت الایمان" اور "ارشاد نامہ" وغیرہ اب منظر عام پر آچکے ہیں۔ اسی طرح حضرت شاہ برہان الدین جانم کے فرزند حضرت شاہ امین الدین اعلےٰ کے ملفوظات میں بھی کئی نظمیں اور کسی قدر طویل مثنویاں شامل ہیں۔ ان میں "رموز السالکین" "نظم وجودیہ" "نظم قربیہ" "محب نامہ" قابل ذکر ہیں۔ اس خاندان کے ارشادات تمامتر مذہبی اور متصوفانہ خیالات پر مشتمل ہیں۔

اسی طرح کے اور بھی نظم و نثر کے رسالے موجود ہیں، جو صوفیائے کرام کے ملفوظات پر مشتمل ہیں۔ یہ رسالے زیادہ تر بیجاپور کے ابتدائی چار حکمرانوں کے عہد سے متعلق ہیں۔

دکن کی ادبی تاریخ میں بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ تا ۱۰۳۵ھ) اور گولکنڈے کے محمد قلی قطب شاہ (۹۸۹ھ تا ۱۰۲۰ھ) کے عہد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان دونوں سلاطین کی سرپرستی میں، ادبی ذوق کی ترقی شروع ہوئی اور بلند پایہ شعرا نشو و نما پانے لگے۔ ان میں محمد قلی کے درباری شاعر، وجہی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جس کی مثنوی "قطب مشتری" (۱۰۱۸ھ) عمدہ شاعری کا نمونہ ہے۔ وجہی کے بعد اس فن کو سب سے زیادہ ترقی، عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے عہد کے مشہور ملک الشعرا ناصر غواصی دی۔ غواصی کی دو مثنویاں "سیف الملوک و بدیع الجمال" (۱۰۳۵ھ) اور "طوطی نامہ" (۱۰۴۹ھ) قدیم اردو کے ترقی یافتہ اور بسیط شعری کارنامے ہیں۔ اس نے اردو مثنوی کو جس معیار تک پہنچا دیا تھا، وہ بعد کے شعرا کے لئے نمونہ بن گیا۔

مقیمی جو اسی عہد کا شاعر ہے اور بیجاپور کے ابتدائی ادبی مثنوی نگاروں میں سے ہے، اپنے آپ کو غواصی کا خوشہ چین بتلاتا ہے۔ اس کی مثنوی "چندر بدن و مہیار" جو ۱۰۵۰ھ سے قبل لکھی گئی ہے، ادبی اعتبار سے زیادہ اہمیت تو نہیں رکھتی، لیکن اس کا قصہ عرب کے "لیلےٰ مجنوں" کے قصے کی طرح بے حد مشہور رہے۔

مقیمی کے زمانے سے مثنوی لکھنے کا طریقہ بیجاپور میں عام ہو گیا۔ اب مذہبی مثنویوں کے بجائے ادبی مثنویاں لکھی جانے لگیں۔ چنانچہ امین جو مقیمی ہی کا معاصر اور ہم وطن تھا، اس کے اثر سے فارسی کے ایک قصے کا ترجمہ "بہرام و حسن بانو" کے نام سے کیا۔ لیکن اس کی تکمیل وہ نہ کر سکا۔ اور بعد کے ایک بیجاپوری شاعر دولت نے ۱۰۵۰ھ میں اس کی تکمیل کی۔

مقیمی تک زیادہ تر اردو مثنویوں کا مواد یا تو طبعزاد ہوتا تھا یا برج بھاشا سے ماخوذ صرف محمد قلی کے زمانے کے ایک شاعر، احمد نے فارسی سے استفادہ کر کے "لیلیٰ مجنوں" لکھی تھی۔ لیکن "بہرام و حسن بانو" کے بعد سے جو مثنویاں اردو میں لکھی جانے لگیں ان میں زیادہ تر فارسی مثنویوں سے استفادہ کیا گیا۔ چنانچہ اس زمانے میں محمد عادل شاہ کے دربار کے ایک شاعر صنعتی نے ۱۰۵۵ھ میں حضرت تمیم انصاری صحابی رسول کی حیات کے ایک قصے "قصۂ بے نظیر" کا ترجمہ کیا۔ اور اس کے دوسرے سال اسی کے ہم وطن شاعر، ملک خوشنود نے "ہشت بہشت" کو

اردو نظم کا جامہ پہنایا۔ ۱۰۵۹ھ میں بیجاپور ہی کے ایک اور شاعر کمال خان رستمی نے ابن حسام کے مشہور فارسی رزمیہ "خاور نامہ" کو نظم کیا۔ یہ اردو کی پہلی قابل ذکر رزمیہ مثنوی ہے۔ نہ صرف اس لحاظ سے، بلکہ بیان اور زور نظم کے اعتبار سے بھی یہ کارنامہ قابل قدر ہے۔

"خاور نامہ" کے بعد، جو مثنوی لکھی گئی وہ گولکنڈے کے شاعر جنیدی کی "ماہ پیکر" (۱۰۶۲ھ) ہے لیکن اس کا مطالعہ ناپید ہے۔ اس کا ذکر مختلف حوالوں کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس کے دو سال بعد گولکنڈے کا ایک اور شاعر کا لکھا کہ ابن نشاطی کی مثنوی "پھولبن" ہے جو اس میں شک نہیں کہ ایک فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے لیکن آزاد خیال چہ اس میں جگہ جگہ احوال اور عہد کے اثرات نمایاں ہیں۔ غواصی کے بعد یہ دوسرا طراز اسی پائے کا شاعر تھا جس نے مثنوی کے معیار کو اسلوب اور تکمیل کی حد تک بلند کیا۔ بعد کے شاعروں نے غواصی کی طرح اس کے کارنامے کو نمونہ بنایا چنانچہ ہنر فرزند مشرقی کی مثنوی "پتہمہ درپن" (۱۱۳۳ھ) میں اس کے ثبوت ملتے ہیں۔

بیجاپور میں علی عادل شاہ ثانی کے عہد تک اردو شاعری کا ذوق خاطرخواہ ترقی کر چکا تھا۔ چنانچہ خود اس کے دربار نے ملک الشعرا نصرتی جیسے زبردست سخن پردازوں کی پرورش کی۔ نصرتی بیجاپور کے لازوال شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی دو مثنویوں میں ایک "گلشن عشق" جو ۱۰۶۸ھ میں نظم ہوئی، دکن کے مشہور قصے "منوہر مدمالتی" کی عشقیہ داستان ہے۔ اس کی دوسری مثنوی "علی نامہ" رزمیہ اور تاریخی مثنوی ہے جس میں علی عادل شاہ اور مغلوں کی جنگوں کے حالات نہایت تفصیل سے پیش کئے گئے ہیں۔ لفظیات کے اعتبار سے "علی نامہ" کی وسعت لا... کارنامہ پیش کرتی ہے نصرتی کے اسلوب میں ادبیت اور لطف بھی موجود ہے وہ جنگوں کے نقشے نہایت عمدگی سے اور حقیقی پیش کر سکتا تھا۔ "علی نامہ" ۱۰۷۶ھ میں ہوئی

اس عہد کی آخری مثنویوں کے ذکر سے پہلے گولکنڈے کی ایک مثنوی "بہرام و گل اندام" کا ذکر ضروری ہے جو ۱۰۸۱ھ میں لکھی گئی۔ یہ بہت زیادہ اہم کارنامہ نہیں ہے۔ تاہم غواصی اور ابن نشاطی کے دبستان کی تمام خوبیوں اور خصوصیات کا حامل ہے

دوسری مثنوی "ظفر نامہ نظام شاہ" ایک رزمیہ ہے جو تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں رام راجہ سے دکن کی دو... سلطنتوں کی جو جنگ ہوئی تھی، اس کا شاعرانہ حال درج ہے۔ اس کا مصنف حسن شوقی، بلند پایہ شاعر تھا ... پہلے، نظام شاہی دربار (احمد نگر) سے متوسل رہا۔ پھر وہ بیجاپور آیا۔ آخر میں محمد قطب شاہ کے زمانے میں گولکنڈہ آگیا تھا۔ اس کی ایک اور مثنوی "میزبانی نامہ" بھی ہے۔

نصرتی کے بعد، سوائے ہاشمی کے بیجاپور میں ایسے بلند پایہ شاعر کم پیدا ہوئے جن کے کارنامے دیرپا پسی کے حامل ہوں۔ صرف شاہ ملک کا ذکر اس کی ضخیم مذہبی مثنوی "شریعت نامہ" کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۱۱ھ میں لکھی گئی تھی۔ ہاشمی وسیع پیمانہ کا انسان تھا، عادل شاہی سلطنت کے زوال کی وجہ سے زمانہ بھی بدل چکا تھا اس لئے اس نے اپنی شاعری میں عام راستے سے تجاوز کیا اور اس دور میں دکن کی آخری مثنویاں زیادہ تر گولکنڈے میں لکھی گئیں۔ چنانچہ امین، غلام علی، فائز اور لطیف، جن کی تصنیفات ۱۰۹۰ھ سے لے کر ۱۱۱۰ھ کے زمانہ پر حاوی ہیں، اسی گولکنڈے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

امین: حضرت عمر کے فرزند ابوشحمہ کے متعلق ایک فرضی قصے کا مصنف ہے، جو ۱۰۹۰ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس کے ایک سال بعد

غلام علی نے "پدماوت" کے حصے کو منظوم کیا۔ اس کا ماخذ فارسی سے زیادہ ہندی قصہ تھا۔ فائز "رضوان شاہ روح افزا" (۱۱۹۴ھ) کا مصنف ہے۔ .... لطیف نے، ایک رزمیہ مثنوی لکھی ہے جو "ظفر نامہ" کے نام سے موسوم ہے، اس میں "خاور نامہ" کا زور بیان اور "علی نامہ" کا لطف موجود نہیں ہے۔

سنہ ۱۱۰۰ھ کے قریب دو ڈھائی سال کے اندر اندر، بیجاپور اور گولکنڈے کے ادبی اور علمی مرکزوں کا خاتمہ ہوگیا۔ وہ علما اور خاص طور پر اردو زبان کے شاعر، جو عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین کی سرپرستی میں اپنے ذوق کی تکمیل میں منہمک تھے منتشر ہونے لگے۔ کیونکہ ان سلاطین کے جانشین یعنی مغلیہ امرا کو اردو شاعری کا چسکا ابھی نہیں لگا تھا۔ شہنشاہی احساس کے ساتھ فطرتاً وہ شہنشاہی دربار کی ادبی روایات اپنے ساتھ لائے تھے۔ تاہم اردو شاعروں کے قدم اکھڑ گئے تو اس سرزمین میں فارسی شعرا کے قدم بھی نہ جم سکے۔ اور شعرا ہی نے دکن کے اگلے ادبی ذوق کو جاری رکھا۔ لیکن یہ خود منتشر ہوگئے، ان کی شعری پیداوار کی یکسانیت منتشر ہوگئی۔

چنانچہ دکن میں مغلوں کے تسلط کے بعد، جو کارنامے ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ بڑی حد تک ان کے پیدا کرنے والوں کی ذہنی حالت کا عکس پیش کرتے ہیں۔ اس زمانے کی شعری پیداوار کو ہم اس طرح تقسیم کرسکتے ہیں۔ (۱) مرثیے (۲) مذہبی نظمیں (۳) متصوفانہ نظمیں، (۴) نیم مذہبی نظمیں۔

دکن کے شعرا نے مرثیہ کے لئے متنوع شعری صنفوں کا استعمال کیا ہے۔ لیکن اس طرز کا زیادہ کلام قافیہ کی ترتیب میں قصیدے کی شکل رکھتا ہے، اس لئے یہ ہمارے دائرہ سے باہر ہے۔ دوسری قسم کی نظموں میں، ولی ویلوری کی "روضۃ الشہدا" ( )، ضعیفی کی "ہدایت ہندی" ذوقی کی "وصال العاشقین" جیسی طویل مذہبی نظمیں شامل ہیں۔ اس دور میں تیسری قسم کی نظمیں بہت زیادہ مقبول ہوئیں۔ ان میں سب سے پہلے قاضی محمد محمود بحری کی "من لگن" کا ذکر ضروری ہے۔ بحری اصل میں بیجاپور کے رہنے والے تھے۔ بیجاپور کی تباہی کے بعد بہ حال تباہ گولکنڈہ پہنچے۔ دو سال بعد، گولکنڈے کی سلطنت کا سایہ بھی سر سے جاتا رہا۔ "من لگن" تصوف کی قدیم نظموں میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ اور وجدی کی "پنچھی باچھا" جو "منطق الطیر" کا ترجمہ ہے، بہت پڑھی جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ عشرتی کی متصوفانہ نظمیں "چت لگن" اور "دیپک پتنگ" بھی کافی مقبول تھیں۔

نیم مذہبی نظموں میں محمد علی عاجز کے قصے قابل ذکر ہیں۔ ان میں فقہ عقائد وغیرہ کے مسائل کو قصے کے پیرایہ میں بیان کیا جاتا تھا۔ ان قصوں کو بھی اپنے زمانہ میں کافی مقبولیت حاصل رہی۔

دکن میں مثنوی کی ترقی کا آخری زمانہ آصفجاہی سلطنت کے قیام کا ابتدائی دور ہے۔ یہ ایک عبوری زمانہ ہے، جس میں قدیم خیالات اور قدیم روایات کی کچھ تو شکست و ریخت ہوئی، اور کچھ نئی تعمیر شروع ہوئی۔ زبان اور اظہار خیال کے سانچوں کے لحاظ سے، اس دور سے بڑا انقلاب رونما ہونے لگا۔

اس دور کا سب سے بڑا شاعر، ولی ہے جس نے اپنی شاعری میں نئے ماحول اور بدلے ہوئے مذاق کو سب سے زیادہ جگہ دی اس کے بعد، شعرا کو ان کے نقش قدم پر چلنا آسان ہوگیا۔ مثنوی کی حد تک ولی کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ انھوں نے صرف دو تین

چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں۔ ان میں سے دو بزرگوں کی تعریف میں ہیں۔ مگر ایک مثنوی جو تین سو تیس شعر کی ہے، نہایت اہم ہے۔ اس مثنوی کا عنوان "مثنوی در تعریف صورت" ہے۔ یہ اگلی تمام مثنویوں کے مقابلہ میں جداگانہ نوعیت رکھتی ہے۔ اس وقت تک اردو میں مثنوی مرقع نگاری کے لئے استعمال نہیں ہوئی تھی۔ ابتدائی چھوٹی چھوٹی مثنویاں متصوفانہ تھیں۔ بعد میں وجہی کے زمانہ سے اس میں قصے لکھے گئے۔ کچھ رزمیہ مثنویاں بھی لکھی گئیں۔ عربی شعرا اس نوع کے خیالات کے لئے "قصیدہ" کا استعمال کرتے تھے۔ فارسی شعرا نے بھی انہیں کی پیروی کی۔

ولی کے اثر سے، جب دہلی میں اردو شاعری کو فروغ ہوا تو ابتدائی زمانہ کے شعرا جیسے شاہ حاتم اور آبرو نے ولی کی اسی مثنوی کی پیروی کی۔ میر تقی میر کے سامنے یہ نمونے تھے۔ اس لئے ان کی وہ مثنویاں، جو فارسی کی تقلید میں نہیں لکھی گئی ہیں۔ اسی طرز کی ہیں۔ فارسی کی قصہ دار مثنویوں کے نمونے پر میر نے جو مثنویاں لکھیں وہ ابتدائی نوعیت کی ہیں۔

ولی کے بعد دکن میں دونوں طرح کی مثنویاں رائج ہو گئیں۔ خود ان کے جانشین، حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی نے ایک طویل مثنوی "بوستان خیال" کے ساتھ ساتھ کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی لکھیں، جو متصوفانہ خیالات سے مملو ہیں۔ سراج کی طویل اور قصہ دار مثنوی "بوستان خیال" اس دبستان کی دکنی مثنویوں کا سب سے بہتر کارنامہ ہے، اور اردو کی تمام مثنویوں میں اس کا درجہ "سحر البیان" کے بعد ہے۔ انداز بیان، صداقت جذبات، تکمیل اور شعری خوبیوں کی بدولت "بوستان خیال" ہر زمانہ میں قدر کی نظر سے دیکھی جائیگی۔

"بوستان خیال" کے بعد، دکن میں مثنوی نگاری کے ذوق پر تنزل طاری ہونے لگا تاہم اس آخری دور میں بھی دو تین مثنویاں ایسی لکھی گئیں، جن کی ادبی اہمیت کبھی کم نہیں ہو سکتی۔ ان میں سب سے پہلے قابل ذکر "لالہ لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی کی تصویر جاناں" ہے۔ جو قصے کی ندرت، اصلیت اور ادبی معیار کی بلندی کے باعث اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ دوسری "لعل و گوہر" ہے۔ جس کے مصنف عارف الدین خاں عاجز اورنگ آباد کے شعرا میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ مثنوی قدیم طرز کے عشقیہ قصوں سے کچھ زیادہ امتیاز نہیں رکھتی۔ لیکن عاجز کا انداز بیان صاف ستھرا اور موجودہ روزمرہ سے بہت قریب ہے۔ چونکہ اس زمانے میں اورنگ آباد کو سیاسی مرکزیت حاصل تھی، اس لئے یہاں اچھے اچھے شاعر جمع ہو گئے تھے۔ اور دکن کے دار الخلافہ کے حیدرآباد میں منتقل ہونے تک، اورنگ آباد ہی کو ادبی مرکزیت حاصل رہی۔ چنانچہ کئی سخن پرداز اکناف ہند سے آکر یہیں فروکش ہو گئے تھے۔ ان میں شاہ غلام قادر ساؔمی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ برہان پور سے آکر یہاں فروکش ہوئے تھے۔ یہ اچھے شاعر تھے اور ان کے اطراف شاگردوں کا ایک خاصہ مجمع تھا۔ یہ شفیق کے ہم عصر اور دوست تھے۔ شفیق نے اپنے تذکرے "چمنستان شعرا" میں ان کی ایک مثنوی "شمشاد و صنوبر" کے اقتباسات دئے ہیں۔ یہ مثنوی خاصی ضخیم بتلائی جاتی ہے۔ لیکن اب تک اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مثنوی اچھی ہوگی۔

اس مضمون کے ختم کرنے سے پہلے ایک اور سخن سنج کا ذکر ضروری ہے، جو اپنے زمانے کے استاد شمار کئے جاتے تھے۔ یہ سید محمد ایمان، شاگرد حضرت شاہ تجلی ہیں۔ ایمان کا نشو و نما نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کے آخر عہد میں ہوا۔ یہ پرگو شاعر تھے۔ انہوں نے

کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی لکھی ہیں، جو پڑھنے اور لطف اندوز ہونے کے قابل ہیں۔

یہ آخری سخن سنج دراصل قدیم دبستان کے آخری شاعر تھے۔ اس کے بعد نئے عہد کے نئے تخیلات اور نئے روزمرہ کے اثرات نے قدیم دبستان کو متاثر کرنا شروع کیا۔ اور قدیم تخیلات پر بڑی شکست و ریخت طاری ہوئی اس دوران میں، دکن کی اُردو شاعری پر پژمردگی سی چھائی رہی۔ یہاں تک موجودہ عہد سے پہلے، جب یہ شکست و ریخت مکمل ہوگی، تعمیر جدید اُردو شاعروں میں ایک نئی روح پھونک دیگی۔

عبدالقادر سروری

گوداوری گھاٹ کی ایک حسین صبح

شب تاریک چلی زلفوں کو سلجھاتی ہوئی
صبح کے خوف سے ڈرتی ہوئی گھبراتی ہوئی

چور کی طرح دبے پاؤں چلی باد صبا
ہر قبائے گل نوخیز کو مسکاتی ہوئی

آئی گردوں سے زمیں دیکھنے تھی عروس شبنم
موتیوں کو در و دیوار پہ بکھراتی ہوئی

جل بجھی شمع، ہوئی رات کی محفل خاموش
بزم تاروں کی چلی آنکھوں کو جھپکاتی ہوئی

اڑ چلی نکہت گل چھوڑ کے دامن گل کا
باد سرشار پہ چلی جھومتی اتراتی ہوئی

جلوہ گر صبح کی دیوی ہوئی رفتہ رفتہ
شب کا پیکر رخ پر نور سے سرکاتی ہوئی

دور تاریکی ہوئی گھاٹ کی تقدیر کھلی
ٹکریاں آئیں حسینوں کی ستم ڈھاتی ہوئی

نقرئی شانوں پہ بکھرائے ہوئے بال کوئی
قلزم حسن کی ہر لہر میں لہراتی ہوئی

ذرے ذرے کو تبسم سے بناتی رنگیں
بجلیاں چشم فسوں ساز سے برساتی ہوئی

کوئی انگڑائیاں لیتی ہوئی بدمستی میں
ساغر عشق سے مے حسن کی چھلکاتی ہوئی

اپنی گستاخ اداؤں سے الجھتی ہر دم
خود بہکتی ہوئی دنیا کو بھی بہکاتی ہوئی

کرنے اشنان کوئی کھول کے جوڑا آئی
کوئی ساحل پہ کھڑی رہ گئی شرماتی ہوئی

بھیگے کپڑوں میں جو عریاں ہوئے جسم سیمیں
بجلیاں پھرنے لگیں ابر میں گھبراتی ہوئی

کوئی کھولے ہوئے بالوں کو چلی ندی میں
نکلی پانی سے کوئی زلفوں کو سلجھاتی ہوئی

چلی ہر ایک نہا دھو کے خراماں آخر
موتی ان بھیگے ہوئے بالوں سے برساتی ہوئی

ہو گیا جلد ہی روپوش یہ رنگیں منظر
آنکھوں آنکھوں میں نظر رنگیں للچاتی ہوئی

علی احمد

اورنگ آباد کا سنہری محل

سنہری محل دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا جو بحمد اللہ پورا ہوا۔ یہ عمارت اورنگ آباد کی قدیم عمارت سے ہے جو مقبرۂ رابعہ درانی سے تقریباً ۲ فرلانگ کے فاصلے پر جانب غرب پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ اس عمارت کا محل وقوع نہایت ہی بلند اور مرتفع ہے اس کے اطراف کھلے میدان اور مشرق و شمال کی جانب پر فضا پہاڑی سے متصل وہ عمارت کے بالکل مقابل میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہ عمارت آباد تھی اس کی دیواروں پر سونے کا ملمع کیا ہوا تھا یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ فی زمانہ گو عمارت صحیح و سالم ہے لیکن دیواروں کے ملمع کا کہیں پتہ نہیں ہاں نقش و نگار کے کہیں کہیں نشان پائے جاتے ہیں۔ یہ محل دو منزلہ ہے نیچے کے حصہ کی تفصیل یہ ہے۔ بیچ میں ایک ہال اس کے دونوں جانب دو دو کمرے ان کمروں کے بازو ایک ایک وسیع ہال۔ اوپر کی منزل نہایت شاندار ہے۔ بیچ میں ایک بہت بڑا ہال اس کے آگے پیش جس میں نہایت کشادہ اور خوشنما کنگرہ دار کمانیں نکلی ہوئی ہیں پیش کے مقابل میں وسیع صحن بڑے ہال کے ہر دو جانب دو دو کمرے اور ہر ایک کمرے کے بازو کھلا ہوا صحن اور صحن کے کنارے پر حد کی دیوار سے لگا ہوا ایک ایک پختہ مسقف بیت الخلا۔ بالاخانہ کے عقبی حصہ میں بھی کشادہ صحن واقع ہے بالاخانے کے اوپر چاندنی ہے جس کے اطراف دیوار کھنچی ہوئی ہے۔ چاندنی پر چڑھنے کے بعد تمام شہر ہتھیلی میں نظر آتا ہے اور نظر ریلوے اسٹیشن سے پرے جنوبی پہاڑی سلسلے تک بلا روک ٹوک کام کرتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارت کوسوں تک گرد و پیش کے وسیع رقبہ پر حکومت کر رہی ہے اس عمارت کے اطراف پختہ دیوار بنی ہوئی ہے جس میں کمانیں نکلی ہوئی ہیں اور دیوار کے اندر عمارت کے عقب و پیش نہایت وسیع مسطح و ہموار صحن ہے علامات و آثار سے پایا جاتا ہے کہ اس صحن میں چمن بندی کی گئی ہوگی کیونکہ اس وسیع چبوترے پر جس پر عمارت قایم کی گئی ہے۔ ایک حوض بنا ہوا ہے جس میں سے پانی ایک چھوٹی سی نہر میں جاتا تھا اور پھر نہر میں سے پشت ماہی آبشار پر سے ڈھلکتا ہوا صحن کی روشوں میں پہونچتا تھا۔ حوض اور نہر میں اب خاک اڑ رہی ہے اور چبوترے پر لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی ہے عمارت کے نیچے کا حصہ آج کل نہایت خراب حالت میں ہے اس کی اکثر کمانیں پتھروں سے چن دی گئی ہیں جس کی وجہ اندرونی حصہ کسی قدر تاریک ہے فرش پر کوڑے کرکٹ کی کوئی حد نہیں اس کے علاوہ جابجا مویشیوں کے گوبر کے ڈھیر پڑے ہوئے ہیں غالباً عدم نگرانی کی وجہ سے مویشی اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ بالاخانہ اب بھی ایسا ہے کہ وہاں کوئی بیٹھ جائے تو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا لیکن افسوس متعدی مالیخولیا کی علامات سے سفید دیواریں سیاہ ہو گئی ہیں۔ آہ! بالاخانہ کچھ نہ پوچھیے کیا چیز ہے شاید ہی ایسا ہوادار مقام کہیں ہو اطراف کا کشادہ منظر کوسوں تک نظر کے روبرو بازو میں پہاڑی کا سلسلہ گوناگوں دلفریبیوں سے معمور اپنے حسن کی آب و تاب کے ساتھ بے نقاب نظر آتی ہے انواع و اقسام کے مناظر کے اجتماع سے ایک عجیب و غریب منظر پیدا ہو گیا ہے غرضکہ منظر کی لطافتیں حد بیان سے باہر ہیں صرف وہی لوگ بخوبی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں جو بذاتہ اس کا لطف اٹھا چکے ہوں۔ اس عمارت کے استحکام کی یہ حالت ہے کہ اس کی گچ ریسہ کے اور اینٹ فولاد کے مانند ہے یہی وجہ ہے کہ صدیوں سے بادوباراں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر رہی ہے۔

اس عمارت کی ویرانی کو دیکھ کر اور بانیانِ عمارت کی عظمت گزشتہ کا خیال کر کے دل پر کچھ ایسا عالم طاری ہو گیا کہ یہ چند اشعار

بے اختیار قلم سے نکل پڑے ۔

(۱)

ہے بہت خوشنما سنہری محل — دلکشا پر فضا سنہری محل
مرتفع اور بلند ہے یہ قصر — روبروئے نظر ہے سارا شہر
ہے محل وقوع فرحت زا — گرد حلقہ ہے اک پہاڑی کا
وادیٔ کوہ قاف میں گویا — یہ سنہری محل ہے پریوں کا

(۲)

خوبصورت وہ دامن کہسار — اور اُس میں وہ سایہ دار اشجار
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائے جاں پرور — چاروں جانب کھلا ہوا منظر
ہر طرف اُس کی حکم رانی ہے — جو جگہ ہے یہاں سہانی ہے

(۳)

ہے مقابل میں مقبرہ[1] ایسا — تعزیہ اک دھرا ہوا گویا
دیکھ کر مقبرے کی زیبائی — ایک تشبیہہ خوب یاد آئی
کیا ہی دلکش ہے خوش قرینہ ہے — سبزہ زاروں میں اک نگینہ ہے
قصر زرین تیرا کیا کہنا — عہد رفتہ کا ہے تو افسانا
قصر کیا ہے سراپے عبرت ہے — دیکھو جس سمت جوش حسرت ہے
اب ہے ویران تھا کبھی آباد — شان رفتہ ہے شوکت برباد
تازیانہ پئے تخیل ہے — نقش بربادیٔ تجمل ہے

(۵)

ہوگئی ہے یہ تیری حالت زار — جابجا سے جگر ہے تیرا فگار
اب کہاں وہ طلائی رنگ ترا — اب نہ وہ آب و تاب ہے نہ ضیا
تھیں کبھی جو نگار دیواریں — ہوگئیں دل فگار دیواریں
فرش جو مثل آئینہ تھا صاف — جابجا اُس میں پڑ گئے ہیں شگاف

---

[1] مقبرۂ رابعہ دورانی

کس مپرسی کی تیری حالت ہے — تیرا ویرانہ جائے عبرت ہے
حوض ہیں خشک صحن میں تیرے — خاک اڑتی ہے تجھ جہاں چشمے
روشیں ہیں وہ اب کہاں باقی — ہیں کہیں کچھ ابھی نشاں باقی

(۶)

کہہ رہے ہیں ترے در و دیوار — تھا کبھی تو بھی غیرت گلزار
کیا ہی ذی شان ہوں گے تیرے مکیں — صاحب اقتدار ذی تمکیں
پیش خدمت تھے جن کے جاہ و حشم — نصرتیں چومتی تھیں جن کے قدم
اب کہاں ہیں وہ مالک دولت — کیا ہوئی ان کی حشمت و ثروت
قصر جن کے تھے مثل قصر جناں — گھونسلے زاغ و بوم کے ہیں وہاں
گردش دہر نے کیا پامال — وہ رہے اور نہ ان کا مال و منال
نہ رہا ان کا کر و فر باقی — یادگار ان کے ہیں کھنڈر باقی

(۷)

اے محل اے وہ یادگار کہن — اے وہ تصویر انقلاب زمن
جو تجھے دیکھنے کو آتا ہے — نقش عبرت وہ لے کے جاتا ہے

سید اللہ بخش توحید

مدارس میں اردو زبان اور ادب کی ترقی و اشاعت کا مسئلہ ہندوستان میں ہمہ گیر توجہ حاصل کر رہا ہے۔ کانگریس نے ہندوستانی کو وہاں کی سرکاری زبان بنانے کا تہیہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں ہندی کے رواج کے لئے بڑی کوشش کی جا رہی ہے ایسی صورت میں اردو کے بہی خواہوں کو اردو کی بھی فکر دامنگیر ہوگئی ہے اور ہندوستان کے دیگر صوبوں کی طرح مدراس میں اردو زبان کی حالت اور اردو ادب کے نشو و نما کے بارے میں عام معلومات حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے ادارۂ ادبیات اردو نے مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی سے یہ مبسوط کتاب لکھوائی ہے۔
اس میں گزشتہ ڈھائی صدیوں سے مدارس میں اردو کا جو کام کیا گیا ہے اس کا تفصیلی ذکر درج کیا گیا ہے قیمت عہ

سب رس کتاب گھر یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہے۔

۱۳۹۸ء میں دیول رائے والیٔ بیجانگر فیروز شاہ بہمنی پر حملہ کرنے کی غرض سے ایک ٹڈی دل لشکر لے کر طوفان کی طرح اٹھا تا کہ مدگل اور رائچور وغیرہ کے قلعوں کو مسمار کرتا ہوا پائے تخت تک پہنچے اور تختۂ سلطنت کو الٹ کر شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔

دیول رائے شمالی سرحد کی طرف سے بڑھتا ہوا دریائے کرشنا کے ساحل پر پہنچا اور وہیں ڈیرے ڈال دیئے فوراً راوٹیاں اور خیمے نصب کر دیئے گئے دوکانیں لگا دی گئیں اور بیوپاری لوگ جنگل میں منگل منانے لگے۔ کیمپ تقریباً بارہ تیرہ میل تک پھیلا ہوا تھا جس میں تیس ہزار سوار اور نوے ہزار پیادوں کا لشکر جرار بحر زخار کی طرح موجیں مار رہا تھا۔ ہر پیشہ کے لوگ اس میں موجود تھے، خرید و فروخت ہو رہی تھی، بازاروں میں چہل پہل تھی، شراب خانے کھلے ہوئے تھے، دور پر دور چل رہے تھے، ارباب نشاط طوائفیں اور کسبیاں نغمہ سرائی میں مصروف تھیں اور رقص و سرود سے محفلوں کو گرما رہی تھیں۔

ادھر سلطان کو خبر پہنچی تو وہ فوراً بارہ ہزار سرفروش اور جان نثار سپاہیوں کا لشکر اپنے ساتھ لے کر آندھی کی طرح اٹھا اور گلبرگہ سے کوچ کر کے دریا کے دوسرے ساحل پر جا پہنچا۔ برسات کا زمانہ تھا، سیلاب کے طوفان نے دریا کا پاٹ اس قدر چوڑا کر دیا تھا کہ پار اترنا مشکل نظر آیا۔ اس لئے حسب ایما شاہی وہیں سراپردہ نصب کر دیا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد سلطان نے اپنے ارکان دولت اور سپہ سالاروں کو مشورہ کرنے کی غرض سے طلب کیا، دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے موافق تدبیریں بتا رہا تھا لیکن سلطان کو تشفی نہیں ہوئی اور کوئی تصفیہ نہ ہو سکا۔ بہرحال نشستند و گفتند و برخاستند کے بعد سلطان کو بہت زیادہ فکر دامنگیر ہو گئی۔

ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، اندھیری رات میں سنسان جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا اور گھوڑے سے لے کر سوار تک سانس نہیں لے رہا تھا، لیکن سلطان بدستور اسی غور و فکر میں غرق تھا کہ دریا کس طرح عبور کیا جائے اور غنیم کی فوج پر کس پہلو سے حملہ کیا جائے یکایک نظر اٹھائی تو دیکھا کہ سامنے کوئی بزرگ کھڑے ہوئے ہیں، چمکدار روشن آنکھیں، نورانی چہرہ، لانبی ستواں ناک، لمبی ڈاڑھی، دراز قد جسم پر سفید براق کپڑے۔ ادھر سلطان نے ذرا غور سے دیکھا، ادھر وہ بزرگ بھی سلام کرتے ہوئے آگے بڑھے تو معلوم ہوا کہ قاضی سراج[1] ہیں۔ سلطان نے تعجب سے پوچھا کہ اس وقت تم کدھر؟ دست بستہ عرض کی کہ پیر و مرشد، اس وقت لوگ خاموشی کے ساتھ جنگ کی تیاری میں مصروف ہیں مگر حضور کے چہرہ سے غور و فکر کے آثار نمایاں ہیں۔ اب حضور زیادہ تردد نہ فرمائیں، اس ہی خواہ دولت کو ایک تدبیر سوجھی ہے، اگر جان کی امان پاؤں تو حرف مدعا زبان پر لاؤں اور ایک تدبیر بتاؤں۔ سلطان فیروز عام طور پر علما، فضلا اور اپنے ارکان دولت سے نہایت بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ باتیں کرتا تھا، قاضی جی کی گفتگو سن کر مسکرایا اور کہا کہ قاضی صاحب! اللہ اللہ کرو، بھلا تم کو جنگ سے کیا واسطہ کیوں خواہ مخواہ اس جھگڑے میں پڑتے ہو، تم تو اپنے خیمہ میں بیٹھے ہوئے اللہ اللہ کرو اور فتح فیروزی کی دعائیں مانگتے رہو۔

---

[1] قاضی سراج بادشاہی امیروں میں سے ایک نامی عہدہ دار اور امیران صدہ کا ایک نامی فرد تھا (فرشتہ)

قاضی جی جیسا کہاں چوکنے والے تھے، دست بستہ عرض کی کہ خداوند نعمت، فتح و فیروزی کی دعا تو ہر وقت زبان پر رہے گی خواہ میں خیمہ میں رہوں یا میدان جنگ میں مگر عرض یہ ہے کہ قاضی سمجھ کر میرا نام بہادروں کی صف سے خارج نہ فرمائیے۔ باپ دادا سے فن سپہ گری ورثہ میں چلا آرہا ہے اس لئے میں اہل قلم سے ہی نہیں ہوں بلکہ اہل سیف بھی ہوں۔

سلطان نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو اپنی تدبیر بھی کہہ ڈالو۔ قاضی جی نے کہا کہ حضور تدبیر یہ ہے کہ میں آج رات دریا پار کرنے کے لئے بہت سے ٹوکرے اور لکڑی کی کشتیاں تیار کرتا ہوں۔ اس وقت غنیم کی فوج غافل ہے اگر حکم ہو تو تھوڑی سی فوج لے کر جاؤں اور سب خون مار دوں۔

سلطان نے کہا کہ قاضی صاحب آپ نے ٹوکروں اور کشتیوں کی تدبیر تو بہت ہی اچھی نکالی مگر سب خون مارنے کی تدبیر مجھے پسند نہیں آئی اس لئے کہ میں فتح کو حیلہ سے حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ پھر غنیم کی فوج ایک لاکھ سے زیادہ ہے اور ہماری صرف دو ہزار یہاں ہے۔ چار سو پانچ سو آدمی لے کر بھی گئے تو کیا فائدہ ہے۔ غنیم کی فوج تو اس پار دور تک پھیلی پڑی ہے۔ شب خون کسی طرح پر انہیں پسپا نہیں کر سکتا۔

قاضی جی کی طبیعت ان معاملات میں بلا کی رسا واقع ہوئی تھی۔ فرمایا مثل مشہور ہے کہ الحرب خدعۃ۔ بس ہم بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ چار پانچ سو آدمی تو ان کے لئے کافی سے زیادہ ہیں۔ خدا نے چاہا تو یہی لوگ ان کو خرگوشوں کی طرح بھگا دیں گے۔ ہاں اگر کسی مصلحت کی بنا پر پیر و مرشد اس کے خلاف ہیں تو آپ اجازت مرحمت فرمائی جائے کہ میں اپنے ساتھ بہت سے آدمی لے کر دریا کو عبور کروں اور خفیہ طور پر غنیم کے لشکر میں پہنچ جاؤں یا اس کے بیٹے کا کام تمام کر دوں۔ اس اثنا میں یہاں فوج بھی ٹوکروں اور کشتیوں سے دریا کے اس پار اتر آئے۔ جب شور بلند ہو تو فوراً ہمارے لشکری دشمن پر گریں اور اس سے پہلے اٹھائیں۔

بادشاہ قاضی جی کی یہ تدبیر سن کر مسکرایا اور خاموش ہو گیا مگر قاضی جی پارے کی طرح بے قرار تھے۔ بادشاہ کے سکوت کو "السکوت کالرضا" سمجھے فوراً سلطان سے رخصت ہو کر کیمپ پہنچے اور سات جوان مرد اپنے ساتھ لئے۔ جو آٹھوں ان کا سا کیسٹ تھے۔ اور فقیروں کا بھیس کرکے چل کھڑے ہوئے۔ صبح ہوتے ہوتے غنیم کے کیمپ میں جا پہنچے۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر ٹاک ٹوئیے مارتے رہے۔ جب کہیں دال گلتی نظر نہ آئی تو ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر آپس میں کھچڑی پکانی شروع کر دی۔ قاضی جی نے ذرا مراقبہ کیا۔ ہزاروں عیاریاں اور چالاکیاں ہاتھ باندھے ہوئے سامنے موجود ہو گئیں پھر کیا تھا۔ فوراً داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور ساتھیوں کو بشارت دی کہ ایک ترکیب سوجھی ہے اب انشاءاللہ فتح ہی فتح ہے۔ ساتھیوں نے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ تو فرمایا کہ راجہ کی فوج کے ساتھ ہزار ہا نشاط طوائفیں اور کسبیوں کے طائفے بھی موجود ہیں۔ بس تم سب یہ سمجھ لیجئے وہیں میں سولہ آنہ امید ہے کہ وہاں پہنچ کر ضرور کامیابی کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ ساتھیوں نے پھر پوچھا کہ آخر وہاں جا کر کیا کیجئے گا؟ تو قاضی جی نے فرمایا کہ تمہیں کیا معلوم کہ فقیر جھولی میں کیا ڈالتا ہے اور کیا نکالتا ہے۔ بس تم لوگ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ اور جو کچھ میں کہوں اس پر بے چون و چرا عمل کئے جاؤ۔ القصہ سب نے مل کر کسبیوں اور طوائفوں کے کیمپ کی طرف دھاوا بول دیا۔ قاضی صاحب شاہ صاحب کا بھیس بدلے خضر راہ بنے ہوئے آگے آگے تھے اور ان کے چیلے اور مرید اپنے مرشد کے پیچھے قدم بقدم چل رہے تھے۔ اول خرابات میں پہنچے اور وہیں دھونی رما دی۔ دو چار روز کے بعد یہ درویشوں کی ٹولی کسبیوں کے کیمپ میں پہنچی اور ان کا نہایت تفصیل کے ساتھ بھید لینا شروع کر دیا۔ ایک مقام پر دیکھا کہ ایک طوائف نہایت طرحدار حسین، مہ جبین، نوکیلی چھبیلی، کنگھی چوٹی سے درست نفیس تنگی

سے آراستہ و پیراستہ: شمعِ محفل بنی بیٹھی ہے۔

اس وقت قاضی جی کو سات خون معاف تھے، اسے دیکھتے ہی رال ٹپک پڑی، کانوں تک باچھیں کھل گئیں، دل سینہ میں بانسوں اچھلنے لگا، ڈورے ڈالنے کے لئے پروانہ وار آگے بڑھے اور اس کے سامنے بیٹھ کر وہ وہ باتیں بنائیں کہ رہے نام سائیں کا۔

اس موقع پر قاضی جی نے اپنے آپ کو پرلے نمبر کا عاشق مزاج، دل پھینک اور رنگیلا ثابت کرنے کی کوشش کی۔ سوجان سے قربان ہو رہے تھے، جو کچھ روپیہ پیسہ اپنے ساتھ لائے تھے بے دریغ اس پر سے تار کر نا شروع کر دیا، وہ وہ باتیں بنائیں، وہ وہ روغن قاز ملا کہ طوائف بھی ان پر ریجھ گئی اور اُسے یقین ہو گیا کہ یہ مجھ پر لٹو ہے۔ رات بھر خوش مذاقی اور ظرافت کی آتشبازی چھوٹتی رہی۔ تمام رنڈیاں اور ڈوم ڈھاڑی قاضی جی سے لپٹے ہوئے تھے اور قاضی جی اپنی مضحکہ خیز حرکتوں اور پرلطف باتوں سے اس محفل کو خوب گرما رہے تھے۔ اس وقت بقول انشاء اللہ خاں، قاضی جی کی یہ کیفیت تھی کہ۔

شب محفل ہولی میں جو وارد ہوا زاہد ۔ رندوں نے لپٹ کر
ڈاڑھی کو دیا اس کی رنگا بند قطونا ۔ اور بھینے لگی گت
تب منہ پہ کہنے لگے تک پر طونا ہو ۔ رکھ ناک پہ انگلی
او ر آئے جی آنے سے برا مانے سو بھڑوا ۔ ہے موسم عشرت

دو چار روز اسی طرح گزرے، اتفاقاً ایک روز رات کے وقت قاضی جی کی معشوقہ راجہ کنور کے دربار میں مجرے کے لئے طلب کی گئی اور وہ جانے کیلئے تیاری کرنے لگی، قاضی جی کو جیسے ہی یہ پتہ لگا، بس مچل گئے، فوراً آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور لگے ٹسوے بہانے پھر یہ ہی نہیں بے تاب ہو کر پروانہ وار اس کے گرد پھرنے لگے اور قدموں پر گر کر عرض کرنے لگے کہ جدائی کی گھڑیاں مجھ سے نہیں کٹ سکیں گی خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو یا تو تم وہاں نہ جاؤ یا مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ طوائف نے کہا کہ قاضی جی کیا عقل ماری گئی ہے، اپنے ہوش کے ناخن لو۔ ہم تو راجہ کے نوکر ٹھہرے، پھر بڑی بات یہ کہ خود کنور جی نے طلب فرما کر ہماری عزت افزائی فرمائی ہے ایسی صورت میں بھلا میں حکم عدولی کیسے کر سکتی اور اپنے ساتھ راج سبھا میں تمھیں کیسے لے جا سکتی ہوں۔ اس لئے کہ وہاں تو صرف وہی شخص جا سکتا ہے جو گانے بجانے اور ناچ رنگ میں مشاق ہو۔

قاضی جی نے جواب دیا کہ اے جانِ جہاں! کیا تم نے اوروں کی طرح مجھ کو بھی نرا کاٹھ ملا سمجھ لیا ہے، رام کی دیا سے میں بھی گانے بجانے سے اچھی طرح واقف ہوں، اس کے علاوہ وہ وہ کمالات جانتا ہوں کہ راجہ صاحب بھی دیکھ لیں تو بھونچکا ہو کر رہ جائیں۔ طوائف نے خیال کیا وہ ان کی لے رہا ہے، مسکرائی، اور اپنا ستار ان کی طرف کھسکا کر کہا کہ لیجئے ذرا اس کو تو چھیڑ دیجئے۔ قاضی جی نے فوراً ستار ہاتھ میں لے پردوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا، پھر جوڑا اور باج کے تاروں کو ٹٹولا اور طربوں کے سُر ملا کر وہ استادی سے بجایا، وہ وہ گت ساری اور میند کاری کے کمالات دکھلائے کہ طوائفیں اور کسبیاں تو رہیں ایک طرف ان کے سازندے بھی سن کر دنگ رہ گئے۔ اب تو ان کی معشوقہ کا ماتھا ٹھنکا، سوچی کہ اس کا ساتھ رکھنا تو باعث فخر و عزت ہے، ناچ گانے سے بھی خوب واقف ہے، باتیں بھی خوب بنا لیتا ہے

بہت ممکن ہے کہ اس کے طفیل سے ہم پر بھی ہن برسنے لگے، فوراً سب کو طائفہ میں شریک کر لیا اور انہیں اپنے ساتھ لئے راج کنور کے دربار میں جا پہنچی۔

محفل کیا کچھ بھری ہوئی تھی، دیول رانے کا سیت اور اس کے احباب اس میں نہیں بول رہے تھے، شراب کا دور چل رہا تھا۔ اس طائفہ کے پہنچتے ہی گانا شروع ہو گیا۔ طبلہ پر تھاپ پڑی، سارنگی ریں ریں کی، مجیرے بجنے لگے۔ طائفہ کی سریلی آواز اور گھنگروؤں کی چھم چھم سے محفل کا رنگ ہی بدل گیا، دیر تک محفل رقص و سرود گرم رہی۔ گانا ختم ہوا تو نقالوں کی باری آئی۔ قاضی جی فوراً ایک ساتھی کو لے کر اکھاڑے میں کودے۔ یہ دونوں زنانہ لباس پہنے، سرمہ، مسّی اور زیور سے سدا سہاگن بنے، ناز و غمزے کرتے، مٹکتے، ٹھمکتے، تالیاں بجاتے اور کمر مٹکاتے ہوئے بس مسخرہ خیز انداز میں راج کنور کے سامنے آئے کہ اہل محفل ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ پھر ان بہروپیے نقالوں نے تمسخر، ضرب بازی، اور گت بازی میں وہ وہ کمالات بتائے کہ راج کنور اور پوری محفل اش اش کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد قاضی جی نے اپنی غیر معمولی چلت پھرت اور دلفریب تھرت کے ساتھ رقص شروع کر دیا۔ لے میں ڈوبا ہوا ساز، سُروں میں ڈوبی ہوئی آواز، اور قتیہ راگ راگنی کے سوز و گداز نے محفل پر جادو سا کر دیا، ہر شخص بت بنا ہوا ان کو ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہا تھا، اسی اثنا میں دونوں نے کمر سے خنجر کھینچ، بھاؤ بتانے شروع کر دئے اور نہایت بیباک روی کے ساتھ وہ وہ جوڑ توڑ دکھائے اور وہ وہ ہاتھ اور پینترے نکالے کہ بھری محفل وجد کرنے لگی۔

آخر کار پا فولے کاٹتے اور پینترے بدلتے ہوئے دونوں کے دونوں راج کنور کی طرف آہستہ آہستہ بڑھے پھر لپک کر اس کے سینے و شکم میں دونوں نے بیک وقت ایسے کاری خنجر بھونکے کہ وہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ اور تماشائی نشہ میں چور اور مست و مخمور تھے۔ جو لڑکھڑاتے ہوئے باہر بھاگے انہیں قاضی جی کے ان ساتھیوں نے سنبھالا جو باہر کھڑے ہوئے تال دے رہے تھے جو بھاگ نہ سکے وہ وہیں کے ہو کے رہ گئے۔

اب قاضی جی اور ان کے ساتھیوں نے کیمپ کے چراغ گل کرنے شروع کر دئے۔ پھر کیا تھا چراغ گل، پگڑی غائب، لشکری حیران و پریشان، اصل واقعہ سے بے خبر، سمجھے کہ سلطان کے لشکر نے شب خون مارا ہے۔ شراب کا نشہ، کچی نیند اور رات کی تاریکی میں ایک دوسرے پر پل پڑے، ہر طرف صدائے دار و گیر بلند ہو گئی۔ ادھر قاضی جی نے اپنے ساتھیوں کو اطلاع دینے کی غرض سے سلطان کی طرف روانہ کر دیا، اور خود کسی گوشۂ عافیت میں سر چھپا کر بیٹھ گئے۔

دیو رانے نے یہ کیفیت دیکھی تو ہوش پراں ہو گئے۔ بس اندھیرے منہ اپنے لڑکے کی لاش لے کر بغیر لڑے بھڑے بیجانگر روانہ ہو گیا۔ دوسرے روز جب مشرق کا شہسوار تاروں کی فوج کو شکست دے کر شعاع کا نیزہ ہاتھ میں لئے نکلا، فیروز شاہ سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق، جسم پر زرہ بکتر اور چار آئینے، سر پر خود فولادی، کمر میں شمشیر اصفہانی، پشت پر سپر، کندھے پر کمان، کمند ابریشمی شکار بند میں آویزاں، عربی گھوڑے پر سوار اپنی فوج ظفر موج کو لئے ہوئے آ پہنچا۔ نقارے پر چوٹ پڑی کہ دل سینوں میں دہل گئے، اللہ اکبر، اللہ اکبر کے نعروں سے دشت و ہامون گونج اٹھے۔ بہادروں نے بڑھ کر حملہ کیا، پھر کیا تھا، تلواروں سے

تلواریں اور نیزوں سے نیزے اژدہوں کی طرح زبانیں نکالے ہوئے ایک دوسرے سے گتھ گئے ۔ تیروں کی دھواں دھار بارش سے آسمان پر ایک ابر سا چھا گیا ۔ جس میں برچھیوں کی سنانیں اور بھالوں کی انیاں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر بجلیاں گرا رہی تھیں ۔ بڑے گھمسان کی لڑائی ہوئی ۔ گھمسان کا رن پڑا ۔ جدھر دیکھو کشتوں کے پشتے لگے تھے ۔ خون کا سیلاب بہہ رہا تھا ۔ کوئی سسک رہا تھا کوئی ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور کوئی تڑپ تڑپ کر رہا تھا ۔ غرض یہ کہ قاضی جی کے ناچ نے سب کو گھنی کا ناچ نچا دیا تھا ۔

بارہ ہزار بہادروں نے وہ جی توڑ کر حملہ کیا کہ ایک دھاوے میں غنیمہ ہزار سے زیادہ کا کھیت کر دیا جو باقی رہے ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور ایسے اکھڑے کہ پھر نہ جمے ۔ یار لوگ عجیب عجیب طرح بھاگ رہے تھے ۔ کوئی بے تحاشا بھاگا ۔ کوئی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا ۔ کوئی نوک دم بھاگا اور کوئی دم دبائے بھاگا چلا جا رہا تھا ۔ پیادوں کو ہوش نہ تھا کہ ہاتھ میں تلوار ہے یا میان سونٹا ۔ سوار کو خبر نہ تھی کہ وہ گھوڑے پر سیدھا سوار ہے یا الٹا ۔ فتحیابوں نے کئی کوس تک ان کا پیچھا کیا ۔ بلکہ ان کے گھر تک پہنچا کر واپس آئے ۔ راستہ میں زخمیوں کی کمریں اور مردوں کی ہمیانیاں کھول کھول کر اپنے کر کیسے خوب ٹھونک ٹھونک کر بھرے اور اس قدر زر جواہر مال و دولت ہاتھ آیا کہ جس کا حد و حساب نہیں ۔

گھوڑوں کی ٹاپوں سے میدان جنگ میں جو غبار اٹھا ، قضا نے ہاتھ بڑھا کر نیزے کی انی سے اس پر فیروز شاہ کا نام لکھ دیا ۔ الغرض راجہ کو ایسی شکست فاش ہوئی کہ اس کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے ۔ سلطان فیروز شاہ اپنے لشکر کے ساتھ کامیابی کے جھنڈے اڑاتا ہوا اور فتح و فیروزی کے نقارے بجاتا ہوا اپنے دارالسلطنت واپس ہوا ۔ اس خدمت کے صلہ میں قاضی سراج خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوئے اور گروہ امرا میں داخل ہو کر چین کی بنسی بجا گئے ۔ ہے ۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

باغ دکن

یہیں بہار کا پہلے پہل بنا ہے یہ چمن
عجیب خطۂ دلکش ہے خاکِ پاکِ دکن

نگاہِ شوق کو کیا کیا سماں دکھاتا ہے
انوکھی شان زمانہ کو یہ بتاتا ہے

نمونۂ کرم و لطف کردگار ہے یہ
یہ باغِ علم ہے گہوارۂ بہار ہے یہ

گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمیں شاداب
لطیف و سرد ہوا پاک و صاف چشمۂ آب

کمی نہیں ہے کسی شئے کی اس گلستاں میں
عجب بہار ہے کچھ اس کے سرو و ریحاں میں

طلسم حسن کا خاکِ دکن ہے گلدستہ
بہم کھڑے ہیں شجر اور کوہ صف بستہ

مسافر آکے جو اس جا قیام کرتے ہیں
مناظر اس کے انہیں جلد رام کرتے ہیں

بلندیوں سے جو ہو مائل نشیب نظر
فریب دیتا ہے تالاب کا حسیں منظر

وہ دیکھو دور سے پانی ہے یوں نظر آتا
سفید سانپ چلا جائے جیسے بل کھاتا

اقبال الدین احمد
سابق اڈیٹر کامریڈ و ادبی دنیا

دکن کے نسوانی ادارے

عہد عثمانی میں جہاں مملکت اور ابنائے مملکت کی ہمہ جہتی فلاح و بہبود کی خاطر سیکڑوں اصلاحیں عمل میں آئی ہیں وہاں طبقۂ نسواں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح حال کے لئے بھی جو سعی بندگانِ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی مرضی مبارک پر حکومت نے اپنی امکانی کوششیں کی ہیں اور مسلسل کئے جا رہی ہے۔

تعلیم نسواں کے سلسلہ میں جو تجاویز عمل میں آئی ہیں اور جو اقدامات کئے گئے ہیں ان کی اہمیت اور وقعت دوسری تجاویز سے کہیں زیادہ ہے! تعلیم نسواں کی اہمیت مردوں کی تعلیم سے بہت زیادہ ہے۔ کسی بھی قوم کے ارتقا کا دار و مدار ہے ہماری آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت، ان کی اخلاقی اصلاح اور ان کی بہتری کے لئے عورت کا صحیح تعلیم و تربیت یافتہ ہونا بس ضروری ہے۔ عورت نہ صرف مرد کا بلکہ ساری قوم کا "نصف بہتر" ہے۔ اس کو جاہل اور تعلیم و تربیت سے محروم رکھ کر ہم کبھی ترقی کی شاہراہ پر گامزن نہیں ہو سکتے۔

عہد عثمانی میں تعلیم نسواں نے ترقی کے جو مدارج طے کئے ہیں اور خواتین دکن نے اصلاح معاشرت و تمدن کی جو کوششیں کی ہیں ان کا اجمالاً تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۳۲۰ف میں جبکہ موجودہ فرمانروائے دکن نے زمام سلطنت اپنے دستِ مبارک میں لی صرف (۹۱) مدارس نسواں ممالکِ محروسہ سرکارِ عالی میں قائم تھے جن میں (۶۲۴۶) لڑکیاں زیر تعلیم تھیں۔ سنہ ۱۳۵۵ف کے اعداد و شمار سے تعلیم نسواں کی ترقی کی رفتار اس طرح واضح ہوتی ہے کہ نسوانی درس گاہوں کی تعداد ۷۶۲ ہو گئی ہے جن میں ساٹھ ہزار لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں۔ ان مدارس میں ۶۹۲ تحتانیہ ہیں جن میں (۴۶۱۰۶) طالبات تعلیم پا رہی ہیں۔ مدارس وسطانیہ ۶۰ ہیں جن کی طالبات کی تعداد ۲۴۰۰ ہے۔ مدارس فوقانیہ نو ہیں ان میں ۲۶۳۳ لڑکیاں ہیں۔ تعلیم نسواں پر معتد بہ رقم جو ہر سال صرف ہو رہی ہے اس کا ایک معمولی اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف سنہ ۱۳۵۵ف میں ہماری علم دوست اور فیاض حکومت نے کوئی ساڑھے نو لاکھ روپے اس طبقہ کی تعلیم پر صرف کئے ہیں۔

ذیل میں چند سرکاری، امدادی و خانگی نسوانی مدارس اور خواتین کے اصلاحی و معاشرتی اداروں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ہم یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ عہد عثمانی میں تعلیم و تمدن نسواں نے ترقی کی منزلیں کس حسن و خوبی سے طے کی ہیں اور خواتین دکن میں تحصیل علم اور اصلاح معاشرت کے جذبات کس حد تک کارفرما ہیں۔

نامپلی زنانہ اسکول

مدرسۂ فوقانیہ نسواں نامپلی کا قیام سنہ [illegible]ف میں عمل میں آیا۔ اس وقت اسکول میں صرف سولہ لڑکیاں شریک تھیں۔ رفتار ترقی تقریباً ناپید تھی مگر سلطان العلوم کے تخت نشین ہوتے ہی ایک عظیم تغیر رونما ہوا۔ طالبات کی تعداد بتدریج بڑھنا شروع ہوئی چنانچہ اس وقت اس میں ۱۱۶۰ لڑکیاں زیر تعلیم ہیں۔ علاوہ لڑکیوں کو امور خانہ داری، دستکاری، صحت، سلائی اور پکوان کی بھی باضابطہ صحیح اصول پر عملی تعلیم دی جاتی ہے۔

کلیۂ اناث

تعلیم نسواں کا معیار بلند کرنے اور طبقۂ نسواں کو اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور کرنے کیلئے سنہ ۱۳۴۳ف میں کلیۂ اناث کا قیام عمل میں آیا۔ اس کالج کے ابتدائی اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم پانے والی طالبات کی تعداد

نصف درجن سے زیادہ نہیں تھی، اسٹاف صرف ایک پرنسپل اور ایک پروفیسر پر مشتمل تھا اور اب کوئی ایک درجن خاتون پروفیسر ساٹھ ستر لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے زینے طے کرا رہی ہیں۔

وظایف تعلیمی

کلیۂ اناث کی کامیاب طالبات کو انکی مخصوص اور امتیازی کامیابیوں کے مدنظر ہماری علم پرور حکومت سے ممالک غیر میں تکمیل تعلیم کے لئے وظائف عطا کئے جاتے ہیں اور اکثر خواتین باہر جاکر امتیازی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ خدمات پر اسی کالج میں مامور ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس وقت ایسی کئی خواتین کالج کی خدمات پروفیسری کو انجام دیتی ہیں۔

محبوبیہ زنانہ اسکول

یہ اسکول ۱۳۱۷ف سے قائم ہے، اس میں سینیر کیمبرج تک تعلیم دیجاتی ہے، یہاں زیادہ تر امرا اور معزز طبقہ کی لڑکیاں شریک ہیں یہاں کی اکثر طالبات سینیر کیمبرج کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے کلیۂ اناث میں داخل ہوتی ہیں، اسمیں طالبات کی تعداد ۱۳۴۶ف کے آخر میں (۴۰۹) تھی، اس اسکول میں کمسن لڑکے بھی داخل ہوسکتے ہیں، علاوہ تعلیم کے دستکاری، مصوری موسیقی، خانہ داری، سلائی اور پکوان کی بھی عملی تعلیم دیجاتی ہے، سادہ معاشرت کا عادی بنانے، لباس میں سادگی پیدا کرنے اور لڑکیوں کو کفایت شعار بنانے کے لئے اس اسکول کی دوراندیش اور تجربہ کار پرنسپل طالبات کو سادہ لباس استعمال کرنے اور زیوارات کو ترک کرنیکی ترغیب و ہدایت دیتی رہتی ہیں، اسکول کی عمارت میں چند سال پہلے کافی توسیع کی گئی ہے۔ اس اسکول میں بھی ہر قسم کے میدانی کھیل ڈرل اور جمناسٹک کا اچھا انتظام ہے۔

مدارس تعلیم المعلمات

یہ مدارس خصوصاً معلمات کو طرز تعلیم سے واقف کرانے کے لئے قائم کئے گئے ہیں ان میں علاوہ (۱۰۴) طالبات کے (۹۰) معلمات بھی مصروف طرز تعلیم و تدریس ہیں، ان کو طرز تعلیم کے جدید طریقوں سے واقف کرایا جاتا ہے۔

ماڈل پرائمری اسکول

یہ اسکول ۱۳۴۲ف میں قائم کیا گیا ہے اس میں مخلوط اسٹاف چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کو تعلیم کے لئے تیار کرتا ہے یہاں باغبانی بھی سکھائی جاتی ہے۔

گرل گائیڈ

کوئی آٹھ سال سے "گرل گائیڈ" کی تحریک جاری ہے، اس تحریک کے بنیادی اصول انسانوں اور جانوروں کے ساتھ ہمدردی ایک دوسرے کی تائید، زخمیوں کی فوری امداد، تیمارداری اور خود اعتمادی ہیں۔ اس تحریک میں کلیۂ اناث، مدرسۂ نسواں نامپلی، محبوبیہ زنانہ اسکول اور تعلیم نسواں کے بعض دوسرے ادارے بھی شریک ہیں کھلی فضا میں سیر و تفریح کے مواقع اور معاشرتی پارٹیاں لڑکیوں کے لئے بڑی دلچسپیوں کا باعث ہوئے ہیں۔

انجمن ترقی تعلیم و تمدن نسواں

تعلیم نسواں کی ترقی اور اعلیٰ تعلیم کی نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ خواتین دکن کی معاشرت، تمدن اور ذہنیت میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ اعلیٰ تعلیم اور صحیح تربیت پائی ہوئی خواتین علم کی خوبیوں سے واقف ہونیکے بعد اپنی ان بہنوں کو جنہیں حصول تعلیم کے ذرایع میسر نہیں علم کی برکات سے واقف کرانے اور روشن خیال بنانیکی پوری کوشش کر رہی ہیں اسی خیال کے تحت یہ انجمن ۱۹۲۷ء میں قائم کیگئی ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ سماجی اور معاشرتی اصلاحات کا تبلیغی کام بھی یہ انجمن بہ احسن وجوہ انجام دے رہی ہے۔ اس انجمن کی صدر محترمہ بیگم صاحبہ نواب ولی الدولہ اور نائب صدر مشہور پارسی خاتون مسز رستم جی فریدوں جی ہیں، ان دونوں روشن خیال اور ملک و قوم کا درد رکھنے والی معزز خواتین کی سرپرستی میں یہ انجمن خوب پروان چڑھ رہی ہے، اشاعت تعلیم، اصلاح معاشرت و رسم و رواج کے مختلف اصول اور طریقے اس انجمن کے پیش نظر ہیں، یہ انجمن متعدد

زنانہ مدارس کی امداد و نگرانی کرتی ہے، غریب اور شوقین لڑکیوں کو وظائف تعلیمی بھی اس انجمن سے دئے جاتے ہیں۔ اس انجمن کے تحت پانچ مدارس قائم ہیں، ان میں تقریباً چار سو بچوں کو مفت ابتدائی تعلیم دیجاتی ہے۔

دارالاقامہ اس انجمن کی سرپرستی میں ایک دارالاقامہ شہر کے وسط میں قائم کیا گیا ہے، اس میں باہر سے آئی ہوئی خواتین بلالحاظ مذہب و ملت قیام کر سکتی ہیں، یہ اقامت خانہ خاص طور پر ان غریب خواتین کی ضرورت کو پورا کرتا ہے جو دایہ گری اور تیمار داری کی عملی تعلیم شفاخانوں میں حاصل کرتی ہیں اور ختم تعلیم پر مختلف دواخانوں اور ہسپتالوں میں ملازم ہوتی ہیں۔

دارالمباحثہ اس انجمن کے زیر سایہ ایک دارالمباحثہ بھی قائم ہے۔ اس میں تعلیم یافتہ خواتین تقریری مقابلے کرتی ہیں۔ اس قسم کے تقریری مقابلوں سے خواتین میں علمی ذوق پیدا کرنے کے علاوہ تقریر کرنے کی قابلیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس سال دارالمباحثہ کی جانب سے ایک پرجوش مناظرہ اردو میں ہوا۔ اس جلسہ میں بلحاظ آراء یہ طے ہوا کہ ہندوستان میں بچوں کی پرورش کا موجودہ طریقہ ناقابل اطمینان ہے۔

ذیلی کمیٹیاں اس انجمن کی کئی ذیلی کمیٹیاں ہیں جو خواتین کے حقوق کی حفاظت، کمسنی کے ازدواج کی مخالفت، عورتوں اور بچوں کی جسمانی اور اخلاقی بہتری کے لئے مناسب تجاویز عمل میں لاتی ہیں۔ تقریروں کے ذریعہ اس انجمن کی اراکین اپنی بہنوں کو ان کے حقوق اور فرائض سے آگاہ کرتی ہیں اور ان کو اپنی صحت و تندرستی کی جانب بطور خاص متوجہ کرتی ہیں۔ ایک کمیٹی عورتوں کی قانونی دشواریوں پر غور کرنے کے لئے مقرر کیگئی ہے۔ اس سال ہر کمیٹی کا ایک عام جلسہ ہوا جس میں کئی اداروں کی مسلم خواتین شریک ہوئیں۔ اس جلسہ میں وہ "نکاح نامہ" پیش کیا گیا جسکو مسز حامد علی خان نائب صدر کل ہند خواتین کی کانفرنس نے مرتب کیا ہے۔ یہ نکاح نامہ ایک اقرار نامہ کی شکل میں ہے جس میں مسلم خواتین کو تحت قانون شرع طلاق کا حق دیا گیا ہے۔ جملہ شریک جلسہ خواتین نے بلحاظ آراء اس نکاح نامہ کو منظور کیا۔

اس انجمن کو کل ہند خواتین کی کانفرنس کی مستقل کمیٹی نے حیدرآباد کی خواتین کی نمایندہ انجمن تسلیم کرلیا ہے۔ اس انجمن سے اس کے نمایندے سالانہ کل ہند کانفرنس کے جلسوں میں بھیجے جاتے ہیں اور کانفرنس کی مستقل کمیٹی میں اس انجمن کی ایک رکن حیدرآباد کے نمایندے کی حیثیت سے شریک رہتی ہے۔

دی گرلز اسکول کوآپریٹیو بلڈنگ سوسائٹی لمیٹڈ مسز نسیم جی کی صدارت میں محدود ذمہ داریوں کی ایک سوسائٹی زنانہ مدارس کی عمارتوں کی تعمیر کے لئے ۱۳۳۵ف میں قائم کیگئی ہے۔ اس سوسائٹی کا مقصد یہ ہے کہ عمارتیں غریب لڑکیوں کے مدارس کیلئے مختلف مقامات پر تعمیر کرائے۔ چنانچہ ایک ایسی ہی عمارت خیریت آباد میں تعمیر کیگئی ہے جس میں ایک اسکول قائم ہے۔

زنانہ کلب گزشتہ چند سال کے اندر حیدرآباد اور سکندرآباد میں خواتین کے کئی کلب قائم ہوگئے ہیں۔ ان کے لئے نہایت کشادہ اور شاندار عمارتیں تیار کیگئی ہیں۔ پردہ کے معقول انتظام کے ساتھ کلب کی اراکین مختلف قسم کے کھیل و تفریحات سے مستفید ہوتی ہیں۔ کھیل اور تفریح کے علاوہ تقاریر کے ذریعہ دماغی اور اخلاقی ترقی بھی ہوتی ہے۔

لیڈیز اسوسی ایشن کلب اس کلب کی بنا کسی زمانہ میں مسز حیدر نواز جنگ مرحومہ نے ڈالی تھی۔ اس وقت یہ کلب نہایت اعلیٰ پایہ پر قائم ہے۔ اس کی صدر لیڈی حیدری ہیں، جن کی نگرانی میں اس کی شاندار اور خوبصورت عمارت تیار ہوئی۔ اس کلب کے اراکین کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ ہے۔ اس کلب کی جانب سے ہر سال دو طلائی میڈل ان طالبات کو عطا کئے جاتے ہیں جو انگریزی اور اردو کے مضامین میں نمایاں کامیابیاں حاصل کرتی ہیں۔ غریب لڑکیوں کو تعلیمی وظائف بھی دئے جاتے ہیں۔ اس کلب کی اراکین مختلف تفریحات اور میدانی کھیلوں کے علاوہ تقریری مقابلوں میں بھی شریک ہوتی ہیں۔

لیڈیز ریکریشن کلب گزشتہ چند سال سے یہ کلب قائم ہے، اس کی صدر رانی شام راج راجونت بہادر ہیں۔ اس کے اراکین کی تعداد تقریباً دو سو ہے۔ میدانی

کھیلوں اور دوسری تفریحات کے علاوہ اس میں ایک تیرنے کا تالاب بھی ہے۔ اس میں خواتین تیراکی کا شوق بھی پورا کرتی ہیں

متذکرہ صدر اداروں کے علاوہ خواتین کی اور کئی انجمنیں بھی ہیں مثلاً انجمن خواتین دکن، انجمن خواتین اسلام، ... خواتین کی انجمن، گجراتی خواتین کی انجمن، عیسائی خواتین کی انجمن، بہبودیٔ اطفال کے متعدد مراکز وغیرہ۔

انجمن خواتین دکن خواتین کی انجمنوں میں اس انجمن کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ یہ انجمن ۱۳۳۵ھ میں مسز صغرا ہمایوں مرزا کی صدارت میں قائم ہوئی۔ اس انجمن کی سرپرست رانی شام راج راجونت بہادر ہیں۔ اس انجمن کے مقاصد یہ ہیں۔ مذہب و ملت کی تمیز کئے بغیر ... دکن کی ... امداد دینا، بیوہ عورتوں اور نادار لڑکیوں کو دستکاری سکھانا، معذور عورتوں کو ماہانہ امداد و وظائف ... کرنا ہے۔

اس انجمن کی کامیابیاں زیادہ تر محترمہ مسز صغرا ہمایوں مرزا کی عالی ہمتی و ایثار کی مرہون منت ہیں۔ اس انجمن نے اب تک بہت سی کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ نقد وظائف معذور، بیوہ اور مدد کی محتاج عورتوں کو ماہانہ امداد دی جاتی ہے۔ اس انجمن کی زیر نگرانی زنانہ صنعت و حرفت کا ایک مدرسہ قائم ہوا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہوگا جس میں ادبی تعلیم کے ساتھ ساتھ امور خانہ داری اور مختلف فنون کی عملی تعلیم کا خاص انتظام کیا جائے گا۔ محترمہ صدر انجمن نے بڑی فیاضی سے اپنی جائیداد کا بڑا حصہ اس ادارہ کے لئے وقف کر دیا ہے۔ ... انجمن کی سرپرستی میں ہر سال ... نمائش کی جاتی ہے۔ اس نمائش میں تعلیم نسواں کے مختلف ادارے حصہ لیتے ہیں۔ اس انجمن کی نگرانی میں اس وقت تین زنانہ اسکول قائم ہیں۔ ... ان کی کارگزاریاں دیکھنے کے بعد مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں ابھی ایسی حساس خواتین موجود ہیں جو اپنی صنف کی تن من دھن سے خدمت کر رہی ہیں

بستان طالبات یہ ادارہ کوئی دس سال سے قائم ہے۔ اس میں یتیم بے یار و مددگار لڑکیوں کے قیام و طعام کا انتظام کیا جاتا ہے اور ان کو تعلیم و تربیت کے ساتھ امور خانہ داری، سوزن کاری اور پکوان وغیرہ کی عملی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس وقت ... لڑکیاں زیر پرورش ہیں۔ اس ادارہ کی معتمد محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ بانو نظامی ہیں۔ علاوہ یتیم لڑکیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے یہ ادارہ ... مفلس بیوہ عورتوں کی امداد بھی کی جاتی ہے۔ سلائی کا کام ان کے لئے فراہم کیا جاتا ہے اور اجرت پر ان سے کام لیا جاتا ہے اور ان کو کشیدہ کاری اور سلائی کی تعلیم بھی مفت دی جاتی ہے۔

چند خانگی ادارے چند خانگی مدارس بعض حساس اور ہمدرد ملک و قوم خواتین کی سرپرستی اور نگرانی میں قائم ہیں۔ بیگم ... صاحب ... کالج نے ایک خانگی اسکول اپنے مکان پر ملازمین کی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے قائم کیا ہے جس میں سلائی کی تعلیم ... دیتی ہیں۔ مسز ... صاحب نے ایک ایسا ادارہ اپنی قیام گاہ جوبلی ہل پر قائم کیا ہے جس میں صرف بیوہ عورتوں کو سلائی اور کشیدہ کاری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مسز ... نے اپنے مکان پر ایک مختصر سا اسکول ادنیٰ نوکروں کی اولاد کے لئے قائم کیا ہے جسکو وہ خود تعلیم دیتی ہیں۔

متذکرہ صدر اعداد و شمار سے واضح ہوگا کہ خواتین دکن میں بیداری کے احساسات کس قدر پیدا ہو گئے ہیں اور اس طبقہ نے ہمارے آقائے ولی نعمت کے عہد میمنت مہد میں اپنی ہر جہتی فلاح و بہبود کے لئے کیسے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ تعلیمی، ذہنی و معاشرتی ترقی کے زینے کس حسن و خوبی سے طے کئے جا رہے ہیں۔ ترقی کی اس رفتار کو دیکھ کر دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ طبقہ مستقبل قریب میں ... طے کر کے بہت جلد بام ترقی پر پہنچ جائیگا۔ تعلیم نسواں کی یہ رفتار پیش خیمہ ہے اس طبقہ کے درخشاں مستقبل کا۔ وہ دن دور نہیں کہ ہماری ملکی بہنیں دوسرے ممالک متمدنہ کی خواتین کی طرح زیور علم سے آراستہ اور صحیح تربیت یافتہ ہو کر علم و عمل کی روشنی سے جہالت کی تاریکی کو ملک سے دور کریں گی۔

مرزا سیف علیخاں

سب میں
دنیا کا سب سے بڑا ہیرا ہے کیونکہ اس کا وزن ۲۳۹ قیراط ہے

"الماس نظام" کے ابتدائی تاریخی واقعات کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہ ہیرا نواب میر فرخندہ علی خاں بہادر آصفجاہ رابع کے عہد حکومت میں دست یاب ہوا تھا۔ صاحب گلزار آصفیہ نے (جو اس دور کے معتبر ترین مورخ سمجھے جاتے ہیں اور جنھیں ایک عرصہ تک دربار شاہی کے تقرب کا بھی اختصاص حاصل رہا) اس کے حالات کی تحقیق میں جو غالباً ان کے چشم دید ہیں یہ بیان کیا ہے کہ قصبۂ جٹ پول میں ایک بقال رہتا تھا معلوم نہیں کہ یہ الماس اسے کہاں سے ہاتھ لگا، مگر اس نے اس کی حفاظت بکا‌ٔے کے سینگ میں چھپا کر اپنے ہی گھر میں زمین میں دفن کر رکھی تھی، اور اس کے ساتھ اس کی فرد کیفیت بھی اسی سینگ میں لکھ چھوڑی۔ چند دنوں بعد وہ مر گیا اور اس کا حال کسی کو نہ بتا گیا، چنانچہ یہ ہیرا اسی طرح دو سو برس تک زمین ہی میں پوشیدہ رہا اور اس دو صدی کے امتداد نے اس کے مکان کو کہنہ و افتادہ کر کے ویران کر دیا اور صرف کھنڈر ہی باقی رہا تھا۔ اتفاق سے کسی نے اس زمین کو خرید کر اس پر مکان بنانا شروع کیا، کھنڈر کی صفائی وغیرہ اور پایہ کھودنے کی وجہ سے اس مکان کی مٹی دوسری طرف منتقل ہوتی رہی یہاں تک کہ اس زمین کا وہ دفن شدہ سینگ بھی جس میں کہ ہیرا چھپا تھا سارے خس و خاشاک کے ساتھ پھینک دیا گیا اس لئے کہ ایسی حقیر چیز کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی اور اس کے راز اور بھید سے کون واقف تھا۔

اس کے بہت دنوں بعد ۱۲۰۰ھ میں اسی قصبہ کا ایک کمہار برتن بنانے کے لئے مٹی کی خاطر اس مقام پر پہنچا اور یہاں اس نے خاک میں دبی ہوئی ایک سینگ پائی صرف اس خیال سے کہ زمین کھودنے اور مٹی حاصل کرنے میں اس سے سہولت ہوگی [illegible] اس سینگ میں اس کو ایک خوبصورت مگر بے رونق پتھر نظر پڑا چونکہ وہ ایک گنوار تھا، اس لئے اس نے اس "سنگِ رنگین" کو کوئی اہمیت نہ دی۔ مٹی ساتھ لادی اور اس پتھر کو بھی اپنے بچوں کے کھیلنے کے لئے رکھ لیا۔
چنانچہ گھر پہنچ کر اس نے اس پتھر کو اپنی لڑکی کے حوالہ کیا اور لڑکی اس کی رنگینی و دل آویزی کو دیکھ کر ہیرا لئے خوش خوش باہر نکلی، اپنے ساتھ کھیلنے والے بچوں کو جمع کیا اور ان بچوں نے دوڑ دوڑ کر سیتاپھل (شریفوں) کے بیج اکھٹے کئے۔ خود میٹھی ترازو کے ایک پلڑے میں یہ رنگین پتھر رکھے بیجوں کو اس کا ہم سنگ کرتی، اور سارے بچوں میں انھیں تقسیم کرتی جاتی تھی۔
ان ہی دنوں سے چند روز پہلے لڑکی کی ماں نے اپنے گاؤں کے ایک سنار سے اس لڑکی کے لئے کسی زیور کے تیار کرنے کی فرمائش کی تھی، اتفاق سے وہ اسی دن چاندی لینے کے لئے اس کے گھر آیا، تو لڑکی کو گھر کے پہلو میں چند بچوں کے ساتھ بیٹھے

حاشیہ ۲
"الماس متن" نامی ایک اور ہیرا ہے، یہ ایک علاقہ کا نام ہے، جہاں کا حاکم راجہ متن کہلاتا ہے، چونکہ یہ الماس اسی کے قبضہ میں ہے، اسی لئے اس نام سے مشہور ہوا۔ یہ ہیرا بھی ناتراشیدہ بیضوی شکل کا ہے، جس کا وزن ۳۶۷ قیراط یعنی ۲½ ماشہ ہے، جوہریوں نے اس کی قیمت دو کروڑ سے زیادہ قرار دی ہے، تو اس لحاظ سے غور فرمائیے کہ "الماس نظام" کس قیمت کا ہوگا جو اس سے (۱۷۲) قیراط زیادہ وزنی ہے کوہ نور جیسا مشہور ترین ہیرا تو غالباً بارہویں نمبر پر شمار ہوتا ہے، جس کا وزن ۱۰۶ ½ قیراط اور قیمت چودہ لاکھ ہے، صرف اس کو اس کی تاریخی حیثیت سے اتنی بڑی شہرت نصیب ہوئی۔ ورنہ اس کا قیمت و وزن کے لحاظ سے کوئی درجہ نہیں۔

اس بے نظیر پتھر سے کھیلتے ہوئے پایا، اور اس نے اپنی واقفیت کی بنا پر اس پتھر کی حقیقت سمجھ لی کہ یہ ایک بے بدل آب دار ہیرا ہے دوسرے دن جب کہ کمہار کے گھر کوئی نہ تھا سنار موقع پاکر اپنے ساتھ مٹھائی لے آیا۔ اور نہایت عاجزی کے ساتھ لڑکی کو سمجھا منا کر مٹھائی دی، اور اس سے وہ پتھر مانگنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کچھ ضدی تھی۔ اس کی اس حرکت پر برہم ہوگئی اور غصہ میں فوراً بھاگ کر گھر دوڑی چلی آئی۔ دوسرے میں جاکر ہیرے کو طاق پر رکھ دیا۔ جب ماں آئی تو سارا قصہ بیان کیا کہ فلاں سنار نے مجھے مٹھائی دی، اور اس پتھر کو بڑی عاجزی سے مانگنے لگا۔ لیکن میں نے اسے نہ دیا۔ ماں نے یہ خیال کیا کہ وہ تو یہ چاندی تولنے کے لیے اس کو تنگ رہا تھا اس لئے اس نے اس پتھر کو ایک پوشیدہ مقام پر چھپا دیا۔ جب دوبارہ سنار آیا اور اس نے لڑکی سے وہ پتھر مانگا تو ماں کو معلوم ہوگیا۔ اس نے سنار سے کہا معلوم نہیں کہ اس دیوانی بچی نے اسے کہاں کھو دیا۔ سنار یہ سن کر بے قرار ہوگیا اور کہنے لگا کہ "افسوس تونے یہ کیا کیا! ارے وہ تو ہیرا تھا!! اگر تو مجھے دے دیتی تو میں تجھے تیرے منہ مانگے پیسے دیتا۔ جب لڑکی کا باپ آیا تو ماں نے یہ سارا قصہ اسے کہہ سنایا۔ اس پتھر کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد کہ یہ ہیرا ہے شاید کمہار زرگر سے ملا، اور ان دونوں میں بعد تصفیہ یہ طے پایا کہ وہ اس معاملہ کو انتہائی پوشیدہ رکھیں گے۔ اور آپس میں نصف نصف تقسیم کریں گے، چنانچہ بہ ہزار دقت ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اسے توڑا، اور ہیرے کا وہ حصہ جس کو سنار نے اپنے لیے پسند کیا تھا، اس کے دو تین ٹکڑے ہوگئے۔ اور وہ حصہ جو کمہار کے لیے مختص تھا محفوظ رہا۔ اور یہی ٹکڑا وزن میں پختہ چھ تولے پانچ ماشے نکلا۔ صاحب گلزار آصفیہ لکھتے ہیں کہ یہ اپنی تمام و کمال [illegible]

سنار اپنے حصے کے ٹکڑوں کو لے آیا، اور دوسرے سناروں کے ہاتھ ایک ایک کرکے فروخت کر دیا۔ اس خرید فروخت کی شہرت ہونے لگی، اور ہوتے ہوتے وہاں کے زمیندار تک بھی پہنچی، فوراً اس [illegible] کو گرفتار کر لیا اور اس پر سختیاں کرکے اس ہیرے کی تحقیقات کی۔ واقعات کے معلوم ہونے پر ان سب [illegible] کمہار کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان دنوں، اس علاقہ کی تعلقداری پر بھاراؤ نامی ایک شخص مامور تھا۔ اس نے اس الماس کی [illegible] حقیقت مدار المہام وقت مہاراجہ چندولال بہادر کو لکھ بھیجی۔ مہاراجہ نے محمد قمرالدین جمعدار مندوزی کو جو نعلف ارتکاندہ تھے بھاراؤ کے ہمراہ اس زمیندار کے پاس بھیج کر اسے طلب کیا۔ زمیندار نے، نوبت و نقارہ اور دس ہزار کی جاگیر اپنے اور اپنی اولاد کے لئے بطور آل تمغہ، سرفراز ہونے کی شرط پر اس ہیرے کو مہاراجہ بہادر کے حوالہ کر دیا۔ راجہ صاحب نے حضور کی نظر اشرف میں گذرانا، اور اسے حسب وعدہ اعلیٰ حضرت سے عرض کرکے جاگیر سے سرفراز کرایا۔ جوہریوں نے اس "نادرالعصر قوم" کو دیکھ کر اور پرکھ کر، بالاتفاق عرض کی کہ یہ الماس عجائبات روزگار سے ایک لاقیمت چیز ہے۔ کسی ملک میں ہم نے ایسا نادر روزگار، اس قدر بڑا ہیرا دیکھا اور نہ سُنا۔ اور ایسے جوہر نایاب کی قیمت لگانے سے ہم عاجز ہیں۔

ہند اور ولایت، ایران کے حکاکوں کو اس الماس کی تختیاں تراشنے کے لئے حکم ہوا تو ان لوگوں نے اس کی مزدوری پانچ لاکھ روپئے طلب کی، اور کہا کہ ہم اس الماس سے سات عمدہ باریک اور شفاف تختیاں تراش کر گزرانیں گے، کہ جب کے آگے "دریائے نور" اور "کوہ نور" بے رونق و بے آب نظر آنے لگیں گے۔ غالباً حضور نے اجرت کی زیادتی کی وجہ سے منظور نہیں فرمایا، یہ جس حالت میں دست یاب ہوا تھا، اسی طرح جواہر خانہ میں محفوظ کر لیا گیا[1]۔

---

[1] گلزار آصفیہ صفحہ ۶۰۵ مؤلفہ حکیم غلام حسین خاں مطبوعہ مطبع محمدی ۱۳۰۸ھ

"تاریخ ریاست حیدرآباد دکن" کے مولف نجم الغنی خاں رام پوری نے اپنی کتاب کے صفحہ انیس[1] پر اس ہیرے کے تراشنے کی اجرت پچاس ہزار لکھی ہے جو درست معلوم نہیں ہوتی۔

"آئینہ جواہر" کا مولف کہتا ہے کہ اس ہیرے کا شمار دنیا کے بڑے بڑے ہیروں میں ہے اور نظام حیدرآباد کے پاس رہنے کی وجہ سے "الماس نظام" سے مشہور ہوا ہے۔ اس کا وزن ۳۴۰ قیراط یعنی (۲۷۷ ۳/۴) ماشہ ہے[2]۔ یہ کان گلکنڈہ سے برآمد ہوا تھا اور ۱۸۳۵ء میں ایک شخص کے پاس بطور کھلونے کے تھا۔ ایک اور روایت یہ نقل کی ہے کہ کسی سوار نے اسے ایک مٹی کے برتن میں پایا تھا۔ جو بعد کو ایک ہندو زرگر کے ہاتھ لگا اور اس نے اس کی آزمائش کے لئے کہ یہ ٹوٹ سکتا ہے یا نہیں اس پر ضرب لگائی جس کی وجہ سے اس کے تین ٹکڑے ہوگئے[3]۔ اس کی شکل ایک چینی عورت کے پاؤں کی طرح ہے جس کا انگوٹھا نہ ہو[4]۔

کنگ صاحب (Mr King) نے بھی اس کی شکل و شباہت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ناتراشیدہ الماس ہے۔ وہ اسی شکل کا ہے اس کے تاریخی حالات لکھنے میں انھوں نے بھی سخت غلطی کی ہے اور ہمارے نزدیک ان کے ایسے مشہور ماہر و نقاد کے بیانات بھی قابل اعتبار نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "کسی حادثہ سے ہندوستان کے غدر میں اس سے ایک ٹکڑا علیحدہ ہوگیا اور اس کا وزن (۲۴۰) قیراط ہے" بعضوں نے یہ شک ظاہر کیا ہے کہ کنگ صاحب نے اس کی کوئی صراحت نہیں کی کہ آیا یہ وزن اس الماس کے ٹوٹنے سے قبل کا ہے یا بعد کا؟ ایک اور انگریز ڈیولے فیٹ (Dieula Fait) کا بیان ہے کہ اس کا وزن اس کے ٹوٹنے سے پیشتر (۴۴۰) قیراط سے کم نہ تھا۔ مبصرین کے نزدیک صاحب گلزار آصفیہ کے سے معتبر مورخ کے آگے ان لوگوں کے گمانوں اور مختلف بیانوں کی کوئی وقعت نہیں اس لئے کہ انھوں نے وزن کی تصریح صاف طور پر کردی ہے۔ بارٹ نامی ایک ماہر نے اس فرضی وزن کی بنا پر اس کی قیمت (۵) لاکھ فرانک لکھی ہے جو بیس لاکھ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

"آئینہ جواہر" کا مولف امرناتھ کہتا ہے کہ اس ناتراشیدہ الماس کی قیمت ٹھیک ٹھیک نہیں کہی جاسکتی۔ کیونکہ کاٹنے کی وجہ سے ناتراشیدہ الماس اکثر وزن میں کم ہوجایا کرتے ہیں، لیکن غیر تراشیدہ حالت میں اس الماس نظام کی شکل چنداں بے ڈھب بھی نہیں۔ البتہ کٹوانے میں نصف سے زیادہ کے نقصان کا احتمال نہ ہوگا۔ تاحال یہ الماس "نظام حیدرآباد کے جانشینوں کے پاس خیال کیا جاتا ہے[5]۔

---

[1] تاریخ ریاست حیدرآباد دکن مطبوعہ نول کشور پریس ۱۹۳۰ء۔

[2] صاحب گلزار آصفیہ نے جو وزن چھ تولے پانچ ماشہ لکھا ہے اس کے کل (۷۷) ماشے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ وزن غلط اور ناقابل تسلیم ہے اور مولف موصوف ہی بیان بہت زیادہ قابل اعتبار ہے۔ ۱۲

[3] آئینہ جواہر کے مولف نے غالباً یہ قصہ انگریزی کتابوں سے لیا ہے اور انگریز محققین نے بلا تحقیق جس طرح روایت سنی تھی اسے اپنی کتابوں میں قلم بند کرلیا گو یہ قصہ ان لوگوں نے غلط لکھا ہے، مگر گلزار آصفیہ کے ہی واقعہ کی الٹ پھیر ہے اور ان غلط قصوں ہی سے صاحب گلزار آصفیہ کی تحقیقات اور سچائی کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہے۔ کمہار کے بجائے مٹی کے برتن کا ذکر کیا گیا ہے شاید مولف ظرف کہہ کر مظروف کا قاعدہ تو مراد نہیں لے رہے ہیں۔ سوار کا اس ہیرے کو پانا بالکل غلط ہے۔ البتہ ایک ہندو زرگر اور اس کے تین ٹکڑے ہونا یہ صحیح ہے۔

[4] آئینہ جواہر مصنفہ پنڈت امرناتھ، حاشیہ صفحہ ۱۲۴ مطبوعہ خادم التعلیم پریس لاہور ۱۹۱۳ء

[5] آئینہ جواہر ص ۱۲۴

رہبر فاروقی

(یعنی پاؤں ناپنے کی رسم)

" یہ مضمون تقی عابدی صاحب کی اس دلچسپ کتاب کا ایک ٹکڑا ہے جو حیدرآباد کی شادیوں پر لکھی جا رہی ہے۔ "

ساچنے موتی کی ایک لڑ چاندی کی تھالی میں رکھ کر تھالی رسم کی کشتی میں رکھ دی جاتی ہے۔ دوسری کشتی میں بنارسی دوپٹہ جس پر مسالا لگا ہوا ہوتا ہے۔ رکھا جاتا ہے۔ تیسری کشتی میں مالیدہ، کھوپرہ کا چورا، مصری، ڈیڑھ والے سنہ پان، بڑلی سپاری، مالیدہ کے لڈو طشتریوں میں جما کر۔ ایک چاندی کی کٹوری میں صندل۔ چاندی کے ڈیڑھ والے پان جس کو لال ناڑہ باندھا جاتا ہے۔ چاندی کے لڈو۔ چاندی کی سپاری وغیرہ کو کشتی میں جما کر رکھا جاتا ہے۔ جملہ سامان رسم کو چاندی کا ورق لگا کر تھالیوں پر زردوزی تھالی پوش اڑھا کر کشتیوں کو لال بستنی میں باندھ کر زردوزی کشتی پوش ڈھانک دئے جاتے ہیں۔ ایک پڑیا آدھا پاؤ مصری خوانوں میں رکھ کر بستنی سے باندھ کر ان پر مخملی خوان پوش اڑھا دئے جاتے ہیں۔ چاندی کی چنگیر میں پھولوں کا گہنا رکھ کر خاص طور پر مشاطہ کے ہاتھ چنگیر دیا جاتا ہے یہ خدمت سوائے مشاطہ کے دوسرا کوئی انجام نہیں دے سکتا۔ ورنہ مشاطہ لڑائی جھگڑے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ رسم بیاہتے وقت مشاطہ کو لال چادر اوڑھنا ضروری ہے۔ اگر چادر سفید ہو تو اس پر لال چھینٹے دیدئے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سہاگ کے کام میں سفید چادر بے نور ہے۔ حیدرآباد میں بیوہ عورتیں سفید کپڑے استعمال کرتی ہیں۔ رنگین کپڑے۔ مسی۔ پھول۔ چوڑیاں وغیرہ استعمال کرنا " ترکِ لذت " کے منافی ہے۔ اور پھر یہ چیزیں بیوہ اور سہاگن کی علامت امتیازی قرار پا چکی ہیں۔ چنانچہ بیوہ عورتیں بجائے کانچ کی چوڑیوں یا جوڑے کے سونے یا چاندی کی چوڑیاں پہنتی ہیں جنہیں " چوڑ " کہا جاتا ہے۔ جملہ سامان ایک زردوزی شامیانے کے نیچے جسے " ڈنڈا پیشگی " کہتے ہیں۔ اس ترتیب سے ہوتا ہے کہ آگے آگے مشاطہ پھولوں کی چنگیر لئے ہوئے اور پیچھے دوسرے لوگ سر پر جملہ رسم کی کشتیاں۔

دکن میں شامیانہ صرف میت کے وقت استعمال کیا جاتا ہے۔ چونکہ میت کے وقت اس کو شامیانے کا نام دیا گیا ہے۔ اس لئے اس کو ڈنڈہ پیشگی کہتے ہیں حالانکہ یہ دونوں کوئی علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔ اسی طرح رواکھویا اور روغن زردے جو میٹھا پکایا جاتا ہے عام طور پر اس کو میٹھا یا حلوہ کہتے ہیں۔ مگر کسی کے یہاں چہلم میں اسی میٹھے کا نام " پپیکا " رکھا جاتا ہے۔

بہرحال جملہ سامانِ رسم بہ ترتیب متذکرہ جب شامیانہ یا ڈنڈہ پیشگی کے نیچے آجاتا ہے تو مختلف باجے نوازتا شہ نفیری روشن چوکی ڈھول۔ بیانڈ وغیرہ کے ساتھ جو آگے آگے بجتا رہتا ہے۔ دلہن کے گھر بھیجا جاتا ہے۔ سرِ شام دلہن کے گھر دولہا کی سمدھن رشتہ دار عورتیں یعنی سمدھنیں رسم کرنے آتی ہیں۔ دولہا کی ماں کے ساتھ چاندی کی تھالی میں سو سوا سو روپیہ اشرفیاں یا کسی قسم کا زیور ہوتا ہے جو بطور " چڑھاوے " کے دلہن کو دیا جاتا ہے۔ اور سمدھنیں اپنے ساتھ ایک ڈیرہ ڈومنیوں کا طائفہ بھی ضرور لاتی ہیں۔ میراثنوں کی موجودگی ان کے مخصوص گانوں کی وجہ سے شادی اور رسم کا جزو لاینفک ہے۔

۲

ادھر دلہن کے گھر کو فرش فروش سے آراستہ کیا جاتا ہے دالان میں گاؤ تکیے لگائے جاتے ہیں۔ بیچ دالان میں ایک

تاش کا منڈپ باندھا جاتا ہے۔ منڈپ باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بوتل ہے۔ بیل منڈوے چڑھے تو گویا منڈپ تو منڈوہ ہے اور بیل آل اولاد کی جو آگے چڑھے گی۔ غریبوں میں تو اب تک لکڑیوں کو بانگ کر سبز پتوں سے منڈپ باندھا جاتا ہے۔ مگر امیروں اور صاحب استطاعت لوگوں نے منڈوے سے منڈپ اس طرح بنا یا ہے۔ اسی منڈپ کے نیچے ایک لال رنگ کی پاؤں گھڑی یعنی پا انداز بچھاتے ہیں تاکہ سمدھنیں منڈپ کے نیچے اور اس پاؤں گھڑی پر سے چلتی ہوئی دالان میں داخل ہو سکیں۔ منڈپ کے نیچے دلہن کی کوئی ایک ان بیاہی رشتہ دار لڑکی چاندی کی کٹوری میں صندل لے کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اور جب سمدھنیں آنا شروع ہوتی ہیں تو ہر سمدھن کو "صندل ہاتھ" دیا جاتا ہے۔ صندل ہاتھ دینے کا طریقہ یہ ہے کہ صندل کی کٹوری میں چار انگلیاں ڈبو کر ہر سمدھن سے اس طرح ہاتھ ملایا جائے کہ اس کے ہاتھ میں ہی صندل لگ جائے کہ یہ نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ نئی آنے والی سمدھنوں میں اگر کوئی سمدھن "امید" سے ہوں تو وہ منڈپ کے نیچے نہیں آسکتیں اور نہ ان کا گود بھرا جاتا ہے وجہ یہ ہے کہ قدرتاً تو ان کا گود بھر جانے والا ہے۔ اب اگر گود بھرا جائے گا تو ڈر ہے کہ بچہ ضائع ہو جائے گا۔ اور گود خالی ہو جائے گا۔ اسی طرح چونکہ منڈپ میں بھی گود ڈالا جاتا ہے اس لئے یہ اس کے نیچے بھی نہیں جا سکتی منڈپ میں گود اس لئے ڈالتے ہیں کہ منڈپ ایک ایسا منڈوہ ہے جس پر آل اولاد کی بیل چڑھتی ہے۔ گود میں پان شریک ہوتے ہیں اور پان کی بیل ہوتی ہے اس لئے ابتدا ہی سے گویا منڈپ میں گود ڈال کر بیل چڑھا دی جاتی ہے۔ تاکہ آئندہ آل اولاد کی بیل ہمیشہ ہری بھری اور چڑھتی رہے۔

منڈپ کے قریب ہی ایک طرف میراثنیوں کا طائفہ بیٹھا ہوا گاتا رہتا ہے ان لوگوں کے گانے بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ ہر موقعہ اور رسم کے لحاظ سے یہ لوگ مخصوص گانے گاتے جاتے ہیں۔ ان کے گانے آپ اپنے وقت پر درج ہوں گے۔ چنانچہ جس وقت سمدھنیں آتی ہیں تو میراثنیں یہ مخصوص گانا گاتی ہیں۔

ساجن آئی رے اللہ پیر منائی رے

میری ساجن آئی رے

جب سمدھنیں دالان میں گاؤتکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتی ہیں تو انھیں "مصری چنائی" جاتی ہے۔ دُو ماما ئیں سمدھنوں کے سر پر ایک تاش کا مسالا لگا ہوا دوپٹہ پکڑ لیتی ہیں اور دلہن کی ایک سہاگن رشتہ دار بیوی چاندی کی طشتری میں مصری کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں جن پر چاندی سونے کا ورق لگا ہوا ہوتا ہے لاتی ہیں اور ہر سمدھن کے آگے باری باری سے پیش کرتی ہیں۔ ہر سمدھن ایسے موقعہ پر شرم اور جھینپ کا اظہار ضرور کرتی ہے اب خواہ یہ فطرتاً ہو یا رسماً بہرحال رسم کی پابندی انھیں ضرور کرنی پڑتی ہے۔ وہ لڑکیاں جو ناکتخدا ہیں مصری لینا تو کجا آنکھ تک اوپر نہیں اٹھاتیں۔ مگر مصری لانے والی بیوی جبر و قہر و زور و زبردستی کے ساتھ ان کے منہ میں مصری ٹھونس ہی دیتی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ فقرے بھی کستی جاتی ہیں جس سے وہ بیچاری تو مارے شرم کے عرق عرق ہوتی جاتی ہے اور ادھر خوب فرمائشی قہقہے اڑتے ہیں۔ مصری چنائی جاتے وقت میراثنیاں گاتی ہیں

سمدھن میری مصری کھاوے

اس کے بعد گانا شروع ہوتا ہے۔ ٹھمری۔ دادرا غزل وغیرہ جب میراثنیں گا چکتی ہیں تو دلہن کو لانے کی جلدی شروع کی جاتی ہے۔ ادھر تو جلدی ہوتی ہے اور ادھر دلہن کو سنوارا جاتا ہے۔ دلہن بیچاری کا شروع شادی سے اخیر شادی تک

پنے اوپر کوئی اختیار نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ اپنی آنکھوں کو بند رکھے باقی جو کام اوپر والے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔

دلہن کو کسی ایک قسم کا قیمتی جوڑا کپڑوں کا پہنایا جاتا ہے اور وہ زیور بھی جو دلہن کو جہیز میں دیا جانے والا ہے۔ پہنا دیتے ہیں آنکھوں پر "آرائش" لگاتے ہیں۔ چنی باریک کٹے ہوئے مقیش سے افشاں چنا جاتا ہے سرمہ لگایا جاتا ہے۔ اور ایک لمبا سا گھونگھٹ کھینچ کر کوئی ماما، انّا، دایا یا چھوکری دلہن کو گود میں اٹھا کر باہر اس زردوزی مسند پر لا بٹھاتی ہے جو دالان میں منڈپ کے نیچے اسی رسم کے لئے بچھائی جاتی ہے۔ ایک مخصوص گیت ہوتا ہے جو اسی وقت میں میراثنیاں نہایت جوش میں گاتی رہتی ہیں۔ اس وقت کا سماں قابل دید ہے اس وقت لوگوں کے جذبات دیکھنے کی چیز ہیں سب سمدھنیں خاموش دلہن کے کمرے کی طرف نگاہیں لگائے سراپا انتظار و مجسم اشتیاق بنی بیٹھی ہوتی ہیں۔ جیسے ہی دلہن نظر آتی ہے۔ میراثنیوں کا جوش اور بڑھ جاتا ہے۔ سمدھنوں کے چہرے پھول کی طرح کھل جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ تبسم ہنسی سے بدل جاتا ہے۔

آئی بنو آئی ۔ ہریالی بنو آئی

ماں کی پیاری بنو آئی باوا کی پیاری بنو آئی

آئی بنو آئی

یہ گیت سمدھنوں میں ایک عجیب جوش و خروش پیدا کر دیتا ہے باہر نوبت نوازی شروع ہو جاتی ہے اور اب رسم شروع ہوتی ہے رسم دولہا کی سہاگن پھوپی یا چچی کو کرنا پڑتا ہے۔ دولہا کی والدہ ان سے نہایت عجز و انکسار اور منت کے ساتھ کہتی ہیں آپ بزرگ ہیں۔ اگر آپ کے ہاتھ سے یہ رکانی ہو جائے تو میری خوش نصیبی ہے۔ خدا آپ کی چھاؤں کا سایہ دلہن پر بھی ڈالے اور دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ اگر دولہا کے رشتہ داروں میں سے کوئی بزرگ نہ ہوں تو خود دولہا کی ماں سہاگن ہوں تو رسم کرنے بیٹھتی ہیں۔ رسم کرنے کے لئے سہاگن کا ہونا ضروری ہے۔

کشتیاں اور چنگیر جو دولہا کے گھر سے آتے ہیں وہ مسند کے قریب رکھ دیے جاتے ہیں۔ رسم کرنے والی بیوی پہلے اپنے گلے کو صندل لگاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ خود سہاگن ہیں اور پھر وہ سہاگن جن کا سہاگ بہت قدیم ہے مطلب یہ کہ ان کی طرح دلہن کا بھی سہاگ تا دیر قائم رہے۔ اپنے گلے کو صندل لگا لینے کے بعد دلہن کے گلے، سینہ اور پیٹھ پر صندل لگا کر سات، نو یا گیارہ سہاگنوں کو بھی بہ ترتیب متذکرہ صندل لگایا جاتا ہے۔ اگر دلہن ہو تو پھر دلہن کو صندل لگانے کے بعد علاوہ سہاگنوں کے ان بیاہی لڑکیوں کو بھی صندل لگایا جاتا ہے تاکہ ان کی شادی بھی جلدی ہو جائے۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ رسم ہوتے وقت اگر کوئی چھینک دے تو رسم تھوڑی دیر کے لئے روک دیا جاتا ہے۔ حالانکہ چھینکنے کے بعد مسلمان الحمد للہ کہہ کر شکر ادا کرتے ہیں۔ تاہم اس کو کسی کام کی ابتداء میں منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح باہر نکلتے وقت کوئی چھینک دے یا کوئی سامنے آ جائے یا ٹھوکر لگ جائے تو تھوڑی دیر کے لئے باہر جانا موقوف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ناکامیابی کی علامت ہے بجائے اس کے اگر کوئی مہتر یا کوئی شخص دہی لے کر سامنے آ جائے تو کامیابی یقینی سمجھی جاتی ہے۔

صندل لگاتے وقت میراثنیں گاتی ہیں۔

صندل لگاؤ ہریالی بنو کو ۔ راج دلاری بنو کو

نسب رسم

صندل لگا چکنے کے بعد گود بھرے جاتے ہیں۔ پہلے رسم کرنے والی بیوی اپنا گود بھر لیتی ہیں۔ اس کے بعد دلہن کا گود چاندی کی سپیاری اور چاندی کے لڈو سے حسب مقدور روپیہ رکھ کر بھرا جاتا ہے۔ دلہن کے قریب دلہن کی ایک رشتہ دار سہاگن بیٹھتی ہیں۔ شرم کی وجہ سے دلہن جھکی ہوئی بیٹھتی ہے۔ اس لئے یہ بیوی دلہن کا سر بھی تھامے ہوئے رہتی ہیں اور موقعہ بموقعہ دلہن کو امداد بھی دیتی جاتی ہیں۔ چنانچہ جس وقت دلہن کا گود بھرا جاتا ہے تو یہ بیوی ایک ریشمی رومال دلہن کے گود میں بچھا کر گود حاصل کر لیتی ہیں۔ دلہن کا گود بھرنے کے بعد منڈپ میں بھی ایک گود ڈالا جاتا ہے اور پھر سات تو۔ یا گیارہ سہاگنوں کے گود بھرے جاتے ہیں۔ گود بھرتے وقت میراثنیاں یہ مخصوص گیت گاتی ہیں۔

ہریالی کا گود بھراؤ۔ پیا کے کارن۔ راج دلاری کے گود بھراؤ

سب مل کر گود بھراؤ۔ سہاگنوں کا گود بھراؤ پیا کے کارن

گود بھراؤ مانگ لگاؤ۔ موتیوں کے چوک پراؤ پیا کے کارن

گود بھرائی ہو چکنے کے بعد دلہن کا منہ میٹھا کیا جاتا ہے۔ رسم کرنے والی بیوی مصری دلہن کے منہ کے پاس لے جاتی ہیں اور وہ بیوی جو دلہن کے قریب بغرض امداد بیٹھتی ہیں ہاتھ بڑھا کر مصری لے لیتی ہیں۔ اس کے بعد "چوبا" کھلایا جاتا ہے۔ مصری کھلاتے وقت کا مخصوص گیت یہ ہے۔

مصری کھاوے بنو میری۔ یہ سہاگن کے ہاتھ سے کھاوے

یہ بچہ والی کھلاوے۔ بنو میری مصری کھاوت

چوبا کھلاتے وقت بجائے مصری کے چوبا کھاوے گاتے ہیں۔ بقیہ گانا یہی ہوتا ہے۔ چوبا کھلانے کے بعد دلہن کو پان کھلایا جاتا ہے۔ پان پر سونے چاندی کے ورق لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس وقت کا مخصوص گیت یہ ہے۔

بنڈڑی کو پان کھلاؤ ری البیلی سہاگن

پان کھلا کر، پھولوں کا گہنا اور ہار پہنائے جاتے ہیں۔ اس وقت یہ مخصوص گیت گایا جاتا ہے۔

ہار وری ماں یہ لال بنو کے گلے

اماں پیاری کے گلے۔ باوا پیاری کے گلے

جائی۔ جوئی اور بیلا چنبیلی۔ اچھے گلالوں کے ہار

یہ چاند بنو کے گلے۔ ہار وری ماں یہ لال بنو کے گلے

یہ جملہ رسوم گویا تمہید تھے اصل پاؤں ناپنے کی رسم کے۔ کیونکہ جب تک یہ سارے رسوم نہ ہوں کوئی رسم ہی نہیں کہلاتا۔ بہرحال یہ سب مراحل طے ہو جانے کے بعد وہ موتیوں کے لڑ جو ساتھ لائی گئی ہے۔ رسم کرنے والی بیوی نکالتی ہیں اور ادھر سے دلہن کے پاس بیٹھی ہوئی دلہن کی رشتہ دار سہاگن دلہن کا سیدھا پاؤں آگے بڑھا دیتی ہیں اور اس "لڑ" سے پاؤں ناپ لیا جاتا ہے۔ یہ لڑ جس سے پاؤں ناپا گیا ہے جلوہ کے روز دلہن کی نتھ میں ڈالی جاتی ہے۔

اس کے بعد "رونمائی" ہوتی ہے اور جو روپیہ، اشرفیاں یا زیور لایا گیا ہے وہ اس طرح دلہن کو "سلامی" میں

دیا جاتا ہے کہ دلہن کے قریب بیٹھی ہوئی بی بی دلہن کے دونوں ہاتھ آگے پھیلا دیتی ہیں اور رسم کرنے والی بیوی "سلامی" دلہن کے ہاتھوں میں ڈال دیتی ہیں اور ساتھ ہی دلہن کے منہ سے چٹ چٹ بلائیں لے لیتی ہیں اس کے بعد "وارن پھیرن" شروع ہوتا ہے۔ ایک میراثن دلہن کے قریب آکر کھڑی ہو جاتی ہے تاکہ "وارن پھیرن" کے روپے حاصل کرے کیونکہ یہ حق میراثن ہی کا ہوتا ہے اس طرح اسے بھی سو سوا سو روپے مل جاتے ہیں۔ بہرحال ایک ایک سمدھن آتی جاتی ہیں دلہن کا منہ دیکھتی ہیں اور حسب مقدور روپیہ وار کر میراثن کو دیتی جاتی ہیں۔ بقیہ میراثنیاں یہ مبارک بادی گاتی رہتی ہیں جس کے بعد یہ رسم ہو جاتا ہے اور دلہن کمرہ میں پہونچائی جاتی ہے۔

تمھیں یہ شادیاں جم جم مبارک ہو مبارک ہو
یہی ہے دعوۂ شادی کی مبارک خانہ آبادی
وہ شہزادہ یہ شہزادی مبارک ہو مبارک ہو

تقی عابدی

کوہِ نور

(گولکنڈہ کا مشہور ہیرا جو اب شہنشاہ انگلستان کے تاج کی زینت ہے۔)

بحرِ ظلمات میں ڈوبا ہوا تارا کوئی — راکھ کے ڈھیر میں خوابیدہ شرارا کوئی
پردۂ خاک سے سورج کی کرن نکلی ہے — جلوہ بردوش تمنائے دکن نکلی ہے
کسی معشوق جواں سال کا رنگین لب ہے — زرپرستوں کے لئے شمعِ سرِ محفل ہے
سنگ کی شکل میں اک نور نظر آتا ہے — پرتوِ جلوہ گہہ طور نظر آتا ہے
شعلۂ حسن ہے یہ جلوۂ نیرنگ ہے یہ — رونق تاج ہے یہ زینت اورنگ ہے یہ
جوہری دیکھ کے کہتا ہے کہ "لاقیمت ہے — جس کی قسمت میں یہ آجائے وہ خوش قسمت ہے"

ذرّہ کہتا ہے کہ "یہ کیا ہے تماشا یارب؟
مہرِ تابندہ سے بڑھ کر ہے یہ ذرّہ یارب؟
کس سے یوں نور کہ اب میری نظر ششدر ہے
چرخ پر مہر ہے اور ارض پہ یہ پتھر ہے
ایک ہے دور بہت، ایک ہے آنکھوں سے قریب
کس کو سجدہ کرے حیران ہے یہ تیرا غریب"

میکش

سمستانِ جٹپول

ہماری سلطنت آصفیہ کے زیر اقتدار بہ عنایت الٰہی ایسے متعدد علاقے ہیں جو اپنی وسعت اور آمدنی کے اعتبار سے ہندوستان کے ان اسٹیٹوں سے بڑھے ہوئے ہیں جن کے حکمران ہز ہائینس کے خطاب سے ممتاز اور توپوں کی سلامی کا اعزاز رکھتے ہیں بلکہ ان میں کے بعض تو یورپ کی چھوٹی چھوٹی خود مختار سلطنتوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ایسے تمام علاقوں کے والی (نواب یا راجہ) کی جانشینی وعلیحدگی، تنقیح وراثت، عطائے اختیارات عدالتی وکوتوالی، اعلیٰ عہدہ دارانِ اسٹیٹ کا تقرر و تنزل کلیتہً حکومت عالیہ آصفیہ نظامیہ کی منظوری کا تابع ہے۔ اِن ہی علاقوں میں سے ایک سمستان جٹ پول ہے جس کا رقبہ ۵۰۰ء۵۴ مربع میل (لوسے ابنسسے کیڑ) اور جس کی مردم شماری ۹ ،۰۸ ۵۰ ہے

جٹ پول کا صحیح تلفظ جٹ پیرول ہے۔ جٹایو ایک پرندہ کا نام ہے اور پرول کے معنی شہر کے ہیں۔ وجہ تسمیہ اس کی یہ ہے کہ جب راون، رام چندر جی کی باعصمت بیوی کو ان کے بن باس کے زمانہ میں اڑائے جا رہا تھا تو یہ پرندہ اس مقام پر راون کا سدراہ ہوا۔ راون کو جو نشہ حکومت میں سرشار تھا جٹایو کی یہ مزاحمت غضب آلود کردی اور اس نے اس پرندہ کو مار ڈالا یا کم از کم یہ کہ اس کو زخمی کر دیا اور اس کا بازو اسی مقام پر گر گیا جس کی یادگار میں جٹیشور نام کی ایک دیول تعمیر کی گئی جو ابتک موجود ہے اور یہیں ایک شہر جٹ پرول نام کا بسا جو اب ایک معمولی سا قریہ رہ گیا ہے۔ بعد میں یہ علاقہ بھی اسی نام سے موسوم ہوگیا۔

سنسکرت میں سنوستھان راجہ کے رہنے کی جگہ کو کہتے ہیں کثرت استعمال سے واؤ اور ھ حذف ہوگئے اور نون، میم سے بدل کر سمستان ہوگیا اور اس سے مراد ایسا علاقہ عطیہ شاہی قرار پایا جس میں ملک کا ایک حصہ ایک رقم معینہ کے ٹھیراؤ سے کسی کو عطا کیا گیا ہو اس رقم معینہ کو اعزازاً پیش کش کہتے ہیں۔ اس طرح اِن دونوں الفاظ کی ترکیب سے اب یہ علاقہ سمستان جٹ پول کہلاتا ہے۔ لیکن سمستان کا مستقر اب جٹ پول نہیں بلکہ کولا پور ہے جو حیدرآباد سے (۱۲۰) میل جانب جنوب ضلع محبوب نگر میں ہے حیدرآباد سے براہ جڑچرلہ ونکتہ کوٹہ، یا پرال تک ۱۰۰ میل کی سیدھی سڑک تعمیرات کی عمارت کی ہے۔ اس کے بعد ۲۰ میل کا راستہ علاقہ سمستان جٹ پول کا ہے جو دریائے کرشنا کے متوازی کولا پور تک چلا گیا ہے۔

یہاں کے راجہ ریچرلہ گوترم سے سربھی خاندان کے ارکین ہیں جو جنوبی ہند کا ایک بڑا معزز اور قدیم خاندان ہے۔ اس خاندان کے دیگر اراکین علاقہ مدراس میں بوبلی، وینکٹ گری، پتھاپور، میلارم، کے راجہ ہیں آخری والی سمستان جٹ پول راجہ وینکٹ لچھما راؤ یہاں کے تائیسویں راجہ تھے ان کا اصلی نام کرشنا چندریا ہے راجہ وینکٹ جگنا تھ راؤ نے انھیں ۱۸۸۵ء میں متبنٰی لیا اور وینکٹ لچھما راؤ نام رکھا بعد میں اعلیٰ حضرت بندگان عالی خلد اللہ ملکہ نے نظام نواز ونت کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

مستقر سمستان کولا پور جس کی مردم شماری ۲۱۵۸ ہے دریائے کرشنا کے شمال میں ۲ میل پر ایک وسیع میدان

میں سطح سمندر سے ۵۹۴۲۱ فٹ مرتفع مقام پر آباد ہے اس کی جدید آبادی راجہ کے شاندار اور خوبصورت اسم بامسمی چندرمحل کے اطراف سلیقے سے بسائی گئی ہے اس چھوٹی سی مگر خوشنما آبادی میں صاف و شفاف پانی ایک باؤلی پر پمپ لگا کر نل کے ذریعہ پہونچایا جاتا ہے اور بجلی کی روشنی بھی ہوتی ہے سڑکیں گرچہ ورم کی ہیں مگر صاف ستھری ہیں عوام کے مکانات گو چھوٹے چھوٹے ہیں لیکن باہر سے خوش وضع معلوم ہوتے ہیں کہ اجازت تعمیر مکان دیتے ہوئے باہر کے ایلویشن کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

راجہ صاحب کے عالی شان چندرمحل کے علاوہ یہاں ایک بڑا دو منزلہ گسٹ ہوس ہے ایک پختہ مسافرخانہ ہے ڈاکٹرخانہ کی پختہ تعمیر ہے مدرسہ وسطانیہ ہے اسٹیٹ کے دفاتر کی عمدہ پکی عمارت ہے یہ سب جدید ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ وینکٹ لچھما راؤ المخاطب بہ نظام نواز ونت بہادر آنجہانی جو ۱۲۹۶ف سے ۱۳۴۲ف تک یہاں کے راجہ رہے پسند اور تزئین آبادی کے شایق تھے اور مولوی محمد علی صاحب اعلیٰ عہدہ دار اسٹیٹ کا تجربہ ہے جو انھوں نے سرکار عالی کی ملازمت میں عہدہ داران سرکار عالی سے حاصل کیا اسٹیٹ کے لیے بڑا مفید رہا صاحب موصوف ۱۳۳۱ف سے یہاں کارفرما ہیں اور تحصیلداری تبدیع کرتے ہوئے اسٹیٹ کی سب سے بڑی خدمت پر اس وقت مامور اور جس طرح والی اسٹیٹ کی نظروں میں باوقعت رہے اسی طرح عوام میں ہر دل عزیز ہیں۔

اس سمستان کے ۶۸ مواضع اور ۲۸ مزرعے ہیں جو باستثنا ایک موضع پٹیال کے باقی سب ایک ہی سلسلہ میں واقع ہیں البتہ شمال میں سمستان ونپرتی اور گوپال پیٹھ یا زبردست خاں کی جاگیر کے ۴ مواضع اس علاقہ میں آگئے ہیں۔ اس سمستان کے مغرب میں تعلقہ عالم پور ضلع رائچور اور علاقہ سمستان ونپرتی ہے ونپرتی بھی ہمارے ہی علاقہ کا سمستان ہے مشرق میں دریائے کرشنا اور سرحد تعلقہ امرآباد ضلع محبوب نگر جنوب میں دریائے کرشنا اور شمال میں تعلقہ ناگر کرنول ضلع محبوب نگر ہے۔ سمستان کی سالانہ آمدنی پانچ لاکھ ہے جس کے منجملہ کوئی ---- ہزار طبابت تعلیمات آبرسانی الکٹرک سڑک کی ترمیم اور نگہداشت اور خیرات مبرات میں خرچ کیے جاتے ہیں۔ بمقابلہ آمدنی ان مدات میں (تقریباً) صرف ۶ فیصد مصارف یقیناً ناکافی ہیں ---- ہزار میں بھی تعلیمات کا حصہ کل ---- اور طبابت کا ---- ہے جو بہت ہی کم ہے لیکن یہ اطمینان بخش ہے کہ اسٹیٹ بہرحال ترقی کے لئے کوشاں ہے چنانچہ حال میں ---- کے صرف سے ڈاکٹرخانہ کی عمارت بنائی گئی ہے مدرسہ وسطانیہ کی تعمیر میں ---- ہزار صرف کئے گئے تزئین آبادی کے سامان بھی حال کی پیداوار ہیں برقی روشنی اور نل کے ذریعہ آب رسانی بھی یہاں جدید چیزیں ہیں۔

کولاپور کے مغرب میں آبادی سے کچھ ذرا سا ہٹا ہوا ایک وسیع ہموار میدان ہے یہ گویا یہاں کا وسیع میدان ہے جو پولو، کرکٹ اور اسپورٹس کے کام آتا ہے۔ راجہ صاحب آنجہانی کے داماد اور فرزند کو ایسے مردانہ کھیلوں کا شوق رہا ہے۔ اس میدان کے کنارے ایک دو منزلہ بنگلہ ہے جو بالعموم گسٹ ہوس اور دسہرہ وغیرہ کے موقع پر پویلین کا کام دیتا ہے اس بنگلہ سے سامنے کا یہ وسیع میدان اور سرسبز جنگل اور پہاڑ پر لطف منظر ہے۔

---- کے مشرق میں اسٹیٹ کا ایک باغ میوہ دار ---- پھولوں سے لدا ہوا ہے جس نے بیچوں بیچ سندرمحل اسم بامسمی ہے۔

اس کی تعمیر ۱۳۱۷ف میں ہوئی۔ ڈاکٹرخانہ کی پختہ عمارت جس کی بنا ء سنہ کرافٹن ۱ بیہ صد۔ ناظم و معتمد مال حکومت سرکار عالی نے ۹ اردی بہشت ۱۳۳۵ف کو رکھی اور جس کا افتتاح ۴ر شہریور ۱۳۴۰ف کو ہوا ضرورت مقامی کے لئے ایک مکمل عمارت ہے اس کا نقشہ ناظم صاحب طبابت سرکار عالی نے دیا تھا۔ اس عمارت میں زنانہ اور مردانہ مریضوں کے لئے علحدہ علحدہ وارڈ ہیں۔ ادویات اور آلات جراحی کا کافی ذخیرہ ہے سند یافتہ ڈاکٹر مامور ہیں اور خوبی کی یہ بات ہے کہ دواؤں کا موازنہ جو عوام کے لئے ہے محل کی ضروریات سے متاثر نہیں ہونے پاتا بلکہ ڈیوڑھی کے ادویہ کا خرچ محل ہی کے موازنہ سے پورا ہوتا ہے۔

راجہ صاحب کے محل کے شمالی و شرقی گوشہ پر دو ہاتھیوں کا تھان پرجھوبنا شان دار صدر دروازہ پر رسالہ کے باڈریس سپاہی کا ہاتھ میں برچھا لئے پہرہ دینا۔ اس دروازے کے مقابل ہی خوبصورت برجی میں برقی گھڑیال دروازہ کے منزل بالا پر نوبت و نقارہ مشرقی امرا کے شان کا ایک پر رعب و پرجلال منظر ہے اس صدر دروازہ سے داخل ہونے پر سیدھے طرف ایک مختصر سے چمن کے وسط میں سری راجہ وینکٹ لچھما راؤ نظام نواز ونت بہادر کا تپلا (اسٹیچو) ہے جس کے پائین کتبہ لگا ہے جس سے واضح ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش ۲۰ر ستمبر ۱۸۶۵ء اور تاریخ وفات ۵ر اپریل ۱۹۲۸ء م ۱۱۔ خورداد ۱۳۳۷ف ہے۔ حکومت سرکار عالی کی منظوری کے بعد یہ ۶ر مارچ ۱۸۸۷ء (مطابق ۴ر فروردی ۱۲۹۶ف) کو اس علاقہ کے راجہ ہوئے۔

جو حالات سنے گئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آنجہانی راجہ بڑے شکاری تھے۔ ۲۹ شیر ۵۸ بونچے اور ۲۹ ریچھ مارے ہیں۔ شکار اور شکاریوں کی تاریخ میں یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ ۶ر ستمبر ۱۹۲۲ء کو راجہ صاحب نے سوا گھنٹہ کے اندر ۵ شیر مارے۔ ان میں جہاں سپاہیانہ جوہر نظر آتے ہیں۔ وہیں انتظامی قابلیت بھی عیاں ہوتی ہے۔ اسٹیٹ کی موجودہ ترقیاں انہی کے عہد سے شروع ہوئی ہیں اب انہی کی رانی صاحبہ سری وینکٹ رتنما بو ویل واڑہ تعلقہ سرسلہ ضلع کریم نگر کے دیسائی کی صاحبزادی ہیں اسٹیٹ کے کاموں کی نگران ہیں اور باوجودیکہ گوشہ کی سخت پابند ہیں حتیٰ کہ ان کے اعلیٰ عہدہ دار بھی انھیں بے پردہ نہیں دیکھ سکتے پھر بھی اسٹیٹ کا انتظام خوبی سے کرتی ہیں۔

کیا میں اس موقع پر کہہ سکتا ہوں کہ گوشہ اور پردہ کو جو تجدد پسند ترقی و انتظام دنیوی میں ہارج سمجھتے ہیں وہ اس صاحب جائداد پردہ نشین ہندو رانی کے عمل کو دیکھیں۔ میں نے محترمہ بیگم صاحبہ سر بلند جنگ کا ایک مضمون کسی اخبار میں چند دن قبل پڑھا تھا۔ جس میں موصوفہ نے بعض بڑے گھرانوں کی بیگمات کے نام گنائے تھے کہ وہ باوجود پردے میں رہنے کے کامیابی کے ساتھ اپنے وسیع علاقہ کا انتظام کرتی ہیں ان مثالوں میں رانی سربھی وینکٹ رتنما صاحبہ کے نام کا اضافہ کر لینا چاہیئے۔

ہم راجہ صاحب کے محل کا ذکر کر رہے تھے جس کے صدر دروازے سے داخل ہونے کے بعد آنجہانی راجہ صاحب کے اسٹیچو (تپلے) کے سلسلے میں ان کے اور ان کی رانی صاحبہ کے کچھ حالات لکھ دیئے اس محل کو جو چندر محل سے موسوم ہے ۱۸۷۱ء میں راجہ وینکٹ جگناتھ راؤ نے بنوایا۔ یہ ایک قدیم وضع کی عمارت بڑے بڑے فیل پایوں پر ہے اس کی دیواریں کسی قلعہ کی فصیل معلوم ہوتی ہیں اسی محل پر راجہ وینکٹ لچھما راؤ نے ایک اور منزل ۱۲۹۹ف میں بڑھائی اور ۱۳۲۵ف میں اسی کے عقب وجیا محل کے نام سے زنانی حصہ تعمیر کرایا۔

بہت بڑے کمپونڈ میں بلند و بالا عمارات کا تسلسل بیسیوں دریچے اور دروازے متعدد برآمدے اور شاہ نشین سے

مکین کی شوکت وحشمت کا اظہار ہورہا ہے۔ اس احاطہ میں آنے کے بعد یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ ہم تین ہزار کی مردم شماری والے قصبہ میں ہیں بلکہ گمان ہوتا ہے کہ دفعتہً حیدرآباد جیسے بلدۂ امرا میں کسی بڑے امیر کی دیوڑھی میں پہونچ گئے۔ چندر محل کے شاندار ڈرائنگ روم میں جس کے فرش، فرنیچر اور دیواروں پر راجہ نظام نواز ونت آنجہانی کے شکار کئے ہوئے جنگلی جانوروں کی کھالیں مختلف طرح پر بچھی یا لٹکی ہوئی تھیں ہم نے دو تصویروں کو بڑی دیر تک دیکھا۔ ان میں سے ایک تو راجہ وینکٹ جگنا تھ راؤ آنجہانی کی تھی جو بڑا سا پگڑا باندھے، انگرکھا پہنے، کندھے پر تلوار لٹکائے، ہاتھ میں تھامے ہوئے بنے کھڑے ہیں دوسری انہی کے ہم نام انہی کے نوجوان پوتے کی جو سوٹ بوٹ میں ملبوس یوروپین وضع قطع بنائے مسکرا رہے ہیں۔ یہ دونوں تصویریں تبدیل لباس، تبدیل مذاق، تبدیل وضع کی معاشرتی تاریخ آنکھوں کے سامنے پیش کرتی ہیں۔

یہاں کی عمارتوں میں برقی قوت رسانی کا مکان (پاور ہوس) بھی قابل ذکر ہے۔ اس مکان میں جو بالکل تجارتی اصول پر بقدر ضرورت اور سستے اصول میں بنایا گیا ہے۔ دو مشین لگے ہیں ایک (۲۰) گھوڑوں کی طاقت کا دوسرا اس کا نصف اس کے ذریعہ محل میں روشنی اور پنکھے دن رات اور عوام کے لیے سر مغرب سے تا ۹ بجے شب تک چلتے ہیں۔ آٹے کی دو چکیاں اور تیل کے دو گھانے کام کرتے ہیں۔ تیل کے گھانوں کو روزآنہ پانچ روپے پرگتہ دے رکھا ہے۔ چانول چھوڑنے کا مشین بھی لگایا ہے مگر یہ مشین ابھی چالو نہیں کیا گیا۔ آب رسانی کے لیے پانی یہیں کی برقی قوت سے کھینچا جاتا ہے۔ جو مشین باؤلی پر لگا ہے وہ ۴۲ ہزار گیالن روزآنہ کھینچ سکتا ہے مگر موسم گرما میں یہاں صرف ۱۰ ہزار گیالن تک پانی خرچ ہوتا ہے۔ کیونکہ پانی مقررہ اوقات پر کھولا جاتا ہے۔ اس لئے باؤلیوں کا استعمال بھی جاری ہے۔

آخری راجہ وینکٹ لچھما راؤ نظام نواز ونت بہادر متوفی کو صلبی دو لڑکیاں ہیں چونکہ اولاد نرینہ نہ تھی۔ اس لئے وینکٹ جگنا تھ راؤ کو متبنیٰ لیا ہے یہ ۱۳۲۶ف میں پیدا ہوئے ہر تیر ۱۳۳۹ف کو ان کی شادی اندرا دیوا سے ہوئی۔ جو نظام نواز ونت بہادر کی چھوٹی صاحبزادی سرسوتی دیوی کی دختر ہیں یہ نوجوان پسر بھی اپنے سپاہی منش متبنیٰ پدر کی طرح شکار اور مردانہ کھیلوں کے شائق ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس چھوٹی سی عمر میں ۱۰ شیر انھوں نے شکار کئے ہیں۔

متوفی راجہ صاحب کی بڑی صاحبزادی راجیشرا راجہ صاحب تیپرول کو ۱۳۱۳ف میں بیاہی گئی ہیں اور دوسرے جن کا نام سرسوتی دیوی ہے وینکٹ کرشنا راؤ زمیندار پرتاپور کو دی گئی جو افسوس کہ عالم جوانی میں بیوہ ہو گئیں ان کے شوہر پرواز کے بڑے شوقین تھے چنانچہ کوناپور سے مدراس کو پرواز کرتے ہوئے ۲۵ اگست ۱۹۳۰ء کو طیارہ کے ٹوٹنے سے گر کے مرگئے۔ کوناپور کے گسٹ ہوس کے متصل ایک سنگی ستون ان کی بیوہ رانی کی طرف سے لگایا گیا ہے جس کی عبارت ان دونوں میاں بیوی کی محبت کی خاموش داستان ہے۔

اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے میں اپنی اس آرزو کا اظہار کرتا ہوں جو رہ رہ کر میرے دل میں پیدا ہوتی ہے کہ کاش ہمارے ملک کے سارے جاگیرات خصوصاً بڑے بڑے علاقوں کا انتظام ایسا ہی ہوتا ہم یہ نہیں کہتے کہ سمستان جٹ پول میں ساری ترقیاں ہو چکی ہیں نہیں۔ بلکہ جس حد تک بھی یہاں ترقی کی گئی ہے۔ وہ بحالت موجودہ بھی دوسرے جاگیری علاقوں کے لئے قابل تقلید ہے۔

ابوظفر مؤید الدین حسن فاروقی

میر محمود صاحبؒ کی پہاڑی پر

میر محمود صاحبؒ کی پہاڑی ہمارے وطن میں ایک مشہور مقام ہے۔ میر عالم کے تالاب کے کنارے ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے اور اس پر اُس بزرگ کی درگاہ بنی ہوئی ہے۔ درگاہ کے اس طرف گھنا جنگل ہے جہاں ہماری پردہ نشین خواتین نہایت خوشی سے اپنے بال بچوں کے ساتھ تفریح مناتی ہیں جس طرح عام دستور ہے ہم لوگ کسی بزرگ کی ذات سے اتنا فائدہ نہیں اٹھاتے جتنا ان کی درگاہ سے اٹھاتے ہیں۔ یہی حال اس درگاہ کا بھی ہے، لوگ اس پُرسکون اور خاموش مقام میں دنیاوی فکروں کو ایک بزرگ کے فیض صحبت سے روحانی چین میں مبدل کرنے کم آتے ہیں اور زیادہ تر اس لئے تکلیف فرماتے ہیں کہ تالاب کا لطف حاصل کیا جائے اور مناظر کی دلچسپیوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

ایک مرتبہ ہم اس مقام پر پہنچ گئے۔ موٹر سیکل پر سوار تھے، خیال ہوا چلو آج اِس مقام کی سیر کرلیں جس کی شہرت مدتوں سے سنتے آرہے ہیں۔ سرما کی تعطیلات تھیں، ٹھنڈا ٹھنڈا موسم نرم نرم دھوپ، نیلا نیلا آسمان فوراً موٹر سیکل تیز کی اور درگاہ کی طرف چلے۔ لوگ کہتے ہیں سیدھا راستہ چلنا چاہیئے مگر بعض وقت راستہ گم کرنے اور اٹکل پر چلے جانے میں غیر معمولی لطف آتا ہے، خصوصاً ایسے وقت جب کہ فطرت اور اس کے اسرار کے سوا کوئی رہنما نہ ہو ہماری نظر پہاڑی کی طرف تھی مگر راستہ بالکل اس کی مخالف سمت نظر آرہا تھا۔ پیدل ہوتے تو دور نکل جانے کا خوف ہوتا مگر جب "پھٹ پھٹی" موٹر سیکل ہو (آپ پھٹ پھٹی کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے) تو اور ہمت بڑھتی ہے۔ ہم دیکھتے رہے پہاڑی کی طرف اور چلتے رہے دوسری طرف راستہ پیچیدہ تھا ایک شاعر کو جو معشوق کی زلفوں کے پیچ و خم دیکھ چکا ہو بھلا راستے کی پیچیدگی کیا ستا سکتی؟ ہم سبز درختوں کی چھاؤں چھاؤں چلتے ہی رہے۔ بڑی دیر کے بعد منزل مقصود آئی پہاڑ کے دامن میں پہنچے، موٹر سیکل گرم ہو چکی تھی ہم نے کچھ اس خیال سے کہ پہاڑ پر جاکر آنے تک کہیں یہ غائب نہ ہو جائے اور کچھ اس لئے کہ گھنے سائے میں اس کی گرمی دور ہوگی اسے شاداب جھاڑیوں کے اندر کھڑا کر دیا اور اوپر کی طرف چلے۔ جنگل، ساگوان کے درخت، پرندکے چہچہے، ٹھنڈی ہوائیں اور دس بجے کی نرم دھوپ بڑا روپ دکھا رہی تھی، ہم نے خیال کیا کہ سب سے پہلے بزرگ کے مزار پر فاتحہ پڑھ لینی چاہیئے۔ معاف کیجئے ہم ذرا مذہبی قسم کے آدمی ہیں فوراً جیب میں ہاتھ پہنچ گیا کہ دیکھیں پھولوں اور خیرات کے لئے کھلے پیسے ہیں بھی یا نہیں بارے ایک اٹھنی نکلی ورنہ ہر موٹر سوار کی جیب سے پیسوں سے زیادہ روپیوں کی جھنکار آتی ہے راستہ بائیں طرف کو مڑتا تھا ہم اپنی وطنی خاکساری کے ساتھ سر جھکائے زمین جھانکتے چلے جا رہے تھے۔ یکایک اوپر جو نظر پڑی تو دیکھتے کیا ہیں کہ دو فرلانگ تک اونچا راستہ ہے سیڑھیوں کی قطار ہے اور اوپر بزرگ کا مزار نظر آرہا ہے۔ فوراً دل پر اثر ہوا۔ ہم نے خیال کیا کہ سچ ہے روح کی بلندی ہر حال قائم رہتی ہے ہم نے سیڑھیاں چڑھنی شروع کیں اوپر پہنچنے تک برا حال ہوگیا سب سے زیادہ تکلیف ہمارے پیٹ کو پہنچی کیونکہ ہمارا پیٹ کسی قدر گول ہے! درگاہ کے چبوترے پر پہنچنے کے بعد ایک قدیم روایت یاد آگئی۔ یہاں کے متعلق مشہور ہے کہ کسی بزرگ کی بددعا سے اِس درگاہ کے تین گوشے آباد ہیں اور ایک ویران۔ ہم نے بڑے شوق سے اس کی توثیق کرنی چاہی گوشوں کی آبادی کا حال سنئے دو چار بکریاں، آٹھ دس کبوتر، تھوڑی سی عدم صفائی اور ایک حافظ صاحب! ویرانی کی طرف عمارت شکستہ اور کچھ نہیں۔ بہر حال ہم نے درگاہ کا ایک معتقدانہ طواف کیا اور درمیانی گنبد کے نیچے مزار کی ایک جانب بیٹھ گئے۔ تکان اور مراقبے میں ایک روحانی تعلق معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس وقت

کسی نہ کسی کیف میں ڈوب گئے اور آنکھیں بند کرلیں یقین مانئے ایسا معلوم ہوا ہم کسی اعلیٰ مقام میں پہنچ گئے ہیں سوائے رنگینیوں کے کچھ نظر نہ آرہا تھا، گرم موجات کی زد دل پر پڑرہی تھی۔ ایسے وقت میں قرآن مجید بہت جلد یاد آتا ہے ہم نے قرآن خوانی اور درود پڑھنا شروع کیا جس وقت ہم پہنچے تھے تو دس بج کر بیس منٹ ہوئے تھے جب آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ بارہ بج گئے ہیں ہم نے کہا خوب اصحاب کہف کی نیند کا ایک جھونکا ہم نے بھی دیکھ لیا۔ آنکھ کھلتے ہی پھر وہی پیٹ کی تکلیف بھوک محسوس ہوئی اور بری طرح محسوس ہوئی۔ درگاہ کے باہر نکلے نہ تھے کہ ایک بزرگ صورت فقیر نے ہمارے سامنے قدرتی باغ کی ایک ڈالی پیش کی کچھ سیتاپھل کچھ موز، عمدہ بیر، دو چار جام، ایک سنگترہ بیچ میں پھولوں کا ایک گلدستہ۔ ہم نے بزرگ کو حیرت سے دیکھا اور کہا حضرت آپ کون ہیں یہ کیا ہے؟ کوئی تحفہ تو نہیں ہمیں یہ محسوس ہورہا تھا کہ ان کے ذریعے غیبی امداد دی جارہی ہے۔ انھوں نے فرمایا "جی ہاں تحفۂ غیب کا لے لیجئے" ہم نے یہ تحفہ فوراً پیٹ میں اتار لیا اور آگے بڑھے جس وقت ہم چلے تو بزرگ نے ہماری طرف غور سے دیکھا ہم نے بھی انھیں غور سے دیکھا تھوڑی دور نکل جانے کے بعد خیال ہوا کہ انھیں کچھ پیسے دیدینے چاہیں۔ ہم نے جیب ٹٹولا تو اس میں نہ چوانی نہ دوانی نہ پیسہ صرف روپے آپ ہی خیال کیجئے کتنی ندامت ہوئی ہوگی بھلا غریب کو ایک روپیہ کیسے دے دیا جائے؟ ہم سوچ ہی رہے تھے کہ بزرگ نے کہا "میں آپ کی مشکل سمجھ گیا، تکلیف نہ کیجئے ادھر آئیے میں آپ کو ایک چیز دکھاؤں"

اُن کے ساتھ چلتے ہوئے سچ جانئے ہمیں کچھ خوف ہونے لگا کیونکہ اس جنگل میں سوائے اُن کے اور ہمارے کوئی نہ تھا ہاں ایک تکلیف دہ ساتھی تھا جو عجیب و غریب طریقے سے ہماری رفاقت کر رہا تھا اور یہ کوا تھا۔ کم بخت ہمارے ساتھ ساتھ ڈالی ڈالی اڑتا اور برابر کائیں کائیں کیا جارہا تھا۔ ایک آدھ میل چلنے کے بعد تالاب کا کنارہ آیا۔ قدرت کا سُہانا پن عجیب لطف دے رہا تھا۔ ہم پانی کے کنارے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے قریب ہی ایک جھونپڑی نظر آئی۔ ہم اور وہ بزرگ دونوں خاموش تھے کہ یکایک فضا میں ایک دوشیزہ آواز بلند ہوئی "ابا جان کھانا تیار ہے" ہم نے چونک کے ادھر دیکھا کچھ نہیں جھونپڑی کے دروازے پہ نظر پڑی۔ ایک رنگین اجالا ایک چمکتی پیشانی ایک چاندی سی کلائی اور ستارے جیسی ایک آنکھ ہم نے فوراً درود پڑھا اور کہا "جل جلالہ"

ہر حسن کا حسن کو بڑا مقدس سمجھتا ہے ہم نے اس وقت یہ محسوس کیا کہ اس نازنین کی محاسن کر ہمارا نگاہی تقدس کچھ دور جا پڑا ہے۔ ہم نے دماغ پر زور ڈال کے سوچنا شروع کیا کہ کسی طرح اس برق تجلی کی بوتی زد میں آنا چاہئے۔ ہم نے کچھ کھانے کے بزرگ کی طرف دیکھ کے ایک سوال کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ انھوں نے فرمایا "میاں چلو کھانا کھائیں ہم نے لبیک کہا اور موصوف سے پہلے کٹیا میں پہنچ گئے۔ ایک نازنین ہاتھ نے سلام کیا ہم نے دعا تو نہیں سلام ہی کا جواب دیا اور بیٹھ گئے۔ پھر آواز پھر بلند ہوئی۔ جناب ہم غریب ہیں، کھانا پسند نہ آئے گا۔ ہم نے کہا۔ "جناب نہیں جناب! آپ کیا کہتی ہیں اس وقت بھوک کی شدت ہے اور یہ کھانا من و سلویٰ معلوم ہو رہا ہے" کھانا کھانے تک وہ تو پشتن تھی۔ دو آنکھوں کے سامنے ہی رہا پندرہ منٹ گذرے ہوں گے کہ خدا حافظ کہنا پڑا ہم با دل ناخواستہ باہر نکلے۔ اتنے میں اُس نازنین نے مجھے آواز دی قریب بلوا کے ایک بلور جس پر دھاریاں تھیں میرے ہاتھ پر رکھا "ابا جان نے دیا ہے، اسے اپنے قلمدان میں رکھا کیجئے" ہم نے اس تحفے کو سر آنکھوں پر لیا اور شکریہ کرکے چلے ہم تنہا تھے راستہ بڑی مشکل سے طے ہو رہا تھا۔ روحانی دنیا میں محبت کی پرستش!

شاید یہ لطف جنت ہی میں حاصل ہو یا نہ ہو؟ ایک درخت کے نیچے ہم نے دیکھا کہ پگڈنڈی پر دھوپ کی طرف ایک بڑا سیاہ بچھو چلا جا رہا ہے ہماری نظر اس پر اس وقت پڑی جب کہ ہم اس پر پاؤں رکھنے ہی والے تھے ہم دور اچھل پڑے اور بچھو کو بہت غور سے دیکھنا شروع کیا چپل بچھو تھا جسم پر بڑے بڑے بال تھے اور ڈنکوں کی طرف دو بڑے سیاہ چتے ۔ اس کی جسامت بڑی تیلی کے برابر ہوگی ۔ تماشہ دیکھئے جوں ہی ہماری نظر اس پر پڑی بچھو اس طرح تلملا اٹھا جیسے اسے کسی تیز اور گرم سیخ سے چرکا دیا گیا ہے ۔ وہ سکڑنے لگا اور ایک دو منٹ میں سکڑ کر ٹھنڈا ہو گیا ۔ ہم نے دس منٹ تک اس کے چلنے کا انتظار کیا مگر وہ مرا پڑا ہوا تھا ۔ ہم نے ایک بڑی لکڑی لے کر دور سے اسے چھیڑا مگر وہ مرچکا تھا! ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی ۔ ہم اس تحفے کو ایک بڑے پتے پر اٹھا کر گھر لے آئے، دو گھنٹوں میں وہ پانی پانی ہو گیا ۔ اب ہم کو میر محمود صاحبؒ کی پہاڑی کے دو تحفے اکثر یاد آتے ہیں ۔ ایک تو اب تک قلمدان سے زیادہ دل میں ہے، اور دوسرا حافظے کی دنیا میں، ہماری سمجھ میں نہ آسکا کہ اس پہاڑی پر ہم کو یہ تحفے کیوں ملے ۔

محمد عبدالقیوم خاں باقی

نیا پل اور شام

شام کی سندر فضا میں دور کی تنویر ہے
خوابِ دوشیزہ کی میرے سامنے تصویر ہے

ہر طرف طوفانِ نغمہ ہر طرف طغیانِ نور
حضرتِ انساں کی ہر گزرن میں گم شورِ طیور

نور کی سرگرمیوں میں غرق ایوانِ بلند
شام کی دیوی نے بڑھ کر پھینک دی اپنی کمند

گنبدوں پر نور کی پرچھائیاں ہیں پر بہار
اور فضا پر چھا گیا ہے نور و ظلمت کا غبار

اک طرف تعمیرِ عدل[1] و اک طرف دار الشفا[2]
دور پر اک مدرسہ[3] ہے نیند میں کھویا ہوا

سامنے دار الکتب[4] کی دل نشیں تعمیر ہے
جس کی خشت و گل میں عقل و ہوش کی تخمیر ہے

رودِ موسیٰ پر نیا پل دہر کی تصویر ہے
جس کی دو رنگی میں دونوں دور کی تعمیر ہے

ایسے خوش منظر میں میری ذات ہی کھوئی ہوئی
جاگتی ہے آنکھ اور تقدیر ہے سوئی ہوئی

سید محمد اکبر وفاقانی

---

[1] عدالت العالیہ ۔ [2] عثمانیہ دواخانہ ۔ [3] کلیہ بلدہ ۔ [4] کتب خانہ آصفیہ ۔